لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ – القُرآن
مَنْ يُّرِدُ اللهُ بِهٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ – الحديث
اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ – نسائی

تحفۃ الباری

فی الفقہ الشافعی

جلد اول، دوّم وسوّم

مسائل ودلائل کا مستند مجموعہ

مؤلف

شیخ الحدیث مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

جامعہ حسینیہ عربیہ، شریوردھن

ناشر: مجلس اشاعت، ممبئی-۱۰

نام کتاب : **تُحفَۃُ البَارِی** فی الفقہ الشافعی (جلد اول)

مؤلف : شیخ الحدیث حضرت **مولانا محمد ابراہیم** بن علی خطیب حفظہ اللہ

(شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن)

صفحات : ۴۶۳

ناشر : **مجلسِ اشاعت**

یونائٹیڈ شافعی مسجد، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی-۳۷، [رابطہ: ۹۰۲۹۱۷۴۸۶۰]

(اراکینِ مجلس: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، جناب مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم،

جناب مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملّا، جناب محمد حسین اسماعیل ملّا، جناب ڈاکٹر محمد فاروق لوکھڑے)

تعداد : ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

سنِ اشاعت : ستمبر ۲۰۰۲ء

اشاعتِ جدید : جون ۲۰۱۳ء

کمپیوٹر کمپوزنگ: جاوید یوسف

طباعت : **غزالی**

ملنے کے پتے

جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن

مقام پوسٹ و تعلقہ: شریوردھن، ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر)

مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم، امام و خطیب پہاڑ والی مسجد، واڑی بندر، ممبئی۔۱۰

مولانا عبدالسلام نجے القاس می، امام و خطیب جالی محلہ شافعی مسجد، باپو کھوٹے اسٹریٹ، ممبئی۔۳

مفتی محمد رضوان فلاحی، مدرس جامعہ عربیہ ادھیم نگر، رتنا گیری، فون: ۹۲۷۰۰۸۴۵۸۵

مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملّا، امام و خطیب یونائٹیڈ شافعی مسجد، ایس۔ ایم۔ ڈی روڈ، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی۔۳۷

ناز بک ڈپو، محمد علی بلڈنگ، محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ممبئی-۳، فون: ۲۳۴۵۴۷۳۰

شفاء ٹریڈرس (مولانا عبدالرزاق الڈے، امام کاکر تلا مسجد، مہاڈ) نزد نائک اسپتال، مہاڈ، ضلع رائے گڑھ، فون: ۹۲۲۶۷۷۱۱۳۲

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ اَمَّا بَعْد

تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی کی اشاعت اور آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم اللہ وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں بے انتہا شکر ادا کرتے ہیں کہ اسی کی توفیق، ہمت اور اعانت کے بعد ہی ہم اس قابل ہوئے کہ اس عظیم کتاب کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کریں۔

اس کتاب کی ضرورت کا خیال ہمیں آج سے تقریباً پانچ چھ سال قبل پیش آیا۔ چونکہ ساکنینِ خطہ کوکن عموماً شافعی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ تقریباً ۳۵۔۴۰ سال قبل جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن، ضلع رائے گڑھ کے قیام کے علاوہ کوکن میں عرصہ دراز سے نہ علمی دور دورہ تھا نہ کوئی علمی مرکز اور نہ ہی علمی اور تاریخی کتابوں کا ذخیرہ تھا نہ کوئی حقائق سے روشناس کرانے والا تھا اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے فقہ شافعی کے تعلق سے عام فہم اردو میں کوئی ایسی جامع کتاب موجود تھی۔ گرچہ عربی زبان میں فقہ شافعی پر کثیر کتابیں موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فقہ شافعی میں کوئی مستند، مفصل و مدلل کتاب عام فہم اردو زبان میں ہو تاکہ عوام الناس کا ہر طبقہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اس مقدس جذبہ اور تمنا کی یہ چنگاری تھی جس نے عزم و ارادہ میں ہلکی سی رمق پیدا کی۔ دن گزرتے گئے اور یہ تمنا ارادوں کے سہارے پروان چڑھی تاآنکہ اس کتاب کی تکمیل نے عملی شکل اختیار کی اور **تحفة الباری فی الفقه الشافعی** کے نام سے مدلل و مفصل کتاب منظر عام پر آگئی۔

پہلے تو ہم صاحبِ کتاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ کے بے انتہا مشکور و ممنون ہیں، جنہوں نے ہماری درخواست قبول کی۔ اور مسندِ حدیث کی ذمہ داریوں اور بے انتہا مصروفیت کے باوجود اس اہم ترین کام کو پورا کرنے کے لئے عرق ریزی کی اور قرآن و سنت اور فقہ کی کتابوں سے مسائل اخذ کر کے عقائد و ایمانیات سے لے کر فرائض تک غرضیکہ تمام ابواب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے امت کے لئے یہ بیش بہا تحفہ تیار کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ کتاب کو صحت و سلامتی اور دارین میں فلاح و کامرانی سے نوازے۔ نیز اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے اور اس کے نفع کو عام کرے۔ آمین

بعدہ ہم ان تمام افراد کے مشکور ہیں جنہوں نے اس عظیم کام کی ابتداء تا انتہا ہر قسم کا تعاون نیز مالی مدد دی اور جنہوں نے گرانقدر وقت اور کوششوں کے بعد نشر و اشاعت کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فرداً فرداً نام لکھنا ان تمام مخلصین کے خلوص کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہو گا۔ لہٰذا ہم ان کے لئے صرف بہ صمیم قلب یہی دعا کرتے ہیں کہ خدائے ذوالجلال والاکرام انہیں دارین کی فلاح و سعادت سے شرف یاب کرے۔ اور ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ بخشے۔ آمین

والسلام

ناشر

(مجلس اشاعت، ممبئی۔۳۷)

مجلسِ اشاعت کی غرض وغایت

سیدنا امام محمد بن ادریس شافعیؒ (امام شافعیؒ) کی عظیم الشان فقہ "فقہ شافعی" جو منقول ومعقول سے جامع ہے۔ اس فقہ کو ہر زمانے میں محدثین، فقہاء ومجددین نے بزبانِ عربی مفصل ومدلل پیش کیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس فقہ کی ترویج واشاعت کا کام مختلف زبانوں میں، بطور خاص اردو میں کیا جائے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ کی سرپرستی میں مذکورہ ادارہ کا قیام عمل میں آیا۔ سالوں کی محنت کے بعد اس ادارہ کی پہلی کامیاب پیش کش ادارہ کے سرپرست شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب کی مرتبہ و مؤلفہ فقہ شافعی پر مدلل و مستند کتاب بنام " **تحفة الباری فی الفقه الشافعی**" منصہ شہود پر آگئی اور اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے فوراً بعد پہلے چند نسخے جن حضرات کی خدمت میں پیش کئے گئے ان میں سب سے پہلا نام حضرت مولانا سید شوکت علی صاحب مد ظلہ العالی [امام وخطیب، جامع مسجد، ممبئی-۲] کا ہے۔ حضرت نے کتاب کو دیکھ کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا اور ایک عظیم کام کی تکمیل پر ادارہ اور صاحبِ کتاب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب حفظہ اللہ کو جزاکم اللہ خیراً واحسن الجزاء کہتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔

اسی طرح ہمارے سامنے فقہی کتابوں کے اور بھی کئی منصوبے زیرِ غور ہیں۔ پہلا کہ اس کتاب کو بزبانِ انگریزی اور ہندی میں منتقل کیا جائے تاکہ ہمارے وہ بھائی جو اردو سے نابلد ہیں وہ بھی اس عظیم کتاب کا مطالعہ کرسکیں۔ الحمدللہ ہم نے اس باب میں پیش رفت کی اور تحفة الباری [پہلی جلد] ہندی زبان میں آپ کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہے۔ ثانیاً جمعہ کے خطبات کی نشرو اشاعت کا عزمِ مصمم بھی ہمارے دلوں میں تھا اور الحمدللہ، اللہ عزوجل کی تائید ونصرت سے جمعہ کے خطبات بعنوان "خطباتِ خطیب" بھی شائع ہوچکی ہے۔ اب اس کے بعد "خطباتِ خطیب" کی اشاعت ثانی کا منصوبہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے اور مذکورہ کام اور ہمارے آئندہ کے منصوبے ہمارے لئے آسان کرے۔ آمین

والسلام
(مجلسِ اشاعت، ممبئی۔۳۷)

شروع اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

فہرست

تحفۃ الباری

فِي الفِقْهِ الشَّافِعِي

جلـــــــد اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

از: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ العالی

یہ غالباً شعبان ۱۴۲۰ھ کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ایک ایسے علاقہ کے سفر کی سعادت نصیب ہوئی جو اس کے لئے بالکل نیا خطہ تھا۔ یعنی ''بمبئی اور گوا'' کے درمیان وہ پہاڑی علاقہ جو ''کوکن'' کہلاتا ہے۔ یہ بڑی خوبصورت، سبز دوپٹوں میں ملبوس، بلند قامت پہاڑیاں ہیں، کہیں کہیں ان کے دامن میں دودھ کی طرح سفید و شفاف آبشار اور جھیلیں بھی ہیں۔ یہ پورا علاقہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور بل کھاتی ہوئی موجیں ان ساحلوں سے کھیلتی رہتی ہیں۔ آپ جب کسی پہاڑی پر کسی جانب سے چڑھیں تو تصور بھی نہ ہوگا کہ اس پہاڑی کے اوپر بھی انسانوں کی کوئی بستی آباد ہوگی، لیکن جب آپ کہیں تنگ اور کہیں کشادہ کہیں ہموار اور کہیں ناہموار پگڈنڈیوں سے گذرتے ہوئے سرو پہاڑی کے کاندھوں پر چڑھیں گے، تو وہاں آپ کو جنگلات کے درمیان ایک اچھی خاصی آباد بستی نظر آئے گی، خوبصورت مکانات، سیمنٹ کے ساتھ ساتھ لکڑیوں کی چھتیں، اکثر مکانات کے چاروں طرف باغیچے، ناریل اور کیلی کے دراز قامت درخت دور سے استقبال کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ان راستوں اور بستیوں سے گذرتے ہوئے راقم الحروف اپنے عزیز دوست مولانا عمر بن یوسف فلاحی سلمہ اور ان کے رفیق باتوفیق اور صاحبِ ذوق عالم مولانا محمد رفیق پورکر کے ساتھ ''شری وردھن'' پہنچا۔ یہ شہر سمندر کے ساحل پر ہے، بلکہ کچھ اس وضع پر ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ سمندر نے اسے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اسی شہر میں ایک بڑی دیدہ زیب عمارت اور سرسبز و شاداب، ہری بھری پھلواریوں پر مشتمل یہ ''جامعہ'' جس کے ایک جانب پہاڑی، دوسری جانب کسی قدر فاصلہ پر گہری جھیل اور قریب ہی سمندر کا ساحل واقع ہے۔ بڑا خوش منظر اور جاذبِ قلب و نظر آتا ہے، طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد اس میں زیر تعلیم ہے۔ میں اس مدرسہ میں جلسہ تقسیمِ اسناد میں مدعو تھا، یہاں مختلف دوستوں اور بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ خود مدرسہ کے گرامی قدر اور فعال مہتمم حضرت مولانا محمد امان اللہ صاحب میرے دیوبند کے دورۂ حدیث کے ساتھی نکلے۔ یہاں جن بزرگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب خطیب ہیں۔ جواں سال، سانولا رنگ، دوہرا بدن اور سر تا پاؤں سفید پوش، مطالعہ میں وسعت اور علم میں گہرائی لیکن تواضع اور انکسار کے پیکر، حدیث و فقہ اور خاص کر فقہ شافعی پر اچھی نظر کے حامل، پہلے جواں عمری اور کسرِ نفسی حجاب بنی رہی، لیکن جب گفتگو اور تبادلۂ خیال کی نوبت آئی تو ان کی شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آسکی، اصل وطن کیرالہ ہے لیکن اب نسبتی شہر ''شری وردھن'' ہی وطن مالوف قرار پایا ہے۔

مولانا ''دارالعلوم اشرفیہ۔ راندیر'' کے فاضل ہیں اور طویل عرصہ سے ''جامعہ حسینیہ'' میں شیخیتِ حدیث جیسے اعلیٰ و باوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ طلبہ میں آپ کے اسباق بہت مقبول ہیں اور بہت سے فضلاء دامنِ تربیت سے وابستہ رہ کر آج ''کوکن'' کے علاقوں میں اعلیٰ دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولانا نے مجھے اس موقع پر اپنا زیرِ تالیف مسودہ بھی دکھایا اور مجھ کوتاہ علم سے خواہش فرمائی کہ اپنے کچھ تاثرات قلم بند کریں۔

یہ کتاب ''فقہ شافعی'' کے نقطۂ نظر سے احکام شرعیہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں گو کہ فقہ شافعی کی اور بھی کئی کتابیں ہیں، لیکن امید ہے کہ جزئیات کے احاطہ، مواد کی کثرت اور استناد کے اعتبار سے انشاء اللہ یہ کتاب نقش ثانی نقش اول سے بہتر کا مصداق ہو گی۔ مصنف نے فقہی احکام کے ساتھ ساتھ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسلام کے مزاج و مذاق کو بھی واضح کیا گیا، مسئلہ کے متعلق ضروری دلائل بھی ذکر فرمائے ہیں، زبان بھی سہل اور عام فہم ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور شافعی بھائیوں کے لئے خصوصاً مفید ثابت ہو گی۔

راقم الحروف کو اپنی حقیر مطالعہ کی روشنی میں اس کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ فقہ شافعی اپنے استدلال اور توازن کے اعتبار سے ایک عظیم الشان فقہ ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اپنے زمانہ کے ذکی ترین لوگوں میں تھے اور ان کو ایک طرف امام مالکؒ سے فقہ حجازی اور دوسری طرف امام محمدؒ سے فقہ عراقی کو حاصل کرنے اور دونوں علمی حلقوں کے سرمایہ کا حامل بننے کا موقع ملا، اس لئے شافعی دبستانِ فقہ دونوں حلقوں کے مزاج و مذاق کی جامع ہے، نہ ظاہر نص پر جمود اور قیاس سے پہلو تہی ہے اور نہ نصوص کے مقابلہ قیاس ورائے کی اتباع ہے، نہ نصوص کے الفاظ پر قناعت اور شریعت کے مصالح و مقاصد سے اغماز ہے، نہ لوگوں کی ضرورتوں اور چاہتوں سے بے اعتنائی ہے گویا یہ فقہ منقول اور معقول دونوں کی جامع ہے۔

اس لئے شافعی مکتبِ فقہ سے ہر عہد میں جلیل القدر محدثین، فقہاء اور مجددین امت پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس نے اپنے زمانہ کے ذہین ترین اہل تحقیق علماء کو متاثر کیا ہے، جس کی روشن مثال حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر حنفی ہونے کے باوجود فقہ شافعی کی گہری چھاپ کا پایا جانا ہے۔

پوری دنیا میں اہل سنت والجماعت میں مجموعی اعتبار سے احناف کے بعد سب سے بڑی تعداد سیدنا امام شافعیؒ ہی کی متبعین کی ہے، خود برِ صغیر میں غالب ترین اکثریت حنفیہ کی ہے، پھر شوافع اس کے بعد کچھ غیر مقلدین ہیں۔ اس فقہ کی عظمت، مسلمانوں کی کثیر تعداد کی اس سے وابستگی ہے اور برِ صغیر میں فقہ حنفی کے بعد اس فقہ کے رواج و شیوع کا تقاضا ہے کہ اردو زبان میں بھی کام ہو، مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب اس ضرورت کی تکمیل میں اہم حصہ ادا کرے گی اور بندگانِ خدا کو اس سے نفع پہونچے گا۔

وباللہ التوفیق وهو المستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۱ر ذوالحجہ ۱۴۲۱ھ، ۷ر مارچ ۲۰۰۱ء م

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

از: مولانا نثار احمد عبد الشکور دروگے صاحب مدظلہ العالی

الحمدلله رب العلمین والصلوٰة والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی آله للطیبین للطاهرین و صحابة للغرالمیامین۔ امابعد

اسلام دین حنیف اور دین فطرت ہے۔ قال تعالیٰ فَأَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفاً (سورہ روم ۳۰)

تم یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو بدلنا نہیں چاہئے، پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اسلام دراصل ایک عقیدہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی ذات ہی معبودِ برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی قابلِ عبادت نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کے تحت شریعتِ مطہرہ کا ظہور ہوتا ہے جو حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں اور جمیع اطراف وجوانب کو منظم کر کے سجاتی سنوارتی اور نکھارتی ہے، اسی شریعت پر اللہ تعالیٰ نے اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ الخ کے ذریعہ اپنی رضا کی مہر ثبت فرمائی پھر شریعت نے ولادت سے وفات سے جملہ ادوار مراحل من کل الوجوہ روشن تعلیمات اور واضح ہدایات عطا کی ہیں ان میں سے کچھ چیزیں ضروریاتِ دین میں سے ہیں جن کا سیکھنا اور علم حاصل کرنا طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم کے سبب فرض ہے۔ ہر مکلف (یعنی عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت) پر من جانب اللہ چند فرائض و واجبات اور احکام عائد ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ اس سے صادر ہوتے ہیں اور کچھ اس کے پیشے اور معاملات سے وابستہ ہوتے ہیں، ان کو حکمِ شرع کے مطابق ادا کرنا فرض و ضروری ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ عمل خواہ کتنا ہی عظیم ہو یا حقیر اگر شرعی اصول و ضوابط کے بنا کیا جائے تو مقبول و معتبر نہیں۔ اس ضرورتِ شدیدہ اور امرِ اہم کے پیش نظر علماء کرام و فقہاء عظام نے بڑی ہی جد وجہد، کد و کاوش، محنت و لگن سے روز مرہ پیش آنے والے مسائل کے احکام خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ کتابوں میں جمع کر کے امت مسلمہ پر نہایت عظیم احسان فرمایا۔

ان کی وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتابیں آج تک دنیا میں عظمت اور قدرت منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام علماء و فقہاء کی نفوس طیبہ کو اعلیٰ علیین کے مراتبہ عالیہ میں اپنی جوار رحمت و رضوان میں جگہ مرحمت کرے اور امت مسلمہ کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

بر صغیر ہند و پاک میں مسلک حنفیت کی اکثریت کے باعث علماء و فقہاء احناف نے اردو زبان میں چھوٹی بڑی بے شمار کتابوں کے ذریعہ اپنے مسلک کو فروغ دیا اور فقہ حنفی بیش بہا اور گرانقدر خدمت انجام دے کر اصحاب احناف پر عظیم احسان کیا۔

اس کے بالمقابل شافعی مسلک کے علماء و پیروکار کی تعداد نسبتاً قلیل رہی بناء بریں اردو زبان میں فقہ شافعی کی زیادہ کتابیں منظر عام پر

نہ آسکیں اور چھوٹی بڑی جو چند کتابیں طبع ہوئیں وہ بھی نا قابل اور تفصیل طلب تھیں شوافع کے لئے یہ ایک لمحۂ فکر اور تشویشناک مرحلہ تھا اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور شیخ الحدیث مولانا ابراہیم صاحب (زادہ اللہ علما وفضلا وفقہا) جیسی عالمانہ فقیہانہ اور محققانہ شخصیت کے ذریعہ اس خلا کو پُر فرمایا۔ مولانا موصوف نے برسوں کی غواصی و غوطہ زنی، کتب بینی و ورق گردانی اور شب بیداری سے ایسا بیش بہا علمی شاہکار اور دُرِّ تاجدار پیش کیا ہے جس سے ہر گھر کو روشن ہونا از حد ضروری ہے۔ یہ کتاب بے شمار مسائل اور دلائل و براہین کا عظیم مجموعہ ہے جو اس سے قبل ناپید تھا، ربِّ کریم مولانا کو اپنی رحمت کے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے، علم و فضل میں زیادتی و کمال اور صحت و عافیت اور سلامتی کے ساتھ عمر میں برکت دے اور کتاب ہذا کو مقبولیت تام اور لوگوں کو اس سے نفع عام بخشے۔

امت مسلمہ کو اس سے مستفیض فرمائے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

مولانا علم کا بحر زخار ہیں جس میں بلا کی گہرائی ہے۔

اور بقول شخصے

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

کا مظہر ہیں۔ موصوف نے جب مجھ سے فرمایا کہ اس کتاب کے متعلق چند کلمات تحریر کروں تو سوچ میں پڑ گیا کہ اس قدر قد آور و نامور ہستی کی بلند پایہ اور علمی کتاب پر مجھ جیسا بے علم و بے مایہ کیا لکھ سکتا ہے۔ پھر جب فون پر بُعد مسافت (جو تعلق قلب کے قرب سے مانع نہیں) کے سبب اصرار ہوا تو اس امید پر کہ علماء کے زمرے میں شامل ہو کر انہیں کی صف میں شمار کیا جاؤں اور جنت میں دار و قرار مل جائے۔ یہ چند باتیں خامہ فرسا کر دیا ہوں۔

والسلام
نثار احمد عبد الشکور دروگے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

از: حضرت مولانا محمد الیاس ندوی صاحب مدظلہ العالی

جنرل سکریٹری، مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل (کرناٹک)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین

امابعد

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام عہد بنی امیہ میں ولی بند عبد الملک کے زمانہ خلافت کے دوران ۱۳ھ میں سندھ میں محمد بن قاسم کے حملہ کے بعد آیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس سے بہت پہلے ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہونچ چکا تھا، تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب تاجروں کی ہندوستان آمد کا سلسلہ عہد نبوی سے قبل ہی سے جاری تھا، ان کی آمد بالعموم کیرالا سے گجرات کے درمیان ساحلی خطوں میں ہوتی تھی، جزیرۃ العرب میں اسلام کی آمد کے بعد ان عرب تاجروں کی حیثیت مبلغین اسلام کی بھی ہوگئی اور ان ہی کے ذریعے دیارِ ہند میں پہلی دفعہ توحید کی اذان گونجی، اس وقت ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقوں میں آباد مسلمان ان ہی عرب دعاۃ وتجار سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لئے وہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کے برخلاف مسلکاً شافعی اور اپنی تہذیب و ثقافت اور وضع وقطع میں یہاں کے دیگر باشندوں سے الگ ہیں اور آج بھی عربوں سے مشابہت رکھتے ہیں، ان شافعی المسلک مسلمانوں کی بڑی تعداد خطہ کوکن میں آباد ہے اور کیرالا کے علاوہ بھٹکل کرناٹک میں بھی ان کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے اور مجموعی طور پر ان کی آبادی کئی ملین ہے، انمسلمانوں کی فقہی ضرورت کے پیش نظر الحمد للہ گذشتہ صدی میں متعدد کتابیں اردو اور دیگر مقامی زبانوں میں لکھی گئیں، خود امام شافعیؒ کی کتاب "کتاب الام" کے کچھ ابواب کے اردو تراجم شائع ہوئے، حیدرآباد کے احمد یار جنگ صاحب نے "المبسوط" کے نام سے ایک تفصیلی کتاب لکھی اور بھٹکل سے تعلق رکھنے والے مولانا ایوب صاحب ندوی نے بھی فقہ کے مختلف ابواب پر کئی کتابیں لکھیں، لیکن ان سب کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک مفصل اور جامع کتاب موجودہ تقاضوں کے پس منظر میں لکھی جائے جس سے عوام اور خواص بیک وقت استفادہ کرسکیں اور اس میں عبادات کے علاوہ معاملات، لین دین اور دیگر فقہی مباحث کا بھی احاطہ ہو۔

کوکن کے مسلمان اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ یہ سعادت ان کے حصہ میں آئی اور وہاں سے اس کی تالیف و تدوین اور اشاعت کا اہم فریضہ انجام پایا اور جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن کے شیخ الحدیث محترم مولانا ابراہیم صاحب زید لطفہ جو خود جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں میرے زمانہ طالب علمی میں زیر تعلیم تھے، ان کے لئے اس گرانقدر خدمت کو اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا، انہوں نے بڑے سلیقے

کے ساتھ دلائل کی روشنی میں شستہ اردو میں فقہ شافعی کے تمام اہم ابواب کا احاطہ کرتے ہوئے ''تحفۃ الباری'' کے نام سے اس کام کو انجام دیا، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے بیک وقت ہمارے علماء و طلباء رجوع کر سکتے ہیں اور عوام الناس بھی اس سے براہ راست استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف وسیع الفکر بھی ہیں اور سلاست طبع کے حامل بھی، ان کا مطالعہ بھی گہرا ہے اور اپنی بات پیش کرنے کا انداز بھی سلجھا ہوا اور سب سے بڑھ کر حاملِ شریعت اور عامل بالسنۃ بھی۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کے ناشرین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کے نفع کو عام فرمائے۔ (آمین)

محمد الیاس ندوی
جنرل سکریٹری، مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل (کرناٹک)
۲/ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ مطابق ۸/ مئی ۲۰۰۸ء

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلماتِ بابرکت

از: حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری مدظلہ العالی

محب مکرم حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب زید مجدہم سے قدیم واقفیت ہے۔ زمانۂ طالبِ علمی ہی میں خوب محنت اور جاں فشانی کے ساتھ حصولِ علم میں مشغول رہے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور وقار کے ساتھ سلجھا ہوا علمی ذوق اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھا ہے۔

ہمارے یہاں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں طلبہ میں ایک مخصوص تعداد شافعی المسلک طلبہ کی ایک زمانہ میں رہی اس وقت سے دل میں برابر یہ داعیہ رہا کہ فقہ شافعی میں اردو زبان میں کوئی کتاب ایسی ہو جس میں تمام فقہی مسائل کا اجمالی طور پر احاطہ کیا گیا ہو۔

برادر موصوف نے اپنی تالیف تحفۃ الباری احقر کو عنایت فرمائی، کتاب دیکھ کر دل بایں معنی خوش ہو گیا کہ احقر کی دیرینہ تمنا پوری ہوتی نظر آئی، زیر نظر کتاب میں انہوں نے فقہی احکام کے ساتھ ساتھ اس کی مصالح و علل پر بھی روشنی ڈالی ہے، بقدرِ ضرورت دلائل بھی ذکر فرمائے ہیں اور زبان بھی آسان اور عام فہم ہے۔

اللہ تعالیٰ موصوف کی اس کاوش کو حسنِ قبول عطا فرما کر تمام مسلمانوں کے لئے عموماً اور حضراتِ شوافع کے لئے خصوصاً نافع و مفید بنائے۔ اس کتاب کی تالیف پر میں برادر موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کے فیوضِ علمیہ سے مسلمانوں کو بیش از بیش مستفید و مستفیض فرمائے۔ آمین

أملاہ احمد خانپوری
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّد بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ خَاتِمِ النَّبِیّٖنِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ'' اَمَّابَعْد

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ ''(فاطر ۲۸)(اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جن کو سمجھ (علم) ہے)

نیز ارشاد ہے۔''قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ ''(زمر ۹)(تو کہہ، کوئی برابر ہوئے ہیں علم و سمجھ والے اور بے سمجھ)

علم کی فضیلت واھمیت: آیات ربّانی اور آیات انفس وآفاق سے صحیح نصیحت اور عبرت انگیزی کا اہل علم کے ساتھ خاص ہونا، جہل اور لاعلمی کی مذمت اور گمراہی کا باعث بننا اور باوجود علم کے حق کو ٹھکرانے کی وعید وتہدید کے متعلق قرآن کریم کی بکثرت آیات سے دلالت حاصل ہوتی ہے، مثلاً: ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۴۲۔۸۷۔۳۱۔۱۵۱۔۲۲۹۔۲۵۱۔ سورہ آل عمران آیتنمبر ۱۹۔ ۶۱۔ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۶۲۔ سورۂ یونس آیت نمبر ۵، سورۂ یوسف آیت نمبر، ۸۶۔ ۶۸۔ سورۂ رعد آیت نمبر، ۳۷۔ سورۂ اسراء آیت نمبر، ۳۶۔ ۱۰۷۔ سورۂ کہف آیت نمبر، ۶۵۔ ۶۶۔ سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱۴۔ سورۂ انبیاء آیت نمبر ۷۔ سورۂ نمل آیت نمبر ۱۵۔ ۴۰۔ سورۂ محمد آیت نمبر ۱۹۔ سورۂ رحمٰن آیت نمبر ۲۔ سورۂ علق آیت نمبر ۵۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے!''اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دینی علم و سمجھ سے نوازتے ہیں''(متفق علیہ) صحیحین کی ایک حدیث میں اس شخص کو قابلِ رشک بتلایا جو علم دین کی دولت سے مالامال ہو، اور اس کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتا اور دوسروں تک اس دولت کو پہنچاتا ہو۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے!''جب انسان کی وفات ہوتی ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ بھی ختم ہوجاتا ہے' سوائے تین اسباب کے، صدقہ جاریہ، نفع بخش علم، یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کرے''(مسلم) مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تحصیل علم میں سفر کرے اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے جنت کا راستہ اس پر آسان کردیتے ہیں۔ بعض روایات میں آگے یہ بھی ارشاد ہے''یقیناً فرشتے طالب علم کی رضامندی میں اپنے پر بچھادیتے ہیں، اور بلاشبہ ایک عالم کے لئے آسمان وزمین والے اور پانی کے اندر مچھلیاں استغفار کرتے ہیں۔ اور ایک عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے، جیسے چودھویں کے چاند کی دیگر ستاروں پر، اور علماء انبیاء کرام کے وراث ہیں اور انبیاء کرام نے درہم اور دینار کی میراث نہیں چھوڑی، انھوں نے تو علمی میراث چھوڑی ہے سو جو اسے حاصل کرلے اس نے کافی حصہّ حاصل کرلیا''(احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤ۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

آپ ﷺ نے فرمایا!''اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھاوے گا کہ بندوں (کے دل) سے اسے نکال دے، بلکہ علماء کو اٹھائے گا، اور (ان کے صحیح جانشین نہ ہونے کی وجہ سے) اس طرح علم اٹھ جائیگا، پھر جب کوئی عالم باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (یعنی مفتی وقاضی وغیرہ) بنائیں گے پھر ان سے مسائل پوچھے جائیں گے، اور وہ بلا علم فتوی دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے''(متفق علیہ) ابن ماجہ اور بیہقی کی ایک روایت میں طلبِ علم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے ترمذی کی حدیث میں ہے۔

"جو طلبِ علم میں نکلے۔ تو لوٹنے تک وہ اللہ کے راستہ میں (جہاد میں) ہے"

آپ ﷺ کا ارشاد ہے!"ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے گراں ہے۔"(ترمذی۔ابن ماجہ) نیز ارشاد ہے۔"حسنِ اخلاق اور دینی فقاہت وسمجھ، یہ دونوں صفتیں کسی منافق میں جمع نہیں ہو سکتیں۔"(ترمذی) ایک حدیث میں فرمایا!"اگر کسی سے ایسی بات پوچھی جائے جو اسے معلوم ہو"(اور سائل کو اس دینی مسئلہ کی ضرورت ہو) لیکن یہ اُسے چھپائے، توبروزِ قیامت اس کو آگ کی لگام پہنائی جائیگی"(احمد۔ابوداؤد۔ترمذی۔ابن ماجہ)

جو شخص علماء کے مقابلہ کیلئے، یا بیوقوفوں سے لڑنے کیلئے، یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے علم حاصل کرے، اس کے متعلق وارد ہے کہ اللہ اسے جہنم میں داخل کردیں گے۔ (ترمذی۔ابن ماجہ)"اسی طرح دینی علوم کو محض دنیا کی تحصیل کی نیت سے حاصل کرنے والے کے متعلق ارشاد ہے کہ اسے جنت کی خوشبو تک نہ ملے گی"(احمد۔ابوداؤد، ابن ماجہ)

علم دین کی فضیلت میں صحابہ وتابعین اور دیگر اسلاف وعلماء سے بھی بکثرت اخبار وآثار منقول ہیں۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث کی روشنی میں دینی علوم کی اہمیت اور نیک نیتی کے ساتھ اس کے تعلیم وتعلّم کی فضیلت بالکل واضح ہے۔ اور اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل واحکام کی حد تک علم کا حصول ہر مسلمان کے حق میں فرض ہے۔ لہٰذا وہ لمحات اور اوقات بڑے قیمتی ہیں"جو آدمی ان علوم کی تحصیل میں صرف کرے۔

خطہ کوکن میں عموماً شافعی مسلک پر عمل ہے، اور عربی زبان میں فقہ شافعی کا کافی وافی ذخیرہ موجود ہے۔ وقت کی ضرورت، اور بعض حضرات کی تعمیل فرمائش میں یہ ایک حقیر سی کوشش اردو زبان میں اسے پیش کرنے کی ہے۔ جس میں حتی الامکان عوام کے پیشِ نظر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سہل اور عام فہم انداز میں مسائل کو پیش کیا جائے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے عبارت کا انداز بدل جائے۔ اور بات طویل ہو جائے۔ نیز قرآن وحدیث کے واضح دلائل سے بھی مسائل کو مدلّل کیا گیا ہے دَقیق اور عقلی دلائل سے عموماً گریز کیا گیا ہے، کیونکہ یہ عام ذہن سے اونچی سطح کی بات ہو جائے گی۔ اور اس کتاب کا اصل مقصد عوام کی اِفادیت اور علمی تشنگی کی سیرابی کا سامان ہے اہلِ علم کے لئے عربی زبان میں ہر طرح سے اطمینان بخش مواد موجود ہے۔ اور وہ حضرات براہ راست مُراجعت کرسکتے ہیں۔ مقدمہ میں امام شافعی کے حالات، شریعت کے مصادر، فقہی تدریجی دور، اختلافات کے اسباب تقلید واتباع اور شافعی کتب فقہ میں ترتیب وغیرہ مباحث پر مختصر روشنی ڈالی گی ہے۔

ابتداء میں مزید افادیت کیلئے مختصراً اہم عقائد کا نچوڑ خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ بغیر صحیح عقائد کے سب کچھ فضول ہے اور عقائد کی درستگی واصلاح اولیّن واہم ترین فریضہ ہے۔

طہارت سے جنائز کے آخر تک ابواب کو امام نوویؒ کی مشور ومعروف کتاب روضۃ الطالبین کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ تاہم نادر الوقوع اور دقیق مسائل کو نظر انداز کیا گیا ہے، بقیہ کتابوں کے اضافوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ تاہم صلوۃ الخوف کا باب مختصراً فتح الوہاب کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے آگے عبادات کے دیگر ابواب یعنی زکات، روزہ اور حج کے مسائل کی ترتیب میں فتح الوہاب (للشیخ زکریا انصاری علیہ الرحمۃ) مع حاشیہ الجمل کو اصل قرار دیا گیا ہے، اور دیگر کتابوں سے ماخوذ مسائل کا حوالہ دیا گیا ہے۔

معاملات کے ابواب کی ترتیب میں دورِ حاضر کی ایک تصنیف "الفقہ المنہجی" (مصطفی الحق۔مصطفی البغا۔علی الشربجی) کو اصل قرار دیتے ہوئے بقیہ مسائل کے مآخذ کا حوالہ دے دیا گیا ہے، دیگر ابواب (مثلاً نکاح، قربانی، قسم وغیرہ) کو مختلف

کتب کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے، جس کا اجمالی حوالہ ہر باب کے اختتام پر درج ہے۔

تمام مسائل معتبر کتب سے ماخوذ ومستفاد ہیں۔ جہاں اپنی جانب سے مزید افہام وتشریح کی ضرورت محسوس کی، عموماً اسے واضح کردیا ہے، یا پھر بین القوسین لکھا گیا ہے۔

بعض مسائل مختلف ابواب سے مناسبت کی وجہ سے مزید افادیت کی خاطر ایک سے زائد مقامات پر درج کئے گئے ہیں۔

جمعہ کے باب سے لے کر جنائز تک (صلوٰۃ الخوف مستثنیٰ) مولوی شعیب عبد الرحمن مانڈ لیکر اور کتاب الفرائض (میراث کا بیان) مفتی محمد عمر یوسف امیر کر ان حضرات کے درخشاں قلم اور عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔

اسلام کی رہنمائی کسی ایک باب اور شعبہ تک محدود نہیں، بلکہ وہ ماں کی گود سے لے کر قبر کی گود تک تمام لمحات اور شعبوں پر حاوی اور مسائل میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ یہی اسلام ایک کامل مذہب اور دین فطرت ہے، اور اس کا مطالبہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ ورسول کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ عقائد یا عبادات ہوں، یا معاملات اور معاشرتی مسائل حدود وسزا کے ابواب ہوں یا عدالت وسیاست کے مسائل، تمام امور میں اسلام کی درخشاں تعلیمات موجود ہیں۔ اور ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام امور میں اسلامی احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے، تاہم عدالت وسیاست اور حدود وغیرہ کا تعلق چونکہ ایک اجتماعی اسلامی نظام سے ہے، جو فی الوقت ان علاقوں میں ناپید ہے۔ جس کی وجہ سے انفرادی حیثیت سے اس پر عملی موقع فراہم ہونے کا سوال نہیں، اور اس کتاب کا مقصد چونکہ عام حضرات کو فی الحال پیش آنے والے مسائل کی تفصیلات سے آگاہ کرنا ہے۔ اس لئے سردست ان ابواب کو داخل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن بعض احباب کے اصرار ومشورہ کی وجہ سے مختصراً ان ابواب کو بھی داخل کیا جارہا ہے تاکہ کتاب ان مسائل سے تشنہ نہ رہے اور فی الجملہ ان مسائل سے بھی آگہی حاصل ہو جائے۔

تحریک وتائید، مشورہ، ہمت افزائی، جانچ واصلاح اور کتاب کی ترتیب وتالیف اور طباعت کی تکمیل تک مختلف خیر خواہ احباب کا تعاون شاملِ حال رہا، جسے اللہ کی علیم وخبیر ذات بخوبی جانتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان تمام معاونین کو اجر جزیل وثواب عظیم عطا فرمائے، اور دارین کی خیر وبرکات سے ان کا دامن بھر دے (اٰمین)۔ (ان احباب کے اسماء کی تصریح شاید ان کی مخلصانہ طبیعت گوارانہ کرے، اس لئے صراحت سے گریز کر رہا ہوں)

اللہ تعالیٰ کا کروڑہا کروڑ، بلکہ بے انتہا شکر ادا کرتا ہوں کہ محض اپنے فضل وکرم اور دستگیری سے اس خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے خوب خوب قبول فرمائے، لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرے، نفع عام وتام فرمائے اور دارین کی فلاح وکامرانی کا سبب بنائے (اٰمین)

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِيْ الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمَ (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمة

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب: محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف الامام عالم العصر ناصر الحدیث فقیہ الملت ابو عبد اللہ القریشی ثم المطلبی الشافعی المکی۔

امام شافعی کے نسب میں جو مطلب بن عبد مناف ہیں، وہ آپ ﷺ کے پردادا ہاشم کے بھائی ہیں، تو گویا عبد مناف پر جا کر آپ ﷺ کے ساتھ مل جاتے ہیں امام شافعی مطلبی سادات میں سے ہیں۔

پیدائش: امام شافعیؒ کی ولادت باسعادت ۱۵۰ھ میں بمقام غزّہ (فلسطین) ہوئی۔ ان کے والد ادریس نوجوانی میں ہی انتقال کر گئے، لہٰذا امام صاحب نے اپنی والدہ کے گود میں یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ والدہ دوسال کی عمر میں انھیں لے کر مکہ مکرمہ تشریف لائیں، اور یہیں وہ پروان چڑھے، تیر اندازی کی طرف توجہ دی۔ اور تمام ہم عصروں پر اس فن میں فوقیت لے گئے، پھر عربی زبان واشعار کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بلند مقام حاصل کیا۔

پھر ان کا دل فقہ کی طرف مائل ہوا، اور اس میں تمام ہم عصروں پر تفوق حاصل کی۔

تحصیل علم اور اساتذہ: مکہ مکرمہ میں مسلم بن خالد زنجی (مفتی مکہ)، داود بن عبد الرحمان عطار، محمد بن علی شافع، سفیان بن عیینہ، عبد الرحمان بن ابی بکر الملیکی، سعید بن سالم، فضیل بن عیاض اور دیگر کئی علماء سے علم حاصل کیا۔

جب امام شافعیؒ کی عمر بیس سال سے کچھ اوپر ہوئی، تو مدینہ منورہ کی طرف رختِ سفر باندھا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کے روبرو حفظاً مؤطا سنا کر اس کی سند حاصل کی، نیز ابراہیم بن ابی یحییٰ، عبد العزیز الدراوردی، عطاف بن خالد، اسمٰعیل بن جعفر اور ابراہیم بن سعد وغیرہ حضرات سے کسبِ فیض فرمایا۔

یمن میں حضرات مُطرّف بن مازن، ہشام بن یوسف القاضی اور دیگر علماء سے تحصیل علم کیا۔ اور بغداد میں امام محمد بن حسن، عبد الوہاب ثقفی اور دیگر کئی افراد سے علم حاصل کیا۔ امام صاحب نے طلب علم میں مکہ مدینہ کے بعد کوفہ، بغداد، فارس اور اطراف کے عجمی علاقے پھر ربیعہ ومصر کے علاقے، شمالِ عراق پھر جنوب روم پھر حران پھر فلسطین اور دیگر علاقوں کا سفر اختیار کیا۔

امام شافعی نے بکثرت کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اور علم کو مدون کیا۔ اور احادیث کی اتباع کرتے ہوئے دیگر حضرات کا رد کیا۔ نیز اصول فقہ اور فروع فقہ پر کتابیں تحریر کیں۔ اور حضرت کی کافی شہرت ومقبولیت ہوئی۔ اور بکثرت طلبہ خدمت میں تحصیل علم کے لئے حاضری دینے لگے۔

شاگرد: درج ذیل علماء کرام نے امام شافعی سے احادیث روایت فرمائی ہے۔

حمیدی، ابوعبید قاسم بن سلام، احمد بن حنبل، سلیمان بن داود، ہاشمی، ابویعقوب بویطی، ابو ثور، حرملہ، موسیٰ بن ابی الجارود مکی،

عبد العزیز مکی، حسین بن علی کرابیسی، ابراہیم بن المنذر، حسن بن محمد زعفرانی، احمد بن محمد ازرقی، احمد بن سعید ہمدانی، احمد بن ابی شریح الرازی، احمد بن یحییٰ مصری، احمد بن عبد الرحمن وہبی، ابراہیم بن محمد شافعی، اسحاق بن راہویہ، اسحاق بن بہلول، ابوعبد الرحمن احمد بن یحییٰ شافعی، حارث ابن سریج، حامد بن یحییٰ بلخی، سلیمان بن داود، ھہری، عبد العزیز بن عمران، علی بن معبد، علی بن سلمہ، عمرو بن سواد، ابو حنیفہ قحزم بن عبد اللہ، محمد بن یحییٰ، سعود بن سہل، ہارون ابن سعید، احمد بن سنان، احمد بن عمرو، یونس بن عبد الاعلی، ربیع بن سلیمان مرادی، ربیع بن سلیمان جیزی، محمد بن عبد اللہ بن الحکیم، بحر بن نصر خولانی، اور ان کے سوا ایک جم غفیر۔

امام دار قطنی نے امام شافعی سے روایت کرنے والوں کے متعلق دو جزو میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ قدیم وجدید اکابر علماء نے اس امام کی شان اور مناقب میں کتابیں لکھی ہیں۔

مناقب: امام ابو عبید نے فرمایا! ”میں نے امام شافعی سے بڑھ کر عقلمند کسی کو نہیں دیکھا“

جب امام صاحب کی عمر پندرہ سال ہوئی تو امام مسلم بن خالد زنجی (مفتی مکہ) نے انھیں فتوی دینے کی اجازت دی۔

مامون نے کہا: میں نے ہر چیز میں امام شافعی کا امتحان لیا تو انھیں کامل پایا۔

امام سفیان بن عیینہ کے پاس تفسیر یا فتوی سے متعلق کوئی سوال آتا تو امام شافعی کی طرف متوجہ ہو کر ان سے پوچھنے کا حکم دیتے۔

فرمودات

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: قرآن وحدیث کی روشنی میں کلام کرنے والا برحق ہے اس کے علاوہ سب بکواس ہے، نیز فرمایا: اصل کے متعلق کیوں اور کیسا سوال نہیں اٹھایا جائیگا۔

فرمایا: اصل قرآن یا حدیث ہے۔ ورنہ پھر ان دونوں پر قیاس، حدیث اگر صحیح ہو تو وہ سنت ہے۔ اور اجماع تنہا حدیث سے بڑھ کر ہے۔ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہو گی، اگر کسی حدیث میں کئی مفہوم کا احتمال ہو، تو جو ظاہر کے زیادہ مشابہ ہو، وہ مراد لیں گے، منقطع حدیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ بجز ابن المسیب کی منقطع روایت کے۔

فرمایا: حدیث کا پڑھنا نفل نماز سے بہتر ہے، نیز فرمایا: تحصیل علم نفلی نماز سے افضل ہے، فرمایا: میں نے ہر کسی سے محض خیر خواہی کی نیت سے مناظرہ کیا ہے۔

فرمایا: اگر تم میرے کتاب میں آپ ﷺ کی سنت کے خلاف کچھ پاؤ۔ تو سنت کو اختیار کرو اور میرا قول چھوڑ دو۔

فرمایا: اگر حدیث صحیح ہو، تو وہی میرا مذہب ہے، اور جب حدیث صحیح ہو، تو میری بات کو دیوار پر دے مارو۔

امام شافعی کا ارشاد ہے۔ ”جب میں آپ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث روایت کروں، اور اس پر میرا عمل نہ ہو تو تم کو اس بات پر گواہ رکھتا ہوں کی میری عقل ماری گئی ہے“

نیز ارشاد ہے: کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہو گا، اور کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی۔ جبکہ آپ ﷺ کی کوئی حدیث روایت کروں، لیکن اسے اختیار نہ کروں۔

عبادت: امام شافعیؒ نے رات کے تین حصہ کئے تھے، پہلی تہائی میں لکھتے، دوسری میں نماز پڑھتے اور تیسری میں سو جاتے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ نیت کی وجہ سے تینوں اعمال عبادت ہیں۔

امام شافعیؒ ماہِ رمضان میں نماز میں ساٹھ قرآن ختم فرماتے۔

زہد وتقوی: امام شافعی نے فرمایا: ۱۶/سال کی مدت سے میں صرف ایک مرتبہ شکم سیر ہوا ہوں، اس وقت ہاتھ ڈال کر اسے قئ کر دیا، کیونکہ شکم پری بدن کو ثقیل وگراں اور دل کو سخت کرتی ہے۔ ذہانت کا ازالہ کرتی ہے، نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور عبادت میں کوتاہی ہوتی ہے اپنے شاگرد امام ربیع سے فرمایا! "زہد اختیار کرو، کیونکہ زاہد کے لئے زہد ایک نوعمر دوشیزہ کے بدن پر زیورات سے بڑھ کر حسین وخوبصورت ہے۔"

اپنے جوشِ سخاوت کی وجہ سے کم ہی کوئی چیز ان کے پاس رہتی تھی۔

بعض زرین اقوال

امام شافعی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ھے: بندوں پر ظلم وزیادتی آخرت کے لئے بدترین توشہ ہے۔

ارشاد ہے۔ علم تو وہ ہے جو نفع دے، نہ کہ جو حفظ کر لیا جائے۔

فرمایا: جسے تقویٰ عزت نہ بخشے تو اس کی کوئی عزت نہیں۔

بکثرت اپنے ہاتھ میں لاٹھی رکھنے کا سبب بتلایا! تاکہ یہ یاد رہے کہ میں ایک مسافر ہوں۔

فرمایا: جو شہوتوں کا پابند ہو گا اسے دنیا پرستوں کی غلامی لازم ہو گی۔

فرمایا: بھلائی پانچ باتوں میں ہے۔ نفس کی بے نیازی، کسی کو تکلیف نہ دینا، حلال کمانا۔ تقویٰ۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔

فرمایا: بہترین ذخیرہ تقویٰ اور بدترین ظلم وزیادتی ہے۔

ارشاد ھے: گناہوں سے پرہیز اور بے مقصد امور کا ترک دل کو منور کرتا ہے۔ تم تنہائی اور کم کھانے کی عادت اختیار کرو، بیوقوفوں اور ناانصافوں کی صحبت سے دور رہو جب تم فضول و بے مقصد معاملہ میں بات کرو گے، تو وہ بات تمہاری مالک بن جائیگی۔ تم اس کے مالک نہ رہو گے۔

فرمایا: عاقل وہ ہے جس کی عقل اسے ہر مذموم سے روکے۔

ارشاد ھے: مروّت کے چار ارکان ہیں۔ خوش اخلاقی، سخاوت، تواضع، اور عبادت

فرمایا: دوست کی علامت یہ ہے کہ اپنے دوست کے دوست کا بھی دوست ہو۔

فرمایا: جو تمھارے پاس چغلی کرے، وہ تمھاری بھی چغلی کرے گا۔

فرمایا: تواضع شریفوں کی عادت ہے، اور تکبر کمینوں کی خصلت ہے، تواضع محبت پیدا کرتی ہے اور قناعت راحت کا باعث ہے۔

فرمایا: لوگوں میں قدر ومنزلت اور فضیلت میں وہ شخص سب سے بڑھکر ہے جو خود اپنی کوئی قدر ومنزلت نہ سمجھے۔

ارشاد ھے: کسی شخص کی غلطی پر لوگ ہنسے، تو اس کی صحیح صورت اس کے دل میں جم جاتی ہے۔

امام صاحب کے متعلق کلمات ائمہ

امام عبدالرحمن بن مھدی: میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں، امام شافعی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

امام مالک: میرے پاس امام شافعی سے بڑھ کر کوئی فہیم قریشی نہیں آیا۔

امام احمد: میں بوقتِ سحر چھے حضرات کے لئے دعا کرتا ہوں، جن میں ایک امام شافعیؒ ہیں، ...امام شافعیؒ دنیا کیلئے سورج کی طرح اور لوگوں کے لئے عافیت کی طرح تھے۔

امام قتیبہ: شافعی امام ہیں۔

امام ابوثور: میں نے امام شافعیؒ کے مثل نہیں دیکھا۔ اور نہ خود انھوں نے اپنے مثل دیکھا ہے۔

امام احمد بن حنبل: اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں ایک ایسی شخصیت کو لوگوں کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں، جو انھیں آپ ﷺ کی سنتوں کی تعلیم دے، اور آپ ﷺ کی طرف منسوب جھوٹ اور غلط باتوں کی تردید کرے، پس ہم نے دیکھا تو پہلی صدی میں حضرت عمر بن عبد العزیز اور دوسری صدی میں حضرت امام شافعیؒ اس رتبہ پر فائز ہیں۔

امام حرملہ: میں نے امام شافعیؒ سے سنا مجھے بغداد میں ناصر الحدیث (حدیث کی نصرت کرنے والے) کے خطاب سے نوازا گیا۔

امام احمد: امام شافعیؒ سب سے زیادہ فصیح تھے، علم فقہ مقفل تھا، جسے امام شافعیؒ نے کھول دیا۔

امام ابوزرعۃ رازی: امام شافعیؒ کے پاس کوئی غلط حدیث نہیں ہے۔

امام ابوداودؒ: مجھے امام شافعیؒ کی کسی حدیث میں خطا کا علم نہیں ہے۔

ابن ھشام لغوی: امام شافعی کے ساتھ ہماری طویل مصاحبت رہی، لیکن کبھی بھی ایک لحنہ (لغت کی غلطی) نہیں ہوئی۔

امام علی بن المدینی: امام شافعیؒ کی کتابوں کو لازم پکڑو۔

امام صاحب کی تصانیف: امام شافعی کی کئی مشہور و معروف اور قیمتی مقبول تصانیف یادگار ہیں، جن میں سے کافی طبع ہو چکی ہیں، امام مروزی فرماتے ہیں کہ بقولِ بعض: امام شافعیؒ نے تفسیر، فقہ اور ادب وغیرہ فنون میں ۱۱۳؍ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔ المسند فی الحدیث ۲۔ السنن فی الحدیث ۳۔ احکام القرآن ۴۔ الفقہ الاکبر ۵۔ الام (جو کافی مشہور ومعروف کتاب ہے) ۶۔ اختلاف الحدیث ۷۔ الاسماء والقبائل فی اختلاف العراقیین ۸۔ اثبات النبوۃ والرد علی البراھمۃ ۹۔ المسبوط فی الفقہ ۱۰۔ المسبوط (ایک دوسری کتاب) ۱۱۔ کتاب الجدید ۱۲۔ کتاب القدیم ۱۳۔ الامالی الکبیر فی الفقہ ۱۴۔ الاملاء الصغیر ۱۵ تعظیم قدر الصلاۃ ۱۶۔ التنقیح فی علم القیافۃ ۱۷۔ الحجۃ العراقی ۱۸۔ رسالہ فی بیان الناسخ والمنسوخ من القرآن والسنہ ۱۹۔ مختصر البویطی ۲۰۔ مختصر الربیع ۲۱۔ مختصر المزنی ۲۲۔ مدافع القرآن

خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مختلف فضائل و محاسن اور کمالات میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ نسبی اعتبار سے وہ قریشی اور مطّلبی سادات میں سے ہیں، جائے ولادت ارض مقدسہ ہے، پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی، مختلف مکتبِ فکر کے کتابوں کی تصنیف و تالیف اور احکام کی تقریر و تنقیح کے بعد ان کا زمانہ ہے، لہٰذا متقدمین کے مذاہب میں غور و تامل فرمایا۔ ماہر وفائق اساتذہ سے تحصیل علم و کمال حاصل کیا، حاذق و پختہ ائمہ سے علمی بحث و مناظرہ کیا، ان کے مذاہب وطریقہ کار میں غور و فکر اور صبر و تحقیق اور اس سے صحیح آگہی کے بعد ان سب کی روشنی میں اپنا ایک معتدل فقہی اصول و مسلک ترتیب دیا جو قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کو جامع ہے۔ اور اپنی کمالِ قوت، بلندئی ہمت اور تمام علوم وفنون میں براعت و تفوق اور پختگی و گہرائی کے ساتھ اختیار و ترجیح اور تکمیل و تنقیح کیلئے اپنے آپ کو فارغ کیا۔ اور اس طرح ایک معتدل، جامع اور بہترین فقہی مسلک کی دولت سے امت کو روشناس کرایا۔

وفات: امام شافعیؒ کا وصال ماہِ رجب کی آخری تاریخ کو ۲۰۴ھ میں ہوا،

(امام شافعی علیہ الرحمۃ کے حالات کیلئے دیکھے۔ سیرا علام البلاء للذہبی۔ حلیة الأولیاء- ۹/ ۶۳۔ ۱۶۲، الانتقاء-۶۵۔ ۱۲۱ تاریخ بغداد -۲/ ۵۶۔ ۷۳، صفة الصقوة ۹۵۱۲ تہذیب الاسماء ۱/ ۴۴۔ ۶۷، تذکرة الحفاظ ۱/ ۳۶۱۔ ۳۶۳، مقدمة الحاوی الکبیر، تہذیب ۹/ ۲۵، تہذیب الکمال، مقدمة المجموع للنووی علیہ الرحمۃ، مقدمة معرفة السنن)

شریعت اسلامیہ کے مصادر

اللہ تبارک تعالیٰ نے بندوں کو اپنی عبادت وتوحید کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن" (الذاریات آیت ۵۶) ترجمہ: "اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی، سو اپنی بندگی کو"

اور اللہ تعالیٰ نے ہر فعل وعمل کا ایک حکم مشروع فرمایا ہے۔ یعنی واجب، حرام، مکروہ مستحب، صحیح، فاسد وغیرہ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان اصولوں کی حفاظت کا ذمہ لے کر جن سے احکام شرعیہ کا استنباط ہو گا، امت کے لئے اس دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

فرمان باری ہے۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" (الحجر ۹) ترجمہ: "ہم نے آپ پر اتاری ہے یہ نصیحت (قرآن مجید) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"

شریعت کے چار اہم مآخذ ومصدر ہیں: قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع

(۱) **قرآن (کتاب اللہ):** قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے۔ جو آپ ﷺ پر نازل ہوا۔ جس کی تلاوت بھی عبادت ہے، اور چھوٹی سی سورت بھی معجزہ ہے، جو سورۃ الفاتحہ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر مکمل ہوتی ہے اور یہ تواتر وصحت کے ساتھ ثابت اور نقل در نقل ہوتا آرہا ہے۔ اس میں کسی باطل اور تحریف کا قطعاً امکان وگذر نہیں ہے۔

بالاجماع قرآن شریف تشریع کا اوّل مصدر، اور شریعت کا کلیہ وبنیاد ہے، اور دین کی حقیقت اور شریعت کے اصول تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اور دیگر تمام دلائل کا انحصار اسی پر ہے۔

حدیث (سنتِ رسول): یعنی آپ ﷺ کے مبارک فرامین نورانی، اعمال وافعال آپ کے اخلاق حسنہ، آپ کا سراپا، آپ کی سیرت ومغازی اور بعثت سے قبل آپ ﷺ سے متعلق اخبار،

قرآن کی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو سنت کی بھی وحی فرمائی، یہ بھی دین کا اہم اصل وبنیاد ہے، جس کی اتباع واجب، اور مخالفت حرام ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے نیز آیات قرآنی بھی اس کی مؤید ہیں کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، جو اس کا انکار کرے، اس نے مؤمنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پس حدیث قرآن کے بعد شریعت واحکام کا دوسرا مصدر ہے۔

بکثرت آیات حدیث کی حجیت واہمیت اور واجب الاتباع ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ فرمانِ ربانی ہے۔ "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (الحشر آیت ۷) ترجمہ: "اور تم کو رسول جو دے، سو لے لو، اور جس سے منع کرے، سو چھوڑ دو" (یعنی مال وجائداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے، اُسے بخوشی ورغبت قبول کرو، جو ملے لے لو، اور جس سے روکا جائے رُک جاؤ اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامر ونواہی کی پابندی رکھو)

ایک جگہ ارشاد ہے" فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ "(النور، ۶۳) ترجمہ:"سوڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے (یعنی رسول کے) حکم کا، اس سے کہ آپڑے ان پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو عذاب دردناک"

(مزید آیات کے لئے دیکھئے، سورۂ نساء آیت نمبر، ۸۰۔۶۵۔۵۹۔احزاب آیت نمبر، ۲۱۔۳۶۔سورۂ اٰل عمران آیت نمبر، ۳۱، نمل آیت نمبر، ۴۴)

احادیث میں آپ ﷺ نے آپ کے فرامین کو سن کر یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی بڑی فضیلت بتلائی ہے۔ اور اس کا حکم دیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس تک حدیث پہنچے تو وہ دلیل وحجت ہوگی، نیز سنن وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ کے فرامین سے منہ موڑ کر صرف قرآن پر اکتفاء واقتصاء کرنے کے دعوی کی سخت مذمت وتردید وارد ہے امام بیہقی نے معرفۃ السنن کے مقدمہ میں امام شافعی سے حدیث کی حجیت اور واجب العمل ہونے کے متعلق کافی روایات ودلائل کو نقل فرمایا ہے۔

قرآن وحدیث کا تعلق اور رشتہ: امام ابن قیمؒ نے فرمایا کہ آپ ﷺ سے ایک بھی صحیح حدیث ایسی وارد نہیں ہے، جو قرآن کے منافی ومخالف ہو، اگر بظاہر مخالفت نظر آئے، تو یہ مجتہد پر مخفی ہونے کی وجہ سے ہے۔ قرآنی احکام کے متعلق احادیث کا انداز درجِ ذیل مختلف وجوہ پر ہے۔

(۱) بطور تاکید قرآن کے موافق (۲) قرآن کے کسی حکم کی وضاحت، یعنی کسی اجمال کی تفصیل، یا مطلق کی تقیید، عام کی تخصیص یا کسی شکل کی توضیح (۳) کسی ایسے حکم پر دلالت جس کے متعلق قرآن ساکت ہو،

اجماع: یعنی آپ ﷺ کے بعد کسی بھی دور میں امت مسلمہ کے تمام مجتہدینِ کرام کا کسی شرعی مسئلہ کے حکم پر اتفاق واجماع کرنا، اگر اکثر مجتہدین متفق ہوں تو اس سے اجماع ثابت نہ ہوگا۔

تمام شرائط کے ساتھ کسی مسئلہ میں اجماع پایا جائے تو یہ واجب العمل شرعی قانون ہوگا جس کی مخالفت جائز نہیں ہے اجماع کے حجت ہونے پر قرآن وحدیث کے درجِ ذیل نصوص دلیل ہیں۔ ارشاد باری ہے۔" وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا "(آل عمران نمبر ۱۰۳) ترجمہ:"اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو"

اور فرمایا:" وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ "(الشوری، ۱۰) ترجمہ:"اور جس بات میں اختلاف کرتے ہو، تم لوگ کوئی چیز ہو، تو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے۔" اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس پر تمہارا اتفاق ہو، وہ برحق ہے، نیز ارشاد ہے۔" وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا "(النساء نمبر ۱۱۵) (اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سبمسلمانوں کے راستہ کے خلاف، تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی، اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا)

آپ ﷺ نے فرمایا:"میری امت ہرگز گمراہی پر متفق نہ ہوگی۔ (طبرانی) یہی مفہوم ابوداؤد کی ایک حدیث سے بھی ثابت ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ میری امت گمراہیہ پر مجتمع ومتفق نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے، جو شذوذ اختیار کرے (جماعت سے کٹ کر جدا ہو) اسے الگ تھلگ جہنم میں ڈال دیا جائیگا" (ترمذی)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے! میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہیگا" (صحیحین) نیز ارشاد ہے"جو جماعت سے بالشت بھر بھی

جدا ہوا۔ تو اس نے اپنے گلے سے اسلام کا حلقہ اتار دیا“ (احمد۔ ابو داؤد۔ حاکم)

قیاس: نصوص محدود، اور پیش آنے والے مسائل بکثرت، جو کسی حد پر ٹھہرنے والے نہیں، لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ قیاس سے کام لیا جائے، سو، صحابہ کرامؓ کے دور سے جمہور علماء کرام نے شریعت کے عام مقاصد اور قواعدِ کلیہ کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کیا، جو صراحتاً قرآن وحدیث میں موجود نہیں، جس مسئلہ کا حکم معلوم نہ ہو، دوسرے کسی معلوم الحکم مسئلہ کے اور اس کے درمیان علت کے اشتراک کی وجہ سے وہی حکم یہاں بھی لگانا قیاس کہلاتا ہے۔ حضرات، صدیق اکبرؓ، عمرؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذؓ بن جبلؓ وغیرہ اکابر صحابہ کرامؓ نے مختلف مسائل میں قیاس کی روشنی میں جواب دیا۔ قیاس کی حجیت پر قرآن وحدیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ہر دور میں جمہور امت کا طبقہ مشرق ومغرب میں قیاس پر عمل کرتا رہا ہے، جو مشہور ومعروف ہے۔ شاذونادر متأخرین کے علاوہ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ قیاس کے حجت پر قوی ترین دلیل ہے۔

امام شافعی کا طریقۂ استنباط: امام شافعیؒ نے مختلف فقہی مکاتبِ فکر سے استفادہ کے بعد ایک معتدل فقہی طریقہ ومسلک کو اپنایا، اور اس سلسلہ میں اپنے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

”اصل قرآن یا سنت ہے، ورنہ پھر ان دونوں پر قیاس، اگر آپ ﷺ کی کوئی حدیث بسند صحیح موصول ہو، تو اسی کو اختیار کیا جائیگا، تنہا حدیث سے اجماع بڑھ کر ہے۔ حدیث کو اپنے ظاہر پہ رکھا جائیگا۔ اگر اس میں کئی مفہوم کا احتمال ہو، تو جو ظاہر کے زیادہ مشابہ ہوگا وہ مقدم ہوگا، ایک سے زائد احادیث ہو تو جو صحت میں فائق ہو، وہ مقدم ہوگا، منقطع حدیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ سوائے حضرت ابن المسیب کے منقطع حدیث کے، کسی اصل کو دوسرے اصل پر قیاس نہیں کیا جائیگا، اور کسی اصل کے متعلق یہ سوال نہ ہوگا کہ کیوں اور کیسے؟ کیوں کا سوال تو فرع کے متعلق ہوگا اگر اس فرع کا صحیح طریقہ سے اصل پر قیاس ہو تو، وہ صحیح ہے، اور وہ حجت بنے گی۔“

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے اصول قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہیں۔ امام شافعیؒ نے قیاس کے متعلق ایک معتدل راہ اختیار کی، نہ تو اس میں تشدد سے کام لیا اور نہ زیادہ توسع اختیار فرمایا۔

مسائل میں صحابہؓ وتابعین کے اختلاف کے اسباب

واضح رہے کہ آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں نہ تو احکام فقہ جمع ہوئے تھے اور نہ اس وقت مسائل میں میں ایسی بحثیں ہوئی تھیں، جیسی یہ فقہا کرتے ہیں کہ نہایت کوشش سے ارکان وشروط اور ہر شئی کے آداب ایک دوسرے سے جدا جدا مع دلائل کے بیان کرتے ہیں، اور صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں میں گفتگو کرتے ہیں... آپ ﷺ کے عہد میں آپ وضو کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ اسے دیکھ کر اس پر عمل کرتے تھے، بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے اور وہ مستحب ہے اسی طرح آپ ﷺ کی نماز اور حج وغیرہ کو دیکھ کر اسی طرح صحابہ کرامؓ ان اعمال کو انجام دیتے، عام طور پر فرائض وسنن کی فقہی انداز میں حد بندی نہ ہوتی۔

نبی کریم ﷺ کے پاس قضایا آتے تھے، تو آپ فیصلے کر دیا کرتے تھے، لوگوں کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتے تو تعریف کرتے اور برائی دیکھتے تو منع فرماتے، یہ تمام امور مجلسوں میں انجام پاتے تھے، یہی حالت شیخین یعنی حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تھی، ان حضرات کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تھا، تو لوگوں سے آپ ﷺ کی حدیث دریافت کرتے تھے۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے جَدّہ (دادی، نانی) کے میراث کے متعلق حدیث کی تحقیق کی، حضرت عمرؓ نے وبا کے متعلق حضرت عبد الرحمٰنؓ کی حدیث کو اختیار کیا۔ اور حضرت ابو موسیٰؓ سلام

کے بعد حضرت عمرؓ کے گھر میں داخلہ کی اجازت چاہتے ہیں، اجازت نہ ملی، تو لوٹ گئے، اس پر حضرت عمرؓ نے باز پرس کی تو انھیں حدیث کا حوالہ دیا، جس کی حضرت ابو سعیدؓ خدری نے تصدیق کی اس طرح کے بے شمار واقعات صحیحین اور سنن وغیرہ کی احادیث میں موجود ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ آنحضرت ﷺ کی عادت حمیدہ یہی تھی کہ ہر صحابی نے، جس قدر اس کو توفیق الٰہی ہوئی آپ کی عبادت، فتاویٰ و فیصلوں کو دیکھا، سمجھ لیا اور خوب حفظ کر لیا، اور ان امارات اور قرائن کی وجہ سے جو اس صحابی کو معلوم تھے، بعض امور کو اباحت پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا۔

آپ ﷺ کے مبارک دور کے بعد صحابہ کرام تمام علاقوں میں پھیل گئے، اور ہر شخص ایک ایک علاقہ کا مقتدیٰ اور رہبر ہو گیا، اب واقعات زیادہ پیش آتے گئے، اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنا شروع کئے، ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا، ضرورت پڑی تو اپنی رائے سے اجتہاد کر کے جواب دیا، اس وقت ان کے درمیان اختلاف کے چند پہلو ہو گئے، جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ایک صحابی نے کسی معاملہ میں کوئی حکم یا فتویٰ سن لیا، دوسرے نے نہیں سنا، جسکی وجہ سے اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کیا، پھر کبھی تو اجتہاد حدیث کے موافق ہو گیا۔ جیساکہ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک عورت کے لئے مہر مثل کا فتویٰ دیا، جس کا مہر مقرر نہ تھا اور شوہر انتقال کر گیا، نیز اس پر عدت لازم ہے۔ اور اسے ورثہ ملے گا، تو حضرت معقلؓ نے گواہی دی کہ آپ ﷺ نے بھی ایک عورت کے حق میں ایسا ہی فیصلہ دیا تھا۔ (نسائی وغیرہ)

(۲) اور کبھی یہ اجتہاد حدیث کے موافق نہ ہوتا، پھر اس صحابی کو معتبر طریقہ سے حدیث ملتی تو اس کی طرف رجوع کرتے، جیساکہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ یہ تھا کہ جس نے جنابت کی حالت میں صبح کی ہو، اس کا روزہ نہیں ہے، لیکن جب بعض ازواجِ مطہرات نے اس کے خلاف حدیث بیان کی، تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اس فتویٰ سے رجوع فرمایا۔

(۳) صحابی کو حدیث تو پہنچے، لیکن اس طرح سے ظاہر نہ ہو، جس سے اس کے حدیث ہونے کا ظنِ غالب ہو، اس واسطے وہ صحابی اپنے اجتہاد کو ترک نہ کرے، مثلاً: حضرت عمرؓ و عائشہؓ کا مطلقہ ثلثہ کے لئے عدم سکنی کے متعلق حضرت فاطمہ بنتِ قیس کی حدیث کو قبول نہ کرنا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس عورت کے قول سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح صحیحین میں ہے کہ حضرت عمرؓ جنبی کے لئے تیمم کے قائل نہ تھے، تب حضرت عمارؓ نے اس کے جواز میں خود اپنا واقعہ مرفوعاً پیش کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے تسلیم نہ کیا، اور ایک مخفی سبب کی وجہ سے انھوں نے اس حدیث کو حجت قرار نہ دیا، لیکن دوسرے طبقہ میں مختلف طرق سے اس حدیث کی شہرت ہو گئی، اور ضعف کا سبب مضمحل ہو گیا۔ لہٰذا تمام علماء نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابی کو حدیث پہنچی ہی نہیں، مثلاً! مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو غسل کے وقت بالوں کو کھولنے کا حکم دیتے تھے، حضرت عائشہؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار فرمایا۔ اور آپ ﷺ کے روبرو اپنا عمل یہ بتایا کہ اپنے سر پر تین بار پانی بہایا کرتی تھی۔

(۵) صحابہ نے آنحضرت ﷺ کو کوئی فعل کرتے دیکھا، پس بعضوں نے اسے عبادت پر اور بعضوں نے اباحت پر محمول کیا، مثلاً حج کے بعد مقام ابطح میں آپ ﷺ کے قیام کو حضرات، ابوہریرہ و ابن عمر رضی اللہ عنہم نے عبادت پر محمول کیا اور اسے سننِ حج میں شمار کیا جبکہ حضرات عائشہؓ و ابن عباسؓ نے اسے محض اتفاقی امر شمار کیا، اور سنن حج میں داخل نہیں کیا۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک طواف میں رمل کرنا مستقل سنت ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کا خیال یہ ہے کہ ایک وقتی سبب کی وجہ سے عارضی عمل تھا، جو آئندہ مطلوب

وسنت نہیں ہے۔

(۶) سہو ونسیان اور بھول کی وجہ سے بھی صحابہ میں اختلاف ہوا، مثلاً حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے ایک عمرہ رجب میں کیا تھا، حضرت عائشہؓ نے سنا تو فرمایا کہ وہ بھول گئے، آپ ﷺ کا کوئی بھی عمرہ رجب میں نہ تھا۔

(۷) اختلاف ضبط کی وجہ سے بھی صحابہ کرام میں اختلاف ہوا۔ مثلاً: حضرت عمر وابن عمرؓ سے حدیث مروی ہے۔ کہ گھر والوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک یہودیہ کے جنازہ کے پاس سے گذرے، اس پر اس کے گھر والے رورہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا، ''یہ لوگ اس عورت پر رورہے ہیں حالانکہ اس کو قبر میں عذاب ہورہاہے'' پس بقول عائشہؓ ان لوگوں نے رونے کی عذابِ قبر کی علت سمجھ کر اس حکم کو ہر میت کے لئے عام کیا۔

(۸) صحابہ کا کسی حکم کی علت میں اختلاف ہو جانا، مثلاً جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا، بعضوں نے کہا کہ یہ قیام فرشتوں کی تعظیم کے لئے ہے، اس لئے مومن وکافر دونوں کے جنازہ کو شامل ہے اور بعض نے کہا کہ یہ قیام موت کے خوف کی وجہ سے ہے، تب بھی دونوں کو شامل ہے، اور حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی کا جنازہ آپ ﷺ کے پاس سے گذرا، اور آپ ﷺ کھڑے ہوئے، اس کراہت کی وجہ سے کہ اس کا جنازہ آپ ﷺ کے سر کے اوپر سے گذرے، پس یہ حکم صرف کافر کے ساتھ خاص ہے۔

(۹) دو مختلف امور کے جمع کرنے میں صحابہ کرام کا اختلاف، مثلاً: آپ ﷺ نے بول وبراز کے وقت قبلہ کی طرف رُخ یا پشت کرنے کی ممانعت فرمائی، اور حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ رو پیشاب کرتے دیکھا، اور حضرت ابن عمرؓ نے آپ ﷺ کو قبلہ کی طرف پشت کئے قضاء حاجت فرماتے دیکھا، تو بعضوں نے آپ ﷺ کے ممانعت کو ترجیح دی اور ہر حال میں اسے ممنوع سمجھا، بعضوں نے حضرت جابر کی حدیث سے اس ممانعت کو منسوخ قرار دیا، اور بعض حضرات نے تمام روایات میں تطبیق وجمع پر عمل کیا، اور ممانعت کو کھلی جگہ کے ساتھ مخصوص قرار دیا، پائخانوں میں اس کی اجازت دی۔

تابعین وغیرہ: خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا اسباب سے صحابہ کے مذاہب مختلف ہوئے اسی طرح تابعین نے توفیق خداوندی وسہولت کے مطابق احادیث اور صحابہ کرام کے مسلک کو حاصل کیا، اسے یاد کیا اور سمجھنے کی کوشش کی، اور حتی الامکان مختلف امور کو جمع کیا، اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو اپنی نظر میں ضعیف سمجھا، اس طرح تابعین میں سے ہر ایک عالم کا ایک مذہب قائم ہو گیا، اور ہر شہر میں ایک (یا زائد) امام قائم ہو گئے، جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب اور سالم بن عبد اللہ ابن عمر، ان کے بعد امام زہری وغیرہ، مکہ میں عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی وشعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس اور شام میں مکحول، پس خدا نے بہت سے قلوب کو ان کے علوم کا گرویدہ کر دیا، اور لوگوں نے نہایت رغبت سے ان سے حدیث صحابہ کرام کے فتوی، اور خود ان کے مذاہب وتحقیقات کو حاصل کیا، اور ان سے مسائل کا استفسار کیا، ان میں مسائل کا خوب تذکرہ رہا اور تمام معاملات کے وہ مرجع رہے۔

سعید بن المسیب اور ابراہیم اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کر دیا تھا، اور ہر بات کے متعلق ان کے پاس اصول وقواعد مرتب تھے، جن کو انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا تھا، سعید بن المسیب اور ان کے اصحاب اس کے قائل تھے کہ فقہ میں حرمین میں علماء سب سے پختہ ہیں، اور ان کے مسلک کی بنیاد حضرات عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ وابن عباسؓ کے فتوے اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں ان سب علوم کو انہوں نے بقدر استطاعت جمع کیا اور ان میں غور وفکر کیا اور بنظر تفتیش اس کا مطالعہ کیا، جن مسائل پر علماء مدینہ کا اتفاق دیکھا ان کو خوب مستحکم طور پر اختیار کیا، اور جو مسائل ان کے نزدیک اختلافی تھے، ان میں سے قوی اور راجح کو

اختیار کیا۔ جب انھیں اس جمع شدہ علمی ذخیرہ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملا، تو اس کو ان کے کلام سے حاصل کیا، اور قرآن وحدیث کے ایماواقتضاء کا تتبع کیا، اور اس طرح ہر باب میں ان کو بکثرت مسائل حاصل ہو گئے۔

ابراہیم اور ان کے شاگردوں نے حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں کو فقہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا، اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل عبد اللہ بن مسعودؓ کے فتوے، حضرت علیؓ کے فیصلے وفتوے اور قاضی شریح اور دیگر قضاۃِ کوفہ کے فیصلے ہیں، انھوں نے بقدرِ امکان مسائل فقہیہ کو جمع کیا، اور اہلِ کوفہ کے آثار سے مسائل کی تخریج کی، اور اس طرح ہر باب کے متعلق فقہی مسائل مرتب ہو گئے۔

فقہاء کے مذاہب: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''بعد والے نسل میں سے عادل لوگ اس دین کو حاصل کریں گے۔'' اس فرمان اور پیشن گوئی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تابعین کے بعد حاملینِ علم کی ایک جماعت کو پیدا کیا، انھوں نے احادیثِ مبارکہ، کثیر الوقوع احکام اور مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے سن کر جمع کیا، اور تمام امور میں انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی کا ثبوت دیا، اس طرح وہ مسلمانوں کے مقتداء اور تمام مذہبی امور کے مرجع بن گئے، کسی مسئلہ میں صحابہ وتابعین کے اقوال مختلف ہوتے تھے، تو ہر عالم کے نزدیک اپنے مشائخ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کے صحیح وسقیم اقوال کو وہ خوب جان سکتا ہے، اور ان اقوال کے مناسب اصول کو خوب یاد رکھ سکتا ہے۔ اور ان کے فضل وتبحّر کی جانب اس کا قلبی میلان زیادہ ہوتا ہے۔

پھر جب ان علماء کو اپنی یادداشت میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تھا، تو ایماء اور اقتضاء کا تتبع کر کے قدماء کے ہی کلام سے مسئلہ کا جواب حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں علماء کو تدوین وتالیف کا الہام ہوا، پس مدینہ میں امام مالک اور ابن ابی ذئب، مکہ میں ابن جریج وابن عُیینَہ، کوفہ میں سفیان ثَوری، بصرہ میں ربیع بن صبیح نے تصنیف کرنا شروع کیا، اور سب نے تصنیف میں مذکورہ طرز اختیار کیا۔

علماء مدینہ میں اپنے وقت میں امام مالک علم وحدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھے، حضرات صحابہ مثلاً عمرؓ، ابن عمرؓ، عائشہؓ اور ان کے اصحاب فقہاء سبعہ کے اقوال کو امام مالک سب سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے، ان سے اور انہی جیسے علماء کی وجہ سے روایت اور فتویٰ کا علم قائم ہوا ہے، امام مالک کے شاگردوں نے ان کی روایات اور پسندیدہ اقوال کو جمع کیا، اور ملخص کر کے لکھا، ان کی شرح کی اور ان سے مسائل کا اخراج کیا، اور اقوال کے اصول اور دلائل میں گفتگو کی اور ان کے شاگرد مغربی ممالک اور اطراف عالم میں پھیل گئے۔

امام ابوحنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم عصر علماء کے مذہب کے زیادہ پابند تھے، اور ابراہیم نخعی کے مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے، اور انکے مذہب کے موافق مسائل کی تخریج کرنے میں عظیم الشان، تخریجات کی وجوہ دریافت کرنے میں دقیق النظر اور فروعات کی جانب نہایت درجہ متوجہ تھے، امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد کے ذریعہ ان کا مسلک مختلف علاقوں میں معمول بہ ہوا۔

مالکی اور حنفی مسلک کے ظہور کے ابتداء میں امام شافعیؒ کی نشو ونما ہوا، جب انھوں نے متقدمین کی روش میں غور کیا، تو انھوں نے بہت سے ایسے امور کو پایا جن کی وجہ سے وہ متقدمین کے طریق کی (من وعن) پیروی نہ کر سکے، امام شافعی نے ان امور کو اپنی کتاب الام کے اول میں ذکر کیا ہے۔

مثلاً: متقدمین مرسل ومنقطع حدیث پر عمل کرتے تھے، حالانکہ یہ خلل سے محفوظ نہ تھیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طرق وسند جمع کئے جائے، تو یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ بہت سی مرسل احادیث بالکل بے اصل ہیں، اور بہت سی مرسل احادیث مسند احادیث کے مخالف تھیں، اس واسطے امام شافعیؒ نے مرسل حدیث پر عمل کے لئے بعض شرائط کو ضروری قرار دیا: جو کہ اصول کی کتابوں میں مذکور

ہیں۔ اسی طرح متقدمین کے دور میں مختلف احادیث کے درمیان جمع و توفیق اور تطبیق کے قواعد منضبط نہ تھے، لہٰذا ان کے اجتہادی مسائل میں بعض مرتبہ خلل رہا کرتا، اسے دور کرنے کے لئے امام شافعیؒ نے اصول مقرر کئے اور ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا، اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف یہی کتاب ہے۔

ایک امر یہ تھا کہ بعض صحیح احادیث علماء تابعین کے مفتیوں کو نہ پہنچیں، اس لئے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا، انھوں نے عام الفاظ کا لحاظ کیا، یا انھوں نے گذشتہ صحابہ کی پیروی کی اور اسی کے موافق فتوی دے دیا، لیکن تیسرے طبقہ میں یہ احادیث مشہور ہوگئیں، تو انھوں نے ان احادیث پر عمل نہ کیا، یہ سمجھ کر کہ یہ احادیث ان کے علماء شہر کے عمل کے خلاف ہیں، اور اس طریقہ کے خلاف ہیں جس پر وہ سب متفق ہیں، اور یہ بات ان احادیث میں طعن کی وجہ بن گئی، اور ان احادیث کے غیر معتبر ہونے کی علت ہوگئی، یا وہ احادیث تیسرے طبقہ میں مشہور نہیں ہوئی تھیں، بلکہ اس کے بعد ان کی شہرت ہوگئی، جبکہ محدثین نے احادیث کے تمام طرق کو جمع کیا، اور مختلف علاقوں کا سفر کر کے علماء حدیث سے ان کی تفتیش کی، پس اکثر احادیث ایسی ظاہر ہوتی گئیں، جن کی روایت صحابہ میں سے ایک یا دو اشخاص نے کی تھی اور ان صحابہ سے بھی صرف ایک یا دو راویوں نے ان کی روایت کی تھی وھلّم جرّاً، حکم پس بہت سی احادیث فقہاء کرام کی نظر سے مخفی رہیں اور ان حفاظِ حدیث کے زمانہ میں مشہور ہوئیں، جنھوں نے تمام طرق حدیث کو جمع کیا تھا، مثلاً بہت سی احادیث کو اہلِ بصرہ نے روایت کیا، اور دیگر علاقے ان احادیث سے بے خبر رہے، پس امام شافعیؒ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ علماء صحابہ اور تابعین کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں حدیث کے متلاشی رہتے تھے، جب کوئی حدیث ان کو نہ ملتی تھی تو وہ کوئی اور استدلال اختیار کرتے تھے، لیکن اس کے بعد جب کوئی حدیث ان پر ظاہر ہو جاتی تھی تو وہ حدیث کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے، پس جب ان کی ایسی حالت تھی تو ان کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کیلئے قادح نہیں ہو سکتا، تاہم وہ کوئی علت قادحہ بیان کر دیں تو اس وقت قادح ہو سکتا ہے۔

اس کی مثال حدیث قلتین ہے، یہ حدیث صحیح ہے جو کئی طریقوں سے مروی ہے، تاہم یہ حدیث امام سعید ابن المسیب و امام زہری کے زمانہ میں مشہور نہ ہوئی اور اس پر مالکیہ وحنفیہ نے عمل نہ کیا، اور امام شافعیؒ نے اس پر عمل کر لیا۔ اسی طرح خیار مجلس کی حدیث ہے، جو صحیح اور کئی طرق سے مروی ہے، اور صحابہ میں ابن عمرؓ وابو ہریرہؓ نے اس پر عمل کیا تھا، لیکن فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین میں اس کی شہرت نہ ہوئی پس وہ اس حدیث کے قائل نہ تھے، لہٰذا امام مالک و امام ابو حنیفہ نے اس امر کو مذکورہ حدیث میں علت قادحہ سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا، البتہ امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

مذکورہ امور اور دیگر اسباب کی وجہ سے امام شافعیؒ نے فقہ کو از سر نو مرتب کیا، اس کے اصول کو ترتیب دیا، اور ان پر فروع کو متفرع کیا، عمدہ کتابیں تصنیف فرمائیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا، فقہا ان کی خدمت میں جمع ہوگئے، ان کی کتابوں کا اختصار کیا، ان پر شروح لکھیں، دلائل بیان کئے اور مسائل کی تخریج کی اور پھر یہ لوگ تمام شہروں میں پھیل گئے، اس طریقہ کا نام شافعیؒ مذہب ہو گیا، واللہ اعلم۔
(تلخیص از حجۃ اللہ البالغہ)

ائمہ کرام کا اختلاف: امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ کے مقبول و معروف ائمہ کرام میں سے کوئی بھی دانستہ کسی چھوٹی یا بڑی بات میں آپ ﷺ کی مخالفت نہ کرے گا، کیونکہ یہ تمام حضرات یقیناً اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ کی اتباع واجب ہے، نیز یہ کہ ہر کسی کی بات کو اختیار اور ترک کیا جا سکتا ہے سوائے آپ ﷺ کے (کہ آپ کی تمام باتوں کو اختیار کرنا لازم ہے) تاہم ان میں سے کسی کا قول، کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو، تو حدیث کے ترک کرنے میں ضرور اس کے پاس کچھ عذر ہوگا۔ جس کی تفصیل حسبِ

ذیل ہے۔

(۱) وہ حدیث اس امام کو نہ ملی ہو، اور جسے حدیث نہ ملی ہو اس کے مطابق حکم کے علم کا مکلف نہیں، ایسی صورت میں وہ کسی آیت یا دوسری حدیث کے ظاہر کے مطابق، یا قیاس وغیرہ کی روشنی میں فتوے دے گا۔ جو کبھی تو اس حدیث کے موافق ہو گا، اور کبھی مخالف اسلاف سے حدیث کے خلاف مروی اقوال کا غالب سبب یہی ہے، کیونکہ تمام احادیث کا احاطہ کسی امام کو حاصل نہ تھا، جو خود خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کو ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض در پیش مسائل سے متعلق احادیث کا انھیں علم نہ ہوتا۔ پھر دریافت کرنے پر دیگر صحابہ کے ذریعہ علم ہوتا، تو اس پر عمل فرماتے، مثلاً: صدیق اکبر کو دادی کی میراث کا علم نہ تھا، حضرت عمرؓ کو استئذان (گھر میں داخل کی اجازت)، شوہر کی دیت میں بیوی کی وراثت، مجوس سے جزیہ لینا، طاعون کے علاقوں میں داخل ہونا، اور نماز کی رکعت میں شک کی صورت کا حکم معلوم نہ تھا، دیگر صحابہ کے ذریعہ معلوم ہوا، تو ان حضرات نے اس پر عمل کیا۔

(۲) حدیث تو ملے لیکن اس کے نزدیک وہ ثابت نہ ہو، مثلاً راوی مجہول، متہم یا ضعیف الحفظ وغیرہ ہو، اسی لئے ائمہ کرام بعض مرتبہ یہ فرماتے ہیں، اگر فلاں حدیث صحیح طریقہ سے ملے، تو میں اس پر فتویٰ دونگا۔

(۳) اپنے اجتہاد کے اعتبار سے حدیث کو ضعیف سمجھے، جس میں دوسروں کو اس سے اختلاف ہو، خواہ بات اس کی صحیح ہو یا دوسرے کی۔

(۴) عادل کے خبر واحد میں بعض شرائط کو ضروری قرار دے، جس سے دوسروں کو اختلاف ہو، مثلاً بعضوں کی یہ شرط کہ حدیث قیاس اصول کے مخالف ہو تو راوی فقیہ ہو، یا بعضوں کا عموم بلوی کے مسائل میں حدیث کے انتشار و ظہور کی شرط لگانا۔

(۵) حدیث تو پہنچی ہو لیکن بھول جائے، جیسے تیمم کا ایک واقعہ حضرت عمارؓ نقل کرتے ہیں، جسمیں خود حضرت عمر بھی شریک تھے لیکن انھیں یاد نہ رہا (صحاح ستہ) اسی طرح حضرت علیؓ نے جنگ جمل کے دن آپ ﷺ کی ایک وصیت حضرت زبیرؓ کو یاد دلائی، اور انھیں یاد آگئی، جس کی وجہ سے وہ میدان سے ہٹ گئے۔ (ابویعلی۔بیہقی۔عبدالرزاق۔البدایۃ والنہایہ لابن کثیر ۷/۲۴۰)

(۶) حدیث کی دلالت سے ناواقفیت، کیونکہ حدیث میں کبھی غریب لفظ ہو گا، جیسے مزابنہ، مخابرہ، محاقلہ، ملامسہ، منابذہ، اور غرر وغیرہ جیسے الفاظ، جن کی تشریح میں علماء کا اختلاف ہو جاتا ہے، نیز جیسے یہ حدیث: ”اغلاق میں طلاق وآزادی (معتبر) نہیں“ (احمد۔ابوداؤد۔حاکم۔ابن حبان)

کیونکہ علماء نے اغلاق کا مفہوم اکراہ (زبردستی) بیان کیا ہے۔ اور جو اس مسئلہ سے اختلاف کرتے ہین وہ اس تشریح کو نہیں جانتے۔ اور کبھی اس امام کی لغت اور عرف میں آپ ﷺ کی لغت کے علاوہ دوسرا مطلب و مفہوم اس لفظ کا ہو گا اور وہ اپنی لغت کے مفہوم پر اسے محمول کرے گا، اسی طرح بعض اوقات لفظ مشترک، مجمل یا حقیقت و مجاز کے درمیان متردد ہو گا، اور وہ اپنے اعتبار سے اقرب صورت پر اسے محمول کریگا۔ گو اس سے دوسرا مفہوم مراد ہو، جیساکہ ابتداءً بعض صحابہ کرام نے خیط الابیض اور خیط اسود کو رسیّ پر محمول کیا، اور بعضوں نے تیمم میں ہاتھ کے مسح کو بغل تک مسح پر محمول کیا۔

(۷) یہ نظریہ کہ حدیث میں اس مسئلہ پر دلالت نہیں ہے۔ مثلاً: اس لئے کہ عام مخصوص حجت نہیں ہے، یا مفہوم حجت نہیں ہے۔ یا کسی سبب سے وارد عموم کو سبب تک محدود رکھیں گے، یا امر مجرد وجوب کو مقتضی نہیں، یا فوراً ادائیگی کو مستلزم نہیں یا معروف باللام میں عموم نہیں، یا منفی افعال سے اس کے ذات اور تمام احکام کی نفی نہیں کرتی، وغیرہ۔

(۸) یہ نظریہ کہ حدیث سے آپ جو دلالت لے رہے ہیں۔ اس کے معارض دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلالت مراد نہیں ہے۔ مثلاً: عام کا خاص سے یا مطلق کا مقید سے معارض ہونا، یا امر مطلق کے معارض وجوب کی نفی کرنے والی دلیل، یا حقیقت کے معارض مجاز کی دلیل وغیرہ۔

(۹) یہ نظریہ کہ حدیث کے معارض ایسی دلیل ہے جو حدیث کے ضعف یا نسخ یا تاویل پر دلالت کر رہی ہے۔ مثلاً اس کے معارض کوئی آیت، یا دوسری حدیث یا اجماع۔

(۱۰) حدیث کے معارض ایسی دلیل جو اس کے ضعف، یا نسخ یا تاویل پر دلالت کرے، اور دوسرا عالم اس دلیل کا قائل نہ ہو۔ مثلاً کئی اہلِ کوفہ کا یہ نظریہ کہ قرآن کا ظاہر یعنی عموم وغیرہ نصِ حدیث پر مقدم ہوگا یا بعض اہل مدینہ کا علماء مدینہ کے عمل اور اجماع کو صحیح حدیث پر مقدم کرنا۔

کئی صحیح احادیث کے متعلق کسی عالم کے عمل نہ کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل اس کے پاس ہوگی، جس کا ہمیں علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ وسیع میدان ہے، اور علماء کے تمام مافی الضمیر کا ہمیں علم نہیں۔ ایک عالم کبھی اپنی حجت ظاہر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا ظاہر کرنے کے بعد کبھی وہ ہم تک پہنچتی ہے اور کبھی نہیں پہنچتی اگر اس کی حجت ہم تک پہنچ بھی جائے، تو ضروری نہیں کہ اس کے انداز احتجاج تک ہمارے فہم کی رسائی ہو جائے، خواہ اس کا احتجاج فی نفسہٖ صحیح ہو یا نہ ہو۔

کسی امام کا کسی حدیث کے ترک کے اسباب کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی حدیث میں کسی حلال یا حرام وغیرہ کا حکم ہو، اور کسی عالم کا اس پر عمل نہ ہو تو اس کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ گنہ گار نہ ہوگا، اپنے اجتہاد کی وجہ سے اس سے مستحق ثواب ہوگا، قرآن مجید نے حضرت داوٗدعلیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک فیصلہ کے متعلق فرمایا۔

آیت: "وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ، وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ، وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا" (الانبیاء: ۷۸-۷۹)

ترجمہ: "اور داوٗد اور سلیمان (علیہما السلام کے قضیہ) کا تذکرہ کیجئے، جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے) فیصلہ کرنے لگے، جبکہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے۔ سو ہم نے فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دیدی اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا"

("یعنی داود علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا) تو سلیمان علیہ السلام کو فہم کے ساتھ مختص فرمایا" لیکن دونوں کے حکمت وعلم کی تعریف فرمائی۔

صحیحین کی ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ جب حاکم اجتہاد کرے اور صحت تک پہنچے تو اسے دوہرا اجر ہوگا۔ اور اگر اجتہاد میں غلطی ہو جائے تو ایک اجر ملے گا۔ تو واضح ہوا کہ مجتہد کو باوجود غلطی کے ایک ثواب ملے گا، یہ ثواب اس کے اجتہاد و کوشش کے عوض ہے۔ اور غلطی معاف ہوگی، کیونکہ تمام احکام میں ہو بہو صحت تک رسائی متعذر یا کافی دشوار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" (الحج: ۷۸) (تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) نیز ارشاد ہے: "يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرہ: ۱۸۵) (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں...)

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے سال صحابہ کرام سے فرمایا کہ کوئی بھی بنو قریظہ پہنچنے سے قبل ہرگز عصر کی نماز نہ پڑھے، اب راستہ ہی میں عصر کا وقت ہو گیا۔ تو بعضوں نے کہا ہم تو بنی قریظہ میں جا کر ہی عصر ادا کریں گے، اور بعضوں نے کہا: اصل مقصود یہ نہ تھا (بلکہ جلد بنو قریظہ چلے جانا مقصود تھا)، تو انھوں نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی، پس کسی گروہ پر گرفت نہ ہوئی۔ پہلے گروہ نے عموم خطاب کو اختیار کیا۔ اور نماز کے قضاء کی صورت کو بھی اس عموم میں داخل کیا۔ اور دوسرے گروہ کے ہاتھ ایسی دلیل تھی، جس کی وجہ سے یہ صورت اس عموم سے خارج و مستثنیٰ تھی۔ کیونکہ اصل مقصد یہود بنو قریظہ کی طرف مبادرت و مسارعت تھی۔

اسی طرح حضرت بلالؓ نے دو صاع کھجور ایک صاع کے عوض فروخت کیا تو آپ ﷺ نے اسے لوٹانے کا حکم دیا، (متفق علیہ) لیکن اس پر سود کھانے کا حکم یعنی فسق اور لعنت وغیرہ مرتب نہ فرمایا۔ کیونکہ وہ حرمت سے ناواقف تھے۔ اسی طرح حضرت عدی بن حاتم اور بعض صحابہ نے سحری کے اختتام کے متعلق قرآن کے لفظ خیط ابیض وخیط اسود (دیکھئے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۸۷) کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہوئے اپنے تکیہ کے نیچے سفید اور سیاہ رسی رکھی، اور دونوں ایک دوسرے سے نمایاں ہونے تک سحری کرتے رہے۔ تو آپ ﷺ نے عدی سے فرمایا "تب تو تمہارا تکیہ کافی چوڑا ہو گیا۔ اس سے تو دن کا اجالا اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ (متفق علیہ)" پس آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ کلام کا صحیح مفہوم تم سمجھ نہ سکے، تاہم اس پر رمضان میں عمداً روزہ توڑنے اور نہ رکھنے کی مذمت کا مرتب نہ ہوا "ہوا" جو بہت بڑا گناہ ہے۔

اس کے برعکس ایک زخمی شخص کو بعضوں نے سخت ٹھنڈی میں غسل کے وجوب کا فتویٰ دیا اور غسل کی وجہ سے وہ مر گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو قتل کر دے۔ جب معلوم نہ تھا تو پوچھا کیوں نہیں؟ جو خود عاجز ہو، اس کا علاج یہی ہے کہ (اہل علم سے) سوال کرے" (ابوداؤد، دارقطنی۔ ابن ماجہ۔ حاکم۔ ابن خزیمہ۔ ابن حنبل) کیونکہ یہ اہل علم نہ تھے اس لئے بلا اجتہاد خطا کر گئے۔ اسی طرح حضرت اسامہ نے ایک غزوہ میں کلمہ پڑھ لینے کے باوجود ایک شخص کو قتل کیا۔ تو ان پر قوَد (قصاص)، دیت یا کفارہ واجب نہیں کیا، کیونکہ ان کے خیال میں اس کا اسلام صحیح نہ تھا۔ اور قتل کرنا جائز تھا۔ حالانکہ اس کا قتل حرام تھا۔ (تلخیص از رفع الملام عن الائمۃ الاعلام لشیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ)

سبب اختلاف: اجتہادی مسائل میں علماء کرام کے اختلاف کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے علام مناوی فرماتے ہیں۔
اس اختلاف کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض درج ذیل ہیں۔ جس سے بقیہ پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) لغت میں کسی کلمہ کے مدلول میں اختلاف:- مثلاً یہ اختلاف کہ قرائن کی عدم موجودگی میں امر وجوب کے لئے ہو گا۔ یا استحباب کے لئے ہو گا۔ یا قدر مشترک کے لئے ہو گا۔ یا کسی اور کے لئے، یا لفظ کے دو مدلول میں سے کسی ایک پر محمول کرنے کے متعلق اختلاف، جیسے عدت کے متعلق قرآن نے "ثلاثۃ قروء" (البقرہ: ۲۲۸) (یعنی تین قروء) کا لفظ استعمال کیا۔ جو طہر اور حیض دونوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ اسے طہر پر اور حنفیہ حیض پر محمول کرتے ہیں۔ یا مثلاً محاربین کی مختلف سزاؤں کو قرآن نے (اوْ) (یعنی یا) کے ساتھ بیان کیا۔ (دیکھئے سورۂ مائدہ: ۳۳) تو امام مالک وغیرہ بعض علماء نے اسے حاکم کے اختیار پر محمول کیا۔ اور شوافع وحنفیہ وغیرہ نے تفصیل و تبعیض پر محمول کیا۔

(۲) ناسخ ومنسوخ میں اختلاف: ایک حکم کو بعض اہل علم ناسخ اور دوسرے منسوخ سمجھتے ہیں

(۳) راوی کی تعدیل وتجریح: حدیث کے کسی راوی کو بعض علماء عادل اور معتبر قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر علماء کی

تحقیق میں وہ مجروح وضعیف شمار ہوگا۔ مثلاً ابراہیم بن یحیٰ کو امام شافعیؒ نے معتمد قرار دیا اور ان کی روایت کو قبول کیا لیکن دیگر حضرات انھیں مجروح سمجھ کر ان سے مروی احادیث کو رد کرتے ہیں۔

(۴) **تعارض کے وقت مرجحات میں اختلاف:** بعض حضرات دو متعارض میں سے ایک کو اختیار کر کے دوسرے کے مقابلہ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ جبکہ دوسرے علماء اس کے برعکس ترجیح دیتے ہیں، مثلاً: اہل مدینہ کے عمل اور خبر واحد میں تعارض ہو، تو مالکی حضرات اہل مدینہ علی صاجہا افضل الصلاۃ والسلام کے عمل کو مقدم رکھتے ہیں۔ جبکہ دیگر حضرات اس کے برعکس خبر واحد کو مقدم رکھتے ہیں۔ جیسا کہ شوافع کا خیار مجلس کی روایت کو جو صحیحین میں سے اہل مدینہ کے عمل پر مقدم رکھنا، اسی طرح حقیقت مرجوح اور مجاز راجح میں تعارض وغیرہ۔

اختلاف کا ایک عام سبب ان دلائل کے متعلق اختلاف ہے۔ جن سے احکام کی تحصیل ہوتی ہے۔ مثلاً: عموم کو اختیار کرنا یا نہ کرنا۔ صفت وشرط وغیرہ کے مفہومِ مخالف کا اعتبار کرنا یا نہ کرنا۔ متفق جملوں کے بعد استثناء کا تعلق تمام سے ہونا۔ یا صرف آخری جملہ سے ہونا۔ استثناء کے بعد بقیہ کا خارج کے مقابلہ میں زیادہ ہونا ضروری ہے یا اس سے کم بھی جائز ہے۔ اسی طرح یہ اختلاف کہ اصل میں حکم کی علت کیا ہے۔ لہٰذا ہر فریق جس علت کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق اس حکم کو متعدی کرے گا... یا فقہاء کا ایک شائبہ کے دوسرے پر غلبہ کے متعلق اختلاف مثلاً حوالہ کے متعلق اختلاف کہ اس میں۔ استیفاء کا شائبہ غالب ہے یا معاوضہ کا۔ اور نقطہ اکتساب (کمانا) ہے یا امانت اور ولایت۔

اسی طرح علماء کا سبب کے مانع کی تاثیر میں اختلاف، مثلاً صاحب نصاب پر قرض، بعضوں کے نزدیک یہ مانع ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے در حقیقت مالداری باقی نہیں رہتی۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ زکات واجب نہ ہو بعض اسے مانع نہیں سمجھتے۔ پس نصاب کی ملکیت کی وجہ سے زکات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

یا جیسا کہ اجماع سکوتی کے متعلق اختلاف: بعض ساکت کی طرف کسی قول کو منسوب نہیں کرتے۔ تو یہ ان کے نزدیک اجماع نہ ہوگا۔ اور بعضوں کے نزدیک سکوت موافقت پر دلالت کرتا ہے۔ پس وہ اسے اجماع شمار کریں گے۔

اسی طرح آپ ﷺ سے (بظاہر) دو متعارض (متضاد) روایات مروی ہوں، اور تاریخ کا علم نہ ہو، اور ایک حکم نسبتاً سخت اور دوسرا آسان وخفیف ہو تو کس پر عمل کیا جائے؟ نیز یہ اختلاف کہ عموم کی تخصیص کن امور سے جائز ہے؟ اور عموم بلوی کے مسائل میں خبر واحد پر عمل کیا جائیگا یا نہیں۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ائمہ کرام کے اختلاف کے اسباب کے متعلق تھا، اصل مقصد بہر حال اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ تاکہ ایک مکلف اوامر ونواہی میں اس کی فرمانبرداری کرے اور اصحاب حقوق تک ان کے حقوق پہنچائے، واللہ اعلم (تلخیص از فرائد الفوائد ص ۱۰۰۔ ص ۱۰۳)

تقلید واتباع

دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے قول وفعل سے احکام الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے تمام معاملات میں خالصتاً اللہ اور رسول کی اطاعت کرنی ہے۔

اور جو شخص رسول ﷺ کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو اور اس کو مستقل بالذات مطاع سمجھتا ہو، وہ یقیناً دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

قرآن وحدیث میں بعض احکام تو وہ ہے۔ جنہیں ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکتا ہے۔ ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں۔ مثلاً قرآن کریم کا ارشاد "لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً" (تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے) یا آپ ﷺ کا فرمان: "لَافَضْلَ لِعَرَبِي عَلٰى عَجَمِي" (کسی عربی کو عجمی میں فضیلت نہیں)

اس کے برعکس بہت سے احکام وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال ہے۔ بظاہر آپس میں تعارض ہے۔ مثلاً: قرآن کریم کا ارشاد ہے: "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ" (اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی وہ تین "قروء" گذرنے تک انتظار کریگی) اس میں مطلقہ کی عدت تین "قروء" بتلائی گئی ہے۔ اور یہ لفظ عربی زبان میں حیض اور طہر دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں فرمایا "سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں" (مشکوٰۃ کتاب الصوم) اور ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: "بحالتِ سفر جی چاہے روزہ رکھ لو، جی چاہے افطار کرلو" (مشکوٰۃ)

نماز کی رکعات میں شک کی صورت میں ایک حدیث میں استیناف (از سر نو لوٹانا) کا حکم دیا، اور دوسری حدیث میں تحری (اٹکل لگانا) کا اور دوسری ایک روایت میں شک کو نظر انداز کر کے یقین (یعنی اقل) کا حکم دیا (مشکوٰۃ) صحیحین کی ایک حدیث میں قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنے کی ممانعت ہے۔ اور صحیحین ہی میں آپ ﷺ کا قبلہ کی طرف پشت کر کے قضائے حاجت فرمانا موجود ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ قرآن وحدیث سے مسائل واحکام کے استنباط میں اس طرح الجھن اور دشواری پیش آتی ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ہم اپنی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے خود ہی کوئی فیصلہ کرلیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ جلیل القدر اسلاف اور ماہرین کی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے ان کی سمجھ کے مطابق عمل کریں۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ واضح رہے کہ پہلی صورت خامی خطرناک ہے اور دوسری حد درجہ محتاط وبہتر، کیونکہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علم وفہم ذکاوت وحافظہ، امانت ودیانت، اور تقویٰ وپرہیز گاری ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرون اولیٰ کے علماء سے ہماری کوئی نسبت نہیں پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اسلاف علماء اس سے بھی قریب ہیں اور اس قرب کی بناء پر ان کے لئے قران وحدیث کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اس کے برخلاف ہم عہد رسالت سے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ ہمارے لئے اس زمانے کے طرز معاشرت وگفتگو وغیرہ کا ہو بہو اور بعینہ تصور بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ کسی شخص کی بات کو سمجھنے کے لئے اس کے پورے پس منظر کا سامنے ہونا بے حد ضروری ہے۔

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے، اگر ہم اپنے فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے مختلف التعبیر پیچیدہ معاملات میں اس مطلب کو درست قرار دیں، جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے، تو کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کسی امام ومجتہد کی تقلید واتباع صرف اس موقع پر کی جاتی ہے جہاں قرآن وسنت سے کسی حکم کے سمجھنے میں اجمال واتباع وابہام یا تعارض وغیرہ کی وجہ سے کوئی الجھن یا دشواری ہو، اور جس حکم میں ایسی کوئی پیچیدگی نہ ہو۔ وہاں کسی کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہوا کہ کسی کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کے حکم کو شارع کی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ بلکہ پیروی تو قرآن وحدیث کی ہے۔ لیکن صحیح مطلب اور مراد سمجھنے کے لئے ایک شارع کی حیثیت سے ان کی تعبیر وتشریح پر اعتماد کیا گیا ہے۔ بنظر انصاف

غور فرمائیں تو اس میں کوئی ایسا پہلو نہیں۔ جسے گناہ یا شرک کہا جا سکے، تاہم کوئی شخص کسی امام کو شارع (شریعت پیش کرنے والا) کا درجہ دے کر اسے واجب الاتباع قرار دیتا ہو، تو بلا شبہ اسے مشرک کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی کو شارع قانون قرار دے کر اپنے مقابلہ میں اس کی فہم و بصیرت پر اعتماد کرنا تو علمی افلاس کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔

تقلید کی دو صورتیں: تقلید کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی خاص امام و مجتہد کو معین نہ کیا جائے بلکہ اگر اس مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک اختیار کیا ہے تو دوسرے میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کر لی جائے۔ اسے تقلید مطلق کہا جاتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد کو متعین کر لیا جائے، اور تمام مسائل میں اسی کی رائے اِختیار کی جائے۔ اسے تقلید شخصی کہا جاتا ہے۔ ان دونوں قسموں کی حقیقت یہی ہے۔ کہ جو براہِ راست قران و حدیث سے احکام مستنبط کرنے (یعنی کسی حکم کلی سے جزئیات نکلنے) کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ جسے قرآن و حدیث کا ماہر سمجھتا ہے، اس کے فہم و بصیرت اور تفقہ پر اعتماد اور اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے، جس کا جواز بلکہ وجوب قران و حدیث کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے:

دلائل

۱) ارشاد باری ہے۔ "فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کر لو)

۲) نیز ارشاد ہے۔ "وَلَو رُدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُوْلِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ" (اور اگر یہ لوگ اس امر کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اولی الامر کے حوالے کرے تو جو لوگ استنباط کے اہل ہیں وہ اسے جانتے) (اور بعض بتلا دیتے) اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ خود استنباط کی اہلیت نہیں رکھتے۔ انھیں چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی تقلید کریں جو اجتہاد و استنباط کے اہل ہیں۔

۳) ایک جگہ ارشاد ہے۔ "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ" (ان کے ہر فرقہ میں ایک چھوٹی سی جماعت اس مقصد کے لئے کیوں نہ ہو کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس آکر اپنی قوم کو بیدار کرے تاکہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے بچیں) اس آیت سے واضح ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم میں واپس پہنچ کر انھیں دین و شریعت کے احکام بتلائیں اور ان کی قوم پر واجب ہے کہ وہ ان کی باتوں پر اعتماد کر کے اس پر عمل کریں، اس کا نام تقلید ہے۔

۴) ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ "اِتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ" (اس شخص کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف رجوع کیے ہوئے ہے) اس میں یہ نہیں فرمایا کہ "میرے راستے کی پیروی کرو" کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستے کو ٹھیک اور بعینہ سمجھنا ہر شخص کے بس میں نہیں۔ اس لئے اس کا یہ طریقہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف دل و جان سے راغب ہے اور اللہ کی پسند و ناپسند کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے، اس کی اِتباع کرنے سے اللہ کی اطاعت ہو جائے گی۔

۵) ایک آیت میں فرمایا۔ "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اولو الامر کی اطاعت کرو) اولو الامر میں ائمہ مجتہدین بھی داخل ہیں۔

۶) ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہیں کب تک تم لوگوں میں زندہ رہوں لہٰذا میرے بعد ان دو شخصوں یعنی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا، (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ شریف ۵۶۰) اس حدیث میں اقتدا کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے۔ جو انتظامی امور میں اطاعت کرنے کے معنی میں ہر گز استعمال نہیں ہوتا اس کا مفہوم بعینہٖ وہ ہے جو تقلید کے ضمن میں گذر چکا۔

۷) ایک حدیث میں علماء کو انبیاء کرام کا وارث قرار دیا ہے (احمد، ابوداود، ترمذی، مشکوٰۃ شریف ۳۴) پس جس طرح انبیاء کی اتباع فرض ولازم ہے، اسی طرح علماء کی اتباع بھی لازم ہے۔ کیونکہ وہ علم وشریعت کے وارث اور حامل ہیں۔

عهد صحابه: ۔ عہد صحابہ میں تقلید مطلق کی مثالیں بکثرت موجود ہیں، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے جو فقیہ نہ تھے، وہ فقہاء صحابہ سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے۔ اور دلیل کی تحقیق ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بطور نمونہ ایک واقعہ پیش خدمت ہے:۔

عبید کہتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے ہاتھ کچھ گیہوں فروخت کئے اور قیمت کے لئے ایک میعاد مقرر کی، پھر میں نے کوفہ جانا چاہا تو لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کو کچھ دام چھوڑ دوں اور وہ لوگ مجھے نقد قیمت ادا کر دیں۔ میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے سوال کیا انھوں نے فرمایا کہ نہ میں اس فعل کی تم کو اجازت دیتا ہوں نہ کھانا کھلانے کی۔ (مؤطا امام مالک)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ”صحابہ کرام سے لے کر مذاہب اربعہ کے ظہور تک یہی دستور اور رواج رہا کہ کوئی عالم مجتہد مل جاتا تو اسی کی تقلید کر لیتے تھے، کسی بھی معتبر ومستند شخصیت نے اس پر نکیر نہیں کی، اگر یہ تقلید باطل ہوتی تو وہ حضرات اس پر ضرور نکیر فرماتے“ (عقد الجید ص ۲۹ مترجم)

بقول ابن خلدوں تمام صحابہ کرام مجتہد (اہل فتوی) نہ تھے، بلا جماع ان کے علمی معیار میں تفاوت تھا، بعض مفتی و مجتہد تھے، جو نسبتاً قلیل تھے، دیگر حضرات مستفتی ومقلد تھے۔ اور مفتی صحابی حکم کے ساتھ دلیل کی وضاحت وبیان کا التزام نہ رکھتا تھا۔ آپ ﷺ کسی ایک صحابی کو ایسے علاقہ میں روانہ کرتے جہاں کے لوگ صرف اسلامی ارکان و عقائد سے واقف ہوتے۔ پھر وہ حضرات عبادات ومعاملات اور حلال وحرام کے تمام مسائل میں اسی صحابی کی اتباع کرتے۔ اگر کسی مسئلہ کا جواب اسے قران وحدیث سے صراحتًا نہ ملتا تو وہ اپنی اجتہاد کے بل بوتے پر جواب دیتا۔ اور وہ حضرات اس کی تقلید کرتے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع تھا۔ وہ عوام کو فتوی دینے اور کسی کو درجہ اجتہاد کے تحصیل کا حکم نہ دیتے۔ یہ بات ان کے علماء وعوام کے تواتر سے یقینا معلوم و واضح ہے۔ (المستصفی ۲/۳۸۵)

امام آمدی کا فرمان هے: ”صحابہ وتابعین کے دور سے عوام مجتہدین سے مسئلہ پوچھ کر احکام شرعیہ میں ان کی متابعت کرتے رہے ہیں، اور وہ علماء دلیل کے تذکرہ کے بغیر ان کو مسئلہ بتادیتے“ ان کو کبھی اس سے منع نہیں کیا تو گویا کہ مطلقاً ایک عامی کے لئے مجتہد کے اتباع کے جواز پر اجماع تھا۔ (الاحکام الآمدی ۳/۱۷۱)

اس سلسلہ میں ایک واضح عقلی دلیل یہ ہے کہ جو اجتہاد کا اہل نہ ہو، اسے کوئی فرعی مسئلہ درپیش ہو تو یا تو اس کے لئے اس میں کوئی شرعی حکم نہ ہو جو کہ اجماع کے خلاف ہے۔ اور اگر شرعی حکم کی پابندی کا تعلق ہے۔ تو ایک صورت یہ ہو گی کہ خود اس حکم کے متعلق دلائل میں غور وفکر کرتے اور دوسری صورت یہ ہو گی کہ کسی مجتہد کی تقلید کرے، پہلی صورت ممتنع ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اور دیگر تمام بندگانِ خدا کو دلائل کی تحقیق میں لگ کر تمام معاشی اور صنعت وحرفت کے مشاغل سے دستبردار ہو کر تمام دنیوی امور کو ویران ومعطل کر دینا پڑے گا۔ اور تقلید کی نفی ہی اس کا سبب ہو گا۔ پس دوسری ہی صورت پر عمل کرنا لازم ہو گا یعنی کسی مجتہد کی تقلید واتباع کی جائے۔

عهد صحابه میں تقلید شخصی: اس کی بعض امثلہ درج ذیل ہیں۔

۱) اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو۔ (کہ وہ طواف وداع کے لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا اس سے ساقط ہو جائے گا اور بغیر طواف کئے واپس آنا جائز ہو گا) ابن عباس نے فرمایا وہ جا سکتی ہے! اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کا قول اختیار نہ کریں گے اور حضرت زید کا قول نہ چھوڑیں گے۔ (بخاری شریف۔ کتاب الحج)

فتح الباری میں اس واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ''آپ فتویٰ دے یا نہ دیں حضرت زید بن ثابت تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف کے) واپس نہیں جا سکتی۔

اور مسند ابو داود طیالسی نے یہ نقل فرمایا ہے: ''انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابت کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہی'' (فتح الباری ۳/۴۶۳)

اس واقعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اہل مدینہ زید بن ثابت کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے۔ ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے۔ نیز حضرت ابن عباس نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو معین کر کے گناہ، یا شرک کے مرتکب ہو رہے ہو۔ بلکہ حضرت ام سلیم سے مسئلہ کی تحقیق کا حکم دیا۔ لہٰذا انہوں نے ام سلیم سے واقعہ کی تحقیق کر کے دوبارہ حضرت زید کی طرف مراجعت کی، جس کے نتیجے میں حضرت زید نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع فرما لیا۔ (فتح الباری ۳/۴۶۴)

۲) صحیح بخاری، مسلم، ابو داود اور ترمذی میں حضرت ہزیل بن شرحبیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ سے کچھ لوگوں نے مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعود سے پوچھا اور ان کے سامنے حضرت ابو موسیٰ کی رائے بھی ذکر کر دی گئی۔ ابن مسعود کا فتویٰ ابو موسیٰ کے فتویٰ سے مختلف تھا۔ جب ابو موسیٰ کے سامنے یہ بات آئی تو فرمایا: جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعود) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو'' (مشکواۃ ص ۲۶۴)

حضرت ابو موسیٰ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے ہر مسئلہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اور یہی تقلید شخصی ہے۔

۳) آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ کیا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دونگا۔ فرمایا کہ اگر کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو تو، عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت (حدیث) سے فیصلہ کرونگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اِس میں بھی نہ ملے تو؟ عرض کیا اس وقت اجتہاد و استنباط کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کرونگا اور کوئی کوتاہی نہ کرونگا، آپ ﷺ نے اِس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے اِس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔ (ترمذی، ابو داود، مشکوٰۃ ۳۲۴)

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلے میں ایک ایسی شمع ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیا جائے اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں خاص توجہ طلب بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے فقہاء صحابہ میں سے اہل یمن کے لئے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا، اور انھیں حاکم و قاضی، معلم و مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ اُن کی اتباع کریں انھیں صرف قرآن وحدیث ہی نہیں بلکہ قیاس واجتہاد کے مطابق فتویٰ صادر کرنے کی اجازت عطا فرمائی اس کا مطلب اِس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو اِن کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو اِن کے لئے لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں پر صحابہ کرام کے عہد مبارک سے عمل ہوتا رہاہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن وحدیث سے براہِ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں۔

لیکن بعد کے ادوار کے اعتبار سے فقہاء کرام نے جو اپنے اپنے زمانے کے نبض شناس تھے یہ محسوس فرمایاکے دیانت اور احتیاط وتقویٰ کا معیار روز بروز گھٹتا جارہاہے ایسی صورت میں تقلید مطلق کا دروازہ چوپٹ کھول دیا گیا تو بہت سے جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مثلاً: سردی میں وضو کے بعد خون نکل آئے تو امام شافعی کا مسلک اختیار کرے گا یعنی وضو نہیں ٹوٹا، پھر کسی عورت کو چھولیا تو امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے وضو باقی سمجھے گا، غرض اسی طرح جس قول میں اسے فائدہ نظر آئے گا اختیار کرے گا، اور جس میں کوئی تکلیف کا پہلو ہو گا اُسے چھوڑ دیگا، اور ایسا بھی ہو گا کہ اِس کا نفس اِس کو اسی قول کے صحت کی دلیلیں سمجھائیگا جو اس کے لئے زیادہ آسان ہیں اور حاصل یہ نکلے گا کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا۔ علامہ ابن تیمیہؒ اسی چیز کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ لوگ ایک وقت اُس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اُس کی جو اِسے درست قرار دیتاہیٰ اور اس طرح کا عمل باتفاق امت ناجائز ہے۔"

آگے اس طرح کی چند مثالیں اور لکھ کر فرماتے ہیں... یہ باجماع مسلمین ناجائز ہے... کیوں کہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولتا ہے اور اس بات کا سبب بنتاہے کہ حرام وحلال کا مدار محض خواہشات پر ہو کر رہ جائے" (فتاوی ابن تیمیہ ۲/۲۴۰-۲۴۱)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں "یادرکھئے کہ پہلی اور دوسری صدی میں تقلید شخصی کا (عام) رواج نہ تھا پھر دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی پر عمل شروع ہوا اور اس وقت بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو کسی متعین مجتہد کے مذہب پر عمل نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی۔"

اگر کسی کو شبہ ہو کہ ایک چیز صحابہ اور تابعین میں ضروری نہ تھی، تو بعد میں کیسے ضروری قرار پائی، تو اس اعتراض وشبہ کا تسلّی بخش جواب دیتے ہوئے شاہ صاحب نے بڑی اچھی بات فرمائی: "اصل میں تو اس شخص کی تقلید کرنا ضروری ہے جو فرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جانتا ہو، اس پر اہل حق کا اجماع ہے، پھر واجب ادا کرنے کے کئی راستے ہوں، تب تو انسان اس میں سے کوئی بھی اختیار کرلے واجب ادا ہو جائے گا، ان راستوں میں سے کسی ایک کو متعین کرنا واجب ہو گا لیکن اگر واجب کو ادا کرنے کا صرف ایک راستہ ہو تو وہی راستہ واجب ہو جائے گا، مثال کے طور پر ہمارے اسلاف حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے۔ مگر ہمارے زمانہ میں حدیث کا لکھنا واجب ہو گیا، کیونکہ روایت حدیث کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں رہی کہ انہی کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے، اسی طرح ہمارے اسلاف صرف ونحو اور لغت کے علم حاصل کرنے میں مشغول نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کی عربی زبان مادری زبان تھی، لیکن ہمارے زمانے میں ان علوم کی تحصیل واجب ہو گئی ہے لہٰذا اگر کوئی جاہل انسان ہندوستان یاماوراء النہر کے کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں نہ تو کوئی شافعی ومالکی یا حنبلی عالم ہے اور نہ ان مذاہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں (بلکہ صرف حنفی مسلک کا عالم یا کتابیں ہیں) تو اس کے لئے امام ابوحنیفہ کی تقلید ہی واجب ہو جائیگی اور ان کے مذاہب سے خروج اس کے لئے حرام ہو گا (کیونکہ دیگر مذاہب کے احکام معلوم کرنے کی اس کے پاس کوئی شکل نہیں ہے) اس کے برخلاف کوئی شخص حرمین میں ہو تو ان مذاہب میں سے کسی کی تقلید کرلینا کافی ہو گا کیونکہ وہاں ہر

مذہب کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہے (الانصاف ص۵۹)

حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

’’یہ چار مذاہب جو مدون ہو کر تحریری شکل مین موجود ہیں، ان کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام اُمت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتیں، بالخصوص اس زمانے میں جبکہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے۔‘‘

سات حروف: بخاری وغیرہ کی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ابتداً لوگوں کی سہولت کے خاطر قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا (سات حروف سے یہاں کیا مراد ہے اس کے متعلق شروحات میں بڑی تفصیل ہے) پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلام کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور مختلف لوگ مختلف طریقے سے پڑھنے لگے اور یہ ان میں آپس میں اختلاف کا سبب بننے لگا، تو بعض صحابہ کرام کے توجہ دلانے پر حضرت عثمانؓ نے صدیق اکبرؓ کے وقت یکجا مرتب مصحف شریف کی مختلف نقول بنا کر اہم اسلامی شہروں میں روانہ فرمایا اور تمام کو اس کا پابند بنایا کہ اس مصحف کے مطابق تلاوت کرے، اور اس کے علاوہ کسی کے پاس کچھ ہو تو اسے جلادے، حالانکہ تلاوت کے دیگر طریقے اور حروف بھی منزل من اللہ تھے، لیکن حالات و مصلحت کے تقاضے کے تحت حضرت عثمانؓ نے تمام کو ایک طریقہ کا پابند بنایا، اور آئندہ امت کا اس درجہ اتفاق واجماع ہوا کہ آج دیگر حروف سے کوئی واقف ہی نہیں، بلکہ اس کی تشریح میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔

اس واقعہ سے حالات کے پیش نظر مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی کی اہمیت پر روشنی واضح طور پر پڑتی ہے اور وقت کی مصلحت کے مطابق نبض شناس علماء کے اس فیصلہ کی حقانیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

مختلف قرأت: علامہ محمد سعید رمضان بوطی فرماتے ہیں: آپ ﷺ سے دس قراءات متواتر ہیں، جن کے مطابق تلاوت کی جاتی ہے، ان میں سے ہر ایک قرأت کی خدمت کیلئے ایک امام نے اپنے آپ کو فارغ کر لیا، اور مختلف اعتبار سے اس کی خدمت انجام دی، اور بالاتفاق ایک مسلمان ان میں سے کسی بھی ایک قرأت کے مطابق تلاوت کر سکتا ہے جیسا کہ اجتہاد سے عاجز ایک مسلمان ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کر سکتا ہے، کیا ایک مسلمان پر یہ لازم ہے کہ روز الگ الگ قرأت کے مطابق تلاوت کرے، اور کیا ایک ہی قرأت کی پابندی اس پر حرام ہے؟ کیا قریب وبعید زمانہ میں کسی بھی مسلمان نے یہ بات کہیہے؟ فروعی اور جزئی مسائل میں کسی ایک امام کی اتباع اور قرأت میں کسی ایک امام کی اتباع دونوں میں کیا فرق ہے کہ اوّل ناجائز ہو جائے اور دوّم جائز قرار پائے؟

صحابہ وتابعین کا دور اور بعد میں ائمہ اربعہ کا دور گذر گیا، لیکن ہم نے کسی بھی دور کے کسی امام کے متعلق یہ نہیں سنا کہ اس نے کسی مقلد کو اس بات سے منع کیا ہو کہ وہ ایک عالم کی اتباع وتقلید کرے، اور وقتاً فوقتاً اپنا مسلک بدلتا رہے۔ (اللامذهبیہ ملخصاً ص۷۸)

تقلید پر کچھ شبہات اور ان کے جواب: تقلید پر وارد عام طور پر شبہات وجواب درج ذیل ہیں:

(۱) قرآن کریم میں ارشاد ہے: ’’**وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ**‘‘ ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے، جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا ان کے باپ دادے عقل وہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی‘‘

جواب: اللہ تعالیٰ نے باپ داداوں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب فرمادیئے ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کو برملا رد

کرتے انھیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں، اور صاف کہتے ہیں کہ ہم اس کے بجائے اپنے باپ دادوں کی بات مانیں گے، دوسرے یہ کہ اُن کے بزرگ عقل وہدایت سے کورے تھے۔

ہم جس تقلید پر گفتگو کر رہے ہیں اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں، کوئی مقلد اللہ ورسول کے احکام کو رد کر کے کسی بزرگ کی بات نہیں مانتا، بلکہ وہ اپنے بزرگ کو شارِح قرآن وحدیث سمجھتا ہے، نیز دوسرے سبب کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس سے کوئی اہل حق انکار نہیں کر سکتا کہ جن ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے، ان سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو، مگر ہر اعتبار سے ان کی جلالتِ قدر ہر ایک کو مسلم ہے، اس لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے۔

(۲) ارشاد ربانی ہے: "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَ هُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ترجمہ: "انھوں نے اپنے علماء اور تارک الدنیا زاہدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پرودگار بنا رکھا ہے۔"

لیکن گذشتہ تفاصیل سے یہ معلوم ہو چکا کہ کسی مجتہد کی تقلید اسے شارع یا قانون ساز سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ اِسے شارِح قانون قرار دے کر کی جاتی ہے، اسے اپنے ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ خود اللہ ورسول کے کلام اور ان کے مراد واحکام کے سمجھنے کے لئے اُن کی تشریحات پر اعتماد کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کافروں کی تقلید سے کوئی تعلق ومناسبت ہی نہیں۔

(۳) بعض حضرات کے ذہن میں یہ خلش رہتی ہے کہ ائمہ مجتہدین نے خود فرمایا ہے کہ ہمارے قول پر اسوقت تک عمل نہ کرو جب تک اس کی دلیل معلوم نہ ہو جائے، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہیں، ورنہ ان کا یہ ارشاد خود ان کے دوسرے اقوال سے معارض ہوگا کیونکہ ان کی سوانح حیات اس قسم کے واقعات سے پُر ہیں کہ لوگ ان سے مسئلہ پوچھتے تھے اور وہ دلیل بیان کئے بغیر جواب دیتے تھے، اگر یہ چیز ان کے نزدیک جائز نہ ہوتی، تو وہ خود اس کا سبب کیوں بنتے۔

(۴) بعض حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں تقلید کا رواج نہ تھا اس لئے یہ بدعت ہے، لیکن گذشتہ صفحات میں یہ ثابت ہو چکا کہ تقلید کی دونوں قسمیں عہد صحابہ میں پائی جاتی تھیں اور قرآن وحدیث دونوں سے اس کا جواز بلکہ وجوب معلوم ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ تقلید شخصی آئندہ ضروری کیسے ہوگی؟ تو اس کا جواب بھی گذر چکا۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث بہت آسان ہے، لہٰذا ان سے احکام کو سمجھنے میں کسی کے واسطے کی ضرورت نہیں، قرآن کریم کا خود ارشاد ہے: "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ" (سورہ قمر) (ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان بنایا ہے) لیکن خود اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی وہ آیات آسان ہیں، جو وعظ و تذکیر اور نصیحت وعبرت کے مضامین پر مشتمل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "الذکر" کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی قرآن نصیحت کے لئے آسان کیا گیا ہے۔

رہیں وہ آیات جو احکام پر مشتمل ہیں، سو ان کا دقیق ہونا بالکل ظاہر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہے، اور ایک باطنی اور ہر حد کیلئے اطلاع کا طریقہ جداگانہ ہے" (یعنی ظاہری کیلئے عربی زبان اور باطنی کیلئے قوت فہم)

تقلید میں جمود: جس طرح تقلید کا انکار درست نہیں، اسی طرح اسے حد اعتدال سے بڑھادینا بھی غلط اور خطرناک ہے مثلاً تقلید میں کوئی اس حد تک پہنچ جائے کہ فقہاء مجتہدین کو خدا کی طرح واجب الاطاعت والاتباع سمجھنے لگے تو وہ بھی انتہائی قابل مذمت ہے اور خطرہ ہے کہ یہ چیز شرک سے مل نہ جائے۔

یا کسی متبحر عالم کو جو قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھتا ہو، اور اس سے متعلق تمام علوم کا ماہر ہو، اپنے امام مجتہد کا قول واضح طور سے کسی صحیح حدیث کے خلاف نظر آئے، وہ صحیح حدیث واضح بھی ہو، اس کے معارض کوئی حدیث نہ ہو، تو اسے چاہیئے کہ امام مجتہد کا قول ترک کر کے صحیح حدیث پر عمل کرے، اور مجتہد کی شان میں گستاخی نہ کرے، اس کے بجائے کوئی شخص اگر مجتہد کے قول کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو، تو یہ تقلید میں غلو ہے اور اس کا یہ عمل ہر لحاظ سے غلط ہے۔ چنانچہ تمام فقہی مذاہب میں کئی مسائل ایسے ہیں جن پر اسی مذہب کے متبحر علماء نے ان کی نظر میں ان کے مسائل کے بظاہر حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے فتویٰ نہیں دیا۔

لیکن حدیث کے مخالف ہونے کا فیصلہ کرنے کیلئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والا متبحر عالم ہو، اور اسے قرآن وحدیث کے علوم سے پوری واقفیت ہو۔ دوسرے یہ کہ جو حدیث اس کے مخالف پڑ رہی ہے وہ واضح المعنی ہو، تیسرے یہ کہ اس حدیث کے معارض کوئی مقبول حدیث نہ ہو اگر ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو تو نہ حدیث کی مخالفت کا فیصلہ درست ہوگا، اور نہ اس کی بنا پر امام کے قول کو چھوڑنا۔

امام نوویؒ المجموع میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے ان کے فتویٰ کے خلاف صحیح حدیث ملنے پر حدیث پر عمل کی کو وصیت فرمائی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی شخص کسی صحیح حدیث کو دیکھ کر اسے امام شافعیؒ کا مذہب قرار دے اور اس کے ظاہر پر عمل کرے، بلکہ اس کا حق اسی کو ہے جو (علمی صلاحیت میں کمال کی وجہ سے) اجتہاد فی المذہب کے رتبہ تک یا اس کے قریب پہنچ چکا ہو، نیز یہ بھی شرط ہے کہ اس کا غالب گمان یہ ہو کہ امام شافعیؒ کو اس حدیث کا یا اس کی صحت کا علم نہ تھا، اور یہ بات امام شافعیؒ کی تمام کتابیں اور ان کے شاگردوں کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہوگی اور یہ شرط کافی مشکل ہے، اور کم ہی کوئی ان شرائط سے متصف ہوگا، علماء نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے کہ امام شافعیؒ نے کافی روایات سے واقفیت کے باوجود ان کے ظاہر پر عمل کو ترک کیا، کیونکہ ان کی تحقیق میں اس میں کوئی طعن، نسخ، تخصیص یا تاویل وغیرہ کا ثبوت تھا (جس کی وجہ سے اس ظاہر پر عمل درست نہ تھا) (المجموع للنووی ۱/۶۴)

بہر حال تقلید کے متعلق افراط و تفریط اور غلو و جمود کے بجائے اعتدال کا راستہ اپنانا ہی برحق اور درست ہے۔

(تقلید کے موضوع پر مزید تفصیل کے لئے ان مآخذ کے طرف رجوع کریں، **تقلید کیا ھے** (مفتی تقی عثمانی صاحب) **الاعتقاد فی التقلید والاجتهاد** "للتھانویؒ" **حجة الله البالغه، وعقد الجید والانصاف** للشاہ ولی اللہ دہلوی، "**تقلید شرعی کی ضرورت**، مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحب، **اللامذهبية** دکتور محمد سعید بوطی **اجتهاد اور تقلید** قاری طیب صاحب)

(اس مضمون سے مقصود نزاع وجدال ہرگز نہیں، بلکہ دور حاضر میں ایسے موضوعات پر نزاع دین کے بلند بالا مقاصد کے لئے انتہائی مضر ہے اسلام کو مختلف خطرات اور چیلنج اپنے نرغہ میں لئے ہوئے ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فروعی مسائل کو نزع واختلاف کا موضوع بنانے کے بجائے تمام امتِ مسلمہ اتحاد و یکجہتی کے ساتھ ان درپیش خطرات اور مخالف قوتوں سے ٹکر لے کر انھیں پاش پاش کرے۔)

بعض فوائد: (۱) جو مکلف مجتہد مطلق نہ ہو، اس پر اجتہادی فروعات میں ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی امام کی تقلید لازم ہے۔ جو خود مجتہد ہو، اسے جن مسائل میں اجتہاد کی قدرت ہے ان میں کسی امام کی تقلید حرام ہے، لیکن تمام شرائط کے ساتھ مجتہد مستقل کا وجود کافی صدیوں سے (تقریباً ۷۰۰ سال سے،) مفقود ہے، فقہی مسالک چار ہی میں محدود نہیں، کیونکہ اس امت کے مجتہدین کی کثرت کی انتہا نہیں، قدیم زمانے میں گیارہ مسلک زیادہ مشہور اور ان کی کتابیں مدون تھیں، نیز ان کے مقلدین پائے جاتے تھے، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مسالک، نیز سفیان ثوری، ابن عُیَینَہ، لیث، اسحاق بن راھویہ، ابن جریر، داؤد اور اوزاعی کے مسالک ان حضرات کے متبعین

ان کے اقوال کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، پانچویں صدی ہجری کے بعد ابتدائی مشہور چار مسلک کے علاوہ بقیہ مسلک ختم ہوگئے۔ اور علماء نے ان چار مسالک کے علاوہ دیگر کی تقلید سے منع فرمایا، کیونکہ معتبر سند کے نہ ہونے کیوجہ سے ان مسائل کی متعلقہ ائمہ کی طرف نسبت پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس کے برعکس رائج چاروں مسلک کے علماء نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ائمہ کے اقوال کو ضبط کرکے اس کی تشریح و تفصیل فرمائی، اور صحیح وضعیف کی وضاحت کی، لہٰذا یہ مسالک تغیر و تحریف سے محفوظ ہوگئے۔

جو شخص کسی ایک مسلک کا پیرو ہو، بعض مسائل میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی یا دیگر کسی امام کی تقلید کرسکتا ہے، جس کا مذہب و مسلک اس مسئلہ میں محفوظ ہو، اور وہ مسئلہ مدون ہو، حتی کہ اس کے تمام شرائط وغیرہ بھی معروف ہوں، پس کئی علماء نے صحابہ کی تقلید سے منع کیا ہے، وہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ اس کی صحیح نسبت کا علم نہ ہو یا اُن کے نزدیک اس کے دیگر شرائط کا علم نہ ہو،

کسی قول کو ترجیح دینے یا اختیار کرنے کی جن میں صلاحیت ہے مثلاً امام نووی، ابن منذر اور سیوطی ان کے اختیارات وترجیح پر عمل کرنا جائز ہے۔

ایک مسلک سے کسی دوسرے مدون مسلک کی طرف منتقل ہونا جائز ہے، خواہ مستقل منتقل ہو، یا بعض حادثہ ومسائل میں، جبکہ اس کی وجہ سے تلفیق لازم نہ آئے۔ بشرطیکہ رخصتوں کو تلاش نہ کرے یعنی ہر مسلک میں سے آسان آسان مسئلوں پر عمل کرے ورنہ فاسق قرار پائے گا، بعض علماء نے فرمایا کہ جو وساوس میں مبتلا ہو اسے آسان مسائل ورخصتوں پر عمل کی گنجائش ہوگی تاکہ وساوس بڑھ کر شریعت کے دائرہ سے نہ نکل جائے اور جو اس کے برعکس ہو وہ مشکل (محتاط) صورت کو اختیار کرے۔

کسی حاجت یا عام مصلحت کی وجہ سے مرجوح قول پر فیصلہ وفتوی دینا جائز ہے، جو عام شخص کسی مسلک کا پیرو ہو، اسے اس مسلک کے راجح اقوال کے متعلق علماء سے پوچھ کر عمل کرنا چاہیئے، ایسے شخص کو بلا حاجت ومصلحت مرجوح قول پر فتوی دینا جائز نہیں ہے اپنے مسلک کے دو معتبر و قابل عالم ہوں۔ تو کسی سے بھی پوچھ کر عمل کرے، اگر دونوں کا جواب الگ الگ ہو تو جس پر چاہے عمل کرے، جبکہ اس کی نظر میں دونوں مساوی درجہ کے ہوں جو عام شخص کسی مسلک کا پابند نہ ہو، مثلاً کوئی نومسلم جو ابھی ان تفاصیل سے ناواقف ہے، اس پر لازم ہے کہ جو بھی معتبر عالم میسر ہو، اس کے فتوی پر عمل کرے، اگر دو مختلف مسلک کے عالم موجود ہوں تو جس سے چاہے رجوع کرے۔

ائمہ کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ اختلافی مسائل میں جو امام کسی مسئلہ کی حلت کا قائل ہو، اس کی تقلید کے بغیر اسے اختیار کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ابن حجر وغیرہ نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے خواہ یہ اختلاف ایک مسلک میں ہو یا مختلف مسالک میں، نیز مسئلہ عبادات کا ہو یا دوسرے کسی اور باب کا تاہم وہ شخص اس وقت گنہگار ہوگا، جبکہ باوجود امکان کے اس پر لازم مسائل کے سیکھنے میں کوتاہی برتے، یا مسئلہ مشہور ومعروف ہو کہ جس سے ناواقفیت میں کوئی بھی معذور شمار نہ ہو۔

(۲) کتب شافعیہ میں ترجیح وترتیب: علامہ ابن حجر مکی وغیرہ متاخرین شافعی علماء نے فرمایا کہ محققین کا اس پر اجماع کہ شافعی مسلک کے شیخین یعنی امام رافعی اور امام نووی سے قبل تصنیف شدہ کتابوں کے مسائل کا اسی وقت اعتبار ہوگا، جبکہ مکمل بحث وتحقیق کے بعد شافعی مسلک میں اس کے راجح ہونے کا ظن غالب ہو جائے، اور یہ حکم ان مسائل کا ہے، جن سے شیخین یا کسی ایک نے تعرض نہ کیا ہو، اگر کسی مسئلہ پر شیخین کا اتفاق ہو، تو تمام محققین کے نزدیک وہی معتمد ہوگا، اگر ان دونوں کا اختلاف ہو تو امام نووی کا قول معتمد ہوگا، امام نووی سے کچھ منقول نہ ہو تو امام رافعی کا قول معتمد ہوگا۔

اگر امام نووی کی کتابوں میں اختلاف ہو، معتمد قول کے متعلق غالباً یہ ترتیب ہوگی پہلے تحقیق پھر تنقیح پھر روضہ اور منہاج اور ان

کے فتاوی پھر شرح مسلم پھر تصحیح التنبیہ اور نکت التنبیہ۔

اگر متاخرین کا اتفاق ہو کہ شیخین کا قول سہو (بھول) پر مبنی ہے تو اس صورت میں ان کا قول معتمد نہ ہو گا، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔

صاحب اعانہ نے فرمایا کہ امام نوویؒ کے کتابوں میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، تو متبحر شخص کسی کتاب کا پابند نہیں، (بلکہ تبحر علمی کی بنیاد پر ترجیح دیگا)

دیگر حضرات ان میں سے بعد والی کتاب پر اعتماد کریں۔ جس میں اصحاب شافعی کے کلام کا تتبع زیادہ ہو جیسے مجموع پھر تحقیق، پھر تنقیح پھر روضہ پھر منہاج۔ ان کتابوں میں سے جس (مسئلہ) پر اکثر کا اتفاق ہو وہ اقل کے مقابلہ میں مقدم ہو گا۔ اور جو اسی باب میں بیان ہوا ہو دوسرے باب میں بیان شدہ مسئلہ کے مقابلہ میں غالباً مقدم ہو گا جیسا کہ ابن حجر و ابن علان وغیرہ نے فرمایا۔

اگر شیخین سے ترجیح منقول نہ ہو اور مفتی ترجیح کا اہل نہ ہو، جیسا کہ دور حاضر کا حال ہے، تو شیخ محمد الرملی کی نہایۃ المحتاج اور علامہ ابن حجر مکی کی تحفۃ المحتاج پر اعتماد کیا جائے گا۔ پھر ابن حجر کی فتح الجواد پھر امداد پھر شرح العباب اور ان کے فتاوے کا اعتبار ہو گا تاہم شرح بافضل ان دونوں پر مقدم ہو گی۔ بعضوں نے فرمایا کہ نہایہ اور تحفہ کے خلاف فتوی دینا جائز نہیں ہے، جن مسائل سے اِن دونوں نے تعرض نہ فرمایا ہو، ان میں ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ پہلے شیخ الاسلام زکریا انصاری کے کلام پر فتوی دیا جائے، پہلے ان کے نہجہ کی شرح صغیر اور پھر فتح الوهاب لیکن اس میں بعض مسائل ضعیف سے ہیں (ان میں سے کوئی نہ ہو تو) پھر 'خطیب' پھر 'حاشیہ الزیادی' پھر 'ابن قاسم' پھر 'عمیرہ' پھر 'شبر املسی' پھر 'حلبی' پھر 'شوبری' پھر 'عنانی' کا کلام معتمد ہو گا، جبکہ یہ حضرات اصول مذهب کی مخالفت نہ کریں۔

اگر تحفہ اور نہایہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، اور مفتی میں ترجیح کی اہلیت نہ ہو، تو اسے اختیار ہے کہ جس پر چاہے فتوی دے، ان دونوں کتابوں کے مخالف ان کی دیگر کتابیں یا دیگر علماء کے کتابوں کے موافق فتوی دینا جائز نہیں ہے۔

اگر ابن حجر اور رملی کا اختلاف ہو، تو بعض علماء کا خیال کہ مسئلہ پوچھنے والا دین میں پختہ، محتاط اور عزائم پر عمل پیرا ہو تو اُسے سخت حکم بتائے اور وہ دین میں کمزور ہو اور صرف سخت حکم بتانے کی صورت میں اُسے ٹالنے والا ہو، تو اُسے آسان و خفیف حکم بتائے، البتہ بدنیتی یا شرعی احکام میں لاپرواہی کے طور پر نہیں، بلکہ اس پر شفقت اور ترس کھاتے ہوئے، تاکہ وہ بالکل دین کی مخالفت کر کے تباہ و برباد نہ ہو جائے۔

تنبیه: مذکورہ بالا کتابوں میں، بلکہ خود تحفہ و نہایہ میں بھی بعض غلط یا کافی ضعیف مسائل آ گئے ہیں، پس ان پر مطلقاً فتوی دینا جائز نہیں ہے۔

تلفیق: مسئلہ گذر چکا کہ بعض مسائل میں دوسرے مسلک کی اتباع جائز ہے، بشرطیکہ تلفیق نہ ہو، تلفیق کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی باب کے دو مسئلوں میں الگ الگ امام کی پیروی کرے، اور اِس سے مرکب صورت جو سامنے آئے، اِس کا کوئی دونوں میں سے کوئی بھی قائل نہ ہو، پس کسی مسلک میں ایک امام کی پیروی کرے، تو اِبن حجر مکی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ سے متعلق تمام مسائل میں اِسی امام کی تقلید لازم ہے، لہٰذا جو شخص حنفی مسلک کی تقلید کرتے ہوئے عین کعبہ سے ہٹ کر صرف جہت کعبہ کی طرف نماز پڑھے تو اس پر لازم ہے کہ وضو میں چوتھائی سر کا مسح کرے، اور وضو کے بعد اس کے بدن سے خون نہ بہے، (کیونکہ یہ دونوں حنفی مسلک میں ضروری ہیں) ورنہ اس کی نماز دونوں مسلک کے مطابق باطل قرار پائے گی، اس اصول کی ابن دقیق العید، سبکی، عراقی اور قاضی حسین وغیرہ کئی

محققین نے صراحت فرمائی ہے۔

امام ابن زیاد اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ علماء کرام کی مثالوں سے اس مسئلہ میں جو بات ہمارے سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دو مسلک کی ترکیب اسی وقت مانع ہوگی جبکہ کے ایک ہی قضیہ میں ہو، مثلاً: وضو کے بعد امام ابو حنیفہ کی تقلید میں بیوی کو چھوئے اور امام شافعی کی تقلید میں پچھنے لگوائے، پھر نماز پڑھے تو یہ نماز باطل ہے، کیونکہ دونوں امام کے نزدیک یہ وضو باطل ہے، امام ابو حنیفہ کی نزدیک پچھنے کی وجہ سے اور امام شافعی کے نزدیک بیوی کو چھونے کی وجہ سے۔

اس کے برعکس دو مختلف قضیوں میں ایسی ترکیب پیش آئے تو وہ تقلید سے مانع نہ ہوگی، مثلاً کوئی شافعی وضو میں چوتھائی سر سے کم کا مسح کرے پھر حنفی مسلک کی اتباع میں قبلہ کی جہت پر نماز پڑھے تو یہ نماز بظاہر صحیح ہوگی، کیونکہ وضو کے بطلان پر دونوں متفق نہیں ہیں، اور نماز دوسرا قضیہ ہے یہی بات امام بلقینی کے فتاویٰ میں موجود ہے (خلاصہ یہ ہے کہ گو وضو نماز کیلئے شرط ہے لیکن دونوں جدا جدا قضیہ ہیں لہٰذا وضو ایک مسلک کے مطابق اور نماز دوسرے مسلک کے مطابق ہو تو صحیح ہے)

(۴) **احتیاط:** حتی الامکان علماء کے نزدیک اتفاقی شکل پر عمل کرنا اور ان کے اختلاف سے بچ نکلنے کی کوشش کرنا مطلوب وہ بہتر ہے، تاہم ہمیشہ یہ ممکن نہ ہوگا، نیز بعض اوقات دوسرے کے دلیل کی واضح کمزوری کی وجہ سے یا کسی فضیلت کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اختلاف کی رعایت نہ کی جائیگی۔

مثلاً: (۱) کسی چیز کے جائز یا حرام ہونے میں اختلاف ہو تو اسے ترک کرنا افضل ہے۔

(۲) کسی عمل کے واجب یا مستحب ہونے میں اختلاف ہو تو اس کو کرنا افضل ہے۔

(۳) کسی عمل کے ترک کرنے یا کرنے کی مشروعیت میں اختلاف ہو تو اسے کرنا افضل ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ میں بسم اللہ کا پڑھنا، کیونکہ یہ امام شافعی کے نزدیک واجب اور امام مالک کے نزدیک (فرض نماز میں) مکروہ ہے، لیکن کئی مالکی حضرات نے احتیاطاً بسم اللہ کے پڑھنے کو اختیار فرمایا ہے۔

(۴) صحیح حدیث سے کوئی حکم ثابت ہو اور مخالف قیاس خفی کی وجہ سے اس سے اختلاف کرے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا جیسے گھوڑے کے گوشت کی حلت، ماں کے ذبح کی وجہ سے جنین کی حلت اور گوہ کی حلت۔

(۵) تقلید کا مطلب ہے دوسرے کے قول کو اس کی تفصیلی دلیل کی معرفت کے بغیر قبول کرنا، پس اپنے عمل کی حد تک ضعیف قول کی تقلید جائز ہے مثلاً اصح، معتمد، اوجہ اور متجہ کے بالمقابل قول، نہ کہ صحیح کے بالمقابل، کیونکہ وہ غالباً فاسد ہوتا ہے۔

ایک غیر مجتہد عدمِ تقلید کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے، تاہم اس کا عمل کسی معتبر مسلک کے مطابق ہو، تو کئی علماء کے نزدیک اس کی عبادت اور معاملات مطلقاً صحیح ہوں گے اور بعضوں نے مطلقاً عدمِ صحت کو اختیار کیا، اور بعضوں کا خیال ہے کہ معاملات تو صحیح ہوں گے، نہ کہ عبادات، کیونکہ اس میں بالجزم (حتمی) نیت نہ ہوگی۔

ائمہ کے کلام و عمل سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عام شخص شرعی حکم سمجھ کر کسی مسئلہ پر عمل کرے اور یہ کسی معتبر مسلک کے موافق ہو، گرچہ وہ متعین طور پر اس قائل سے واقف نہ ہو، تب بھی وہ عمل صحیح ہوگا، جبکہ بوقت عمل کسی دوسرے کا صحیح مقلد نہ ہو۔

امام سیوطیؒ نے کئی علماء کرام کے متعلق نقل فرمایا کہ وہ عوام جو کسی مسلک کے پابند نہ ہوں، اور اس کے نصوص و قواعد سے واقف نہ ہوں، چاروں مسلک کے مطابق ان کو فتویٰ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا عمل کسی عالم کے فتویٰ کے مطابق ہو، تو کافی ہے تاہم علامہ

کروی فرماتے ہیں کہ اپنے مسلک کے ضعیف قول یا وجہ کی تقلید اس کی شرط کے ساتھ دوسرے مسلک کی تقلید سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے مطلوبہ تمام شرائط کا وجود کافی دشوار ہے۔(قلائد ۲/ ۷ ۴۴۔ ترشیح المستفدین ۳-۷، فتح المعین مع الاعانہ ۴/ ۷ ۲۱-۲۲۰، ۱/ ۱۹

بعض فقھی مبادیات

فقه کی تعریف: لغت میں فقہ فہم اور سمجھ کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں تفصیلی دلائل کی روشنی میں عملی احکامِ شرعیہ کے متعلق حاصل کردہ علم کو فقہ کہا جاتا ہے۔

استمداد: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس

فائدہ: اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالانا اور ممنوعات سے بچنا

موضوع: طاری ہونے والے احکام کے اعتبار سے مکلفین کے افعال

حکم: وجوب عینی یا کفائی

سائل: قضایا، مثلاً نیت واجب ہے، وضو نماز کی صحت کے لئے شرط ہے، دخولِ وقت، نماز کا سبب ہے۔

واضح: ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ۔(اعانۃ ۱/ ۱۴)

والله اعلم باالصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی عقائد

۱۔ آیات قرآنی

۱۔ "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" (آل عمران آیت نمبر ۱۸) گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور (دوسرے) اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان سے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

۲۔ "فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (سورہ محمد آیت ۱۹)۔۔۔ تو آپ اس کا (بہ اکمل وجوہ) یقین کیجئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں۔

۳۔ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" (الانبیاء ۲۵) (اور یہ توحید کوئی نئی بات نہیں جس سے توحش ہو بلکہ شرع قدیم ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں پس میری (ہی) عبادت کیا کرو۔

معلوم ہوا کہ توحید تمام انبیاء ورسل کا دین اور تمام اولین وآخرین اہل صدق ویقین کی راہ ہے

۴۔ "لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" (الانبیاء ۲۲) زمین (میں) اور آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے درہم برہم ہو جاتے کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا لہٰذا اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے تعدد الٰہ بھی منفی ہے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔

۵۔ "هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" (زمر۔۴) وہ ایسا اللہ ہے جو واحد ہے زبردست ہے۔

۶۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔۱۹) بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

۷۔ "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (البقرۃ ۲۸۵) اعتقاد رکھتے ہیں رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اس چیز (کے حق ہونے) کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مومنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جاوے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مومنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ۔ کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو نہ سمجھیں)

حدیث جبریل علیہ السلام

جبریل امین کا سوال: ایمان کیا ہے آپ ﷺ کا جواب: ”ایمان (شرعی) یہ ہے کہ تم اللہ تعالےٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی ملاقات پر (یعنی اس دار فانی سے کوچ کر جانا یا دیدار الٰہی) اور اس کے رسولوں (پیغمبروں) پر (بعض روایات میں ”نبیوں پر اور کتابوں پر ایمان“ کے الفاظ ہیں) اور قیامت پر ایمان لاؤ (بخاری مسلم ابوداود وغیرہ) بعض روایات میں مزید یہ بھی ہے ”اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا“

جبریل امین کا سوال: اسلام کیا ہے؟

آپ ﷺ کا جواب: ”اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (یعنی کلمہ شہادت کا اقرار) اور (پنجوقتہ فرض) نمازوں کی پابندی کرو اور فرض زکات ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو ”بعض روایات میں ہے بصورتِ استطاعت بیت اللہ کا حج کرو۔“ (بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ)

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان:

(۱) اس کی گواہی کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود برحق (عبادت کے لائق) نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ (۲) (پنج وقتہ فرض) نمازوں کی اقامت (یعنی صحیح ادائیگی اور پابندی) (۳) زکوٰۃ کی ادائیگی (۴) رمضان کے روزے رکھنا (۵) حج کرنا۔ (بخاری۔مسلم)

”اسلام“ اس لفظ کے لغوی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور عالم ابن الانباری (متوفی ۳۲۸ھ) فرماتے ہیں کہ مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو کلی طور پر اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت وعبادت کے لئے وقف کر دے۔ عربی میں مسلم کے معنی ہیں کسی چیز کا کلیۃً (مکمل) کسی کا ہو جانا اسی طرح اسلام کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا دین اور عقائد مکمل طور پر خدائے واحد کی ملکیت بن جائیں۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تشریح میں فرمایا 'مسلم یعنی اسلام کی راہ پر چلنے والا وہ ہے جو اللہ پر دل وجان سے یقین رکھے اور اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں“ (مسند احمد)

'ایمان' آپ ﷺ جو کچھ اللہ کی طرف سے لے آئے ہیں اس کی تصدیق کرنا (فتح الباری)

ایمان جب معتبر اور صحیح ہوتا ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان سب کو مان لے، اللہ ورسول کی کسی بات میں شک کرنا اس کو جھٹلانا یا اس میں عیب لگانا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ اس کارخانۂ قدرت (ساری کائنات) کا ایک قدیم صانع اور پیدا کرنے والا ہے جو ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، اس کا وجود حتمی اور اس کا معدوم ہونا محال ہے، وہ تمام صفات کمال سے متصف اور تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ تمام معلومات اس کے علم میں ہیں، تمام ممکنات پر وہ قادر ہے اور تمام کائنات اسی کے ارادہ سے ہے، وہ حیات سے متصف ہے سمیع (سننے والا) ہے بصیر (دیکھنے والا) ہے۔ اس کا کوئی شبیہ ونظیر اور مثل نہیں، نہ اس کا کوئی مقابل اور ہمسر، وہ بے مثل ہے اس کا کوئی مددگار نہیں، واجب الوجود ہونے اور عبادت کے مستحق ہونے اور تمام مخلوقات کی پیدائش اور پوری کائنات کے انتظام وانصرام میں اس کا کوئی شریک ومعین نہیں۔ وہ جو چاہے کرتا ہے، کوئی اس کو روک ٹوک کرنے والا نہیں، عبادت (یعنی غایت تعظیم وتقدیس) کا صرف وہی مستحق ہے۔ صرف وہی ہے جو مریض کو شفا دیتا، مخلوق کو رزق عنایت فرماتا، اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے، اس کی شان ہے۔

''اِنَّمَآ اَمۡرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ''(سورہ یٰس ۸۲)(اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرمادیتا ہے ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتی ہے۔)

اللہ تعالیٰ حلول واتحاد سے پاک ہے (وہ نہ کسی دوسرے کے قالب میں اتر جاتا ہے نہ کسی سے متحد ہوتا ہے) اس کی ذات وصفات حدوث سے مبرّا ہیں (یعنی ذات وصفات قدیم ہیں) وہ نہ جوہر ہے نہ عرض نہ جسم (جوہر وہ چیز ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو اور کسی چیز میں ہو اور عرض وہ چیز ہے جو کسی ایسے محل کا محتاج ہو جس پر وہ قائم ہو سکے) وہ کسی جگہ اور سمت میں محدود نہیں وہ عرش کے اوپر ہے (مستوی علی العرش ہے) قیامت کے دن مومنوں کو اس کا دیدار ہوگا، جو وہ چاہتا ہے سو ہوتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا، وہ غنی ہے کسی چیز کا محتاج نہیں اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا اس سے پوچھا نہیں جاسکتا کہ وہ کیا کر رہا ہے (برخلاف مخلوق کے کہ اس سے پوچھا جاسکتا ہے) کسی کے واجب کرنے سے کوئی چیز اس پر واجب نہیں ہوتی، حکمت اس کی صفت ہے، اس کا ہر فعل حکیمانہ ہے، اس کے علاوہ کوئی حاکم (حقیقی) نہیں۔

تقدیر اچھی ہو یا بری اللہ کی طرف سے ہے (صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اس وقت تک کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ تقدیر پر (اچھی ہو یا بری) ایمان نہ لائے اور جب تک یہ جان نہ لے کہ جو کچھ اس کو پہنچا ہے وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا اور جس سے بچ کر نکل گیا وہ اس تک پہونچ نہیں سکتا تھا (ترمذی شریف)

عالم (جہاں ودنیا) میں جو کچھ ہوتا ہے بھلا ہو یا برا سب کو اللہ تعالیٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے جاننے کے موافق اس کو پیدا کرتا ہے تقدیر اسی کا نام ہے۔ اور بری چیزوں کو پیدا کرنے میں بہت سے بھید ہیں، جن کو ہر ایک نہیں جانتا مخلوق کی صفتوں سے وہ پاک ہے، اور قرآن وحدیث میں بعض جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے (مثلاً پنڈلی، ہاتھ، استواء علی العرش، آسمانِ دنیا پر نزول فرمانا وغیرہ) تو ان کے معنی اللہ کے حوالے کریں کہ وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم کھود کرید کے بغیر اس طرح ایمان لاتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ جو کچھ اس کا مطلب ہے وہ ٹھیک اور برحق ہے۔

اس کا ازلی وذاتی علم ہر اس واقعہ کو جو وجود میں آچکا ہے یا آئے گا محیط ہے۔ وہی واقعات کو ان کے وجود سے پہلے قابل وجود بناتا ہے۔ اس کے بلند مرتبہ اور مقرب فرشتے ہیں اور دوسرے وہ فرشتے ہیں جن کو بندوں کے اعمال لکھنے اور مصیبتوں اور آفتوں سے ان کی حفاظت کرنے اور خیر کی طرف بلانے پر مامور کیا گیا ہے، وہ بندہ کیلئے خیر کا سبب بنتے ہیں۔ فرشتے کبھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ اور اس کی مخلوقات میں سے جنات بھی ہیں۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اس کے الفاظ ومعانی سب اللہ کی طرف سے ہیں وہ مکمل ہے تحریف (نقص واضافہ اور تبدیلی) سے محفوظ ہے جو اس میں تحریف یا کمی زیادتی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں۔ قرآن وحدیث کے کھلے کھلے مطلب کو نہ ماننا اور اینچ پینچ کر کے اپنا مطلب بنانے معنی گھڑنا بددینی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے صفات میں انحراف وتحریف یعنی جو صفت نازیبا ہے اس سے اس کو موصوف کرنا اس کی صفات کی ایسی تاویل کرنا جو اس کے شایانِ شان نہیں، جائز نہیں اور اس بارے میں صرف شریعت کا فیصلہ معتبر ہے، اس دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔

معاد جسمانی برحق ہے (یعنی آخرت میں جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا) (آخرت میں) جزا وسزا اور (اعمال کا) حساب برحق ہے، پلِ صراط قرآن وسنت سے ثابت ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، وہ (دونوں) پیدا کی جاچکی ہیں۔

کبائر (کبیرہ گناہوں) کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، شفاعت (سفارش) ان کے حق میں برحق ہے جن کے بارے میں اللہ اجازت دے، کبائر کے مرتکب امتیوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت برحق ہے، آپ کی شفاعت قبول کی جائیگی۔ فاسق کے لئے عذابِ قبر اور مومن کے لئے قبر کا آرام وراحت حق ہے، (قبر میں) منکر و نکیر کا سوال کرنا برحق ہے۔

مخلوق کی طرف انبیاء کرام علیہم الصلوۃ السلام کی بعثت برحق ہے اور انبیائے کرام کی زبان اور ان کے واسطہ سے اللہ تعالے کا اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف قرار دینا برحق ہے انبیاء کرام مجموعی طور پر کچھ ایسی امتیازی صفات سے متصف ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں نہیں پائی جاتیں، اور وہ ان کے نبوت کی دلیل ہوتی ہیں۔ جن میں خوارق عادات (عام عادت کے خلاف امور کا ظہور جیسے شق القمر، انگلیوں سے پانی نکلنا وغیرہ) جن کو معجزات (آیات) کہا جاتا ہے، سلامتی فطرت اور مثالی اخلاق وغیرہ صفات ہیں انبیاء اکرام کفر، کبائر کے عمداً ارتکاب اور ان پر قائم رہنے سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں ان میں اول سیدنا آدم علیہ السلام اور آخری حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی درمیان میں جو ہوئے ان کے بارے میں یوں عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ہم ایمان لاتے ہیں جو معلوم ہیں ان پر بھی اور جو ہم کو نہیں معلوم ان پر بھی، اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں آسمان سے جبریل علیہ السلام کی معرفت بہت سے پیغمبروں پر اتاریں، جن میں چار بہت مشہور ہیں: توریت، حضرت موسی علیہ السلام پر، زبور، حضرت داوٗد علیہ السلام پر، انجیل، حضرت عیسی علیہ السلام پر، اور قرآن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر، قرآن آخری کتاب ہے اب کوئی کتاب آسمان سے نہ آئے گی، قیامت تک قرآن مجید کا ہی حکم چلتا رہے گا۔ دوسری کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا ہے۔ مگر قرآن مجید کی نگہبانی کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

سیدنا محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ آپ کی دعوت ساری دنیا تمام انسانوں اور جنات کے لئے ہے۔ اس امتیازی خصوصیت میں اور اسکے علاوہ اس جیسی دوسری خصوصیات میں وہ سب نبیوں میں افضل ہیں۔ آپ کی رسالت پر ایمان لائے بغیر ایمان معتبر نہیں۔ اسلام ہی واحد دین حق ہے، اس کے سوا کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول اور آخرت میں ذریعہ نجات نہیں۔ معراج برحق ہے آپ کو بحالت بیداری رات میں بیت المقدس اور وہاں سے جہاں اللہ نے چاہا لے جایا گیا۔

اولیائے عظام کی (اللہ کے وہ مومن بندے جو خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے عارف اور اپنے ایمان میں مقام احسان تک پہنچے ہوئے ہیں) کرامات حق ہیں جس کو اللہ چاہتا ہے ان سے نوازتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت خاصہ سے سرفراز فرماتا ہے تکلیفِ شرعی (یعنی اوامر ونواہی خداوندی کا مخاطب اور شرعی فرائض کا مکلف ہونا اور ان کے نتیجہ میں آخرت میں جزاو سزا کا مستحق ہونا) کسی سے ساقط نہیں ہوتی، خواہ وہ ولایت، مجاہدہ اور جہاد کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو وہ فرائض کا ہمیشہ مکلف رہے گا۔ کوئی حرام چیز یا معصیت جب تک آدمی صحیح الحواس اور عاقل ہے اس کے لئے جائز نہ ہوگی، نبوت ولایت سے مطلقاً افضل ہے کوئی ولی خواہ کتنا ہی بڑا ہو کسی صحابی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا، خواہ وہ صحابی اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے نہ ہو، صحابہ کرام کی اولیاء عظام پر فضیلت ثواب کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی عظمت پر ہے نہ کہ کثرت عمل پر (صحیح حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تو وہ ان میں سے کسی کے مدّ اور آدھے مد برابر بھی نہ ہوگا۔) آپ ﷺ کو جس مسلمان نے دیکھا ہے یا آپ ﷺ کی ملاقات کی ہو ان کو صحابی کہتے ہیں ان کی بڑی بزرگی اور مناقب وارد ہیں ان سے محبت اور اچھا گمان رکھنا چاہئے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد بہترین مخلوق اور بہترین مومنین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ عشرہ مبشرہ (جن دس صحابہ کو ایک ہی حدیث میں جنت کی بشارت دی گئی ہے) کیلئے جنت اور خیر کی ہم شہادت دیتے ہیں، اہل بیت اور

ازاواج مطہرات کی (جو امہات المومنین ہیں) عظمت وتوقیر کرتے ہیں۔ ان سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسلام میں ان کے بلند مقام کے معترف ہیں۔ اسی طرح اہل بدر اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں کے مقام کے معترف ہیں اہل سنت تمام صحابہ کرام کی عدالت کے قائل ہیں۔ ان کی عصمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ اور ان کے نزاعات اور اختلافات کے بارے میں کف لسان (زبان بند رکھتے ہیں) اور احتیاط سے کام لیتے ہیں ان کی کوئی برائی نہیں کرتے۔

آپ ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام و خلیفہ بر حق تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر خلافت علی منہاج النبوۃ ختم ہوگئی۔ حضرت ابو بکر وحضرت عمر امت محمدیہ ﷺ میں علی الترتیب سب سے افضل ہیں ہم صحابہ کرام کا صرف ذکر خیر ہی کرتے ہیں وہ ہمارے دینی قائد ور ہنما ہیں۔ ان کو برا کہنا حرام ہے اور ان کی تعظیم واجب ہے۔

ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے (متکلمین کی اصطلاح میں "اہل قبلہ" وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین پر یعنی وہ امور جن کا ثبوت کتاب وسنت واجماع سے قطعی طریقہ پر ہو چکا ہے ایمان رکھتے ہیں۔ اگر کوئی محض ضروریات دین میں سے کسی چیز کا مثلاً عالم کے حدوث، قبروں سے اٹھائے جانے، اللہ کے تمام جزئیات سے واقف ہونے، نماز، روزہ کی فرضیت وغیرہ کسی امر کا منکر ہو تو اہل قبلہ میں شمار نہیں کیا جائے گا خواہ وہ کتنے ہی مجاہدات وریاضات کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی انکار کی علامتوں مثلاً بت کے سامنے سجدہ کسی حکم شرعی کا مذاق وتمسخر جیسی کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس کائنات کے خالق اور قادر ومختار ہونے کا انکار کرے یا غیر اللہ کی عبادت کرے یا آخرت یا (کسی بھی) نبی کا انکار کرے یا ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ کافر ہے ضروریات دین یعنی وہ امور جن کا ثبوت دین میں معلوم ومشہور ہے دین کے وہ حقائق واحکام جو قرآن سنت متواتر اور صریح اجماع کی بنیاد پر دلیل قطعی ویقینی سے ثابت ہوں۔) معصیت کو جائز سمجھنا (بشرطیکہ اس کا معصیت ہونا ثابت ہو) کفر ہے شریعت کا مذاق اڑانا اوراس کے احکام کے ساتھ تمسخر کفر ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا) بشرطیکہ فتنہ کا سبب نہ ہو۔ اور بات مان لینے کا گمان غالب ہو واجب ہے ۔ہم تمام انبیاء ورُسل اور ان پر نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور انبیاء میں باہم تفریق نہیں کرتے ایمان زبان سے اقرار اور دل کی تصدیق کا نام ہے۔ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے "خلق" اور بندوں کے "کسب" سے ہیں۔ علامات قیامت پر جیساکہ حدیث میں وارد ہے ہم یقین رکھتے ہیں اجتماعیت اور اتحاد کو ہم حق اور ثواب کی چیز اور انتشار وافتراق کو گمراہی وکج روی اور عذاب کا سبب سمجھتے ہیں۔

مذکورہ عقائد سے متعلق بعض آیات۔

ا۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْئٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" (الشوریٰ-١١) کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے۔

٢۔ "وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا" (فاطر ٤٤) اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو ہرادے، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہ بڑے علم والا، بڑی قدرت والا ہے۔

٣۔ "وَهُوَالْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَعَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ" (الحدید ١-٣) اور وہ زبردست، حکمت والا ہے، اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، وہی حیات دیتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے۔

۴۔ ”وَاِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ“ (الحج۷) اور قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کو دوبارہ پیدا کرے گا۔

۵۔ ”لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا“ (الفرقان-۲) اس نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اس کا شریک ہے حکومت میں، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا۔

۶۔ ”قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ“ (الاعراف۱۵۸) آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمّی پر (بھی ایمان لاؤ) جو کہ اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان (نبی) کا اتباع کرو تاکہ تم راہ (راست) پر آجاؤ۔

۷۔ ”مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا“ (الاحزاب-۴۰) محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن (ہاں ایک دوسری ابوۃ روحانی بیشک حاصل ہے چنانچہ) آپ اللہ کے رسول ہیں۔ (اور رسول روحانی مربّی ہونے سے روحانی باپ ہوتا ہے) اور (اس ابوۃ روحانیہ میں اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے اکمل و افضل ہیں چنانچہ آپ) سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔

۸۔ ”وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ“ (القیمۃ ۲۲/۲۳) بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

۹۔ ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ“ (سورہ اخلاص) آپ کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کے اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

توحید، دین خالص اور شرک کی حقیقت

عبودیت کی بنیاد عقائد اور ایمان کی تصحیح پر ہے۔ جس کے عقائد میں خلل اور ایمان میں بگاڑ ہو اس کی نہ کوئی عبادت مقبول، نہ اس کا کوئی عمل صحیح مانا جائے گا۔ اور جس کا عقیدہ درست اور ایمان صحیح ہو اس کا تھوڑا عمل بہت ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اس کی پوری کوشش کرنا چاہئے کہ اس کا ایمان و عقیدہ صحیح ہو اور صحیح ایمان و عقیدہ کے حصول اور اس پر اطمینان اس کا مقصودِ عمل اور منتہائے آرزو ہو اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھے اور اس میں ایک لمحہ بھی تاخیر سے کام نہ لے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ توحید کے چار درجات ہیں۔

۱- صرف اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود قرار دنیا لہٰذا کوئی اور واجب الوجود نہیں۔

۲- عرش آسمان، زمین اور تمام قائم بالذات اشیاء کا خالق صرف اللہ کو سمجھنا (اسی کو توحید الربوبیۃ کہا جاتا ہے) یہ دو درجے وہ ہیں۔ جن سے آسمانی کتابوں نے بحث کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ مشرکین عرب اور یہود و نصاری کو ان کے بارے میں اختلاف و انکار تھا بلکہ قرآن کریم اس کی صراحت کرتا ہے کہ یہ دونوں مرتبے ان کے نزدیک مسلمات میں سے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) ”وَلَئِنْ

سَاَلْتَھُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ خَلَقَھُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ "(الزخرف-۹) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے نے پیدا کیا ہے۔)

۳۔ آسمان وزمین کے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اس کے انتظام وانصرام کو صرف خدا تعالے کے ساتھ خاص سمجھنا۔

۴۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی کو مستحق عبادت نہ گردانا (اس کو توحید الوہیت کہا جاتا ہے) یہ دونوں درجے طبعی ربط کی وجہ سے باہم دیگر پیوست اور لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں انھیں دونوں درجوں یاقسموں سے قرآن عظیم نے بحث کی ہے اور کافروں کے شکوک وشبہات کا شافی ووافی جواب دیا ہے (ح جۃاللہ البالغہ ۱/ ۵۹-۶۰ باختصار)

اس سے معلوم ہوا کہ شرک کے معنی صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو اللہ تعالے کا ہم مرتبہ وہم سر قرار دیا جائے بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بلند وبالا ذات کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ اور جس کو "عبودیت" بندگی کا شعار بنایا ہے جیسے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا، کسی کے نام پر قربانی کرنا، یا نذریں ماننا، مصیبت وتنگی میں کسی سے مدد مانگنا، اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے، اور اس کو کائنات میں متصرف سمجھنا یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور انسان ان سے مشرک ہو جاتا ہے، خواہ اس کا یہ اعتقاد ہی کیوں نہ ہو کے یہ انسان، فرشتہ یا جن جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو رہا ہے، یا جس کے نام پر قربانی کر رہا ہے نذریں مان رہا ہے۔ اور جس سے مدد مانگ رہا ہے اللہ تعالیٰ سے بہت کم مرتبہ اور پست مقام ہے اور چاہے یہ مانتا ہو کہ اللہ ہی خالق ہے اور یہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے۔

شرک کے مظاہر واعمال اور جاھلی رسم ورواج: ہمہ گیر علم، ارادۂ مطلقہ، اور آزاد وغیر محدود تصرف اور قدرتِ کاملہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہے، اور عبادت کے اعمال اور شعائر جیسے سجدہ یا رکوع کسی کے سامنے کرنا، کسی کے نام پر اور اس کی خوشنودی کیلئے روزہ رکھنا، دور دور سے اہتمام کے ساتھ کسی جگہ کے لئے شدرحال (طول طویل سفر کر کے جانا) اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو بیت اللہ کو زیبا ہے۔ اور وہاں قربانی کے جانور لے جانا، نذریں اور منتیں ماننا شرک کے کام اور شرک کے مظاہر ہیں۔ تعظیم کے وہ طریقے اور علامتیں جو عبودیت اور غایت ذلت کی مظہر ہوں، صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کو ہے اور انسانی قدرت سے باہر ہے دلوں کے بھیدوں اور خیالات اور نیتوں کا علم ہر وقت کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سفارش قبول کرنے اور اہل وجاہت اور با اثر واقتدار لوگوں کو راضی وخوش کرنے میں دنیا کے بادشاہوں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ ایسی ہر چھوٹی اور بڑی بات میں (ان کے بجائے) اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ شاہان دنیا کی طرح کائنات کے انتظام اور درباریوں اور وزراء واعوان سے مدد لینا اللہ کے شایان شان نہیں ہے۔ کسی قسم کا سجدہ سوائے اللہ کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ حج کے مناسک واعمال۔ غایت درجہ کی تعظیم کے مظاہر اور محبت وفنائیت کے تمام شعائر بیت اللہ اور حرم محترم کے ساتھ خاص ہیں۔ صالحین اور اولیاء کے ساتھ جانوروں کی تخصیص، ان کا احترام کرنا ان کی نذریں چڑھانا، اور ان کی قربانی کے ذریعہ ان سے تقرب حاصل کرنا، حرام ہے۔ عاجزی وانکساری کے ساتھ غایت درجہ کی تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تقرب وتعظیم کے جذبہ سے قربانی کرنا صرف اللہ کا حق ہے۔ کائنات میں آسمانی برجوں (نچھتروں) سیاروں کی تاثیر پر اعتقاد رکھنا شرک ہے۔ کاہنوں، نجومیوں اور غیب کی باتیں بتانے والوں پر اعتماد کرنا کفر ہے۔ کفر کو پسند کرنا کفر کی باتوں کو اچھا جاننا کسی دوسرے سے کفر کی کوئی بات کرانا کسی نبی یا فرشتے کی حقارت کرنا ان کو عیب لگانا اللہ کے سوا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہو گئی۔ کسی کو نفع نقصان کا مختار سمجھنا کسی سے مرادیں مانگنا یا روزی یا اولاد مانگنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، جن یا بھوت پریت وغیرہ کے چھوڑ دینے کے لئے ان کی بھینٹ دینا، بکرا وغیرہ ذبح کرنا کسی جگہ کا کعبہ کے برابر ادب وتعظیم کرنا، کسی کے نام پر بچے کے کان ناک چھیدنا، وغیرہ کسی کے نام کا بازو پر پیسہ باندھنا، یا گلے

میں ناڑا ڈالنا، کسی جانور پر کسی بزرگ کا نام لے کر اس کا ادب کرنا، کسی مہینہ یا تاریخ کو منحوس سمجھنا، کسی بزرگ کا نام بطور وظیفہ جپنا، کسی کے نام یا سر کی قسم کھانا، کسی بزرگ وغیرہ کی تصویر برکت کے لئے رکھنا، اور اس کی تعظیم کرنا، یہ سب کفر اور شرک کی باتیں ہیں۔

نام رکھنے میں مسلمانوں کو توحید کے شعار کا اظہار کرنا چاہیے۔ غلط فہمی پیدا کرنے والے اور جس سے مشرکانہ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے ایسے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانا شرک ہے۔ غیر اللہ کی نذریں ماننا حرام ہے۔ اسی طرح کسی ایسے مقام پر قربانی کرنا جہاں کوئی بت تھا، یا جاہلیت کا کوئی جشن منایا جاتا تھا ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں افراط و تفریط اور نصاریٰ کے اپنے نبی کے بارے میں غلو و مبالغہ کی تقلید، اور اولیاء وصالحین کی تصویروں اور شبیہوں کی تعظیم کرنے سے پرہیز اور مکمل احتیاط کرنا چاہیے۔

نبوت کا بنیادی مقصد

اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقیدہ اور عبد اور معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ میں اور ہر ماحول میں انبیائے کرام علیہم السلام کی پہلی دعوت اور ان کی بعثت کا اولین اور اہم ترین مقصد رہا ہے ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع ونقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور صرف وہی عبادت، دعاء، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے۔

قرآن کریم کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ شرک وبت پرستی کے خلاف صف آرائی اُن سے جنگ کرنا نبوت کا بنیادی مقصد تھا قرآن کبھی تو ان کے بارے میں اجمالاً کہتا ہے۔

"وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ"(سورۃ انبیاء ۲۵)

"(اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت کرو)"

اور کبھی تفصیل کے ساتھ ایک ایک نبی کا نام لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کی دعوت کی ابتداء اسی توحید کی دعوت سے ہوئی تھی۔ سورہ اعراف میں حضراتِ نوح، ہود، صالح، شعیب، علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نام لے لے کر ان کی اس دعوت توحید کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔"قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ" اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں"(الاعراف ۵۹)(دیکھئے سورۃ اعراف از رکوع ۸ تا رکوع ۱۲ نیز سورہ ہود رکوع ۳ تا رکوع ۸)

یہ ہرگز جائز نہیں کہ نئے اصلاحی دعوتی تقاضوں اور زمانہ کی نئی ضرورتوں کے اثر سے "شرک جلی" کی اہمیت کو کم کر دیا جائے اور دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں میں اس کو ضمنی حیثیت دی جائے یا "سیاسی اطاعت" اور انسانوں کے وضع کئے ہوئے کسی نظام و قانون کے قبول کرنے کو اور غیر اللہ کی عبادت کو ایک درجہ میں رکھا جائے، اور دونوں پر ایک ہی حکم لگایا جائے۔ (شرک جلی یعنی واضح اور کھلا ہوا شرک، اور ریاکاری جیسے امر کو شرک خفی کہیں گے، جو حقیقی شرک نہیں ہے)

بدعت

کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ رسول نے دین میں شامل نہیں کیا اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا، اس کا ایک جزء بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لئے کرنا، اور اس کے خود ساختہ شرائط وآداب کی اسی طرح پابندی کرنا، جس طرح ایک حکم شرعی کی پابندی کی جاتی ہے، بدعت ہے۔ بدعت اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی، امام مالکؒ نے خوب فرمایا: جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کر دی، اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی،

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا" پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔ (روایت ابن الماجشون عن الامام مالکؒ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شریعت کی خصوصیت، اس کی سہولت، اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے۔ اس لئے کہ جو دین کا شارع ہے وہ انسان کا خالق بھی ہے۔

"اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَا للّٰطِیْفُ الْخَبِیْرِ" (الملک۔ ۱۴) "(اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔"

آپ ﷺ نے بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی تاکید بلیغ فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَالَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ" (متفق علیہ) جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد (مردود وغیر مقبول) ہے" "اِیَّاکُمْ وَالْبِدْعَۃَ" "فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ" (مشکوۃ المصابیح/بروایت ابوداود واحمد) "بدعت سے ہمیشہ بچو، اس لئے کہ بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہو گی۔"

اور یہ حکیمانہ پیشگوئی بھی فرمائی، "مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَۃٌ اِلَّا رُفِعَ بِھَا مِثْلُھَا مِنَ السُّنَّۃِ" (مسند احمد) "جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت ضرور اٹھ جاتی ہے" صحابہ کرام اور ان کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام اور اپنے اپنے وقت کے مجددین و مصلحین اور علمائے ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے ممانعت کی اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول ورواج پذیر ہونے سے روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔

بعض بدعتوں اور بری رسموں کا بیان

قبروں پر دھوم دھام سے میلہ کرنا، چراغ جلانا، چادریں ڈالنا، پختہ قبریں بنانا، بزرگوں کے راضی کرنے کو قبروں کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا، تعزیہ کو چومنا، چاٹنا، خاک ملنا، طواف یا سجدہ کرنا، قبروں کی طرف نماز پڑھنا، مٹھائی وغیرہ چڑھانا، تعزیہ یا عَلم وغیرہ رکھنا، کسی چیز کو اچھوتی سمجھنا، محرم کے مہینہ میں سوگ کی صورتیں، تیجا، چالیسواں وغیرہ کو ضروری سمجھ کر کرنا، عورت کے دوسرے نکاح کو معیوب سمجھنا۔ نکاح، ختنہ اور بسم اللہ وغیرہ میں وسعت نہ ہونے کے باوجود ساری خاندانی رسمیں کرنا، ہولی دیوالی کی رسمیں کرنا، سلام کی جگہ بندگی وغیرہ کہنا، یا صرف سر پر ہاتھ رکھ کر جھک جانا، دیور، جیٹھ، پھوپھی زاد، خالہ زاد بھائی کے سامنے بے حجابانہ یا کسی اور نامحرم کے سامنے آنا، راگ باجا، گانا سننا، ناچ دیکھنا، نسب پر فخر کرنا، کسی بزرگ سے منسوب ہونے کو نجات کیلئے کافی سمجھنا، کسی کے نسب میں کسر ہو اس پر طعن کرنا، پیشہ کو ذلیل سمجھنا، حد سے زیادہ کسی کی تعریف کرنا، شادیوں میں فضول خرچی اور خرافات کے کام کرنا، ہندوؤں کی رسمیں کرنا، دولہا کو خلاف شرع پوشاک پہنانا، کنگنا، سہرا باندھنا، مہندی لگانا، آتشبازی (پٹاخے) وغیرہ کا سامان کرنا، فضول آرائش کرنا، گھر کے اندر عورتوں کے درمیان دولھا کو بلانا، شیخی سے (بڑائی میں) مہر زیادہ مقرر کرنا، غمی میں چلا کر رونا، منہ اور سینہ پیٹنا، محاسن بیان کر کے رونا، جو کپڑے اس کے بدن سے لگیں سب کو دھلوانا، برس روز تک یا کچھ زیادہ اس گھر میں اچار نہ پڑنا، کوئی خوشی کی تقریب نہ کرنا، مخصوص تاریخوں میں پھر غم کا تازہ کرنا، حد سے زیادہ زیب وزینت میں مشغول ہونا، سادی وضع معیوب سمجھنا، مکان میں تصویریں لگانا، بہت باریک کپڑا پہننا۔ بجتا زیور پہننا، عورتوں کا مردوں کی وضع اختیار کرنا، اور اس کے برعکس، بدن گودوانا، وغیرہ۔

(عقائد کا اکثر حصہ دستور حیات سید ابوالحسن علی الندوی اور بہشتی زیور سے ماخوذ ہے بعض دیگر کتب سے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین سیدنا محمدنِ النبی الامی و علی اٰل محمدو صحبہ اجمعین امابعد

کتاب الطہارۃ (پاکی وصفائی کا بیان)

باب۔ پاک پانی

ارشاد خداوندی ہے ”وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا“ (الفرقان ۴۸) ترجمہ:- ”اور ہم نے آسمان سے پاکی حاصل کرنے کا پانی اتارا“

حدیث: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہارت ہے“ (رواہ احمد عن جابر مشکوۃ ج/۱، ص ۳۹)

اسی طرح صحیح مسلم شریف کی ایک طویل روایت میں آپ ﷺ نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔

لفظ ”طہارت“ عربی لغت میں نظافت کیلئے اور حسی میل اور معنوی عیب سے صاف ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً نجاست، تھوک، بلغم، حسد، کبر، بغض وغیرہ سے پاک وصاف ہونا اور شرعاً وضو غسل، تیمّم، اور نجاست کے ازالہ کے لئے اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں (بشری ۱/۱۴) وضو، غسل اور نجاست کے ازالہ کے لئے مطلق پانی (ماء مطلق) کا ہونا ضروری ہے وہ پانی جس میں کوئی لازمی قید نہ ہو اسے مطلق پانی کہیں گے۔

(اگر لازمی قید آجائے، مثلاً گلاب کا پانی۔ شکر کا پانی وغیرہ تو یہ مطلق نہ ہونے کی وجہ سے طہارت میں استعمال نہیں ہو سکتا، گلاب کے پانی کو آپ صرف پانی نہیں کہہ سکتے، لہٰذا اس قید کو قید لازم کہیں گے البتہ کنویں یا ندی یا بارش کے پانی کو آپ بغیر قید کے صرف پانی بھی کہہ دیں گے، معلوم ہوا یہ قید لازمی نہیں اور اسی کو مطلق پانی کہا جائے گا۔)

مستعمل پانی: رفع حدث کے لئے (یعنی وضو یا غسل کے فرض میں) جو پانی استعمال ہو وہ طاہر (یعنی پاک تو) ہے لیکن طہور نہیں (یعنی پاک کرنے والا نہیں لہٰذا ایسے پانی کو پھر وضو وغیرہ کے لئے استعمال نہیں کرسکتے) جو پانی نفل طہارت میں استعمال ہو وہ طہور بھی ہے مثلاً تجدید وضو (باوضو ہوتے ہوئے پھر وضو کرنا) سنت غسل، وضو یا غسل میں دوسری یا تیسری مرتبہ اعضاء کا دھونا، مضمضہ (کلی) کا پانی۔

نفل نماز پڑھنے کے لئے کئے گئے وضو کا پانی اور نابالغ کے وضو کا پانی بھی طہور نہیں ہے۔

جو مستعمل پانی رفع حدث میں استعمال نہیں کرسکتے، اس سے نجاست کا ازالہ بھی نہیں ہوگا (اس پانی سے کسی نجس کپڑے کو اچھی طرح دھویا جائے تب بھی وہ کپڑا شرعاً ناپاک ہی رہے گا، جب تک اس پر طہور پانی نہ بہایا جائے، پاکی حاصل نہیں ہوگی) اگر مستعمل پانی جمع کرنے کے بعد وہ قلتین کی مقدار کو پہنچ جائے تو پھر وہ طہور شمار ہوگا۔

قلتین کی مقدار ص ۱۵ پر آرہی ہے (تقریباً ۱۹۳ کلو پانی) قلتین پانی میں کوئی جنبی (جس کو غسل کی ضرورت ہو) اتر کر غسل کرے تو وہ پانی طہور ہی رہے گا۔ قلتین سے کم پانی میں کوئی جنبی اتر جائے، یہاں تک کہ مکمل بدن پانی میں ہو پھر غسل کی نیّت کرے تو اس کا غسل صحیح ہوا۔ لیکن اب وہ پانی دوسرے کے حق میں مستعمل بن چکا۔ اگر قلتین سے کم پانی میں دو جنبی اشخاص پورے طور پر ڈوب جائیں، پھر

دونوں بہ یک وقت (ایک ہی وقت میں) غسل کی نیت کریں تو دونوں کا غسل صحیح ہو گا۔

جنبی کا بعض بدن پانی میں اور بعض پانی سے باہر ہو، اور وہ غسل کی نیت کرے، تو داخل حصہ تو پاک ہوا، اسی حال میں اگر بقیہ حصہ کو بھی پانی میں داخل کرے تو مکمل غسل ہو جائیگا، لیکن غسل مکمل کرنے سے پہلے پانی سے الگ ہوا تو وہ پانی مستعمل شمار ہو گا، لہذا بقیہ غسل اس سے حاصل نہیں ہو گا۔

دو جنبی قلیل پانی میں غوطہ لگائیں اور ان میں سے ایک نے پہلے نیت کی تو اس کا غسل تو صحیح ہوا، لیکن دوسرے کے حق میں وہ پانی مستعمل شمار ہو گا۔

دو جنبی کے بدن کا کچھ حصہ پانی میں اور کچھ خارج میں تھا اور دونوں نے ساتھ میں نیت کی تو داخل حصّہ دونوں کا پاک ہوا البتہ خارجی اعضاء کے لئے وہ پانی مستعمل ہو جانے کی وجہ سے کام نہیں دے گا۔

پانی جب تک کسی عضو پر ہی رہے (ابھی جدا نہیں ہوا) تو وہ مستعمل نہیں کہلائے گا (اگر وضو کرنے والا چلو میں پانی لے تاکہ کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھوئے اور چلو سے اسے کہینوں کی طرف بہائے تو اگرچہ ہتھیلی اور آگے کے حصّے کی طہارت حاصل ہو رہی ہے، لیکن ابھی وہ پانی مستعمل نہیں سمجھا جائے گا اور کہنیوں تک دھونے کے لئے کام دے گا۔ یہی پانی نیچے گرنے کے بعد اسے لیکر آپ ہاتھ کا بقیہ حصّہ دھونا چاہیں تو صحیح نہیں ہے۔)

اگر پانی متوضی (وضو کرنے والا) کے ایک عضو سے دوسرے عضو کی طرف بہے تو وہ مستعمل کہلائے گا، یہاں تک کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف منتقل ہو تو وہ مستعمل ہو چکا۔ مکمل چہرہ دھونے سے پہلے متوضی پانی میں ہاتھ ڈبوئے تو وہ مستعمل نہیں ہو گا، چہرہ مکمل دھونے کے بعد رفع حدث کی نیت سے ہاتھ قلیل پانی میں ڈالے تو وہ مستعمل ہو جائیگا۔ (یعنی ہاتھ کے حدث کو دور کرنے کی نیت سے جب پانی میں ہاتھ ڈالا تو اتنا ہاتھ پاک ہو چکا۔ اور اس استعمال سے وہ پانی مستعمل ہو گیا۔ وضو کے بقیہ اعمال کو اس پانی سے انجام نہیں دے سکتے، البتہ ہاتھ اگر ابھی پانی سے جدا نہیں ہوئے ہیں۔ تو ان کو کہنیوں تک اندر داخل کرے تو ہاتھ کی طہارت کے لئے یہ کافی ہو گا، اس لئے کہ استعمال کا حکم عضو سے جدائی کے بعد لگے گا اسی طرح ایک مرتبہ چہرہ دھونے کے بعد دوسری یا تیسری مرتبہ بھی دھونے کے ارادے سے ہاتھ پانی میں داخل کرے تو وہ مستعمل نہیں ہو گا)

لیکن مذکورہ صورت میں چلو میں پانی لینے کی نیت سے (تاکہ ہاتھ باہر دھوئے) ہاتھ اندر داخل کیا ہے تو وہ پانی مستعمل نہیں ہو گا۔

اور اگر بغیر کسی نیت کے داخل کیا ہے تو صحیح یہ ہیکہ مستعمل ہو جائے گا لیکن امام بغویؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مستعمل نہیں ہو گا۔

امام شاشیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن عبد السلامؒ، ابو عجیلؒ، ابو شکیلؒ اور تعیبیؒ وغیرہ حضرات نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ بلا نیت ہاتھ ڈبونے سے وہ پانی مستعمل نہ ہو گا۔ (ترشیح المستفیدین ص ١٤)

جنبی جب غسل کی نیت کرے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو محدث (بے وضو) کا چہرہ دھونے کے بعد ہے۔ (یعنی فرض غسل کی نیت کے بعد قلیل پانی میں چلو سے پانی نکالنے کی نیت سے ہاتھ داخل کرے تو صحیح ہے ورنہ پانی مستعمل ہو جائے گا۔)

جو آدمی وضو کی نیت کو فرض نہیں مانتا ہو مثلاً کوئی حنفی، اس کے وضو کا پانی بھی مستعمل ہو گا۔

کسی نے سر کا مسح کرنے کی بجائے سر دھو دیا تو وہ پانی بھی مستعمل ہے، کوئی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرے تب بھی سارا پانی

مستعمل قرار پائے گا۔

فصل: پانی میں کسی دوسری چیز کا گرنا اور شامل ہونا

اس سلسلہ میں ایک عام ضابطہ اور اصول یہ ہے کہ جن چیزوں کے شامل ہونے کے بعد پانی کو صرف پانی (یعنی ماء مطلق) نہیں کہہ سکتے، ایسے پانی سے طہارت ممنوع ہے، ورنہ صحیح ہے۔

جن چیزوں سے پانی کو بچانا آسان ہو (اور عام حالات میں ان چیزوں کے خود بخود پانی میں شامل ہونے کی نوبت نہ آتی ہو،) ایسی چیزوں کے پانی میں گرنے کی وجہ سے پانی میں ہلکا سا تغیر (تبدیلی) آجائے، تو وہ پانی طہور ہی ہے۔ (جبکہ وہ چیز پاک ہو۔)

جو چیز پانی میں شکر، نمک وغیرہ کی طرح گھلتی نہ ہو، بلکہ اپنی حالت پر باقی رہتی ہو، اس کو ''مُجَاوِر'' (پڑوس میں رہنے والا) کہیں گے جیسے لکڑی پتھر وغیرہ۔

تو کسی مجاور کی وجہ سے جو کہ پانی میں مختلط (گھلتا) نہ ہو، زیادہ تغیر آجائے تب بھی وہ طہور ہی رہے گا جیسے لکڑی، تیل، موم وغیرہ کی وجہ سے، کافور کی دو قسم ہیں۔ ایک پانی میں گھلتا ہے۔ دوسرا نہیں گھلتا۔ پہلی قسم کے کافور کی وجہ سے زیادہ تغیر آجائے تو طہارت کے قابل نہیں رہیگا، لیکن دوسری قسم کا کافور لکڑی وغیرہ کے حکم میں ہے۔ جن اشیاء سے پانی کو محفوظ رکھنا عام مدتّ میں ممکن نہ ہو، جیسے پانی کے بہنے یا رکنے کی جگہ میں موجود مٹی، کائی، گندھک، نورہ، (چونے کا پتھر) ھڑتال وغیرہ، ان اشیاء کی وجہ سے زیادہ تغیر بھی آجائے تو حرج نہیں، پانی طہور ہے۔

پانی میں پیدا ہونے والی مٹی کی وجہ سے تغیر بھی طہارت سے مانع نہیں۔

اسی طرح مدت دراز تک ایک ہی جگہ رکے رہنے سے پانی میں جو تغیر پیدا ہوتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں، گرم کیا ہوا پانی بھی طہور ہے۔

مذکورہ متغیر پانی، سمندری پانی، زم زم کا پانی اور گرم پانی اگرچہ کسی نجس چیز کو جلا کر گرم کیا گیا ہو، کو استعمال کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

زیادہ گرم یا زیادہ سرد پانی استعمال کرنا مکروہ ہے۔

ماءِ مشمس: حوض اور تالاب کا پانی سورج کی تپش سے گرم ہو تو بالاتفاق اس کا استعمال مکروہ نہیں ہے۔ البتہ کسی برتن کا پانی سورج کی تپش اور دھوپ سے گرم ہو تو ان شرائط کے ساتھ مکروہ تنزیہہ ہے (سورج کی تپش سے گرم ہونے والے پانی کو مشّمس پانی کہیں گے۔)

(۱) علاقہ گرم ہو (۲)۔ برتن کا مادہ ایسا ہو جسے ڈھال کر بنایا جاسکتا ہو جیسے تانبا (ہتھوڑے وغیرہ سے کوٹ کر جس کو پھیلا سکتے ہو عموماً دھات اس میں آجائے گی) لیکن سونا چاندی اس سے مستثنٰی ہیں۔ (۳)۔ بدن میں استعمال کیا جائے (کپڑا وغیرہ دھونے میں استعمال کرنا مکروہ نہیں) یہی پانی ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کی کراہت ختم ہو جائے گی۔

(دلیل کے اعتبار سے امام نوویؒ نے عدم کراہت کو زیادہ ترجیح دی ہے، مگر شافعی مسلک کے اعتبار سے کراہت کا قول راجح ہے، کیونکہ امام شافعی اور دار قطنی وغیرہ نے بسند صحیح حضرت عمرؓ سے اس پانی سے غسل کی کراہت کو روایت کیا ہے)

متفرق: مذکورہ بالا صورت میں دھوپ کی شدت کی وجہ سے برتن سے ذرات جدا ہو کر پانی میں شامل ہوتے ہیں، جو گرمی کی حالت میں بدن سے چھو جائے تو چمٹ کر برص (سفید داغ) کی بیماری کا سبب بن سکتا ہے اور یہی سبب کراہت ہے۔ اگر کسی کو عادل طبیب (ڈاکٹر) کے کہنے سے مشمّس پانی کے استعمال کی وجہ سے برص ہونے کا غالب گمان ہو، تو پھر اُسے اس پانی کا استعمال حرام ہے۔

مٹی کے پکے ہوئے برتن میں، سردیا معتدل علاقہ میں، بدن کے علاوہ کپڑے زمین یا کھانے وغیرہ میں اور اسی طرح ٹھنڈا ہونے کے بعد مشمس پانی کا استعمال مکروہ نہیں ہے (فتح الوہاب مع الجمل ۳۶/۱)

جن اشیاء کے پانی میں شامل ہونے کی نوبت عموماً نہیں آتی مثلاً زعفران ایسے اشیا کی وجہ سے پانی میں اتنا تغیر آجائے کہ اب وہ ماء مطلق نہیں کہلائے گا، تو وہ طہور نہیں ہے۔

اگر کسی نے پانی نہ پینے کی قسم کھالی ہو تو اس حد تک متغیر پانی کے پینے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

پانی کے مزہ، رنگ، یا بو میں سے کسی ایک وصف کا بدل جانا کافی ہے۔ قصداً مٹی پانی میں پھینکنے سے تغیر آیا ہو تب بھی وہ طہور ہے۔

پانی سے بننے والے نمک کی وجہ سے اگر تغیر پیدا ہو تو حرج نہیں، دیگر نمک مضر ہوں گے۔ درختوں کے پتے پانی میں گر کر تغیر پیدا کریں، چاہے ریزہ ریزہ ہوں یا نہ ہوں تو وہ طہور ہے۔ اور قصداً پتے پانی میں پھینکے گئے اور اس کی وجہ سے تغیر پیدا ہو تو یہ مضر ہے۔

سیال کی آمیزش (تقدیری تغیّر)

قلیل یا کثیر پانی میں ایسا پاک مائع (بہنے والی چیز، سیال) شامل ہو جائے، جو صفات میں پانی کی موافق ہو، (پانی سے الگ اس میں کوئی رنگ یا مزہ یا بو نہ ہو) جیسے گلاب کا پانی جس کی خوشبو ختم ہو چکی ہو، درخت کا پانی، مستعمل پانی وغیرہ تو مذکورہ مائع کی مقدار اتنی ہو کہ اگر اس کا مزہ یا رنگ یا بو پانی کے مخالف ہوتا، تو پانی میں موئثر تغیر پیدا کرتا۔ (یعنی ایسا تغیر جو سابقہ تفصیلات کی روشنی میں طہوریت کو ختم کرنے والا ہو) تو اس پانی کی طہوریت ختم ہو جائے گی۔ (اس تغیر کو تقدیری تغیر کہیں گے۔)

(مذکورہ مائع کو اوسط درجہ میں پانی کے مخالف اوصاف والا سمجھ کر چلیں گے اور اگر نجس چیز شامل ہو رہی ہے تو اشد درجہ میں پانی کا مخالف تصور کریں گے۔) اور پانی کے مقابلہ میں اس مائع کی مقدار اتنی ہو کہ اوصاف میں مخالف تصور کرنے کے باوجود تغیر موئثر پیدا نہیں کرے گا، تو پانی طہور ہے اور اس صورت میں مکمل پانی طہارت میں استعمال کر سکتے ہیں، مائع کی مقدار کو آخر میں باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

کسی کے پاس اتنا پانی ہو کہ طہارت کیلئے ناکافی ہو اور تھوڑا سا مائع ملا لینے کی صورت میں کافی ہو جاتا ہو تو ملا لینا لازم ہے، لیکن اگر مائع کی قیمت طہارت کیلئے درکار پانی کی قیمت سے زیادہ ہو تو ملانا ضروری نہیں، اس فصل میں مذکورہ مسائل میں پانی کے قلتین سے کم زیادہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے۔ (سارے ہی صورتوں کا یہی حکم ہوگا) پانی کو جوش دینے کی وجہ سے بخارات (بھاپ) بلند ہو اور پھر وہ پانی میں تبدیل ہو تو وہ پانی بھی طہور ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے مائع کے بخارات سے ٹپکا ہوا پانی ہو تو طہور نہیں ہے جیسا کہ پسینہ طہور نہیں ہے۔

باب۔ نجاستوں اور نجس پانی کے بیان میں

نجاست لغت میں ہر گندگی کو کہا جائیگا، شریعت میں نجاست سے ایسی گندگی مراد ہے جس کی موجودگی میں عام حالات میں نماز صحیح نہیں ہوتی۔

نجاست کی دو قسمیں ھیں: (۱) نجاست حکمی جو اپنے محل سے آگے بڑھ جائے جیسے جنابت۔ (۲) نجاست عینیہ جو اپنے محل سے تجاوز نہ کرے (پیشاب وغیرہ) جس نجاست عینیہ کا کوئی اثر باقی نہ ہو۔ (جیسے پیشاب کپڑے پر لگ جائے جس میں نہ بدبو ہے نہ مزہ نہ رنگ) اس کو بھی نجاست حکمیہ کہتے ہیں (جمل ۱۶۸/۱)

ساری اشیاء کی ہم دو تقسیم کر سکتے ہیں ۱۔ جماد ۲۔ حیوان

جماد کا مطلب جو نہ حیوان ہو نہ حیوان تھا نہ کسی حیوان کا جزء ہے نہ کسی حیوان سے نکلا ہے۔

شراب اور نشہ لانے والی نبیذ کے علاوہ سارے جَمادات پاک ہیں۔ حیوانات میں کُتا، خنزیر (سور) اور ان دونوں سے کسی ایک کے بھی دوسرے جانور سے ملاپ کی وجہ سے جو پیدا ہو نجس ہیں۔ اس کے علاوہ سارے جاندار اپنی زندگی میں پاک ہیں۔ مردار میں پیدا ہونے والے کیڑے بھی پاک ہیں۔ جن حیوانات کو شرعی طریقے سے (ذبح شکار وغیرہ کے ذریعے) حلال نہ کیا گیا ہو اور روح نکل چکی ہو تو اس کو مردہ (مَیْتَۃْ) کہا جائیگا۔ (جمل ۱/۱۷۳)

مردار میں صرف مچھلی، ٹڈی اور انسان پاک ہیں کسی جانور کو ذبح کرنے کے بعد پیٹ سے مردہ جنین برآمد ہو، تو وہ بھی پاک ہے۔ (خلقت مکمل ہونے کے بعد برآمد ہونے والے جنین کو اپنے ماں کے تابع سمجھتے ہوئے کھانا جائز ہے لیکن علقہ اور مضغہ کا کھانا ناجائز ہے) (جمل ۱/۱۷۳)

شرعی طریقہ سے شکار کئے ہوئے جاندار کو ذبح کرنے کا موقع نہ ملے اور مر جائے، تب بھی وہ پاک ہے۔ (اور اس کا کھانا حلال ہے۔)

اس کے علاوہ سارے مردار نجس ہیں۔ مردار کے تمام اجزاء (ہڈی بال، اون وغیرہ) نجس ہیں۔ کیونکہ ان سب میں زندگی ہوتی ہے (مغنی المحتاج، ج ۱/۷۸)

وہ جاندار جن کو اگر زندگی میں کاٹا جائے تو ان کے بدن سے خون نہ بہے (یا تو خون نہ ہونے کی وجہ سے یا اس لئے کہ معمولی سا ہے، بہنے جیسا نہیں) جیسے مکھی وغیرہ، ان کا مردہ بھی نجس ہی ہے، لیکن یہ پانی یا دوسری سیال چیز میں گر جائے (اور اس میں کوئی تغیر اس مردار کی وجہ سے پیدا نہ ہو) تو وہ سیال چیز نجس نہیں ہوگی۔ البتہ کسی نے اس طرح کے مردہ کو پانی وغیرہ میں ڈال دیا تو وہ نجس ہو جائے گا۔ اگر اس طرح کے مردوں کی کثرت کی وجہ سے تغیر پیدا ہو تو پھر وہ پانی یا مائع نجس ہو جائیگا۔ (مغنی المحتاج ۱/۷۸) حدیث: ''اگر کسی کے برتن میں مکھی گرے تو اسے مکمل ڈبو کر پھر نکال دو، کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے، اور دوسرے میں شفا ہے'' (بخاری) بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے: ''وہ اپنے بچاؤ کے لئے بیماری والا پر آگے کرتا ہے۔'' (ابوداؤد، ابن خزیمہ، ابن حبان، تلخیص ۱/۳۷) سرکہ یا سیب وغیرہ پھل میں جو کیڑے پڑتے ہیں ان کا مردار بھی نجس ہے۔

البتہ اس کی وجہ سے وہ چیز نجس نہ ہوگی، کیونکہ اس سے بچنا مشکل ہے، نیز ان اشیاء کو ان کیڑوں سمیت کھانا جائز ہے کیونکہ اسے جدا کرنا کافی دشوار ہے۔ جن جانوروں کو کھانا حرام ہے انھیں ذبح کیا جائے تب بھی وہ نجس ہیں (مغنی المحتاج ۱/۷۸)

حیوان کے اجزاء کا حکم

ایک عام اصول یہ ہے کہ کسی بھی زندہ حیوان سے جو حصّہ جدا ہو وہ نجس ہے، حدیث: ''زندہ (جانوروں کے بدن) سے جو (حصہ) جدا کیا جائے وہ مردہ (کے حکم میں) ہے (احمد، ترمذی، حاکم وغیرہ۔ تلخیص ۱/۳۹) البتہ مندرجہ ذیل اشیاء اس اصول سے مستثنیٰ ہیں۔

(۱)۔ ''ماکُول اللّحم'' (جن جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے۔) حیوانات کے بال، اون اور پرَ جو زندگی میں کاٹ لئے گئے ہوں یا خود بخود جھڑے ہوں۔ (۲)۔ انسان کے بال (۳)۔ انسان، مچھلی اور ٹڈی کے بدن کا کوئی بھی حصّہ ۴۔ انسان کا مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے۔)

حیوان کے باطن سے نکلنے والی اشیاء کا حکم

لعاب (تھوک) آنسو، پسینہ اور بلغم کا وہی حکم ہو گا جو اس حیوان کا ہے۔ اگر حیوان نجس ہو تو مذکورہ اشیاء بھی نجس، ورنہ طاہر (کتّے اور سور کا تھوک وغیرہ بھی نجس ہے، مویشیوں وغیرہ کا تھوک، پسینہ سب پاک ہے۔)

خون، پیشاب، پاخانہ، بیٹ اور قئ جیسی چیزیں تمام حیوانات کی نجس ہیں۔ آپ ﷺ کے بدن اطہر سے نکلے ہوئے ان فضلات کو بھی جمہور نے نجس کہا ہے۔

لیکن امام بغوی قاضی، سبکی، بارزی، زرکشی، ابن الرفعہ، بلقینی، حافظ ابن حجر اور رملی وغیرہ حضرات نے اس کے برعکس طہارت کے قول کو ترجیح دی ہے۔ (حاشیہ الجمل ۱/۱۷۴)

مچھلی اور ٹڈی کا خون اور بیٹ، ایسے جانداروں کا پاخانہ جن میں بہنے والا خون نہ ہو، اور تلی اور جگر سے ٹپکنے والا خون نجس ہے۔

"ما کول اللحم" (جن کا گوشت جائز ہے۔) جانوروں کا دودھ پاک ہے۔ اور "ماکول اللحم" (جن کا گوشت جائز نہیں) ان جانوروں کا دودھ نجس ہے۔

کتّے اور سّور اور ان کے فرع کی منی ناپاک ہے۔ انسانوں سمیت بقیہ سارے جانداروں کی منی پاک ہے۔

انڈے پاک ہیں، چاہے "غیر ماکول اللحم" پرندے کے ہوں۔

مشک پاک ہے، مشک کا نافہ اگر ہرنی کی زندگی میں جدا ہوا ہو تو پاک ہے ورنہ نجس ہے۔ جو کھیتی اور پودے نجاست پر اُگے ہیں نجس العین نہیں، لیکن نجاست کے لگنے سے نجس ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا دھونے سے پاک ہو جائیں گے۔ ان پودوں کی بالیوں میں تیار ہونے والے دانے پاک ہیں۔

پیپ نجس ہے، اسی طرح زخموں کا پانی اگر متغیّر ہو تو نجس ہے، ورنہ نہیں۔ نجاست کا دھواں بھی نجس ہے۔

عورت کے فرج (اگلی شرمگاہ) کی رطوبت (تری) علقہ (جما ہوا خون) اور مضغہ پاک ہیں۔ صفراء اور جگالی نجس ہیں۔

نیند کی حالت میں منہ سے بہنے والی رال حلق کے کوے سے نکلے تو پاک ہے اور معدے سے نکلے تو نجس ہے۔ طویل نیند کی صورت میں رال بہنا بند ہو تو وہ کوّے سے نکلنے والا سمجھا جائے گا، اگر شک ہو تو نجس نہیں سمجھیں گے، البتہ احتیاطاً دھو دینا بہتر ہے۔

جس شخص کو ہمیشہ نیند کی حالت میں کثرت سے رال کی شکایت ہو، باوجود نجس ہونے کے اس کے حق میں اسے معاف رکھا جائے گا۔

دانہ کسی جانور کے کھانے کے بعد پاخانہ میں صحیح سالم نکل آئے اور اس کی سختی اس حد تک باقی ہو کہ بونے کی صورت میں اُگ سکتا ہے تو وہ دانہ پاک ہے۔ صرف اوپری حصّہ دھو دینا ضروری ہے۔

لیکن اب دوبارہ اُگنے کے قابل نہیں رہا تو نجس العین ہو چکا۔

فصل: ٹھہرا ہوا پانی

اگر کسی جگہ ٹھہرا اور رکا ہوا پانی (خواہ برتن میں ہو یا حوض میں و تالاب اور گڑھے وغیرہ میں) قلتین (دو قلہ) یا اس سے زائد ہو تو اسے کثیر کہیں گے اور دو قلہ سے کم ہو تو اسے قلیل کہا جائے گا۔

قلتین (دو قلہ) کی مقدار = قلتین ۵۰۰ رطل بغدادی کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر کسی مکعب کے ہر ضلع کے لمبائی ۶۰، سینٹی میٹر ہو تو یہ

قلتین کے مساوی ہو گا(ضمیمہ عمدۃ السالک) لمبائی، چوڑائی اور گہرائی سواذِراع (ایک ہاتھ اور پاؤ ہاتھ) ہو تو یہ قلتین کی مقدار ہے (ایک ذراع=۴۸ سینٹی میٹر) کلوگرام کے اعتبار سے قلتین (۱۹۲ء۸۵۷) کلوگرام ہو گا(الفقہ المنہجی ۱/۳۴)

حدیث: اگر پانی قلتین (کی مقدار) ہو تو وہ نجس نہ ہو گا۔(الشافعی، احمد سننِ اربعہ ابن خزیمہ، بیہقی، ابن حبان، حاکم، دارقطنی تلخیص ۱/۲۸)

قلیل اور کثیر پانی کی یہ حد صرف تقریبی ہے لہٰذا قلتین میں اگر ایک دو رطل کی کمی بھی ہو تو اس پر قلتین اور کثیر کا حکم لگایا جائے گا۔ کسی پانی میں نجاست گرے اور اسکے دو قلہ ہونے میں شک ہو تو پانی نجس نہیں ہو گا، بلکہ اپنی طہارت پر باقی رہے گا۔

نجاست مؤثرہ (اثر کرنے والی یعنی جو معاف نہ ہو) اگر قلیل پانی میں مل جائے تو وہ پانی نجس ہو جائے گا، چاہے نجاست کی وجہ سے پانی میں کوئی تغیر نہ پیدا ہوا ہو۔ غیر مؤثرہ نجاست کی وجہ سے پانی نجس نہیں ہو گا، جیسے وہ مردار جس میں بہنے والا خون نہ ہو اور ایسی نجاست جو عام نظروں سے دکھائی نہ دے۔ اور بلی کا منہ نجس ہونے کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو پھر آکر پانی میں منہ ڈال دے اور اس مدت میں اس کے منہ کی طہارت کا احتمال بھی ہو (تو اس کے منہ ڈالنے سے پانی نجس نہ ہو گا) کثیر پانی میں نجاست گرنے سے تغیر پیدا ہو جائے تو بالا جماع پانی نجس ہو جائے گا۔ تغیر کم ہو یا زیادہ۔ مزہ، رنگ، بو میں سے کوئی بھی وصف متغیر ہو۔ چاہے گرنے والی نجاست مخالط (گھلنے والی) ہو یا مجاوِر (جو پانی میں نہ گھلے) (ہر حال میں وہ پانی نجس ہو جائے گا) نہر کے کنارے پانی سے جدا مردہ پڑا ہوا ہو اور اس کی وجہ سے پانی میں بدبو محسوس ہو تو وہ پانی نجس نہیں ہے اس لئے کہ نجاست پانی سے جدا ہے۔

نجاست کے باوجود کثیر پانی میں تغیر نہ ہو، نجاست کی مقدار کم ہونے اور پانی میں فنا و نابود ہونے کی وجہ سے، تو وہ پانی نجس نہیں ہو گا۔ اور سارا پانی استعمال کرنا صحیح ہے۔(یعنی قلتین میں ایک لیٹر پیشاب شامل ہو گیا اور پھر بھی کوئی تغیر نہ آیا تو اب مکمل پانی کا استعمال کرنا درست ہے آخر میں ایک لیٹر باقی رکھنے کی ضرورت نہیں جو کہ شامل ہونے والے پیشاب کی مقدار ہے۔) نجاست کے اوصاف پانی ہی کی طرح ہونے کی وجہ سے تغیر نہیں پیدا ہو رہا ہے، تو اس نجاست کو پانی کے مخالف اوصاف کا تصور کرکے اندازہ لگانا ضروری ہے۔

(اس اندازے کی تفصیل صفحہ ۸۶ پر تقدیری تغیر کے نام سے گذر چکی ہے) پانی میں نجاست کے گرنے کی وجہ سے کچھ پانی متغیر ہوا اور کچھ نہ ہوا تو ایسی صورت میں اگر غیر متغیر پانی کی مقدار کم از کم قلتین ہے تو اتنا حصہ پاک ہی رہے گا۔ نجاست کی وجہ سے متغیر ہونے والے کثیر پانی کا تغیر اگر بذاتِ خود (بغیر کسی چیز کے ملائے) زائل (ختم) ہو جائے تو پھر وہ پانی پاک ہو جائے گا۔

پانی میں مشک ملانے کی وجہ سے نجاست کی بدبو ختم ہو جائے یا سرکہ ملانے سے نجاست کا مزہ ختم ہو جائے یا زعفران ملانے سے نجاست کا رنگ زائل ہو جائے تو ان صورتوں میں پانی پاک نہیں ہو گا۔

اسی طرح مٹی اور گچ وغیرہ کی وجہ سے تغیر کا زوال بھی کافی نہیں۔ نجاست اتنی قلیل مقدار میں ہو کہ معتدل بینائی سے نظر نہ آئے تو پانی اور کپڑے دونوں میں معاف ہے، جیسے پیشاب کا باریک قطرہ، مکھی کا نجاست پر بیٹھنے کے بعد اڑ کر پانی یا کپڑے سے چھونا۔ نجس قلیل پانی میں پانی کے علاوہ کسی اور چیز کے ملانے سے وہ قلتین تک پہنچ جائے تب بھی پاک نہیں ہو گا بلکہ قلتین سے کم پاک پانی میں گلاب کا پانی ڈال کر قلتین تک پہنچایا جائے پھر اس میں کوئی نجاست گر جائے تو بھلے ہی پانی میں تغیر نہ آئے پانی نجس ہو جائے گا۔ صرف پانی کی مقدار اگر قلتین ہے تو پھر بغیر تغیر کے نجاست اس پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

قلتین سے کم نجس پانی میں دوسرا پانی چاہے وہ مستعمل ہو یا غیر مستعمل پاک ہو یا نجس۔ شامل کر کے قلتین کی مقدار ہو جائے اور پانی میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ تو یہ پانی اب مطہر ہو گیا۔ (وضو، غسل وغیرہ میں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔) اگر نجاست کی وجہ سے تغیر ابھی باقی ہو، یا ابھی تک قلتین سے کم ہی مقدار ہو، تو پھر سارا پانی نجس ہی رہے گا۔

مذکورہ جن صورتوں میں قلتین تک پہنچنے کے بعد پانی طہور ہو جاتا ہے،، بعد میں تقسیم یا استعمال کی وجہ سے مقدار قلتین سے کم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ پانی طہور ہی رہے گا۔

ٹھہرے ہوئے کثیر پانی میں جامد نجاست (ٹھوس نجاست جو پانی میں گھلے نہیں جیسے مردہ) گرے تو اس پانی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ نجاست اور طہارت کے مسائل میں کنویں کے پانی کا حکم بھی دوسرے پانی کی طرح ہے۔ لہٰذا کنویں کا قلیل پانی نجس ہو جائے تو پانی بڑھکر جب قلتین تک پہنچ جائے اور نجاست کا اثر نہ ہو تو طہور ہو گا۔ چاہے پانی کنویں سے ہی نکلے یا باہر سے ڈالا جائے۔ اور اگر کثیر پانی تغیر سے نجس ہو جائے تو خود بخود یا مزید پانی کے ملانے سے تغیر ختم ہو جائے تو طہور ہو گا، اسی طرح پانی کے گھٹانے سے تغیر ختم ہو اور بقیہ پانی قلتین سے کم نہ ہو تو طہور ہو جائے گا۔

پانی کے علاوہ دیگر مائع اور سیال اشیا میں نجاست کے گرنے سے وہ نجس ہو جائے گا، چاہے قلیل ہو یا کثیر، پانی میں ہی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی قوت کی وجہ سے کثیر ہونے کی صورت میں وہ نجس نہیں ہوتا۔

کسی کنویں سے وضوء کرتا رہا پھر اس میں پھولی ہوئی مرغی ملی، تو جو نمازیں بالیقین کنویں کا پانی نجس ہونے کے بعد اس سے وضو کر کے پڑھی ہیں، صرف انہیں کا اعادہ کافی ہے۔

نجاست کا ازالہ (نجاست دور کرنا)

نجس کی دو قسمیں ھیں۔ (۱) نجس العین (۲) غیر نجس العین

(نجس العین سے مراد وہ اشیاء ہیں جو بذات خود ہی نجس ہوں۔ کسی نجاست کے لگنے سے نجس نہیں ہوئیں۔ جیسے پیشاب، پاخانہ، خون وغیرہ، اور غیر نجس العین سے مراد وہ نجس اشیاء ہیں جو اپنے اصل کے اعتبار سے تو پاک ہیں، لیکن نجاست کے لگنے کی وجہ سے نجس ہوئی ہیں۔ جیسے۔ کپڑا جس پر پیشاب لگا ہو۔)

نجس العین میں سے صرف دو ہی چیزیں پاک ہو سکتی ہیں۔

۱) شراب جبکہ سرکہ بن جائے۔

۲) مردار کا چمڑا جبکہ اسے دباغت دیجائے۔

غیر نجس العین کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) نجاست حکمیہ (۲) نجاست عینیہ

(۱) جس نجاست کا ہونا یقینی ہے، لیکن کسی طرح محسوس نہیں ہوتی، اسے نجاست حکمیہ کہیں گے۔ جیسے کپڑے پر پیشاب لگ کر خشک ہو چکی ہو۔ اور اس کی بدبو یا کوئی اور اثر باقی نہیں ہے، ایسی نجاست کے اوپر ایک مرتبہ پانی بہانا کافی ہے۔ وہ جگہ پاک ہو جائے گی۔ دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پانی بہانا سنت ہے۔

(۲) جس نجاست کا اثر باقی ہو، اسے نجاست عینیہ کہا جائے گا۔

اس کے رنگ اور بو اور مزہ میں سے جو بھی اثرات موجود ہوں، اس کے مکمل ازالہ کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ باوجود کوشش کے نجاست کا مزہ باقی ہو تو ابھی جگہ پاک نہیں ہو گی۔ اچھی طرح دھونے کے باوجود رنگ یا بو میں سے کوئی ایک وصف باقی ہو تو حرج نہیں ہے، جگہ پاک ہو جائے گی، البتہ دونوں باقی ہوں تو وہ جگہ پاک نہ ہو گی۔

(اگر صرف پانی سے نجاست کے اثرات کا ازالہ ہو جاتا ہو تو دوسرے اشیاء کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن صابون وغیرہ کے بغیر ازالہ ناممکن ہو تو پھر اس کا استعمال بھی ضروری ہو گا۔) (جمل ۱/۱۹۲)

اچھی طرح دھو کر جب عین کا ازالہ ہو جائے (یعنی نجاست کے سارے اثرات حسب بالا ختم ہو جائیں) تو دوسری اور تیسری مرتبہ دھونا سنت ہے۔

طہارت کے حصول کیلئے دھونے کے بعد کپڑے وغیرہ کو نچوڑنا ضروری نہیں ہے۔

ازالہ کی کیفیت۔ قلیل پانی کا نجس مقام پر ڈالنا و بہانا اور گرانا (یا خود بخود گرنا) ضروری ہے۔ اسکے برعکس نجس چیز کو قلیل پانی میں ڈال دیا تو طہارت حاصل نہ ہو گی۔ بلکہ وہ پانی بھی نجس ہو جائے گا۔

(مثلاً ڈول میں قلتین سے کم پانی ہے اور نجس کپڑا اس ڈول میں ڈبو دیا تو پانی بھی نجس اور کپڑا بھی پورا نجس، لیکن ڈول کے پانی کو کپڑے پر گرا کر دھویا تو پاکی حاصل ہو جائے گی۔) (کثیر پانی میں نجس چیز کو ڈبو کر بھی دھویا جائے تو پاکی حاصل ہو جائے گی، لیکن پانی میں تغیر کا پیدا نہ ہونا ضروری ہے۔)

متفرق مسائل: زمین پر پیشاب ہو تو اس پر اچھی طرح پانی بہاوے، جو کہ اس پر غالب آئے اور اسے ڈھانک لے تو طہارت حاصل ہو گی۔

چکنی چیز جیسے تلوار، چھری، آئینہ وغیرہ پر نجاست لگ جائے تو صرف پونچھنے سے وہ پاک نہ ہو گی، بلکہ دھونا ضروری ہے۔

نجس پانی میں پکایا ہوا گوشت ظاہراً اور باطناً نجس ہو جائے گا۔ گوشت کو اوپر سے اچھی طرح دھونے سے اندر بھی پاک ہو جائیگا۔

چھری کو خوب گرم کر کے نجس پانی اس پر ڈال دیا گیا اور اس نے اس کو جذب کر لیا تو چھری نجس ہو گئی، بعد میں اوپر سے اچھی طرح پاک پانی سے دھو دینے سے وہ پاک ہو جائے گی۔ بدن پر لگی ہوئی نجاست کو جلد از جلد دور کرنا مستحب ہے۔ نماز وغیرہ کی ادائیگی کے ارادہ کے وقت واجب ہے، نجاست کے بدن پر لگانے میں اگر وہ گنہگار ہے، تو پھر فوراً اس کا ازالہ ضروری ہے۔

امام متولی وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب پانی نجاست پر وارد ہوتا ہے (واقع ہوتا ہے) تو اس میں قوت ہوتی ہے لہٰذا نجاست پر لگنے کے بعد بھی نجس نہیں ہو گا، بلکہ مطہر ہی رہے گا۔ لہٰذا اگر پانی کو کپڑے کے نجس حصہ پر گرا دیا جائے جس کی وجہ سے رطوبت (تری۔ گیلا پن) پھیل جائے تو وہ جگہ نجس نہ ہو گی۔

پانی کو کسی نجس برتن میں ڈال دیا اور نجاست سے وہ متغیر نہ ہو تو وہ طہور ہی رہے گا۔ بعد میں برتن میں چاروں طرف پانی کو پھرائے تو سب پاک ہو جائے گا۔

نجاست کی وجہ سے کپڑا دھو کر نچوڑنے کے بعد اس پر دوبارہ نجاست گرے تو صرف اتنی جگہ کا دھونا کافی ہے مکمل کپڑا دھونے کی ضرورت نہیں۔

نجاست کے ازالہ اور دور کرنے کیلئے غسل یعنی دھونا اور محل نجاست پر پانی کا بہانا ضروری ہے۔ (صرف مسح یا چھڑکاؤ کافی نہیں ہے۔)

لیکن وہ لڑکا جس کی عمر دو سال سے کم ہو، اور غذا کے طور پر دودھ کے علاوہ کوئی اور چیز کھاتا پیتا نہ ہو، اسکے پیشاب پر اتنا پانی چھڑکنا کہ پیشاب کے سارے محل کو گھیرے اور اس پر غالب ہو جائے کافی ہے، جگہ پاک ہو جائے گی۔ اتنا پانی ڈالنا کہ بہنے لگے ضروری نہیں۔(فتح الوہاب مع الجمل ۱/۱۸۸)

لڑکی کے پیشاب کو دوسری نجاستوں کی طرح دھونا ہی ضروری ہے۔

احادیث: (۱) حضرت ام قیس رضی اللہ عنہا اپنے ایک چھوٹے بیٹے کو جس نے ابھی کھانا شروع نہ کیا تھا، آپ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں تو آپ ﷺ نے اسے اپنے گود میں بٹھایا تو اس نے پیشاب کر دیا، تو آپ ﷺ نے پانی منگوا کر اس پر چھڑک دیا اور اسے دھویا نہیں۔(بخاری و مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا" لڑکی کا پیشاب لگ جائے تو دھویا جائے گا، اور لڑکے کے پیشاب کی وجہ سے پانی چھڑک دیا جائے گا"(ترمذی و حسنہ والحاکم و صححۂ۔الفتح مع الجمل ۱/۱۸۹۔شرح التنبیہ للسیوطی ۱/۸۷)

کتے اور خنزیر کی نجاست دور کرنے کا طریقہ

حدیث: "کُتا کسی کے برتن سے پیئے تو اسے سات مرتبہ دھوڈالے"(متفق علیہ) مسلم کی روایت میں مزید ہے،،"اس میں پہلی مرتبہ مٹی سے"(تلخیص)،"کتے نے کسی چیز میں منہ ڈالا، یا اس کے خون یا پیشاب یا پسینہ یا بال یا کسی اور جز اور فضلہ کی وجہ سے کوئی چیز نجس ہو جائے تو طہارت کے لئے سات مرتبہ دھونا ضرروی ہے جس میں ایک مرتبہ پاک مٹی کا ہونا ضروری ہے۔ خنزیر کا حکم بھی کتے ہی کی طرح ہے۔ مٹی کی جگہ صابون یا کوئی اور چیز استعمال کرنا کافی نہیں۔ یا صرف پانی سے آٹھ مرتبہ دھوڈالے تو کافی نہیں ہے۔ ان نجاستوں سے آلودہ کپڑے اور برتن کو صرف ماء کثیر میں ڈبونا کافی نہیں ہے۔ اسی طرح نجس یا مستعمل مٹی کا استعمال کرنا بھی کافی نہیں ہے۔ مٹی کو پانی میں گھول کر اس پانی کو نجس مقام پر بہائے۔ صرف مٹی کو نجس مقام پر رکھنا کافی نہیں ہے۔(بلکہ رکھنے کے بعد اس پر پانی کا بہانا ضروری ہے) ایک ہی برتن میں کتّے نے کئی مرتبہ منہ ڈالا، یا کئی کتوں نے منہ ڈالا، تب بھی سب کی طرف سے سات مرتبہ مذکورہ طریقہ سے دھونا کافی ہے۔ کتے کی نجاست کے ساتھ کوئی اور نجاست بھی لگی ہو تو سات ہی مرتبہ دھونا کافی ہے۔(اس نجاست کی وجہ سے الگ سے ایک مرتبہ دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔) اگر کتے کی نجاست عینی ہو، جیسے اس کا خون یا پاخانہ تو اس عین کے ازالہ کیلئے جتنی مرتبہ بھی دھونا پڑے گا، وہ ایک شمار ہو گا۔

(مثلاً خون کا رنگ وغیرہ دور کرنے کیلئے پانچ چھ مرتبہ دھونا پڑا تو یہ سب مل کر ایک شمار ہو گا۔ دوبارہ مستقل چھ مرتبہ اور دھونا پڑے گا۔)

مستحب یہ ہے کہ مٹی آخری مرتبہ استعمال نہ کرے، بہتر یہ ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ دھوئے۔(گویا سب سے بہتر پہلی مرتبہ مٹی کا استعمال ہے ورنہ پھر آخری مرتبہ سے پہلے کسی بھی مرتبہ)

مسلم کی حدیث میں پہلی مرتبہ، ابوداود کی روایت میں آخری مرتبہ اور دار قطنی کی روایت میں کسی ایک مرتبہ مٹی کے استعمال کا حکم ہے، لہٰذا کسی بھی مرتبہ میں مٹی شامل کرنا کافی قرار دیا گیا۔(شرح التنبیہ للسیوطی ۱/۸۶) ایسی زمین میں جس پر مٹی ہو، مذکورہ نجاست لگ جائے تو وہاں پھر مٹی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

کتے نے ایسے پانی میں منہ ڈالا، جو اسکے پینے کے باوجود دو قلے سے کم نہیں ہوا تو وہ پانی طہور ہی رہے گا اس برتن کو بھی دھونا

ضروری نہیں۔

کتے کی نجاست سے نجس ہونے والی چیز اگر کسی دوسرے مقام پر لگ جائے تو اس مقام کو بھی اسی طرح سات مرتبہ دھونا ضروری ہوگا۔
(جیسے کتے کے منہ ڈالنے کی وجہ سے پانی نجس ہو گیا۔ اب وہ پانی کسی کے کپڑے کو لگ جائے تو اس کپڑے کو بھی اسی ترتیب سے سات مرتبہ دھونا پڑے گا۔)

کسی جامد چیز میں کتّا منہ لگائے۔ (جیسے کھانا) تو جن حصوں پر اس کا منہ لگا ہے، الگ کر دینے سے بقیہ چیز اپنی طہارت پر باقی رہے گی۔

جس برتن میں کتے نے منہ ڈالا ہو فی الحال اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً اس نجس پانی کو بہانا کوئی ضروری نہیں ہے۔

نجاست کی وجہ سے متغیر ماء کثیر میں کتے نے منہ ڈالا پھر وہ پانی کپڑے کو لگ گیا تو اسے سات مرتبہ دھونا، جس میں ایک مرتبہ مٹی بھی استعمال کرنا ضروری ہے۔ بلی کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ نجس نہیں ہے۔ وہ تمہارے گھر میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ (مالک، احمد، سننِ اربعہ) بلی کے جھوٹے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا۔ اور جس جگہ سے بلی نے ہریسہ (ایک قسم کا کھانا جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے) کھایا تھا، اس جگہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی کھایا۔ (ابو داود، مشکوٰۃ ۱/۵۱) ایک حدیث میں بلی کو گھر کے افراد کی طرح قرار دیا۔ (ابن خزیمہ، حاکم-تلخیص ۱/۳۵)

بلّی: بلی کا جسم چونکہ پاک ہے اس لئے اسکا جھوٹا بھی پاک ہے اس میں کوئی کراہت بھی نہیں بلی کا منہ نجس ہونے کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہی پھر آکر قلیل پانی یا کسی دوسری چیز میں اس نے منہ ڈبویا تو اس صورت میں اگر وہ اتنی دیر غائب رہی ہے کہ کسی اور جگہ پانی میں منہ داخل کر کے اس کے منہ کی پاکی کا امکان ہے تو مذکورہ پانی وغیرہ نجس نہ ہوگا، ورنہ نجس ہو جائیگا۔

نجاست کا دھون (غُسالہ)

(نجاست کے دھلنے میں نکلنے والے پانی کا حکم)

نجاست کو دھو کر پاک کرتے وقت جو پانی نکلے گا۔ اگر نجاست کے اثر سے وہ متغیر ہو تو نجس ہے اگر اس کی مقدار قلتین ہے اور کوئی تغیر بھی نہیں تو وہ پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ قلتین سے کم ہو تو دھونے کے بعد اس نجس جگہ کا جو حکم ہو گا وہی اس غسالہ (دھون) کا بھی حکم ہو گا۔ (دھونے کے بعد جگہ پاک ہو چکی ہے، تو غسالہ بھی پاک ہے، ابھی پاکی حاصل نہیں ہوئی، تو غسالہ بھی نجس ہے۔)
غسالہ میں تغیر تو نہ ہو لیکن نجاست کی وجہ سے اسکا وزن بڑھ چکا ہو تو وہ نجس ہو گا۔

ظروف (برتن)

ظروف کی تین قسمیں ہیں۔

(۱)۔ **کھال سے بنے ہوئے:** کھال دو صورتوں میں پاک ہوتا ہے۔ (الف) "ماکول اللحم" (وہ جانور جنکا گوشت حلال ہے) جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کے گوشت کی طرح کھال بھی پاک ہے۔ غیر ماکول اللحم (جن جانوروں کا گوشت حرام ہے) کو ذبح کرنے کے باوجود کھال اور گوشت دونوں نجس ہوں گے۔

جزئیہ: اپاہج گدھے یا کسی اور غیر ماکول اللحم جانور کو اس کے کھال کی دباغت کیلئے ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

(ب) مردار کے کھال کو دباغت دی جائے، کتے اور سور اور ان میں سے کسی کی اولاد کے علاوہ تمام مردہ جانوروں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے، ماکول اللحم ہو یا غیر ماکول اللحم (ان کا گوشت حلال ہو یا حرام) دباغت میں کھال کے فاسد مادے مثلاً گوشت اور خون وغیرہ کو اچھی طرح دور کر کے ایسی حالت میں لانا ضروری ہے کہ بعد میں اگر پانی میں ڈالا جائے تو اس میں بگاڑ اور بدبو نہ پیدا ہو۔

دباغت: دباغت تیز اشیاء جیسے مازو، انار کا چھلکا، درخت سلم کے پتے سے ہونی چاہئے۔ صرف مٹی یا سورج کی دھوپ سے دباغت حاصل نہیں ہوتی۔ دباغت کے دوران پانی کا استعمال ضروری نہیں ہے۔ نجس اشیا جیسے کبوتر کی بیٹ سے بھی دباغت حاصل ہو گی۔ دباغت کے بعد یہ کھال نجس کپڑے کی مانند ہے۔ اب اسے پانی سے دھونے پر وہ پاک ہو جائے گا۔

دباغت سے کھال کا ظاہر و باطن پاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت، تر چیزوں کیلئے استعمال کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ دباغت سے مردار کی کھال پاک تو ہو جائے گی، لیکن اس کا کھانا حرام ہے۔ مردار کی کھال دباغت سے پہلے ہی کراہت کے ساتھ خشک اشیاء کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس کا ہبہ کرنا اور وصیت کرنا بھی جائز ہے۔

(۲) **بال اور ھڈی:** بال، اون، پر اور ہڈی موت کی وجہ سے نجس ہو جاتے ہیں۔ انسان کے بال موت یا بدن سے جدائی کے بعد بھی نجس نہ ہوں گے۔ نجس بال عرفاً قلیل ہوں تو پانی اور نمازی کے کپڑے میں وہ معاف ہے۔ کھال پر بال ہوں تو دباغت سے وہ بال پاک نہ ہوں گے، لیکن قلیل مقدار میں ہو تو معاف ہے۔

"**ماکول اللحم**" کو شرعی طریقے سے حلال کرنے سے اس کی ہڈیاں بھی پاک ہوں گی ان ہڈیوں سے بنے برتن کا استعمال جائز ہے۔ نجس ہڈیوں کے برتن کو کراہت کے ساتھ خشک اشیاء کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔ (لیکن پانی یا کوئی اور تر چیز ان برتنوں میں ڈالتے ہی نجس ہوں گے۔)

آپ ﷺ نے (حجۃ الوداع میں) سر کا دایاں جانب نائی کے سامنے کیا اور وہ بال حضرت ابو طلحہؓ کو عنایت فرمائے، پھر بایاں سامنے کیا اور اس نے مونڈھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے لوگوں میں تقسیم کرو۔ (متفق علیہ) (خلاصۃ البدر ۱/۲۴)

مردار کی ہڈیوں کو جلانا جائز ہے۔ اگر بال نظر آئے لیکن پاک ہے یا نجس معلوم نہیں تو یہ دیکھئے کہ ماکول اللحم کا ہے یا غیر ماکول اللحم کا، ماکول اللحم کا ہے تو پاک، ورنہ ناپاک ہے۔ یہی اندازہ نہ ہو کہ ماکول اللحم کا ہے یا نہیں تو وہ پاک ہے۔ مردار کی کھال پر دباغت کے بعد بال ہوں تب بھی اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا گذر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا تو فرمایا "اس کی کھال کو دباغت دے کر اس سے نفع کیوں نہ اٹھایا" (متفق علیہ)

(۲) کھال کو دباغت دی جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (رواہ مسلم)

(۳) جس کھال کو بھی دباغت دی جائے تو وہ پاک ہے۔ (رواہ الشافعی والترمذی وقال حسن صحیح) (خلاصۃ البدر ۱/۲۳)

(۳) **سونے اور چاندی کے برتن:** سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال مرد و عورت دونوں پر حرام ہے، ان برتنوں سے کھانا پینا وضو کرنا، چاندی کے چمچے سے کھانا، چاندی کی بوتل سے گلاب پانی کی خوشبو کا استعمال اور چاندی کی انگیٹھی (عود سوز) سے دھونی لینا سب حرام ہے۔ دور سے خوشبو آ رہی ہو تو حرج نہیں۔

حدیث:"سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا منع ہے"(متفق علیہ)(خلاصۃ البدر ۲۵/۱)

مذکورہ برتنوں کے استعمال کے بغیر صرف ان کا بنانا اور رکھنا بھی حرام ہے۔ لہٰذا ان کا بنانے والا اُجرت کا مستحق بھی نہیں۔ اور کوئی اس طرح کے برتن کو توڑ ڈالے تو اس پر کوئی تاوان بھی نہیں آئے گا۔ اور ان سے گھر وغیرہ کو مزین کرنا بھی حرام ہے۔ چھوٹا اور معمولی سا برتن مثلاً سرمہ دانی، عطر دانی وغیرہ بھی سونے چاندی کا حرام ہے۔

فیروز، یاقوت اور زبرجد جیسے نفیس جواہرات سے بنے برتن حرام نہیں، البتہ مکروہ ہیں۔ اسی طرح کاریگری اور صناعی کی باریکی کے اعتبار سے نفیس اور قیمتی برتن بھی حرام نہیں۔

سونے یا چاندی کا طلا (پانی چڑھانا): کسی چیز پر سونے یا چاندی کا طلا مطلقاً حرام ہے، کم ہو یا زیادہ، عورت کا زیور ہو یا کوئی اور شئ۔

اس طرح طلا شدہ چیز کے استعمال کا حکم یہ ہے کہ اگر آگ پر تپانے سے سونا چاندی بالکل حاصل نہیں ہو سکتا تو جائز ہے۔ اور طلائی مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے آگ پر تپانے سے سونا چاندی حاصل ہو سکتی ہے، تو عورتوں کے زیورات کی حد تک ان کو استعمال کی اجازت ہے۔ بقیہ چیزوں میں ایسی صورت میں استعمال بھی حرام ہے۔ آگ کے علاوہ کسی کیمیائی مادّے سے سونے یا چاندی کو جدا کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

سونے یا چاندی پر طلا: چاندی یا سونے پر کسی اور دھات کا طلا کیا گیا اور طلا کی مقدار اتنی کم ہے کہ آگ سے اسے جدا کر کے حاصل نہیں کر سکتے تو اس کا استعمال حرام ہے۔ ورنہ جائز ہے سونے یا چاندی کو تنہا یا کسی اور شی میں ملا کر بطور دوائی اور علاج کے استعمال کرنے میں حرج نہیں۔ (کانچ کے گلاس وغیرہ پر بھی سونے یا چاندی کا پانی چڑھانا جائز نہیں ہے۔ اور استعمال کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کو مد نظر رکھے۔)

تضبیب (برتن میں پیوند لگانا)

کسی برتن میں سوراخ وغیرہ کی وجہ سے یا اس کے بغیر کسی دھات کا ٹکڑا چپکا دینا تضبیب (پیوند کاری) کہلاتا ہے۔ اگر چاندی کے ذریعے تضبیب ہو تو اس کا حکم حسب ذیل ہے۔

(۱) چاندی قلیل مقدار میں بقدر حاجت استعمال ہوئی ہو تو اس برتن کے استعمال میں کوئی حرمت یا کراہت نہیں ہے۔

(۲) چاندی زیادہ مقدار میں اور حاجت سے زائد ہو تو استعمال حرام ہے۔

(۳) چاندی کم لیکن حاجت سے زیادہ ہو تو مکروہ ہے۔

(۴) چاندی زیادہ لیکن بقدر حاجت ہو تو مکروہ ہے۔

یہاں حاجت سے ٹوٹے ہوئے حصے کی اصلاح اور درستگی مراد ہے۔ چاندی کے کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ عرف کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

تضبیب کیلئے سونے کا ٹکڑا استعمال کرنا مطلقاً حرام ہے۔ کوئی اپنے چلّو سے پانی پئے اور اس کی انگلی میں انگوٹھی ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔ سونے چاندی کے برتن فروخت کرے تو بیع صحیح ہو گی (اگر چہ جائز نہیں ہے) اسی طرح ان برتنوں سے وضو کرے تو ہو

جائے گا، لیکن اس حرکت کی وجہ سے گنہگار ہو گا۔ ان برتنوں میں کھانا پینا تو حرام ہے۔ لیکن جو چیز (مثلاً غذا یا پانی) اس میں رکھی ہو تو وہ حلال ہی رہے گی۔

صفۃ الوضو (وضو کے مسائل اور تفصیلات)

آیت: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡھَکُمۡ وَاَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوۡا وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡھِکُمۡ وَاَیۡدِیۡکُمۡ مِّنۡہُ مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَھِّرَکُمۡ وَلِیُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ''۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ٦)

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے (ملامسہ کیا ہو) قربت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو۔ یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو، اس زمین پر سے، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں، لیکن اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک وصاف رکھے اور یہ کہ تم پر انعام فرماوے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے بہترین طرز پر وضو کیا، اس کے گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسکے ناخن کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں (متفق علیہ، عن عثمان، مشکوۃ ۱/۳۸)

(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضوء کے وقت دونوں ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی بہایا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالکر اسے صاف کیا، پھر تین مرتبہ چہرہ دھویا پھر دایاں ہاتھ کہنیوں سمیت تین مرتبہ دھویا، پھر بایاں ہاتھ کہنیوں سمیت تین مرتبہ دھویا، پھر سر کا مسح کیا پھر دایاں قدم تین مرتبہ پھر بایاں قدم تین مرتبہ دھویا، اور اسکے بعد فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے، پھر دو رکعت نماز اس طرح ادا کرے کہ پوری نماز میں اپنے جی میں کسی طرح وسوسہ نہ لائے، تو اس کے گذشتہ سارے گناہ بخشے جائیں گے۔'' (متفق علیہ، مشکوۃ ۱/۳۹)

تشریح: اس حدیث کے ضمن میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ خود بخود کوئی وسوسہ آئے اور فوراً اس سے اعراض کرے تو بھی یہ فضلیت ان شاء اللہ حاصل ہو جائے گی۔ جن روایتوں میں وضو نماز یا دیگر عبادتوں کی وجہ سے گناہوں کی بخشش کا وعدہ ہے، علماء نے اسے دلائل کی روشنی میں صغیرہ گناہوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ کبیرہ گناہوں کی بخشش کیلئے اصولاً صحیح توبہ ضروری ہے۔

(۳) ''آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جو مسلمان بہترین اور کامل وضو کر کے ظاہراً و باطناً پوری توجہ کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرے یقیناً اس کے لئے جنت واجب ہو چکی۔'' (مسلم عن عقبہ، مشکوۃ ۱/۳۹)

لفظ وضوء، وَضَاءَۃ سے مشتق ہے، جس کا مطلب لغت میں پاکیزہ اور خوبصورت ہونا ہے۔ شرعاً نیت سے شروع کرتے ہوئے بعض مخصوص اعضاء میں پانی کے استعمال کو وضو کہتے ہیں، جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ چونکہ اس کی برکت سے گناہوں کی تاریکی چھٹ کر نورانیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے وضو سے تعبیر کیا گیا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہیکہ سابقہ شریعتوں میں بھی وضو مشروع تھا۔

اس لئے معراج کے واقعہ سے قبل بھی مسلمان باوضوہی نماز ادا کیا کرتے تھے، لیکن بطور استحباب یا نظافت کے، ہجرت سے کچھ قبل شب معراج میں نماز کے ساتھ ساتھ وضو بھی فرض کیا گیا۔ مخصوص کیفیات کے ساتھ، یا اعضاء وضو کا قیامت کے دن پر نور ہونا امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی خصوصیت میں داخل ہے۔

اعضاء اربعہ کی حکمت۔(وضو میں صرف چار اعضاء کے پاکی کی حکمت) سارے بدن کو دھونے کا حکم باعث مشقت ہوتا اس لئے شریعت نے تخفیفاً وضو میں صرف چار اعضاء کو مشروع کیا، اور اس لئے بھی کہ خیر و شر کا صدور انہیں اعضاء سے ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ حور عین سے صحبت کی خاطر استنجاء کو مشروع کیا گیا، جنت کے دستر خوان سے تناول کیلئے ہاتھ دھونا، رب العالمین سے کلام کیلئے کلی کرنا، جنت کی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہونے کیلئے ناک میں پانی لینا، دیدار الٰہی کی دولت سے سرفراز ہونے کیلئے چہرہ کا دھونا، کنگن سے مزیّن ہونے کے لئے کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا، تاج پہننے کیلئے سر کا مسح، اللہ رب العزت کے کلام سے محظوظ ہونے کیلئے کان کا مسح اور جنت کی سیر کیلئے قدموں کا دھونا مشروع کیا گیا۔(حاشیہ الجمل ۱/۱۰۰)

وضومیں کچھ فرائض اور کچھ سنتیں ھیں۔

وضو کے فرائض: وضو کے فرائض چھ (٦) ہیں۔(۱) نیت

حدیث: ”اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ“ ”اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔“(صحاح ستہ)

شرعاً کسی فعل کے ابتداء میں متصلاً اس فعل کے قصد و ارادہ کو نیت کہتے ہیں۔

نیت کا اصل مقام دل ہے، لہٰذا جہاں بھی نیت کو فرض کہا جائے گا۔ تو اس سے قلبی اور دلی نیت مراد ہے، زباں سے ادائیگی مراد نہیں ہے۔

نیت وضو و غسل میں ضروری ہے۔ نجاست کے دور کرنے کیلئے نیت کی ضرورت نہیں۔ کافر کا وضو و غسل صحیح نہیں ہے۔ وضو یا غسل کرنے کے بعد کوئی مسلم مرتد ہو جائے (اسلام چھوڑ بیٹھے) تو اس کا وضو اور غسل باطل نہ ہو گا۔ لیکن تیمم کے بعد کوئی مرتد ہو جائے تو تیمم باطل ہو گا۔

نیت کا وقت: چہرہ کا کچھ حصہ دھلنے کے بعد نیت کافی نہیں، ایسی صورت میں نیت سے پہلے جتنا دھلا اسکا اعتبار نہ ہو گا، اس کا دوبارہ دھونا ضروری ہے۔ چہرہ دھونا شروع کرتے وقت نیت پائی جائے، نہ اس سے پہلے نیت تھی اور نہ بعد میں رہی تو وضوء صحیح ہو گا۔ لیکن چہرہ سے پہلے وضو کی سنتوں کا ثواب نہیں ملے گا۔ وضو کے ابتداء سے نیت ہو اور چہرہ دھونا شروع کرنے تک وہ نیت موجود رہے تو صحیح ہے۔ اور سنتوں کا بھی ثواب ملے گا۔ وضو کے ابتدائی سنتوں میں سے کسی سنت کے ساتھ نیت پائی گئی (جیسے بسم اللہ پڑھنا، مسواک، ہتھیلیوں کا دھونا، کلی، ناک میں پانی لینا) پھر چہرہ دھونے سے پہلے نیت غائب ہو جائے، دل میں موجود نہ ہو تو وضوء صحیح نہ ہو گا۔ کلی یا ناک میں پانی لیتے وقت وضو کی نیت ہو اور چہرہ کا بھی کچھ حصہ ساتھ میں دھل جائے۔ تو بعد میں نیت غائب ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

چہرہ کا وہ حصہ دھلتے وقت چہرہ کی نیت تھی تو اسے دوبارہ دھونا ضروری نہیں ہے۔ ورنہ ضروری ہے۔

نیت کی کیفیت: جو دائم الحدث نہیں ہے، اس کے لئے حدث دور ہونے کی یا حدث سے پاکی کی یا اداءِ وضو یا فرض وضو کی نیت کرنا کافی ہے جیسے نَوَیْتُ فَرْضَ الْوُضُوْءِ اسی طرح ہر وہ فعل جو وضو کے بغیر ناجائز ہو، اسے مباح اور جائز کرنے کی نیت کرتا ہوا وضو شروع کرے تو بھی صحیح ہے، جیسے نماز جائز ہونے کیلئے سجدہ تلاوت یا سجدہ شکر یا طواف کعبہ مباح اور جائز ہونے کیلئے۔ لہٰذا عربی میں یوں

کہیں گے "نَوَیۡتُ اِسۡتِبَاحَةَ الصَّلٰوۃِ یا نَوَیۡتُ اِسۡتِبَاحَةَ سَجۡدَۃِ التِّلَاوَۃِ یا نَوَیۡتُ اِسۡتِبَاحَةَ الطَّوَافِ" کسی نے وضو کے وقت تلاوت قرآن یا حدیث یا سلام یا بازار کا دخول جائز ہونے کی نیت کی تو وضو صحیح نہ ہو گا۔ اس لئے کہ مذکورہ امور کیلئے وضو ضروری نہیں ہے (فتح الوہاب وغیرہ) حدث کے شک کی وجہ سے احتیاطاً وضو کرنے کے بعد حدث کا یقین ہوا تو یہ وضو کافی نہیں، اس لئے کہ تردد کے ساتھ کیا تھا۔ اب یقین حاصل ہوا تو دوبارہ وضو ضروری ہے۔ حدث کا یقین ہو اور طہارت میں شک ہو، پھر وضو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بے وضو ہی تھا، تو یہ وضو کافی ہے۔

دائم الحدث: جس کو بار بار ریح خارج ہونے (گیس نکلنے) یا پیشاب کے قطرے ٹپکنے کی شکایت ہو یا کوئی اور مرض جس کی وجہ سے وضو بالکل ٹھہرتا نہ ہو، اسے دائم الحدث کہیں گے۔ دائم الحدث کیلئے صرف حدث دور کرنے یا فرض وضو وغیرہ کی نیت کافی نہیں، اس کے لئے استباحۃ الصّلوٰۃ کی نیت ضروری ہے، اس کے ساتھ رفع حدث یا فرض وضو کی نیت کا بھی ملا لینا افضل ہے۔

دو نیتیں: وضو یا غسل کی معتبر نیت کے ساتھ کسی ایسی چیز کا بھی قصد کرے جو بغیر قصد کے بھی حاصل ہوتی ہو، تو وضو صحیح ہو گا۔ جیسے وضو کے ساتھ ٹھنڈک حاصل کرنے کی نیت کرے۔ جنبی شخص جمعہ کے دن جنابت اور جمعہ دونوں کی نیت سے ایک غسل کرے تو دونوں غسل حاصل ہو جائیں گے۔ صرف جنابت کی نیت کرے تو جمعہ کا غسل حاصل نہ ہو گا مسجد میں داخل ہونے کے بعد فرض نماز کے ساتھ تحیۃ المسجد کی بھی نیت کر لے تو دونوں حاصل ہو جائیں گے۔

متفرق: تین تین مرتبہ وضو کر رہا تھا، پہلی مرتبہ کسی عضو کے دھونے میں تھوڑا حصہ خشک رہ گیا، پھر دوسری یا تیسری مرتبہ جب بطور نفل دھو رہا تھا تو وہ حصہ دھل گیا تو یہ کافی ہے۔ وضو کرتے وقت کوئی حصہ خشک رہے، بعد میں تجدید کی نیت سے پھر وضو کرے اور اس وقت وہ خشک حصہ دھل جائے تو یہ کافی نہیں (تجدید کا مطلب ہے باوضو ہونے کے باوجود دوبارہ وضو کرنا۔) لیکن اس صورت میں مذکورہ شخص اگر اپنے اس وضو کو بھول کر رفع حدث وغیرہ کی نیت سے از سر نو وضو کرتا ہے تو اس کا وضو صحیح ہے۔ وضو کی نیت کو اعضاء وضو پر تقسیم کر دے، یعنی ابتداءً مکمل وضو کی نیت نہ کرتے ہوئے ہر عضو کے دھونے کے وقت صرف اس عضو کے حدث کو دور کرنے کی نیت کرے تو وضو صحیح ہو جائے گا۔ (مثلاً چہرہ دھوتے وقت چہرہ کے رفع حدث کی ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے رفع حدث کی نیت کرے) شوافع علماء کا قول یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے نیت کرنا مستحب ہے۔ اگر صرف دل میں نیت ہو تو کافی ہے، لیکن صرف زبان سے الفاظ ادا کر لے، لیکن دل میں نیت نہیں، تو یہ ناکافی ہے۔ دل اور زبان کی نیت میں فرق ہو تو دل کی نیت کا اعتبار ہو گا۔ کوئی صرف طہارت کی نیت کرے (حدث سے طہارت کی نیت نہ کرے) تو یہ کافی نہیں۔ عورت حیض سے پاکی کے غسل میں شوہر کے لئے وطی (صحبت) کے جواز کی نیت کرے تو غسل صحیح ہے۔ وطی کے ساتھ نماز وغیرہ بھی جائز ہوں گے۔ کسی کو زبردستی نہر میں ڈال دیا گیا اور اس نے نہر میں وضو کی نیت کر لی تو وضو ہو گیا۔ وضو کرنے والا پیروں کے علاوہ سارے اعضاء دھونے کے بعد نہر میں گر جائے اور دونوں پیر دھل جائے تب اس کے ذہن میں وضو کی نیت حاضر ہو تو وضو صحیح ہو گیا، ورنہ پیروں کا دھونا ابھی باقی رہے گا۔ نماز اور قرض خواہ کو ٹالنے، دونوں نیت سے نماز شروع کی تو صحیح ہے۔ وضو کے بعد وضو کے توڑنے کی نیت کر لینے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۲) **چہرہ دھونا:** مکمل چہرہ دھونا ضروری ہے۔ چہرہ کے حدود۔ لمبائی میں پیشانی کے آخری سرے پر عموماً بال اگنے کے مقام سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک اور عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک، کان چہرہ میں داخل نہیں ہے۔ پیشانی کے دونوں طرف اوپری حصے میں سر کا کچھ حصہ عموماً بالوں سے عاری (خالی) ہوتا ہے۔ وہ چہرہ میں داخل نہیں ہے۔ اسی طرح سر کے آگے کے بال جھڑ جائیں

تو وہ چہرہ کے حد میں نہیں سمجھا جائے گا، لیکن ان دونوں کا دھونا مستحب ہے۔ کنپٹی کا حصہ بھی داخلِ چہرہ نہیں ہے۔ اگر پیشانی پر بال اُگ آئیں تب بھی وہ چہرہ کے حد میں داخل ہے۔ اور اس کا دھونا فرض ہے۔ چہرہ کے حد میں اگنے والے وہ بال جو عموماً ہلکے ہوتے ہیں، زیادہ گھنے اور گنجان نہیں ہوتے جیسے ابرو، پلک، مونچھ اور رخسار پر کان کے مقابل بال، ان کا ظاہر و باطن مع اندرونی کھال کے دھونا ضروری ہے گرچہ یہ بال کسی کے گنجان ہوں۔ داڑھی اور رخسار کے بال اگر خفیف اور ہلکے ہیں تو اندرونی کھال سمیت ظاہر و باطن کا دھونا ضروری ہے اور اگر کثیف اور گنجان ہوں تو صرف ان بالوں کے ظاہر کا دھونا واجب ہے۔ اگر کچھ حصہ خفیف اور کچھ کثیف ہو تو دونوں کا اپنا حکم ہو گا۔ یعنی کثیف کے صرف ظاہر کو دھونا اور خفیف کو کھال سمیت مکمل دھونا ضروری ہے۔

خفیف و کثیف کا فرق: گفتگو کے وقت اندرونی کھال نظر آئے تو بال خفیف، اور نظر نہ آئے تو کثیف۔

عورت کے داڑھی اُگ آئے اور کثیف ہو تب بھی اسکے باطن و کھال کا دھونا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ ایک نادر صورت ہے۔ ریش بچہ (داڑھی بچہ) کثیف ہونے کے باوجود باطن و کھال کا دھونا ضروری ہو گا۔ داڑھی، رخسار، مونچھ یا رخسار پر کان کے مقابل بال بڑھ کر چہرہ کے حد سے باہر نکل جائیں تو ان کے ظاہر کا دھونا ضروری ہے۔ چہرہ دھوتے وقت سر، گردن اور ٹھوڑی کے نیچے کا کچھ حصہ بھی دھونا ضروری ہے۔ تا کہ بالیقین مکمل چہرہ دھل جائے۔ کسی کی ناک یا ہونٹ کٹا ہو، تو کٹنے کے بعد جو حصہ کھل چکا ہے، وضو اور غسل میں اس کا دھونا ضروری ہے۔ چہرہ میں پھوڑا یا رسولی نکلے اور بڑھ کر چہرہ کے حد سے نیچے چلا جائے تو اسے مکمل دھونا ضروری ہے۔ ہونٹوں کی ظاہری سرخی کو دھونا ضروری ہے۔ ہر کسی کے دو چہرے ہوں تو دونوں کا دھونا ضروری ہے۔ چہرہ دھونے کیلئے دونوں ہاتھ سے پانی لینا مستحب ہے۔

(۳) دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا: کہنی کے اوپر سے ہاتھ کٹا ہوا ہو تو دھونا فرض نہیں ہے، لیکن باقی بازو کا دھونا مستحب ہے، تا کہ وہ عضو طہارت سے خالی نہ رہے۔ اگر کہنیوں سے نیچے کٹا ہو، تو بقیہ حصہ کا دھونا واجب ہے اگر کہنی کے جوڑ سے کٹا ہو تو بقیہ ہڈی کے کنارے کا دھونا واجب ہے۔ کسی کو ایک ہی جانب دو ہاتھ ہوں، اور اصلی ہاتھ اور زائد ہاتھ واضح ہو تو ایسی صورت میں زائد ہاتھ اگر اصلی ہاتھ کے محل فرض (یعنی وہ حصہ جس کا وضو میں دھونا فرض ہے۔ جیسے بازو یا کہنی) سے نکلا ہے تو اصلی سمیت اس کا دھونا بھی واجب ہے۔ اس کی لمبائی اصلی سے کم ہو یا زائد جیسے کہ زائد انگلی یا رسولی کا دھونا واجب ہے۔ زائد ہاتھ اگر محل فرض سے بھی اوپر نکلے (جیسے کاندھے سے) اور محل فرض کی محاذات اور سیدھ میں نہ ہو تو اسے بالکل دھونے کی ضرورت نہیں اگر محل فرض کی سیدھ میں ہو تو جتنا حصہ سیدھ میں ہے اس کا دھونا واجب۔ زائد اور اصلی میں فرق نہیں کر سکتے تو ہر حال میں دونوں کا دھونا واجب ہے۔ ایک ہاتھ کا کافی چھوٹا ہونا (جبکہ دوسرا معتدل ہو۔) یا اس کی انگلیاں کم ہونا یا قوت گرفت (کسی چیز کو پکڑنے کی قوت) بالکل نہ ہونا یا کم ہونا اس ہاتھ کے زائد ہونے کی علامتوں میں سے ہے، ناخن کافی لمبے ہو کر انگلیوں کے سروں سے آگے نکل جائیں تو ان کا دھونا واجب ہے۔ بازو یا پیر پر گھنے بال ہوں تب بھی اس کے ظاہر و باطن اور کھال کا دھونا واجب ہے۔ وضو کے بعد ہاتھ یا پیر کٹے یا سر مونڈے، تو کھلے ہوئے حصہ کو دوبارہ دھونا لازم نہیں ہے۔ دوبارہ وضو کرتے وقت ان حصوں کا دھونا ضروری ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں سوراخ یا چھید ہو، تو اسکے اندر بھی دھونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی ظاہر ہو چکا۔ ہاتھ کٹا ہوا شخص یا مریض خود وضو کرنے پر قادر نہ ہو، تو کسی ایسے شخص کا سہارا حاصل کرنا ضروری ہے، جو اسے وضو کرائے جبکہ ایسا سہارا مفت مل رہا ہو یا مناسب اجرت (مزدوری) پر اور مذکورہ شخص اجرت بھی دے سکتا ہو۔ اگر وضو کرانے والا کوئی سہارا ہی نہیں۔ یا وہ اجرت مانگ رہا ہو اور یہ دے نہیں سکتا یا دے تو سکتا ہے لیکن وہ زیادہ اجرت مانگ رہا ہے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ لیکن چونکہ اس طرح کا عذر نادر ہے (کبھی کبھار ہی پیش آتا ہے) اس لئے بعد میں اس نماز کا اعادہ

(لوٹانا) ضروری ہے۔ اگر تیمم بھی نہیں کر سکتا تو اسی حال پر نماز پڑھ لے اور آئندہ اس نماز کو دوھرائے۔

(۴) **سر کا مسح کرنا:** صرف اتنا مسح کرنا جسکو مسح کہا جاسکے کافی ہے، اگرچہ ایک بال کے کچھ حصہ کا یا اسکے بقدر سر کی کھال کا مسح ہی ہو، سر پر مکمل بال ہوں اور صرف کھال کا مسح کرے تب بھی کافی ہے۔ صرف انھیں بالوں پر مسح معتبر ہو گا جو کھینچے جانے کی صورت میں سر کے حد سے باہر نہ نکل جائیں۔ مسح کرنے کے بجائے کسی نے سر دھو دیا، یا پانی کا ایک قطرہ ٹپکا دیا، یا تر ہاتھ سر پر صرف رکھا، پھیرا نہیں، تو بھی کافی ہو گا۔ مسح کے بجائے سر دھونا نہ تو مستحب ہے اور نہ مکروہ ہے۔ مسح ہاتھ سے ہی ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف انگلی، لکڑی یا کپڑے کے ٹکڑے وغیرہ سے مسح کرنا بھی جائز ہے کسی اور نے سر پر مسح کیا تو یہ بھی کافی ہے۔ مسح میں عورت کا حکم بھی مرد ہی کی طرح ہے۔ کسی کو دو سر ہوں تو کسی ایک پر مسح کافی ہے۔

(۵) **دونوں قدم ٹخنوں سمیت دھونا:** زائد پیر کا وہی حکم ہے جو زائد ہاتھ کا۔

جس پر حدث اصغر اور اکبر دونوں ہوں، (یعنی وضو اور غسل دونوں ضروری ہوں) تو صرف غسل کی نیت سے سارا بدن دھونا کافی ہے، ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں (غسل کے ضمن میں وضو بھی حاصل ہو جائے گا جدا وضو کرنا ضروری نہیں) پیر کے علاوہ سارا بدن دھونے کے بعد وضو توڑنے والا کوئی سبب پایا جائے، تو اسے پیروں کو جنابت کی طرف سے دھونا اور بقیہ اعضاء وضو کو حدث اصغر کی طرف سے دھونا ضروری ہے۔ مذکورہ صورت میں ابتدائی تینوں اعضاء میں ترتیب ضروری ہے، لیکن پیر کبھی بھی دھو سکتا ہے۔

(۶) ترتیب: جیسے بتایا گیا اسی ترتیب سے وضو کرنا ضروری ہے، یعنی پہلے نیت کرنا، پھر چہرہ دھونا، پھر ہاتھ، پھر سر کا مسح اور آخر میں پیر دھونا۔ بھول کر یا عمداً ترتیب کی خلاف ورزی ہو، تو وضو صحیح نہ ہو گا۔ البتہ چہرہ کا دھونا معتبر ہو گا اور اس کے بعد ترتیب سے جو ادا کرے وہ بھی معتبر ہو گا چار اشخاص نے کسی کے چاروں اعضاء وضو کو اس کی اجازت سے بیک وقت دھو دیا تو صرف چہرہ کا دھونا شمار ہو گا۔ کسی نے پانی میں غوطہ لگا کر وضو کی نیت کر لی تو کافی ہے، ترتیب کے تحقق کیلئے تھوڑی دیر پانی میں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔

منی یا مذی میں تردد: کسی کی شرمگاہ سے ایسی تری نکلے جس کے منی یا مذی ہونے میں اشتباہ و شک ہو تو اسے اختیار ہے کہ اسے منی سمجھتے ہوئے غسل کر لے، یا مذی سمجھتے ہوئے جہاں جہاں وہ لگا ہو اسے دھو ڈالے اور وضو کر لے۔

وضو کی سنتیں

(۱) **مسواک کرنا:** لکڑی جیسی چیز سے دانتوں کو اور اطراف کے مقامات کو رگڑ کر صاف کرنے کو مسواک کرنا کہتے ہیں۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۱۶)

احادیث:

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر میری امت کی تکلیف کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انھیں عشاء کو تاخیر سے پڑھنے کا اور ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔" (متفق علیہ۔ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ مشکوۃ ۱/۴۴)

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ رات جب تہجد کیلئے بیدار ہوتے تو مسواک سے دندان مبارک کو اچھی طرح رگڑ کر دھوتے۔ (متفق علیہ۔ مشکوۃ ۱/۴۴)

(۳) آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "مسواک منہ کی پاکی کا سبب اور رضائے الٰہی کے حصول کا باعث ہے۔" (رواہ الشافعی۔

واحمد۔والنسائی عن عائشہ۔ورواہ البخاری معلقاً مشکوٰۃ ۱/۴۴)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے "مسواک کر کے پڑھی جانے والی نماز بغیر مسواک کے نماز پر ستر درجہ فوقیت رکھتی ہے" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن عائشہ۔مشکوۃ ۱/۴۵)

صرف روزہ دار کیلئے زوال کے بعد سے غروب تک مسواک کرنا مکروہ ہے، بقیہ تمام اوقات میں مسواک کرنا مستحب ہے، بعض خاص مواقع میں مسواک کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، جو درج ذیل ہیں۔ نماز کے وقت اگرچہ منھ میں بدبو نہ ہو، وضو کے وقت، اگرچہ اس وقت نماز نہ پڑھے۔ قرآن کی تلاوت کیلئے۔ دانتوں میں زردی آجائے تو، چاہے منہ میں بدبو نہ ہو۔ نیند۔ طویل خاموشی۔ کچھ نہ کھانے یا کسی بدبو دار چیز کے کھانے سے یا کسی اور سبب سے منہ میں بو پیدا ہو جائے۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اور نیند سے بیدار ہونے پر بھی مسواک کی تاکید ہے ان مواقع میں بھی مسواک کی تاکید ہے۔ سجدہ تلاوت کیلئے تلاوت کے بعد اور سجدہ سے قبل، کوئی شخص دو دو رکعت نماز پڑھ رہا ہو تب بھی ہر نماز کیلئے مسواک مطلوب ہے۔ اگر نماز سے پہلے مسواک کرنا بھول جائے اور دوران نماز یاد آجائے تو خفیف حرکت کے ساتھ تلافی کرے۔ (کثیر حرکت کی صورت میں نماز باطل ہو گی۔) فاقد الطہورین (جو وضو اور تیمم دونوں نہ کر سکے) اور تیمم کر کے نماز پڑھنے والے کیلئے بھی مسواک سنت ہے۔ نماز جنازہ کیلئے۔ سجدہ شکر کیلئے۔ ذکر کیلئے۔ تعلیم و تعلم (سکھانا اور سیکھنا) اور حدیث و دیگر شرعی علوم سننے کیلئے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت۔ سوتے وقت۔ بھوک و پیاس کے وقت۔ کھانے کے بعد۔ سحری کے وقت۔ وتر کے بعد۔ سفر کیلئے۔ سفر سے واپسی پر۔ سکرات کے وقت تاکہ روح کے نکلنے میں آسانی ہو۔ جماع کے وقت۔ مذکورہ تمام اوقات کی پابندی دشوار ہو تو جتنا ممکن ہو انجام دے۔ وضو کے ابتداء میں مسواک بھول جائے تو دوران وضو یاد آنے پر اس کی تلافی کرے۔ (حاشیہ الجمل ۱/۱۲۱)

مسواک کپڑے کے ایک ٹکڑے اور ہر کھردری چیز سے حاصل ہو گا۔ (لہٰذا برش سے بھی مسواک کی اصل سنت حاصل ہو گی) لیکن لکڑی افضل ہے۔ اَرَاک (پیلو) کی لکڑی سے زیادہ بہتر ہے۔ پیلو کی خشک لکڑی جو پانی سے تر شدہ ہو، اولیٰ ہے۔ کھردری انگلی سے مسواک کی فضیلت حاصل نہ ہو گی۔ دوسرے کی کھردری انگلی سے مسواک کی فضیلت حاصل ہو گی، امام رویانیؒ وغیرہ کے نزدیک اپنی انگلی سے بھی حاصل ہو گی۔ اسی قول کو مجموع میں امام نوویؒ نے ترجیح دی ہے۔ (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل۔ ۱/۱۱۹) مستحب ہے کہ مسواک دانتوں کے عرض میں کرے، طول میں کرنا مکروہ ہے، لیکن زبان پر طول میں کرے۔ منہ کے دائیں جانب سے مسواک کی ابتداء کرے، چھوٹے بچوں کو بھی مسواک کی عادت ڈالے۔ دوسرے کی اجازت سے اس کا مسواک استعمال کر سکتے ہیں۔ حلق کے اوپر کی طرف نرمی سے مسواک پھیرنا مستحب ہے۔ مسواک کے وقت سنت کی ادائیگی کی نیت رہے۔

روزہ دار کیلئے زوال کے بعد سے لے کر غروب تک مسواک کرنا مکروہ ہے۔ بخاری و مسلم وغیرہ کی روایتوں میں روزہ دار کے خلوف (خلوف یعنی معدہ کے خالی ہونے کی وجہ سے زوال کے بعد سے منہ میں پیدا ہونے والی بو) کو عند اللہ مشک سے بھی بہتر بتایا گیا ہے، اور مسواک کرنے سے اس محمود بو کا ازالہ ہو جائے گا، اس لئے اسے مکروہ قرار دیا گیا۔ زوال کے بعد سونے کی وجہ سے منہ میں بدبو پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کیلئے مسواک کرنا مکروہ نہیں ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۱۹۔ ترشیح المستفیدین ص ۲۰)

(دلیل کے اعتبار سے امام مزنی، ابو شامۃ، ابن عبد السلام اور امام نوویؒ جیسے شافعی علماء نے زوال کے بعد بھی عدم کراہت کو ترجیح دی ہے۔ لیکن شافعی مسلک میں کراہت کا قول راجح ہے۔)

مسواک کے دیگر آداب: مسواک کے وقت پہلی مرتبہ تھوک نگل لے، یہ بیماریوں کو دور کرتا ہے، بعد میں نہ نگلے، ورنہ

وسوسہ کا سبب بنے گا۔ مسواک کو نہ چوسے، ورنہ بینائی کو نقصان پہنچائے گا۔ مسواک کو کھڑا رکھے نہ کہ لٹا کر۔ لکڑی کے دونوں طرف سے مسواک نہ کرے۔ بغیر اجازت اور رضامندی کے دوسرے کا مسواک استعمال کرنا حرام ہے۔ دوسرے کا مسواک اجازت کے بعد بھی استعمال کرنا نسیان کا باعث ہے۔ بطور تبرک استعمال کرے تو کوئی حرج نہیں۔ استعمال کے بعد مسواک دھو کر رکھنا چاہئے۔ چھنگلیا کے برابر موٹی اور تقریباً ایک بالشت لمبی ہو۔ مسواک دائیں ہاتھ سے کرے، مسواک کرتے وقت انگوٹھا اور چھنگلیا نیچے اور بقیہ تمام انگلیاں اس کے اوپر ہوں۔

نقصان دہ لکڑیوں سے مسواک کرنا مکروہ ہے۔ مسواک سے قبل یا بعد کھانے کے ذرات کو خلال کے ذریعے دور کرنا بہتر ہے۔ دانت نہ ہوں تب بھی مسواک کرنا سنت ہے۔ (ترشیح ص ۲۰ وغیرہ)

مسواک کے بعض فوائد: منہ پاک وصاف ہوتا ہے، رب کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ دانت سفید ہوتے ہیں، اور منہ کی بو بہتر ہوتی ہے مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے، صحت و ذکاوت کا سبب ہے، رطوبتوں کو ختم، نگاہوں کو تیز، بڑھاپے کو مؤخر، پشت کو مضبوط، ثواب کو دوچند، اور سکرات کی تکلیف کو آسان کرتا ہے، اور موت کے وقت کلمہ شہادت کو یاد دلاتا ہے۔ کشادگی اور مالداری کا باعث ہے۔ سر درد اور سر کے رگوں کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔ دانتوں کے درد اور زردی کو ختم کرتا ہے۔ معدہ کو درست اور قوی، فصاحت و عقل کو تیز، دل کو پاک، بدن کو قوی، اور مال واولاد کو بڑھاتا ہے۔ (بغیہ ص ۱۹)

(۲) **تسمیہ:** وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھے۔ اگر بھول جائے تو وضو مکمل ہونے سے پہلے جب بھی یاد آئے پڑھ لے۔ عمداً بھی چھوڑ دے تو وضو کی تکمیل سے پہلے پڑھ کر تلافی کرلے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ جو وضو کے وقت اللہ کا نام نہ لے، اس کا وضو نہیں (رواہ الترمذی۔ وابن ماجہ۔ عن سعید بن زید و۔ رواہ احمد وابوداود۔ عن ابی ہریرہؓ۔ (وفی سندہ ضعف۔ مشکوۃ۔ ۱/۴۶)

علماء کے نزدیک دیگر روایات کی روشنی میں اس حدیث میں وضو کی نفی سے صرف کمال کی نفی مراد ہے۔ یعنی بغیر تسمیہ کے وضو تو ہو جائے گا، لیکن کامل نہ ہو گا۔ (اور سند کے اعتبار سے اس روایت میں کچھ ضعف ہے) صرف بسم اللہ پڑھنے سے سنت ادا ہو جائیگی، لیکن ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھنا اکمل اور بہتر ہے۔ جب وضو کے ابتداء میں ہتھیلیاں دھونا شروع کرے، اس وقت بسم اللہ پڑھے۔ تسمیہ سے پہلے تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنا سنت ہے۔ وضو کے علاوہ دیگر تمام اہم امور کے ابتداء میں بھی تسمیہ سنت ہے، عبادت ہو یا غیر عبادت۔ جیسے غسل، تیمم، تلاوت، جماع، ذبح، گھر سے نکلنا، وغیرہ۔ نماز حج اور اذکار سے پہلے سنت نہیں ہے۔ مکروہ کام کیلئے بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے اور حرام کام کیلئے حرام ہے۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۱/۱۲۲)

(۳) **ہتھیلی دھونا:** چہرہ سے قبل دونوں ہتھیلیوں کا دھونا سنت ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد ہاتھ کے نجاست میں شک ہو اور ہاتھ پانی میں ڈبونا ہو یا ایسی کوئی بات نہ ہو، بہر حال دونوں ہتھیلیوں کا دھونا سنت ہے۔ لیکن ہاتھ کی پاکی یقینی نہ ہو تو دھونے سے پہلے پانی میں ڈبونا مکروہ ہے۔ اور تین مرتبہ دھونے سے پہلے یہ کراہت ختم نہ ہو گی۔ بخاری ومسلم میں آپ ﷺ سے نیند سے بیدار ہونے کے بعد تین مرتبہ دھونے سے پہلے ہاتھوں کو پانی کے برتن میں داخل کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اور اگر ہاتھ بالیقین پاک ہوں تو ڈبونا مکروہ نہیں۔

پانی کسی بڑے برتن میں ہو کہ اس سے ہاتھ پر نہیں ڈال سکتے اور نکالنے کیلئے کوئی چھوٹا برتن، جگ وغیرہ بھی نہیں، تو دوسرے سے

مد دلے یا منہ یا صاف کپڑے کے کنارے وغیرہ سے پانی نکالے۔

(۴) **مضمضہ اور استنشاق:** (مضمضہ یعنی کلی کرنا اور استنشاق یعنی ناک میں پانی لینا) منہ اور ناک میں صرف پانی پہنچانے سے اصل سنت حاصل ہو جائے گی۔ صحیحین وغیرہ کی روایات کی روشنی میں ہر چلو سے پہلے کلی پھر بقیہ پانی سے استنشاق اس طرح تین مرتبہ کرنا زیادہ افضل طریقہ ہے۔ (گویا تین چلو پانی لیا جائے گا اور ہر چلو سے کلی کرنے کے بعد باقی پانی کو ناک میں داخل کریں گے) پہلے تین چلو سے تین مرتبہ کلی بعد میں تین چلو سے تین مرتبہ استنشاق کرے تو یہ بھی صحیح ہے۔ ایک چلو سے تین مرتبہ کلی اور دوسرے چلو سے تین مرتبہ استنشاق کرنا بھی کافی ہے۔ مضمضہ کا استنشاق سے پہلے ہونا ضروری ہے (بعد میں ہو تو سنت ادا نہ ہوگی۔)

(۵) **مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ:** کلی کے پانی کو تالو کے آخری سرے اور دانتوں کے کنارے تک پہنچائے، دانتوں پر انگلی پھیرے، استنشاق میں سانس کے ذریعہ پانی ناک کی جڑ تک کھینچے اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا (چھوٹی انگلی) سے گندگی صاف کرے۔ روزہ دار مضمضہ اور استنشاق میں مبالغہ نہ کرے۔ پانی صرف منہ میں رکھا، پھیرا نہیں تب بھی کلی کی سنت ادا ہو جائے گی۔

(۶) **تثلیث (تین تین مرتبہ کرنا):** وضو کے افعال کو ایک ایک مرتبہ کرنا فرض ہے، دوسری مرتبہ کرنا بہتر ہے اور تین تین مرتبہ کرنا سنت ہے۔ دھونا اور مسح کرنا اور وضو کے دوسرے افعال، خواہ فرض ہوں یا سنت تین تین مرتبہ کرنا سنت ہے۔ کتنی مرتبہ دھویا اس میں شک ہو، تو کم تعداد پر عمل کریں گے۔ (وضو میں چہرہ دھوتے وقت کسی کو شک ہو جائے کہ ایک مرتبہ دھویا یا دو مرتبہ تو ایک شمار کریں گے۔ اسی طرح دو یا تین میں شک ہو تو دو شمار کرتے ہوئے ایک مرتبہ اور دھو دیں گے۔) تین مرتبہ سے زائد کرنا مکروہ ہے۔

موقوفہ پانی کو تین سے زائد مرتبہ استعمال کرنا حرام ہے صحیحین وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ سے وضو کے افعال کو ایک مرتبہ سے تین مرتبہ تک ادا کرنا مروی ہے۔ لہٰذا ایک مرتبہ ادا کرنا ضروری، اور دوسری اور تیسری مرتبہ سنت ہوا۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۱/۱۲۷)

(۷) **تخلیل:** چہرہ کے جن بالوں کے جڑ میں پانی پہنچانا ضروری نہیں، انگلیوں سے ان کا خلال کرنا سنت ہے۔

مثلاً: مرد کی گھنی داڑھی جیسا کہ ترمذی، ابو داود اور ابن ماجہ کی روایت سے ثابت ہے دائیں چلو میں پانی لیکر انگلیوں کو کشادہ کر کے داڑھی کے نیچے کی جانب سے اندر داخل کرے۔

(۸) **دائیں کو بائیں پر مقدم رکھنا:** ہاتھ اور پیر دھوتے وقت پہلے دایاں پھر بایاں دھونا سنت ہے۔ (صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ طہارت کنگھی کرنا، اور جوتے پہننا سارے ہی امور میں حتی الامکان دائیں کو مقدم کرنا پسند فرماتے تھے۔) دونوں کان اور سر کا مسح اور رخسار اور ہتھیلی کا دھونا ایک ساتھ انجام دیں گے، اگر ایک ہاتھ سے معذور ہونے کی وجہ سے بیک وقت انجام نہیں دے سکتا، تو ان اعضاء میں بھی دائیں کو بائیں پر مقدم رکھیں گے۔

(۹) **فرض سے زائد مقدار کا دھونا:** چہرہ کے ساتھ سر کے اگلے حصہ اور گردن کے کنارے کا دھونا، ہاتھ دھوتے وقت کہنیوں سے اوپر بازو کا کچھ حصہ دھونا، اور قدم دھوتے وقت پنڈلی کا کچھ حصہ بھی دھونا سنت ہے۔ مکمل بازو کاندھے کے قریب تک اور مکمل پنڈلی کا دھونا زیادہ بہتر ہے۔

صحیحین وغیرہ کی روایتوں میں اس کا حکم موجود ہے، اس لئے کہ اعضاء وضو قیامت کے دن منور ہونگے۔ صحیح مسلم میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا وہاں تک مومن کے زیورات (زینت اور نورانیت) پہنچیں گے۔

(۱۰) **پورے سر کا مسح کرنا:** پورے سر کا مسح کرنا سنت ہے، جیسا کہ صحیحین کی روایت سے ثابت ہے۔ دونوں شہادت کی

انگلی کو ایک دوسرے سے ملا کر سر کے اگلے حصے پر اور دونوں انگوٹھے کو کنپٹی پر رکھے پھر دونوں ہاتھ گدی تک لے جائے پھر واپس آگے تک لائے، یہ ایک مرتبہ مسح ہوا۔ گدی سے واپس لوٹانا اس شخص کیلئے مستحب ہے جس کے سر پر ایسے بال ہوں، جو لوٹاتے وقت پلٹیں اور ان کے نچلے حصہ کا مسح ہو جائے، اگر بال ہی نہ ہوں یا کافی چھوٹے یا بڑے ہونے کی وجہ سے پلٹنے کا سوال ہی نہ ہو، تو ایسا شخص مسح کرتے ہوئے ہاتھوں کو صرف گدی تک لے جائے، واپس نہ لائے۔ اگر واپس لائے تو یہ دوسرا مسح شمار نہ ہو گا، اگر سر پر عمامہ (دستار۔ پگڑی) وغیرہ ہو، جسے نکالنے کا ارادہ نہ ہو تو واجب مقدار سر کا مسح کرنے کے بعد بقیہ مسح اس عمامہ کے اوپر مکمل کرنا سنت ہے۔

اگر عمامہ پر مسح کی تکمیل سے پہلے ہاتھ سر سے اٹھائے تو نیا پانی لینا شرط ہے، نیز سر کی واجب مقدار کا مسح عمامہ سے قبل ہونا بھی شرط ہے،(ترشیح)(افضل یہ ہے کہ ناصیہ (سر کے اگلے حصے) سے کم پر اکتفاء نہ کرے) سر کا مسح نہ کرتے ہوئے صرف عمامہ کے اوپر مسح کر لینا کافی نہیں ہے۔

(۱۱) **کان کا مسح کرنا:** نئے پانی سے دونوں کان کے ظاہر و باطن کا مسح کرنا سنت ہے۔ جیسا کہ بیہقی اور حاکم کی روایت میں موجود ہے۔ (یعنی سر کا مسح سے بچی ہوئی تری سے کان کا مسح کرنا کافی نہیں ہے) انگلیوں کو سر کے مسح کیلئے تر کرنے کے بعد سر کے مسح کے وقت بعض انگلیوں کو جدا رکھا (یعنی ان انگلیوں سے سر کا مسح نہیں کیا) پھر اس جدا انگلی کی تری سے کان کا مسح کر لیا تو کافی ہے۔ کان کے سوراخ کا مسح کرنا بھی سنت ہے۔

مسح کا طریقہ: مسح کا سنت طریقہ یہ ہے کہ شہادت کی دونوں انگلی کو دونوں کان کے سوراخ میں داخل کر کے اس کو کان کے اندرونی شکنوں پر پھیرتے ہوئے اس کا مسح کر لے اور دونوں انگوٹھے سے بیرونی حصے کا مسح کر لے۔ مسح کی مکمل ادائیگی کے لئے اس کے بعد دونوں تر ہتھیلی کو کان سے چپکا دے۔ (فتح الوہاب وغیرہ)

چہرہ کے ساتھ کانوں کا دھونا اور سر کے وقت بھی اسکا مسح کر لینا سنت ہے۔ (جمل ۱/ ۱۲۹) گردن کا مسح نہیں کیا جائے گا۔ (بعض شافعی علماء کی رائے میں سر یا کان کے مسح کے بعد اسی تری سے گردن کا مسح بھی مندوب ہے۔ ترشیح المستفیدین ص ۲۱)

(۱۲) **ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کا خلال کرنا:** ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں آپ ﷺ نے وضو میں انگلیوں کے خلال کا حکم دیا ہے۔ اچھی طرح انگلیوں کے درمیان پانی پہنچانے کا اہتمام کرنے سے خلال کی فضیلت حاصل ہو گی۔ لیکن ہاتھ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے خلال کرے۔ اور پیر میں بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے پیر کے نیچے کی طرف سے خلال کرے۔ دائیں پیر کی چھنگلیاں سے شروع کر کے بالترتیب بائیں پیر کی چھنگلیا پر ختم کر لے۔ اگر انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوں اور بغیر خلال کے درمیان میں پانی نہ پہنچے تو تخلیل کر کے پانی پہنچانا ضروری ہے، لیکن اگر ایک دوسرے سے جڑی اور چپکی ہوئی ہوں تو ان کو چیرنا پھاڑنا جائز نہیں ہے۔

(۱۳) **ترک استعانت:** وضو کرتے وقت کسی سے مدد نہ لینا سنت ہے، اگر پانی ڈالنے یا لانے کیلئے مدد لے تو اس میں کراہت نہیں۔ (اسے بھی بعض علماء نے خلاف اولیٰ قرار دیا ہے) اعضاء کے دھونے کا کام دوسرے سے کرانا مکروہ ہے، اگر معقول عذر ہو تو کسی طرح کی مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(۱۴) اگر کوئی عذر نہ ہو تو وضو کے پانی کو نہ پونچھنا مستحب ہے۔ شرح مسلم میں امام نوویؒ نے اس کے اباحت کو ترجیح دی ہے۔

(۱۵) **وضو کے پانی کو نہ جھاڑے:** جھاڑنے کو امام نوویؒ نے تحقیق، شرح مسلم، اور شرح وسیط میں خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، لیکن روضہ اور مجموع میں مباح قرار دیا ہے، کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

(۱۶) **دیگر مستحبات:** تسمیہ کے بعد "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ الْمَاءَ طَہُوْراً" (حمد اس اللہ کی جس نے پانی کو طہور بنایا) پڑھنا، وضو کے سارے افعال میں نیت کو موجود رکھنا، دل کے ساتھ زبان سے بھی نیت کرنا، آنکھ کے کنارے اہتمام سے پانی پہنچانا، انگوٹھی کو حرکت دینا جہاں پانی جلد نہ پہنچے وہاں احتیاط کے ساتھ پہنچانا، چہرہ دھوتے وقت اوپر کی طرف سے شروع کرنا، سر کا مسح آگے سے شروع کرنا، ہاتھ اور پیر کو انگلیوں کی طرف سے دھونا شروع کرے، جبکہ خود ہی پانی لے، کوئی دوسرا پانی ڈالے تو کہنی اور ٹخنے کی طرف سے شروع کرے۔ (علامہ ابن حجرؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں انگلیوں کی طرف سے شروع کرے۔ ترشیح)

وضو کا پانی ایک مد سے کم نہ ہو (تقریباً ۵۲۵ گرام) پانی کے استعمال میں اسراف وفضول خرچی نہ کرے، کسی فعل کو تین سے زیادہ نہ کرے، دوران وضو بلا حاجت کلام (بات چیت) نہ کرے، پانی چہرہ پر نہ مارے، ایسی جگہ وضو نہ کرے کہ چھینٹے اڑیں۔

اگر آنکھوں میں کیچڑ ہو، اور پانی کنارے نہ پہنچے تو اسے دور کرکے پانی پہنچانا واجب ہے۔ آنکھوں کا اندرونی حصہ دھونا سنت نہیں ہے۔ بلکہ نقصان کے پیش نظر بعضوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ نجاست کا معاملہ نسبتاً سخت ہے، اس لئے اندر نجاست لگے تو دھونا ضروری ہے۔ وضو کے بعد بقیہ پانی تھوڑا سا تہبند پر (محل استنجا کے مقابل) چھڑکنا مسنون ہے۔ کسی جگہ پینے کے لئے جو پانی رکھا گیا ہو، اسے وہاں سے لے جانا یا اس سے وضو کرنا حرام ہے۔ مکمل وضو کرنے کی صورت میں (وقت کی تنگی کی وجہ سے) پوری نماز وقت میں نہ ملے، تو وضو میں صرف فرائض پر اکتفاء کرنا واجب ہے، تثلیث اور دیگر مستحبات کی ادائیگی جائز نہیں، جماعت کے چھوٹنے کا اندیشہ ہو، تو صرف فرائض پر اکتفاء مندوب ہے۔ (فتح المعین) بخاری شریف کی روایت سے بوقت غسل آپ ﷺ کا حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے گفتگو کرنا ثابت ہے، اس لئے امام نوویؒ وغیرہ نے صراحت فرمائی ہے کہ وضو اور غسل کے وقت گفتگو مکروہ نہیں ہے، لیکن نہ کرنا اولیٰ ہے۔ علماء کے کلام میں عریاں وغیر عریاں دونوں اس میں شامل ہیں۔ (قلائد۔ ۱/۲۶)

اعضاء کو ہاتھ سے رگڑ کر دھوئے، وضو کے افعال کو پیاپے (پے در پے مسلسل) ادا کرے، تمام حالات میں پہلا عضو خشک ہو جانے سے پہلے دوسرے عضو کو دھوئے، قبلہ رو ہو کر وضو کرے، وضو سے بچے ہوئے پانی میں سے کچھ پی لے، وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے۔

دعا: "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ" صحیح مسلم میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ ""جو اچھی طرح وضو کرنے کے بعد اس دعا کو پڑھ لے، اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جائیں گے، جس دروازے سے جی چاہے داخل ہو" ترمذی کی روایت میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔ (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِی مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ) پھر یہ دعا بھی پڑھے۔ "سُبْحَانَكَ اَللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْكَ" (النسائی فی عمل الیوم واللیلۃ، والحاکم فی المستدرک۔ تلخیص ۱/۱۱۲) ترجمہ (اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں میں، اور بہت پاک رہنے والوں میں شامل فرما، اے اللہ تو پاک ہے اور میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ صرف تو ہی معبود ہے۔ اور میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں۔)

اس کے بعد درود شریف اور تین مرتبہ سورہ "انا انزلنا" اور یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِی ذَنْبِی وَ وَسِّعْ لِی فِی

دَارِی وَ بَارِكْ لِي فِي رِزْقِي وَ لَا تَفْتِنِّي بِمَا زَوَيْتَ عَنِّي" (حاشیۃ الجمل ۱/۱۳۴) (اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور میرے گھر میں کشادگی عطا فرما، اور میرے رزق میں برکت دے اور جس سے محروم ہوں اس کے فتنہ میں نہ ڈال) مذکورہ تمام اذکار و دعا قبلہ رو ہو کر نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دونوں ہاتھ اٹھا کر پڑھے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۳۵) مستغفری کی ایک حسن روایت کی وجہ سے بعضوں نے ہر عضو کے وقت کلمہ شہادت کو مستحب قرار دیا ہے۔ (ترشیح) بعض کتابوں میں ہر عضو کے لئے الگ الگ دعائیں ہیں ثبوت کے اعتبار سے امام نووی اور بعض دیگر علماء اسے کافی ضعیف سمجھتے ہیں، اور اس کے پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، لیکن بعض دیگر حضرات اسکا پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں اور بعضوں نے کہا کہ بطور دعا پڑھنا اچھا ہے لیکن سنت نہ سمجھے (ترشیح)۔

واللہ اعلم بالصواب

وضو سے متعلق متفرق مسائل

وضو میں آنکھوں کے اندر پانی نہ ڈالے، اگر کسی کے ہاتھ میں کہنیا پیر میں ٹخنہ نہ ہو تو مقدار کا اندازہ لگایا جائے گا۔ پیر پھٹنے کی وجہ سے اس میں موم یا مہندی بھر دے تو وضو کیلئے اس کا دور کرنا ضروری ہے، مہندی کا رنگ باقی ہو تو حرج نہیں، اگر عضو پر سیال تیل ہو جس کی وجہ سے پانی فوراً بہہ جائے اور عضو پر ٹھہرے نہیں تو وضو صحیح ہے۔ ناخن کے اندر ایسا میل ہو جس کی وجہ سے وہاں پانی نہیں پہنچتا تو وضو صحیح نہ ہو گا۔ دوران وضو کسی عضو کے دھونے میں شک ہو جائے تو اس کا دوبارہ دھونا ضروری ہے۔ وضو ہونے کے بعد کسی عضو کے دھونے میں شک آئے تو حرج نہیں۔ مضمضہ اور استنشاق کے بعد ہتھیلی دھوئے تو یہ دھونا شمار نہ ہو گا۔ جن اعضا کو دھونے کا حکم ہے ان پر پانی کا بہانا ضروری ہے (صرف تری کا لگنا اور مسح کرنا کافی نہیں ہے) کسی بھی وقت وضو کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنا مستحب ہے۔ دوران وضو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں، اگر کوئی سلام کرے تو جواب دینا ضروری ہے، لیکن غسل کرنے والے کو سلام نہ کرے، ہمیشہ باوضو رہنا مستحب ہے۔ (حاشیۃ الجمل وغیرہ ۱/۱۳۵)

تجدید وضو: (باوضو شخص کا پھر سے وضو کرنا) وضو کر لینے کے بعد کوئی سی نماز پڑھ چکا ہو، چاہے ایک ہی رکعت یا نماز جنازہ یا تحیۃ المسجد پڑھے تو تجدید وضو سنت ہے۔ اس سے پہلے تجدید وضو مکروہ ہے۔ بلکہ مستقل عبادت سمجھ کر کرے تو بعض علماء نے حرام قرار دیا ہے۔ صرف سجدۂ تلاوت یا سجدہ شکر کے بعد تجدید وضو مستحب نہیں ہے۔ ابوداود وغیرہ کی حدیث میں تجدید وضو پر دس نیکیاں لکھے جانے کا وعدہ مروی ہے (جمل ۱/۱۶۵)

استنجاء کا بیان

شرمگاہ سے نکلنے والی نجاست کو پانی یا پتھر (ڈھیلا) سے دور کرنے کو استنجاء کہتے ہیں، استنجاء کرنا واجب ہے۔

قضاء حاجت (بول و براز) کے آداب: اوروں کی نگاہ سے عورت (بدن کا وہ حصہ جو دوسروں سے چھپانا ضروری ہے، ستر) کو کسی بھی آڑ سے چھپالے، اگر کھلی جگہ بیٹھا ہے تو آڑ اس سے تین ہاتھ یا اس سے کم فاصلہ پر ہونا چاہئے۔ اگر جانور کے ذریعے آڑ کرے یا کسی گڑھے میں بیٹھ گیا، یا خود اپنے دامن کو لٹکا کر آڑ کر لیا تو یہ بھی کافی ہے۔ کھلے میدان میں ہو یا عمارت میں، سورج اور چاند کی طرف رخ یا پشت نہ کرے، اس لئے کہ یہ مکروہ ہے۔ کھلے میدان میں بغیر آڑ کے قبلے کی طرف رخ یا پشت کر کے قضاء حاجت کرنا حرام ہے۔ بیت الخلاء کے اندر یا کھلے میدان میں آڑ کے ساتھ اس طرح قضاء حاجت حرام نہیں ہے۔

کھلے میدان میں جب قبلہ رو یا پشت بیٹھے تو اس کے اور قبلہ کے درمیان ایسا آڑ ہونا ضروری ہے جو کم از کم دو تہائی ۲/۳ ہاتھ اونچا ہو اور اس سے تین ہاتھ سے زیادہ دور نہ ہو۔ اگر اپنے دامن سے آڑ کر لیا تب بھی حرمت ختم ہو جائے گی۔

صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

صحیحین ہی کی روایت میں آپ ﷺ کا حضرت حفصہؓ کے مکان میں شام کی طرف رخ اور کعبہ کی طرف پشت کر کے قضاء حاجت کرنا مروی ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ کی ایک حسن حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے یہ تذکرہ ہوا کہ بعض لوگ اپنی شرمگاہ کو قبلہ رو کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے اس کا انکار فرماتے ہوئے اپنے قضاء حاجت کی نشست اور بیٹھک کو قبلہ رو کرنے کا حکم دیا۔ ان مختلف روایات کو سامنے رکھ کر علماء نے وہ تفصیل بیان کی جو اوپر آپ کے سامنے آچکی۔ (فتح الوہاب ص۹ وغیرہ) جس جگہ بیٹھ کر لوگ گفتگو کرتے ہوں قضاء حاجت نہ کرے، صحیح مسلم میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب پاخانہ نہ کرے، قلیل پانی میں کرنا اور سخت ہے، رات کے وقت زیادہ برا ہے۔ کسی بل یا سوراخ میں پیشاب نہ کرے، پھل آور درخت کے نیچے پیشاب پاخانہ نہ کرے، ہوا کے رخ پر بیٹھ کر پیشاب نہ کرے، (ورنہ ہوا کی وجہ سے پیشاب بدن پر اڑے گا) اپنے بائیں پیر پر زور دے کر بیٹھے (اور دائیں کے صرف پنجے کو زمین پر رکھ کر بقیہ حصہ الگ رکھے) استنجاء کے ڈھیلے پہلے ہی تیار رکھے۔

ڈھیلے سے استنجاء کے لئے قضاء حاجت کی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ بیت الخلاء میں قضاء حاجت کرنے والے کو پانی سے استنجاء کرنے کے لئے وہاں سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ ہو تو ہٹنا بہتر ہے۔ تاکہ چھینٹیں نہ اڑیں۔ ایسی کوئی چیز قضاء حاجت کے وقت اپنے ساتھ نہ رکھے، جس میں قرآن یا اللہ و رسول کا کچھ ذکر موجود ہو، جیسے انگوٹھی وغیرہ اگر رکھے تو مکروہ ہے۔ کوئی ایسی انگوٹھی پہلے نکالنا بھول جائے۔ تو اب اپنی ہتھیلی سے اسے چھپائے رکھے۔ (کسی کا نام محمد ہو مثلاً، اور اپنے نام کے طور پر اسے انگوٹھی پر نقش کرے تو اسے قضاء حاجت کے وقت لے جانا مکروہ نہیں ہے۔ (قلائد) انگوٹھی پر اللہ کا نام ہو اور استنجاء کے وقت اس پر نجاست لگتی ہو تو یہ حرام ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۸۲)

بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پیر اندر رکھے اور باہر نکلتے وقت پہلے دایاں پیر باہر نکالے، میدان میں قضاء حاجت کی صورت میں جس جگہ بیٹھنا ہو، وہاں پہلے بایاں پیر رکھے اور اٹھنے کے بعد دایاں پیر ہٹائے۔ پیشاب کے بعد کھنکھار کر اور ذکر (مرد کی اگلی شرمگاہ) پر انگلی پھیر کر قطرات سے اچھی طرح صفائی حاصل کرے۔ بول و براز کے وقت بیت المقدس کی طرف رخ یا پشت کرنا مکروہ ہے، حرام نہیں ہے کسی بھی جگہ میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت کر کے جماع (صحبت) کرنا مکروہ نہیں ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہونے کی دعا: ترمذی کی روایت میں ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بسم اللہ پڑھنے سے انسانوں کی شرمگاہ کا جنات کے نگاہوں سے پردہ ہو جاتا ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت (یعنی داخل ہونے سے پہلے) یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الخُبُثِ وَالخَبَائِث'' (اے اللہ مذکر و مونث شیاطین سے تیری پناہ چاہتا ہوں) لہٰذا پہلے ''بسم اللہ'' پھر اس دعا کا پڑھنا مستحب ہے۔ ابن السنی اور طبرانی کی کتاب الدعا میں یہ الفاظ مروی ہیں ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الرِّجْسِ النَّجِسِ وَالخَبِیْثِ المُخْبِثِ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم'' (الاذکار صفحہ ۲۷۔۲۸) داخل ہوتے وقت دعا بھول جائے تو اندر دل میں ہی پڑھ لے۔ (قلائد ۱/۲۶)

بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد کی دعا: سنن ابوداود اور ترمذی کی صحیح روایت میں آپ ﷺ سے "غفرانك" کہنا مروی ہے۔ نسائی اور ابن ماجہ میں یہ دعا موجود ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ" ابن السنی اور طبرانی کی روایت میں آپ ﷺ سے یہ دعا پڑھنا منقول ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذَاقَنِیْ لَذَّتَهٗ وَ اَبْقٰی فِیَّ قُوَّتَهٗ وَ دَفَعَ عَنِّیْ اَذَاهُ" (الاذکار ص ۲۷۔۲۸)

بیت الخلاء اور میدان دونوں جگہ ان دعاؤں کو پڑھے۔ بیٹھتے وقت زمین سے قریب ہونے سے پہلے ہی اپنا کپڑا نہ اٹھائے، اسی طرح اٹھ کر کھڑا ہونے سے پہلے ہی کپڑا درست کرے۔ بغیر کسی مجبوری کے وہاں سے نکلنے سے پہلے ذکر یا بات کرنا مکروہ ہے۔ اگر قضاء حاجت کے وقت چھینک آئے تو دل میں "الحمد للہ" پڑھ لے، زبان سے ادا نہ کرے۔ جماع کے وقت چھینک آئے تو یہی حکم ہے۔

سنت یہ ہے کہ قضاء حاجت کیلئے لوگوں سے دور نکل جائے (بیت الخلاء اس سے مستثنیٰ ہے) اور نرم زمین پر پیشاب کرے، تاکہ چھینٹے بدن پر نہ اڑیں۔ سڑک پر اور قبروں کے قریب پیشاب کرنا مکروہ ہے۔ قبروں کے اوپر اور مسجد میں پیشاب کرنا حرام ہے۔ مستحب ہے کہ ننگے پیر اور ننگے سر بیت الخلا نہ جائے اور نہ نکلنے والی نجاستوں کو دیکھے، اور نہ اپنی شرمگاہ کو، اور نہ آسمان کی طرف، ہاتھوں سے بے کار حرکتیں نہ کرے، کسی برتن میں پیشاب کرنا مکروہ نہیں۔ بغیر عذر کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے۔ بیت الخلاء میں زیادہ دیر بیٹھے رہنا مکروہ ہے۔

قضاء حاجت کے وقت کھانے پینے مسواک کرنے اور پیشاب میں تھوکنے سے احتراز کرے (جمل ۱/۹۲)

فصل: استنجاء کن چیزوں سے کیا جائے گا۔

جس نجاست کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس میں پتھر اور ڈھیلے سے استنجاء کافی نہیں ہے (لہٰذا زخم سے پیپ خون وغیرہ نکلے تو ڈھیلے کے ذریعہ اس سے پاکی حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ پانی ہی استعمال کرنا پڑے گا) اگر ریح (گیس، ہوا) خارج ہو تو استنجاء کی ضرورت نہیں۔ سبیلین (اگلی اور پچھلی شرمگاہ) سے نکلنے والی چیز ایسی ہو کہ جگہ بالکل تر اور نجاست سے ملوث نہ ہو تو استنجاء کرنا واجب نہیں ہے، لیکن سنت ہے جیسے کیڑا یا کنکر بغیر رطوبت کے نکلے یا مینگنی بالکل خشک نکلے۔ (اگر خروج ریح کے وقت وہ جگہ تر ہو تو استنجاء مسنون ہے، ورنہ مکروہ ہے۔) (قلائد ۱/۲۵)

سبیلین سے نکلنے والی چیز اس مقام کو نجس کرے تو پتھر یا پانی سے استنجاء کرنا واجب ہے۔

صرف پتھر (ڈھیلے) سے استنجاء کے شرائط۔ (۱) نجاست شرمگاہ سے نکلے، کسی اور جگہ سے نکلے تو پتھر کافی نہیں۔ (۲) نجاست خشک نہ ہو جائے، خشک ہونے کے بعد پانی استعمال کرنا ضروری ہے۔ (۳) کھڑے ہونے کی حالت میں دونوں سرین کا جو حصہ ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ پاخانہ اس حصہ سے آگے نہ بڑھ چکا ہو، اور پیشاب ختنہ کے مقام سے آگے نہ پھیلا ہو، ورنہ پورا پانی سے دھونا ہو گا۔ (۴) مذکورہ بالا حد کے اندر بھی اگر نجاست الگ الگ ہو جائے۔ (یعنی ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ ہو۔) تو جو نجاست اصل جگہ سے جدا ہے، اس میں پانی ضروری ہے (۵) نکلنے کے بعد نجاست جس جگہ ٹھہر چکی پھر وہاں سے آگے نہ بڑھے ورنہ پانی ضروری ہو گا (۶) اس نجاست میں باہر سے کوئی نجس یا پاک چیز شامل نہ ہوئی ہو ورنہ پانی استعمال کرنا ہو گا۔ (۷) تین مرتبہ محل نجاست کو صاف کرے، یا تو تین پتھر استعمال کرے، یا ایک ہی بڑے پتھر کے تین کناروں سے تین مرتبہ مسح کرے۔ صحیح مسلم کی روایت میں آپ ﷺ نے تین سے کم پتھر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور تین الگ الگ کناروں سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اصل مطلوب

تین مرتبہ مسح کرنا اور پونچھنا ہے۔(۸) تینوں مرتبہ پورے محل نجاست پر مسح کرے۔(۹) جگہ اچھی طرح صاف ہو جائے۔

اگر تین مرتبہ مسح کرنے سے اچھی طرح صاف نہ ہو تو صاف ہونے تک مزید پتھر استعمال کرنا ضروری ہے نجاست کا صرف اتنا اثر باقی رہے کہ پانی یا باریک ٹھیکریوں کے بغیر جدا نہ ہو تو اس میں حرج نہیں۔

سنتیں: (۱) اچھی طرح صفائی کیلئے تین سے زیادہ مسح کرنا پڑے تو طاق عدد پر ختم کرے۔ (مثلاً ۴ رڈھیلوں میں صفائی حاصل ہو جائے تو طاق عدد کی رعایت کیلئے پانچواں بھی استعمال کرنا سنت ہے۔)

صحیحین میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ تم میں سے کوئی استنجاء کیلئے ڈھیلے استعمال کرے تو طاق تعداد میں استعمال کرے۔

(۲) دبر (پچھلی شرمگاہ) کیلئے پہلے ڈھیلے کو دائیں کنارے سے آگے کی طرف نجاست کے بالکل قریب رکھ کر آہستہ آہستہ پھراتے ہوئے اسی جگہ لے آئے پھر دوسرے ڈھیلے کو بائیں طرف سے اسی طرح استعمال کرے۔ دونوں ڈھیلے پورے محل نجاست سے گذرنا ضروری ہے۔ تیسرے ڈھیلے کو دونوں کنارے اور درمیان سے گذارے۔ ذکر (اگلی شرمگاہ) کی پاکی میں اسے ڈھیلے کے تین الگ الگ مقام پر مسح کرنا کافی ہے۔ ایک ہی مقام پر دو مرتبہ ذکر سے مسح کرے تو اب پانی ضروری ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ پانی سے استنجاء کرنے والا اگلی شرمگاہ کو مقدم، اور ڈھیلے سے استنجاء کرنے والا دبر کو مقدم رکھے۔

(۳) بائیں ہاتھ سے استنجاء کرے جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے، مسلم کی روایت میں آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے سے روکا ہے، لہٰذا یہ مکروہ ہے۔ استنجاء کرتے وقت درمیانی انگلی پر زور دے۔ استنجاء کے بعد ہاتھوں کو زمین وغیرہ پر رگڑ کر دھونا اور شرمگاہ اور تہبند پر پانی چھڑکنا سنت ہے۔ استنجاء کے بعد ہاتھ میں بدبو محسوس ہو تو اسے دھونا ضروری ہے۔ لیکن دبر پر نجاست کا حکم نہیں لگے گا۔

(۴) پہلے ڈھیلا پھر پانی دونوں استعمال کرے، تاکہ ڈھیلے سے نجاست دور ہو جائے، اور ہاتھوں کو نجاست سے ملوث کئے بغیر پانی سے نجاست کا اثر دور ہو جائے۔ اس صورت میں ڈھیلے کا پاک ہونا یا تین مرتبہ ہی استعمال کرنا ضروری نہیں (اس لئے کہ بعد میں پانی استعمال کر ہی رہا ہے، لیکن کامل فضیلت کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے) صرف ایک پر اکتفاء کرنا ہو تو پانی افضل ہے۔

استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد احیاء العلوم میں یہ دعا درج ہے۔ "**اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَ حَصِّنْ فَرْجِیْ مِنَ الْفَوَاحِشِ**" (اے اللہ میرے قلب کو نفاق سے اور شرمگاہ کو حرام کاریوں سے پاک صاف کرنا۔) (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل جلد ۱ ص ۹۷ تا ۱۰۰)

فصل۔ پانی کے علاوہ کس چیز سے استنجاء کیا جائے

عموماً ہم پتھر یا ڈھیلے کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن دوسری جامد (ٹھوس) چیزوں سے بھی استنجاء جائز ہے۔ مائع سے جائز نہیں۔ لہٰذا اس فصل میں اسی کے شرائط بیان کئے جارہے ہیں۔

(۱) وہ چیز پاک ہو۔ اگر نجس چیز کو استنجاء کیلئے استعمال کیا تو بعد میں پانی ہی استعمال کرنا ضروری ہے۔ (۲) نجاست کو پونچھ کر اچھی طرح صاف کرنے والی ہو۔ لہٰذا شیشہ (کانچ)، بانس، چکنا لوہا، نرم کوئلہ اور جھڑنے والی مٹی وغیرہ کافی نہیں، کوئلے اور مٹی کا ڈھیلا سخت ہو تو کافی ہے۔

پتھر، دباغت دی گئی کھال، گھاس، ٹھیکری، اینٹ، ایسے اوراق جس میں کوئی محترم علم یا محترم نام نہ ہو، جیسے فلسفہ وغیرہ کے اوراق،

یہ اشیاء استنجاء کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ پتھر وغیرہ کا تر نہ ہونا ضروری ہے۔ (جمل وغیرہ)

(۳) محترم نہ ہو، مطعوم (کھائی جانے والی چیز جیسے روٹی اور ہڈی) سے استنجاء جائز نہیں، جس چیز پر حدیث وفقہ وغیرہ کا علم لکھا ہو، اس سے بھی استنجاء جائز نہیں۔ حیوانات سے متصل اجزاء (جیسے بکری وغیرہ کا پیر یا دم) سے استنجاء جائز نہیں، حیوانات سے جدا اور پاک اجزاء سے استنجاء کرسکتے ہیں جیسے بال اور پر۔ سونے چاندی کا ٹکڑا یا کسی دوسرے قیمتی جواہرات کا ٹکڑا جس میں کھردرا پن ہو، اور ریشم کا کپڑا بھی جائز ہے۔

محترم چیز سے استنجاء کرنے سے پاکی حاصل نہ ہوگی اور گنہگار بھی ہوگا۔ لیکن نجاست دوسری جگہ منتقل نہ ہوئی ہو تو اس کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا کافی ہے۔ پتھر سے استنجاء کرنے کے بعد اس پتھر کو دھو کر خشک ہونے کے بعد پھر استعمال کرسکتے ہیں۔ ایک ہی پتھر سے نجاست اچھی طرح دور ہوگئی، پھر دوسرا اور تیسرا پتھر استعمال کیا جن پر کچھ گندگی نہیں لگی تو ان دونوں پتھروں کو بغیر دھوئے بھی دوبارہ استعمال کرسکتے ہیں۔

وضو اور تیمم سے پہلے ہی استنجاء کرلینا چاہئے، استنجاء سے پہلے وضو کرلیا تو صحیح ہوگا، لیکن تیمم صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح تیمم کے وقت ہاتھ پر نجاست ہو تو تیمم صحیح نہ ہوگا۔ نکلنے والی نجاست بدن سے جدا ہونے کے بعد پھر اسی جگہ جاکر لگ جائے تو پانی ہی استعمال کرنا چاہئے۔ استنجاء کیلئے اتنا پانی استعمال کرے کہ نجاست کے ازالہ کا غالب گمان حاصل ہوجائے۔ اندرونی حصے کو دھونے کی کوشش نہ کرے۔

حدث (بے وضو ہونا) کے احکام ومسائل

لغت میں حدث نئی چیز کو کہتے ہیں، شرعاً جن اسباب سے طہارت ختم ہوتی ہے۔ اسے حدث کہتے ہیں (فتح الوہاب ۱/۷) اگر وضو ٹوٹ جائے تو اسے حدث اصغر (چھوٹا حدث۔ چھوٹی ناپاکی) کہیں گے۔ اور ایسے اسباب پائے جائیں جن سے غسل واجب ہوجائے تو اُسے حدث اکبر (بڑا حدث۔ بڑی ناپاکی) کہیں گے۔ صرف حدث کہنے میں دونوں آگئے، لیکن عموماً صرف حدث کا لفظ بے وضو ہونے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آیت: ”وَاِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ“ (سورہ المائدہ ۶) ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو اس زمین پر سے، شافعی مسلک میں سبیلین (اگلی اور پچھلی شرمگاہ) کے علاوہ بدن کے کسی اور حصے سے کسی بھی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح نماز میں قہقہہ لگانے۔ (ٹھٹھا مار کر ہنسنے) اونٹ کا گوشت کھانے اور آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (بعض دیگر ائمہ کرام کے نزدیک ان اسباب سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔)

چار اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ھے۔

(۱) **سبیلین سے کسی بھی چیز کا نکلنا:** عورت یا مرد کے اگلے یا پچھلے شرمگاہ سے ہوا، پیشاب، پاخانہ، خون، کیڑا، سنگریزہ وغیرہ پاک یا ناپاک، عموماً نکلنے والی یا نادر (کبھی کبھار بیماری یا کسی عذر سے نکلنے والی) کسی بھی طرح کی چیز نکلے، وضو ختم ہوجائے گا۔ لیکن صرف منی نکلنے سے وضو ختم نہ ہوگا۔ (مثلاً بیداری میں غلط خیالات ذہن میں آنے سے یا سرین کو زمین سے ٹکا کر بیٹھ کر سونے میں کسی کی منی نکل جائے تو اس سے غسل تو واجب ہوگا لیکن وضو نہ ٹوٹے گا۔) کسی چیز کے داخل ہونے سے وضو پر اثر نہ ہوگا لہٰذا شرمگاہ

سے کوئی دوا وغیرہ اندر داخل کی گئی تو وضو نہ ٹوٹے گا۔ اس کی کچھ مقدار باہر نکل آئے تو ٹوٹ جائے گا (ترشیح المستفیدین ۲۶) عام شرمگاہ کا راستہ بند ہو جائے اور معدہ سے نیچے کوئی دوسرا سوراخ اور راستہ کھل جائے۔ تو اس راستے سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو ختم ہو گا، لیکن عام شرمگاہ کا راستہ بھی کھلا ہو تو پھر اس نئے راستے سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں جائے گا۔ معدہ سے اوپر سوراخ ہو تو اس میں سے کسی بھی چیز کے نکلنے سے وضو نہیں جائے گا، چاہے پیشاب، پاخانہ نکلے یا اور کوئی چیز، اصلی شرمگاہ کا راستہ جاری ہو یا بند، یہ اس وقت ہے جبکہ اصلی راستہ عارضی طور پر بند ہو۔ اگر پیدائشی طور پر ہی اصلی راستہ بند ہو تو پھر نیا راستہ معدہ سے اوپر ہو تب بھی اس میں سے کسی چیز کے نکلنے سے وضو ختم ہو جائے گا، اور دیگر سارے احکام میں وہ اصلی ہی کی طرح ہو گا۔ (فتح الوہاب مع الجمل ۱/۶۵)

اگر سوراخ ناف سے نیچے کی طرف ہے تو اسے معدہ سے نیچے سمجھیں گے اور ناف کے سیدھ میں یا اس سے اوپر ہے تو اُسے معدہ سے اوپر سمجھا جائے گا۔ عارضی راستے سے نکلنے میں جن صورتوں میں وضو ٹوٹتا ہے، صرف ڈھیلے سے استنجاء ناکافی ہے۔ اس جگہ کو چھونے سے وضو نہ ٹوٹے گا۔ اور اس راستے میں صحبت کرنے سے صحبت کے احکام ثابت نہ ہوں گے۔ کیڑا شرمگاہ سے باہر سر نکالنے کے بعد اندر جائے تب بھی وضو ختم ہو گا۔

(۲) **عقل کا زائل ھونا** (ختم ہونا) یعنی عقل کی قوت تمیز و پہچان کا ختم ہونا۔ جنون (پاگل پن) بے ہوشی اور نشہ کی وجہ سے ہر حال میں وضو ٹوٹے گا۔ نشہ سے وہ کیفیت مراد ہے جس میں شعور ختم ہو جائے، صرف مستی کی ابتدائی کیفیت مراد نہیں۔ ایسی نیند جس میں بدن ڈھیلا پڑ جائے، پاس والے کا کلام سمجھ نہ سکے اور شعور ختم ہو جائے وضو کو ختم کر دے گا۔ اونگھ اور وساوس سے وضو ختم نہ ہو گا۔ اپنے دونوں سرین کو نیچے کی طرف اچھی طرح جما کر سونے سے وضو نہیں جائے گا۔ چاہے کسی چیز سے اس طور پر ٹیک لگا کر سویا ہے کہ اگر وہ چیز ہٹ گئی تو گر جائے گا۔ (فتح المعین مع ترشح ص ۲۷) لیٹ کر سونے سے جماؤ حاصل نہیں ہو سکتا، لہٰذا لیٹ کر کسی بھی طرح سونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ شافعی مسلک میں کم یا زیادہ سونے میں کچھ فرق نہیں ہے، جن صورتوں میں وضو ٹوٹتا ہے زیادہ سونے سے بھی ٹوٹتا ہے، اور کم سونے سے بھی۔ اسی طرح جن صورتوں میں وضو نہیں ٹوٹتا، کم سوئے یا زیادہ، نہیں ٹوٹے گا۔ گوٹ مار کر جماؤ کے ساتھ سو جائے تو وضو باقی رہے گا۔ (سرین اور قدم زمین پر رکھ کر پنڈلیوں کو کھڑا رکھے اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لے یا کسی کپڑے سے پشت کے پیچھے سے باندھ دے تو ایسی بیٹھک کو گوٹ مار کر بیٹھنا کہتے ہیں۔)

سرین کے جماؤ کے ساتھ سویا ہوا تھا، لیکن بیداری سے پہلے ایک سرین ہٹ گئی تو وضو ختم ہو گیا۔ بیدار ہونے کے بعد یا بیداری کے ساتھ ہٹے یا شک ہو کہ پہلے ہٹی یا بعد میں تو ان صورتوں میں وضو باقی رہے گا۔ اگر شک پیدا ہو کہ سویا تھا یا صرف اونگھا تھا یا سرین جما کر سویا تھا یا نہیں تو وضو باقی رہے گا۔ کوئی پیٹھ کے بل لیٹ کر سرین کو اچھی طرح زمین سے جما کر سوئے تب بھی وضو نہ رہے گا، چاہے لنگوٹ وغیرہ کس کر باندھا ہو، امام شافعیؒ اور دیگر علماء شوافع کا کہنا ہے کہ نیند کی جن صورتوں میں ہمارے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، وضو کر لینا مستحب ہے، اس لئے کہ بعض دوسرے ائمہ کرام کے نزدیک تمام صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ان کے اختلاف سے بچنا بہتر ہے۔

(۳) **مذکر و مونث (مرد و عورت) کی چمڑی کا آپس میں مس ھونا، چھو جانا:** ایسی صورت میں دونوں کا وضو ختم ہو گا۔ حدث کے سلسلہ میں اس فصل کی ابتداء میں سورہ مائدہ کی آیت ۶ پیش کی گی ہے۔ اس میں ایک سبب **اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ** (یعنی عورتوں سے ملامسہ) بھی گزر چکا۔ لمس کے حقیقی معنی چھونا ہے، جیسا کہ بعض احادیث میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ نیز حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ”جو شخص عورت کا بوسہ لے یا اسے ہاتھ سے چھوئے، اس پر وضو لازم ہے“ (مالک،

شافعی) حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے: ''بوسہ لینا بھی لمس میں داخل ہے، اور اس سے وضو لازم ہے، لمس سے مراد جماع سے کمتر امور ہیں۔ (بیہقی) اس طرح حضرت عمرؓ نے بھی بوسہ کو لمس کے مفہوم میں داخل کیا ہے۔ (دیکھئے تلخیص ۱/۱۹۸) دونوں کی عمر اتنی ہونا ضروری ہے کہ عرفاً ایک سلیم الفطرت کو انہیں دیکھ کر غالباً شہوت آسکتی ہو (اس کے جذبات ابھر سکتے ہیں) بال، دانت، ناخن اور بدن سے جدا اعضو کو چھونے سے وضو ختم نہ ہو گا۔ یا دونوں میں سے ایک بھی کم سن (کم عمر) ہو، حد شہوت کو نہ پہنچا ہو تو ایسی صورت میں وضو نہ جائے گا۔ نسبی۔ رضاعی (دودھ کا رشتہ) یا سسرالی اعتبار سے آپس میں محرمیت کا رشتہ ہو (ایسا رشتہ جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہو۔ جیسے بیٹی، بہن، رضاعی ماں، ساس وغیرہ) تو ایک دوسرے کے چھونے سے وضو ختم نہ ہو گا۔ کسی مردہ یا بالکل بڑھیا یا شل (خشک۔ لنجا) یا زائد عضو (جیسے چھٹی انگلی یا تیسرا ہاتھ) کو مس کرے یا بغیر شہوت کے یا بغیر قصد و ارادہ کے مس کرے تو ان تمام صورتوں میں وضو ختم ہو جائے گا۔ ارادہ کے بغیر بھی آپس میں چمڑی چھو جانے سے وضو ختم ہو تا ہے۔ قریب البلوغ یا خصی یا نامرد کے چھونے سے دونوں کا وضو ختم ہو گا۔ کوئی شخص کسی خوبصورت امرد (ابھی جس کو داڑھی نہ آئی ہو) کو شہوت سے چھوئے تو وضو ختم نہ ہو گا (اگرچہ یہ فعل معصیت ہے) شک ہو کہ محرم عورت کو مس کیا یا غیر محرم کو تو وضو ختم نہ ہو گا۔ محرم کو کسی نے شہوت سے بھی مس کیا تو وضو باقی رہیگا۔ زبان اور دانت کے قریب کا گوشت چمڑی کے حکم میں ہے۔ ان کو چھونے سے وضو ختم ہو گا۔

(۴) **انسان کی شرمگاہ کو چھونا: حدیث** (۱) جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے اسے وضو کرنا چاہئے (مالک، الشافعی، احمد، سنن اربعہ وصححہ احمد و ابن معین والبخاری والترمذی)

(۲) تم میں سے کوئی بغیر آڑ اور پردہ (حائل کے اپنے ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو وہ وضو کرلے۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ، تلخیص ۱/۱۸۴)

ہتھیلی کے بطن (پیٹ۔ اندرونی حصہ) سے اپنے یا کسی دوسرے مرد یا عورت، چھوٹا یا بڑا زندہ یا مردہ کی اگلی یا پچھلی شرمگاہ کو چھونے سے وضو ختم ہو جائے گا۔ پچھلی شرمگاہ سے مراد پچھلے راستے کے دونوں کناروں کے ملنے کی جگہ ہے۔ (لہٰذا ران اور سرین کے بقیہ حصے کو چھونے سے وضو ختم نہ ہو گا) شرمگاہ کٹ کر جدا ہو چکی ہو، (لیکن اتنا حصہ کٹا ہو کہ اسے شرمگاہ کہا جا سکے) یا شل ہو، یا شل ہاتھ سے مس کیا ہو، یا بھول کر مس کیا ہو، تب بھی وضو ختم ہو گا زائد انگلی دیگر انگلیوں کے سیدھ میں ہو تو اس سے بھی وضو ٹوٹے گا۔ کسی اور جگہ ہو تو نہیں ٹوٹے گا۔ ایک ہاتھ میں دو ہتھیلی ہوں اور دونوں یکساں کام دیتے ہوں تو دونوں سے وضو ٹوٹے گا، اور ایک زائد ہو تو صرف اصلی سے ٹوٹے گا، زائد سے نہیں۔

کسی جانور کے شرمگاہ کو چھونے سے وضو ختم نہ ہو گا۔ مذکورہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ ہتھیلی کے باطن سے چھوئے، انگلیوں کے سرے سے یا دو انگلیوں کے درمیانی حصے سے، یا انگلی کے کنارے کی طرف سے، یا ہتھیلی کے کنارے کی طرف سے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے پر ہلکے دباؤ کے ساتھ رکھنے پر جتنا حصہ اندر چلا جاتا ہے، اس سے چھونا وضو کو ختم کرے گا۔ جو حصہ باہر رہے اس سے وضو ختم نہ ہو گا۔

کسی دوسرے کی شرمگاہ کو چھونے کی صورت میں صرف چھونے والے کا وضو ٹوٹے گا۔ سامنے والے کا وضو باقی رہے گا۔

وضو کا استحباب: شرمگاہ کے اطراف کے بال، سرین کا قریبی حصہ، ران کا اوپری سرا، کمسن لڑکی، امرد، برص کا مریض اور یہودی کو چھونے کے بعد وضو کر لینا مستحب ہے۔ اسی طرح فصد، (نشتر سے رگ کھولنا) کسی کی طرف شہوت سے دیکھنا، گناہ کی بات

زبان سے نکالنا، غصہ، میت کو اٹھانا اور چھونا، ناخن تراشنا، مونچھ تراشنا اور سر مونڈنے کے بعد وضو کرنا مستحب ہے۔

مندرجہ ذیل اوقات میں بھی وضو مستحب ھے: قرآن کی تلاوت، قرآن سننا، حدیث پڑھنا، حدیث سننا، حدیث روایت کرنا، کسی شرعی علم کا پڑھنا یا پڑھانا، تفسیر و حدیث اور فقہ کی کتاب کو اٹھانا، یا لکھنا، ذکر، ذکر کی مجلس میں حاضری، اذان، اقامت، مسجد میں داخل ہونا، مسجد میں بیٹھنا، جمعہ کے علاوہ دوسرے خطبے دینا، وقوف عرفہ سعی، کسی بھی نبی کے قبر کی زیارت، سونے سے پہلے بیداری کے بعد، قے کے بعد، اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد، نماز میں قہقہہ لگانا، ایک مرتبہ صحبت کے بعد غسل کرنے سے پہلے دوبارہ صحبت کرنا ہو، غیبت، چغلی، بہتان تراشی، فحش و گندی باتیں، جھوٹ، اور کوئی بھی قبیح بات زبان سے نکالنے کے بعد (الفتح مع الترشیح ص ۲۷ حاشیۃ الجمل ۱/۱۳۵)

ایک اہم قاعدہ اور اصول

یقینی حکم کو باقی سمجھا جائے گا، اور شک کو نظر انداز کیا جائے گا، لہٰذا کسی کو پاکی کا یقین ہے، بعد میں حدث ہونیکے متعلق صرف شک یا گمان ہے تو یقین کو لیتے ہوئے وہ پاک ہے۔ اس کے برعکس حدث کا یقین ہے، بعد میں پاکی حاصل کیا یا نہیں شک ہے، تو وہ ابھی مُحدث (بغیر پاکی کے) ہے وضو کے بعد کسی مرد نے عورت کو چھوا، لیکن جلد یا بال میں شک ہے تو وضو باقی ہے۔ کسی کو اچھی طرح یاد ہے کہ سورج نکلنے کے بعد اس نے وضو بھی کیا ہے اور پیشاب بھی، لیکن پہلے کیا انجام دیا یاد نہیں تو ایسی صورت میں سورج نکلنے سے پہلے وہ بے وضو تھا تو اب باوضو ہے اور اگر پہلے باوضو تھا اور تجدید وضو کا عادی تھا تو اب بے وضو ہے اور تجدید وضو کا عادی نہیں تھا تو باوضو ہے سورج نکلنے سے پہلے کی حالت یاد نہیں تو بے وضو ہے۔

خنثیٰ مشکل (ھجڑا) کا بیان

(کسی کو مرد و عورت دونوں کے اعضاء مخصوصہ ہوں تو وہ خنثی ہے۔ مرد یا عورت کے فیصلے کیلئے کوئی واضح علامت نہ ہو تو خنثی مشکل ہے) خنثی مشکل کے مرد یا عورت ہونے کا فیصلہ درج ذیل تفصیل کی روشنی میں کیا جائے گا۔ صرف مرد کی شرمگاہ سے پیشاب نکلے تو وہ مرد ہے۔ صرف عورت کی شرمگاہ سے پیشاب نکلے تو وہ عورت ہے۔ دونوں شرمگاہ سے نکلے اور دونوں کا سلسلہ ایک ساتھ ختم ہو، تو جس شرمگاہ سے پہلے نکلنا شروع ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔ دونوں کا سلسلہ ساتھ شروع ہوتا ہو لیکن آگے پیچھے ختم ہوتا ہو تو جس شرمگاہ سے بعد میں ختم ہو اس کا اعتبار ہوگا۔ ایک سے شروع پہلے ہو، اور دوسرے سے ختم بعد میں ہو تو پہلے شروع ہونے والی شرمگاہ پر حکم لگے گا۔ دونوں کی ابتداء و انتہا ساتھ ہو تو پیشاب سے استدلال نہیں کر سکتے۔ بلوغ کی عمر کے بعد صرف مرد کی شرمگاہ سے منی نکلے تو وہ مرد ہے، صرف عورت کی شرمگاہ سے منی نکلے یا حیض آئے تو وہ عورت ہے، جبکہ بار بار اسطرح ہو دونوں سے منی خارج ہو تو اس کی صفت کے مطابق حکم لگے گا۔ اگر مرد کی منی کے صفات ہیں تو مرد، اور عورت کی منی کے صفات ہیں تو عورت۔

ایک راستے سے مرد کی صفت پر اور دوسرے راستے سے عورت کی صفت پر خارج ہو تو منی سے استدلال ممکن نہیں۔ کسی خنثی کو بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کا عورت ہونا بالکل قطعی ہے اور اس علامت کو دیگر تمام علامات پر مقدم رکھیں گے۔ پیشاب اور حیض یا منی میں تعارض ہو تو ان کی روشنی میں فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ داڑھی اُگنے، پستان ابھرنے، اور پسلیوں کے تعداد کی کمی بیشی سے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اوپر بیان کردہ علامتوں سے فیصلہ نہ ہو پائے تو عقل کی حالت میں بالغ ہونے کے بعد اگر اپنا میلان اور رجحان عورتوں کی طرف بتاتا ہے تو

وہ مرد ہے اور مردوں کی طرف میلان بتاتا ہے تو وہ عورت ہے۔

چند جزئیات: بالغ ہونے کے بعد کسی ایک صنف کی طرف میلان ہو تو فوراً اس سے آگاہ کرنا چاہئے۔ اگر اس نے تاخیر کی تو گنہگار ہو گا۔ (۲) من چاہی خبر دینا حرام ہے، جیسا میلان ہو وہی بتائے (۳) اگر کہتا ہے کہ دونوں کی طرف میلان ہے یا کسی کی طرف بھی نہیں، تو اشکال باقی رہے گا (۴) ایک مرتبہ کسی ایک جانب میلان کی خبر دینے کے بعد اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ البتہ مرد ہونے کی خبر کے بعد بچہ جننے یا حمل ٹھہرنے سے اس کا قول باطل ہو جائے گا۔ جیسے کہ دیگر ظاہری علامتوں کی روشنی میں مرد کا فیصلہ دینے کے بعد حمل ظاہر ہو، تو یہ فیصلہ غلط قرار پائے گا۔ (۵) اس کے خبر کے مطابق فیصلہ کے بعد اس کے خلاف کوئی علامت ظاہر ہو۔ (حمل کی علامت کے علاوہ) تو ان کا اعتبار نہ ہو گا۔ اس کے خبر ہی کو معتبر سمجھیں گے۔ اپنے میلان کی خبر کے مطابق عورت یا مرد ہونا طے پایا تو پھر سارے مسائل میں اس کے ساتھ اسی فیصلہ کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ (محض تہمت کی وجہ سے اس کے خبر کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں۔)

وہ امور جو بے وضو حرام ہیں (محدث کے لئے حرام امور):

محدث (بے وضو) پر یہ امور حرام ہیں: ہر قسم کی نماز، سجدہ تلاوت، سجدہ شکر، طواف، قرآن پاک کو چھونا یا اٹھانا، اور لے جانا، قرآن کے کنارے یا سطروں کے درمیانی حصہ میں ہاتھ لگانا، کسی لٹکانیکی چیز سے قرآن کو اٹھانا، قرآن پاک کی جلد کو چھونا، کسی جزدان، صندوق و بکس یا تھیلی میں قرآن ہو تو اس جزدان وغیرہ کو چھونا۔

کسی لکڑی وغیرہ سے قرآن کے صفحات کو الٹنا جائز ہے۔ اپنی آستین کو ہاتھ پر لپیٹ کر اس سے صفحات کا پلٹنا حرام ہے۔ مختلف اسباب (سازوسامان) کے درمیان قرآن بھی ہو تو ان اسباب کا قرآن سمیت اٹھانا حرام نہیں ہے، لیکن مکروہ ہے۔ کاغذ وغیرہ کو سامنے رکھ کر بغیر چھوئے اور اٹھائے اس پر قرآن پاک لکھنا جائز ہے۔ تورات وانجیل اور قرآن کی ان آیتوں کو جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے، بے وضو چھونا اور اٹھانا جائز ہے (البتہ مکروہ ہے)۔ آپ ﷺ کی حدیث کو چھونا اور اٹھانا جائز ہے لیکن وضو کر لینا اولیٰ (بہتر) ہے۔

پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے کسی چیز پر قرآن کی آیت تحریر کی گئی جیسے سکہ، کپڑا، عمامہ، کھانا، اور دیوار وغیرہ پر، تو اس کا چھونا اور اٹھانا حرام نہیں ہے۔ فقہ واصول کی کتابوں میں قرآنی آیات موجود ہونے کے باوجود ان کا چھونا اور اٹھانا حرام نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر میں تفسیر کے الفاظ قرآن کے الفاظ سے زائد ہوں تو کراہت کے ساتھ چھونا وغیرہ جائز ہے۔ اگر دونوں الفاظ برابر ہوں یا قرآن کے الفاظ زائد ہوں تو حرام ہے۔ جس تختی وغیرہ پر سیکھنے کیلئے قرآن کی آیت لکھی گئی ہو، کسی بالغ کیلئے اس کا چھونا اور لے جانا حرام ہے۔ کسی باشعور بچے کے سرپرست یا استاد پر اسے سیکھنے کے لئے (بے وضو) قرآن کے چھونے اور اٹھانے سے روکنا واجب نہیں، البتہ سنت ہے۔ جس روٹی وغیرہ پہ قرآن پاک لکھا ہو، اسے کھانا حرام نہیں۔ قرآن لکھی ہوئی دیوار کو گرانا حرام نہیں ہے۔ جس لکڑی پر قرآن کندہ ہو اسے جلانا مکروہ ہے۔ مسجد یا کسی دوسرے دیوار پر اور کپڑوں پر قرآن کا لکھنا مکروہ ہے کسی نجس چیز سے قرآن پاک، حدیث یا دیگر شرعی علوم کا لکھنا حرام ہے۔ بدن کے کسی حصہ پر نجاست لگی ہو تو صرف اس حصے سے قرآن کو چھونا حرام ہے۔ دوسرے اعضاء سے چھونا جائز ہے۔ کسی کو پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہوں (یعنی نہ وضو کر سکتا ہے اور نہ تیمم) تو اس کو وقت کی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے فرض نماز کو ویسے ہی پڑھنا چاہئے، لیکن قرآن کو چھونا وغیرہ حرام ہو گا۔ قرآن مجید کے ڈوبنے، جلنے، اس پر نجاست کے لگنے یا کافر کے قبضہ میں چلے جانے کا خطرہ ہو، اور جلدی سے وضو کر کے بچا نہیں سکتا، تو اس مجبوری کی وجہ سے بے وضو

اٹھا لینے کی اجازت ہو گی۔ بے شعور بچہ جو قرآن کے احترام کو نہیں سمجھتا اسے قرآن دینا جائز نہیں ہے۔ اگر اس عمر میں وہ قرآن سیکھ سکتا ہے تو استاد یا سرپرست کی موجودگی میں سیکھنے کیلئے اسے قرآن دینے کی بعض علماء نے گنجائش دی ہے۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں بے حرمتی ہونے سے وہ روکیں گے۔ اگر قرآن پاک کفار کے ہاتھ لگنے کا اندیشہ ہو تو قرآن لے کر ان کے علاقہ میں جانا حرام ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید لے کر دشمن کے علاقہ کی طرف سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری شریف)

قرآن پاک کو بطور تکیہ سر کے نیچے رکھ لینا، اس کے صفحات کو ایک دوسرے سے چپکا دینا، کسی چیز کے حفاظت کے لئے استعمال کرنا۔ (چاہے علمی کتاب کی حفاظت کیلئے ہو۔) کھانے کی چیز اس پر رکھنا، بغیر چبائے اسے کھا جانا (یعنی ہر وہ چیز جس پر قرآن تحریر ہو) سکّے وغیرہ اس میں رکھنا اور نجس جگہ اسے رکھنا حرام ہے۔ قرآن بوسیدہ ہونے کے بعد بے حرمتی سے بچانے کے لئے اسے جلانے میں حرج نہیں۔ قرآن پر نجاست لگ جائے تو دھو کر صاف کرنا ضروری ہے۔ چاہے اس کی وجہ سے قرآن تلف ہو جائے۔ قرآن سے فال نکالنا مکروہ ہے۔ قرآن کے علاوہ شرعی علوم کی دیگر کتابوں کو بے وضو چھونا واٹھانا حرام نہیں ہے۔ بقیہ احکام میں یہ کتابیں بھی قرآن کی طرح ہیں اس لئے کہ ان میں ان کتابوں کی توہین معلوم ہوتی ہے۔

قرآن لکھی چیز کو چبا کر کھانا یا دھو کر پینا جائز ہے، اس لئے کہ اندر پہنچنے تک قرآن کی تحریر باقی نہیں رہتی۔ لیکن نگلنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اسی حال میں اندر پہنچ کر وہاں کی نجاست اس پر لگے گی۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۷۸)

باب: غسل کے احکام (نہانا)

آیت: "وَاِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُباً فَاطَّهَّرُوۡا" (سورہ المائدہ۔ آیت ۶) "اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو" لغت میں کسی بھی چیز پر پانی کے بہنے کو غسل کہتے ہیں۔ شریعت میں نیت کے ساتھ پورے بدن پر پانی کے بہنے کو غسل کہتے ہیں۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۱۴۱)

چار اسباب سے غسل واجب ہوتا ہے

(۱) **موت**، اس کی تفصیل جنازہ کے باب میں آئے گی۔ (۲) **حیض** عورت کو حیض کا خون آنے کی وجہ سے خون کا سلسلہ بند ہونے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔ حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا! "جب حیض آئے تو نماز چھوڑ دو، اور ختم ہو جائے تو غسل کر کے نماز پڑھو" (متفق علیہ عن عائشہ) غسل اور اکثر احکام میں نفاس (ولادت کے بعد کا خون) بھی حیض کی طرح ہے۔ (۳) **ولادت**، حاملہ عورت کے بدن سے بچہ، علقہ یا مضغہ باہر آجائے اور خون نہ آئے تب بھی غسل کرنا ضروری ہے۔ (۴) جنابت۔ جنابت دو وجہ سے ہو گی۔ (الف) جماع (صحبت) (ب) انزال۔ (منی کا نکلنا)

(الف) **جماع**: حشفہ (عضو تناسل کی سپاری) کے بقدر مرد کی اگلی شرمگاہ کسی بھی فرج میں داخل کرنے کو جماع کہیں گے۔ عورت، مرد، جانور، زندہ، مردہ، عمر میں کم ہو یا زیادہ، ان میں سے کسی کے بھی اگلی یا پچھلی شرمگاہ میں داخل کرے، جنبی (بڑی ناپاکی والا) کہلائے گا۔ عورت کی شرمگاہ میں کسی بھی عضو تناسل کے داخل ہونے سے اس پر غسل واجب ہو گا۔ اگرچہ جانور، مردہ یا بچہ کا عضو تناسل داخل ہو۔ اور اس مرد پر بھی غسل واجب ہے جس کے دبر میں عضو تناسل داخل ہو۔ اگر میت کے ساتھ جماع کیا ہے۔ تو میت کو

اس کی وجہ سے دوبارہ غسل دیناواجب نہیں (صرف جماع کرنے والے پر غسل واجب ہے) کم سن یاپاگل جماع کرے یاان سے کوئی جماع کرے تو یہ بھی جنبی کہلائیں گے۔ اگر بچہ ممیز (باشعور) ہو تو اس کا غسل صحیح ہو گا۔ بالغ ہونے کے بعد دوبارہ غسل واجب نہیں ہے۔ جس طرح ممیز بچے کے سرپرست پر اس کو وضو کا حکم دیناضروری ہے، اسی طرح جنابت کی صورت میں غسل کا حکم دینا بھی ضروری ہے۔ بچہ بالغ ہو جائے یاپاگل کا جنون ختم ہو جائے اور ابھی جنابت کا غسل نہیں لیا، تو غسل لیناواجب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔! مرد عورت کے شعب اربعہ کے درمیان بیٹھے اور دونوں کے ختنہ کی جگہ ایک دوسرے کو چھو جائے (یعنی مرد عورت سے جماع کرے) تو غسل واجب ہو گیا" (مسلم۔الشافعی۔ ترمذی۔ابن حبان وغیرہ) یہ ساری تفصیلات اس وقت ہیں جبکہ حشفہ کے بقدر داخل کیاجائے، اگر اس سے کم حصہ داخل کرے تو غسل واجب نہیں ہے۔ عضو تناسل پر کپڑا وغیرہ لپیٹ کر اندر داخل کیاتب بھی غسل واجب ہے، اسی طرح دیگر احکام میں بھی اسے جماع سمجھاجائے گا۔

(ب) **منی کے انزال کی وجہ سے جنابت**۔ حدیث: (۱) پانی پانی کی وجہ سے ہے۔ (مسلم۔ابوداود۔نسائی۔ابی خزیمہ ابن حبان وغیرہ) مفہوم: منی نکلنے کی وجہ سے غسل کرناواجب ہے۔ (۲) حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا کے سوال پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! عورت کو پانی (منی) نظر آئے، (یعنی نیند میں انزال ہو جائے) تو غسل واجب ہو گا (متفق علیہ) منی عام راستے سے نکلے یاپشت یا خصیہ کے سوراخ سے، آدمی جنبی ہو جائے گا۔ مرد کی پشت یاعورت کی پسلیوں کے نیچے سے منی نکلنے سے جنابت حاصل ہو گی، جبکہ اصل راستہ بند ہو۔ (فتح الوہاب، السراج۔ص ۲۰)

منی کے کچھ خواص ہیں (۱) اگر منی تر ہے تو اس کی بو گوندھے ہوئے آٹے اور کھجور کے شگوفہ کی طرح ہو گی اور خشک ہے تو انڈے کی سفیدی کی طرح (۲) اچھل کر نکلنا (۳) نکلنے سے لذت کا حاصل ہونا اور نکلنے کے بعد عضو مخصوص کا سست اور شہوت ماند پڑ جانا۔ سارے خواص کا پایا جاناضروری نہیں۔ کوئی ایک خاصیت بھی موجود ہے تو وہ منی ہے۔ منی کے دیگر بھی صفات ہیں۔ جیسے کہ اعتدال کی حالت میں مرد کی منی کا سفید اور گاڑھاہونا اور عورت کی منی کا پتلا اور زرد ہونا۔

لیکن یہ صفات خواص میں داخل نہیں، لہٰذا ان کے نہ ہونے سے منی نہ ہونا یاان کے ہونے سے منی ہی ہوناضروری نہیں۔ کسی مرض کی وجہ سے گاڑھاپن اور سفیدی ختم ہو جائے، یاکثرت جماع کی وجہ سے خون کی رنگت پر نکلے، تب بھی بعض خواص پر اعتماد کرتے ہوئے غسل واجب ہو گا۔ انزال کی وجہ سے غسل کرنے کے بعد بقیہ منی نکلے تو دوبارہ غسل کرناضروری ہے۔ چاہے پیشاب سے پہلے نکلے یابعد میں، عورت کی منی نکلے تو اس پر بھی غسل واجب ہے، صحیحین میں ام سُلَیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے عورتوں کے احتلام کے متعلق پوچھاتو آپ ﷺ نے جواب دیاکہ! اگر منی نظر آئے تو اسے غسل کرناضروری ہے۔

امام الحرمین اور امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی منی صرف تلذذ سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ (یعنی دیگر خواص اس میں نہیں ہوتے) دیگر اکثر حضرات کے نزدیک اس کی منی بھی خواص میں مرد کی طرح ہے۔ جماع کی وجہ سے غسل کرنے کے بعد عورت کے بدن سے مرد کی منی نکلے تو ان دو شرطوں کے ساتھ اس پر غسل واجب ہے۔

(۱) عورت بالغہ ہو، کمسن نہ ہو۔ (۲) مذکورہ جماع میں اس کی بھی شہوت پوری ہو چکی ہو (اس صورت میں اس میں عورت کی منی کا بھی امکان ہے۔) اگر ایک شرط بھی نہ ہو تو غسل واجب نہیں (اس لئے کہ وہ صرف مرد کی منی ہو گی) عورت نے کسی کی منی کو اپنے فرج میں داخل کیا (بغیر صحبت کے) تو اس پر غسل لازم نہیں ہے۔

متفرق: میت کو غسل دینے کے بعد اور جنون وبے ہوشی ختم ہونے کے بعد غسل کرنا واجب نہیں ہے۔ اپنے کپڑے یا بستر میں، جس کو دوسرا کوئی استعمال نہیں کرتا، منی نظر آئے اور احتلام یاد نہیں تب بھی اس پر غسل واجب ہے۔ اور ہر وہ نماز جس کے بعد اس منی کے نکلنے کا احتمال نہیں لوٹانا ضروری ہے اور جن نمازوں سے پہلے نکلنے کا احتمال ہے ان کا لوٹانا مستحب ہے۔ (جیسے کسی نے جمعہ کو کپڑے پہنے پھر اتوار کی شام منی نظر آئے تو اتوار کی فجر ظہر اور عصر کو لوٹانا ضروری ہے۔ سنیچر کی فجر سے عشاء تک کی نماز لوٹانا مستحب ہے۔) اگر اس بستر میں کوئی اور بھی سوتا ہو اور اس کی منی ہونے کا بھی احتمال ہو تو اس پر غسل واجب نہیں، البتہ مستحب ہے کہ دونوں بھی غسل کر لیں۔ منی اپنے مقام سے نکلنے اور انزال کے قریب ہونے کا احساس ہوتے ہی عضو مخصوص کو مضبوطی سے پکڑ لیا جس کی وجہ سے منی فی الحال باہر نہیں آئی۔ اور نہ بعد میں آنے کا علم ہوا تو غسل واجب نہیں۔

فصل: جنبی پر حرام امور: جو امور محدث (بے وضو) کے لئے حرام ہیں جنبی کے لئے بھی حرام ہیں۔ جنبی کیلئے مزید قرآن پاک کی تلاوت اور مسجد میں رکنا بھی حرام ہے۔ قرآن کی آیت کا ایک حصہ بھی قرآن کے قصد سے پڑھنا حرام ہے۔ کسی جنبی کو پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہوں، (جو وضو اور تیمم نہ کر سکے) وہ فرض نماز میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھے گا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا: جنبی اور حائضہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دار قطنی)

(۲) حضرت علی کا فرمان ہے: جنابت کے علاوہ کوئی چیز آپ ﷺ کو قرآن (کی تلاوت) سے نہ روکتی تھی،، (احمد، اصحاب السنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، بزار، دار قطنی، بیہقی وصححہ الترمذی وغیرہ)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد (میں رکنا) حلال نہیں۔ (ابوداود، ابن ماجہ، طبرانی، صححہ ابن خزیمہ وحسنہ ابن القطان، تلخیص ۱/۱۴۸)

قرآن کے ارادہ کے بغیر قرآن میں سے کچھ پڑھے تو جائز ہے۔ جیسے "بِسْمِ اللهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" یا سواری کے دعا کے طور پر "سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ" آیت پڑھے، تلاوت وذکر کی نیت کے بغیر یہ آیت اس کی زبان سے جاری ہو تو جائز ہے۔ جنبی کی طرح حیض ونفاس والی عورت پر بھی تلاوت حرام ہے۔ کسی پاک آدمی کا منہ نجس ہو تو اسے تلاوت کرنا مکروہ ہے۔ حمام میں تلاوت مکروہ نہیں ہے۔ تلاوت کی نیت کے بغیر وعظ ونصیحت، بیان یا (شیاطین وغیرہ کے شر سے) حفاظت کی خاطر قرآن پڑھنا حرام نہیں ہے۔ (ترشیح ص ۳۰/) مسجد میں ٹھہرنا اور رکنا تو جنبی پر حرام ہے، لیکن مسجد سے گذر جانا حرام نہیں ہے۔ البتہ بغیر کسی ضرورت کے یہ مکروہ ہے۔ جنبی مسجد میں ٹہلتا رہے یہ بھی حرام ہے۔ مجبوری کی وجہ سے رکنے کی اجازت ہے، جیسے کوئی مسجد میں سو گیا اور احتلام ہو گیا، بعد میں دروازہ مقفّل (بند) ہونے یا کسی خوف کی وجہ سے باہر نکلنا ممکن نہیں، ایسی صورت میں اگر ممکن ہو تو تیمم کر لینا چاہئے۔ (مسجد میں کنواں وغیرہ ہو تو اندر ہی غسل کرنا ضروری ہے، مسجد کا فرش یا دیوار مٹی کی ہے تو اسے تیمم میں استعمال کرنا جائز نہیں) امام شافعیؒ نے الأم (اُم امام شافعیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ہے) میں اور دیگر علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ جنبی اور حائضہ (حیض والی عورت) کے علاوہ دوسرے حضرات مسجد میں سو سکتے ہیں۔ (جبکہ نمازیوں کیلئے تنگی وتشویش کا باعث نہ ہو) بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک خاتون کا آپ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سونا مروی ہے۔ ایسی مسجد میں احتلام ہو، جس میں دو دروازے ہوں، ایک اس سے قریب اور دوسرا دور تو قریبی دروازہ سے نکلنا اولیٰ ہے۔

جنبی اور حائضہ کے غسل سے بچا ہوا پانی طہور ہے، اس کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی

ہے کہ آپ ﷺ اور وہ ایک ہی برتن سے جنابت کا غسل کیا کرتے تھے۔ جنبی کیلئے (غسل سے پہلے) جماع کرنا، سونا، اور کھانا پینا جائز ہے، لیکن سنت ہے کہ شرمگاہ کو دھونے اور وضو کرنے سے پہلے یہ امور انجام نہ دے۔ صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں حضرات عائشہ رضی اللہ عنہا، جابر رضی اللہ عنہ، ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جنبی کیلئے کھانے یا سونے کا ارادہ ہو تو درمیان میں وضو کر لینے کا حکم مروی ہے۔ صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جماعت (صحبت) کے بعد دوبارہ جماع کا ارادہ ہو، تو درمیان میں وضو کر لینے کا حکم دیا ہے۔ (تلخیص ۱/۱۴۹۔۱۴۸) حیض و نفاس کا خون جاری ہو تو اس کے لئے مذکورہ وضو سنت نہیں ہے، جب خون بند ہو جائے (اور ابھی غسل نہیں کیا) تو وہ بھی جنبی کی طرح ہے (یعنی سونے اور کھانے پینے کیلئے وضو کرلے۔)

غسل کی کیفیت

غسل کا ادنیٰ درجہ: غسل کے دو فرض ہیں۔ (۱) نیت۔ نیت سے متعلق جزئیات وضو کے بیان میں گذر چکے، کسی فرض حصے کے دھونے کے بعد نیت کافی نہیں۔ اس کے ساتھ متصل ہو تو کافی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ادا کی جانے والی غسل کی سنتوں کا ثواب نہیں ملے گا۔ فرض حصہ دھونا شروع کرنے سے پہلے نیت کرلی اور شروع کرنے تک نیت حاضر ہے تو کافی ہے ورنہ کافی نہیں (جیسا کہ وضو میں تفصیل گزر چکی)

اگر رفع جنابت (جنابت دور کرنا) یا سارے بدن سے رفع حدث یا حائضہ نے حدثِ حیض کے دور کرنے کی نیت کی تو غسل صحیح ہے۔ صرف رفع حدث کی نیت کی، جنابت وغیرہ سے تعرض نہ کیا، تو غسل ہو جائے گا۔ اگر عمداً حدث اصغر کے دور کرنے کی نیت کی تو غسل صحیح نہ ہو گا اور غلطی سے اپنے حدث کو حدث اصغر خیال کرتے ہوئے یہ نیت کی تھی تو صرف چہرہ، ہاتھ اور پیر (سر کے علاوہ تینوں اعضاء وضو) کی جنابت دور ہو گی، بقیہ بدن کی دور نہ ہو گی۔ ایسا فعل جائز قرار دینے کی نیت کرے جو بغیر غسل کے جائز نہیں جیسے نماز ۔طواف۔ تلاوت قرآن تو کافی ہے، حائضہ وطی (صحبت) جائز قرار دینے کی نیت کرے تو غسل صحیح ہو گا۔

جن امور کے لئے غسل واجب نہیں (مستحب ہو یا نہ ہو) جیسے اذان۔ مسجد سے گذرنا وغیرہ۔ ایسے امور کے جواز کی نیت سے غسل صحیح نہ ہو گا۔ فرض غسل یا غسل کے فریضہ کو انجام دینے کی نیت کرے تو کافی ہے۔

(۲) **پورے بدن پر پانی بہانا:** کان کے سوراخ میں سے جو حصہ ظاہر ہے، بدن کی شکنیں اور سلوٹیں، غیر مختون کے ختنہ میں کٹنے والی کھال کے نیچے کا حصہ، کسی کی ناک کٹنے کی وجہ سے جو حصہ کھل چکا ہو، قضاء حاجت کیلئے بیٹھتے وقت ثیبہ کے فرج کا جتنا حصہ ظاہر ہو تا ہے، ان تمام اعضاء پر پانی بہانا ضروری ہے۔ کلی اور استنشاق ضروری نہیں، کھال پر اگنے والے تمام بالوں اور اس کی جڑوں میں چاہے گھنے ہوں، پانی پہنچانا ضروری ہے۔ آنکھ کے اندر اگے بال کو دھونا ضروری نہیں، بلکہ حدث کی وجہ سے آنکھ کے اندر پانی پہنچانا سنت بھی نہیں ہے، لیکن نجاست لگی ہو تو دھونا ضروری ہے۔ ناک کے اندرونی بال چاہے لمبے ہوں، دھونا ضروری نہیں۔ (بشریٰ ۱/۳۸) بالوں میں گرہ پڑی ہو تو اس کے اندر پانی کا نہ پہنچنا معاف ہے۔ (البتہ کسی نے گرہ لگائی ہو تو تھوڑی مقدار میں معاف ہے زیادہ ہو تو معاف نہیں) چوٹیوں کے اندر بغیر کھولے پانی نہ پہنچے، تو ان کا کھولنا ضروری ہے، ورنہ ضروری نہیں۔

اکمل غسل کا طریقہ: (۱) اگر نجاست لگی ہو تو غسل سے پہلے اس کا دھونا واجب نہیں ہے، غسل کی نیت سے ایک مرتبہ دھو دیا تو نجاست کا ازالہ اور غسل دونوں حاصل ہونگے، لیکن بدن پر لگی گندگی جیسے منی وغیرہ کو پہلے دور کرنا بہتر ہے۔

(۲) پھر نماز کی طرح وضو کرے، جیسا کے بخاری شریف میں حدیث مروی ہے، مکمل وضو کر لینا بہتر ہے، اگر قدموں کو باقی رکھے اور غسل سے فارغ ہونے کے بعد دھولے تب بھی کافی ہے۔

اگر صرف جنبی ہے (بے وضو نہیں ہے) تو اس وضو میں سنت غسل کی نیت کرلے، اور بے وضو بھی ہے تو حدث اصغر کے دور کرنے کی نیت کرلے۔ باوضو شخص اگر عضو مخصوص پر کپڑا لپیٹ کر جماع کرے اور بدن عورت کے بدن سے بالکل مس نہ ہو، یا نظر وفکر کی وجہ سے انزال ہو تو ان صورتوں میں جنبی تو ہوگا، لیکن وضو نہ ٹوٹے گا (۳) موڑ اور پیچ والے مقامات مثلاً کان، پیٹ کی شکنیں، بالوں کی جڑ وغیرہ کا خصوصی خیال رکھے۔ پانی بہانے سے پہلے بال کی جڑوں کا پانی سے خلال کرے۔

(۴) پانی پہلے سر پر ڈالے، پھر دائیں طرف پھر بائیں طرف، اس کیفیت کو بخاری شریف و مسلم نے حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے مرفوعاً پیش کیا ہے، وضو کی طرح تین مرتبہ پورے بدن پر پانی بہانا، پہلے سر پر تین مرتبہ، پھر دائیں طرف تین مرتبہ، پھر بائیں طرف تین مرتبہ نہر وغیرہ میں غسل کر رہا ہو تو تین غوطے لگائے۔ ہر مرتبہ جہاں تک ہاتھ پہنچتا ہو بدن کو اچھی طرح رگڑے۔ غسل کی تجدید (بغیر سبب کے دوبارہ غسل کرنا) مستحب نہیں ہے۔ (۵) حیض یا نفاس کا غسل ہو تو غسل کے بعد خوشبو کو روئی جیسی چیز میں لیکر اپنے فرج میں داخل کرے۔ (فرج کا وہ حصہ مراد ہے جس کا غسل میں دھلنا ضروری ہے) مشک استعمال کرنا بہتر ہے، ورنہ دوسری کوئی خوشبو۔ خوشبو میسر نہ ہو تو مٹی، ورنہ صرف پانی بھی کافی ہے (خوشبو کا یہ حکم شوہر کی وفات پر سوگ منانے والی عورت، روزہ دار اور محرم کیلئے نہیں ہے۔) ایک صحابیہ نے آپ ﷺ سے غسل حیض کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مشک کے استعمال کی طرف رہنمائی فرمائی۔ (متفق علیہ)

(۶) وضو اور غسل کیلئے پانی کی مقدار متعین نہیں ہے، البتہ ایک معتدل بدن والے کیلئے مستحب یہ ہے کہ وضو کا پانی تقریباً ایک مد اور غسل کا پانی تقریباً ایک صاع سے کم نہ ہو، جیسا کہ حضرت سفینہ سے صحیح مسلم کی حدیث میں اور حضرت انس سے صحیحین میں مروی ہے۔

(۷) غسل مکمل ہونے تک نیت کا باقی رکھنا مستحب ہے، رکے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے غسل سے فارغ ہونے کے بعد یہ پڑھے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ"

وضو کے باب میں بیان کردہ کئی سنتیں یہاں بھی جاری ہوں گی۔ وضو وغسل کے وقت گفتگو مکروہ نہیں، البتہ گفتگو نہ کرنا اولیٰ ہے۔ (قلائد ۱/ ۲۶) دوسروں کے سامنے غسل کرتے وقت ستر کا کھلا رکھنا جائز نہیں ہے (میاں بیوی ایک دوسرے کے حق میں مستثنیٰ ہیں) تنہائی میں عریاں (ننگا) نہانا جائز ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق مروی ہے، لیکن افضلیت کے خلاف ہے۔ غسل کرنے والے کا مضمضہ، استنشاق یا وضو کو چھوڑنا بُری بات ہے، اس کی تلافی کرے، غسل میں ترتیب واجب نہیں ہے۔ لیکن پہلے وضو کے اعضاء کو پھر سر اور بدن کے اوپر کے حصہ پر پانی بہانا مستحب ہے۔ انزال منی کی وجہ سے پیشاب کرنے سے پہلے غسل کر لینا جائز ہے۔ البتہ پیشاب کے بعد غسل کرنا افضل ہے، تاکہ غسل کے بعد پھر منی نہ نکلے ایک ہی غسل سے فرض اور سنت (جیسے جنابت اور جمعہ کا غسل) کی نیت کرے تو دونوں حاصل ہونگے۔ ایک ہی کی نیت کی تو ایک ہی غسل حاصل ہوگا۔ کسی پر حیض وجنابت دونوں کا غسل ہو تو کسی ایک کی نیت سے غسل کر لینے سے دونوں غسل ادا ہونگے۔ عید، جمعہ۔ سورج گہن وغیرہ کے سب غسل جمع ہو جائیں اور سب کی نیت سے غسل کرے تو سب حاصل ہونگے، بلکہ کسی ایک کی نیت سے بھی دیگر غسل حاصل ہو جائیں گے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۱۶۶)

جو شخص جنبی اور بے وضو دونوں ہو، صرف غسل کر لینے سے اس کو دونوں پاکی حاصل ہوں گے، خواہ وضو کی نیت نہ کرے اور اعضاء وضو میں ترتیب کا خیال نہ رکھے۔ (حاشیۃ الجمل ۱۶۷۱)

کتاب التیمم

تیمم کا مطلب عربی زبان میں قصد ہے، اور شرعاً چہرہ اور ہاتھ پر مخصوص شرائط کے ساتھ وضو اور غسل یا کسی ایک عضو کے بدلہ میں مٹی پہنچانے کو تیمم کہتے ہیں (حاشیۃ الروضہ)

آیت: ''وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ''(سورۃ النساء آیت ۴۳) ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو، یا حالت سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص استنجا سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے، تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔

پہلا باب تیمم کے اسباب

پانی استعمال نہیں کر سکتے تو تیمم کرنا جائز ہوگا۔ اس مجبوری کے درج ذیل سات اسباب ہیں۔

(۱) **پانی موجود نہ ہونا:** اس سلسلہ میں مسافر کی چار حالتیں ہو نگی۔ (الف) اپنے اطراف پانی نہ ہونا یقینی ہو، ایسی صورت میں پانی کی تلاش کے بغیر بھی تیمم کر سکتا ہے۔ (ب) اطراف میں پانی ہونے کا امکان ہو، اس صورت میں نماز کا وقت ہونے کے بعد پانی کی تلاش ضروری ہے، خود تلاش کرے یا کسی اور معتبر شخص سے کروائے۔ اپنے طور پر کسی دوسرے شخص کا تلاش کرنا کافی نہیں۔ پہلے اپنی قیام گاہ میں تلاش کرے پھر دائیں بائیں۔ اور آگے پیچھے دور تک نگاہ دوڑائے جبکہ مسطح زمین ہو (ٹیلے وغیرہ نہ ہوں) سرسبز مقامات اور جہاں پرندے موجود ہوں، وہاں خصوصاً توجہ دے اور اگر زمین مسطح نہ ہو (ٹیلے اور گڑھے وغیرہ ہوں) لیکن پانی کی تلاش میں آگے نکل جانے کی صورت میں اپنے جان یا مال کا خطرہ ہو تو جانا واجب نہیں ہے۔ اور ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے تو چاروں طرف اتنی دور تک پانی کی تلاش میں جانا ضروری ہے کہ وہاں سے کسی ضرورت سے اپنے ساتھیوں کو آواز دے اور وہ اپنے کام اور گفتگو میں مصروف ہوں تو اس کی آواز پر مدد کو پہنچ سکیں۔ زمین کے نشیب و فراز (اونچ نیچ) کے اعتبار سے اس مسافت (دوری) میں فرق آئے گا۔

اسی مسافت کو 'منہاج' میں یوں بتلایا کہ مسطح زمین پر جہاں تک نظر جاتی ہے وہاں تک جانا ضروری ہے اور شرح صغیر میں اس کو تیر کی انتہا سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایک تیر زیادہ سے زیادہ جتنی دور جاتا ہو۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہ مسافت ۳۰۰ سے ۴۰۰ ہاتھ تک ہوتی ہے (۱۲۰ تا ۱۶۰ میٹر) اس مسافت کو اصطلاح فقہ میں حد غوث کہتے ہیں۔ (حاشیۃ الجمل مع الفتح ۱/۱۹۹)

سفر میں ساتھی ہوں، تو تمام ساتھیوں سے بھی پانی کے متعلق دریافت کرے۔ اتنی بلند آواز سے جو ساتھیوں تک پہنچے یہ اعلان کرے کہ کسی کے پاس پانی ہے جو بطور ہبہ یا قیمت سے مجھے دیدے، ہر ساتھی سے فرداً فرداً پوچھنا ضروری نہیں۔ تمام ساتھی مل کر کسی ایک آدمی کو پانی تلاش کرنے روانہ کریں تو کافی ہے۔ یہ تفصیلات اس وقت ہیں جبکہ اس سے پہلے تلاش اور تیمم نہ کر چکا ہو۔ اس سے پہلے پانی تلاش کر کے نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کر چکا ہو اور اس کے بعد کوئی ایسی بات پائی جائے جس کی وجہ سے پانی کا احتمال ہو جیسے اس جگہ سے ہٹ چکا ہو، یا نیا قافلہ نظر آئے یا بادل چھا جائے تو پھر تلاش کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہر وہ مقام جہاں ایک مرتبہ تلاش کے بعد پانی نہ ہونا یقینی ہو چکا اور بعد میں پانی کی موجودگی کا کوئی احتمال بھی نہیں تو وہاں دوبارہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر پانی کے احتمال کا سبب پایا نہ جائے اور پانی کے نہ ہونے کا گمان ہو (یقین نہ ہو) تو تلاش کرنا ضروری ہے، لیکن پہلی مرتبہ کے

مقابلہ میں کمتر درجہ میں۔

مذکورہ بالا مسائل میں دونوں تیمم کے درمیان مدت طویل ہو یا کم، یا بغیر مدت کے معاملہ پیش آئے نوعیت یہی رہے گی۔

(ج) اطراف میں پانی کا ہو نا یقینی ہو۔ پانی اتنی دوری پر ہو جہاں تک کسی جگہ پڑاؤ ڈالنے والے مسافر ایندھن اور گھاس چارہ کیلئے جاتے ہوں۔ تو پانی تک (جانے میں نماز قضاء نہ ہو تو) جاکر وضو کر کے نماز پڑھنا ضروری ہے، تیمم کرنا جائز نہیں۔ یہ مسافت سابقہ حد غوث سے زائد ہے۔ اس مسافت کا نام حد قرب ہے جو تقریباً نصف فرسخ (ڈیڑھ میل ہاشمی، ۳کلو میٹر سے کچھ کم) ہو تا ہے۔

حد قرب کی مقدار ۶۰۰۰ (چھ ہزار) قدم ہے۔ (مقدمہ الحضرمیہ) اس صورت میں پانی تک پہنچنے میں نماز کا وقت نکل جاتا ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے لیکن کسی کے پاس پانی ہو اور وقت اتنا تنگ ہو چکا ہو کہ وضو کرنے تک نماز قضاء ہوتی ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، وضو ہی کرنا ضروری ہے۔ اگر پانی مذکورہ حد قرب سے بھی دور ہو تو پانی تک جانا ضروری نہیں ہے، بلکہ تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے اس مسافت کو حد بعد کہیں گے۔ (فتح الوہاب ۱/۲۲) مقیم شخص کو پانی تک پہنچنے میں وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تب بھی تیمم کرنا جائز نہیں اس لئے کہ اس کو تو قضاء لازم ہے۔

جن صورتوں میں مسافر کو تیمم کی اجازت ہے، اگر اسے قضاء ہونے سے پہلے پانی ملنے کا یقین ہو، تو نماز کو مؤخر کرنا، تاکہ وضو کر کے پڑھ لے افضل ہے۔ پانی کا یقین نہ ہو صرف امید ہو تو تیمم کر کے اوّل وقت پڑھ لینا افضل ہے۔ اس صورت میں بعد میں پانی مل جائے تو وضو کر کے پھر پڑھ لینا بڑی اچھی بات ہے۔ اگر پانی نہ ہونے کا گمان ہو یا دونوں کا یکساں احتمال ہو، تو اوّل وقت تیمم کر کے پڑھ لینا افضل ہے۔

اوّل وقت میں تنہا نماز پڑھنی پڑتی ہو اور تاخیر کی صورت میں جماعت ملتی ہو، تو سب سے بہتر یہ ہے کہ اوّل وقت میں تنہا نماز پڑھ کر بعد میں جماعت سے دوبارہ پڑھ لے۔ جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث میں آئندہ ائمہ کے نماز مؤخر کرنے کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ اصل وقت (اوّل وقت) میں اپنی نماز پڑھ لی جائے، پھر جماعت کے ساتھ بھی (بطور نفل) ادا کرے۔ اگر ایک ہی نماز پڑھنا ہو تو تاخیر زیادہ نہ ہوتی ہو، تو جماعت کے ساتھ پڑھنا ورنہ اوّل وقت پڑھنا افضل ہے۔

(د) کسی ایسے کنویں پر سارے مسافروں کا اژدہام ہو جائے جس سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی پانی لے سکتا ہے (جگہ کی تنگی یا ایک ہی ڈول ہونے کی وجہ سے) اور نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے اپنی باری آنے کی توقع ہو، تو تیمم کرنا جائز نہیں اور اگر یہ یقین ہو کہ اپنی باری وقت کے بعد ہی آئے گی تو وقت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے پھر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کئی لوگ عریاں (ننگے) ہوں اور ان کے پاس ایک ہی کپڑا ہو جس کو باری باری پہن کر نماز پڑھ رہے ہوں اور اپنی باری تک وقت نکل جاتا ہو تو عریاں ہی وقت کے اندر نماز ادا کر لے پھر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کئی آدمی ایسی تنگ جگہ ہوں، جہاں کھڑے ہو کر صرف ایک ہی آدمی نماز پڑھ سکتا ہو اور اپنی باری وقت کے بعد آئے گی تو وقت کے اندر بیٹھ کر نماز پڑھ لے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

پانی کی قلت: جنبی یا محدث کو اتنا پانی ملے جو اس کی طہارت کے لئے ناکافی ہے، تو پہلے وہ پانی استعمال کرے پھر بقیہ اعضاء کے لئے تیمم کرے۔ لہٰذا محدث پہلے چہرہ پھر ہاتھ اس طرح جتنا ہو سکے ترتیب سے دھوتا جائے اور جنبی بدن کے جس حصے کو چاہے دھولے (اس لئے کہ غسل میں ترتیب ضروری نہیں ہے) لیکن پہلے اعضاء وضو کو دھونا اولیٰ ہے۔ کوئی محدث اور جنبی دونوں ہو، تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (یعنی اعضاء وضو کو مقدم کرنا ضروری نہیں ہے۔) محدث کو برف یا اولہ ملے جسے پگھلا نہیں سکتا، تو اس کا استعمال ضروری

نہیں ہے، جبکہ تیمم کے لئے مٹی موجود ہو، ورنہ اس کا استعمال واجب ہے۔ مٹی پورے تیمم کو ناکافی ہو، تو جتنی ہے استعمال کرنا واجب ہے۔ صحیحین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ میں تم کو کسی بات کا حکم دوں، تو جتنا تم سے ہوسکے اس پر عمل کرو" برف کی صورت میں اگر اتنا پانی ہو کہ چہرہ اور ہاتھ دھل سکتے ہیں تو اس برف سے سر کا مسح لازم ہے، اور پانی نہ ہو تو مسح کی بھی ضرورت نہیں (حاشیۃ الجمل ۱/۲۰۲) تیمم کے بعد پانی نظر آئے تو تیمم باطل ہو جائے گا۔ کسی کے بدن پر کئی نجاستیں ہوں، اور اتنا پانی میسر ہو کہ اس میں سے کچھ ہی دھل سکتا ہے، تو اتنا دھونا ضروری ہے۔ کوئی جنبی یا محدث یا حائضہ ہو اور بدن پر نجاست بھی ہو اور پانی صرف کسی ایک کو کافی ہو تو اس سے نجاست دور کرنا ضروری ہے، نجاست کو اس سے دھو کر پھر تیمم کرے۔

فصل: کسی کے پاس طہارت کیلئے کافی پانی تھا، اس پانی کو نماز کے وقت سے پہلے یا بعد میں کسی حاجت کی وجہ سے یا بغیر حاجت کے ختم کر دیا، یا وہ پانی نجس ہو گیا، تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے، لیکن وقت کے بعد بغیر غرض کے پانی تلف کرنے سے گنہگار ہو گا۔

(۱) نماز کے وقت میں پانی کے پاس سے گذرا لیکن وضو نہیں کیا، پانی سے کافی دور نکل جانے کے بعد تیمم کر کے نماز پڑھ لی تو اعادہ کی ضرورت نہیں، وقت ہونے کے بعد بغیر حاجت (پیاس وغیرہ) کے کسی کو پانی ہبہ یا فروخت کرنا صحیح نہیں جبکہ فروخت کرنے والے کو قیمت کی ضرورت نہ ہو۔ لہٰذا جب تک پانی مشتری (خریدار) یا موہوب لہ، (جس کو ہبہ کیا) کے پاس باقی ہو، تیمم صحیح نہ ہو گا بلکہ پانی واپس لے لے، اگر نہیں لے سکتا تو قضا واجب ہے۔ وقت میں تیمم سے پڑھنا صحیح نہیں بلکہ پانی ملنے تک یا ایسی حالت جس میں تیمم سے فرض ساقط ہو جاتا ہو، آنے تک نماز کو موٴخر کر دے۔ جس صورت میں ہبہ صحیح نہیں، موہوب لہ کے پاس وہ پانی تلف ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان (تاوان) نہ آئے گا۔

(۲) اپنے جان یا مال پر خوف و خطرہ ہو: اگر قریب ایسا درندہ یا دشمن ہو جو اس کی جان لے گا، یا کسی عضو کو نقصان پہنچائے گا، یا اپنے مال پر غاصب یا چور حملہ آور ہو گا یا کشتی میں ہو اور سمندر سے پانی لینے میں خطرہ ہو تو ان صورتوں میں تیمم کر سکتا ہے۔ اگر پانی تک جانے میں سفر کے ساتھی چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر لے۔ خادم کو پانی ہبہ کیا تو قبول کرنا ضروری ہے۔ پانی نکالنے کیلئے کوئی ڈول اور رسی عاریتاً دے تو قبول کرنا واجب ہے۔ کوئی پانی قرض دے تو لینا واجب ہے، اگر کوئی پانی یا ڈول وغیرہ کی قیمت ہبہ کرے تو قبول کرنا واجب نہیں۔ کسی تنگدست کو یا ایسے مالدار کو جس کا مال غائب ہے (پاس موجود نہیں) کوئی پانی کی قیمت قرض دے رہا ہو تو قبول کرنا واجب نہیں۔ کسی تنگدست کو پانی ادھار قیمت پر مل رہا ہو تو خریدنا ضروری نہیں، لیکن مالدار کو ضروری ہے، جبکہ قیمت کی ادائیگی کے لئے اتنی مہلت رکھی گئی ہو جس میں وہ اپنے مال تک پہنچ سکتا ہے۔

پانی کی قیمت پاس ہے لیکن قرض کی ادائیگی، ساتھ موجود حیوان محترم کا نفقہ، یا سفر کی آمد و رفت کے خرچ کے لئے اس کی ضرورت ہے، تو اس سے پانی خریدنا واجب نہیں۔ (حیوان محترم سے وہ جاندار مراد ہیں۔ شرعاً جن کے مارنے کی اجازت نہیں۔ انسان ہو یا جانور۔ مرتد حربی وغیرہ غیر محترم ہیں۔ ان کی رعایت کی اجازت نہیں) مذکورہ بالا ضروریات سے زائد رقم ہو اور ثمن مثل (مناسب قیمت) پر پانی مل جاتا ہو، تو خریدنا واجب ہے۔ موقع محل اور وقت کے اعتبار سے مناسب قیمت سے زائد قیمت پر ملتا ہو تو خریدنا واجب نہیں، چاہے زیادتی کی مقدار کم ہی ہو۔ اگر ادھار خریدنے کی وجہ سے مدت کے مناسب قیمت بڑھ جاتی ہو، تو یہ بھی ثمن مثل ہی ہے موقع محل اور وقت کے اعتبار سے مناسب قیمت کو ثمن مثل کہیں گے۔ اگر پانی نکالنے کا آلہ (ڈول وغیرہ) ثمن مثل یا اجرت مثل (مناسب کرایہ) پر مل جاتا ہو تو لینا واجب ہے۔ صرف ایک کپڑا موجود ہے۔ اسے ڈول سے باندھ کر پانی حاصل کر سکتا ہے، تو کرنا لازم

ہے، ڈول نہیں ہے اور کپڑے ہی کو پانی میں لٹکا کر بھگونے کے بعد نچوڑ کر وضو کر سکتا ہے، تو ایسا کرنا واجب ہے۔
اگر کپڑا پانی تک نہیں پہنچتا، لیکن چاک (پھاڑ) کر کے جوڑنے سے پہنچ سکتا ہے تو اس طرح کرنا ضروری ہے۔ لیکن مذکورہ امور اس وقت واجب ہیں جبکہ ان کی وجہ سے پانی کی قیمت یا (ڈول کی) رسی کی اجرت سے زیادہ کپڑے کا نقصان نہ ہو۔
(اگر وضو کے پانی کا ثمن مثل پانچ روپئے ہے اور مذکورہ کسی طریقے سے کپڑے کے استعمال سے کپڑے کا پانچ روپئے تک کا نقصان ہوتا ہو، تب بھی واجب ہے، اس سے زائد نقصان ہوتا ہو تو واجب نہیں)

(۳) پیاس جیسے امور کے لئے پانی کی ضرورت ہو: اس میں کئی مسائل ہیں (الف) پانی ہو لیکن اپنے یا ساتھی یا کسی حیوان محترم کے پیاس کیلئے فی الحال یا آئندہ اس کی ضرورت ہو تو تیمم جائز ہے مذکورہ صورت میں پانی دوسرے کو بغیر عوض کے دے یا عوض سے (لیکن جو شخص سفر کی وجہ سے گنہگار ہو، اسے توبہ کرنے تک تیمم جائز نہیں، جب توبہ کرے تو پانی پینا اور تیمم کر لینا جائز ہے۔ (حاشیۃ الروضہ) پیاس کے باوجود کوئی پانی نہ دے تو جبراً اور زبردستی لینا جائز ہے (غیر محترم حیوان یعنی حربی، مرتد، سوّر، کاٹ کھانے والا کتا۔ چوہا۔ کوا، چیل، بچھو اور ان جیسے جاندار)
پانی سے وضو کر کے مستعمل پانی کو جمع کر کے پینا ضروری نہیں، بلکہ تیمم کرنا کافی ہے۔ کسی کے پاس پاک اور نجس پانی ہو تو پاک پانی پینے کیلئے استعمال کرے اور تیمم کرے۔ آئندہ کل پانی ملنے کا امکان ہو، لیکن یقین نہ ہو، تو پانی کل (پینے) کیلئے رکھ کر تیمم کرنا جائز ہے۔
(ب) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کوئی انسان انتقال کر جائے اور اس کے ساتھ پیاسے ہوں تو اس میت کے پانی کو خود پینے کے لئے استعمال کر کے میت کو تیمم کرایا جائے اور پانی کی قیمت اس کی میراث میں داخل کی جائے۔
(ج) کسی نے وصیت کی یا کسی کو وکیل بنایا کہ پانی اس آدمی پر صرف کیا جائے جو پانی کا زیادہ حقدار ہو۔ اور میت، جنبی، حائضہ، جس کے بدن پر نجاست ہو اور محدث جمع ہو جائیں تو میت زیادہ حقدار ہے۔ میت کے مستحق ہونے کے لئے وارث کی طرف سے اس وصیت کو قبول کرنا شرط نہیں ہے، جیسا کہ کوئی تطوعاً (بغیر عوض کے) اسے کفن دے۔ دو آدمی آگے پیچھے انتقال کر جائیں، اور ان کے انتقال سے پہلے ہی صرف اتنا پانی میسر ہے جو ایک کو کافی ہو تو پہلے انتقال کرنے والا اس کا زیادہ مستحق ہے۔ دونوں ایک ساتھ انتقال کر جائیں یا انتقال کے بعد پانی ملے تو دونوں میں جو افضل ہو، وہ مستحق ہے، فضیلت میں دونوں برابر ہوں تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہو گا۔
مذکورہ وصیت و توکیل کی صورت میں جنبی اور حائض جمع ہوں تو حائضہ زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر جنبی اور محدث جمع ہوں اور پانی صرف وضو کے لئے کافی ہو، غسل کے لئے ناکافی ہو، تو محدث زیادہ مستحق ہے، دونوں کو ناکافی ہو تو جنبی زیادہ مستحق ہے، پانی کے ضرورت مند مذکورہ افراد کسی مباح پانی پر پہنچ کر ایک ساتھ اپنے قبضہ میں لے لیں، تو سب برابر برابر اس پانی کے مالک بن گئے، اور کسی کیلئے اپنا حصہ دوسرے کو دینا، چاہے وہ زیادہ ضرورت مند ہو، یا پانی ناقص ہو جائز نہیں ہے۔

(۴) پانی کے متعلق لاعلمی کی وجہ سے پانی استعمال نہ کر سکنا: اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔
(الف) اپنے سامان سفر میں موجود پانی بھول جائے، یا قیام گاہ کے قریب کنویں کا علم تھا، لیکن اس وقت بھول گیا، لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ اس صورت میں یاد آنے پر وضو کر کے نماز کا اعادہ ضروری ہے جیسے کوئی طہارت میں کوئی عضو بھول جائے یا کپڑا پہننا بھول جائے، پانی کی قیمت پاس تھی لیکن بھول گیا تو یہی حکم ہے۔
(ب) سامان سفر میں پانی بھی رکھ دیا گیا تھا، جس کا اسے علم نہیں تھا، اس لئے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، پھر معلوم ہوا یا تیمم کرنے کے

بعد قریب میں ایسے کنویں کی موجودگی کا علم ہوا جو پہلے معلوم نہیں تھا، تو اس صورت میں اعادہ کی ضرورت نہیں (البتہ شرح مہذب میں امام نوویؒ نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر کنواں واضح تھا تو اعادہ ضروری اور مخفی تھا تو ضروری نہیں ہے۔ حاشیۃ الروضہ)

ج) پانی اپنے اسباب سفر میں کھو گیا، اور تلاش کے باوجود نہ ملنے پر تیمم کر کے نماز پڑھ لی پھر پانی مل گیا، تو اعادہ واجب ہے۔ (اور نہ ملے تو واجب نہیں کمافی الحاشیۃ)

(د) اپنا اسباب سفر ہی دیگر مسافروں کے اسباب میں گم ہو جائے، اس صورت میں خوب مبالغہ کے ساتھ تلاش کیا تھا تو اعادہ کی ضرورت نہیں، اور سرسری تلاش کیا تھا تو اعادہ واجب ہے۔

(۵) مرض (بیماری): اس کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) مرض ایسا ہو کہ وضو کرنے کی وجہ سے وفات پانے کا، یا کسی عضو کے فوت ہونے کا، یا کسی عضو کے منفعت کے فوت ہونے کا ڈر ہو، تو تیمم کرے گا۔ خوفناک مرض کا اندیشہ ہو تو بھی تیمم کر لے۔

(ب) وضو کی وجہ سے درد کی زیادتی، شفا اور صحت میں تاخیر، دائمی مرض جو اسے لنجا بنادے یا چہرہ جیسے ظاہری اعضا جو کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں، اس پر بد نما (مثلاً سیاہ داغ وغیرہ) عیب کا اندیشہ اور خطرہ ہو، تو تیمم جائز ہے۔

(ج) وضو کی وجہ سے معمولی عیب کا خطرہ ہو جیسے چیچک کا داغ، معمولی سی سیاہی، یا ظاہری اعضاء کے علاوہ بد نما عیب کا اندیشہ ہو، یا ایسا مرض ہو کہ پانی کی وجہ سے کسی خطرناک نتیجہ کا اندیشہ نہیں۔ بھلے ہی فی الحال زخم یا ٹھنڈک یا گرمی کی وجہ سے پانی استعمال کرنے میں تکلیف ہوتی ہو، تو ان تمام صورتوں میں تیمم کی اجازت نہیں (بعض علماء نے بد نما عیب کی وجہ سے مطلقاً تیمم کی اجازت دی ہے، ظاہر و باطن کی قید کے بغیر۔ کمافی الحاشیۃ)

مرض کا فیصلہ: مریض خود طب سے واقف ہو تو اپنی واقفیت کی بنیاد پر مرض کے سبب تیمم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کر کے اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اسی طرح ماہر طبیب (حکیم، ڈاکٹر) کی بات پر بھی اعتماد کر سکتا ہے۔ جبکہ وہ مسلمان بالغ اور عادل (جو کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے اور صغائر پر اصرار نہ کرے) شخص ہو، عورت یا غلام ہونے میں حرج نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک صرف اپنے تجربہ کی بنیاد پر فیصلہ کافی نہیں۔ امام اسنوی اور ابن حجر وغیرہ بعض علماء اسے کافی سمجھتے ہیں، یہی زیادہ مناسب ہے۔ طبیب کے نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ لی تو ان نمازوں کا اعادہ ضروری ہے گرچہ بعد میں طبیب ملے اور تیمم کے جواز کا فیصلہ دے۔ (حاشیۃ اجمل ۱/ ۲۰۸)

اگر بیماری تمام اعضاء طہارت کو گھیرے تو صرف تیمم کافی ہے۔ بعض اعضاء بیمار ہیں، تو تندرست اعضاء کو دھونا واجب ہے اور بیمار اعضاء کا مسئلہ زخمی کے مسئلہ کی طرح ہے امام نووی ابو علی السنجیؒ کا فتویٰ نقل کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق کوئی طبیب نہ ملے، تو تیمم کی اجازت نہیں (فتاوی بغوی میں تیمم کی اجازت ہے اور روضہ کے محشی اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔) مرض کے سبب تیمم کرنے میں مقیم و مسافر اور حدث اصغر و اکبر میں کوئی فرق نہیں، اور بعد میں اعادہ کی ضرورت بھی نہیں

(۶) جبیرہ باندھنا: (جبیرہ یعنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے باندھنے کی لکڑی یا پٹی۔ پلاسٹر) جبیرہ ہڈی کے ٹوٹنے یا جگہ سے ہٹنے اور اکھڑنے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔ کبھی تو جبیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی نہیں، ضرورت کے سلسلے میں مرض میں گذری ہوئی تفصیلات کا اعتبار کیا جائے گا۔

پہلی حالت: ضرورت کی وجہ سے جبیرہ باندھنا۔ اب یا تو طہارت کے وقت مرض کے بیان میں گذرے ہوئے تکلیف اور

ضرر کے بغیر اسے نکال سکیں گے یا نہیں، نہیں ہٹا سکتے تو ہٹانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن طہارت میں کئی باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔(۱) عضو کے تندرست حصہ کا دھونا واجب ہے۔ یہاں تک کہ جبیرہ کے نیچے کے تندرست حصے کو بھی حتی الامکان دھوئے۔ جیسے کپڑے کا تر ٹکڑا اس پر رکھ کر نچوڑے تاکہ قطرات سے وہ حصے دھل جائیں۔

(۲) جبیرہ پر پانی سے مسح کرنا واجب ہے، اگر جنبی ہے تو جب چاہے مسح کرے اور محدث (بے وضو) ہے تو جب جبیرہ والے عضو کے دھونے کی باری آئے گی مسح کرے۔ پورے جبیرہ پر مسح کرنا ضروری ہے۔

(۳) چہرہ اور ہاتھ کا تیمم کرنا واجب ہے۔ جبیرہ عضو تیمم (یعنی چہرہ یا ہاتھ) پر ہے تو جبیرہ پر مٹی سے مسح کرنا واجب نہیں۔ اب اگر یہ جنبی ہے تو تیمم سے پہلے تندرست اعضاء کو دھوئے یا بعد میں اسے اختیار ہے۔ (بعد میں دھونا مستحب ہے تاکہ مٹی کا اثر ختم ہو جائے۔) (حاشیۃ الروضہ) اور محدث ہے تو ایک عضو کی طہارت پوری ہونے سے پہلے آگے نہیں بڑھ سکتا، لہٰذا اگر جبیرہ چہرہ پر ہے تو ہاتھ دھونے سے پہلے تیمم واجب ہے۔ اب چاہے چہرہ کے تندرست حصے کو پہلے دھوئے پھر بیمار حصے کی طرف سے تیمم کرے، یا اس کے برعکس اگر جبیرہ ہاتھ پر ہے تو سر کے مسح سے پہلے اور چہرہ دھونے کے بعد تیمم واجب ہے۔ جبیرہ دو یا تین اعضاء پر ہو تو اتنے ہی تیمم بھی واجب ہیں۔ کسی کے چہرہ اور ہاتھ پر جبیرہ ہے تو چہرہ کے تندرست حصے کو دھوئے اور بیمار حصے کی طرف سے تیمم کرے پھر ہاتھ میں بھی اسی طرح دھوئے اور تیمم کرے۔ (جہاں بھی تیمم کا لفظ آئے تو اس سے چہرہ اور ہاتھ کا تیمم مراد ہے۔ بیمار عضو پر مٹی پھیرنا مراد نہیں ہے)

وضو کے چاروں اعضاء مکمل زخمی ہوں (کسی حصے میں بھی پانی استعمال نہیں کر سکتے) تو چاروں کی طرف سے ایک تیمم کافی ہے۔ اس لئے کہ دھونا ساقط ہونے کی وجہ سے ترتیب ساقط ہو گئی۔ اگر سر پورا زخمی ہو اور بقیہ تینوں اعضاء کا بعض حصہ، تو اعضاء کے تندرست حصوں کو دھونا، اور چار تیمم کرنا ضروری ہے۔

دونوں ہاتھ میں زخم ہو تو مستحب ہے کہ ہر ہاتھ کو ایک عضو سمجھے، لہٰذا چہرہ دھونے کے بعد دائیں ہاتھ کا تندرست حصہ دھوئے اور بیمار حصے کے بدلے تیمم کرے، پھر اسی طرح بائیں کو دھوئے اور تیمم کرے۔ اسی طرح دونوں پیروں کی صورت میں کرے، یہ بہتر شکل ہے۔ اس لئے کہ طہارت میں دائیں کو مقدم رکھنا سنت ہے، اور صرف ایک ہی تیمم (دونوں ہاتھ کیلئے) کرنے میں دونوں بیک وقت پاک ہوئے۔ (اگرچہ یہ صورت بھی کافی ہے) جبیرہ کی صورت میں مذکورہ تینوں اُمور درج ذیل دو شرائط کے ساتھ کافی ہونگے۔ (۱) جبیرہ کے نیچے تندرست حصہ صرف اتنا آیا ہو جو جبیرہ کے باندھنے میں لابدی اور ضروری ہے۔ (۲) جبیرہ پاکی کی حالت میں (باوضو) باندھا ہو۔ اگر پاکی میں نہیں باندھا اور نکالنا ممکن ہو تو نکال کر پاکی کے بعد باندھے۔ ممکن نہ ہو تو رہنے دے، لیکن صحت کے بعد نمازوں کی قضاء واجب ہے۔ اگر پاکی میں باندھا ہو تو بعد میں قضاء کی ضرورت نہیں۔ مذکورہ ساری تفصیل اس وقت ہے جبکہ پاکی کیلئے جبیرہ نہ ہٹا سکے۔ اگر بغیر ضرر کے ہٹا سکتا ہے تو ہٹانا واجب ہے۔ اب ممکن ہو تو تندرست حصہ دھوئے۔ اگر دھو نہیں سکتے اور عضو تیمم میں ہے۔ تو تیمم کے طور پر مسح کرے۔

دوسری حالت۔ جبیرہ کی ضرورت نہ ہو وہ اور پانی لگنے میں خطرہ ہو۔ اس صورت میں تندرست حصے کو ممکنہ حد تک دھوئے۔ یہ ترکیب اپنائے۔ کہ کپڑے کا تر ٹکڑا رکھ کر اس پر زور دے تاکہ نکلنے والے قطرات سے تندرست حصہ دھل جائے خود یہ عمل کرنا یا اجرت دے کر کروانا اس پر لازم ہے۔ اور تیمم کرنا بھی واجب ہے تاکہ ٹوٹا ہوا حصہ بغیر طہارت کے نہ رہے۔ اگر مرض مذکور عضو تیمم میں ہے، تو اس پر مٹی پھیرے، اسی طرح زخم کے منہ کھلے ہوں اور اس پر مٹی پھیر سکتے ہیں، تو پھیرنا واجب ہے۔

(۷) **زخم**: زخم پر کبھی مرہم یا پٹی چپکانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس وقت اس کا حکم بھی جبیرہ کی گذشتہ تفصیلات کے مطابق

ہو گا۔ اور کبھی مرہم وغیرہ کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس صورت میں تندرست حصہ دھوئے اور زخم کے بدلے تیمم کرے۔ زخم پر پانی سے مسح کرنا واجب نہیں اور نہ تو زخم پر مرہم یا جبیرہ لگا رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر مسح کرے۔

تندرست حصہ دھوئے، اور مرض یا ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے تیمم کرے اور حائل پر یا براہ راست مسح کرے، اور اس طہارت سے ایک فریضہ ادا کرے، تو نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتا ہے۔ دوسرا فرض ادا کرنا ہو تو تیمم کا اعادہ ضروری ہے لیکن وضو یا غسل کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جنبی کے زخم اعضاء وضو پر نہ ہوں، اور تندرست اعضاء کو دھو کر زخم کیلئے تیمم کرنے کے بعد فرض نماز پڑھنے سے پہلے وضو ٹوٹے تو صرف وضو کرنا لازم ہے۔ تیمم لازم نہیں، اس لئے کہ اس کا تیمم اعضاء وضو کی طرف سے نہیں ہے، لہٰذا حدث کی وجہ سے اس پر اثر نہیں پڑے گا۔ فرض نماز پڑھنے کے بعد وضو ٹوٹے تو اب نفل نمازوں کیلئے صرف وضو کرے تیمم کی ضرورت نہیں۔ (لیکن دوسرا فرض پڑھنے کیلئے تیمم بھی کرنا ہو گا۔) (حاشیۃ الجمل)

مذکورہ تفصیل کے مطابق کسی مریض نے طہارت حاصل کی، بعد میں وہ تندرست ہوا، اور طہارت ابھی باقی ہے، تو (جنبی ہو یا محدث) محل عذر کو دھوئے اور محدث محل عذر کے بعد کے اعضاء کو بھی دھوئے (اس لئے کہ وضو میں ترتیب ضروری ہے۔ لہٰذا عذر ہاتھ میں تھا تو اب ہاتھ دھونے کے بعد سر کا مسح اور پیر کا دھونا ضروری ہے۔) طہارت کے بعد معلوم ہوا کہ عذر ختم ہو چکا تھا تو تیمم باطل ہوا اور محل عذر کا دھونا واجب ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ زخم مندمل (اچھا) ہو چکا ہو گا۔ مرہم نکالا تو معلوم ہوا کہ ابھی مندمل نہیں ہوا تو تیمم باطل نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس پانی نہ ہونے سے تیمم کرنے کے بعد پانی ہونے کا وہم گذرے، تو تیمم باطل ہو گا۔

دوسرا باب۔ تیمم کی کیفیت

تیمم کے سات ارکان ہیں۔

(۱) مٹی (بعض علماء نے مٹی کو تیمم کے رکن میں شمار نہیں کیا۔ کما فی الحاشیۃ) مٹی پاک، خالص، اور غیر مستعمل ہونا شرط ہے۔ مٹی ہو نا بالکل متعین ہے۔ سرخ، سیاہ، زرد، خاکستری، ارمنی مٹی، جو بطور دوا کھائی جاتی ہے، نالہ کی مٹی، شور زمین کی مٹی، جس پر کچھ اُگے نہیں یہ ساری انواع اس میں داخل ہیں۔ کپڑے یا دیوار وغیرہ پر ہاتھ مارنے سے گرد اڑتی ہو تو یہ کافی ہے۔ مٹی کے ڈھیلے سے دیمک جو مٹی نکالتی ہے۔ اس سے تیمم جائز ہے۔ جیسا کہ سرکہ سے گندھی ہوئی مٹی خشک ہونے کے بعد اس سے تیمم جائز ہے۔

چونے کا پتھر، گچ، ہڑتال، دیگر معدنیات، ذریرہ (ایک قسم کی خوشبو) اور پسے ہوئے پتھر جیسے اشیاء سے تیمم صحیح نہ ہو گا۔۔ مٹی کو جلا کر راکھ کر دیا، یا ٹھیکری کو کوٹ کر ملائم کر دیا، تو اس سے تیمم جائز نہیں۔

گارے کو بھون کر کوٹا یا مٹی آگ سے سیاہ ہوئی، جلی نہیں تو اس سے تیمم جائز ہے۔ ریت اگر سخت ہو، اسمیں گرد نہ ہو، تو تیمم کیلئے اس پر ہاتھ مارنا کافی نہیں، ہاتھ مارنے سے گرد اٹھے تو کافی ہے۔ مٹی پاک ہونا لازم ہے، نجس مٹی سے تیمم صحیح نہ ہو گا۔ اگر کتے کی پشت پر مٹی ہو جو اس کے بدن پر کی کسی رطوبت مثلاً پانی یا پسینہ وغیرہ سے ملی ہوئی۔ ہو تو اس سے تیمم جائز نہیں، ورنہ جائز ہے۔ رطوبت سے ملی ہے یا نہیں معلوم نہ ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ مٹی خالص ہونا لازم ہے۔ زعفران آٹا وغیرہ اس میں شامل ہو تو اس سے تیمم جائز نہیں۔ قلیل و کثیر کا کوئی فرق نہیں۔ مٹی غیر مستعمل ہونا بھی ضروری ہے۔ تیمم کے وقت عضو سے چپکی ہوئی اور جھڑنے والی مٹی مستعمل ہے۔

(۲) مٹی کا قصد کرنا ضروری ہے۔ کوئی ہوا کے رخ پر کھڑا ہو جائے اور ہوا مٹی اڑا کر اس کے بدن پر ڈال دے پھر یہ تیمم کی نیت

سے ہاتھ پھیرے تو یہ کافی نہیں چاہے مٹی ہی کی نیت سے ہوا میں کھڑا ہو۔

کسی دوسرے نے بغیر اجازت کے تیمم کرایا، تو صحیح نہ ہوگا۔ اجازت سے کرایا ہے تو صحیح ہے، کوئی عذر ہو یا نہ ہو۔

(۳) جس مٹی سے مسح کرنا ہے، اسے عضو کی طرف منتقل کرنا۔ چہرہ پر مٹی تھی، تیمم کی نیت سے اسے ہی پھیر دیا تو یہ کافی نہیں۔ اگر چہرہ سے ہاتھ کی طرف یا ہاتھ سے چہرہ کی طرف منتقل کیا، چہرہ سے مٹی لے کر پھر چہرہ پر پھیر دیا، یا کسی بھی عضو پر کی مٹی کو لے کر چہرہ یا ہاتھ پر پھیر دیا۔ یا ہوا نے آستین پر مٹی ڈال دی اور اس سے چہرہ کا مسح کر لیا، یا ہوا میں اڑ کر آنے والی مٹی کو لے کر پھر استعمال کیا، تو ان تمام صورتوں میں تیمم صحیح ہے۔ عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے زمین پر لوٹ پوٹ ہوا تو جائز ہے۔

(۴) نیت واجب ہے، رفع حدث کی یا جنبی نے رفع جنابت کی نیت کی تو تیمم صحیح نہ ہوگا۔ اگر "اِسْتِبَاحَۃُ الصَّلٰوۃِ" (نماز مباح اور جائز ہونے) کی نیت کی ہے۔ تو اس کی چار صورتیں ہوں گی۔

(الف) فرض اور نفل دونوں نمازوں کے استباحت کی نیت کرے۔ اس صورت میں دونوں جائز ہوں گے۔ فرض سے پہلے اور بعد میں وقت کے اندر اور بعد میں جب چاہے نفل پڑھ سکتا ہے۔

فرض کے تعین کی ضرورت نہیں (یعنی ظہر کی نماز یا عصر کی نماز کے استباحت کی نیت) صرف فرض کی نیت کی تو کوئی بھی فرض پڑھ سکتا ہے۔ معین فرض کی نیت کی ہے تو اس تیمم سے دوسری فرض نماز پڑھ سکتا ہے (معین ہی پڑھنا ضروری نہیں)

(ب) پنجوقتہ نماز یا منذورہ نماز میں سے کسی فرض نماز کے استباحت کی نیت کی، نفل نماز سے تعرض نہیں کیا، تب بھی فرض کے ساتھ نفل، پہلے یا بعد، وقت میں یا وقت گذرنے کے بعد، پڑھنا جائز ہے۔

دو قضاء نماز یا دو منذورہ نماز کی نیت سے تیمم کیا تو ایک نماز پڑھنا جائز ہے۔ قضاء نماز کیلئے تیمم کیا۔ لیکن اس کے ذمہ قضاء نہیں تھی یا ظہر کی قضاء کیلئے تیمم کیا اور عصر کی قضاء ذمہ تھی تو تیمم صحیح نہیں ہوگا۔

اپنے اوپر قضاء نماز کا گمان تھا، جس کے لئے تیمم کیا۔ پھر قضاء یاد آئی (یعنی تیمم کے بعد گمان یقین سے بدل گیا۔) تو یہ تیمم صحیح نہیں ہے۔

(ج) نفل کی نیت سے تیمم کرے، اس تیمم سے فرض نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، نفل جائز ہے۔ مس مصحف، یا سجدۂ تلاوت، یا شکر کی نیت سے، یا جنبی اعتکاف، یا تلاوت کی نیت سے تیمم کرے، تو یہ نفل کی نیت کی طرح ہے، فرض نماز اس سے جائز نہیں جس کی نیت کی وہ جائز ہے۔ نماز جنازہ کی نیت سے تیمم کیا تو یہ نفل کی نیت کی طرح ہے۔

حیض کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد عورت وطی (صحبت) مباح ہونے کی نیت سے تیمم کرے تو صحیح ہوگا، اور نفل کے تیمم کی طرح ہوگا۔

(د) صرف نماز کی نیت کرے (یعنی فرض و نفل کی صراحت نہ کرے) اس کا حکم نفل کی نیت کی طرح ہے خلاصہ یہ کہ فرض نماز کی نیت کی ہو تو تمام امور جائز، نفل یا نماز یا نماز جنازہ یا خطبۂ جمعہ کی نیت ہو تو فرض عین نماز کے علاوہ سب جائز، اور نماز کے علاوہ کسی چیز کی نیت سے نماز جائز نہ ہوگی، بقیہ امور جائز ہونگے۔ (حاشیۃالجمل ۱/۲۲۰)

اگر تیمم کی یا فرض تیمم، کی ادائیگی کی نیّت کرے تو صحیح نہ ہوگا۔ استباحت نماز کی نیت سے تیمم کیا، یہ گمان کرتے ہوئے کہ حدث اصغر ہے، حالانکہ حدث اکبر تھا، یا اس کے بر عکس، تو تیمم صحیح ہوگا عمداً اس طرح کرنے سے صحیح نہ ہوگا۔

سفر میں جنبی ہوا اور بھول گیا، پھر بعض نمازوں کو تیمم سے اور بعض کو وضو سے ادا کیا تو یاد آنے پر صرف وضو سے پڑھی گئی نمازوں

کا اعادہ کرے گا۔ (اس لئے کہ جنابت وحدث کی صورت میں تیمم میں کوئی فرق نہیں)

تیمم کے پہلے فرض سے نیت کا مؤخر ہونا جائز نہیں ہے، اور تیمم کا پہلا فرض مٹی منتقل کرنا ہے۔ (لہٰذا مٹی منتقل کرتے وقت ہی نیت ہونی چاہیئے۔) مٹی منتقل کرتے وقت نیت تھی لیکن چہرہ کا مسح شروع کرنے سے پہلے ہی غائب ہوئی۔ تو یہ کافی نہیں (بلکہ مٹی کے منتقل کرنے سے چہرہ کا مسح شروع ہونے تک نیت کا موجود رہنا ضروری ہے۔ فتح الوہاب وغیرہ) اوّل فرض سے پہلے ہی نیت کر لی تو وہی تفصیل ہے جو وضو میں گذر چکی۔

(۵) **چہرہ کا مسح کرنا:** پورے چہرہ کا مسح ضروری ہے وضو میں جن بالوں کی جڑ میں پانی پہنچانا ضروری ہے، تیمم میں مٹی کا وہاں پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ البتہ داڑھی کے لٹکتے بالوں کے ظاہر پر مٹی کا مسح ضروری ہے۔

ہونٹ کے اوپر ناک کے اگلے حصے پر بھی مسح ضروری ہے۔ ناخن کے نیچے مٹی پہنچانا واجب نہیں ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۲۲۰)

(۶) **دونوں ھاتھ کا مسح کرنا:** دونوں ہاتھ کا کہنیوں سمیت مکمل مسح کرنا واجب ہے۔

تیمم کیلئے دو ضرب واجب ہیں۔ (یعنی دو مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا) حقیقتاً ضرب کا پایا جانا واجب نہیں ہے، بلکہ نرم مٹی پر صرف ہاتھ رکھ دیا اور اس پر غبار لگ گیا تو یہ کافی ہے۔

حدیث: "اَلتَّیمُمُ ضرْبتَانِ، ضَربَۃ" لِلْوجْہِ وَضَربَۃ" لِلیَدینِ اِلی المِرْفقینِ"

ترجمہ: تیمم کیلئے دو ضرب ہیں، ایک ضرب چہرہ کیلئے، اور ایک ضرب کہنیوں سمیت دونوں ہاتھ کیلئے (رواہ الدارقطنی، والحاکم والبیہقی)

اصل مقصود یہ ہے کہ دو مرتبہ مٹی منتقل کرنا پایا جائے، ایک ہی مرتبہ منتقل کرکے مکمل تیمم کر لینا کافی نہیں۔ دو سے زیادہ مرتبہ منتقل کرنا مکروہ ہے۔ چہرہ کا مسح اوپر کی طرف سے شروع کرنا مستحب ہے۔

ھاتھ کے مسح کی کیفیت: بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے علاوہ دیگر انگلیوں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے علاوہ دیگر انگلیوں کے پشت پر اس طرح رکھے، کہ دائیں انگلیوں کے پورے بائیں کے شہادت کی انگلی سے آگے نہ نکلیں پھر ہتھیلی کے پشت پر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسح کرتے ہوئے آگے بڑھے، جب ہتھیلی کے کنارے پر پہنچے تو انگلیوں کے کناروں کو بازو کے کنارے سے ملائے اور اس طرح کہنی تک پھیرتا چلا جائے پھر ہتھیلی کو بازو کے باطن کی طرف پھرا کر واپس گٹے تک لائے، انگوٹھا جدا ہی رہے، گٹے تک آنے کے بعد بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے بطن سے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے پشت پر مسح کرے، پھر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اسی طرح بائیں ہاتھ کا مسح کرے، اس کیفیت کے ساتھ مسح کرنا واجب نہیں، مستحب ہے۔

دونوں ضرب کی ابتداء میں انگلیوں کو کشادہ رکھنا مستحب ہے۔ دونوں میں یا دوسری ضرب میں کشادہ رکھا تو ہاتھ کے مسح کے بعد انگلیوں کا خلال مستحب ہے، ورنہ واجب ہے۔ پھر ایک ہتھیلی کا دوسرے پر پھیرنا مستحب ہے۔ اصل واجب مٹی کا چہرہ اور ہاتھ تک پہنچانا ہے، ہاتھ سے، کپڑے سے، یا لکڑی سے، کسی بھی طرح پہنچائے، ہاتھ کا عضو پر پھیرنا ہی کوئی شرط نہیں۔ مسح کے دوران ہاتھ اٹھا لیا پھر واپس رکھ کر مسح مکمل کیا تو کافی ہے، نئی مٹی لینا واجب نہیں۔

(۷) **ترتیب:** چہرہ کا مسح ہاتھ سے قبل کرنا واجب ہے۔ اگر بھول سے بھی اس کے برعکس ہوا تو تیمم صحیح نہیں ہوگا۔ مٹی کے لینے میں ترتیب واجب نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دائیں سے پورے چہرے کا مسح کر پائے اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا مسح کر

لے تو جائز ہے۔

مٹی لینے کے بعد چہرہ کے مسح سے قبل حدث (وضو توڑنے والا کوئی سبب) واقع ہوا، تو یہ مٹی لینا باطل ہوا، دوبارہ مٹی لینا ضروری ہے۔ تیمم کیلئے ایسی عورت کے بدن پر ہاتھ مارے جس کی کھال کو مس ہونے سے وضو ختم ہو گا، اور اس کے بدن پر مٹی اتنی زیادہ لگی ہوئی ہے کہ دونوں کی کھال مس نہیں ہو گی، تو تیمم صحیح ہے، اور مٹی کی کمی کی وجہ سے کھال کو مس ہو تو تیمم صحیح نہیں ہے۔

تیمم کی سنتیں

بعض سنتوں کا ذکر چہرہ اور ہاتھ کے مسح کی کیفیت میں گذر چکا۔ دیگر سنن درج ذیل ہیں۔

تیمم کے ابتداء میں ''بسم اللہ'' پڑھنا، دائیں کو بائیں پر مقدم رکھنا، کہنیوں سے اوپر بازو کے بقیہ حصہ کا بھی مٹی سے مسح کرنا، موالات۔ (تیمم کے افعال کو پے درپے کرنا) لی ہوئی مٹی زیادہ ہو تو جھاڑ کر کم کرنا۔

ایک سے زیادہ مرتبہ مسح نہ کرنا، (مسح میں تکرار مکروہ ہے) مسح مکمل ہونے سے پہلے عضو پر سے ہاتھ نہ اٹھانا۔ پہلی مرتبہ ہاتھ مارتے وقت انگشتری ہو تو اُتارنا۔ دوسری مرتبہ ہاتھ مارنے کے وقت انگشتری اتارنا واجب ہے۔ صرف اسے حرکت دینا کافی نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مٹی اندر داخل ہونے والی نہیں، (بخلاف وضو کے، وضو میں انگشتری کو صرف حرکت دینے سے پانی اندر چلا جائے گا اس لئے وہ کافی ہے) در حقیقت مقصود دوسری مرتبہ مسح کے وقت انگوٹھی کا نہ ہونا ہے، تاکہ مکمل ہاتھ کا مسح ہو سکے۔ مٹی منتقل کرتے وقت انگوٹھی ہو اور مسح سے پہلے اتار دے تو کافی ہے۔ انگلی میں ہی کچھ آگے کر کے اس حصے تک مٹی پہنچا دینا بھی کافی ہے۔ انگوٹھی کافی چوڑی ہو کہ حرکت دینے سے مٹی اندر پہنچ جائے۔ تو اتارنا واجب نہیں۔ (حاشیہ الجمل ۱/۲۲۶)

دیگر سنتیں: استقبال قبلہ، تیمم کے بعد شہادتین کا پڑھنا، تیمم سے قبل مسواک کرنا، وضوٗ کے بعد کے اذکار پڑھنا، تیمم کے بعد دو رکعت پڑھنا، تیمم میں اور نماز میں زیادہ فاصلہ نہ ہو، ابتداء میں ''بسم اللہ'' پڑھنا اگر بھولے، تو دوران تیمم یاد آنے پر پڑھ لے، بہتر یہ ہے کہ تیمم کے بعد نماز سے فارغ ہونے تک مٹی کے اثرات کو اعضاء سے صاف نہ کرے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۲۲۱)

تیمم کی صحت کیلئے بدن پر کسی نجاست کا نہ ہونا شرط ہے، بدن پر نجاست ہوتے ہوئے یا استنجاء سے قبل تیمم کرے تو صحیح نہ ہو گا۔ تیمم کرنے کے بعد بدن پر نجاست لگنے سے تیمم باطل نہ ہو گا۔

کپڑے پہننے پر قادر ہوتے ہوئے پہننے سے قبل تیمم کر لے، تو صحیح ہو گا۔ قبلہ کی تعین کیلئے اجتہاد کرنے سے پہلے تیمم کرے تو صحیح ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۲۲۰)

تیسرا باب۔ تیمم کے احکام

(۱) **جن اسباب سے وضو ٹوٹتا ہے تیمم بھی ٹوٹتا ہے۔** پھر تیمم کی دو قسمیں ہے۔ (الف) وہ تیمم جو پانی کی موجودگی میں بھی جائز ہے۔ جیسے مریض کا تیمم (ب) صرف پانی کی غیر موجودگی، یا اس کی تحصیل میں خطرہ، یا پانی کی ضرورت، جیسی صورتوں میں جائز ہے۔ پہلی قسم میں پانی نظر آنے سے تیمم پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ دوسری قسم میں نماز شروع کرنے سے پہلے پانی پر قدرت کا وہم بھی حاصل ہو، تو تیمم باطل ہو گا۔ جیسے کوئی سراب (ریگستانی ریت جو دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی کی وجہ سے پانی جیسا نظر آتا ہے) دیکھ کر پانی سمجھے، یا اطراف میں بادل گھر جائیں، یا چند لوگ نمودار ہوں جن کے پاس پانی ہونے کا امکان ہو لیکن پانی کے وہم کے

ساتھ اس کے استعمال سے کوئی امر مانع (رکاوٹ) ہو، تو تیمم باطل نہ ہوگا، جیسے پانی نظر آئے لیکن پیاس کیلئے اس کی ضرورت ہے یا پانی کی تحصیل میں کسی درندہ یا دشمن کی وجہ سے رکاوٹ ہے یا کنویں کی گہرائی کی وجہ سے پانی نظر آتے وقت ہی اس کا حصول متعذر ہونا معلوم ہو۔ یا کسی کو یہ اعلان کرتے سنا کہ فلاں شخص نے بطور ودیعت (امانت) میرے پاس پانی رکھا ہے۔ اور یہ اس فلاں کے وہاں موجود نہ ہونے سے واقف ہو اور اس طرح کی دیگر رکاوٹیں۔

ایسی نماز میں پانی نظر آئے۔ جس کا بعد میں قضاء کرنا ضروری ہے تو تیمم باطل ہوگا، جیسے مقیم کا تیمم سے نماز پڑھنا۔ اور بعد میں قضاء کی ضرورت نہیں جیسے مسافر کی نماز، تو پانی نظر آنے کی وجہ سے نماز اور تیمم باطل نہ ہونگے (جبکہ تکبیر تحریمہ کی راء کے بعد نظر آئے، تکبیر تحریمہ کے دوران بھی نظر آئے تو تیمم باطل ہوگا۔ (حاشیۃ الجمل)

پانی ملنے کے بعد دوران نماز اِقامت کی نیت کر لی یا قصر کی نیت سے نماز پڑھتے وقت پانی ملا، پھر پوری نماز کی نیت کی، تو دونوں صورتوں میں نماز باطل ہو گی۔ جن صورتوں میں نماز میں پانی ملنے سے نماز باطل نہیں ہوتی، اگر پانی ملے تو نماز کو توڑ کر وضو کر کے از سرِ نو اِس فرض کو ادا کرنا افضل ہے، جبکہ وقت کے اندر مکمل نماز باوضو ادا کر سکے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے وضوء کر کے از سرِ نو پڑھنے میں مکمل نماز وقت کے اندر نہیں ہو سکتی، تو پھر نماز کو توڑنا حرام ہے۔ (تیمم کر کے جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا، اب توڑ کر وضو سے پڑھنے کی صورت میں جماعت نہیں ملے گی، اکیلے پڑھنی ہو گی، تو اس صورت میں نہ توڑ کر تیمم ہی سے جماعت کے ساتھ نماز مکمل کرنا بہتر ہے۔ حاشیۃ الجمل ۱/۲۲۵) تیمم سے فرض نماز مکمل کرے، اور سلام پھیرنے تک وہ پانی موجود ہے تو اب تیمم باطل ہو گیا۔ اس تیمم سے نفل نہیں پڑھ سکتا، بلکہ سلام سے پہلے ہی وہ پانی ختم ہو جائے، تب بھی اس تیمم سے نفل نہیں پڑھ سکتا (تیمم باطل ہو گیا۔)

سلام پھیرنے کے بعد نماز کا کوئی چھوٹا ہوا رکن یاد آئے تو اس کی تلافی کرے گا، لیکن سجدہ سہو یاد آئے تو اس کے لئے واپس نماز میں نہیں لوٹے گا۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۲۲۴) نفل نماز میں پانی نظر آئے اور نفل کی متعین رکعات کی نیت تھی، تو ان رکعتوں کو مکمل کرے، اس سے زائد نہ پڑھے اور نیت میں رکعات کی تعیین نہیں کی تھی، تو صرف دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرے۔ (لیکن دو کے بعد کسی رکعت میں پانی نظر آئے، تو اس رکعت کو مکمل کر کے سلام پھیرے (فتح الوھاب)

(۲) تیمم سے جائز ہونے والے امور: ایک تیمم سے صرف ایک ہی فرض ادا کر سکتا ہے، ایک سے زائد کی گنجائش نہیں، متفق ہوں یا مختلف (ایک ہی قسم کے فرض ہوں یا الگ الگ) جیسے، دو فرض نمازیں، دو فرض طواف، فرض نماز اور طواف، دو ظہر کی قضاء، مکتوبہ اور منذورہ یا دو منذورہ، کو ایک تیمم سے ادا کرنا جائز نہیں، کم سن بھی اس حکم میں بالغ کی طرح ہے (حضرت علی، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ہر نماز کے لئے تیمم مروی ہے) ایک ہی تیمم سے ایک فرض اور کئی سنتوں کو ادا کر سکتا ہے طواف کے بعد کی دو رکعت نماز سنت ہے، اس لئے ایک تیمم سے طواف اور اس نماز کو ادا کر سکتے ہیں۔ جمعہ کے خطبہ اور نماز کو ایک تیمم سے نہیں ادا کر سکتے۔ ایک تیمم سے کسی فرض کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر سکتے ہیں۔

کسی نماز کو بھول جائے جیسے ہفتہ میں کسی دن کی ظہر، تو تیمم کر کے ایک ظہر پڑھ لے۔ پنجوقتہ نماز میں سے ایک نماز قضاء ہو اور کونسی ہے۔ یاد نہیں، تو پانچوں نماز پڑھنا واجب ہے۔ ان پانچوں کیلئے ایک ہی تیمم کافی ہے۔

پنج وقتہ میں سے دو مختلف نمازیں قضاء ہوں، اور کون کون سی ہیں یاد نہیں، تو بہتر یہ ہے کہ دو تیمم کرے۔ ایک تیمم کر کے فجر، ظہر، عصر، مغرب، پڑھے پھر دوسرا تیمم کر کے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء پڑھ لے۔ اگر پانچ تیمم سے پانچ نماز پڑھ لے تب بھی کافی ہے۔ دو

متفق قضاء نمازوں کو بھول جائے (جیسے کسی کی دو دن ظہر قضاء ہوئی، پھر یاد نہیں رہا کہ کونسی نماز قضاء ہوئی تھی۔) تو پانچوں نمازوں کو دو مرتبہ پڑھنا ضروری ہے۔ ایک تیمم کرکے پانچ نمازیں، پھر دوسرے تیمم سے پانچ نمازیں ادا کرے۔ اگر یہ یاد نہ ہو کہ دو قضا نمازیں متفق ہیں یا مختلف تو احتیاطاً متفق سمجھتے ہوئے اسی کیفیت کے ساتھ ادا کرنا لازم ہے۔ ایک فرض نماز یا کوئی فرض طواف چھوٹنے کے درمیان اشتباہ واقع ہو، تو ایک تیمم کرکے ایک طواف اور پانچوں نمازیں پڑھ لے۔ تیمم کرکے تنہا نماز پڑھ لی، پھر اسی تیمم سے اس نماز کو جماعت کے ساتھ دوبارہ پڑھ سکتا ہے۔ تیمم سے کسی فرض کو ایسے طور پر پڑھے کہ پھر اعادہ لازم ہے تو اسی تیمم سے اعادہ کرنا جائز ہے۔ (مثلاً کوئی بندھا ہوا تھا۔ تیمم کرکے اسی حال میں نماز ادا کی پھر چھوٹ گیا تو اسی تیمم سے صحیح طریقے سے نماز ادا کرسکتا ہے۔ جمل)

فرض کیلئے تیمم کا وقت: کسی فرض کیلئے وقت سے پہلے تیمم جائز نہیں ہے۔ اگر کیا تو فرض یا نفل کیلئے یہ تیمم صحیح نہیں ہے۔ جمع بین الصلاتین (مسافر کا ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کو ایک وقت پڑھنا) میں پہلی نماز کے وقت دوسری بھی تیمم سے پڑھ لینا صحیح ہے۔ اس لئے کہ پہلی کا وقت ہی اس صورت میں دوسری کا بھی وقت ہے۔ تیمم کرکے ظہر پڑھ لی پھر عصر کو جمع کرکے پڑھنے کیلئے تیمم کرنے کے بعد عصر کا وقت شروع ہو گیا تو جمع اور تیمم باطل ہو گئے۔ (اب پھر تیمم کرکے عصر پڑھ لے۔) قضاء نماز کا وقت یاد آنے پر ہے۔

کسی ادا نماز کیلئے اوّل وقت میں تیمم کرکے آخری وقت میں نماز پڑھی تو جائز ہے۔ کسی قضاء نماز کیلئے چاشت کے وقت تیمم کیا، پھر اس کے پڑھنے سے پہلے ظہر کا وقت شروع ہو جائے تو اس تیمم سے ظہر کی نماز ادا کرسکتا ہے۔ ظہر کیلئے تیمم کرنے کے بعد کوئی قضاء نماز یاد آئے تو اس تیمم سے پڑھ سکتا ہے۔

سنتوں کیلئے تیمم کا وقت: سنتیں مؤقت ہونگی یا غیر مؤقت (وقت متعین ہے تو مؤقت ورنہ غیر مؤقت کہیں گے) فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی رواتب سنتیں، نماز عید، سورج گہن یا چاند گہن کی نماز مؤقت نمازیں ہیں، جن کے اوقات معروف ہیں۔ استسقاء کی نماز کا وقت اس کے لئے میدان میں جمع ہونا ہے، جنازہ کی نماز کا وقت میت کے غسل سے فارغ ہونا ہے، ان مؤقتہ سنت نمازوں کیلئے وقت سے پہلے تیمم کیا تو صحیح نہ ہو گا۔

غیر مؤقت نمازوں کیلئے (جو کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں) مکروہ اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت تیمم کرنا صحیح ہے، مکروہ وقت میں کیا تو صحیح نہ ہو گا (مکروہ اوقات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) مکروہ وقت سے پہلے تیمم کرنے کے بعد مکروہ وقت شروع ہونے سے یہ تیمم باطل نہ ہو گا، مکروہ وقت ختم ہونے کے بعد اس تیمم سے مذکورہ سنت نماز پڑھ سکتے ہیں۔

فرض نماز کے وقت سے پہلے مٹی ہاتھ میں لی، پھر وقت ہونے کے بعد اس سے چہرہ کا مسح کیا تو صحیح نہ ہو گا، اس لئے کہ مٹی لینا بھی تیمم کے واجبات میں داخل ہے، لہٰذا وقت سے پہلے صحیح نہ ہو گا۔ وقت شروع ہونے میں شک ہو اور تیمم کرے، تو حقیقتاً وقت میں تیمم واقع ہوا ہو، تب بھی صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح وقت ہونے میں شک ہوتے ہوئے پانی کی تلاش کافی نہیں، چاہے حقیقتاً وقت میں تلاش واقع ہو۔

(۳) نماز کی قضاء: عذر یا تو عام ہو گا یا نادر (کبھی کبھار پیش آنے والا)

عام عذر: عام عذر کی صورت میں نماز کی قضاء نہیں ہے، جیسے محدث یا جنبی مسافر کا وضوء یا غسل کیلئے پانی نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کرکے نماز پڑھنا، جبکہ گناہ کا سفر نہ ہو۔ گناہ کے سفر میں تیمم اور قضاء دونوں واجب ہیں۔

گناہ کے سفر میں پانی ہوتے ہوئے پیاس یا مرض کی وجہ سے تیمم کرے، تو صحیح نہیں ہے، بلکہ پہلے اس گناہ سے توبہ کرے پھر تیمم کرے گا۔ اور حقیقتاً پانی ہے ہی نہیں تو تیمم صحیح ہو گا، لیکن بعد میں قضاء واجب ہے۔ (حاشیۃ الروضہ والجمل ۱/۲۳۳) طویل و قصیر

(مختصر) سفر کا ایک ہی حکم ہے۔

اسی طرح مریض کا تیمم کر کے یا بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنا، اور شدت خوف کے وقت اشارہ سے نماز پڑھنا عام اعذار میں داخل ہیں۔

نادر عذر: یہ دو طرح کے ہیں۔(۱) جو غالبا دائم رہتا ہے (۲) جو دائم نہیں رہتا۔ دائم عذر کی صورت میں قضاء کی ضرورت نہیں، جیسے استحاضہ، سلسل البول، سلس المذی، ایسا زخم جس سے مسلسل خون بہتا ہو، ہمیشہ ریح خارج ہوتی رہے، چاہے اس کا کچھ بدل ہو یا نہ ہو۔ غیر دائم عذر کی دو قسمیں ہیں۔(۱) جس میں بدل ہو (۲) جس میں بدل نہ ہو۔ جس غیر دائم عذر میں بدل نہیں قضاء واجب ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) پانی اور مٹی دونوں نہ ملے۔ تو فرض نماز پڑھنا اور بعد میں قضا کرنا دونوں واجب ہیں۔ لیکن قرآن کو چھونا۔ جنبی یا حائضہ کا تلاوت کرنا، حائضہ سے (حیض کے بعد) وطی کرنا ناجائز ہے۔ نماز میں پانی یا مٹی ملے تو نماز باطل ہو جائے گی۔

(۲) کسی ستون سے بندھا ہو یا زمین سے مضبوط بندھا ہوا ہو، ایسا شخص اشارہ سے نماز پڑھے۔ اور بعد میں اعادہ کرے، اسی طرح سمندر میں کسی تختے کے سہارے ڈوبنے سے بچنے والا اشارہ سے نماز پڑھے، بعد میں دوہرائے۔

(۳) کسی کے زخم میں نجاست ہو جس کے دھونے سے تلف ہونے کا خطرہ ہو یا کوئی نجس جگہ مقید ہو تو یہ دونوں اسی حال میں نماز پڑھ کر بعد میں اعادہ کریں گے۔

جس غیر دائم عذر میں بدل ہے اس کی درج ذیل صورتیں ہیں۔

(۱) مقیم پانی نہ ہونے کے سبب تیمم کرلے تو اس پر اعادہ واجب ہے۔ اس لئے کہ حالت اقامت میں پانی نہ ملنا نادر ہے۔ مسافر پر اس صورت میں اس لئے قضاء نہیں ہے کہ سفر میں پانی نہ ملنا عام عذر ہے۔ یہ ضابطہ علماء عموماً پیش کرتے ہیں حالانکہ دراصل سفر واقامت کی تخصیص نہیں، لہٰذا کوئی بے آب بیابان یا کسی اور جگہ جہاں غالباً پانی نہیں ملتا قیام کرے، اور طویل مدت تک وہاں مقیم رہ کے تیمم سے نماز پڑھتا رہا، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور اگر مسافر دوران سفر کسی بستی میں داخل ہوا اور پانی نہ ہونیکی وجہ سے تیمم سے نماز پڑھی تو اعادہ واجب ہے، حالانکہ سفر کا حکم باقی ہے۔ لیکن چونکہ اقامت میں غالباً پانی میسر اور سفر میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اس لئے علماء یوں تعبیر کر دیتے ہیں۔

(۲) بعض اعضاء میں عذر کی وجہ سے تیمم کرنا، اگر اس عضو پر جبیرہ یا مرہم وغیرہ ساتر نہ ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں، اور اگر ساتر ہو جسے پاکی کی حالت میں رکھا گیا ہے، تو اعادہ واجب نہیں، ورنہ واجب ہے۔ لیکن یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ جبیرہ تیمم کی جگہ میں نہ ہو۔ اگر تیمم کے عضو پر جبیرہ ہو تو ہر حال میں بعد میں اعادہ واجب ہے۔

(۳) سخت سردی کی وجہ سے تیمم کرنا، اس صورت میں بعد میں اعادہ واجب ہے۔

جبیرہ کی وجہ سے نماز کا اعادہ: اگر جبیرہ اعضاء تیمم (چہرہ یا ہاتھ) میں ہو، تو ہر حال میں اعادہ واجب ہے بدل اور مبدل منہ (تیمم اور وضو) دونوں کے ناقص ہونے کی وجہ سے۔ اعضاء تیمم کے علاوہ میں ہو، اور جبیرہ کے باندھنے کیلئے تندرست حصہ جتنا ناگزیر تھا اس سے زائد جبیرہ کے نیچے چلا گیا ہے تو اعادہ واجب ہے، چاہے جبیرہ حدث کی حالت میں باندھا ہو یا طہارت کی حالت میں، اسی طرح صرف بقدر ضرورت تندرست حصہ نیچے چلا گیا ہے۔ لیکن جبیرہ حدث کی حالت میں باندھا ہے تو اعادہ واجب ہے، اور طہارت کی

حالت میں باندھا ہے تو اعادہ واجب نہیں ہے۔ اور تندرست حصہ بالکل ہی جبیرہ کے نیچے نہ آیا ہو تو اعادہ واجب نہیں، حدث کی حالت میں باندھا ہو یا طہر کی حالت میں، اوپر کے جملوں میں طہر (طہارت) سے، اگر جبیرہ اعضاء وضو میں ہے تو حدث اصغر اور اکبر دونوں سے طہارت مراد ہے، اعضاء وضو کے علاوہ میں ہے تو حدث اکبر سے طہارت مراد ہے (ترشیح المستفیدین ۲۵)

جو ستر چھپانے سے عاجز ہو وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے، اور رکوع وسجدہ کو مکمل ادا کرے (صرف اشارہ نہ کرے) سفر میں ہو یا حضر میں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کپڑا نجس ہو تو عریاں (ننگے) نماز پڑھے اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کپڑا پاک ہے لیکن نماز کی جگہ نجس ہے تو کپڑے کو بچھا کر اس پر عریاں نماز پڑھ لے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مریض کو کوئی ایسا شخص نہ ملے جو اس کو (نماز کیلئے) قبلہ رو کرے تو جس رخ پر ہے نماز پڑھ لے بعد میں اعادہ واجب ہے۔ امام الحرمین وغیرہ کا ارشاد ہے کہ جن اعذار کے دائم ہونے کی وجہ سے ہم نے فرض کو ساقط کیا تھا، اگر جلد ختم ہو جائیں تب بھی دائم ہی کے حکم میں ہیں۔ اور جن کے متعلق غیر دائم کا فیصلہ تھا، کسی کے حق میں دائم بن جائیں، تب بھی غیر دائم کے حکم میں ہوں گے۔

جن نمازوں کا وقت میں پڑھنا اور بعد میں اعادہ کرنا دونوں واجب ہیں، حقیقتاً فرض دوسری نماز ہے۔ بعض علماء کے نزدیک دونوں بھی فرض ہیں۔ ہاتھ کٹا ہو تو تیمم میں بھی اس کا حکم وضو کی طرح ہے یہاں تک کہ کسی کا ہاتھ کہنی کے اوپر سے کٹا ہو تو بازو کے بقیہ حصے کا مسح کرنا مستحب ہے۔ راستے میں گھڑے میں مسافروں کو پینے کیلئے پانی رکھا ہو، تو اس سے وضو جائز نہیں، بلکہ تیمم کرے۔ کسی مرنے والے کے پاس اتنا پانی ہو جو اس کے غسل کو ناکافی ہو، تو اسے غسل میں استعمال کریں گے (بقیہ بدن کی طرف سے بعد میں تیمم کریں گے) مرض کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ رہا تھا، دورانِ نماز شفایاب ہو گیا، تو مسافر کو دوران نماز پانی نظر آنے کی طرح ہے۔ (جس کی تفصیل ص ۱۲۹ پر گذر چکی)

جنابت یا حیض کی وجہ سے تیمم کیا پھر وضو ٹوٹا تو محدث پر جو امور حرام ہیں، وہ سب حرام ہونگے۔ تلاوت قرآن اور مسجد میں ٹھہرنا حرام نہیں۔

جنبی نے (پانی نہ ہونے کے سبب) تیمم کیا، پھر پانی نظر آیا، تو تلاوت اور دیگر جو امور حرام تھے غسل کر لینے تک حرام رہیں گے۔ امام جرجانیؒ فرماتے ہیں کہ صرف ان تین صورتوں میں فرض کا پڑھنا صحیح ہے اور نفل منع ہے (دیگر صورتوں میں فرض صحیح ہے تو نفل بدرجہ اولی صحیح ہے) (۱) فاقد الطہورین (جسے وضو کیلئے پانی اور تیمم کیلئے مٹی میسر نہ ہو) (۲) پاک ستر موجود نہ ہو (۳) بدن پر ایسی نجاست ہو جسے دور کرنے سے عاجز ہو۔

باب: موزوں پر مسح کرنا

حدیث: حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کی پھر وضو فرمایا اور موزوں پر مسح کیا۔" (متفق علیہ)

موزوں پر مسح دو شرط کے ساتھ جائز ھے: (۱) موزے کامل طہارت کی حالت میں پہنے ہوں۔ ایک پیر دھو کر اس میں موزہ پہن لیا پھر دوسرا دھویا تو مسح جائز نہیں ہے۔ اگر پہلا موزہ اتار کر پہن لیا تو اب مسح کر سکتے ہیں۔ دھونے سے پہلے پیروں کو موزے کی پنڈلی میں داخل تو کیا، (یعنی اس حصے میں جو پوری طرح موزہ پہننے پر پنڈلی پر آتا ہے) پھر دھونے کے بعد پوری طرح اندر

داخل کیا تو یہ پہننا صحیح ہے اور مسح کرنا جائز ہے۔

طہارت کی حالت میں موزہ پہننا شروع کیا، لیکن موزے کے قدم تک پیروں کے پہنچنے سے قبل ہی وضو ختم ہو گیا، تو مسح کرنا جائز نہیں۔

شرائط کے ساتھ موزے کا مسح کرنے کے بعد پیر کو موزے سے نکالنا شروع کیا لیکن ابھی محل فرض (پیر کا وہ حصہ جو وضو میں دھونا فرض ہے) میں سے کچھ ظاہر نہیں ہوا تو مسح کرنا جائز ہے۔

مستحاضہ (وہ عورت جسے بیماری کی وجہ سے شرمگاہ سے خون آتا ہو) نے اپنی وضو کے بعد موزے پہنے پھر استحاضہ کے علاوہ کوئی وضو توڑنے والا سبب پایا گیا تو وہ بھی موزے پر مسح کر سکتی ہے، لیکن اس کے خون کا سلسلہ بند ہو جائے اور مسح سے پہلے ہی یہ بیماری ختم ہو جائے تو اب مسح کی اجازت نہیں ہے۔ مستحاضہ موزے پر مسح کر کے نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتی ہے، جس وضو کے بعد موزے پہنے، اس وضو سے مستحاضہ نے فرض نماز نہیں پڑھی تھی۔ مثلاً وضو کے بعد موزہ پہن لیا۔ اور فرض نماز کی ادائیگی سے قبل ہی وضو ختم ہو گیا تو اب وضو میں موزے پر مسح کر کے ایک فرض نماز ادا کر سکتی ہے۔ اور فرض نماز کی ادائیگی کے بعد وضو ختم ہوا تو مسح کر کے نوافل تو پڑھ سکتی ہے۔ لیکن کسی بھی فرض نماز کی گنجائش نہیں۔ فرض نماز پڑھنا ہو تو موزے نکال کر طہارت کی حالت میں دوبارہ پہننے ہونگے۔

مستحاضہ ہی کے مثل سلس البول، دائم الحدث، اور زخم وغیرہ کی وجہ سے وضو کے ساتھ تیمم بھی کرنے کی صورتوں کا حکم ہے۔ صرف تیمم کرے وضو نہ کرے اور اس کا سبب پانی کی عدم موجودگی کے علاوہ کچھ ہو تو اس کا حکم بھی مستحاضہ کے مثل ہے۔ اور پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہو تو اس کو مسح کی بالکل گنجائش نہیں۔

(۲) **موزہ مسح کی صلاحیت رکھتا ہو:** (مسح کے قابل ہو) جس کیلئے درج ذیل شرائط ہیں۔ (۱) پیر کے محل فرض کو چھپانے والا ہو۔ (یعنی دونوں پیر ٹخنوں سمیت موزے کے اندر چھپ جائیں) تھوڑا بھی حصہ کھلا رہتا ہو تو مسح جائز نہیں، موزے پھٹنے کی وجہ سے پیر کے محل فرض کا تھوڑا سا حصہ بھی کھل جائے تو مسح جائز نہیں صرف استر یا ابرا (موزہ کی اندرونی تہہ یا بیرونی تہہ) پھٹ جائے اور بقیہ گف (موٹا، گاڑھا) ہو، تو مسح جائز ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح استر کچھ پھٹے اور دوسری طرف ابرا پھٹے (دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل نہ ہوں کہ پیر کھل جائے۔) اور دونوں گف (موٹے) ہوں تو مسح جائز ہے۔

موزے کے پھٹے ہوئے کناروں کو ملا کر باندھ دیا جائے اور پیر بالکل ظاہر نہ ہو، تو مسح جائز ہے، پیر کا کچھ حصہ نظر آئے تو مسح نہیں کر سکتا۔

(۲) موزے قوی اور مضبوط ہوں کہ مسافر اترنے اور سوار ہونے کے وقت بقدر احتیاج (بغیر چپل کے) اس کو پہن کر مسلسل چل سکے۔ لہٰذا صرف اون اور بال سے بنے پائتابے پر مسح ناکافی ہے (آج کل عموماً جوتے چپل میں پہنے جانے والے موزوں میں بھی یہ شرط نہیں پائی جاتی اس لئے اس پر مسح کی گنجائش نہیں ہے۔) موزہ بہت زیادہ کشادہ یا تنگ ہونے کی وجہ سے اسے پہنکر چلنا متعذر ہو تو اس پر مسح جائز نہیں۔ اسی طرح موزے کے موٹاپے یا وزن کی وجہ سے چلنا دشوار ہو جیسے لکڑے یا لوہے کا موزہ تو مسح جائز نہیں۔

لکڑے یا لوہے سے باریک موزہ بنائے جس میں چلنا ممکن ہو تو مسح جائز ہے۔ جس کو موزہ نہ کہا جا سکے جیسے چمڑے کے ایک ٹکڑے کو لپیٹ کر باندھ دینا اس پر مسح جائز نہیں۔

(۳) مغصوبہ یا چوری کا موزہ اور سونے چاندی کے موزے پر مسح صحیح ہے۔ کتے کی کھال، یا دباغت سے پہلے مردار کی کھال کے موزے پر مسح صحیح نہیں ہے، نہ مس قرآن کیلئے نہ کسی اور مقصد کیلئے۔ موزے میں دیگر شرائط ہوں لیکن پانی اندر سرایت کرتا ہو تو اس

پر مسح جائز نہیں ہے۔ موزے کا اوپری سرا اتنا کشادہ ہو کہ اندر قدم نظر آتے ہوں یا موزہ کانچ کا ہو، لیکن اسے پہن کر چل پھر سکتے ہوں تو ایسے موزوں پر مسح جائز ہے۔

جُرمُوق: غالباً ٹھنڈی کی شدت کی وجہ سے موزے کے اوپر پہنے جانے والے موزے کو جر موق کہا جاتا ہے۔ اس کی چار صورتیں ہیں (۱) اوپر کے موزے میں مسح کے شرائط ہوں، اندر کے موزے میں نہ ہوں، کمزور یا پھٹے ہونے کی وجہ سے، اس صورت میں صرف اوپر کے موزے پر مسح صحیح ہے۔

(۲) پہلے کے برعکس صورت ہو تو صرف اندرونی موزہ پر مسح صحیح ہے۔ اوپری موزہ پر صرف اسی پر مسح کے ارادہ سے مسح کرلے تو مسح صحیح نہیں، خواہ تری اندرونی موزہ تک پہنچے، لیکن دونوں کے قصد سے یا اندرونی موزہ کے قصد سے مسح کرے اور تری اندرونی موزہ تک پہنچے تو کافی ہے۔ اسی طرح کسی موزہ کے قصد کے بغیر فی الجملہ مسح کے ارادہ سے مسح کرے تب بھی کافی ہے۔

(۳) دونوں میں سے ایک میں بھی مسح کے شرائط نہ ہوں، تو مسح ممکن نہیں۔

(۴) دونوں میں مسح کے شرائط موجود ہوں تو صرف اوپری موزہ کا مسح ناکافی ہے۔ دونوں کے درمیان ہاتھ داخل کر کے اندرونی موزہ کا مسح کرلیا تو یہ جائز ہے۔ جبیرہ کے اوپر موزہ پہن لے تو اس پر مسح کافی نہیں۔

فصل۔ مسح کی کیفیت

کم سے کم جسے مسح کہا جائے وہ ضروری ہے۔ پیر کے تلوے کنارے اور ایڑی کا حصہ چھوڑ کر وضو کے محل فرض پر کہیں مسح ہونا ضروری ہے۔ ابوداود و ترمذی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے موزوں کے اوپر کی طرف مسح کرنا مروی ہے۔ اوپری حصہ اور تلوا دونوں طرف مسح کرنا اکمل ہے۔ جیسا کہ مسند احمد، ابوداود اور ترمذی وغرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مروی ہے۔ لیکن پورے موزے کا مکمل مسح سنت نہیں ہے۔ ایڑی کی طرف بھی مسح کرلینا سنت ہے۔ مسح کے وقت موزے کے نیچے نجاست ہو تو یہ مسح کافی نہیں ہے۔ مسح کے بجائے موزے کو دھو دیا تو کافی ہے، لیکن مکروہ ہے، اسی طرح ایک سے زائد بار مسح کرنا بھی مکروہ ہے۔ ہاتھ سے ہی مسح کرنا ضروری نہیں ہے، کپڑے یا لکڑی وغیرہ سے بھی کرنا جائز ہے۔ صرف تر ہاتھ موزے پر رکھ دیا، مسح نہیں کیا یا پانی ٹپکا دیا تو یہ کافی ہے، جیسا کہ سر کے مسح میں گذرا۔

فصل۔ مسح کا حکم

نماز اور دیگر وہ امور جن کیلئے وضو ضروری ہے، موزہ پر مسح جائز ہے۔ مسح کی چار مدتیں ہیں۔ (۱) مقیم کیلئے ایک دن رات گذرنا، اور مسافر کیلئے تین دن اور تین رات۔ موزہ پہننے کے بعد حدث (وضو ٹوٹنا) سے مدت شمار کریں گے۔ مقیم اگر جمع نہ کرے تو زیادہ سے زیادہ چھ ادا نمازیں پڑھ سکتا ہے، بارش کی وجہ سے جمع کیا تو سات نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ مسافر بغیر جمع کے سولہ /۱۶ اور جمع کے ساتھ سترہ /۱۷ نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ قضاء نمازوں کی کوئی تحدید نہیں۔ مسافر کو تین دن کی رخصت اس وقت ملے گی جبکہ اس کا سفر طویل ہو اور گناہ کا نہ ہو۔ اگر سفر قصیر ہے یا گناہ کا ہے تو صرف ایک دن رات مسح کرے گا۔

حدیث: آپ ﷺ نے اگر طہارت کے ساتھ موزے پہنے ہوں تو مسافر کے لئے تین شب وروز اور مقیم کے لئے ایک شب وروز اس پر مسح کرنے کی رخصت دی ہے۔ (ابن خزیمہ، ابن حبان، ابن الجارود، الشافعی، ابن ابی شیبہ دارقطنی، بیہقی

وصححہ الخطابی، تلخیص) حالت اقامت میں موزے پہننے کے بعد سفر شروع ہو اور سفر میں مسح کیا تو مسافر کی مدت پوری کرے گا، حدث اقامت میں ہوا ہو یا سفر میں، حدث اور نماز کا وقت ختم ہونے کے بعد سفر شروع کیا یا قبل۔

اقامت میں مسح کرنے کے بعد سفر شروع کیا تو مقیم کی مدت پوری کرے۔ ایک موزہ پر اقامت میں مسح کے بعد سفر شروع کیا اور سفر میں دوسرے پر مسح کیا تو یہ مقیم کی مدت تک ہی مسح کر سکتا ہے، اس لئے کہ مسح کی ابتداء اقامت میں ہو چکی تھی۔

سفر میں مسح کرنے کے بعد مقیم ہو جائے اور ایک دن رات یا اس سے زائد مدت گذر چکی ہو، تو مسح کی مدت ختم ہو چکی۔ اور سابقہ نمازیں صحیح ہیں۔ ایک دن رات مکمل ہونے سے پہلے مقیم ہو جائے، تو اس کے مکمل ہونے تک مسح کر سکتا ہے۔ سفر یا اقامت میں مسح کرنے والے کو مدت کے ختم ہونے کے متعلق شک ہو تو مدت کو ختم سمجھے گا۔

مسافر کو شک ہو کہ مسح اقامت میں شروع کیا تھا، یا سفر میں، تو اقامت پر عمل کرتے ہوئے ایک شب و روز ہی مسح کریگا۔

باجود شک کے دوسرے دن بھی مسح کر کے نماز پڑھے، پھر تیسرے دن یہ معلوم ہو جائے کہ مسح سفر میں شروع کیا تھا، تو دوسرے دن کی نمازیں قضاء کرنا لازم ہے۔ تیسرے دن مسح کر سکتا ہے۔ پہلے دن مسح کرنے کے بعد دوسرے دن بھی وہ طہارت بر قرار ہو اور حدث نہ ہو تو تیسرے دن اس مسح سے نماز پڑھ سکتا ہے، کیونکہ وہ صحیح ہے۔ دوسرے دن حدث ہو اور شک کے ساتھ مسح کرے اور وہ طہارت باقی ہو تو مسح صحیح نہ ہو گا۔ لہٰذا مسح کا اعادہ واجب ہے۔

(۲) **دونوں یا ایک موزہ اتارنا:** اس صورت میں مسح کی طہارت باقی ہو تو پیروں کا دھونا لازم ہے از سر نو وضو لازم نہیں ہے۔ موزہ میں کمزوری یا پھٹن وغیرہ کی وجہ سے مسح کی صلاحیت باقی نہ رہے تو یہ موزہ اتارنے کے حکم میں ہے۔ (لہٰذا پیر دھونا واجب ہے) نماز کے دوران مسح کی مدت ختم ہو جائے یا پیر ظاہر ہو جائے تو نماز باطل ہو گی۔

صرف ایک رکعت کے بقدر مدت باقی ہو اور دو رکعت کی نیت سے نماز شروع کرے تو نماز منعقد ہو گی۔ (اور دوران نماز مدت ختم ہو جائے تو باطل ہو جائے گی)

(۳) مسح کرنے والے پر جنابت یا حیض یا نفاس کا غسل واجب ہو، تو غسل کے بعد از سر نو موزے پہننا لازم ہے۔ (۴) موزہ میں پیر نجس ہو جائے اور موزے کے اندر اسے دھونا ممکن نہ ہو تو موزے اتار کر دھونا واجب ہے۔ اسی میں دھونا ممکن ہو اور دھو لیا تو مسح باطل نہ ہو گا۔

جس کے دونوں قدم صحیح سالم ہوں، ایک ہی میں موزہ پہنے تو اس پر مسح صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کو ایک ہی پیر ہو، تو اس پیر کے موزے پر مسح صحیح ہے۔ دوسرے قدم کا کچھ حصہ بھی موجود ہو تو جب تک اس حصّے کو کسی ایسی چیز سے جو مسح کے شرط کے مطابق ہو، نہ چھپائے، مسح جائز نہ ہو گا دو پیروں میں ایک ایسا بیمار ہو کہ اسکا دھونا واجب نہیں اور دوسرے میں موزہ پہن لے تو اس پر مسح صحیح نہیں ہے، کیونکہ بیمار پیر کی جانب سے تیمم واجب ہے، لہٰذا وہ بھی صحیح کی طرح ہے۔

کتاب الحیض: (حیض کا بیان)

آیت: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۚ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ، فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ الله (البقرہ۔ ۲۲۲) ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندی چیز ہے تو (حالت) حیض میں تم عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علیٰحدہ رہا کرو۔ اور (اس حالت میں) ان سے

قربت مت کیا کرو، جب تک کہ وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جاویں تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے اللہ نے تم کو اجازت دی ہے۔

عربی میں حیض کا لفظ بہنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں اس کے دس نام ہیں حیض، طَمث، ضحک، اِکبار، اعصار، دراس، عراک، فراک، طمس اور نفاس۔ اور شریعت میں عورت کے رحم کے اندرونی حصّے سے فطری طور پر مخصوص اوقات میں (فرج کے راستے) نکلنے والے خون کو حیض کہا جاتا ہے۔ رحم کے اندر ایک رگ سے جس کا نام عاذل ہے، بیماری کی وجہ سے نکلنے والے خون کو استحاضہ کہتے ہیں۔ اور ولادت کے بعد نکلنے والے خون کو نفاس کہا جاتا ہے (حاشیۃ الروضہ)

عورت پر حیض اور دیگر ضروری مسائل کا سیکھنا واجب ہے، اگر شوہر وغیرہ عالم ہے تو اس کو سکھانا لازم ہے ورنہ کسی سے پوچھ کر اسے مسئلہ بتادے۔ ان واجب کے سیکھنے کے لئے عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کام کیلئے (جیسے ذکر کی مجلس کی شرکت) شوہر کے اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتی، بستی سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو محرم کا بھی ساتھ ہونا ضروری ہے۔ (الانوار السنیہ ۷۵) اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔

باب (۱) حیض اور استحاضہ کا حکم۔ حیض کی کم سے کم عمر ۹ / سال قمری ہے۔ اس عمر سے پہلے عورت کے فرج سے خون نکلے تو وہ دم فساد (فساد کا خون۔ بیماری کا خون) ہے اگر خون کے نظر آنے اور ۹ سال مکمل ہونے کے درمیان اتنی مدت ہو، جس میں ایک حیض اور طہر نہیں آسکتا۔ (یعنی ۱۵ / دن یا اس سے کم) تو وہ خون حیض ہے، ورنہ نہیں۔

تشریح: خون کے اور ۹ سال مکمل ہونے کے درمیان اتنی مدت ہو جس میں ایک حیض اور طہر آسکتا ہو۔ (۱۶ دن یا اس سے زیادہ) تو وہ دم فساد ہے۔ حیض کی کم سے کم عمر میں گرم ممالک و سرد ممالک کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

حیض کی اقل و اکثر مدت۔ حیض کی اقل مدت ایک دن رات ہے۔

تشریح: ایک عورت کو کم سے کم ۲۴ گھنٹے حیض آئے گا حیض کا خون اس سے کم نہیں ہو سکتا۔

حیض کی اکثر مدت ۱۵ شب و روز ہیں۔

تشریح۔ ایک مرتبہ جب حیض شروع ہو تو اسکا سلسلہ مکمل ۱۵ روز سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اور حیض کی غالب مدت ۶ یا ۷ دن میں (یعنی عموماً اکثر عورتوں کو ۷۔۶ دن حیض آتا ہے)

اقل طھر۔ دو حیض کے درمیان طہر (پاکی) کی کم سے کم مدت ۱۵ دن ہیں اور غالب مدت حیض کے بعد ماہ کے بچے ہوئے ایام۔

تشریح: عموماً ایک ماہ میں ایک مرتبہ حیض آتا ہے۔ لہٰذا حیض کے بعد بقیہ سارے ایام طہر کے رہتے ہیں، جیسے کسی کو ۶ دن حیض ہو تو تقریباً ۲۴ دن اس کے طہر کے ہوتے ہیں۔

طہر کی اکثر مدت۔ طہر کی اکثر مدت کی کوئی حد نہیں ہے۔ (ممکن ہے کہ کسی کو مہینوں اور سالوں حیض نہ آئے ایسی صورت میں یہ ساری مدت طہر ہی کہلائے گی۔)

اگر کسی عورت کو مستقل ایک دن سے کم یا ۱۵ دن سے زیادہ حیض آئے یا ۱۵ دن سے کم طہر ہو، تب بھی اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(فصل) حائضہ کیلئے حرام امور:

حدیث: ایک روایت میں آپ ﷺ نے عورت کے دینی نقصان کی وضاحت میں فرمایا! کیا وہ حیض میں نماز و روزہ ترک

نہیں کرتی۔(متفق علیہ)

جو امور جنبی کیلئے حرام ہیں، حائضہ کے حق میں بھی حرام ہیں۔ عورت حیض کے ایام کی نمازوں کی قضاء نہیں کرے گی۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ حائضہ کے مسجد میں سے گذرنے کی صورت میں مسجد میں گندگی لگنے کا اندیشہ ہو تو گذرنا حرام ہے۔

اسی طرح مستحاضہ، سلس البول، اور زخم سے خون بہنے والا شخص مسجد سے گذرنے کی صورت میں مسجد میں نجاست لگنے کا خطرہ ہو تو ان لوگوں کو بھی مسجد سے گذرنا حرام ہے۔ حائضہ اور دیگر مذکورہ افراد کے گذرنے سے اس طرح نجاست وگندگی کا اندیشہ نہ ہو تو ان کو مسجد سے گذرنا جائز ہے۔ حیض کے ایام میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ لیکن بعد میں ان روزوں کی قضاء کرے گی۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت عائشہ سے مروی ہے۔

حائضہ سے استمتاع (زن وشوئی تعلقات) کی دو نوعتیں ہیں۔

(۱) **فرج میں جماع کرنا (صحبت کرنا)**: یہ حرام ہے۔ حیض کا سلسلہ ختم ہو کر غسل یا بصورت عذر تیمم کرنے تک یہ حرمت باقی رہے گی، جیسا کہ آیت میں علیٰحدگی کا اور عدم قربت کا حکم دیا گیا، نیز مسلم وغیرہ کی حدیث میں بھی جماع کی ممانعت موجود ہے۔ پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہو تو صرف فرض نماز پڑھ لے گی، لیکن اس سے جماع حرام ہے۔

حیض کی حالت میں جماع کا حرام ہونا معلوم ہوتے ہوئے عمداً کوئی جماع کرے تو کوئی مالی تاوان اور کفارہ واجب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے خوب توبہ واستغفار کرے، لیکن حیض کے ابتدائی ایام میں جماع کی صورت میں ایک دینار (تقریباً سوا چار گرام سونے کے برابر) صدقہ کرنا مستحب ہے۔ آخری ایام میں جماع کیا ہو تو نصف دینار صدقہ کرنا مستحب ہے۔ یہ مقدار فقراء ومساکین کو دے، ایک ہی فقیر کو دینا بھی کافی ہے۔ صدقہ کا حکم دار قطنی، بیہقی، احمد اور سنن میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔(تلخیص/۱۷۵)

(۲) **جماع کے بغیر استمتاع**: اس کی دو صورتیں ہیں۔(۱) حائضہ کے ناف اور گھٹنے کے درمیانی حصے سے استمتاع کرنا حرام ہے ابو داود وغیرہ میں تہبند سے اوپر استمتاع کی اجازت مروی ہے۔(۲) بقیہ حصے سے استمتاع جائز ہے۔

حیض کے دیگر احکام۔ حیض کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد غسل واجب ہے، جب تک خون جاری ہو طہارت حاصل نہ ہو گی، لیکن وہ تمام مشروع غسل، جن کے لئے طہارت کی قید نہیں، حیض میں بھی مستحب ہیں، جیسے احرام کا غسل، وقوف عرفہ کا غسل، حیض آتے ہی عورت بالغہ شمار ہوگی، حیض سے عدت اور استبراء کا تعلق ہے۔ بلوغ، عدت، اور استبراء کے علاوہ دیگر تمام احکام میں نفاس بھی حیض کی طرح ہے۔

حیض کی حالت میں طلاق بدعی ہے۔(مکہ سے نکلتے وقت) حیض جاری ہو تو اس پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ کفارہ کے روزہ کا تتابع حیض کی وجہ سے منقطع نہیں ہوتا۔ حیض ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے ہی روزہ اور طلاق کی حرمت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اب نماز چھوٹی تو قضاء ضروری ہے، البتہ استمتاع (جماع وغیرہ) اور دیگر وہ سارے امور جن کے لئے طہارت ضروری ہے، بغیر غسل کے جائز نہ ہوں گے۔

فصل استحاضہ کا بیان

استحاضہ دو طرح ہے۔ کبھی تو حیض ونفاس کے علاوہ آنے والے ہر خون کو استحاضہ کہتے ہیں۔ حیض کے بعد متصل ہو یا نہ ہو، جیسے

سات سال میں خون آئے، اور کبھی صرف حیض سے متصل مزید خون کو استحاضہ کہتے ہیں، اس صورت میں دوسرے خون کو دم فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال ساری صورتوں کے احکام یکساں ہیں۔ استحاضہ سلس البول کی طرح دائمی حدث ہے۔ لہٰذا اس حال میں روزہ نماز سے کوئی رکاوٹ نہیں، اور وطی (صحبت) کرنا جائز ہے۔ دائمی حدث کی وجہ سے طہارت اور ازالہ نجاست میں خاص احتیاط ضروری ہے۔ وضو یا تیمم سے پہلے مستحاضہ (وہ عورت جس کو استحاضہ کی شکایت ہو) اپنی اگلی شرمگاہ کو دھو کر اس جگہ کپاس یا کپڑے کا ٹکڑا رکھ دے، تاکہ نجاست رکے اور کم ہو۔ اس سے خون رکے تو یہ کافی ہے، ورنہ ایک ٹکڑا کمر میں باندھ کر دوسرے ٹکڑے کو لنگوٹ کی طرح کس کر باندھ دے یہ سب کرنا اس کے لئے واجب ہے۔ کس کر باندھنے میں تکلیف ہو تو نہ باندھے، روزے کی حالت میں شرمگاہ میں کپاس وغیرہ نہ رکھے صرف باندھنے پر اکتفاء کرے۔ سلس البول (جس کو ہمیشہ پیشاب کا قطرہ آتا ہو) اپنے عضو مخصوص کے سوراخ میں روئی داخل کرے، اس سے قطرے نہ رکیں تو سرے کو باندھ بھی دے۔

مذکورہ احتیاطی تدابیر کے بعد مستحاضہ وضو کرے، اس احتیاط کا وضو سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ اور ہر فرض نماز کیلئے وضو واجب ہے، نوافل جتنی چاہے پڑھ سکتی ہے۔ مستحاضہ کا طہارت نماز کا وقت ہونے کے بعد ہی ہونا چاہئے۔ طہارت کے بعد اسے جلد ہی نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اوّل وقت طہارت حاصل کر کے آخری وقت یا اس کے بعد نماز پڑھے، اور اس تاخیر کا سبب نماز ہی کا کوئی سبب ہو، جیسے اذان، قبلہ کیلئے اجتہاد، کپڑے پہننا، جمعہ اور جماعت کا انتظار وغیرہ تو حرج نہیں، ورنہ ممنوع ہے۔ ہر فرض نماز کیلئے از سر نو شرمگاہ کا دھونا، روئی رکھنا اور باندھنا، وضو کرنا ضروری ہے، چاہے پٹی اپنی جگہ سے زیادہ کھسک گئی ہو یا اس کے اطراف خون نظر آئے، یا ایسی کوئی بات پیش نہ آئی ہو۔ باندھنے کے بعد خون کے غلبہ کی وجہ سے خون نکل پڑے، تو اسکا وضو باطل نہ ہو گا۔ اگر باندھنے میں کمی کی وجہ سے نکل پڑا تو وضو باطل ہو گا۔

اسی طرح پٹی ٹھیک نہ باندھنے سے اپنی جگہ سے سرک جائے اور اس کی وجہ سے خون کا نکلنا بڑھ جائے، تو وضو ختم ہو گا۔ اگر نماز میں ایسا اتفاق ہو تو نماز باطل ہو گی۔ اگر فرض کے بعد ہو تو اب نفل پڑھنا حرام ہو گیا۔

مستحاضہ کی شفاء: مستحاضہ کی بیماری ختم ہو جائے، تو اس کی طہارت باطل ہو گی۔ نماز میں شفاء ہو جائے، تو نماز باطل ہو گی۔ کسی مستحاضہ کا خون طہارت کے بعد رک جائے اور اسکو اس طرح خون رکنے اور پھر دوبارہ شروع ہونے کی عادت ہو، یا عادت تو نہیں تھی لیکن کسی معتبر واقف شخص نے یہ بتا دیا کہ پھر شروع ہو گا، تو ان دونوں صورتوں میں اگر خون رکنے کی مدت اتنی کم ہو، کہ اسمیں طہارت اور جس نماز کیلئے طہارت حاصل کی ہے نہیں ہو سکتی تو وہ (دوبارہ طہارت کئے بغیر) نماز شروع کر سکتی ہے۔ لیکن خون رکا ہی رہا تو معلوم ہوا کہ طہارت باطل تھی۔ اور نماز قضاء پڑھنی ہو گی۔ اور رکنے کی مدت میں طہارت اور متعلقہ نماز کی گنجائش رہتی ہے۔ تو خون رکنے کے بعد وضو لازم ہے۔ خلاف عادت اتنی مدت سے پہلے ہی پھر خون جاری ہو تو وضو کا اعادہ واجب نہیں، لیکن خون رکنے کے بعد نماز شروع کر چکی اور وضو کا اعادہ نہیں کیا اور نماز ہونے سے پہلے ہی پھر خون شروع ہو تو نماز کا اعادہ واجب ہے۔ البتہ خون رکے اور رکنے لوٹنے کی اسے عادت نہ ہو اور کسی معتبر شخص نے لوٹنے کی خبر بھی نہ دی، تو وضو کا اعادہ لازم ہے۔ لیکن وضو اور نماز کے امکان سے قبل ہی پھر خون شروع ہو تو سابقہ وضو باقی سمجھا جائے گا۔

مذکورہ بالا اعادۂ وضو کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خون رکنے کے بعد وضو کے اعادہ کے بغیر نماز شروع کرے، تو نماز صحیح نہیں، خون لوٹے یا نہ لوٹے، نیز طہارت و نماز کے امکان کے بعد لوٹے یا اس سے قبل۔ مستحاضہ اپنی طہارت سے مستقل نوافل بھی پڑھ

سکتی ہے، فرض کے تابع بھی، وقت کے اندر بھی، اور بعد میں بھی، مستحاضہ (اور دیگر دائمی حدث والے افراد) کی طہارت سے نماز جائز ہو جاتی ہے لیکن یہ طہارت حقیقتاً حدث (ناپاکی) دور نہیں کرتی۔

کسی کو کبھی خون آتا ہے اور کبھی رکتا ہے۔ تو خون کے بہاؤ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ جس وقت رکے وضو و نماز ادا کرنی چاہئے۔ تاہم اسے نماز کے قضا ہونے کا خطرہ ہو، تو بہاؤ کے وقت ہی وضو کرکے نماز پڑھ لیں۔

سلس البول کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو پیشاب ٹپکتا ہے اور بیٹھ کر پڑھنے کی صورت میں رک جاتا ہے تو طہارت کی خاطر بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔ اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔

باب۔۲ مستحاضہ کی مختلف قسمیں

ان کی چار قسمیں ھیں۔

(۱) اَلْمُبْتَدَاۃُ الْمُمِیْزَہ (جس کو پہلی مرتبہ ہی خون ۱۵ دن سے زائد آئے اور قوی و ضعیف خون میں تفریق کر سکے) اس کو مختلف رنگ کا خون آتا ہے، جس میں ایک رنگ قوی ہو تو اُسے تمیز پر عمل کرنا ہے۔ یعنی قوی خون کے ایام میں حائضہ ہو گی۔ اور ضعیف خون کے ایام میں مستحاضہ، تمیز پر عمل کیلئے درج ذیل تین شرائط ضروری ہیں۔

(۱) قوی خون ۱۵/ دن سے بڑھ نہ جائے (۲) ایک شب و روز سے کم نہ ہو تاکہ اسے حیض شمار کر سکیں۔ (۳) ضعیف خون ۱۵/ دن سے کم نہ ہو تاکہ اسے دو حیض کا درمیانی طہر قرار دیا جاسکے اور یہ ۱۵/ دن (یا اس سے زائد) مسلسل ہونا ضروری ہے، لہٰذا ایک دن سیاہ اور دو دن سرخ اس ترتیب سے سارا ماہ گذر جائے تو ضعیف خون کی مجموعی مدت ۱۵ دن سے بھی بڑھ گئی (۲۰ دن ہو چکی) لیکن یہ تمیز نہیں ہے کیونکہ اتصال نہیں پایا گیا۔ قوت کیلئے ان تین صفات میں سے کسی صفت کا اعتبار کیا جائے گا۔ رنگ، بو، گاڑھا پن، سیاہ رنگ، اشقر (سرخ و زردی مائل) سے قوی ہے۔ اور اشقر زرد اور اکدر (گدلے) سے قوی ہے۔ بدبو دار خون غیر بدبو دار خون سے قوی ہے۔ اسی طرح گاڑھا خون پتلے سے قوی ہے۔

لہٰذا بعض خون میں قوت کے تینوں صفات ہوں۔ اور بعض تینوں سے خالی تو قوت کے صفات کا خون قوی ہو گا (اور دوسرا ضعیف)

بعض میں ایک صفت اور بعض میں دو صفتیں ہوں، تو دو صفات والا قوی ہے، بعض میں دو اور بعض میں تین صفت ہوں، تو تین صفات والا قوی ہے۔

تشریح: کسی کو پہلے دس دن سیاہ، خون آئے پھر ۲۰/ دن زرد، تو پہلے دس دن حیض ہے، دس دن بدبو دار اور ۲۰ دن غیر بدبو دار تو ۱۰ دن حیض اور ۲۰ دن استحاضہ ہے۔ ۵ دن گاڑھا اور ۲۵ دن پتلا خون آئے تو ۵ دن حیض اور ۲۵ دن استحاضہ ہے۔ ۱۰ دن سیاہ اور بدبو دار ہو اور ۲۰ دن پتلا خون ہو تو ۱۰ دن حیض اور بقیہ استحاضہ اسی طرح دیگر مختلف صورتوں کو سمجھ لیجئے۔

تمیز کی صورت میں کبھی پہلے قوی خون آئے گا اور کبھی پہلے ضعیف، قوی مقدم ہو اور بعد میں ایک قسم کا ضعیف خون آتا رہے جیسے ۱۵ دن تک سیاہ خون پھر سرخ مسلسل تو اس کا حیض سیاہ خون ہے اور سرخ طہر ہے، چاہے کافی مدت تک آتا رہے۔

اگر قوی کے بعد دو ضعیف خون (یکے بعد دیگرے) آئے اور اس میں سے پہلے ضعیف کو قوی کے ساتھ ملا کر حیض قرار دے سکتے ہیں تو ایسا ہی کریں گے۔

جیسے ۵ دن سیاہ خون آیا پھر ۵ دن سرخ، پھر زرد مسلسل آتا رہا، (تو سیاہ اور زرد دونوں ملا کر ۱۰ دن حیض) (حاشیہ الروضہ)
لیکن ان دونوں کو ملا کر حیض نہیں قرار دے سکتے تو صرف قوی حیض ہو گا۔ جیسے ۵ دن سیاہ، پھر ۱۱ دن سرخ، پھر زرد کا سلسلہ، (تو صرف ۵ دن حیض ہے)

کسی کو ضعیف پہلے آئے، جیسے ۵ دن سرخ، پھر ۵ دن سیاہ، پھر سرخ کا سلسلہ تو اس کا حیض صرف سیاہ خون کے پانچ دن ہیں، قبل و بعد کے ایام طہر ہیں۔

اگر سیاہ خون ۱۶ دن آئے تو پھر یہ "فاقِدۃُ التمیز" (جس کے خون سے تمیز کر کے حیض و نفاس کا حکم نہ لگا سکیں) کہلائے گی۔

کسی مبتداۃ کو پہلی مرتبہ ۱۵ دن سرخ پھر ۱۵ دن سیاہ خون نظر آئے تو مکمل ماہ نماز روزہ ترک کرے گی۔

تشریح: پہلی مرتبہ کسی رنگ کا خون آئے تو حیض شمار کرے گی، جب ۱۵ سے آگے بڑھا اور بعد میں ۱۵ دن تک قوی ہے تو معلوم ہوا کہ پہلے پندرہ دن استحاضہ تھا، اور اب یہ پندرہ دن حیض ہے، تو گویا بعد میں پندرہ دن کے نمازوں کی قضاء لازم ہو گی۔ مذکورہ صورت میں سیاہ خون ۱۵ دن سے بھی آگے بڑھ جائے تو اب اس کی تمیز کا اعتبار نہیں، لہٰذا صرف ایک دن رات حیض شمار ہو گا، تو اس ایک صورت میں مستحاضہ ۳۱ دن تک نماز نہیں پڑھے گی۔

پہلی مرتبہ خون۔ حیض کی عمر ہونے کے بعد محض خون نظر آتے ہی نماز روزہ اور جماع سے رکنا ضروری ہے۔ اب مکمل ایک دن سے پہلے ہی رک جائے تو معلوم ہوا کہ حیض نہیں تھا، لہٰذا نماز قضا کرے گی۔

مبتداۃ ممیزہ کا خون قوت سے ضعف کی طرف پلٹے تو وہ نماز روزہ شروع نہیں کرے گی، ہو سکتا ہے کہ خون پندرہ دن سے آگے نہ بڑھے، تو ایسی صورت میں سارا حیض ہو گا۔ لہٰذا پندرہ دن ہونے تک رکی رہے گی۔ پندرہ کے بعد بھی خون جاری رہا، تو اب معلوم ہوا کہ وہ مستحاضہ ہے، اب اسے قوی خون کے بعد کے ایام کی نماز قضاء کرنی ضروری ہے۔ یہ حکم پہلی ماہ کا ہے، (جب پہلی ماہ اس کا مستحاضہ ہونا ثابت ہوا تو) دوسرے ماہ سے قوی خون ختم ہوتے ہی غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے گی، بعد میں کسی ماہ شفاء ہوئی اور ۱۵ دن کے اندر خون رک گیا تو اس ماہ قوی اور ضعیف دونوں خون حیض ہے۔

امام الحرمینؒ کی تصریح اور دیگر علماء کے کلام سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب مکمل ضعیف خون آنا شروع ہو تو اسے ضعیف شمار کریں گے یہاں تک کہ کچھ سیاہ دھاریاں اور کچھ سرخ آنا شروع ہو، تب بھی حیض کا حکم ختم نہ ہو گا جب سیاہی بالکل نہ رہے تو حیض کا حکم ختم ہو گا۔ (اور ضعیف کا سلسلہ جاری ہو گا جو استحاضہ شمار ہو گا۔)

(۲) وہ مبتدأۃ جس کو تمیز حاصل نہ ہو: کسی کو ایک ہی صفت کا خون مسلسل آئے، یا قوی و ضعیف آئے، لیکن تمیز کے شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو اس کا حکم اس قسم میں بیان ہو رہا ہے۔

اگر ایسی عورت کو اپنے خون کی ابتدا کب سے ہوئی معلوم نہیں تو اس کا حکم متحیرہ کی طرح ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب آئے گی اور ابتداء معلوم ہے تو پہلا ایک دن رات حیض ہے اور بقیہ ۲۹ دن استحاضہ ہے۔

پہلی مرتبہ ۱۵/ ایام تک روزہ نماز کے ترک میں غیر ممیزہ بھی ممیزہ کی طرح ہے۔ ۱۵ دن سے آگے بڑھا، تو استحاضہ ہونا معلوم ہوا، لہٰذا ۱۴ دن کے نمازوں کی قضاء کرے گی۔ دوسرے ماہ اور اس کے بعد سابقہ شرائط کے مطابق تمیز موجود ہو تو اب مبتداۃ ممیزہ ہو گی، بعد میں بھی تمیز نہ ہو تو مدت گذرنے پر غسل اور صوم و صلوۃ واجب ہے۔

کسی ماہ اسے ۱۵ دن گذرنے سے قبل شفاء ہو جائے، تو اس ماہ میں وہ مستحاضہ نہیں ہے، بلکہ سارے ایام حیض ہیں۔ لہٰذا ان ایام میں رکھے گئے روزوں کی قضاء کرے اور اس سے پہلے کیا ہوا غسل بھی صحیح نہیں ہے۔ مدت کے بعد صوم وصلوٰۃ اور وطی پر گناہ نہ ہوگا گرچہ حقیقتاً حیض میں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ لاعلمی سے یوں ہوا ہے۔

(۳) معتادہ غیر ممیزہ: (جس کو حیض کی پہلے سے ایک عادت بندھی ہو اور خون کے رنگ میں فرق نہ ہو) ایسی عورت حیض و طہر کے سلسلہ میں اپنی سابقہ عادت پر عمل کرے گی۔ اس کی دو حالتیں ہوں گی (۱) اس کی عادت میں اختلاف نہ ہو۔ کئی مرتبہ حیض وطہر کی عادت گذر چکی ہو تو حیض وطہر کی مقدار اور مدت میں اسی عادت پر عمل کرے گی، چاہے مہینے میں چند روز حیض آتا ہو، یا سال میں یا اس سے زائد مدت میں، صرف ایک مرتبہ ہی پہلے حیض وطہر آچکا ہے، تو اس کو بھی عادت شمار کر کے اس پر عمل کرے گی۔

کسی کو پانچ دن حیض آتا تھا۔ کسی ماہ ۶/ دن آیا، اس کے بعد والے ماہ میں استحاضہ شرع ہوا تو ۶ دن حیض کی عادت شمار کریں گے۔

پہلی مرتبہ خون عادت سے آگے بڑھے، تو مبتداہ کی طرح روزہ نماز سے رکی رہے، ہو سکتا ہے ۱۵ سے آگے نہ بڑھے (ایسی صورت میں پورا حیض ہی ہوگا) اب اگر ۱۵ سے بھی آگے بڑھے تو عادت سے زائد ایام کے نماز کی قضاء کرے آئندہ مہینوں میں عادت ختم ہوتے ہی غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے۔

(۲) دوسری حالت یہ کہ عادت مختلف ہو۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔

مختلف عادتیں ترتیب کے ساتھ جاری ہوں۔ جیسے ایک ماہ تین دن حیض پھر ۵ دن پھرے دن پھر چوتھے ماہ ۳ دن۔ پھر ۵ دن پھر سات دن۔ پھر اسی طرح ہمیشہ۔ اب استحاضہ شروع ہو تو اسی عادت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ صرف ایک مرتبہ اس ترتیب سے حیض آنے سے عادت ثابت نہیں ہوگی۔ کم از کم دو مرتبہ یہ ترتیب پیش آنا چاہیئے۔ لہٰذا مذکورہ مثال میں کم از کم چھ ماہ میں عادت ثابت ہوگی۔ اب تین دن حیض والے ماہ کے بعد استحاضہ شروع ہو جائے تو استحاضہ کے پہلے ماہ ۵ روز اور دوسرے ماہ ۷ روز اور تیسرے ماہ ۳ دن حیض شمار ہونگے۔ ۵ دن حیض والے ماہ کے بعد استحاضہ شروع ہو جائے تو پہلے ماہ ۷ روز، پھر تین روز، پھر ۵ روز، حیض شمار ہونگے۔ ۷ روز حیض کے بعد دوسرے ماہ سے استحاضہ شروع ہو تو پہلے ماہ ۳ دن، دوسرے ماہ ۵ دن اور تیسرے ماہ ۷ دن حیض ہونگے۔ اس صورت میں ایک عادت اور اکثر عادت کے درمیانی ایّام میں احتیاط واجب نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ سابقہ عادت اسے یاد ہو۔ اگر بھول جائے تو ہر ماہ ۳ دن حیض گذار کر غسل کر کے نماز روزہ شروع کرے، پھر ۵ روز مکمل ہونے پر غسل کرے، پھر سات روز مکمل ہونے پر غسل کرے، اس دوران ہر فرض نماز کیلئے وضو کرے۔

حیض وطہر کا سلسلہ مکرر آچکا لیکن ترتیب و نظم کے بغیر، اس صورت میں آخری حیض کی مدت یاد نہیں تو کم سے کم جو حیض گذر چکا ہو اس پر عمل کرے گی اور زائد میں احتیاط پر عمل کرے گی۔ اور آخری حیض کی مدت یاد ہے تو اسی پر عمل کریگی۔ اور اس سے زائد مدت ہو تو اس میں احتیاط پر عمل کرے گی۔ مثلاً مذکورہ مثال میں استحاضہ سے قبل آخری حیض تین دن تھا۔ (تو ہر ماہ تین دن حیض شمار کرے گی۔ البتہ ۵ دن اور ۷ دن ہونے پر غسل دہرائے گی لیکن آخری حیض ۷ دن تھا تو ہر ماہ ۷ دن حیض شمار کرے گی، اس سے زائد اس کیلئے کبھی رہا نہیں، اس لئے احتیاط کا سوال ہی نہیں۔) حیض وطہر کا اختلافی سلسلہ مکرر آیا ہی نہیں، مثلاً ایک ماہ تین، پھر پانچ، پھر سات دن حیض آیا پھر چوتھے ماہ استحاضہ شروع ہو گیا اور آخری مدت بھول چکی تو کم سے کم مدت (مذکورہ مثال میں تین دن) حیض شمار کرے اور زائد میں احتیاط کرے، اور آخری مدت یاد ہے تو ہر ماہ وہی مدت حیض شمار کرے، کم ہو یا زیادہ، اس صورت میں احتیاط کی ضرورت نہیں۔ (بعض

علماء نے اس صورت میں بھی احتیاط کو واجب قرار دیا ہے)(حاشیۃ الجمل علی فتح الوہاب ۱/۲۵۱)

(۴) **ایسی معتادہ ممیزہ جس کو عادت یاد ہو:** اگر عادت اور تمیز متفق ہوں، جیسے ہر ماہ کے ابتداء میں پانچ ایام حیض آتا تھا اور باقی طہر، اب کسی ماہ استحاضہ شروع ہو گیا، اور ابتدائی پانچ ایام سیاہ خون اور بقیہ ماہ سرخ خون آئے، تو وہی پانچ ایام حیض کے ہیں۔

اگر عادت اور تمیز متفق نہ ہوں، اور عادت اور تمیز کے درمیان اقل طہر (۱۵ دن) کا فاصلہ نہ ہو تو تمیز پر عمل کرے گی۔ جیسے پانچ روز حیض آتا تھا پھر کسی ماہ دس روز سیاہ خون اور بقیہ ایام سرخ خون جاری رہا تو اس کا حیض دس روز ہو گا (سیاہ خون کے ایام)

اور اگر عادت و تمیز کے درمیان اقل طہر کا فاصلہ ہو، تو عادت کی مقدار بھی حیض ہے، اور قوی خون بھی حیض ہے، اس لئے کہ دونوں کے درمیان کامل طہر کی مدت مل جاتی ہے، جیسے ۲۰ یا زائد دن ضعیف خون آئے پھر پانچ دن قوی پھر ضعیف اور اس کی قدیم عادت ۵ روز کی ہے تو پہلے پانچ دن عادت کی وجہ سے حیض، اور قوی خون کے ۵ دن تمیز کی وجہ سے حیض ہے۔

(۵) **تمیز سے عادت کا فیصلہ:** معتادہ کو جس عادت پر عمل کرنا ہے، وہ بغیر استحاضہ کے صحیح حیض اور طہر ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور کبھی تمیز کی روشنی میں بھی عادت کا فیصلہ ہوتا ہے جیسے مبتداء کو ۵ دن سیاہ پھر ۲۵ دن سرخ خون آئے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے پھر کسی ماہ صرف سیاہ یا سرخ خون مسلسل جاری رہے تو سابقہ تمیز کی بنیاد پر ہر ماہ ابتدائی ۵ دن حیض اور بقیہ استحاضہ ہے۔ مذکورہ صورت میں کسی ماہ دس روز سیاہ خون آئے بقیہ سرخ اور بعد کے ماہ مسلسل سیاہ کا سلسلہ جاری رہا تو حیض ۱۰ دن ہیں۔ کسی کو پانچ دن سیاہ خون کی عادت تھی، پھر خون مستمر رہا اور کسی ماہ ۱۰ روز سیاہ خون آیا تو اس ماہ دس روز حیض ہے۔

فصل: زرد اور مٹیالے رنگ کا خون

عادت کے ایام میں زرد یا مٹیالے رنگ کا خون آئے تو یہ بھی حیض شمار ہو گا، دیگر ایام میں اسکا حکم سیاہ خون کا حکم ہے۔

باب ۳- مستحاضہ معتادہ جو اپنی عادت بھول چکی ہو:

اس کی دو صورتیں ہو گی۔ ممیزہ۔ غیر ممیزہ

ممیزہ تمیز پر عمل کرے گی (قوی خون کو حیض اور ضعیف کو استحاضہ شمار کرے گی) غیر ممیزہ کی کئی حالتیں ہو نگی۔

(۱) غفلت یا جنون وغیرہ کی وجہ سے اپنی عادت کے مقدار اور وقت کو بھولے، ایسی عورت کو مُتَحَیِّرَہ اور مُحَیِّرَہ کہتے ہیں۔ (اس لئے کہ خود بھی احکام کے متعلق تحیّر کا شکار اور دوسرے کو بھی تحیر میں ڈالنے کا سبب) محیرہ کو چھ اشیاء میں احتیاط لازم ہے۔

(۱) اس سے جماع کرنا ہمیشہ حرام ہے (یعنی جب تک استحاضہ کی وجہ سے وہ متحیرہ ہے) دیگر استمتاع کے متعلق متحیرہ حائضہ کے حکم میں ہے۔

(۲) اس پر قرآن چھونا اور نماز کے باہر تلاوت کرنا حرام ہے، نمازوں میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورۃ پڑھنا حرام نہیں ہے، دخول مسجد میں حائضہ کی طرح ہے۔

(۳) پنج وقتہ نمازیں ہمیشہ (ہر روز) واجب ہیں نوافل پڑھنا حرام نہیں ہے۔ نفل روزے اور طواف بھی حرام نہیں، ہر فرض نماز کے لئے غسل واجب ہے، جبکہ حیض کا خون رکنے کا وقت معلوم نہ ہو۔ غسل نماز کے وقت میں ہونا شرط ہے۔ غسل کے بعد فوراً نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

اگر اتنا یاد ہو کہ فلاں وقت حیض رک جاتا تھا۔ مثلاً غروب کے وقت تو ہر دن رات صرف ایک مرتبہ غروب کے وقت غسل لازم ہے اور اس سے مغرب پڑھ لے اور بقیہ فرائض کیلئے صرف وضو کرے۔ مستحاضہ کو درمیان میں خون رکتا رہتا ہو تو ظاہر ہے کہ ان اوقات میں غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ (فتح الوہاب ۱/۸۲)

نمازوں کو بعد میں قضا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) ماہ رمضان کے مکمل روزے رکھنا واجب ہے ۳۰ کا مہینہ ہو تو اس کے ۱۴ روزے شمار ہونگے اور ۲۹ کا ہو تو ۱۳ روزے شمار ہونگے (دونوں صورت میں ۱۶ روزوں کی قضاء لازم ہے)

بعد میں مکمل ایک ماہ (۳۰ دن) مسلسل روزہ رکھے۔ اب اس پر دو روزے باقی رہیں گے، جبکہ رات میں خون رکنے کی عادت نہ تھی (یعنی دن میں رکنے کی عادت تھی یا شک ہے کہ رات میں رکتا تھا یا دن میں) لہٰذا ان دو روزوں کے قضاء کی یہ صورت ہوگی کہ ۱۸ دن میں سے ابتداء میں تین دن اور آخر میں تین دن روزہ رکھے۔ یا ۱۸ دن میں سے ابتداء میں چار دن اور آخر میں دو دن روزہ رکھے۔ یا اس کے برعکس یا دو دن ابتداء میں دو آخر میں اور دو درمیان میں رکھے۔ یا ان دو کی قضاء میں ۵ روزے رکھے۔ پہلا۔ تیسرا۔ پانچواں۔ سترھواں۔ اور انیسواں۔ اگر رات میں حیض رکتا تھا تو اس پر کوئی قضاء باقی نہیں۔ (فتح الوہاب ۱/۲۸)

(۵) ایک دن کا روزہ قضاء رکھنا ہو تو کم از کم تین روزے رکھنے ہونگے۔

ایک دن روزہ رکھے گی پھر ایک دن افطار پھر تیسرے دن روزہ پھر سترھویں دن روزہ رکھے گی۔ دوسرا روزہ تیسرے دن اور تیسرا روزہ سترھویں دن ہی لازم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تیسرے دن کے بجائے اس کے بعد پندرھویں دن تک کسی بھی روز روزہ رکھ سکتی ہے اور سترھویں کی بجائے اس کے بعد انتیسویں کے آخری دن تک کسی بھی دن روزہ رکھ سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ پندرہ کے بعد (سولہ سے) تیسرے روزے کا فاصلہ پہلے اور دوسرے روزے کے درمیان فاصلہ کے برابر یا اس سے کم ہو۔

لہٰذا اگر پہلا اور تیسرا اور اٹھارواں روزہ رکھے تو کافی نہیں اس لئے کہ پندرہ کے بعد دو دن کا فاصلہ ہے۔ اور ابتدائی دونوں روزے میں صرف ایک دن کا فاصلہ ہے۔ اگر پہلے دن۔ چوتھے دن۔ اور اٹھارویں یا سترھویں دن روزہ رکھے تو جائز ہے۔ اگر پہلے دن اور پندرھویں دن روزہ رکھے تو دونوں روزوں میں ۱۳ دن کا فاصلہ ہوا۔ لہٰذا وہ ۲۹/انتیسواں یا اس سے قبل ۱۶ کے علاوہ کسی دن روزہ رکھے تو کافی ہے۔

ایک دن سے زائد قضا رکھنا ہو تو قضا روزوں کی تعداد کو دوگنا کر کے اس میں دو جمع کریں گے، جو حاصل ہوگا اس کے نصف تعداد روزے کبھی بھی پے درپے (مسلسل) رکھے گی، اور بقیہ نصف روزے سولھویں دن سے شروع کرے گی۔ لہٰذا دو روزے رکھنا ہو تو تین روزے مسلسل کبھی بھی رکھے پھر چوتھے دن سے پندرہ تک روزہ ترک کرے پھر ۱۶۔ ۱۷۔ اور ۱۸ کو روزہ رکھے۔

اگر تین روزے رکھنا ہیں تو پہلے چار روزے رکھے پھر ۱۶/سولھویں دن سے چار روزے اور رکھے۔

اگر ۱۴ روزے رکھنا ہو تو مکمل ماہ روزہ رکھے۔

اگر کسی نے سارے روزوں کو بغیر زیادتی کے مسلسل کسی بھی وقت رکھا پھر سترھویں دن سے دوبارہ سارے روزے رکھے اور ان دونوں کے درمیان دو روزے ایک ساتھ یا الگ الگ پہلے سلسلے یا دوسرے سلسلے کے ساتھ متصل یا غیر متصل رکھے تب بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگی۔

یہ تمام تفصیل ان روزوں کے قضاء میں تھی جس میں تتابع (مسلسل ہونا) ضروری نہیں تھا۔ اگر نذر وغیرہ سے تتابع ضروری ہو اور ایک ماہ میں ہوسکتے ہوں تو ان روزوں کو مسلسل رکھے۔ پھر دوبارہ سترھویں سے رکھے۔

مثال: کسی پر دوروزے مسلسل ہیں تو دوروزے رکھے اور ۱۷ اور ۱۸ کو رکھے اور درمیان میں دو مسلسل رکھے۔ اگر مسلسل دوماہ کے رکھنا ہیں تو اسے مسلسل ۱۴۰ دن روزے رکھنا ہوں گے۔

(۶) **متحیرہ کی عدت:** متحیرہ فی الحال ۳ ماہ کے اعتبار سے عدت گذارے گی (سن یاس تک انتظار کی ضرورت نہیں)

بعض متفرق مسائل

کسی پر دوروزے ہوں تو سابقہ ترتیب کے علاوہ یہ ترتیب بھی صحیح ہے کہ پہلے۔ تیسرے۔ ۱۷/ سترھویں اور ۱۹/ انیسویں دن روزہ رکھے۔ چوتھے اور سولہویں روز روزہ نہ رکھے۔ درمیان میں ۱۱/ ایام باقی رہے۔ ان میں سے کسی بھی ایک دن روزہ رکھے۔ متحیرہ کے شوہر پر اس کا نفقہ (خرچ) ضروری ہے، متحیرہ ہونے کی بنیاد پر شوہر نکاح فسخ نہیں کرسکتا، اس لئے کہ آئندہ جماع متوقع ہے بخلاف رتقاء کے (رتقاء یعنی گوشت بڑھنے سے جس کا فرج بند ہوچکا ہو اور اس سے صحبت ممکن نہ ہو) متحیرہ کی اقتداء میں کسی دوسرے متحیرہ یا غیر متحیرہ کی نماز صحیح نہ ہوگی۔

دودھ پلانے کے عذر سے یہ اگر روزہ نہ رکھے تو اس پر فدیہ ضروری نہیں ہے۔ سفر یا بارش کے عذر کی وجہ سے پہلی نماز کے وقت دو نمازوں کے درمیان جمع نہیں کرسکتی (جمع تقدیم نہیں کرسکتی)

ایک دن روزہ واجب ہونے کی صورت میں سابقہ تفصیل کے مطابق روزہ رکھنا شروع کیا اور ایک روزہ رکھنے کے بعد نیت کی تھی یا نہیں، شک ہوا تو حرج نہیں، وہ روزہ صحیح ہے۔

(۲) حیض کا وقت یاد ہے لیکن مدت اور مقدار بھول چکی ہے۔ اس صورت میں اصول یہ ہے کہ جو حیض کا مدت ہونا یقینی ہے اس میں حیض کے سارے احکام ثابت ہونگے۔ اور جو مدت بالیقین طہر ہے اس میں طہر کے احکام ثابت ہونگے لیکن دائم الحدث شمار ہوگی۔

اور وہ مدت جس میں حیض وطہر دونوں کا احتمال ہو، اس مدت میں استمتاع کے اعتبار سے حائضہ شمار ہوگی اور عبادات لازم ہونے کے اعتبار سے طاہرہ (غیر حائضہ) شمار ہوگی۔ اب اس مدت میں حیض کے انقطاع کا احتمال ہو تو ہر فرض کیلئے غسل واجب ہے، اور مناسب حال احتیاط ضروری ہے۔

اگر عورت تیس دن کی تعین کرے اور کہے کہ ابتداء میں حیض شروع ہوتا تھا اس طرح بعد کے ہر تیس دن میں تو تیس دن کا پہلا دن اور رات بالیقین حیض ہے اس کے بعد ۱۵ دن مکمل ہونے تک حیض وطہر اور انقطاع کا احتمال ہے اس کے بعد ماہ کے آخر تک بالیقین طہر ہے، اسی طرح ہر تیس روز کا حکم ہوگا، یہاں ماہ سے قمری ماہ مراد نہیں، بلکہ عورت ہی ایام کی تعین کرے، اگر عورت تیس ایام کی تعین کر کے کہے کہ اتنا مجھے یاد ہے کہ ہر ماہ کے آخر میں حیض کا سلسلہ ختم ہوتا تھا تو ان تیس ایام کے ابتدائی ۱۵ روز بالیقین طہر ہے آخری دن اور رات بالیقین حیض ہے درمیانی ۱۴ ایام میں حیض اور طہر دونوں کا احتمال ہے نہ کہ انقطاع کا، اگر عورت کہے کہ میں ہر ماہ کے آخر اور دوسرے ماہ کے ابتداء میں حائضہ رہتی تھی تو ہر ماہ کا ابتدائی لحظہ اور آخری لحظہ بالیقین حیض ہے، ۱۵ کا آخری لحظہ اور ۱۶ کی شب کا ابتدائی لحظہ بالیقین طہر ہے ابتدائی لحظہ اور ۱۵ کے آخری لحظہ کا درمیانی وقت حیض طہر اور انقطاع کا احتمال رکھتا ہے۔

۱۶ر کے ابتدائی لحظہ اور ماہ کے آخری لحظہ کا درمیانی وقت حیض وطہر دونوں کا احتمال رکھتا ہے نہ کہ انقطاع کا، اگر عورت کہے کہ ایک ماہ کا آخر اور دوسرے کا ابتداء طہر رہا کرتا تھا تو اس کے لئے یقینی حیض نہیں۔ ہر ماہ کا ابتدائی و آخری لحظہ بالیقین طہر ہے ان دو لحظوں کے بعد اقل حیض کی مقدار میں انقطاع کا احتمال نہیں اس کے بعد احتمال ہے۔(۳) حیض کے مقدار کی عادت یاد رہے، یہ تحیر سے اسی وقت نکلے گی جبکہ دور کی مقدار ابتداء اور حیض کی مقدار اسے یاد ہو۔

اگر وہ کہے کہ میرا حیض پانچ دن ہے اور میرے دور میں اسے گم کر چکی۔(یعنی کون سے ایام تھے پتہ نہیں) اور اس کے علاوہ کچھ مجھے پتہ نہیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہر وقت حیض۔ طہر اور انقطاع کا احتمال موجود ہے، اسی طرح اگر کہے کہ میرا حیض ۵ روز، اور دور تیس ایام ہیں جس کی ابتداء میں نہیں جانتی (تو یہی حکم ہے)

باب۔۵ نفاس کا بیان

عورت کو ولادت کے بعد جو خون آتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں۔ نفاس کی اکثر مدت ۶۰ دن ہیں (یعنی زیادہ سے زیادہ کسی عورت کو ۶۰ دن نفاس آسکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں)

اور نفاس کی غالب مدت ۴۰ دن ہیں۔(یعنی عام طور پر عورتوں کو ۴۰ دن تک خون آتا ہے) اور نفاس کی اقل (کم سے کم) مقدار کی کوئی حد نہیں جتنی دیر بھی نکلے خواہ بالکل کم ہو نفاس ہو گا۔

بچہ مکمل پیدا ہو یا ناقص، زندہ ہو، یا مردہ، اس کے بعد جاری ہونے والا خون نفاس ہے۔ اگر کسی عورت کے بطن سے علقہ (خون کا لوتھڑہ) یا مضغہ (بوٹی) نکلے اور دایہ، یہ بتادے کہ یہ انسانی خلقت کی ابتداء ہے تو اس کے بعد نکلنے والا خون نفاس ہے۔

فصل: حاملہ کو حیض کے مطابق خون آئے تو وہ حیض ہے، حمل کی حرکت سے قبل ہو یا، بعد اور اس کی وجہ سے نماز روزہ کی حرمت اور حیض کے دیگر احکام جاری ہونگے، لیکن اس حیض میں طلاق دینا حرام نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے عورت کی عدت ختم نہ ہو گی (لیکن صاحب حمل کے علاوہ دوسرے کسی کی عدت عورت پر واجب ہو جائے تو ایسی صورت میں دوسری عدت اس حیض سے ختم ہو گی۔ (حاشیۃ الروضہ)

خون کے نکلنے کے بعد پندرہ روز سے، یا اس سے قبل یا خون سے متصل ہی ولادت ہو تو ان تمام صورتوں میں وہ حیض ہے۔ زچگی کے وقت ولادت سے پہلے نکلنے والا خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض اسی طرح عین ولادت کے وقت کا خون بھی نفاس و حیض نہیں ہے، ولادت کے بعد نکلنے والا خون نفاس ہو گا جب بچے کے ساتھ ساتھ نکلنے والا خون نفاس نہیں ہے، تو اس خون کی وجہ سے نہ غسل واجب ہو گا اور نہ روزہ باطل ہو گا۔ ان مسائل سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں سے جدا ہونے کے بعد سے نفاس کے خون کی ابتداء شمار کی جائیگی۔

دو جڑواں بچوں کے درمیان (ایک کی ولادت کے بعد دوسرے کی ولادت سے پہلے) نظر آنے والا خون نفاس نہیں۔

فصل: نفساء کا خون ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے، تو اس کا نفاس استحاضہ سے مل گیا، اب نفاس و استحاضہ کے فرق کیلئے حیض و استحاضہ کی سابقہ تفصیل کو مد نظر رکھا جائے گا۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں مستحاضہ کی ۵ قسمیں ہونگی۔

(۱)**معتادہ** (جس کی اس سے قبل نفاس کی متعین عادت رہی ہو) مثلاً کسی کی عادت اس سے قبل ۴۰ دن نفاس کی تھی تو اب اس کا نفاس ۴۰ دن شمار ہو گا۔ حیض کے اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہونگی یا تو معتادہ ہو گی، اس صورت میں ۴۰ دن کے بعد طہر کی سابقہ

عادت کی مدت تک طہر اور حیض کی مدت میں حیض شمار ہو گا، یا پھر وہ مبتداء ہو گی، لہذا ۴۰ دن کے بعد مبتداء کی طہر، کی مقدار تک اس کا طہر ہو گا، اور اس کے بعد حیض کی مدت حیض ہو گی۔ عادت و تمیز دونوں ہو، تو حیض کی سابقہ تفصیل کی روشنی میں فیصلہ ہو گا۔

کئی مرتبہ ولادت کے بعد خون نہ نکلا پھر ایک مرتبہ استحاضہ شروع ہو جائے تو خُون نہ نکلنے کو عادت سمجھتے ہوئے بالکل نفاس کی نفی نہیں کریں گے بلکہ پہلی ولادت کی طرح اسے مبتداء سمجھیں گے۔

(۲) اور (۳) مبتداء ممیزہ اور غیر ممیزہ۔ غیر ممیزہ کا صرف ایک لحظہ نفاس ہو گا۔ اب یہ نفساء حیض کے سلسلہ میں معتادہ تھی۔ تو نفاس کے بعد حیض وطہر کے مطابق سابقہ عادت پر عمل کرے گی اور مبتداء ہے تو مبتداء کے طہر اور حیض کا حکم یہاں بھی جاری ہو گا۔ اور اگر ممیزہ ہے تو تمیز کے شرائط کی موجودگی میں تمیز پر عمل کرے گی، جیسا کہ حائضہ کے متعلق گذر چکا۔

نفساء کی تمیز کی شرط یہ ہے کہ قوی خون ۶۰ دن سے زائد نہ ہو قوی اور ضعیف کے اقل کا کوئی ضابطہ نہیں۔

(۴) معتادہ ممیزہ۔ معتادہ میں اسکا حکم بیان ہو چکا۔

(۵) اپنے نفاس کی سابقہ عادت کو بھولنے والی، اس کا حکم حیض کی عادت کو بھولنے والی کی طرح ہے، اب اگر یہ حیض میں مبتداء ہے یا حیض کی عادت کو بھول چکی ہے تو ہمیشہ احتیاط لازم ہے اور اگر حیض کی عادت یاد ہے تو اس کا حکم حیض کے وقت کو بھولنے والی اور مقدار کو یاد رکھنے والی کی طرح ہے، جس کا بیان گذر چکا ہے۔

نفاس کا خون درمیان میں رکے تو اس کی دو صورتیں ہونگی۔ (۱) کل مدت ۶۰ دن سے زائد نہ ہو، اس صورت میں دو خون کے درمیان انقطاع (خون نہ نکلنے) کی مدت اقل طہر (۱۵ دن رات) سے کم ہو، جیسے ایک دن خون آئے اور ایک دن رکے تو مکمل (خون نکلنے اور نہ نکلنے کی مدت) نفاس ہے۔

اور درمیانی انقطاع اقل طہر کے برابر ہو مثلاً ولادت کے بعد کئی روز خون آئے پھر ۱۵ دن یا اُس سے زائد رک جائے، پھر دوبارہ شروع ہو جائے، تو یہ حیض کا خون ہے۔ (اور درمیانی انقطاع کی مدت طہر ہے) ولادت کے بعد ۱۵ دن یا اس سے زائد خون نہ آئے پھر آنا شروع ہو جائے تو یہ حیض ہے گویا اسے نفاس آیا ہی نہیں۔ اس صورت میں بعد میں آنے والا خون اقل حیض (ایک شب وروز) سے کم ہو تو وہ دمِ فساد ہے، اور آنے والا خون اکثر حیض (۱۵ دن رات) سے زائد ہو جائے تو پھر یہ مستحاضہ ہے جس کا تفصیلی حکم گذر چکا ہے۔

(۲) کل مدت ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے، اس صورت میں ۶۰ دن کے دوران انقطاع کی مدت ۱۵ دن رہی اور پھر آنے والا خون ۶۰ دن سے آگے بڑھ جائے تو یہ حیض ہے اور ۱۵ دن کی مدت سے کم رہی اور یہ عورت مبتداء ممیزہ ہے تو تمیز پر عمل کرے ممیزہ نہیں ہے تو مبتداء کے سابقہ حکم پر چلے۔ معتادہ ہے تو عادت کی طرف رجوع کرے۔

ولادت کے بعد صفرۃ وکدرۃ (زردیا مٹیالے) رنگ کا خون ہو تو وہ بھی نفاس ہی ہے۔ نفساء خون رکنے کے بعد غسل یا تیمم (جہاں تیمم کی گنجائش ہو) کرلے تو شوہر کیلئے فی الحال بغیر کراہت کے اس سے وطی (صحبت) کرنا جائز ہے۔

ولادت کے بعد صرف ایک گھڑی خون نظر آئے اور رک جائے تو اسے غسل کرنا لازم ہے اور اس سے وطی (صحبت) حلال ہے، لیکن پھر خون شروع ہونے کا اندیشہ ہے تو وطی سے توقف (رکنا) مستحب ہے۔

کتاب الصلوٰۃ (نماز کا بیان)

صلوٰۃ لغت میں دُعا کو کہتے ہیں۔

اور شرع میں نیت کے ساتھ تکبیر سے شروع کر کے سلام کے ساتھ مکمل کی جانے والی چند اقوال و افعال کے مجموعہ کا نام صلوٰۃ ہے۔ جس میں مخصوص شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس میں سات ابواب ہیں۔

باب (۱) نماز کے اوقات کا ذکر

آیت: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَ قُرآنَ الفَجْرِ (بنی اسرائیل ۷۸)

ترجمہ: آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے (اس میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء آگئیں) اور صبح کی نماز بھی (ادا کیا کیجئے)

ظہر: ظہر کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے۔

زوال: استواء شمس (سورج کا آسمان میں ٹھیک درمیان میں پہنچنا) کے بعد سایہ کا بڑھنا، یا استواء کے وقت سایہ نہ ہو تو بعد میں سایہ پیدا ہونا۔ استواء کے وقت بالکل سایہ کا نہ ہونا سال کے سب سے طویل دن بعض علاقوں میں ہوتا ہے جیسے مکہ، صنعاء یمن۔

زوال کے وقت سایہ ہو تو اس سایہ کے علاوہ کسی کا سایہ اسی کے برابر ہوتے ہی ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ مثال۔ زوال کے وقت کسی ۵ فٹ طویل شخص کا سایہ ایک فٹ ہے تو جب سایہ ۶ فٹ (۵+۱) ہو جائے گا تو ظہر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ زوال کے وقت بالکل سایہ نہ ہو تو ۵ فٹ سایہ ہوتے ہی وقت ختم ہو گا۔ مذکورہ ابتدائی اور انتہائی وقت کا درمیانی وقت وقتِ اختیاری ہے۔

عصر: ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی عصر کا وقت شروع ہو گا۔ اور سورج غروب ہونے تک باقی رہے گا۔ عصر کے چار اوقات ہیں۔ (۱) وقت فضیلت: اوّل وقت۔ (۲) اختیاری وقت دو مثل (دوگنا) سایہ ہونے تک (زوال کا سایہ چھوڑ کر) (۳) وقتِ جواز بلا کراہت، اختیاری وقت کے بعد سے سورج میں زردی آنے تک (۴) وقت کراہت۔ اصفرار (زردی) سے غروب تک۔

شرح مسلم اور تحقیق میں عصر کا پانچواں وقت بھی بیان کیا ہے۔ اور وہ ہے وقت عذر یعنی سفر یا بارش کی وجہ سے جمع تقدیم کر کے ظہر کے ساتھ پڑھ لینا۔ (حاشیۃ الروضہ ۲۹)

مغرب: سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اصل سورج کی ٹکیہ کا غروب ہو جانا ہے جو کہ کھلے میدانوں میں نظر آئے گا۔ بستی اور پہاڑ کی چوٹی میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ کہ سورج کی شعاعیں دیواروں پر نظر نہ آئے اور مشرق کی جانب سے تاریکی چھانا شروع ہو جائے۔ شفق احمر کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت رہے گا۔ (شفق احمر یعنی غروب کے بعد مغرب کی سمت جو سرخی نظر آتی ہے)

حدیث: شفق کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت ہے۔ (مسلم عن عبداللہ بن عمر)

عشاء: شفق احمر کے غائب ہوتے ہی عشاء کا وقت شروع ہو گا۔ جس علاقہ میں رات مختصر ہونے کی وجہ سے شفق غائب نہیں ہوتی وہاں سے قریب ترین علاقہ کے شفق کے غائب ہونے کا اعتبار کیا جائے گا۔ عشاء کا اختیاری وقت تہائی رات تک ہے۔ (شرح مسلم میں امام

نوویؒ نے نصف رات تک لکھا ہے) اور جواز کا وقت صبح صادق تک ہے (یعنی صبح صادق سے پہلے کسی بھی وقت پڑھنا جائز ہے۔)

فجر: صبح صادق ہوتے ہی فجر کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اِسفار (روشنی پھیلنے) تک وقت اختیاری ہے اور سورج طلوع ہونے تک وقت جواز ہے۔ فجر کے چار اوقات ہونگے۔ (۱) وقتِ فضیلت اول وقت (۲) وقتِ اختیاری۔ اِسفار تک (۳) وقتِ جواز بلا کراہت: سرخی آنے تک (۴) وقتِ کراہت۔ سرخی سے سورج طلوع ہونے تک، جبکہ عذر نہ ہو۔

فجر کی نماز دن کی نمازوں میں شمار ہے۔ مغرب کی نماز کو عشاء اور عشاء کی نماز کو عَتمَۃ کہنا مکروہ ہے (کیونکہ اول کو بخاری شریف میں اور دوم کو مسلم شریف میں منع فرمایا ہے۔ مغنی المحتاج) فجر کی نماز کیلئے صبح یا فجر کا لفظ استعمال کرنا بہتر ہے۔ "صَلٰوۃُ الۡغَدَاۃِ" کہنے کے مقابلہ یہ دونوں الفاظ اولیٰ ہیں۔ بغیر عذر کے عشاء سے قبل سونا اور عشاء کے بعد گفتگو کرنا مکروہ ہے (کیونکہ یہ دونوں آپ ﷺ ناپسند فرماتے تھے۔ (متفق علیہ) نیکی کی بات (جیسے قرآن و حدیث پڑھنا پڑھانا وغیرہ) مکروہ نہیں ہے۔ (جیسا کہ حاکم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔)

اگر وقت کے اندر جاگنے کا گمان نہ ہو تو سونا حرام ہے، وقت ہونے سے قبل سونا حرام نہیں، خواہ وقت میں نہ جاگنے کا گمان غالب ہو، کیونکہ یہ ابھی اس نماز کا مخاطب نہیں، وقت کے بعد نیند کے غلبہ سے بالکل مجبور ہو جائے اور ادائیگی کا پختہ ارادہ ہو تو (سونے میں) کوئی حرمت اور کراہت نہیں ہے۔

نیند کے اقسام (۱) غفلت کی نیند: ذکر کی مجلس میں سونا (۲) بد بختی کی نیند: نماز کے وقت سونا (۳) لعنت کی نیند: صبح کے وقت سونا (۴) عقوبت کی نیند: فجر بعد سونا (۵) راحت کی نیند: ظہر سے قبل سونا (۶) رحمت کی نیند: عشاء کے بعد سونا (۷) حسرت کی نیند: شب جمعہ سونا۔ (حاشیۃالجمل ۱/۲۷۴)

صَلٰوۃ الوسطیٰ: قرآن پاک میں جس صلوۃ الوسطیٰ کا خصوصی ذکر آیا ہے صحیح احادیث سے یہ عیاں ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔

احادیث: (۱) حدیثِ امامتِ جبرئیل علیہ السلام: آپ ﷺ نے فرمایا! حضرت جبرئیل نے بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ (دو دن) میری امامت فرمائی (معراج سے تشریف آوری کے بعد) پس میرے ساتھ زوال کے وقت ظہر ادا کی جبکہ سایہ تسمے کے برابر تھا اور عصر کی نماز اس وقت ادا کی جبکہ ہر شئی کا سایہ اس کے برابر ہوا، اور مغرب پڑھائی جبکہ روزہ دار نے افطار کیا، (افطار کے وقت) اور عشاء شفق غائب ہونے کے بعد پڑھائی، اور فجر اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار پر کھانا حرام ہو جائے (یعنی صبح صادق ہوتے ہی) پھر دوسرے دن سایہ مثل پر ظہر ادا فرمائی، اور دو مثل سایہ ہونے پر عصر پڑھائی، مغرب (کل کی طرح) افطار کے وقت پڑھائی اور عشاء تہائی رات تک (موٴخر کر کے) ادا کی اور فجر کو اِسفار (روشنی اور اجالے) کے وقت ادا فرمایا، پھر میری جانب متوجہ ہو کر فرمایا اے محمد ﷺ یہ آپ سے قبل انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا وقت ہے۔ اور وقت ان دونوں کے درمیان ہے (یعنی پہلے اور دوسرے دن کے اوقات کا درمیانی وقت) (ابو داود۔ ترمذی)

(۲) جسے غروب سے قبل عصر کی ایک رکعت مل جائے وہ اپنی نماز مکمل کر لے اور طلوع سے قبل فجر کی ایک رکعت ملے تو وہ اپنی نماز مکمل کر لے (بخاری شریف)۔ (۳) فجر کی نماز کا وقت طلوع فجر (صبح صادق) سے طلوع آفتاب تک ہے۔ (مسلم)

فصل: نماز کا وقت شروع ہوتے ہی نماز واجب ہو جاتی ہے لیکن فوراً ادا کرنا ضروری نہیں، وقت ختم ہونے سے پہلے کبھی بھی ادا کر

ناکافی ہے، (ایسے واجب کو واجب مُوَسَّع کہتے ہیں) وقت کے اندر مؤخر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، بغیر عذر کے بھی مؤخر کرے اور دوران وقت مر جائے، تو اس تاخیر کی وجہ سے گنہگار نہ ہو گا (البتہ شرح مہذب اور تحقیق میں مؤخر کرنے کی صورت میں ادائیگی کے عزم اور ارادہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ (کمافی حاشیۃ الروضہ)

بعض نماز وقت میں اور بعض خارج میں ہو تو اسکا حکم

وقت کے اندر ایک رکعت یا زائد ادا ہو تو پوری نماز ادا شمار ہو گی، البتہ بغیر عذر کے اتنا مؤخر کرنا کہ نماز کا کچھ حصہ وقت سے باہر جائے جائز نہیں۔ اور ایک رکعت سے بھی کم وقت کے اندر ادا ہو تو پوری نماز قضاء شمار ہو گی۔

حدیث: جسے نماز کی ایک رکعت ملی اسے وہ نماز ملی (یعنی مکمل ادا شمار ہو گی اب بقیہ رکعتوں کو ادا کرے) (صحیحین)

ایسے وقت نماز شروع کرے کہ مکمل نماز وقت کے اندر ادا ہو سکتی ہے، لیکن طویل تلاوت کی وجہ سے وقت نکل گیا تو نہ گنہگار ہو گا اور نہ اس میں کراہت ہے (لیکن بعض فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے)

فصل۔ اوّل وقت کی فضیلت

آیت: "سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" (حدید ۲۱) ترجمہ: "تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو۔"

اول وقت نماز ادا کرنا افضل ہے۔ نماز کا وقت ہوتے ہی نماز کے اسباب میں مصروف ہو جائے، جیسے طہارت اذان وغیرہ، پھر نماز پڑھ لے تو اس سے اوّل وقت کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس فضیلت کیلئے ستر عورت کو وقت سے پہلے انجام دینا ضروری نہیں ہے۔ چند لقمے کھانا اور کچھ گفتگو کرنا وغیرہ جیسے معمولی اشغال سے یہ فضیلت فوت نہ ہو گی۔ عام عادت کے برخلاف ان امور کو جلد اور عجلت کے ساتھ انجام دینے کی ضرورت نہیں۔

تشریح: مقصود یہ بتانا ہے کہ اول وقت کی فضیلت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری تیاریاں پہلے ہی مکمل کر کے نماز کا وقت ہوتے ہی فوراً نماز شروع کرے، بلکہ متوسط طور پر مذکورہ امور وقت ہونے کے بعد انجام دے کر نماز ادا کرے تو بھی اسے اول وقت ہی سمجھیں گے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ ظہر کی نماز سخت گرمی میں (اول وقت) ادا کرتے اور عصر اس وقت ادا کرتے کہ سورج زندہ ہوتا (یعنی پوری طرح ضیاپاش رہتا) اور مغرب جبکہ سورج غروب ہو جاتا اور عشاء کی نماز لوگ کثیر ہوتے تو جلد پڑھاتے اور کم ہوتے تو تاخیر فرماتے اور فجر کی نماز غَلَس میں (یعنی اول وقت میں جبکہ رات کی تاریکی کا اثر باقی ہو) ادا کرتے۔ (متفق علیہ)

(۲) حضرت رافع بن خَدِیج کا ارشاد ہے۔ ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹتے تو اپنے تیر کے گرنے کی جگہ نظر آتی تھی۔ (یعنی ابھی کافی روشنی باقی رہتی) (متفق علیہ)

(۳) آپ ﷺ کی سحری اور نماز میں تقریباً ۵۰ آیتوں کی تلاوت کے بقدر فاصلہ ہوتا۔ (بخاری شریف)

(۴) حضرت رافع کا ارشاد ہے ہم آپ ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد اونٹ ذبح کرتے، پھر اس کے دس حصے کرتے پھر اسے پکا کر غروب آفتاب سے قبل کھاتے۔" (متفق علیہ)

پانچوں نمازوں کو اول وقت پڑھنا افضل ہے، البتہ نماز ایسی مسجد (یا کسی اور جگہ) با جماعت ادا ہو جہاں لوگ دور سے چل کر آتے

ہوں، تو گرمی کی شدت میں ظہر کی نماز میں ابراد سنت ہے۔

(ابراد کا مطلب کچھ تاخیر کر کے گرمی کی شدت کم ہونے کے بعد پڑھنا) اتنی تاخیر کرلے کہ دیواروں کے سایہ میں نمازی چل کر مسجد پہنچ سکے، نصف اول سے زیادہ مؤخر نہ کرے، اگر جماعت میں شریک ہونے والے نمازیوں کے مکانات مسجد سے قریب ہوں یا کچھ حضرات کسی جگہ جمع ہیں، جہاں کوئی اور جماعت کیلئے نہیں آئے گا تو ابراد سنت نہیں ہے۔ اسی طرح مسجد میں پہنچنے کے لئے سایہ موجود ہو، یا گھر ہی میں نماز پڑھتا ہو، تو ابراد سنت نہیں ہے۔ صرف گرم علاقوں میں ابراد کیا جائے گا۔ جمعہ کی نماز میں ابراد نہیں کیا جائے گا۔

حدیث: جب شدید گرمی ہو تو (ظہر کی) نماز میں ابراد کرو (اسے نسبتاً ٹھنڈے وقت ادا کرو) (متفق علیہ)

فصل۔ وقت میں اشتباہ

بادل یا تاریکی میں قید ہونے یا اس طرح دیگر اسباب کی وجہ سے نماز کا وقت مشتبہ ہو تو اس کے لئے اجتہاد سے کام لے تدریس، اعمال اور وظیفہ جیسے امور سے صحیح اندازلگانے کی کوشش کرے۔

تشریح: کسی کو یہ اندازہ ہے کہ مغرب کے بعد بارہ رکعت پڑھنے تک شفق رہتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے تو اب کسی دن بادل کی وجہ سے شفق کا اندازہ نہ ہو تو وہ عادت کے مطابق بارہ رکعت پڑھ لینے کے بعد عشاء کے وقت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح دیگر اعمال سے اندازہ کر کے وقت کی تعین کرے گا۔ اگر مرغ صحیح وقت پر اذان دینے کا عادی ہے، تو اس کی اذان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ کئی مؤذن اذان دیں اور ان کی کثرت کی وجہ سے گمان غالب ہو کہ وقت کی تعین میں غلطی نہیں کریں گے، تو ان کی اذان کا اعتبار کیا جائے گا۔ نابینا بھی بینا کی طرح اجتہاد سے کام لے۔ مذکورہ اجتہاد اس وقت کیا جائے گا جبکہ مشاہدہ کی روشنی میں وقت کی اطلاع دینے والا کوئی معتبر آدمی نہ ہو۔ اگر کوئی معتبر آدمی کہے کہ میں نے طلوع فجر ہوتے، یا شفق غروب ہوتے دیکھا ہے، تو اجتہاد کی گنجائش نہیں، بلکہ اس کی بات پر عمل کرینگے۔ لیکن اجتہاد سے بتائے، تو اس بینا شخص کو جو خود اجتہاد کر سکتا ہے اس کی تقلید جائز نہیں (یعنی وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرے، دوسرے کے اجتہاد کی پیروی جائز نہیں ہے) البتہ نابینا کیلئے جائز ہے۔ نماز کے اوقات سے واقف مؤذن کی اذان کا اعتبار کیا جائیگا۔ جن صورتوں میں وقت کیلئے اجتہاد کرنا لازم ہے بغیر اجتہاد کے نماز پڑھے، اور وقت میں ادا ہو، تب بھی اس کا اعادہ لازم ہے۔ کوئی علامت اور دلالت وقت کے متعلق نہ ہو یا ہونے کے باوجود غلبہ ظن حاصل نہ ہو، تو دل میں وقت ہونے کا غلبہ حاصل ہونے تک انتظار کرے۔ احتیاط یہ ہے کہ اتنا تاخیر کرے کہ اس سے زیادہ تاخیر کی صورت میں نماز قضاء ہو جانے کا گمان غالب ہو۔

دخول وقت کا یقین حاصل ہونے کا امکان ہونے کے باوجود اجتہاد کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ مُنَجِّم اپنے حساب سے دخول وقت کو جانتا ہے تو اپنی حد تک اس پر عمل کر سکتا ہے دوسرا اس کی پیروی نہیں کرے گا۔

جن صورتوں میں اجتہاد جائز ہے، اجتہاد کے ذریعے نماز پڑھنے کے بعد کچھ پتہ نہ چلا (کہ نماز وقت میں ہوئی تھی یا آگے پیچھے) تو اس پر کچھ لازم نہیں ہے۔ (نماز دہرانے وغیرہ کی ضرورت نہیں) بعد میں معلوم ہو کہ نماز وقت کے اندر یا وقت کے بعد واقع ہوئی تھی تو قضاء کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعد میں واقع ہوئی ہے تو وہ قضا شمار ہوگی۔

لیکن وقت سے پہلے نماز ادا ہو چکی ہو تو اسکا اعادہ لازم ہے، خواہ وقت کے اندر معلوم ہو یا بعد میں، کسی نے اسے مشاہدہ اور علم کی بنیاد پر وقت سے پہلے نماز ہونے کی خبر دی تو اعادہ واجب ہے، اور اجتہاد کے ذریعے خبر دی ہے، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔

فصل۔ نماز کے وجوب سے مانع اسباب

درج ذیل اسباب ہوں تو نماز واجب نہ ہوگی۔

بچپن (نابالغ ہونا) کفر، جنوں، بے ہوشی، حیض، نفاس، ان کو مانع کہتے ہیں۔

احادیث:(۱) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے عورتوں کے دینی نقصان کی وضاحت یوں فرمائی: کیا وہ حیض کی حالت میں نماز روزہ نہیں چھوڑتی۔ (متفق علیہ)

(۲) حضرت عائشہ کا ارشاد ہے: ہم کو (ایام حیض کے) روزوں کی قضاء کا حکم تھا، نماز کی قضاء کا حکم نہیں تھا (متفق علیہ)

(۳) تین لوگ مرفوع القلم ہیں (یعنی غیر مکلف ہیں ان پر گناہ لکھا نہ جائیگا) بچہ، بالغ، ہونے تک، سونے والا بیدار ہونے تک، اور پاگل، پاگل پن ختم ہونے تک (احمد ابو داود نسائی، ابن ماجہ)

ان اسباب کی تین حالتیں ہوں گی۔ (۱) وقت کے ابتداء میں سبب پایا جائے، اور آخر میں نہ پایا جائے، جیسے کوئی عورت نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے حیض یا نفاس سے پاک ہو جائے اس صورت میں اتنا وقت بھی باقی ہو جس میں صرف تکبیر تحریمہ کہہ سکے، تو یہ نماز اس پر فرض ہو جائے گی۔ لیکن یہ شرط ہے کہ مانع اتنی دیر تک دوبارہ نہ پایا جائے جس میں طہارت حاصل کر کے وہ نماز پڑھی جا سکے۔ اتنی مدت سے پہلے ہی مانع لوٹ آئے تو نماز واجب نہ ہو گی۔

مثال: عصر کی نماز کے آخری وقت کوئی بچہ بالغ ہوا، پھر پاگل ہوا یا پاگل اچھا ہوا، پھر دوبارہ پاگل پن کا دورہ پڑا، یا عورت پاک ہوئی پھر پاگل ہوئی، یا پاگل عورت اچھی ہوئی، پھر حیض شروع ہوا تو درمیانی سلامتی کی مدت اتنی ہو کہ اسمیں طہارت اور چار رکعات ادا ہو سکتے ہیں تو عصر کی نماز واجب ہو گی ورنہ نہیں۔

فجر، ظہر یا عشاء میں یہ صورت پیش آئے تو صرف وہی نماز واجب ہو گی۔ اگر عصر کے وقت یہ صورت پیش آئے تو عصر کے ساتھ ظہر بھی اور عشاء میں پیش آئے تو عشاء کے ساتھ مغرب بھی واجب ہو گی۔

حدیث: حائضہ عورت طلوع فجر سے ایک رکعت (کی ادائیگی کے بقدر) پہلے پاک ہو جائے تو اس پر مغرب اور عشاء دونوں لازم ہیں اور غروب آفتاب سے قبل پاک ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں پڑھے گی (اثرم، بیہقی فی المعرفہ) (تلخیص ۱/۲۰۳)

بچہ فرض نماز پڑھنے کے بعد وقت ختم ہونے سے پہلے بالغ ہو جائے تو دوبارہ اس نماز کو پڑھنا مستحب ہے۔ نماز کے دوران عمر کے اعتبار سے بالغ ہو جائے تو اس نماز کو مکمل کرنا واجب ہے، اور اعادہ مستحب ہے۔

(۲) اول وقت اعذار مذکورہ نہ ہوں، پھر حیض، نفاس، جنون اور بے ہوشی میں سے کوئی عذر طاری ہو جائے تو اس صورت میں اگر وقت ہونے کے بعد مختصر ترین انداز میں متعلقہ نماز کی ادائیگی کے بقدر وقت گذرنے کے بعد حیض (یا دیگر کوئی مانع) شروع ہو جائے تو پاک ہونے کے بعد اس نماز کی قضاء واجب ہے۔

کسی نے طویل نماز شروع کی اور نماز پوری ہونے سے پہلے حیض شروع ہو گیا اور اتنا وقت نماز کا گذر چکا ہے کہ مختصر پڑھنے کی صورت میں مکمل نماز مل جاتی تو اس نماز کی قضاء واجب ہے۔

مسافر پر قصر والی نماز کے دو رکعت کی مقدار وقت گذرنے کے بعد جنون یا بے ہوشی طاری ہو تو اس نماز کی قضاء ضروری ہے۔

تشریح: ظہر، عصر یا عشاء میں اوپر کی صورت میں مسافر کے حق میں ۴ رکعات کا لحاظ نہیں کریں گے، چونکہ وہ قصر کر کے دو رکعت پڑھ سکتا ہے، اس لئے ابتداء میں مختصر دو رکعت کا وقت بھی مل جائے تو قضاء لازم ہے۔

جن لوگوں کو وقت ہونے کے بعد طہارت حاصل کرنا ضروری ہے، جیسے تیمم کرنے والا، مستحاضہ وغیرہ ان کے حق میں طہارت کا وقت بھی ملنا ضروری ہے۔ (صرف بقدر نماز وقت ملنے سے ان پر قضاء لازم نہ ہوگی۔) دیگر حضرات کے حق میں طہارت کے وقت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ابتداء میں مختصراً اس نماز کو ادا کرنے کی مدت سے بھی پہلے مانع آجائے تو قضاء لازم نہیں۔

ظہر کا وقت ملنے سے عصر، اور مغرب کا وقت ملنے سے عشاء کی نماز واجب نہیں ہے۔ مذکورہ نماز کے وجوب کا حکم صرف ابتداء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ درمیان میں کسی بھی وقت اتنی مہلت مل جائے کہ وہ نماز ادا ہو سکتی تھی تو وہ لازم ہو جائے گی، جیسے پاگل کو وقت کے دوران افاقہ ہوا اور پھر وقت میں پاگل پن لوٹ آئے، یا بچہ بالغ ہو جائے، اور پھر مجنون ہو جائے، یا مجنونہ کو افاقہ ہو اور پھر حیض شروع ہو جائے (ان صورتوں میں درمیانی سلامتی کی مدت میں مختصراً نماز کی ادائیگی کی گنجائش تھی اور ادا نہ کی گئی تو بعد میں عذر ختم ہونے کے بعد اس کی قضاء لازم ہے۔)

جس طرح عصر کا آخری وقت ملنے سے ظہر بھی فرض ہو جاتی ہے اسی طرح عصر کا ابتدائی وقت ملنے سے بھی ظہر فرض ہو گی۔ جیسے کوئی بے ہوش، عصر کا اتنا وقت جس میں ظہر اور عصر کے ادائیگی کی گنجائش ہو گذرنے کے بعد افاقہ پائے۔

(۳) مکمل وقت سبب پایا جائے۔

حیض و نفاس کی وجہ سے نہ نماز واجب ہو گی اور نہ جائز ہے۔ بعد میں قضاء بھی نہیں کی جائے گی۔ کافر اصلی۔ (جو ابتداء سے کافر ہو کبھی مسلمان نہ رہا ہو) نماز اور دیگر شرعی فروعات کا مکلف ہے، لیکن اسلام لے آئے تو ایام کفر کے نماز وغیرہ کی قضاء اس پر واجب نہیں ہے۔

تشریح: جس طرح کافر پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح نماز، روزہ وغیرہ فرائض بھی لازم ہیں، لیکن بغیر اسلام لائے ان کی ادائیگی معتبر نہ ہو گی۔ اب کوئی کافر ہی مرتا ہے تو اس کو کفر کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے ترک پر بھی عذاب ہو گا اور مرنے سے قبل کبھی بھی اسلام لے آئے تو قرآن و حدیث کی رو سے سابقہ سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں، کفر کے ایام کی نمازوں وغیرہ کو قضاء کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرتد (جو اسلام سے پھر جائے اس) پر ردّت کے ایام کے نمازوں کی قضاء واجب ہے۔

نابالغ بچہ پر نہ نماز ادا کرنا واجب ہے اور نہ اس کی قضاء۔ جن لوگوں پر نماز فرض نہیں، ان کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا جائے گا، سوائے نابالغ لڑکے اور لڑکی کے، بچہ جب سات سال کا ہو جائے اور باشعور ہو تو اسے نماز کا حکم دیا جائے گا، اور دس سال کا ہونے کے بعد نماز کی پابندی نہ کرے تو اسے مار لگائی جائے گی۔

حدیث: بچوں کی عمر سات سال ہو جائے تو ان کو نماز کا حکم دو، اور دس سال ہو جائے تو نماز (کے چھوڑنے) پر ان کو مار لگاؤ۔ (ابوداود وصححہ فی المجموع، ترمذی، حاکم، دارقطنی۔ تلخیص ۱/۹۵)

مذکورہ تنبیہ اور مار سرپرست (باپ، دادا، یا وصی۔) پر واجب ہے (فتح الوھاب ۱/۳۲) علماء کرام نے کہا ہے کہ والدین پر بچہ سات سال کا ہونے کے بعد اسے طہارت، نماز اور دیگر شرعی باتوں کی تعلیم دینا واجب ہے اور دس سال کا ہونے کے بعد کوتاہی کی صورت میں مارنا واجب ہے، اگر روزہ کی طاقت ہے تو اس کا حکم بھی نماز کی طرح ہے۔

تشریح: سات سال کی عمر میں روزہ کی طاقت ہے تو رکھنے کا حکم دیں گے۔ دس سال ہونے پر باوجود طاقت کے نہ رکھے تو سزا دیں گے۔

اگر بچہ کا اپنا مال ہے (وراثت یا ہبہ وغیرہ طریقے سے ملا ہوا) تو فرائض اور دیگر شرعی تعلیم کی اجرت اسی مال سے دی جائے گی۔(یعنی والدین کو اپنے جیب سے دینا ضروری نہیں، خوشی سے دیں تو کوئی حرج بھی نہیں) بچہ کا اپنا کچھ مال نہ ہو (جیسے عموماً ہوتا ہے) تو والد کے ذمہ ہے، وہ نہ ہو تو پھر والدہ کے ذمہ اجرت ہوگی۔

جنون کی وجہ سے کسی کی عقل زائل ہو جائے یا بے ہوش ہو اور نماز کا وقت اس میں گذر جائے تو اس پر نماز واجب نہ ہوگی اور نہ بعد میں قضاء واجب ہوگی۔ کسی حرام سبب سے عقل زائل ہو، جیسے شراب پینا یا عقل کو زائل کرنے والی کوئی دوا استعمال کرنا تو قضاء واجب ہے، جبکہ بغیر حاجت کے دوا استعمال کرے اور یہ جانتا ہو کہ وہ دوا عقل کو زائل کرے گی اور شراب جان بوجھ کر پی ہو۔ اگر حاجت کی وجہ سے، یا لاعلمی میں اس طرح ہو جائے تو قضاء واجب نہیں ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ شراب اور نشہ لانے والی چیز ہے لیکن جتنی مقدار استعمال کر رہا ہے اس کے متعلق یہ گمان ہے کہ اس سے نشہ نہ آئے گا، لیکن آگیا تو نماز کی قضاء واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ اس کی صریح غلطی ہے۔

کہیں سے کسی ضرورت سے کود پڑا، جس سے عقل زائل ہوئی، تو نماز کی قضاء لازم نہیں، لیکن یہ حرکت فضول اور بلاوجہ کی تھی تو قضاء واجب ہے۔

مرتد ہونے کے بعد پاگل ہو جائے، پھر اچھا ہونے کے بعد دوبارہ اسلام لے آئے تو اس صورت میں پاگل پن کے نمازوں کی بھی قضاء لازم ہے، اس کے ارتداد کی وجہ سے یہ سخت حکم اس پر لگایا جائے گا۔ شراب پی کے نشہ آنیکے بعد پاگل ہو جائے تو پاگل پن کے نماز کی قضاء لازم نہیں ہے اس کے علاوہ نشہ کی مدت کی قضاء لازم ہے۔ عورت پر ارتداد یا نشہ کے ایام میں حیض کی نمازوں کی قضاء لازم نہیں ہے۔

کسی دوا کے استعمال سے حیض آئے یا بچہ ساقط ہو جائے اور نفاس آئے، تو ان ایام کے نمازوں کی قضاء واجب نہیں ہے، اس لئے کہ حیض و نفاس میں نماز ترک کرنا عزیمت ہے۔ (رخصت نہیں ہے۔)

مکروہ اوقات کا بیان

مکروہ اوقات پانچ ھیں۔

پانچ کا عدد اصلی اوقات کے اعتبار سے ہے ورنہ اقامتِ جماعت کے وقت اور خطیب کے خطبہ کیلئے چڑھنے کے وقت بھی نفل مکروہ ہے۔(حاشیۃ الروضہ)

(۱) سورج طلوع ہوتے وقت یہاں تک کہ ایک نیزہ کے برابر بلند ہو جائے (یعنی ظاہری نظر میں تقریباً ۲ ہاتھ کی مقدار بلند ہونے تک)

(۲) استواء شمس کے وقت (سورج کے آسمان میں ٹھیک درمیان میں پہنچنے کے وقت)

(۳) شام کو سورج میں زردی آنے کے وقت سے مکمل غروب ہونے تک۔

(۴) فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک۔

(۵) عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ فجر (کی نماز) کے بعد سورج طلوع ہونے تک نماز نہیں اور عصر کے بعد غروب تک نماز نہیں۔ (متفق علیہ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ)

آخری دونوں وقت میں اگر فجر اور عصر کو اول وقت ادا کرے تو کراہت کی مدت بڑھ جائے گی، اور مؤخر کرے تو کم ہو جائے گی۔

مذکورہ اوقات میں صرف وہ نماز مکروہ ہے، جس کا کوئی سبب نہ ہو، جیسے نفل مطلق۔ جس نماز کا سبب پہلے یا مقارن (نماز کے ساتھ ساتھ) پایا جائے، وہ ان اوقات میں مکروہ نہیں ہے۔ (کیونکہ آپ ﷺ کی ظہر کی دو رکعت سنت فوت ہوئی تو آپ ﷺ نے اسے عصر بعد پڑھی۔ (بخاری شریف و مسلم) سبب والی نمازوں میں قضاء نماز داخل ہے۔ ان اوقات میں فرائض و سنن اور وہ نفل جن کو بطور وظیفہ پابندی سے پڑھتا ہو ان کی قضاء جائز ہے۔ (ایک صحابی نے سنت فجر کو فجر کے بعد ادا فرمایا تو آپ ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی۔ ترمذی، ابوداود)

اسی طرح نماز جنازہ، سجدہ تلاوت، سجدۂ شکر، طواف کی سنت اور سورج گہن کی نماز ان اوقات میں جائز ہے۔ ان اوقات میں وضو کرلے تو سنت وضو کی دو رکعت پڑھ سکتا ہے۔ اِستسقاء کی نماز ان اوقات میں پڑھ سکتا ہے۔ احرام کی دو رکعت سنت ان اوقات میں مکروہ ہے، اعتکاف، درس، انتظار نماز وغیرہ کسی سبب سے کوئی ان اوقات میں مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد مکروہ نہیں ہے۔ دوسرے کسی حاجت کے بغیر صرف تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنے کے ارادے سے مکروہ اوقات میں مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ کسی قضاء نماز کو عمداً ان اوقات میں قضاء کرنے کیلئے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔ کسی سنت کو ان اوقات میں قضاء کر لیا تو بعد میں ہمیشہ اس سنت کو ان اوقات میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

تشریح: مثلاً ظہر کی سنت چھوٹ گئی جسے عصر کے بعد قضاء کر لیا تو اب روزانہ عصر کے بعد چار رکعات پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ آئندہ بھی اگر اس طرح قضاء ہو تو اس کی تلافی میں کوئی حرج نہیں، بغیر قضاء ہوئے آئندہ کیلئے مستقل عادت بنانا ممنوع بتایا جا رہا ہے۔

مذکورہ مکروہ اوقات میں بعض وقت اور مقام کے اعتبار سے کچھ استثناء بھی ہے۔

وقت: جمعہ کے دن استواء کے وقت کسی کیلئے بھی نفل مکروہ نہیں ہے۔

دلیل: آپ ﷺ نے نصف النہار کے وقت نماز سے منع فرمایا بجز یوم جمعہ کے (الشافعی، بیہقی) امام شافعیؒ نے ثعلبہ سے روایت پیش کی ہے کہ صحابہ کرام عموماً بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز پڑھا کرتے۔ بخاری وغیرہ کی روایت میں امام کے خطبہ تک نماز میں مشغول رہنے کا ذکر ہے ابوداود کی ایک مرسل روایت میں جمعہ کے استثناء کا یہ سبب بتایا کہ اس روز استواء کے وقت جہنم بھڑکائی نہیں جاتی۔ (تلخیص الحبیر ۱/۲۰۰)

مقام: مکہ مکرمہ اور اس کے حرم میں کسی بھی وقت کوئی نماز مکروہ نہیں، طواف کی نماز ہو یا کوئی اور نماز۔

حدیث: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے بنی عبد مناف! تم میں سے کوئی لوگوں کے کسی بھی معاملہ کا ذمہ دار بنے تو ہرگز کسی کو دن رات کی کسی بھی گھڑی میں کعبہ کے طواف اور (وہاں) نماز سے نہ روکے۔ (رواہ الشافعی، والاربعہ قال الترمذی حسن صحیح رواہ ابن حبان والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم)

کراہت کے باوجود کوئی نماز شروع کرے تو منعقد ہی نہ ہوگی۔ جیسے عید کے دن روزہ، ان اوقات میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو نذر منعقد ہی نہ ہوگی۔ مطلق نماز کی نذر مانی (ان اوقات میں پڑھنے کی نہیں) تو ایسی منذورہ نماز کو ان اوقات میں پڑھ سکتے ہیں اس لئے کہ

سبب (یعنی نذر) پایا گیا۔ ان اوقات میں جو کراہت ہے وہ تحریمی کراہت ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی تحرّی (جستجو) کر کے (قصداً) طلوع شمس اور غروب شمس کے وقت نماز نہ پڑھے۔ (بخاری و مسلم عن ابن عمر رضی اللہ عنہ)

(۲) فجر کی نماز کے بعد سورج بلند ہونے تک اور عصر کے بعد سورج غروب ہونے تک نماز (پڑھنی) نہیں ہے۔ (متفق علیہ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ) (مسلم، مالک، الشافعی، وغیرہ کی روایات میں استواء کے وقت بھی ممانعت مروی ہے۔)

باب (۲) اذان

احادیث۔ (۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان اور صف اول میں کیا (فضیلت اور ثواب) ہے پھر بغیر قرعہ اندازی کے اسے حاصل نہ کر سکیں، تو قرعہ اندازی کریں'' (رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

(۲) ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ اذان دی جاتی ہے 'تو شیطان گوز مارتا ہوا (ہوا چھوڑتا ہوا) بھاگ جاتا ہے تاکہ اسے اذان سنائی نہ دے۔ (رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''قیامت کے دن مؤذن کی گردن سب سے اونچی ہوگی''۔ (رواہ مسلم عن معاویہؓ)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤذن کی آواز جس جن یا انسان یا چیز تک پہنچتی ہے، وہ قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے کر رہے گا'' (رواہ البخاری عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ) (من الاذکار ص ۳۵)

اذان اور اقامت سنت ہیں پنج وقتہ فرائض میں سے کسی بھی نماز کی مردوں کی پہلی جماعت کیلئے اذان بالاتفاق مشروع ہے۔ بستی میں یا جنگل میں منفرد (اکیلے نماز پڑھنے والا) کیلئے اذان و اقامت سنت ہے۔

کسی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ کر نمازیوں کے جانے کے بعد کسی کو نماز پڑھنی ہو تو بلند آواز سے اذان نہ دے تاکہ اوروں کو غلط فہمی نہ ہو، ورنہ بلند آواز سے دے سکتا ہے۔

جماعت ثانیہ: کسی مسجد میں جماعت ہونے کے بعد چند لوگ آئیں اور اس مسجد میں کوئی امام راتب (پابندی کے ساتھ امامت کیلئے متعین شخص) نہ ہو، تو ان حضرات کو جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر امام راتب موجود ہے۔ تو بعد میں پھر جماعت کرنا مکروہ ہے، جبکہ غیر مطروق مسجد ہو، اگر مسجد مطروق ہو تو مکروہ نہیں۔ (حاشیۃ الروضہ) (مسجد مطروق یعنی جہاں لوگوں کی آمد و رفت اور نماز کا سلسلہ جاری رہتا ہو۔)

مسجد میں دوبارہ مکروہ، یا غیر مکروہ جماعت ہو، تو اس کے لئے اذان مسنون ہے، لیکن بلند آواز سے نہیں دیں گے، تاکہ اوروں کو اشتباہ نہ ہو، چاہے مسجد مطروق ہو یا غیر مطروق، اگر بلند آواز سے دے تو خلاف اولیٰ ہے۔

تنہا عورت کیلئے اور عورتوں کی جماعت کیلئے صرف اقامت مستحب ہے، اذان مستحب نہیں ہے، اگر عورت ذکر کی نیت سے عورتوں کی جماعت کیلئے اتنی آواز سے اذان دے کہ صرف عورتیں سن سکیں، تو یہ مکروہ نہیں ہے، اور نہ مستحب ہے اگر شرعی اذان کی نیت سے دے یا بلند آواز سے دے تو حرام ہے۔ (جمل ۱/۲۹۹)

نومولود کے کان میں عورت کا اذان دینا کافی ہے (بغیۃ ص ۳۷) پنجوقتہ فرائض کے علاوہ کسی بھی نماز کیلئے اذان اور اقامت

مشروع نہیں ہے۔ منذورہ ہو یا سنت، جماعت سے پڑھی جانے والی نماز ہو جیسے عیدین، کسوفین اور استسقاء، یا بغیر جماعت کے جیسے ضحیٰ (چاشت)، البتہ عید، کسوف (سورج گہن) اور استسقاء (پانی مانگنے) کی نماز کیلئے "الصّلاۃ جامعۃ" کہہ کر آواز دیں گے۔ (کسوف کیلئے اس طرح اعلان صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔) اسی طرح تراویح کی نماز جماعت سے ہو رہی ہو تو اس کے لئے بھی **الصّلاۃ جامعۃ** کہہ کر پکارا جائے گا۔ لیکن جنازہ کی نماز کیلئے اس طرح پکارنا مستحب نہیں ہے۔ فرض نماز کی قضاء کیلئے بھی اذان و اقامت مستحب ہے۔

مسلسل کئی قضاء نمازیں پڑھے، تو صرف پہلی نماز کیلئے اذان کہے اور اقامت ہر نماز کیلئے پڑھے۔

پہلے ادا نماز اور اس کے بعد قضاء پڑھے تو اذان صرف ادا کیلئے دے اقامت دونوں میں کہے گا۔ اس کے برعکس پہلے قضا اور پھر ادا پڑھے تو قضاء کیلئے اذان و اقامت دے، ادا کیلئے اذان نہ دے، صرف اقامت کہے لیکن دونوں میں زیادہ فاصلہ ہو جائے تو ادا کیلئے بھی اذان دے۔

سفر یا بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرے تو جمع تقدیم ہو یا تاخیر پہلی نماز کیلئے اذان اور دونوں کیلئے اقامت کہے۔

شیخین کی روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مزدلفہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مغرب وعشاء کو ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھنے کا ذکر موجود ہے۔

قضاء نماز کی اذان کے بعد ادا کا وقت شروع ہو تو ادا کیلئے بھی اذان دے گا۔ ایک ادا نماز کو بالکل آخری وقت پڑھے، پھر دوسری نماز کو اول وقت پڑھے تو دوسری نماز کیلئے بھی اذان مستحب ہے۔

فصل: اذان کی صفت

(۱) اذان کے اکثر کلمات دوہرے اور اقامت کے اکہرے ہیں۔ اذان کے ابتداء میں تکبیر چار مرتبہ اور آخر میں " لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ "ایک مرتبہ ہے۔ اقامت میں اول و آخر تکبیر، اور اقامت کے الفاظ (**قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ**) دو دو مرتبہ ہیں۔

(۲) اذان کو ٹھہر ٹھہر کر واضح انداز میں ادا کرنا مستحب ہے۔ اقامت کو بغیر فاصلہ کے جلد پڑھنا مستحب ہے۔

(۳) **ترجیع**۔ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ (مسلم، ابوداود اور ترمذی وغیرہ میں اسکا ثبوت ہے۔) یعنی ابتداء میں چار مرتبہ تکبیر کہنے کے بعد پہلے دو مرتبہ "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ" پھر دو مرتبہ "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ" پست آواز میں کہے (پست آواز سے مراد یہ ہے کہ اس کے قریب والے سن سکیں یا متوسط رقبہ کی مسجد ہو اور مسجد میں اذان دے تو اہل مسجد سن سکیں۔ (جمل ۱/۳۰۵) پھر دوبارہ" اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ" دو مرتبہ "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ" دو مرتبہ بلند آواز سے دیگر کلمات کی طرح ادا کرے، پھر آگے بڑھے۔ (خلاصہ یہ کے پہلے شہادتین کو دو دو مرتبہ پست آواز سے پھر اسی طرح بلند آواز سے ادا کرے۔) ترجیع کے بغیر بھی اذان درست ہے۔ اگر پہلے پست آواز میں شہادتین کو ادا نہ کرے، تو بلند آواز سے ادا کرنے کے بعد ادا کرے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۳۰۴)

(۴) **تثویب**: تثویب سنت ہے (ابوداود وغیرہ میں اچھی سند سے مروی ہے) یعنی فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ "(نماز نیند سے بہتر ہے) کہنا، فجر میں دو اذان کہے تو دونوں میں تثویب مسنون ہے۔ تثویب کے بغیر بھی اذان ہو جائے گی۔

(۵) اذان و اقامت قبلہ رو کھڑے ہو کر دینا سنت ہے، بغیر عذر کے اس کی خلاف ورزی کرے تو اذان و اقامت صحیح ہے، لیکن مکروہ ہے، مسافر سواری پر اذان دے تو کوئی حرج نہیں۔ لیٹ کر اذان دینا بیٹھ کر دینے سے بھی شدید مکروہ ہے۔

(۶) **حَیْعَلَتَیْنِ** (حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ) میں سر پھیرنا سنت ہے۔ "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰہِ" کہنے کے بعد دائیں طرف سر پھیر کر دو مرتبہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کہے، پھر بائیں طرف پھیر کر دو مرتبہ حَیّ عَلَی الْفَلَاح کہے، سینہ کو قبلہ کے رخ سے نہ ہٹائے، اور قدموں کو بھی اپنی جگہ رکھے۔ اقامت میں بھی حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ کے وقت دائیں طرف اور حَیّ عَلَی الْفَلَاح کے وقت بائیں طرف رخ کرنا سنت ہے۔

(۷) بہتر یہ ہے کہ بغیر زیادہ مشقت کے ممکنہ حد تک بلند آواز سے اذان دے، صرف اپنی نماز کیلئے اذان دے رہا ہے تو اتنی آہستہ آواز میں دینا بھی کافی ہے، کہ صرف خود سن سکے اور جماعت کیلئے اذان دے رہا ہے تو آہستہ دینا کافی نہیں ہے اسی طرح اقامت بھی بالکل آہستہ ناکافی ہے۔ البتہ اذان کے مقابلے میں اقامت میں آواز کچھ پست رکھے۔

(۸) اذان کے الفاظ میں ترتیب شرط ہے اس کے بغیر اذان صحیح نہ ہوگی، لیکن ترتیب والے کلمات پر بناء کر سکتا ہے۔

تشریح: کسی نے پہلے "اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کو ادا کیا پھر تکبیر کو تو تکبیر کا تو اعتبار ہوگا، شھادت کا نہیں اب تکبیر کے آگے کے کلمات کو ترتیب سے ادا کرے۔

اذان کے دوران کچھ الفاظ چھوٹ جائیں تو ان الفاظ کو ادا کر کے بعد کے الفاظ کا پھر اعادہ کرے۔

تشریح: مثلاً کسی نے اذان دی اور "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" چھوٹ گیا تو "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" ادا کر کے آگے کے بھی سارے الفاظ لوٹانے پڑیں گے۔

(۹) اذان کے الفاظ کے درمیان تسلسل ہونا چاہیے۔ دوران اذان تھوڑی دیر چپ رہا یا معمولی کلام کر لیا تو اذان باطل نہ ہوگی۔ زیادہ دیر چپ رہا یا زیادہ بات کی تو اذان باطل ہو گی۔ اذان کے دوران نیند یا بے ہوشی طاری ہو اور جلد ہی ختم ہو جائے تو حرج نہیں (لیکن از سر نو اِعادہ بہتر ہے۔ اعانۃ) اور زیادہ دیر طاری رہے، تو اس اذان کا اعتبار نہیں۔

مؤذن کو اذان کے دوران بالکل ہی کچھ نہ کہنا مستحب ہے، اگر چھینک آئے تو دل میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" پڑھ لے، اگر اذان کے دوران مؤذن کو کسی نے سلام کیا تو مستحب یہ ہے کہ اذان مکمل ہونے تک جواب نہ دے اسی طرح کسی نے چھینک کر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہا تو اذان مکمل ہونے تک اس کو "یَرْحَمُکَ اللّٰہ" نہ کہے۔ لیکن کسی نے جواب دیا یا کسی مصلحت سے بات کی تو مکروہ نہیں ہے استحباب کے خلاف ہے۔

کسی نابینا کے کنویں میں گرنے کا اندیشہ ہو (یا اس طرح کی کوئی اور ضروری بات ہو) تو اذان میں ہی اسے متنبہ کرنا واجب ہے۔

اذان دینے کے بعد کوئی اسلام سے پھرے، پھر اسلام لا کر اقامت کہے تو جائز ہے۔ لیکن مستحب یہ ہے کہ اس کی اذان و اقامت سے نماز نہ پڑھے۔ بلکہ دوسرا کوئی اذان و اقامت کو دوہرائے، اس لئے کہ اس کی ردت اس کے متعلق شبہ پیدا کرتی ہے۔ دوران اذان کوئی مرتد ہو، تو وہ اس پر بناء نہیں کر سکتا۔ اگر پھر اسلام لے آئے، اور زیادہ فاصلہ نہ ہوا ہو، تو بناء کی گنجائش ہے۔

فصل مؤذن کی صفت

مؤذن کا مسلمان، عاقل اور مذکر ہونا شرط ہے۔ کوئی (کافر) اذان میں شہادتین کو ادا کرے تو اسے مسلمان سمجھیں گے (اب یہ شخص دوبارہ اذان دے تو اس اذان کا اعتبار ہوگا۔) (مغنی) لیکن عیسویہ فرقہ کا ہو تو اس سے اس کے اسلام کا فیصلہ نہیں دیا جائیگا۔ (عیسویہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے، جو ابو عیسیٰ اسحٰق بن یعقوب اصبھانی کی طرف منسوب ہے جس کا یہ اعتقاد ہے کہ آپ ﷺ صرف عرب کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔ (مغنی) جو نشہ میں ہو اس کی اذان درست نہیں ہے، نشہ کی ابتدائی کیفیت میں اذان درست ہے۔ مردوں کیلئے عورت اور خنثیٰ کی اذان معتبر نہ ہوگی۔ ممیز بچہ کی اذان صحیح ہے۔ البتہ نابالغ اور فاسق کی اذان مکروہ ہے۔

آداب

مستحب ہے کہ باوضو اذان دے۔ (ترمذی، دارقطنی، بیہقی) اگر بے وضو یا جنبی نے اذان دی تو مکروہ ہے، جنابت کی صورت میں کراہت شدید ہے اور اقامت میں اذان سے بھی بڑھ کر کراہت ہے۔ مستحب ہے کہ مؤذن بلند اور شیریں آواز ہو۔ منارہ یا چھت جیسی کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر اذان دے، اور دونوں شہادت کی انگلی کا سرا دونوں کان کے سوراخ میں داخل کرے۔ مؤذن عادل اور معتبر شخص ہو۔ آپ ﷺ نے یا کسی صحابی نے جن کو مؤذن کا رتبہ دیا ان کی اولاد میں جو عادل اور مؤذن کیلئے مناسب ہوں، ان کو ترجیح دی جائے، موذن اور اذان سننے والے، اذان کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں درود پاک بھیجیں، پھر یہ دعا پڑھیں۔ "اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَائِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَاماً مَحْمُوْداَ نِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ"

(اے اللہ: اس پوری پکار کے رب اور قائم ہونے والی نماز کے رب، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ عطا فرما اور ان کو فضیلت عطا فرما۔ اور ان کو مقام محمود پر پہنچا، جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔) (بخاری۔ مسلم)

سنت ہے کہ اذان سننے والا ہر شخص اذان کا جواب دے (مسلم شریف) جنبی یا حائضہ ہی کیوں نہ ہو۔ پوری اذان اور اقامت میں جیسے مؤذن کہتا ہے خود بھی کہے، لیکن حیعلتین (حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح) کے جواب میں "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ" کہے (مسلم) "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃِ" کے جواب میں "اَقَامَھا اللّٰہُ وَ اَدَا مَھَا وَ جَعَلَنِی مِن صَالِحِیْ اَھْلِھا" کہے (ابوداود) "اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کے جواب میں "صَدَقْتَ وَ بَرِرْتَ" کہے۔ مؤذن کے ہر جملہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا جواب دے۔ اگر کوئی تلاوت یا ذکر میں ہو تو اذان کا جواب دینے کیلئے اس سے رکنا مستحب ہے۔ نماز میں ہو تو فارغ ہونے تک جواب نہ دے۔ نماز میں جواب دینا مکروہ ہے، نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ یا اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" یا "صَدَقْتَ وَ بَرِرْتَ" کہا تو نماز باطل ہوگی، کیونکہ یہ کلام میں داخل ہے۔ اگر کوئی حنفی شخص اقامت کے کلمات دوہرے ادا کرے، تو جواب میں بھی دو دو مرتبہ کہے۔ (عباب المحیط ۱/۱۷۵)

نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران اذان کا جواب دیا ہے، تو سورہ فاتحہ کو از سر نو پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز میں جواب پسندیدہ نہیں ہے۔ مغرب کی اذان سننے کے بعد یہ پڑھنا مستحب ہے۔ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِكَ وَاِدْبَارُ نَھَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِكَ فَاغْفِرْ لِیْ" (اخرجہ ابوداود والترمذی وصححہ الحاکم واقرہ الذہبی) (اے اللہ یہ تیری رات کے آنے اور تیرے دن کے جانے کا وقت ہے اور تیرے پکارنے والوں کی آوازیں ہیں، سو تو مجھے بخش دے۔)

اذان اور اقامت کے درمیان دعا مستحب ہے۔(ترمذی)مؤذن کو اقامت کیلئے جگہ بدلنا مستحب ہے۔

اذان کی افضلیت: اذان اور امامت دونوں میں بڑی فضیلت ہے۔ لیکن اذان زیادہ افضل ہے کیونکہ مؤذنوں کے حق میں آپ ﷺ نے "اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ" (اے اللہ مؤذنوں کو بخش دے) کہہ کر دعا دی ہے اور امام ضامن ہونے کی وجہ سے اس پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، امام رافعیؒ وغیرہ نے امامت کو ترجیح دی ہے۔ امام نوویؒ نے ترمذی شریف کی ایک روایت کی وجہ سے ایک ہی شخص کے اذان وامامت کی ذمہ داری ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے (رواہ الترمذی من حدیث ابی ہریرہ، احمد فی المسند وابوداود وابن حبان)

معاوضہ: مؤذن کیلئے مستحب ہے کہ بغیر معاوضہ کے اذان دے، اگر ایسا موؤذن نہ ملے تو امام مصالح کے مال سے اسے رزق دے۔ اگر فاسق مؤذن بغیر معاوضے کے اور امین مؤذن معاوضہ کے ساتھ اذان دے، تو امین کو مؤذن رکھ سکتے ہیں۔ ایک مؤذن امین بغیر عوض کے اذان دے اور دوسرا امین اس سے بہتر آواز والا عوض کے ساتھ اذان دے، تو مصلحت کے پیش نظر بہتر آواز والے کو مقرر کیا جا سکتا ہے، ایک بستی میں کئی مساجد ہوں، اور تمام نمازی ایک ہی مسجد میں جمع ہو سکتے ہوں تب بھی ساری مساجد میں مؤذن مقرر کر کے ان کو تنخواہ دے، تاکہ مسجد معطل نہ رہ جائیں۔ بیت المال میں تنخواہ کی گنجائش نہ ہو۔(یا بیت المال کا نظام ہی نہ ہو) تو ذمہ دار یا رعایا میں سے کوئی تنخواہ دے سکتا ہے، اس صورت میں مقدار وغیرہ دینے والے کی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک مسجد میں دو مؤذن ہونا مستحب ہے اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ایک صبح صادق سے پہلے فجر کی اول اذان دے گا اور دوسرا صبح صادق کے بعد دوسری اذان دے گا۔ مصلحت کے مطابق دو سے زائد مؤذن رکھ سکتے ہیں۔ ایک سے زائد مؤذن ہوں تو یکے بعد دیگرے اذان دیں گے۔ ابتداء میں اختلاف ہو تو قرعہ اندازی سے فیصلہ کریں گے وقت تنگ ہو اور مسجد بڑی ہو تو الگ الگ کونے میں اذان دیں، اور مسجد چھوٹی ہو تو ایک ہی ساتھ کھڑے ہو کر اذان دیں۔ لیکن اس طرح ایک ساتھ اذان اس وقت دیں گے جبکہ انکے آواز کے اختلاف سے تھویش (اضطراب، گڈمڈ ہونا) نہ پیدا ہو، ورنہ ایک ہی مؤذن اذان دے تعیین میں اختلاف ہو تو قرعہ اندازی کی جائیگی۔ اقامت کیلئے ان مؤذنوں میں سے کوئی مقرر ہے تو وہی اولیٰ ہے ورنہ بالترتیب اذان کی صورت میں پہلے اذان دینے والا اقامت کیلئے اولیٰ ہے۔ جس کا حق تھا اس کے علاوہ نے اقامت دی تو اس کا بھی اعتبار ہو گا (پھر اقامت دوہرانے کی ضرورت نہیں) ایک ساتھ اذان دینے کی صورت میں کوئی ایک اقامت کہے۔ اختلاف ہو تو قرعہ اندازی کریں۔ ایک مسجد میں ایک ہی شخص اقامت دے (مسجد بہت بڑی ہونے کی وجہ سے ضرورت ہو تو ایک سے زائد کی بھی گنجائش ہے۔) اذان کے وقت کا تعلق مؤذن سے ہے۔ اس سلسلہ میں امام سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اقامت کا تعلق امام سے ہے اس کے اشارے سے ہی موذن اقامت دے۔

فجر کی اذان وقت سے پہلے دے سکتے ہیں: نصف شب گذرنے کے بعد کبھی بھی فجر کی اذان دی جاسکتی ہے۔ البتہ اقامت صبح صادق سے قبل نہیں دے سکتے۔ فجر کے لئے دو اذان سنت ہیں۔ ایک صبح صادق سے قبل اور دوسری صبح صادق کے بعد، صرف ایک اذان بھی جائز ہے۔ صبح صادق سے قبل دے یا بعد، یا کچھ الفاظ صبح صادق سے قبل اور کچھ بعد، ایک ہی اذان دینا ہو تو بہتر یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد دے۔ فجر کے علاوہ دیگر اذانوں میں تثویب مکروہ ہے۔ اذان میں کسی ذکر کے بڑھانے یا اس کے مقدار کو بڑھانے سے اذان فاسد نہ ہوگی۔

مستحب ہے کہ موذن دو تکبیر (اللہ اکبر) کو ایک سانس میں ادا کرے (پہلی تکبیر کے بعد معمولی سا سکتہ کرے، اگر سکتہ نہ کرے تو

پہلے 'اکبر' کے راء پر پیش پڑھے (اور اسے لام کے ساتھ ملالے) (جمل ۱/۳۰۴) بقیہ ہر جملہ کو ایک ایک سانس میں ادا کرے۔

بارش کی رات یا تاریک ہو ادا ررات ہو تو اذان کے بعد۔ ''اَلَا صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ'' (اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) کہنا مستحب ہے۔ (یااَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ یا اَلَا صَلُّوْا فِی بُیُوْتِکُمْ کہے، بعضوں نے اذان مکمل ہونے کے بعد اس اضافہ کو بہتر کہا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ جماعت کے ترک کے کسی بھی عذر کی صورت میں یہ اضافہ مطلوب ہے شربینی کی رائے میں حیعلتین کو ترک کر کے اس کی جگہ اسے پڑھنا کافی ہے۔ (بشری الکریم ص ۶۲) ان الفاظ کو حی علی الفلاح کے بعد کہنا زیادہ بہتر ہے۔ (اس کے جواب میں ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' پڑھے۔ (فتح الوہاب مع الجمل ۱/۳۰۱)

کسی نابینا کا تنہا موذن ہونا مکروہ ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بینا ہو (جو اسے وقت سے آگاہ کرے) تو مکروہ نہیں۔ اذان مسجد سے قریب دینا سنت ہے۔ اذان میں حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ (نیک کام کی طرف آؤ) کہنا مکروہ ہے۔ کسی کے کہنے پر اذان کے الفاظ دوہرائے جائیں تو اذان صحیح ہوگی۔ عربی میں اذان دینے والے کی موجودگی میں غیر عربی میں اذان صحیح نہ ہوگی۔ کوئی بھی عربی میں دینے پر قادر نہ ہو تو دوسری زبان میں بھی صحیح ہوگی۔ اللہ اکبر کی جگہ اللہ الاکبر کہے تو اذان صحیح ہوگی۔ حضر میں سفر کے مقابلہ میں اذان کی زیادہ اہمیت ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کے حق میں اقامت زیادہ اہم ہے۔

باب ۳۔ استقبال قبلہ (کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنا)

فرض نماز صحیح ہونے کیلئے قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھنا شرط ہے۔ مباح قتال یا کسی اور سبب سے شدت خوف ہو تو یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح مباح سفر اور شدت خوف کے علاوہ صورتوں میں نفل نماز صحیح ہونے کیلئے استقبال قبلہ شرط ہے۔ جو استقبال قبلہ سے مجبور ہو جیسے کوئی مریض جسے قبلہ کی طرف کرنے کیلئے کوئی موجود نہ ہو یا وہ شخص جس کو باندھ دیا گیا ہو اپنے رخ پر نماز پڑھ لیں گے۔ بغیر مجبوری کے فرض نماز کو سواری پر ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر فرض نماز کیلئے زمین پر اترنے کی صورت میں ساتھیوں سے پیچھے رہنے کا خوف ہو یا جان و مال کا کچھ خطرہ ہو تو سواری پر ہی پڑھ لے لیکن بعد میں اس نماز کا اعادہ کرے۔ منذورہ اور جنازہ کی نماز بھی سواری پر جائز نہیں ہے۔

فرض نماز میں استقبال

فرض نماز کو ٹھہر کر اور رک کر پڑھنا ضروری ہے۔ لہٰذا پیدل قبلہ کی طرف رخ کر کے اور سوار ہو کر قیام یا استقبال کے بغیر صحیح نہ ہوگی۔ اگر قبلہ کی طرف رخ کر کے سارے ارکان کو مکمل ادا کرے اور سواری رکی ہوئی ہو تو فرض نماز صحیح ہوگی۔ جیسے اونٹ پر ہودج میں یا تختہ پر باقاعدہ نماز پڑھے۔ اگر جانور چل رہا ہو تو اس کی پشت پر فرض نماز صحیح نہ ہوگی اس جہاز یا کشتی میں جو جاری ہو یا ساحل سے بندھی ہو اور اس تختہ پر جسکو لوگوں نے کاندھے پر اٹھار کھا ہو اور رسی سے بندھے ہوئے جھولے میں فرض نماز صحیح ہے۔

نفل نماز میں استقبال

طویل یا قصیر سفر میں نفل نماز پیدل اور سواری پر اپنے سفر کے رخ پر پڑھنا جائز ہے البتہ حضر (اقامت) میں جائز نہیں ہے۔ حضر میں قیام کے علاوہ بقیہ تمام مسائل میں نفل نماز بھی فرض کی طرح ہے۔ جہاز میں چونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممکن ہے، اس

لئے اس کے بغیر نفل کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ملاح اپنی ذمہ داری کی وجہ سے جہاز کے رخ پر نفل پڑھ سکتا ہے۔ جانور پر ہودج وغیرہ میں قبلہ رو نماز پڑھ سکتا ہو تو اس کے بغیر نفل کی اجازت نہیں ہے۔

سوار شخص نفل نماز با قاعدہ نہیں ادا کر سکتا ہو تو بصورت سہولت تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنا واجب ہے۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ بقیہ نماز کو قبلہ کی طرف نہ ادا کرے، تو سفر کے رُخ پر ادا کرنا ضروری ہے۔ کسی اور طرف رخ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو بے مقصد ادھر ادھر گھومتا ہے، کسی متعین منزل کے سفر کا ارادہ نہیں ہے۔ اس کو بغیر قبلہ رو نفل ادا کرنے کی رخصت نہیں ہے۔ (ایسا مسافر سفر کے دیگر رخصتوں پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔) (حاشیۃ الروضہ)

زمین پر نماز پڑھنے والا شخص عمداً قبلہ کی طرف سے پھر جائے تو نماز باطل ہو گی۔ اگر بھول کر قبلہ کی طرف سے پھر جائے اور جلد ہی دوبارہ قبلہ رو ہو جائے تو نماز باطل نہ ہو گی۔ اگر زیادہ دیر گذری تو نماز باطل ہو گی۔ کسی نے زبردستی اسے قبلہ کی طرف سے موڑ دیا تو جلد یا بدیر دوبارہ قبلہ رو ہونے کے باوجود نماز باطل ہو گی، کیونکہ یہ ایک نادر صورت ہے جیسا کہ زبردستی بات چیت پر مجبور کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔

پیدل یا سواری پر نفل پڑھنے والا اپنا رخ سفر کی جہت سے قبلہ کی طرف موڑ دے تو حرج نہیں، کسی اور طرف عمداً موڑے تو نماز باطل ہو گی۔ بھول کر یا غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو، اور جلد تلافی کرے تو نماز باطل نہ ہو گی اور سجدہ سہو کرنا مشروع نہیں ہے۔ زیادہ دیر اسی حالت پر گذری تو نماز باطل ہو گی۔ جانور کے اڑیل پن کی وجہ سے رخ مڑ جائے تو زیادہ دیر گذرنے کی صورت میں نماز باطل ہو گی، جلد رخ درست کرے تو باطل نہ ہو گی۔ اور اس صورت میں سجدہ سہو کرنا مشروع ہے۔ سواری پر نماز پڑھنے کی صورت میں سجدہ کیلئے سواری پر پیشانی ٹیکنے کی ضرورت نہیں بلکہ رکوع اور سجدہ کو آگے کی طرف جھک کر ادا کرے گا۔ سجدہ میں رکوع کے کے مقابلے میں کچھ زیادہ جھکے گا۔ دونوں کے جھکاؤ میں کچھ فرق ہونا ضروری ہے۔ آخری ممکنہ حد تک جھکنا واجب نہیں ہے۔ دیگر ارکان کی کیفیت واضح ہے۔

جہاز یا کسی ایسی چیز میں سوار جو استقبال اور دیگر ارکان کو مکمل ادا کر سکتا ہو، اس پر باقاعدہ قبلہ رو ہو کر تمام ارکان کی ادائیگی واجب ہے۔ پیدل نماز پڑھنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ، رکوع اور سجدہ میں قبلہ رو ہونا واجب ہے۔ سلام میں واجب نہیں ہے۔ رکوع اور سجدہ باقاعدہ ادا کرے، تشہد کو چلتے ہوئے پڑھنا کافی ہے۔ خلاصہ یہ کہ پیدل نماز پڑھنے والا چار ارکان میں استقبال کرے، تکبیر تحریمہ، رکوع سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان کی بیٹھک، اور چار ارکان میں چلتا رہے۔ قیام، اعتدال، تشہد اور سلام (باجوری ۱/۱۴۹ جمل ۱/۳۱۹)

سواری کا جو حصہ نمازی کے بدن یا کپڑے سے چھوئے اسکا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر جانور پیشاب کرے یا نجاست پر چلے یا زین پر نجاست ہو اور اس پر کچھ بچھا کر نماز پڑھے تو حرج نہیں۔ سوار خود جانور کو نجاست پر چلائے تب بھی حرج نہیں۔ پیدل نماز پڑھنے والا عمداً نجاست پر چلے تو اس کی نماز باطل ہو گی۔ پیدل نمازی لاعلمی میں خشک نجاست پر چلے اور فوراً وہاں سے ہٹ جائے تو نماز درست ہو گی، تر نجاست پر چلنے سے مطلقاً نماز باطل ہو گی۔ (بشری الکریم ۱/۱۹۰)

سوار یا پیدل نفل کے جواز کیلئے نماز مکمل ہونے تک سفر جاری رہنا شرط ہے۔ دوران نماز اپنی منزل پر پہنچ جائے تو قبلہ رو ہو کر باقاعدہ بقیہ نماز کو مکمل کرنا ضروری ہے اگر سوار ہے اور سواری پر باقاعدہ تمام ارکان نہیں ادا کر سکتا تو اس سے اترنا ضروری ہے۔ سفر میں کسی بستی سے ہو کر گذرے۔ (وہاں اترنے اور قیام کرنے کا ارادہ نہ ہو) تو سواری پر ہی نماز مکمل کر سکتا ہے۔ ایسے افعال سے پرہیز واجب

ہے، جن کی ضرورت نہیں۔ اگر حاجت کی وجہ سے جانور کو ایڑ لگائے تو حرج نہیں۔ بغیر عذر کے جانور کو چلائے، یا پیدل نمازی بغیر عذر کے دوڑے تو نماز باطل ہو گی۔

فصل۔ زمین پر نمازی کا قبلہ رو ہونا

آیت: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ، وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَه۔ (سورۃ البقرۃ ۱۴۴)

ترجمہ: پھر اب سے اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ (پیغمبر بھی، امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (ہر جگہ نماز کے اندر) اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو۔

اس کی کئی حالتیں ہیں: (۱) **(کعبہ کے اندر نماز پڑھنا)** کعبہ کے اندر فرض اور نفل دونوں صحیح ہیں۔ صحیحین میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ کے اندر نماز پڑھنا مروی ہے۔ باہر نفل پڑھنے کے مقابلے میں کعبہ کے اندر پڑھنا افضل ہے۔ باہر فرض نماز پڑھنے میں جماعت ملتی ہو تو باہر پڑھنا افضل ہے۔ ورنہ کعبہ کے اندر فرض پڑھنا افضل ہے۔ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کی صورت میں کسی بھی دیوار کی طرف رخ کر سکتا ہے۔ دروازہ کی طرف رخ کر کے بھی نماز پڑھ سکتا ہے، جبکہ دروازہ بند ہو یا کھلا ہو تو اس کی چوکھٹ تقریباً دو تہائی (۲/۳) ہاتھ بلند ہو۔

(۲) **کعبۃ اللہ منہدم ہو جائے** (والعیاذ باللہ): اور وہ جگہ بغیر عمارت کے کھلی پڑی ہو تو باہر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ اگر اندر نماز پڑھے تو اس کا حکم کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے کی طرح ہے۔ (جو تیسری حالت میں واضح ہے)

(۳) **کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا:** اس صورت میں سامنے کوئی ابھری ہوئی چیز نہ ہو تو نماز صحیح نہ ہو گی۔ اگر کعبہ کا ہی کچھ حصہ سامنے ابھرا ہوا ہو، جو دو تہائی ذراع ہو تو جائز ہے، اس سے کم ہو تو جائز نہیں۔ سامنے کچھ سامان رکھ کر اس کی طرف رخ کرنا کافی نہیں ہے۔ دیوار کے بقیہ حصے کی طرف یا کسی درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لے تو جائز ہے۔ اگر اسی میدان کی مٹی جمع کر کے اس کی طرف رخ کرے یا گڑھا کھود کر اس میں نماز کیلئے کھڑا ہو جائے، یا چھت یا میدان کے آخری کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرے کنارے کی طرف رخ کرے اور دوسرا کنارہ اس کے قیام کی جگہ سے اونچا ہو تو جائز ہے۔

اگر اس پر اگی ہوئی گھاس پھوس کی طرف یا ایسی لکڑی یا لاٹھی کی طرف رخ کرے جسے میخ سے مضبوط نہ کیا ہو، تو کافی نہیں، اگر میخ سے مضبوط کر دیا ہے تو اس کی طرف رخ کرنا کافی ہے۔

(۴) **رکن کعبہ کے کنارے:** اس طرح نماز پڑھنا کہ بدن کا کچھ حصہ اس کے محاذات سے نکل جائے، اس صورت میں نماز صحیح نہ ہو گی امام کعبہ کے قریب مقام ابراہیم کے پاس یا کسی اور جگہ کھڑا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے بیت اللہ کے چاروں طرف کھڑے ہوں تو جائز ہے۔ امام کے قریب کھڑے ہونے والے مقتدیوں کی صف طویل ہو تو جو کعبہ کی محاذات سے خارج ہوں ان کی نماز باطل ہے۔

(۵) **مکہ میں مسجد حرام سے باہر کہیں نماز پڑھے:** اگر کعبہ نظر آ رہا ہو جیسے جبل ابی قبیس (مکہ کے ایک پہاڑ کا نام) پر نماز پڑھنے والا تو کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھے کعبہ کو دیکھ کر محراب بنایا ہے تو ہمیشہ اس کے مطابق نماز پڑھے گا۔ ہر نماز کیلئے کعبہ کا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح جو مکہ میں پرورش پائے اور کعبہ کے رخ کا اسے یقین ہو، گرچہ نماز کے وقت کعبہ نظر نہ آ رہا ہو، تو وہ اس رخ پر نماز پڑھے گا۔ اگر نظر نہ آ رہا ہو اور یقین بھی نہیں تو دلائل پر اعتماد کرنا اور اجتہاد پر عمل کرنا جائز ہے جب کہ کعبہ کے اور

اس کے درمیان کچھ حائل ہو، کیونکہ اس صورت میں مشاہدہ کا مکلف بنانا باعث مشقت ہے۔

(۶) مدینہ میں نماز پڑھے: اس صورت میں آپ ﷺ جس مقام پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے وہ کعبہ کے قائم مقام ہے، جس کو وہ مقام نظر آرہا ہو اس کے مطابق اپنے محراب اور نماز کے رخ کی تعیین کرے گا، اجتہاد کی بنیاد پر اس سے عدول جائز نہیں ہے۔

ہر وہ مقام جہاں آپ ﷺ نے نماز ادا کی ہے، اور آپ ﷺ کا رخ معلوم ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے اسی طرح مسلمانوں کے علاقوں کے محراب اور انکے راستوں کے محراب پر بھی اعتماد کیا جائے گا اور اجتہاد کی گنجائش نہ ہوگی۔ علامت ایسے راستوں میں ہو جہاں سے لوگ بہت کم گذرتے ہوں یا مسلمان و کفار دونوں یکساں طور پر گذرتے ہوں، یا کسی ویران بستی میں ہو، جسے مسلمانوں نے بسایا تھا یا کفار نے کچھ پتہ نہیں، تو ایسی علامت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ اجتہاد کریگا آپ ﷺ نے جہاں جس رخ پر نماز ادا کی ہے وہاں اجتہاد کر کے ذرا بھی دائیں یا بائیں جانب مڑنا جائز نہیں ہے، قبلہ کی معرفت کا ماہر اگر اس طرح کا خیال کرے تو اس کا خیال باطل ہے۔ دیگر شہروں میں اصل جہت سے کچھ دائیں یا بائیں جانب کی حد تک اجتہاد جائز ہے۔

(۷) ایسی جگہ ہو جہاں قبلہ کے رخ کا کوئی یقین نہیں:

جو قبلہ کے رخ کو یقینی طور پر معلوم کر سکتا ہو اسے اجتہاد کی اجازت نہیں۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے کے امکان کے باوجود حجر (حطیم) کی طرف رخ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کا بیت اللہ کا حصہ ہونا قطعی نہیں ہے، بلکہ مظنون ہے۔ اسی طرح یقین کے امکان کی صورت میں کسی اور کے قول پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے، لیکن جو یقین پر قادر نہ ہو، اور کوئی اسے علم کی بنیاد پر قبلہ کی اطلاع دے، تو اس پر اعتماد کرے، اجتہاد نہ کرے جبکہ خبر دینے والا عادل ہو، مرد ہو یا عورت۔ کافر، فاسق، بچے اور ممیز کی بات کا اعتبار نہ ہو گا۔

خبر پر عمل کرنے میں اہل اجتہاد اور دیگر حضرات برابر ہیں۔ قبلہ کے متعلق صحیح اطلاع دینے والا کوئی نہ ہو تو اجتہاد سے جو رخ متعین ہو اس پر عمل کرے۔ قبلہ کے دلائل کی روشنی میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔ جو خود اجتہاد کر سکتا ہو اسے دوسرے کی تقلید کی اجازت نہیں ہے، وقت میں گنجائش ہو یا نہ ہو، اگر دوسرے کی تقلید کی تو نماز کی قضاء واجب ہے۔ لیکن وقت تنگ ہو تو کسی طرف نماز پڑھ لے پھر اعادہ واجب ہے۔ بادل یا تاریکی یا دلائل کے تعارض کی وجہ سے مجتہد پر دلائل مخفی ہوں تب بھی دوسرے کی تقلید نہ کرے۔ (بلکہ جس طرف چاہے نماز پڑھ لے اور بعد میں اعادہ کرے۔) (جمل) جو اجتہاد پر قادر نہ ہو اور دلائل کے سیکھنے سے عاجز ہو، جیسے نابینا یا وہ بینا جو دلائل سے ناواقف ہو اور اس میں سیکھنے کی قابلیت بھی نہیں، تو ان پر کسی مکلف عادل مسلم کی تقلید واجب ہے جو دلائل سے واقف ہو، اس کے قول کو جو کہ اجتہاد پر مبنی ہو قبول کرنے کو تقلید کہیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے مسلمانوں کے جم غفیر کو اس رخ پر نماز پڑھتے دیکھا ہے تو اس قول پر عمل کرنا خبر کو قبول کرنا ہے نہ کہ تقلید۔

دو مجتہد کا اجتہاد الگ الگ ہو تو کسی بھی ایک کی تقلید کرے، زیادہ معتبر اور عالم کی تقلید بہتر ہے، قبلہ کے دلائل سیکھنے پر قادر شخص اگر سفر کا ارادہ رکھتا ہے، تو اس پر ان دلائل کا سیکھنا فرض عین ہے، کیونکہ مسافر کو اس کی عموماً ضرورت پیش آتی ہے، اور بڑی آسانی سے رخ کی تعیین ہر جگہ نہیں ہو پاتی، ورنہ ان دلائل کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، کیونکہ آپ ﷺ اور اسلاف نے نماز کے ارکان و شروط کی طرح ہر کسی کو ان دلائل کے سیکھنے کا پابند نہیں بنایا۔

اجتہاد سے نماز پڑھنے کے بعد غلطی سامنے آئے تو اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) نماز شروع کرنے سے پہلے ہی غلطی ظاہر ہو، اگر غلطی یقینی ہو تو اس سے اعراض کر کے بعد میں جو رخ سامنے آیا ہے اس پر عمل کرے۔ اگر غلطی یقینی نہ ہو صرف ظن ہو کہ صحیح رخ دوسرا ہے، تو دوسرے اجتہاد کی دلیل اس کے نزدیک پہلے کے بالمقابل زیادہ واضح

ہو، تو دوسرے اجتہاد پر اعتماد کرے، اور پہلے کی دلیل زیادہ واضح ہے تو اس پر عمل کرے، اور دونوں یکساں درجہ میں ہے تو اسے اختیار ہے (دونوں میں سے کسی بھی رُخ پر پڑھ لے)

(۲) نماز مکمل ہونے کے بعد غلطی ظاہر ہو: اگر غلطی یقینی ہے تو اعادہ واجب ہے۔ غلطی یقینی نہیں صرف ظن ہے تو اعادہ واجب نہیں۔ اجتہاد کرکے چار نمازوں کو چار الگ الگ رخ پر ادا کرے تب بھی کسی کا اعادہ واجب نہیں ہے۔

دوران نماز غلطی ظاہر ہو: اس کی دو صورتیں ہیں۔

(الف) غلطی ظاہر ہوتے وقت صحیح رخ بھی ظاہر ہو، اب اگر غلطی یقینی ہے تو نماز باطل ہو گی۔ اگر غلطی یقینی نہیں ہے صرف مظنون ہے تو جو رخ ابھی ظاہر ہوا ہے، اس طرف مڑ کر اسی نماز کو مکمل کرلے (توڑنے کی ضرورت نہیں) اس صورت میں کسی نے اگر اجتہاد کرکے چار رکعات چار الگ الگ سمت پڑھی تب بھی اعادہ کی ضرورت نہیں۔

(ب) غلطی کے ساتھ صحیح سمت ظاہر نہ ہو، اجتہاد کرکے جلد صحیح سمت کا فیصلہ نہ کرسکا تو نماز باطل ہو گی اگر فیصلہ کرسکا تب بھی از سرنو اس سمت میں نماز پڑھے گا۔

اجتہاد سے کیا مطلوب ہے؟

اجتہاد سے عین کعبہ مطلوب ہے (یعنی اصل مقصود یہ ہو کہ کعبہ کی طرف رخ ہو جس سمت میں کعبہ ہے صرف اس سمت رخ ہونا تھوڑا دائیں یا بائیں مڑ کر کافی نہیں۔)

نماز کے بعد کعبہ سے کچھ دائیں یا بائیں ہونا اجتہاد سے ظاہر ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ دورانِ نماز ظاہر ہو تو اس طرف مڑ کر بقیہ نماز پوری کرے۔

اجتہاد سے سمت کی تعیین کرکے نماز پڑھ لے، پھر دوسری کوئی فرض نماز ادا ہو یا قضاء (یا منذورہ یا جنازہ کی نماز) پڑھنے کا ارادہ ہو تو پھر اجتہاد کرنا واجب ہے۔ نفل نماز کیلئے اجتہاد کے اعادہ کی ضرورت نہیں، دو اشخاص کا اجتہاد الگ الگ سمت ہو تو ہر ایک اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرے۔ اور دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔ کئی لوگوں کا اجتہاد یکساں ہو اور ان میں سے ایک امامت کرے پھر کسی مقتدی کا اجتہاد بدل جائے تو اُسے امام سے جدا ہونا واجب ہے۔ اور وہ دوسری طرف رخ کرے گا۔ اگر امام کا اجتہاد بدل جائے تو وہ دوسری طرف رخ کرے اور مقتدی حضرات اس سے جدا ہو جائیں۔ (دل میں اس کے اقتداء سے نکلنے کی نیت کرکے تنہا اپنی نماز مکمل کرلیں۔)

باب ۴۔ نماز کی صفت

شرط: نماز کیلئے جو امور واجب ہیں لیکن نماز کی ماہیت میں داخل نہیں، انھیں شرط کہتے ہیں۔

رکن: جو امور نماز کے اندر واجب ہیں، اور نماز کی ماہیت میں داخل ہیں، انھیں رکن کہتے ہیں۔

سنت: جو امور نماز میں مطلوب اور باعثِ ثواب ہیں، لیکن واجب نہیں، اسے سنت اور مندوب کہیں گے۔ جس سنت کی تلافی سجدہ سہو کے ذریعے ہوتی ہے، اسے سنتِ بَعض کہیں گے اور جس سنت کے ترک پر سجدہ سہو مشروع نہیں ہے اسے سنت ہیئت کہا جاتا ہے نماز کا رکن سر کی طرح، شرط زندگی کی طرح، سنن ابعاض اعضاء کی طرح، اور سنن ہیئات بالوں کی طرح ہیں۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۳۲۸)

نماز کے سترہ ارکان ھیں: نیت، تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، (تلاوت) رکوع، رکوع میں طمانینت (ٹھہراؤ) اعتدال، اعتدال میں طمانیت، سجود، سجود میں طمانینت، دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا اس میں طمانینت، نماز کے آخر میں بیٹھنا، اس بیٹھنے میں تشہد پڑھنا۔ آپ ﷺ کی خدمت میں درود بھیجنا، سلام پھیرنا، مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھنا۔

نماز میں چھ سنن ابعاض ھیں: (۱) فجر کی نماز میں اور رمضان کی آخری نصف ماہ کی وتر میں دعائے قنوت پڑھنا (۲) قنوت کیلئے کھڑے رہنا۔ (۳) پہلا تشہد (۴) پہلے تشہد میں بیٹھنا (۵) تشہد اول میں آپ ﷺ پر درود بھیجنا (۶) آخری تشہد میں آپ ﷺ کے آل پر درود بھیجنا، انکے علاوہ جو سنن ہیں وہ ابعاض نہیں ہیں۔ (بلکہ ہیئات سنتوں میں شمار ہیں)

فصل۔ نیّت کے متعلق

نیّت تکبیر تحریمہ سے مقارن (ساتھ پائی جانا) اور تکبیر مکمل ہونے تک اس کو برقرار رکھنا واجب ہے۔ نیّت قصد کو کہیں گے، لہٰذا نمازی اپنے ذہن میں نماز اور وہ صفات جن کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، جیسے ظہر کی نماز اس کی فرضیت وغیرہ کو حاضر رکھے۔ ان امور کا قصد تکبیر کے ابتداء سے پایا جائے۔ کئی علماء کے نزدیک عوام کے حق میں عرفی مقارنت کافی ہے۔ یعنی اسے نماز کا فی الجملہ استحضار ہو۔ (حاشیۃ الروضہ)

تکبیر کے بعد نیّت کا باقاعدہ برقرار رکھنا واجب نہیں ہے، لیکن یہ شرط ہے کہ نیّت کے منافی کوئی بات پائی نہ جائے، لہٰذا کسی نے نماز کے دوران نماز سے نکلنے کی نیّت کی تو نماز باطل ہو گی۔ نماز سے نکلنے اور نہ نکلنے میں تردد کرے، تب بھی نماز باطل ہو گی، وسوسہ کے درجہ میں پائے جانے والے تردد کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلی رکعت میں یہ نیّت کرے کہ میں دوسری رکعت میں نماز سے نکل جاؤنگا، یا نماز سے نکلنے کو کسی ایسی چیز پر معلق کرے جس کا نماز میں پایا جانا یقینی یا محتمل ہو، تو فوراً ہی نماز باطل ہو گی (اس چیز کا پایا جانا ضروری نہیں بلکہ نیّت کرتے ہی نماز باطل ہو گی) کسی فرض یا سنّت راتبہ کی نیّت سے نماز شروع کی، پھر نماز میں کسی اور فرض یا سنّت کی نیّت کی، تو وہ نماز باطل ہو گی، اور جس دوسری نماز کی نیّت کی ہے وہ بھی حاصل نہ ہو گی۔

روزہ دار روزہ چھوڑنے کے متعلق تردد کرے، یا کسی چیز پر معلق کرے، یا چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرے، تو ان صورتوں میں روزہ نہ ٹوٹے گا۔ یہی مسئلہ حج کی صورت میں بھی ہو گا۔

نماز میں شک پیدا ہو کہ مکمل نیّت کی یا نہیں یا نیّت کے کسی شرط کو ترک کیا ہے، پھر جلد ہی شک کی حالت میں کسی رکن کو ادا کرنے سے پہلے یاد آجائے کہ نیّت مکمل طور پر کر چکا ہے، تو نماز باطل نہ ہو گی، شک کی حالت میں کافی دیر گذر جائے، یا کسی فعلی رکن (جیسے رکوع۔ سجدہ) یا قولی رکن (جیسے قرأت۔ تشہد) کے ادا کرنے کے بعد یاد آجائے تو نماز باطل ہو گی۔ یہ شک پیدا ہو کہ ظہر کی نیّت کی تھی، یا عصر کی، تو دونوں میں سے کوئی بھی شمار نہ ہو گی۔ اگر یاد آجائے کہ کونسی نیّت کی تھی، تو مندرجہ بالا تفصیل یہاں بھی جاری ہو گی۔

نیّت کی کیفیت

فرض نماز میں ان امور کا قصد واجب ھے۔ (۱) نماز پڑھنا (۲) جو نماز پڑھ رہا ہے اس کی تعیین، صرف یہ نیّت کافی نہیں کہ اس وقت کی فرض نماز پڑھ رہا ہوں، کیونکہ کوئی قضاء نماز اس وقت یاد آجائے تو یہ اس قضاء کا بھی وقت ہے، ظہر کی نیّت سے جمعہ یا

جمعہ کی نیّت سے ظہر کی نماز صحیح نہ ہوگی۔(۳)فرضیت کی نیّت، چاہے بالغ ہو یا نابالغ، نماز ادا ہو یا قضاء، اللہ کی طرف منسوب کرنا، یعنی یہ کہنا کہ میں اللہ کیلئے نماز ادا کر رہا ہوں ضروری نہیں ہے۔ استقبال قبلہ اور رکعات کی تعداد سے تعرض واجب نہیں ہے۔ لیکن مثلاً ظہر میں تین یا پانچ رکعات کی نیّت کی تو نماز منعقد نہ ہوگی۔ قضاء نماز میں ادا کی یا ادا میں قضاء کی نیّت کرے اور اس کے حقیقی معنی کا قصد نہ ہو تو نماز صحیح ہوگی ورنہ ایک طرح کا مذاق ہونے کی وجہ سے نماز صحیح نہ ہوگی۔ بادل وغیرہ کے سبب وقت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے ادا یا قضاء کی نیّت میں غلطی ہو، تو نماز صحیح ہوگی۔ یعنی وقت باقی سمجھ کر ادا کی نیّت سے نماز پڑھی، حالانکہ وقت نکل چکا تھا، تو یہ نماز صحیح ہے یا یہ سمجھ کر کہ وقت نکل چکا، قضاء کی نیّت سے پڑھی، حالانکہ وقت ابھی باقی تھا تو یہ نماز بھی درست ہے۔

ادا: کسی عبادت کیلئے شریعت نے جو وقت متعین کیا ہے اس وقت میں اس عبادت کو مکمل یا بعض انجام دینا، اور اس سے پہلے کسی خلل کے ساتھ وہ عبادت انجام نہ دی گئی ہو۔

قضاء: متعینہ وقت کے بعد عبادت کو انجام دینا۔(حاشیۃ الروضہ)

نفل کی دو قسمیں ہیں

(۱) وہ نفل جس کے لئے وقت یا سبب ہو۔ ایسے نفل کیلئے نماز پڑھنے کی نیّت اور نفل کی تعیین واجب ہے۔ لہٰذا استسقاء، عید الفطر، عید الاضحیٰ، ضحی (چاشت) وغیرہ کی نیّت کرے۔

رواتب: (وہ سنّتیں جو پنجوقتہ فرائض سے قبل یا بعد پڑھی جاتی ہیں) میں فرض نماز کی طرف منسوب کر کے تعیین کرے گا جیسے سنّت فجر، سنّت ظہر، یا سنّت عشاء وغیرہ وتر کی نماز میں سنّت وتر کی نیّت کرے اسے عشاء کی طرف منسوب نہ کرے، کیونکہ وہ مستقل نماز ہے۔(عشاء کے تابع نہیں ہے)

وتر کی نماز ایک رکعت سے زائد پڑھے تو ساری رکعتوں کیلئے وتر کی نیّت کرے جیسا کہ تراویح میں۔

دیگر امور میں وہی تفصیل ہے جو فرض کے سلسلے میں گذر چکی، البتہ نفلیت کی نیّت ضروری نہیں ہے۔

(۲) **نفل مطلق**: (وہ نفل نماز جو وقت و سبب کی قید کے بغیر، ثواب کیلئے انسان اپنی مرضی سے ادا کرتا ہے) ایسی نفل نماز کیلئے صرف نماز کی ادائیگی کی نیّت کافی ہے۔

محل نیّت: تمام عبادات میں نیّت کے سلسلے میں دل کا اعتبار کیا جائے گا۔ دل کی غفلت کے ساتھ محض زبان سے ادائیگی کافی نہیں ہے۔ زبان سے دل کی نیّت کے خلاف لفظ نکل جائے تو حرج نہیں جیسے ظہر کی نماز کیلئے دل میں ظہر کا قصد کرے لیکن زبان سے عصر کا لفظ نکلے، تو ظہر کی نماز منعقد ہوگی۔ نیّت کے بعد دل یا زبان سے انشاء اللہ ادا کرے اور تبرک کا قصد ہو، یا یہ کہ سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہی ہوتا ہے، تو حرج نہیں۔ اگر شک کے ارادے سے ان الفاظ کو ادا کرے تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

فرض نماز کے ابتداء میں یا دوران میں ایسا کام کرے جو فرضیت کے منافی ہو، نفلیت کے منافی نہ ہو، تو فرض باطل ہوگا، بطور نفل شمار ہونے میں یہ تفصیل ہے۔

(۱) زوال سے پہلے عمداً (جان بوجھ کر) ظہر کی نیّت سے نماز شروع کرے تو بالکل باطل ہے۔ اگر غلطی سے یوں ہوا ہے تو نفل شمار ہوگی۔

(۲) مسبوق نے امام کو رکوع میں پایا اور اپنی تکبیر تحریمہ کا کچھ حصہ رکوع میں ادا کیا تو فرض منعقد نہ ہو گا۔ جانتے ہوئے یوں کیا ہے تو بالکل باطل ہو گی، ورنہ بطور نفل منعقد ہو گی۔

(۳) کسی فرض نماز کو تنہا شروع کرنے کے بعد جماعت کھڑی ہوئی تو اسے پانے کیلئے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو یہ نفل شمار ہو گی۔

(۴) کسی مرض کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز میں طبیعت کچھ ٹھیک ہو گئی پھر بھی کھڑا نہ ہوا، یا جو کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے، وہ فرض نماز بیٹھ کر شروع کرے، یا فرض نماز پڑھنے والا بغیر سبب کے اسے نفل سے بدل دے تو ان تینوں صورتوں میں نماز باطل ہو گی۔

فصل۔ تَکْبِیْرَۃُ الْاِحْرَام۔ (تکبیر تحریمہ)

حدیث: (۱) آپ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے۔ (بخاری عن ابن عمر، ترمذی عن علی)

حدیث: (۲) ایک طویل حدیث میں نماز کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا! پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

حدیث: (۳) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا "نماز کی تحریمہ تکبیر ہے" (شافعی، احمد، ابوداود ترمذی، ابن ماجہ وصححہ الحاکم)

جو تکبیر کے کلمہ کو ادا کر سکتا ہو (اللہ اکبر کہہ سکتا ہو) اس پر وہی واجب ہے، اس سے ملے جلے دیگر الفاظ کافی نہیں، جیسے "الرَّحْمٰن اَجَلّ۔ الرَّبُّ اَعْظَمُ۔ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اَکْبَرُ"۔ اگر "اللّٰہُ الْاَکْبَرُ یا اَللّٰہُ اَکْبَرُ مِنْ کُلِّ شَیْئٍ یا اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ اَجَلُّ وَ اَعْظَمُ یا اَللّٰہُ الْجَلِیْلُ اَکْبَرُ" کہے تو کافی ہے۔

اسی طرح اللہ اور اکبر کے درمیان اللہ کے صفات میں سے کوئی صفت مختصر لفظ کے ساتھ داخل کرے تو تکبیر صحیح ہو گی۔ جیسے "اَللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَکْبَرُ" اگر الفاظ بڑھ جائیں تو تکبیر صحیح نہ ہو گی جیسے "اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ اَکْبَرُ" کیونکہ طوالت کی وجہ سے اسے تکبیر نہ کہا جائے گا۔ اگر "اَکْبَرُ اللّٰہُ" یا "اَللّٰہُ اَکْبَرْ" اللہ کہے تو نماز منعقد نہ ہو گی۔ تکبیر کے الفاظ میں دونوں کلمہ (اللہ اور اکبر) کے درمیان وقفہ نہ کرنا ضروری ہے۔ ایسی زیادتی سے پرہیز واجب ہے، جس سے معنی میں خلل واقع ہو۔ جیسے "آللّٰہُ اَکبر" (اللہ کے ہمزہ کو مد کے ساتھ ادا کرنا، کیونکہ اس صورت میں ترجمہ ہو گا، کیا اللہ سب سے بڑے ہیں) یا آللّٰہُ اکبار یا دونوں کے درمیان واو کا بڑھانا۔

تکبیر کو ایسے ادا کرنا کہ خود سن سکے واجب ہے جن نمازوں میں قیام واجب ہے، مکمل تکبیر قیام کی حالت میں ادا کرنا واجب ہے۔ عربی میں تکبیر ادا کر سکتا ہو تو کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ ادا کرنا کافی نہیں ہے۔

جو عربی میں پوری تکبیر ادا نہ کرسکتا ہو اس کی دو حالتیں ہونگی۔

(۱) **ادا کرنے کی قدرت حاصل ھی نہیں کرسکتا۔** گونگا ہونے کی وجہ سے ایسا ہے تو اپنے زبان ہونٹ اور کوے کو تکبیر کیلئے بقدر امکان حرکت دے گا۔ بات چیت کر سکتا ہے لیکن باوجود کوشش کے تکبیر کیلئے زبان ساتھ نہیں دیتی تو تکبیر کا ترجمہ کرے۔ کسی اور ذکر کو اس کی جگہ اختیار نہ کرے۔ ترجمہ کسی بھی زبان میں ادا کر سکتا ہے۔ بعد میں ان نمازوں کا اعادہ واجب نہیں ہے۔

(۲) **سیکھ کر تکبیر کی صحیح ادائیگی کی قدرت حاصل کر سکتا ھے،** تو اس پر سیکھنا لازم ہے۔ کسی

جنگل یا ایسی جگہ ہے جہاں سکھانے والا کوئی نہیں تو سیکھنے کیلئے سفر کرنا لازم ہے۔ جو نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے سیکھ سکتا ہو، اس کے لئے اول وقت میں ترجمہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

ذہن کی کمزوری یا وقت کی تنگی کی وجہ سے ترجمہ کے ذریعے نماز پڑھ لی، تو بعد میں اعادہ لازم نہیں ہے۔ باوجود امکان کے سیکھنے میں تاخیر کی اور وقت تنگ ہوا تو ترجمہ سے نماز پڑھ لے، لیکن بعد میں اعادہ واجب ہے۔ نماز شروع کرنے کی نیّت سے ایک سے زائد تکبیر کہے اور دو تکبیروں کے درمیان نماز سے نکلنے کی نیّت نہ کرے تو طاق عدد سے نماز میں داخل ہوگا، اور جفت سے نماز باطل ہو گی، لہٰذا پہلی تکبیر سے نماز شروع ہو گی دوسری تکبیر سے باطل پھر تیسری تکبیر کہے، تو نماز میں داخل ہو گا اور چوتھی تکبیر سے نکل جائے گا اور اسی ترتیب سے آگے کی تکبیرات کا حکم ہو گا۔ پہلی تکبیر کے بعد والی تکبیروں سے نماز شروع کرنے یا توڑنے کی نیّت نہ کرے تو پہلی تکبیر سے نماز شروع ہو گی۔ بقیہ تکبیرات ذکر شمار ہو گی، اس سے نماز باطل نہ ہو گی۔

رفع یدین۔(دونوں ہاتھ اٹھانا)

حدیث: (۱) آپ ﷺ نماز کی ابتداء میں دونوں دست مبارک کاندھوں تک اٹھایا کرتے، اور جب رکوع کی تکبیر کہتے، ”اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح دونوں ہاتھ اٹھاتے“ (متفق علیہ، عن ابن عمر) بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے ”وفات تک آپ ﷺ کے نماز کی یہی کیفیت رہی“ اور بخاری کی روایت میں مزید یہ بھی ہے ”سجدے میں جاتے وقت اور سجدے سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین نہ کرتے۔“

(۲) آپ ﷺ نے تکبیر تحریمہ کے وقت کاندھا کے بالمقابل ہاتھوں کو بلند کیا۔ (شافعی، احمد)

تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانا سنّت ہے۔ ہاتھوں کو اس طرح اٹھائے کہ انگلیوں کے سرے کان کے اوپری کنارے کے بالمقابل، دونوں انگوٹھے کان کی لو کے بالمقابل، اور ہتھیلی کاندھے کے بالمقابل آجائے۔ رفع یدین کے وقت دونوں ہتھیلی قبلہ کی طرف ہو۔ اگر دونوں یا ایک ہتھیلی کٹی ہوئی ہو تو بازو کو اٹھائے، کہنیوں سے ہاتھ کٹا ہو تو بقیہ حصّے کو اٹھائے۔

اگر کسی عذر سے مذکورہ حد کی پابندی نہیں کر سکتا، بلکہ کچھ کم یا زیادہ ہی اٹھانا پڑتا ہے، تو جیسا ممکن ہو عمل کرے۔ کم اور زیادہ دونوں ممکن ہو تو زیادہ پر عمل کرے۔

رفع یدین ہر نمازی کیلئے سنّت ہے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھے یا بیٹھ کر (یا لیٹ کر۔ جمل)، فرض نماز ہو یا نفل، امام ہو یا مقتدی، افضل صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھانا شروع کرتے وقت تکبیر کہنا بھی شروع کرے (اور بہتر ہے کہ ہاتھ مذکورہ حد تک پہنچتے ہی تکبیر بھی مکمل ہو چکی ہو۔ (حاشیۃ الروضہ)

تکبیر شروع کرے اور رفع یدین نہ کرے تو تکبیر مکمل ہونے سے پہلے رفع یدین کرے۔ اگر تکبیر مکمل ہو چکی تو اب رفع یدین نہ کرے۔ (کیونکہ اس کا محل فوت ہو چکا)

مستحب ہے کہ رفع یدین کے وقت دونوں ہاتھ کھلے ہوں (چادر وغیرہ میں چھپے نہ ہوں) اور انگلیوں کو متوسط درجہ میں جدا اور کشادہ رکھے۔ تکبیر اتنی جلدی نہ ادا کرے کہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ زیادہ مد کرے۔ (کھینچے)

رفع یدین کی حکمت: غیر اللہ سے کبریائی کی نفی، تاکہ گونگا یا جس آدمی تک آواز نہ پہنچے وہ دیکھے (اور سمجھ لے کہ نماز

شروع ہو چکی) دنیا کو پسِ پشت ڈال کر ہمہ تن عبادت کی طرف توجہ کی طرف اشارہ، مکمل قیام کا اشارہ، کامل اطاعت و انقیاد کی طرف اشارہ، نماز کی عظمت کی طرف اشارہ، بندہ اور معبود کے درمیان پردہ کے ہٹنے کی طرف اشارہ، تاکہ مکمل بدن سے استقبالِ قبلہ حاصل ہو، امام شافعیؒ نے فرمایا: اللہ کی تعظیم اور اس کے نبی کی اتباع کے لئے، ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رفع یدین نماز کی زینت ہے، ہر مرتبہ اٹھانے پر دس نیکیاں ملیں گی، ہر انگلی پر ایک نیکی، توجیہ کی طرف اشارہ (ملخص من فتح الباری والجمل)

ہاتھ باندھنا

حدیث: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کے بعد دایاں ہاتھ بائیں پر رکھا۔ (مسلم) (۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام میں دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے (نسائی) (۳) بعض روایات میں ہاتھ باندھنے کو انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سنّتوں میں شمار کیا (دار قطنی۔ بیہقی۔ طبرانی) تکبیر کے بعد اب ہاتھوں کو سینے کے نیچے تک لاکر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے نچلا حصہ کچھ گٹا اور بازو کو پکڑے۔ پھر سینے کے نیچے اور ناف سے اوپر رکھے۔

فصل۔ قیام (نماز میں کھڑے ہونا)

حدیث: بخاری شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھو، یہ نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھو، یہ نہ ہو سکے تو کروٹ کے بل (لیٹ کر) پڑھو" نسائی کی روایت میں آگے یہ بھی ہیکہ" یہ نہ ہو سکے تو چت لیٹ کر پڑھو، ہر کسی کو اللہ اس کی حیثیت کے مطابق ہی مکلف بناتا ہے۔ (مغنی المحتاج ۱/۱۵۳) قیام نماز کا رکن ہے۔ نفل نماز میں بیٹھنا قیام کے قائم مقام ہے۔ مجبوری کی صورت میں فرض نماز میں بھی بیٹھنا قیام کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ استقلال کے ساتھ بغیر سہارے کے کھڑے رہنا شرط نہیں ہے۔ کسی دیوار یا انسان سے ایسے ٹیک لگا کر کھڑا ہو کہ اس کے ہٹائے جانے کی صورت میں وہ گر جائے گا تو نماز کراہت کے ساتھ صحیح ہو گی۔ (کراہت اس وقت ہے جبکہ کوئی مجبوری نہ ہو۔ جمل) اگر بغیر ٹیک اور سہارے کے کھڑا نہیں رہ سکتا تو سہارے سے کھڑا رہنا واجب ہے۔ صرف سر جھکانے سے قیام میں خلل نہ ہو گا۔ اصل اعتبار ریڑھ کی ہڈی کو کھڑے رکھنے کا کیا جائیگا۔ لہٰذا جو صحیح قیام کر سکتا ہو اسے قیام کی ہیئت سے ہٹ کر دائیں یا بائیں جانب جھکنے کی یا آگے کی طرف رکوع کی حد تک جھکنے کی اجازت نہ ہو گی۔ آگے اتنا جھکے کہ رکوع کی حد تک نہ پہنچے، لیکن کھڑے ہونے کے مقابلے میں رکوع سے قریب ہو تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

بغیر کسی کی مدد کے کھڑے نہیں ہو سکتا، لیکن کھڑے ہونے کے بعد زیادہ تکلیف نہیں ہوتی، تو کسی کی مدد سے کھڑے ہو جانا لازم ہے۔ اگر مفت میں کوئی اس طرح تعاون نہ کرے اور اس کے پاس مناسب اجرت موجود ہے تو اجرت دے کر مدد لینا لازم ہے۔ مذکورہ تفصیلات اس کیلئے ہے جو اس پر قادر ہو۔ کوئی مجبور ہو مثلاً اپاہج پن یا بڑھاپے کی وجہ سے کسی کی کمر اتنی جھک چکی ہے کہ رکوع کے حد تک پہنچتی ہے تو وہ اسی حال پر قیام کرے گا، جب رکوع کا وقت آئے اور مزید جھک سکتا ہے، تو رکوع کیلئے مزید جھکے۔ قیام تو کر سکتا ہے لیکن پشت میں کسی تکلیف کی وجہ سے رکوع اور سجدہ سے عاجز ہے تو اس پر قیام لازم ہے اور رکوع اور سجدہ کو حسب گنجائش ادا کرے۔ ممکنہ حد تک پشت کو جھکائے اس کی گنجائش نہ ہو تو سر اور گردن کو جھکائے اس کے لئے کسی چیز پر ٹیک لگانے یا پہلو کی طرف جھکنے کی ضرورت پڑے تو یہ لازم ہے بالکل ہی جھکا نہیں سکتا تو رکوع سجدہ کی طرف اشارہ کرے قیام اور لیٹنا ممکن ہو لیکن بیٹھ نہ سکتا ہو تو بیٹھنے کی جگہ قیام کرے گا۔ بغیر عذر کے صرف ایک پیر پر کھڑے ہونا صحیح ہے لیکن مکروہ ہے۔ دونوں پیروں کو آپس میں ملا کر رکھنا (یا آگے پیچھے رکھنا)

مکروہ ہے۔ مستحب یہ ہے کہ دونوں میں (تقریباً ایک بالشت کا) فاصلہ ہو۔ رکوع سجدہ کو طویل کرنے کے مقابلے میں قیام کو طویل کرنا افضل ہے۔ اور رکوع کے مقابلہ میں سجدہ کو طویل کرنا افضل ہے۔

جو قیام سے عاجز ہو

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا! ''نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر اس کی قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر (پڑھو) ورنہ پھر پہلو کے بل (پڑھو) (بخاری شریف) نسائی میں آگے یہ بھی فرمایا ورنہ چت لیٹ کر۔ (تلخیص۔ ۱/۲۴۰)

فرض نماز میں قیام سے عاجز ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اس سے ثواب میں کمی نہ ہو گی، کیونکہ وہ معذور ہے، عاجز ہونے سے یہ مراد نہیں کہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ قیام سے ہلاکت کا خوف ہو، مریض کو شدید مشقت پیش آئے، سمندری سفر میں غرق ہونے کا خطرہ ہو، یا سر گھومنے اور چکرانے لگے، تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں دشمن کا خطرہ ہو، تو بیٹھ کر نماز پڑھے، لیکن بعد میں اعادہ واجب ہے، کیونکہ یہ نادر عذر ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کیلئے کسی خاص طرز اور ہیئت پر بیٹھنا متعین نہیں ہے، کسی بھی طرح بیٹھ کر نماز پڑھنا کافی ہے۔ لیکن اقعاء کا انداز اختیار کرنا نماز میں مکروہ ہے۔

اقعاء: دونوں سرین پر بیٹھ کر ران اور گھٹنے کو کھڑا رکھنا۔

اقعاء کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ اس میں کتے اور بندر سے مشابہت پائی جاتی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں صراحت ہے (حاشیۃ الجمل ۱/۳۴۲) افضل یہ ہے کہ افتراش کی ہیئت میں بیٹھے (یعنی جیسے تشہد اول میں بیٹھتے ہیں جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔)

بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں رکوع کیلئے کم از کم اتنا جھکے کہ چہرہ (یا صرف پیشانی) گھٹنے سے آگے کی جگہ کے بالمقابل آجائے۔ اکمل رکوع کے لئے اتنا جھکے کہ پیشانی سجدہ کی جگہ کے مقابل آجائے۔ سجدہ میں کچھ فرق نہیں ہے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی طرح ہی سجدہ کرے گا۔ مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ اس پر قادر ہو، کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے اس طرح رکوع سجدہ نہیں کر سکتا تو جتنا ممکن ہو جھکے، اگر سجدہ نہیں کر سکتا صرف رکوع کر سکتا ہے، تو سجدہ کے وقت بھی رکوع کی طرح جھکے۔ سجدہ نہیں کر سکتا لیکن کامل رکوع سے کچھ زیادہ جھک سکتا ہے تو رکوع کیلئے کامل طریقے سے زیادہ نہ جھکنا واجب ہے۔ اور سجدہ کیلئے جتنا زیادہ جھک سکتا ہو، جھکنا واجب ہے۔ حتی کہ اگر کنپٹی یا پیشانی سے اوپر سر کی ہڈی کے بل سجدہ کر سکتا ہو، اور اس طرح کرنے سے پیشانی زمین سے زیادہ قریب ہوتی ہو تو اس طرح کرنا لازم ہے۔

کوئی شخص تنہا مکمل نماز کھڑا ہو کر پڑھ سکتا ہو (مختصراً پڑھنے کی وجہ سے) لیکن باجماعت پڑھنے کی صورت میں نماز کا کچھ حصہ بیٹھ کر پڑھنے کی نوبت آتی ہو تو اسے تنہا پڑھنا افضل ہے۔ باجماعت کچھ بیٹھ کر پڑھے تب بھی نماز صحیح ہو گی۔ اگر کسی کی حالت ایسی ہو کہ صرف سورہ فاتحہ پڑھنے کی صورت میں قیام ممکن ہو اور دوسری سورت ملالینے کی صورت میں بیٹھنا پڑتا ہو، تو صرف سورہ فاتحہ سے نماز پڑھ لے۔ اگر سورت بھی شروع کر دی پھر عاجز ہوا تو بیٹھ جائے۔ رکوع کی خاطر سورت چھوڑنا لازم نہیں ہے۔

جو بیٹھنے سے عاجز ہو

عاجز ہونے سے مراد بیٹھنا مشکل ہو یا بیٹھنے میں شدید مشقت ہوتی ہو جیسا کہ قیام کے سلسلہ میں گذرا۔ جو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے عاجز ہو دائیں کروٹ پر چہرہ اور بدن کے اگلے حصہ کو قبلہ رو کر کے لیٹے جیسا کہ میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے (بغیر عذر کے) بائیں کروٹ پر لیٹے تو نماز صحیح ہو گی لیکن سنّت کے خلاف ہو گا اگر کروٹ کے بل نہیں لیٹ سکتا تو پیر کے تلووں کو قبلہ رو کر کے چت لیٹے اور سر کے نیچے تکیہ

وغیرہ رکھ دے تاکہ چہرہ قبلہ رو ہو جائے اور نماز ادا کرے۔(مغنی المحتاج۔ ۱/۱۵۵)

رکوع سجدہ کر سکتا ہو تو کرے ورنہ آگے کی طرف جھک کر جتنا ممکن ہو پیشانی کو زمین کے قریب کر کے اشارے سے ادا کرے۔ سجدہ کو رکوع کے مقابلہ میں زیادہ پست رکھے۔ سر سے اشارہ نہ کر سکتا ہو تو آنکھ اور پلک کے اشارے سے ادا کرے اس سے بھی عاجز ہو تو نماز کے افعال اپنے دل پر جاری کرے(دل میں رکوع سجدہ وغیرہ کا تصور کرے)

اگر زبان بند ہو جائے تو قرآن اور دیگر اذکار کو دل پر جاری کرے بہر حال جب تک ہوش باقی ہے نماز ساقط نہ ہوگی۔ قیام پر قادر شخص آشوب چشم میں مبتلا ہو اور کوئی معتبر طبیب یہ کہے کہ بیٹھ کر یا چت یا کروٹ لیٹ کر نماز پڑھنے کی صورت میں علاج ہو سکتا ہے، ورنہ نابینا ہونے کا خطرہ ہے تو اس کے مشورہ پر عمل کرنا جائز ہے۔

دوران نماز قیام سے عاجز ہو جائے تو بیٹھ کر بقیہ نماز مکمل کرے۔(عذر کی وجہ سے) بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران قیام پر قادر ہو اتو بقیہ نماز کھڑا ہو کر مکمل کرے گا۔ اسی طرح لیٹ کر نماز پڑھنے کے دوران بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو جائے تو بقیہ نماز بیٹھ کر یا کھڑا ہو کر پوری کرے(یعنی ساری صورتوں میں بقیہ نماز کو قدرت کے مطابق ادا کرنا کافی ہے۔ از سر نو دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔) اگر حالت نقص سے کمال کی طرف بدل جائے مثلاً بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے مرض کے افاقہ کی وجہ سے قیام کی قدرت حاصل ہو جائے اور قرأت سے پہلے ہی ایسا ہو جائے تو کھڑا ہونے کے بعد قرأت کریگا۔ اگر دوران قرأت ایسا ہو تو بقیہ سورہ فاتحہ کھڑا ہونے کے بعد پڑھے گا۔ کھڑے ہوتے ہوئے پڑھنا منع ہے، اگر پڑھ لیا تو مکمل کھڑا ہونے کے بعد اس کو دوہرانا واجب ہے۔

سورہ فاتحہ مکمل ہونے اور رکوع کرنے سے قبل قیام پر قادر ہو جائے تو اب قیام واجب ہے تاکہ قیام سے رکوع کیلئے جھکے۔ لیکن اس قیام میں طمانینت لازم نہیں ہے۔ کیونکہ اصل مقصود قیام نہیں ہے۔(بلکہ قیام سے رکوع میں جانا مقصود ہے۔ لہٰذا کھڑا ہو کر فوراً ہی رکوع میں جانا کافی ہے) مذکورہ صورتوں میں قیام میں پوری سورہ فاتحہ پڑھ لینا مستحب ہے، تاکہ کمال کی حالت میں قرأت حاصل ہو۔ بیٹھ کر رکوع میں جانے کے بعد طمانینت سے پہلے طبیعت میں افاقہ ہو تو قیام سے رکوع میں جانے کی حد تک اٹھ جانا واجب ہے۔

تشریح: اتنا اٹھ جائے کہ قیام سے رکوع میں جانے کی صورت میں جو کیفیت اور ہیئت ہوتی ہے وہ حاصل ہو جائے، سیدھے کھڑے ہو کر پھر رکوع میں جانا جائز نہیں ہے تاکہ ایک رکوع زائد نہ ہو اگر ایسا کیا تو نماز باطل ہو گی۔ اور بیٹھ کر رکوع میں جانے اور طمانینت حاصل ہونے کے بعد طبیعت میں افاقہ ہو تو رکوع مکمل ہو چکا، لہٰذا سابقہ طرز پر رکوع کیلئے کھڑا ہونے کی ضرورت نہیں اعتدال میں آنے کے بعد افاقہ ہوا اور ابھی طمانینت حاصل نہ ہوئی ہو تو کھڑا ہونا لازم ہے، تاکہ اعتدال اور طمانینت حاصل ہو۔ اگر طمانینت کے بھی بعد افاقہ ہو تو قیام لازم نہیں ہے، تاکہ اعتدال طویل نہ ہو جائے حالانکہ وہ قصیر (مختصر) رکن ہے۔ فجر کی دوسری رکعت میں اس طرح کا اتفاق ہو(یعنی اعتدال و طمانینت کے بعد افاقہ ہو) تو قنوت بیٹھ کر نہ پڑھے ورنہ نماز باطل ہو گی۔ بلکہ کھڑا ہو جائے اور قنوت پڑھ لے۔ اگر نماز کے دوران کمال سے نقص کی طرف لوٹنا پڑے، یعنی نماز میں کوئی مجبوری پیش آجائے(بیمار ہونا وغیرہ) تو جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لے۔

تشریح: باقاعدہ قیام وغیرہ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز میں کسی بیماری کی وجہ سے قیام سے عاجز ہو گیا تو بیٹھ جائے، بیٹھنے سے بھی عاجز ہو تو بقیہ نماز لیٹ کر پوری کرے۔ اسی طرح رکوع سجدہ وغیرہ کا بھی حکم ہے سورۂ فاتحہ کے دوران عاجز ہو تو بیٹھتے بیٹھتے قرأت کا جاری رکھنا واجب ہے۔

بیٹھ کر نفل پڑھنا

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "کھڑے ہو کر نماز پڑھنا افضل ہے، اور جو بیٹھ کر پڑھے اسے کھڑے ہو کر پڑھنے والے سے نصف ثواب ملے گا، اور جو لیٹ کر پڑھے اسے بیٹھنے والے سے نصف ثواب ملے گا۔" (بخاری شریف) قیام پر قادر ہونے کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ لیکن اس صورت میں قیام کے مقابلے میں نصف ثواب حاصل ہو گا۔ قیام اور بیٹھنا ممکن ہوتے ہوئے لیٹ کر نفل نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن قدرت ہو تو رکوع وسجدہ کیلئے بیٹھنا لازم ہے، صرف اشارہ کافی نہ ہو گا، اسی طرح کروٹ لیٹنا ممکن ہو تو چت لیٹ کر پڑھنا صحیح نہیں ہے، ورنہ صحیح ہے۔ (مغنیالمحتاج ۱/۱۵۵) ان مسائل میں سارے نوافل کا یہی حکم ہے سنن راتبہ، عید، کسوف اور استسقاء وغیرہ کی نماز ہو یا کوئی اور نفل۔

فصل۔ دعاء استفتاح

تکبیر تحریمہ کے بعد نمازی کو دعائے استفتاح پڑھنا سنّت ہے۔ درج ذیل صورتوں میں دعائے استفتاح پڑھنا سنّت نہیں ہے۔

(۱) دعائے استفتاح پڑھنے کی صورت میں امام کے پیچھے پوری سورۂ فاتحہ نہ ملنے کا اندیشہ ہو۔

(۲) نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو۔

(۳) قیام کے علاوہ کسی اور رکن میں آکر امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ البتہ امام کے آخری تشہد میں کوئی آکر شامل ہو جائے، اور اس کے بیٹھنے سے پہلے امام سلام پھیر دے، یا تشہد اول میں شامل ہو جائے اور بیٹھنے سے قبل ہی امام اٹھ جائے، یا امام کی موافقت کرنے سے قبل ہی حدث وغیرہ کی وجہ سے وہ نماز سے نکل جائے تو ان صورتوں میں دعائے استفتاح پڑھنا مسنون ہے۔

(۴) نماز جنازہ میں دعائے استفتاح سنّت نہیں ہے۔ (مغنی ۱/۱۵۶، حاشیۃالروضہ)

دعائے استفتاح: "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفاً مُسلِماً وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْن اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ بِذَالِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِين"

(ترجمہ: میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا سارے باطل ادیان سے منہ موڑ کر صرف اس کی طرف مائل ہوتے ہوئے، مسلمان بن کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں، یقیناً میری نماز وعبادت اور جینا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے۔ جو تمام عالم کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔) امام اس سے زیادہ نہ پڑھے، اگر مقتدی اس سے زائد پڑھنے کی اجازت دیں یا کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو اس دعا کے بعد مزید یہ پڑھنا بھی مستحب ہے۔

"اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ اَنْتَ رَبِّيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي ذُنُوْبِي جَمِيْعًا اِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلاَّ اَنْتَ وَاهْدِنِي لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِى لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلاَّ اَنْتَ لَبَّيكَ وَ سَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ وَ الشَّرُ لَيْسَ اِلَيْكَ اَنَا بِكَ وَاِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَ تَعَالَيتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوبُ اِلَيْكَ" (صحیح مسلم-الام ۱/۱۰۲)

ترجمہ: یااللہ تو ہی بادشاہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تسبیح اور حمد تیرے ہی لئے ہے، تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے، پس میرے تمام گناہ بخش دے یقیناً تیرے علاوہ کوئی گناہ نہیں بخش سکتا، اور مجھے

بہترین اخلاق کی ہدایت فرما، جو تو ہی، فرما سکتا ہے۔ اور برے اخلاق کو مجھ سے ٹال دے جسے تو ہی ٹال سکتا ہے۔ میں تیری اطاعت و فرمانبرداری پر ہمیشہ قائم ہوں اور تمام خیر تیرے ہاتھ ہے، اور شر تیری طرف منسوب نہیں، تو ہی توفیق بخشنے والا ہے اور تجھی سے التجاء ہے تو بابرکت اور اعلیٰ ہے تجھ سے مغفرت کا طالب اور تیری بارگاہ میں تائب ہوں۔

تنہا نماز پڑھنے والے کیلئے اور اس امام کیلئے جس کے مقتدی محدود و متعین اور تطویل سے راضی ہوں اور دیگر مقتدیوں کا آ کے شامل ہونے کا امکان نہ ہو، مندرجہ بالا دعا کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی درج ذیل دعاء پڑھنا بھی مستحب ہے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر اور قرأت کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

”اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَّ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ۔ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ“ (رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

ترجمہ: یا اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان مشرق و مغرب کی طرح دوری فرما، یا اللہ مجھے گناہوں سے ایسا پاک وصاف فرما جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ یا اللہ میرے گناہوں کو پانی اور برف اور اولے سے دھو دے۔

استفتاح کے متعلق دیگر روایات بھی مروی ہیں، ان میں سے کسی بھی دعا کو پڑھ لینے سے استفتاح کی سنّت حاصل ہو گی۔ لیکن شوافع کے نزدیک افضل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث (**یعنی وَجَّھْتُ** الخ) اور اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت (**اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ** الخ) ہے۔ (شرح مہذب ۳/ ۳۱۹۔ ۳۲۱)

امام نووی رحمہ اللہ نے ”الاذکار“ میں استفتاح کے متعلق وارد تمام روایات کو جمع کیا ہے اور لکھا ہے۔ کہ منفرد یا، وہ امام جس کے مقتدی تطویل کی اجازت دیں، ان تمام دعائوں کو پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔ (الاذکار ص ۴۲ تا ص ۴۴) کسی نے عمداً یا بھول کر دعا استفتاح چھوڑ دی اور تعوذ (اعوذ باللہ) شروع کر دی تو اب دعا استفتاح نہ پڑھے، اور نہ کسی اور رکعت میں اس کی تلافی کرے۔

مسبوق (بعد میں آ کر امام کے ساتھ شامل ہونے والا مقتدی) آخری تشہد میں امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو اور تکبیر کہہ کے بیٹھ جائے اور بیٹھتے ہی امام سلام پھیر دے تو کھڑا ہو لیکن اب دعا استفتاح نہ پڑھے۔ کیونکہ اس کا محل فوت ہو چکا۔ اگر بیٹھنے سے قبل امام سلام پھیر دے تو نہ بیٹھے اس صورت میں دعا پڑھ لے۔ دعا استفتاح فرض نماز اور تمام نفل نمازوں میں پڑھنا سنّت ہے۔ (صرف جنازہ کی نماز میں سنّت نہیں ہے) مسبوق کے نماز میں داخل ہوتے ہی امام آمین کہے تو یہ بھی امام کے ساتھ آمین کہے، پھر دعا استفتاح پڑھے۔

فصل۔ تَعَوُّذْ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

آیت: ”**فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُراٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ**“ (النحل۔ ۹۸)

ترجمہ: تو جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔“

دعا استفتاح کے بعد ”اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ“ کہنا مستحب ہے۔ تمام نمازوں میں تعوذ سراً (آہستہ) ادا کرے۔ تعوذ ہر رکعت میں مستحب ہے۔ لیکن پہلی رکعت میں اس کی زیادہ تاکید ہے۔

حدیث: مسند احمد، اصحاب سنن، حاکم ابن حبان، دار قطنی اور بیہقی وغیرہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعوذ پڑھنا

وارد ہے۔(تلخیص الحبیر۔ا ص۔۲۴۵،۲۴۴)

فصل (قرأت (تلاوت)

تعوذ کے بعد قرأت کرے نمازی یا تو سورہ فاتحہ کی قرأت پر قادر ہو گا یا نہیں۔ جو سورہ فاتحہ کی تلاوت کر سکتا ہو اسے قیام یا قیام کے بدل (بیٹھنے یا لیٹنے) میں سورہ فاتحہ ہی کی تلاوت لازم ہے۔ ترجمہ یا سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن میں سے کچھ اور پڑھ لینا کافی نہ ہو گا۔

امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) سب پر سورہ فاتحہ کی تلاوت متعین ہے، چاہے سری نماز ہو، یا جہری، جہری نماز میں بھی مقتدی آہستہ اس طرح تلاوت کرے کہ خود اس کا نفس سن سکے۔ امام کو جہری نماز میں اپنی فاتحہ کے بعد اتنی دیر چپ رہنا مستحب ہے جس میں مقتدی فاتحہ پڑھ سکے۔ (جیسا کہ آئندہ ۹ نمبر کے اثر میں وارد ہے)

سورہ فاتحہ کی فرضیت کی دلیل

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”جو سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ کرے اس کی نماز (درست) نہیں“ (صحاح ستہ عن عبادۃ بن الصامت) امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث آپ ﷺ سے تواتراً منقول ہے۔ (جزء القرأۃ)

(۲) وہ نماز کافی نہیں جس میں سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ ہو“ (ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم باسناد صحیح)

(۳) ایک صحابی کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا......... ”پھر سورہ فاتحہ پڑھو......... “ (ابوداؤد، احمد ابن حبان) مکمل نماز سکھلانے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر رکعت میں اسی طرح کرو۔ (بخاری، ترمذی، بیہقی)، (تحفۃ الاحوذی جلد دوّم)

مقتدی پر سورہ فاتحہ کے وجوب کے دلائل

احادیث: (۱) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”آپ ﷺ نے فجر کی نماز ادا کی تو آپ ﷺ پر قرأت گراں ہوئی، نماز کے بعد فرمایا!” میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے (اقتدا میں) قرأت کرتے ہو؟“ ہم نے کہا۔ یارسول اللہ باللہ ہم تلاوت کرتے ہیں“ تو فرمایا ”سورہ فاتحہ کے علاوہ تلاوت نہ کرو کیونکہ جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز (درست) ہی نہیں“ (احمد، بخاری فی جزء القراء۔ وصححہ ابوداود۔ والترمذی والدارقطنی وابن حبان والحاکم والبیہقی)

امام خطابی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر بالکل صریح دلالت کرتی ہے کہ سورہ فاتحہ کی تلاوت مقتدی پر واجب ہے، خواہ امام جہراً تلاوت کرے یا سراً۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ”جو ایسی نماز پڑھے جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ ناقص و ناتمام ہے“ تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں (تو اس وقت کیا کریں) تو فرمایا: اپنے جی میں (آہستہ) پڑھو۔ (مسلم)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے یہ پوچھا کہ تم لوگ امام کی تلاوت کے دوران تلاوت کرتے ہو؟ پھر صحابہ نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا ”یوں نہ کرو، اور تم اپنے جی میں سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو“ (بخاری

فی جزء القرأۃ۔بیہقی فی کتاب القرأۃ، ابن حبان، طبرانی فی الاوسط)

بیہقی نے کتاب القرآۃ میں حضرت ابو قتادہ اور عمر بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے بھی اس طرح کی حدیث نقل فرمائی ہے۔

آثار: (۱) یزید بن شریک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مقتدی کے لئے تلاوت کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا: "سورہ فاتحہ پڑھو" پوچھا گرچہ آپ امام ہو؟ فرمایا: گو میں ہوں، پوچھا: اگرچہ آپ جہراً تلاوت کریں (بلند آواز سے پڑھیں)، فرمایا: جی، گو جہراً پڑھوں۔ (دارقطنی۔باسناد صحیح)

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: "ظہر، عصر کی نماز میں امام کے پیچھے پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورت پڑھو اور آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھو" (دارقطنی، حاکم، بیہقی باسناد صحیح)

(۳) ابو نعیم جہراً تلاوت کر رہے تھے اور پیچھے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے تھے، استفسار کرنے پر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ مت پڑھو۔ (دارقطنی وحسنہ)

(۴) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: "ہم لوگ امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ اور دوسری ایک سورت اور آخری دو رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔" (ابن ماجہ بسند صحیح)

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ خود بھی امام کے پیچھے سورہ کی تلاوت فرماتے اور شاگردوں کو بھی اس کا حکم فرماتے۔ (بیہقی فی کتاب القرأۃ)

(۶) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا فتویٰ دیا۔ (بیہقی بسند حسن)

(۷) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "امام کے پیچھے (سورہ فاتحہ کی) تلاوت کرو، نماز جہری ہو یا نہ ہو"۔ (بیہقی بسند صحیح)

(۸) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بھی مقتدی وغیر مقتدی کو سورہ فاتحہ کی تلاوت کا حکم دیا۔ (بیہقی)

(۹) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح مروی ہے کہ سلف امامت کی صورت میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا موقع دیتے تھے۔ (کتاب القراء للبخاری) حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کافی صحابہ کرام اور اکابر تابعین کا زمانہ پایا ہے۔

(۱۰) حضرت عروہ بن زبیرؒ (تابعی) کا فرمان ہے: "امام کے سکتہ میں تلاوت کرو" کیونکہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہ ہو گی" (بیہقی)

جن احادیث میں مقتدی کے لئے تلاوت کی ممانعت ہے۔ امام بیہقی وغیرہ فرماتے ہیں کہ اسے سورہ فاتحہ کے علاوہ دوسرے سورت کی تلاوت یا جہراً تلاوت پر محمول کریں گے جیسا کہ مفصل روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

(اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ۲/۲۲۶-۲۵۳، تحقیق الکلام (اردو) مولانا عبدالرحمن مبارکپوری، ابکار المنن، تلخیص الحبیر، کتاب القرأۃ خلف الامام للبخاری جزء القرأۃ للبیہقی، امام الکلام عبدالحی لکھنوی، مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ لعبید اللہ مبارکپوری وغیرہ)

فاتحہ ہر رکعت میں واجب ہے، لیکن امام کے رکوع کے وقت جو مسبوق آکر نماز میں شامل ہو اس پر واجب نہیں ہے۔ بغیر سورہ فاتحہ پڑھے امام کے ساتھ رکوع ملنے کی صورت میں وہ رکعت مقتدی کے حق میں اسی وقت شمار ہو گی، جبکہ امام کیلئے شمار ہو۔ اگر امام بے

وضو تھا یا غلطی سے پانچویں رکعت پڑھ رہا تھا تو صرف رکوع میں شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہ ہو گی۔

مقتدی کے تلاوت کی رفتار سست ہو، یا وہ اپنے نماز میں ہونے کو بھول جائے، یا بھیڑ کی وجہ سے وقت پر سجدہ نہ کر پائے، یا امام کے رکوع کے بعد فاتحہ پڑھنے میں شک ہوا، اور اس کے لئے پیچھے رہا، اور ان تمام صورتوں میں امام سے تین طویل رکن پیچھے رہا اور عذر ختم ہونے تک امام دوسری رکعت کے رکوع میں پہنچ چکا ہے تو ان صورتوں میں بھی یہ مقتدی (اپنے سجدے سے اٹھنے کے بعد) امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو گا اور اسے یہ رکعت مل جائیگی۔ کوئی امام کے ساتھ قیام میں آکر شامل ہوا اور سورہ فاتحہ شروع کرے لیکن مکمل ہونے سے پہلے امام رکوع میں جائے تو بقیہ فاتحہ کو مکمل کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ امام کے ساتھ رکوع میں چلا جائے اور یہ رکعت بھی شمار ہو گی۔(حاشیۃالروضہ، الجمل ۱/۳۴۵، المغنی ۱/۱۵۷)

بَسمله: "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورہ فاتحہ کے ابتداء میں ایک مکمل آیت ہے۔ اسی طرح سورہ برأت (توبہ) کے علاوہ بقیہ تمام سورتوں کے ابتداء میں بھی مکمل آیت ہے۔ آپ ﷺ نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت شمار کیا۔ (رواہ ابن خزیمہ، والحاکم، جمل ۱/۳۴۵)

خطیب، ابن حجر۔ اور ابن عبد الحق نے فرمایا کہ سورہ برأت کے ابتداء میں بسم اللہ کی تلاوت حرام اور درمیان میں مکروہ ہے۔ اور رملیؒ کے نزدیک ابتداء میں مکروہ اور درمیان سے تلاوت شروع کرنے کی صورت میں مستحب ہے۔ (جمل ۱/۳۴۵) جہری نماز میں سورہ فاتحہ اور بعد والی سورت کے ابتداء میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو بھی جہراً ادا کرنا سنّت ہے۔ سورہ فاتحہ کو تمام حروف اور تشدیدات کی رعایت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ کسی حرف یا تشدید کو چھوڑ دیا یا ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھا تو قرأت صحیح نہ ہو گی۔ چاہے حرف ضاد کو بدلے یا کسی اور حرف کو، قرأت میں ایسا لحن (غلطی) کرے جس سے معنی بدل جائے جیسے اَنۡعَمۡتُ تا کے پیش یا زیر کے ساتھ پڑھے یا اِیَّاکِ کاف کے زیر کے ساتھ پڑھے تو صحیح نہیں ہے۔ اگر عمداً اس طرح پڑھے تو نماز باطل ہو گی اور عمداً نہیں پڑھا تو دوبارہ صحیح قرأت کرنا واجب ہے۔ قرأت سبعہ (سات قرأتوں) میں سے کسی بھی قرأت کو اختیار کر سکتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کی تلاوت میں ترتیب واجب ہے۔ اگر عمداً آگے پیچھے پڑھا تو قرأت باطل ہو گی۔ دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ غلطی سے اس طرح ہوا تو ابتدائی مرتب آیات کا اعتبار ہو گا۔ اس پر بنا کر کے بعد والی آیات کو پھر پڑھے لیکن زیادہ دیر گذری ہو تو مکمل فاتحہ از سر نو پڑھے۔

تشریح: مثلاً کسی نے "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" سے آخر تک پہلے پڑھا پھر "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے "مَالِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ" تک پڑھا اور عمداً اس طرح کیا ہے تو نئے سرے سے مکمل سورت ترتیب سے پڑھ لے۔ غلطی سے اس طرح ہوا تو بعد میں "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے "مَالِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ" تک پڑھنا معتبر ہے، اب اس کے آگے "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" سے آخر تک ترتیب سے پڑھ لینا کافی ہے۔ کسی نے "بِسۡمِ اللّٰہِ" مکمل پڑھی پھر "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ" چھوڑ کر بقیہ آیتوں کو پڑھتا رہا اور کافی دیر ہوئی تو اب "بِسۡمِ اللّٰہِ" کے بعد سے پڑھنا کافی نہیں، بلکہ "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے شروع کرنا واجب ہے۔

اگر عمداً تشہد کی ترتیب کو ایسا بگاڑ دے کہ معنی غلط ہو جائے تو نماز باطل ہو گی (اور عمداً نہیں ہے تو نماز باطل نہ ہو گی۔ لیکن اس کا اعتبار نہ ہو گا بلکہ تشہد کو صحیح دوہرانا واجب ہے) اور معنی نہ بگڑے تو اس طرح پڑھنا کافی ہو جائے گا۔

تشریح: کسی نے تشہد کو "اَلسَّلَامُ عَلَیۡكَ" سے "مُحَمَّدٌ رَّسُوۡل" تک پڑھا پھر "اَلتَّحِیَاتُ" سے "لِلّٰہِ" تک پڑھا تو چونکہ

اس سے مفہوم نہیں بگڑا، اس لئے نماز درست ہو گی۔ لیکن کسی نے "اَلتَّحِیَاتُ الْمُبَارَکَاتُ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰہِ عَلیٰ عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ" وغیرہ پڑھ دیا تو مفہوم بگڑ جائے گا۔ اسلئے عمداً ہے تو نماز باطل ہو گی ورنہ پورے تشہد کو از سر نو صحیح پڑھے۔

سورہ فاتحہ کی ترتیب میں عمداً ایسی تبدیلی کرے جس سے مفہوم بدل جائے تو نماز باطل ہو گی۔

تسلسل: سورہ فاتحہ کی آیتوں کے درمیان میں موالات و تسلسل (پے درپے پڑھنا) واجب ہے۔ اگر عمداً دوران فاتحہ زیادہ دیر چپ رہا، جیسے تلاوت کا سلسلہ ختم کر رہا ہو، یا کسی عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے تلاوت کی طرف سے اعراض و پہلو تہی برت رہا ہو تو تلاوت باطل ہو گی اور از سر نو تلاوت لازم ہو گی۔ دوران تلاوت تھوڑی دیر چپ رہنے میں حرج نہیں۔ تلاوت ختم کرنے کی نیّت کرے لیکن چپ نہ رہے تو تلاوت باطل نہ ہو گی۔ لیکن ختم کرنے کی نیّت کے بعد تھوڑی دیر بھی چپ رہے تو تلاوت باطل ہو گی۔

سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران تسبیح یا تہلیل "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" پڑھے یا کوئی آیت پڑھے تو قرأت باطل ہو گی۔ کم پڑھے یا زیادہ، یہ اس وقت ہے جبکہ نمازی کو ان کے پڑھنے کا حکم نہ ہو۔ البتہ جس چیز کے پڑھنے کا نماز میں حکم ہو، اور اس کا تعلق نماز ہی کی مصلحت سے ہو، اس سے قرأت باطل نہ ہو گی، جیسے امام کے ساتھ آمین کہنا، امام کے ساتھ سجدہ تلاوت کرنا، امام کو لقمہ دینا، امام رحمت کی آیت پڑھے تو اللہ سے رحمت کی دعا کرنا، عذاب کی آیت پر عذاب سے پناہ مانگنا۔ لہٰذا یہ امور اگر مقتدی کی سورہ فاتحہ کے دوران پیش آئیں تو موالات باطل نہ ہو گی (بعد میں آگے کی آیتوں کا پڑھنا کافی ہے)

نماز میں چھینک آنے پر "الحمد للہ" کہے تو موالات ختم ہو گی۔ اگر بھول کر دورانِ فاتحہ زیادہ دیر چپ رہا تو موالات ختم نہ ہو گی۔ بعد میں صرف آگے کی آیتوں کا پڑھ لینا کافی ہے۔

جو سورہ فاتحہ نہیں پڑھ سکتا۔

جو سورہ فاتحہ پر قادر نہ ہو اسے سیکھنا یا قران کا حاصل کرنا تاکہ اس میں دیکھ کر پڑھ سکے لازم ہے۔ تاریکی کی وجہ سے دیکھ کر پڑھنے کیلئے چراغ اور روشنی کی ضرورت ہو، اور اس کا انتظام اس کے بس میں ہو، تو یہ بھی واجب ہے، اس کے بس میں ہوتے ہوئے بغیر سورہ فاتحہ کے نماز پڑھے، تو ان تمام نمازوں کا اعادہ واجب ہے۔ اگر سورہ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو، مثلاً وقت کی تنگی، یا ذہنی کمزوری کی وجہ سے سیکھ نہیں سکتا، یا کوئی سکھلانے والا نہیں ہے، یا قرآن موجود نہیں، وغیرہ صورتیں۔ تو ایسی صورت میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ پڑھنا جائز نہیں ہے اگر کہیں اور سے قرآن پڑھ سکتا ہو تو سات آیتیں پڑھے گا، سات سے کم کافی نہ ہوگے اگرچہ طویل ہوں ان سات آیتوں کے حروف کی مجموعی تعداد سورہ فاتحہ کے حروف سے کم نہ ہونا شرط ہے۔

دو آیتوں کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت کے جگہ پڑھنے میں حرج نہیں۔

"بسم اللہ" سمیت سورہ فاتحہ کے حروف کی تعداد ۱۵۶ ہے جبکہ مالک کو (الف) کے ساتھ پڑھیں۔ (فتح الوہاب۔ ۱/ ۴۰)

مذکورہ شرط کے مطابق مسلسل سات آیات تلاوت کر سکتا ہو، تب بھی متفرق آیات کا پڑھنا کافی ہے۔ اگر سات آیات سے کم پڑھ سکتا ہو جیسے ایک دو آیتیں تو اتنا پڑھ لے اور بقیہ کی طرف سے ذکر پڑھے۔ جو قرآن میں سے کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا ہو اسے تسبیح و تہلیل وغیرہ ذکر پڑھنا واجب ہے، کسی خاص ذکر کی تعیین نہیں البتہ یہ شرط ہے کہ اس کے حروف کی تعداد سورہ فاتحہ کے حروف سے کم نہ ہو اور سات انواع کے ذکر ہوں تاکہ ہر نوع ایک آیت کے قائم مقام ہو اسی طرح آخرت سے متعلق دعائیہ کلمات کا ادا کرنا بھی کافی ہے، ان

اذکار یا دعا سے سورہ فاتحہ کے بدل کی نیّت ضروری نہیں ہے، البتہ یہ لازم ہے کہ ان سے کسی اور چیز کی نیّت نہ کرے، جیسے دعا استفتاح کو استفتاح کی سنّت حاصل ہونے کی نیت سے یا تعوذ کی نیّت سے پڑھے، تو اس سے سورہ فاتحہ کا بدل نہ ہوگا۔

حدیث: ایک شخص قرآن پڑھنے سے عاجز تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اسے نماز میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" پڑھنے کا حکم دیا۔ (رواہ ابوداود، احمد، النسائی وغیرہم۔ تلخیص ۱/۲۵۱) جو کسی ذکر اور دعا کے پڑھنے سے بھی عاجز ہو (وہ ذکر و دعا کا ترجمہ پڑھے ورنہ) اسے سورہ فاتحہ کی مقدار کھڑا رہنا واجب ہے، پھر رکوع میں جائیگا جس کو سورہ فاتحہ کچھ یاد ہو، اور دوسرا کچھ یاد نہ ہو تو جتنا یاد ہے اسے بار بار پڑھ لے کہ سورہ فاتحہ کے برابر ہو جائے۔ اگر دوسرا بھی کچھ یاد ہے تو جتنی سورہ فاتحہ یاد ہے پڑھ کر بقیہ کی طرف سے بدل کو پڑھے۔ اس صورت میں اگر کسی کو سورہ فاتحہ آخری نصف یاد ہے، ابتدائی نصف یاد نہیں، تو ابتدائی نصف کی طرف سے بدل (ذکر وغیرہ) کو ادا کرنے کے بعد آخری نصف کی تلاوت کرے اس کے برعکس کرے تو کافی نہیں، اور صرف نصف اول یاد ہے تو پہلے اسے ادا کر کے بعد میں بدل کو ادا کرے۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے کہ جبکہ نماز کے آخر تک وہ سورہ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو۔

اگر دوران نماز کسی کے کہلوانے یا قرآن مل جانے وغیرہ کی وجہ سے سورہ فاتحہ پر قادر ہو جائے اور ابھی بدل سے فارغ نہیں ہوا یا بدل کو شروع ہی نہیں کیا۔ تو سورہ فاتحہ کی تلاوت لازم ہے۔

رکوع کے بعد اس طرح قدرت حاصل ہوتی ہے، تو یہ رکعت صحیح ہو چکی۔ رکوع سے سورہ فاتحہ پڑھنے کیلئے لوٹنا جائز نہیں ہے۔ رکوع سے قبل اور بدل سے فارغ ہونے کے بعد قدرت حاصل ہوئی ہے تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے۔

آمین: سورہ فاتحہ پڑھنے والے ہر شخص کو، چاہے نماز کے اندر پڑھے یا خارج نماز سورہ فاتحہ کے بعد آمین (قبول کر) کہنا سنّت ہے۔ "ولا الضآلین" اور "آمین" کے درمیان معمولی سا سکتہ مستحب ہے تاکہ اس میں اور قرآن میں فرق معلوم ہو۔

امام، مقتدی اور منفرد (تنہا نمازی) ہر ایک کیلئے آمین کہنا مستحب ہے، یہ تینوں بھی جہری نماز میں آمین کو جہراً ادا کریں۔ مقتدی کی آمین امام کے آمین کے ساتھ ہونا مستحب ہے، نہ کہ اس سے آگے پیچھے۔ اگر ساتھ فوت ہو جائے تو اس کے بعد کہہ لے۔ کسی نے آمین کو ترک کر دیا اور دوسری چیز (مثلاً سورت کی تلاوت) میں مشغول ہو گیا تو آمین فوت ہو چکی اب لوٹ کر اسے ادا نہ کرے۔

احادیث: آپ ﷺ "امّ القرآن" (سورہ فاتحہ) کی تلاوت سے فارغ ہونے پر بلند آواز سے آمین کہتے تھے (قال الدارقطنی۔ اسنادہ حسن والحاکم صحیح علی شرطہما۔)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی جب "ولا الضالین" پر پہنچے تو آمین کہا پھر (نماز کے بعد) فرمایا کہ تم سب سے بڑھ کر میری نماز آپ ﷺ کی نماز سے مشابہ ہے۔ (رواہ النسائی وعلقہ البخاری)

(۳) حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نماز میں "ولا الضالین" کے بعد بلند آواز سے آمین کہی" (رواہ ابوداود، والدارقطنی، وابن حبان)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے جب امام آمین کہے تم بھی آمین کہو۔ اس لئے کہ ملائکہ آمین کہتے ہیں، لہٰذا جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہو (اسی وقت ادا ہو) اس کے سابقہ گناہ معاف ہونگے۔ (متفق علیہ۔ تلخیص ۲۵۲۔۲۵۴) امام مطلوبہ وقت پر آمین نہ کہے تو مقتدی آمین کہہ لے (فتح الوہاب)

سورہ فاتحہ کے بعد تلاوت

فجر کی نماز اور دیگر نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں امام اور منفرد کیلئے سورہ فاتحہ کے بعد کچھ اور تلاوت کرنا سنّت ہے۔ نفل نماز دو رکعت سے زائد ادا کرے، اور دو رکعت پر تشہد نہ پڑھے، تو بقیہ رکعتوں میں بھی فاتحہ کے بعد تلاوت کرے۔ (حاشیۃ الجمل۔ شرح مھذب ۳/۳۸۷) سورت کی تلاوت سنّت ہے، لہٰذا نہ پڑھے تو نماز صحیح ہو گی، اور سجدہ سہو بھی نہیں کرے گا۔ نماز جنازہ میں سورت کی تلاوت مستحب نہیں ہے۔ (الاذکار ص ۴۶)

کسی سورت کا کچھ حصہ پڑھ لینے سے بھی اصل استحباب حاصل ہو جائے گا۔ لیکن مکمل سورت پڑھنا افضل ہے، حتیٰ کہ کسی چھوٹی سورت کا مکمل پڑھ لینا اس کے بقدر بڑی سورت میں سے چند آیات پڑھ لینے سے اولیٰ (بہتر) ہے۔ سنّت ہیکہ پہلی رکعت کی قرأت دوسری رکعت کی قرأت سے طویل ہو۔ (جیساکہ بخاری و مسلم کی روایت سے ثابت ہے۔ فتح الوھاب)

فجر کی نماز میں طِوالِ مفصل (جیسے سورہ حجرات) کی تلاوت، ظہر میں فجر کے قریب، عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل کی تلاوت مستحب ہے۔ مذکورہ ترتیب نسائی وغیرہ میں موجود ہے۔ (محلی ۱/۱۵۴ فتح الوھاب)

تلاوت کی مذکورہ ترتیب منفرد اور اس امام کیلئے مستحب ہے جس کے مقتدی متعین و محدود اور تطویل سے راضی ہوں، عام ائمہ تخفیف پر عمل کریں۔ (حاشیۃ القلیوبی وغیرہ)

سورہ حجرات سے سورہ عم یتساء لون تک طِوالِ مفصل، وہاں سے سورہ والضحیٰ تک اَوْساط مفصل، پھر آخر تک (سورہ ناس تک) قِصار مفصل ہے۔ (شرح علی ۱/۱۵۴۔ تحفۃ المحتاج۔ ۲/۵۵)

صاحب نہایہ نے لکھاہے کہ قاف اور مرسلات جیسی سورتیں طوال مفصل، جمعہ جیسی سورتیں اوساط مفصل، اور والعصر جیسی سورتیں قصار مفصل ہیں۔ صاحب مغنی فرماتے ہیں۔ کہ حجرات، اقتربت، الرحمن، جیسی سورتیں طوال، مفصل، والشمس وضحاھا، اور واللّیل اذا یغشی، جیسی سورتیں اوساط مفصل، اور والعصر، اور اخلاص، جیسی سورتیں قصار مفصل ہیں۔ (حاشیۃ الشروانی۔ علی التحفہ ۲/۵۵)

جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں الٓمّٓ تَنْزِیْل (سورہ سجدہ) اور دوسری رکعت میں "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ" (سورہ دہر) مکمل پڑھنا سنّت ہے۔

مذکورہ دونوں سورتوں کا پڑھنا شیخین کی روایت سے ثابت ہے (محلی ۱/۱۵۴) اگر پہلی رکعت میں سورہ دہر کی تلاوت کی تو دوسری رکعت میں سورہ سجدہ کی تلاوت کرے۔ پہلی رکعت میں کسی اور سورت کو پڑھ لیا تو دوسری رکعت میں دونوں سورتوں کو پڑھ لے۔ اگر یہ دونوں سورتیں نہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں "سَبِّحِ اسْمَ اور هَلْ اَتَاكَ" پڑھ لے، ورنہ سورہ کافرون اور اخلاص پڑھ لے (حاشیۃ القلیوبی ۱/۱۵۴)

جن نمازوں میں بعض سورت (یعنی کسی سورت کے کچھ حصہ) کا پڑھنا ثابت ہے، وہاں وہی افضل ہے جیسے فجر کی سنّت میں سورہ بقرہ اور آل عمران کی ایک ایک آیت، اور تراویح کی نماز، اسلئے کہ ماہ رمضان میں تراویح میں مکمل قرآن کی تلاوت مطلوب ہے، البتہ کہیں قرآن مکمل نہ پڑھا جائے تو مکمل سورت کا پڑھنا افضل ہو گا (حاشیۃ القلیوبی علی المحلی ۱/۱۵۴۔ حاشیۃ الجمل۔ ۱/۳۵۹)

جہری نماز میں امام کی تلاوت کی آواز سنائی دے رہی ہو تو مقتدی سورت کی تلاوت نہ کرے بلکہ امام کی تلاوت کو بغور سنے۔ سری نماز میں اور جہری نماز میں جبکہ دوری یا بہرہ پن کی وجہ سے امام کی آواز سنائی نہ دے تو مقتدی کو بھی سورت کی تلاوت مسنون ہے۔ سورت کو سورہ فاتحہ سے قبل پڑھ لیا تو اس کا اعتبار نہ ہو گا (اس سے سورت کی سنّت حاصل نہ ہو گی)

جس جگہ غیر محرم (اجنبی) مرد تک آواز پہنچتی ہو، عورت جہراً تلاوت نہ کرے، اگر تنہا ہو یا صرف عورتیں ہوں، یا محرم مرد ہوں، تو جہر کر سکتی ہے۔

دن کی مطلق نفل نمازوں میں سراً تلاوت کی جائے۔ رات کی نفل نمازوں میں جہر اور سر کے بین بین (درمیان) تلاوت کی جائے البتہ قریب میں کسی نمازی یا سونے والے کو تلاوت کی آواز سے تکلیف ہو تو سراً تلاوت کرے۔ لیکن تراویح مستثنیٰ ہے اس میں جہراً تلاوت ہو گی۔

تلاوت کے مستحبات: قرآن پڑھنے والے کیلئے چاہے نماز میں پڑھے یا خارج نماز، یہ امور مستحب ہیں: جب آیت رحمت پڑھے تو رحمت کی دعا کرے، جب آیت عذاب پڑھے تو اس سے پناہ چاہے، تسبیح کی آیت پڑھے تو تسبیح پڑھے، جس آیت میں مثال ہو اس پر غور کرے جب "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الحَاکِمِیْنَ" (سورہ والتین) پڑھے "تو بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰالِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ" پڑھے "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْن" (المرسلات) پڑھے تو "آمَنَّا بِاللّٰہِ" کہے امام کی تلاوت پر مقتدی بھی ان امور کو انجام دے۔

تلاوت کے متعلق بعض مسائل: امام اور منفرد کے لئے فجر، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں، جمعہ، عید، خسوف، قمر، (چاند گہن) استسقاء، تراویح، رمضان کی وتر، اور طواف کی دو رکعت میں (جبکہ اسے رات یا فجر کے وقت ادا کیا جائے) جہراً تلاوت کرنا سنّت ہے۔ دیگر تمام نمازوں میں سراً تلاوت سنّت ہے۔ البتہ رات کی نفل مطلق میں درمیانی صورت اختیار کرے۔ (فتح الوہاب مع جمل ۱/۳۶۰)

سورت کی تلاوت میں مصحف کی ترتیب کو ملحوظ رکھنا مستحب ہے۔ لہٰذا دوسری رکعت میں پہلی رکعت کی سورت سے (متصل) بعد والی سورت پڑھے (جس نماز میں مستقل سورتیں وارد ہیں۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہے) اگر اس کی خلاف ورزی کی تو جائز ہے (لیکن خلاف اولیٰ ہے) (الاذکار ص ۴۶)

جمعہ کی فجر کی پہلی رکعت میں مکمل "الٓمٓ تَنْزِیْلُ السَّجدَہ" اور دوسری رکعت میں مکمل "ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ" (سورہ دہر) کی تلاوت سنّت ہے۔ بعض عوام کا دونوں سورت کا صرف کچھ حصہ پڑھ لینا خلاف سنّت ہے۔ (عام جماعت کے امام کیلئے بھی مذکورہ سورتوں کا پڑھنا سنّت ہے۔) عید اور استسقاء کی نماز میں پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ ق، اور دوسری رکعت میں سورہ "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃ" سنّت ہے، یا پھر پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" اور دسری رکعت میں "ھَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃ" پڑھے، دونوں بھی سنّت ہے۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ "منافقون" سنّت ہے، یا پھر پہلی میں سبح اسم اور دوسری میں "ھل اتاک" دونوں بھی سنّت ہے۔ ان مقامات میں مذکورہ سورت کے بعض حصہ پر اکتفاء نہ کرنی چاہیے، اگر تخفیف (ہلکی نماز) کا ارادہ ہے تو تلاوت کی رفتار کچھ اعتدال کے ساتھ تیز کرے۔ فجر کی سنّت کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد "قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِیَ

مُوْسیٰ وَ عِیْسیٰ وَ مَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْھُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ"(سورہ بقرہ آیت ۱۳۶) اور دوسری رکعت میں "قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئاً وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ"(سورہ آل عمران آیت ۶۴) پڑھنا سنّت ہے یا پہلی رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْن "اور دوسری رکعت میں "قُلْ ھُوَ اللهُ اَحَدٌ" پڑھنا سنت ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ان دونوں ترتیب کا آپ ﷺ سے عملاً ثبوت ہے، سنت مغرب، طواف، اور استخارہ کی پہلی رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ "اور دوسری میں "قُلْ ھُوَ اللهُ اَحَدٌ" پڑھے۔ اگر تین رکعت وتر ادا کر رہا ہے تو پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلیٰ"اور دوسری میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ، اور تیسری میں "قُلْ ھُوَ اللهُ اَحَدٌ"اور معوذتین "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھنا سنّت ہے۔ مذکورہ تمام تفصیل مشہور احادیث سے ثابت ہیں (الاذکار ص ۴۸)

مذکورہ تفصیل کے مطابق کسی نماز کی پہلی رکعت میں مسنون سورت نہ پڑھے تو دوسری رکعت میں دونوں سورتوں کو پڑھ لے تاکہ اس کی نماز ان دونوں سورتوں سے خالی نہ رہے۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ منافقون پڑھ لی۔ تو اب دوسری رکعت میں سورۂ جمعہ پڑھ لے۔ سورہ منافقون کو نہ دوہرائے۔ رات کی نماز کی قضاء دن میں یا اس کے برعکس ہو تو جہر اور سر کے سلسلے میں قضاء کے وقت کا اعتبار ہو گا۔ (لہٰذا ظہر کی نماز رات میں قضاء کرے تو جہراً تلاوت کرے، اور عشاء کی نماز دن کو قضاء کرے تو سراً تلاوت کرے) جہری نماز میں جہراًاور سری نماز میں سراً تلاوت کرنا سنّت ہے۔ واجب نہیں ہے، لہٰذا اس کے برعکس کیا تو نماز صحیح ہے، لیکن مکروہ تنزیہی کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور سجدہ سہو نہیں کرے گا۔

نماز میں آہستہ تلاوت کرنے اور دیگر مشروع اذکار کے پڑھنے میں خود کو سنائی دینا لازم ہے۔ بغیر عارض کے ایسا پڑھے کہ خود نہ سن سکے تو اس کا اعتبار نہ ہو گا۔ (الاذکار ص ۴۸)

سکتے: امام کیلئے جہری نماز میں چار سکتے مستحب ہیں (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد تاکہ دعا استفتاح پڑھ لے۔

(۲) سورہ فاتحہ کے بعد فاتحہ کے آخر اور آمین کے درمیان بہت ہلکا سا سکتہ کرے تاکہ یہ واضح ہو کہ آمین فاتحہ میں داخل نہیں۔

(۳) آمین کے بعد اتنا طویل سکتہ کرے کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ سکے۔

(۴) تلاوت اور رکوع کی تکبیر کے درمیان مختصر سکتہ کرے۔ (الاذکار ص ۴۹)

فصل: رکوع کے متعلق

کم سے کم رکوع کیلئے ایک معتدل الخلقت اور ہاتھ پیر کی سلامتی والے شخص کو آگے کی جانب اتنا جھکنا ضروری ہے کہ دونوں ہتھیلی گھٹنوں تک پہنچ سکے۔ اگر کوئی پیچھے کی طرف سمٹ کر گھٹنوں کو آگے نکالے اور ایسی ہیئت اختیار کرے کہ ہتھیلی گھٹنے تک پہنچ سکے، تو اس سے رکوع حاصل نہ ہو گا۔ اس ہیئت کے ساتھ آگے کی طرف جھکنا بھی پایا جائے اور دونوں کی مجموعی شکل سے ہتھیلی گھٹنے تک پہنچ سکے تب بھی یہ رکوع معتبر نہ ہو گا۔ مذکورہ صحیح رکوع کیلئے کسی اور کی مدد کی ضرورت ہو یا کسی چیز کا سہارا لینے کی ضرورت ہو، تو یہ لازم ہے۔ اتنا رکوع نہ کر سکے تو جتنا ممکن ہو جھکے، جھکنے سے بالکل ہی عاجز ہو تو قیام ہی میں (سر کے اشارے سے ورنہ پھر) آنکھ کے اشارے سے رکوع کرے۔

یہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کا بیان ہے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کی تفصیل (ص ۱۰۷ پر) قیام کے فصل

میں گذر چکی ہے۔

رکوع میں طمانیت واجب ہے۔ کم سے کم طمانیت یہ ہے کہ سارے اعضاء کو استقرار (ٹھہراؤ) حاصل ہو اوراس کے جھکنے اوراٹھنے میں فصل (جدائی) ہوجائے۔ اگر کوئی اقل رکوع کی حد سے آگے جھکتا چلا جائے اور پھر واپس اٹھ جائے اور حرکتیں متصل ہوں (یعنی اس دوران اعضاء میں ٹھہراؤ نہ ہو) تو اس سے طمانیت حاصل نہ ہوگی، اور یہ زیادہ جھکنا طمانیت کے قائم مقام نہ ہوگا۔ رکوع کیلئے جھکنے کے وقت کسی اور ارادے سے نہ جھکنا شرط ہے، اگر نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کر کے سجدہ تلاوت کے ارادے سے جھکے، اور رکوع کی حد کو پہنچنے کے بعد سجدہ کا ارادہ بدل کر اسے ہی رکوع میں شمار کرنا چاہے تو یہ صحیح نہ ہوگا، بلکہ واپس قیام کی طرف لوٹ کر پھر رکوع کرنا چاہیئے۔

اکمل رکوع

ھیئت: اتنا جھکے کہ اس کی پشت اور گردن تخت کی طرح بالکل ایک سیدھ میں آجائے، اور پنڈلیوں کو کوکھ تک سیدھا کھڑا رکھے، اور گھٹنوں کو نہ موڑے اور دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑے۔ انگلیوں کے درمیان معمولی فاصلہ رکھے، اوران (کے پشت کا) کارخ قبلہ کی طرف رکھے، اگر ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو یا بیمار ہو تو دوسرے ہاتھ سے مذکورہ امور انجام دے، ہاتھوں کو گھٹنے پر رکھنا ممکن نہ ہو تو ایسے ہی لٹکائے رکھے۔ مرد رکوع میں اپنی کہنی کو پہلو سے دور رکھے لیکن عورت اور خنثٰی ایسا نہ کرے۔

ذِکر: جیسے ہی جھکنا شروع کرے تکبیر کہنا اور مکمل رکوع تک تکبیر کو دراز کرنا مستحب ہے تاکہ نماز کا کوئی حصہ ذکر سے خالی نہ رہے۔ دیگر تکبیرات انتقالات کا بھی یہی حکم ہے۔ تکبیر کی ابتداء کے ساتھ رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانا) جیسا کہ تکبیر تحریمہ میں گذر چکا مستحب ہے۔ رکوع میں تین مرتبہ "**سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ یا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ**" پڑھنا مستحب ہے۔ (جیسا کہ مسلم اور سنن کی روایتوں میں وارد ہے)

احادیث: (۱) آپ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تکبیر کہتے (صحیحین عن ابی ہریرہ ایک روایت میں ہے۔ "ہر اٹھنے اور جھکنے میں تکبیر کہتے" صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے بھی اس طرح مروی ہے۔ (۲) آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہر جھکنے اوراٹھنے اور قیام اور بیٹھنے میں تکبیر کہا کرتے۔ (رواہ الترمذی و رواہ احمد والنسائی) (تلخیص ۱/۲۵۸)

اس کے بعد یہ دعا پڑھنا افضل ہے۔ "**اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ وَشَعْرِيْ وَبَشَرِيْ وَمَا اسْتَقَلَّتْ بِهٖ قَدَمِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ**" **ترجمہ:** اللہ میں نے تیرے لئے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرا فرمانبردار ہوا میرے کان، آنکھ، مغز، ہڈی، پٹھے، بال، کھال اور تمام اعضاء رب العالمین کے آگے جھک گئے)

منفرد کیلئے تین تسبیحات سے زیادہ پڑھنا مستحب ہے۔ امام تین سے زیادہ نہ پڑھے، البتہ مقتدی تطویل سے راضی ہوں تو پڑھ سکتا ہے۔ رکوع اور سجدہ میں تلاوت مکروہ ہے۔ مستحب ہے کہ رکوع کی تکبیر کو سورہ کے آخر سے نہ ملائے بلکہ دونوں کے درمیان معمولی سکتہ کرے۔ قیام کی حالت میں تکبیر اور رفع یدین دونوں ایک ساتھ شروع کرے اگر تکبیر مکمل ہونے تک رفع یدین نہیں کیا تو اب نہ کرے، مکمل ہونے سے پہلے یاد آجائے تو کرلے، اگر کسی کی ہتھیلی کٹی ہو تو ہاتھ کے بقیہ حصے کو گھٹنے تک نہ لے جائے تاکہ رکوع کی ہیئت میں تبدیلی نہ ہو۔ تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ہر نمازی کے لئے مستحب ہے، چاہے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہو یا بیٹھ کر یا

لیٹ کر یا اشارے سے جیسا کہ اُمّ میں اس کی صراحت ہے۔ رکوع میں ذکر کی اقل مقدار ایک تسبیح ہے۔ بکثرت صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ رکوع کیلئے تکبیر کہتے تھے، یہ تکبیر سنت ہے، اسے ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ لیکن اس سے نہ نماز باطل ہوگی اور نہ سجدہ سہو کرے گا۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز کے سبھی تکبیرات کا یہی حکم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں "سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي" (ترجمہ۔ یا اللہ اے ہمارے رب پاکی اور تعریف تیرے ہی لئے ہے یا اللہ مجھے بخش دے) پڑھتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ رکوع میں یہ پڑھتے "اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ" سنن میں یہ الفاظ ہیں "خَشَعَ سَمْعِي وَ بَصَرِيْ وَ مُخِّيْ وَ عَظْمِيْ وَ مَا اسْتَقَلَّتْ بِهٖ قَدَمِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن" صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں یہ تسبیح پڑھتے۔ "سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ" ترجمہ: پاک ہے، مقدس ہے، فرشتوں اور روح الامین کا رب ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہوا آپ ﷺ نے سورہ بقرہ تلاوت فرمائی جب رحمت کی آیت پڑھتے تو رک کر رحمت کی دعا کرتے، اور آیت عذاب پڑھتے تو پناہ چاہتے، پھر قیام کے بعد رکوع کیا اور رکوع میں یہ پڑھتے رہے۔ "سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَائِ وَالْعَظْمَةِ" پھر سجدہ میں بھی یہی پڑھتے رہے۔ (ہذا حدیث صحیح رواہ ابوداود والنسائی، فی سننہما والترمذی فی کتاب الشمائل باسانید صحیحہ)

صحیح مسلم کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے رکوع میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے تعظیم کا حکم دیا ہے، لہٰذا اصل مقصود رکوع میں مذکورہ کسی بھی ذکر کے ذریعے تعظیم الٰہی ہے، البتہ اگر ممکن ہو تو ان تمام اذکار کا پڑھنا افضل ہے۔ پہلے تسبیح "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" پڑھے، مختصر پڑھنا ہو تو تسبیح کو ترجیح دے، کمال کا ادنی درجہ تین تسبیح پڑھنا ہے۔ صرف ایک مرتبہ بھی پڑھے تو اصل تسبیح پر عمل ہوگا۔ ان میں سے بعض اذکار پر اکتفا کرنا ہو تو مستحب ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف اذکار کو پڑھے تاکہ سبھی پر عمل کا موقع ملے۔ دیگر مواقع کے اذکار میں بھی اسی طرح کرے۔ (یعنی ایک ہی وقت تمام اذکار کو نہیں پڑھ سکتا ہو تو مختلف اوقات میں مختلف اذکار پڑھے تاکہ سبھی پر عمل ہو جائے۔ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رکوع یا سجدہ میں تلاوت سے منع فرمایا! اس لئے رکوع و سجدہ میں تلاوت مکروہ ہے، اگر کوئی پڑھے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ (الاذکار ۵۰۔۵۱)

فصل۔اعتدال

اعتدال رکن ہے لیکن براہ راست مقصود نہیں ہے۔ اعتدال کی واجب مقدار یہ ہے کہ رکوع کے بعد دوبارہ رکوع سے پہلے جو حالت تھی اس طرف لوٹ جائے چاہے، کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہو یا بیٹھ کر۔ اگر قیام سے رکوع میں گیا اور طمانینت سے پہلے ہی گر پڑا تو واپس رکوع میں لوٹ کر طمانینت حاصل کرنے کے بعد اعتدال میں لوٹنا واجب ہے۔ اور اگر طمانینت کے بعد گرا تھا تو سیدھے کھڑا ہو جائے اور سجدہ کرے۔ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد سجدہ کرلے، اور شک ہو کہ اعتدال صحیح ہوا یا نہیں تو پھر قیام کی طرف لوٹنا واجب ہے، بعد میں سجدہ کرے۔

رکوع کی طرح اعتدال میں بھی طمانینت واجب ہے، کسی اور ارادے سے رکوع سے نہ اٹھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی رکوع میں سانپ دیکھ کر گھبراہٹ میں کھڑا ہو جائے، تو یہ اعتدال میں شمار نہ ہوگا۔

اعتدال کو طویل نہ کرنا واجب ہے۔ اعتدال کے وقت سابقہ کیفیت کے مطابق رفع یدین مستحب ہے۔ جیسے ہی رکوع سے سر اٹھانا

شروع کرے رفع یدین بھی شروع کرے اور جب مکمل اعتدال میں پہنچ جائے تو ہاتھوں کو نیچے لائے۔ اٹھتے وقت ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ'' کہنا مستحب ہے۔

جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو ''رَبَّنَا لَكَ الۡحَمۡدُ'' یا ''رَبَّنَا وَلَكَ الۡحَمۡدُ'' اور ''مِلۡأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلۡأَ الۡاَرۡضِ وَمِلۡأَ مَاشِئۡتَ مِنۡ شَیۡءٍ بَعۡدُ'' پڑھے۔ **ترجمہ:** اے رب ہمارے ساری تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں آسمان اور زمین اور جو ان کے درمیان ہے وہ بھر کر اور ان کے علاوہ تیری چاہت کے برابر (صحیح مسلم) یہ دونوں ذکر امام، مقتدی اور منفرد سبھی کیلئے مستحب ہے، امام کے علاوہ کیلئے یہ پڑھنا بھی مستحب ہے اور مقتدی حضرات راضی ہوں تو امام کیلئے بھی مستحب ہے۔ ''اَهۡلَ الثَّنَاءِ وَالۡمَجۡدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الۡعَبۡدُ وَ كُلُّنَا لَكَ عَبۡدٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعۡطَيۡتَ وَلَا مُعۡطِيَ لِمَا مَنَعۡتَ وَلَا يَنۡفَعُ ذَالۡجَدِّ مِنۡكَ الۡجَدُّ'' (رواہ مسلم) اے تعریف اور بزرگی والے، بندہ نے جو کچھ کہا سچ کہا اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں جس کو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو نہ دے اسے کوئی دینے والا نہیں اور تیرے سامنے کسی مالدار کو اس کی دولت کچھ کام نہیں دے سکتی)

مقتدیوں کی رضامندی کے بغیر امام کیلئے یہ ذکر پڑھنا مکروہ ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ کی اقتداء میں ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ'' کے بعد ایک صحابی ''رَبَّنَا وَلَكَ الۡحَمۡدُ حَمۡداً كَثِيۡراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيۡهِ'' (**ترجمہ:** اے ہمارے رب اور ساری کثیر و پاکیزہ اور بابرکت تعریفیں تیرے ہی لئے ہے۔) پڑھتے ہیں۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تیس سے کچھ اوپر فرشتوں کو اس کی طرف سبقت کرتے دیکھا کہ کون پہلے اسے لکھ لیتا ہے (صحیح بخاری) اعتدال میں ان تمام اذکار کا پڑھنا مستحب ہے جیسا کہ رکوع کے ذکر میں گذرا۔ بعض پر اکتفاء کرنا ہو تو ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَكَ الۡحَمۡدُ مِلۡأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلۡأَ الۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَمِلۡأَ مَاشِئۡتَ مِنۡ شَیۡءٍ بَعۡدُ'' پڑھے۔ اور اختصار کرنا ہو تو ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَكَ الۡحَمۡد'' پڑھے۔ یہ سارے اذکار مستحب ہیں، ان کا ترک کرنا مکروہ تنزیہ ہے۔ ترک کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے۔ اعتدال میں تلاوت مکروہ ہے۔ (الاذکار۔ ۵۲۔ ۵۳)

امام ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ'' جہراً اور ''رَبَّنَا لَكَ الۡحَمۡدُ'' سراً کہے مقتدی (اور منفرد) دونوں ہی سراً کہے، رکوع کرنے کے بعد کوئی عذر ایسا پیش آئے کہ کھڑا نہیں ہو سکتا تو رکوع ہی سے سجدہ میں جائے اور اس عذر کی وجہ سے اعتدال ساقط ہو جائیگا۔ پیشانی زمین پر ٹیکنے سے پہلے عذر ختم ہو جائے تو واپس اعتدال کی طرف لوٹ کر پھر سجدہ میں جانا واجب ہے۔ اگر پیشانی زمین پر رکھنے کے بعد عذر ختم ہو تو اب اعتدال کی طرف نہ لوٹے بلکہ اعتدال ساقط ہو گا۔ اگر کوئی مسئلہ جاننے کے باوجود لوٹے تو نماز باطل ہو گی۔ لاعلمی کی وجہ سے لوٹا ہے تو نماز باطل نہ ہو گی۔

قنوت

لفظ قنوت عربی زبان میں مختلف معانی میں مستعمل ہے۔ دعاء، خشوع، عبادت، اطاعت، عبودیت کا اقرار، سکوت، نماز، قیام، طول قیام، دوام طاعت، یہاں نماز کے قیام کے مخصوص محل میں دعاء مراد ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/۳۶۸)

احادیث: (۱) آپ ﷺ ایک ماہ تک بئر معونہ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قاتلین پر (بد دعا کرتے ہوئے) قنوت پڑھتے رہے، پھر اسے ترک کیا۔ البتہ فجر میں اس دار فانی سے کوچ کرنے تک قنوت پڑھتے رہے (احمد والدار قطنی

والبیہقی وصححہ الحاکم فی کتاب القنوت۔ تلخیص ۱/۲۶۱)

(۲) بیہقی میں ہے کہ عوام بن حمزہ نے ابو عثمان سے قنوت فجر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ رکوع کے بعد، پھر پوچھا کس سے (ثبوت ہے ؟) تو فرمایا حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے۔

(۳) حضرت ابو رافع فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فجر میں قنوت پڑھا کرتے۔ حضرت اسود نے فرمایا کہ میں نے سفر و حضر میں حضرت عمر کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ صرف فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔ (بیہقی) حضرت عبد اللہ بن معقل سے بسند صحیح مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فجر میں قنوت پڑھی (بیہقی والشافعی۔ تلخیص۔ ۱/۲۶۲)

الفاظ قنوت: حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے چند کلمات سکھلائے جسے میں وتر میں پڑھتا ہوں۔ ''اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ فِیْمَنْ هَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ وَقِنِیْ شَرَّ مَا قَضَیْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ وَاِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ'' (وقال الترمذی حدیث حسن)

ترجمہ: اے اللہ مجھے ہدایت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے ہدایت دی اور مجھے عافیت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے عافیت دی اور میرا ولی بن جا ان لوگوں کے ساتھ جن کا تو والی بنا۔ اور جو کچھ تو نے عطا کیا اس میں برکت دے۔ اور جس کا تو نے فیصلہ کیا اس کے شر سے مجھے بچا اس لئے کہ بیشک تو حکم کرتا ہے۔ اور تجھ پر حکم نہیں کیا جا سکتا اور تو جس کا والی بن گیا وہ ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب تو برکت والا ہے اور تو بلند ہے۔

بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فجر میں یہی دعا قنوت پڑھتے تھے۔ نسائی کی ایک روایت کی روشنی میں اس کے بعد ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّسَلِّمْ'' کہنا مستحب ہے۔ (الاذکار ۔ ۵۷) بیہقی کی ایک روایت میں ''تبارکت'' سے قبل ''وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ'' بھی ہے۔ (تلخیص الحبیر ۱/۲۶۵) بعض صحابہ کرام سے قنوت کے بعد درود پڑھنا ثابت ہے، (ارواء الغلیل للالبانی ۲/۱۷۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وارد یہ قنوت پڑھنا بھی بہتر ہے۔ ''اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَخْلَعُ مَنْ یَّفْجُرُكَ اَللّٰهُمَّ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْكَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰی عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ الْجِدَّ بِالْكُفَّارِ مُلْحِق۔ اَللّٰهُمَّ عَذِّبِ الْكَفَرَةَ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِكَ وَیُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَیُقَاتِلُوْنَ اَوْلِیَآئَكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِهِمْ وَاَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَاجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَالْحِكْمَةَ وَثَبِّتْهُمْ عَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَوْزِعْهُمْ اَنْ یُّوْفُوْا بِعَهْدِكَ الَّذِیْ عَاهَدْتَهُمْ عَلَیْهِ وَانْصُرْهُمْ عَلٰی عَدُوِّكَ وَعَدُوِّهِمْ اِلٰهَ الْحَقِّ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ'' دونوں پڑھنا مستحب ہے۔ پہلے ''اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ الخ'' پھر قنوت عمر پڑھے۔ ایک ہی قنوت پڑھنا ہو تو ''اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ الخ'' پڑھے۔ دونوں پڑھنا صرف تنہا نمازی یا ایسے امام کیلئے مستحب ہے کہ مقتدی متعین اور تطویل سے راضی ہوں۔ قنوت کی نیّت سے کوئی اور دعا یا ایسی آیت کا پڑھنا جس میں دعا ہو کافی ہے۔ لیکن حدیث میں وارد قنوت پڑھنا افضل ہے (اذکار ۵۸)

فجر کی دوسری رکعت کے اعتدال میں اور رمضان کے آخری نصف کے وتر کی آخری رکعت کے اعتدال میں دعاء قنوت مستحب ہے۔ امام صرف اپنے لئے دعا نہ کرے (یہ مکروہ ہے) بلکہ جمع کے الفاظ استعمال کرے۔ (کیونکہ آپ ﷺ نے امام کیلئے صرف اپنے حق

میں دعا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اسے مقتدیوں کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ (ابو داود، الترمذی)

قنوت کے بعد درود شریف سنّت ہے۔ (رواہ النسائی) اگر مسلمانوں پر وبا یا قحط جیسی کسی مصیبت کا نزول ہو تو دیگر چاروں فرض نماز میں بھی قنوت (نازلہ) مستحب ہے۔ امام قنوت کو جہراً پڑھے (چاہے قنوت فجر ہو یا قنوت نازلہ) اور منفرد (تنہا نمازی) سراً پڑھے۔ مقتدی امام کے دعائیہ کلمات پر آمین کہے اور ثنا کے کلمات امام کے ساتھ خود بھی پڑھے یا سنے ("فَاِنَّكَ تَقۡضِیۡ" سے "فَلَكَ الۡحَمۡدُ عَلٰی مَا قَضَیۡتُ" تک ثنا ہے۔ اور قنوت عمر میں ابتداء سے ملحق تک ثنا اور اَللّٰھُمَّ عَذِّبِ الۡکَفَرَۃَ سے آخر تک دعا ہے۔ جمل) اگر امام سے دوری وغیرہ کی وجہ سے اس کی قنوت سنائی نہ دے تو مقتدی بھی خود قنوت پڑھے دعائے قنوت میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے، لیکن بعد میں چہرہ وغیرہ پر پھیرنا مستحب نہیں (مجموع میں امام بیہقی کے حوالہ سے نقل ہے کہ نماز میں چہرہ پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق نہ کوئی حدیث ہے نہ کوئی اثر اور نہ قیاس اور نہ یہ اسلاف سے ثابت ہے۔) (امام کو ثناء اور درود کے کلمات بھی جہراً پڑھنا سنت ہے۔ بشری الکریم ۱/ ۸۰)

اگر قنوت کی نیّت سے کسی ایسی آیت کی تلاوت کرے جو دعا کو متضمن ہو یا اس کے مشابہ ہو تو صحیح ہے، ورنہ یہ قنوت میں شمار نہ ہوگا۔ اگر رکوع سے پہلے قنوت پڑھے تو یہ معتبر نہ ہوگا۔ بلکہ رکوع کے بعد پھر لوٹائے اور سجدہ سہو بھی کرے جیسا کہ 'الام' میں صراحت ہے۔

فصل سجدہ: سجدہ نماز کا رکن ہے۔ اوّل سجدہ: پیشانی زمین پر رکھنا واجب ہے، پیشانی کے دونوں طرف کے کسی کنارے کو رکھنا کافی نہیں، پیشانی کا صرف زمین سے چھو جانا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے سر اور گردن کے بوجھ کو سجدہ کی جگہ ڈالنا ضروری ہے، یہاں تک کہ پیشانی ٹک جائے۔ اگر کپاس یا گھاس پھوس جیسی اشیاء پر سجدہ کرے تو اتنا بوجھ ڈالے کہ وہ دب جائے اور بالفرض اس کے نیچے اس کا ہاتھ ہو تو اس کا اثر اس پر ظاہر ہو، ورنہ سجدہ صحیح نہ ہوگا۔ دونوں ہاتھ گھٹنے اور پیروں کا بھی زمین پر رکھنا ضروری ہے، ناک رکھنا واجب نہیں ہے۔ پیشانی کا بھی کچھ حصہ بغیر کسی حائل کے سجدہ کی جگہ چھونا واجب ہے۔ اگر عمامہ کے کنارے یا دامن کے کنارے پر سجدہ کرے، جو اس کی حرکت سے حرکت کرتا ہو تو سجدہ صحیح نہیں ہوگا۔ اگر نمازی کی حرکت سے کپڑے کے اس حصہ میں حرکت نہ ہوتی ہو تو سجدہ ہو جائے گا۔ پیشانی پر زخم کی وجہ سے پٹی بندھی ہو اور اسی پر سجدہ کرے تو یہ کافی ہے، اور آئندہ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پیشانی کے علاوہ دیگر اعضاء سجدہ کو کھلی حالت میں رکھنا واجب نہیں۔ سجدہ میں بدن کا نچلا حصہ (یعنی کمر اور اطراف کا حصہ) اوپری حصہ کے مقابلے میں اونچا ہونا ضروری ہے۔ اس ہیئت کو تنکیس کہیں گے۔ (رواہ ابو داود، والنسائی صححہ ابن حبان، حاشیۃ الروضہ)

اگر نچلا دھڑ سر وغیرہ کے مقابلے میں نیچا ہو، یا دونوں ایک ہی سیدھ میں ہو تو سجدہ صحیح نہ ہوگا۔ (عورت کا بھی یہی حکم ہے) اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے سجدہ میں مطلوبہ ہیئت مشکل ہو اور تکیہ وغیرہ کے سہارے وہ ہیئت ممکن ہو، تو یہ لازم ہے اور اس کے باوجود بھی یہ ہیئت حاصل نہ ہو تو یہ ضروری نہیں۔ سجدہ کیلئے جھکنے سے عاجز ہو تو سر سے اشارہ کرے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو آنکھ سے اشارہ کرے۔

سجدہ میں طمانینت واجب ہے۔ سجدہ کیلئے جھکتے وقت کوئی اور ارادہ نہ ہو، اگر اعتدال سے نیچے گر جائے تو یہ سجدہ شمار نہ ہوگا، بلکہ اعتدال کی طرف لوٹ کر پھر سجدہ میں جانا ضروری ہے۔

سجدہ کیلئے جھکتے وقت پیشانی کے بل گر جائے تو اس وقت اگر سہارے کے ارادے سے پیشانی کو زمین پر رکھا ہے تو سجدہ شمار نہ ہوگا۔ اور ایسا کوئی ارادہ نہیں پایا گیا تو شمار ہوگا۔ اگر سجدہ کیلئے جھکتے وقت پہلو کے بل گر پڑا پھر پلٹ کر سجدہ کے ارادہ سے سجدہ کی ہیئت میں آگیا، تو یہ سجدہ شمار ہوگا۔ اگر سیدھے ہونے کا ارادہ تھا اور سجدہ کی طرف توجہ نہیں تھی، تو یہ کافی نہیں ہے۔ بلکہ اچھی طرح بیٹھ کر پھر سجدہ میں جائے۔ سجدہ کیلئے کھڑا نہ ہو، بلکہ عمداً کھڑا ہو تو اس زائد قیام کی وجہ سے نماز باطل ہوگی۔ سجدہ اور استقامت (سیدھے ہو جانا) دونوں کا بھی

ارادہ نہ ہو تو سجدہ صحیح ہو گا۔ لیکن صرف استقامت کا ارادہ اور ساتھ ساتھ سجدہ نہ ہونے کا ارادہ بھی ہو تو نماز باطل ہو گی۔

اکمل سجدہ: سنّت ہے کہ سجدہ کرتے وقت پہلے دونوں گھٹنے پھر دونوں ہاتھ، پھر ناک اور پیشانی زمین پر رکھے۔ اور جھکنے کے ساتھ تکبیر شروع کرے اور سجدہ میں پہنچنے تک اسے دراز کرے، اس تکبیر کے وقت رفع یدین نہ کرے، سجدہ میں پیشانی کے ساتھ ناک بھی کھلی ہوئی زمین پر رکھے، اور دونوں گھٹنوں کو جدا رکھے۔ مرد دونوں کہنیوں کو پہلو سے اور پیٹ کو رانوں سے جدا رکھے۔ اور عورت ان اعضاء کو آپس میں ملائے رکھے۔ دونوں ہاتھ کاندھوں کے بالمقابل رکھے، انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہوں اور ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔ سجدہ، جلسہ بین السجدتین، اور تشہد میں ہاتھوں کی انگلیاں ملی ہوئی رکھنا سنّت ہے، بقیہ حالتوں میں اعتدال کے ساتھ (متوسط طور پر) کھلی رکھنا سنت ہے۔ سجدہ میں کلائی زمین پر نہ بچھائے، بلکہ زمین سے اٹھائے رکھے اور پیروں کی انگلیوں کے پیٹ کو زمین پر اس طرح رکھے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔ دونوں قدم کے درمیان تقریباً ایک بالشت کا فاصلہ رکھے اور قدموں کو دامن سے باہر نکالے۔ اگر موزے نہ پہنا ہو تو پیروں کو کھولے۔ سجدہ میں یا نماز کی کسی اور حالت میں بلا حاجت اپنے بال یا کپڑوں کو سمیٹنا مکروہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے قیامت سے متعلق ایک طویل روایت میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اللہ کی عبادت کرنے والے حضرات کو جہنم سے نکالنے کا حکم دیں گے لہٰذا وہ نکالیں گے۔ اور ان لوگوں کو سجدہ کے آثار سے پہچان لیں گے اور اللہ تعالیٰ نے جہنم پر سجدہ کے اثر کو جلانا حرام رکھا ہے لہٰذا آدمی مکمل جل جائے گا سوائے سجدہ کے اثر کے۔ (بخاری و مسلم، عن ابی ہریرہ کما فی عمدۃ القاری)

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ رکوع و سجدہ مکمل نہیں ادا کر رہا ہے تو نماز کے بعد اس سے فرمایا: تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اگر اس حالت پر مر گئے تو آپ ﷺ کی سنّت کے خلاف مرو گے (بخاری)

(۳) آپ ﷺ کو سات اعضاء پر سجدہ کا حکم دیا گیا۔ پیشانی، دونوں ہاتھ، (ہتھیلیاں) دونوں گھٹنے اور دونوں پیر (دونوں قدم کے کنارے) اور یہ کہ اپنے بال یا کپڑے نہ سمیٹیں۔ (صحاح ستہ کما فی العینی)

(۴) مسلم کی ایک روایت میں ہے: جب سجدہ کرو تو دونوں ہتھیلیوں کو رکھو اور کہنیوں کو اٹھاؤ۔ اور ابو داود میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ دونوں ہاتھ بھی چہرہ کی طرح سجدہ کرتے ہیں، تب پھر تم میں سے کوئی چہرہ (زمین پر) رکھے تو ہاتھ بھی رکھے اور چہرہ اٹھائے تو ہاتھ بھی اٹھائے۔ (تلخیص الحبیر)

(۵) آپ ﷺ جب سجدہ میں جاتے تو گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھتے اور جب اٹھتے تو ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے (سنن اربعہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، ابن السکن فی صحاحہم کما فی التلخیص)

(۶) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں جانے یا سجدہ سے اٹھنے کے لئے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ (رواہ البخاری و مسلم و النسائی کما فی عمدۃ القاری)

(۷) آپ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو ناک و پیشانی اچھی طرح (زمین پر) ٹکاتے اور دونوں ہاتھ پہلو سے دور رکھتے اور ہتھیلی کاندھے کے بالمقابل رکھتے۔ (ابو داود و ابن خزیمہ فی صحیحہ عن ابی حمید۔ التلخیص) ابو داود کی ایک روایت میں حضرت ابو حمید نے آپ ﷺ سے سجدہ میں دونوں رانوں کو جدا رکھنا بھی نقل فرمایا ہے۔ اور بیہقی میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: آپ ﷺ سجدہ میں انگلیوں کو قبلہ رو کرتے اور قدموں میں فاصلہ رکھتے۔

سجدہ کے اذکار: سجدہ کے اذکار کے متعلق بعض روایات رکوع کے ضمن میں گذر چکیں۔ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ

سے آپ ﷺ کا سجدہ میں یہ پڑھنا مروی ہے۔ ”اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَہٗ وَصَوَّرَہٗ وَشَقَّ سَمْعَہٗ وَبَصَرَہٗ تَبَارَکَ اللہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ“ (ترجمہ: اے اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرا فرمانبردار ہوا، میری ذات نے اس ہستی کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی صورت گری کی، نیز اس کے کان وآنکھ بنائے، اللہ تعالیٰ کی بڑی برکت جو سب سے بہتر بنانے والا ہے) کتب سنن میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے: تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی تین مرتبہ کہے۔ اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کا سجدہ میں یہ پڑھنا وارد ہے۔ ”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَبِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ“

ترجمہ: (یا اللہ میں تیرے غصہ سے تیری رضامندی کی، اور تیرے سزا سے تیری معافی کی، اور تیری ذات سے تیری ہی ہستی کی پناہ چاہتا ہوں، میں تیری کیا تعریف کر سکوں؟ بس تو ایسا ہی ہے جیسا خود تو نے اپنی تعریف فرمائی۔)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قرب سجدہ کی حالت میں پاتا ہے لہٰذا خوب دعا کرو، مسلم شریف کی ایک اور روایت میں سجدہ کے دعا کی قبولیت کی قوی توقع کی وجہ سے دعا میں خوب کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سجدہ میں یہ دعا پڑھتے۔ ”اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ کُلَّہٗ دِقَّہٗ وَجِلَّہٗ وَاَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ وَعَلَانِیَتَہٗ وَسِرَّہٗ“

ترجمہ: یا اللہ میرے چھوٹے بڑے اول وآخر ظاہری اور چھپے ہوئے سارے ہی گناہوں کو تو بخش دے) ممکن ہو تو سجدے میں وارد تمام اذکار پڑھے۔ ورنہ مختلف اوقات میں مختلف اذکار کو پڑھ کر سبھی پر عمل کی سعادت حاصل کرے۔ (الاذکار۔ ۵۴)

فصل۔ جلسہ بین السجدتین (دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا)

سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد اچھی طرح طمانینت کے ساتھ بیٹھ جانا واجب ہے۔ اٹھتے وقت کوئی اور ارادہ نہ ہو اور اس نشست (یعنی بیٹھنے) کو طویل نہ کرے۔ تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھانا مستحب ہے۔ اور سنّت ہے کہ مفترشاً بیٹھے۔ (مفترشاً یعنی بایاں پیر بچھا کر اس پر بیٹھ جانا اور دایاں قدم کھڑا رکھنا) دونوں ہاتھوں کی مٹھی کھول کر گھٹنے کے پاس رانوں پر رکھنا مستحب ہے۔ اگر انگلیوں کے کنارے گھٹنے کی طرف مڑ جائے تو بھی حرج نہیں۔ اگر دونوں ہاتھ رانوں کے پاس زمین ہی پر رکھ دے تو یہ قیام میں ہاتھ لٹکائے رکھنے کی طرح ہے۔ (یعنی جائز ہے)

احادیث: (۱) حضرت ابو حمید کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ پہلے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد بایاں قدم موڑ کر اس پر بیٹھ گئے۔ (ابوداود والترمذی وابن حبان)

(۲) آپ ﷺ دو سجدوں کے درمیان یہ پڑھتے۔ ”اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاھْدِنِیْ“ (ابوداود، ترمذی ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی کی روایتوں سے مجموعی طور پر یہ الفاظ سامنے آتے ہیں۔ بعض روایتوں میں الفاظ میں تقدیم وتاخیر ملے گی۔ کسی بھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ تلخیص۔ ۱/۲۷۵)

ترجمہ: یا اللہ مجھے معاف فرما، اور مجھ پر رحم فرما، مجھے غنی کر دے، مجھے بلندی عطا کر، مجھے عافیت وسلامتی دے، مجھے رزق دے، نیز مجھے ہدایت فرما)

فصل: پھر دوسرا سجدہ بھی پہلے سجدہ کی طرح کرے، اس کے واجبات اور سنّت کی وہی تفصیل ہے جو پہلے سجدہ کی ہے۔ دوسرے سجدہ سے تکبیر کہتا ہوا سر اٹھائے۔ اب تشہد کا محل نہ ہو، تو تھوڑی سی دیر بیٹھنا مستحب ہے، جسے جلسہ استراحت کہتے ہیں۔ سجدہ سے اٹھتے وقت تکبیر شروع کرے اور قیام میں پہنچنے تک اسے دراز کرے، اس جلسہ میں بھی افتراش سنّت ہے، جلسہ استراحت کے بعد یا اس کے بغیر ہی کھڑا ہو تو دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر کھڑے ہونا سنّت ہے۔ ایک پیر آگے کر کے اس کے سہارے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نماز کی طاق رکعت میں ہوتے (پہلی یا تیسری رکعت میں) تو اٹھنے سے پہلے اچھی طرح بیٹھ جاتے۔ (رواہ البخاری عن مالک بن الحویرث) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ جب دوسرے سجدہ سے سر اٹھاتے تو بیٹھ جاتے اور زمین کا سہارا لیتے پھر کھڑے ہو جاتے۔

(۲) ایک مرتبہ حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ نے دس صحابہ کرام کے مجمع میں آپ ﷺ کے نماز کا طریقہ بتلایا جس میں فرمایا کہ...... پھر آپ ﷺ سجدے میں گئے پھر پیر بچھا کر بیٹھ گئے یہاں تک کہ ہر جوڑ اپنی جگہ لوٹ جائے پھر کھڑے ہوئے۔ (رواہ ابوداود، والترمذی۔ تلخیص۔ ۲۷۶)

فصل۔ تشہّد اور تشہّد کیلئے بیٹھنا

اگر نماز کے آخر میں ہو تو یہ دونوں فرض ہیں اور درمیان میں ہو تو سنّت ہیں۔ کسی خاص ہیئت میں بیٹھنا لازم نہیں ہے، بلکہ کسی بھی طرح بیٹھے تو کافی ہے، لیکن آخری تشہد میں تورّک کی ہیئت پر بیٹھنا اور درمیانی تشہد میں افتراش کی ہیئت میں بیٹھنا سنّت ہے۔

افتراش: بائیں پیر کو اس طرح رکھنا کہ اس کی پشت زمین کی طرف ہو اور اس پر بیٹھ جائے اور دایاں پیر کھڑا رکھ کر اس کی انگلیوں کے کنارے روئے زمین پر قبلہ رو رکھے۔

تورّک: یہ نشست بھی افتراش کی طرح ہی ہے لیکن اس میں بائیں پیر کو دائیں طرف باہر نکال کر بائیں سرین کو زمین سے لگادے۔

مسبوق امام کے آخری تشہد میں مفترشاً بیٹھے۔ کسی کو تشہد کے بعد سجدہ سہو کرنا ہو تو وہ مفترشاً بیٹھے۔ (سجدہ سہو کے بعد تورّکاً بیٹھ کر سلام پھیرے) دونوں تشہد میں ہاتھ رانوں پر گھٹنے سے قریب رکھے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں کھلی اور آپس میں ملی ہوئی قبلہ رو رکھے۔ دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بند کرے اور تشہد کی انگلی کھلی رکھے۔

انگوٹھے کو شہادت کی انگلی کے نیچے ہتھیلی کے کنارے رکھے۔ (رواہ مسلم) تشہد میں جب اِلاَّ اللہ کے ہمزہ (الف) پر پہنچے تو شہادت کی انگلی اٹھانا مستحب ہے۔ لیکن اسے حرکت نہ دے۔ اگر حرکت دیتا رہے تو نماز باطل نہیں ہوگی۔ (لیکن مکروہ ہے) بائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ مکروہ ہے۔ اگر دائیں ہاتھ کی انگلی کٹی ہو تب بھی بائیں انگلی سے اشارہ نہ کرے۔

آخری تشہد واجب ہے۔ اور اس میں آپ ﷺ پر درود پڑھنا بھی واجب ہے، اور آپ ﷺ کے آل پر درود پڑھنا سنّت ہے۔ پہلے تشہد میں آپ ﷺ پر درود پڑھنا سنّت ہے۔ آل النبی ﷺ سے بنو ہاشم اور بنو المطلب مراد ہیں، جیسا کہ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے بعضوں کے یہاں اس سے سارے مسلمان مراد ہیں۔

اکمل تشہد: ”اَلتَّحِيَاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوٰتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ

اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ"(رواہ مسلم، الشافعی، الترمذی، الدارقطنی، عن ابن عباس، تلخیص الحبیر ۱/۲۸۱) **ترجمہ:** زبانی، بدنی، مالی تمام عبادات اللہ ہی کے لئے ہیں، اے نبی آپ پر سلام، اور اللہ کی رحمت و برکت نازل ہو، ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔)

دونوں جگہ السلام کے بجائے سلام بھی وارد ہے، وہ بھی پڑھ سکتا ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد بھی پڑھ سکتا ہے۔ تشہد ابن مسعود کے الفاظ۔"اَلتَّحِيَاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ"بقیہ حسب بالا، لیکن آخر میں "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ"(متفق علیہ)

تشہد عمر:"اَلتَّحِيَاتُ لِلّٰهِ الزَّا كِيَاتُ لِلّٰهِ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ الصَّلٰوتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ"بقیہ تشہد ابن مسعود کی طرح (رواہ مالک والشافعی والحاکم والبیہقی)

اقل تشہد:"اَلتَّحِيَاتُ لِلّٰهِ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ سَلَامٌ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ"

درود:"اقل درود: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، يَا صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ ، يا صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آل پر اقل درود کیلئے آگے وآلہ بڑھائے۔

اکمل درود:"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ"(رواہ النسائی والحاکم)

احادیث:(۱) حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب دوسری رکعت پر بیٹھتے تو بائیں پیر پر بیٹھتے (یعنی افتراش کی ہیئت پر) اور آخری رکعت میں بیٹھتے تو بائیں پیر کو آگے بڑھا کر دوسرا کھڑا رکھتے اور اپنی سرین پر بیٹھتے (یہی تورک کی کیفیت ہے)(رواہ البخاری)

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی دائیں ران پر رکھتے اور ساری انگلیاں بند کرتے اور انگوٹھے سے متصل انگلی (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرتے۔(مسلم عن ابن عمر)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن (۵۳) گننے والے کی طرح انگلیاں رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔(مسلم عن ابن عمر)

اس کی صورت یہ ہے کہ انگوٹھا شہادت کی انگلی کی جڑ میں معترضاً (یعنی آڑی) ہو۔(تلخیص۔ ۲۷۹)

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے اور اسے حرکت نہ دیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اشارہ سے آگے نہ بڑھتی۔(احمد و ابوداود والنسائی وابن حبان فی صحیحہ) جس روایت میں انگلی ہلانے کا ذکر ہے، اسے بقول امام بیہقی اپنے وقت پر اشارہ کے لئے اٹھانے پر محمول کریں گے، اس سے مسلسل حرکت دینا مراد نہیں لیں گے تاکہ روایات میں تعارض باقی نہ رہے۔(تلخیص)

افضل درود:"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا

بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ" (الاذکار ص ۸۳) ترجمہ: اے اللہ اپنی خاص رحمت (درود) نازل فرما حضرت محمد مصطفی ﷺ پر جو تیرے بندے اور رسول اور امی نبی ہیں اور آپ ﷺ کے آل بیبیوں اور اولاد پر جیسی خاص رحمت تو نے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کے آل پر نازل فرمائی۔ اے اللہ برکت نازل فرما حضرت محمد مصطفی ﷺ پر اور آل وازواج واولاد پر جیسی برکت تو نے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کی آل پر نازل فرمائی۔ دونوں جہاں میں، بلا شبہ تو ہی تعریف کا مستحق ہے، تو بڑی شان والا ہے۔)

درود کے بعد دعا مستحب ہے دنیا وآخرت سے متعلق جو دعا بھی چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن اخروی دعا افضل ہے اور احادیث سے ثابت دعاؤں کا پڑھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے تشہد کے سکھانے کے بعد فرمایا پھر اپنے پسند کی دعا مانگے (متفق علیہ عن ابن مسعود)

(۲) تم میں سے کوئی تشہد اخیر سے فارغ ہونے کے بعد چار چیزوں سے اللہ کی پناہ چاہے، عذاب جہنم، عذاب قبر، زندگی اور موت کے فتنے، مسیح دجال کا شر۔ (متفق علیہ عن ابی ہریرہ) مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالِ" (اے اللہ! میں عذاب جہنم، عذاب قبر، حیات وموت کے فتنے، اور مسیح دجال کے فتنے کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں)

(۳) آپ ﷺ نماز میں یہ دعا پڑھتے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ" (متفق علیہ عن عائشہ) (آخری جملہ کا ترجمہ ہے۔: اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں گناہ اور قرض سے)

(۴) آپ ﷺ تشہد اور سلام کے درمیان یہ پڑھتے۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ" (رواہ مسلم عن علی رضی اللہ عنہ)

ترجمہ: یا اللہ میرے تمام گناہ بخش دے، اگلے، پچھلے، سری، ظاہری، زیادتیاں، اور جن کو تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے، تو ہی آگے کر دینے والا اور تو ہی (توفیق چھین کر) پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۵) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی درخواست پر آپ ﷺ نے نماز میں پڑھنے کیلئے یہ دعا سکھلائی۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ" (متفق علیہ عن عبد اللہ بن عمر) مسلم کی بعض روایات میں کبیراً ہے، لہٰذا دونوں کو جمع کر کے "ظُلْمًا كَثِیْرًا كَبِیْرًا" پڑھنا مستحب ہے۔ (الاذکار صفحہ ۶۴) (ترجمہ: یا اللہ! میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں، تو اپنی رحمتِ خاص سے مجھ کو بخش دے، تو بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔)

امام کیلئے افضل ہے کہ دعا تشہد اور درود سے کم ہو، کیونکہ یہ ان کے تابع ہے۔ امام کیلئے لمبی دعا پڑھنا مکروہ ہے۔ تشہد اول میں صرف آپ ﷺ پر درود تک پڑھے۔ تشہد اوّل کو طویل کرنا اور اس میں دعا پڑھنا مکروہ ہے۔ اگر طویل کیا تو نماز باطل نہیں ہو گی، اور نہ سجدہ سہو کی ضرورت ہے، عمداً طویل کیا ہو یا سہواً۔ عربی میں پڑھ سکتا ہو تو اس کا ترجمہ کرنا جائز نہیں۔ اگر عاجز ہو تو ترجمہ کرے۔ اسی طرح جس کو عربی میں دعا یاد نہ ہو وہ ماثورہ دعا (وہ دعا جو حدیث میں ہو) کا ترجمہ کر سکتا ہے۔ اور اگر عربی میں پڑھ سکتا ہے تو ترجمہ جائز

نہیں۔ ترجمہ کرے گا تو نماز باطل ہو گی۔ اپنی جانب سے غیر عربی میں دعا بنا کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔
دیگر اذکار، جیسے تشہد اول، قنوت، تکبیرات انتقالات اور تسبیحات عربی میں پڑھ سکتا ہو تو ترجمہ ممنوع ہے، عاجز ہو تو جائز ہے۔ تشہد اول سے تکبیر کہتا ہوا کھڑا ہو جائے۔ اس وقت بھی رفع یدین کرنا سنّت ہے جیسا کہ صحیح بخاری شریف وغیرہ میں آپ ﷺ سے ثابت ہے۔
چار رکعت والی نماز میں بائیس تکبیریں اور تین رکعت والی میں سترہ اور دو رکعت میں گیارہ تکبیریں مشروع ہیں۔

سلام پھیرنا

سلام بھی نماز کا رکن ہے۔

اقل سلام: اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ کہنا ہے۔ اگر کوئی سلام علیک کہے تو ناکافی ہے، اگر "عَلَيۡكُمُ السَّلَامُ" کہے تو جائز ہے۔ "سَلَامٌ عَلَيۡكَ" "سَلَامِي عَلَيۡكُمۡ" "سَلَامُ اللهِ عَلَيۡكُمۡ" "سَلَامٌ عَلَيۡهِمۡ" یہ الفاظ ناکافی ہیں۔ "سَلَامٌ عَلَيۡهِمۡ" کے علاوہ ان میں سے کوئی لفظ عمداً کہے تو نماز باطل ہو گی۔ سلام کے وقت نماز سے نکلنے کی نیّت واجب نہیں ہیں (البتہ سنّت ہے) بیٹھنے کی حالت میں سلام پھیرنا واجب ہے۔

اکمل سلام: "اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَةُ اللهِ" ہے۔ دوسرا سلام پھیرنا سنّت ہے۔ پہلا دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف، قبلہ رو حالت میں سلام شروع کرے پھر اس طرح چہرہ پھیرے کہ سلام کے الفاظ مکمل ہونے تک چہرہ کا پھیرنا بھی مکمل ہو جائے، اور چہرہ اتنا پھیرے کہ اس کا ایک رخسار (گال) دکھائی دے (پہلے سلام میں دایاں رخسار اور دوسرے سلام میں بایاں رخسار پیچھے والے کو دکھائی دے۔ (حاشیۃالجمل ۱/۳۹۳)

امام کیلئے پہلے سلام کے وقت دائیں طرف موجود فرشتے اور مسلمان جنات وانسان پر سلام کی نیّت کرنا مستحب ہے اور دوسرے سلام سے بائیں جانب والوں کے حق میں نیّت کرے۔ مقتدی بھی اسی طرح نیّت کرے۔ مزید اگر وہ امام کے دائیں جانب ہے تو اپنے دوسرے سلام سے امام کے جواب کی نیّت کرے اور بائیں جانب ہے تو پہلے سلام سے نیّت کرے۔

اور بالکل اس کے پیچھے ہو گا تو کسی بھی سلام سے جواب کی نیّت کرے۔ پہلے سلام سے کرنا افضل ہے۔ مقتدی بعض بعض کے جواب کی نیّت کرے۔ تنہا نمازی دونوں سلام سے دونوں طرف موجود فرشتوں کی نیّت کرے۔ ہر نمازی کیلئے پہلے سلام کے وقت نماز سے نکلنے کی نیّت مستحب ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ دائیں طرف "اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَةُ اللهِ" اور بائیں طرف "اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَةُ اللهِ" کہہ کر سلام پھیرتے۔ (سنن اربعہ، دارقطنی، ابن حبان، عن ابن مسعود واصلہ فی صحیح مسلم تلخیص ۲۸۸)

(۲) آپ ﷺ دائیں طرف سلام پھیرتے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" یہاں تک کہ آپ کا دایاں رخسار مبارک نظر آتا۔ "السلام علیکم و رحمۃ اللہ" یہاں تک کہ بایاں رخسار نظر آتا (نسائی من حدیث ابن مسعود)

(۳) آپ ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم امام کے سلام کا جواب دیں اور آپس میں محبت کریں اور بعض بعض کو سلام کریں۔ (ابوداود والحاکم (تلخیص ۱/۲۸۹)

نماز سے فارغ ہونے کے بعد بکثرت اللہ کا ذکر سنّت ہے۔ مستحب اذکار کے متعلق کئی صحیح روایات وارد ہیں جن کو میں نے (امام

نووی ؒ نے) 'الاذکار' میں بیان کیا ہے۔ سلام کے بعد سراً (آہستہ) دعا کرنا سنّت ہے۔ البتہ امام مقتدی کو دعاء سکھانا چاہتا ہو تو جہراً کرے (زور سے پڑھے) اور جب مقتدی سیکھ جائیں تو آہستہ پڑھے۔ (فتح الوھاب)

سنّت کے لئے گھر جانا: فرض نمازوں کے بعد سنّت نماز پڑھنے کیلئے اپنے گھر جانا مستحب ہے۔ (کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے "لوگوں اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، اسلئے کہ افضل نماز آدمی کا اپنے گھر میں پڑھنا ہے سوائے پنجوقتہ فرائض کے" (فتح الوہاب) ورنہ اس جگہ سے ہٹ کر پڑھے۔ (مجموع میں ہے کہ منتقل نہ ہو تو گفتگو کے ذریعہ فصل کرے کیونکہ بغیر کلام یا خروج کے ایک نماز کو دوسرے سے جوڑنا ممنوع ہے۔ حاشیۃ الجمل)

سنّت کے لئے جگہ بدلنے کا مقصد یہ ہے کہ (قیامت کے دن) یہ سارے مقامات اس کے حق میں عبادت کی گواہی دیں گے۔ البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قبلیہ سنّتوں میں جگہ تبدیل نہ کرے، اس لئے کہ نمازی کو جلدی آنے اور صفِ اوّل میں پہنچنے کی تاکید ہے۔ صف بندی کے بعد بالخصوص جمعہ اور کثرتِ صفوف کی صورت میں منتقل ہونا باعثِ مشقت ہے۔ سنّت کیلئے گھر جانا اس وقت مستحب ہے جبکہ وقت کی تنگی، گھر کی دوری، بازار وغیرہ کی مصروفیات یا سستی کی وجہ سے ترک ہی ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح معتکف، جمعہ سے پہلے نوافل، طواف کی نماز اور احرام کی نماز جبکہ میقات میں مسجد ہو اس حکم سے مستثنٰی ہیں (حاشیۃ الروضہ ۲۷۰ و ۱۳ الجمل) مقتدی کو امام کے دونوں سلام کے بعد سلام پھیرنا مستحب ہے) (فتح الوہاب مع الجمل ۱/۳۹۵)

عورتیں نماز میں شریک ہوں، تو مرد نماز کے بعد اسی جگہ اتنی دیر بیٹھا رہے کہ عورتیں گذر جائیں۔ نماز کے بعد دائیں یا بائیں جس طرف اپنی ضرورت ہو اس طرف اٹھ کر چل دے۔ کسی طرف ضرورت نہ ہو تو دائیں طرف افضل ہے۔ امام پہلا سلام پھیرتے ہی مقتدی کی اتباع ختم ہو چکی، اب اسے اختیار ہے چاہے تو سلام پھیرے ورنہ مزید دعاء وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرے۔ مسبوق کیلئے تشہد اوّل کا موقع ہے تو وہ بھی امام کے سلام کے بعد مزید بیٹھ سکتا ہے، لیکن اس کے لئے مکروہ ہے۔ اور تشہد اول کا محل نہیں ہے، تو امام کے دوسرے سلام کے بعد فوراً کھڑا ہو جائے جان بوجھ کر عمداً بیٹھا رہا تو نماز باطل ہو گی۔ سلام کے بعد امام ذکر و دعا کیلئے بیٹھا رہا تو اس کے لئے افضل ہے کہ دائیں طرف مڑ کر بیٹھ جائے، کہ دایاں بازو مقتدیوں کی جانب اور بایاں بازو محراب (قبلہ) کی طرف ہو۔ (فتح الوہاب مع الجمل۔ ج ۱ ص ۴۰۵) کیونکہ حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھتے، تو آپ کے دائیں طرف ہونا پسند کرتے، آپ اپنا چہرہ انور ہماری طرف کرتے۔ (مسلم)

اگر امام صرف ایک ہی سلام پھیرے تب بھی مقتدی کو دو سلام مستحب ہے۔ نماز میں خشوع مستحب ہے۔ اور اپنی نگاہ سجدہ کی جگہ رکھے۔ (البتہ تشہد میں انگلی اٹھانے کے بعد اس پر رکھے۔ المجموع) کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو نماز میں آنکھ بند کرنا مکروہ نہیں ہے۔ نماز میں نشاط کے ساتھ اور سارے مشاغل سے دل فارغ کر کے داخل ہونا چاہئے۔

سلام کے بعد کے اذکار

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسی (کس وقت کی) دعا زیادہ مقبول ہے؟ تو فرمایا رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد"۔ (رواہ الترمذی عن ابی امامہ وقال حدیث حسن)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہونے پر تین مرتبہ استغفار پڑھتے اور یہ کہتے۔ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ

تَبَارَکْتَ یَاذَا الْجَلَالِ وَالاِ کْرَامِ "(رواہ مسلم عن ثوبان)(اے اللہ تو سلام ہے اور تیری ہی طرف سے سلامتی ہے، بابرکت ہے تیری ذات اے عظمت وبزرگی والے)

(۳) آپ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد یہ ذکر پڑھتے "لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ ، وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر"

"اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ ، وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَایَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ "(متفق علیہ)(یا اللہ جو تو عطا کرے کوئی اسے نہیں روک سکتا، اور جس سے تو روکے کوئی نہیں دے سکتا، اور کسی کی مالداری اسے تیرے پاس نفع بخش نہیں ہوسکتی)

(۴) آپ ﷺ ہر نماز کے بعد سلام پھیر کر یہ دعا پڑھتے۔ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَعَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر ، " لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْکَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ "(مسلم عن عبداللہ بن زبیر)

(۵) آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ جو ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ " سُبْحَانَ اللّٰہِ "۳۳ مرتبہ " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ " اور ۳۳ مرتبہ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" پڑھے، اور سو کی تعداد مکمل کرتے ہوئے "لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٍ "" پڑھے اس کے گناہ معاف ہوں گے خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہو"(مسلم)

(۶) حضرت عقبہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے ہر نماز کے بعد معوذتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) پڑھنے کا حکم دیا۔ (ابوداود، ترمذی، نسائی) ابوداود کی ایک روایت میں 'مُعَوَّذَاتْ' کا لفظ ہے۔ لہٰذا سورہ اخلاص بھی پڑھے

(۷) آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کو ہر نماز کے بعد اس دعا کی خصوصی وصیت فرمائی۔ "اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ "۔ (ابوداود والنسائی باسناد صحیح)(یا اللہ تیرا ذکر وشکر اور اچھی عبادت کرنے پر میری مدد فرما)

(۸) آپ ﷺ نماز مکمل کرنے کے بعد دایاں دست مبارک پیشانی پر پھیرتے پھر یہ پڑھتے۔ "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اَللّٰھُمَّ اَذْہِبْ عَنِّی الْھَمَّ وَالْحُزْنَ "(ابن السنی)

(۹) حضرت ابو امامہ کا ارشاد ہے کہ میں جب کبھی کسی فرض یا سنّت نماز میں آپ ﷺ کے قریب رہا تو آپ کو یہ کہتے سنا۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَخَطَایَایَ کُلَّھَا ، اَللّٰھُمَّ اَنْعِشْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّہٗ لَایَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَایَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ "(ابن السنی)

(۱۰) آپ ﷺ نماز بعد ان کلمات کو پڑھا کرتے تھے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْبُخْلِ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَ عَذَابِ الْقَبْرِ "(بخاری شریف) یا اللہ میں بزدلی، بخل نکمی عمر، دنیاوی فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔)(الاذکار۔ ص ۶۶۔ ۶۹)

فصل۔ فرض نماز کی قضاء

کسی کی فرض نماز چھوٹ جائے تو اس کی قضاء واجب ہے اسے چاہئے کہ جلد ہی اسے قضاء کرلے، رات کی نماز رات میں یا دن کی

رات میں پڑھے تو قضاء کے وقت کا اعتبار ہو گا، لہٰذا رات میں قضاء پڑھے تو جہراً اور دن میں پڑھے تو سراً پڑھے، چاہے رات کی نماز ہو یا دن کی۔

نمازوں کو ترتیب سے قضاء کرنا مستحب ہے۔ قضاء نمازوں میں آپس میں اور قضاء اور ادا کے درمیان ترتیب واجب نہیں ہے۔ کسی فرض نماز کا وقت ہو اور قضاء نماز یاد آئے اور وقت میں (دونوں کی) گنجائش ہو تو پہلے قضاء پڑھ لینا مستحب ہے۔ وقت تنگ ہو تو ادا نماز پہلے پڑھنا واجب ہے ادا نماز شروع کرنے کے بعد قضاء یاد آئے تو ہر حال میں اب اسے پہلے مکمل کرے، پھر قضاء پڑھ لے۔ اس کے بعد ادا کو پھر دوہرانا مستحب ہے۔ وقت میں گنجائش سمجھتے ہوئے قضاء پہلے شروع کرے، پھر دورانِ نماز پتہ چلا کہ وقت تنگ ہے، تو اس نماز کو توڑ کر پہلے ادا پڑھنا واجب ہے۔ (تاکہ یہ بھی قضاء نہ ہو جائے)

اگر جماعت ہو رہی ہو اور وقت میں گنجائش ہو تو پہلے تنہا قضاء پڑھ لینا افضل ہے۔ قضاء نمازوں کا صحیح علم نہیں، اتنا معلوم ہے دس سے کم اور بیس سے زائد نہیں ہے تو بیس نمازیں لازم ہیں۔

نماز شروع کرنے سے پہلے پانچ شرائط لازم ہیں۔:(۱) حدث اور نجاست سے پاکی (۲) ستر عورت (۳) استقبال قبلہ (۴) یقیناً یا ظناً دخول وقت کا علم (۵) نماز کی فرضیت کا علم اور اس کے اعمال کی معرفت: اگر نماز کی فرضیت سے لاعلم ہو یا بعض نمازوں کا فرض ہونا تو معلوم ہے لیکن جو نماز پڑھ رہا ہے اس کی فرضیت کا علم نہیں ہے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہو گی۔ اگر وضو کی فرضیت کا علم نہ ہو تب بھی یہی حکم ہے۔ کسی کو نماز کی فرضیت کا تو علم ہو لیکن ارکان معلوم نہ ہوں تو اس کی تین صورتیں ہو نگی۔(۱) سارے افعال کو سنّت سمجھے (۲) بعض افعال کو فرض اور بعض کو سنّت سمجھے لیکن دونوں میں تمیز نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں نماز صحیح نہ ہو گی۔(۳) سارے افعال کو فرض سمجھ کر انجام دے اس صورت میں نماز صحیح ہو جائیگی۔ امام غزالیؒ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا ایسا عامی آدمی جس کو نماز کے فرائض اور سنتّوں کی تمیز نہ ہو اس کی نماز اس شرط کے ساتھ صحیح ہو جائے گی کہ کسی فرض کو نفل کی نیّت سے ادا نہ کرے، اگر نفل کی نیّت سے ادا کرے تو اس کا اعتبار نہ ہو گا۔ اگر تفصیل سے غافل ہو تو ابتداء میں اجمالی نیّت کافی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والے حضرات کے ظاہری احوال سے یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے اعراب (دیہاتی اور گنوار) کو اسے لازم قرار دیا ہو اور ان سے ناواقف شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم دیا ہو۔

باب-۵ نماز کے شروط اور ممنوع امور

(نماز کے شرائط اور نماز میں جو امور منع ہیں)

شروط شرط کی جمع ہے، لغت میں علامت کو کہتے ہیں، اصطلاحاً شرط وہ ہے جس کے عدم سے عدم لازم ہو اور وجود سے وجود یا عدم لذاتہ لازم نہ ہو۔(حاشیۃ الروضۃ)

نماز کے آٹھ شروط ھیں۔(۱) استقبال قبلہ (۲) نماز کا وقت ہونے کا یقین یا گمانِ غالب، ان دونوں کا ذکر اپنے باب میں گذر چکا (۳) طہارتِ حدث جس کی تفصیل کتاب الطہارت میں گذر چکی۔ اگر کوئی شخص تکبیر تحریمہ کے وقت باوضو نہ ہو، تو نماز منعقد ہی نہ ہو گی۔ عمداً یوں کرے یا سہواً اسی طرح باوضو نماز شروع کرنے کے بعد دوران نماز وضو ٹوٹ جائے، تو ساری صورتوں میں نماز باطل ہو جائے گی۔(وضو کر کے دوبارہ از سر نو نماز پڑھنی چاہئے)

نماز میں کسی منافی امر کا پیش آنا: حدث کے علاوہ نماز کے منافی کوئی سبب دوران نماز پیش آئے اور یہ نمازی کے

اختیار سے ہو، یا بغیر اختیار کے ہو، لیکن اس کی کوتاہی کے سبب ہو جیسے کوئی موزے پر مسح کرے، پھر نماز میں مسح کی مدت ختم ہو جائے تو دونوں صورتوں میں نماز باطل ہو گی۔ اس کے اختیار اور کوتاہی کے بغیر پیش آئے اور فوراً اس کا ازالہ کرے جیسے کپڑا ہٹ جائے اور فوراً وہ اسے درست کرے یا، خشک نجاست گرے اور فوراً اسے جھٹک دے، یا جس کپڑے پر نجاست گرے اس کپڑے کو ہٹا دے تو ان صورتوں میں نماز صحیح ہے، اگر اپنے ہاتھ یا آستین سے نجاست کو ہٹائے، تو نماز باطل ہو گی۔ اگر اس کے زخم سے خون ٹپکتا رہے، لیکن اس کی کھال لت پت نہ ہو، تو نماز باطل نہیں ہو گی۔

شرط (چوتھی) نجاست سے پاکی: جو نجاست معاف نہیں اس سے کپڑے بدن اور جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے۔ کپڑے پر نجاست لگے اور نجاست کی جگہ کو جانتا ہے تو گذرے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کو دور کرے۔ اگر اتنا حصہ کاٹ ڈالے تو یہ بھی کافی ہے۔ اگر نجاست کو دھونا ممکن ہو اور پاک حصہ سے ستر عورت ممکن ہو، اور کاٹنے کی صورت میں کپڑے کی اجرت سے زیادہ نقصان نہ ہو تو نجس حصہ کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ اگر بدن یا کپڑے میں نجاست کی جگہ کو نہیں جانتا، اور کسی بھی حصہ میں ہونے کا امکان ہو، تو مکمل دھونا واجب ہے، اندازہ لگا کر کسی ایک حصہ کو دھونا کافی نہیں۔ اگر اس کپڑے کو دو حصوں میں چاک کرے، تو دونوں کے درمیان اندازہ لگانا کافی نہیں، البتہ کوئی تر چیز اس کپڑے کے ایک طرف چھو جائے تو وہ تر چیز نجس نہیں ہو گی، اس لئے کہ اسی حصہ کا نجس ہونا یقینی نہیں۔

لباس کی پاکی: نمازی کا لباس پاک ہونا واجب ہے، اور لباس کا کوئی بھی حصہ کسی نجاست کو نہ چھوئے خواہ وہ نمازی کی حرکت سے حرکت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، لہٰذا عمامہ (پگڑی) کا وہ کنارہ جو حرکت نہ کرتا ہو، نجس زمین کو لگے تو نماز باطل ہو گی۔ اگر کسی رسی یا کپڑے کے سرے کو ہاتھ میں پکڑے یا ہاتھ، پیر یا کمر میں باندھے اور دوسرا سرا نجس ہو یا نجاست سے لگا ہو تو نماز باطل ہو گی۔ اگر رسی کا سرا اپنے قدموں تلے رکھے تو نماز صحیح ہو گی۔

ھڈی جوڑنا: ٹوٹی ہوئی ہڈی کو کسی پاک ہڈی سے جوڑنے میں کوئی حرج نہیں، اگر ضرورت کی وجہ سے نجس ہڈی سے جوڑے اور کوئی پاک ہڈی اس کے قائم مقام موجود نہ ہو تو یہ معذور ہے (لہٰذا مجبوری کی وجہ سے اس کی نماز درست ہو گی) اور اس ہڈی کو جدا کرنا اسے لازم نہیں۔

اگر نجس ہڈی کے جوڑنے کا محتاج نہ ہو یا پاک ہڈی اس کے قائم مقام موجود ہو تو اس نجس ہڈی کو الگ کرنا واجب ہے۔ جبکہ ہلاکت کا ،خوف نہ ہو، اور کوئی عضو تلف نہ ہو، اور اسی طرح تیمم کے باب میں مذکورہ کسی تکلیف کا خطرہ نہ ہو۔ وہ خود جدا نہ کرے تو سلطان جبراً جدا کرائے۔ اس ہڈی کے ساتھ اس کی نماز درست نہ ہو گی۔

جدا کرنے میں پیش آنے والی تکلیف و درد کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح ہڈی پر گوشت چڑھ چکا ہو یا نہ چڑھ چکا ہو، دونوں برابر ہے۔ جدا کرنے میں ہلاکت جیسے امور کا خطرہ ہو تو جدا کرنا واجب نہیں۔ جن صورتوں میں جدا کرنا واجب تھا۔ بغیر جدائی کے مر گیا تو اب جدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

زخم کیلئے نجس دوائی کا استعمال کرنا، یا نجس دھاگے سے اسے سینا (ٹانکے لگانا) نجس ہڈی جوڑنے کی طرح ہے۔ بدن کے کسی حصے کو چیر کر اس میں خون ڈالے یا گودے تو نجس ہو جائے گا۔ گودنے کے اثرات کو علاج کے ذریعے دور کرے۔ بغیر زخم کے دور نہ ہو تو زخمی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور توبہ کر لینے کے بعد اسکو گناہ نہ ہو گا۔

بالوں میں جوڑ: عورت کا اپنے بالوں میں نجس بالوں کو یا انسانی بالوں کو جوڑنا قطعاً حرام ہے، کیونکہ انسان کی عظمت کی وجہ

سے اس کے کسی بھی حصہ سے انتفاع حرام ہے، بلکہ اس کے بال وغیرہ دفن کئے جائیں، اس مسئلہ میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں برابر ہیں۔ انسانی بال کے علاوہ کوئی اور پاک بال ہوں اور عورت غیر شادی شدہ ہو تو ان بالوں کو جوڑنا بھی حرام ہے۔ اور شادی شدہ ہو تو شوہر کی اجازت ہو تو جوڑنا جائز ہے ورنہ حرام ہے۔

غیر شادی شدہ عورت کو اور شادی شدہ عورت کو بغیر شوہر کی اجازت کے رخسار کو سرخ کرنا حرام ہے۔ شوہر کی اجازت ہو تو جائز ہے سیاہ خضاب، انگلیوں کو مہندی سے رنگنا اور بالوں کو گھنگھریالے بنانا ان سب میں یہی تفصیل ملحوظ ہوگی۔

نمازی کے بدن اور کپڑے کو اوپر نیچے اور چاروں جانب سے چھونے والی جگہ پاک ہونا واجب ہے۔ اگر ایسا کھڑا ہو کہ نجس دیوار یا چھت کو چھو رہا ہے تو نماز باطل ہوگی۔ اگر چٹائی پر نماز پڑھے اور اس کے نیچے نجاست ہو یا ایک کنارے پر نجاست ہو یا تخت پر نماز پڑھے اور اس کے پائے نجاست پر ہو تو حرج نہیں، چاہے وہ جگہ اس کی حرکت سے حرکت کرے یا نہ کرے۔ نمازی کے بدن اور کپڑے کو لگنے والی جگہ تو پاک ہو، لیکن سامنے یا سجدہ وغیرہ میں بالمقابل جگہ نجس ہو (لیکن بدن یا کپڑے پر نہ لگے) تو نماز درست ہوگی۔ باریک بُنا ہوا کپڑا نجاست پر بچھا کر نماز پڑھے اور درمیانی سوراخوں سے نجاست کو چھوئے تو نماز باطل ہوگی ورنہ صحیح ہوگی۔

وہ مقامات جہاں شریعت نے نماز سے روکا ھے۔

(۱) **کوڑا خانہ اور مذبح** (بوچڑخانہ۔ جہاں جانور ذبح ہو) ان دونوں جگہوں پر نجاست کی وجہ سے ممانعت ہے۔ اگر کپڑا یا پاک بچھونا بچھا کر اس پر نماز پڑھے تو صحیح ہوگی لیکن نیچے نجاست ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

(۲) **سڑک پر:** اس کے دو سبب ہیں۔ (الف) غلبۂ نجاست۔ (ب) لوگوں کے گذرنے کی وجہ سے توجہ کا بٹنا۔

(۳) **حمام:** نجاست اور میل کچیل کی کثرت یا شیطانی پناہ گاہ ہونے کی وجہ سے

(۴) **کعبہ کے اوپر:** جس کی تفصیل گذر چکی۔

(۵) **وہ جگہ** جہاں رات اونٹوں کو رکھا جاتا ہو، یا پانی پینے کے بعد جمع کیا جاتا ہو البتہ بکریوں کے باڑے میں کراہت نہیں ہے۔ کسی کے بھی باڑے میں ایسی جگہ نماز پڑھے جہاں پیشاب یا مینگنی وغیرہ نجاست ہو تو نماز صحیح نہیں ہے۔

(۶) مقبرہ (قبرستان) قبرستان میں نماز ہر حال میں مکروہ ہے، اگر قبر دوبارہ کھودی گئی ہو تو اس جگہ نماز درست نہ ہوگی، اگر کوئی پاک چیز بچھا کر وہاں نماز پڑھے یا دوبارہ قبر نہ کھودی ہو یا شک ہو تو نماز صحیح ہوگی۔ نماز میں قبر کی طرف رخ کرنا مکروہ ہے۔

حدیث: آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے (۱) کوڑا خانہ، (۲) مذبح (۳) مقبرہ (۴) سڑک کے بیچ (۵) حمام (۶) اونٹ کا باڑہ (۷) بیت اللہ کے اوپر۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ وضعفہ الحافظ فی التلخیص۔ حاشیۃ الروضہ)

معاف نجاستوں کی تفصیل

(۱) ڈھیلوں سے استنجاء کے بعد اس جگہ باقی نجاست کا اثر معاف ہے، لیکن قلیل پانی میں وہ جگہ چھو جائے تو پانی نجس ہوگا، نمازی ایسے شخص کو اٹھائے تو اس کی نماز باطل ہوگی، پسینہ کی وجہ سے وہ جگہ تر ہو جائے تو معاف ہے۔ اگر کسی ایسے حیوان کو اٹھائے جس کے بدن پر نجاست نہ ہو تو نماز صحیح ہوگی اگر اس کے منفذ پر نجاست ہو تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ اگر یہ حیوان قلیل پانی میں یا کسی اور مائع میں گر کر زندہ نکل آئے تو وہ چیز نجس نہ ہوگی، نماز میں ایسا انڈا ساتھ ہو جس کے اندر خون ہو ظاہری حصہ پاک ہو یا ایسے انگور کا خوشہ اٹھائے، جسکے

دانوں کے اندر شراب بن چکی ہو، تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ نجاست بھری سل بند بوتل ساتھ رکھے تو نماز درست نہ ہوگی، مذبوحہ جانور کا خون وغیرہ اچھی طرح دھو کر اسے نماز میں اٹھائے تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ (کیونکہ اس کے اندر نجاست موجود ہے)

(۲) **راستہ کا کیچڑ اور مٹی:** اگر یہ یقیناً نجس ہو تو قلیل مقدار معاف ہے، نہ کہ کثیر مقدار، قلیل کا مطلب جس سے بچنا کافی دشوار ہو، عادت کے پیش نظر اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی طرح بدن یا کپڑے کے جس حصہ میں لگا ہے وہ بھی دیکھا جائے گا (لہٰذا پیر اور دامن میں ہاتھ اور آستین کے مقابلے میں زیادہ مقدار معاف ہوگی۔ اسی طرح سرما میں گرما کے مقابلے میں اور نابینا کے حق میں بینا کے مقابلے میں زیادہ مقدار معاف رکھی جائے گی۔ (حاشیۃ الجمل) ائمہ کرام نے سہولت کے طور پر سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ قلیل مقدار وہ ہوگی۔ جس میں آدمی گرنے پڑنے یا لغزش یا قلت احتیاط کی طرف منسوب نہ ہو، اگر منسوب ہو تو یہ مقدار کثیر ہوگی۔ اگر کیچڑ کے نجاست کا یقین نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں (وہ پاک سمجھا جائے گا) موزے یا جوتے کے تلوے میں نجاست لگ جائے اور اسکو زمین سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کر دے، تب بھی اس کو پہن کر نماز درست نہ ہوگی۔

(۳) **پسو یا مچھر کھٹمل** وغیرہ کا خون اور مکھی کی بیٹ اور چمگاڈر کا پیشاب اس کی قلیل مقدار کپڑے اور بدن میں معاف ہے اسی طرح کثیر مقدار بھی بعض شرائط کے ساتھ معاف ہے۔

شرائط: (۱) اس کے دھونے کی طرف بالکل بے توجہی کی وجہ سے مقدار میں زیادہ اضافہ نہ ہوا ہو (۲) خود اپنے عمل سے ایسا نہ کیا ہو (۳) اس کپڑے کو پہننے کی ضرورت ہو۔

مکمل لباس کو پہننے کے بعد اس کپڑے کو مزید اوپر سے پہنے تو اس میں نماز صحیح نہ ہوگی۔

(۴) یہ معافی نماز کی حد تک ہے، لہٰذا ایسا کپڑا اگر قلیل پانی میں گر جائے تو پانی نجس ہوگا۔ (حاشیۃ الروضہ)

ان اشیاء کی قلیل مقدار پسینہ سے پھیل جائے تو وہ بھی معاف ہے۔ غالباً جتنی مقدار لگ جاتی ہے اور جس سے بچنا مشکل ہو اسے قلیل شمار کریں گے۔

(۵) پھوڑے پھنسی کا خون اور پیپ یہ بھی قلیل اور کثیر معاف ہے اگر خود پھوڑے کو دبا کر اندر کی چیز نکالے تو یہ معاف ہے (بعض فقہاء کے نزدیک اس صورت میں قلیل مقدار معاف ہے) کسی دوسرے آدمی یا جانور کا خون لگے تو تھوڑا معاف ہے، زیادہ مقدار معاف نہیں ہے، اپنے ہی زخم یا مقام فصد وغیرہ کا خون لگ جائے تو یہ بھی پھوڑے کے حکم میں ہے، آبلہ اور زخم کا پانی اگر بدبودار ہو تو وہ نجس ہے، ورنہ پاک ہے۔

(۶) نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ کپڑے یا بدن یا محل نماز میں غیر معاف نجاست تھی تو ہر وہ نماز جو یقینا نجاست کے ساتھ پڑھی گئی ہے، لوٹانا واجب ہے، لیکن جن نمازوں کے بعد اس نجاست کے لگنے کا احتمال ہو، ان نمازوں کا اعادہ لازم نہیں ہے۔

(۷) **متفرق انواع کے متعلق:** استحاضہ اور سلسل البول کی صورت میں جو نجاست جاری رہتی ہے۔ زخم پر زیادہ خون ہو اور اسکے ازالہ میں خطرہ ہو، شدت خوف کی نماز میں ہتھیاروں پر لگا ہوا خون، یہ سب معاف ہیں۔

شرط (پانچویں) ستر عورت - (شرمگاہ کا چھپانا): لفظ عورت عربی میں ان انسانی اعضاء کیلئے استعمال ہوتا ہے جن کو شرم وحیاء سے چھپایا جاتا ہے۔ شرعاً جن اعضاء کو عام حالت میں اور نماز میں چھپانا ضروری ہے، اسے عورت کہیں گے، لہٰذا ان مسائل میں اکثر جگہ یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوگا یہ ذہن میں رہے) ستر عورت نماز کے علاوہ تنہائی میں بھی واجب ہے، نماز کی صحت

کیلئے ستر عورت شرط ہے، اگرچہ تنہائی میں کیوں نہ ہو، باوجود قدرت کے اسے ترک کرے تو نماز باطل ہوگی۔ نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کپڑا ایسی جگہ سے پھٹا تھا جس میں سے عورت (یعنی بدن کا وہ حصہ جسے نماز وغیرہ میں چھپانا ضروری ہے۔) نظر آئے تو نماز کا اعادہ واجب ہے، چاہے اسے پہلے سے معلوم ہی نہ ہو، یا معلوم تھا لیکن بھول کر اس میں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد پھٹنے کا احتمال ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تنہائی میں نماز کے علاوہ کسی ضرورت سے کشف عورت (محل مخصوص سے کپڑا ہٹانا) کی اجازت ہے (مثلاً غسل، قضاء حاجت، استنجاء، علاج، موئے زیر ناف کا صاف کرنا اور ختنہ جیسے امور۔ (حاشیۃ الروضہ)

مرد کیلئے عورت ناف اور گھٹنے کے درمیان کی جگہ ہے۔ عورت (مونث) اگر آزاد ہے تو نماز میں چہرہ اور ہتھیلی کے ظاہر و باطن کے علاوہ سارے بدن کا چھپانا واجب ہے۔ باندی کا حکم مردوں کی طرح ہے۔ خنثیٰ مشکل کا حکم عورت کی طرح ہے۔

ستر کی صفت

ستر عورت ایسی چیز سے واجب ہے جو نگاہ کے اور چمڑی کے رنگ کے درمیان حائل ہو، لہٰذا ایسا باریک کپڑا جس سے بدن کا رنگ جھلکے ناکافی ہے۔ کپڑا تو موٹا ہو لیکن ایسا بنا ہوا ہو کہ درمیان میں سوراخ ہو (سوئٹر وغیرہ کے مشابہ) اور اس سوراخ سے بدن جھلکے تو یہ بھی ناکافی ہے۔ رنگ تو چھپ جائے لیکن بدن کے حجم کا احساس ہو تو حرج نہیں۔ شفاف پانی میں کھڑے ہونے سے نماز درست نہ ہوگی۔ پانی گہرا سبز یا گدلا ہو اور اس میں کھڑے ہونے کی صورت میں کھال دکھائی نہ دے تو نماز درست ہے۔ جبکہ اس صورت میں رکوع و سجدہ کر سکے یا مثلاً جنازہ کی نماز کیلئے کھڑا ہو، اگر عورت پر کیچڑ ایسا مل دے کہ رنگ چھپ جائے تو یہ کافی ہے۔ کپڑا ہونے کے باوجود بھی اس سے نماز ہوگی۔ کپڑا وغیرہ نہ ہو اور کیچڑ مل سکتا ہے تو یہ واجب ہے۔

ستر اور پردہ اوپر اور چاروں جانب سے ضروری ہے۔ دامن اور تہبند کے نچلے جانب سے ضروری نہیں پس اگر کوئی وسیع (کشادہ) دامن والا قمیص پہن کر چھت کے کنارے کھڑا ہو اور نیچے سے عورت نظر آئے تب بھی نماز درست ہوگی۔ اگر قمیص کا گریبان کشادہ ہو اور رکوع سجدہ وغیرہ میں اوپر کی جانب سے عورت نظر آئے تو نماز درست نہ ہوگی۔ لہٰذا اسے گریبان میں بٹن لگانا یا درمیان میں باندھ دینا یا کاندھے پر کپڑا وغیرہ ڈال کر گریبان کے حصے کو چھپانا ضروری ہے۔ قمیص سینے یا پشت کی طرف سے پھٹا ہوا ہو اور اس میں سے عورت نظر آئے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (مذکورہ مثالوں کا تعلق ایسی صورت سے ہے کہ صرف لمبی قمیص پہن کر نماز پڑھے مزید تہبند یا پائجامہ وغیرہ نیچے کے حصہ میں نہ پہنے) اگر گریبان کی کشادگی داڑھی یا سر کے بالوں سے چھپ جائے تو نماز صحیح ہوگی۔

اگر تہبند کے سوراخ کو ہاتھ سے کپڑا سمیٹ کر یا اس کے بغیر بند کرے تو نماز درست ہے۔ کپڑے وغیرہ کا بدن پر ہونا ضروری ہے لہٰذا کوئی تنگ خیمہ میں ننگا نماز پڑھے تو یہ صحیح نہیں۔ اگر زمین میں گڑھا کھود کر اس میں کھڑا ہو جائے اور اتنی مٹی ڈال دے کہ ستر عورت ہو تو نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر ستر کیلئے ایسا شیشہ (کانچ) استعمال کرے جس سے رنگ واضح ہو تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔

ستر کی غیر موجودگی: ستر عورت کیلئے کچھ بھی میسر نہ ہو تو ننگا ہی نماز پڑھے، تیمم کے باب میں اس کے نماز کی کیفیت وغیرہ گذر چکی ہے۔ کئی ننگے نمازی جمع ہوں تو وہ باجماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کا امام عورتوں کی جماعت کی طرح درمیان میں کھڑا ہوگا۔ ان کیلئے عام حالت میں تنہا اور باجماعت نماز برابر ہے۔ اگر سب نابینا ہوں یا تاریکی میں ہوں تو ان کیلئے بھی جماعت مستحب ہے۔ ان میں ایک کپڑے پہنے ہوئے ہو تو وہی امامت کرے اور بقیہ اس کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوں۔ اس کے برعکس کوئی ننگا امامت کرے

اور کپڑے والا اس کی اقتداء کرے تب بھی جائز ہے۔

اگر مرد اور عورتیں اس طرح جمع ہوں تو ایک ساتھ نماز نہ پڑھیں بلکہ صرف مرد پڑھیں اور عورتیں پیچھے قبلے کیطرف پشت کئے بیٹھی رہیں بعد میں عورتیں نماز پڑھیں اور مرد اسی طرح پیچھے بیٹھے رہیں۔

ناکافی ستر: صرف بعض عورت (شرمگاہ) چھپا سکتا ہو تو جتنا ممکن ہے، چھپانا لازم ہے۔ اگر صرف اگلی اور پچھلی شرمگاہ کو چھپا سکتا ہے تو اسے ہی چھپائے۔ اسے چھوڑ کر دوسرے کسی عضو کو نہ چھپائے صرف ایک ہی شرمگاہ کو چھپانا ممکن ہو، تو اگلی شرمگاہ چھپائے۔

بعض متفرق مسائل

ننگا آدمی کسی دوسرے سے زبردستی اس کا کپڑا نہیں لے سکتا (امام اذرعیؒ نے فرمایا یعنی صرف ستر کیلئے لینا جائز نہیں، البتہ سخت گرمی وسردی سے بچنے کیلئے مضطر کی طرح جائز ہوگا۔ اور ایسی صورت میں اس میں نماز پڑھے گا۔ اسی طرح اگر کپڑے کے مالک کو اس ننگے شخص کو کپڑا پہنانا شرعاً واجب ہو، باپ یا بیٹا ہونے کی وجہ سے اور خود وہ اس کپڑے سے بے نیاز ہو اور کپڑا اس قسم کا ہو جو اسے دیا جانا چاہئے، تو ان شرائط کے ساتھ زبردستی لینے کی گنجائش ہوگی۔ (حاشیۃ الروضہ) اگر کوئی ننگے شخص کو کپڑا ہبہ کرے تو اسے قبول کرنا لازم نہیں ہے (امام اذرعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس شخص کو گرمی یا سردی کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو ہبہ قبول کرنا بظاہر قطعاً لازم ہے اور اس صورت میں ہبہ قبول نہ کر کے ننگا ہی نماز پڑھے تو اعادہ لازم ہے۔ (حاشیۃ الروضہ) اگر کوئی عاریۃ (وقتی طور پر استعمال کیلئے) کپڑا دے تو لینا لازم ہے، اگر نہ لے اور عریاں ہی نماز پڑھے تو صحیح نہ ہوگی۔ کوئی کپڑا فروخت کرے یا اجرت (کرایہ) پر دے تو یہ پانی کے فروخت کی طرح ہے۔ جس کی تفصیل تیمم میں گذر چکی۔ اور کپڑا قرض دینا قیمت قرض دینے کی طرح ہے۔ کپڑا اور پانی (طہارت کیلئے) خریدنے کی ضرورت ہو اور کوئی ایک ہی چیز خرید سکتا ہے تو کپڑا خریدے۔ اگر کوئی اپنا کپڑا سب سے زیادہ مستحق کیلئے وصیت کر جائے تو عورت پھر خنثیٰ مقدم ہے۔ صرف نجس کپڑا ہو اور پاک کرنے کا انتظام نہ ہو تو ننگا ہی بلا اعادہ نماز پڑھ لے، نماز کے علاوہ ستر عورت کے لئے اسے پہننا لازم ہوگا۔ صرف ریشم کا کپڑا موجود ہو تو نماز اور لوگوں کی نگاہوں سے پردے کیلئے اسے پہننا واجب ہے، کیونکہ حاجت کی وجہ سے ریشم مباح (جائز) ہوگا۔ نماز کیلئے اپنی حیثیت کے مطابق بہترین کپڑا پہننا اور عمامہ باندھنا مستحب ہے، دو کپڑے پہنے تو افضل قمیص اور چادر یا قمیص اور پاجامہ ہے ایک ہی کپڑا پہنے تو افضل قمیص ہے، ورنہ پھر تہبند، اس کے بعد پاجامہ۔ ایک کپڑا اگر کشادہ ہو تو کاندھے کے اوپر سے اسے پہن لے اور دونوں کنارے بالمقابل کاندھے پر ڈالدے، اگر تنگ ہو تو ناف کے اوپر باندھ لے، اور اس کا کچھ حصہ کاندھے پر ڈالدے، عورت کیلئے مکمل بدن چھپانے والا کرتہ اور دوپٹہ میں نماز پڑھنا اور اپنے کپڑوں کے اوپر ایسی ڈھیلی چادر یا قمیص استعمال کرنا جس سے اس کے اعضاء کی ساخت بالکل معلوم نہ ہو، مستحب ہے۔

ننگے آدمی کیلئے کسی دوسرے کا کپڑا (بلا اجازت) پہننا حرام ہے بلکہ ایسے ہی نماز پڑھ لے، آئندہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر گھاس پتے وغیرہ کے ذریعے بدن چھپانا ممکن ہو تو یہ لازم ہے۔ کسی نجس جگہ مقید ہو اور کپڑا ستر عورت اور نجاست پر بچھانا دونوں کے لئے ناکافی ہو تو اس کپڑے کو نجاست پر بچھا کر ننگا ہی بلا اعادہ نماز پڑھ لے۔ اگر کسی کے پاس کپڑا ہو لیکن نماز کا وقت ہونے کے بعد بلا ضرورت اس کو تلف کر دیا یا پھاڑ ڈالے تو گنہگار ہوگا۔ اور ننگا ہی نماز پڑھ لے۔ ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا جس میں تصویر ہو مکروہ ہے۔

مرد کو نماز میں ڈھاٹا باندھنا اور عورت کو نقاب سے منہ چھپانا اور دونوں کو منہ ڈھانکنا مکروہ ہے، البتہ جمائی آئے تو سنت ہے کہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھے (بائیں ہاتھ کا پشت رکھنا بہتر ہے۔ حاشیۃ الجمل) اشتمال صماء اور اشتمال یہود مکروہ ہے۔ اشتمال صماء یعنی پورے بدن کو کپڑے سے ڈھانپ لینا اور مزید دونوں کنارے اٹھا کر بائیں کاندھے پر ڈال دینا، اشتمال یہود بھی اسی طرح ہوگا البتہ دونوں کناروں کو اٹھائے گا نہیں۔

فصل۔ چھٹی شرط۔ کلام اور بات چیت نہ کرنا۔

نماز میں گفتگو کی دو حالت ہوگی۔ (۱) بغیر عذر کے، اگر صرف ایک حرف زبان سے نکالے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن اس ایک حرف کا کچھ مفہوم ہو تو باطل ہوگی جیسے (عربی زبان میں) قِ (قوت دے) شِ (چغلی کر) اگر دو حرف نکالے تو نماز باطل ہوگی، چاہے اس کا کچھ مفہوم ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی حرف کو مد کرے تو نماز باطل ہوگی، بغیر مجبوری کے کھانسنے میں دو حرف ظاہر ہوں تو نماز باطل ہوگی۔ اگر کھانسنے میں مجبور اور بے بس تھا تو حرج نہیں بغیر کھانسنے اور کھنکھارنے کے تلاوت ممکن نہ ہو تو وہ معذور ہے۔ اگر تلاوت تو ممکن ہو لیکن جہر (زور سے پڑھنا) ممکن نہ ہو تو یہ عذر نہیں ہے۔ (یعنی آہستہ ہی پڑھ لے۔ زور سے پڑھنے کیلئے کھانسنے کی صورت میں دو حرف ظاہر ہوئے تو نماز باطل ہوگی) امام کے کھانسنے سے دو حرف ظاہر ہوں تو اسے معذور سمجھتے ہوئے اقتداء برقرار رکھیں گے۔ ہنسنے، رونے اور پھونکنے میں دو حرف ظاہر ہوں تو نماز باطل ہوگی ورنہ نہیں، چاہے رونا دنیا کے تعلق سے ہو یا آخرت کی وجہ سے۔

(۲) عذر کی وجہ سے گفتگو: بغیر قصد و ارادہ کے گفتگو کی طرف سبقت لسانی ہو، یا ہنسی یا کھانسی کے غلبہ کی وجہ سے دو حرف ظاہر ہوں یا (نماز میں ہونا) بھول کر یا نماز میں گفتگو کی حرمت کا مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی سی گفتگو کرے تو نماز باطل نہ ہوگی زیادہ گفتگو ہو تو اس صورت میں بھی نماز باطل ہوگی۔ کم اور زیادہ کا فیصلہ عرف کی روشنی میں کیا جائے گا۔

لاعلمی صرف اس شخص کیلئے عذر ہے جو ابھی ابھی اسلام لایا ہو۔ اگر قدیم مسلمان ہو تو اس کی نماز باطل ہوگی کیونکہ مسائل نہ سیکھنا اس کا قصور ہے۔ کلام کا نماز میں حرام ہونا تو معلوم ہو لیکن اس سے نماز ٹوٹنے کا علم نہ ہو، تو یہ بھی عذر نہیں ہے۔ اگر کھانسی سے نماز کے ٹوٹنے کا علم نہ ہو تو وہ معذور ہے، کیونکہ اس حکم کا علم عوام کو نہیں ہوتا کسی کو گفتگو کا حرام ہونا تو معلوم ہو لیکن جس قسم کی گفتگو اس نے کی ہے اس کا حرام ہونا معلوم نہ ہو تو وہ معذور ہے، کسی کی زبردستی اور اکراہ کی وجہ سے گفتگو کرے تو نماز باطل ہوگی جیسے کوئی زبردستی بے وضو یا بیٹھ کر نماز پڑھنے پر مجبور کرے تو اس کا اعادہ لازم ہے۔ اگر نماز کی مصلحت سے گفتگو کرے مثلاً امام بیٹھنے کی جگہ کھڑا ہو تو مقتدی نے کہا بیٹھ جاؤ۔ تو نماز باطل ہوگی۔ یہ عذر نہیں ہے۔ بلکہ اسے تسبیح کے ذریعے تنبیہ کرنا چاہئے۔ کوئی انسان ہلاکت کے قریب ہو (مثلاً کوئی اندھا گڑھے میں گرنے کے قریب ہو) اور بغیر کلام کے اس کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا تو آواز دے کر اسے روکنا واجب ہے لیکن نماز باطل ہوگی۔ آپ ﷺ اپنے دور میں کسی نمازی سے گفتگو کریں تو اسے فوراً جواب دینا لازم ہے اور اس سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر جہنم کے خوف سے آہ کہے تو نماز باطل ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے چار رکعت کی نماز میں) دو پر سلام پھیر دی تو ذوالیدین نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا نماز قصر ہوگئی یا آپ بھول گئے؟ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا تب آپ ﷺ نے دوسری دو رکعت پڑھ کر سلام پھیری پھر تکبیر کہہ کر نماز کی طرح یا اس سے طویل دو سجدے

کئے۔(صحاح ستہ)

(۲)حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نماز میں بات کر لیتے تھے کوئی شخص اپنے پاس والے سے بات کر لیتا یہاں تک کہ آیت:"وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" نازل ہوئی تو ہم کو سکوت کا حکم ہوا اور کلام سے روکا گیا۔(بخاری۔مسلم،ابوداود)

(۳)ایک صحابی معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ لاعلمی کی وجہ سے نماز میں کچھ گفتگو کرتے ہیں، لہٰذا فراغت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا کہ ان نمازوں میں لوگوں کے گفتگو کے قبیل کی کوئی چیز درست نہیں، نماز میں تو تسبیح و تکبیر اور تلاوت ہوگی۔(مسلم،ابوداود ،نسائی) (تیسیر الوصول)

نماز میں تنبیہ: کسی مرد کو نماز کے دوران تنبیہ کی ضرورت پیش آئے، مثلاً کسی نابینا کو دیکھے کہ کنویں میں گرنے کے قریب ہے، یا کوئی گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہے یا کسی کو کچھ اطلاع دینا ہو تو سنت ہے کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کہے۔ان تمام صورتوں میں عورت تالی بجائے گی جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے دائیں ہتھیلی کے اندرونی حصے (پیٹ) کو بائیں ہتھیلی کے پشت پر مارے اگر دائیں انگلیوں کو بائیں انگلیوں پر مارے یا دائیں انگلیوں کو بائیں ہتھیلی کی پشت پر مارے تو یہ بھی جائز ہے البتہ دونوں ہتھیلی کے پیٹ کو آپس میں مار کر تالی نہ بجائے۔بطور لہو ولعب (کھیل کود) اس طرح کرے تو نماز باطل ہوگی۔

مبطل کلام: بغیر عذر کے کلام سے نماز تب باطل ہوگی جبکہ قرآن ذکر اور دعا جیسے کلام کے علاوہ کلام ہو۔اگر قرآن کے آیت کو تلاوت کی نیت سے یا تلاوت کے ساتھ کسی اور نیت سے پڑھے، جیسے امام یا کسی دوسرے کو متنبہ کرنا، لقمہ دینا، یا کوئی بات سمجھا دینا جیسے اندر آنے کی اجازت چاہنے والوں کو (اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ ۔آیت ۴۶ سورہ الحجر) کہنا یا (يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ۔آیت ۱۲۔سورہ مریم) کہنا یا اس کے مشابہ، تو ان تمام صورتوں میں نماز باطل نہ ہوگی، چاہے دوران تلاوت اس آیت تک پہنچا ہو یا موقع کی مناسبت سے ابتداءً اس آیت کو پڑھا ہو۔لیکن صرف افہام اور اطلاع کی نیت سے آیت کی تلاوت کرے (یعنی ساتھ تلاوت کا قصد نہ ہو) تو نماز باطل ہوگی۔اگر قرآن کے چند کلمات کو بغیر قرآنی ترتیب کے پڑھے۔جیسے۔"يَا اِبْرَاهِيْمَ ، سَلَامٌ كُنْ" تو نماز باطل ہوگی اور ان الفاظ کو کسی حال میں قرآن کا حکم نہ ہوگا۔

ذکر واذکار: تسبیحات اور دعائیں عربی زبان میں پڑھنا جائز ہے، چاہے مسنون ہو یا نہ ہو۔لیکن جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور مخلوق کو خطاب ہو، ایسے الفاظ سے اجتناب ضروری ہے، کسی انسان کو خطاب کے لفظ سے سلام کرے یا اس کے سلام کا جواب دے تو نماز باطل ہوگی۔کسی نے سلام کیا تو نمازی ہاتھ یا سر کے اشارہ سے جواب دے، اگر علیہ السلام کہے، (یعنی اس پر سلامتی ہو) تو نماز باطل نہ ہوگی۔(کیونکہ اس میں خطاب نہیں ہے) دوسرے کے چھینکنے پر "يَرْحَمُهُ اللّٰهُ" (اللہ اس پر رحم کرے) کہے۔تو حرج نہیں لیکن "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ" (اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے تو نماز باطل ہوگی۔

احادیث: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہتے تو آپ جواب دیتے۔پھر جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹے (ہجرت حبشہ کے بعد) تو آپ کو سلام کہا، لیکن جواب نہ دیا، پوچھنے پر فرمایا: یقیناً نماز میں (نماز کے اعمال میں) مصروفیت ہے۔(بخاری و مسلم) ابوداود ابن حبان کی روایت میں ہے۔اللہ نے نیا حکم نازل فرمایا ہے، کہ نماز میں گفتگو نہ کرو" آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں نماز پڑھ رہے تھے تو انصار نے آکر سلام عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہتھیلی کے اشارہ سے جواب دیا۔(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ ،ابن حبان، تلخیص الجیر)

نماز میں سکوت یا اشارہ: نماز میں تھوڑی دیر یا زیادہ دیر کسی عذر سے یا بغیر عذر کے چپ رہے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، گونگے شخص کا سمجھ میں آنے والا اشارہ بیع (خرید و فروخت) وغیرہ معاملات میں نطق (گفتگو) کی طرح ہے۔ لیکن ان اشاروں سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی۔

شرط (ساتویں) افعال کثیرہ سے پرہیز (زیادہ حرکت سے بچنا)

نماز کے اعمال کے علاوہ افعال کی دو قسمیں ہیں۔ (ا) وہ فعل و عمل جو نماز کی جنس سے ہو۔ (جیسے مزید رکوع و سجدہ وغیرہ) (ب) جو نماز کی جنس سے نہ ہو۔

(۱) اگر نماز کے جنس کے عمل کو کوئی بھول کر انجام دے، جیسے ایک رکوع یا سجدہ یا رکعت زائد ادا کرے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن عمداً یوں کرے تو نماز باطل ہوگی۔ (۲) جو عمل اور حرکت نماز کی جنس سے نہ ہو اگر وہ کثیر ہے تو نماز باطل ہوگی اور قلیل ہو تو نماز باطل نہ ہوگی۔ قلیل و کثیر کے فرق کیلئے عادت کی طرف رجوع کریں گے۔ لہٰذا جتنی حرکت کو عموماً لوگ قلیل تصور کرتے ہوں، اس سے نماز باطل نہ ہوگی جیسے اشارۃً سلام کا جواب دینا، چپل اتارنا، ہلکا کپڑا پہننا، یا اتارنا، صرف ایک عمل جیسے ایک قدم آگے رکھنا، ایک مار مارنا قلیل ہے، اسی طرح دو بھی قلیل ہے لیکن تین کثیر ہے۔ کثیر عمل سے نماز اس وقت باطل ہوگی، جبکہ یہ مسلسل اور پے در پے ادا ہوں۔ اگر ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ یہ اعمال ایک دوسرے سے جدا شمار ہوں، تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، جیسے ایک قدم یا دو قدم آگے رکھا پھر کچھ دیر کے بعد ایک دو قدم اور آگے رکھا تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔

بعض علماء نے فرمایا کہ دو عمل کے درمیان (اقل) ایک رکعت کے بقدر فاصلہ ہو تو یہ جدا شمار ہوں گے۔ ایک عمل سے نماز اس وقت باطل نہیں ہوگی۔ جبکہ وہ حد سے گذرا ہوا نہ ہو۔ لہٰذا کوئی ایک مرتبہ بھی کود دے تو نماز باطل ہوگی۔ اسی طرح بڑی حرکتوں سے نماز باطل ہوگی۔ خفیف اور چھوٹی حرکتوں سے باطل نہ ہوگی، جیسے انگلیوں سے تسبیح گننا، کھجانا یا گرہ لگانا یا کھولنا۔ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ اگر آیتوں کو نماز میں انگلیوں پر گنتا رہے تو نماز باطل نہ ہوگی، لیکن اولیٰ اس طرح نہ کرنا ہے۔ عمل کثیر عمداً ہو یا سہواً دونوں صورتوں میں نماز باطل ہوگی۔ یہ عام حالت کی نمازوں کا حکم ہے۔ شدت خوف کی نماز میں حاجت کی وجہ سے کچھ گنجائش ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

نماز میں قرآن میں دیکھ کر تلاوت: نماز میں قرآن شریف میں دیکھ کر تلاوت کرنا جائز ہے، بلکہ سورہ فاتحہ زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھنا واجب ہے، جیسا کہ گذر چکا۔ بیچ میں ورق الٹنے میں حرج نہیں، قرآن کے علاوہ کسی تحریر کو دیکھ کر اپنے دل میں اسے پڑھے (یعنی زبان سے ادا نہ کرے) تو نماز باطل نہ ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے امامہ بنت ابی العاص (آپ کی نواسی) کو کاندھے پر اٹھا کر نماز پڑھائی (متفق علیہ)

(۲) حضرت ابن عباس تہجد کی نماز میں آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے کان پکڑ کر انہیں دائیں طرف کر دیا۔ (متفق علیہ)

(۳) آپ ﷺ نماز میں اشارہ فرماتے۔ (ابو داود، ابن خزیمہ)

(۴) حضرت عائشہؓ کے ایک غلام قرآن میں دیکھ کر ان کو تراویح پڑھاتے تھے۔ (امامت کرتے تھے) (ابن ابی شیبہ والبخاری تعلیقاً) (تلخیص الحبیر)

سُترہ (نمازی کا سامنے کچھ آڑ رکھنا)

احادیث: (۱) جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنے سامنے کوئی چیز (بطور سترہ) رکھے نہ ہو تو عصا (ڈنڈا) کھڑا کر دے، عصا نہ ہو تو ایک خط (لکیر) کھینچ دے، پھر سامنے سے کسی کے گذرنے میں اسے کوئی نقصان نہیں، (الشافعی، احمد، ابوداود، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی۔ تلخیص ۱/۳۰۵)

(۲) نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کو اس گناہ کی شدت کا علم ہو تو چالیس سال تک کھڑے رہنا سامنے سے گذرنے سے بہتر ہے۔ (متفق علیہ)

(۳) نماز میں تمہارے سامنے سے کوئی گذرے تو اسے روکو، نہ مانے تو پھر روکو، پھر نہ مانے تو اسے مارو وہ شیطان ہے۔ (رواہ البخاری و مسلم)

نمازی کے سامنے دیوار یا ستون وغیرہ سترہ ہونا مستحب ہے۔ سترہ اور نمازی کے درمیان تین ذراع (ہاتھ) سے زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ کھلے میدان وغیرہ میں ہو تو عصا وغیرہ کھڑا کر دے۔ یا اپنا اسباب وغیرہ جمع کر کے سامنے رکھ دے (جس کی اونچائی ایک ذراع یا کم از کم دو تہائی ہاتھ ہو) سامنے رکھنے کچھ میسر نہ ہو تو ایک خط کھینچے یا مُصَلّٰی (جانماز) بچھالے، خط لمبائی میں قبلے کی طرف کھینچے۔

سترہ موجود ہو تو نمازی کے اور سترہ کے درمیان سے گذرنا حرام ہے۔ کوئی گذرے، تو نمازی اسے دفع کر سکتا ہے، نہ مانے تو مار بھی سکتا ہے چاہے نتیجتاً وہ مر بھی جائے۔ گذرنے والے کیلئے دوسرا راستہ ہو، یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے، جیسا کے بخاری شریف کی روایت سے واضح ہے۔ اگر سامنے سترہ نہ ہو یا سترہ دور ہو (یعنی نمازی کے اور اس کے درمیان تین ذراع سے زائد فاصلہ ہو) تو خود نمازی کی غلطی ہے لہٰذا اب گذرنے والے کو روکنے کا اختیار نہ ہو گا اور خود گذرنا بھی حرام نہ ہو گا لیکن افضل نہ گذرنا ہے۔

دوران جماعت آنے والے کو پہلی صف میں جگہ خالی نظر آئے تو اسے پر کرنے کے لئے دوسرے صف کے آگے سے گذرنا جائز ہے، کیونکہ یہ ان کا قصور ہے۔

کسی بھی چیز کے نمازی کے سامنے سے گذرنے سے نماز باطل نہ ہو گی، چاہے مرد، عورت، کتا، گدھا یا اور کوئی شئے گذرے۔ نمازی سامنے سترہ رکھے تو سنت ہے کہ اسے بالکل سامنے نہ رکھتے ہوئے معمولی دائیں یا بائیں سمت رکھے۔

حدیث: (۱) حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے جب بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کو کسی لکڑی یا ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا تو اسے دائیں یا بائیں بھنوؤں (آنکھ) کے بالمقابل رکھتے پایا۔ اسے بالکل سامنے نہ رکھتے۔ (تاکہ بت پرستوں سے مشابہت نہ ہو) (رواہ ابوداود)

(۲) نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (یعنی سامنے سے گذرنے سے) حتی الامکان (گذرنے والے کو) دفع کرو کیونکہ وہ شیطان ہے۔ (ابوداود عن ابی سعید) (مشکوۃ)

شرط (آٹھویں)۔ کھانے سے باز رہنا

نماز میں کچھ کھالے، چاہے معمولی چیز ہو تو نماز باطل ہو گی۔ دانتوں میں پھنسے ریزے یا سر سے اترے ہوئے بلغم کو عمداً نگلے تو نماز باطل ہو گی۔ مغلوباً اندر چلا جائے تو باطل نہ ہو گی۔ بھول کر یا مسئلہ سے لاعلمی کی وجہ سے تھوڑا کھالیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی۔ زیادہ کھاجائے تو

اس صورت میں بھی ٹوٹ جائیگی۔ قلیل وکثیر کا دارومدار عرف پر ہو گا۔ بغیر چبائے اور نگلے بھی کوئی چیز پیٹ میں پہنچ جائے، مثلاً کوئی شکر منہ میں رکھے اور وہ پگھل کر اندر پہنچ جائے تو نماز باطل ہو گی۔ تو خلاصہ یہ کہ جن صورتوں میں روزہ ٹوٹتا ہے نماز بھی ٹوٹ جائے گی۔ چبانا تنہا بھی ایک فعل ہے، جس کی کثرت سے نماز باطل ہو گی، چاہے اندر کوئی چیز نہ جائے یہاں تک کہ گوند چباتا رہے تو نماز باطل ہو گی۔

فصل۔ مسجد کے بعض احکام

بے وضو شخص مسجد میں ٹھہر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے بغیر کراہت کے مسجد میں سونا جائز ہے۔ (لیکن جو نشہ میں ہو وہ مستثنیٰ ہے اسے مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حاشیۃ الروضہ) جنبی اور حائضہ کا مسئلہ گذر چکا ہے۔ کسی کافر کو حرم مکہ میں داخلہ کی قطعاً اجازت نہیں ہے، چاہے مسجد ہو یا غیر مسجد۔ حرم پاک کے علاوہ دنیا کے دیگر مساجد میں کافر (کسی مکلف) مسلمان کی اجازت سے جا سکتا ہے، بغیر اجازت کے نہیں جا سکتا۔ اگر گیا تو (اسلامی حکومت) اسے مناسب تعزیری سزا دے گی، اگر حاکم (قاضی) فیصلے کیلئے مسجد میں بیٹھے تو ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم باشندہ) اپنے محاکمے کے لئے (حاکم کے سامنے اپنا جھگڑا اور کیس لے جانے کیلئے) بغیر اجازت کے جا سکتا ہے۔ اور اس کا مسجد میں بیٹھنا ہی اجازت سمجھا جائے گا۔

ذمی کو سونے اور کھانے کیلئے مسجد میں اجازت نہ دی جائے، قرآن یا علمی بات سننے کیلئے اجازت دی جائے، شاید کہ اسلام لے آئے۔ ذمی جنبی ہو تب بھی روکنا ضروری نہیں ہے۔ جن صورتوں میں مسلمان حائضہ کو مسجد سے روکا جاتا ہے، ایک کافرہ حائضہ کو بھی روکا جائے گا۔ بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روکا جائے گا (ایسے بچے مراد ہیں جو مسجد کے احترام وغیرہ کی سمجھ نہیں رکھتے) جنبی اور حائضہ کو مسجد کے علاوہ دیگر نماز کے مقامات (مثلاً عید گاہ) میں جانا ممنوع نہیں ہے۔ مسجد کو نقش و نگار کرنا اور کنگرے بنانا مکروہ ہے۔ نماز کے علاوہ دیگر اوقات میں مسجد کو بند رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اگر کوئی تھوکے تو اب اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ مسجد کے ریت یا مٹی میں اسے دفن کر دے (جبکہ قدیم طرز پر مسجد میں ریت یا مٹی بچھی ہو، پختہ فرش نہ ہو، ورنہ مناسب طریقے سے اس کی صفائی کرے) اگر ہاتھ وغیرہ سے پونچھ کر اچھی طرح صاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ جو شخص لہسن یا پیاز یا اور کوئی بدبودار چیز کھالے تو جب تک بدبو ختم نہ ہو، بلا مجبوری کے مسجد میں جانا مکروہ ہے، مسجد کے اندر پیڑ لگانا مکروہ ہے، اگر کوئی لگا دے تو امام وقت (ذمہ دار) اسے کاٹ دے۔ مسجد میں کنواں کھودنا۔ اور کوئی کاریگری وغیرہ کرتے بیٹھنا مکروہ ہے۔ مسجد میں کھانے پینے میں اور وضو کرنے میں حرج نہیں جبکہ اس سے اوروں کو تکلیف نہ ہو۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پیر اندر رکھے اور نکلتے وقت بایاں پیر باہر نکالے اور جو مشہور دعائیں احادیث میں موجود ہیں پڑھے۔ مسجد کی دیوار کو باہر کی طرف سے بھی تمام باتوں میں مسجد ہی کی حرمت کا حکم ہے۔

احادیث: (۱) مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے۔ (متفق علیہ عن انس رضی اللہ عنہ)

(۲) جو شخص اس بدبودار پودے سے (یعنی پیاز) کھائے وہ ہرگز ہمارے مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو ان چیزوں سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ (متفق علیہ عن انس رضی اللہ عنہ)

(۳) اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب جگہ مساجد ہیں اور سب سے مبغوض (نفرت والی جگہ) بازار ہیں۔ (مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

(۴) جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے مسجد تعمیر کرے اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنّت میں مکان تعمیر کرتے ہیں۔ (متفق علیہ، عن عثمان رضی اللہ عنہ)

(۵) تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو "اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" اور باہر نکلے تو "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ

فَضْلِكَ" پڑھے۔(رواہ مسلم عن ابی اسید)

(۶) مجھے مساجد کو مزین (گچ کاری) کرنے کا حکم نہیں دیا گیا حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تم ضرور مساجد کو مزین کروگے جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے کیا۔(رواہ ابوداود عن ابن عباس، مشکوۃ شریف)

باب ۶۔ان سجدوں کا ذکر جو اصل نماز میں داخل نہیں

ایسے سجدے تین ہیں(۱) سجدہ سہو(۲) سجدہ تلاوت(۳) سجدہ شکر

(۱) **سجدہ سہو:** سجدہ سہو سنت ہے، واجب نہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں(۱) کسی مطلوبہ عمل کا ترک (۲) کسی ممنوعہ عمل کا ارتکاب۔(۱) **مطلوبہ عمل کا ترک:** اگر کسی رکن کو ترک کرے تو اس کی تلافی اور تدارک ضروری ہے، سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں ہے، تلافی کے بعد کبھی تو سجدہ سہو بھی سنت ہوگا اور کبھی نہیں جیسا کہ آئندہ تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اگر سنن ابعاض میں سے کوئی سنت عمداً یا سہواً (بھول سے) چھوٹ جائے، تو سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔

(۲) **ممنوع عمل کا ارتکاب:** اس کی دو قسمیں ہیں(۱) ایسا عمل جس کے عمداً کرنے سے بھی نماز باطل نہیں ہوتی۔ جیسے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) ایک یا دو قدم آگے بڑھنا (۲) ایسا عمل جس کے عمداً کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔ جیسے کلام، زائد رکوع وغیرہ۔ پہلی صورت میں سجدہ سہو نہ کرے۔ دوسری صورت میں اگر سہواً وہ عمل کرنے سے نماز باطل نہ ہو تو سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔ عمل کثیر، زیادہ کھانا، اور کثیر کلام سہواً بھی ہو تو نماز باطل ہوگی اس لئے اس صورت میں سجدہ سہو کا سوال نہیں، اسی طرح عمداً یا سہواً حدث ہو جائے تب بھی نماز باطل ہے اس لئے سجدہ سہو نہیں کرے گا۔ صحیح مسلم شریف کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اعتدال کو کافی طویل کیا۔ اس لئے دلیل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ اعتدال کو ذکر کے ذریعے طویل کرنا جائز ہے۔(امام اذرعیؒ بھی مذھباً ودلیلاً اسے صحیح قرار دے رہے ہیں اور نص شافعی سے اسے نقل فرمایا ہے۔حاشیۃ الروضہ)

کسی رکن ذکری (قولی رکن) کو دوسرے طویل رکن کی طرف منتقل کرے مثلاً سورہ فاتحہ مکمل یا بعض، رکوع یا تشہد میں پڑھے یا بعض تشہد، قیام میں عمداً پڑھے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی۔ لیکن عمداً اعتدال کو سورہ فاتحہ یا تشہد کی وجہ سے طویل کرے تو نماز باطل ہوگی۔ سہواً اس طرح ہو تو سجدہ سہو کرے۔

بعض وہ مسائل جن کے عمداً کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی پھر بھی ان کے سہواً کرنے سے سجدہ سہو سنت ہے(۱) رکوع سے قبل دعا قنوت پڑھنا(۲) رمضان کے نصف آخر کے علاوہ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا۔(حاشیۃ الروضہ۔ ۱/۴۰۶)

فصل۔ترتیب کے متعلق

نماز کے ارکان میں ترتیب واجب ہے عمداً ترتیب ترک کرنے سے نماز باطل ہوگی۔ اگر سہواً ترک ہو تو اس متروکہ (چھوٹے ہوئے) رکن کے بعد کے اعمال کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اسے ادا نہ کرے۔ متروکہ فعل کے مثل ادا کرنے سے قبل یاد آئے تو فوراً اس متروک کو ادا کرے۔(اور آگے بڑھے۔) اور دوسری رکعت میں اس کے مثل ادا کرنے تک یاد نہ آیا تو اس کے ذریعے وہ ادا ہو گیا، اور اس طرح ایک رکعت ہوگئی۔ اور درمیانی اعمال لغو ہوئے۔(ان کو شمار نہیں کرے گے)

مثال۔ پہلی رکعت کا رکوع ترک کرکے آگے بڑھا اب دوسری رکعت کا رکوع کرنے سے پہلے جب بھی یاد آئے فوراً پہلی رکعت کا

رکوع کرے اور پھر ترتیب سے آگے بڑھے۔ دوسری رکعت کے رکوع تک یاد نہ آئے تو دوسری رکعت کا یہ رکوع پہلی رکعت کا رکوع شمار ہوگا۔ درمیان میں جو سجدے وغیرہ ہو چکے ہو غیر معتبر ہیں۔ اب آگے اعتدال سجدے وغیرہ کرے تب پہلی رکعت مکمل ہوگی۔

یہ تفصیل اس وقت ہے کہ چھوٹا ہوا رکن اور اس کی جگہ یاد ہو، ورنہ پھر ادنیٰ ممکن پر عمل کر کے آگے بڑھے۔ ان ساری صورتوں میں سجدہ سہو کرے۔ لیکن از سر نو نماز دہرانی پڑے، مثلاً کوئی رکن چھوٹے اور اس کے نیت یا تکبیر تحریمہ ہونے کا بھی امکان ہو (تو اس صورت میں نماز نئے سرے سے پڑھنا ضروری ہے) تو سجدہ سہو نہ کرے، اسی طرح سلام ترک ہو اور زیادہ وقت گذرنے سے پہلے یاد آجائے تو سلام پھیرے سجدہ سہو کی ضرورت نہیں ہے۔

تشہد اوّل کا ترک: مسئلہ گذر چکا کہ تشہد اول کے ترک سے سجدہ سہو سنت ہے، اگر کوئی دوسری رکعت میں تشہد بھول کر کھڑا ہو گیا یا بیٹھا لیکن تشہد پڑھنا بھول کر کھڑا ہو گیا اور پوری طرح قیام میں پہنچنے کے بعد یاد آیا تو اب تشہد کیلئے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ اگر مسئلہ معلوم ہوتے ہوئے عمداً بیٹھ گیا تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے بیٹھا تو نماز باطل نہ ہوگی، لیکن یاد آتے ہی فوراً کھڑا ہونا واجب ہے۔ امام کھڑا ہو جائے تو مقتدی کو تشہد کیلئے پیچھے رہنا جائز نہیں ہے، اگر پیچھے رہا تو اس کی نماز باطل ہوگی، البتہ امام سے جدائی کی نیت کرے تو جائز ہے۔ امام کے ساتھ مقتدی بھی کھڑا ہوا، پھر امام لوٹ گیا تو اب مقتدی کو لوٹنا جائز نہیں، بلکہ یا تو امام سے جدائی کی نیت کرے (اور اپنی نماز تنہا پوری کرے) یا قیام میں امام کا انتظار کرے، کیونکہ ممکن ہے امام نے بھول سے اس طرح کیا ہو۔ مذکورہ صورت میں جان بوجھ کر مقتدی بھی امام کے ساتھ بیٹھ جائے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ بھول کر یا لاعلمی سے بیٹھے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر مقتدی بیٹھا اور امام کھڑا ہو کر پھر بیٹھ گیا تو مقتدی کیلئے کھڑے ہونا لازم ہے۔ اگر امام تشہد اوّل میں بیٹھے اور مقتدی بھول سے کھڑا ہو جائے یا دونوں کھڑے ہوئے لیکن امام قیام میں پہنچنے سے پہلے یاد آنے کی وجہ سے واپس لوٹا اور مقتدی مکمل کھڑا ہو تو دونوں صورتوں میں مقتدی کو امام کی متابعت میں تشہد کیلئے لوٹنا واجب ہے ورنہ نماز باطل ہوگی۔

بھول کر تشہد اوّل چھوڑ کر اٹھنے کے بعد قیام کی حالت کو پہنچنے سے پہلے یاد آجائے تو تشہد کے لئے واپس لوٹنا مستحب ہے اس صورت میں قیام کے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا تو سجدہ سہو ادا کرے۔ اور قعود (بیٹھنے) کے زیادہ قریب تھا، یا دونوں طرف برابر تھا، تو سجدہ نہ کرے۔ عمداً تشہد اوّل چھوڑ کر اٹھے اور قیام سے زیادہ قریب ہونے کے بعد لوٹے تو نماز باطل ہوگی۔ اور اس سے پہلے ہی لوٹے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ کوئی بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعت کے بعد تلاوت شروع کرے اور اس کا گمان یہ ہو کہ میں تشہد سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اور تیسری رکعت کا وقت آچکا ہے تو اب تشہد کی طرف نہ لوٹے، اگر تشہد کا نہ پڑھنا معلوم ہو اور سبقت لسانی سے تلاوت ہو جائے تو اسے چھوڑ کر تشہد پڑھ سکتا ہے۔

قنوت کے ترک کو بھی تشہد اوّل پر قیاس کریں گے، لہٰذا قنوت بھول کر سجدہ میں پیشانی رکھدے تو اب واپس لوٹنا جائز نہیں ہے، پیشانی زمین پر رکھنے سے پہلے یاد آجائے تو لوٹ سکتا ہے، اب رکوع کی حد تک پہنچنے کے بعد لوٹا ہے تو سجدہ سہو کرے، پہلے ہی لوٹ گیا تو سجدہ نہیں کرے گا۔

زائد رکعت شروع کرنا: چار رکعت والی نماز میں بھول کر پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو جب بھی یاد آئے فوراً بیٹھ جائے، اور سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے چاہے قیام میں یاد آئے یا رکوع یا سجدہ میں۔ بیٹھنے کے بعد یاد آیا تو اب سجدہ کر کے سلام پھیر دے۔ پانچویں رکعت میں یا بیٹھنے کے بعد تشہد پڑھنے سے پہلے یاد آجائے، اور چوتھی رکعت میں تشہد نہیں پڑھا تھا تو اب تشہد پڑھنا واجب

ہے۔ اور چوتھی رکعت میں تشہد پڑھ چکا تھا (چاہے تشہد اول سمجھ کر پڑھا ہو۔) تو اب تشہد کے اعادہ کی ضرورت نہیں، صرف سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ رکوع چھوڑ کر سجدہ میں چلا گیا پھر یاد آیا تو واپس قیام میں لوٹ کر پھر رکوع میں جانا واجب ہے۔

فصل: ایک قاعدہ (اصول اور ضابطہ) جس پر فقہی ابواب میں بارہا عمل ہوتا ہے۔

اصول: کسی چیز کے وجود یا عدم کا یقین ہو، پھر اس کے تغیر و زوال کے متعلق شک ہو جائے، تو سابقہ یقین ہی کو برقرار رکھیں گے، اور شک کو نظر انداز کیا جائے گا۔ لہٰذا اس اصول کی روشنی میں کسی سنت بعض کے متعلق شک ہو تو اصل اس کا انجام نہ دینا ہے، لہٰذا سجدہ سہو کرے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ کسی متعین سنت بعض کے متعلق شک ہو۔ اگر یہ شک ہو کہ کوئی سنت بعض ترک تو نہیں ہوئی، تو اس صورت میں سجدہ سہو نہ کرے۔ جیسا کہ سہو کے ہونے نہ ہونے میں شک ہو تو سجدہ نہیں کریگا۔ کسی ممنوع عمل کے ارتکاب میں شک ہو جیسے بھول کر سلام یا کلام، تو چونکہ اصل عدم ہے (یعنی نہ کرنا) اس لئے سجدہ نہ کرے۔ سہو کا یقین ہو لیکن سجدہ سہو کیا یا نہیں اس میں شک ہے تو سجدہ کرے گا اس لئے کہ اصل سجدہ نہ کرنا ہے۔ یہ شک ہو جائے کہ ایک سجدہ کیا یا دو تو (ایک سمجھ کر) ایک اور سجدہ کرے سہو کا یقین ہے لیکن سبب کے متعلق شک واقع ہو تو سجدہ ادا کریگا۔

رکعت کی تعداد میں شک

اگر شک ہو جائے کہ تین رکعت ہوئی یا چار تو اقل (کم) پر عمل کر کے باقی کو مکمل کرے (اس مثال میں تین رکعت شمار کرے اور چوتھی رکعت پڑھے) اور سجدہ سہو کرے محض گمان اور اجتہاد کا یہاں دخل نہ ہو گا۔ اسی طرح دوسرے کے قول پر بھی عمل نہیں کرینگے اسی طرح امام چوتھی رکعت سمجھ کر کھڑا ہو اور مقتدی پانچویں سمجھ کر اسے لقمہ دیں تو وہ ان کے قول کو اختیار نہیں کرے گا۔ (اگر اُسے بھی یاد آجائے کہ یہ پانچویں رکعت ہے تو اس پر عمل کریگا۔)

نماز ہی میں شک زائل ہو جائے تو شک آنے سے ختم ہونے تک کے اعمال ہر حال میں ضروری تھے تو سجدہ سہو نہ کرے۔ اور ان کے زائد ہونے کا احتمال تھا تو سجدہ کرے مثلاً! ظہر کی نماز میں شک ہوا کہ یہ رکعت تیسری ہے یا چوتھی۔ اور وہ اسی شک کے ساتھ اس رکعت کو مکمل کرے اس ارادے کے ساتھ کہ ایک رکعت اور ملانا ہے لیکن اس رکعت کے شروع کرنے سے پہلے ہی یاد آجائے کہ یہ تیسری ہے یا چوتھی (اور شک دور ہوا) تو اس صورت میں سجدہ نہ کرے۔ اس لئے کہ یہاں شک کے ساتھ جو رکعت ادا ہوئی ہے وہ ہر حال میں ضروری تھی۔ لیکن مزید ایک رکعت کیلئے کھڑا ہونے کے بعد یاد آیا تو سجدہ سہو کرے، چاہے یہ چوتھی ہی رکعت ہو۔ اس لئے کہ کھڑا ہوتے وقت اس کے پانچویں اور زائد ہونے کا احتمال موجود تھا۔

احادیث: آپ ﷺ نے فرمایا! ''کسی کو نماز میں شک ہو کہ کتنی رکعت ہوئی تین یا چار تو شک کو ترک کر کے (نظر انداز کر کے) یقین پر بناء کرے پھر سلام سے قبل دو سجدہ کرے۔ (مسلم ابوداود۔ ترمذی، نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا! ''کسی کو نماز میں بھول ہو اور پتہ نہ چلے کہ ایک رکعت پڑھی یا دو تو ایک پر بناء کرے۔ (ایک سمجھ کر آگے بڑھے) پتہ نہ چلے کہ دو پڑھی یا تین تو دو پر بناء کرے، پتہ نہ چلے کہ تین پڑھی یا چار تو تین پر بناء کرے اور سلام سے قبل دو سجدے کرے''۔ (ترمذی) (تیس یر الوصول)

نماز کے دوران شک: نماز کے دوران رکعات کی تعداد یا کسی رکن کی ادائیگی میں شک ہو، تو اصل یہ ہے کہ اس نے نہیں

کیا، لہٰذا یقین پر عمل کرے، جیسا کہ گذرا۔ لیکن سلام پھیرنے کے بعد اس طرح شک ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اور اسے کسی تلافی کی ضرورت نہیں۔

فصل۔ سجدہ سہو میں تکرار

سہو کے کئی اسباب پائے جائیں تب بھی نماز کے آخر میں صرف دو ہی سجدے کرینگے۔ حقیقتاً سجدہ سہو میں تکرار نہیں ہو گا۔ لیکن بعض مسائل میں صورۃً سجدہ سہو میں تکرار ہو گا۔

(۱) مسبوق امام کے ساتھ سجدہ سہو کرنے کے بعد اپنی نماز کے آخر میں بھی سجدہ سہو کرے گا۔

(۲) جمعہ کی نماز میں سہو ہو اور سجدہ کرے پھر سلام سے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو جائے کہ ظہر کا وقت نکل چکا ہے تو مزید دو رکعت ظہر کی نیت سے ملالیں گے۔ اور آخر میں پھر سجدہ سہو کرینگے۔

(۳) اس گمان سے سجدہ کیا کہ کچھ سہو ہوا تھا، پھر سلام سے پہلے ہی یہ بات واضح ہو جائے کہ سہو نہیں ہوا تھا تو اب سجدہ سہو کرے۔ (کیونکہ پہلے دو سجدے بے محل اور زائد تھے)

(۴) مسافر نماز قصر میں سہو کی وجہ سے سجدہ کرے پھر سلام سے قبل مکمل نماز کی نیت کرے یا کشتی اپنی بستی میں پہنچنے کی وجہ سے وہ مقیم ہو جائے تو اب مکمل نماز پڑھ کے پھر سجدہ کرے۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں سجدہ سہو کا اعادہ نہ کرے۔

(۱) سجدہ سہو کے درمیان یا بعد میں سلام سے قبل بھول کر کلام کرے۔

(۲) غلطی سے سہو کے تین سجدے کرے۔

(۳) سہو کے سجدے ایک کیا یا دو شک ہوا، اس لئے ایک ٹھہرا کر دوسرا سجدہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ دو سجدے کر چکا تھا۔ (اور یہ تیسرا ہے)

(۴) اس گمان سے سجدہ کیا کہ سہو قنوت کے ترک کی وجہ سے تھا پھر یاد آیا کہ کچھ اور سبب تھا۔

فصل۔ مقتدی کے سہو کے متعلق: بحالت اقتداء صرف مقتدی کو سہو ہو تو سجدہ نہ کرے، اس کا سہو امام اٹھالے گا۔ (یعنی امام کی وجہ سے اس کی تلافی ہو جائے گی) امام کے سلام کے بعد سہو ہو تو امام نہیں اٹھائے گا (بلکہ یہ سجدہ سہو کرلے) ابتداء سے امام کے ساتھ شامل مقتدی امام کے سلام کے بعد بھول سے کلام کرے تو اب یہ سجدہ سہو کرے۔ اسی طرح منفرد سے سہو ہو پھر وہ کسی جماعت میں شامل ہو تو امام اس سہو کو نہیں اٹھائے گا (وہ آخر میں اپنا سجدہ کرلے) مقتدی یہ سمجھ کر سلام پھیرے کہ امام سلام پھیر چکا ہے پھر پتہ چلا کہ اس نے سلام نہیں پھیرا، تو اب اس کے ساتھ سلام پھیرے، سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سہو اقتداء کی حالت میں ہوا ہے۔ تشہد میں یاد آجائے کہ اس نے رکوع یا سورہ فاتحہ بھول کر چھوڑ دی تھی تو امام کے سلام کے بعد ایک رکعت پڑھنا لازم ہے، لیکن سجدہ نہ کرے، کیونکہ بحالت اقتداء بھول ہوئی ہے۔ مسبوق سہواً امام کے ساتھ سلام پھیرے پھر یاد آئے تو اسی نماز پر بنا کرے (یعنی آگے کی بقیہ رکعات پڑھ لے) اور سجدہ کرے اس لئے کہ یہ سہو اقتداء کے ختم ہونے کے بعد ہوا ہے۔ مسبوق کو یوں محسوس ہوا کہ امام سلام پھیر چکا ہے، مثلاً کچھ آواز سنائی دی اور وہ سمجھا کہ امام کے سلام پھیرنے کی آواز ہے اس لئے اپنی بقیہ نماز پوری کرنے کھڑا ہوا اب مثلاً اس کے

ذمہ ایک رکعت باقی تھی وہ مکمل کر کے بیٹھا تو پتہ چلا کہ ابھی امام نے سلام نہیں پھیرا اور اس کا گمان غلط تھا تو یہ رکعت چونکہ غیر محل میں ادا ہوئی ہے اس لئے اسے شمار نہیں کرینگے۔ کیونکہ بقیہ رکعت کی ادائیگی کا وقت اقتداء ختم ہونے کے بعد ہے۔ لہٰذا اب امام کے سلام کے بعد بقیہ نماز مکمل کرے، اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں کیونکہ اقتداء کا حکم باقی تھا۔ اس مسئلہ میں اگر اس کے کھڑے ہونے کے بعد امام سلام پھیر دے تو اسے چاہیئے کہ واپس تشہد میں بیٹھ جائے اور پھر کھڑا ہو۔ لیکن امام کے سلام کا اسے علم نہ ہوا، یہاں تک کہ وہ رکعت مکمل کر لی، تو یہ رکعت شمار نہیں ہوگی۔ (پھر ایک رکعت پڑھے) اور سجدہ سہو ادا کرے۔ کیونکہ امام کے سلام کے بعد زیادتی پائی گئی۔

فصل۔ امام کا سھو: امام سے نماز میں سہو ہو تو وہ سہو مقتدی کو بھی لاحق ہوگا۔ (یعنی مقتدی سے سہو نہ بھی ہو تو امام کے سہو کی وجہ سے وہ بھی سجدہ سہو کریگا) البتہ دو صورتیں مستثنٰی ہیں۔

(۱) امام کا بے وضو ہونا معلوم ہو جائے تو صرف اس کے سہو کی وجہ سے مقتدی سجدہ نہ کرے۔ اور اس صورت میں مقتدی کا سہو امام بھی نہیں اٹھائے گا۔ (لہٰذا مقتدی سے کچھ سہو ہوا تو وہ اپنا سجدہ سہو کرے)

(۲) مقتدی کو امام کے سجدہ کا سبب معلوم ہو اور اس کی غلطی کا یقین ہو جیسے امام کا گمان ہو کہ میں نے کسی سنت کو ترک کیا ہے۔ اور مقتدی کو معلوم ہو کہ وہ سنت ترک نہیں ہوئی تو سجدہ میں امام کی موافقت نہ کرے۔

ان دو صورتوں کے علاوہ امام سجدہ سہو کرے تو مقتدی کو اس کی موافقت لازم ہے۔ عمداً موافقت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ چاہے امام کے سہو کا مقتدی کو پتہ ہو یا نہ ہو، پس جب بھی امام اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے مقتدی کو اس کی اتباع واجب ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے کچھ سہو ہوا ہوگا۔ لیکن امام پانچویں (زائد) رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو مقتدی یہ سوچ کر کہ شاید اس سے کوئی رکن چھوٹ گیا ہوگا، اس کی اتباع نہ کرے، کیونکہ اس صورت میں حقیقت حال کی تحقیق کے باوجود اتباع جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مقتدی بالیقین اپنی نماز مکمل کر چکا ہے۔ اگر مقتدی مسبوق ہو یا کسی رکن مثلاً سورۂ فاتحہ کے ترک میں اسے شک ہو اور امام پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہو، تو مقتدی کو اس کی اتباع جائز نہیں ہے۔ اگر امام ایک ہی سجدہ کرے تو مقتدی دوسرا بھی کرے کہ شاید امام بھولا ہو، اگر امام سجدہ سہو ترک کرے تو مقتدی سجدہ کر لے۔ امام سلام پھیرے اور مقتدی بھی (سجدہ سہو) بھول کر اس کے ساتھ سلام پھیرے، پھر امام سجدہ کرے تو مقتدی بھی اس کی اتباع کرے۔

اگر مقتدی سہو کا علم ہوتے ہوئے عمداً سلام پھیرے تو اسے امام کی اتباع لازم نہیں ہے۔ امام کے سلام کے بعد مقتدی سلام نہ پھیرے اور سجدہ سہو کرے پھر امام لوٹ کر سجدہ کرے تو مقتدی اس کی اتباع نہ کرے اور مقتدی کے سجدہ سے پہلے ہی امام سجدہ کی طرف لوٹے تب بھی مقتدی اس کی اتباع نہ کرے، بلکہ تنہا اپنا سجدہ ادا کرے، سہو کے بعد امام کو حدث ہو جائے تو مقتدی اپنی نماز مکمل کر کے سجدہ سہو کرے، اگر صرف مقتدی کو سہو ہونے کے بعد امام کو حدث ہو تو مقتدی کو سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ امام سہواً پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہو، اور اس کے رکوع کی حد تک پہنچنے کے بعد مقتدی نے اس سے جدائی کی نیت کی تو مقتدی سجدہ سہو کرے اور رکوع کی حد سے پہلے ہی جدائی کی نیت کر لی تو اب سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر امام حنفی ہو اور (اپنے مسلک کے مطابق) سجدہ سہو سے پہلے سلام پھیرے تو مقتدی اس کے ساتھ سلام نہ پھیرے بلکہ اپنے سلام سے قبل سجدہ سہو کرے۔ اور امام کے سجدہ کے انتظار کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے سلام کے وجہ سے دونوں میں جدائی ہو چکی۔

مسبوق کے امام کے ساتھ شامل ہونے سے قبل یا شامل ہونے کے بعد امام سے سہو ہو اور امام اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے تو مقتدی (مسبوق) کو اس کے ساتھ سجدہ کرنا لازم ہے، بعد میں اپنی نماز کے آخر میں بھی سجدہ سہو کرے گا، اور امام سجدہ نہ کرے تو صرف

اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے گا۔

فصل۔ سجدہ سہو کی کیفیت اور محل کے متعلق

سہو کے دو سجدے ہیں، درمیان میں افتراش کی ہیئت پر بیٹھے، دوسرے سجدے کے بعد سلام پھیرنے تک تورک کی ہیئت پر بیٹھے، اس سجدے کے واجبات اور مستحبات وہی ہیں جو نماز کے سجدے کے ہیں۔ بعض ائمہ نے ان دونوں سجدوں میں "سُبْحَانَ مَنْ لَّا يَنَامُ وَلَايَسْهُوْ" (ترجمہ پاک ہے وہ ذات جو نہ سوتی ہے اور نہ بھولتی ہے) پڑھنا مستحب سمجھا ہے، اور یہ ذکر مناسب حال ہے۔ (لیکن حافظ ابن حجرؒ تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت مجھے نہیں ملا۔ (حاشیۃ الروضہ) آخری تشہد درود و دعا سے فارغ ہونے کے بعد اور سلام پھیرنے سے قبل سجدہ سہو کا محل ہے۔ اگر عمداً سجدہ سے قبل سلام پھیرا تو سجدہ فوت ہو گیا۔ اسی طرح سہواً سلام پھیرنے کے بعد کافی وقت گذر گیا تو سجدہ فوت ہو گیا، اب سجدہ نہ کرے لیکن سہواً سلام کے بعد جلد ہی یاد آئے اور سجدہ نہ کرنا چاہے تو نہ کرے اس کی نماز صحیح ہے (کیونکہ سجدہ سہو سنت ہے) اور سجدہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور یہ بہتر ہے۔ لیکن ان صورتوں میں سجدہ نہیں کر سکتا: جمعہ کا سلام پھیرتے ہی وقت نکل جائے، قصر پڑھنے والا سلام کے بعد اقامت کی نیت کرے، تیمم کر کے نماز پڑھنے والے کو سلام پھیرتے ہی پانی نظر آئے، یا موزے پر مسح کی مدت ختم ہو جائے یا دائم الحدث شفاء پائے۔ (حاشیۃ الروضہ ۴۲۰)

سجدہ کرنے کی صورت میں وہ دوبارہ نماز میں داخل سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اس صورت میں درج ذیل مسائل کا ترتب ہو گا۔

(۱) اگر عمداً کلام کیا یا حدث ہوا تو نماز باطل ہو گی (۲) جمعہ میں سجدہ کی طرف لوٹنے کے بعد جمعہ کا وقت نکل جائے تو جمعہ فوت ہو گی۔ (اور اب ظہر مکمل کرنا پڑے گی) (۳) مسافر قصر پڑھ رہا تھا اور سجدہ میں مکمل نماز کی نیت کی تو اب پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔ اس طرح سجدہ کی طرف لوٹنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ اور دوبارہ تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ سلام پھیرنا لازم ہے۔

بعض متفرق مسائل

(۱) نفل نماز میں سہو کا حکم فرض ہی کی طرح ہے۔ (۲) ایک نماز کا سلام پھیر کر دوسری نماز شروع کرنے کے بعد یقین ہوا کہ پہلی نماز کا ایک رکن چھوٹ گیا ہے، تو یہ دوسری نماز منعقد نہ ہو گی، پہلی نماز کے بعد زیادہ دیر نہیں گذری تو اسی پر بناء کرے ورنہ از سر نو اس نماز کو پڑھ لے۔ (۳) چار رکعت والی نماز میں تشہد کی حالت میں شک ہوا کہ یہ پہلا تشہد ہے یا دوسرا اور اسی شک کی حالت میں تشہد پڑھ کر کھڑا ہوا پھر شک دور ہوا تو سجدہ سہو ادا کرے، چاہے پہلا تشہد ثابت ہو یا آخری۔ کیونکہ پہلا تشہد ہونے کی صورت میں بھی اس کا یہ قیام زیادتی کے شک کے ساتھ تھا۔ تشہد میں بیٹھا ہوا ہی تھا اور شک دور ہوا تو سجدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (۴) مسافر قصر کی نیت کرے اور بھول کر چار رکعت پڑھے اور ہر رکعت میں ایک ایک سجدہ بھول جائے تو اسے دو رکعت حاصل ہوئی اب سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے، اس کی نماز مکمل ہے۔ اسے مکمل نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اس کی نیت نہیں کی ہے۔ اسی طرح جمعہ کی نماز بھول کر اس طرح چار رکعت پڑھے تو سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ (۵) فجر کے علاوہ کسی نماز میں قنوت نازلہ کا ارادہ تھا لیکن بھول گیا، تو اس کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے۔ (۶) کسی نماز میں داخل ہونے کے بعد یوں خیال ہوا کہ تکبیر تحریمہ نہیں کہی، اس لئے دوبارہ تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کی پھر یاد آیا کہ پہلی نماز میں تکبیر تحریمہ کہہ چکا تھا تو اب اگر دوسری نماز سے فارغ ہونے کے بعد یاد آیا تو پہلی نماز فاسد نہیں ہوئی اور دوسری نماز کے ذریعہ مکمل ہوئی۔ دوسری نماز سے فارغ ہونے سے قبل یاد آئے تو پہلی نماز کی طرف لوٹ کر اسے مکمل کرے۔

سجدہ تلاوت

احادیث:(۱) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب ابن آدم سجدہ (کی آیت) تلاوت کر کے سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا وہاں سے ہٹتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا لہٰذا اسے جنت ملی اور مجھے سجدے کا حکم ہوا اور میں نے نافرمانی کی اس لئے مجھے جہنم ملی۔ (رواہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ ہمارے سامنے قرآن پڑھتے جب سجدہ آتا۔ تو تکبیر کہہ کر سجدہ ریز ہوتے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرتے۔ (ابو داود الحاکم)

(۳) آپ ﷺ نے ایک مرتبہ سورۂ النجم میں سجدہ نہ فرمایا۔ (متفق علیہ) اس سے معلوم ہوا کہ سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے۔

(۴) ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ میں سورۂ نحل کی تلاوت کی جب آیت سجدہ پر پہنچے تو فرمایا! اے لوگو! ہم سجدہ کی آیت پڑھتے ہیں تو جو سجدہ کرے اس نے ٹھیک کیا، اور جو سجدہ نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ نہیں کیا ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں اللہ نے سجدہ فرض نہیں کیا ہے الّا یہ کہ ہم چاہیں۔ (بخاری)

سجدۂ تلاوت سنت ہے اور ان کی تعداد ۱۴ ہے۔ سورۂ ص کا سجدہ شکر کا سجدہ ہے۔ جو خارج نماز مستحب ہے۔ کیونکہ نسائی شریف کی روایت میں ہے کہ سیدنا داود علیہ السلام نے یہ سجدہ توبہ کی قبولیت پر کیا اور ہم شکراً کرتے ہیں۔ (فتح الوہاب) نماز میں یہ سجدہ عمداً کرنے سے نماز باطل ہوگی بھول کر یا لاعلمی کے وجہ سے کرے تو نماز باطل نہ ہوگی لیکن سجدہ سہو کرنا سنت ہے۔ اگر امام (مثلاً حنفی ہے اور) سورۂ ص میں سجدہ کرے تو مقتدی اتباع نہ کرے بلکہ اس سے جدائی کی نیت کرے۔ (اور آگے اپنی نماز تنہا مکمل کرے) یا قیام میں اس کا انتظار کرے۔ امام ابھی قیام کے حد میں ہو، اور مقتدی جدائی کی نیت کرے تو سجدہ سہو نہ کرے اگر امام کا انتظار کرے یا رکوع کی ہیئت سے قریب ہونے کے بعد جدائی کی نیت کرے تو سجدۂ سہو کرنا مسنون ہے۔ (نہایۃ المحتاج۔ ۹۵/۲)

سجدہ کی آیات واضح اور مشہور ہیں۔ حم السجدہ میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ (لَا يَسْئَمُوْنَ) (فُصِلَّتْ: آیت ۳۸) پر سجدہ کرے۔

سجدہ کی آیت تلاوت کرنے والے کیلئے، (جبکہ اس کی تلاوت مشروع ہو، ناجائز نہ ہو)، غور سے بالقصد کان لگا کر اسے سننے والے کے لئے (جبکہ سننا اس کیلئے مطلوب اور مستحب ہو) اور بلا قصد آیت سننے والے کے لئے سجدہ تلاوت سنت ہے، لیکن بالقصد سننے والے کے حق میں تاکید زیادہ ہے۔ چاہے پڑھنے والا نماز میں پڑھے یا خارج نماز۔ بے وضو بچہ اور کافر کی تلاوت سننے والے کی لئے سجدہ تلاوت سنت ہے۔

امام بلقینی اور زرکشی نے فرمایا کہ فرشتہ اور جن کی تلاوت پر سجدہ سنت ہے جنبی، نشہ میں مست، بھول کر پڑھنے والے، نیند میں پڑھنے والے، کسی تربیت یافتہ پرندہ مثلاً طوطے کی تلاوت، نماز جنازہ کے اندر تلاوت، عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں تلاوت، اور رکوع جیسے حالات میں تلاوت، کی صورت میں سجدہ تلاوت، نہ کرے، کیونکہ یہ سب غیر مشروع تلاوت ہیں (نہایۃ المحتاج ۹۶/۲) تلاوت کرنے والا سجدہ نہ کرے تب بھی سننے والے کیلئے سجدہ مسنون ہے۔ البتہ اس کے کرنے پر تاکید بڑھ جائیگی۔

تنہا نمازی اپنی قرأت کی وجہ سے سجدہ کرے گا۔ سجدہ کے بغیر رکوع میں چلا گیا پھر سجدہ کرنے کا ارادہ ہو تو نہیں کر سکتا۔ رکوع کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی ارادہ کرے تو جائز ہے۔ سجدہ تلاوت کیلئے جھکا پھر ارادہ بدل کر واپس لوٹا تو یہ جائز ہے۔ جیسے کوئی تشہد اول تھوڑا پڑھے اور اسے مکمل نہ کرے تو یہ جائز ہے۔ تنہا نمازی کسی اور کی تلاوت کی طرف توجہ دے۔ (چاہے وہ نماز میں ہو یا نہ ہو) تو اس کی تلاوت پر سجدہ نہ کرے، کیونکہ اسے یہ توجہ ممنوع ہے، اگر سجدہ کرے گا تو نماز باطل ہو گی۔ اگر امام ہے تو مذکورہ مسائل میں وہ بھی منفرد (تنہا نمازی) کی طرح ہے۔ امام کو جہری یا سری نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ نہیں ہے۔ (لیکن نماز میں سجدہ کی نیت سے اس طرح تلاوت کرنے میں کچھ تفصیل ہے۔ جس کا بیان آرہا ہے۔)

امام سجدۂ تلاوت کرے تو مقتدی بھی کرے، ورنہ اس کی نماز باطل ہو گی۔ امام سجدہ نہ کرے تو مقتدی بھی نہ کرے ورنہ اس کی نماز باطل ہو گی۔ نماز کے بعد اس سجدہ کی تلافی کر لینا بہتر ہے (جبکہ زیادہ دیر نہ گزری ہو۔ جمل)۔ امام سجدہ میں جائے اور مقتدی کو پتہ نہ چلا یہاں تک کہ اس نے سجدے سے سر اٹھا لیا تو اب مقتدی سجدہ نہ کرے۔ ابھی امام سجدہ میں ہو، اور مقتدی کو معلوم ہوا تو وہ بھی سجدہ کرے۔ مقتدی کے جھکنے کی حالت میں ہی امام سر اٹھائے تو مقتدی اس کے ساتھ واپس لوٹ جائے اور سجدہ نہ کرے۔ اسی طرح کوئی کمزور شخص امام کے ساتھ سجدہ تلاوت کیلئے جھکے لیکن اپنی سست حرکت کی وجہ سے اس کے زمین تک پہنچنے سے قبل ہی امام سر اٹھائے تو یہ امام کے ساتھ لوٹ جائے، اور سجدہ نہ کرے۔ مقتدی اپنی تلاوت کی وجہ سے سجدہ نہیں کر سکتا، بلکہ اسے آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ ہے۔ امام کے علاوہ کسی دوسرے کی قرأت کی وجہ سے مقتدی سجدہ نہ کرے، بلکہ کسی اور کی تلاوت کی طرف توجہ دینا اسے مکروہ ہے۔ مقتدی اپنی تلاوت یا امام کے علاوہ کسی اور کی تلاوت پر سجدہ کرے تو اس کی نماز باطل ہو گی۔

سجدہ کی آیت دوہرانا

ایک ہی جگہ سجدہ کی آیتوں کو پڑھے تو ہر ایک کیلئے سجدہ کرے، ایک ہی آیت سجدہ دوبار ایک مجلس میں تلاوت کرے اور پہلی مرتبہ سجدہ نہیں کیا تو اب ایک سجدہ کافی ہے۔ پہلی مرتبہ سجدہ کیا تو دوسری مرتبہ پھر کرے۔ نماز میں ایک ہی رکعت میں آیت سجدہ کو دوہرائے تو ایک مجلس کی طرح ہے۔ اور دو رکعتوں میں دوہرائے تو دو مجلس کی طرح ہے۔

فصل۔ سجدۂ تلاوت کے شرائط اور اس کی کیفیت

طہارت، ستر عورت اور استقبال قبلہ وغیرہ شرائطِ نماز سجدۂ تلاوت کیلئے بھی ضروری ہیں۔ سجدہ کی کیفیت کی دو حالتیں ہیں
(۱) خارج نماز (۲) داخل نماز

(۱) خارج نماز سجدہ کیلئے پہلے سجدۂ تلاوت کی نیت واجب ہے۔ اور تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھا کر ایک تکبیر کہے پھر دوسری تکبیر بغیر ہاتھ اٹھائے کہتے ہوئے سجدہ میں جائے پہلی تکبیر ضروری ہے اور دوسری مستحب، سجدہ کیلئے کھڑا ہونا مستحب نہیں ہے۔ (جائز ہے)

سجدۂ تلاوت کے اذکار

سجدہ میں یہ ذکر مستحب ہے: "سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَ شَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ" **ترجمہ:** میرا چہرہ اس ہستی کے روبرو سجدہ ریز ہوا جس نے اس کی تخلیق اور صورت گری فرمائی، اور اپنی قدرت و قوت سے

اس میں سننے و دیکھنے کی طاقت پیدا فرمائی۔(رواہ احمد و اصحاب السنن والدارقطنی والحاکم والبیہقی و صححہ ابن السکن)(ابن السکن کی روایت میں تین مرتبہ پڑھنے کا ذکر ہے۔امام حاکم نے آخر میں ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنَ اللّٰهُ الْخَالِقِيْنَ'' کا اضافہ فرمایاہے۔(تلخیص الحبیر ۱۰/۲)

یہ ذکر بھی پڑھنامستحب ہے۔''اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْراً وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْراً، وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْراً وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗد''(الترمذی والحاکم وابن حبان وابن ماجہ)

ترجمہ: ''یا اللہ اس (سجدہ) کی وجہ سے تو اپنے یہاں میرے حق میں نیکی لکھ دے،اوراسے تیرے پاس میرے لئے ذخیرہ بنا،اوراسکے ذریعے میرا گناہ معاف فرما،اور مجھ سے قبول فرما جیسے تونے اپنے بندے داود علیہ السلام سے اسے قبول فرمایا''اگر نماز کے سجدہ کے اذکار پڑھے تو جائز ہے۔پھر تکبیر کہتاہوا سر اٹھائے اور سلام پھیرے سلام پھیرنا فرض ہے،تشہد وغیرہ نہ پڑھے۔

نماز میں سجدۂ تلاوت کیلئے تکبیر تحریمہ کی ضرورت نہیں ہے۔نماز کے سجدہ کی طرح بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیر کہتاہوا سجدہ میں جائے اور تکبیر کہتاہوا سجدہ سے اٹھے،اور یہاں بھی اوپر کے اذکار پڑھنا مستحب ہے سجدہ تلاوت سے اٹھنے کے بعد سیدھا کھڑا ہو جائے،جلسۂ استراحت میں نہ بیٹھے،اٹھنے کے بعد کچھ تلاوت کرکے پھر رکوع میں جانا مستحب ہے۔پوری طرح کھڑے ہوکر پھر رکوع میں جانا واجب ہے۔(پورا کھڑا ہوکر بغیر تلاوت کے رکوع میں جائے تو یہ بھی جائز ہے)

فصل

آیت سجدہ کے پڑھنے یا سننے کے فوراً بعد ہی سجدہ کرلینا چاہئے،کچھ تاخیر ہو جائے تو سجدہ کرلے،زیادہ تاخیر ہو جائے تو سجدہ فوت ہو جائے گا،اب اس کی تلافی اور قضاء نہ کرے،آیت کی تلاوت کے وقت بے وضو تھا پھر فوراً وضو کیا تو سجدہ کرلے،تاخیر ہو گئی ہو تو نہ کرے۔نماز میں سورہ فاتحہ سے قبل آیت سجدہ پڑھے تو سجدہ کرے،بخلاف اس کے رکوع یا سجدہ میں پڑھے تو سجدہ نہ کرے۔آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیلئے جھکنے کے بعد سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کے متعلق شک ہو تو سجدہ مکمل کرکے پھر قیام میں آکر سورۂ فاتحہ پڑھ لے،خارج نماز فارسی (یا کسی اور زبان میں) آیت سجدہ پڑھے تو سجدہ نہ کرے۔تلاوت کرنے والے کے ساتھ سننے والا سجدہ کرے تو یہ اس کے اقتداء کی نیت نہ کرے۔سننے والا اس سے قبل بھی سجدہ سے سر اٹھا سکتا ہے۔صرف سجدہ کرنے کی نیت سے ایسی ایک دو آیت یا سورت کی تلاوت کرنا جس میں سجدہ ہو،اس کا حکم یہ ہے کہ اگر نہ نماز میں ہو اور نہ مکروہ اوقات میں تو کوئی حرج نہیں۔اگر نماز میں یا مکروہ اوقات میں ایسا کرے تو مکروہ ہے۔(اور ممانعت جانتے ہوئے نماز میں اس طرح تلاوت کرے اور سجدہ کرے تو نماز باطل ہو گی۔لیکن جمعہ کی فجر میں چونکہ حدیث کی رو سے الم سجدہ کی تلاوت سنت ہے اس لئے وہ مستثنیٰ ہے۔نہایۃ المحتاج ۹۷/۱)مذکورہ کراہت کا حکم اس وقت ہے جبکہ تلاوت سے سجدہ کے علاوہ اور کچھ مقصود نہ ہو،ورنہ قطعاً کوئی کراہت نہیں۔نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کے بعد سجدہ نہ کرے تو سلام پھیرنے تک اگر زیادہ فاصلہ نہیں ہوا تو سلام کے بعد سجدہ کرے (زیادہ دیر ہو چکی ہو تو اب سجدہ نہ کرے)

آیت سجدہ مکمل ہونے سے قبل سجدہ کرے تو صحیح نہیں،خواہ ایک ہی حرف پہلے کرے،آیت سجدہ کے بعد چند آیات اور پڑھے اور زیادہ تاخیر نہ ہو تو سجدہ کرسکتا ہے۔سجدہ تلاوت میں آیت سجدہ تلاوت کرے تو دوسرا سجدہ نہ کرے۔سری نماز میں امام آیت سجدہ تلاوت کرے تو نماز کے فراغت تک سجدہ مؤخر کرنا مستحب ہے۔(اسی طرح جہری نماز میں تلاوت مقتدیوں کی تشویش کا احتمال ہو تو موخر

کرے۔نہایۃ المحتاج)اگر خطیب آیت سجدہ پڑھے تو علماء نے اسے سجدہ نہ کرنا مستحب قرار دیا ہے، منبر سے اترنے اور چڑھنے کی تکلیف کے پیش نظر۔ نماز جنازہ میں آیت پڑھے تو نہ نماز میں سجدہ کرے اور نہ بعد نماز اصل یہ ہے کہ غیر مشروع تلاوت میں سجدہ نہ کرے۔

سجدہ شکر

احادیث:(۱)آپ ﷺ کے پاس کوئی خوش کن معاملہ آتا تو آپ ﷺ (بطور شکر) سجدہ ریز ہو جاتے (رواہ ابوداود وابن ماجہ والترمذی وقال حدیث حسن غریب)

(۲)آپ ﷺ کو کسی حاجت کی بشارت سنائی گئی تو آپ ﷺ سجدہ میں گر پڑے۔(ابن ماجہ)

(۳)آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بشارت سنائی اور فرمایا: آپ کے رب نے آپ سے کہا ہے۔ جو آپ پر درود پڑھے میں اس پر درود بھیجوں گا۔ جو آپ پر سلام بھیجے میں اس پر سلام بھیجوں گا۔ تو میں نے بطور شکر سجدہ کیا۔(احمد حاکم بیہقی وحسنہ الالبانی)

(۴)جب آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خط آیا کہ قبیلہ ہمدان نے اسلام قبول کیا ہے تو آپ ﷺ سجدے میں چلے گئے۔(رواہ البیہقی وصححہ)

(۵)جب یمامہ فتح ہوا۔(اور مسیلمہ کذاب مارا گیا) تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سجدے میں گر پڑے۔(ابن ابی شیبہ و بیہقی)

(۶)خوارج کے مردوں میں (آپ ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق) ذاالثدیہ ملا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سجدہ میں چلے گئے (کیونکہ حدیث کی روسے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برحق ہونے کی دلیل تھی۔(ابن ابی شیبہ، بیہقی، احمد)

(۷)غزوہ تبوک سے تخلف کے بعد جب حضرت کعب بن مالک کو توبہ کی قبولیت کی خوشخبری سنائی گئی تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ (متفق علیہ)(ارواء الغلیل للالبانی ۲/۲۲۶)

سجدۂ شکر سنت ہے اچانک کسی نعمت کے حصول پر (جیسے بچہ کی پیدائش، مال کا حصول، غائب کا آجانا یا دشمن پر غلبہ) یا کسی مصیبت کے ٹلنے پر (جیسے ڈوبنے یا جلنے سے نجات) یا کسی مصیبت زدہ کو یا فسق وفجور کے مرتکب کو دیکھ کر۔ نعمتوں کے استمرار (دوام کے ساتھ پائے جانے) کی وجہ سے سجدہ سنت نہیں ہے۔ کسی نعمت کی وجہ سے یا ایسے مصیبت سے نجات کی وجہ سے جس کا دوسرے سے تعلق نہ ہو، سجدہ کرے تو اس کا اظہار مستحب ہے۔ مصیبت کا دوسرے سے تعلق ہو اور اس میں وہ معذور نہ ہو جیسے فاسق تو اس کے سامنے سجدہ کرلے شاید کہ اسے توبہ کی توفیق ہو۔ لیکن وہ معذور ہو (جیسے اپاہج وغیرہ) تو مخفی سجدہ کرے، تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ سجدہ شکر کیلئے نماز کے شرائط ضروری ہیں۔ اور اس کی کیفیت خارج نماز سجدہ تلاوت کی طرح ہے۔ نماز میں سجدہ شکر کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے نماز میں سجدہ شکر سے نماز باطل ہو گی۔ اگر نماز میں آیت سجدہ اس نیت سے پڑھے کہ اس آیت پر سجدہ شکر کرے تو یہ حرام ہے۔ اور اس سجدہ سے نماز باطل ہو گی۔ سواری پر نفل نماز میں یا خارج نماز سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر صرف جھک کر ادا کرنا جائز ہے۔ پیدل مسافر باقاعدہ زمین پر سجدہ کرے جیسا کہ نفل نماز میں کرتا ہے۔ مذکورہ صورتوں میں سجدہ شکر کے ساتھ بطور شکر صدقہ وخیرات کرنا اور نماز پڑھنا مسنون ہے (لیکن محض نفل کی نیت سے نماز پڑھے، نماز شکر کی نیت نہ کرے۔ حاشیۃ التحفہ) سجدہ شکر کے سبب کے بعد عرفاً زیادہ فاصلہ ہو جائے تو پھر یہ فوت ہو جائے گا اب اس کی قضاء نہ کرے۔

بغیر سبب کے سجدہ یا رکوع

بغیر کسی سبب کے صرف سجدہ یا رکوع کے ذریعہ تقرب حرام ہے، چاہے نماز کے بعد ہو یا کسی اور وقت (یعنی سجدہ تلاوت یا شکر کے علاوہ عبادت سمجھ کر صرف سجدہ یا رکوع حرام ہے) بعض جاہلوں کا اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرنا قطعاً ہر حال میں حرام ہے۔ قبلہ رو کرے یا کسی اور طرف اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کی نیت ہو، یا نہ ہو بعض صورتوں میں تو کفر ہو جاتا ہے۔ "عافانا اللہ تعالیٰ"

باب: نفل نمازوں کا بیان

سنت ، مستحب ، مَنْدُوْب، تَطَوُّع، نَفْل ، مُرَغَّبٌ فِيْهِ اور حَسَنٌ ان سارے الفاظ کا مفہوم (فی الجملہ) ایک ہی ہے، یعنی جس کا انجام دینا شرعاً ترک کرنے کے مقابلہ میں راجح ہو اور ترک کرنا جائز ہو (یعنی جس کی ادائیگی میں ثواب ہو اور ترک میں گناہ نہ ہو) فرض کا ثواب نفل کے مقابلہ میں ستر گنا زائد ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے۔ جس کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ فرائض کی کمی کو پورا کرنے اور عذر کی وجہ سے ترک شدہ فرائض کی قیامت میں تلافی کیلئے نوافل کو مشروع کیا گیا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں ہے۔ "نماز اور زکوۃ وغیرہ کے فرائض مکمل نہ ہوں تو نوافل سے ان کی تکمیل کی جائیگی" کلمہ شہادت کے بعد باقی عبادات میں سب سے افضل نماز ہے۔ فرض نماز تمام فرائض میں افضل، اور نفل نماز تمام نوافل میں افضل ہے۔ نماز کے بعد روزہ پھر حج پھر زکوۃ افضل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرفاً پہلے کی کثرت دوسرے کے صرف مؤکدات پر اقتصار کے ساتھ افضل ہے، ورنہ ایک روزہ دو رکعت نماز سے افضل ہے (تحفۃ المحتاج ۵۱۱/۲)

نوافل کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس میں جماعت سنت ہے، جیسے عیدین، سورج گہن اور چاند گہن کی نماز استسقاء کی نماز ان نمازوں کا ذکر مستقل ابواب میں ہو گا۔

(۲) جس میں جماعت سنت نہیں ہے اس میں فرائض کے آگے پیچھے پڑھی جانے والی سنتیں داخل ہیں۔ ان سنتوں کو رواتب کہا جاتا ہے۔

سنن رواتب: (۱) فجر سے قبل دو رکعت، ان کو ہلکی پڑھنا سنت ہے پہلی رکعت میں "سورہ کفرون" اور دوسری میں سورہ اخلاص یا پہلی میں سورہ بقرہ کی ایک آیت "**قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ**" الخ۔ (آیت ۱۳۶) اور دوسری میں سورۂ آل عمران کی ایک آیت۔ "**قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا**" (آیت ۶۴) پڑھنا سنت ہے۔ سنت فجر کے بعد لیٹنا سنت ہے۔ کسی بھی طرح لیٹنے سے اصل سنت حاصل ہو گی۔ لیکن دائیں کروٹ قبلہ رو لیٹنا افضل ہے۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے قبر میں اس طرح لیٹنا یاد آجائے، اور آدمی اعمال صالحہ کے ذریعہ اس جگہ کی کامیابی کی پوری کوشش کرے، اگر نہ لیٹے تو ذکر و تلاوت یا گفتگو یا جگہ کی تبدیلی کے ذریعہ سنت اور فرض میں فصل کرے۔ اگر اسے قضاء پڑھے یا فرض فجر کے بعد پڑھے، تب بھی اس کے بعد لیٹنا سنت ہے۔

(۲) ظہر سے قبل چار رکعت اور ظہر کے بعد چار رکعت جس میں پہلے اور بعد میں دو دو رکعت مؤکد اور دو دو غیر مؤکد ہیں۔ جمعہ کی نماز کا بھی یہی حکم ہے۔ (۳) عصر سے قبل چار رکعت۔

(۴) مغرب سے قبل دو رکعت اور مغرب کے بعد دو رکعت۔ مغرب کے بعد کی دو رکعت میں سورۂ کافرون اور اخلاص پڑھنا مستحب ہے۔

(۵)عشاء سے قبل دو رکعت اور بعد میں دو رکعت۔

مذکورہ نمازوں میں موکدہ (جن کی تاکید اور اہمیت زیادہ ہے) دس رکعتیں ہیں: فجر کی دو، ظہر سے قبل اور بعد میں دو، مغرب کے بعد دو اور عشاء کے بعد دو رکعت بقیہ غیر موکدہ ہیں۔(تحفۃ المحتاج مع الحواشی و فتح الوھاب وغیرہ)

احادیث:(۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو بھی مسلمان بندہ اللہ کیلئے فرض کے علاوہ ۱۲ / رکعات بطور سنت پڑھے، اللہ تعالیٰ ضرور اس کیلئے جنت میں ایک مکان تعمیر فرمائیں گے۔"(رواہ مسلم و ترمذی)

(۲) حضرت ابن عمر فرماتے ہیں۔ "کہ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ (یعنی آپ کی اتباع میں، بطور جماعت پڑھنا مراد نہیں ہے) دو رکعت ظہر سے قبل، دو رکعت ظہر کے بعد، دو رکعت مغرب بعد، اپنے گھر، عشاء کے بعد دو رکعت گھر میں پڑھی اور حضرت حفصہؓ نے مجھ سے کہا کہ آپ ﷺ صبح صادق کے وقت دو ہلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے"۔(متفق علیہ)

(۳) حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ "آپ ﷺ نوافل میں فجر کی دو رکعت سنت کی سب سے زیادہ پابندی فرماتے۔"(متفق علیہ)

(۴) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "فجر کی دو رکعت (سنت) دنیا و ما فیھا سے بہتر ہے"(مسلم)

(۵) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھو تیسری مرتبہ فرمایا جو چاہے اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اسے (موکدہ) سنت نہ سمجھیں۔(متفق علیہ)

(۶) آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو ظہر سے قبل اور ظہر کے بعد چار رکعات کی پابندی کرے اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام قرار دیں گے۔"(احمد، الترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ)

(۷) آپ ﷺ نے فرمایا! "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو عصر سے قبل چار رکعت پڑھے"۔(احمد ترمذی۔ابوداود)

(۸) آپ ﷺ نے فرمایا! ہر دو اذان (یعنی اذان و اقامت) کے درمیان نماز (پڑھنا سنت) ہے۔(بخاری شریف، مسلم شریف)

(۹) صحیحین کی ایک روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ فجر کی سنت کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے۔(مشکوۃ: ۱/۱۰۳)

مغرب کی قبلیہ سنت موذن کا جواب دینے کے بعد پڑھنا سنت ہے، لیکن امام اذان کے بعد فوراً فرض شروع کرتا ہو اور سنت پڑھنے کی صورت میں تکبیر تحریمہ فوت ہوتی ہو تو اس سنت کو بعد میں پڑھے اور موذن کے جواب پر اسے مقدم نہ کرے۔(نہایۃ المحتاج۔۲/۱۱۱)

وتر

وتر کی نماز سنت موکدہ ہے۔ اور یہ ایک یا تین یا پانچ یا سات یا نو یا گیارہ رکعات پڑھ سکتے ہیں۔ گیارہ سے زائد وتر کی نیت سے نہیں پڑھ سکتے۔ ایک رکعت سے زائد ایک ہی سلام سے پڑھنا ہو تو یا تو صرف آخری رکعت میں تشہد کیلئے بیٹھے یا آخری رکعت سے پہلے والی رکعت میں تشہد اول کے طور پر بیٹھے پھر اٹھ کر آخری رکعت پڑھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرے۔ دو تشہد سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ ہر دو رکعت پر تشہد پڑھ کر سلام پھیرتا رہے اور آخر میں ایک رکعت پڑھ لے، تو یہ بھی صحیح ہے۔ مثال: اگر پانچ رکعات ایک سلام سے پڑھنا ہے تو صرف پانچویں رکعت پر تشہد کے لئے بیٹھے یا چوتھی اور پانچویں رکعت پر تشہد کیلئے بیٹھے یا دو رکعت پر تشہد پڑھ کر سلام پھیرے پھر

دو رکعت پر سلام پھیرے۔ پھر ایک رکعت پڑھے۔ اسی طرح دیگر رکعتوں کو بھی قیاس کر لو۔ فصل (یعنی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر آخر میں ایک رکعت تنہا پڑھنا) وَصل سے (یعنی ایک ہی سلام سے ساری رکعتیں پڑھنے سے) افضل ہے۔ (تحفۃ المحتاج وغیرہ)

وتر کا وقت: عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سے صبح صادق تک وتر کا وقت ہے۔ عمداً یا بھول کر عشاء سے قبل وتر پڑھے تو صحیح نہ ہو گی۔ کسی نے بھول کر اپنے آپ کو باوضو سمجھ کر عشاء کی نماز پڑھ لی پھر حدث کی وجہ سے وضو کر کے وتر پڑھی پھر معلوم ہوا کہ عشاء بے وضو پڑھی تو یہ وتر صحیح نہ ہو گی۔ (عشاء کے بعد پھر پڑھے) عشاء کے بعد کسی اور سنت کے بغیر صرف ایک رکعت وتر پڑھے تو صحیح ہو گی۔ مستحب یہ ہے کہ وتر رات کی تمام نمازوں کے بعد ہو۔ اگر تہجد نہیں پڑھتا ہے تو عشاء اور سنت عشاء وغیرہ کے بعد وتر پڑھے۔ اور اس طرح اس کی وتر رات کی آخری نماز ہو گی۔ اگر تہجد پڑھتا ہے (اور رات بیدار ہونے کا اطمینان ہو) تو وتر کو موخر کرنا اور تہجد کے بعد پڑھنا افضل ہے۔ اگر سونے سے قبل وتر پڑھ لی، پھر تہجد کو اٹھا تو اب وتر کا دوبارہ اعادہ نہ کرے۔ رمضان میں وتر با جماعت پڑھنا مستحب ہے۔ غیر رمضان میں جماعت مستحب نہیں ہے۔

دعاء قنوت

رمضان کے آخری نصف میں (یعنی سولھویں شب سے) وتر کی آخری رکعت میں دعا قنوت مستحب ہے۔ صرف ایک رکعت وتر پڑھے۔ تو اس میں قنوت پڑھے دیگر ایام میں وتر میں قنوت مکروہ ہے۔ رمضان کے نصف آخر میں دعا قنوت ترک کرے یا دیگر ایام میں دعا قنوت پڑھے تو سجدہ سہو کرے۔ وتر میں بھی فجر کی طرح اعتدال میں قنوت پڑھے۔ اور الفاظ بھی وہی ہیں جو قنوت فجر کے ہیں اس کے ساتھ علماء نے قنوت عمر کا اضافہ مستحب قرار دیا ہے۔

قنوت عمر: ''اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسۡتَعِيۡنُكَ وَ نَسۡتَغۡفِرُكَ وَ نَسۡتَهۡدِيۡكَ وَ نُؤۡمِنُ بِكَ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيۡكَ وَ نُثۡنِي عَلَيۡكَ الۡخَيۡرَ كُلَّهٗ نَشۡكُرُكَ وَلَا نَكۡفُرُكَ وَ نَخۡلَعُ وَ نَتۡرُكُ مَنۡ يَّفۡجُرُكَ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَلَكَ نُصَلِّي وَ نَسۡجُدُ وَاِلَيۡكَ نَسۡعٰى وَ نَحۡفِدُ نَرۡجُوۡا رَحۡمَتَكَ وَ نَخۡشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالۡكُفَّارِ مُلۡحِق ۔ اَللّٰهُمَّ عَذِّبِ الۡكَفَرَةَ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِكَ وَيُكَذِّبُوۡنَ رُسُلَكَ وَ يُقَاتِلُوۡنَ اَوۡلِيَائَكَ اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتِ وَالۡمُسۡلِمِيۡنَ وَالۡمُسۡلِمَاتِ وَاَصۡلِحۡ ذَاتَ بَيۡنِهِمۡ وَاَلِّفۡ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَاجۡعَلۡ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَالۡحِكۡمَةَ وَ ثَبِّتۡهُمۡ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوۡلِكَ وَاَوۡزِعۡهُمۡ اَنۡ يُّوۡفُوۡا بِعَهۡدِكَ الَّذِيۡ عَاهَدۡتَهُمۡ عَلَيۡهِ وَانۡصُرۡهُمۡ عَلٰى عَدُوِّكَ وَ عَدُوِّهِمۡ اِلٰهَ الۡحَقِّ وَاجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ''

پہلے قنوت فجر (اَللّٰهم اهۡدِنِي الخ) پڑھے پھر قنوت عمر۔ جہراً اور ہاتھ اٹھانے میں فجر کی قنوت کا ہی حکم ہے۔ وتر کی تین رکعت پڑھنے کی صورت میں پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد (سبح اسم ربک الاعلیٰ) دوسری میں (قل یا یھا الکٰفرون) اور تیسری میں (''قل ھو اللہ احد'' ''فلق'' اور ''سورہ ناس'') پڑھنا مستحب ہے۔

احادیث: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چاہے، وتر کی پانچ رکعت پڑھے اور جو چاہے تین رکعت پڑھے۔ اور جو چاہے، ایک رکعت پڑھے۔ (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، ابن حبان، حاکم)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، وتر کی پانچ یا سات یا نو یا گیارہ رکعتیں پڑھو'' (دارقطنی، حاکم، بیہقی)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پانچ رکعت ادا کرتے جس میں صرف آخری رکعت میں بیٹھتے''۔

(مسلم)

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نو رکعتیں پڑھتے جس میں صرف آٹھویں رکعت پر بیٹھتے پھر اٹھ جاتے اور سلام نہ پھیرتے پھر نویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے۔ (مسلم)

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی سات رکعتیں ادا فرماتے جس میں صرف چھٹی اور ساتویں رکعت میں بیٹھتے۔ (نسائی)

(۶) آپ ؐ وتر کی تین رکعت پڑھتے اور صرف آخری رکعت میں بیٹھتے۔ (احمد، نسائی، حاکم، بیہقی، عن عائشہ)

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وتر رات کے آخری حصہ میں ایک رکعت ہے۔ (مسلم)

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعت اور ایک رکعت میں فصل فرماتے۔ (یعنی درمیان میں سلام پھیرتے) (احمد ابن حبان، ابن السکن)

(۹) فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "رات میں اپنی نماز کے آخر میں وتر پڑھا کرو۔" (متفق علیہ)

(۱۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جسے یہ اندیشہ ہو کے رات کے آخری حصہ میں بیدار نہ ہو پائیگا تو وہ ابتداء ہی میں وتر پڑھ لے۔ اور جسے آخری حصہ میں اٹھنے کی توقع ہو تو وہ وتر رات کے آخیر میں پڑھے۔ کیونکہ وہ وقت فرشتوں کی حضوری کا اور افضل وقت ہے۔ (مسلم)

(۱۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلی" اور دوسری میں "قل یاایھا الکفرون" اور تیسری میں "قل ھو اللہ احد" اور معوذ تین پڑھا کرتے۔ (ابوداود، ابن ماجہ، ترمذی، دارقطنی، ابن حبان) (خلاصۃ البدر المنیر ۱/۱۷۴)

امام محمد بن نصر ورزی نے کتاب قیام اللیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ وہ رمضان کے نصف آخر میں قنوت پڑھتے اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل فرمایا کہ وہ وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے۔ حضرت ابن عمر بھی آخری نصف میں قنوت پڑھتے۔ حضرت ابی بن کعب جب رمضان میں لوگوں کی امامت فرماتے تو نصف اوّل میں قنوت نہ پڑھتے، اور نصف آخر میں پڑھتے۔ (تحفۃ الاحوذی ۲/۵۶۵ ملخصاً)

تمام نوافل میں سب سے افضل دونوں عید کی نماز ہے۔ اس کے بعد سورج گہن کی نماز پھر چاند گہن کی نماز پھر استسقاء (بارش کیلئے نماز)

فصل۔ ضحیٰ (چاشت کی نماز)

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے اور غسل فرما کر (چاشت کی) آٹھ رکعت ادا کی۔ (صحاح ستہ)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر ماہ تین روزے، دو رکعت چاشت، اور سونے سے قبل وتر پڑھنے کی وصیت فرمائی۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی۔ نسائی)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے ہر جوڑ پر صبح صدقہ ہے، لہٰذا ہر تسبیح صدقہ ہے اور ہر تحمید (الحمد اللہ) صدقہ ہے، ہر تہلیل (لا الہ الا اللہ) صدقہ ہے، ہر تکبیر (اللہ اکبر) صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، اور نہی عن المنکر صدقہ ہے، اور بندہ کا چاشت کی

دو رکعت ادا کرنا ان سب کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔(مسلم ابوداود)

(۴) اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "ابن آدم دن کے ابتدائی حصہ میں میرے لئے چار رکعت نماز پڑھ لو، میں آخری حصہ کی کفایت کرونگا۔(ترمذی)

(۵) "آپ ﷺ سے مروی ہے کہ جو چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں سونے کا ایک محل تعمیر فرمائیں گے"۔(ترمذی وقال ابن حجر اسنادہ ضعیف)

(۶) "آپ ﷺ چار رکعت پڑھتے اور اس پر جتنا اللہ تعالیٰ چاہتے اضافہ فرماتے"۔(مسلم)

(۷) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اوابین کی نماز (یعنی اللہ کی طرف رجوع ہونے والے نیک لوگوں کی نماز) کا وقت وہ ہے جبکہ اونٹنی کے بچوں کے پیر دھوپ کی شدت سے جلنے لگے۔(مسلم۔ترمذی)

چاشت کی نماز سنت ہے۔ اس میں جماعت سنت نہیں ہے چاشت کی کم سے کم دو رکعت، افضل آٹھ رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل ہے۔ چاشت کا وقت سورج بلند ہونے (مکروہ وقت نکلنے) کے بعد سے استواء تک ہے۔ اس کا افضل وقت دن کا چوتھائی حصہ گذرنے کے بعد ہے۔

چاشت کی نماز میں سورہ "والشمس وضحھا" اور "والضحی" کی تلاوت مسنون ہے اس کے متعلق بیہقی میں حدیث مروی ہے۔ چاہے ہر دو رکعت میں یہ پڑھے یا پہلے دو رکعت میں یہ پڑھے اور بقیہ ہر دو رکعت میں "سورۂ کافرون" اور "اخلاص" پڑھے۔(تحفۃ المحتاج ۲/۵۳۳)

تحیۃ المسجد

حدیث:(۱) آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے قبل دو رکعت پڑھ لے۔(بخاری، مسلم، ابوداود، موطا، ترمذی، نسائی، تیسیر الوصول ۲/۳۱۶)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران آئے تو مختصر دو رکعت پڑھے۔(بخاری، مسلم، خلاصۃ البدر ۱/۲۱۴)

مسجد میں داخل ہونے والے کیلئے تحیۃ المسجد کی دو رکعت سنت ہے داخل ہونے کے بعد کسی فرض یا سنت کے ساتھ تحیۃ المسجد کی نیت کر لے تو دونوں کا ثواب ملے گا۔ بغیر نیت کے بھی دونوں حاصل ہوں گے۔ جو بار بار مسجد میں داخل ہو ہر مرتبہ اسے تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت امام فرض نماز پڑھا رہا ہو تو تحیۃ المسجد مکروہ ہے۔ مسجد حرام میں داخل ہونے والے کیلئے طواف چھوڑ کر تحیۃ المسجد پڑھنا مکروہ ہے۔ تحیۃ المسجد سے قبل مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ دیر گذر جائے تو یہ فوت ہو جائیگی۔ صحیحین کی روایت کی روشنی میں سہواً (بھول کر) یا لاعلمی کی وجہ سے تھوڑی دیر بیٹھا تو اٹھ کر اس کی تلافی کر سکتا ہے۔

دیگر نوافل (جن میں جماعت مسنون نہیں): احرام کی دو رکعت، طواف کے بعد دو رکعت، وضو کے بعد سنت وضو کی نیت سے دو رکعت، استخارہ کی دو رکعت، صلوٰۃ الحاجہ کی دو رکعت، طلوعِ شمس کے بعد مکروہ وقت کے بعد اشراق کی دو رکعت، (یہ چاشت کے علاوہ نماز ہے) سفر کے ارادہ کے وقت اپنے گھر میں دو رکعت، اسی طرح دوران سفر جہاں جہاں ٹھہرے، سفر سے واپسی پر

مسجد میں دو رکعت، قتل کے وقت دو رکعت، گھر میں داخل اور خارج ہونے کے وقت دو رکعت، توبہ کے وقت دو رکعت قبل توبہ یا بعد توبہ گرچہ صغیرہ گناہ سے توبہ کرے، مغرب اور عشاء کے درمیان اوابین کی ۲۰ر رکعتیں، زوال کے بعد صلوۃ الزوال کی دو یا چار رکعتیں، چار رکعت پڑھے تو بقول امام سیوطی ایک ہی سلام سے پڑھے، صلوۃ التسبیح ہر وقت یا دن ورات میں یا کسی ایک وقت میں یا ہفتہ میں یا مہینے میں یا سال میں ورنہ عمر میں چار رکعت، حمام سے نکلنے کے بعد دو رکعت، آپ ﷺ کی مسجد (مسجد نبوی) سے سفر میں نکلتے وقت دو رکعت، ایسے علاقہ میں جانے والے کیلئے جہاں اللہ کی عبادت نہ ہوتی ہو دو رکعت، میاں بیوی کی پہلی ملاقات پر صحبت سے قبل دونوں کیلئے دو رکعت، عقد نکاح سے قبل اور حفظ قرآن کے وقت دو رکعت۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کوئی تنگی پریشانی و مصیبت یا روزی کی تنگی پیش آئے، یا اولاد یا کوئی اور رشتہ دار انتقال ہو یا کوئی غمگین معاملہ پیش آئے تو دو رکعت سنت ہے۔ کسی کی کوئی شئی گم ہو جائے تو دو رکعت پڑھ کر یہ دعا مانگے۔ ’’**اَللّٰھُمَّ رَادَّ الضَّآلَّةِ هَادِيَ الضَّلَالِ تَهْدِي مِنَ الضَّلَالِ رُدَّ عَلَيَّ ضَالَّتِي بِعِزَّتِكَ وَ سُلْطَانِكَ فَإِنَّهَا مِنْ عَطَائِكَ**‘‘ **ترجمہ:** یا اللہ گمشدہ چیز کو لوٹانے والے، گمراہی سے ہدایت بخشنے والے، آپ ہی گمراہی سے ہدایت کی روشنی عطا فرماتے ہیں، اپنی عزت و قدرت سے میری گمشدہ چیز لوٹا دیجئے کہ وہ آپ ہی کا عطیہ ہے‘‘ ہفتہ کے ہر دن کیلئے بعض کتابوں میں جو مخصوص نمازیں درج ہیں، فقہا کرام نے اس کا رد کیا ہے۔ یہ جائز نہیں اور ان نیتوں سے پڑھنے سے صحیح نہ ہوگی۔ حدیث سے اس طرح کی نمازوں کیلئے ثبوت ہونا ضروری ہے۔ لیلۃ الرغائب کی نماز (رجب کی پہلی جمعہ میں مغرب اور عشاء کے درمیان ۱۲ر رکعت) اور نصف شعبان کی ۱۰۰ ارکعات بدعت قبیحہ ہے۔ اور ان کے متعلق حدیث موضوع ہے۔ تحفہ مع الحواشی، نہایۃ المحتاج، حاشیۃ الجمل ۱/۴۷۸، بشری الکریم ۱/۱۱۶)

احادیث

(۱) **استخارہ کی نماز:** حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ’’آپ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کی تعلیم فرماتے جیسا کہ ہمیں قرآن کی سورت سکھایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو فرض کے علاوہ دو رکعت پڑھے پھر یہ دعا پڑھے:

’’**اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ اَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاقْدُرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَ اصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِيْ بِهٖ**‘‘ اور اپنی حاجت کا نام لے۔ (بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی)

ترجمہ: یا اللہ میں آپ سے آپ کے علم سے خیر کا طلبگار ہوں اور آپ کی قدرت سے قدرت کا طلبگار ہوں۔ اور آپ کے فضل عظیم کا سائل ہوں کیونکہ آپ قادر ہیں اور میں قادر نہیں آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا اور آپ علام الغیوب ہیں۔ یا اللہ! اگر یہ معاملہ آپ کے علم میں میرے دین و زندگی اور انجام کے اعتبار سے میرے حق میں بہتر ہے تو اسے مقدر فرمائیں اور آسان کیجئے، پھر اس میں مجھے برکت عنایت فرمائیں، اور اگر آپ جانتے ہوں کہ یہ معاملہ میرے دین، زندگی اور انجام کے اعتبار سے میرے لئے بدتر ہے تو اسے مجھ سے پھیر دیں، اور مجھے اس سے پھیر دیں، اور جہاں بھی ہو میرے حق میں خیر مقدر فرمائیں، پھر مجھے اس پر راضی رکھیں۔

(۲) **صلوۃ الحاجۃ:** آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف یا کسی انسان کی طرف کوئی حاجت ہو تو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ کی حمد و ثنا اور آپ ﷺ پر درود پاک پڑھ کر یہ دعا پڑھے۔ ’’**لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ**

الْکَرِیْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالعِصْمَةَ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَالْغَنِیْمَةَ مِنْ کُلِّ بِرٍّ وَ السَّلَامَةَ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْباً اِلَّا غَفَرْتَهُ وَلَا هَمّاً اِلَّا فَرَّجْتَهُ وَلَا حَاجَةً هِیَ لَكَ رِضاً اِلَّا قَضَیْتَهَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ "(ترمذی۔وقال حدیث غریب)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بڑا ہی بردبار کرم کرنے والا ہے پاک ہے اللہ جو عرش عظیم کا رب ہے۔سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری رحمت کے اسباب کا اور تیری مغفرت کو پختہ کرنے والی خصلتوں کا، اور ہر گناہ سے حفاظت کا، اور ہر نیکوکاری کی نعمت کا، اور ہر نافرمانی سے سلامتی کا، اے اللہ تو میرے کسی گناہ کو بغیر بخشے مت چھوڑ، اور میری کسی فکر کو بغیر دور کئے مت چھوڑ اور میری کسی ایسی حاجت کو جو تیری مرضی کے موافق ہو بغیر پورا کئے مت چھوڑ، اے سب سے بڑے رحم کرنے والے"

(۳)**صلوۃ التسبیح:** آپ ﷺ نے بڑی تاکید اور بیانِ فضیلت کے ساتھ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس نماز کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ہو سکے تو ہر دن اسے پڑھو، ورنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ، ورنہ ہر ماہ ایک مرتبہ، ورنہ سال میں ایک مرتبہ، یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم پوری عمر میں اسے ایک مرتبہ پڑھ لو۔

طریقہ: چار رکعت پڑھو، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھو، سورت سے فارغ ہونے کے بعد پندرہ /۱۵ مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرْ" کہو پھر رکوع میں اسے دس مرتبہ پڑھو۔ پھر رکوع سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو، پھر سجدہ میں چلے جاؤ اور دس مرتبہ اسے پڑھو، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو، پھر سجدہ میں دس مرتبہ پڑھو، پھر سر اٹھا کر اسے دس مرتبہ پڑھو، اس طرح ہر رکعت میں ۷۵ / تسبیح ہو گی۔ چاروں رکعت میں اسی طرح پڑھو (تو کل ۳۰۰ تسبیحات ہوں گی ۔)(ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ بیہقی)(تیسیر الوصول) چاروں رکعات ایک سلام یا دو سلام سے پڑھ سکتا ہے۔ دن میں ایک سلام سے اور رات میں دو سلام سے (یعنی دو دو رکعت) پڑھنا افضل ہے، قیام کی ۱۵ تسبیحات کو تلاوت سے قبل بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس صورت میں تلاوت کے بعد دس تسبیح پڑھے اور جلسۂ استراحت اور تشہد میں تسبیح نہ پڑھے۔ امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ اس نماز میں سورہ "**الهٰکم التکاثر**" "**والعصر**" "**کافرون**" اور "اخلاص" کی تلاوت کرے، سجدہ سے سر اٹھاتے وقت تکبیر کہے اور جلسہ استراحت میں ختم کر کے تسبیحات پڑھے۔ جلسہ سے اٹھتے وقت تکبیر نہ کہے۔ تشہد میں پہلے تسبیحات پڑھ لے پھر تشہد وغیرہ پڑھے۔

اگر رکوع کی تسبیحات ترک ہوں تو اعتدال سے واپس نہ لوٹے، اور نہ اعتدال میں تلافی کرے، بلکہ سجدہ میں اس کی تلافی کرے، (اور سجدہ میں رکوع اور سجدہ کی ملا کر ۲۰ تسبیحات پڑھ لے، (اسی طرح سجدہ کی تسبیح ترک ہو تو دوسرے سجدہ یا قیام یا تشہد میں تلافی کرے۔ جلسہ استراحت یا جلسہ بین السجد تین میں تلافی نہ کرے) اگر بعض تسبیحات ترک ہوں (اور تلافی نہ کرے) تو اس کی اصل سنت حاصل ہو گی، اور تمام ترک کر دے تو نفل مطلق شمار ہو گی۔ ان تسبیحات کو رکوع، اعتدال، سجدہ اور جلسہ بین السجد تین کے عام مشروع اذکار کے بعد پڑھے۔

یہ نماز نفل مطلق میں شمار ہے، لہٰذا مکروہ اوقات میں حرام ہے۔ اور اس کی قضاء مشروع نہیں ہے۔ نیز تکرار (بار بار انجام دنیا) سنت ہے۔ خواہ ایک ہی وقت میں کیوں نہ ہو، اس کی تسبیحات ہیئت میں داخل ہیں لہٰذا اس کے ترک کی وجہ سے سجدہ سہو نہ کرے۔ صلوۃ التسبیح کی نیت سے نماز شروع کرے اور تسبیحات نہ پڑھے تو نماز صحیح ہو گی (عام نفل کے طور پر) امام سبکیؒ وغیرہ فرماتے ہیں، کہ اس نماز کی

عظیم فضیلت کو سننے کے بعد دین کے متعلق ایک لاپرواآدمی ہی اسے ترک کر سکتا ہے امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سلام سے پہلے یہ دعا پڑھے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ تَوۡفِیۡقَ اَھۡلِ الۡھُدٰی وَاَعۡمَالَ اَھۡلِ الۡیَقِیۡنِ وَمُنَاصَحَةَ اَھۡلِ التَّوۡبَةِ وَعَزۡمِ اَھۡلِ الصَّبۡرِ وَجِدَّ اَھۡلِ الۡخَشۡیَةِ وَطَلَبَ اَھۡلِ الرَّغۡبَةِ وَتَعَبُّدُ اَھۡلِ الۡوَرۡعِ، وَعِرۡفَانَ اَھۡلِ الۡعِلۡمِ حَتّٰی اَخَافَكَ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ مَخَافَةً تَحۡجُزُنِیۡ عَنۡ مَعَاصِیۡكَ حَتّٰی اَعۡمَلَ بِطَاعَتِكَ عَمَلاً اَسۡتَحِقُّ بِهٖ رِضَاكَ وَحَتّٰی اُنَاصِحَكَ بِالتَّوۡبَةِ خَوۡفاً مِنۡكَ وَحَتّٰی اُخۡلِصَ لَكَ النَّصِیۡحَةَ حَیَاءً مِنۡكَ، وَحَتّٰی اَتَوَكَّلَ عَلَیۡكَ فِی الۡاُمُوۡرِ حُسۡنَ ظَنٍّ بِكَ سُبۡحَانَ خَالِقِ النَّارِ"۔(تحفہ مع الوحواشی، نہایہ، بشری الکریم، اعانۃ الطالبین ۱/۲۵۹)

(۴)**صلوۃ الوضو:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے بلال رضی اللہ عنہ تم نے اسلام میں سب سے زیادہ پر امید جو عمل کیا ہو ہمیں اس کی خبر دو، کیونکہ ہم نے تمہارے چپل کی آہٹ ہمارے آگے جنت میں سنی، تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یہی زیادہ پر امید عمل کیا ہے کہ میں نے رات دن کی کسی بھی گھڑی میں طہارت حاصل کی تو اس طہارت سے جتنا مقدر میں ہو نماز پڑھی۔(متفق علیہ)

(۵)**صلوۃ التوبہ:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی شخص سے گناہ کا ارتکاب ہو پھر وہ وضو کر کے نماز پڑھ لے اور اللہ سے استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مغفرت فرمادینگے۔"(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ شریف ۱/۱۱۶)

(۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بندہ کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہو گا اگر وہ صحیح نکلی تو کامیاب وبامراد ہوا اگر وہ فاسد اور غلط نکلی تو نامراد اور نقصان میں رہا۔ اگر اس کے فرض میں کچھ کوتاہی ہو تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندہ کے پاس کچھ نوافل بھی ہیں۔ لہٰذا اس کے ذریعہ فرض کی کمی کو پورا کیا جائیگا پھر دیگر اعمال میں بھی یہی صورت ہو گی۔(ابوداود، احمد)

(۷)**صلوۃ الزوال:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد ظہر سے قبل چار رکعت ادا فرماتے اور فرمایا کہ یہ ایسا وقت ہے کہ آسمان کے دروازے اس وقت کھل جاتے ہیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا کوئی نیک عمل اس وقت اٹھالیا جائے۔(ترمذی، وقال حسن غریب)

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو مغرب کے بعد چھ رکعات اس طرح ادا کرے کہ ان کے درمیان کوئی بری گفتگو نہ کرے تو یہ ۱۲/ سال کی عبادت کے برابر ہوں گے۔"(ترمذی)

(۹)**صلوۃ الاشراق:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو فجر جماعت سے پڑھ کر سورج نکلنے تک اللہ کے ذکر میں مصروف رہے پھر (مکروہ وقت کے بعد) دو رکعت ادا کرے تو اسے حج وعمرہ کا ثواب ملے گا مکمل مکمل مکمل۔(ترمذی، حسن غریب)

(۱۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے چاشت کے وقت تشریف لاتے تشریف آوری پر پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتے، پھر مسجد میں بیٹھ جاتے (تاکہ صحابہ کرام ملاقات سے مشرف ہوں)(مسلم)

جن نوافل کیلئے جماعت سنت نہیں ان میں سب سے مؤکد سنن رواتب (فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی سنتیں) ہیں ان میں سب سے افضل وتر پھر سنت فجر ہے۔ بعض علماء نے صلوۃ اللیل کو تمام نوافل میں افضل قرار دیا ہے۔ کیونکہ صحیح مسلم شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے: فرض نماز کے بعد افضل نماز صلوۃ اللیل (رات کی نماز) ہے۔"

رواتب کے بعد افضل چاشت کی نماز ہے۔ پھر وہ نماز جو کسی فعل سے متعلق ہو، جیسے طواف کی دو رکعت، احرام کی دو رکعت، تحیۃ المسجد۔

فصل۔تراویح

تراویح کی ۲۰ رکعتیں دس سلام سے پڑھی جائے۔ اگر چار رکعت ایک سلام سے پڑھے تو تراویح صحیح نہ ہوگی۔ اس میں تراویح یا قیام رمضان کی نیت کرے۔ مطلق نیت سے تراویح صحیح نہ ہوگی۔ بلکہ ہر دو رکعت کیلئے تراویح کی نیت کرے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا"؛ میں نے اہل مدینہ کو ۳۹ رکعتیں پڑھتے دیکھا جس میں تین وتر کی نماز ہے۔" علماء نے فرمایا کہ دیگر حضرات اس کی پیروی نہیں کرسکتے۔ تراویح کو باجماعت ادا کرنا افضل ہے۔ عشاء کی نماز ہونے کے بعد تراویح کا وقت شروع ہوگا۔ (اور وتر کی طرح صبح صادق تک رہے گا)

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو رمضان میں ایمان واحتساب کے ساتھ (یعنی ثواب کی امید رکھتے ہوئے) قیام کرے تو اس کے گذشتہ گناہوں کی بخشش ہوگی۔ (موطا، بخاری مسلم، ابوداود۔ ترمذی۔ نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی تو آپ ﷺ کی اقتداء میں کافی صحابہ کرام نے بھی نماز پڑھی، پھر دوسرے دن صحابہ کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ پھر تیسرے دن یہ حضرات جمع ہوئے تو آپ ﷺ ان کی طرف نہ نکلے پھر صبح کے وقت فرمایا کہ تمہاری حرکتوں کو میں دیکھ رہا تھا لیکن اس لئے نہیں نکلا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے اور یہ واقعہ رمضان کا ہے۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداود۔ نسائی۔ موطا) (تیسیر الاصول)

(۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عمر کے دور خلافت میں رمضان میں ۲۰ رکعت (تراویح) پڑھا کرتے۔ (بیھقی۔باسناد صحیح) موطا امام مالک میں ۲۳ رکعت کا ذکر ہے۔ امام بیہقیؒ نے فرمایا ۲۳ وتر سمیت ہیں۔ (فتح الوھاب ۱/ ۵۸)

فصل۔نفل مطلق

کسی سبب اور وقت کی قید کے بغیر ایسے ہی سنت نماز (جسے مطلق نفل کہیں گے) جتنی چاہے پڑھ سکتا ہے، صرف ایک رکعت پڑھنا بھی بلا کراہت جائز ہے۔ کسی عدد کی نیت کے بغیر نفل شروع کرے، تو ایک دو یا اس سے زائد کسی بھی رکعت پر سلام پھیر سکتا ہے، کتنی رکعت پڑھی معلوم نہ ہو اور سلام پھیرے، تو یہ بھی صحیح ہے۔ کسی عدد کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد اس میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ ایک رکعت کی نیت کے بعد اسے دس رکعت یا دس کی نیت کے بعد ایک رکعت کرسکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ زیادتی یا کمی سے پہلے ہی نیت بدل دے، نیت کی تبدیلی کے بغیر عمداً یوں کرے تو نماز باطل ہوگی۔ مثال: کسی نے دو رکعت کی نیت کی پھر زیادتی کی نیت کرکے تیسری کیلئے اٹھ گیا تو جائز ہے، اگر عمداً تیسری کی نیت کے بغیر اٹھا تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر اٹھ گیا تو واپس لوٹے اور سجدہ سہو کرکے سلام پھیرے، اس صورت میں اٹھنے کے بعد رکعت کے اضافہ کا ارادہ ہوا تو پہلے بیٹھ جائے پھر دوبارہ اٹھے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔ چار رکعت کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد بدل کر دو کی نیت کرکے دو پر سلام پھیر دے تو جائز ہے۔ نیت کی تبدیلی کے بغیر عمداً یوں سلام پھیر دے تو نماز باطل ہوگی۔ بھول کر سلام پھیرا تو بقیہ رکعتیں پڑھ کر سجدہ سہو کرکے سلام پھیرے۔ اس صورت میں سلام کے بعد دو کا ارادہ ہوگیا تو سجدہ سہو کرکے پھر سلام پھیرے کیونکہ پہلا سلام شمار میں نہیں ہے۔

صرف ایک رکعت پڑھے تو تشہد پڑھنا ہی ہے۔ ایک سے زائد پڑھے تو صرف آخر میں ایک تشہد بھی پڑھ سکتا ہے، اور یہ تشہد رکن ہے۔ اور چار رکعت والی فرض کی طرح ہر دو رکعت پر بھی تشہد پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہر رکعت میں تشہد پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (البتہ ہر

تین رکعت یا چار رکعت وغیرہ پر تشہد پڑھ سکتا ہے۔(تحفہ) صرف آخر میں ایک تشہد کی صورت میں ہر رکعت میں سورت پڑھے گا۔ زائد تشہد کی صورت میں تشہد اول کے بعد صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا۔ رات اور دن کے نوافل میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل ہے۔

احادیث: (۱) ایک حدیث کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا! اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے بہتر نماز ہے۔(دارمی، احمد، طبرانی فی المعجم الکبیر و حسنہ الالبانی) یہ راویت صحیح ہے اور صحابہ کی ایک جماعت حضرت ثوبان، ابن عمرو، ابوامامہ، جابر، ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

(۲) حضرت ثوبان اور ابو درداء نے آپ ﷺ سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے کثرت سجدہ (کثرت نماز) کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ تم ایک سجدہ اللہ کے لئے کروگے تو اللہ ضرور تمہارا ایک درجہ بلند فرمائیں گے اور ایک گناہ مٹا دینگے۔ (مسلم۔ نسائی۔ ابو عوانہ۔ ابن ماجہ۔ بیہقی۔ ترمذی۔ وقال حدیث حسن صحیح)

(۳) ایک صحابی ربیعہ بن کعب اسلمی نے آپ ﷺ سے جنت میں آپ کی رفاقت کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے ان کو کثرت سجدہ کا حکم دیا۔ (مسلم، ابو اعوانہ۔ ابو داود۔ نسائی بیہقی)

(۴) ایک مرتبہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کئی رکعتیں پڑھی تو سلام کے بعد احنف نے پوچھا کہ تم نے جفت پر سلام پھیری، یا طاق رکعت پر کچھ پتہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے پتہ نہ بھی ہو تو اللہ کو معلوم ہے۔ پھر آپ ﷺ کی یہ روایت سنائی: ”جو بھی بندہ اللہ کے لئے ایک سجدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور اس کا ایک درجہ بلند فرماتے، ایک گناہ معاف فرماتے اور اس کے حق میں ایک نیکی لکھتے ہیں۔“ (دارمی واحمد۔ واسنادہ صحیح علی شرط مسلم) (ارواء الغلیل ج/۲)

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک رکعت پڑھی اور فرمایا کہ یہ نفل ہے جو چاہے زائد پڑھے اور جو چاہے کم۔ (بیہقی) (تلخیص و خلاصہ البدر)

(۶) نماز بہترین عمل ہے، جو چاہے کم پڑھے جو چاہے زیادہ پڑھے۔ (احمد۔ بزار، ابن حبان، طبرانی، حاکم)

(۷) رات اور دن کی (سنت) نماز دو دو رکعت ہے (احمد، سنن اربعہ، وصححہ ابن خزیمہ، ابن حبان، الحاکم، البیہقی، نقل تصحیحہ، عن البخاری)

(۸) رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ (یعنی سنت نماز دو دو رکعت افضل ہے۔) (متفق علیہ) (تلخیص الحبیر)

فصل۔ سنن رواتب کا وقت

(رواتب یعنی پنجوقتہ فرائض سے قبل و بعد کی سنتیں)

فرض کی قبلیہ سنت کا وقت فرض نماز کا وقت داخل ہوتے ہی ہوگا (اذان ہونا کوئی ضرورت نہیں ہے)۔ اور وقت باقی رہنے تک جائز ہے۔ لیکن فرض سے قبل ہی پڑھنا افضل ہے۔ فرض کی بعدیہ سنت کا وقت فرض نماز پڑھنے کے بعد داخل ہوگا، اور وقت ختم ہوتے ہی سنت کا وقت بھی ختم ہوگا۔

نفل کی اقسام

نفل کی دو قسمیں ہیں (۱) جن کا کوئی معین وقت نہیں، سبب کے پائے جانے کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ جیسے گہن، استسقاء،

اور تحیۃ المسجد کی نمازیں۔ ان نمازوں کی قضاء مشروع نہیں ہے۔

(۲) جو موقت ہیں (یعنی جن کا وقت متعین ہے) جیسے عید، ضُحیٰ اور رواتب نمازیں۔ یہ نمازیں اگر فوت ہوں تو ان کی قضاء ہمیشہ مستحب ہے۔

سنن رواتب کو سفر میں بھی پڑھنا مستحب ہے۔ فجر کی سنت کے بعد فرض سے قبل لیٹنا سنت ہے۔ اگر نہ لیٹے تو دونوں میں (گفتگو وغیرہ کے ذریعے) فصل کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنت کے بعد اگر میں جاگتی رہتی تو مجھ سے گفتگو فرماتے ورنہ نماز کی اطلاع تک لیٹ جاتے۔ (رواہ البخاری) فجر کی سنت میں مختصر تلاوت سنت ہے۔ صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد (" **قولوا امنا باللہ۔۔۔۔** " (سورہ بقرہ آیت ۱۳۶) اور دوسری میں " **قل یااھل الکتاب تعالوا۔۔۔۔۔** " (سورہ آل عمران آیت ۶۴) تلاوت فرماتے۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ پہلی رکعت میں " قل یاایھا الکافرون " اور دوسری میں " **قل ھو اللّٰہ احد** " کی تلاوت فرمائی۔ لہٰذا دونوں بھی سنت ہے مغرب کی سنت اور استخارہ اور تحیۃ المسجد کی نماز میں بھی " قل یاایھا الکافرون " اور " قل ھو اللہ احد " کی تلاوت کرے۔ رات کی نفل دن کی نفل سے افضل ہے کسی کو نصف رات عبادت کرنا ہے تو آخری نصف افضل ہے۔ اور ایک تہائی رات عبادت کرنا ہو تو درمیانی حصہ افضل ہے اس سے افضل یہ ہے کہ رات کے چھ حصے کرکے چوتھے اور پانچویں حصے میں جاگے، جیسا کہ صحیحین کی ایک روایت سے ثابت ہے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب داود علیہ السلام کی نماز (کا طریقہ) ہے، نصف رات سو جاتے، اور ایک تہائی عبادت میں گذارتے، پھر آخری چھٹے حصے میں سو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنا مکروہ ہے، انسان کو چاہے کہ رات میں کچھ نہ کچھ نماز ضرور پڑھے۔ نفل نماز گھر میں پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔

لیکن درج ذیل نوافل مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ (۱) جمعہ کی قبلیہ سنت (۲) چاشت کی نماز (۳) استخارہ کی نماز (۴) معتکف کی نماز (۵) فرض نماز کے بعد سیکھنے یا سکھانے کیلئے مسجد میں رکا ہوا شخص (۶) رواتب کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، وقت کی تنگی یا اپنی سستی کی وجہ سے (۷) سفر میں جاتے وقت نماز (۸) سفر سے لوٹنے پر نماز (۹) طواف کی دو رکعت، کیونکہ ان کا مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا افضل ہے (۱۰) میقات میں مسجد ہو تو احرام کی دو رکعت اس مسجد میں ادا کرنا مستحب ہے۔ (حاشیۃ الروضہ۔عن البکری)

تہجد کی نماز کے لئے اٹھنے والے کیلئے مستحب ہے کہ ایسے آدمی کو جگادے جس سے تہجد کی توقع ہو، جبکہ کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ صحیح احادیث کی وجہ سے سفر سے واپسی پر مسجد میں دو رکعت کی پابندی مستحب ہے۔ (واللہ اعلم)

قیام لیل اور تہجد

آیت: (۱) " وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا " (بنی اسرائیل، ۷۹) " اور کسی قدر رات کے حصہ میں بھی (نماز ادا کیجئے) سو اس میں تہجد پڑھا کیجئے، جو کہ آپ کے لئے (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پنجگانہ نمازوں کے علاوہ) زائد چیز ہے، امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود (جو کہ شفاعتِ کبریٰ کا مقام ہے) جگہ دے گا۔ "

(۲) ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے صفات شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: " وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا

وَّقِیَاماً“(الفرقان: ۶۴)اور جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں۔

(۳)ایک جگہ مؤمنین کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:”تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفاًوَّ طَمَعاً۔۔۔۔“(السجدۃ:۱۶)(مؤمنین کے اعمال کا یہ حال ہے کہ شب کو)ان کے پہلو خواب گاہوں (بستروں) سے علاحدہ ہوتے ہیں(خواہ فرضِ عشاء کے لئے یا مزید تہجد کے لئے بھی اور)اس طور پر (علاحدہ ہوتے ہیں کہ وہ لوگ)اپنے رب کو(ثواب کی)امید سے اور(عذاب کے)خوف سے پکارتے ہیں۔(اس میں نماز اور دعا وذکر سب آگیا)

(۴)متقیوں کے اہم صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:” کَانُوْاقَلِیْلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ.وَ بِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ “(الذٰریت:۱۸،۱۷)”وہ لوگ (یعنی متقی لوگ فرائض سے ترقی کرکے سنن و نوافل کا ایسا اہتمام کرنے والے تھے کہ)رات کو بہت کم سوتے تھے“(یعنی رات کا زیادہ حصہ عبادت میں صرف کرتے تھے)اور(پھر باوجود اس کے اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے،بلکہ)اخیر شب میں (اپنے کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر)استغفار کیا کرتے تھے۔“

(۵)یٰاَیُّھَاالْمُزَّمِّلُ.قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً.نِصۡفَہٗ اَوِا نۡقُصۡ مِنْہُ قَلِیْلاً.اَوْ زِدْعَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاً“ (المزمل: ۱ تا ۴)”اے کپڑوں میں لپٹنے والے(اس میں تانس اور ملاطفت کے طور پر حضور اکرم ﷺ کو خطاب ہے)رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو، مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات (کہ اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو) یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو یا نصف سے بڑھادو اور (اس قیامِ لیل میں) قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو۔“

احادیث:(۱)”جب تم سوتے ہو تو شیطان تم میں سے کسی کے سر کے پچھلے حصہ (گدی) میں تین گرہیں (گانٹھ)مار دیتا ہے،ہر گرہ پر دم کرتا ہے کہ ابھی رات بہت طویل ہے،اس لئے تم سو جاؤ،پھر اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرتا ہے،تو ایک گرہ کھل جاتی ہے،پھر اگر وہ وضوء کرلے تو(دوسری) گرہ کھل جاتی ہے،پھر اگر وہ نماز پڑھ لے تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں،لہٰذا وہ بڑی بشاشت اور پاکیزہ حالت میں صبح کرتا ہے۔ورنہ بالکل پس مردہ اور سست حالت میں صبح کرتا ہے۔“(مالک،بخاری،مسلم)

(۲)”فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔“(مسلم وغیرہ)

(۳)”اے لوگو!سلام کو خوب رواج دو،اور کھانا کھلاؤ(خوب سخاوت کرو)اور صلہ رحمی کرو،(ہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)اور نماز پڑھو اس وقت جب لوگ سو رہیں ہوں(یعنی رات کے وقت)تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔“(ترمذی وقال حدیث حسن)

(۴)حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:”حضور اکرم ﷺ راتوں کو اتنا قیام کرتے (نماز میں کھڑے رہتے) کہ دونوں قدمِ مبارک پھٹ جاتے،“تو میں نے عرض کی:”آپ تو بخشے بخشائے ہیں،پھر کیوں اس طرح مشقت اٹھاتے ہو،“تو ارشاد فرمایا:”کیا مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا(بے انتہا)شکر گذار بندہ بنوں“(متفق علیہ)

(۵)”رات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں ایک مسلمان شخص دنیا و آخرت کی جو بھی بھلائی اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگے گا،اللہ تبارک وتعالیٰ یقیناً اُسے وہ عنایت فرمائیں گے،اور یہ ہر رات میں ہے“(مسلم)

(۶)”تم لوگ قیامِ لیل کیا کرو،کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کی عادت رہ چکی ہے،اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قربت کا باعث ہے،نیز گناہوں کے لئے کفارہ اور معاصی سے بچانے والا ہے۔“(ترمذی،ابن ماجہ،حاکم)

(۷)”اللہ تبارک وتعالیٰ اُس شخص پر رحم فرمائے، جو رات کو اُٹھ کر نماز پڑھے، اور اپنی بیوی کو (بھی نماز کے لئے) اٹھائے، اگر وہ نہ اُٹھے تو اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اُس عورت پر رحم فرمائے، جو رات کو اُٹھ کر نماز پڑھے، اور اپنے شوہر کو جگائے، اگر وہ انکار کرے تو اُس کے چہرے پر پانی مارے۔“(ابوداود، نسائی، ابن ماجہ)

(۸)”رات کی نماز کی فضیلت دن کی نماز پر ایسی ہے جیسا کہ مخفی صدقہ کی علانیہ صدقہ پر“(طبرانی فی الکبیر)

(۹)”کوئی شخص رات کو اپنی اہلیہ کو جگائے اور دونوں دو رکعت نماز پڑھیں تو اُن کو ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں کی فہرست میں لکھ لیا جاتا ہے۔“(ابوداود، نسائی، ابن ماجہ)

(۱۰)”پروردگار رات کے آخری حصہ کے اندر اپنے بندے سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، اگر تم اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہو تو ہو جاؤ“(ترمذی)

(۱۱) نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر ہوا، جو رات میں صبح تک پڑا سوتا رہا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:”وہ ایسا شخص ہے کہ شیطان نے اُس کے دونوں کانوں میں پیشاب کر دیا“(صحیحین)

(۱۲) حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے فرمایا:”اے عبد اللہ! تم فلاں کی طرح مت بن جانا کہ وہ پہلے رات میں نماز پڑھا کرتا تھا، پھر اُسے چھوڑ دیا۔“(متفق علیہ)

[الترغیب والترہیب للمنذری ۱/۴۲۲، مشکوۃ: ۱/۱۰۸، تیسیر الوصول ۲/۳۰۱]

تهجد: عربی زبان میں تہجد کا لفظ سونے اور نیند سے بیدار ہونے کے لئے مستعمل ہے، جیسا کہ علامہ جوہریؒ وغیرہ نے فرمایا (گویا اضداد کے قبیل سے ہے)۔ بعضوں نے کہا کہ ھجود تو سونے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور تہجد نیند کے ازالہ اور بیدار ہونے کے لئے۔ امام طبریؒ نے کئی اسلاف سے نقل فرمایا کہ تہجد کا مطلب ہے سونے کے بعد بیدار ہونا۔ امت کے حق میں تہجد کی نماز کے عدمِ وجوب پر اجماع قائم ہو چکا ہے۔ تاہم آپ ﷺ پر واجب تھی یا نہیں؟ اختلاف ہے۔ (من فتح الباری ۳/۱)

قرآنی آیات اور صحیحین وغیرہ کی بکثرت احادیث کی روشنی میں تہجد کی نماز بالاجماع سنت ہے۔ بعض فقہاء نے اُس کے سنت موکدہ ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔ فقہی اعتبار سے رات کو سو کر اُٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے گی اُسے تہجد کہا جائے گا۔ لہٰذا عشاء کی نماز اور نیند کے بعد جو سنت پڑھی جائے گی، اُسے تہجد کہا جائے گا۔ اگر عشاء کی فرض نماز سے قبل بھی سو کر اُٹھے، پھر عشاء پڑھ لے تو اُس کے بعد تہجد پڑھ سکتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک عام وقت میں (یعنی عشاء کا وقت ہونے کے بعد) سونا ضروری ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک عشاء کے وقت سے پہلے ہی سو کر اٹھے تب بھی (عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد) تہجد پڑھ سکتا ہے۔ مسافر عشاء کو جمع تقدیم کر کے مغرب کی نماز کے بعد پڑھ لے، تو وہ بھی سو کر اُٹھنے کے بعد تہجد پڑھ سکتا ہے۔ (تو گویا تہجد کی صحت کے لئے اُس سے قبل عشاء کی نماز اور نیند، دونوں کا پایا جانا ضروری ہے)۔ اگر سو کر اُٹھنے کے بعد کوئی شخص وتر، یا کسی فرض کی قضاء یا نذر وغیرہ کی نماز پڑھ لے، تو اُس سے بھی تہجد کی فضیلت حاصل ہو جائے گی تہجد میں رکعات کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے، (جتنی بھی چاہے پڑھ سکتا ہے) ایک قول یہ ہے کہ اُس کی زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں۔

جو تہجد کا عادی ہو، بلا کسی مجبوری کے اُسے ترک کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۱۲ سے واضح ہے اگر چھوٹ جائے تو اُس کی قضا مستحب ہے۔

نفلِ مطلق رات میں دن کے مقابلہ میں زیادہ افضل ہے۔ (جیسا کہ ۲ نمبر پر مسلم کی حدیث دلالت کر رہی ہے) (قیامِ لیل اور رات کی نماز کی فضیلت کے لئے سو کر اُٹھنا کوئی ضروری نہیں ہے، وہ صرف تہجد کے لئے شرط ہے، کوئی اگر رات بھر جاگ کر نماز وغیرہ عبادات میں مشغول ہو، تو یہ بھی قیامِ لیل ہے، گو اُس پر تہجد کا اطلاق نہ ہو گا)

ہمیشہ مکمل رات جاگنا مکروہ ہے، گرچہ عبادات میں جاگے، کیونکہ صحیحین وغیرہ کی حدیث میں اُس سے منع کیا گیا ہے، نیز عموماً یہ نقصان کا باعث ہو گا۔ تاہم محبِ طبریؒ اور بعض دیگر علماء کے نزدیک اگر تمام رات مسلسل بیداری کسی کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو، تو اُس کے حق میں یہ مکروہ نہ ہو گا، بالخصوص جسے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ مناجات میں بڑی لذت ولطف حاصل ہو، ایسی صورت میں کسی ناگوار امر کا خطرہ ہو تو کراہت ہو گی، ورنہ نہیں، بکثرت تابعین اور دیگر بزرگوں کے حالات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ممانعت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض علماء مطلقاً کراہت کے قائل ہیں۔ چوکیداری وغیرہ جیسے اعذار کی وجہ سے رات بھر جاگنے کی نوبت آئے، تو یہ بظاہر مکروہ نہیں ہے۔

رات کا اتنا حصہ جاگنا جو مضر ہو، مکروہ ہے۔ (گو مکمل رات نہ جاگے)۔ بعض راتوں کو مکمل جاگ کر عبادت میں گذارنا مکروہ نہیں ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رمضان کا آخری عشرہ تمام رات عبادت میں گذار دیتے۔ رمضان کے آخری عشرہ اور دونوں عید کی راتوں کو مکمل جاگ کر عبادت میں گذارنا مستحب ہے۔

صرف جمعہ کی شب کو (یعنی جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب) نماز کے ساتھ خاص کرنا مکروہ ہے، کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ کسی دوسری شب کو اس طرح نماز یا کسی دوسری عبادت کے ساتھ مخصوص کرنا مکروہ نہیں ہے۔ ایسی طرح شبِ جمعہ کو نماز کے علاوہ تلاوت، ذکر اور درود وغیرہ عبادات کے ساتھ مخصوص کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، بلکہ اس رات درود شریف کی کثرت کی بڑی اہمیت ہے۔ بعضوں کے خیال میں اس رات درود پڑھنا بجز سورۂ کہف کے قرآن کی تلاوت سے بھی افضل ہے۔ اگر جمعہ کے ساتھ اُس سے پہلے کی یا بعد کی رات میں بھی جاگے، تو کراہت ختم ہو گی۔

اگر کسی نمازی یا سونے والے شخص وغیرہ کو تکلیف نہ ہو، تو رات کی نفلِ مطلق میں جہر اور سر کے درمیان تلاوت کرنا مستحب ہے۔ عورت کے لئے یہ حکم اُس وقت ہے، جب کہ کسی اجنبی مرد کو اُس کی آواز سنائی نہ دے۔ بعضوں کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ کبھی آواز سے اور کبھی آہستہ تلاوت کرے۔

فوائد: (۱) رات میں نیند سے بیدار ہونے والے ہر شخص کے لئے سنت ہے کہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر نیند کو دور کرے، مسواک کرے اور آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائے (گرچہ گھر میں ہو اور چھت کی وجہ سے آسمان نظر نہ آئے یا نابینا ہو) اور سورۂ آل عمران کی آخری گیارہ آیات (آخری رکوع) یعنی "اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" سے سورت کے آخر تک تلاوت کرے۔ یہ تمام امور صحیحین میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ثابت ہیں۔

(۲) رات میں نماز شروع کرتے وقت پہلی دو رکعتیں مختصر پڑھنا سنت ہے۔ بعد میں جس طرح چاہے (لمبی یا مختصر) پڑھے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب رات نماز کے لئے اُٹھتے تو اپنی نماز کو دو خفیف (مختصر اور ہلکی) رکعتوں سے شروع کرتے۔ نیز آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ: "جب تم میں سے کوئی رات کو اُٹھے تو اپنی نماز کو دو خفیف رکعتوں سے شروع کرے۔ (مسلم) (تاکہ اب آگے باقی نمازوں کو نشاط کے ساتھ ادا کرے، نیز امت کے حق میں ایک فائدہ یہ بھی ہو گا

کہ جلد ہی شیطان کی لگائی ہوئی تیسری گرہ کھل جائے گی)

(۳) صحیحین کی حدیث کی وجہ سے سنت ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔

(۴) رکوع وسجدہ کی طوالت یا رکعات کی کثرت کی بجائے قیام کو طویل کرنا زیادہ افضل ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

(۵) سنت ہے کہ اطمینان سے اور غور وتدبر کے ساتھ تلاوت کرے، اگر کسی دوسرے کو تکلیف ہو، یا ریاکاری کا اندیشہ ہو، تو جہراً تلاوت نہ کرے۔ بطورِ تدبر ایک ہی آیت کو بار بار پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، گو کئی مرتبہ دہرائے۔

(۶) صحیحین وغیرہ کی احادیث کی رُو سے اگر نماز میں اونگھ آنا شروع ہو تو پھر سو جائے، یہاں تک کہ نیند کا غلبہ ختم ہو جائے، ورنہ زبان سے نادانستہ کچھ بھی غلط اور نامناسب الفاظ نکل جائیں گے۔

(۷) میاں بیوی میں سے جو بھی رات نماز کے لئے اُٹھے، وہ دوسرے کو بھی جگادے، جیسا کہ حدیث نمبر: ۷ میں اس کی فضیلت گذر چکی۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات بیدار ہونے کے بعد آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کو بیدار کرنے کا حکم دیا۔

کسی دوسرے کے تہجد کے لئے اٹھنے کی توقع ہو، تو اُسے بھی بیدار کرنا مستحب ہے، جب کہ اسے کوئی ضرر و تکلیف نہ ہو، صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رات میں نماز کے لئے جگایا۔

(۸) مستحب ہے کہ قیامِ لیل کرنے والا اتنی مقدار کا اپنے کو عادی بنائے، جس پر بظاہر دوام اور ہمیشگی ممکن ہو، بعد میں اُسے ترک کرنا یا مقدار میں کمی کرنا مکروہ ہے۔ صحیحین کی روایات اس تفصیل پر دلالت کرتی ہیں۔

(۹) سوتے وقت رات نماز کے لئے اُٹھنے کی نیت اور پختہ ارادہ کر کے سوئے، کیونکہ ایسی صورت میں اگر نیند کے غلبہ کی وجہ سے آنکھ نہ بھی کھلے تو اُس کے لئے نیت (کی وجہ سے نماز) کا ثواب لکھ دیا جائے گا۔ (نسائی، ابن ماجہ باسناد صحیح)

(۱۰) رات کے تمام حصوں میں بکثرت دعا و استغفار کرنا تاکیدی مستحب ہے۔ آخری نصف میں زیادہ تاکید ہے، اور سحری کے وقت مزید افضل ہے، جیسا کہ قرآنی آیات اور احادیث سے ثابت ہے۔

(۱۱) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’اگر بندہ بیمار پڑھتا ہے، یا سفر میں جاتا ہے، تو اُس کے حق میں صحت و اقامت کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔‘‘ (بخاری)

(۱۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ’’سحری کے کھانے کے ذریعے دن کے روزہ پر اور قیلولہ کے ذریعے رات کے قیام پر تعاون حاصل کرو‘‘ (ابنِ ماجہ باسناد ضعیف) امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ فضائل میں ضعیف احادیث پر بھی عمل کیا جائے گا۔ لہٰذا تہجد کے لئے قیلولہ کرنا سنت ہے۔ یعنی زوال سے قبل کچھ دیر سو جانا، اور محدثین کے نزدیک بلا نیند کے صرف آرام کرنا بھی قیلولہ کہلاتا ہے۔ اس کی مقدار لوگوں کی عادت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ امام احمدؒ نے گرمی اور سردی میں کبھی اُسے ترک نہیں کیا۔

(۱۳) رات سو کر اُٹھنے کے بعد کچھ نہ کچھ نماز پڑھنے کا اہتمام اور کوشش کرے، گو دو رکعت ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۴) جو شخص مطلق نفل نماز یا ذکر وغیرہ کا عادی ہو، (اُس کا اپنا کچھ معمول ہو) تو چھوٹنے کی صورت میں اُس کی قضا مستحب ہے (جیسا کہ نفلِ مؤقت کی قضا مستحب ہے) تاکہ نفس آرام کی طرف مائل نہ ہو، اور پھر رفتہ رفتہ یہ معمول بالکل ہی ختم نہ ہو جائے۔

(۱۵) قیامِ لیل نفس پر گراں ترین چیز ہے، بالخصوص نیند سے اُٹھ کر قیام کرنا، تاہم جب عادت ڈالے اور پابندی کرے اور ابتداءً

مشقت جھیلے تو بعد میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ انس، مناجات اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ خلوت کی حلاوت و لذت کا دروازہ کھل جاتا ہے، اُس کے بعد انسان قیامِ لیل سے سیر اب ہی نہیں ہو گا، اُسے بار محسوس کرنا اور اُس میں سستی کرنا تو در کنار، جیساکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نیک بندوں کا حال ہے۔ اسی لئے بعض صالحین نے فرمایاکہ اگر جنتیوں کی حالت ہمارے رات کی حالت کی طرح ہو، تب تو ان کی زندگی بڑی پاکیزہ اور پُر لطف ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں: چالیس سال سے میں سوائے طلوعِ فجر کے کسی اور چیز سے غمگین نہیں ہو تا (کیونکہ اس کی وجہ سے قیامِ لیل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے) ایک بزرگ کا قول ہے کہ رات میں اپنے لہو و لعب سے لطف اندوز ہونے والوں سے بڑھ کر شب بیداروں کو اپنی شب بیداری وعبادت میں لذت وچاشنی نصیب ہوتی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر قیامِ لیل اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی نسبت پر بھائیوں سے ملاقات کی دولت نصیب نہ ہوتی تو قطعاً مجھے دنیا میں رہنا گوارا نہ ہو تا۔ اسلاف بزرگوں کے اس طرح کے اقوال کثرت سے منقول اور مشہور ہیں۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ ان کی اتباع میں قیامِ لیل کی پابندی کریں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے مخصوص بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ توفیق عنایت فرمائے (آمین)

[المجموع ۴/۴۳-۴۸، التحفہ مع الحواشی والنہایہ مع الحواشی وفتح الوہاب مع الجمل باب فی صلاۃ النفل، بشری الکریم ۱/۱۱۸، فتح المعین مع الاعانہ ۱/۲۶۷]

کتاب۔ صلاۃُ الجماعۃ (نماز باجماعت)

آیت: (وَ اِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوۃَ (سورہ نساء) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نماز خوف میں جماعت کا حکم دیا، تو عام حالات میں بدرجہ اولیٰ اس کی اہمیت ہو گی۔

احادیث: (۱) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا جماعت کی نماز تنہا نماز سے ستائیس درجہ افضل ہے۔ (متفق علیہ)

(۲) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے: نماز کیلئے جو جتنی دور سے پیدل آئے گا، اتنا ہی زیادہ ثواب کا مستحق ہو گا، اور جو نماز کا انتظار کرتا رہے یہاں تک کہ امام کے ساتھ نماز پڑھے، اسے نماز پڑھ کر سو جانے والے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ (صحیح بخاری)

(۳) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا فرمان ہے "جس نے عشاء باجماعت ادا کی تو گویا نصف رات نماز میں گذاردی۔ اور جس نے فجر باجماعت ادا کی، تو گویا ساری رات نماز میں گذاری۔ (مسلم۔ مالک۔ ابوداود۔ ترمذی)

(۴) ایک نابینا شخص (حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ) نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے عرض کیا کہ مجھے مسجد لانے والا کوئی ہے نہیں، لہٰذا یہ درخواست ہے کہ (ترک جماعت کی) اجازت مرحمت فرمائیں، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اجازت دی، جب وہ جانے لگے تو بلا کر دریافت فرمایا: "کیا تم اذان سنتے ہو،" کہا، جی ہاں۔ فرمایا۔ پھر جماعت میں شرکت کرو۔" (مسلم۔ نسائی)

(۵) ایک مرتبہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ لکڑیاں جمع کر کے ان لوگوں کے مکانات جلا ڈالوں جو جماعت میں شریک نہیں ہوتے۔ (موطا۔ بخاری۔ مسلم۔ ابوداود۔ ترمذی۔ نسائی۔) (تیسیر الوصول ۲/۲۶۵)

(۶) کسی شخص کا دوسرے کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے افضل ہے اس کا دو اشخاص کے ساتھ نماز پڑھنا ایک کے ساتھ پڑھنے سے افضل ہے، جتنے زیادہ نمازی ہوں، وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ (ابوداود۔ نسائی)

(۷) کسی بستی یا صحرا و جنگل میں تین افراد ہوں اور ان میں جماعت کا قیام نہ ہو، تو ضرور شیطان ان پر غلبہ اور قابو پالے گا، لہٰذا

جماعت کی پابندی کرو، کیونکہ بھیڑیا (ریوڑ اور چرواہے سے) دور (تنہا) بکری کو کھا جاتا ہے۔(احمد۔ابوداود۔نسائی۔ابن ماجہ۔ حاکم۔تلخیص الحبیر۔۲/۲۷)

تنہا اور جماعت کی نماز کے ارکان و شروط میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن جماعت افضل ہے۔جمعہ کی نماز میں جماعت فرض عین اور دیگر فرض نمازوں میں فرض کفایہ ہے۔ محدثین شوافع میں سے امام ابن المنذر اور ابن خزیمہ (اور بعض دیگر علماء) نے جماعت کو فرض عین کہا ہے۔ کسی بستی کے لوگ جماعت کا اہتمام نہ کریں تو امام وقت (مسلم حکومت کا بادشاہ) ان سے قتال ولڑائی کرے۔ جماعت کی ذمہ داری سے اہل بستی اسی وقت سبکدوش ہوں گے، جبکہ ایسے انداز میں اس کا قیام ہو کہ ان کے درمیان اس شعار (دینی اہم علامت) کا اظہار ہو، لہٰذا چھوٹی بستی میں ایک جگہ اس کا قیام کافی ہے، بڑی بستیوں اور شہروں میں کئی مقامات میں جماعت ہونی چاہئے۔ تمام لوگ گھروں میں جماعت سے پڑھنے پر اکتفاء کریں تو اس سے فرض ساقط نہ ہوگا۔ بازار یا کسی گھر میں ایسے طور پر جماعت ہو کہ سب شریک ہوتے ہوں اور اظہار حاصل ہو تو یہ کافی ہے۔

بستی یا صحرا کے چند حضرات اظہار کے ساتھ جماعت کا اہتمام کریں اور اکثر حضرات نہ آئیں تو جماعت حاصل ہوگی۔ اور پیچھے رہنے والوں کو گناہ نہ ہوگا۔ (لیکن احادیث میں سخت تاکید کی وجہ سے بغیر معقول اور شرعی عذر کے پیچھے نہیں رہنا چاہئے) جیساکہ بعض حضرات کا نماز جنازہ پڑھنا کافی ہے۔ (اوروں کو گناہ نہ ہوگا) یہ مردوں کے متعلق تفصیلات تھیں۔ عورتوں کے لئے جماعت سے پڑھنا مستحب ہے۔ لیکن مردوں کے مقابلہ میں تاکید کم ہے، اور جماعت ترک کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، لیکن مردوں کو ترک جماعت مکروہ ہے۔ عورتوں کی امام (عورت) کو ان کے درمیان میں کھڑی رہنا مستحب ہے (نہ کہ مردوں کے امام کی طرح آگے)۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہو گئیں۔(عبدالرزاق، دارقطنی ،بیہقی، تلخیص الحبیر ۲/۴۴)

عورتوں کیلئے گھر کی جماعت افضل ہے، مردوں کے ساتھ مسجد میں حاضر ہونا نوجوان عورتوں کو مکروہ ہے، نہ کہ بوڑھی عورتوں کو۔

حدیث۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اپنی عورتوں کو مسجد سے نہ روکو اور ان کے حق میں ان کا گھر بہتر ہے۔(ابوداود، وصححہ الحاکم)

عورتوں کی امامت مرد کرے یہ افضل ہے، بہ نسبت عورت کی امامت کے، لیکن غیر محرم کو ان کے ساتھ تنہائی جائز نہیں (مقتدیوں میں کوئی ایک عورت اس مرد امام کی محرم یا بیوی ہو)۔ (ممیز) بچوں کو مساجد اور جماعت کی شرکت کا حکم دیں گے، تاکہ وہ عادی بنیں (مغنی)

قضاء نماز میں جماعت سنت ہے، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب وادی میں فجر کی نماز فوت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ساتھ باجماعت اس کی قضاء کی۔ ادا نماز کے پیچھے قضاء اور قضاء کے پیچھے ادا جائز ہے، لیکن تنہا پڑھنا اس سے افضل ہے، تاکہ علماء کے اختلاف سے نکل جائے۔ کن نوافل میں جماعت مشروع ہے اور کن میں نہیں اس کا ذکر نوافل کے باب میں گذر چکا ہے۔ غیر مشروع ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مستحب نہیں ہے، اگر کوئی ایسے نوافل کو باجماعت پڑھے تو جائز ہے، اور اسے مکروہ نہ کہیں گے، کیونکہ احادیث صحیحہ اس کے متعلق موجود ہیں۔

کوئی شخص اپنے گھر میں اپنے ساتھی یا بیوی یا بچے کے ساتھ نماز پڑھے تو اس سے (فی الجملہ) جماعت کی فضیلت حاصل ہوگی، لیکن

مسجد میں افضل ہے۔ مسجد میں جتنی بڑی جماعت ہو وہ افضل ہے۔ قریب کی مسجد میں کم جماعت اور دور کی مسجد میں بڑی جماعت ہوتی ہو تو دور کی افضل ہے سوائے دو صورتوں کے۔(۱)اس کے دور جانے سے قریبی مسجد میں جماعت نہ ہو، اس کے وہاں امام ہونے کی وجہ سے یا اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی آتے ہوں تو قریبی مسجد افضل ہے۔(۲)دور کی مسجد کا امام بدعتی مثلاً معتزلی وغیرہ ہو۔

سلام سے پہلے مقتدی امام کے ساتھ شامل ہو جائے تو اسے (فی الجملہ) جماعت کی فضیلت حاصل ہو گی۔ امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ کی پابندی مستحب ہے، امام کے تکبیر کے بعد ہی اپنے نماز کی ابتداء کرے، تو یہ فضیلت حاصل ہو گی، تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے کا ڈر ہو تو رفتار تیز نہ کرے، بلکہ سکینہ کے ساتھ چلے جیسا کہ فوت ہونے کا ڈر نہ ہونے کی صورت میں چلنا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے جب اقامت سنو تو سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ نماز کے لئے چلو، تیز رفتاری کی ضرورت نہیں، جتنی نماز ملے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے (امام کے سلام کے بعد) اسے مکمل کر لو۔(مؤطا۔بخاری۔مسلم۔ابوداود۔ترمذی۔نسائی۔(تیسیر الوصول ۲/۲۷۴)

فصل: امام کو ابعاض اور ہیئات سنتوں کی پابندی کے ساتھ مختصر اور ہلکی نماز پڑھانا مستحب ہے۔

حدیث:(۱)تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھائے۔(متفق علیہ)

(۲)حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے ہلکی اور مکمل نماز کسی اور امام کے پیچھے نہیں پڑھی۔(متفق علیہ) (تلخیص)

امام نوویؒ نے شرح مہذب میں خفیف اور ہلکی نماز کا یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ نہ تو اقل (صرف فرائض) پر اکتفا کرے اور نہ منفرد کیلئے جو اکمل اور مستحب ہے اس پر عمل کرے۔(حاشیۃ الروضۃ) اگر مقتدی متعین اور محدود ہوں اور تطویل سے راضی ہوں تو لمبی نماز پڑھانا مستحب ہے۔ امام نماز کو طویل کرے، تو اس کی درج ذیل صورتیں ہیں۔(۱)بازار یا محلہ کی مسجد میں نماز کے دوران مزید مقتدیوں کے آنے کیلئے طویل کرنا یہ مکروہ ہے

(۲)ایسی مسجد میں امامت کرے جہاں کوئی معزز و بلند مرتبہ اور شریف نماز میں آتا ہو، تو اس کے انتظار میں طویل کرنا یہ بھی مکروہ ہے

(۳)نماز میں یہ محسوس کرے کہ کوئی شخص آ چکا ہے، اور اس کی اقتداء کرنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں رکوع اور تشہد اخیر میں اس کا انتظار درج ذیل شرائط کے ساتھ مستحب ہے (تاکہ پہلی صورت میں اسے وہ رکعت اور دوسری صورت میں جماعت کی فضیلت مل جائے)

شرائط: زیادہ طویل نہ کرے، مسبوق مسجد کے اندر ہو، باہر ہو تو قطعاً انتظار نہ کرے، محض تقرب الی اللہ کی نیت سے انتظار کرے، لہٰذا مقتدیوں میں فرق نہ کرے (کہ بعض کیلئے انتظار کرے اور بعض کیلئے نہ کرے۔)

فصل۔ فرض نماز کا جماعت کے ساتھ اعادہ

جو شخص تنہا یا با جماعت پنجوقتہ نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھ چکا ہو، پھر اُسی نماز کی جماعت ملے تو ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ اعادہ کرنا مستحب ہے۔ اس کی فرض پہلی شمار ہو گی، لیکن اعادہ میں بھی نیت فرض ہی کی کرے گا۔ کسی نے نماز پڑھنے کے بعد دوسرے کو وہی نماز تنہا پڑھتے دیکھا تو اسے اس کے ساتھ نماز میں شامل ہونا مستحب ہے تاکہ اسے جماعت کی فضیلت حاصل ہو۔

احادیث:(۱)حجۃ الوادع میں مسجد خیف میں فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے دیکھا کہ دو آدمی نماز میں شریک نہیں ہوئے،

دریافت کرنے پر انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اپنے قیام گاہ پر نماز پڑھ لی تھی، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح نہ کرو جب اپنے قیام گاہ پر نماز پڑھ لو پھر کسی مسجد میں پہنچ جاؤ۔ جہاں جماعت ہو رہی ہو تو پھر ان کے ساتھ پڑھ لو، یہ تمہارے لئے نفل ہو گی۔(احمد ابوداود، ترمذی، نسائی، قال الترمذی حسن صحیح)

(۲) ایک حدیث میں حضرت ابوذر سے آپ ﷺ نے ایسے امراء کے دور میں جو نماز کو موخر کریں، اپنی نماز وقت پر پڑھنے کے بعد ان کے ساتھ ملے تو دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ تمہارے لئے نفل ہو گی۔(مسلم)

(۳) ایک مرتبہ ظہر کی جماعت کے بعد ایک شخص آکر تنہا نماز پڑھنے لگا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ! ہے کوئی جو اس پر صدقہ کرے (یعنی) اس کے ساتھ نماز پڑھے (تاکہ اسے جماعت کا ثواب ملے) ترمذی۔ابن حبان۔حاکم۔بیہقی، تلخیص الحبیر)

فصل۔ جماعت کے اعذار

کسی عام یا خاص عذر کے بغیر جماعت کے ترک کی اجازت نہیں ہے۔

عام اعذار: دن یا رات میں ایسی بارش ہو جس سے مشقت ہو، رات میں تیز و تند ہواؤں کا چلنا، شدید کیچڑ، ظہر کے وقت گرم ہوا اور شدت کی دھوپ و گرمی، اس صورت میں اگر ظہر کو ٹھنڈے وقت میں نہ پڑھیں یا اس کے باجود شدید گرمی باقی ہو تو جماعت سے پیچھے رہ سکتا ہے، رات یا دن میں شدت کی سردی۔

خاص اعذار: ایسا مرض جس کی وجہ سے جماعت میں حاضری میں مشقت ہو۔ تیمار داری۔ کسی ظالم کی طرف سے اپنے یا متعلقین میں سے کسی کے جان و مال کا خطرہ ہو۔ قرض خواہ کے پیچھے پڑنے یا قید میں ڈالنے کا اندیشہ ہو جبکہ یہ تنگدست ہو۔ اگر قرض کا مطالبہ کرنے والا برحق ہو، (اور یہ ادا کر سکتا ہو) تو نہ دینا ظلم ہے لہٰذا اس پر جماعت کی حاضری اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے۔ روٹی تنور میں یا ہانڈی چولہے پر ہو اور دوسرا کوئی اس پر نگاہ رکھنے والا نہ ہو، اس پر قصاص لازم ہو اور چند روز پوشیدہ رہنے سے سامنے والے کی طرف سے معافی کی توقع ہو، پیشاب یا پاخانہ یا اخراج ریح کی ضرورت ہو اس صورت میں پہلے ان ضروریات سے فارغ ہو لے، چاہے اس کی وجہ سے جماعت ترک ہو جائے، انہیں روک کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن فارغ ہونے تک وقت ہی ختم ہو جائے تو پہلے نماز پڑھ لے، شدید بھوک یا پیاس لگی ہو اور کھانا پینا حاضر ہو، اور طبیعت کا اس طرف میلان ہو تو پہلے کھا پی لے، یعنی اتنے لقمے کھالے کہ بھوک کی شدت کو مار دے، البتہ دودھ اور ستو جیسی ایک ہی مرتبہ میں کھائی جانے والی چیز ہو تو مکمل کر لے۔ کھانے پینے سے وقت نکل جائے تو پھر نماز کو مقدم کرنا لازم ہے۔ اس کے مناسب لباس موجود نہ ہو، چاہے ستر عورت ہو سکتا ہو یا نہ ہو سکتا ہو۔ سفر کا ارادہ ہو، اور سفر کے ساتھی نکل چکے ہوں۔ گمشدہ چیز کی تلاش اور اعلان میں لگا ہو، اور جماعت چھوڑنے سے اس چیز کے ملنے کا امکان ہو یا وہ آدمی ملے جس نے اس کا مال غصب کیا ہو اور اس سے وہ واپس لینے کا ارادہ ہو، کچی پیاز یا گندنا وغیرہ بدبودار اشیاء کھا چکا ہو اور دھونے وغیرہ سے اس کی بو کا ازالہ نہ ہو۔ نیند کا غلبہ (جس کی وجہ سے جماعت کا انتظار مشکل ہو) برف باری جبکہ اس سے کپڑے تر ہوں۔ زلزلہ۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں حد سے زیادہ موٹاپا (جس سے جماعت میں شریک ہونا بہت شاق ہو) عذر جماعت میں شمار کیا ہے، اور حدیث بیان کی کہ ایک انصاری نے اس عذر کی وجہ سے آپ ﷺ سے اپنے گھر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ (حاشیۃ الروضہ)

احادیث:(۱)جو اذان سن کر بغیر عذر کے جماعت میں شریک نہ ہو اس کی نماز نہیں۔(ابن ماجہ۔طبرانی،دارقطنی۔ بیہقی۔حاکم۔وقال صحیح علی شرط الشیخین)

(۲)جو فارغ اور تندرست ہونے کے باوجود اذان سن کر جماعت میں شریک نہ ہو اس کی نماز نہیں۔(حاکم۔بیہقی)

(۳)آپ ﷺ سفر میں ٹھنڈے رات میں اور بارش کی رات میں موذن کو حکم دیتے کہ اپنی اپنی قیام گاہ پر نماز پڑھنے کا اعلان کرو۔ (بخاری۔مسلم ابوداود۔بیہقی۔)

(۴)اسی طرح دن میں بھی بارش کی وجہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں رخصت مروی ہے۔(بخاری،مسلم)

(۵)آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو پیاز اور لہسن کھائے وہ ہرگز ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ جس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔(مسلم۔نسائی۔ترمذی۔بیہقی)

(۶)جو لہسن یا پیاز کھائے وہ ہم سے یا ہماری مسجد سے الگ رہے اور اپنے گھر بیٹھے۔(بخاری۔مسلم۔ابوداود بیہقی ۔احمد،ارواءالغلیل)

(۷)کھانے کی موجودگی میں یا بول وبراز (پیشاب پاخانہ) روک کر نماز نہیں (یعنی اس طرح نماز مت پڑھو)(مسلم)

(۸)اقامت ہو اور کسی کو حاجت محسوس ہو تو پہلے اس سے فارغ ہو جائے۔(مالک،شافعی،احمد،سنن اربعہ)

(۹)شام کا کھانا حاضر ہو اور اقامت ہو تو پہلے کھانا کھالو۔(متفق علیہ)

باب۔امام کے صفات

واجب صفات: مقتدی کو معلوم ہو کہ امام بے وضو یا جنبی ہے یا اس کے کپڑے پر نجاست ہے تو ایسے شخص کی اقتداء جائز نہیں ہے، کافر صرف نماز پڑھنے سے مسلمان نہ ہو گا اور اس کی اقتداء کرنا جائز نہ ہو گا۔ اگر امام کسی اور مسلک کا ہو اور مقتدی کے مسلک کے مطابق جو واجبات ہیں، ان کی پابندی کرتا ہو، یا پابندی میں صرف شک ہو، تو اس کے پیچھے نماز صحیح ہو گی ورنہ صحیح نہ ہو گی۔ کسی کی نماز ایسی ہو کہ پھر اس کی قضاء لازم ہو جیسے پانی اور مٹی نہ ہونے کی وجہ سے بلا وضو اور بلا تیمم نماز۔ تو ایسے نمازی کی اقتداء جائز نہیں ہے۔ جو دوسرے کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو اس کو امام بنانا صحیح نہیں ہے۔ دو آدمی باجماعت نماز پڑھ رہے ہوں، لیکن ان میں امام سمجھ میں نہ آئے تو ان میں سے کسی کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو امی ہو یعنی سورہ فاتحہ صحیح نہیں پڑھ سکتا تو اس کے پیچھے قاری (سورہ فاتحہ صحیح پڑھنے والا) کی نماز صحیح نہ ہو گی۔ بے موقع ادغام کرنے والا راء کو تاء سے بدلنے والا ایک حرف کی جگہ دوسرا پڑھنے والا اور جو تشدید کو ادا نہ کر سکے یہ سب امی ہیں۔ امام اور مقتدی ایک ہی طرح کے امیّ ہوں تو اقتداء صحیح ہو گی۔ اگر ایک شخص سورہ فاتحہ نصف اول صحیح پڑھتا ہو اور دوسرا نصف ثانی تو ان دونوں کو ایک دوسرے کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے۔ تمتام (تاء میں ہکلانے والا) اور فافاء (فاء کو بار بار ادا کرنے والا) کی امامت مکروہ ہے اور اس کی اقتداء صحیح ہے۔

تلاوت میں ایسی غلطی کرے جس سے مطلب بدلتا نہ ہو جیسے اَلحمْدُ لِلّٰہ پڑھنا، تو اس کی اور اقتداء کرنے والوں کی نماز صحیح ہو گی۔ اور مفہوم بدل جائے۔ جیسے "انعمتُ یا انعمتِ" تو نماز باطل ہو گی۔ اگر زبان پلٹتی ہو اور سیکھنا ممکن ہو تو سیکھنا لازم ہے۔ اگر کوتاہی کرے اور وقت تنگ ہو تو ایسے ہی نماز پڑھ لے اور بعد میں اعادہ کرے، اس کی اقتداء صحیح نہ ہو گی۔ اور اگر زبان پلٹتی نہ ہو یا اتنا وقت نہیں ملا کہ سیکھ

سکتا، اور سورہ فاتحہ میں یہ مسئلہ ہو تو اس کی نماز اور اس جیسے آدمی کی اقتداء صحیح ہے۔ لیکن قاری کی اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ فاتحہ کے علاوہ میں یہ مسئلہ ہو تو اس کی اور پیچھے والوں کی نماز درست ہے۔ مرد کے پیچھے مرد اور عورتیں اقتداء کر سکتے ہیں۔ عورت کے پیچھے صرف عورت اقتداء کر سکتی ہے۔ مرد اور خنثی کی اقتداء عورت کے پیچھے صحیح نہ ہوگی۔ خنثی کے پیچھے صرف عورت اقتداء کر سکتی ہے، مرد اور خنثی کی اقتداء عورت کے پیچھے صحیح نہ ہوگی۔ خنثی کے پیچھے صرف عورت نماز پڑھ سکتی ہے، مرد یا دوسرا خنثی نہیں پڑھ سکتے۔

امام تیمم یا مسحِ موزہ کرے اور مقتدی وضو کرے اور پیر دھوئے تو اقتداء صحیح ہے۔ سلس البول کی اقتداء تندرست کو (جس کو یہ بیماری نہ ہو) اور مستحاضہ غیر متحیرہ کی اقتداء طاہرہ عورت کیلئے صحیح ہے۔ ڈھیلوں سے استنجاء کرنے والے اور جس کے بدن یا کپڑے پر معاف نجاست ہو اس کی اقتداء صحیح ہے۔ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے والا بیٹھ کر پڑھنے والے کی اور کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر پڑھنے والا لیٹ کر پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتے ہیں۔

امام کو باوضو اور پاک سمجھ کر اقتداء کی اور نماز بعد اس کا بے وضو یا جنبی ہونا معلوم ہوا تو مقتدی کو قضا کی ضرورت نہیں ہے۔ امام کا بے وضو ہونا مقتدی کو معلوم تھا، پھر بھول کر اس کی اقتدا کی، تو نماز کا اعادہ ضروری ہے۔ امام کو قاری سمجھ کر اقتداء کی، لیکن وہ امی نکلا، تو اعادہ لازم ہے۔ نماز کے دوران امام کا بے وضو یا جنبی ہونا معلوم ہو، تو فوراً جدائی کی نیت کر کے بقیہ نماز تنہا مکمل کرے، قضاء کی ضرورت نہیں۔ امام کو مرد سمجھ کر کسی مرد نے اقتداء کی، پھر معلوم ہوا کہ عورت ہے، تو اعادہ واجب ہے۔ مسلمان سمجھ کر اقتداء کرے اور وہ کافر نکلے تو اعادہ لازم ہے۔ نماز کے بعد امام کے بدن یا کپڑے میں نجاست کا علم ہو اور وہ خفیہ (غیر ظاہرہ) ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں اور ظاہرہ ہو (کہ نظر آسکتی تھی) تو اعادہ لازم ہے۔ ممیز بچہ (باشعور بچہ) کی اقتداء میں فرض اور نفل پڑھ سکتا ہے، لیکن بالغ امام افضل ہے۔ غلام اور نابینا کی امامت صحیح ہے۔

احادیث: (۱) حضرت عمرو بن سلمہ آپ ﷺ کے دور مسعود میں اپنے قوم کی امامت فرمایا کرتے اور اس وقت ان کی عمر سات سال تھی (بعض روایت میں ۶/ یا ۷/، ۷ یا ۸ اور ۸/ بھی ہے) (بخاری، ابوداود، نسائی، طبرانی)

(۲) مرض الوصال میں آپ ﷺ نے بیٹھ کر امامت فرمائی اور صحابہ نے کھڑے ہو کر پڑھی"۔ (متفق علیہ)

(۳) بعض غزوات میں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں امامت کی ذمہ داری حضرت ابن ام مکتوم (ایک نابینا صحابی) کو سونپی۔ (ابوداود، احمد، ابن حبان، ابو یعلی، طبرانی اسنادہ حسن) (تلخیص الحبیر)

فصل۔ امام کے لئے مستحب صفات

درج ذیل چھ اسباب کی وجہ سے امام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ فقہ (مسائل کا علم) قراءۃ۔ ورع۔ (پرہیز گاری) عمر، نسب، ہجرت۔ فقہ اور قرأت تو واضح ہیں۔ ورع سے مراد عدالت (اللہ کے خوف سے شبہات سے بچنا) اور حسن سیرت اور عفت و پاکدامنی ہے۔ عمر سے اسلام کی حالت میں گذری ہوئی عمر مراد ہے۔ پس آج اسلام لایا ہو ابوڑھا ابتدا اسے مسلمان نوجوان پر مقدم نہ ہوگا اور نہ کل اسلام لانے والے جوان پر مقدم ہوگا۔ نسب میں قریش کا نسب تو معتبر ہے ہی، ساتھ ساتھ ہر وہ نسب جو کفاءت (نکاح میں) میں معتبر ہے، جیسے علماء و صلحاء یہاں بھی معتبر ہے۔ ہاشمی اور مطلبی دیگر قریش پر مقدم ہوں گے۔ قریش دیگر عرب پر مقدم ہوں گے، اور دیگر عرب عجم (غیر عرب) پر مقدم ہوں گے۔ جو آپ ﷺ کی طرف ہجرت کر چکا ہو وہ غیر مہاجر پر مقدم ہوگا۔ جو پہلے ہجرت کر چکا وہ بعد والے پر مقدم ہوگا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنیوالے مقدم ہوں گے۔ مہاجرین یا ہجرت میں

مقدم حضرات کی اولاد دوسروں کے اولاد پر مقدم ہو گی۔ ان مسائل کی روشنی میں بعض جزئیات سامنے آئیں گے۔ ایک عادل اور ایک فاسق ہو تو امامت کیلئے عادل بہتر ہے، چاہے فاسق فقہ قرأت اور دیگر صفات میں عادل سے بڑھا ہوا ہو، بلکہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہے، اسی طرح وہ بدعتی جو اپنی بدعت کی وجہ سے کافر نہ ہوا ہو، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور جو بدعت سے کافر ہو چکا ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہی نہیں۔ اس کا حکم دیگر کافروں کی طرح ہے۔ ایک اَوْرَعُ (زیادہ متقی) ہو اور دوسرا اَفْقَہُ یا اَقْرَأ (زیادہ فقہ جاننے والا یا قرأت جاننے والا) تو اَفْقَہُ اور اَقْرَأ کو ترجیح دیں گے۔ ایک صرف بقدر نماز قرأت جانتا ہو، لیکن فقہ میں ماہر ہو اور دوسرا پورا قرآن پڑھتا ہو لیکن فقہ کم جانتا ہو، تو اَفْقَہُ (اوّل) بہتر ہے۔ جس میں فقہ اور قرات دونوں ہو وہ صرف فقہ یا صرف قرأت جاننے والے پر مقدم ہو گا۔ فقہ اور قرأت دونوں بھی نسب، عمر اور ہجرت پر مقدم ہیں۔ فقہ اور قرأت کے بعد ورع، پھر ہجرت میں مقدم، پھر جس کی اسلامی عمر زیادہ ہو، اور اس کے بعد نسبی فضیلت مقدم ہو گی۔ ان تمام صفات میں دونوں برابر ہوں تو کپڑے اور بدن کی میل کچیل سے صفائی، اچھی صحت، اچھی آواز جیسے اوصاف کی وجہ سے ترجیح دیں گے (ان صفات کی روشنی میں ترجیح عام حالات میں ہے، کسی جگہ امام متعین ہو تو وہی مقدم ہو گا۔ (حاشیہ الروضہ)

کسی علاقہ کا حاکم و گورنر اس علاقے میں اوروں کی بہ نسبت امامت کا زیادہ مستحق ہے، چاہے اوروں میں مندرجہ بالا صفات ہوں۔ حاکم امام مسجد اور صاحب خانہ پر مقدم ہو گا جب کہ صاحب خانہ اپنے گھر میں جماعت کی اجازت دے۔ حاکم دوسرے کو امامت کی اجازت دے تو حرج نہیں، حاکموں میں فرقِ مراتب کا لحاظ کیا جائے گا امام اعظم (بادشاہ) اوروں پر مقدم ہو گا۔ پھر جو جتنا بڑا حاکم ہو گا وہ مقدم ہو گا۔ کسی جگہ جماعت ہو رہی ہو اور حاکم نہ ہو تو اس جگہ رہنے والا آگے بڑھنے یا کسی کو بڑھانے کا مستحق ہو گا۔ چاہے رہنے والا مالک ہو یا کرایہ دار ہو یا مستعیر ہو (عاریت پر لے کر رہنے والا) گھر دو آدمی میں مشترک ہو تو دونوں کی اجازت کے بغیر تیسرا امامت نہ کرے اور نہ ان میں سے کوئی دوسرے کی اجازت کے بغیر امامت کرے، ایک ہی شریک حاضر ہو تو وہی مستحق ہے۔ گھر کا مالک اور کرایہ دار دونوں ہوں تو کرایہ دار مقدم ہے۔ مالک اور مستعیر دونوں ہوں تو مالک مقدم ہے۔ کسی مسجد میں امام متعین ہو (جیسے عام طور پر ہوتا ہے) تو وہی امام مستحق ہے، اگر وہ حاضر نہ ہو، تو اسے بلا بھیجنا مستحب ہے۔ اول وقت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو دوسرے کو امامت کرنا مستحب ہے، جبکہ فتنے کا ڈر نہ ہو، فتنہ کا ڈر ہو تو لوگ تنہا نماز پڑھیں، بعد میں امام آجائے تو اس کے ساتھ اعادہ مستحب ہے۔

احادیث: (۱) قوم کی امامت کتاب اللہ کا اقرأ (جو قرآن زیادہ صحیح پڑھے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ) کرے قرأت میں برابر ہوں تو سنت (حدیث) کا زیادہ علم رکھنے والا، سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو (وہ امامت کرے) کوئی آدمی دوسرے کے گھر اس کی امامت نہ کرے اور نہ اس کے دائرہ اختیار میں اس کی امامت کرے، اور اس کی مخصوص نشست گاہ میں نہ بیٹھے مگر اس کی اجازت سے۔ (مسلم و اصحاب السنن)

(۲) حضرت ابن عمر حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ (الشافعی۔ ابن ابی شیبہ)

(۳) سنت یہ ہے کہ صاحب خانہ ہی امامت کرے۔ (الشافعی، عن ابن مسعود)

(۴) قریش کو مقدم کرو۔ (الشافعی، ابن ابی شیبہ، بیہقی، طبرانی، تیسیر الوصول، ارواء الغلیل، تلخیص الحبیر)

نماز میں مسائل کی زیادہ ضرورت پیش آسکتی ہے، اور مرض الوصال میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام بنایا، حالانکہ خود آپ ﷺ نے حضرت ابی ابن کعب کو اقرأ قرار دیا، اس لئے علماء نے افقہ کو اقرأ پر مقدم رکھا۔ (تحفۃ المحتاج وغیرہ)

فصل۔ اقتداء کے شرائط اور آداب

اقتداء کے سات شرائط ہیں۔

(۱) **مقتدی قبلہ کی طرف** امام سے آگے نہ ہو (کیونکہ آپ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے سے یہی ہوتا رہا اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور آگے بڑھنے والا تابع نہیں ہے۔ (حاشیۃ الروضہ) اگر مقتدی امام سے آگے بڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ اگر ایک ہی مقتدی ہو تو مستحب ہے۔ کہ امام سے معمولی پیچھے رہے۔ دو یا زائد مقتدی ہوں تو پیچھے صف بنالیں۔ امام و مقتدی ایک ہی سیدھ میں ہوں تو نماز صحیح ہوگی۔

آگے بڑھنے اور برابری میں ایڑیوں کا اعتبار ہوگا۔ ایڑیاں برابر ہوں اور مقتدی کی انگلیاں آگے ہوں تو حرج نہیں۔ (بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں محل نشست یعنی سرین کا اعتبار ہوگا۔ اور لیٹ کر پڑھنے میں پہلو کا اعتبار ہوگا۔ (حاشیۃ الروضہ) مقتدی کی انگلیاں امام سے پیچھے ہوں لیکن ایڑی آگے ہو تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ مسجد حرام میں امام کے لئے مقام ابراھیم کے پیچھے کھڑے ہونا مستحب ہے۔ لوگ کعبہ کے چاروں طرف کھڑے رہیں امام کی طرف کھڑے ہونے والے آگے نہ بڑھیں۔ دوسری طرف کھڑے ہونے والے امام کے مقابلہ میں کعبہ سے زیادہ قریب ہوں تو حرج نہیں۔

امام کے ساتھ ایک مذکر مقتدی ہو تو اس کے دائیں طرف کھڑا رہے، بالغ ہو یا بچہ، بائیں طرف یا پیچھے کھڑا ہو جائے تو نماز باطل نہ ہوگی، پھر دوسرا مقتدی آئے تو بائیں طرف تکبیر تحریمہ کہے پھر دونوں مقتدی پیچھے ہٹ کر صف بنالیں۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو تو امام آگے بڑھ جائے۔ یہ حکم اسوقت ہے جبکہ دوسرا مقتدی قیام میں آئے۔ تشہد یا سجدے میں آئے تو قیام تک آگے پیچھے نہ ہوں۔ ابتداء سے ہی دو مرد یا ایک مرد اور ایک بچہ ہو تو وہ دونوں امام کے پیچھے صف بنالیں، صرف عورتیں ایک یا زائد ہو تو پیچھے صف بنالیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ہوں تو مرد امام کے دائیں طرف اور عورت اس مرد کے پیچھے کھڑی ہو جائے۔ دو مذکر اور عورت ہو تو دونوں مذکر پیچھے صف بنائیں اور عورت ان کے پیچھے کھڑی رہے ایک مرد ایک خنثیٰ اور ایک عورت ہو تو مرد دائیں طرف خنثیٰ ان کے پیچھے اور عورت خنثیٰ کے پیچھے کھڑی رہے۔ کئی مرد اور بچے ہوں تو پہلے مردوں کی صف پھر بچوں کی صف ہوگی۔ عورتیں بھی ہوں تو ان کی صف بچوں کے پیچھے ہوگی۔ اگر مرد ننگے ہوں تو امام صف کے درمیان کھڑا ہو۔ صرف عورتوں کی جماعت ہو تو ان کی امام صف میں درمیان میں کھڑی رہے گی۔ یہ ساری تفصیلات مستحب ہے۔ خلاف ورزی سے نماز باطل نہ ہوگی۔

احادیث: (۱) ایک مرتبہ حضرت ابن عباس آپ ﷺ کے بائیں طرف نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں دائیں طرف منتقل کیا۔ (تیسرا الوصول، عن مؤطا، بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی)

(۲) حضرت جابر راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ ﷺ کی دائیں طرف نماز پڑھ رہا تھا، پھر دوسرے آدمی آکر بائیں طرف کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے ہم دونوں کو ہٹا کر آپ کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ (مسلم)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہمارے گھر میں میں اور ایک یتیم آپ ﷺ کے پیچھے نماز کیلئے کھڑے ہوئے اور ام سُلیم ہمارے پیچھے۔ (متفق علیہ)

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہو گئیں۔ (عبدالرزاق، دار قطنی،

بیہقی)

(۵) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرمائی تو ان کے درمیان میں کھڑی ہو گئیں۔ (الشافعی، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق) (تلخیص الحبیر)

کوئی شخص دوران جماعت حاضر ہو تو اسے صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو جانا مکروہ ہے۔ بلکہ صف میں کچھ جگہ خالی ہو یا گنجائش ہو (کہ داخل ہو جائے تو جگہ بن جائے گی) تو صف میں داخل ہو جائے، اگر پیچھے کی صف میں جگہ نہ ہو لیکن آگے کی صف میں ہو تو پچھلی صفوں کو چیر کر جانا جائز ہے، ان کی غلطی کی وجہ سے، اگلی صفوں میں جگہ نہ ہو تو پیچھے تکبیر باندھنے کے بعد آگے سے ایک نمازی کو پیچھے کھینچ لے اور اس آدمی کو اس کا ساتھ دینا مستحب ہے۔ اگر یہ تنہا ہی کھڑا رہا تب بھی نماز صحیح ہو گی۔

حدیث: (۱) مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے سے فرمایا۔ کیوں نہ صف میں داخل ہوئے یا صف میں سے کسی کو کھینچ لیا اپنی نماز کو لوٹاؤ۔ (طبرانی، بیہقی، تاریخ اصبہان لابی نعیم، احمد، مراسیل ابی داود)

(۲) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں تھے لہٰذا انہوں نے صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ ہوا تو فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری حرص بڑھائے دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ (بخاری، تلخیص الحبیر)

صف میں دو ہی شخص ہوں تو ان میں سے ایک کو نہ کھینچے کیونکہ دوسرا تنہا ہو جائے گا آگے بڑھ کر امام کے ساتھ صف بنا سکتا ہو تو آگے بڑھے یا پیچھے دو سے زائد آدمی کی گنجائش ہو تو ان دونوں کو پیچھے لے آئے۔ (فتح الوہاب ۱/۶۵)

(۲) **امام کی نماز کے ظاہری** افعال کا علم ہو، امام کے مشاہدہ کے ذریعے، یا بعض صفوں کے مشاہدہ کے ذریعے، یا امام یا مبلغ کی آواز سن کر امام کے افعال کا علم ہونا ضروری ہے۔

(۳) امام اور مقتدی ایک ہی جگہ ہوں، اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) امام اور مقتدی دونوں مسجد میں ہوں تو اقتداء صحیح ہے، دونوں کے درمیان کی مسافت کم ہو یا زائد یا دونوں مسجد کے الگ الگ حصے میں ہوں جیسے صحن مسجد اور چبوترہ، منارہ، تہ خانہ، چھت، اور گوشہ بشرطیکہ چھت مسجد میں داخل ہو، مسجد میں دو عمارتوں میں ہوں تو ایک کا دوسری طرف کھلنے والا دروازہ ہونا شرط ہے، ورنہ دونوں ایک مسجد شمار نہ ہوں گے۔ جب یہ شرط پائی گئی تو اس سے کوئی فرق نہیں کہ دروازہ کھلا ہو یا بند یا مقفل۔ امام و مقتدی ایسے دو مسجدوں میں ہوں کہ درمیان میں کوئی نہر یا راستہ یا مسجد کی ایسی دیوار حائل ہو، جس میں ایک دوسرے کی طرف کھلنے والا دروازہ نہ ہو تو یہ ایک کے مسجد اور دوسرے کے خارج مسجد کھڑے ہونے کی طرح ہے جو آگے انشاء اللہ آئے گا۔ مسجد بننے کے بعد مسجد میں نہر کھودی گئی تو وہ بھی مسجد ہے۔ اور مسجد سے پہلے کھودی گئی تو دو غیر متصل مسجد ہیں۔ ایک دوسرے سے متصل کئی مسجدیں ہوں کہ دروازہ ایک دوسرے میں کھلتا ہو تو یہ ایک ہی مسجد کے حکم میں ہے۔ مسجد کا رحبہ (مسجد سے خارج وہ حصہ جو مسجد کیلئے گھیر لیا گیا ہو) مسجد کے حکم میں ہے۔

(۲) دونوں مسجد سے باہر ہوں۔ اس کی دو صورتیں ہونگی۔

(الف) دونوں کھلے میدان میں ہوں، تو اقتداء صحیح ہے بشرطیکہ دونوں کہ درمیان کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ ذراع (ہاتھ) سے زائد نہ ہو۔ امام کے پیچھے دو آدمی آگے پیچھے کھڑے ہوں تو ان کے درمیان اور دو صف ہوں تو ان صفوں کے درمیان بھی اسی فاصلہ کا اعتبار ہو گا۔ امام کے پیچھے کئی صف ہوں اور امام اور آخری صف کا فاصلہ میلوں کا ہو تب بھی جائز ہے۔ (جبکہ امام اور صف اول کے درمیان اور بقیہ ہر دو

صف کے درمیان کا فاصلہ ۳۰۰ ذراع سے زائد نہ ہو) امام و مقتدی یا دوصفوں کے درمیان ایسی نہر جسے تیر کر پار کرنا پڑتا ہو یا ایسا راستہ جس پر لوگ چلتے ہوں حائل ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ان سارے مسائل میں اس میدان کے اطراف احاطہ ہو یا نہ ہو، یا چھت ہو یا نہ ہو سب برابر ہے۔

(ب) دونوں میدان میں (کھلی جگہ) نہ ہوں، بلکہ دونوں الگ الگ تعمیر میں ہوں، جیسے ایک صحن میں دوسرا چبوترہ پر یا امام ایک مکان میں اور مقتدی دوسرے مکان میں (یا ایک عمارت میں اور دوسرا میدان میں) تو مذکورہ دیگر شرائط کے ساتھ امام و مقتدی کے درمیان ایسے حائل کا نہ ہونا شرط ہے جو گذرنے یا دیکھنے سے روکے، یا اس حائل میں مَنْفَذْ (گذرگاہ) ہو تو ایک شخص کا اس منفذ میں کھڑا ہونا شرط ہے۔ اب اس شخص کے پیچھے یا دوسری طرف کھڑے ہونے والوں کی اقتداء صحیح ہے، چاہے ان کے اور امام کے درمیان حائل ہو منفذ میں کھڑا شخص پیچھے اور دوسری طرف والوں کیلئے امام کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا ان کو اس سے آگے بڑھنا جائز نہیں اور نہ اس سے قبل تکبیر تحریمہ کہیں۔ اگر امام اور مقتدی کے درمیان گزرنے سے مانع جیسے کھڑکی یا دیکھنے سے مانع جیسے بند دروازہ موجود ہو یا منفذ میں کوئی کھڑا نہ ہو تو پھر اس صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا حائل دونوں کے اجتماع سے مانع ہے۔

(۳) **ایک مسجد میں** اور دوسرا خارج مسجد ہو، اس صورت میں حائل کے متعلق مندرجہ بالا شرائط ضروری ہیں۔ مسجد اور خارج مسجد شخص دوصفوں کی طرح ہیں۔ لہٰذا وہ شخص جس طرف کھڑا ہے اس طرف مسجد کے آخری کنارے سے اس کے درمیان کا فاصلہ ۳۰۰ ذراع سے زائد نہ ہو، مسجد کے آخری صف یا امام کی جگہ سے فاصلے کا اعتبار نہ ہوگا۔ (فتح الوہاب۔ ۱/۶۶)

(۴) **اقتداء کی نیت:** مقتدی تکبیر تحریمہ کے وقت ہی اقتداء یا جماعت کی نیت کرلے، ورنہ اس کی نماز باجماعت نہ ہوگی۔ اقتداء کی نیت نہ کرے تو اس کی نماز تنہا منعقد ہوگی۔ دوران نماز اقتداء کی نیت میں شک ہو، اور امام کی متابعت میں کسی فعل کو انجام دینے سے قبل یاد آگیا تو حرج نہیں، کسی فعل کو اس کی متابعت میں انجام دینے کے بعد یاد آئے تو نماز باطل ہے، کیونکہ بحالت شک وہ تنہا نمازی کے حکم میں ہے، اور تنہا نمازی کو متابعت کی اجازت نہیں، حتی کہ آخری تشہد میں شک آئے تو اپنا سلام امام کے سلام پر موقوف رکھنا جائز نہیں ہے۔ متابعت کی وجہ سے نماز اس وقت باطل ہوگی، جبکہ اپنے رکوع یا سجدہ کے لئے امام کا زیادہ انتظار کرے تاکہ اس کے ساتھ رکوع یا سجدہ کرے، اگر دونوں کا عمل اتفاقاً ساتھ ہو تو حرج نہیں ہے۔ جمعہ کی نماز کیلئے اقتداء کی نیت واجب ہے۔

مقتدی کو نیت میں امام کی تعین واجب نہیں ہے، صرف جو بھی امام ہے اس کے ساتھ اقتداء کی نیت کافی ہے۔ اگر مقتدی تعین کرے، پھر اس میں غلطی ہو، مثلاً زید کے اقتداء کی نیت کی لیکن وہ عمر تھا تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ جیسا کہ نماز جنازہ میں میت کی تعین کرے اور غلط نکلے تو نماز صحیح نہیں ہے۔ دل میں یہ سمجھتے ہوئے اقتداء کی کہ یہ زید ہے (لیکن تعین نہیں کی) اور وہ کوئی اور تھا تو اقتداء صحیح ہے۔

امام اور مقتدی الگ الگ نماز کی نیت کریں تو اقتداء صحیح ہوگی۔ لہٰذا قضاء کے پیچھے ادا اور اس کے برعکس اور فرض کے پیچھے نفل اور اس کے برعکس جائز ہے (کیونکہ اختلاف نیت سے نماز کی شکل نہیں بدلتی)

حدیث: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے پھر لوٹ کر اپنی قوم کو وہی نماز پڑھایا کرتے۔ (بخاری، مسلم، ابوداود ترمذی، ابن ماجہ) بعض روایات میں آگے یہ صراحت بھی ہے۔ یہ ان کیلئے نفل اور قوم کیلئے فرض ہوتی تھی۔ (الشافعی، عبدالرزاق، دارقطنی، بیہقی (تیسیر، تلخیص)

اقتداء صحیح ہونے کیلئے امام کو امامت کی نیت شرط نہیں ہے، مقتدی مرد ہوں یا عورت، لیکن اسے بغیر نیت کے جماعت کا ثواب نہ

ملے گا۔ کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہو اور اس کی لاعلمی میں لوگ آکر اس کی اقتداء کریں تو قاضی حسین نے فرمایا کہ اسے جماعت کا ثواب مل جائیگا جمعہ کی نماز میں امامت کی نیت نہ کرے تو اس کی جمعہ صحیح نہ ہو گی۔ نیت میں مقتدی کی تعین کرے اور غلط نکلے تو اس میں حرج نہیں۔

(۵) امام اور مقتدی کی نماز افعال وارکان کے اعتبار سے ایک ہی قسم کی ہو، لہٰذا اگر امام اور مقتدی کی نماز ظاہری افعال میں مختلف ہو، جیسے عام فرض نماز جنازہ کی نماز کے پیچھے (یا اس کے برعکس) یا سورج گہن کی نماز کے پیچھے تو صحیح نہ ہو گی۔ افعال ظاہری میں دونوں نماز یکساں ہوں اور رکعتوں کی تعداد یکساں ہو جیسے ظہر عصر یا عشاء کے پیچھے تو واضح ہے۔ امام کے رکعت کی تعداد کم ہو جیسے فجر کے پیچھے ظہر تو امام کے سلام کے بعد مقتدی مسبوق کی طرح اٹھ کر اپنی بقیہ نماز مکمل کرے، قنوت میں امام کی اتباع کرے، اگر قنوت کے وقت امام سے الگ ہونے کی نیت کرے تو جائز ہے۔ اگر ظہر کی نماز مغرب کے پیچھے ادا کرے تو امام کے آخری تشہد کے وقت مقتدی کو اختیار ہے کہ اس کی اتباع کرے یا جدائی اختیار کرے۔ اگر مقتدی کے رکعت کی تعداد کم ہو، جیسے فجر کی نماز ظہر کے پیچھے تو یہ بھی جائز ہے، جب امام تیسری رکعت کیلئے اٹھے تو مقتدی کو اس سے جدائی یا اس کے انتظار میں اختیار ہے، اور انتظار کرنا افضل ہے۔ امام اگر اعتدال میں کچھ رکتا ہو اور یہ قنوت پڑھ سکتا ہو تو پڑھ لے، ورنہ کوئی حرج نہیں۔ قنوت کے لئے امام سے جدا بھی ہو سکتا ہے۔ مغرب کی نماز ظہر کے پیچھے ادا کرے تو جب امام چوتھی رکعت کے لئے اٹھے تو اس سے جدائی کی نیت کر کے تشہد پڑھ کر سلام پھیرے، تشہد میں امام کا انتظار کرنا جائز نہیں ہے۔ تراویح کے پیچھے عشاء پڑھنا جائز ہے، امام سلام پھیرے تو اٹھ کر اپنی بقیہ نماز مکمل کرے۔ عید یا استسقاء کی نماز کے پیچھے فجر وغیرہ پڑھ سکتا ہے، تکبیرات زوائد میں امام کی اتباع نہ کرے۔ اتباع کرنے میں بھی حرج نہیں، کیونکہ اذکار سے نماز میں حرج نہیں ہوتا۔ اگر فجر کی قضاء کے پیچھے عید پڑھے تو جائز ہے، اور زائد تکبیرات کہنا بہتر ہے۔

(۶) **نماز کے افعال میں امام کی موافقت:** امام کسی فرض کو ترک کرے مثلاً بیٹھنے کی جگہ کھڑا ہو یا اس کے برعکس، اور نہ لوٹے تو مقتدی کو اس کی اتباع جائز نہیں ہے۔ کیونکہ امام نے عمداً ایسا کیا ہے۔ تو اس کی نماز باطل ہے، سہواً کیا ہے تو اس کا یہ فعل غیر معتبر ہے چاہے نماز باطل نہ ہو۔ امام کسی سنت کو ترک کرے اور مقتدی کے اس میں مصروف ہونے میں تخلف فاحش (بہت زیادہ اور قبیح پیچھے رہنا) پایا جاتا ہو جیسے سجدہ تلاوت اور تشہد اوّل تو مقتدی اس سنت کو نہ ادا کرے۔ اگر ادا کرے گا تو نماز باطل ہو گی۔ امام سجدہ سہو یا دوسرا سلام ترک کرے تو مقتدی اسے بجالائے۔ لیکن سنت کی ادائیگی میں معمولی تخلف (امام سے پیچھے رہنا) پایا جارہا ہو، جیسے جلسہ استراحت تو اس میں حرج نہیں، اسی طرح پہلے سجدہ میں امام کے ساتھ شامل ہو جاتا ہو تو قنوت کے لئے پیچھے رہنے میں حرج نہیں۔

(۷) **امام کی متابعت:** مقتدی پر امام کی متابعت واجب ہے۔ افعال میں اس سے آگے نہ بڑھے۔ متابعت کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اس انداز میں نماز پڑھے کہ اس کے ہر فعل کی ابتداء امام کی ابتداء کے بعد اور فارغ ہونے سے قبل ہو۔ مخالفت کی درج ذیل صورتیں ہوں گی۔

(الف) امام کے ساتھ ساتھ ادا کرنا (مُقارَنت) تکبیر تحریمہ میں امام کی مقارنت ہو یا مقارنت کا شک ہو، تو نماز منعقد ہی نہ ہو گی۔ مقتدی کی پوری تکبیر تحریمہ امام کی پوری تحریمہ کے بعد ہونا شرط ہے۔ امام صاحب کو مستحب ہے کہ دائیں بائیں رخ کر کے صف بندی کا حکم دے اور صفیں درست ہونے کے بعد ہی تکبیر کہے۔ موذن کے اقامت سے فارغ ہونے کے بعد لوگ کھڑے ہو کر صف درست کر لیں۔ تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر افعال میں مقارنت جائز ہے لیکن مکروہ ہے اور اس سے جماعت کی فضیلت فوت ہو جائے گی۔

احادیث: (۱) حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے مونڈھوں پر ہاتھ پھیرتے

اور فرماتے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو کہ تمہارے قلوب میں اختلاف پیدا ہو گا۔ بالغ اور عقلمند حضرات میرے قریب رہیں پھر اس کے بعد والے پھر اس کے بعد والے۔(مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے صفوں کو سیدھا اور درست رکھو، کیونکہ یہ نماز کے اتمام میں داخل ہے۔(بخاری۔مسلم)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے: امام اسی لئے ہے کہ اس کی اتباع (واقتداء) کی جائے، پس وہ تکبیر کہے تب تم تکبیر کہو۔ اور وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)(تیسیر الوصول)

(۴) حضرت براء رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ہم آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تو جب آپ ﷺ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی آپ ﷺ کے پیشانی مبارک کے زمین پر رکھنے تک اپنی پشت نہ جھکاتا۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

(ب) امام سے پیچھے رهنا: امام سے بغیر عذر کے ایک رکن پیچھے رہا تو نماز باطل نہ ہو گی۔ دو رکن (فعلی) بلا عذر پیچھے رہا تو نماز باطل ہو گی۔ سورت کے پڑھنے یا رکوع وسجدہ کے تسبیحات کے لئے پیچھے رہنا عذر شمار نہ ہو گا۔ امام رکوع میں جائے بعد میں مقتدی رکوع کرے اور امام کو رکوع میں پالے تو یہ ایک رکن پیچھے رہنا شمار نہ ہو گا، امام رکوع سے اٹھ گیا اور مقتدی ابھی قیام ہی میں ہے تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی لیکن امام سجدہ کیلئے قیام کی حد سے آگے جھک چکا ہو اور مقتدی ابھی تک قیام ہی میں ہو تو اس کی نماز باطل ہو گی۔ لہٰذا دو رکن پیچھے رہنے کا مطلب یہ ہوا کہ امام کے دو رکن مکمل ہو چکے ہوں اور مقتدی ابھی ان دو سے قبل کے رکن میں ہو۔ یہ تفصیل بلا عذر "تخلف" (پیچھے رہنے) میں ہے۔

اعذار کی کئی انواع هیں: خوف، اس کا ذکر نماز خوف میں آئیگا۔

ایک عذر یہ کہ مقتدی کی رفتار تلاوت دھیمی ہو اور امام کی تیز، اس صورت میں امام مقتدی کی سورہ فاتحہ سے قبل رکوع کرے تو مقتدی اسے مکمل کرنے کے لئے پیچھے رہے۔ اور اپنی نماز کی ترتیب پر امام کے پیچھے چلے جب تک کہ امام تین (لِذَاتِہٖ) مقصود ارکان سے زائد آگے نہ بڑھ جائے۔ اگر امام تین رکن سے آگے بڑھ جائے تو (اپنی ترتیب چھوڑ کر) امام کے ساتھ شامل ہو جائے اور اس کے سلام کے بعد اپنی فوت شدہ رکعت کی تلافی کرے، یا امام سے جدا ہونے کی نیت کر لے۔(اور اپنی ترتیب کے مطابق نماز مکمل کر لے)

لذاتہ مقصود رکن کہنے سے اعتدال اور جلسہ بین السجد تین نکل گئے۔ عذر کے مسئلہ میں ان کو شمار نہیں کریں گے۔ لہٰذا مذکورہ مثال میں امام دوسری رکعت کا رکوع کرے اور مقتدی پہلے اعتدال میں ہو یا مقتدی ابھی فاتحہ مکمل نہیں کر چکا اور امام دوسرے سجدے سے اٹھ کر قیام یا تشہد میں پہنچ چکا تو یہ تین ارکان مقصودہ میں تخلف ہوا، لہٰذا اب مقتدی یا تو امام کے ساتھ رکوع یا قیام یا تشہد میں شامل ہو جائے یا اس سے جدائی کی نیت کرے۔(فتح الوہاب، تحفۃ المحتاج ۳/ص ۱۷۴)

مقتدی دعا استفتاح کی وجہ سے فاتحہ مکمل نہ کر پایا اور امام نے رکوع کر لیا تو یہ بھی عذر ہے، لہٰذا فاتحہ مکمل کر لے، یہ ساری تفصیل موافق مقتدی کے لئے ہے (یعنی جس کو امام کے ساتھ قیام میں بقدر سورہ فاتحہ وقت ملے) مسبوق (جس کو امام کے ساتھ سورہ فاتحہ کا وقت نہ ملے) اگر امام کو قیام میں پائے اور (جلد ہی) اس کے رکوع کا احتمال ہو تو اسے استفتاح نہ پڑھتے ہوئے جلد ہی فاتحہ پڑھنا چاہیئے۔ اب امام اس کی فاتحہ مکمل ہونے سے پہلے ہی رکوع کرے، اور اس نے استفتاح نہیں پڑھی تھی تو فاتحہ روک کر امام کے ساتھ رکوع کرے، اور اس کی وہ رکعت شمار ہو گی۔ اگر فاتحہ مکمل کرنے پیچھے رہا اور امام نے رکوع سے سر اٹھالیا تو وہ رکعت فوت ہو گئی۔ اب رکوع نہ کرے، امام کے ساتھ آگے بڑھے۔ اگر اس نے استفتاح پڑھی تھی تو اس کے بقدر سورۃ فاتحہ پڑھے، اب امام کے ساتھ رکوع نہ ملے تو وہ رکعت فوت ہو گئی

اب رکوع نہ کرے۔ بلکہ امام کے ساتھ سجدہ کرلے۔ امام کے سجدہ کے لئے جھکنے تک بھی بقدر استفتاح سورہ فاتحہ نہیں ہوئی تو اب امام سے جدائی کی نیت کرنا لازم ہے۔(فتح الوہاب ۱/۶۸، تحفۃ، نہایۃ)

ایک عذر بھول ہے۔ اگر امام کے ساتھ رکوع کرے پھر یاد آئے کہ سورہ فاتحہ بھول گیا یا اس میں شک ہو تو واپس لوٹنا جائز نہیں، کیونکہ محل قرأت فوت ہو چکا۔ اب امام کے سلام کے بعد ایک رکعت پڑھے۔ امام رکوع میں گیا اور مقتدی کو رکوع میں جانے سے پہلے ہی یاد آ گیا تو اب پہلے فاتحہ مکمل کرلے، اور اس کیلئے تخلف عذر ہے۔

(ج) رکوع یا کسی اور ظاھری فعل میں امام سے آگے بڑھنا۔ اگر کامل ایک رکن آگے نہ بڑھے، مثلاً امام سے قبل رکوع کیا لیکن امام رکوع میں پہنچنے سے قبل رکوع سے سر نہیں اٹھایا تو نماز باطل نہ ہوگی، عمداً اس طرح ہو یا سہواً، اگر عمداً آگے بڑھا ہے تو واپس قیام میں آکر امام کے ساتھ رکوع مستحب ہے۔ اور سہواً ہے تو اسے لوٹنے نہ لوٹنے کا اختیار ہے۔ اگر عمداً دو رکن (فعلی) امام سے آگے بڑھا، اور اس کا حرام ہونا بھی معلوم ہو، تو نماز باطل ہوگی۔ سہواً یا لاعلمی میں اس طرح ہو تو باطل نہ ہوگی، لیکن وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ امام کے سلام کے بعد اس کی تلافی کرے۔

دو رکن آگے بڑھنے کی ایک مثال: امام سے قبل رکوع کرے جب امام رکوع کا ارادہ کرے تو یہ اٹھ جائے۔ جب امام اٹھنے کا ارادہ کرے تو یہ سجدہ میں جائے، نہ تو دونوں رکوع میں جمع ہوئے اور نہ ہی اعتدال میں،

امام سے قبل رکوع کرکے اعتدال میں پہنچے، اور امام قیام میں ہو، پھر اعتدال میں امام کے پہنچنے تک رکا رہا تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ صرف ایک رکن آگے بڑھنے سے نماز باطل نہ ہوگی۔ یہ سارے احکام افعال ظاہرہ کے متعلق تھے۔ تکبیر تحریمہ میں سبقت سے نماز باطل ہوگی جیسا کہ گذر چکا۔ سورہ فاتحہ اور تشہد میں آگے بڑھنے سے نقصان نہ ہوگا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اپنا سر رکوع یا سجدہ سے امام سے قبل اٹھانے کی وجہ سے اللہ اس کا سر گدھے کا سر کردے۔(بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔"امام سے قبل سر اٹھانے اور جھکانے والے کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے۔" (مالک)(تیسیر الوصول)

مسبوق امام کو رکوع میں (یا تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد) پالے تو تکبیر تحریمہ کہے پھر فاتحہ نہ پڑھے، بلکہ ایک اور تکبیر کہتا ہوا رکوع میں جائے، اسی طرح امام کو قیام میں پالے اور تکبیر تحریمہ کہتے ہی امام رکوع میں جائے تو یہ بھی جائے اگر حالت قیام میں صرف ایک تکبیر تکبیر تحریمہ کی نیت سے کہے تو نماز صحیح ہے (کیونکہ رکوع کی تکبیر سنت ہے۔) لیکن ایک ہی تکبیر دونوں نیت سے یا رکوع کی نیت سے یا بلا کسی نیت کے مطلق کہے تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی آئے تو امام جس حال میں ہو اسی میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے"(ترمذی)

بلا عذر یا عذر کی وجہ سے مقتدی امام سے جدا ہونے کی نیت کرے۔ (اور اپنی نماز تنہا مکمل کرے) تو جائز ہے۔ (کیونکہ ذات الرقاع کے صلاۃ الخوف میں پہلا گروہ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ سے جدا ہو گیا) بلا عذر اس طرح کرنا مکروہ ہے اور اس سے جماعت کی فضیلت فوت ہو جائے گی۔ جس عذر سے ابتداءً جماعت ترک کر سکتے ہیں، وہ یہاں بھی عذر ہے۔ امام نماز کو طویل کرلے اور مقتدی کو کمزوری یا کسی مصروفیت کی وجہ سے ساتھ دینا مشکل ہو تو یہ عذر ہے، کیونکہ حضرت معاذؓ کے ایک مقتدی نے ان کے تطویل کی

وجہ سے اپنی نماز تنہا مکمل کی تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہ فرمائی۔ امام کا تشہد اول یا قنوت وغیرہ سنت مقصودہ کو ترک کرنا عذر میں داخل ہے۔(تحفۃ المحتاج، ۳۔ص ۱۹۱) اگر امام کا وضو ٹوٹ جانے وغیرہ سے اس کی نماز باطل ہو جائے تو مقتدی کی نماز باطل نہ ہو گی۔

کسی کے نماز کے دوران جماعت شروع ہو جائے۔

کوئی تین یا چار رکعت والی نماز میں ہو اور دو رکعت ہونے سے قبل جماعت شروع ہو جائے تو مستحب ہے کہ اسے نفل سے بدل کر دو رکعت پر سلام پھیرے، اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اگر دو رکعت والی نماز ہو یا تین یا چار والی اور تیسری رکعت شروع کر چکا ہو تو اس نماز کو مکمل کرلے اور پھر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، قضاء نماز پڑھ رہا ہو تو اس کی جماعت کی وجہ سے دو رکعت پر سلام پھیرنا مستحب نہیں ہے۔ قضاء نماز شروع کرنے کے بعد حاضرہ نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو دو رکعت پر سلام پھیر کر پہلے حاضرہ (وقت والی نماز) ادا کرے۔ دوران سنت جماعت شروع ہو اور فوت ہونے کا خدشہ نہ ہو تو اپنی سنت مکمل کرلے۔ فوت ہونے کا ڈر ہو تو سنت توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے۔

اگر تنہا نمازی سلام نہ پھیر کر دوران نماز ہی جماعت میں شامل ہو جانے کی نیت کرلے، تو یہ جائز ہے، اب امام کی پیروی کرے، اگر اس کی نماز امام سے قبل مکمل ہو، تو یا تو امام سے جدا ہو جائے، یا تشہد میں دعا پڑھتا رہے اور امام کا انتظار کرے، تاکہ اس کے ساتھ سلام پھیرے۔ امام کی نماز پہلے پوری ہو تو یہ مقتدی مسبوق کی طرح اپنی نماز مکمل کرے۔ اقتداء کی نیت سے پہلے مقتدی سے سہو ہوا تھا تو اسے امام نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ اس کے سلام کے بعد اپنا سجدہ سہو کرے۔ اقتداء کے بعد سہو ہو تو امام اٹھالے گا۔ اقتداء سے قبل یا بعد امام سے سہو ہو تو وہ مقتدی کو بھی لاحق ہو گا اور امام کے ساتھ سجدہ کرے گا اور مسبوق کی طرح اپنی نماز کے آخر میں بھی کرے گا۔

امام کے ساتھ رکوع میں ملنا

کسی کو امام کے ساتھ رکوع ملے اور امام کا وہ رکوع شمار ہو (یعنی امام بے وضو یا زائد رکعت میں نہ ہو) تو اسے وہ رکعت مل جائے گی۔ امام کے اقل رکوع کی حد سے اٹھنے سے قبل مقتدی کو طمانینت کے ساتھ رکوع ملے، تو رکعت ملے گی ورنہ رکعت نہیں ملے گی (مقتدی جھک رہا تھا اور امام اٹھا یا اس کے اقل رکوع میں پہنچتے ہی طمانینت سے قبل امام اقل رکوع کی حد سے اٹھ گیا تو رکعت نہیں ملے گی) رکوع کے بعد امام کے ساتھ شامل ہونے سے وہ رکعت شمار نہیں ہو گی، لیکن امام جس حال میں ہو اس کے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے۔ امام آخری تشہد میں ہو تو اس کے ساتھ بیٹھنا لازم ہے۔ تشہد پڑھنا لازم نہیں ہے، لیکن سنت ہے۔

حدیث: (۱) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ رکوع میں تھے۔ لہٰذا وہ (صف سے پہلے ہی) رکوع کر کے پھر صف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (تو آپ ﷺ نے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہ دیا)۔ (متفق علیه)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔" امام کے پشت اٹھانے سے قبل کسی کو ایک رکعت (رکوع) مل گئی تو وہ نماز مل گئی۔ (صحیح ابن خزیمه)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا" جب تم آؤ اور ہم سجدے میں ہوں تو سجدہ کرو اور اسے شمار نہ کرو اور جسے رکعت (رکوع) ملی اسے نماز ملی۔ (صحیح ابن خزیمه) (تلخیص الحبیر)

مسبوق کا امام کے ساتھ شامل ہونا

مقتدی امام کو سجدہ یا تشہد وغیرہ میں پائے تو تکبیر تحریمہ کہہ کر دوبارہ تکبیر کے بغیر امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ بعد میں امام کے ساتھ تکبیر کہتا ہوا دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو گا۔ تشہد اور تسبیحات پڑھنے میں بھی امام کی موافقت کرے۔ امام کے آخری تشہد میں مسبوق کے بیٹھنے کا محل ہو، مثلاً چار رکعت والی نماز میں تیسری رکعت میں یا مغرب کی دوسری رکعت میں شامل ہوا، تو امام کے سلام کے بعد تکبیر کہتا ہوا اٹھے۔ اور مقتدی کے بیٹھنے کا محل نہ ہو مثلاً آخری رکعت میں یا چار رکعت والی نماز کے دوسری رکعت میں شامل ہوا تھا تو بغیر تکبیر کے اٹھ جائے۔ مقتدی کے بیٹھنے کا محل نہ ہو تو امام کے سلام کے بعد رکنا جائز نہیں (اٹھ جائے) ورنہ نماز باطل ہو گی۔ اگر اس کے بیٹھنے کا محل تھا تو حرج نہیں۔ مقتدی امام کے ایک سلام کے بعد اٹھ سکتا ہے لیکن دونوں سلام کے بعد اٹھنا سنت ہے۔ پہلا سلام مکمل ہونے سے پہلے عمداً اٹھ جائے، تو نماز باطل ہو گی۔ امام کے ساتھ جو نماز ملے وہ مسبوق کی نماز کا ابتدائی حصہ ہے، سلام کے بعد جو پڑھے گا، وہ آخری حصہ ہے۔ لہٰذا اگر مغرب کی ایک رکعت ملی اور سلام کے بعد اٹھا تو دوسری رکعت میں جہر کرے اور تشہد پڑھے اور تیسری میں آہستہ تلاوت کرے فجر کے امام کے ساتھ ایک رکعت ملے اور اس میں قنوت پڑھے تو اپنی دوسری رکعت میں پھر قنوت پڑھ لے۔ البتہ امام کے ساتھ سورت نہیں پڑھ پایا تو اپنی نماز میں اس کی تلافی کر لینا مستحب ہے تاکہ اس کی نماز سورت سے خالی نہ رہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم اقامت سنو تو سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ نماز کی طرف بڑھو اور جلدی مت چلو۔ پس جتنی ملے پڑھ لو، اور جو فوت ہو جائے اس کا اتمام کرو۔ (مؤطا۔بخاری۔مسلم۔ابوداود، ترمذی، نسائی، تیسیر)

اور اتمام ابتدا کے بعد ہو گا، لہٰذا معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ جو ملی وہ اول نماز ہے۔ (تحفۃ و نہایۃ)

صحیح احادیث کی روشنی میں فجر کی جماعت دیگر نمازوں سے افضل ہے، پھر عشاء پھر عصر۔

جماعت ثانیہ (دوسری جماعت)

کسی مسجد میں امام راتب (متعین امام) ہو، تو اس کی جماعت سے قبل یا بعد اس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ مسجد مطروق ہو (جہاں لوگوں کی آمد و رفت اور نماز کا سلسلہ جاری رہتا ہو) تو حرج نہیں۔ یہ مسئلہ باب الاذان میں گذر چکا ہے۔

اگر اکثر مقتدی امام کو ناپسند کرتے ہوں، تو اسے امامت مکروہ ہے۔ کم یا نصف ناپسند کریں تو مکروہ نہیں۔ کراہت اس وقت ہے جبکہ کسی شرعی نقص کی وجہ سے اسے ناپسند کریں (مثلاً نجاست سے محتاط نہ رہے۔ نماز کے ھیئات کی پابندی نہ کرے۔ مذموم معیشت اختیار کرے یا فاسقوں کی صحبت اختیار کرے یا اس جیسے امور) (حاشیۃ الروضہ) اگر شرعی کمزوری نہ ہو تو کوئی کراہت نہیں، بلکہ ناپسند کرنا باعث ملامت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: تین افراد کی نماز ان کے کان سے آگے نہیں بڑھے گی (بارگاہ الٰہی میں مقبول نہ ہو گی) بھگوڑا غلام جب تک کہ لوٹے نہیں، وہ عورت کہ شوہر کی ناراضگی کی حالت میں رات بسر کرے اور وہ امام کہ لوگ اس سے ناراض ہوں۔ (ترمذی، حسن غریب)

بعض مقتدیوں کا آنا اہل مسجد کو ناگوار ہو، تو ان کو آنے میں کوئی کراہت نہیں، کہ دوسروں کی نماز کا ان سے تعلق نہیں۔ امام اور مقتدی کا ایک دوسرے سے اونچا یا نیچا ہونا مکروہ ہے۔ اگر امام کو صفتِ نماز کی تعلیم کیلئے اونچی جگہ کھڑا ہونا پڑا یا مقتدی کو تکبیر کی آواز

پیچھے پہنچانے کیلئے اونچائی پر نماز پڑھنی پڑی تو (حرج نہیں بلکہ) مستحب ہے۔ مردوں کی صف میں سب سے افضل پہلی صف ہے پھر جو جتنی قریب ہو، اسی طرح صرف عورتوں کی صف کا حکم ہے۔ مرد وعورت دونوں ہوں تو عورتوں کی آخری صف سب سے افضل ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ امام کسی چیز کے اوپر کھڑا رہے اور لوگ اس کے پیچھے نیچے ہوں۔ (دارقطنی)

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اونچی جگہ امامت فرمائی تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے انکی قمیص پکڑ کر کھینچ لی اور نماز کے بعد فرمایا: "کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اس سے روکا جاتا تھا۔ (ابوداود وصححہ ابن خزیمہ، ابن حبان والحاکم)

(۳) منبر نبوی جب پہلی مرتبہ تیار کر کے اپنی جگہ رکھا گیا تو آپ ﷺ نے اس پر نماز پڑھائی اور سجدہ کے لئے نیچے اترے۔ بعد میں لوگوں سے فرمایا: "میں نے یہ اس لئے کیا تاکہ تم میری اقتداء کرو اور نماز سیکھو"۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ)

(۴) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر لوگوں کو اذان اور صف اول کی فضیلت معلوم ہو جائے پھر اس کے حصول کیلئے قرعہ اندازی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ہو تو قرعہ اندازی کریں۔ (متفق علیہ)

(۵) آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: مردوں کی بہترین صف پہلی اور بدترین آخری اور عورتوں کی بہترین صف آخری اور بدترین پہلی ہے۔ (مسلم، بزار۔ طبرانی)

(۶) اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلے صف پر درود بھیجتے ہیں۔ (احمد۔ بزار) (مجمع الزوائد، تلخیص، مشکوۃ، تیسیر)

مسافر کی نماز کا بیان

مشروعیت: آیت: "وَاِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوۃِ" **ترجمہ:** اور جب تم زمین میں سفر کرو، سو تم کو اس میں گناہ نہ ہوگا کہ تم (ظہر، عصر اور عشاء کے فرض) نماز (کی رکعات) کو کم کرو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو)

احادیث: (۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "ہم آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو آپ ﷺ مدینہ واپسی تک دو دو رکعت ادا کرتے رہے۔ (متفق علیہ)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ میں ظہر کی چار رکعات ادا کی اور مقام ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعت ادا کی۔ (رواہ الترمذی)

(۳) حضرت عائشہ سے مروی ہے: آپ ﷺ سفر میں قصر بھی فرماتے اور اتمام بھی، افطار بھی کرتے اور روزہ بھی رکھتے۔" (رواہ الدارقطنی والبیہقی وغیرھما، وقال الدارقطنی: اسنادہ صحیح)

قصر کی نماز ۴ھ میں مشروع ہوئی۔ (قالہ ابن اثیر، حاشیہ الجمل)

مسافر کے نماز کی کیفیت: مسافر کی نماز مقیم کی طرح ہے۔ البتہ اسے قصر (یعنی چار رکعت والی فرض نماز میں چار کے بجائے دو رکعت ادا کرنا) اور جمع بین الصلاتین (دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا) جائز ہے۔ قصر بالاجماع جائز ہے۔ سفر طویل (۴۸ میل) اور مباح ہو تو قصر کرنا جائز ہے (اگر طویل نہ ہو یا طویل ہونے میں شک ہو تو قصر کی گنجائش نہیں۔ (حاشیۃ الروضہ)

سفر: سفر قصر ہو تو اس میں معین منزل کا قصد ہونا ضروری ہے، لہٰذا ایسا حیران و پریشان آدمی جسے یہ معلوم نہیں کہ کہاں جارہا ہے، قصر نہیں کر سکتا گرچہ اس کا سفر لمبا ہو جائے۔

ابتداءسفر: ایسے شہر سے سفر کرے جس کے چاروں جانب خاص اُسی کیلئے دیوار بنائی گئی ہو (یعنی شہر پناہ ہو) تو سفر کی ابتداء کیلئے اسے پار کرنا ضروری ہے، خواہ اس دیوار کے اندرونی حصہ میں کھیتیاں یا ویران پڑی ہوئی جگہ ہو) اس لئے کہ دیوار کے اندر کا تمام حصہ شہر کے حد ہی میں شمار ہو گا۔ (لہٰذا صرف شہر کے مکانات پار کرنا کافی نہیں) بلکہ دیوار پار کرنے کے بعد قصر کر سکتا ہے۔ اگر اس دیوار کے بیرونی حصے میں ملے جلے مکانات یا قبرستان ہوں تو اسے پار کرنا ضروری نہیں۔ شہر کے چاروں جانب دیوار نہ ہو یا دیوار تو ہے لیکن جس جانب سے سفر کرتا ہے اس طرف نہیں ہے، تو سفر کی ابتدء آبادی کو مکمل چھوڑنے سے ہو گی، اور عمارتوں کے درمیان ویران حصہ کو شہر کی حد ہی میں شمار کیا جائے گا۔

اگر شہر کے اطراف میں ویران جگہ (یعنی مکانات ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں) پڑی ہوئی ہو اور اس کے بعد آبادی بھی نہ ہو تو سفر کی ابتداء کیلئے اس ویران حصہ کو پار کرنا ضروری ہو گا جبکہ ان پرانے مکانات کی دیواریں ابھی باقی ہوں (یعنی اس کے نشانات بالکل مٹ نہ چکے ہوں۔) اور اس جگہ شہر کی کھیتی بھی نہ کی جاتی ہو۔ اور نہ آبادی کے چاروں جانب شہر پناہ بنا کر اتنے حصہ کو الگ کر دیا ہو، لیکن اگر اس کے برعکس صورت ہو (یعنی مکانوں کے نشانات بالکل مٹ چکے ہوں۔ اور اس جگہ کھیتی کی جاتی ہو۔ یا آبادی کا احاطہ کر کے اتنے حصہ کو الگ کر دیا ہو) تو ویران حصہ کو پار کرنا ضروری نہیں۔

شہر سے متصل باغات اور کھیتیاں ہوں تو ان کو پار کرنا ضروری نہیں۔ اگر کسی بستی یا گاؤں سے سفر کر رہا ہو تو (ابتداء سفر کیلئے) اس کا حکم مذکورہ تمام امور میں شہر کے مانند ہے۔ اگر بستی کے باہر کھیل کا میدان وغیرہ ہو تو اسے پار کرنا بھی ضروری ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۵۹)

اگر دو بستیاں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہوں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہ ہو، خواہ دونوں کے نام الگ الگ ہوں، تو وہ ایک گاؤں کے دو محلہ کے مانند ہیں۔ لہٰذا سفر کی ابتداء ان دونوں بستیوں کو پار کرنے سے ہو گی۔ اور اگر کوئی حد فاصل موجود ہو تو صرف اپنی بستی پار کرنا کافی ہے، خواہ دونوں بستیاں بالکل قریب ہوں۔ اگر چند مختلف بستیوں کے چاروں جانب دیوار بنائی گئی ہو، تو ابتداء سفر کیلئے دیوار پار کرنا ضروری نہیں (بلکہ صرف اپنی بستی پار کرنا کافی ہے) اگر کوئی جنگل میں رہتا ہو، تو اس کے لئے اتنا جگہ کا پار کرنا ضروری ہے جتنی جگہ اس کی طرف منسوب ہو۔

خیمہ میں رہنے والوں کے سفر کی ابتداء تمام خیموں کو پار کرنے سے ہو گی، چاہے خیمے ایک ہی جگہ (یعنی بالکل قریب قریب) ہوں یا تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ہوں۔ اور خیموں کے ساتھ اس کے اطراف میں جو اونٹ وغیرہ کے پانی پینے کی جگہ اور کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ ہو اسے بھی پار کرنا ضروری ہے۔

کسی شہر کیلئے دو فصیل (دیوار) ہوں تو سفر کی ابتداء ان دونوں کو پار کرنے سے ہو گی اور اگر دیوار کے بجائے خندق ہو، تو خندق پار کرنا ضروری ہے۔ اور خندق و دیوار دونوں ہوں تو صرف دیوار پار کرنا کافی ہے (حاشیۃ البجیرمی ۲/ ۲۵۳) اگر مٹی وغیرہ کے بند کے ذریعے کسی بستی کا احاطہ کیا گیا ہو تو اس کا حکم دیوار ہی کے مانند ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۱/ ۵۹۰) مسافر آبادی چھوڑنے کے بعد (اور مسافت قصر طے کرنے سے پہلے) کسی ضرورت سے (مثلاً کسی چیز کو بھول گیا تھا، اس کو لینے کیلئے شہر) واپس لوٹے تو اس کی چند صورتیں ہو گی۔

(۱) وہ شہر مسافر کا نہ وطن ہو اور نہ اس میں اقامت کرے، تو واپس لوٹنے اور شہر میں داخل ہونے سے مقیم نہ ہو گا۔

(۲) وہ شہر اس کا وطنِ اصلی ہو تو واپس لوٹتے ہوئے قصر وغیرہ نہیں کر سکتا، بلکہ جب دوبارہ اس شہر سے روانہ ہو تو قصر کر سکتا ہے۔

(۳) وہ شہر اس کا وطنِ اصلی تو نہ ہو، لیکن وہاں کچھ مدت اقامت کرے تو واپس لوٹتے ہوئے قصر کر سکتا ہے۔ اور اگر مسافت قصر طے کر چکا ہو تو واپس لوٹتے ہوئے از سر نو مسافر شمار ہو گا، اب ہر حالت میں قصر کر سکتا ہے۔

سفر کے رخصت کی انتہا

سفر ختم ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ (۱) وطن کی طرف لوٹنا۔ اور وطن کی طرف لوٹنے سے مراد ابتداء سفر میں جس جگہ کو پار کرنا ضروری قرار دیا تھا، وہاں پہنچنا ہے۔ اسی طرح وطن کے علاوہ کسی اور جگہ کا سفر ہو اور وہاں مطلقاً یا مکمل چار دن اقامت کی نیت کرے تو ایسی جگہ پہنچنے سے بھی سفر ختم ہو گا۔ لیکن اگر سرے سے نیت ہی نہیں کی یا چار دن سے کم کی نیت کی تو اس جگہ پہنچنے سے سفر ختم نہ ہو گا۔ (بلکہ جانے اور آنے کے دو دن چھوڑ کر مکمل چار دن ٹھہرنے سے سفر ختم ہو گا۔) (حاشیۃ البجیرمی ۱/۲۵۳)

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا مہاجر اپنے اعمال حج سے فارغ ہونے کے بعد تین دن مکہ میں رک سکتا ہے۔ (متفق علیہ)
(اور ایک مہاجر کو مکہ میں اقامت ممنوع تھی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تین دن تک کہیں رکنا شرعاً اقامت میں داخل نہیں ہے)

دوران سفر کسی ایسی بستی یا شہر میں اترے، جہاں اس کے اھل وعیال اور رشتہ دار ہوں تو اس بستی یا شہر میں داخل ہونے سے مقیم نہ ہو گا۔

حدیث: آپ ﷺ اور حضرات مہاجرین نے حج کے موقع سے مکہ میں قصر کیا۔ (متفق علیہ)

حالانکہ مکہ میں حضرات مہاجرین کے اہل وعیال اور خاندان والے موجود تھے۔ (تلخیص الحبیر) اگر دوران سفر کوئی اپنی بستی سے گذرے تو بستی میں داخل ہوتے ہی مقیم شمار ہو گا۔

(۲) **اقامت کی نیت کرنا:** اگر دوران سفر کسی بستی یا شہر میں مطلقاً اقامت کی نیت کرے تو مقیم ہو جائے گا (مطلقاً اقامت کی نیت سے مراد یہ کہ کسی مدت کی تعیین نہیں کی کہ کتنے دن رکنا ہے صرف وہاں رکنے کی نیت ہے) اور اگر اس کے آگے دوبارہ سفر شروع کرے تو قصر اس وقت کر سکتا ہے جبکہ وہاں سے دو مرحلہ (۴۸ میل) کا سفر کرے۔ اسی طرح اگر کسی چٹیل میدان (ویران علاقہ) میں اقامت کی نیت کرے تب بھی مقیم ہو جائے گا۔ مگر مذکورہ صورت میں اس وقت مقیم ہو گا جبکہ وہاں رُک کر اقامت کی نیت کرلے۔ سفر میں چلتے چلتے اقامت کی نیت کی تو مقیم نہ ہو گا بلکہ مسافر ہی رہے گا۔ (المجموع ۴/۳۶۱)

(۳) صورت اقامت بھی پائی جائے: اگر کسی بستی یا شہر میں کسی ضرورت سے قیام کرے تو اس کی دو صورتیں ہونگی (۱) تھوڑی دیر میں کام پورا ہونے کی امید ہو اور کام سے فراغت کے بعد کوچ کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں چار دن قصر کی اجازت ہے (اور اگر چار دن سے زیادہ وقت لگے تو اٹھارہ دن قصر کی اجازت ہے)۔ (المجموع ۴/۳۶۲)

حدیث: آپ ﷺ نے فتح مکہ کے سال قبیلہ ہوازن سے لڑائی کے موقع پر مکہ میں چار دن سے زیادہ قیام کیا اور اس دوران قصر کرتے رہے۔ اور عمران بن حصین کی روایت میں ہے کہ اٹھارہ دن تک قیام کیا۔ (ابوداود، ترمذی وحسنہ البیہقی، تلخیص)

(۲) اور اگر جانے اور آنے کے دو دن کے علاوہ تین دن میں کام پورا ہونے والا نہ ہو، جیسے علم حاصل کرنے کیلئے یا کسی بڑے کاروبار کی غرض سے رکا ہے، تو قصر جائز نہیں۔

مسافت قصر: سفر کا طویل ہونا ضروری ہے، اور طوالت کی مقدار ۴۸ میل ہے۔ (کلو میٹر کے اعتبار سے الفقہ المنہجی میں تقریباً ۸۱ کلومیٹر کو مسافت قصر قرار دیا ہے) سمندری سفر میں بھی مسافت قصر کیلئے اسی ۴۸ میل کا اعتبار ہو گا۔ چاہے اس مسافت کو ایک سیکنڈ میں طے کرے۔ اگر مسافت قصر میں شک ہو تو غور و فکر کر کے حد متعین کی جاسکتی ہے۔ بحری سفر میں سخت ہوا چلنے کی وجہ سے کسی جگہ رکنا پڑے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے اپنے کسی کام کے آج کل میں پورا ہونے کی امید پر رکا ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں ۱۸ دن تک قصر کی اجازت ہے۔ (المجموع ۴/۳۶۴) مقدار مسافت میں صرف (یک طرفہ) جانے کی مسافت شمار ہو گی، واپس لوٹنے کی نہیں۔ ابتداء سفر ہی میں مسافت قصر کے طے کرنے کا پختہ ارادہ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی بھاگے ہوئے نوکر یا گم شدہ جانور یا مقروض کی تلاش میں نکلے اور معلوم نہ ہو کہ کہاں ملے گا تو قصر جائز نہیں، چاہے اس کی تلاش میں سفر طویل ہو جائے۔ لیکن اگر تلاش کرتے کرتے مل گیا پھر اپنے شہر واپس لوٹنے کا ارادہ کیا اور وہاں سے اپنے وطن تک مسافت قصر ہو، تو اس جگہ کو چھوڑنے سے قصر کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اگر سفر کی ابتداء سے پہلے ہی معلوم ہو کہ مسافت قصر سے پہلے نہیں ملے گا تو قصر کر سکتا ہے۔ اگر سفر شروع کرنے سے پہلے مسافت قصر کا ارادہ ہو مگر آبادی پار کرنے سے پہلے یہ نیت کر لی کہ مقروض یا نوکر مل جائیگا تو واپس لوٹونگا تو ایسی حالت میں قصر نہیں کر سکتا اور اگر آبادی پار کرنے کے بعد نیت کی ہے تو ملنے تک قصر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد مقیم ہو جائے گا۔ کسی نے مسافت قصر تک جانے کے ارادہ سے سفر شروع کیا، مگر دوران سفر کسی شہر میں چار دن اقامت کی نیت کی تو ایسی صورت میں ابتداء سفر سے اس شہر میں داخل ہونے تک قصر کر سکتا ہے۔ چاہے اس شہر تک مسافت قصر ہو یا نہ ہو، لیکن اگر اس شہر میں چار دن سے کم اقامت کی نیت کی ہے تو دوران سفر اور شہر میں داخل ہونے کے بعد بھی قصر کر سکتا ہے۔

اگر بیوی شوہر کے ساتھ سفر کر رہی ہو، اور اُسے منزل مقصود کا پتہ نہیں کہ کہاں تک جانا ہے، تو مسافت قصر طے کرنے سے پہلے بیوی قصر نہیں کر سکتی، چاہے بیوی نے مسافت قصر کی نیت کی ہو (البتہ مسافت قصر طے کرنے کے بعد قصر کر سکتی ہے۔ حاشیۃ الروضہ)

اور اگر منزل کا پتہ ہو اور مسافت قصر کی نیت کی ہو تو بیوی بھی شروع سے قصر کر سکتی ہے، اگر کافر (یا پولیس) کسی مسلمان کو قید کر کے لے جائے اور اسے معلوم نہیں کہ کہاں لے جارہا ہے تو وہ قصر نہیں کر سکتا۔ چاہے ان کے ساتھ مسافت قصر تک چلتا رہے۔ البتہ مسافت قصر طے کرنے کے بعد قصر کر سکتا ہے۔ جس شہر کی طرف لے جارہا ہے اس کا علم ہو۔ لیکن دوران سفر موقع ملنے پر قیدی کے فرار کا ارادہ ہو، تو مسافت قصر طے کرنے سے پہلے قصر جائز نہیں۔ اور اگر بھاگنے وغیرہ کا ارادہ نہ ہو۔ اور سفر مسافت قصر تک ہو تو ابتداء سفر ہی سے قصر کر سکتا ہے۔

کسی منزل تک جانے کیلئے دو راستے ہوں، ایک مسافت قصر کے بقدر اور دوسرا قصیر (یعنی مسافت قصر سے کم) لہٰذا اگر طویل راستے سے کسی دینی یا دنیاوی غرض سے سفر کر رہا ہو مثلاً راستہ پر امن ہے یا کوئی اور سہولت حاصل ہے تو ایسی صورت میں قصر کر سکتا ہے۔

اور اگر محض قصر وغیرہ رخصتوں کا حاصل کرنا مقصود ہے تو قصر نہیں کر سکتا۔ کوئی طویل سفر کے ارادہ سے نکل جائے مگر دوران سفر واپس لوٹنے کا ارادہ کرے تو اسی وقت سفر ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا جب تک اس مقام پر رکا رہے گا۔ قصر نہیں کر سکتا، بلکہ جب اس مقام کو چھوڑ دے تو وہاں سے نیا سفر شمار ہو گا۔ اب یہ سفر مسافت قصر کے بقدر ہو تو قصر کر سکتا ہے، چاہے اپنے شہر لوٹے یا پہلی منزل کی طرف جائے یا کسی تیسری جگہ کا سفر کرے۔

ایسے شہر کی جانب سفر شروع کرے جہاں تک (مسافت قصر نہ ہونے کی وجہ سے) قصر جائز نہ ہو، لیکن پھر ارادہ بدل کر اس سے اتنا آگے سفر کا ارادہ کرے کہ وہاں تک (مسافت قصر ہونے کی وجہ سے) قصر کر سکتا ہے تو جس جگہ سے نیت میں تبدیلی کی، وہیں سے سفر کی

ابتدا ہو گی۔ اگر اس جگہ سے آگے کی منزل تک مسافت قصر ہو، تو قصر کر سکتا ہے (ورنہ نہیں) اگر کوئی طویل سفر کیلئے اس ارادہ سے نکلا کہ ہر مرحلہ پر (یعنی مسافت قصر سے کم پر) چار دن قیام کرے گا تو وہ اس لمبے سفر میں ابتداء ہی سے قصر نہیں کر سکتا۔

قصر کے جواز کیلئے سفر کا مباح ہونا ضروری ھے: مباح سفر سے مراد یہ کہ وہ سفر معصیت (گناہ کے کام) کیلئے نہ ہو، چاہے وہ نیک کام کیلئے ہو یا تجارت کیلئے ہو لہٰذا معصیت کے سفر میں قصر جائز نہیں معصیت کا سفر جیسے بیوی کا شوہر کو چھوڑ کر بھاگ جانا۔ مقروض کا قرض کی ادائیگی پر قدرت ہونے کے باوجود بھاگ جانا۔ ڈاکہ زنی کیلئے سفر کرنا وغیرہ۔

کوئی سفر تو مباح کام کیلئے کرے، لیکن دوران سفر معاصی کا بھی ارتکاب کرے جیسے شراب وغیرہ پیئے تو ایسے شخص کیلئے قصر جائز ہے۔ سفر کی ابتداء تو مباح کام کے ارادہ سے ہو، پھر (دوران سفر) اسے معصیت کا بنادیا (یعنی گناہ کے ارادہ سے سفر کرے) تو جہاں سے معصیت کا ارادہ کیا وہاں سے قصر نہیں کر سکتا، سفر کی ابتداء تو معصیت کے ارادہ سے ہو، مگر پھر معصیت کا ارادہ بدل کر توبہ کر کے پہلی منزل کی طرف ہی سفر جاری رکھا، تو سفر کی ابتداء وہاں سے ہو گی جہاں سے توبہ کی۔ اب اگر محل توبہ سے منزل مقصود تک مسافت قصر ہو، تو قصر کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔

سفر معصیت میں رخصتیں: معصیت کیلئے سفر کرنیوالے کو نہ قصر کی اجازت ہے، نہ روزہ چھوڑنے کی، نہ سواری پر نفل پڑھنے کی، اور نہ جمع بین الصلاتین کی اور نہ تین دن تک موزے پر مسح کرنے کی، بلکہ (مقیم کی طرح) ایک دن ورات مسح کرے۔ اور نہ اسے بھوک سے بے تابی کی حالت میں مردار کھانے کی اجازت ہے، نیز ایسے مسافر سے جمعہ بھی ساقط نہ ہو گی۔

کن نمازوں میں قصر جائز ھے: سفر میں ادا کی جانے والی ہر ایسی چار رکعات والی فرض نماز میں جس کی ادائیگی کا وقت سفر میں ہی ہوا ہو قصر جائز ہے۔ مغرب اور صبح کی نماز میں قصر بالاجماع جائز نہیں۔

قضاء نماز: حالت اقامت کی فوت شدہ نماز سفر میں قضاء کرے، یا شک ہو کہ حالت سفر میں فوت ہوئی یا حالت اقامت میں یا ایسے سفر کی فوت شدہ نماز جس میں قصر جائز نہیں قضاء کرے، چاہے دوسرے سفر میں قضاء کرے یا سفر قصر کی فوت شدہ نماز حضر میں، یا ایسے سفر میں جس میں قصر جائز نہیں قضاء کرے تو ان تمام صورتوں میں قصر جائز نہیں۔ ہاں اگر سفر قصر کی فوت شدہ نماز اُسی سفر میں یا دوسرے سفر قصر میں قضاء کرے تو قصر جائز ہے۔ لیکن اگر حالت حضر میں یا ایسے سفر میں جس میں قصر جائز نہیں قضاء کرے تو قصر نہ کرے بلکہ اتمام کرے۔ (فتح الوہاب) (خلاصہ یہ کہ سفر قصر کی قضاء سفر قصر میں قصر کرنا جائز اور بقیہ تمام صورتوں میں اتمام یعنی مکمل نماز قضاء کرنا لازم ہے)

کوئی شخص اتنا وقت گذرنے کے بعد جس میں نماز کا ادا کرنا ممکن ہو، سفر شروع کرے تو اس نماز میں قصر جائز ہے۔ اسی طرح کسی عورت کو اتنا ہی وقت گذرنے کے بعد حیض شروع ہو جائے، تو اس پر اس نماز کی قضا لازم ہو گی۔

صرف چار رکعات کی ادائیگی کے بقدر وقت باقی رہنے کی صورت میں سفر شروع کرے تو اس نماز میں قصر جائز ہے۔ (بلکہ اگر سفر شروع کرتے وقت صرف ایک رکعت کے بقدر وقت ہو تب بھی قصر جائز ہے۔ مغنی ۲۶۳/۱ ۔ حاشیۃ البجیرمی۔ ۱۴۷/۲)

اگر اتنا وقت گذرنے سے پہلے جس میں اس نماز کا ادا کرنا ممکن ہو، سفر کرے تو ایسی نماز میں بھی قصر جائز ہے۔

فصل۔ قصر کے شرائط

قصر کے چار شرائط ہیں۔

(۱) کسی مقیم کی اقتداء نہ کرے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ مسافر کو تنہا نماز پڑھنے کی صورت میں دو رکعت اور کسی مقیم کی اقتداء کرنے کی صورت میں چار رکعات پڑھنے کا حکم کیوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا! کہ یہ سنت ہے۔(مسند احمد۔تلخیص)

اگر کسی مقیم کی اقتداء کی، چاہے ایک لحظہ کیلئے، تو اس پر اتمام (پوری چار رکعات) ادا کرنا لازم ہے۔

لحظہ بھر اقتداء کی چند صورتیں ہیں (۱) امام کو سلام سے پہلے پالے۔ (۲) امام کو مسافر مقتدی کے تکبیر تحریمہ کے بعد حدث لاحق ہو (۳) اقتداء کے بعد امام سے جدا ہونے کی نیت کرے۔ (المجموع ۳۵۶/۴) فجر کی قضاء نماز پڑھنے والے کی اقتداء میں کوئی ظہر ادا کرے تو قصر جائز نہیں، خواہ صبح کی نماز پڑھنے والا مسافر ہو یا مقیم۔

عصر کی نماز قصر کرنے والے کی اقتداء میں نماز ظہر قصر کی نیت سے ادا کرے تو قصر جائز ہے۔(المجموع ۳۵۶/۴) جمعہ ادا کرنے والے کی اقتداء میں ظہر ادا کرے تو قصر جائز نہیں، چاہے جمعہ کا امام مسافر ہو یا مقیم۔ اگر مسافر کو امام کے مقیم ہونے کا یقین یا غالب گمان ہو، تو ایسے امام کی اقتداء میں مسافر کو مکمل نماز ادا کرنا لازم ہے لیکن مسافر نے ایسے امام کی اقتداء میں قصر کی نیت کی تو اس کی نماز تو منعقد ہو گی، البتہ قصر کی نیت باطل ہو گی۔ (یعنی نماز مکمل ادا کرنی ہو گی۔) اور اگر امام کے مسافر ہونے کا یا امام کے قصر کی نیت کرنے کا یقین یا گمان ہو تو اس کی اقتداء میں قصر جائز ہے۔ مسافر کو امام کی نیت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ اس نے قصر کی نیت کی ہے یا نہیں، تب بھی اس کی اقتداء میں قصر جائز ہے، خواہ یہ شک دوران نماز پیش آئے۔ امام کی نیت سے ناواقف ہو اور مقتدی اپنی نیت کو امام کی نیت پر معلق رکھتے ہوئے کہے کہ امام نے قصر کیا تو میں بھی قصر کروں گا اور اتمام کیا تو میں بھی اتمام کرونگا تو یہ معلق کرنا صحیح ہے۔ لہٰذا امام اتمام کرے تو مقتدی بھی اتمام کرے اور قصر کرے تو مقتدی بھی قصر کرے، لیکن اگر ایسی صورت میں امام کی نماز فاسد ہو جائے یا خود فاسد کر دے اور کہے کہ میں نے قصر یا اتمام کی نیت کی تھی تو مقتدی کو بھی امام کی نیت کے مطابق نماز پوری کرنی ہو گی، اور اگر امام بتلائے بغیر چلا جائے اور مقتدی کو امام کی نیت کا علم نہ ہو سکے تو اتمام ضروری ہے۔ امام کے مسافر یا مقیم ہونے میں شک ہو تو مقتدی کو اتمام لازم ہے۔ اگر مسافر کسی مقیم کی یا ایسے مسافر کی جو اتمام کر رہا ہو اقتداء کرے پھر خود مقتدی کی یا امام کی نماز فاسد ہو جائے، یا امام کا محدث ہونا معلوم ہو جائے اور نئے سرے سے نماز شروع کرے تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔

ایسے امام کی اقتداء کرے جس کے مسافر ہونے کا صرف غالب گمان ہو، لیکن پھر امام کا مقیم ہونا معلوم ہو گیا یا مقیم اور محدث دونوں ہونا معلوم ہوا، البتہ پہلے مقیم ہونا معلوم ہوا تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔ اور اگر پہلے محدث ہونا معلوم ہوا یا دونوں کا بہ یک وقت علم ہو گیا تو مقتدی کیلئے قصر جائز ہے۔

کوئی حالت اقامت میں نماز شروع کرے، بعد میں نمازی کو اپنے محدث (بے وضو) ہونے کا علم ہو گیا اور نماز کے وقت میں سفر شروع کیا تو اس نماز میں قصر جائز ہے بخلاف اس کے اگر حالت اقامت میں ہی نماز شروع کی اور کسی سبب سے نماز فاسد ہو جائے (پھر سفر شروع کرے) تو اس نماز میں اتمام لازم ہے۔

مسافر کسی مقیم کی اقتداء کرے پھر نماز کے بعد مقتدی کو اپنا بے وضو ہونا معلوم ہو گیا، تو مقتدی کیلئے اس نماز میں قصر جائز ہے۔ اسی طرح ایسے امام کی اقتداء کرے جس کے محدث ہونے کا یقین اور مقیم ہونے کا صرف گمان ہے تو مقتدی کیلئے قصر جائز ہے۔

دوران نماز امام کا کسی کو نائب بنانا: امام کی نماز حدث وغیرہ سے فاسد ہو جائے، تو بقیہ نماز پڑھانے کیلئے مقتدیوں میں سے کسی کو اپنا نائب بنانا جائز ہے۔ اگر کوئی ایسا مسافر امام جو مقیم اور مسافر حضرات کو نماز پڑھا رہا ہو، نماز فاسد ہونے کی وجہ سے کسی

مقیم کو اپنا نائب بنائے، تو مسافر مقتدیوں کیلئے قصر جائز نہیں۔ بلکہ اگر وہ مسافر امام بھی واپس آکر اس نائب کی اقتداء کرے تو اس کے لئے بھی قصر جائز نہیں۔ اور اقتداء نہ کرے تو قصر جائز ہے۔ امام کے نائب کے اقتداء کی نیت واجب نہیں اگر امام یا مقتدی حضرات کسی کو نائب نہ بنائیں تو تنہا اپنی نماز پوری کریں۔ اس صورت میں مسافر حضرات کیلئے قصر جائز ہے۔ اور اگر امام یا مقتدی لوگ کسی مسافر کو نائب بنائیں تو مسافر حضرات قصر کریں (اور مقیم حضرات مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پوری کریں)

اگر مسافر لوگ کسی مسافر کو، اور مقیم حضرات کسی مقیم کو نائب بنائیں تو یہ بھی جائز ہے اور مسافر اپنے امام کی اقتداء میں قصر کریں۔

(۲) تکبیر تحریمہ کے وقت قصر کی نیت کرنا۔ نماز پوری ہونے تک قصر کی نیت یاد رکھنا ضروری نہیں، لیکن اس کے منافی (مخالف) چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر پہلے قصر کی نیت کی، بعد میں اتمام کی یا قصر و اتمام کے درمیان تردد ہو (کہ قصر کر رہا ہے یا اتمام) یا شک ہو کہ قصر کی نیت کی یا نہیں، تو ان صورتوں میں اتمام لازم ہے۔

کسی مسافر نے ایسے مسافر امام کی اقتداء کی جس نے قصر کی نیت کی ہے مگر امام دو رکعت کے بعد (سلام پھیرنے کے بجائے) تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا، تو ایسی صورت میں امام نے اتمام کی نیت کی ہے تو مقتدی پر بھی اتمام ضروری ہے۔ اور اگر امام بھولے سے کھڑا ہوا ہو مثلاً امام حنفی ہو (جو سفر کی نماز میں اتمام کا قائل نہیں) تو مقتدی پر اتمام ضروری نہیں، بلکہ اختیار ہے، چاہے تو اس کی اقتداء سے الگ ہو اور سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ یا امام کے واپس لوٹنے تک انتظار کرتا رہے اور اس کے ساتھ سلام پھیرے۔ اور اگر مقتدی اتمام کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن امام کی سہو (بھول) کی حالت میں اقتداء کرنا جائز نہیں، کیونکہ امام سہو کی حالت میں جو فعل ادا کرتا ہے وہ شمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح امام کی اقتداء اس فعل کی ادائیگی میں بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ فعل شمار نہ ہوگا جیسے کسی مسبوق کو امام کے ساتھ ایک رکعت مل گئی ہو اور امام سہواً زائد رکعت ادا کرنے کیلئے کھڑا ہو گیا، تو مسبوق کیلئے اپنی بقیہ نماز کو پورا کرتے وقت امام کی اس زائد رکعت میں اقتداء کرنا صحیح نہیں۔ اگر شک ہو کہ امام بھولے سے یا اتمام کی نیت سے تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا تو مقتدی پر اتمام لازم ہے۔

کوئی منفرد قصر کی نیت سے نماز پڑھ رہا ہو، اور دو رکعت پڑھ کر تیسری رکعت کیلئے کسی ایسے سبب کی وجہ سے کھڑا ہو گیا جس سے اتمام واجب ہو جائے جیسے مسافر نے اتمام یا اقامت کی نیت کی، یا سواری اقامت کی جگہ پہنچنے کے بعد تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا ہو تو اس کا کھڑا ہونا صحیح ہے اور اتمام لازم ہے۔ اور اگر مذکورہ امور میں سے کوئی بھی امر پیش نہ آیا ہو، اور عمداً تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوا ہو تو نماز باطل ہو گی۔ اور اگر سہواً کھڑا ہو گیا تو یاد آنے کے بعد واپس لوٹنا لازم ہے، پھر سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ لیکن یاد آنے کے بعد اتمام کا ارادہ ہو جائے تو پہلے بیٹھنا لازم ہے، پھر اتمام کیلئے واپس اٹھے۔ کوئی مسافر تیسری اور چوتھی رکعت سہواً ادا کرے، اور تشہد میں بیٹھنے کے بعد یاد آجائے تو سجدہ سہو کر کے سلام پھیرے۔ اور یہ نماز قصر ہی شمار ہو گی اور سہواً جو زائد رکعات ادا کی، وہ شمار نہ ہو گی۔ اور اگر ان دو زائد رکعتوں کے ادا کرنے کے بعد، اور سلام سے پہلے اتمام کی نیت کی تو اب مزید دو رکعت پڑھنا ضروری ہے، اور آخر میں سجدہ سہو کرے (اور درمیان میں جو سہواً دو رکعت پڑھی گئی وہ شمار نہ ہو گی۔)

(۳) نماز کی ابتداء سے سلام پھیرنے تک مسافر ھو۔ لہٰذا اگر مسافر نے درمیان نماز اقامت کی نیت کی یا جہاز میں نماز پڑھ رہا تھا اور درمیان نماز جہاز اقامت کی جگہ پہنچ جائے یا وطن میں جہاز میں نماز شروع کرے اور سلام سے قبل سفر شروع ہو جائے یا شک ہو کہ اس نے اقامت کی نیت کی یا نہیں، یا کسی شہر میں داخل ہونے کے بعد یہ شک ہو جائے کہ یہی اس کی منزل مقصود ہے یا نہیں،

تو ان تمام صورتوں میں مکمل چار رکعات ادا کرنا ضروری ہے۔

(۴) قصر کے جواز کا علم ہو لہٰذا اگر قصر کے جواز سے ناواقف ہوتے ہوئے نماز میں قصر کرے تو قصر کرنا صحیح نہیں۔

جمع بین الصلاتین کا بیان

(دو نمازوں کو ایک وقت ادا کرنا)

سنہ ۹ھ غزوہ تبوک کے موقع پر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دو نمازوں کو ایک ساتھ ادا فرمایا۔

احادیث: (۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سفر میں جلدی ہوتی تو مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرتے (متفق علیه)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ”آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم زوال شمس سے پہلے کوچ کرتے تو ظہر کو عصر تک موئخر کرتے پھر (عصر کے وقت سواری سے) اتر کر ظہر اور عصر کے درمیان جمع فرماتے اور زوال شمس کے بعد کوچ کرتے تو پہلے ظہر پڑھتے پھر سوار ہوتے۔ (متفق علیه)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب سفر میں جمع بین الصلاتیں کا ارادہ کرتے تو ظہر کو عصر کا اول وقت شروع ہونے تک موئخر کرتے، پھر دونوں کو جمع فرماتے۔ (رواہ مسلم)

(۴) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم غزوہ تبوک کے موقع پر زوال شمس کے بعد سفر فرماتے تو ظہر اور عصر کے درمیان جمع فرماتے (یعنی جمع تقدیم) اور زوال شمس سے پہلے سفر فرماتے تو ظہر کو عصر تک موخر کرتے (یعنی جمع تاخیر کرتے) اور مغرب میں بھی اسی طرح کرتے کہ غروب شمس کے بعد سفر کرتے تو مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرتے (جمع تقدیم) اوراور غروب شمس سے پہلے سفر کرتے تو مغرب کو عشاء تک موخر کرتے، پھر عشاء کے وقت اتر کر دونوں میں جمع کرتے (جمع تاخیر) (رواہ ابوداود والترمذی و قال حدیث حسن وقال البیہقی ھو محفوظ صحیح)۔ (المجموع ۳۷۲/۴)

جمع کا حکم اور اس کی قسمیں: جس سفر میں قصر جائز ہے، اس سفر میں ظہر و عصر اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنا بھی جائز ہے۔

جمع کی دو قسمیں ھیں: (۱) جمع تقدیم (تقدیم سے مراد ظہر و عصر کو ظہر کے وقت یا مغرب وعشاء کو مغرب کے وقت پڑھنا) (۲) جمع تاخیر (تاخیر سے مراد ظہر و عصر کو عصر کے وقت یا مغرب وعشاء کو عشاء کے وقت پڑھنا) جمعہ میں صرف جمع تقدیم جائز ہے جمع تاخیر جائز نہیں۔ (جمل ۱ /۶۰۸) جس سفر میں قصر جائز نہیں اس میں جمع بین الصلاتین بھی جائز نہیں۔ پہلی نماز (مثلاً ظہر یا مغرب) کے وقت سفر جاری ہو تو جمع تاخیر اوراول وقت میں کہیں رکا ہو، تو جمع تقدیم افضل ہے۔ کیونکہ اوپر حدیث میں یہی تفصیل گذری۔ گناہ کے سفر میں جمع کرنا جائز نہیں، فجر کو کسی دوسری نماز کے ساتھ اور عصر کو مغرب کے ساتھ جمع کرنا جائز نہیں۔

جمع کی صورت میں جو نماز پڑھی جائے، وہ ادا ہی شمار ہوگی، قضاء نہ ہوگی۔ (المجموع ۳۷۸/۴) مسافر حجاج کرام مقام عرفہ میں ظہر اور عصر کے درمیان جمع تقدیم کریں اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان جمع تاخیر کریں۔

جمع تقدیم کے شرائط

جمع تقدیم کے تین شرائط ھیں (۱) دونوں نمازوں کے درمیان ترتیب ہو۔ لہٰذا پہلے اس وقت کی نماز ادا کرے

(مثلاً ظہر ہے تو ظہر یا مغرب ہے تو مغرب پڑھے) اس کے بعد دوسری نماز پڑھے، کسی نے دوسری نماز پہلے ادا کی، تو یہ جمع صحیح نہیں۔ اور پہلی نماز کے بعد اس کا اعادہ واجب ہے۔ اگر پہلے اس وقت کی نماز ادا کی، پھر دوسری نماز لیکن بعد میں پہلی نماز کا فاسد ہونا معلوم ہوا تو دوسری نماز بھی فاسد شمار ہوگی۔

(۲) جمع تقدیم کی نیت کرنا، اور نیت پہلی نماز کی تکبیر تحریمہ سے سلام پھیرنے تک کسی بھی وقت کافی ہے، سلام پھیرنے کے بعد کرے تو کافی نہیں (اب دوسری نماز کو اپنے وقت میں ادا کرے)

(۳) دونوں نمازوں کو پے درپے (متصلاً اور تسلسل کے ساتھ) ادا کرنا۔ دونوں نمازوں کے درمیان طویل فاصلہ ہو جائے، تو جمع نہیں کر سکتا، چاہے طویل فاصلہ عذر کی وجہ سے ہو، مثلاً سہو لاحق ہو یا بیہوشی طاری ہو یا بغیر عذر کے ہو۔ ہاں اگر معمولی فاصلہ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ فاصلہ کے کم زیادہ ہونے کا دارومدار عرف عام پر ہوگا۔

حدیث: آپ ﷺ نے جب مقام نمرۃ میں جمع تقدیم کی، تو دونوں نمازوں کو پے درپے ادا کیا اور دونوں کے درمیان کی سنتیں ترک فرمائیں البتہ دونوں کے درمیان اقامت کہی۔ (صحیحین، حاشیہ الروضہ)

دونوں نماز سے فراغت کے بعد پہلی نماز کے کسی رکن کا چھوٹ جانا یاد آ گیا تو دونوں نمازیں باطل ہونگی اور دونوں کا جمع کی صورت میں اعادہ کر سکتا ہے، اگر دوسری نماز سے کوئی رکن چھوٹ گیا ہے اور نماز سے فراغت کے بعد طویل فاصلہ نہ ہوا ہو، تو اس رکن کی تلافی کر کے نماز مکمل کرلے، اور دونوں نمازیں صحیح ہونگی۔ اور اگر فاصلہ طویل ہو جائے تو دوسری نماز باطل ہوگی، اب جمع جائز نہیں، بلکہ دوسری نماز اپنے وقت میں ادا کرے۔ اور اگر معلوم نہ ہو کہ رکن پہلی نماز سے چھوٹا ہے یا دوسری نماز سے تو دونوں کا اعادہ ضروری ہے اور جمع کرنا جائز نہیں۔ (۴) دوسری نماز کے تکبیر تحریمہ تک سفر باقی رہے۔

جو عصر کی نماز بطور جمع تقدیم ادا کرے، اس پر اب نفل مطلق حرام ہے، گرچہ عصر کا اول وقت شروع نہ ہوا ہو۔ جو عشاء کو جمع تقدیم سے پڑھے، وہ عشاء کا اصل وقت شروع ہونے سے قبل تراویح اور وتر پڑھ سکتا ہے، البتہ ابھی سے سَمَر (گفتگو) کو مکروہ نہیں قرار دیا جائیگا۔ (قلائدالخرائد ۱/۱۵۷)

جمع تاخیر کے شرائط: جمع تاخیر کے دو شرط ہیں۔ (۱) پہلی نماز کے وقت جمع تاخیر کی نیت کرے اور نیت کے وقت پہلی نماز کا کم از کم اتنا وقت باقی ہو، جس میں وہ نماز مکمل، یا (قصر پڑھنا ہو تو) بطور قصر ادا کی جا سکے۔ اس سے کم وقت ہو (اور جمع کی نیت کر بھی لے) تو وہ نماز قضاء شمار ہوگی اور گنہگار ہوگا۔ امام رملی، خطیب، ابن قاسم اور شبر املسی وغیرہ متاخرین نے اسی کو ترجیح دی ہے اور بقول صاحب جمل یہی معتمد ہے۔ شیخ زکریا انصاری اور ابن حجر مکی نے فرمایا کہ نیت کے وقت صرف ایک رکعت کا وقت باقی ہو، تب بھی جمع صحیح ہے۔ اور ادا شمار ہوگی، گرچہ اتنی تاخیر کا گناہ ہوگا۔ اور ایک رکعت کا وقت بھی نہ ہو تو سبھی کے نزدیک قضاء شمار ہوگی۔ (جمل ۱/۶۱۳، تحفہ مع الحواشی ۳/۲۶۶، مغنی ۱/۲۷۳)

(۲) دونوں نمازوں کے مکمل ہونے تک سفر باقی رہے۔ جمع تاخیر میں ترتیب، نمازوں کو پے درپے پڑھنا اور نماز کی حالت میں جمع کی نیت کرنا مستحب ہے۔ (المجموع۔ ۴/۳۷۶) جمع تقدیم کی صورت میں پہلی نماز کے دوران یا دوسری نماز شروع کرنے سے پہلے مقیم ہو جائے، خواہ اقامت کی نیت کی وجہ سے مقیم ہو جائے یا سواری اقامت کی جگہ پہنچنے سے، تو جمع تقدیم نہیں کر سکتا۔ اور دوسری نماز کو اس کے وقت میں پڑھے۔ اور پہلی نماز صحیح شمار ہوگی اگر دوسری نماز کے دوران یا فراغت کے بعد مقیم ہو جائے تو جمع باطل نہ ہوگی۔ جمع تاخیر

کی صورت میں دونوں نماز سے فراغت کے بعد مقیم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن فراغت سے پہلے مقیم ہو جائے تو پہلی نماز قضاء شمار ہو گی۔(گرچہ اس میں گناہ نہ ہو گا۔)(اعانہ ۲/۱۰۴)

فصل۔ بارش کی وجہ سے جمع

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرات ابن عمر رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی وجہ سے جمع مروی ہے۔(مغنی ۱/۲۷۴) بارش، اولہ باری، برف باری یا پر نم سرد ہواؤں کی وجہ سے کپڑے تر ہوں تو ایک مقیم کیلئے بھی جمع تقدیم جائز ہے۔ اور یہ رخصت ایسے مقیم کے لئے ہے، جو دور سے مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہو، اور آتے وقت راستہ میں بارش وغیرہ سے تکلیف ہوتی ہو، لہٰذا اگر کوئی گھر میں اکیلا یا باجماعت نماز ادا کررہا ہو یا مسجد کی طرف سائبان میں چل کر آئے، یا مسجد گھر سے بالکل قریب ہو یا عورتیں اپنے گھروں میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کررہی ہوں، یا تمام لوگ مسجد میں آکر تنہا نماز ادا کریں، تو جمع کرنا جائز نہیں، اور اس جمع کیلئے وہی شرائط ہیں جو سفر کی صورت میں جمع تقدیم کیلئے ہیں، البتہ مزید شرط یہ ہے کہ دونوں نمازوں کے تکبیر تحریمہ کے وقت اور پہلی نماز سے فارغ ہونے کے وقت بارش پائی جائے۔ اگر پہلی یا دوسری نماز کے دوران یا دونوں کے بعد بارش رُک جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بارش کی وجہ سے جمعہ اور عصر میں جمع تقدیم جائز ہے اور جمع کی صورت میں مذکورہ تینوں حالتوں (دونوں نماز کے ابتداء کے وقت اور جمعہ سے فراغت کے وقت) میں بارش کا پایا جانا ضروری ہے۔ دونوں خطبوں کے وقت بارش کا ہونا ضروری نہیں۔ خوف اور راستے میں کیچڑ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز نہیں۔

جمع کی صورت میں سنت پڑھنے کا بیان

ظہر اور عصر جمع کرنے کی صورت میں پہلے ظہر کی اگلی سنت ادا کرے، پھر دونوں فرض پھر ظہر کے بعد کی سنت، اس کے بعد عصر کی سنت ادا کرے عصر کی سنت کو پہلے بھی ادا کر سکتا ہے اور تمام سنتوں کو دونوں فرض کے بعد بھی ادا کر سکتا ہے۔(قلائد) مغرب وعشاء جمع کرے تو پہلے دونوں فرض ادا کرے پھر مغرب کی بعد والی سنت پھر عشاء کی سنت پھر وتر۔

طویل سفر (جو ۴۸ میل کے بقدر ہو) میں چار رخصتین ہیں (۱) نماز میں قصر (۲) روزہ کا افطار (۳) تین دن اور تین رات موزے پر مسح کرنا (۴) جمع بین الصلاتین اور قصیر سفر میں بھی چار رخصتین ہیں (۱) جمعہ کا ترک کرنا (۲) حالت اضطراری میں مردار کھانا (۳) سواری پر نفل پڑھنا (۴) تیمم

قصر اتمام سے افضل ہے۔

احادیث: (۱) حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں "میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا تو آپ دو رکعت نماز پڑھتے تھے الخ۔(رواہ الترمذی)

(۲) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے اچھے بندے وہ ہیں جو حالت سفر میں قصر کریں۔(فتح العزیز)

(۳) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو رخصتوں پر عمل کرنا پسند ہے، جیساکہ گناہوں کا ارتکاب ناپسند ہے۔

البتہ یہ چند حالتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔(ابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحیہا)

(۱) جب سفر تین مرحلے سے کم ہو تو اتمام افضل ہے (تاکہ امام ابو حنیفہؒ کے اختلاف سے بچے، کیونکہ اس مسافت پر ان کے نزدیک قصر واجب ہے، لیکن علامہ کردی کی تحقیق کے مطابق ان کے تین مرحلوں کی مسافت ہمارے دو مرحلوں کے مساوی ہے۔ لہٰذا مطلقاً قصر افضل ہو گا۔ (بغیہ ص ۷۶ بشری الکریم ۱/۱۳۶)

(۲) اگر کوئی قصر کو ناپسند سمجھے تو اس کے لئے قصر افضل ہے بلکہ کراہت زائل ہونے تک اتمام مکروہ ہے یہی حکم دیگر رخصتوں کا بھی ہے۔

(۳) ملّاح اپنے اہل و عیال کے ساتھ کسی کشتی میں سفر کر رہا ہو، تو اس کے لئے اتمام افضل ہے۔

(۴) کسی آدمی کی ہمیشہ سفر کی عادت ہو، اور اس کا کوئی وطن نہ ہو، تو اس کے لئے بھی اتمام افضل ہے (اگر چہ وہ قصر کر سکتا ہے) سفر میں روزہ کی طاقت ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ ائمہ کرام کے اختلاف سے بچتے ہوئے جمع بین الصلاتین نہ کرنا افضل ہے۔ البتہ ان صورتوں میں جمع افضل ہے: حاجی کیلئے عرفہ اور مزدلفہ میں، جمع کے جواز میں شک کرنے والا، رخصت سے اعراض کرنے والا، جمع کی صورت میں جماعت ملتی ہو، یا دائمی حدث کے بغیر نماز ادا ہوتی ہو یا ستر عورت کے ساتھ ادا ہوتی ہو۔ (مغنی المحتاج۔ ۱/۲۷۲) اگر کافر یا نابالغ بچہ مسافت قصر تک سفر کیلئے نکلے، پھر دوران سفر ہی کافر مسلمان ہو جائے اور بچہ بالغ ہو جائے، تو دونوں بقیہ سفر میں قصر کر سکتے ہیں۔ خوف کی وجہ سے اپنی بستی میں قصر جائز نہیں، اور نہ حالت خوف میں ایک رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے۔

مرض کی وجہ سے جمع: کئی علماء نے مرض کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنی حد تک اس پر عمل کر سکتا ہے۔ بیماری کے اعتبار سے تقدیم یا تاخیر جس میں سہولت ہو، اس پر عمل کرے، مثلاً دوسری نماز کے وقت بیماری کا زور بڑھتا ہو تو جمع تقدیم کے شرائط کے ساتھ تقدیم پر عمل کرے، برعکس صورت میں جمع تاخیر کی نیت کے ساتھ تاخیر کرے۔ جمع تقدیم کی صورت میں بارش کی طرح دونوں نماز کی تکبیر تحریمہ، پہلی نماز کے سلام کے وقت اور دونوں کے درمیان بیماری کا پایا جانا شرط ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس مسئلہ میں مرض اس درجہ کا ہو کہ مریض کو ہر نماز کے وقت میں ادا کرنے میں اتنی مشقت ہو، جتنی بارش میں چلنے سے ہو، جبکہ کپڑے تر ہوں۔ اور بعضوں کے نزدیک اتنی مشقت ضروری ہے کہ فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہو جائے (ان دونوں ضابطوں میں بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے) (تحفہ مع الحواشی ۳/۲۷۴ فتح المعین۔ مغنی۔ جمل وغیرہ، قلائد ۱/۱۵۶)

جمعہ کا بیان

آیت: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"۔ (سورہ جمعہ ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کیلئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف فوراً چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل مانعہ عن السعی) چھوڑ دیا کرو (اور تخصیص بیع کی بوجہ زیادہ اہتمام کے ہے کہ اس کے ترک کو فوت نفع سمجھا جاتا ہے) یہ (چل پڑنا مشاغل بیع وغیرہ کو چھوڑ کر) تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا نفع فانی) (بیان القرآن)

احادیث کی روشنی میں جمعہ کی چند خصوصیات (ماخوذ نور اللمعة للسیوطی)

(۱) جمعہ کا دن اس امت کیلئے عید کا دن ہے۔ (ابن ماجہ، طبرانی فی الاوسط)

(۲) صرف جمعہ کا نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ (ساتھ جمعرات یا سنیچر کا بھی رکھے تو کراہت نہ ہوگی) (بخاری، مسلم)

(۳) صرف جمعہ کی رات قیام (نماز و عبادت) کی تخصیص مکروہ ہے۔ (مسلم)

(۴) آپ ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں "الم تنزیل السجدہ اور ھل اتی علی الانسان کی تلاوت فرمایا کرتے۔ (شیخین)

(۵) جمعہ کے دن فجر کی نماز با جماعت تمام نمازوں میں افضل نماز ہے۔ (بیہقی۔ بزار۔ طبرانی)

(۶) جمعہ مساکین کا حج ہے۔ (حمید بن زنجویہ فی فضائل الاعمال، حارث بن ابی اسامہ فی مسندہ)

(۷) آپ ﷺ نماز جمعہ میں سورہ جمعہ اور "اذا جاءک المنافقون" تلاوت فرماتے۔ (مسلم)

(۸) آپ ﷺ نے ایک مرتبہ جمعہ کی نماز میں شریک نہ ہونے والوں کے متعلق فرمایا: میں نے ارادہ فرمایا کہ کسی آدمی کو امامت کیلئے آگے بڑھاؤں اور ان لوگوں کو جلاڈالوں جو جمعہ میں نہیں آتے۔ (حاکم)

(۹) آپ ﷺ نے فرمایا! لوگوں کو چاہئے کہ جمعہ کے ترک سے باز آجائیں ورنہ یقیناً اللہ ان کے دلوں پر مہر لگادیں گے پھر وہ لوگ غافلین میں شمار ہونگے۔ (مسلم و نحوہ ابوداود۔ ترمذی)

(۱۰) جو بغیر عذر کے جمعہ ترک کرے وہ ایک دینار صدقہ کرے، نہ ہو تو نصف دینار صدقہ کرے۔ (احمد، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ)

(۱۱) جو درمیان خطبہ اپنے ساتھی سے کہے چپ رہ اس نے لغو حرکت کی۔ (صحیحین)

(۱۲) امام کے منبر پر پہنچ کر بیٹھتے ہی (تحیۃ المسجد کے علاوہ) کوئی بھی نماز پڑھنا حرام ہے۔

(۱۳) جمعہ کے دن نصف النہار کے وقت نماز مکروہ نہیں ہے (کیونکہ) جمعہ کے علاوہ دنوں میں جہنم بھڑکائی جاتی ہے۔ (ابوداود)

(۱۴) جو جمعہ کیلئے آئے تو غسل کرلے۔ (صحیحین)

(۱۵) کیا تم میں سے کوئی اس سے عاجز ہے کہ ہر جمعہ اپنی اہلیہ سے جماع کرے، کیونکہ اسے دوہرا اجر ہے، اپنے غسل کا اجر اور بیوی کے غسل کا اجر۔ (بیہقی فی الشعب بسند ضعیف)

(۱۶) مسواک اور خوشبو کا استعمال۔ (صحیحین) (۱۷) تیل کا استعمال۔ (بخاری۔ حاکم)

(۱۸) جمعہ کی نماز سے قبل ناخن اور مونچھ تراشنا۔ (بزار۔ طبرانی۔ بیہقی فی الشعب۔ سعید بن منصور)

(۱۹) اپنے کپڑوں میں سے بہتر کپڑے پہن کر جمعہ کیلئے جانا۔ (احمد۔ ابوداود۔ حاکم)

(۲۰) مسجد میں خوشبو کی دھونی دینا۔ (زبیر بن بکار، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ، ابویعلی)

(۲۱) جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے پہلی ساعت (گھڑی) میں (مسجد کیلئے) روانہ ہوا گویا اس نے اونٹ کی قربانی پیش کی، جو دوسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے بیل کی قربانی پیش کی، جو تیسری ساعت میں روانہ ہوا گویا سینگ والے مینڈھے کی قربانی کی، جو چوتھی ساعت میں روانہ ہوا گویا مرغ کی قربانی پیش کی، جو پانچویں ساعت میں روانہ ہوا، گویا ایک انڈے کے ذریعہ تقرب حاصل کیا پھر جب امام (خطبہ کیلئے) آجائے تو ملائکہ ذکر (خطبہ) سننے کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم)

(۲۲) آپ ﷺ جمعہ کے علاوہ شدت گرمی میں (ظہر کی) نماز ٹھنڈے وقت پڑھتے۔ (بخاری)

(۲۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (چونکہ جمعہ کیلئے جلد ہی پہنچ جاتے اس لئے) جمعہ کی نماز کے بعد کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔ (صحیحین)

(۲۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو جمعہ کے دن اچھی طرح مکمل غسل کرے، پھر جلد جمعہ کیلئے پہنچے، ابتداء سے خطبہ میں شریک رہے، پیدل جائے، سوار نہ ہو، امام سے قریب ہو کر خوب توجہ سے (خطبہ وغیرہ) سنے اور کوئی لغو حرکت نہ کرے، تو اُسے ایک ایک قدم پر ایک سال کے روزہ اور نماز کا ثواب حاصل ہو گا۔ (احمد، سنن اربعہ۔ حاکم)

(۲۵) سورہ کہف کی تلاوت: دو جمعہ کے درمیان باعث نورانیت ہے۔ (حاکم۔ بیہقی) دو جمعہ کے درمیانی گناہ معاف ہونگے (ابن مردویہ) دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ (ضیاء فی المختارۃ)

(۲۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ سے قبل حلقہ بندی سے منع فرمایا۔ (ابوداود)

(۲۷) جمعہ کی نماز دوسرے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہے۔ جبکہ کبائر سے محفوظ ہو۔ (ابن ماجہ)

(۲۸) جمعہ کے دن انتقال ہونے والا عذاب قبر سے محفوظ رہے گا۔ (ابویعلی، بیہقی فی کتاب عذاب القبر)

(۲۹) شب جمعہ یا یوم جمعہ میں انتقال کرنے والا فتنہ قبر سے محفوظ رہے گا۔ (ترمذی وحسنہ، بیہقی، ابن ابی الدنیا)

(۳۰) سورج طلوع ہونے والے ایام میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے۔ (مسلم)

(۳۱) جمعہ سید الایام (سارے ایام کا سردار) ہے۔ (حاکم، ابوداود ونحوہ)

(۳۲) جمعہ کے دن مسلمان کی مغفرت ہوتی ہے۔ (ابن عدی، طبرانی فی الاوسط)

(۳۳) جمعہ کے دن رات کے ۲۴ ساعتوں میں سے ہر ساعت میں ۶۰۰ جہنم کے مستحقوں کو جہنم سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔ (بخاری فی تاریخہ، ابویعلی)

(۳۴) جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو دعا مانگی جائے قبول ہو گی۔ (شیخین)

(۳۵) جو شب جمعہ حم الدخان، کی تلاوت کرے اس کی بخشش ہو گی۔ (ترمذی)

(۳۶) شب جمعہ۔ "حمٓ الدخان" اور "یٰسین" پڑھنے والے کی صبح تک مغفرت ہو جائے گی۔ (بیہقی، فی الشعب)

(۳۷) جمعہ کے دن درود کی خوب کثرت رکھے ۔ (ابوداود ۔ حاکم ۔ ابن ماجہ) (ملخصا من نور اللمعة لجلال الدين السیوطی علیہ الرحمۃ)

جمعہ مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی مطلوبہ تعداد کی کمی کی وجہ سے یا اظہار اس کا شعار ہے اور مکہ میں یہ ممکن نہ تھا اس لئے مکہ میں اس کا قیام عمل میں نہ آسکا، ہجرت سے پہلے حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے ایک میل کے فاصلہ پر نَقِیعُ الْخَضِمَات نامی بستی میں جمعہ کا اہتمام فرمایا، جس میں ۴۰/ افراد شریک تھے۔

جمعہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ ہفتہ میں افضل ترین دن جمعہ کا دن ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہ یوم عرفہ سے بھی افضل ہے گرچہ علماء شافعیہ کے یہاں عرفہ افضل ہے۔ لیلۃ القدر جمعہ سے افضل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی شب دیدار الہی سے سرفراز ہوئے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہ رات سب سے افضل تھی۔ (بعض صحابہ نے شب جمعہ کو شب قدر سے افضل قرار دیا ہے۔ بشری الکریم ۲/۲)

جمعہ کی نماز کا بیان

جمعہ کی نماز فرض عین ہے۔ اور ارکان و شرائط میں دیگر پانچوں فرض نماز کے مانند ہے، البتہ جمعہ کو تین چیزوں میں خصوصیت حاصل ہے (۱۔ ۲) جمعہ کے واجب و صحیح ہونے کیلئے دیگر شرائط کے ساتھ چند مزید شرائط ہیں (۳) جمعہ کے آداب۔

جمعہ صحیح ہونے کیلئے چھ شرائط ھیں:

(۱) **وقت**۔ جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ جمعہ کی نماز زوال کے بعد ادا فرماتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

(۲) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جمعہ کے بعد قیلولہ اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ (صحیحین)

اگر کسی کی جمعہ فوت ہو جائے تو جمعہ کی صورت میں اس کی قضاء نہ کرے۔ (بلکہ ظہر کی مکمل چار رکعت قضاء کرے) اگر وقت نکل جائے یا وقت کے نکل جانے میں شک ہو، یا صرف اتنا وقت باقی ہو، کہ اس میں صرف ارکان پر اکتفاء کرتے ہوئے دو خطبے اور دو رکعت ادا کرنے کی گنجائش نہ ہو، تو جمعہ نہ پڑھیں، بلکہ ظہر ادا کریں۔ وقت میں جمعہ کی نماز شروع کرے اور دوران نماز وقت نکل جائے تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر ادا کرے، اور ظہر کی نیت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور جس وقت سے ظہر کا ارادہ کرے اسی وقت سے قراءت سراً پڑھے۔ دوران نماز وقت نکل جانے میں شک ہو تو جمعہ ہی پوری کریں۔ ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

جمعہ کی نماز میں کسی مسبوق کو امام کے ساتھ ایک رکعت مل گئی ہو، اور وہ اپنی دوسری رکعت پوری کرنے کیلئے کھڑا ہونے کے بعد سلام سے پہلے وقت نکل گیا تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرے۔ امام اور مقتدی حضرات پہلا سلام وقت میں پھیریں اور دوسرا سلام وقت نکل جانے کے بعد تو سب کی جمعہ صحیح ہو گی۔ اور اگر امام ہی پہلا سلام وقت نکل جانے کے بعد پھیرے تو سب کی جمعہ باطل ہو گی۔

امام اور بعض (یعنی ۳۹) مقتدی پہلا سلام وقت میں پھیریں، تو انکی تو جمعہ صحیح ہو گی، اور جو مقتدی وقت کے بعد سلام پھیریں ان کی جمعہ باطل ہو گی۔

اگر وقت میں سلام پھیرنے والوں کی تعداد چالیس سے کم ہو تو انکی بھی جمعہ باطل ہو گی۔ (جمل ۲/۱۴) اگر امام اور مقتدی پہلا سلام وقت کے نکل جانے کو جانتے ہوئے وقت کے بعد پھیریں تو سب کی نماز باطل ہو گی (یعنی اب اسی پر بناء کرتے ہوئے ظہر پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں) ہاں اگر نفل کی نیت کر کے سلام پھیرے تو صحیح ہے۔ اور اگر وقت کے نکلنے کا علم نہ ہو تو اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کریں۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۲/۱۴)

(۲) **اقامت (آبادی) کی جگہ جمعہ ادا کی جائے**: یعنی ایسی آبادی میں جو جمعہ ادا کرنے والے حضرات کا وطن اصلی ہو، چاہے شہر ہو یا گاؤں، نیز اس آبادی کی عمارتیں پتھر کی ہوں، یا مٹی یا لکڑی کی، اگر زمین کے اندر یا پہاڑ میں مکانات بنا کر رہتے ہوں اور اسی کو وطن بنائے ہوئے ہوں تو وہاں پر ان کا جمعہ ادا کرنا صحیح ہے۔ (حاشیۃ الجمل)

جو حضرات جنگل میں خیمہ بنا کر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں، چاہے موسم سرما یا گرما میں وہاں سے منتقل ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، وہاں پر ان کا جمعہ ادا کرنا صحیح نہیں۔ کسی بستی یا شہر کی تمام عمارتیں منہدم ہو جائیں اور ان لوگوں کا وہاں عمارتیں بنانے کا قصد ہو تو اس بستی والوں پر وہاں جمعہ ادا کرنا لازم ہے، چاہے فی الحال کسی خیمہ میں رہتے ہوں یا اس کے علاوہ میں۔ کسی جگہ گاؤں بسانے کے ارادہ سے پڑاؤ

ڈالے ہوئے ہوں۔ تو وہاں پر عمارتیں بننے سے پہلے جمعہ ادا کرنا صحیح نہیں۔ (حاشیہ الجمل ۲/۱۵) جمعہ کا کسی مسجد یا گھر میں ادا کرنا ضروری نہیں، بلکہ ایسے کھلے میدان میں بھی جو شہر کے حدود میں داخل ہو، جمعہ ادا کرنا صحیح ہے۔ لیکن شہر کے باہر ایسے مقام پر جمعہ قائم کرنا درست نہیں جہاں سے مسافر کیلئے نماز میں قصر کی اجازت ملتی ہے۔

(۳) **ایک ھی بستی میں ایک سے زائد جمعہ نہ ھو:** اس لئے کہ آپ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوتی تھی۔ (حاشیۃ الروضہ) (بلاضرورت) ایک سے زائد جمعہ ہو جائیں تو اس کی چند صورتیں ہونگی۔

(الف) دونوں جمعہ یکے بعد دیگرے ادا ہوں تو جو جمعہ پہلے ہو، وہ صحیح ہو گی اور دوسری جمعہ باطل ہو گی، اور جس امام کی تکبیر تحریمہ پہلے مکمل ہو گی اس کی جمعہ صحیح ہو گی اگر ایک امام تکبیر تحریمہ کے ہمزہ کو پہلے کہے لیکن دوسرا امام تکبیر کی راء سے پہلے فارغ ہو جائے تو اس دوسرے امام کی جمعہ صحیح ہو گی۔ کسی جماعت کے جمعہ شروع کرنے کے بعد کسی نے آکر خبر دی کہ اس سے پہلے ایک جمعہ ہو چکی تو دوسری جماعت والوں کیلئے مستحب ہے کہ نئے سرے سے ظہر ادا کریں اور اسی پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرنا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے۔

(ب) دونوں جمعہ ایک ساتھ ادا ہو جائیں تو دونوں باطل ہیں اب جمعہ کی ادئیگی کیلئے وقت میں گنجائش ہو تو از سر نو جمعہ ادا کریں۔ (ورنہ پھر سب ظہر ادا کریں)

(ج) صورتِ حال کچھ سمجھ میں نہ آئے یعنی پتہ نہ چلے کہ آیا دونوں ایک ساتھ ادا ہوئیں یا یکے بعد دیگرے تو جمعہ کا اعادہ ضروری ہے۔ (نیز بعد میں ظہر پڑھنا مستحب ہے۔)

دونوں میں سے ایک کے بارے میں یقین ہے کہ وہ پہلے ادا ہوئی ہے، بعد میں التباس (شبہ) ہو گیا (یعنی پتہ نہ چلے کہ کون سی پہلے ہوئی) تو دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی جمعہ کی ادائیگی سے بری نہ ہو گا بلکہ سب کو ظہر ادا کرنا پڑے گی۔

(ھ) کسی ایک کے پہلے ہونے کا یقین ہے لیکن پہلے کونسی ادا کی گئی اس کے بارے میں شبہ ہو جائے، مثلاً مسجد کے باہر دو مریض یا دو مسافر کھڑے تھے، انہوں نے دونوں تکبیر تحریمہ کی آواز آگے پیچھے سنی، لیکن پہلے کون سی ہوئی اس کا انہیں علم نہیں ہو سکا، بعد میں آکر انہوں نے نمازیوں کو صورت حال بتادی، تو ایسی صورت میں بھی دونوں جماعتوں کو ظہر ادا کرنا پڑے گی (اگر لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ایک جگہ جمعہ پڑھنا دشوار ہو تو بقدر ضرورت ایک سے زائد جمعہ جائز ہے۔) (الفقہ المنہجی)

(۴) **چالیس آدمیوں کا ھونا:** چالیس سے کم کی صورت میں جمعہ منعقد نہ ہو گی۔

حدیث: حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے چالیس آدمیوں کی موجودگی میں جمعہ پڑھائی۔ (رواہ ابوداؤد) اور چالیس آدمیوں کا مذکر مکلف، آزاد اور متوطن (باشندہ) ہونا ضروری ہے۔ اور بلا ضرورت وہاں سے موسم سرما اور گرما میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ اگر گرمی میں پڑاوٗ ڈالیں اور سردی میں کوچ کریں یا اس کے برعکس کریں۔ تو ایسے لوگ متوطن (باشندے) نہیں کہلائیں گے۔ اور صرف ایسے لوگوں کی موجودگی میں جمعہ منعقد نہ ہو گی۔ کوئی شخص کسی بستی کا باشندہ اس وقت کہلائے گا جبکہ اس کا ایک ہی گھر ہو، لیکن اگر کسی کے دو مختلف شہر میں دو گھر ہوں تو وہ جہاں زیادہ رہتا ہو۔ وہیں کا باشندہ کہلائے گا۔ اور اگر دونوں جگہ برابر رہتا ہو تو جس جگہ اس کے اہل وعیال اور مال ہو۔ وہیں کا باشندہ شمار ہو گا، اگر کسی ایک بستی میں اہل وعیال ہوں اور دوسری بستی میں مال ہو تو جہاں اہل وعیال ہوں، وہیں کا باشندہ ہو گا اور اگر دونوں بستیاں تمام چیزوں میں برابر ہوں تو جمعہ کی ادائیگی کے وقت جہاں ہو وہیں کا باشندہ کہلائے گا۔ (اعانۃ ۲/۸۵، حاشیۃ البجیرمی ۲/۱۷۰) مریضوں سے جمعہ منعقد ہوتی ہے۔ امام کا چالیس آدمیوں میں شمار ہو گا۔ نماز کی طرح

دونوں خطبوں کے ارکان سننے کیلئے بھی چالیس آدمیوں کا ہونا ضروری ہے اگر چالیس کی تعداد تو موجود ہو مگر خطبہ شروع کرنے سے پہلے کم ہو جائیں، تو تعداد مکمل ہونے تک خطبہ کی ابتداء نہ کرے۔ اگر دوران خطبہ کم ہو جائیں۔ اور فوری طور پر واپس لوٹیں تو انکی غیر موجودگی میں جو رکن پڑھا گیا اس کا اعادہ کرتے ہوئے اسی خطبہ پر بناء کرے، اور اگر طویل فاصلہ کے بعد لوٹیں یا پہلے لوگوں کے بجائے دوسرے چالیس افراد آئیں، یا پہلے چالیس میں سے بعض آئیں اور بعض نہ آئیں البتہ دیگر بعض نئے افراد شامل ہو کر چالیس کی تعداد پوری ہو جائے تو ان تینوں صورتوں میں نئے سرے سے خطبہ دینا ضروری ہے۔ اگر خطبہ کے بعد کم ہو جائیں، اور فوری طور پر واپس لوٹیں تو اسی خطبہ سے جمعہ ادا کرے۔ اور طویل فاصلہ کے بعد لوٹیں، تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہے کیونکہ خطبہ اور نماز دونوں کا پے در پے (متصل) ہونا ضروری ہے۔ فاصلہ کم زیادہ ہونے کا دارومدار عرف عام پر ہوگا (شروع ہی سے امام کے ساتھ شریک) چالیس افراد کے جانے سے پہلے دوسرے چالیس افراد آکر امام کے ساتھ مل جائیں پھر پہلے چالیس افراد چلے جائیں، تو اس سے جمعہ پر کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ جمعہ صحیح ہوگی۔ چاہے بعد میں آنے والے لوگوں نے خطبہ سنا ہو یا نہ سنا ہو۔ پہلے لوگوں کے چلے جانے کے بعد فوراً دوسرے چالیس افراد آکر امام کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ اس شرط کے ساتھ صحیح ہوگی کہ بعد میں آنے والے افراد خطبہ کے وقت حاضر رہے ہوں۔ (حاشیۃالجمل ۲/۲۲) تکبیر تحریمہ کے بعد کچھ مقتدی چلے جائیں، اور بقیہ نماز میں تعداد چالیس سے کم رہے تو جمعہ باطل ہوگی۔ کیونکہ نماز پوری ہونے تک اتنی تعداد کا ہونا ضروری ہے۔ امام تکبیر تحریمہ کہے۔ اور مقتدی حضرات رکوع کے بعد آکر امام کے ساتھ شریک ہو جائیں تو جمعہ صحیح نہ ہوگی اور اگر رکوع سے پہلے آکے ملیں تو جمعہ صحیح ہوگی۔

(۵) **جمعہ کو باجماعت ادا کیا جائے:** اگر چالیس آدمیوں نے بھی اکیلے اکیلے جمعہ کی نماز پڑھی تو صحیح نہ ہوگی۔ اور اس میں جماعت کیلئے وہی شرائط ہیں جو دیگر نماز کیلئے ہیں، جمعہ کی نماز غلام، مسافر، ممیز، بچہ، متنفل (نفل پڑھنے والا) اور ایسے امام کے پیچھے جس کا نماز کے بعد محدِث (بے وضو) ہونا معلوم ہو جائے صحیح ہے۔ جبکہ چالیس کی تعداد ان کے بغیر پوری ہو جائے اور اگر تعداد ان کے سمیت پوری ہوتی ہو تو جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ (اور محدث امام جمعہ کا اعادہ نہ کرے بلکہ ظہر ادا کرے۔ (المجموع ۴/۲۵۹) جمعہ ادا کرنے کے بعد چالیس یا بعض مقتدیوں کا محدث ہونا ظاہر ہو جائے تو محدث حضرات کی جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ البتہ امام اور جو مقتدی محدث نہ ہوں انکی صحیح ہوگی۔ (جمل ۲/۲۳) سارے مقتدی حضرات غلام یا عورتیں ہوں تو اس سے امام کی بھی جمعہ نہ ہوگی۔ امام کا سہواً جمعہ یا جمعہ کے علاوہ کسی نماز میں زائد رکعت کیلئے کھڑے ہونے کے بعد کوئی ایسا شخص جس کو امام کے سہو کا علم ہے۔ آکر اس رکعت میں امام کی اقتداء کر لے، تو اس کی نماز منعقد نہ ہوگی، چاہے اُسے پوری رکعت ملی ہو اور اگر سہو سے ناواقف ہو اور پوری رکعت ملی ہو تو مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی۔ (اور جمعہ کی نماز میں وہ رکعت جمعہ ہی کی شمار ہوگی نہ کہ ظہر کی) اور امام کے سلام کے بعد اسی رکعت پر بناء کرے۔ لیکن اگر پوری رکعت نہ ملے بلکہ صرف رکوع ملے تو وہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ محدث کے امام کو رکوع میں پانے سے وہ رکعت شمار نہیں ہوتی، اسی لئے محدث امام کو جمعہ کے دوسری رکعت کے رکوع میں پانے سے جمعہ حاصل نہ ہوگی۔

امام کے ساتھ ایک رکعت ملنے سے جمعہ مل جاتی ہے (چاہے پھر وہ رکعت ملفقہ کیوں نہ ہو) اور باقی ایک رکعت امام کے سلام کے بعد پوری کرے۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے جمعہ کی ایک رکعت بھی پائی تو اس نے جمعہ کو پالیا، اور جسے ایک رکعت سے کم ملے وہ ظہر کی چار رکعات ادا کرے۔“ (دارقطنی۔ تلخیص)

اور اگر ایک رکعت بھی نہ ملے مثلاً دوسری رکعت کے رکوع کے بعد امام کو پالے تو جمعہ حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ سلام کے بعد ظہر ادا کرے، اور امام کی موافقت میں نیت جمعہ ہی کی کرے۔

امام کے ساتھ ایک رکعت پانے کی صورت میں اپنی دوسری رکعت کے تشہد میں بیٹھنے کے بعد یاد آیا کہ دو رکعتوں میں سے کسی ایک سے سجدہ چھوٹ گیا۔ اگر دوسری رکعت سے چھوٹ گیا ہے تو اسے جمعہ حاصل ہوگی مگر پھر ایک سجدہ کر کے تشہد لوٹا کر سجدہ سہو کرے اور سلام پھیرے اور اگر پہلی رکعت سے چھوٹ گیا یا شک ہو جائے تو اسے جمعہ حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ جو رکعت ادا کی ہے وہ ظہر کی شمار ہوگی۔

امام کو دوسری رکعت میں پانے کے بعد سلام سے پہلے شک ہو جائے کہ امام کے ساتھ ایک سجدہ کیا یا دو تو دوسرا سجدہ کر کے امام کے ساتھ مل جائے تو اسے جمعہ مل جائے گی۔ اور اگر سلام پھیرنے کے بعد شک ہو جائے تو جمعہ حاصل نہ ہوگی بلکہ سجدہ کر کے ظہر پوری کرے۔

دوران نماز نائب بنانے کا حکم

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کے ایام میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھارہے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کچھ افاقہ محسوس کیا تو نماز کیلئے تشریف لائے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (دوران نماز) پیچھے ہٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ (صحیحین)

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب نماز کی حالت میں نیزہ مارا گیا تو آپ نے اپنا نائب بنایا۔ (رواہ البیہقی۔ مغنی ۲/۲۹۷) جمعہ یا جمعہ کے علاوہ کسی اور نماز میں امام عمداً یا بلا عمد کے حدث پیش آنے یا اس کے علاوہ کسی اور سبب یا بلا کسی سبب کے نماز سے نکل جائے تو (بقیہ نماز پوری کرنے کیلئے) کسی کو نائب بنانا جائز ہے۔ چاہے امام کسی کو نائب بنائے یا مقتدی حضرات بنائیں، یا بذات خود کوئی آگے بڑھ کر نماز پڑھائے۔ اور اگر کوئی بھی آگے نہ بڑھے تو (مقتدی) تنہا نماز پوری کرے۔

نیابت کی تفصیل

نائب بنانے کا مسئلہ اگر جمعہ کی نماز میں پیش آئے تو اس کی تین حالتیں ہونگی۔ (۱) دوران خطبہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو نائب بنانا صحیح ہے جس نے اس خطبہ کے گذرے ہوئے حصہ کو (یعنی جتنے ارکان پڑھے گئے اسے) سنا ہو۔ (۲) خطبہ اور نماز کے دوران (یعنی خطبہ پورا ہونے کے بعد نماز پڑھانے کیلئے نائب بنانا ہو تو) ایسے شخص کو بنائے جس نے پورا خطبہ (خطبہ کے ارکان) سنا ہو۔ (۳) دورانِ نماز ایسے مقتدی کو نائب بنانا صحیح ہے، جس نے امام کو حدث پیش آنے سے پہلے ہی اس کی اقتداء کی ہو۔ اور اس نائب نے اگر امام کو پہلی رکعت میں پایا ہو تو نائب اور مقتدی سب کی جمعہ صحیح ہوگی اور دوسری رکعت میں پایا ہو تو مقتدی کی جمعہ صحیح ہوگی، نائب کی نہیں، بلکہ نائب اسی نماز پر بناء کرتے ہوئے ظہر پوری کرے۔ منفرد (تنہا نماز پڑھنے والے) کو جمعہ کی نماز میں نائب بنانا صحیح نہیں (لیکن اگر کسی نے بنایا) تو نائب کی جمعہ صحیح نہ ہوگی۔ اس لئے کہ ایک جمعہ کے بعد دوسری جمعہ کا قیام ممنوع ہے۔ اور وہ نائب اگر اہل وجوب میں سے (یعنی ایسا شخص جس پر جمعہ واجب) ہو تو اس کی ظہر بھی صحیح نہ ہوگی کیونکہ جمعہ فوت ہونے سے پہلے ظہر ادا کرنا جائز نہیں، ہاں اگر وہ مسئلے سے ناواقف ہو تو اس کی یہ نماز نفل شمار ہوگی۔ اور اگر اہل وجوب میں سے نہ ہو اور ظہر کی نیت کر کے آگے بڑھا ہے تو اس کی ظہر صحیح ہوگی۔ اور مقتدی حضرات اگر اس نائب کی اپنی پہلی رکعت میں اقتداء کریں تو اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ اور دوسری رکعت میں کریں

تو اقتداء صحیح ہو گی۔ اور جمعہ ہی کی نماز پوری کریں۔ (جمل ۲/۶۵) جمعہ کے علاوہ دیگر کسی نماز میں نائب بنانے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں مطلقاً جائز ہے۔ مقتدی کو بنائے یا منفرد کو، چاہے کسی بھی رکعت میں بنائے البتہ منفرد کو چار رکعت والی نماز میں دوسری اور چوتھی رکعت میں نائب بنانا ہے۔ تو دوبارہ اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے۔ امام کے مقابلے میں مقتدی حضرات کا کسی کو نائب بنانا زیادہ بہتر ہے، نائب ایسا ہونا ضروری ہے جو مقتدی حضرات کے امامت کے لائق ہو۔ مردوں کی امامت کیلئے عورت کو نائب بنائے تو صحیح نہیں، البتہ مردوں کی نماز اس سے باطل نہ ہو گی۔ ہاں اگر اس عورت کی اقتداء کی تو باطل ہو گی، فوری طور پر نائب بنانا ضروری ہے۔ فوری طور پر نہ بنائے بلکہ مقتدیوں کے ایک فعلی رکن ادا کرنے کے بعد یا اتنا زمانہ گذرنے کے بعد جس میں ایک رکن ادا کرنا ممکن ہو بنائے تو ایسی صورت میں جمعہ کے علاوہ دیگر نماز میں دوبارہ اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نائب بنانا صحیح نہیں۔ البتہ جمعہ کی نماز میں تاخیر کی صورت میں مطلقاً نائب بنانا ممنوع ہے۔ دوبارہ اقتداء کی نیت کرے یا نہ کرے۔ (حاشیۃ البجیرمی ۲/۱۹۱) مسبوق کو نائب بنائے تو اس پر امام کے نماز کی ترتیب کی رعایت ضروری ہے۔ لہٰذا امام کے بیٹھنے کی جگہ بیٹھے اور کھڑے ہونے کی جگہ کھڑے رہے لیکن اگر مسبوق کو امام کے نماز کی ترتیب کا علم نہ ہو، تو ایک رکعت پوری کرنے کے بعد مقتدی حضرات کو دیکھے، اگر مقتدی حضرات کا کھڑے ہونے کا ارادہ ہو تو یہ بھی کھڑا ہو، ورنہ پھر بیٹھ جائے، صبح کی دوسری رکعت میں ایسے مسبوق کو جو اسی رکعت میں شامل ہوا ہو نائب بنائے تو نائب دعائے قنوت بھی پڑھے۔ اور بیٹھ کر تشہد بھی پڑھے پھر اس کی اپنی دوسری رکعت میں بھی دعائے قنوت پڑھے۔ نائب کی اقتداء سے پہلے یا اقتداء کے بعد امام کو سہو پیش آیا، تو نائب اولاً سابق امام کی نماز کے آخر میں، پھر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرے۔ نائب سابق امام کے ترتیب کے مطابق نماز پوری کرنے کے بعد سلام سے پہلے اپنی بقیہ نماز پوری کرنے کیلئے کھڑا ہو جائے، تو مقتدی حضرات کو اختیار رہے گا، چاہیں تو اس نائب سے مفارقت کی نیت کر کے سلام پھیریں یا بیٹھ کر امام کا انتظار کرتے رہیں اور امام کے ساتھ سلام پھیریں (اور یہی صورت افضل ہے المجموع۔ ۴/۵۸۱) دوسری رکعت میں بنائے گئے نائب کی کوئی مسبوق اُسی رکعت میں اقتداء کرے تو مسبوق کی جمعہ صحیح ہو گی، نائب کی نہیں۔ جن لوگوں کو امام کے ساتھ پہلی رکعت ملے ان کی ہر حال میں جمعہ صحیح ہو گی، ایسے لوگ اگر کسی ظہر یا نفل پڑھنے والے کی اقتداء کریں، تو کوئی حرج نہیں۔ امام کو حدث پیش آنے سے پہلے نائب کو سہو لاحق ہو تو نائب کو سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ امام اس کا تحمل کرے گا۔ البتہ حدث کے بعد سہو لاحق ہوا تو نائب اور مقتدی حضرات سبھی کو سجدہ سہو کرنا مسنون ہے۔

مقتدی کو امام کے حدث سے پہلے یا نیابت کے بعد سہو لاحق ہوا تو مقتدی کو سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر امام کے حدث کے بعد اور نیابت سے پہلے کسی مقتدی کو سہو پیش آیا تو نائب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر لے۔ جمعہ اور دیگر نمازوں میں نائب کے اقتداء کی نیت کرنا ضروری نہیں (کیونکہ نائب پہلے امام کے قائم مقام ہے)

جمعہ کی پہلی رکعت میں امام کو حدث وغیرہ پیش آنے کی صورت میں امام کسی کو نائب نہ بنائے، تو مقتدیوں پر کسی کو نائب بنانا واجب ہے۔ اور دوسری رکعت میں مندوب ہے، اگر مسبوق کی طرح تنہا اپنی نماز پوری کریں تب بھی جمعہ صحیح ہو گی۔ امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کرنے کے بعد کسی عذر سے یا عذر کے بغیر امام سے الگ ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی بلکہ (تنہا) جمعہ پوری کرے۔ جمعہ کی نماز میں امام کی نماز مکمل ہونے کے بعد مسبوق حضرات کسی اور کو امام نہ بنائیں (بلکہ اپنی نماز تنہا مکمل کریں) کیونکہ ایک جمعہ کے بعد دوسری جمعہ کا قیام ممنوع ہے اسی طرح دیگر نمازوں میں بھی مسبوق امام کی نماز کے بعد یا مقیم مقتدی مسافر امام کی دو رکعت پر سلام کے بعد کسی

اور کو امام نہ بنائیں کیونکہ جماعت کی فضیلت حاصل ہو چکی، اب تنہا اپنی اپنی نماز مکمل کر لینا کافی ہے۔

فصل۔ازدحام کا مسئلہ

(فتح الوھاب سے ماخوذ ہے)

جو شخص جمعہ یا دیگر نماز میں بھیڑ یا بھول کی وجہ سے پیچھے رہنے کی صورت میں امام کے ساتھ پہلی رکعت میں زمین پر سجدہ نہ کر سکے، تو جس پر سجدہ کرنا ممکن ہو (مثلاً کسی کی پیٹھ پر) تو اس پر کرنا لازم ہے۔

حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا! جب سخت بھیڑ ہو جائے (اور تم میں سے کوئی زمین پر سجدہ نہ کر سکے) تو اپنے بھائی کی پیٹھ پر سجدہ کرے (رواہ البیہقی باسنادہ صحیح) کسی چیز پر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو سجدہ کرنے کیلئے موقع کا انتظار کرتا رہے، اگر دوسری رکعت میں امام کے رکوع میں جانے سے پہلے موقع ملے، تو سجدہ کر کے امام جس حالت میں ہو اس میں جاکر ملے چاہے امام قیام میں ہو یا رکوع میں (سجدہ کے بعد) امام قیام میں ملے تو مسبوق کی طرح قرأت پڑھنا شروع کر دے لیکن امام قرأت پوری ہونے سے پہلے رکوع میں چلا جائے تو قرأت روک کر امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو جائے، اور اگر (سجدہ کے بعد) امام رکوع میں ملے تو رکوع میں شریک ہو جائے (اور امام کے اقل رکوع کی حد سے اٹھنے سے قبل اسے رکوع میں طمانیت حاصل ہو چکی ہو تو یہ رکعت شمار ہو گی ورنہ نہیں۔) (جمل) اور امام رکوع سے اٹھ چکا ہو تو جس حالت میں ہو اس میں اس کی موافقت کرے۔ اور سلام کے بعد ایک رکعت ادا کرے۔ کیونکہ ایک رکعت فوت ہو چکی اور اگر سجدہ سے سر اٹھانے سے پہلے ہی امام سلام پھیر چکا ہو، تو اس مقتدی کی جمعہ فوت ہو گئی اب اسی نماز کو آگے بڑھاتے ہوئے ظہر پوری کرے (اور سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد امام سلام پھیرے تو جمعہ فوت نہ ہو گی۔) (حاشیۃ الجمل)

اگر امام کے دوسری رکعت میں رکوع میں جانے کے بعد سجدہ کا موقع ملے تو (اب سجدہ نہ کرے بلکہ) امام کے ساتھ رکوع کرے اور اس کی یہ رکعت مُلَفَّقَہ (یعنی جو پہلی رکعت کے رکوع اور دوسری رکعت کے سجدہ سے مل کر پوری ہوئی) کہلائے گی۔ لیکن اگر امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا بلکہ عمداً اور جانتے ہوئے اپنی نماز کی ترتیب کے مطابق سجدہ کیا تو اس کی نماز باطل ہو گی، ایسی صورت میں امام کو رکوع میں پانا ممکن ہو تو دوبارہ جمعہ کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنا ضروری ہے۔

البتہ بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے اپنی نماز کی ترتیب کے مطابق سجدہ کیا، تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی، لیکن اس کا یہ سجدہ شمار بھی نہ ہو گا۔ اب سجدہ کے بعد رکوع کو طویل کرنے کی وجہ سے امام کو رکوع میں پائے تو موافقت ضروری ہے۔

اور سجدہ میں پائے تو دوبارہ امام کے ساتھ سجدہ کرے اور یہ سجدہ شمار ہو گا۔ اور یہ رکعت ملفقہ کہلائے گی اور جمعہ بھی حاصل ہو گی۔

امام کو تشہد میں پائے تو موافقت ضروری نہیں بلکہ پہلی رکعت کی تکمیل کیلئے دو سجدے کرے۔ اور سلام کے بعد ایک رکعت ادا کرے۔ اور اس سے اُسے جمعہ حاصل ہو گی (جمل۔ ۲/ ۶۵) اور اگر کھڑے ہو کر رکوع وغیرہ کر کے دوبارہ سجدہ کرے تو اس کا یہ سجدہ شمار ہو گا اور ان سجدوں کی وجہ سے اس کی ایک رکعت مکمل ہو جائے گی اور یہ ملفقہ رکعت شمار ہو گی (یعنی پہلی رکعت کے رکوع اور ان دوسرے دو سجدوں سے مل کر پوری ہوئی) لیکن یہ سجدے اگر امام کے سلام سے پہلے ادا ہوں تو جمعہ حاصل ہو گی ورنہ نہیں۔ اگر امام کے دوسری رکعت کے سجدہ میں جانے کے بعد سجدہ کا موقع ملے تو سجدہ میں امام کی موافقت کرے۔ اور اسے یہ ملفقہ رکعت حاصل ہو گی۔ (یعنی پہلی رکعت کے رکوع اور دوسری رکعت کے سجدہ سے مل کر مکمل ہوئی۔) اگر امام کے تشہد میں بیٹھنے کے بعد موقع ملے تو سجدہ

کرے۔ اب اگر امام کو سلام سے پہلے پائے تو جمعہ مل جائے گی ورنہ نہیں۔ امام کے ساتھ پہلی رکعت مکمل کرنے کے بعد دوسری رکعت کے سجدہ میں بھیڑ ہو جائے تو امام کے سلام سے پہلے یا بعد، جب بھی موقع ملے سجدہ کرے اور اس کی جمعہ صحیح شمار ہو گی۔

چھٹی شرط۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہوں

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا! آپ ﷺ دو خطبے دیتے تھے جس میں درمیان میں بیٹھتے تھے۔ (صحیحین)

خطبہ کے ارکان: خطبہ کے پانچ ارکان ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے۔ (مسلم)

(۲) آپ ﷺ پر درود پڑھنا۔ حمد اور درود میں لفظ حمد اور لفظ صلاۃ کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی ان دونوں کا مادّہ پایا جانا ضروری ہے بعینہ لفظ ''اَلۡحَمۡدُ'' اور لفظ الصلاۃ ضروری نہیں جیسے ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ۔ اَحۡمَدُ اللّٰهَ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ یَا اُصَلِّیۡ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' کہے اور حمد میں لفظ اللہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ''اَلۡحَمۡدُ لِلرَّحۡمٰنِ یَا اَلۡحَمۡدُ لِلرَّحِیۡمِ'' کہے۔ تو کافی نہ ہو گا۔ درود میں لفظ محمد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ آپ ﷺ کے اسماء مبارکہ میں سے کوئی بھی اسم ظاہر ہو تو کافی ہے، جیسے ''اُصَلِّیۡ عَلٰی مُحَمَّدٍ یا اُصَلِّیۡ عَلٰی اَحۡمَدَ'' کہے (حاشیۃ الجمل ۲/۲۵) آپ ﷺ کا اسم گرامی نہ لیتے ہوئے صرف ''صَلَّی اللّٰهُ عَلَيۡهِ'' ضمیر کے ساتھ کہے تو یہ کافی نہیں۔ چاہے اس سے پہلے آپ ﷺ کا ذکر گذر چکا ہو، آپ کے آل اور اصحاب کو بھی درود میں شامل کرنا مستحب ہے۔

(۳) تقوی کی وصیت کرنا

حدیث: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''آپ ﷺ دو خطبے دیتے اور درمیان میں بیٹھتے۔ قرآن کی تلاوت فرماتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔'' (رواہ مسلم)

اور لفظ وصیت کا ہونا ضروری نہیں۔ اسلئے کہ اس سے مقصود وعظ و نصیحت کرنا ہوتا ہے جو دیگر لفظ سے بھی حاصل ہو گا۔ وصیت میں صرف دنیا کے دھوکے اور اس کی خوبصورتی سے ڈرانے پر اکتفاء کرنا کافی نہیں، کیونکہ منکرین شریعت بھی اس کی وصیت کرتے ہیں۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارنا اور معاصی سے روکنا ضروری ہے۔ اور نصیحت میں طویل کلام کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف ''اَطِيۡعُوۡا اللّٰهَ'' کہے۔ تب بھی کافی ہے۔ مذکورہ تینوں ارکان کا دونوں خطبوں میں پایا جانا ضروری ہے۔

(۴) دوسرے خطبہ میں مومنین کیلئے امور آخرت سے متعلق دعا مانگنا۔ اگر صرف پہلے خطبہ میں مانگے تو وہ شمار نہ ہو گی، ایسی دعا کا ہونا ضروری ہے، جس پر دعا کا اطلاق ہو سکے صرف سامعین کیلئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے ''رَحِمَکُمُ اللّٰهُ'' کہنا (اللہ تم پر رحم کرے)

(۵) دو خطبوں میں سے کسی ایک میں قرآن پڑھنا۔ لیکن پہلے خطبہ میں پڑھنا افضل ہے (اور پہلے خطبہ کے آخر میں پڑھنا مسنون ہے۔ حاشیۃ الجمل ۲/۲۶) اور کم سے کم ایک آیت پڑھے۔ اور آیت کا مُفۡهِم ہونا ضروری ہے (یعنی ایسی آیت پڑھے جس میں وعدہ وعید۔ قصہ یا کوئی حکم شرعی ہو) اگر کسی نے صرف سورہ مدثر کی آیت ''ثُمَّ نَظَرَ'' پڑھی تو یہ کافی نہیں کیونکہ اس میں نہ وعدہ و وعید کا ذکر ہے اور نہ قصہ و حکم شرعی گرچہ ایک پوری آیت ہے۔ ہر جمعہ میں پہلے خطبہ کے آخر میں پوری سورہ ''ق'' پڑھنا مسنون ہے (رواہ مسلم) اور اصل سنت کے حصول کیلئے اس سورۃ کا کچھ حصہ پڑھنا بھی کافی ہے۔ اور اس کے لئے سامعین حضرات کی رضامندی ضروری

نہیں جیسے کہ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور منافقون پڑھنے کیلئے مقتدیوں کی رضا مندی ضروری نہیں (جمل ۲/۲۶) اگر خطبہ میں کوئی آیت سجدہ پڑھے اور منبر پر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تو نیچے اتر کر کرے۔ اور ممکن ہو تو اس پر ہی سجدہ کرے۔ اگر منبر پر ممکن نہ ہو مگر منبر بھی اتنا بلند ہو کہ نیچے اتر کر سجدہ کرنے تک طویل فاصلہ ہو جائے گا، تو سجدہ نہ کرے۔ کوئی خطیب آیت موعظت (نصیحت کی آیت) پڑھ کر اسے بیک وقت دو رکن (مثلاً تقوی کی وصیت اور قرأت قرآن) کی طرف سے ادا کرنے کا قصد کرے تو یہ صحیح نہیں (اس سے صرف قرأت کا رکن ادا ہو گا۔ جمل ۲/۲۶)۔ اگر خطبہ میں چند ایسی آیتیں پڑھے جس میں خطبہ کے ارکان کا ذکر ہو تو یہ صحیح نہیں کیونکہ اسے خطبہ نہیں کہا جائے گا۔ البتہ اگر کسی آیت کے ضمن میں بعض ارکان آجائیں تو حرج نہیں۔

خطبہ کا عربی میں ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں ایک بھی عربی میں خطبہ دینے والا نہ ہو تو دوسری زبان میں خطبہ دے۔ اور تمام پر بطور فرض کفایہ عربی خطبہ سیکھنا واجب ہے۔ کسی ایک نے بھی سیکھ لیا تو کافی ہے ورنہ سب گنہگار ہونگے۔ اور ایسی صورت میں انکی جمعہ صحیح نہ ہو گی بلکہ ظہر ادا کرنا پڑے گی۔

خطبہ کے شرائط

خطبہ کے چھ شرائط ھیں (۱) وقت۔ خطبہ کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے اگر خطبہ کا تھوڑا حصہ بھی وقت سے پہلے پڑھے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد جمعہ پڑھتے تھے اور زوال کے بعد خطبہ دیتے تھے۔ (رواہ البخاری)

(۲) دونوں خطبوں کا نماز سے پہلے پایا جانا۔ (۳) قیام (کھڑے رہنے پر) قدرت ہو تو دونوں میں قیام کرنا۔

حدیث: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ (رواہ مسلم، ابوداؤد) کھڑے ہونے سے عاجز ہو تو بہتر ہے کہ کسی کو نائب بنائے۔ عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر یا لیٹ کر خطبہ دے تو یہ جائز ہے اور ایسے شخص کی اقتداء بھی جائز ہے۔ خطبہ کے بعد معلوم ہو جائے کہ وہ قیام پر قادر تھا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ امام کا نماز کے بعد محدث ہونا معلوم ہو جائے۔ اور اس کا حکم پیچھے گذر چکا ہے۔

(۴) دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا

حدیث: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیتے تھے اور دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے (مسلم) اور بیٹھنے میں طمانیت واجب ہے، عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر خطبہ دے تو دونوں کے درمیان فصل کیلئے لیٹنے کی ضرورت نہیں بلکہ تھوڑی دیر سکتہ اختیار کرلے اور یہ سکتہ واجب ہے۔

(۵) حدث اصغر و اکبر سے بدن، کپڑا و مکان کا نجاست سے پاک ہونا، اور ستر عورت بھی ضروری ہے۔ دونوں خطبوں اور ان کے ارکان اور خطبہ و نماز کے درمیان تسلسل (موالات) ضروری ہے۔

دوران خطبہ خطیب کو حدث لاحق ہو جائے، تو حالت حدث میں جو کچھ پڑھا گیا وہ شمار نہ ہو گا (اور دوسرے کو نائب بنانا جائز ہے۔ نائب پڑھے ہوئے خطبہ پر بناء کرے۔ جمل ۲/۲۸) اور اگر خطیب خود پاکی حاصل کر کے واپس لوٹے تو نئے سرے سے خطبہ دینا

ضروری ہے چاہے فاصلہ طویل ہو یا کم۔

(۶) اتنی بلند آواز میں خطبہ دے کہ اسے ایسے چالیس افراد سن سکیں جنکے ذریعے جمعہ منعقد ہوتی ہے۔ اتنا آہستہ خطبہ دے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی سن نہ سکے تو یہ خطبہ شمار نہ ہوگا۔ تمام حاضرین یا بعض بہرے ہونے یا دور ہونے یا سونے کی وجہ سے خطبہ نہ سن سکیں تو خطبہ صحیح نہ ہوگا (تمام خطبہ سن رہے ہوں لیکن اس کا مفہوم سمجھ میں نہ آرہا ہو تب بھی خطبہ درست ہوگا)

تمام حضرات خطیب کی جانب متوجہ ہو کر خاموشی سے خطبہ سنیں۔ جس آدمی کو خطبہ سنائی دے اسے خاموش رہنا سنت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، کہ ایک شخص آکر پوچھنے لگا قیامت کب ہے۔ تو صحابہؓ نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ خاموش نہ رہا، تو تیسری مرتبہ کے بعد آپ ﷺ نے اس سے پوچھا "تونے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ تو اس نے کہا اللہ اور اس کے رسول کی محبت ۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو (قیامت کے دن) اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا (رواہ البیہقی، والنسائی) حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے نہ اس پر نکیر فرمائی اور نہ اس سے کہا کہ خاموش رہنا واجب ہے۔

لیکن جسے خطبہ سنائی نہ دے اسے اختیار ہے چاہے تو خاموش رہے یا ذکر وغیرہ میں مشغول رہے۔ خطیب کیلئے بھی خطبہ کے دوران خاموش رہنا سنت ہے (یعنی خطبہ کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہ کرے) ہاں اگر کوئی اہم کام مقصود ہو، مثلاً کسی اندھے کو کنویں میں گرتے ہوئے یا کسی آدمی پر بچھو وغیرہ رینگتے ہوئے دیکھے، تو اس کو بچانے کیلئے یا کسی شخص کو خیر کی بات سکھلانا یا کسی گناہ کے کام سے روکنا ہو تو بات کر سکتا ہے لیکن اشارہ پر اکتفاء کرنا مستحب ہے۔ اور جہاں تک ہو سکے بات نہ کرے۔

حدیث: (۱) اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ کے دوران ابن ابی الحقیق کے قاتلوں اور کیفیتِ قتل کے متعلق سوال کیا (رواہ البیہقی۔ تلخیص الحبیر)

(۲) آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران "سلیک غطفانی سے کلام فرمایا تھا" (مسلم) خطبہ کی ابتداء سے پہلے اور فراغت کے بعد اور دونوں کے درمیانی وقفہ میں بات کرنا جائز ہے۔ دوران خطبہ مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے بیٹھنے سے پہلے بات کرنا جائز ہے لیکن بیٹھنے کے بعد خاموش رہنا سنت ہے۔

دوران خطبہ داخل ہونے والے کا سلام کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر سلام کرے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ چھینکنے والے کی حمد کا جواب دینا سنت ہے۔ خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد جو آدمی نماز کی حالت میں نہ ہو، وہ نماز شروع نہ کرے گرچہ اس نے سنت نہ پڑھی ہو۔ اور جو نماز میں ہو وہ اپنی نماز مختصر اور ہلکی پڑھے۔

دوران خطبہ نماز شروع کرنے کی ممانعت ہر ایک کیلئے ہے، چاہے اسے خطبہ سنائی دے یا نہ سنائی دے، دوران خطبہ مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد کی مختصر دو رکعت پڑھنا مستحب ہے (یعنی صرف واجبات ادا کرے۔ قلائد ۱/۱۷۱)

حدیث: حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن دوران خطبہ آکر بیٹھ گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے سلیک کھڑے ہو جاؤ۔ اور مختصر سی دو رکعت ادا کرو" اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی خطبہ کے دوران آئے تو مختصر سی دو رکعت ادا کرے۔ (مسلم)

اگر سنت نماز نہیں پڑھی ہے تو سنت نماز پڑھے، اور تحیۃ المسجد کا ثواب سنت کے ضمن میں مل جائے گا (بہتر یہ ہے کہ دونوں کی

نیت کرے۔)(جمل)خطبہ کے آخر میں کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ نماز نہ پڑھے، تاکہ امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو جائے(بلکہ نماز شروع ہونے تک کھڑا رہے تاکہ تحیۃ المسجد کا ثواب فوت نہ ہو جائے۔)(جمل۔ ۲/ ۳۱)خطبہ کی نیت اور خطبہ کے فرض ہونے کی نیت کرنا ضروری نہیں(جمل ۲/ ۲۷)

خطبہ کے ارکان کے درمیان ترتیب ضروری نہیں، بلکہ سنت ہے۔ لہٰذا حمد سے ابتداء کرے پھر درود پڑھے، پھر تقویٰ کی وصیت پھر قرأت، اور پھر دعا کرے(فتح الوھاب)

خطبہ کی سنتیں

(۱)منبر پر خطبہ دے۔

حدیث: منبر بننے کے بعد آپ ﷺ منبر پر خطبہ دیتے تھے(متفق علیہ) منبر کا محراب کے دائیں جانب ہونا مستحب ہے۔ اور مسجد کے وسیع نہ ہونے کی صورت میں منبر کا اتنا وسیع ہونا جس سے مصلیوں کو تنگی ہو، مکروہ ہے۔ اگر منبر نہ ہو تو کسی بلند جگہ پر خطبہ دے۔(۲)امام جب منبر کے پاس پہنچے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے۔ جیسا کہ ابن عدی کی روایت میں وارد ہے۔(تلخیص ۲ /۵۷۷)(۳)منبر پر چڑھتے ہوئے جب اس سیڑھی تک پہنچے جس پر خطیب بیٹھتا ہے(جسے مستراح کہا جاتا ہے)تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر سلام کرے۔(۴)سلام کے بعد اس مستراح پر بیٹھے جیسا کہ بخاری میں ثابت ہے۔

(۵)امام کے بیٹھنے کے بعد موذن (خطیب کے سامنے کھڑے ہو کر) اذان دینا شروع کرے، اور اذان پوری ہونے تک خطیب بیٹھا رہے۔ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کیلئے صرف ایک ہی موذن اذان دے(بخاری)

(۶)خطبہ فصیح و بلیغ ہو اس میں گھٹیا اور بالکل نادر قسم کے کلمات نہ ہوں، بلکہ ایسا ہو جو جلد سمجھ میں آئے۔

(۷)خطبہ نہ بہت طویل ہو اور نہ بہت مختصر بلکہ درمیانی ہو۔

حدیث: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: آپ ﷺ کی نماز اور خطبہ متوسط ہوا کرتا تھا(مسلم)

(۸)خطبہ کے وقت قبلہ کی طرف پیٹھ اور لوگوں کی جانب چہرہ ہو۔ اور خطبہ دیتے وقت دائیں بائیں نہ مڑے بلکہ خطبہ پورا ہونے تک لوگوں کی طرف متوجہ رہے، اگر قبلہ رو ہو کر خطبہ دے تب بھی جائز ہے۔

حدیث: آپ ﷺ خطبہ کے وقت لوگوں کی طرف رخ فرماتے اور تمام لوگ آپ کی طرف اور آپ دائیں بائیں نہ مڑتے۔(تلخیص)

(۹)دونوں خطبوں کی درمیانی نشست سورہ اخلاص کے بقدر ہو۔ اور اس نشست میں کچھ تلاوت کرے۔(ابن حبان) سورہ اخلاص کی تلاوت افضل ہے۔(جمل۔ ۲/ ۳۶)

(۱۰)خطبہ دیتے وقت بائیں ہاتھ میں تلوار یا عصا وغیرہ ہو۔ اور دایاں ہاتھ منبر کے کنارے رکھے۔

حدیث: آپ ﷺ خطبہ میں کمان پر ٹیک لگایا کرتے تھے۔(رواہ ابو داود۔ تلخیص)اگر کوئی چیز نہ ملے تو دونوں ہاتھوں اور جسم کو اس طریقے پر ساکن رکھے، کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے۔ یا دونوں ہاتھ چھوڑے رکھے۔(اور اگر دایاں ہاتھ منبر کے کنارے اور بایاں ہاتھ چھوڑے رکھے تب بھی کوئی حرج نہیں۔جمل ۲/ ۳۶)اس سے مقصود یہ ہے کہ خطبہ دیتے وقت خشوع کی کیفیت ہو

اور ہاتھ سے کوئی عبث اور فضول حرکت نہ ہو۔

(۱۱)خطیب کی طرف متوجہ ہو کر دھیان و توجہ سے خطبہ سنے، کسی دوسرے چیز میں مشغول نہ ہو یہاں تک کہ لذت کے طور پر کوئی چیز پینا بھی مکروہ ہے، لیکن پیاس کی وجہ سے پینے میں کوئی حرج نہیں، نہ خطیب کیلئے اور نہ دیگر لوگوں کیلئے۔

(۱۲)خطبہ سے فراغت کے بعد منبر سے نیچے اترے اور موذن اقامت شروع کرے اور اقامت پوری ہوتے ہی جلد محراب میں پہنچ کر نماز شروع کرے۔(۱۳)خطبہ کو "اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ لِيۡ وَلَكُمۡ" سے ختم کرے۔(المجموع۔۴/۵۲۹)

(۱۴)خطیب کو خطبہ کے وقت حاضر ہونا سنت ہے۔(المجموع ۴/۵۲۹)دیگر حضرات کیلئے جلد از جلد مسجد پہنچنا سنت ہے۔(فتح الوھاب)

(۱۵)خطبہ میں آپ ﷺ کا اسم گرامی یا وصف یا آیت "ان اللہ وملائکتہ" الخ پڑھی جائے تو معمولی آواز سے درود پڑھنا مسنون ہے، آواز زیادہ بلند کرنا مکروہ ہے، نیز خطبہ میں صحابہ کرام کے اسماء پر آہستہ رضی اللہ عنہ اور دعا پر آمین کہنا مستحب ہے۔(اعانۃ ۲/۸۷)

(۱۶)جمعہ کیلئے جاتے وقت طویل راستہ سے چل کر جانا اور چھوٹے راستے سے چل کر یا سوار ہو کر واپس لوٹنا سنت ہے فتح الوھاب)

خطبہ کے مکروھات

(۱)دوسرے خطبہ میں (بالخصوص) آپ ﷺ پر درود پڑھتے وقت دائیں بائیں مڑنا۔(المجموع ۴/۵۲۹)

(۲)منبر پر چڑھتے وقت عصاء وغیرہ منبر کی سیڑھی پر زور سے رکھنا۔

(۳)خطیب کے منبر پر چڑھنے کے بعد اور بیٹھنے سے پہلے دعا کرنا۔ بعض جہلاء کا خیال ہے کہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے حالانکہ قبولیت کی گھڑی منبر پر بیٹھنے کے بعد ہوتی ہے۔

(۴)بادشاہوں کیلئے دعاء کرتے وقت انکے اوصاف میں مبالغہ کرنا۔ خطبہ میں بادشاہ کیلئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس کی تعریف میں مبالغہ نہ کیا جائے، مسلمان حاکموں کی اصلاح کیلئے دعا کرنا مستحب ہے۔

(۵)دوسرا خطبہ بہت تیزی سے پڑھنا۔

(۶)احتباء(یعنی گوٹ مار کر بیٹھنا) کیونکہ ابوداود اور ترمذی کی روایت میں آپ ﷺ نے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ منبر وسیع ہو تو (خطبہ کیلئے) اس کے دائیں جانب کھڑا ہونا مستحب ہے۔ خطیب کیلئے خطبہ کے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔

خطیب پر بیہوشی طاری ہو جائے تو کسی کو اس کا نائب بنا کر اسی خطبہ پر بناء کرنا جائز نہیں بلکہ از سر نو خطبہ دینا ضروری ہو گا۔ (جمل۔۲۲۹)

دوسرا باب۔ جن پر جمعہ فرض ھے۔

حدیث: جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ چار لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ غلام، عورت، بچہ اور مریض (ابوداود) اور دار قطنی کی روایت میں مسافر کا بھی ذکر ہے۔

جمعہ واجب ہونے کیلئے پانچ شرائط ہیں

(۱)**مکلف ہونا:** بچے، مجنون اور بیہوش پر جمعہ فرض نہیں، البتہ جو نشہ کی حالت میں ہو، اس پر دیگر نمازوں کی طرح جمعہ بھی ظہر کی صورت میں قضاء کرنا واجب ہے۔

(۲)**آزاد ہونا:** کسی بھی قسم کے غلام پر جمعہ واجب نہیں۔ آقا غلام کو جمعہ کیلئے جانے کی اجازت دے تو غلام کا جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے واجب نہیں۔

(۳)**مذکر ہونا:** عورت اور خنثیٰ مشکل پر جمعہ فرض نہیں ہے۔

(۴)**مقیم ہونا:** مسافر پر جمعہ نہیں لیکن جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے اسی طرح بچے کیلئے آنا ممکن ہو تو اس کے لئے بھی جمعہ مستحب ہے۔

(۵)**صحت مند ہونا۔** مریض پر جمعہ فرض نہیں خواہ مریض کے نہ آنے کی صورت میں تعداد کم ہونے کی وجہ سے دیگر لوگوں کی جمعہ فوت ہو جائے۔ جن پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ ان سے جمعہ منعقد نہ ہو گی۔ (یعنی مطلوبہ چالیس افراد میں ان کا شمار نہ ہو گا) بجز مریض کے (یعنی مریض مشقت برداشت کر کے جمعہ میں حاضر ہو جائے تو اس کا شمار مطلوبہ تعداد میں ہو گا)

غلام، بچے، عورت، مسافر، وغیرہ (مسجد میں آکر) جمعہ ادا کریں تو ان کی جمعہ منعقد ہو گی۔ ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں، البتہ مجنون اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ اس کا نماز پڑھنا ہی صحیح نہیں۔ مذکورہ حضرات (یعنی غلام۔ مسافر۔ وغیرہ) جمعہ کیلئے آئیں، تو انہیں جمعہ پڑھے بغیر واپس جاکر ظہر پڑھنے کی اجازت ہے، سوائے مریض کے، کہ وہ وقت شروع ہونے کے بعد آئے اور نماز کھڑی ہو چکی ہو، یا نماز کے انتظار میں زیادہ ضرر کا اندیشہ نہ ہو، تو اسے جمعہ پڑھے بغیر واپس لوٹنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر ضرر کا اندیشہ ہو، گرچہ جماعت کھڑی ہو چکی ہو مثلاً دست کی شکایت ہو، تو جمعہ پڑھنا لازم نہیں (بلکہ واپس لوٹ کر ظہر پڑھے) اور اگر وقت سے پہلے ہی جمعہ کے لئے آیا ہے تو مریض کیلئے بھی واپس لوٹنا جائز ہے (فتح الوھاب)

مذکورہ حکم میں مریضوں کے ساتھ دیگر عذر والے بھی شامل ہیں جن کا عذر مرض سے مشابہ ہے۔

اور یہ مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ مذکورہ حضرات نے ابھی جمعہ کی نماز شروع نہ کی ہو، اگر شروع کر چکے ہوں۔ تو واپس لوٹنا جائز نہیں (بلکہ جمعہ پوری کرنا ضروری ہے) جن اعذار کی وجہ سے جماعت کا چھوڑنا جائز ہے ان میں سے کوئی بھی ممکن عذر جمعہ میں پایا جائے تو جمعہ کا چھوڑنا بھی جائز ہے۔ راستے میں بہت زیادہ کیچڑ ہونے کی وجہ سے جمعہ اور جماعت چھوڑنا جائز ہے۔

مریض کی تیمارداری کیلئے اگر کوئی قریبی رشتہ دار ہو، اور مریض نزع کے عالم میں ہو، یا نزع کے عالم میں تو نہ ہو، البتہ مریض اس سے مانوس ہو (اور اس کی موجودگی اس کے لئے تسلی واطمینان کا باعث ہو) تو اُسے جمعہ چھوڑ کر مریض کے پاس رہنے کی اجازت ہے، اور اس سے مانوس نہ ہو تو جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔ تیمارداری کرنے والا کوئی اجنبی ہو تو اُسے بھی جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔ غلام، بیوی دوست۔ اور سسرالی رشتہ دار قریبی رشتہ دار کے مانند ہیں۔ مریض کی تیمارداری کیلئے کوئی نہ ہو تو امام الحرمین وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس کے پاس نہ رہنے کی صورت میں اگر اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو اس کی تیمارداری کرنے والے سے بھی جمعہ ساقط ہو گی۔ چاہے مریض قریبی ہو یا اجنبی۔ کیونکہ مسلمان کو ہلاکت سے بچانا فرض کفایہ ہے۔

مریض کو ایسی ظاہری تکلیف ہو، جس کا دور کرنا فرض کفایہ نہ ہو، تب بھی جمعہ کے ساقط ہونے کیلئے یہ ایک عذر ہے۔ (یعنی اس کی تیمارداری کرنے والے سے جمعہ ساقط ہو گی) مریض کی دیکھ بھال کیلئے آدمی تو موجود ہے، البتہ اس کی دوائیاں خریدنے یا قریب المرگ ہونے کی

وجہ سے کفن خریدنے اور قبر کھودنے میں مشغول ہو۔ جس کی وجہ سے خدمت کیلئے فارغ نہ ہو تو گویا اس کی تیار داری کیلئے کوئی نہیں ہے۔

اپاہج پر سواری ملنے کی صورت میں جمعہ واجب ہو گی، چاہے سواری ذاتی ہو یا اجرت پر ملے یا استعمال کیلئے کسی سے لے (یعنی عاریت پر لے) جبکہ سوار ہونے میں اسے کوئی دشواری بھی نہ ہو۔

نابینا کو مسجد تک لے جانے والا کوئی رہبر ملے، چاہے مفت میں ملے یا اجرت پر تو جمعہ واجب ہو گی۔ اجرت پر ملنے کی صورت میں اس کے پاس مال بھی موجود ہو۔ امام قاضی حسینؒ فرماتے ہیں کہ اگر بغیر رہبر کے لاٹھی کے ذریعے اچھی طرح چل سکتا ہو تب بھی جمعہ لازم ہو گی۔

کوئی اجنبی کسی شہر میں آکر بسے اور اسے اپنا وطن بنائے تو اس پر جمعہ واجب ہو گی، اور اس کے ذریعے منعقد بھی ہو گی۔ اور اگر اُسے اپنا وطن نہ بنائے بلکہ اقامت کی مدت کے بعد اپنے شہر لوٹنے کا ارادہ ہو، خواہ یہ مدت کم ہو یا زیادہ۔ جیسے کوئی تجارت یا علم حاصل کرنے کی غرض سے دوسرے شہر چلا گیا تو اس پر جمعہ واجب تو ہو گی، لیکن اس کے ذریعے منعقد نہ ہو گی (یعنی مطلوبہ ۴۰/ اشخاص میں اس کا شمار نہ ہو گا۔) کسی بستی میں اہل کمال (یعنی ایسے افراد جنکے ذریعہ جمعہ منعقد ہوتی ہو) میں سے چالیس افراد موجود ہوں، تو ان پر جمعہ لازم ہو گی۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی بستی میں جمعہ ادا کریں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسی دوسری بستی (یا شہر) میں جاکر ادا کریں تو اُن سے فرض تو ساقط ہو جائیگا۔ البتہ اپنی بستی میں جمعہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہونگے۔

اور کسی بستی میں اہل کمال میں سے چالیس افراد نہ ہوں، تو اس کی دو صورتیں ہونگی (۱) جس شہر یا گاؤں میں جمعہ ادا کی جارہی ہو وہاں سے ان لوگوں کو اذان سنائی دے تو (اس بستی میں جاکر) جمعہ ادا کرنا ان لوگوں پر واجب ہے۔

حدیث: جو اذان کی آواز سنے اس پر جمعہ واجب ہے۔ (رواہ ابوداود۔ فتح الوھاب)

اذان سنائی دینے کی تفصیل: ایسے وقت جبکہ سناٹا اور ہوا پرسکون ہو جمعہ کی بستی کے اس کنارہ سے جو مذکورہ بستی کی طرف ہو، کوئی بلند آواز موذن عام بلند آواز سے اذان دے، اور اس بستی کے کنارہ سے ایک معتدل سماعت کے شخص کو توجہ دینے کی صورت میں سنائی دے تو اس بستی والوں کو وہاں جمعہ کیلئے حاضر ہونا لازم ہے۔ کوئی بستی کسی پہاڑ کی چوٹی پر آباد ہو، اور بستی والوں کو بلندی پر ہونے کی وجہ سے اذان سنائی دے لیکن اگر وہی بستی کسی ہموار حصہ پر ہوتی تو انھیں اذان سنائی نہ دیتی تو اس بستی والوں پر جمعہ واجب نہیں۔ اور اگر کوئی بستی کسی پست حصہ میں آباد ہو اور پستی میں ہونے کی وجہ سے اذان کی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن بالفرض یہی بستی کسی ہموار جگہ پر ہوتی تو آواز سنائی دیتی تو اس بستی والوں پر جمعہ واجب ہو گی۔

(۲) جس شہر میں جمعہ ادا کی جارہی ہے وہاں سے اس بستی والوں کو اذان کی آواز نہ پہنچے تو ان پر جمعہ واجب نہیں۔

خیموں میں رہنے والے حضرات اگر کسی جگہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں، تو اس جگہ پر جمعہ ادا نہ کریں۔ گرچہ وہاں سے کوچ نہ کرتے ہوں۔ بلکہ اگر انہیں قریب کی بستی سے اذان کی آواز سنائی دے، تو وہاں جاکر جمعہ ادا کرنا واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ جیسا کہ کسی بستی میں چالیس سے کم افراد ہونے کی صورت میں حکم ہے۔ (یعنی ایسے افراد اپنی جگہ ظہر ادا کریں) جس بستی میں چالیس سے کم افراد ہوں، اور انہیں دو شہروں سے اذان کی آواز سنائی دے تو جمعہ کیلئے کہیں بھی جانا جائز ہے، لیکن بڑی جماعت میں شرکت افضل ہے۔ جن اعذار کی وجہ سے جمعہ ترک کرنا جائز ہے، وہ زوال کے بعد طاری ہوں، تب بھی جمعہ ترک کرنا جائز ہے بجز سفر کے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جمعہ کے دن زوال کے بعد سفر کا حکم: اگر ساتھیوں سے جدا ہونے کا یا پیچھے رہنے کی صورت میں کسی ضرر کا اندیشہ

نہ ہو اور (سفر کی صورت میں) دوران راہ کسی جگہ جمعہ ملنے کا امکان بھی نہ ہو تو زوال کے بعد سفر جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ فجر اور زوال کے درمیان سفر کرنے کی صورت میں اگر کسی جگہ جمعہ ملنے کا امکان نہ ہو تو سفر حرام ہے چاہے مباح سفر ہو۔ یا نیکی کا سفر ہو (مثلاً حج عمرہ وغیرہ) ورنہ جائز ہے۔ (فتح الوھاب) فجر سے پہلے سفر کرنا جائز ہے۔ (المجموع۔ ۴/۴۹۹)

جس صورت میں زوال کے بعد سفر کرنا حرام ہے کسی نے سفر کیا تو وہ گنہگار ہو گا اور اُسے جمعہ فوت ہونے تک سفر کی رخصت پر عمل کرنا جائز نہیں، بلکہ جمعہ فوت ہونے کے بعد سے اس کے سفر کی ابتداء ہو گی۔ جن معذورین کو جمعہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ انکی دو قسمیں ہیں

(۱) جمعہ فوت ہونے سے پہلے جس کے عذر کے زائل ہونے کی امید ہو۔ مثلاً ایسا مریض جس کے مرض میں تخفیف کی امید ہو، تو ایسے شخص کیلئے ظہر کو جمعہ فوت ہونے تک موٴخر کرنا مستحب ہے، ممکن ہے کہ وہ عذر ختم ہو جائے اور جمعہ ادا کرنے کا موقع مل جائے امام کے دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد جمعہ فوت ہو جاتی ہے۔

(۲) جس کے عذر کے ختم ہونے کی امید نہ ہو، جیسے کہ عورت اور اپاہج آدمی۔ ایسے لوگوں کیلئے ظہر اول وقت پڑھنا افضل ہے۔

معذورین کسی جگہ جمع ہوں، تو باجماعت ظہر ادا کرنا مستحب ہے۔ معذورین کا عذر مخفی ہو، تو مخفی طور پر ظہر باجماعت ادا کرنا مستحب ہے، تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اور عذر مخفی نہ ہو تو سب کے سامنے جماعت بنانے میں حرج نہیں۔ معذور جمعہ فوت ہونے سے قبل ظہر ادا کرے۔ پھر نماز کے بعد اس کا عذر ختم ہو جائے تو اب اسے جمعہ پڑھنا لازم نہیں، گرچہ اسے جمعہ مل سکتی ہو۔ البتہ خنثیٰ مشکل اس سے مستثنیٰ ہے، ظہر ادا کرنے کے بعد مرد ثابت ہو۔ اور جمعہ مل سکتی ہو تو اس پر لازم ہے۔ معذورین کیلئے ظہر ادا کرنے کے بعد جمعہ کیلئے آنا مستحب ہے آنے کے بعد جمعہ ادا کریں تو فرض انکی ظہر ہی شمار ہو گی، اور جمعہ کی نماز نفل ہو گی۔ دوران ظہر عذر ختم ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی۔ بلکہ نماز جاری رکھے۔ بلا عذر جمعہ فوت ہونے سے پہلے ظہر ادا کرنا صحیح نہیں (کیونکہ جمعہ کے دن اصلی فرض جمعہ کی نماز ہے نہ کہ ظہر۔) شہر کے تمام یا بعض افراد جمعہ ترک کر کے ظہر ادا کریں تو گنہگار ہونگے۔ اور ظہر صحیح نہ ہو گی کیونکہ جمعہ کا فرض ذمہ میں باقی ہے۔ اور ظہر ادا کی ہے۔ لہٰذا انہیں جمعہ کیلئے آنا واجب ہے اگر آکر جمعہ ادا کریں تو ٹھیک اور جمعہ فوت ہو گئی تو ظہر کی قضاء کریں۔ شہر کے تمام افراد جمعہ کے بجائے ظہر پڑھیں، تو جمعہ کی نماز وقت نکل جانے سے یا اتنا تنگ ہونے سے جس میں صرف دو رکعت ادا کرنے کی گنجائش باقی رہے فوت ہو گی۔

تیسرا باب۔ جمعہ ادا کرنے کی کیفیت کے بیان میں

جمعہ کی نماز دو رکعت ھیں۔

حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جمعہ کی نماز دو رکعت ہیں (رواہ النسائی) اور ارکان میں دیگر نمازوں کی طرح ہیں۔ البتہ چند مستحب امور کی وجہ سے دیگر نمازوں سے ممتاز ہے۔ مستحب امور: (۱) جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) "تم میں سے کوئی جمعہ کیلئے آئے تو غسل کرے۔" (متفق علیہ)

(۲) "جو شخص جمعہ کے دن وضو کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ اور غسل کرے تو غسل کرنا افضل ہے۔" (رواہ الترمذی، وقال حدیث، حسن) جمعہ کے غسل کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔ جمعہ کیلئے جاتے وقت غسل کرنا مستحب ہے۔ اور یہ غسل جمعہ میں شریک ہونے والے کیلئے مستحب ہے، چاہے اس پر جمعہ واجب ہو یا نہ ہو۔

غسل کے بعد حدث اصغر پیش آجائے تو غسل باطل نہ ہو گا، بلکہ صرف وضو کرے، جمعہ کا غسل کرنے کے بعد جماع یا کسی اور وجہ سے جنبی ہو جائے، تو جمعہ کا غسل باطل نہ ہو گا، بلکہ صرف جنابت کا غسل کرے۔

کسی پر جمعہ کے دن جنابت وغیرہ کی وجہ سے غسل واجب ہو جائے تو جنابت اور جمعہ کیلئے ایک غسل کرنا کافی ہے، الگ الگ دو غسل کی ضرورت نہیں۔ البتہ نیت دونوں غسلوں کی کرنا ضروری ہے۔ صرف جمعہ کے غسل کی نیت کرے جنابت کی نہ کرے، تو جنابت کا غسل حاصل نہ ہو گا، اور اگر صرف جنابت کی نیت کرے، تو جمعہ کا غسل حاصل نہ ہو گا (المجموع ۴/ ۵۳۴) کوئی شخص وضو کے بعد پانی ختم ہونے کی وجہ سے، یا بدن پر پھوڑے وغیرہ کی وجہ سے غسل سے عاجز ہو تو تیمم کرے، اس سے غسل کی فضیلت حاصل ہو گی۔ کسی نے جمعہ کیلئے صبح صادق سے پہلے غسل کیا تو صحیح نہیں۔ (المجموع۔ ۴/۵۳۶)

مسنون غسل: (۱) میت کو غسل دینے والے کیلئے میت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) "جو میت کو غسل دے اسے غسل کرنا چاہئے"۔ (رواہ الترمذی)

(۲) "میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل کرنا ضروری نہیں"۔ (رواہ الحاکم)

(۲) کافر کا اسلام لانے کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے قیس بن عاصم اور ثمامہ بن اثال کو اسلام لانے کے بعد غسل کا حکم دیا۔ (رواہ ابن حبان و ابن خزیمہ) اور دیگر بہت سارے حضرات کو اسلام لانے کے بعد غسل کا حکم نہیں دیا۔ اگر کافر کو حالت کفر میں ایسا کوئی سبب پیش آیا ہو جس سے غسل واجب ہوتا ہو، مثلاً جنابت وغیرہ تو اسے اسلام لانے کے بعد غسل کرنا لازم ہے۔

(۳) بے ہوش اور مجنون کو افاقہ کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

(۴) حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد غسل کرنا سنت ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، "آپ ﷺ چار حالتوں میں غسل کرتے تھے۔" جنابت کی وجہ سے، جمعہ کے دن، پچھنے لگوانے کی وجہ سے اور میت کو غسل دینے کے بعد۔ (رواہ ابوداود، ابن خزیمہ، والحاکم) (تلخیص الحبیر)

(۵) ہر اجتماع (لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ) میں شرکت کیلئے نیز بدن میں بدبو پیدا ہو تو غسل کرنا سنت ہے۔

تمام مسنون غسلوں میں جمعہ اور غاسلِ میت کے غسل کی زیادہ تاکید آئی ہے۔ اور ان دونوں میں جمعہ کا غسل زیادہ مؤکد ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بکثرت صحیح احادیث وارد ہیں (اور بعض ائمہ نے اُسے واجب قرار دیا ہے)

(۲) جمعہ کے دن امام کے علاوہ دیگر لوگوں کیلئے جامع مسجد جلدی جانا مستحب ہے، اور پہلی گھڑی میں جانا افضل ہے۔ پھر دوسری میں پھر تیسری میں اسی طرح بالترتیب اور ان گھڑیوں کا شمار طلوع فجر سے کیا جائے گا۔ اور ان گھڑیوں سے درجات کی ترتیب مراد ہے۔ پہلے گھڑی میں آنے والے کیلئے ایک اونٹ قربان کرنے کا، دوسری میں آنے والے کیلئے ایک گائے یا بیل قربانی کرنے کا، تیسری میں آنے والے کیلئے ایک دنبہ کا، چوتھی میں آنے والے کیلئے ایک مرغی صدقہ کرنے کا، اور پانچویں میں آنے والے کیلئے ایک انڈے کا ثواب ملتا ہے۔

حدیث: جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے پہلی ساعت (گھڑی) میں (مسجد کے لئے) روانہ ہوا گویا اس نے اونٹ کی قربانی پیش کی، جو دوسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے بیل کی قربانی پیش کی، جو تیسری ساعت میں روانہ ہوا گویا اس نے سینگ والے مینڈھے کی قربانی کی۔ جو چوتھی ساعت میں روانہ ہوا گویا مرغ کی قربانی کی، جو پانچویں ساعت میں روانہ ہوا گویا ایک انڈے کے ذریعے تقرب

حاصل کیا پھر جب امام (خطبہ کے لئے) آجائے تو ملائکہ ذکر (خطبہ) سننے کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں۔(بخاری و مسلم) ایک ہی گھڑی میں پہلے آنے والے کو بعد میں آنے والے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت حاصل ہو گی۔ مثلاً ایک شخص گھڑی کے ابتداء میں آیا، اور دوسرا اسی گھڑی کے آخر میں، تو دونوں اصل اونٹ یا گائے بیل وغیرہ کے ثواب میں برابر ہونگے۔ البتہ ابتداء میں آنے والے کو آخر میں آنے والے کے مقابلے میں ایک کامل جانور کا ثواب ملے گا۔ اور درمیان میں آنے والے کو متوسط جانور کا ثواب ملے گا (المجموع۔ ۴ / ۵۴۱) امام کیلئے خطبہ کے وقت آنا مسنون ہے۔(فتح الوھاب)

(۳) جمعہ کے دن بال کٹوانا، ناخن تراشنا، مسواک کرنا، بدبو زائل کرنا، تیل لگانا، خوشبو لگانا، اچھے کپڑے پہننا سنت ہے۔ سفید کپڑے پہننا افضل ہے۔

احادیث: (۱) جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر جمعہ کیلئے آئے اور لوگوں کی گردنوں کو نہ پھاندے (پھلانگے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر جو نماز فرض کی ہے اُسے ادا کرے، اور امام کے نماز سے فارغ ہونے تک خاموش رہے تو یہ اس کے لئے اس جمعہ اور سابقہ جمعہ کے درمیان (گناہوں کیلئے) کفارہ ہو گا۔(احمد۔ابوداود۔ابن حبان۔والحاکم)

(۲) آپ ﷺ جمعہ کے دن ناخن تراشتے اور مونچھ کترتے۔(رواہ البزار) امام کے لئے دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ زینت اختیار کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح عمامہ باندھنا بھی مستحب ہے۔ وقت تنگ نہ ہو تو جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے سکون و وقار سے چلے، دوڑ کر نہ جائے۔

حدیث: (۱) ''جب تم نماز کے لئے آؤ تو چل کر آؤ، دوڑ کر نہ آؤ'' (متفق علیہ)

جمعہ، عید، جنازہ، اور مریض کی عیادت کے لئے پیدل جانا مستحب ہے۔

(۲) ''آپ ﷺ عید اور جنازہ میں سوار ہو کر نہیں جاتے تھے (تلخیص) البتہ کوئی عذر ہو تو سوار ہو کر جانے میں کوئی حرج نہیں، اور جب سوار ہو کر جائے تو سواری کو سکون کے ساتھ چلائے۔

(۴) جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ **منافقون** یا پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں **سورہ غاشیہ** پڑھنا سنت ہے۔

حدیث: (۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''آپ ﷺ جمعہ کی پہلی رکعت میں **سورہ جمعہ** اور دوسری میں ''**سورہ منافقون**'' پڑھتے تھے۔'' (مسلم)

(۲) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ ﷺ عیدین اور جمعہ میں ''**سبح اسم ربک الاعلی** اور **ھل اتاک حدیث الغاشیہ**'' پڑھتے تھے۔(مسلم) اگر پہلی رکعت میں سورہ جمعہ پڑھنا بھول جائے یا عمداً یا لاعلمی کی وجہ سے ترک کرے۔ تو دوسری رکعت میں سورہ منافقون کے ساتھ پڑھے۔ اگر پہلی رکعت میں سورہ منافقون پڑھے تو دوسری میں سورہ جمعہ پڑھے۔ اور سورہ منافقون لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

جمعہ کے وقت مسجد میں داخل ہونے والا لوگوں کی گردنوں کو پھاندتے ہوئے آگے نہ بڑھے۔

حدیث: آپ ﷺ نے جمعہ کے دن ایک شخص کو گردنوں کو پھاندتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اسے فرمایا کہ بیٹھ جا۔ تو نے تکلیف دی اور تاخیر کی۔(ابن حبان۔حاکم وصححاہ)

امام کو آگے جانے کے لئے راستہ نہ ہو تو گردنوں کو پھاند کر جانے میں کوئی حرج نہیں۔ مسجد میں داخل ہونے والے کیلئے پیچھے بیٹھنے کے واسطے جگہ نہ ہو اور آگے جگہ خالی ہو اور وہاں تک جانے کیلئے گردنوں کو پھاند کر جانے کی ضرورت پڑے تو جا سکتا ہے۔ مسجد میں کسی آدمی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھنا جائز نہیں۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں نہ بیٹھے بلکہ کہے، جگہ کشادہ کرو۔ (متفق علیہ)

کسی شخص کو جگہ پکڑنے کیلئے بھیجنا جائز ہے۔ اور آنے کے بعد اسے اٹھانا جائز ہے۔ کسی آدمی کے بیٹھنے کے واسطے کپڑا بچھایا گیا تو دوسرے کیلئے اس پر بیٹھنا جائز نہیں، البتہ اس کپڑے کو ہٹا کر اس جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ خطبہ سے پہلے آنے والے کیلئے ذکر، قرآن کی تلاوت اور درود شریف پڑھنے میں مشغول رہنا مستحب ہے، جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں کثرت سے درود پڑھنا مستحب ہے نیز جمعہ کے دن کثرت سے دعا کرے، شاید دعا کے قبولیت کی گھڑی حاصل ہو جائے۔ قبولیت کی گھڑی کے سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔ البتہ راجح قول وہ ہے جو صحیح مسلم سے ثابت ہے کہ قبولیت کی گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز پوری ہونے تک ہے۔ جمعہ کے دن اور رات میں سورہ کہف پڑھنا مستحب ہے، جمعہ کی نماز کے بعد متصلاً کوئی نماز نہ پڑھے بلکہ وہاں سے ہٹ کر پڑھے، یا گفتگو کے ذریعہ فصل کرے۔ جمعہ کے دن زوال کے بعد اور نماز سے پہلے خرید و فروخت کرنا مکروہ ہے۔ امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد اذان شروع ہوتے ہی خرید و فروخت کرنا حرام ہے۔ اگر دو آدمی خرید و فروخت کا معاملہ کریں اور ان میں سے ایک پر جمعہ فرض ہو اور دوسرے پر نہ ہو تو دونوں گنہگار ہونگے۔ زوال سے پہلے بیع کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ بیع کے حرام ہونے کے باوجود کسی نے بیع کی تو اس کی بیع صحیح ہو گی۔ بیع کے علاوہ دیگر پیشے اور معاملات وغیرہ جو جمعہ کی حاضری سے روکنے یا تاخیر کا باعث ہو وہ بھی بیع کی طرح حرام ہیں۔ کسی نے امام کے منبر پر بیٹھنے سے پہلے اذان دی تو بیع حرام نہ ہو گی۔ (مسجد سے دوری کی وجہ سے) جسے جمعہ پانے کیلئے خطبہ کی اذان سے قبل یا زوال سے قبل ہی مسجد کی طرف بڑھنا ضروری ہو، اس کیلئے اسی وقت سے بیع حرام ہے۔ (جمل)

اذان سن کر جمعہ کے ارادہ سے نکلے اور راستے میں چلتے چلتے بیع کرے یا جامع مسجد میں بیٹھ کر بیع کرے تو یہ حرام نہیں کیونکہ مقصود یہ ہے کہ جمعہ کے لئے تاخیر نہ ہو، البتہ جمعہ اور دیگر ایام میں مسجد میں بیع کرنا مکروہ ہے۔ جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے جاتے وقت یا ان نمازوں کے انتظار کے وقت انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے۔ (یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل نہ کرے) اور نہ کوئی فضول حرکت کرے۔

حدیث: حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! تم میں سے کوئی شخص اچھی طرح وضو کر کے (نماز کے ارادہ سے) مسجد کی طرف نکلے، تو اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک نہ کرے، کیونکہ وہ نماز کے حکم میں ہے۔ (رواہ الترمذی)

کوئی جامع مسجد میں امام کی جگہ یا لوگوں کے راستے میں بیٹھے تو اسے اٹھنے کا حکم دے۔ کوئی لوگوں کی طرف رخ کر کے (اور قبلہ کی جانب پیٹھ کر کے) بیٹھے اور جگہ بھی تنگ ہو تو اسے وہاں سے دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم دے۔ جگہ تنگ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ خطیب جب سورہ احزاب کی آیت "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" پڑھے تو سننے والوں کیلئے اتنی بلند آواز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا جائز ہے، جسے قریب کا آدمی سن سکے۔ (بہت زور سے پڑھنا بدعت ہے۔) (جمل) جمعہ کے دن مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھنا یا پاؤں پھیلا کر بیٹھنا مکروہ ہے، البتہ کوئی بیمار ہو تو حرج نہیں، لیکن اس صورت میں ایسی جگہ بیٹھنا مستحب ہے جس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

(المجموع۔ ۵۴۸/۴) بوڑھی عورتوں کو اگر ان کے شوہر اجازت دیں، تو جمعہ کے لئے آنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن جمعہ میں شرکت کے لئے خوشبو اور بناؤ سنگار جیسے امور سے گریز کریں۔

صلاۃ الخوف (خوف کی حالت میں نماز) (من فتح الوھاب)

آیت: وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (سورہ نساء ۱۰۲)

ترجمہ: اور جب آپؐ ان میں تشریف رکھتے ہوں (اور اسی طرح آپ کے بعد جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں۔ (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جاویں گے تو کوئی دشمن موقع پاکر حملہ کر بیٹھے گا) تو یوں چاہے کہ ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑے ہو جاویں اور وہ لوگ ہتھیار لے لیں۔ پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے) تمہارے پیچھے ہو جاویں اور دوسرا گروہ جنھوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی آجاویں اور آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں صلوۃ الخوف کے ۱۶ انواع اور طریقے سامنے آتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے ان میں سے چار کو اختیار کیا ہے (کیونکہ یہ طریقے عام نمازوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں تغیر کم ہے۔ اور ایک طریقے کا ذکر قرآن میں بھی ہے، لہٰذا صحیح روایت سے دوسرے کسی طریقے کی کیفیت معلوم ہو تو اس پر بھی عمل کر سکتا ہے) (تحفہ مع الشروانی ۴۳۰/۳)

(۱) **عُسفان کی نماز:** دشمن قبلہ کی طرف ہو، اور مسلمانوں میں اتنی کثرت ہو کہ نصف حضرات تنہا دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور دونوں میں کچھ حائل نہ ہو، تو امام تما مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تمام کو ایک ساتھ نماز پڑھائے۔ اعتدال کے بعد ایک صف (ایک حصہ) امام کے ساتھ دونوں سجدہ کرے اور دوسری صف اعتدال ہی میں پہرہ دیتی رہے، پہلی صف سجدہ سے اٹھے تو دوسری صف سجدہ کر کے امام کے ساتھ شامل ہو، اور کثرت افعال کے بغیر یہ صف آگے بڑھے اور پہلی صف پیچھے ہٹے، دوسری رکعت میں اب جو پہلی صف ہے وہ سجدہ کرے اور دوسری صف پہرہ دے جب پہلی صف تشہد کے لئے بیٹھے تو یہ لوگ سجدہ کریں اور تشہد پڑھ کر امام سب کے ساتھ سلام پھیرے، یہ نوع مسلم کی حدیث میں ہے۔ اگر دونوں رکعت میں ایک ہی فرقہ (گروہ) پہرہ دے اور بقیہ امام کی متابعت کریں تو یہ جائز ہے۔

(۲) **بَطن نَخل کی نماز:** اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، دشمن قبلہ کی سمت نہ ہو، یا قبلہ کی سمت ہو لیکن درمیان میں کچھ حائل ہو، تو امام لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں گروہ کو الگ الگ ایک ایک مرتبہ نماز پڑھائے، اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ پر رہے، دوسری نماز امام کے لئے نفل ہوگی، یہ طریقہ غیر خوف میں بھی جائز ہے، لیکنمسلمانوں کی کثرت اور دشمنوں کی قلت اور دوران نماز اچانک حملہ آور ہونے کا خدشہ ہو تو سنت ہے۔

(۳) **ذاتُ الرِّقاع کی نماز:** یہ طریقہ بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ دشمن قبلہ کی طرف نہ ہو یا درمیان میں کچھ حائل ہو تو ایک گروہ دشمن کے مقابلہ پر رہے اور دوسرے کو امام دو رکعت کی نماز میں ایک رکعت پڑھائے۔ پھر امام کے دوسرے رکعت کے قیام میں یہ گروہ امام سے جدا ہونے کی نیت کر کے اپنی ایک رکعت تنہا مکمل کر کے دشمن کے مقابلہ میں چلا جائے، امام قیام میں دوسرے گروہ کا منتظر رہے اور اس کے آنے پر اس کے ساتھ اپنی دوسری رکعت پڑھ کر تشہد میں اس کا انتظار کرے اور وہ گروہ اپنی دوسری رکعت مکمل

کر کے امام کے ساتھ تشہد میں مل جائے، پھر امام ان کے ساتھ سلام پھیرے، تاکہ اس گروہ کو امام کے ساتھ سلام کی فضیلت حاصل ہو۔ جیسا کہ پہلے گروہ کو اس کے ساتھ تکبیر تحریمہ کی فضیلت حاصل ہوئی، قیام اور تشہد کے انتظار میں امام تلاوت و تشہد پڑھنے میں مصروف رہے۔ اسطرح جمعہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بشر طیکہ ہر رکعت میں ایسے چالیس افراد ہوں جنھوں نے خطبہ سنا ہو، لیکن دوسری رکعت کے دوران تعداد کم ہو جائے تو حرج نہیں۔ جمعہ کی نماز عُسفان کے طرز پر بدرجہ اولی جائز ہے۔ تین رکعت کی نماز ہو تو پہلے گروہ کو دو رکعت اور دوسرے کو ایک رکعت پڑھانا افضل ہے۔ اگر چہ اس کے برعکس بھی (یعنی پہلے کو ایک اور دوسرے کو دو) جائز ہے۔ (کیونکہ دوسری صورت میں دوسرے گروہ کے لئے پہلے رکعت میں تشہد کا اضافہ تطویل کا سبب بنے گا اور پہلی صورت میں اس سے سلامتی ہے) پہلی صورت میں پہلے گروہ کے نماز سے فارغ ہو کر دوسرے کے آمد کا انتظار تشہد میں یا تیسرے قیام میں کرے۔ قیام میں انتظار افضل ہے کیونکہ قیام محل تطویل ہے۔ چار رکعت کی نماز میں دونوں فریق کو دو دو رکعت پڑھائے اور دونوں کے ساتھ ایک ایک تشہد پڑھے۔ اور دوسرے فریق کا انتظار تشہد کی نشست میں کرے، یا تیسرے قیام میں اور یہ افضل ہے، جیساکہ گذرا۔ اگر تین رکعت کی نماز میں تین اور چار رکعت کی نماز میں چار فرقوں میں ان کو تقسیم کر کے ہر ایک فریق کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھتا رہے تو یہ بھی جائز ہے، گرچہ بلا حاجت اس طرح کرے۔ پہلے فرقے ایک ایک رکعت پڑھ کر جدا ہوں اور اپنی نماز مکمل کریں۔ اور امام دوسرے فرقے کا انتظار کرتا رہے۔ اور آخری فریق کا انتظار تشہد میں کرے تاکہ ان کے ساتھ سلام پھیرے۔

ذات الرقاع والی نماز کی کیفیتیں عسفان اور بطن نخلہ والی نماز سے افضل ہے، کیونکہ اس کی صحت پر فی الجملہ اجماع ہے، بخلاف ان دونوں کے اور مسلمانوں کی کثرت کے وقت یہ طریقہ مسنون ہے۔ ذات الرقاع والی نماز حالتِ امن میں بھی پہلے فرقے کے لئے جائز ہے۔ دوسرا فرقہ اگر اپنی نماز کے تکمیل کے وقت جدائی کی نیت کرے تو اس کے لئے بھی جائز ہے۔

دو رکعت کی نماز ذات الرقاع کے طرز پر ہو تو ہر فریق کا سہو امام اٹھائے گا۔ کیونکہ وہ حساً یا حکماً مقتدی ہیں۔ سوائے پہلے فریق کے دوسری رکعت کے سہو کے، کیونکہ وہ امام سے جدا ہو چکے۔ پہلی رکعت میں امام کا سہو سب کو لاحق ہو گا، لہٰذا امام سجدہ نہ بھی کرے تو سب کریں گے دوسری رکعت میں امام کا سہو دوسرے فریق کو لاحق ہو گا نہ کہ پہلے فریق کو، کیونکہ وہ سہو سے قبل امام سے جدا ہو چکے۔ اسی اعتبار سے تین اور چار رکعت کی نماز کے سہو کا اندازہ کر لو۔

صلوٰۃ الخوف کے مذکورہ تینوں طریقوں میں احتیاطاً نمازی کو ایسا ہتھیار ساتھ رکھنا سنت ہے، جو نماز کی صحت کے منافی نہ ہو (جیسے نجس وغیرہ نہ ہو) اور اس سے کسی اور کو تکلیف نہ ہو، اور اس کے ترک میں بظاہر خطرہ نہ ہو، مراد ایسے ہتھیار ہیں جو قتل کرتے ہیں جیسے نیزہ، تلوار، چھری کمان و تیر، نہ کہ وہ جو دفاع میں مستعمل ہوں جیسے زرہ اور ڈھال۔ درمیانِ صف نیزہ جیسی ایذا رساں چیز رکھنا مکروہ ہے، بلکہ دوسرے کو لگنے کا غالب گمان ہو تو حرام ہے۔ جس ہتھیار کے ترک کرنے میں بظاہر خطرہ موجود ہو اسے ساتھ رکھنا واجب ہے۔ سامنے رکھ کر وقت پر ہاتھ بڑھا کر فوراً اٹھا سکتا ہو، جیسا کہ ساتھ ہونے کی صورت میں، تو اس طرح سامنے رکھنا بھی کافی ہے۔ بلکہ ساتھ رکھنے سے نماز صحیح نہ ہوتی ہو تو سامنے قریب ہی رکھنا چاہئے۔

(۴) **شدت خوف کی حالت میں نماز:** شدت خوف کی صورت میں ہر کوئی اپنے طور پر جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔ چاہے گھمسان کی لڑائی جاری ہو اور اسے چھوڑ کر ہٹ ہی نہ سکتے ہوں، یا یہ بات تو نہ ہو لیکن وہاں سے ہٹنے یا تقسیم کی صورت میں اچانک دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو۔ سوار یا پیدل جیسے ممکن ہو نماز پڑھے، رکوع سجدہ نہ کر سکتا ہو تو اشارے سے ادا کرے، لیکن نماز کو وقت

سے موئخر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالاً أَوْ رُكْبَاناً" (البقرہ ۲۳۹) (پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ (پیدل) پڑھ لو یا سوار)۔ دشمن کی وجہ سے قبلہ سے رخ ہٹنے میں حرج نہیں۔ لیکن سواری کے اڑیل پن سے زیادہ دیر بغیر قبلہ رو گذرے تو صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا قبلہ رو ہو کر یا بغیر قبلہ رو (جس طرح بن پڑے نماز پڑھو) امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپس میں بعض کی بعض اقتداء کر سکتے ہیں، امام و مقتدی کا رخ الگ الگ بھی ہو تو حرج نہیں جیسا کہ کعبۃ اللہ کے چاروں طرف نماز میں ہوتا ہے۔ حالت امن کی طرح یہاں بھی جماعت افضل ہے۔ حاجت کی وجہ سے عمل کثیر میں معذور سمجھا جائے گا، جیسے مسلسل نیزہ بازی اور تلوار بازی۔ چلّانے میں معذور نہ ہو گا کہ اس کی حاجت نہیں۔ ہتھیار میں غیر معاف نجاست ہو تو احتیاج کی صورت میں اُسے اٹھا سکتا ہے۔ البتہ یہ عذر نادر ہے۔ اس لئے بعد میں اس نماز کی قضاء کر لے، احتیاج نہ رہے تو اسے ڈال دے۔

درج ذیل صورتوں میں بھی خوف پایا جاتا ہے اسلئے مسافر ہو یا مقیم ان صورتوں میں صلاۃ الخوف کی اجازت ہو گی۔

(۱) ہر مباح قتال جیسے عادل کا باغی کے ساتھ قتال (۲) صاحب مال کا اس آدمی سے قتال جو ظلماً اس کا مال لینا چاہے (۳) آگ، سیلاب یا درندہ سے بچنے کے لئے بھاگنا اور دوڑنا جبکہ کوئی اور بچاؤ کا راستہ نہ ہو (۴) قرض خواہ پیچھے لگے، اور مقروض تنگدست ہو، اگر اس نے پکڑ لیا تو قید میں ڈال دیگا۔ نہ وہ اس کی تنگدستی کو تسلیم کر رہا ہے اور نہ اس کے پاس پیش کرنے کیلئے گواہ ہیں، لہٰذا اس کے ہاتھ سے بچنے کے لئے بھاگ رہا ہے۔

عشاء کو رک کر پڑھنے کی صورت میں حاجی کو وقوف عرفہ کے فوت ہونے کی وجہ سے حج فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ سفر کرتے ہوئے عشاء نہیں پڑھ سکتا، بلکہ عشاء کو بعد میں قضاء کر لے، کیونکہ نماز کی قضاء حج کی قضاء کے بہ نسبت آسان ہے۔

دور سے کچھ وجود نظر آیا اور اسے دشمن سمجھ کر یا دشمن کو اپنے سے دگنا سے زائد سمجھ کر صلاۃ الخوف پڑھی، بعد میں اس کے برعکس ظاہر ہوا، مثلاً وجود جانور کا تھا اور دشمن صرف دوگنا تھے، تو اس نماز کو قضاء کریں، کیونکہ جس گمان کی غلطی بالکل واضح ہو جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

فصل۔ لباس وغیرہ کے متعلق

مرد اور خنثی پر خالص ریشم کا کپڑا اور ایسے کپڑا جس میں ریشم کی مقدار وزن کے اعتبار سے زائد ہو حرام ہے۔ صحیحین کی روایت میں مردوں کو اس سے روکا گیا ہے، احتیاطاً خنثی پر بھی وہی حکم لگایا گیا۔ اکثر حصہ دوسرا کپڑا (غیر ریشم) ہو یا دونوں برابر ہو تو استعمال جائز ہے، کیونکہ اسے ریشمی کپڑا نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی مجبوری ہو جیسے سخت اور ضرر رساں گرمی و سردی اور اچانک جنگ کا آجانا، اور دوسرا کوئی کپڑا میسر نہ ہو، تو یہ حرام نہ ہو گا۔ اسی طرح حاجت جیسے خارش ہو اور دوسرا کپڑا تکلیف دہ ہو یا جوں کی کثرت ہو تو یہ جائز ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف اور زبیر بن العوام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خارش کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور ان حضرات نے جوں کی شکایت کی تو ریشمی قمیص کی اجازت دی۔ سفر و حضر میں یہی تفصیل ہو گی۔ جنگ جاری ہو اور ہتھیار کے دفاع میں ریشم جیسی کوئی چیز دستیاب نہ ہو تو ریشم کی اجازت ہو گی۔ ولی اور ذمہ دار کو اجازت ہے کہ بچہ اور پاگل کو ریشم پہنائے، کیونکہ وہ غیر مکلف ہے۔ چار انگلی کے برابر ریشم کی نقش و نگاری یا پیوند لگا ہو تو یہ حلال ہے۔ (مسلم) یا عادت کے مطابق کپڑے کے کنارے ریشم کا سنجاف (گوٹ) لگایا گیا ہو، تو یہ جائز ہے (مسلم) عورت کو ریشم مطلقاً جائز ہے۔ حتیٰ کہ اس کا بستر وغیرہ بھی کیونکہ حدیث میں ہے۔ "سونا اور ریشم میری امت کے

عورتوں کو حلال ہے اور مردوں پر حرام"۔(قال الترمذی حسن صحیح)

نجس اور متنجس تیل (جو پاک تیل نجس ہوا ہو) کو چراغ میں جلانا جائز ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے اس چوہے کہ متعلق پوچھا گیا جو گھی میں گرا تھا (اور مر گیا تھا) تو آپ ﷺ نے جواب دیا۔ "اگر گھی جامد (جماہوا) ہو تو چوہا اور اطراف کا گھی پھینک دو (بقیہ استعمال کرو) اور اگر مائع (سیال اور پگھلا ہوا) ہو تو اسے چراغ میں استعمال کرو، یا اس سے نفع اٹھاو (رواہ الطحاوی و قال رجالہ ثقات) چراغ سے مسجد ملوث ہو تو ایسا تیل مسجد میں جلانا ممنوع ہو گا، اسی طرح دوسرے سے کرایہ یا عاریت پر لئے ہوئے مکان میں بھی منع ہو گا۔ کتے یا خنزیر کا تیل استعمال کرنا اس کے نجاست کی شدت کی وجہ سے مطلقاً منع ہے۔

ایسا متنجس (نجاست لگا ہوا) کپڑا جو تر نہ ہو پہننا جائز ہے۔ کیونکہ یہ نجاست عارضی اور وقتی اور بسہولت زائل ہونے والی ہے، لیکن نماز میں اس کی اجازت نہ ہوگی۔ نجس چیز جیسے مردار کی کھال (جسے دباغت نہ دی گئی ہو) پہننا جائز نہیں ہے، کیونکہ عبادت کی پابندی کے اعتبار سے انسان کو نجاست سے دوری اور اجتناب کا تعبدی حکم ہے۔ البتہ بالکل مجبوری کی صورت میں اجازت ہو گی۔

صلوٰۃ العیدین کا بیان (دونوں عید کی نماز)

عیدین کی مشروعیت: اللہ تعالیٰ اپنے کلام مجید میں ارشاد فرماتے ہیں۔ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (اپنے رب کیلئے نماز ادا کرو اور قربانی کرو) اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں صلوٰۃ سے عید الاضحیٰ کی نماز مراد ہے (الجامع لاحکام القرآن ۱۴۸/۲۰)

حدیث: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ جاتے اور سب سے پہلے نماز پڑھاتے پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انھیں وعظ و نصیحت کرتے جبکہ تمام حضرات صف میں بیٹھے ہوئے رہتے (متفق علیہ)

عیدین کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے، اور ۲ سنہ ھ میں مشروع ہوئی، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے سب سے پہلے ۲ سنہ ھ میں عید الفطر کی نماز ادا کی (حاشیۃ الجمل ۹۲/۲)

عید کی نماز کا حکم: عید کی نماز سنت موکدہ ہے اگر شہر کے تمام افراد اس نماز کو چھوڑ دیں تب بھی امام وقت (حاکم) ان سے قتال نہیں کر سکتا۔ اور یہ نماز منفرد مسافر، غلام، عورت، ہر ایک کیلئے مشروع ہے چاہے پھر گھر میں پڑھے یا کسی اور جگہ۔

عید کی نماز باجماعت سنت ہے، لیکن حاجی کو منیٰ میں اپنے حج کے اعمال کی کثرت کی وجہ سے تنہا پڑھنا افضل ہے (تحفہ) بلا حاجت عید کی ایک سے زائد جماعت مکروہ ہے، اور حاکم اس سے روک سکتا ہے (تحفہ ۴۹۲/۳)

وقت: عید کی نماز کا وقت سورج طلوع ہونے سے شروع ہو جاتا ہے البتہ ایک نیزے کے بقدر سورج بلند ہونے کے بعد پڑھنا افضل ہے (اور اس سے قبل خلاف اولی ہے) اور آخری وقت عید کے دن زوال شمس تک ہے۔

نماز عید پڑھنے کیلئے افضل جگہ

عید کی نماز عید گاہ میں بھی پڑھنا جائز ہے اور مسجد میں بھی، البتہ ان دونوں کے درمیان افضلیت میں اختلاف ہے۔ اگر مکہ یا بیت المقدس میں ہو تو مسجد حرام اور مسجد اقصی میں پڑھنا افضل ہے (حاشیۃ الجمل ۹۹/۲) اور ان دونوں کے علاوہ کسی شہر (یا بستی) میں

پڑھنی ہے اور مسجد کشادہ ہو، یا مسجد کشادہ تو نہ ہو، مگر عید گاہ تک جانے کیلئے کوئی عذر درپیش ہو مثلاً بارش یا راستے میں کیچڑ وغیرہ ہو، تو مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ اور اگر مسجد تنگ ہو تو عید گاہ میں ادا کرنا افضل ہے، بلکہ ایسی صورت میں مسجد میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ امام عید گاہ نماز پڑھنے کیلئے جائے تو بوڑھوں کو نماز پڑھانے کیلئے کسی کو اپنا نائب بنائے۔

عید کے رات و دن کی سنتیں

دونوں عیدوں میں سورج غروب ہونے سے لے کر امام کے عید کی نماز کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنے تک تکبیر مُرسَل کا پڑھنا مستحب ہے (تکبیر مُرسَل کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ تکبیر کے بیان میں آئے گا)

عیدین کی رات عبادات کیلئے بیدار رہنا مستحب ہے۔

حدیث: جو شخص عیدین کی رات بیدار رہے تو اس کا دل اس دن نہیں مرے گا جس دن سارے قلوب مردہ ہو جائیں گے۔ (رواہ دارقطنی) اور رات کا اکثر حصہ عبادت کرنے سے پوری رات بیدار رہنے کا ثواب ملے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ پانچ راتوں میں دعا قبول ہوتی ہے جمعہ کی، عیدین کی، رجب کی پہلی اور نصف شعبان کی رات۔

عیدین کیلئے غسل کرنا، خوشبو لگانا، بالوں کو زائل کرنا (چاہے پھر موئے زیر ناف ہوں یا بغل کے ہوں) ناخن کاٹنا، بدبو زائل کرنا، اوراچھے کپڑے پہننا سنت ہے۔ البتہ سفید کپڑوں کا پہننا افضل ہے۔ عمامہ باندھنا بھی مستحب ہے۔ کسی کے پاس ایک ہی کپڑا ہو تو اسے جمعہ اور عید کیلئے دھو کر پہننا مستحب ہے۔ عید کے غسل کا وقت نصف رات سے شروع ہوتا ہے مذکورہ امور (غسل وغیرہ) ہر آدمی کیلئے مستحب ہیں خواہ وہ نماز عید کیلئے جائے یا گھر میں بیٹھا رہے۔

عید الفطر میں نماز کیلئے جانے سے پہلے کوئی چیز کھانا مستحب ہے۔ اگر ممکن ہو تو کھجور طاق عدد کھانا سنت ہے۔ اور عید الاضحی میں نماز سے پہلے نہ کھانا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر میں نماز کیلئے جانے سے پہلے طاق عدد کھجور کھاتے تھے۔ (رواہ البخاری) **حدیث:** حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر میں نماز سے پہلے اور عید الاضحی میں نماز کے بعد کچھ نوش فرماتے (رواہ احمد۔ والترمذی۔ وابن حبان) عید کی نماز کیلئے امام کے علاوہ دیگر لوگوں کیلئے فجر بعد صبح سویرے جانا مستحب ہے تاکہ اپنے لئے جگہ پکڑیں اور نماز کا انتظار کرتے رہیں۔ البتہ امام کیلئے نماز کے وقت جانا مستحب ہے پھر مسجد یا عید گاہ پہنچتے ہی نماز عید شروع کرے۔

عید کی نماز کیلئے چل کر جانا سنت ہے۔ اگر بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے چل کر نہیں جا سکتا ہے تو سوار ہو کر جائے، البتہ واپس لوٹتے وقت تندرست آدمی کیلئے بھی سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ عید الفطر کی نماز تھوڑی تاخیر سے اور عید الاضحی کی جلدی پڑھنا مستحب ہے۔

نماز عید سے پہلے نفل کا حکم

امام کیلئے نماز عید سے پہلے اور بعد میں نفل پڑھنا مکروہ ہے، البتہ مقتدی کیلئے مکروہ نہیں ہے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید سے پہلے اور بعد میں کوئی نفل نہیں پڑھی، (رواہ البخاری)

نماز عید کیلئے جانے اور لوٹنے کا سنت طریقہ

نماز عید کیلئے لمبے راستے سے جانا اور چھوٹے راستے سے واپس لوٹنا سنت ہے۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن ایک راستے سے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس لوٹتے۔(رواہ البخاری)

اذان واقامت کا حکم۔ نماز عید کیلئے نہ اذان ہے اور نہ اقامت بلکہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کہہ کر لوگوں کو جمع کیا جائے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر اذان واقامت کے نماز عید ادا کی اور خطبہ دیا۔(متفق علیہ)

نماز عید کا طریقہ

عید کی نماز دو رکعت ہے اور ارکان وسنن وغیرہ میں دیگر نمازوں کی طرح ہے اور نیت نماز عید کی کرے اور یہ اس کا ادنی طریقہ ہے۔

اکمل طریقہ حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحی میں پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیر کہا کرتے(احمد۔ابودائود۔ابن ماجہ۔ودارقطنی وصححہ احمد وعلی والبخاری/تلخیص)

تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے استفتاح(**یعنی وجهت**) پڑھے اس کے بعد پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ اور رکوع کی تکبیر کے علاوہ مزید سات تکبیریں کہے اور دوسری رکعت میں سجدہ سے اٹھنے اور رکوع کیلئے جھکنے کی تکبیر کے علاوہ پانچ زائد تکبیرات کہے۔ اور ان زائد تکبیرات میں ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک متوسط آیت کے بقدر ٹھہرنا مستحب ہے(تقریباً سورہ اخلاص کے بقدر ٹھہرے۔تحفہ)

اور ہر دو تکبیروں کے درمیان ایسے الفاظ پڑھنا مستحب ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد، کبریائی، بزرگی بیان ہو(بیہقی) اسی لئے ان الفاظ کا پڑھنا افضل ہے۔"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" ان کلمات کے ساتھ دیگر کلمات کا اضافہ کرنا بھی جائز ہے۔(مثلاً"وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" پڑھے لیکن ذکر اتنا بھی طویل نہ ہو جائے کہ تکبیرات کے درمیان عرفاً طویل فاصلہ شمار ہو۔)(حاشیۃ الجمل ۲/۹۵)(ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ) مذکورہ ذکر(پہلی رکعت میں) ساتویں تکبیر(اور دوسری رکعت میں) پانچویں تکبیر کے بعد نہ پڑھے، بلکہ اس تکبیر کے بعد تعوذ پڑھے۔اسی طرح(پہلی رکعت میں) تکبیر تحریمہ اور زائد تکبیرات میں سے پہلی تکبیر کے درمیان اور(دوسری رکعت میں) پانچ تکبیروں میں سے پہلی تکبیر سے پہلے نہ پڑھے۔امام نوویؒ نے المجموع میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ان زائد تکبیرات کے درمیان ذکر سے فصل نہ کرتے ہوئے پے درپے ان تکبیرات کو کہنا مکروہ ہے۔(المجموع۔۵/۱۷)

ان زائد تکبیرات کے بعد تعوذ پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھے(اگر پہلے تعوذ پڑھ لے تو تکبیرات فوت نہ ہوں گی) اگر سورہ فاتحہ شروع کر چکا تو زائد تکبیریں فوت ہو چکیں، لوٹ کر پڑھنا مسنون نہیں، لیکن رکوع سے قبل لوٹ کر ان تکبیروں کو پڑھے۔تو نماز باطل نہ ہوگی، رکوع سے ان تکبیروں کیلئے لوٹے تو نماز باطل ہوگی۔(اعانۃ ۱/۲۶۲) سورہ فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں سورہ ق اور دوسری رکعت میں سورہ قمر مکمل یا پہلی رکعت میں سورہ اعلی اور دوسری میں سورہ غاشیۃ پڑھنا سنت ہے(خواہ مقتدی راضی نہ ہوں)

حدیث(۱): آپ صلی اللہ علیہ وسلم "عید الفطر اور عید الاضحی میں سورہ ق اور سورہ قمر پڑھا کرتے تھے"(رواہ مسلم)

حدیث(۲)حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورہ اعلی اور سورہ غاشیہ پڑھا کرتے تھے(رواہ مسلم) لیکن پہلی دو سورتوں کا پڑھنا افضل ہے(تحفہ)

زائد تکبیرات میں رفع یدین کا حکم

زائد تکبیرات میں رفع یدین(یعنی دونوں ہاتھ کاندھوں تک اٹھانا) سنت ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان تکبیرات میں رفع یدین کرتے تھے(رواہ البیہقی) ہر تکبیر کے بعد(عام نمازوں کی طرح سینہ کے نیچے ناف کے اوپر) دایاں ہاتھ بائیں پر رکھے۔ نماز عید میں قرأت اور زائد تکبیرات جہراً کہنا سنت ہے۔ البتہ تکبیرات کے درمیان ذکر سراً کہے۔(تکبیرات زوائد میں مقتدی کو بھی جہر مسنون ہے نیز قضاء پڑھنے کی صورت میں بھی مسنون ہے(الشروانی ۲/۴۹۵)

زائد تکبیرات میں شک: اگر تکبیرات کی تعداد میں شک ہو جائے تو کم سے کم عدد لے کر بقیہ تکبیرات پوری کرے۔ آٹھ تکبیرات کہنے کے بعد شک ہو جائے کہ ان میں سے کسی تکبیر سے تکبیر تحریمہ کی نیت کی یا نہیں، تو نئے سرے سے نماز شروع کرے اور یہ شک پیش آجائے کہ ان تکبیرات میں کس تکبیر سے تکبیر تحریمہ کی نیت کی، تو آخری تکبیر کو تکبیر تحریمہ قرار دیتے ہوئے زائد تکبیرات کا اعادہ کرے، کسی رکعت میں زائد تکبیرات کہنا بھول جائے، اور رکوع میں یا رکوع کے بعد یاد آجائے تو نماز جاری رکھے تکبیرات کہنے کیلئے واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں، اگر لوٹے گا تو نماز باطل ہو گی۔ اگر قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے یاد آجائے تب بھی تکبیریں کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور زائد تکبیرات کے چھوٹنے کی صورت میں (چاہے بھول سے چھوٹ گئی ہوں یا عمداً دونوں صورتوں میں) سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں(بلکہ عالماعامداً سجدہ سہو کرنے سے نماز باطل ہو گی) امام کو دوران قرأت یا دوران تکبیرات پالے تو مقتدی کیلئے فوت شدہ تکبیرات کہنے کی ضرورت نہیں۔ امام کو رکوع میں پائے تو مقتدی بھی امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو جائے، زائد تکبیرات کہتے نہ بیٹھے۔ اگر مسبوق امام کو دوسری رکعت میں پائے تو امام کے ساتھ پانچ تکبیریں کہے اور پھر اپنی دوسری رکعت میں بھی پانچ ہی تکبیریں کہے۔ اگر ایسے امام کے اقتداء میں جو تین یا چھ تکبیرات کہنے کا قائل ہو نماز ادا کرے تو تکبیرات کی تعداد میں امام کی اقتداء کرے اس سے زائد تکبیریں نہ کہے۔

عید کی نماز باجماعت پڑھنا سنت ہے، جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے واضح ہے۔(الفقہ المنہجی)

عید کے خطبہ کا وقت اور اس کا طریقہ: عید کا خطبہ نماز کے بعد ہے۔

حدیث:(۱)حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ سے پہلے نماز عید ادا کرتے تھے۔(رواہ البخاری و مسلم)

حدیث:(۲)حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید الفطر اور عید الاضحی کے دن نکلا تو سب سے پہلے آپ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا(رواہ البخاری) لہٰذا امام نماز سے فراغت کے بعد منبر پر چڑھ کر سلام کر کے(جمعہ کی طرح بقدر اذان) بیٹھ جائے، پھر دوبارہ کھڑے ہو کر دو خطبے دے، اور ان دونوں خطبوں کے ارکان جمعہ کے خطبہ کے مانند ہیں۔ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا بھی مستحب ہے۔ ان خطبوں کو قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر دینا جائز ہے۔ اگر صرف نماز پڑھے اور خطبہ نہ دے تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ کوئی منفرد(تنہا) نماز عید ادا کرے تو اُسے خطبہ دینے کی ضرورت نہیں۔ عید الفطر کے خطبہ میں صدقہ فطر کے

احکام اور عید الاضحی میں قربانی کے احکام بتلانا مستحب ہے۔ پہلے خطبہ کے ابتداء میں پے در پے (اور جدا جدا) نو تکبیرات اور دوسرے خطبہ کے ابتداء میں سات تکبیرات پڑھنا مستحب ہے۔ ان تکبیرات کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و تہلیل اور ثنا کے کلمات پڑھنا جائز ہے۔ اور مذکورہ نو اور سات تکبیرات نفس خطبہ میں سے نہیں ہیں، بلکہ یہ خطبہ کیلئے بطور مقدمہ کے ہیں۔ خطبہ کو دھیان و توجہ سے سننا مستحب ہے۔ اور نہ سننا مکروہ ہے عید کی نماز اگر عید گاہ میں پڑھی گئی اور نماز کے بعد دوران خطبہ کوئی آئے تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے بلکہ بیٹھ کر خطبہ سنے اور خطبہ ہونے کے بعد نماز عید چاہے عید گاہ میں ادا کرے یا اپنے گھر جا کر۔ اور اگر عید کی نماز مسجد میں پڑھی گئی اور نماز کے بعد دوران خطبہ کوئی آئے تو سب سے پہلے عید کی نماز ادا کرے، پھر خطبہ سنے اور تحیۃ المسجد الگ سے پڑھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ تحیۃ المسجد کا ثواب نماز عید کے ضمن میں مل جائے گا۔ امام نماز سے پہلے ہی خطبہ دے تو خطبہ شمار نہ ہو گا جیسا کہ فرض کی پچھلی سنت فرض سے پہلے پڑھے تو شمار نہیں ہوتی۔

قضاء: عید کی نماز فوت ہو جائے تو اس کی قضاء کرنا مستحب ہے۔ رمضان کی تیس تاریخ کو زوال سے اتنی دیر پہلے، جس میں لوگوں کا جمع ہو کر نماز عید ادا کرنا ممکن ہو دو عادل شخص گذشتہ رات (یعنی تیسویں رات) چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو روزہ توڑ کر نماز پڑھیں اور یہ نماز ادا شمار ہو گی۔ قضاء نہ ہو گی۔ اور اگر غروب شمس کے بعد گواہی دیں تو نماز کے سلسلے میں گواہی قبول نہ کریں کیونکہ گواہی قبول کرنے کی صورت میں سوائے نماز چھوڑنے کے کچھ فائدہ نہیں۔ لہٰذا دوسرے دن نماز اداءً پڑھے قضاء نہ ہو گی۔ اور اگر زوال کے بعد غروب سے پہلے، یا زوال سے اتنی دیر پہلے جس میں نماز پڑھنا ممکن نہ ہو گواہی دیں تو روزہ توڑ دیں البتہ نماز فوت ہو جائے گی۔ اب اس کی قضاء کرے، خواہ اسی دن قضاء کرے یا دوسرے دن۔ لیکن اگر شہر کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے لوگوں کا اُسی دن جمع ہونا ممکن ہو تو اسی دن پڑھنا افضل ہے، ورنہ دوسرے دن پڑھنا افضل ہے۔

حدیث: ایک قافلہ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر گذشتہ رات چاند دیکھنے کی گواہی دینے لگا تو آپ ﷺ نے انہیں روزہ افطار کرنے اور (دوسرے دن) صبح کو نماز ادا کرنے کا حکم دیا (رواہ احمد۔ و نسائی والبیہقی وصححہ الخطابی) اور دوسرے دن ہی قضاء کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس سے بھی موئخر کرنا جائز ہے۔ دو آدمیوں نے زوال سے پہلے یا مغرب سے پہلے گواہی دی، اور زوال کے بعد یا مغرب کے بعد عادل قرار دئے گئے تو جس وقت عادل قرار دئے گئے، اس وقت کا اعتبار ہو گا، لہٰذا پہلی صورت میں نماز قضاء پڑھے، اور دوسری صورت میں اداء پڑھے۔ اور یہ مذکورہ ساری تفصیل اس صورت میں ہو گی جبکہ تمام لوگوں کو اشتباہ ہو جائے، اور سب کی نماز فوت ہو جائے۔ لیکن اگر چند افراد کو اشتباہ ہونے کی وجہ سے نماز فوت ہو جائے (تو ادا کی گنجائش نہیں) بلکہ قضاء کرے اور قضاء کبھی بھی کرنا جائز ہے۔

جمعہ کے دن عید آجائے، اور عید کی نماز کیلئے ایسی بستیوں کے لوگ آجائیں، جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے تو ایسے لوگوں کو جمعہ چھوڑ کر واپس اپنی بستی میں جانے کی اجازت ہے۔ (لیکن اگر ان لوگوں کے جانے سے پہلے جمعہ کا وقت شروع ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں جمعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ (فتح الوہاب)

تکبیرات کا بیان

تکبیرات کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ایک قسم تو وہ ہے جو نماز اور خطبہ میں پڑھی جاتی ہے جس کا بیان گذر چکا ہے اور دوسری قسم ان دونوں کے علاوہ ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) تکبیر مُرسل (مطلق) (۲) تکبیر مُقیّد

تکبیر مرسل اُسے کہتے ہیں جو کسی ایک حال کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ مسجدوں گھروں، راستوں اور رات و دن میں پڑھی جائے۔ اور تکبیر مقید اُسے کہتے ہیں جو صرف نماز کے بعد پڑھی جائے۔ تکبیر مرسل دونوں عیدوں میں مشروع ہے اور تکبیر مرسل کا وقت عید کی رات سورج غروب ہونے سے لے کر امام کا عید کی نماز کیلئے تکبیر تحریمہ باندھنے تک ہے۔ تنہا نمازی کے خود کے تکبیر تحریمہ کا اعتبار ہوگا۔ (عید الفطر کی رات میں نماز کے بعد تکبیر پڑھنا مسنون نہیں۔ مغنی المحتاج ۲/ ۳۱۴) تکبیر مرسل عیدین کی رات و دن گھروں، مسجدوں، بازاروں اور راستوں میں چاہے حضر میں ہو، یا سفر میں، عید گاہ جاتے وقت اور عید گاہ میں بلند آواز سے کہنا مستحب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحی میں عید گاہ آنے تک بلند آواز سے تکبیر و تہلیل کہتے (رواہ الحاکم والبیہقی) البتہ حاجی حضرات اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عید الاضحی کی رات میں تکبیر نہ کہیں بلکہ تلبیہ پڑھیں، تکبیر مُقَیَّد صرف عید الاضحی میں مشروع ہے، عید الفطر میں نہیں۔ تکبیر مرسل اور مقید منفرد، باجماعت نماز پڑھنے والا، مرد، عورت، مقیم اور مسافر سبھی کو پڑھنا سنت ہے۔

تکبیرات کا وقت: عید الاضحی کے موقع سے لوگوں کی دو قسمیں ہونگی۔ (۱) حجاج کرام (۲) حجاج کے علاوہ" حجاج کرام یوم النحر میں ظہر کے بعد سے تکبیر کی ابتداء کریں اور ایام تشریق کے آخری دن صبح کی نماز کے بعد ختم کریں اور حجاج کے علاوہ دیگر لوگ عرفہ کے دن فجر کے بعد سے ابتداء کریں اور ایام تشریق کے آخری دن عصر کے بعد تک پڑھتے رہیں۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ ﷺ عرفہ کے دن صبح کی نماز کے بعد سے تکبیر کی ابتداء کرتے اور ایام تشریق کے آخری دن عصر بعد ختم کرتے (رواہ الحاکم) ایام تشریق عید کے بعد تین دن ہیں، ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ ذوالحجہ (الفقہ المھنجی) اگر امام مقتدی کے مسلک کے خلاف تکبیر کہے، مثلاً امام عرفہ کے دن تکبیر کہے اور مقتدی اس دن تکبیر کا قائل نہ ہو یا اس کے برعکس ہو تو مقتدی تکبیر کہنے اور نہ کہنے میں اپنے مسلک پر عمل کرے امام کی موافقت ضروری نہیں (کیونکہ سلام پھیرتے ہی امام کی اتباع کا حکم اور دونوں کا تعلق ختم ہو چکا)

قضاء نماز اور نوافل کے بعد تکبیر پڑھنے کا حکم

دیگر ایام کی فوت شدہ نماز کی ایام تشریق میں قضاء کرے یا ایام تشریق کی فوت شدہ نماز ان ہی ایام میں قضاء کرے تو اس کے بعد تکبیر کہنا مستحب ہے۔ اسی طرح سنن رواتب، مطلق نوافل، اور نماز جنازہ کے بعد بھی تکبیر کہنا مستحب ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ایام تشریق میں جو بھی نماز پڑھی جائے اس کے بعد تکبیر کہنا مستحب ہے۔ ایام تشریق کی فوت شدہ نماز دیگر ایام میں قضاء کرے تو اس کے بعد تکبیر کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی نماز کے بعد تکبیر کہنا بھول جائے تو یاد آنے پر تکبیر کہدے، فاصلہ کم ہو یا زیادہ۔ گرچہ اپنی جگہ سے اٹھ چکا ہو۔ مسبوق اپنی نماز پوری کرنے کے بعد تکبیر کہے۔

تکبیر مطلق (مرسل) کو نماز کے اذکار کے بعد پڑھے، اور مقید کو پہلے پڑھے۔ عمرہ کرنے والا اگر طواف یا سعی کے ذکر میں مشغول نہ ہو تو وہ بھی تکبیر پڑھے جو عید الفطر کی رات حج کا احرام باندھے اسے تلبیہ سنت ہے۔ ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں مویشیوں کو دیکھے یا ان کی آواز سنے تو ایک مرتبہ تکبیر سنت ہے۔ (بغیہ ۸۹)

تکبیر کے کلمات: تکبیر کا طریقہ یہ ہے کہ۔ تین مرتبہ بالترتیب تکبیر کہے۔

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ" البتہ افضل اور مشہور الفاظ یہ ہیں۔ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا

اَللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ"(فتح الوھاب)مذکورہ تین تکبیروں میں سے تیسری کے بعد ان کلمات کو بھی بڑھانا اچھا ہے۔

"اَللّٰهُ اَکْبَرُ کَبِیْراً وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ کَثِیْراً وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُکْرَةً وَّ اَصِیْلاً لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلاَ نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہُ صَدَقَ وَعْدَہُ وَنَصَرَ عَبْدَہُ وَہَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ"

متفرق مسائل: عید کے دن آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دینا اور مصافحہ کرنا مباح ہے۔(جمل ۱۰۵/۲) ممیز بچوں کو عید کی نماز کیلئے لانا مباح ہے۔(المجموع۔۹/۵)

عید کے دن اپنے اہل وعیال پر خرچ میں وسعت کرنا۔ اپنی حیثیت کے مطابق کثرت سے صدقہ کرنا مسلمان بھائی کی ملاقات کے وقت خوشی کا اظہار کرنا اور خوشی کے اظہار کیلئے رشتہ داروں کی ملاقات کرنا مندوب ہے۔(الفقہ الاسلامی۔۱۴۱۵/۲)

عید الفطر کی مبارکبادی کا وقت تکبیر کی طرح غروب سے اور عید الاضحی کا عرفہ کے دن فجر سے ہے۔(بغیہ ص۸۹) عورتوں کو گھر میں باجماعت نماز عید ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں ایک عورت (نماز بعد) ان کو وعظ ونصیحت کر سکتی ہے۔ جو عورتیں نماز کیلئے (عید گاہ وغیرہ) نہ جائیں انہیں زیب وزینت مندوب ہے۔ عید کی طرح دیگر عبادات میں بھی پیدل جانا اور آمد ورفت میں راستہ کی تبدیلی، نیز جاتے وقت طویل اور واپسی میں مختصر راستہ اختیار کرنا مستحب ہے۔ البتہ حج اور غزوہ میں سوار ہونا مسنون ہے۔ عید الفطر میں نماز سے قبل کھانے کی سنت راستہ یا مسجد میں بھی ادا کرے تو عذر کی وجہ سے یہ خلاف مروّت نہیں ہے۔ عید کی نماز میں زائد تکبیرات کا ترک اس میں کمی بیشی ان میں رفع یدین نہ کرنا، یا درمیانی ذکر کا ترک کرنا مکروہ ہے۔(بشری الکریم ۱۸/۲-۱۹)

صلوٰۃ الکسوف (سورج اور چاند گھن کی نماز کا بیان)

مشروعیت: ایک حدیث شریف میں ہے۔ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں کسی کے مرنے اور پیدا ہونے سے اس میں گہن نہیں لگتا، لہٰذا جب تم گہن دیکھو تو نماز پڑھ کر دعا کرو یہاں تک کہ گہن ختم ہو جائے۔

گہن کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے۔ سورج گہن کی نماز ۲ھ میں مشروع ہوئی اور چاند گہن کی نماز ۵ھ جمادی الاخری میں مشروع ہوئی۔(حاشیۃ الجمل ۱۰۵/۲)

نماز گھن کا حکم اور وقت: لفظ کسوف اور خسوف کا چاند گہن اور سورج گہن دونوں پر اطلاق ہوتا ہے سورج اور چاند گہن کی نماز سنت موکدہ ہے۔

اور یہ نماز منفرد، عورت، مسافر غلام ہر ایک کیلئے پڑھنا سنت ہے۔ ممیز بچہ کے ولی کیلئے مسنون ہے کہ وہ بچہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے۔(حاشیۃ الجمل ۱۰۷/۲) اس نماز کو باجماعت اور مسجد میں ادا کرنا مستحب ہے

حدیث: آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے سورج گہن کی نماز باجماعت ادا کی تھی۔(متفق علیہ) اس نماز کو مکروہ اوقات میں بھی پڑھنا جائز ہے، اور جامع مسجد میں پڑھنا مستحب ہے اور اس کے لئے اقامت کے بجائے اَلصَّلَاۃُ جَامِعَۃٌ کہنا مستحب ہے۔

نماز گھن کا طریقہ: صلوٰۃ الکسوف کی نیت سے تکبیر تحریمہ کہہ کر رکعت باندھ لے پھر سورہ فاتحہ پڑھ کر رکوع کرے اور رکوع سے اٹھ کر دوبارہ سورہ فاتحہ پڑھے پھر دوبارہ رکوع کر کے رکوع سے اٹھے۔ اور اعتدال کے بعد سجدہ میں چلا جائے یہ ایک

رکعت ہوئی اسی طرح دوسری رکعت بھی پڑھے ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع کرے اور ہر قیام میں سورہ فاتحہ پڑھے۔

حدیث: ”آپ ﷺ نے دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدہ کئے (متفق علیہ) اگر سنت ظہر کی طرح دو رکعت ادا کرے تو یہ بھی کافی ہے۔ سنت ظہر کی طرح ادا کرنے کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد ہر رکعت میں دو رکوع پر عمل کرنا جائز نہیں۔ (اعانۃ)

نماز گھن کا اکمل طریقہ: (مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق) پہلے قیام میں دعائے استفتاح تعوذ اور سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ پڑھے، سورہ بقرہ اچھی طرح یاد نہ ہو تو کسی اور جگہ سے اس کے بقدر پڑھے۔ اور دوسرے قیام میں سورہ ال عمران یا اس کے بقدر کہیں اور جگہ سے پڑھے، تیسرے قیام میں سورہ نساء یا اس کے بقدر کہیں اور جگہ سے، اور چوتھے قیام میں سورہ مائدہ یا اس کے بقدر پڑھے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے قیام میں سورہ بقرہ پڑھے وہ یاد نہ ہو تو اس کے بقدر کہیں اور سے، اور دوسرے قیام میں سورہ بقرہ کی دو سو آیات کے بقدر، تیسرے قیام میں بقرہ کے ڈیڑھ سو آیات، اور چوتھے قیام میں سو آیات کے بقدر پڑھنا مستحب ہے۔ ہر قیام میں قرأت سے پہلے تعوّذ پڑھنا مستحب ہے۔

ان دو رکعت کے پہلے رکوع اور سجدہ میں تقریباً سورہ بقرہ کی سو آیات اور دوسرے رکوع وسجدہ میں بقرہ ہی کی اسّی (۸۰) آیات اور تیسرے رکوع وسجدہ میں ستّر (۷۰) آیات کے اور چوتھے رکوع وسجدہ میں پچاس (۵۰) آیات کے بقدر تسبیح پڑھے۔ (یعنی رکوع وسجدہ کو اتنا طویل کرے کہ اس میں تقریباً سو (۱۰۰) اسّی (۸۰) ستّر (۷۰) اور پچاس (۵۰) آیت کے بقدر تسبیح پڑھ سکے) اور ہر رکوع سے اٹھتے وقت تسمیع (سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ) اور تحمید (رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ الخ) پڑھنا بھی مستحب ہے۔ جلسہ بین السجدتین، دوسرے رکوع کے بعد اعتدال اور تشہد کو طویل نہ کرے گہن کی نماز میں امام کو پہلی رکعت یا دوسری رکعت کے پہلے رکوع میں پانے سے وہ رکعت مل جاتی ہے۔ اور دوسرے قیام یا دوسرے رکوع میں شریک ہونے سے وہ رکعت فوت ہو جاتی ہے۔

دوسری رکعت پانے کی صورت میں امام کے سلام کے بعد اپنی ایک رکعت پوری کرے اور اس میں بھی دو قیام اور دو رکوع کرے۔

گہن کافی دیر تک رہنے کی وجہ سے ایک رکعت میں دو سے زیادہ رکوع کرنا جائز نہیں۔ اگر پہلے ہی قیام میں گہن ختم ہو جائے تو اس سے نماز باطل نہ ہوگی، بلکہ ایسی صورت میں بھی ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع کر کے نماز مکمل کرے۔

سلام پھیرنے کے بعد ابھی گہن باقی ہو تو اس کی وجہ سے دوبارہ نماز پڑھنے کی گنجائش نہیں، البتہ باجماعت اعادہ سنت ہے (بشری الکریم)

نماز گھن کے خطبہ کا حکم: نماز کے بعد دو خطبے دینا بھی مستحب ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: آپ ﷺ نے سورج گہن کے موقع سے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد خطبہ بھی دیا۔ (متفق علیہ)

دونوں خطبے ارکان وشرائط میں جمعہ کے خطبوں کے مانند ہیں۔ اور یہ خطبے باجماعت نماز پڑھنے والے کیلئے مسنون ہیں، خواہ نماز شہر میں ادا کریں یا مسافر حضرات جنگل میں پڑھیں (منفرد کیلئے خطبہ نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج)

خطبہ میں امام لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرنے، نیک کام کرنے، غلام آزاد کرنے، اور صدقہ کرنے پر ابھارے، اسی طرح غفلت اور دنیا کے دھوکے سے ڈرائے۔

حدیث: حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، ”آپ ﷺ نے سورج گہن کے موقع پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ (رواہ البخاری) چاند گہن کی نماز میں قرأت جہراً پڑھے اور سورج گہن میں سراً۔

کسوف کی قضاء

سورج گہن کی نماز(نماز شروع کرنے سے پہلے)مکمل طور پر گہن ختم ہونے یا گہن ہی کی حالت میں سورج غروب ہونے سے فوت ہو جاتی ہے۔ گہن کا کچھ حصہ ختم ہو جائے اور کچھ باقی ہو تو بقیہ کیلئے نماز شروع کرنا جائز ہے، جیسے کہ اتنی ہی مقدار میں گہن لگنے کی صورت میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ دوران نماز گہن ختم ہو جائے تو نماز توڑنے کی ضرورت نہیں، بلکہ نماز پوری کرے۔(المجموع ۵/۵۴)بادل حائل ہونے کی وجہ سے گہن کے ختم ہونے یا گہن لگنے کے متعلق شک ہو جائے تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ پہلی صورت میں نماز پڑھے، کیونکہ گہن کا باقی رہنا اصل ہے اور دوسری صورت میں نہ پڑھے۔

چاند گہن کی نماز(نماز شروع کرنے سے پہلے)گہن مکمل طور پر ختم ہونے یا سورج طلوع ہونے سے فوت ہو جاتی ہے۔

سورج طلوع ہونے کے بعد بھی گہن لگا ہوا ہو، تب بھی نماز پڑھنا جائز نہیں۔ رات گہن ہی کی حالت میں چاند غائب ہونے اور گہن ہی کی حالت میں طلوع فجر سے یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے گہن لگنے سے نماز فوت نہیں ہوتی، بلکہ نماز پڑھنا جائز ہے۔ دورانِ نماز سورج طلوع ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی، جیسا کہ دورانِ نماز گہن ختم ہونے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اگر طلوع شمس کے بعد چاند گہن شروع ہو جائے تو نماز نہ پڑھے گہن کی نماز فوت ہونے پر اسکی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں(الفقہ المنھجی) گہن کے متعلق نجومیوں کی بات پر عمل نہ کرے۔

ایک ھی وقت میں دو مختلف نمازوں کا جمع ھونا

ایک وقت میں دو مختلف نمازیں جمع ہو جائیں، تو جس نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، اُسے پہلے ادا کرے۔ اگر فوت ہونے میں دونوں برابر ہوں تو جو زیادہ موکد ہو، اُسے پہلے ادا کرے، جیسے عید اور کسوف یا جمعہ اور کسوف کی نماز ایک ساتھ جمع ہو جائیں، اور وقت کی تنگی کی وجہ سے عید یا جمعہ کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو عید یا جمعہ کی نماز پہلے ادا کرے۔ اور اگر عید یا جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر گہن کی نماز پہلے ادا کرے۔ دیگر فرائض کا حکم بھی جمعہ ہی کے مانند ہے۔ گہن اور وتر یا گہن اور تراویح کی نماز ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو گہن کی نماز پہلے ادا کرے۔ اس لئے کہ یہ نماز افضل ہے۔

جنازہ اور کسوف یا جنازہ اور عید کی نماز جمع ہو جائیں تو نماز جنازہ پہلے پڑھے اور نماز جنازہ پوری ہونے کے بعد امام دوسری نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو جائے۔ امام قبر تک جنازہ کے ساتھ نہ جائے، اگر جنازہ حاضر نہ ہو یا حاضر تو ہو لیکن اس کا ولی حاضر نہ ہو، تو امام ایک جماعت الگ سے تیار کرے جو جنازہ کا انتظار کرتی رہے۔ اور خود امام دوسری نماز میں مصروف ہو جائے۔ جنازہ اور جمعہ کی نماز جمع ہو جائیں اور وقت تنگ نہ ہو تو نماز جنازہ پہلے ادا کرے۔ پھر جمعہ ادا کرے، وقت تنگ ہو تو جمعہ مقدم کرے۔

نماز عید اور کسوف جمع ہو جائیں تو دونوں نمازیں ادا کرنے کے بعد ایسے دو خطبے دے جس میں عید اور کسوف کے احکام کا ذکر ہو۔

نماز جمعہ اور کسوف ایک ساتھ جمع ہو جائیں۔ اور وقت کی تنگی کی وجہ سے جمعہ کو مقدم کرنا ہو تو پہلے جمعہ کا خطبہ دے، پھر جمعہ کی نماز ادا کر کے کسوف کی نماز پڑھے اس کے بعد کسوف کا خطبہ دے، اور اگر کسوف کی نماز پہلے ادا کرے تو نماز کسوف کے بعد(جمعہ کی نیت سے)جمعہ کیلئے ایسے دو خطبے دے، جس میں کسوف کے مسائل کا بھی ذکر ہو۔ چار خطبے دینے کی ضرورت نہیں(یعنی دو جمعہ کے اور دو کسوف کے)اور ان خطبوں میں جمعہ اور کسوف دونوں کی ایک ساتھ نیت نہ ہو،(بلکہ صرف جمعہ کے خطبہ کی نیت ہو)اسلئے کہ ایسی صورت میں فرض اور نفل کے

درمیان شرکت ہوگی، بخلاف عید اور کسوف میں کہ اس میں دونوں کے خطبوں کی ایک ساتھ نیت جائز ہے۔ کیونکہ دونوں سنت ہیں۔

زلزلہ وغیرہ میں نماز کا حکم

گہن کے علاوہ جتنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جیسے زلزلے، بجلی، کڑک، اور سخت ہوائیں چلنے کی صورت میں باجماعت نماز پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ البتہ تنہا نماز پڑھنا مستحب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ رہے۔ اور خوب آہ وزاری کے ساتھ دعا کرنا بھی مستحب ہے۔ عورتیں بھی گہن کی نماز پڑھ سکتی ہیں۔

استسقاء کی نماز کا بیان

مشروعیت۔ حدیث: حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف بارش مانگنے کیلئے گئے، پھر قبلہ کی طرف رخ کرکے چادر کو پلٹا اور دو رکعت نماز ادا کی (رواہ الشیخان) استسقاء کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے۔ اور ۶ ؁ھ رمضان میں مشروع ہوئی، (حاشیۃ الجمل ۱۱۴/۲) استسقاء کے لغوی معنی ہے پانی طلب کرنا۔

شرعی تعریف: ضرورت کے وقت بندوں کا اللہ تعالیٰ سے بارش کا سوال اور دعا کرنا۔

پانی بالکل نہ ہو، کم ہو یا نمکین ہو، تو ان تمام صورتوں میں استسقاء مشروع ہو۔ (فتح المعین)

استسقاء کا حکم اور وقت: استسقاء کی نماز سنت مؤکدہ ہے اس نماز کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں، بلکہ رات و دن کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ مکروہ وقت میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ سبب والی نماز ہے۔ (فتح الوہاب مع جمل۔ ۱۲۰/۲) استسقاء کی نماز جنگل (یعنی کھلے میدان) میں پڑھنا سنت ہے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء کی نماز کیلئے صحراء کی طرف جایا کرتے تھے۔ (تلخیص الحبیر)

نماز استسقاء کے آداب: امام استسقاء کیلئے نکلنے سے پہلے لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرنے، نیک کام کرنے، صلہ رحمی، اور فقراء پر صدقہ اور زبردستی کسی کا حق دبایا ہے تو اسے ادا کرنے کا حکم دے، چاہے وہ حق خون کے قبیل کا ہو (یعنی ناحق کسی کو قتل کیا ہو) یا کسی کی آبروریزی کی ہو یا کسی کا مال چھین لیا ہو۔ اسی طرح مسلسل چار دن روزے رکھنے کا بھی حکم دے اور چوتھے دن روزے کی حالت میں ہی پرانے کپڑوں میں نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ زیب وزینت اور خوشبو کے بغیر، میدان کی طرف نکل پڑے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف زیب وزینت اختیار کئے بغیر نکلے اور عید کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی، (رواہ احمد، حاکم، تلخیص) نماز استسقاء کیلئے جانے سے پہلے غسل کرنا، مسواک کرنا، اور بدبو زائل کرنا مستحب ہے، بچوں، بوڑھوں اور جانوروں کو بھی استسقاء کیلئے ساتھ لے جانا مستحب ہے اگر نماز کیلئے ذمی بھی نکلیں تو وہ مسلمانوں سے الگ تھلگ کھڑے رہیں۔

ہر آدمی کا اپنے نیک عمل کے وسیلے سے دعا مانگنا بھی مستحب ہے۔ اسی طرح اکابر حضرات اور نیک لوگوں کے خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کے وسیلے سے دعا مانگے (یعنی ایسے حضرات کو دعا کیلئے آگے بڑھائے جو موجود ہو اور اب یہ جاننا ممکن نہیں)

استسقاء کے تین طریقے ھیں: (اور یہ تینوں سنت مؤکدہ ہیں) (۱) کسی نماز کے بغیر محض دعا کرنا، خواہ تنہا دعا کرے یا اجتماعی شکل میں (۲) متوسط طریقہ یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد (فرض ہو یا نفل) اور جمعہ وغیرہ کے خطبہ میں دعا کرے۔

(۳) **افضل طریقہ:** سب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے، پھر دو خطبے دے کر بارش کیلئے دعا کرے۔ اور اس نماز کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی رکعت میں عید کی طرح سات زائد تکبیرات اور دوسری رکعت میں پانچ زائد تکبیرات کہے۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ ق اور دوسری میں سورہ قمر یا پہلی میں سورہ اعلیٰ (**سبح اسم ربک**) اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا مستحب ہے۔ اور دونوں رکعت میں قراءت جہراً پڑھنا مستحب ہے۔ اور اس نماز کیلئے اقامت کے بجائے اَلصَّلَاۃُ جامعۃ کہہ کر لوگوں کو جمع کیا جائے، اور عید کی طرح اس نماز کے زائد تکبیرات کے درمیان ایک متوسط آیت کے بقدر ٹھہرنا اور ذکر پڑھنا مستحب ہے۔ (المجموع ۵/۷۴)

خطبہ۔ نماز کے بعد دو خطبے دینا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ استسقاء کیلئے نکلے اور دو رکعت نماز پڑھا کر خطبہ دیا۔ (رواہ احمد ابن ماجہ) اور یہ خطبے ارکان و شرائط میں عید کے خطبوں کے مانند ہیں۔ البتہ چند امور میں عید اور استسقاء کے خطبوں میں فرق ہے۔

(۱) استسقاء کے خطبے میں ابتداء میں تکبیرات کے بجائے استغفار پڑھے۔ استغفار یہ ہے۔

"اَسْتَغْفِرُ اللہَ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ" (پہلے خطبہ میں نو مرتبہ اور دوسرے میں سات مرتبہ استغفار پڑھے) خطبہ کے آخر میں استغفار پڑھے اور دوران خطبہ استغفار اور اس آیت (اِسْتَغْفِرُوا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّاراً یُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَیْکُمْ مِدْرَاراً) اور اس دعا (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْاَرْضِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ) اور (یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ نَسْتَغِیْثُ وَ مِنْ رَّحْمَتِكَ نَرْجُوْا فَلَا تَکِلْنَا اِلٰی اَنْفُسِنَا طَرْفَۃَ عَیْنٍ وَ اَصْلِحْ لَنَا شَانَنَا کُلَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ) کو کثرت سے پڑھے۔ (مغنی المحتاج ۔ ۱/۳۲۴) (۲) دوسرے خطبہ میں قبلہ کی طرف رخ کرے (جس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا)

(۳) پہلے خطبہ میں یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔

"اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثاً مُّغِیْثاً ھَنِیْئاً مَرِیْئاً مَرِیْعاً غَدَقاً مُجَلِّلاً سَحّاً طَبَقاً دَائِماً اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا الْغَیْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِیْنَ اَللّٰھُمَّ اِنّ بِالْعِبَادِ وَالْبِلَادِ مِنَ اللَّاْوَاءِ وَالْجُھْدِ وَالضَّنْكِ مَا لَا نَشْکُوْا اِلَّا اِلَیْكَ اَللّٰھُمَّ اَنْبِتْ لَنَا الزَّرْعَ وَاَدِرَّ لَنَا الضَّرْعَ وَاسْقِنَا مِنْ بَرَکَاتِ السَّمَاءِ وَ اَنْبِتْ لَنَا مِنْ بَرَکَاتِ الْاَرْضِ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ عَنَّا الْجُھْدَ وَالْجُوْعَ وَالْعُرْیَ وَاکْشِفْ عَنَّا مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا یَکْشِفُہٗ غَیْرُكَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ اِنَّكَ کُنْتَ غَفَّاراً فَاَرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَیْنَا مِدْرَاراً"

ترجمہ: اے اللہ بارش برسا تکلیف دور کرنے، اور فریاد رسی کرنے والی برکت و راحت والی، خوشگوار، شاداب، فراوانی والی شیرین جل تھل کرنے والی، لگاتار عام اور ڈھانپنے والی ہمیشہ اے اللہ ہمیں بارش سے سیراب کر، اور ہم کو مایوس نہ کر، اے اللہ بیشک بندوں اور شہروں میں دشواری، مشقت اور تنگی ہے، جسکی ہم آپ کے پاس فریاد کر رہے ہیں اے اللہ ہمارے لئے کھیتی اُگادے، اور جانوروں کے تھن سے دودھ عطا فرما۔ اور ہم پر آسمان کی برکتوں کا نزول فرما۔ اور زمین کی برکتیں ہمارے لئے اُگادے اے اللہ ہم سے تنگی، بھوک اور برہنگی دور فرما۔ اور ہمارے اوپر سے ان آفتوں کو دور فرما جنہیں آپکے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اے اللہ ہم مغفرت مانگتے ہیں۔ بیشک آپ غفار ہیں لہٰذا ہمارے اوپر موسلا دھار بارش برسا)۔

پہلے خطبہ میں اور دوسرے خطبہ کے ابتداء میں لوگوں کی طرف رخ اور قبلہ کی طرف پیٹھ ہو البتہ دوسرا خطبہ تقریباً ایک تہائی ہونے کے بعد قبلہ کی طرف رخ کرکے سراً و جہراً خوب دعا کرے۔ اور امام جب آہستہ دعا کرے تو دیگر لوگ بھی آہستہ ہی کریں۔ اور امام

جب جہراً دعا کرے تو تمام لوگ اس کی دعا پر آمین کہیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں، جیسے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب بارش کیلئے دعا مانگی تو ہتھیلی کی پیٹھ کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ کسی مصیبت کے دور ہونے کیلئے دعا کرتے وقت ہتھیلی کی پیٹھ کا رخ آسمان کی طرف رکھنا سنت ہے۔ اور کسی چیز کا سوال کرتے وقت ہتھیلی کے پیٹ کا رخ آسمان کی طرف رکھنا سنت ہے امام نوویؒ نے المجموع میں امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایسی حالت میں یہ دعا بھی مانگے "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ اَمَرْتَنَا بِدُعَائِكَ وَوَعَدْتَّنَا اِجَابَتَكَ وَقَدْ دَعَوْنَاكَ كَمَا اَمَرْتَنَا فَاَجِبْنَا كَمَا وَعَدْتَّنَا اَللّٰھُمَّ امْنُنْ بِمَغْفِرَةِ مَا قَارَفْنَا وَاِجَابَتِكَ فِي سُقْيَانَا وَسَعَةِ رِزْقِنَا"

ترجمہ: اے اللہ آپ نے ہمیں دعا کا حکم دیا اور اس کی قبولیت کا وعدہ بھی کیا لہٰذا ہم آپ سے دعا کرتے ہیں جیسے آپ نے ہمیں حکم دیا۔ لہٰذا ہماری دعا قبول فرما۔ جیسے کہ آپ نے وعدہ کیا۔ اے اللہ ہم سے جو گناہ ہوئے ہیں انہیں معاف فرما اور بارش سے سیر اب فرما اور وسیع رزق عطا کر کے ہم پر احسان فرما۔) امام جب دعا سے فارغ ہو جائے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں وعظ و نصیحت کرے۔ پھر آپ ﷺ پر درود پڑھ کر مومن مرد و عورت کیلئے دعا کرے اور قرآن کی ایک دو آیات پڑھے اور آخر میں استغفر اللہ لی ولکم الخ کہہ کر خطبہ کو ختم کرے۔

دوسرے خطبہ میں (دعا کیلئے) قبلہ کی طرف رخ کرتے وقت امام کیلئے چادر کی تحویل مستحب ہے۔ اور چادر اگر چوکور ہو تو تحویل کے ساتھ تنکیس بھی مستحب ہے اور گول ہو تو صرف تحویل مستحب ہے۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے استسقاء کے موقع پر تحویل رداء کی۔ (رواہ الحاکم) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی تحویل کا ذکر ہے جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ تحویل یعنی چادر کا وہ حصہ جو دائیں کندھے پر ہو اسے بائیں کندھے پر ڈالے اور جو بائیں کندھے پر ہو اسے دائیں کندھے پر ڈالے۔

تنکیس: یعنی چادر کے اوپری حصہ کو نیچے کرنا اور نچلے حصہ کو اوپر کرنا۔ اگر اس نچلے کنارے کو جو بائیں بازو پر ہے اسے دائیں کندھے پر اور جو دائیں بازو پر ہے اسے بائیں کندھے پر ڈالے تو تحویل و تنکیس ایک ساتھ حاصل ہوگی۔ امام کی طرح دیگر حضرات بھی اس وقت اپنی چادر میں تحویل و تنکیس کریں۔

تحویل وتنکیس کی حکمت: حالات بدل کر سر سبزی و شادابی کی طرف منتقل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نیک فالی کو پسند فرماتے تھے۔ (متفق علیہ) کپڑے نکالنے تک چادر کو تحویل ہی کی حالت میں رکھنا مستحب ہے، بارش مانگنے کے بعد بارش برسے تو ٹھیک ہے ورنہ اگر دعا کی قبولیت میں تاخیر ہو جائے، تو دوبارہ سہ بارہ بھی نماز پڑھ کر بارش مانگ سکتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش برسائے اور دوبارہ جب بارش مانگنے کے لئے نکلے تو نکلنے سے پہلے پھر تین دن کے روزے رکھنے کی ضرورت نہیں، نماز کے واسطے تیاری کرنے کے بعد نکلنے سے پہلے ہی بارش برسے تو وعظ و نصیحت، دعا اور شکر ادا کرنے کیلئے میدان کی طرف جائے، اور بطور شکر دو رکعت استسقاء کے نماز کی طرح ادا کرے۔ اور نیت بھی استسقاء کی کرے اور خطبہ بھی دے (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل ۲/۱۱۵) بارش کا مانگنا تمام کیلئے مستحب ہے، چاہے وہ کسی بستی و دیہات یا شہر کے رہنے والے ہوں یا مسافر ہوں، پانی ختم ہو جائے اور فی الحال اس کی ضرورت نہ ہو تو پھر بارش مانگنے کی ضرورت نہیں۔ اگر مسلمانوں کی کسی بستی میں پانی ختم ہو جائے اور انہیں پانی کی ضرورت ہو تو دوسری بستی والوں کیلئے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے بارش اور اپنے لئے پانی کی زیادتی کی دعا کرنا مستحب ہے۔ اگر امام استسقاء (بارش مانگنے کو) چھوڑ دے تو دیگر حضرات نہ چھوڑیں۔

اگر نماز سے پہلے خطبہ دے تو جائز ہے اور ایسا خطبہ و نماز صحیح ہے۔ ابوداود شریف میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے خطبہ دیا پھر نماز پڑھی اور بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ استسقاء کیلئے نکلے تو آپ نے دعا کی، قبلہ کی طرف رخ کیا اور چادر کو پلٹایا پھر دو رکعت نماز ادا کی بارش زیادہ برسنے کی وجہ سے مکانات اور کھیتوں کو نقصان پہنچنے لگے، تو اس کے لئے کوئی نماز مشروع نہیں۔ البتہ بارش کے کم ہونے کی دعا کرنا سنت ہے دعا یہ ہے "اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا" (**ترجمہ:** اے اللہ ہمارے اطراف میں، نہ کہ ہم پر) بعضوں نے بارش دور کرنے کی نیت سے تنہا نماز پڑھنا مسنون قرار دیا ہے۔ (بشری الکریم) سال میں پہلی بار بارش گرنے کے وقت (گھر سے) باہر نکل کر ستر کے علاوہ حصہ کھول کر بدن کو بارش سے تر کرنا مستحب ہے اور یہ اکمل طریقہ ہے ورنہ اگر بدن کے کسی ایک عضو کو مثلاً سر یا ہاتھ کھول کر تر کرے تب بھی اصل سنت حاصل ہو گی۔ (حاشیۃ الجمل ۱۲۵/۲)

جب بارش کے پانی سے وادی بہہ پڑے تو اس میں غسل اور وضو کرنا مستحب ہے۔ کڑک اور بجلی چمکنے کے وقت یہ تسبیح پڑھے "سُبْحَانَ مَنْ يُّسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهٖ" (پاک ہے وہ ذات، جس کی تسبیح و تحمید گرج اور فرشتے اس کے خوف سے کرتے رہتے ہیں)

حدیث: حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب کڑک کی آواز سنتے تو کلام ترک فرماتے اور (مذکورہ بالا دعا پڑھتے) (رواہ فی المؤطا) ترمذی میں اس دعا کے بعد یہ دعا پڑھنا بھی مروی ہے "اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ" (الفقہ الاسلامی)

ترجمہ: یا اللہ ہمیں اپنے غضب سے قتل نہ کر اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر، اور اس سے قبل ہی عافیت عطا فرما) بارش برستے وقت یہ دعا پڑھنا سنت ہے "اَللّٰهُمَّ صَيِّباً نَافِعاً" (یا اللہ نفع بخش بارش ہو) ہوا کو برا بھلا کہنا مکروہ ہے (خواہ ہوا خلاف عادت چلے) بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کے خیر کی دعا اور شر سے پناہ چاہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ جب ہوا تیز چلتی تو یہ دعا پڑھتے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَهَا وَ خَيْرَ مَا فِيْهَا وَ خَيْرَمَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَ شَرِّ مَا فِيْهَا وَ شَرِّمَا اُرْسِلَتْ بِهٖ" (ترجمہ اے اللہ میں اس ہوا کے خیر کا اور جو کچھ اس میں خیر ہے اور جس خیر کے ساتھ یہ بھیجی گئی ہے اس کا طالب ہوں۔ اور میں آپ کی اس کے شر سے اور جو کچھ اس میں شر ہے اور جس شر کے ساتھ یہ بھیجی گئی اس سے پناہ مانگتا ہوں) بارش برسنے کے بعد یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔ "مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ" (اللہ کے فضل رحمت سے ہم پر بارش ہوئی) بارش برستے وقت دعا کرنا مستحب ہے۔ اور برسنے پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے۔ اور "مطرنا بنوء کذا" (یعنی فلاں ستارہ فلاں برج میں جانے کی وجہ سے بارش ہوئی) کہنا مکروہ ہے۔ اگر یہ اعتقاد ہو کہ ستارہ ہی بارش برسانے والا ہے تو یہ کفر ہے اور اس سے آدمی مرتد ہو گا۔ کڑک اور بجلی چمکنے کے وقت اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا مستحب ہے۔ اس لئے کہ سلف صالحین اس کی طرف دیکھنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ جب ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھے تو یہ الفاظ پڑھے۔ **ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ۔** (رواہ ابن السنی والطبرانی، الفقہ الاسلامی)

کتاب الجنائز (جنازہ کے احکام)

موت کی یاد اور اس کی تمنا کرنے کا حکم: ہر آدمی کیلئے موت کو کثرت سے یاد کرنا مستحب ہے۔

حدیث: لذتوں کو توڑنے والی چیز کو کثرت سے یاد کرو یعنی موت کو"۔(رواہ الترمذی) کسی مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ ہے اگر تمنا ہی کرنا ہے تو اس طرح کہے۔ "اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِی مَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْراً لِّی وَتَوَفَّنِی اِذَا کَانَتِ الوَفَاۃُ خَیْراً لِّیْ (صحیحین)" **ترجمہ:** (اے اللہ مجھے زندہ رکھئے جب تک زندگی میرے لئے بہتر ہے، اور موت دیجئے جب موت میرے لئے بہتر ہو۔) البتہ اگر دین کے سلسلے میں کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، تو موت کی تمنا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مرنے سے پہلے گناہوں سے توبہ کرے، اور ناحق کسی کا حق دبایا ہے تو اسے ادا کرے، مریض کیلئے تو مذکورہ دونوں چیزیں بدرجہ اولیٰ کرنا چاہئے۔

بیمار کیلئے بیماری پر صبر کرنا مستحب ہے، اور جہاں تک ہوسکے بیماری کی حالت میں کراہے نہیں، علاج کرانا مستحب ہے۔

عیادت کا حکم اور اس کے آداب: اگر کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "کہ ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کے ساتھ جانے اور مریض کی عیادت کا حکم دیا۔(متفق علیہ) کوئی ذمی بیمار ہو تو اس کے مسلمان رشتہ دار یا پڑوسی یا دوست وغیرہ کیلئے اس کی بھی عیادت کرنا مستحب ہے، جیساکہ ایک یہودی غلام کے بیمار ہونے پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عیادت کی۔(رواہ البخاری) ذمی کی عیادت کرنا جائز ہے کافر کی بھی عیادت کرنا جائز ہے۔

عیادت کرنے والے کو مریض کے اچھے ہونے کی امید نظر آئے تو اس کے لئے دعا کرکے وہاں سے واپس لوٹے۔ اور اچھے ہونے کی امید نہ ہو تو اسے توبہ اور وصیت کی رغبت دلائے، مریض کے دل کو خوش کرنا مستحب ہے، مریض کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے۔ اور نہ بار بار عیادت کرے، بلکہ کبھی کبھی عیادت کرے، لیکن اگر بیمار کو کسی آدمی (مثلاً دوست یا رشتہ دار) کے رہنے سے انسیت حاصل ہوتی ہو، تو ایسے شخص کیلئے بار بار عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جس وقت عیادت کرنا مریض پر شاق گذرتا ہو، ایسے وقت عیادت کرنا مکروہ ہے۔ بیمار سے زیادہ پوچھ تاچھ نہ کرے۔ اور اُسے اچھے ہونے کی امید دلائے اور آہ وبکا کرنے سے ڈرائے۔(حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۳۴) مریض کا زیادہ شکوہ شکایت کرنا مکروہ ہے۔ بیمار پر دوا پینے کیلئے زبردستی کرنا مکروہ ہے۔

سکرات کے وقت مطلوبہ امور: جس کی موت کا وقت قریب آچکا ہو، اسے قبلہ رخ کردے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں کروٹ پر قبلہ رخ لٹائے جیساکہ قبر میں رکھا جاتا ہے، اگر دائیں کروٹ پر لٹانا دشوار ہو تو بائیں کروٹ پر لٹائے۔ اور اگر کسی وجہ سے بائیں کروٹ پر بھی لٹانا دشوار ہو تو پھر چت لٹائے اس صورت میں پیر کے تلوے قبلہ رخ کرے اور سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھ کر تھوڑا اوپر اٹھائے تاکہ چہرہ قبلہ رخ ہو جائے۔(المجموع ۵/۱۱۶) نیز ایسے شخص کو شہادت کا کلمہ تلقین کرنا مستحب ہے۔

حدیث: (۱) اپنے مردوں (یعنی جس کی موت کا وقت قریب آچکا ہو) کو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" تلقین کرو۔(رواہ مسلم)

(۲) جس کا آخری کلام "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔(رواہ الحاکم)

مگر کلمہ کی ادائیگی کیلئے اس پر اصرار نہ کرے اور نہ اس سے کہے کہ کلمہ پڑھ، بلکہ اس کے پاس کلمہ پڑھتا رہے، تاکہ وہ کلمہ سن کر خود پڑھ لے، یا اس کے پاس یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہے تو چلو ہم سب اللہ کا ذکر کریں، پھر کہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر" ایک مرتبہ کلمہ پڑھنے کے بعد دوبارہ اس سے نہ پڑھوایا جائے۔ جب تک کہ اس کے بعد کوئی دوسری بات نہ کرے۔ ورثاء کے علاوہ کسی اور شخص کا کلمہ تلقین کرنا مستحب ہے اور اگر ورثاء کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو تو ورثاء میں سے اس پر جو زیادہ

مشفق ہو وہ تلقین کرے، اسے ٹھنڈا پانی پلانا بھی مستحب ہے۔(حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۳۸۔ مغنی المحتاج) اسی طرح اس کے پاس سورہ یٰسین پڑھنا بھی مستحب ہے۔

حدیث: اپنے مردوں (یعنی جن کی موت کا وقت قریب آچکا ہو) پر سورہ یٰسین پڑھا کرو۔(رواہ ابوداود و ابن حبان)

بعض تابعین نے سورہ رعد پڑھنے کو بھی مستحب قرار دیا ہے۔ سورہ یٰسین کا جہراً پڑھنا مسنون ہے۔ اور سورہ رعد سراً پڑھے گر چہ محتضر (جس کی موت کا وقت آچکا ہو) جہراً پڑھنے کا مطالبہ کرے۔(حاشیۃ الجمل ۲/ ۱۳۸) اور ایسے شخص کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھے۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے تین دن پہلے فرماتے ہوئے سنا تم میں سے ہر ایک کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا ہو۔(رواہ مسلم)

اور اس کے پاس بیٹھنے والے کیلئے مستحب ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے رحمت کی امید دلائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی ترغیب دے۔

روح قبض ہونے کے بعد مندوب (مستحب) امور: جب روح قبض ہو جائے تو میت کی آنکھیں بند کر دے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کی آنکھیں بند کر دیں۔(رواہ مسلم، تلخیص) اور چوڑی پٹی سے اس کے جبڑوں کو سر کے اوپر باندھے (تاکہ منہ کھلا نہ رہے) اس کے بعد میت کے تمام جوڑوں کو اسطرح نرم کرے کہ اس کی کلائی کو بازو تک، اور پنڈلی کو ران تک، اور ران کو پیٹ تک لے جاکر اس کی اصلی حالت پر لوٹائے۔ اور انگلیوں کو اس طرح نرم کرے کہ انگلیوں کو ہتھیلی کے پیٹ تک لے جاکر واپس اپنی اصلی حالت پر لوٹائے۔

جوڑوں کو نرم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ غسل دینے اور کفن پہنانے میں آسانی ہو۔ پھر جن کپڑوں میں موت واقع ہوئی ہے انہیں نکال دے اور پتلے کپڑے (یعنی چادر وغیرہ) کے ذریعے پورا بدن ڈھانکے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو آپ کے بدن مبارک پر یمنی چادر ڈالی گئی تھی۔(متفق علیہ، تلخیص)

کپڑا ڈالنے کے بعد اس کے ایک طرف کا کنارہ سر کے نیچے اور دوسرے طرف کا کنارہ دونوں پاؤں کے نیچے دبائے تاکہ ہوا، وغیرہ کے ذریعے بدن کھل نہ جائے۔ میت کے پیٹ پر قرآن کے علاوہ کوئی معمولی وزنی چیز رکھ دی جائے (تاکہ میت کا پیٹ پھول نہ جائے) پھر میت کو کسی بلند چیز پر مثلاً چارپائی وغیرہ پر اس طرح چت لٹائے کہ پیر کے تلووں کا رُخ قبلہ کی طرف ہو اور سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھے تاکہ چہرہ کا رخ بھی قبلہ کی جانب ہو۔ میت کو چارپائی وغیرہ پر رکھنے کی صورت میں اس کے نیچے بستر نہ بچھائے، تاکہ بستر کی گرمی سے میت میں تغیر پیدا نہ ہو۔(فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل۔ ۲/ ۱۴۱) ان مذکورہ تمام امور کا میت کے محرم رشتہ داروں میں سے مشفق آدمی کیلئے جتنا سہولت و آسانی کے ساتھ ممکن ہو انجام دینا سنت ہے۔ اگر مرد کی میت ہو تو مرد اور عورت کی میت ہو تو عورت ان امور کو انجام دے۔ اگر محرم مرد کے ان امور کو کوئی محرم عورت انجام دے یا اس کے برعکس ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ اور فی الحال ممکن اور آسان ہو تو میت کے قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ میں جلدی کرے میت کے پاس اچھی باتیں کرنا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جب تم مریض یا میت کے پاس آؤ تو خیر کی باتیں کرو۔ اس لئے کہ تم جو کہتے ہو ملائکہ اس پر آمین کہتے ہیں۔(رواہ مسلم)

میت کے پیشانی کو بوسہ لینا

میت کے رشتہ داروں اور دوستوں کیلئے میت کے چہرہ کا بوسہ لینا جائز ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کو ان کی وفات کے بعد بوسہ لیا۔ (رواہ الترمذی)

(۲) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی جبین مبارک کو وفات کے بعد بوسہ لیا تھا۔ (رواہ البخاری) زمانہ جاہلیت کی طرح میت کے اوصاف بیان کر کے اس کے موت کی خبر دینا مکروہ ہے۔ البتہ اس پر نماز وغیرہ پڑھنے کیلئے خبر دینے میں کوئی حرج نہیں (جیسا کہ بخاری شریف کی روایات سے ثابت ہے)

باب میت کے غسل کا بیان

جب کسی کی موت کا یقین ہو جائے اور موت کی نشانیاں بھی ظاہر ہو جائیں مثلاً اس کے دونوں قدم ڈھیلے پڑ جائیں اور کھڑے نہ ہو سکیں، یا ناک ٹیڑھی ہو جائے یا دونوں کنپٹیاں اندر کو دھنس جائیں، یا چہرہ کی چمڑی پھیل جائے، یا دونوں ہتھیلیاں کلائی سے اکھڑ جائیں، یا دونوں خصیتیں اوپر کی جانب سکڑ جائیں، اور صرف چمڑی لٹکنے لگے، تو غسل اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ اور اگر موت کا یقین نہ ہو کہ بظاہر مرنے کا کوئی سبب نظر نہ آرہا ہو، اور احتمال ہو کہ اس پر سکتہ طاری ہوا ہو، یا گھبراہٹ وغیرہ کی نشانیاں ظاہر ہو جائیں، تو ایسی حالت میں جب تک بدن کی بو وغیرہ میں تبدیلی کے ذریعے موت کا یقین نہ ہو غسل وغیرہ میں جلدی نہ کرے۔

میت کو غسل دینے کے حقدار: غسل دینے کے سلسلے میں اصول تو یہ ہے کہ مرد کی میت ہو تو مرد غسل دے اور عورت کی میت ہو تو عورت غسل دے۔

مرد کو غسل دینے کیلئے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے امامت کیلئے بہتر ہے۔ لہٰذا نسبی رشتہ دار مرد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہونگے۔ (یعنی سب سے پہلے باپ کا حق ہے۔ پھر دادا پھر بیٹا پھر پوتا اسی طرح نیچے تک پھر حقیقی بھائی پھر علاتی بھائی (باپ شریک بھائی) پھر حقیقی بھتیجہ پھر علاتی بھتیجہ پھر حقیقی چچا پھر علاتی چچا۔ پھر حقیقی چچازاد بھائی پھر علاتی چچازاد بھائی اسی طرح آخر تک) اس کے بعد ذوی الارحام میں جو زیادہ قریبی ہے سب سے پہلے وہ پھر اس کے بعد والے رشتہ دار حقدار ہونگے۔ ان کے بعد اجنبی مردوں کو حق ہے پھر بیوی پھر محرم عورتوں کو حق ہے۔ عورت کو غسل دینے کیلئے ہر حال میں عورت ہی بہتر ہے۔ اور عورتوں میں بھی قریبی عورتیں بہتر ہیں۔ اور قریبی عورتوں میں بھی سب سے بہتر وہ عورت ہے جس کا اس میت عورت کے ساتھ محرمیت کا رشتہ ہو۔ اور محرمیت سے مراد یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو مرد قرار دیں تو دوسرے کا اس سے نکاح حرام ہو گا۔ اور محرمیت سے نسبی رشتہ داری مراد ہے نہ کہ رضاعی (دودھ کے رشتے سے محرم) (حاشیۃ الجمل) جیسے ماں۔ بیٹی۔ پوتی۔ نواسی۔ بہن۔ اگر دونوں عورتیں محرمیت میں برابر ہوں تو جو عورت عصبی اعتبار سے بھی تعلق رکھتی ہو وہ مقدم ہو گی۔ جیسے خالہ کے ساتھ پھوپھی جمع ہو تو پھوپھی مقدم ہو گی۔ اور محرمی رشتہ والی کوئی عورت نہ ہو تو دیگر قریبی رشتہ داروں میں اقرب فالا قرب کے اعتبار سے مقدم ہو گی۔ جیسے چچازاد بہن، پھوپھی زاد بہن، ماموں زاد بہن، خالہ زاد بہن، ان کے بعد اجنبی عورتوں کو حق ہے پھر شوہر کو اور شوہر کے بعد محرم مردوں کو غسل کا حق ہے۔

بہر حال مذکورہ ترتیب کے مطابق غسل جو بھی دے، اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، اور میت کا قاتل نہ ہو۔ اگر کافر ہو تو اسے غسل دینے کا حق نہ ہو گا۔ یہاں تک کہ ایک اجنبی مسلمان میت کے قریبی کافر پر مقدم ہو گا۔ غسل دینے کیلئے جسے پہلا حق حاصل

ہے اسے اپنا حق بعد والے کو دینا جائز ہے۔ اور بعد والے کو قبول کرنا بھی جائز ہے۔ مگر ایک شرط کے ساتھ کہ دونوں کی جنس ایک ہو مثلاً میت مرد ہے تو اپنا حق مرد ہی کو دے، ایسا نہیں کہ تمام مرد اپنا حق چھوڑ کر عورتوں کے سپرد کر دیں۔ اور عورت کی میت ہو تو عورت ہی کو اپنا حق دے، ایسا نہیں کہ تمام عورتیں اپنا حق چھوڑ کر مرد کے سپرد کر دیں۔

مرد کا عورت کو غسل دینا: تین اسباب میں سے کسی ایک سبب کے پائے جانے کی صورت میں مرد کیلئے عورت کو غسل دینا جائز ہے۔

(۱) **زوجیت:** مرد کیلئے اپنی مسلمان اور ذمی بیوی کو غسل دینا جائز ہے، خواہ اس مرد نے مرنے والی کی بہن سے یا اس کے علاوہ چار بیویوں سے شادی کی ہو۔

حدیث: آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے پہلے وفات پاگئی تو میں تجھے غسل اور کفن دونگا۔ (رواہ ابن ماجہ۔ احمد۔ دارقطنی۔ والبیہقی) اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ (اخرجہ الشافعی، دارقطنی)

(۲) **محرمیت۔** محرم مرد کیلئے محرم عورت کو غسل دینا جائز ہے۔

(۳) **مِلکِ یمین۔** آقا کیلئے اپنی باندی کو غسل دینا جائز ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ کسی کے نکاح یا عدت میں نہ ہو۔

عورت کیلئے اپنے شوہر کو غسل دینا جائز ہے۔ لیکن شوہر نے اسے طلاق رجعی دی ہو اور عدت میں ان دونوں میں سے کوئی ایک مر جائے تو دوسرے کو غسل دینا جائز نہیں، اس لئے کہ طلاق کی وجہ سے زندگی ہی میں ایک دوسرے کو دیکھنا حرام تھا۔

میاں بیوی میں سے کوئی ایک دوسرے کو غسل دے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر غسل دے تاکہ بدن کے کسی حصہ کو مس نہ ہو جائے۔ ہاتھ پر کپڑا لپیٹے بغیر غسل دے تو غسل تو صحیح ہو جائے گا، البتہ غاسل کا وضو ٹوٹ جائے گا جبکہ میت کو باوضو غسل دینا بہتر ہے۔ (جمل ۲/۱۵۱) کوئی مرد ایسی جگہ وفات پائے جہاں صرف اجنبی عورتیں موجود ہوں یا کوئی عورت مر جائے اور وہاں صرف اجنبی مرد موجود ہوں تو میت کو غسل نہ دیں بلکہ تیمم کرا کے دفن کریں۔ اور ہاتھ پر کپڑا وغیرہ لپیٹ کر تیمم کرائیں۔ (حاشیہ الجمل۔ ۲/۱۵۱) اتنا چھوٹا بچہ مر جائے جو ابھی حد شہوت کو نہ پہنچا ہو (لڑکا ہو یا لڑکی) تو اُسے مرد و عورت دونوں میں سے کوئی بھی غسل دے سکتا ہے۔ غسل دینے والوں میں سے ایک ہی درجہ کے دو آدمی جمع ہو جائیں مثلاً دو بھائی، یا دو بیویاں جمع ہو جائیں، اور ان میں سے ہر ایک غسل دینا چاہتا ہے تو قرعہ اندازی کی جائے جس کے نام قرعہ نکلے وہ غسل دے۔ (فتح الوہاب)

غسل کا حکم اور اس کا طریقہ: میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔ غسل کا ادنی درجہ یہ ہے کہ بدن پر جہاں نجاست لگی ہو اسے دور کرنے کے بعد مکمل بدن پر پانی بہائے۔ غاسلِ میت (غسل دینے والے) کیلئے غسل کی نیت کرنا ضروری نہیں، سنت ہے۔ کافر کا کسی مسلمان میت کو غسل دینا صحیح ہے۔ کوئی شخص ڈوب کر مر جائے (تو اس کا ڈوبنا غسل کیلئے کافی نہ ہو گا) بلکہ نعش ملنے کے بعد غسل دینا ضروری ہے۔

غسل کے آداب اور اس کا اکمل طریقہ: میت کو تنہائی میں غسل دینا واجب ہے۔ غسل کے وقت غسل دینے والے اور اس کا ہاتھ بٹانے والے کے علاوہ کوئی وہاں داخل نہ ہو۔ البتہ امام رویانیؒ اور دیگر حضرات نے ذکر کیا ہے کہ میت کے ولی کو وہاں جانے کی اجازت ہے، گرچہ وہ نہ غسل دے رہا ہو اور نہ اس کا ہاتھ بٹا رہا ہو۔ غسل دینے والوں کا طاق عدد میں ہونا مستحب ہے۔ غسل دینے والا

امانت دار ہو، غسل دیتے وقت میت میں کوئی اچھائی دیکھے (مثلاً چہرہ کا روشن ہونا۔ اور بدن سے خوشبو آنا) تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا مستحب ہے۔ اور کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے (مثلاً چہرہ کالا پڑنا۔ بدن سے بدبو کا آنا۔ صورت بدلنا) تو لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا حرام ہے۔ لیکن اگر بیان کرنے میں کوئی مصلحت ہو۔ مثلاً مرنے والا علی الاعلان بدعت کا کام کرتا تھا۔ تو اس کے عیب کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ دیگر لوگ بدعت سے رک جائیں۔ (حاشیۃ الروضہ)

غسل کیلئے بڑے برتن (مثلاً بالٹی وغیرہ) میں ٹھنڈا پانی لے۔ اور گرم پانی کے مقابلے میں ٹھنڈے پانی سے غسل دینا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن بہت سردی یا بدن میں میل وغیرہ ہونے کی وجہ سے گرم پانی استعمال کرنا چاہے تو جائز ہے۔ کھارے پانی سے غسل دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور کھارے پانی سے مراد وہ پانی ہے جو اصل کے اعتبار سے کھارا ہو (جیسے سمندر یا کھاڑی کا پانی) نہ کہ پانی میں نمک ملا کر کھارا کیا ہوا۔ (جمل ۱۴۵/۲) پانی کا برتن غسل کی جگہ سے دور رکھے تاکہ غسل کے وقت اس میں پانی کے چھینٹے نہ اُڑیں۔ غسل کا طریقہ یہ ہے کہ میت کو پرانا کرتہ پہنا کر، اگر کرتہ نہ ملے یا کرتہ میں غسل دینا ممکن نہ ہو تو ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصہ کو چھپا کر، غسل دینے کیلئے بنائے گئے تخت پر رکھنے کے بعد آہستہ سے اس طرح بٹھائے کہ پیچھے کی جانب مائل ہو، اور غسل دینے والا اپنا دایاں ہاتھ میت کے کندھے پر رکھے اور انگوٹھا گدّی کے گڑھے میں رکھے تاکہ سر کسی طرف جھک نہ جائے۔ اور میت کی پیٹھ کو اپنے داہنے گھٹنے سے ٹیک دے، پھر اپنے بائیں ہاتھ سے میت کے پیٹ کو اچھی طرح ملتا رہے تاکہ اندر سے فضلات نکل جائیں، اور معین شخص (ہاتھ بٹانے والا) کثرت سے پانی ڈالتا رہے تاکہ نکلنے والے فضلات کی بدبو نہ پھیلے۔ اس کے بعد میت کو چت لٹا کر بائیں ہاتھ کو صاف ستھرا کپڑا لپیٹ کر میت کی اگلی پچھلی شرمگاہ دھو ڈالے۔ پھر اس کپڑے کو نکال کر بائیں ہاتھ کو صابن وغیرہ سے اچھی طرح دھوئے اور میت کے بدن پر جہاں کہیں گندگی لگی ہو اسکو بھی خوب دھیان سے دھوئے۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا لپیٹ کر بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے دانتوں اور نتھنوں کو دھوئے۔ دھوتے وقت دانتوں کو نہ کھولے تاکہ پانی پیٹ میں نہ چلا جائے۔ پھر میت کو وضو کرائے (وضو کی نیت کرنا ضروری ہے اور نیت مسنون وضو کی کرے۔) (حاشیۃ الجمل۔ ۱۴۶/۲)

وضو میں ہر عضو کو تین تین بار دھوئے، مضمضہ اور استنشاق بھی کرائے، مگر مضمضہ اور استنشاق کے وقت سر کو تھوڑا مائل کرے، تاکہ پانی اندر نہ جائے۔ وضو سے فراغت کے بعد میت کے سر اور داڑھی کو ایسے پانی سے دھوئے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں۔ اگر سر اور داڑھی کے بال آپس میں چپکے ہوئے ہوں تو کشادہ دندانے والی کنگھی سے نرمی کے ساتھ کنگھی کرے، تاکہ کوئی بال اکھڑ نہ جائے۔ اگر کوئی بال اکھڑ جائے تو اسے کفن میں رکھے۔ اس کے بعد چت لٹانے کی حالت ہی میں دائیں اور بائیں بازو کے گردن سینہ ران اور قدم کے اگلے حصہ کو دھو ڈالے۔

اس کے بعد بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں طرف کے پچھلے اعضاء کو گدّی سے لے کر قدم تک تمام حصے کو دھو ڈالے۔ پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں طرف اسی طرح دھوئے۔ یہ مکمل غسل ایسے پانی سے دے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں۔ اس کے بعد خالص پانی سر سے لے کر قدم تک ڈالے۔ پھر تیسری مرتبہ خالص پانی میں تھوڑا کافور ملا کر سر سے پاؤں تک بہائے اور یہ تینوں ملا کر ایک مرتبہ غسل ہوا۔ اس طریقے سے تین مرتبہ غسل دینا مستحب ہے۔ اور تینوں مرتبہ خالص پانی میں کافور ملانا مستحب ہے۔ مگر آخری بار پانی ڈالتے وقت کافور ملانے کی زیادہ تاکید ہے۔ (تخت پر میت کے سر رکھنے کی جگہ تھوڑی اونچی و بلند ہو تاکہ میت کے نیچے پانی جمع نہ رہے)

حدیث: حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ایسے وقت تشریف لائے جس وقت ہم آپ کی بیٹی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) کو غسل دے رہے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے ایسے پانی سے جس میں بیری کے پتے ڈالے ہوئے ہوں“ تین یا پانچ مرتبہ یا اگر تم اس سے زیادہ تعداد میں غسل کی ضرورت محسوس کرو تو (زیادہ تعداد میں) غسل دو۔ اور آخری (غسل میں پانی میں) تھوڑا کافور ملاؤ۔ اور دائیں جانب سے اور مواضع وضو (وضو کی جگہوں) سے غسل کی ابتداء کرو۔ (رواہ البخاری و مسلم)

غسل دینے کیلئے سب سے بہترین صورت یہ ہے کہ مذکورہ طریقہ کے مطابق سب سے پہلے ایسے پانی سے غسل دے جس میں بیری کے پتے ڈالے گئے ہوں، پھر خالص پانی سر سے قدم تک بہائے، پھر دوبارہ بیری کے پتے ڈالے ہوئے پانی سے غسل دے، پھر خالص پانی بہائے پھر سہ بارہ بیری کے پتے ڈالے ہوئے پانی سے غسل دے پھر خالص پانی بہائے۔ اس کے بعد خالص پانی میں تھوڑا کافور ملا کر تین مرتبہ سر سے قدم تک بہائے (حاشیۃ الجمل۔ ۲/۱۴۷) اگر تین مرتبہ غسل دینے کے باوجود بھی صفائی حاصل نہ ہو تو صفائی حاصل ہونے تک غسل دیتا رہے، اگر مکمل صفائی جفت عدد میں غسل دینے سے حاصل ہو تو مزید ایک اور مرتبہ غسل دے کر طاق عدد کرنا مستحب ہے (یعنی مثلاً چار مرتبہ غسل دینے کے بعد مکمل صفائی حاصل ہو تو پانچویں مرتبہ بھی دینا مستحب ہے تاکہ طاق عدد کی رعایت ہو) ہر مرتبہ کے غسل میں پہلی اور دوسری بار جس پانی سے غسل دیا جاتا ہے وہ غسل شمار نہیں ہوتا۔ (کیونکہ پہلی بار استعمال ہونے والا پانی بیری کے پتے ہونے کی وجہ سے متغیر رہتا ہے اور دوسری بار استعمال ہونے والا پانی بدن سے پتوں کا اثر زائل کرنے کی وجہ سے کسی حد تک متغیر ہو جاتا ہے۔) البتہ تیسری مرتبہ کافور ملا کر جس پانی سے غسل دیا جاتا ہے وہ غسل شمار ہوتا ہے۔

غسل کے بعد سابقہ طریقے کے مطابق دوبارہ میت کے جوڑوں کو نرم کرے تاکہ کفن پہنانے میں آسانی ہو۔ غسل کے بعد میت کے بدن کو کسی کپڑے کے ذریعے اچھی طرح پونچھے تاکہ کفن تر نہ ہو جائے۔ میت کو (غسل کے وقت) اوندھا منہ لٹانا جائز نہیں۔ غسل دیتے وقت قریب میں انگیٹھی جلا کر اس میں خوشبو ڈال دے، تاکہ میت کے پیٹ سے نکلنے والے فضلات کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔ غسل دینے والا ہر مرتبہ کے غسل میں میت کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا رہے۔ اور پہلے غسل کے مقابلہ میں بعد والے غسل میں کچھ نرمی سے ہاتھ پھیرے۔ اگر آخری غسل میں یا غسل کے بعد کوئی نجاست نکلے تو صرف نجاست کا دھونا واجب ہے۔ نئے سرے سے غسل دینے کی ضرورت نہیں، چاہے پھر وہ نجاست اگلی پچھلی شرمگاہ سے نکلے یا کسی اور راستہ سے نکلے۔ میت کو کفن میں لپیٹنے سے پہلے نکلے یا بعد میں۔ مردہ عورت کو غسل دینے کے بعد اس کے بدن کو کسی مرد کے چھونے کی وجہ سے نہ دوبارہ غسل کی ضرورت ہے اور نہ وضو کی۔ اسی طرح غسل کے بعد کسی مردہ عورت سے صحبت کی گئی تب بھی اس مردہ پر نہ غسل واجب ہے اور نہ وضو۔ غسل دیتے وقت میت کے ستر (یعنی ناف سے گھٹنے تک کے حصہ) کو دیکھنا حرام ہے۔ چھوٹے بچے یا بچی کی میت اس سے مستثنیٰ ہے۔ (جمل) بلکہ غسل دینے والے کیلئے بلا کسی ضرورت میت کے بدن کے کسی حصہ کو دیکھنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر ضرورت ہو جیسے غسل شدہ حصہ کو پہچاننا ہو تو دیکھنا جائز ہے۔ جو آدمی غسل دینے والے کے ساتھ بحیثیت مُعین ہو، وہ بلا ضرورت میت کے کسی بھی حصے کو نہ دیکھے۔

کوئی مسلمان جل کر مر جائے (اور جلنے کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہو گئی ہو) کہ غسل دینے کی صورت میں بدن کے گلنے کا اندیشہ ہو تو غسل نہ دے بلکہ تیمم کرائے۔

اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ غسل دیں گے تو قبر میں جلد بوسیدہ اور سڑ گل جائیگا تو ایسی صورت میں غسل ہی دیا جائے گا تیمم نہ کرائے، کیونکہ قبر میں تو سبھی کو بوسیدہ ہونا ہے۔

جنبی اور حائضہ عورت کو بلا کراہت میت کو غسل دینا جائز ہے۔ اگر جنبی یا حائضہ عورت مر جائے تو ایک ہی غسل کافی ہے (الگ الگ دو غسل دینے کی ضرورت نہیں، یعنی ایک جنابت اور حیض کا اور دوسرا موت کی وجہ سے) اگر کسی میت عورت کے بال لمبے ہوں تو اس کی تین چوٹیاں بنا کر پیٹھ پیچھے ڈالنا سنت ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں مروی ہے۔

کسی کی بیک وقت تمام بیویاں گرنے یا ڈوبنے یا کسی اور سبب سے مر جائیں تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی جسکے نام قرعہ نکلے گا اُسے پہلے غسل دے۔ کسی کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں مسلمان عورتیں اور کفار مرد موجود ہوں تو کافر غسل دے اور عورتیں نماز جنازہ پڑھیں۔

میت کے بدن کو کسی کپڑے سے پونچھنے کے بعد وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوتا۔

مُحرم میت کا غسل: کوئی حالتِ احرام میں مر جائے تو اسے خوشبو لگانا، اس کے ناخن اور بال کاٹنا حرام ہے، اگر محرم مرد ہو تو اسے سلا ہوا کپڑا پہنانا اور اس کا سر ڈھانپنا جائز نہیں، عورت کا چہرہ ڈھانپنا جائز نہیں (خلاصہ یہ ہے کہ موت کے بعد بھی احرام کی پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے)

حدیث: ایک شخص کا حالت احرام میں انتقال ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اسے غسل دے کر کفن پہناؤ مگر خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر ڈھانپنا اسلئے کہ قیامت کے دن وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا۔(صحیحین)

محرم کو غسل دیتے وقت خوشبو کی دھونی دینے میں کوئی حرج نہیں جیسے کہ اگر محرم کسی عطر فروش کے پاس بیٹھے تو حرج نہیں (لیکن خوشبو کے لئے کسی محرم کا عطر کی دوکان میں بیٹھنا مکروہ ہے۔ جمل)

محرم کے علاوہ دیگر میت کے بھی ناخن کاٹنا، بغل کے بال اور موئے زیر ناف نکالنا اور مونچھ کترنا مکروہ ہے، کیونکہ اس کے متعلق آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی معتمد چیز منقول نہیں، نیز میت کے اجزاء قابل احترام ہیں، توان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ کوئی ختنہ کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کی ختنہ کرنے کی ضرورت نہیں (اگر ختنہ کی چمڑی کے نیچے پانی نہ پہنچ پائے تو اس کی طرف سے تیمم کرائے۔ جمل ۱۵۴/۲)

کوئی عورت عدت وسوگ کی حالت میں مر جائے تو اسے خوشبو لگانا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص محرم میت کو خوشبو لگائے یا سلا ہوا کپڑا پہنائے تو ایسا شخص گنہگار ہوگا، مگر فدیہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مونچھ کا استرے وغیرہ کے ذریعے حلق کرنا مکروہ ہے۔

کفن کا بیان

کفن پہنانا فرض کفایہ ہے۔ سفید رنگ کا کفن ہونا مستحب ہے۔

حدیث: سفید کپڑے پہنا کرو کہ تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہے، اور اسی میں مردوں کو کفنایا کرو، (رواہ الترمذی) میت کو زندگی میں جو کپڑا پہننا جائز تھا، اسی جنس کا کفن ہونا ضروری ہے۔ عورت کو ریشم کے، زعفرانی اور زرد رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے میں کفن دینا کراہت کے ساتھ جائز ہے، اور مرد کیلئے حرام ہے۔ لیکن اگر ریشم کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ ملے تو مرد کیلئے بھی ریشم کا کفن پہنانا جائز ہے (حاشیۃ الروضہ) مباح کفنوں میں میت کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ میت مالدار ہے تو کفن کیلئے عمدہ کپڑا استعمال کرے اور متوسط ہے تو متوسط اور غریب ہو تو موٹا اور کھردرا قسم کا کپڑا استعمال کرے۔

کفن میں غلو کرنا (یعنی اسراف کرنا) مکروہ ھے: کیونکہ ابو دائود کی روایت ہے "کفن میں غلو نہ کرو، اس لئے کہ وہ بڑی جلد سڑ گل جائے گا" (رواہ ابوداود باسناد حسن) اِمام قاضی حسینؒ فرماتے ہیں کہ کفن کیلئے نئے کپڑے کے بمقابل پرانا دھویا ہوا کپڑا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن چونکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو جدید کپڑوں میں کفنایا گیا اور بظاہر صحابہ کے اتفاق سے تھا اس لئے بعض حضرات نے نقل و دلیل کی روسے جدید کو بہتر سمجھا ہے۔ (جمل ۲/۱۶۲) کفن کا سفید صاف ستھرا اور موٹا ہونا مستحب ہے۔ قیمتی ہونا مستحب نہیں۔

کفن کی اقل واکمل مقدار: کفن کیلئے کم سے کم ایک کپڑا ہونا ضروری ہے اور ایک کپڑا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے جس سے ستر عورت ہو سکے۔ اور ستر کی مقدار مذکر و مونث کے لحاظ سے مختلف ہو گی۔ اور کفن کی اکمل مقدار یہ ہے کہ مرد کیلئے تین کپڑے ہوں۔ اور عورت کیلئے پانچ۔ تہبند قمیص، اوڑھنی اور دو چادریں۔ مرد کو تین کپڑوں میں کفن دینا افضل ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو تین سفید یمنی کپڑوں میں کفن دیا گیا اور اس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔ (رواہ الشیخان)

اور اگر پانچ کپڑوں میں کفن دے تو جائز ہے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا۔ (رواہ البیہقی) کہ تین چادریں عمامہ اور قمیص تھا) لیکن یہ مستحب نہیں اور عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے۔

حدیث: آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو پانچ کپڑوں میں کفن دینے کا حکم دیا، (رواہ ابوداود) اور پانچ سے زیادہ کپڑے استعمال کرنا مکروہ ہے۔

اگر مرد و عورت کے کفن کیلئے تین کپڑے استعمال کرے، تو مستحب یہ ہے کہ تین چادروں میں کفن دیا جائے اور تینوں چادریں لمبائی چوڑائی میں ایسی ہوں کہ ہر ایک چادر پورے بدن کو چھپائے، اور تین چادریں استعمال کرنے کی صورت میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں، البتہ پانچ کپڑے استعمال کرنے کی صورت میں فرق ہے۔ مرد کیلئے پانچ کپڑے استعمال کرے، تو اس میں تین چادریں ایک کرتہ اور عمامہ ہو۔ اور سب سے پہلے عمامہ اور قمیص پہنائے اس کے بعد تین چادریں لپیٹے۔ اور عورت کیلئے پانچ کپڑے استعمال کرے تو اس میں تہبند قمیص اوڑھنی اور دو چادریں ہوں۔ اور سب سے پہلے ازار یعنی تہبند پہنائے (اور تہبند سے ناف سے گھٹنے تک ڈھانکے) پھر قمیص (اور قمیص سے ناف سے اوپر تک کے حصہ کو ڈھانپے۔) پھر اوڑھنی۔ (اور اوڑھنی سے سر ڈھانپے) اس کے بعد دو چادریں لپیٹے۔ (اور چادروں سے پورا بدن ڈھانپے)

چادر لپیٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے اچھی اور کشادہ چادر پہلے بچھائے، پھر دوسری اور تیسری چادر بچھائے۔ اور ہر ایک پر خوشبو اور کافور چھڑکے (خوشبو کا ڈالنا مستحب ہے واجب نہیں) پھر میت کو اس پر آہستہ سے چت رکھے۔ اس کے بعد دھنی ہوئی تھوڑی روئی لے کر اس پر خوشبو اور کافور ڈال کر دوسرینوں کے درمیان اتنا ٹھوس دے کہ پچھلی شرمگاہ کے حلقہ تک پہنچ جائے تاکہ شرمگاہ سے کوئی چیز نہ نکل سکے۔ مگر شرمگاہ میں داخل نہ کرے۔ اور مزید مضبوطی کیلئے اوپر سے لنگوٹ کی طرح ایک کپڑا باندھے۔ پھر روئی میں خوشبو اور کافور ملا کر ناک کے نتھنے، کان، آنکھ، کھلے زخموں، اور سجدہ کی جگہوں (یعنی ان اعضاء پر جو سجدہ میں زمین پر لگ جاتے ہیں: پیشانی، ناک، دونوں ہتھیلیوں کا پیٹ، دونوں گھٹنے، اور دونوں قدم کی انگلیاں) پر رکھے۔ اس کے بعد بائیں جانب سے پھر دائیں جانب سے کفن لپیٹنا شروع کرے۔ سب سے پہلے اندرونی چادر لپیٹے پھر دوسری، پھر تیسری، کفن لپیٹنے کے بعد سر کے پاس چادر کا جو زائد حصہ ہو اُسے عمامہ کی طرح جمع کر کے چہرہ اور سینہ پر جہاں تک پہنچ سکے ڈال دے، اور پاؤں کے پاس جو زائد حصہ ہو اُسے قدم اور پنڈلی پر ڈال دے۔ بہتر تو یہ ہے کہ میت کو ابتداءً جب کفن

پر رکھے تو اس طرح رکھے کہ کفن کا زائد حصہ سر کے پاس زیادہ رہے پھر کفنوں کو رسی سے باندھے تاکہ اٹھاتے وقت کفن کھل نہ جائے، اور قبر میں اتارنے کے بعد اس رسی کو کھول دے۔ اگر میت محرم نہ ہو تو کفن کو عود کے ذریعہ دھونی دینا مستحب ہے۔ بڑے آدمی کی طرح چھوٹے بچہ کو بھی تین کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے۔ اگر ایسے کپڑے میں کفن دیا جائے، جس میں سر اور پیر پوری طرح نہیں چھپ رہے ہوں، تو صرف سر کو ڈھانپ دے۔ کسی میت نے یہ وصیت کی کہ اس کے کفن کیلئے ایک کپڑا بھی استعمال نہ کرے تو اس کی وصیت نافذ نہ ہو گی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ البتہ دوسرے اور تیسرے کپڑے کے ساقط کرنے کی وصیت کی تو یہ وصیت نافذ ہو گی، کیونکہ یہ میت کا حق ہے۔ اگر میت نے کفن کے متعلق کچھ وصیت نہ کی ہو مگر ورثاء کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ ایک کپڑے میں کفن دیا جائے یا تین کپڑوں میں یا تمام اس پر متفق ہو گئے کہ ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے، تو ایسی صورت میں کفن کیلئے تین ہی کپڑے استعمال کریں۔

میت پر اتنا قرض ہو کہ اس کی ادائیگی میں سارا مال ختم ہو جائیگا، اور ایسی صورت میں قرض خواہ حضرات ایک ہی کپڑے میں کفن دینے کا مطالبہ کریں، تو ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے۔

کفن کے مصارف (اخراجات): کفن کا خرچ ترکہ کے راس المال (یعنی کل ترکہ) میں سے لیا جائے اور یہ خرچ قرض کی ادائیگی، وصیت کے نفاذ اور میراث تقسیم کرنے سے پہلے نکالا جائے۔ کفن کیلئے شیء مرھون کو (یعنی رھن کے طور پر میت کی کوئی چیز کسی کے قرض کے مقابلہ رکھی ہوئی ہو) اور جانی (جانی سے مراد میت کا غلام جس نے کسی پر جنایت کی ہو) کو اور ایسے مال کو جس میں زکوۃ واجب ہو چکی ہو بیچا نہ جائے۔

اگر میت نے اپنے پیچھے کچھ مال نہ چھوڑا ہو، تو اُس کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اس شخص پر ہو گی جس کے ذمہ اس کا نان نفقہ تھا۔ لہٰذا ایسی میت (یعنی جس نے کچھ مال نہ چھوڑا ہو) کے قریبی آدمی پر اس کے کفن کی ذمہ داری ہو گی۔ اور ایسے شخص پر میت کیلئے ایک سے زائد کپڑوں میں کفن دینا ضروری نہیں۔ اولاد کے کفن کی ذمہ داری باپ پر ہو گی۔ اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، کیونکہ بچے موت کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو گئے، اور عاجز بچوں کا نفقہ واجب ہے، بیوی کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری شوہر پر ہے۔ شوہر کے پاس مال نہ ہو، تو پھر بیوی کے مال سے کفن وغیرہ لایا جائے۔ میت کے پاس نہ کچھ مال ہے اور نہ اس کا ایسا کوئی قریبی رشتہ دار جس کے ذمہ اس کا نفقہ ہو، تو پھر اس کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری بیت المال پر ہو گی، لیکن ایسی صورت میں اسے ایک ہی کپڑے میں کفن دیا جائے اور اگر ایسی کسی حالت میں اُس نے ایک ہی کپڑا اپنے پیچھے چھوڑا ہے تو اُسی کپڑے میں کفن دیا جائے اور بیت المال سے دیگر زائد کپڑے نہ لے۔ اور اگر بیت المال میں بھی مال نہ ہو (یا بیت المال کا کوئی نظم ہی نہ ہو) تو عام مسلمانوں پر اس کے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ہو گی۔ جن کے پاس اپنے سالانہ مصارف سے زائد تجہیز کی گنجائش ہو ایسے جن افراد سے تجہیز کا مطالبہ کیا جائے، ان پر لازم ہے تاکہ ایک دوسرے پر ٹالتے نہ رہیں۔ (جمل ۲/ ۱۶۴) مگر ایسی صورت میں ایک سے زائد کپڑوں میں کفن دینا ضروری نہیں۔ امام صمیریؒ فرماتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنے لئے کفن تیار کرنا مستحب نہیں، تاکہ اس کا حساب دینا نہ پڑے، ہاں اگر کفن کے حلال کمائی سے ہونے کا کامل یقین ہو یا علماء، عابدین اور بزرگوں سے بطور ہدیہ ملا ہو تو اس کو کفن کے طور پر محفوظ رکھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا کرنا بہتر ہے کیونکہ بعض صحابہ کرام سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

باب۔ جنازہ اٹھانے کا بیان (میت کو کندھا دینا)

جنازہ اٹھانے میں نہ ذلت ہے اور نہ اس سے مروءۃ ختم ہوتی ہے، بلکہ یہ تو ایک نیک کام ہے۔ اور میت کا اکرام ہے۔ اور

آپ ﷺ صحابہ کرام اور حضرات تابعینؒ کے فعل سے ثابت ہے۔ جنازہ اٹھانے کے ذمہ دار مرد ہیں، میت مرد کی ہو یا عورت کی۔ جنازہ غافل اور سست آدمی کی طرح نہ اٹھائے، اور نہ اس طریقہ پر اٹھائے جس سے میت کے گرنے کا اندیشہ ہو۔

جنازہ اٹھانے کا طریقہ: جنازہ اٹھانے کے دو طریقے ہیں (۱) دو ستون کے درمیان اور وہ اس طرح کہ آگے کے دو ستونوں کو ایک آدمی اپنے دونوں کندھوں پر اٹھائے اور پچھلے دو ستونوں کو دو آدمی اٹھائیں ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب اور پچھلے ستونوں کے درمیان کوئی نہ رہے کیونکہ اسے چلنے میں دشواری ہوگی۔ اگر آگے کا آدمی اکیلا نہیں اٹھا سکتا تو ستونوں کے باہر سے دو آدمی ایک ایک ستون کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس کا تعاون کریں۔

(۲) **تربیع:** یعنی آگے کے جانب دو آدمی ہوں ایک دائیں ستون کو اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دوسرا بائیں ستون کو اپنے دائیں کندھے پر اٹھائے۔ اور پیچھے کے ستون کو بھی دو آدمی اسی طرح اٹھائیں۔

کوئی شخص تربیع والے طریقے کے مطابق جنازہ اٹھانا چاہتا ہے، تو آگے کے بائیں ستون سے ابتداء کرے کہ سب سے پہلے آگے کے بائیں ستون کو اپنے دائیں کندھے پر اٹھائے، (کیونکہ اس میں اپنی اور میت کی دائیں جانب سے ابتداء پائی جاتی ہے۔ جمل) پھر اُسے دوسرے کے سپرد کرے، اس کے بعد پیچھے کے بائیں ستون کو دائیں کندھے پر اٹھائے، پھر جنازہ کے سامنے سے آگے بڑھ کر آگے کے دائیں ستون کو اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے، پھر پیچھے کے دائیں ستون کو بھی اسی طرح اٹھائے۔ اور اگر پہلے طریقہ کے مطابق اٹھانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے آگے کے دونوں ستون کو اپنے دونوں کندھے پر اٹھائے، پھر پیچھے کے بائیں ستون کو دائیں کندھے پر اٹھائے، اس کے بعد جنازہ کے سامنے سے آگے بڑھ کر پیچھے کے دائیں ستون کو بائیں کندھے پر اٹھائے۔ (حاشیہ الجمل۔ ۱۶۵/۲) جنازہ اٹھانے کے مذکورہ دونوں طریقہ جائز ہیں۔ البتہ افضل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان جمع کرے، یعنی کبھی تو پہلے طریقہ کے مطابق اٹھائے۔ اور کبھی دوسرے کے مطابق اگر کسی ایک طریقے کے مطابق ہی اٹھانا ہے تو پہلا طریقہ افضل ہے۔

فصل - جنازہ لے چلنا

سوار اور پیدل چلنے والے کیلئے جنازہ کے آگے چلنا اور اتنا قریب رہنا افضل ہے کہ اگر پیچھے مڑ کر دیکھے تو جنازہ نظر آئے۔

حدیث: (۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے میں نے آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمرؓ کو جنازہ کے آگے چلتے دیکھا (احمد۔ اصحاب السنن۔ دارقطنی۔ بیہقی)

(۲) حضرت عمرؓ لوگوں کو مار کر حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے جنازہ کے آگے چلاتے تھے۔ (مصنف عبد الرزاق)

(۳) حضرت صالح کا ارشاد ہے! میں نے حضرت ابو ہریرہؓ، ابو قتادہؓ، ابن عمرؓ، اور ابو اُسَیدؓ، کو جنازہ کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (ابن ابی شیبہ) (تحفۃ الحوذی۔ ۹۰/۴) جنازہ کو چھوڑ کر پہلے ہی قبرستان نہ پہنچے (بلکہ ساتھ رہے) لیکن اگر کوئی جنازہ سے پہلے قبرستان پہنچ جائے تو حرج نہیں۔ پھر چاہے تو (قبرستان میں) کھڑے جنازہ کا انتظار کرتا رہے یا بیٹھ جائے۔ جنازہ کو جلدی جلدی لے چلنا سنت ہے۔

حدیث: جنازہ کو جلدی لے چلو، اس لئے کہ اگر وہ نیک ہے تو وہ بہت اچھی چیز ہے، جس کی طرف تم لے جا رہے ہو اور اگر اس

کے علاوہ ہو تو بری چیز ہے جس کو تم اپنے کندھوں سے اتار دیتے ہو۔ (متفق علیہ) لیکن اگر جلدی چلنے سے میت میں تغیر پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، تو پھر آہستہ چلے، اور جلدی چلنے سے مراد عادۃً جو چال ہے اس سے کچھ تیز چال کرے۔ بالکل تیز چلنا (دوڑنا) مراد نہیں، ہاں اگر میت میں تغیر پھٹنے یا پھولنے کا اندیشہ ہو تو پھر اور زیادہ تیز چلے۔ بلا عذر جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جانا مکروہ ہے کوئی عذر ہو تو حرج نہیں البتہ واپس لوٹتے وقت سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں (کیونکہ مسلم شریف میں آپ ﷺ کا واپسی میں سوار ہونا مذکور ہے۔ فتح الوہاب)

حدیث: ایک جنازہ میں آپ ﷺ نے بعض لوگوں کو سوار دیکھا تو فرمایا! تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ اللہ تعالیٰ کے فرشتے تو پیدل چل رہے ہیں اور تم لوگ جانوروں کی پشت پر ہو (ترمذی) اگر عورت کی میت ہو تو (مزید) ستر کے لئے اس کی نعش پر قبہ نما بنانا مستحب ہے (جیسا کہ آجکل ہوتا ہے)

جنازہ کے ساتھ جانا: مردوں کیلئے جنازہ کے ساتھ جانا سنت موکدہ ہے۔

حدیث: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے۔ ہمیں آپ ﷺ نے جنازہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا الخ (متفق علیہ) عورتوں کیلئے جانا مکروہ ہے جبکہ جانے کی صورت میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ حرام ہے۔ مسلمان کیلئے اس کے قریبی (رشتہ دار) کافر کے جنازہ کے ساتھ جانے میں حرج نہیں۔ جنازہ کے ساتھ انگیٹھی وغیرہ میں آگ لے جانا مکروہ ہے۔ اسی طرح قبر کے پاس انگیٹھی کا ہونا، بھی مکروہ ہے جنازہ کے پیچھے نوحہ کرنا، چیخنا، چلاّنا حرام ہے، جنازہ کے ساتھ چلتے وقت شور کرنا دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے۔ (کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازہ کے ساتھ شور وغل کو ناپسند فرماتے تھے۔) (بیہقی) بلکہ مستحب یہ ہے کہ موت اور موت کے بعد آنے والے احوال اور دنیا کے فنا ہونے اور اس کے علاوہ دیگر امور آخرت کے متعلق غور کرے۔ تلاوت و ذکر وغیرہ بھی بلند آواز سے نہ کرے۔ آہستہ تلاوت و ذکر مسنون ہے (جمل) اگر کسی بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس سے جنازہ گذرے اور جنازے کے ساتھ جانے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے لئے کھڑا رہنا مستحب نہیں ہے۔ (بعض علماء نے اس صورت میں قیام کو مستحب قرار دیا ہے) اور ایسے آدمی کا اس میت کیلئے دعا کرنا اور تعریف کے لائق ہو تو تعریف کرنا اور ان الفاظ کا کہنا مستحب ہے۔ "سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوْتُ يَا سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" (مغنی المحتاج ۱/۳۴۰) طبرانی میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب کسی کا جنازہ دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ "هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا" نیز طبرانی نے آپ ﷺ سے اس روایت کو پیش کیا ہے: جو کسی جنازہ کو دیکھ کر یہ پڑھے "اَللّٰهُ اَكْبَرُ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا" تو اس کے حق میں بیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ (جمل ۲/۱۶۵)

باب۔ نماز جنازہ کا بیان

نماز جنازہ ۱ھ میں مدینہ میں فرض ہوئی۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے اَسعد بن زُرَارہ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور سب سے پہلے بَرَاء بن مَعْرُور کی قبر پر نماز ادا کی۔ اور سب سے پہلے غائبانہ نماز جنازہ نجاشی کی پڑھی۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۲/۲۲) نماز جنازہ فرض کفایہ ہے۔ جس پر نماز ادا کی جاتی ہے اس میں تین امور کا پایا جانا ضروری ہے (۱) میت ہو (۲) مسلمان ہو۔ (۳) شہید نہ ہو۔

کسی زندہ مسلمان (کے بدن) کا کچھ حصہ (مثلاً ہاتھ پیر وغیرہ) مل جائے تو اس ملے ہوئے جز پر نماز نہ پڑھے، بلکہ کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دے، اگر کسی مردہ آدمی کا کوئی جز ملے چاہے جز معمولی کیوں نہ ہو اسے غسل دے کر کپڑے میں لپیٹے پھر اس پر نماز جنازہ

پڑھ کر دفن کرے۔ عضو پر نماز پڑھنے کی صورت میں پورے میت کی نیت کرے، نہ کہ صرف متعلقہ عضو کی۔

حدیث: واقعہ جمل میں حضرت عبد الرحمن بن عتاب بن اسید کا انتقال ہوا تو ان کا ایک ہاتھ پرندہ نے اٹھا کر مکہ میں ڈالا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے ہاتھ پر نماز جنازہ ادا کی (فتح الوھاب) اگر صرف ایک بال یا ناخن ملے تو اس کیلئے نہ غسل ہے اور نہ نماز (حاشیۃ الروضہ۔جمل)

زندگی میں جدا ہونے والے اجزاء کا حکم: زندہ آدمی کے بدن سے نکلے ہوئے ناخن اور بال کو (مثلاً کنگھی وغیرہ کرنے سے بال نکل جائے یا ناخن کاٹنے کی وجہ سے الگ ہو جائے) اور پچھنے لگوانے اور حجامت کروانے کی وجہ سے نکلے ہوئے خون کو اور عورت کے پیٹ سے گرے ہوئے خون اور گوشت کے لوتھڑے کو دفن کرنا مستحب ہے۔

دارالاسلام میں کسی میت کا کوئی عضو یا پوری میت مل جائے، لیکن اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہ ہو، تو اسپر نماز جنازہ پڑھے، اسلئے کہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو گا۔

نماز جنازہ پڑھانے کا حقدار کون: نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے سب سے بہتر اس کا ولی ہے۔ اور ولی سے مراد اس کا رشتہ دار۔ لہٰذا کسی اجنبی کو رشتہ دار سے پہلے نماز پڑھانے کا حق نہ ہو گا۔ ہاں اگر قریبی کوئی عورت موجود ہو اور وہاں (قریبی مرد کے بجائے) صرف اجنبی مرد موجود ہو تو اجنبی مرد نماز پڑھانے کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اگر کوئی اجنبی ممیز بچہ بھی موجود ہو، تو وہ اس قریبی عورت پر مقدم ہو گا۔ تمام نمازوں میں عورتوں کی امامت کیلئے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ بہتر ہے۔ نماز جنازہ کی امامت کے لئے رشتہ داروں میں بھی سب سے بہتر میت کا باپ ہے پھر دادا اسی طرح اوپر تک۔ (یعنی پر دادا، سکڑ دادا) پھر بیٹا۔ پھر پوتا ایسے ہی نیچے تک (یعنی پڑپوتا وغیرہ) پھر حقیقی بھائی، پھر علاتی بھائی (باپ شریک بھائی) پھر حقیقی بھتیجہ، پھر علاتی بھتیجہ، پھر حقیقی چچا، پھر علاتی چچا، پھر حقیقی چچا کا بیٹا، پھر علاتی چچا کا بیٹا، پھر باپ کا چچا، پھر باپ کے چچا کا بیٹا، پھر دادا کا چچا، پھر دادا کے چچا کا بیٹا، یعنی وراثت کی ترتیب کے مطابق۔

اگر دو چچازاد بھائی ایک ساتھ جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک ماں شریک بھائی ہو تو ماں شریک بھائی مقدم ہو گا۔ (المجموع ۔۵/۲۱۸)

اگر میت کے عصبہ موجود نہ ہوں تو پھر ذوی الارحام کو حق ہو گا۔ اور ذوی الارحام میں پہلے نانا کو حق ہو گا، پھر ماں شریک بھائی کو، پھر ماموں، پھر اخیافی چچا، (باپ کا ماں شریک بھائی) اگر میت کسی اجنبی شخص کو نماز پڑھانے کی وصیت کرے تو اس کی وصیت نافذ نہ ہو گی (یعنی اس وصیت کا نفاذ ضروری نہیں۔ گرچہ میت کی غرض کے پیش نظر اسے امام بنانا بہتر ہے۔) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صہیب رضی اللہ عنہ، کے متعلق اپنی نماز جنازہ کے امامت کی وصیت کی تھی۔ اور ان کے ذمہ داروں نے اس کی اجازت دی (بشری الکریم۔ ۲/ ۳۵) اگر ایک ہی درجہ کے دو آدمی جمع ہو جائیں جیسے دو بیٹے یا دو بھائی اور دونوں میں نماز پڑھانے کے متعلق نزاع و اختلاف ہو جائے، تو دونوں میں عادل (یعنی جو بدعتی و فاسق نہ ہو) اور اسلام میں عمر کے لحاظ سے جو بڑا ہو وہ مقدم ہو گا۔ اگر عمر میں دونوں برابر ہوں، تو ان میں سے فقیہ کو مقدم کرے۔ اور اگر دونوں فقیہ ہوں تو قاری کو مقدم کرے۔ (المجموع۔۵/ ۲۱۹) دونوں میں ایک غلام اور ایک آزاد ہو تو آزاد مقدم ہو گا، چاہے غلام فقیہ اور قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ تمام رشتہ دار ہر اعتبار سے برابر ہوں اور ان میں سے کسی ایک کی امامت پر سب راضی ہوں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ قرعہ اندازی کریں۔

امام کہاں کھڑا ہو: امام کا نماز پڑھاتے وقت عورت کی کمر کے پاس اور مرد کے سر کے پاس کھڑا رہنا مستحب ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مرد کے جنازہ میں سر کے پاس اور عورت کے جنازہ میں کمر کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ تو آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کرتے تھے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا، جی ہاں (رواہ ابوداود والترمذی وحسنہ) اگر سامنے موجود جنازہ کے آگے یا قبر کے آگے کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو صحیح نہ ہو گی۔

بیک وقت کئی جنائز: اگر بیک وقت کئی جنازے آجائیں، تو ہر ایک پر الگ الگ نماز پڑھنا جائز ہے، اور یہی زیادہ بہتر ہے، اور تمام پر ایک ہی نماز پڑھنا بھی جائز ہے، مگر ایسی صورت میں تمام جنازوں کو قبلے کی جانب امام کے سامنے ایک کے پیچھے ایک رکھے۔ خواہ تمام جنازے ایک ہی نوع کے ہوں (یعنی سارے جنازے مرد کے یا سارے جنازے عورت کے ہوں) یا مختلف النوع ہوں (یعنی مرد اور عورت دونوں کے ہوں) البتہ مختلف النوع جنازے بیک وقت آئے ہوں تو مرد کے جنازے کو امام کے قریب رکھے، پھر بچے کے، پھر خنثیٰ مشکل کے، پھر عورت کے جنازے کو رکھے۔

حدیث: (۱) حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن عمر بن الخطاب اور ان کی والدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے جنازے پر بیک وقت نماز پڑھائی اور لڑکے کے جنازے کو پہلے (امام کے قریب) رکھا پھر ان کے والدہ کے جنازہ کو رکھا۔ اور اسی / ۸۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازے میں شریک تھے، اور تمام نے تصویب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سنت ہے۔ (رواہ ابوداود، والبیہقی، والنسائی، فتح العزیز)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے (بیک وقت) نو جنازوں پر نماز پڑھائی اور (ان میں) مرد کے جنازے امام سے قریب تھے اس کے بعد عورتوں کے تھے۔ (رواہ البیہقی۔ والدارقطنی۔ فتح العزیز ۲/۴۳۳، مغنی المحتاج) اور اگر بیک وقت ایک ہی نوع کے جنازے آئے ہوں تو ان میں سے جو افضل ہو گا، اسے امام کے قریب رکھے۔ اور یہاں افضل سے مراد وہ شخص ہے جس میں تقویٰ، پرہیزگاری وغیرہ ہو، آزادی کی وجہ سے کسی کو آگے نہیں رکھا جائیگا۔ اگر مرنے والے سبھی تمام صفات میں برابر ہوں۔ اور ان کے اولیاء کسی ایک جنازے کو امام کے قریب رکھنے پر راضی ہو جائیں، تو ٹھیک، ورنہ قرعہ اندازی کی جائیگی۔ ایک ہی نوع کے جنازے یکے بعد دیگرے آئے ہوں۔ تو جس کا جنازہ پہلے آیا ہو، اسے امام کے قریب رکھے، خواہ آخر میں آنے والا افضل ہو۔ اگر مختلف النوع جنازوں میں پہلے عورت کا جنازہ آیا ہو پھر مرد کا یا بچے کا تو عورت کے جنازے کو امام کے قریب نہ رکھے، بلکہ مرد یا بچے کے جنازے کو امام کے قریب رکھے۔ اگر بچے کے جنازے کو پہلے رکھنے کے بعد مرد کا جنازہ آئے، تو بچے کے جنازہ کو نہ ہٹائے، بلکہ مرد کے ولی سے کہا جائے کہ اپنا جنازہ بچے کے پیچھے رکھ، یا دوسری جگہ منتقل کر، تمام جنازے صرف خنثیٰ مشکل ہی کہ ہوں تو تمام کو ایک قطار میں رکھے (یعنی ہر ایک کا سر دوسرے کے پاؤں کے پاس رہے آگے پیچھے نہ رکھے) تمام جنازوں پر ایک ہی نماز پڑھنے کی صورت میں کسی میت کا ولی، دوسرے کی امامت سے راضی نہ ہو، تو وہ اپنے میت پر نماز پڑھے۔ اگر تمام اولیاء ایک ہی نماز پڑھنے سے راضی ہوں، تو جس کا جنازہ پہلے آیا ہو اس کا ولی امامت کرے۔ چاہے اس ولی کی میت مرد کی ہو یا عورت کی، اور تمام جنازے ایک ساتھ آئے ہوں تو قرعہ اندازی کی جائے، جس کے نام قرعہ نکلے، اس کا ولی نماز پڑھائے۔

فصل۔ نماز جنازہ کا طریقہ۔

نماز جنازہ کے سات ارکان ہیں۔

(۱) نیت کرنا: نیت کا وقت وہی ہے جو دیگر نمازوں کے سلسلے میں گذر چکا۔ یعنی تکبیر تحریمہ کے ساتھ ساتھ نیت کرے۔ فرضیت کی

نیت کرنا بھی ضروری ہے۔ اور مطلق فرض کی نیت کافی ہے، فرض کفایہ کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اگر ایک میت ہو تو ایک پر اور ایک سے زائد ہوں تو تمام پر نماز کی نیت کرے۔ نیت میں میت کے تعیین کی اور پہچاننے کی ضرورت نہیں، بلکہ اگر اس طرح نیت کرے کہ امام جس پر نماز پڑھتا ہے میں بھی اس پر نماز پڑھتا ہوں تب بھی کافی ہے۔ اگر میت کی طرف اشارہ کئے بغیر تعیین کرے (مثلاً زید پر نماز پڑھتا ہوں) اور اس میں غلطی ہو جائے (مثلاً عمرو کی میت نکلی) تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ لیکن اگر اشارہ کرے پھر غلطی ہو جائے تو نماز صحیح ہوگی۔ مقتدی پر اقتداء کی نیت کرنا ضروری ہے۔

(۲) **قیام:** قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں (۳) چار تکبیریں۔ (متفق علیہ)

حدیث۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت پر چار تکبیریں کہیں اور پہلی تکبیر کے بعد ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھی (رواہ الشافعی، والحاکم، تلخیص) اگر کسی نے بھول سے یا عمداً پانچ تکبیریں کہیں تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی اگر امام پانچ تکبیریں کہے تو پانچویں تکبیر میں اس کی اتباع نہ کرے، بلکہ امام سے مفارقت (الگ ہونے) کی نیت کر کے سلام پھیرے۔ یا اس کا انتظار کرتا رہے اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیرے، اور یہی صورت افضل ہے۔

(۴) **سلام۔** سلام کے ساتھ نماز سے نکلنے کی نیت کرنا سنت ہے، واجب نہیں۔ اور صرف "**السلام علیک**" کہنا کافی نہیں۔

(۵) پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا۔

حدیث: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی۔ (الشافعی۔ حاکم)

(۲) نماز جنازہ کا سنت طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کہنے کے بعد آہستہ سورہ فاتحہ پڑھے۔ پھر درود پڑھے (الشافعی ونحوہ البیہقی)

(۶) دوسری تکبیر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنا۔

حدیث: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نماز جنازہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ (رواہ الحاکم و صححہ علی شرط الشیخین، فتح الوہاب) آپ کے آل پر درود پڑھنا سنت ہے۔ (فتح الوھاب)

(۷) تیسری تکبیر کے بعد میت کیلئے دعا کرنا (میت کیلئے بالخصوص اخروی دعا کرنا ضروری ہے، نیز دعا کسی اور تکبیر کے بعد ہو تو یہ کافی نہیں ہے) (حاشیۃ الجمل ۱۷۲/۲)

حدیث: جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لئے دعا کرو۔ (رواہ ابوداود۔ ابن ماجہ۔ والبیہقی) اور کم سے کم اتنی دعا کا ہونا ضروری ہے جس پر دعا کا اطلاق ہو سکے۔ اور افضل دعا کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

نماز جنازہ کا اکمل طریقہ

نماز جنازہ کی سنتیں (۱) چاروں تکبیرات میں رفع یدین کرنا۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ تمام تکبیرات میں رفع یدین کرتے تھے۔ (رواہ البیہقی)

(۲) دیگر نمازوں کی طرح ہر تکبیر کے بعد دونوں ہاتھ سینہ کے نیچے اور ناف کے اوپر باندھنا۔ (۳) سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا (۴) سورہ فاتحہ کے بعد دوسری کوئی سورت نہ پڑھنا۔ اگر مقتدی امام سے قبل سورہ فاتحہ سے فارغ ہو جائے تو دعا میں مصروف رہے، اسی طرح درود سے فارغ ہو جائے تو دعا، یا درود پڑھے۔ (جمل ۱۷۳/۲) نماز جنازہ میں دعائے افتتاح نہ پڑھے۔ البتہ تعوذ پڑھ سکتا ہے۔

سورہ فاتحہ کو سراً (آہستہ) پڑھے، دن ہو یا رات۔ دوسری تکبیر کے بعد درود سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا، آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے آل پر درود پڑھنا، اور مومن مردوں و عورتوں کیلئے دعا کرنا سنت ہے۔ اور ان تینوں کے درمیان ترتیب ضروری نہیں بلکہ بہتر ہے۔ تیسری تکبیر کے بعد کثرت سے میت کیلئے دعا کرنا سنت ہے۔ دعا کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف "اَللّٰھُمَّ ارْحَمْهُ یَا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهُ" کہے (یا اللہ اس پر رحم فرما۔ یا اس کی مغفرت فرما) اور اکمل درجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سے جو منقول دعا ہے، وہ پڑھے۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ دعا پڑھے "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِیْرِنَا وَ کَبِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثَانَا اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَهُ مِنَّا فَاَحْیِهٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّیْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَی الْاِیْمَانِ" (رواہ ابوداؤد والترمذی)

ترجمہ: اے اللہ ہمارے زندہ و مردے کی، حاضر و غائب کی، چھوٹے و بڑے کی، مذکر و مونث کی، مغفرت فرما۔ اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے، اسے اسلام پر زندہ رکھ، اور جسے تو موت دے اسے ایمان کی حالت میں موت دے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

"اَللّٰھُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ وَ ابْنُ عَبْدَیْكَ خَرَجَ مِنْ رَوْحِ الدُّنْیَا وَ سَعَتِهَا مَحْبُوْبِهٖ وَ اَحِبَّائِهٖ فِیْهَا اِلٰی ظُلْمَةِ الْقَبْرِ وَ مَا هُوَ لَاقِیْهِ كَانَ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ وَ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ اَللّٰھُمَّ اِنَّهُ نَزَلَ بِكَ وَ اَنْتَ خَیْرُ مَنْزُوْلٍ بِهٖ وَ اَصْبَحَ فَقِیْراً اِلٰی رَحْمَتِكَ وَ اَنْتَ غَنِیٌّ عَنْ عَذَابِهٖ وَ قَدْ جِئْنَاكَ رَاغِبِیْنَ اِلَیْكَ شُفَعَاءَ لَهُ اَللّٰھُمَّ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِیْ اِحْسَانِهٖ وَاِنْ كَانَ مُسِیْئاً فَتَجَاوَزْ عَنْهُ وَلَقِّهٖ بِرَحْمَتِكَ رِضَاكَ وَقِهٖ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابَهُ وَافْسَحْ لَهُ فِیْ قَبْرِهٖ وَجَافِ الْاَرْضَ عَنْ جَنْبَیْهِ وَلَقِّهٖ بِرَحْمَتِكَ الْاَمْنَ مِنْ عَذَابِكَ حَتّٰی تَبْعَثَهُ اِلٰی جَنَّتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ"

ترجمہ: اے اللہ یہ تیرے بندہ اور تیرے دو بندوں کا بیٹا ہے۔ دنیا میں اپنے دوست واحباب کو چھوڑ کر دنیا کے آرام اور وسعت سے قبر کی تاریکی اور جو کچھ قبر میں پیش آنے والا ہے اس کی طرف چلا آیا۔ اور اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ تیرے بندے اور رسول ہیں۔ اور تو اسے زیادہ جاننے والا ہے اے اللہ یہ تیرا مہمان ہوا، اور تو بہترین مہمان نواز ہے، اور تیری رحمت کا محتاج ہے، اور تو اس کے عذاب سے بے نیاز ہے، اور ہم لوگ تیرے پاس امیدیں لئے ہوئے اس کے لئے سفارشی بن کر آئے ہیں۔ اے اللہ اگر وہ نیک ہے تو، تُو اس کی نیکی میں اضافہ کر۔ اگر وہ برا ہے تُو تو اس سے درگذر فرما۔ اور اپنی رحمت سے اسے اپنی رضا نصیب فرما، قبر کے فتنہ اور اس کے عذاب سے بچا۔ اس کی قبر کو کشادہ فرما۔ اور زمین کو اس کے پہلوؤں سے دور کردے، اور اپنی رحمت کے ذریعے اسے اپنے عذاب سے امن عطا فرما۔ یہاں تک کہ اے ارحم الراحمین اسے جنت میں داخل فرما) اگر عورت کی میت ہو تو اس طرح دعا پڑھے۔ "اَللّٰھُمَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكَ وَ بِنْتُ عَبْدَیْكَ الخ" یعنی ضمائر مونث لائے، لیکن اگر ضمائر مونث لانے کے بجائے مذکر ہی لائے اور اس سے شخص مراد لے تب بھی حرج نہیں۔

اگر بچے کی میت ہو تو اس ثانی دعا کے بدلے پہلی دعا کے بعد یہ دعا پڑھے۔ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ فَرَطاً لِاَبَوَیْهِ وَسَلَفاً وَّ ذُخْراً وَ عِظَةً وَاِعْتِبَاراً وَّ شَفِیْعاً وَّ ثَقِّلْ بِهٖ مَوَازِیْنَهُمَا وَاَفْرِغِ الصَّبْرَ عَلٰی قُلُوْبِهِمَا وَلَا تَفْتِنْهُمَا بَعْدَهُ وَلَا تَحْرِمْهُمَا اَجْرَهُ" (الفقہ المنہجی)

ترجمہ: اے اللہ اس بچہ کو اس کے والدین کیلئے آگے جانے والا سامان بنا اور انکے لئے ذخیرہ، نصیحت، اور عبرت بنا، اور سفارشی بنا، اور اس کے ذریعہ ان کے ترازو کو وزنی بنا، اور ان کے قلوب پر صبر کا فیضان فرما۔ اور اس کے بعد انہیں آزمائش میں نہ ڈال۔ اور اس کے اجر سے انہیں محروم نہ فرما۔)

امام بخاریؒ اور تمام حفاظ حدیثؒ فرماتے ہیں کہ جنازے کی سب سے زیادہ صحیح دعا یہ ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَ عَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَکْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَاراً خَیْراً مِنْ دَارِهِ وَاَھْلاً خَیْراً مِنْ اَھْلِهِ وَزَوْجاً خَیْراً مِّنْ زَوْجِهِ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَفِتْنَتِهٖ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ''(رواہ مسلم عن عوف بن مالک)

ترجمہ: اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم فرما اسے عافیت عطا فرما، اسے معاف کر، اس کی اچھی طرح مہمان نوازی فرما، اوراس کے ٹھکانہ کو کشادہ کر، اوراسے پانی، برف اوراولے کے ذریعے دھودے، اور گناہوں سے ایسا صاف کر جیسے کہ تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کرتا ہے۔ اوراس کو اس (دنیا) کے گھر سے بہتر گھر اوراس کے گھر والوں سے بہتر گھر والے اوراس کے جوڑے سے بہتر جوڑا عطا فرما اوراسے جنت میں داخل فرما۔ اور قبر کے عذاب سے اوراس کے فتنہ سے اور (جہنم کے) آگ کے عذاب سے پناہ دے) اوراس دعا کو پہلی دونوں دعائوں (اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا الخ۔ اوراَللّٰھُمَّ ھٰذَا عَبْدُكَ الخ) سے پہلے پڑھنا مندوب ہے (حاشیۃ الجمل ۲/۱۷۳) چوتھی تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے۔ ''اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُ''(رواہ ابوداود۔الفقہ النھجی)

(اے اللہ اس کے اجر سے ہمیں محروم نہ فرما۔ اوراس کے بعد ہمیں آزمائش میں نہ ڈال۔ اور ہماری اور اس کی مغفرت فرما) یہ ذکر واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ چوتھی تکبیر کے بعد طویل دعا کرنا مسنون ہے۔ اور یہ آپ ﷺ کے فعل سے ثابت ہے۔

حدیث: حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جب اپنی بیٹی کے جنازہ کی نماز پڑھائی، تو چوتھی تکبیر کے بعد اتنی دیر کھڑے ہو کر دعا استغفار کرتے رہے جتنی دیر دو تکبیروں کے درمیان کھڑے رہے پھر فرمایا کہ آپ ﷺ اس طرح کرتے تھے۔ (رواہ الحاکم والبیہقی وقال الحاکم حدیث صحیح۔حاشیۃ الروضہ)

اس کے بعد دو سلام پھیرنا مستحب ہے (جس میں پہلا واجب ہے) اگر مسبوق امام کو نماز کے دوران پائے، تو تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائے اورامام کی اگلی تکبیر کا انتظار نہ کرتا رہے۔ تکبیر کہنے کے بعد سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کرے، مسبوق اذکار میں اپنی ترتیب کو ملحوظ رکھے (یعنی مثلاً دوسری تکبیر کے بعد امام کے ساتھ شریک ہوا ہے تو ایسا نہیں کہ مسبوق بھی امام کی طرح درود شریف پڑھنا شروع کرے بلکہ مسبوق سورہ فاتحہ پڑھے)

اگر امام مسبوق کے پہلی تکبیر سے فارغ ہوتے ہی فوراً دوسری تکبیر بھی کہہ ڈالے، تو مسبوق بھی امام کے ساتھ دوسری تکبیر کہے اور مسبوق کو سورہ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ دیگر نمازوں میں ہوتا ہے۔ مسبوق سورہ فاتحہ پڑھ ہی رہا تھا کہ امام نے دوسری تکبیر کہہ ڈالی تو بقیہ قرأت روک کر امام کے ساتھ آگے بڑھے اور بعد والی تکبیر میں بقیہ قرأت پوری کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر کسی سے کچھ تکبیریں فوت ہو جائیں، تو امام کے سلام کے بعد ان کا تدارک کرے، لیکن صرف تکبیرات پر اکتفا نہ کرے، بلکہ ذکر و دعا بھی پڑھے۔ مسبوق حضرات کی بقیہ نماز پوری ہونے تک جنازہ نہ اٹھانا مستحب ہے۔ اوراگر جنازہ اٹھایا گیا تو اس سے مسبوق کی نماز باطل نہ ہوگی۔ چاہے جنازہ قبلہ کی جانب سے ہٹایا گیا ہو، لیکن اگر جنازہ کی موجودگی میں نماز شروع کرنے سے پہلے ہی قبلہ کی جانب سے ہٹایا گیا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

اگر مقتدی بلا عذر امام سے ایک تکبیر پیچھے رہے اورامام دوسری تکبیر بھی کہہ ڈالے تو اس سے مقتدی کی نماز باطل ہوگی اور ایک

تکبیر پیچھے رہنا ایسا ہے جیسا کہ ایک رکعت پیچھے رہنا (مثلاً امام تیسری تکبیر بھی کہے اور مقتدی ابھی پہلی تکبیر میں ہو دوسری تکبیر نہ کہی ہو)

نماز جنازہ کے شرائط: دیگر نمازوں میں جو شرائط ضروری ہیں، اس نماز میں بھی ضروری ہیں، جیسے: طہارت، ستر عورت، قبلہ کے جانب رخ کرنا وغیرہ، البتہ مزید شرط یہ ہے کہ نماز سے پہلے میت کا غسل ہو چکا ہو کوئی کنویں میں مر جائے یا کان میں دب کر مر جائے اور اسے باہر نکال کر غسل دینا دشوار ہو تو اسپر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ کفن پہنانے سے پہلے نماز پڑھنا کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ نماز جنازہ کیلئے جماعت کا ہونا ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے۔ صرف ایک مرد کے نماز ادا کرنے سے بھی فرض ذمہ سے ساقط ہو جائیگا، چاہے وہ ممیز (باشعور) بچہ ہی کیوں نہ ہو، مردوں کی موجودگی میں کوئی عورت یا خنثیٰ مشکل ادا کرے، تو فرض ساقط نہ ہوگا۔ ہاں اگر ایک بھی مرد موجود نہ ہو تو عورتیں تنہا نماز ادا کریں۔ باجماعت ادا کرنا ان کے لئے مستحب نہیں، چاہے مرد کا جنازہ ہو یا عورت کا۔ (لیکن اگر باجماعت ادا کریں تو کوئی حرج نہیں۔ المجموع ۲۱۳/۵) اوران کے ذریعے فرض بھی ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ صرف عورتیں موجود ہوں، تو فرض کے ادائیگی کی ذمہ داری عورتوں پر ہوگی، اور اگر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہوں تو فرض کے ادائیگی کی ذمہ داری عورتوں پر نہ ہوگی، بلکہ مردوں پر ہوگی، چاہے ایک ہی مرد کیوں نہ ہو۔

فصل۔ غائبانہ نماز جنازہ

حدیث: آپ ﷺ نے نجاشی کی موت پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی (صحیحین) اپنے شہر سے غائب میت پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے اور ایسی صورت میں میت کا قبلہ کی جہت میں ہونا یا مسافت قصر کے فاصلہ پر ہونا ضروری نہیں البتہ نمازی کا قبلہ رو ہونا ضروری ہے۔ غائبانہ نماز بھی میت کو غسل دینے کے بعد ادا کرنا ضروری ہے، غسل سے پہلے صحیح نہیں (مغنی ۳۴۵/۱) اگر مصلی (نمازی) اور میت ایک ہی شہر میں ہو تو میت کا مصلی کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ امام ابو محمد جوینیؒ فرماتے ہیں کہ میت شہر میں ہونے کی صورت میں مصلی اور میت کے درمیان تقریباً تین سو ذراع (ہاتھ) سے زیادہ کا فاصلہ نہ ہو۔

فصل۔ نماز جنازہ کا تکرار

ایک بار نماز جنازہ باجماعت ادا کرنے کے بعد دیگر حضرات آجائیں (دفن سے پہلے آئیں یا بعد میں) تو انہیں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ باجماعت ادا کریں یا اکیلے اوران کی یہ نماز فرض ہی شمار ہوگی۔ البتہ دفن کے بعد آنے کی صورت میں قبر پر نماز ادا کریں۔

حدیث: (۱) رات میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو صحابہ کرام نے تاریکی میں آپ ﷺ کو بیدار کرنا مناسب سمجھا، اوراسے دفن کر دیا تو آپ ﷺ اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو گئے، اور صحابہ کرام نے پیچھے صف باندھی پھر اس پر نماز پڑھی۔ (متفق علیہ)
(۲) ایک مسکین عورت (ام محجن) کا رات میں انتقال ہوا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو اطلاع دیئے بغیر (رات ہی میں) دفن کر دیا تو (دوسرے دن) آپ ﷺ نے ان کی قبر پر جا کر نماز ادا کی۔ (رواہ النسائی والبیہقی، باسنادہ صحیح)

کسی میت کو نماز پڑھے بغیر دفن کر دیں، تو دفن کرنے والے سبھی گنہگار ہونگے، نماز پڑھنے کیلئے قبر کھودنے کی ضرورت نہیں، بلکہ قبر پر ہی نماز پڑھے۔ قبر پر اسی شخص کی نماز صحیح ہوگی جس پر (اس میت کی) موت کے وقت نماز فرض تھی۔ (یعنی جو مسلمان مکلف طاہر ہو۔ حاشیہ الجمل۔ ۱۸۲/۲) نبی کی قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا حکم: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں، بلکہ صحیح مسلم میں سہیل بن بیضاء رضی اللہ عنہ

کے متعلق صحیح حدیث موجود ہونے کی وجہ سے فقہانے مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے (نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ مسجد میں ادا کی۔)(تلخیص)

ابو دائود میں جو حدیث ہے کہ جو مسجد میں نماز جنازہ پڑھے اس کے لئے کوئی چیز نہیں، اس کے تین جواب ہیں (۱) وہ حدیث ضعیف ہے (۲) سنن ابی دائود میں فلا شیءعلیہ کا لفظ ہے (یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں) اور اگر فلا شیءلہ والی حدیث کو صحیح مان بھی لیں، تب بھی اس کو فلا شی علیہ والی حدیث محمول کریں گے، جیسے کہ قرآن میں ہے "اِنْ اَحسَنْتُمْ اَحسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا ۔ اَیْ فَعَلَیْهَا" (۳) اسے کامل اجر نہیں ملے گا جبکہ دفن تک جنازہ کے ساتھ نہ جائے۔

نماز جنازہ کیلئے
تین یا تین سے زیادہ صفوں کو بنانا مستحب ھے

حدیث: جب کوئی مسلمان مرتا ہے اور اس پر تین صفیں نماز ادا کرتی ہیں، تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔(رواہ الحاکم وغیرہ وقال صحیح علی شرط مسلم۔فتح الوھاب) امام اور مقتدی کی نیت الگ الگ ہونے سے نماز پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ مثلاً امام موجود میت پر نماز کی نیت کرے اور مقتدی غائب پر یا اس کے برعکس۔ خودکشی کرنے والے کو غسل بھی دے اور اس پر نماز بھی پڑھے۔

ایک مرتبہ نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد مصلیوں کی زیادتی کیلئے اور (ولی کے علاوہ) کسی کے انتظار میں جنازہ میں تاخیر کرنا صحیح نہیں۔ البتہ میت میں تغیر کا اندیشہ نہ ہو تو ولی کا انتظار کرنے میں حرج نہیں (جبکہ جلد اس کی آمد متوقع ہو، ورنہ انتظار کرنا مندوب نہیں۔) (جمل) بعد میں آنے والے نمازی قبر پر نماز پڑھ لیں۔ اگر وہ قبر پر نہیں پڑھیں گے تو میت کی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض فقہا نے نمازیوں کی کثرت کیلئے انتظار کرنا بہتر قرار دیا ہے۔(جمل ۱۸۶/۲)

سِقْط (ایسا حمل جو چھ مہینے پورے ہونے سے پہلے گر جائے)

سقط کی دو حالتیں ہیں۔ (۱) پیدائش کے بعد زندگی کی کوئی علامت پائی جائے مثلاً چیخے، چلائے، روئے، یا حرکت کرے، پھر مر جائے تو اس کے لئے چار چیزیں واجب ہونگی۔ غسل۔ کفن۔ نماز۔ اور دفن

(۲) زندگی کی کوئی علامت اس میں پائی نہ جائے، البتہ اس میں خلقت کا ظہور ہوا ہو، تو نماز کے علاوہ بقیہ تینوں چیزیں واجب ہیں (یعنی غسل۔ کفن۔ دفن) اور اگر خلقت کا ظہور نہ ہوا ہو، تو اس کے لئے نہ غسل ہے اور نہ نماز بلکہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کرنا سنت ہے۔ اگر بچہ چھ ماہ مکمل ہونے کے بعد پیدا ہو، تو ایک بڑے شخص کے جنازہ کی طرح نماز اور دیگر تمام امور واجب ہیں، گرچہ وہ مردہ حالت میں پیدا ہو، اور اس سے پہلے اُس کی زندگی کا کچھ علم نہ ہو۔(نہایۃ المحتاج ۴۹۵/۲)

فصل۔ کافر پر نماز جنازہ کا حکم

کافر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں، چاہے وہ حربی ہو یا ذمی۔ اور مسلمانوں کو اُسے غسل دینا جائز ہے، واجب نہیں۔ اور غسل دینے کے لئے اس کے کافر رشتہ دار مسلمان رشتہ دار سے زیادہ بہتر ہیں۔ کوئی ذمی مر جائے تو مسلمانوں پر اسے کفن دینا اور دفن کرنا ضروری ہے۔ اگر کافر حربی ہو تو اس کا کفن دفنمسلمانوں پر ضروری نہیں، بلکہ اس کی نعش کتوں کے حوالہ کر دینا جائز ہے، البتہ دفن کرنا بہتر ہے،

تاکہ لوگوں کو اس کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔ اور مرتد کا حکم بھی کافر حربی کی طرح ہے۔

مسلمان میت کافر کے ساتھ یا شہید غیر شہید کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں، اور ان کے درمیان تمیز نہ ہو سکے، تو تمام کو غسل دینا اور تمام پر نماز پڑھنا واجب ہے۔ ان تمام پر بیک وقت ایک ہی نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور یہی افضل ہے، لیکن ایسی صورت میں صرف مسلمان میت کا قصد ہو۔ اور اگر ہر ایک پر الگ الگ نماز پڑھے تو یہ بھی جائز ہے البتہ ایسی صورت میں نیت اس طرح کرتے اگر یہ میت مسلمان ہو تو، اور دعا اس طرح کرے۔ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ اِنْ کَانَ مُسْلِماً'' (اے اللہ اس کی مغفرت فرما اگر یہ مسلمان ہو)

فصل شہید کا حکم

شہید پر نماز پڑھنا اور اسے غسل دینا دونوں حرام ہیں۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے شہیدوں کے متعلق حکم فرمایا کہ انہیں ان کے خون کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اور انہیں نہ غسل دیا گیا اور نہ ان پر نماز پڑھی گئی۔ (رواہ البخاری)

غسل دینے سے شہادت کا خون زائل ہو، یا نہ ہو، اور شہید مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بالغ ہو یا بچہ، ہر ایک کیلئے یہی حکم ہے۔

شہید کے اقسام

شہید کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس پر نماز پڑھنا اور غسل دینا دونوں حرام ہیں۔ اور وہ ایسا شہید ہے جو کفار کے ساتھ جنگ کے سبب دورانِ جنگ ہی مر جائے خواہ اسے کسی کافر نے قتل کیا ہو۔ یا غلطی سے کسی مسلمان کا ہتھیار لگا ہو، یا اس کا ہی ہتھیار اس کی طرف لوٹ آیا (جس کی وجہ سے مر گیا) یا گھوڑے پر سے گر کر مر جائے۔ یا کسی جانور کے لات مارنے کی وجہ سے مر جائے۔ یا جنگ کے اختتام کے بعد مقتول ملے اور اس کے موت کا سبب معلوم نہ ہو سکے، اس پر خون کا اثر ہو یا نہ ہو۔

اگر کوئی کفار کے ساتھ جنگ کے دوران کسی بیماری کے سبب یا اچانک موت آنے کی وجہ سے مر جائے تو وہ شہید شمار نہ ہو گا۔ اگر لڑائی کے ختم ہونے کے بعد ایسے زخم سے مر جائے جو جنگ میں ہی پہنچا ہے اور زخمی میں حیاۃ مستقرۃ (یعنی ایسی زندگی جس میں اپنے اختیار اور مرضی سے حرکت پائی جائے) باقی ہو تو وہ شہید نہیں کہلائے گا۔ چاہے زخمی ہونے کے بعد کھانا کھایا ہو، بات چیت کی ہو، نماز پڑھی ہو، یا ان تینوں میں سے کچھ بھی نہ کیا ہو، چاہے زمانہ زیادہ گذرا ہو یا کم۔ جنگ کے اختتام پر اس میں صرف حرکت مذبوح باقی ہو تو وہ شہید کہلائے گا۔ اگر جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے زندگی کی امید ہو تو وہ شہید نہیں کہلائے گا۔ کوئی کافر حربی دارالاسلام میں داخل ہو کر کسی مسلمان پر حملہ کر کے قتل کر ڈالے، تو ایسا مسلمان شہید شمار نہ ہو گا۔

اگر کوئی باغی اہل عدل (امام برحق کے موافقین) میں سے کسی کو قتل کر ڈالے تو وہ شہید شمار نہ ہو گا، اسے غسل بھی دینا ہو گا، اور نماز بھی پڑھنی ہو گی۔ اسی طرح کسی باغی کو قتل کیا گیا تو اس کے لئے بھی یہی حکم ہو گا۔ ڈاکو کسی کو قتل کرے تو مقتول شہید نہیں کہلائے گا۔

۲۔ ایسے شہداء جو مذکورہ تمام اوصاف سے خالی ہوں: مثلاً پیٹ کے درد سے مر جائے۔ طاعون کی بیماری میں مر جائے۔ ڈوب کر مر جائے۔ حالت اجنبیت اور غریب الوطنی میں مر جائے (یعنی کہیں سفر کیلئے گیا ہوا تھا تو وہیں انتقال ہو گیا) کوئی عورت دردِزہ کی حالت میں مر جائے۔ اور ایسا شخص جسے ظلماً کوئی مسلمان یا ذمی یا باغی جنگ کے علاوہ کسی اور موقع سے قتل کرے، تو ان تمام کا حکم دیگر میت کے مانند ہے یعنی غسل بھی دے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھے۔ گرچہ حدیث میں ان کے متعلق شہادت کا لفظ واقع ہوا ہے (اور اس سے

آخرت میں شہادت کے ثواب کا حصول مراد ہے)

حدیث: شہداء پانچ ہیں: طاعون کی بیماری میں مرنے والا، پیٹ کی بیماری میں مرنے والا، ڈوب کر مرنے والا، کسی چیز کے نیچے دب کر مرنے والا، اور اللہ کے راستے کا شہید (رواہ احمد، والترمذی) قصاصاً (یعنی کسی کے قتل کی پاداش میں) اور حداً قتل کیا جانے والا آدمی شہید نہیں کہلائے گا، (حد کی مثال مُحْصَنْ زانی کو سنگ سار کرنا)

کسی تارک صلوۃ (نماز چھوڑنے والے) کو قتل کیا جائے تو اس کے لئے بھی چاروں امور ضروری ہیں۔ غسل، کفن، نماز اور دفن اور اُسے مسلمان کے قبرستان میں ہی دفن کیا جائے اور دیگر قبروں کی طرح اس کی قبر کو معمولی اٹھایا جائے، جیسا کہ دیگر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ڈاکو کو اولاً قتل کرے، پھر غسل دے کر اس پر نماز جنازہ پڑھے، پھر کفن ہی کی حالت میں سولی پر چڑھائے، پھر تین دن کے بعد سولی پر سے اتا کر اُسے دفن کر دے۔

اگر کوئی جنبی اور حائضہ عورت شہید ہو جائے۔ تو اسے بھی غسل دینا اور اس پر نماز پڑھنا حرام ہے۔ شہید کے بدن پر شہادت کے خون کے علاوہ کوئی اور نجاست لگی ہو تو اسے دھونا ضروری ہے۔

شہید کو اس کے خون سے لت پت کپڑوں میں کفن دینا افضل ہے (خون نہ لگا ہو تب بھی اسی کپڑے میں کفن دینا مستحب ہے) اور اگر اس کے بدن پر اتنا کپڑا نہ ہو۔ جو پورے بدن کو ڈھانپ سکے، تو دوسرے کپڑے کے ذریعے اس کی تکمیل کرے۔ اگر ورثاء اس کے بدن کے کپڑوں کو نکال کر دوسرے کپڑوں میں کفن دینا چاہیں تو جائز ہے۔ البتہ اس کے بدن سے (لڑائی کے کپڑے) زرہ، چمڑا، پوستین، موزہ وغیرہ نکال دے۔

دفن کا بیان

دفن کرنا فرض کفایہ ہے۔ قبرستان کے علاوہ کسی اور جگہ دفن کرنا جائز ہے، البتہ قبرستان میں دفن کرنا افضل ہے۔ اگر میت کو عام قبرستان اور اس کی اپنی زمین میں دفن کرنے کے سلسلے میں ورثاء میں اختلاف ہو جائے، تو عام قبرستان میں ہی دفن کرے۔ بعض ورثاء نے میت کے ہی زمین میں دفن کیا تو دیگر ورثاء کیلئے میت کو وہاں سے منتقل کر کے عام قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے، لیکن ایسا نہ کرنا بہتر ہے۔ ورثاء میں سے کسی کا اپنی زمین میں دفن کرنے کا ارادہ ہو، تو دیگر وارثوں کیلئے اس کا قبول کرنا ضروری نہیں، اور اگر کسی وارث نے اپنی زمین میں دفن کیا تو ابن صباغؒ فرماتے ہیں کہ میت کو وہاں سے منتقل نہ کرے، کیونکہ ایسی صورت میں میت کی بے حرمتی ہوگی۔ اور میت کو وہیں رکھنے سے کسی کا حق بھی ضائع نہیں ہوتا۔ ورثاء نے میت کو اس کی زمین میں دفن کرنے کے بعد اس زمین کو بیچ دیا تو مشتری (خریدار) کو وہاں سے میت منتقل کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر مشتری بیع (خرید و فروخت) کے وقت اس بات سے ناواقف تھا تو اسے بیع فسخ کرنا جائز ہے۔ اور میت جب زمین کے اندر بالکل فنا و نابود ہو جائے، یا تمام ورثاء میت کو وہاں سے منتقل کرنے پر متفق ہو جائیں، تو ایسی صورت میں مشتری اس جگہ سے انتفاع کر سکتا ہے۔

قبر کی گہرائی: دفن کے لئے کم سے کم اتنا گہرا گڑھا ہونا ضروری ہے، جس میں سے میت کی بو ظاہر نہ ہو، اور درندوں سے اس کی حفاظت ہو سکے۔

اکمل درجہ یہ ہے کہ قبر کشادہ اور اتنی گہری ہو کہ اس میں ایک معتدل آدمی اپنے دونوں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا کر کھڑا رہ سکے یعنی تقریباً ساڑھے چار ہاتھ گہری ہو۔

حدیث: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر کو وسیع اور گہری کھودو" (رواہ ابوداؤد۔ الترمذی) میت کو شق اور لحد (بغلی قبر) میں دفن کرنا جائز ہے۔ لحد یعنی قبر کی تہہ میں قبلے کی جانب اتنا کھودے جس میں میت سما(رہ) سکے۔ اور شق یعنی درمیان قبر نہر کے مانند کھودے۔ اگر زمین سخت ہو تو لحد کھودنا افضل ہے ورنہ شق

تدفین کامسنون طریقه: میت کو (قبرستان لانے کے بعد) قبر کی پائنتی کے پاس رکھ کر سر کی جانب سے آہستہ سے قبر میں اتارنا سنت ہے۔

حدیث: "حضرت عبد اللہ بن یزید الخطمی رضی اللہ عنہ نے حضرت حارث کو قبر میں قبر کی پائنتی کی جانب سے اتارا پھر فرمایا کہ "یہ سنت ہے" (رواہ ابوداود باسناد صیحح)

مرد کی موجودگی میں مرد ہی قبر میں داخل ہوں، چاہے میت مرد کی ہو یا عورت کی، اور میت کو دفن کرنے کا حقدار وہی ہے، جو نماز پڑھانے کا حقدار ہے۔

البتہ بیوی کو دفن کرنے کیلئے شوہر زیادہ مستحق ہے۔ اس کے بعد اس کے محرم رشتہ دار، باپ، دادا، بیٹا، پوتا، بھائی، پھر بھتیجہ، پھر چچا مستحق ہیں پھر غلام پھر ممسوح، پھر مجبوب پھر غیر محرم عصبہ مثلاً، چچازاد بھائی، پھر غیر محرم ذورحم مثلاً ماموں زاد و پھوپھی زاد بھائی، ورنہ پھر کوئی نیک اجنبی شخص (جمل) میت کو قبر میں اگر اکیلا آدمی رکھ سکتا ہو۔ مثلاً کسی بچے کی میت ہو، تو اچھی بات ہے، ورنہ میت قبر میں رکھنے والوں کا طاق عدد میں ہونا مستحب ہے، تین یا پانچ جیسے ضرورت ہو۔

بوقت تدفین پردہ اور دعا:- دفن کرتے وقت قبر پر پردہ کرنا مستحب ہے، چاہے (میت) مرد کی ہو یا عورت کی، لیکن عورت کی ہو تو زیادہ موکد ہے

میت کو قبر میں اتارتے وقت ان الفاظ کا پڑھنا مستحب ہے "**بِاسْمِ اللهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰه**" (اللہ کے نام سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر)

حدیث: حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ آپؐ جب میت کو قبر میں رکھتے تو "بِاسْمِ اللهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ" کہتے (رواہ ابوداود۔ ابن حبان۔ والحاکم۔ تلخیص) اس کے بعد یہ دعا پڑھتے "**اَللّٰهُمَّ اَسْلَمَهُ اِلَيْكَ اَلآ شِحَّاءُ مِنْ وَّلَدِهٖ وَاَهْلِهٖ وَقَرَابَتِهٖ وَاِخْوَانِهٖ وَفَارَقَهُ مَنْ كَانَ يُحِبُّ قُرْبَهُ وَخَرَجَ مِنْ سَعَةِ الدُّنْيَا وَالْحَيَاةِ اِلٰى ظُلْمَةِ الْقَبْرِ وَضِيْقِهٖ وَنَزَلَ بِكَ وَاَنْتَ خَيْرُ مَنْزُوْلٍ بِهٖ اِنْ عَاقَبْتَهُ فَبِذَنْبِهٖ وَاِنْ عَفَوْتَ عَنْهُ فَاَهْلُ الْعَفْوِ اَنْتَ اَنْتَ غَنِيٌّ عَنْ عَذَابِهٖ وَهُوَ فَقِيْرٌ اِلٰى رَحْمَتِكَ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَتَهُ وَاغْفِرْ سَيِّئَتَهُ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاجْمَعْ لَهُ بِرَحْمَتِكَ الْاَمْنَ عَنْ عَذَابِكَ وَاكْفِهِ كُلَّ هَوْلٍ دُوْنَ الْجَنَّةِ اَللّٰهُمَّ وَاخْلُفْهُ فِيْ تَرِكَتِهٖ فِي الْغَابِرِيْنَ وَارْفَعْهُ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَعُدْ عَلَيْهِ بِفَضْلِ رَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ**" **ترجمه:** اے اللہ اس کے بچوں، گھر والوں، رشتہ داروں اور بھائیوں نے چاہت کے باوجود اسے تیرے حوالہ کر دیا اور یہ اپنے محبوب لوگوں سے جدا ہو گیا۔ دنیا اور زندگی کی وسعتوں سے قبر کے اندھیرے اور اس کی تنگی کی طرف چلا آیا، اور تیرا مہمان ہوا اور تو بہترین مہمان نواز ہے۔ اگر تو اسے سزا دے تو یقیناً اس کے گناہوں کے سبب سے ہو گی، اور اگر تو معاف کر دے تو تو ہی معاف کرنے والا ہے۔ تو اس کے عذاب سے بے نیاز

ہے۔ اور یہ تیری رحمت کا محتاج ہے۔ اے اللہ تو اس کی نیکیوں کو قبول فرما اور برائیوں کو معاف فرما۔ اور اسے قبر کے عذاب سے بچا، اور اپنی رحمت سے اسے تیرے عذاب سے امن عطا کر اور جنت سے قبل ہر خوف وہولناکی سے اس کی کفایت فرما۔ اے اللہ اس کے پیچھے والوں میں اس کا جانشین بن۔ اور اعلی علیین میں اس کا درجہ بلند فرما۔ اور اے ارحم الراحمین اس پر بار بار اپنا فضل فرما۔)

میت کو لحد میں قبلہ رخ، دائیں کروٹ پر دیوار سے بالکل قریب رکھے اور پیٹھ کے پیچھے اینٹ وغیرہ لگا دے تاکہ میت نہ اوندھا منہ ہو جائے اور نہ چت ہو جائے (پشت کے بل پلٹ جائے) میت کو قبر میں قبلہ رخ رکھنا واجب ہے۔ اگر قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے، یا چت لٹا کر دفن کر دیا اور بدن میں تغیر نہ ہوا ہو، تو قبر کھود کر قبلہ رخ رکھنا ضروری ہے۔ اور اگر بدن میں تغیر ہو چکا ہو، تو پھر قبر نہ کھودے (بلکہ اسی حالت میں رہنے دے) قبر میں دائیں کروٹ پر لٹانا واجب نہیں (بلکہ مستحب ہے) میت کو قبر میں بائیں کروٹ پر قبلہ رخ رکھنا مکروہ ہے (اور اگر کسی نے ایسا کیا تو دائیں کروٹ پر کرنے کیلئے) قبر کھودنے کی ضرورت نہیں۔

کوئی ذمی حاملہ عورت مر جائے اور اس کے پیٹ کا بچہ مسلمان کا ہو۔ (یعنی کسی مسلمان شوہر سے حاملہ رہ چکی ہو۔ اور ساتھ میں بچہ بھی مر گیا ہو) تو قبر میں اس عورت کی پیٹھ قبلہ کی طرف کر دے تاکہ اس جنین کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے کیونکہ جنین کا چہرہ ماں کی پیٹھ کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس ذمی عورت کو مسلمانوں اور کافروں کے قبرستان کے درمیان دفن کرے۔ اگر مسلمان اور کافروں کے مردے آپس میں خلط ملط ہو جائیں تو انھیں بھی دونوں کے قبرستان کے درمیان دفن کر دے۔

(قبر میں) میت کے سر کے نیچے کچی اینٹ یا پتھر رکھے، اور تھوڑا سا کفن ہٹا کر دائیں رخسار (گال) کو اینٹ یا مٹی سے لگا دے۔

(قبر میں) سر کے نیچے تکیہ رکھنا، بستر بچھانا، اور کسی پیٹی (تابوت) میں رکھ کر دفن کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر زمین نرم ہو یا تر ہو تو پیٹی میں رکھ کر دفن کرنا مکروہ نہیں، ایسی صورت میں پیٹی کا خرچ ترکہ کے راس المال میں سے لے۔

مذکورہ صورت کے علاوہ اگر میت اپنی نعش پیٹی میں دفن کرنے کی وصیت کرے تو وصیت نافذ نہ ہو گی۔

میت کو لحد میں رکھنے کے بعد لحد کو کچی اینٹوں سے بند کر دے۔ اور جہاں کہیں معمولی شگاف (پھٹن) باقی رہ جائے اسے اینٹوں کے ٹکڑوں وغیرہ سے بند کر دے۔ پھر ہر آدمی دونوں ہاتھوں سے تین مٹھی مٹی ڈالے (بیہقی) اور پہلی بار مٹی ڈالتے وقت "**مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ**" اور دوسری بار "**وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ**" اور تیسری بار "**وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى**" پڑھنا مستحب ہے اس کے بعد بیلچہ وکدال وغیرہ (پھاوڑے) کے ذریعے مٹی ڈالے۔

مستحب یہ ہے کہ (قبر کھودتے وقت) جتنی مٹی نکلی ہے، اس سے زیادہ مٹی قبر پر نہ ڈالے۔ (اگر کسی وجہ سے قبر کی مسنون مقدار کے لئے وہ مٹی ناکافی ہو تو مزید مٹی بقدر ضرورت ڈال سکتے ہیں۔) قبر کو ایک بالشت اونچا رکھے تاکہ پتہ چلے کہ یہ قبر ہے اور اس کی زیارت اور احترام کرنے میں سہولت ہو اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں مر جائے تو اس کی قبر اونچی نہ رکھے بلکہ مخفی رکھے تاکہ مسلمانوں کے وہاں سے لوٹنے کے بعد کافر اس قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔

قبر کو چونا لگانا، اس پر نام لکھنا، قبر کو پختہ بنانا اور اس پر عمارت یا قبہ وغیرہ بنانا مکروہ ہے۔ موقوفہ یا عام قبرستان میں قبر پر عمارت بنانا یا اسے پختہ کرنا حرام ہے ایسی صورت میں اسے منہدم کیا جائے، اگر میت کی زمین میں ہو تو نہ گرائے۔

حدیث: "آپ ﷺ نے قبر کو چونا لگانے، اس پر عمارت بنانے، اس پر نام لکھنے اور اسے روندنے سے منع فرمایا"۔ (رواہ الترمذی والحاکم وقال الترمذی حسن صحیح)

قبر کو مٹی کے گارے سے لیپنے میں کوئی حرج نہیں۔

دفن کے بعد قبر پر (خالص) پانی چھڑکنا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس پر ڈالنا اور بطور نشانی اس کے سرہانے پتھر رکھ دینا یا لکڑی وغیرہ گاڑ دینا مستحب ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم کی قبر پر پانی چھڑکا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈالیں" (الشافعی، ابوداود فی المراسیل والبیہقی، تلخیص)

(۲) "آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کی قبر کے سرہانے (بطور نشانی) پتھر رکھا" الخ۔ (رواہ ابوداود باسناد جید)

قبر پر گلاب کا پانی چھڑکنا یا اس پر سائبان بنانا مکروہ ہے۔ قبروں کے درمیان چپل پہن کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔

قبر کو ہموار (مسطح) بنانا کوہان نما بنانے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ (جیسا کہ آپ ﷺ اور شیخین کی قبروں کو کیا گیا۔ ابوداود باسناد صحیح)

جنازہ سے واپس لوٹنے والوں کی چار قسمیں ھیں۔

(۱) صرف نماز پڑھ کر واپس لوٹا۔ (۲) میت کو قبر میں داخل کرنے تک ساتھ رہا، مگر مٹی ڈالنے سے پہلے واپس لوٹا۔ (۳) دفن ہونے تک ساتھ رہا البتہ دعا کئے بغیر واپس لوٹا۔ (۴) دفن کے بعد دعا وغیرہ کر کے واپس لوٹا۔ مذکورہ تمام قسموں میں فضیلت کے اعتبار سے یہی اعلیٰ ہے۔ جو آدمی صرف نماز پڑھ کر واپس لوٹے، اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن کے بعد لوٹے اسے دو قیراط ثواب ملتا ہے۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو نماز ہونے تک جنازے کے ساتھ رہے اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن تک ساتھ رہے اسے دو قیراط ثواب ملتا ہے۔ اور دو قیراط سے دو بڑے پہاڑ مراد ہیں۔ (رواہ بخاری ومسلم)

تلقین: دفن کے بعد قبر کے سرہانے بیٹھ کر تلقین پڑھنا مستحب ہے، الفاظ یہ ہیں۔

"یَا عَبْدَ اللهِ ابْنَ اَمَةِ اللهِ اُذْكُرْ مَا خَرَجْتَ عَلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا شَهَادَةَ اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَاَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَاَنَّ النَّارَ حَقٌّ وَاَنَّ الْبَعْثَ حَقٌّ وَاَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ وَاَنَّكَ رَضِيْتَ بِاللهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا وَّبِالْقُرْآنِ اِمَامًا وَّبِالْكَعْبَةِ قِبْلَةً وَّ بِالْمُؤْمِنِيْنَ اِخْوَانًا"

ترجمہ: اے اللہ کے بندے اور اللہ کی بندی کے بیٹے، اس عہد کو یاد کر جس عہد کے ساتھ دنیا سے لوٹا ہے یعنی اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور جنت و جہنم، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا حق ہیں اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھانے والے ہیں اور تو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے پر اور قرآن کے پیشوا اور کعبۃ اللہ کے قبلہ اور مومنین کے بھائی ہونے پر راضی تھا۔

(بچے کی میت ہو تو تلقین پڑھنے کی ضرورت نہیں) تلقین کے متعلق تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

قبر کے پاس قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا بھی مسنون ہے اور پورا قرآن پڑھنا افضل ہے۔ (حاشیۃ البجیرمی ۲/۲۷۴) دفن کے بعد کچھ لوگ قبر کے پاس رک کر میت کے لئے فرشتوں کے سوالات کا صحیح جواب دینے کی دعا کرتے رہیں۔

حدیث: اللہ کے رسول ﷺ جب کسی میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو کھڑے ہو کر کہتے: "اپنے بھائی کے لئے مغفرت کی اور

ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، اس لئے کہ اب اس سے سوالات کئے جائیں گے۔" (البزاز وقال الحاکم صحیح الاسناد)

حالتِ اختیاری (عام حالات) میں مستحب ہے کہ ایک قبر میں ایک ہی میت کو دفن کرے، اگر مجبوری ہو، مثلاً کئی جنازے ہوں (جنگ یا وباء وغیرہ کی وجہ سے) اور ہر میت کو الگ الگ قبر میں دفن کرنا دشوار ہو، تو پھر ایک میں دو یا تین کو دفن کرسکتے ہیں البتہ ایسی صورت میں ان میں سے جو افضل ہو گا اسے قبر میں قبلہ کی سمت پہلے رکھے، اور فرع کو اصل سے پہلے نہ رکھے، گو فرع افضل ہو (مثلاً بیٹے یا پوتے کو باپ دادا پر مقدم نہ کرے۔)

مرد و عورت کو ایک ساتھ دفن نہ کرے، ہاں اگر شدید ضرورت ہو (تو پھر اجازت ہے) اور مرد کو پہلے رکھے، گو بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
اگر مرد، عورت، خنثیٰ مشکل اور بچہ کی میت ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو مرد کو پہلے رکھے پھر بچہ کو پھر خنثیٰ مشکل پھر عورت کو رکھے۔

دو میت (چاہے دونوں ایک جنس کے ہوں یا الگ الگ) ایک ساتھ دفن کرنے کی صورت میں دونوں کے درمیان مٹی کی آڑ بنانا مندوب ہے۔

قبر پر بیٹھنا، چلنا وغیرہ: قبر کو میت کیعظمت کیخاطر قابل احترام چیز قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس پر بیٹھنا، ٹیک دینا، اور بلا ضرورت اس پر سے چلنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر اپنی میت کے قبر تک دوسرے کی قبر پر سے چلے بغیر نہیں پہنچ سکتے تو پھر اجازت ہے۔

زیارتِ قبر: مردوں کیلئے قبروں کی زیارت مستحب ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا (لیکن اب) زیارت کرو۔ اس لئے کہ اس سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔" (رواہ ابوداود، مسلم، الترمذی)

عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت مکروہ ہے۔ (لیکن آپ ﷺ کے قبر کی زیارت عورت کے لئے بھی سنت ہے۔ الفقہ المنہجی)

کافر کے قبر کی زیارت مباح ہے۔ (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل ۲/۲۰۹)

زائر (یعنی زیارت کرنے ولے) کے لئے اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ (مسلم، ابوداؤد)

ترجمہ: اے مومنین کی جماعت تم پر سلامتی ہو اور ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ (ابوداؤد)

اے اللہ ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ فرما اور ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔

مذکورہ دعا کے بعد ان الفاظ کا پڑھنا بھی مسنون ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبِّ هٰذِهِ الْاَجْسَادِ الْبَالِيَةِ وَالْعِظَامِ النَّخِرَةِ الَّتِيْ خَرَجَتْ مِنَ الدُّنْيَا وَهِيَ بِكَ مُؤْمِنَةٌ اَنْزِلْ عَلَيْهَا رَحْمَةً مِّنْكَ وَسَلَامًا مِّنِّيْ (حاشیۃ الجمل ۲/۲۰۹)

ترجمہ: اے اللہ، جو ان بوسیدہ ہڈیوں اور بوسیدہ جسموں کا رب ہے، یہ لوگ اس حالت میں دنیا سے روانہ ہوئے ہیں کہ تجھ پر ایمان رکھتے تھے، آپ کی طرف سے ان پر رحمتیں اور میری جانب سے سلام نازل فرما۔

قبرستان میں تلاوت کرنا ایک موجودہ شخص کی طرح میت کے لئے رحمت و برکت کا باعث ہے۔ اسی لئے قبرستان میں تلاوت

مستحب ہے نیز تلاوت کے بعد دعا جلد قبول ہو گی اور دعا میت کو نفع پہنچائے گی۔ لہٰذا زائر قبلہ رو کھڑا ہو کر جتنا قرآن یاد ہو اسے پڑھے اور دعا کر کے میت کو ثواب پہنچائے۔ دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا ضروری نہیں اور بیٹھنے کے مقابلے میں کھڑے ہو کر دعا وغیرہ کرنا افضل ہے۔ (حاشیۃالجمل ۲/۲۱۰)

تلاوت سے میت کو ان صورتوں میں نفع ہوگا۔

۱) میت (قبر) کے پاس تلاوت کرنا۔ (۲) میت کے قصد سے تلاوت کرنا (گرچہ وہ دور ہو)۔ (۳) میت کے حق میں دعا کرنا۔ (جمل) زیارت کے وقت قبر سے اتنا قریب رہے جتنا زندگی میں اس کی ملاقات کے وقت رہتا۔ قبر کو بوسہ لینا یا ہاتھ سے چومنا مکروہ ہے۔ اسی طرح اولیاء کرام کی زیارت کے لئے داخل ہوتے وقت چوکھٹ کو چومنا بھی مکروہ ہے۔ (حاشیۃالبجیرمی ۲/۲۶۲)

قبر کو کھودنا: کسی قبر کو بوسیدہ ہونے سے (یعنی میت کے اجزاء مٹی بن جانے سے) پہلے کھودنا جائز نہیں۔ ہاں کسی ضرورت کی بناء پر کھودے تو جائز ہے۔ مثلاً جس میت کو غسل دینا ضروری تھا، اسے بغیر غسل کے دفن کرے یا قبلہ کی طرف رخ کئے بغیر دفن کرے تو قبر کھودنا جائز ہے، لیکن اگر میت میں تغیر پیدا ہو چکا ہو تو پھر کھودنا جائز نہیں۔

یا غصب کی ہوئی زمین میں یا غصب یا چوری کئے ہوئے کپڑے میں کفن پہنا کر دفن کر دیا ہو۔ مالک اسے لوٹانے کا مطالبہ کرے، تو قبر کھودنا جائز ہے۔ لیکن مالک کے لئے مسنون ہے کہ اپنا حق معاف کرے۔

قبر میں کسی کی انگوٹھی یا مال گر جائے تو اس کو نکالنے کے لئے بھی قبر کھودنا جائز ہے۔

اگر کسی کو ریشم کے کپڑے میں، یا بلا کفن کے دفن کر دے تو کفن پہنانے کے لئے قبر کھودنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا مال نگل کر مر جائے تو مال نکالنے کیلئے پیٹ نہ چیرے۔ ہاں اگر کسی دوسرے کا مال نگل لیا ہو، اور صاحبِ مال، مال لوٹانے کا مطالبہ کرے تو قبر کھود کر اس کے پیٹ کو چیر کر مال نکالے، لیکن اگر ورثاء اسی کے مثل مال یا اس کی قیمت ادا کرنے کی ضمانت لیں تو پھر قبر نہ کھودے۔

اگر قبر بالکل بوسیدہ ہو جائے اور میت مٹی میں مل جائے تو اسے کھود کر دوسرے کو اس میں دفن کرنا جائز ہے۔ اور قبر کی بوسیدگی کی معلومات کے لئے تجربہ کار حضرات سے رجوع کریں۔

عام قبرستان میں کسی بوسیدہ قبر کو اٹھا کر اس پر مٹی ہموار کرنا جائز نہیں، تاکہ لوگ اسے نئی سمجھ کر وہاں دفن کرنے سے رک نہ جائیں، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء کرامؒ کی قبریں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (فتح الوہاب)

اگر پورے قبرستان میں سیلاب کا پانی پہنچنے کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا ہو، تو وہاں سے میت کو منتقل کرنا جائز ہے، چاہے دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑے۔ (حاشیۃ الجمل ۲/۲۱۱) اگر کوئی کشتی میں مر جائے اور کشتی کسی ساحل یا جزیرہ کے قریب ہو اور ساحل تک پہنچنا ممکن ہو تو اس کے ساتھیوں کے لئے ساحل کی طرف نکل کر اسے غسل دینا، کفن پہنانا، نماز پڑھنا اور دفن کرنا واجب ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو ساحل پر دفن کرنا ضروری نہیں بلکہ اسے غسل دے کر کفن پہنا کر نماز پڑھے پھر دو تختوں کے درمیان باندھ کر سمندر میں ڈال دے تاکہ سمندر کی موجوں سے کنارے پہنچ جائے شاید کسی کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے دفن کر دے چاہے ساحل والے کافر ہوں، اور اگر کسی وزنی چیز سے باندھ کر سمندر میں ڈال دے تاکہ نیچے تہہ تک پہنچ جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ (مغنی ۱/۳۶۲) قبرستان میں رشتے داروں کو (مختلف جگہوں پر دفن کرنے کے بجائے) ایک ہی جگہ دفن کرنا مستحب ہے۔ (کیونکہ زیارت کرنے والے کے لئے اس میں آسانی ہو گی۔ مغنی)

حدیث: آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کے (قبر پر) سرہانے پتھر رکھ کر فرمایا "میں نے یہ علامت اس لئے رکھی تاکہ اپنے (رضاعی) بھائی کی قبر جان سکوں اور میرے رشتہ داروں میں سے جو بھی وفات پائے اسے وہاں دفن کروں" (رواہ ابوداود باسناد جید)

کسی میت کے مکمل طور پر بوسیدہ ہونے سے پہلے دوسری میت کو وہاں دفن کرنا حرام ہے۔

اگر قبر کھودتے وقت ہڈیاں مل جائیں تو قبر بند کرے، مزید نہ کھودے۔ لیکن اگر مکمل قبر کھودنے کے بعد کچھ ہڈیاں نکل آئیں، تو ان ہڈیوں کو اس قبر کے ایک جانب رکھ کر دوسری میت کو اس کے ساتھ دفن کردے۔

اگر ایک ہی وقت میں کسی کے رشتہ دار مر جائیں اور ہر ایک کو الگ الگ قبر میں دفن کرنا ممکن ہو، تو سب سے پہلے اس میت کو دفن کرے جس میں تغیر ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے بعد دوسرے نمبر پر جس میں تغیر کا خدشہ ہو، اور اگر تغیر کا خدشہ نہ ہو تو سب سے پہلے باپ کو دفن کرے، پھر ماں، پھر اقرب فالاقرب کے اعتبار سے دفن کرتا جائے اور اگر دونوں بھائی ہوں تو بڑے بھائی کو پہلے دفن کرے، اور دونوں بیویاں ہو تو پھر قرعہ اندازی کی جائے۔

کسی مسلمان کو کافروں کے قبرستان میں دفن نہ کرے اور نہ کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں۔ رات میں دفن کرنا مکروہ نہیں۔ کیونکہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک شخص کو رات میں دفن کر دیا پھر آپ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس کے قبر پر نماز جنازہ ادا کی۔ (لیکن رات دفن کرنے پر انکار نہ فرمایا) نیز بخاری ہی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رات دفن کرنے کا ذکر موجود ہے ، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رات میں دفن فرمایا۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور عائشہ رضی اللہ عنہم کی تدفین بھی رات میں عمل میں آئی بلکہ مسند احمد کی ایک روایت میں خود آپ ﷺ کا رات دفن ہونا مروی ہے۔ (فتح الباری، مغنی، فتح الوہاب، تحفۃ الاحوذی)

البتہ دن میں دفن کرنا مستحب ہے۔ اوقات مکروہہ میں بھی دفن کرنا مکروہ نہیں (لیکن سنت ہے کہ مکروہ وقت کے علاوہ دفن کرے۔فتح الوہاب)

اور جس حدیث میں ان اوقات میں دفن کرنے سے روکا ہے، وہ اس پر محمول ہے جبکہ بالقصد ان اوقات میں دفن کرے۔ قبرستان میں رات گذارنا مکروہ ہے۔ دفن کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف میت کو منتقل کرنا حرام ہے اور اگر مرنے والے نے اس کی وصیت کی ہو تو اس کی وصیت نافذ نہ ہوگی۔ ہاں اگر مکہ، مدینہ یا بیت المقدس سے قریب ہو، تو وہاں کے دفن کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اگر کوئی حاملہ عورت مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ (جنین) زندہ ہو۔ اور اس کے زندگی کی بھی امید ہو تو اس کے پیٹ کو چیر کر بچہ نکالے پھر دفن کرے اور اگر بچہ کے زندگی کی امید نہ ہو تو پیٹ نہ چیرے بلکہ بچہ مرنے تک اسے ایسے ہی چھوڑ دے، پھر دفن کر دے۔

اگر کوئی قافلہ جنگل میں کسی ایسے میت کے پاس سے گزرے، جس کے کپڑوں پر غسل، کفن وغیرہ کا اثر نہ ہو، تو رک کر غسل وغیرہ دینا نماز پڑھنا اور دفن کرنا ضروری ہے، میت عورت کی ہو یا مرد کی۔ اور اگر میت پر غسل، کفن وغیرہ کا اثر ہو تو صرف دفن کرے اور اگر نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر پڑھے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ اس پر نماز پڑھی گئی ہوگی۔

تعزیت کا بیان

حدیث: ”کوئی مسلمان اپنے بھائی کی مصیبت کے وقت تعزیت کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے شرافت کا لباس پہنائیں گے“۔(رواہ ابن ماجہ والبیہقی باسناد حسن)

تعزیت کرنا سنت ہے، تعزیت کے لئے بیٹھنا مکروہ ہے۔(یعنی گھر والے کسی ایک جگہ اس لئے بیٹھے رہیں، تاکہ لوگ آکر ان کی تعزیت کریں۔ بلکہ گھر والوں کو چاہئے کہ اپنے کام کاج میں مصروف رہیں) تمام گھر والوں کی تعزیت کرنا مستحب ہے، چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، البتہ جوان عورت کی صرف اس کے محرم رشتہ دار ہی تعزیت کریں۔ تعزیت چاہے نماز اور دفن سے پہلے کرے، یا دونوں کے بعد ہر حال میں مشروع ہے البتہ تعزیت دفن کے بعد کرنا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر میت والے زیادہ جزع وفزع (بے صبری کا مظاہرہ) کررہے ہوں، تو انہیں صبر دلانے کے لئے دفن سے پہلے تعزیت کرنا بہتر ہے۔

تعزیت کرنے کا وقت موت کے وقت سے تین دن تک ہے، اس کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے۔ البتہ اگر تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جائے وہ فی الحال موجود نہ ہو، (تو پھر اس کے آنے کے بعد تین دن تک تعزیت کرے)

کسی کا مال گم ہونے کی وجہ سے بھی تعزیت کرنا اور اس کے لئے مناسب دعا کرنا مسنون ہے خواہ مال کم ہو لیکن اتنا ہو کہ جس کے گم ہونے سے افسوس ہو، (جمل)

تعزیت کے وقت مصافحہ کرنا بھی مسنون ہے۔(جمل ۲/۲۱۲)

کوئی غائب یا معذور ہو، تو خط وکتابت کے ذریعے بھی تعزیت ہوسکتی ہے۔(حاشیۃ البحیری ۲/۲۷۱، حاشیۃ الجمل ۲/۲۱۳)

(ذمی جیسے) محترم کافر کے کسی مسلمان یا کافر رشتہ دار کی میت پر اس کی تعزیت جائز ہے اگر اس کافر کے اسلام کی کچھ توقع ہو تو اس کی تعزیت مستحب ہے۔ حربی کافر یا مرتد کی تعزیت میں اس کی تعظیم پائی جارہی ہو، تو یہ حرام ہے، ورنہ پھر مکروہ ہے، اور اگر اس کے اسلام کی امید ہو تو اسکی تعزیت سنت ہے۔ کسی مسلم کے حربی یا مرتد رشتہ دار کے مرنے پر اس مسلم کی تعزیت نہ کی جائے۔(الجمل ۲/۲۱۴)

تعزیت کا مطلب یہ ہے کہ (میت کے گھر والوں کو) صبر کا حکم دے (اور صبر پر ملنے والے) اجر کے وعدہ کو یاد دلا کر صبر کی ترغیب دے اور جزع وفزع کے گناہ سے ڈرائے۔ اور میت کے لئے مغفرت کی اور مصیبت زدہ شخص کیلئے مصیبت کے تلافی کی دعا کرے۔

مسلمان کے انتقال پر کسی مسلمان کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ ہے۔ ”أَعْظَمَ اللّٰهُ أَجْرَكَ وَأَحْسَنَ عَزَائَكَ وَغَفَرَ لِمَيِّتِكَ“ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم اور صبر جمیل عطا کرے اور آپ کے میت کی مغفرت فرمائے۔) اور کسی کافر ذمی کے مرنے پر کسی مسلمان کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ کہے۔ ”أَعْظَمَ اللّٰهُ أَجْرَكَ وَأَخْلَفَ عَلَيْكَ“ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا کرے اور اس کا بدلہ دے۔) یا یہ کہے۔ ”أَعْظَمَ اللّٰهُ أَجْرَكَ وَأَلْهَمَكَ الصَّبْرَ“ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ آپ کو بھرپور اجر دے اور صبر کی توفیق دے) یا یہ کہے ”أَعْظَمَ اللّٰهُ أَجْرَكَ وَجَبَرَ مُصِيْبَتَكَ“ (اللہ تعالیٰ آپ کو خوب ثواب دے اور آپ کی مصیبت دور کرے) اگر کسی مسلمان کے موت پر کسی کافر ذمی کی تعزیت کرے تو یہ الفاظ کہے۔ غَفَرَ اللّٰهُ لِمَيِّتِكَ وَأَحْسَنَ عَزَائَكَ“ (اللہ تمہارے میت کو بخش دے اور تمہیں صبر عطا کرے) مسلمان کسی ذمی کے قریبی ذمی رشتہ دار کی موت پر تعزیت کرسکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ الفاظ کہے ”أَخْلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَلَانَقَصَ عَدَدَكَ“ (اللہ تمہیں اس کا بدلہ دے، اور تمہاری تعداد کم نہ کرے)

حدیث: جب غزوہ موتہ میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کو ایسی خبر ملی ہے کہ (کھانے کی طرف) ان کی توجہ نہیں رہے گی۔" (ابوداؤد وغیرہ وحسنہ الترمذی)

میت کے گھر والوں کا لوگوں کو کھانے کی دعوت دینا بدعت اور غیر مستحب فعل ہے۔

نوحہ کرنے والی عورتیں اگر جمع ہو گئی ہوں تو ان کے لئے کھانا پکانا جائز نہیں، کیونکہ اس میں گناہ کے کام پر تعاون ہے۔ میت پر موت سے پہلے اور موت کے بعد رونا جائز ہے، البتہ موت سے پہلے رونا بہتر ہے۔

حدیث: (۱) "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پر موت سے پہلے روئے۔" (رواہ الشیخان) (۲) اور "اپنی بیٹی کے قبر پر روئے" (رواہ البخاری) (۳) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کے قبر کی زیارت کی تو اس وقت بھی روئے (رواہ مسلم)

ندب کرنا (یعنی میت کے اوصاف شمار کرنا جیسے واجبلاہ، ہائے میرا سہارا تو تو پہاڑ جیسا عظیم الشان شخص تھا وغیرہ) نوحہ (ماتم) کرنا، اور جزع وفزع کرنا (یعنی چہرہ پیٹنا، بال بکھیرنا، گریبان وغیرہ چاک کرنا۔ چہرہ پر سیاہی ملنا، خاک ڈالنا وغیرہ) حرام ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور تقدیر پر رضامندی کے منافی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی سے اس سے منع فرمایا ہے۔

احادیث: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "جو چہرہ پیٹے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی چیخ وپکار پر عمل کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (بخاری شریف) (۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "نوحہ کرنے والی عورت موت سے قبل توبہ نہ کرے تو بروز قیامت اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کو قطران اور خارش کا کرتہ پہنایا جائے گا۔" (مسلم)

قطران کولتار کے مانند ایک چیز کا نام ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کے بدن پر خارش اور کھجلی کو مسلط کر دیا جائے گا۔ (الفقہ المنہجی ۱/۲۶۲)

رشتہ داروں کے نوحہ وغیرہ کرنے کی وجہ سے میت کو عذاب نہ ہوگا اور جس حدیث میں میت کو عذاب ہونے کا ذکر آیا ہے اسکو اس پر محمول کیا گیا ہے جبکہ وہ نوحہ کرنے کی وصیت کرے۔

تلقین (بالمشافہ سمجھانا)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارے بھائیوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور تم اس کی قبر پر مٹی درست کر چکو، تو ایک شخص اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور کہے "یافلان بن فلانہ" (اے فلاں بن فلانہ) کیونکہ وہ سنے گا، لیکن جواب نہ دے گا، پھر کہے، یافلاں بن فلانہ، تو وہ سیدھے بیٹھ جائے گا۔ پھر کہے یافلاں بن فلانہ، تب وہ کہے گا ہماری رہنمائی کیجئے، اللہ آپ پر رحم فرمائے، لیکن تم نہیں جانتے (محسوس نہیں کرتے۔)، پھر (اس طرح تلقین) کہے۔ "اُذْکُرْ مَا خَرَجْتَ عَلَیْہِ مِنَ الدُّنْیَا شَھَادَۃُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ وَ اَنَّکَ رَضِیْتَ بِاللّٰہِ رَبّاً وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْناً وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِیّاً وَبِالْقُرْآنِ اِمَاماً" تب منکر ونکیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے۔ چلو جس شخص کو اس کی حجت (دلیل وبرہان) تلقین کی گئی، وہاں ہمارا کیا کام:-

ایک شخص نے پوچھا یارسول اللہ اگر اس کی ماں (کے نام) کا علم نہ ہو تو؟ فرمایا: اس کی ماں حواء کی طرف منسوب کرے، یافلاں بن حواء" (الطبرانی عن ابی امامہ واسنادہ صالح وقد قواہ الضیاء فی احکامہ واخرجہ عبدالعزیز فی الشافی)

حضرت راشد بن سعد، ضمرۃ بن جیب اور دیگر حضرات فرماتے ہیں: میت کی قبر درست کر کے لوگوں کے جانے کے بعد قبر کے پاس میت سے یہ کہنا مستحب سمجھا جاتا تھا: یافلاں! قل (کہو) ''لا الہ الا اللہ'' تین مرتبہ۔ قل (کہو) ''رَبِّیَ اللّٰہُ وَدِیْنِیَ الْاِسْلَامُ وَ نَبِیِّ مُحَمَّدٌ'' پھر چلا جائے حضرت حکم بن حارث نے فرمایا میرے دفن کے بعد قبر پر پانی چھڑک دو تو قبر کے پاس قبلہ رو کھڑے ہو کر میرے حق میں دعا کرو۔ (طبرانی)

ابن ماجہ کی ایک روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً دفن کے وقت یہ دعا مروی ہے۔ اَللّٰھُمَّ جَافِ الْاَرْضَ عَنْ جَنْبَیْھَا وَصَعِّدْ رُوْحَھَا وَلَقِّھَا مِنْكَ رِضْوَا ناً'' (رواہ الطبرانی) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بوقت موت فرمایا: ''میرے دفن کے بعد قبر کے پاس اتنا وقت رکو، جس میں ایک اونٹ کو ذبح کر کے گوشت تقسیم کیا جاسکے تاکہ تمہاری وجہ سے مجھے انسیت حاصل ہو اور پتہ چلے کہ میرے رب کے قاصدوں (منکر نکیر) سے کیا گفتگو ہوئی ہے (اور کیا جواب دیتا ہوں) (صحیح مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے، تو وہاں رک کر فرماتے: ''اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو اور اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اس وقت اس سے سوال ہوگا'' (ابوداؤد، حاکم، بزار عن عثمان) (تلخیص ۱۴۳/۲)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: دفن کے بعد میت کے تلقین کو ہمارے کئی فقہاء کرام نے مستحب قرار دیا ہے۔ قاضی حسین نے اپنی تعلیق میں، ان کے شاگرد ابوسعد متولی نے اپنی کتاب تتمہ ؒمیں، امام ابوالفتح نصر مقدسی اور امام رافعی وغیرہ حضرات نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

اور قاضی حسین نے اسے اصحاب شوافع سے نقل فرمایا ہے۔

امام ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ سے تلقین کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا: ہم تلقین کو اختیار فرماتے ہیں، اور اس پر ہمارا عمل ہے اور ہمارے کئی خراسانی علماء نے اس کا ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں حضرت ابوامامہ سے ایک حدیث مروی ہے، جس کی سند قوی نہیں، لیکن دیگر شواہد اور اہل شام کے قدیمی عمل سے اس کی تائید و تقویت ہوئی ہے۔

علامہ محمد بن علان صدیقی فرماتے ہیں: تلقین اس لئے مستحب ہے کہ اس میں میت کے لئے تذکیر (یاد دہانی، وعظ و نصیحت) ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، ''وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْریٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' **ترجمه**: اور سمجھا تا رہ، کہ سمجھانا مومنین کو کام آتا ہے (نصیحت کرنا مسلمانوں کو نفع بخش ہے) اور اس وقت بندہ سب سے زیادہ تذکیر اور نصیحت و سمجھانے کا محتاج ہے۔

علامہ سخاویؒ نے مسئلہ تلقین پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں چاروں مسلک کے ائمہ کرام سے اس کے استحباب کو نقل فرمایا ہے۔ اور کافی طویل کلام کرتے ہوئے ابو امامہ کی متعلقہ روایت کے دس سے بھی زائد شواہد پیش کئے ہیں۔ (الاذکار مع شرح ابن علان ۱۹۴/۴ - ۱۹۶)

امام آجری فرماتے ہیں۔ دفن کے بعد کچھ دیر قبلہ رو ہو کر میت کے حق میں ثابت قدمی کی دعا کرنا مستحب ہے۔

امام حکیم ترمذی فرماتے ہیں: بوقت دفن قبر کے پاس کھڑے ہو کر ثابت قدمی کی دعا کرنا نماز جنازہ کے بعد میت کے حق میں مدد (مزید قوت و اعانت) ہے کیونکہ مومنین کی نماز جنازہ اس کے حق میں ایک فوج کی طرح ہے، جو کسی بادشاہ کے در پر اس کی سفارش کے لئے جمع ہوئے ہوں، اور قبر پر ثابت قدمی کی دعا کے لئے رکنا اس فوج کی مدد (مزید اعانت) ہے۔ کیونکہ یہ بڑی ہولناکی اور سوال کا وقت ہے۔ (شرح الصدور ص ۱۰۶)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے تلقین کے متعلق پوچھا گیا تو اسے مستحسن قرار دیا اور (امت کے) عمل سے استدلال کیا۔ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ ابو امامہ کی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں: اگرچہ یہ روایت ثابت نہیں، لیکن علاقوں اور زمانوں میں اس پر مسلسل بلا انکار عمل اس پر عمل کے لئے کافی ہے" (الروح لابن قیم ص ۱۲)

مکلف کی میت کے دفن کے بعد اس کی قبر کے سرہانے چہرہ کے بالمقابل بیٹھ کر تلقین پڑھنا مستحب ہے۔ دیگر حضرات کو بوقت تلقین وہاں کھڑا رہنا مستحب ہے۔ جو غیر مکلف ہو (یعنی بچہ یا وہ پاگل جو کبھی مکلف نہ رہا ہو) اس کی قبر پر تلقین سنت نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے فتنۂ قبر نہ ہوگا۔ (مغنی المحتاج ۱/۳۶۷/فتاویٰ ابن زیادہ، ص ۱۰۶)

(بعض علماء جیسے ابن عبد السلام وغیرہ نے تلقین کو بدعت لکھا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو اثبات یا نفی کے اعتبار سے اچھالنا اور متنازع و اختلاف پیدا کرنا غلط ہے۔)

ایصال ثواب (میت کو ثواب پہنچانا)

کئی حضرات نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ دعا میت کو نفع پہنچاتی ہے قرآن پاک سے اس پر یہ آیت دلیل ہے۔ "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ" (الحشر ۱۰) **ترجمہ:** "اے رب ہم کو بخش اور ہمارے بھائیوں کو، جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں" آپ ﷺ نے فرمایا: "میت تو قبر میں ایک ڈوبنے والے مدد کے لئے پکارنے والے کی طرح ہے، جو اپنے ماں باپ یا اولاد یا معتبر دوست کی دعا کا منتظر رہے، جب یہ دعا پہنچتی ہے تو اسے دنیا و مافیہا سے محبوب ہوتی ہے، نیز اللہ تعالیٰ زمین والوں کی دعا کی وجہ سے پہاڑوں کے مثل اہل قبور پر (ثواب) داخل فرماتے ہیں اور زندوں کا مردوں کے حق میں ہدیہ ان کے لئے استغفار کرنا ہے" (بیہقی فی الشعب، دیلمی) علامہ خطیب شربینی فرماتے ہیں: "اجماع اور صحیح احادیث کی روشنی میں میت کے حق میں اس کے وارث یا اجنبی کی طرف سے صدقہ دینا، وقف کرنا، مسجد تعمیر کرنا اور کنواں کھودنا وغیرہ اور دعا نفع پہنچاتا ہے۔" (مغنی ۳/۶۹)

احادیث: (۱) ایک شخص نے آپ ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میری ماں کا اچانک انتقال ہو گیا، اور اس نے وصیت نہیں کی، میرا خیال ہے، اگر اسے گفتگو کا موقع ملا ہوتا تو اس نے صدقہ دیا ہوتا، اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں تو کیا اسے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "جی ہاں" (متفق علیہ) (۲) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ میری ماں کا انتقال ہوا، تو (اس کے حق میں) کون سا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا: "پانی" تو انہوں نے ایک کنواں کھودا اور کہا یہ سعد کی ماں کے لئے ہے۔ (احمد، سنن اربعہ)

میت کی جانب سے صدقہ دینے سے جس طرح میت کو نفع ہوتا ہے، صدقہ دینے والے کو بھی ہوتا ہے، اس کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی، اسی لئے صدقہ کے وقت والدین کی طرف سے صدقہ کی نیت کرنا مستحب ہے۔ (مغنی)

حدیث: "تم میں سے کوئی نفلی صدقہ کرے تو اسے والدین کی جانب سے کرے، ان دونوں کو بھی ثواب ملے گا، اور اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔" (طبرانی، شرح الصدور صفحہ ۳۰۸)

امام نوویؒ نے شرح مسلم اور فتاویٰ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر حضرات سے یہ نقل فرمایا کہ میت کو نماز وغیرہ کی قضاء کا ثواب اور تلاوت کا ثواب نہیں پہنچے گا۔

لیکن شرح مسلم اور اذکار میں انہوں نے ایک قول ائمہ ثلاثہ کی طرح تلاوت کا ثواب پہنچنے کا نقل فرمایا ہے، جس کو کئی شافعی علماء نے اختیار کیا ہے، جیسے ابن الصلاح، محب طبری، ابن ابی الدم صاحب ذخائر اور ابن ابی عصرون، اور لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور جو کام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے۔ امام ابن الصلاح فرماتے ہیں: بہتر ہے کہ یہ کہے: یا اللہ ہم نے جو تلاوت کیا اس کا ثواب فلاں کو پہنچا، اس طرح دعا ہو جائے گی، اس میں قریب و بعید کا کوئی فرق نہیں۔ (مغنی)

تعزیت کی رسمی محفلوں میں قرأت اور چالیسویں وغیرہ کا انعقاد بدعت ہے۔ (الفقہ المنہجی ۱/۲۶۳)

مسائل متفرقہ

(۱) قبر کو زیادہ بلند کرنا منع ہے، آپ ﷺ نے حضرت علی کو ایسی قبریں برابر کرنے کا حکم دیا تھا۔ (مسلم وغیرہ)

(۲) چالیسویں وغیرہ کی مناسبت سے اہل میت کا لوگوں کی دعوت کرنا بدعت ہے۔ اگر یہ دعوت میت کے ترکہ سے ہو اور وارثوں میں نابالغ بھی ہوں، تو یہ عمل شدید حرام ہے، کیونکہ یتیم کا مال کھانا اور بلا مصلحت ضائع کرنا ہے۔ (الفقہ المنہجی ۱/۲۶۳، اعانۃ، جمل)

امام احمد اور ابن ماجہ نے بسند صحیح حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا "ہم اہل میت کے پاس اجتماع اور ان کی طرف سے کھانے کے نظم کو نوحہ (ماتم) شمار کرتے تھے۔"

(۳) وارد ہے کہ جس امتی کی موت طہارت کی حالت میں ہو، حضرت جبرئیل اس کی میت پر حاضر ہوتے ہیں، لہٰذا مریض اس کا اہتمام کرے۔ اگر کراہنے سے کچھ سکون حاصل ہو، یا بلا اختیار کراہے، تو یہ مباح ہے، ورنہ خلاف اولیٰ ہے۔ اس کی جگہ تسبیح وغیرہ پڑھنا بہتر ہے۔ (بغیہ ۹۲)

(۴) جانوروں کو قبرستان میں داخل کرنا اور قبروں پر چلانا شدید مکروہ ہے، اگر کوئی کسی جانور کو قبر پر پیشاب کرتے دیکھے تو اسے چلّا کر ہٹانا واجب ہے۔ (بغیہ ص ۹۸)

(۵) موت (نزع) کے وقت مریض کے پاس سورہ یٰسین کی تلاوت مسنون ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔ (ابوداؤد وصححہ ابن حبان)

بعض علماء نے اس کے پاس سورۃ الرعد کی تلاوت کو مستحب کہا ہے۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اس سے روح بسہولت نکلتی ہے۔ علامہ جیلی فرماتے ہیں کہ اسے ایک ایک گھونٹ سرد پانی ملانا مسنون ہے، کیونکہ نزع کی شدت کی وجہ سے شدید پیاس لگتی ہے، تو ایسے وقت شیطان کے گمراہ کرنے کا خدشہ ہے، کیونکہ وارد ہے: شیطان میٹھا خوشگوار پانی لے کر آتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے۔ کہو میرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو میں یہ پانی تجھے پلاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے فضل و کرم سے بوقت موت ثابت قدم رکھے (آمین) نزع کے وقت حائضہ کو وہاں رکنا مکروہ ہے، کیونکہ حدیث میں وارد ہے، ملائکہ (فرشتے) اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا، تصویر اور جنبی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتے، تصویر اور دیگر وہ حضرات جن پر غسل واجب ہو، ان کا بھی یہی حکم ہے۔" (مغنی المحتاج ۱/۱۳۱)

(۶) میت کو تحقیر آمیز انداز میں لے جانا حرام ہے۔ مثلاً تھیلے میں، یا ٹوکرے میں یا بڑے آدمی کی میت کو جنازہ کے بغیر ہاتھ پر یا کاندھے پر لے جانا۔ چھوٹے بچے کو ہاتھ پر لے جانے میں حرج نہیں۔ (مغنی ۱/۳۵۹)

(۷) قبر کے پاس یا میت کے ساتھ آگ لے جانا مکروہ ہے، ابوداود کی روایت میں جنازہ کے ساتھ آواز بلند کرنے اور آگ لے جانے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا انتقال ہو جائے تو ساتھ نہ آگ رہے اور نہ نوحہ کرنے والی (مسلم شریف) اگر رات کی تاریکی میں تدفین کی وجہ سے چراغ ساتھ لے جائیں تو مکروہ نہیں ہے تاکہ تدفین بہتر طور پر ہو سکے۔ (نہایۃ ۳/ ۳۲)

(۸) کسی مسلمان کو کافروں کے قبرستان میں دفن کرنا اور اس کے برعکس جائز نہیں۔ دونوں کی لاشیں خلط ملط ہو جائیں تو مستقل قبرستان میں دفن کرے، حربیوں کا قبرستان بالکل ختم ہو جائے تو اسے مسلمانوں کا قبرستان یا مسجد بنانا جائز ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ایسی ہی تھی۔ کوئی شخص کسی قبرستان میں اپنے لئے قبر کھودے تو دوسرے کسی جنازہ پر یہ مقدم نہ ہو گا۔ کیونکہ پتہ نہیں یہ کس جگہ مرے گا، البتہ اس سے مزاحمت نہ کرنا بہتر ہے۔ (مغنی ۱/ ۳۶۴)

(۹) قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کو علماء نے مشروع قرار دیا ہے۔

امام زعفرانیؒ نے اپنے استاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے قبر کے پاس تلاوت کے متعلق پوچھا تو ارشاد فرمایا: "اس میں کوئی حرج نہیں۔" امام نوویؒ رحمۃ اللہ شرح المہذب میں فرماتے ہیں: قبر کی زیارت کرنے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہاں جتنا بسہولت ہو سکے تلاوت کرے، اس کے بعد ان کے حق میں دعا کرے۔ امام شافعیؒ نے اس کی صراحت فرمائی ہے اور اصحاب شافعیہ کا اس پر اتفاق ہے۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں "قبر پر مکمل قرآن ختم کریں تو یہ افضل ہے۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: انصاریوں میں کوئی انتقال ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر جا کر قرآن پڑھتے رہتے۔ (شرح الصدور صفحہ ۳۱۱)

(۱۰) کفن پر قرآن پاک، اللہ کے اسماء حسنیٰ، دیگر محترم اسماء مثلاً فرشتوں یا انبیاء کرام کے اسماء لکھنا حرام ہے، کیونکہ میت کے پیپ وغیرہ کی نجاست سے آلودہ ہو گا۔ (اعانۃ ۲/ ۱۱۵)

(۱۱) اگر مرض یا قید وغیرہ عذر کی وجہ سے بستی کے جنازہ پر پہنچنے سے عاجز ہو، تو بعض علماء نے ایسے شخص کو غائبانہ نماز جنازہ کی اجازت دی ہے۔ (اعانۃ ۲/ ۱۳۳)

(۱۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "مومن کی روح جب تک اس کا قرض ادا نہ کیا جائے معلق رہتی ہے۔ (یعنی اس کے معزز اور پسندیدہ مقام سے روک دیا جاتا ہے) (رواہ الترمذی وحسنہ وصححہ ابن حبان)

لہٰذا میت کے غسل وغیرہ سے پہلے ہی اس کے قرض کی ادائیگی اور اس میں مسارعت مستحب ہے۔

فی الحال ادائیگی مشکل ہو، تو ولی (ذمہ دار) قرض خواہوں سے درخواست کرے کہ میت کے ذمہ سے قرض کو معاف کرو، اور میں اسے اپنے حوالہ لے لیتا ہوں۔ اگر میت کے ترکہ سے ادائیگی ممکن ہو اور قرض خواہ مطالبہ کرے، یا میت ٹال مٹول وغیرہ کی وجہ سے اس تاخیر میں گنہگار ہو تو جلد از جلد ادائیگی واجب ہے، اسی طرح میت کی وصیتوں کو بھی جلد از جلد نافذ کرے۔ (نہایۃ المحتاج ۳/ ۱۸)

(۱۳) بیماری میں علاج کرنا بالاجماع واجب نہیں ہے، کیونکہ اس سے شفا یقینی نہیں۔ ایک کافر معالج کے علاج اور مشورہ پر اعتماد کرنا جائز ہے، جبکہ کسی عبادت کے ترک وغیرہ کا مسئلہ نہ ہو۔

علامہ ابن البزری کا فتویٰ ہے کہ جس کا توکل قوی ہو، اسے علاج نہ کرنا اولیٰ ہے۔ اور جس کا نفس کمزور اور صبر ناقص ہو، اسے علاج کرنا افضل ہے۔ (نہایۃ ۳/ ۱۹)

(۱۴) حدیث کی اتباع میں قبر پر سبز ٹہنی لگانا مستحب ہے۔ اور خشک ہونے سے قبل کسی اور کو اسے لینا حرام ہے۔ (نہایۃ ۳/۳۵)
قبر پر درخت لگانا اور اس کو پانی ڈالنا حرام ہے جبکہ پانی کی تری یا درخت کی جڑیں میت تک پہنچتی ہوں۔ ورنہ شدید مکروہ ہے۔
(۱۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تدفین کے بعد اپنے سرہانے سورہ بقرہ کی ابتدائی اور انتہائی آیتوں کے تلاوت کی وصیت فرمائی تھی۔ (بیہقی، ابوبکر خلال بسند حسن شرح الاذکار ۴/۱۹۴)
(۱۶) کفار کے اولاد میں سے کوئی ممیز شہادتین کا اقرار کرے اور عبادت اور دیگر اسلامی امور کی پابندی کرے۔ پھر بلوغ سے قبل مر جائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد ۱۰۶)
(۱۷) میت کو زمزم کے پانی سے غسل دینا خلاف اولیٰ ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۲/۱۴۵)

تارک صلوٰۃ کا بیان

(پنج وقتہ فرض نماز کا چھوڑنے والا)

(۱) سرے سے نماز کے وجوب کا انکار کر کے چھوڑے، تو ایسا شخص مرتد ہوگا (یعنی اسلام سے نکل جائے گا) اور اس پر مرتدین کے احکام جاری ہونگے ہاں اگر ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوا ہو (تو اور بات ہے) کیونکہ ممکن ہے اسے نماز کے وجوب کے سلسلہ میں کچھ علم نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ایسے اجماعی (متفق علیہ) حکم کا انکار کرے جس کے متعلق صراحۃً نص موجود ہو اور جس کے حکم شرعی ہونے کا ہر عام و خاص آدمی کو علم ہو (جیسے نماز، زکوٰۃ، حج کا فرض ہونا اور شراب و زنا کا حرام ہونا) تو ایسا شخص بھی کافر ہوگا۔
اور اگر ایسے اجماعی مسئلے کا جس کا صرف خواص کو ہی علم ہو (جیسے میراث میں حقیقی بیٹی کے ساتھ پوتی کا سدس حصہ کا مستحق ہونا۔ معتدہ سے نکاح کا حرام ہونا) یا ایسے نئے مسئلہ کا جس پر اہل زمانہ کا اجماع ہو چکا ہو، انکار کرے تو کافر نہ ہوگا، بلکہ اسے صحیح بات بتلادے تاکہ وہ اس کا قائل ہو جائے۔
(۲) نماز کا انکار کئے بغیر ترک کر دے، تو اس کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) کسی عذر کی وجہ سے چھوڑ دے مثلاً نیند کی وجہ سے یا بھول کی وجہ سے چھوڑ دے۔ تو ایسے شخص پر صرف قضاء ہے، اور قضا کے وقت میں وسعت ہے۔ (۲) شرعی عذر کے بغیر محض سستی اور کاہلی کی وجہ سے چھوڑ دے، تو ایسا آدمی کافر نہیں کہلائیگا۔ البتہ اس سے اولاً توبہ کرائی جائے، اگر توبہ کر کے نماز پڑھے تو ٹھیک، ورنہ پھر کسی ایک نماز کے ترک کے بعد جب اس کا وقتِ ضرورت بھی نکل جائے تو اسے تلوار کے ذریعہ قتل کر ڈالے۔ مثلاً ظہر کے ترک کی وجہ سے غروب شمس کے بعد قتل کرے اور مغرب کے ترک کی وجہ سے طلوع فجر کے بعد قتل کرے (قتل کا استحقاق اسلامی حکومت کو ہے نہ کہ عام انسان کو) توبہ کے لئے اسے مہلت دینا ضروری نہیں (بلکہ فی الحال توبہ کا مطالبہ کافی ہے۔) تارک صلوٰۃ کے غسل اور کفن و دفن کا مسئلہ پیچھے گذر چکا۔
حدیث: "مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ توحید و رسالت کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں۔" (متفق علیہ)
کوئی تارک صلوٰۃ یہ کہے کہ میں نے اپنے گھر میں نماز پڑھی، تو اسے قتل نہ کرے۔ (عمداً) بغیر وضو کے نماز پڑھنے پر بھی قتل کیا جائے گا۔
(اسی طرح کسی اجماعی رکن یا شرط کو ترک کرے تو قتل کیا جائے گا۔ جمل) بلا عذر جمعہ ترک کر کے ظہر پڑھے تو اس کی وجہ سے قتل نہ کیا جائے۔
تارک صلوٰۃ کو مہلت کے زمانے میں کوئی قتل کر ڈالے تو قاتل گنہگار تو ہوگا۔ لیکن اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔ اگر کوئی عذر کی وجہ

سے نماز چھوڑ دے۔(مثلاً بھول کر، ٹھنڈی کی وجہ سے یا پانی نہ ہونے کی وجہ سے چاہے وہ اعذار صحیح ہوں یا غلط) تو اسے قتل نہ کرے البتہ اسے نماز پڑھنے کا حکم دے۔

اگر کوئی کہے کہ میں نے بلا عذر جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی تو اسے قتل کیا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے کہ میں نماز نہیں پڑھونگا یا خاموش رہے۔

کسی عذر کی وجہ سے نماز فوت ہو جائے تو اسے فوراً قضاء کرنا ضروری نہیں ہے۔

اور جو نماز بلا کسی عذر کے فوت ہو جائے اس کی فوراً قضا کرنا ضروری ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسی حالت (اور تعلق) ہے کہ اسے نماز (وغیرہ) معاف ہے اور شراب اور لوگوں کا مال حلال ہے (جیسا کہ بعض جاہل صوفیت کے دعویدار کا حال ہے) تو اس کے قتل کے وجوب میں کوئی شبہ نہیں۔ بلکہ ایسے آدمی کا قتل کرنا اللہ کے نزدیک ۱۰۰ کافر کے قتل سے افضل ہے۔ کیونکہ اس سے ضرر اور نقصان (مسلمانوں پر) زیادہ ہوگا۔(حاشیۃ الجمل ۱۳۱/۲)

کتاب الزکوٰۃ (زکوٰۃ کا بیان)

زکات کے معنی: عربی زبان میں لفظ 'زکات'، تطہیر (پاک صاف کرنا) نشوونما، برکت اور کثرتِ خیر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً مخصوص طریقہ سے مال یا بدن کی جانب سے نکالی جانے والی چیز کو 'زکات' کہتے ہیں کیونکہ زکات مال کو پاک کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے کو گناہ سے پاک کرنے اور مال کے اضافہ و اصلاح اور آفات سے بچانے کا سبب ہے۔ زکات کی مختلف انواع ہیں، جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

زکات کی فرضیت قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ اور اس کا دینی اہم رکن ہونا بالکل قطعی اور واضح ہے۔ لہٰذا جو زکات کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہو جائے گا۔(بشری الکریم ۴۰/۲)

جو زکات کی فرضیت کا قائل ہو، لیکن ادا نہ کرے، وہ فاسق و گنہگار ہے۔ آخرت میں سخت عذاب کا سزاوار ہے، اور حکومت اسلامیہ قہراً و جبراً اس سے زکات وصول کرے، چاہے اس کے لئے قتال کی نوبت آئے، جیسا کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے طرز سے واضح ہے۔(بخاری و مسلم)(الفقہ المنہجی ۱۴/۲)

آیات:(۱) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ "اور قائم رکھو نماز کو اور دیتے رہو زکوٰۃ،(البقرہ، آیت ۱۱۰)

(۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا "لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ (صدقہ) کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو"(سورہ توبہ آیت ۱۰۳)

(۳)"وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورہ توبہ آیت ۳۴)(اور جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں۔(مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوقِ واجبہ نہ نکالیں) سو ان کو خوشخبری سنا دے دردناک عذاب کی۔"

(۴) وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ○الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ہُمْ کٰفِرُوْنَ“(حم السجدہ آیت ۶۔۷)”ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں۔“

(۵)”وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَاللّٰہِ ھُوَ خَیْراً وَّ اَعْظَمَ اَجْراً“(المزّمل ۲۰۰)”اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھی طرح (اخلاص سے) قرض دو۔ اور جو نیک عمل اپنے آگے (آخرت کا ذخیرہ بنا کر) بھیج دوگے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

احادیث:(۱) حدیث جبرئیلؑ میں جب انہوں نے آپ ﷺ سے اسلام کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:”اسلام یہ ہے کہ تم توحید و رسالت کی گواہی دو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بصورتِ استطاعت بیت اللہ کا حج کرو“(متفق علیہ)

(۲) صحیحین کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے اوپر کی پانچوں باتوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا۔

(۳) جس کو اللہ مال دے پھر وہ اس کی زکوٰۃ نہ دے تو قیامت کے دن اس کا مال گنجا، آنکھوں کے پاس دو سیاہ نقطے والا سانپ بن جائے گا (یعنی خطرناک اور بہت زہریلا سانپ) اور اس کے گلے کا طوق بنادیا جائے گا۔ پھر وہ اس کے جبڑے کو گرفت میں لے کر (ڈسے گا) اور کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں پھر یہ آیت تلاوت فرمائی (وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الخ)“(بخاری)

(۴) کسی کے پاس اونٹ یا گائے یا بکریاں ہوں اور ان کا حق (زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو بروز قیامت ان جانوروں کو سب سے زیادہ بڑی اور موٹی شکل میں لایا جائے گا۔ (پھر یہ جانور مالک کو) اپنے کھروں سے روندتے اور سینگوں سے مارتے رہیں گے۔ جب آخری جانور گزر جائے گا تو پھر پہلا لایا جائے گا (اور یہ سلسلہ سزا اور رسوائی کا جاری رہے گا۔) جب تک کہ لوگوں کا فیصلہ نہ ہو جائے۔“(متفق علیہ)

(۵)”جس مال میں بھی زکوٰۃ شامل ہوگا (یعنی جس میں سے زکات ادا نہ کی گئی یا بغیر حق کے جس نے زکات لے کر اپنے مال میں اسے شامل کیا) وہ برباد ہو جائے گا۔“(الشافعی، البخاری فی تاریخہ، حمیدی)

زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اسرار

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:-

”جاننا چاہئے کہ زکات میں سب سے اہم مصالح دو ہیں۔ پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے، اس لئے کہ نفس اور حرص و بخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حرص بدترین اخلاق میں سے ہے۔ جو معاد میں (آخرت میں) انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتی ہے۔ جو حریص ہوگا مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا، اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اگر زکوٰۃ کی مشق اس کو ہوگی تو یہ حرص اس سے ختم ہو چکی ہوگی، جو بالآخر اس کو نفع پہنچائے گی۔

انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد معاد میں سب سے اعلیٰ اخلاق سخاوت نفس ہے جس طرح رجوع الی اللہ انابت و عبودیت، دعا اور تضرع سے عالم جبروت سے مناسبت اور قرب پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سخاوت خسیس اور پست دنیاوی صورتوں اور شکلوں کو توڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ بہیمیت کی ضد ہے۔ اور اس کی اصل یہ ہے کہ ملکوتی (فرشتوں والی) صفات غالب ہوں۔ اور بہیمانہ صفات ان سے دب

جائیں۔ بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر بھی اس حکم کا اطلاق ہونے لگے جو ملکوتی صفات پر ہوتا ہے۔ اس کا راستہ یہی ہے کہ مال کو باوجود ضرورت و احتیاج کے راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے۔ ظالم کو معاف کیا جائے، مصائب پر صبر کیا جائے اور دنیاوی تکالیف و مشکلات آخرت کے یقین کی وجہ سے آسان و خوشگوار ہو جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان تمام چیزوں کا حکم دیا ہے اور ان کے حدود مقرر فرمادیئے ہیں۔ ان میں مال کا خرچ کرنا بھی ہے۔ جو بہت سے حدود و قیود کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اس کی اہمیت اتنی ہے کہ ایمان اور نماز کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل نار کے بارے میں فرماتا ہے:

"قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ○ (مدثر ۴۳۔۴۵)

ترجمہ: وہ کہیں گے ہم تو نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ ہم غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے، اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔"

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے۔ اس لئے کہ ضعفاء اور اہل حاجت جمع ہوں گے۔ اگر ان کی ہمدردی اور اعانت کی یہ سنت نہ ہو تو وہ سب بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ شہروں کا نظام مال پر قائم ہوتا ہے۔ اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے مدبرین و منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعۂ معاش اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کی معشیت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ مشترکہ اخراجات یا چندے نہ سب کے لئے آسان ہیں نہ ممکن۔ اس لئے رعیت سے ان مصالح کے لئے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور ہے۔ اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم و ملزوم رہیں۔ اس کے لئے شرع نے بھی اس کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ ۲/۲۹)

علامہ بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں:

"ادائیگی زکوٰہ کے وقت نیت کی درستی بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ بہت بڑی عبادت ہے۔" (رسائل الارکان ص ۱۶۳)

(ارکان اربعہ ص ۱۵۰)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:۔

"انفاق کی ترغیب و فضیلت پر جو احادیث آئی ہیں، ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہر عمل سخاوت کے ساتھ ہو جو زکوٰۃ کی روح ہے۔ اور تہذیب نفس کا کام بہت حد تک اس سے انجام پا سکتا ہے بخل کی برائی بار بار اس لئے بیان کی گئی کہ حرص ایسی چیز ہے جو مانع زکوٰۃ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ "اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا" (اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عنایت فرما، اے اللہ روک کر رکھنے والے کا مال تلف فرما۔) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچو اس لئے کہ حرص ہی نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کیا ہے، دوسرے موقع پر ارشاد ہے "اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ" بے شک صدقہ اللہ تعالیٰ کے عقاب کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا "اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ" بے شک صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور اس کو بڑھاتا رہتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ، ۲/۳۱، ارکان اربعہ ۱۵۶)

باب - مویشیوں کی زکات

مویشیوں میں درج ذیل شرائط کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔

(۱) اونٹ، گائے یا بکری ہو، مذکر ہو یا مونث ہو، لہٰذا دیگر حیوانات جیسے گھوڑا اور غلام وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو جانور زکات والے اور غیر زکوٰۃ والے جانور کی جفتی سے پیدا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

حدیث: مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔" (بخاری و مسلم)

(۲) نصاب مکمل ہو جس کی تفصیل آئندہ پیش ہو گی۔

(۳) اپنی ملکیت میں اس پر مکمل (اسلامی) سال گزر جائے۔ ابوداود وغیرہ کی روایت میں وارد ہے کہ "کسی مال میں سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہے" یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی صحیح آثار سے اس ضعف کی تلافی ہو جاتی ہے۔ (اور قابل اعتماد اور استدلال شمار ہو گی) بلکہ فقہاء و تابعین کا اس پر اجماع ہے۔ (بشری الکریم ۲ / ۴۴) لیکن نصاب کے بقدر مویشیوں کی نسل کے لئے نصاب کا ہی سال شمار ہو گا، چاہے ان کی ماں مر جائے۔ (بچوں کے سال کی ابتداء ان کی پیدائش سے شمار نہیں ہو گی بلکہ وہ ماں کے تابع ہوں گے) یعنی جب ان بچوں کی وجہ سے دوسرے نصاب کو پہنچ جائے جیسے ۱۲۰ بکریاں ہوں اور ایک کو بچہ ہو اور ۱۲۱ ہو جائیں تو زکات میں دو بکری واجب ہو گی۔ اگر دوسرے نصاب کو نہ پہنچے تو بچوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا جیسے ۱۰۰ بکریاں ہوں اور ۲۰ بچے پیدا ہوں (تو اس صورت میں ایک ہی بکری واجب ہے۔) امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عمر کا یہ فرمان نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے ساعی (زکوٰۃ وصول کرنے والا) سے کہا کہ "بچوں کو بھی شمار کرو" اور سال کی شرط میں مصلحت یہ ہے کہ مال میں نشو ونما اور اضافہ حاصل ہو اور بچے اہم نفع اور اضافہ میں داخل ہیں۔ لہٰذا سال میں اپنے اصل اور ماں کے تابع ہوں گے۔ ابتداءً جانور نصاب سے کم ہوں پھر بچے پیدا ہونے کی وجہ سے نصاب کو پہنچ جائیں، تو اب سے سال شروع ہو گا۔

اگر دوران سال مکمل نصاب یا بعض (فروخت وغیرہ کی وجہ سے) ملکیت سے نکل جائے پھر دوبارہ خریدنے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے اس کی ملکیت میں آئے تو اب سے از سر نو سال شروع ہو گا۔ اگرچہ زکات سے بچنے کے لئے اس طرح کرے لیکن زکات سے بچنے کی نیت سے اس طرح کرنا مکروہ ہے (بعضوں نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ اس سے باطناً (حقیقتاً) زکات سے سبکدوش نہ ہو گا۔ (بشری الکریم ۲ / ۴۴) مگر کسی ضرورت سے یا ایسے ہی کرنا مکروہ نہیں ہے۔

خرید، ھبہ، وراثت اور وصیت وغیرہ کے سبب ملکیت میں آنے والے جانور وغیرہ کا سال اب سے شروع ہو گا۔ پہلے سے موجود جانور کے ساتھ اس کا سال شمار نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ اولاد اور پیداوار کی طرح نہیں ہے۔ لیکن نصاب میں سابقہ مال کے ساتھ اسے شمار کریں گے۔ کیونکہ وہ کثرت کی وجہ سے مواسات اور غمگساری کے قابل ہے۔ لہٰذا ۳۰ گائے ملکیت میں ۶ ماہ ہوں پھر ۱۰ گائے خریدے تو ۳۰ کا پہلا سال مکمل ہونے پر ایک تبیع (ایک سالہ بیل یا گائے) واجب ہے۔ بعد میں ہر سال مُسِنَّہ (دو سالہ گائے) کا پونا حصہ اور ۱۰ کا سال مکمل ہونے پر مسنہ کا پاؤ واجب ہے۔ پہلا سال مکمل ہونے کے بعد پیدا ہونے والی اولاد کا اس سال میں شمار نہیں کریں گے بلکہ یہ دوسرے سال میں شمار ہوں گے۔ اگر مالک سال مکمل ہونے کے بعد بچوں کی پیدائش کا دعویٰ کرے تو مان لیں گے۔ اگر ساعی اسے متہم سمجھتا ہے تو اسے قسم دلانا سنت ہے۔

(۴) مالک یا اس کا قائم مقام سال بھر مویشی کو چراہ گاہ میں چرائے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ "بکری اگر سائمہ ہے (یعنی چراہگاہ پر گزر بسر کرنے والی) تو اس میں ۴۰ سے ۱۲۰ تک ایک بکری واجب ہے۔" لہٰذا اس کا مفہوم یہ نکلا کہ اگر چارہ وغیرہ لا کر کھلانا پڑتا ہے، تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ بکری پر اونٹ اور گائے کو بھی قیاس کیا جائے گا۔ عام جائز چراگاہ میں یا کسی کی مملوکہ چراگاہ (جس کی قیمت معمولی ہو) میں چرنے کی صورت میں چونکہ (خرچ کم) اور فائدہ زیادہ ہو رہا ہے، اس لئے صرف ایسے جانوروں میں زکات واجب کی گئی۔ اگر کوئی اپنے طور پر اتنا چارہ کھلائے کہ اس کے بغیر بھی نمایاں نقصان کے بغیر جانور جی سکتا ہو اور اس عمل سے چراگاہ بھیجنے کو روکنا بھی مقصود نہ ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ (بلکہ زکات واجب ہو گی)

اگر جانور خود چراگاہ میں چرے یا مالک کے علاوہ کوئی اور مثلاً غاصب چرائے، یا سائمہ جانور خود (گھر میں) چارہ کھائے، یا سال کا اکثر حصہ اسے چارہ کھلایا، یا اتنی مقدار کھلایا کہ اس کے بغیر یا تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا، یا نمایاں ضرر کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے، یا بغیر نمایاں ضرر و نقصان کے زندہ تو رہ سکتا ہے، لیکن اس طرح کھلانے سے مقصود چراگاہ کا سلسلہ ختم کرنا تھا، یا مویشی اسے وراثت میں ملے، اور (چراگاہ میں چرتے ہوئے) سال گذر گیا، لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا تو ان تمام صورتوں میں زکات واجب نہیں ہے۔ کیونکہ مالک کی طرف سے شرط کے مطابق چراگاہ میں چرانا پایا نہ گیا۔ مویشی ایک دو دن بغیر چارہ کے گذر کر سکتا ہے نہ کہ تین دن۔

کھیتی باڑی وغیرہ کے کام کاج کے لئے جو جانور ہوں ان میں زکات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ استعمال کے لئے پالے گئے ہیں، نہ کہ مال بڑھانے کیلئے جیسا کہ پہننے کے کپڑے اور گھر کے اسباب۔

سائمہ کی زکات ان کے پانی پینے کے لئے آتے وقت لینا مندوب ہے، کیونکہ اس وقت ان کی گنتی بسہولت ممکن ہے لہٰذا ساعی ان کو بستی میں لانے کا مکلف نہ بنائے، جیسا کہ اسے چراگاہ میں ان کی تلاش کرنا لازم نہیں ہے۔ اگر جانور پانی پینے کو نہ آتے ہوں، تو ان کے گھر کے قریب زکوٰۃ وصول کرے، کیونکہ بیہقی کی روایت میں ہے کہ "جنگل و صحراء میں رہنے والوں کی زکوٰۃ پانی کے پاس یا ان کے گھر کے سامنے وصول کی جائے۔"

زکوٰۃ نکالنے والا معتبر ہو تو تعداد کے متعلق اس پر اعتماد کیا جائے گا، ورنہ ان کی گنتی کی جائے گی۔ اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ کسی تنگ راستے سے ان کو ایک ایک کر کے گذارا جائے اور مالک اور ساعی دونوں یا ان کے نائب کے ہاتھ میں چھڑی ہو، جس سے دونوں بھی ہر ایک جانور کی طرف اشارہ کریں اور اس کی پشت کو چھو لیں۔ کیونکہ اس طرح شمار کرنے میں غلطی کا امکان بہت کم ہے شمار کے بعد تعداد میں دونوں کا اختلاف ہو اور اس سے زکوٰۃ کی مقدار کا فرق ہوتا ہو تو دوبارہ شمار کریں۔

اگر زکوٰۃ کی اہلیت رکھنے والے دو اشخاص نصاب میں شریک ہوں یا نصاب سے کم میں شریک ہوں اور ایک شریک نصاب کا مالک ہو، چاہے جانور ہوں یا کوئی اور زکوٰۃ کا مال جیسے سونا چاندی تو ایک شخص کی طرح زکات دیں گے۔ (یعنی یہ سارا مال ایک کا ہوتا تو جس طرح زکوٰۃ نکالی جاتی اسی طرح نکالی جائے) کیونکہ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے "زکات کے خوف سے نہ تو متفرق کو جمع کیا جائے گا اور نہ مجتمع کو متفرق (جدا) کیا جائے گا" مالک کو زکوٰۃ کے وجوب یا کثرت کے خوف سے اور ساعی کو زکوٰۃ ساقط ہونے یا کم ہونے کے خوف سے جمع اور تفریق سے منع کیا گیا۔ مذکورہ روایت دراصل خُلطۃ الجِوَار (جس کا تذکرہ آئندہ آرہا ہے) کے متعلق ہے۔ لہٰذا خُلطہ شُیوع کا (شرکت کی جو مثال گذر چکی) بھی بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہو گا۔

نصاب کا اعتبار کرنے سے معلوم ہوا کہ جنس متحد ہونا چاہئے چاہے انواع مختلف ہوں، اور جن اموال میں سال کا اعتبار ہوتا ہے، اس

میں مکمل سال شرکت پائی جائے ورنہ وجوب زکوٰۃ کے وقت جیسے پھل و اناج خلطت میں سال کی ابتداء، خلطہ کے وقت سے شمار ہوگی، نصاب سے کم میں شرکت سے زکات اس وقت واجب ہوگی جب کہ کوئی ایک نصاب کا مالک ہو۔ مثلاً دو آدمی ۲۰ بکری میں برابر شریک ہوں اور ایک کے پاس الگ ۳۰ بکریاں ہوں تو اسے ایک بکری کا ۵ / ۴ اور دوسرے کو ۵ / ۱ (پانچواں حصہ) زکات میں دینا لازم ہے، لیکن کسی کے بھی پاس بقدر نصاب نہ ہوں چاہے دونوں کا مجموعی مال نصاب تک پہنچ جائے تو زکات واجب نہیں ہے۔ مثلاً دونوں کے پاس ۱۹/ ۱۹/ بکری ہوں اور دو بکری میں دونوں شریک ہوں۔

خُلْطَة جِوَار:- (یعنی دونوں کے جانور یا کوئی اور مال ساتھ رہتے ہیں، لیکن ملکیت الگ الگ ہے اور شرکت نہیں ہے)

خلطۂ جوار کی صورت میں درج ذیل امور میں اتحاد ہو تو ایک مالک کی طرح زکات واجب ہوگی۔

(۱) مَشرَب (مویشیوں کے پانی پینے کی جگہ) (۲) مُراح (رات آرام کرنے کی جگہ) (۳) چرواہا (۴) ایک نوع کے جانور ہوں تو نر (جو جفتی کے لئے استعمال ہو) ایک ہو، انواع متفرق ہوں تو اس اعتبار سے نر کے الگ ہونے میں حرج نہیں نر ایک ہونے سے مقصود یہ ہے کہ مویشیوں میں آزاد چھوڑا گیا ہو چاہے کسی ایک کی ملکیت ہو۔ یا کسی ایک نے یا دونوں نے عاریت پر لی ہو (۵) مُحلب (دودھ دوہنے اور نکالنے کی جگہ) (۶) ناطور۔ (کھیتی اور باغ کا محافظ) (۷) کھلیان (۸) دوکان (۹) محفوظ رکھنے کی جگہ۔ اسی طرح چراگاہ، چراگاہ کا راستہ، پانی پینے کی نہر، ہل چلانے والا، ترازو، پیمانہ، وزن کرنے والا اور ناپنے والا بھی متحد ہوں۔ اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف ایک ہی ہو، بلکہ دونوں کے مال کے لئے الگ الگ نہ ہوں۔ اب اگر زیادہ بھی ہوں اور دونوں کے لئے مشترک طور پر استعمال ہو تو اس سے خلطہ پر اثر نہ ہو گا۔

دودھ دوہنے والا، دودھ کا برتن، اون کترنے والا اور کترنے کا آلہ متحد ہونا ضروری نہیں ہے۔ خلطہ کی نیت ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان سہولتوں کے اتحاد سے خرچ میں جو کمی ہوتی ہے، اس کا قصد اور عدم قصد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذکورہ امور میں اتحاد اس لئے مشروط ہے، تاکہ دونوں مال جمع ہو کر ایک مال کی طرح ہو جائے۔ اور زکوٰۃ ادا کرنے والے نیک بخت پر خرچ کا بار کم پڑے۔ جن امور میں اتحاد شرط ہے، دونوں مال میں طویل وقت تک (تین دن یا زائد) اتحاد نہ پایا جائے، یا قلیل مدت تک دونوں مالک یا ایک کی جانب سے بالقصد اتحاد نہ ہو، یا جانور خود جدا ہوں اور یہ اسی حال پر رکھیں، تو خلطہ کا حکم باقی نہ رہے گا۔

دونوں میں ایک مال موقوف یا ذمی کا یا بیت المال کا ہو تو خلطہ کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ بلکہ جو اہلِ زکات ہے اس کا مال نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ ہے، ورنہ نہیں۔

نصاب

اونٹ کا نصاب: اونٹ کے نصاب کی ابتداء پانچ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ۲۰ تک ہر ۵ میں دو سالہ ایک بکری یا بکرا یا ایک سالہ بھیڑ یا دنبہ واجب ہے۔ ۵ یا زائد اونٹ میں زکات میں نکالا جانے والا اونٹ بھی دے سکتے ہیں۔ ۲۵ اونٹ میں ایک بِنتِ مَخَاض یعنی ایک سالہ اونٹنی، ۳۶ میں ایک بِنتِ لَبُون یعنی دو سالہ اونٹنی، ۴۶ میں حِقَّہ یعنی تین سالہ اونٹنی، ۶۱ میں جَزَعَہ یعنی چار سالہ اونٹنی، ۷۶ میں دو بنت لبون، ۹۱ میں دو حقے، ۱۲۱ میں تین بنت لبون واجب ہیں۔ پھر ۹ کے اضافہ پر اور بعد میں ہر دس کے اضافہ پر واجب بدلتا رہے گا۔ لہٰذا ہر ۴۰ میں بنت لبون اور ہر ۵۰ میں حقہ واجب ہے۔ ''بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے''۔۔۔ پھر ۱۲۰ سے زائد ہو تو ہر ۴۰ میں

بنت لبون اور ہر ۵۰ میں حقہ واجب ہے" مطلب ایک کا اضافہ ہے نہ کہ اس سے کم جیسا کہ ابو داود کی روایت میں صراحت ہے"۔۔۔ پھر جب ۱۲۱ ہو جائے تو اس میں ۳ بنت لبون واجب ہے۔" آگے ۱۳۰ میں دو بنت لبون اور ایک حقہ، ۱۴۰ میں دو حقّے اور ایک بنت لبون، اور ۱۵۰ میں ۳ حقے، اور اسی طرح آگے واجب ہو گا۔

دو نصاب کے درمیان کی تعداد معاف ہے۔ اسے وَقَص کہتے ہیں۔ اور اس سے واجب متعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی کے پاس ۹ / اونٹ ہوں اور سال مکمل ہونے اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے قبل ۴ تلف ہو جائیں، تب بھی ایک بکری واجب ہے۔ زکات میں ادا ہونے والے جانور مونث ہوں، تاکہ دودھ اور نسل کا فائدہ حاصل ہو۔

گائے بیل کا نصاب:- ہر ۳۰ میں ایک تَبِیْعَ یا تَبِیْعَہ (ایک سالہ بیل یا گائے) اور ہر ۴۰ میں ایک مُسِنَّۃ (دو سالہ گائے) واجب ہے۔ ترمذی شریف وغیرہ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "آپ ﷺ نے مجھے یمن روانہ کیا تو حکم دیا کہ میں ہر ۴۰ گائے میں ایک مسنہ اور ہر ۳۰ میں ایک تبیع وصول کروں" (صححہ الحاکم وغیرہ)

بکری کا نصاب:-- ۴۰ بکری میں ایک بکری، ۱۲۱ میں دو، ۲۰۱ میں تین اور ۴۰۰ میں چار بکری واجب ہیں۔ اس کے بعد ہر ۱۰۰ میں ایک بکری، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ زکات میں نکالی جانے والی بکری دو سالہ ہو، یا ایک سالہ دنبہ ہو، یا دنبہ کے آگے کے دانت گر چکے ہوں۔

خاتمہ

ساعی یا مستحق زکات لیتے وقت مالک کے حق میں مناسب دعا کرے۔ مثلاً یہ کہے "اللہ تمہیں اس کا اجر دے اور طہارت کا باعث بنائے اور بقیہ مال میں برکت عطا فرمائے" البتہ درود کے لفظ سے دعا دینا (اللھم صل علیہ کہنا) مکروہ ہے۔ کیونکہ وہ انبیاء کرام اور ملائکہ کے ساتھ خاص ہے، البتہ تبعاً گنجائش ہے۔ انبیاء کرام کے علاوہ دیگر صالحین کے لئے ترضی اور ترحم (رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ علیہ جیسے الفاظ کہنا) سنت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے مجموع میں فرمایا ہے کہ بعض علماء نے جو ترضی کو صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یہ ضعیف ہے۔ زکات، صدقہ، تدریس، تصنیف، تلاوت، تسبیح و ذکر اور دیگر عبادات و قربت کے انجام دینے کے بعد "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" کہنا سنت ہے۔

نباتات کی زکات

(زمینی پیداوار یعنی اناج و پھل کی زکات)

آیات: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام ۱۴۱) (اور اس میں (یعنی پھل اور کھیتی میں) جو حق واجب ہے، وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو)

(۲) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ ۲۶۷) (اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا ہے۔)

اختیاری حالت میں بطورِ خوراک اور غذا استعمال ہونے والی اشیاء یعنی کھجور، انگور اور اناج (دانے) جیسے گیہوں، چاول، مسور، مکئی، چنا اور لوبیا میں زکات (عشر) واجب ہے۔

احادیث:(۱) آپ ﷺ نے کھجور کی طرح انگور کے خرص (مقدار کا اندازہ لگانا) کا حکم دیا، اور کھجور کی طرح خشک ہونے کے بعد اس کی زکات وصول کرنے کا حکم دیا۔ (ترمذی، ابن حبان، ابوداود، نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور معاذ رضی اللہ عنہ کو لوگوں کو دین سکھانے کے لئے یمن روانہ کیا تو فرمایا: "صرف ان چار اشیاء کی زکات لو۔ جو، گیہوں، خشک انگور (کشمش) اور کھجور" (حاکم۔ بیہقی)

مذکورہ اشیاء پر قیاس کرتے ہوئے ان کے مثل دیگر اشیاء میں بھی زکات واجب ہو گی۔

دوسری حدیث میں حصر اضافی ہے، کیونکہ حاکم میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "بارش، بہنے والے پانی اور اپنے جڑوں سے پانی حاصل کرنے والے اشیاء میں عُشر (دسواں حصہ) اور پانی لاکر سیراب کرنا پڑے تو نصف عُشر (بیسواں حصہ) واجب ہے، اور یہ حکم کھجور، گیہوں اور دیگر دانوں (اناج) کا ہے۔ رہی ککڑی، خربوزہ، انار اور تروتازہ ساگ تو اسے آپ ﷺ نے معاف رکھا ہے۔ (وقال صحیح الاسناد)

مذکورہ اشیاء کی بالقصد کھیتی کرے یا خود بخود اُگ آئے زکات واجب ہے۔ اختیاری خوراک کہنے سے بطور دوا، سالن مجبوری یا شوقیہ کھائی جانے والی اشیاء نکل گئیں، ان میں زکات واجب نہیں جیسے زیتون، زعفران، شفتالو، زرد آلو، انجیر، اخروٹ، بادام، سیب اور اندرائن وغیرہ

نصاب: اناج اور پھل کا نصاب پانچ وسق ہے، اس سے کم میں زکات واجب نہیں ہے۔

حدیث: "پانچ وسق سے کم میں زکات نہیں ہے۔" (رواہ الشیخان)

پانچ وسق بغدادی ۱۶۰۰ رطل کے برابر ہے۔

وسق کی مقدار:-۵ وسق کی مقدار (۶۵۳) کلو گرام ہو گی۔ (الفقہ الاسلامی للدکتور وہبۃ الزحیلی ۲/ ۸۱۱)

الفقہ المنہجی میں فرمایا: "وسق پیمانہ ہے جس کی مقدار ابن حبان کی روایت میں آپ ﷺ نے ۶۰ صاع بتلائی، ایک صاع ۴ مد کے برابر ہے۔ یعنی چار بڑے لپ بھر، ایک صاع کو دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۱۰۵/۱۴) نے تین لیٹر کے برابر قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے وسق ۱۸۰ لیٹر اور اناج وغیرہ کا نصاب (۹۰۰) لیٹر ہو گا۔ (الفقہ المنہجی ۲/ ۴۰)

ایک صاع وزن کے اعتبار سے تقریباً (۲۴۰۰) گرام (۲ کلو ۴۰۰ گرام) ہو گا۔ (الفقہ المنہجی ۱/ ۲۳۰) (اس اعتبار سے ۵ وسق کا وزن تقریباً ۷۲۰ کلو ہو گا)۔

علامہ ہاشم مجذوب نے بعض اناج کا نصاب کلو گرام میں اس طرح بیان کیا ہے۔ مسور ۷۹۲ کلو، گیہوں ۷۴۴ کلو، چنا ۷۵۶ کلو اور جو ۶۰۲ کلو (ہامش عمدۃ السالک ص ۱۵۳) ایسا مکعب جس کے اضلاع کا طول ۹۷ء۶۵ سینٹی میٹر ہو، اس کا حجم ۵ وسق کے برابر ہو گا۔ (ضمیمہ عمدۃ السالک)

علامہ قرضاوی کے تحقیق کے مطابق ایک صاع ۲۱۷۶ گرام (۲ کلو ۱۷۶ گرام) کے برابر ہوتا ہے۔ (گیہوں کے وزن سے) اور یہ مقدار ۲ء۷۵ لیٹر پانی کے برابر ہے۔ لہٰذا نصاب تقریباً ۶۵۳ کلو گرام گیہوں کے برابر ہو گا۔ (ترجمہ فقہ الزکوٰۃ ص ۲۰۰)

کھجور اور انگور بغیر نقص اور عیب کے خشک ہوتے ہوں تو خشک ہونے کے بعد نصاب کا اعتبار ہو گا۔ ورنہ تر حالت میں اندازہ لگایا جائے کہ خشک ہو کر بقدر نصاب ہو گا یا نہیں۔ اور امام (یا عامل) کی اجازت سے اسی حالت میں توڑ کر اس میں سے زکات ادا کرے، جیسا کہ

درخت کے نقصان کی صورت میں کیا جائے گا۔

بھوسہ اور جو چھلکا اناج کے ساتھ کھایا نہیں جاتا، اس کی صفائی کے بعد اناج کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے جس اناج کو چھلکے سمیت کھایا جاتا ہو جیسے مکئی، اس کا چھلکے سمیت اعتبار ہو گا۔ چاہے عیش و تنعم کے طور پر اس کا ازالہ کرے۔ جو اناج چھلکے سمیت محفوظ رکھا جاتا ہو اور چھلکا کھایا نہ جاتا ہو جیسے چاول اور گیہوں کے بعض اقسام تو ان میں غالباً دس (۱۰) وسق نصاب ہو گا۔ اگر دس (۱۰) وسق میں خالص پانچ (۵) وسق سے کم نکلے تو اس میں زکات نہیں ہے۔ اور دس سے کم میں ہی خالص ۵ وسق حاصل ہوں تو زکات واجب ہے۔

ایک ہی جنس کے مختلف انواع کو نصاب کی تکمیل میں آپس میں ملایا جائے گا۔ اور ہر نوع سے اس کی قسط کے مطابق زکات ادا کرے۔ (مثلاً ایک قسم کے چاول دو (۲) وسق اور دوسرے قسم کے تین (۳) وسق ہوں تو یہ بقدر نصاب ہے۔ اس میں زکات واجب ہو گی) (لہٰذا ہماری مثال میں ۲ حصہ زکات پہلی قسم سے اور ۳ حصہ دوسری قسم سے ادا کرے) اگر کثرتِ انواع اور ہر نوع کی مقدار کی کمی کی وجہ سے الگ الگ نکالنا دشوار ہو تو متوسط اور درمیانی قسم سے نکالے۔ لیکن دو مختلف جنسوں کو ملایا نہ جائے۔ (لہٰذا چاول دو (۲) وسق اور گیہوں تین (۳) وسق ہو تو زکات واجب نہ ہو گی۔)

ایک سال کی پیداوار کو نصاب کی تکمیل کے لئے دوسرے سال کی پیداوار کے ساتھ ملایا نہیں جائے گا، گرچہ پہلے سال کے پھل کٹنے سے پہلے ہی دوسرے سال کے نمودار ہونا شروع ہو جائیں۔ لیکن ایک ہی سال میں کٹنے والے اناج اور ظاہر ہونے والے پھلوں کو ملایا جائے گا۔ چاہے انواع اور علاقے کے اختلاف کی وجہ سے پکنے اور تیار ہونے کے اوقات الگ الگ ہی کیوں نہ ہوں۔ پھل کا ظہور ایک ہی سال میں ہو تو اسے آپس میں ملائیں گے اور اناج کا کٹنا ایک ہی سال میں ہو تو اسے ملایا جائے گا۔ سال سے اسلامی ۱۲ ماہ مراد ہیں۔ اگر محرم میں کھیتی لگائے اور رجب میں کاٹے پھر دوسرے سال صفر میں لگا کر جمادی الآخر میں کاٹے تو دونوں کھیتی کے درمیان ایک سال سے زائد عرصہ ہے۔ لیکن کاٹنا ایک ہی سال میں ہوا ہے اس لئے اسے ملایا جائے گا۔ اگر ایک ہی درخت پر سال میں دو مرتبہ کھجور آئیں تو اسے ملایا نہ جائے گا بلکہ اس کا حکم دو سال کے پھلوں کی طرح ہے۔

جن درختوں اور کھیتی کی سیرابی بارش، نہر اور نالی کے پانی سے ہو جائے یا پانی سے قریب ہونے کی وجہ سے اپنے جڑوں سے خود ہی پانی حاصل کرتے ہوں تو پیداوار میں عشر (دسواں حصہ) واجب ہے۔ نالی کھودنے میں اگر خرچ بھی ہو جائے تو عشر واجب ہے۔ کیونکہ یہ خرچ گاؤں کی اصلاح کے لئے ایک مرتبہ ہو گا پھر ہمیشہ بغیر خرچ کے پانی ملتا رہے گا۔

اگر نہر وغیرہ سے جانوروں پر پانی لا کر سیراب کرنا پڑے، یا رہٹ (چرخی) کے ذریعہ (یا مشین سے) سیراب کرنا پڑے تو نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب ہے، کیونکہ اس میں خرچ بڑھ جاتا ہے، بخلاف پہلی صورت کے۔

حدیث: "بارش اور چشموں سے سیرابی ہو، یا جڑوں کے ذریعہ قریبی گڑھے کے پانی سے سیرابی حاصل ہو تو عشر واجب ہے اور اونٹ پر پانی لا کر سینچا گیا ہو تو نصف عشر واجب ہے"۔ (بخاری، ابن حبان، ابو داود، نسائی)

اگر دونوں ہی قسم کے پانی سے سیرابی ہو تو مدت کے اعتبار سے تقسیط ہو گی۔ مثلاً کھیتی کی ابتداء سے پختگی تک ۸/ ماہ درکار ہوں جس میں ۴ ماہ بارش سے اور بقیہ چار ماہ اونٹ وغیرہ پر پانی لا کر سینچا گیا ہو تو مدت کا اعتبار کرتے ہوئے عشر کا پونا حصہ یعنی (۴/۳) حصہ واجب ہو گا۔ یا ابتدائی ۶/ ماہ میں دو مرتبہ بارش سے سیرابی ہوئی اور بقیہ دو ماہ میں تین مرتبہ اونٹ کے ذریعہ تو عشر کا پونا حصہ اور عشر کا آٹھواں حصہ یعنی (۸/۷) واجب ہو گا۔ اگر مدت کا صحیح علم نہ ہو تو دونوں مدت کو برابر شمار کریں گے۔ اور پہلی مثال کی طرح ۴۰/۳ حصہ واجب

ہو گا۔ مالک اور ساعی کا سیر ابی کے متعلق اختلاف ہو کہ کس پانی سے ہوا ہے تو مالک کی بات کو تسلیم کریں گے۔ کیونکہ اصل زائد مقدار کا واجب نہ ہونا ہے۔ اگر ساعی مالک کو متہم سمجھے تو اسے قسم دلانا مستحب ہے۔

کسی شخص کی بعض کھیتی بارش سے اور بعض اونٹ وغیرہ کے ذریعہ (یعنی ذاتی خرچ سے) سینچی گئی ہو اور دونوں بھی تنہا بقدر نصاب نہ ہو لیکن مجموعی طور پر بقدر نصاب ہو تو زکات واجب ہے۔ اوّل میں عشر اور دوسرے میں نصف عشر نکالے۔

پھل میں زکات بُدُوُّ صَلَاح (اس کی پختگی اور رنگ بدلنے) کے بعد اور اناج میں دانے سخت ہونے کے بعد واجب ہو گی۔ بعض اناج اور پھل کا اس طرح ہونا کافی ہے۔ وجوب زکوٰۃ کا یہ مطلب نہیں کہ فی الحال نکالنا واجب ہے، بلکہ زکات کے وجوب کا سبب پایا جا چکا، لہٰذا اب مالک کو اس میں سے کھانا، صدقہ، ہدیہ وغیرہ تصرفات حرام ہیں۔ پھل کے توڑنے وخشک کرنے کا خرچ اور اناج کے کاٹنے اور صفائی وغیرہ کا خرچ مالک کو اپنی طرف سے برداشت کرنا ہے۔ زکات کے مال میں اس کا شمار نہیں ہو گا۔ (لہٰذا مکمل پیداوار میں سے زکوٰۃ نکالے، خرچ کو اس میں سے نفی نہیں کر سکتا)۔

پھل اور اناج میں ایک ہی مرتبہ زکات واجب ہے، بعد میں (سالہا سال اپنی ملکیت میں ہی باقی ہو، تب بھی) اس میں کچھ واجب نہیں، اناج و پھل توڑتے وقت اس میں سے کچھ فقراء کو خیرات کرنا مستحب ہے۔ (قلائد الخرائد ۱/۲۱۴)

سونے چاندی کی زکات

”وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (سورہ توبہ، آیت: ۳۴) **ترجمہ:** اور جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں۔ سو ان کو خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔“ آیت میں کنز سے وہ مال مراد ہے جس کی زکات نہ ادا کی گئی ہو۔ زکات ادا کر دی جائے تو وہ شرعاً کنز نہیں ہے، چاہے مدفون ہو یا نہ ہو۔ (الحاوی ۳/۷۲)

۲۰ مثقال سونے اور ۲۰۰ درہم چاندی پر سال گذر جائے تو چالیسواں حصہ (۱/۴۰) زکات واجب ہے۔

احادیث: (۱) ”پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم) سے کم چاندی میں زکات واجب نہیں ہے۔“ (متفق علیہ)

(۲) ”پانچ اونٹ سے کم میں کچھ واجب نہیں، اور ۲۰ مثقال (سونے) سے کم میں کچھ واجب نہیں، اور ۲۰۰ درہم (چاندی) سے کم میں کچھ واجب نہیں۔“ (دارقطنی، واسنادہ ضعیف)

(۳) ”(سونے میں) تم پر کچھ واجب نہیں یہاں تک کہ ۲۰/ دینار ہو جائے“ ”تمہارے پاس ۲۰ دینار ہو اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں نصف دینار واجب ہے۔ زائد ہو تو اس میں بھی اسی حساب سے نکالے۔“ (ابوداود، ترمذی) (تلخیص الحبیر ۲/۱۸۴)

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ”چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔“ چونکہ سونا اور چاندی منجانب اللہ سائمہ جانوروں کی طرح اضافہ کے لئے مہیا کئے گئے ہیں، اس لئے اس میں زکات کو واجب کیا گیا ہے۔ سونے چاندی اور زمینی پیداوار میں جانوروں کی طرح وقص (دو نصاب کے درمیانی تعداد پر زکات کی معافی) نہیں ہے، کیونکہ ان اشیاء میں بلا ضرر تقسیم ممکن ہے، بخلاف جانوروں کے۔ مذکورہ نصاب سے کم ہو تو زکات واجب نہ ہو گی۔ اگر ملاوٹ ہو تو ملاوٹ کے بغیر خالص سونے یا چاندی کی مقدار نصاب کے برابر ہو تو زکات واجب ہو گی۔ سونے، چاندی کے علاوہ ہیرے جواہرات وغیرہ میں زکات واجب نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں اس پر

زکات کا تذکرہ نہیں ہے، اور یہ اشیاء کام کاج اور استعمال کے جانوروں کی طرح استعمال کے لئے مہیا ہیں۔ اسی طرح سال مکمل ہونے سے قبل زکات واجب نہ ہو گی۔

دورِ حاضر میں نصاب

(۱) فقہ شافعی میں دورِ حاضر کی ایک مشہور اور معتبر کتاب "**الفقه المنهجی**" میں سونے کا نصاب ۹۶ گرام اور چاندی کا نصاب ۶۷۲ گرام قرار دیا ہے۔ (الفقہ المنھجی ۳۱/۲)

(۲) دکتور وہبہ زحیلی نے سونے کا نصاب ۹۶ گرام (یا درہم عربی کا اعتبار کرتے ہوئے ۸۵ گرام) اور چاندی کا نصاب تقریباً ۶۴۲ گرام قرار دیا ہے۔ (الفقہ الاسلامی ۵۹۷/۲)

(۳) فقہ الزکوٰۃ میں علامہ یوسف القرضاوی کی تحقیق کے مطابق ایک درہم ۲٫۹۷۵ گرام اور ایک دینار ۴٫۲۵ گرام کے مساوی ہے، لہٰذا سونے کا نصاب ۸۵ گرام اور چاندی کا نصاب ۵۹۵ گرام ہو گا۔ (فقہ الزکوٰۃ القرضاوی ۲۶۰/۱)، (احتیاطاً کم مقدار کو اختیار کرنا بہتر ہے)

اگر کوئی برتن سونے چاندی سے مخلوط بنا ہو اور اکثر مقدار کس کی ہے معلوم نہ ہو تو احتیاط پر عمل کرنے کی صورت میں (جبکہ یہ برتن کسی مجبور یعنی بچے پاگل وغیرہ کا نہ ہو) دونوں کو اکثر فرض کر کے زکات نکالے، واجب سے زائد مقدار سنت شمار ہو گی۔ لہٰذا برتن کا وزن ۱۰۰۰ ہو جس میں ایک ۶۰۰ اور دوسرا ۴۰۰ ہے تو ۶۰۰ سونے اور ۶۰۰ چاندی کی زکات نکالے۔ مکمل سونا فرض کر کے زکات نکالنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایک جنس کی زکات دوسرے جنس سے ادا نہ ہو گی، گرچہ وہ اعلیٰ ہو۔ دوسرا طریقہ زکات کا یہ ہے کہ آگ پر تپا کر دونوں کو الگ کر کے ہر ایک کی زکات نکالے یا پانی کے ذریعہ اکثر و اقل کی تعیین کرے۔ وہ اس طرح کہ پانی میں ۱۰۰۰ سونا ڈالے اور پانی کی بلندی پر نشان لگائے۔ پھر ۱۰۰۰ چاندی ڈال کر نشان لگائے پھر مذکورہ مخلوط برتن کو ڈالے۔ اب پانی کی بلندی جس نشان سے قریب ہو گی وہی اس میں اکثر ہو گا۔

سونے چاندی کی حرام اشیاء جیسے برتن اور مکروہ جیسے زینت کی خاطر چاندی کا معمولی سا جوڑ اور پیوند یا حرام و مکروہ زیور میں زکات واجب ہے۔

زیورات میں زکات: مباح اور جائز زیورات میں زکات واجب نہیں۔ (جیسے عورتوں کے کنگن) جبکہ مالک کو اس کا علم ہو اور ذخیرہ اور خزانہ کی نیت نہ ہو۔ کیونکہ سونا چاندی میں زکات کا تعلق، ان سے جائز انتفاع سے بے نیازی سے ہے نہ کہ ان کے جوہر (اور اصل مادے) سے، کیونکہ ان کی ذات میں کوئی غرض نہیں ہے۔ لہٰذا انتفاع ہی نہ ہو یا مکروہ و حرام انتفاع ہو تو زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جائز انتفاع کی صورت میں واجب نہیں ہے کیونکہ وہ کام کاج کے جانوروں کے مشابہ ہے۔

زیورات میں عدم زکات کے دلائل: (۱) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "ہمارے علم میں کسی بھی خلیفہ نے زیورات کی زکات کا حکم نہیں دیا۔" (ابن ابی شیبہ)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹیوں اور کنیزوں کو سونے کے زیورات پہناتے اور اس کی زکات نہ نکالتے۔ (مؤطا امام مالک)

(۳) حضرت عائشہؓ اپنے زیر پرورش یتیم بھتیجیوں کے زیورات کی زکوٰۃ نہ نکالتیں۔" (مالک، الشافعی)

(۴) ایک شخص نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے زیورات کے متعلق پوچھا تو فرمایا "اس کی زکات عاریت دینا ہے۔" (الشافعی۔ البیہقی)

(۵) امام بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور امام دار قطنی و بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے زیورات میں عدم زکات کو نقل فرمایا ہے۔ (تلخیص الحبیر ۲/۱۸۹)

اگر زیور ٹوٹ جائے اور اس کی اصلاح کا ارادہ ہو اور بغیر پگھلائے ممکن ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کی صورت باقی رہنے اور اصلاح کے ارادے کی وجہ سے، اگر اصلاح کا ارادہ نہ ہو بلکہ بغیر ڈھالے ایسے ہی سونے چاندی کے ٹکڑے (بسکٹ) کے طور پر رکھنے کا ارادہ ہو یا دراہم یا خزانہ کا ارادہ ہو، یا بلا کسی ارادے کے ایسے ہی چھوڑ دے یا اصلاح کے لئے دوبارہ پگھلا کر ڈھالنے کی ضرورت ہو، تو ان تمام صورتوں میں زکات واجب ہے، کیونکہ فی الحال نہ یہ مستعمل ہے اور نہ قابل استعمال، ٹوٹنے کے وقت سے سال شمار کریں گے۔

مالک کو زیورات کا علم نہ ہو مثلاً وراثت میں مباح (جائز) زیور ملے اور سال گزرنے تک اسے اس بات کا علم نہ ہوا تو اس میں زکات واجب ہے، کیونکہ اس نے مباح استعمال کے لئے رکھنے کی نیت نہیں کی، اس طرح اگر کوئی ذخیرہ اور خزانہ کی نیت سے زیورات رکھے تو اس میں زکات واجب ہے۔

مرد یا خنثیٰ کے پہننے کے لئے کنگن اور پازیب بنانا حرام ہے۔ اگر کوئی مرد یہ زیور کسی عورت یا بچے کے پہننے کے لئے یا ان کو عاریت پر یا کرایہ پر دینے کے لئے بنائے یا بلا قصد بنائے یا ذخیرہ کے لئے بنائے تو جائز ہے، لیکن آخری صورت میں زکات واجب ہے۔ سونے چاندی سے کسی ذی روح کی تصویر بنانا ہر کسی کے لئے حرام ہے، اور اس میں زکات واجب ہے۔ مرد اور خنثیٰ کے لئے سونے چاندی کے زیورات حرام ہیں۔ سونے چاندی کے ہاتھ اور انگلیاں عورتوں کو بھی حرام ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سونا اور ریشم میری امت کے عورتوں کے لئے حلال اور مردوں پر حرام ہیں"۔ (صححہ الترمذی)

احتیاطاً خنثیٰ کو بھی مرد کے حکم میں رکھیں گے۔

مردوں کو ناک، انگلی کا پورا اور دانت (ٹوٹنے اور کٹنے کی صورت میں) سونے کا استعمال کرنا جائز ہے، گرچہ چاندی سے ممکن ہو تب بھی، کیونکہ سونا غالباً زنگ آلود نہیں ہوتا اور جگہ کو نہیں بگاڑتا۔

حدیث: حضرت عرفجہ ابن اسعد کی ناک جاہلیت میں ایک جنگ (یوم الکلاب) میں کٹ گئی تو انہوں نے چاندی کی ناک بنالی، اس سے بدبو آنے لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سونے کی ناک بنوالی۔ (ترمذی و حسنہ، ابن حبان و صححہ)

ناک پر دانت اور پورے کو قیاس کیا گیا، چاہے ایک دانت ہو یا زائد اور ایک ہی انگلی کا پورا ہو یا تمام، یہ اعضا کام دیتے ہیں، اس لئے اجازت ملی، لیکن انگلی اور ہاتھ سے یہ مقصد حل نہ ہوگا، لہٰذا ناجائز قرار دیا۔

چاندی کی انگوٹھی: چاندی کی انگوٹھی مردوں کو سنت ہے۔ اس کی مقدار، تعداد، اور پہننے کی جگہ میں اس جیسے لوگوں کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا، لہٰذا ایک عالم صرف چھنگلی (چھوٹی انگلی) میں پہنے اور عامی آدمی ایک اور انگوٹھے میں بھی پہن سکتا ہے۔ عادت کے خلاف استعمال مکروہ یا حرام ہوگا، اور ان دونوں صورتوں میں زکوٰۃ لازم ہوگی۔ انگوٹھی پر سونے کا پانی چڑھانا حرام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انگوٹھی کا وزن ایک مثقال (تقریباً سوا چار گرام) سے کم ہو۔ مختلف اوقات میں پہننے کی نیت سے کئی انگوٹھیاں بنا کے رکھنا جائز ہے، جبکہ

اسراف میں شمار نہ ہو، اوراس میں زکات لازم نہیں ہے۔ لیکن عادت سے زائد پہننے کی نیت ہو تو زکات واجب ہے۔ امام رملیؒ نے فرمایا کہ ایک وقت میں دو یا زائد پہننے کی نیت سے بنائے تو زکات واجب ہے۔

انگشتری دائیں ہاتھ کی چھنگلی اور بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں مستحب ہے، لیکن دائیں میں افضل ہے، کیونکہ یہ زینت ہے، اور دایاں اشرف ہے، مرد کو کسی اور انگلی میں انگشتری پہننا مکروہ ہے۔ (تحفة المحتاج ۴/۳۲۸) بہ یک وقت دونوں میں پہننا بھی جائز ہے۔ بعضوں نے ایک سے زائد انگوٹھی پہننا حرام قرار دیا ہے۔ (تحفة المحتاج) انگشتری نگینہ کے ساتھ، اور بلا نگینہ دونوں طرح پہن سکتے ہیں، نگینہ ہو تو اسے ہتھیلی کے باطن (پیٹ) کی طرف رکھنا افضل ہے۔ انگشتری پر ذکر اللہ یا کچھ اور نقش کرنا بلا کراہت جائز ہے، اپنا نام نقش کرے تو اسے مُہر کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ذکر اللہ کے نقش کی صورت میں اس پر نجاست کے لگنے سے پرہیز واجب ہے۔ اگر بائیں میں پہنے اور استنجاء کے وقت اس پر پانی لگے تو یہ حرام ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی استعمال فرمائی۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ کے انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ ﷺ تھا پہلی سطر محمد دوسری سطر رسول تیسری سطر اللہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نقش "**نِعۡمَ الۡقَادِرُ اللّٰه**" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نقش "**كَفٰى بِالۡمَوۡتِ وَاعِظاً يَا عُمَر**" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نقش "**اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ مُخۡلِصاً**"، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقش "**اَلۡمُلۡكُ لِلّٰهِ**" اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا نقش "**اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ**" تھا۔

مرد کے لئے بغیر اسراف کے چاندی سے جنگی ہتھیار مثلاً تلوار، نیزہ، تیر کا کنارہ وغیرہ آراستہ کرنا حلال ہے، کیونکہ یہ کفار کو غصہ دلانے کا باعث ہے۔ اسراف (حد سے تجاوز، زیادتی) ہو تو حرام ہے۔ زین، لگام اور رکاب جیسی اشیاء جو پہننے میں استعمال نہ ہوں، چاندی سے آراستہ کرنا برتن کی طرح ناجائز ہے۔ سونے سے ہتھیار وغیرہ کو آراستہ کرنے میں چونکہ زیادہ تکبر ہے، اس لئے یہ ناجائز ہے۔ عورتوں کو ہتھیار آراستہ کرنا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں مردوں سے تشبہ (مشابہت اختیار کرنا) ہے، جو کہ حرام ہے، جیسا کہ مردوں کو عورتوں سے تشبہ حرام ہے، کیونکہ اس پر لعنت وارد ہوئی ہے، اگرچہ بوقت ضرورت عورتوں کو بھی فی الجملہ ہتھیار سے لڑنے کی اجازت ہے۔ عورت کو لڑنے کا اتفاق ہو اور مذکورہ آراستہ ہتھیار کے علاوہ میسر نہ ہو تو اس کا استعمال حلال ہے۔

حدیث: "آپ ﷺ کے تلوار کے قبضہ پر چاندی کی گرہ تھی۔" (نسائی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ) (تلخیص ۱/۶۴)

عورتوں کے زیور: عورتوں کو سونے چاندی کے مختلف زیورات پہننا جائز ہے جیسے ہار، انگشتری، کنگن، چپل، پازیب اور سونے چاندی سے بنے ہوئے کپڑے، لیکن ان اشیاء میں اسراف (حد سے تجاوز) حرام ہے جس زیور میں اسراف ہو اس کی پوری زکات واجب ہے، نہ کہ صرف زائد مقدار کی۔ مثلاً دونوں پازیب کا مجموعی وزن ۲۰۰ مثقال ہو تو عورت کو یہ پہننا حلال نہیں ہے کیونکہ عورتوں کو زیور کے جواز کا اصل مقصد شوہر کے لئے مزین ہونا ہے، جو کہ شہوت کے لئے محرک اور نتیجۃً کثرتِ نسل کا باعث ہے اور اسراف کی صورت میں کوئی زینت نہیں ہے، بلکہ اس کی بدصورتی سے نفس کو نفرت ہوگی۔ مذکورہ احکام میں نابالغ بچہ اور پاگل بھی عورت کی طرح ہے۔ (جو زیورات عورت کو جائز ہیں ان کو بھی جائز ہیں)

قرآن کو آراستہ کرنا: ہر کسی کو قرآن پاک چاندی سے آراستہ کرنا بطورِ اکرام جائز ہے اور عورت کو سونے سے آراستہ کرنا بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں مطلقاً سونا عورتوں کو حلال بتلایا۔ قرآن کے علاوہ حدیث اور دیگر دینی علوم کی کتابوں کو سونے چاندی سے

آراستہ کرنا جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی قبر اطہر یا دیگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء کرام وغیرہ کے قبروں کو بھی سونے چاندی سے آراستہ کرنا جائز نہیں ہے۔

امام غزالیؒ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا: "جس نے سونے سے قرآن لکھا بڑا اچھا کام کیا اور اس پر زکات واجب نہیں ہے۔ (یعنی اس سونے میں) چاہے مرد لکھے یا عورت، اسی طرح مرد یہ قرآن استعمال کر سکتا ہے۔" "**المجموع**" میں امام نوویؒ نے کئی فقہاء کرام سے نقل کیا کہ جن صورتوں میں سونے کو حرام قرار دیا گیا وہ اس وقت ہے جب کہ وہ زنگ آلود نہ ہو جائے، اگر زنگ آلود ہو جائے تو حرام نہیں ہے۔

معدن اور دفینہ (کان اور خزانہ) کی زکوٰۃ

کوئی اپنی ذاتی زمین یا موات (عام زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو) میں معدن سے سونا یا چاندی بقدر نصاب نکالے تو فوراً اس میں چالیسواں حصہ (۲٫۵ فیصد) زکوٰۃ نکالنا لازم ہے۔ روایت گزر چکی ہے کہ چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے اور امام حاکم کی صحیح میں روایت ہے کہ "آپ ﷺ نے معادن قبلیہ (ایک جگہ کا نام) سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کی۔ سال گزرنے کا اعتبار اس لئے کیا جاتا ہے کہ آدمی اس مدت میں اپنا مال بڑھا سکے۔ اور معدن سے حاصل ہونے والی چیز تو مکمل اضافہ ہے، اس لئے یہاں سال گزرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ دیگر اموال زکوٰۃ کی طرح بقدر نصاب ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے کم مقدار ہمدردی اور غمگساری کی متحمل نہیں ہے۔

معدن سے حاصل ہونے والی بعض مقدار کو بعض کے ساتھ ملائیں گے۔ (تکمیلِ نصاب کے لئے) جبکہ معدن ایک ہی ہو اور نکالنے کا عمل مسلسل ہو یا کسی عذر سے تسلسل ٹوٹے مثلاً مرض، سفر، اوزار کی اصلاح وغیرہ، اگرچہ عرفاً فاصلہ زیادہ ہو جائے، یا پہلے حاصل شدہ اپنی ملکیت سے نکل چکی ہو، لیکن معدن الگ الگ ہو، یا بلاعذر عمل منقطع ہو، تو تکمیلِ نصاب کے لئے اول دوسرے کے ساتھ نہیں ملائیں گے، چاہے درمیانی فاصلہ کم ہی ہو لیکن دوسرے کو پہلے کے ساتھ ملانے سے بقدر نصاب ہو تو اس دوسرے میں فی الحال زکوٰۃ واجب ہے اور اوّل میں اس پر سال گذرنے کے بعد واجب ہو گی۔

معدن سے نصاب سے کم سونا یا چاندی ملے، لیکن پہلے سے اس کی ملکیت میں موجود سونے چاندی کے ساتھ اسے ملانے سے بقدر نصاب ہو جاتا ہے تو معدن کا ابھی اور پہلے سے موجود کا سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کرے۔

مثال: پہلی مرتبہ کان سے ۱۹؍ مثقال سونا حاصل ہوا اور دوسری مرتبہ ایک مثقال تو ۱۹؍ مثقال میں زکوٰۃ واجب نہ ہو گی، ایک مثقال میں واجب ہو گی۔ اسی طرح ۱۹؍ مثقال پہلے سے اس کے پاس موجود تھا۔ پھر ایک مثقال کان سے ملا تو ایک مثقال پر زکوٰۃ نکالے۔ دونوں صورتوں میں ایک مثقال ملنے پر دونوں کا سال شروع ہو جائے گا۔

سونے چاندی کے علاوہ لوہا، تانبہ، یاقوت، یا سرمہ وغیرہ معدن سے نکلے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ معدن کی زکوٰۃ اس کی صفائی اور خالص کرنے کے بعد نکالنا واجب ہے، اور یہ تمام مصارف مالک کے ذمہ ہیں۔ (سونے چاندی سے اس خرچ کو نفی نہیں کرے گا)

رِکاز (دفینہ):- دفینہ ملتے ہی اس میں خمس (پانچواں حصہ ۱/۵) نکالنا واجب ہے۔ جبکہ سونا یا چاندی ہو اور بقدر نصاب یا زائد ہو۔ نصاب سے کم ہو لیکن پہلے سے ملکیت میں موجود سونے چاندی کے ساتھ ملا کر نصاب ہو جاتا ہو، تب بھی اس میں خمس نکالے۔ معدن

کے برعکس اس میں یا تو کچھ خرچ ہی نہیں ہوتا، یا بہت کم خرچ ہوتا ہے۔ لہٰذا پانچواں حصہ واجب قرار دیا۔ دفینہ کا خمس اور کان کی زکوٰۃ مستحقین زکوٰۃ پر زکوٰۃ کی طرح تقسیم کی جائے گی کیونکہ یہ زمین سے حاصل شدہ فائدہ پر واجب حق ہے، لہٰذا پھل اور کاشت کے مشابہ ہوا۔

رکاز سے وہ دفینہ مراد ہے جو جاہلی ہو، یعنی آپ ﷺ کی بعثت سے قبل مدفون ہو، اس پر کسی علامت کی وجہ سے یہ اندازہ ہو تو کافی ہے۔ اس طرح کا دفینہ کسی اہل زکوٰۃ (جس میں شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے شرائط موجود ہوں) کو موات میں یا موات کو احیاء (آباد) کر کے مالک بننے کے بعد اس میں، یا کسی قلعہ میں یا جاہلیت کی قبروں یا کھنڈرات میں ملے تو اس کی زکوٰۃ (خمس ۲۰٪) ادا کرے۔

کسی مسجد میں یا سڑک پر ملے یا اسلامی دفینہ ہو (مثلاً اس پر قرآن کی آیت یا کسی مسلمان بادشاہ کا نام کندہ ہو) اور اصل مالک کا علم ہو تو اسے لوٹانا واجب ہے، اور مالک کا علم نہ ہو تو پھر لقطہ ہے، لہٰذا ایک سال تک اس کا اعلان کرنے کے بعد بھی مالک نہ ملے تو خود اس کا مالک بن سکتا ہے۔ اگر دفینہ پر کوئی خاص علامت نہ ہو، جس سے جاہلی یا اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکے تو وہ بھی لُقطہ ہے۔ اگر دفینہ کسی اور کی زمین میں ملے اور وہ شخص اس کا دعویٰ کرے تو بلا قسم کے اس کے حوالے کریں گے اگر وہ اپنا ہونے کا دعویٰ نہ کرے تو اس سے قبل اس زمین کے مالک کی ورنہ اس سے قبل مالک کی اسی طرح آخر میں اس زمین کو احیاء کرنے والے کی ملکیت ہوگی، چاہے وہ دعویٰ نہ کرے کیونکہ وہ احیاء کی وجہ سے زمین کے اندرونی اشیاء کا مالک بن چکا اور فروخت کی وجہ سے یہ ملکیت زائل نہ ہوگی کیونکہ یہ مدفون منقول شئ ہے۔ اصل مالک اور مستحق اوپر کی صورتوں میں انتقال کر چکا ہو تو اس کے ورثاء اس کے قائم مقام ہوں گے۔ اگر بعض وارث مورث کی ملکیت کا اقرار کریں اور بعض انکار تو اقرار کرنے والوں کا حصہ ان کے حوالے کیا جائے اور بقیہ کے متعلق اوپر کی ترتیب ملحوظ رکھے۔ اگر مالک کے تحقیق سے مایوسی ہو جائے تو امام وقت یا جس کے ہاتھ میں ہے وہ صدقہ کر دے۔

کسی دوسرے کی ملکیت میں ملے ہوئے دفینہ کے دو دعویدار ہوں تو مالک جس کی تصدیق کرے اس کے حوالے کریں گے۔

کسی زمین کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا یا کرایہ پر دینے والا اور لینے والا، یا عاریتاً دینے والا اور لینے والا دونوں دعویٰ کریں کہ دفینہ میرا ہے، میں نے دفن کیا تھا، تو جس کے قبضہ میں ہے (یعنی خریدنے والا، کرایہ پر یا عاریتاً لینے والا) اسے قسم دلا کر اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، جبکہ کسی درجہ میں اس کی سچائی ممکن بھی ہو۔ اگر ممکن نہ ہو مثلاً اتنی کم مدت میں وہ دفن نہیں کر سکتا تو اس کی تصدیق نہ کرے۔ مذکورہ فروخت کرنے والے یا کرایہ یا عاریت پر دینے والے کے پاس زمین واپس لوٹنے کے بعد یہ اختلاف ہو اور یہ تینوں یوں کہیں کہ واپس لوٹنے کے بعد میں نے دفن کیا اور یہ ممکن بھی ہو تو قسم کے ساتھ ان کی تصدیق کریں گے، اگر یہ کہیں کہ میرے ہاتھ سے زمین نکلنے سے پہلے دفن کیا تھا تو بالمقابل لوگوں کی تصدیق کریں گے۔

تجارت کی زکوٰۃ [ماخوذ از الفقہ المنہجی)

آیت: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ" (البقرہ، ۲۶۷)

ترجمہ "اے ایمان والو خرچ کرو صاف ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے" امام مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تجارت کے متعلق نازل ہوئی۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: "اونٹوں میں ان کی زکوٰۃ واجب ہے، گائے بیل میں ان کی زکوٰۃ واجب ہے، بکریوں میں زکوٰۃ واجب ہے، کپڑوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔" (رواہ حاکم باسناد صحیح علی شرط الشیخین)

مراد برائے فروخت کپڑے ہیں، اس پر دیگر تجارتی اشیاء کو بھی قیاس کریں گے۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو برائے فروخت اشیاء کا صدقہ (زکوٰۃ) نکالنے کا حکم دیتے تھے۔" (ابوداود)

اسباب تجارت میں زکوٰۃ کے شرائط: (۱) عقدِ معاوضہ کے ذریعہ ان اسباب و اشیاء کا مالک بنا ہو، جیسے خریدنا، کرایہ اور مہر وغیرہ۔ اگر وراثت، وصیت یا ہبہ کے ذریعہ مالک بنا ہو تو یہ اسباب تجارت میں شمار نہ ہوگا۔ (۲) تملک (مالک بننے) کے وقت اس میں تجارت کی نیت ہو اور یہ نیت مستمر (جاری) ہو۔ اگر تملک کے وقت تجارت کی نیت نہ ہو، تو یہ مالِ تجارت شمار نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ بعد میں نیت کرنے سے بھی شمار نہ ہوگا۔ اسی طرح تجارت کی نیت سے خریدنے کے بعد تجارت کا ارادہ بدل جائے اور اپنی ہی ملکیت میں رکھنے کی نیت ہو تو مال تجارت سے نکل جائے گا۔ اور اس سے زکوٰۃ کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ (موَرِث کے مالِ تجارت میں جب تک وارث تجارت کی نیت سے تصرف نہ کرے، اس پر تجارت کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، تصرف کے وقت سے تجارتی سال کی ابتداء ہوگی، اسی طرح کوئی بطور قرض کوئی چیز تجارت کی نیت سے لے، تو اس میں (فی الحال) زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ قلائد ۱/۲۲۰)

مالِ تجارت کا سال و نصاب اور اس میں واجب مقدار

مالِ تجارت سے وہ اشیاء مراد ہیں، جن کا معاوضہ کے مقابلہ میں نفع کی غرض سے تبادلہ اور لین دین ہوتا ہے۔ یہ اشیاء جس طرح کی بھی ہوں، مالِ تجارت میں اس کا شمار ہوگا لہٰذا ہر تجارتی مال چاہے اس میں براہِ راست زکوٰۃ واجب ہو (جیسے سونا، چاندی، پھل اور مویشی) یا نہ ہو (جیسے کپڑا، مختلف مصنوعات، زمین، جائیداد اور شیر ز وغیرہ میں) اپنے شرائط کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے۔ (عورت جائز زیورات تجارت کی نیت سے خریدے، تو یہ مالِ تجارت شمار ہوگا۔ قلائد ۱/۲۱۸)

نصاب، سال کا گذرنا اور واجب مقدار ان تینوں مسائل میں مالِ تجارت سونے چاندی کی طرح ہے۔ مالِ تجارت کی رائج الوقت سکوّں میں قیمت لگائی جائے گی، لہٰذا یہ قیمت ۲۰ مثقال سونا (۹۶ گرام) یا ۲۰۰ درہم چاندی کی قیمت کے مساوی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر مالِ تجارت سونے یا چاندی سے خریدا گیا ہو تو جس سے خریدا ہے اسی کے قیمت کا اعتبار ہوگا۔

تجارت شروع کرنے کے بعد اسلامی ایک سال مکمل ہونے پر مذکورہ نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔ ابتداء میں یا درمیان میں نصاب کی ضرورت نہیں ہے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ تجارت کی نیت سے مالِ تجارت کا مالک بننے سے مکمل ایک قمری سال گذرنا چاہئے۔ لیکن مالِ تجارت سونے یا چاندی کے نصاب یا اس سے زائد سے حاصل کیا تھا تو جس نصاب سے سامان تجارت کو خریدا ہے اس نصاب کی ملکیت سے ہی سال شروع ہوگا۔

سابقہ تفصیل کی روشنی میں اختتامِ سال پر تاجر اپنے سارے تجارتی مال کی ایک مکمل فہرست بنا کر اس کی کل قیمت (حالیہ قیمت کے اعتبار سے نہ کہ وقت خرید کی قیمت) کا اندازہ لگائے۔ اور یہ قیمت سونے یا چاندی میں سے کسی ایک کے بھی نصاب کے قیمت کے برابر ہو تو قیمت کا چالیسواں حصہ (۱/۴۰ یعنی ۲.۵ فیصد) زکوٰۃ نکالے۔ اور سونے چاندی کے نصاب سے قیمت کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جو اشیاء برائے فروخت ہوں، صرف ان کی قیمت لگائے۔ دوکان، فرنیچر اور دوسرے وہ اسباب جو محض استعمال اور تجارت

میں استعانت اور مدد کے لئے ہوں، برائے فروخت نہ ہوں، ان کی قیمت شمار کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان اشیاء میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی قیمتی ہوں۔

قیمت شمار کرنے میں راس المال (اصل پونجی) اور حاصل شدہ نفع دونوں کو شمار کرکے مجموعہ پر زکوٰۃ ادا کرے۔ مثلاً ۲۵/ ہزار کی رقم سے تجارت شروع ہوئی اور سال کے آخر میں کل قیمت ۵۰/ ہزار ہو تو پورے ۵۰/ ہزار کی زکوٰۃ نکالے۔

تجارت کی زکوٰۃ میں کل قیمت کا چالیسواں حصہ دیا جائے جیسا کہ گزرا۔ اشیاء تجارت خود زکوٰۃ میں دینا کافی نہیں ہے، کیونکہ یہ اصل میں ایسی اشیاء نہیں ہیں، جن میں زکوٰۃ واجب ہو، محض تجارت کی نیت کی وجہ سے زکوٰۃ کا حکم صادر ہوا، اور قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوئی، اس لئے قیمت میں سے ہی زکوٰۃ نکالے۔ (الفقہ المنہجی ۲/ ۴۵)

بعض حالیہ مسائل

(ماخوذ از الفقہ الاسلامی - دکتور وھبہ الزحیلی)

دورِ حاضر میں سونے چاندی کے سکوں کا رواج بالکل ختم ہو چکا ہے اور سارے عالم میں لین دین اور تجارت وغیرہ کا مکمل انحصار اور دارومدار نوٹوں پر ہے، لہٰذا علماء کرام کا فیصلہ ہے کہ کسی کے پاس سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر رقم (بشکل نوٹ وکرنسی) موجود ہو، اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں چالیسواں حصہ (۲٫۵ فیصد) زکوٰۃ واجب ہے۔ (الفقہ الاسلامی۔ ۲/ ۷۷۲)

شیئرز پر ہر سال کے اختتام پر اس کی حالیہ قیمت اور نفع دونوں کے مجموعہ پر ۲٫۵٪ زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ حکم تجارتی شیئرز کا ہے۔

اگر کسی کارخانہ اور فیکٹری میں چند حضرات شریک ہوں تو عمارت اور فیکٹری میں استعمال ہونے والے آلات اور مشنیریوں کو چھوڑ کر شرکت کی جو قیمت ہوگی اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

وہ عمارتیں جن سے کرایہ کے طور پر آمدنی حاصل ہوتی ہو، فیکٹری، جہاز، ہوائی جہاز اور موٹر گاڑیاں جو برائے کرایہ ہوں اور جانوروں کا فارم یا پولٹری فارم جیسے آمدنی کے وسائل میں براہِ راست زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ ان سے ہونے والی آمدنی میں زکوٰۃ واجب ہے، بشرطیکہ وہ بقدر نصاب ہو (یعنی سونے یا چاندی کے نصاب کی حالیہ قیمت کے برابر ہو) اور اس پر مکمل ایک اسلامی سال گذر جائے، اس صورت میں اس میں ۲٫۵٪ (۱/۴۰) زکوٰۃ واجب ہے۔

جو اپنے پیشہ کی بنیاد پر آزادانہ کماتے ہیں جیسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، درزی اور بڑھئی وغیرہ یا کہیں تنخواہ پر اس طرح گذر بسر کرتے ہیں، ان کی آمدنی بھی جب سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کو پہنچ جائے اور اس پر سال گذر جائے تو اس میں ۲٫۵٪ (چالیسواں حصہ) زکوٰۃ واجب ہے۔ (الفقہ الاسلامی ۲/ ۸۶۶) (یعنی مکمل آمدنی پر نہیں، بلکہ اپنے اخراجات وغیرہ کے بعد بچی ہوئی رقم بقدر نصاب یا زائد ہو، اور اس پر سال گذر جائے، تب اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ نصاب یا سال کی تکمیل سے قبل جو بھی رقم خرچ ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح نصاب کے بقدر ہونے کے بعد سال کی تکمیل سے قبل نصاب گھٹ جائے تو بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کے چند مسائل

۱) سرکاری نیم سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اور اس پر ادارہ ہر ماہ کچھ

رقم کا اضافہ کرتا ہے پھر مجموعہ پر کچھ رقم سالانہ بنام سود جمع کرتا ہے، شرعاً تنخواہ میں سے جو رقم کاٹی جاتی ہے اس کی اصل تنخواہ ہے اور زکوٰۃ اتنے ہی روپیہ پر فرض ہوسکتی ہے اور باقی دونوں رقم ادارہ کی طرف سے بطور امداد کے ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اگر اپنے اختیار سے فنڈ میں رقم کٹوائی جائے تو جو رقم ادارہ بنام سود جمع کرے گا تو وہ سود ہی ہوگا۔

۲) مذکورہ بالا مسئلہ اس وقت ہے جب کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملازم نے اپنی طرف سے کسی شخص یا کمپنی کی تحویل میں نہ دلوائی ہو بلکہ ادارہ نے اپنے تصرف میں رکھی ہو یا ادارے نے کسی شخص یا کمپنی کو دی ہو تو اپنے طور سے اپنی ذمہ داری پر دی ہو اگر ملازم نے اپنی ذمہ داری پر یہ رقم کسی شخص یا بینک یا بیمہ کمپنی یا کسی اور مستقل کمیٹی مثلاً ملازمین کے نمائندوں پر مشتمل بورڈ وغیرہ کی تحویل میں دلوادی ہو تو یہ ایسا ہے جیسے خود وصول کر کے اس کی تحویل میں دے دی ہو لہٰذا پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اب اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دیں تو یہ شرعاً بھی سود ہوگا جس کا لینا ملازم کے لئے قطعاً حرام ہے، فنڈ خواہ جبری ہو یا اختیاری۔

۳) پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم تنخواہ سے لازمی طور پر کٹتی ہے وہ ادارہ کے ذمہ قرض کے حکم میں ہے اور قرض واپس ملنے کی امید ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لہٰذا اپنی تنخواہ سے جمع شدہ رقم اور اپنے پاس جمع شدہ رقم ملا کر نصاب تک پہنچ جائے اور سال پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حکومت کی طرف سے اضافہ شدہ رقم پر جب تک قبضہ نہ ہو جائے اور قبضہ کے بعد سال نہ گذر جائے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

جو لوگ حکومتی ٹیکس کی بچت کے لئے لائف انشورنس کراتے ہیں اور جو رقم جمع کراتے ہیں اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس لئے کہ وہ امانت کے حکم میں ہے۔

پگڑی وڈپازٹ رقم پر زکوٰۃ

مکان یا دوکان کرایہ پر دیتے وقت مالک ایک رقم ڈپازٹ کے نام سے لیتا ہے اور مکان کی واپسی کے وقت وہ رقم واپس کی جاتی ہے چونکہ وہ ایک امانت یا قرض کے حکم میں ہے لہٰذا رقم دینے والے پر اس کی زکوٰہ ضروری ہے۔ لینے والا اگر اس کو بطور امانت رکھ دے یا خرچ کر دے تو لینے والے پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

پیشگی کرایہ دینے والے پر زکوٰۃ نہیں ہے لینے والے پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر سال گزر جائے۔

کبھی فون بک کرتے وقت دس ہزار یا تیس ہزار روپیہ ڈپازٹ کے طور پر جمع کیا جاتا ہے وہ پیشگی کرایہ ہوتا ہے لہٰذا اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی پگڑی کی رقم حق استعمال کی قیمت ہوتی ہے لینے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

سیونگ سرٹیفکٹ پر زکوٰۃ

آج کل بعض سرکاری کام کی انجام دہی کے لئے سیونگ سرٹیفکٹ لینا لازمی ہوتا ہے۔ سیونگ سرٹیفکٹ کی رقم بھی قرض کے حکم میں ہے لہٰذا اگر ہماری طرف سے جمع شدہ رقم بقدر نصاب ہو یا ہمارے پاس کی جمع شدہ رقم ملا کر بقدر نصاب ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اس سرٹیفکٹ پر ملنے والی سود کی پوری رقم کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔ (ماخوذ از کتاب الزکوٰۃ، مولانا محمد ایوب ندوی شافعی)

متفرقات

سال کی تکمیل کے وقت تجارتی مال جس جگہ ہو وہاں کے سکوں میں قیمت اور نصاب کا اندازہ لگایا جائے، اگر مال تجارت ایسی شئ ہو کہ براہ راست اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہو جیسے سائمہ جانور اور پھل اور صرف ایک زکوٰۃ کا نصاب مکمل ہو مثلاً چالیس بکریاں ہوں اور سال گذرنے پر قیمت نصاب کے برابر نہ ہو یا ۳۹ بکریاں ہوں اور ان کی قیمت بقدر نصاب ہو تو جو نصاب مکمل ہے اس کی زکوٰۃ نکالے۔ (پہلی مثال میں بکریوں کی اور دوسری مثال میں تجارت کی) اور دونوں نصاب مکمل ہوں تو عین کی زکوٰۃ (اس چیز کی زکوٰۃ) نکالے نہ کہ تجارت کی، کیونکہ زکوٰۃ عین پر اتفاق ہے جو اس کی قوت کا باعث ہے۔ بہر حال دونوں زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراض (مضاربت) کے مال کی زکوٰۃ مالک کے ذمہ ہے، چاہے اس میں نفع کا ظہور ہو، کیونکہ فی الحال سارے مال پر مالک کی ملکیت ہے۔ عامل صرف ظہور سے اپنے حصہ کا مالک نہ بنے گا، بلکہ تقسیم کے بعد بنے گا۔ اگر مالک اس کی زکوٰۃ اپنے دوسرے مال میں سے ادا کرے تو فبہا (یعنی عامل سے وہ رقم نہیں لے سکتا) اور اسی مال میں سے ادا کرے تو وہ نفع میں شمار ہوگا جیسا کہ دیگر اس مال سے متعلقہ اخراجات (جیسے دلال کی اجرت وغیرہ) کا حکم ہے۔ (لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اب جو نفع ہوگا اس میں عامل کو مقررہ تناسب سے حصہ ملے گا)

زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد نکالنے سے قبل مالِ تجارت فروخت کرنا صحیح ہے، کیونکہ اس زکوٰۃ کا تعلق قیمت سے ہے جو فروخت کی وجہ سے فوت نہ ہوگا۔ مالک کو اسباب تجارت کے استعمال میں حرج نہیں جیسے سواری کرنا، عمارت میں رہنا، تجارت وحیوان یا پھل وغیرہ میں سے کھانا اسی طرح ھبہ کرنا، صدقہ کرنا، عاریت پر دینا اور اجرت پر دینا جائز ہے اور صدقہ یا کھانے وغیرہ کے ذریعہ جو چیز ختم ہو جائے اس میں تجارت باطل ہوگی اور اس پر اس کا بدلہ لازم نہیں ہے۔ خود استعمال کرنے میں اسے اجرت کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے سے حاصل شدہ اجرت کا مالِ تجارت میں شمار نہ ہوگا (یہ اور بات ہے کہ اجرت سکوں میں ہو تو اس کا حکم سونے چاندی کی طرح ہوگا) (حاشیۃ الجمل مع فتح الوہاب)

باب- زکوٰۃ الفطر (صدقۂ فطر)

احادیث: (۱) ''آپ ﷺ نے رمضان میں زکوٰۃ الفطر کو لوگوں پر فرض فرمایا، ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، ہر آزاد یا غلام، مذکر و مؤنث پر مسلمانوں میں سے''۔ (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے روزہ دار کی لغو اور فضولیات سے پاکی اور مساکین کو کھلانے کی خاطر زکوٰۃ الفطر کو فرض فرمایا۔ جو نمازِ عید سے قبل ادا کرے تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے، اور جو نماز کے بعد ادا کرے تو یہ ایک عام صدقہ ہے۔'' (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم)

(۳) ''آپ ﷺ نے صدقۂ فطر کو فرض فرمایا اور لوگوں کے نماز کے لئے جانے سے قبل اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا''۔ (متفق علیہ) (تلخیص الحبیر ۲/۱۹۴)

صدقۂ فطر اس امت کی خصوصیت ہے اور مشہور یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی طرح ہجرت کے دوسرے سال عید سے دو روز قبل فرض ہوا۔ امام وکیع فرماتے ہیں: ''جس طرح سجدۂ سہو نماز کے نقصان اور کمی کی تلافی کرتا ہے صدقۂ فطر رمضان کے نقصان کی

تلافی کرتا ہے۔" ابن شاہین نے ترغیب میں اور ضیاء نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا: "ماہِ رمضان آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتا ہے، صدقۂ فطر کی ادائیگی کے بغیر بارگاہِ الٰہی میں اٹھایا نہیں جاتا" مطلب یہ ہے کہ اس ماہ کا عظیم ترین ثواب ایک قادر شخص کو صدقۂ فطر کی ادائیگی کے بغیر حاصل نہیں ہوگا۔

صدقۂ فطر بالاجماع فرض (واجب) ہے۔ ماہِ رمضان کا آخری لمحہ اور ماہِ شوال کا اوّل لمحہ پانے سے صدقۂ فطر واجب ہوگا۔ صدقۂ فطر ایک مسلمان کو اپنی جانب سے اور شرعاً اپنے زیر کفالت مسلم (جن کا نان نفقہ اوراخراجات اس کے ذمہ واجب ہیں) افراد کی جانب سے نکالنا واجب ہے۔ فطرہ کے وجوب کے وقت جن کا نفقہ اس کے ذمہ ضروری ہے ان کی جانب سے نکالے، چاہے اس سے پہلے یا بعد میں نفقہ کا وجوب نہ پایا جائے۔ کافر پر اپنا فطرہ واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث میں "من المسلمین" (مسلمانوں میں سے ہونا) کی قید وارد ہے اور فطرہ پاکی کی خاطر ہے، اور ایک کافر اس کا اہل نہیں ہے

کسی پر اس کے باپ کی بیوی کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگرچہ اعفاف کی وجہ سے نفقہ واجب ہے۔

رمضان کے آخری دن غروب کے بعد نکاح ہو تو اس بیوی کی جانب سے شوہر پر فطرہ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح غروب کے بعد کوئی اسلام قبول کرے یا بچہ پیدا ہو تو ان کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگر شک واقع ہو کہ غروب سے قبل یہ امور ہوئے ہیں یا بعد میں تب بھی واجب نہیں۔

آخری دن غروب کے بعد کسی کے انتقال سے فطرہ ساقط نہ ہوگا۔ اگر شوہر غروب کے بعد بیوی کو طلاق دے، چاہے بائنہ طلاق ہی کیوں نہ ہو، اسے اس بیوی کا فطرہ ادا کرنا ہوگا۔ (بشری الکریم ۲/۵۲)

فطرہ کے اوقات: (۱) وقتِ وجوب۔ رمضان کے آخری دن کے غروب سے واجب ہوگا۔ (۲) وقتِ جواز۔ رمضان کا پورا مہینہ (۳) وقتِ فضیلت۔ نمازِ عید سے قبل (۴) وقتِ کراہت۔ نمازِ عید کے بعد (۵) وقتِ حرمت۔ عید کا دن گزر جانے کے بعد۔

عید کے دن نمازِ عید سے قبل ہی فطرہ ادا کرنا سنت ہے۔ کیونکہ حدیث میں اس کا حکم گزر چکا۔ اگر نماز خلافِ معمول تاخیر سے ادا ہو تو دن کے ابتدائی حصہ میں ہی ادا کر دینا سنت ہے، تاکہ مستحقین کو کشادگی حاصل ہو جائے۔ بغیر عذر کے عید کا دن گذرنے تک تاخیر کرنا حرام ہے، کیونکہ اصل مقصود عید کے مبارک دن مستحقین کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بے نیاز کرنا ہے۔ فی الحال مال پاس نہ ہونا، یا مستحقین کا ہی موجود نہ ہونا عذر میں شمار ہوگا۔ بلا عذر تاخیر کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اور فوراً اس کی قضاء کرنا لازم ہے۔

بوقتِ وجوب تنگدست اور غریب آدمی پر فطرہ واجب نہیں ہے۔ چاہے بعد میں دولت آجائے۔ لیکن عید کا دن گذرنے سے قبل ادائیگی کی قدرت ہو جائے تو ادا کرنا سنت ہے۔

فطرہ کے مسئلہ میں غریب آدمی سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے اور اپنے زیر کفالت افراد کے لئے عید کے دن اور اس کے بعد والی شب کے کھانے پینے کے اخراجات، مناسب کپڑے، مکان، خادم (بصورت ضرورت واحتیاج)، قرض (چاہے موخر ہو اور صاحبِ قرض تاخیر سے متفق ہو) سے زائد مال نہ ہو، جو فطرہ میں ادا کر سکے۔ جس کے پاس مذکورہ اخراجات سے زائد مال ہو، اس پر فطرہ واجب ہے۔ (فطرہ کے لئے زکوٰۃ کی طرح بقدر نصاب مال کی شرط نہیں ہے) اس کے مناسب کپڑے، مکان کہنے سے برعکس صورت نکل گئی۔ لہٰذا اگر کسی کا مکان اعلیٰ درجہ کا ہو جسے فروخت کرکے اپنے مناسب مکان حاصل کرنے کے بعد فطرہ کے لئے رقم بچ سکتی ہے تو یہ لازم ہے اگر کسی کے ذمہ سابقاً (پہلے ہی) فطرہ واجب ہو چکا تھا تو اب ادائیگی کے لئے مکان فروخت کرے، نہ کہ لباس، کیونکہ اس صورت

میں یہ قرض کے حکم میں ہے۔ خادم کے احتیاج کا مطلب اپنے یا زیر کفالت افراد کی خدمت کے لئے احتیاج ہے، نہ کہ کھیتی باڑی میں کام کرنے یا جانوروں کی دیکھ ریکھ کا احتیاج۔

کسی عورت کا شوہر غریب ہو تو شوہر پر اس کا فطرہ واجب نہیں ہے۔ اگر عورت کے پاس مال ہو تو اسے اپنا فطرہ ادا کرنا سنت ہے۔

اگر عورت شوہر کی نافرمانی کرے اور نفقہ ساقط ہو جائے تو پھر عورت کو خود اپنا فطرہ ادا کرنا لازم ہے۔

جو شخص فطرہ کی کچھ مقدار ادا کر سکتا ہو، اسے وہ ادا کرنا لازم ہے تاکہ بقدر امکان واجب کی ادائیگی ہو سکے۔ جو شخص چند صاع دے سکتا ہو تو پہلے اپنا فطرہ مقدم کرے۔ کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں اپنی ذات سے ابتداء کا حکم موجود ہے کہ ''پہلے اس پر (خود پر) صدقہ کرو پھر کچھ بچے تو اپنے اہل پر، مزید ہو تو دیگر رشتہ داروں پر'' پھر بیوی کا فطرہ ادا کرے کیونکہ اس کے اخراجات زیادہ تاکیدی ہیں کہ معاوضہ ہے اور وقت گزر جانے سے ساقط نہیں ہوتا۔ پھر اپنے نابالغ بچے کا فطرہ ادا کرے کہ اس کا نان نفقہ نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ پھر باپ دادا نانا وغیرہ پھر ماں دادی نانی وغیرہ کا فطرہ پھر بالغ اولاد کا جبکہ اپاہج یا پاگل ہوں، نفقہ میں ماں کو باپ پر مقدم کیا جاتا ہے، کیونکہ نفقہ احتیاج کے پیش نظر ہے، اور ماں نسبتاً زیادہ محتاج ہے، اور فطرہ تطہیر (پاکی) اور شرف کے لئے ہے، جس کا باپ زیادہ مستحق ہے، کیونکہ بیٹا اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس کے شرف کی وجہ سے مشرف ہوتا ہے۔

فطرہ کی مقدار: ایک شخص کی طرف سے ایک صاع اناج ادا کرے جیسا کہ حدیث میں گزرا، حالیہ اوزان کے اعتبار سے اس کی تعیین کی تفصیل گزر چکی ''فقہ منہجی'' کے اعتبار سے ایک صاع تین لیٹر (تقریباً ۲ کلو ۴۰۰ گرام) کے مساوی ہے۔ (۱/ ۲۳۰)

فطرہ کی جنس: ایسا اناج جس میں عشر واجب ہوتا ہے جو صحیح اور بے عیب ہو اور پنیر یا دودھ جن سے مکھن نکالا نہ گیا ہو۔

ایسا عیب دار اناج جس میں خوراک بننے کی صلاحیت (اقتیات) نہ ہو، اور جسے زیادہ دن رکھا نہ جاسکے، اور گھن لگا ہوا اناج، یا تر اناج فطرہ میں ناکافی ہے۔ خشک ہو کر دوبارہ خوراک اور ذخیرہ کی صفت پر آچکا ہو تو کافی ہے۔ اتنا قدیم اناج کہ اس کا مزہ یا رنگ یا بو بدل چکا ہو ناکافی ہے۔ قدیم سستا ہو لیکن تغیر نہ ہو تو کافی ہے۔

جس کا فطرہ ادا کیا جا رہا ہو اس کی بستی میں جو اناج سال بھر غالباً (زیادہ اور عموماً) استعمال ہوتا ہو، اس سے ادا کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ اشیاء کی قیمت علاقہ کے سکّوں میں ادا کی جاتی ہے اور اسی اناج کی طرف لوگوں کا زیادہ میلان بھی ہوگا۔ لہٰذا علاقوں کے اعتبار سے واجب جنس مختلف ہوگی۔ ادا کرنے والا اور جس کی جانب سے ادا کر رہا ہے دونوں الگ الگ مقام پر ہوں تو جس کا فطرہ ادا کیا جا رہا ہے اس کی بستی کا اعتبار ہوگا اور وہیں کے فقراء کو دیا جائے گا۔ (ادا کرنے والے کی بستی کا اعتبار نہ ہوگا)

کسی جگہ مختلف اناج مستعمل ہوں اور کسی کو غلبہ نہ ہو تو اختیار ہے ان میں سے جو چاہے ادا کرے۔ البتہ خوراک کی صلاحیت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا دینا افضل ہے، ان مختلف اناج میں کوئی غالب ہو تو وہی ادا کرے (اس سے کم درجہ کا جائز نہیں)

ادنیٰ اناج واجب ہو تو اس کی جگہ اعلیٰ دینا جائز ہے، کیونکہ اس میں خیر کی زیادتی ہے، اس کے برعکس جائز نہیں ہے، کہ یہ حق سے کم ہے۔

اعلیٰ اور ادنیٰ کی تعیین میں قیمت کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ اناج کے خوراک اور غذائیت کی صلاحیت کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اناج کی ترتیب اس طرح ہے گیہوں، جو، مکئی، چاول، چنا، اڑد، مسور، لوبیہ، کھجور، خشک انگور، پنیر، دودھ تو گویا فطرہ میں سب سے اعلیٰ گیہوں اور آخر میں دودھ کا درجہ ہے۔

ایک کی جانب سے واجب اناج اور دوسرے کی طرف سے اس سے اعلیٰ نکالنا جائز ہے۔ ایک ہی صاع جدا جنس سے نہیں ادا کر سکتا۔ (یعنی نصف صاع گیہوں اور نصف چاول ادا کرے تو صحیح نہیں ہے) جیسا کہ قسم کے کفارہ میں پانچ اشخاص کو اناج اور پانچ کو لباس دینا کافی نہیں ہے۔ اگر کہیں گیہوں اور جَو ملا کر کھانے کا معمول ہو اور دونوں کی مقدار برابر ہو تو کسی کا بھی ایک صاع ادا کرے ایک زیادہ ہو تو وہ ادا کرے۔ مخلوط دینا کافی نہیں ہے۔

سرپرست (ولی) اپنے مالدار ماتحت (زیر پرستی، مولی) کی جانب سے اپنے مال میں سے فطرہ ادا کر سکتا ہے کیونکہ اسے اس پر ولایت حاصل ہے اور یہ براہِ راست اسے مالک بنانے پر قادر ہے۔ وہ مالدار ہے تو اصل وجوب اس کے مال میں ہے لہٰذا اس میں سے ادا کرنا بھی صحیح ہے۔ اولاد رشید ہوں (یعنی بالغ ہوں اور مالی تصرفات کی صحیح سدھ بدھ رکھتے ہوں) تو اس کی اجازت کے بغیر اس کی طرف سے فطرہ ادا کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی اجنبی کی طرف سے بغیر اجازت فطرہ ادا کرنا جائز نہیں۔ کوئی شخص کسی کے اخراجات مروتاً برداشت کر رہا ہو (شرعاً واجب نہ ہو) تو اس کا فطرہ اس شخص پر واجب نہیں ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر ادا کرے تو ادا نہ ہو گا۔

فطرہ میں قیمت، روٹی، ستو یا آٹا وغیرہ دینا کافی نہیں ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۱۲۳/۳)

"الفقہ المنہجی" میں فرمایا: "امام شافعیؒ کے مسلک کی رو سے قیمت ادا کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ بستی کے غالب اناج کا ہی ادا کرنا لازم ہے، البتہ دورِ حاضر میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی اتباع کرتے ہوئے قیمت ادا کرنے میں حرج نہیں، کیونکہ آج کل اناج کے مقابلہ میں قیمت فقیر کے لئے زیادہ نفع بخش اور اصل مقصود کے حصول میں بہتر ہے۔" (الفقہ المنہجی ۲۳۰/۱) (لیکن حتی الامکان حدیث کے مطابق اناج ہی دینے کی کوشش کریں اگر کسی جگہ اس پر عمل تقریباً ناممکن ہو تو بدرجہ مجبوری قیمت ادا کریں۔)

باب- زکوٰۃ کن پر واجب ہے۔

زکوٰۃ آزاد مسلمان پر واجب ہے۔ ابتداء سے جو کافر ہے اس پر اس دنیا میں زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہے۔ کوئی مسلم دین سے ہٹ جائے (مرتد ہو جائے) اور اس دوران اس پر زکوٰۃ فرض ہو تو دوبارہ اسلام لانے کی صورت میں اس کی ادائیگی لازم ہے۔

بچہ، پاگل یا سفیہ (جس میں مالی تصرف کی صلاحیت نہ ہو) کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لہٰذا ولی (سرپرست) ان کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ولی کوتاہی کرے تو گنہگار ہو گا اور صاحبِ مال خود اپنے کامل ہونے کے بعد (یعنی بچہ بالغ ہو یا پاگل اچھا ہو جائے اور سفیہ میں سمجھ بوجھ آجائے تو) سابقہ (گذشتہ) سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ سے مروی ہے "جو کسی یتیم کا ولی ہو، وہ اس کے مال میں تجارت کرے، اسے ایسے ہی نہ چھوڑے کہ صدقہ اسے کھا جائے" (یعنی تجارت نہ ہوئی اور ہر سال زکوٰۃ ادا ہوتی رہی تو اسی میں مال ختم ہو جائے گا)۔ ترمذی، دارقطنی، بیہقی) نیز ایجابِ زکوٰۃ کے متعلق وارد صحیح احادیث کے اطلاق سے اس کی مزید تائید و تاکید ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے یتیم کے مال میں زکوٰۃ کا وجوب مروی ہے۔ (بیہقی، شافعی) امام مالک نے مؤطا میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور دارقطنی و بیہقی اور ابن عبد البر نے کئی سندوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل فرمایا ہے۔ (تلخیص الحبیر ۱۶۷/۲)

الفقہ المنہجی میں بچے اور پاگل کے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل میں فرمایا: "قرآن کی آیات اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو مال کا مالک بنایا اور اس میں محروم افراد کا حق مقرر فرمایا اور آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ اپنے وقت میں یہ حق

وصول کریں تاکہ مال کی پاکی اور حفاظت کا باعث بنے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مالکوں کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی، جس طرح کہ مال کی تخصیص نہیں فرمائی۔

آیات: ”خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً“ (التوبہ:۱۰۳) ”آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے“

(۲) وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ“ (المعارج۔۲۴۔۲۵)

”جن کے مالوں میں سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے۔“

اسی طرح بخاری شریف میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل روایت میں یہ لفظ موجود ہے ”هٰذِهٖ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ“ **ترجمہ:** یہ زکوٰۃ کا وہ فریضہ ہے جو آپ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض فرمایا ہے۔“ مسلمان کا لفظ عام ہے، جو بالغ اور نابالغ عاقل و پاگل سبھی کو شامل ہے۔ اور جب تک شارع کی جانب سے تخصیص کی دلیل نہ ہو، عام کو اپنے عموم پر رکھنا ہی اصل ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ”الامّ“ میں آپ ﷺ کا یہ فرمان نقل فرمایا ہے ”یتیموں کے مال میں تجارت کرو تاکہ زکوٰۃ اسے ختم نہ کرے۔“ معلوم ہوا کہ بغیر تجارت کے مال کو یوں ہی رکھے تو زکوٰۃ کی وجہ سے ختم ہوگا، ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے نکالنے سے ہی ختم ہوگا، اور بغیر وجوب کے اس کے نکالنے کا سوال ہی نہیں، کیونکہ ولی کو ان کے مال میں تبرع کا (بلا معاوضہ دینے کا) اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بچے کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ پاگل بھی بچے کے حکم میں ہے۔ اس لئے اس کو بھی اس پر قیاس کریں گے۔

بالاجماع بچے اور پاگل کی جانب سے صدقۂ فطر واجب ہے، تو جب بچپن اور پاگل پن ان کے بدن کی طرف سے صدقۂ فطر کیلئے مانع (رکاوٹ) نہیں ہے، تو ان کے مال میں زکوٰۃ سے مانع نہ ہونا چاہئے جبکہ وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط مکمل ہوں۔

زکوٰۃ کا مقصد فقراء کی حاجت روائی اور مال کی پاکی و صفائی ہے، قطع نظر اس سے کہ مالک کون ہے، جبکہ وہ مسلمان اور اسلامی نظام کا متبع ہو، لہٰذا بچے اور پاگل کے مال سے بھی زکوٰۃ متعلق ہونا چاہئے۔

زکوٰۃ محض ایک بدنی عبادت نہیں ہے، کہ اس کے لئے مکلف ہونا ضروری ہو، بلکہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں مال کا پہلو غالب ہے، جس کے ذریعہ اقتصادی عدل اور بشمولِ کفایت کا تحقق مطلوب ہے۔ لہٰذا اس حکم کی اطاعت میں تمام اصحابِ مال مساوی ہوں گے۔ (الفقہ المنہجی۔۱۸/۲-۲۰)

غصب و قرض وغیرہ میں زکوٰۃ: غصب شدہ مال واپس مل جائے تو اس کی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔ کسی کا مال گم ہو جائے یا دفن کر کے بھول جائے تو ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔ کسی کے ذمہ قرض ہو یا کوئی چیز اس کے پاس ہو اور وہ انکار کر رہا ہو، اور مستحق فی الحال وصول کرنے پر قادر نہ ہو تو آئندہ جب بھی وہ مال ملے، اس میں گذشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب ہے۔

کسی کا مال کہیں دور ہو تو اس میں بھی بصورتِ قدرت زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ کسی چیز کے خریدنے کے بعد قبضہ نہ ہوا ہو، تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، (بقیہ شرائط ہوں تو) کیونکہ ملکیت مکمل حاصل ہو چکی۔ کسی کا کسی پر تجارتی مال یا روپیہ پیسہ کا قرض لازم ہو جس کی واپسی کا وقت ہو چکا ہو اور واپسی ممکن بھی ہو تو فی الحال اُس کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔ چاہے وہ واپس نہ لے، کیونکہ وہ واپس لینے پر قادر ہے تو گویا کہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر قرض مؤجّل (مؤخّر) ہو تو غصب کی طرح ہے یعنی قبضہ اور حصول کے بعد زکوٰۃ ادا

کرے۔ اگر قرض غیر لازم ہو یا مویشی کا ہو یا ایسی اشیاء کا جس میں عشر واجب ہے تو ان میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ (تحفة المحتاج)

مقروض پر زکوٰۃ: کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہو تو کسی بھی طرح کا کسی کا کتنا ہی قرض ہو، یہ زکوٰۃ کے وجوب سے مانع نہیں ہے۔ بلکہ زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کے دلائل مطلق ہیں اور اسی مال کا قرض میں ادا کرنا کوئی متعین نہیں ہے۔

ترکہ میں زکوٰۃ: کسی کے ذمہ زکوٰۃ اور انسانی قرض باقی ہو اور اس کا انتقال ہو جائے اور ترکہ میں دونوں کی گنجائش نہ ہو تو اللہ کے قرض کو مقدم کرتے ہوئے زکوٰۃ کو مقدم کریں گے۔ صحیحین کی ایک روایت میں ہے ''اللہ کا قرض ادائیگی کا زیادہ مستحق ہے'' زکوٰۃ ہی کی طرح حج اور کفارہ وغیرہ دیگر حقوق اللہ کا حکم ہے۔ (یعنی ان حقوق کی ادائیگی مقدم ہوگی)

کسی زندہ شخص کے مال میں یا ترکہ میں مختلف حقوق اللہ (جیسے زکوٰۃ، حج، کفارہ) واجب ہوں، اور سبھی کی گنجائش نہ ہو، تو ہر ایک کو بالتقسیط ادا کریں گے لیکن نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ مقدم ہوگی۔

باب - زکوٰۃ کی ادائیگی

زکوٰۃ دیگر واجبات کی طرح فوراً ادا کرنا واجب ہے، جبکہ ادائیگی کی قدرت ہو جائے، کیونکہ مستحقین فی الوقت اس کے محتاج اور ضرورت مند ہیں، تاخیر کرنا حرام ہے۔ البتہ کسی رشتہ دار، پڑوسی، زیادہ محتاج شخص یا افضل شخص کے انتظار میں تاخیر کی اجازت ہے، جبکہ حاضرین کو زیادہ ضرر نہ ہو۔ لیکن اس صورت میں ادا کرنے سے قبل مال تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا۔ (اپنے جیب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی)

قدرت کی صورتیں: غائب مال، مغصوبہ مال وغیرہ اپنے پاس آجائے، زکوٰۃ لینے والے موجود ہوں، پھل خشک ہو جائے، اناج اور معدنیات کی صفائی ہو جائے، مالک اہم دینی یا دنیوی امر جیسے نماز یا کھانے میں مشغول نہ ہو، کسی ایک جگہ موجود غائب مال تک پہنچ سکتا ہو، فی الحال واجب الاداء قرض حاصل کر سکتا ہو، کسی پر مفلسی کی وجہ سے حکومت نے تصرفات کی پابندی عائد کر دی ہو اور اس کے ذمہ زکوٰۃ ہو تو اس پابندی کے ہٹنے کے بعد (اسے ادا کرنا واجب ہے) اسی طرح کرایہ جتنا پختہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً گھر چار سال کے لئے ۱۰۰ دینار کرایہ پر دے دے اور کرایہ مکمل ۱۰۰/ دینار لے لے تو پھر سال کے گذرنے پر جتنا کرایہ یقینی ہو چکا اس کی زکوٰۃ نکالنا کافی ہے۔ کیونکہ بقیہ کرایہ میں ملکیت ضعیف ہے۔ اگر گھر منہدم ہو جائے تو آئندہ کا کرایہ واپس کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس مثال میں پہلا سال گزرنے پر صرف ۲۵/ دینار کی زکوٰۃ نکالے اسی طرح آگے بھی۔

مہر کا جماع وغیرہ کے ذریعہ پختہ ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا نکاح میں ۲۰/ دینار مہر مقرر ہوئی تو سال مکمل ہونے پر اس میں زکوٰۃ واجب ہے، چاہے ابھی جماع نہ ہوا ہو، یا بیوی کو ادا نہ کی گئی ہو۔

تنبیہ: مہر میں زکوٰۃ کے مسئلہ پر توجہ کی ضرورت ہے، کبھی سالہا سال تک مہر ادا نہیں کی جاتی، لیکن بیوی کی ملکیت اس پر مکمل ہے، اس لئے اگر شرائط موجود ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر بیوی ابھی حاصل کر سکتی ہو تو ابھی واجب ہے۔ اگر شوہر نہ دے تو جب بھی دے سابقہ ایام کی زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ واجب ہونے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی پر قدرت سے پہلے ہی مال تلف ہو جائے تو مالک پر کوئی ضمان نہیں ہے۔ لیکن مالک خود تلف کرے یا قدرت کے بعد موخر کرے اور تلف ہو جائے تو مالک کو ضمان لازم ہے۔ عدمِ تلف کی صورت میں جو زکوٰۃ دینی تھی اب بھی دینا لازم ہے، کیونکہ مستحقین کو ادا کرنے میں تاخیر اس کی غلطی ہے۔

مالِ باطن: سونا، چاندی، تجارتی اسباب، خزانہ
مالِ ظاهر: مویشی، کھیتی باڑی، پھل اور معدن

صاحبِ مال خود یا وکیل کے ذریعہ اپنے ظاہری و باطنی دونوں مال کی زکوٰۃ براہ راست مستحقین کو ادا کر سکتا ہے۔ لیکن ظاہر مال کی زکوٰۃ امام (اسلامی حکومت کا ذمہ دار) طلب کرے تو اس کے حوالہ کرنا واجب ہے۔ امام باطنی مال کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کر سکتا، البتہ امام کو علم ہو کہ مالک باطنی مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کر رہا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے حکم دے کہ خود ادا کرو یا ہمارے حوالہ کرو۔ صدقۂ فطر مالِ باطن کے حکم میں ہے۔

صاحب مال زکوٰۃ امام کے حوالہ بھی کر سکتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ اور خلفائے راشدین ساعی (عامل) کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے روانہ فرماتے تھے۔ خود تقسیم کرنے کے بجائے امام کے سپرد کرنا افضل ہے۔ کیونکہ وہ مستحقین سے زیادہ واقف ہے افضل اس وقت ہے جبکہ امام زکوٰۃ کی تقسیم ایمانداری اور عدل سے کرتا ہو، ورنہ خود تقسیم کرنا بہتر ہے۔ تقسیم کے لئے وکیل کے سپرد کرنے سے خود مالک کا تقسیم کرنا افضل ہے۔

نیت: زکوٰۃ میں نیت واجب ہے۔ دیگر نیتوں کی طرح یہاں بھی واجب دل سے نیت کرنا ہے۔ جیسے یہ زکوٰۃ ہے، یہ فرض صدقہ ہے، یہ میرے مال کا فرض صدقہ ہے۔

صرف میرا مالی فرض کافی نہیں، کیونکہ یہ کفارہ اور نذر بھی ہو سکتا ہے اور نہ میرا مالی صدقہ کافی ہے۔ کیونکہ صدقہ نفل بھی ہوتا ہے نیت میں کس مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر رہا ہے، اس کی تعیین کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ۲۰۰/ درہم حاضر اور ۲۰۰ درہم غائب تھے۔ اور مالک نے ۵/ درہم مطلق زکوٰۃ کی نیت سے ادا کئے۔ پھر پتہ چلا کہ غائب مال تلف ہو چکا ہے تو اس ادا کردہ زکوٰۃ کو حاضر کی جانب سے قرار دے سکتا ہے۔ لیکن زکوٰۃ ادا کرتے وقت مخصوص مال کی تعیین کرے، تو وہ زکوٰۃ دوسرے مال کی طرف سے شمار نہیں ہو سکتی مذکورہ مثال میں ۵/ درہم زکوٰۃ میں غائب مال کی تعیین کر چکا تھا۔ تو اب اسے حاضر کی جانب نہیں پھیر سکتا۔ (حاضر کی زکوٰۃ مستقل ادا کرنی ہوگی) لیکن تعیین کے ساتھ یہ بھی نیت ہو کہ وہ معین مال تلف شدہ ہو تو پھر دوسرے مال کی طرف سے اور وہ تلف شدہ ظاہر ہو تو دوسرے مال کی طرف سے شمار ہوگا۔ یہاں غائب سے اس مجلس سے غائب ہونا مراد ہے، نہ کہ بستی سے، اس بناء پر کہ زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ اپنی جگہ مسئلہ آجائے گا۔

ولی اپنے بچے یا پاگل کی زکوٰۃ ادا کرے تو اسے نیت لازم ہے بغیر نیت کے ادا کیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اور اس پر ضمان لازم ہوگا۔ سفیہ کا ولی نیت اس کے سپرد کر سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی مقدار کو اپنے مال سے جدا کرتے وقت یا ادا کرتے وقت یا دونوں کے درمیان یا امام یا وکیل کے سپرد کرتے وقت نیت کافی ہے۔ امام اور وکیل بھی مستحقین کو دیتے وقت نیت کرلیں تو افضل ہے۔ تقسیم کے لئے جسے وکیل بنایا نیت میں بھی اسے وکیل بنا سکتا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے کی اجازت کے بغیر امام یا کسی اور کا نیت کر لینا کافی نہیں ہے۔ لیکن کوئی زکوٰۃ ادا نہ کرے، اور امام جبراً اس سے زکوٰۃ وصول کرے تو امام کو نیت لازم ہے اور یہ نیت کافی ہے۔ اسے مالک کی نیت کے قائم مقام شمار کریں گے۔

مالک زکوٰۃ کی نیت سے دے اور لینے والا نفلی صدقہ یا ہدیہ وغیرہ کی نیت سے لے تو زکوٰۃ ادا ہوگی، جبکہ وہ مستحق ہو۔

حکومت کے ٹیکس زکوٰۃ کی نیت سے ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

کسی پر ۵/ درہم زکوٰۃ ہو اور وہ ۱۰/ درہم زکوٰۃ اور نفلی صدقہ کی نیت سے ادا کرے، تو تمام نفلی صدقہ شمار ہو گا، زکوٰہ ادا نہ ہو گی، کیونکہ اس نے فرض و نفل کو مشترک کر دیا، جو مضر ہے۔(حاشیۃ الجمل ۲/۲۹۷)

تعجیل زکوٰۃ (قبل از وقت زکوٰۃ ادا کرنا)

حدیث: حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل از وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔(احمد، اصحاب سنن، حاکم، دار قطنی، بیہقی، تلخیص الحبیر ۲/۱۷۱)

کوئی شخص نصاب کا مالک ہو تو سال مکمل ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ کسی نے مالِ تجارت نصاب سے کم مالیت کا بھی خریدا(۲۰۰/ درہم سے کم مالیت کا سامان) ہو، تو وہ سال سے قبل زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، جبکہ سال کی تکمیل پر مالیت نصاب تک پہنچ چکی ہو یا ۲۰۰/ درہم مالیت کی اشیاء خرید کر تکمیل سال سے قبل ہی ۴۰۰/ درہم کی زکوٰۃ ادا کرے اور سال مکمل ہونے پر مالیت ۴۰۰/ درہم ہو چکی ہو تو یہ زکوٰۃ ادا کرنا معتبر ہو گا، کیونکہ تجارت میں صرف سال کے آخر میں نصاب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

ایک سال سے زائد کی زکوٰۃ ابھی نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی دوسرا سال شروع ہی نہیں ہوا اور انعقاد حول (سال شروع ہونے) سے قبل تعجیل جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ تجارت کے علاوہ اشیاء میں نصاب کی تکمیل سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا کسی کے پاس صرف ۱۰۰/ درہم ہو اور وہ ۵/ درہم بطورِ زکوٰۃ دے، تو یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وجوب کا سبب (نصاب) نہیں پایا گیا۔ دو سال کی زکوٰۃ معجل دے تو صرف پہلے سال کی طرف سے کافی ہو گی۔ بیہقی کی روایت میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دو سالہ زکوٰۃ لینے کا جو ذکر ہے، تو وہ روایت منقطع ہے۔ اگر معتبر فرض کریں تو یہ تاویل ہو گی کہ دو سال میں وصول کی۔ صدقۂ فطر ماہِ رمضان شروع ہونے کے بعد دے سکتا ہے، چاہے بالکل ہی ابتداء میں دے۔ کیونکہ فطرہ رمضان اور فطر (رمضان کا اختتام) ان دو اسباب سے واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک سبب (رمضان) پائے جانے کے بعد ادا کرنا معتبر ہو گا۔ رمضان سے قبل ادا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ دونوں سببوں پر مقدم ہو گا۔

پیداوار کی زکوٰۃ وجوب کے وقت سے قبل جائز نہیں ہے، مسئلہ گزر چکا کہ پھلوں میں وقتِ وجوب بُدُوِّ صَلَاح (پختگی) اور اناج میں دانوں کا سخت ہونا ہے، کیونکہ وقتِ وجوب سے قبل اس کی مقدار کا کوئی اندازہ نہیں ہو پائے گا۔

مُعَجَّل زکوٰۃ صحیح اور کافی ہونے کی شرائط: مستحق میں زکوٰۃ لیتے وقت اور واجب ہوتے وقت استحقاق کی صفت موجود ہو، درمیان میں یہ صفت نہ ہو تو حرج نہیں، مثلاً اب درمیان میں اسلام چھوڑ بیٹھا، لیکن سال مکمل ہونے سے قبل پھر اسلام لے آیا، اسی طرح سال کی تکمیل پر یا اس سے قبل وہ غائب ہو جائے اور اس کا زندہ رہنا یا محتاج ہونا معلوم نہ ہو تو یہ کافی ہے۔ مالک کا زکوٰۃ کی ادائیگی سے وجوب تک صفتِ وجوب پر باقی رہنا ضروری ہے۔

اگر دونوں میں سے کوئی وقت وجوب سے قبل مر جائے، یا مستحق مرتد ہو جائے، یا مال تلف ہو جائے، یا فروخت کیا جائے (جبکہ مال تجارت نہ ہو) تو معجل زکوٰۃ میں شمار نہ ہو گی۔ اگر معجل زکوٰۃ تلف ہو جائے تو حرج نہیں۔

صرف معجل زکوٰۃ کی وجہ سے یا معجل زکوٰۃ اور دوسرے مال کی وجہ سے لینے والا غنی (مالدار) ہو چکا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ زکوٰۃ دینے کا مقصد ہی اسے بے نیاز کرنا ہے۔ لہٰذا جو مقصود ہو، وہ کافی ہونے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ معجل زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال کی وجہ سے غنی ہو چکا ہو تو معجل زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

مذکورہ شرائط میں سے کسی کی کمی کی وجہ سے جب معجل زکوٰۃ معتبر اور ادا نہ ہو تو سامنے والے سے اسے واپس لے لیں گے، جبکہ وہ چیز موجود ہو، ورنہ اس کا بدل بصورت مثل یا قیمت وصول کیا جائے گا، تلف کے وقت کی قیمت کا اعتبار نہ ہو گا، بلکہ مستحق کے قبضہ کے وقت کا اعتبار ہو گا۔ کیونکہ اضافہ مستحق کی ملکیت میں حاصل ہوا اور اس کا وہ ضامن نہ ہو گا۔.....زیادتی جیسے دودھ اور اولاد وغیرہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ واپسی کے سبب سے قبل پایا گیا ہو مستحق نے اب تک زکوٰۃ کے جانور کا جو دودھ استعمال کیا یا اس جانور کو بچہ پیدا ہوا تو یہ مستحق کا ہے اسے مالک کو واپس لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اضافہ اصل شئی سے جدا ہے، لیکن متصل زیادتی جیسے موٹاپا اور عمر کی زیادتی واپس لوٹائی جائے گی (اتنی مدت میں مستحق کے پاس جانور موٹا تازہ ہو چکا ہے اور اس کی عمر بڑھ چکی جس سے قیمت بھی بڑھ جائے گی، تب بھی مکمل جانور لوٹائیں گے۔ موٹاپے یا عمر کے اضافہ کا کچھ بدلہ اسے نہ ملے گا) اسی طرح واپسی کے سبب سے قبل اس میں جو نقص پیش آئے (جیسے جانور کا بیمار ہونا یا ہاتھ پیر وغیرہ کٹنا) اس کا تاوان ادا کرنے کی ضرورت نہیں (ناقص حالت میں صرف وہ شئی لوٹا دے) لیکن لیتے وقت یہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں تھا، تو زیادتی اور نقصان کا تاوان دونوں لوٹائے۔ واپسی کے سبب کے بعد کی زیادتی اور نقصان کا تاوان لوٹایا جائے گا۔

مذکورہ صورتوں میں معجل زکوٰہ واپس لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ ادا کرتے وقت یہ شرط لگادی ہو کہ کسی مانع کے پیش آنے کی صورت میں واپس لے لوں گا۔ یا یہ صراحت کر دی ہو کہ یہ زکوٰۃ معجل ہے یا کسی اور ذریعہ سے لینے والے کو اس کا علم ہو کہ یہ معجل زکوٰۃ ہے۔ تعجیل کا علم ادا کرتے وقت یا بعد میں لیکن اس میں تصرف کرنے سے پہلے ہونا لازم ہے، اگر ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی گئی تو واپس نہیں لے سکتا، بلکہ وہ نفلی صدقہ شمار ہو گا۔

مالک اور مستحق کے مابین اختلاف ہو کہ واپسی کی شرائط پائی گئیں یا نہیں تو مستحق کو (اور وہ مر چکا ہو تو اس کے وارث کو) قسم دلائی جائے گی اور پھر اس کی تصدیق کریں گے (یعنی مال اسی کے پاس رہے گا واپس نہیں کیا جائے گا)

کل مال میں زکوٰۃ کا تعلق: جس مال میں زکوٰۃ واجب ہو زکوٰۃ کا اس مال سے شرکت کا تعلق ہوتا ہے۔ (گویا کہ مستحقین زکوٰۃ کی مقدار میں صاحب مال کے شریک اور پارٹنر ہیں) کیونکہ اگر مالک خود زکوٰۃ نہ دے تو امام جبراً اس سے وصول کرتا ہے جیسا کہ بعض شرکاء کے تقسیم سے انکار کی صورت میں جبراً مشترک مال شرکاء کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مالک دوسرے مال سے زکوٰۃ ادا کرے تو ادا ہو جائے گا، کیونکہ اس کی بنیاد تساہل اور نرمی اور نفع رسانی پر ہے۔

چونکہ زکوٰۃ کا تعلق شرکت کی طرح ہے، اس لئے جس مال میں زکوٰۃ واجب ہو چکی ہو، اسے کچھ یا مکمل فروخت کرے تو زکات کی مقدار میں بیع (فروخت) باطل ہو گی، چاہے پہلی صورت میں بقدرِ زکوٰۃ باقی رکھے، کیونکہ مستحقین کا حق تمام مال میں شائع (پھیلا ہوا) ہے، لہٰذا جتنا بھی فروخت کرے، مالک اور مستحقین دونوں کا اس میں حق ہے، البتہ فروخت کے وقت زکوٰۃ کے مقدار کو مستثنیٰ رکھے اور سامنے والے کو اس کی مقدار کا علم بھی ہو، تو بقیہ میں لین دین صحیح ہے۔

مالِ تجارت کو وجوبِ زکوٰۃ کے بعد بھی فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور بیع باطل نہ ہو گی، کیونکہ تجارت کی زکوٰۃ بجائے تجارتی اشیاء کے ان کی قیمت میں واجب ہے، جو بیع کی وجہ سے فوت نہ ہو گی، لیکن اگر بلا معاوضہ مال تجارت دے تو اتنی مقدار میں باطل ہے، مثلاً ۴۰ر مثقال کی چیز ۲۰ر مثقال میں فروخت کرے تو نصف مثقال کی چیز میں بیع باطل ہے، جو بقیہ ۲۰ر کے زکوٰۃ کی مقدار ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ (زکوٰۃ کے مستحقین)

آیت: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ "(سورہ توبہ۔۶۰)

ترجمہ: "(فرض) صدقات تو صرف (ان لوگوں کا حق ہے) غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (صرف کیا جاوے) اور قرضداروں کے قرضہ (ادا کرنے) میں اور جہاد کرنے (والوں کے سامان) میں اور مسافروں کی (امداد) میں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور بڑے حکمت والے ہیں۔"

احادیث: (۱) دو حضرات آپ ﷺ کی خدمت میں صدقہ (زکوٰۃ) مانگنے حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا "تم چاہو تو میں دے دوں۔ اس میں کسی مالدار یا قوی کمانے والے کا کوئی حق نہیں ہے۔" (احمد، ابوداؤد، نسائی، دارقطنی)

(۲) "صدقہ کسی مالدار اور قوی صحیح الاعضاء شخص کے لئے حلال نہیں ہے"۔ (نسائی، دارقطنی، ابن حبان، حاکم)

(۳) "صدقہ صرف ان پانچ افراد کو حلال ہے: اللہ کے راستے میں غزوہ کرنے والا، یا عامل، مقروض یا جو شخص اپنے مال سے خریدے یا وہ شخص جس کے مسکین پڑوسی کو صدقہ ملے اور وہ اس غنی کو ہدیہ میں دے۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم، مالک، احمد، ابن خزیمہ، دارقطنی، بیہقی)

(۴) "زکوٰۃ پر برحق عامل گھر لوٹنے تک فی سبیل اللہ غازی کی طرح ہے۔" (ابوداود، ترمذی) (مشکوٰۃ)

مستحقین زکوٰۃ کے متعلق مذکورہ آیات میں پہلے چار مستحقین کی طرف زکوٰۃ کو لامِ ملک کے ذریعہ اور بقیہ چار کی طرف ظرفیت کے فی کے ذریعہ منسوب کیا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ پہلے چاروں میں مطلق ملکیت کافی ہے اور آخری چاروں میں مذکورہ مقاصد کے لئے ملکیت ہے۔ لہٰذا ان میں متعلقہ مقاصد میں صرف نہ ہوا تو واپس لے لیا جائے گا۔ بخلاف پہلے چاروں مستحقین کے۔

زکوٰۃ آٹھ قسم کے لوگوں کا حق ھے

۱) **فقیر:** جس کے پاس اتنا مال نہ ہو اور نہ اس کے مناسب کمائی کا ایسا ذریعہ ہو جس کی آمدنی اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی بھی درجہ میں کفایت کر جائے اگر اس کے مناسب حال حلال آمدنی کا ذریعہ (نوکری وغیرہ) ممکن ہو، اور وہ اسے اختیار نہ کرے تو اسے زکوٰۃ نہ دے۔ ضروریات میں کھانا پینا، لباس اور مکان وغیرہ ضروریات داخل ہیں جو کہ اس کے اور زیر کفالت افراد کے مناسب ہوں۔ مثلاً کسی کو ۱۰/ روپئے کی ضرورت ہو اور اس کا مال یا کمائی صرف ۲، ۳ یا ۴ روپئے ہوں، (یعنی نصف سے کم ہو) چاہے اس کا مال بقدر نصاب یا کم وبیش ہو، (لیکن اس کے مصارف اور ضروریات کے اعتبار سے اوپر کی تفصیل میں داخل ہو تو وہ فقیر کہلائے گا)

اپاہج ہونا یا اوروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا فقیر کے لئے ضروری نہیں ہے، یعنی جو صحیح الاعضاء ہو اور کسی سے سوال نہ کرتا ہو، لیکن اوپر کی تفصیل پائی جارہی ہو تو وہ فقیر ہے۔

۲) **مسکین:** اوپر کے مقابلہ میں اس کی ضروریات زندگی کے لئے کسی درجہ میں کفایت کر جاتا ہے، لیکن اطمینان سے کافی نہیں ہوتا۔ جیسے اصل ضرورت ۱۰/ روپئے کی ہو لیکن صرف ۷، ۸ روپئے ہو (یعنی نصف سے زائد ہو) فقیر اور مسکین دونوں کے غالب عمر کی

کفایت مُراد ہے۔ مناسب ذریعۂ آمدنی کہنے سے غیر مناسب خارج ہو جاتا ہے وہ نہ ہونے کی طرح ہے۔ اس کا اعتبار نہ ہو گا۔ (یعنی اس شخص کے لئے نامناسب کمائی کا ذریعہ ہو اور وہ نہ اختیار کرے تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں)

کسی کے پاس بھلے مال نہ ہو، لیکن شرعاً اس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہو جیسے شوہر، والدین یا اولاد اور وہ ساری ضروریات پوری کریں، تو یہ فقیر و مسکین شمار نہ ہو گا۔ اور اُسے زکوٰۃ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ غیر محتاج ہے، جیسا روز اپنی ضروریات کے بقدر کمانے والا، لیکن مذکورہ ذمہ دار نفقہ اور خرچ نہ دے سکے یا نہ دے یا ناکافی مقدار دے، تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ کوئی نفلی عبادتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے کما نہ سکے تو یہ فقیر نہ شمار ہو گا۔ لیکن کوئی شرعی علوم کی تحصیل میں مشغول ہو اور اس میں اس کی صلاحیت بھی ہو اور کمانا طلبِ علم میں حرج ڈالتا ہو تو اسے بحیثیت فقیر یا مسکین زکوٰۃ دے سکتے ہیں کیونکہ دینی علوم کا حصول فرض کفایہ ہے۔

کسی شخص کے پاس اس کے مناسب مکان، کپڑے اور کتابیں (جن کی اسے ضرورت ہو) موجود ہوں، تب بھی وہ فقیر شمار ہو گا۔ کسی کا مال دو مرحلہ (منزل) یا اس سے دور ہو تو مال ملنے تک یا کسی کے ذمہ اس کے مؤجل قرض (موخر اور بعد میں ملنے والا قرض ہو تو ادائیگی کا وقت آنے تک ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، کیونکہ فی الحال یہ فقیر یا مسکین شمار ہونگے۔)

۳) **عامل**: اسلامی حکومت کی جانب سے اجتماعی طور پر زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا نظم ہو، تو اس سلسلہ میں کام کرنے والے افراد مثلاً ساعی (زکوٰۃ جمع کرنے والا)، منشی (جو ان تفاصیل کو لکھے) اور حاسب (حساب کتاب لکھنے والا) عامل کہلائیں گے۔ اور ان کی تنخواہ زکوٰۃ سے ادا کی جائے گی۔ (گرچہ وہ امیر ہوں) امام کے وصولیابی کے بعد مال کی حفاظت اور جانوروں کے چرانے کا خرچ کل مالِ زکوٰۃ سے ادا کرے (صرف عامل کے حصہ سے نہیں)، مالک کے مال سے زکوٰۃ کی مقدار الگ کرنے کے لئے وزن، ناپ یا شمار کرنے والوں کی اجرت مالک کے ذمہ ہے۔ یہی کام زکوٰۃ کے مال میں مستحقین کے حصوں کی تقسیم کے لئے عمل میں آئے تو اس کی اجرت عامل کے حصہ سے ادا ہو گی۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جب کہ امام (اسلامی حکومت کا ذمہ دار) مالِ زکوٰۃ جمع کر کے تقسیم کرے اور عامل کے لئے بیت المال سے جدا تنخواہ نہ رکھے۔ اگر مالک خود ہی زکوٰۃ تقسیم کر دے یا امام عامل کو بیت المال سے معاوضہ دے تو عامل کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ قاضی (جج) اور حاکم و گورنر کا عامل میں شمار نہ ہو گا اور زکوٰۃ میں ان کا حق نہیں ہے، بلکہ ان کی تنخواہ مال غنیمت کے اس خمس سے ادا ہو گی جو مصالح عامہ کی خاطر ہو۔

(۴) **مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبُ** (جن کی تالیف قلب اور محبت مقصود ہو) ان کی چار قسمیں ہیں۔

۱) وہ نو مسلم جو ابھی اسلام میں پختہ نہ ہو، اسے زکوٰۃ سے تعاون کریں گے تاکہ ایمان پر جم جائے۔

۲) وہ نو مسلم جو پختہ ہو لیکن اپنے قوم کے شریف (اور ذمہ دار) لوگوں میں سے ہے، اور اس کے تعاون سے دیگر ہم قوم کے افراد کے اسلام کی توقع ہو تو اسے بھی زکوٰۃ دی جائے گی۔

۳) وہ مسلمان جو اپنے قرب و جوار کے مانعینِ زکوٰۃ (زکوٰۃ نہ دینے والے) کی طرف سے کفایت کرے اور انہیں ڈرا کر یا ان سے لڑ کر زکوٰۃ امام تک پہنچائے۔

۴) وہ مسلمان جو اپنے قرب و جوار کے کفار اور باغیوں سے قتال کر کے مسلمانوں کو ان کے شرور سے بچائے۔

آخری دونوں قسموں کو زکوٰۃ اس وقت دیں گے جب کہ اس مقصد کے لئے باقاعدہ فوج روانہ کرنے کے مقابلہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں زیادہ سہولت ہو۔ اسی طرح ان دو قسموں کا مذکر ہونا شرط ہے۔ پہلی دو قسموں میں یہ شرط نہیں ہے۔ مولفۃ القلوب امیر بھی ہو تو اسے

زکوٰۃ دی جائے گی۔

یہ تفصیلات موٴلفۃ المسلمین کی تھیں۔ کسی کافر کو اس کے اسلام کی امید پر یا اس کے شر کے ڈر سے زکوٰۃ یا کسی اور مد سے مال دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو عزت و قوت اور سربلندی عطا فرمائی ہے اور ان کی تالیف سے بے نیاز کر دیا ہے۔ لیکن اگر مسلمان ایسی مصیبت میں پھنس جائیں کہ ان کو مال دینے پر مجبور ہو جائیں تو گنجائش نکل آئے گی۔

۵) **مُکَاتَب کی آزادی میں**: وہ غلام جو صحیح مُکاتَب ہو اور خود زکوٰۃ ادا کرنے والے کا غلام نہ ہو، ان کو بدل کتابت کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ سے تعاون کریں گے، جبکہ ان کے پاس مکمل رقم نہ ہو، ان کے آقاؤں کی اجازت یا رقم کی ادائیگی کا وقت ہونا ضروری نہیں ہے۔

۶) **مقروض** (غارم):- اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱) جس نے اپنی مباح ضرورت کے لئے قرض لیا ہو، اطاعت کا کام ہو یا نہ ہو، اور چاہے بعد میں غلط کام میں صرف کیا ہو، لیکن یہ معلوم ہو کہ لینا مباح مقصد کے لئے تھا، یا کسی نے غلط کام مثلاً شراب کے لئے قرض لیا اور اب تائب ہو چکا ہے اور بظاہر توبہ میں سچا ہے، بھلے ہی زیادہ مدت نہ گزری ہو، یا غلط کام کے لئے لینے کے بعد (اس میں صرف نہ کرے) بلکہ مباح کام میں استعمال کرے، تو ان لوگوں کو بصورتِ حاجت زکوٰۃ دی جائے۔ یعنی قرض کی ادائیگی کا وقت آجائے اور ان کے پاس ادائیگی کی سبیل نہ ہو۔ اگر حاجت نہ ہو تو زکوٰۃ نہ دے۔

اگر گناہ کے کام کے لئے قرض لیا اور اس میں صرف بھی کیا اور ابھی تائب نہیں ہوا تو اسے زکوٰۃ نہ دی جائے۔

۲) مسلمانوں کے دو گروہوں میں کسی مسئلہ پر لڑائی کا خطرہ ہو، مثلاً کسی مقتول کے قاتل کے متعلق اختلاف ہو، جس کے نتیجہ میں لڑائی کا اندیشہ ہو، اور کوئی قرض لے کر مقتول کی دیت ادا کر دے، تاکہ فتنہ اور لڑائی ٹل جائے، تو اسے قرض کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ دی جائے گی۔ چاہے وہ شخص مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہاں اگر فقر کا اعتبار کریں گے تو لوگ ایسے اہم کاموں میں آگے نہیں بڑھیں گے۔ اگر اس نے قرض نہیں لیا، بلکہ اپنے ذاتی مال سے ادا کیا، یا قرض لیا تھا لیکن اسے اپنے ذاتی مال سے چکا دیا تو اب اسے زکوٰۃ نہیں دیں گے۔

۳) کوئی شخص کسی دوسرے کے قرض کا ضامن بنے اور کسی تیسرے سے قرض لے کر ضامن اسے ادا کرے تو اس صورت میں اگر اصل مقروض (اصیل) کی اجازت کے بغیر ضامن بنا ہو اور ضامن غریب ہو، یا اجازت سے ضامن رہا ہو اور دونوں غریب ہوں، تو قرض کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ سے تعاون کیا جائے گا۔ اجازت سے ضامن ہو اور اصیل امیر ہو، تو زکوٰۃ نہ دی جائے۔ مقروض کے مد سے جب ضامن کا قرض ادا ہو تو وہ اصیل سے نہیں لے سکتا۔

جو مصالح عامہ مثلاً مہمان نوازی، قیدی کی رہائی اور مسجد کی تعمیر جیسے امور کے لئے قرض لے، اسے زکوٰۃ دی جائے، گرچہ وہ امیر ہو۔ (فتح المعین مع الترشیح ۱۵۴)

۷) **فی سبیل اللّٰہ**:- اس کا لغوی مفہوم ہے اللہ تک پہنچانے والا راستہ، پھر اس کا بکثرت استعمال جہاد کے لئے ہونے لگا، کیونکہ یہ شہادت کا سبب ہے جو اللہ سے ملاتی ہے پھر بلا معاوضہ مجاہدین پر اس کا اطلاق ہوا، کیونکہ یہ اوروں سے افضل ہیں۔

یہاں فی سبیل اللہ سے وہ غازی مراد ہیں جو اللہ کے راستہ میں بلا معاوضہ جہاد کے لئے جائے، لہٰذا اس کو غزوہ پر تعاون کے طور پر

زکوٰۃ دی جائے گی، گرچہ وہ امیر ہو، جس مجاہد کو فئی کے مال سے تنخواہ اور روزی ملتی ہو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، اگر فئی کا مال نہ ہو، تب بھی زکوٰۃ نہ دے بلکہ اس کی اعانت وامداد مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

۸)**ابن سبیل** (مسافر): جو زکوٰۃ کی بستی سے سفر شروع کرکے کہیں جارہا ہو یا بطورِ مسافر وہاں سے گذر رہا ہو، اور معصیت کا سفر نہ ہو، تو بصورتِ احتیاج اسے زکوٰۃ دی جائے۔ گرچہ کہیں اور اس کا مال موجود ہو، چاہے طاعت کا سفر ہو جیسے حج وزیارت یا مباح سفر ہو جیسے تجارت وغیرہ۔ اگر اس کے پاس اشیاء ضروری موجود ہوں، یا معصیت کا سفر ہو یا بلا کسی صحیح مقصد کے آوارہ گردی کررہا ہو تو ایسے مسافروں کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔

مستحقین کے شرائط:

۱)**آزادی**: مکاتب کے علاوہ دیگر کسی غلام کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے۔

۲)**اسلام**۔ کافر کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے

"ان کے (مسلمانوں کے) اغنیاء سے لے کر انہیں کے فقراء کو دی جائے گی۔" البتہ حمال اور ناپ تول وغیرہ کے لئے کافر کو عامل کے مد سے مزدوری پر رکھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ بطور اجرت اور مزدوری ہے زکوٰۃ نہیں ہے۔

۳)**ھاشمی یا مطلبی نہ ھو**: ہاشمی یا مطلبی سادات کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "یہ صدقات (زکوٰۃ) تو لوگوں کا میل کچیل ہے اور یہ نہ محمد ﷺ کے لئے حلال ہے اور نہ آلِ محمد ﷺ کے لئے" (مسلم شریف) اور فرمایا: "اے اہل بیت! میں تمہارے لئے صدقات میں سے کچھ بھی حلال نہیں قرار دیتا اور نہ ہاتھوں کا غُسالہ (یعنی دھوون، مراد قلیل مقدار یا زکوٰۃ ہے) تمہارے لئے خمس کے خمس میں اتنا حق ہے جو تم کو کافی ہو جائے یا مستغنی کردے"۔ (طبرانی)

ان حضرات کو خمس کا خمس نہ بھی ملے تو زکوٰۃ نہ دی جائے۔ دیگر واجبات جیسے نذر اور کفارہ کا بھی یہی حکم ہے۔ نفلی صدقات ان کے لئے حلال ہے، لیکن آپ ﷺ کے مقام عالی کی وجہ سے آپ پر یہ سب حرام تھا لیکن ہدیہ حلال تھا۔ (کیونکہ وہ بطور اکرام دیا جاتا ہے)

ہاشمی یا مطلبی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کو بھی زکوٰۃ حلال نہیں ہے، ایک روایت ہے: "کسی قوم کا مولیٰ بھی انہیں کا ایک فرد شمار ہوگا۔" (صححہ الترمذی وغیرہ)

کئی متقدمین ومتاخرین فقہاء کرام نے جب سادات کو بیت المال سے خمس کا خمس نہ ملے تو زکوٰۃ دینا جائز قرار دیا ہے، جن میں اصطخری، ھروی، ابن یحییٰ، ابن ابی ہریرہ، فخر رازی، قاضی حسین، ابن شکیل ابن زیاد، ناشری اور ابن مطبر د داخل ہیں۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۰۶)

فقہ منہجی میں بھی حالات حاضرہ کے تحت سادات کو زکات کی ادائیگی کے جواز پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ ان کا حق خمسِ خمس ان کو ملتا نہیں، تب زکات بھی نہ دینا ان کے لئے بربادی کا باعث ہے۔ (الفقہ المنہجی ۲/۶۷)

فاسق کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، البتہ معلوم ہو کہ وہ گناہ میں صرف کرے گا تو دینا حرام ہے۔ جو بلوغ کے وقت سے سستی کی وجہ سے نماز ترک کرتا ہو یا بچہ یا پاگل ہو تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب شرعاً مجور (تصرفات سے روکے ہوئے) ہیں۔ لہٰذا ان کی زکوٰۃ ان کے ولی (سرپرست اور ذمہ دار) کے حوالہ کرے۔

اگر فقیر یا مسکین اپنے مناسب اسباب معیشت اختیار کرکے گذر بسر کی آمدنی حاصل کرسکتے ہوں (چاہے سستی کی وجہ سے نہ کریں

)توان کوز کوٰۃ دینااور ان کا قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

رشتہ داروں کوزکوٰۃ: جن لوگوں کا نفقہ (مصارف) زکوٰۃ ادا کرنے والے کے ذمہ واجب ہو وہ انہیں زکوٰۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ اس نفقہ کی وجہ سے وہ غیر محتاج ہیں اور ان کو دینا خود اپنے آپ کو دینے کی طرح ہے، کیونکہ اس کا فائدہ اسی کی طرف لوٹ رہا ہے، لٰہذا والدین یا دادا، دادی، نانا، نانی اوپر تک، ان کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ ان کا نفقہ فرع (اولاد) پر واجب ہے، اسی طرح نابالغ اولاد یا بالغ لیکن پاگل یا اپاہج اولاد کو اپنی زکوٰۃ نہیں دے سکتا، کیونکہ ان کا نفقہ باپ دادا پر واجب ہے، شوہر، بیوی کو زکوٰۃ نہ دے، کہ اس کا نفقہ تو شوہر پر واجب ہے۔

مذکورہ لوگوں کو مسکین یا فقیر کے مد سے زکوٰۃ نہ دی جائے، لیکن ان میں کوئی مقروض یا فی سبیل اللہ وغیرہ صفت میں داخل ہو تو اس وصف کی مناسبت سے جس پر نفقہ واجب ہے، وہ بھی انہیں زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ افراد کو دیا جانے والا نفقہ ناکافی ہو تو دیگر حضرات اپنی زکوٰۃ سے اس کا تعاون کرسکتے ہیں۔(الفقہ المنہجی ۲ /۶۵)

بیوی کا شوہر کوزکوٰۃ دینا: اگر بیوی پر زکوٰۃ واجب ہو اور شوہر فقیر ہو تو اسے سنت ہے کہ اپنی زکوٰۃ شوہر کو دے۔ اسی طرح اولاد غریب ہوں تو ان پر خرچ کرنا مستحب ہے، کیونکہ شوہر اور اولاد کا نفقہ بیوی اور ماں پر واجب نہیں ہے۔

احادیث: (۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر اور زیر پرورش یتیموں پر خرچ کرنے کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ہاں، اس کو دوہرا اجر ہے، ایک رشتہ داری کا اور ایک صدقہ کا“۔**(صحیحین)**

(۲) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی یتیم اولاد پر خرچ کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ان پر خرچ کرو تمہیں اس کا اجر ملے گا۔“**(صحیحین)**

جن رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں ان کوزکوٰۃ دینا: زکوٰۃ ادا کرنے والے کے ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ اس پر لازم نہیں جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ اور ان کی اولاد وغیرہ یہ فقیر یا مسکین یا دیگر مستحقین زکوٰۃ میں داخل ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح وہ بڑے بیٹے جن کی آمدنی ان کے گزر بسر کے لئے ناکافی ہو ان کو بھی زکوٰۃ دے سکتا ہے۔(کیونکہ ان کا نفقہ باپ پر نہیں ہے۔)

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ”مسکین کو صدقہ دینا (صرف) صدقہ ہے، اور رشتہ دار کو دینا صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے۔“(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)(الفقہ المنہجی ۲/۶۶)

فصل - مستحقین کوزکوٰۃ کی تقسیم

زکوٰۃ ادا کرنے والے کے علم میں جو زکوٰۃ کا مستحق ہو، اسے بلا طلب زکوٰۃ دے، اور جو مستحق نہ ہو، اسے نہ دے، اگر اسے علم نہ ہو اور وہ ضعفِ اسلام، فقر، مسکنت، غازی یا مسافر ہونے کا دعویٰ کرے، تو بلا قسم اور بینہ (گواہوں) کے اسے سچا سمجھ کر زکوٰۃ دے، گرچہ وہ متہم ہو۔ کیونکہ ان امور پر گواہی پیش کرنا اس کے لئے مشکل ہو سکتا ہے۔ دیگر مستحقین استحقاق کا دعویٰ کریں تو گواہی ضروری ہے، کیونکہ بسہولت پیش کرسکتے ہیں۔ فقیر و مسکین اگر اہل وعیال کا دعویٰ کریں یا اس مال کے تلف ہونے کا دعویٰ کریں جس کا ہمیں علم تھا، تو اس پر

بینہ کا مطالبہ ہو گا، کیونکہ بسہولت ممکن ہے۔

غازی اور مسافر زکوٰۃ لینے کے بعد غزوہ یا سفر میں نہ جائیں تو ان سے واپس لی جائے، کیونکہ استحقاق کی صفت پائی نہیں گئی۔ اگر جا کے واپس آجائیں اور غازی کی تنگی کے ساتھ خرچ کرنے کی وجہ سے کچھ بچ گیا ہو، یا باقاعدہ خرچ کے باوجود معمولی مقدار بچ گئی ہو تو اس سے بقیہ واپس نہ لے، ورنہ واپس لے، مسافر سے مطلقاً واپس لے۔ اسی طرح مکاتب زکوٰۃ کی رقم کے بغیر ہی آزاد ہو جائے یا مقروض بری ہو جائے تو ان سے زکوٰۃ کی رقم واپس لی جائے گی۔

استحقاق کی صفت کے لئے بینہ سے مراد دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا اس کی اطلاع دینا ہے۔ دیگر معاملات کی طرح قاضی کے پاس دعویٰ، انکار اور گواہی کا مطالبہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صفت استحقاق لوگوں میں مشہور و مستفیض ہو، یا مقروض کی قرض خواہ خود تصدیق کرے یا مکاتب کی آقا تصدیق کرے، تو یہ بھی کافی ہے، بینہ کی ضرورت نہیں۔

مقدار زکوٰۃ۔ اگر فقیر یا مسکین میں تجارت یا کسی صنعت و حرفت کے ذریعہ گذر بسر کی صلاحیت نہ ہو، تو اس کو اتنی مقدار زکوٰۃ دی جائے کہ اس سے کوئی ایسی جائیداد جانور وغیرہ خرید سکے جس کی آمدنی پر اس کا گذر بسر ہو سکے اور آئندہ زکوٰۃ کا محتاج نہ رہے۔ فقیر و مسکین کے عمر غالب (تقریباً ساٹھ سال) کے مصارف کا اعتبار ہو گا۔ اس کے بعد جو ضرورت مند ہو، اسے ایک ایک سال کا خرچ دیتے رہیں۔ امام خود بھی جائیداد خرید کر اسے دے سکتا ہے۔ اسے مذکورہ جائیداد فروخت کرنا جائز اور صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں عام مصلحت ہے۔

جو کسی پیشہ اور حرفت کے ذریعہ کما سکتا ہو، اسے اتنی رقم دی جائے کہ متعلقہ پیشہ کے آلات خرید سکے اور جو تجارت کر سکتا ہو اسے متعلقہ تجارت کے اسباب خریدنے کے لئے اتنی رقم دی جائے کہ اس کا نفع اس کے گذر بسر کے لئے غالباً کفایت کر جائے۔

مکاتب اور مقروض جتنی رقم کی ادائیگی سے عاجز ہوں، اتنی رقم انہیں دے دی جائے (لیکن گزر چکا کہ اصلاح بین المسلمین کی خاطر جو مقروض ہے، اسے باوجود مالداری کے دی جائے) مسافر کو منزل تک یا اپنے مال تک پہنچنے کے مصارف دیئے جائیں۔ مدتِ مسافر سے زائد اقامت کے مصارف اور واپسی کا ارادہ نہ ہو تو واپسی کے مصارف نہ دیں۔

غازی کو اس کے آمد و رفت اور اقامت میں ضروریات یعنی اس کا اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ ولباس، ہتھیار کی قیمت، گھوڑے پر قتال کرے تو گھوڑے کی قیمت وغیرہ دے۔ چاہے دورانِ غزوہ اس کی اقامت کی مدت طویل ہو کیونکہ اس کے باوجود وہ غازی ہی کہلائے گا، بخلاف مسافر کے۔

مذکورہ اشیاء کا غازی مالک بن جائیگا، لہٰذا واپس نہیں لیا جائے گا، بجز اس کے جو بچ جائے جیسا کہ گزر چکا۔ امام اس مد سے ہتھیار وغیرہ خرید کر وقف کر دے تو یہ بھی جائز ہے، پھر اسے عاریتاً غازی کو دے یا کہیں سے کرایہ پر حاصل کر کے دے تو جائز ہے۔ بوقت ضرورت سفر اور زادِ راہ کے لئے سواری مہیا کی جائے گی، لیکن یہ واپسی پر لوٹائی جائے گی۔ جیسا کہ مسافر کو بھی بصورت ضرورت مہیا کی جائے گی اور پھر واپس لی جائے گی۔

مولفۃ القلوب کو امام یا مالک جتنا مناسب سمجھیں، زکوٰۃ دے۔

عامل کو اس کے خدمات کے مناسب معاوضہ دیا جائے۔ اگر زکوٰۃ میں اس کا حصہ معاوضہ سے زائد ہو تو بقیہ دیگر مستحقین پر صرف کیا جائے اور معاوضہ سے کم ہو تو مالِ زکوٰۃ سے یا مصالح کے مال سے اسکی تکمیل و تلافی کی جائے۔

کسی شخص میں استحقاقِ زکوٰۃ کی دو صفت ہوں، مثلاً فقیر مقروض ہو تو کسی ایک ہی صفت کی بنیاد پر لے گا، دونوں صفت کے اعتبار

سے نہ لے، جبکہ ایک زکوٰۃ سے لے (دو مختلف زکوٰتوں میں سے ایک سے فقر کی وجہ سے اور دوسرے سے قرض کی وجہ سے لے تو جائز ہے) بیک وقت دونوں صفتوں کے اعتبار سے لینا ممنوع ہے۔ اگر پہلے قرض کے مد سے لے کر قرض خواہ کو دے دیا تو اب دوبارہ فقیر کے مد سے لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کو میت کی تکفین یا مسجد کی تعمیر وغیرہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ کوئی اپنے مقروض کو اس شرط سے زکوٰۃ دے کہ وہ قرض میں واپس لوٹا دے تو یہ جائز نہیں ہے اور اس سے اداء قرض صحیح نہیں ہے دونوں بلا شرط اس کی نیت رکھیں تو حرج نہیں ہے، اگر مقروض سے کہا کہ تیرے ذمہ جو قرض ہے وہ تمہارے لئے زکوٰۃ سمجھو تو یہ کافی نہیں ہے، جب تک اس پر قبضہ کر کے پھر واپس نہ کر دے۔ (الفتح مع الترشیح ص ۱۵۴)

فصل - اصناف کا استیعاب (تمام اصناف کو زکوٰۃ دینا) وغیرہ

بصورتِ امکان زکوٰۃ آیت میں مذکورہ آٹھوں اصناف پر تقسیم کرنا واجب ہے، یعنی جب امام تقسیم کرے اور یہ سارے اصناف پائے جائیں۔ آیت کا ظاہری تقاضہ یہی ہے کہ زکوٰۃ اور فطرہ دونوں کا یہی حکم ہے، لیکن کئی علماء نے صرف ایک کو فطرہ دینا کافی قرار دیا ہے۔

تمام اصناف موجود نہ ہوں مثلاً مالک خود تقسیم کرے تو عامل کا سوال نہیں یا امام ہی تقسیم کرے لیکن بعض اصناف ہی موجود ہوں تو موجود تمام اصناف کو دے، کیونکہ معدوم (غیر موجود) کا کوئی حصہ نہیں۔ آج کل عام طور پر فقراء، مساکین، مقروض اور مسافر یہ چار صنف پائے جاتے ہیں۔ (بشری الکریم ۲/ ۵۸) اتفاقاً کوئی بھی صنف موجود نہ ہو، تو ان کے وجود تک زکوٰۃ محفوظ رکھے۔

امام کو ہر صنف کے تمام مستحق افراد تک زکوٰۃ پہنچانا واجب ہے، کیونکہ اس کے حق میں یہ مشکل نہیں ہے، اگر بستی میں مستحقین کی تعداد محدود ہو اور ان کا ضبط و شمار آسان ہو، اور زکوٰۃ ان سب کو ادا کرنے کی مقدار میں ہو، تو مالک کے ذمہ بھی تمام مستحقین تک پہنچانا واجب ہے۔ اور تعداد محدود نہ ہو یا محدود ہو لیکن مقدار زکوٰۃ کم ہو (اور تمام کے حوائج کو کافی نہ ہو) تو ہر صنف کے تین یا زائد افراد کو دینا واجب ہے۔ کیونکہ آیت میں مستحقین کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (اور عربی زبان میں جمع کا صیغہ کم از کم تین کے لئے مستعمل ہے) فی سبیل اللہ اور ابن سبیل جو جنس کے لئے ہے اور اس سے بھی یہی مراد ہے۔ مالک خود تقسیم کرے تو عامل کا سوال نہیں، ایک ہی عامل سے کام چل جائے تو وہ بھی کافی ہے۔ (تین ضروری نہیں)

امام یا مالک کسی صنف یا فرد کو (جسے دینا لازم تھا) نہ دے تو اس کا ضامن ہو گا۔ امام زکوٰۃ کے مال سے اس کا حق ادا کر دے اور مالک اپنے ذاتی مال سے، مال کی تھوڑی مقدار دینا بھی کافی ہے۔

عامل کے علاوہ دیگر اصناف میں مساوات لازم ہے، چاہے بعض اصناف زیادہ محتاج ہوں (لیکن ایک صنف پر تقسیم کرنے کے بعد ان کا حصہ ابھی بچا ہو تو دوسرے ضرورت مند صنف پر صرف کرے) کیونکہ آیت میں مستحقین کو واو تشریک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر صنف کا مساوی حق ہو۔

ایک صنف کے مختلف مستحق افراد میں مساوات لازم نہیں ہے، کمی بیشی کر سکتا ہے۔ لیکن امام تقسیم کرے اور ان کی ضروریات یکساں ہوں تو ایسی صورت میں افراد کے درمیان بھی مساوات لازم ہے۔

جس بستی میں زکوٰۃ واجب ہو، وہاں مستحقین موجود ہوں تو مالک کو دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا تاکہ وہاں کے مستحقین کو تقسیم کرے

جائز نہیں ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ کیونکہ صحیحین کی روایت میں ہے: "ان کے امیروں سے زکوٰۃ لے کر انہیں کے فقراء کو لوٹائی جائے گی" اور ہر بستی کے مستحقین کی نگاہ اور امیدیں اس بستی کے زکوٰۃ سے وابستہ ہوگی، اور یہ نقل ان کی وحشت کا باعث ہوگا۔

تنبیه: کئی فقہاء شافعیہ مثلاً ابن الصلاح، ابن الفرکاح وغیرہ نے نقل زکوٰۃ کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنے ذاتی مسئلہ میں ان کے فتویٰ پر عمل کرے تو جائز ہے۔

اگر چہ امام شافعی کا اصل مسلک زکوٰۃ کے موجودہ تمام مستحقین کو دینے کا وجوب ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک ہی صنف کو دینا بھی جائز ہے اور (فقہاء شوافع میں سے) ابن عجیل اور اصبحی نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے اور اکثر متاخرین نے اسے اختیار کیا ہے لہٰذا زکوٰۃ کے منتقل کرنے اور ایک ہی شخص کو زکوٰۃ ادا کرنے کے جواز میں ان حضرات کی تقلید جائز ہے۔ (بغیۃ المسترشدین ۱۰۵)

اصل مسلک شافعی تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ کرے، صرف امام اور حاکم اپنے زیر ولایت علاقوں میں منتقل کر سکتے ہیں، اسی طرح مذکورہ آٹھوں اصناف کو دینا بھی واجب ہے، لہٰذا مشقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن فقہاء کرام نے منتقل کرنے اور صرف تین یا ایک شخص کو زکوٰۃ دینے کی اجازت دی ہے، ان کی تقلید جائز ہے۔ کسی جگہ زکوٰۃ کے اظہار میں کسی ظالم سے خطرہ ہو تو منتقل کرنا مطلقاً جائز ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد بہامش البغیہ ۱۱۰)

ابن عجیل سے منقول ہے کہ زکوٰۃ کے تین مسائل میں خلافِ مسلک فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ (۱) زکوٰۃ کو منتقل کرنا (۲) ایک ہی صنف کو زکوٰۃ دینا (۳) ایک شخص کی زکوٰۃ کسی ایک ہی آدمی کو دینا۔ (ترشیح المستفیدین ۱۵۵)

کسی شخص کی ۲۰ر بکریاں ایک بستی میں اور ۲۰ر بکریاں دوسری بستی میں ہوں تو کسی ایک جگہ ایک بکری ادا کرنا کراہت کے ساتھ کافی ہے، مال پر سال کی تکمیل کے وقت مال کسی صحرا، جنگل (غیر آباد علاقہ) یا سمندر میں ہو تو اس سے قریب ترین بستی کے مستحقین کو زکوٰۃ ادا کی جائے۔

کسی بستی میں مستحقین کی کوئی صنف (قسم) موجود نہ ہو، یا ان کو دینے کے بعد زکوٰۃ باقی ہو، تو اس سے قریب ترین بستی کے مستحقین پر صرف کی جائے۔ اگر بعض اصناف موجود نہ ہوں، یا بعض اصناف کو بقدرِ کفایت دینے کے بعد ان کا حصہ باقی ہو اور دیگر مستحقین کو اپنے حصہ سے بقدر کفایت نہ مل سکے تو دیگر اصناف کی بقیہ زکوٰۃ ان مستحقین پر صرف کرے، نقل نہ کرے، کیونکہ اصل استحقاق اسی بستی والوں کا ہے، لیکن دیگر مستحقین کو بقدر کفایت مل چکا ہے تو قریب ترین بستی کے انہیں اصناف پر صرف کرے۔

اصل مسلک کے اعتبار سے نقل زکوٰۃ میں یہ ساری تفصیلات اس وقت ہیں، جب کہ مالک خود تقسیم کرے۔ امام (مسلمان حاکم) کے حق میں چونکہ سارے فقراء اسلام ایک بستی کے فقراء کی طرح اور تمام زکوٰۃ ایک زکوٰۃ کی طرح ہے، اور اس کی ولایت (حکومت و گورنری) عام ہے، اس لئے بلا کسی شرط اور تفصیل کے وہ اپنی اور رعایا کی زکوٰۃ منتقل کر سکتا ہے۔

چونکہ زکوٰۃ کا قبول کرنا فرض کفایہ ہے۔ اس لئے سارے ہی مستحقین اگر قبول کرنے سے باز رہیں، تو ان سے قتال کیا جائے گا۔

عامل کے شرائط: گواہی کا اہل ہو، یعنی مسلمان، مکلف، عادل وغیرہ جو گواہ کے شرائط ہیں موجود ہوں۔ زکوٰۃ کے مسائل کا علم ہو کہ کس سے کتنا لینا ہے، کیونکہ یہ شرعی ولایت ہے، لہٰذا قاضی کی طرح یہ امور ضروری ہیں۔ اگر اسے بتا دیا جائے کہ کس سے کتنا لینا ہے تو علم زکوٰۃ، آزادی اور مذکر ہونے کی شرط نہیں ہے۔ عامل ہاشمی یا مطلبی نہ ہو اور نہ ان کا مولیٰ، کیونکہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اگر امام نے انہیں عامل بنایا تو مال مصالح سے معاوضہ دے نہ کہ زکوٰۃ سے۔ کیونکہ یہ ان کے حق میں حرام ہے۔

امام کے لئے سنت ہے کہ زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے کسی مہینے کی تعیین کرے تاکہ مالک حضرات بروقت ادائیگی کے لئے اور مستحقین لینے کے لئے تیار رہیں۔ ماہ محرم کی تعیین سنت ہے، کیونکہ یہ شرعی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ تعیین ان اموال میں ہے جس میں سال کی تکمیل کا اعتبار ہوتا ہے، جو کہ لوگوں کے حق میں مختلف ہوگا۔ جس کا سال متعینہ ماہ سے پہلے ہی مکمل ہو اور مستحقین موجود ہوں، اور کوئی عذر نہ ہو تو اسے فوراً ادا کرنا لازم ہے۔ متعینہ ماہ تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے۔

کھیتی باڑی اور پھلوں میں جب زکوٰۃ واجب ہوتی، اس وقت عامل کو روانہ کرے اور ایک ہی علاقہ میں اس وقت میں زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ اغنیاء زکوٰۃ نہ دیں یا شک ہو تو امام کو زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے عامل کا روانہ کرنا واجب ہے۔

جانوروں کو داغ لگانا: زکوٰۃ اور فیئ کے جانوروں کو بطور علامت داغ لگانا مسنون ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو دستِ مبارک میں داغ لگانے کا آلہ تھا، جس سے صدقہ کے اونٹ کو داغ لگا رہے تھے۔ (بخاری شریف)

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے جانوروں سے یہ ممتاز ہوگا اور گم ہونے کی صورت میں پانے والا لوٹا دے گا اور خود زکوٰۃ دینے والا اس کا مالک نہیں بنے گا، کیونکہ کسی چیز کو صدقہ کرنے کے بعد دوبارہ سامنے والے سے (خرید وغیرہ کے ذریعہ) اس کا مالک بننا مکروہ ہے، وراثت میں مل جائے تو کراہت نہیں ہے۔

داغ مضبوط اور ٹھوس ظاہری جگہ میں جہاں زیادہ بال نہ ہوں، دے تاکہ جلد نظر آسکے اور جانوروں کے لئے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ بکریوں میں کان اور اونٹ گائے میں ران پر دینا بہتر ہے۔ بکریوں کو بالکل ہلکا، گائے کو اس سے بڑھ کر اور اونٹ کو اس سے بھی بڑھ کر داغ دے۔ زکوٰۃ اور فیئ کے علاوہ جانوروں کو داغ دینا مباح ہے، نہ تو مندوب ہے اور نہ ہی مکروہ۔ گھوڑا، خچر، گدھا اور ہاتھی بھی داغ کے مسئلہ میں ان مویشیوں کی طرح ہیں، محل داغ میں اونٹ و گائے کا حکم ہے۔

چہرہ پر داغ لگانا حرام ہے، کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گدھا جس کے چہرہ پر داغ لگا تھا گذرا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ اس داغ لگانے والے پر لعنت بھیجے" (مسلم شریف)

زکوٰۃ کے مویشیوں کے داغ میں زکوٰۃ یا صدقہ یا طھرہ (پاکی) یا لِلّٰہ (اللہ کے لئے) لکھے "لِلّٰہ" لکھنا بہتر اور بابرکت ہے۔

بطور علامت انسان کو داغ لگانا حرام ہے۔ معتبر واقف حضرات کے مشوروں سے بوقت احتیاج (علاج کے لئے) آدمی اور دیگر جانوروں کو داغ لگانا جائز ہے۔ انسان اور دیگر جانوروں کے چہرہ پر مارنا (چاہے ہلکی مار ہو) حرام ہے۔

کمسن ماکول (جس کا گوشت حلال ہے) جانور کو گوشت کی بہتری کے لئے خصی کرسکتے ہیں، دیگر جانورں کو (یعنی بڑی عمر کے یا جن کا گوشت حرام ہے) خصی کرنا حرام ہے۔ جانوروں میں جفتی کرانا جبکہ مضر نہ ہو جائز ہے۔ حدیث میں گھوڑے اور گدھے کے درمیان جفتی کی ممانعت کراہت کے لئے ہے تاکہ گھوڑوں کی قلت نہ ہو۔

زکوٰۃ میں قیمت کی ادائیگی:

تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت کا ادا کرنا اصل ہے، جیسا کہ گزر چکا۔

دیگر اشیاء میں قیمت کا ادا کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ زکوٰۃ اسی چیز میں واجب ہوتی ہے لہٰذا (عموماً) اسی میں سے دینا لازم ہے (جس کی تفصیل گزر چکی) لیکن امام بلقینیؒ نے سونا چاندی کی زکوٰۃ رائج سکوں میں نکالنے کی اجازت دی ہے، لہٰذا حالات اور فقراء کے فائدہ کو پیشِ

نظر رکھتے ہوئے ان کے اس فتویٰ پر عمل کرنے میں حرج نہیں۔ کیونکہ ان کا شمار اہل تخریج وترجیح علماء میں ہوتا ہے۔(فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۱۲، ترشیح ص ۱۰۵)

نفلی صدقہ (خیرات)

آیت: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْن "(آل عمران۔۹۲) تم خیر کامل (یعنی ثواب عظیم) کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی (بہت) پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے۔"

۲) **اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ ثُمَّ لَایُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًی لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ** (البقرہ ۲۶۲)

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس جاکر اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ لوگ مغموم ہوں گے۔"

احادیث: (۱) "جو ایک کھجور کے برابر پاک اور حلال مال سے صدقہ کرے، اور اللہ تعالیٰ حلال کے علاوہ قبول نہیں کرتے، تو اللہ اسے اپنے یمین (دائیں) سے قبول کرتے ہیں، پھر اس کی ایسی پرورش (نگہداشت) کرتے ہیں، جیسا تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے چھوٹے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ (کھجور) پہاڑ کے مانند ہو جاتا ہے۔" (متفق علیہ)

۲) صدقہ کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔ (مسلم شریف) (یہاں برکت اور آخرت میں بے انتہا ثواب ملے گا)

۳) اے مسلمان خواتین! ہرگز کوئی پڑوسن اپنے پڑوسن کے حق میں (ہدیہ لینے اور دینے میں) حقارت کا جذبہ نہ رکھے، چاہے بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو" (یعنی معمولی سی چیز جو بھی میسر ہو اس کا لین دین رکھیں) (متفق علیہ)

۴) "کسی بھی نیکی اور حسن سلوک کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، گرچہ اپنے (مسلمان) بھائی سے بشاشت اور خندہ پیشانی سے ملاقات ہی کیوں نہ ہو۔" (مسلم شریف)

۵) "اے لوگو! سلام کو رواج دو اور کھانا کھلاؤ اور صلہ رحمی کرو اور رات میں لوگ جب سو رہے ہوں نماز پڑھو، بڑی سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

۶) "صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔" (ترمذی)

۷) " ایک مسلمان اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنے اہل خانہ پر جو صرف کرے، اس کے لئے صدقہ (کا ثواب) ہے۔" (متفق علیہ)

۸) "جب سالن پکاؤ تو پانی کچھ زیادہ ڈال دو، اور پڑوسیوں کا بھی خیال رکھو۔" (مسلم شریف)

۹) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنا صدقہ دیا ہوا گھوڑا خریدنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنا صدقہ واپس نہ لو کیونکہ صدقہ واپس لینے والا قئے کرکے پھر اسے چاٹنے والے کتے کی طرح ہے۔" (متفق علیہ)

۱۰) " سائل کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی واپس کرو، چاہے ایک جلا ہوا کھر ہی ہو" (جو بھی میسر ہو دے دو) (مالک، نسائی،

ترمذی)

۱۱)"مسکین کو صدقہ صدقہ ہے اور رشتہ دار کو صدقہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے۔"(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۱۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے "اگر میرے پاس احد پہاڑی کے مثل سونا ہو تو مجھے یہ بات پسند آتی کہ تین رات تک اس میں سے کچھ باقی نہ رہے، سوائے اس مقدار کے جو قرض کی ادائیگی کے لئے سنبھال رکھوں۔"(بخاری)

۱۳)"اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے "اے ابن آدم (راہِ خدا میں) خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔"(متفق علیہ)

۱۴)"اے ابن آدم جو کچھ بچ رہے (زائد ہو) اس کا خرچ کرنا تیرے حق میں بہتر ہے، اور روکے رکھنا بدتر ہے، البتہ بقدر کفاف (جو اپنی ضروریات کے بقدر اور سوال سے بچانے والا ہو) روکنے پر کوئی ملامت نہیں (خرچ کرنے میں) اپنے زیرِ کفالت افراد (کنبہ) سے پہل کرو۔"(مسلم شریف)

۱۵) رب کعبہ کی قسم وہ لوگ بڑے خسارہ اور نقصان میں ہیں جو بڑے مالدار ہیں، سوائے ان کے جو آگے پیچھے دائیں بائیں (جو بھی راہِ خیر میں صرف کے مواقع ہوں اس میں) صرف کرتے رہیں، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔"(متفق علیہ)

۱۶)"جو لوگوں سے مال مانگے اپنی دولت بڑھانے کے لئے تو یہ (جہنم کے) آگ کا شعلہ مانگ رہا ہے، چاہے کم مانگے یا زیادہ"(مسلم شریف)

۱۷)"آدمی لوگوں سے (بھیک) مانگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامت میں اس حال میں آئیگا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔"(وہاں بڑی ذلت و رسوائی کا سامنا ہو گا)(متفق علیہ)(مشکوٰۃ المصابیح ۱/۱۶۲-۱۷۱)

صدقہ کی فضیلت میں بکثرت آیات و احادیث وارد ہیں، اس لئے یہ سنت موکدہ ہے، کسی عارض کی وجہ سے حرام بھی ہو جائے گا، جیسے یہ معلوم ہو کہ لینے والا اسے گناہ پر صرف کرے گا تو اسے دینا حرام ہے۔

مال یا پیشہ کی وجہ سے جو امیر ہو اسے بھی صدقہ حلال ہے، اور دینے والے کو ثواب ملے گا۔ کیونکہ صحیحین کی حدیث میں امیر کو صدقہ دینے کا ذکر موجود ہے اور اس کا یہ فائدہ مذکور ہے کہ شاید اسے عبرت حاصل ہو اور خود بھی اللہ کے راہ میں خرچ کرے، لیکن امیر کو صدقہ لینے کے درپے ہونا مکروہ ہے اور اس سے دور رہنا مستحب ہے۔

کسی شخص میں فقر، صلاح و نیکی، نسب یا علم وغیرہ کسی وصف کی موجودگی کا گمان کرتے ہوئے اس کی وجہ سے اسے صدقہ، ہدیہ، وصیت، ہبہ، نذر یا وقف کا مال دیا جائے، لیکن حقیقتاً اس میں وہ وصف نہ ہو، یا کسی میں ایسا مخفی وصف ہو کہ جس کا علم ہوتا تو اسے نہ دیا جاتا تو ان تمام صورتوں میں اسے لینا حرام ہے۔ کسی صفت کا گمان کر کے دے اور حقیقتاً ایسا نہ ہو، اور حقیقت معلوم ہوتی تو نہ دیا ہوتا، تو اس صورت میں لینے کے باوجود وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔ امیر شخص کو سوال کرنا حرام ہے، سوال کی وجہ سے جو ملے اسے لینا بھی حرام ہے، گرچہ لینے کی صورت میں وہ مالک بن جائے، لیکن اپنی غریبی اور فقر و فاقہ کا اظہار کیا اور سامنے والے نے اسی بنیاد پر دیا ہے، تو مالک نہ بنے گا۔

شرح مسلم وغیرہ میں ہے کہ کسی سے مانگنے میں اپنے آپ کو ذلیل کرے یا بہت الحاح اور اصرار سے مانگے اور اس طرح مانگے کہ سامنے والے کو ایذاء و تکلیف ہو تو بالاتفاق حرام ہے، چاہے مانگنے والا محتاج ہو۔ (بالکل اضطراری اور مجبوری کی شکل ہو تو جائز ہے) جس کو مانگنا جائز ہو اُسے معلوم ہو کہ دینے والا اس سے یا دیگر حاضرین سے حیا و شرم کی وجہ سے دے رہا ہے، ورنہ دیانہ ہوتا تو احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس کا لینا حرام ہے اور واپس لوٹانا لازم ہے۔

صدقہ کے حلال ہونے میں شک ہو، یا لینے میں ہتک مروت ہو یا خست وذلت کا باعث ہو، یا یہ گمان ہو کہ کسی غرض و مقصد سے دے رہا ہے (چاہے اخروی مقصد ہو) تو قبول نہ کرنا بہتر ہے۔ کسی کے مال میں حرام بھی ہو، بھلے کثیر مقدار میں، اس سے صدقہ لینا حرام نہیں ہے۔ البتہ جو چیز دے رہا ہے وہی حرام ہے تو منع ہے۔ اللہ کے وجہ (چہرہ) کے وسیلہ سے سوال اور سفارش مکروہ ہے۔ (ابوداود کی روایت میں ایسے سوال سے منع کیا گیا ہے) ایسے سوال وسفارش کو رد کرنا بھی مکروہ ہے۔ ایک غریب شخص اپنے ایک سالہ ضروریات کے لئے سوال کر سکتا ہے، لیکن فی الحال اپنا ضرورت مند ہونا ظاہر کرے تو سوال حرام ہے۔ سائل کا امیر ہونا معلوم ہو تو اسے دینا حرام نہیں ہے۔ دوست واحباب آپس میں بے تکلفی کی وجہ سے جو مطالبہ کرتے ہیں اور لیتے دیتے ہیں باوجود مالداری کے یہ حرام نہیں ہے۔ کمانے پر قادر شخص طلبِ علم میں مکمل وقت صرف کرنے کی وجہ سے کمانہ پائے تو اسے سوال کرنا حرام نہیں ہے۔

فتاویٰ السیوطی میں ہے کہ مسجد میں مانگنا مکروہ تنزیہہ ہے۔ (معقول مجبوری ہو تو مکروہ نہیں ہے) اور سائل کو مسجد میں دینا باعثِ ثواب ہے، مکروہ نہیں ہے، کافر کو صدقہ دینا جائز ہے، صحیحین کی روایت میں ہے: ''ہر ذی روح (کے ساتھ حسنِ سلوک) میں ثواب ہے۔

جہراً اور علانیہ صدقہ دینے کے بجائے سراً اور مخفی دینا، غیر رمضان کے بجائے ماہِ رمضان میں دینا، اوروں کے بجائے رشتہ دار، بیوی، دوست پھر پڑوسی (جو قریب ہو وہ مقدم ہوگا) کو دینا افضل ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث سے یہ فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ظاہری اموال کی زکوۃ علانیہ دینا افضل ہے۔

ماہِ رمضان میں، اپنے حاجتوں کے وقت، سورج گہن اور چاند گہن کے وقت، بیماری کے وقت، سفر کے وقت، حج میں، جہاد میں اور فاضل وقت اور مقامات جیسے عشرہ ذوالحجہ، جمعہ، رمضان کا آخری عشرہ اور ایام عید نیز مکہ و مدینہ میں صدقہ کی کثرت سنت ہے۔

اپنے اور زیر کفالت افراد کے ضروریات کا صدقہ حرام ہے، اگر خود فقر وفاقہ پر صبر کی ہمت رکھتا ہو تو اپنی ضروریات کا صدقہ وایثار حرام نہیں ہے۔ ایک انصاری جوڑے نے اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر مہمان کو کھلایا تو اس کی تعریف میں قرآن پاک کی آیت ''وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر ۹)'' نازل ہوئی۔ (ترجمہ آیت) اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔''

اگر قرض ہو تو قرض کی ادائیگی کی رقم صدقہ کرنا حرام ہے، جبکہ کہیں اور سے بظاہر اس کی ادائیگی کی امید نہ ہو، کیونکہ واجب سنت پر مقدم ہے۔ قرض کی ادائیگی کی کوئی اور صورت ہو تو صدقہ کرنا حرام نہیں ہے۔

آیت: یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ'' (البقرۃ ۲۱) ترجمہ ''لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو۔''

اپنے اور زیر کفالت افراد کے ایک دن رات کے مصارف وضروریات اور متعلقہ موسم کے پوشاک اور ادائِ قرض کی رقم سے زائد مقدار کا صدقہ کر دینا سنت ہے، جبکہ محتاجگی اور تنگی پر صبر ہو سکتا ہو۔ ورنہ مکروہ ہے۔ (اسی تفصیل پر بظاہر مختلف ومتعارض روایات کو محمول کیا جائے گا)

اپنے ایک سالہ ضروریات سے زائد مقدار کو روکے رکھنا مکروہ ہے۔ کسی بھی گناہ کے سرزد ہونے کے بعد صدقہ کرنا سنت ہے۔ نیا کپڑا پہننے والے کے لئے پرانا صدقہ کرنا سنت ہے۔

ایک حدیث میں ہے۔ ''بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی بے نیازی کے بعد ہو۔ (متفق علیہ، ابوداؤد، وصححہ الحاکم)

ترمذی کی ایک صحیح روایت میں ہے کہ (ایک موقع پر) ''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال صدقہ کر دیا۔'' اپنے

ضروریات سے زائد میں سے بعض کا صدقہ مطلقاً مسنون ہے۔ لیکن بڑی مقدار ہو جو کل مال کے قریب ہو تو مذکورہ تفصیل کے مطابق حکم ہوگا۔ جہاں پانی کی ضرورت ہو، وہاں پانی کا صدقہ (کنویں یا نل کے انتظام کے ذریعہ یا کسی اور طرح) افضل ہے۔ ورنہ پھر کھانے کا صدقہ۔ ہر دن جو بھی میسر ہو، صدقہ کرنا سنت ہے۔ گرچہ قلیل مقدار ہی ہو، اس سے عار کرنے اور رکنے کی ضرورت نہیں۔ (ترشیح)

مَنّ (احسان جتلانا):- آیت: لَاتُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (البقرہ ۲۶۴) تم احسان جتلا کر یا ایذاء دے کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو۔"

حدیث: "تین لوگوں سے اللہ نہ گفتگو کریں گے اور نہ ان کی طرف نظر (التفات و کرم) کریں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱) کپڑا (ٹخنہ سے نیچے) لٹکانے والا (۲) احسان جتلانے والا (۳) جھوٹی قسم کے ذریعہ سامان فروخت کرنے والا۔ (مسلم شریف)

صدقہ کرکے اس پر احسان جتلانا حرام اور ثواب کو ختم کرنے والا ہے۔ اپنے صدقہ کا اظہار و تذکرہ، شکر، دعا، خدمت، تعظیم، مجلس میں تقدیم اور اپنی اتباع کے ذریعہ سامنے والے سے (جس کو صدقہ کیا ہے) بدلہ کی خواہش اور تمنا منّ (احسان جتلانا) میں داخل ہے۔ (ترشیح)

جس کے پاس حلال و حرام دونوں مال ہوں، اس سے (صدقہ وغیرہ) لینا مکروہ ہے۔ شبہ کی قلت و کثرت کے اعتبار سے کراہت کم و بیش ہوگی۔ جو چیز لے رہا ہے اس کا حرام ہونا معلوم ہو تو لینا حرام ہے۔ سنت ہے کہ اپنی پسندیدہ چیز، بشاشت اور خوشدلی سے، اپنی کمائی سے، بسم اللہ کہہ کر اور محض اللہ کی رضاجوئی میں صدقہ کرے، اگر نعمت کے شکر یا مصیبت کے ٹالنے کی نیت سے دے تو جائز ہے۔ (ترشیح: ۱۵۸)

بہتر چیز ہوتے ہوئے گھٹیا اور ردی کا صدقہ کرنا مکروہ ہے۔ پرانے کپڑے کا صدقہ کرنا مکروہ نہیں ہے۔ قلیل مقدار صدقہ کرنے کو ناپسند کرنے اور اس سے رُکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ قبول کرے وہ کثیر ہے۔ اور قرآن میں ہے "فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (سورہ زلزال) یعنی جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور حدیث میں ہے "جہنّم کی آگ سے اپنی حفاظت (کی کوشش) کرو گرچہ ایک ٹکڑا کھجور (صدقہ کرکے) کیوں نہ ہو۔" (بخاری) (بشری الکریم ۲/۶۳)

کتاب الصوم (روزہ کا بیان)

ارشاد باری ہے۔ یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" (البقرہ۔ ۱۸۳۔۱۸۴) اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کے تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے)

پھر آگے فرمایا "شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ" (البقرہ۔ ۱۸۵) (وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہ رمضان ہے جس

میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے۔ جس کا ایک وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں۔ سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کرکے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے۔

کچھ آگے ارشاد فرمایا "وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" (البقرہ۔۱۸۷) اور کھاؤ اور پیئو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (کہ وہ نور ہے) صبح (صادق) کا (جبکہ وہ بالکل شروع ہی شروع میں طلوع ہوتی ہے) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے (کہ عبارت ہے تاریکی کی اس حد فاصل سے جو کہ خطِ نور صبح سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مراد متمیز ہونے سے یہ کہ صبح صادق طلوع ہو جائے) پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔" (من بیان القرآن)

احادیث: (۱) ماہ رمضان شروع ہو تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں او رشیاطین مقید کر دیئے جاتے ہیں" (متفق علیہ)

(۲) جنت کے آٹھ دروازے ہیں جس میں ایک دروازے کا نام "اَلرَّیَّان" ہے اس میں صرف روزہ دار داخل ہونگے۔ (متفق علیہ)

(۳) جو ماہ رمضان میں ایمان (اخلاص نیت اور تصدیق کامل) اور ثواب کی توقع و امید کے ساتھ روزہ رکھے، اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے اور جو رمضان میں ایمان اور ثواب کی امید کے ساتھ قیام کرے (نماز و عبادات انجام دے) اس کے گذشتہ خطائیں معاف ہونگی۔ اور جو شب قدر میں ایمان اور بہ نیت ثواب قیام کرے اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوں گے۔ (متفق علیہ) (مراد یہاں حقوق اللہ سے متعلق صغیرہ گناہ ہیں۔)

(۴) آپ ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کا ہر عمل دوچند ہوتا ہے، ایک نیکی دس گنا سے ۷۰۰ گنا تک دوچند ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزہ کے، کہ وہ تو میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، (روزہ دار) میری خاطر اپنی خواہشات اور کھانے کو ترک کرتا ہے، روزہ دار کو دو خوشی ملے گی، ایک افطار کے وقت اور دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت، اور روزہ دار کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے اور روزہ ڈھال ہے، تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو فحش اور قبیح گفتگو نہ کرے، اور چیخے چلائے نہیں، اگر کوئی اسے برا بھلا کہے یا اس سے لڑے تو یہ کہہ دے، میں روزہ دار ہوں' (متفق علیہ)

روزہ کے مقاصد اور زندگی پر اس کے اثرات

(از ارکان اربعہ - سید ابوالحسن علی ندوی)

امام غزالیؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے "روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو "صمدیت" کہتے ہیں۔ وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے، اس لئے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں، اور انسان کا درجہ بھی بہائم سے بلند ہے، نیز خواہشات کے مقابلہ کے لئے اس کو عقل و تمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے۔ البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پالیتی ہیں اور

اس کو ان سے آزاد ہونے کے لئے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ جب وہ اپنے خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے اور جانوروں کے ریوڑ سے جاملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے۔“ (احیاء العلوم ج ا ص ۲۱۲)۔

علامہ ابن قیمؒ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفسِ انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے، اس کے شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس کے ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے اور حیات ابدی کے حصول کے لئے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدّت میں تخفیف ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے اور اعضاو جوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جن میں اس کی دنیاو آخرت دونوں کا نقصان ہے اس لحاظ سے یہ اہل تقویٰ کی لگام، مجاہدین کی ڈھال اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے۔ روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے۔ فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جو چیزیں مانع صحت ہیں ان کو خارج کر دیتا ہے۔ اور اعضاو جوارح میں جو خرابیاں ہَوا و ہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں وہ اس سے دفع ہوتی ہیں، وہ صحت کے لئے مفید اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت مدد و معاون ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ۔ ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔“ (سورہ بقرہ۔ ۱۸۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ“ (روزہ ڈھال ہے) چنانچہ ایسے شخص کو جو نکاح کا خواہشمند ہو اور استطاعت نہ رکھتا ہو روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس کو اس کا تریاق قرار دیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ روزہ کے مصالح اور فوائد چونکہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی رو سے مسلّم تھے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے فرض کیا ہے“ (زاد المعاد ج ا رص ۱۵۲)

اسی سلسلہ کلام میں آگے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ”چونکہ قلب کی اصلاح اور استقامت حال، سلوک الی اللہ اور جمعیت باطنی پر منحصر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ توجہ وانابت پر اس کا دارومدار ہے، اس لئے پراگندہ خاطری اس کے حق میں سخت مضر ہے۔ کھانے پینے کی زائد مقدار، لوگوں سے زیادہ میل جول، ضرورت سے زیادہ گفتگو وہ چیزیں ہیں جن سے جمعیت باطنی میں فرق آتا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ سے منقطع ہو کر مختلف راستوں پر بھٹکنے لگتا ہے، بعض اوقات محض اسی وجہ سے اس کی راہ کھوئی ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی مقتضی تھی کہ اپنے بندوں پر روزہ فرض کرے اور اس کے ذریعہ کھانوں کی زائد مقدار اور خواہشات کے فضلہ کا ازالہ و تنقیہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے آدمی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے۔ وہ اس سے دنیا و آخرت دونوں جگہ فائدہ اٹھا سکے۔ اور اس کی عارضی اور مستقل کسی مصلحت کو نقصان نہ پہونچے“ (زاد المعاد ج ۱ ا ص ۱۶۸) (ارکان اربعہ ص ۲۳۲۔۲۳۵)

رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال ماہ شعبان میں فرض ہوئے ماہ رمضان افضل ترین ماہ ہے۔ اور یوم عرفہ سال کے تمام ایام میں سب سے افضل دن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ر سال رمضان کے روزے رکھے جس میں ایک یا دو سال کامل (۳۰ دن) تھے اور بقیہ ناقص (۲۹ر دن) اس میں امت کے لئے تسلی ہے کہ ایام سے قطع نظر نفس رمضان سے متعلقہ فضائل میں کامل و ناقص مساوی ہے۔ البتہ تیسویں دن کے واجب روزے کا ثواب اور سحری و افطار کے مستحبات کا ثواب ناقص کے مقابلہ میں زائد ہے۔ روزے کی فرضیت اور

اسلام کا اہم رکن ہونا ایسی قطعی اور واضح حقیقت ہے کہ اس کا منکر کافر ہو جائے گا۔

رمضان کے روزوں کی حکمت

(۱) حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ''جنت الفردوس کا ولیمہ تناول کرنے کے لئے اپنے آپ کو بھوکا رکھو''

(۲) بھوک کو لازم قرار دیا تاکہ بھوکوں پر رحم کریں۔ (۳) نیزہ اور کمان وغیرہ ٹیڑھی اشیاء کو آگ میں تپا کر سیدھا کیا جاتا ہے، لہٰذا اطاعت ربانی سے کجی اختیار کرنے اور منہ موڑنے والے نفوس کو سیدھا کرنے اور اصلاح کے لئے بھوک کی آگ اور بھٹی میں تپانے کا حکم دیا، حقیقی آگ کا اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حکم نہ دیا۔ (۴) فرشتوں نے مومنین کے گناہوں کی کثرت کی شکایت کی۔ جب رمضان کے روزے رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اگر خارج رمضان میری نافرمانی کی تو رمضان میں میری خاطر مشقتوں کو برداشت کیا لہٰذا فرشتوں نے شکایت کے بجائے سفارش شروع کی قرآن میں ان کے الفاظ نقل ہوئے۔ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَا تَّبَعُوْا سَبِيلَكَ ترجمہ: ''سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے (شرک و کفر سے) توبہ کرلی ہے اور آپکے رستے پر چلتے ہیں۔'' (المومن آیت۷)

(۵) روزے کی برکت سے واجب اور سنت زہد حاصل ہوتا ہے۔

(۶) خیر خواہ طبیب اور معالج بیماری میں پرہیز کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے گناہوں کے بیمار پر نرمی برتتے ہوئے پرہیز (بھوک پیاس وغیرہ) کا حکم دیا۔

(۷) شیطان انسان کا دشمن ہے جو مستقل اس کے درپے آزار وہلاکت ہے، لہٰذا ایک مومن کا کام یہ ہے کہ بھوکا پیاسا رہ کر اس کے راستوں کو بند کردے، یہی مفہوم ہے اس فرمان کا کہ شیطان انسانی بدن میں خون کی طرح چکر لگاتا ہے لہٰذا اس کی گذرگاہ کو بھوک وپیاس سے تنگ کردو۔

لفظ ''صوم'' (روزہ) کا مفہوم عربی زبان میں روکنا ہے۔ اور شرعی مفہوم ہے ''پیٹ، شرمگاہ اور منہ کی شہوت کو اللہ کی اطاعت میں نیت کے ساتھ قبل فجر سے غروب تک روکنا۔''

رمضان کا روزہ ان تین باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے سے واجب ہو گا۔ (۱) شعبان کے ۳۰ دن مکمل ہو۔ (۲) کسی کو ۲۹ر کو چاند نظر آئے تو اسے روزہ رکھنا واجب ہے چاہے وہ فاسق ہو، آئنہ وغیرہ کے واسطہ سے نظر آنے کا اعتبار نہ ہو گا منجم اور حاسب کی بات کا بھی اعتبار نہ ہو گا۔ (۳) جسے خود نظر نہ آئے اس کے حق میں ایک عادل گواہ کے ذریعہ چاند کی رویت کا ثبوت ہونا چاہئے۔

احادیث (۱) ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید مناؤ اور بادل وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آسکے تو شعبان کی گنتی ۳۰ر تک مکمل کرو'' (بخاری و مسلم)

(۲) ''حضرت ابن عمرؓ نے آپ ﷺ کو یہ خبر دی کہ انہوں نے چاند دیکھا تو آپ ﷺ نے بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا'' (ابوداود وصححہ ابن حبان)

(۳) ایک اعرابی نے آپ ﷺ کے روبرو چاند کی گواہی دی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو روزہ کا حکم دیا (ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان دارقطنی اور بیہقی)

(اکثر مسائل میں اور دیگر مہینوں کے ثبوت کے لئے دو گواہ ضروری ہیں لیکن) رمضان کے لئے احتیاطاً شریعت نے ایک عادل گواہ

بھی کافی قرار دیا ہے گواہ کے لئے جو شرائط ہیں اس کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا فاسق، غلام اور عورت کی گواہی کافی نہیں ہے، لیکن اس کے اندرونی تقویٰ کا گہرائی سے علم ہونا ضروری نہیں ہے ظاہری حالت کافی ہے، یعنی بظاہر جو متقی ہو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

رمضان کی گواہی شہادت حِسبَہ ہے، اسلئے پہلے کسی دعوی کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، البتہ کسی ایسے قاضی کے سامنے گواہی ہو جس کے احکام اور فیصلوں کا نفاذ ہوتا ہو۔ امام بغویؒ اور بعض دیگر علماء نے کہا کہ کسی کو ایسا شخص جو اس کے نزدیک معتمد اور معتبر ہو رویت ہلال کی خبر دے اور وہ اسے سچا یقین کرے تو اسے روزہ رکھنا واجب ہے، چاہے وہ قاضی کے سامنے نہ کہے۔ اسی طرح فاسق، غلام یا عورت خبر دے اور یہ ان کی تصدیق کرے تو اسے روزہ واجب ہے۔

شہادت

شہادت میں یہ کہنا کافی ہے۔ 'میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے چاند دیکھا۔' ایک ہی گواہ سے رمضان کا ثبوت صرف روزے اور اس کے تابع امور جیسے تراویح کے حق میں ہو گا۔ قرض کی ادائیگی کا وقت پہلا رمضان مقرر ہو یا چاند پر طلاق معلق ہو تو ان امور کے لئے ایک گواہ سے ثابت ہونا کافی نہیں۔ (بلکہ دو گواہ ضروری ہیں) لیکن خود گواہ سے متعلق ہو تو کافی ہے کیونکہ وہ خود اعتراف کر رہا ہے کہ رمضان شروع ہو چکا۔

ایک یا دو عادل گواہ کی وجہ سے روزہ شروع کرنے کے بعد ۳۰؍ دن مکمل ہو جائیں اور شوال کا چاند نظر نہ بھی آئے اور بدلی وغیرہ نہ ہو، تب بھی دوسرے دن عید منائیں گے، کیونکہ ۳۰؍ دن گذرنے سے مہینہ مکمل ہو تا ہے۔ یہاں ایک گواہ سے عید منانے کا اشکال وارد نہ ہو گا، کیونکہ ایک چیز مقصوداً ثابت نہ بھی ہو، تو ضمناً ثابت ہو جاتی ہے۔

اتحاد و اختلاف مطالع: ایک جگہ چاند نظر آئے تو اس سے قریب علاقوں میں بھی اسے تسلیم کیا جائیگا، نہ کہ دور و دراز علاقوں میں۔ قرب و بعد کا دارو مدار اختلاف مطالع پر ہے۔ جن دو مقامات کے طلوع شمس یا طلوع فجر یا طلوع کواکب (ستارے) اور ان کے غروب کے اوقات مختلف ہوں ان کے درمیان اختلاف مطالع ہو گا ورنہ اتحاد مطالع۔ بعضوں نے کہا کہ دو مقامات اتنے فاصلہ پر ہوں کہ ایک جگہ چاند کی رویت کے باوجود غالباً دوسری جگہ چاند نظر نہ آتا ہو تو ان میں اختلافِ مطالع ہو گا اور یہ بعید شمار ہونگے۔ لہٰذا ایک جگہ نظر آنے سے دوسری جگہ ثابت نہ ہو گا۔ جیسا کہ طلوع فجر و طلوع شمس اور غروب (اور اس کی وجہ سے نماز کے اوقات اور سحری و افطار کے اوقات میں) قریب و بعید علاقہ میں فرق ہوتا ہے۔ اگر مشرقی علاقہ میں چاند نظر آئے تو اسی جہت (سمت) اور عرض میں مغربی علاقہ میں نظر آنا لازمی ہے۔ (اگر مطالع کے اتفاق و اختلاف میں شک ہو، تو اختلاف پر محمول کریں گے۔ تاج تبریزی فرماتے ہیں کہ ۲۴؍ فرسخ (۷۲) میل سے کم میں اختلافِ مطالع ممکن نہیں۔ نہایۃ ۱۵۶/۳)

حدیث: حضرت کریب فرماتے ہیں "میں نے شام میں (رمضان کا) چاند دیکھا پھر مدینہ منورہ آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا جمعہ کی شب میں، دریافت فرمایا۔ کیا تم نے دیکھا؟ میں نے کہا جی ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لیکن ہم لوگوں نے سنیچر کی شب دیکھا ہے، لہٰذا ہم (۳۰ کی) گنتی مکمل ہونے تک روزہ رکھیں گے۔ میں نے عرض کیا، تو کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رویت اور ان کا روزہ رکھنا آپ کے لئے کافی نہیں؟ فرمایا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی حکم دیا ہے (مسلم)

جس جگہ چاند نظر آئے وہاں سے کوئی شخص دوسری جگہ سفر کرے جہاں ۲۹؍ کو چاند نظر نہ آیا تھا تو آخری روزہ میں ان کی موافقت کرے۔ (چاہے اس کے ۳۱؍ روزے ہو جائیں) اگر اپنی بستی میں عید منا کر وہاں پہنچا (اور وہاں ابھی روزہ ہو) تو ان کے ساتھ امساک کرے۔ (یعنی روزے دار کی طرح بغیر کھائے پیئے بقیہ دن گذارے) چاہے اس کے ۳۰؍ روزے پورے ہو چکے ہوں، کیونکہ اب یہ بھی دوسری بستی والوں کے حکم میں ہے، بعد میں اس روزے کی قضاء کرلے۔ (اسی طرح کوئی مثلاً مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد سفر کر کے ایسی جگہ پہنچے جہاں ابھی سورج غروب نہیں ہوا تو وہاں کے غروب کے بعد پھر مغرب پڑھے)

اس کے برعکس جہاں چاند نظر نہیں آیا وہاں سے کوئی نظر آنے والی بستی میں پہنچے تو ان کے ساتھ عید منائے گرچہ ابھی اس کے اٹھائیس ۲۸ روزے ہوئے ہوں۔ یعنی رمضان ۲۹؍ کا ہو تو اس کی عید ان کے ساتھ ۲۹؍ ویں روزے کو ہوگی۔ اس کے ۲۹؍ روزے ہو چکے ہوں تب بھی یہی حکم ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جبکہ اس بستی میں رمضان ۳۰؍ دن کا ہو۔ اسے صرف ۲۸؍ روزے ملے ہوں تو بعد میں ایک روزہ قضاء کرے کیونکہ ۲۸؍ کا مہینہ نہیں ہوتا۔ لیکن اسے ۲۹؍ دن مل چکے تو قضا کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مہینہ ۲۹ کا بھی ہوتا ہے (چاہے جس بستی سے چلا تھا وہاں رمضان ۳۰؍ دن کا ہو تب بھی قضا کی ضرورت نہیں ہے) دن میں چاند نظر آئے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر رمضان کی ۳۰؍ تاریخ کو زوال سے پہلے بھی چاند نظر آئے تو روزہ نہ توڑے، اور شعبان کی ۳۰؍ کو اس طرح نظر آئے تو امساک کی ضرورت نہیں۔ حضرت شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط آیا کہ چاند بعض بعض سے بڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا دن میں نظر آئے تو روزہ نہ توڑو جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دیں کہ ہم نے کل شام چاند دیکھا تھا۔ (دارقطنی، بیہقی باسناد صحیح)

کسی بھی وقت چاند پر نظر پڑے تو یہ دعا پڑھے اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شَرِّ هٰذَا الۡغَاسِقِ" (بغیۃ ص ۱۱۱) کسی بھی ماہ پہلی تاریخ کا چاند نظر آئے تو یہ دعا پڑھنا سنت ہے: اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيۡنَا بِالۡاَمۡنِ وَالۡاِيۡمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالۡاِسۡلَامِ وَالتَّوۡفِيۡقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرۡضٰى رَبُّنَا وَرَبُّكَ اللّٰهُ اَللّٰهُ اَكۡبَرُ وَ لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيۡۤ اَسۡئَلُكَ خَيۡرَ هٰذَا الشَّهۡرِ وَ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ شَرِّ الۡقَدۡرِ وَ مِنۡ شَرِّ الۡمَحۡشَرِ (هِلَالَ خَيۡرٍ وَ رُشۡدٍ دو مرتبہ اٰمَنۡتُ بِالَّذِيۡ خَلَقَكَ (تین مرتبہ) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ ذَهَبَ بِشَهۡرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهۡرِ كَذَا (پہلی کذا کی جگہ گذشتہ ماہ کا اور دوسرے کذا کی جگہ جو ماہ شروع ہوا اس کا نام لے) (بغیہ ص ۱۱۱ نہایۃ ۳/۱۵۷)

روزے کے ارکان

روزے کے تین ارکان ہیں۔ (۱) نیت (۲) امساک (مفطرات سے رکنا) (۳) روزہ دار

(۱) **نیت:** مشہور حدیث ہے۔ "اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّيَّاتِ" (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ صحاح ستہ وغیرہ)

دیگر عبادات کی طرح ہر روزہ کے لئے نیت واجب ہے (رمضان۔ نذر یا کفارہ کے) فرض روزے کے لئے رات میں نیت کرنا واجب ہے، غروب کے بعد اور صبح صادق سے پہلے کسی بھی وقت نیت کرنا کافی ہے۔

حدیث: جو صبح صادق سے قبل (رات میں) روزے کی نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہے۔ (احمد۔ ابوداود۔ نسائی۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابن خزیمہ۔ دارقطنی) آگے آنے والی حضرت عائشہ کی روایت کے پیش نظر اس روایت کا تعلق فرض روزے سے ہے فرض روزہ کی نیت میں روزہ کی تعیین (یعنی رمضان یا نذر یا کفارہ کا ہے) بھی لازم ہے۔ اگر دو رمضان کے قضا روزے یا مختلف قسم کے کفارے کے روزے ذمہ میں ہوں اور صرف قضاءِ رمضان کی یا کفارہ کی نیت کرے، سال اور سببِ کفارہ کی تعیین نہ کرے، تو یہ جائز ہے

مخصوص ایام کے سنت روزوں میں (جیسے عرفہ، عاشورہ، ایام بیض اور شوال کے چھ ۶؍ روزے) تعیین لازم نہیں ہے، کیونکہ ان ایام میں روزے اسی میں شمار ہوں گے، بلکہ کسی اور روزے کی نیت کرے تو بھی یہ حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ تحیۃ المسجد کا ثواب کسی اور نماز سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل مقصود ان ایام میں روزوں کا پایا جانا ہے۔

نیت کے بعد روزے کے منافی (مخالف عمل) پایا جائے تب بھی نیت صحیح ہوگی جیسے نیت کے بعد جماع کرنا یا از خود قئے کرنا۔ اسی طرح نیت کے بعد سوجائے یا حیض کا سلسلہ اکثر مدت کے بعد یا عادت کے مطابق ختم ہو جائے تو یہ نیت صحیح ہے۔ تجدید نیت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سبب روزے کی نیت کے منافی نہیں ہے۔ اگر فجر سے قبل نیت ہی ختم کردے تو روزہ نہ ہوگا۔ صبح صادق سے قبل پھر نیت کرنا ضروری ہے۔ لیکن دن میں نیت کے ختم کرنے سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ البتہ ردّت (اسلام چھوڑنا) دن میں بھی ہو تو روزہ ختم ہوجائے گا۔ سنت (نفل) روزوں کی نیت زوال سے قبل کرنا بھی صحیح ہے۔

حدیث: ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا "کیا تمہارے پاس (کھانے کے لئے) کچھ ہے؟ عرض کیا "یارسول اللہ! ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" فرمایا: "پھر میں روزہ رکھتا ہوں۔" (مسلم، ابوداود۔ ابن حبان) ایک روایت میں ہے "کیا تمہارے پاس کچھ ناشتہ ہے"۔

زوال کے قبل نیت کرنے سے نفلی روزہ اس وقت صحیح ہوگا جبکہ صبح صادق کے بعد سے روزے کے منافی کوئی بات (جیسے کھانا۔ جماع۔ کفر حیض۔ نفاس۔ پاگل پن۔) نہ پائی جائے ورنہ روزہ صحیح نہ ہوگا۔

کامل نیت: نَوَیْتُ صَوْمَ غَدٍ عَنْ اَدَاءِ فَرْضِ رَمْضَانِ هٰذِهِ السَّنَةِ لِلّٰهِ تَعَالٰی۔

ترجمہ: "میں نے کل اس سال کے رمضان کے فرض روزے کی ادائیگی کی نیت کی۔" تاکہ اس کے برعکس صورتوں سے متمیز ہو جائے۔ نیت کا اصل محل دل ہے۔ دل میں نیت ہو اور زبان سے نہ کہے تو کافی ہے لیکن زبان سے کہے اور دل میں نہ ہو تو یہ کافی نہیں۔ اگر سحری کرے تاکہ روزہ رکھے یا پانی پئے تاکہ دن میں پیاس نہ لگے یا صبح صادق کے خوف سے کھانے پینے یا جماع سے باز آئے اور تصور میں روزہ اپنے شرعی صفات کے ساتھ موجود ہو جس کا نیت میں خیال ہونا ضروری ہے تو یہ بھی نیت کہلائے گی۔ کیونکہ روزے کے قصد کو متضمن ہے۔

۳۰؍ رمضان کی رات کل رمضان کے روزے کی نیت کرے اور (چاند نظر نہ آیا اور) رمضان ہی تھا تو یہ روزہ صحیح ہے۔ لیکن ۳۰؍ شعبان کی شب میں اس طرح نیت کرنے سے روزہ صحیح نہ ہوگا۔ (کیونکہ ابھی رمضان کا ثبوت نہیں ہوا، اس لئے پختہ نیت نہ ہوگی) البتہ اس کے نزدیک کسی معتبر شخص کے کہنے سے رمضان کا گمان ہو تو بالجزم نیت کی وجہ سے روزہ صحیح ہے۔

اگر یوں نیت کرے کہ کل شعبان ہو تو نفل روزہ اور رمضان ہو تو فرض روزہ (اور کوئی علامت نہ ہو) تو شعبان ہونے کی صورت میں نفل روزہ صحیح ہوگا کیونکہ اصل بقائے شعبان ہے اور رمضان ہو تو فرض یا نفل دونوں صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی کو قید و بند میں ہونے کی وجہ سے رمضان کا علم نہ ہو سکے تو مختلف علامتوں کی روشنی میں اندازہ لگا کر روزہ رکھے اگر واقعتاً یہ روزے رمضان میں ہی رکھے ہیں تو ادا ہیں اور بعد میں ہیں تو قضاء ہیں۔ اور پہلے ہیں اور پھر رمضان مل جائے تو اس میں ادا کرے ورنہ بعد میں قضا کرے اگر آئندہ سال کے رمضان میں واقع ہو تو اس کی طرف سے ادا ہوں گے نہ کہ سابقہ سال کی قضاء۔

(۲) جو معذور جاہل نہ ہو اور مختار ہو اور روزہ یاد ہو اس شخص کو مندرجہ ذیل امور سے رکنا لازم ہے۔

(الف) جماع

(ب)عمداً قئے کرنا، لہٰذا جو روزہ دار ہونا یاد ہوتے ہوئے اپنے اختیار سے حرمت کے علم کے باوجود (یا علم نہ ہو لیکن اس میں کوتاہی کی ہو) جماع کرلے یا از خود قئے نکالے تو اس کا روزہ باطل ہو گا (ٹوٹ جائیگا) جماع کے مسئلہ میں اجماع ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جسے روزہ میں خود بخود قئے ہو جائے تو اس پر قضاء نہیں اور جو از خود قئے نکالے وہ قضاء کرے (سنن۔دارمی۔ابن حبان۔دار قطنی۔حاکم)

اگر (روزہ ہونا) بھول کر یا کسی کے مجبور اور زبر دستی کرنے سے بے اختیار یا مسئلہ کی لاعلمی کی وجہ سے جبکہ اس لاعلمی میں وہ قصور وار نہ ہو یعنی تازہ نو مسلم ہو یا علماء سے (یعنی اس مسئلہ کے جاننے والے عالم سے) دور دراز علاقہ میں پلا بڑھا ہو اور جماع یا قئے کرے تو روزہ نہ ٹوٹے گا۔ از خود قئے ہو جانے سے بھی روزہ باطل نہ ہو گا۔ عمداً قئے کرنا خود ہی مبطل ہے، گرچہ واپس پیٹ میں ایک قطرہ بھی نہ جائے۔ اندر سے بلغم نکال کر تھوکنے میں حرج نہیں۔ اگر دماغ سے بلغم اترے اور منہ کے حد ظاہر تک (یعنی لفظ 'ح' کے مخرج تک) پہنچ جائے او راسے تھوکنے پر قادر تھا اور نہ تھوکا اور پیٹ میں چلا گیا تو روزہ باطل ہو گا۔ اگر تھوک نہ پایا تو باطل نہ ہو گا۔

کسی بھی عین (چیز) کا منفذِ مَفتوح (کھلے ہوئے راستے) سے جوف (خالی جگہ میں) جانا، گرچہ اس جوف میں غذا یا دوا کو بدلنے (اور ہضم کرنے) کی قوت نہ ہو، جیسے حلق، دماغ، کان کا اندرونی حصہ، پیٹ، پیشاب اور پستان کا سوراخ اور مثانہ صرف ہوا داخل ہو یا ذائقہ محسوس ہو تو حرج نہیں، کیونکہ یہ عین نہیں ہیں (دھواں اندر چلا جائے تو روزہ نہ ٹوٹے گا لیکن بیڑی وغیرہ کے دھوئیں سے ٹوٹ جائیگا۔ بشری الکریم ۶۸/۲) تیل یا سرمہ مسامات کے ذریعہ اندر پہنچے تو حرج نہیں، جیساکہ پانی سے غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں، چاہے اس کا اثر اندر محسوس ہو، کیونکہ یہ منفذِ مفتوح کے ذریعہ نہیں پہنچے۔ خالص پاک تھوک اپنے معدن (منہ) سے پیٹ میں جائے گرچہ منہ میں جمع کرنے کے بعد یا زبان باہر نکالنے کے بعد اس پر موجود تھوک ہو، اس سے روزہ باطل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس سے بچنا مشکل ہے۔ تھوک نجس ہو یا اس میں کسی اور چیز کی آمیزش ہو یا منہ سے باہر نکالنے کے بعد (گرچہ ظاہری ہونٹ پر ہی کیوں نہ ہو) پیٹ میں جائے تو روزہ باطل ہو گا۔ جس کے مسوڑھوں سے ہمیشہ خون نکلتا رہے، وہ اچھی طرح تھوک کر منہ کو صاف کرے کہ تھوک سفید ہو جائے تو یہ کافی ہے، اسے مشقت کی وجہ سے کلی کرنے اور منہ دھونے کی ضرورت نہیں۔ کان میں سخت تکلیف کی وجہ سے دوا ڈالنے کی نوبت آئے اور اس میں فائدہ کی تحقیق ہو تو استعمال کی اجازت ہے اور مجبوری کی وجہ سے روزہ صحیح ہو گا۔ معتبر ڈاکٹر کے کہنے سے کسی بیماری میں قئے کرنی پڑے تو اس سے روزہ باطل ہو گا۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۱)

مکھی، مچھر، راستہ کا غبار یا آٹا چھانتے وقت اس کے ذرات پیٹ میں جائے تو روزہ باطل نہ ہو گا، کیونکہ پہلی دونوں صورتوں میں عمداً نہیں کیا اور آخری صورتوں میں اس سے احتیاط کافی دشوار ہے۔ اگر بھول سے کوئی چیز جوف میں پہنچ جائے یا اسے لوٹانے پر قادر نہ ہو یا زبر دستی اور جبراً یوں ہو یا مسئلہ سے لاعلمی اس کا سبب ہو جبکہ لاعلمی میں اس کا قصور نہ ہو تو ان صورتوں میں روزہ باطل نہ ہو گا۔

حدیث: کوئی شخص روزہ میں بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ مکمل کرلے، اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے"۔ (متفق علیہ) ابن حبان اور دار قطنی وغیرہ کی روایت میں ہے "اس پر قضاء لازم نہیں" (تلخیص الحبیر ۲/۴۰۷)

اگر بواسیر کے مسے باہر نکلیں اور انہیں اندر داخل کرے تو حرج نہیں، اگر مجبوراً انگلی بھی ساتھ داخل کرنی پڑے تو وہ بھی معاف ہے۔ مجبوری نہ ہو اور انگلی داخل کرے تو روزہ ٹوٹ جائیگا۔

پانی کے غیر مطلوب استعمال سے وہ پیٹ وغیرہ میں چلا جائے تو روزہ باطل ہو گا، جیسے کلی اور استنشاق میں مبالغہ کرنا، وضو میں چوتھی

مرتبہ کلی واستنشاق کرنا۔ اگر منہ سے نجاست دور کرنے کیلئے۔ مبالغہ کرے یا وضو میں مبالغہ نہ کرے اور بلا اختیار پانی پیٹ میں چلا جائے تو روزہ باطل نہ ہو گا

واجب یا مسنون غسل میں پانی کان وغیرہ میں چلا جائے تو حرج نہیں، اگر غوطہ لگانے سے کان میں پانی جاتا ہو اور اس سے بچنا مشکل ہو تو غوطہ لگانا حرام ہے۔ اور کان میں پانی جانے سے روزہ باطل ہو گا۔ صرف ٹھنڈک حاصل کرنے یا صفائی و نظافت کے لئے غسل کرے اور کان میں پانی چلا جائے تو روزہ باطل ہو گا۔

(د) **استمناء** (قصداً اپنی منی نکالنا)۔ اپنے یا بیوی یا کسی اور کے ہاتھ سے بلا حائل یا حائل کے ساتھ منی نکالے تو روزہ باطل ہو گا، کیونکہ بغیر انزال کے جماع سے جب روزہ باطل ہوتا ہے تو شہوت کے اس عمل سے بصورت انزال بدرجہ اولی باطل ہو گا۔ اسی طرح بلا حائل بیوی کو چھونے، بوسہ لینے یا ساتھ لیٹنے سے منی نکلے تو روزہ باطل ہو گا لیکن اگر حائل ہو (چاہے پتلا کپڑا ہی کیوں نہ ہو) تو روزہ باطل نہ ہو گا۔ کھجلی وغیرہ کی وجہ سے شرمگاہ کو کھجائے اور انزال ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

صرف کسی کو دیکھنے یا کچھ سوچنے کی وجہ سے انزال ہو تو روزہ باطل نہ ہو گا۔ جیسا کہ احتلام کی وجہ سے باطل نہیں ہو گا۔ اگر تحریک شہوت (انزال) کا اندیشہ ہو تو (فرض روزے میں) بیوی کو چھونا اور بوسہ لینا وغیرہ حرام ہے، اگر ایسا کوئی خطرہ نہ ہو تو یہ جائز ہے لیکن اسکا ترک اولی اور بہتر ہے، کیونکہ روزہ دار کو شہوتوں کا ترک کرنا مسنون ہے۔ حرمت کا حکم نہیں لگا یا کیونکہ اس صورت میں انزال کا احتمال ضعیف ہے۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ بعض ازواج مطہرات کا روزہ میں بوسہ لیتے، آپ ﷺ کو اپنی حاجت پر مکمل قابو تھا۔ (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو روزہ میں مباشرت (بیوی کے ساتھ صرف لیٹنے وغیرہ) کی اجازت دی اور دوسرے شخص کو جو جوان تھا منع فرمایا۔ (ابوداود۔ بیہقی)

وردو غیرہ کے ذریعے وقت کا اندازہ لگا کر (تحری سے) افطار کرنا جائز ہے صرف ظن (گمان) سے افطار کی اجازت نہیں کیونکہ اصل دن کا باقی رہنا ہے، لیکن غروب کا یقین ہو جائے (مشاہدہ وغیرہ سے) پھر افطار کرے تو یہ بہتر ہے، تاکہ غلطی سے محفوظ رہے۔ سحری کا وقت باقی رہنے میں شک بھی ہو تو سحری کر سکتا ہے کیونکہ اصل ابھی رات کا باقی ہونا ہے۔ لہٰذا روزہ صحیح ہو گا جبکہ یہ معلوم نہ ہو کہ صبح صادق ہونے کے بعد سحری ہوئی۔

تحری کر کے اندازہ لگا کر سحری یا افطار کرنے کے بعد معلوم ہو جائے کہ اندازہ غلط تھا تو روزہ صحیح نہ ہو گا، کیونکہ ایسا ظن و گمان جس کی غلطی واضح ہو چکی ہو معتبر نہیں۔ اگر بغیر تحری کے سحری یا افطار کرے اور کچھ پتہ نہ چلے تو سحری تو صحیح ہے لیکن افطار غلط ہے (اور روزہ نہ ہو گا) اگر بعد میں دونوں کا اپنے وقت میں ہونا معلوم ہو تو دونوں صحیح ہیں۔ اور دونوں کی غلطی واضح ہو تو دونوں غیر معتبر ہیں۔ اگر صبح صادق کے وقت منہ میں کھانا ہو اور اس میں سے کچھ بھی نہ نگلے بلکہ پھینک دے یا منہ میں ہی رکھے تو روزہ صحیح ہے۔ پھینکنے کی صورت میں بلا اختیار کچھ اندر چلا بھی جائے تو حرج نہیں لیکن دوسری صورت میں اگر اندر چلا گیا تو روزہ باطل ہو گا۔

دوران جماع صبح صادق ہو اور فوراً ترک جماع کی نیت سے جدا ہو جائے تو روزہ صحیح ہے۔ گرچہ بعد میں انزال ہو جائے۔ اگر ترک جماع کی نیت کے بغیر یا لذت حاصل کرنے کے لئے جدا ہوا ہو تو روزہ باطل ہو گا۔ اگر صبح صادق ہوتے ہی جدا نہ ہوا چاہے صبح صادق کا علم

ہو یا نہ ہو تو روزہ صحیح نہ ہو گا۔

انجکشن: روزہ کی حالت میں بطور علاج انجکشن لگوانے میں کوئی حرج نہیں ہے اس سے روزہ فاسد نہ ہو گا۔(من فتاوی الصیام)

(۳)**روزہ دار:** روزہ دار کے لئے مکمل دن (صبح صادق سے غروب تک) اسلام، عقل اور حیض و نفاس سے پاکی شرط ہے لہٰذا دن کے کسی بھی حصہ میں ان صفات میں سے کسی کی ضد پائی گئی تو روزہ صحیح نہیں۔ لہٰذا دن میں ایک سیکنڈ بھی کفر یا پاگل پن پایا گیا تو روزہ نہ ہو گا۔ حائضہ و نفساء کو روزہ کی نیت سے امساک حرام ہے لیکن کسی مفطر (روزے کے منافی عمل جیسے کھانا وغیرہ) پر عمل کرنا واجب نہیں ۔ صرف روزہ کی نیت نہ ہونا کافی ہے، جیسے عید کا حکم ہے۔ بچہ کی ولادت ہو یا علقہ یا مضغہ کا اسقاط ہو گرچہ بغیر تری کے تو روزہ صحیح نہ ہو گا سارا دن سوتا رہا تو روزہ ہو جائیگا۔ دن کے بعض حصہ میں بے ہوشی یا نشہ پایا جائے تو روزہ صحیح ہے۔ لیکن مکمل دن بے ہوش رہا، یا نشہ میں رہا تو روزہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں صفت انسان کو اہلیت خطاب سے خارج کرتے ہیں۔ بخلاف نیند کے کیونکہ نیند سے فوت شدہ نماز کی قضا لازم ہے۔ بخلاف بے ہوش کے اور اس نشہ کے جس میں اس کی غلطی نہ ہو، لہٰذا اگر کوئی رات میں شراب پئے اور دن کے بعض حصے میں ہوش میں ہو تو روزہ صحیح ہو گا۔ ممیز کا روزہ صحیح ہے، غیر ممیز کا صحیح نہیں ہے۔

وقت کے اعتبار سے روزہ کے صحت کی شرط: روزہ دن میں رکھا جائے نہ کہ رات میں، عید الفطر اور عید الاضحی کا دن نہ ہو۔ صحیحین کی حدیث میں دونوں عید کے روزے سے منع فرمایا ہے۔ ایام تشریق (یعنی ۱۱/ ۱۲/ ۱۳/ ذی الحجہ) میں بھی روزہ رکھنا منع ہے، چاہے تمتع کے طریقہ پر حج کرنے والا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ ابو داؤد کی ایک صحیح روایت میں ان ایّام کے روزوں سے روکا گیا ہے۔ یوم الشک (شک کے دن) میں بغیر معتبر سبب کے روزہ نہ رکھے۔ کیونکہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو یوم الشک میں روزہ رکھے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔ (رواہ الترمذی وغیرہ وصححہ)

فرض یا سنت روزہ کی قضاء، نذر کا روزہ اور ورد کا روزہ شک کے دن رکھنا بلا کراہت صحیح ہے۔ ورد کا مطلب یہ کہ کسی کی روزہ کی کوئی خاص عادت ہو جیسے پیر یا جمعرات کا روزہ رکھنا یا ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا، اور شک کے دن اس کی ترتیب کے مطابق روزہ کا دن ہو تو رکھنا صحیح ہے یوم الشک سے قبل ایک مرتبہ بھی رکھنے سے وہ ورد میں شمار ہو گا۔ مذکورہ روزوں کو کوئی عمداً موخر کرے تاکہ ۱۵/ شعبان کے بعد یا یوم الشک میں رکھے تو حرام ہے، اور صحیح نہ ہوں گے۔

حدیث: رمضان سے ایک یا دو روز قبل روزہ شروع نہ کرو۔ البتہ جو شخص کوئی روزہ رکھتا تھا تو وہ رکھ سکتا ہے" (صحیحین) مثلاً کوئی ہمیشہ یا داؤدی روزہ کا عادی ہو۔ ورد پر بقیہ روزوں کو بھی قیاس کر لیں گے سببیت میں اشتراک کی وجہ سے۔

یوم الشک: یوم الشک سے مراد شعبان کی ۳۰/ تاریخ ہے، جبکہ لوگوں میں چاند کا چرچا اور افواہ ہو۔ لیکن کسی نے گواہی نہ دی ہو یا ایسے ایک سے زائد لوگوں نے گواہی دی ہو جو قبول نہ ہو، جیسے بچے، عورتیں، غلام اور فاسق و بدکار لوگ، لیکن جن لوگوں کو مذکورہ گواہی کی سچائی کا ظن اور گمان ہو ان کے حق میں یہ یوم الشک نہ ہو گا۔ لہٰذا وہ روزہ کی نیت کر سکتے ہیں، بلکہ ان پر روزہ واجب ہے۔ اور رمضان ثابت ہو جائے تو یہ روزہ کافی ہو جائے گا۔ (قضاء کی ضرورت نہیں) اگر لوگوں میں چاند دکھائی دینے کا چرچا ہی نہیں ہوا اور کسی نے گواہی بھی نہیں دی یا مذکورہ لوگوں میں سے صرف ایک نے گواہی دی تو یہ یوم الشک نہیں، بلکہ شعبان کی ۳۰/ تاریخ ہے، گرچہ مطلع ابر آلود ہو، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اس صورت میں شعبان کے ۳۰/ دن مکمل کرنے کا حکم موجود ہے۔

۱۵ شعبان کے بعد روزہ: ۱۵/ شعبان کے بعد بلا سبب روزہ رکھنا حرام ہے جبکہ سابق سے نہ ملائے۔ یعنی کوئی ۱۵/ شعبان کو روزہ رکھے اور آگے بھی رکھتا چلا جائے تو جائز ہے۔ اگر ۱۵/ کو نہیں رکھا تو آگے نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح ۱۵/ سے رکھتا رہا پھر مثلاً ۲۰/ کو چھوڑ دیا، تو اب آگے نہیں رکھ سکتا۔ قضاء، نذر اور ورد کے روزے ان ایام میں جائز ہیں۔

روزے کی سنتیں

(۱) **سحری کرنا:** ایک حدیث کی رو سے سحری کھجور سے سنت ہے، اس کا وقت نصف شب سے شروع ہوتا ہے، سحری اس امت کی خصوصیت ہے، سابقہ امتیں سونے سے قبل کھا لیا کرتے، عشاء کے وقت سے ان پر کھانا پینا حرام تھا۔ قلیل و کثیر مقدار سے سحری حاصل ہوگی۔ ایک حدیث میں ہے "سحری کرو، اگرچہ ایک گھونٹ پانی ہی کیوں نہ ہو"

احادیث: (۱) سحری کیا کرو کیونکہ اس میں برکت ہے" (متفق علیہ)

(۲) "سحری کے کھانے کے ذریعہ روزے پر اور قیلولہ کے ذریعہ قیام اللیل پر مدد حاصل کرو"۔ (ابن ماجہ، حاکم)

(۳) اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کے فرشتہ سحری کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں"۔ (ابن حبان)

سحری میں تاخیر مستحب ہے۔ حدیث میں ہے "۔ آپ ﷺ کی سحری اور نماز (فجر) میں پچاس آیتوں کی تلاوت کے بقدر فاصلہ تھا "(متفق علیہ) سحری کی تاخیر میں یہود نصاریٰ کی مخالفت ہے۔ اور عبادت پر قوت حاصل کرنے کے لئے بھی معین و مددگار ہے۔ سحری اور تاخیرِ سحری اس وقت مستحب ہے جبکہ ابھی رات باقی ہونے کا یقین ہو۔

(۲) **افطار جلد کرنا:** آپ ﷺ نے فرمایا "لوگ بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے" (متفق علیہ)۔ ترمذی کی روایت میں ہے "اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نزدیک محبوب ترین بندے جلد افطار کرنے والے ہیں" جب رات ہونے کا یقین ہو جائے تو افطار میں تعجیل (جلدی کرنا) مستحب ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو افضل ہے کہ تعجیل نہ کرے۔ بلکہ بغیر تحری کے تعجیل حرام ہے۔ جیسا کہ تفصیل گذر چکی۔ قصداً اور فضیلت سمجھ کر افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، ورنہ کراہت نہیں ہے۔ افطار کے وقت کوئی راستہ سے گذر رہا ہو تب بھی اسے تعجیل سنت ہے اور اس کی وجہ سے اس کی مروت پر اثر نہ پڑے گا۔ (یعنی اس صورت میں راستہ میں کھانے میں حرج نہیں عام حالات میں یہ خلاف مروت ہے)

(۳) **کھجور سے افطار کرنا:** کھجور سے افطار کرنا سنت ہے اصل سنت ایک کھجور سے حاصل ہوگی اور اقل کمال تین کھجور سے، زائد میں بھی طاق کی رعایت کرے، کھجور نہ ہو تو پانی سے افطار کرے ورنہ کسی اور میٹھی اور شیریں چیز سے۔ دوسروں کو افطار کرانا سنت ہے کسی نے افطار کے لئے کھجور دیا تو اُسے افطار ہی میں استعمال کرنا چاہئے۔ وقت ہونے کے بعد کھجور کا انتظار کرنے کے بجائے پانی سے جلد افطار کرنا افضل ہے۔

اگر رُطَب (تازہ کھجور) ہو تو اسے تمر (خشک کھجور) پر مقدم رکھے۔

حدیث: (۱) جسے کھجور میسر ہو وہ اسی سے افطار کرے اور جسے کھجور نہ ملے وہ پانی سے افطار کرے۔ کیونکہ وہ طہور ہے" (پاک اور پاک کرنے والا) (اصحاب السنن، احمد، ابن حبان، حاکم)

(۲) "آپ ﷺ نماز سے پہلے چند رطب (تر کھجور) پر افطار فرماتے وہ نہ ہو تو تمر (خشک کھجور) پر ورنہ چند گھونٹ پانی پیتے"

(احمد، ترمذی، نسائی) کسی روزے دار کو افطار کرانا مسنون ہے، یعنی اسے کھانا کھلائے، اس سے مجبور ہو تو کھجور یا پانی کے گھونٹ سے افطار کرائے۔

حدیث ”جو کسی روزہ دار کو افطار کرائے، اسے اس کی طرح ثواب ملے گا، نیز روزہ دار کے ثواب میں کچھ کمی بھی نہ ہوگی“ (ترمذی وصححہ)(المنتہی)

(۴) روزے کے تعلق سے ان امور کا ترک مسنون ہے۔

(الف) ہر قبیح وفحش امر جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ کو ترک کرے گناہ ہونے کے اعتبار سے تو ان کا ترک واجب ہے لیکن روزہ کے کامل ثواب کے حصول کے پیش نظر اسے روزہ کے سنت میں شمار کیا گیا۔

حدیث: (۱) ”جو جھوٹی بات اور اس پر عمل کو نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے سے رکنے سے کوئی مطلب نہیں“ (بخاری۔اصحاب السنن)

(۲) روزہ ڈھال ہے، لہٰذا کوئی روزہ میں فحش اور گندی بات اور جہالت (کے کام) نہ کرے، اگر کسی نے اس سے گالی گلوچ یا لڑائی کی تو یہ کہدے کہ میرا روزہ ہے۔ (نسائی) پہلے فقرہ کے علاوہ بخاری ومسلم میں بھی ہے۔

(ب) ایسی خواہش اور رغبتیں جو روزہ کو باطل نہ کرے اسے ترک کرنا سنت ہے، جیسے خوشبو سونگھنا، پھولوں کو چھونا اور دیکھنا وغیرہ۔ رات خوشبو استعمال کرے اور دن میں اس کا اثر باقی ہو تو بعض علماء کے نزدیک یہ مکروہ نہیں ہے۔ روزہ دار کے لئے سرمہ نہ لگانا بہتر ہے، کیونکہ اس میں زینت ہے، نیز تاکہ امام مالکؒ کے اختلاف سے بچ جائیں۔ کیونکہ وہ (سرمہ کی وجہ سے) روزہ فاسد ہونے کے قائل ہیں۔ (اعانۃ)

(ج) فصد اور سینگی کا ترک مستحب ہے۔ کیونکہ یہ کمزوری کا باعث ہے۔

(د) کھانا وغیرہ نہ چکھے کہ مکروہ ہے، کہیں حلق میں نہ چلا جائے۔ اگر چھوٹے بچے کو کچھ چبا کر دینا پڑے تو کراہت نہیں۔

(ھ) گوند جیسی چیز نہ چبائے، یہ مکروہ ہے۔

(۵) فرض غسل رات ہی (صبح صادق سے پہلے) کر لینا سنت ہے تاکہ روزہ کے ابتداء سے پاکی رہے۔

(۶) افطار کے بعد یہ دعا پڑھے: (۱) اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ (ابوداؤد باسناد حسن مرسل)

ترجمہ: اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا۔

(۲) ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ“ (ابوداؤد، نسائی، دارقطنی حاکم)

ترجمہ: پیاس ختم ہوئی اور رگیں تر ہوئیں اور انشاء اللہ اجر ثابت ہوا۔

(۷) رمضان میں صدقہ اور تلاوت قرآن کی کثرت رکھے۔ اہل وعیال کے خرچ میں اور دیگر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں مزید توسّع سے کام لے۔ کیونکہ اس ماہ میں نیکیوں کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔ آپ ﷺ کا جود وسخا رمضان میں بالکل عروج پر ہوتا (متفق علیہ) روزہ داروں کو رات کے کھانے وغیرہ کے ذریعہ افطار کرائے، ورنہ جتنا میسر ہو، کم از کم پانی سے ہی کیوں نہ ہو، تاکہ روزہ کھلوانے کا ثواب ملے۔ یہ سارے امور شرعاً ہمیشہ مطلوب ہیں، لیکن رمضان میں تاکید بڑھ جاتی ہے۔ تلاوت قرآن ہر جگہ

(سوائے نجس مقامات کے) مستحب ہے حتی کہ راستہ وغیرہ میں بھی جبکہ اس پر توجہ ہو۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام رمضان میں ہر شب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ایک دوسرے کو قرآن سنایا کرتے۔ (بخاری ومسلم) مصحف شریف میں دیکھ کر، قبلہ رو ہو کر اور جہراً (آواز سے) تلاوت مستحب ہے۔ جبکہ ریاکاری کا اندیشہ نہ ہو اور جہر سے کسی نمازی یا سونے والے کو تکلیف نہ ہو۔ (ورنہ آہستہ تلاوت کرے)

رمضان میں اعتکاف کرنا سنت ہے، اعتکاف اور دیگر مذکورہ عبادات کی تاکید عشرہ اخیرہ میں مزید بڑھ جاتی ہے۔ آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں وصال تک اعتکاف فرماتے رہے، اور آپ ﷺ کے بعد ازواج مطہرات نے بھی اعتکاف فرمایا"۔ (متفق علیہ) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف فرمایا" (متفق علیہ) "ایک سال سفر کی وجہ سے آپ ﷺ اعتکاف نہ کر سکے لہٰذا آئندہ سال دو عشرہ کا اعتکاف فرمایا۔ (مستدرک) آپ ﷺ آخری عشرہ میں دیگر ایام کے مقابلہ میں عبادات میں اور بھی کوشش فرماتے (مسلم)

فصل رمضان کے روزہ کے وجوب کے شرائط۔

(۱) **اسلام۔** کوئی مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام لائے تو ایام ردت کے روزوں کی قضا واجب ہے۔ ابتداء سے ایک کافر شخص اسلام قبول کرلے تو اسے سابقہ روزوں وغیرہ کی قضا کی ضرورت نہیں، بلکہ قضا کرے بھی تو منعقد نہ ہوگی۔

(۲) **مُکلف ھو۔** یعنی عاقل اور بالغ ہو۔ بچہ، پاگل، بے ہوش اور نشہ میں مست آدمی پر (فی الحال) روزہ فرض نہیں ہے، لیکن بے ہوش اور مست آدمی کو بعد میں قضا لازم ہے۔ بچہ اور پاگل کو قضا لازم نہیں ہے۔ لیکن ردت یا نشہ میں جو پاگل پن پایا جائے ان ایام کی قضا لازم ہے۔ بچہ پانچ سات سال کی عمر میں باشعور ہوں اور روزہ رکھنے کی طاقت ہو تو ان کو روزہ کا حکم دینا اور دس سال کی عمر کے بعد اس کے ترک پر ان کو مارنا ولی کے ذمہ واجب ہے، تاکہ ابھی سے روزہ کے عادی بنیں۔

(۳) **روزہ رکھنے کی طاقت ھو۔** صحت مند ہو اور مقیم ہو جو حساً یا شرعاً روزہ نہ رکھ سکے۔ بڑھاپے، وہ مرض جس سے شفاء سے مایوسی ہو، حیض وغیرہ کی وجہ سے یا مسافر یا بیمار ہو تو ان پر (فی الحال) روزہ واجب نہیں ہے۔ جس مرض میں روزہ رکھنے سے ایسا ضرر لاحق ہو جس سے (بجائے وضو کے) تیمم کی اجازت ملتی ہو تو رخصت پر عمل کی نیت سے روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ روزہ رکھنے کے بعد یہ صورت پیش آئے تو توڑ سکتا ہے۔

آیت: وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضاً اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ (البقرہ۔۱۸۵) ترجمہ: اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا (اس پر واجب ہے) اگر روزہ سے ہلاکت کا یا کسی عضو کے منفعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے، اگر مرض کا سلسلہ جاری ہو تو ابتداء سے نیت ہی چھوڑ سکتا ہے، مرض آتا جاتا ہو اور صبح صادق کے وقت ہو تو نیت نہ کرے لیکن صبح صادق کے وقت مرض نہ ہو تو نیت کرلے۔ اگر دن میں مرض آگیا اور تکلیف ہو تو افطار کر سکتا ہے۔

اپنے یا زیر کفالت افراد کے گذر بسر کے لئے ناگزیر اور ضروری مقدار کمانا روزہ کی حالت میں ناممکن ہو (اور رات میں نہیں کما سکتا) تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ (لیکن صرف بقدر مجبوری) اگر کفار مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوں اور مقابلہ کے لئے افطار کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ملے گی بلکہ شدید خطرے میں افطار (روزہ نہ رکھنا یا رکھا ہو تو توڑنا) واجب ہے۔

معمولی بیماری جیسے سر درد، دانت درد اور کان درد وغیرہ میں روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ البتہ روزہ کی وجہ سے کسی بیماری کے شدت اوراضافہ کا خطرہ ہو تو اجازت ملے گی۔ جو بھوک یا پیاس کی شدت سے ایسا مغلوب ہو کہ روزہ کی وجہ سے تیمم کو جائز کرنے والی بیماری کا اندیشہ ہو تو روزہ ترک کر سکتا ہے (بشری الکریم ۲/۷۲)

سفر: ایسا سفر جس میں نماز قصر کرنا جائز ہے اس میں روزہ ترک کر سکتا ہے۔ اگر روزہ رکھنے میں ضرر ہو تو ترک افضل ہے۔ ضرر اور تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔

احادیث: (۱) فتح مکہ کے سفر میں آپ ﷺ رمضان میں روانہ ہوئے اور مقام کُدید تک روزہ رکھتے رہے، پھر آپ ﷺ نے افطار فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی افطار فرمایا (بخاری)

(۲) ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ہم آپ ﷺ کی مصاحبت میں ۱۶/ رمضان کو غزوہ کے لئے روانہ ہوئے تو بعضوں نے روزہ رکھا اور بعضوں نے نہیں رکھا۔ پس نہ روزہ دار نے بے روزہ پر اعتراض کیا اور نہ اس نے روزہ دار پر" (مسلم)

(۳) حضرت حمزہ بن عمرو بکثرت روزہ رکھا کرتے، انہوں نے آپ ﷺ سے دوران سفر روزہ کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا چاہو تو رکھو، ورنہ مت رکھو، (متفق علیہ)

(۴) ایک سفر میں ایک صحابی روزہ کی وجہ سے پریشان اور بدحال ہوئے اور ان کی وجہ سے دیگر صحابہ کرام بھی پریشان ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا "سفر میں روزہ کوئی نیکی نہیں ہے" (متفق علیہ) یعنی جب اللہ کی طرف سے رخصت ہے تو اپنے آپ کو اور دوسروں کو اتنی مصیبت میں ڈالنا مطلوب نہیں ہے۔

جو شخص مستقل سفر ہی میں رہتا ہو (کبھی بھی مقیم نہ ہوتا ہو کہ روزہ قضا کر سکے) تو ایسے مسافر کو روزہ ترک کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ورنہ حقیقتِ وجوب ہی بدل جائیگی۔ حالت اقامت میں روزہ شروع کرنے کے بعد سفر پر نکلے یا مسافر روزہ رکھنے کے بعد مقیم ہو جائے یا مریض روزہ رکھنے کے بعد تندرست ہو جائے تو ان حضرات کو روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

قضا و امساک: مرض، سفر، حیض و نفاس، ردت، نشہ، بے ہوشی اور ترک نیت کی وجہ سے جو روزہ چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ رمضان کی قضا میں تتابع اور تسلسل واجب نہیں، سنت ہے۔

بچہ روزہ رکھے اور دن میں بالغ ہو جائے تو اس روزہ کی تکمیل واجب ہے۔ بعد میں اسے پھر قضا کی ضرورت نہیں۔ دن کے دوران بچہ بالغ ہو جائے اور اس کا روزہ نہ ہو یا پاگل اچھا ہو جائے، یا کافر اسلام لائے، تو ان پر اس دن کی قضاء لازم نہیں، کیونکہ جو وقت اب ان کو مل رہا ہے اس میں روزہ ممکن نہیں ہے، البتہ ان کو قضا کرنا مستحب ہے۔ مذکورہ تینوں افراد کو اور اس مسافر و مریض کو جن کا روزہ نہ تھا اور ان کا سفر و مرض کا عذر ختم ہو چکا، رمضان میں بقیہ دن امساک سنت ہے۔ (امساک یعنی روزہ دار کی طرح کھانا پینا وغیرہ ترک کرنا)۔ دن میں عورت کا حیض و نفاس ختم ہو جائے تو اسے بھی امساک سنت ہے۔

جس نے روزہ نہ رکھنے میں خطاء اور غلطی کی ہو اسے امساک لازم ہے۔ مثلاً بغیر عذر کے روزہ نہ رکھنا، یا توڑنا، نیت بھول جانا، ابھی رات باقی سمجھ کر کھالیا پھر معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو چکی تھی، یوم الشک میں روزہ نہ رکھا پھر پتہ چلا کہ آج رمضان ہے، یہ حکم وقت کی حرمت کی وجہ سے ہے۔ اور نیت کو بھول جانا عبادت کے معاملہ میں بے توجہی پر دلالت کر رہی ہے۔ جو اس کی کسی حد تک تقصیر ہے، اور یوم الشک کا روزہ در حقیقت اس پر واجب تھا، البتہ لاعلمی کی وجہ سے رکھنا منع تھا اور نہ رکھا، اسی لئے عید کے بعد فوراً اس کی قضاء واجب

ہے۔ رمضان کے علاوہ نذر اور قضاء روزہ میں امساک مشروع نہیں ہے۔ امساک کرنے والا درحقیقت شرعی روزہ میں نہیں ہے اگرچہ اس پر اسے ثواب ملے گا، لہٰذا واجب امساک کی خلاف ورزی کی (کھایا، پیا یا جماع کیا) تو گناہ کے علاوہ کچھ اور لازم نہ ہو گا۔

مانع حیض گولی: اگر عورت رمضان کے مبارک ماہ میں روزہ اور دیگر عبادات کی فضیلت کی تحصیل کی نیت سے مانع حیض دوائی استعمال کرے۔ (اور اس میں طبی نقطۂ نظر سے اسے کوئی خاص خطرہ و نقصان نہ ہو) تو اس میں حرج نہیں، اگر محض یہ نیت ہو کہ روزہ کا قرض ذمہ میں باقی نہ رہے، تو یہ مناسب نہیں، گرچہ روزہ تو ادا ہو جائے گا۔ (من فتاویٰ الصیام للشیخ ابن جبرین)

صومِ وصال (وصال کا روزہ)

حدیث: ”آپ ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا“ (متفق علیہ من حدیث ابن عمر و ابی ہریرۃ و عائشہ و انس) دو روزوں کے درمیان افطار واجب ہے، فرض روزہ ہو یا سنت کیونکہ وصال حرام ہے۔ صوم وصال کا مطلب ہے دو یا زائد دن مسلسل روزہ رکھنا اور رات میں بلا عذر عمداً کچھ کھانا پینا اور جماع وغیرہ نہ کرنا۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی کہ آپ کو صوم وصال کی اجازت تھی۔

فصل - روزہ کا فدیہ

کسی کا رمضان، نذر یا کفارہ کا واجب روزہ عذر کی وجہ سے فوت ہو اور اس کی قضا کے امکان اور قدرت سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو جائے، تو اس کے تدارک اور تلافی کی ضرورت نہیں اور نہ وہ گنہگار ہو گا۔ مثلاً کوئی بیمار ہو جائے اور روزہ فوت ہو اور موت تک بیمار ہی رہے یا سفر میں فوت ہو اور موت تک سفر جاری رہا، یا حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ فوت ہو اور اسی حال میں انتقال ہو، اگر بلا عذر فوت ہو تو گناہ بھی ہو گا اور تدارک بھی لازم ہے جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

اگر بلا عذر یا عذر کی وجہ سے روزہ فوت ہو اور قضا کے امکان کے بعد انتقال ہو، تو اس کے ترکہ میں سے ہر دن کے روزہ کے بدلے ایک ایک مُد فطرہ کی جنس سے (یعنی گیہوں وغیرہ جس کی تفصیل صدقہ فطر میں گذری) فدیہ ادا کرے، یا اس کا کوئی رشتہ دار اس کی جانب سے روزہ رکھے یا کوئی اجنبی رشتہ دار کی اجازت یا میت کی وصیت سے روزہ رکھے۔ (امکان کے بعد انتقال ہو تو دونوں صورتوں میں گناہ ہو گا۔ اس لئے موقع ملتے ہی فوراً قضا کرنا بہتر ہے)

حدیث (۱) کسی کا انتقال ہو اور ذمہ میں روزہ ہو تو اس کی جانب سے ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو طعام دیا جائے (الترمذی وصحح وقفہ علی ابن عمر)

(۲) کسی کا انتقال ہو اور اس کے ذمہ روزہ باقی ہو، تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے“ (متفق علیہ)۔

(۳) ایک عورت کی والدہ کا انتقال ہوا۔ اور اس کے ذمہ نذر کے روزے تھے تو اس کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا ”اپنی امی کی جانب سے تم روزہ رکھو“ (مسلم)

کسی مرنے والے کے ذمہ نماز یا اعتکاف باقی ہو تو یہ عبادات نہ اس کی جانب سے انجام دے اور نہ ہی فدیہ دے، کیونکہ یہ ثابت نہیں۔ ایک قول میں یہ دونوں بھی انجام دے یا ہر نماز کے بدلہ ایک مد اناج دے۔ امام سبکیؒ نے اپنے بعض اقارب کی جانب سے نماز ادا کی۔ اگر کوئی روزہ کے ساتھ اعتکاف کی نذر مانے تو ولی اس کی جانب سے اس نذر کو پورا کرے اسی طرح حج بدل میں طواف کی دو رکعت بھی اس کی جانب سے ادا کرے۔

جو شخص ایسے عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑے جس کے ختم ہونے کی کوئی توقع وامید نہ ہو جیسے بوڑھاپا یا ایسا مرض جس سے شفایابی کی امید نہ ہو تو ہر روزہ کے بدلہ ایک مد اناج دے۔ آئندہ روزہ قضا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آیت **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ**۔ (البقرہ آیت ۱۸۴) **ترجمہ:** جو شخص تم میں سے (ایسا) ہو جو بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دے) تو اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں) زیادہ بہتر ہے اگر روزے کی فضیلت سے) خبر رکھتے ہو"۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں: یعنی جو نوجوانی میں روزہ پر قادر تھے اور اب بڑھاپے میں عاجز ہیں، ان کے ذمہ ایک فقیر کا کھانا فدیہ ہے۔ (تفسیر بغوی)

اگر مشقت اٹھا کر روزہ رکھے تو یہ کافی ہے۔ فدیہ ادا کرنے سے قبل (اتفاقاً اور خلافِ توقع) عذر زائل ہو جائے تب بھی فدیہ ادا کر سکتا ہے۔ روزہ رکھنا واجب نہیں۔ دن سے قبل رات ہی میں اس دن کا فدیہ ادا کر سکتا ہے۔ رات سے بھی قبل آئندہ کا فدیہ ادا کرنا جائز نہیں۔

درج ذیل افراد کو روزہ کی قضا اور فدیہ (ایک مد) دونوں لازم ہیں۔ (۱) کسی آدمی یا حیوانِ محترم کی زندگی بچانے یا کسی عضو کو یا منفعت کو تلف ہونے سے بچانے کے لئے روزہ توڑنا پڑے۔ مثلاً کوئی ڈوب رہا تھا اور اس کے بچانے میں پانی اندر چلا گیا اور روزہ ٹوٹ گیا۔

(۲) حاملہ عورت صرف اپنے حمل (جَنین) کو نقصان اور خطرہ کی وجہ سے روزہ نہ رکھے۔

(۳) مُرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) شیر خوار بچہ کو نقصان وخطرہ ہونے کی وجہ سے روزہ نہ رکھے۔

جنین اور بچہ کو روزہ سے نقصان ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔ مرضعہ کا بچہ اپنا ہو یا دوسرے کا یہی حکم ہے۔ مذکورہ تینوں صورتوں میں افطار سے دو اشخاص کو فائدہ پہنچا اس لئے فدیہ سمیت قضاء لازم ہوا۔ آخری دو صورتوں کے لئے آیت سابقہ سے بھی استدلال کیا گیا۔ کیونکہ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ ان دونوں کے حق میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ (رواہ البیہقی)

حاملہ اور مرضعہ کو صرف اپنے جان کا خطرہ ہو یا اپنی اور بچوں کی تکلیف کا مسئلہ ہو یا کوئی بلا عذر روزہ نہ رکھے یا کسی مال کو بربادی سے بچانے کے لئے روزہ توڑنا پڑے یا اوپر کی مثالوں میں متحیرہ عورت (مستحاضہ کی ایک قسم) روزہ نہ رکھے، تو ان تمام صورتوں میں صرف قضا کافی ہے، فدیہ کی ضرورت نہیں۔

جس شخص کو رمضان کے روزوں کے قضا کا موقع ملے (یعنی بلا عذر روزہ رکھنے کے ایام میسر ہوں) اور وہ نہ رکھے، یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا، تو اسے قضا کے ساتھ ہر روزہ کے بدلہ ایک مد فدیہ دینا واجب ہے۔ کیونکہ ۶/ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی فتویٰ دیا ہے اور ان کے مخالف کسی اور صحابی سے مروی نہیں۔ جتنے سال تاخیر ہوگی اتنے ہی فدیے واجب ہونگے، جبکہ ہر سال رکھنے کی گنجائش کے باوجود موخر کرے۔ کیونکہ مالی حقوق میں تداخل نہیں ہوتا (مثلاً کسی نے باوجود گنجائش کے ۵/ روزے ۳ سال مؤخر کئے تو ۵/ روزوں کی قضا کے ساتھ ہر روزہ کے بدلہ تین تین مد اناج لازم ہے۔) بھول کی وجہ سے یا تاخیر کی حرمت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے قضا میں تاخیر ہوئی تو فدیہ کی مقدار میں اضافہ نہ ہوگا۔ مذکورہ صورت میں ایک سال تاخیر کے بعد روزہ کی قضا سے قبل انتقال کر جائے تو اس کے ترکہ سے ہر روزہ

کے بدلہ دو مد نکالے، ایک روزہ کا اور ایک تاخیر کا۔ اور ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے، تو صرف ایک مد تاخیر کا نکالے۔ مذکورہ فدیہ کا مصرف فقیر و مسکین ہیں۔ کیونکہ مسکین کا ذکر آیت و حدیث میں ہے۔ اور فقیر اس سے بھی زیادہ تنگدستی میں ہوتا ہے۔ سارے مد ایک ہی فقیر یا مسکین کو بھی دے سکتا ہے، کیونکہ ہر دن مستقل عبادت ہے لہٰذا سارے مد مختلف کفّاروں کی طرح ہیں۔ ایک ہی مد دو میں تقسیم نہ کرے۔ (بلکہ ایک مد مکمل ایک شخص کو دے)

رمضان کے روزہ میں جماع

کسی نے رمضان کا روزہ ماہ رمضان میں ایسے وطی (جماع) سے فاسد کیا جس میں روزہ کے تعلق سے وہ گنہگار ہو اور کوئی شبہ نہ ہو تو قضا کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہے۔ مذکورہ شرائط کی روشنی میں درج ذیل لوگوں پر کفارہ واجب نہیں ہے۔

(۱) جس سے وطی کی جائے۔ کیونکہ حدیث میں کفارہ کا مُخاطب فاعل (جماع کرنے والا) ہے۔

(۲) بھول کر، اکراہ (زبردستی) کی وجہ سے، یا لاعلمی کی وجہ سے وطی کرنے والا، کیونکہ ان کا روزہ فاسد نہ ہوا۔

(۳) جس پر امساک واجب ہو کیونکہ اس کا روزہ نہیں ہے کہ وطی سے فاسد ہو۔

(۴) جو بلا عذر وطی کرے، پھر دن ہی میں پاگل ہو جائے یا مر جائے کیونکہ اس سے یہ واضح ہوا کہ اس کا ایک مکمل دن کا روزہ فاسد نہیں ہوا۔

(۵) روزہ کے علاوہ نماز وغیرہ کا وطی سے فاسد کرنے والا۔

(۶) دوسرے کا روزہ فاسد کرنے والا جیسے مسافر اپنی بیوی سے وطی کر کے اس کا روزہ فاسد کرے۔

(۷) ماہ رمضان کے علاوہ کوئی روزہ مثلاً قضا یا نذر کا روزہ فاسد کرے، کیونکہ حدیث رمضان کے ماہ میں روزے کے متعلق ہے اور رمضان کے بعض خصوصی فضائل ہیں جس میں کسی اور کی شرکت نہیں۔

(۸) وطی (جماع) کے علاوہ کھانے پینے یا استمناء وغیرہ کے ذریعے فاسد کرے، کیونکہ حدیث وطی کے متعلق ہے، اور دیگر اسبابِ فساد وطی کی طرح نہیں۔

(۹) رات سمجھ کر وطی (جماع) کرے یا رات کا شک ہو اور وطی کرے اور معلوم ہوا کہ دن کا وقت تھا۔

(۱۰) بھول کر کچھ کھا گیا اور سمجھا کہ روزہ ٹوٹ گیا، پھر وطی کیا۔

(۱۱) بچہ (نابالغ) وطی کرے، کیونکہ بچہ غیر مکلف ہونے کی وجہ سے اسے گناہ نہ ہوگا، اور بقیہ صورتوں میں شبہ کی وجہ سے کفارہ ساقط ہوگا۔ اور بغیر تحری کے رات شروع سمجھ کر یا شک کے ساتھ وطی کے علاوہ صورتوں میں گناہ بھی نہ ہوگا۔

(۱۲) مسافر زنا کرے بہ نیت ترخص یا جماع کرے بغیر نیت رخصت کے، کیونکہ اس صورت میں محض روزہ کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوا۔ بلکہ یا تو زنا کی وجہ سے یا نیت ترخیص نہ ہونے کی وجہ سے گناہ ہوگا۔ بہ نیت ترخص جائز جماع کرے تو کفارہ کا کوئی سوال نہیں۔

جتنے روزے جماع کے ذریعہ مذکورہ شرائط کے ساتھ فاسد کرے اتنے کفارے واجب ہوں گے۔ اگر دو دن جماع کیا تو دو کفارے واجب ہیں، پہلا کفارہ دوسرے جماع سے قبل ادا کر چکا ہو یا نہیں، کیونکہ ہر دن کا روزہ مستقل عبادت ہے، لہٰذا کفارہ میں تداخل نہ ہوگا۔ ایک ہی دن میں دو مرتبہ جماع کرے تو ایک ہی کفارہ واجب ہے، کیونکہ دوسرے جماع سے روزہ فاسد نہیں ہوا۔ جماع کرنے

کے بعد سفر، مرض یا ردت پائی جائے تو اس سے کفارہ ساقط نہ ہو گا۔ کیونکہ اس نے تکلیف کی اہلیت کے باوجود روزہ کے حرمت کو پامال کیا ہے۔ البتہ مسافر ایسی جگہ پہنچے جہاں لوگ عید منا رہے ہوں اور اس کا مطلع اس کی بستی کے مطلع سے جدا ہو تو کفارہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ان میں شمار ہو گا۔ جو شخص فجر سے قبل جماع کرے اور طلوع فجر کا علم ہونے کے بعد بھی اسی حالت پر ہو تو اس پر بھی کفارہ لازم ہے۔

کفارہ

حدیث: ایک شخص آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا میں ہلاک ہو گیا دریافت فرمایا کیا بات پیش آئی؟ جواب دیا۔ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا" پوچھا کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ کہا "جی نہیں" دریافت کیا۔ تو کیا دو ماہ مسلسل روزہ رکھ سکتے ہو" جواب دیا نہیں" پوچھا' کیا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گئے۔ بعد میں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں ایک ٹوکرا کھجوروں کا آ گیا تو اس سے فرمایا "اسے صدقہ کرو" تو کہا "یا رسول اللہ! کیا ہم سے بڑھ کر فقیر و نادار پر اللہ کی قسم مدینہ منورہ کے دونوں سیاہ چٹانی سلسلوں کے درمیان (یعنی مدینہ منورہ کی بستی میں) کوئی گھرانہ ہم سے زیادہ محتاج نہیں ہے" تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہنسے یہاں تک کہ دندانِ مبارک نظر آئے۔ پھر فرمایا۔ جاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ" (صحیحین) بخاری کی ایک روایت میں امر کا صیغہ وارد ہے۔ یعنی "ایک غلام آزاد کرو (ورنہ) پھر دو ماہ روزہ رکھو (ورنہ) پھر ۶۰؍ مساکین کو اناج دو" ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے "کھجوروں کی ٹوکری آئی جس میں ۱۵؍ صاع کی مقدار تھی"

جماع کا یہ کفارہ مرتب ہے، پہلے ایک مومن غلام آزاد کرے، اگر غلام میسر نہ ہو تو دو ماہ مسلسل روزہ رکھے، اگر چاند کی ایک تاریخ سے روزہ شروع کرے تو چاند کے اعتبار سے دو ماہ رکھنا کافی ہے (چاہے ۲۹؍ کا مہینہ ہو یا ۳۰؍ کا) لیکن درمیان سے شروع کرے اور پہلا مہینہ ۲۹؍ کا ہو تو تیسرے ماہ سے اتنے ہی روزے رکھے کہ پہلا اور تیسرا مل کر ۳۰؍ ہو دوسرے مہینہ میں چاند کا اعتبار ہو گا، اگر درمیان میں ایک روزہ بھی چھوٹ جائے گرچہ عذر سے ہو تو از سر نو دو ماہ روزہ رکھے۔ البتہ حیض، نفاس، جنون یا مکمل دن بیہوشی کی وجہ سے چھوٹ جائے تو حرج نہیں۔ ان روزوں میں رات ہی سے نیت کرنا اور کفارہ کی نیت کرنا واجب ہے۔ کفارہ کی تعیین ضروری نہیں ہے۔ بوڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے اس طرح مسلسل روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو ۶۰؍ ایسے فقراء یا مساکین کو اناج دے، جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں، ایک ایک کو ایک مد ایسا اناج دے جو فطرہ میں دیا جاتا ہے۔ (بشری الکریم ۲؍۷۷)

سنت روزے (نفل روزے)

حدیث: "جو ایک دن اللہ کے راستہ میں روزہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ جہنم سے ۷۰ سال دور کر دیں گے" (صحیحین)

(۱) عرفہ کے دن (۹ ذوالحجہ کو) روزہ سنت ہے۔ البتہ مسافر کے لئے اس دن روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ اگر حاجی اس دن مکہ مکرمہ یا کہیں اور مقیم ہو اور (عید کی) رات میں میدان عرفات پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے یہ روزہ سنت ہے۔ جو حاجی دن میں میدان عرفات پہنچے (جیسے عموماً ہوتا ہے اور افضل بھی یہی ہے) اسے عرفہ کا روزہ سنت نہیں ہے۔ بلکہ نہ رکھنا سنت ہے چاہے قوی ہو۔ تاکہ دعا وغیرہ عبادات کے لئے قوت حاصل ہو۔ اگر روزے سے ان اعمال میں کمزوری نہ آئے تب بھی نہ رکھے۔ اگر رکھے تو خلاف اولیٰ ہے۔

حدیث: (۱) آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے، عرفہ کے روزہ کے متعلق اللہ سے امید ہے کہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ (کے گناہوں) کا کفارہ ہو جائیگا، اور عاشورہ کے روزہ میں اللہ سے توقع ہے کہ گذشتہ ایک سال کا کفارہ ہو جائیگا (مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے میدان عرفات میں عرفہ کا روزہ نہیں رکھا۔ (متفق علیہ)

(۳) آپ ﷺ نے میدان عرفات میں عرفہ کے روزہ سے منع فرمایا۔ (احمد، ابوداؤد۔نسائی، ابن ماجہ)

عرفہ کے ساتھ آٹھ تاریخ کا بھی روزہ رکھنا احوط ہے، بلکہ روضہ میں فرمایا کہ ایک سے ۸ر تک رکھنا سنت ہے اور اس میں حاجی وغیر حاجی دونوں برابر ہیں۔

(۲) عاشوراء و تاسوعاء: محرم کی دس اور ۹ر تاریخ کو روزہ سنت ہے اوپر مسلم کی روایت میں عاشورہ کی فضیلت گذر چکی صرف عاشورہ کا روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے (نہایۃ عن الام)

حدیث: (۱) عاشورہ کا روزہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے (ابن حبان)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو بالضرور ۹ر محرم کو روزہ رکھونگا" (مسلم)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے "اگر میں آئندہ سال تک رہا تو بالضرور عاشوراء سے ایک دن قبل یا ایک دن بعد روزہ کا حکم دوں گا۔ (بیہقی) ۹ر محرم کا روزہ بطور احتیاط اور یہود کی مخالفت کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے ۹ر کو نہ رکھا تو ۱۱ر محرم کو رکھے۔ بلکہ "الام" وغیرہ میں ہے کہ ۹ر ۱۰ر اور ۱۱ر تین روزے مستحب ہیں۔ امام غزالیؒ نے ۱ر محرم سے لیکر ۸ر تک کے روزوں کو سنت قرار دیا ہے۔ (نہایۃ المحتاج)

عاشورہ کی بدعات

عاشورہ کے دن کی مشہور و شائع نماز، انفاق (خرچ کرنا) خضاب، تیل لگانا سرمہ لگانا اور مخصوص پکوان وغیرہ موضوع و افتراء ہے اس دن سرمہ کا اہتمام بدعت ہے جسے قاتلین حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے گھڑا۔ عاشورا کے دن اپنے اہل و عیال پر خرچ میں توسیع کرنا سنت ہے۔ تاکہ سال بھر اللہ اسے کشادگی عطا فرمائے جیسا کہ حدیث حسن میں ہے بہت سے محدثین نے اسے آزمایا تو مجرب پایا (کردی علی بافضل) امام منادی فرماتے ہیں کہ اہل و عیال پر توسیع کی حدیث اگرچہ ضعیف ہے، لیکن مختلف سندوں سے وارد ہے اسلئے مجموعی طور پر قوت حاصل ہوتی ہے بعض سند کو زین عراقی اور ابن ناصر الدین نے صحیح قرار دیا۔ (حاشیۃ الشیروانی علی تحفۃ المحتاج۔ ترشیح المستفیدین ص ۱۷۰)

(۳) پیر اور جمعرات کا روزہ

حدیث: آپ ﷺ بالقصد پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے اور فرماتے "اعمال پیر اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) پیش ہوتے ہیں تو مجھے یہ محبوب ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں" (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد، نسائی، احمد)

(۴) ایام بیض کے روزے:

یعنی چاند کی ۱۳ر ۱۴ر اور ۱۵ تاریخ کے روزے۔

حدیث: آپ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ایام بیض یعنی ۱۳ر ۱۴ر ۱۵ تاریخ کے روزوں کی وصیت فرمائی۔ (نسائی، ترمذی، ابن حبان) احتیاطاً ۱۲ر تاریخ کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔ ذوالحجہ کے مہینہ میں ۱۳ر کے بجائے ۱۶ر کو روزہ رکھے۔ کیونکہ ۱۳ر کو یوم تشریق کی وجہ سے روزہ حرام ہے۔ ان تاریخوں میں چونکہ ساری رات چاندنی ہوتی ہے، اس لئے انہیں ایام بیض (روشن ایام یعنی روشن

راتیں) کہا گیا۔

(۵)ایام سود:

یعنی ۲۸/۲۹/ اور ۳۰ کا روزہ سنت ہے۔ یہ راتیں چاند کے غائب ہونے کی وجہ سے مکمل تاریک ہوتی ہیں، اس لئے ایام سود (تاریک) کہا گیا۔ ان کے ساتھ ۲۷/ تاریخ کو بھی روزہ رکھنا بہتر ہے۔ اگر ۲۸/ سے شروع کرے اور مہینہ ۲۹/ کا ہو تو آئندہ ماہ کی ایک تاریخ کو رکھ کر تین کی تعداد پوری کرے۔

(٦)شوال میں چھ ٦/ روزے سنت ھیں۔

حدیث: جو رمضان کا روزہ رکھے اور اس کے بعد شوال میں ٦/ روزے رکھے تو یہ ہمیشہ (سال بھر) روزہ رکھنے کی طرح ہے"۔ (مسلم)۔ نسائی کی روایت میں ہے۔ ماہ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور ٦/ روزے (شوال کے) دو ماہ کے برابر ہیں۔ اور اس طرح سال بھر کے روزے ہوئے۔ یعنی سال بھر فرض روزے کا ثواب ملیگا۔ ورنہ مذکورہ روزے کی کوئی خصوصیت نہیں، کیونکہ ایک نیکی کا (کم از کم) دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ (لہٰذا کسی وقت بھی ٦/ روزے کا ثواب دو ماہ سنت روزے کے برابر ہوگا) ان روزوں کو عید کے بعد متصل اور مسلسل رکھنا افضل ہے، عبادت کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے (شوال میں کسی بھی وقت اور متفرق رکھنے سے بھی اصل سنت حاصل ہوگی)

اگر کسی عذر سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکا تب بھی یہ روزے سنت ہیں۔ جو بلا عذر رمضان کے روزے نہ رکھے اسے یہ روزے حرام ہیں۔ (کیونکہ اسے فوراً رمضان کی قضاء واجب ہے) اگر شوال میں یا عاشوراء وغیرہ کے روز قضا یا نذر کا روزہ رکھے تو ان ایام کے سنت روزہ کا ثواب بھی ملے گا۔ جیسا کہ رملی، بارزی، اسنوی، ناشری، اور فقیہ علی بن صالح الحضرمی وغیرہ علماء کرام کا فتوی ہے۔ البتہ مطلوبہ کامل ثواب حاصل نہ ہوگا۔ شوال کا یا کوئی اور سنت روزہ فوت ہو جائے تو آئندہ اس کی قضاء مستحب ہے۔

(۷)صوم دَھر (ھمیشہ روزہ رکھنا)

اگر کسی ضرر و نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور کوئی حق فوت نہ ہو تو عیدین اور ایام تشریق کے علاوہ ہمیشہ روزہ رکھنا سنت ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو ہمیشہ روزہ رکھے اس پر جہنم یوں تنگ ہو جائے گی اور ۹۰ کا اشارہ کیا۔ (یعنی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے کے نیچے لگا کر مختصر دائرہ کی شکل میں اشارہ کیا)" (بیہقی) یعنی اتنی تنگ ہوگی کہ داخل نہ ہو پائے گا۔ یا اندر اس کے لئے جگہ نہ ہوگی۔ (گویا جہنم سے محفوظ رہیگا)

اگر صوم دہر سے ضرر کا اندیشہ ہو یا حق فوت ہو تو یہ مکروہ ہے۔ اور اسی صورت پر مسلم کی اس روایت کو محمول کریں گے۔ "اس کا روزہ نہیں جو ہمیشہ روزہ رکھے" امام سبکیؒ نے فرمایا کہ اگر صوم دھر سے کوئی واجب حق فوت ہو تو یہ حرام ہے۔ اور روزہ سے بڑھ کر سنت حق فوت ہو تو مکروہ ہے، اور روزے کے برابر درجہ کا ہو تو کراہت نہیں۔

(۸)صوم داؤدی: یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا (یعنی مسلسل ایک دن آڑ روزہ رکھنا)

حدیث: افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ (روزہ نہ رکھتے)۔ اس سے افضل صورت نہیں۔ (صحیحین)۔

امام متولی، سبکی اور اذرعی وغیرہ نے فرمایا کہ صوم دہر کے استحباب کے باوجود صوم داؤدی زیادہ افضل ہے، کیونکہ حدیث میں اس کی

صراحت آئی ہے، اور یہ طریقہ نفس پر زیادہ شاق بھی ہو گا۔ کیونکہ روز عادت بدلتی رہے گی۔ صوم دہر میں مستقل سحری اور رات کھانے کی عادت بن جائیگی تو اتنا احساس نہیں ہو گا۔ امام ابن عبد السلام اور امام غزالی نے صوم دہر کو اس سے افضل قرار دیا ہے۔(نہایۃ المحتاج۔ حاشیۃ الجمل)

(۹) ہر ماہ تین روزے سنت ھیں۔

تاکہ دس گنا کے اعتبار سے مکمل ماہ روزے کا ثواب ملے۔ چاہے یہ روزے ایام بیض میں رکھے یا کسی اور ایام میں۔ ایام بیض میں رکھے تو دونوں سنت پر عمل ہو جائے گا۔(نہایۃ المحتاج)

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میرے خلیل (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے ہر ماہ تین روزہ کی وصیت فرمائی ہے (متفق علیہ)

(۱۰) اشھُر حُرُم (حرمت والے مھینے) وشعبان:

رمضان کے بعد حرام مہینے (یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب) کے روزے افضل ہیں۔ رمضان کے بعد سب سے افضل محرم کے روزے ہیں، پھر بقیہ تین حرام مہینے، پھر شعبان کے روزے، پھر بقیہ مہینے برابر درجہ میں ہیں۔(بشری الکریم ۸۲/۲)

حدیث: (۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان سے زیادہ کسی ماہ میں (سنت) روزہ رکھتے نہیں دیکھا" (مالک، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

(۲) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے "میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان اور رمضان کے علاوہ مسلسل دو ماہ روزہ رکھتے نہیں دیکھا" (اصحاب السنن)

(۳) رمضان کے بعد افضل روزہ اللہ کے ماہِ محرم کا روزہ ہے، اور فرض نماز کے بعد افضل نماز صلوۃ اللیل (تہجد) ہے۔(مسلم)

(۱۱) ابتدائی تین روزے۔

ہر ماہ کے ابتدائی تین دن روزہ رکھنا سنت ہے (تحفۃ المحتاج ۴/۶۳۶)

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ کے ابتدائی تین دن روزہ رکھتے اور جمعہ کے دن بہت کم افطار کرتے (افطار یعنی روزہ نہ رکھنا) (ترمذی۔ نسائی) (مطلب جمعہ کے آگے یا پیچھے ایک دن ملا کر)

مکروہ روزے

حدیث: (۱) تم میں سے کوئی جمعہ کا روزہ نہ رکھے، الّا یہ کہ اس سے قبل ایک دن یا بعد ایک دن روزہ رکھے" (متفق علیہ)

(۲) سنیچر کے دن صرف فرض روزہ رکھا کرو" (احمد، اصحاب السنن، ابن حبان، حاکم)

صرف جمعہ یا سنیچر یا اتوار کو بلا سبب نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ یہود سنیچر کی اور نصاریٰ اتوار کی تعظیم کے قائل ہیں۔ اگر تینوں دن یا دو دن کو جمع کرے تو مکروہ نہیں، کیونکہ مجموعی طور پر کوئی تعظیم کا قائل نہیں۔ نذر، قضا یا کفارہ کا روزہ ان ایام میں مکروہ نہیں۔ اسی طرح کسی سبب سے رکھے، مثلاً کوئی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار (صوم داؤدی) کا عادی ہو اور روزہ کا دن ان ایام میں آئے تو کراہت نہیں، جیسا کہ یوم الشک کا روزہ۔ اور مسلم کی روایت میں ہے "جمعہ کو دیگر ایام میں سے روزہ کے لئے مخصوص نہ کرو، الّا یہ کہ تم میں سے کسی کے (عادت کے

)روزہ کے دن آجائے"جمعہ پر دیگر روزوں کو بھی قیاس کیا گیا۔ عرفہ یا عاشورہ جیسے روزے ان ایام میں آئیں، تو رکھنے میں کوئی کراہت نہیں۔

نفل عبادت کو توڑنا

حج اور عمرہ کے علاوہ دیگر نفلی عبادت کو بلا عذر توڑنا جائز ہے، لیکن مکروہ ہے۔

آیت: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ(سورہ محمد: ص ۳۳)

ترجمہ: اور اپنے اعمال کو برباد مت کرو۔

احادیث: (۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ہم نے کہا" ہمارے یہاں حَیس (کھجور، گھی اور پنیر سے بنی ہوئی مٹھائی) ہدیہ میں آیا ہے" تو فرمایا" مجھے بتاؤ۔ میں نے آج روزہ رکھا تھا" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نوش فرمایا۔ (مسلم)

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے " نفلی روزہ دار اپنے نفس کا امیر ہے۔ (اسے اختیار ہے) چاہے تو روزہ رکھے (پورا کرے) اور چاہے تو توڑ دے، (احمد ترمذی، حاکم، وقال صحیح الاسناد) صحابہ کرام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی سنت کو توڑنے کا جواز مروی ہے۔ (الحاوی للماوردی ۴۶۸/۳) روزہ پر دیگر عبادتوں کو بھی قیاس کیا گیا۔ اگر کچھ عذر ہو، مثلاً میزبان کا روزہ کی وجہ سے مہمان کے ساتھ کھانے میں عدم شرکت اسے گراں گذرے، یا اس کے برعکس مہمان کا روزہ میزبان کے لئے باعث دل شکنی ہو تو نفلی روزہ توڑنا مکروہ نہیں ہے۔ بلا عذر توڑنے پر سابق پر کچھ ثواب نہ ملے گا، البتہ عذر کی وجہ سے ہو تو ثواب ملے گا۔ حج و عمرہ کے اپنے مخصوص احکامات ہیں، لہٰذا یہ نفل بھی ہوں تو مکمل کرنا لازم ہے۔ اور توڑنا حرام ہے۔

روزے وغیرہ نفلی عبادات کو توڑنے کی صورت میں بعد میں ان کی قضاء واجب نہیں ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو نفل روزہ بلا قضا توڑنے کی اجازت دی تھی (ابوداود) روزہ پر دیگر عبادات کو بھی قیاس کریں گے۔ لیکن بعد میں قضاء کر لینا مستحب ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے نفل روزہ توڑ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قضاء کا حکم دیا۔ (مؤطا، عبد الرزاق، احمد، ترمذی، بیہقی، الحاوی مع التعلیق ۴۶۹/۳)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ہانی نے روزہ توڑا تو فرمایا" چاہو تو قضاء رکھ لو ورنہ مت رکھو۔ (الحاوی ۴۶۹/۳)

فرض کو توڑنا

کسی بھی فرض عین عبادت کو شروع کرنے کے بعد توڑنا اور قطع کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، گرچہ وہ فوری نہ ہو۔ جہاد، نماز جنازہ، حج اور عمرہ کے علاوہ دیگر فرض کفایہ کو توڑنا حرام نہیں۔

عورت کا نفلی روزہ

حدیث: کسی عورت کے لئے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ حلال نہیں ہے (صحیحین)

عورت شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے، شوہر کی رضامندی کا علم بھی کافی ہے۔ عاشوراء جیسے موکد نفلی روزے اجازت کے بغیر حرام نہیں۔ شوہر کی غیر موجودگی میں روزہ رکھنا قطعاً جائز ہے۔ نفل نماز کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں،

کیونکہ اس کا وقت بمقابلہ روزہ مختصر ہوتا ہے۔

کتاب الاعتکاف (اعتکاف کا بیان)

آیت: ''وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ''(البقرہ۔۱۸۷)

ترجمہ: اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) (من بیان القرآن)

حدیث: ''آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں وصال تک اعتکاف فرمایا کرتے''(متفق علیہ)

عربی زبان میں اعتکاف کا مطلب ہے ٹھہرنا، روکے رکھنا، ہمیشہ لازم رہنا۔ شرعاً مخصوص شخص کا نیت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف کہلاتا ہے۔ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے۔ اعتکاف ہر وقت سنت ہے چاہے بغیر روزے کے یا صرف رات میں اعتکاف کرے، کیونکہ کسی وقت کی قید اور تعیین مروی نہیں۔ رمضان کے آخری عشرہ میں دیگر ایام کے مقابلہ میں زیادہ افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی پابندی فرمائی ہے۔ (شیخین) اور اس کی اصل حکمت لیلۃ القدر کی تلاش اور اس کے حصول کی کوشش ہے۔ جو قرآن کی رو سے ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ یعنی اس ایک رات کی عبادت ایسے ہزار ماہ کی عبادت سے بہتر ہے، جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔

حدیث: (۱) جو لیلۃ القدر میں ایمان اور ثواب کی نیت سے قیام کرے (اللہ کی عبادت کرتا رہے) اس کے سابقہ گناہ معاف ہوں گے۔ (متفق علیہ) (مراد اس سے حقوق اللہ سے متعلق صغیرہ گناہ ہیں۔

(۲) شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو (متفق علیہ)

امام شافعیؒ کے نزدیک آخری عشرہ کے ہر شب میں لیلۃ القدر کا امکان ہے، لیکن زیادہ احتمال طاق راتوں میں اور اس میں بھی ۲۱، یا ۲۳ کی رات میں ہے۔ ۲۱ویں شب پر شیخین کی روایت اور ۲۳ویں شب پر مسلم کی روایت دلالت کرتی ہے۔ امام مزنی اور ابن خزیمہ وغیرہ نے فرمایا کہ شب قدر منتقل ہوتے رہتی ہے۔ (ہر سال ایک ہی متعین رات نہیں ہوتی) امام نوویؒ نے روضہ، مجموع اور فتاویٰ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ جمع بین الاحادیث میں امام شافعیؒ کے کلام کا بھی یہی تقاضا ہے۔ شب قدر کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی صبح جب سورج طلوع ہوگا، تو بالکل سفید ہوگا، اس میں زیادہ شعاع نہ ہوگی۔ شب قدر اس امت کی خصوصیت ہے۔ یہ سال کی سب سے افضل رات اور تا قیامت باقی ہے۔ یہ درحقیقت نظر آتی ہے، جسے نظر آئے اسے یہ چھپانا سنت ہے، کیونکہ یہ نظر آنا ایک کرامت ہے اور کرامت کا پوشیدہ رکھنا سنت ہے۔ شب قدر میں ساری رات نماز، تلاوت، دعا وغیرہ عبادات میں مصروف رہے۔ شب قدر میں یہ دعا بکثرت پڑھے۔ ''اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا''(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: (اے اللہ! بے شک تو ہی معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے پس ہمیں معاف فرما۔) شب قدر کا علم نہ ہو سکے تب بھی اس رات کی عبادت کرنے سے اس کی فضیلت فی الجملہ حاصل ہوگی (کامل فضیلت بغیر علم کے حاصل نہ ہوگی) اس کی ایک علامت اس میں گرمی و سردی کا نہ ہونا ہے۔ (یعنی رات معتدل ہوگی) شب قدر کے بعد دن میں بھی کثرتِ عبادت مستحب ہے۔

اعتکاف کے ارکان:

اعتکاف کے چار ارکان ہیں۔ (۱) نیت۔ (۲) مسجد (۳) اتنا ٹھہرنا جسے عکوف کہہ سکیں۔ (۴) معتکف

(۱)نیت: دیگر عبادات کی طرح اعتکاف میں نیت واجب ہے۔ اگر نذر کا اعتکاف ہے تو فرضیت کی نیت واجب ہے تاکہ نفل سے متمیز ہو۔

کسی مدت کی تعیین کے بغیر مطلق اعتکاف کی نیت کرلے تو یہ کافی ہے، چاہے طویل وقت اعتکاف میں ٹھہرا رہے۔ لیکن واپسی کے ارادے کے بغیر مسجد سے باہر جائے اور بعد میں واپس لوٹے تو دوبارہ نیت کرے، قضاء حاجت کے لئے گیا ہو یا کسی اور کام سے، کیونکہ جتنا وقت اعتکاف میں گذرا وہ مکمل عبادت ہے، اگر اعتکاف کے لئے واپس لوٹنے کے ارادے سے جائے تو یہ ارادہ بھی نیت کے قائم مقام ہے۔ (واپسی کے بعد پھر نیت کی ضرورت نہیں)

اگر نیت میں مدت کی تعیین کرے مثلاً ایک دن کا اعتکاف یا ایک ماہ کا اعتکاف اور قضاء حاجت کے علاوہ کسی مقصد سے مسجد سے باہر جائے اور لوٹے تو پھر نیت کرلے چاہے زیادہ فاصلہ نہ گذرا ہو، کیونکہ اس سے اعتکاف منقطع ہوتا ہے۔ بول و براز (پیشاب، پاخانہ) کے لئے جائے تو دوبارہ نیت کی ضرورت نہیں، چاہے زیادہ وقت گذر جائے کیونکہ یہ لازمی ضرورت ہے، اس لئے گویا کہ بوقت نیت ہی مستثنیٰ ہے۔

اگر متعین مدت میں مسلسل (متتابع) اعتکاف کی نذر مانے اور کسی ایسے عذر سے نکلے جس سے تسلسل ختم نہیں ہوتا، تو لوٹنے کے بعد تجدید نیت کی ضرورت نہیں۔ قضاء حاجت کے لئے گیا ہو یا کسی اور عذر سے، کیونکہ اس کی نیت اس مکمل مدت کو شامل ہے۔ بول و براز، مرض اور حیض ایسے اعذار ہیں جن سے اعتکاف کا تسلسل ختم نہیں ہوتا۔

عورت کو شوہر کی اجازت کے بغیر اور غلام کو آقا کی اجازت کے بغیر اعتکاف جائز نہیں۔

(۲)**مسجد:** اعتکاف شرعی مسجد میں ہو، کیونکہ شیخین کی روایت سے آپ ﷺ کا عمل یہی ثابت ہوتا ہے۔ کسی اور جگہ اعتکاف صحیح نہیں، چاہے وہ جگہ نماز کے لئے رکھی گئی ہو۔ لہٰذا امام شافعیؒ کے قول جدید میں عورت اپنے گھر میں نماز کے لئے متعین مخصوص جگہ میں اعتکاف نہیں کرسکتی۔ (قول قدیم کی رو سے اس کی گنجائش ہے)۔

عام مساجد کے بجائے جامع مسجد میں اعتکاف افضل ہے، (عموماً) کثرت جماعت کی وجہ سے، بعض علماء نے جامع مسجد کو واجب کہا ہے' ان کے اختلاف سے بچنے کے لئے بھی یہی بہتر ہے۔ اور جمعہ کے لئے مسجد چھوڑ کر جانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی۔ کسی نے مسلسل اتنے ایام کے اعتکاف کی نذر مانی، جس میں جمعہ کا دن آتا ہو اور اس پر جمعہ واجب ہو اور نذر میں جمعہ کے لئے جانے کی شرط نہ لگائی ہو، تو ایسے شخص کو جامع مسجد ہی میں اعتکاف واجب ہے، کیونکہ جمعہ کے لئے مسجد سے باہر جانے سے تسلسل (تتابع) باطل ہوگا۔

کسی نے نذر میں مسجد مکہ یا مسجد مدینہ یا مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کی تعیین کی ہو تو متعین ہو جائے گا۔ دیگر مساجد ان کے قائم مقام نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان مساجد میں مزید فضیلت ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "کجاوے نہ کسے جاویں (باقاعدہ سفر نہ کیا جائے) مگر صرف تین مساجد کے لئے، میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ" (صحیحین) پہلی (مسجد مکہ) بعد والے دونوں کے قائم مقام ہوگی، کیونکہ وہ سب سے افضل ہے اور حج و عمرہ کا تعلق اس سے ہے۔ اور مسجد نبوی بیت المقدس کے قائم مقام ہوگی۔ کیونکہ اسے زیادہ فضیلت حاصل ہے، بہ نسبت بیت المقدس کے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے "میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز سے بھی افضل ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز میری مسجد میں سو نماز سے بھی افضل ہے۔ (رواہ الامام احمد وصححہ ابن ماجہ) اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ آخری دو پہلے کے اور تیسرا دوسرے کے قائم مقام نہ ہوگا۔ (یعنی مسجد حرام کی نذر کہیں اور

پوری نہ ہو گی۔ اور مسجد نبوی کی نذر بیت المقدس میں ادا نہ ہو گی) ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد میں تعین کرے تو وہ متعین نہ ہو گا۔ (کسی بھی مسجد میں اعتکاف کر لینا کافی ہے) اگر اعتکاف کے وقت کی تعیین کرے، تو وقت متعین ہو گا۔ متعینہ وقت سے پہلے اعتکاف کرے تو نذر ادا نہ ہو گی۔ اور موئخر کرے تو قضا شمار ہو گی۔ اور عمداً مؤخر کرنا باعث گناہ ہے۔

(۳) **مسجد میں رکوع وغیرہ میں طمانینت** کی مقدار سے کچھ زائد (ایک ہی لمحہ کیوں نہ ہو) ٹھہرنا اور رکنا پایا جائے، اگر چہ بلا سکون ہو، لہٰذا صرف مسجد میں چلتا پھرتا رہے (ایک جگہ سکون سے نہ بیٹھے) تو یہ بھی کافی ہے۔ بغیر ٹھہرے ہوئے صرف گذر جانا کافی نہیں۔ اعتکاف مطلق کی نذر ہو (یعنی صرف اعتکاف کی نذر ہو، مدت کا ذکر نہ ہو) تو تھوڑی سی دیر اعتکاف کر لینا کافی ہے، زیادہ دیر کرے تو پورا واجب شمار ہو گا، مکمل ایک دن اعتکاف کر لینا مستحب ہے، کیونکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور کسی صحابی سے اس سے کم اعتکاف ثابت نہیں۔

(۴) **مُعتَکِف**: (اعتکاف کرنے والا) معتکف کے لئے اسلام، عقل اور حدثِ اکبر سے پاک ہونا شرط ہے، لہٰذا کافر، پاگل اور حدثِ اکبر والے کا اعتکاف صحیح نہ ہو گا۔ کیونکہ کافر و پاگل کی نیت کا اعتبار نہیں۔ اور حدثِ اکبر میں مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے۔

ان صورتوں میں اعتکاف اور اعتکاف کا تتابع (تسلسل) ختم ہو جائے گا: مرتد ہونا، نشہ آنا (جبکہ اس میں گنہ گار ہو) حیض جبکہ مدتِ اعتکاف غالباً اس سے خالی رہتا ہو، بخلاف ایسی مدت کے جو اس سے خالی نہ رہے، جیسے مکمل ایک ماہ۔ ایسی جنابت جس سے روزہ باطل ہوتا ہو، ایسی جنابت جس سے روزہ باطل نہ ہو، لیکن فوراً اسے دور نہ کرے۔ مذکورہ سارے امور قضاء حاجت کے لئے مسجد سے باہر جانے کے بعد پیش آئیں تب بھی یہی حکم ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک بلا عذر بدنی عبادت کے منافی ہے۔

ایسی جنابت ہو جس سے روزہ نہ ٹوٹے (مثلاً نسیاناً یا لاعلمی میں ہو، یا احتلام ہو جائے) اور جلد ہی پاکی حاصل کرے یا جنون یا بے ہوشی طاری ہو تو اعتکاف اور تتابع منقطع نہ ہو گا۔

حدث اکبر کے بعد بغیر ٹھہرے مسجد ہی میں طہارت کا حصول مشکل ہو تو فوراً نکلنا واجب ہے، کیونکہ اس حالت میں مسجد میں رکنا گناہ ہے۔ اگر مسجد میں طہارت ممکن ہو (مثلاً تالاب وغیرہ ہو) تو فوراً نکلنا واجب نہیں۔ (بلکہ فوراً وہیں غسل کرے لیکن وہیں غسل واجب نہیں ہے غسل کے لئے باہر جانا بھی) جائز ہے۔ اور اس پر لازم ہے کہ جلد غسل کرے تاکہ اعتکاف کا تتابع ختم نہ ہو۔ نیند اور بے ہوشی کا وقت اعتکاف میں شمار ہو گا، بقیہ امور جو گذر چکے ان سے اعتکاف نہ بھی ٹوٹے تو وہ وقت اعتکاف میں شمار نہ ہو گا۔ مثلاً جنون۔ حیض وغیرہ (لہٰذا واجب مدت کی تکمیل کے لئے ان اوقات کی تلافی لازم ہے)

اعتکاف میں جائز امور

اعتکاف کی حالت میں خوشبو کا استعمال، زینت (مثلاً غسل، مسیں (مونچھ) کترنا، بالوں میں تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا، اچھے لباس پہننا) نکاح کرنا اور نکاح کرانا، اور پیشہ و کاریگری (مثلاً کپڑا سینا) جائز ہے۔ کاریگری زیادہ ہو تو مکروہ ہے۔ کتابت علم کسی دوسرے کے لئے بھی کثرت کے ساتھ مکروہ نہیں۔ مسجد میں اپنے معاشی امور کی اصلاح کا حکم دینا اور جائداد وغیرہ کا خیال اور فکر کرنا اور کھانا پینا جائز ہے۔ بہتر ہے کہ دستر خوان پر کھائے، اور کسی برتن وغیرہ میں ہاتھ دھوئے اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو۔

مسجد میں فصد اور سینگی برتن میں مکروہ ہے۔ استحاضہ وغیرہ بدن سے نکلنے والے دیگر خون کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر مسجد خون سے ملوث ہو، یا پیشاب پاخانہ کرے (گرچہ کسی برتن میں ہو) تو یہ حرام ہے۔ بغیر حاجت کے مسجد میں نجاست کا داخل کرنا حرام ہے۔ حاجت

ہو تو حرام نہیں، جیسے نجس جوتے چپل اندر لے جاسکتے ہیں جبکہ مسجد کی گندگی کا خطرہ نہ ہو۔
معتکف کے لئے بہتر یہ ہے کہ علم دین، تلاوت، احادیث کا سننا سنانا وغیرہ عبادات میں لگا رہے۔ کنگھی کرنے کے بعد جھڑے ہوئے بال مسجد میں نہ ڈالے۔ اگر بال کاٹنے یا مونڈنے کی ضرورت ہو تو اپنے گھر جائے، مسجد میں نہ انجام دے۔ (گرچہ حائل کی صورت میں گنجائش ہے) اعتکاف بغیر روزہ کے اور صرف رات میں بھی کر سکتا ہے، کیونکہ اعتکاف کے لئے روزہ شرط نہیں ہے۔

حدیث: معتکف کو روزہ لازم نہیں ہے اِلاّیہ کہ وہ خود لازم کرلے (رواہ الحاکم وصححه على شرط مسلم)

یوں نذر مانے کہ کسی ایسے دن اعتکاف کروں گا جس میں روزہ ہو تو روزہ کی حالت میں اعتکاف لازم ہے، اب وہ روزہ رمضان وغیرہ کا فرض روزہ ہو یا کوئی اور نفل روزہ، البتہ روزے کے ساتھ اعتکاف لازم ہے دونوں الگ الگ پایا جانا کافی نہیں۔
اگر نذر یوں ہو کہ روزے کی حالت میں اعتکاف کروں گا یا اعتکاف کی حالت میں روزہ رکھوں گا تو دونوں بھی لازم اور دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا بھی لازم ہے۔ اس صورت میں رمضان وغیرہ کا فرض روزہ کافی نہیں۔
کسی نے نماز کے حالت میں اعتکاف یا اعتکاف کی حالت میں نماز کی نذر مانی تو دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا لازم نہیں۔ الگ الگ ادا کرے تو بھی کافی ہے۔ حج و عمرہ میں قِران کی نذر ہو تب بھی دونوں کو الگ الگ ادا کر سکتا ہے، بلکہ وہ افضل ہے، اور دم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (قِران یعنی ایک ہی احرام سے حج و عمرہ دونوں کی ادائیگی کی نیت کرنا)

اعتکاف کی نذر

معین یا غیر معین کسی مدت کے اعتکاف کی نذر تتابع کی شرط کے ساتھ مانے مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر ایک ماہ کا مسلسل اعتکاف یا فلاں ماہ کا مسلسل اعتکاف واجب تو ادا میں ہر حال میں تتابع واجب ہے اور معین مدت کی صورت میں قضا میں بھی واجب ہے، کیونکہ اس نے لفظاً اسے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اگر شرط نہ لگائے تو صرف معین مدت کے ادا اعتکاف میں لازم ہے۔ (قضا اور غیر معین میں نہیں) صرف دل میں اعتکاف کی نذر ماننے یا تتابع کی شرط لگائے (الفاظ میں زبان سے ادا نہ کرے) تو یہ لازم نہیں۔ اگر تفریق کی شرط لگائے (یعنی جدا جدا مدت کی شرط لگائے) تو تتابع کے ساتھ اعتکاف سے بھی نذر ادا ہو گی کیونکہ یہ افضل ہے۔
ایک دن اعتکاف کی نذر ہو تو تفریق جائز نہیں۔ (مثلاً آج نصف دن کرے پھر کل بقیہ کرے تو یہ کافی نہیں) کیونکہ ایک دن کا مفہوم متصل اور ایک ساتھ ایک دن ہے۔ لہٰذا صبح صادق سے غروب ہونے تک اعتکاف کرے۔ البتہ دن کے دوران اعتکاف شروع کر کے دوسرے دن اس وقت تک اعتکاف میں رہے تو یہ کافی ہے۔ (مثلاً آج دوپہر ۱۲ بجے اعتکاف شروع کیا اور دوسرے دن ۱۲ بجے تک اعتکاف میں رہا تو یہ کافی ہے۔)
تتابع اور تسلسل کے شرط کے ساتھ کسی ایسے عارض (سبب) کی وجہ سے نکلنے کی شرط لگاوے جو مقصود و جائز ہو، اور اعتکاف کے منافی نہ ہو، تو یہ شرط صحیح ہے (مثلاً بیمار کی عیادت، جنازہ میں شرکت، کسی ضرورت سے بادشاہ کی ملاقات وغیرہ) کیونکہ اعتکاف اپنے پر لازم کر لینے سے لازم ہوتا ہے لہٰذا جن شرائط کے ساتھ لازم کیا ہے، اس کا اعتبار ہو گا اگر کسی خاص عارض کی تعین کرے مثلاً مریضوں کی عیادت تو صرف اس کے لئے جا سکتا ہے، کسی اور عارض کی وجہ سے نہیں جا سکتا۔ اور مطلقاً عارض کی شرط ہو تو ہر دینی یا جائز دنیوی عارض کی وجہ سے جا سکتا ہے۔ اگر مدت معین ہو (مثلاً اس ماہ کا اعتکاف) تو مذکورہ عارض کے مدت کے تدارک اور تلافی کی ضرورت نہیں کیونکہ

در حقیقت نذر اس کے علاوہ مدت کی ہے۔ اگر مدت معین نہ ہو جیسے ایک ماہ تو تدارک واجب ہے تاکہ مدت مکمل ہو۔ اور شرط کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ عارض قضاء حاجت کے حکم میں ہو جائے گا کہ اس کی وجہ سے تتابع منقطع نہ ہو گا۔

عارض کے بغیر یوں شرط لگائے کہ اگر مجھے نکلنا ہو تو نکلوں گا یا حرام عارض کی شرط لگائے مثلاً چوری یا شراب پینا یا غیر مقصود عارض کی شرط لگائے جیسے سیر و تفریح یا اعتکاف کے منافی ہو جیسے جماع تو یہ شرط صحیح نہیں اور سرے سے نذر ہی منعقد نہ ہو گی۔

''المجموع''میں ہے کہ ایک دن کے اعتکاف کی نذر ہو اور رات اعتکاف کرے یا اس کے برعکس (یعنی رات کی نذر ہو اور دن میں اعتکاف کرے) تو وقت معین کیا اور فوت ہو چکا تو یہ کافی ہے کیونکہ قضا ہے، ورنہ کافی نہیں (بلکہ معین وقت میں ہی کرے)

مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے تتابع منقطع نہ ہو گا:

(۱) بول و براز کے لئے جانا۔ چاہے اپنے گھر جائے جو مسجد سے بہت زیادہ دور نہ ہو اور اس سے قریب اس کا دوسرا امکان نہ ہو۔ اگر گھر بہت زیادہ دور ہو اور راستے میں اس کے مناسب کوئی اور جگہ نہ ہو تو گھر جا سکتا ہے۔ مسجد کے عام بیت الخلاء میں یا مسجد کے قریب کسی دوست وغیرہ کے گھر جانا واجب نہیں، پہلی صورت میں مشقت اور دوسری صورت میں احسان کی وجہ سے۔ اگر قریب دوسرا گھر ہو یا اپنا گھر بہت دور ہو اور راستہ میں مناسب محلِ استنجاء موجود ہو تو تتابع منقطع ہو گا۔ کیونکہ واپسی تک پھر حاجت محسوس ہو سکتی ہے اور لوٹنا پڑے گا اور پورا دن اسی چکر میں گزرے گا۔ گھر بہت دور ہونے سے مطلب اتنا فاصلہ ہونا ہے کہ نصف سے زیادہ وقت آنے جانے میں ہی گذر جائے۔

بول و براز کے لئے نکلے تو تیز رفتاری کی ضرورت نہیں، اپنی عام رفتار سے آمد و رفت کافی ہے۔ استنجاء سے فراغت کے بعد باہر سے ہی وضو کر کے آسکتا ہے، کیونکہ یہ استنجاء کے تابع ہے۔ لیکن مسجد میں وضو ممکن ہونے کے باوجود وضو کے لئے باہر جانا جائز نہیں۔

(۲) قضاء حاجت کے لئے جانے کے بعد راستہ میں ہی کسی مریض کی عیادت کر لے یا سفر سے آنے والے کی ملاقات کر لے جبکہ وہاں زیادہ نہ رکے، اور اپنا راستہ بدلنا نہ پڑے، اگر راستہ سے ہٹ کر جانا پڑا یا زیادہ رکا تو تتابع ختم ہو گا۔

(۳) جنون یا بے ہوشی یا ایسا مرض جس میں مسجد میں قیام دشوار ہو مثلاً خادم کی یا ڈاکٹر کی آمد و رفت کی ضرورت ہو یا مسجد کے گندگی کا اندیشہ ہو (جلاب وغیرہ کی وجہ سے) اگر مرض ایسا ہو کہ مسجد سے نکلنے کی ضرورت نہیں جیسے سر درد، معمولی بخار وغیرہ تو اس کی وجہ سے تتابع منقطع ہو گا۔

(۴) چور یا آگ کے ڈر سے نکلنا۔

(۵) اعتکاف ہی کو یا تتابع کی قید کو بھول گیا اور مسجد سے نکلا، بھول کر کافی وقت باہر گذرا تب بھی یہ عذر ہے۔

(۶) موذن راتب (وہ مؤذن جو مستقل اذان کی خدمت پر مقرر و متعین ہو) کا اذان کے لئے مسجد سے جدا مسجد ہی کے قریبی منارہ پر جانا، کیونکہ یہ مسجد کے لئے تعمیر شدہ اور اسی کی ماتحتی میں ہے۔ اور مؤذن بھی اس کا عادی اور لوگ اس کی اذان سے مانوس ہیں۔ اگر مؤذن راتب کے علاوہ کوئی مذکورہ منارہ پر جائے یا مؤذن راتب مسجد کے مینارہ کے علاوہ دوسری جگہ جائے یا مسجد کے منارہ پر اذان کی ضرورت کے بغیر جائے یا مسجد سے دور منارہ پر جائے تو تتابع ختم ہو گا۔ جو منارہ مسجد سے متصل ہو کہ اس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہو تو اس پر اذان کے بغیر بھی جانے میں حرج نہیں، کیونکہ وہ مسجد سے خارج شمار نہ ہو گا۔ مسجد کی سمت سے ہٹی ہوئی ہو تب بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے۔

(۷) مسجد میں لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہو تو کھانے کے لئے باہر جا سکتا ہے گرچہ مسجد میں ممکن ہو، کیونکہ مسجد میں کھانے سے آدمی شرماتا ہے۔ پانی مسجد میں میسر ہو تو پانی پینے باہر نہیں جا سکتا۔

(۸) بغیر حق کے کوئی اکراہ اور جبر سے نکالے۔

(۹) اس حد (سزا) کے لئے نکلنا جو گواہوں سے ثابت ہو، اپنے اقرار سے ثابت ہو تو اس کے لئے نکلنے سے تتابع ختم ہو گا۔
(۱۰) وہ جاہل جو مذکورہ مسائل سے ناواقف ہو۔
مسلسل اعتکاف کے نذر میں جو وقت ایسے عذر کی وجہ سے مسجد سے باہر گذرے جس سے تسلسل ختم نہ ہو، اس کی قضاء واجب ہے جیسے حیض، نفاس اور مذکورہ جنابت وغیرہ قضاء حاجت، کھانا اور مؤذن راتب کے اذان کے اوقات کی قضاء واجب نہیں۔ کیونکہ یہ لابدی (ضروری) اور مستثنیٰ ہیں۔ اور ان اوقات میں بھی وہ حکماً معتکف شمار ہو گا۔

کتاب الحج (حج کا بیان)

لفظ 'حج' عربی زبان میں قصد وارادہ اور زیارت یا کسی معظم ومحترم کے بکثرت قصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
شرعاً، آئندہ سطروں میں پیش ہونے والی مخصوص عبادت کی خاطر کعبۃ اللہ کے قصد کو حج کہتے ہیں۔
لفظ 'عمرہ' عربی میں زیارت وملاقات اور قصد کے لئے مستعمل ہے، اور شریعت میں آئندہ آنے والی مخصوص عبادت کے لئے کعبۃ اللہ کے قصد وزیارت کو عمرہ کہتے ہیں۔
حج قدیم شریعتوں میں بھی مشروع تھا لیکن اس کیفیت کے ساتھ اس امت کی خصوصیت ہے۔ وارد ہے کہ ہر نبی نے حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی بیت اللہ کا حج کیا ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں حج کے اعلان کا حکم دیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ میری آواز کہاں تک پہنچ پائیگی؟
ارشاد باری ہوا تم اعلان کرو، پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر بآواز بلند اعلان فرمایا: "يَا اَيُّهَاالنَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحَجُّوْا" (اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا تم حج کرو۔) اس آواز کو آسمان وزمین والوں نے سنا، حتیٰ کہ جو ابھی باپ کے پشت اور ماں کے رحم میں تھے (یعنی آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں) انھوں نے بھی سنا، پس جس نے ایک مرتبہ جواب دیا وہ ایک مرتبہ حج کریگا جس نے دو مرتبہ دیا وہ دو مرتبہ، اور جس نے تین مرتبہ دیا وہ تین مرتبہ جس نے اس سے زیادہ مرتبہ دیا وہ اتنی ہی مرتبہ حج کریگا۔
وقت فرضیت: راجح قول کے مطابق ۵ ہـ میں فرض ہوا۔ آپ ﷺ نے ۹ ہـ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر روانہ کیا اور انھوں نے اس فریضہ کو انجام دیا بعض مالدار صحابہ مثلاً حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جہاد اور دشمن کے ساتھ مصروفیت کے بغیر آپ ﷺ کی طرح اس سال حج میں نہ گئے، بلکہ ۱۰ ہـ میں آپ ﷺ کی معیت میں حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ آپ ﷺ نے قبل نبوت اور بعد نبوت اور قبل ہجرت کئی حج وعمرے کئے جن کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہجرت کے بعد ایک حج "حجۃ الوداع" ادا فرمایا۔
حج کا حکم: حج اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک ہے۔ اسکا اسلامی رکن ہونا بالکل قطعی اور واضح ہے۔ کوئی اس کا انکار کردے تو کافر ہو گا۔ البتہ تازہ نو مسلم ہو، یا ان مسائل سے واقف حضرات سے دور دراز علاقہ میں پلا بڑھا ہو، تو اسے معذور سمجھیں

گے۔(اور معلوم ہونے تک کفر کا حکم نہ لگے گا)

حج نماز کے علاوہ دیگر تمام عبادات سے افضل ہے۔ کیونکہ یہ بدن اور مال دونوں پر مشتمل ہے۔ صحیح اور مبرور حج (جس میں سارے ارکان وآداب کی رعایت ہو اور ابتداء سے انتہاء تک گناہ کا دخل نہ ہو) کی وجہ سے صغیرہ گناہ بالاتفاق معاف ہونگے۔ راجح قول کے مطابق کبائر بھی معاف ہوں گے۔ جس گناہ کا تاوان وبدلہ یا قضالازم ہے، (مثلاً کسی کا قرض وغیرہ۔ قضا نمازیں وغیرہ) حج کے بعد ان کو انجام دیناواجب ہے۔ البتہ دوران حج یا فراغت کے بعد ان کی ادائیگی کا موقعہ ملنے سے پہلے ہی مر جائے۔ تو انشاء اللہ یہ بھی معاف ہونے کی امید ہے۔

حج وعمرہ کی فرضیت

حج وعمرہ اصل شرع کی رو سے زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ آئندہ ادائیگی کے ارادے کے ساتھ تاخیر کی گنجائش ہے۔ جبکہ نذر، قضایا بے بس ہونے کے اندیشہ کی وجہ سے وقت تنگ نہ ہو۔ نذر یا قضا کی صورت میں مزید حج یا عمرہ بھی فرض ہو جاتا ہے۔

آیت:(۱)"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا"(آل عمران۔آیت۹۷) اور اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے۔ یعنی اس شخص کو جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کی سبیل کی۔

(۲)"وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ"(البقرۃ۔۱۹۶) اور حج اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو۔ یعنی ان دونوں کو مکمل اور تام طریقہ سے انجام دو۔

حدیث:(۱) آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، تو تم حج کرو" تو ایک شخص نے پوچھا "اے اللہ کے نبی! کیا ہر سال؟" تو آپ ﷺ چپ رہے۔ یہاں تک کہ اس نے تین مرتبہ پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں ہاں کہتا تو واجب ہو جاتا اور تم نہ کر پاتے"(مسلم)

(۲) حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا "ہمارا یہ عمرہ اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نہیں بلکہ ہمیشہ کیلئے"(دارقطنی باسناد صحیح)

حج وعمرہ کی صحت

حج وعمرہ صحیح ہونے کے لئے صرف اسلام شرط ہے۔ کافر ومرتد کا حج صحیح نہ ہو گا۔ صرف صحت کے لئے مکلف ہونا لازم نہیں لہٰذا بچے کا (ولیِ مال) مالی سرپرست اور ذمہ دار (یعنی باپ پھر دادا پھر وصی پھر حاکم یا اس کا قیم) ممیز یا غیر ممیز بچہ اور پاگل کی طرف سے احرام باندھ کر اسے حج کرا سکتے ہیں۔ مالی ذمہ دار کے علاوہ جیسے بھائی یا چچا وغیرہ کو اس کی اجازت نہیں۔

حدیث: ایک عورت نے ایک بچے کا ہاتھ پکڑ کر آپ ﷺ سے پوچھا "کیا اس کا حج ہو گا" تو جواب دیا "ہاں! اور تم کو اجر ملے گا۔"(موطأ، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی۔ابن حبان)

بچہ وپاگل کی طرف سے احرام کا طریقہ یہ ہے کہ اسے محرم بنانے کی نیت کرلے، تو وہ محرم ہو جائیگا۔ اس کا موجود ہونا یا ولی کی طرف متوجہ ہونا شرط نہیں ہے۔ غیر ممیز بچہ کو لے کر ولی طواف کرائے۔ طواف سے پہلے طواف کے شرائط ستر عورت وضو وغیرہ) بھی کرائے، اس کو سعی بھی کرائے۔ (طواف وسعی خود ولی کا ہونے کے بعد اسے لے کر کرائے) اس کی جانب سے ولی طواف کی دو رکعت ادا

کرے۔ ولی اسے مواقف (وقف کے مقامات مثلاً عرفہ، مزدلفہ) میں لے جائے بغیر ولی کے وہ اپنے طور پر جائے تو یہ کافی نہیں ہے۔ اگر وہ رمی کر سکتا ہے۔ تو کنکر اس کو تھمادے۔ تاکہ وہ رمی کرے، نہیں کر سکتا، تو ولی یا اس کی اجازت سے دوسرا کرے، جبکہ خود اس کے ذمہ میں رمی نہ ہو۔ ممیز (باشعور) بچہ خود ہی طواف، نماز، سعی، مواقف کی حاضری اور رمی کے اعمال انجام دے۔ کسی بے ہوش کی بے ہوشی کے ختم ہونے کی امید ہو تو اس کی جانب سے دوسرا احرام نہ باندھے۔ اگر اب ہوش میں آنے کی امید نہ ہو یا تین دن سے زائد مدت ہو چکی۔ تو ولی اس کی طرف سے احرام باندھ سکتا ہے۔

از خود انجام دینا

بذات خود حج عمرہ کی انجام دہی کے لئے اسلام کے ساتھ تمیز (باشعور ہونا) بھی شرط ہے لہٰذا ایک ممیز بچہ اپنے ولی کی اجازت سے خود ہی احرام باندھ کر حج وعمرہ کے اعمال ادا کر سکتا ہے۔

اسلامی فریضۂ حج

اسلام نے جو ایک حج وعمرہ زندگی میں فرض کیا ہے اس کی ادائیگی اور فرضیت سے سبکدوش ہونے کیلئے یہ شرائط ہیں۔ (۱) اسلام (۲) تمیز (۳) بالغ ہونا (۴) آزادی۔

فریضہ کی ادائیگی کیلئے استطاعت شرط نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی غریب آدمی تکلیف اٹھا کر کسی طرح حج کرلے تو اس کا فریضہ ادا ہو گیا۔ (آئندہ مالدار اور مستطیع ہونے کے بعد دوبارہ ادا کرنا ضروری نہیں)۔ کیونکہ وہ کامل ہے۔ جیسا کہ مریض تکلیف اٹھا کر جمعہ میں شریک ہو تو اس کا جمعہ ہو جائیگا (گرچہ اس پر فرض نہ تھا)۔ بچہ اور غلام کا حج اسلامی فریضہ کی طرف سے ادا نہ ہو گا۔ بچہ بالغ ہونے اور غلام آزاد ہونے کے بعد (بصورت استطاعت) ان پر دوبارہ حج لازم ہے۔ کیونکہ یہ ناقص الحال ہیں۔

حدیث: "کوئی بچہ حج کرے پھر بالغ ہو تو اسپر اسلامی حج لازم ہے۔ اور کوئی غلام حج کرے پھر آزاد ہو تو اس پر اسلامی حج فرض ہے" (ابن خزیمہ، حاکم، بیہقی، ابن حزم وصححہ، خطیب)

اگر حج میں وقوف عرفہ سے قبل یا دوران وقوف بچہ بالغ ہو جائے یا غلام آزاد ہو تو یہ اسلامی حج کیلئے کافی ہے۔ اگر سعی طواف قدوم کے بعد کر چکا تھا، تو اب دوبارہ کرے۔ عمرہ میں طواف سے قبل یا دوران طواف بلوغ یا آزادی پائی جائے تو یہ عمرہ فریضہ کی طرف سے کافی ہے۔ البتہ دوران طواف ہے تو طواف از سرِ نو لوٹائے۔

وجوب حج وعمرہ

حج وعمرہ کے وجوب کے لئے یہ شرائط ہیں (۱) اسلام (۲) تمیز (۳) بالغ ہونا (۴) آزادی (۵) استطاعت۔ لہٰذا ایک کافر پر اس دنیا میں مطالبہ کے اعتبار سے حج واجب نہیں (گرچہ آخرت میں اس پر گرفت ہو) اس لئے کوئی کفر میں حج پر قادر ہو' لیکن اسلام قبول کرتے وقت قادر نہ ہو (تنگ دست ہو) تو اس پر حج فرض نہ ہو گا۔ لیکن کوئی مرتد قادر تھا تو دوبارہ اسلام لانے کے بعد یہ فریضہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ غیر ممیز یا ممیز نابالغ پر اور غلام پر حج فرض نہیں۔ اسی طرح جو حج کی قدرت واستطاعت نہ رکھتا ہو، اس پر بھی فرض نہیں۔

آیت: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران ۹۸)

حدیث: آپ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ حج کب واجب ہو گا، تو فرمایا "جب توشہ اور سواری ہو۔" (ترمذی وقال حدیث حسن)

حدیث سے قرآن کے لفظ استطاعت کی وضاحت ہوتی ہے۔

استطاعت (طاقت وقدرت)

استطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ (الف) بذات خود ادا کرنے کی استطاعت (ب) استطاعت بالغیر۔

استطاعت کے تحقق کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس اتنا مال ہو جو حج و عمرہ کی ادائیگی کے لئے کافی ہو۔ یعنی آمد ورفت کا کرایہ اور کھانے پینے کے مصارف اور حکومتیں جن امور کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مثلاً پاسپورٹ، پروانہ راہ داری، مطوف کا خرچ وغیرہ۔ اور یہ سارا مال اس کے قرض اور اہل وعیال کے مصارف کے علاوہ ہو، جب تک کہ وہ حج و عمرہ کیلئے غائب رہے۔

(الف) **بذات خود ادا کرنے کی استطاعت:** آدمی قادر، تندرست ہو کہ بغیر شدید نقصان اور مشقت کے خود سفر کر کے مناسک کو ادا کر سکتا ہو۔

(ب) **استطاعت بالغیر:** آدمی اتنے مال کا مالک ہو کہ اسکے ذریعہ کسی اور کو نائب بنا کر زندگی میں یا موت کے بعد حج کرا سکتا ہو، جبکہ شدید مرض یا بڑھاپے وغیرہ کے وجہ سے خود حج کرنے پر قادر نہ ہو۔

بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، اور ادائیگی سے قبل وفات پا گئی۔ تو کیا میں ان کی جانب سے حج کروں، تو آپ ﷺ نے جواب دیا۔ "ہاں تم ان کی طرف سے حج کرو" نسائی کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے اپنے وفات شدہ والد کا حج ادا کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔

صحیحین میں ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اللہ کے فریضہ حج کے وقت ابّا بالکل بوڑھے اور سواری پر بیٹھ کر سفر کرنے کے ناقابل ہیں تو کیا میں ان کی جانب سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں"۔

ملاحظات

(۱) جس کے پاس تجارت کا رأس المال ہو، اسے حج و عمرہ کی ادائیگی میں صرف کرنا واجب ہے۔ کسی کے پاس زمین ہو اس کی آمدنی پر اس کا گذر بسر ہو تو حج و عمرہ کی ادائیگی کے لئے اسے فروخت کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اگر اس کے ذمہ کسی کا قرض ہوتا تو مال تجارت اس میں ادا کرنا واجب ہوتا۔ تو اسی طرح حج و عمرہ کا حکم ہو گا۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا فروخت کرنا اس پر لازم نہیں۔

(۲) رہنے کا مکان اور گھر کا اثاثہ اور اسباب حج و عمرہ کی ادائیگی کے لئے فروخت کرنا واجب نہیں کیونکہ یہ ان ضروریات میں سے ہیں جن سے انسان بے نیاز نہیں، لہٰذا ان کے فروخت کا مکلف نہ ہو گا۔

(۳) جس کے اور مکہ مکرمہ کے درمیان دو مرحلہ سے کم فاصلہ ہو (مسافت قصر سے کم یعنی تقریباً ۸۱ کلو میٹر سے کم) اور وہ چلنے کی قوت رکھتا ہو تو اسے سواری میسر نہ بھی ہو تو پیدل جا کر حج و عمرہ کرنا لازم ہے۔

(۴) جس کے پاس صرف بقدرِ حج رقم ہو اور وہ اس سے نکاح کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کی دو حالتیں ہونگی۔

(الف) نکاح کی حاجت ہو، لیکن اپنے نفس پر ضبط و قابو (کنٹرول) حاصل ہو، تو اس پر حج واجب ہے۔ اور نکاح سے قبل حج کر لینا افضل ہے۔

(ب) زنا اور گناہوں کے ارتکاب کا اندیشہ ہو، تو اس پر بھی حج واجب ہے، لیکن پہلے نکاح کر لینا افضل ہے۔ خلاصہ یہ کہ نکاح کی حاجت سے حج کا وجوب ختم نہ ہو گا۔

(۵) عورت پر حج و عمرہ کے وجوب کیلئے سابقہ شرائط کے ساتھ مزید دو شرطیں ہیں۔

(۱)-(الف) اس کے ساتھ اس سفر میں اس کا شوہر ہو۔

(ب) یا نسبی یا غیر نسبی کوئی مَحْرَم ہو۔ کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے۔ ''عورت بغیر مَحْرَم کے سفر نہ کرے۔''

(ج) یا اس کے ساتھ معتبر، پاکباز اور دین دار عورتیں ہوں۔ کم از کم دو اور عورتیں ہوں یعنی کل تین۔ ان عورتوں میں سے کسی کا شوہر یا محرم ساتھ ہونا شرط نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح معتبر عورتوں کی اجتماعی صورت میں فتنوں سے امن حاصل ہو گا۔

اگر عورت کو حج میں جانے والا کوئی محرم وغیرہ نہ مل سکے تو اس پر محرم کی اجرت بھی واجب ہے۔ جبکہ اسکے پاس موجود ہو۔

یہ شرط حج میں جانے کے وجوب کے لئے تھی۔ جہاں تک جواز کا مسئلہ ہے، تو اس میں صرف ایک عورت بھی کافی ہے۔ بلکہ راستہ پر امن ہو، تو تنہا عورت بھی جا سکتی ہے۔ (لیکن جانا واجب نہیں) یہ مسئلہ فرض حج کا ہے۔ سنت حج یا دیگر اسفار کے لئے شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے۔ فرض حج کے لئے تنہا عورت کا جانے کے جواز کی دلیل بخاری شریف کی یہ روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ ''اگر تم زیادہ عرصہ زندہ رہے تو بالضرور یہ منظر دیکھو گے کہ ایک خاتون تنہا مقام حِیرہ (ایک جگہ کا نام) سے آکر کعبۃ اللہ کا طواف کریگی اور اسے اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہو گا۔''

(۲) عورت طلاق یا وفات کی عدت میں نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ (سورۃ الطلاق - ۱)

آیت: ''**لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ**'' (عدت میں) ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں۔ (بیان القرآن)

(۶) عورت شوہر کی اجازت کے بغیر حج میں نہیں جا سکتی، اگر حج پر قدرت کے باوجود شوہر کے روکنے کی وجہ سے نہ جا سکی اور پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے ترکہ میں سے اس کا حج بدل کروایا جائے گا، اور اس میں عورت گنہگار شمار نہ ہو گی۔ (الفقہ المنہجی ۱۲۶/۳)

میت کا حج بدل: کسی میت کے ذمہ فرض حج یا عمرہ باقی ہو، تو اس کے ترکہ میں سے اسے ادا کروانا واجب ہے۔ جیسا کہ دیگر قرضوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ (اور میت کے ان مالی حقوق کی ادائیگی کے بعد وارثوں میں وراثت تقسیم ہو گی) اگر میت کا ترکہ نہ ہو، تو وارث کے لئے سنت ہے کہ اس کی جانب سے انجام دے۔ اگر کوئی اجنبی وارث کی اجازت یا بغیر اجازت کے انجام دے تو یہ بھی جائز ہے۔

غریب مَعْضُوب (عاجز): جو شخص معضوب ہو، یعنی شدید بڑھاپے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے خود حج کو نہ جا سکتا ہو، اور غریب ہو کہ کسی اور کو بھی روانہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اسکے اصول و فروع میں سے کوئی یا کوئی اجنبی شخص اپنی جانب سے بخوشی اس کا حج کرنے پر راضی ہو، تو فوراً اسے اجازت دے کر حج کروانا واجب ہے، جبکہ وہ شخص خود عاجز نہ ہو اور معتبر ہو اور اس کے ذمہ کوئی فرض حج نہ ہو، البتہ کوئی اسے اپنی جانب سے مال دے، تاکہ یہ کسی کے ذریعہ حج کرائے، تو اس مال کا لینا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نسبتاً زیادہ احسان پایا جاتا ہے۔ البتہ اصول و فروع میں سے کوئی خود ہی مال دے کر کسی کو روانہ کرنا چاہے، یا اس سے یہ کہے کہ تم کسی کو حج کے لئے روانہ کرو، ہم

اس کو اجرت دیں گے، تو قبول کرنا لازم ہے، (براہِ راست رقم اسے دے تو لازم نہیں) اور اجنبی شخص کا یہ مطالبہ قبول کرنا لازم نہیں۔

انواعِ نیابت: معضوب یعنی جو خود حج کرنے سے عاجز ہو، وہ فرض اور نفل دونوں میں دوسرے کو نائب بنا سکتا ہے بلکہ فرض میں واجب ہے، میت کی طرف سے فرض حج مطلقاً جائز ہے، نفل حج میت کی وصیت ہو تو جائز ہے ورنہ صحیح نہیں ہے۔ جو شخص خود حج کر سکتا ہو، اس کے لئے کسی اور کو نائب بنانا مطلقاً منع ہے۔ (یعنی فرض ہو یا نفل)

میقات

میقات لغت میں حد یا کسی فعل کے لئے متعینہ وقت کو کہتے ہیں۔ اور شرعاً اس باب میں عبادت کی ادائیگی کے لئے متعین وقت اور جگہ کو کہا جائے گا۔

میقات زمانی (یعنی حج وعمرہ کا وقت)

آیت: ''اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ'' (البقرہ۔آیت ۱۹۷)۔ (زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں۔ جو (مشہور) معلوم ہیں (ایک شوال۔ دوسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔

حج کا احرام ایک شوال سے عید الاضحی (۱۰/ ذی الحجہ) کے فجر تک کسی بھی وقت باندھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور وقت کسی نے حج کا یا مطلق (حج وعمرہ کی قید کے بغیر) احرام باندھا تو وہ احرام بطورِ عمرہ منعقد ہوگا۔ کیونکہ احرام کا تعلق کافی قوی اور شدید ہوتا ہے۔ لہٰذا جو احرام باندھا، وقت اسے قبول نہیں کر سکتا، تو جو قبول کرتا ہے وہی شمار ہوگا۔ اور اس عمرہ سے اسلامی فرض عمرہ ادا ہو جائیگا۔ چاہے لاعلمی میں ایسا کرے یا جان بوجھ کر۔

عمرہ کا احرام سال بھر کسی بھی وقت باندھ سکتے ہیں، کیونکہ صحیحین وغیرہ کی روایات میں مختلف اوقات میں عمرے ثابت ہیں، البتہ حاجی کے لئے نفر (منیٰ میں رمی کے اعمال سے فارغ ہو کر چلے آنے) سے قبل عمرہ کی اجازت نہیں۔ (فی الحال گرچہ حاجی احرام میں نہیں لیکن) احرام کے احکام کا باقی رہنا احرام کے باقی رہنے کی طرح ہے۔ اور ابھی تحلل حاصل نہیں ہوا۔ (حج کا احرام نہیں کھلا) تو حج پر عمرہ داخل کرنا منع ہے۔ اور تحلل کے بعد حج کے بقیہ اعمال کی وجہ سے فی الحال عمرہ کے اعمال ادا نہ کر پائے گا۔

میقات مکانی

جو حرم مکہ میں ہو اور عمرہ کرنا چاہے، اسے احرام کے لئے حرم سے باہر حل میں جانا لازم ہے صحیحین کی روایت میں ہے کہ ''آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حج کے بعد تنعیم روانہ فرمایا، اور انھوں نے وہاں سے عمرہ ادا کیا۔'' تنعیم مکہ سے سب سے قریبی حل ہے۔ حل میں عمرہ کے احرام کے لئے سب سے افضل مقام ''جعرانہ'' ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین سے واپسی پر اسی مقام سے رات جا کر عمرہ انجام دیا۔ (صحیحین) یہ طائف کے راستہ میں مکہ مکرمہ سے ۶/ فرسخ (۱۸/ میل) کے فاصلہ پر ہے۔ پھر تنعیم افضل ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ نے وہیں سے عمرہ کروایا، اب وہیں مسجد عائشہ رضی اللہ عنہا موجود ہے۔ یہ مکہ مکرمہ

سے ایک فرسخ (۳؍ میل) دور ہے۔ پھر حدیبیہ سے عمرہ افضل ہے، جو مکہ سے ۶؍ فرسخ کی مسافت پر ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے سال ذوالحلیفہ سے عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد مقام حدیبیہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن مشرکین آڑے آئے۔) لہٰذا امام شافعیؒ نے جس پر آپ ﷺ نے عمل کیا اسے مقدم رکھا، پھر جس کا آپ ﷺ نے حکم دیا، پھر جس کا آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا۔

اگر کوئی مکہ سے ہی احرام باندھ کر عمرہ کرے اور حل میں نہ جائے تو یہ عمرہ صحیح ہو جائے گا اور اس سے اسلامی فرض عمرہ بھی ادا ہو گا، لیکن میقات سے احرام کے ترک کی وجہ سے اس پر دم واجب ہو گا۔ اور وہ گنہگار بھی ہو گا۔ لیکن احرام باندھنے کے بعد کسی اور عمل کے ادا کرنے سے قبل میقات (حل) میں جا کر آئے تو دم لازم نہیں، کیونکہ اس نے میقات سے مکہ کی مسافت احرام کی حالت میں طے کی۔ اور تمام اعمال بعد میں انجام دے تو گویا کہ میقات سے ہی احرام باندھا، اگر پہلے سے میقات جانے کا ارادہ تھا تو اس تقدیم احرام سے گنہگار نہ ہو گا۔

مکہ سے حج کا احرام باندھنے کے لئے میقات خود مکہ ہی ہے۔ (چاہے قِران کا احرام ہو یا وہ شخص غیر مکی ہو)

آفاقی یعنی دنیا کے مختلف علاقوں سے حج یا عمرہ کے لئے آنے والوں کے میقات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ میقات ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے تقریباً دس مرحلہ کے فاصلہ پر اور مدینہ منورہ سے ۶؍ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جو آج کل اَبْیَار علی کے نام سے معروف ہے۔

(۲) شام، مصر اور مغرب سے آنے والوں کے لئے جُحفہ میقات ہے۔

(۳) تہامۃ الیمن، چین اور ہندوستان کی طرف سے آنے والوں کے لئے یلملم میقات ہے جو ایک پہاڑی کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ہے۔

(۴) نجدِ یمن اور نجدِ حجاز کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات قَرْن ہے، جو مکہ سے دو مرحلہ کی مسافت پر ایک جگہ کا نام ہے۔

(۵) مشرق یعنی عراق وغیرہ کی طرف سے آنے والوں کا میقات ذاتِ عِرق ہے، جو مکہ سے دو مرحلہ پر ہے۔

حدیث ۱: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میقات کی اس طرح تعیین فرمائی۔ ''اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ، اہل شام کے لئے جحفہ، اہل نجد کے لئے قرن، اہل یمن کے لئے یلملم اور فرمایا کہ یہ ان علاقوں کے لوگوں کے لئے اور دوسرے علاقوں سے اس طرف سے گذرنے والوں کے لئے میقات ہے۔ جو کہ حج اور عمرے کے ارادے سے آئیں۔ جو ان حدود سے (مکہ مکرمہ کی طرف) اندر ہوں، وہ جہاں سے (حج یا عمرہ کا سفر) شروع کریں (وہی ان کے لئے میقات ہے) یہاں تک کہ اہل مکہ، مکہ ہی سے احرام باندھیں (صحیحین)

۲: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ آپ ﷺ نے اہلِ مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ، اہلِ شام، مصر اور مغرب کے لئے جحفہ کو میقات قرار دیا۔ (الشافعی فی الام)

۳: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''آپ ﷺ نے اہل عراق کے لئے ذاتِ عرق کو میقات مقرر کیا ہے۔ (ابو داود وغیرہ باسناد صحیح کما فی المجموع)

اگر کوئی کسی کی نیابت میں حج کو جائے، تو اس نائب بنانے والے کے میقات کا یا اس سے دور جس مقام کی اس نے تعیین کی ہو، اس

کا اعتبار ہو گا۔

جو شخص میقات سے دور اور پرے رہتا ہو، اسے میقات سے احرام افضل ہے، نہ کہ گھر سے کیونکہ آپ ﷺ نے بالا جماع حجۃ الوداع میں ذوالحلیفہ سے احرام باندھا (نہ کہ مدینہ منورہ سے)، اسی طرح عمرۃ الحدیبیہ میں بھی (رواہ البخاری) اپنے گھر سے بھی احرام باندھ سکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے ایسا کیا ہے میقات پر پہنچنے تک عورت کو حیض یا نفاس شروع ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ہی احرام باندھنا سنت ہے۔

میقات کے ابتدائی حصہ سے (یعنی جو مکہ سے نسبتاً دوری پر ہو) احرام افضل ہے، بہ نسبت درمیانی اور آخری حصے کہ، تاکہ بقیہ میقات سے احرام کی حالت میں گذرے، لیکن ذوالحلیفہ میں اس مسجد سے احرام افضل ہے جہاں سے آپ ﷺ نے احرام باندھا تھا۔

جس حاجی کے راستہ میں مذکورہ میقات میں کوئی نہ پڑتا ہو، وہ دورانِ سفر دائیں یا بائیں جانب کسی میقات کے محاذات (سیدھ) میں جب پہنچ جائے، تو وہی اس کے لئے میقات ہے۔ دونوں طرف میقات ہو تو جو زیادہ قریب ہو اس کا اعتبار ہو گا۔ دونوں ایک ہی فاصلہ پر ہو، تو جو مکہ سے زیادہ دور ہو اس کا اعتبار ہو گا۔ اگر کوئی بھی میقات محاذات میں نہ آئے، تو مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ (مسافت قصر) کی دوری پر اس کا میقات شمار ہو گا، کیونکہ مکہ مکرمہ سے اس سے کم فاصلہ پر کوئی میقات نہیں۔

جو شخص میقات سے اندر مکہ کی طرف رہتا ہو اور آگے کوئی اور میقات نہ ہو تو اس کے لئے جہاں سے حج کا ارادہ ہو وہی جگہ میقات ہے اسی طرح کوئی باہر سے آکر میقات سے گذرے اور فی الحال حج یا عمرہ کا ارادہ نہ ہو پھر میقات گذرنے کے بعد آگے جاکر ارادہ ہوا تو جہاں سے ارادہ ہوا وہیں سے احرام باندھے۔ حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو، اور اپنے میقات سے آگے بغیر احرام کے بڑھ جائے تو اسے اپنی میقات کی طرف، یا اسی مسافت کے کسی اور میقات کی طرف لوٹنا، تاکہ وہاں سے احرام باندھے لازم ہے۔ اگر احرام باندھ چکا ہے، تو اسی حالت میں میقات پر لوٹے۔ اگر کوئی معقول عذر ہو مثلاً وقت تنگ ہو، راستہ پر خطرہ ہو، رفقاء سے کٹ جائے یا پر مشقت بیماری ہو، تو واپسی لازم نہیں۔

عذر کی وجہ سے یا بلا عذر واپس میقات کی طرف نہ لوٹا، اور مطلقاً عمرہ کا یا اسی سال حج کا احرام باندھ چکا تو اس پر دم لازم ہے۔ اسی طرح حج و عمرہ کے کسی عمل کو ادا کرنے کے بعد (چاہے وہ رکن ہو جیسے وقوف عرفہ، یا سنت ہو جیسے طوافِ قدوم) لوٹے تب بھی دم لازم ہے، ان دونوں صورتوں میں بلا احرام میقات سے گذرنے کا گناہ بھی ہو گا۔ کوئی لاعلمی یا بھول کی وجہ سے بلا احرام میقات سے گذرا تب بھی دم لازم ہے، البتہ گناہ نہ ہو گا حج و عمرہ کے کسی عمل کو ادا کرنے سے قبل ہی لوٹے تو دم نہ ہو گا۔ اور پہلے سے واپسی کا ارادہ موجود تھا تو گناہ بھی نہ ہو گا۔

احرام

نیت کے ساتھ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کو احرام کہتے ہیں۔

پہلے ہی تعیین کر لینا (کہ حج ہے یا عمرہ ہے یا دونوں) زیادہ افضل ہے۔ مطلقاً بھی احرام درست ہے۔ یعنی صرف احرام کی نیت ہو، (حج یا عمرہ وغیرہ کی تعیین نہ ہو)، مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ (حجۃ الوداع میں) نکلے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”جو حج و عمرہ کا احرام باندھنا چاہے باندھے، جو حج کا احرام باندھنا چاہے تو وہ باندھے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا

چاہے وہ وہی باندھے" امام شافعیؒ کی روایت میں ہیکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام احرام باندھ کر (تلبیہ پڑھتے ہوئے) وحی کا انتظار کرتے ہوئے نکلے، تو یہ حکم ہوا کہ جس کے پاس ہدی کا جانور نہ ہو وہ اپنا احرام عمرہ کا کر دے، اور جس کے پاس ہدی ہو، وہ حج کا کرے۔"

بغیر تعیین کے مطلقاً حج کے مہینوں میں احرام باندھا تو اس احرام کو حج یا عمرہ یا دونوں، جو چاہے قرار دے، پھر اس کے اعمال انجام دے، تعیین سے قبل عمل معتبر نہ ہوگا، اگر حج کا وقت باقی نہ ہو تو عمرہ قرار دے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ ایام میں مطلق احرام باندھے تو وہ عمرہ شمار ہوگا۔ حج کے ایام آنے کے بعد اسے حج کی طرف نہیں پھیر سکتا۔

کسی نے مثلاً یہ کہا کہ میں نے زید کی طرح احرام باندھا، تو یہ صحیح ہے اور زید محرم ہے تو اس کا احرام بھی اسی قسم کا شمار ہوگا اگر محرم نہیں یا احرام فاسد ہے تو مطلق محرم ہوگا۔ اگر زید کے احرام کی معرفت اس کی موت یا جنون وغیرہ کی وجہ سے متعذر اور مشکل ہو، تو قِران کی نیت کر کے اس کے اعمال انجام دے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے آپ ﷺ کے احرام کی طرح احرام باندھا، تو آپ ﷺ نے اس کی تحسین فرمائی۔(شیخین)

احرام کی سنتیں

(۱) دل سے نیت واجب ہے، ساتھ میں زبان سے بھی ادا کرنا سنت ہے لہٰذا یوں کہے: "نَوَیْتُ الْحَجَّ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے حج کی نیت کی اور اللہ کے لئے اس کا احرام باندھا) عمرہ میں یہ کہے۔ "نَوَیْتُ الْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهَا لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے عمرہ کی نیت اور اللہ کے لئے اس کا احرام باندھا) قِران یعنی حج وعمرہ دونوں ایک ساتھ ہوں تو یوں کہے۔ "نَوَیْتُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ وَاَحْرَمْتُ بِهِمَا لِلّٰهِ تَعَالٰی" (میں نے حج وعمرہ کی نیت کی اور اللہ کے لئے ان دونوں کا احرام باندھا) نیت کے بعد متصلاً تلبیہ پڑھے اور اس تلبیہ میں اپنے احرام کی نوعیت بھی ذکر کرے۔ مثلاً حج ہے تو "لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ بِحَجَّةِ الخ" عمرہ ہے تو "لَبَّیْک اَللّٰهُمَّ بِعُمْرَةٍ لَبَّیْكَ الخ" اور دونوں ہے تو لَبَّیْک اَللّٰهُمَّ بِحَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ لَبَّیْک الخ" اس پہلے تلبیہ کو زور سے نہ پڑھے، آہستہ پڑھے۔ آئندہ تلبیہ کے کلمات زور سے پڑھے۔ احرام کی نوعیت کا ذکر صرف اس پہلے تلبیہ میں مستحب ہے۔ آئندہ تلبیہ میں مستحب نہیں اگر کسی دوسرے کی جانب سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ رہا ہے تو یوں نیت کرے۔ "نَوَیْتُ الْحَجَّ (الْعُمْرَةَ) عَنْ فُلَانٍ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ عَنْهُ، لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ عَنْ فُلَانٍ الخ" (میں نے فلاں کی طرف سے حج (عمرہ) کی نیت کی اور اس کی جانب سے احرام باندھا) دونوں لفظ فلاں کی جگہ جس کی طرف سے حج یا عمرہ ادا کر رہا ہے۔ اس کا نام لے۔

طواف اور سعی میں تلبیہ مستحب نہیں کیونکہ ان میں مخصوص اذکار پڑھے جاتے ہیں۔

(۲) احرام کے لئے غسل (ورنہ تیمم) کرنا سنت ہے۔ اس غسل کا ترک مکروہ ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ ہر سنت جس کا بالقصد حکم ہو، اس کا ترک مکروہ ہے، امام ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ مطلوبہ مواقع میں غسل ترک نہ کرے، کیونکہ ان غسلوں کا قلوب کی نورانیت اور غفلت کے ازالہ میں بڑا دخل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے احرام کے لئے کپڑے تبدیل کئے اور غسل فرمایا۔" (ترمذی وحسنه۔ دارقطنی۔ بیہقی۔ طبرانی) یہاں اور آئندہ آنے والے غسلوں میں تیمم کو غسل پر قیاس کیا گیا۔ (لہٰذا مطلوبہ مقامات میں غسل سے مجبور ہو تو تیمم کر لے)۔

درج ذیل موقعوں پر غسل سنت ھے۔

مکہ میں داخل ہونے کے لئے احرام میں ہو یا بغیر احرام کے، جو شخص ذوطویٰ کے راستہ داخل ہو، اسے مقام ذی طوی میں غسل کرنا افضل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ مقام ذی طوی میں رات بسر فرماتے، پھر فجر پڑھ کر غسل فرماتے" (متفق علیہ)

دوسرے راستہ سے آرہا ہو تو ذوطویٰ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں، بلکہ اپنے راستہ میں اسی فاصلہ پر غسل کرلے۔ اگر مکہ سے قریب ہی غسل احرام کر کے احرام باندھے اور مکہ آئے تو دوبارہ دخول کے لئے غسل سنت نہیں لیکن بدن سے بو آرہی ہو تو پھر غسل مسنون ہے۔ مدینہ منورہ اور حرم پاک میں داخل ہونے کے لئے غسل مسنون ہے۔

زوال کے بعد وقوف عرفہ کے لئے، مزدلفہ میں ۱۰/ ذوالحجہ کی صبح یا نصف شب کے بعد اور ایام تشریق میں ہر روز رمی کے لئے غسل سنت ہے۔ ہر دن فجر سے غسل کا وقت شروع ہو گا اور غروب یا رمی کرنے سے وقت ختم ہو گا۔ بطور قربت اور لوگوں کے ان مقامات میں اجماع و بھیڑ کی وجہ سے بدبو کے ازالہ اور نظافت کے لئے غسل کو مسنون قرار دیا۔

(۳) احرام سے قبل ہی موئے زیر ناف، بغل کے بال دور کرے اور مونچھ (مسیں) اور ناخن تراشے ان امور کو غسل سے قبل انجام دے، اگر جنبی نہ ہو تو، ورنہ غسل کے بعد انجام دے، جو حاجی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے قبل یہ امور انجام دے (کیونکہ ذوالحجہ شروع ہونے کے بعد قربانی سے قبل یہ امور مکروہ ہیں)

(۴) احرام کے لئے (احرام سے قبل) بدن میں خوشبو استعمال کرنا مرد و عورت کو سنت ہے۔ اگر اس کے اجزاء باقی رہیں تو بھی حرج نہیں۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے۔ "میں آپ ﷺ کو احرام کے لئے احرام سے قبل خوشبو لگاتی تھی اور تحلل (احرام کھولنے کے وقت) کے لئے بیت اللہ کے طواف سے قبل خوشبو لگاتی۔" (متفق علیہ)

کپڑے میں خوشبو لگانا اور بعد میں بدن یا کپڑے کی اس خوشبو کو باقی رکھنا حلال ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ "گویا کہ میں خوشبو کی چمک کو آپ ﷺ کے مانگ میں احرام کی حالت میں دیکھ رہی ہوں۔" اگر احرام کے بعد بدن یا کپڑے سے اس خوشبو کو ہٹا کر دوبارہ استعمال کرے، یا خوشبو دار کپڑا اتار کر پھر دوبارہ پہنے، تو فدیہ لازم ہو گا۔ کپڑے میں خوشبو باقی نہ ہو، لیکن پانی چھڑکنے سے ظاہر ہو سکتی ہو، تو پہننا ممنوع ہے ورنہ نہیں۔

(۵) عورت کو احرام کے لئے دونوں ہاتھ گٹوں تک مہندی سے رنگنا مسنون ہے کیونکہ کبھی ان کے کھلنے کی نوبت آتی ہے۔ اور ابن عمر نے اسے سنت قرار دیا ہے۔ چہرے پر بھی کچھ مہندی لگائے، کہ اس کے کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ تو چمڑی کا رنگ مہندی کے رنگ سے چھپ جائے گا، (مہندی سے بالجملہ ستر کے باوجود اجنبی مرد کو دیکھنا جائز نہیں) احرام کے بعد مہندی مکروہ ہے، کیونکہ یہ زینت ہے۔ اور محرم پر اگندہ اور غبار آلود ہوتا ہے۔ لیکن لگائے تو فدیہ واجب نہیں، مرد اور خنثی کو مہندی سنت نہیں بلکہ حرام ہے۔

احرام اور غیر احرام میں مرد کے لئے بغیر عذر کے ہاتھ پیر جیسے اعضاء میں مہندی لگانا حرام ہے اور سر، داڑھی کے بالوں میں لگانا جائز بلکہ سنت ہے۔ جیسا کہ امام نووی ؒ نے شرح مہذب میں صراحت فرمائی ہے۔ شادی شدہ عورت کے لئے نقش و نگار، سیاہ رنگنا، پوروں کو

مہندی اور سیاہی ملا کر رنگنا اور چہرہ کو سرخ رنگنا سنت نہیں، شوہر کی اجازت کے بغیر یہ امور حرام ہیں۔ جیسا کہ غیر شادی شدہ کے لئے حرام ہیں۔

(۶) مرد احرام سے پہلے ہی محیط کپڑے (جو بدن کو گھیرے) اتار دے، تاکہ احرام کی حالت میں ان کا پہننا نہ پایا جائے، جو کہ حرام ہے۔ زیادہ معتمد قول یہ ہے کہ یہ اتارنا واجب ہے لیکن بعض علماء نے اسے سنت قرار دیا ہے۔

(۷) مرد کو احرام کے لئے سفید تہبند اور سفید چادر اوڑھنا (اور چپل پہننا) سنت ہے، جو جدید ہوں، ورنہ دھلے ہوئے۔

حدیث: ''تم میں سے کوئی تہہ بند، چادر اور چپل میں احرام باندھے'' (ابو عوانه فی صحیحه)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا ہے۔

(۸) احرام سے قبل (یعنی حج یا عمرہ کی نیت سے قبل) احرام کی دو رکعت سنت ادا کرے، جبکہ مکروہ وقت نہ ہو۔ اگر حرم مکہ میں ہے تو کسی بھی وقت پڑھ سکتا ہے۔ اگر نماز اور احرام میں عرفاً زیادہ فاصلہ ہو جائے تو یہ فوت ہو جائے گی۔ دوبارہ اعادہ سنت ہے۔ تاکہ احرام اس کے بعد پایا جائے۔ کسی فرض نماز یا سنت نماز کے بعد احرام باندھے تو یہ بھی کافی ہے۔ اس نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں اخلاص پڑھنا سنت ہے۔

سنتِ احرام کی دو رکعت کی روایت مسلم میں حضرت جابر سے، صحیحین میں ابن عمر سے اور ابو داود، احمد اور حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(۹) نماز کے بعد جب حاجی مکہ کی طرف اپنا سفر شروع کرے، (پیدل ہو یا سواری پر) اس وقت احرام (یعنی حج و عمرہ کی نیت) افضل ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کی سواری جب آپ ﷺ کو لے کر اٹھی، اسی وقت آپ ﷺ نے نیت کی (اور تلبیہ شروع کیا)۔ (متفق علیہ)

تلبیہ

مُحرِم کے لئے تلبیہ کی کثرت سنت ہے، جیسا کہ آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ (رواہ مسلم) مرد کو بلند آواز سے تلبیہ سنت ہے، کیونکہ جبرئیل امین نے آپ ﷺ سے کہا کہ صحابہ کرام کو بآواز بلند تلبیہ کا حکم دیں (مؤطا، احمد، اصحاب السنن وقال الترمذی ہذا حدیث صحیح) اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ تکلیف اور ضرر نہ ہو۔ اگر کسی قاری، ذاکر، نمازی، طائف یا سونے والے کو زور سے تلبیہ پڑھنے سے زیادہ تشویش اور حرج ہو تو یہ حرام ہے، معمولی تشویش ہو تو مکروہ ہے۔

تلبیہ کی تاکید کے اوقات: تغیر احوال کے وقت تلبیہ کی کثرت زیادہ موکد ہے، مثلاً سوار ہونا، سواری سے اترنا، بلندی پر چڑھنا، نشیب میں اترنا، رفقاء سے ملاقات واختلاط۔ بعد نماز۔ رات کی آمد۔ دن کی آمد۔ سحری کا وقت۔ نیند، بیداری، ہواؤں کا چلنا زوال شمس۔

احرام باندھتے وقت پہلا تلبیہ آہستہ پڑھنا سنت ہے۔ عورت اور خنثیٰ زور سے نہ پڑھیں بلکہ دوسرں کو آواز جائے تو مکروہ ہے۔ دیگر اذکار کی طرح تلبیہ بھی محل نجاست میں زبان سے ادا کرنا مکروہ تنزیہ ہے۔ دل میں اس کا جاری کرنا مکروہ نہیں ہے۔

تلبیہ کے الفاظ: ”لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ، لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَاشَرِیْكَ لَكَ“(متفق علیہ)’وَالْمُلْكَ‘ پر معمولی وقف سنت ہے۔(تحفہ)

ان الفاظ کو تین تین مرتبہ دوہرانا سنت ہے۔ ان کلمات میں کمی بیشی نہ کرنا مستحب ہے ان الفاظ کے پڑھنے کے بعد کچھ اضافہ کرلے تو مکروہ نہیں ہے۔ کیونکہ صحیحین میں ہے۔ کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پر ان الفاظ کا اضافہ فرماتے ” لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ بِیَدَیْكَ وَالرُّغْبَاءُ اِلَیْكَ وَالْعَمَلُ“(الشروانی علی التحفہ)لبیک کا مطلب ہے میں آپ کی اطاعت کا دم بھرتا ہوں۔ اور بار بار آپ کی پکار کو قبول کرکے اس کا جواب دے رہا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”بحکم الٰہی حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام“ نے لوگوں کو حج کی دعوت دی، تو آسمان وزمین کے درمیان سبھی نے سنا، کیا تم لوگوں کو نہیں دیکھتے کہ زمین کے مختلف گوشوں سے تلبیہ پڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

جب کوئی پسندیدہ یا ناپسندیدہ بات دیکھے تو یہ پڑھنا سنت ہے۔”لَبَّیْكَ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْآخِرَةِ“(حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے) میدان عرفات میں جب صحابہ کرام کے جم غفیر کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ادا فرمائے ۔ (الشافعی وغیرہ عن مجاہد مرسلاً) جنگ خندق کے لئے خندق کھودتے وقت شدید پریشانی کے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے(رواہ الشافعی)اگر احرام میں ہے تو لبیک کے ساتھ یہ کلمہ پڑھے، ورنہ ”اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْآخِرَةِ“ پڑھے۔

تلبیہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آل واصحاب پر دورد پڑھے، اسے بھی تین مرتبہ پڑھنا افضل ہے، کوئی سادرود پڑھ سکتا ہے، لیکن دورد ابراہیمی افضل ہے۔ درود کے بعد اللہ تعالیٰ سے جنت اور اس کی رضا مندی کی دعا کرے اور جہنم سے اللہ کی پناہ چاہے،(رواہ الشافعی وغیرہ قال فی المجموع وضعفہ الجمہور)

مثلاً یوں دعا پڑھے:”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ سَخَطِكَ وَالنَّارِ“(اے اللہ۔ میں تجھ سے تیری رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں اور تیرے غضب اور جہنم کی آگ سے تیری پناہ چاہتا ہوں) دوران تلبیہ گفتگو مکروہ ہے۔ البتہ سلام کا جواب مستحب ہے۔ لیکن تلبیہ مکمل کرکے جواب دینا بہتر ہے۔ دوران تلبیہ سلام کرنا مکروہ ہے۔(الشیروانی مع التحفہ ۵/۱۰۹)

حج کی صفت

(ابتداء سے انتہا تک ترتیب سے مکمل کیفیت)

حاجی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی اقتداء میں وقوف عرفہ سے قبل مکہ مکرمہ میں داخل ہونا افضل ہے۔ ثَنِیَّۃ کَدَاء کے راستہ مکہ میں داخل ہونا افضل ہے۔(متفق علیہ، عن ابن عمر وعائشہ) چاہے یہ اس کے راستے میں نہ پڑے، غیر محرم کے لئے بھی یہی راستہ افضل ہے۔

جب بیت اللہ پر نگاہ پڑے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھے۔

”اَللّٰھُمَّ زِدْ ہٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفاً وَّ تَعْظِیْماً وَّ تَكْرِیْماً وَّ مَهَابَةً وَزِدْ مَنْ شَرَّفَهُ وَكَرَّمَهُ مِمَّنْ حَجَّهُ اَوِ اعْتَمَرَهُ تَشْرِیْفاً وَّ تَكْرِیْماً وَّ تَعْظِیْماً وَّ بِرًّا“(رواہ الشافعی والبیہقی وقال انہ منقطع) پھر یہ پڑھے۔”اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ“(قالہ عمر رضی اللہ عنہ رواہ عنہ البیہقی قال فی المجموع واسنادہ لیس بقوی)

پھر مسجد حرام میں باب بنی شیبہ سے داخل ہو (جس کا نام آج کل باب السلام ہے۔برماوی)
آپ ﷺ اسی دروازے سے داخل ہوئے۔(رواہ البیہقی باسناد صحیح۔طبرانی)
یہ دروازہ کعبۃ اللہ کے دروازہ اور حجر اسود کی طرف ہے جب اپنی بستی میں جانے کے لئے مسجد حرام سے نکلے تو باب الحَزْورہ (باب الوادع) یہاں سے مشکل ہو تو باب بَنِی سَہم (باب العمرۃ) سے نکلے۔

طوافِ قدوم: مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد پہلے طواف قدوم کرے، یہ طواف سنت ہے، بعضوں نے اسے واجب کہا ہے۔اسی لئے اس کا ترک مکروہ ہے۔

حدیث: مکہ مکرمہ میں تشریف آوری کے بعد آپ ﷺ نے وضو کر کے پہلے بیت اللہ کا طواف کیا۔(متفق علیہ)
بیت اللہ کا تحیہ طواف ہے۔طواف کے بعد کی دو رکعت سنت ادا کرنے میں تحیۃ المسجد بھی حاصل ہو گی۔اسی لئے داخل ہونے کے بعد پہلے تحیۃ المسجد پڑھنے کے بجائے طواف کر لے۔

ان اعذار کی صورتوں میں طواف کو ان سے مؤخر کرلے: کسی فرض یا جنازہ یا سنت کی جماعت تیار ہو، کسی نماز کا وقت تنگ ہو (کہ طواف کرنے سے قضاء ہو جائے)، کوئی قضاء نماز یاد آجائے، دورانِ طواف بھی یہ امور پیش آئیں تو پہلے انھیں ادا کرے۔بیٹھ جانے اور تاخیر کی وجہ سے طوافِ قدوم فوت نہ ہو گا۔البتہ اس سے قبل وقوفِ عرفہ ہو تو یہ فوت ہو گا۔طوافِ قدوم کو طواف قادم، طوافِ ورود، طوافِ وارد اور طواف تحیہ بھی کہتے ہیں۔

طوافِ قدوم حلال (بلا احرام شخص) کے لئے اور اس حاجی کے لئے سنت ہے جو وقوفِ عرفہ سے قبل مکہ میں جائے۔وقوفِ عرفہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والے حاجی اور عمرہ کرنے والے شخص کے لئے یہ مطلوب نہیں، کیونکہ ان دونوں کے لئے فرض طواف کا وقت ہے۔

جو شخص حج و عمرہ کے علاوہ کسی اور مقصد سے (مثلاً کسی کی ملاقات یا تجارت وغیرہ کے لئے) حرم مکہ کا ارادہ کرے، اسے حج یا عمرہ کا احرام سنت ہے۔اس کا ترک مکروہ ہے۔بار بار جانا پایا جائے یا نہیں۔(کئی ائمہ کرام اس کے وجوب کے قائل ہیں۔)

طواف کے واجبات

طواف کے واجبات آٹھ ہیں۔

(۱) ستر عورت (نماز کی طرح)

(۲) حدثِ اصغر اور اکبر سے پاکی (یعنی باوضو ہو اور غسل کی حاجت نہ ہو) اور نجاست سے پاکی۔کیونکہ آپ ﷺ نے طواف کو نماز قرار دیا۔(ترمذی، حاکم، دارقطنی، وصححہ ابن السکن وابن خزیمہ وابن حبان)

اگر دورانِ طواف بے وضو ہو جائے یا کپڑا یا بدن ناپاک ہو جائے، تو دوبارہ پاکی حاصل کر کے سابقہ طواف پر بناء کرے، خواہ عمداً اس طرح کیا ہو، چاہے فاصلہ کم ہو یا زیادہ، کیونکہ طواف میں وضو کی طرح موالات (پےَ در پےَ) شرط نہیں۔(مثلاً تین چکر کے بعد وضو ٹوٹے تو اب وضو کر کے بقیہ چار چکر پورے کر لینا کافی ہے۔) لیکن از سر نو طواف دوہرانا سنت ہے تاکہ جن علماء نے اسے واجب کہا ہے ان کے اختلاف سے بچ جائے اگر طوافِ رکن (طوافِ افاضہ) سے قبل عورت کو حیض شروع ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے پاکی تک رکنا نا

ممکن ہو (مثلاً خرچ کی رقم ختم ہو جائے۔ ساتھی سب نکل جائیں۔ ٹکٹ میں اتنی تاخیر کی گنجائش نہ ہو وغیرہ) تو وہ امام ابو حنیفہؒ یا امام احمدؒ کے ایک روایت کی تقلید کرتے ہوئے اسی حال میں طواف کر لے اور اس پر ایک اونٹ کا دم لازم ہو گا۔ اور اس حال میں مسجد میں داخل ہونے کی وجہ سے گنہگار ٹھہرے گی۔ (حاشیۃ الشیروانی مع التحفہ ۱۳۰/۵)

(۳) طواف میں آگے کی طرف چلتا رہے اور بیت اللہ اس کی بائیں جانب ہو، اس کا مکمل بدن کعبہ سے باہر اور الگ ہونا واجب ہے لہٰذا شاذروان اور حجر (حطیم) کے باہر سے طواف کرے، کعبہ کی دیوار سے باہر تقریباً دو تہائی ہاتھ حصہ قریش نے تعمیر کعبہ کے وقت مصارف کی تنگی کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، جسے کعبہ کے اطراف میں بالکل پست دیوار نما کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ اسے ہی شاذروان کہتے ہیں۔ اسی طرح حطیم کا حصہ بھی حقیقۃً بیت اللہ میں داخل ہے۔ جسے قریش نے قلتِ رقم کی وجہ سے خارج کر دیا (صحیحین)

اگر کوئی کعبہ کی طرف رخ کر کے (سر کتا ہوا) طواف کرے یا کعبہ کی طرف پشت کر لے یا کعبہ کو اپنے دائیں طرف کرے یا بائیں طرف کر کے رکن یمانی کی طرف پیچھے چلتا ہوا طواف کرے تو ان صورتوں میں طواف صحیح نہ ہو گا کیونکہ یہ شرعی طواف کی کیفیت کے مخالف ہے۔

(۴) طواف کی ابتداء حجر اسود سے ہو اس کا بدن حجر اسود کے محاذات میں (بالمقابل) ہو کر گذرے، کسی اور جگہ سے طواف شروع کرے تو معتبر نہ ہو گا، جب طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کے پاس پہنچے تو اب طواف شروع ہو گا، اگر حجر اسود اپنی جگہ سے زائل ہو جائے۔ (والعیاذ باللہ) تو اس کی جگہ سے طواف شروع کرے اور اس صورت میں اسی جگہ کا استلام، بوسہ اور اس پر سجدہ کرنا (یعنی اپنی پیشانی کا اس پر رکھنا) سنت ہو گا۔

(۵) بالیقین سات چکر ہوں۔ اگر شک ہو تو کم پر بنا کرے جیسا نماز کی رکعت میں (مثلاً ۴ چکر ہوئے یا ۵ شک ہو تو ۴ مان کر مزید ۳ چکر پورے کرے)۔ اس کا خیال ہو کہ طواف مکمل ہو چکا اور دوسرا معتبر شخص کہے کہ ۶ چکر ہوئے تو مزید ایک چکر لگا لینا سنت ہے۔ طواف مکمل ہونے کے بعد تعداد میں شک ہو تو کوئی حرج نہیں۔

(۶) طواف مسجد کے اندر ہو، چاہے مسجد جتنی وسیع ہو، البتہ حرم کے حدود میں طواف ہونا ضروری ہے۔ اگر مسجد کی چھت پر طواف کرے (اگرچہ چھت کعبہ سے بلند ہو)، یا طواف کرنے والے اور کعبہ کے درمیان کچھ حائل ہو، (مثلاً ستون وغیرہ) تب بھی طواف صحیح ہے، لیکن مکروہ ہے بلکہ خارج مطاف طواف مکروہ ہے۔ گرچہ کچھ حائل نہ ہو، کیونکہ بعض علماء کے نزدیک بغیر مطاف کے طواف صحیح نہ ہو گا۔

(۷) نیت: اگر مستقل طواف کرے تو نیت واجب ہے، حج یا عمرہ کا فرض طواف یا طوافِ قدوم ہو تو نیت واجب نہیں، کیونکہ حج و عمرہ کی نیت اس کو بھی شامل ہے۔

(۸) کعبہ کے گرد اپنے چکر کو کسی اور طرف نہ پھیرے۔ مثلاً مقروض کا پیچھا کرنے کی نیت سے چکر لگائے تو یہ طواف شمار نہ ہو گا۔

طواف کی سنتیں

مرض وغیرہ عذر نہ ہو تو مکمل طواف پیدل کرے، آپ ﷺ کی اتباع میں (رواہ مسلم) اور یہ تواضع اور ادب کے بھی زیادہ مناسب ہے، بلا عذر رینگ کر طواف مکروہ ہے اور سوار ہو کر خلاف اولیٰ ہے۔ کسی عذر کی وجہ سے سوار ہو کر طواف میں حرج نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو مرض کی وجہ سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت دی تھی (صحیحین)

طواف کی ابتداء میں حجر اسود کا استلام کرے، بوسہ لے اور اس پر سجدہ کرے (یعنی اپنی پیشانی رکھے)۔ استلام اور بوسہ کا ذکر بخاری

ومسلم کی روایت میں اور سجدہ کا ذکر بیہقی میں موجود ہے، یہ تینوں عورتوں کے لئے مردوں کی غیر موجودگی میں سنت ہے۔ استلام کا مطلب ہے ہاتھ سے چھونا۔ دائیں ہاتھ سے استلام افضل ہے۔ دایاں نہ ہو (یا کچھ مجبوری ہو) تو بائیں سے کرلے۔ تینوں ممکن نہ ہو تو جو ممکن ہو اس پر عمل کرے۔ ہاتھ سے استلام نہ کرسکے اور ہاتھ میں لکڑی وغیرہ ہو تو اس سے استلام کرکے اسے بوسہ دے۔ اس سے بھی عاجز ہو تو دائیں ہاتھ سے یا ہاتھ میں جو چیز ہو اس سے حجر اسود کی طرف اشارہ کرکے اسے بوسہ دے۔ استلام، بوسہ اور سجدہ کو ہر چکر میں تین تین مرتبہ انجام دینا سنت ہے۔ تین مرتبہ استلام، پھر تین مرتبہ بوسہ پھر تین مرتبہ سجدہ افضل ہے یا ایک مرتبہ استلام پھر بوسہ پھر سجدہ کرے اسی ترتیب سے تین مرتبہ۔

حدیث: آپ ﷺ نے اونٹنی پر طواف فرمایا، پس جب بھی حجر اسود پر پہنچتے اپنے پاس کسی چیز سے اس کی طرف اشارہ کرتے اور تکبیر پڑھتے۔ (بخاری)

رکنِ یمانی کا استلام کرے اور بعد میں ہاتھ کو بوسہ دے۔ (صحیحین) اگر استلام نہ کرپائے تو ہاتھ سے یا کسی چیز سے اشارہ کرکے اسے بوسہ دے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حجرِ اسود کے علاوہ کہیں بوسہ لینا سنت نہیں اور حجر اسود اور رکنی یمانی کے علاوہ کسی حصہ کا استلام سنت نہیں۔ اس کی خلاف ورزی مکروہ نہیں، مباح ہے۔

طواف کی ابتداء میں استلام کے وقت یہ پڑھے۔ ”بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَر ! اَللّٰهُمَّ اِيۡمَاناً بِكَ وَ تَصۡدِيۡقاً بِكِتَابِكَ وَوَفَاءً بِعَهۡدِكَ وَاِتِّبَاعاً لِّسُنَّةِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ “ (سلف وخلف کا اس پر عمل رہا ہے۔) کعبہ کے دروازے کے سامنے پہنچے تو یہ پڑھے ” اَللّٰهُمَّ الۡبَيۡتُ بَيۡتُكَ وَالۡحَرَمُ حَرَمُكَ ، وَالۡاَمۡنُ اَمۡنُكَ وَ هٰذَا مَقَامُ الۡعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ “ (ہذا کہتے وقت دل سے مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کرے)۔

دونوں رکن یمانی کے درمیان (یعنی رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان) یہ دعا سنت ہے۔ ”رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ “ (رواہ ابوداود)

اس کے علاوہ اپنے اور دوسروں کے لئے جائز دعا، جو چاہے مانگتا رہے، آخرت کی دعا پر اکتفاء کرنا افضل ہے۔ آپ ﷺ یا صحابہ کرام سے منقولہ دعا وذکر کا پڑھنا افضل ہے۔ اس کے بعد تلاوت افضل ہے۔ تلاوت کے بعد غیر منقولہ دعا افضل ہے یہ سب سراً (آہستہ آواز میں) سنت ہے، کہ خشوع کے لئے بہتر ہے کسی کو تکلیف نہ ہو تو اوروں کی تعلیم کے لئے جہراً سنت ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہاں ۱۵ ر جگہ دعا مقبول ہوتی ہے۔ مطاف میں، ملتزم کے پاس، میزاب تلے، کعبہ میں، زمزم کے پاس، صفا پر، مروہ پر، محل سعی میں، مقام ابراہیم کے پاس، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں، اور تینوں جمروں کے پاس۔

استلام اور بعد کے سارے امور کی رعایت ہر چکر میں سنت ہے۔ لیکن پہلی مرتبہ زیادہ موکّد ہے۔

رَمَل: جس طواف کے بعد سعی کرنا ہو اس طواف کے پہلے تین چکروں میں مردوں کو رمل سنت ہے۔ عمرہ میں آتے ہی جو طواف کریگا، اس میں اور حج میں طواف قدوم کے بعد سعی کرنا ہو تو اس میں اور طواف افاضہ کے بعد سعی کرنا ہو تو طواف افاضہ میں رمل کرے۔ (مکہ سے ہی حج کا احرام باندھنے کی صورت میں طواف میں رمل ہوگا۔)

حدیث: آپ ﷺ نے حجر اسود سے حجر اسود تک تین چکروں میں رمل کیا اور چار میں (عام رفتار سے) چلے“ (متفق علیہ)

رمل کا مطلب ہے قریب قریب قدم رکھتے ہوئے تیز رفتاری سے چلنا، اور کاندھوں کو ہلانا، رمل کو ترک کرنا یا زیادہ تیز رفتاری اختیار

کرنا مکروہ ہے۔

بقیہ چار چکر عام رفتار سے چلے۔ ابتدائی تین چکروں میں رمل نہ کرے، تو بقیہ میں اس کی تلافی نہ کرے، کیونکہ بقیہ چکروں میں سکینہ سے چلنا مطلوب ہے، لہٰذا اسے تبدیل نہ کرے۔ رمل میں یہ دعا پڑھے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجاً مَبْرُوْراً وَّ ذَنْباً مَغْفُوْراً وَّ سَعْياً مَّشْكُوْراً" بقیہ چار چکروں میں یہ پڑھے۔ "رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

جس طواف میں رمل سنت ہے، اس پورے طواف میں مرد کے لئے اضطباع سنت ہے۔ (ابوداود) اس کے بعد سعی میں بھی اضطباع کرے۔ (طواف پر قیاس کرتے ہوئے)

اضطباع: چادر کا درمیانی حصہ دائیں بغل کے نیچے لے اور دونوں کنارے بائیں کاندھے پر ڈال دے۔

طواف اور سعی کے درمیان طواف کی دو رکعت نماز میں اضطباع نہ کرے کہ نماز میں مکروہ ہے۔

مرد تبرکاً کعبہ سے قریب ہو کر طواف کرے، اس سے استلام اور بوسہ میں بھی سہولت رہے گی۔ البتہ بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے خود کو تکلیف ہو یا اپنے سے کسی اور کو تکلیف پہنچے تو دوری بہتر ہے۔ قریب سے طواف کی صورت میں بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے رمل نہ کر سکے اور انتظار کرنے کی صورت میں آگے کشادگی حاصل ہو کر رمل کی گنجائش نہ ہو، تو دوری کے ساتھ طواف کرنا تاکہ رمل کی سنت حاصل ہو، زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ رمل کا تعلق براہِ راست عبادت سے ہے۔ اور قرب کا تعلق مقام عبادت سے، دوری میں عورت کے لمس کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہو، تو قریب طواف کرنا بہتر ہے۔ اگرچہ رمل فوت ہو۔ جب رمل نہ کر سکے تو چلنے میں حرکت کرنا اور سوچنا کہ ممکن ہوتا تو رمل کرتا، سنت ہے، یہی مسئلہ سعی کے دوران دوڑنے کا ہے۔ (جیسا کہ آئے گا)

عورت کو رمل واضطباع مکروہ ہے، بلکہ مرد کی مشابہت کے قصد سے ہو تو حرام ہے۔ عورت کو مطاف کے کنارے سے طواف سنت ہے تاکہ مردوں سے اختلاط نہ ہو، اگر مطاف مردوں سے خالی ہو تو اسے بھی قرب سنت ہے۔

طواف کے تمام چکروں میں، اس کے بعد دو رکعت نماز میں، بعد میں استلام میں اور پھر سعی میں آپس میں موالات (پئے در پئے اور تسلسل) سنت ہے۔

طواف کے بعد دو رکعت نماز سنت ہے، یہ نماز مقام ابراہیم کے پیچھے افضل ہے۔ (صحیحین)

مقام ابراہیم کے پاس نہ پڑھے تو حجر (حطیم) میں ورنہ پھر مسجد حرام میں، ورنہ پھر حرم پاک میں، ورنہ جہاں چاہے اور جب چاہے پڑھے۔ اس کے موت تک وقت باقی ہے۔ کوئی مقام ابراہیم کے پاس بیٹھا رہے اور اس سے دوسروں کو وہاں سنت طواف کی فضیلت میں رکاوٹ ہو تو یہ حرام ہے۔ (جمل ۳/۵۷۱)

طواف کی دو رکعت میں سورہ کافرون اور سورۂ اخلاص تلاوت کرے (رواہ مسلم) رات میں اور فجر سے طلوع تک (یعنی غروب سے سورج نکلنے تک) اس نماز کو جہراً پڑھے، طلوع سے غروب تک سراً پڑھے اگر طواف کے بعد کوئی فرض نماز یا نفل پڑھے اور اس کی بھی نیت کر لے تو یہ کافی ہے، نیت نہ ہو تو طلب ساقط ہوگی۔

طواف میں سکون و وقار ملحوظ رکھے، بجز خیر کے گفتگو نہ کرے، عمرہ کرنا طواف سے افضل ہے۔ جبکہ دونوں کا وقت مساوی ہو۔ وقوف عرفہ طواف سے افضل ہے۔ طواف میں اپنی نگاہ کی حفاظت کرے، کسی پرائی عورت یا امردِ حسین پر نگاہ نہ ڈالے، اپنے نگاہ و دل کو

ضعفاء وناقص الخلقت افراد کی تحقیر سے محفوظ رکھے، مسائل سے ناواقف افراد کو حقیر نہ جانے، بلکہ نرمی سے اسے مسئلہ سمجھائے۔

طواف کے مکروھات: طواف میں بلا عذر تھوکنا، دونوں ہاتھ پشت پر کندھوں پر باندھنا، ہاتھوں کو منہ پر رکھنا، انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسانا، انگلیاں چٹخانا (بجانا)، بول وبراز کی حاجت کو روک کر طواف کرنا، اور کھانا حاضر ہو اور اس کی طرف اشتیاق ومیلان ہو تو اسے چھوڑ کر طواف کرنا اور طواف میں کھانا پینا مکروہ ہے۔ جمائی کی وجہ سے منہ پر ہاتھ رکنا مستحب ہے، تھوک کی ضرورت پیش آئے تو اپنے کپڑے میں تھوکے۔ مطاف میں تھوکنا حرام ہے۔ ہاتھوں کو پشت پر باندھنا طواف کے علاوہ بھی مکروہ ہے۔

کئی طواف مسلسل کرے تو ہر طواف (سات چکر) کے بعد دو رکعت پڑھنا افضل ہے ورنہ پھر سارے طواف کے بعد ہر ہر طواف کی دو دو رکعت پڑھے، سارے طواف کی طرف سے آخر میں دو رکعت پڑھ لے، تو یہ بھی کافی ہے۔ طواف دن رات میں کسی بھی وقت جائز ہے، کسی وقت مکروہ نہیں پیدل، سوار یا رینگتے ہوئے عذر کی وجہ سے یا بلا عذر طواف جائز ہے۔

مُلۡتَزَم

طواف کی دو رکعت سے قبل ملتزم پر آئے، جو حجر اسود اور دروازہ کے درمیان کی جگہ ہے۔ اپنے چہرے اور سینہ کو کعبہ کی دیوار سے چمٹائے اور دایاں رخسار اس پر رکھے، دایاں ہاتھ دروازے کی طرف اور بایاں حجر اسود کی طرف پھیلائے اور پردہ سے چمٹ کر دعا مانگے۔ ”اَللّٰھُمَّ رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ أَعۡتِقۡ رَقَبَتِیۡ مِنَ النَّارِ وَاَعِذۡنِیۡ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ وَ وَسَاوِسِہٖ“ (اے اللہ۔ اس بیت عتیق کے رب، میری گردن جہنم سے آزاد کر اور شیطان مردود اور اس کے وساس سے پناہ عطا فرما) جو جو دعا چاہے مانگے۔

ایک دوسرے کو اٹھا کر طواف کرانا

حامل: اٹھانے والا، محمول: جس کو اٹھایا جائے (کاندھے پر یا گود میں یا پالکی وغیرہ میں) بیمار یا چھوٹا بچہ ہونے کی وجہ سے یا بغیر کسی عذر کے ایک شخص یا زائد اشخاص دوسرے کو اٹھا کر طواف کریں، تو اس کی مختلف درج ذیل صورتیں ہونگی۔

حامل کی صورتیں: (۱) حلال ہو (۲) محرم ہو اور اپنا طواف کر چکا ہو (۳) محرم ہو اور اپنے طواف کا وقت نہ ہوا ہو (۴) محرم ہو اور اپنے طواف کا وقت ہوا ہو، لیکن ابھی اپنا طواف نہ کر چکا ہو۔

اور محمول محرم ہو، اس کے طواف کا وقت ہو چکا ہو لیکن ابھی طواف باقی ہو، اب حامل محمول کے طواف کی نیت کرے، یا مطلق ہو (کسی کی تعیین نہ ہو)، یا دونوں کی کرے یا صرف اپنی تو یہ چار صورتیں ہوئیں۔ اس کو پہلے چار میں ضرب دیں تو ۱۶ر شکلیں ہوئیں، پھر جن صورتوں میں حامل نے محمول کے لئے نیت کی ہو، یا مطلق نیت ہو تو محمول کا طواف شمار ہو گا، ان دو کو ابتدائی چار میں ضرب دینے سے ۸ر شکلیں نکلیں۔ اس میں ایک شکل میں حامل کا طواف شمار ہو گا۔ جبکہ نیت مطلق ہو اور محرم حامل کے طواف کا وقت ہوا ہو اور ابھی اس کا طواف باقی ہو۔ اور جب اپنے یا دونوں کے طواف کی نیت کرے تو حامل کا طواف شمار ہو گا، ان دو صورتوں کو ابتدائی چار میں ضرب دینے سے آٹھ شکلیں ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ ۱۶ میں ۹ شکلوں میں حامل کا اور ۷ر شکلوں میں محمول کا طواف شمار ہو گا (اور دونوں کا طواف نہ ہو گا۔ کسی ایک ہی کا ہو گا۔) (حاشیۃ الشیروانی علی التحفہ ۱۶۶/۵)

اگر سعی میں کوئی دوسرے کو اٹھا کر چلے تو اس میں بھی مذکورہ بالا تفصیل پر عمل ہو گا۔

اگر کسی گاڑی یاسائیکل کرسی وغیرہ پر بٹھا کر کوئی کھینچے یا دھکیلے تو اس صورت میں دونوں کا طواف ایک ساتھ ہوگا۔

صفا ومروہ کی سعی

آیت: ”اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا“(البقرہ۔ ۱۵۸) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں ان دونوں کے درمیان آمدورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے)۔

حدیث: آپ ﷺ حج یا عمرہ میں آنے کے بعد پہلے طواف میں تین چکر رمل کرتے اور چار عام رفتار سے چلتے پھر دو رکعت نماز ادا کرتے پھر صفاومروہ کے درمیان سعی فرماتے (متفق علیہ)

طواف اور نمازِ طواف سے فارغ ہو کر حجر اسود کا استلام کرنا سنت ہے، پھر باب الصفا سے سعی کرنے کے لئے نکلے، آپ ﷺ کی اتباع میں۔(رواہ مسلم)

سعی کے شرائط: (۱) صفا سے ابتداء کرے (۲) مروہ پر ختم کرے، اس کے برعکس مروہ سے شروع کرے تو پہلا چکر شمار نہ ہوگا۔(۳) سات چکر لگائے، صفا سے مروہ تک ایک چکر پھر مروہ سے صفا تک دوسرا چکر شمار ہوگا، اسی طرح سات چکر مکمل کرے۔ جو مروہ پر مکمل ہوگا۔

حدیث: آپ ﷺ نے صفا سے ابتداء فرمائی اور مروہ پر ختم کیا،(مسلم)

(۴) طوافِ رکن (طوافِ افاضہ) یا طوافِ قدوم کے بعد سعی کرے، طوافِ قدوم اور سعی کے درمیان وقوفِ عرفہ حائل نہ ہو۔ لہٰذا طوافِ قدوم کے بعد سعی کرنا ہو تو وقوف سے پہلے ہی کرلے کیونکہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا اور آپ کا فرمان ہے کہ ”اپنے مناسک (حج وعمرہ کے اعمال) کو مجھ سے حاصل کرو“۔ اگر طوافِ قدوم کے بعد وقوف پایا جائے تو اب طوافِ فرض کے بعد ہی سعی کر سکتا ہے۔ نفلی طواف کے بعد سعی ناکافی ہے۔ سعی کو دوہرانا سنت نہیں، بلکہ مکروہ ہے۔ اسی لئے طوافِ قدوم کے بعد سعی کی ہو تو طواف رکن کے بعد دوبارہ نہ کرے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔

سعی کے سنن وآداب: مرد کے لئے صفا مروہ پر ایک آدمی کی قامت چڑھ جانا سنت ہے کیونکہ ”آپ ﷺ دونوں پر اسی طرح چڑھے یہاں تک کہ کعبہ نظر آگیا“ (رواہ مسلم) عورت کے لئے یہ سنت نہیں۔ جو اوپر نہ چڑھے اس کے حق میں واجب یہ ہے کہ جہاں سے جارہا ہے اس کو ایڑی اور جہاں جارہا ہے اس کو پنجہ چھو جائے۔

صفاومروہ دونوں جگہ ہر کسی کو ہر چکر میں درج ذیل حدیث میں وارد ذکر سنت ہے۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے... ”جب آپ ﷺ صفا کے قریب پہنچے تو ”اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ“ تلاوت فرمائی، اور فرمایا جہاں سے اللہ نے ابتداء کی (قرآن میں) میں بھی وہیں سے ابتدا کرتا ہوں، پھر صفا پر اتنا چڑھ گئے کہ بیت اللہ نظر آگیا تو قبلہ رو ہو کر توحید وتکبیر کے کلمات کہے اور پڑھا ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر لَا اِلٰه اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ“ پھر دعا مانگی۔ اس طرح تین مرتبہ پڑھا (یعنی ذکر ودعا کو تین مرتبہ دوہرایا)... پھر مروہ پر بھی صفا کی طرح عمل کیا“۔(مسلم۔ابوداود)

ہر چکر کے ابتداء وانتہا میں عام رفتار سے چلے درمیان میں دو سبز نشانات کے درمیان (جو معروف ہیں) مرد تیز دوڑے (رواہ

مسلم) عورت کو دوڑنا سنت نہیں۔

سعی کے دوران یہ دعا پڑھنا سنت ہے ''رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ'' پھر یہ پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجّاً مَبْرُوْراً وَّ ذَنْباً مَّغْفُوْراً وَّ سَعْياً مَّشْكُوْراً وَّ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ يَا عَزِيْزُ يَا غَفُوْرُ ''سعی میں قرآن کی تلاوت افضل ہے۔ سعی کے ساتوں چکروں کو مسلسل (پئے درپئے) ادا کرے۔ اسی طرح طواف اور سعی کے درمیان بھی تسلسل ہو۔

سعی کے لئے طہارت یا ستر شرط نہیں، البتہ طواف کے شرائط اور سنتیں یہاں سنت ہیں سوار ہو کر سعی کرنا جائز ہے، لیکن عذر نہ ہو تو پیدل بہتر ہے، سعی کے دوران گفتگو وغیرہ کے لئے رکنا اور اسکے بعد دو رکعت پڑھنا مکروہ ہے۔

وقوف عرفہ

آیت: (۱) ''فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ...'' (البقرہ۔ ۱۹۸) پھر جب تم لوگ عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو۔

(۲) ''ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' (البقرہ ۱۹۹) پھر (اس میں اور بات بھی یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور رکھا تھا تمام حجاج تو عرفات ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ہی رہ جاتے تھے عرفات نہ جاتے تھے یہ جائز نہیں بلکہ) تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''حج عرفہ ہے۔ جو شب جمع (۱۰/ ذوالحجہ کی شب) فجر سے قبل (عرفہ) پہنچ جائے، اس کا حج مکمل ہوا''۔ (احمد، اصحاب السنن، ابن حبان حاکم، دار قطنی، بیہقی) (حج عرفہ ہے، یعنی وقوف عرفہ حج کا اہم ترین رکن ہے، کہ وہ فوت ہو گیا تو اس سال حج فوت ہو گیا)

(۲) آپ ﷺ نے یوم الترویۃ (۸/ ذوالحجہ) سے قبل خطبہ دیا، جس میں مناسک سے آگاہ فرمایا۔ (حاکم۔ بیہقی)

سنت ہے کہ امام یا اس کا نائب ۷/ ذوالحجہ کو (جس کو یوم الزینۃ کہتے ہیں) ظہر کی نماز کے بعد (اور جمعہ کا دن ہو تو جمعہ کی نماز کے بعد) ایک خطبہ دے، جس میں حجاج کرام کو دوسرے دن ۸/ تاریخ کو (جس کا نام یوم الترویۃ ہے) صبح زوال سے قبل منیٰ روانگی کا حکم دے۔ ۹/ ذی الحجہ کو یوم عرفہ، ۱۰/ کو یوم النحر، ۱۱/ کو یوم القرّ، ۱۲/ کو یوم النفر الاول اور ۱۳/ ذوالحجہ کو یوم النفر الثانی کہا جاتا ہے۔ اس خطبہ میں آئندہ مسجد ابراہیم (نیا نام مسجد نمرہ) کے خطبہ تک کے مناسک سکھلائے سارے خطبوں میں آئندہ کے سارے مناسک واعمال سکھائے، تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ تمتع کرنے والے حضرات اور مکی حضرات کو احرام کے بعد مکہ سے روانگی سے قبل طواف وداع کا بھی حکم دے، کہ یہ ان کے کئے مستحب ہے، لیکن مفرد اور قارن کے لئے مستحب نہیں۔

سنت ہے کہ امام دوسرے دن ۸/ تاریخ کو نماز فجر کے بعد حجاج کرام کو لے کر منیٰ کے لئے روانہ ہو۔ اگر جمعہ کا دن ہو تو جس پر جمعہ لازم ہے وہ قبل فجر ہی روانہ ہو۔ منیٰ میں ظہر سے ۹/ تاریخ کی فجر تک پانچ نمازیں ادا کرے اور شب باشی کرے۔

حدیث: آپ ﷺ منیٰ میں سورج طلوع ہونے تک ٹھہرے رہے۔ (مسلم)

۹/ ذوالحجہ کو سورج کی روشنی پھیلنے کے بعد عرفہ کے لئے روانہ ہو اور عرفہ کے قریب میدانِ نمرہ میں زوال تک رُکے۔ پھر امام لوگوں کے ساتھ مسجد ابراہیم علیہ السلام جائے اور دو خطبہ دے، پہلے خطبہ میں عید کے خطبہ تک آئندہ پیش آنے والے مسائل سے آگاہ

کرے، اور بکثرت دعا و تہلیل کی ترغیب دے، خطبہ خفیف ہو، پھر بقدر سورۂ اخلاص بیٹھ جائے پھر دوسرے خطبہ کے لئے کھڑا ہو تو موذن اذان شروع کرے، اور اذان ختم ہونے تک خطبہ سے بھی فارغ ہو جائے دوسرے خطبہ میں صرف ذکر و دعا مقصود ہے۔ اس لئے ساتھ ہی اذان کو بھی مشروع کیا گیا تاکہ جلد نماز شروع ہو جائے بعد میں ظہر و عصر بطور جمع تقدیم ادا کرے (مسلم)

عرفات و مزدلفہ میں جمع اور قصر سفر کی وجہ سے ہے، لہٰذا جو شرعی مسافر ہو، وہی اس پر عمل کرے۔ جو مکی ہو یا مکہ میں مقیم ہو، وہ جمع و قصر نہ کرے۔ البتہ جو حج کے اعمال سے فارغ ہو کر مدت اقامت تک مکہ میں رُکے بغیر اپنے وطن لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ بھی شرعی مسافر ہے اور جمع و قصر کر سکتا ہے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد غروب تک آپ ﷺ کی اتباع میں عرفات میں وقوف کرے۔ (رواہ مسلم) غروب تک تلبیہ، ذکر واذکار، تلاوت و درود اور دعاؤں میں مصروف رہے۔ ترمذی کی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "افضل دعا عرفہ کے دن ہے۔ اور میں نے اور سابقہ انبیاء کرام نے جو پڑھا اس میں افضل یہ ہے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْر" بیہقی میں یہ اضافہ ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْراً وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْراً وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْراً اَللّٰهُمَّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ (اے اللہ میرے قلب میں نور عطا فرما، اور میرے کان اور میری نگاہ میں، یا اللہ مجھے شرح صدر عطا فرما اور میرے امور آسان فرما)

مستغفری کی روایت میں ہے کہ "جو عرفہ کے دن ہزار مرتبہ قل اللہ احد کی تلاوت کرے، جو مانگے عنایت ہوگا"۔ سورہ حشر کی تلاوت اور تمام مومنین اور مؤمنات کے لئے دعا سنت ہے۔

میدانِ عرفات کا یہ مجمع دنیا کا عظیم ترین مجمع ہے، جس میں اللہ کے اولیاء کرام اور مخصوص بندے بے شمار موجود ہیں، اور یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ وقوف کرنے والے حجاج کرام کی وجہ سے ملائکہ کے روبرو فخر فرماتے ہیں، لہٰذا اپنے ظاہر و باطن کو تمام نامناسب اور مذموم صفات سے فارغ اور پاک وصاف کر کے ممکنہ حد تک خشوع و خضوع اور تذلل وزاری کے ساتھ دعا و ذکر میں خوب کوشش کرے، یہ ایسی مبارک جگہ ہے جہاں آنسو بہائے جاتے ہیں۔ اور لغزشوں کی معافی ہوتی ہے، دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا رہے، دعا وغیرہ کو زیادہ بلند آواز سے نہ پڑھے۔ عذر نہ ہو تو سایہ میں نہ رہے، بلکہ دھوپ میں رہے۔ اس دن خوب صدقہ کرے۔ اور اللہ سے حسنِ ظن رکھے۔ آج کے دن سب سے زیادہ لوگوں کو جہنم سے خلاصی حاصل ہوتی ہے۔ درمیان عرفہ جبل الرحمۃ پر چڑھنے سے گریز کرے، یہ بدعت ہے۔ وقوفِ عرفہ میں طہارت اور استقبال قبلہ کو ملحوظ رکھے۔

مُزدَلِفہ کی روانگی

آیت: "فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُم" (البقرۃ ۱۹۸)
پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر الحرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آخر شب کو وہاں قیام کرکے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقے میں اپنی رائے کو دخل مت دو بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلایا ہے۔

غروب کے بعد عرفات سے مزدلفہ کے لئے روانہ ہو آپ ﷺ کی اتباع میں مغرب وعشاء کو جمع تاخیر کے طور پر مزدلفہ میں ادا کرے۔ (صحیحین) یہ جمع بھی سفر کی وجہ سے ہے نہ کہ حج کی وجہ سے۔ (اس لئے جو شرعی مسافر ہوں، وہی جمع کریں۔ بقیہ حضرات

دونوں نمازیں اپنے وقت میں ادا کریں) سکون و وقار کے ساتھ یہ سفر طے کرے، سامنے راستہ خالی ملے تو رفتار بڑھادے۔

واجب وقوف: وقوف عرفہ میں واجب یہ ہے کہ مُحرِم عبادت کی اہلیت کے ساتھ (گرچہ نیند میں ہو یا کسی اور کام سے وہاں سے گذر جائے) ۹/ ذوالحجہ کے زوال سے ۱۰/ ذوالحجہ کے صبح صادق کے درمیان کسی بھی وقت عرفہ کے کسی بھی حصہ میں پایا جائے۔ (گرچہ ایک لحظہ ہی کیوں نہ پایا جائے) بے ہوش، مدہوش اور پاگل میں چونکہ عبادت کی اہلیت نہیں، اس لئے ان کا وقوف کافی نہ ہو گا۔ البتہ پاگل کا نفل حج شمار ہو گا۔

کوئی غروب سے قبل ہی میدان عرفہ چھوڑ دے اور واپس نہ لوٹے تو اسے دم دینا سنت ہے۔ تاکہ اسے واجب سمجھنے والوں کے اختلاف سے بچ سکے۔ اگر واپس لوٹا گرچہ رات میں ہو تو دم کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس نے وقوف عرفہ مین رات اور دن کے جمع کرنے کی سنت پر عمل کر لیا۔

اگر چاند میں غلطی کی وجہ سے ۱۰/ ذوالحجہ کو وقوف ہو اور ان کی تعداد کم نہ ہو، تو یہ وقوف کافی ہے۔ آئندہ قضا کی ضرورت نہیں۔

مزدلفہ میں شب باشی (مَبِیتِ مُزدَلِفہ)

عرفات سے روانہ ہونے کے بعد رات کے دوسرے نصف حصہ میں (کم از کم) ایک لحظہ مزدلفہ میں رکنا واجب ہے۔ جیساکہ احادیث صحیح کی روسے آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ نصف اول گذرنے کے بعد مزدلفہ سے آگے روانہ ہونا جائز ہے، آئندہ حج کے کئی اعمال انجام دینا ہے، لہٰذا اس تخفیف کو روا رکھا گیا۔ جو نصف ثانی میں مزدلفہ میں نہ ہو، یا نصف ثانی سے قبل ہی روانہ ہو جائے، اور واپس نہ لوٹے تو اس پر دم لازم ہے، کیونکہ ایک واجب ترک ہوا کسی عذر کی وجہ سے وقوف مزدلفہ ترک ہو تو گناہ اور دم لازم نہ ہو گا۔ مثلاً خوف، یا ۱۰/ کی رات کو وقوف عرفات کے لئے پہنچا اور اس میں مصروف ہونے کی وجہ سے وقت پر مزدلفہ نہ پہنچ سکا، یا عرفہ سے طواف رکن کے لئے مکہ مکرمہ چلا گیا، جس سے وقوف مزدلفہ فوت ہو گیا تو کچھ لازم نہیں۔

۱۰/ تاریخ کی رمی کے کنکر مزدلفہ ہی سے رات یا فجر بعد جمع کر لینا سنت ہے، آپ ﷺ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کو یوم النحر کی صبح اپنی رمی کے لئے کنکر چننے کا حکم دیا۔ (رواہ البیہقی وغیرہ باسناد صحیح علی شرط مسلم) عورتوں اور کمزوروں کو نصف شب کے بعد ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دینا سنت ہے، تاکہ بھیڑ بڑھنے سے قبل ہی رمی کر لیں، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی اجازت سے مزدلفہ سے نصف اخیر (نصف ثانی) میں ہی کوچ کر گئیں، آپ ﷺ نے ان کو اور ساتھ جانے والے دیگر حضرات کو دم کا حکم نہ دیا، صحیحین مین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے خاندان کے ضعیفوں (کمزوروں) کے ساتھ مجھے شب مزدلفہ جلد ہی روانہ کر دیا۔

دیگر حجاجِ کرام کو سنت ہے کہ غَلَس (اول وقت) میں فجر پڑھنے تک مزدلفہ میں رُکیں، جیساکہ آپ ﷺ نے کیا۔ (صحیحین) شیخین کی روایت کی روشنی میں یہاں فجر کا وقت ہوتے ہی (تاریکی میں) نماز پڑھنا دیگر ایام کے مقابلہ میں زیادہ موکد اور مطلوب ہے تاکہ آئندہ کے اعمال حج کی ادائیگی کے لئے کشادہ وقت میسر ہو۔

فجر کے بعد تلبیہ کے ساتھ منیٰ کے لئے روانہ ہو، اور جب مشعر الحرام پر پہنچے (جو مزدلفہ کے آخر میں ایک پہاڑی ہے) تو قبلہ رو ہو اور رُک کر اِسفار تک (روشنی پھیلنے تک) ذکر واذکار اور دعا میں مصروف رہے۔ (رواہ مسلم)

پھر طلوع سے قبل سکون سے آگے بڑھے، طلوعِ آفتاب تک رُکنا مکروہ ہے۔ آگے کشادگی نظر آئے تو رفتار تیز کرے۔ راستہ میں وادی مُحَسِّر میں پہنچے تو پیدل و سوار اپنی رفتار تیز کریں، وادی سے پار ہو جائیں تو پھر سکون سے عام رفتار سے آگے بڑھیں۔

سورج نکلنے کے بعد منیٰ پہنچ جائے تو ہر حاجی جمرہ عقبہ پر سات کنکر مارے۔ (رواہ مسلم) رمی کی ابتدا کے ساتھ ہی تلبیہ کا سلسلہ روک دے۔ کیونکہ اب تحلل کے اسباب پر عمل شروع کر چکا، جیسا کہ عمرہ کرنے والا طواف کی ابتدا کے ساتھ ہی تلبیہ روک دیتا ہے۔ ہر کنکر کے ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہے۔ (رواہ البخاری و مسلم) یہ رمی منیٰ کا تحیّہ ہے، لہٰذا منیٰ پہنچنے کے بعد کسی اور کام سے قبل فوراً رمی سے فارغ ہو جائے۔ رمی دائیں ہاتھ سے کرے اور مرد ہاتھ اتنا بلند کرے کہ بغل کی سفیدی نظر آئے۔ عورت ہاتھ اوپر نہ اٹھائے، حلق کے وقت اور اسکے بعد بھی تکبیر پڑھتا رہے، جیسا کہ سلف کا عمل رہا ہے۔ جس کے پاس ہدی کا جانور ہو، اسے ذبح کرے اور سر مونڈے یا بال کترے۔ (حلق یا تقصیر کرے)

آیت: "ثُمَّ لۡيَقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ وَلۡيُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ" (الحج ۲۹) پھر (قربانی کے بعد) لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں۔ (یعنی احرام کھول ڈالیں اور سر منڈا لیں یا بال کٹا دیں اور ناخن اور لب بنوالیں) اور اپنے واجبات کو (خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو، یا بلا نذر ابتداء جو افعال حج کے واجب ہیں جیسے رمی جمار کہ ایام منیٰ میں ہوتی ہے ان سب کو) پورا کریں اور اس مامون گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں (یہ طوافِ زیارت کہلاتا ہے، جو کہ فرض ہے۔)

احادیث: (۱) "حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے اور بعض صحابہ کرام نے سر مونڈا اور بعض صحابہ کرام نے صرف بال کترے۔" (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے حجۃ الوادع میں حلق کرنے والوں کو (سر مونڈنے والوں کو) تین مرتبہ اور کترنے والوں کو ایک مرتبہ دعا دی" (متفق علیہ)

(۳) عورتوں کو حلق مشروع نہیں، وہ صرف بال کتریں" (ابوداؤد۔ دارقطنی۔ طبرانی۔ اسنادہ حسن کما فی التلخیص)

(۴) "آپ ﷺ نے عورتوں کو بال منڈانے سے منع فرمایا"۔ (ترمذی)۔

مذکر کے لئے حلق افضل ہے اور دوسروں کے لئے صرف بال کترنا۔ مجموع میں ہے کہ عورت اور خنثیٰ کو حلق مکروہ ہے۔ عورت کے لئے پیدائش کے ساتویں دن بال کے برابر صدقہ کے لئے اور معالجہ کے لئے حلق مشروع ہے، ورنہ مکروہ ہے، شوہر کی اجازت کے بغیر حرام ہے۔

بال مونڈنے اور کترنے سے مراد احرام کی حالت میں موجود بالوں کا ازالہ کرنا ہے۔ لہٰذا اس وقت (۱۰ر تاریخ کو) بال نہ ہوں، تو بعد میں اگنے والے بالوں کا ازالہ واجب نہیں ہے۔ حلق یا تقصیر سے یہ مقصود نہیں کہ احرام ختم ہونے کی وجہ سے جائز ہو گیا، لہٰذا اس پر عمل کر رہا ہے۔ (بلکہ یہ ایک مقصود و مطلوب عمل ہے) حج و عمرہ کا مستقل رکن اور باعثِ ثواب عمل ہے۔

تنبیہ: کوئی حج سے قبل ایسے وقت عمرہ کرے کہ عمرہ میں حلق کرنے کی صورت میں دوبارہ یوم النحر (۱۰ر ذوالحجۃ) تک دوبارہ سر میں بال نہیں آئیں گے، تو اسے عمرہ میں تقصیر افضل ہے۔

حلق اور تقصیر کی اقل مقدار یہ ہے کہ سر کے تین بال کا ازالہ کرے۔ چاہے لٹک کر سر کے حد سے باہر نکلے ہوں یا الگ الگ مقام سے ازالہ کرے۔ جس کے سر پر بال نہ ہوں اسے استرا پھرالینا مستحب ہے، تاکہ حلق سے مشابہت حاصل ہو۔

پورے سر کا حلق یا تقصیر افضل ہے۔ عورتوں کو بھی پورے سر کے بالوں سے ایک پورے کی مقدار کترنا مستحب ہے۔ داڑھی اور مونچھ کے بال کو کچھ کترنا اور ناخن تراشنا مستحب ہے۔

طوافِ افاضہ

(طوافِ رکن، طوافِ زیارت، طوافِ فرض، طوافِ صدر)

آیت: "**وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ**" (الحج۔آیت ۲۹)۔ اور (ان ہی ایام معلومات میں) اس مامون گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔ (یہ طوافِ زیارت کہلاتا ہے جو کہ فرض ہے)۔

منیٰ کے مذکورہ اعمال سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ روانہ ہو اور طوافِ رکن انجام دے (متفق علیہ) طواف کے بعد سعی کرے (سعی حج کا رکن ہے) کوئی حج کے احرام سے مکہ مکرمہ میں آئے اور طواف قدوم کے بعد سعی کر لے تو اسے اب دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت نہیں۔ (لیکن اکثر حضرات مکہ سے حج کا احرام باندھ کر نکلتے ہیں اس لئے طوافِ قدوم کے بعد سعی کا سوال نہیں، لہٰذا ان سبھی حضرات کو طوافِ افاضہ کے بعد سعی فرض ہے۔ منیٰ کی روانگی سے قبل ہی کسی نفل طواف کے بعد سعی ناکافی ہے)

طواف اور سعی سے فارغ ہو کر پھر منیٰ لوٹ جائے، تاکہ وہاں شب گذاری ہو، یوم النحر کے اعمال کو اسی ترتیب سے انجام دینا مستحب ہے، یعنی پہلے رمی پھر ذبح پھر حلق یا تقصیر اور پھر طواف و سعی، یہ ترتیب واجب نہیں ہے۔ کیونکہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے رمی سے قبل حلق کر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اب رمی کر لو کوئی حرج کی بات نہیں" دوسرے نے آکر عرض کیا کہ میں نے رمی سے قبل ہی طواف افاضہ کر لیا تو فرمایا "اب رمی کر لو کوئی بات نہیں۔" (مسلم) صحیحین کی روایت میں ہے کہ "آج کے دن (۱۰ر ذوالحجہ کو) آپ ﷺ سے کسی بھی عمل کے تقدیم و تاخیر کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا (بقیہ اعمال) انجام دو۔ کوئی حرج کی بات نہیں۔" تقریباً انجام دی جانے والی ہدی کی قربانی کے علاوہ بقیہ مذکورہ اعمال کا وقت ۱۰ر ذوالحجۃ کی نصف شب کے بعد ہو جائے گا، جبکہ اس سے قبل وقوفِ عرفہ کا فریضہ انجام دے چکا ہو۔

حدیث: "آپ ﷺ نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو لیلۃ النحر (عید الاضحی کی رات) میں (منی) روانہ فرمایا، تو انھوں نے فجر سے قبل رمی کر لی، پھر طوافِ افاضہ کیا" (ابوداود، باسناد صحیح علی شرط مسلم کما فی المجموع) بقیہ اعمال کو بھی اس پر قیاس کر لیا گیا۔

یوم النحر کی رمی کا اختیاری وقت اس دن غروب تک ہے۔ ایک شخص نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے مَسَا کے وقت رمی کی تو آپ نے فرمایا "کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔" (بخاری شریف) مَسَا زوال سے غروب تک وقت کو کہا جاتا ہے، وقت جواز ایام تشریق کے آخر تک باقی رہے گا۔ امام رافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ ۱۰ر تاریخ کی رمی کا افضل وقت زوال تک ہے تو گویا ۱۰ر تاریخ کی رمی کے تین اوقات ہوئے۔ (۱) وقتِ فضیلت طلوع سے زوال تک۔ (۲) وقتِ اختیار زوال سے غروب تک۔ (۳) وقتِ جواز۔ غروب سے ایام تشریق کے آخر تک۔

حلق (یا تقصیر) اور طوافِ افاضہ (اور سعی باقی ہو تو وہ بھی) کا کوئی آخری وقت نہیں، زندگی میں کبھی بھی ادا کرے تو ادا ہو جائے گا اور حج صحیح ہو گا۔ اور اس کی ادائیگی تک احرام کا حکم باقی رہے گا۔ لیکن ان امور کو یوم النحر میں ہی انجام دینا افضل ہے۔ یوم النحر سے

مؤخر کرنا مکروہ ہے، ایام تشریق سے بھی مؤخر کرے تو کراہت شدید ہو گی۔ مکہ مکرمہ سے ان امور کو انجام دیئے بغیر نکلنا اور بھی شدید مکروہ ہے۔ چونکہ حدیث میں ان اعمال کے لئے وقت کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ اس لئے تاخیر کو جائز قرار دیا گیا۔

ہدی کے وقت کا ذکر مُحرِّماتِ احرام میں آئے گا۔

تحَلُّل (حلال ھونا۔ احرام کھُلنا)

تحلل کا مطلب ہے احرام کی پابندی کا ختم ہونا۔

چونکہ حج کا وقت طویل اور اعمال حج کثیر ہیں، اس لئے حج میں دو تحلل ہیں۔ تحلل اوّل کے بعد بعض پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور بقیہ تحلل ثانی کے بعد ختم ہوتی ہیں اس کے برعکس عمرہ میں ایک ہی تحلل ہے۔

تحلل اوّل: یوم النحر کے تین اعمال رمی، حلق (یا تقصیر) اور طوافِ رکن (سعی باقی ہو تو مع سعی) میں کسی بھی دو عمل کے انجام دینے سے تحلل اوّل حاصل ہو گا۔ یعنی اب نکاح، جماع (صحبت) اور جماع کے مقدمات (مثلاً بوس و کنار) کے علاوہ دیگر محرمات احرام جائز ہو جائیں گے۔ یعنی سلا ہوا لباس، حلق یا تقصیر، ناخن تراشنا، شکار، خوشبو، تیل، مرد کو سر چھپانا اور عورت کو چہرہ چھپانا جائز ہو جائے گا۔ نکاح، جماع اور مقدمات جماع اب بھی حرام ہیں۔

کسی کے سر پر بال ہی نہ ہو تو رمی اور طواف میں کسی ایک کے انجام دیتے ہی تحللِ اوّل حاصل ہو گا۔

حدیث: ”جب تم رمی اور حلق کر چکو تو تم کو خوشبو، کپڑے اور ہر چیز حلال ہے، سوائے عورتوں کے۔“ (احمد، ابوداود، دارقطنی، بیہقی)“ تلخیص ۲۷۹/۲)

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے احرام سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو لگائی اور تحلل کے وقت (کعبہ کے طواف سے قبل بھی خوشبو لگائی) (متفق علیہ)

تحلل ثانی (تحللِ دوّم): یوم النحر کے مذکورہ تین اعمال میں سے جب تیسرا بھی انجام دے، تو بقیہ تینوں محرمات بھی جائز ہوں گے۔ (اب احرام کی پابندی بالکل ختم ہو چکی، صرف منیٰ کی شب باشی۔ اور رمی انجام دینا باقی ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے) کسی کی یوم النحر کی رمی فوت ہو، (ایام تشریق کے آخر تک نہ کر سکا) اور اس کا بدل یعنی دم یا روزہ لازم ہوا، تو جب تک وہ بدل انجام نہ دے تحلل حاصل نہ ہو گا۔

ایّامِ تشریق میں منیٰ میں شب باشی

آیت: ”وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ“۔ (البقرہ-۲۰۳)

ترجمہ: اور (منیٰ میں) اللہ کا ذکر کرو کئی روز تک پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی گناہ نہیں۔ اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے (یعنی بارھویں کو نہ آئے بلکہ تیرھویں کو آئے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔“

ایام تشریق: ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ: مذکورہ تینوں رات کا اکثر حصہ میدان منیٰ میں بسر کرنا واجب ہے۔ (مثلاً غروب

سے صبح صادق تک ۱۰/ گھنٹے ہوں تو ۵/ گھنٹہ سے کچھ زائد وقت گذارنا واجب ہے۔) کیونکہ صحیح احادیث سے آپ ﷺ کا یہ عمل ثابت ہے، اور آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے حج وعمرہ کے اعمال کو مجھ سے حاصل کرو۔

ایام تشریق کی رمی

ایام تشریق کے ہر روز زوال کے بعد تینوں جمروں کی رمی واجب ہے، (۱) جمرہ اُولیٰ جو مسجد خیف کے قریب ہے اس کو جمرہ کبریٰ بھی کہتے ہیں۔ جمرہ عقبہ کو بھی جمرہ کبریٰ کہا جاتا ہے۔ (۲) جمرہ وسطیٰ۔ (۳) جمرہ عقبہ۔ یہ منیٰ میں داخل نہیں، بلکہ یہاں منیٰ کی حد ختم ہوتی ہے۔

اگر کوئی ۱۲/ ذوالحجہ کو رمی کے بعد منیٰ سے نَفرِ اوّل کے ارادے سے روانہ ہو جائے اور دوبارہ ۱۳/ کی شب باشی کے لئے لوٹنے کا ارادہ نہ ہو، (اور اس سے قبل دو شب منیٰ میں گذار چکا ہو، یا عذر کی وجہ سے ترک کیا ہو) تو یہ جائز ہے۔ اور ۱۳/ تاریخ کی رمی اور شب باشی ساقط ہو جائے گی۔ اسے نَفرِ اول کہتے ہیں روانگی کا سفر شروع ہو جائے اور میدان منیٰ سے نکلنے سے قبل ہی غروب ہو جائے۔ یا روانگی کے بعد کسی سبب سے یا بلا سبب دوبارہ منیٰ میں جائے تب بھی ۱۳/ تاریخ کی شب باشی اور رمی لازم نہ ہوگی۔

اگر بلا عذر ۱۱ اور ۱۲ کی شب باشی ترک کرے، یا ۱۲/ کو قبل زوال ہی روانہ ہو جائے، یا بعد زوال بغیر رمی روانہ ہو جائے، تو اُسے نفر اول کی اجازت نہیں۔ اور ۱۳/ کی شب باشی اور رمی ساقط نہ ہوگی البتہ آخری دو صورتوں میں ۱۲ کو غروب سے قبل منیٰ لوٹ کر رمی کر لے، تو اب نفر اوّل پر عمل کر سکتا ہے۔

۱۳/ تاریخ کی شب باشی اور رمی کے بعد منیٰ سے روانہ ہونے کو نفرِ ثانی کہتے ہیں امام، ۱۰/ ذوالحجہ کو نمازِ ظہر کے بعد ایک خطبہ دے، جس میں حجاج کرام کو ایام تشریق کی رمی اور نفر اوّل کے مسائل وغیرہ اور الوداعی پیغامات دے۔

رمی کی صحت کے شرائط

رمی کے درج ذیل چھ/ ۶ شرائط ھیں۔

(۱) **ترتیب:** پہلے جمرہ اولیٰ کی رمی کرے (جو مسجد خیف کے قریب ہے) پھر جمرہ وسطیٰ کی پھر جمرۂ عقبہ کی، جیسا کہ آپ ﷺ سے مروی ہے۔ (بخاری) لہٰذا جمرہ اولیٰ کی رمی مکمل ہونے سے پہلے دوسرے یا تیسرے کی رمی کرے تو یہ معتبر نہ ہوگا اسی طرح وسطیٰ کی تکمیل سے پہلے جمرۃ عقبہ کی رمی کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۲) **سات مرتبہ رمی کرنا:** یہی آپ ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ اگر سات کنکر ایک ہی مرتبہ مارے تو ایک ہی شمار ہوگا۔ ایک کنکر دائیں ہاتھ سے، اور ایک بائیں ہاتھ سے بہ یک وقت مارے تب بھی ایک ہی شمار ہوگا، اگر یکے بعد دیگرے ہو تو دو شمار ہوں گے۔ ایک ہی کنکر کو سات مرتبہ مارے تو یہ کافی ہے۔ کنکر کو صرف رمی کی جگہ میں رکھ دے تو یہ کافی نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ رمی (پھینکنا اور مارنا) نہیں کہلاتا، اور حدیث میں وارد تفصیل کے خلاف ہے۔

(۳) **ھاتھ سے رمی کرے:** جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ قدرت کے باجود کمان، پیر یا گوپھن وغیرہ سے رمی کرنا کافی نہیں۔ اگر ہاتھ سے رمی کرنے سے عاجز ہو (ہاتھ کٹا ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے) تو کمان سے ورنہ پیر سے ورنہ پھر منہ سے رمی کرے، ورنہ پھر کسی اور کو نائب بنائے۔

(۴) **کنکر و پتھر ہو:** کیونکہ احادیث میں حَصیٰ (کنکری) کا ذکر ہے، اور کنکری پتھر سے ہی ہے، لہٰذا پتھر کے سبھی انواع کافی ہیں، اگرچہ یاقوت و عقیق وغیرہ ہی کیوں نہ ہو۔ (ان سے رمی تو ہو جائے گی، لیکن اضاعت مال ہو، تو پھر اس اعتبار سے حرام ہے) سونا، چاندی، لوہا (اور جوتے چپل) وغیرہ اشیاء سے رمی حاصل نہ ہوگی۔ (کیونکہ یہ پتھر کے انواع میں داخل نہیں)

(۵) **مَرمٰی (محلِ رمی) کا قصد:** اگر کوئی ہوا وغیرہ میں کنکر مارے اور وہ مرمیٰ میں جاگرے، تو اس سے رمی حاصل نہ ہوگی۔ جمرہ میں ستون کی شکل میں جو نشانی لگائی گئی ہے، اس کے اطراف احاطہ کے اندر کی جگہ مرمیٰ (محل رمی) ہے۔ اور اسی کو جمرہ کہا جاتا ہے۔ (عوام اس ستون نما علامت کو جمرہ سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ) کوئی اس ستون کو مارنے کی نیت سے رمی کرے، تو یہ کافی نہیں، بھلے ہی کنکری ستون کو لگ کر مَرمیٰ میں گر جائے۔ اگر مَرمیٰ کے قصد سے ستون پر مارے، اور کنکری اس پر لگ کر مَرمیٰ میں گرے۔ تو یہ کافی ہے۔ جمرہ میں علامتی ستون آپ ﷺ کے دور میں نہیں تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس جگہ کنکریاں جمع ہوتی ہیں اور ان کا ڈھیر لگتا ہے۔ وہ جمرہ ہے۔ (بعض عوام ستون کو مقصود اور شیطان تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے)

(۶) **کنکری یقینا جمرہ میں پہنچی ہو،** جمرہ میں گرنے کے بعد اچھل کر باہر نکل جائے، تو حرج نہیں۔ اگر جمرہ میں گرنے میں شک ہو تو یہ کافی نہیں۔

پہلی شرط صرف ایام تشریق کی رمی کے لئے ہے، بقیہ شرائط یوم النحر اور ایام تشریق کی رمی میں ضروری ہیں۔

مسلم کی حدیث کی وجہ سے سنت ہے کہ رمی چھوٹے کنکروں سے (جو کہ گوپھن یا غلیل میں استعمال ہوتے ہیں یا دو انگلیوں سے پھینکنے میں استعمال ہوتے ہیں) کی جائے۔ جو انگلی کے پورے سے کچھ چھوٹی ہو، لوبیا کے دانے کے برابر ہو۔ اس سے چھوٹی یا بڑی کنکری سے رمی مکروہ ہے۔ کنکری انگوٹھے پر رکھ کر شہادت کی انگلی کے سرے سے اسے اڑانا مکروہ ہے۔ صحیح حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ (رمی کے علاوہ بھی یہ حرکت مکروہ ہے)۔

سنت ہے کہ قبلہ رو ہو کر، تکبیر کہتا ہوا، یکے بعد دیگرے سات کنکریاں جمرۂ اولیٰ میں مارے پھر اس سے ہٹ کر کچھ آگے بڑھے اور ایسی جگہ رکے جہاں کنکر آکر نہ لگے، اور قبلہ رو ہو کر حضورِ قلبی اور خشوع کے ساتھ اللہ کی حمد، تکبیر، تہلیل، تسبیح اور دعاؤں میں تقریباً سورۂ بقرہ کی تلاوت کے بقدر وقت تک مصروف رہے۔ پھر جمرۂ وسطیٰ کی بھی اسی طرح رمی کرکے دعا و ذکر میں مصروف رہے، پھر جمرۂ عقبہ کی اسی طرح رمی کرے (جس کی یوم النحر میں رمی کی تھی)، اس کے بعد دعا کے لئے نہ رُکے۔ (یہ تفصیل بخاری شریف کی روایت سے سامنے آتی ہے) ایک جمرہ کی ساتوں کنکریوں کی رمی کے درمیان اور ہر جمرہ کی رمی کے درمیان موالات (تسلسل) سنت ہے۔

آخری دن جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد تکبیر و تہلیل پڑھتے ہوئے منیٰ سے نکل جائے۔ اور ظہر منیٰ میں نہ ادا کرے۔ اگر ادا کرے تو جائز ہے لیکن خلافِ افضل ہے۔

رمی میں نیابت: جو کسی ایسے عذر کی وجہ سے رمی سے عاجز ہو، جو رمی کا وقت ختم ہونے سے پہلے دور ہونے کی امید نہ ہو، تو کسی اور کو اپنی رمی کا نائب بنانا (کسی اور کے ذمہ رمی سونپنا) واجب ہے، خواہ اسے اجرت دینی پڑے، بعد میں اتفاقاً عذر ختم ہو جائے، تب بھی نائب کی رمی معتبر ہوگی، لیکن اب اسے خود اس کا اعادہ کرلینا سنت ہے۔

نائب جب تک اپنی رمی مکمل نہ کرلے دوسرے کی طرف سے رمی نہیں کر سکتا۔ ایام تشریق کے ہر دن نائب پہلے تینوں جمروں کی اپنی رمی مکمل کرلے۔ پھر دوسرے کی طرف سے نیابت میں رمی کرے۔ ہر دن مستقل شمار ہوگا۔ ایک دن کی اپنی رمی مکمل کرلینے کے

بعد دوسرے کی نیابت ادا کر سکتا ہے۔ اگر اپنی رمی کا ایک کنکر بھی باقی ہو تو نیابت ادا نہ ہو گی۔ اپنی رمی سے پہلے دوسرے کی نیت سے رمی کرے تب بھی اپنی ہی رمی شمار ہو گی۔

ایک شخص کو کئی لوگ نائب بنائیں تو یہ جائز ہے، لہٰذا نائب اپنی رمی کے بعد ایک کی مکمل رمی کرنے کے بعد دوسرے کی رمی کرے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے وغیرہ کی۔

نیابت کی صورت میں ممکن ہو تو سنت ہے کہ اصل شخص نائب کو کنکری تھمائے اور تکبیر کہے۔ ورنہ یہ بھی نائب ہی انجام دے۔

یوم النحر یا ایام تشریق کی کوئی رمی رہ جائے، تو ایام تشریق کے ختم ہونے سے قبل دن یا رات کسی بھی وقت اس کا تدارک کرے، اور یہ ادا ہو گی۔ چرواہوں اور اہل سقایہ کے حق میں یہ اجازت حدیث سے ثابت ہے، اوروں کو ان پر قیاس کر لیا گیا۔ متروکہ رمی اور بعد کی رمی میں ترتیب واجب ہے۔ (مثلاً ۱۰ر تاریخ کی رمی یا ایک کنکر بھی باقی ہو تو جب تک وہ مکمل نہ ہو ۱۱ر تاریخ کی رمی معتبر نہ ہو گی)۔ متروکہ رمی رات میں اور زوال سے قبل بھی کر سکتا ہے۔

اگر رمی کی تلافی نہ ہوئی، تو تین یا زائد کنکریوں کے ترک سے دم لازم ہو گا، صرف آخری ایک کنکری ترک ہو تو ایک مد اناج اور دو کنکری ترک ہو تو دو مد اناج لازم ہے۔

ایام تشریق کی شب باشی مکمل ترک کر دے تو دم لازم ہے، ایک رات ترک کرے تو ایک مد اناج اور نَفْر اول نہ کرے تو دو رات کے ترک میں دو مد اناج، اور نَفْر اول کرے تو دو رات کے ترک میں دم لازم ہے، کیونکہ شب باشی کی جنس مکمل ترک ہو رہی ہے۔

کوئی معقول عذر ہو (مثلاً جانور چرانا، حجاج کرام کو پانی پلانا، مریض کی دیکھ ریکھ وغیرہ) جس کی وجہ سے منیٰ کی شب باشی ترک ہو، تو دم وغیرہ لازم نہیں۔

طوافِ وداع

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے اعمالِ حج سے فارغ ہونے کے بعد طواف (وداع) فرمایا۔" (بخاری)

(۲) "لوگوں کو حکم دیا گیا کہ آخری عمل بیت اللہ کا طواف ہو، البتہ حائضہ عورت کو رخصت ہے۔" (متفق علیہ)

(۳) "حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو طوافِ افاضہ کے بعد حیض شروع ہوا، تو آپ ﷺ نے انہیں (طواف وداع کے بغیر) مکہ سے روانگی کی اجازت مرحمت فرمائی۔" (صحیحین)

جو مکہ مکرمہ سے مسافتِ قصر کے لئے روانہ ہو، اسے طواف وداع واجب ہے۔ چاہے مکی ہو یا غیر مکی، حاجی یا معتمر ہو، یا نہ ہو، جا کر وہاں رکنا ہو یا مکہ لوٹنے کا ارادہ ہو اپنے وطن جا رہا ہو یا کہیں اور مسافتِ قصر سے کم فاصلہ کے لئے وہاں اقامت کی نیت سے روانہ ہو یا وہاں اس کا وطن ہو تو طوافِ وداع واجب ہے۔ اور اقامت کی نیت نہ ہو، تو سنت ہے حاجی مکہ مکرمہ سے منیٰ یا عرفات کے لئے روانہ ہو یا کوئی عمرہ کرنے نکلے (مسجد عائشہ وغیرہ کی طرف) تو ان حضرات کو طواف وداع سنت ہے حاجی منیٰ سے ہی اپنے گھر جانا چاہے تو اسے مکہ آکر طوافِ وداع کرنا لازم ہے۔ (حاجی جب مکہ سے مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے روانہ ہو، تو طوافِ وداع واجب ہے۔)

مکہ سے روانگی کے وقت کسی عورت کو حیض یا نفاس ہو تو اس پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ مکہ کے حدود سے نکلنے سے قبل پاک ہو جائے، تو لوٹ کر طواف وداع کرنا لازم ہے۔ مکہ سے باہر جانے کے بعد پاکی حاصل ہو تو لوٹنے کی ضرورت نہیں۔

جس پر طواف وداع لازم ہو وہ اسے ترک کر دے تو دم لازم ہے، کیونکہ ایک واجب ترک ہوا۔ بلا طواف روانگی کے بعد اپنے وطن اور مسافتِ قصر سے قبل لوٹ کر طواف کرلے تو دم لازم نہیں۔ طوافِ وداع کے بعد وہیں ٹھہر ارہا تو دوبارہ طواف لازم ہے۔ البتہ سفر کی تیاری میں رکنا پڑا، یا اقامت کی وجہ سے جماعت میں شریک ہوا، تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔

طوافِ وداع کے بعد مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت طواف کی ادا کرے اور ملتزم سے چمٹ کر خوب دعا کرے، اعمالِ حج کی ادائیگی کی توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے قبولیت کی دعا کرے۔ دیگر دنیوی و اخروی دعا مانگے۔ پھر زمزم کا پانی پئے، اور لَوٹ کر حجر اسود کا استلام اور بوسہ لے کر روانہ ہو جائے۔ حائضہ عورت کو مسجد کے دروازے پر مذکورہ دعا مانگ کر روانہ ہونا مستحب ہے۔ مسجد حرام سے نکلتے وقت کعبہ کی طرف پشت کر کے نکلے، کعبہ کی طرف رخ کر کے الٹے قدم لوٹنا مکروہ ہے، اس کے متعلق کوئی سنت مروی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے روانگی کے وقت مسجد کے دروازہ پر کعبہ کو دیکھتے کھڑا رہنے کی کراہت منقول ہے، بلکہ سب سے آخری عمل طواف کر کے نکل جائے۔

نفلی عمرہ اور طواف کی کثرت اور مکہ کے مشہور مقاماتِ فضل کی زیارت مستحب ہے۔ کعبہ کی طرف ایمان و احتساب (ثواب کی نیت سے) دیکھتے رہنا سنت ہے۔ بیہقی کی شعب الایمان میں روایت ہے کہ ہر دن رات اللہ تعالیٰ کی ۱۲۰ رحمتیں ہیں، جو کعبہ پر نازل ہوتی ہیں، ۶۰ر طواف کرنے والوں کو، ۴۰ نمازی کو اور ۲۰ دیکھنے والوں کو۔ صدقہ و دیگر عبادات و نیکیوں کو بکثرت انجام دینا سنت ہے، کیونکہ یہاں ایک نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ طوافِ وداع کو طوافِ صَدَر بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد اپنے وطن کی طرف صدور (رجوع اور واپسی) ہوتی ہے۔ طوافِ رکن کو بھی طوافِ صَدَر کہتے ہیں۔

زَمْزَم

حدیث: (۱) مسلم شریف میں حضرت جابر سے حجۃ الوداع کے متعلق مروی طویل حدیث کے آخر میں ہے کہ "آپ ﷺ نے طوافِ افاضہ سے فارغ ہو کر زمزم کا پانی نوش فرمایا۔"

(۲) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ سِقایہ (پانی پلانے کی جگہ) کے پاس تشریف لے گئے، اور اس میں سے زمزم کا پانی نوش فرمایا"۔ (بخاری)

(۳) "زمزم کا پانی جس مقصد کے لئے پیا جائے وہ مقصد حاصل ہو گا" (احمد، ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ، بیہقی)

(۴) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ "زمزم کا پانی قبلہ رو ہو کر، بسم اللہ کہہ کر، تین سانس میں خوب سیر اب ہو کر پیو، جب فارغ ہو جاؤ تو الحمدللہ کہو، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا، "ہمارے اور منافق کی امتیازی نشانی یہ ہے کہ وہ زمزم شکم سیر ہو کر نہیں پیتے۔" (دارقطنی، حاکم)

زمزم کا پانی (جب بھی موقع ملے) پینا سنت ہے۔ کیونکہ یہ مبارک اور قلب کی تقویت کا باعث ہے۔ اس کے کئی نام ہیں۔ زمزم، ہزمۃ جبریل، سُقیا اللہ اسمٰعیل، بَرَکہ، سَیّدۃ، نافعہ، مصونۃ، عونہ، بشری، صاحبہ، برۃ، عصمۃ، سالمہ، میمونۃ، مغذیہ، کافیہ، طاہرہ، حرمیۃ، مُرَوِیَۃ، مُؤنِسَہ، طیبۃ، شباعۃ العیال، طعام طعم، شفاء سقم۔ یہ جنت کے پانی سے ہے، اور آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے بعض مرتبہ بطور معجزہ جو پانی نکلا اس کے بعد زمزم کا پانی سب سے افضل ہے۔ مسلم کی حدیث میں اسے مبارک اور غذا کے قائم مقام قرار دیا

ہے۔ ابو داؤد طیالسی کی روایت میں مزید اسے بیماری سے شفا بھی قرار دیا ہے۔ اس لئے ہر کسی کو زمزم کا پینا سنت ہے۔ اور اس سے اپنے دنیوی واخروی مقاصد کے حصول کا قصد کرے۔ پیتے وقت قبلہ رو بیٹھنا سنت ہے۔ آپ ﷺ نے بیان جواز کے لئے کھڑے ہو کر پیا تھا۔ پینے سے قبل اللہ سے دعا کرے کہ "یا اللہ مجھے آپ ﷺ سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ زمزم کا پانی جس مقصد سے پی لے، وہ حاصل ہو گا۔ یا اللہ میں اسے فلاں مقصد کے لئے پی رہا ہوں، لہٰذا آپ محض اپنے فضل وکرم سے یہ عنایت فرمادیں۔" پھر بسم اللہ کہہ کر خوب سیر اب ہو کر تین سانسوں میں اسے پی لے۔ زمزم کے پانی میں سانس چھوڑنا مکروہ ہے۔ زمزم اپنے ساتھ وطن لے جانا، تاکہ خود اور دوسروں کو سنت وبرکت حاصل ہو، سنت ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زمزم کا پانی لے جاتیں اور فرماتیں کہ آپ ﷺ بھی لے جایا کرتے تھے۔ (حسنہ الترمذی وصححہ الحاکم، وفی اسنادہ خلاد بن یزید وہو ضعیف) (تلخیص ۲/۲۰۸)

مکہ کے علاوہ بھی کہیں زمزم پیئے تو اپنے مقصد کے لئے دعا کرے۔ حضرت ابن عباس زمزم پیتے وقت یہ دعا پڑھتے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ عِلْماً نَافِعاً وَرِزْقاً وَاسِعاً وَشِفَاءً مِنْ کُلِّ دَاءٍ (یا اللہ مجھے علم نافع، وسیع وکشادہ رزق اور ہر بیماری سے شفا عطا فرما) علماء نے مختلف مقاصد کے لئے پیا اور اپنا مطلوب حاصل کر لیا۔ کنویں کے قریب جا کر نگاہ ڈالنا اور اپنے سر، چہرے اور سینہ پر زمزم کا پانی چھڑکنا سنت ہے۔

مکہ میں مکمل قرآن پاک کی تلاوت کرے۔ (قرآن ختم کرے) روانگی کے وقت کعبہ نظروں سے اوجھل ہونے تک اس کے فراق پر افسوس کرتے ہوئے بار بار پلٹ کر کعبہ کا دیدار کرے۔ مکہ سے روانگی کے وقت یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اٰئِبُوْنَ تَآئِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔ صَدَقَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَہَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ" (آپ ﷺ غزوہ، حج یا عمرہ سے لوٹتے تو یہ دعا پڑھتے، متفق علیہ)

مدینہ منورہ

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے قبر اور منبر کی درمیانی جگہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض (یعنی حوض کوثر) پر ہے۔" (صحیحین)

(۲) تین مساجد کے علاوہ کسی اور طرف کجاوے نہ کسے جاویں (یعنی باقاعدہ سفر نہ اختیار کیا جائے) مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) اور میری یہ مسجد" (مسجد نبوی) (صحیحین)

(۳) "جو بھی مجھ کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتے ہیں تاکہ میں اس کو جواب دوں۔ (احمد، ابوداود)

(۴) آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن روانہ کرتے وقت فرمایا "معاذ! شاید اس سال کے بعد میری تمہاری ملاقات نہ ہو، شاید کہ تم میری اس مسجد اور قبر کے پاس سے گذرو" (احمد بسند صحیح) ظاہر ہے کہ یہاں لعلّ (شاید) طلب وامید کے معنی میں ہے۔

آپ ﷺ کے قبر اطہر کی زیارت سنت ہے۔ بہ اتفاق صحابہ کرام وتابعین عظام یہ بڑی قربت اور نیکی ہے۔ (الفقہ المنہجی)۔ حاجی اور معتمر کے حق میں اس کی زیادہ تاکید ہے کیونکہ دور ودراز سے مدینہ منورہ کے اتنے قریب آکر بغیر زیارت کے لوٹ جانا بڑی بُری بات ہے۔ آپ ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی کی جو حد تھی اس میں نماز پڑھنے کی بڑی پابندی کرے کہ وہاں ایک نماز ہزار نماز کے برابر ہے۔ آپ ﷺ کے قبر اطہر کا طواف نہ کرے۔ پشت یا پیٹ قبر کی دیوار (جالی) سے چپکانا شدید مکروہ ہے، اس کا ہاتھ سے

مسح اور بوسہ مکروہ ہے، بلکہ ادب یہ ہے کہ دور کھڑا رہے، جیسا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں رہتا۔ مدینہ کے قیام کے دوران حتی المقدور روزے رکھے اور آپ ﷺ کے پڑوسیوں پر (وہاں کے ہوں یا بیرونی) صدقہ و خیرات کرے۔

مدینہ منورہ کی زیارت کے قصد سے سفر کرنے والا راستہ میں بکثرت درود و سلام پڑھتا رہے۔ حرم مدینہ اور وہاں کے درخت دکھائی دیں تو درود و سلام میں اور اضافہ کرے اور اللہ سے اسے نفع بخش بنانے اور قبول کرنے کی دعا کرے۔ مدینہ میں داخل ہونے سے قبل غسل کرلے، ورنہ داخل ہونے کے بعد مسجدِ نبوی میں جانے سے قبل کرلے۔ پھر سب سے نظیف اور صاف ستھرے (سفید ہو تو وہ بہتر ہے) کپڑے پہن کر مسجد جائے مسجد میں داخل ہونے کے بعد روضہ (قبر اور منبر کے درمیانی جگہ) میں جاکر (ممکن ہو تو) منبر کے پاس دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور اس نعمتِ عظمیٰ پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

نماز کے بعد قبر اطہر کے پاس جاکر قبلہ کی طرف پشت کرکے قبر کی طرف رُخ کرے، نگاہ نیچی رکھے، اور دنیوی علائق سے دل کو بالکل فارغ کرکے پست آواز میں سلام عرض کرے۔

اقلّ سلام: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

آپ ﷺ پر اکمل سلام: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَبِيْبَ اللهِ ۔ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ حَقّاً. بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَ اَدَّيْتَ الأَمَانَةَ وَ نَصَحْتَ الأُمَّةَ وَكَشَفْتَ الغُمَّةَ وَجَلَوْتَ الظُّلْمَةَ وَجَاهَدْتَ فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۔ جَزَاكَ اللهُ عَنَّا اَفْضَلَ مَا جُوْزِيَ نَبِيٌّعَنْ اُمَّتِهِ وَعَلىٰ اٰلِكَ وَاَصْحَابِكَ وازْوَاجِكَ وَاَهْلِ بَيْتِكَ اَجْمَعِيْنَ۔ اگر کسی نے آپ ﷺ کو اس کی جانب سے سلام عرض کرنے کی درخواست کی ہو تو یوں کہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ مِنْ فلان بْنِ فلان (فلان بن فلاں کی جگہ اس کا اور اس کے والد کا نام لے)

پھر دائیں جانب تقریباً ایک ہاتھ ہٹ کر (جالی میں دوسرے سوراخ کے سامنے) حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں سلام عرض کرے:-

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَا بَكْر ، جَزَاكَ اللهُ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمْ خَيْراً

پھر ایک ہاتھ آگے بڑھ کر (جالی میں تیسرے سوراخ کے سامنے) حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کرے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا عُمَر ، جَزَاكَ اللهُ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمْ خَيْراً

پھر دوبارہ آپ ﷺ کے قبر اطہر کی طرف آکر اپنے لئے آپ ﷺ کا وسیلہ چاہے، اور اللہ کے حضور آپ ﷺ کی شفاعت و سفارش چاہے، پھر قبلہ رو ہو کر اپنے اور امتِ مسلمہ کے لئے مناسب دعائیں کرے۔ (قبلہ رو ہونے میں پشت آپ کی طرف نہ ہو)

جب مدینہ منورہ سے روانگی کا ارادہ ہو تو مسجد میں الوداعی دو رکعت ادا کرے اور حسبِ سابق قبرِ اطہر پر جاکر درود و سلام پیش کرے، اور دارَین کی سلامتی و عافیت کے لئے دعا کرے۔ اور بار بار یہ بابرکت موقع نصیب ہونے کی دعا کرے۔ وہاں سے روانہ ہو تو عادت کے مطابق آگے کی طرف چلے۔ عوام کی طرح پیچھے کی طرف چلنے کی ضرورت نہیں۔

مدینہ منورہ جانے والا مسجد نبوی کی زیارت، اس میں نماز اور قبر اطہر کی زیارت کی نیت کرے۔ مدینہ میں داخل ہونے کے بعد واپسی تک آپ ﷺ کی تعظیم اور ہیبت کا استحضار رہے۔

ہر روز آپ ﷺ کی زیارت کے بعد بقیع کی زیارت کیلئے جائے، بالخصوص جمعہ کے دن، وہاں پہنچ کر یوں سلام کرے

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَہْلِ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَھُمْ" احادیث میں بقیع کے قبروں کی اور ان کی زیارت کی فضیلت وارد ہے۔

شہداء احد کی قبروں کی زیارت مستحب ہے، جمعرات کے دن افضل ہے۔

مسجد قباء کی زیارت تقرب اور نماز کی نیت سے موکدہ مستحبات میں سے ہے، ترمذی وغیرہ کی صحیح روایت میں مسجد قباء میں نماز کو عمرہ کی طرح قرار دیا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدل اور سوار مسجد قباء تشریف لے جاتے ،اور اس میں دو رکعت ادا کرتے، ایک صحیح روایت میں ہے کہ آپ ہر سنیچر وہاں تشریف لے جاتے۔

سفر سے واپسی کے آداب: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج یا عمرہ سے لوٹتے تو ہر اونچائی پر تین مرتبہ تکبیر کہتے، پھر یہ پڑھتے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَائِحُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ، صَدَقَ اللہُ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَہَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ" (بخاری و مسلم)

(۲) وطن سے قریب پہنچے تو کسی کو آگے روانہ کر کے پہلے ہی خبر دینا سنت ہے، تاکہ اچانک گھر نہ پہنچے۔ (اگر فون وغیرہ کا انتظام ہو تو اس سے اطلاع کافی ہے۔)

(۳) (بلا اطلاع کے اچانک) رات میں گھر نہ آئے، صبح یا شام کے وقت آئے۔

(۴) بستی میں پہنچنے پر پہلے مسجد جا کر دو رکعت ادا کرنا سنت ہے، پھر جب گھر پہنچے تو گھر میں بھی دو رکعت پڑھ کر دعا کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔

(۵) حاجی کی خدمت میں ملاقات و سلام کے لئے آنے والا اسے یوں دعا دے "قَبِلَ اللہُ حَجَّکَ وَغَفَرَ ذَنْبَکَ وَاَخْلَفَ نَفَقَتَکَ" (اللہ آپ کا حج قبول کرے، اور گناہ معاف کرے اور خرچ کا بدلہ دے)

(۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "اے اللہ! حاجی کی اور حاجی جس کے حق میں استغفار کرے اس کی مغفرت فرما" (حاکم)

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپسی میں گھر میں داخل ہوتے تو یہ پڑھتے تَوْبًا تَوْبًا لِرَبِّنَا اَوْبًا لَا یُغَادِرُ حَوْبًا۔ (یعنی ایسی توبہ اور اللہ کی طرف رجوع کا سوال جس کے بعد کوئی گناہ باقی نہ رہے)

(۸) حج سے واپسی کے بعد دینداری اور عبادت و نیکیوں میں ماضی کے مقابلہ میں اضافہ ہو، کہ یہ حج کے قبولیت کی علامت ہے، عبادات کا سلسلہ ہمیشہ بڑھتا رہے۔

(۹) کسی بھی سفر سے واپسی پر اپنے گھر والوں کے لئے ہدیہ لائے (چاہے مختصر سفر ہو)

(۱۰) حاجی کو مستحب ہے کہ دوسروں کی مغفرت کی دعا کرے۔ اگر چہ وہ مطالبہ نہ کرے، دوسروں کو حاجی سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا مستحب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب حاجی سے ملاقات کرو تو سلام و مصافحہ کرو اور اپنے حق میں دعا کی درخواست کرو، کہ اس کے گناہ بخشے گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ حاجی کے اپنے گھر میں داخل ہونے سے قبل ہی درخواست کرے۔

(۱۱) مسافر کو گھر لوٹنے پر دعوت کرنا مستحب ہے۔ (اسے تَقِیعۃ کہتے ہیں) بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے لوٹنے پر دوست و احباب دعوت کریں۔

حج وعمرہ کے ارکان اوران کی ادائیگی کے طریقے

حج کے ارکان: حج کے ارکان چھ ہیں۔

۱) **احرام:** یعنی حج میں داخل ہونے کی نیت کرنا کیونکہ مشہور حدیث ہے ''اعمال کادارومدار نیت پر ہے۔''

۲) **وقوفِ عرفہ:**

۳) **طوافِ افاضہ:**

۴) **سعی**۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''اے لوگو! سعی کرو۔ کیونکہ سعی تم پر لکھی گئی ہے (یعنی فرض کی گئی ہے) (دار قطنی باسناد حسن کمافی المجموع)

۵) **حلق یا تقصیر** (سر مونڈنا یا بال کٹوانا) کیونکہ تحلل اس پر موقوف ہے اور طواف کی طرح اس کی بھی دم سے تلافی نہیں ہوتی۔ (وقوف اور طواف کی دلیل گذر چکی)

۶) **اکثرمیں ترتیب:** احرام سب پر مقدم ہو، وقوفِ عرفہ، طوافِ افاضہ اور حلق یا تقصیر پر مقدم ہو۔ اگر طوافِ قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو تو اب سعی طوافِ افاضہ کے بعد انجام دے۔ یہی ترتیب آپ ﷺ کے قول وفعل سے سامنے آتی ہے۔

کسی رکن کا تدارک اور تلافی دم سے نہ ہوگی۔

حج کے واجبات: (۱) میقات سے احرام باندھنا (۲) یوم النحر اور ایام تشریق کی رمی (۳) مزدلفہ کی شب باشی (۴) ایام تشریق میں منی کی شب باشی (۵) محرماتِ احرام سے پرہیز کرنا- طوافِ وداع بھی واجب ہے جیساکہ گذرا۔ لیکن وہ مستقل واجب ہے، اس کا حج وعمرہ کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔

مذکورہ واجبات بھی ضروری ہیں۔ لیکن ان کے ترک سے دم کے ذریعہ ان کی تلافی ہوجائے گی اور حج صحیح ہوجائے گا (بخلاف رکن کے) واجبات کو ابعاض (واخذ بعض) بھی کہتے ہیں۔

ارکان وواجبات کے علاوہ جو بھی تفصیلات گذریں، وہ سب سنت اور ہیئت (جمع: سنن وہیئات) ہے۔ مثلاً طوافِ قدوم، اذکار ودعا، حجر اسود کا استلام، رمل، اضطباع وغیرہ۔

عمرہ کے ارکان: وقوفِ عرفہ کے علاوہ بقیہ عمرہ کے بھی ارکان ہیں، یعنی عمرہ میں پانچ ارکان ہیں (۱) احرام، عمرہ کی نیت (۲) طواف (۳) سعی (۴) حلق یا تقصیر (۵) ترتیب۔ عمرہ میں مطلقاً ترتیب ضروری ہے۔

حج وعمرہ کی ادائیگی کی مختلف صورتیں

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ ''ہم حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کی معیت میں روانہ ہوئے، بعضوں نے حج کا احرام باندھا، تو بعضوں نے عمرہ کا، اور بعضوں نے حج وعمرہ دونوں کا'' (متفق علیہ)

حج وعمرہ کی ادائیگی کی تین صورتیں ہیں۔

۱) **اِفراد:** پہلے صرف حج کرے، حج سے فارغ ہونے کے بعد عمرہ ادا کرے (اگر عمرہ نہ کرے تب بھی اسے اِفراد کہیں گے)

۲) **تَمَتُّع:** افراد کے برعکس، یعنی پہلے عمرہ کرے، (گرچہ اپنی بستی کی میقات نہ ہو)، پھر حج کرے، خواہ حج کا احرام مکہ ہی سے

باندھے، یا عمرہ کے میقات سے، یا اس کے مثل مسافت سے، یا اس سے قریب سے، اس طریقہ سے حج وعمرہ انجام دینے والا مُتَمَتِّعْ کہلاتا ہے، کیونکہ اسے حج وعمرہ کے درمیان محرماتِ احرام کے تمتع (فائدہ اٹھانے) کا موقع ملا، یا دوبارہ میقات تک نہ لوٹنے کا فائدہ حاصل ہوا۔

۳) **قِرَان**: حج وعمرہ دونوں احرام حج کے مہینوں میں بہ یک وقت (ایک ساتھ) باندھنا، یا پہلے عمرہ کا احرام باندھے، (حج کے مہینے میں ہو یا قبل) پھر حج کے مہینے میں اسی پر حج کا احرام بھی داخل کرے، (یعنی حج کی بھی نیت کرلے) جبکہ عمرہ کا طواف ابھی شروع نہ کیا ہو، ان دونوں صورتوں میں حج وعمرہ کی نیت کے بعد صرف حج کے اعمال ادا کرے، اور اسی سے حج وعمرہ دونوں حاصل ہوگا (عمرہ کی صرف نیت کافی ہے، عمرہ کے اعمال کو اس صورت میں مستقل ادا کرنے کی ضرورت نہیں)۔

حدیث: (۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج وعمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے سنا۔" (متفق علیہ)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حجۃ الوداع میں عمرہ کا احرام باندھا۔ لیکن ان کو حیض شروع ہوا تو اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے احرام کا اور اعمال حج کی ادائیگی کا (بجز طواف کے) حکم دیا، اور فرمایا کہ (پاکی کے بعد) تمہارا طواف حج وعمرہ دونوں کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ (متفق علیہ)

عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد اس کے ساتھ حج کی نیت ملانا صحیح نہیں۔ کیونکہ عمرہ کا اصل مقصود اور افضل عمل شروع ہو چکا، تو اب یہ (احرام) صرف عمرہ ہی کا ہوگا، اب کسی اور طرف پھیر نادرست نہیں۔

صرف حج کا احرام باندھنے کے بعد اس کے ساتھ عمرہ کو شامل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ اس صورت میں مزید کسی عمل کا فائدہ نہ ہوگا، بخلاف برعکس صورت کے کہ اس میں وقوف، رمی اور شب باشی کا اضافہ ہوگا۔

مذکورہ تینوں صورتوں میں سے اِفراد افضل ہے، جبکہ اسی سال (یعنی ذوالحجہ کے اختتام تک) عمرہ بھی کرلے، اگر اس سال عمرہ نہ کرے تو بقیہ دونوں صورتیں اس سے افضل ہوں گی، کیونکہ عمرہ کو اس سال سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، پھر تمتع قران کے مقابلہ میں افضل ہے۔ افضلیت کی ترتیب میں علماء کرام کا اختلاف ہے، جس کی بنیاد حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی نوعیت میں راویوں کا اختلاف ہے۔ صحیحین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے متعلق افراد اور تمتع اور قران تینوں ہی روایتیں ہیں۔ کثرتِ روات کی وجہ سے اول کو ترجیح دی گئی۔ مزید برآں حضرت جابر نے جو قدیم صحابی ہیں، مناسک کی تفصیل اور ضبط وعنایت میں خصوصی توجہ دی ہے، (اور ان سے افراد ہی مروی ہے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائً افراد ہی کو اختیار فرمایا، بعد میں اس پر عمرہ کو داخل کرکے قارن ہوئے، تاکہ اس عظیم مجمع میں جاہلیت کے اس تصور کی تردید ہو جائے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ بدترین برائی ہے، گرچہ قبل بھی اس کی تردید ہو چکی تھی (البتہ آئندہ کسی کے لئے حج پر عمرہ کا احرام داخل کرنے کی اجازت نہیں جیسا کہ گذر چکا) تمتع میں چونکہ حج وعمرہ کے اعمال اکمل (اور مستقل) ادا ہوتے ہیں (بجز اشتراک میقات کے)، بخلاف قران کے، اس لئے تمتع کو قران سے افضل قرار دیا گیا۔

آیت: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرۃ۔۱۹۶)

ترجمہ: جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو فقط اس کو ضروری ہے کہ جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں۔ (ایامِ) حج میں (کہ آخر ان ایام

کانویں تاریخ ذی الحجہ کی ہے) اور سات (دن کے) ہیں جبکہ تم حج سے لوٹو، یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے، یہ اس شخص کے لئے ہیں، جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام کے قرب (ونواح) میں نہ رہتے ہوں۔ (یعنی قریب ہی کا وطن دار نہ ہو)۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن کی جانب سے یوم النحر میں گائے ذبح فرمائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سب حج قران ادا کر رہی تھیں۔

لہٰذا مذکورہ آیت و حدیث کی روشنی میں متمتع اور قارن (تمتع اور قران کے طریقے پر حج کرنے والے) پر دم لازم ہے۔ جبکہ حرم کے حاضرین میں سے نہ ہو۔ اور متمتع نے اپنے حج کے سال ہی حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کیا ہو، اور حج کے احرام کیلئے کسی میقات تک (گرچہ وہ میقات عمرہ کے بہ نسبت مکہ سے قریب ہو) یا میقات عمرہ کی مسافت تک نہ گیا ہو۔ اگر کسی میقات تک یا عمرہ کے میقات کے مسافت کے بقدر لوٹ کر حج کا احرام باندھے یا مکہ سے احرام باندھ کر میقات تک جائے، یا قارن عرفہ سے قبل مکہ میں داخل ہو پھر دوبارہ میقات تک لوٹے تو دم لازم نہ ہوگا۔ حاضرینِ حرم سے مراد وہ حضرات ہیں، جن کا مکان حرمِ مکہ سے دو مرحلہ (مسافتِ قصر) کے اندر ہو۔ حاضرینِ حرم کو تمتع یا قران کی صورت میں دم کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کو ترک میقات (یعنی میقات عامہ) کا فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

آفاقی شخص (میقات کے حدود سے باہر کہیں بھی بسنے والا) میقات سے آگے بڑھ جائے، (گرچہ حج و عمرہ کا ارادہ نہ ہو) پھر ارادہ ہو جائے، اور مکہ میں داخل ہونے سے قبل یا بعد عمرہ کا احرام باندھے، تو اس پر دم تمتع لازم ہے، کیونکہ یہ اس کا وطن نہیں، اسلئے حاضرینِ حرم میں شمار نہ ہوگا۔

اگر عمرہ حج کے مہینوں سے قبل ادا کرے، یا حج کے مہینوں میں ادا کرے اور حج آئندہ سال ادا کرے، یا عمرہ کا احرام حج کے مہینوں سے قبل باندھے لیکن اعمال حج کے مہینوں میں ادا کرے، پھر حج ادا کرے تو ان صورتوں میں دم لازم نہیں۔

دم (ھدی) کا وقت: متمتع حج کا احرام باندھے تو دم واجب ہوگا۔ عمرہ سے فارغ ہو کر حج کے احرام سے قبل دم دینا جائز ہے۔ اس دم کے لئے وقت کی تعیین نہیں ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں یوم النحر میں ذبح کرنا افضل ہے (ائمہ ثلاثہ نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ ان کے اختلاف سے بھی بچ نکلے گا)

روزے: کوئی شخص حساً یا شرعاً ادائیگی کے وقت حرم میں دم سے عاجز ہو، تو (یعنی ہدی کا جانور نہ ملے، عام قیمت سے زیادہ پر ملے، یا موجودہ رقم اپنے خرچ یا قرض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہو، یا رقم بستی میں ہو پاس نہ ہو، یا غریب ہو کہ ہدی کا جانور خرید ہی نہیں سکتا تو ان تمام صورتوں میں) اسکے عوض روزے رکھنا واجب ہے، تین روزے یوم النحر سے قبل رکھنا واجب ہے، سنت ہے کہ عرفہ سے قبل ہی ان تینوں روزوں سے فارغ ہو جائے، کیونکہ حاجی کیلئے عرفہ میں روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ یوم النحر (۱۰/ ذی الحجہ) یا ایام تشریق (۱۱/ ۱۲/ اور ۱۳) میں یہ روزے جائز نہیں، جیسا کہ روزہ کے باب میں گذر چکا۔ اسی طرح حج کے احرام سے قبل بھی یہ روزے نہیں رکھ سکتا، کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے، لہٰذا اسے اپنے وقت سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں (بخلاف دم کے کہ عمرہ کے بعد جائز ہے کیونکہ وہ مالی عبادت ہے) لہٰذا ۶/ ذی الحجہ سے قبل ہی احرام باندھنا بہتر ہے، تاکہ ۶، ۷ اور ۸ کو روزہ رکھ سکے۔

مذکورہ شخص مزید سات روزے اپنے وطن میں رکھے، راستہ میں یا مکہ مکرمہ میں ان روزوں کا رکھنا کافی نہیں، اگر کوئی مکہ کو ہی وطن بنالے، (وہیں بس جائے) گرچہ فراغت حج کے بعد ہو، تو یہ روزے مکہ مکرمہ میں ہی ادا کرے (کیونکہ یہ اس کا وطن بن چکا) اگر مذکورہ تین روزے ایام حج میں فوت ہو جائیں، تو ان کی قضا اور بقیہ سات روزوں میں بقدر ادا فصل اور تفریق لازم ہے۔ (مسلسل دس روزے

نہیں رکھ سکتا) لہٰذا چار دن اور گھر لوٹنے کے لئے عادتاً ممکنہ ایام کے بقدر فاصلہ ضروری ہے۔ (مثلاً کسی کو مکہ سے اپنے گھر پہنچنے میں دو دن لگتے ہوں، تین روزے کی قضا کے بعد درمیان میں کم از کم ۶؍ دن کا فاصلہ کر کے پھر بقیہ سات روزے رکھے) اگر مکہ ہی کو وطن بنالے، تو صرف چار دن کا فاصلہ کافی ہے۔

تین اور سات روزوں کو ادا و قضا کی شکل میں تتابع (تسلسل) کے ساتھ انجام دینا سنت ہے، جلد سے اس عبادت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے اور اسے (یعنی تسلسل کو) واجب قرار دینے والے علماء کے اختلاف سے بچنے کی خاطر اسے سنت قرار دیا گیا۔

محرماتِ احرام (احرام کی وجہ سے حرام امور)

احرام میں کئی امور حرام ہیں، حکمت یہ ہے کہ ان میں ایک طرح کا ترَفُّہ (آرام، آسودہ حالی و خوش حالی) ہے، اور مُحرِم تو حدیث کی رو سے پراگندہ حال و بال اور غبار آلود ہوتا ہے، لہٰذا ترفہ اسے مناسب نہیں۔ مزید اصل مقصد یہ ہے کہ اس ادا کے ذریعہ میدان حشر میں بالکل تہی دست بارگاہِ الٰہی میں حاضری کی یاد تازہ ہو، اور سراپا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے، کسی اور طرف توجہ نہ ہو، حاصل یہ کہ حج کا اصل مقصود ظاہری تجرد ہے تاکہ اس کے ذریعہ باطنی تجرد حاصل ہو جائے اور روزہ میں اس کے برعکس معاملہ ہے۔

حدیث: (۱) "مُحرِم قمیص نہ پہنے، اور نہ عمامہ، اور نہ پاجامہ، اور نہ بَرَانِس اور نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جس میں زعفران یا وَرس لگی ہو" (صحیحین) بخاری میں یہ اضافہ بھی ہے۔ "عورت نقاب سے چہرہ نہ چھپائے اور نہ دستانے پہنے۔" برانس یہ بُرنُس کی جمع ہے، جو لمبی ٹوپی کو کہتے ہیں اور وَرس ایک زرد پودہ ہے، جسے رنگنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص اور قبا اور پاجامہ اور موزہ پہننے سے منع فرمایا، البتہ چپل نہ ہو (تو موزے کی گنجائش ہے)۔ (بیہقی باسناد صحیح) احرام کی وجہ سے (یعنی حج یا عمرہ کی نیت کر لینے سے) درج ذیل امور حرام ہیں۔

۱) مرد کو سر کا کچھ حصہ چھپانا، (جبکہ ایسی چیز سے چھپائے جسے عام طور پر چھپانے میں شمار کرتے ہوں) مثلاً ٹوپی پہننا، رومال رکھنا، پٹی باندھنا، عمامہ (دستار) باندھنا وغیرہ۔

جو ساتر شمار نہ ہو مثلاً سایہ کے لئے چھتری وغیرہ استعمال کرنا (گرچہ وہ سر سے چھو جائے)، تکیہ یا عمامہ پر سر رکھنا، ٹوکری، صندوق یا کوئی بوجھ سر پر اٹھانا (لیکن یہ مکروہ ہے)، پانی میں غوطہ لگانا یا اپنا یا کسی اور کا ہاتھ سر پر رکھنا حرام نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی کے وقت ایک صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سر پر کپڑا تان کر سایہ کر رہے تھے۔ (مسلم، نسائی، ابوداود)

۲) مرد کا کسی محیط (پورے عضو کو گھیرنے والا) کو عادت کے مطابق پہننا، سلائی کے ذریعہ محیط ہو جیسے قمیص یا بننے کی وجہ سے (جیسے سوئٹر یا بنیان وغیرہ) یا بٹنے یا باندھنے کی وجہ سے محیط ہو۔ مذکورہ تفصیل کے مطابق محیط نہ ہو تو پہن سکتا ہے، جیسے تہبند (لنگ جبکہ آپس میں سلی نہ ہو) اور چادر۔

تہبند کو گرہ لگانا یا اس پر دھاگہ (پٹہ وغیرہ) باندھنا، تاکہ ٹکا اور جما رہے یا اس میں نیفہ جیسا بنا کر اس میں ازار بند ڈال کر باندھنا اور چادر کے کنارے کو تہبند کے اندر داخل کرنا (پھنسانا) جائز ہے، (لیکن آخری دو صورتیں مکروہ ہیں)

سوجے سے چادر کے دو کناروں کو جوڑنا، دونوں کناروں کو سلائی سے جوڑنا یا کاج و بٹن کے ذریعہ جوڑنا جائز نہیں (یہ حکم چادر یعنی اوپری حصے میں اوڑھنے کے کپڑے کا ہے۔) تہبند میں قریب قریب کاج بٹن لگا کر ایک دوسرے میں داخل کر کے جوڑنا جائز نہیں ہے،

اگر دور دور ہوں تو بعض علماء نے اجازت دی ہے۔

۳) احرام میں عورت پر دستانے پہننا یا اپنا چہرہ کسی ساتر سے چھپانا حرام ہے، آزاد عورت کو چہرہ کا کنارہ اتنا چھپانا لازم ہے جس کے بغیر سر مکمل نہ چھپ سکے۔ عورت کو سر وغیرہ میں محیط کپڑا پہننا جائز ہے۔ کسی لکڑی وغیرہ کے سہارے چہرہ پر کپڑا اس طرح لٹکانا کہ چہرہ کو مس نہ ہو جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ لوگ احرام میں ہمارے پاس سے گذرتے، تو ہم چادر سر سے چہرے پر لٹکا لیتے، جب آگے بڑھ جاتے تو چہرہ کھول دیتے (ابوداود) بلا اختیار یہ کپڑا چہرہ سے مس ہو اور فوراً ہٹائے تو فدیہ نہیں ہے۔ اگر عمداً مس کرے، یا اتفاقاً مس ہونے کے بعد اسے نہ ہٹائے تو فدیہ واجب ہے، عورت کو پیروں میں موزے پہننا یا آستین کو ہتھیلیوں تک لمبا کر کے اس میں ہتھیلیوں کو چھپانا یا کسی کپڑے کو ہتھیلی پر لپیٹنا جائز ہے، لیکن عورت کو ہتھیلی کھلی رکھنا مستحب ہے۔

نابالغ کا حکم: نابالغ بچہ بھی احرام کی پابندیوں میں بالغ کی طرح ہے، ولی کو لازم ہے کہ بچوں کو ان محرمات سے روکے۔ خلاف ورزی کی صورت میں ولی گنہگار ہو گا۔ اگر بچہ ممیز ہو تو فدیہ ولی پر واجب ہو گا۔ لیکن کسی دوسرے نے بچہ سے یہ کروایا مثلاً اسے خوشبو لگائی، تیل لگایا یا سلا کپڑا پہنایا تو اس شخص پر فدیہ لازم ہو گا۔ غیر ممیز بچہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے فدیہ لازم نہ ہو گا۔

کسی مجبوری یا حاجت کی وجہ سے سر چھپانے کی اور دیگر ممنوعہ امور کی گنجائش ملے گی۔ مثلاً محیط کے علاوہ دوسرا کپڑا میسر نہ ہو، معالجہ کے لئے سر پر پٹی وغیرہ باندھنے کی ضرورت ہو، یا گرمی یا سردی کی پریشانی کی وجہ سے مذکورہ خلاف ورزی ہو، چادر نہ ہونے کی وجہ سے قمیص نہیں پہن سکتا بلکہ اسے چادر کی طرح لپیٹ لے۔ البتہ بلا حاجت مذکورہ امور کی وجہ سے فدیہ کی طرح بصورت حاجت بھی فدیہ لازم ہو گا۔ لیکن غیر محیط کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے پاجامہ پہنے (جسے بطورِ تہبند نہیں لپیٹ سکتا) یا چپل نہ ہونے کی وجہ سے موزے ٹخنوں سے نیچے کاٹ کر پہنے تو فدیہ لازم نہ ہو گا چپل کی عدم موجودگی میں مذکورہ طریقہ پر موزہ صرف حاجت کی شکل میں پہن سکتا ہے۔

احرام میں وہ چپل جائز ہے جو پورے قدم کا احاطہ نہ کرے یا تمام انگلیوں کو نہ چھپائے جیسے سلیپر۔

۴) **خوشبو:** احرام میں ہر کسی کو اپنے بدن یا کپڑے میں یا کھانے پینے اور چپل وغیرہ میں ایسی اشیاء کا استعمال حرام ہے، جس سے خوشبو مقصود ہوتی ہو۔ جیسے مشک، عود، کافور، صندل زعفران اور عطر وغیرہ، جن اشیاء سے خوشبو مقصود نہ ہو، بھلے اس میں خوشبو ہو، جیسے خوشبودار پھل، سیب، لیمو وغیرہ، وہ حرام نہیں، اسی طرح دار چینی، لونگ، مصالحہ، سونف اور مہندی وغیرہ بھی حرام نہیں۔ خوشبودار سرمہ کا استعمال حرام ہے، جن کھانے کی اشیاء میں خوشبو یا اس کا مزہ ظاہر ہو (بھلے نظر نہ آئے) اسے کھانا حرام ہے، (حلوہ کے بعض اقسام میں زعفران وغیرہ خوشبو کے اثرات ہوتے ہیں۔ احرام میں اسے کھانا حرام ہے) خوشبو اس چیز میں بالکل گھل کر ختم ہو جائے، یا صرف رنگ باقی ہو تو استعمال حرام نہیں۔ خوشبو دوسری کسی چیز میں بالکل مغلوب ہو جائے، مثلاً معمولی گلاب پانی کافی پانی میں گھل جائے اور اس کا کوئی مزہ یا خوشبو محسوس نہ ہو، تو اس کا استعمال حرام نہیں۔

عادت کے مطابق کپڑے یا بدن کے ظاہر یا باطن میں خوشبو کا استعمال حرام ہے۔ عطر کی دوکان میں بیٹھنا یا ایسی جگہ جہاں خوشبو کی دھونی دی جا رہی ہو بیٹھنا حرام نہیں، اگر خوشبو سونگھنے کی نیت سے بیٹھا ہے، تو مکروہ ہے ورنہ مکروہ نہیں۔

اگر خوشبو کسی چیز میں بندھی ہوئی، یا عطر کی بالکل بند بوتل، یا کسی برتن میں گلاب اٹھائے تو یہ جائز ہے۔ خوشبودار بستر یا جگہ میں بیٹھے یا لیٹے، اور اس کا بدن یا کپڑا اسے چھوئے، تو گنہگار ہو گا اور فدیہ لازم ہو گا۔ اگر کوئی اور کپڑا بچھا کر بیٹھے یا لیٹے تو فدیہ لازم نہیں، لیکن کپڑا باریک (پتلا) ہو تو مکروہ ہے۔ خوشبودار صابون کا استعمال حرام ہے۔ (الفقہ المنہجی۔ ۲/ ۱۳۴)

قصداً خوشبو کا استعمال حرام، اور فدیہ کے وجوب کا باعث ہے، کسی کو اپنے احرام کا خیال نہ ہو، یا خوشبو کی حرمت کا علم نہ ہو، یا کسی نے زبردستی استعمال کروایا، تو گنہگار نہ ہو گا اور نہ فدیہ لازم ہو گا خوشبو کی حرمت کا علم ہو، لیکن وجوبِ فدیہ کا علم نہ ہو، تو فدیہ لازم ہے۔ خوشبو کی حرمت کا تو علم ہے، لیکن جو چیز استعمال کر رہا ہے، اس کا خوشبودار ہونا معلوم نہیں۔ تو گناہ اور فدیہ لازم نہیں۔

حرمت کی صورتوں میں بدن یا کپڑے پر خوشبو لگے تو گنہگار ہو گا اور فدیہ لازم ہو گا اور فوراً اس کا ازالہ کرے۔ اگر تاخیر کرے گا تو مزید گنہگار ہو گا، لیکن فدیہ میں اضافہ نہ ہو گا۔ جن صورتوں میں حرام نہیں اور فدیہ لازم نہیں، یعنی بھول کر یا لاعلمی یا زبردستی کی وجہ سے یا ہوا میں آکر خوشبو لگے تو ان صورتوں میں بھی فوراً اس کا ازالہ واجب ہے، ازالہ کے امکان کے باوجود تاخیر کرے تو گناہ اور فدیہ لازم ہے، خشک خوشبو ہے تو اسے فوراً جھٹک کے دور کر دے۔ ورنہ دھو کر یا کسی اور طریقے سے اس کا ازالہ کرے۔ کسی اور کے ذریعہ دھلا کر دور کرنا بہتر ہے، اگر خود بھی کرے تو حرج نہیں۔ کوئی اپاہج یا ہاتھ کٹے ہونے کی وجہ سے ازالہ نہ کر سکے تو اس پر گناہ اور فدیہ نہیں، کیونکہ وہ معذور ہے۔

غسل: احرام میں غسل یا کپڑے دھونا مکروہ نہیں ہے، نہانے کے لئے خطمی یا بیری کے پتے کا استعمال حرام نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے میل کچیل دور کرنا مقصود ہوتا ہے، نہ کہ تزئین اور بالوں کو بڑھانا، لیکن اس کا استعمال خلافِ اولیٰ ہے۔

حدیث: آپ ﷺ احرام میں اپنا سر دھوتے تھے۔ (متفق علیہ)

۵) **تیل:** سر یا داڑھی کے بال میں تیل گھی وغیرہ لگانا حرام ہے۔ (خوشبودار ہو یا نہ ہو) کیونکہ حدیث کی رو سے مُحرم غبار آلود اور پراگندہ حال ہوتا ہے اور تیل کے استعمال میں اختیارِ زینت ہے، جو اس کے منافی ہے۔ تیل استعمال کیا تو فدیہ لازم ہے۔ چہرہ کے بقیہ بال مثلاً مسیں (مونچھ)، بھنویں، ریش بچہ کا بھی یہی حکم ہے۔ لہٰذا اس بات پر توجہ دینی چاہئے کہ گوشت وغیرہ کھاتے وقت مونچھ یا ریش بچہ پر تیل و چکناہٹ نہ لگے۔ کیونکہ عمداً مسئلہ جانتے ہوئے یہ حرام ہے اور اس سے فدیہ لازم ہو گا۔ پیشانی یا رخسار کے بال، گنجے کے سر میں گنج کی جگہ، امرد کی ٹھوڑی پر اور بدن کے دیگر حصوں پر تیل لگانا جبکہ خوشبودار نہ ہو جائز ہے۔ کیونکہ اس سے تزئین مقصود نہیں ہوتی۔ حضرت ابن عمر کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ احرام میں غیر خوشبودار تیل استعمال فرماتے (ترمذی) کسی کا سر منڈا ہو، تو اس پر تیل لگانا جائز نہیں، کیونکہ یہ آئندہ نکلنے والے بال کی تحسین کا باعث ہو گا۔

۶) **ناخن اور بال تراشنا:** احرام میں بدن کے کسی بھی حصہ کا بال یا ہاتھ پیر کے ناخن تراشنا حرام ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے "**وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ**(سورہ بقرہ ۱۹۶) اور اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی (کا جانور) اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے۔"

آیت میں مذکور پر بقیہ کو قیاس کیا گیا ہے کہ دونوں میں ترفّہ ہے۔ حاجت کی وجہ سے مثلاً جُو کی کثرت یا زخم کے علاج کیلئے اس کی اجازت ہو گی، لیکن فدیہ لازم ہو گا۔ اگر مجبوری ہو مثلاً آنکھ میں بال اُگ آئے جس سے تکلیف ہو یا بال آنکھ کو چھپا دے یا ناخن ٹوٹ جائے اور اس سے تکلیف کی وجہ سے صرف اتنا جدا کر دیا تو فدیہ بھی لازم نہیں، جیسا کہ بے ہوش، پاگل اور غیر ممیز بچہ پر ان امور کی وجہ سے فدیہ نہیں۔ اگر چمڑی جدا کرے جس کی وجہ سے اس پر کے بال بھی جدا ہوئے یا ناخن سمیت پورہ کاٹ ڈالے تو اس سے فدیہ لازم نہیں، البتہ سنت ہے۔

بال کو حلق، تقصیر، اکھاڑنا یا جلانا کسی بھی طرح دور کرنا حرام ہے، ایک بال بلکہ بعض حصہ بھی دور کرنا حرام ہے۔ ناخن کا بھی یہی

حکم ہے، سر یا داڑھی میں کنگھی کرنے سے بال جھڑیں تو کنگھی کرنا حرام ہے۔ ورنہ مکروہ۔

مُحرم کو غیر مُحرم (حلال) کے بالوں کا ازالہ جائز ہے، اور حلال شخص کو مُحرم کے بالوں کا ازالہ حرام ہے۔

فدیہ: ایک بال یا ایک ناخن یا ایک کا کچھ حصہ زائل کرے تو ایک مد فدیہ دے، دو بال یا دو ناخن میں دو مد دے، روزہ اختیار کرے تو ایک بال یا ایک ناخن میں ایک دن کا روزہ اور دو میں دو دن کا روزہ رکھے۔ اگر تین یا زائد بال یا ناخن متصلاً جدا کرے، (یعنی عرفاً ایک ہی وقت اور جگہ میں) تو مکمل فدیہ لازم ہے۔

آیت: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضاً اَوْ بِهٖ اَذًى مِنْ رَاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ" (سورہ بقرہ۔۱۹۶)"البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑ جاوے) تو (اسکو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے۔ (خواہ تین) روزے سے یا خیرات دینے سے یا (اقلِ درجہ ایک بکری) ذبح کر دینے سے۔"

حدیث: آپ ﷺ نے مقامِ حدیبیہ میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جُوان کے چہرے پر گرے جا رہے تھے، تو ان کو سر مونڈنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ایک فَرَق (تین صاع) اناج چھ مساکین کو دو، یا تین دن روزے رکھو، یا قربانی کرو (بکری ذبح کرو) (متفق علیہ)

جب عذر میں فدیہ کا حکم ہے تو بلا عذر تو بدرجہ اولیٰ واجب ہو گا۔ سر پر ناخن کو بھی قیاس کیا گیا سر اور بدن کے سارے بال ایک ہی وقت میں صاف کرے تو ایک ہی فدیہ لازم ہے، کسی دوسرے نے مُحرم کے بال مونڈے، اور یہ باوجود قدرت کے اسے نہ روکے تو فدیہ اسی مُحرم پر لازم ہے۔

۷) **صحبت:** احرام میں جماع (صحبت) حرام ہے، جبکہ عاقل ہو، مسئلہ معلوم ہو، احرام یاد ہو اور بلا جبر ہو،

آیت: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (سورہ بقرہ ۱۹۷) (سو جو شخص ان ایّام میں اپنے ذمہ حج مقرر کرے، حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے)۔

صحبت کے مقدّمات (مثلاً بوس و کنار) بھی شہوت کے ساتھ حرام ہیں، اور اس کی وجہ سے بھی دم لازم ہے، لیکن اس کے بعد صحبت کر لے، تو یہ دم ساقط ہو گا کیونکہ وہ جماع کے دم میں داخل ہو جائے گا۔ استمناء بھی حرام ہے اور انزال ہو جائے تو دم لازم ہے (ورنہ نہیں)۔

تحلل اول سے بھی پہلے صحبت کرنے سے حج فاسد ہو گا۔ دیگر محرمات کی وجہ سے، یا تحلل اولیٰ کے بعد تحلل ثانی سے قبل صحبت سے حج فاسد نہ ہو گا۔ عمرہ میں احرام کھلنے سے قبل صحبت کرنے سے عمرہ فاسد ہو گا۔ (چاہے تین بالوں میں سے آخری بال کے ازالہ سے قبل ہو) حج کے ساتھ عمرہ کی نیت ہو تو وہ صحت و فساد میں حج کے تابع ہے۔

حج یا عمرہ کو فاسد کرنے والی صحبت کی وجہ سے مرد پر ایک ایسے اونٹ کی قربانی لازم ہے، جس میں قربانی کے صفات و شرائط ہوں (حج و عمرہ فرض ہو یا نفل) امام مالک نے اسے مؤطا میں کئی صحابہ کرام سے نقل فرمایا ہے، اور ان کا کوئی مخالف بھی نہیں، اگر اونٹ سے عاجز ہو تو گائے (بیل) کی قربانی دے، اس سے بھی عاجز ہو تو سات بکریوں کی قربانی کرے۔ اس سے عاجز ہو تو اونٹ کی مکہ مکرمہ میں جو قیمت ہو، اس سے اناج خرید کر فقراء و مساکینِ حرم کو صدقہ کرے۔ اس سے بھی عاجز ہو تو ہر مُد اناج کی جگہ ایک روزہ رکھے۔ (مثلاً اونٹ

کی قیمت میں ۱۰۰ / مد اناج ملتا ہو تو ۱۰۰ روزہ رکھے) عورت بھی احرام میں ہو، اور اس گناہ میں شریک ہو، تب بھی اس پر کفارہ لازم نہیں۔
دیگر عبادات فاسد ہو جائیں، تو وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن حج و عمرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ فاسد ہونے کے باوجود اسے ترک کرنا اور احرام سے نکلنا جائز نہیں ہے، بلکہ آخر تک سارے اعمال انجام دینا لازم ہے، کیونکہ حج و عمرہ کے اتمام کے عموم میں فاسد بھی داخل ہے۔ مزید فوراً فاسد کردہ حج یا عمرہ کی قضا (اعادہ) بھی لازم ہے، چاہے فرض ہو یا نفل، کیونکہ نفل حج و عمرہ شروع کرنے کے بعد فرض کی طرح واجب الاتمام ہے۔ دیگر نوافل شروع کرنے سے لازم نہیں ہوتے۔ فاسد عمرہ مکمل کر کے دوبارہ فوراً قضا عمرہ انجام دے، اور حج آئندہ سال انجام دے، اعادہ فاسد کی طرف سے واقع ہو گا اور فاسد فاسد نہ ہوتا تو اس سے فریضہ اسلام یا نذر جو بھی مقصود تھا وہ اس اعادہ سے حاصل ہو گا۔ (یعنی کسی نے اپنے اسلامی فرض حج کو صحبت سے فاسد کیا، تو آئندہ سال اس کے اعادہ سے وہ فریضہ ادا ہو جائے گا) کوئی اعادہ میں پھر جماع کرے تو پھر اس کا کفارہ لازم ہو گا۔ لیکن اسکے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ اصل کا پھر اعادہ لازم ہے، اصل اور ادا میں میقات یا اس سے قبل جہاں سے احرام باندھا تھا وہیں سے اعادہ میں بھی احرام ضروری ہے، اعادہ میں دوسرا راستہ اختیار کیا تو ادا کے محلِ احرام کے بقدر مسافت سے احرام باندھے۔ لیکن ادا میں بغیر احرام کے میقات سے آگے بڑھا تھا تو بجائے محلِ احرام کے میقات سے مسافت کا اعتبار ہو گا۔ ادا میں جس وقت احرام باندھا تھا۔ اعادہ میں اسی وقت سے باندھنا ضروری نہیں ہے۔

۸) **شکار:** احرام میں خشکی کے ماکول وحشی جانور کا شکار اور اس سے تعرض حرام ہے۔

آیت: وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُماً۔ (سورہ مائدہ ۹۶)

ترجمہ: اور تم پر جنگل (خشکی) کا شکار حرام ہوا، جب تک تم احرام میں رہو۔"

حدیث: (۱) حضرت صعب بن جثّامہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں جنگلی گدھا بطور ہدیہ پیش کیا تو لوٹا دیا اور اعتذار فرمایا کہ" ہم نے محض احرام میں ہونے کی وجہ سے اسے لوٹایا ہے۔" (متفق علیہ)

(۲) "شکار کا گوشت احرام میں تم لوگوں کو حلال ہے، جبکہ خود شکار نہ کرو، یا تمہارے خاطر شکار نہ کیا جاوے۔" (ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) غیر ماکول (یعنی جس کا گوشت حلال نہ ہو) سے تعرض حرام نہیں، غیر ماکول میں جو طبعاً موذی (تکلیف دینے والے) ہیں، ان کا قتل مسنون ہے، جیسے کوا، چیل، بچھو، چوہا، کاٹ کھانے والا کتا، شیر، چیتا، بھیڑیا، ریچھ، گدھ، عقاب، پسو، کھٹمل، بھڑ اور جو وغیرہ۔
محرم کے بدن یا کپڑے سے جو، دور کرنا مکروہ نہیں ہے، البتہ سر یا داڑھی کے جو سے تعرض مکروہ ہے، تاکہ بال نہ اکھڑے، اگر اسے قتل کیا تو ایک کے فدیہ میں ایک لقمہ سہی، دینا مندوب ہے۔

حدیث: (۱) پانچ جانداروں کو حرم پاک یا احرام کی حالت میں قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں، چوہا، کوا، چیل، بچھو، کاٹ کھانے والا کتا (متفق علیہ)

(۲) مُحرم حملہ آور درندے (یعنی جو قتل یا زخمی کرتے ہوں جیسے شیر چیتا بھیڑ وغیرہ) کو قتل کر سکتا ہے۔ (ترمذی، ابو داود، ابن ماجہ) مسلم کی ایک روایت میں سانپ کے مارنے کا جواز اور ابو داود کی مرسل روایت میں بھیڑیئے کو مارنے کا جواز موجود ہے۔

جن جانوروں میں نفع و نقصان دونوں ہو اُسے قتل کرنا نہ مسنون ہے نہ مکروہ، جیسے شکرہ (چرغ)، تیندوا اور باز وغیرہ
جن جانداروں میں نفع و نقصان ظاہر نہ ہو، اسے مارنا مکروہ ہے، جیسے کیکڑا، گبریلا وغیرہ
نملِ سلیمانی، شہد کی مکھی، مینڈک، بندر، بلی، ہدہد اور بے ضرر کتے کو مارنا حرام ہے (احرام میں ہو یا بغیر احرام کے) سلیمانی چیونٹی

کے علاوہ چھوٹی چیونٹی کو بغیر جلائے مارنا جائز ہے۔ اگر بغیر جلائے دفع نہ ہوں، تو جلانے کی گنجائش ہے۔

بحری شکار (یعنی صرف پانی میں زندہ رہنے والے حیوانات) احرام اور حرم میں حلال ہیں، جو خشکی اور تری دونوں جگہ زندہ رہے، وہ خشکی کے حکم میں ہے۔ پالتو جانور (اونٹ، گائے، بیل، بھینس، بکری، مرغی وغیرہ) احرام میں جائز ہیں۔

حرم پاک میں مُحرم و غیر مُحرم کو شکار (جو احرام میں منع ہے) حرام ہے۔ شکار اور شکاری دونوں حرم میں ہوں یا کوئی ایک، یا صرف پیر حرم میں ہوں یا (دونوں خارج حرم ہوں لیکن) ہتھیار حرم سے ہو کر گذرے (اور شکار کو لگے) تو یہ تمام صورتیں حرام ہیں۔ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا۔ "یہ شہر (مکہ) اللہ کے حکم کی وجہ سے حرام ہے۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور نہ یہاں کے شکار کو ڈرایا (اور بھگایا) جائے۔" مکہ مکرمہ پر بقیہ حرم کو قیاس کیا جائے گا۔ لیکن خارجِ حرم کسی حلال (غیر مُحرم) نے شکار کیا، اور حرم میں کوئی اس سے وہ شکار خریدے یا ذبح کر کے کھائے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ یہ حِل (خارج حرم) کا شکار ہے۔

شکار کے تمام اجزاء سے تعرض حرام ہے، مثلاً دودھ، انڈا، بال و پر، شکار کرنے کی طرح کسی کو شکار میں اعانت کرنا (اشارہ کرنا، آلہ ذبح دینا وغیرہ) بھی حرام ہے۔ اس کے تعرض کی وجہ سے وہ شکار یا کوئی جز تلف ہو جائے تو اس کا ضمان واجب ہے۔

آیت: لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ "(مائدہ ۹۵)

ترجمہ: اے ایمان والو، وحشی شکار کو (باستثناء ان کے کہ جن کو شرع نے مستثنیٰ کر دیا) قتل مت کرو، جبکہ تم حالت احرام میں ہو، اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر پاداش واجب ہو گی، جو کہ مساوی ہو گی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے۔"

مُحرم پر حلال مذکور (یعنی حرم میں شکار کرنے والے) کو قیاس کیا گیا، کہ دونوں کو شکار سے تعرض حرام ہے۔ لہٰذا مُحرم اور حلال مذکور کو (استثنائی صورتوں کے علاوہ) اس کے ہاتھ سے جو تلف ہو، (ودیعت ہی کیوں نہ ہو) اسکا ضمان لازم ہے۔ کسی کی ملکیت میں کوئی شکار ہو اور وہ احرام باندھے تو اس شکار سے اس کی ملکیت ختم ہو گی۔ اور اسے چھوڑ دینا لازم ہے۔ کسی سے شکار خریدے تو مالک نہ ہو گا، کیونکہ اس کا خریدنا صحیح نہیں، بلکہ مالک کو لوٹانا لازم ہے۔ حلال شخص کے حرم میں داخل ہونے سے شکار کی ملکیت ختم نہ ہو گی، اور اسے شکار خریدنا جائز ہے۔ لیکن وہ حرم میں شکار کرے تو اس کا مالک نہ ہو گا۔

شکار عمداً کرے، اختیار سے کرے، کسی کے جبر سے کرے، مسئلہ سے لاعلمی کی وجہ سے کرے، احرام میں ہونا بھول کر یا خطاءً کرے۔ سبھی صورتوں میں ضمان لازم ہے۔ لیکن جبر و اکراہ کی صورت میں جبر کرنے والے سے وصول کر لے۔ آیت میں "مُتَعَمِّداً" کی قید غالب کے پیشِ نظر لائی گئی ہے، لہٰذا اس کا مفہوم مخالف معتبر نہ ہو گا۔

استثناء: ان صورتوں میں شکار کے قتل و تعرض سے ضمان لازم نہیں ہے: کوئی شکار اس پر حملہ آور ہوا تو اس نے دفاعاً قتل کر دیا، کوئی پاگل پن میں شکار کو قتل کرے، ٹڈی راستوں میں اتنی کثرت سے ہوں کہ ان کے روندے بغیر گذرنا مشکل ہو اور روندنے سے وہ مر جائیں، انڈا توڑ دے اور اس میں چوزہ تیار ہو چکا ہو اور وہ اڑ جائے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچے، کسی شکار کو درندہ کے چنگل سے نجات دلایا اور اپنے پاس رکھا کہ علاج اور نگہداشت کرے، پھر وہ مر گیا۔

ضمان: جس شکار کا تقریباً ہم مثل موجود ہو، اس کے ضمان میں وہی مثل جانور کی قربانی دے۔ اور جس کا مثل نہ ہو، اس کی قیمت کا ضامن ہو گا۔ جبکہ اس کے متعلق (اسلاف سے کچھ) نقل نہ ہو۔ پہلی قسم میں بعض شکار کے متعلق آپ ﷺ اور بعض اسلاف سے نقل موجود ہے۔ لہٰذا اسی کی اتباع کی جائے گی۔

لہٰذا اشتر مرغ کے شکار میں اونٹ، وحشی گدھے یا نیل گائے میں گائے، ہرن میں بکرا، ہرنی میں بکری، خرگوش میں بکری کا ایک سال کے اندر کا بچہ جو قوی ہو، کبوتر میں (یعنی جو غٹر غوں کرے اور جانوروں کی طرح منہ لگا کر پانی پیئے) بکری (بحکم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) بطورِ ضمان واجب ہے جس شکار کے متعلق اسلاف سے نقل نہ ہو اس کے مثل کا دو عادل اور اس مسئلہ سے واقف حضرات فیصلہ کریں گے۔

آیت: يَحۡكُمُ بِهِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ (مائدہ۔۹۵)

ترجمہ: ”جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں“ (کہ دین داری میں بھی قابلِ اعتبار ہوں اور تجربہ و بصیرت میں بھی)۔

مذکر کے فدیہ میں مؤنث اور اس کے برعکس اور عیب دار کے بدلہ عیب دار (جبکہ ایک ہی طرح کا عیب ہو) کافی ہے۔ جن جانداروں کا مثل نہ ہو، (جیسے ٹڈی اور چڑیا وغیرہ) ان کی قیمت کا فیصلہ بھی دو عادل شخص کریں گے۔

۹) **نکاح:** ہر وہ نکاح جس میں ولی، شوہر، بیوی یا وکیل مُحرم ہو باطل ہے۔

میاں بیوی حلال ہوں لیکن گواہ مُحرم ہو تو جائز ہے۔ احرام میں رجعت کرنا اور نکاح کا پیغام دینا مکروہ ہے۔ (ترشیح ص ۱۹۳) مسلم کی روایت میں ہے ”مُحرم نہ نکاح کرے اور نہ کرائے۔“

حرم کے درخت اور جھاڑیوں کا حکم: حرم پاک کے خود رو جھاڑیوں اور درختوں سے تعرض حرام ہے، (مُحرم ہو یا غیر مُحرم) کیونکہ صحیحین کی روایت میں درخت کاٹنے اور تر گھاس پھوس اکھاڑنے (یا کاٹنے) کی ممانعت وارد ہے۔ خشک درخت اور جھاڑیوں سے تعرض جائز ہے، لیکن گھاس پھوس اگر مرے نہ ہوں، تو اکھاڑنا حرام ہے، کاٹنا حرام نہیں، خارج حرم اُگنے والا پودہ حرام نہیں، خواہ بعد میں اسے حرم میں لا کے لگایا جائے، اس کے برعکس حرم کا پودہ خارجِ حرم جانے کے بعد بھی حرام رہے گا۔ گیہوں اور جَو وغیرہ جس کی انسان خود کاشت کرتا ہے، اس سے تعرض حرام نہیں، حرم کے نباتات چارہ کیلئے استعمال کرنا یا حرم میں جانور کو چرنے چھوڑ دینا یا دوائی کے لئے لینا یا اذخر (ایک مخصوص گھاس) کا استعمال حرام نہیں، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اذخر کی گھروں میں اور لوہاروں کو عام ضرورت کی بنا پر حضرت عباس کی درخواست پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا استثناء فرمایا۔

درخت کی شاخیں سڑکوں پر آکر مسافروں کی تکلیف کا باعث بنے تو اسے کاٹ سکتے ہیں، اصلاح کے لئے درختوں کو چھانٹنا اور کترنا جائز ہے، بغیر جھاڑتے ہوئے پتے توڑنا، پھل توڑنا اور مسواک وغیرہ کیلئے چھوٹی ٹہنی توڑنا جائز ہے۔

درختوں سے ناجائز تعرض کی صورت میں شکار کی طرح ضمان لازم ہے، عرفاً بڑے درخت میں اونٹ گائے اور تقریباً اس کے ساتویں حصے کے برابر درخت میں ایک بکری دے۔ اسے امام شافعیؒ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے۔ اب مذکورہ جانور کو حرم میں ذبح کرکے مساکین حرم پر صدقہ کرے۔ یا اس کی قیمت سے اناج خرید کر صدقہ کرے، یا ہر مد کی جگہ ایک روزہ رکھے، تر گھاس پھوس کاٹنے کے بعد پھر اگے تو اس میں ضمان نہیں، ورنہ اس میں اور چھوٹے پودوں اور درختوں میں قیمت واجب ہوگی۔

حرم مدینہ اور، وَجّ (طائف کی وادی) شکار اور درختوں سے تعرض کی حرمت میں مکہ کی طرح ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ کو حرام قرار دیا۔ اور میں نے مدینہ منورہ کو (یعنی اس کے دو طرف کے دو سیاہ چٹانی سلسلہ کے درمیان کی جگہ کو) حرام قرار دیا۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں۔“ مسلم میں یہ اضافہ ہے۔ ”وہاں شکار نہ کیا جائے۔“ اور ابو داود میں بسند صحیح روایت ہے۔ ”وہاں تر گھاس پھوس اکھاڑی (اور کاٹی) نہ جائے۔ اور نہ شکار کو بھگایا جائے۔“ اور ابو داود و ترمذی میں ہے۔ ”آگاہ رہو! مقام وَجّ کا شکار اور درخت حرام ہے۔“ ان دونوں مقامات میں خلاف ورزی سے ضمان لازم نہ ہوگا کہ یہ اداءِ حج

وعمرہ کی جگہ نہیں۔

تمام محرماتِ احرام میں گناہ اس وقت ہو گا جب عمداً احرام ہونے کا علم ہوتے ہوئے، اپنے اختیار سے (بلا جبر وزبر دستی) اور مکلف ہوتے ہوئے اسکا ارتکاب کرے۔ ورنہ گناہ نہ ہو گا۔ اسی طرح جو امور استمتاع (فائدہ اٹھانے) کے قبیل سے ہیں، ان میں فدیہ بھی لازم نہ ہو گا۔ جیسے لباس، خوشبو، جماع اور تیل کا استعمال۔ جو اتلاف میں شمار ہو اس میں فدیہ لازم ہے، جیسے شکار کا قتل، بال یا ناخن کاٹنا وغیرہ۔ کیونکہ اتلاف کے فدیہ میں جہل اور بھول سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ محرمات میں جماع اور شکار کبیرہ ہیں، بقیہ صغیرہ ہیں۔ (ترشیح المستفیدین ص ۱۹۲)

محرماتِ احرام کی چار قسمیں

(۱) جو حاجت کی وجہ سے جائز ہے، اس میں نہ حرمت ہے اور نہ فدیہ۔ تہبند نہ ہونے کی وجہ سے پائجامہ پہننا، چپل نہ ہونے کی وجہ سے موزہ ٹخنوں سے نیچے کاٹ کر پہننا، سلسلۃ البول (پیشاب کے قطرات) کی بیماری کی وجہ سے ذکر (شرم گاہ) پر کپڑا باندھنا جبکہ اس کے بغیر نہ ٹکے، بال سمیت چمڑی دور کرنا، آنکھ میں اُگے ہوئے یا آنکھ کو ڈھانکنے والے بال کو دور کرنا، عضو سمیت ناخن کو دور کرنا، ناخن کا کٹا ہوا حصہ تکلیف کی صورت میں دور کرنا، حملہ آور شکار کو بطورِ دفاع قتل کرنا، اپنے بستر پر شکار کا انڈا ہو تو اسے دور کرنا یا لاعلمی میں اس کا تلف ہونا۔ شکار کو درندہ کے منہ سے نجات دے اور وہ مر جائے۔ ترفہ کے امور یعنی لباس یا خوشبو پر بھول، لاعلمی یا جبر واکراہ (زبردستی) کی وجہ سے عمل ہو جائے۔

(۲) جس میں گناہ ہو گا، فدیہ لازم نہ ہو گا، عقدِ نکاح، شہوت کے ساتھ مباشرت جبکہ کچھ حائل ہو (مباشرت سے بدن کا چھونا مراد ہے نہ کہ جماع) شہوت سے دیکھنا، شکار کے قتل میں تعاون کرنا۔ کسی نے اس کے لئے شکار کیا یا اس کا اس شکار میں دخل ہوا اور پھر یہ اس سے کھائے۔ شکار کو خرید کر یا پکڑ کر اپنے قبضہ میں لینا (جبکہ تلف نہ کرے اور نقصان نہ پہنچے)۔ شکار کو بھگانا، مُحرم کے جنازہ کے ساتھ محرمات احرام میں سے کسی عمل کو کرنا (مثلاً اسے خوشبو لگانا)

(۳) جس میں فدیہ لازم ہے، لیکن گناہ نہ ہو گا۔ مرض جیسے عذر کی وجہ سے مرد کو لباسِ ممنوعہ کی حاجت ہو، یا عورت کو چہرہ چھپانا پڑے، یا بال و ناخن کاٹنے کی ضرورت پیش آئے، کوئی ممیز لاعلمی میں بال دور کرے، بلا قصد شکار کو بھگایا اور اس میں وہ تلف ہو گیا، بھوک کی وجہ سے شکار کو ذبح کرنے پر مجبور ہوا، خلاصہ یہ کہ سابقہ دو قسموں کے علاوہ جو حاجت کی وجہ سے جائز ہوں اس میں فدیہ ہے، گناہ نہیں، یہاں حاجت سے مراد جس میں شدید مشقت ہو کہ عادۃً اس کا برداشت کرنا مشکل ہو۔

(۴) جس میں گناہ اور فدیہ دونوں لازم ہیں۔ اس میں محرمات کی بقیہ صورتیں سب داخل ہوں گی۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۸ و ترشیح المستفیدین ص ۱۹۲ ملخصا)

خلاصہ یہ کہ محرمات میں جو اتلاف کی قسم سے ہو (جیسے شکار کا قتل) یا جس میں فی الجملہ اتلاف اور ترفہ دونوں کا دخل ہو (جیسے بال یا ناخن کا ازالہ) تو اس میں مطلقاً ضامن ہو گا، بھول، لاعلمی وغیرہ اعذار سے یہ ساقط نہ ہو گا۔ اور جو محض ترفہ کی قسم سے ہو (جیسے خوشبو) اس میں عقل، اختیار اور مسئلہ کی واقفیت کی صورت میں ضمان ہو گا۔ (بغیۃ المسترشدین ص۱۱۸)

حرمِ مکہ کی خصوصیات: (۱) شکار کی حرمت (۲) درخت کاٹنے کی حرمت (۳) ہدی کا جانور ذبح کرنا (۴) اس کا

گوشت حرم ہی میں تقسیم کرنا(۵) مناسک سے متعلق اناج حرم میں تقسیم کرنا(ان تینوں میں محصر مستثنیٰ ہے)(۶) نذر کی وجہ سے پیدل وہاں جانے کا وجوب(۷) احرام ہی سے داخل ہونا(وجوباً یا استحباباً)(۸) تحلل حرم ہی میں ہو گا۔(سوائے محصر کے)(۹) حرم میں قتل سے دیت مغلظ ہو گی۔(۱۰) وہاں کے لقطہ کا اٹھانے والا مالک نہ بنے گا۔(۱۱) کوئی کافر و مشرک وہاں داخل نہیں ہو سکتا(۱۲) کافر و مشرک کو وہاں دفن نہ کیا جائے(۱۳) اگر حل میں جانے کا ارادہ نہ ہو، تو حرم سے عمرہ کا احرام نہیں باندھ سکتا۔(۱۴) وہاں کے باشندوں پر قِران یا تمتع کی صورت میں دم واجب نہ ہو گا۔(بغیۃ المسترشدین ص ۱۱۵)

حج میں کوتاھی اور خلل

حج میں خلل کے اسباب اور ان کے احکام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱) **واجبات حج میں سے کسی واجب کا ترک کرنا:** مثلاً میقات سے احرام نہ باندھے، رمی ترک کرے، مزدلفہ میں شب باشی نہ کرے۔ منی کی شب باشی ترک کرے، طوافِ وداع نہ کرے۔

کسی واجب کے ترک سے جو خلل واقع ہو، اس کی تلافی کے لئے ایک بکری (جو قربانی میں چلے) ذبح کرنا لازم ہے۔ اگر بکری نہیں دے سکتا تو ایام حج میں تین روزے اور گھر لوٹ کر سات روزے رکھے۔

۲) **حج کے کسی رکن کو ترک کرنا:** اگر وقوفِ عرفہ ترک ہو جائے، تو درج ذیل امور جائز ہیں۔

الف: بکری ذبح کرے اور عاجز ہو تو روزہ رکھے، (تمتع کی طرح) دم یا روزہ کا وقت قضا کے احرام کے بعد داخل ہو گا۔

ب: عمرہ کے اعمال انجام دے کر احرام کھول دے، یعنی طواف کرے اور طوافِ قدوم کے بعد سعی نہ کی ہو تو سعی کرے، اور حلق یا تقصیر کرے۔ لیکن یہ فرض عمرہ میں شمار نہ ہو گا۔ اگر عمل عمرہ ممکن نہ ہو تو محصر کی طرح حلال ہو۔

ج: اس حج کو آئندہ سال فوراً قضا کرے۔ برابر ہے کہ فرض حج تھا یا نفل، بغیر عذر کے قضا کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ وقوفِ عرفہ نیند یا بھول وغیرہ عذر سے ترک ہو یا بلا عذر مذکورہ احکام کی پابندی لازم ہے۔ موطا امام مالک میں حضرت ہبار بن الاسود سے بسند صحیح مروی ہے کہ وہ یوم النحر میں حضرت عمر کی خدمت میں پہنچے جبکہ وہ ہدی ذبح فرما رہے تھے۔ اور عرض کیا امیر المؤمنین! ہم سے تاریخ کے شمار میں غلطی ہوئی اور ہمارا گمان تھا کہ آج عرفہ کا دن ہے تو حضرت عمر نے فرمایا "تم اور دیگر احباب مکہ جا کر طواف و سعی کرو اور ہدی کا جانور ہو تو ذبح کرو۔ پھر حلق یا تقصیر کرو۔ پھر لوٹ جاؤ۔ آئندہ سال پھر حج کرو اور ہدی ذبح کرو۔ میسر نہ ہو تو تین روزے ایام حج میں اور سات واپسی کے بعد رکھو۔" یہ فیصلہ صحابہ کرام میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے اس پر نکیر نہ کی، تو گویا اجماع ہو گیا۔

وقوفِ عرفہ کے علاوہ کوئی رکن (طوافِ افاضہ و سعی یا حلق) ترک ہو تو اس کا تلافی سے کوئی تعلق نہیں، جب تک اس متروکہ رکن کو ادا نہ کرے، خلل دور نہ ہو گا۔ اور حج اس رکن کی ادائیگی تک معلق رہے گا، چاہے جتنا وقت گذر جائے۔(زندگی میں جب بھی ان ارکان کو ادا کرے گا حج مکمل ہو گا۔ اس وقت تک احرام کا حکم باقی رہے گا)

۳) گذشتہ محرمات احرام میں سے کسی کا ارتکاب کرنا، اس خلل کی تلافی و تدارک کی تفصیل محرمات کے ضمن میں گزر چکا۔

دم کے اقسام

دم (خون) سے مراد تغلیباً جانور کی قربانی یا اناج کا صدقہ یا روزہ ہے، حج میں واجب دم کے پانچ اقسام ہیں۔

۱) **مُرتَب ومقدّر دَم**: (اس میں ترتیب ضروری ہے، اور تفصیل شریعت کی طرف سے متعین ہے) حج کے واجبات میں سے کسی واجب کے ترک سے یہ واجب ہوتا ہے۔ اگر کوئی واجب ترک ہو تو پہلے ایک بکری (قربانی کے صفات پر) ذبح کرے یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ۔ اس میں سے کسی پر عمل نہ کرسکے تو اس کے بدلہ میں ۱۰/روزے رکھے، تین ایام حج میں اور سات اپنے وطن لوٹ کر۔ اسی قسم میں تمتع کا دم، قران کا دم اور وقوفِ عرفہ کے ترک کی وجہ سے فواتِ حج کا دم بھی داخل ہے۔

۲) **مُخَیّر ومُقَدَّر دَم**: (اس میں ترتیب ضروری نہیں ہے، اختیار ہے کہ کسی پر بھی عمل کرے، لیکن تفصیل شرعاً متعین ہے) حلق وتقصیر یا ناخن کاٹنا یا اس کے مشابہ دیگر ممنوعہ امور کے ارتکاب سے یہ دم لازم ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں ایک بکری ذبح کرے یا تین دن روزہ رکھے یا تین صاع گیہوں یا جو حرم کے چھے مساکین کو دے، ہر مسکین کو نصف صاع، صرف تین بال یا ناخن کاٹے، تب بھی یہ فدیہ لازم ہوگا۔

۳) **مُخَیّر ومُعَدَّل دَم**: نباتات کے کاٹنے اور شکار کے قتل کرنے سے یہ واجب ہے، تفصیل محرماتِ احرام میں گذر چکی۔

۴) **مُرَتَّب وَمُعَدّل دَم**: یہ احصار کی وجہ سے لازم ہے، حج کے احرام کے بعد رکاوٹ پیش آئے (اور حج نہ کرسکے) تو اولاً جس جگہ رکاوٹ پیش آئے، ایک بکری ذبح کرے، دینے پر قادر نہ ہو تو اس کی قیمت کا اناج فقراء ومساکین پر تقسیم کرے، اس سے بھی عاجز ہو تو ہر ایک مد اناج کی جگہ ایک روزہ رکھے۔

۵) یہ بھی مرتب اور معدل دم ہے، کوئی تحلل اول سے قبل جماع کرے، اس پر ایک اونٹ کی قربانی واجب ہے، اس سے عاجز ہو تو ایک گائے کی قربانی دے، یہ نہ ہوسکے تو سات بکریوں کو ذبح کرے، اس سے بھی عاجز ہو تو اونٹ کی قیمت کا اناج اہلِ حرم کو صدقہ کرے، صدقہ پر بھی قادر نہ ہو تو ہر ایک مد کے بدلے ایک روزہ رکھے، (مثلاً اونٹ کی قیمت میں ۲۰۰ مد اناج ملتا ہو تو ۲۰۰ روزے رکھے)۔

مذکورہ تمام صورتوں میں قربانی اور صدقہ حرم پاک ہی میں ضروری ہے، روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے (لیکن حرم کی فضیلت کے باعث وہیں رکھنا افضل ہے) مذکورہ دم میں ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اول پر عمل کرنے سے عاجز نہ ہو دوّم کی طرف نہیں منتقل ہوسکتا۔ یہ تخیر کی ضد ہے، تخیر میں اسے اختیار ہے کہ کسی پر بھی عمل کرلے۔ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جس بدل کا حکم ہے، شریعت نے خود اسے مقرر کردیا ہے، چاہے ترتیب ہو یا تخیر۔ اس کے مقابلہ میں تعدیل (معدل) ہے۔ یعنی قیمت کا اندازہ لگا کر بدل کی طرف عدول کیا جائے اور بدل کو مقرر کیا جائے۔ (الفقہ المنہجی۔ ۲/۱۶۴) غیر حاجی کی طرح حاجی کو بھی قربانی سنت ہے۔

کسی مامور کے ترک یا ممنوع کے ارتکاب کی وجہ سے واجب ہونے والے دم کی ادائیگی کیلئے کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ اصل عدمِ تخصیص ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل وارد نہیں، لیکن قربانی کے ایام (۱۰ سے ۱۳) میں ذبح کرنا افضل ہے، البتہ امام سبکی وغیرہ نے فرمایا کہ اگر سبب دم حرام ہو تو فوراً دم دینا واجب ہے۔ احصار کے علاوہ ذبح کا حرم پاک میں ہونا ضروری ہے۔

آیت: **هَدۡياً بَالِغَ الۡكَعۡبَةِ**" (سورہ مائدہ ۹۵) (وہ پاداش کا جانور) نیاز کے طور پر کعبہ (کے پاس) تک (یعنی حرم کے اندر) پہنچائی جاوے۔"

اور ذبیحہ کا گوشت اور دیگر اجزاء یا اس کے بدلہ میں اناج حرم کے مساکین (حرم کے باشندے ہوں یا بیرون سے آئے ہوئے) پر صرف کرنا لازم ہے۔ حرم کے باشندوں پر صرف کرنا افضل ہے۔ (جبکہ غیر باشندے زیادہ محتاج نہ ہوں)۔ حاجی کو جانور ذبح کرنے کے لئے افضل جگہ منیٰ ہے۔

ھَدْی

بطورِ تقرب حرم مکہ میں ذبح کرنے کے لئے جو جانور اپنے ساتھ لے جایا یا کسی کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے، اسے ہَدی کہتے ہیں۔ اپنی بستی سے ساتھ ہدی کا جانور (اونٹ، گائے یا بکری اور مینڈھا) لے جانا مستحب ہے۔ منیٰ سے خرید لے تو بھی اصل سنت حاصل ہو گی۔ (آج کل عموماً اسی پر عمل ہے)، اگر کوئی نذر مان لے تو واجب ہو گی۔ ہدی کا جانور بھی حرم پاک میں ذبح کرنا واجب ہے۔ (احصار کی صورت میں محل حصر میں ذبح کرے) ہدی کے جانور کے ذبح کا وقت قربانی کا وقت ہے۔ (یعنی ۱۰/ ذوالحجہ سے ۱۳/ تک) کوئی اور دن نذر میں متعین کرے تو وہی معین ہو گا۔ بعض علماء کرام نے فرمایا کہ حج کے ایام کے علاوہ عمرہ میں یا ایسے ہی کوئی ہَدی لے جائے تو اسے اسی وقت ذبح کرنا جائز ہے، قربانی کے ایام تک انتظار کی ضرورت نہیں، حج کی ہَدی ایامِ قربانی میں ذبح نہ کیا اور واجب تھا (نذر کی وجہ سے) تو بعد میں بطورِ قضا ذبح کرے، واجب نہیں تھا، تو فوت ہو گیا۔ اگر ذبح کرے بھی تو عام گوشت کے حکم میں ہے، واجب ہدی کو مکمل مساکینِ حرم پر صرف کرنا لازم ہے۔ اور نفل کے بطور نفل واقع ہونے کیلئے بھی ان پر صرف لازم ہے، البتہ نفل قربانی کی طرح خود بھی کھا سکتا ہے۔ حج و احرام سے متعلق سارے قربانیوں پر بھی ہدی کا اطلاق ہوتا ہے۔

اِحْصَارْ

آیت: ”فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ“ (سورہ بقرہ ۱۹۶) ”پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور احرام کھولے)“

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ کو جب مشرکین نے عمرہ سے روکا تو مقام حدیبیہ میں ہی حلال ہوئے، (احرام کھولا)، لہٰذا (ہدی کو) نحر فرمایا، پھر حلق کیا اور اپنے صحابہ کرام سے بھی ارشاد فرمایا کہ ”اٹھ کر نحر کرو پھر حلق کرو۔“

کسی حاجی یا معتمر کو مسلمان یا غیر مسلم دشمن تمام راستوں سے روک دے جس کی وجہ سے حج و عمرہ کے ارکان کی ادائیگی سے مجبور ہو تو آئندہ بتائے گئے طریقہ سے احرام کھول سکتا ہے۔ تمام کو روکے، یا چند ساتھیوں کو، واپسی سے بھی روکے یا نہ روکے۔ اگر وقت طویل ہو تو انتظار کرنا اور تحلل کو مؤخر کرنا افضل ہے۔ اگر حج کا احرام ہو اور وقت تنگ ہو، تو جلد تحلل اختیار کرنا افضل ہے۔ اگر حج میں ایسے وقت رکاوٹ کے دور ہونے کا یقین ہو کہ اس کے بعد حج مل جائیگا یا عمرہ میں تین دن میں دور ہونے کا یقین ہو تو امام ماوردی نے فرمایا کہ تحلل منع ہے۔ قتال یا مال خرچ کر کے آگے بڑھ سکتا ہو تو یہ لازم نہیں، بلکہ کفار کو اس طرح مال دینا مکروہ ہے، مسلمان کو دینا مکروہ نہیں۔ اگر دشمن کفار ہوں اور قتال کی قدرت ہو تو ان سے قتال کر کے آگے بڑھنا بہتر ہے۔ تاکہ حج اور جہاد و نصرت اسلام دونوں فضیلت حاصل ہو، اگر قتال سے عاجز ہو یا دشمن مسلمان ہوں تو تحلل بہتر ہے، تاکہ مسلمانوں کی جانیں تلف نہ ہوں۔

اگر رمی یا شب باشی وغیرہ کسی واجب کی ادائیگی میں رکاوٹ پیش آئے تو تحلل کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ طواف و حلق پر عمل کر سکتا ہے اور واجب کے بدلہ دم دینا کافی ہے۔ (بشری الکریم ۲/ ۱۴۱)

اِشتِراط: اگر ابتدا میں احرام کے وقت ہی یہ شرائط لگادے کہ مرض یا کوئی اور عذر پیش آئے تو میں احرام کھول دوں گا تو مذکورہ عذر کے وقت احرام کھولنا جائز ہے۔

حدیث: آپ ﷺ ضُباعہ بنت الزبیر کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا ”کیا حج کا ارادہ ہے؟“ اس نے جواب دیا

"واللہ! میں تو اپنے آپ کو بیمار پارہی ہوں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا "تم حج کرو اور یہ شرط لگادو کہ اے اللہ! جہاں آپ (یا بیماری و عذر) مجھے روک دیں گے میں حلال ہو جاؤں گی" (صحیحین) علامہ ابن حجر نے فتویٰ دیا کہ کسی نے احرام کے وقت شرط لگائی کہ کوئی بھی دینی یا دنیوی عذر پیش آئے تو میں احرام کھول دوں گا، (حلال ہو جاؤں گا) تو یہ شرط صحیح ہے، اب اگر ہدی کی شرط نہیں لگائی تو مذکورہ عذر کی صورت میں بلا ہدی صرف نیت سے حلال ہو جائے۔ ہدی کی شرط ہو تو ہدی بھی لازم ہے۔ (بغیہ ص ۱۱۶) حج پر عمرہ کو بھی قیاس کیا گیا۔ اگر یہ کہہ دے کہ "اگر میں بیمار ہوا تو حلال" تو بیمار ہوتے ہی بغیر تحلل کے خود بخود حلال ہو گا۔ اگر احرام کے وقت شرط نہ لگائی، تو بیماری وغیرہ اعذار کی وجہ سے احرام نہیں کھول سکتا، بلکہ صبر کے ساتھ عذر ختم ہونے کا انتظار کرے، اور اس کے بعد عمرہ کا احرام ہے، تو عمرہ کرے۔ اور حج کا احرام ہے اور وقت نکل چکا، تو عمرہ کے اعمال ادا کرکے احرام کھولے۔

احصار یا (بصورت شرط) مرض وغیرہ کی وجہ سے جہاں احصار یا مرض پیش آئے، وہیں بکری یا اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ ذبح کرے پھر حلق (یا تقصیر) کرے، دونوں کام تحلل کی نیت سے انجام دے، مرض وغیرہ اعذار میں ذبح اس وقت ضروری ہے جبکہ شرط میں ذبح کا تذکرہ کیا ہو، ورنہ صرف نیت اور حلق سے حلال ہو گا، مُحْصَر کے لئے دم لازم ہے، شرط لگائے یا نہ لگائے۔

اگر احصار خارج حرم ہو تو جانور کو حرم میں روانہ کرنا لازم نہیں، کیونکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے حدیبیہ میں ذبح کیا اور وہ حرم سے باہر ہے، اگر ممکن ہو تو حرم میں روانہ کرنا بہتر ہے۔ احصار کی جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ حِل (خارجِ حرم) میں ذبح جائز نہیں، جہاں ذبح کرے وہیں کے فقراء و مساکین پر تقسیم کردے، وہاں فقراء نہ ہوں تو قریب کے فقراء پر تقسیم کردے۔

معذور پر جو دم لازم ہو، یا ہدی ساتھ لایا ہو، تو وہ بھی محل عذر میں ذبح کرے۔

اگر دم سے عاجز ہے تو دم کی قیمت کا اناج محل عذر میں صدقہ کرے اور ساتھ حلق و نیت تحلل بھی ہو، اناج سے عاجز ہو تو جہاں چاہے روزے رکھے۔ اور تحلل کی نیت کے ساتھ حلق کرے۔ ہر مد کے بدلہ ایک روزہ رکھے۔ آخری مد کم ہو تو اس کے بدلہ میں بھی ایک روزہ رکھے۔ (سابقہ روزوں میں بھی یہی مسئلہ ہے) روزہ کی صورت میں فوراً بھی نیت کے ساتھ حلق کرکے حلال ہو سکتا ہے، تحلل روزہ رکھنے پر موقوف نہیں، بخلاف ذبح اور اطعام کے۔ کیونکہ روزہ کا وقت بڑھ جائے گا، اور اس سے فارغ ہونے تک احرام کی حالت میں رہنا باعثِ مشقت ہے۔

اگر بیوی شوہر کے بلا اجازت حج یا عمرہ کا احرام باندھے، تو وہ اسے احرام کھولنے کا حکم دے سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مستحق منافع سے محروم ہو رہا ہے، لہٰذا بیوی مُحْصَر کی طرح تحلل اختیار کرے۔ (گویا بغیر اجازت کے اس کا احرام صحیح ہے) اگر بیوی احرام نہ کھولے (حلال نہ ہو) تب بھی شوہر اس سے نفع اٹھا سکتا ہے اور گناہ بیوی کو ہو گا۔ اگر شوہر کی اجازت سے احرام باندھا ہے، تو اسے کھولنے کا حکم دینا جائز نہیں ہے۔ اگر طلاق رجعی یا بائنہ کی عدت میں ہو، تو احرام کھولنے کا حکم نہیں دے سکتا، البتہ عدت تک روک سکتا ہے۔

مُحْصَر پر آئندہ اس حج یا عمرہ کا اعادہ لازم نہیں ہے، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں تقریباً ۱۴۰۰ صحابہ کرام کو احصار پیش آیا اور آئندہ سال عُمْرَۃُ الْقَضِیَّۃِ میں ان میں سے بعض نے (زیادہ سے زیادہ ۷۰۰ نے) ہی عمرہ کیا، اور جو نہ گئے ان کو قضا کا حکم منقول نہیں ہے، اور یہ فوات احصار کی وجہ سے ہے جس میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ (مُحرم کا کوئی قصور نہیں)

ان صورتوں میں محصر پر قضا لازم ہے (۱) امن کے عدمِ توقع کے باوجود تحلل کو مؤخر کرے، حالانکہ تحلل ممکن تھا اور حج فوت ہو جائے (۲) حج فوت ہونے کے بعد احصار پیش آئے (۳) احصار ختم ہونے کے بعد وقت باقی تھا، اس لئے حلال نہ ہوا اور حج کے لئے

آگے بڑھا، لیکن حج فوت ہو گیا(۴) دوسرا راستہ جو پہلے کے مساوی یا اس سے مختصر تھا اختیار کیا اور وقوف فوت ہو گیا(پہلے راستہ کے مقابلہ میں اس راستہ کی تطویل یا مزید صعوبتوں کی وجہ سے حج فوت ہو تو اعمالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھولے، قضا لازم نہیں) مذکورہ صورتوں میں قضاء کا لزوم فوات کی وجہ سے ہے، نہ کہ احصار کی وجہ سے۔ احصار کے زوال کی امید پر احرام ہی میں رہا اور حج فوت ہو گیا، تو عملِ عمرہ کر کے حلال ہو، اب آئندہ اعادہ واجب نہیں۔

فریضۂ اسلام میں احصار: اگر احصار شدہ حج فرض تھا اور مُستقِر ہو چکا تھا، (یعنی فرضیت پختہ اور اس پر لازم ہو چکی تھی) تو اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ حج کے استطاعت و امکان کے بعد پہلا سال گذر جائے یا اعادہ یا نذر کا حج ہو، تو یہ سب مستقر حج ہیں، جیسا کہ کوئی فرض نماز شروع کر کے مکمل نہ کرے، تو اسکے ذمہ باقی رہے گی۔

اگر ابھی مستقر نہیں ہوا (مثلاً حج کے امکان کے بعد پہلے ہی سال فرض حج کی روانگی میں احصار پیش آئے) تو حصر کے ازالہ کے بعد استطاعت کا اعتبار ہو گا، آئندہ پھر استطاعت ہو، تو حج کی ادائیگی واجب ہے، ورنہ نہیں۔

والدین میں سے ہر کوئی (یا دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ اوپر تک) اپنے بیٹے پوتے وغیرہ اولاد کو، جبکہ وہ مکی نہ ہو، نفل حج یا عمرہ کے احرام سے روک سکتا ہے، بلا اجازت احرام باندھے تو اسے کھولنے کا حکم بھی دے سکتا ہے، اس حکم پر اسے حلال ہونا لازم ہے۔ حج و عمرہ کے ساتھ طلبِ علم یا تجارت وغیرہ کا بھی قصد ہو (اور تجارت کا نفع سفر خرچ سے زائد ہو) اور راستہ پر امن ہو، تو اجازت کی ضرورت نہیں۔ مکی اولاد کو حج و عمرہ سے نہ روکے۔ (کہ اس میں زیادہ مشقت و کلفت نہیں) فرض حج و عمرہ (اسلامی رکن ہو یا قضا یا نذر) سے اولاد کو روکنا جائز نہیں، لیکن والدین (اوپر تک) سے اجازت لینا مستحب ہے اگر اجازت نہ دیں تو موٴخر کرنا بہتر ہے، جبکہ شرعاً فوراً ادا کرنا لازم نہ ہو (جیسے قضا)۔ راستہ پر خطر ہو، یا کوئی اور صحیح شرعی غرض ہو (جیسے غیر معتبر لوگوں کے ساتھ سفر کرنا یا قدرت نہ ہونے کے باوجود پیدل سفر کرنا وغیرہ) تو فرض سے بھی روک سکتا ہے۔ کسی پر والدین کا نفقہ واجب ہو، تو جب تک اس کے نفقہ کا معقول انتظام نہ کرے، اولاد کو سفر سے روک سکتے ہیں۔ اسی طرح بیوی کے نفقہ کا بھی انتظام کرے ورنہ (وہ راضی نہ ہو تو) اسے طلاق دے، البتہ حاکم اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ (بشری الکریم۔ ۱۲۳/۲)

کسی کو ظلماً قید میں ڈالا جائے، (مثلاً قرض کی وجہ سے کسی غریب کو قید میں ڈالنا) تو وہ احصار کی طرح تحلل پر عمل کر سکتا ہے۔
(ترشیح المستفیدین ص ۱۹۸)

کسی کے قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت آچکا ہو، اور مقروض ادا کرنے کی حیثیت رکھتا ہو، تو صاحبِ قرض اپنا قرض وصول کرنے کے لئے اسے حج کے سفر میں جانے سے روک سکتا ہے، احرام کھولنے کا حکم نہیں دے سکتا، کیونکہ اسکے احرام سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اگر قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آئے، یا وقت تو ہو چکا لیکن مقروض غریب ہے، (کہ ادا نہیں کر سکتا) تو اسے نہیں روک سکتا، کیونکہ اس پر (فی الحال) قرض کی ادائیگی لازم نہیں۔ (ترشیح المستفیدین ص۱۹۸)

حج کی حکمتیں اور اسرار

(ماخوذ از ارکان اربعہ ملخصًا)

حج اور اس کے تمام اعمال و مناسک نیز اس سلسلہ کے تمام واقعات و حوادث جو ان اعمال کے ساتھ وابستہ ہیں، مظاہر سے بے نیازی اور انانیت و خود پرستی سے رہائی و آزادی کا وہ لباس زیبا جو حاجی زیب تن کرتا ہے اور احرام، وقوف، افاضہ، رجم (رمی)، سعی اور طواف کے

تمام وہ اعمال جو بجالا تا ہے، دراصل توحید، اسباب کی نفی، خدا پر توکل، اس کے راستہ میں قربانی اور اس کی اطاعت وخوشنودی کو اپنی زندگی میں موثر، پائدار اور فعال بنانے کی سعی و تدبیر ہے، وہ عادات، رسم ورواج، جھوٹے معیار اور مصنوعی قدروں کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت اور طاقتور ایمان، سچی محبت، بے نظیر قربانی اور اعلیٰ درجہ کے ایثار و بے غرضی کی تجدید ہے۔ حج ان اعلیٰ مقاصد، صالح جذبات، روحانی اور ایمانی قدروں، نیز اس انسانی و اسلامی اخوت کی بقاوترقی کا ضامن ہے، جو مصنوعی قومیتوں اور نسل و وطن کے محدود اور ناقص پیمانوں سے بالاتر ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے راستہ اور مسلک پر چلنے ان کی روح کو اپنے اندر پیدا کرنے اور ہر جگہ اور ہر دور میں ان کی دعوت کے پرچم کو بلند رکھنے کی دعوت ہے۔

" مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ‌ؕ هُوَسَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰ تُوا الزَّكٰوةَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ هُوَمَوۡلٰٮكُمۡ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ"(سورہ حج۔۷۸)

ترجمہ: "تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت (پر قائم رہو) اسی نے تمہیں مسلم قرار دیا اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں، اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ گواہ ٹھہرو، سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو، وہی تمہارا کارساز ہے، سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار۔"

حضرت ابراهیم علیه السلام سے تجدید تعلق: حج کا ایک بڑا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملت حنیفی کے امام اور مؤسس حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تجدید تعلق کیا جائے، ان کی میراث کی حفاظت کی جائے، ان کی زندگی اپنے سامنے رکھ کر اپنی زندگی کا موازنہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا جائے اور ان کی زندگی میں جو غلطیاں، فساد اور تحریف نظر آئے اس کو دور کیا جائے اور اس کے اصل سرچشمہ کی طرف رجوع کیا جائے، اس لئے کہ حج ایک قسم کا سالانہ اجتماع ہے۔ جس کے ذریعہ مسلمان اپنے اعمال اور اپنی زندگی کا احتساب و تجزیہ کر سکتے ہیں اور ان قوموں اور سوسائٹیوں کے اثرات سے چھٹکارا پاسکتے ہیں جن کے بیچ میں وہ رہتے ہیں۔

شعائر اللّٰه اور ان کی حکمت: ایک ایسی چیز کی آرزو اور جستجو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے۔ جس کو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اس کے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کر سکے اور قرب ووصال اور تعظیم و تسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے جو ہمیشہ سے اس کے ضمیر میں ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں، اس کی ہی کہلائی جاتی ہیں اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے۔ اسکے علاوہ ان کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات و معاملات اور اعمال و احوال وابستہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دین توحید اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں۔ ان چیزوں کا نام اس نے "شعائر اللہ" رکھا۔ ان کی تعظیم اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا۔ اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اسکے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ و مستور محبت اور مشاہدہ و قرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں۔ ارشاد ہے:

"ذٰلِكَ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ(سورہ حج۔۳۲)

ترجمه: "یہ بات ہو چکی اور جو کوئی (دین) خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا سو یہ (ادب) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔"

دوسری جگہ آتا ہے۔

"ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ"(سورہ حج۔ ۳۰)

ترجمہ: یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا، سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہو گا۔"

جذبۂ عشق کی تسکین: امام غزالیؒ لکھتے ہیں۔" اگر اللہ تعالیٰ سے لِقا کا شوق ہے تو مسلمان اس کے وسائل و اسباب اختیار کرنے پر لامحالہ مجبور ہو گا۔ عاشق اور محب ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے جس کی اضافت اس کے محبوب کی طرف ہو، کعبہ کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف ہے۔ اسلئے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہئے۔ علاوہ اس اجر و ثواب کی طلب و احتیاج کے جس کا وعدہ بھی اس سے کیا گیا ہے۔"(احیاء العلوم ۱/ ۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ بھی اسی نکتہ کو حج کی بنیادی حکمت بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔" کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے اور محبت جوش مارتی ہے اور وہ اس شوق کی تسکین لئے اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے۔"(حجۃ اللہ البالغۃ ۱۰/ ۵۹)

عقل ومادیت کے پرستاروں کے خلاف نعرہ بغاوت: امام غزالیؒ نے حج کی حقیقت و روح کو بڑے عجیب اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔" اس (بیت اللہ) کی وضع اور شکل ایک شاہی دربار یا شاہی ایوان کی طرح ہے، جہاں پر عُشاق و اہلِ فراق ہر دشوار اور دور و دراز مقام سے افتاں و خیزاں، آشفتہ سر اور پراگندہ مُو ہو کر پہنچتے ہیں۔ رب البیت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے، اپنی حقارت کا احساس لئے ہوئے، اس کی عزت و جلال کے سامنے اپنے کو فراموش کئے ہوئے، اس علم واعتراف کے ساتھ کہ وہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہے کہ کوئی گھر اور چہار دیواری اس کو گھیر سکے، یا کوئی شہر اس کا احاطہ کر سکے تاکہ اس کی عبودیت ورقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

اسی لئے ان کو ایسے اعمال اور نقل و حرکت کا پابند کیا گیا ہے، جن سے نہ نفس انسانی کو کوئی لگاؤ ہے۔ نہ عقل کی وہاں تک رسائی ہے، مثلاً رمی جمار (شیطان کو ایک خاص جگہ پہنچ کر پتھر مارنا) صفا و مروہ کے درمیان بار بار دوڑنا، اس قسم کے اعمال کمالِ عبودیت اور غایت درجہ فنائیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ایک قسم کی رحم دلی و غمخواری ہے، اس کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے، روزہ نفس کشی اور ان خواہشاتِ بشری کی سرکوبی کے لئے ہے، جن کو شیطان اپنی مقصد براری کے لئے استعمال کرتا ہے، اس میں دوسرے مشاغل کم کر کے عبادت میں انہماک و اشتغال کا پہلو واضح ہے، نماز میں رکوع و سجود اور ان افعال اور حرکات کے ذریعہ جن سے تواضع کی روح پیدا ہوتی ہے خدا کے سامنے اس کی کبریائی اور اپنے عجز کا اظہار ہے، اور اس سے دلوں کو خاص لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن رمیٔ جمار اور سعی اور اس طرح کے دوسرے اعمال ایسے ہیں، جن سے دل کو کوئی حظ اور سرور حاصل نہیں ہوتا، طبیعت بشری بھی ان کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عقل بھی ان کے معنی و مفہوم سے قاصر رہتی ہے، چنانچہ یہ عمل یا اقدام صرف اطاعت ہی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے جو بہر صورت واجب الاتباع ہے۔ اس سے مقصود عقل کو اس کے اختیارات سے محروم کر دینا اور نفس و طبیعت کو ان چیزوں سے دور رکھنا ہے، جن سے اس کو لگاؤ اور انس پیدا ہو سکتا ہے، اسلئے کہ جب کوئی چیز عقل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے تو طبیعت اس کی طرف خود بخود چلنے لگتی ہے، اور طبیعت کا یہ رجحان خود اس عمل کا باعث اور محرک بن جاتا ہے اور اس میں کمال عبدیت اور مجرد

اطاعت کی شان باقی نہیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر خصوصیت سے یہ لفظ کہے: "لَبَّیْکَ بِحَجَّۃٍ حَقًّا تَعَبُّدًا وَرِقًّا" (لبیک حج پر سچے دل کے ساتھ غلامی اور عبدیت کے جذبہ کے ساتھ) حج کے علاوہ یہ الفاظ آپ نے کسی اور عبادت حتی کہ نماز کیلئے بھی استعمال نہیں فرمائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے مخلوق کی نجات کا دارومدار اس پر رکھا ہے کہ ان کے اعمال اطاعت و انقیاد اور تسلیم و عبودیت کے طریقہ اور سنت پر ہوں، اس لئے وہ اعمال و عبادات (جن کے اسرار و معانی عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہیں) تزکیہ نفوس اور رجحان وطبیعت، اخلاق و فضائل سے ہٹا کر عبودیت کاملہ سے روشناس کرنے میں زیادہ موثر ہیں اس بات کی تہہ تک پہونچ جانے کے بعد یہ بات ہماری سمجھ میں خوب آجائے گی کہ ان افعال اور حرکات و سکنات پر تعجب دراصل ان عبادتوں کے مخصوص اسرار و مقاصد کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اور حج کی اصل بنیاد اور حقیقت سمجھنے کے لئے انشاء اللہ اتنا ہی کافی ہے۔" (احیاء العلوم ۱/۲۴۰)

رمیٔ جمار کے متعلق کہتے ھیں: "اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل عبودیت کا مظاہرہ ہوسکے۔ عقل اور نفس کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، مزید برآں اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبہ ہے۔ اس لئے کہ ابلیس ملعون اسی جگہ ان کے حج میں شبہ پیدا کرنے یا کسی معصیت میں مبتلا کرنے آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہوجائے اور اسکو ان سے کوئی توقع ہی باقی نہ رہ جائے، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ان کے سامنے شیطان حقیقت میں آگیا تھا، اس لئے انہوں نے اس کو مارا، میرے سامنے تو شیطان نہیں ہے کہ میں اس کو ماروں تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ خیال بھی شیطان ہی کا پیدا کردہ ہے اور وہی ہے جس نے یہ خیال تمہارے دل میں ڈالا ہے تاکہ شیطان کو ذلیل وخوار کرنے کا جو عزم اور ارادہ تمہارے اندر تھا وہ کمزور پڑ جائے۔

"تم کو جاننا چاہئے کہ ظاہر میں تم جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارتے ہو لیکن حقیقت میں وہ کنکریاں شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں، اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں، اسلئے کہ اس کی تذلیل و توہین سب سے زیادہ اس تعمیل حکم سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اطاعتِ محض کے جذبہ کے ساتھ ہو، نفس یا عقل کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔" (احیاء العلوم ۱/۲۴۳)

قربانی کے سلسلے میں کہتے ھیں: جاننا چاہئے کہ یہ امتثال امر (یعنی قربانی) تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، چنانچہ یہ حکم بھی فوراً بجالانا چاہئے اور یہ امید اللہ تعالیٰ کی ذات سے رکھنی چاہئے کہ اس کے ایک ایک جز کے بدلہ میں تمہارا ایک ایک جز آگ سے محفوظ رکھے گا، حدیث میں اسی طرح آیا ہے، قربانی جتنی بڑی ہوگی اور اس کے اجزا جتنے زیادہ ہوں گے آگ سے فدیئے بھی اسی قدر زیادہ ہوسکیں گے۔ (ایضاً)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے:- یہ بات بھی طہارت نفس میں داخل ہے کہ آدمی ان جگہوں میں اترے اور قیام کرے جہاں صالحین اور اولیاء اللہ ہمیشہ سے دل کی تعظیم اور ارادت کے ساتھ اترتے آئے ہیں اور اس کو خدا کے نام سے معمور کرتے رہے ہیں۔ یہ اہل خیر کے حق میں ملائکہ اور ملاء اعلیٰ کو متوجہ کرنے کا باعث ہوگا اور جب وہ وہاں اترے گا تو ان کا رنگ اس پر بھی چڑھ جائے گا۔" (حجۃ اللہ البالغہ ۱/۵۹)۔ (۳۰۳) حج کے مزید فوائد و مصالح کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کریں۔

حجۃُ الوِداع

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "رسول اللہ ﷺ نو برس تک مدینہ میں رہے اور حج نہیں کیا۔ پھر دسویں سال لوگوں میں

اعلان ہوا کہ آپ ﷺ حج کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، تو مدینہ منورہ میں بہت سارے لوگ جمع ہو گئے، سب کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ کی پیروی کریں اورآپ کی طرح عمل (حج) کریں۔ غرض ہم سب آپ ﷺ کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ ذوالحلیفہ پہنچے، اور وہاں حضرت اسماء بنت عمیس کی زچگی ہوئی اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ تولد ہوئے، تو انہوں نے آپ ﷺ سے کہلا بھیجا کہ میں کیا کروں؟ فرمایا۔ ’’غسل کرلو اور ایک کپڑے کا لنگوٹ باندھ لو اور احرام باندھ لو‘‘۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں دو رکعت پڑھیں، اور قصواء اونٹنی پر سوار ہوئے، یہاں تک کہ جب وہ آپ ﷺ کو لے کر مقامِ بَیدَاء (ایک مقام ہے مثل ٹیلہ کے) پر سیدھی ہوئی، تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے آگے کی جانب دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف تاحد نظر سوار اور پیادے ہی نظر آرہے تھے، آپ ﷺ ہمارے درمیان تھے، اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوتا اور آپ اس کی تاویل (وحقیقت) کو خوب جانتے تھے، اورآپ نے جو بھی عمل کیا ہم نے بھی وہی کیا۔ پھر آپ ﷺ نے توحید کے ساتھ لبیک پکاری۔ ’’لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔‘‘ اور لوگوں نے بھی یہی لبیک پکاری جو اب لوگ پکارتے ہیں اور آپ اپنی لبیک پکارتے رہے۔‘‘

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ’’ہم حج کے سوا اور کچھ ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اور عمرہ کو پہچانتے ہی نہ تھے۔ (بلکہ ایام حج میں عمرہ بجا لانا ایام جاہلیت سے برا سمجھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس جہالت کا قلع قمع فرمایا) یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کے ساتھ ہم بیت اللہ میں آئے تو آپ نے رکن (حجر اسود) کا استلام کیا (چھوا) اور تین چکر میں رمل فرمایا (اچھل اچھل کر چھوٹے چھوٹے ڈگ (قدم) رکھ کر شانیں اچھال اچھال کر چلے) اور چار چکر عادت کے موافق (عام رفتار سے) چلے۔ پھر مقام ابراہیم پر تشریف لائے اور یہ آیت تلاوت فرمائی، (وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاہِیْمَ مُصَلًّى) (یعنی مقرر کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ) اور مقام (ابراہیم) کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کیا۔ پھر میرے والد کہتے تھے اور میرے علم میں انہوں نے آپ ﷺ سے ہی ذکر کیا ہوگا۔ کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں اور ان میں قل یاایہا الکفرون اور قل ہو اللہ احد کی تلاوت فرمائی۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹے پھر اسے استلام کیا پھر دروازہ سے صفا کی طرف تشریف لے گئے۔ جب صفا (پہاڑی) کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (یعنی صفا اور مروہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں) اور فرمایا کہ ’’جس سے اللہ نے شروع کیا اسی سے ہم شروع کرتے ہیں‘‘۔ لہٰذا صفا سے (سعی) کو شروع کیا۔ تو آپ ﷺ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ کو دیکھا اور قبلہ کی طرف چہرہ انور کیا۔ اور اللہ کی توحید و کبریائی بیان کی۔ (یعنی لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہا) اور کہا۔ ’’لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ‘‘ پھر اس کے بعد دعا کی، پھر ایسا ہی کہا، پھر دعا کی، غرض تین بار ایسا ہی کیا، پھر اتر کر مروہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کے قدم میدان کے درمیان میں اترے تو دوڑے یہاں تک کہ جب چڑھ گئے، تو پھر آہستہ چلنے لگے یہاں تک کہ مروہ پر پہنچے۔ پھر مروہ پر بھی وہی کیا جو صفا پر کیا تھا۔ (یعنی کلماتِ مذکورہ، دعا، قبلہ رو ہونا وغیرہ) پھر مروہ پر طواف (سعی) مکمل ہوا (یعنی سات چکر ہو چکے)، تو آپ ﷺ نے فرمایا ’’جو بات بعد میں سامنے آئی، اگر پہلے ہی آئی ہوتی تو میں ہَدی ساتھ نہ لے آتا (بلکہ مکہ ہی میں خرید لیتا) اور اپنے اس احرام حج کو عمرہ کر ڈالتا، تو اب تم میں سے جس کے ساتھ ہدی نہ ہو وہ احرام کھولدے، اور اس کو عمرہ (شمار) کرلے۔‘‘

پھر سُراقہ بن مالک بن جُعْشُم کھڑے ہوئے اور عرض کی کہ ’’یارسول اللہ کیا یہ اسی سال کے لئے خاص ہے یا ہمیشہ کے لئے اجازت ہے‘‘ (حج کے ایام میں عمرہ کا جواز مراد ہے۔ نوویؒ) تو آپ ﷺ نے انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر (تشبیک کرکے) ارشاد فرمایا کہ ’’عمرہ حج

میں داخل ہو چکا۔ دو مرتبہ ارشاد فرمایا۔ پھر فرمایا نہیں (یعنی اس سال کی خصوصیت نہیں) بلکہ ہمیشہ کے لئے ہمیشہ کے لئے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے نبی ﷺ کے اونٹ لے کر آئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ احرام کھول دیا ہے، اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور سرمہ لگائے ہوئی ہیں۔ تو حضرت علی نے اسے غلط سمجھا اور برا مانا، تو انہوں نے فرمایا کہ میرے والد محترم نے اس کا حکم فرمایا ہے، راوی نے فرمایا کہ حضرت علی عراق میں فرماتے تھے کہ میں حضرت فاطمہ کے احرام کھولنے کے سبب ان پر غصہ کرتا ہوا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تاکہ ان کی نقل کردہ بات کی تحقیق و استفسار کروں، اور عرض کی کہ میں نے ان کے احرام کھولنے پر ناراضگی کا اظہار کیا، تو آپ نے فرمایا کہ "فاطمہ نے سچ کہا (میں نے ہی ان کو احرام کھولنے کا حکم دیا تھا) تم نے جب حج کا قصد کیا (اور احرام باندھا) تو کیا کہا۔" عرض کیا۔ "یا اللہ میں اہلال کرتا ہوں (احرام باندھتا ہوں) جیسا کہ آپ ﷺ نے اہلال کیا۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے ساتھ ہدی ہے، (اس لئے میں نے احرام نہیں کھولا)، اب تم بھی احرام نہ کھولو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر وہ اونٹ جو حضرت علی یمن سے لائے اور جو نبی ﷺ اپنے ساتھ لائے سب مل کر سو اونٹ ہو گئے، فرمایا: پھر سوائے آپ ﷺ کے اور ان صحابہ کے جن کے ساتھ ہدی کے جانور تھے، دیگر تمام صحابہ نے احرام کھول دیا، اور بال کترا لئے۔ پھر جب ترویہ کا دن ہوا، (یعنی ۸/ ذوالحجہ) تو سب لوگ منیٰ کو چلے اور حج کا احرام باندھا۔ آپ ﷺ سوار ہو کر نکلے۔ منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور (۹/ ذی الحجہ کو) فجر کی نماز ادا فرمائی، پھر کچھ دیر ٹھہرے، یہاں تک کہ سورج طلوع ہوا، اور نَمِرہ (عرفات کے قریب ایک جگہ، جو عرفات میں داخل نہیں ہے) میں بالوں کا ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ پھر آپ ﷺ چلے اور قریش کو یقین تھا کہ آپ ﷺ مشعر حرام (مزدلفہ کی ایک پہاڑی) میں وقوف کریں گے، جیسا کہ قریش جاہلیت میں کیا کرتے تھے، آپ ﷺ وہاں سے آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ عرفہ پہنچ گئے، تو دیکھا کہ مقام نمرہ میں آپ کیلئے خیمہ لگ چکا ہے، لہٰذا آپ ﷺ اس میں اترے، پھر جب زوال ہوا تو آپ کے حکم سے قصوا اونٹنی کسی گئی اور آپ ﷺ وادی کے بیچ میں پہنچے۔

پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا، فرمایا: "تمہارا خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسے آج کے دن (۱۰/ ذی الحجہ) کی حرمت ہے، اس مہینے کے اندر، اس شہر کے اندر (یعنی حرم پاک میں) سن لو! زمانہ جاہلیت کی ہر چیز میرے دونوں قدموں تلے پامال ہے، (یعنی اسلام کی روشنی کے آگے اب ان چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں) اور جاہلیت کے خون بے اعتبار ہو گئے، (اب اس کے بدلہ کی گنجائش نہیں)، اور پہلا وہ خون جو میں اپنے خونوں میں سے معاف کئے دیتا ہوں، ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے، جو قبیلۂ بنو سعد میں دودھ پیتا تھا اور اس کو قبیلۂ ہذیل نے قتل کر ڈالا۔"

"زمانۂ جاہلیت کا سود سب چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلے ہم ہمارا سود یعنی حضرت عباس بن عبد المطلب کا سود چھوڑ دیتے ہیں، وہ سب معاف کر دیا گیا۔ اور تم لوگ اب ڈرو اللہ سے کہ عورتوں پر زیادتی نہ کرو، اس لئے کہ ان کو تم نے اللہ کی امان میں لیا ہے، اور ان کے ستر (فرج و شرمگاہ) کو اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے حلال کیا ہے، اور ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے بچھونے پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں (یعنی تمہارے گھر میں) جس کا آنا تم کو ناگوار ہو، پھر اگر وہ ایسا کریں (اور تمہارا یہ حکم نہ مانیں) تو ان کو ایسا مارو کہ سخت چوٹ نہ لگے۔ (یعنی ہڈی وغیرہ نہ ٹوٹے، کوئی عضو ضائع نہ ہو، حسن صورت میں فرق نہ آئے) اور ان کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ ان کا رزق (کھانا پینا) اور لباس دستور کے موافق تمہارے ذمہ ہے۔"

"اور تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں، کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑے رہو، (اس پر قائم اور کاربند رہو) تو ہر گز کبھی

گمراہ نہ ہو۔(اور وہ اہم ترین نور ہدایت) اللہ کی کتاب (ہے۔یعنی قرآن مجید)۔ اور تم لوگوں سے (بروز قیامت) میرے متعلق سوال ہوگا، تو تم کیاجواب دوگے؟'' صحابہ کرام نے عرض کیا۔''ہم گواہی دیں گے کہ بے شک آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے (اللہ تبارک و تعالیٰ کا پیغام اور دینِ حق) پہنچایا اور (رسالت کا حق) ادا فرمایا اور (امت کے ساتھ) خیر خواہی کا معاملہ فرمایا''۔ پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی انگشتِ شہادت (کلمہ کی انگلی) سے بایں طور اشارہ فرمایا کہ اسے آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اور لوگوں کی جانب جھکاتے تھے اور فرماتے تھے۔''یا اللہ گواہ رہو'' تین بار (یہی فرمایا اور یوں ہی اشارہ کیا)

پھر اذان و اقامت ہوئی اور ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ (سنت وغیرہ) نہیں پڑھی۔ پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سوار ہو کر مَوقِف (وقوف کی جگہ) پہنچے، پھر اپنی قصواء اونٹنی کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور پگڈنڈی کو اپنے آگے کر لیا، اور قبلہ رو ہو کر وقوف فرمایا، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا، زردی تھوڑی تھوڑی جاتی رہی اور سورج کی ٹکیہ ڈوب گئی۔ اور حضرت اسامہ کو (اپنی سواری پر) پیچھے بٹھالیا اور لوٹے۔ اور قصواء کی مہار اس قدر کھینچی ہوئی تھی کہ اس کا سر کجاوہ کے آگے مَوْرِک میں لگ گیا تھا۔ (مَوْرِک وہ جگہ ہے جہاں بعض وقت سوار تھک کر اپنا لٹکا ہوا پیر رکھتا ہے) اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے (اور فرماتے تھے)''اے لوگو! سکون و اطمینان سے چلتے رہو۔'' اور جب کسی ریت کی ڈھیری پر آتے (جہاں بھیڑ کم پاتے) تو ذرا مہار ڈھیلی کر دیتے، یہاں تک کہ اونٹنی چڑھ جاتی۔

آخر مزدلفہ پہنچ گئے، اور وہاں مغرب و عشاء ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھی، دونوں کے درمیان کوئی سنت نہیں پڑھی، پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لیٹ گئے یہاں تک کہ صبح صادق ہوئی، جب فجر خوب واضح (ظاہر) ہوئی تو اذان و اقامت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر مشعر حرام تشریف لائے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا، تکبیر، تہلیل اور تحمید میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ خوب روشنی پھیل گئی، تو طلوع آفتاب سے قبل ہی وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور حضرت فضل بن عباس کو اپنے پیچھے سوار کر لیا، وہ نوجوان، خوبصورت بالوں والے، گورے چٹے خوبصورت انسان تھے۔ جب آپ روانہ ہوئے تو ایک گروہ عورتوں کا (اونٹ پر سوار) چلا جاتا تھا، اور فضل ان کی طرف دیکھنے لگے تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فضل کے چہرہ پر اپنا دست مبارک رکھا، اور فضل نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور دیکھنے لگے تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پھر اپنا ہاتھ ادھر پھیر کر ان کے منہ پر رکھ دیا تو فضل نے وہاں سے چہرہ پھیر لیا اور دیکھنے لگے۔

پھر آپ بطن مُحَسِّر میں پہنچے تو اونٹنی کو ذرا تیز چلایا اور بیچ کی راہ لی جو جمرۂ کبریٰ پر جا نکلی ہے، یہاں تک کہ اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے پاس ہے، (اسی کو جمرۂ عقبہ کہتے ہیں) اور سات کنکریاں اس کو ماریں۔ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے (ایسی کنکریاں ماریں) جو چٹکی سے ماری جاتی ہیں (اور باقلا کے دانہ کے برابر ہوں) اور بطن وادی سے (وادی کے بیچ سے) کھڑے ہو کر ماریں (کہ منیٰ اور عرفات و مزدلفہ دائیں طرف اور مکہ بائیں طرف تھا)۔ پھر نحر کی جگہ (قربانی کی جگہ) آئے اور اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے، بقیہ حضرت علی کے حوالہ کئے اور انہوں نے نحر کئے۔ اور ان کو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے ہدی میں شریک کیا، پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حکم سے ہر اونٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا۔ پھر (آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور حضرت علی) دونوں نے اس میں سے گوشت کھایا اور شوربہ پیا۔

پھر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سوار ہو کر بیت اللہ شریف تشریف لے گئے، اور طوافِ افاضہ کیا، اور مکہ میں ظہر پڑھی، اور بنی عبد المطلب کے

پاس آئے کہ وہ لوگ زمزم پر پانی پلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اولادِ عبد المطلب پانی نکالو (اور بھرو) اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ بھیڑ کر کے تمہیں پانی بھرنے نہ دیں گے، تو میں بھی تمہارا شریک ہو کر پانی بھرتا۔ (یعنی آپ بھرتے تو سنت ہو جاتا اور ساری امت بھرنے لگتی اور ان کی سقایت جاتی رہتی) پھر ان لوگوں نے ایک ڈول آپ کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے اس میں سے پانی پیا۔“ (رواہ مسلم وابوداود)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ضمیمہ

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا ہے، نئی سائنسی تحقیقات اور مختلف میدانوں میں مختلف نئے طریقے وجود پاتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ شرعی اصولوں کی روشنی میں اس کا شرعی حکم معلوم کرے۔ مختلف علماء کرام یا ان کی مجلس تحقیق و جستجو کے بعد ایسے امور کے فیصلے صادر کرتی ہے، لہٰذا تحفۃ الباری کی تیسری طباعت میں دو ضمیمے پیش کئے جارہے ہیں، پہلے ضمیمہ میں "نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے" کتاب کی روشنی میں بعض مسائل کی تلخیص پیش کی گئی ہے، اس کتاب میں "مجمع الفقہ الاسلامی ' الھند" کے مختلف سیمیناروں کے فیصلوں کو جمع کیا گیا ہے۔

دوسرے ضمیمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت قائم 'اسلامی فقہ اکیڈمی' مکہ مکرمہ کے "فقہی فیصلے" نامی کتاب کے بعض مسائل کو ملخصاً پیش کیا گیا ہے۔

دونوں ضمیموں کے مسائل مختلف ابواب سے متعلق ہیں، لیکن فی الوقت ضمیمہ کی شکل میں ان مسائل کو یکجا پیش کیا جارہا ہے۔

"نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے"

سے ماخوذ چند مسائل

(۱) **مسجد کی شرعی حیثیت:** اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سیمینار متفقہ طور پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ بابری مسجد یا کسی اور مسجد کے بارے میں ایسی کوئی صلح شرعی اعتبار سے قطعاً جائز نہیں کہ جس کا مقصد مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا یا نعوذ باللہ اسے بت خانہ بنانا ہو، اور یہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور علماء کا متفقہ فیصلہ ہے۔ (ص:۴۰)

(۲) حکومت سعودیہ کے انتظامی احکامات کی پابندی تمام ہی لوگوں پر ضروری ہے، یہ امر بالمعروف ہے، جس کی اطاعت لازم ہے، لہٰذا حکومت سعودیہ کے احکام وضوابط کے مطابق سعودیہ میں مقیم مسلمانوں کو اگر ہر سال حج کرنے سے منع کیا جائے تو اس کی پابندی شرعاً ضروری ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان پابندیوں کی مخالفت کرتے ہوئے بھی احرام حج باندھ کر میقات سے آگے بڑھ جائے اور پھر پکڑا جائے اور اسے انتظامیہ واپس کردے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو شرعاً محصر عن الحج کا ہے۔ (ص:۴۳)

(۳) بلادِ عرب میں عموماً وتر کی تین رکعتیں دو سلام سے ادا کی جاتی ہیں، احناف کے لئے بھی ایسے امام کی اقتداء میں نماز وتر ادا کرنے کی گنجائش ہے، اگر امام وتر کی تین رکعتیں دو سلام سے ادا کرے تو حنفی مقتدی دو رکعت کے بعد سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے۔ (ص:۴۴)

(۴) **زکوٰۃ:** زکوٰۃ کی وصولیابی میں مہتمم یا اس کا نائب (سفیر ومحصل) طلبہ کا وکیل ہے، مہتمم یا اس کے نائب (سفیر ومحصل) کو دے دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی (گو وہ رقم فوری طور پر خرچ نہ ہو)۔ مہتمم مدرسہ کا فرض ہے کہ زکوٰۃ کی رقم حسب احکام شرع طلبہ پر صرف کرے۔ (ص:۶۲)

(۵) بیت المال، مدارس یا دیگر رفاہی اداروں میں جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (ص:۶۳)

(۶) کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولیابی کا مروجہ طریقہ جائز نہیں۔ (ص:۶۴)

(۷) زکوٰۃ دینے والے شخص یا زکوٰۃ دینے والوں کی جماعت کی طرف سے زکوٰۃ میں نکالی ہوئی رقوم کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگادینا تاکہ مستقبل میں اس کا نفع فقراء و مساکین اور دیگر مستحقین زکوٰۃ پر تقسیم کیا جاتا رہے، جائز نہیں ہے، اس طرح زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (ص:۶۸)

(۸) عام شرکاء سمینار کا خیال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لئے درکار سرمایہ کی فراہمی میں پیش آنے والی دشواری کے باوجود شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف "فی سبیل اللہ" کا دائرہ وسیع کرکے اس میں تمام دینی اور دعوتی کاموں کو شامل کرلیا جائے، کیونکہ قرونِ اولیٰ میں اس تعمیم و توسیع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ (ص:۶۹)

(۹) **روزہ:** امراضِ قلب سے متعلق جو دوا زبان کے نیچے رکھی جاتی ہے، اگر روزہ کی حالت میں اس کا استعمال کیا جائے، اور اس کے اجزاء یا اس دوا کے ملے ہوئے لعاب کو نگلنے سے مکمل طور پر بچا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ (ص:۸۶)

(۱۰) تنفس وغیرہ کے مرض میں انہیلر (Inheller) کے استعمال سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔ (ص:۸۶)

(۱۱) جو دوا بھاپ کی شکل میں منہ یا ناک کے ذریعہ کھینچی جائے، خواہ مشین کے ذریعہ کھینچی جاتی ہو یا کسی اور طریقے سے، ان سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔ (ص:۸۶)

(۱۲) انجکشن کے ذریعہ جو دوا رگوں یا گوشت میں پہنچائی جاتی ہے، خواہ اس سے محض دوا کی ضرورت پوری کی جائے یا غذا کی، روزہ اس سے نہیں ٹوٹتا، البتہ روزہ کی حالت میں غذائی ضرورت کی تکمیل اور تقویت کے لئے بلاضرورت انجکشن لینا مکروہ ہے۔ (ص:۸۶)

(۱۳) گلوکوز چڑھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ چونکہ یہ ایک درجہ میں انسان کی غذائی ضرورت کو بھی پوری کرتا ہے، اس لئے بلاعذر گلوکوز چڑھانا مکروہ ہے۔ (ص:۸۶)

(۱۴) **فون، ویڈیو کانفرنسنگ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ نکاح:** نکاح کا معاملہ بہ مقابلہ عقد بیع (خرید و فروخت) کے زیادہ نازک ہے، اور گواہان کی شرط بھی ہے، اس لئے انٹرنیٹ، ویڈیو کانفرنسنگ اور فون پر راست نکاح کا ایجاب و قبول معتبر نہیں، البتہ اگر ان ذرائع ابلاغ پر نکاح کا وکیل بنایا جائے اور وہ گواہان کے سامنے اپنے موکل کی طرف سے ایجاب و قبول کرلے تو نکاح درست ہوجائے گا، اس صورت میں یہ بات ضروری ہوگی کہ گواہان وکیل بنانے والے غائب شخص سے واقف ہوں یا ایجاب و قبول کے وقت اس کا نام مع ولدیت ذکر کیا جائے۔ (ص:۹۵)

(۱۵) مہر کی سونے یا چاندی کے ذریعہ تعیین عمل میں آئے تاکہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے، اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہنچے۔ (ص:۱۰۲)

(۱۶) **مسلم و غیر مسلم تعلقات:**

۱- اسلام کا اپنا ایک مستقل نظامِ حکمرانی ہے۔ لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے، لہٰذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھرپور طریقے سے استعمال کریں۔

۳- جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں، اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴- جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملّی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں۔

۵- ملک اور انسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے، اور ان کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

۶- مسلمانوں کو ایسی جگہ رہائش اختیار کرنی چاہئے جہاں وہ اپنے دین وایمان اور اپنے تشخص کو برقرار رکھ سکیں، اور تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہئے جس سے وہ اپنے دینی وملی تشخص کی حفاظت کرسکیں۔

۷- اسلام میں غیر مسلم پڑوسیوں اور اہل تعلق کے بھی بعض حقوق ہیں، اس لئے ان کی بیماری وغم کے موقعوں پر ان کی عیادت وتعزیت کی جائے گی۔

۸- وندے ماترم جیسے گیت میں شرکیہ الفاظ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیئے جانے کا تصور پایا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے اس جیسے گیت کا پڑھنا شرعاً حرام ہے، اور ان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

۹- اگر غیر اسلامی قانونِ شہادت یا دوسرے قوانین کی بنیاد پر کسی مسلمان کے حق میں خلاف شرع فیصلے ہو جائیں تو اس کے لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے۔ یہ سیمینار تما مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ اپنے تنازعات 'دار القضاء' میں لے جائیں اور وہاں جو فیصلہ ہو اس کو قبول کریں اور اس کے مطابق عمل کریں، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض مقدمات میں مسلمان قاضی کا فیصلہ ہی شرعاً معتبر ہے۔

۱۰- وحدتِ ادیان کا تصور غیر اسلامی ہے اور کتاب وسنت کی رو سے باطل اور عملی طور پر غیر مفید ہے، بلکہ یہ دراصل اسلام کے تشخص کو مٹانے کی ایک گہری سازش اور مسلمانوں کو گمراہی پر ڈالنے کی ایک ناپاک کوشش ہے، اس لئے مسلمانوں کو ایسے فتنہ سے بچنا چاہئے۔

۱۱- اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مظلوم غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

۱۲- مسلمانوں کی طرف سے چلائے جانے والے خدمت خلق کے اداروں مثلاً ہاسپیٹل وغیرہ کے ذریعہ بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت واعانت کرنی چاہئے، یہی انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی رقم صرف مستحق مسلمانوں ہی پر خرچ کی جائے۔

۱۳- اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ قدرتی آفات کے موقع پر مسلم تنظیموں کی جانب سے برادرانِ وطن کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ (ص:۱۰۸--۱۱۰)

(۱۷) فون اور ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ بیع میں ایجاب وقبول معتبر ہو گا، انٹرنیٹ پر بھی اگر بیک وقت عاقدین موجود ہوں اور ایجاب کے فوراً بعد دوسرے کی طرف سے قبول ظاہر ہو جائے تو بیع منعقد ہو جائے گی۔

(۱۸) اگر انٹرنیٹ پر ایک شخص نے بیع کی پیشکش کی، اور دوسرا شخص اس وقت انٹرنیٹ پر موجود نہیں تھا، بعد کو اس نے اس

پیشکش کرنے والے کا پیغام حاصل کیا، یہ صورت تحریر و کتابت کے ذریعہ بیع کی ہوگی، اور جس وقت وہ دوسرا شخص اس پیشکش کو پڑھے، اسی وقت اس کی جانب سے قبولیت کا اظہار ضروری ہوگا۔(ص:۱۲۱)

(۱۹) کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت:

۱- کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے، بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی و قانونی کی ہے۔

۲- کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی و بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔

۳- دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی و بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔

۴- کرنسی نوٹوں پر زکوۃ لازم ہے۔(ص:۱۲۲--۱۲۳)

(۲۰) خرید و فروخت:

۱- ادھار خرید و فروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی ربا (سود) کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید و فروخت میں جو بھی قیمت ہو وہ مبیع یعنی خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے، اسی طرح ادھار خرید و فروخت کے مقابلہ میں بھی طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے۔

۲- متعینہ مدت میں قیمت یا قسط کے ادانہ کرنے کی صورت میں مزید کسی طرح کی زیادتی کا مطالبہ اور معاملہ سود کے تحت داخل ہے، خواہ معاملہ کرتے وقت اس طرح کی شرط لگائی گئی ہو، یا یہ کہ بعد میں اس طرح کا مطالبہ کیا جائے۔

۳- جس شخص نے بطور رہن (گروی) کوئی سامان اپنے پاس رکھا ہو، اس کا رہن رکھے ہوئے سامان سے نفع اٹھانا سود ہے، جو کسی حال میں جائز نہیں۔

۴- طے شدہ مدت تک بعض قسطوں کو ادا کر دینے کے بعد بقیہ قسطوں کے ادانہ کرنے کی صورت میں بائع (فروخت کنندہ) کو یہ حق نہیں ہے کہ فروخت کردہ شیٔ کو واپس لے لے اور ادا کردہ قسطوں کو واپس نہ کرے۔

۵- قرض کی دستاویز (رسیدات، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہو جائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق واجب رقم سے کم لے کر اس معاملہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اس طرح خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔(ص:۱۲۵--۱۲۶)

(۲۱) اگر ایک شخص کسی بائع (فیکٹری وغیرہ) سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دے، اور ابھی خریدا ہوا مال فیکٹری سے روانہ بھی نہ کیا ہو تو یہ صورت بیع قبل القبض میں داخل ہے اور جائز نہیں ہے۔(ص:۱۳۲)

(۲۲) شیئرز اور ان کی خرید و فروخت:

۱- کسی کمپنی کا خرید کردہ اکویٹی شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، وہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے کمپنی کو اتنی رقم دی ہے۔

۲- ایسے کمپنیوں کے شیئرز کی ابتدائی خریداری جو ابھی سرمایہ اکٹھا کرنے کے مرحلے سے گزر رہی ہیں، شرعاً خریداری نہیں، بلکہ

اس کمپنی میں شرکت ہے۔

۳- عام طور پر کمپنیوں کی دوسری املاک نقد سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے کمپنیز کے شیئرز کی خریداری درست ہے، لیکن اگر معلوم ہوجائے کہ اداکردہ نقد اس مقدار نقد کے برابر یا اس سے کم ہے جس کی شیئرز نمائندگی کرتا ہے، تو ایسی صورت میں شیئرز کی خریداری اس کی مقررہ قیمت سے کم یا زیادہ پر درست نہ ہوگی۔

۴- جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے، مثلاً شراب وخنزیر کے گوشت کی تجارت یا سودی قرضے دینا وغیرہ، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۵- چونکہ فی الحال ایسی کمپنیاں ہندوستان میں موجود نہیں ہیں، یا بہت کم ہیں جو خالص اسلامی بنیادوں پر کاروبار کرتی ہوں، اس لئے جنمسلمانوں کے پاس نقد سرمایہ ہو اور اپنے مخصوص حالات کی بنا پر ان کے لئے جائز تجارت میں اس سرمایہ کو لگانا قابل عمل نہ ہو، ان کے لئے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے، جن کا بنیادی کاروبار حلال ہو (مثلاً انجینئرنگ کے سامان یا عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا) اگرچہ انہیں بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے سودی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہو۔

۶- جنمسلمانوں نے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدے جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن کمپنیز حتمی طور پر بعض ناجائز تصرفات میں بھی ملوث ہوتی ہیں، انمسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ شیئرز ہولڈرس کی سالانہ میٹنگ میں کمپنی کو آئندہ ایسے ناجائز تصرفات سے روکنے کی کوشش کریں، اور دوسرے شیئر ہولڈرس کو افہام وتفہیم کے ذریعہ اس بات پر آمادہ کرنے کی سعی کریں کہ وہ بھی ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے میٹنگ میں ان کی تائید کریں۔

۷- اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے منافع میں سے اس کے بقدر صدقہ بلانیت ثواب کردینا ضروری ہے۔

۸- اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہوگیا ہے، اسی تناسب سے ملنے والے منافع سے نکال کر بلانیت ثواب اپنی ملک سے نکال دینا ضروری ہے۔

۹- حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی تجارت کرنا درست ہے۔

۱۰- فیوچر سیل (Futuresale) جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا، بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان برابر کرلینا مقصود ہوتا ہے، اسلامی شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے، کیونکہ یہ کھلا ہوا جوا ہے۔

۱۱- غائب سودا (Forwordsale) جس میں بیع تو ہوجاتی ہے، لیکن اس کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، بیع نہیں وعدہ بیع ہے، مقررہ تاریخ آنے پر ایجاب وقبول ہونے کے بعد ہی بیع وجود میں آئے گی۔

۱۲- حاضر سودے (Cashsale-Spotsale) میں شیئر سرٹیفیکٹ پر قبضہ سے پہلے خرید کردہ شیئرز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۱۳- شیئر سرٹیفکٹ حاصل ہونے کے بعد خریدار کا اس پر قبضہ متحقق ہوجاتا ہے، اگرچہ بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے کمپنی میں اس کا نام اندراج نہ ہوسکا ہے، لہٰذا اس شیئر کو خریدار فروخت کرسکتا ہے۔

۱۴- جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے، ان کی خرید وفروخت میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، ناجائز اور حرام

کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت میں بحیثیت بروکر کام کرنا جائز نہیں ہے۔(ص:۱۳۵-۱۳۷)

(۲۳) ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حلال ہے، اسلامی مالیاتی ادارہ یا کوئی بھی مسلمان ان کے شیئرز خرید سکتا ہے۔(ص:۱۳۸)

(۲۴) ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حرام ہے، ان کے شیئرز کی خریداری ہرگز جائز نہیں ہے۔(ص:۱۳۸)

(۲۵) **پگڑی کی شرعی حیثیت:**

۱- مالک مکان زرِ ضمانت وڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے، بہتر ہے کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے، اگر اس کو خرچ کردے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کردے۔

۲- اگر کوئی مکان یا دوکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی نقد رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالک مکان نے بحیثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کرلیا ہے۔ یہ رقم اس کے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی۔ آئندہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کے عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہو جائیں مالک مکان سے وصول کرلے، اور اسی طرح کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہو سکتا ہے۔

۳- مالک مکان نے پگڑی لئے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالک مکان کو حق ہوگا کہ جب چاہے مکان خالی کرالے۔ البتہ مالک مکان کو چاہئے کہ خالی کرانے کا نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے جو مقامی حالت کے پیش نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو، اور کرایہ دار کو چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کردے۔

۴- جو مکان یا دوکان بغیر پگڑی لئے کرایہ پر دی گئی ہو، پھر مالک مکان کو مکان واپس کرتے وقت کرایہ دار کے لئے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵- سمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدہ کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلقہ امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کرلیں تاکہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو، اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں سمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت مدت کا تعین کرلیا جائے اور اگر مالک مکان عوض لے کر ہمیشہ کے لئے اپنے مکان خالی کرانے کے حق سے دستبردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحۃً آپس میں اس کو طے کرلیں۔(ص:۱۴۰-۱۳۹)

(۲۶) **بنک انٹرسٹ (سود):** بنک انٹرسٹ کے سود ہونے پر شرکاء سمینار کا اتفاق ہے۔ اس سلسلہ میں طے پایا کہ:

۱- بنکوں سے ملنے والی سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے، بلکہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہئے۔

۲- بینک کے سود کی رقم کو بلانیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کردیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔

۴-اکثر شرکاء سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہِ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہئے۔(ص:۱۴۱)

(۲۷) **انشورنس:** مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے، کیونکہ وہ ربوٰ (سود)، قمار (جوا)، غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان ومال، صنعت وتجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر "الضرورات تبیح المحظورات"، رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ مال کی شرعاً اہمیت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان ومال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے۔

(واضح رہے کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے یہ تجویز اور سمینار میں شریک اہل علم کی طرف سے اس کی تائید کا یہ مطلب نہیں کہ انشورنس مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس انشورنس کے بعد جو بھی صورت پیش آئے اس میں ملنے والی سب رقم انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز ودرست ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں جان ومال کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے اور جو حق قانون وضابطہ میں بتایا جائے، اس کے مطابق ملنے والا مال تو انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز ودرست ہوگا اور بقیہ صورتوں میں صرف اپنی جمع کردہ رقم کے بقدر لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد کا نہیں، اور انشورنس کی صورت میں زائد کے جواز کی جہت حکومت کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کی طرف سے اور اس پر ضمان کی ہے۔)

(۲۸) **سود:**

۱-ربوٰ (سود) قطعی حرام ہے، اور جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲- سود ادا کرنے کی حرمت بذات خود نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کرکے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں، اور کون سی حاجت قابل لحاظ ہے اور کونسی قابل لحاظ نہیں، اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳-ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے، اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے۔ اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ (Subsidy) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴-ہندوستان میں حکومت جب اراضی مملوکہ کو اکوائر کرتی ہے (یعنی بحکم سرکاری وہ اراضی مفاد عامہ کے لئے خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکان اراضی کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشا کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان اراضی سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان اراضی کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں۔ سمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں، بلکہ قیمت کا جزء ہے، جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔(ص:۱۵۱-۱۵۰)

(۱۲۹) اسلامی مالیاتی ادارہ کو ریزروبینک کے حکم کی وجہ سے جبراً اپنے سرمایہ کا پانچ فیصد حصہ سرکاری تمسکات میں محفوظ کرنا پڑتا ہے، اس پر حکومت سود بھی دیتی ہے، تو شرکاء سمینار کے نزدیک یہ صورت درست ہے کہ اس محفوظ سرمایہ پر ملنے والے سود کو بتدریج محفوظ سرمایہ بنادیا جائے اور اصل سرمایہ دھیرے دھیرے نکال لیا جائے۔(ص:۱۵۲)

(۳۰)بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ:

۱- چونکہ معاملہ میں اصل اباحت ہے، اس لئے اے ٹی ایم کارڈ جس کے ذریعہ مشین سے اپنی جمع کردہ رقم نکالی جاتی ہے، کے استعمال میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

۲-ڈیبٹ کارڈ کا استعمال، اس کے ذریعہ خرید وفروخت اور ایک کھاتہ سے دوسرے کھاتہ میں رقم کی منتقلی درست اور جائز ہے۔

۳-اے ٹی ایم کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ کے حصول اور استعمال کے لئے جو رقم ادا کی جاتی ہے، وہ کارڈ کا معاوضہ اور سروس چارج ہے، اس لئے اس کا ادا کرنا جائز ہے۔

۴- کریڈٹ کارڈ کی مروج صورت چونکہ سودی معاملہ پر مشتمل ہے، لہٰذا کریڈٹ کارڈ یا اس قسم کے کسی کارڈ کا حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔(ص:۱۶۳)

(۳۱)نیٹ ورک مارکٹنگ:

۱- ملٹی لیول مارکٹنگ کی مروجہ شکلیں مختلف مفاسد کو شامل ہیں، اس میں دھوکہ، غرر، مبیع کو ایک غیر متعلق چیز کے ساتھ مشروط کرنا، ایک معاملہ کو دو معاملوں سے مرکب بنادینا اور شبہ قمار وغیرہ خلاف شرع باتیں پائی جاتی ہیں، اور خریداروں کا اصل مقصد سامان خریدنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ غیر معمولی کمیشن حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۲- چونکہ اس میں شرکت جائز نہیں ہے، اس لئے دوسروں کو اس میں شریک کرنا اور نیچے کے ممبروں کی وساطت سے کمیشن حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔(ص:۱۶۴)

(۳۲)خواتین کی ملازمت:

۱-عام حالات میں شریعت نے خواتین پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، لیکن شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کے لئے کسب معاش مباح ہے۔

۲- شریعت نے اصولی طور پر خواتین پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، البتہ بعض حالات میں ان پر نفقہ کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

۳-شرعی حدود وشرائط کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے عورت کے لئے معاشی جدوجہد جائز ہے۔

۴- عورت کے اندرون خانہ کسب معاش کے لئے کوئی صورت اختیار کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ اس سے شوہر اور بچوں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

۵- شوہر یا ولی (سرپرست) اگر عورت کی کفالت کررہے ہوں تو پھر عورت کے لئے کسب معاش کی غرض سے باہر جانے کے لئے ان کی اجازت ضروری ہے۔

۶-رات میں کسب معاش کی خاطر عورت کے باہر نکلنے کے لئے شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

۷-خواتین کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلیں تو درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

الف: ولی یا شوہر کی اجازت شامل ہو، سوائے اس کے کہ ولی یا شوہر نفقہ نہ دیتا ہو اور اس کے لئے خود کسب معاش کے سوا چارہ نہ ہو۔

ب: شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔
ج: لباس مردوں کے لئے باعث کشش نہ ہو۔
د: خوشبو کے استعمال سے پرہیز ہو۔
ہ: مردوں سے اختلاط بالکل نہ ہو۔
و: اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی کی نوبت نہ آئے۔
ز: شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو۔

۸- ملازمت کرنے والی خواتین ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، لیکن ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، تو اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ادارہ کا کوئی مرد تنہائی میں کسی خاتون کارکن سے بات نہ کرے، اگر ذمہ دار مردوں کے ساتھ تبادلہ خیال کی ضرورت ہو تو خواتین پردہ کے اہتمام کے ساتھ بیٹھیں، اپنی آواز میں لوچ سے پرہیز کریں، اسی طرح خواتین کارکن ذمہ دار مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلفی کا ماحول ہرگز نہ بنائیں۔

۹- جوان عورتوں کے لئے ایسے اداروں میں کام کرنا جائز نہیں جہاں ان کے ساتھ مرد کارکن بھی شریک کار ہوں۔

۱۰- ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے اقارب سے دور تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں، اگر کسی عورت کے ساتھ بہت مجبوری ہو تو پھر وہ مفتی سے رابطہ کرکے اپنی مشکل کا حل تلاش کرسکتی ہے۔ (ص ۱۷۰-۱۶۸)

(۳۳) طبّی مسائل:

۱- علاج کرنے کا حق اس شخص کو حاصل ہے جو فن کا علم رکھتا ہو اور تجربہ کار ہو، اور اس کے علم اور تجربہ کی کسی مستند و معتبر ذریعہ نے تصدیق کی ہو، صحیح علم و تجربہ کے بغیر علاج و معالجہ کرنا جائز نہیں۔ جس شخص کو علاج معالجہ کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اگر اس کے علاج کی وجہ سے مریض کو غیر معمولی ضرر لاحق ہو جائے تو ضمان عائد ہوگا۔

۲- اگر کسی مستند معالج (ڈاکٹر، حکیم) نے علاج میں کوئی کوتاہی کی اور اس کی وجہ سے مریض کو ضرر پہنچ گیا تو معالج ضامن ہوگا۔

۳- قدرت کے باوجود مریض یا اس کے اولیاء (سرپرست و ذمہ دار حضرات) کی اجازت کے بغیر اگر ڈاکٹر مریض کا آپریشن کردے اور آپریشن مضر یا مہلک ثابت ہو تو ضمان لازم آئے گا۔

۴- اگر مریض بے ہوش ہو، اور اس کے اولیاء وہاں موجود نہ ہوں اور ڈاکٹر یہ محسوس کرتا ہو کہ اس کی جان یا عضو کی حفاظت کے لئے فوری آپریشن ضروری ہے، اور اس نے اجازت کے بغیر آپریشن کردیا مگر مریض کو نقصان پہنچ گیا تو ڈاکٹر ضامن نہ ہوگا۔

۵- ڈرائیور کی بینائی متاثر ہونے کی صورت میں ڈاکٹر پر ضروری ہے کہ وہ متعلقہ محکمہ کو باخبر کردے، اسی طرح ہوائی جہاز کا پائلٹ یا ٹرین اور بس کا ڈرائیور اگر نشہ کا عادی ہو اور اس سے مسافروں کو خطرہ لاحق ہو تو ڈاکٹر پر لازم ہوگا کہ وہ متعلقہ محکمہ کو آگاہ کردے۔

۶- اگر ڈاکٹر کو اپنے مریض کے جرم کی اطلاع ہو اور جرم میں کوئی بے گناہ شخص ماخوذ ہو رہا ہو تو اس بے گناہ شخص کی براءت کے لئے ڈاکٹر پر حقیقت حال کا اظہار ضروری ہے، رازداری سے کام لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔ (ص: ۱۷۳--۱۷۴)

(۳۴) ضبطِ ولادت:

۱- جو بچہ موجود ہے، اس کی پرورش، رضاعت (دودھ پلانا) اور نشو ونما میں اگر ماں کے جلد حاملہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا خطرہ

ہے تو ایسی صورت میں مناسب وقفہ قائم رکھنے کی خاطر عارضی مانع حمل تدابیر اختیار کرنا جائز ہے۔

۲- دائمی منع حمل کی تدابیر کا استعمال مردوں کے لئے کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، عورتوں کے لئے بھی منع حمل کی مستقل تدابیر ممنوع ہیں، سوائے ایک صورت کے، وہ استثنائی صورت یہ ہے کہ ماہر قابل اعتماد اطباء کی رائے میں اگلا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں عورت کی جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا ظن غالب ہو، تو اس صورت میں عورت کا آپریشن کرا دینا تاکہ استقرار حمل نہ ہوسکے، جائز ہے۔(ص:۱۷۵--۱۷۶)

(۳۵) اعضاء کی پیوند کاری:

۱- کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے:

الف: غیر حیوانی اجزاء کا استعمال (جائز ہے)

ب: ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور جو بطریقۂ شرعی ذبح کئے گئے ہوں (جائز ہے)

ج: جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریق شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں تو ان کا استعمال جائز ہے۔ اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیز کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

۲- ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

۳- اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

۴- اگر کوئی مریض ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کا عضو اس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی، اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا، اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوند کاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضو انسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کے لئے فراہم ہے، تو ایسی ضروری، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوند کاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لئے مباح ہوگا۔

۵- اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے، اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

۶- اگر کسی نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں۔(ص:۱۷۷--۱۷۸)

(۳۶)ایڈز:

۱- اگر کوئی ایڈز کا مریض ہو مگر اس نے اپنا مرض ظاہر کئے بغیر کسی خاتون سے نکاح کر لیا تو ایسی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہو گا۔ اور اگر نکاح کے بعد مرد اس بیماری میں مبتلا ہو جائے اور خطرناک حد تک پہنچ جائے تو خاتون کے لئے فسخ نکاح کا حق ہو گا۔

۲- ایڈز کی مریضہ اگر حاملہ ہو جائے اور مستند ڈاکٹروں کی رائے میں غالب گمان یہ ہے کہ بچہ بھی اس مرض سے متاثر ہو گا، تو ایسی صورت میں حمل میں جان آنے سے پہلے جس کی مدت فقہاء نے ۱۲۰/ دن لکھی ہے، اسقاط کرانے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۳- ایڈز کے مریض کو اگر مرض نے پورے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا ہو اور وہ زندگی کے معمولات کو ادا کرنے سے معذور ہو گیا ہو تو ایسے شخص کو مرض موت کا مریض سمجھا جائے گا۔

۴- ایڈز کے مریض کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں یا متعلقین کو اس مرض سے مطلع کر دے اور خود بھی احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھے۔ (ص:۱۷۹)

(۳۷)کلوننگ:

۱- کلوننگ کے سلسلہ میں جو تفصیلات اور صورتیں اب تک سامنے آئی ہیں، اور ان کی وجہ سے جن اخلاقی اور سماجی نقصانات کا خطرہ ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی بھی طریقہ پر انسانی کلوننگ حرام ہے۔

۲- نباتات وحیوانات میں ایسی کلوننگ جو انسانی مفاد میں ہو اور جو انسان کے لئے دینی، اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے مضرت رساں نہ ہو، جائز ہے۔ (ص:۱۸۱)

(۳۸)الکحل:

۱- الکحل ایک کیمیائی مادہ ہے، جو مختلف پھلوں اور اناج کے نشاستہ (Carbohydrate) یا شکر سے بنایا جاتا ہے، اس کی بہت ساری قسمیں ہیں، جن میں صرف ایک قسم نشہ آور ہے۔

۲- بعض دوائوں میں ایتھائل الکحل (EthylAlcohal) کا استعمال ہوتا ہے، یہ الکحل نشہ آور ہے، اور دوا میں شامل ہونے کے بعد بھی اس کی حقیقت نہیں بدلتی، لیکن علاج ومعالجہ کے باب میں شریعت نے جو سہولت روا رکھی ہے، اس کے تحت مجبوراً الکحل آمیز ادویہ کا استعمال درست ہے۔

۳- عطریات میں جو الکحل استعمال ہوتا ہے، فنی ماہرین کی تحقیق واطلاع کے مطابق وہ نشہ آور نہیں ہے، اس لئے یہ ناپاک نہیں ہے۔ (ص:۱۸۳)

(۳۹)میڈیکل انشورنس:

۱- میڈیکل انشورنس، انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے، لہٰذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے، اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲- اگر قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو، صاحب استطاعت کے لئے اس کے بقدر بلانیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔ (ص:۱۸۴)

(۴۰) جنیٹک ٹسٹ:

۱- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا بچہ ایسا ناقص العقل اور ناقص الاعضاء ہے، جو نا قابل علاج ہے اور پیدائش کے بعد اس کی زندگی ایک بوجھ اور اس کے اور گھر والوں کے لئے تکلیف دہ رہے گی تو ایسی صورت میں حمل پر ایک سو بیس (۱۲۰) دن گذرنے سے پہلے پہلے والدین کے لئے اس کا اسقاط جائز ہے۔

۲- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی شخص کی اگلی نسل میں پیدائشی نقص کے امکانات ہیں، تو اس اندیشہ کے پیش نظر سلسلہ تولید کو روکنا قطعاً ناجائز ہے۔

۳- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ کسی شخص کے بارے میں اندیشہ ہو کہ وہ آئندہ جنون یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو سکتا ہے، جو شرعاً فسخ نکاح کا سبب ہے، تو فسخ نکاح کے لئے محض یہ ٹسٹ کافی نہیں ہو گا۔

۴- علاج کی غرض سے امراض کی شناخت اور تحقیق کے لئے جنیٹک ٹسٹ کرانا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ (ص:۱۸۵)

(۴۱) ڈی این اے ٹسٹ:

۱- جس بچہ کا نسب شرعی اصول کے مطابق ثابت ہو، اس کے بارے میں ڈی این اے ٹسٹ کے ذریعہ اشتباہ پیدا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲- اگر کسی بچہ کے بارے میں چند دعوے دار ہوں اور کسی کے پاس واضح شرعی ثبوت نہ ہو تو ایسے بچہ کا نسب ڈی این اے ٹسٹ کے ذریعہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

۳- جو جرائم موجب حد و قصاص ہیں، ان کے ثبوت کے لئے منصوص طریقوں کے بجائے ڈی این اے ٹسٹ کا اعتبار نہیں ہو گا۔

۴- حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے جرائم کی تفتیش میں ڈی این اے ٹسٹ سے مدد لی جا سکتی ہے اور قاضی ضرورت محسوس کرے تو اس پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔ (ص:۱۸۶)

(۴۲) موت کی حقیقت اور مصنوعی آلہ تنفس:

۱- جب سانس کی آمد و رفت پوری طرح رک جائے اور موت کی علامات ظاہر ہو جائیں، تب ہی موت کے واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اور اسی وقت سے موت سے متعلق وصیت کا نفاذ، میراث کا اجراء اور عدت کا آغاز وغیرہ احکام جاری ہوں گے۔

۲- اگر مریض مصنوعی آلۂ تنفس پر ہو، لیکن ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس نہ ہوئے ہوں اور امید ہو کہ فطری طور پر تنفس کا نظام بحال ہو جائے گا، تو مریض کے ورثہ کے لئے اسی وقت مشین کا ہٹانا درست ہو گا جبکہ مریض کی املاک سے اس علاج کو جاری رکھنا ممکن نہ ہو، نہ ورثہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نہ کوئی اور ذریعہ میسر ہو۔

۳- اگر مریض آلۂ تنفس پر ہو اور ڈاکٹروں نے مریض کی زندگی اور فطری طور پر نظام تنفس کی بحالی سے مایوسی ظاہر کر دی ہو تو ورثہ کے لئے جائز ہو گا کہ مصنوعی آلۂ تنفس علاحدہ کر دیں۔ (ص:۱۸۷)

(۴۳) یوتھینزیا کا حکم:

۱- کسی مریض کو شدید تکلیف سے بچانے یا اس کے متعلقین کو علاج اور تیمارداری کی زحمت سے نجات دلانے کے لئے عمداً ایسی تدبیر کرنا کہ جس سے اس کی موت واقع ہو جائے حرام ہے اور یہ قتل نفس کے حکم میں ہے۔

۲- ایسے مریض کو گو مہلک دوا نہ دی جائے، مگر قدرت کے باوجود اس کا علاج ترک کر دیا جائے تاکہ جلد سے جلد اس کی موت واقع ہو جائے، یہ بھی جائز نہیں ہے۔(ص:۱۸۸)

(۴۴)**پلاسٹک سرجری:**

۱- جسمانی عیب دور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز ہے، اور عیب سے مراد جسم میں پائی جانے والی ایسی صورت ہے، جو معروف ومعتاد اور عمومی تخلیقی کیفیت سے مختلف ہو، چاہے پیدائشی ہو یا بعد میں پیدا ہو جائے۔

۲- جسمانی تکلیف کے ازالہ کے لئے- اگر ڈاکٹر کا مشورہ ہو- پلاسٹک سرجری جائز ہے۔

۳- درازی عمر کی وجہ سے طبعی طور پر انسان کی ظاہری حیثیت میں جو تغیر آتا ہے، جیسے جھریوں کا پیدا ہو جانا وغیرہ، ان کو ختم کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں ہے۔

۴- ناک اور دوسرے اعضاء خلقی طور پر کم خوبصورت اور غیر مناسب ہوں، مگر انسان کی عمومی معتاد خلقت کے دائرہ سے باہر نہ ہوں تو زینت اور محض خوبصورتی کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں۔

۵- اپنی شناخت چھپانے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں، سوائے اس کے کہ مظلوم کو ظالم سے بچنے کے لئے ایسا کرنا پڑے۔(ص:۱۸۹)

(۴۵)**وظیفہ طلبہ:** مدرسہ میں طلبہ کے قیام وطعام اور تعلیم وغیرہ پر جو مجموعی مصارف آتے ہیں، ان کا حساب لگا کر ہر طالب علم پر واجب الادا ماہانہ اخراجات کے بقدر مد زکوٰۃ سے ادا کئے جائیں، یہ ادائیگی بصورت نقد یا چیک طالب علم کو دی جائے، اور خود مہتمم مدرسہ بھی یہ رقم زکوٰۃ اکائونٹ سے نکال کر مدرسہ کے عام اکائونٹ میں اس کی طرف سے جمع کر سکتا ہے، بشرطیکہ بوقت داخلہ، فارم داخلہ میں طالب علم کی طرف سے اور نابالغ ہو تو اس کے ولی کی طرف سے یہ تصریح کرادی جائے کہ مہتمم مدرسہ اس کی طرف سے از مد زکوٰۃ اس کے اخراجات مدرسہ کو ادا کرنے کا مجاز ہو گا۔(ص:۲۰۹)

”اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے“

سے ماخوذ

(۱)**انشورنس:** تجارتی بیمہ کی تمام صورتیں حرام ہیں، خواہ جان کا بیمہ ہو یا سامان تجارت کا بیمہ یا کسی اور چیز کا۔(ص:۵۷)

(۲)**قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ھاتھ رکھنا:** کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قسم کھاتے وقت توریت یا انجیل پر ہاتھ رکھے۔۔۔۔ اگر کسی غیر اسلامی مملکت کی عدالت قسم لینے والے کے لئے ان پر ہاتھ رکھنا ضروری قرار دیتی ہو تو مسلمان کو چاہئے کہ وہ عدالت سے قرآن پر ہاتھ رکھنے کا مطالبہ کرے، اگر اس کا مطالبہ نہ مانا جائے تو مجبوراً تعظیم کی نیت کے بغیر ہاتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔(ص:۱۱۹--۱۲۰)

(۳)**خطبہ ونماز میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال:** خطبہ جمعہ وعیدین، نماز میں قراءت اور تکبیروں میں لائوڈ اسپیکر کے استعمال میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، انسان کی ایجاد کردہ ہر نئی چیز سے کوئی شرعی غرض یا اسلام کے کسی واجب کی تکمیل ہوتی ہے اور

ایسی کامیابی ملتی ہے جو اس کے بغیر نہیں ملتی تو وہ چیز اسی درجہ میں مطلوب ہوگی، جس درجہ میں اس سے شرعی مقاصد پورے ہوتے ہوں، معروف اصولی قاعدہ ہے کہ 'واجب کی تکمیل جس چیز پر موقوف ہو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے'۔ (ص:۱۳۵)

(۴) **کرنسی نوٹ:**

۱- کرنسی نوٹ بذات خود نقد ہے، اور اس پر سونے چاندی کا حکم جاری ہوگا، چنانچہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس میں زیادتی اور ادھار دونوں قسم کے سود جاری ہوں گے۔

۲- مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف جنس ہوں گی۔

۳- ایک جنس کی کرنسی کا باہم تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، خواہ نقد ہو یا ادھار۔

۴- ایک جنس کی کرنسی سے دوسری جنس کی کرنسی کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، البتہ ادھار تبادلہ جائز نہیں ہے۔

۵- کرنسی نوٹ کی قیمت سونے اور چاندی کے نصاب میں سے کمتر نصاب کے بقدر ہو جائے یا دیگر نقود یا سامان تجارت کے ساتھ مل کر نصاب پورا ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۶- بیع سلم اور کمپنیوں میں کرنسی نوٹ کو رأس المال بنانا درست ہے۔ (ص:۱۳۸--۱۳۹)

(۵) **غیر اسلامی تقریبات:** غیر اسلامی تہواروں اور تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، مسلمانوں کے لئے ان میں نہ شرکت جائز ہے، نہ ان کے ذمہ داروں کو ہدیہ پیش کرنا اور نہ ان کی رسومات میں ان کی موافقت کرنا اور نہ ان کے مقامات کی زیارت کرنا، کیونکہ ان میں اسلام مخالف امور انجام پاتے ہیں۔ (ص:۱۵۹)

(۶) **قرآنی رسم الخط:** قرآن کے عثمانی رسم الخط میں تبدیلی جائز نہیں ہے اور موجودہ رسم الخط میں اسے باقی رکھنا واجب ہے، تاکہ ایک دائمی دلیل وحجت اس بات کی ہو کہ قرآن کے متن میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی پابندی ہی میں صحابہ کرام اور ائمہ سلف کی پیروی واتباع بھی ہے۔ (ص:۱۷۷)

(۷) **مصنوعی بار آوری اور ٹسٹ ٹیوب بے بی کا حکم:**

۱- ایک شادی شدہ مرد کا نطفہ لے کر اس کی زوجہ کی اندام نہانی یا رحم میں مناسب مقام پر انجکٹ کر دیا جائے۔۔۔، اس طریقہ کو اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مرد کے اندر کوئی ایسی کمی ہو کہ وہ اپنا مادہ منویہ دوران مباشرت عورت کے مناسب مقام تک نہ پہنچا سکے۔ یہ طریقہ اس تحقیق کے بعد جائز ہے کہ حمل کے لئے عورت اس طریقہ کی محتاج ہے۔

۲- شوہر کا نطفہ اور اس کی زوجہ کا انڈا لے کر مقررہ فیزیکلی شرائط کے مطابق ایک طبی ٹسٹ ٹیوب میں رکھا جائے، جہاں ان دونوں میں بار آوری ہو، پھر جب بار آور شدہ حصہ تقسیم اور بکھراؤ کا عمل شروع کر دے تو مناسب وقت میں اسے نکال کر اسی خاتون کے رحم میں ڈال دیا جائے۔ اس طریقہ کو اس وقت اپنایا جاتا ہے جب بیوی اس وجہ سے بانجھ ہو کہ وہ ٹیوب بند ہو جو اس کی انڈا دانی اور رحم کے درمیان جڑی ہوتی ہے (فلوپین ٹیوب) یہ طریقہ شرعی نقطۂ نظر سے اپنی ذات میں اصولاً درست ہے، لیکن اس سے وابستہ دیگر امور اور شک کے اسباب سے پوری طرح محفوظ نہیں ہے، لہٰذا اس طریقہ کو انتہائی ضرورت کے حالات میں ہی اختیار کرنا چاہئے۔

۳- مذکورہ بالا دونوں جائز طریقوں میں اکیڈمی طے کرتی ہے کہ نومولود کا نسب نطفہ اور انڈا دینے والے زوجین (شوہر اور بیوی) سے ثابت ہوگا، میراث اور دیگر حقوق ثبوتِ نسب کے تابع ہوتے ہیں، لہٰذا بچہ کا نسب جس مرد و عورت سے ثابت ہوگا وراثت اور دیگر

احکام بھی بچہ اور ان کے درمیان جاری ہوں گے جن کے ساتھ بچہ کا نسب ثابت ہوا ہے۔

۴- مصنوعی بار آوری کے دیگر تمام طریقے حرام ہیں، مثلاً: (۱) ایک شخص کا نطفہ دوسرے شخص کے بیوی کے مناسب مقام پر انجکٹ کر دینا، (۲) شوہر کا نطفہ اور کسی دوسری عورت جو اس کی زوجہ نہیں ہے (جسے رضاکار کہتے ہیں) کے انڈے کو لے کر ٹسٹ ٹیوب کے اندر بار آوری کی جائے، پھر اسے اس شخص کی بیوی کے رحم میں ڈال دیا جائے، (۳) ایک اجنبی مرد و عورت کا نطفہ اور انڈا لے کر ٹسٹ ٹیوب میں بار آوری کے لئے رکھا جائے، پھر اسے کسی دوسری شادی شدہ عورت کے رحم میں ڈال دیا جائے، یا (۴) ٹسٹ ٹیوب کے اندر بیرونی بارآوری زوجین کے انڈوں کے درمیان کی جائے، پھر اسے حمل کے لئے رضاکار عورت کے رحم میں ڈال دیا جائے، یہ تمام طریقے حرام ہیں۔

۵- مصنوعی بار آوری میں عام طور پر حتی کہ اس کی جائز شکلوں میں بھی دوسرے امور وابستہ ہوتے ہیں، نطفوں یا بار آور حصوں کے ٹسٹ ٹیوب میں اختلاط کے امکانات ہوتے ہیں، بالخصوص جبکہ یہ کام کثرت سے اور عام ہو جائے، اس لئے اکیڈمی دین کا جذبہ رکھنے والوں کو نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کریں، الا یہ کہ انتہائی سخت ضرورت ہو، اور آخری درجہ احتیاط اور نطفوں یا بار آور شدہ حصوں کے اختلاط سے مکمل تحفظ کے ساتھ کیا جائے۔ (ص:۱۸۸--۱۹۴)

(**تنبیہ**: ایک عورت کے معالجہ کے عام مسائل میں جو شرائط اور ترتیب کتاب النکاح وغیرہ میں موجود ہیں، ان کا لحاظ یہاں بھی ضروری ہے)

(اکیڈمی کے بعض علماء کا اختلاف اصل کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔ ص:۲۰۳--۲۱۰)

(۸) اعضاء کی پیوند کاری:

اول: کسی زندہ انسان کا کوئی عضو دوسرے انسان کے جسم میں لگا دینا جو اپنی زندگی بچانے کے لئے یا اپنے بنیادی اعضاء کے عمل میں سے کسی عمل کو بحال کرنے کے لئے اس کا ضرورت مند ہو ایک جائز عمل ہے، بشرطیکہ:

۱) عضو کے لینے سے اس شخص کی طبعی زندگی کو کوئی نقصان نہ پہنچے، ورنہ ایسی پیشکش اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوگی جو شرعاً ناجائز ہے۔

۲) رضاکارانہ اور بغیر کسی دبائو کے عضو دیا جائے۔

۳) مریض کے علاج کے لئے عضو کی پیوند کاری میں طبی نقطۂ نظر سے تنہا ممکن ذریعہ رہ گیا ہو۔

۴) عضو لینے اور عضو لگانے کے عمل کی کامیابی غالباً یا عادۃً یقینی ہو۔

دوم: مندرجہ ذیل حالتیں بدرجہ اولیٰ جائز شمار کی جائیں گی:

۱- کسی مردہ انسان کا عضو دوسرے ضرورت مند انسان کے تحفظ کے لئے حاصل کیا جائے، بشرطیکہ جس کا عضو لیا جارہا ہو وہ مکلف ہو اور زندگی میں اس کی اجازت دے چکا ہو (شیخ صالح بن فوزان اسے ناجائز قرار دے رہے ہیں، جبکہ ابو بکر زید متوقف ہیں)

۲- کسی مطلقاً ماکول اللحم (حلال) اور ذبح شدہ جانور کا یا بوقت ضرورت دوسرے کسی جانور کا عضو کسی ضرورت مند انسان میں پیوند کاری کے لئے لیا جائے۔

۳- انسانی جسم کا کوئی حصہ لے کر اسی انسان کے جسم میں اس کی پیوند کاری کی جائے۔

۴- معدنی یا کسی اور دھات کے مصنوعی ٹکڑے کو کسی مرض کے علاج کے لئے انسان کے جسم میں لگایا جائے، جیسے جوڑوں اور قلب کے والو وغیرہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

یہ چاروں حالتیں سابقہ شرائط کے ساتھ اکیڈمی کی رائے میں جائز ہیں۔(ص:۲۰۰--۲۰۱)

(۹) لکڑی کے تابوت میں مسلمانوں کی تدفین:

۱- مسلمان کے لئے غیر مسلموں کی مشابہت اور تقلید کی نیت سے اختیار کیا جانے والا کوئی بھی عمل اور سلوک شرعاً ممنوع اور صریح احادیث کی رو سے ناجائز ہے۔

۲- تابوت میں تدفین سے اگر غیر مسلموں کی مشابہت مقصود ہو تو حرام، ورنہ بلاضرورت مکروہ ہے، بصورتِ ضرورت حرج نہیں۔(ص:۲۲۱)

(۱۰) انبیاء کرام علیہم السلام کی تصویر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کی بھی کسی بھی طرح کی تصویر کسی بھی مقصد سے بنانا حرام اور ناجائز ہے، اور اس پر بندش لگانا واجب ہے۔(ص:۲۲۴)

(۱۱) پوسٹ مارٹم:

اول: مندرجہ ذیل مقاصد کے تحت لاشوں کا پوسٹ مارٹم جائز ہے:

الف: اگر تعزیراتی مقدمہ میں موت یا جرم کے اسباب کی دریافت قاضی کے لئے دشوار ہو، اور پوسٹ مارٹم کے ذریعہ ہی اس کی دریافت ہو سکتی ہو۔

ب: اگر پوسٹ مارٹم کے متقاضی امراض کی دریافت مطلوب ہو تاکہ اس کی روشنی میں ان امراض کے لئے مناسب علاج اور ضروری احتیاطی اقدامات کئے جاسکیں۔

ج: اگر طب کی تعلیم و تدریس مقصود ہو، جیسا کہ میڈیکل کالجز میں رائج ہے۔

دوم: بغرض تعلیم پوسٹ مارٹم میں درج ذیل شرائط کی رعایت ضروری ہے:

الف: لاش اگر کسی معلوم شخص کی ہو تو موت سے قبل حاصل کی گئی خود اس کی اجازت یا موت کے بعد وارثین کی اجازت ضروری ہے، معصوم الدم لاش کا پوسٹ مارٹم بغیر ضرورت کے نہیں ہونا چاہیئے۔

ب: پوسٹ مارٹم بقدر ضرورت ہی کیا جائے تاکہ لاشوں کے ساتھ کھلواڑ کی صورت نہ پیدا ہو۔

ج: خواتین کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم خواتین ڈاکٹروں کے ذریعہ ہی کرنا ضروری ہے، سوائے اس صورت کے جب خاتون ڈاکٹر نہ ملیں۔

سوم: تمام حالات میں پوسٹ مارٹم شدہ لاش کے تمام اجزاء کی تدفین واجب ہے۔(مسلم لاش کے متعلق بعض علماء کے اختلاف کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع کریں)(ص:۲۶۳--۲۶۴)

(۱۲) موت کے بارے میں قطعی حکم اور انسانی جسم سے طبی آلات کی علاحدگی: جس مریض کے جسم میں زندگی برقرار رکھنے والے آلات لگے ہوں، اگر اس کے دماغ کی کارکردگی مکمل طور پر بند ہو جائے اور تین ماہر ڈاکٹر اس بات پر متفق ہوں

کہ اب دماغ کی یہ کارکردگی دوبارہ بحال نہیں ہوسکتی تو اس مریض کے جسم سے لگے ہوئے آلات ہٹالینا درست ہے، خواہ ان آلات کی وجہ سے مریض میں حرکت قلب اور نظام تنفس قائم ہو۔ البتہ مریض کی موت شرعاً اس وقت سے معتبر مانی جائے گی، جب ان آلات کے ہٹانے کے بعد قلب اور تنفس اپنا کام بند کردیں۔ (شیخ محمد جبیر کے نزدیک اگر ڈاکٹر فیصلہ کردیں کہ مریض کے دماغ کی پوری کارکردگی ختم ہوچکی ہے تو اسے مردہ قرار دیا جائے گا۔) (ص:۲۶۶--۲۶۷)

(۱۳) **باکسنگ:** اجلاس کی متفقہ رائے ہے کہ ان دنوں باکسنگ (مکہ بازی) کے جو مقابلے منعقد ہوتے ہیں وہ شریعت اسلامی میں بالکل حرام ہیں، ٹی وی پروگراموں پر انہیں نشر کرنا جائز نہیں ہے، تاکہ نئی نسل کے بچے انہیں سیکھنے اور نقل کرنے سے محفوظ رہیں۔ (ص:۲۷۰)

(۱۴) **فری اسٹائل فائٹنگ:** یہ بھی شرعاً حرام ہے۔ (ص:۲۷۰)

(۱۵) **کشتی:** کشتی کی دوسری شکلیں جو محض جسمانی ورزش کے لئے کھیلی جاتی ہیں، اور ان میں ایذاء رسانی کو مباح نہیں سمجھا جاتا ہے، شرعاً جائز ہیں۔ (ص:۲۷۱)

(۱۶) **بیلوں کے ساتھ کشتی:** بعض ممالک میں رائج یہ کشتی ایک وحشیانہ عمل ہے اور ناجائز ہے۔ (ص:۲۷۱)

(۱۷) **جانوروں کی لڑائی:** بعض ممالک میں اونٹوں، مینڈھوں، مرغوں وغیرہ کے لڑانے کا جو رواج ہے، جن میں ایک جانور دوسرے کو زخمی یا ختم کردیتا ہے، یہ بھی حرام ہے۔ (ص:۲۷۱)

(۱۸) **بجلی کے شاک سے ماکول اللحم جانور ذبح کرنا:**

۱- اگر ماکول اللحم جانور کو بجلی کا شاک لگایا جائے، پھر اسے زندہ حالت میں ذبح یا نحر کیا جائے تو یہ شرعی ذبح ہے، اور اس جانور کا کھانا حلال ہے، لیکن ذبح کرنے سے پہلے ہی اس کی روح نکل جائے تو وہ مردار اور حرام ہے۔

۲- بجلی کے انتہائی تیز شاک لگانا اسلام میں ممنوع ہے۔

۳- اگر بجلی کے شاک معمولی ہوں کہ جانور کو اس سے تکلیف نہ پہنچتی ہو اور مقصود یہ ہو کہ ذبح سے جانور کو کم سے کم تکلیف پہنچے اور اس کی قوت مدافعت میں کمی آجائے تو اس مصلحت کے پیش نظر اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ (ص:۲۷۳--۲۷۴)

(۱۹) **مختلف مسالک کے درمیان فقہی اختلاف:** بعض مسائل میں فقہی اختلاف کے پس پشت کچھ علمی اسباب ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت اور بندوں پر اس کی رحمت کارفرما ہے، ساتھ ہی اس کی وجہ سے نصوص سے استنباط احکام کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ یہ اختلاف ایک نعمت اور عظیم قانونی فقہی سرمایہ ہے، جس نے امت مسلمہ کو اپنے دین وشریعت کے سلسلہ میں انتہائی کشادگی اور آسانی عطا کی ہے، امت مسلمہ اس کی وجہ سے کسی ایک شرعی تطبیق میں اس طرح محدود ہوکر نہیں رہ جاتی ہے کہ اس سے تجاوز کا امکان نہ ہو، بلکہ اگر کبھی ایک مسلک کے لحاظ سے کوئی تنگی ودشواری آجاتی ہے تو دوسرے مسلک میں اس کے لئے کشایش اور آسانی میسر ہوجاتی ہے، عبادات ومعاملات سے لے کر خانگی امور اور قضاء وجنایات تک تمام میدانوں میں شرعی دلائل کی روشنی میں یہ کشایش میسر رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے اختلاف کا نہ ہونا ناممکن ہے، کیونکہ اصل نصوص بیشتر امور میں ایک سے زائد مفہوم ومعنی کا احتمال رکھتے ہیں، نیز یہ نصوص تمام امکانی واقعات کا احاطہ کر بھی نہیں سکتے، بقول بعض علماء: نصوص محدود ہیں اور واقعات لامحدود، لہٰذا قیاس کی

طرف رجوع کرنا اور علل احکام، شارع کی غرض اور شریعت کے عام مقاصد پر نظر رکھنا اور شریعت کو واقعات اور نئے نئے حادثات میں حَکَم بنانا ضروری ہے، اور اس تطبیق واجتہاد میں علماء کے فہم وفقہ اور احتمالات کے درمیان ترجیحات کی تعیین میں اختلاف ایک فطری بات ہے، جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر مختلف علماء کے احکام مختلف ہو جاتے ہیں، جب کہ حق کی تلاش اور دریافت ہی ہر ایک کا مقصود ہوتا ہے اور اس میں جس کا اجتہاد صحیح ہو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ اور جس سے غلطی ہو جائے وہ بھی ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ اس طرح کشایش کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور دشواری وتنگی دور ہو جاتی ہے۔

پس اس فقہی اختلاف کے وجود میں کہاں سے کوئی نقص ہوگا؟ یہ تو سراپا خیر ورحمت اور فی الواقع اللہ کی رحمت وشفقت اور نعمت ہے اور ساتھ ہی فقہ وقانون سازی کی دنیا میں ایسا عظیم سرمایہ اور امتیاز ہے، جس پر امت مسلمہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ لیکن اسلام کو اپنی آنکھوں میں کھٹکنے والا کانٹا سمجھنے والے دشمنان اسلام مسلم نوجوانوں، بالخصوص بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ کی اسلامی ثقافت ومعلومات میں کمی کا استحصال کرتے ہوئے انہیں یہ باور کرانے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں کہ فقہی اختلاف بھی اعتقادی اختلاف کی مانند ظلم اور شریعت میں تناقض وتضاد ہے، اور دونوں کے درمیان کے زبردست فرق پر پردہ ڈال جاتے ہیں۔

جہاں تک اس طبقہ کا تعلق ہے، جو ان تمام مسالک ہی کو پس پشت ڈال دینا چاہتا ہے، اور لوگوں کو ایک نئے اجتہاد کی دعوت دیتے ہوئے موجودہ فقہی مسالک اور ان کے ائمہ عظام کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتا ہے۔ اوپر پیش کردہ ان فقہی مسالک کی اہمیت وامتیاز اور ان کے ائمہ کی عظیم خدمات کے پیش نظر اس طبقہ کو چاہئے کہ اس ناپسندیدہ اور گھٹیا طرز عمل سے گریز کرے، جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرتا ہے، اور انہیں ایسے نازک وقت میں منتشر کرتا ہے، جس میں دشمنانِ اسلام کی خطرناک سازشوں کے مقابلہ میں پوری امت کو ایک جھنڈے تلے جمع ہو جانے کی سخت ترین ضرورت درپیش ہے۔ (ص:۲۹۱--۲۹۳)

(۲۰) **زمین پر زکوٰۃ:** تجارت کے لئے مخصوص کی گئی زمینیں سامانِ تجارت میں سے ہیں، لہٰذا اصل زمینوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور سال گزرنے پر اس کی قیمت کا تخمینہ لگایا جائے گا (اور ان کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر نکالا جائے گا)

(۲۱) **خون چڑھانے سے رضاعت کے ثبوت کی نفی:** دو سال سے کم عمر کے بچہ میں کسی عورت کا خون منتقل کرنے سے اس عورت کے ساتھ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ رضاعت صرف دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ (ص:۳۱۲)

(۲۲) **خون کا معاوضہ:** قرآن وحدیث کی روشنی میں خون کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، اگر طبی مقاصد کے لئے ضرورت کے حالات درپیش ہوں اور رضاکارانہ خون دستیاب نہ ہو تو خریدنے والا اس کا معاوضہ دے سکتا ہے، اور اس کا گناہ قیمت لینے والے پر ہوگا، البتہ اس نیک انسانی عمل کی حوصلہ افزائی کی خاطر بطور ہدیہ یا انعام کچھ دیا جا سکتا ہے، اس کا تعلق معاوضات سے نہیں، بلکہ عطیات سے ہے۔ (ص:۳۱۲--۳۱۳)

(۲۳) **تبدیلیٔ جنس:**

۱- مذکر یا مؤنث کے اپنے مخصوص اعضاء کامل ہو چکے ہوں تو انھیں ایک دوسرے میں تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، ایسی تبدیلی قابلِ سزا جرم ہے، کیونکہ یہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی ہے، جو قرآن وحدیث کی رو سے حرام ہے۔

۲- جس شخص کے اعضاء میں دونوں کی علامتیں جمع ہو گئی ہوں، اگر اس میں مرد کے اعضاء زیادہ ہوں تو طبی علاج کے ذریعہ عورت کے اشتباہ کو دور کر لینا جائز ہے، اور اگر عورت کے اعضاء غالب ہوں تو مرد ہونے کے اشتباہ کو دور کر لینا جائز ہے، خواہ یہ علاج سرجری کے

طور پر ہو یا ہارمون کے ذریعہ ہو، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا مرض ہے، اور علاج کے ذریعہ مرض سے شفاء مقصود ہے، نہ کہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی۔ (ص: ۳۲۲--۳۲۳)

(۲۴) **بیوی کو علاج سے روکنا:** شوہر کو امانت دار اور قابل اعتماد ڈاکٹر کی جانب سے بتائے گئے شرعاً مباح اور مناسب علاج سے بیوی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ علاج سے روکنے میں اسے ضرر پہنچانا ہے، جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے: ''لاضرر ولا ضرار'' یہی حکم ہر سرپرست پر بھی عائد ہوتا ہے۔ (ص: ۳۳۳)

(۲۵) **ناقص الخلقت بچہ کا اسقاط:** اگر حمل ایک سو بیس (۱۲۰) دنوں کا ہو تو اس کا اسقاط جائز نہیں، خواہ طبی تشخیص سے یہ ثابت ہو رہا ہو کہ بچہ ناقص الخلقت ہے، البتہ اگر ماہر قابل اعتماد اطباء کی کمیٹی کی رپورٹ سے یہ ثابت ہو رہا ہو کہ حمل کا باقی رہنا ماں کی زندگی کے لئے یقیناً خطرناک ہے، تو ایسی صورت میں بڑے نقصان کے ازالہ کے لئے بچہ کا اسقاط جائز ہے خواہ وہ ناقص الخلقت ہو یا نہ ہو۔

اگر حمل پر ایک سو بیس دن نہ گذرے ہوں اور ماہر قابل اعتماد اطباء کی کمیٹی کی رپورٹ اور تجرباتی وسائل اور آلات کے ذریعہ نئی تحقیقات کی بنیاد پر یہ ثابت ہو رہا ہے ہو کہ بچہ خطرناک طور پر ایسا ناقص الخلقت ہے کہ ناقابل علاج ہے اور اگر وہ باقی رہ کر اپنے وقت پر پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی ایک بوجھ اور اس کے اور اس کے گھر والوں کے لئے الم رساں رہے گی، تو ایسی صورت میں والدین کے مطالبہ پر اس کا اسقاط جائز ہے، اجلاس اس فیصلہ کے ساتھ ہی اطباء اور والدین سے اس معاملہ میں اللہ کا خوف اور احتیاط ملحوظ رکھنے کی اپیل کرتا ہے۔ (ص: ۳۳۷--۱۳۸)

(۲۶) **جیلاٹین:** جیلاٹین ایسے مادہ کو کہتے ہیں، جسے مٹھائیوں اور بعض طبی دوائوں کے بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے، اور اسے جانوروں کی کھالوں اور ہڈیوں سے حاصل کیا جاتا ہے، لہٰذا: مباح مواد اور مباح جانور، جن کو شرعی طور پر ذبح کیا گیا ہو، سے نکالے گئے جلاٹین کا استعمال جائز ہے، لیکن کسی حرام چیز جیسے خنزیر نیز دوسرے حرام جانوروں کی کھال اور ہڈیوں اور حرام مواد سے حاصل کئے گئے جلاٹین کا استعمال جائز نہیں ہے۔ (ص: ۳۸۲)

(۲۷) **شراب:** خالص شراب کا استعمال دوا کے بطور کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو تم پر حرام کیا ہے، اس میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی ہے'' (بخاری) (۴۰۹) (۶۸)

الکحل آمیز دوا: ان دوائوں کا استعمال جائز ہے، جن میں الکحل کی صرف اتنی مقدار ہو، جو دوا بنانے کے لئے ضروری ہو اور اس کا متبادل نہ ہو، اس شرط کے ساتھ کہ کسی راست باز طبیب نے وہ دوا تجویز کی ہو، اسی طرح زخموں کی خارجی صفائی، جراثیم کو مارنے نیز تیلوں اور کریم وغیرہ میں بھی الکحل کا استعمال جائز ہے۔ (ص: ۴۱۰)

(۲۸) **جینیٹک نشان اور اس سے استفادہ** کے میدان: (سائنسی تحقیق کے مطابق) جینیٹک نشان کے نتائج والدین کی طرف اولاد کی نسبت یا عدم نسبت کے بارے میں تقریباً قطعی ہیں، اسی طرح واقعہ کے وقت اور جگہ میں پائے جانے والے خون، منی یا تھوک کے نمونہ کی نسبت اصل آدمی کی طرف قطعی ہے اور یہ عام قیافہ شناسی کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہے، اور اس میں اگر غلطی ہوتی ہے تو وہ موروثی نشان کی ماہیت کی جہت سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ انسانی کوشش اور آلودگی کے عوامل کے باعث ہوتی ہے، اس بنا پر اکیڈمی نے مندرجہ ذیل فیصلے کئے:

اول: جرائم کی تفتیش میں جینیٹک علامتوں سے استفادہ کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے، اور ایسے جرائم کے ثبوت میں اس کو بنیاد بنایا

جاسکتا ہے، جن میں حد شرعی اور قصاص نہ ہو، کیونکہ حدیث میں ہے: "حدود کو شبہات کی بنیاد پر ساقط کرو"

دوم: نسب کے سلسلہ میں اس کا استعمال حد درجہ احتیاط اور راز داری سے ہونا چاہئے، اسی لئے اس پر شرعی قواعد اور نصوص کو مقدم رکھا جائے گا۔

سوم: نسب کی نفی میں شرعاً جینیٹک علامت پر اعتماد کرنا درست نہ ہوگا، اسی طرح لعان پر اسے مقدم نہیں کیا جاسکتا۔

چہارم: جو نسب شرعاً صحیح ثابت ہیں، ان کو مزید مؤکد کرنے کے لئے اس کا استعمال درست نہ ہوگا۔

پنجم: ذیل کے حالات میں اثبات نسب کے لئے جینیٹک نشان پر اعتماد جائز ہوگا:

الف: مجہول النسب پر تنازع کی مختلف صورتوں میں جن کا فقہاء نے ذکر کیا ہے، خواہ تنازعہ اس نوعیت کا ہو کہ مجہول النسب کے بارے میں دلیل ہی نہ ہو یا دلائل مساوی ہوں یا وطی بالشبہ وغیرہ میں اشتراک پایا جائے۔

ب: اسپتالوں میں بچوں کی پیدائش یا بچہ گھروں میں پیدائش یا ٹسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ میں اشتباہ کی صورتیں۔

ج: حادثات، آفات اور جنگ وغیرہ میں بچے ضائع ہو جائیں یا مل جل جائیں اور ان کے گھر والوں کو پہچانا نہ جاسکے، یا ایسی نعشیں ہوں کہ شخصیت کا پتہ لگانا دشوار ہو، یا جنگ کے قیدیوں اور مفقودین کی تحقیق مقصود ہو۔

ششم: کسی جنس، قوم یا فرد کے بشری جینوم کو فروخت کرنا کسی بھی غرض کے لئے جائز نہیں، کیونکہ اس میں بہت مفاسد ہیں۔ (ص:۴۱۲--۴۱۴)

(۲۹) **نجس دوائی کا استعمال:** ایسی دوائوں کا استعمال جن میں خنزیر وغیرہ نجس العین کی آمیزش ہو، مباح ہے، جبکہ ایسا متبادل موجود نہ ہو جو علاج میں اس سے بے نیاز کردے، اور متبادل کے ذریعہ علاج میں طویل عرصہ لگتا ہو۔ اس کے استعمال میں صرف اتنی ہی مقدار پر اکتفا کیا جائے جو ضروری ہو اور جب یقینی طور پر پاک متبادل مل جائے تو اسے اختیار کیا جائے۔ (ص: ۴۵۴ -- ۴۵۵ مفہوم)

(۳۰) **خلع:**

۱- شوہر کے لئے حرام ہے کہ وہ عورت کو خلع حاصل کرنے سے روکے۔

۲- عورت کے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں کہ بلاوجہ طلاق کا مطالبہ کرے، حدیث میں ہے: "اگر کوئی عورت بے وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

۳- قاضی محض عورت کے مطالبہ پر شوہر کو جدائی اور معاوضہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، بلکہ وہ دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے گا، اور اس کے لئے دو ثالث بھیجے گا، اگر دونوں ثالث اتفاق نہ کریں اور صلح مشکل ہو جائے اور قاضی کے سامنے خلع ناگزیر ہو جائے تو شوہر کو علاحدگی کا حکم دے گا۔ اگر شوہر انکار کرے تو بہ عوض یا بلاعوض جس طرح بہتر سمجھے گا، جدائی کرائے گا۔ (ص:۴۸۶)

☆☆☆

تجاویز بموقع پہلا شافعی فقہی سمینار

منعقدہ ۱۲/ اور ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۹/ اور ۲۰/ جنوری ۲۰۱۹ء
زیر اہتمام مجمع الامام الشافعی العالمی - منعقدہ دارالعلوم الاسلامیہ العربیہ، تلوجہ، نوی ممبئی

تجاویز

موجودہ زمانہ میں حجاج کے لئے پیش آمدہ مسائل

۱- موجدہ دور میں اعمال حج وعمرہ کی ادائیگی کے موقع پر جب ازدہام کی وجہ سے اجنبیہ عورت کے لمس سے بچنا دشوار ہو، اس صورت میں اگر بغیر قصد وشہوت کے لمس ہو جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

۲- اگر طواف زیارت سے قبل کسی عورت کو حیض یا نفاس آجائے اور اسکے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کی گنجائش نہ ہو کہ وہ حیض ونفاس سے پاک ہو کر طوافِ زیارت کر سکے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر طرح کوشش کرلے کہ اس کے سفر کی تاریخ آگے بڑھ سکے تاکہ وہ پاک ہو کر طوافِ زیارت ادا کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جاسکے، لیکن اگر یہ کوششیں کامیاب نہ ہوں اور پاک ہونے سے قبل اس کا سفر ناگزیر ہو جائے تو ایسی حالت میں وہ عورت کم از کم ایک دن دوا یا کسی اور جائز تدبیر کے ذریعہ نقاء (طہر) کی کوشش کر کے طوافِ زیارت ادا کرے۔

۳- اگر نقاء کی کوئی صورت نہ بن پڑے تو وہ عورت غسل کر کے مستحاضہ کی طرح مکمل احتیاط کے ساتھ طواف زیارت کرلے اور بطور دم ایک بدنہ (بڑا جانور) حدودِ حرم میں دے، اگر بدنہ دینے کی استطاعت نہ ہو تو ایک بکرا یا مینڈھا بھی دے سکتی ہے۔

۴- حاجی اولاً حسبِ استطاعت اصل منیٰ (جو اس آج کل منیٰ قدیم کہتے ہیں) میں قیام کی کوشش کرے، لیکن حکومت کی فراہمکردہ جگہ کے مطابق ان حدود سے باہر قیام کرنے پر مجبور ہو تو نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا اور نہ دم واجب ہوگا۔

۵- معذورین کے لئے رمی جمرات میں نائب بنانا جائز ہے محض سستی اور کاہلی کی وجہ سے نائب بنانا درست نہیں۔

۶- نائب کے لئے ہر جمرہ پر اپنی رمی کے بعد منوب عنہ کی طرف سے رمی کرنے کی گنجائش ہوگی۔

۷- مکہ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات الگ الگ مقامات شمار کئے جائیں گے، لہٰذا اگر حاجی کا منیٰ جاتے وقت یہ ارادہ ہو کہ اعمال حج مکمل ہونے کے بعد منیٰ سے مکہ آکر مدت اقامت تک ٹھہرے بغیر مکہ سے لوٹ آئے گا تو وہ منیٰ، مزدلفہ، عرفہ اور واپسی میں قصر وجمع کر سکتا ہے بشرطیکہ سفر شرعی ہو۔

۸- حاجی اگر مسافر شرعی نہ ہو تو اتمام کرنا واجب ہوگا، البتہ عرفہ کے دن مشقت کی وجہ سے نمازِ مغرب عشاء کے ساتھ مزدلفہ میں

بطور جمع تاخیر ادا کر سکتا ہے۔

۹- فرض عمرہ تو حتی المقدور ادا کرنے کی کوشش کرے لیکن نفل عمرہ بھی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کرلے، تو شرعاً عمرہ ادا ہو جائے گا۔

۱۰- حج و عمرہ کے ارادے سے جدہ کے راستہ مدینہ جانے والوں کے لئے ہندوستانی میقات سے احرام باندھنا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ریاض، ج دہ، دمام وغیرہ جانے والے شخص کی نیت اصلاً حج و عمرہ کی ہے، تو میقاب سے احرام باندھنا ضروری ہے، ورنہ نہیں۔

۱۱- حکومت کے قانون کی پاسداری کرنی چاہئے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ محصر کے حکم میں ہو گا، البتہ احرام باندھتے وقت وہ نیت کرلے کہ اگر کوئی رکاوٹ پیش آئے تو احرام سے نکل جاؤنگا، اس صورت میں دم واجب نہیں ہو گا۔

۱۲- حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور قدیم پاسپورٹ کے گم ہونے کا بہانہ بنا کر نیا پاسپورٹ بنانا درستن ہیں ہے، البتہ اگر کوئی اس طرح پاسپورٹ بنا کر حج کرلے تو اس کا حج شرعاً درست ہو جائے گا۔

۱۳- (الف) طوافِ وداع کے بعد اگر مکہ سے علی الفور نکلنے میں دشواری پیش آئے تو چند گھنٹے ضرورتاً تاخیر کرنے سے طواف وداع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، نہ اعادہ واجب ہو گا نہ دم۔

(ب) لیکن اگر کسی نے طواف وداع ہی نہ کیا ہو تو اس پر دم واجب ہو گا، نیز دیگر فرض یا سنت طواف، طواف وداع کی طرف سے کافی نہیں ہو گا۔

تجاویز: جبیرہ کے احکام و مسائل

۱- صاحب جبیرہ وضو یا غسل کرتے وقت جبیرہ پر پانی سے مسح کرنے کے ساتھ ساتھ بسہولت اگر تیمم کر سکتا ہو تو تیمم ضروری ہے ار اگر تیمم کرنے میں مشقت لاحق ہو تو جبیرہ پر صرف پانی کا مسح کافی ہے، تیمم ضروری نہیں اور اس شخص کو پاک سمجھا جائے گا۔

۲- صاحب جبیرہ حتی المقدور طہارت کے حصول کی کوشش کرے، لیکن جبیرہ باندھنے سے پہلے طہارتک ے حصول میں مشقت شدیدہ لاحق ہو یا طہارت کے باقی رکھنے میں دشواری ہو تو ایسی حالت میں طہارت شرط نہیں ہے۔

۳- جن صورتوں میں نماز کا اعادہ واجب ہے، ان صورتوں میں اگر نماز کے اعادہ میں مشقت نہ ہو تو اعادہ واجب ہے اور اگر مشقت ہو تو اعادہ واجب نہیں ہے۔

تجاویز: سمندری جانوروں اور مچھلیوں کی خرید و فروخت سے متعلق مسائل

۱- قوانینِ الٰہی سے بغاوت اور تمام آسمانی آفات جن سے انسانی زندگی دشوار ہو جائے، فساد فی البحر میں شامل ہیں، اس تعلق سے

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے معاملات بالخصوص بیع وشراء میں شرعی تقاضوں کو پورا کریں اور اپنی غلطیوں پر نادم ہوتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کریں۔

۲- اسلام میں جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے، اس لئے مچھلیوں کے شکار کے لئے ایسے کیمیکل کے استعمال سے بچنا ضروری ہے جو خود مچھلیوں اور انسانوں کے لئے نقصان دہ ہو۔

۳- شعبۂ موسمیات کی جانب سے دی گئی اطلاعات کو گمان غالب مانتے ہوئے ان کی پابندی کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اگر ملکی قوانین کا مقصد فساد کو دور کرنا ہو اور ان کی بنیاد مصلحت پر ہو تو ان قوانین کی پابندی ضروری ہے۔

۴- سمندر سے ملنے والے خزانوں پر حکومت کی جانب سے لگائے جانے والے ٹیکس کی مقدار اگر مناسب ہو تو اسے ادا کرنا بہتر ہے، لیکن اگر ٹیکس کی مقدار نامناسب ہو تو جائز تدابیر اختیار کی اجازت ہو گی۔

۵- نماز اسلام کے اہم ارکان میں سے ہے، اس لئے کشتی وجہاز میں بھی ہر صورت میں حسبِ قدرت شرائط کا خیال رکھتے ہوئے ادا کرنا ضروری ہے۔

۶- اگر کوئی کشتی وجہاز چل رہا ہو تو ہر طرح کے سہولیات کے باوجود اس میں سوار لوگ شرعی مسافر کے حکم میں ہوں گے، لیکن اگر اقامت کی نیت کے ساتھ جہاز چار دن یا اس سے زیادہ کے لئے لنگر انداز ہو جائے تو وہ مسافر نہیں رہیں گے۔

۷- سپلائر کا قرض کی وجہ سے مچھلی والے سے کم قیمت میں مچھلی خریدنا جائز نہیں۔

۸- خرید وفروخت میں سامان کی قیمت طے ہونا ضروری ہے قیمت طے کئے بغیر سپلائر کا مچھلی خریدنا جائز نہیں۔

۹- کسی کی ملکیت میں جبراً دخل اندازی جائز نہیں، بیع وشراء رضامندی سے طے ہونے والے امور ہیں، اس لئے اگر مچھلی والا کسی تیسرے کو مچھلی فروخت کرے تو حاصل ہونے والے نفع میں سپلائر کو شریک ہونا جائز نہیں۔ (البتہ کمیٹی ان مسائل کے متبادل پر غور وفکر کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔)

۱۰- پاور لائٹ اور بارود سے مچھلیوں کے شکار کرنے میں ملکی قانون کی رعایت کرتے ہوئے احتیاط ضروری ہے۔

۱۱- سمندر سے ملی ہوئی اشیاء اگر سمندر کی جنس سے ہوں تو لقطہ کے حکم میں نہیں ہیں، بلکہ ان چیزوں کو پانے والے مالک ہو گا، لیکن اگر سمندر کی جنس سے نہ ہوں تو ان کا حکم مال ضائع کا ہو گا۔

۱۲- سمندری سیپ اور کالو کا کھانا جائز ہے۔

تجاویز بابت دوسرا شافعی فقہی سمینار مجمع الامام الشافعی العالمی

منعقدہ ۱۶-۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲-۱۰/ جنوری ۲۰۲۰ء

منعقدہ جامعہ ضیاء العلوم، کنڈلور، کرناٹک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

مجمع الامام الشافعی العالمی کا دوسرا فقہی سمینار بتاریخ ۱۶-۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲-۱۰ جنوری ۲۰۲۰ء بمقام جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک میں منعقد ہوا۔ سمینار کے لئے دوماہ پہلے متعینہ تین عناوین (۱-زکاۃ کے اہم مسائل، ۲-تجارت کے چند اہم جدید مسائل، ۳-قربانی کے اہم مسائل) پر جملہ ۷۰/ مقالات موصول ہوئے۔ موصولہ مقالات کی عربی اور اردو زبان میں تلخیص کی گئی اور عرض مسئلہ تیار کرنے کے لئے چند مفتیانِ کرام کا انتخاب کیا گیا، ان حضرات نے تمام مقالوں کا خلاصہ عرضِ مسئلہ کے اندر سمیٹا گویا کہ سمندر کو کوزہ میں بھر دیا، پھر سمینار میں مقالات کے خلاصوں کی خواندگی ہوئی اس پر بحث و مناقشہ ہوا، اس کے بعد تجاویز کمیٹیاں منتخب ہوئیں، ان تجاویز کمیٹیوں نے بہت ہی تگ و دو اور محنت کے بعد تجاویز مرتب کیں، پھر سمینار کے آخری دن ان تجاویز کو حاضر مفتیان کے سامنے یکے بعد دیگر پیش کیا گیا۔ جملہ شافعی مفتیان نے جن جن اصلاحات کی طرف رہنمائی کی اس کی اصلاح کی گئی، اب اکابر علماء و مفتیان کی سرپرستی میں درج ذیل تجاویز فیصل ہوگئیں، جنھیں آپ حضرات کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

سوالنامہ:

زکاۃ سے متعلق جدید مسائل

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے تیسرا رکن زکاۃ ہے، اس کی اہمیت و فضیلت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں بیاسی مقامات پر اقامت صلاۃ کے ساتھ ساتھ ایتاء زکاۃ کا حکم دیا گیا ہے، گویا نماز اور زکاۃ ایک ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب وفات نبی ﷺ کے بعد منکرین زکاۃ نے سر اٹھایا تو خلیفہ اول حضرت ابو بکر ؓ نے ان سے قتال کا ارادہ کرتے ہوئے فرمایا:

واللہ لأقتلن من فرق بین الصلاۃ والزکاۃ

جس کی تائید اصحابِ نبی ﷺ نے کی اور ان سے جنگ کرکے انہیں سرنگوں کردیا۔

زکاۃ کی اسی اہمیت کی بنا پر ہر دور میں قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے اجمال کی تشریح و توضیح کی جاتی رہی ہے، لیکن آج جدید ایجادات، ٹکنالوجی، صنعتی انقلاب اور سیاسی الٹ پھیر نے مزید دوچند مسائل پیدا کردیئے ہیں، مسلمانوں کا سیاست سے رشتہ ٹوٹ جانے اور انقلابات میں پچھڑ جانے سے نت نئے مسائل کھڑے کردیئے ہیں، جس سے زکاۃ کا باب بھی مستثنیٰ نہیں، بالخصوص ہمارے ملک میں اور ان میں بھی متبعین شوافع کے مابین برابر ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں جن میں زکاۃ کے مسائل کا حل طلب کیا جارہا تھا، چنانچہ "مجمع الامام

الشافعی العالمی، الہند" نے اپنے دوسرے سیمینار کے لئے "زکاۃ سے متعلق جدید مسائل" جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا، امید ہے کہ فاضل مقالہنگار درج ذیل سوالات کے جوابات محقق و مدلل انداز میں پیش کریں گے۔

۱- شرع اسلامی کی رو سے ایک مسلمان کے مال میں شرعی حقوق کیا ہیں؟ اور ان میں زکاۃ کا کیا مقام ہے؟

ب: مسلمانوں کے درمیان علمی بیداری ندارد ہے، عالم یہ ہے کہ وہ دین کے متعلق بنیادی معلومات سے بھی دور ہیں، ایسے میں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ کیا وجوبِ زکاۃ کے لئے زکاۃ کی فرضیت کا علم ضروری ہے؟ یا اس سلسلہ میں بھی جہل کا اعتبار کیا گیا ہے؟ اور اگر جہل معتبر مان لیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ لاعلمی کے زمانے کی زکاۃ ادا نہ کی جائے؟

۲- ادائیگی زکاۃ کے لئے شوافع اور مالکیہ حولان حول کے ساتھ "تمکن" کی شرط لگاتے ہیں، جبکہ حنابلہ اور احناف صرف حولان حول کو ہی کافی سمجھتے ہیں، اس پس منظر میں قرض اور بعض تجارتی مال کے زکاۃ پر کیا اثر پڑے گا؟

ب: پلاٹ، فلیٹ یا کوئی بھی جگہ فروخت کرنے کی نیت سے خریدے؛ لیکن کئی سال گزر گئے اور وہ جگہ فروخت نہ ہو تو کیا ہر سال اس جگہ کی زکاۃ نکالنا واجب ہو گی؟

ج: عالمی تجارت میں یہ صورت بھی پائی جاتی ہے کہ خریدا ہوا مال سمندری راستے سے آتے ہوئے اس قدر تاخیر ہو جائے کہ بازار سے اصل قیمت کے بجائے نصف یا اس سے کم ملے؛ ایسے میں مسافت کے درمیان زکاۃ کی نوبت آجائے تو کیا زکاۃ نکالی جائے گی؟ اور اگر نکالی جائے تو کس معیار پر زکاۃ نکالی جائے گی؟

د: تجارتی مال خرادا ہوا اگر فروخت ہونے میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ اس کی قیمت نصف ہو گئی ہو، حتیٰ کہ وہ دیوالیہ کے دہانے پر ہے تو کیا اب بھی اس کے مال میں زکاۃ واجب ہو گی؟

۳- مالک مشترک میں زکاۃ کا مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے، آج عموماً پلاٹنگ کے کام اور تجارتی کاموں میں اشتراک پایا جاتا ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بزنس میں اجتماعیت کو ترجیح دی جاتی ہے، ایسے میں زکاۃ کی ادائیگی کے لئے ہر ایک کا الگ الگ حصہ تصور کیا جائے گا یا کل مال کو اک اکائی تصور کریں گے؟

ب: ایک فلیٹ کو کئی لوگوں نے ادھار خرید کر ادھار فروخت کیا؛ ایسے میں اختتام سال پر کتنے لوگ اس کی زکاۃ ادا کریں گے؟

۴- مال کے اندر نصاب اور حولان حول اصل ہے، اسی لئے مال دین میں زکاۃ کے تعلق سے امام شافعی کے دو قول ہیں، قول جدید کے مطابق مال اگرچہ قرض کا ہے، لیکن اگر شرائط مکمل ہو جائیں تو زکاۃ ادا کرنی ہو گی، جبکہ قدیم قول کے مطابق ادا نہ کرنی ہو گی۔ یہ صورت آج کے دور میں بہت سے مسائل جنم دے رہے ہیں، تو کیا ممکن ہے کہ قدیم قول کو اختیار کیا جائے؟

ب: اگر کسی کا مال دوسرے کے ذمہ بطور قرض واجب الاداء ہو اور اس نے مثلاً پانچ سال بعد وہ قرض ادا کیا تو کیا، اسے ہر سال کے حساب سے زکاۃ نکالنی ہو گی، یا اس پر ملکیت ضعیفہ کے سبب زکاۃ ہی فرض نہ ہو گی نیز زکاۃ ایک ہی آدمی نکالے گا یا دونوں؟

۵- موجودہ اوزان کے اعتبار سے سونا اور چاندی کا نصاب کیا ہے؟

ب: سونا اور چاندی اگر زیورات کی شکل میں ہوں تو اس پر زکاۃ نہیں ہے، لیکن بعض متاخرین فقہاء کا ماننا ہے کہ وہ زیورات جو عاریت، یا پہننے کے علاوہ ذخیرہ، وقت کی ضرورت اور نفقہ کے لئے ہو تو اس پر زکاۃ واجب ہو گی، اس سلسلہ میں مناسب تحقیق اور رائے پیش کریں۔

ج: عصرِ حاضر میں زیورات پر زکاۃ کے سلسلہ میں اسراف اور ضرورت کی تعبیر کیا ہوسکتی ہے؟

د: ہیرے، جواہرات بہت ہی قیمتی پتھر ہیں، لیکن ان پر زکاۃ سونے یا چاندی کی طرح لازم نہیں، ایسے میں دولت جمع کرنے کا ایک برا ذریعہ بن گیا ہے یالگزری استعمال کا سبب بن گیا ہے، ایسے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہوگا؟

۶- آج بینکوں میں کھاتہ کھولنا عام بات ہے، بلکہ سرکاری رو سے ضروری بھی ہو چکا ہے، چنانچہ بینکوں میں ڈپازٹ مال کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ یہ خیال رہے کہ بینک والے ڈپازٹ مال میں تصرف کرتے ہیں، ایسے میں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ اگر زکاۃ واجب ہوگی تو وہ اصل رقم میں ہوگی یا محض منافع میں؟

ب: شیئر مارکیٹ میں انویسٹ کئے گئے اموال اگر بقدر نصاب ہوں تو کیا زکاۃ واجب ہوگی؟ جبکہ شیئر مارکیٹ میں انویسٹ مال میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے، تو وہیں اس پر حقیقی قبضہ بھی نہیں ہوگا جسے تمکین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ج: شیئرز کی قیمت دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک جسے قیمت اسمیہ کہتے ہیں، دوسری جسے قیمت سوقیہ کہتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان میں کس قیمت پر زکاۃ نکالی جائے گی؟

۷- حکومت کی جانب سے بعض صورتوں میں انشورنس کروانا لازمی ہوتا ہے، جس میں خاطر خواہ رقم صرف ہوتی ہے، یہ رقم بطور ودیعت بینکوں کے پاس محفوظ ہوتی ہیں اور ایک مدت کے بعد یا واقعہ کے بعد وہ رقم اپنے اضافہ کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہے، ایسے میں زکاۃ کا کیا حکم ہوگا؟

ب: وہائٹ گولڈ اور پی ایف کی زکاۃ کا کیا حکم اور طریقہ کار کیا ہے؟

۸- آج مسلمان عموماً اقلیت یا غیر اسلامی حکومتوں کے زیر سایہ ہیں، جہاں ٹیکس کا نظام رائج ہوتا ہے، کئی بار یہ جبر و ظلم کی حد تک بڑھ جاتا ہے، بحیثیت ایک مسلمان زکاۃ اور ٹیکس دونوں کی ادائیگی دشوار ہو جاتیہے، ایسے میں کیا یہ ممکن ہے کہ ٹیکس کے مال کو زکاۃ سمجھ لیا جائے؟

۹- حلال رزق خدا کی عظیم نعمت ہے، لیکن آج حرام کا دائرہ اس قدر وسیع تر ہو گیا ہے کہ اس سے بچنا دشوار ہے، ایسے میں اگر حلال و حرام مال مخلوط ہو جائیں تو کیا اس پر زکاۃ لازم آئے گی؟ اور اگر زکاۃ لازم آئے تو ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

۱۰- شادی بیاہ کا خرچ عیاں ہے، خصوصاً بچیوں کی شادی میں ایک عام باپ کی کمر ٹوٹ جاتی ہے، معاشرے میں جہیز، عزت اور نام و نمود کے نام پر اسراف اور بے جا رسموں نے زمانہ جاہلیت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، ایک بچی کی شادی کے لئے ایک باپ زندگی بھر تگ و دو کرتا ہے تب کہیں شادی ہو پاتی ہے، ایسی صورت میں کیا ایسے جمع شدہ مال پر بھی زکاۃ لازم آئے گی؟ یا اسے ضرورت سمجھ کو معفو عنہ سمجھا جائے گا؟

۱۱- غلہ جات میں نصاب زکاۃ کیا ہے؟ آم، کاجو، ناریل سپاری، کالی مرچ اور الائچی، لونگ، دال چینی وغیرہ وغیرہ جن کے بڑے بڑے باغات ہوتے ہیں اور مہنگے داموں میں بیچے جاتے ہیں، تو کیا ان پر زکاۃ ہوگی؟ اور کیا سمندری ماکولات کو ''قوت'' کی تعریف میں شامل کرتے ہوئے زکاۃ کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے؟ کیونکہ اس کی آمدنی کروڑوں میں ہو جاتی ہے۔

تجاویز بابت: زکات سے متعلق جدید مسائل

۱۔

الف: زکاۃ اسلام کا اہم ترین رکن اور عبادت ہے اور نفس مال کے اعتبار سے مال میں صرف زکات ہی حق واجب ہے، دیگر فرض اور مندوب حقوق دوسرے اسباب کی بنا پر ثابت ہوتے ہیں۔

ب: فرضیت زکات کے لئے لاعلمی (جہل) کا اعتبار نہیں، لہٰذا لاعلمی کے زمانہ کی بھی زکات لازم ہوگی۔

۲۔

الف: زکات کی ادائیگی کے لئے حولان حول (ایک سال گزرنا) کے ساتھ تمکن (زکات کی ادائیگی پر قدرت) بھی شرط ہے، لہٰذا اگر حولان حول اور تمکن کے بعد مال تلف ہوجائے یا صاحب مال خود تلف کردے بہر صورت زکات واجب ہوگی، لیکن حولان حول کے بعد تمکن سے پہلے اگر زیادتی سے مال تلف کردے تو زکات ساقط نہیں ہوگی اور اگر بغیر کسی زیادتی کے تلف ہوجائے تو زکات ساقط ہوگی۔ نیز اگر حولان حول اور تمکن کے بعد زکات کی ادائیگی سے پہلے مزکی (زکات ادا کرنے والا) کا انتقالہوجائے تو اس کے ترکہ سے زکات ادا کی جائے گی۔

ب: فروخت کرنے کی نیت سے خریدے گئے پلاٹ یا فلیٹ میں ہر سال زکات واجب ہوگی، جسے شرعی فرض سمجھتے ہوئے خوش دلی سے ادا کرنا چاہئے، البتہ اگر چند سالوں تک فروخت نہ ہونے کی بناء پر زکات کی ادائیگی دشوار ہو اور صاحبِ مال اس میں ذاتی استعمال کی نیت کرے تو ایسی صورت میں زکات واجب نہیں ہوگی۔

ج: خریدے ہوئے مال کے حمل و نقل میں اس قدر تاخیر ہوجائے کہ بازار سے اصل قیمت کے بجائے اس میں کمی ہوجائے اور ایسی مسافت کے درمیان زکات کی نوبت آجائے تو اس مال کی زکات تمکن کے بعد نکالی جائے گی۔

د: سامانِ تجارت کی فروخت میں تاخیر کی وجہ سے قیمت میں کافی گراوٹ آجانے کے باوجود اگر وہ نصاب کے بقدر ہو تو زکات واجب ہوگی۔

۳۔

الف: پلاٹنگ اور تجارتی کاموں میں بصورت اشتراک اگر تمام شرکاء اہلِ زکات میں سے ہوں تو مال کو ایک اکائی تصور کرتے ہوئے زکات نکالی جائے گی، البتہ ہر شریک اپنے حصہ کی زکات علیٰحدہ طور پر بھی نکال سکتا ہے۔

ب: ایک فلیٹ کو جب کئی لوگ تجارت کی نیت سے ادھار خرید رہے ہیں تو سال کے اخیر میں تمام لوگوں پر زکات واجب ہوگی، اس لئے کہ ہر ایک کا نصاب کے بقدر یا اس سے زیادہ مال دوسرے کے ذمہ قرض ہے اور قرض زکات کے لئے مانع نہیں ہے، البتہ زکات کی ادائیگی کے لئے تمکن شرط ہے اس لئے ہر بائع اس فلیٹ کی قیمت پر زکات اس وقت ادا کرے گا جب کہ اس پر تمکن کی تفصیل صادق آجائے۔

۴۔

الف: راجح قول کے مطابق دین وجوبِ زکات کے لئے مانع نہیں ہے، لہٰذا قرض ہونے کے باوجود اگر کسی کے پاس نصاب کے بقدر مال

موجود ہو اور سال مکمل ہو تو اس کی زکات ادا کرنا ضروری ہے اور قرض کو منہا نہیں کیا جائے گا۔

ب: جس شخص کو مثلاً پانچ سال بعد قرض کی رقم ملی ہے اور وہ نصاب کے بقدر ہے تو اس پر ہر سال کی زکات واجب ہو گی اور زکات دائن کے ساتھ مدیون پر بھی اس وقت واجب ہو گی، جب وہ مدیون کے پاس ایک سال تک محفوظ رہے اور فی نفسہ وہ رقمی یا دوسرے مال کے ساتھ مل کر نصاب کے بقدر ہو جائے، البتہ اگر وہ مال خرچ ہو گیا تو اس مال کی زکات صرف دائن پر ہو گی، مدیون پر نہیں۔

۵-

الف: موجودہ اوزان کے اعتبار سے سونے کا نصاب پچاسی (۸۵) گرام اور چاندی کا نصاب پانچ سو پچانوے (۵۹۵) گرام ہے۔

ب: جو زیورات مطلق یا مباح استعمال کی نیت سے بنائے جائیں، یا عاریت پر دینے یا اجرت پر دینے کے لئے بنائے جائیں یا استعمال کی نیت کے ساتھ ذخیرہ اندوزی کا قصد ہو تو زکاۃ واجب نہیں ہو گی، اس کے علاوہ ذخیرہ اندوزی اور نفقہ یا تجارت مثلاً سونے کے بسکٹ یا چاندی کی وہ اینٹیں جن کو لوگ سستے داموں میں خریدتے ہیں اور دام بڑھنے کی امید پر کچھ مدت کے لئے اپنے گھروں میں چھوڑے رکھتے ہیں یا مرد کے شوقیہ زیورات ان تمام پر زکوۃ واجب ہو گی۔

ج: اسراف کا معیار عرف و عادت پر ہے، جب کہ ہر علاقہ اور زمانہ کا عرف مختلف ہوتا ہے، لہٰذا جس مقدار میں زیورات حسن کا سبب بنتے ہوں وہ مباح میں داخل ہیں لہٰذا ان زیورات پر زکات واجب نہیں ہو گی اور زیادہ مقدار کی بناء پر عیب معلوم ہونے لگے تو اسراف میں داخل ہیں، ایسی صورت میں زکات واجب ہو گی۔

د: ہیرے اور جواہرات گرچہ موجودہ زمانہ میں دولت جمع کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان قیمتی اشیاء پر زکات واجب نہیں ہو گی۔

۶-

الف: بینکوں میں ڈپازٹ مال کی شرعی حیثیت قرض کی ہے، اگر وہ نصاب کے بقدر بذاتِ خود یا دوسرے مال سے مل کر ہو جائیں اور اس پر سال بھی گزر جائے تو زکات واجب ہو گی، البتہ سودی بینک کا منافع سود ہے، اسے بلانیت ثواب کسی مستحق کو دیا جائے۔

ب: اگر جائز شیئر مارکیٹ میں لگائے ہوئے راس المال کی حالیہ قیمت اور منافع دونوں سال اخیر میں بذاتِ خود یا دوسرے مال کے ساتھ مل کر نصاب کے بقدر ہو جائے تو اس پر زکات واجب ہو گی اور اس میں بازار کی قیمت (Market Value) کا اعتبار کیا جائے گا۔

۷-

الف: بینک میں بطور ودیعت اور ڈپازٹ رہنے والی اصل انشورنس کردہ رقم میں زکات واجب ہو گی، البتہ مزکی کو اختیار ہے کہ وہ فوری طور پر نکالے یا رقم کے حصول کے بعد۔ اضافہ شدہ رقم سود ہے، اس لئے اس پر زکات نہیں ہو گی۔

ب: وائٹ گولڈ ملاوٹی سونے کے حکم میں ہے، لہٰذا اگر اس میں خالص سونا نصاب کے برابر ہو تو زکات واجب ہو گی۔

۸- زکات ایک مالی عبادت ہے، کسی صورت میں ٹیکس وغیرہ کی ادائیگی زکات کی رقم میں شمار نہیں کی جاسکتی ہے۔

۹- مخلوط حلال و حرام مال اگر متمیز اور معلوم ہو تو صرف حلال مال میں زکات واجب ہو گی، لیکن اگر دونوں کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو تو تحری و غالب گمان کے مطابق حرام مال کو جدا کر کے حلال مال پر زکات واجب ہو گی۔

۱۰- بچیوں کی شادی یا اور کسی ضرورت کے لئے جمع کردہ رقم اگر نصاب کے بقدر ہو جائے اور حولان حول ہو تو اس پر زکات واجب ہو گی۔

۱۱-

الف: غلہ جات میں زکات کا نصاب پانچ وسق ہے، جس کی مقدار موجودہ پیمانہ کے اعتبار سے نو سو لیٹر ہے۔

ب: آم، کاجو اور ناریل وغیرہ کی پیدائش میں فی نفسہ زکات واجب نہ ہو گی، البتہ اگر یہ اشیاء خود کے باغ کی ہوں تو بیچنے کے بعد حاصل شدہ رقم بقدر نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو زکات واجب ہو گی اور اگر اس نے ان اشیاء کو تجارت کی نیت سے خریدا ہے تو خریدنے کے وقت سے تال کی تکمیل پر نصاب کے بقدر ہو تو زکات واجب ہو گی۔

ج: سمندری ماکولات قوت (خوراک اور غذا) کی تعریف میں داخل نہیں، لہٰذا ان پر زکات نہیں، البتہ سمندری چیزوں کی آمدنی نصاب کے بقدر ہو اور اس پر سال گزر جائے تو زکات واجب ہو گی۔

سوالنامہ:

تجارت کے چند اہم جدید مسائل

کسب معاش کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، لیکن وقت اور حالات کے ساتھ نیز جدید ایجادات کے دور میں ایک طرف جہاں تجارت کی وسعت دوچند ہو گئی ہے تو وہیں اس سے متعلق بہت سے مسائل جنم لے رہے ہیں، زمانے میں اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ فقہاء کی جماعت عصر حاضر کے معاملات و تجارت پر ایک غائرانہ نظر ڈالے اور اس پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کرے، اس سلسلہ میں اگرچہ متعدد اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں اور محققین علماء کا گروہ متحرک ہے، تاہم بہت سے میدان ہیں جو اب بھی تشنہ ہیں۔

مجمع الامام الشافعی العالمی کی کوشش یہ ہے کہ عوام میں روزمرہ پیش آنے والے مسائل پر علمائے شافعیہ کی ایک جماعت فقہ شافعی کی روشنی میں مسائل کا اطمینان بخش حل تلاش کرے، چنانچہ اسی بنا پر اکیڈمی کے دوسرے سیمینار کے لئے تجارت سے متعلق جدید مسائل کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے، فاضل مقالہ نگار سے گزارش ہے کہ موضوع کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے حتی الامکان تحقیق و تدقیق اور عصری ہم آہنگی کے ساتھ جوابات تحریر فرمائیں۔

۱- تجارت کے تعلق سے فقہی شرائط میں یہ اہم شرط منقول ہے کہ مال پر قبضہ کے بغیر اس کی فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن آج قبضہ کی صورتیں مختلف ہو گئی ہیں، صرف کاغذات پر دستخط کو بھی قبضہ مان لیا جاتا ہے، یا متعاقدین کی رضامندی کو بھی قبضہ سے تعبیر کرتے ہیں، اس تناظر میں یہ مسئلہ قابلِ وضاحت ہے کہ فقہ اسلامی میں قبضہ کی کیا صورت ہے، اور مروجہ دور میں اسے کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے؟

ب: خرید و فروخت میں یہ بات رائج ہو گئی کہ قبضہ سے قبل ہی فروخت کر دیا جائے، جیسے شیئر مارکیٹ میں ہوتا ہے، یا پلاٹ یا فلیٹ خریدنے میں بھی یہ صورت کئی دفعہ پائی جاتی ہے، ایسے میں کیا صرف باہمی رضامندی کو ہی عقد کے لئے کافی سمجھا جائے یا پھر قبضہ حقیقی نہ ہونے کی صورت میں اسے منسوخ مانا جائے؟

۲- بینکوں کی طرف سے ہوم لون ملتا ہے، یا ہیوی ڈپازٹ سے گھر کا خواب پورا کیا جاتا ہے، جس پر کم شرح میں سود بھی لگایا جاتا ہے،

کیا گھر خریدنے یا بنانے کے لئے اس طرح کا لون لینا یا بینکوں سے معاملہ کرنا درست ہو گا؟

۳- بلڈر جب پلاٹ بیچتا ہے تو اس سے قبل کہ رقم مکمل حاصل ہو، کل رقم کی ایک دستاویز بنوا لیتے ہیں اور پھر اس دستاویز کو ذریعہ بنا کر تیسری پارٹی سے سودا کرتے ہیں، ایسے میں اس بلڈر کا یہ کرنا اور کسی کا جانتے بوجھتے اس کام میں شامل ہونا نیز خریدنا بھی درست ہو گا؟

ب: اگر کوئی لون کے لئے دستاویز مانگے اور اس کی بنیاد پر وہ سودی لون لینا چاہتا ہو تو کیا ایسے میں کوئی اپنے دستاویزات لون لینے والے کو دے سکتا ہے؟

ج: اگر بائع کو یہ معلوم ہو کہ مشتری کل رقم یا آدھی رقم بینک سے لون نکال کر بائع کو دے رہا ہے، تو کیا ایسے میں مشتری کو بائع اپنا سامان فروخت کر سکتا ہے، واضح ہو کہ اس لون کو نکالنے کے لئے بائع کا سپورٹ کرنا اور کاغذات پر دستخط کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۴- کئی مرتبہ خرید و فروخت یا علاقائی منڈی میں بیع و شراء کرتے ہوئے کوئی شرط لگادی جاتی ہے، جیسے درخت پر لگے پھل کو بیچنے کے ساتھ اسے توڑنے کی شرط لگادی جائے وغیرہ ایسے میں اس بیع اور اس شرط کا کیا حکم ہو گا؟

۵- معاشی تنگی کی بنا پر آج کسی کے لئے بھی بزنس کرتے ہوئے یکمشت رقم لگانا دشوار ہے، لامحالہ بینک یا کسی متمول شخص سے رجوع کرنا پڑتا ہے، جہاں پر اکثر قسطوں میں معاملہ طے ہوتا ہے، ایک خاص مدت پر اگر قسط نہ لوٹائی گئی تو زائد چارج بھی لگادیا جاتا ہے، ایسے میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس طرح قسطوں پر معاملہ کرنا کیسا ہے؟ کیا اسے سود کے دائرہ میں لایا جاسکتا ہے یا پھر ایک ضرورت کے تحت گوارا کیا جاسکتا ہے؟

ب: جو لوگ قسطوں میں معاملہ کرتے ہیں، اور ایک مدت پر رقم کی واپسی کی شرط لگاتے ہیں، اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ قسطیں نہ ادا کرنے کی صورت میں معاملہ کو منسوخ کرنا یا زائد رقم لینا کیسا ہے؟

ج: اگر معاملہ اس طرح طے پایا کہ فی الوقت ایڈوانس دیدے اور کسی خاص تاریخ پر اصل رقم ادا کرے، لیکن جب وقت معینہ آیا تو وہ شخص رقم کی ادائیگی سے قاصر رہا ایسے میں کیا یہ درست ہے کہ بیع منسوخ کرتے ہوئے ایڈوانس کی رقم واپس نہ کی جائے؟ یا صرف معاملہ منسوخ کردے لیکن ایڈوانس لوٹادے؟

۶- رہن پر لی گئی چیز کا استعمال درست نہیں، لیکن اب معاملہ ایسا ہے کہ اگر رہن میں دی گئی چیز کا استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو معاملہ بھی نہیں کیا جاتا، ایسے میں رہن کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

۷- گھر کو کرایہ پر دینے کی ایک صورت یہ رائج ہو گئی ہے کہ گھر میں رہنے سے قبل ہی سال دو سال کا ایک معاہدہ کر لیا جاتا ہے اور ایک موٹی رقم لے لی جاتی ہے، اب یہ رقم مالک مکان کے لئے ہے خواہ کرایہ دار رہے یا نہ رہے، ان رقوم کو وہ کسی بھی صورت میں واپس نہیں لے سکتا، حتی کہ وہ مدت معینہ مکمل ہو جائے، جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو مکمل رقم واپس کردی جاتی ہے اور مکان اپنے مالک کے تصرف میں چلا جاتا ہے، اس طرح کے معاملہ میں فقہ شافعی کا نقطہ نظر کیا ہے، کیا اسے کرایہ شرعی مانا جائے گا؟ یا کیا کوئی صورت جواز کی ہو سکتی ہے جس کی رو سے اس کا معاملہ درست ہو جائے؟

۸- تجارت کی وسعت اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ایک لمس (ٹچ) پر دنیا حاضر ہو جاتی ہے، جنہیں آن لائن تجارت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جن میں ایپس اور مختلف ٹولس کا استعمالہو تا ہے، ان ایپس کے مالکان اپنے گراہکوں کو لبھانے کے لئے مختلف آفر دیتے ہیں، خرید و

فروخت پر کئی دفعہ رقم واپس بھی مل جاتی ہے، جو بسا اوقات اصل رقم سے زائد بھی ہو سکتی ہے، ایسے میں یہ مسئلہ وضاحت طلب ہے کہ کیا ان رقوم کا استعمال درست ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سود میں شامل ہو؟

ب: بہت سی ٹولس ایسی ایجاد ہو گئی ہیں کہ جن سے رقم آن لائن بھیجی جاسکتی ہیں، بہت سے حضرات نقد لے کر اپنے مستعمل ایپس سے رقم بھیج دیتے ہیں، ایسے میں دو باتیں قابل غور ہیں: اوّل یہ کہ کیا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے؟ دوّم یہ ہے کہ رقم بھیجتے ہوئے ایپس پر اسکریچ کا آپشن ملتا ہے جس کے ذریعہ کچھ رقم ملتی ہے اس رقم کا لینا کیسا ہے؟ نیز اگر کسی ایپ مالک کے ایپ کو کوئی دوسرا استعمال کرے تو ملی ہوئی رقم کس کی ہو گی؟

ج: بہت سے ایپس کمائی کا ذریعہ ہے، جیسے یوٹیوب، انسٹاگرام وغیرہ جن کے اندر خاص مراحل اور ترکیب کے بعد ان کے مالکان کی جانب سے پیسے ملتے ہیں، آج کے دور میں نئی نسل کے لئے یہ اہم ذریعۂ معاش بن چکا ہے، اس سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟

تجاویز بابت: تجارت سے متعلق چند اہم جدید مسائل

۱-

الف: فقہاء شافعیہ کے یہاں مال پر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے اور کتاب و سنت میں قبضہ کی کوئی متعینہ صورت بھی وارد نہیں ہے اس لئے فقہاء نے قبضہ کی صورت کا مدار ہر زمانہ کے عرف پر رکھا ہے۔

ب: فریقین کی رضامندی قبضہ کے لئے کافی نہیں، بلکہ قبضہ کے تحقق کے لئے ضمان (رسک / نقصان کی ذمہ داری) کا منتقل ہو جانا بھی ضروری ہے۔

۲-

الف: سود قطعی حرام ہے، اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، اس لئے امتِ مسلمہ کو سودی قرض سے بچانے کے لئے اصحابِ خیر اور مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ بلا سودی قرض کو رواج دیں، واضح رہے کہ ضرورتمندوں کو قرض دینا کارِ ثواب ہے۔

ب: بعض خاص حالات میں شدید ضرورت پر سودی قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے، اسی طرح شدید ضرورت مندوں کے لئے دستاویز کے ذریعہ تعاون کرنے کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن کون سا عذر شدید ضرورت ہے اور کون سا نہیں، اس سلسلہ میں خود فیصلہ کرنے کے بجائے متعمد اصحابِ افتاء سے رجوع کیا جائے۔

۳- اگر خریدار شدید ضرورت کی بناء پر بینک سے سودی قرض لینے پر مجبور ہے تو بائع اپنی ذاتی منفعت کے لئے نہیں، بلکہ خریدار کی شدید ضرورت کے پیش نظر اپنا سامان اسے فروخت کر سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کے کاغذات پر دستخط بھی کر سکتا ہے۔

۴- درخت پر پھلوں کی خرید و فروخت میں عقد کے وقت یہ شرط لگانا کہ بائع ہی پھل توڑ کر دے گا، اس طرح کی شرط لگانے سے شرط اور بیع دونوں ہی فاسد ہوں گی۔

۵- قسطوں پر معاملہ کرنا بذاتِ خود درست ہے، البتہ قسطوں کے معاملہ میں کوئی خاص قسط یا پوری قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں زائد رقم لینا سود ہے، لہٰذا باہمی رضامندی سے یہ معاملہ ختم کر دیا جائے، بصورتِ دیگر بائع کو اپنا حق وصول کرنے کا اختیار ہو گا۔

۶- عام حالات میں معاملہ ختم کرنے کی صورت میں بائع کے لئے بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے، البتہ اگر خریدار کی طرف سے

خریداری کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے بائع کا نقصان ہو جائے تو وہ بیعانہ کی رقم سے اپنے نقصان کے بقدر تلافی کر سکتا ہے۔

۷- شئ مرہون سے مرتہن کے لئے انتفاع جائز نہیں، لہٰذا مرہون سے اتفاق کی شرط کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں اور نہ ہی ایسے مرہون سے انتفاع کی اجازت ہوگی۔

۸- ہیوی ڈپازٹ کی رقم (جسے واپس کرنا پڑتا ہے) قرض ہے اور قرض دے کر مقروض سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا سود میں داخل ہے، اس لئے ہیوی ڈپازٹ کی صورت میں مالکِ مکان و دکان کا کرایہ میں کمی کرنا یا بالکل ہی کرایہ کی رقم کو معاف کرنا، قرض کے مقابلہ میں فائدہ اٹھانا ہے، اس وجہ سے اس طرح کا معاملہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

۹- کمپنی کے ایپس مالکان کی طرف سے کیش بیک کے طور پر جو رقم ملتی ہے، وہ ایک طرح کا انعام وعطیہ ہے، اس لئے اس رقم کو لینے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ کیش بیک کسی دوسرے سودی فائنانسر (Financer) ادارہ مثلاً بینک یا دیگر پرائیویٹ سودی فائنانسنگ اداروں کی طرف سے نہ ہو۔

۱۰- آن لائن رقوم منتقل کرنا اور اس پر اجرت لینا درست ہے اور ایپس سے حاصل ہونے والے منافع کا حقدار ایپس اکاؤنٹ ہولڈر ہوگا۔

۱۱- یوٹیوب اور اس جیسے ایپس کو ذریعۂ معاش بنانے کا حوصلہ افزائی نہ کی جائے، البتہ ایپس مالکان کی طرف سے جو رقم ملتی ہے، اس کو لینے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی اور شرعی قباحت نہ ہو۔

سوالنامہ:

قربانی کے متعلق بعض اہم سوالات

قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے، اس کا اجر وثواب بھی بہت زیادہ ہے، آخرت کے اجر وثواب کے ساتھ دنیاوی اعتبار سے بھی یہ عبادت مختلف اقوام کے لئے متعدد فوائد کا ذریعہ بنی ہے، قربانی کے فوائد واجر وثواب کے حصول کے لئے قربانی کا صحیح ہونا ضروری ہے، شریعت مطہرہ میں قربانی کے مستقل احکام منقول ہیں، ان کی رعایت کے ساتھ ہی قربانی درست ہو سکتی ہے، لیکن قربانی کے بعض اصولوں پر عمل مشکل ترین ہے، نیز لوگوں میں عادت وعرف کے تبدیلی کی وجہ سے بعض اصول کی رعایت ممکن نہیں ہے، اسی طرح ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر قربانی کے متعلق بعض مسائل درپیش ہیں، اسی پس منظر میں مجمع الامام الشافعی العالمی نے اپنے دوسرے سیمینار میں قربانی کے متعلق چند حل طلب مسائل بحث وتحقیق کے لئے اصحابِ علم وتفقہ کی خدمت میں پیش کیا ہے، امید ہے کہ آپ ان مسائل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے مطالعہ وتحقیق کا نچوڑ اور اپنی واضح رائے پیش کریں گے۔

۱- قربانی میں جانوروں کی عمر شریعت میں متعین ہے، قربانی کے جانوروں میں بکرے کی دو سال متعین ہے، اس سے کم عمر بکرے یا بکری کی قربانی درست نہیں ہے، لیکن اس زمانہ میں دکانوں پر دستیاب بکروں یا بکریوں کی عمر دو سال سے کم ہوتی ہے، گرچہ وہ جسمانی اعتبار سے دو سال کے نظر آتے ہیں اور بسا اوقات بکروں کے تاجر دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے ایسے فربہ اور جسیم بکروں کی عمر دو سال بتلاتے ہیں، اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ دو سال کے بکرے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں دو سال سے کم عمر

والے جانوروں پر قربانی درست ہوگی؟ یا پھر مینڈھے یا دیگر جانوروں پر قربانی کی جائے گی؟

۲- قربانی میں ناکافی جانوروں کے سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول متعین کیا ہے کہ جانور ہر ایسے عیب سے پاک ہو جس کی بناء پر اس کے گوشت میں نقص یا کمی پیدا ہوتی ہو، اسی اصول کے مطابق کسی جانور کے کان کا کچھ حصہ کٹ کر الگ ہوگیا ہو تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہوتی، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ لوگوں کے نزدیک کان کی حیثیت ماکول اللحم اعضاء کی طرح نہیں رہی، اس کے باوجود بھی یہی کہا جائے گا کہ کان میں نقص والا جانور قربانی کے لئے ناکافی ہے یا عرف وعادت کا اعتبار کرتے ہوئے کان کو سینگ تصور کرکے یہ مان لیا جائے کہ جس طرح سینگ ٹوٹا ہوا جانور قربانی کے لئے کافی ہے اسی طرح کان میں عیب والا جانور بھی کافی ہو جائے گا؟

۳- برصغیر کے تارکینِ وطن بہ کثرت مغربی ملکوں میں آباد ہیں، ان ملکوں میں بعض اوقات قربانی کرنا دشوار ہوتا ہے، نیز ان کے آبائی وطن میں مستحقین زیادہ ہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ان علاقوں میں قربانی ہو جائے، نیز اس وقت خود ہمارے ملک میں جن علاقوں میں بڑے جانوروں پر قربانی دشوار ہے۔ ان علاقوں کے لوگ اپنی قربانی کرانے کے لئے جانور کی قیمت ذمہ دار قسم کے لوگوں اور معتبر اداروں کے حوالے کردیتے ہیں اور یہ حضرات ایسے علاقوں میں جاکر قربانی کرتے ہیں جہاں قربانی آسان ہے، اس ضمن میں درج ذیل سوالات قابلِ حل ہیں۔

الف: قربانی کے گوشت کا کچھ نہ کچھ حصہ غریبوں کو دینا واجب ہے، ان غریبوں سے اپنے گاؤں وعلاقہ کے غریب مراد ہیں یا مطلق غرباء مراد ہیں؟

ب: اپنے علاقے کو چھوڑ کر دیگر علاقوں میں قربانی کرانے کا کیا حکم ہے؟

ج: قربانی کے لئے اس جگہ کی تاریخ اور وقت کا اعتبار ہوگا جہاں قربانی کی جارہی ہے یا اس شخص کے علاقہ کی تاریخ اور وقت کا اعتبار ہوگا جس کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے، مثلاً مہاراشٹر کا کوئی شخص کیرالا میں کسی کو قربانی کی ذمہ داری سونپ دے تو کیرالا میں اگر تاریخ مقدم ہے تو کیرالا کی تاریخ کا اعتبار ہوگا یا مہاراشٹر کی تاریخ کا اعتبار ہوگا؟

۴- قربانی کے جانور کے کھال کا مصرف یہ ہے کہ قربانی کرنے والا اس کھال کو اپنے استعمال میں لائے یا کسی فقیر کو دے دے، لیکن چوں کہ کھال کا استعمال اب ترک ہو چکا ہے اور ہر مسلمان کھال کو کسی فلاحی ادارے کے حوالہ کرتا ہے اور فلاحی ادارے ان کھالوں کو فروخت کرکے ان کی قیمت کو ضرورت مندوں پر تقسیم کرتے ہیں، چوں کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد قربانی کی اس سنت کو انجام دیتے ہیں، جس سے غریبوں اور مسکینوں کی ایک حد تک ضرورت مکمل ہو جاتی ہے، لیکن حالیہ سالوں میں جیسے ہی قربانی کے ایام قریب آجاتے ہیں کھالوں کی قیمت میں ناقابل بیان گراوٹ آجاتی ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا بھاری مقدار میں نقصان ہو جاتا ہے، لیکن حکومت اور تجارتی کمپنیوں کو خوب نفع حاصل ہوتا ہے، ایسی صورت حال میں ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ کم قیمت میں کھال فروخت کرنے کے بجائے اسے دفن کر دیا جائے اور اس کی قیمت کے بقدر رقم غرباء پر تقسیم کی جائے، اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ کھال کو فروخت کئے بغیر دفن کرنے میں ضیاع مال کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ نیز جب قربانی کرنے والے کو کھال کا استعمال درست ہے تو کیا اسے دفن کرنے کا اختیار ہے؟ نیز اگر کوئی دفن کرے تو کھال کے بقدر قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے؟

۵- جانور کے اعضاء میں سے (خصیتین) فوطے کے سلسلہ میں فقہاء نے یہ صراحت کی ہے وہ عادتاً کھائے نہیں جاتے، لہٰذا اس کا کھانا مکروہ ہے، لیکن اس زمانہ میں عمومی طور لوگوں میں اس کے کھانے کا رواج ہے، اس پر مستزاد کہ لوگوں اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں گویا یہ مرغوب غذاؤں میں شامل ہے، اب سوال یہ ہے کہ لوگوں کی اس عادت کا اعتبار کرتے ہوئے خصیتین کو کھایا جائے گا، اگر نہیں تو کیا یہ کراہت اب بھی باقی رہے گی؟

۶- (الف) قربانی کے موقع پر قصاب حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ جانوروں کی صفائی کے وقت جانور کی غیر استعمال اشیاء کو ایسی جگہ چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے فضائی آلودگی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے عام انسانوں کو تکلیف اور ضرر لاحق ہوتا ہے اور بڑے جانوروں کی قربانی کے موقع پر برادرانِ وطن کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، ایسے حالات میں اسلام کی کیا رہنمائی ہے۔

(ب) قصاب حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنی سہولت کی خاطر قربانی کے جانوروں کی صفائی میں بڑے جانور کا سر اور پیر وغیرہ جانور کی گندگی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں یا دفن کر دیتے ہیں، جبکہ جانور کے سر میں گوشت کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ہوتا ہے اور جانوروں کے پیروں کو کھایا جاتا ہے، اس پس منظر میں یہ سوال ہے کہ قصاب حضرات کی یہ حرکت ضیاع مال میں شامل ہے؟

۷- موجودہ ایام میں قربانی کے مواقع پر ایک خاص طبقہ کی طرف سے اس بات پر کافی زور دیا جاتا ہے کہ ایک بکرے یا بکری کی قربانی پورے اہلِ خانہ کی طرف سے کافی ہوگی، اس تعلق سے عوام الناس میں کافی اختلاف و تشویش پائی جاتی ہے، اس ضمن میں کچھ باتوں کی تحقیق ضروری ہے۔

الف: چھوٹے جانور (بکرا، بکری، مینڈھا، مینڈھی) پر صرف ایک شخص کی طرف سے قربانی ہوگی، اس کے کیا دلائل ہیں؟

ب: فقہاء کی تصریحات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قربانی سنت علی الکفایہ ہے لہٰذا ایک چھوٹے جانور کو گھر والوں کی طرف سے ذبح کیا جائے تو قربانی کی سنت سب کی طرف سے ادا ہوگی، اس صورت میں قربانی کے ثواب میں سب شریک ہوں گے یا صرف ایک ہی کو ثواب ملے گا؟

ج: گھر والوں میں پورا خاندان شامل ہے یا صرف قربانی کرنے والے کے بیوی بچے اور والدین؟

۸- قربانی کے جانور کو لٹاتے وقت اس کے تین پاؤں باندھے جاتے ہیں اور ایک کھلا رکھا جاتا ہے، قابل حل بات یہ ہے کہ جانور کے اگلے دونوں پیروں میں سے ایک پیر کھلا رکھنا مسنون ہے یا پچھلے دونوں پیروں میں سے ایک کھلا رکھنا مستحب ہے؟

تجاویز بابت: قربانی کے متعلق بعض اہم سوالات

۱- شریعت کی متعین کردہ جانور کی عمر کا خیال رکھ کر قربانی کیجائے، اگر کسی وجہ سے مطلوبہ عمر کے جانور مہیا نہ ہوں تو بڑے جانور میں شرکت یا مینڈھے کے ذریعہ قربانی کی سنت ادا کی جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو آخری درجہ میں شوافع کے قول مرجوح کے مطابق دو سال سے کم عمر کے بکرے پر قربانی کی گنجائش ہے۔

۲- کان کٹ کر الگ ہوئے جانور کی قربانی درست نہیں ہے، لیکن اگر سالم کان والا جانور دستیاب نہ ہو تو تہائی سے کم حصہ کے بقدر کان کٹے جانور کی قربانی کی گنجائش ہے۔

۳- قربانی کا کچھ گوشت فقراء کو دینا واجب ہے ان سے اس جگہ کے فقراء مراد ہیں جہاں قربانی ہو رہی ہے۔

۴- شعائر اسلام کے بقاء کے لئے اپنے ہی علاقہ میں قربانی کرنا بہتر ہے، تاہم اپنے علاقہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں بھی قربانی کرانا درست ہے۔

۵- بہتر یہ ہے کہ قربانی کے لئے موکل اور وکیل دونوں کے وقت کی رعایت کی جائے تاہم اگر وکیل اور موکل کے وقت میں موافقت دشوار ہو تو وکیل کے وقت کا اعتبار ہو گا۔

۶- قربانی کا چمڑا بلا ضرورت دفن کرنا ضیاعِ مال ہے، اگر دفن کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو علاقائی علماء سے رجوع کریں۔

۷- خصیتین کا کھانا مکروہ ہے۔

۸- قربانی یا اس کے علاوہ مواقع پر کسی بھی قسم کی گندگی اور فضائی آلودگی کو پھیلانا جائز نہیں ہے۔

۹- جانور کی قابل انتفاع کسی بھی چیز کو بلا ضرورت تلف کرنا ضیاع مال میں شامل ہو گا۔

۱۰- احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک چھوٹے (مینڈھا، بکرا) جانور پر صرف ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی ہو گی، البتہ قربانی کرنے والا ثواب میں دوسروں کو بھی شریک کر سکتا ہے۔

۱۱- ذبح کے وقت جانور کا پچھلا داہنا پیر کھلا رکھنا مستحب ہے۔

لِيَتَفَقَّهُوا فِيْ الدِّيْنِ – القُرآن
مَنْ يُّرِدُ اللہُ بِہٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِيْ الدِّيْنِ – الحديث
اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ – نسائی

تحفۃ الباری

فی الفقہ الشافعی

جلد دوّم وسوّم

مسائل ودلائل کا مستند مجموعہ

مؤلف

شیخ الحدیث مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ

جامعہ حسینیہ عربیہ، شریوردھن

ناشر: مجلس اشاعت، ممبئی - ۱۰

نام کتاب : **تُحفَةُ البَارِی** فی الفقہ الشافعی (جلد دوم وسوم)

مؤلف : شیخ الحدیث حضرت **مولانا محمد ابراہیم** بن علی خطیب حفظہ اللہ

(شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن)

صفحات : ۵۴۱

ناشر : **مجلسِ اشاعت**

یونائیٹڈ شافعی مسجد، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی-۳۷، [رابطہ: ۹۰۲۹۱۷۴۸۶۰]

(اراکینِ مجلس: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، جناب مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم، جناب مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملّا، جناب محمد حسین اسماعیل ملّا، جناب ڈاکٹر محمد فاروق لوکھڑے)

تعداد : ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

سنِ اشاعت : ستمبر ۲۰۰۲ء

اشاعتِ جدید : جون ۲۰۱۳ء

کمپیوٹر کمپوزنگ: جاوید یوسف

طباعت : **غزالی**

ملنے کے پتے

جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن

مقام پوسٹ و تعلقہ: شریوردھن، ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر)

مولانا محمد فاروق اسماعیل معلم، امام و خطیب پہاڑ والی مسجد، واڑی بندر، ممبئی۔۱۰

مولانا عبدالسلام نجے القاسمی، امام و خطیب جالی محلہ شافعی مسجد، باپو کھوٹے اسٹریٹ، ممبئی۔۳

مفتی محمد رضوان فلاحی، مدرس جامعہ عربیہ ادھیم نگر، رتناگیری، فون: ۹۲۷۰۰۸۴۵۸۵

مولانا محمد رضوان کبیر الدین ملّا، امام و خطیب یونائیٹڈ شافعی مسجد، ایس۔ ایم۔ ڈی روڈ، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی۔۳۷

ناز بک ڈپو، محمد علی بلڈنگ، محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ممبئی-۳، فون: ۲۳۴۵۴۷۳۰

شفاء ٹریڈرس (مولانا عبدالرزاق الڈے، امام کاکر تلا مسجد، مہاڈ) نزد نائک اسپتال، مہاڈ، ضلع رائے گڑھ، فون: ۹۲۲۶۷۷۱۱۳۲

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْد

تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی کی اشاعت اور آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم اللہ وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں بے انتہا شکر ادا کرتے ہیں کہ اسی کی توفیق، ہمت اور اعانت کے بعد ہی ہم اس قابل ہوئے کہ اس عظیم کتاب کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کریں۔

اس کتاب کی ضرورت کا خیال ہمیں آج سے تقریباً پانچ چھ سال قبل پیش آیا۔ چونکہ ساکنینِ خطہ کوکن عموماً شافعی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ تقریباً ۳۵۔۴۰ سال قبل جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن، ضلع رائے گڑھ کے قیام کے علاوہ کوکن میں عرصہ دراز سے نہ علمی دور دورہ تھا نہ کوئی علمی مرکز اور نہ ہی علمی اور تاریخی کتابوں کا ذخیرہ تھا نہ کوئی حقائق سے روشناس کرانے والا تھا اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے فقہ شافعی کے تعلق سے عام فہم اردو میں کوئی ایسی جامع کتاب موجود تھی۔ گرچہ عربی زبان میں فقہ شافعی پر کثیر کتابیں موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فقہ شافعی میں کوئی مستند، مفصل و مدلل کتاب عام فہم اردو زبان میں ہو تاکہ عوام الناس کا ہر طبقہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اس مقدس جذبہ اور تمنا کی یہ چنگاری تھی جس نے عزم و ارادہ میں ہلکی سی رمق پیدا کی۔ دن گزرتے گئے اور یہ تمنا ارادوں کے سہارے پروان چڑھی تاآنکہ اس کتاب کی تکمیل نے عملی شکل اختیار کی اور **تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی** کے نام سے مدلل و مفصل کتاب منظرِ عام پر آگئی۔

پہلے تو ہم صاحبِ کتاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ کے بے انتہا مشکور و ممنون ہیں، جنہوں نے ہماری درخواست قبول کی۔ اور مسندِ حدیث کی ذمہ داریوں اور بے انتہا مصروفیت کے باوجود اس اہم ترین کام کو پورا کرنے کے لئے عرق ریزی کی اور قرآن و سنت اور فقہ کی کتابوں سے مسائل اخذ کر کے عقائد و ایمانیات سے لے کر فرائض تک غرضیکہ تمام ابواب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے امت کے لئے یہ بیش بہا تحفہ تیار کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ کتاب کو صحت و سلامتی اور دارین میں فلاح و کامرانی سے نوازے۔ نیز اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے اور اس کے نفع کو عام کرے۔ آمین

بعدہ ہم ان تمام افراد کے مشکور ہیں جنہوں نے اس عظیم کام کی ابتداء تا انتہا ہر قسم کا تعاون نیز مالی مدد دی اور جنہوں نے گرانقدر وقت اور کوششوں کے بعد نشر و اشاعت کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فرداً فرداً نام لکھنا ان تمام مخلصین کے خلوص کو تکلیف پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا ہم ان کے لئے صرف بہ صمیم قلب یہی دعا کرتے ہیں کہ خدائے ذوالجلال والاکرام انہیں دارین کی فلاح وسعادت سے شرفیاب کرے۔ اور ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ بخشے۔ آمین

والسلام
ناشر
(مجلسِ اشاعت، ممبئی۔ ۱۰)

مجلسِ اشاعت کی غرض وغایت

سیدنا امام محمد بن ادریس شافعی (امام شافعیؒ) کی عظیم الشان فقہ "فقہ شافعی" جو منقول و معقول سے جامع ہے۔ اس فقہ کو ہر زمانے میں محدثین، فقہاء و مجددین نے بزبانِ عربی مفصل و مدلل پیش کیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس فقہ کی ترویج و اشاعت کا کام مختلف زبانوں میں، بطور خاص اردو میں کیا جائے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب حفظہ اللہ کی سرپرستی میں مذکورہ ادارہ کا قیام عمل میں آیا۔ سالوں کی محنت کے بعد اس ادارہ کی پہلی کامیاب پیش کش ادارہ کے سرپرست شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ابراہیم بن علی خطیب کی مرتبہ و مؤلفہ فقہ شافعی پر مدلل و مستند کتاب بنام " **تحفة الباری فی الفقه الشافعی**" منصہ شہود پر آگئی اور اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے فوراً بعد پہلے چند نسخے جن حضرات کی خدمت میں پیش کئے گئے ان میں سب سے پہلا نام حضرت مولانا سید شوکت علی صاحب مدظلہ العالی [امام و خطیب، جامع مسجد، ممبئی-۲] کا ہے۔ حضرت نے کتاب کو دیکھ کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا اور ایک عظیم کام کی تکمیل پر ادارہ اور صاحبِ کتاب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب حفظہ اللہ کو جزاکم اللہ خیراً و احسن الجزاء کہتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔

اسی طرح ہمارے سامنے فقہی کتابوں کے اور بھی کئی منصوبے زیرِ غور ہیں۔ پہلا کہ اس کتاب کو بزبانِ انگریزی اور ہندی میں منتقل کیا جائے تاکہ ہمارے وہ بھائی جو اردو سے نابلد ہیں وہ بھی اس عظیم کتاب کا مطالعہ کر سکیں۔ الحمدللہ ہم نے اس باب میں پیش رفت کی اور تحفۃ الباری [پہلی جلد] ہندی زبان میں آپ کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہے۔ ثانیاً جمعہ کے خطبات کی نشر و اشاعت کا عزمِ مصمم بھی ہمارے دلوں میں تھا اور الحمدللہ، اللہ عزوجل کی تائید و نصرت سے جمعہ کے خطبات بعنوان "خطباتِ خطیب" بھی شائع ہوچکی ہے۔ اب اس کے بعد "خطباتِ خطیب" کی اشاعت ثانی کا منصوبہ ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے اور مذکورہ کام اور ہمارے آئندہ کے منصوبے ہمارے لئے آسان کرے۔ آمین

والسلام
(مجلسِ اشاعت، ممبئی۔۱۰)

شروع اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

فہرس

تحفة الباري

في الفقه الشافعي

جلد دوّم

کتاب البیوع (خرید وفروخت کا بیان)

آیت: وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرہ-۲۷۵) (جن لوگوں نے اپنی حماقت اور ضد سے سود کی حلت کے لئے بیع سے استدلال کرنا چاہا اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہو گا)

۲) لَاتَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء۔ ۲۹) آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں۔

قرآن پاک میں بیع سے متعلق دیگر آیات بھی ہیں جو بطور استدلال متعلقہ مسائل کے ضمن میں پیش ہوں گے۔

احادیث: بیع کے متعلق قولی، فعلی، اور تقریری احادیث بکثرت وارد ہیں جو اس کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔

۱) آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی رسی لے جائے اور ایندھن کا ایک گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھالائے اور اسے فروخت کر دے جس سے اللہ اس کے چہرہ کو (سوال اور بھیک کی ذلت سے) بچائے یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت لوگوں کے روبرو ہاتھ پھیلانے کے۔" (بخاری فی الزکاۃ)

۲) آپ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ اناج قرض (ادھار) خریدا اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھی۔ (بخاری فی البیوع۔ مسلم فی المساقاۃ)

۳) صحابہ کرام آپ ﷺ کے روبرو یا دانستگی میں بیع وشرا کرتے (خرید وفروخت کرتے) اور آپ ﷺ اس پر نکیر نہ کرتے۔ جس کی بکثرت مثالیں ہیں۔ (دیکھئے بخاری کتاب البیوع کے ابواب) مختلف مسائل پر بحث کے دوران بطور استدلال کئی روایات کا تذکرہ ہو گا جو بیع کے جواز اور مشروعیت پر واضح دلیل ہوں گی۔

لہٰذا قرآن وسنت اور مختلف زمانوں میں امت کے اجماع سے خرید وفروخت کی مشروعیت اور اسلام میں اس کا جواز ثابت ہے۔

عربی میں لفظ "بیع" کسی کے عوض کسی کے لین دین کو کہتے ہیں خواہ وہ مال ہو یا نہ ہو۔ فقہاء کرام کی اصطلاح میں "بیع" سے ایسا عقد مراد ہے جس میں مال کے مقابلہ میں مال کا لین دین ہو جس سے تابیدی ملکیت حاصل ہو۔ (مستقل اور ہمیشہ کی ملکیت حاصل ہو)

حکمت: انسان مختلف اشیاء کا ضرور تمند ہوتا ہے اور بالعموم ہر شخص بذاتِ خود اپنی ساری ضروریات فراہم نہیں کر سکتا، لہٰذا آپس میں ان اشیاء کا تبادلہ ناگزیر ٹھہرا، اور یہ تبادلہ بغیر طرفین کی رضامندی کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی رضامندی کو عقدِ بیع کہیں گے۔ اسی طرح کسی کے پاس رقم ہو گی لیکن ضرورت کی چیز نہ ہو گی اور دوسرے کے پاس چیز ہے لیکن اسے رقم کی ضرورت ہے، لہٰذا یہ دونوں آپسی تبادلہ سے اپنا مقصد حل کر لیں گے، نیز انسان کی فطرت میں نفع اور فائدہ کی تلاش وسعی داخل ہے، اور اس مقصد کے حصول کا مناسب ذریعہ خرید وفروخت اور تجارت ہے۔ واللہ اعلم۔

عقد بیع کے ارکان

ہر عقد کے وجود کے لئے چند ارکان اور صحت کے لئے ان ارکان کی کچھ شرائط ضروری ہیں تاکہ اللہ کے مقررہ شرعی احکام کا ترتب اور ظہور ہو۔ یہی تفصیلات ذیل میں درج ہیں۔ بیع کے تین ارکان ہیں:

۱) **عَاقِدان** (طرفین۔ فروخت کرنے والا اور خریدنے والا) انہیں دونوں کے اتفاق سے عقد کا ظہور ہوتا ہے، ہر ایک میں درج ذیل شرائط لازمی ہیں۔

(الف) رشید ھو۔ یعنی عاقل بالغ اور مالی تصرفات کی صحیح صلاحیت اور سمجھ بوجھ رکھتا ہو، پس بچہ اور پاگل کا لین دین صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح سفاہت (مالی تصرف میں سادہ لوح ہونا) کی وجہ سے جس پر حجر (روک اور پابندی) لگی ہو یعنی جو ناجائز امور میں مال صرف کرے، یا مباحات میں برباد کرے یا کم عقلی اور سادگی ولاعلمی کی وجہ سے کافی نقصان اٹھاتا ہو، اس کی بیع بھی صحیح نہ ہو گی۔ (جب کہ اس پر حجر لگا یا گیا ہو) اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے ”وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (النساء۔۶) اور تم یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جاویں (یعنی بالغ ہو جائیں کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت ورعایتِ مصالح مال سلیقہ اور انتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کردو (اور اگر ہنوز سلیقہ یا انتظام نہ معلوم ہو تو حوالے نہ کرو)

تو اللہ تعالیٰ نے ذمہ داروں کو اپنے ماتحت یتیموں کو بلوغ کے وقت معاملات میں آزمانے کا حکم دیا، اور مال میں صحیح تصرف کی صلاحیت کی صورت میں مال ان کے حوالے کیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ رشد (مالی تصرف کی صحیح ہدایت اور سمجھ) مال کی سپردگی اور قبضہ میں دینے اور تصرف کی صحت کے لئے شرط ہے۔ اور خرید وفروخت بھی مالی تصرف ہے لہٰذا اس میں بھی رشد شرط ہے۔

بچہ اور پاگل چونکہ غیر مکلف ہیں اس لئے ان میں مالی تصرف کی اہلیت نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ”تین مرفوع القلم ہیں (۱) پاگل مغلوب العقل شفایاب ہونے تک (۲) سویا ہوا شخص بیدار ہونے تک (۳) بچہ بالغ ہونے تک“ (ابوداود۔ الحدود) مرفوع القلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے مواخذہ اور باز پرس نہ ہو گی اور عقود پر احکام کا ترتب ہوتا ہے، لہٰذا جس کے تصرفات پر مواخذہ نہ ہو سکے، وہ اس تصرف کے کرنے کا اہل نہ ہو گا۔

(ب) بااختیار ھو۔ لین دین کے جس معاملہ کو انجام دے رہا ہے، اپنی مرضی اور اختیار سے بلا کسی جبر واکراہ کے انجام دے، فرمان باری ہے ”إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ“ (النساء: ۲۹) لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔“

فرمانِ رسول ﷺ“۔ بیع تو (تبھی معتبر اور صحیح ہو گی جبکہ خرید وفروخت کرنے والے کی آپسی) رضامندی سے ہو۔“ (ابن ماجہ۔ التجارات)

لہٰذا کوئی جبر واکراہ کی وجہ سے خرید وفروخت کرلے تو رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ رضامندی تو ایک مخفی اور پوشیدہ معاملہ ہے، جس پر بغیر اکراہ اور زبردستی کے قولی یا فعلی تصرف دلالت کرتی ہے بصورت اکراہ یہ ناپید، یا مشکوک ہے۔ لہٰذا محض اقوال کا اعتبار نہ ہو گا، اور بیع صحیح نہ ہو گی۔

ہزل (ٹھٹھا، بیہودگی اور بکواس) کے طور پر خرید وفروخت کے الفاظ ادا کرنے سے بھی بیع نہ ہوگی، کیونکہ یہ انداز عدمِ رضا اور عدمِ قصد پر دلالت کرتا ہے۔

اگر برحق اکراہ ہو تو بیع صحیح ہے۔ مثلاً کسی پر دوسرے کا قرض ہو اور بلا عذر وہ ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہے اور اپنے اسباب فروخت نہ کرے تو قاضی اسے فروخت کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہوسکے، اور یہ بیع صحیح ہوگی، شارع کے رضا کو اس کے رضا کے قائم مقام سمجھ لیں گے۔

(ج) طرفین کا تعدد (طرفین الگ الگ ہوں) یعنی خریدنے والا اور فروخت کرنے والا جدا جدا ہوں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی مصلحتوں کا دوسرے کی مصلحتوں سے ٹکراؤ ہوگا۔ بائع تو زیادہ سے زیادہ قیمت اور کم سے کم شرائط کا متمنی ہوگا اور مشتری (خریدنے والا) اس کے برعکس، اسی طرح دیگر امور، اسی طرح بیع کے بعض احکام مبیع (فروخت شدہ شئ) کے قبضہ سے متعلق اور بعض احکام قیمت کے قبضہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور ہر ایک پر کچھ ذمہ داری اور حق سوال و بازپرسی مرتب ہوتا ہے، جو کبھی دوسرے سے متعارض ہوگا، لہٰذا ایک ہی شخص میں دوطرفہ ذمہ داری کا جمع ہونانا ممکن ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں اگر کسی نے دوسرے کو اپنے اموال کے فروخت کے لئے وکیل بنایا تو مذکورہ وکیل خود اپنے لئے وہ اموال نہیں خرید سکتا، یا کسی نے کوئی چیز خریدنے کے لئے وکیل بنایا اور وہ چیز خود وکیل کے پاس موجود ہو تو وکیل اپنی ہی چیز موکل کے لئے نہیں خرید سکتا، اسی طرح کوئی دو آدمیوں کی طرف سے وکیل ہو تو وہ ان میں سے ایک کا مال دوسرے کے لئے نہیں خرید سکتا، علت وہی جو گذر چکی۔ (مثلاً زید نے اپنی بکری فروخت کرنے کے لئے بکر کو وکیل بنایا اور خالد نے ایک بکری خریدنے کے لئے بکر کو وکیل بنایا تو بکر زید کی مذکورہ بکری خالد کے لئے نہیں خرید سکتا) کیونکہ مال پر قبضہ یا مال کا سپرد کرنا وغیرہ بیع سے متعلقہ حقوق کا تعلق وکیل سے ہوگا۔ جس میں کبھی نزاع اور قاضی کی طرف فیصلہ کے لئے رجوع کی ضرورت پیش آئے گی۔ لہٰذا ایک وقت میں ایک ہی شخص مدعی اور مدعی علیہ بن جائے یہ ناممکن ہے۔

البتہ جو خود تصرف سے قاصر ہو تو اس کا والد (بطور ولی) اس کا مال خریدلے (یا برعکس صورت ہو) تو جائز ہے۔ کیونکہ اس کی بھرپور شفقت کی وجہ سے غبن (نقصان اور خسارہ میں ڈالنے) کی تہمت کا سوال نہیں۔ اسی طرح قاضی اپنے ماتحت قاصرین کا مال ایک دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، کیونکہ اس کی ولایت عام ہے اور کبھی مجبوراً اس طرح بیع کی نوبت آئے گی۔

(د) بینا ہو۔ نابینا کا لین دین صحیح نہیں ہے۔ وہ خرید وفروخت کے لئے کسی کو وکیل بنادے۔

(۲) صیغہ۔ یعنی وہ الفاظ جو عاقدین (خرید وفروخت کرنے والے) بیع کے قصد اور رضامندی کے متعلق ادا کریں۔ یہ بات گذر چکی کہ بیع کی صحت کے لئے رضامندی شرط ہے۔ اور رضامندی ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے، اس کے قائم مقام اس پر دلالت کرنے والے تصرف کو رکھا گیا، جو عاقدین کی زبانی ادا ہوتی ہے۔ اسی کو "صیغہ" کہا جائے گا۔ جو ایجاب اور قبول پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایجاب: مثلاً بائع (فروخت کرنے والے) کا یہ کہنا۔ "میں نے آپ کو یہ کپڑا سو روپے میں فروخت کیا۔"

قبول: مشتری (خریدنے والے) کا یہ کہنا۔ "میں نے اسے قبول کرلیا" یا "میں نے اسے خرید لیا" وغیرہ۔ صیغہ صریح اور کنایہ دونوں ہوسکتا ہے۔

صریح: ہر وہ لفظ جو صراحتاً خرید وفروخت پر دلالت کرے، مثلاً: فروخت کیا، ملکیت میں دے دیا، خرید لیا، ملکیت میں لے لیا،

قبول کر لیا وغیرہ

کنایۃ: ایسے الفاظ جس میں بیع اور غیر بیع دونوں کا احتمال ہو۔ مثلاً بائع کہے میں نے یہ دس روپے میں تمہیں دے دی یا دس روپے میں لے لو، یا دس روپے میں قبضہ کر لو۔ یا خریدار کہے میں نے لے لیا یا قبضہ کر لیا۔

تمام شرائط موجود ہوں تو صریح الفاظ کی ادائیگی سے بیع منعقد ہو گی، نیت کی محتاج نہ ہو گی۔ جبکہ کنایہ الفاظ سے بصورت نیت یا قرائن جو ارادۂ بیع پر دلالت کرے، بیع منعقد ہو گی (ورنہ نہیں)۔

مُعاطَاۃ: بائع بغیر لفظ کے چیز خریدار کے سپرد کرے اور وہ بغیر لفظ کے لے لے یا کسی ایک کی جانب سے لفظ پایا جائے اور دوسرے کی جانب سے نہ پایا جائے، تو اسے بیع معاطاۃ کہا جائے گا۔

شافعی مسلک میں مشہور یہ ہے کہ عاقدین کی طرف سے الفاظ لازم ہیں اور معاطاۃ کے طرز پر بیع (بلا الفاظ کے خرید و فروخت) صحیح نہیں، بعض فقہاء نے چھوٹی موٹی اور کم قیمت اشیاء میں اسے صحیح قرار دیا ہے، البتہ نفیس اور زیادہ قیمتی اشیاء میں غیر صحیح کہا ہے،

امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ بعض متاخرین فقہاء شافعیہ نے مطلقاً بیع معاطاۃ کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ یہ طریقہ معروف ہو (اور عام طور پر لوگوں میں اس طرز پر لین دین ہوتا ہو) اور جبکہ دورِ حاضر کا عام ماحول بغیر لفظی ایجاب و قبول کے لین دین کا ہے تو لوگوں کی سہولت کی خاطر اس کے جواز کا فتویٰ ہی بہتر ہے، تاکہ بیع باطل اور لوگ گنہگار نہ شمار ہوں، کیونکہ شاذ و نادر ہی عاقدین ایجاب و قبول کے کلمات ادا کرتے ہیں۔

سابقہ تفصیلات اس کے حق میں تھیں جو گفتگو پر قادر ہو، جو گونگا ہو اس کا واضح اشارہ جو ان تصرفات میں معروف ہو کافی ہے۔ اور اسے ضرورۃً الفاظ کے قائم مقام شمار کریں گے، کیونکہ یہ گفتگو کی طرح مافی الضمیر کی نمائندگی کرتا ہے۔

کسی غائب یا حاضر کو تحریراً فروخت کرے (زبان سے لفظ ادا نہ کرے) تو یہ بھی صحیح ہے۔ سامنے والے کو علم ہوتے ہی وہ قبول کرے تو بیع صحیح ہو گی (حاشیۃ الجمل علی فتح الوہاب ۱۰/۳)

صیغۂ عقد کے شرائط: (۱) ایجاب و قبول کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو جس سے عرفاً قبول سے اعراض سمجھا جائے، اسی کو مجلس عقد کا اتحاد کہا جاتا ہے، بائع کے کلماتِ ایجاب کے بعد کافی دیر خاموشی رہی یا درمیان میں عقد سے غیر متعلق کوئی گفتگو ہو خواہ فاصلہ کم ہو، پھر خریدار قبول کرے تو عقد صحیح نہ ہو گا۔ اگر ایجاب کے بعد عقد ہی سے متعلق گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا، بعد میں خریدار نے قبول کیا تو عقد صحیح ہے، خواہ فاصلہ طویل ہو۔

(۲) ایجاب و قبول ہر پہلو سے آپس میں متفق اور مطابق ہو۔ کوئی کہے "میں نے تمہیں سو روپے میں فروخت کیا" تو دوسرے نے کہا "میں نے ۵۰ روپے میں خریدا" یا کہے "میں نے یہ گھر ہزار میں فروخت کیا" تو اس نے کہا "میں نے نصف گھر ۵۰۰ پانچ سو میں خرید لیا" یا کہے "میں نے نقد ہزار میں بیچا" اور وہ کہے "میں نے ادھار ہزار میں خریدا" تو ان تمام صورتوں میں بیع منعقد نہ ہو گی، کیونکہ ایجاب و قبول میں موافقت نہیں ہے۔ البتہ پہلا شخص دوبارہ دوسرے شخص (خریدار) کے کلمات قبول کے مطابق کلمات ادا کرے تو بیع منعقد ہو گی، ایجابِ اوّل فضول ہو جائے گا، قبولِ اوّل ایجاب ہو جائے گا اور قبولِ ثانی حقیقتاً قبول ہو گا جو ایجاب کے موافق ہے۔ (مذکورہ پہلی مثال میں بعد میں بائع کہے کہ میں نے ۵۰ روپے میں فروخت کر دیا تو یہ قبول صحیح ہوا اور بیع منعقد ہوئی۔

(۳) قبول مکمل ایجاب اور اس کے مصالح کے بعد ہو، پس اگر فروخت کنندہ نے کہا: میں نے یہ کپڑا ہزار درہم میں ایک ماہ کی ادھاری پر تین دن کے خیار کے شرط پر فروخت کیا، اور خریدار اس کے ان الفاظ سے فارغ ہونے سے قبل ہی قبول کرے، تو یہ باطل

ہے۔(مغنی ۶/۲)

(۳) بیع کسی شرط پر معلق نہ ہو، یا کسی وقت کے ساتھ محدود نہ ہو، لہٰذا صیغہ ایسا ہو جس سے فوراً ہی عقد منعقد ہونے پر اور ہمیشہ ملکیت کے ثبوت پر دلالت ہو، اگر کسی نے یوں کہا "میں نے آپ کو یہ مکان فروخت کیا اگر فلاں شخص آجائے تو، یا فلاں ماہ میں" اور دوسرے نے قبول کرلیا تو اس شرط کی وجہ سے عقد صحیح نہ ہوگا، کیونکہ تعلیق سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیع کا حتمی اور پختہ ارادہ نہیں ہے اور اس سے وہ راضی نہیں ہے اور گذر چکا کہ رضامندی شرط ہے۔

اسی طرح یہ کہا کہ "یہ گاڑی سال بھر کے لئے آپ کو فروخت کردی" اور اس نے کہا "میں نے خرید لی" تو مدت کی قید کی وجہ سے یہ بیع منعقد نہ ہوگی، اس لئے کہ اعیان (اشیاء) کی ملکیت میں توقیت (تحدید وقت و مدت) کی گنجائش نہیں۔ (وہ تو ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے)۔

یہ مسئلہ اس وقت ہے جب کہ توقیت یا تعلیق کا تعلق "مبیع" (فروخت شدہ شئ) سے ہو، اگر قیمت میں ہو مثلاً اس شرط پر خریدا کہ قیمت فلاں ماہ کے ابتداء میں، یا دو ماہ بعد ادا کرے گا، تو بیع صحیح ہے، اس لئے کہ قیمت ادھار ہے، جو ذمہ میں ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس میں توقیت و تعلیق کی گنجائش ہے بخلاف اعیان کے۔

اگر بیع مقایضہ ہو یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے بالمقابل فروخت کرے (روپے پیسے نہ ہوں) مثلاً گاڑی کے عوض گاڑی یا مکان، تو اس صورت میں بھی تعلیق کی گنجائش نہیں۔

۳) معقود علیہ (محل عقد یعنی فروخت شدہ شئ اور قیمت) یہ بیع کا تیسرا رکن ہے۔ اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(الف) عقد کے وقت مبیع (چیز) موجود ھو۔ لہٰذا معدوم (غیر موجود) چیز کی بیع جائز نہیں، مثلاً ان پھلوں کی بیع جو آئندہ درخت پر لگنے والے ہوں، یا وہ بچے جو بکریاں آئندہ جنیں، جو معدوم کے حکم میں ہو، اس کی بیع بھی جائز نہیں مثلاً جانوروں کا حمل، یا پستان میں موجود دودھ وغیرہ، کیونکہ حدیث میں ایسی چیز کے فروخت سے روکا گیا ہے جو اپنے پاس نہ ہو۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام سے فرمایا۔ "جو چیز تمہارے پاس نہ ہو، وہ فروخت مت کرو۔" (ابوداود، نسائی، ترمذی)

(۲) آپ ﷺ نے بیع الغرر (خطرہ اور بربادی کے بیع) سے منع فرمایا ہے۔" (مسلم)

مذکورہ بیع وجود و عدمِ وجود کے درمیان باعثِ ہلاکت اور جہالت کو شامل ہے جو غرر ہی میں شمار ہوگی۔

(ب) شرعاً مال متقوم ھو (شرعاً جو مال شمار ہو اور اسکی کچھ قیمت ہو) نجس اور حرام اشیاء کی خرید و فروخت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا مبیع یا قیمت شراب، مردار، گوبر یا کتا ہو تو بیع صحیح نہیں ہے۔

حدیث (۱): آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بے شک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سوّر اور بتوں کے فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔" عرض کیا گیا، مردار کی چربی کشتیوں میں لگانے، بدن پر ملنے اور لوگوں کے چراغ میں استعمال ہوتا ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا۔ "نہیں، وہ حرام ہے" پھر اس موقع سے آپ ﷺ نے فرمایا "یہودیوں کو اللہ مار ڈالے (ان پر لعنت ہو)، جب اللہ نے ان پر چربی حرام کردی تو انہوں نے اسے پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گئے (استعمال کی)" (بخاری، مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا۔" (بخاری۔ مسلم)

حدیث میں مذکورہ ممنوعہ اشیاء پر دیگر ایسی اشیاء کو قیاس کیا جائے گا جو حرام اور نجس ہو، وہ متنجس اشیاء (وہ پاک اشیاء جو نجس ہو چکی

ہوں) جن کو اب پاک کرنا ممکن نہ ہو اس کی بیع بھی ممنوع ہے جیسے سرکہ، دودھ، تیل، سیال گھی وغیرہ (جبکہ ان میں نجاست گر جائے)

جن اشیاء کو پاک کرنا ممکن ہو، اس کی خرید و فروخت صحیح ہے، یہ پاک ہی کے حکم میں ہے۔ (مثلاً نجس کپڑا، برتن وغیرہ کہ دھونے سے پاک ہو جائیں گی)

(ج) شرعاً اور عرفاً قابل انتفاع ہو: یعنی عرفاً اس میں کوئی مقصود نفع و فائدہ ہو، جو شرعاً مباح ہو، لہٰذا زمینی کیڑے مکوڑے (حشرات الارض)، موذی حیوانات جن سے کوئی مناسب نفع حاصل نہ کیا جاسکے، آلات لہو (آلات موسیقی) وغیرہ کی خرید و فروخت صحیح نہیں، کیونکہ بغیر مناسب نفع کے مال صرف کرنا، اسے ضائع کرنا ہے، اور آپ ﷺ نے اضاعتِ مال (مال برباد کرنے) سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری، الاستقراض)

شکار کے لئے تیندوا، قتال و لڑائی کے لئے ہاتھی، چوکیداری کے لئے بندر اور شہد کے لئے مکھیوں وغیرہ کی بیع جائز ہے، کیونکہ مناسب و مباح نفع و مقصد موجود ہے اور کتے کی طرح ان میں کسی کی بالخصوص ممانعت وارد نہیں ہے۔

بوقتِ عقد کوئی چیز نفع بخش نہ ہو، لیکن مستقبل میں نفع بخش ہو تو بیع جائز ہے۔ مثلاً چھوٹا بچھڑا۔

(د) حساً اور شرعاً اس کے سپرد کرنے پر قادر ہو: اگر عاقد (عقد کرنے والا چاہے خریدار ہو یا فروخت کرنے والا) مبیع یا معین ثمن (قیمت) کی ادائیگی پر بوقتِ عقد قادر نہ ہو تو بیع منعقد نہیں ہو گی، کیونکہ دوسرے شخص کو اپنی رقم یا چیز کے عوض کا یقین نہیں ہے، تو گویا اس کا صرف کرنا، اضاعتِ مال ہے جس کی ممانعت گذر چکی، پس تلف شدہ یا گمشدہ گاڑی کی فروخت، ہوا میں اڑنے والے پرندے یا پانی میں تیرنے والی مچھلی وغیرہ کی بیع صحیح نہیں، البتہ غاصب خود خریدے یا خریدار غاصب سے چھین لینے پر قادر ہو تو بیع صحیح ہے۔

کسی ایسی شئ کا معین حصہ فروخت کرنا جس کی تقسیم سے قیمت گھٹ جائے اور وہ قابل انتفاع نہ رہے۔ (مثلاً کتاب، تلوار، چھوٹا سا مکان وغیرہ) صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ شرعاً اس کے سپرد کرنے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ سپردگی کے لئے تقسیم کر کے جدا کرنا لازم جس میں اس کا نقص ہے اور منفعت فوت ہو جاتی ہے اور یہ اضاعتِ مال ہے جو کہ ممنوع ہے۔ البتہ اس کا غیر معین جز (بطور شیوع) فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں خریدار تقسیم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اور دونوں باری باری اس سے نفع اٹھائیں۔

(ھ) عاقد کو ولایت یا ملکیت کی رو سے اس پر اختیار حاصل ہو: پس خود مالک کی خرید و فروخت صحیح ہے، کیونکہ شریعت نے اسے اپنے مال پر اختیار (اور تصرف کا حق) دیا ہے۔ ولی یا وصی کا اپنے ماتحت قاصرین (بچے وغیرہ) کے حق میں خرید و فروخت صحیح ہے، ان کو بھی شریعت نے یہ حق دیا ہے۔ وکیل اپنے موکل کا مال خرید و فروخت کر سکتا ہے، کیونکہ خود مالک (موکل) نے اسے یہ اختیار سونپا ہے۔

جس کو تصرف کا کوئی حق اور اختیار نہ ہو، وہ خرید و فروخت کرے تو باطل ہے (یعنی کسی اور کی چیز اس کی اجازت کے بغیر فروخت کرے، اور اس پر اسے ولایت وغیرہ بھی نہ ہو تو یہ بیع باطل ہے) فقہاء اسے "فضولی کی بیع" سے تعبیر فرماتے ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے "جس کا تو مالک نہیں اس کی بیع (صحیح) نہیں۔" (ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

البتہ کسی نے اپنے مورث کا مال یہ سمجھتے ہوئے فروخت کیا کہ وہ زندہ ہے، پھر پتہ چلا کہ بوقت عقد وہ مر چکا تھا، تو اس بیع کو صحیح قرار دیں گے، اور بیع کے آثار اس پر مرتب ہوں گے۔ کیونکہ اس کے گمان و خیال کی غلطی واضح ہو گئی، اور در حقیقت وہ اس چیز کا (وراثت میں) مالک بن چکا تھا، تو یہ بیع فضولی نہ ہوئی۔ اور عقود میں اصول یہ ہے کہ نفس الامر اور حقیقت کا اعتبار کیا جائے گا، نہ کہ عاقد کے گمان کا۔

(و) عاقدین معقود علیہ سے واقف ہوں:- اگر مبیع یا قیمت کے متعلق دونوں کو یا کسی ایک کو ایسی لاعلمی ہو جو غالباً نزاع اور جھگڑے واختلاف کا سبب بنے، تو بیع صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ غرر میں داخل ہے جس کی ممانعت گذر چکی۔ لہٰذا جس مبیع یا قیمت میں دونوں یا کسی ایک کو جہالت وناواقفیت ہو، وہ بیع صحیح نہیں ہے۔

مثلاً:- کئی اشیاء میں سے کسی ایک کی بلا تعیین خرید یا فروخت (کسی نے کہہ دیا کہ میں نے ان بکریوں میں سے ایک بکری فروخت کردی لیکن کسی بکری کی تعیین نہ کرے تو یہ غلط ہے)

یا کوئی معین چیز ہزار، میں فروخت کرے لیکن ہزار سے روپئے یا پیسے یا کچھ اور، کیا مراد ہے واضح نہ کرے اور علاقہ میں ایسا کوئی عرف بھی نہ ہو جس سے اس کی تعیین ہو تو یہ بیع بھی صحیح نہیں۔ اگر عرفاً مطلقاً ہزار کہنے سے مخصوص سکے مراد لئے جاتے ہوں تو اس پر محمول کریں گے اور بیع صحیح ہوگی۔ یا کوئی چیز یا مکان اتنی قیمت پر فروخت کیا جس قیمت پر فلاں نے اپنا مکان فروخت کیا ہے، حالانکہ عاقدین مذکورہ مکان کی قیمت سے ناواقف ہیں۔ اسی طرح...

درج ذیل امور سے معقود علیہ کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۔ مبیع سامنے موجود ہو، دکھائی دے رہی ہو تو بیع صحیح ہے، خواہ اس کی مقدار اور ظاہری صفت کی وضاحت نہ ہو۔ مثلاً ایک گاڑی جو خریدار کی نظروں کے سامنے ہے، معین قیمت پر فروخت کی جائے، بغیر اس کے نوع وطرز اور کمپنی وغیرہ کے ذکر کے۔ یا غلہ کا ایک ڈھیر جو سامنے موجود ہے، ہزار روپئے میں فروخت کردے اور مقدار کی کوئی تعیین نہ ہو، تو بیع صحیح ہے۔ کیونکہ مشاہدہ وتعیین علم ہی کے قائم مقام ہے

۲۔ عاقدین ایک دوسرے کی شئی پہلے دیکھ چکے ہوں، اس کے اوصاف ذہن میں ہوں، اور عقد تک اتنی مدت نہ گذری ہو کہ اس چیز میں غالباً کوئی تبدیلی وتغیر آجائے، جیسے کپڑا، مکان وغیرہ (تو یہ کافی ہے) اگر اتنی مدت گذر چکی کہ عموماً اتنی دیر میں اس میں تغیر آجاتا ہو تو یہ ناکافی ہے۔

۳۔ عوض کے بعض حصہ کا دیکھنا، جبکہ بقیہ کے دیکھنے کی پھر ضرورت نہ رہے، جیسے تھان میں کپڑے کا ایک حصہ دیکھ لینا جس سے بقیہ کا اندازہ ہوجائے، یا متماثل اشیاء کا نمونہ دیکھ لینا۔ (چاول گیہوں وغیرہ)

۴۔ عوض کے اس ظاہری حصے کو دیکھ لینا جو بقیہ کی حفاظت کا باعث ہو، جیسے تربوز، انار، انڈا وغیرہ ان کا اوپری چھلکا دیکھ لینا کافی ہے۔ اخروٹ اور بادام جیسی اشیاء کی پختگی کے بعد ان کا اندرونی چھلکا دیکھنا کافی ہے، کیونکہ اس کا رہنا ان اشیاء کے لئے بہتر ہے۔

جو چیز بیرونی چھلکے سمیت کھائی جائے اس کا صرف بیرونی چھلکا دیکھ لینا صحت بیع کے لئے کافی ہے۔

قیمت اگر ادھار ہو تو مدت کی تعیین اور علم ضروری ہے۔ اگر غیر معلوم ہو تو بیع صحیح نہیں مثلاً یوں کہنا۔ دھان کٹنے کے بعد ادا کریں گے، یا فلاں شخص سفر سے لوٹنے کے بعد......

اسی طرح اطمینان کے اسباب ووسائل (مثلاً رہن، ضامن وغیرہ) کی شرط ہو تو اس کا علم بھی ضروری ہے۔ اگر اس شرط پر بیع ہو کہ قیمت کے مقابلہ میں کوئی ضامن یا رہن پیش کرے لیکن کسی ضامن یا رہن کی تعیین نہ ہو، تو یہ عقد صحیح نہیں۔

مبیع پر قبضہ اور اس کا ضمان (تاوان): تمام ارکان وشروط کی رعایت کے ساتھ عقد بیع مکمل ہو جائے، اور مبیع ابھی بائع (فروخت کرنے والے) کے قبضہ میں ہو تو یہ اس کے ضمان میں داخل ہے، یعنی خریدار کے قبضہ سے پہلے ہی بائع کے قبضہ میں وہ چیز تلف ہو جائے یا خود بائع اسے تلف کردے تو بیع فسخ ہوگئی، خریدار کو قیمت وغیرہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر قیمت پہلے ہی دے

چکا تھا تو اب واپس لے لے۔ خریدار کے قبضہ کے بعد خریدار کے ضمان میں داخل ہو گیا اور برباد ہوا تو خریدار کا ہی نقصان شمار ہو گا (قیمت کی واپسی یا سقوط کا سوال نہیں)

مبیع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت جدا ہو گی (۱) اگر منقول چیز ہے (یعنی جسے منتقل کیا جاسکے) اور اسے ہاتھ سے لے لیا جاتا ہو، تو اس کا قبضہ یہی ہے کہ خریدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جیسے کپڑا کتاب وغیرہ۔ اگر ہاتھ میں لی جانے والی چیز نہ ہو تو اس کا منتقل کر دینا قبضہ ہے، جیسے موٹر کار جانور وغیرہ (۲) غیر منقول اشیاء جیسے گھر، زمین وغیرہ کا قبضہ تخلیہ سے ہو گا یعنی خریدار کے اور اس چیز کے درمیان سے خود ہٹ جائے، اپنا تسلط ختم کر دے اور وہ چیز خریدار کے اختیار و قدرت میں دے دے۔ اس کے قبضہ میں کچھ رکاوٹ ہو تو اسے دور کرے، گھر وغیرہ ہو تو دروازہ کی کنجی عطا کرے۔

قبضہ میں بائع کی اجازت ضروری ہے۔ کیونکہ حقیقتاً یہ اس کی ملکیت ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سے نہیں نکلے گی۔

بیع کے خیارات (اختیارات اور پسندیدگی): عقد بیع میں اصل تو یہی ہے کہ جب تمام ارکان اور ان کے شروط پائے جائیں تو پختہ طور پر بیع منعقد ہو جائے، اور مبیع کی ملکیت خریدار کی طرف، اور قیمت کی ملکیت بائع کی طرف منتقل ہو جائے اور کسی کو اس کے توڑنے اور فسخ کرنے کا اختیار نہ رہے۔ لیکن شارع نے مکلفین کی مصلحتوں کی رعایت کی، اور چونکہ بعض مرتبہ عاقد جلد بازی میں اور بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھانے کی وجہ سے اس عقد سے پوری طرح متفق نہ ہو گا، اس لئے شریعت نے ارکان و شروط کے باوجود بیع کو غیر لازم قرار دیا اور عاقدین میں سے ہر کسی کو عقد کے نفاذ یا فسخ کا اختیار دیا، اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتے ہوئے اور پوری رضامندی و رغبت سے معاملہ تکمیل تک پہنچے، اس کی گنجائش رکھی گئی۔ شارع نے خیار کے تین انواع بیان کئے ہیں۔ (۱) خیار مجلس (۲) خیار شرط (۳) خیار عیب۔

۱) **خیار مجلس:** خرید و فروخت کرنے والوں نے بیع مکمل کر لی (ایجاب و قبول وغیرہ ہو چکا) تو اس کے بعد جب تک دونوں اسی مجلس میں ہوں (بدن کے اعتبار سے)، ہر ایک کو بیع سے رجوع کا حق ہے۔ مجلس سے جدا ہونے کے بعد یہ "خیار مجلس" ختم ہو جائیگا اور بیع لازم ہو گی۔ مجلس کے اتحاد و افتراق کا فیصلہ عرف کی روشنی میں ہو گا۔ اگر دونوں کسی کشادہ مکان میں عقد بیع انجام دیں، پھر دونوں میں سے کوئی ایک اندرونی کوٹھری سے صحن میں آجائے، یا اسکے برعکس تو اس سے تفرق (جدائی) حاصل ہو گی۔ (یعنی اب بیع لازم ہو چکی۔ خیار مجلس کا حق ختم ہوا)، چھوٹا مکان ہو تو کسی ایک کا مکان سے باہر نکلنا کافی ہے۔ بازار، جنگل و صحرا یا کشتی میں ہوں تو ایک کا دوسرے کی طرف پشت کر کے چند قدم چلنا کافی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلیں یا چلیں تو مجلس باقی رہے گی اور خیار ساقط نہ ہو گا۔

اسی طرح ایک یا دونوں بیع کے بعد اس کے لزوم و پختگی کو اختیار کریں تو خیار مجلس ساقط ہو گا۔ یعنی دونوں یوں کہیں، ہم نے عقد کو نافذ کیا اور اس کے لزوم کو اختیار کیا۔ اسی طرح ایک نے دوسرے کو اختیار دیا تو اس کا حق ساقط ہو گا۔ مثلاً بائع نے مشتری (خریدار) سے کہا "بیع کے نفاذ یا فسخ کو اختیار کرو" تو بائع کا خیار ساقط ہوا، اب خریدار نے نفاذِ بیع کو اختیار کر لیا تو خیار مجلس ساقط ہو گیا، کیونکہ دونوں نے خود ہی شریعت کے عطا کردہ حق کو ساقط کر دیا ایک نے اختیار کیا، دوسرے نے نہ کیا تو اختیار کرنے والے کا حق ساقط ہو گا، دوسرے کا باقی رہے گا۔

حدیث: "عاقدین جب تک (ایک دوسرے سے) جدا نہ ہوں، اور ساتھ ہوں تو انہیں خیار حاصل ہے۔ یا پھر ایک دوسرے کو اختیار دے دے۔ (بخاری۔ مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اس حدیث کے راوی ہیں، جب کوئی پسندیدہ چیز خرید لیتے تو بائع سے الگ ہو جاتے (تاکہ وہ خیار مجلس کی وجہ سے بیع فسخ نہ کر دے) (بخاری) اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس مجلس سے بدن کا جدا ہونا مراد ہے (صرف ایجاب و قبول سے بیع لازم نہ ہو گی)

۲-خیارِ شرط:-یعنی عاقدین یا کوئی ایک یہ شرط لگائے کہ متعین و معلوم مدت کے دوران اسے عقد کے فسخ کا حق حاصل ہو گا، یہ شرط عین عقد کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، اور عقد کے بعد اس مجلس (نشست) سے جدائی سے پہلے بھی، چونکہ عاقد کے شرط لگانے کی وجہ سے یہ خیار حاصل ہوتا ہے اس لئے اسے "خیار شرط" کہتے ہیں۔ اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(الف) مدت معلوم و متعین ہو، اگر یوں کہے، "مجھے اختیار رہے گا۔" لیکن مدت کا ذکر نہ ہو، تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح مجہول مدت کا بھی یہی حکم ہے۔ مثلاً، کچھ وقت، فلاں کے آنے تک، وغیرہ اور صحیح یہ ہے کہ ان صورتوں میں غرر (دھوکہ) اور جہالت کی وجہ سے بیع باطل ہو گی۔

(ب) مدت تین دن سے زائد نہ ہو، جبکہ چیز اس مدت میں بگڑنے والی نہ ہو، کیونکہ مزید غور و فکر کے لئے غالباً اس سے زیادہ مدت کی ضرورت نہیں ہے۔ تین دن سے زائد مدت کی شرط ہو، خواہ ایک لحظہ ہی کیوں نہ ہو، تو بیع باطل ہو گی۔ متعینہ مدت تک وہ چیز سڑتی یا بگڑتی ہو، تب بھی بیع باطل ہے، خواہ مدت تین دن ہو، یا اس سے کم۔

(ج) متعینہ مدت شرط سے متصل اور مسلسل ہو۔ اگر تفرق (جدائی) سے ابتدا کی شرط لگائے یا ایام تو معین ہوں لیکن مسلسل نہ ہوں، یا شرط کے وقت سے مدت شمار نہ ہو، تو یہ شرط صحیح نہیں ہے اور عقد باطل ہو گا، کیونکہ اس شرط کا نہ تقاضائے عقد سے کچھ تعلق، اور نہ شریعت میں ایسی کوئی صورت وارد۔

حدیث: حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ تعالی عنہ کو فروخت میں بڑا دھوکہ (اور نقصان) ہوتا تھا، انہوں نے اس کی شکایت آپ ﷺ کی تو فرمایا۔ "جب کچھ فروخت کرو تو کہو۔ دھوکہ (اور نقصان) نہ ہو" ایک روایت میں ہے۔ "اور مجھے تین دن تک اختیار رہے گا۔" (البخاری فی البیوع، بیہقی)

حدیث گرچہ حضرت حبان کے سبب وارد ہوئی ہے، لیکن اصل اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، نہ کہ خصوصِ سبب کا، لہٰذا یہ حدیث ہر لین دین کو شامل ہو گی، اور ہر خرید و فروخت کرنے والے کو خیار حاصل ہو گا، سوائے ان کے جن میں عدمِ جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہیں، جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

اجنبی کے لئے خیار شرط: عاقد جس طرح اپنے لئے خیار کی شرط طے کر سکتا ہے، کسی اجنبی کے لئے (یعنی جس کا اس خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہیں) بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس خیار کے مشروعیت کا اصل مقصد حاجت و مصلحت ہے، تاکہ عاقد کے نقصان و خسارہ کو دفع کیا جا سکے، اور بعض اوقات خود کو تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے خیار سے یہ مقصد حاصل نہ ہو گا، بلکہ دوسرے کو اس کی زیادہ معلومات ہو گی، تو اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ اس کے حق میں خیار شرط لگائی جائے، ایسی صورت میں بجائے عاقد کے جس اجنبی کے لئے شرط لگائی گئی ہے، اسے خیار حاصل ہو گا۔

یہ خیار کب ساقط ہو گا؟

جسے خیار حاصل تھا اُس نے یہ کہا۔ "میں نے بیع فسخ کر دیا۔" یا بائع کو خیار ہو، اور وہ کہے "میں نے اپنی چیز واپس لے لی" یا خریدار کہے "میں نے قیمت واپس لے لی" تو عقد بیع فسخ ہو جائے گا جبکہ خیار ساقط (ختم) ہونے کی صورت میں بیع لازم ہو جائے گی۔ خیار شرط

مذکورۂ ذیل امور سے ساقط ہو گا۔

ا۔ متعینہ و مقررہ مدت کے اختتام سے، مقررہ مدت مکمل ہو جائے اور اس دوران جسے خیار حاصل تھا (دونوں یا کوئی ایک) اس نے بیع کو فسخ نہیں کیا، تو بیع لازم ہو چکی اور خیار ساقط ہو گیا، اب اس بنیاد پر کوئی بھی بیع فسخ نہیں کر سکتا۔

۲۔ مدتِ خیار میں بیع کو نافذ کرنا اور اس کی اجازت دینا، مثلاً جسے خیار حاصل ہے وہ کہے "میں نے عقد کی اجازت دی" (اسے نافذ کیا) یا "میں نے بیع کو اختیار کیا۔"

۳۔ جسے خیار حاصل تھا اس کا مبیع میں ایسا تصرف کرنا جو عادتاً مالک کے علاوہ نافذ نہیں ہوتا، اب یہ تصرف خریدار کی جانب سے ہے، تو اس کی وجہ سے بیع کو نافذ تسلیم کرینگے، اور نتیجتاً خیار ساقط ہو گا۔ اور بائع کی جانب سے تصرف ہو، تو اسے فسخ سمجھیں گے۔

مدتِ خیار میں مبیع (فروخت شدہ چیز) کا حکم

ا) دوران مدت مبیع کی ملکیت: دونوں کو خیار شرط حاصل ہو، تو مبیع کی ملکیت عقد کے نفاذ یا عدمِ نفاذ کے فیصلہ تک موقوف رہے گی، اگر عقد فسخ ہوا تو مطلب یہ ہوا کہ چیز بائع ہی کی ملکیت میں تھی، منتقل نہیں ہوئی، اور عقد نافذ ہو تو پھر یہ واضح ہوا کہ عقد کے وقت سے مبیع میں ملکیت خریدار کی ہو چکی تھی، اور قیمت بائع کی ملکیت میں داخل ہو چکی تھی، لہٰذا وقتِ عقد کے بعد سے اس کے زوائد و منافع کا بھی وہ مالک ہو گا۔ زوائد یعنی درخت کے پھل، جانوروں کا دودھ وغیرہ اور منافع یعنی گھر کا کرایہ، گاڑی کا کرایہ وغیرہ اسی طرح عقد سے اس چیز پر جو خرچ ہو، اس کا بھی وہی ذمہ دار ہے (مثلاً زید نے ایک گائے بکر کو ایک بکری کے عوض فروخت کی اور دونوں کو خیار شرط حاصل ہے۔ اب کسی ایک نے عقد کو فسخ کیا تو مطلب یہ ہوا کہ گائے زید ہی کی ہے، اور بکری بکر کی۔ لہٰذا اس دوران گائے کو کھلانے پلانے وغیرہ کا خرچ زید کے ذمہ اور بکری کا خرچ بکر کے ذمہ ہے۔ اور گائے کا دودھ وغیرہ زید کی ملکیت اور بکری کا دودھ وغیرہ بکر کی ملکیت ہے۔ اور اگر بیع کو نافذ کیا گیا تو عقد کے وقت سے گائے بکر کی ملکیت میں اور بکری زید کی ملکیت میں منتقل ہو چکی، لہٰذا اس وقت سے بکری کا خرچ زید کے ذمہ اور گائے کا بکر کے ذمہ، اور بکری کا دودھ وغیرہ فوائد زید کی ملکیت اور گائے کے فوائد بکر کی ملکیت ہیں)

اور خیار صرف کسی ایک کو حاصل ہو تو ملکیت اسی کی ہو گی، کیونکہ صرف اسے ہی تصرف کا اختیار ہے، دوسرے کو نہیں، نتیجتاً ثمرات و منافع بھی اسی کو حاصل ہوں گے اور نفقہ و خرچ بھی اسی پر عائد ہوں گے (مثلاً زید نے ایک بکری سو روپے میں بکر کو فروخت کی اور خیار صرف زید کو حاصل ہے تو دورانِ مدت ملکیت زید ہی کی رہے گی، اور اس کے منافع و مصارف کا ذمہ دار بھی وہی ہو گا۔)

۲) **دورانِ مدت مبیع برباد ہوجائے:** قبضہ سے پہلے، بائع کے پاس ہی مبیع تلف و برباد ہو جائے تو بیع فسخ ہو گی اور خیار ساقط ہو گا، خواہ خیار مشتری کو ہو یا بائع کو، کیونکہ اب مبیع کی سپردگی کا کوئی سوال نہیں، لہٰذا بائع کے ضمان میں شمار ہو گا۔

اور اگر قبضہ کے بعد خریدار کے پاس تلف ہو جائے تو بیع فسخ نہ ہو گا، کیونکہ قبضہ کی وجہ سے وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو چکا، اور خیار بھی باقی رہے گا، چاہے بائع کو خیار حاصل ہو یا خریدار کو، اور صاحبِ خیار کو نفاذ یا عدم نفاذ کا حق ہے۔ اگر نفاذ کا فیصلہ ہوا تو خریدار کو اس کی قیمت بائع کے حوالہ کرنا لازم ہے، کیونکہ مبیع پر اس کی ملکیت ثابت ہوئی۔ اگر عقد فسخ ہوا اور نافذ نہ ہو تو خریدار پر اس کا مثل یا تلف کے دن کی قیمت ادا کرنا لازم ہے، اور خریدار اصل قیمت واپس لے لے گا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ چیز مشتری کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوئی۔

۳۔ **خیار عیب:** ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ جب کسی کے ساتھ لین دین اور معاملہ کرے تو پوری خیر خواہی اور ایمانداری

کے ساتھ، بغیر فریب دہی اور دھوکہ کے کرے، ورنہ باطل راستہ سے اوروں کا مال ہڑپ کرنا پایا جائے گا، اور آپ ﷺ نے دھوکہ سے بڑی شدت سے روکا اور ڈرایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ "جو دھوکہ دے، وہ ہم سے نہیں"۔ مبیع میں عیب اور نقص ہو، جو بائع کو معلوم ہو، اور وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہ کرے، تو یہ بھی دھوکہ اور خیانت میں داخل ہے۔ مذکورہ حدیث کا سبب ورود اس پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ بازار میں اناج کے ایک ڈھیر (انبار) کے قریب سے گذرے تو اپنا دست مبارک اس کے اندر داخل کیا، تو کچھ تری محسوس ہوئی، جس پر آپ ﷺ نے باز پرس فرمائی تو مالک نے عذر پیش کیا کہ بارش کا پانی ٹپکنے کی وجہ سے یہ بات پیش آئی ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "تو تم نے اسے اوپر کی طرف کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیتے؟ جو دھوکہ اور خیانت سے کام لے وہ مجھ سے نہیں۔" (مسلم)

حدیث مبارک سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عیب کا نہ بتانا بھی خیانت ہے، اور بائع کی ذمہ داری ہے کہ عیب کو ظاہر کرے اور لوگوں کو بتلائے۔ آپ ﷺ کے اس فرمان سے اس کی مزید تاکید و تائید ہوتی ہے۔ "مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اور کوئی مسلم اپنے بھائی (مسلم) سے کوئی لین دین کرے جس میں عیب ہو، تو اس کے لئے یہ حلال نہیں کہ اسے نہ بیان کرے" (اور چھپائے) (ابن ماجہ، التجارات)

سابقہ حدیث کے عموم کے پیش نظر غیر مسلم کا بھی یہی حکم ہو گا اور اسلامی اخلاق ایسے انسانی ذاتی اخلاق ہیں کہ مسلم و غیر مسلم دونوں ہی کے ساتھ اسے اپنایا جائے گا۔

بائع کی طرح عاقدین کے علاوہ کسی اور کو اس عیب کا علم ہو، تو اسے بھی اس عیب کا بیان کرنا واجب ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "کسی چیز کے فروخت کرنے والے کے لئے یہ حلال نہیں کہ اس میں جو (عیب) ہے اس سے آگاہ نہ کرے، اور جو اس (عیب) سے واقف ہو، اسے بھی بیان نہ کرنا حلال نہیں" (احمد فی مسندہ عن واثلہ)

خرید و فروخت کا معاملہ ہر اعتبار سے مکمل ہو، اور خریدار چیز اپنے قبضہ میں لے لے، اور اس کے سامنے کسی عیب کا ذکر نہ آیا، پھر بعد میں اس چیز کے کسی عیب کا پتہ چلا، تو بیع صحیح ہے، البتہ خریدار کو اختیار حاصل ہے کہ یا تو اس عیب کے ساتھ اس چیز پر راضی رہے، یا پھر وہ چیز بائع کو واپس لوٹا کر بیع فسخ کر دے اور اپنی قیمت واپس لے لے۔

حدیث: (۱) ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس کے ذریعے آمدنی حاصل کرتا رہا، پھر اس میں عیب نظر آیا تو اسے لوٹا دیا، بائع نے غلام کی (درمیانی مدت کی) آمدنی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "آمدنی (نفع و کرایہ) ضمان کے مقابلہ میں ہے۔" (مسند احمد عن عائشہؓ) مطلب یہ کہ اس مدت میں غلام تلف ہوتا تو خریدار کا نقصان شمار ہوتا، اسلئے جو نفع اور آمدنی اس سے حاصل ہوئی ہے وہ بھی خریدار کا حصہ ہے)۔

۲) اس مسئلہ کے لئے حدیث المصراۃ سے بھی استدلال ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

معقول: لین دین میں اصل سلامتی ہے، اور خریدار مکمل قیمت اسی لئے دے رہا ہے کہ مبیع صحیح سالم اسے مل جائے اور قیمت اور چیز کا صحیح تقابل ہو، اسی بنیاد پر وہ اس بیع سے متفق تھا، اور ظہور عیب سے اس میں خلل واقع ہوا تو اس کا مقصود فوت ہوا، اور رضامندی کا تحقّق نہ ہوا، اس لئے اسے فسخ کا حق دیا گیا کہ مبیع لوٹا کر قیمت واپس لے لے۔

خیار عیب کے شرائط

۱- عیب قدیم ہو، خریدار کے قبضہ سے پہلے ہی اس چیز میں وہ عیب موجود ہو، چاہے اب عقد سے پہلے ہو یا عقد کے بعد، کیونکہ قبضہ

سے پہلے چیز بائع کے ضمان (ذمہ داری) میں ہوتی ہے۔

خریدار کے قبضہ کے بعد عیب پیدا ہوا تو اس سے حق خیار حاصل نہ ہو گا، البتہ اس عیب کا اصل سبب قبضہ سے قبل ہی پایا گیا تو خیار حاصل ہو گا۔ مثلاً خریدنے اور قبضہ کرنے کے بعد اس پر زنگ لگے، پھر معلوم ہوا کہ دراصل قبضہ سے قبل وہ پانی سے بھیگا تھا، جس کی وجہ سے اب یہ زنگ لگا ہے، تو خریدار کو لوٹانے کا حق ہو گا، کیونکہ اس عیب کا ترتب ایسے سبب پر ہے جو بائع کے پاس پیش آیا تھا، تو گویا بائع ہی کے پاس عیب پیدا ہوا۔

۲- تاجروں کے عرف میں وہ عیب مبیع کی قیمت کی کمی کا باعث ہو، خواہ اصل چیز میں کوئی کمی اور نقص ہو یا نہ ہو، کیونکہ بیع معاوضہ ہے اور معاوضہ میں اعتبار قیمت کا ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں تجربہ کار تاجروں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

اگر عیب کی وجہ سے اصل چیز (عین) میں کمی واقع ہو، لیکن قیمت میں کمی نہ ہو، تو لوٹانے کا حق نہ ہو گا۔ البتہ ایسا نقص ہو جس سے خریدار کا اصل مقصد فوت ہو تو حق حاصل ہو گا مثلاً کسی نے قربانی (اضحیہ) کے لئے بکری خریدی، پھر پتہ چلا کہ اس کے کان کا کچھ حصہ کٹا ہوا ہے، تو اسے لوٹانے کا حق ہو گا، کیونکہ یہ قربانی کے قابل نہیں ہے، اگر کسی واجب ذبح کے لئے نہیں خریدا، تو اس عیب کی وجہ سے لوٹانے کا حق نہ ہو گا، کیونکہ اس سے قیمت پر اثر نہ پڑے گا، اور نہ اس کا مقصد فوت ہو رہا ہے۔

۳- اس طرح کی اشیاء میں عموماً وہ عیب نہ پایا جاتا ہو، مثلاً کسی نے ایجنسی سے نئی گاڑی خریدی، پھر معلوم ہوا کہ اس کے پہیے (ٹائر) بوسیدہ ہیں، تو اسے فسخ کا حق ہو گا۔ لیکن کسی سے مستعمل (سیکنڈ ہینڈ اور پرانی) گاڑی خریدی اور اس کے پہیے بوسیدہ ہوں تو اس سے حق فسخ حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ مستعمل گاڑیوں کے پہیے عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں۔

خیار عیب کی بنیاد پر کب لوٹا سکتا ہے۔

عیب کا علم ہونے کے بعد عرف وعادت کے مطابق فوراً لوٹانا ضروری ہے۔ کھاتے وقت یا دوران نماز علم ہوا تو فارغ ہونے تک موٴخر کر سکتا ہے۔ رات میں پتہ چلا تو صبح تک موٴخر کر سکتا ہے، لوٹانے کے امکان اور قدرت کے باوجود تاخیر کرے تو یہ خیار ساقط (ختم) ہو جائے گا۔

اسی طرح عیب معلوم ہونے کے بعد اور لوٹانے کے امکان سے پہلے اسے استعمال کرے تو خیار ساقط ہو گا، کیونکہ امکان کے باوجود موٴخر کرنا یا امکان سے پہلے اسے استعمال کرنا اس کے رضامندی اور عیب کے باوجود مبیع کے اختیار پر دلالت کرتا ہے۔ (لہٰذا لوٹانے کا حق ختم ہو گا)

عیب دار مبیع میں زیادتی

خریدار کے قبضہ کے بعد اس چیز میں کوئی قدیم عیب ظاہر ہو، اور اب تک وقتِ عقد کے مقابلہ میں اس میں کچھ زیادتی اور اضافہ ہو چکا ہو، تو یہ اضافہ عیب کی وجہ سے لوٹانے سے مانع نہیں بنے گا۔ اگر اضافہ متصل ہو۔ مثلاً جانور کا موٹاپا، کپڑے کا سلانا تو اسے اختیار ہے کہ لوٹائے یا نہ لوٹائے دونوں صورتوں میں اسے کچھ ملے گا نہیں، کیونکہ یہ اضافہ اصل کے تابع اور ملکیت میں نمو ہے۔

اگر اضافہ منفصل (جدا) ہو، تو خریدار لوٹانا چاہے تو صرف اصل (خریدی ہوئی چیز) لوٹا دے اضافہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی ملکیت اور ضمان میں رونما ہوا ہے۔ اور حدیث گذر چکی کہ ”آمدنی (اور اضافہ) کا تعلق ضمان (تاوان) سے ہے۔“ (مثلاً کسی

نے گھوڑا خریدا اور اس پر سواری کرتا رہا یا کرایہ پر سواری کے لئے چلاتا رہا، بعد میں قدیم عیب کی وجہ سے لوٹائے تو اس استعمال کا کرایہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ لوٹانے سے پہلے اگر گھوڑا مر جاتا تو خریدار کا ہی نقصان شمار ہوتا)

قدیم عیب کے ساتھ کسی جدید عیب کا وقوع:

خریدار کو کسی قدیم عیب کا پتہ لگے، اور قبضہ کے بعد اس میں ایک نیا عیب بھی پیدا ہو چکا ہے تو خریدار کو ردِ قہری (زبردستی لوٹانے) کا حق نہ ہوگا، اگر بائع اس حال میں واپس لینے پر یا خریدار اسی حال میں اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں۔

اگر دونوں راضی نہ ہوں، تو خریدار جدید عیب کا عوض اور چیز دونوں بائع کو لوٹا دے، یا پھر بائع خریدار کو قدیم عیب کا معاوضہ دے۔ دونوں میں سے جس پر بھی دونوں متفق ہوں، جائز ہے، کیونکہ حق ان کا ہے، تو انہیں کی رضامندی پر عمل ہوگا۔

اگر دونوں کا اختلاف ہو، کہ بائع جدید عیب کا بدلہ اور چیز لوٹانے کا مطالبہ کرے، اور خریدار چیز اپنے پاس رکھتے ہوئے قدیم عیب کا بدلہ مانگے یا اس کے برعکس ہو یعنی بائع دوسرا مطالبہ اور خریدار پہلا مطالبہ کرے تو اس مطالبہ کے حق میں فیصلہ ہوگا، جس میں عقد اپنی جگہ باقی رہے (اور فسخ نہ ہو) لہٰذا پہلی صورت میں خریدار کا مطالبہ اور دوسری صورت میں بائع کا مطالبہ تسلیم کیا جائے گا۔

اگر قدیم عیب کا علم بغیر جدید عیب کے نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں رد قہری کا حق ہوگا مثلاً کسی نے تربوز یا انار وغیرہ خریدا اور اندرونی حال معلوم کرنے کے لئے بقدر ضرورت اسے کاٹا اور اس میں عیب ظاہر ہوا تو اسے لوٹا سکتا ہے۔ ضرورت سے زائد کاٹے تو ردِ قہری کا حق نہ ہوگا۔

عیوب سے برأت (بری الذمہ ہونے) کی شرط

بوقتِ عقد بائع یہ شرط لگائے کہ میں مبیع میں ظاہر ہونے والے تمام عیوب سے بری ہوں (یعنی کوئی عیب ظاہر ہو تو میری کوئی ذمہ داری نہیں) تو یہ عقد صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس سے بیع کی مزید تاکید ہو رہی ہے، اور فسخ (لوٹانے) کی نفی کی جارہی ہے، جیسا کہ بظاہر عیب ہے بھی نہیں، لیکن باوجود اس شرط کے اگر عیب ظاہر ہو تو مسئلہ کی نوعیت حسبِ ذیل ہوگی۔

اگر مبیع حیوان نہیں ہے۔ (یعنی کوئی غیر جاندار چیز ہے) تو یہ شرط لغو اور فضول ہے، لوٹانے کا حق ساقط نہ ہوگا، کسی بھی عیب کا علم ہوا تو سابقہ تفصیل کے مطابق خریدار کو خیار حاصل ہوگا۔

اگر مبیع حیوان ہے، تو بائع حیوان کے اس باطنی عیب سے بری اور سبکدوش ہوگا جو عقد کے وقت موجود تھا، لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا کیونکہ حیوان میں غالباً کچھ نہ کچھ مخفی عیوب ہوتے ہیں، لہٰذا مذکورہ شرط کے ذریعہ بائع احتیاطاً اپنی ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے حضرت ابن عمرؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنا ایک غلام ۸۰۰ آٹھ سو درہم میں برأت کی شرط کے ساتھ بیچا، پھر خریدار نے کہا کہ اس میں ایسا عیب ہے جس کا آپ نے تذکرہ نہیں کیا، پس دونوں یہ مسئلہ لے کر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ حضرت ابن عمرؓ یہ قسم لیں کہ بوقت فروخت کسی عیب کا انہیں علم نہیں تھا، حضرت ابن عمرؓ نے قسم سے انکار کیا اور غلام واپس لے لیا، اور بعد میں اسے ۱۵۰۰ پندرہ سو درہم میں فروخت کیا۔ ابن عمرؓ نے اللہ کی خاطر قسم نہیں لی تو اللہ نے ان کو اس کا معاوضہ عنایت فرمایا۔

پس حضرت عثمانؓ کے مذکورہ فیصلہ سے معلوم ہوا کہ حیوان (ذی روح) کے سلسلہ میں برأت کی شرط صحیح ہے، ان کا یہ فیصلہ صحابہ میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے اختلاف نہ کیا، تو گویا اجماعی مسئلہ ہو گیا۔

اگر (حیوان میں) عیب ظاہر ہو تو شرط کی وجہ سے اس سے بری نہ ہو گا، کیونکہ اس کی اطلاع آسان اور سہل ہے۔

اسی طرح (باطنی عیب کو) بائع پہلے سے جانتا تھا تو بری نہ ہو گا، کیونکہ اس کی صراحت واجب ہے ورنہ دھوکہ ہو گا، یہی حکم ہو گا جبکہ ناواقف تھا، لیکن واقفیت آسان تھی۔ عقد کے بعد اور (خریدار کے) قبضہ سے قبل جو عیب پیدا ہو، اس سے بری نہ ہو گا، کیونکہ شرط کا تعلق صرف عقد کے وقت موجودہ عیوب سے ہے، اگر آئندہ پیدا ہونے والے عیب سے بھی برأت کی شرط لگائے تو بری نہ ہو گا، کیونکہ اس میں کسی چیز کے ثبوت سے پہلے اس کا اسقاط پایا جا رہا ہے۔

بعض مخصوص بیوع (خرید و فروخت)

گذشتہ اوراق میں عام بیع کی تفصیلات کا ذکر تھا، جس پر اکثر عمل ہوتا رہتا ہے اس کے علاوہ بیع کے کچھ مخصوص انواع واقسام بھی ہیں، جن کے مستقل نام ہیں، ان میں بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز، بعض ناجائز ہونے کے باوجود صحیح ہیں، لیکن گنہگار ہو گا اور بعض سرے سے باطل ہیں، آئندہ سطور میں انہیں اقسام کا تذکرہ ہے۔

جائز بیوع

۱- **تَوْلِیَه:** یعنی خریدار قبضہ کے بعد وہ چیز قیمت خرید میں ہی دوسرے کو فروخت کر دے، بغیر اس کے کہ قیمت کا تذکرہ کرے، یا خریدار یوں کہے: **وَلَّیْتُكَ هٰذَا الْعَقْدَ** (میں نے تم کو اس عقد کا والی و ذمہ دار بنایا۔ یعنی یہ عقد تمہارے حوالے سونپ دیا)

۲- **اِشراک:** یہ بھی تولیہ کی طرح ہے، اتنا فرق ہے کہ اس کا تعلق مبیع کے ایک حصے سے ہے نہ کہ کل سے، مثلاً پہلا خریدار دوسرے سے کہے "میں نے نصف قیمت کے مقابلہ میں تم کو اس عقد کے نصف میں شریک کر لیا۔" حصہ کا تعین ضروری ہے۔ (مثلاً نصف، تہائی وغیرہ) اگر تعین نہ ہو مثلاً یوں کہے "میں نے بعض عقد میں تم کو شریک کیا" تو جہالت کی وجہ سے یہ عقد صحیح نہ ہو گا۔ مطلقاً کہہ دے تو صحیح ہے اور نصف پر محمول کریں گے۔ مثلاً یوں کہا۔ "میں نے تم کو اس عقد میں شریک کیا۔"

۳- **مُرَابَحَه:** خریدار قبضہ کے بعد وہ چیز قیمت خرید مع متعین نفع کے فروخت کرے تو اسے مرابحہ کہیں گے۔ مثلاً کہے: "میں نے یہ گھر تم کو قیمت خرید پر مع دس فیصد نفع کے فروخت کیا یا مع اس گاڑی کے نفع کے فروخت کیا... وغیرہ... نفع قیمت کے جنس سے نہ ہو تب بھی جائز ہے۔ (مثلاً ایک مکان ایک لاکھ میں خریدا اور دس فیصد پر بطور مرابحہ فروخت کیا تو ایک لاکھ دس ہزار قیمت ہو گی)

۴- **مُحَاطَطَه** (وَضِیْعَہ): یعنی قبضہ کے بعد قیمتِ خرید میں متعین و مقرر کمی کے ساتھ فروخت کرنا مثلاً میں نے یہ مکان قیمتِ خرید میں دس فیصدی نقصان اور کمی کے ساتھ تم کو فروخت کیا۔ (تو اس صورت میں اگر پہلی قیمت خرید ایک لاکھ ہے تو دوسری قیمت ۹۰ ہزار ہو گی) یہ قسم سابقہ قسم (مرابحہ) کے بالکل برعکس ہے۔

مذکورہ چاروں بیع جائز اور مشروع ہیں کیونکہ (۱) ان میں عقد بیع کے تمام ارکان و شرائط پائے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فرمان "**احل اللہ البیع**" (اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے) کے عموم میں یہ بھی داخل ہیں (۲) نیز ہجرت کی طویل حدیث میں آپ ﷺ کا صدیق اکبرؓ سے اونٹ خریدنے کا جو ذکر ہے، اس میں صدیقؓ کی درخواست پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ "قیمت سے" (خریدیں گے) بظاہر یہ عقد تولیہ ہے۔ واللہ اعلم (بخاری)

ان چاروں بیوع کی صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ عاقدین پہلی قیمت سے عقد کے وقت واقف ہوں، اگر دونوں یا کوئی ایک پہلی

قیمت سے ناواقف ہو، تو بیع منعقد نہ ہوگی، یہاں تک کہ مجلس عقد میں جدائی سے قبل معلوم ہو جائے، تب بھی منعقد نہ ہوگی۔ دوسرا خریدار تو قیمت سے ناواقف ہو ہی سکتا ہے، بائع (پہلا خریدار) بھی کبھی ممکن ہے قیمتِ خرید بھول چکا ہو۔

تنبیہ: مذکورہ تمام صورتوں میں اگر بائع نے یہ کہا۔ "جس قیمت میں خریدا، اسی میں تم کو فروخت کیا" تو قیمت خرید کے علاوہ دیگر مصارف وغیرہ اس میں شامل نہ ہوں گے۔ اور اگر یہ کہا "کہ مجھے جتنے میں پڑی ہے، اتنے ہی میں تمہیں فروخت کیا" تو اس میں قیمت کے ساتھ ساتھ منتقل کرنے کا کرایہ، حفاظت کی اجرت وغیرہ بھی داخل ہوں گی۔

ممنوعہ بیوع

ممنوعہ بیوع کی دو قسمیں ہیں (۱) حرام وباطل (۲) حرام لیکن صحیح

حرام اور باطل بیوع

اس سے وہ بیوع مراد ہیں، جن سے کسی رکن کے خلل یا شرط کے نقص کی وجہ سے شریعت نے روکا ہے، اور فقہا کرام نے اس کے بطلان کا حکم لگایا ہے۔

۱) دودھ دوہنے سے قبل ہی پستان (تھن) میں اسے فروخت کرنا، اون کو جانور کے پشت سے کترنے سے قبل فروخت کرنا اور پھلوں کو بدُوِّصلاح سے قبل فروخت کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ "آپ ﷺ نے پھلوں کے فروخت کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ کھانے کے قابل نہ ہوں، اور تھن میں دودھ، اور دودھ میں گھی (یعنی دودھ بلو کر گھی نکالنے سے قبل اس گھی کو فروخت کرنے سے منع فرمایا) (دار قطنی فی البیوع)

بطلان کا سبب معقود علیہ یعنی مبیع سے ناواقفیت ہے۔ بدو صلاح (پختگی اور پکنے) سے قبل اس کا علم نہیں ہوگا کہ پکنے کے بعد اس کی کیا مقدار ہوگی، کبھی کافی تفاوت ہو سکتا ہے اسی طرح دودھ اور اون کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس غرر اور جہل کی وجہ سے باطل ہونے کا حکم لگا۔ پھلوں کی بیع میں لوگ کافی مخالفت کے شکار ہیں، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

بدو صلاح سے قبل پھل کو فروخت کرنا۔

پھل کی پختگی (پکنا) کے ظہور اور کھانے کے قابل ہونے سے قبل اس کی بیع غلط اور باعث گناہ ہے، لوگوں نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر پھل کے وجود سے قبل ہی، محض شگوفہ کی بنیاد پر (بلکہ اس کے بھی بغیر) پھل کی خرید و فروخت شروع کر دی ہے، یہ تو اور بھی بڑا خلل ہے، جو بیع کو مزید باطل کرنے اور آدمی کو مزید گنہگار بنانے کا سبب ہے، کیونکہ یہ ایسے معدوم (غیر موجود) کی بیع ہے، کہ ممکن ہے آئندہ اس کا وجود تک نہ ہو۔

بہر حال ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ مسئلہ کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیں، اور ایک ایسے مسلمان پر، جو اللہ پر صحیح ایمان رکھتا ہو، آپ ﷺ کی دل سے تصدیق کرتا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضری اور پیشی پر مکمل ایمان ویقین رکھتا ہو، جس دن کہ مال واولاد کچھ بھی نفع نہ پہنچا سکیں گے، سوائے اس شخص کے جو قلبِ سلیم کے ساتھ بار گاہِ الٰہی میں حاضر ہو، لازم ہے کہ بغور سن کر شرعی حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اس پر عمل پیرا ہو، اس کی مخالفت سے بالکل کنارہ کش ہو، خواہ اس میں اسے کچھ مصلحت نظر آئے، کیونکہ سارا نقصان اور خسارہ در حقیقت اللہ کے حکم کی خلافت ورزی اور آپ ﷺ کی خلاف ورزی میں پوشیدہ ہے۔

بدوصلاح سے قبل پھل کی فروخت میں مبیع کی مقدار کی لاعلمی کے ساتھ ساتھ کافی غرر (خطرہ) کا سامان بھی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کچھ ایسی آفتیں اور بیماریاں پیدا ہوں، جس کی وجہ سے پھل برباد ہوں، تو اس صورت میں درختوں کا مالک پھل کی قیمت کے نام سے ایسی رقم وصول کررہا ہے، جس کے مقابلہ میں سامنے والے کو کچھ نہیں حاصل ہورہا ہے، لہٰذا باطل طریقے سے لوگوں کا مال ہڑپ کرنے میں داخل ہوگا، اسی کی آپ ﷺ نے ایک حدیث میں صراحت فرمائی ہے، فرمایا۔ "بھلا بتاؤ تو، اگر اللہ نے پھل پیدا نہ فرمائیں، تو تم اپنے بھائی کا مال کس بنیاد پر لے رہے ہو۔" ایک روایت میں ہے "پھر تو اپنے بھائی کا مال کیوں کر اپنے لئے حلال قرار دیتا ہے؟" (بخاری و مسلم)

پس بدوصلاح سے قبل پھل کی بیع حرام و باطل ہے، اور اس کو صراحتاً رو کا گیا ہے، خرید و فروخت کرنے والے دونوں گنہگار ہوں گے، حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ نے پھل کے فروخت سے منع فرمایا، یہاں تک کہ بدوصلاح ہو جائے، بائع اور خریدار دونوں کو منع فرمایا۔" (بخاری۔ مسلم)

اس شرعی حکم کی حکمت واضح ہے اس کی مخالفت مختلف اختلافات، نزاع اور لڑائی تک کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک مومن بلکہ ساری انسانیت کو یہی زیبا ہے کہ شرعی حکم کی پیروی کرے، تاکہ سعادت و خوش بختی سے ہم کنار ہو، جو اللہ کے لئے کوئی چیز ترک کردے، اللہ اس سے بہتر اس کا بدلہ عنایت فرمائیں گے۔

بدوصلاح کے بعد: بدوصلاح اور پختگی کے ظہور کے بعد پھل کی بیع جائز ہے، سابقہ احادیث اور اس موضوع کی دیگر احادیث کے مفہوم سے اس پر دلالت ہوتی ہے، اور اس کی حکمت واضح ہے، کیونکہ اس مرحلہ کے بعد غالباً کسی آفت کا خطرہ نہیں ہوتا، پھل مضبوط اور بڑے ہو جاتے ہیں اور گٹھلیاں اور بیج بھی بڑے ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس اس سے پہلے آفات کا بڑا خطرہ رہتا ہے کہ پھل بھی ابھی چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں اور گٹھلیاں بھی۔

بدوصلاح کے بعد پھلوں کے بیچنے کے بعد خریدار عام عرف اور عادت و معمول کے مطابق ان کو کاٹنے اور توڑنے کے وقت تک مزید درخت پر رکھ سکتا ہے، البتہ بائع فی الحال توڑنے کی شرط لگائے تو مزید رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

بدوصلاح کا ضابطہ

اصل ضابطہ یہ ہے کہ کوئی چیز غالباً جس حالت میں مطلوب ہوتی ہے، اس حالت تک پہنچ جائے تو یہ اس کا بدوصلاح ہے۔

امام ماوردیؒ نے بدوصلاح کے آٹھ انواع بیان کئے ہیں۔

۱) **رنگ** (یعنی پختگی کے بعد رنگت کا بدلنا مثلاً سرخ یا زرد وغیرہ ہونا) جیسے بلح (کچی کھجور)، آلو بخارا، زرد آلو۔

۲) **ذائقہ:** جیسے انگور کی حلاوت و شیرینی اور انار کا کھٹا پن

۳) **پختگی اور نرم وملائم ہونا:** جیسے انجیر و خربوزہ

۴) **قوت اور سختی:** مثلاً گیہوں، جو

۵) **لمبائی اور پُر ہونا:** جیسے چارہ اور سبزی و ترکاری

۶) **بڑا ہو جانا** جیسے ککڑی

۷) **شگوفہ کے غلاف کا پھٹ جانا اور کھل جانا** جیسے روئی، اخروٹ

۸) **کِھل جانا** جیسے گلاب کا پھول

بعض کا بدو صلاح ظہور کے حکم میں ہے۔ لہٰذا تمام بغیر شرطِ قطع کے فروخت کر سکتا ہے جبکہ باغ، جنس اور عقد متحد ہو ورنہ ہر ایک کا حکم جدا جدا ہو گا۔(حاشیۃالجمل ۲۰۴/۳)

حدیث میں ہے ''کھجوروں کو زھو سے قبل فروخت کرنے سے منع فرمایا۔'' عرض کیا گیا کہ زھو کیا ہے؟ تو فرمایا ''سرخ ہو جانا یا زرد ہو جانا''...... ''اور اسے کھایا جائے''(بخاری۔مسلم)

پختگی سے قبل اگر پھل قابل انتفاع ہو تو ابھی توڑنے کی شرط کے ساتھ اسے فروخت کرنا جائز ہے(مثلاً کیری، کٹھل وغیرہ) کیونکہ درخت پر باقی رکھنے کی صورت میں جو غرر اور دھوکہ کی شکل تھی وہ یہاں موجود نہیں اور مبیع قابلِ انتفاع بھی ہے۔ اگر ابھی پھل کسی مناسب کام اور نفع کے قابل نہ ہو، یا درخت پر ہی رکھنے کی شرط کے ساتھ خرید و فروخت ہو تو بیع صحیح نہیں۔ بلا شرط فروخت ہو، اور عام عرف درخت ہی پر رکھنے کا ہو، تو یہ باطل ہے کیونکہ معروف کا حکم بھی مشروط کی طرح ہے۔ سابقہ تمام تفصیلات میں کھیت (اناج) کا حکم بھی پھل کی طرح ہے، کیونکہ دونوں سے مقصود ایک ہی ہے۔ واللہ اعلم

بدو صلاح کے بعد درخت پر باقی رکھنے کی شرط کے ساتھ فروخت شدہ پھل وغیرہ کی سیرابی کی ذمہ داری بائع پر ہے (جبکہ ان درختوں کو سیراب کرنا ضروری ہو) خواہ خریدار کے سپرد کر چکا ہو یا نہ کر چکا ہو۔ اتنی سیرابی لازم ہے کہ پھلوں میں نمو ہو اور بربادی سے مامون رہیں۔ اگر خریدار پر سیرابی کی شرط لگائی تو بیع باطل ہے۔ پھل توڑنے کی شرط کے ساتھ فروخت کرے تو سپردگی کے بعد بائع کے ذمہ سیرابی نہیں ہے۔

خریدار کے سپرد ہونے کے بعد اب وہ اس میں تصرف کر سکتا ہے، اور وہ چیز اس کے ضمان میں داخل ہو چکی، خواہ توڑنے کی شرط نہ ہو، کیونکہ اس کا قبضہ ہو چکا۔ (لہٰذا اب کسی وجہ سے پھل ضائع ہوں تو خریدار کا نقصان ہو گا، بائع قیمت نہ لوٹائے گا۔) صحیح مسلم کی حدیث میں نقصان کو معاف کرنے کا جو حکم ہے، وہ استحبابی درجہ میں ہے۔

جو پھل وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہوں اور قدیم وجدید میں اختلاط ہوتا ہو، جیسے انجیر، ککڑی، خربوزہ وغیرہ، ان کو بدو صلاح کے بعد بھی توڑنے کی شرط کے ساتھ ہی فروخت کر سکتا ہے۔ اگر اختلاط کا اندیشہ نہ ہو تو اس شرط کے بغیر بھی جائز ہے۔(حاشیۃالجمل ۲۰۶/۳)

۲) وہ بیوع جن میں مُقَامَرہ (جوئے بازی) کا پہلو ہو: ان میں مبیع کے متعلق جہالت ولاعلمی یا عاقدین کے ارادے میں خلل ہوتا ہے۔ ان بیوع کی درج ذیل انواع کو صراحتاً منع کیا گیا ہے۔

بیع المُنَابَذَہ یا بیع المُلَامَسَہ: یعنی کئی اشیاء میں سے بلا تعین کسی ایک کو فروخت کرنا، پھر بائع کسی ایک کو (خریدار کی طرف) پھینک دے، یا خریدار اس میں سے کسی ایک کو چھولے تو وہی مبیع ہو گی۔ یا کپڑا مثلاً تاریکی میں فروخت کر دے اور خریدار صرف چھولے، دیکھے نہیں یا کسی معین چیز کی خرید و فروخت ہو، اور شرط یہ ہو کہ جب بائع اسے پھینک دے یا خریدار چھولے تو بیع واجب ولازم ہو گی۔ پہلی صورت میں مبیع کے متعلق لاعلمی واضح ہے۔ اور دوسری صورت میں عاقدین کے ارادہ میں خلل ہے، کیونکہ یہ پتہ نہیں کہ وہ کب پھینکے گا یا یہ کب چھولے گا تاکہ بیع لازم ہو جائے۔

ملامسہ اور منابذہ کی ممانعت بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے۔

بیع الحَصَاۃ (کنکر والی بیع): کئی اشیاء میں سے ایک خرید لینا، اس طور پر کہ کوئی ایک کنکر مارے اور جس پر کنکر لگے وہی مبیع قرار پائے۔ مسلم کی حدیث میں ہے کہ ''آپ ﷺ نے ''بیع الحصاۃ'' سے منع فرمایا ہے''۔ فقہاء کرام نے اسے باطل قرار دیا ہے، کیونکہ

اس میں جہالت اور عاقدین کے ارادہ کا خلل پایا جارہا ہے۔

آج کل اس کی مختلف شکلیں رائج ہیں۔ مثلاً کئی اشیاء ایک جگہ رکھی جاتی ہیں، اور ان پر مخصوص طریقے سے لکڑی یا لوہا وغیرہ گھمایا جاتا ہے، اور جس چیز پر وہ رک جائے وہی متعین قیمت پر خریدار کے ہاتھ فروخت قرار پاتی ہے۔ (بہرحال ہر ایک الل ٹپ بیع جس میں براہ راست مبیع اور قیمت کی تعیین نہ ہو، جوئے کے حکم میں، اور باطل ہے۔)

۳) **ایک ھی بیع میں دو بیع**: یعنی عقد کے صیغہ میں بیک وقت دو عقد کو ذکر کرنا، مثلاً یوں کہے۔ میں نے یہ مکان تمہیں ایک ہزار نقد پر اور دو ہزار قسط وار پر ایک سال کی مدت تک فروخت کیا اور خریدار نقد یا قسط وار قبول کرے۔

یا یوں کہے۔ میں نے یہ گاڑی ہزار میں تمہیں اس شرط پر فروخت کر دی کہ تم اپنا مکان دو ہزار میں مجھے فروخت کر دو۔

اس طریقے سے بیع ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ پہلی صورت میں قیمت کے متعلق لاعلمی ہے (کوئی ایک طے نہیں ہوئی) اور دوسری صورت میں ایک شرط پر معلق ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ”آپ ﷺ نے ایک ہی بیع میں دو بیع سے منع فرمایا ہے۔“ (ترمذی، نسائی، احمد)

بیع بالتقسیط (قیمت کی قسط وار ادائیگی کے ساتھ بیع)

بیع بالتقسیط صحیح ہے، بشرطیکہ صیغۂ عقد میں دونوں قیمت کا تذکرہ نہ ہو، ورنہ ایک بیع میں دو بیع ہوگا، جو باطل ہے، جیسا کہ گذر چکا۔ البتہ عاقدین قیمت کے متعلق گفتگو کریں اور آخر میں بیع بالتقسیط پر متفق ہوں، اور اسی پر عقد طے پائے، تو یہ صحیح ہے۔ اس میں کوئی حرمت اور گناہ نہیں۔ چاہے بھاؤ تاؤ کرتے وقت نقد قیمت کا بھی ذکر ہو، لیکن عقد طے پاتے وقت صیغہ میں اس کا کوئی ذکر نہ ہو۔ (بالجزم بیع بالتقسیط طے ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

مذکورہ صورت سود میں داخل نہیں، بلکہ فی الجملہ لین دین کی سہولت اور تیسیر میں داخل ہے۔

۴) **بیع العُرْبَون** (بیعانہ۔ سائی): یعنی کوئی چیز اس شرط پر فروخت کرنا کہ خریدار قیمت کا ایک حصہ ابھی دے دے، جو بیع مکمل ہونے کی صورت میں تو قیمت میں شمار ہوگا، اور بیع مکمل نہ ہو تو بائع کے حق میں ہبہ شمار ہوگا، یہ ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ اس میں بائع کو ہبہ کی شرط ہے، جو فاسد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ ”آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے“ (ابوداود، ابن ماجہ)

دورانِ عقد بیعانہ کی شرط ہو تو حرام اور باطل ہے، البتہ عقد میں یہ شرط نہ ہو، بلکہ اتمامِ عقد کے بعد بائع بطور بیعانہ ایک قسط مانگے تو حرج نہیں، لیکن آئندہ یہ عقد فسخ ہو جائے تو خریدار کی اجازت اور رضامندی کے بغیر وہ رقم بائع کو حلال نہ ہوگی۔

۵) **بیعُ الدَّیْن بِالدَّیْن** (قرض کو قرض کے عوض بیچنا): یعنی ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہو، اور ایک تیسرے شخص کا اس پہلے پر قرض ہو، لہٰذا یہ شخص اپنا قرض تیسرے کو اس کے قرض کے مقابلہ میں بیچ دے۔ اس طرح کے بیع ممنوع اور باطل ہیں، کیونکہ مبیع کی سپردگی پر قدرت نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح قرض کو بیچنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (دارقطنی)

اس کی ایک شکل یہ بھی ہے، کہ کوئی چیز خریدی جائے۔ قیمت تو ابھی دے دے لیکن چیز متعین مدت کے بعد سپرد ہوگی۔ متعینہ

مدت گذرنے کے بعد بائع چیز پیش نہیں کر سکا اور خریدار سے کہا "مذکورہ چیز فلاں قیمت پر مجھے فروخت کر دو، قیمت فلاں مدت کے بعد ادا کروں گا یہ بھی باطل ہے۔

جس پر دین ہو، اسی کو وہ دَین (قرض) دوسرے دَین کے بدلے فروخت کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ کسی پر موجود قرض، کسی موجودہ چیز کے مقابلہ میں کسی تیسرے کو فروخت کرنا بھی باطل ہے، کیونکہ مبیع کی سپردگی پر قادر نہیں ہے۔

البتہ جس پر قرض ہو، کسی چیز کے بدلہ وہ قرض اسی کو فروخت کر دے، مثلاً ہزار روپے قرض تھا، گھڑی کے بدلہ وہ اسے فروخت کر دیا، یا مقروض پانچ سو ۵۰۰ روپے نکال کر اسے دے دے، تو یہ بیع صحیح ہے۔ کیونکہ یہ صلح کے حکم میں ہے، جو جائز ہے، جس کا ذکر آئندہ انشاء اللہ آئے گا۔ اس جائز صورت کے لئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی اس روایت سے استدلال کیا جا سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں: "میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا" میں بقیع میں اونٹ فروخت کرتا ہوں، دینار کے مقابلہ میں فروخت کر کے کبھی اس کی جگہ درہم لیتا ہوں، اور کبھی درہم کے مقابلہ میں فروخت کر کے اس کی جگہ دینار لیتا ہوں"؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "اس دن کے نرخ کے مطابق اس لین دین میں حرج نہیں، جبکہ دونوں کی جدائی تک رقم کا لین دین باقی نہ رہے۔" (ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، احمد) ابن عمرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ دینار میں بطور قرض فروخت کرتے، پھر اس کی جگہ درہم لیتے، یہ بعینہ مذکورہ شکل ہوئی۔ بقیع اہلِ مدینہ کے قبرستان کی جگہ کا نام ہے وہاں اس وقت بازار بھی لگتا تھا۔

۲) **قبضہ کرنے سے پہلے مبیع (چیز) دوسرے کو فروخت کرنا:** کوئی شخص ایک چیز خرید لے، اور اس پر قبضہ ہونے سے پہلے ہی کسی دوسرے کو فروخت کر دے، تو یہ ممنوع اور باطل ہے، کیونکہ یہ مسئلہ گذر چکا کہ مبیع قبضہ سے پہلے خریدار کے ضمان میں داخل نہیں ہوا، لہٰذا ابھی اسے بیچنے کا اختیار نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو اناج خریدے، قبضہ کرنے تک اسے فروخت نہ کرے" (بخاری، مسلم) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا یہی حکم ہے۔ (بخاری مسلم)

یہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ بائع کے علاوہ کسی اور کو فروخت کرے۔ اگر بائع کو ہی فروخت کر دے اور پہلی قیمت یا اس کے مثل کے بغیر ہو تو یہ بھی باطل ہے اور مذکورہ ممانعت میں داخل ہے۔

لیکن بائع کو جس قیمت پر خریدا تھا بعینہ اسی قیمت کے مقابلہ میں، یا اس کے تلف ہونے کی صورت میں اس کے مثل سے فروخت کر دے، تو یہ صحیح ہے، کیونکہ یہ در حقیقت پہلی بیع کا اقالہ ہے، کوئی نئی بیع نہیں ہے، گرچہ بظاہر بیع ہے۔

وہ حرام بیوع جو باطل نہیں

ان سے وہ بیوع مراد ہیں، جن کی ممانعت وارد ہے، لیکن کسی رکن میں نقص یا کسی شرط میں خلل کی وجہ سے نہیں، بلکہ کسی خارجی امر اور سبب کی وجہ سے، اسی لئے ان کے صحت کا حکم لگایا جائے گا، البتہ حرام اور باعث گناہ ہو گا۔

۱) **بَیْعُ الْمُصَرّاۃ:** مصراۃ اس اونٹنی، گائے یا بکری وغیرہ کو کہیں گے جس کا دودھ عمداً چند روز نہ نکالا جائے تاکہ تھن میں جمع ہو، اور خریدار کو زیادہ دودھ والی ہونے کا گمان ہو، جس کی وجہ سے وہ برغبت خرید لے یا قیمت میں اضافہ کرے۔ (کسی بھی ماکول اللحم جانور کو اس طرح فروخت کرے تو بیع المصراۃ میں داخل ہے)

اس طرح خرید و فروخت ہو تو صحیح ہے، لیکن دھوکہ اور خیانت کی وجہ سے بائع کو اس طرح کرنا حرام ہے، خریدار کو اس دھوکہ کا علم ہو جائے تو فوراً لوٹانے کا اختیار ہے، کیونکہ یہ عیب کی وجہ سے رد کرنے کے حکم میں ہے۔ اگر دودھ نکال چکا ہے تو اس دودھ کے بدلہ میں ایک صاع کھجور بھی واپس کرے، یا بائع راضی ہو تو وہی دودھ لوٹا دے، مصراۃ کا علم ہونے کے باوجود خریدار اس جانور کو لوٹانا نہیں چاہتا تو اسے اس دھوکہ کے بدلہ میں کچھ رقم وغیرہ واپس نہیں ملے گی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اونٹی اور بکری کا تصریہ مت کرو، (تھنوں میں دودھ روک کے مت رکھو) اس طرح کرنے کے بعد کسی نے خریدا تو دودھ دوہنے کے بعد اسے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے، اگر جانور پسند ہے تو رکھ لے، ناپسند ہو تو لوٹا دے اور ایک صاع کھجور بھی دے۔" (بخاری۔ مسلم) اونٹنی و بکری پر دیگر ایسے جانوروں کو قیاس کیا جائے گا، بالخصوص وہ جن کا گوشت حلال ہے۔

۲) **نَجْش**: یعنی کسی کا کسی برائے فروخت چیز کی قیمت بڑھانا، حالانکہ وہ خریدنا نہیں چاہتا، صرف دوسرے خریدار کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ چیز نفیس اور قیمتی ہے، تاکہ وہ زیادہ قیمت پر خرید لے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ نے نجش سے منع فرمایا" (متفق علیہ) لہٰذا یہ حرکت حرام ہے، البتہ بیع صحیح ہو جائے گی۔ اگر بائع اور ناجش (نجش کرنے والا) دونوں کی ملی بھگت سے یہ کام ہو تو دونوں حرمت کے مرتکب ہوں گے، اور بائع دھوکہ باز اور خائن شمار ہو گا، لہٰذا خریدار کو خیار حاصل ہو گا۔ اگر دونوں کی ملی بھگت ثابت نہ ہو تو خریدار کو خیار نہ ہو گا، قیمت کی صحیح تحقیق و تفتیش اور اندازہ اس کی ذمہ داری تھی۔

۳) **بَیْعُ الْحَاضِرِ لِلْبَادی**: کوئی شخص بستی کے باہر سے (صحرا و جنگل سے یا کسی اور جگہ سے) اپنے ساتھ کچھ ایسے اسباب فروخت کرنے لائے، جس کی اہل بستی کو حاجت ہو، اور بستی کا کوئی فرد اُسے یہ مشورہ دے کہ تم ابھی فروخت نہ کرو، میں وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا فروخت کر کے تم کو زیادہ نفع اور فائدہ پہنچاؤں گا، تو اسے بیع الحاضر للبادی کہتے ہیں۔ (یعنی بستی والے کا صحرا نشین کے لئے فروخت کرنا) اس طرح کرنا حرام ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (متفق علیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ) ممانعت اور تحریم کا سبب لوگوں کے لئے تنگی اور حرج ہے۔

۴) **تَلَقِّی الرُّکْبَان**: تاجر بستی سے باہر نکل کر اسباب لانے والوں سے ملاقات کر کے ان کو یہ تاثر دے کہ یہ اسباب بازار اور بستی میں سستے ہیں، تاکہ ان سے سستے داموں خرید سکے، تو اس عمل کو تلقی رکبان (آنے والے قافلہ کا استقبال اور ملاقات) کہیں گے۔

کوئی اس طرح اسباب خرید لے تو یہ خرید و فروخت صحیح ہے، لیکن حرام ہے، کیونکہ دھوکہ پایا جا رہا ہے، صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یہ باہر سے اسباب لانے والے افراد بازار میں پہنچ جائیں اور قیمت سے آگاہ ہوں، اور یہ واضح ہو کہ ان کو نقصان ہوا ہے، تو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے تلقی رکبان کی ممانعت کے بعد ارشاد فرمایا کہ کسی نے اس طرح خریدا، تو بائع کو بازار میں پہنچنے کے بعد خیار (فسخ حاصل) ہو گا۔ (مسلم۔ اصحاب السنن)

۵) **اِحْتِکار** (ذخیرہ اندوزی، بندش، روک رکھنا) یعنی جو اشیاء بطور غلہ اور اناج استعمال ہوتے ہوں، انہیں عوام کی ضرورت کے وقت بازار سے خرید خرید کر ذخیرہ کرنا، تاکہ زیادہ سے زیادہ مہنگا ہو جائے اور پھر لوگوں کی مجبوری اور ضرورت سے فائدہ اٹھاتا ہوا رفتہ رفتہ فروخت کرے۔ (تاکہ خوب نفع ہو)

اس طرح کا تصرف حرام ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ”ایک گنہگار شخص ہی احتکار کرے گا۔“ (مسلم فی المساقاۃ)

اگر عوام کو اس غلہ کی شدید ضرورت ہو تو ایسے آدمی کو مناسب دام سے اسے فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا، وہ نہ مانے تو قاضی (حاکم) خود اس کی طرف سے فروخت کر کے اسے قیمت دے دے۔ جس وقت بازار میں غلہ وافر مقدار میں ہو، اس وقت خرید کر جمع کرنا، تاکہ آئندہ قیمت بڑھنے پر فروخت کرے اس ممانعت میں داخل نہیں۔

۶) **کسی کی بیع پر بیع کرنا، یا سومٌ علی سومٌ** (کسی کے بھاؤ تاؤ میں ٹانگ اڑانا): بیع پر بیع کرنا، یعنی کسی نے کوئی چیز خریدی اور ابھی مدتِ خیار میں ہو، تو اسے جا کر یہ کہنا کہ اس قیمت میں اس سے بہتر چیز میں تم کو فروخت کرتا ہوں، یا ایسی ہی چیز اس سے کم قیمت پر تم کو دیتا ہوں۔

سوم، یعنی کوئی کسی چیز کی قیمت کر رہا ہو، اور عاقدین کسی قیمت پر متفق ہو جائیں، پھر دوسرا آکر بائع کو زیادہ قیمت کی پیش کش کرے تاکہ خود خرید لے، یا خریدار کے سامنے ویسی ہی چیز اس سے کم قیمت پر، یا اس سے بہتر چیز اسی قیمت پر پیش کرے۔

یہ ساری صورتیں حرام ہیں، کیونکہ صحیحین میں آپ ﷺ نے بیع پر بیع اور قیمت پر قیمت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ان امور کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ یہ امور مروّت کے خلاف، اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و بغض اور کینہ کپٹ کا، اور عداوت و جھگڑے کا باعث ہے۔ جو آپسی ربط وضبط اور اخوت و اتحاد کے منافی ہے، حالانکہ اسلام اتحاد و اتفاق اور آپسی محبت و الفت کی بڑی تاکید کرتا ہے۔

۷) **جس کا تمام مال حرام ہو اس کے ساتھ معاملہ کرنا:** اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں کا سارا مال حرام ہے، مثلاً شراب، سور، مردار یا کتے جیسی حرام اشیاء کی رقم ہو، یا رشوت وغیرہ کوئی ناجائز ذریعۂ آمدنی ہو، تو ایسے شخص کے ہاتھ کچھ فروخت کرنا، اس سے کوئی چیز خریدنا یا کرایہ وغیرہ کا لین دین کرنا اور اس کا کھانا کھانا حرام ہے۔

تمام مال حرام نہ ہو، بلکہ حرام اور حلال مخلوط ہو، تو مذکورہ معاملات اس کے ساتھ مکروہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے ”حلال واضح ہے، اور حرام واضح ہے، اور دونوں کے درمیان بعض مشتبہ امور ہیں، جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شبہات سے پرہیز کرے اس نے اپنے دین و آبرو کی حفاظت کی، اور جو شبہات میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا۔“ (متفق علیہ)

خرید وفروخت کے آداب

۱) **برتاؤ میں نرمی اور فیاضی:** بائع قیمت کے متعلق کچھ نرمی سے پیش آئے، کم لے، خریدار مبیع میں نرمی برتے، لہٰذا شدید شرائط عائد نہ کرے، قیمت زیادہ دے۔

تنگدست اور غریب شخص سے قیمت وصول کرنے میں تساہل برتے، اسے مہلت دے، قرض کے مطالبہ میں سخت رویہ نہ اختیار کرے۔

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس شخص پر جو فروخت کرنے، خریدنے اور قرض کے مطالبہ میں نرمی کا برتاؤ کرے۔“ (بخاری)

۳) **معاملات میں سچائی اور دیانت داری:** اشیاء کی صفات اور دیگر تفصیلات کے بتانے میں جھوٹ نہ کہے، قیمتِ

خرید وغیرہ حقیقت سے زیادہ نہ بتائے، جن باتوں کو پوچھا جائے سچائی اور خیر خواہی کے ساتھ بتادے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تاجر بروز قیامت فاجر اٹھائے جائینگے، سوائے ان کے جو تقویٰ الٰہی سے متصف ہوں اور سچ بولیں۔" (ترمذی فی البیوع وصححہ)

ایک اور روایت میں فرمایا۔ "سچا اور امانت دار تاجر انبیاء کرام، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا۔" (ترمذی) ایک حدیث میں فرمایا۔۔ "اگر (بائع اور خریدار) دونوں سچائی سے کام لیں اور (عیب وغیرہ کو) واضح کریں تو ان کی بیع میں برکت ہو گی، اور اگر (عیب) چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو برکت مٹادی جائے گی۔" (متفق علیہ عن حکیم)

۳) **قسم نہ کھائے**، خواہ سچا ہی ہو لین دین میں زیادہ قسم نہ کھائے، بلکہ بہتر ہے کہ قسم کھائے ہی نہیں، خواہ وہ سچا ہو، کیونکہ اس میں اللہ کے نام کی بے وقعتی ہوتی ہے، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (البقرۃ: ۲۲۴) ترجمہ: "اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین الخلق کے کام کرو۔ (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے)

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے "قسم سامانِ تجارت کو خوب رائج کرتا اور فروغ دیتا ہے۔، (لیکن) برکت کو مٹا دیتا ہے۔" (متفق علیہ)

ان لوگوں کو بڑے احتیاط کی ضرورت ہے، جو جھوٹی قسموں کے ذریعہ اپنے اسباب کو رواج دے کر تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں، اس میں بڑی تباہی اور ہلاکت ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے جھوٹی قسموں کے بل بوتے پر تجارت کو فروغ دینے والے کو سخت وعید اور دھمکی سنائی ہے۔ فرمایا "اللہ تعالیٰ نظر (کرم والفت) نہ فرمائیں گے، نہ ان کا تزکیہ ہو گا، اور ان کو دردناک عذاب ہو گا۔" (مسلم)

۴) **بازاروں میں اور لین دین کے اوقات** میں بکثرت صدقہ وخیرات کرتا رہے، تاکہ بے خیالی میں کھائی جانے والی قسموں کا، یا عیب کی عدمِ وضاحت، قیمت میں کوتاہی یا بعض ناروا سلوک وغیرہ امور کا کفارہ ہو۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے تاجروں کو خطاب کر کے فرمایا۔ "بلاشبہ شیطان اور گناہ فروخت کے وقت حاضر رہتے ہیں، لہٰذا تم اپنے معاملات میں صدقات کی آمیزش کیا کرو۔" (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ)

۵) **تحریر و گواہ**: اگر معاملہ ادھار ہو تو قیمت ومدت وغیرہ تفصیلات کو قلمبند کر لینا مستحب ہے، تاکہ اختلاف وتنازعہ نہ ہو۔

آیت: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (البقرہ۔ ۲۸۲) ترجمہ: "اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا (خواہ دام ادھار ہو یا جو چیز خریدنا ہے وہ ادھار ہو) ایک میعاد معین تک (کیلئے) تو اس (کی یادداشت ودستاویز) کو لکھ لیا کرو۔"

اسی طرح اس عقد بیع اور تحریر پر گواہ رکھنا بھی مستحب ہے۔ مذکورہ آیت میں فرمایا "وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (البقرہ۔ ۲۸۲) ترجمہ: اور (اس معاملہ دین پر علاوہ دستاویز لکھنے کے معاملے کی پختگی کے لئے) دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کرو۔ پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جاویں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو۔

ان امور کی انجام دہی مزید اطمینان اور آپسی تعاون کا باعث ہے۔

آیت: ”وَلَا تَسۡـَٔـمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰٓى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا “(البقرہ۔ ۲۸۲)

ترجمہ: اور تم اس (دَین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا۔ یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑھو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے۔)

اس طرح نقد لین دین میں بھی گواہ رکھنا مستحب ہے، تاکہ آئندہ عقد یا اس کے کسی شرط کے متعلق انکار واختلاف اور نتیجتاً نزاع اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے، اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت ہو جائے۔”وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ (البقرہ: ۲۸۲) (اور تم گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو)

اِقَالَہٗ (بیع توڑنا)

’اقالہ‘ عربی زبان میں اٹھانے (ختم کرنے) کے معنی میں مستعمل ہے۔ عقود میں اس سے مراد عقد کے احکام و آثار کو اٹھا دینا اور ختم کرنا، لہٰذا فقہی اصطلاح میں اقالہ کا مطلب ہے، جو عقد فسخ کی صلاحیت رکھتا ہو، دونوں عاقدین کا اپنے اختیار سے اسے ختم کر دینے پر اتفاق کر لینا۔

مذکورہ تعریف سے یہ واضح ہوا کہ اقالہ کا تعلق لازم عقود سے ہے، یعنی جو اپنے ارکان و شرائط کے ساتھ مکمل ہو جانے پر طرفین میں سے تنہا کوئی ایک اسے فسخ نہیں کر سکتا، دونوں کے اتفاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ جو عقود جائز ہیں، یعنی (لازم نہیں بلکہ) عاقدین میں سے جو بھی چاہے دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ کر سکتا ہے، اس میں اقالہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہے کہ جو عقود شرعاً قابل فسخ ہوں، انہیں میں اقالہ ہو سکتا ہے، جیسے خرید و فروخت اور اجارہ (کرایہ داری) وغیرہ، جو قابل فسخ نہ ہوں، جیسے نکاح، تو اس میں اقالہ کا کوئی دخل نہیں۔

اقالہ کی مشروعیت: اقالہ مشروع ہے، بلکہ ایک مطالبہ کرے تو دوسرے کو اسے قبول کر لینا مستحب ہے، کیونکہ لوگوں کی سہولت، اور موہوم نقصان سے بچنے کے ارادہ میں ساتھ دینا پایا جا رہا ہے۔ کبھی یوں پیش آتا ہے کہ کوئی خرید و فروخت کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں مجھے کافی خسارہ ہو رہا ہے، یا فی الوقت اس لین دین کی ضرورت نہیں تھی، لہٰذا یہ سوچ کر وہ پریشان اور غمگین ہوگا، اور اس کی پیش کش پر اقالہ کرنے میں اسے اس پریشانی سے نجات ملے گی، اور اس عمل میں جو اجر حاصل ہوگا، واضح ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔”جو کسی (نادم) مسلمان کی بیع کا اقالہ کر لے (بیع کو اس کی درخواست پر توڑ دے) اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لغزش سے بروز قیامت درگذر فرمائیں گے۔“(ابوداود، ابن ماجہ وصححہ ابن حبان والحاکم)

اقالہ کا رکن: اقالہ میں صیغہ کا ہونا لازم ہے، یہی صیغہ اقالہ کا رکن ہے۔ مثلاً ایجاب میں یہ کہے ”میری بیع کا اقالہ کرو“ (بیع کو توڑ دو) دوسرا قبول میں یہ کہے ”میں نے اقالہ کیا“ فسخ، ترک (چھوڑنا) رفع (اٹھانا، ختم کرنا) ان الفاظ سے بھی اقالہ صحیح ہوگا۔ اقالہ بھی چونکہ عقد ہے، اس لئے دیگر عقود کی طرح ایجاب و قبول میں اتحادِ مجلس شرط ہے۔

اقالہ کے شرائط: (۱) اقالہ کرنے والے دونوں اشخاص کی رضامندی، جبراً اقالہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ فسخ عقد ہے، لہٰذا اس کی طرح رضامندی اور اختیار سے ہونا لازم ہے۔

(۲) اصل عقد کے مقابلہ میں کوئی کمی بیشی نہ ہو، کسی ایک بدل میں اضافہ یا نقصان کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ عقد کو ختم کرکے دونوں کا اپنی سابقہ حالت پر لوٹنا ہے۔ اسی لئے بیع میں اقالہ ہو، اور مبیع میں منفصل اضافہ ہوچکا ہو، جو اصل سے پیدا ہوا ہو، مثلاً بکری فروخت ہوئی، پھر اسے بچہ ہوا، تو اب اقالہ نہیں ہوسکتا۔

سود [رِبَا]

"ربا" کا لفظ عربی میں زیادتی اور اضافہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاح: فقہی اصطلاح میں ربا کا مفہوم ہے عوض مخصوص پر ایسا عقد، جو بوقتِ عقد شرعی معیار میں معلوم التماثل نہ ہو، یا دونوں بدل یا ایک بدل میں تاخیر ہو (تشریح آئندہ تفصیل سے سمجھ میں آئیگی)

عوض مخصوص سے ربوی اموال مراد ہیں، جن کی تفصیل آرہی ہے۔

معلوم التماثل نہ ہو (ایک دوسرے کے برابر ہونا معلوم نہ ہو) یعنی ایک دوسرے سے زائد ہو، یا مساوی ہونا یقینی نہ ہو۔

معیارِ شرعی یعنی نپنے والی اشیاء میں ناپ، اور تلنے والی اشیاء میں تول اور وزن

بوقتِ عقد کی قید سے عقد کے بعد تماثل کا علم نکل گیا۔ مثلاً گیہوں کا ایک ڈھیر دوسرے ڈھیر کے بدلہ فروخت کیا، دونوں کی مقدار نامعلوم ہے، تو یہ ربوی عقد (سودی لین دین) ہے، سود کے احکام اس پر لاگو ہوں گے، گو بعد میں ناپنے کے بعد دونوں برابر اور مساوی ہوں، کیونکہ بوقتِ عقد اس کا علم نہیں تھا۔

بدل میں تاخیر کا مطلب یہ کہ دونوں مجلس میں (اپنی اپنی چیزوں پر) قبضہ نہ کریں، یا ادھار کی شرط ہو (یعنی ادائیگی کے لئے مدت متعین ہو)

وہ اموال جن میں سود کا حکم لگے گا

سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک ان چھ اشیاء میں سود کا حکم لاگو ہوگا، کیونکہ ان کے متعلق صراحتاً نص وارد ہے۔

امام بخاری، امام مسلم اور دیگر حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سونا سونے کے بدلہ میں سود ہے لیکن یہ کہ مجلس میں ہی لین دین اور قبضہ ہو، اور گیہوں گیہوں کے بدلہ سود ہے اِلّا یہ کہ مجلس میں ہی لین دین ہو، جَو جَو کے مقابلہ میں سود ہے اِلّا یہ کہ مجلس میں ہی قبضہ ہو، اور کھجور کھجور کے مقابلہ میں (فروخت کرنا) سود ہے، لیکن یہ کہ مجلس ہی میں قبضہ ہوجائے۔" (متفق علیہ)

ایک روایت میں چاندی اور سونے کے لین دین کا بھی یہی حکم بیان ہوا ہے، دیگر روایات میں بھی ان اشیاء کا نمک سمیت ذکر آیا ہے۔

ان چھ اشیاء کی طرح بعض دیگر اشیاء میں بھی سود ہوگا، کیونکہ یہ حکم علت کی روشنی میں ہے، لہٰذا سود کے وصف کے تحقّق میں معتبر علّت جن اشیاء میں بھی ہوگی، اس پر انہیں قیاس کیا جائے گا۔

سود کی علّت: یعنی وہ وصف جس کی موجودگی میں وہ چیز ربوی (سودی) شمار ہوگی (اور ان کا آپس میں غیر شرعی طریقہ سے لین دین سود میں شمار ہوگا)۔ مذکورہ اشیاء کی روشنی میں فقہاء شافعیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سونے چاندی میں علت ثمنیت (یعنی طبعاً و قدرتاً

ان کا دیگر اشیاء کے لئے قیمت کی حیثیت رکھنا) اور دیگر اشیاء میں علت طعم (یعنی کھائی جانے والی چیز) ہے۔ ناپ تول سے دی جانے والی چیز ہو یا نہ ہو اس سے کوئی بحث نہیں، لہٰذا ثمن یا مطعوم کو اسی جنس کے مقابلہ میں فروخت کرنے میں بعض خاص شرائط کی رعایت ضروری ہے۔ (ورنہ وہ سود میں داخل ہوگا)

جب یہ بات واضح ہو چکی، تو جو چیز بھی سونے چاندی کی جگہ بطور قیمت استعمال ہو، جیسے آج کل نوٹ و سکے اور کرنسی، اسے بھی ربوی مال شمار کریں گے اور غالباً انسان جن اشیاء کو کھاتا ہے، وہ بھی ربوی ہوگا، خواہ بطور غذا اور اناج کھائے جیسے چاول، مکئی وغیرہ یا بطور تفکّہ (میوہ نوشی) استعمال ہو جیسے کشمش، انجیر، سیب، امرود وغیرہ یا دوائی کے طور پر اور غذا یا بدن کی اصلاح کے لئے استعمال کرے مثلاً ادرک، زعفران، گوند وغیرہ

مذکورہ اشیاء کے علاوہ کوئی چیز ربوی (سودی) نہیں۔ مثلاً سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھات اور معدنیات (لوہا، پیتل، تانبہ وغیرہ)، کپڑا، لکڑا، کتاب، گھریلو سامان وغیرہ۔ خواہ وزن یا ناپ سے اس کا تعامل ہو یا کسی اور طریقے سے۔

رِبا (سود) کے انواع اور ہر ایک کا حکم

۱) **رِبَا الۡفَضۡل** (سودِ اِضافہ): یعنی کسی سودی مال کو اسی جنس کے مقابلہ میں زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا۔ مثلاً ایک سیر گیہوں دو سیر گیہوں کے بدلے فروخت کرنا، یا ۱۰۰ر گرام سونا ۱۱۰ر گرام، یا ۹۰ر گرام سونے کے عوض فروخت کرنا۔ اس طرح کی خرید و فروخت حرام ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”سونے کو سونے کے بدلہ میں فروخت نہ کرو مگر برابر سرابر، بعض بعض کے مقابلہ میں کم و بیش نہ ہو۔ اور چاندی چاندی کے بدلہ فروخت نہ کرو مگر برابر سرابر، بعض کو بعض کے مقابلہ میں کم و بیش نہ کرو“ (متفق علیہ)۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ ”سونا سونے کے مقابلہ میں، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض، جَو جَو کے بدلہ میں اور نمک نمک کے عوض ایک دوسرے کے مساوی اور فوری لین دین، و قبضہ ہو، اگر کوئی زائد دے یا زائد کا مطالبہ کرے تو اس نے سود لیا، لینے اور دینے والا دونوں برابر ہیں“ (مسلم)

اس مسئلہ میں ایک نوع بہتر یا دوسرا کمتر و گھٹیا ہو تو اس کا اعتبار نہ ہوگا (بلکہ دونوں طرف مقدار میں مساوات لازم ہے) کیونکہ مذکورہ روایات کے الفاظ عام ہیں۔ نیز ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے گھٹیا قسم کے کھجور دو صاع دے کر اس کے عوض بَرنی کھجور (کھجور کی ایک بہترین قسم) ایک صاع خریدی، آپ ﷺ کو پتہ چلا، بڑی تاکید سے اسے منع فرمایا اور سود قرار دیا۔ (بخاری۔ مسلم)

اسی طرح صنعت اور کاریگری کا بھی کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا ایک طرف سونے یا چاندی کے زیورات ہوں اور دوسری طرف صرف سونے یا چاندی کا ڈلا (یا بسکٹ)، تب بھی دونوں کا وزن مساوی ہونا لازم ہے، کمی بیشی جائز نہیں ہے، کیونکہ گذشتہ روایات کے الفاظ عام ہیں۔

(**تنبیہ: آج کل** عموماً پرانے زیورات دے کر جدید خریدے جاتے ہیں۔ جس میں پرانا صرف سونا شمار ہوتا ہے، اور جدید میں بناوٹ اور کاریگری کی رقم بھی ملانی پڑتی ہے، اس طرح لازماً کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے، جو قطعاً سود اور شرعاً حرام ہے، نیز اکثر جدید زیور آرڈر اور پسند کے مطابق بعد میں تیار ہو کر ملتا ہے، حالانکہ سونا سونے کے یا چاندی چاندی کے عوض ہو تو دونوں طرف سے نقد اور فوراً قبضہ لازمی ہے ادھار اور تاخیر بھی سود میں داخل ہے، لاعلمی اور بے التفاتی کی وجہ سے بلاوجہ اس طرح سود اور حرام کا ارتکاب ہوتا ہے، اس سے حد درجہ احتیاط لازم ہے۔ بہتر اور آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنا زیور وغیرہ فروخت کر کے اس کی قیمت لے لے، پھر اس سے جو زیور چاہے خرید لے، خواہ فوراً ہو یا ادھار، یہ الگ الگ دو عقد ہوں گے، اور اس طرح سود کی نحوست سے نجات

ملے گی)

۲) **ربا النّسا** (سودِ تاخیر): یعنی ایک ہی علت کے دو سودی اشیاء کی ادھار خرید و فروخت، خواہ دونوں اشیاء ایک ہی جنس کی ہوں یا جدا جدا، اور دونوں مساوی مقدار میں ہو یا کمی بیشی کے ساتھ۔

مثال: ایک سیر گیہوں ایک سیر گیہوں کے عوض، یا ایک سیر جو کے عوض یا دو سیر چاول کے عوض، ایک ماہ کی مہلت پر فروخت کرے، یا ۱۰ر گرام سونا ۱۰ر گرام سونے کے عوض، یا ۱۰ر گرام چاندی کے عوض، یا ۱۰۰ر گرام چاندی کے عوض یا ۵ر گرام چاندی کے عوض ایک دن یا اس سے زائد مدت پر فروخت کرنا۔

مذکورہ تعامل بھی حرام اور ممنوع ہے، کیونکہ اس میں در حقیقت سود کا مفہوم موجود ہے، گو ظاہر نہ ہو، کیونکہ فوری کو ادھار پر تقدم حاصل ہے، لہٰذا اس تعامل میں ایک عوض میں زیادتی ہے، یعنی جو نقد دیا جارہا ہے (ادھار کے مقابلہ میں گویا وہ زائد ہے)

آپ ﷺ نے ربوی اشیاء کو حاضر کے عوض غائب (ادھار) کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) ایک حدیث میں جنس جدا ہو تو کمی بیشی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا، بشرطیکہ نقد معاملہ ہو (مسلم)

۳) **ربا الید** (سودِ قبضہ): یعنی کسی سودی شئ کو اسی علّت کے کسی شئ کے عوض فروخت کرے، اور نفسِ عقد میں ادھار اور تاخیر کی کوئی شرط نہ ہو، لیکن عملاً دونوں بدل یا کسی ایک بدل پر مجلس ہی میں قبضہ نہ ہو۔ (تو یہ بھی ممنوع ہے) حضرت عمرؓ کی متفق علیہ روایت گزر چکی کہ مجلس ہی میں قبضہ نہ ہو (اور دونوں اپنی اپنی چیز ایک دوسرے کے حوالہ نہ کرے) تو یہ سود ہے۔

جنسِ واحد اور جنسِ دیگر

ایک ہی جنس میں شمار ہونے، نہ ہونے کے متعلق فقہاءِ کرام نے ایک قاعدہ وضع کیا ہے، فرماتے ہیں: ہر وہ دو اشیاء جو اصل خلقت کے اعتبار سے اسم خاص (خاص نام) میں متفق ہوں، ایک ہی جنس ہیں، اور جو اصل خلقت میں اسم خاص میں مختلف ہوں دو الگ الگ جنس ہیں۔

اسم خاص کا مطلب جو عام اور مشترک نام سے اسے نمایاں کرے، مثلاً لفظ، کھجور، اسم خاص ہے، جو دیگر پھلوں اور میووں سے اسے ممیز اور نمایاں کرتا ہے، جبکہ پھل اور میوہ اسم عام ہے۔

اصلِ خلقت سے مراد وہ ہیئت ہے، جس پر اسے پیدا کیا گیا، لہٰذا کسی صنعت اور تبدیلی و تحویل کے بعد اتفاق کافی نہیں۔

پس سونے کی تمام انواع ایک جنس ہیں، اسی طرح چاندی کی انواع بھی، اور کھجور کی تمام انواع ایک جنس اور کشمش کی تمام انواع، اور گیہوں کی تمام انواع اور جَو کی تمام انواع ایک جنس شمار ہونگی۔

کسی چیز کے تر اور خشک کو ایک ہی جنس میں شمار کریں گے۔ مثلاً انگور و کشمش، تر کھجور اور خشک کھجور۔

کسی چیز سے بنائی جانے والی شئ اور وہ چیز (اصل) ایک ہی جنس ہیں۔ جیسے گیہوں اور اس کا آٹا۔

مختلف حیوانات کا گوشت جدا جنس ہے، مینڈھا ایک جنس ہے، بکری بھی اسی میں شمار ہے، گائے بیل اور بھینس کا گوشت ایک جنس ہے، اور تمام انواع کے اونٹ کا گوشت ایک جنس شمار ہوگا۔

گوشت سرخ ہو یا سفید، اس سے کوئی فرق نہیں، ایک ہی جنس ہیں، گوشت کے ساتھ مخلوط یا چپکی ہوئی چکنائی بھی گوشت کے حکم میں ہے، پیٹ کی چربی، دنبہ کی چکنی، اونٹ کا کوہان، جگر (کلیجہ)، تلی اور اوجھ یہ سب الگ الگ جنس ہیں۔

مختلف اجناس کی فروع (اس سے نکلنے اور بننے والی چیز) بھی جدا جدا جنس شمار ہوں گے، لہٰذا گیہوں کا آٹا اور چاول کا آٹا جدا جنس ہیں۔ انگور کا سرکہ ایک جنس اور کھجور کا سرکہ دوسری جنس ہے، اسی طرح غذا یا دوا میں مستعمل تیل کا حکم ہے۔ (لہٰذا مونگ پھلی کا تیل ایک جنس اور تل کا تیل ایک الگ جنس ہے) دودھ کا بھی یہی حکم ہے۔ پس مینڈھے اور بکری کا دودھ ایک جنس ہے، گائے اور بھینس کا دودھ ایک جنس ہے اونٹنیوں کا دودھ ایک جنس ہے۔ مختلف پرندوں کے انڈے مختلف جنس ہیں۔

رِبوی (سودی) اموال کی خرید وفروخت اور اُس کی صحت کے شرائط

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کئی اشیاء کے ربوی (سودی) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان اشیاء کے لین دین اور خرید وفروخت میں شریعت نے مزید کچھ شرائط عائد کئے ہیں، جن کا لحاظ لازم ہے، خلاف ورزی کی صورت میں اس پر سود کا اطلاق ہوگا، اور آدمی گنہگار اور حرام کا مرتکب ہوگا۔

دین اسلام میں اللہ تعالیٰ نے بڑی سہولت اور آسانی رکھی ہے، اور حرج کو دور فرمایا ہے، لہٰذا ربوی اشیاء کے لین دین کی صحت کے شرائط واضح کر دیئے ہیں، تاکہ آدمی سود کی حرمت سے بچ سکے۔ سابقہ تفصیل کی روشنی میں اس لین دین کی مختلف صورتیں اور ان کے شرائط درج ذیل ہیں۔

۱) **اتحادِ جنس:** کسی سودی چیز کو اسی جنس کے بدلہ فروخت کرے، مثلاً گیہوں کے بدلہ گیہوں، شکر کے عوض شکر، چاندی کے مقابلہ میں چاندی وغیرہ، تو اس میں تین شرائط لازم ہیں، ورنہ سودی کاروبار شمار ہوگا۔

أ) **دونوں بدل میں تماثل (مساوات۔ برابری):** چیز مکیل ہو (یعنی ناپ سے لین دین ہوتا ہو) تو ناپ میں برابر ہوں، مثلاً ایک مد کے بدلہ ایک مُد، ایک لیٹر کے بدلہ ایک لیٹر، اگر موزون (وزن سے فروخت ہونے والی) ہو تو وزن میں دونوں برابر ہو، مثلاً ار کلوگرام کے بدلہ ار کلوگرام، اور عددی ہو تو عدد میں برابر ہوں، مثلاً پانچ کے عوض پانچ۔

ب) **عقد حالاً (فوری اور نقد) ہو:** عقد میں دونوں یا کسی ایک بدل کی سپردگی ادھار نہ ہو، خواہ مختصر مدت کے لئے ہو۔

ج) **تَقَابُض (دونوں کا قبضہ کرنا):** دونوں بھی آپس میں ایک دوسرے کو بدل دے دیں اور اس پر قبضہ کرلیں، مجلس عقد سے دونوں کی جدائی سے قبل قبضہ ضروری ہے۔ (دلائل گزر چکے)

۲) **جنس مختلف ہو، اور علّت متحد (ایک) ہو:** ایک سودی مال کسی دوسرے جنس کے سودی مال کے عوض فروخت ہو، لیکن دونوں کی علّت ایک ہو، مثلاً سونا چاندی کے عوض یا کوئی اناج دوسرے کسی اناج کے عوض یا مطعوم (کھائی جانے والی) کے عوض، تو اس عقد کی صحت کے لئے دو شرائط لازم ہیں، تاکہ سود کا ارتکاب نہ ہو۔

(أ) عقد حالاً (فوری اور نقد) ہو، جیساکہ اتحادِ جنس میں گزر چکا۔

(ب) مجلسِ عقد میں ہی دونوں اپنی اپنی چیزوں پر قبضہ کرلیں۔

اس صورت میں دونوں بدل میں تماثل اور مساوات ضروری نہیں، ایک صاع گیہوں دو صاع جو کے بدلہ میں، اور ایک گرام سونا ۵ر گرام چاندی کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔ اور یہ عقد صحیح ہوگا اور اس پر عقد کے آثار مرتب ہوں گے، جبکہ ادھار معاملہ نہ ہو، اور مجلس میں ہی طرفین سے قبضہ ہوجائے جیساکہ گذر چکا۔

آپ ﷺ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا... ''سونا چاندی کے عوض، اور چاندی سونے کے عوض اور گیہوں کے عوض جَو اور جَو کے عوض گیہوں اور کھجور کے عوض نمک اور نمک کے عوض کھجور فوری لین دین ہو تو جیسا چاہو (یعنی کمی بیشی کے ساتھ) فروخت کرو۔'' (رواہ الشافعی)

۳) **علت مختلف ہو:** یہ ہم جان چکے کہ مال کے سودی ہونے میں فقہاء کرام کے نزدیک علت اس کا ثمن ہونا یا مطعوم ہونا ہے، لہٰذا کسی سودی عقد میں دونوں بدل میں علت کا اختلاف اسی وقت ہو گا جبکہ ایک طرف ثمن (قیمت) اور دوسری طرف مطعوم ہو، اور ایسی صورت میں بیع کے صحت اور جواز کے لئے سابقہ کسی شرط کی قید نہیں، (دیگر اور عام بیع کے جو شرائط ہیں وہ کافی ہیں) لہٰذا مثلاً ۲۰ صاع گیہوں ۱۰ گرام سونے کے عوض فروخت کرنا صحیح ہے، خواہ مجلس میں ہی قبضہ ہو یا نہ ہو، ادھار کی شرط ہو یا نہ ہو۔

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر فرمادیا، تو وہ جَنِیب کھجور (ایک عمدہ قسم کا کھجور) لے آئے، تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا۔ ''کیا خیبر کے تمام کھجور ایسے ہی ہیں؟'' تو جواب دیا: نہیں، قسم بخدا، اے اللہ کے رسول ﷺ ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے عوض، اور دو صاع تین صاع کے عوض حاصل کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''ایسا نہ کرو، جمع (یعنی مخلوط یا گھٹیا قسم کے کھجور) کو دراہم کے عوض فروخت کرو، پھر ان دراہم سے جنیب خریدو'' (متفق علیہ)

پس اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ بیع (خرید و فروخت) مطلقاً جائز ہے، جبکہ کوئی ایک بدل اثمان میں سے ہو (یعنی سونا چاندی سے)، اور دوسرا بدل کچھ اور، خواہ مطعوم ہو یا غیر مطعوم۔

۴) **غیر ربوی (غیر سودی) مال کے ساتھ تبادلہ ہو:** جب کوئی ربوی مال غیر ربوی مال کے عوض فروخت ہو، تو بیع مطلقاً صحیح ہے، ربوی تعامل کے شرائط میں سے کسی شرط کی قید نہیں، پس نہ تماثل شرط ہے نہ حلول اور نہ تقابض، کیونکہ ایک بدل غیر ربوی ہو تو عقد ربوی شمار نہ ہو گا۔

لہٰذا طعام کے کسی بھی نوع کو کپڑے وغیرہ کے عوض فروخت کرے تو مطلقاً جائز ہے، تماثل ہو یا نہ ہو، اور بیع حالاً ہو یا موٴجلاً (ادھار)

مماثلت (مساوات): اس کا تحقق اور اعتبار اور مانع

آپ یہ مسئلہ جان چکے کہ کسی ربوی مال کی اسی جنس سے خرید و فروخت کی صورت میں دونوں بدل میں مماثلت اور مساوات کا تحقق اور ثبوت ضروری ہے، تاکہ بیع صحیح ہو اور سود کا ارتکاب نہ ہو۔

اب ان سطور میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ مساوات کیسے ثابت ہو گی؟ اس کا اعتبار کب ہو گا؟ اور اس ثبوت میں کون سے امور مانع (رکاوٹ) شمار ہوں گے؟

(أ) **مماثلت کا ثبوت کس طرح ہو گا:** ہر ربوی مال میں دونوں بدل کا شرعی مقدار کے اعتبار سے برابر اور مساوی ہونا شرط ہے، جو چیز کیلی ہو اس میں کیل (ناپ) کا اور جو موزون ہو اس میں وزن کا اعتبار ہو گا، کیلی چیز میں وزن کے فرق کا اور موزون چیز میں کیل کے فرق کا کوئی اثر نہ ہو گا (کیلی سے مراد جو ناپ سے فروخت ہو اور موزون یعنی جس کا لین دین وزن سے ہو) کیلی اشیاء کو اسی جنس سے فروخت کرنے میں کیل (ناپ) میں مساوات لازم ہے، اگر مساوی وزن سے لین دین ہو تو جائز نہیں، اور موزون کا اسی جنس سے وزن میں مساوات کے ساتھ تبادلہ ضروری ہے، ناپ میں مساوات کے ساتھ لین دین جائز نہیں۔

پس یہ واضح ہوا کہ مماثلت کیلی میں کیل اور موزون میں وزن کے ذریعہ ثابت ہوگی۔

کسی مال کے موزون یا مکیل ہونے کا فیصلہ

کسی مال کے موزون یا مکیل ہونے میں آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں اہلِ حجاز (مکہ و مدینہ) کے غالب عادت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ اقرب یہی ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی اور آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے "وزن میں اہل مکہ کا' اور ناپ میں اہل مدینہ کا اعتبار ہوگا" (ابوداود، نسائی عن ابن عمر)

لہٰذا اہل حجاز کا اس وقت جو عرف رہا ہوگا، اسی کا اعتبار ہوگا، خواہ آئندہ لوگ اپنے علاقوں میں کسی جدید عرف پر عمل پیرا ہوں (مثلاً کھجور و گیہوں وغیرہ آپ ﷺ کے دور میں ناپ سے فروخت ہوتی تھیں، لیکن اب ہمارے علاقوں میں عموماً وزن سے لین دین ہوتا ہے، پھر بھی یہ کیلی شمار ہوں گے، اور اسی جنس سے فروخت کے وقت ناپ میں مساوات لازم ہے، نہ کہ وزن میں)

جو شئے آپ ﷺ کے دور مسعود میں نہ تھی جیسے کافی، قہوہ، چائے وغیرہ، یا تھی لیکن اس کا حال نامعلوم ہو، تو اگر اس کا ناپ ممکن نہ ہو، یعنی بڑی اشیاء ہوں کہ درمیان میں کافی خلا باقی رہتا ہو جیسے سیب، انار اور بینگن وغیرہ تو اس میں وزن کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر ناپ ممکن ہو تو اس میں بیع کے علاقہ کے عرف وعادت کا اعتبار ہوگا۔

امام ابویوسف کا قول: حنفیہ میں امام ابویوسف رحمہ اللہ کسی بھی شئے کے مکیل یا موزون ہونے میں علاقہ کے عرف اور عادت کا اعتبار کرتے ہیں، پس جس جگہ جو چیز وزن سے فروخت ہوتی ہے وہ موزون اور جو کیل سے فروخت ہوتی ہو وہ مکیل کہلائے گی۔

ان کی رائے میں نص کا تعلق بھی عرف سے ہے، آپ ﷺ نے بعض اشیاء کے کیل اور بعض کے وزن کی صراحت اس وقت کے عرف کے اعتبار سے فرمائی ہے، اگر عرف اس کے برعکس ہوتا تو آپ ﷺ کی صراحت بھی برعکس ہوتی۔

بعض متاخرین حنفیہ نے اس قول پر عمل کو ترجیح دی ہے، اور شاید لوگوں کی سہولت اور انہیں گناہ سے بچانے کے لئے یہی بہتر ہوگا، ورنہ اکثر علاقوں میں لوگوں کے معاملات کو فاسد و باطل قرار دینا پڑے گا، اور انہیں فاسق اور گنہگار ٹھہرانا ہوگا، لہٰذا ہماری رائے میں اس قول پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (یہ اصحاب الفقہ المنہجی کی رائے ہے)

(ب) ممثالت کا اعتبار کب ہوگا:

۱) اگر ربوی چیز کا ناپ یا وزن مختلف حالات میں جدا ہو، اور اس کے تری و خشکی کی حالت مختلف ہو، تو اس میں خشک ہونے کے بعد مماثلت کا اعتبار ہوگا، جو کہ پختگی کے کمال کی حالت ہے،

لہٰذا۔ اناج کو آپس میں خرید و فروخت کرنے کے لئے اس کا خشک اور سخت ہونا ضروری ہے، نیز چھلکوں کی صفائی بھی ہو، تاکہ مماثلت کا تحقق ہو۔

اور کھجور کے کھجور سے تبادلہ کے لئے اس کا تمر بننا (خشک ہونا) ضروری ہے، رُطب (تر کھجور) کو رُطب کے عوض یا رُطب کو تمر کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

اور انگور کو انگور یا کشمش کے عوض فروخت نہ کرے، کیونکہ اس میں کمال یہ ہے کہ وہ کشمش بنے۔ اسی طرح کسی بھی میوہ کو اسی جنس سے خشک حالت کے بغیر فروخت نہ کرے۔ (جیسے زرد آلو، انجیر) نہ تر کو تر کے عوض فروخت کرے اور نہ تر کو خشک کے عوض۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سے رُطب (تر کھجور) کے عوض تمر (خشک کھجور) خریدنے کے متعلق

پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے حاضرین سے دریافت فرمایا۔ ''کیا رُطب خشک ہونے کے بعد گھٹ جاتا ہے''؟ تو صحابہ کرام نے عرض کیا: جی ہاں۔ تب آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا اور فرمایا کہ اہلِ علم کا اس پر عمل ہے۔ (ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، مؤطا)

۲) اگر وہ چیز خشک نہ ہوتی ہو، جیسے ککڑی، وہ کھجور جو خشک نہ ہو، یا وہ انگور جو کشمش نہ بنے اور زیتون، تو ایسی اشیاء میں تر حالت میں مماثلت کافی ہے، اور وزن سے فروخت کی جائے، چاہے وہ مکیل ہو۔

۳) اناج سے جو چیز بنائی جائے، مثلاً آٹا وغیرہ اسے اسی جنس سے برابری کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں اور نہ اس اناج سے جس سے وہ بنا ہو، کیونکہ وہ حالتِ کمال سے نکل چکا، اور اس حالت میں مماثلت کا علم ممکن نہیں۔

البتہ ایسی چیز کسی دوسرے جنس سے برابر یا کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، مثلاً گیہوں کا آٹا، چاول کے آٹے کے عوض، کیونکہ جنس جدا ہے، لیکن حلول اور تقابض شرط ہے۔

۴) جن دانوں سے تیل نکالا جاتا ہے، ان میں دانے کی حالت میں اور تیل کی حالت میں مماثلت کا اعتبار ہوگا جیسے تل، مونگ پھلی وغیرہ (لہٰذا تل کو تل کے عوض یا تل کے تیل کو تل کے تیل کے عوض فروخت کر سکتے ہیں) لیکن دانے کو تیل کے عوض فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ مساوات کا ثبوت نہ ہوگا (لہٰذا تل کو تل کے تیل کے عوض فروخت کرنا منع ہے)

۵) انگور اور کھجور کے شیروں اور سرکوں میں بھی آپس میں مماثلت کافی ہے۔

۶) دودھ میں پانی یا کسی اور چیز کی آمیزش کے بغیر خالص حالت میں مماثلت کا اعتبار ہوگا۔

ج) مماثلت سے مانع امور (رکاوٹ)

۱) **آگ کی تاثیر:** کسی ربوی چیز کو آگ پر پکایا گیا یا بھونا گیا ہو تو اسے اسی جنس سے فروخت کرنا جائز نہیں (جیسے جوش دیا ہوا دودھ، بُھنا ہوا گوشت وغیرہ) کیونکہ حقیقی مماثلت دشوار ہے۔

موم سے شہد، دودھ سے گھی اور سونے چاندی سے کھوٹ کو جدا کرنے کے لئے آگ میں تپایا یا پکایا ہو تو اس میں حرج نہیں۔

۲) **مُخَالَطَة:** (اختلاط، خلط ملط کرنا اور ملانا): کسی ربوی مال میں اس کے جنس کے علاوہ کوئی اور چیز مخلوط (ملی ہوئی) ہو، خواہ وہ مخلوط ربوی ہو یا غیر ربوی، مماثلت کا تحقق اور یقین نہ ہو سکے گا، نتیجتاً اسے اسی جنس کے عوض فروخت کرنا ممنوع ہوگا، چاہے بالمقابل جنس خالص ہو یا مخلوط۔ اسی لئے پنیر وغیرہ میں مماثلت کا اعتبار نہ ہوگا۔

مماثلت یقینی ہو، محض گمان و تخمین کافی نہیں

مسئلہ گذر چکا کہ کسی ربوی شئے کی اسی جنس کے عوض خرید و فروخت کی صحت کے لئے دونوں بدل میں کیل یا وزن میں مساوات شرط ہے۔ اس مساوات اور مماثلت کا عقد کے وقت بالیقین موجود ہونا ضروری ہے، لین دین سے قبل ہی دونوں بدل کا کیل یا وزن ہو جائے، یا دونوں کی مقدار دونوں عاقدین کو معلوم ہو۔

صرف گمان میں اور اندازاً مماثلت کافی نہیں، مثلاً گیہوں کا ایک ڈھیر دوسرے ڈھیر کے عوض اٹکل سے فروخت کرے، یعنی بغیر کیل یا وزن کے، یہ سمجھتے ہوئے کہ دونوں برابر ہوں گے، یا ۱۰۰ صاع گیہوں ایک ڈھیر گیہوں کے عوض فروخت کرے، جس کے متعلق اندازہ یہ ہو کہ ۱۰۰/ صاع ہوگا، تو یہ دونوں بیع ممنوع ہے۔ کیونکہ دونوں میں کمی بیشی کا احتمال ہے، اور اتحادِ جنس کی صورت میں ربوی

اشیاء کی فروخت کی صحت کے لئے تفاضل (کمی بیشی) کا احتمال نہ ہونا شرط ہے، کیونکہ تفاضل کا احتمال یقینی تفاضل کی طرح ہے۔

آپ ﷺ نے کھجور کے ایک ڈھیر کو جس کی مقدار نامعلوم ہو، متعین مقدار کھجور کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا فرمان ہے۔ "جب بھی کسی مسئلہ میں حلال و حرام کا اجتماع ہو، تو حرام ہی کو غلبہ ہو گا" یعنی کسی موقع پر دو امر وارد ہو: ایک حلت کا اور دوسرا حرمت کا مقتضی ہو، تو تقاضائے حرمت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے روکا جائے گا، تاکہ شبہات کے ارتکاب سے دور رہے اور دینی امور میں احتیاط کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ مذکورہ مسئلہ میں عدم تفاضل کا احتمال حلت کا، اور تفاضل کا احتمال حرمت کا مقتضی ہے، لہٰذا حرمت کو ترجیح دی جائے گی۔

مُزَابَنَه: درخت پر موجود تازہ کھجور کو توڑے گئے خشک کھجور کے عوض اندازاً مساوات کے ساتھ فروخت کرنے کو مزابنہ کہتے ہیں، اسی طرح انگور و کشمش کو فروخت کرنا بھی مزابنہ ہے۔

مُحَاقَلَه: بالیوں میں موجود اناج کے عوض اندازاً اس کے مساوی صاف کیا ہوا اناج فروخت کرنا محاقلہ کہلاتا ہے۔ مزابنہ اور محاقلہ میں دونوں بدل میں یقینی مساوات نہ ہونے کی بناء پر یہ دونوں شرعاً ممنوع ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے اس طریقِ بیع سے منع فرمایا ہے۔

عَرَایا: صاحبِ باغ اپنے کھانے کے لئے جس درخت کا انتخاب کر کے اسے مستثنیٰ رکھے، اسے لغت میں عَرِیّہ (جمع۔ عَرَایا) کہتے ہیں۔

درخت پر موجود تازہ کھجور کا اندازہ لگا کر اس کے مساوی خشک کھجور کے عوض اسے فروخت کرنا، یا اسی طرح انگور کو کشمش کے عوض فروخت کرنا، جبکہ ۵/وسق سے کم مقدار ہو، (یعنی تقریباً سات سو کلو گرام کے مساوی) تو شرعاً اسے عریہ (عرایا) کہا جاتا ہے۔

لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر مزابنہ کی عام ممانعت سے شریعت نے عرایا کی مذکورہ صورت کو مستثنیٰ قرار دیا، اور اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔

صحیحین میں حضرت سہل بن ابی حثمہ، ابو ہریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم سے کھجوروں میں بیع العرایا کی رخصت کی روایات موجود ہیں۔ انگوروں کو بھی چونکہ کھجوروں کی طرح خشک کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے، اور اس میں بھی اندازہ لگانا ممکن اور دونوں ہی زکوی مال ہیں، اسلئے انگور کو بھی کھجور پر قیاس کیا گیا۔

گوشت کو گوشت کے عوض، گوشت کو حیوان کے عوض اور حیوان کو حیوان کے عوض فروخت کرنا

گوشت کو گوشت کے عوض فروخت کرنا: مسئلہ گزر چکا کہ گوشت اپنے اصل کے مطابق جنس شمار ہو گا اور یہ ربوی مال ہے، لہٰذا ایک ہی جنس کا گوشت ہو (مثلاً گائے کے گوشت کو گائے کے گوشت کے عوض فروخت کرنا) ہو تو تماثل، حلول اور تقابض کی شرط کے ساتھ جائز ہے۔ اگر جنس مختلف ہو، مثلاً بکری کا گوشت گائے کے گوشت کے عوض، تو تفاضل (کمی بیشی) جائز ہے، البتہ حلول اور تقابض شرط ہے۔

حیوان کے عوض گوشت کو فروخت کرنا: حیوان کے عوض گوشت کی فروخت مطلقاً ناجائز ہے، نقد ہو یا اُدھار، گوشت اسی حیوان کے جنس کا ہو یا کسی اور جنس کا، حیوان ماکول اللحم ہو (جیسے بکری کے عوض گائے کا گوشت) یا غیر ماکول اللحم (جیسے گائے کا گوشت گدھے

کے عوض)، پس تمام صورتوں میں یہ بیع ناجائز ہے۔

گوشت ہی کی طرح دیگر کھائے جانے والے اعضاء واجزاء کا حکم ہے۔ مثلاً چربی، چکتی، جگر، دل، گردہ، تلی وغیرہ۔

چمڑے کو دباغت کے بعد حیوان کے بدلہ فروخت کرنا جائز ہے، کہ اب وہ گوشت کے حکم میں نہ رہا، البتہ دباغت سے پہلے چمڑہ بھی گوشت کے حکم میں ہے، اس لئے اس کے بدلہ حیوان کی فروخت جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی اصل دلیل حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ”آپ ﷺ نے بکری کو گوشت کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا“ (الحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد)

اور امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت نقل کی ہے کہ ”آپ ﷺ نے حیوان کو گوشت کے بالمقابل بیچنے سے منع فرمایا ہے۔“ (مؤطا۔البیوع)

حیوان کو حیوان کے بدلہ بیچنا: گزشتہ تفصیلات سے یہ واضح ہو چکا کہ حیوان ربوی مال نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت اور ہیئت پر کھانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ اثمان میں داخل ہے۔

لہٰذا حیوان کو حیوان کے عوض تفاضل (کمی بیشی) کے ساتھ بیچنا جائز ہوگا، خواہ دونوں ایک ہی نوع کے ہوں یا الگ الگ نوع کے، پس ایک بکری دو کے عوض، ایک بکری ایک اونٹ کے عوض، ایک اونٹ تین بکری کے عوض وغیرہ بیچنا جائز ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ جانور سواری اور بار برداری اور کھانے اور نسل بڑھانے کے قابل ہے، یا صرف کھانے کے قابل ہے۔

اسی طرح حالاً اور مؤجلاً (نقد اور ادھار) بھی جائز ہے، مجلسِ عقد ہی میں قبضہ ہو یا نہ ہو، اور دونوں بدل ایک ہی جنس ہوں یا مختلف جنس۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ”آپ ﷺ نے انہیں ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا، تو اونٹ ختم ہو گئے، تب آپ ﷺ نے صدقہ کے اونٹوں کے بدلہ خریدنے کا حکم دیا، لہٰذا وہ ایک اونٹ دو اونٹ کے عوض (ادھار) خریدتے، کہ صدقہ کے اونٹ سے (بعد میں) ادا کریں گے۔“ (رواہ ابوداود وذکر لہٗ البیہقی شاہدا صحیحا)

سودی تعامل (لین دین) کا حکم، اس پر مرتب اثرات کے اعتبار سے

ربوی (سودی) مال کی خرید وفروخت میں شریعت کے مقررہ شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا، جس کی تفصیلات سابقاً گذر چکیں، تو یہ عقد باطل قرار پائے گا، لہٰذا اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، گویا کہ عقد ہوا ہی نہیں، کیونکہ معاوضات اور لین دین میں سود اِسے باطل کر دیتا ہے۔

اس عقد کے بطلان کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عاقدین اپنا اپنا بدل واپس لوٹالیں، پھر از سرِ نو صحت عقد کے تمام شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے عقدِ جدید کریں، ورنہ دونوں بھی گنہگار ہوں گے، اللہ کی طرف سے سخت عذاب وگرفت کے مستحق ہوں گے اور ان دونوں کی یہ کمائی حرام اور خبیث ہوگی۔

ربا القرض (قرض کا سود)

ربا القرض یعنی کسی سے اس شرط پر متعینہ مدت کے لئے مال قرض لینا کہ وہ اسے قرض کو مع متعین اضافہ کے لوٹائے گا، یا قرض کی واپسی تک بطور نفع وفائدہ متعین قسط قرض خواہ کو ادا کرتا رہے گا۔

شریعت کے نصوص و دلائل اولاً اور براہ راست اسی سودی تعامل سے روکنے اور اسے باطل قرار دینے کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں اسی سودی لین دین کا رواج تھا، سرِ مو اس میں اور اُس میں تفاوت نہ تھا، اسی لئے دورِ حاضر کے بعض حریصوں کی طرح اس وقت کے لوگوں نے سود کے حرص اور مالی رغبت میں اس کے جواز کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ یہ نفع حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے، اس میں اور بیع (خرید و فروخت) میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے بڑی سختی سے اس کی تردید کرتے ہوئے ان کے اس لچر استدلال اور پاگل پن کا پول کھول کر رکھ دیا، اور اس دور از کار قیاس پر سخت دردناک سزا اور ہمیشہ جہنمی زندگی کی دھمکی دی۔

آیت: اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ (البقرۃ: ۲۷۵-۲۷۶)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنادے لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے، اور سود کو حرام کر دیا ہے، (تو اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ اس سے باز آگیا تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے۔ وہ اسی کا رہا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالہ رہا۔ اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جاوینگے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھا دیتے ہیں۔ (کبھی تو دنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو۔"

اس طرح مذکورہ آیت نے بڑی صراحت اور وضاحت سے مطلقاً سود کے حرمت کا اعلان کیا، قلیل و کثیر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا، سود سے باز آنے کی ترغیب دی، اور دوبارہ اسے اختیار کرنے پر سخت دھمکی دی۔

پھر اگلی آیات نے مومنوں کو مطلقاً اس سے باز آنے کا حکم دیا، اور اسے ایمان کی صحت کی شرط و دلیل قرار دیا، اور سودی معاملات پر اصرار کی صورت میں ایسی سخت دھمکی دی جو کسی اور گناہ پر نہیں دی، پھر بہتر انسانی سلوک کی رہنمائی کی جس سے آپسی تعاون اور معاشرہ میں محبت و موٗدت کی فضاء قائم ہو۔

آیت: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (البقرۃ:۲۷۸ تا ۲۸۱)

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا مقتضا اطاعت کرنا ہے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کروگے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تم پر جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلوگے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے

پاوے گا۔ اور اگر (مدیون و مقروض) تنگدست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اسکے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔ اور (مسلمانوں) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگذاری درست رکھو اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)

قرآن کریم کی مذکورہ آیات کے ساتھ ساتھ بکثرت روایات صحیحہ نے بھی سود کی حرمت کو مؤکد کیا ہے، اسے کبیرہ اور مہلک گناہوں میں شمار کیا، اور اس کے مرتکب کو ہلاکت وبربادی سے ڈرایا اور جس معاشرہ میں یہ رواج پایا جائے اس کے ضیاع اور نیست ونابود ہونے سے آگاہ اور متنبہ کیا ہے۔

احادیث: (۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے (لینے والے) اور کھلانے والے (دینے والے)، اور لکھنے والے (سودی کاروبار کے منشی وکلرک) اور دونوں گواہ پر لعنت بھیجی ہے۔ اور فرمایا: وہ سب برابر ہیں (یعنی گناہ میں)" (رواہ مسلم)

۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سات مہلکات سے بچو" صحابہ کرام نے پوچھا: یارسول اللہ، وہ کیا ہیں؟ تو فرمایا: "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو، جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا اسے بغیر حق (اور شرعی جواز) کے قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، کفار سے جہاد کے دوران میدان سے راہِ فرار اختیار کرنا، عفت مآب پاکیزہ اور بھولی بھالی مومن خواتین پر (زنا کی) تہمت لگانا" (متفق علیہ)

۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زنا اور سود کسی بستی میں ظاہر ہو تو انہوں نے اپنے اوپر عذابِ الٰہی کو دعوت دی۔" (حاکم فی المستدرک، احمد، طبرانی)

مذکورہ آیات واحادیث سود کی حرمت وشناعت کے لئے کافی ہیں، سود کو شرک وسحر کے ساتھ بیان کیا گیا اور زنا جیسے جرم کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا، اسی لئے تمام مسلمانوں کا سود کی حرمت پر اجماع ہے۔ بالاتفاق یہ اکبر الکبائر میں سے اور موجب فسق ہے۔ اور جب تک آدمی اس سے صحیح توبہ نہ کرے اس کا کوئی عمل صالح مقبول نہ ہوگا، بلکہ تمام آسمانی مذاہب سود اور سودی تعامل کی حرمت پر متفق ہیں، قرآن مجید نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ بنو اسرائیل کو اس سے روکا گیا تھا، اور جس لعنت وعذاب کے وہ مستحق ہوئے، اس کا ایک سبب اس حکم کی خلاف ورزی بھی تھی۔ (دیکھئے۔ سورہ نساء۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱)

سودی تعامل اور لین دین ہر جگہ اور ہر کسی کے ساتھ حرام ھے، خواہ دارالحرب ہو یا کسی غیر مسلم ذمی یا حربی کے ساتھ معاملہ ہو۔ اسی طرح مروجہ بینک کے ساتھ بھی سودی کاروبار حرام ہے، بعض دنیا پرست مختلف تاویلات اور لچر دلائل کے ذریعے بینکوں کے سود کو، یا غیروں کے بینک سے سود وصول کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، جو قطعاً باطل ہے۔ (البتہ مجبوری کے درجہ میں حکومت کے قوانین اور کاروباری مسائل کے اعتبار سے بینکوں کے ذریعے رقوم کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے، لیکن سود کی نیت سے گنجائش نہ ہوگی، جو سود نکلے اسے مفتیان کرام فقراء ومساکین پر صدقہ کردینے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سود سے متعلق بعض جدید مسائل

دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۸۹ء میں مندرجہ ذیل امور پر اتفاق کیا گیا۔

۱) **ربوا (سود) قطعی حرام ھے**، اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲) **بعض خاص حالات** میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں، اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳) **ھندوستان میں محض سرکاری قرضے** ایسے ہیں جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے، اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ کے مساوی یا اس سے کم ہو، تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴) **ھندوستان میں حکومت** جب اراضی مملوکہ کو اکوائر کرتی ہے (یعنی سرکاری حکم سے لوگوں کے ملکیت کی زمین مفاد عامہ کے لئے جبراً خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکوں کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشاء کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں، سیمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں، بلکہ قیمت کا جز ہے، جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

۵) **بینک انٹریسٹ بھی سود ھے**، اسے بینکوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ نکال کر ثواب کی نیت کے بغیر فقراء و مساکین پر خرچ کر دیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے، سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا، اکثر شرکاء سیمینار کی رائے میں اسے رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء و مساکین تک محدود رکھنا چاہئے۔ (تلخیص از مجلہ فقہ اسلامی۔ ترتیب مجاہد الاسلام قاسمی ص ۵۷۱-۵۷۲)

بیع سَلَم (سَلَف)

عربی زبان میں سَلَم تقدیم (مقدم کرنا۔ پہلے دینا) کو کہتے ہیں، شرعاً کسی موصوف چیز کی ذمہ میں بیع جو بلفظ سلم یا سلف ہو، بیع سلم کہلاتی ہے یہ معدوم اور بائع کے پاس فی الحال غیر موجود چیز کی بیع ہے، لیکن اسے (بعض مصالح کی وجہ سے) مستثنیٰ اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

مشروعیت: معدوم کی بیع ناجائز ہونے کے باوجود لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر، شریعت اسلامیہ نے بیع سلم کی اجازت دی ہے۔

حدیث: (۱) جس وقت آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ ایک سال اور دو سال کی مدت پر پھلوں میں بیع سلم کیا کرتے، لہٰذا آپ ﷺ نے فرمایا۔ 'جو بیع سلم کرے، تو معلوم پیمانہ (ناپ)، اور معلوم وزن (تول) میں اور معلوم مدت کے لئے کرے" (متفق علیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ)

۲) حضرات عبد الرحمن بن ابزیٰ اور عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے "ہم لوگوں کو آپ ﷺ کی معیت میں مال

غنیمت ملتا تھا، اور ہمارے پاس شام کے لوگ آتے تھے تو ہم ان سے گیہوں، جو اور تیل میں ایک متعینہ مدت کے لئے بیع سلم کرتے" ان سے پوچھا گیا۔ "کیا ان لوگوں کے پاس کھیتی باڑی تھی بھی یا نہیں؟" تو فرمایا "ہم لوگ ان سے یہ سب دریافت نہ کرتے" (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ادھار (قرض) کے جواز پر قرآن پاک کی آیت (سورۃ البقرہ۔ آیت ۲۸۲) سے بھی بیع سلم کے جواز کے لئے استدلال کیا، کیونکہ یہ بھی ایک طرح کے ادھار کا معاملہ ہے، لہٰذا آیت کی روشنی میں یہ بھی جائز ہوگا۔ (عام طور پر قیمت ادھار ہوتی ہے، لیکن بیع سلم میں اس کے برعکس قیمت فوراً اور چیز ادھار ہوتی ہے)

حکمت: معدوم کی بیع ہونے کے اعتبار سے قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ بیع سلم کی اجازت نہ ہوتی لیکن لوگوں کی حاجتوں کے پیشِ نظر اجازت ملی، کیونکہ مختلف اہل پیشہ اور کاشت کار و باغبانوں کو بعض مرتبہ اپنے پیشہ کو چلانے اور پیداوار کو بڑھانے وغیرہ کے لئے مال کی ضرورت پیش آئے گی اور بوقت ضرورت ممکن ہے بطور قرض دینے والا کوئی نہ ملے، یا کسی وجہ سے وہ خود نہ چاہے، لہٰذا شریعت نے یہ رخصت اور سہولت عنایت فرمائی کہ پہلے ہی بطور قیمت کسی سے مال لے کر اپنی ضروریات میں صرف کرے اور مقررہ وقت پر سامنے والے کو وہ چیز فراہم کرے۔

اسی طرح جو تاجر اسباب خریدنا چاہتے ہیں اور رقم موجود ہے، لیکن فی الحال کوئی فروخت کرنے والا نہیں ہے، تو ان کو یہ سہولت دی کہ مال ابھی صرف کریں اور اسباب بعد میں وصول کریں۔

بہر حال شریعت نے بیع سلم کے ذریعے مختلف مصلحتوں سے لوگوں کو ہمکنار کیا، نفع پہنچایا، اور مال کو بلاوجہ اور بے کار پڑے رہنے سے بچایا، جس پر کہ معاش کا دارومدار ہے، اور جواز کے لئے ایسے شرائط و قیود لگادیئے کہ معدوم کی بیع میں جو خطرات ہوسکتے تھے، اس کا تدارک اور اس سے حفاظت ہوگئی۔

ارکان وشرائط

بیع سلم کے چار ارکان ہیں، عاقدین، صیغہ، سلم کا رأس المال (یعنی قیمت)، مُسْلَمٌ فِیہ (یعنی وہ چیز جس کی بیع سلم ہو رہی ہے۔) ان میں سے ہر ایک کے کچھ شرائط ہیں۔

۱) **عاقدین:** یعنی ایک تو خریدار جو مطلوبہ چیز کے مقابلہ میں پہلے ہی قیمت دے رہا ہے۔ اسے مُسلِمْ کہیں گے۔

اور دوسرا فروخت کرنے والا، جو قیمت وصول کر رہا ہے تاکہ اس کے بدلہ میں چیز ادا کرے، اسے مُسْلَم اِلَیْہِ کہیں گے۔

بائع اور خریدار میں عقل، بلوغ اور اختیار وغیرہ جو شرائط ضروری ہیں ان دونوں میں بھی ضروری ہیں۔ البتہ یہاں بینا ہونا ضروری نہیں، جبکہ عام بیع میں یہ ضروری تھا، کیونکہ بیع میں عاقدین کا مبیع کو دیکھنا ضروری تھا، اور سلم میں مبیع ادھار ہے اور اس کے اوصاف متعین کردیئے گئے ہیں، جو صرف سماعت (سننے) سے حاصل ہوجائیں گے، چیز کے قبضہ کے وقت کسی بینا کو وکیل بنادینا کافی ہے، تاکہ مذکورہ صفات کی تحقیق ہوسکے۔

۲) **صیغہ:** یعنی ایجاب و قبول کے الفاظ۔ مثلاً خریدار کہے "میں تم کو یہ ہزار روپے دے رہا ہوں ۲۵ میٹر فلاں فلاں صفت کے کپڑے میں بیع سلم کے طور پر، اور مُسْلَم الیہ کہے "میں نے قبول کرلیا" وغیرہ۔ بیع کی طرح ایجاب و قبول میں اتحاد مجلس اور ایک دوسرے کی موافقت وغیرہ ضروری ہیں۔ نیز لفظ سَلَم یا سَلَف کے ساتھ صیغہ شرط ہے، کسی اور لفظ سے صحیح نہ ہوگا۔ مزید عقد سلم حتمی ہو،

اس میں خیار شرط کا دخل نہ ہو، البتہ خیار مجلس حاصل ہو گا، کیونکہ یہ خیار دونوں کی جدائی کے ساتھ ہی ختم ہو گا، لہٰذا اس کا سلم کے شرائط سے ٹکراؤنہ ہو گا۔ بخلاف خیار شرط کے۔

۳) **رأس المال**: یعنی وہ قیمت جو خریدار ادا کرتا ہے، اس میں مندرجہ شرائط ضروری ہیں۔

(الف) عاقدین اس کی مقدار وصفت سے واقف ہوں۔ مثلاً ہزار روپے وغیرہ ناپ تول کی اشیاء بطور قیمت ادا کر رہا ہو تو اسی اعتبار سے مقدار کی تعیین، نیز اس کی صفات کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً سو کلو فلاں قسم کے گیہوں۔ اگر چیز سامنے موجود ہو تو صرف مقدار کی تعیین کافی ہے، صفات کے تذکرہ کی ضرورت نہیں، کہ وہ دکھائی دے رہی ہے۔

(ب) مجلس عقد میں ہی خریدار قیمت ادا کرے اور مُسلَم اِلیہ اس پر قبضہ کرلے، دونوں کے اس مجلس سے جدائی سے قبل یہ لازم ہے، کیونکہ سلم کا اصل مفہوم ہی سپرد کرنا ہے، لہٰذا ایہ نہ پایا گیا تو عقد ہی نہ ہو گا، مزید یہ **بَیْعُ الدَّیْنُ بِالدَّیْنِ** کے مشابہ ہو گا، جو کہ ممنوع ہے۔ حقیقی قبضہ شرط ہے، اگر قیمت کو کسی اور کے حوالہ کرے (کہ مسلم الیہ اس سے وصول کرلے) تو صحیح نہ ہو گا، کیونکہ حوالہ قبضہ نہیں ہے۔

۴) **مُسْلَمٌ فِیْه**: یعنی جو چیز فروخت کی جارہی ہے، اور جس کی ادائیگی کا بائع وعدہ کر رہا ہے۔ اس میں یہ شرائط ہوں۔

(الف) ایسی چیز ہو کہ اوصاف کے ذریعے اس کا ضبط ممکن ہو، جن کے اختلاف سے اغراض کا فرق ہوتا ہے، اس حد تک ضبط اور تعیین ہو سکے کہ کسی خاص اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہ سکے، معمولی سا تفاوت جس سے لوگ درگذر کرتے ہوں، اس میں حرج نہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں آپ ﷺ اور شیخین کے دورِ مسعود میں گیہوں، جو، کشمش اور کھجور میں بیع سلم کا ذکر ہے، اور یہ ساری اشیاء ایسی ہیں، جن کا ضبط ممکن ہے، حضرت ابن عباسؓ نے کرابیس (ایک مخصوص قسم کا کپڑا) میں سلم کی اجازت دی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ریشم کے کپڑے میں سلم کی اجازت دی۔ ان پر دیگر ہر اس شئ کو قیاس کیا جائے گا، جس کا وصف کے ذریعہ ضبط ممکن ہو، خواہ پہلے سے پائی جاتی ہو، یا اب پائی جارہی ہے یا ایسی چیز جو کہ آئندہ پائی جائے گی، گو وہ مثلی نہ ہو۔

اگر وصف سے ضبط ممکن نہ ہو تو اس میں بیع سلم جائز اور صحیح نہیں کیونکہ اوصاف کی لاعلمی آئندہ نزاع کا سبب بنے گی۔ مثلاً کھال، نفیس جواہر، وغیرہ......

آگ پر پکی اور بھنی ہوئی اشیاء میں بھی سلم درست نہیں ہے، کیونکہ آگ کی تاثیر کا فرق ہو گا، لہٰذا ضبط ممکن نہیں، اگر صرف تمیز اور جدائی کے لئے آنچ دی گئی ہو، جیسے گھی جدا کرنے کے لئے، شہد سے موم جدا کرنے کے لئے گرم کرنا، تو اس میں بیع سلم صحیح ہے، کیونکہ اس صورت میں آگ کی تاثیر معمولی ہوتی ہے۔

(ب) اس کی جنس، نوع، مقدار اور صفت سے دونوں عاقدین واقف ہوں، جیسا کہ ابتداء میں حدیث میں گزر چکا۔

(ج) مختلف اشیاء سے مرکب ومخلوط چیز نہ ہو، مثلاً جَو وغیرہ ملا کر بنایا ہوا چارہ، مشک وعنبر وغیرہ ملا کر بنائی گئی خوشبو، جبکہ اس میں ہر چیز کا تناسب نامعلوم ہو۔

اگر مرکب میں موجود مختلف اشیاء کی مقدار اور ان کا تناسب معلوم ہو، اور وصف سے ضبط ممکن ہو، تو سلم صحیح ہے۔ مثلاً اون اور روئی سے بنا ہوا کپڑا جبکہ دونوں کا تناسب معلوم ومتعین ہو۔ اسی طرح صرف کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس میں (نمک وغیرہ) کوئی چیز ملائی گئی ہو تو اس میں سلم صحیح ہے۔

(د) مُسلَم فیہ دین ہو، یعنی معین نہ ہو بلکہ ذمہ میں ہو، صرف اس چیز کے اوصاف بیان ہوئے ہوں، مثلاً ہزار روپئے سپرد کرے

فلاں صفات کے دس کپڑوں کے لئے۔ اگر یوں کہے کہ ان دس کپڑوں میں بیع سلم کے طور پر یہ ہزار روپے دے رہا ہوں، اور وہ کپڑے سامنے موجود اور معین ہوں تو یہ عقد سلم صحیح نہیں ہے، کیونکہ سلم کی مشروعیت تعیین کے بغیر صرف اوصاف کی بنیاد پر ذمہ میں فروخت کرنے کے لئے ہے، خود لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور نہ اس طرح (عام) بیع منعقد ہو گی، کیونکہ لفظ سلم استعمال ہوا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ چیز دین ہو، اور 'یہ کپڑے' کہنا مبیع کو معین کر دیتا ہے، اس طرح دونوں لفظ میں تعارض ہوا، لہٰذا یہ عقد صحیح نہ ہو گا۔

(ھ) اس کی سپردگی پر قادر ہو۔ غالب گمان ہو کہ مقررہ وقت پر طے شدہ چیز حاصل ہو گی، گو دوسری جگہ سے لانا پڑے۔ مقررہ وقت پر غالبًا نہ ملنے والی شئی میں بیع سلم صحیح نہیں۔ مثلاً سرما میں آم، انگور یا تازہ و تر کھجور وغیرہ۔ (اگر کسی دور میں یا کسی علاقہ میں اس موسم میں بھی یہ اشیاء دستیاب ہوں تو صحیح ہے)۔ اسی طرح جو نوع نادر و مشکل ہو، اس میں بھی صحیح نہیں۔ مثلاً مخصوص حجم (سائز) کا خربوزہ، یا ایسی جگہ کا جہاں وہ چیز بہت کم پائی جائے، کیونکہ کسی آفت یا بیماری کیوجہ سے وقت مقررہ پر ممکن ہے ادا نہ کر سکے۔

غالباً موجود شئ کسی سبب سے وقت مقررہ پر مہیا نہ کی جا سکے، تو عقد سلم فسخ نہ ہو گا، مسلم (خریدار) کو اختیار ہے کہ دستیاب ہونے تک انتظار کرے، یا ادا شدہ رقم بلا کسی کمی یا بیشی کے واپس لے اور عقد فسخ کرے۔

ایک مسئلہ کی طرف توجہ ضروری ہے، وہ یہ کہ مسلم فیہ کی جگہ دوسری چیز لینا جائز نہیں ہے۔ مثلاً گیہوں کے بدلہ گھی، کپڑے کے بدلہ لوہا وغیرہ۔ بلکہ مزید انتظار نہیں کرتا ہے تو پہلے عقد سلم فسخ کر دے، پھر قیمت واپس لے کر خود اسی مسلم الیہ سے یا کسی دوسرے سے جو چاہے خرید لے، یا قیمت مسلم الیہ کے ذمہ باقی رہے، پھر مسلم الیہ اس کے بدلہ کوئی اور چیز فروخت کرے، یا قیمت ہی لوٹا دے۔

نیز اس کا خیال بھی رہے کہ خریدار مُسْلَم فیہ (چیز) پر قبضہ کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو فروخت نہیں کر سکتا، جیسا کہ آج کل کئی تاجر کرتے ہیں۔ اگر اس طرح کرنا ہو تو اس کی جائز اور صحیح شکل یہ ہے کہ خریدار بھی دوسرے کو بطور بیع سلم فروخت کرے، پھر وقت مقررہ پر اس میں سے یا کسی اور جگہ سے موصوفہ چیز ادا کر دے۔

(و) مُسْلَم فیہ کی ادائیگی کے وقت کی تعیین، مثلاً ایک ماہ کے بعد دو، ایک رمضان کو ادا کرو وغیرہ۔ مدت کا ذکر نہ ہو، یا ذکر ہو لیکن متعین نہ ہو مثلاً فلاں جب سفر سے لوٹے، میر ادھان جب کٹے وغیرہ تو صحیح نہیں، کیونکہ مدت مجہول ہے۔ فلاں کے لوٹنے اور دھان کٹنے کا وقت متعین نہیں، آگے پیچھے ہو سکتا ہے، پھر آپس میں اختلاف و نزاع ہو گا۔ حدیث میں گزر چکا کہ "معلوم مدت کے لئے ہو"

اگر وقت مقررہ سے پہلے ہی مسلم الیہ، مسلم فیہ (چیز) مُسْلَمْ (خریدار) کی خدمت میں پیش کر دے، تو اسے قبول کر لینا لازم ہے، جبکہ بقیہ مدت میں اس کو مزید خرچ یا کلفت برداشت نہ کرنی پڑے اور متعینہ مدت میں شرعاً اس کی کوئی مناسب و معقول غرض نہ ہو، یا قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر نہ ہو۔ اگر حیوان ہے، جس میں اسے مزید خرچ ہو گا، یا لوٹ کھسوٹ کے ایّام میں سپرد کر رہا ہے تو وہ انکار کر سکتا ہے، اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اپنے وقت میں فروخت کرنے تک رکھنے کا انتظام اس کے پاس نہ ہو تو وہ انکار کر سکتا ہے۔

(ز) سپردگی کی جگہ کی تعیین لازم ہے، جبکہ جس جگہ عقد طے ہوا وہ اس قابل نہ ہو، یا قابل تو ہو، لیکن اسے وہاں منتقل کرنے میں مشقت و خرچ ہو۔ اگر وہ جگہ سپردگی کے قابل بھی ہو اور کوئی خرچ وغیرہ بھی نہ ہو، تو وہیں سپرد کرے، جبکہ عقد میں کسی دوسرے جگہ کی تعیین و صراحت نہ ہوئی ہو، کسی دوسرے جگہ کی صراحت ہو تو وہی متعین ہے۔ اختلاف کی صورت میں عرف کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔

عقد استصناع

عقد استصناع یعنی کسی کارگیر اور پیشہ ور سے اس سے متعلق کسی چیز کا حکم (آرڈر) دے کر بنوانا اور اسکے لئے درکار اشیاء بھی اسی کاریگر کی ہوں۔

دورِ حاضر میں اس کا عام رواج اور چلن ہے، لہٰذا اس مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے، پہلے اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

مثلاً موچی کو جوتے چپل وغیرہ تیار کرنے کا حکم دے، چمڑا اور دیگر ضروری اشیاء بھی اسی کی ہوں۔ بڑھئی سے لکڑی یا المونیم کی کوئی چیز بنوائی جائے (ٹیبل، کرسی، پلنگ وغیرہ) لکڑی وغیرہ اشیاء بھی اسی کی ہوں، اسی طرح شیشہ گر سے گلاس، کپ وغیرہ، لوہار سے چاقو چھری وغیرہ بنوانا۔ بستر، گدا وغیرہ اسبابِ خانہ بنوانا، جس کے نمونہ اور اوصاف کی وضاحت اور اس پر اتفاق ہو جائے۔

اس نوعِ عقد میں فقہاءِ کرام کا اختلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عقدِ سلم کے مذکورہ شرائط کا انطباق ہو، یعنی وصف کے ذریعہ ضبط، استعمال ہونے والے مواد اور اشیاء کا ضبط، سپردگی کی مدت کی تعیین، مجلس عقد میں قیمت کی حوالگی وغیرہ شرائط، تو اسے عقد سلم کا حکم دیتے ہوئے صحیح قرار دے سکتے ہیں، گو بیع کا لفظ استعمال ہوا ہو، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار معانی و مقاصد کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا۔

اگر سلم کے سابقہ شروط پائے نہ جائیں، جیسا کہ آج کل عموماً ہوتا ہے، بالخصوص مجلس عقد میں قیمت کی مکمل ادائیگی، کیونکہ اکثر بنوانے والے (آرڈر دینے والے) بوقتِ عقد قیمت کی ایک قسط ادا کرتے ہیں، بقیہ رقم قسط وار یا چیز تیار ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے، بلکہ کبھی بعد میں بھی رقم باقی ہوتی ہے، اور کاریگر اس کا مطالبہ کرتا ہے، کبھی بوقتِ عقد بالکل ہی قیمت کی ادائیگی نہیں ہوتی، عام معمول یہی سب ہے، تو یہ سلم نہ ہوا، نتیجتاً فقہاء شافعیہ رحمہم اللہ کے نزدیک صحیح نہ ہوگا۔ البتہ سادات حنفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک اس طرح کا معاملہ صحیح ہے۔ تعامل اور عام حاجت کے پیش نظر، بشرطیکہ عقد میں ساری باتوں اور چیز کی تفصیلات کی وضاحت ہو، تاکہ آئندہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔

لہٰذا ہمارے نزدیک (بقول مصنفین الفقہ المنہجی) اس مسئلہ میں سادات حنفیہ کے اس فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کی سہولت کی خاطر، اس قسم کے تعامل کو صحیح قرار دینے میں کوئی حرج نہیں، حالات اور لوگوں کے عام تعامل کا یہی تقاضہ ہے۔ سارے ہی فقہاء کرام اور ائمہ عظام حق ہی کی اتباع کرتے ہیں، اور رضائے الٰہی کے مطابق اور سنت رسولؐ کے موافق بندگانِ خدا کی مصلحتوں کی تلاش و جستجو میں کوشاں ہیں۔ واللہ اعلم

فلیٹ کی خرید و فروخت

ہماری رائے میں مکان اور فلیٹ کی، صرف نقشہ اور پلان کی بنیاد پر خرید و فروخت بھی اس قسم میں داخل ہے۔

لہٰذا تمام اوصاف منضبط ہوں، سیمنٹ، لوہا اور دیگر مستعمل اشیاء کی تفصیلات واضح ہوں اور قیمت مکمل مجلس عقد میں ادا کر دی جائے تو یہ عقد بطور بیع سلم کے صحیح ہوگا۔

اور اگر بیع سلم کے شروط کا پورا انطباق نہ ہو، جیسا کہ دورِ حاضر میں عام ماحول ہے، کیونکہ بوقتِ عقد پوری قیمت عموماً ادا نہیں کی جاتی، اور کوئی خریدار تعمیر میں مستعمل اشیاء کی تفصیلات سے واقف نہیں ہوتا، تو یہ عقد استصناع میں داخل ہوگا، اور اسے صحیح قرار دیا جائے گا، لوگوں کا مدت سے اس پر عمل ہے، بشرطیکہ متعلقہ ساری تفاصیل پہلے ہی طے ہو جائے، کوئی کسر اور جہالت باقی نہ رکھے، تاکہ آئندہ نزاع نہ پیدا ہو، اور ایسی کوئی شرط نہ ہو، جو شریعت الٰہی کے مخالف، فاسد و باطل ہو اور جس کی وجہ سے عقد باطل قرار پائے۔

قرض

عربی زبان میں لفظ 'قرض' کا معنی ہے 'کاٹنا' اور فقہی اصطلاح میں قرض کہا جاتا ہے۔ کسی مالی چیز کا دوسرے کو اس شرط پر مالک بنانا کہ وہ اس کا بدل بغیر اضافہ کے لوٹادے۔ اہلِ حجاز قرض کو سلَف کہتے ہیں، لہٰذا اس لفظ سے بھی قرض صحیح ہو گا۔

قرض جائز اور مشروع ہے، قرض کا محتاج قرض کا سوال کر سکتا ہے، اسے مانگنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جس سے قرض کا سوال ہو، اسے قرض دینا مستحب ہے، کتاب وسنت اور اجماع امت سے یہ ثابت ہے۔

آیت: "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا" (البقرہ:۲۴۵)

ترجمہ: کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے، اچھے طور پر قرض دینا، پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دیوے"۔ اور اللہ کو قرض دینے میں صدقات اور بندوں کو قرض دینا شامل ہیں۔

احادیث: (۱) ایک اعرابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی سختی سے اپنے قرض کا مطالبہ کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے دریافت کروایا کہ "اگر تمہارے پاس کھجور ہوں تو ہمیں قرض دو، جب ہمارے پاس کھجور آئیں گے تو قرض ادا کر دیں گے۔" (ابن ماجہ)

۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "کوئی بھی مسلم دو مرتبہ قرض دے تو ایک مرتبہ صدقہ کی طرح ہے۔" (ابن ماجہ۔ابن حِبّان)

۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے "جو لوگوں کے اموال ادا کرنے کی نیت سے لے تو اللہ تعالیٰ اس کی جانب سے ادا کر دیں گے۔ اور جو تلف کرنے کی نیت سے لے تو اللہ تعالیٰ اسے تلف کر دیں گے۔" (بخاری)

اجماع: آپ ﷺ کے دورِ مسعود سے آج تک امت کا قرض پر عمل رہا ہے اور علماء نے اسے بغیر کسی انکار کے صحیح سمجھا ہے۔

حکمت۔ قرض کی مشروعیت کی حکمت بالکل واضح ہے، نیکی اور تقویٰ کے امور پر مسلمانوں میں باہمی تعاون کو اجاگر کرنا، اور پریشان حال اور فاقہ مست افراد کی طرف دستِ تعاون دراز کر کے آپسی اخوت اور بھائی چارہ کے رشتہ کو مضبوط کرنا اور ایک دوسرے کی پریشانی کو دور کرنے میں جلدی اور پیشقدمی کرنا، کیونکہ کبھی کوئی بطور ہبہ یا صدقہ تعاون کرنے میں پس وپیش کر سکتا ہے، لہٰذا قرض کے ذریعہ یہ مقصد بسہولت حاصل ہو جائیگا۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ 'مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ہلاکت کے غار میں دھکیلتا ہے، اور جو اپنے بھائی کی حاجت میں لگا ہو، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں ہیں، جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف کا ازالہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کے بروز قیامت تکالیف میں سے کسی تکلیف کو دور کریں گے، جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ (رواہ البخاری)۔ ایک جگہ ارشاد گرامی ہے۔ "اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے کسی بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔" (رواہ مسلم)

قرض کی ایک اہم حکمت محتاجوں اور تنگدستوں کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانے کا خاتمہ کرنا ہے، کیونکہ عموماً ایک مکلف کسی حاجت سے ہی قرض لے گا، اب اگر اسے قرض حسَن نہ مل پائے تو سود اور انسانی خون چوسنے کا رواج چل پڑے گا، جیسا کہ تجربہ شاہد ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں قرض کا ثواب صدقہ سے بھی زائد بتلایا، آپ ﷺ فرماتے ہیں، کہ شب معراج میں، میں نے جنت کے دروازے پر

یہ لکھا پایا۔ "صدقہ کا ثواب دس گنا اور قرض کا اٹھارہ گنا ہے۔" تو میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں قرار پایا؟ تو جواب دیا کہ سائل اپنے پاس ہوتے ہوئے بھی سوال کرتا ہے اور ایک آدمی قرض حاجت کی وجہ سے ہی مانگے گا۔ (ابن ماجہ)

قرض کا حکم: سابقہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی کہ قرض دینا مستحب ہے، اور لینا مباح ہے، عام حالات میں یہ حکم ہے۔ قرض کے مقاصد و اغراض کے تحت اس حکم میں درج ذیل تبدیلی ہو گی۔

۱) **حرام:** اگر یہ معلوم ہو کہ سامنے والا کسی حرام کام میں صرف کرنے کیلئے قرض لے رہا ہے تو ایسی صورت میں قرض دینا حرام ہے مثلاً شراب پینے اور جوا کھیلنے وغیرہ۔

۲) **مکروہ:** اگر یہ معلوم ہو کہ بغیر مصلحت کے صرف کرنے کے لئے قرض لے رہا ہے، یا تکبر کرنے اور بکھیرنے کے لئے لے رہا ہے یا لینے والے کو معلوم ہو کہ میں ادائیگی سے قاصر رہوں گا تو مکروہ ہے۔

۳) **واجب:** جب معلوم ہو کہ قرض مانگنے والا اپنے یا اہل و عیال پر بقدر مشروع خرچ کرنے کا محتاج اور ضرورت مند ہے، اور اس سے قرض لینے کے علاوہ اس کا کوئی اور راستہ نہیں ہے تو قرض دینا واجب ہے۔

قرض کے ارکان: قرض کے تین ارکان ہیں (۱) صیغہ (۲) عاقد (۳) مَعقُود علیہ

۱) **صیغہ:** یعنی ایجاب و قبول کے کلمات۔ مثلاً میں نے تمہیں قرض دیا، میں نے تم سے قرض لیا قرض کا لفظ ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ہم معنی دوسرے لفظ بھی صحیح ہیں مثلاً اس کے بدل کے مقابلہ میں تمہیں اس کا مالک بنایا، یا یہ اس کے مثل کے عوض لے لو، اور قرض لینے والا کہے، میں بدل کے عوض اس کا مالک بن گیا وغیرہ۔

ماضی اور امر کے لفظ سے بھی صحیح ہو گا۔ مثلاً مجھے قرض دو، مجھ سے قرض لو، مجھے قرض دیا وغیرہ۔

قرض دینے والے کی طرف سے ایجاب اور لینے کی طرف سے قبول کا کلمہ ضروری ہے، کیونکہ یہی آپسی رضامندی کا عنوان ہے، اور اسی پر دارومدار ہے، صرف معاطاۃ (بلا لفظ کے لین دین) کافی نہیں۔ مثلاً کوئی کہے مجھے قرض دو اور دوسرا بلا لفظ کے دے دے۔

۲) **عاقد:** یعنی قرض لینے والا اور دینے والا، ان دونوں میں درج ذیل شرائط ضروری ہیں۔

(اَ) **رُشد:** یعنی بالغ ہوں اور دینی اور مالی صلاح سے متصف ہوں۔ کیونکہ قرض ایک مالی معاملہ ہے، اور معاوضہ مالیہ میں عاقد میں رشد شرط ہے، لہٰذا کسی بچے یا پاگل یا سفاہت کی وجہ سے مجور شخص کا قرض لینا یا دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ مالی تصرف کا اختیار نہیں رکھتے۔

(ب) **اختیار:** لہٰذا اکراہ (جبر و زبردستی) کی صورت میں صحیح نہ ہو گا، کیونکہ رضامندی مفقود ہے۔

(ج) قرض دینے والے کو اس چیز میں تبرع (صدقہ۔ مفت کسی کو دینا) کا حق ہو، کیونکہ قرض میں تبرع کا شائبہ ہے، لہٰذا کوئی ولی اپنے ماتحت (بچہ یا پاگل وغیرہ) کے مال سے بلا حاجت یا ضرورت قرض نہیں دے سکتا۔

۳) **معقود علیہ:** (محلِ قرض۔ وہ مال جو بطور قرض دیا جائے) قرض کا مال مثلی ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ مال جس کا بیع کے ذریعے مالک بن سکتے ہوں اور اوصاف کی روشنی میں اس کی اس حد تک تعیین ہو سکے کہ خاص تفاوت باقی نہ رہے اور اس میں بیع سلم صحیح ہو، تو اسے بطور قرض دے سکتے ہیں۔

لہٰذا روپئے پیسے، درہم ودینار، چاول، گیہوں، جو، انڈے اور گوشت وغیرہ مثلی اشیاء کا قرض دینا صحیح ہے اور حیوانات اور جائیداد وغیرہ ذوات القیم اشیاء جن کا وصف سے ضبط ممکن ہو، قرض دینا صحیح ہے لیکن جن کا وصف سے ضبط و تعیین نہ ہو سکے اور جو ذمہ میں ثابت نہیں ہوتے، ان کا قرض لینا دینا صحیح نہیں، کیونکہ ایسی اشیاء کا بدل لوٹانا تقریباً ناممکن یا کافی مشکل ہو گا۔

حدیث: آپ ﷺ نے ایک شخص سے ایک نوجوان اونٹ قرض لیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں صدقہ کے اونٹ آئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابو رافعؓ کو اس شخص کا اونٹ لوٹانے کا حکم دیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ (ان صدقہ کے اونٹوں میں) بہترین چھ سالہ اونٹوں کے علاوہ موجود نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسے وہی دے دو، کیونکہ بہترین حضرات قرض کو بہتر طریقے پر لوٹانے والے ہیں" (متفق علیہ)

یہ واضح ہے کہ "نوجوان اونٹ" مثلی چیز نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ قرض کا مثلی ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز جس چیز کا وصف سے ضبط ممکن ہو، وہ مثلی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے اس کو بھی مثلی کا حکم دیا جائیگا، لہٰذا اس کا قرض دینا صحیح ہو گا۔

معقود علیہ کے شرائط: (أ) بوقت قرض اس کی مقدار معلوم ہو، ناپ، وزن، عدد یا پیائش کے ذریعے تاکہ اس کا بدل لوٹانا ممکن ہو۔

لہٰذا اگر چند روپے قرض دے جن کی تعداد و مقدار معلوم نہ ہو، یا اناج دے جس کا وزن یا ناپ معلوم نہ ہو، تو قرض صحیح نہ ہو گا۔ کسی پکی ہوئی چیز کا قرض دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ پکنے سے اس کی کیمت پر اثر پڑے گا اور پکنے کی مقدار کا صحیح علم نہ ہو گا۔

کسی چیز کے مکیل یا موزون وغیرہ ہونے میں شریعت کی حد بندی کا اعتبار ہو گا، ورنہ پھر عرف پر دار و مدار ہو گا، جیسا کہ سود کے باب میں گذر چکا۔

(ب) وہ چیز کسی اور جنس کے ساتھ مخلوط نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا بدل لوٹانا مشکل ہو گا خصوصاً جبکہ مخلوط اشیاء کی انفرادی مقدار نا معلوم ہو، پس گیہوں اور جو کا مخلوط (آمیزہ)، پانی ملا ہوا دودھ وغیرہ قرض دینا جائز نہیں۔

روٹی قرض دینا: بغیر کسی انکار کے سارے زمانوں میں روٹی کے قرض کا عرف جاری رہا، اس لئے علماء نے اس کا استثناء کیا ہے، اور روٹی کو وزن یا عدد کے ذریعے قرض دینا جائز قرار دیا ہے۔

قرض پر مرتب اثر کے اعتبار سے اس کا حکم: جب قرض صحیح ہو تو اس کا حکم اس پر مرتب ہو گا، یعنی قرض لینے والا جب اس چیز پر قبضہ کر لے گا تو اس کا مالک بن جائے گا۔ اور قرض دینے والا جب بھی مطالبہ کرے اس کا بدل لوٹانا اس پر لازم ہے۔ قبضہ کے بعد ابھی اس نے اس میں کوئی تصرف نہ کیا ہو اور اسی حالت میں باقی ہو اور کسی دوسرے کا کوئی لازمی حق اس سے وابستہ نہ ہو، تو قرض دینے والا اسی چیز کو بھی واپس لے سکتا ہے، کیونکہ اس چیز کی عدم موجودگی میں وہ بدل کا مطالبہ کر سکتا ہے تو وہی چیز موجود ہو تو بعینہ اس کا مطالبہ بدرجہ اولی جائز ہو گا، اور بصورت مطالبہ لوٹانا لازم ہو گا۔

لیکن وہ چیز اسی حالت پر باقی نہ ہو، مثلاً بکری قرض لے کر ذبح کر دی، یا گیہوں لے کر اسے پیس دیا، یا اس سے کسی اور کا لازمی حق متعلق ہو، مثلاً قرض لے کر اس نے وہ چیز رہن (گروی) رکھ دی، تو ان صورتوں میں قرض دینے والا بعینہ اسی چیز کے واپسی کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

قرض لے کر وہ چیز کرایہ سے کسی دوسرے کو دے دے تو اسی چیز کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ کرایہ دار کا اس سے کوئی

حق لازم وابستہ نہیں بخلاف رہن کے۔

شئے مقروض میں متصل یا منفصل (ملی ہوئی یا جدا) زیادتی و اضافہ کے باوجود اسے واپس لینا جائز ہے، کیونکہ متصل اصل کے تابع ہے، اور منفصل اضافہ بھی اصل کی واپسی سے مانع نہیں ہے، گرچہ منفصل اضافہ کا مالک قرض لینے والا ہوگا، کیونکہ یہ اس کی ملکیت میں حاصل ہوا ہے۔ (لہٰذا صرف اصل کی واپسی ہوگی نہ کہ منفصل اضافہ کی)

قرض لینے والا بعینہ وہی چیز لوٹا سکتا ہے، قرض دینے والا اس کے بدل یا قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

قرض کا بدل کیا لوٹائے؟

اگر قرض مثلی مال ہو، اور موجود و دستیاب ہو تو مثل لوٹائے (مثلاً گیہوں کے بدلے گیہوں چاول کے بدلے چاول وغیرہ)، اگر فی الحال موجود نہ ہو تو اس کی قیمت لوٹائے اور اگر قرض مال متقوم ہو، تو صورۃً اس کا مثل لوٹائے، مثلاً ایک بکری قرض لے، تو اسکی جگہ اس کے اوصاف پر مشتمل بکری لوٹادے، جیساکہ ابورافع کی حدیث میں گذر چکا۔

قرض لینے اور دینے والے میں قیمت کی مقدار یا مثل کی صفت میں اختلاف ہو، تو قرض لینے والے کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کی جائے گی، کیونکہ وہ مدعیٰ علیہ ہے۔

قرض کے مطالبہ کا وقت: قرض دینے والا جس وقت بھی چاہے قرض کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، خواہ بوقت عقد کوئی مدت متعین ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یا اس سلسلے میں کوئی عرف موجود ہو یا نہ ہو۔

قرض کے شرائط: کبھی عقدِ قرض میں بعض شرائط طے پاتی ہیں، جن میں بعض مفسد ہیں، بعض لغو وفضول اور قرض پر غیر موثر ہیں، اور بعض معتبر اور ان کا نبھانا واجب ہے، تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱) **شُرُوطِ مُفْسِدہ** (وہ شرائط جو عقد قرض کو فاسد و باطل کر دیتے ہیں): ہر وہ شرط جو عقد کے موافق و مناسب نہ ہو، اور اس میں قرض دینے والے کا کچھ فائدہ ہو، وہ مُفْسِد ہے۔ مثلاً اس شرط پر قرض دے کہ مع اضافہ کے لوٹائے، یا عیب دار چیز قرض دے بشرطیکہ بے عیب اور اچھی لوٹائے، اور اس شرط پر قرض دے کہ لینے والا اپنا گھر مثلاً اس کے ہاتھ فروخت کر دے وغیرہ۔ اس طرح کا شرط فاسد اور عقد کو فاسد کرنے والا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''ہر وہ قرض جو (دینے والے کے) نفع کا باعث ہو، وہ سود ہے'''' مغنی المحتاج'' میں تحریر ہے کہ ''یہ روایت گرچہ ضعیف ہے، لیکن اس مفہوم کو امام بیہقی نے کئی صحابہ کرام سے نقل فرمایا ہے'' صاحب مُہذّب، نے ذکر کیا ہے کہ حضرات ابی بن کعب ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے نفع کے باعث قرض سے منع فرمایا ہے۔ قرض کا اصل مقصود چونکہ ضرورت مند کا تعاون اور اس کے ساتھ ہمدردی ہے، اور اس میں اپنے حق میں نفع کی شرط اس کے منافی ہے، اسلئے اسے غلط قرار دیا گیا۔ نیز حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا'' قرض اور بیع حلال نہیں ہے'' (یعنی قرض میں کسی چیز کے فروخت کی شرط لگانا ممنوع ہے) (الحاکم فی المستدرک۔ وزوائد ابن حبان) بہر حال فساد عقد کی وجہ سے یہ بالکل باطل قرار پائے گا اور عقد قرض کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہوگا۔

غیر مشروط نفع یا اضافہ: بغیر شرط اور عرف کے قرض لینے والا کچھ اضافہ یا ہدیہ پیش کرے تو اس کا حکم حسب ذیل ہے۔

اگر قرض کی واپسی سے قبل اس طرح کا اضافہ وغیرہ پیش کرے تو اس سے احتیاط برتنا (یعنی نہ لینا) افضل ہے۔ اگر قرض سے قبل

بھی ان دونوں کے درمیان اس طرح ہدیہ وغیرہ کا معمول تھا تو حرج نہیں۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے ہے "تم میں سے کوئی قرض دے، پھر مقروض اسے کچھ ہدیہ دے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو یہ سوار نہ ہو اور قبول نہ کرے، البتہ دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ سلسلہ تھا تو حرج نہیں۔" (ابن ماجہ فی الصدقات)

اسی طرح قرض دینے والا مقروض کے ہدیہ کی مکافات کرے (بدلہ دے) تو یہ کراہت ختم ہو گی۔

اگر قرض کی ادائیگی کے بعد مقروض ہدیہ وغیرہ دے تو کوئی حرج نہیں، قرض دینے والے کو اس کا لینا مکروہ نہیں ہے، کیونکہ ادائیگی کی وجہ سے قرض کا حکم ختم ہو چکا، بلکہ آپ ﷺ کے قول وعمل کی اتباع میں یہ عمل مستحب ہے۔ صحیحین کی ایک روایت کے الفاظ گذر چکے کہ "بہترین لوگ بہتر طریقے سے قرض کو لوٹانے والے ہیں۔" نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آپ ﷺ پر ان کا قرض تھا، تو آپ ﷺ نے وہ ادا فرمایا اور مزید اضافہ بھی فرمایا۔" (متفق علیہ)

مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ لوگوں کا عام عرف قرض کے لوٹانے میں اضافہ یا ہدیہ وغیرہ کا نہ ہو، اسی طرح مقروض اس کا عادی اور اس سلسلہ میں معروف نہ ہو، ورنہ پھر مذکورہ اضافہ یا ہدیہ وغیرہ کا قبول کرنا مکروہ ہو گا، کیونکہ عرف سے معروف مشروط کی طرح ہے۔

۲) **وہ شرائط جو لغو (فضول) ھیں، لیکن عقد کو فاسد نہیں کرتے:** اس سے ہر وہ شرط مراد ہے جو عقدِ قرض کے مناسب نہ ہو، لیکن اس میں کسی کا فائدہ نہ ہو، یا صرف مقروض کا فائدہ ہو، مثلاً یہ شرط لگانا کہ مقروض صحیح سالم اور بے عیب چیز کے بدلہ عیب دار چیز لوٹائے، یا بہتر چیز کے بدلہ بے کار اور نکمی چیز لوٹائے وغیرہ۔ اس طرح کے شرائط لغو قرار پائیں گے اور ان کا نبھانا واجب نہ ہو گا، البتہ عقد فاسد نہ ہو گا، کیونکہ اس میں بظاہر اصل مقصد یعنی مقروض کی اعانت اور سہولت کی تاکید پائی جا رہی ہے، قرض خواہ کا کوئی نفع نہیں ہے، بلکہ مقروض ہی کا نفع ہے۔

قرض میں ادائیگی کی مدت متعین کرنا

یہ مسئلہ گذر چکا کہ قرض خواہ جب چاہے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے، خواہ عقد میں مدت متعین ہو یا نہ ہو، تو گویا مدت کی تعیین کو نبھانا لازم نہیں، البتہ اس طرح مدت کی شرط کا عقد قرض پر کچھ اثر بھی پڑے گا یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس شرط میں قرض دینے والے کا کچھ فائدہ ہو، مثلاً لوٹ مار کا زمانہ ہو، اور ادائیگی کے لئے ایسی مدت طے کی گئی جس میں بظاہر امن وامان حاصل ہو جائے گا، تو اس شرط سے عقد فاسد ہو گا، کیونکہ اس میں قرض خواہ کا نفع ہے، تو یہ اضافہ کی شرط کی طرح ہو گیا۔

اگر اس شرط میں قرض خواہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تو عقد فاسد نہ ہو گا، لیکن یہ شرط لازم بھی نہ ہو گی (جب چاہے مطالبہ کر سکتا ہے) البتہ اس کا نبھانا مستحب ہے۔

۳) **وہ شرائط جن کا ایفا (نبھانا) لازم ھے:** اس سے وہ شرائط مراد ہیں جن میں عقد کی پختگی، حق کا اثبات اور اس کی تاکید ہو۔ مثلاً قرض کے مقابلہ میں رہن کی شرط، کفیل (ضامن) کی شرط، عقد قرض پر گواہ رکھنے کی شرط، یا حاکم کے سامنے اس کے اقرار کی شرط، یا اس معاملہ کو تحریری شکل میں محفوظ کر لینے کی شرط، یہ شرائط جائز ہیں، اور قرض دینے والے کو اس کا حق ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی ایک زرہ مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس رہن رکھی، اور اس سے اپنے اہلِ خانہ کے لئے جَو (ادھار) خریدا" (بخاری شریف)

مقروض کو ان شرائط کا نبھانا لازم ہے، اگر نہ نبھائے تو قرض دینے والا عقد کو فسخ (توڑ) کر سکتا ہے۔

رہن (گروی)

رہن عربی زبان میں حبس، روکنا اور ثبوت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تعریف: شرعاً کسی متمول عین (چیز) کو قرض کا وثیقہ (قابل اطمینان واعتماد) قرار دینا، تاکہ ادائیگی کی دشواری کی صورت میں اس عین کے ذریعہ اس کا حصول ہو سکے، عقد رہن کہلاتا ہے۔

جو شخص (مقروض) بطورِ وثیقہ کوئی چیز رکھے اسے "راہن" اور جس کے پاس رکھا جائے (قرض خواہ) اسے مرتہن، اور جو چیز رکھی جائے اسے مرہون کہتے ہیں۔ مَرہُون کے لئے بھی رہن کا لفظ استعمال ہوتا ہے، متمول کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز شرعاً مال شمار ہو، اور اس عقد کا مقصود یہ ہے کہ قرض یا ادھار دینے والے کو اپنی رقم کی واپسی کا اطمینان ہو، کہ وہ ضائع اور ڈوب نہ جائے گی، پس عین کو قرض کے مقابلہ میں رہن رکھا جاتا ہے، تاکہ کسی سبب سے مقروض ادائیگی سے قاصر ہو جائے، تو اسے فروخت کر کے اپنا قرض وصول کر سکے، تفصیلات آئندہ سطور میں پیش ہو رہی ہیں

حقوق کے وثائق تین (۳) ہیں: شہادت (گواہی) رہن اور ضمان، اوّل انکار کے خوف سے اور آخری دونوں افلاس کے خطرہ کی وجہ سے ہے۔

مشروعیت: قرآن وحدیث کی روشنی میں رہن بالاجماع جائز اور مشروع ہے۔

آیت: " وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ " (البقرہ۔۲۸۳)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو، ادھار کا ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو...

اور اگر تم (دَین کا معاملہ کرتے وقت) کہیں سفر میں ہو، اور (دستاویز پر لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ، سو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دے دی جاویں۔"

پس اس سے دلالت ہوئی کہ رہن ادھار کے اطمینان کی خاطر تحریر کے قائم مقام ہے، اور یہ مشروعیت کا عنوان ہے۔

حدیث: "اپنے اہل خانہ کی ضرورت کے لئے ۳۰ صاع جَو کے عوض آپ ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی۔" (صحیحین)

مزید دلائل مسائل پر گفتگو کے وقت پیش ہوں گی۔

حَضَر (اقامت) میں اور کاتب کی موجودگی میں رھن: مذکورہ بالا آیات میں بحالت سفر اور کاتب (لکھنے والے) کی غیر موجودگی میں رہن کا حکم دیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ نہیں کہ برعکس صورتوں میں ناجائز ہے۔ بلکہ رہن سفر وحضر اور کاتب کی موجودگی اور غیر موجودگی، تمام صورتوں میں مشروع اور جائز ہے، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ: ایک یہودی سے اناج ادھار خرید کر آپ ﷺ نے لوہے کی زرہ (جنگی لباس) اس کے پاس رہن رکھی، (متفق علیہ) اور بظاہر یہ واقعہ

مدینہ منورہ کا ہے، نیز وہاں کاتب بکثرت تھے، تو معلوم ہوا کہ سفر اور کاتب نہ ہونا رہن کی صحت کے لئے شرط نہیں۔

چونکہ سفر میں غالباً رہن رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور گواہ اور کاتب مفقود ہوتے ہیں، بالخصوص ابتدائی ادوار میں جبکہ پڑھنے اور لکھنے کی قلت تھی، اس لئے اس عموم اور غالب کے پیشِ نظر آیت میں سفر اور کاتب کی غیر موجودگی کی قید لگائی، یہ عربی زبان کا اسلوب ہے، جس کے اعلیٰ ترین معیار پر قرآن نازل ہوا ہے، اور غالب حالت کے پیشِ نظر جو قید ہو، اس کا مفہوم مخالف مراد نہیں ہوتا۔

رھن کا حکم: رہن ایک جائز عقد ہے، واجب نہیں، کیونکہ یہ حق کے متعلق اطمینان و اعتماد کے لئے مشروع ہے، اور انسان کو حق ہے کہ اس اطمینان پر عمل کرے یا نہ کرے، نیز رہن تحریر کا بدل ہے، لہٰذا اس کا بھی وہی حکم ہوگا، تو چونکہ تحریر واجب نہیں، اس لئے رہن بھی واجب نہ ہوگا۔

لیکن تحریر و رہن کے عدم وجوب کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ان امور میں کوتاہی برتے، اور آپس میں ایک دوسرے کو عدالت میں کھینچنے لگے، یا غیر دیندار لوگ اسے دوسروں کا مال ناحق ہڑپنے کا ذریعہ بنالیں، کیونکہ یہ کم از کم ارشادی امر ہے، یعنی مستحب ہے، لہٰذا ہر حال میں تحریری ثبوت فراہم کرنا ہی بہتر ہے، ورنہ پھر رہن پر عمل کرے، تاکہ لوگ اپنا مال ڈوب جانے اور برباد ہونے کے اندیشہ سے اس فعلِ خیر (قرض، ادھار) سے گریز نہ کریں۔

حکمت: لوگ آپس میں معاملات کرتے رہتے ہیں، بعض مرتبہ کسی کو نقدی کی ضرورت ہے، لیکن موجود نہیں، اور کبھی کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت ہے، (لیکن قیمت ندارد) لہٰذا رقم قرض لینے یا ادھار خریدنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور ایسے حضرات مل نہ پائیں گے جو ان پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے رقم یا اشیاء بغیر وثیقہ کے دے دیں اور صاحبِ مال یا چیز فروخت کرنے والا وثیقہ کا خواہاں ہوگا، تاکہ اپنے حق کی وصولیابی کا اطمینان ہو جائے، اور کسی اختلاف اور جھگڑے و تنازع اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہ آئے، پس کفالت اور تحریر و گواہی سے راضی نہ ہوگا، لہٰذا کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرے گا، جو اپنے حق کے بالمقابل بطورِ وثیقہ اپنے قبضہ میں رکھے، اور ضرورت مند بھی اس سے راضی ہو کر مطلوبہ وثیقہ اس کے سپرد کرے گا، اور اس طرح طرفین کے مصلحت کی رعایت ہو جائے گی، اور بسہولت لوگ آپس میں تعامل کر لیں گے۔

عقد رھن کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مَرۡہُون (۴) دَین (قرض یا ادھار)

(۱) **عَاقِدَیۡن:** یعنی راہن اور مُرتہن، راہن یعنی مقروض، اور مرتہن یعنی جس کا راہن پر قرض ہے، اور جس کے قبضہ اور ماتحتی میں مرہون شئ رکھی جائے گی، عاقدین کے شرائط یہ ہیں۔

۱- **مکلف**، یعنی عاقل بالغ ہوں، اور مالی تصرفات کی پابندی عائد نہ ہو، پس بچہ خواہ وہ ممیّز ہو، راہن یا مرتہن نہیں بن سکتا، اگر بچہ اپنی کوئی چیز کسی کے پاس رہن رکھے، تو یہ صحیح نہیں، اور مرتہن اس چیز کا ضامن ہوگا، اسی طرح بچہ کے پاس کوئی رہن رکھے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اور اس میں رہن کے احکام ثابت نہ ہوں گے۔ مجنون بھی بچہ کی طرح ہے۔

چونکہ عقدِ رہن پر بعض احکام اور ذمہ داریاں مرتب ہوتی ہیں، اور بچہ اور پاگل اس کے اہل نہیں، اس لئے شریعت نے ان کے اقوال اور عقود سے متعلق تصرفات کا اعتبار نہیں کیا، کیونکہ حدیث میں بھی پاگل کو افاقہ (اور شفا) تک، اور سونے والے کو بیدار ہونے

تک، اور بچہ کو تاحدِ بلوغ مرفوع القلم شمار کیا ہے (ابوداود) مرفوع القلم یعنی جس سے مواخذہ نہ ہو اور باز پرس نہ کی جاسکے۔

جو شخص حرام کام میں مال صرف کرے، یا اسراف اور فضول خرچی کرے، اسے شرعاً سفیہ کہا جاتا ہے، اور اس پر (حکومت کی طرف سے) مالی تصرفات کی پابندی عائد کردی جاتی ہے، اس پابندی کی صورت میں اسے مجور کہیں گے، پس ایسا شخص بھی رہن نہیں رکھ سکتا۔

۲-اکراہ اور جبروزبردستی نہ ہو: راہن اپنی مرضی واختیار سے رہن رکھے اور مرتہن اپنی مرضی سے قبول کرلے، اگر دونوں میں سے کسی ایک پر جبر کیا گیا تو رہن صحیح نہ ہوگا، اور اس پر احکام وآثار مرتب نہ ہوں گے، لہٰذا اکراہ اور جبر کے زائل ہوتے ہی سابقہ حال لوٹ آئیگا، اور مرتہن پر اکراہ تھا تو راہن پر واجب ہے کہ اپنی چیز لوٹالے، اور راہن پر اکراہ تھا تو مرتہن پر اس کا لوٹانا واجب ہے، بعد میں ان کا رہن کا ارادہ ہو تو از سرِ نو اسے انجام دیں۔

۳-رھن رکھی جانے والی چیز میں تبرع کی اھلیت ھو: مثلاً راہن رہن کا مالک ہو، اور مرتہن متعلقہ قرض کا مالک ہو۔

ولی اور وصی کا رھن رکھنے دینا یا لینا: اس شرط کا منشاء یہ ہے کہ جسے کسی دوسرے پر مالی ولایت حاصل ہو، جیسے ولی اور وصی، وہ اپنے اس ماتحت کا مال کسی کے پاس بطور رہن رکھنے یا قرض کے عوض دوسرے کا مال بطورِ رہن لینے کا اختیار نہیں رکھتے، کیونکہ رہن لینا اور دینا دونوں میں تبرع کا مفہوم پایا جارہا ہے۔ جس کی ان کو اجازت نہیں۔ البتہ ظاہری مصلحت کی وجہ سے فقہاء کرام نے درج ذیل دو صورتوں میں ولی اور وصی کو رہن کی اجازت دی ہے۔

۱-حالتِ ضرورت: اپنے ماتحت کو نفقہ کی ضرورت ہو، اور فی الحال اس کا کوئی مال قابل صرف نہ ہو، تو نفقہ اور خرچ کے لئے کسی سے لئے جانے والے مال کے عوض اس کی کوئی چیز رہن رکھ سکتا ہے، جبکہ آئندہ اس رقم کی ادائیگی اور رہن کی واپسی کی امید ہو، مثلاً اس کا اناج یا کوئی اور آمدنی متوقع ہو، یا کسی ادھار کی مدت مکمل ہو کر اس کی واپسی کی امید ہو، یا اس کی کوئی چیز جو فی الوقت سستی ہے، آئندہ زائد نرخ پر فروخت ہونے کا امکان ہو۔

اسی طرح اپنے ماتحت کے مال کی چوری یا لوٹ کھسوٹ کے ڈر سے اسے ادھار فروخت کرنا یا قرض دینا، اور اس کی واپسی کے اطمینان کے لئے احتیاطاً سامنے والے سے کوئی چیز بطور رہن رکھنا جائز ہے۔

۲-ظاھری مصلحت: مثلاً ۲۰۰/روپئے کی چیز ۱۰۰/روپئے میں فروخت ہورہی ہے، لیکن خریدنے کے لئے قیمت موجود نہ ہو، تو ان کی ۱۰۰/روپئے کی کوئی چیز رہن رکھ کر اسے خرید لینا، اس صورت میں یہ شرط ہے کہ مرہون شئی کسی امانت دار اور تونگر کے پاس ہو، اس پر گواہ رکھے، اور عرفاً طویل مدت کے لئے نہ ہو، اگر ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو رہن صحیح نہیں، اسی طرح ان کی ۱۰۰ روپیہ قیمت کی کوئی چیز ۲۰۰ روپیہ میں اُدھار فروخت کرے اور اسکے بالمقابل خریدار کی ۲۰۰/روپئے کی چیز بطور رہن وصول کرے، تو یہ صحیح ہے۔ ان صورتوں میں ان ماتحتوں کا کافی نفع ہورہا ہے، اسلئے اس ظاہری مصلحت کے پیش نظر رہن کی گنجائش ملی۔

۲-صیغہ: عقد رہن کا دوسرا رکن صیغہ یعنی ایجاب وقبول ہے، یعنی ہر وہ کلام جو رہن رکھنے اور قبول کرنے پر دلالت کرے، مثلاً راہن کہے: تمہارے قرض کے بدلہ میں نے میرا یہ مکان رہن رکھا، یا ادھار چیز خرید کر کہے: یہ چیز تمہاری اس چیز کی قیمت کے عوض رہن رکھو، وغیرہ اور قرض خواہ کہے: میں نے قبول کیا یا رہن لے لیا وغیرہ۔

رہن وغیرہ عقود چونکہ مالی تبادلہ ہیں، جس میں طرفین کی رضامندی ضروری ہے، کیونکہ کسی کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے

بغیر حلال نہیں، اور رضامندی ایک مخفی امر ہے، اور اس پر دلالت کرنے والے الفاظ سے اس کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا ایجاب و قبول کو شرط قرار دیا جاتا ہے۔

مُعَاطَاۃ: مثلاً کوئی کہے: یہ چیز فلاں مدت تک مجھے ادھار فروخت کر دو، اور قیمت کے عوض میری یہ گھڑی رہن رکھو، اور بائع کہے: میں نے فروخت کر دیا اور خریدار چیز پر قبضہ کرلے اور بائع کو گھڑی دیدے (لیکن بائع کی طرف سے رہن کی قبولیت کے الفاظ ادا نہ ہوں) تو زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ رہن منعقد نہ ہوگا، کیونکہ دونوں طرف سے رہن سے متعلق صیغہ کا پایا جانا ضروری ہے، گونگے شخص کا رہن رکھنے یا پالینے کے متعلق اشارہ جو سمجھ میں آجائے کافی ہے، یا اسے تحریری شکل میں پیش کرے تو یہ بھی کافی ہے۔

۳) **مَرْھُون:** یعنی وہ چیز جو راہن مرتھن کے پاس اُس کے قرض کے وثیقہ کے طور پر رکھتا ہے۔

شئی مرھون کے شرائط حسبِ ذیل ھیں

۱- **مَرْھُوْن عَیْن** (چیز) ہو: پس کسی منفعت کا رہن صحیح نہیں، مثلاً مکان میں رہائش کیونکہ منفعت وقت گذرنے کے ساتھ تلف ہو گی، اور اس پر روکے رکھنے والا قبضہ ممکن نہیں۔

۲- **مرھون قابل فروخت ھو:** بیع میں مذکورہ مبیع کے تمام شرائط موجود ہوں، مثلاً بوقتِ عقد موجود ہو، شرعاً مالِ متقوم ہو، سپردگی پر قادر ہو، اور راہن کی ملکیت یا تسلط میں داخل ہو، لہٰذا بکری کو آئندہ ہونے والا بچہ، کتا، سوّر، ہوا میں اڑنے والا پرندہ، فلاں پر موجود قرض، جو چیز آئندہ خریدے گا، یا جو لکڑی گھاس پھوس وغیرہ جمع کرے گا، رہن رکھنا صحیح نہیں، مرہون کا راہن مالک ہی ہو یہ ضروری نہیں، بلکہ رہن رکھنے کے لئے دوسرے کی چیز عاریتاً لے، تو یہ بھی جائز ہے۔ (اور اس کے شرائط آئندہ پیش ہوں گے)

اگر راہن کا کسی چیز میں حصہ اور اشتراک ہو، مثلاً نصف گاڑی، یا نصف گھر، یا جگہ، جس کی ابھی تقسیم و تمیز نہ ہوئی ہو، (ایسی مشترک چیز کو مشاع کہا جاتا ہے)، تو اس میں اپنا حصہ رہن رکھ سکتا ہے، کیونکہ اس کا حصہ قابل فروخت ہے، لہٰذا قرض کی ادائیگی کے لئے متعینہ وقت ادائیگی دشوار ہو تو مرتھن مقروض کا حصہ اس مشترک اور مشاع چیز میں سے فروخت کرکے اپنا حق حاصل کر سکتا ہے، ایسی مشترکہ شئ پر قبضہ کی تفصیل و کیفیت آئندہ بیان ہو گی۔

۴) **دَین** (مَرہُون بِہٖ): یعنی وہ حق جو مرتھن کا راہن پر ہے، اور جس کے عوض رہن رکھا جا رہا ہے، اس کے شرائط یہ ہیں:

۱- **قرض وادھار ھو**، یعنی درہم و دینار یا رائج کرنسی وغیرہ ہو، جو ذمہ میں ثابت ہوتی ہوں، اور اشیاء کی قیمت کا تعین اس سے ہوتا ہو، کیونکہ رہن کا مقصد دشواری کی صورت میں مرہون کی قیمت سے اس کی تحصیل ہے، جو کہ دین میں ممکن ہے۔

دَین کے سبب کا کوئی اعتبار نہیں، خواہ کسی ادھار خرید شدہ شئ کی قیمت ہو، یا قرض لیا ہو، یا مرتھن کی کسی چیز کو تلف کرنے کی وجہ سے ضمان عائد ہوا ہو۔

لہٰذا: مرہون بہ کوئی عین (چیز) نہیں ہو سکتا، مثلاً کسی کی کوئی چیز غصب کرلی، اب مالک اس کا مطالبہ کرے اور غصب شدہ شئ کی واپسی تک کوئی چیز رہن رکھنے کا مطالبہ کرے، یا کسی سے کچھ بطورِ عاریت لے، اور معیر یہ مطالبہ کرے کہ مستعیر عاریت کے لوٹانے تک کوئی چیز یا کچھ رقم رہن رکھے، تو اس طرح کا رہن صحیح نہیں ہے، جو کہ آج کل کافی عام ہے

''مغنی المحتاج'' کے مصنفؒ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کی جو عادت ہے کہ کتاب وقف کرکے یہ شرط لگاتے ہیں

کہ بغیر راہن کے کتاب عاریت میں یا اس جگہ سے لے جانے کی اجازت نہ دی جائے، یہ باطل ہے۔

عین کے عوض رہن صحیح نہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ ادائیگی کی دشواری کی صورت میں مرہون کی قیمت سے اس کی تحصیل ممکن نہیں، مثلاً ایک سائیکل سے آپ گھڑی کیسے حاصل کرسکتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ گھڑی کی قیمت حاصل کی جائے تو قیمت کی تعیین واندازہ میں اختلاف پایا جائیگا، جو تنازعہ کا باعث ہوگا، نیز قرآن مجید میں رہن کی مشروعیت دین کے متعلق وارد ہے، پس کسی اور میں ثابت نہ ہوگی۔

۲- مُرتھن کا دَین راھن کے ذمہ ثابت ھو: مثلاً خرید وفروخت مکمل ہونے کے بعد مبیع کی قیمت چاہے ابھی مبیع سپرد نہ ہوئی ہو، بیوی کے گذشتہ ایّام کا نفقہ، یا وہ قرض جو راہن کسی سے لے، جس پر قبضہ ہوچکا ہو یا ابھی قبضہ نہ ہوا ہو، وغیرہ...، پس ان میں رہن صحیح ہے، کیونکہ حق ثابت ہوچکا، لہٰذا وثیقہ کی ضرورت پیش آئی، پس رہن دَین کا ضمان ہوگا، اس لئے رہن لینا جائز ہوا۔

اگر دین کو واجب کرنے والے عقد کے ساتھ ہی رہن پایا جائے تو صحیح ہے، مثلاًیوں کہا: یہ کپڑا مجھے ایک ماہ کی مہلت پر ۱۰۰ روپیہ میں فروخت کردو، اور میں اس کے عوض یہ گھڑی رہن رکھتا ہوں، تو بائع نے کہا: میں نے قبول کیا، یا تم کو فروخت کرکے رہن رکھ لیا، یا کہا: مجھے ایک سال کے لئے ہزار روپیہ قرض دیجئے، اور اس کے بدلہ یہ گھڑی رہن رکھئے اور وہ کہے: میں نے قبول کیا۔ کیونکہ حاجت اس کی مقتضی ہے، کیونکہ دَین کے ثبوت کے ساتھ ہی رہن کی شرط نہ ہو، تو ممکن ہے کہ مالک خریدار یا مقروض پر دین کے ثبوت کے بعد اسے لازم قرار نہ دے سکے، اور اس طرح اپنے دَین کی حفاظت واطمینان کا حق فوت ہوجائے گا۔

اگر حق کے ثبوت سے یا مُوجب سے قبل ہی عقد رہن ہو تو صحیح نہیں، جیسے بیوی کا مستقبل کے نفقہ کے عوض شوہر سے کوئی چیز بطورِ رہن وصول کرنا، یا آئندہ جو قرض دے گا اسکے عوض ابھی رہن لینا، یا آئندہ جو چیز خریدے گا اس کے عوض ابھی رہن رکھنا، وغیرہ، ان صورتوں میں رہن صحیح ومنعقد نہ ہوگا، کیونکہ رہن حق کا وثیقہ ہے، لہٰذا اس کے ثبوت پر مقدم نہ ہوگا، اسکے تابع ہے، لہٰذا اس سے پہلے نہیں پایا جائیگا، جیسے معاملہ کے ثبوت سے قبل گواہی کا سوال نہیں،

۳- دین کی مقدار وصفت عاقدین کو معلوم ھو: اگر مرتہن کا راہن پر دین ثابت ہو، لیکن مجہول ہو، روپئے ہیں یا ریال پتہ نہیں، یا مقدار مجہول ہو، ایک ہزار ہیں یا دو ہزار ہیں پتہ نہیں، اب اس کے عوض کچھ رہن رکھے، تو یہ صحیح نہیں، خواہ دوسرے کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، کیونکہ دین مجہول ہو تو رہن کی قیمت سے اس کی تحصیل دشوار ہے۔

عقدِ رھن کا لزوم: جب تمام ارکان مع شرائط موجود ہوں تو عقدِ رہن صحیح اور منعقد ہوگا، اور جب تک مرہون شئ راہن کے پاس ہے، وہ اس سے رجوع کرسکتا ہے، کیونکہ اس پر مرتہن کے قبضہ کے بعد ہی یہ لازم ہوگا، (نہ کہ اس سے قبل)، لہٰذا جب راہن اسے مرتہن کے حوالہ کرے، اور مرتہن کی جانب سے معتبر اور صحیح قبضہ پایا جائے تو عقد رہن لازم ہوجائے گا، اور مرتہن کو اسے روکے رکھنے کا حق ہوگا، اور اس کی رضامندی کے بغیر راہن رجوع کرکے وہ چیز واپس نہیں لے سکتا۔

دلیل: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ'' اس میں ''فَرِھَانٌ''، ''وَاِنْ كُنْتُمْ'' شرط کا جواب اور جزاء ہے، پس یہ ایسے رہان کی اجازت ہے جس میں 'مقبوضۃ' صفت ہو اور کسی بات کی اجازت اور حکم کسی صفت کے ساتھ ہو، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صفت اس کے تمام شرط میں داخل ہو، کیونکہ کسی صفت کے ساتھ مشروع امر اس صفت کے بغیر نہیں پایا جاسکتا۔ پس معلوم ہوا کہ عقدِ رہن بغیر قبضہ کے تمام نہ ہوگا، اور جب قبضہ ہوگا تو تمام ومکمل ہوگا۔ تب پھر لازم ہوجائے گا، اسی طرح اگر بغیر قبضہ کے رہن لازم ہوتا تو لفظ ''مقبوضہ'' کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، اور شارع کا کلام لغو اور عدم فائدہ سے محفوظ ومامون ہوگا، لہٰذا

لزومِ عقد کے لئے اس صفت کا اعتبار ضروری ہے۔

رھن پر قبضہ کی کیفیت: شئ مرہون یا تو غیر منقول ہوگی (جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کی جاسکے) جیسے زمین و مکان، یا منقول ہوگی (جسے منتقل کیا جاسکے) جیسے موٹر گاڑی، گھڑی وغیرہ۔

اگر مرہون غیر منقول ہو تو راہن کا اس کے اور مرتہن کے درمیان تخلیہ کافی ہے، یعنی اسے قبضہ میں لینے میں جو رکاوٹ ہو، اسے دور کردے، مثلاً مکان میں اسباب یا کسی کی رہائش ہو تو اسے خالی کر کے اس کے حوالہ کردے۔

اگر رہن منقول ہو تو صرف تخلیہ کافی نہیں، بلکہ اس شئ کے مناسب نقل اور مرتہن کا اسے لے لینا ضروری ہے، ورنہ قبضہ معتبر نہ ہوگا۔

مذکورہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ وہ منقول یا غیر منقول شئ مکمل رہن ہو، اگر اس کا بعض رہن ہو، یعنی رہنِ مشاع ہو تو یہ تفصیل ہے:

اگر شئ منقول ہے تو اسے مکمل مرتہن کے سپرد کرنا قبضہ کہلائے گا، اور یہ سپردگی شریک کے اجازت کے بعد ہوگی، اگر شریک اجازت نہ دے تو اب مرتہن شریک کے قبضہ میں اسے مکمل رکھنے پر راضی رہے، اور مرہون حصے میں قبضہ کے متعلق شریک مرتہن کا نائب شمار ہوگا، اور اس طرح یہ عقد صحیح و مکمل ہوگا، اگر مرتہن اس سے راضی نہ ہو تو معاملہ حاکم و قاضی کے سامنے پیش کیا جائے گا، پھر وہ کسی عادل کے پاس مرتہن اور شریک کی جانب سے وہ چیز رکھ دے گا، اور شریک اپنی ملکیت کے اعتبار سے مرہون سے انتفاع کرسکتا ہے، جبکہ مرتہن کی یا قاضی کی اجازت ہو۔

عقد رھن کے احکام

ان احکام کی ہم چار بڑی تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱) مرتہن کے قبضہ میں مرہون کی موجودگی سے متعلق احکام (۲) مرہون کی بربادی اور تلف کے احکام (۳) مرتہن کے قبضہ میں مرہون کے نمو اور اضافہ کے احکام (۴) رہن کے فرعی احکام

قسم اوّل: مرتہن کے قبضہ میں مرہون کی موجودگی کی حالت میں متعلقہ احکام:

۱) **مرھون کا حبس** (اسے روک رکھنا): جب مرہون مرتہن کے قبضہ میں چلا جائے گا تو قرض کی ادائیگی سے قبل راہن واپس نہیں لے سکتا۔ اب مرتہن کو اسے اپنے پاس روکے رکھنے کا حق حاصل ہے۔

رہن کے اتمام کے لئے پہلا قبضہ کافی ہے، اس قبضہ کا استمرار اور دوام شرط نہیں، اسی لئے مرتہن اپنی مرضی سے مرہون شئ راہن کے حوالہ کرسکتا ہے، اس سے رہن باطل اور ختم نہ ہوگا، اور مرتہن کا حق اس سے متعلق رہے گا، جب چاہے واپس اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔

کیونکہ رہن کا مقصد قرض کی تحصیل ہے، اور وہ جس کے دوام کے بغیر بھی ممکن ہے، نیز راہن رہن کے منافع کا مالک ہے لہٰذا مرتہن کی اجازت سے ان منافع کی تحصیل جائز ہوگی اور یہ مرتہن کے قبضہ سے اسے نکالے بغیر نہ ہوسکے گا۔

۲) **رھن کی حفاظت اور اس کے مصارف:** رہن کا مقصد چونکہ قرض کی واپسی کی دشواری کی صورت میں اس سے اس کی تحصیل ہے، جو رہن کی سلامتی پر موقوف ہے، اور یہ مرتہن کی مصلحت کی خاطر ہے اس لئے رہن کی حفاظت و نگہداشت اور مناسب طریقے سے کسی ضرر اور بربادی وغیرہ سے اسے محفوظ رکھنا مرتہن کی ذمہ داری ہے، اسے رکھنے کے لئے محفوظ جگہ کا نظم، یا محافظ کی اجرت وغیرہ مرتہن کے ذمہ ہوگا۔

رھن کے ذاتی مصارف: مرہون شئ کے بقا کے لئے جو اخراجات ہوں، مثلاً جانور کا چارہ، درختوں کی آب پاشی، مکان کی مرمت وغیرہ، وہ راہن کے ذمہ ہے، کیونکہ یہ اس چیز کی بقا کے لئے ضروری ہے، جو کہ اس کی ملکیت ہے، لہٰذا مرتہن کے حق کی حفاظت کے طور پر راہن کو ان مصارف کا پابند بنایا جائیگا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے "جس نے رہن رکھا، اس سے رہن کو روکا نہ جائے، اس کے فوائد اور نقصانات اسی کے ہیں" (الامام الشافعی فی الامّ، دارقطنی) مصارف بھی غُرم (نقصانات) میں داخل ہیں، ایک روایت میں ہے۔"رہن راہن کے ضمان میں ہے" (ابن حبان، حاکم وقال علی شرط الشیخین۔فتح الوہاب)

۳) **مرتھن کا قبضہ اور تسلط:** ایک مرتبہ رہن مرتہن کے قبضہ اور تسلط میں چلا جائے تو اب اس پر اس کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، یعنی مرتہن کی زیادتی یا تقصیر کے بغیر وہ چیز تلف ہو جائے، تو اس پر اس کا بدل اور تاوان نہ ہو گا، اور نہ اس کیوجہ سے قرض کا کچھ حصہ ساقط ہو گا، کیونکہ ابھی حدیث میں گذر چکا کہ نقصان راہن کا ہو گا، تو مطلب یہ ہوا کہ مرتہن پر نقصان کی ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔

۴) **مرھون سے انتفاع:** (الف) راہن کا مرہون سے انتفاع: مرہون کے منافع مالک یعنی راہن کا حق ہیں، لیکن مرتہن کے پاس محبوس ہونے کی وجہ سے انتفاع سے عاجز ہے، پس اگر وہ راہن کو لوٹا دے تو اسے انتفاع جائز ہے، مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات واضح ہے، نیز آپ ﷺ کا ایک اور فرمان ہے "اگر سواری کا جانور رہن ہو تو اخراجات کے بالمقابل اس کی سواری جائز ہے، اور اخراجات کے عوض اس کا دودھ استعمال ہو گا، اور جو سوار ہو گا اور دودھ پیئے گا، اسی پر اخراجات ہوں گے" اور سوار ہونے والا اور پینے والا منافع کا مالک یعنی راہن ہے، پس اسے انتفاع جائز ہے، اور اسی پر نفقہ اور خرچ لازم ہے، لیکن اس انتفاع کے درج ذیل شرائط ہیں۔

انتفاع کی وجہ سے اس چیز میں کوئی نقص یا بربادی پیش نہ آئے۔ راہن مرہون کو سفر میں نہ لے جائے کہ بلاوجہ خطرہ کے امکانات ہیں۔ اگر مرتہن خود ان امورِ ممنوعہ کی اجازت دے تو جائز ہے۔

اگر مرہون مرتہن کے قبضہ میں رہتے ہوئے انتفاع ممکن ہو تو اسی حالت میں انتفاع کر سکتا ہے، اگر اس کے قبضہ سے نکالے بغیر انتفاع ممکن نہ ہو تو پھر نکال لے، لیکن بہتر ہے کہ مرتہن اس پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ رکھے، کیونکہ یہ ایک مالی معاملہ ہے، انتفاع سے فارغ ہونے کے بعد راہن پر لازم ہے کہ پھر مرتہن کے قبضہ میں لوٹا دے۔

(ب) **مرتھن کا مرھون سے انتفاع:** رہن کی وجہ سے مرتہن اس کا مالک نہیں بنے گا، اور نہ اس کے منافع اس کے لئے جائز ہوں گے، بلکہ مرہون اور اس کے منافع کا مالک راہن ہی رہے گا، لہٰذا راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن کو اس سے انتفاع قطعاً جائز نہیں، اگر نفع اٹھائے تو اس کی زیادتی ہے، اور وہ مرہون کا ضامن ہو گا۔

اگر عقدِ رہن کے وقت ہی مرتہن کے انتفاع کی شرط رکھی گئی تو یہ شرط فاسد ہے، جس کی وجہ سے عقدِ رہن بھی فاسد ہو گا، کیونکہ یہ شرط عقد کے تقاضہ کے مخالف ہے۔

اگر عقد میں ایسی کوئی شرط نہ ہو، بلکہ بعد میں راہن اپنی مرضی سے مرتہن کو اجازت دے تو یہ جائز ہے، کیونکہ راہن مالک ہے، اور دوسرے کی حق تلفی کے بغیر اسے اپنی ملکیت میں تصرف کا اختیار ہے۔

۵) **مرھون میں تصرف:** یعنی ہبہ یا فروخت وغیرہ جیسے تصرفات، اسکی درج ذیل مختلف صورتیں ہیں:

(الف) **راھن کا مرھون میں تصرف:** اگر راہن مرتہن کی اجازت کے بغیر مرہون میں ایسا تصرف کرے جس سے وہ چیز

راہن کی ملکیت سے نکل جائے، تو یہ تصرف باطل ہے، جیسے فروخت کرنا، ہبہ کرنا، وقف کرنا وغیرہ، اور رہن اپنی حالت پر برقرار رہے گا۔
کیونکہ مرتہن کے قرض کے بالمقابل یہ وثیقہ ہے، اگر تصرف نافذ ہو تو وثیقہ فوت ہو گا، لہٰذا اس کے حق کی حفاظت کی خاطر اسے باطل قرار دیا گیا۔
اگر ایسا تصرف کرے کہ ملکیت تو زائل نہ ہو، لیکن مرہون شئ میں حسّی یا معنوی نقص آجائے تو یہ تصرف بھی صحیح نہیں، مثلاً کسی کو استعمال کے لئے عاریت دینا جس سے وہ بوسیدہ ہو جائے، یا اتنی مدت کے لئے کرایہ پر دے کہ اس سے قبل قرض کی ادائیگی کا وقت آجائے، تو یہ معنوی نقص ہے، کیونکہ کرایہ پر دی ہوئی چیز کے خریدنے میں رغبت کم ہوتی ہے، لہٰذا قرض کی تحصیل کیلئے فروخت کرنے کا موقع آئے تو، یا تو فروخت ہی نہ ہو گی، یا کم قیمت پر فروخت ہو گی۔ اگر کرایہ کی مدت قرض کی ادائیگی کی مدت کے ساتھ یا اس سے پہلے ہی ختم ہوتی ہو، تو جائز اور صحیح ہے، کیونکہ اس میں مرتہن کا کچھ نقصان نہیں۔
اسی طرح مرہون کو کسی دوسرے مرتہن کے پاس بھی رہن نہیں رکھ سکتا، کیونکہ دونوں کے حق میں تزاحم و ٹکراؤ ہو گا، اور رہن کا مقصد فوت ہو گا۔
اگر مذکورہ مفاسد نہ ہوں تو تصرف صحیح اور نافذ ہو گا جیسے عاریت پر دینا وغیرہ۔ یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جب کہ مرتہن کی اجازت کے بغیر تصرف ہو، اگر اس کی اجازت سے ہو تو تمام تصرفات نافذ اور صحیح ہیں، اور اس پر شرعی آثار کا ترتب ہو گا، کیونکہ ممانعت مرتہن کے حق کے خاطر تھی، اور اجازت سے وہ خود اپنے حق سے دستبردار ہو چکا۔
اب مرتہن اپنی اجازت سے رجوع نہ کرے اور راہن تصرف کرے تو تصرف نافذ ہو گا، اور اس تصرف سے ملکیت زائل ہو جیسے ہبہ وغیرہ تو رہن باطل اور ختم ہو جائیگا، اور ملکیت زائل نہ ہو، جیسے کرایہ و عاریت وغیرہ تو رہن برقرار رہے گا۔
(ب) مرتهن کا تصرف: راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن کا کوئی بھی تصرف باطل ہے۔ اس پر کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہو گا، اگر اس تصرف میں مرہون شئ دوسرے کے سپرد کردے تو یہ اس کی تعدی ہے، اور مرتہن اس کا ضامن ہو گا، کیونکہ یہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے۔
اگر راہن کی اجازت سے مرتہن تصرف کرے تو یہ صحیح اور نافذ ہے، اب اگر اس تصرف سے ملکیت زائل ہو جیسے ہبہ و بیع تو رہن باطل ہو گا، ورنہ برقرار رہے گا، جیسے عاریت اور اجارہ۔
۲) **رهن کی واپسی:** جب قرض کی مکمل ادائیگی ہو جائے تو عقد رہن ختم ہو جائے گا اور مرتہن پر واجب ہے کہ مرہون شئ راہن کو لوٹا دے، خواہ متعین مدت پر قرض ادا ہو یا اس سے قبل، اگر مرتہن بلا عذر نہ لوٹائے یا کوتاہی برتے تو اس چیز کا ضامن ہو گا، کیونکہ اب اسے روکے رکھنے کا حق حاصل نہیں لہٰذا یہ غصب کی طرح ہو جائے گا۔ اگر معقول عذر ہو، مثلاً مرہون کسی دوسری جگہ ہو جس کے لئے آنے میں کچھ مدت درکار ہو تو ضامن نہ ہو گا، اسی طرح اُسے یہ معلوم ہو کہ لوٹانے کی صورت میں فلاں شخص راہن سے زبردستی غصب کرلے گا، اور اس لئے وہ واپسی سے باز آئے تو ضامن نہ ہو گا۔
اگر قرض کی ادائیگی قسط وار ہو، تو جب تک مکمل قرض ادا نہ ہو یا بقیہ اقساط کو مرتہن معاف نہ کردے، رہن ختم نہ ہو گا، لہٰذا رہن تجزی کے قابل ہو تب بھی راہن ادا کردہ قسط کے بالمقابل رہن کے بعض حصہ کی واپسی اور چھڑانے کا مطالبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ رہن دَین کے تمام اجزاء کے عوض وثیقہ ہے، لہٰذا باتفاق فقہاء مکمل ادائیگی کے بغیر اس کا کوئی حصہ نہیں چھوٹے گا۔ (مثلاً ہزار روپئے قرض

کے عوض دو ۲ گھڑی رہن رکھے، پھر ۵۰۰ روپئے کی ادائیگی کے بعد ایک گھڑی چھڑانا چاہے تو اجازت نہ ہوگی)

اگر راہن بوقت عقد یہ شرط رکھے کہ جتنی رقم ادا ہوتی رہے گی اس کے بقدر رہن چھوٹتا رہے گا، تو رہن فاسد ہوگا۔

۷) **مرهون کی فروخت:** قرض کی واپسی کی متعین مدت پر راہن ادائیگی سے قاصر ہو، اور مرتہن مطالبہ کرے، تو مرہون کو فروخت کرکے اس کی قیمت سے ادائیگی ہوگی۔ چونکہ مرہون راہن کی ملکیت ہے، اسلئے فروخت کا حق اس کو یا اس کے وکیل کو حاصل ہوگا، البتہ مرتہن کی اجازت شرط ہے، کیونکہ اس کی مالیت اور قیمت اس کا بھی حق ہے کہ اسی سے قرض کی تحصیل ہوگی۔

اگر مرتہن فروخت کی اجازت نہ دے تو حاکم کے پاس پہنچے، اور وہ فروخت کی اجازت یا قرض کی معافی کا حکم دے گا، پھر بھی مرتہن نہ مانے تو حاکم فروخت کردے گا، اور اس کا قرض ادا کرے گا۔

اسی طرح راہن فروخت پر راضی نہ ہو، تو قاضی اسے دین کی ادائیگی یا مرہون کے فروخت کا حکم دے، اور انکار کی صورت میں خود ہی فروخت کرکے مرتہن کا قرض اس کی قیمت سے چکائے۔ اگر راہن اپنی کوئی دوسری چیز فروخت کرکے قرض چکانا چاہے تو یہ جائز ہے، اور اس پر مرہون کی فروخت کے لئے جبر نہیں کرسکتے، کیونکہ اصل مقصد قرض چکانا ہے، چاہے کہیں سے چکائے۔

اگر راہن مرتہن کو فروحت کی اجازت دے دے، اور وہ راہن کی موجودگی میں فروخت کرے تو صحیح ہے، کیونکہ بیع میں نقصان نظر آئے تو پختگی سے قبل ہی وہ رجوع کرسکتا ہے، راہن کی غیر موجودگی میں مرتہن فروخت کرے تو بیع صحیح نہیں، کیونکہ اس کا فروخت کرنا اپنے مفاد کے لئے ہے، یعنی قرض کی تحصیل، لہٰذا جلد بازی، اور راہن کی مصلحت کی نظر اندازی سے متہم ہوگا۔

قسم دوم: مرهون شئی کی بربادی اور تلف سے متعلق: جس کی درج ذیل صورتیں ہوں گی:

۱) **مرهون کا بنفسہٖ اور اپنے طور پر تلف هوجانا:** اگر تعدی یا کوتاہی کی وجہ سے خود بخود تلف ہوجائے تو تعدی یا کوتاہی برتنے والا ضامن ہوگا، چاہے راہن ہو یا مرتہن۔ اگر مرہون مثلی ہے تو مثل کا ورنہ قیمت کا ضامن ہوگا، اور یہ مثل یا قیمت مرتہن کے قبضہ میں بطورِ رہن رہے گی۔

اور اگر بلا تعدی اور کوتاہی کے مرتہن کے قبضہ میں تلف ہو تو اس پر ضمان نہ ہوگا، یہ راہن کا نقصان شمار ہوگا، اور اس کی وجہ سے قرض کا کوئی حصہ ساقط نہ ہوگا، کیونکہ مرتہن کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، اس کی دلیل یہ حدیث ہے "راہن کو روکا نہ جائے، رہن، رہن رکھنے والے کا ہے، اس کا غُنم (نفع) اسی کے لئے ہے، اور اس کا غُرم (نقصان) اسی کے ذمہ ہے" (الشافعی فی الأم)

رہن، رکھنے والے کا ہے یعنی بربادی اور تلف کی صورت میں راہن کے مال میں شمار ہوگا، جیسا کہ اگلے جملہ سے واضح ہے، غنم کا مطلب ہے اس کی سلامتی واضافہ اور منافعہ، اور غُرم یعنی اس کے اخراجات، نقصان اور بربادی، لہٰذا یہ تلف مالک یعنی راہن کا ہے، لیکن راہن کے دوبارہ رہن رکھنے کے لئے اس کے بدل کا ضامن نہ ہوگا، کیونکہ اس کے تلف میں اس کا کوئی قصور نہیں۔

حدیث کے مفہوم کی مزید تاکید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ رہن قرض کا وثیقہ ہے، لہٰذا بلا تعدی تلف ہوجائے تو دیگر وثائق مثلاً قرض کا تحریری ثبوت، گواہ، یا کفیل کے تلف وہلاک ہونے کی طرح ہوگا، اور ان وثائق میں سے کسی کے تلف سے قرض ساقط نہیں ہوتا، لہٰذا مرہون کے تلف سے بھی ساقط نہ ہوگا۔

۲) **مرهون شئی کو تلف کردینا:** راہن، مرتہن یا کوئی تیسرا شخص (جس کو ہم اجنبی سے تعبیر کرلیں) جس کا اس عقدِ رہن سے کوئی تعلق نہیں، مرہون کو تلف کردے، تو وہ اس کا ضامن ہوگا، جس کی تفصیل یوں ہے:

۱-اگر راہن تلف کر دے تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

(الف) اگر قرض چکانے کی مدت آچکی ہو تو راہن سے اپنے قرض و ادھار کا مطالبہ کرے، مرہون کی قیمت و ضمان کے مطالبہ کی ضرورت نہیں، جب مدت مکمل ہو چکی تو اب دوبارہ رہن رکھنے کی کیا ضرورت۔

(ب) اگر ابھی ادائیگی کا وقت نہ ہوا ہو تو مثل یا قیمت کا مطالبہ کرے، تاکہ تکمیلِ مدت تک تلف شدہ رہن کی جگہ اسے رہن رکھے، کیونکہ ضمان مضمون کے قائم مقام ہوتا ہے۔

(ج) ضمان کا مطالبہ اور بوقتِ ضرورت حاکم کے روبرو مسئلہ کی پیشی مرتہن کی ذمہ داری ہے، کہ مرہون کے حبس (روکنے) کا اصل حق اسی کا ہے۔

۲-اگر مرتہن تلف کر دے تو یہ احکام مرتب ہوں گے:

(الف) جس دن مرتہن نے اس پر قبضہ کیا تھا، اس دن کی قیمت کا یا مثل کا ضامن ہو گا، کیونکہ غیر کا مال بلا حق تلف کیا ہے۔

(ب) ادائیگی کا وقت نہ ہوا ہو، تو یہ مثل یا قیمت مدت کی تکمیل تک مرتہن کے قبضہ میں رہن رہے گا، کیونکہ یہ سابقہ مرہون کا بدل ہے، لہٰذا وہی حکم اس کا بھی ہو گا۔

(ج) اگر ادائیگی کا وقت ہو چکا ہو، اور ضمان قرض کی جنس سے ہو، تو مرتہن اس میں سے اپنا حق لے لے، بقیہ مقدار لوٹا دے، اگر قرض کی مقدار اس سے زائد ہو تو بقیہ راہن سے وصول کر لے، اور دونوں مساوی ہو، تو برابر سرابر ہو گیا، کسی کے ذمہ کچھ نہ ہو گا۔

۳) اگر اجنبی مرہون شئ تلف کر دے تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(الف) مرہون کا مثل ہو تو مثل کا ورنہ اتلاف کے دن کی قیمت کا ضامن ہو گا، اور یہ ضمان تلف شدہ مرہون کی جگہ مرتہن کے پاس رہن رہے گا۔

(ب) خصومت اور مطالبہ کا اصل حق راہن کا ہے، کیونکہ وہی مالک ہے، البتہ مرتہن بھی وہاں حاضر رہ سکتا ہے، کیونکہ بدل سے اس کا حق متعلق ہے، جو کہ اس کے پاس رہن رہے گا، راہن مطالبہ نہ کرے تو مرتہن کو مطالبہ کا حق نہیں۔

قسم سوّم: رهن کی نشوونما اور اضافه کے متعلق: یعنی درخت کے پھل، کھیت کا غلّہ و آمدنی، جانور کا موٹاپا، اولاد، مکان کا کرایہ، گاڑی کی آمدنی وغیرہ۔

مرہون شئ سے اس طرح متصل یا منفصل کوئی اضافہ یا آمدنی حاصل ہو تو وہ راہن کی ملکیت ہے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کا اِضافہ ہے، لہٰذا وہی اس کا بھی حکم ہو گا۔

البتہ متصل زیادتی مثلاً رہن کے جانور کا موٹا ہونا وغیرہ، یہ بھی رہن ہی رہے گا، کیونکہ اسے اصل سے جدا نہیں کر سکتے، اور منفصل (جدا) زیادتی اور اضافہ مثلاً اولاد، دودھ اور پھل وغیرہ، رہن میں داخل نہیں، اور مرتہن اسے روک نہیں سکتا، کیونکہ یہ راہن کی ملکیت ہے اور اس کے متعلق عقدِ رہن جاری نہیں ہوا، حدیث کے لفظ "اس کے منافع راہن کے لئے ہیں" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قسم چهارم: رہن سے متعلق بعض جزئیات اور فروعی احکام:

۱) **مرهون کسی عادل کے قبضه میں رکھنا:** کسی وجہ سے بعض اوقات راہن کو مرتہن کے پاس اپنی چیز رکھنے پر اطمینان نہ ہو گا، تو ایسی صورت میں دونوں متفقہ طور پر کسی عادل اور معتبر شخص کے پاس اسے رکھ سکتے ہیں، عادل کا مطلب جو قابل اعتماد

اور امانت دار ہو، جس سے راہن اور مرتہن دونوں راضی ہوں، جب وہ عادل مرہون پر قبضہ کرلے تو یہ قبضہ صحیح ہے اور عقد رہن مکمل ہوگا، اور قبضہ میں وہ مرتہن کا وکیل شمار ہوگا۔

کسی عادل کے پاس مرہون شئ رکھنے کی صورت میں یہ احکام متعلق ہوں گے:

۱- وہ عادل شخص شئ مرہون راہن یا مرتہن کے سپرد نہیں کرسکتا، جبکہ دونوں کی اجازت نہ ہو، اجازت کے بغیر کسی کے سپرد کردے تو ضامن ہوگا، اگر وہ چیز تلف ہوجائے تو قیمت یا مثل کا ضمان لازم ہوگا۔

۲-اس کی تعدی یا قصور کے بغیر مرہون تلف ہو تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ اس کا قبضہ مرتہن کے مثل ہے، جو کہ قبضہ امانت ہے۔

۳- قرض کی ادائیگی کے وقت ادائیگی میں دشواری کی وجہ سے راہن و مرتہن دونوں اسے مرہون کے فروخت کی اجازت دیں یا بوقت عقد ہی دونوں اس کے فروخت کی شرط لگائیں، تو اس صورت میں وہ فروخت کرسکتا ہے، بوقت فروخت راہن سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، اجازت یا شرط کے بغیر اسے فروخت کا اختیار نہیں، کیونکہ دونوں نے اسے صرف اپنے پاس رکھنے کا حق دیا ہے نہ کہ تصرف کا، اگر راہن اجازت کے بعد اسے بیع سے روکے تو یہ روکنا صحیح ہے، اب اسے فروخت کا حق نہ ہوگا، اسی طرح وہ عادل خود اس حق سے دستبردار ہوسکتا ہے۔

۴- تعدی کی وجہ سے بصورت تلف عادل ضامن ہو، یا راہن و مرتہن میں سے کسی ایک کے سپرد دوسرے کی اجازت کے بغیر کرے اور اس کے ہاتھوں وہ تلف ہو، تو عادل سے قیمت لے کر اُسے از سرِ نو اُسی کے پاس یا کسی اور کے پاس رھن قرار دیں گے۔

۲) مُستعار (عاریت پر لی ہوئی چیز) کا رہن: اگر رہن رکھنے کے لئے راہن کسی دوسرے کی چیز عاریتاً لے تو اس سے متعلقہ احکام کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- **راھن یعنی مستعیر اصل مالک** (معیر) کو دَین کا جنس، مقدار، صفت اور مرتہن کی تفصیلات سے آگاہ کرے۔

۲- **راھن اور مالک کی موافقت:** مالک (یعنی معیر اور عاریت پر دینے والے) کے شرائط کے مطابق راہن رہن رکھے تو رہن صحیح ہوگا، اور مرتہن قبضہ کرلے تو یہ عقد مکمل اور لازم ہوگا، اب معیر یا راہن رجوع نہیں کرسکتا، اور رہن کے سابقہ تمام احکام مرتب ہوں گے، منجملہ ان کے یہ کہ اگر مرہون تعدی و تقصیر کے بغیر مرتہن کے پاس ضائع ہو تو اس پر ضمان نہ ہوگا۔ جیسا کہ راہن پر بھی نہ ہوگا۔

اگر راہن مالک کے شرط کی مخالفت کرے، مثلاً اس نے زید کے پاس رہن رکھنے کے لئے عاریت دی اور اس نے افضل کے پاس رکھا، تو رہن باطل ہے، اسی طرح قرض کی جنس میں مخالفت ہو، مثلاً ریال کے عوض رہن کے لئے دے، اور یہ روپے کے عوض رکھے، یا مقدار میں مخالفت ہو، مثلاً ہزار کے عوض رہن کے لئے دے اور یہ دو ہزار کے عوض رکھے، تو باطل ہے، اگر شرط سے کم مقدار پر رکھے، مثلاً ہزار کے شرط پر دے، اور راہن ۵۰۰ روپئے کے عوض رکھے تو صحیح ہے، کیونکہ اس میں مزید سہولت اور معیر کی مصلحت ہے۔

۳- **مُستَعِیر (عاریت پر لینے والا، راھن) کے ھاتھوں مستعار کا تلف:** مسئلہ گذر چکا کہ مرتہن کے پاس تلف ہو تو کسی پر ضمان نہیں، لیکن مُستَعِیر (راہن) کے پاس تلف ہو یا عیب دار ہوجائے تو وہ ضامن ہے، خواہ مرتہن کے سپرد کرنے سے قبل تلف ہو یا رہن چھڑانے کے بعد، اس کی تعدی سے ہو یا بلا تعدی۔

۴- **مُعیر کا مُستعار کو رھن سے چھڑانا:** قرض چکانے کی مدت پر راہن چکانے اور رہن چھڑانے سے عاجز ہو، اور معیر قرض چکا کر اپنی چیز رہن سے چھڑانا چاہے تو اس کو اس کا اختیار ہے، اور مرتہن پر اسے قبول کرنا لازم ہے، اس صورت میں معیر راہن

سے ادا کردہ رقم مکمل واپس لوٹالے گا۔

مُعیر یا مُستعیر کی موت: مستعیر (راہن) کی وفات ہو، اور قرض چکانے کیلئے کچھ مال نہ چھوڑے، تو رہن اپنی حالت پر باقی رہے گا، مرہون کو مُعیر کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کرسکتے کیونکہ اس کی ملکیت ہے، اگر وہ فروخت پر راضی ہو اور اس کی قیمت سے قرض مکمل ادا ہو تا ہو تو فروخت کیا جائے، خواہ مرتہن، متفق نہ ہو، لیکن قرض مکمل ادا نہ ہو تو مرتہن کی رضامندی کے بغیر فروخت نہیں کرسکتے، کیونکہ اسے روکنے میں اس کا نفع ہے، ممکن ہے مالک کو اس چیز کی ضرورت پیش آئے اور وہ پورا قرض ادا کرکے چھڑانے کی کوشش کرے، یا آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور پورا قرض ادا ہو جائے۔

اگر معیر کا انتقال ہو، اور اس پر قرض ہو، اور ادائیگی کے لئے اس رہن کے علاوہ کوئی چیز نہ چھوڑی ہو، تو راہن کو اسے چھڑانے کا حکم دیں گے، تاکہ معیر کے ورثاء کے سپرد کرکے اس سے قرض ادا کیا جائے، اور ہر کسی کو اپنا حق مل جائے، راہن چھڑانے پر قادر نہ ہو تو وہ رہن ہی رہے گا، اور معیر کے وارثوں کو اس صورت میں راہن کا قرض ادا کرکے اسے چھڑانے کا حق ہو گا، اگر وہ قرض ادا نہ کریں اور وہ اور دیگر قرض خواہ رہن کے فروخت کا مطالبہ کریں تو فروخت کیا جائیگا، جبکہ اس کی قیمت سے مرتہن کا قرض مکمل ادا ہو، خواہ مرتہن راضی نہ ہو، اگر قرض مکمل ادا نہ ہو تو مرتہن کی اجازت کے بغیر فروخت نہ کی جائے۔

۳) عقد رهن کی تکمیل کے بعد مرهون یا دَین میں اضافه:

(الف) مرهون میں اضافه: قرض کے عوض کوئی چیز رہن رکھے اور مرتہن کے مرہون پر قبضہ کے بعد راہن کوئی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ بطورِ رہن رکھنا چاہے، تو صحیح ہے، کیونکہ اس میں مرتہن کے حق کی اور مضبوطی ہے، جیساکہ بلا رہن قرض لینے کے بعد پھر کوئی چیز رہن رکھے۔

مرتہن جب اس اضافہ اور دوسری چیز پر قبضہ کرلے تو یہ اور پہلی چیز مل کر مکمل ایک ہی رہن شمار ہوں گے، اور اس پر بھی رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

(ب) دَین (قرض) میں اضافه: مثلاً ایک ہزار کے عوض کوئی چیز رہن رکھے، اور قبضہ ہو کر عقد مکمل ہو، پھر مزید ہزار روپئے قرض لینا چاہے، بشرطیکہ یہی رہن اس ہزار کی جانب سے بھی رہن قرار پائے (یعنی کل دو ہزار کی طرف سے رہن شمار ہو،) تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ اس صورت میں وثیقہ میں کمی پائی جارہی ہے۔

۴) رهن کے طرفین (عاقدین - راهن ومرتهن) میں تعدّد:

۱- راهنوں کا تعدّد (یعنی ایک سے زائد راهن): مثلاً کسی کا دو یا زائد افراد پر قرض ہو، اور یہ سبھی مقروض تمام قرضوں کے عوض ایک ہی عقد میں ایک چیز مثلاً گھر یا گاڑی وغیرہ رہن رکھیں، تو یہ صحیح ہے، چاہے ان سب پر ایک ہی عقد میں قرض ثابت ہو، یا علیٰحدہ علیٰحدہ، کیونکہ مرتہن خریدار کی طرح اور راہن فروخت کنندہ کیطرح ہے، اور ایک آدمی کئی لوگوں سے ایک چیز خرید سکتا ہے، اس صورت میں راہن جدا جدا ہونے کی وجہ سے عقد رہن جدا جدا شمار ہو گا، لہٰذا جو بھی اپنا قرض ادا کرے گا، اس کے بالمقابل اس کا حصہ اس مرہون میں سے چھوٹ جائے گا۔

۲- مرتهن کی کثرت: دو یا زائد افراد کا کسی ایک شخص پر قرض ہو، اور وہ ان تمام قرضوں کے عوض اپنا مکان مثلاً اُن سب کے پاس رہن رکھ دے اور وہ قبول کرلیں، تو یہ صحیح ہے، خواہ یہ سب مذکورہ قرض میں شریک ہوں، یا نہ ہوں (بلکہ ہر ایک کا اپنا الگ الگ

قرض ہو) راہن ان میں سے جس کا بھی قرض ادا کر دے، اسی تناسب سے مرہون کا اتنا حصّہ رہن سے آزاد ہو گا، کیونکہ مستحقین کے تعدد کی وجہ سے عقد رہن بھی الگ الگ شمار ہو گا۔

۳-**مرھون چیز کا تعدّد:** مثلاً راہن مرتہن سے کہے: میں نے یہ دونوں گاڑیاں دو لاکھ کے عوض تمہارے پاس رھن رکھیں، اور مرتہن قبول کر کے ان پر قبضہ کرے، تو یہ عقدِ رہن صحیح ہے،

بلا تفریق پورے قرض کے عوض یہ رہن رکھے، تو جب تک مکمل قرض ادا نہ ہو، رہن کا کوئی حصہ، (مثلاً ایک گاڑی) واپس نہیں لے سکتا، اگر رہن کے وقت تفریق کرے اور یوں کہے: ہر گاڑی ایک لاکھ کے عوض، تو یہ دو جدا جدا عقدِ رہن شمار ہوں گے، لہٰذا ایک کے بالمقابل قرض کی رقم (مثلاً ایک لاکھ) ادا کرے تو ایک گاڑی واپس لے سکتا ہے۔

متفرقات

۱) جو چیز جلد بگڑنے یا سڑنے والی ہو، اسے رہن رکھ سکتے ہیں، جبکہ اُسے خشک کر کے محفوظ کیا جا سکتا ہو، جیسے کھجور اور انگور جو خشک ہو سکیں، یا فوری واجب الادا قرض کے عوض رہن رکھے، یا سڑنے سے پہلے قرض کی واپسی کی تاریخ آجائے، یا سڑنے کے وقت کے بعد قرض چکانے کا وقت ہو تا ہو، لیکن ایسی صورت میں بگڑنے سے قبل اسے فروخت کر کے قیمت کو اس کی جگہ رہن رکھنے کی شرط ہو۔

سڑنے سے قبل ادائیگی کا وقت نہ آئے تو پہلی صورت میں خشک کر کے رکھا جائے، اور یہ مصارف اور ذمہ داری مالک (راہن) کی ہے، اور دیگر صورتوں میں فروخت کر کے قیمت کو رہن رکھے۔ (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل ۳/۲۷۲)

۲) مرہون پر قبضہ سے قبل راہن یا مرتہن میں سے کوئی مر جائے، یا پاگل یا بے ہوش ہو جائے تو رہن باطل نہ ہو گا، موت کی صورت میں وارث اور پاگل پن کی صورت میں اس کے مال کی نگرانی کا ذمہ دار رہن کے لینے یا دینے میں قائم مقام ہو گا، بے ہوشی میں افاقہ کا انتظار کریں گے۔ (مغنی المحتاج ۲/۱۲۹)

۳) راہن غائب ہو اور شہر میں کوئی شرعی حاکم بھی نہ ہو، تو مرتہن خود رہن فروخت کر کے اپنا حق حاصل کرے (مغنی المحتاج ۲/۱۳۵)

۴) مرتہن غائب ہو، اور راہن قرض کی رقم حاکم کے سپرد کر کے رہن چھڑانے کا مطالبہ کرے تو جائز ہے (مغنی المحتاج ۲/۱۳۵)

۵) کسی کا انتقال ہو، اور اس پر قرض ہو، تو اس قرض کا تعلق اس کے ترکہ سے مرہون سے قرض کے تعلق کی طرح ہے، (یعنی ترکہ کو اس قرض کے عوض رہن سمجھا جائیگا)، اسی میں میت کی بہتری ہے، کیونکہ اس صورت میں وارث کو ترکہ میں تصرف کی اجازت نہ ہو گی، قرض ترکہ کے مساوی ہو یا کم و بیش یہی حکم ہو گا۔

وارث ترکہ میں تصرف کرے، اور مورث (میّت) پر کوئی قرض نہ ہو، پھر قرض طاری ہو، مثلاً عیب کی وجہ سے خریدار چیز لوٹا دے جس کی قیمت میت ختم کر چکا، تو اس کی وجہ سے وارث کا تصرف فاسد نہ ہو گا، لیکن وارث اس خریدار کا قرض (قیمت) ادا نہ کرے تو اس تصرف کو فسخ کیا جائے گا۔

اگر وارث ترکہ اپنے پاس رکھ کر اپنے مال میں سے قرض ادا کرنا چاہے تو یہ جائز ہے، لیکن میت خود قرض کے عوض اپنی کسی چیز کو دینے کی وصیت کر جائے، یا اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے قرض چکانے کی وصیت کرے، تو اس وصیت پر عمل کرے، وارث

اس چیز کو رکھ کر دوسری جگہ سے قرض ادا نہیں کر سکتا۔

قرض کا ترکہ سے تعلق ہونے کے باوجود وارث اس کے وارث ہوں گے، لہٰذا ترکہ کے زوائد سے قرض کا تعلق نہ ہوگا، مثلاً اولاد وغیرہ (بلکہ وارث کی ملکیت ہوگی) (مغنی المحتاج۔ ۱۴۴/۲)

قرض اور وصیتوں کی دائیگی سے قبل وارث کا ترکہ میں تصرف یا اس کی تقسیم صحیح نہیں، اگر میت پر حج فرض ہو تو اس کی ادائیگی بھی قرض میں داخل ہے، خواہ میت نے حج بدل کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اگر وارث قرض کی مقدار ترکہ میں سے یا کہیں اور سے وصی یا حاکم کے حوالہ کرے تو اب بقیہ مال میں بعض فقہاء کے نزدیک تصرف کی اجازت ملے گی، لیکن ابن حجر اور رملی کا فتویٰ یہ ہے کہ جب تک حج ادا نہ ہو، وارث کا تصرّف صحیح نہ ہوگا۔ (بغیۃ المسترشدین ص ۱۳۷)

۶) نقدی، اشیاء اور قرض کی شکل میں جو بھی ترکہ ہے، تمام ورثاء اس میں مشترک ہیں، لہٰذا صحیح حصہ کے بغیر کسی حصہ پر کسی کا تنہا اور مستقل حق نہ ہوگا، حتی کہ ایک وارث قرض کا ایک حصہ وصول کرے تو یہ تنہا اس کا حق نہ ہوگا، خواہ مقروض نے اس وارث کے حصہ کے قرض کی ادائیگی کا قصد کیا ہو، البتہ کوئی وارث اپنے قرض خواہ کو ترکہ کے قرض میں سے وصول کرنے کے لئے حوالہ کرے، اور ترکہ کا مقروض اس کے سپرد کر دے تو یہ تنہا اس کا ہوگا، دیگر ورثاء اس میں شریک نہ ہوں گے (حاشیۃ الجمل ۳۰۷/۳)

۷) میت کا کسی پر قرض ہو تو وہ اپنے صفت کے ساتھ وارث کی طرف منتقل ہوگا لہٰذا قرض کے عوض رہن ہو تو وہ حق بھی وارث کی طرف منتقل ہوگا، لیکن راہن پر یہ لازم نہیں کہ رہن وارث کے قبضہ میں دے، کیونکہ یہ مورث کے قبضہ سے راضی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وارث کے قبضہ سے بھی راضی ہو، (حاشیۃ الجمل ۳۰۷/۳)

۸) ضمان اور عدم ضمان میں فاسد عقد بھی صحیح عقد کی طرح ہے، لہٰذا اگر صحیح عقد ضمان کا مقتضی ہو، جیسے فروخت اور عاریت، تو اس کے فاسد میں بدرجہ اولیٰ ضمان ہوگا، اور صحیح عقد ضمان کا مقتضی نہ ہو، جیسے رہن اور ہبہ وغیرہ، تو فاسد میں بھی ضمان نہ ہوگا، نفس ضمان میں برابری مراد ہے، نہ کہ ضامن اور مقدار میں، کیونکہ اس میں کبھی فرق بھی ہو سکتا ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۲۸۲/۴)

۹) اگر قرض کی ادائیگی کا وقت آنے پر رہن مرتہن کے حق میں فروخت شدہ شمار کرنے کی شرط لگائی جائے تو رہن اور فروخت دونوں فاسد ہیں، اور مرہون وقت آنے تک امانت اور بعد میں مضمون (ضمانت کا موجب) ہے۔ (نہایۃ ۲۸۳/۴)

حَجْر [مالی تصرفات پر پابندی اور ممانعت]

حَجْر عربی زبان میں روکنے اور منع کرنے کو کہا جاتا ہے، اور شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں "مالی تصرفات میں خلل انداز کسی سبب کی وجہ سے مالی تصرفات سے روکنے کو حجر کہا جاتا ہے۔"

تصرفات میں خلل انداز اسباب کئی اور مختلف ہیں، اور اسی اعتبار سے حجر بھی مختلف ہیں۔ مثلاً: مفلس (دیوالیہ) پر قرض خواہوں کے حق کی وجہ سے پابندی، مرض الموت میں وارث کے حق کی وجہ سے روک، بچے اور پاگل پر ان کے مال کی حفاظت کی خاطر حجر، غلام پر اس کے آقا کی مصلحت کے پیش نظر پابندی، مرتد پر مسلمانوں کی مصلحت کی وجہ سے حجر، راہن پر مرتہن کے حق کی وجہ سے مرہون میں تصرف پر پابندی۔ ان میں سے اکثر انواع متعلقہ ابواب میں مذکور ہیں، اس باب میں اس کے اہم انواع پر گفتگو ہوگی۔

(جس پر مالی تصرف کی پابندی عائد ہوتی ہے، اسے مَحْجُور علیہ کہا جائے گا)

مشروعیت: مذکورہ تعریف کے مطابق حجر اور مالی تصرف کی پابندی قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں مشروع ہے۔
آیت: ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا''(سورہ النساء: ۵)

ترجمہ: ''اور مت پکڑا دو بے عقلوں (کم عقلوں) کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے گذران کا سبب بنایا ہے۔'' (سفہاء یہ سفیہ کی جمع ہے، یعنی جس میں مالی تصرف کی صلاحیت اور سمجھ نہ ہو، اور مال کو بے موقع صرف کرتا ہو۔ مال کو تمام کی طرف منسوب کیا؛ کیونکہ یہ اللہ کا مال ہے، اور امت کا اس میں حق ہے، گرچہ کسی فرد کی خالص ملکیت ہو) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں سرپرستوں اور ذمہ داروں کو اس سے منع فرمایا کہ سفہاء اور بے عقلوں کے قبضہ میں مال دیں، اور یہی ان پر حجر اور پابندی ہے۔

۲) ''وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ''(النساء: ۶)

ترجمہ: ''اور یتیموں کو سدھاتے رہو، جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو، پھر اگر ان میں ہوشیاری (یک گونہ تمیز) دیکھو، تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو''۔ (یتیم یعنی وہ بچہ اور نابالغ جس کا باپ انتقال کر جائے، اور نکاح کی عمر کو پہنچنے سے مراد بلوغ ہے، اور رشد کا مطلب ہے عقل کی سلامتی حسنِ تصرف اور دینی صلاح) آیت سے معلوم ہوا کہ جس میں ابھی رشد (ہوشیاری اور تمیز) نہ ہو، اس کے سپرد مال نہیں کیا جائے گا، بلکہ رشد کی صفت آنے تک اس پر تصرفات کی پابندی عائد ہوگی (جس میں رشد کی صفت ہو، اسے 'رشید' کہتے ہیں)

۳) ''فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ'' (البقرہ: ۲۸۲)

ترجمہ: ''پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے، بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا، تو بتلاوے کارگذار اس کا انصاف سے'' (یعنی جو مدیون و مقروض ہے، وہ اگر بے عقل بھولا یا سست اور ضعیف ہے، مثلاً بچہ ہے یا بہت بوڑھا ہے کہ معاملہ کے سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں ہے، یا معاملہ کو کاتب کو بتلا نہیں سکتا، تو ایسی صورتوں میں مدیون کے مختار اور وارث اور کارگذار کو چاہئے کہ معاملہ کو انصاف سے بلا کم و کاست لکھوادے) اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ ان لوگوں کی طرف سے ان کے اولیائ (مختار اور سرپرست) تصرف کریں گے، اور یہی حجر کا مطلب ہے۔

احادیث:

۱) آپ ﷺ نے کسی قرض کی وجہ سے حضرت معاذ پر پابندی عائد کی اور ان کا مال فروخت کردیا (تاکہ اس سے قرض ادا ہو) (رواہ البیہقی والحاکم وصححہٗ)

۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں ''مجھے غزوۂ احد کے وقت آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا جبکہ میری عمر ۱۴ سال تھی، تو آپ ﷺ نے (غزوہ میں شرکت کی) اجازت نہ دی، اور غزوۂ خندق میں آپ ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو میری عمر ۱۵ ر سال تھی، تب آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی'' (متفق علیہ)

۳) اُسَیْفِعْ پر لوگوں کا کافی قرض چڑھ گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ اُس پر جس کا بھی قرض ہو وہ کل حاضر ہو جائے، کیونکہ ہم اس کا مال فروخت کر کے (قیمت) قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کرنے والے ہیں۔ (امام مالک)

قرآن وحدیث کے نصوص کی روشنی میں حجر کی مشروعیت اور جواز پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حکمت: حجر ایک سلبی اور احتیاطی عمل ہے، جس میں بعض اوقات مجور علیہ (جس پر پابندی عائد ہے) کی، اور بعض اوقات

دوسروں کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے۔

خرید و فروخت اور مالی تصرفات کے لئے صحیح صلاحیت اور مالی اور دینوی امور میں مہارت اور واقفیت ضروری ہے، لہٰذا جن میں یہ صفات نہ ہوں (جیسے بچے پاگل وغیرہ)، ان پر خود تصرف کی پابندی لگا کر، ان کے ذمہ داروں کے حوالہ کرنے میں ان کے مال کی حفاظت اور ان کے حق میں بہتری اور مصلحت ہے۔

ایک مفلس (دیوالیہ) شخص، جس پر دوسروں کے قرض کا بوجھ ہو، اپنے بقیہ مال میں اپنی مرضی سے تصرف کر کے ان قرض خواہوں کو مزید نقصان پہنچائے گا، اور ان کے حقوق فوت ہو جائیں گے لہٰذا حاکم کی جانب سے اس پر حجر لگا کر اس مال کو قرض خواہوں میں تقسیم کرنے میں ان کی بھلائی اور بہتری ہے۔

حجر کے انواع: (۱) نابالغ، سفیہ (کم عقل اور بھولا) اور پاگل پر حجر (۲) مفلس (دیوالیہ) پر حجر (۳) جس مریض کے موت کا خطرہ ہو، اس پر حجر

۱) **نابالغ:** ایک نابالغ کا حجر رشد کی صفت کے ساتھ بالغ ہوتے ہی ختم ہو گا۔

بلوغ: قمری مکمل پندرہ سال کی عمر ہو، یا مکمل قمری نو سال کے بعد انزال ہو، تو اس سے مرد اور عورت پر بلوغ کا حکم لگ جائیگا۔ نیز عورت کو ممکنہ وقت میں حیض آئے یا وہ حاملہ ہو جائے تو یہ بھی اس کے حق میں بلوغ کی علامت ہے۔

کافر کے بچہ اور جس کا اسلام معلوم نہ ہو، اس کے زیر ناف کھردرے اور سخت بال اُگنا، ان کے حق میں بلوغ کی علامت سمجھی جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان کے حق میں یہ بلوغ کی علامت نہیں ہے۔

رُشد (ھدایت): یعنی دینی اور مالی صلاح اور سلامتی و درستگی، پس ایسے حرام کا ارتکاب نہ کرے کہ عدالت (عادل ہونا) باطل ہو جائے، یعنی کسی کبیرہ کا ارتکاب نہ ہو یا صغیرہ پر اصرار نہ ہو اور اس کی اطاعت و نیکیاں برائیوں پر غالب نہ ہوں، یہ دینی صلاح ہے، اور مالی صلاح یہ ہے کہ تبذیر (فضول خرچی) نہ کرے، یعنی معاملات میں بہت زیادہ نقصان اٹھانا، یا مال کو مثلاً سمندر میں پھینک دینا، یا کسی حرام میں صرف کرنا، خواہ وہ حرام صغیرہ ہی ہو۔ صدقات اور راہِ خیر میں مال صرف کرنا اور اپنی حیثیت سے اونچا لباس اور کھانا پینا استعمال کرنا تبذیر میں داخل نہیں ہے۔

(جس میں مذکورہ تفصیل کے مطابق رشد کی صفت ہو، اسے رشید اور جو اس صفت سے عاری ہو، اسے سفیہ کہا جاتا ہے) (السراج الوہاج ص ۲۲۹)

ائمہ ثلاثہ نے رشد کے لئے صرف مالی صلاح کو کافی سمجھا ہے۔ اور امام ابن عبد السلام کا رجحان بھی یہی ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۳۳۹)

رشد کا امتحان اور آزمائش: قرآن نے ''وَابۡتَلُوۡا الۡیَتَامیٰ'' (سورہ نساء:۶) (اور یتیموں کو سدھاتے رہو، ان کی آزمائش کرو اور امتحان لو) کہہ کر بچہ کے رشد کے امتحان کا حکم دیا ہے۔ اس کے دینی رشد کا انداز عبادات و فرائض کی ادائیگی، محرمات سے اجتناب، شبہات سے پرہیز اور صالحین کی مصاحبت کی روشنی میں حاصل ہو گا۔

مالی رُشد کی آزمائش کے مراتب جدا جدا ہیں، ایک تاجر زادہ کا امتحان خرید و فروخت کے مقدمات کے ذریعہ (مثلاً خریدنے میں قیمت کم کرنا، فروخت میں زائد از زائد پر فروخت کرنا وغیرہ)، ایک کاشتکار کے بیٹے کی آزمائش کاشتکاری اور اس سے متعلق نوکر چاکر کی

صحیح نگرانی اور مزدوری کی تعیین اور ادائیگی کے ذریعے اور کسی صنعت و حرفت سے متعلق افراد کی متعلقہ حرفت کی ذمہ داری کے نبھانے کی صلاحیت وغیرہ کے ذریعہ کی جائے گی۔

ایک عورت کے رشد کی آزمائش اس کے مناسب امور میں اس کی مہارت اور سمجھ بوجھ کے ذریعے کی جائے گی، مثلاً ایک عام عورت کے حق میں کھانے کا بلی، چوہا اور مرغی وغیرہ سے حفاظت۔

آزمائش کا دو یا زائد مرتبہ پایا جانا شرط ہے، یہاں تک کہ اس کے رشد کا ظنِ غالب حاصل ہو۔ ایک مرتبہ کافی نہیں، کبھی اتفاقاً بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ آزمائش کا وقت بلوغ سے کچھ قبل ہے۔ لہٰذا اس کا عقد صحیح نہ ہو گا، بلکہ مال اس کے سپرد کر کے بھاؤ تاؤ کرنے میں آزمائیں گے، پھر جب عقد کا ارادہ ہو تو ولی عقد کرے گا۔

آزمائش اور امتحان کا اصل ذمہ دار اس کا ولی اور سرپرست ہے۔ (نہایۃ المحتاج منہا۔ ۴/ ۳۶۳) بالغ ہوتے وقت بھی رشید نہ ہو، تو حجر باقی رہے گا، لہٰذا جو بلوغ سے قبل اس کے مال میں تصرف کرتا تھا، اب بھی وہی کرے گا۔ اگر بوقت بلوغ رشید ہو، تو بلوغ کے ساتھ ہی حجر خود بخود ختم ہو جائیگا، اور اس کا مال اس کے حوالہ کیا جائے گا، اب اس کے بعد وہ تبذیر (فضول خرچی) کرے، تو قاضی (حاکم) اس پر حجر لگائے گا نہ کہ کوئی اور، قاضی کو مستحب ہے کہ اس کا معاملہ باپ یا دادا کے حوالہ کرے، وہ نہ ہوں تو کسی دوسرے رشتہ دار کے سپرد کرے، ایک رشید اور بالغ شخص بعد میں فاسق ہو جائے، تو اس پر حجر نہیں عائد ہو گا (السراج الوہاج ص ۲۳۱)

محجور علیہ سفیہ کے غیر معتبر تصرفات:

کسی سفیہ پر حجر ہو، تو اس کے درج ذیل تصرفات صحیح نہ ہوں گے۔

خرید و فروخت: خواہ کافی نفع کے ساتھ ہو، گرچہ ولی کی اجازت ہو اور وہ عوض متعین کرے۔

غلام آزاد کرنا۔ ہبہ کرنا (کسی دوسرے کا ہبہ قبول کرنا صحیح ہے) اپنے حق میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح قبول کرنا (ولی کی اجازت سے نکاح صحیح ہے۔ نیز کسی دوسرے کا نکاح بطور وکالت قبول کرنا صحیح ہے۔ اور ایجاب نکاح کسی بھی صورت میں صحیح نہیں، نہ اصالۃً اور نہ وکالۃً۔ خواہ ولی کی اجازت سے ہو)

اگر یہ سفیہ کسی غیر مجور علیہ سے کچھ خرید لے یا قرض لے، اور اس کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لے (خواہ سامنے والے کو اس کا مجور علیہ ہونا معلوم ہو یا نہ ہو) پھر اس کے پاس وہ تلف ہو جائے یا تلف کر دے تو اس پر نہ فی الحال ضمان واجب ہے، اور نہ حجر ختم ہونے کے بعد، لیکن وہ گنہگار ہو گا، کیونکہ مکلف ہے۔ اگر رشد کے بعد اسے تلف کر دے، یا رشد کے بعد واپسی کے امکان کے بعد تلف ہو جائے، تو ضمان لازم ہے۔ اسی طرح اگر یہ سفیہ اجازت کے بغیر کسی کے مال پر قبضہ کرے، یا سامنے والا واپسی کا مطالبہ کرے اور پھر تلف ہو یا کسی مجور علیہ کے پاس سے لے تو ضامن ہو گا۔

بالکل مجبوری کی صورت میں کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ کا خریدنا اس کے لئے جائز ہے۔ اس کا حجر سے قبل یا بعد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی قرض یا مال کے تلف کرنے کا اقرار صحیح نہیں، حجر کی حالت میں اس کے پاس موجود کسی چیز کا دوسرے کے حق میں اقرار معتبر نہیں۔

اس کے معتبر اور صحیح تصرفات: طلاق، رجعت۔ خلع (اگرچہ مہر مثل سے کم پر ہو) ظہار، لعان وغیرہ کے ذریعہ بچے کی نفی۔ حد یا قصاص کا اقرار۔

واجب اور مستحب بدنی عبادات میں سفیہ کا حکم رشید کی طرح ہے۔ یہ اپنی زکوۃ از خود تقسیم نہیں کر سکتا۔ اگر ولی اجازت دے، اور

کسے دینا ہے متعین کر دے، تو اس کا ادا کرنا صحیح ہے۔ البتہ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ یہ تقسیم ولی یا اس کے نائب کی نگرانی میں ہونا چاہئے۔

حجر کی حالت میں فرض حج یا عمرہ کا احرام باندھے، تو ولی اس کے مصارف کسی معتبر شخص کے سپرد کر دے، جو راستے میں اس پر خرچ کرتا رہے، یا ولی خود اس کے ساتھ روانہ ہو، البتہ سفر مسافت قصر سے کم ہو اور ولی مناسب سمجھے تو اسی کے سپرد کر سکتا ہے۔

حجر کی حالت میں نفل حج یا عمرہ کا احرام باندھے، اور اس سفر کے مصارف اس کے عام مصارف سے زائد ہوں تو ولی اسے روک دے۔ اور وہ مُحصر کی طرح احرام کھولے گا۔ اور مال کا صرف کرنا ممنوع ہونے کی وجہ سے بجائے دم کے روزہ رکھے گا۔ زائد مصارف کو راستہ میں کما کر پورا کر سکتا ہو تو اسے روکنا جائز نہیں ہے۔ (نہایۃ المحتاج۔ ۳۶۶/۴-۳۷۲)

نابالغ کا ولی (سرپرست):- ایک بچہ اور نابالغ کا سرپرست (والی، ذمہ دار) اس کا باپ، پھر دادا... اوپر تک ہو گا۔ بظاہر ان کا عادل (دین دار) ہونا کافی ہے۔ یہ نہ ہوں تو پھر ان میں سے جو آخر میں انتقال کرے، اس کا وصی (وصی یعنی جس کو وصیت کی جائے) وصی کا باطناً (حقیقتاً) بھی عادل ہونا شرط ہے۔ ورنہ پھر عادل و امین قاضی (حاکم) بچہ کا ولی ہو گا۔ کسی جگہ مناسب قاضی نہ ہو تو اس کی ولایت اور سرپرستی نیک مسلمانوں کو حاصل ہو گی۔ امام ابن عبد السلام فرماتے ہیں کہ جس کے پاس اجنبی یتیم اور اس کا مال ہو اور وہ مال حاکم کے سپرد کرنے کی صورت میں وہ خیانت کرے گا، تو اسے مجبوری کی وجہ سے اس کے مال میں تصرف کی اجازت ہو گی، جبکہ یہ عادل اور امین ہو۔

حدیث:"جس کا کوئی ولی نہیں، اس کا ولی سطان (حاکم) ہے" (ترمذی وحسنہ، والحاکم وصححہٗ)

والدہ اور دیگر رشتہ داروں کو بغیر وصیت کے ولایت حاصل نہ ہو گی۔ لیکن عصبہ (باپ کی جانب سے رشتہ دار) ولی خاص (باپ دادا) کی غیر موجودگی میں بچہ، پاگل اور بالغ سفیہ کا مال ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قلیل مقدار ہے، اس لئے تسامح برتا گیا۔

ولی پر لازم ہے کہ مصلحت کے مطابق بچہ کے مال میں تصرف کرے، اور بربادی سے اس کی حفاظت کرے۔

آیت:"وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" (بنی اسرائیل: ۳۴)

ترجمہ:"اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقہ سے (تصرف کی اجازت ہے) جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے۔"

اگر اس کے مال سے زمین و جائیداد خرید لے، جس کی آمدنی اور کرایہ سے اس کا گذر بسر ہو سکے، تو یہ تجارت سے بہتر ہے۔ یتیم کے مناسب روزی کا کوئی ذریعہ (نوکری وغیرہ) ہو، تو ولی اسے اس کے لئے مجبور کرے۔

ولی کو مجور کے مال میں سے (اپنی ذمہ داری نبھانے کا) کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں ملے گا، اگر وہ غریب ہے اور اس کے مال کی دیکھ ریکھ میں مصروفیت کی وجہ سے کمانہ پاتا ہو تو مناسب اجرت، یا اپنے خرچ میں سے جو کم مقدار ہو، وہ لے گا۔ (مثلاً اس محنت کی اجرت ۲۵، روپیہ یومیہ اور اس کے گذر بسر کے لئے ۳۰/روپیہ یومیہ درکار ہو تو ۲۵ روپیہ لے گا۔)

آیت "وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ" (سورہ نساء: ۶) ترجمہ: اور جس کو حاجت نہ ہو، وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے۔ اور جو شخص حاجت مند ہو، تو وہ مناسب مقدار سے کھالے (برت لے)"

ولی یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا سکتا ہے، اور سہولت کی خاطر اپنے ساتھ کھانے پینے کا معمول رکھ سکتا ہے، جبکہ یہ یتیم کے حق میں بہتر ہو۔

بچے کی جائیداد جیسی اشیاء عام حالات میں فروخت نہ کرے (جبکہ اس کی بربادی وغیرہ کا خطرہ نہ ہو) البتہ اس کی آمدنی بچے کے

کھانے پینے اور لباس وغیرہ مصارف کیلئے ناکافی ہوں، یا عام قیمت سے زائد قیمت مل رہی ہو، جس میں اس سے قیمتی جائیداد خریدی جاسکتی ہو، تو فروخت کر سکتا ہے۔ مالِ تجارت مصلحت کی صورت میں فروخت کرے گا۔ دیگر اشیاء (مثلاً جانور وغیرہ) مالی حاجت اور مناسب نفع کے عوض فروخت کر سکتا ہے۔

ولی بچہ کے مال کی زکوٰۃ ادا کرے، اور بچے کی حیثیت کے مطابق معقول انداز میں اس پر خرچ کرتا رہے۔ (تلخیص فتح الوہاب مع الجمل ۳/۳۴۵-۳۴۹)

اگر بچے پر خرچ کرنے میں تنگی سے کام لے تو گنہگار ہوگا، اور اسراف برتے تو ضامن بھی ہوگا (السراج الوہاج ص ۲۳۲)

مُفلِس (دیوالیہ) پر حجر کے احکام

جس شخص پر اس کے مال سے زائد قرض ہو (جو فی الحال واجب الادا ہو) اسے فقہی اصطلاح میں مفلس کہا جاتا ہے۔ جس کے احکام درج ذیل ہیں:

۱) مُفلس پر حجر اسی وقت جائز ہے، جبکہ اس پر اس کے مال سے زائد قرض ہو چکا ہو، اگر اس کی ملکیت میں موجود مال کے برابر یا اس سے کم قرض ہو، تو حجر جائز نہیں، خواہ اس کا گذر بسر براہِ راست اسی مال سے ہو، یا اس کی روزانہ کمائی میں سے۔

جو قرض موٴجل ہو (یعنی جس کی ادائیگی کا وقت نہ آیا ہو) اس کی وجہ سے حجر عائد نہ ہوگا، نیز حجر کی وجہ سے موٴجل قرض فی الحال ادا کرنا لازم نہ ہوگا (الجمل ۳/۳۱۱)

۲) مفلس پر جن حضرات کا قرض ہے، ان کی طرف سے حجر کا مطالبہ ہو، تب ہی اس پر حجر عائد ہوگا۔

اگر ان میں اختلاف ہو تو حجر عائد ہوگا، جبکہ صرف مطالبہ کرنے والوں کے قرض کی مقدار اس کے مجموعی مال سے زائد ہو۔ کیونکہ آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ پر حجر عائد فرمایا تھا، تو قرض خواہوں کا مطالبہ موجود تھا، نیز یہ حجر ان کی مصلحت کے خاطر ہے، لہٰذا جب خود ان کا مطالبہ نہیں ہے تو گویا ان کی نگاہ میں حجر میں کوئی مصلحت نہیں، پس مفلس کو پریشان نہیں کیا جائیگا۔

۳) جب حاکم مفلس پر پابندی عائد کر دیگا، تو قرض خواہوں کا حق اس کے ذمہ سے اس کے مال کی طرف منتقل ہوگا، گویا کہ مرہون شئی کی طرح ہوگا، جس سے مرتہن کا حق وابستہ ہوتا ہے۔

اس لئے شریعت ان کو اس مال پر تسلط کا حق دیتی ہے، تاکہ اپنا حق وصول کر سکیں۔

۴) حاکم کو سنت ہے کہ مفلس پر عائد شدہ حجر کی تشہیر کرے، تاکہ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے پرہیز کریں۔

۵) حاکم یا اس کے نائب پر واجب ہے کہ مفلس کا مال فروخت کر دے، پھر قیمت قرض خواہوں کے درمیان ہر ایک کے قرض کے تناسب سے تقسیم کرے (مثلاً ایک کا ۵۰ ہزار روپئے اور دوسرے کا ۲۵ ہزار قرض ہو اور مال کی قیمت ۳۰ ہزار ملے تو اول کو ۲۰ ہزار اور دوّم کو ۱۰ ہزار دے دے)

حاکم کو مسنون ہے کہ حتی الامکان جلد از جلد یہ کام انجام دے، نیز فروخت کی کیفیت میں محجور علیہ کے مصلحت کی رعایت کرے، مثلاً جلد بگڑنے والی اشیاء پہلے فروخت کر دے، جیسے کھانا وغیرہ، پھر قابل انتفاع اشیاء، پھر جائیداد وغیرہ اور ہر چیز اس کے بازار میں اور مناسب دام پر فروخت کرے۔ سنت ہے کہ یہ فروخت محجور علیہ اور قرض خواہوں کے روبرو ہو۔

حاکم پر لازم ہے کہ مفلس اور اس کے اہل وعیال کے مناسب ان کی حاجات یعنی لباس، خوراک اور رہائش کے نظم کو باقی رکھے۔ (اور فروخت نہ کرے، تاکہ ان کا بھی گذر بسر ہو سکے۔)

۲) مال یا قیمت جب قرض خواہوں میں تقسیم کر دے، تو اب ان پر لازم ہے کہ اپنے بقیہ قرض کے لئے مفلس کو اس کی تنگدستی دور ہونے تک مہلت دیں، کیونکہ قرآن کا حکم ہے۔ "وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (البقرہ: ۲۸۰)

ترجمہ: "اور اگر (مقروض) تنگدست ہو تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے، آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ کہ بالکل ہی معاف کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

نیز مسلم شریف کی روایت میں ہے: "آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص پر خرید شدہ پھلوں میں آفت آنے کی وجہ سے کافی قرض ہو گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس پر صدقہ کرو"، تو لوگوں نے صدقہ کیا، لیکن اس سے قرض مکمل ادا نہ ہوا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو مل گیا لے لو، اور تمہارا (فی الحال) اتنا ہی حق ہے۔"

لہٰذا مفلس کے مال کی تقسیم کے بعد اب وہ لوگ اس سے بقیہ قرض کی ادائیگی کے لئے کمانے کا یا ان کے پاس نوکری کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

حجر کے بعد مفلس کا تصرف

۱) محجور علیہ مفلس کا کوئی بھی مالی تصرف، مثلاً خرید و فروخت، رہن، ہبہ وغیرہ صحیح نہیں، جبکہ اس کا تعلق اس کے عین مال سے ہو، (یعنی اس کے پاس موجود مال کے ذریعہ ہو، مثلاً اس میں سے کچھ فروخت کرے یا کسی کو ہبہ کرے تو یہ صحیح نہ ہوگا)

۲) ہر وہ مالی تصرف جس کا مفلس کے ذمہ سے تعلق ہو، صحیح ہے۔ مثلاً بطورِ سلم فروخت کرنا۔

۳) مفلس کے تمام غیر مالی تصرفات صحیح ہیں، مثلاً نکاح، طلاق، خلع، قصاص لینا یا معاف کرنا وغیرہ البتہ عورت پر حجر ہو تو اپنے موجودہ مال کے عوض وہ خلع نہیں لے سکتی، کیونکہ اس سے قرض خواہوں کا حق وابستہ ہے۔

۴) اس کا کسی حق یا مال کا اقرار صحیح ہے، جبکہ اس کا وجوب حجر سے پہلے ہو، لہٰذا موجودہ مال میں دیگر قرض خواہوں کی طرح مُقرلہٗ (جس کے مال کا اقرار کیا ہے) کا بھی حصہ ہوگا۔

البتہ وہ اقرار جس کا تعلق حجر کے مابعد سے ہو، نظر انداز کیا جائے گا، اور ان قرض خواہوں کو اسے اپنے ساتھ شریک کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ حجر کے اختتام کا انتظام کرے۔

متفرقات

۱) جس کے پاس مال ہی نہ ہو، اس پر قرض کی وجہ سے حجر عائد نہ ہوگا (جمل ۳/۳۰۹)

۲) قاضی کے پاس کسی مقروض کا تنگدست ہونا ثابت ہو جائے، تو اسے آسودگی تک مہلت دی جائے گی، جیسا کہ آیت میں گزر چکا، لہٰذا اسے قید میں ڈالنا، اس کے پیچھے پڑے رہنا اور قرض کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ (جمل۔ ۳/۳۲۱)

۳) قاضی ایک مقید اور محبوس شخص کو جمعہ، جماعت، بیوی سے جنسی تعلق اور احباب سے گفتگو وغیرہ سے روک سکتا ہے۔

(جمل ۳/۳۲۲)

۴)اگر کسی مجور علیہ مفلس کے پاس یا کسی مفلس میت کے ترکہ میں کسی قرض خواہ کی چیز بعینہ موجود ہو، تو وہ درج ذیل شرائط کی صورت میں وہ چیز واپس لے سکتا ہے۔

۱)معاوضہ محضہ کے طور پر وہ چیز اس کے قبضہ میں گئی ہو، یعنی ایسا عقد جو عوض کے فساد کی وجہ سے فاسد ہو، جیسے فروخت کرنا (اجارہ قرض وغیرہ) لہٰذا کسی عورت کو ذمہ میں خلع دے، پھر اس پر مفلسی کی وجہ سے حجر لگے، تو شوہر عورت سے رجوع نہیں کر سکتا۔

۲)حجر کا علم ہوتے ہی اپنی چیز واپس لے، مسئلہ معلوم ہوتے ہوئے تاخیر کرے گا تو یہ حق فوت ہو گا، جسے مسئلہ معلوم نہ ہو، اس کا حق فوت نہ ہو گا ''میں نے بیع فسخ کر دیا'' جیسے الفاظ سے رجوع کرے۔

۳)اس کے عوض پر قبضہ نہ کر چکا ہو، اگر کچھ عوض لے چکا تو بقیہ کے بالمقابل چیز کو واپس لے سکتا ہے۔

۴)افلاس کی وجہ سے عوض کی تحصیل دشوار ہو، اگر اس کے مقابلہ میں رہن ہو جس سے پوری قیمت کا حصول ممکن ہو، یا کوئی آسودہ ضامن جو ضمان کا اقرار کرتا ہو، موجود ہو تو چیز واپس لینا جائز نہیں۔

۵)عوض قرض (دَین) ہو (یعنی ذمہ میں ہو) اگر کوئی معین چیز عوض ہو، تو دیگر قرض خواہوں کے بمقابل اسے مقدم رکھتے ہوئے وہ چیز بطور عوض دی جائے گی۔

۶)قرض (دین) کی ادائیگی کا وقت ہو چکا ہو۔ اگر ابھی ادائیگی کا مقررہ وقت نہ ہوا ہو، تو واپس نہیں لے سکتا۔

۷)کوئی لازم حق اس سے متعلق نہ ہو، اگر متعلق ہو، مثلاً اس نے بطورِ رہن کسی کے قبضہ میں دیا ہے، تو فی الحال رجوع نہیں کر سکتا۔

اگر فروخت شدہ چیز کی صفت تبدیل ہو جائے، مثلاً انڈے سے چوزہ نکلے، یا بیج پودا بن جائے تو بائع اسی حالت میں واپس لے گا، اس فسخ اور واپسی کے لئے قاضی کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہیں۔ (اعانۃ الطالبین ۳/۶۷)

اگر مبیع میں متصل اضافہ ہو، جیسے (جانور کا) موٹاپا، تو وہ بھی بائع کو بلا عوض ملے گا، اور جدا اضافہ خریدار کا حق ہو گا، جیسے فروخت کے بعد پیدا ہونے والے پھل یا بچے (السراج ص۲۲۷)

حدیث: ''کوئی شخص مفلس ہو جائے، اور بائع (فروخت کنندہ) کو اپنی چیز بعینہ (اس کے پاس) ملے، تو یہ اس کا دیگر قرض خواہوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہے۔'' (بخاری و مسلم)

مرض الموت کے تصرف

تعریف: اس سے وہ مریض مراد ہے، جس کو ایسا مرض لاحق ہو، جو شدت اختیار کرنے کی صورت میں موت کا سبب بنتا ہو، پھر وہ مرض اس حد تک اس پر طاری رہے کہ طبیب (ڈاکٹر) اور تجربہ کار افراد اس کی موت کا خطرہ محسوس کریں۔

گھمسان کی لڑائی، دریا میں طغیانی اور ہواؤں کے تیز جھکڑ اور طوفان اور زچگی کی سخت تکلیف کے اوقات کا بھی یہی حکم ہے۔

دانت درد وغیرہ جیسی بیماری کا یہ حکم نہیں، خواہ کتنا ہی شدید ہو، کیونکہ یہ عموماً موت کا سبب نہیں بنتی۔

احکام: (۱) اگر اس کا کوئی خاص وارث نہ ہو، یا وارث تو ہو لیکن اسے تصرف کا اختیار نہ ہو جیسے چھوٹا بچہ، تو اس مریض کو اپنے تہائی مال سے زیادہ میں تبرعاً تصرف جائز نہیں (یعنی ایسا تصرف جو بلا عوض ہو جیسے ہبہ، صدقہ و خیرات یا وقف وغیرہ کرنا، اگر خرید

وفروخت وغیرہ کرے تو جائز ہے) خواہ یہ تصرف فوراً اور نقد کرے یا موت پر معلق ہو جیسے وصیت۔ اگر ثلث (تہائی) سے زائد میں اس طرح تصرف کرے تو صرف تہائی تک نافذ ہو گا۔ اور زائد میں باطل ہو گا، جبکہ یہ تصرفات یکے بعد دیگرے ہوں، اگر یہ ایک وقت ہوں تو بصورتِ امکان تمام پر تہائی کو اسی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا، ورنہ مکمل باطل ہو گا۔ (مثلاً زید کو دو ہزار اور عمر کو چار ہزار کی وصیت کی ،اور کل مال ۹ر ہزار ہو، تو زید کو ایک ہزار اور عمر کو دو ہزار ملے گا)

۲) اگر اس کا کوئی وارث خاص موجود ہو (یعنی رشتہ داروں میں سے کوئی وارث ہو، بیت المال اور عام مسلمان وارث نہ ہوں)، اور وہ وارث جائز التصرف ہو (یعنی بالغ اور رشید ہو)، تو تہائی سے زائد تبرع وارث کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اجازت دے تو نافذ، ورنہ باطل ہے۔ اس کی اجازت یا عدمِ اجازت کا اعتبار مورث کے موت کے بعد ہو گا۔

حدیث: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں سخت بیمار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو تہائی مال کے صدقہ کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا۔ پھر نصف کی اجازت چاہی تو اس کا بھی انکار فرمایا۔ پھر ایک تہائی کی اجازت دی اور فرمایا ''ایک تہائی بہت ہے تم اپنے وارثوں کو آسودہ اور مالدار چھوڑ جاؤ یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ ان کو تنگدست چھوڑ جاؤ کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔'' (بخاری۔مسلم)

۳) گذشتہ حکم کا ترتب اس وقت ہو گا جبکہ مریض پر اتنا قرض نہ ہو، جو اس کے سارے ترکہ کو گھیرے، اگر اتنا قرض ہو تو تہائی وغیرہ کے قید کے بغیر اس کے مکمل ترکہ پر پابندی عائد ہو گی۔

۴) تبرعات اور واجب تصرفات کے درمیان کچھ فرق ہے، سابقہ تینوں احکام کا اصل تعلق تبرعات سے ہے، واجب تصرفات اگر اپنی زندگی میں انجام دے، تو اس کا اعتبار کل مال سے ہو گا، اور اگر موت کے بعد انجام دینے کے لئے وصیت کرے، مثلاً قرض کی ادائیگی کی وصیت، یا فرض حج یا زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت، اور یہ وصیت مطلق ہو (یعنی تہائی کی قید نہ لگائے)، تو اس کا تعلق بھی کل مال سے ہو گا۔ اگر اسے تہائی ترکہ کے ساتھ مقید کرے اور اس میں ادا نہ ہو پائے تو حسبِ ضرورت مزید ترکہ اس میں صرف کیا جائے گا (اگر کل لگانا پڑا تو کل ترکہ لگائیں گے) لیکن تہائی کے ساتھ مقید کرنے کا ایک فائدہ وارثوں کے حق میں یہ ہو گا کہ ساتھ میں تبرعات کی وصیت ہو تو ان واجب تصرفات کی ادائیگی کے بعد اگر تہائی میں سے ابھی کچھ باقی ہو، تو اس میں ان تبرعات کا حسبِ گنجائش نفاذ ہو گا۔ اگر تہائی میں سے کچھ نہ بچے تو تبرعات نافذ نہ ہوں گے۔ (اور واجب تصرفات کو تہائی کے ساتھ مقید نہ کرے، تو اس کی ادائیگی کے بعد بقیہ کی تہائی میں تبرعات کا نفاذ ہو گا)

صُلح

صلح لغت میں نزاع کو ختم کرکے فریقین کے مابین اتفاق پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور شریعت میں ایسے عقد کو صلح کہتے ہیں، جس سے اتفاق حاصل ہو، اور اختلاف و نزاع دور ہو۔

مشروعیت: صلح جائز اور مشروع ہے، بلکہ کبھی مستحب ہوتا ہے، قرآن مجید نے اسے خیر سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ''وَالصُّلْحُ خَيْرٌ'' (النساء: ۱۲۸) اور یہ اس کے مشروعیت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ بات جو خیر ہو مشروع ہے، اور جو شر ہو وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں ممنوع ہے۔

آیت: "لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا" (النساء : ۱۱۴) **ترجمه:** "عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب وبرکت) نہیں ہوتی۔ ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا حق تعالیٰ کی رضاجوئی کے واسطے سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرماویں گے۔"

قرآن مجید کے دیگر دلائل بھی اس کی مشروعیت پر آگے بیان ہوں گے۔ نیز حدیث سے بھی اس کی مشروعیت ثابت ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "مسلمانوں کے مابین صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جو حرام کو حلال، یا حلال کو حرام قرار دے" (ترمذی، ابوداود، ابن ماجه)

شریعت کے احکام و خطاب سے عموماً مسلمان مقصود ہوتے ہیں اور وہی شرعی احکام کا صحیح اتباع کرتے ہیں، اسلئے حدیث میں مسلمانوں کا ذکر کیا گیا، ورنہ غیر مسلمین کا بھی یہی حکم ہے۔

ہر دور میں مسلمانوں کا صلح کی مشروعیت پر اجماع رہ چکا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "فریقین کو ان کی حالت پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ آپس میں صلح کرلیں، کیونکہ فیصلہ کینہ پیدا کرتا ہے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی، اور کسی نے بھی اس پر انکار و نکیر نہ کی، تو یہ صلح کی مشروعیت پر ان کا اجماع ہوا۔

صلح کی مشروعیت کی حکمت: اسلام وحدت واخوت اور تعاون و بھائی چارگی کا دین ہے، اس نے تفرق، اختلاف اور اس کے اسباب کو بالکل ختم اور نظر انداز کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے "**وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا**" (آل عمران: ۱۰۳) ترجمہ: "اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ کے دین کو جس میں اصول وفروع آگئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو۔"

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ اصحاب حقوق کو حقوق کی ادائیگی کی ترغیب دیتی ہے، کیونکہ اس میں کوتاہی ہی عموماً جھگڑا اور نزاع واختلاف کو بھڑکانے کا باعث بنتا ہے۔

آیت: "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (البقره۔۱۸۸) ترجمہ: "اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعے سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔"

ایک اور آیت میں اسے اور ظلماً کسی کے قتل کو ساتھ ساتھ بیان کیا، کیونکہ یہ اکثر قتل کا سبب بن جاتا ہے۔

آیت: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا" (النساء ۲۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر مثلاً) کوئی تجارت ہو، جو باہمی رضامندی سے ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں۔"

آپ ﷺ بھی آپسی بغض اور نزاع سے ڈراتے ہیں، کیونکہ اس کا انجام قتال وخونریزی ہے، جو لوگوں کو کفر تک لے جاسکتا ہے۔ فرمان ہے: "آپس میں بغض اور حسد اور قطع تعلق نہ رکھو، اور اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کے رہو"۔ نیز ارشاد ہے۔ "میرے بعد کہیں کافر نہ بن جانا کہ بعض بعض کی گردن مارنے لگے۔" (بخاری۔مسلم)

اور لوگوں کو ان اسباب پر ابھارا اور برانگیختہ کیا، جو آپسی محبت کو قوت و دوام بخشے اور اختلاف کے اثرات کو یکسر ختم کردے، پس آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو خرید وفروخت اور قرض کے لین دین میں نرمی (فراخ دلی) سے پیش آئے۔" (بخاری شریف) اور چونکہ لوگوں کے درمیان صلح کرانا، اور آپسی ناچاقی (بگاڑ) اور اختلافات کا ازالہ کرنا، پیش کردہ اسلامی مقاصد کا اہم ترین سبب ہے، اس لئے اسلام نے اس کی ترغیب دی، اسے مشروع قرار دیا اور اسے خیر میں شمار کیا۔ آپ ﷺ نے بغرضِ اصلاح ایسی بات کہنے کا جو کہی نہ گئی تھی، اجازت دی ہے، جب کہ وہ بات نزاع کو ختم کر کے اتفاق کی فضا پیدا کرے، پس ارشاد ہے: "وہ جھوٹا نہیں جو لوگوں میں اصلاح کرے، پس اچھی بات کہے اور نقل فرمائے۔" (بخاری مسلم)

صلح کے اقسام

۱) **مسلم اور غیر مسلم حکومت کے درمیان صلح:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (الانفال: ۶۱) **ترجمہ:** "اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی (اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جایئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے۔"

۲) **عادل مسلمانوں اور باغی مسلمانوں کے درمیان صلح:** آیت "وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا" (الحجرات: ۹) **ترجمہ:** "اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرو۔"

۳) **زوجین (شوہر وبیوی) کے درمیان کچھ نزاع واختلاف پیدا ہو، توصلح کرانا:**
آیت: "وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا" (النساء: ۱۲۸) **ترجمہ:** "اور اگر کسی عورت کو (قرائن سے) اپنے شوہر سے غالب احتمال بددماغی یا بے پرواہی کا ہو سو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کرلیں۔"

۴) **بغاوت سے ہٹ کر کسی غیر مالی معاملہ میں لڑنے والوں میں صلح:**
حدیث: اہل قباء آپس میں لڑ پڑے حتیٰ کہ آپس میں پتھر بازی کی نوبت آئی، جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: "چلو چل کر ان میں صلح کروائیں۔" (بخاری شریف)

۵) **وہ امور جن میں مال کا تعلق ودخل ہو، ان میں صلح:** فقہاء کرام صلح کے باب میں اصل گفتگو اسی پر کرتے ہیں، دیگر اقسام کا تذکرہ ضمناً آتا ہے۔

مدّعِی اور مُدّعیٰ علیہ کے درمیان صلح

اگر مدعی علیہ مدعی کے حق کا اقرار کرتا ہو تو اسے "صلح مع الاقرار" کہیں گے۔ اور اگر حق کا انکار کرتا ہو تو اسے "صلح مَعَ الانکار" کہیں گے۔

صلح مع الانکار: یعنی ایک انسان دوسرے پر کسی حق کا (مثلاً ہزار روپئے، یا گھر وغیرہ کا) دعوی کرے، اور مدعی علیہ اسے تسلیم نہ کرے، بلکہ انکار کرے یا خاموش رہے، پھر مدعی سے صلح کا مطالبہ کرے، تو شرعاً یہ صلح ناجائز ہے۔ اگر واقع ہوا تو باطل ہے، اور صلح کے آثار واحکام (جن کا عنقریب ذکر آئے گا) میں سے کسی کا ترتب نہ ہو گا، کیونکہ یہ حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرنے والی صلح ہے، جو سابقہ حدیث کی رو سے بالکل ممنوع ہے۔

کیونکہ مدعی اگر اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے، تو گویا اس صلح کے ذریعے دوسرے کا مال اپنے لئے حلال قرار دے رہا ہے، حالانکہ وہ اس کے حق میں حرام ہے۔ اور اگر وہ سچا ہے تو اپنے مال کا ایک جزو اپنے اوپر حرام کر رہا ہے، حالانکہ وہ حلال ہے، کیونکہ مدعی علیہ نے (اپنے جھوٹے انکار کی وجہ سے) اسے اپنا یہ حق چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔

صلح مع الاقرار: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کرے، خواہ دعویٰ کسی چیز کے متعلق ہو یا قرض وادھار کے متعلق، اور مدعی علیہ اس حق کا اعتراف واقرار بھی کرے، لیکن مدعی سے مصالحت کی درخواست کرے، اور دونوں میں کسی بات پر صلح ہو جائے، تو یہ جائز اور صحیح ہے، اور اس پر صلح کے آثار واحکام مرتب ہوں گے، کیونکہ یہ صورت صلح کے جواز اور مشروعیت کے دلائل میں سرِفہرست داخل ہے۔ اس کی مختلف صورتیں حسب ذیل ہیں۔

صلح عَنِ الْعَیْنِ: یعنی کسی چیز کے مقابلہ میں صلح کر لینا، کبھی یہ صلح اسی چیز کے بعض حصے پر ہو گی، اسے صُلْحُ الْحَطِیْطَۃ کہتے ہیں، (یعنی ایسی صلح جس میں صاحبِ حق کچھ نزول اختیار کر کے حق سے کم لے لیتا ہے) اور کبھی اس چیز کے عوض کسی دوسری چیز پر یا منفعت پر صلح ہوتی ہے، اسے صُلْحُ الْمُعَاوَضہ کہتے ہیں (کیونکہ اپنے حق کے مُعاوضہ وبدلہ میں دوسری چیز لے رہا ہے)

صُلْحُ الْحَطِیْطَۃ: دعویٰ کسی عَیَن (شئ) کے حق کا ہو، اور فریقین میں اسی عین کے ایک حصہ پر صلح ہو، مثلاً مکان ہو، پھر اس پر صلح ہو کہ مدعی اس کا نصف لے لے (اور بقیہ نصف مدعیٰ علیہ کو چھوڑ دے)، تو بقیہ نصف صاحبِ حق اور مدعی کی جانب سے مدعیٰ علیہ کے لئے ہبہ قرار پائے گا، اور ہبہ کے سارے احکام اس پر عائد ہوں گے، مثلاً مدعیٰ علیہ کی جانب سے قبول کی شرط وغیرہ (جس کی تفصیل ہبہ میں گذر چکی) اس قسم کی صلح کو صلح الحطیطۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ صاحبِ حق نے اپنا کچھ حق معاف کر کے کم لے لیا۔

صلح المعاوضہ: اگر دعویٰ کسی عین اور چیز کا ہو، اور فریقین میں اس پر صلح ہو کہ مدعیٰ علیہ اس کے عین کے بدلہ کوئی اور شئ مدعی کو دے، مثلاً دعوی گھر کا ہے، اور صلح میں یہ طے پایا کہ مدعی کو کار (گاڑی) دی جائے، تو یہ جائز اور صحیح ہے، اور درحقیقت کار کے عوض گھر کی بیع (فروخت) ہے، لہٰذا اس میں بیع کے تمام مسائل نافذ ہوں گے، مثلاً قیمت کا معلوم ہونا، شرعاً نفع بخش مال ہونا وغیرہ، اسی طرح خیار مجلس، خیار شرط اور خیار عیب حاصل ہو گا، اور وہ شرائط جو بیع کو فاسد کرتے ہیں، اس صلح کو بھی فاسد کریں گے اور بیع میں غرر (دھوکہ) وغیرہ جو امور حرام ہیں یہاں بھی حرام ہیں۔

اس صلح کو تمام صورتوں میں صلح المعاوضہ کہا جاتا ہے، کیونکہ صاحب حق اپنے حق کے عوض دوسری شئ پر راضی ہوا، خواہ وہ عین (چیز) ہو یا منفعت۔

اگر صلح کسی دوسرے عین کی منفعت پر ہو، مثلاً گھر کے عوض اس کی گاڑی کو ایک سال تک استعمال کرنے کا حق، تو یہ صلح عقدِ اجارہ ہے، لہٰذا اس میں اجارہ کے احکام جاری ہونگے۔ اور اگر صلح اسی عین کی منفعت پر طے پائے، مثلاً گھر کا دعویٰ ہے، پھر یہ طے پایا کہ مدعی اسی گھر میں دس سال رہے پھر مدعی علیہ کو لوٹا دے، تو یہ اعارہ ہے، اور اس میں اعارہ کے احکام ثابت ہوں گے۔

۲) **صلح عن الدّین** (یعنی قرض اور ادھار کے مقابلہ میں صلح): مثلاً کوئی شخص دوسرے پر ہزار روپے کے قرض کا دعویٰ کرے اور مدعیٰ علیہ اسے تسلیم کرے، پھر فریقین صلح کرلیں، اگر صلح قرض ہی کے ایک حصہ پر ہو تو یہ صلح الحطیطہ ہے، اور کسی عین یا منفعت پر ہو تو صلح معاوضہ ہے۔

(اَ) **صلح الحطیطة**: مثلاً ہزار روپے کا دعویٰ کرے اور مقروض اسے تسلیم بھی کرے، پھر اس میں سے پانچ سو روپے گھٹا کر بقیہ پانچ سو پر صلح ہو جائے، تو یہ صلح صحیح ہے، اور گویا بقیہ قرض سے اسے بری کر دیا، (بقیہ قرض معاف کر دیا)

حدیث: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں حضرت عبد اللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے مسجد میں اپنے قرض کا مطالبہ کیا، جس میں دونوں کی آواز بلند ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرۂ مبارکہ میں اُسے سنا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، یہاں تک کہ اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا، پھر کعب بن مالک کو آواز دے کر اشارہ فرمایا۔ "نصف قرض معاف کر دو" انہوں نے اسے تسلیم کر لیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عبد اللہؓ سے) فرمایا: "اب تم بقیہ ادا کر دو" (متفق علیہ)

یہ صلح، صلح ابراء (بری کرنا)، کم کرنا اور اسقاط (ساقط کرنا) وغیرہ الفاظ سے صحیح ہے۔

اگر ابراء (بری کرنا اور معاف کرنا) جیسے الفاظ استعمال ہوں تو مقروض کا قبول کرنا شرط نہیں ہے، ابراء کے شرائط ضروری ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱) ابراء کرنے والا اس مال میں اہل تبرع میں سے ہو (یعنی بلا عوض مال دینے کی اہلیت ہو) لہٰذا ولی بچہ کی جانب سے ابراء نہیں کر سکتا، کیونکہ اسے بچے کے مال میں تبرع کا حق نہیں ہے۔

۲) ابراء کی مقدار سے واقف ہو، پس اگر یوں کہا: میں نے قرض کے ایک حصہ سے تم کو بری کر دیا تو یہ صحیح نہیں۔ اسی طرح اگر یہ کہا: میں نے رُبُع (چوتھائی، پاؤ) مقدار معاف کر دی، حالانکہ اسے کل مقدار کا علم نہیں ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔

۳) ابراء دَین اور قرض سے ہو، اگر صلح عین ہو تو ابراء کے لفظ سے درست نہ ہو گا۔

۴) نہ کسی شرط پر معلق ہو، اور نہ کسی مدت کے ساتھ مقید ہو۔

اور صلح کا لفظ استعمال کرے تو مقروض کا قبول کرنا شرط ہے۔

اگر مقروض بقیہ دین (قرض) ادا نہ کرے: صاحبِ حق مقروض سے قرض کا ایک حصہ معاف کر دے، تاکہ وہ بقیہ قرض ادا کر دے، لیکن مقروض بقیہ بھی ادا نہ کرے، تو اس پر دوبارہ مکمل قرض واجب نہ ہو گا، بلکہ صرف بقیہ ہی واجب ہو گا، اور اسی کا قرض خواہ مطالبہ کرے گا، کیونکہ فقہی قاعدہ ہے کہ جس حق کو آپ نے ساقط کر دیا، وہ پھر نہ لوٹے گا (دوبارہ واجب نہ ہو گا) لہٰذا جن کا بھی کسی پر حق ہو، وہ اس سلسلہ میں محتاط اور چوکنّا رہیں، اور مقروض سے ابراء، اسقاط یا معاف کر دیا (یا حق چھوڑ دیا) وغیرہ الفاظ استعمال نہ کریں، ورنہ قرض ساقط ہو جائے گا، پھر مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ مقروض نے اس معافی کو قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور یہ الفاظ غصہ کی حالت میں سرزد ہوں یا خوشی اور مسرت کے جوش میں، جیسا کہ کبھی بیوی شوہر پر اس کے کسی حق کو معاف کر دیتی ہے۔

ب) دین میں صلح معاوضہ: یعنی کسی پر دَین (قرض) کا دعویٰ کرے، مثلاً ہزار روپے، مدعیٰ علیہ بھی اس کا اقرار کرے، پھر اس دین کی طرف سے کسی دوسری شئی پر مصالحت کرلے۔ مثلاً گھڑی پر، تو یہ معاوضہ اور بیع ہے، بیع کے احکام نافذ ہوں گے، اور اگر کسی شئی کے منفعت پر مصالحت ہو، مثلاً مقروض اسے ایک سال کیلئے اپنا مکان رہائش کے لئے دے دے، تو یہ اجارہ ہے، اور اجارہ کے

احکام جاری ہوں گے۔

مُدَّعِیٰ اور کسی اجنبی شخص کے درمیان صلح

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کرے، پھر مدعیٰ علیہ کے علاوہ کوئی تیسرا شخص درمیان میں آکر مدعی سے اس حق کے سلسلہ میں صلح کرلے۔ مُدّعیٰ علیہ کی حالت اوراس اجنبی کے موقف اور منشا کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱) وہ اجنبی شخص مدعیٰ علیہ کی جانب سے وکیل ہونے کا دعویٰ کرے، مثلاً کہے: مدعیٰ علیہ نے مجھے تم سے صلح کرنے کیلئے وکیل بنایا ہے، اور وہ تمہارے دعوے کا اقرار کررہاہے، اور مدعی علیہ اس کے بعد اس وکالت کا انکار نہ کرے، اور اجنبی نے صلح کرلی، تو یہ صلح صحیح ہے، اور مدعی نے جس حق کا دعویٰ کیا تھا وہ مدعی علیہ (موکل) کی ملکیت ہوگی، اور اگر مدعی علیہ وکالت کا انکار کرے تو صلح باطل ہے۔

۲) اجنبی اپنے لئے صلح کرے، مثلاً کہے: آپ نے فلاں پر جس حق کا دعویٰ کیا ہے، وہ اس کا اقرار کررہاہے، اور میں اس کی طرف سے فلاں کے عوض آپ سے صلح کرتاہوں، اور وکالت کا دعویٰ نہ کرے، تو یہ باطل ہے۔

۳) مدعیٰ علیہ حق کا انکار کرے، اور اجنبی کہے: وہ اس انکار میں جھوٹا اور غلط ہے، اور اس حق کی طرف سے اپنے لئے صلح کرلے، تو یہ کسی مغصوب شئ کا غاصب کے علاوہ کسی اور کو فروخت کرنے کی طرح ہے، لہٰذا اگر وہ اجنبی مدعیٰ علیہ کے پاس سے وہ حق حاصل کرنے پر قادر ہے تو صلح صحیح ہے، ورنہ صحیح نہیں۔

۴) مدعیٰ علیہ حق کا انکار کرے، اور اجنبی اس کے انکار کے باطل وغلط ہونے کا اقرار نہ کرے، اور اس حق کے متعلق اپنے لئے صلح کرے، تو یہ صلح باطل ہے۔

صلح کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مُصَالَح عنہ (جس حق کی طرف سے صلح ہو) (۴) مُصَالَح علیہ (صلح میں جو طے پائے)

۱) **عاقدین:** یعنی مدعی اور مدعی علیہ، ان دونوں کے شرائط یہ ہیں:

۱- دونوں مکلف یعنی عاقل بالغ ہوں، پس نابالغ اور پاگل کی صلح صحیح نہیں ہے۔

۲- مال میں تصرف کی ولایت ہو، جبکہ کسی نابالغ کی طرف سے صلح ہو، جیسے باپ، دادا، وصی، کیونکہ صلح ایک مالی تصرف ہے، اور بچوں کے مال میں ان کے علاوہ دوسروں کو تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

۳- اگر صلح بچہ کی طرف سے ولی کرے، تو اس میں ظاہری اور واضح نقصان نہ ہو، خواہ وہ مدعی ہو یا مدعیٰ علیہ

۲) **صیغہ:** یعنی فریقین کا ایجاب و قبول، مثلاً مدعی علیہ کہے: میں نے تم سے فلاں حق کے عوض فلاں چیز پر مصالحت کرلی یا: تمہارے فلاں دعویٰ کے مقابلہ میں فلاں پر مصالحت کرلی اور مدعی کہے: میں نے قبول کرلیا، یا میں راضی ہوں، یا میں نے مصالحت کرلی وغیرہ جو اس صلح سے اس کی رضامندی پر دلالت کرے۔

۳) **مُصَالَح عنہ:** یعنی وہ حق جس کا مدعی دعویٰ کررہاہے، اور جس کے بدلہ کسی اور چیز پر مصالحت کا مطالبہ ہو، اس کے شرائط یہ ہیں:

۱- کسی آدمی کا حق ہو، مال ہو یا غیر مال جیسے قصاص کا حق، کیونکہ اس کے عوض صلح صحیح ہے، پس کوئی شخص کسی پر قصاص کا مستحق ہو،

پھر اس سے قصاص کے بدلہ کسی مال پر مصالحت ہو، تو جائز ہے، خواہ کوئی متعین شئ ہو (جیسے گھر) یا غیر متعین (جیسے ہزار دینار)، غیر متعین (دین) ہو تو مجلس صلح ہی میں قبضہ شرط ہے تاکہ دین کے عوض دین نہ ہو (جو ممنوع ہے)

قصاص نفس اور جان میں ہو یا صرف زخم اور اعضاء میں، اس کی طرف سے مصالحت صحیح ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رُبیّع بنت النضر نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا، ان کے مطالبہ پر آپ ﷺ نے قصاص کا حکم دیا، لیکن آخر میں وہ لوگ قصاص سے درگذر کرتے ہوئے تاوان (مال) پر راضی ہوئے (متفق علیہ)

اگر مصالح عنہ حق آدمی کا نہ ہو، بلکہ اللہ کا ہو، جیسے کسی زانی سے صلح کر کے مال وصول کرے تاکہ قاضی کو اطلاع کر کے اس پر سزا کا نفاذ نہ ہو، تو یہ صلح صحیح نہیں ہے۔

حدیث: ایک نوکر نے اپنے مالک کی بیوی سے زنا کر لیا، تو لوگوں نے اس نوکر کے والد کو بتایا کہ تمہارے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا، تو انہوں نے مالک سے سو ۱۰۰ بکریوں اور ایک باندی کے عوض بیٹے کو بچالیا پھر آپ ﷺ کی خدمت میں یہ قضیہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا "باندی اور بکریاں تم کو واپس ہوں گی، اور تمہارے بیٹے کو سو کوڑے اور یک سالہ جلا وطنی کی سزا ملے گی......" (بخاری و مسلم ۔مختصراً)

پس آپ ﷺ کا باندی اور بکری کو لوٹانے کا فیصلہ حق اللہ کے سلسلہ میں ہونے والے اس صلح کے باطل ہونے پر واضح دلیل ہے۔

دیگر وہ حدود جن میں اللہ کے حق کا پہلو غالب ہے، جیسے چوری کی حد، حدِ قذف، انہیں بھی حد زنا پر قیاس کریں گے، گرچہ ان دونوں میں بندہ کا حق بھی ہے، لیکن حق اللہ غالب ہے، لہٰذا اسی پر فیصلہ ہوگا۔

کسی شخص سے صلح کرلے تاکہ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے، تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ شہادت اللہ کا حق ہے۔ فرمان باری ہے "وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰہِ" (الطلاق: ۲) (اور تم ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے گواہی دو)

پس ان حقوق کے عوض صلح باطل ہے، اور جس نے اس طرح مال حاصل کیا ہو اسے لوٹانا واجب ہے، کیونکہ یہ ناحق اور ناپاک کمائی ہے، اگر قاضی کو معلوم ہو تو یہ ایسا فسق (گناہ) ہے کہ اس شخص کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۲- مُصَالِح کا حق ہو، ورنہ صلح صحیح نہیں ہے، البتہ اپنے ماتحت (بچہ وغیرہ) کی طرف سے ہو تو صحیح ہے، جیسا کہ گذر چکا۔ لہٰذا کوئی مطلقہ عورت اپنے بچہ کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ یہ طلاق دینے والے سابقہ شوہر کا بیٹا ہے، اور وہ شوہر انکار کرے، پھر عورت بچہ کے نسب کے متعلق کسی چیز پر صلح کرلے تو یہ باطل ہے، کیونکہ نسب بچہ کا حق ہے، نہ کہ اس کی ماں کا۔

۳- محل صلح یعنی عقدِ صلح کا جس چیز سے تعلق ہو، اس میں مصالح کا حق ثابت ہو، لہٰذا شفیع اپنے حق شفعہ کے عوض کچھ مال لے کر صلح کرلے تاکہ شریک کسی اور کو فروخت کر دے، تو یہ صلح باطل ہے، کیونکہ شریک کے فروخت ہونے والے حصہ میں (محلِ صلح میں) اس شریک (شفیع) کا کوئی حق نہیں کہ اس کی طرف سے یہ صلح کرلے، اسے شریعت نے صرف اتنا حق دیا ہے کہ چاہے تو وہ حصہ یہ خرید سکتا ہے، اسے نہیں خریدنا تو اس کا حق ساقط ہو گیا، اس کے عوض مال لینا جائز نہیں ہے۔

۴- معلوم ہو، اگر مصالح عنہ دونوں یا کسی ایک کو نامعلوم اور مجہول ہو، تو صلح باطل ہے۔

۴) **چوتھا رکن ہے مُصَالَح علیه:** یعنی وہ بدل اور عوض جو اپنے دعویٰ شدہ حق کے مقابلہ میں مُدَّعِی مُدَّعیٰ علیہ سے وصول کرتا ہے۔ اس کے شرائط یہ ہیں:

۱- شرعی مال ہو، اگر شراب، سوّر، یا آلات لہو وغیرہ ہو تو صلح صحیح نہیں۔ مصالح علیہ کوئی عین مثلاً گھر، گھڑی، گاڑی وغیرہ یا دَین مثلاً ہزار روپئے یا منفعت مثلاً مکان میں یک سالہ رہائش وغیرہ ہو سکتی ہے۔

۲- مُصَالِح کی ملکیت ہو، صلح کے بعد پتہ چلا کہ وہ مال اُس کی ملکیت نہیں، مثلاً چوری یا غصب وغیرہ کا ہے، تو صلح باطل ہے، گرچہ دوسرا فریق اُس پر قبضہ کر چکا ہو۔

۳- مُصَالَح علیہ عاقدین کو معلوم ہو، کیونکہ بدل کی جہالت اور ناواقفیت نزاع کا سبب بنے گی۔

حقوق مشترکہ میں تَزَاحُم (تنگی اور ٹکراؤ)

۱) **پرنالہ اور ساباط بنانا:** (ساباط یعنی دو گھروں یا دیواروں کے درمیان راستہ کے اوپر چھت) یہ اشیاء یا تو جاری اور عام مستعمل راستہ کی طرف بنائی جائے گی، یا غیر مستعمل راستہ کی طرف، جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

أ۔ ان اشیاء کا طریق نافذ (عام مستعمل راستہ) کی طرف بنانا: طریقِ نافذ یعنی جس راستے میں ہر کسی کو چلنے اور گذرنے کا حق ہو، کسی کی تخصیص نہ ہو، ایسے راستے میں کوئی ایسا تصرف کرنا جو راہ گیروں کے لئے تکلیف دہ و پریشان کن ہو، جائز نہیں، مثلاً گھر کے باہر راستے کی طرف لکڑا وغیرہ نکالنا، ساباط بنانا، پرنالہ بنانا وغیرہ، کیونکہ راستہ پر صرف اس کا حق نہیں، بلکہ عام راہ گیروں کا حق ہے، اگر کسی نے اس طرح ممنوع چیز بنائی تو اس کا ازالہ واجب ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ضرر سے منع فرمایا ہے۔ (ابن ماجہ، مؤطا امام مالک)

لیکن ازالہ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو، البتہ ہر کسی کو اس کے ازالہ کے مطالبہ کی اجازت ہے۔ اگر مذکورہ اشیاء راہ گیروں کے لئے ضرر رساں نہ ہوں، اور راستہ پیدل ہو، تو ان اشیاء کا اتنا اونچا ہونا ضروری ہے کہ ایک لمبا آدمی اپنے سر یا پشت پر کچھ لاد کر چلے تو اسے اس سے کوئی تکلیف نہ ہو، نیز اس کی وجہ سے اس جگہ زیادہ تاریکی نہ چھا جائے۔

اگر اس راہ سے سوار اور گاڑیاں بھی گذرتی ہوں تو اسی مناسبت سے اونچائی شرط ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر میں ایک پرنالہ لگایا، جو کہ مسجد نبوی کے راستہ میں تھا۔" (اخرجہ احمد والبیہقی والحاکم کما فی نیل الاوطار)

ان اشیاء پر صلح حرام ہے، حاکم کی طرف سے ہو یا کسی دوسرے کی طرف سے۔

ب- ان اشیاء کا غیر نافذ طریق (راستہ) میں بنانا: غیر نافذ راستہ کسی ایک کا ہے تو یہ اس کی ملکیت ہے، اور بعض لوگوں میں مشترک ہے، تو بقیہ شرکاء کی اجازت کے بغیر مذکورہ اشیاء کا بنانا جائز نہیں اور اس پر صلح صحیح نہیں ہے۔

۲) **راستہ میں چبوترہ بنانا یا درخت بونا:** راستہ میں چبوترہ، یا دیوار کے لئے ستون بنانا یا درخت لگانا حرام ہے، اگرچہ راستہ کشادہ ہو اور گذرنے والوں کو اس سے تکلیف نہ ہو اور حاکم نے اجازت دی ہو، کیونکہ کبھی راہ گیروں کی بھیڑ وغیرہ کی وجہ سے ٹھوکر لگنے اور تنگی کا امکان ہے، نیز زیادہ مدت بیتنے پر ان کی جگہ ذاتی ملکیت سمجھی جائے گی اور عوام کے گذرنے کا حق ختم ہو جائے گا، لہٰذا ان امور کے لئے صلح کی گنجائش نہیں، البتہ کوئی اپنے نفع کے بجائے عام مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر درخت لگائے اور اس سے کوئی ضرر نہ ہو تو اس میں حرج نہیں۔

۳) **دوسرے کی دیوار پر لکڑا لگانا:** اپنے گھر سے متصل یا پڑوس کی دیوار جو دوسرے کی ملکیت ہو، اس کی اجازت کے بغیر اس پر لکڑا رکھنا یا گاڑنا وغیرہ جائز نہیں، اور وہ منع کرے تو اس پر جبر (زبردستی) کرنا جائز نہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کسی شخص کو اپنے بھائی کا صرف وہی مال حلال ہے، جو وہ بطیبِ خاطر (برضا و رغبت) دے" (مسند احمد)

اگر مالک بلا عوض لکڑا رکھنے کی اجازت دے تو یہ عاریت ہے، اس میں عاریت کے احکام ثابت ہوں گے، پس اس اجازت سے ایک ہی مرتبہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، لہٰذا اگر لکڑا ہٹا دے، یا گر جائے یا دیوار گر جائے اور مالک اسے دوبارہ بنائے، تو دوبارہ (نئی اجازت کے بغیر) لکڑا نہیں رکھ سکتا۔

اگر مالک عوض لے کر لکڑا رکھنے یا اس پر تعمیر کی اجازت دے، اور دیوار کے سرے کو بطور کرایہ دے، تو یہ اجارہ ہے، اور اگر یہ کہے: میں نے تعمیر کے لئے فروخت کر دیا، یا: اسے اس پر تعمیر کا حق فروخت کر دیا تو یہ ایک ایسا عقد ہے، جس میں بیع اور اجارہ دونوں کا شائبہ ہے۔

صلح کے مُبْطِلات (باطل کرنے والے امور)

۱- **اقالة:** صلح کے بعد فریقین میں سے ایک دوسرے سے کہے: اس صلح سے اقالہ کیجئے، یعنی میں اس صلح کو فسخ کرنا چاہتا ہوں، اور دوسرا اسے تسلیم کر لے تو صلح فسخ (ختم) ہو جائے گی۔

لیکن قصاص پر صلح ہوئی تھی اور اسے فسخ کرے تو یہ فسخ نہ ہو گا، بلکہ اب مدعی قاتل سے دیت وصول کرے گا۔

۲- **خیار عیب کی وجہ سے صلح کو رد کرنا:** جس چیز پر صلح ہو، اس پر قبضہ کے بعد اس میں کوئی ایسا عیب نظر آئے جو عرفاً قیمت کی کمی کا باعث ہو، (جس کی تفصیل بیع میں گذر چکی) تو اسے لوٹانے کی اجازت ہے، اور لوٹانے کی صورت میں صلح باطل ہو جائے گی۔

باطل ہونے کے بعد صلح کا حکم

عقد صلح باطل ہو تو مدعی اپنے اصل دعویٰ کی طرف رجوع کرے گا، جبکہ صلح عن الانکار ہو، اور مسئلہ بیان ہو چکا کہ صلح مع الانکار اصلاً باطل ہے۔

اگر صلح مع الاقرار ہو، تو مدعی نے جس چیز کا دعویٰ کیا تھا، مدعیٰ علیہ سے وہی وصول کرے گا، نہ کہ کچھ اور، کیونکہ بطلان کی وجہ سے گویا صلح ہوئی ہی نہیں، اور پھر پہلی بات لوٹ آئے گی۔

مشترک منافع کے احکام

سڑک کی اصل منفعت، اس پر چلنا ہے، نیز راہ گیروں (گذرنے والوں) کو کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو، تو کسی پیشے کے لئے، یا بطور استراحت یا ساتھی کے انتظار میں بیٹھنا یا رکنا بھی منفعت میں داخل ہے۔ (یعنی اس صورت میں یہ امور بھی جائز ہیں) کیونکہ ہمیشہ بلا انکار لوگوں کا اسی پر عمل چلا آرہا ہے۔

پیشے اور تجارت کیلئے بیٹھنے والا شخص اسباب رکھنے کے لئے چارپائی وغیرہ بچھا سکتا ہے۔ (ہاتھ گاڑی کا بھی یہی حکم ہوگا)، اسی طرح عارضی طور پر سایہ کا نظم بھی کر سکتا ہے، جبکہ راہ گیروں کو حرج نہ ہو، مستقل چبوترہ وغیرہ تعمیر کرنا جائز نہیں، جو شخص کسی پیشہ کے لئے کسی جگہ بیٹھے تو اس کی اور اس کے اسباب کی جگہ اس کے ساتھ خاص ہوگی، دوسرا کوئی اس پر تنگی نہیں ڈال سکتا، جو اسکے ناپ تول اور لین دین وغیرہ میں حرج ڈالے۔ اس کے حرج کے بغیر اسی پیشہ والے کو اس کے قرب وجوار میں بیٹھنا جائز ہے، پہلا شخص اسے روک نہیں سکتا، پاس کھڑے ہونے والے کی وجہ سے خریدنے والوں کو قریب آنے یا اسباب نظر آنے میں رکاوٹ ہو رہی ہو تو اسے وہاں سے ہٹا سکتا ہے۔

خرید و فروخت کے لئے اس طرح بیٹھنے والے پیشہ وروں کے پاس سے امام (حکومت) معاوضہ نہیں لے سکتا۔

جو شخص پہلے کسی جگہ اپنی دوکان لگالے، اس نشست گاہ (بیٹھک) میں اس کا حق مقدم ہوگا، ابوداود کی سابقہ حدیث کی رو سے، اگر دو اشخاص بیک وقت آجائیں تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا۔

جو شخص کسی جگہ پیشہ شروع کردے، پھر واپسی کے ارادہ سے وہاں سے جائے، (جیسے عموماً دوپہر کھانے کے لئے یا شام کاروبار بند کرکے جاتے ہیں، اور جانے کے بعد درمیان میں اتنی مدت نہ گذرے کہ اس جگہ سے اس کی مانوسیت اور تعلق منقطع ہوجائے (یعنی اس کے ساتھ لین دین کرنے والوں کا سلسلہ منقطع ہوجائے، اور دوسروں سے جڑ جائے) تو اس جگہ میں اس کا حق باقی رہے گا، لہٰذا اس بات سے واقف کسی دوسرے شخص کے لئے اس کے علم اور رضامندی کے گمان کے بغیر وہاں بیٹھنا (کاروبار کرنا) حرام ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے: "جو شخص اپنی مجلس (نشست گاہ) سے اٹھ کر جائے، پھر وہیں لوٹ آئے، تو وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے۔"

نیز اس جگہ کی تعیین کا مقصد یہ ہے کہ وہاں اس کی جان پہچان رہے، تاکہ لوگ اس سے معاملہ کریں۔

اگر واپسی کا ارادہ نہ ہو، بلکہ پیشہ چھوڑ دے، یا جگہ تبدیل کرنے کے ارادہ سے جائے، یا واپسی کا تو ارادہ ہو، لیکن طویل مدت گذر جائے، کہ اب بظاہر اس کا وہاں سے تعلق ختم ہوچکا، تو ان صورتوں میں اس کے اعراض کی وجہ سے حق باطل ہوگا، خواہ اس جگہ اپنا کچھ اسباب چھوڑ گیا ہو، یا امام نے وہ جگہ اس کے سپرد کی تھی، یا سفر یا مرض جیسے اعذار کی وجہ سے گیا ہو، (تب بھی اس کا حق ختم ہوگا)

اگر کوئی لوٹنے یا نہ لوٹنے کے ارادہ کے بغیر جائے تو بظاہر اس کا حکم بھی لوٹنے کے ارادے کی طرح ہی ہے۔ اگر کوئی صرف آرام کرنے کے لئے، یا کسی دوست وغیرہ کے انتظار میں، یا بھیک مانگنے کے لئے بیٹھے، یا پھیری والا ہو کہ آج یہاں اور کل وہاں چکر لگاتا رہتا ہے، تو ان صورتوں میں اس کے وہاں سے چلے جانے سے اس کا حق ختم ہوگا،

جن صورتوں میں حق باقی رہتا ہے، صاحبِ حق کی غیر موجودگی میں دوسرا وہاں بیٹھ سکتا ہے خواہ تجارت کے لئے کیوں نہ ہو۔

راستہ پر مجلس: گفتگو وغیرہ کے لئے راستہ پر بیٹھنا مکروہ ہے، جبکہ راستہ کا حق ادا نہ کرے، یعنی نگاہ پست رکھنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا وغیرہ۔

مسافر خانہ: کوئی شخص کسی موقوفہ مسافر خانہ یا خانقاہ وغیرہ میں کسی جگہ جاکر ٹھہرے، اور اس میں وہاں ٹھہرنے کے شرائط موجود ہوں، پھر کسی حاجت کے لئے باہر جائے مثلاً کھانا خریدنا، تو اس کا حق باقی ہے، خواہ اس جگہ اپنا سامان چھوڑ کر نہ جائے، یا امام نے اسے اجازت نہ دی ہو۔ اگر بلا حاجت نکل کر جائے، یا زیادہ دیر کے لئے غائب رہے، (اگرچہ حاجت کے لئے ہو)، تو اس کا حق باطل ہوگا۔

(مساجد کے متعلق مسائل وقف کے آخر میں بیان ہوچکے)

زمین سے حاصل مشترکہ اعیان (اشیاء) کا حکم

مَعْدِن (کان): معدن سے نکلنے والی اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔

۱) **ظاهر:** جو بلا کوشش اور محنت کے نکلے، البتہ اس کی تحصیل میں محنت کی ضرورت ہو، جیسے گندھک، تار کول، چکی کے پتھر، چونے کا پتھر، یاقوت، سرمہ کا پتھر، نمک (جبکہ کھودنے اور مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ ہو)

۲) **باطن:** جو بلا کوشش اور محنت کے نہ نکلے، جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبہ وغیرہ۔ احیاء کرنے والے کو احیاء سے قبل ہی ظاہری معدن کا علم ہو، تو احیاء کی وجہ سے وہ اس کا مالک نہیں بنے گا، اس پر سلف وخلف کا اتفاق ہے، نیز تحجُّر (گھیر کر دوسروں کو منع کرنے)، یا بادشاہ کے کسی کے سپرد کرنے (اور بطور جاگیر دینے) سے اسے اختصاص (خصوصی حق) حاصل نہ ہوگا، کیونکہ یہ اشیاء بہنے والے پانی، ایندھن اور چارہ کی طرح تمام مسلم وغیر مسلموں میں مشترک ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ نمک کی کان ایک شخص کے سپرد کی، تو دوسرے نے کہا کہ اس سے پانی کی طرح مستقل نمک حاصل ہوتا ہے، تو آپ ﷺ نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا۔ (رواہ اصحاب السنن الاربعہ وصححہ ابن حبان) (مغنی ۲/۳۷۲)

تالاب وغیرہ کی مچھلیاں، بری وبحری شکار اور جواہرات، جنگلات کے درخت اور پھل ظاہری معدن میں شمار ہیں، لہٰذا ان اشیاء میں تحجر، اختصاص، بادشاہ کی طرف سے کسی مخصوص آدمی کے سپرد کرنا (خواہ عارضی طور پر ہو)، اور ان اشیاء کو حاصل کرنے والوں سے معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔

باطنی معدن کو صرف کھودنے سے مالک نہ بنے گا، بلکہ اسے نکالنے کے بعد اس پر استیلاء اور تسلط ہو جائے، تو مالک بنے گا۔

جو کسی موات کا احیاء کرے، (اور اسے اس جگہ میں کسی ظاہری یا باطنی معدن کی موجودگی کا علم نہیں تھا)، بعد میں اس جگہ ظاہری یا باطنی معدن ظاہر ہو تو یہ اس کا مالک بن جائے گا، کیونکہ یہ زمین کے اجزاء میں داخل ہے، اور یہ شخص احیاء کی وجہ سے (نیچے ساتوں زمین تک) اس حصہ کا مالک بن چکا۔ اگر اسے پہلے سے ظاہری یا باطنی معدن کا علم ہو، تو احیاء کی وجہ سے نہ اس معدن کا مالک ہوگا، اور نہ ہی اس جگہ کا، کیونکہ اس کا قصد فاسد ہے، اس لئے کہ معدن کو مکان، باغ یا کھیتی باڑی وغیرہ بنانے کا کوئی سوال نہیں۔

پانی: نہر، وادی وندی جیسے مباح پانی میں تمام لوگوں کا یکساں حق ہے، ہر ایک جتنا چاہے لے سکتا ہے، تحجر یا امام کے کسی کو دینے کی وجہ سے کوئی اسکا مالک نہ بنے گا، اسی طرح نہر کے کناروں کا بھی حکم ہے، نہ امام اسے فروخت کر سکتا ہے، نہ کسی کو دے سکتا ہے۔

حدیث: "تین چیزوں میں تمام لوگ شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ" (رواہ ابن ماجہ باسناد جید)

بعض لوگ مذکورہ مباح پانی سے اپنی زمین سیراب کرنا چاہیں، اور پانی تمام کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو، اور ان میں سے بعض نے پہلے اپنی زمین کا احیاء کیا ہے، تو جس نے پہلے احیاء کیا، اس کا حق مقدم ہوگا، خواہ پانی سے اس کی جگہ دوسرے کے مقابلہ میں دور ہو، پانی کے مقدار کے متعلق کھیتی، زمین اور وقت کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا، (اس سے زیادہ روکنے کا حق نہ ہوگا، بلکہ دوسرے کے لئے چھوڑ دے)، نشیب وفراز ہو تو ہر حصے کو جدا جدا سیراب کرے۔ اگر تمام نے بیک وقت احیاء کیا، یا ترتیب کا علم نہ ہو، تو جو نہر سے قریب ہوگا، وہ مقدم ہوگا۔

اگر پانی تمام کو کافی ہو، تو جو جب چاہے سیراب کرے۔

مباح پانی کو کوئی شخص اپنے کسی برتن میں یا حوض وغیرہ میں جمع کرے، تو وہ اس پانی کا مالک بن چکا، اگر اس پانی کو پھر اپنی جگہ لوٹا دیا، تو دوبارہ وہ مباح ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایندھن اور گھاس پھوس کاٹ کر اپنے قبضہ میں لے، (یا شکار کرے) تو وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

کسی نے نہر کھودی تاکہ (وادی کا پانی) اس میں آئے، تو یہ پانی مباح ہی رہے گا، گرچہ نہر کا مالک اس کا زیادہ مستحق ہو گا، البتہ عرف کی روشنی میں دوسروں کو اسے پینا، جانوروں کو پلانا اور استعمال کرنا جائز ہے۔ لیکن وہ نہر کو تملک کی نیت سے بند کر دے، تو وہ مالک ہو جائے گا، گرچہ پانی زیادہ ہو۔

اگر (بارش وغیرہ کا) پانی بہہ کر کسی کی زمین میں پہنچے تو، اس سے وہ مالک نہ بنے گا، لہٰذا کسی دوسرے نے لے لیا، تو وہ مالک ہو گا، گرچہ اجازت کے بغیر دوسرے کی ملکیت میں داخلہ حرام ہے (مغنی ۲/۳۷۴)

کنواں: کسی افتادہ زمین (موات) میں کسی نے انتفاع کیلئے کنواں کھودا، تو اس جگہ سے کوچ کرنے تک اس کے پانی میں اس کا حق مقدم ہے، اگر اس سے اعراض کرے، یا راہ گیروں کے انتفاع کے لئے کھودے یا کسی مخصوص قصد کے بغیر کھودے، تو ان صورتوں میں دیگر لوگوں کو بھی مساوی حق حاصل ہو گا۔ راہ گیروں کے قصد سے کھودے، یا موات میں مسجد بنائے، یا عام قبرستان کے قصد سے احیاء کرے، تو وقف کے الفاظ کے بغیر بھی یہ حکم ثابت ہو گا۔

افتادہ زمین میں کنواں کھودنے کے بعد اسے پاٹ دینا ممنوع ہے، خواہ اپنی ذات کے لئے کھودا ہو، کیونکہ لوگوں کا حق اس سے متعلق ہو چکا، جسے اب یہ باطل نہیں کر سکتا۔

کسی نے اُفتادہ زمین میں مالک بننے کے قصد سے کنواں کھودا، یا اپنی ملکیت میں کنواں کھودا، تو یہ اس پانی کا مالک ہے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کی پیداوار ہے، جیسے پھل و دودھ، ملکیت کے باوجود اپنے اور مویشیوں اور کھیتی باڑی کے لئے درکار پانی سے زائد پانی میں صحیحین کی حدیث کی وجہ سے دیگر مویشیوں کے لئے استعمال کی اجازت دینا ضروری ہے، جبکہ ان کے مالک کو مباح پانی نہ ملے، اور قریب میں مباح گھاس ہو، جسے وہ مویشی چرتے ہوں اور زائد پانی کو مالک نے اپنے برتن وغیرہ میں جمع کر کے نہ رکھا ہو، نیز ان مویشیوں کے کنویں پر آنے کی وجہ سے اس کی کھیتی یا باغات کا نقصان نہ ہو، پانی نکالنے کے لئے اپنا ڈول وغیرہ دینا ضروری نہیں ہے۔ کسی پیاسے آدمی کے پینے کی ضرورت اپنے جانوروں اور کھیتی پر بھی مقدم ہو گی۔ جن صورتوں میں کنویں کا زائد پانی دوسروں کو صرف کرنا واجب ہے، اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، دوسرے کی کھیتی باڑی کے لئے اپنا زائد پانی صرف کرنا واجب نہیں، نیز کسی کو طہارت کے لئے دینا بھی ضروری نہیں۔

مملوکہ نالیوں میں سے پانی پینا اور جانوروں کو پلانا وغیرہ جائز ہے، خواہ کسی بچہ وغیرہ کا ہو، یا موقوف ہو، جبکہ مالک یا موقوف علیہ حضرات کو ضرر نہ ہو، کیونکہ عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ (حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج ۳/۵۶۸-۵۷۵)

حوالہ

عربی میں حوالہ نقل و انتقال کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاحاً حوالہ ایسے عقد کو کہتے ہیں جس کا تقاضا دَین (ادھار، قرض) کو ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا "مالدار کا (قرض کی ادائیگی میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ اور تم میں سے کسی کا قرض (مقروض) کسی مالدار (یعنی قرض کی ادائیگی پر قادر) کے حوالہ کر دے، تو تم اس حوالہ کو قبول کر لو" (متفق علیہ، مسند احمد)

مختلف ادوار میں حوالہ کے جواز اور مشروعیت پر مسلمانوں کا اجماع رہ چکا ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے حوالہ کو قبول کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ بطور استحباب ہے، نہ کہ وجوب و فرضیت کے طور پر۔ پس کسی کا دوسرے پر قرض ہو اور وہ کسی تیسرے کے حوالہ اسے کرے، تو قبول کر لینا مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔ استحباب اس صورت میں ہے، جبکہ وہ تیسرا شخص ادائیگی پر قادر ہو، اور اس کے مال میں شبہ نہ ہو، ورنہ پھر مستحب نہیں ہے۔

حوالہ کے ارکان

(۱) مُحِیل (۲) مُحال، (مُحتال)، (۳) مُحالُ علیہ (۴) مُحال بہ (۵) صیغہ

۱) **مُحیل**: یعنی وہ مقروض جو اپنے قرض خواہ سے یہ کہے کہ تم میرے فلاں مقروض سے اپنا قرض وصول کر لو۔ محیل، محال اور محال علیہ کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے۔

۲) **مُحال (مُحتال)**: وہ قرض خواہ جس کا قرض مقروض دوسرے کے حوالہ کرے، جو کہ اس مقروض کا مقروض ہو۔

۳) **مُحال علیہ**: جس سے قرض خواہ اپنا قرض وصول کرے گا۔

۴) **محال بہ**: اس سے وہ حق مراد ہے جو محال کا محیل پر ہے۔ جسے وہ محال علیہ کے حوالہ کر رہا ہے۔

محال بہٖ کے شرائط: (۱) قرض و ادھار ہو، عَین (کسی شئ) کا حوالہ صحیح نہیں ہے۔ (ب) قرض (دَین) لازم ہو: جیسے مبیع (فروخت شدہ چیز) سپرد کرنے اور مدتِ خیار کے اختتام کے بعد قیمت یا نتیجتاً لازم ہونے والا ہو، جیسے مدتِ خیار میں قیمت، کیونکہ مدتِ خیار کے اختتام کے ساتھ یہ لازم ہو گا، پس بائع کسی کو خریدار کے حوالہ کرے تاکہ اس سے قیمت وصول کرے، تو یہ حوالہ صحیح ہے۔ قرض کا مستقر اور پختہ ہونا شرط نہیں۔ لہٰذا دخول سے قبل مہر، مدت کی تکمیل سے قبل کرایہ، اور مبیع پر قبضہ سے قبل قیمت کا حوالہ صحیح ہے۔

(مثال: احمد کا محمد پر ہزار روپیہ قرض ہے، اور محمد کا حامد پر ہزار روپیہ قرض ہے، اب محمد اگر احمد سے کہہ دے کہ تم یہ قرض براہِ راست حامد سے وصول کر لو، تو اس مثال میں محمد محیل، احمد محال (محتال)، اور حامد محال علیہ اور ہزار روپیہ محال بہ ہے)

۵) **صیغہ**: ایجاب و قبول کے کلمات، مثلاً مُحیل کہے: میں نے تم کو فلاں کے حوالے کر دیا، اور محال کہے: میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں۔ ایجاب و قبول مجلسِ عقد میں ہی پائے جائیں۔

خیارِ شرط اور خیارِ مجلس

عقدِ حوالہ حتمی ہونا شرط ہے۔ لہٰذا اس میں خیارِ شرط اور خیارِ مجلس حاصل نہ ہو گا۔

حوالہ کے صحت کے شرائط

۱) مُحال علیہ پر مُحیل کا قرض ہو، اور یہ قرض بھی محال کے قرض کی طرح لازم یا لازم ہونے والا ہو، اور مدت و جنس اور مقدار و صفت میں محال کے قرض کے مُساوی ہو، دونوں کے قرض میں اس میں سے کسی میں اختلاف ہو۔ تو حوالہ صحیح نہیں ہے۔

۲) مُحیل اور مُحال اس حوالہ سے راضی ہوں، محال علیہ کی رضامندی شرط نہیں ہے۔

۳) مُحیل اور محال کو دونوں قرض کے مقدار، جنس اور صفت کا علم ہو۔

حوالہ کا حکم: تمام ارکان و شرائط کی رو سے جب حوالہ صحیح ہو جائے گا تو مُحیل مُحال کے قرض سے بری اور سبکدوش ہو جائے

گا، اور مُحال کا حق اس کے ذمہ سے مُحال علیہ کے ذمہ کی طرف منتقل ہو گا۔ اور محال علیہ پر سے محیل کا قرض ساقط ہو جائے گا۔ اب محیل اور محال کا آپس میں اس قرض کی رو سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، بلکہ مُحال اور مُحال علیہ کا تعلق جڑ گیا، اب مُحال اپنے قرض کے لئے مُحیل کی طرف رجوع نہیں کر سکتا، خواہ کسی سبب سے محال علیہ سے وہ قرض وصول نہ کر پائے۔ مثلاً وہ مفلس (کنگال) ہو یا دَین (قرض) کا انکار کر دے، یا مُحال کو اس کی تنگدستی اور غریبی کا علم ہو یا نہ ہو، یا محال علیہ کے مالداری کی شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو، تمام صورتوں میں محیل کی طرف رجوع نہیں کر سکتا۔

اگر محال نے کسی سبب سے قرض نہ ملنے کی صورت میں مُحیل کی طرف رجوع کی شرط لگائی تو حوالہ باطل ہو جائے گا۔

مُحیل اور مُحال کا حوالہ کے متعلق اختلاف

مُحال اپنا قرض مُحال علیہ سے وصول کرے پھر اس کا مُحیل سے اختلاف ہو، مُحیل کہے: تمہارا مجھ پر کوئی قرض نہیں تھا، میں نے تو صرف قبضہ کرنے کے لئے تم کو وکیل بنایا تھا، اور مُحال کہے: بلکہ تم پر میرے قرض کی جگہ تم نے یہ حوالہ کیا تھا، تو اس صورت میں مُحیل کی بات مع قسم تسلیم کریں گے۔ اسی طرح مُحیل قرض کا تو اقرار کرے، لیکن کہے: میں نے اپنے لئے قبضہ کرنے تمہیں وکیل بنایا تھا، اور وہ کہے کہ تم نے حوالہ کیا تھا، تو محیل کی مع قسم تصدیق کریں گے۔

اگر مُحیل صراحۃً حوالہ کے الفاظ استعمال کرے اور کہے کہ میں نے وکالت کی نسبت سے کہا تھا، تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائیگی، بلکہ محال کی بات مع قسم مانی جائے گی۔

مُحال یا مُحال علیہ کا حوالہ: حوالہ صحیح ہونے کے بعد مُحال اپنے کسی قرض خواہ کا قرض اس مُحال علیہ کے حوالہ کر سکتا ہے، اسی طرح مُحال علیہ مُحال کو اپنے کسی مقروض کے حوالہ کر سکتا ہے۔

متفرق مسائل

کوئی شخص مال کی ایک مقدار کسی دوسرے کے سپرد کرے تاکہ وہ فلاں بستی کے فلاں شخص کو ادا کرے تو:

اگر یہ مال بطورِ امانت اس کے سپرد کیا ہے تو بلا کراہت جائز ہے، اور منتقل کرنے والا شخص اس کا ضامن نہ ہو گا، جبکہ اس امانت کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ کرے، اور اسے اپنے مال کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ (اس طرح نہ ملائے کہ وہ مال الگ معلوم نہ ہو سکے)، اگر اپنے مال کے ساتھ خلط ملط کیا تو ضامن ہو گا۔ (ضامن نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بلا تقصیر وہ مال تلف ہو، تو وہ ذمہ دار نہیں اور اسے اس کا بدلہ ادا کرنا ضروری نہیں ہے)

دورِ حاضر میں پوسٹ وغیرہ کے سپرد روپیوں کی منتقلی کو سونپنا (مثلاً منی آرڈر وغیرہ) بھی اسی قبیل سے ہے، کیونکہ عوام پوسٹ آفس کے سپرد جو رقم کرتی ہے، ہو بہو وہی رقم دوسرے تک نہیں پہنچتی اور دوسرے رقوم میں مل جاتی ہے، لہٰذا یہ ادارے اس رقم کے ضامن ہونگے۔

اگر یہ رقم بلا شرط کے کسی کو قرض دے، بعد میں اس سے یہ رقم فلاں تک پہنچانے کی درخواست کرے، (اور وہ اس سے راضی ہو)، تو یہ صورت بھی بلا کراہت جائز ہے۔

اگر بطور قرض دے، بشرطیکہ فلاں بستی میں فلاں شخص کو لے جا کر یہ قرض لوٹا دے، تو قرض کی واپسی کے لئے مدت کی تعین کے مثل ہو گا، لہٰذا قرض دینے والے کا اس میں کوئی فائدہ و مقصد نہ ہو، تو قرض صحیح ہے، لیکن شرط فضول ہے۔ البتہ اسے نبھانا بہتر ہے، اور قرض دینے

والے کا اس میں کوئی فائدہ ہو، مثلاً راستہ پر خطر ہو، (اور رقم لٹ جانے کا اندیشہ ہو) تو عقد باطل ہے، کیونکہ قرض خواں کے نفع کا باعث ہے۔

کفالت (ضمان۔ ذمہ داری لینا)

تعریف: کسی دوسرے کے ذمہ ثابت حق کو اپنے اوپر واجب ولازم کرلینا، یا جس پر دوسرے کا حق ہو اسے حاضر کرنے کی، یا کسی چیز کو حاضر کرنے کی ذمہ داری لینا کفالت کہلاتا ہے۔

تشریح: ایسا عقد جس میں عاقد یعنی کفیل یا ضامن کسی شخص کا دوسرے پر ثابت حق کے متعلق یہ ذمہ داری لے کہ اگر اس نے حق ادا نہ کیا تو میں خود ادا کر دوں گا۔ یا پھر اسے جس پر حق ہے عدالت میں یا صاحب حق کے پاس پیش کروں گا یا کسی کی چیز دوسرے کے پاس غصب وغیرہ کی وجہ سے ہو تو اس چیز کو لاکر مالک کے سپرد کروں گا، تو اسے کفالت کہا جاتا ہے۔

مشروعیت: کفالت مشروع ہے، بلکہ بعض اوقات مستحب ہوگا، جبکہ کفیل کو اپنی ذات پر اعتماد ہو، اور کفالت کے سبب نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

حدیث: (۱) ایک جنازہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "کیا اس پر قرض ہے؟" صحابہ نے عرض کیا کہ تین دینار قرض ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم لوگ اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو" تب حضرت ابو قتادہ نے عرض کیا: یا رسول ﷺ آپ اس کی نماز پڑھیں، اور وہ قرض میرے ذمہ ہے، تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ ادا کی۔ (بخاری شریف)

۲) آپ ﷺ نے ایک شخص کی طرف سے دس دینار کی ذمہ داری لی (حاکم)

حضرت یوسف علیہ السلام کا مفقود پیمانہ پیش کرنے والے کے لئے ایک اعلان کرنے والے نے ایک اونٹ کا بوجھ انعام دلوانے کی ذمہ داری لی تھی (دیکھئے سورۂ یوسف آیت ۷۲) اس سے بھی کفالت کی تائید ہوتی ہے۔ دیگر دلائل دوران بحث پیش ہوں گے۔

حکمت: کبھی انسان اپنی ضرورت کی چیز خریدتا ہے، لیکن نہ تو قیمت پاس ہے۔ اور نہ رہن رکھنے کی سہولت، یا کبھی بائع رہن پر راضی نہیں، اور اس خریدار کو ادھار دینے پر بھی اسے اطمینان نہیں، ایسی صورت میں کفیل کی ضرورت پیش آئے گی۔ (جن کی کفالت و ذمہ داری سے بائع مطمئن ہو جائے گا) بعض اوقات قرض لینے کی ضرورت پیش آئے گی اور دینے والا کفیل کا مطالبہ کرے گا۔ کبھی کسی غلطی اور خیانت کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا، لیکن بعض دیگر ذمہ داریوں کی ادائیگی کی خاطر مہلت کا مطالبہ کرے گا، لہٰذا اس کی واپسی اور حاضری کے اطمینان کے لئے کسی کی کفالت کی ضرورت پیش آئے گی، کبھی انسان کو کوئی چیز عاریت پر لینے کی نوبت آئے گی، لیکن مالک صحیح سلامت اس چیز کی واپسی کی ذمہ داری لینے والے کفیل کے بغیر دینے پر رضامند نہ ہوگا۔ اور کبھی کسی کے پاس کسی کی غصب شدہ چیز ہوگی۔ جس کے لاکر واپس کرنے میں مہلت درکار ہے، لیکن مالک بغیر کفیل کے اس غاصب کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنے پر راضی نہیں، وغیرہ وغیرہ...، لہٰذا انسانی مصالح کے پیش نظر سہولت اور حاجت کو مد نظر رکھتے ہوئے شریعت نے کفالت کو مشروع قرار دیا۔ کیونکہ دین اسلام میں کوئی حرج کا پہلو نہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ تو مخلوق کی سہولت اور آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں نہ کہ تنگی کا (دیکھئے سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵، اور سورۂ حج ۷۸) اور آپ ﷺ نے سہولت کا حکم فرمایا اور تنگی سے منع فرمایا (بخاری شریف)

کفالت کے انواع

۱) **دَین (قرض) کی کفالت:** کسی مقروض کے قرض کی کفالت اور ذمہ داری لینا کہ وقت مقررہ پر وہ ادا نہ کرے تو میں ادا کردونگا۔ اسے ضمان بھی کہا جاتا ہے۔

۲) **نفس کی کفالت:** کسی پر قرض یا قصاص وغیرہ کوئی حق ثابت ہو تو اس کو حاضر اور پیش کرنے کی ذمہ داری لینا، بدون اس کے کہ اس حق کی ادائیگی کی ذمہ داری لے۔ (بعضوں کے نزدیک مالی ذمہ داری کو ضمان اور بدنی ذمہ داری کو کفالت کہا جاتا ہے)

کفالت کے ارکان

(۱) کَفِیل (۲) مَکْفُول لَہٗ (۳) مَکْفُول عنہ (۴) مَکْفُول بہ (۵) صیغہ

۱) **کفیل:** یعنی وہ ضامن شخص جو کسی کے حق کی ادائیگی یا خود اس شخص کی پیشی کی ذمہ داری لے۔

کفیل کے شرائط یہ ہیں

وہ تبرع کا اہل ہو: یعنی عاقل بالغ اور رشید ہو، کیونکہ کفالت تبرع ہے، پس پاگل اور بچے کی کفالت صحیح نہیں۔ اسی طرح جس پر بے جا تصرفات کی وجہ سے مالی تصرفات کی پابندی عائد ہو، وہ بھی مالی کفیل نہیں بن سکتا، کیونکہ مالی کفالت مالی تصرف ہے۔ اسی لئے جو مرض الموت میں ہو وہ اپنے مال کے تہائی حصے سے زائد مقدار میں کفیل نہیں بن سکتا، تہائی تک گنجائش ہے۔

۲) **مَکْفُول لَہٗ:** یعنی صاحبِ حق، جس کے حق کی حفاظت اور اطمینان کے لئے کفیل یہ ذمہ داری لیتا ہے۔ کفیل کا مکفول لہٗ کو براہِ راست جاننا شرط ہے۔ صرف اس کے نسب سے واقفیت کافی نہیں، کیونکہ یہی آئندہ اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔ اور مطالبہ کے انداز میں بعض سخت اور بعض نرم ہوتے ہیں، لہٰذا ذمہ داری لینے والے کا اسے جاننا ضروری ہے۔

اگر اس کا کوئی وکیل ہو تو اسے جاننا شرط ہے۔ مکفول لہ کا موجود ہونا یا کفالت سے اس کا متفق ہونا شرط نہیں۔

۳) **مَکْفُول عنہ:** یعنی جس سے مکفول لہ کی جانب سے حق کا مطالبہ ہو، جسے کفیل کے مقابلہ میں اَصِیل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ذمہ قرض وغیرہ کوئی ایسا حق جس کا ضمان درست ہو۔ ثابت ہونا شرط ہے۔

کسی کی مالی ضمان میں مضمون عنہ (مکفول عنہ۔ مقروض) کی رضامندی شرط نہیں کیونکہ بغیر اجازت کے دوسرے کا قرض ادا کرنا جائز ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری لینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، اس لئے میت کے قرض کا ضمان صحیح ہے، خواہ میت نے ترکہ وغیرہ نہ چھوڑا ہو۔ مکفول عنہ کی معرفت بھی ضروری نہیں، کیونکہ اس کا اور کفیل کا کوئی معاملہ ہی نہیں۔

۴) **مکفول بہ:** وہ حق جس کی ذمہ داری لی جائے مکفول بہ کہلاتا ہے۔ (چاہے قرض ہو یا کچھ اور) اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱) **بوقت عقد حق ثابت ہو،** جو حق ابھی ثابت نہ ہو اس کا ضمان صحیح نہیں، خواہ اس کے وجوب کا سبب پایا گیا ہو، جیسے بیوی کے مستقبل کا نفقہ، یا نہ پایا گیا ہو، جیسے فلاں کو جو قرض دے گا اس کا ضمان، کیونکہ ضمان حق کا وثیقہ ہے۔ لہٰذا اس پر مقدم نہ ہوگا، جیسے گواہی۔

حق کے ثبوت کے لئے ضامن کا اعتراف کافی ہے۔ چاہے مضمون پر کچھ ثابت نہ ہو، لہٰذا اگر کہے۔ زید کے انور پر ۱۰۰/ دینار ہیں اور میں اس کا ضامن ہوں اور انور اس قرض کا انکار کرے تب بھی زید ضامن سے ۱۰۰/ دینار کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آئندہ واجب ہونے والے حق کا ضمان صحیح ہے، جیسے کہے: اسے ۱۰۰/ روپئے قرض دو میں اس کا ضامن ہوں

اوراس نے دے دیئے تو یہ صحیح ہے، کیونکہ اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔

رشتہ داروں کے آئندہ نفقہ کا ضمان صحیح نہیں، کیونکہ یہ ایک احسان اور حسن سلوک ہے۔ نہ کہ دَین۔

ضمان الدّرک: مذکورہ شرط سے ضمان درک مستثنیٰ ہے۔ یعنی کسی چیز کے خریدار کے لئے یہ ذمہ داری لینا کہ اگر وہ چیز عیب دار ہے یا ناقص یا کسی اور کی ثابت ہو (یعنی غصب شدہ یا چوری وغیرہ کا مال ثابت ہو) تو قیمت لوٹائی جائے گی، تو ان صورتوں میں خریدار ضامن سے اپنی رقم (اس چیز کی قیمت) وصول کرے گا۔ اس ضمان کا بائع کی جانب سے قیمت پر قبضہ کے بعد ہونا شرط ہے۔

۲) **حق لازم ہو:** خواہ مستقر (پختہ) ہو، جیسے قبضہ اور مدت خیار کے بعد مبیع کی قیمت، دخول کے بعد مہر، یا غیر مستقر ہو جیسے قبضہ سے قبل قیمت، یا دخول سے قبل مہر۔

جو حق آئندہ لازم ہونے والا ہو، یعنی بذات خود لازم ہو جائے اور کسی دوسرے پر اس کا لزوم موقوف نہ ہو۔ اس کا ضمان صحیح ہے، جیسے مدت خیار میں قیمت، کیونکہ مدت کے اختتام کے ساتھ ہی خود بخود یہ لازم ہو گا۔ لہٰذا اس کا ضمان صحیح ہے۔ گرچہ ابھی لازم نہیں ہوا۔

لازم یا آئندہ لازم ہونے والے کا مطلب وہ دین ہے جسے بلا سبب فسخ کرنے کا اختیار نہ ہو، جیسا کہ سابقہ مثالوں میں ہے۔ اگر دَین لازم یا لازم ہونے والا نہ ہو، یعنی جس پر دَین ہے۔ وہ بغیر سبب کے اسے فسخ کر سکتا ہو جیسے جعالہ کا معاوضہ۔ یعنی اپنی گمشدہ شئی لانے والے کے لئے متعین مال کی ادائیگی کی ذمہ داری، تو کسی کے لانے سے قبل وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے، لہٰذا اس کا ضمان صحیح نہیں۔ کیونکہ عمل سے فارغ ہونے کے بعد یہ معاوضہ ثابت ہو گا۔ جیسا کہ "باب الجعالہ" میں گذر چکا۔

۳) **ضامن کو دَین کی جنس،** مقدار اور صفت معلوم ہو۔ جنس یعنی مثلاً درہم و دینار روپئے پیسے۔ مقدار یعنی ایک ہزار، دو ہزار وغیرہ، صفت یعنی اچھے قسم کے یا گھٹیا قسم کے جبکہ چیز مختلف صفات کی ہو۔ مغصوب وغیرہ کسی چیز کا ضمان ہو تو اس چیز کا جاننا شرط ہے۔

مجہول کا ضمان صحیح نہیں۔ جیسے آپ کا اس پر جو بھی قرض ہے، میں اس کا ضامن ہوں۔

۴) **حق تبرع کے قابل ہو،** یعنی جس پر حق ہے بلا معاوضہ وہاں سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے قابل ہو، جیسے مذکورہ بالا حقوق، اگر قابل انتقال نہ ہو تو ضمان صحیح نہیں۔ مثلاً حق شفعہ، یہ شفیع کا حق ہے۔ جس کی بنیاد پر شریک اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کرے تو یہ قیمت دے کر لے سکتا ہے، لیکن یہ حق دوسرے کو منتقل نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کا ضمان صحیح نہیں۔

۵) **صیغہ:** یعنی ضامن و کفیل کی جانب سے ایجاب اور مکفول لہ کی جانب سے قبول

کفالت کے تحقق اور وجود کے لئے کفیل کی جانب سے ایجاب کافی ہے۔ مکفول لہٗ کی طرف سے قبول یا رضامندی شرط نہیں، جیسا کہ گذر چکا۔

صیغہ کے شرائط: ۱) ایسا لفظ ہو جو صراحتاً یا کنایتہ التزام (اپنے ذمہ لینے) پر دلالت کرے،

صریح الفاظ: فلاں پر آپ کے قرض کا میں ضامن بنتا ہوں، میں نے وہ قرض اپنے اوپر لے لیا، میں نے اس کا تکفل کیا، میں اس کا کفیل ہوں، فلاں کے بدن کا میں کفیل ہوں، فلاں کو حاضر کرنے کا میں کفیل (یا ضامن) ہوں وغیرہ۔

کنایہ: تم فلاں کو چھوڑ دو، اوراس پر آپ کا جو قرض ہے۔ وہ میرے ذمہ۔ وغیرہ

اگر لفظ التزام (اپنے اوپر لازم اور واجب کر لینے) پر دلالت نہ کرے، تو کفالت صحیح نہیں۔ مثلاً کہے، فلاں پر جو مال ہے میں ادا کروں گا، یا میں فلاں کو حاضر کروں گا۔ وغیرہ۔ کیونکہ اس طرح کے الفاظ التزام پر دلالت نہیں کرتے، صرف وعدہ ہے، جس کا نبھاؤ لازم

نہیں، لیکن کوئی قرینہ ضمان کی طرف پھیرنے والا موجود ہو تو ضمان صحیح ہوگا۔ جیسے کسی نے دیکھا کہ صاحبِ حق مقروض کو قید کرنا چاہتا ہے، تو اس نے کہا: میں اس کا قرض ادا کرتا ہوں، تو یہ قرینہ ہے کہ وہ ضمان کے ارادہ سے کہہ رہا ہے، تو گویا کہ اس نے کہا: میں اس کا ضامن ہوں، تم اسے چھوڑ دو، اس سے تعرض نہ کرو۔

گونگے کا معروف و مُفْہِم اشارہ اور تحریر الفاظ کے قائم مقام ہے۔

۲) **عقد مُنَجّز ہو** (فوری ہو): یعنی کسی شرط پر معلق نہ ہو، خواہ مالی کفالت ہو یا بدنی کفالت، پس کوئی کہے: اگر زید آیا تو میں تمہارے فلاں پر قرض کا کفیل، تو یہ ضمان صحیح نہیں، اسی طرح اگر کہا: تم فلاں کام کرو تو میں فلاں کو حاضر کرنے کی کفالت لیتا ہوں، تو یہ کفالت صحیح نہیں، کیونکہ کفالت ایک عقد ہے اور عقود میں تعلیق کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۳) **مالی کفالت میں توقیت** (مدت کی قید) نہ ہو، کیونکہ مقصد حق ادا کرنا ہے، لہٰذا یہ قید صحیح نہیں، اسی طرح بدنی کفالت میں بھی صحیح قول کے مطابق توقیت صحیح نہیں، کہ اصل مقصد حاضر کرنا ہے۔

اگر کفالت منجز ہو، اور کسی مدت متعینہ تک مکفول کی حاضری کی تاخیر کی شرط لگائے تو جائز ہے، مثلاً یوں کہا: میں اسے حاضر کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، لیکن ایک ماہ کے بعد اسے حاضر کروں گا۔

اسی طرح فی الوقت واجب الادا قرض کو مخصوص مدت کے بعد ادا کرنے کی شرط کے ساتھ ضامن بننا صحیح ہے کیونکہ ضامن متبرع ہے (بلا عوض و فائدہ مفت میں یہ ذمہ داری نبھا رہا ہے) اور ممکن ہے فی الوقت ادائیگی کی حیثیت نہ ہو، اور ضمان کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کے شرط کے مطابق ضمان صحیح ہوگا، اب یہ مدت صرف ضامن کے حق میں ثابت ہوگی، لہٰذا مکفول لہ فی الحال (مدت سے قبل) اس سے اپنے حق کا مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن یہ مدت مکفول عنہ (اَصیل) کے حق میں ثابت نہ ہوگی، لہٰذا صاحب حق اس سے فی الوقت مطالبہ کر سکتا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص اپنے ایک مقروض کے ساتھ چمٹے رہے، جس پر دس دینار قرض تھا، تو اس نے کہا: میرے پاس ادائیگی کے لئے کچھ بھی نہیں؟ تب اس نے کہا: واللہ (قسم بخدا) میں تم سے جدا ہونے والا نہیں جب تک کہ میرا قرض نہ چکاؤ یا کسی ضامن کو پیش نہ کرو، پس وہ اسے آپ ﷺ کی بارگاہ میں لے آیا، تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم اس سے کتنی مہلت طلب کرتے ہو؟'' جواب دیا: ایک ماہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب پھر میں اس کی طرف سے ضامن بنتا ہوں''...(ابن ماجہ)

اسی طرح موئخر دین کو فی الوقت، ادا کرنے کی ضمانت لینا صحیح ہے، لیکن فوری ادا لازم نہیں۔ بلکہ اصل مقروض کو جو مہلت اور مدت ملی ہے۔ وہ اس کے حق میں بھی ثابت ہوگی۔ اگر ضامن فوراً ادا کر دے تو اصیل سے تکمیلِ مدت سے قبل واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

کفالت بالنَّفس (بدنی کفالت) کے احکام

۱- کفالت بالنفس بھی ایک طرح کی کفالت ہے، جس میں کفیل اس بات کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ مکفول کو مکفول لہ کے پاس حاضر اور پیش کرے گا، کفالت کی یہ قسم بھی مشروع ہے، اور کفالت کے دلائل کے عموم میں یہ بھی داخل ہے۔ نیز اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آثار مروی ہیں۔ منجملہ ان کے مختصراً ایک واقعہ یہ ہے کہ بعض لوگ مرتد ہوئے تو حضرت ابن مسعود نے عدی بن حاتم، جریر بن عبد اللہ اور اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو موئخر الذکر دونوں نے کہا: ان سے توبہ کا مطالبہ کرو۔ اگر تائب ہوں تو ان کے اہل خاندان کو کفیل بناؤ، پس مطالبہ پر انہوں نے توبہ کی اور ان کے اہلِ خاندان کو کفیل بنایا گیا (اخرجہ البیہقی۔

والبخاری بعضہ تعلیقا فی صحیحہ)

نیز حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس فرمان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ''لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖ''(سورہ یوسف ۶۶) ترجمہ:''(جب یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے عزیز مصر کے مطالبہ پر اپنے بھائی بنیامین کو ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا) اس وقت تک ہر گز اس کو تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر کو مجھ کو پکا قول نہ دوگے کہ تم اس کو ضرور ہی لے آؤ گے''

۲) **جس پر کوئی مالی حق ھو،** اسے حاضر کرنے کی کفالت صحیح ہے، خواہ مال کی مقدار سے واقف ہو یا ناواقف، کیونکہ اس نے کفالت بالبدن یعنی اس شخص کو حاضر کرنے کی ذمہ داری لی ہے، (نہ کہ مال ادا کرنے کی) اسی لئے اس کفیل سے مال کا مطالبہ نہ ہوگا، بلکہ صرف اس شخص کو پیش کرنے کا مطالبہ ہو گا۔ بس اتنا کافی ہے کہ مکفول پر جو مال ہے، اس کی طرف سے ضمان صحیح ہو۔ جیسا کہ مکفول بہ پر گفتگو کے دوران گذر چکا۔

اگر کسی پر کوئی سزا عائد ہو رہی ہو، تو اس کے بدنی کفالت میں حسب ذیل تفصیل:

اگر یہ عقوبت اور سزا کسی انسان کا حق ہے، جیسے قصاص اور حد قذف تو اس میں بدنی کفالت صحیح ہے۔

اگر عقوبت اللہ تعالیٰ کا حق ہو، جیسے شراب، چوری یا زنا کی حد، تو اس میں بدنی کفالت صحیح نہیں۔ کیونکہ حدود کی بنیاد رفع دفع و اسقاط اور درگذر پر ہے، جبکہ یہ حقوق اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوں، لہٰذا ان میں پردہ پوشی اور حتی الامکان درگذر کی کوشش مطلوب ہے۔ اور اس کی کفالت اس مطلوب کے برعکس اظہار اور تاکید و توسیع کی کوشش ہے لہٰذا یہ صحیح نہیں۔

۳) **پیشی کی جگہ اور وقت:** اگر کفیل مکفول کو لا کر پیش کرنے کا کوئی وقت مقرر کرے تو اس مقررہ وقت میں اسے پیش کرنا لازم ہے، جبکہ مکفول لہ مطالبہ کرے، اگر اسے حاضر کر دیا تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا اور حاضر نہ کرے تو حاکم اسے قید کر دے۔

اگر مکفول غائب ہو، اور کفیل ناواقف ہو کہ وہ کدھر ہے تو اس پر پیشی لازم نہیں، کیونکہ وہ معذور ہے اور اس کی ناواقفیت کے دعویٰ کو اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔

اگر اس کی جگہ سے واقف ہو تو پیشی لازم ہے، جبکہ راستہ باسلامت ہو اور اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، اور عام طور پر آمد و رفت میں جو وقت درکار ہو اتنی مہلت دی جائے گی۔ مہلت کے گذرنے کے باوجود وہ حاضر نہ کرے تو پھر قید میں ڈال دیا جائے، کیونکہ کفالت کی وجہ سے اس پر مکفول کی سپردگی لازم تھی، جس میں وہ کوتاہی برت رہا ہے، البتہ مکفول کا دَین وہ خود ادا کر دے تو قید نہیں کیا جائے گا۔

جب کفیل کو قید کیا جائے گا تو وہ مستقل قید میں رہے گا، الّا یہ کہ موت، یا اس کی جگہ سے ناواقفیت کی وجہ سے یا کسی ایسے کے پناہ میں ہو کہ اس تک پہنچنا ممکن نہ ہو، اور اسے حاضر کرنا دشوار ہو جائے۔

قید سے بچنے کے لئے کفیل خود ہی قرض ادا کر دے، پھر مکفول آجائے، اور ادا کردہ قرض اس حالت پر باقی ہو تو وہ، ورنہ اس کا بدل مکفول لہٗ سے واپس لے سکتا ہے (کیونکہ اصل ذمہ داری مکفول کو پیش کرنا تھی اور وہ آچکا)

جگہ: اگر سپردگی کے لئے کفیل کسی جگہ کی تعین کرے اور وہ سپردگی کے مناسب ہو، تو وہی جگہ متعین ہو گی، اگر مناسب نہ ہو، یا

اس میں خرچ ہو تو اس سے قریب مناسب جگہ پر محمول کیا جائیگا۔ اس کے لئے مکفول کی اجازت شرط ہے، ورنہ یہ فاسد ہے۔ کسی جگہ کی تعیین نہ ہو، تو کفالت کی جگہ مراد ہو گی جبکہ وہ اس قابل ہو، ورنہ وہاں سے قریب تر مناسب و قابل جگہ متعین ہو گی۔

۴) مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کفیل مناسب جگہ مکفول کو سپرد کرے، اور وہاں کوئی ایسی رکاوٹ نہ ہو جو مکفول لہ کو اپنا حق وصول کرنے سے روکے، تو کفیل بری ہو جائے گا (اب اس کی کوئی ذمہ داری نہیں) لیکن کوئی رکاوٹ ہو، مثلاً کوئی طاقت ور شخص جو اسے حق وصول کرنے سے روکے، تو کفیل بری نہ ہو گا، سپردگی کے لئے متعین جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ سپرد کرے اور مکفول لہ کسی سبب سے اس سے راضی نہ ہو، مثلاً متعین جگہ اس کے گواہ ہوں۔ یا حق کی وصولیابی کے لئے کوئی معاون ہو، تو اس دوسری جگہ اسے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔ اگر کسی معقول سبب اور مقصد کے بغیر وہ تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو، تو حاکم اس پر جبر کرے گا، وہ نہ مانے تو خود اس کی طرف سے تسلیم کرے گا۔ اگر حاکم نہ ہو تو کفیل اس سپردگی پر گواہ رکھے، اور وہ بری ہو جائے گا۔

اور جس طرح سابقہ شرائط کے مطابق سپردگی سے کفیل بری ہو جاتا ہے، اسی طرح خود مکفول اپنے آپ کو پیش کرے تب بھی بری ہو جائے گا۔ اگر مکفول لہ تسلیم کرنے سے انکار کرے تو سابقہ تفصیل کے مطابق اس پر جبر کیا جائیگا۔ مکفول کا صرف حاضر ہو جانا کافی نہیں، بلکہ اسے یوں کہنا لازم ہے: میں نے فلاں کی طرف سے اپنے آپ کو سپرد کیا۔

۵) اگر مکفول کی وفات و تدفین ہو جائے یا وہ روپوش یا فرار ہو اور اس کی جگہ کا علم نہ ہو تو کفیل بری ہو گا، اور اس سے مکفول پر موجود حق کا مطالبہ نہ ہو گا (دفن کی قید اس لئے کہ اس سے قبل اس کے حاضری کا مطالبہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تاکہ اس کی صورت پر گواہ رکھے۔ تحفۃ المحتاج ۶/ ۶۵۶)

۶) بدنی کفالت میں اگر یہ شرط رکھی جائے کہ کفیل مکفول کو پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو اس پر ثابت حق کا ضامن ہو گا، تو یہ کفالت باطل ہے، کیونکہ یہ شرط بدنی کفالت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

۷) مکفول لہ اپنا حق معاف کر دے تو کفیل بھی پیش کرنے کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔

۸) بدنی کفالت میں مکفول کی رضامندی شرط ہے، کیونکہ اس کفالت میں کفیل مال کا ذمہ دار نہیں ہے، اس کا صرف یہی فائدہ ہے کہ مکفول کو حاضر کر دے گا، اور وہ اس کفیل کی کفالت سے راضی نہ ہو تو اسے کفیل کے ساتھ آنا لازم نہیں ہے۔

مکفول لہ کی رضامندی شرط نہیں، کیونکہ یہ ایک وثیقہ ہے، لہٰذا اس کی رضامندی کے بغیر بھی صحیح ہے۔ جیسے گواہی

مالی کفالت (ضمان) کے احکام

کسی کے ذمہ جو مالی حق ہو، اس کے متعلق یہ ذمہ داری لینا کہ اس نے ادا نہ کیا تو میں ادا کر دوں گا، اسے کفالت بالمال (مالی کفالت) اور ضمان کہتے ہیں۔ اس کی مشروعیت پر ہر دور میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ اس کے بعض احکام گذر چکے۔ اب بعض دیگر احکام بیان ہو رہے ہیں۔

۱) **کفیل اور مکفول عنہ سے مطالبہ:** کوئی کسی کے مالی حق کا ضامن بن جائے تو صاحبِ حق، کفیل (وضامن) اور اصیل (مکفول عنہ۔ جس پر حق ہے) دونوں سے مطالبہ کر سکتا ہے (یا بعض حق کا کفیل سے اور بعض کا اصل سے بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔ فتح الوہاب)

اسی لئے عقد ضمان میں اصیل کے قرض سے بری ہونے کی شرط لگائے تو یہ ضمان صحیح نہیں، کیونکہ ضمان اس قرض کی مزید پختگی اور

اطمینان کے لئے ہے، اور یہ شرط اس کے منافی ہے۔ کیونکہ یہ پختگی اصیل کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی ذمہ دار بنانے میں ہے۔ نہ کہ اسے بری کرنے میں۔

حضرت ابو قتادہؓ نے ایک میت کا قرض اپنے ذمہ لینے کے بعد دو دن سے اسے چکایا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اب تم نے اس میت کی جِلد ٹھنڈی کر دی'' (مسند احمد) آپ ﷺ کا یہ فرمان اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ محض ضمان کی وجہ سے وہ مقروض قرض سے سبکدوش نہیں ہوا۔ ورنہ بوقت ضمان ہی اس کی جِلد ٹھنڈی ہو چکی ہوتی، لہٰذا جب اصیل اور مقروض قرض سے بری نہیں ہوا، تو صاحب حق اس سے مطالبہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ضامن سے مطالبہ کر سکتا ہے، کیونکہ اس نے ذمہ داری لی ہے۔ اگر کفیل (ضامن) اور اصیل (مضمون عنہ۔ مقروض) دونوں حاضر و موجود ہوں، اور دونوں بھی قرض ادا کرنے پر قادر ہوں، تو صاحب حق کو دونوں میں سے کسی سے بھی مطالبہ کرنے اور لینے کا حق حاصل ہے۔ اصیل سے اس لئے کہ قرض اس کے ذمہ ہے۔ اور کفیل سے آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ: ''زَعِیْم غارم ہے۔'' (ترمذی شریف) یعنی کفیل سے قرض کا مطالبہ کیا جائیگا۔ (واخرجہ ابن حبان وصححہ کما فی فتح الوہاب)

۲) **اصیل کی برأت سے کفیل کی برأت:** اگر صاحب حق اصیل کو اپنے دَین اور حق سے بری و سبکدوش کر دے تو کفیل بھی اس سے بری ہو گا، اب اس سے بھی مطالبہ کا سوال نہیں، لیکن کفیل کو ضمان سے یا دَین اور اس کے مطالبہ سے بری کر دے، تو اس سے اصیل بری نہ ہو گا، بلکہ صرف کفیل ہی بری ہو گا۔

اگر ایک ضامن کی طرف سے دوسرا شخص ضامن بن جائے تو یہ بھی صحیح ہے، اور اس صورت میں یہ دین تین اشخاص کے ذمہ ثابت ہو گا، اصیل، اوّل ضامن اور دوّم ضامن، اور صاحب حق ان تینوں میں سے کسی سے بھی مطالبہ کر سکتا ہے، اگر اس نے اصیل کو بری کر دیا تو تینوں بری ہو جائیں گے، اوّل ضامن کو بری کر دیا تو دوّم ضامن بھی بری ہو گا، لیکن اصیل بری نہ ہو گا، اگر دوم ضامن کو بری کر دے تو صرف وہی بری ہو گا، اول ضامن اور اصیل بری نہ ہوں گے۔

۳) **کفیل کا اصیل سے اپنی خلاصی (یعنی حق کی ادائیگی) کا مطالبہ:** اگر صاحب حق کفیل سے دین کا مطالبہ کرے، اور اس نے اصیل کی اجازت سے کفالت لی تھی تو کفیل اصیل سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ دین ادا کر کے مجھے کفالت سے آزاد کر دو، صاحب حق جب تک کفیل سے مطالبہ نہ کرے، وہ اصیل سے اپنی خلاصی اور دین کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اور اصیل کی اجازت کے بغیر کفیل بنا تھا، تو یہ اصیل سے ادائیگی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۴) **موت کی وجہ سے ادھار کی مہلت کا خاتمہ:** کفیل یا اصیل کا انتقال ہو تو اس کے حق میں دَین کی مہلت ختم ہو جائے گی اور فوری واجب الادا ہو جائے گی، کیونکہ موت مہلت اور مدت کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن جو زندہ ہے اس کے حق میں ابھی مہلت کا اعتبار ہو گا، کیونکہ مہلت بھی ایک منفعت ہے، پس اس کے حق میں وہ باطل نہ ہو گی۔

اگر اصیل کا انتقال ہو، تو کفیل صاحب حق سے اس بات کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ ترکہ کی تقسیم سے قبل اس میں سے اپنا حق وصول کرے، یا پھر اسے کفالت سے بری کر دے، کیونکہ قرض کی مدت ختم ہونے تک ممکن ہے ترکہ ختم ہو جائے اور اسے قرض ادا کرنا پڑے۔

اگر کفیل کی موت ہو، اور صاحبِ حق اس کے ترکہ سے اپنا حق وصول کر لے، تو اس کے وارثوں کو مکفول عنہ (اصیل) سے قرض کی مدت پوری ہونے تک واپسی کے مطالبہ کا حق نہ ہو گا، کیونکہ اس کے حق میں مدت ابھی باقی ہے۔

۵) **کفیل کا مکفول عنہ سے ادا کردہ حق وصول کرنا:** کفیل یا مکفول عنہ میں سے کسی نے بھی حق ادا کر دیا

تو دونوں بھی بری ہو گئے۔ کفیل حق ادا کرے تو مکفول عنہ سے واپسی اور وصولیابی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف): اگر مکفول عنہ (اصیل) کی اجازت سے کفیل بنا ہے، تو اس سے واپس لے گا، خواہ ادائیگی اس کی اجازت سے ہو، یا بغیر اجازت کے۔

(ب): اگر کفالت اور ادائیگی دونوں ہی اصیل کی اجازت کے بغیر ہو، یا کفالت تو بغیر اجازت کے ہو اور ادائیگی اجازت سے ہو تو اس سے واپس نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اجازت کے بغیر کفیل وضامن بنا ہے، تو گویا اس نے تبرعاً (مفت میں اپنی جانب سے) قرض ادا کیا ہے۔

واپسی کی صورت میں مکفول عنه سے کیا واپس لے ؟: اصیل پر جو قرض تھا، اسی صفت کے ساتھ وہ قرض ضامن نے ادا کر دیا، تو وہی اصیل (مکفول عنہ) سے واپس لے گا، اگر اس کے علاوہ کوئی اور چیز ادا کرے، اور وہ دَین سے کم ہو تو وہی ادا کردہ واپس لے، اگر دَین سے زائد ہے تو دَین کی مقدار واپس لے، کیونکہ یہی مقدار اصیل کے ذمہ واجب تھی۔ مثلاً اصیل پر صحیح سو (۱۰۰) دینار قرض تھا اور ضامن نے ۱۰۰/ دینار عیب دار ادا کئے، تو اصیل سے عیب دار واپس لے۔ اگر ضامن ۵۰/ دینار پر صلح کرلے، تو اصیل سے ۵۰/ دینار ہی لے سکتا ہے۔ اگر کسی چیز پر جس کی قیمت ۸۰/ دینار ہو صلح کرلے تو ۸۰/ دینار واپس لے، صلح میں ادا کردہ چیز کی قیمت ۱۲۰/ دینار ہو، تو صرف ۱۰۰ دینار ہی لے گا،

۶) **ضامن کا ادائیگی کا دعوی**: اگر ضامن و کفیل یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اصیل کی جانب سے دَین چکا دیا تو اگر مکفول لہ اسے تسلیم کرتا ہے، تو ضامن اصیل (مکفول عنہ) سے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، کیونکہ جب صاحب حق نے خود اقرار کرلیا تو اس کے ذمہ سے دَین ساقط ہو چکا، اگر اصیل انکار کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر مکفول له انکار کرے تو: (۱) ضامن کے پاس ادائیگی کا بیّنہ (گواہ) ہو تو اس کے حق میں فیصلہ ہو گا، اور وہ اصیل سے یہ رقم لوٹالے گا۔

۲) ادائیگی کا بینہ نہ ہو، تو مکفول لہ کی بات مع قسم قبول کی جائیگی، اب قسم کے بعد وہ ضامن یا اصیل کسی سے بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔
(بینہ سے مراد دوعادل مرد گواہ، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور ضامن کی قسم)

مذکورہ صورت میں مکفول عنہ کی غیر موجودگی میں کفیل نے یہ حق ادا کیا تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتا، خواہ وہ اس کی تصدیق کرے یا اسے جھٹلائے، کیونکہ اس ادائیگی سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور صاحب حق کا مطالبہ ابھی باقی ہے، اور گواہ نہ رکھنا کفیل کی غلطی ہے۔

اگر مکفول عنہ (اصیل) کے روبرو ادا کرے تو اس سے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ گرچہ اس ادائیگی سے وہ دَین سے سبکدوش نہیں ہوا (کیونکہ صاحب حق انکار کر رہا ہے) کیونکہ اس صورت میں اس کی کوتاہی ہے کہ احتیاط پر عمل نہیں کیا، اور ادائیگی پر گواہی کا مطالبہ نہ کیا۔

اَعیان (معین اشیاء) کا ضمان

کسی کی کوئی چیز دوسرے کے ہاتھ میں ہو اور کوئی تیسرا شخص اس کی واپسی کی ضمانت لے، تو یہ تفصیل ہے۔

اگر اس کے پاس وہ چیز بطور امانت ہو (جیسے ودیعت) تو ضمان صحیح نہیں، کیونکہ جس کے قبضہ میں ہے (بصورت تلف) خود اس پر ضمان واجب نہیں، تو کسی دوسرے پر بدرجہ اولیٰ واجب نہ ہو گا۔

اگر اس کا قبضہ ضمانت کا ہو (یعنی بصورت تلف اس پر ضمان اور تاوان واجب ہوتا ہو) جیسے غصب شدہ شئ، مستعار، بطور بھاؤ تاؤ خریدنے کے لئے ہاتھ میں لی ہوئی چیز اور خریدار کے قبضہ سے قبل مبیع وغیرہ، تو اس کا ضمان صحیح ہے۔

اس ضمان میں یہ شرط ہے کہ جس کے قبضہ میں چیز ہے، اس کی اجازت ہو، یا پھر ضامن اس سے وہ چیز لینے کی قدرت رکھتا ہو، ضمان صحیح ہونے کے بعد، جب وہ چیز مضمون لہ (مکفول لہٗ) کے پاس لوٹ جائے، تو یہ ضامن بری الذمہ ہو جائے گا۔

اس چیز کے تلف ہونے کی صورت میں قیمت کے لوٹانے کا ضمان لے تو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایسے دَین کا ضمان ہے، جو ثابت نہیں ہوا۔ اور ضمان کے صحت کے شرائط میں گذر چکا کہ مضمون ثابت دَین ہو، اور اس چیز کی قیمت اس کے تلف کے بعد ہی ثابت ہوگی، لہٰذا اس کی موجودگی میں قیمت کا ضمان صحیح نہ ہوگا۔

متفرقات

۱) کسی کا قرض اس کی اجازت سے بغیر ضمان کے ادا کرے، تو مقروض سے واپس لے گا، خواہ واپسی کی شرط نہ لگائے، اس کے برعکس بغیر اجازت کے ادا کرے تو واپس نہیں لے سکتا کیونکہ یہ تبرّع ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۳۹۱)

۲) کوئی مضطر ہو (شدتِ بھوک سے زندگی و موت کی کشمکش میں ہو) اور کوئی اس کے منہ میں جبراً اپنا کھانا رکھے، یا وہ بے ہوش ہو (اور اسے کھلائے) تو آئندہ واپس لے سکتا ہے، کیونکہ اس کی جان بچانا واجب ہے (حاشیۃ الجمل ۳/۳۹۱)

۳) کسی پر واجب زکات یا کفارہ کی ادائیگی کا ضامن بننا صحیح ہے۔ وہ زندہ ہو تو ادائیگی کے لئے اس کی اجازت ضروری ہے، کیونکہ نیت ضروری ہے۔ اگر مردہ کی طرف سے ہے تو اجازت کے بغیر ادا ہو جائے گا۔ (تحفۃ المحتاج ۶/۲۲۲)

۴) بدنی کفالت میں کفیل کی موت ہو، تو کفالت باطل ہوگی، اور مکفول لہ کو اس کے ترکہ میں سے کچھ نہ ملے گا، اور اگر مکفول لہ کا انتقال ہو، تو کفالت باطل نہ ہوگی۔ بلکہ وارثوں کو یہ حق حاصل ہوگا جیسا کہ مالی ضمانت میں ہوتا ہے (تحفۃ المحتاج ۶/۲۵۸)

۵) مقروض بغیر کسی قصد کے قرض خواہ کو (قرض کی رقم) ادا کرے تو یہ کچھ بھی نہیں، اور وہ اس کا مالک نہ ہوگا، بلکہ قرض کی ادائیگی کی نیت ہونا ضروری ہے۔ اگر قرض کی مقدار الگ کرتے وقت بھی نیت ہو تو کافی ہے، جیسا کہ زکات میں (تحفۃ المحتاج ۶/۲۷۶)

۶) کسی نے کہا: میرے جانور کو چارہ کھلاؤ، یا قیدی نے کہا: میرا فدیہ دے کر مجھے آزاد کرو۔ تو یہ رقم واپس لے سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے: مجھے ایک روٹی کھلاؤ، تو اس کا بدلہ عام عرف کی وجہ سے نہیں لے سکتا، اگر کسی سے کہا کہ میرا کپڑا دھو دو، تو وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔ (تحفۃ المتحاج ۶/۲۷۷)

۷) اگر کوئی کہے: میں تمہارے زید پر قرض کا اس چیز میں ضامن ہوں، تو یہ صحیح ہے اور اس قرض کا تعلق اس چیز سے ہوگا۔ لہٰذا وہ چیز تلف ہو جائے تو ضمان بھی ختم ہوگا (ترشیح المستفیدین ص ۲۴۳)

شرکت

اقسام: (۱) شرکت املاک (۲) شرکتِ عقد

۱) **شرکت املاک:** دو (۲) یا زائد افراد ایک شئ کے مالک ہوں، خواہ قہراً یعنی ان کے اختیار و ارادہ کے بغیر ہو، جیسے دونوں کا

اس شئ کا وارث بن جانا، یا اختیار و ارادہ سے ہو، مثلاً دونوں مشترک طور پر کوئی شئ خرید لیں، یا کوئی شخص ایک شئ دونوں کو ہبہ کرے اور وہ قبول کریں۔

اس میں ہر شریک دوسرے کے حصے میں اجنبی اور بے تعلق ہے، لہٰذا اس کی اجازت کے بغیر اس کے حصے میں تصرف جائز نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا مقصد شرکت کے باب میں اس شرکت کے متعلق بحث کرنا نہیں ہوتا، اس کی ہر صورت اس سے متعلقہ باب میں بیان ہوتی ہے، مثلاً ہبہ، وراثت یا وصیت وغیرہ میں۔

۲) **شرکت عقد:** یعنی وہ شرکت جو بالاختیار بقصد تصرف اور تحصیل نفع کے لئے انجام دی جائے۔ شرکت کے اس باب میں اصل مقصود اسی کے انواع مسائل و احکام کا ذکر ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں دو شرکاء میں تیسرا ہوں، جب تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے، اگر اس نے خیانت کی تو میں دونوں کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔" (ابوداود)

مفہوم: اللہ تعالیٰ کی حفاظت و مدد، اور اس کی طرف سے برکت ان دونوں کی تجارت اور ان کے مال سے متعلق ہوتی ہے، جبکہ وہ سچائی اور امانت پر قائم ہوں، جب اس کے بجائے خیانت آجائے تو برکت و اعانت اٹھ جاتی ہے، اور نزاع و خصومت اور نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔

۲) حضرت سائب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے شریکِ تجارت تھے، جب فتح مکہ کے دن وہ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا "مرحباً (خوش آمدید) میرے بھائی اور شریک کو، جو نہ دفع کرتے اور نہ جھگڑا" (یعنی بڑے خوش اخلاق شریک تھے، موافقت کرتے، مخالفت اور جھگڑا نہ کرتے) (ابوداود) اگر یہ آپ ﷺ کے الفاظ ہیں تو میرے شریک کہنا اس کی مشروعیت پر دال ہے اور حضرت سائبؓ کے الفاظ ہیں تو آپ ﷺ کا سکوت بھی مشروعیت پر دال ہے۔

۳) حضرت براء اور زید رضی اللہ عنہما شریک تھے، لہٰذا دونوں نے چاندی (کچھ) نقد اور (کچھ) ادھار خریدی، آپ ﷺ کو پتہ چلا تو فرمایا "جو نقد ہے، اسے باقی رکھو، اور جو اُدھار ہے اسے رد کردو" (مسند احمد) یہ حدیث بھی شرکت کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس پر انکار نہ فرمایا۔

اسی طرح آپ ﷺ کے وقت سے ہر دور میں بلا کسی انکار کے شرکت کا تعامل امت میں جاری ہے، لہٰذا بالاجماع جائز ہے۔

حکمت: کبھی مال کی قلت اور کبھی مطلوبہ تجربہ اور معلومات میں کمی کے باعث ایک آدمی تنہا تجارت نہیں کرپاتا، لہٰذا مصلحت کے پیشِ نظر مناسب اصول و ضوابط کی روشنی میں شریعت نے شرکت کو جائز قرار دیا، تاکہ لوگ صحیح انداز پر اپنے معاشی مسائل کو حل کرسکیں اور مطلوبہ ترقی حاصل ہو۔

شرکت کے انواع

(۱) شرکتِ عِنان (۲) شرکت مُفاوضہ (۳) شرکتِ اَبدَان (۴) شرکتِ وُجُوہ

۱) **شرکتِ عنان:** یعنی دو یا زائد افراد اپنی اپنی رقم کے ساتھ مشترک تجارت کریں، تاکہ نفع بھی ان میں مشترک ہو، شرکت کی یہ قسم بالاتفاق مشروع اور جائز ہے۔

۲) **شرکتِ مفاوضہ:** یعنی دو(۲) یازائد افراد اپنی تمام ملکیت میں مشترک ہو جائیں، اور ہر ایک دوسرے کی طرف سے وکیل و کفیل ہو، اور تمام نفع ونقصان میں شریک ہو، یہ قسم شافعی مسلک میں باطل ہے (بعض دیگر ائمہ کرام نے اسے جائز قرار دیا ہے)

۳) **شرکتِ اَبْدانْ (شرکتِ اَعمال):** یعنی دو(۲) یازائد افراد بغیر مال کے اعمال کے قبول کرنے اور انجام دینے میں شرکت کریں، خواہ ان کے اعمال متفق ہوں یا مختلف، بشرطیکہ نفع (کمائی) آپس میں مساوی یا متفاوت تقسیم کریں گے۔ مثلاً دو حمال یا درزی یا کسی اور صنعت و حرفت والوں کی شرکت، یہ شرکت بھی باطل ہے، کیونکہ کبھی بعض شریک دوسرے کے مقابلہ کافی زیادہ کام کرے گا، کبھی سارا کام ایک شریک کرے گا اور دوسرا کچھ نہ کرے گا، لہٰذا ممنوعہ ضرر ونقصان پایا جائے گا، اور عمل کا نفع اور کمائی کی تقسیم منصفانہ نہیں ہو گی۔ (بعض دیگر ائمہ کرام نے اس شرکت کو جائز قرار دیا ہے)

۴) **شرکت وجوہ:** یعنی دو یازائد افراد بغیر مال کے شرکت کریں، کہ اپنے مقام وحیثیت اور تعلقات وپہچان (کریڈٹ) کی بنیاد پر ادھار سامان خریدیں، خواہ مشترک خریدیں یا انفرادی طور پر، اب یہ خریدی ہوئی اشیاء مشترک ہوں اور فروخت کے بعد نفع متعینہ تناسب سے آپس میں تقسیم کرلیں، چونکہ مشترک مال نہیں پایا جارہا ہے، اور شرکت میں اصل مال ہے، اس لئے یہ نوع بھی باطل ہے۔ (اس شرکت کو بھی بعض دیگر فقہاءِ کرام نے جائز قرار دیا ہے)

شرکتِ عنان: یہ قسم تمام فقہاء کرام کے نزدیک مشروع اور صحیح ہے، اور عام طور پر شائع اور معروف یہی ہے، اس شرکت کی صحت کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱) **صیغہ:** ہر شریک کی طرف سے دوسروں کے لئے ایسے الفاظ پایا جانا ضروری ہے جو خرید و فروخت وغیرہ تجارتی معاملات کی اجازت پر دلالت کرے۔

۲) **وکالت کی اھلیت:** ہر شریک عاقل و بالغ ہو اور اس پر مالی تصرفات کی پابندی نہ ہو، کیونکہ ہر شریک اپنے حصہ میں اصالۃً اور دوسرے کے حصے میں وکالۃً تصرف کر رہا ہے۔

۳) **شرکت کا مال مثلی ھو:** آپس میں شرکاء کا مال خلط ملط کرنے کے بعد بعض بعض سے نمایاں نہ ہو، مثلاً دور حاضر میں رائج کرنسی اور سکّے وغیرہ، موزون یا مکیل اشیاء جبکہ ہر ایک شریک کا مال ایک ہی جنس کا ہو، جیسے گیہوں، جو، لوہا وغیرہ۔

اگر شرکت کا مال، یا کسی ایک شریک کا مال ایسے اسباب و سامان کے قبیل سے ہو جو نمایاں اور متمیز ہو، مثلی نہ ہو، تو شرکت صحیح نہیں، کیونکہ اسے اس طرح خلط کرنا کہ متمیز اور جدا معلوم نہ ہو، ممکن نہیں اور کبھی ایک کا مال تلف یا کم ہو گا، تو اس کی تلافی دوسروں کے مال سے نہیں ہو سکتی، اگر رأس المال (شرکت میں لگنے والی اصل پونجی اور مال) اسباب کے قبیل سے ہو تو اس کے صحت کی شکل یہ ہو گی کہ ہر ایک اپنے سامان کا ایک حصہ دوسرے کے سامان کے ایک حصہ کے عوض فروخت کردے، اس طرح دونوں تمام اسباب میں شریک ہوں گے، اب ہر ایک دوسرے کو اپنے حصہ میں تصرف کا اختیار دے دے، اس صورت میں فروخت کے بعد قیمت میں دونوں شریک رہیں گے۔

اسی طرح ایک شریک کا مال مثلی ہو اور دوسرے کا اسباب و سامان، تو اسباب والا اپنا ایک حصہ مثلی کے ایک حصہ کے بدلہ فروخت کردے تاکہ دونوں تمام مال میں شریک ہو جائیں۔

اسی طرح دونوں کسی سامان کے بطورِ وراثت، یا خرید وغیرہ کے مالک بن جائیں اور ایک دوسرے کو اپنے حصے میں بغرض تجارت تصرف کی اجازت دیں، تو شرکت صحیح ہے۔

۴) **شرکت کے مال کو خلط کرنا (آپس میں ملانا):** ابتداءً مشترک مال نہ ہو، تو تمام شرکاء اپنا اپنا مال لاکر آپس میں اس طرح ملائیں کہ بعض کا حصہ بعض سے جدا معلوم اور متمیز نہ ہو، اب عقد شرکت جاری ہوگی۔ مال کے خلط سے پہلے عقد شرکت طے ہو تو صحیح نہیں، چاہے بعد میں اسی مجلس میں اموال کا خلط ہو، خلط کے بعد دوبارہ عقد کا اعادہ ضروری ہے تاکہ شرکت صحیح ہو۔

مشترک طور پر کسی چیز کے خریدنے، بطور ہبہ قبول کرنے یا وارث بننے کی وجہ سے پہلے سے کسی مال میں مشترک ہوں، پھر عقدِ شرکت طے پائے تو صحیح ہے، اسے تقسیم کرکے پھر ملالینا کوئی شرط نہیں۔

۵) **نفع ونقصان کا تناسب مال کی مقدار کے مطابق ہو:** لہٰذا کسی کے لئے اس کے مال کے مقابلہ میں کم یا زائد نفع ونقصان کا تناسب مقرر کرنا صحیح نہیں۔ تمام شرکاء کا مال مساوی اور برابر مقدار میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر تین شرکاء میں ایک کا مال نصف اور دوسرے دونوں کا پاؤ پاؤ ہو تو صحیح ہے۔ اب نفع کی صورت میں نفع میں سے پہلے شریک کو نصف حصہ اور دوسرے دونوں کو پاؤ پاؤ حصہ ملے گا، اور نقصان ہو تب بھی اسی تناسب سے برداشت کریں گے، چاہے عمل میں سب شریک ہوں یا نہ ہوں، یا بعض کا عمل کم اور بعض کا زیادہ ہو (پس شرکاء کے نفع ونقصان کی تقسیم کا تعلق صرف مال کی مقدار سے ہے، عمل اور محنت سے نہیں)

اگر خسارہ اور نقصان میں تفاوت کی شرط ہو تو شرکت باطل ہے، اور اگر نفع میں مال کے تناسب کے برعکس تفاوت ہو تب بھی شرکت صحیح نہیں، پس شرکاء کی جانب سے خرید وفروخت پائی جائے تو اجازت کی وجہ سے یہ تصرف نافذ ہوگا، اور ہر ایک کو اس کے رأس المال کی نسبت سے نفع ملے گا، اور دوسروں سے اجرتِ مثل واپس لے گا۔ (یعنی دوسرے کے مال میں تصرف اور محنت کے بدلہ اجرت لے گا)

حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے درج ذیل صورتوں میں مال کے تناسب سے زائد نفع کے شرط کی اجازت دی ہے:

۱- تمام شرکاء کے مال کی مقدار مساوی ہو، مثلاً ہر ایک کا تہائی حصہ ہو، اور تمام عمل اور محنت میں شریک ہوں، تو کسی کو اس کی مقدار سے زائد تناسب کی شرط صحیح ہے، کیونکہ کبھی وہ محنت میں زیادہ ماہر اور واقف کار ہوگا، تو یہ اضافہ اس کے مہارت ومحنت کے بالمقابل ہو جائے گا۔

۲- شرکاء مال میں شریک ہوں اور عمل ومحنت بعض انجام دیں، تو محنت کرنے والوں کو زیادہ تناسب طے کرنا صحیح ہے۔

۳- شرکاء کے مشترک مال کے مقدار میں تفاوت ہو، مثلاً ایک کا تہائی حصہ اور دوسرے کا دو تہائی، اور دونوں عمل میں شریک ہوں، تو ایک کو اس کے مال کے مقدار کے تناسب سے زائد نفع طے کرنا جائز ہے۔ مثلاً دونوں نفع میں مساوی ہوں، یا ایک کو دوسرے سے زائد ملے، کیونکہ اس کی محنت ومہارت کی زیادتی کا احتمال ہے، تو یہ زیادتی اس کے مقابل ہوگی۔

۴- رَأسُ المال میں سابقہ مال کی طرح تفاوت ہو، اور عمل اس کے ذمہ ہو جس کی مقدار کم ہے، اور یہ شرط ٹھہرے کہ نفع میں دونوں مساوی ہوں، یا عمل انجام دینے والے کو زائد نفع ملے تو یہ صحیح ہے۔

تنبیہ: مذکورہ صورتوں میں زائد مقدار اس وقت صحیح ہوگی، جبکہ اس کے حق میں متعین کردہ نفع کے تناسب کے ضمن میں ہو، مثلاً اس کا پورا حصہ عام اور کل نفع سے فی صدی کے تناسب سے ہو، مثلاً ۵۰ فیصد، یا ۶۰ یا کم یا بیش، اگر عمل کے بالمقابل مستقل الگ نسبت یا الگ مقدار مثلاً ہزار روپیہ ماہانہ مقرر کرے تو باتفاق فقہاء صحیح نہیں۔

اس کی روشنی میں دورِ حاضر کے بہت سے شرکت کے عقد، جو لوگ انجام دیتے ہیں، اس کا فساد واضح ہو جاتا ہے، بعض مرتبہ محنت کرنے والے شریک کے لئے نفع میں اس کے حصہ کے علاوہ جدا تنخواہ رکھی جاتی ہے۔ اور کبھی محنت کے مقابلہ میں نفع کی ایک مقدار مثلاً نصف یا پاؤ اس کے لئے طے کی جاتی ہے، پھر بقیہ نفع سارے شرکاء حسبِ تناسب تقسیم کرلیتے ہیں، لہٰذا معاملات میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے

والے اس کے عتاب و گرفت سے ڈریں، اور یہ جان لیں کہ عقدِ فاسد کی کمائی خبیث ہے، جس میں اللہ تعالیٰ برکت نہیں عطا فرماتے۔

بہر حال، دور حاضر میں حالات کے پیشِ نظر، جس میں سخاوت اور مالی قربانی کا جذبہ کم سے کمتر ہوتا جارہا ہے، "الفقہ المنہجی" کے مصنفوں کی رائے میں حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مذکورہ مسائل پر عمل کرنے میں حرج نہیں، اگر چہ بہتر اور تقویٰ کے مناسب یہی ہے کہ عمل ایسے انجام دے کہ تمام فقہاء امت کے نزدیک صحیح ہو، یہی دین میں احوط طریقہ ہے۔

عقدِ شرکت کے آثار

جب شرکتِ عنان کے شرائط موجود ہوں، تو وہ صحیح ہوگی، اور اس پر درج ذیل آثار مرتب ہوں گے:

۱- ہر شریک کو شرکت کے مال میں عرف اور عدم ضرر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تصرف کا اختیار ہوگا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے اصیل اور شریک کی طرف سے وکیل ہے۔

لہٰذا دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت کرنا، بستی میں رائج سکوں کے علاوہ سے فروخت کرنا، زیادہ نقصان اٹھا کر خرید و فروخت کرنا اور شرکت کا مال سفر میں لے جانا جائز نہ ہوگا، بلا اجازت اس طرح کا تصرف باطل ہوگا، اور دیگر شرکاء کی اجازت تھی تو صحیح ہوگا۔

۲- شرکاء پر طے شدہ شرائط کے مطابق عمل واجب ہے۔

۳- شرائط مذکورہ کے مطابق کسی شریک نے شرکت کے مال سے کچھ خریدا، تو یہ خرید تمام کے لئے ہے۔ لیکن بائع (قیمت وغیرہ کا) مطالبہ صرف خریدار سے کرے گا۔

شرکت کا فساد اور اس کے آثار

شرکت کے مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو شرکت فاسد ہوگی، اعمالِ شرکت کی ابتداء سے قبل ہی فساد کا علم ہو جائے تو اس پر عقد کا کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، اگر شرکت باقی رکھنا ہے تو از سرِ نو صحیح طریقے سے اس کی تجدید کرے۔

اعمالِ شرکت کی ابتداء کے بعد خلل اور فساد کا پتہ چلے تو شرکت کو وہیں روک دے، آگے جاری نہ رکھے، آگے جاری رکھنا ہو تو صحیح طریقے سے اس کی تجدید کرے، گذشتہ فساد کی وجہ سے درج ذیل آثار مرتب ہوں گے:

۱- جو نفع ظاہر ہو چکا ہو، ہر شریک کو اس کے مال کے تناسب سے تقسیم کر کے دیا جائے۔

۲- ہر شریک دوسرے شرکاء سے ان کے اموال میں محنت کے عوض اجرت لیگا، کیونکہ یہ واضح ہو گیا کہ وہ ان کا اجیر تھا، نہ کہ شریک۔

۳- شرکاء کے تصرفات معتبر اور نافذ ہوں گے، کیونکہ ہر ایک نے دیگر شرکاء کی اجازت سے تصرف کیا ہے۔

صحیح شرکت کی انتہاء اور اختتام

درج ذیل امور سے عقدِ شرکت ختم ہو جائے گی:

۱- **تمام شرکاء یا بعض کی طرف سے** عقدِ شرکت کو فسخ کرنا، کیونکہ یہ ایک جائز عقد ہے، یعنی ہر شریک جب چاہے فسخ کر سکتا ہے، اور فسخ کرنا اسکا اختتام ہے، اگر دو شریک ہوں اور کسی ایک نے فسخ کر دیا تو شرکت ختم ہو گئی، اگر زائد شرکاء ہوں اور ان میں سے ایک نے فسخ کر دیا تو دیگر شرکاء کی شرکت باقی رہے گی، فسخ نہ ہوگی۔

۲-موت، اگر شرکاء کی موت واقع ہو تو شرکت ختم ہو گی، وارثوں کی طرف منتقل نہ ہو گی، اگر دو شریک میں سے ایک مر جائے تو شرکت ختم ہو گی، زائد شرکاء میں ایک مر جائے تو اس کی شرکت ختم ہو گئی، بقیہ شرکاء کی شرکت باقی رہے گی۔

فسخ اور اختتام وفات کے وقت سے ہو گی، چاہے شرکاء کو اس کا علم نہ ہو۔

۳-**جنون اور بے ھوشی**: کوئی شریک پاگل یا بیہوش ہو جائے تو اس کی شرکت فسخ اور ختم ہو جائے گی، لیکن بے ہوشی سے شرکت اس وقت ختم ہو گی جبکہ ایک فرض نماز کا وقت مکمل اسی حالت میں گذرے، ورنہ حرج نہ ہو گا۔

جنون کی صورت میں حکم ولی کی طرف منتقل ہو گا، اب چاہے تو مال کی تقسیم کا مطالبہ کرے، یا نئے سرے سے عقدِ شرکت کرے۔

بے ہوشی کے عنقریب ختم ہونے کا احتمال ہو تو حکم ولی کی طرف منتقل نہ ہو گا، اگر اُسے افاقہ ہو تو، تقسیم کو اختیار کرے، یا پھر جدید عقدِ شرکت کرے، گرچہ سابق کو برقرار رکھنے کے الفاظ سے ہو، اگر عنقریب بے ہوشی سے افاقہ کی امید نہ ہو، یا بے ہوشی تین دن یا زائد طاری رہے، تو جنون کی طرح حکم ولی کی طرف منتقل ہو گا۔ اب وہ تقسیم کو اختیار کرے یا از سرِ نو شرکت کو۔

مُتفرّقات

۱-کوئی شخص انتقال کر جائے اور اولاد اس کے ترکہ میں (بلا تقسیم) خرید و فروخت، کاشتکاری، حج، شادی بیاہ، وغیرہ تصرف کرتے رہے، پھر بعد میں وراثت کی تقسیم کا مطالبہ ہو، تو اس صورت میں جس نے حج یا شادی بیاہ نہیں کی وہ حج یا شادی میں خرچ کرنے والے سے اپنا حصہ واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر اجازت تھی اور اس کی اجازت معتبر بھی ہو، یعنی عاقل، بالغ اور رشید ہو تو واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اسی طرح بظاہر رضامندی کا قرینہ موجود ہو، تب بھی واپس نہیں لے سکتا۔ اگر اجازت بھی نہ ہو اور رضامندی کا قرینہ بھی نہ ہو، یا ایسے آدمی نے اجازت دی جس کی اجازت کا اعتبار نہیں، تو خرچ کرنے والے سے اپنے حصے کی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے (حاشیۃ الشروانی علی تحفۃ المحتاج ۷/۲۰)

۲-امام نووی اور ابن الصلاح نے فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص سونا، چاندی یا گیہوں (وغیرہ) غصب کر کے اپنے مال میں ملا لے اور وہ الگ سمجھ میں نہ آئے، تو مغصوبہ مقدار کو الگ کر کے بقیہ میں تصرف کرنا حلال ہے۔ (تحفۃ المحتاج ۷/۲۳)

۳-زمین کا مالک، بیج کا مالک، ہل کا مالک اور عامل (محنت کرنے والا) چاروں شرکت کریں کہ اناج چاروں میں تقسیم ہو گا، تو یہ شرکت صحیح نہیں، اور نہ یہ اِجارہ اور قرض شمار ہو گا، بلکہ کھیتی مکمل بیج کے مالک کی ہو گی، اگر پیداوار حاصل ہو تو اس پر دیگر لوگوں کو اجرت مثل دینا لازم ہے، ورنہ کچھ لازم نہیں (الشروانی علی التحفۃ۔ ۷/۲۳)

وَکالَت

عربی میں لفظ 'وکالت' حفاظت اور سپرد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

فقهی تعریف: کوئی شخص جو کام خود کر سکتا ہو، اور اس میں نیابت کی گنجائش ہو، صیغہ کے ساتھ کسی دوسرے کے سپرد کرے، تاکہ وہ اس کی زندگی میں اسے انجام دے، وکالت کہلاتا ہے۔

مشروعیت: قرآن وحدیث کی روشنی میں وکالت کی مشروعیت پر اجماع ہے۔

آیت: ”وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِنْ اَهْلِهَا“(سورہ نساء ۳۵) **ترجمہ:**”اور اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو۔“ اور یہ دونوں آدمی میاں بیوی کی طرف سے وکیل ہوں گے، جو درپیش مسئلہ میں غور و فکر کریں گے، یہ آیت گرچہ زوجین کے متعلق خاص ہے، لیکن وکالت کی مشروعیت کے تعلق سے عام ہے۔

نیز اصحاب کہف کا ایک شخص کو سکہ دے کر سب کے لئے کھانا لانے کے لئے روانہ کرنا بھی توکیل (وکیل بنانا) ہے۔ (دیکھئے سورۂ کہف آیت ۱۹) اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی قمیص بھائیوں کے سپرد کرنا تاکہ والد محترم کے چہرے پر ڈال دیں اور بینائی لوٹ آئے۔ اس میں انہیں قمیص لے جانے اور والد کے چہرے پر ڈالنے کے لئے وکیل بنایا جارہا ہے۔ (دیکھئے سورہ یوسف آیت ۹۳) ان دونوں واقعات سے بھی وکالت کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔ لیکن یہ براہ راست دلیل نہ ہوگی۔ کیونکہ سابقہ شریعت کئی علماء کے نزدیک ہمارے لئے شریعت نہیں ہے۔

احادیث: ۱) سیرت کی کتابوں میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابو سفیان رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے حق میں قبول کرنے کے لئے حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ کو وکیل بنایا“

۲) حضرت رافع رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ”آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے حلال حالت میں (بغیر احرام کے) نکاح کیا، اور حلال حالت میں ہی دخول ہوا، اور میں ان دونوں کے درمیان سفیر تھا“ (ترمذی)

۳) آپ ﷺ نے حضرت عروۃ البارقی رضی اللہ عنہ کے سپرد ایک دینار کیا تاکہ آپ ﷺ کے لئے ایک بکری خریدیں“ .... (بخاری۔ترمذی)

حکمت: اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کی صلاحیت و قوت اور تونگری میں تفاوت رکھا ہے، اور ان کے لئے رزق کے مختلف اسباب فراہم فرمائے ہیں۔

بعض حضرات اپنے تمام امور بذات خود انجام دینے کی قدرت و صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن مشاغل و ذمہ داریوں کی کثرت دوسروں سے تعاون پر مجبور کرتی ہے، بعضوں کو اپنی ضرورت کے بعض اعمال انجام دینے کی خود قدرت و صلاحیت نہیں ہوتی، بعض متعلقہ ذمہ داری اور اعمال کے متعلق کماینبغی واقفیت اور تجربہ نہیں رکھتے۔ کوئی بے چارہ صاحب حق ہوتا ہے، لیکن دلیل و زبان اور فصاحت و بیان اور قوت گویائی میں کمی کی وجہ سے اپنے حق کے اظہار اور اپنے دفاع پر قادر نہیں ہوتا، اس کے برعکس اس کا مدمقابل اپنی چرب زبانی کی وجہ سے اس کا حق لے ڈوبے گا۔ ان متعدد اسباب کی وجہ سے لوگوں کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اپنے بعض امور میں دوسروں پر اعتماد کریں، اور ان کے تجربات اور لیاقت و استعداد سے استفادہ کریں، لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وکالت کو مشروع قرار دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کے حوائج کی تکمیل اور معاملات کی انجام دہی میں سہولت و تیسیر حاصل ہو، اور حرج و مشقت کا ازالہ و دفعیہ ہو۔

حکم: عام حالات میں وکالت جائز و مشروع اور مباح ہے، اگر کسی مستحب کام کی اعانت میں ہو تو مستحب ہے، مکروہ کی اعانت میں مکروہ اور کسی حرام کے تعاون میں ہو تو حرام ہے۔ کبھی حالات کے تحت واجب بھی ہو سکتی ہے، مثلاً کوئی مضطر ہو، اور خود کھانا خریدنے سے عاجز ہو، اور کسی کو وکیل بنائے تو یہ وکالت قبول کرنا واجب ہے، (ورنہ وہ بھوک سے مر جائے گا، اور اسے بچانا واجب ہے)

وکالت کے ارکان

(۱)مُوکِّل (۲)وَکِیل (۳)صیغه (۴)مُوکَّل فیه

۱)**مُوکِّل**: یعنی وہ شخص جو بطور نیابت اپنے بعض امور کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے سے تعاون لے۔ جس تصرف میں وکیل بنارہاہے، خود موکل کا ملکیت یا ولایت کی وجہ سے اس کا انجام دینا صحیح ہونا شرط ہے۔ یعنی وکیل کو جس تصرف کا اختیار دے رہاہے۔ شرعاًخود اسے اس تصرف کا حق حاصل ہو، شریعت اس کے تصرف کو صحیح تسلیم کرے اور اس پر آثار واحکام کا ترتب ہو۔

دوسرے کو جس تصرف کا نائب بنارہاہے خود ہی شرعاً اسے انجام نہیں دے سکتا، تو اس کی نیابت وتوکیل صحیح نہیں، کیونکہ موکل تو اصل ہے۔ جب اصل ہی تصرف پر قادر نہ ہو تو نائب کہاں سے ہوگا۔

لہٰذا کسی مال کے مالک کو اس میں تصرف کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔ جبکہ وہ عاقل بالغ اور نافذ التصرف ہو (یعنی شرعاً اس کا تصرف نافذ ہو) اس پر تصرفات کی پابندی عائد نہ ہو۔

اسی طرح کسی کے مال کے ولی کے لئے، جیسے باپ، داد، اور وصی، اپنے ماتحت کے مال میں تصرف کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔ کیونکہ ولی خود ولایت کی وجہ سے تصرف کر سکتاہے۔

ایک عاقل بالغ شخص اپنے نکاح کے لئے کسی کو وکیل بناسکتا ہے، کیونکہ وہ خود اپنا نکاح کر سکتا ہے اور کسی باکرہ لڑکی کے عادل ولی کو اس لڑکی کے نکاح کیلئے دوسرے کو وکیل بنانا جائز ہے۔ کیونکہ وہ خود اس کا نکاح کرا سکتاہے۔

لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں کسی بچہ، پاگل یا بے ہوش کا کسی کو وکیل بنانا صحیح نہیں۔ کیونکہ شرعاً یہ بذات خود کوئی تصرف نہیں کر سکتے۔

مال کے بے جا تصرف کی وجہ سے جس پر مالی تصرفات کی پابندی عائد ہو، وہ کسی مالی تصرف میں دوسرے کو وکیل نہیں بناسکتا۔ ایک فاسق باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے لئے دوسرے کو وکیل نہیں بناسکتا، کیونکہ وہ خود (فاسق ہونے کی وجہ سے) بیٹی کا نکاح نہیں کرا سکتا۔

عورت چونکہ بذات خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی، لہٰذا کسی کو اپنے نکاح کا وکیل بھی نہیں بناسکتی۔ حج یا عمرہ کے احرام میں کوئی اپنا نکاح نہیں کر سکتا، اسی طرح کسی کو احرام کی حالت میں عقد نکاح کے لئے وکیل نہیں بناسکتا۔ اگر احرام کے بعد نکاح کے لئے وکیل بنائے تو صحیح ہے۔

اس اصول سے نابینا خارج ہے، وہ خرید وفروخت وغیرہ امور جو دیکھنے پر موقوف ہیں، بذات خود انجام نہیں دے سکتا، لیکن کسی دوسرے کو ان امور میں مجبوری کی وجہ سے وکیل بناسکتاہے۔ اگر اسے توکیل کی بھی اجازت نہ ہو تو شدید مصیبت ومشقت کا شکار ہوگا۔

۲)**وکیل**: یعنی جو دوسرے کی جانب سے بطور نیابت اس کی اجازت وتوکیل سے تصرف کرے۔

وکیل میں یہ شرط ہے کہ متعلقہ تصرف اور ذمہ داری کا بذات خود اپنے لئے انجام دینا صحیح ہو، اگر خود اپنے لئے وہ تصرف نہیں کر سکتا، تو اس میں کسی دوسرے کا وکیل بھی نہیں بن سکتا، کیونکہ ایک انسان کا اپنی ذات کے لئے تصرف دوسروں کے لئے تصرف کے مقابلہ میں قوی ہوتاہے۔ کیونکہ اپنے لئے اصالۃً اور دوسرے کے لئے نیابۃً انجام دیتاہے۔ اور اصالت نیابت سے قوی تر ہوتاہے۔ لہٰذا جب قوی تر کی بنیاد پر تصرف صحیح نہ ہو تو ضعیف میں بدرجہ اولیٰ صحیح نہ ہوگا۔

اسی لئے بچے، پاگل اور بے ہوش کو وکیل بنانا صحیح نہیں۔ ایک باشعور بچے کو نفل حج، قربانی کے جانور کو ذبح کرنا، اور زکات کی تقسیم

کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے، کیونکہ خود اپنے حق میں وہ ان تصرفات کو انجام دے سکتا ہے۔ سفیہ مالی تصرفات میں وکیل نہیں بن سکتا۔ اور ایک نابینا ایسے تصرف میں وکیل نہیں بن سکتا جس کی صحت مشاہدہ پر موقوف ہو۔ جو شخص حج یا عمرہ کے احرام میں ہو، اسے نکاح کے لئے وکیل نہیں بنا سکتے، جیسا کہ ایک عورت کو نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ خود اپنا نکاح نہیں کر سکتے۔

البتہ ایک باشعور اور اطمینان بخش بچہ گھر میں داخلہ کی اجازت، اور کسی کو ہدیہ پہنچانے وغیرہ میں وکیل بن سکتا ہے۔ کیونکہ اسلاف نے ایسے امور میں چشم پوشی سے کام لیا ہے، لہٰذا ان امور میں بچے کی بات پر اعتماد کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی کی دعوت ولیمہ کی خبر میں بھی اس پر اعتبار کریں گے۔ نیز ایک فاسق اور غیر مسلم بھی ان امور میں بچے کی طرح ہے، بقول امام نوویؒ ان دونوں پر اعتماد میں کوئی اختلاف نہیں۔

وکیل معین ہونا بھی شرط ہے۔ اگر دو آدمیوں سے کہے: تم میں سے ایک کو اپنا گھر فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، یا جو بھی میرا گھر فروخت کرنا چاہے، میں نے اسے فروخت کے لئے وکیل بنایا تو صحیح نہیں۔

اگر قاضی یا ولی کی جانب سے ان کے ماتحتوں کے مال کے فروخت کے لئے وکیل بنایا جائے تو اس کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔

۳) **صیغہ**: ایجاب و قبول کے درج ذیل شرائط ہیں۔

۱) موکل کی جانب سے صراحتاً یا کنایتاً ایسا لفظ پایا جائے جو توکیل سے اس کی رضامندی پر دلالت کرے، کیونکہ ایک مکلف کو دوسرے کی اجازت کے بغیر اس کے حق میں تصرف ممنوع ہے۔

صریح: مثلاً میں نے تم کو اپنا مکان فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، میں نے مکان کا فروخت کرنا تمہارے سپرد کر دیا۔

کنایتہ: مثلاً میں نے اس کے فروخت میں تم کو اپنا قائم مقام بنایا، یا نائب بنایا

وکالت میں تحریر اور خط بھی گفتگو والفاظ کے قائم مقام ہیں۔

وکیل کی جانب سے قبول پایا جانا کافی ہے، باقاعدہ لفظ شرط نہیں، بلکہ فعل بھی کافی ہے۔

۲- کسی شرط پر معلق نہ ہو، مثلاً یوں کہا: اگر زید سفر سے آگیا تو تم فلاں کام میں میرے وکیل، یا اگر ماہ رمضان آجائے تو تم کو فلاں میں وکیل بنایا۔

اگر اس صورت میں شرط کے مطابق وکیل تصرف کرے، تو اس کا تصرف صحیح ہوگا، کیونکہ تصرف کی اجازت تھی۔

اگر وکالت فوراً ہو، لیکن تصرف کو معلق کرے، تو صحیح ہے مثلاً یوں کہا: میں نے تمہیں وکیل برائے فروخت مکان بنایا، بشرطیکہ فلاں کی آمد کے بعد اسے فروخت کرو، یا فلاں ماہ میں فروخت کرو۔

اسی طرح وکالت کو محدود کرنے میں حرج نہیں۔ مثلاً تم ایک ماہ کے لئے میرے وکیل ہو، تو یہ وکالت صحیح ہے۔ اور ماہ ختم ہوتے ہی وکالت بھی ختم ہوگی۔ اس کے بعد وکیل کو تصرف کا حق نہ ہوگا۔

۴) **موکل فیہ**: یعنی وہ عمل اور تصرف جو وکیل موکل کی جانب سے انجام دے، اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱) بوقت توکیل اس میں موکل کو تصرف کا حق ثابت ہو، جیسے کسی ایسی چیز کے فروخت کے لئے وکیل بنانا جس کا بوقت توکیل مالک ہے۔ یا اپنے زیر ولایت بچے کا گھر کرایہ پر دینے کے لئے وکیل بنانا، جس کا بچہ بوقتِ عقد مالک ہے۔ لہٰذا جس کا مالک نہیں، یا آئندہ مالک بننے والا ہے۔ اس میں تصرف کے لئے وکیل نہیں بنا سکتا۔ مثلاً اپنے دوست کا مکان فروخت کرنے کے لئے وکیل بنانا، جس کا یہ مالک نہیں ہے۔ یا زید کا وہ مکان فروخت کرنے کیلئے وکیل بنائے، جو آئندہ یہ اس سے خریدنے والا ہے، یا فلاں عورت کو طلاق دینے وکیل بنائے۔

جس سے آئندہ نکاح کرنے والا ہے، تو ان تمام صورتوں میں وکالت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بوقت توکیل وہ خود ان امور کو انجام نہیں دے سکتا، تو کسی دوسرے کو وکیل کیسے بنا سکتا ہے؟

اگر فی الحال مملوکہ چیز کے تابع آئندہ ملکیت میں آنے والی چیز میں تصرف کے لئے وکیل بنائے، تو یہ وکالت صحیح ہے۔ مثلاً اپنے درختوں پر آئندہ آنے والے پھل کے فروخت کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے۔ کیونکہ اصل یعنی درختوں کا مالک ہے۔ یا فی الحال موجود کپڑوں کے فروخت کے لئے اور آئندہ خریدے جانے والے کپڑوں کے فروخت کے لئے وکیل بنائے۔ تو فی الحال غیر موجود کپڑوں میں بھی تبعاً توکیل صحیح ہے۔ اگر اپنی کوئی چیز فروخت کرکے اس کی قیمت سے دوسری چیز خریدنے کے لئے وکیل بنائے تو صحیح ہے۔

۲) موکل فیہ فی الجملہ معلوم ہو، ہر اعتبار سے معلوم ہونا شرط نہیں، کہ یہ دشوار ہے۔ نیز وکالت کی مشروعیت حاجت کی وجہ سے ہے۔ جس کا تقاضہ یہ ہے کہ کچھ تسامح ودرگذر سے کام لیا جائے۔

اگر کہے: میں نے تمہیں اپنا مال فروخت کرنے، اور قرض وصول کرنے، اور میرے ودیعتوں کو واپس لینے کے لئے وکیل بنایا، تو یہ صحیح ہے، خواہ اموال، قرض اور مقروض، ودیعت اور اصحاب ودیعت نامعلوم ہوں، کیونکہ اس میں ضرر کم ہے۔ اور موکل فیہ کسی درج میں معلوم ہو چکا۔

اگر کہے: میرے چھوٹے بڑے سارے امور میں تم کو وکیل بنایا، یا ہر چیز تمہارے سپرد کردی، یا تم میرے وکیل ہو بس جیسا چاہو تصرف کرو، تو توکیل صحیح نہیں، کثرت ضرر اور بالکل ہی جہالت کی وجہ سے۔

لہٰذا دور حاضر کا وکالت عامہ صحیح نہیں، جس کے نقصانات واضح ہیں کہ بعض مرتبہ وکیل ایسے اشیاء میں تصرف کرتا ہے، جو موکل کو پسند نہیں ہوتے۔

اسی طرح اپنا بعض مال فروخت کرنے وکیل بنائے، لیکن اس بعض کی تعیین نہ کرے تو کثرت جہالت اور کافی دھوکہ وغرر کی وجہ سے صحیح نہیں۔

۳) موکل فیہ نیابت کے قابل ہو، توجو کام نیابت کو قبول نہ کرے، اس میں توکیل صحیح نہیں۔ اسی لئے خالص بدنی عبادات مثلاً روزہ ونماز وغیرہ میں وکالت صحیح نہیں، کیونکہ ان کی تشریع کا مقصد وحکمت نفس کے مجاہدہ کے ذریعہ امتحان وآزمائش ہے۔ جو دوسرے کے انجام دینے سے حاصل نہ ہوگا۔

جن عبادات کی ادائیگی کے لئے جسمانی قدرت شرط ہو، نہ کہ وجوب کے لئے، اس میں بذاتِ خود انجام دہی سے عاجز ہو، تو توکیل صحیح ہے۔ جیسے حج وعمرہ

اسی طرح مالی عبادات کی تکمیل اور اس پر اعانت کے قبیل سے جو امور ہوں، ان میں توکیل صحیح ہے، جیسے مستحقین پر زکات کی تقسیم، نذر یا کفارہ کے مال کی تقسیم، قربانی کے جانور ذبح کرنا، ولیمہ کی بکری ذبح کرنا وغیرہ۔

کن امور میں وکالت صحیح ھے، اور کن میں نھیں، اس کی تفصیل: وکالت یا تو حقوق اللہ میں ہوگی یا حقوق العباد میں۔

حقوق اللّٰہ میں وکالت: حق اللہ یعنی جو احکام مصلحت عامہ کے پیش نظر مشروع ہوں، نہ کہ کسی معین فرد کے مصلحت کے لئے، پس یہ ایسا عام نظام ہے جس سے ہر کسی کا حق متعلق ہو، اسی لئے تمام انسانیت کے رب کی طرف منسوب ہوا۔ اور اسے حق اللہ کہا گیا

کیونکہ وہی تنہا اس کے مستحق ہیں، کوئی انسان اسے ساقط نہیں کر سکتا۔ خالص عبادات اس میں داخل ہیں۔ اور ہم جان چکے کہ اس میں توکیل صحیح نہیں۔ اسی میں کامل عقوبتیں یعنی حدود داخل ہیں۔ اس میں وکالت یا تو اثبات کے لئے ہوگی یا نفاذ کے لئے۔

اگر حدود کے اثبات (ثابت کرنے) کے لئے وکالت ہو تو صحیح نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد درگذر پر ہے۔ یعنی شارع نے اس کے درگذر اور اسقاط کو ترجیح دی ہے، لہٰذا معمولی شبہ کی وجہ سے بھی ساقط ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کے اثبات کے لئے توکیل اس بات کے منافی ہے، کیونکہ اس سے اس کا نفاذ واجب ہو گا۔

اور اگر حدود کے نفاذ اور جاری کرنے کے لئے وکیل بنائے تو یہ جائز اور صحیح ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے زنا کے ثبوت کے بعد رجم کے لئے اور شراب کے ثبوت کے بعد کوڑے برسانے کے لئے وکیل بنایا۔ (دیکھئے بخاری شریف، الوکالۃ، باب: الوکالۃ فی الحدود)

حقوق العباد (بندوں کے حقوق) میں وکالت: انفرادی حیثیت سے بندوں سے متعلقہ حقوق کو حقوق العباد کہا جائے گا، جیسے خرید و فروخت، شادی بیاہ، طلاق، شرکت اور صلح وغیرہ، ان حقوق میں باتفاق علماء وکالت صحیح ہے۔ اسی میں اپنے حق کے اثبات کے لئے جھگڑنا اور دلیل پیش کرنا داخل ہے، اور اس میں بھی وکالت جائز ہے، دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عقیل کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس وکیل بنایا اور فرمایا: "یہ جو کچھ اپنے حق میں فیصلہ کریں وہ میرے حق میں ہو گا۔ اور جو کچھ اپنے خلاف فیصلہ کریں۔ وہ میرے خلاف ہو گا۔" اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روبرو حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کو وکیل بنایا اور کہا: "خصومت انسان کو مکروہات پر برانگیختہ کرتا ہے، اور شیطان وہاں حاضر ہوتا ہے۔ اور مجھے وہاں حاضر ہونا ناپسند ہے۔" (البیہقی: باب: التوکل فی الخصومات)

قصاص میں وکالت: قصاص کے اثبات اور نفاذ کے لئے وکالت صحیح ہے، کیونکہ اس میں حق العبد (بندہ کے حق) کا پہلو غالب ہے، یعنی مقتول کے اولیاء کا حق غالب ہے، اسی لئے وہ اسے ساقط اور معاف کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بجائے دیت وصول کر سکتے ہیں۔

گواهی، قسم اور نذر میں وکالت: شہادت (گواہی) میں وکالت صحیح نہیں۔ مثلاً یوں کہنا: "میں نے تمہیں وکیل بنایا کہ تم میری جانب سے یوں گواہی دو۔" کیونکہ شہادت کا تعلق شاہد (گواہ) کے علم سے ہے۔ اس لئے کہ شہادت دیکھی یا سنی بات کی خبر دینا ہے، جو وکیل کو حاصل نہیں، لہٰذا شہادت کا تعلق براہ راست شاہد سے ہو گا، یہ توکیل کو قبول نہ کرے گا، اگر اس میں وکیل بنائے تو وکیل شہادت پر شاہد ہو گا۔

اسی طرح قسم اور نذر میں وکالت صحیح نہیں، مثلاً یوں کہنا: میں نے تمہیں میری جانب سے قسم لینے کے لئے یا نذر ماننے کے لئے وکیل بنایا، کیونکہ اس میں اللہ کی تعظیم ہے، لہٰذا یہ خالص عبادت کے مشابہ ہوا، تو اس کا تعلق براہ راست قسم لینے اور نذر ماننے والے سے ہوا۔

ایلاء۔ لعان، قَسَامَة اور ظهار میں وکالت: ان امور میں بھی وکالت صحیح نہیں، کیونکہ یہ (سب مختلف قسم کے) قسم ہیں۔

اقرار میں وکالت: مثلاً یوں کہنا: میں نے تمہیں وکیل بنایا کہ تم میری جانب سے اس بات کا اقرار کرو کہ فلاں کے میرے ذمہ ہزار روپئے ہیں، اس طرح اقرار میں توکیل صحیح نہیں، اور اگر یہ اقرار کرے تو موکل پر وہ رقم لازم نہ ہو گی، کیونکہ اقرار گواہی کی طرح

اثبات حق کی خبر دینا ہے، لہٰذا توکیل کو قبول نہ کرے گا۔

مباحات (مثلاً شکار، جنگل کی لکڑیاں وغیرہ) کا مالک بننے میں وکالت: اگر کسی کو اپنی جانب سے شکار کرنے، یا لکڑی وایندھن چننے کے لئے وکیل بنائے، تو صحیح ہے، اور وکیل موکل کی نیت سے جو شکار اور لکڑیاں جمع کرے، موکل اس کا مالک ہو گا۔

کسی حرام کام میں وکالت: کسی چیز کی چوری یا غصب کے لئے، یا کسی گناہ وظلم کے لئے وکیل بنانا صحیح نہیں، اگر وکیل نے ان میں سے کوئی کام انجام دیا، تو وہی اس کا ضامن وذمہ دار اور گنہگار ہو گا، کیونکہ حرام امور کا حکم ارتکاب کرنے والے کے ساتھ خاص ہے، نیز شارع کا مقصد اس کی تحریم سے ہر کسی کو اس سے روکنا ہے۔

وکیل کے تصرفات کے حدود

۱) **خصومت (جھگڑے ونزاع) میں وکالت:** یعنی عدالت میں دعویٰ دائر کرنے اور انصاف وفیصلہ کے مطالبہ کے لئے توکیل، (جیسا کہ عموماً کیس میں ہوتا ہے) یہ وکیل اپنے موکل کے حق کے اثبات یا مدمقابل کے دعویٰ کی تردید ودفاع سے متعلق تمام تصرفات کا مالک ہے، البتہ اسے اپنے موکل کی جانب سے اقرار کا حق حاصل نہیں۔

کسی مالی معاملہ میں وکیل اپنے موکل کا حق ثابت کرے اور اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو اسے اس حق پر قبضہ کا اختیار نہ ہو گا، کیونکہ حق کے اثبات میں توکیل سے قبضہ کی اجازت نہ ہو گی، نہ تو لفظاً اور نہ عرفاً، کیونکہ جھگڑے اور حق کو ثابت کرنے میں کسی کی توکیل سے رضامندی سے یہ لازم نہیں کہ وہ قبضہ کے مناسب امانت دار اور اطمینان بخش بھی ہو، اور اس کے قبضہ سے راضی ہو۔

۲) **قبضہ کے لئے توکیل:** اگر ایک شخص دوسرے کو وکیل بنائے تاکہ وہ فلاں کے پاس اس کا جو حق ہے، اس پر قبضہ کرے، اور وہ فلاں موکل کے اس حق کا انکار کرے، تو ایک قول یہ ہے کہ وکیل اس حق کے اثبات کے لئے لڑ سکتا ہے، لیکن راجح قول یہ ہے کہ محض قبضہ کی توکیل میں اس طرح اثبات کے لئے خصومت کی گنجائش نہیں۔

۳) **خرید وفروخت کے لئے وکیل:** (الف) فروخت کرنے کے لئے وکالت۔ یہ وکالت یا تو مطلق ہو گی یا مقید۔

مطلق وکالت: یعنی بغیر کسی قید کے کسی چیز کے فروخت کرنے کے لئے وکیل بنانا، اس صورت میں وکیل درج ذیل امور کا پابند ہو گا۔

۱) شہر میں عام طور پر رائج سکوں کے عوض ہی فروخت کرے، مثلاً روپئے رائج ہوں تو ریال وغیرہ سے فروخت نہ کرے۔

۲) ادھار فروخت نہ کرے، خواہ اس میں قیمت زیادہ ملے، کیونکہ مطلق توکیل ہے۔ تو نقد فروخت کرنا چاہئے، اس لئے کہ غالباً یہی معتاد ہے۔

اگر ادھار فروخت کرنے وکیل بنائے اور مدت متعین کی ہو، تو اس مدت تک ادھار فروخت کر سکتا ہے، اس سے زائد نہیں، اگر اس سے کم مدت کے لئے یا نقد فروخت کرے تو صحیح ہے، لیکن نقد فروخت کرنے میں موکل کا نقصان ہو، مثلاً قیمت کی کمی یا قیمت پر خطرہ وغیرہ تو صحیح نہیں، اگر موکل کی جانب سے مدت متعین نہ ہو، تو اس جیسی چیز میں عرفاً جو مدت ہوتی ہے، اس پر محمول کریں گے۔ اور کوئی عرف نہ ہو تو موکل کے لئے زیادہ نفع بخش صورت کی رعایت کرے۔

۳) **غَبَنِ فاحش** (زیادہ نقصان) کے ساتھ فروخت نہ کرے، یعنی قیمت اتنی کم نہ ہو جس سے غالباً چشم پوشی نہ برتی جاتی ہو، اور اس کا ضابطہ یہ بیان کیا گیا کہ قیمت کا اندازہ لگانے والوں کے اندازہ سے کم ہو، مثلاً ۷ر سے ۱۰ر کے درمیان کا اندازہ لگائیں، اور اسے ۵ یا ۶ میں فروخت کرے تو یہ غبن فاحش ہے۔ (۷ر یا زائد میں فروخت کرے تو غبن فاحش نہیں)

مذکورہ تینوں قید میں سے کسی کی مخالفت کرے اور بیچے تو یہ بیع صحیح نہیں، اگر مبیع (چیز) خریدار کے سپرد کر دے، تو وکیل اس کا ضامن ہے، کیونکہ تصرف میں تعدی وزیادتی کی ہے۔ اب اگر مبیع موجود ہو تو اسے واپس لوٹا لے، ورنہ موکل وکیل یا خریدار میں سے جس سے چاہے اپنی قیمت وصول کرے آخر میں ضمان خریدار پر ہی ہوگا۔ اگر وکیل کے سپرد قیمت کر چکا تھا، تو اس سے لوٹا لے۔

مقید وکالت: یعنی کسی چیز کے فروخت کے لئے وکیل بنائے، اور اسے کسی شخص، یا جگہ، یا وقت یا قیمت کے ساتھ مقید کرے،

اگر کسی شخص کے ساتھ مقید کرے، مثلاً یوں کہا: یہ چیز زید کے ہاتھ فروخت کرو، تو اسی کو فروخت کرنا چاہئے، کیونکہ یہ تخصیص کسی خاص مقصد کے تحت ہوگی، مثلاً زید کا مال شبہ سے بالاتر ہوگا، اگر قرینہ سے یہ واضح ہو کہ اصل مقصد نفع کی تحصیل ہے، تو کسی دوسرے کو فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

اگر وقت کے ساتھ مقید کرے: مثلاً کہا: یہ چیز بروز جمعہ فروخت کرو، تو اسی دن فروخت کرے، اس سے قبل یا بعد نہیں کر سکتا، ممکن ہے اس وقت کوئی خاص بات ہو جس کی وجہ سے یہ اس وقت فروخت کو ترجیح دے رہا ہے۔

اگر کسی جگہ، مثلاً فلاں بازار کے ساتھ مقید کرے، اور اس میں کچھ صحیح مقصد ہو، مثلاً وہاں زیادہ قیمت ملتی ہے، تو دوسری جگہ فروخت کرنا جائز نہیں، تاکہ موکل کی غرض فوت نہ ہو، اور اس تعیین میں کوئی صحیح غرض نہ ہو، مثلاً وہاں اور دوسری جگہ قیمت مساوی ہو، تو راجح یہ ہے کہ وہ دوسری جگہ بھی فروخت کر سکتا ہے، کیونکہ مقصد دونوں جگہ یکساں حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے ایک جگہ فروخت کی اجازت دیگر مقامات میں بھی اجازت سمجھی جائے گی۔

اگر قیمت متعین کر دے، مثلاً ۱۰۰ر روپئے میں فروخت کرو۔ تو اس سے کم قیمت میں، گرچہ معمولی کمی کیوں نہ ہو، فروخت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے زائد قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ عرفاً اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ متعینہ قیمت سے کم میں فروخت نہ کرے، بلکہ زائد قیمت پر خریدار موجود ہو تو اسے ۱۰۰ر روپئے میں فروخت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وکیل موکل کے حق میں زیادہ نفع بخش صورت کا پابند ہے۔ بلکہ اگر خیار شرط کی مدت میں بھی کوئی زائد قیمت دے کر خریدنا چاہتا ہے تو اسے فسخ کر کے اسکے ہاتھ فروخت کرے ،اگر اس نے فسخ نہ کیا تو خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

اگر موکل صراحتاً اضافہ سے منع کر دے، مثلاً یوں کہے، ۱۰۰ر روپئے میں فروخت کرو، اس سے زائد قیمت نہ لینا، تو اب زائد قیمت پر فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ صراحت کے آگے عرف کا کوئی اعتبار نہیں۔

ایسے شخص کو فروخت کرنا جہاں سہولت اور قیمت کی کمی کی تہمت لگے: کسی چیز کے فروخت کے لئے جو وکیل ہو، وہ خود اپنی ذات کے لئے، یا اپنے نابالغ اولاد یا کسی ماتحت (زیر ولایت) کے لئے نہیں خرید سکتا، کیونکہ ایسی وکالت میں اصل عرف یہ ہے کہ دوسرے کو فروخت کرے، حتیٰ کہ موکل اجازت دے تب بھی یہ خریدنا صحیح نہیں، کیونکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے اغراض جدا ہوتے ہیں۔ خریدار کم سے کم دام کا متمنی ہوگا، اور وکیل کی ذمہ داری ہے کہ موکل کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے زائد دام پر فروخت کرے، لہٰذا دونوں ایک ہوں تو یہ غرض فوت ہوگی۔

ان کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کو فروخت کرنا جائز ہے۔ مثلاً باپ، دادا، بیوی، بھائی، بالغ اولاد وغیرہ، جبکہ ایک اجنبی کو جس قیمت پر فروخت کیا ہوتا، اسی پر انہیں فروخت کرے، اس صورت میں تہمت کا سوال نہیں، لہٰذا یہ بیع صحیح ہوگی، جیسا کہ اپنے کسی دوست کو جو رشتہ دار نہ ہو فروخت کرنا صحیح ہے۔

بیع فاسد کی توکیل: اگر کسی عقد فاسد کے ذریعہ فروخت کے لئے وکیل بنائے، تو وکیل کو یہ عقد انجام دینا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہیں دی، تو موکل کو خود اس کا اختیار نہیں۔ پھر وکیل کو کیسے سونپ سکتا ہے۔ جیسے ربوی مال اسی جنس کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا۔ (مثلاً ایک صاع گیہوں دو صاع کے عوض) یا حرام قیمت کے عوض فروخت کرنا (مثلاً آلاتِ لہو، شراب وغیرہ)

مذکورہ صورت میں وکیل کو صحیح عقد کے ذریعہ بھی فروخت کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ موکل نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

(ب) خریدنے کے لئے وکالت:

مطلق وکالت: یعنی کسی موصوف شئ کو قیمت ونوع کی تعیین کے بغیر خریدنے کے لئے وکیل بنانا، مثلاً: میں نے تمہیں ایک کار خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اس صورت میں وکیل ان امور کا پابند ہوگا۔

۱- **عیب دار چیز نہ خریدے**، اگر عیب دار چیز خریدے تو یہ تفصیل ملحوظ رہے گی:

اگر وکیل عیب سے واقف تھا: تو یہ خریدی وکیل کے حق میں ہوگی، نہ کہ موکل کے حق میں۔

اگر وکیل عیب سے ناواقف تھا: اور قیمت عیب دار چیز کے مناسب ہے، تو یہ خریدی موکل کے حق میں ہوگی، کیونکہ قیمت کے اعتبار سے اس کا کوئی نقصان نہیں، نیز وہ چاہے تو بائع کو واپس بھی کر سکتا ہے، اور وکیل کا کوئی قصور نہیں، کہ وہ تو عیب سے ناواقف تھا۔ اگر چیز عیب سمیت ادا کردہ قیمت کے مساوی نہ ہو، تب بھی اصح یہی ہے کہ خریدی موکل کے حق میں ہوگی، جیسا کہ وہ خود ناواقفیت کی وجہ سے خریدتا تو ہوتا، اس صورت میں اگر وہ چیز موکل کے مال سے خریدی گئی ہے، تو صرف موکل کو عیب کی وجہ سے رد کرنے کا اختیار ہوگا، اگر وہ راضی ہے تو وکیل کو رد کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر وکیل نے ذمہ میں خریدا ہو، تو اسے بھی رد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲- **ثمن مثل سے ہی خریدے**، یعنی اس چیز کی عام طور پر جو مناسب قیمت ہو، اس سے مہنگی نہ خریدے، اگر معمولی اضافہ ہو، جس سے عموماً چشم پوشی برتی جاتی ہے، تو حرج نہیں، اگر زیادہ تفاوت ہو تو یہ خرید موکل کے حق میں نہ ہوگی۔

مقید وکالت: موکل چیز کی نوعیت یا قیمت وغیرہ کی قید لگائے، تو وکیل کو اس کی پابندی لازم ہے۔ اگر اس نے قید کی مخالفت کی تو یہ خریدی اسی کی ہوگی نہ کہ موکل کی۔ الاّ یہ کہ مخالفت مزید خیر کا باعث ہو۔

نوع کی مثال: مجھے فلاں قسم کی ایک کار جو فلاں سن کا ماڈل ہو، خرید دیجئے، اب اس تفصیل کے مطابق خریدے تو وہ کار موکل کی ہے، ورنہ وکیل کی ہے۔

قیمت کی مثال: میرے لئے ایک لاکھ میں ایک مکان خرید کر دیجئے۔ اب اگر وکیل نے دو لاکھ میں خریدا تو یہ موکل کے لئے نہیں، بلکہ وکیل کے لئے ہے۔

مزید چیز اور بہتری کی مثال: مخصوص اوصاف کی چیز ایک لاکھ میں خریدنے کہے اور وکیل انہیں اوصاف سے متصف چیز ۸۰/ ہزار میں خریدے تو اس میں مزید خیر کا پہلو ہے۔ اس لئے موکل کے حق میں ہوگی، اسی طرح معین اوصاف کی ایک چیز متعین

قیمت سے خریدنے وکیل بنائے اور وکیل اس قیمت میں ویسی ہی دو چیزیں خریدے، تو یہ خریدی بھی موکل کے حق میں صحیح ہوگی۔ کیونکہ اس مخالفت میں موکل ہی کا نفع ہے۔ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے ایک دینار میرے سپرد کیا، تاکہ میں آپ کے لئے ایک بکری خریدوں تو میں نے دو بکریاں خریدیں۔ پھر اس میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا۔ اور ایک بکری اور ایک دینار لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تفصیل بیان کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تمہارے خرید و فروخت میں برکت عطا فرمائے۔" (بخاری، ترمذی)

وکیل کا خیار شرط لگانا۔ جو فروخت کے لئے وکیل ہو، وہ خریدار کے لئے، اور جو خریدی کے لئے وکیل ہو، وہ فروخت کنندہ کے لئے، خیار شرط کا حق نہیں دے سکتا، کیونکہ اس میں موکل کا کوئی فائدہ و مصلحت نہیں، اگر موکل اجازت دے تو جائز ہے۔

وکیل اپنے یا موکل کے لئے خیار شرط کی قید لگا سکتا ہے، کیونکہ اس میں موکل کے حق میں مصلحت اور احتیاط کا پہلو پایا جا رہا ہے۔

عقدِ وکالت کے حقوق اور اس کا حکم

حقوق عقد سے مراد وہ تصرفات ہیں، جو عقد کے غایت و مقصود کے لئے لازمی ہیں۔ مثلاً بیع میں چیز کی سپردگی اور قیمت پر قبضہ، نکاح میں مہر کا مطالبہ وغیرہ اور حکم کا مطلب عقد کی غرض و غایت اور مقصود، جیسے مبیع میں خریدار کی ملکیت کا ثبوت، عقد نکاح میں بیوی سے جنسی تعلقات کی حلت وغیرہ۔ اس وقت ان حقوق اور احکام کے مستحق کے متعلق گفتگو کرنا ہے۔

حکم عقد: عقد کا حکم موکل کے لئے ثابت ہوگا، نہ کہ وکیل کے لئے۔ کیونکہ وکیل تو صرف ایک واسطہ ہے۔ اور وہ موکل کے حوالہ اور نام سے ہی گفتگو اور عقد کرتا ہے۔ پس عقد پر اس کی ولایت موکل سے مستفاد ہے۔ تو گویا درحقیقت عاقد موکل ہی ہے۔

لہٰذا وکیل کی جانب سے جیسے ہی عقد مکمل اور صحیح ہوگا، فوراً اس کا حکم موکل کے حق میں ثابت ہوگا۔

حقوقِ عقد: عقد کے اعتبار سے ان کی دو قسمیں ہیں، کیونکہ وکیل جس عقد کے انجام دے گا، یا تو اسے اپنی جانب منسوب کرے گا یا موکل کی جانب۔

وہ عقود جنہیں وکیل اپنی جانب منسوب کرتا ہے: جیسے خرید و فروخت اجارہ وغیرہ، کیونکہ وکیل بوقت عقد کہے گا، میں نے فروخت کیا، میں نے خریدا، میں نے اجرت پر دی، یہ نہیں کہے گا کہ موکل کی جانب سے یا موکل کے لئے لہٰذا ان عقود کے احکام وکیل سے متعلق ہونگے نہ کہ موکل سے، پس عقد سے قبل چیز (مبیع) کے دیکھنے میں وکیل کا اعتبار ہوگا اور وکیل کے مجلسِ عقد سے جدائی کی صورت میں عقد لازم ہوگا۔ وہی مبیع یا قیمت کا مطالبہ کرے گا اور سامنے والے سے بدل اپنے قبضہ میں لے گا۔......وغیرہ

وہ عقود جو موکل کی جانب منسوب کرتا ہے: مثلاً نکاح، خلع، قتل کے عوض صلح وغیرہ، کیونکہ وکیل بوقت عقد کہے گا: مثلاً میں نے تمہاری بیٹی کا نکاح اپنے موکل فلاں کے حق میں قبول کیا، تمہاری فلانی بیوی کی جانب سے تمہارے ساتھ خلع کا معاملہ کرتا ہوں، وغیرہ۔

ان عقود کے احکام کا تعلق موکل سے ہوگا۔ نہ کہ وکیل سے، لہٰذا نکاح کی صورت میں مہر کا مطالبہ موکل سے ہوگا، نہ کہ وکیل سے اور خلع میں بدل خلع کا مطالبہ موکِلہ بیوی سے ہوگا، جسے خلع دیا جا رہا ہے، نہ کہ وکیل سے......

وکالت سے متعلق احکام

۱)**وکیل کی توکیل: موکل فیہ** یعنی جو کام وکیل کے سپرد کیا گیا ہے، وکیل خود اسے انجام دے سکتا ہو، اور وہ کام اس کی سطح کے افراد کے شایانِ شان بھی ہو، (خلاف شان نہ ہو، تو وکیل خود ہی اسے انجام دے گا) کسی دوسرے کو موکل کی اجازت کے بغیر وکیل نہیں بنا سکتا، کیونکہ موکل اس کے تصرف سے راضی ہے، نہ کہ کسی دوسرے کے، اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اگر متعلقہ ذمہ داری اور کام وکیل سے بذاتِ خود انجام نہ پاسکے، اس کی عدم صلاحیت کی وجہ سے، یا براہِ راست انجام دینا اسے زیبا نہ دینے کی وجہ سے، تو اس صورت میں یہ وکیل اس کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے کو وکیل بنا سکتا ہے، کیونکہ موکل کی جانب سے ایسی ذمہ داری اسے سونپنے کا اصل مقصد یہی ہوگا کہ وہ دوسرے کے ذریعے اسے کروائے۔

اگر موکل فیہ وکیل کو زیبا بھی ہو اور صلاحیت بھی ہو، لیکن کثرت کی وجہ سے تنہا انجام دینا دشوار ہو، تو اپنے بس سے زائد امور میں دوسرے کو وکیل بنا سکتا ہے، کیونکہ مجبوری کا یہی تقاضا ہے۔

جن صورتوں میں وکیل کو توکیل جائز ہے، شرط ہیکہ امانت دار کو وکیل بنائے، تاکہ موکل کی مصلحت کی رعایت ہو سکے، البتہ موکل خود کسی غیر امین کی تعیین کرے، تو اسے وکیل بنا سکتا ہے۔

اگر موکل نے کہا: تم کسی کو اپنا وکیل بناؤ تو یہ دوم وکیل اوّل وکیل کا وکیل ہے، لہٰذا اوّل دوّم کو معزول (برخاست) کر سکتا ہے، جیسا کہ اوّل کے معزول ہونے سے وہ بھی معزول ہو جائے گا۔

اور اگر موکل نے کہا: میری جانب سے کسی کو وکیل بناؤ، یا مطلق اسے توکیل کی اجازت دی (میری جانب سے یا تمہاری جانب سے کوئی قید نہ لگائی) تو دوّم وکیل موکل کا وکیل ہے، لہٰذا یہ دونوں وکیل ایک دوسرے کو وکالت سے ہٹا نہیں سکتے، اور موکل دونوں میں سے جسے بھی چاہے برخاست کر دے، نیز اوّل کے ہٹنے یا ہٹانے سے دوّم کی وکالت ختم نہ ہوگی۔

۲)**معاوضہ کے ساتھ توکیل:** وکالت کے عوض موکل وکیل کے لئے کچھ معاوضہ طے کرے، یا نہ کرے، وکالت صحیح ہے۔ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے وکیل بنایا اور عمل پر کچھ عوض نہ دیا، اسی طرح آپ ﷺ زکوٰۃ کے جمع کرنے کے لئے صحابہ کرام کو وکیل بناتے اور ان کی محنت کے عوض ان کو اجرت مرحمت فرماتے، اگر معاوضہ کے ساتھ توکیل ہو، تو معاوضہ متعین ہونا شرط ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں مختلف معاملات میں فی صد کی نسبت سے عوض مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً: کسی کیس اور قضیہ میں وکیل جو کیس لڑے، جیتنے کی صورت میں اس رقم میں سے ۲۵ فیصد وغیرہ اس کا معاوضہ مقرر کرنا، مختلف اداروں میں چندہ جمع کرنے والوں کے لئے ان کی جمع شدہ رقم سے فی صدی کے اعتبار سے عوض دینا، اسی طرح جائیداد وغیرہ فروخت کرنے والے وکلاء (دلال) کے لئے اس کی قیمت میں سے نسبت طے کرنا وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں صحیح اور شرعی طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے اتفاق سے ایک معین عوض عمل شروع کرنے سے قبل توکیل کے وقت ہی مقرر کیا جائے۔ اور متعلقہ ذمہ داری اور عمل انجام دینے کے بعد وکیل اس مقرر کردہ عوض کا مستحق ہوگا۔

۳)**وکیل کے قبضہ کی صفت:** موکل فیہ میں وکیل کا قبضہ امانت کا ہے، اسلئے تعدی کے بغیر ضامن نہ ہوگا، گرچہ توکیل بالعوض ہو، کیونکہ موکل فیہ میں تصرف کرنے میں وکیل موکل کا نائب ہے، لہٰذا اس کی حیثیت بھی اسی کی طرح ہوگی، پس مالک جس طرح تلف شدہ اشیاء کا ضامن نہ ہوگا، وہ بھی نہیں ہوگا۔

نیز وکالت وکیل کی جانب سے ایک تعاون وسہولت ہے، اور ضمان اس کے منافی ہے، پھر لوگ وکالت سے کنارہ کش رہیں گے، جو حرج کا باعث ہو گا۔

اگر وکیل تعدی اور زیادتی سے پیش آئے تو ضامن ہو گا، مثلاً برائے فروخت دی ہوئی شئی استعمال کرنا، یا اس سے ضائع اور گم ہو جائے، اور اسے پتہ نہ ہو کہ کیسے ضائع ہوا، یا کسی جگہ رکھ کر اسے بھول جائے، یا موکل کی مخالفت کرے، تو ان تمام صورتوں میں ضامن ہو گا۔

۴) **وکالت کا دعویٰ:** جس پر کسی کا حق ہو، اس کے پاس کوئی آکر یہ دعویٰ کرے کہ وہ صاحبِ حق کی طرف سے وکیل بن کر اس حق پر قبضہ کرنے کے لئے آیا ہے، اور یہ اس کی تصدیق کرے، تب بھی اس کے سپرد کرنا واجب نہیں، کیونکہ اس سے وہ بری الذمہ نہ ہو گا، اگر وکیل اپنے دعویٰ پر بیّنہ (گواہ) پیش کر دے تو دینا لازم ہے۔

وکیل کے سپرد حق کر دے، اور صاحبِ حق آنے کے بعد وکالت کی تصدیق کرے، تو یہ بری الذمہ ہو جائیگا، اور اگر وہ توکیل کا انکار کرے تو اس انکار پر قسم لے کر اس کی تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل عدمِ توکیل ہے،

اب صاحبِ حق کے قسم کے بعد اگر حق عَین (کوئی چیز) ہے، اور ابھی باقی ہے تو اسے لے لے، اگر تلف شدہ ہے تو اس کا بدل لے۔ وہ جس پر حق تھا اس سے، یا جس نے وکالت کا دعویٰ کر کے چیز اپنے قبضہ میں لیا اس سے مطالبہ کر سکتا ہے، دونوں میں سے جس سے بھی اپنا حق وصول کرے، تو وہ دوسرے سے اس کے متعلق رجوع نہیں کر سکتا، (یعنی وہ چیز یا بدل واپس نہیں لے سکتا) کیونکہ دونوں کا نظر یہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کا اس سے وصول کرنا ظلم ہے، لہٰذا اپنے ظلم کو دفع کرنے کے لئے دوسرے سے واپس نہیں لے سکتا۔

اگر حق قرض (دَین) تھا، تو مقروض سے ہی مطالبہ کرے، کیونکہ اس کے اعتبار سے وہ حق ابھی اسی کے ذمہ باقی ہے، دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوا، لہٰذا وہ وکالت کے مدعی سے مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۵) **قرض کی ادائیگی کے لئے وکالت:** اگر کسی کو قرض کی ادائیگی کے لئے وکیل بنائے تو وکیل پر لازم ہے کہ ادائیگی پر گواہ رکھے، کیونکہ موکل کی مصلحت کو پیش نظر رکھنا اس پر واجب ہے، اور یہ گواہی بھی مصلحت واحتیاط میں داخل ہے، تاکہ کل صاحبِ حق ادائیگی کا انکار کر کے دوبارہ مقروض سے قرض وصول نہ کرے۔

وکیل بغیر گواہی کے قرض ادا کرے، اور صاحبِ حق ادائیگی کا انکار کرے، تو اس کے خلاف وکیل کی بات تسلیم نہ ہو گی، اور قرض ابھی موکل کے ذمہ باقی رہیگا۔

اب اگر وکیل نے موکل کی غیر موجودگی میں یہ قرض ادا کیا تھا، تو اس مقدار کا موکل کے حق میں ضامن ہو گا، کیونکہ گواہ نہ رکھنا اُس کی غلطی ہے اور اگر موکل کی حاضری میں ادا کیا تھا تو ضامن نہ ہو گا، کیونکہ غلطی موکل کی ہے، اسے چاہیے تھا کہ ادائیگی پر گواہ رکھے، کیونکہ اس میں اسی کی مصلحت تھی۔

۶) **دو کو وکیل بنانا:** کسی تصرف کے لئے (بہ یک وقت) دو آدمی کو وکیل بنائے اور بوقتِ توکیل یہ صراحت کر دے کہ ان میں سے ہر کوئی تنہا تصرف کر سکتا ہے، تو کسی ایک کا تنہا تصرف بھی صحیح ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے دونوں کو وکیل بنائے، یا انفرادی طور پر دونوں کو وکیل بنائے (ایک ہی لفظ میں نہ بنائے) تو ہر ایک کو دوسرے کی طرف مراجعت کے بغیر تصرف کرنا جائز ہے۔

اگر ایک ہی لفظ سے دونوں کو وکیل بنائے (اور تنہا تصرف کی اجازت اور صراحت نہ ہو) اور معاملہ ایسا ہو، جس میں مالی بدل ہوتا ہو، جیسے خرید وفروخت قرض وصول کرنا، نکاح، مال کے عوض طلاق وغیرہ، تو ایک وکیل تنہا دوسرے کے بغیر تصرف نہ کرے، اگر

تصرف کرے تو یہ دوسرے کی اجازت پر موقوف ہے، کیونکہ ان تصرفات میں مزید رائے مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور موکل دونوں کی مجموعی رائے سے راضی تھا نہ کہ صرف ایک کے، اور دونوں کا اتفاق ممکن بھی ہے، اسلئے تنہا ایک کا تصرف دوسرے سے مراجعت کے بغیر نافذ نہ ہو گا، کیونکہ موکل نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اگر تصرف ایسے معاملہ سے نہ ہو، جس میں مالی بدل ہو، جیسے بلامال کے طلاق، ہبہ سپرد کرنا، قرض کی ادائیگی وغیرہ، تو ان میں سے ہر ایک انفرادی طور پر بھی تصرف کر سکتا ہے، کیونکہ ان امور میں مزید رائے وفکر کی ضرورت نہیں، لہٰذا دونوں کو مستقل اختیار حاصل ہو گا۔

اسی طرح کسی خصومت اور کیس میں دو کو وکیل بنائے تو دونوں کو مستقل اور انفرادی طور پر حق حاصل ہو گا، کیونکہ اصل مقصد قاضی کو موکل کے حق کی اطلاع دینا اور اس کے سامنے معاملہ کو رکھنا ہے، اور کبھی دونوں کا بہ یک وقت اس کے روبرو حاضر ہونا خلل کا باعث بن سکتا ہے۔

۷) موکل اور وکیل میں اختلاف:

(الف) اگر وکیل سپرد کردہ مال وغیرہ کے تلف کا دعویٰ کرے، اور موکل اسے جھٹلائے اور کہے کہ کچھ بھی تلف نہیں ہوا، تو وکیل کو مع قسم اپنے دعویٰ میں سچا سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ امین ہے اور تلف پر گواہ کا پیش کرنا مشکل ہو گا، لہٰذا وہ اس کا مکلف نہ ہو گا۔

البتہ وکیل کسی ظاہری اور غیر مخفی سبب سے تلف کا دعویٰ کرے، مثلاً آگ لگنا، سیلاب، لوٹ وغیرہ، تو اس پر گواہ پیش کرنا لازم ہے، کیونکہ ان صورتوں میں یہ دشوار نہیں، اگر گواہ نہ پیش کرے تو ضامن ہو گا۔

(ب) تعدی یا کوتاہی میں اختلاف: تلف پر دونوں متفق ہوں، لیکن تعدی اور کوتاہی میں اختلاف ہو، مثلاً موکل دعویٰ کرے کہ وکیل نے اس کے شرائط کی مخالفت کی، یا حفاظت میں کوتاہی برتی، یا وہ چیز خود استعمال کی وغیرہ ایسے امور جو وکیل کی جانب سے کوتاہی یا تعدی شمار ہوتی ہے، اور وکیل ان باتوں کا انکار کرے اور دعویٰ کرے کہ اس سے کوئی زیادتی اور کوتاہی سرزد نہیں ہوئی ، تو وکیل کی بات مع قسم معتبر ہو گی، کیونکہ موکل اس پر ضمان کا دعویٰ کر رہا ہے اور وہ انکار کر رہا ہے، اور ہمیشہ منکر کی بات مع قسم معتبر ہوتی ہے، لہٰذا وکیل قسم لے تو اس پر ضمان نہ ہو گا۔

(ج) تصرف میں اختلاف: وکیل جو چیز برائے فروخت سپرد ہوئی تھی، اس کے فروخت کا دعویٰ کرے، اور موکل فروخت کا انکار کرے، یا وکیل کا دعویٰ ہو کہ بیچنے کے بعد قیمت وصول کر لی جو تلف ہوئی اور موکل کہے کہ تم نے ابھی قیمت وصول نہیں کی ، تو یہاں بھی وکیل کی بات مع قسم معتبر ہو گی۔

(د) واپسی میں اختلاف: وکیل موکل کے تمام حقوق جو اس کے قبضہ میں تھے، موکل کو لوٹانے کا دعویٰ کرے، مثلاً برائے فروخت دی ہوئی چیز لوٹانے کا، یا فروخت کے بعد قیمت لوٹانے کا دعویٰ کرے اور موکل اس بات کا انکار کرے تو:

اگر وکالت بلا عوض ہو تو وکیل کی بات مع قسم معتبر ہو گی اور اگر بالعوض وکالت ہو تب بھی راجح قول یہی ہے کہ وکیل کی بات مع قسم قبول کی جائے گی۔

(ھ) توکیل میں اختلاف: نفس وکالت ہی میں اختلاف ہو، وکیل کہے کہ تم نے فلاں مسئلہ میں مجھے وکیل بنایا، اور یہ وکالت کا انکار کرے تو:

یہ اختلاف تصرف سے قبل ہو، تو کسی خصومت اور کیس کا سوال ہی نہیں، یعنی قاضی کے سامنے پیش بھی ہو تو وہ خارج کر دے گا کہ

اس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر اس نے وکیل بنایا بھی ہو تو اس انکار کی وجہ سے وہ معزول ہو چکا۔

اور اگر یہ اختلاف تصرف کے بعد ہو، تو موکل کی بات مع اس کے قسم کے معتبر ہو گی کیونکہ اصل عدم اجازت اور عدم توکیل ہے، نیز وکیل دعویٰ کر رہا ہے اور موکل انکار، اور بات منکر کی مع قسم معتبر ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں طرفین کو وکیل و موکل صرف مجازاً دعویٰ کے اعتبار سے کہا جارہا ہے۔

(و) **وکالت کی صفت میں اختلاف:** نفسِ وکالت پر دونوں متفق ہوں، لیکن اس کی صفت میں اختلاف ہو، مثلاً وکیل کہے آپ نے مجھے ادھار بیچنے کے لئے وکیل بنایا، اور موکل کہے نہیں، بلکہ نقداً فروخت کرنے کے لئے، یا وکیل کہے: تم نے فلاں چیز ہزار روپئے میں خریدنے کے لئے مجھے وکیل بنایا، اور موکل کہے: بلکہ، پانچ سو میں، یا وکیل کہے: تم نے مجھے کار خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اور موکل کہے: بلکہ مکان خریدنے...... وغیرہ...،

تو ان صورتوں میں موکل کی بات مع قسم تسلیم کی جائے گی، کیونکہ اس سے صادر ہونے والی اجازت اور اس کی گفتگو اور الفاظ سے وہ خود زیادہ واقف ہو گا۔

عقدِ وکالت کا اختتام

درج ذیل صورتوں میں عقد وکالت کی انتہا ہو گی۔

۱) **فسخ:** عقد وکالت طرفین کی جانب سے ایک جائز عقد ہے لہٰذا موکل یا وکیل جب چاہے اسے فسخ کر سکتے ہیں، خواہ وکالت بالعوض ہو یا بلا عوض پس موکل وکیل کو برخاست اور علیٰحدہ کر دے، تو وکالت ختم ہو گی، اور یہ علیٰحدگی ان الفاظ سے ہو گی: میں نے وکالت ختم کر دی یا تمہیں اس سے نکال دیا، علیٰحدہ کر دیا، میں نے وکیل کو تصرف سے جدا کر دیا، یا معزول کر دیا، یا کسی قاصد کے ذریعہ اسے یہ پیغام پہنچائے یا خط کے ذریعہ عزل کی اطلاع دے۔

جب موکل اسے معزول کرے گا تو وکیل فوراً معزول ہو جائے گا، اور تصرف کی اجازت ختم ہو جائے گی، چاہے وہ حاضر ہو یا غائب، اس معزولی کی اطلاع اسے موصول ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، کیونکہ معزولی عقد کو ختم کرتی ہے، لہٰذا اس میں رضامندی اور واقفیت شرط نہیں۔

معزولی کے بعد، معزولی کا علم ہونے سے قبل، وکیل تصرف کرے تو یہ تصرف باطل ہے۔

اسی طرح وکیل خود علیٰحدہ ہو جائے مثلاً کہے: میں نے اپنے آپ کو وکالت سے علیٰحدہ کر لیا، علیٰحدگی اختیار کی، یا وکالت کو لوٹا دیا وغیرہ، تو فوراً وکالت سے معزول ہو گا اور وکالت ختم ہو جائیگی، گرچہ موکل غائب ہو اور اسے اس علیٰحدگی کا علم نہ ہو۔

۲) **طرفین میں سے کسی کا تصرف کی اہلیت سے نکل جانا:** وکالت کی صحت کے لئے موکل اور وکیل میں بعض شرائط لازمی ہیں جن کا ذکر ہو چکا۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موکل یا وکیل میں مفقود ہو جائے تو وہ تصرف کی اہلیت سے نکل جائے گا اور نتیجہ میں وکالت باطل اور ختم ہو جائے گی۔ جیسے پاگل پن، بے ہوشی وغیرہ۔

اسی طرح کسی ایک کی موت سے بھی وکالت ختم ہو گی، دوسرے کو اس موت کا علم ہو یا نہ ہو۔

۳) **محل تصرف کا موکل کی ملکیت یا ولایت سے نکل جانا:** اس صورت میں بھی وکالت ختم ہو گی مثلاً: جس چیز کے فروخت کرنے کے لئے وکیل بنایا، خود ہی اسے فروخت کر دیا، یا کسی کو ہبہ کر دیا، یا اپنے ماتحت بچہ کا مال فروخت کرنے وکیل بنایا،

پھر بچہ تصرف کی صلاحیت کے ساتھ بالغ ہوا تو اس کی پابندی اور ماتحتی ختم ہو جائے گی اور موکل کی اس پر ولایت نہ رہے گی، لہٰذا اس کے مال میں اس کی جانب سے تصرف کی اجازت بھی باطل ہو جائے گی، اور نتیجتاً وکالت باطل اور ختم ہو جائے گی۔

اسی طرح وہ چیز تلف ہو جائے، مثلاً گاڑی کے فروخت کے لئے وکیل بنایا اور گاڑی چوری ہو گئی یا برائے فروخت مکان منہدم ہو گیا، یا بیٹی کے نکاح کیلئے وکیل بنایا اور بیٹی وفات پا گئی، تو ان تمام صورتوں میں چونکہ اصل محلِ تصرف ہی باقی نہ رہا، اس لئے وکالت بھی ختم ہو گئی۔

۴)**وکیل کا متعلقہ ذمہ داری اور تصرف کو انجام دینا:** وکیل اپنی ذمہ داری پوری کرے، تو وکالت ختم ہو گی، مثلاً مکان بیچنے کے لئے وکیل بنایا اور وکیل نے بیچ دیا، یا کسی چیز کے خریدنے کے لئے اور وکیل خرید چکا، یا فلاں کا فلاں سے نکاح کرنے کے لئے اور اس نے نکاح کرا دیا۔۔ تو ان صورتوں میں وکالت ختم ہو چکی، کیونکہ جو کام سپرد ہوا تھا وہ انجام دے چکا، اب کسی تصرف کا سوال نہیں۔

متفرق مسائل

۱) عورت کو کسی کے نکاح کے ایجاب یا قبول کے لئے یا کسی مطلقہ سے رجعت کے لئے وکیل نہیں بنا سکتے۔(حاشیۃ الجمل ۴۰۲/۳)

۲) جن امور میں گھر سے باہر جانے کی ضرورت پیش آتی ہو، یا شوہر کا حق فوت ہوتا ہو، ان میں شوہر کو اجازت کے بغیر بیوی وکالت قبول نہیں کر سکتی۔(حاشیۃ الجمل ۴۰۲/۳)

۳) عورت کو کسی دوسری عورت کے طلاق کے لئے وکیل بنانا صحیح ہے۔(حاشیۃ الجمل ۴۰۲/۳)

۴) کسی نے اپنے مقروض سے کہا کہ فلاں یتیم پر روز میرے قرض میں سے ۱۰/ روپئے خرچ کرو، اور وہ اس پر عمل کرے، تو صحیح ہے، اور اس طرح قرض سے بری ہو گا، (یعنی جب قرض کی مقدار اس یتیم پر صرف کرے) اگر مقروض سے کہے کہ اس قرض کی رقم سے میرے لئے اناج خرید و اور وہ اناج خرید کر قیمت ادا کرے اور اناج پر قبضہ کرے، پھر وہ اناج اس کے پاس تلف ہو جائے تو وہ قرض سے بری ہو چکا۔(فتح المعین مع اعانہ ۹۷/۳)

۵) کوئی خرید و فروخت، یا نکاح وغیرہ کے متعلق وکالت کا دعویٰ کرے اور سامنے والا اسے سچا سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کرے، پھر وہ وکیل خود اپنے آپ کو جھٹلائے اور کہے کہ مجھے اس کی اجازت نہیں تھی تو اس سے کوئی اثر نہیں ہو گا۔(اعانہ ۹۸/۳)

اکراہ (مجبور کرنا)

اکراہ: کسی کو قہراً اور زبردستی ایسے کام پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرے، اکراہ کہلاتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ ’’الامّ‘‘ میں فرماتے ہیں: (اکراہ یعنی) کسی آدمی کا ایسے شخص کے اختیار و قبضہ میں ہونا کہ اس سے اپنا بچاؤ نہ کر سکے۔

کسی نقصان اور خطرہ کی دھمکی سے اکراہ حاصل ہو گا، جیسے مارنا، قید کرنا، مال تلف کرنا وغیرہ۔ لوگوں کے احوال کے اعتبار سے

اکراہ کا اختلاف ہو گا۔

پس ایک ذی وجاہت اور بڑی شخصیت کو لوگوں کے سامنے حقیر کرنے کی دھمکی، اور مختصر قید کی دھمکی اکراہ ہے۔ جبکہ یہ دھمکی دوسروں کے حق میں اکراہ شمار نہ ہوگی۔

جو اہل مروت وہیئۃ میں سے ہو (جس کا شمار شرفاء میں ہو) اسے معمولی مار اور سزا کی دھمکی اکراہ ہے، جبکہ یہ دوسروں کے حق میں اکراہ نہیں ہے۔

اور مال برباد کرنے کی دھمکی میں سامنے والے کی مالی حیثیت کے اعتبار سے مال کی مقدار کا اعتبار ہو گا لہٰذا ایک غریب شخص کے لئے مال کی جو مقدار اکراہ شمار ہوگی، امیر کے لئے وہ اکراہ نہ ہوگی، کسی کی مالی حیثیت کے مطابق اگر دھمکی کی مقدار اس کے لئے مالی تنگی کا باعث ہے تو یہ اس کے حق میں اکراہ ہے ورنہ نہیں۔

جو اسباب کسی کے حق میں اکراہ ہو، دوسرے کے متعلق بھی وہ اکراہ ہے، جبکہ اس کا معاملہ اس کے لئے باعث اہتمام وفکر اور رنج و غم ہو جیسے اصول وفروغ (باپ دادا اور بیٹے پوتے وغیرہ)، بھائی بہن وغیرہ لہٰذا کسی بات پر ان میں سے کسی کے قتل کی دھمکی خود اس کے قتل کی دھمکی کی طرح ہے (اگر زید نے بکر کو کسی کام پر مجبور کیا اور نہ کرنے پر قتل وغیرہ کی دھمکی دے تو زید مُکرِہ اور بکر مُکْرَہ۔ (یا مُسْتَکْرَہ) کہلائے گا اور اس کام کو مُکْرَہ عَلَیہ کہیں گے۔

اکراہ کے تحقق کے شرائط: (۱) مُکرِہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے پر قادر ہو، ورنہ یہ اس کی بکواس ہوگی۔

(۲) مستکرہ کو غالب گمان ہو کہ اگر میں نے مکرہ کی بات نہ مانی تو اس دھمکی پر عمل کر بیٹھے گا۔

(۳) بھاگ کر، یا مقابلہ کر کے یا کسی دوسرے کی مدد سے مستکرہ مکرہ سے خلاصی اور چھٹکارا نہ حاصل کر سکے۔

(۴) مکرہ علیہ کام (یعنی جس کے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے) سے مستکرہ کسی حق کی وجہ سے باز آرہا ہو یعنی یا تو اپنے حق کی وجہ سے جیسے اپنا مال تلف کرنا یا کسی دوسرے کے حق کی وجہ سے جیسے دوسرے کا مال تلف کرنا یا شریعت کے حق کی وجہ سے جیسے شراب پینا، زنا کرنا وغیرہ۔

۵) مکروہ علیہ کام کے مقابلہ میں جس کی دھمکی دی جارہی ہے وہ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہو، لہٰذا کوئی مال تلف نہ کرنے کی صورت میں طمانچہ لگانے کی دھمکی دے، اور اس کے حق میں یہ طمانچہ نسبتاً کم نقصان دہ ہو تو اسے اکراہ شمار نہ کریں گے۔

اگر ہاتھ نہ کاٹے تو قتل کی دھمکی دے، تو یہ اکراہ ہے کیونکہ قتل ہونا ہاتھ کٹنے سے زیادہ پر خطر اور نقصان دہ ہے۔ لہٰذا وہ نسبتاً آسان اور خفیف کو اختیار کر سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: "جب بھی آپ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا، جس میں ایک زیادہ آسان ہو، تو آپ ﷺ آسان صورت کو ہی اختیار فرماتے تھے۔" (متفق علیہ)

(۶) مکرہ علیہ پر عمل کی صورت میں جس چیز کی دھمکی دی ہے اس سے نجات مل جائے۔

اگر کسی نے دوسرے سے کہا: خود کو قتل کر و ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا تو یہ اکراہ شمار نہ ہو گا کیونکہ خود کو قتل کر دے تو دھمکی سے (قتل سے) نجات کا سوال نہیں۔

اسی طرح کسی کو ہاتھ کاٹنے پر مجبور کرے کہ ورنہ میں تمہارا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ لہٰذا اس صورت میں مستکرہ کو مکرہ علیہ پر عمل کرنا

جائز نہیں، کیونکہ اسے حقیقتاً مکرہ (مستکرہ) نہیں کہا جائیگا۔ کیونکہ حقیقی مکرہ وہ ہے جو مکرہ علیہ پر عمل کرنے سے دھمکی سے نجات پا جائے بلکہ خود قتل کرنے یا ہاتھ کاٹنے میں تو نقصان یقینی ہے کہ وہ خود انجام دے رہا ہے۔ اگر وہ خود انجام نہ دے تو دھمکی یقینی نہیں، ممکن ہے مکرہ صرف ڈرا کر چھوڑ دے اور دھمکی پر عمل نہ کرے۔

۷) مُہَدَّدْ بِہٖ (یعنی جس نقصان اور خطرہ کی دھمکی دی ہے) فوری ہو، اگر آئندہ ہو تو یہ اکراہ نہیں، کیونکہ اس دوران کسی مدد یا پناہ وغیرہ کے ذریعہ خلاصی اور نجات کے امکانات ہیں۔

۸) مستکرہ مکرہ کے حکم کے خلاف نہ کرے، یعنی مکرہ علیہ کے بجائے کوئی دوسرا کام کرنا، یا اس میں اضافہ یا کمی کرنا، کیونکہ ان صورتوں میں وہ اپنی مرضی سے عمل کر رہا ہے، لہٰذا مکرہ شمار نہیں ہو گا۔

اگر کسی نے کسی شخص کو اپنی بیوی کے طلاق پر اکراہ کیا اور وہ اپنا مکان فروخت کر دے، یا ایک طلاق رجعی پر مجبور کیا اور اس نے تین طلاق دے دی، یا تین طلاق پر مجبور کیا اور اس نے ایک ہی دی، تو یہ تینوں صورتیں نافذ ہونگی یعنی اس کے احکام مرتب ہوں گے جیسا کہ اپنے اختیار سے کرنے پر ہوتے ہیں کیونکہ اس کا اکراہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۹) مکرہ علیہ مُعیّن ہو، یعنی ایک ہی چیز ہو، پس اگر کسی کو دو بیویوں میں سے ایک کے طلاق پر مجبور کیا جائے یا زید اور انور میں سے کسی ایک کو قتل کرنے پر مجبور کیا جائے، تو یہ اکراہ نہ ہو گا۔

۱۰) مکرہ علیہ معاملہ یا جس بات کی دھمکی دی گئی وہ مکرہ پر لازم نہ ہو۔ مثلاً مجور مفلس کو اس کے مال کے فروخت کرنے کی دھمکی دینا، یا اپنی بیوی سے ایلاء کرنے والے کو اس کی جانب سے بیوی کو طلاق دینے کی دھمکی دینا یا عمداً کسی کو قتل کرنے والے کو قصاص (بدلہ میں قتل کی سزا) کی دھمکی دینا، تو یہ اکراہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مکرَہ پر اس کا استحقاق حاصل ہے۔ (ایلاء کی تفصیل کتاب النکاح کے ضمن میں آئے گی، مذکورہ مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص چار ماہ سے زائد اپنی بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھالے اور بیوی قاضی (حاکم) سے شکایت کرے، تو قاضی چار (۴) ماہ کے بعد اسے اپنی قسم سے رجوع ہونے کا یا بیوی کو طلاق دینے کا حکم کرے گا اگر وہ دونوں کا انکار کرے تو قاضی خود اس کی جانب سے ایک طلاق دے گا۔)

۱۱) جس بات کی دھمکی دے رہا ہے وہ مُکرِہ کا حق نہ ہو، جس کے ذریعہ ایسی چیز حاصل کرنا چاہے جو اس کا حق نہیں ہے، مثلاً شوہر پر بیوی کا قرض ہو اور شوہر اسے یہ دھمکی دے کہ اگر قرض معاف نہ کرے تو اسے طلاق دے دیگا، تو یہ اکراہ نہیں، لہٰذا بیوی نے اسے معاف کر دیا تو قرض ساقط ہو جائے گا اور آئندہ اسے مطالبہ کا حق نہ ہو گا۔

بعض علماء نے اسے بھی اکراہ شمار کیا ہے، کیونکہ شوہر بیوی کا سلطان ہے، لہٰذا اس کی جانب سے اکراہ کا تحقق ہو گا، اور اس قول کی بنیاد پر طلاق کی دھمکی سے ڈر کر وہ قرض معاف کرے تو شوہر کے ذمہ سے معاف نہ ہو گا، وہ بعد میں پھر مطالبہ کر سکتی ہے۔

مختلف تصرفات اور ان میں اکراہ کے آثار

وہ تصرفات جن کے انجام دینے یا نہ دینے پر اکراہ ہو سکتا ہو، ان کی دو (۲) قسمیں ہیں۔

۱) **حسّی تصرفات:** یعنی وہ امور جو حواس سے معلوم ہوں، خواہ قولی ہوں یا فعلی، جیسے کھانا پینا، قتل کرنا، تلف کرنا، گالی گلوچ اور کفر

۲)شرعی تصرفات: یعنی جن امور کا تعلق شریعت سے ہو، کہ اس نے اس کا کوئی خاص نام رکھا ہو اور اس پر بعض متعین احکام مرتب کئے ہوں، جیسے خرید وفروخت، نکاح اور طلاق اور دیگر عقود اور فسوخ

حسی تصرفات اور ان پر اکراہ کے آثار: ان تصرفات سے دو قسم کے احکام متعلق ہیں، ایک کا تعلق قیامت اور آخرت سے ہے، یعنی اس پر گرفت ہوگی یا نہ ہوگی اور ایک کا تعلق دنیوی اعتبار سے ہے، کہ ضمان اور سزا مرتب ہوگی یا نہ ہوگی۔

مکرہ علیہ تصرفات کے اعتبار سے حسی تصرفات میں اکراہ کے آثار مختلف ہوں گے، بعض تصرفات جو حرام اور ممنوع تھے، اکراہ کی وجہ سے مباح (جائز) ہوں گے، کبھی اصل ممانعت باقی رہے گی، لیکن اس کے انجام دینے کی رخصت مل جائے گی، اور کبھی اس کی حرمت باقی رہے گی، نہ مباح ہوگی اور نہ اس کی رخصت ہوگی۔ ان تینوں انواع کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اوّل نوع: وہ حسی تصرفات جو اکراہ کی وجہ سے مباح ہو جاتے ہیں:۔

اس نوع میں مردار، خون، سوّر کا گوشت اور شراب نوش کرنا داخل ہے، نیز اس طرح کے دیگر محرمات۔ اگر کسی مسلمان کو ان میں سے کسی پر عمل پر مجبور کیا جائے تو وہ اسے مباح ہو جائے گا، کیونکہ اضطرار کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسے مباح قرار دیا ہے، اس لئے کہ ان چیزوں کی حرمت کے ذکر کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَیۡہِ“(الانعام:۱۱۹)

ترجمہ: ”مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر“ اور تحریم سے استثناء اباحت کی دلیل ہے۔

نیز ارشاد باری ہے: ”فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثۡمَ عَلَیۡہِ “(البقرہ:۱۷۳) ترجمہ: ”پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے، نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی، تو اس پر کچھ گناہ نہیں“(یعنی اس سے قبل مذکورہ اشیاء مردار خون وغیرہ حرام ہیں، لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں کھالینے کی اجازت ہے) گناہ کی نفی کرنا بھی اباحت کی دلیل ہے اور کسی عمل پر مجبور کیا جائے تو وہ بھی مضطر ہے۔ لہٰذا اس کا بھی یہی حکم ہوگا۔ اگر مکرہ اس عمل سے باز رہے، جس سے اسے تکلیف پہنچے تو اس پر مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ باز رہ کر وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، حالانکہ یہ ممنوع ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ(البقرہ:۱۹۵)

ترجمہ: ”اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں“ یہ اخروی مواخذہ کے اعتبار سے ہے۔

دنیوی احکام: اگر کسی کو شراب نوشی پر مجبور کیا جائے تو اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ حد کا ایک اہم مقصد مستقبل میں اس گناہ سے روکنا ہے، اور مکرہ کا یہ عمل گناہ شمار نہ ہوگا، بلکہ (اپنی جان کی حفاظت کی خاطر) اس پر واجب تھا، کیونکہ اس کے شراب نہ پینے پر اگر سامنے والا اپنی دھمکی پر عمل کرے تو یہ گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اکراہ کی وجہ سے شراب پی کر نشہ میں آئے تو اس حالت میں اس کے تصرفات نافذ نہ ہوں گے، کیونکہ نشہ میں تصرفات اس وقت نافذ ہوتے ہیں، جبکہ وہ شخص اس سے گنہگار ہو، یعنی اپنے اختیار سے شراب پیئے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت کے خطاء، بھول اور اکراہ کے امور کو وضع (معاف) فرمایا ہے۔“

(ابن ماجہ، وقد جاء الحدیث من طرق عند غیرہ مع اختلاف فی بعض الالفاظ)

وضع فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام اور مرتب اثرات کو ختم کر دیا ہے، لہٰذا اس حدیث کی روشنی میں دنیوی اور اخروی دونوں اثرات غیر معتبر ہیں۔

دوّم نوع: وہ حسی تصرفات جن کی اکراہ کی وجہ سے رخصت مل جاتی ہے:

الف) ایسا قول یا فعل جو بظاہر کفر ہو: مثلاً زبان سے کفریہ کلمات ادا کرنا، یا آپ ﷺ کی شان میں گستاخی، یا بت

کو سجدہ کرنا، یا کفار جس کی تعظیم کرتے ہوں بطور عبادت و تقدیس اس کی تعظیم کرنا وغیرہ۔ تو اس طرح کے اقوال و افعال کو اکراہ کی وجہ سے انجام دینے کی رخصت ملے گی، جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن و برقرار ہو۔

آیت: " مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡ بَعۡدِ إِيمَانِهِ إِلا مَنۡ أُكۡرِهَ وَقَلۡبُهُ مُطۡمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ وَلَكِنۡ مَنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِنَ اللّٰهِ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٌ "(النحل:۱۰۶)

ترجمہ: "جو شخص ایمان لائے پیچھے (یعنی ایمان لانے کے بعد) اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں کفر بالرّسول بھی داخل ہے) مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جاوے (کہ تو اگر کفر کا فلاں کام یا فلاں کام نہ کرے گا تو تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً) بشر طیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدہ میں فتور نہ آئے اور اس قول یا فعل کو برا سمجھتا ہو تو وہ مستثنٰی ہے کہ اس کو ظاہری کفر کا ارتکاب جائز ہے اور اسکے لئے وہ وعید آئندہ نہیں ہے) لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑی سزا ہو گی۔"

حدیث: مشرکین نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکڑ کر آپ ﷺ کی شان میں گستاخی اور اپنے باطل معبودوں کے حق میں ذکرِ خیر پر مجبور کیا، پھر آپ ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "اپنے دل کی حالت کیسے پا رہے ہو" تو انہوں نے جواب دیا "ایمان پر مطمئن" تو فرمایا: "وہ پھر اس طرح کریں تو تم بھی یہی کرنا" (یعنی زبان سے خلافِ اسلام بات نکالنا۔ تاکہ ان کی ایذاء رسانی سے چھٹکارا حاصل ہو) (حاکم فی المستدرک و قال صحیح علی شرط الشیخین)

اس کی صرف رخصت دی گئی، اور اسے مباح نہ قرار دیا، کیونکہ کسی بھی صورت میں کفر کے اباحت کا سوال نہیں، پس اس کی حرمت تو باقی رہے گی، لیکن اکراہ کی وجہ سے مواخذہ اور گناہ نہ ہو گا، لہٰذا اکراہ کی وجہ سے اصل وصف یعنی حرمتِ میں تغیر نہ ہو گا، صرف اس کے حکم یعنی اس پر مرتب مواخذہ وغیرہ پر اثر پڑے گا۔

چونکہ حرمت باقی ہے، اور صرف مجبوری کی وجہ سے رخصت ہے، اس لئے اس سے باز رہنا افضل ہے۔ اگر باز رہنے اور رکنے کی وجہ سے اس کی جان چلی جائے تو فی سبیل اللہ جہاد کرنے کا ثواب حاصل ہو گا، کیونکہ اس نے دینِ اسلام کی سربلندی اور اظہارِ اعزاز کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا۔

حدیث: حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے آپ ﷺ سے (مشرکین کی ایذاء رسانی) کی شکایت کی، اور کہا: کیا آپ اللہ سے ہم لوگوں کی مدد اور نصرت کے لئے دعاء نہ کرینگے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "تم سے قبل (سابقہ امت میں) کسی آدمی کو زمین میں گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیتے، اور آری لاکر اس کے سر پر چلاتے اور اس کے دو حصے کر دیتے، لیکن یہ مصیبت اسے اپنے دین سے نہ ہٹاتی۔ (بخاری شریف) آپ ﷺ نے اس حدیث میں سابقہ امت کے افراد کے صبر واستقلال کی تعریف فرمائی کہ انہوں نے تمام عذاب و قتل کو برداشت کر لیا، لیکن ظاہراً بھی کفر کے ارتکاب سے گریز کیا، تو معلوم ہوا کہ صبر کرنا اور مصیبتوں کو جھیلنا رخصت پر عمل کرنے سے افضل ہے۔

مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو پکڑ کر ایک سے پوچھا: محمد ﷺ کے متعلق تمہارا کیا نظریہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ اللہ کے رسول ہیں، پھر پوچھا: میرے متعلق کیا کہتے ہو؟ جواب دیا: تم بھی، تو انہیں چھوڑ دیا...... اور دوسرے سے اپنے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: میں بہرہ ہوں، سن نہیں پاتا۔ دو تین مرتبہ اس نے پوچھا تو یہی جواب دیا، تو انہیں قتل کر دیا، پھر آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: "پہلے نے رخصتِ الٰہی پر عمل کیا، اور دوسرے نے حق کا اعلان کیا، اسے مبارک ہو" (دیکھئے تفسیر قرطبی آیت

۔الامن اکرہ ۔ ۔ ۔ مسئلہ۱۸، ۱۸۹/۱۰)

اسی طرح حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قید کر کے کفار ستانے اور عذاب دینے لگے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں، لیکن انہوں نے اسے تسلیم نہ کیا، تو ان کو قتل کر دیا۔ یہ خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اقدام پر نکیر نہ فرمائی (دیکھئے بخاری شریف، کتاب المغازی باب فضل من شہد بدرا) بلکہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ شہداء کے سردار ہیں اور وہ جنت میں میرے رفیق ہیں۔

مذکورہ تمام تفصیلات آخرت سے متعلق تھیں۔

دنیوی اعتبار سے مُکرہ پر کفر کا حکم نہ لگے گا اور اس کے ساتھ مُرتد کا معاملہ نہ ہوگا۔

امام شافعی علیہ الرحمہ آیت (اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ) پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کفر کے مختلف احکام ہیں جیسے بیوی سے جدائی، کافر کو قتل کیا جائے، اور اس کا مال غنیمت شمار ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اکراہ کی وجہ سے گناہ کو ساقط کر دیا تو دیگر احکام بھی ساقط ہوں گے، کیونکہ جب اعظم ساقط ہوا تو اصغر (چھوٹی چیزیں) بھی ساقط ہونگی۔

اسلام پر اکراہ: اگر کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے اور وہ اسلام لے آئے تو اس کا اسلام صحیح اور معتبر ہوگا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک اور معاملہ کیا جائیگا کیونکہ یہ بر حق اکراہ ہے۔ بالخصوص ایک مرتد اور حربی کے حق میں، اگرچہ اُس کے دل میں کفر کا احتمال ہو، اسلام کی جانب کو ترجیح دیتے ہوئے، کیونکہ اس میں دین حق کی سربلندی ہے، جو کہ واجب ہے۔ (نیز ہم ظواہر کے مکلف ہیں اور سرائر اور اندرونی معاملات کی ذمہ داریاں ہم پر نہیں، اس کا حساب کتاب بارگاہِ الٰہی میں ہوگا)

(ب) کسی مسلمان کا مال تلف کرنا یا اس کی آبروریزی:

اگر کسی مسلمان کا مال تلف کرنے پر اکراہ اور جبر کیا جائے تو اس کی رخصت ہوگی، اور اس سے وہ گنہگار نہ ہوگا، کیونکہ شدت بھوک کی وجہ سے ہلاکت کا خوف ہو تو اس اضطراری کیفیت میں دوسرے کا مال استعمال کرنے کی رخصت ہے، لہٰذا اکراہ میں بھی رخصت ہوگی، کیونکہ یہ بھی ایک اضطراری کیفیت ہے۔ اسی طرح اکراہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو گالی دینا اور اس کی آبروریزی کی رخصت ہوگی۔

اگر مُکرہ مال تلف کرنے اور آبروریزی سے باز رہے تو یہ افضل ہے۔ اور اس کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچے تو اس پر ثواب کا مستحق ہوگا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ایک مسلمان ہر طرح دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت و آبرو" (سب کچھ حرام ہے) (مسلم شریف) لہٰذا کسی صورت میں اس سے تعرض جائز نہیں، اکراہ کی وجہ سے صرف رخصت حاصل ہوگی، یعنی اس پر مواخذہ اور گرفت نہ ہوگی، لیکن حرمت باقی رہے گی، لہٰذا اپنے حق پر ایک مسلمان بھائی کے حق کو ترجیح دیتے ہوئے اس رخصت پر عمل نہ کرے تو باعثِ ثواب ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے" (ابوداود، ترمذی) اس سے یہ ثابت ہوا کہ خود اپنے مال کے تلف اور ضائع کرنے پر اکراہ ہو، اور وہ اس سے باز رہے تو یہ افضل ہے، تو دوسرے کے مال کے اتلاف سے بچنا بدرجہ اُولیٰ افضل ہوگا۔

دنیوی حکم: اکراہ کی وجہ سے کسی دوسرے کا مال تلف کر دے، تو صاحبِ مال مُکرہ اور مُستکرَہ (مُکرَہ) دونوں میں سے جس سے چاہے ضمان اور بدلہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ مکرہ اصل سبب ہے اور مکرَہ تلف کرنے والا ہے اور دونوں برابر ہیں، لیکن آخر میں ضمان مُکرِہ پر ہی عائد ہوگا، یعنی صاحبِ مال مستکرہ سے ضمان وصول کرے، تو وہ مکرِہ سے وہ رقم واپس لے گا۔

سوّم نوع: وہ حسی تصرفات جن کی اکراہ کی وجہ سے نہ رخصت ہے اور نہ وہ مباح ہیں۔

بعض تصرفات ایسے ہیں جو شرعاً حرام ہیں، اور عقل بھی اس کی حرمت کی گواہی دیتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں اس کی رخصت نہ ہوگی۔

(الف) بغیر حق کے کسی مسلمان کا قتل: کیونکہ قتل بالکل حرام ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے بھی اس کی اباحت اور رخصت نہ ہوگی۔

آیت: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۵۱) ترجمہ: "جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے، اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے، (مثلاً قصاص یا رجم میں، پس قتل ناحق حرام ہوا)

حدیث: توحید ورسالت کی گواہی دینے والے ایک مسلمان شخص کا خون تین اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر حلال نہیں۔ جان کے بدلہ جان (یعنی کسی کو قتل کرنے کی سزا میں قصاص میں اسے قتل کرنا)، ثیّب زانی (یعنی نکاح صحیح میں جو صحبت کر چکا ہو، وہ زنا کرے تو اسے سنگسار کیا جائیگا)، اور اپنا دین چھوڑ کر جماعت سے جدا ہونیوالا" (صحیحین)

قتل ہی کی طرح اکراہ کی وجہ سے کسی مسلمان کا کوئی عضو کاٹنا، یا مہلک مار، یا ایسی مار جو شدید ایذا رساں ہو، مباح نہیں اور نہ ان امور کی رخصت ہے۔

آیت: وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا" (الاحزاب: ۵۸) **ترجمہ:** "اور جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو، ایذاء پہنچاتے ہیں، تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بار لیتے ہیں"

لہٰذا تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ مذکورہ امور میں سے کسی پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا، خواہ اکراہ تام ہو یا ناقص۔

دنیوی احکام: مکرہ اور مُستکرہ دونوں سے قصاص لیا جائیگا، کیونکہ ایک اس کا سبب اور دوسرا درحقیقت انجام دینے والا ہے، لہٰذا لوگوں کے جان کی اہمیت کے پیش نظر اور ایسی زیادتیوں سے تنبیہ کے لئے دونوں سے قصاص لیا جائیگا۔

(ب) زنا: زنا کے فحش اور منکر ہونے کی وجہ سے تمام شرائع اور عقل اس کی حرمت پر متفق ہیں، لہٰذا کسی بھی صورت میں اس کے رخصت یا اباحت کی گنجائش نہیں۔

آیت: "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا" (الاسراء: ۳۲) ترجمہ: "اور زنا کے پاس نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے، اور بری راہ ہے"

لہٰذا اکراہ کی وجہ سے کسی مرد یا عورت کو زنا کے ارتکاب کی گنجائش نہ ہوگی، اگر اس نے زنا کیا تو گنہگار ہوگا، لیکن اکراہ کی صورت میں زانی پر حد نافذ نہ ہوگی، کیونکہ شبہ موجود ہے، اور حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں، اور یہاں اکراہ کے سبب شبہ قائم ہے۔

۲) **شرعی تصرفات اور ان میں اکراہ کا اثر:** شرعی تصرفات یا تو انشاء ہوں گے یا اقرار (یعنی فی الحال کسی تصرف کو انجام دینا یا سابقہ کسی تصرف کے وقوع کا اقرار)

انشائیہ تصرفات کے دو انواع ہیں۔

۱) **جس میں فسخ اور رد کا احتمال نہ ھو:** جیسے طلاق، نکاح، رضاعت، رجعت، قسم، نذر، ظہار، ایلاء، ایلاء سے رجوع، قصاص کی معافی۔ یہ ایسے تصرفات ہیں کہ انعقاد ہوتے ہی لازم ہوں گے، اور فسخ یا رد کو قبول نہ کرینگے۔

۲) **جس میں فسخ اور رد کا احتمال ہو**، جیسے خرید و فروخت، اجارہ، ہبہ، وغیرہ یہ تصرفات محض انعقاد کی وجہ سے لازم نہ ہوں گے بلکہ فسخ یا رد کو قبول کرینگے۔

وہ انشائیہ تصرفات جس میں فسخ کا احتمال نہ ہو، اس میں اکراہ کا اثر

ان تصرفات میں سے کسی کو اکراہ کی وجہ سے انجام دے تو فاسد اور غیر معتبر ہو گا اور اس پر کسی شرعی اثر کا ترتب نہ ہو گا، اکراہ کی وجہ سے کالعدم قرار پائے گا۔

عمومی دلیل: اکراہ کی وجہ سے کفریہ کلمات کی ادائیگی کو شریعت نے غیر معتبر قرار دیا اور اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا، حالانکہ شرعاً کفر شدید ترین قول ہے اور جب اکراہ کی وجہ سے یہ ساقط ہوا، تو خفیف اور ہلکے درجے کے تصرفات بدرجۂ اولیٰ ساقط ہوں گے۔

لہٰذا نکاح پر اکراہ ہو تو یہ عقد نکاح ثابت نہ ہو گا، اور اس کے آثار، یعنی مہر کا وجوب اور استمتاع کی حلت وغیرہ کا ترتب نہ ہو گا۔

حدیث: حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے والد نے ان کا نکاح کر دیا اور وہ ثیّبہ (پہلے شادی شدہ) تھیں۔ اور یہ نکاح انہیں ناگوار تھا،۔۔ تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد کر دیا (بخاری شریف۔ نسائی)

اسی طرح اکراہ کی وجہ سے طلاق دے تو واقع نہ ہو گی۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے "اکراہ کے ساتھ نہ طلاق ہو گی اور نہ آزادی" (ابوداود۔ حاکم۔ ابن ماجہ) اسی طرح اس نوع کے دیگر تصرفات کا بھی اکراہ کی صورت میں اعتبار نہ ہو گا، اور اس پر کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہو گا، عمومی و خصوصی دلائل کی وجہ سے، جس میں سابقہ وہ روایت بھی داخل ہے، جس میں بتایا گیا کہ اکراہ والا عمل غیر معتبر ہو گا۔

لیکن کسی عورت کو رضاعت (بچے کو دودھ پلانے پر) مجبور کیا جائے، یا آدمی کو صحبت کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس پر اثر مرتب ہو گا، لہٰذا تمام شرائط موجود ہوں تو رضاعت کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گی، جیسا کہ نکاح کے بعد وطی (صحبت) کی وجہ سے کامل مہر لازم ہو گی۔

قابل فسخ انشائیہ تصرفات میں اکراہ کا اثر: اس نوع کے کسی تصرف پر اکراہ ہو تو وہ باطل ہو گا۔ لہٰذا اس سے متعلق کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہو گا، کیونکہ ان کے صحت کی شرط رضامندی ہے، اور بصورتِ اکراہ وہ موجود نہیں، پس یہ تصرف صحیح نہ ہو گا۔

"مغنی المحتاج" میں فرمایا: بلاحق مکرہ کا مالی عقد صحیح نہ ہو گا۔

کیونکہ ارشاد باری ہے: (اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ) (النساء: ۲۹) ترجمہ: "مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے"

مالی عقد میں خرید و فروخت، اجارہ، ہبہ، حوالہ اور وکالت وغیرہ وہ سارے عقود داخل ہیں، جن کا مال سے تعلق ہے۔

اقرار پر اکراہ کا اثر: اکراہ کی وجہ سے کسی بھی قسم کے تصرف کا اقرار لغو اور فضول ہے۔ اور اس پر کسی اثر کا ترتب نہ ہو گا، سابقہ دلائل کے ساتھ اس کے مزید دلائل یہ ہیں۔

۱) **اقرار ایک خبر ھے**، جس میں سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہے۔ اختیاری حالت میں سچائی کے جانب کو ترجیح دی گئی کیونکہ انسان اپنے متعلق جھوٹ سے متہم نہیں ہوتا اور اکراہ کی حالت میں دھمکی کی وجہ سے جھوٹ کے جانب کو ترجیح حاصل ہو گی، لہٰذا اقرار صحیح نہ ہو گا۔

۲) **اقرار ایک طرح کی گواہی ھے۔** ارشاد باری ہے۔'' يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ''(النساء:۱۳۵)

ترجمه: ''اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا'' (یعنی اگرچہ وہ گواہی تمہاری ذات کے خلاف کیوں نہ ہو)

اور اپنے نفس اور ذات کے متعلق گواہی اقرار ہی ہے، تو اقرار گواہی کے حکم میں ہوا، اور تہمت کی صورت میں گواہی رد ہوتی ہے اور اکراہ کی صورت میں اقرار میں تہمت موجود ہے، لہٰذا اقرار مقبول نہ ہو گا۔

مُخَيَّر فِيْهَا تصرفات میں اکراہ کا اثر: (یعنی ایک سے زائد امور میں مکرہ کے اختیار سے کسی ایک کے کرنے پر اکراہ ہو)

گذشتہ مسائل کا تعلق ان تصرفات سے ہے، جبکہ مکرہ علیہ کوئی ایک چیز ہے۔ اگر اکراہ غیر معین امر پر ہو، مثلاً شراب نوشی یا اتلافِ مال پر اکراہ، یا طلاق یا ایلاء میں سے کسی ایک پر اکراہ یا فروخت یا اجارہ پر اکراہ، پھر مستکرہ ان میں سے کسی ایک کو انجام دے، تو ان صورتوں میں اکراہ کا کوئی اثر نہ ہو گا، بلکہ وہ تصرف صحیح اور شرعاً معتبر ہو گا، اور اس پر متعلقہ شرعی آثار مرتب ہوں گے، جیسا کہ بذاتِ خود بلا اکراہ انجام دینے کی صورت میں ہوتا، کیونکہ اختیار دینے کے بعد مکرہ کا کسی ایک کو انجام دینا اس کا قرینہ ہے کہ اس نے اکراہ سے ہٹ کر اپنے اختیار سے اسے انجام دیا ہے۔

اس مسئلہ میں تمام تصرفات کا یہی حکم ہے، خواہ وہ حسی ہوں یا شرعی یا دیگر۔

اقرار

اقرار لغت میں اثبات کو کہتے ہیں

شرعی تعریف: کسی کا اپنے ذمہ کسی حق کے متعلق خبر دینا، اقرار کو اعتراف بھی کہا جاتا ہے۔

اقرار کے مشروعیت کی دلیل: اقرار مشروع ہے، اس کی مشروعیت قرآن مجید، احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

آیت: '' قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ '' (آل عمران ۸۱)

ترجمه: فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا، اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا، بولے ہم نے اقرار کیا، تو فرمایا اب گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔''

۲)'' يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ''(النساء:۱۳۵)

ترجمه: اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا (یعنی گرچہ وہ گواہی تمہارے خلاف ہو)

علماء کرام نے کہا کہ کسی کا اپنی ذات کے خلاف گواہی کا مطلب اقرار ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے (زنا کے ایک واقعہ میں) فرمایا: ''اُنیس، تم اس کی بیوی کے پاس جاؤ، پس اگر وہ (زنا کا) اعتراف کرے تو

اسے رجم کردو"، تو انیس اس کے پاس گئے اور اس نے اعتراف کرلیا، لہٰذا آپ ﷺ کے حکم سے اسے رجم (سنگسار) کیا گیا۔ (صحیحین)

علماء نے اقرار کی مشروعیت پر اجماع نقل فرمایا ہے، اور یہ کہ اقرار کے مطابق اس سے مواخذہ ہوگا (جو آدمی کسی حق کا اقرار کرے اسے 'مُقِرّ' جس کے حق کا اقرار کرے اسے مُقرلَہ، اور جس حق کا اقرار کرے اسے مُقربِہٖ کہا جائیگا۔ مثلاً: زید نے اقرار کیا کہ انس کے میرے ذمہ ۵۰۰ روپے ہیں، تو اس مثال میں زید 'مقر' انس مُقِرلہ اور ۵۰۰ روپے مقربہ کہلائیں گے)

حکمت: انسانوں کی ضرورت وحاجت کے پیش نظر اکثر احکام مشروع ہوتے ہیں، بعض اوقات کسی کا کسی پر حق ہوتا ہے، اور صاحبِ حق کے پاس کوئی گواہ نہیں ہوتا، اب اگر اقرار مشروع نہ ہو، تو کئی حقوق ضائع اور تلف ہوں گے اور جیسا کہ واضح ہے، اسلام حقوق متعلقہ افراد تک پہنچانے اور اس کے اثبات کا حریص اور حامی ہے۔ اسلام ہمیشہ لوگوں کا مال اور ان کے حقوق کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً اقرار کی مشروعیت اور اس کا اعتبار شریعت کے اس مزاج کے عین موافق ہے۔

حقوق اللہ ہوں یا انسانی حقوق، اقرار کی وجہ سے ظاہر وواضح ہوتے ہیں، تاکہ اس کی تحصیل اور ادائیگی ہو سکے۔

حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ کے روبرو زنا کا اقرار کیا اور ان پر حد نافذ کرنے اور انہیں اس گناہ سے پاک وصاف کرنے کی درخواست کی، تاکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ادا ہو، لہٰذا آپ ﷺ کے حکم سے انہیں سنگسار کیا گیا۔ اسی طرح قبیلۂ غامد کی ایک خاتون نے زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ کے حکم سے اسے سنگسار کیا گیا۔ (بخاری۔مسلم)

حقوق

جن حقوق کا اقرار کیا جاتا ہے (مُقَرَّبِہٖ) ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حق اللہ عزوجل (۲) حق العِبَاد (انسانی حقوق، بندہ کا حق)

۱) **حق اللّٰہ تعالی**: مثلاً حد زنا، چوری کی حد، ردت کی حد، شراب کی حد، زکات، کفارہ وغیرہ۔ ان حقوق کی مشروعیت دین کی اقامت اور معاشرہ کی اجتماعی مصلحت کے پیش نظر ہے۔

حق اللہ کے سلسلہ میں بندہ براہِ راست اللہ سے توبہ کرے، تو یہ اسکے لئے نفع بخش ہے۔ اور اقرار کے بعد اگر اس سے رجوع کرے تو صحیح ہے۔ (یعنی اس کے اقرار کے مطابق اس سے مواخذہ نہ ہوگا) کیونکہ حق اللہ کی بنیاد پردہ پوشی اور رفع دفع کرنے پر ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ماعز سے رجوع کے متعلق تعریض فرمائی، جبکہ انہوں نے زنا کا اقرار کیا، پس آپ ﷺ نے فرمایا: "شاید تم نے بوسہ لیا ہوگا، یا دبایا ہوگا" اس گفتگو کا مقصد انہیں زنا کے اقرار سے رجوع کا اشارہ کرنا، اور پھر رجوع کو شبہ سمجھتے ہوئے انہیں معذور قرار دینا تھا۔

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ "حتی الامکان مسلمانوں پر سے حدود کو دفع کرو (ہٹاؤ)، اگر اس کے نجات کی کوئی شکل ہو تو اسے چھوڑ دو، کیونکہ امام (حاکم) کا معافی میں غلطی کر جانا سزا میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔" (ترمذی فی الحدود)

اور بلاشبہ اقرار سے رجوع کر لینا ایسا شبہ ہے، جو حد کو ساقط کر دیتا ہے۔

قاضی (جج) کو مستحب ہے کہ مُقِرّ کو رجوع کی تعریض (اشارہ) کرے، البتہ اس سے یوں نہ کہے: تم اقرار سے رجوع کر لو، کیونکہ یہ

ایک جھوٹ کا حکم ہو گا۔

پس اگر مُقِرّ اقرار کے بعد حق اللہ سے رجوع کرے، تو یہ رجوع صحیح ہے، اور جس بات کا اقرار کیا تھا، اس کا حکم ساقط و زائل ہو جائے گا، حضرت ماعز رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہے کہ جب ان پر پتھر پڑنے لگے تو وہ بھاگے، تو لوگوں نے ان کا پیچھا کر کے انہیں سنگسار کر دیا، اور آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ''تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا؟'' (بخاری۔مسلم۔ترمذی)

۲) حق العباد (بندوں کا حق): اس میں ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد رجوع کرنا اور اقرار سے پھر جانا صحیح نہیں، کیونکہ مقرلہٗ کا اس حق سے تعلق ہے، البتہ خود مقرلہ اس حق کا انکار کرے اور مقر کو جھٹلائے، تو رجوع کرنا صحیح ہو گا۔

اگر کسی نے اپنے ذمہ زید کے قرض کا، یا اس کا مال تلف کرنے، یا اسے زنا کی تہمت لگانے کا اقرار کیا، تو اس سے رجوع صحیح نہیں، بلکہ جس بات کا اقرار کیا، وہ اس پر لازم ہے، الا یہ کہ زید خود اسے جھٹلائے۔

مُقِرّ کے شرائط

قاضی کے روبرو اور عدالت میں کسی کا اقرار صحیح اور معتبر ہونے کیلئے درج ذیل شرائط لازم ہیں۔

۱) **بلوغ**، لہٰذا کسی نابالغ کا اقرار صحیح نہیں، گرچہ وہ ممیز (باشعور) ہو، کیونکہ وہ مرفوع القلم ہے۔ اور اسے تصرفات کا حق نہیں۔

۲) **عقل**، پس کسی پاگل یا بیہوش شخص کا اقرار صحیح نہیں، کیونکہ وہ ممنوع التصرف ہیں، نیز انھیں شعور و سمجھ نہیں اور وہ مرفوع القلم ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''تین لوگ مرفوع القلم ہیں (یعنی ان کے تصرف کا کوئی اعتبار نہیں اور ان پر گناہ لکھا نہ جائیگا): سونے والا جب تک بیدار نہ ہو، بچہ جب تک بالغ نہ ہو، اور پاگل جب تک اسے عقل نہ آئے۔ (ابو داود وغیرہ)

۳) **اختیار**، (یعنی اپنی مرضی اور اختیار سے اقرار کرے)، لہٰذا اگر کوئی اکراہ اور جبر کی وجہ سے اقرار کرے تو معتبر نہیں، کیونکہ حدیث کی رو سے یہ معاف ہے۔ (ابن ماجہ) (اکراہ کی تفصیل گزر چکی)

۴) **مَحجُور علیہ نہ ہو**: (یعنی اس پر مالی تصرف کی پابندی عائد نہ ہو)، مجور علیہ حجر اور پابندی سے پہلے یا بعد میں کسی معاملہ کی وجہ سے قرض کا اقرار کرے (لیکن اقرار حجر کے بعد ہو) یا کسی کا مال تلف کرنے کا اقرار کرے، تو یہ اقرار صحیح نہیں، کیونکہ وہ مالی تصرف سے عاجز ہے۔

اگر مجور علیہ کسی حد یا قصاص کا اقرار کرے تو صحیح ہے، کیونکہ اس کا مال سے تعلق نہیں، اور اس میں تہمت کا بھی سوال نہیں، اگر چوری کا اقرار کرے، تو ہاتھ کٹے گا، لیکن اقرار شدہ مال اس پر لازم نہ ہو گا۔

مُقَرّلہ کے شرائط (جس کے حق کا اقرار کرے، اس کے شرائط)

۱) مقرلہ کسی حد تک متعین ہو کہ اس کی جانب سے دعویٰ اور مطالبہ کی توقع ہو۔

اگر کہے: کسی انسان کا مجھ پر ہزار روپیہ قرض ہے، تو یہ اقرار صحیح نہیں، کیونکہ مبہم اور غیر معین شخص کے لئے اقرار ہے، اور ابہام کی وجہ سے اقرار باطل ہوتا ہے۔

اگر یوں کہا: ان تینوں میں سے ایک کا مجھ پر ہزار روپیہ قرض ہے، تو یہ اقرار صحیح ہے، کیونکہ فی الجملہ تعیین پائی گئی، اب ان میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ اس اقرار سے میں مراد ہوں، تو قسم کے ساتھ اس کی تصدیق کی جائے گی، جبکہ مقر اسے نہ جھٹلائے، کیونکہ اس کا

احتمال موجود ہے، نیز قسم کی وجہ سے مزید تاکید حاصل ہوئی، اور جب مقر نے خود اسے نہیں جھٹلایا تو اس میں مزید پختگی حاصل ہوئی۔

۲) مُقَرّلہ میں مُقَرّبہ (اقرار شدہ حق) کے استحقاق کی اہلیت ہو، تب جاکر اقرار بر محل ہوگا، اور اس کی صداقت کا احتمال ہوگا، اگر کوئی کہے: اس جانور کے میرے ذمہ ۱۰۰۰/روپئے ہیں، تو اقرار صحیح نہیں، کیونکہ جانور میں اس استحقاق کی اہلیت نہیں، وہ نہ فی الحال ملکیت کی صلاحیت رکھتا ہے، اور نہ آئندہ۔

۳) مُقَرّلہ مُقِرّ کو نہ جھٹلائے، اگر اسے جھٹلائے تو اقرار باطل ہوگا، اور جس مال کا اقرار کیا ہے وہ مقر کے پاس ہی رہے گا، کیونکہ اس کے قبضہ میں ہونا بظاہر اس کی ملکیت پر دلالت کر رہا ہے، اور بعد میں طاری اقرار کے بمقابل تکذیب (جھٹلانا) موجود ہے، اس لئے وہ ساقط ہو جائے گا۔

صیغہ کے شرائط

اقرار کے صیغہ میں ایسا صریح یا کنایہ لفظ شرط ہے، جو التزام (اپنے اوپر کسی کا حق لازم ہونا) پر دلالت کرے، نیت کے ساتھ تحریر اور گونگے کا بامعنی اشارہ بھی اسی حکم میں ہے۔

پس اگر کہا: زید کے مجھ پر ہزار روپئے ہیں، یا اس کے میرے ذمہ ہزار روپئے ہیں، تو یہ اقرار ہے، اور اسے ذمہ پر لازم قرض (دَین) پر محمول کرینگے، کیونکہ صیغہ سے عرفاً یہی بات ذہن میں آتی ہے۔

اگر یوں کہا: زید کے میرے پاس ہزار روپئے ہیں، تو یہ بھی اقرار ہے، اور اسے عین پر محمول کریں گے، (یعنی وہی ہزار روپئے امانت وغیرہ کے طور پر اس کے پاس رکھے ہوئے ہیں)

اگر کوئی دوسرے سے کہے: میرا تم پر ہزار روپیہ قرض ہے، اور وہ جواب دے:: جی ہاں یا صحیح ہے، یا آپ نے سچ کہا، تو یہ اقرار ہے۔ اگر اس نے جواب میں کہا کہ: تم وہ قرض معاف کر چکے ہو یا میں ادا کر چکا ہوں، تو یہ بھی اقرار ہے، کیونکہ اس حق کا اپنے ذمہ ہونا اس نے قبول کر لیا، پھر اس کے اسقاط کا دعویٰ کر رہا ہے، اور اصل عدم اور نفی ہے۔

مُقَرّبِہٖ کے شرائط (جس حق کا اقرار کیا جائے، اس کے شرائط)

۱) **مقر به بوقتِ اقرار مقر کی ملکیت نه هو**، کیونکہ اقرار ملکیت کا ازالہ نہیں ہے، بلکہ مقربہ کے متعلق یہ اطلاع دینا ہے کہ وہ مقرلہ کی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی کہے: میرا کپڑا زید کا ہے، یا میرا جو قرض زید پر ہے وہ جمیل کا ہے، تو یہ اقرار صحیح نہیں ہے کیونکہ ان حقوق کا اپنی طرف منسوب کرنا اس کی ملکیت ہونے پر دلالت کر رہا ہے (یعنی میرا کپڑا اور میرا قرض کہنا)، لہٰذا اس کا کسی دوسرے کے لئے اقرار کرنا اس کے منافی ہے۔ (اس لئے معتبر نہ ہوگا)

۲) **مقر به (اقرار کرده حق) مقر کے قبضه میں هو**، تاکہ اقرار کے مطابق مقرلہ کے سپرد کر سکے، کیونکہ اگر وہ حق اس کے قبضہ میں نہیں ہے، تو یہ یا تو بغیر اجازت کے دوسرے کی جانب سے دعویٰ ہوگا، یا گواہی کے لفظ کے بغیر گواہی ہوگی، لہٰذا قبول نہ کی جائیگی۔

اقرار کے وقت وہ حق اس کے قبضہ میں نہ ہو، پھر اس کے قبضہ میں آجائے تو اس کے اقرار کے مطابق مقرلہ کے سپرد کی جائے گی،

کیونکہ شرط پائی گئی۔(یعنی مقر کے قبضہ میں ہونا)

مجھول (غیرمعلوم) کا اقرار

مجہول کا اقرار صحیح ہے، کیونکہ اقرار سابقہ حق کی اطلاع ہے، اور کسی چیز کے متعلق کبھی مفصلاً اطلاع اور خبر دی جاتی ہے اور کبھی اجمالاً اور مختصراً

لہٰذا اگر کوئی کہے: میرے ذمہ اختر کا مال ہے، تو یہ اقرار صحیح ہے، اور اس مال کی وضاحت و تفصیل کے لئے اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور وہ کسی بھی مالیت والی چیز کی تعیین کرے، تو اسے تسلیم کریں گے، خواہ کم ہی کیوں نہ ہو، مثلاً ایک روپیہ وغیرہ، کیونکہ مال کا لفظ اس پر بھی صادق آتا ہے۔

مجہول کے اقرار کے بعد اس کی وضاحت سے انکار کرے تو اسے قید میں ڈال دیا جائے، یہاں تک کہ وضاحت کر دے، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے۔

اقرار میں استثناء اور اس کا حکم

چونکہ قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور کلام عرب کے نظم و نثر میں (اسی طرح اردو وغیرہ دیگر زبانوں میں بھی) استثناء بکثرت وارد ہے، اسلئے اقرار میں استثناء صحیح ہے۔

لہٰذا اگر کوئی کہے: مجھ پر ہزار روپے ہیں سوائے ۱۰۰ روپیہ (یا مگر ۱۰۰ روپیہ) تو اقرار صحیح ہے، اور اس پر ۹۰۰ روپے لازم ہیں۔

استثناء کی صحت کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱) گفتگو میں استثناء اقرار کے جملہ سے اس طور پر متصل ہو، کہ عرفاً ایک ہی کلام شمار ہو، لہٰذا سانس لینے یا یادداشت کے لئے معمولی وقفہ ہو جائے تو حرج نہیں۔

اگر زیادہ وقفہ اور دیر گذر جائے، اور پہلا جملہ دوسرے جملہ سے (استثناء سے) جدا شمار ہو تو استثناء صحیح نہیں، بلکہ اس سے قبل اقرار کردہ حق مکمل ثابت ہو گا۔

۲) استثناء کو معتبر ماننے کی صورت میں مکمل حق اور مقربہ ساقط نہ ہو جائے۔

مثلاً یوں کہا: مجھ پر اس کے پانچ ہیں مگر چار (چار چھوڑ کر، سوائے چار) تو اقرار صحیح ہے، اور ایک لازم ہو گا۔

لیکن اگر یوں کہا: مجھ پر اس کے پانچ ہیں مگر پانچ (پانچ کے علاوہ، سوائے پانچ) تو استثناء باطل اور غیر معتبر ہے، اور پانچ پورے لازم ہوں گے (کیونکہ استثناء کو ماننے کی صورت میں مکمل اقرار ساقط ہو جاتا ہے۔)

منقطع استثناء

کسی جملہ کے بعد دوسری جنس کا استثناء کرے تو اسے منقطع استثناء کہیں گے، اور یہ بھی صحیح اور معتبر ہے، کیونکہ قرآن حکیم وغیرہ میں وارد ہے

آیت: ”قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ“ (الشعراء ۷۵۔۷۷)

ترجمہ: ”کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے، سو وہ میرے دشمن ہیں، مگر جہاں کا رب“۔
(اس آیت میں کفار کے معبودوں سے رب العٰلمین کا استثناء کیا، حالانکہ وہ ان کے باطل معبودوں میں داخل ہی نہیں، تو یہ استثناء منقطع ہوا)

(منقطع استثناء کی مثال: میری ساری رقم دیدو سوائے گھڑی کے، تو اس میں گھڑی کا استثناء کیا جو رقم کی جنس میں داخل نہیں، تو اسے استثناء منقطع کہیں گے)

لہٰذا اگر کہے: مجھ پر اکرم کے ہزار روپئے ہیں، سوائے کپڑے کے، تو یہ اقرار صحیح ہے، اور اس پر واجب ہے کہ کپڑے کی قیمت بتائے، جو ہزار سے کم ہو، تاکہ مکمل مقربہ ساقط نہ ہو جائے، اگر اس نے کپڑے کی قیمت ہزار روپئے بتلائی تو یہ استثناء غیر معتبر ہوگا، اور مکمل ہزار روپئے لازم ہوں گے۔ (اگر اس نے کپڑے کی قیمت ۵۰۰ روپئے بتلائی تو اسے نفی کرکے بقیہ ۵۰۰ روپئے اس پر لازم ہوں گے)۔

معین چیز سے استثناء: کسی معین چیز سے بھی استثناء صحیح ہے، مثلاً یوں کہا: یہ مکان رضوان کا ہے، سوائے اس کمرہ کے، تو یہ متصل لفظوں میں اقرار واخراج ہے، لہٰذا تخصیص کی طرح ہوگا (اور اس کمرہ کے علاوہ بقیہ مکان رضوان کا ہوگا)

مرض (بیماری) میں اقرار: عام مرض یا مرض الموت کا اقرار بھی صحت اور تندرسی کی حالت کے اقرار کی طرح ہے۔ اگر بحالت صحت کسی کے قرض کا اقرار کرے، پھر مرض میں کسی دوسرے کے قرض کا اقرار کرے، تو یہ اقرار بھی صحیح ہے، اور صحت کا قرض اس پر مقدم نہ ہوگا۔ مرض میں جس طرح کسی اجنبی (غیر وارث) کے حق میں اقرار صحیح ہے۔ اسی طرح وارث کے حق میں بھی صحیح ہے، کیونکہ اس وقت وہ اس حالت پر پہنچ چکا ہے (یعنی دنیا سے کوچ کرنے کا وقت) کہ ایسی حالت میں ایک جھوٹا آدمی بھی سچ کہتا ہے، اور فاسق وفاجر شخص بھی توبہ کرتا ہے۔ (لہٰذا وارث کے متعلق کسی حق کا اقرار کرے تو اسے متہم سمجھ کر اس اقرار کو جھٹلانے اور باطل قرار دینے کی ضرورت نہیں)

کوئی اپنی صحت یا مرض میں کسی شخص کے قرض کا اقرار کرے، اور اس کے موت کے بعد وارث کسی دوسرے کے قرض کا اقرار کرے تو پہلا قرض مقدم نہ ہوگا (دونوں مساوی درجہ میں ہوں گے) کیونکہ وارث کا اقرار مورث کے اقرار کی طرح ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۵/ ۷۰)

متفرق مسائل

۱) اگر کوئی دوسرے سے کہے: میرے تم پر ہزار روپئے ہیں یا تمہارے ذمہ جو میرے ہزار روپئے ہیں، وہ ادا کرو اور دوسرا شخص یہ کلمات کہے تو یہ اقرار نہیں: آج وہ ادا کرنا مجھ پر لازم نہیں ہے، تمہارا ہزار روپے سے زائد نہیں، لے لو، وہ لے لو، وہ تمہارے بٹوہ (تھیلی پاکٹ) میں رکھ لو۔

اگر دوسرا شخص جواب میں یہ الفاظ کہے تو یہ اقرار ہے۔ جی ہاں، آپ نے سچ کہا، تم نے مجھے اس سے بری کردیا (معاف کردیا)، میں نے وہ ادا کردیا، میں وہ کل ادا کرونگا، میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے دعویٰ سے انکار نہیں، البتہ ان میں سے کسی لفظ کے ساتھ استہزاء (ٹھٹھا، مذاق اڑانا) کا قرینہ ہو، مثلاً سر ہلانا اور ایسا ہنسنا جو تعجب اور انکار پر دلالت کرے، تو یہ اقرار نہ ہوگا۔ (نہایۃ المحتاج ۵/ ۷۶)

۲) کسی شخص کی زبان سے ایسے الفاظ کہلوائے جائیں جن کے معانی ومطالب سے وہ ناواقف ہو، تو اس پر اس کی گرفت نہ ہوگی، کیونکہ بلا مطلب سمجھے مفہوم کے قصد کا سوال نہیں۔ (نہایۃ ۵/ ۸۰)

۳) اگر کوئی کہے: ”لکھو کہ میرے ذمہ ہزار روپئے ہیں“ تو یہ اقرار نہیں، کیونکہ اسنے صرف لکھنے کا حکم دیا ہے۔ (نہایۃ ۵/ ۸۰)

۴) امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اسبابِ خانہ کے متعلق میاں بیوی کا اختلاف ہو، تو ان میں سے جو بھی کسی چیز کے متعلق بیّنہ (گواہ) پیش کرے، وہ چیز اس کی ہو گی،... اور بینہ پیش نہ کرے تو ہر ایک دوسرے کے لئے اپنے دعویٰ پر قسم لے، اگر دونوں قسم لیں تو وہ دونوں میں نصف نصف ہو گی، صرف ایک قسم لے اور دوسرا نہ لے تو قسم لینے والے کے حق میں فیصلہ دیا جائیگا (اور مکمل اس کا ہو گا)، یہ اختلاف زوجیت کا رشتہ بر قرار رہتے ہوئے ہو، یا آپس میں جدائی کے بعد، (مسئلہ کی نوعیت یہی ہو گی)، دونوں کے ورثاء یا ایک اور دوسرے کے ورثاء کے اختلاف کا بھی یہی حکم ہے۔ خواہ وہ چیز صرف شوہر کے مناسب ہو جیسے تلوار وغیرہ، یا بیوی کے مناسب ہو، جیسے زیورات وغیرہ، یا دونوں کے مناسب ہو، جیسے روپے پیسے یا دونوں کے مناسب نہ ہو جیسے قرآن شریف جبکہ دونوں ان پڑھ ہوں (الشبراملسی علی نہایۃ ۵/۸۷)

۵) ایک دن کسی کے لئے ایک ہزار کا اقرار کرے، پھر کسی دوسرے دن اسی کے لئے ہزار کا اقرار کرے تو صرف ہزار ہی لازم ہوں گے، اگر مقدار جدا ہو، مثلاً پہلے ہزار کا اور پھر پانچ سو کا اقرار کرے، تو قلیل کثیر میں داخل ہو گا۔

(یعنی مذکورہ صورت میں ہزار لازم ہوں گے)، اگر دونوں کی الگ الگ صفت بیان کرے مثلاً ہزار روپئے اور ۵۰۰ ریال، یا دو مختلف جہت کی طرف منسب کرے، مثلاً ایک کسی چیز کی قیمت کے طور پر اور دوسرا قرض لیا ہو، یا (مختلف وقت کی طرف نسبت کرے مثلاً) کہے کہ میں نے سنیچر کو اس سے ہزار روپئے لئے، پھر کہے کہ اِتوار کو ۵۰۰ روپئے لئے تو تینوں صورتوں میں دونوں اقرار و مقدار لازم ہوں گے۔ (نہایۃ ۵/۱۰۰)

۶) **نسب کا اقرار:** (مثال: اگر عثمان یہ اقرار کرے کہ عمر میرا بیٹا ہے، تو اس اقرار کو "اِستِلحاق" عثمان کو مُستَلحِق اور عمر کو مُستَلحَق کہا جائیگا)

اگر کوئی کسی کا نسب خود سے جوڑے، مثلاً کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، تو اس اقرار کی صحت کے لئے یہ شرط ہے کہ حِس سے نہ جھٹلائے، یعنی عمر کے تفاوت کے اعتبار سے یہ اس کا بیٹا ہو سکتا ہو، اور نہ شریعت اسے جھٹلائے، یعنی کسی اور سے اس کا نسب پہلے سے ثابت نہ ہو (معروف النسب نہ ہو)، نیز وہ مستلحق مکلف ہو تو اس کی تصدیق کرے اگر وہ اس کو جھٹلائے یا چپ رہے (نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب) تو بغیر بیّنہ (گواہ) کے نسب ثابت نہ ہو گا، اگر بیّنہ نہ ہو تو اسے قسم دلائے، وہ قسم نہ کھائے تو خود مستلحق (اقرار کرنے والا) قسم لے، اور اس طرح اس سے نسب ثابت ہو گا۔

اگر کسی نابالغ کا استلحاق کرے، تو انہیں شرائط کے ساتھ نسب ثابت ہو گا۔ (سوائے تصدیق کے) بالغ ہونے کے بعد وہ تکذیب کرے تو نسب باطل نہ ہو گا۔

بالغ یا نابالغ میت کا استلحاق بھی صحیح ہے، اور یہ اس میت کا وارث بنے گا، تہمت کو نظر انداز کیا جائے گا۔

کسی بالغ کا دو شخص استلحاق کریں تو وہ جس کے حق میں تصدیق کرے گا اس سے نسب ثابت ہو گا۔

اگر کوئی کسی کا نسب کسی دوسرے کے ساتھ جوڑے، مثلاً یہ شخص میرا بھائی ہے، یا میرا چچا ہے (تو پہلی صورت میں نسب اپنے باپ سے اور دوسری صورت میں دادا سے جوڑ رہا ہے) تو نسب کے ثبوت کے لئے سابقہ شرائط کے ساتھ درج ذیل شرائط بھی ضروری ہیں۔

(الف) جس کے ساتھ جوڑ رہا ہے، وہ انتقال کر چکا ہو، (پہلی مثال میں مستلحق کا باپ اور دوسری مثال میں دادا زندہ نہ ہوں)، لہٰذا کسی زندہ کے ساتھ دوسرے کا استلحاق معتبر نہیں، خواہ وہ پاگل ہو، یہ ضروری نہیں کہ میت (اپنی زندگی میں) اس مستلحق کی

نفی نہ کر چکا ہو،

(ب) اقرار کرنے والا جس کے ساتھ نسب جوڑ رہا ہے، اس کے ترکہ کا مکمل وارث ہو، خواہ ایک شخص اقرار کرے یا زائد، (مثلاً۔ زید کا انتقال ہوا اور ورثاء میں صرف دو بیٹے ہوں، تو ان دونوں کا اقرار ضروری ہے کہ فلاں زید کا بیٹا ہے) اس صورت میں اس کا نسب بھی ثابت ہو گا۔ اور وہ وارث بھی بنے گا (مذکورہ مثال میں صرف ایک بیٹا تیسرے بیٹے کا اقرار کرے، اور دوسرا انکار کرے، تو نسب ثابت نہ ہو گا۔ اسلئے وہ وارث نہ ہو گا، اور نہ ظاہراً اقرار کرنے والے کے حصہ میں شریک ہو گا، البتہ باطناً اسے لازم ہے کہ اسے بھی اپنے حصے میں شریک کرے)

وارثوں میں نابالغ بھی ہوں، تو صرف بالغ کا اقرار کافی نہیں، بلکہ ان کے بلوغ کا انتظار کیا جائے گا، جب وہ بالغ ہو کر اقرار میں موافقت کریں تو نسب ثابت ہو گا۔

اگر دو وارثوں میں ایک اقرار کرے اور دوسرا انکار، پھر دوسرا مر جائے اور اس کا وارث صرف اقرار کرنے والا ہو، تو (اب) نسب ثابت ہو گا، خواہ اس کی موت کے بعد یہ پھر اقرار کو نہ دوہرائے۔

بظاہر جو وارث بن رہا ہے، وہ مستحق کی وجہ سے محجوب ہوتا ہو (اسے وراثت نہ ملتی ہو)، مثلاً ایک بھائی میت کے حق میں بیٹے کا اقرار کرے، تو اس کا نسب ثابت ہو گا، لیکن اسے وراثت نہ ملے گی۔ (السراج الوہاج ص ۲۶۱-۲۶۲)

عارِیّت

تعریف: جس چیز سے انتفاع حلال ہو، اسے باقی رکھتے ہوئے اس سے انتفاع کو کسی کے لئے مباح قرار دینا عاریت کہلاتا ہے۔ اس چیز کو بھی عاریت کہا جاتا ہے اور اس عقد کو بھی۔

عقد عاریت کی وجہ سے مستعیر (عاریت پر کسی کی چیز لینے والا) اس کی منفعت کا مالک نہیں بنتا، صرف اس چیز سے انتفاع جائز ہے۔ اسی لئے اس چیز کو کسی دوسرے کو کرایہ سے یا رعایت پر نہیں دے سکتا۔

عاریت میں صرف شرعاً قابل انتفاع چیز ہی دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا سوّر اور آلات لہو کو عاریت پر دینا صحیح نہیں، جیسا کہ حائضہ اور نفساء کو قرآن مجید عاریت دینا صحیح نہیں، کیونکہ انہیں اسے چھونے اور اس میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

مشروعیت: اعارہ کی مشروعیت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اجماع قائم ہے۔

اعارہ (عاریت پر دینا): اِن اشیاء کا ہو گا جو استعمال سے ختم نہ ہوں۔ اگر ختم ہوں جیسے صابون، موم بتّی وغیرہ تو ان کا اعارہ صحیح نہیں ہے۔

آیت: "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" (الماعون ۴-۶)

ترجمہ: "ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ (یعنی ترک کرتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور مانگی نہیں دیتے برتنے کی چیز"

اکثر مفسرین نے ماعون کا مطلب یہ بیان کیا کہ جو چیزیں پڑوسی آپس میں ایک دوسرے سے عاریتاً لیتے ہیں۔ جیسے ڈول، سوئی، ہانڈی

وغیرہ۔ بس اللہ تبارک و تعالیٰ نے ماعون سے انکار کرنا قیامت کے منکرین کا شیوہ بتلایا اور اس پر سخت عذاب و ہلاکت کی دھمکی دی، تو معلوم ہوا کہ اعارہ ایک مشروع و مطلوب عمل ہے۔

حدیث: (۱) ''آپ ﷺ نے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے ایک گھوڑا عاریتاً لیا اور اس پر سوار ہوئے۔'' (متفق علیہ)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس زمین ہو وہ ہبہ کرے یا عاریتاً دے دے'' (مسلم شریف)

دیگر احادیث مسائل پر گفتگو کے دوران پیش ہوں گی، جن میں عاریت کے مشروعیت و احکام کا تذکرہ ہوگا۔

حکم: عاریت مستحب اور مطلوب ہے، جیساکہ دلائل گذر چکے۔ ابتداءً اسلام میں یہ واجب تھا، کیونکہ اس سے انکار پر سخت وعید و دھمکی گزر چکی۔ البتہ یہ وجوب بالاجماع منسوخ ہو چکا۔ اور عام حالات میں اس کا استحباب باقی ہے۔ (عاریت پر دینے کے لئے لفظ اعارہ استعمال ہوتا ہے)

بعض مخصوص حالات میں یہ واجب ہو جائیگا۔ جبکہ کسی معصوم (غیر حربی) انسان کی زندگی کا بچانا اس پر موقوف ہو۔ مثلاً شدید اور مہلک سردی یا گرمی سے بچاؤ کے لئے کپڑا اعاریتہ دینا۔ کسی ڈوبنے والے کے لئے رسی کا اعارہ، کاری زخم کے مرہم کے لئے مطلوبہ اسباب کا اعارہ وغیرہ۔

جس اعارہ سے مال محترم کی حفاظت ہو وہ بھی واجب ہے۔ مثلاً ماکول اللحم جانور کے ذبح کی خاطر چھری کا اعارہ جبکہ ذبح نہ کرنے کی صورت میں اس کے ہلاکت کا اندیشہ ہو، کیونکہ ذبح نہ کرنے میں مال کی بربادی ہے جو کہ شرعاً منع ہے۔ (لیکن ان صورتوں میں مفت دینا لازم نہیں، مالک چاہے تو اجرت مانگ سکتا ہے۔ ترشیح ص ۲۵۷)

کسی حرام کے تعاون میں اعارہ حرام اور کسی مکروہ کے تعاون میں اعارہ مکروہ ہے۔

عقد اعارہ کے ارکان

(۱) مُعِیر (عاریت دینے والا) (۲) مُستَعِیر (عاریت لینے والا) (۳) صیغہ (۴) شئ مُستَعار (عاریت پر دی جانے والی شئ)

۱) **مُعِیر:** یعنی جو اپنے قبضہ کی چیز سے انتفاع دوسرے کو مباح اور جائز قرار دے، اس کے شرائط یہ ہیں:

ألف: اس عاریت کی چیز کی منفعت کا مالک ہو، چاہے اس چیز کا مالک ہو یا نہ ہو، مثلاً کرایہ پر لی ہو یا اس کے حق میں وصیت ہو یا اس پر وقف ہو۔ چونکہ وہ ان اشیاء کی منفعت کا مالک ہے، لہٰذا اسے اعارہ کا حق ہے۔ کیونکہ عاریت کا تعلق منفعت سے ہے نہ کہ اس چیز سے۔ اسی لئے مستعیر عاریت کی چیز کسی اور کو عاریتاً نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ منفعت کا مالک نہیں، اسے صرف نفع اٹھانا مباح ہے۔

ب: اسے تبرّع کا حق ہو، لہٰذا بچے اور پاگل کا اعارہ درست نہیں۔ اسی طرح منفعت اگر قابلِ معاوضہ ہو تو مجور علیہ کا اعارہ بھی درست نہیں۔

ج: اپنی مرضی اور اختیار سے ہو، لہٰذا مُکرہ (جس پر جبر کیا جائے) کا اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حدیث کی رو سے کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں (دار قطنی)

(۲) **مُستَعِیر:** جس کے لئے عاریت کی چیز سے انتفاع کو مباح قرار دیا گیا ہو۔ وہ مستعیر ہے اور اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

الف) عاقل بالغ ہو، پس بچے اور پاگل کو اعارہ صحیح نہیں، اگر ان کو اعارہ کی ضرورت پیش آئے تو ان کی جانب سے ان کا ولی

ذمہ دار ہو گا۔

ب) معین ہو، اگر دو اشخاص سے کہا: میں نے تم میں سے ایک کو میری کتاب عاریت دی یا ایک جماعت سے کہا: میں نے تم میں سے ایک کو کتاب عاریت دی، تو یہ اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ مستعیر معین نہیں ہے۔

(۳) صیغہ: یعنی ایجاب و قبول پر مشتمل وہ عبارت جو اس عقد پر دلالت کرے، معیر اور مستعیر دونوں کی جانب سے لفظ شرط نہیں، بلکہ ایک کی جانب سے لفظ اور دوسرے کی طرف سے فعل کافی ہے۔ پس اگر مالک نے کہا یہ کتاب لو اور پڑھو، یا میں نے یہ کتاب تمہیں عاریتاً دی۔ اور مستعیر اسے لے لے تو یہ اعارہ صحیح ہے۔ اسی طرح اگر مستعیر نے کہا: مجھے فلاں چیز عاریت دو اور مالک نے وہ چیز اس کے سپرد کر دی تو عقد صحیح ہو گا۔

کسی ایک کی جانب سے لفظ ضروری ہے، لہٰذا اگر مستعیر بغیر کسی گفتگو کے وہ چیز لے لے اور معیر بھی خاموش رہے تو اعارہ صحیح نہیں، اور مستعیر کو اس سے انتفاع جائز نہیں، لیکن اگر کوئی چیز خریدے اور بائع کسی برتن میں وہ دے تو وہ برتن عاریت ہے۔ اگرچہ دونوں طرف سے صیغہ نہیں پایا گیا۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۴۵۷)

طرفین کے صیغے میں تتابع واتصال ضروری نہیں۔ لہٰذا کسی نے کہا مجھے فلاں چیز عاریتاً دیجئے۔ اور مالک کچھ مدت کے بعد وہ چیز اسے دے تو صحیح ہے۔ جبکہ معیر کی طرف سے رجوع یا مستعیر کی طرف سے رد کی کوئی دلالت اس دوران نہ پائی گئی ہو۔

اعارہ کسی وقت یا شرط کی قید کے بغیر صحیح ہے۔ جیسا کہ کسی شرط پر معلق رکھنا اور کسی مدت کے ساتھ مقید کرنا بھی صحیح ہے۔ مثلاً یوں کہا۔ میں نے یہ گھر تمہیں ایک سال رہائش کے لئے عاریتہ دیا۔ یا فلاں جو اس میں رہتا ہے وہ نکل گیا تو تمہیں دیا۔

(۴) مُستَعَار: اس سے وہ عین (شئ) مراد ہے، جس کی منفعت مستعیر کے حق میں مباح کی گئی ہو، (یعنی عاریت میں دی جانے والی چیز) اس کے شرائط حسبِ ذیل ہیں:

الف: اس کی منفعت کا معیر مالک ہو، بس مستعیر کسی اور کو اعارہ نہیں کر سکتا۔

ب: اس سے انتفاع ممکن ہو، لہٰذا بالکل بوسیدہ کپڑا جو کسی وقت پہننے کے لائق نہ ہو، یا بالکل مریض یا اپاہج جانور سواری کے لئے یا بغیر انجن اور مشین کی گاڑی وغیرہ کا اعارہ صحیح نہیں۔

بوقت عقد نفع کا وجود شرط نہیں، پس جانور کا بچہ سواری کے لئے دینا صحیح ہے جبکہ اعارہ مطلق ہو (وقت کی قید نہ ہو) یا اتنی مدت کے لئے ہو کہ وہ بچہ اس دوران سواری کے قابل ہو جائے گا۔ اسی طرح کپڑا جو پہننے کے لائق نہ ہو، لیکن اس کی اصلاح ممکن ہو تو اس کا اعارہ صحیح ہے۔

ج: اس چیز سے انتفاع شرعاً جائز ہو، لہٰذا آلاتِ لہو کا اعارہ، عورت کو غیروں کے سامنے آرائش کے لئے زیورات کا اعارہ، شراب بنانے کے لئے برتن کا اعارہ، کھانے کی خاطر سوّر ذبح کرنے کے لئے چھری کا اعارہ، کسی کو ناحق مارنے والے کو ہتھیار کا اعارہ وغیرہ... صحیح نہیں، کیونکہ اس طرح کا انتفاع شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔

د: انتفاع کی وجہ سے وہ چیز گھٹتی نہ ہو جیسے کپڑے، مکانات اور برتن وغیرہ۔ اگر استعمال کرنے سے گھٹتی اور ختم ہوتی ہو تو اس کا اعارہ صحیح نہیں۔ لہٰذا جلانے کے لئے موم بتی، غسل وغیرہ کے لئے صابون وغیرہ کا اعارہ صحیح نہیں۔ کیونکہ ان سے انتفاع کی صورت میں رفتہ رفتہ وہ چیز گھٹتی اور ختم ہوتی رہے گی۔

مستعار کی تعیین شرط نہیں، اگر کہہ دے کہ میرے جانوروں میں سے جو چاہے لو، تو کافی ہے، بخلاف اجارہ کے (ترشیح ص ۲۵۷)

عاریت کے بعض احکام

۱) **مستعار شئی سے انتفاع کے حدود:** مالک کی اجازت کے دائرہ میں مستعیر اس شئی سے نفع اٹھائیگا۔ اجازت کے علاوہ کسی امر میں نفع اٹھانا جائز نہیں۔ البتہ اس انتفاع واستعمال سے اجازت والے انتفاع سے نسبتاً کم نقصان ہوتا ہو تو حرج نہیں۔ اگر انتفاع کی مطلق اجازت دے دے یعنی کسی خاص نوعیت کے انتفاع کی قید کے بغیر عاریت دے تو عادتاً اس سے جو انتفاع ہوتا ہے وہ جائز ہوگا۔ اگر کسی انتفاع سے صراحتاً منع کرے تو وہ ممنوع ہوگا۔ خواہ اس کی تاثیر اور نقصان اجازت شدہ انتفاع سے کم ہو، لہٰذا:

اگر تعمیر یا درخت لگانے کے لئے زمین عاریت دے تو کاشتکاری جائز ہے، کیونکہ یہ نسبتاً کم نقصان دہ ہے، لیکن صراحتاً کاشتکاری سے روک دے تو اس کی اِجازت نہ ہوگی۔

اگر انتفاع کے لئے زمین عاریت دے (بغیر کسی قید کے) تو اس میں تعمیر، درخت بونا اور کاشتکاری جائز ہے۔

اگر یوں کہا: میں نے یہ زمین تمہیں عاریتاً دی، آگے یہ الفاظ نہ کہے تاکہ تم انتفاع کرو، تو صحیح بات یہ ہے کہ یہ اعارہ صحیح نہیں ہے۔

اگر کاشتکاری کے لئے زمین عاریتاً دے، تو اس میں تعمیر اور درخت لگانا جائز نہیں، کیونکہ یہ دونوں کاشتکاری کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ ہے۔

اگر مطلقاً کاشت کاری کے لئے اعارہ کرے، تو جو چاہے کاشت کر سکتا ہے، اگر کسی خاص نوع کی کاشت کیلئے اعارہ ہو تو وہ نوع اور اس کے مثل یا اس سے کم ضرر رساں نوع کی کاشت کر سکتا ہے، اس نوع سے زیادہ ضرر رساں نوع کی کاشت نہیں کر سکتا۔

اسی طرح دیگر اشیاء کی عاریت کا حکم ہوگا۔ لہٰذا سواری کے لئے موٹر کار وغیرہ عاریتاً دے تو اسے سامان لادنے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر ہلکے پھلکے سامان لادنے کے لئے عاریت پر لے تو اس میں وزنی اشیاء لادنے کی اجازت نہ ہوگی، مثلاً کپڑے لادنے کے لئے دیا تھا تو اس میں لوہا اور سیمنٹ وغیرہ نہیں لاد سکتا۔

مستعیر براہ راست خود ہی انتفاع کرے یا اپنے کسی نائب اور قائم مقام (مثلاً وکیل) کے ذریعہ، کیونکہ یہ نفع بھی اسی کی طرف لوٹے گا، لیکن بشرطیکہ شئی مستعار پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے وہ نائب مستعیر کے مثل یا اس سے کم تر ہو۔ اگر سائیکل عاریت پر لے کر اپنے کام سے نوکر یا وکیل کو وہ سائیکل سواری کے لئے دے تو جائز ہے۔ جبکہ اس کا وزن اور بوجھ اس سے زائد نہ ہو، ورنہ اجازت نہ ہوگی۔

۲) **شئی مستعار پر مستعیر کے قبضہ کی نوعیت:** مستعیر کا قبضہ ضمان کا قبضہ ہے، پس جب وہ شئی مستعار اپنے قبضہ میں لے لے تو وہ اس کے ضمان میں داخل ہو چکی۔ یعنی اب اگر وہ شئی تلف ہو جائے تو مستعیر اس کا ضامن ہوگا۔ (اس کا بدل دینا ہوگا) خواہ اس نے استعمال میں زیادتی سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو، اسکی حفاظت میں کوتاہی کی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ اس نے اپنے نفع کی خاطر دوسرے کے مال پر قبضہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے کچھ زرہیں حنین کے دن بطور عاریت لئے تو انہوں نے کہا: آپ غصب کر رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا "نہیں" بلکہ عاریت ہے جو مضمون ہوگی۔ (جس کا ضمان بصورتِ تلف ادا کیا جائے گا) (ابوداود)

شئ مستعار کے تلف کے دن اس کی جو قیمت ہوگی وہ مستعیر بطور ضمان ادا کرے گا، جبکہ وہ تلف اور ختم ہو جائے، خواہ کسی ناگہانی مصیبت اور آسمانی آفت سے ہی تلف کیوں نہ ہو، اجازت کے مطابق استعمال کی وجہ سے اس کے بوسیدہ پن یا قیمت کی کمی کا ضامن نہ ہوگا۔

اِجازت کے علاوہ استعمال کی وجہ سے قیمت کا جو نقصان ہوگا، اس کا ضامن ہوگا۔ اسی طرح کسی ایسے کام میں استعمال کرے جس میں عادتاً وہ شئی استعمال نہیں ہوتی اور اس سے نقصان ہو تو اس کا ضامن ہوگا۔ مثلاً مکان لوہاری، یا بڑھئی کے پیشہ میں استعمال کرے۔ یا کھانے پینے کے برتن ریت اور پتھر ڈھونے میں استعمال کرے۔

معیر کے اعارہ سے رجوع اور مستعار چیز کے واپسی کے مطالبہ کے بعد اگر اسے استعمال کرے تو ضامن ہوگا۔ خواہ مالوف استعمال ہو یا سابقاً اس کی اجازت کے مطابق استعمال کرے۔ اسی طرح عاریت موقت ہو اور مدت کے اختتام کے بعد استعمال کرے تو ضامن ہوگا۔ (مثلاً ایک ماہ کے لئے عاریت پر دے اور مستعیر ماہ کی تکمیل کے بعد بھی استعمال کرے تو ضامن ہوگا)

ضمان کی مذکورہ تفصیل کے برعکس شرط لگائی جائے۔ یعنی ضمان کی صورتوں میں عدم ضمان کی یا عدم ضمان کی صورتوں میں ضمان کی، تو یہ شرط لغو ہے، نبھانے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ عقدِ عاریت اپنی جگہ صحیح ہوگی۔

۳) **مستعار کا خرچ اور واپسی کے مصارف:** اگر مستعار پر کچھ خرچ ہو، مثلاً جانور کا چارہ، مکان کی مرمت وغیرہ، تو یہ مصارف اس چیز کے مالک پر ہوں گے۔

مدت کے اختتام یا اعارہ کے فسخ کے بعد جب مستعیر پر لوٹانا لازم ہو اور لوٹانے میں خرچ ہو مثلاً گاڑی کا کرایہ وغیرہ، تو یہ مستعیر پر لازم ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''کسی ہاتھ نے جو لیا، ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے'' اور حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عاریت لوٹائی جائے گی'' (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ)

یہ حکم اس وقت ہے جب کہ براہ راست معیر کو لوٹائے لہٰذا اگر کسی مستاجر (کرایہ دار) سے عاریت لے، پھر وہ عاریت کرایہ پر دینے والے (یعنی اس چیز کے مالک) کو لوٹائے تو اس صورت میں مصارف مالک کے ذمہ ہیں۔ کیونکہ یہاں مستعیر لوٹانے میں کرایہدار کے قائم مقام ہے۔ اور اجارہ میں لوٹانے کے مصارف مالک کے ذمہ ہیں، نہ کہ کرایہ دار کے۔

۴) **عاریت سے رجوع اور اسے لوٹانا:** عقد عاریت طرفین کی جانب سے ایک جائز عقد ہے۔ (نہ کہ لازم) یعنی معیر اور مستعیر میں سے کوئی بھی جب چاہے اسے فسخ کر سکتا ہے۔ چاہے دوسرا راضی نہ ہو یا اسے اس کا علم نہ ہو۔ اگر عاریت میں مدت متعین ہو تب بھی معیر جب چاہے واپس لے سکتا ہے۔ اور مستعیر جب چاہے لوٹا سکتا ہے۔ کسی پر بھی اسے باقی رکھنا لازم نہیں ہے۔

البتہ میت کی تدفین کے لئے زمین عاریتاً لے تو اس دفن شدہ زمین کا اعارہ دونوں بھی فسخ نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ میت بوسیدہ ہو کر سڑ گل کر مٹی نہ بن جائے، اور اس کا کوئی بھی حصہ باقی نہ رہے۔ کیونکہ تدفین اجازت سے تھی۔ اب قبر کھودنے اور اسے نکالنے میں اس کی بے حرمتی ہے۔ اس صورت میں مستعیر پر اجرت لازم نہ ہوگی۔

اسی طرح معیر مستعار کو کسی خاص کام میں استعمال کی اجازت دے اور تکمیل سے قبل رجوع کرنے میں مستعیر کا نقصان ہو تو یہ رجوع صحیح نہیں۔ جیسے اسباب منتقل کرنے کے لئے کشتی عاریتاً دے اور بیچ دریا میں واپسی کا مطالبہ کرے یا اس کام کے لئے موٹر عاریت پر دے اور کسی صحرا جیسی جگہ میں جہاں دوسری گاڑی کا انتظام نہ ہو سکے واپسی کا مطالبہ کرے تو ان صورتوں میں مستعیر پر فی الحال مستعار

کا لوٹانا لازم نہیں، اس سے انتفاع کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے، جب تک کہ بغیر ضرر کے لوٹا سکے۔ لیکن ان صورتوں میں واپسی کے مطالبہ سے واپسی تک کے مدت کی اجرت مثل مستعیر پر لازم ہے۔ معیر کے رجوع کے بعد مستعیر رجوع سے لاعلمی کی وجہ سے وہ چیز استعمال کرے تو اس پر اجرت لازم نہیں، لیکن معیر کی موت یا جنون یا بے ہوشی سے لاعلمی کی وجہ سے ان امور کے بعد بھی استعمال کرتا رہا تو اجرت لازم ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۴۶۰/۳)

مستعار زمین کی واپسی: اگر تعمیر یا درخت لگانے کے لئے زمین عاریت دے، پھر تعمیر یا درخت لگانے کے بعد معیر اعارہ سے رجوع کرے تو مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہو گی:

اگر معیر نے پہلے ہی شرط رکھی ہو کہ رجوع کے وقت تعمیر اور درخت کو مستعیر اکھاڑ دے، تو شرط کی وجہ سے اس پر یہ واجب ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے "مسلمانوں پر اپنے شرائط کی پابندی لازم ہے"۔ اگر مستعیر انکار کرے تو معیر خود ہی نکال ڈالے۔

اگر اکھیڑنے کے بعد زمین کو ہموار کرنے کی شرط تھی تو دونوں صورتوں میں زمین ہموار کر کے دینا لازم ہے۔ اگر شرط نہ تھی تو لازم نہیں۔

اگر معیر نے اکھیڑنے کی شرط نہ رکھی تھی تو مستعیر کو اکھیڑنے نہ اکھیڑنے کا اختیار ہے۔ اب اگر وہ اکھاڑنے کو اختیار کرے تو فبہا، اور اس سے تعمیر یا درخت میں جو نقصان ہو گا اس کا کوئی بدلہ نہ ملے گا، نیز زمین کو صحیح اور ہموار کرنا بھی اس پر لازم ہے۔

اگر مستعیر اکھاڑنے کو اختیار نہ کرے تو معیر کو درج ذیل تین باتوں کا اختیار ہے۔

۱) عمارت یا درخت کو باقی رہنے دے۔ اور آئندہ مناسب کرایہ (اجرت مثل) وصول کرے۔

۲) درخت اکھاڑ دے یا عمارت ڈھادے۔ اکھاڑنے اور ڈھانے کے مصارف اسی کے ذمہ ہوں گے۔ نیز اس کی وجہ سے قیمت میں جو نقصان ہوا اس کا ضامن ہو گا۔ (یعنی اتنی رقم مستعیر کو ادا کرے گا)

۳) درخت یا عمارت واجب الازالہ ہونیکی صورت میں اس کی جو قیمت ہو اس قیمت سے اسے خرید کر مالک بن جائے۔ جو باقاعدہ ایجاب و قبول پر مشتمل عقد کے ذریعے طے پانا لازم ہے۔

معیر مذکورہ تینوں شکلوں میں سے جسے بھی اختیار کرے، مستعیر پر اس کی موافقت لازم ہے۔ اگر معیر کسی بھی شکل کو اختیار نہ کرے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قاضی (حاکم) ان دونوں سے اعراض کرے، یہاں تک کہ وہ دونوں کسی بات پر اتفاق و صلح کر لیں، یا معیر کسی شکل کو اختیار کر لے۔

اعارہ مطلق ہو یا کسی مدت کے ساتھ مقید، دونوں صورتوں میں یہی تفصیل ہو گی۔ البتہ اعارہ مطلقہ میں ایک مرتبہ تعمیری کام یا درخت بونے کے بعد اسے اکھاڑ دے۔ تو اب دوبارہ نئی اجازت کے بغیر اس کی اجازت نہ ہو گی۔ اگر نئی اجازت کے بغیر اس نے تعمیر یا درخت بوئے تو معیر مطلقاً اکھاڑ کر زمین ہموار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اور اعارہ مخصوص مدت کے لئے ہو تو اس مدت میں جتنی مرتبہ چاہے درخت بوئے اور اکھاڑ دے یا تعمیری کام دہرائے، جب تک کہ معیر رجوع نہ کرے، یا مدت ختم نہ ہو جائے۔

اگر زمین کا اعارہ کاشت کاری کے لئے ہو، پھر اناج کی پختگی اور تیار ہونے سے قبل رجوع کرے تو مستعیر تیار ہونے تک رک سکتا ہے، جبکہ اس سے قبل نکالنے میں نقصان ہو۔ اور اس دوران معیر کو اجرت مثل دی جائے گی۔ اعارہ مطلق ہو یا مؤقت یہی حکم ہے۔ لیکن مؤقت ہونے کی صورت میں مدت کی تکمیل تک مستعیر کی کوتاہی کی وجہ سے پختگی اور پکنے میں تاخیر ہو تو معیر اسے کھیتی اکھاڑ کر زمین ہموار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ خواہ اس میں اسے نقصان ہو۔ کیونکہ مستعیر کی طرف سے تعدّی اور زیادتی ہے۔ اور حدیث کی رو سے

ظالم جڑوں کا کوئی حق نہیں۔(ابوداود۔ترمذی)

۵)**مستعار شئی کو لوٹانے کی کیفیت:** مستعار شئی کی نوعیت کے اعتبار سے عرف اور عادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے لوٹایا جائیگا۔ لہٰذا منقولہ اشیاء(جو چیزیں منتقل کی جاتی ہیں) کو منتقل کر کے معیر کے سپرد کرنا ضروری ہے، بالخصوص جبکہ وہ شئی نفیس اور قیمتی بھی ہو، اس کی نفاست کے اعتبار سے سپردگی میں اختلاف ہوگا۔ جواہر اور سونا چاندی جیسے اشیاء کو براہ راست معیر ہی کے ہاتھ واپس کرنا چاہئے، بعض دیگر اشیاء کا اس کے گھر پہنچانا یا کسی اور قائم مقام کے سپرد کرنا بھی کافی ہوگا، جیسے برتن وغیرہ۔

اگر مستعار غیر منقول ہو جیسے مکان زمین وغیرہ تو اسے خالی کر دینا، نیز اسے قبضہ میں لینے اور نفع اٹھانے میں جو رکاوٹ ہو اسے دور کرنا کافی ہے۔

۶)**معیر اور مستعیر کا اختلاف:**

(الف) واپسی میں اختلاف: مثلاً مستعیر دعویٰ کرے کہ وہ مستعار شئی لوٹا چکا اور معیر انکار کرے۔ تو معیر کو قسم دلائی جائے گی۔ اور اسکی بات مانی جائیگی۔

(ب) تلف کی صورت میں اختلاف: اگر مستعار شئی تلف ہو اور مستعیر یہ دعویٰ کرے کہ حسبِ اجازت استعمال میں تلف ہوئی، اور معیر اس کا انکار کرے۔ اور کہے: بلکہ بغیر استعمال کے تلف ہوئی یا اجازت کے علاوہ استعمال سے تلف ہوئی۔ تو مستعیر کا دعویٰ مع قسم تسلیم کیا جائے گا۔ پس وہ اپنے دعویٰ پر قسم لے تو ضمان سے بری ہو جائے گا۔

۷)**اصل عقد میں اختلاف:** مثلاً مالک اجارہ کا دعویٰ کرے۔ اور منتفع استعارہ کا(یعنی نفع اٹھانے والا عاریت پر لینے کا دعویٰ کرے) یا منتفع کہے: آپ نے مجھے عاریتاً دی، اور مالک کہے: بلکہ تم نے مجھ سے غصب کیا، تو مالک کا دعویٰ اس کے قسم کے ساتھ تسلیم ہوگا۔ جب مالک قسم لے تو اجرتِ مثل کا مستحق ہوگا، جبکہ اتنی مدت گذر چکی ہو جس میں اس چیز کی اجرت ملتی ہو، اگر وہ چیز باقی ہے تو اسے لوٹا دے۔ اور لوٹانے سے پہلے تلف ہو جائے تو غصب کے دعوے میں منتفع اس کا ضامن ہوگا۔ اب ضمان کی مقدار میں مالک منتفع کے مقابلہ میں زائد کا دعویٰ کرے تو مالک کو اس زیادتی پر قسم دلائی جائے۔(پھر وہ اس زیادتی کا مستحق ہوگا)

عقد اعارہ کا اختتام

درج ذیل صورتوں میں یہ عقد اختتام پذیر ہوگا۔

(الف) معیر کا عاریت کا مطالبہ کرنا اور اعارہ سے رجوع کرنا، چاہے اعارہ کی متعینہ مدت کی تکمیل سے قبل ہو یا بعد۔

(ب) مستعیر کا شئی مستعار کو معیر کے حوالہ کر دینا اور لوٹانا۔ مدت پوری ہونے کے بعد ہو یا پہلے ہی۔

(ج) دونوں میں سے کسی ایک کا پاگل یا بے ہوش ہو جانا۔

(د) کسی ایک کا انتقال کر جانا۔

(ھ) سفاہت کی وجہ سے معیر یا مستعیر پر حجر(پابندی اور روک) لگ جانا۔

(و) فَلَس کی وجہ سے مالک پر حجر لگ جانا۔

متفرق مسائل

۱) کسی ظرف اور برتن میں کوئی شئی خریدے تو وہ ظرف عاریت ہے۔ اسی طرح کسی برتن میں ہدیہ آئے اور اس میں کھانا معتاد ہو تو کھاتے وقت وہ برتن عاریت ہے۔ اور اس سے قبل امانت ہے۔

۲) مالک ودیع (جس کے پاس ودیعت و امانت رکھی گئی ہو) کو (مثلاً) ودیعت کے کپڑے پہننے کی اجازت دے تو پہننے کے بعد وہ عاریت ہے۔

۳) بعض مرتبہ تیل یا گھی خریدنے کے لئے اپنا برتن گھی فروش کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اب اس میں مبیع (تیل گھی وغیرہ) ڈالنے سے قبل وہ برتن تلف ہو جائے تو اس کا ضمان نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ امانت ہے، اور مبیع ڈالنے کے بعد تلف ہو تو ضامن ہو گا، کیونکہ یہ عاریت ہے۔

۴) اگر کسی کو پانی پلانے کہے اور وہ پانی کا گلاس دے، جو پانی پینے سے قبل اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جائے، تو اگر بلا عوض پلانے کہا تھا تو پانی غیر مضمون اور گلاس مضمون ہو گا۔ اور عوض کی شرط تھی تو پانی مضمون اور گلاس غیر مضمون ہو گا۔ (اور اطلاق کی صورت میں عرف کو مد نظر رکھے) اگر پانی پینے کے بعد گلاس ٹوٹ جائے اور عوض کی شرط نہ تھی تو گلاس مضمون اور پانی غیر مضمون ہے۔ اور عوض کی شرط تھی تو نہ گلاس کا ضامن ہو گا اور نہ گلاس میں باقی پانی کا۔

۵) مستعار مصحف شریف میں خطا اور غلطی نظر آئے تو اس کی اصلاح واجب ہے، دیگر کتب میں اس کی اجازت نہیں، وقف میں خطا یقینی ہو تو اس کی اصلاح واجب ہے۔ کنارے پر حواشی وغیرہ کی اجازت نہیں، دوسرے کی کتاب میں غلطی دیکھے تو اصلاح نہ کرے۔ اگر مالک کی رضامندی کا گمان ہو تو اصلاح میں حرج نہیں۔ کسی لفظ یا حکم میں تردد و شک ہو تو اس کی اصلاح نہ کرے۔ کاتب کی اپنی ملکیت میں وہ "شاید یہ لفظ یا حکم اس طرح ہے" لکھ سکتا ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۴۵۹ و ۴۵۷)

غصب

عربی زبان میں بطور ظلم کسی چیز کو لینا غصب کہلاتا ہے۔

شریعت میں کسی دوسرے کے حق پر ظلماً تسلط اور قبضہ کو غصب کہا جاتا ہے۔

دوسرے کا حق کوئی عین (چیز) ہو۔ جیسے گھر وغیرہ یا منفعت جیسے کسی کی رضامندی کے بغیر اس کے مکان میں رہائش یا اختصاص جیسے شکاری کتا وغیرہ، اور سیرابی کا حق وغیرہ، ان حقوق پر تعدی اور ظلم کے طور پر صاحبِ حق کی رضامندی کے بغیر جبراً و قہراً اپنا قبضہ اور تسلط (استیلائ) غصب کہلائے گا۔

لہٰذا بغیر کسی عقد اور اباحت کے دوسرے کا کھانا کھا گیا تو یہ غصب ہے۔ کسی کے مکان میں اس کی رضامندی کے بغیر رہے تو یہ غصب ہے، خواہ اسے کرایہ دے۔ اسی طرح بلا اجازت دوسرے کے بستر وغیرہ پر بیٹھے تو یہ غصب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں دورِ حاضر کے ایک عام عادت کے متعلق تنبیہ کی جاتی ہے۔ لوگ عموماً دوسروں کے مکانات اور دوکانوں کا مالکوں کی مرضی کے بغیر قدیم معمولی کرایہ دے کر اس پر قبضہ جمائے رہتے ہیں، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں اور دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم کرایہ دار ہیں۔ اس پر اجارہ کا انطباق نہ ہو گا، بلکہ یہ تو صریح غصب ہے۔ اور اس پر غصب کے دینوی و اخروی احکام کا انطباق ہو گا

(حکومتوں کے غیر شرعی قانون کے سہارے دوسروں کی حق تلفی جائز نہ ہوگی)

(غصب کرنے والے کو غاصب، جس کا حق غصب کیا جائے اسے مَغْصُوبٌ مِنْہ اور جو حق غصب کیا جائے اسے مغصوب کہا جاتا ہے۔)

تحریم: قرآنی آیات اور احادیث کی رو سے غصب شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

آیات: وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ:۱۸۸)

ترجمہ: "اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک، کہ کھاجاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کرکے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔" (یعنی کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو، یا اپنا مال بطریق رشوت حاکم تک نہ پہنچاؤ کہ حاکم کو موافق بنا کر کسی کا مال کھالو)

۲) إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ (النساء:۱۰)

ترجمہ: "جو لوگوں کے یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں، اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔"

احادیث: ۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے "بلا شبہ تمہاری جان اور تمہارا مال اور تمہاری عزت و آبرو آپس میں حرام ہے ... (بخاری۔مسلم)

۲) ارشاد نبوی ہے "کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔" (دارقطنی)

۳) آپ ﷺ کا ارشاد ہے "جو ظلماً بالشت بھر زمین پر قبضہ کرے تو اسے بروزِ قیامت ساتوں زمین کا طوق پہنایا جائے گا۔ (بخاری۔مسلم)

آپ ﷺ کے دور مسعود سے لے کر دور حاضر تک تمام مسلمانوں کا غصب کی تمام انواع واقسام کی حرمت پر اجماع ہے۔

غصب کے احکام

اخروی حکم: آخرت میں گناہ اور سزا کا مستحق قرار پائے گا، کیونکہ غصب کبیرہ گناہ ہے، اور عمداً جان بوجھ کر گناہوں کا ارتکاب آخرت میں عذاب اور گرفت کا سبب بنتا ہے، جبکہ توبہ کی مہلت گزرنے سے پہلے ہی دنیا میں صحیح توبہ نہ کرے۔

دنیاوی احکام: ۱) **حاکم کا غاصب کی تادیب:** حاکم غاصب کو بطور تادیب مناسب سزا (مار، قید وغیرہ) دے، جو آئندہ اسے اور دوسروں کو اس حرکت سے باز رکھے، یہاں تک کہ مغصوب منہ غاصب کو معاف کردے تب بھی حاکم کو اس کا اختیار ہوگا، کیونکہ یہ حق اللہ ہے، تاکہ آئندہ ظلم اور تعدی کا دروازہ بند ہوجائے۔

۲) **غصب سے فوراً باز آنا:** غصب ایک گناہ ہے، اور گناہ سے حتی الامکان فوراً باز آنا واجب ہے۔ لہٰذا مغصوب (غصب شدہ حق) اگر موجود ہے، تو اسے فوراً واپس کردے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی ہرگز کسی کی کوئی چیز حقیقتاً یا بطور مزاح و تماشہ نہ لے، اگر کسی نے (مثلاً) اپنے

بھائی کی لاٹھی (بھی) لی ہو تو اسے واپس کر دے۔" (ابوداود۔ترمذی)

جس جگہ سے غصب کیا تھا، مغصوبہ شئی کو وہاں لے جا کر لوٹا دے، لوٹانے کی ذمہ داری اور اخراجات غاصب کے ذمہ ہیں، کیونکہ لوٹانا اس پر واجب ہے، اور جب لوٹانے کے لئے خرچ ہو تو وہ بھی اس پر واجب ہو گا، کیونکہ واجب کی ادائیگی اور تکمیل کے لئے جو امور ضروری ہوں، وہ بھی واجب ہوتے ہیں۔

مغصوب چیز کو جس سے غصب کیا تھا، اس کے سامنے لے جا کر پیش کر دینا کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اسے اپنے قبضہ میں لے سکے، یہ ضروری ہے، دیگر حقوق میں صاحب حق کو اس پر قبضہ اور اس سے استفادہ کی راہ میں جو رکاوٹ اور موانع ہوں، ان کا ازالہ اور دور کرنا ضروری ہے۔

مغصوب صاحبِ حق کے سپرد کرے، تو اب غاصب غصب کے حکم سے نکل گیا اور ضمان سے بری ہو گیا۔

۳) **غاصب کے پاس مغصوب تلف ہونے کی صورت میں ضمان:** اگر مغصوب غاصب کے پاس تلف ہو جائے تو وہ اس کا ضامن ہو گا، خواہ وہ تلف کرے یا وہ خود بخود تلف ہو جائے، یا کسی آسمانی ناگہانی آفت کی وجہ سے تلف ہو یا کسی اور سبب سے، کیونکہ اس پر اپنا قبضہ جمانا خود اس کی زیادتی اور ظلم ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے "جس نے کوئی چیز لی وہ اس کے ذمہ ہے۔ یہاں تک کہ اسے لوٹا دے، (ترمذی۔ابوداود۔ابن ماجہ) اس سے صراحتاً ثابت ہوا کہ لوٹانا غاصب کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا تلف کی وجہ سے وہ چیز نہ لوٹا سکے تو ضامن ہو گا، اور اس کا بدل یعنی مثل یا قیمت لوٹانا لازم ہے۔

مغصوب کے ضمان کی کیفیت: جب مغصوب تلف ہو جائے تو غاصب پر لازم ہے کہ بدل میں اس کے زیادہ مشابہ اور قریب تر چیز لوٹائے۔

پس اگر مغصوب مثلی ہے، تو مثل کا لوٹانا واجب ہے، کیونکہ ارشادِ ربّانی ہے: "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ" (النمل: ۱۲۶)

ترجمہ: "اور اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔" (دونوں کی رضامندی سے مثلی کے بدلہ قیمت لینا جائز ہے۔ (فتح المعین)

مثلی اشیاء: یعنی وہ اشیاء جن کے مثل بازار وغیرہ میں دستیاب ہو، اور دونوں میں کوئی خاص تفاوت نہ ہو، دورِ حاضر میں کئی اشیاء مثلی شمار ہوں گی، بالخصوص مصنوعات (کمپنی اور فیکٹری میں تیار ہونے والی اشیاء)، کیونکہ یہ اشیاء ایک ہی مشین سے تیار کی جاتی ہیں۔ جو چیز کیل کے ذریعہ یعنی ناپ کے ذریعہ فروخت ہو جیسے تیل وغیرہ یا وزن کے ذریعہ جیسے شکر وغیرہ تو یہ بھی مثلی ہیں۔ جس میں تعداد اور شمار کا اعتبار ہوتا ہو اور تقریباً ایک طرح کے ہوں جیسے انڈے، اخروٹ وغیرہ اور جو گز یا میٹر وغیرہ سے ناپے جاتے ہوں جیسے کپڑے، جبکہ ایک ہی نوع کے ہوں، مثلی شمار ہوں گے۔

اگر مذکورہ تفصیل کے مطابق اس کا مثل نہ ہو تو ایسی چیز کو قیمی کہا جائے گا۔ لہٰذا اگر مغصوب قیمتی ہو، یا مثلی ہو لیکن مثل کا لوٹانا دشوار ہو، تو اس مغصوب کی قیمت لوٹانا لازم ہے۔ حیوانات، مکانات، گاڑیاں اور دیگر ساز و سامان وغیرہ جو مختلف صفات کی وجہ سے مختلف قیمت کے ہوتے ہیں قیمی کہلاتے ہیں۔

مثلی کے لوٹانے کی دشواری کی صورت: وہ چیز بازار میں بالکل نایاب ہو، یا اس کی عام اور مناسب قیمت سے بہت

زیادہ مہنگی مل رہی ہو، تو قیمت لوٹانا کافی ہے۔

قیمت کی تعیین: اگر مغصوب مثلی ہے، اور بوقتِ تلف بازار میں دستیاب تھی، تو غصب کے وقت سے لے کر ادائیگی کی دشواری کے درمیان اس کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت رہی ہو گی، وہ لوٹانا لازم ہے۔ اگر بوقتِ تلف بازار میں مفقود تھی، تو غصب سے تلف کے دوران جو اعلیٰ قیمت ہو گی، وہ لوٹانا واجب ہے۔

اگر مغصوب قیمی ہے، تو غصب سے تلف کے دوران جو اعلیٰ قیمت ہو، اس کا لوٹانا واجب ہے۔ اگر بوقتِ غصب ١٠٠٠ روپئے قیمت ہو، پھر اس کی قیمت گھٹ جائے، تو ١٠٠٠ روپئے دینا لازم ہے۔ اگر بوقت غصب قیمت ٥٠٠ روپئے، پھر درمیان میں ١٠٠٠ ہو جائے، پھر اتر کر ٧٠٠ تک پہنچے تو غاصب پر ١٠٠٠ روپئے لوٹانا لازم ہے۔

جس وقت قیمت بڑھ گئی اس وقت بھی وہ غاصب تھا، اور لوٹانا اس پر واجب تھا، لہٰذا وہی قیمت بطورِ ضمان اس پر لازم ہو گی۔

ضمان کے اثرات: غاصب مغصوب کا بدل اور ضمان ادا کرے، تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

(الف) مغصوب منہ اس بدل کا مالک بن جائیگا، لہٰذا اس میں خرید و فروخت اور ہبہ و اجارہ وغیرہ تصرفات انجام دے سکتا ہے۔

(ب) غاصب ضمان کی وجہ سے مغصوب کا مالک نہ ہو گا، لہٰذا مغصوبہ چیز کو برباد سمجھ کر اس کا بدل ادا کرے (مثلاً وہ چیز گم ہو جائے، یا چوری ہو جائے) پھر وہ چیز مل جائے اور غاصب کے قبضہ میں آجائے تو ادا کردہ ضمان کے عوض غاصب اس کا مالک نہ بنے گا، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ چیز مغصوب منہ کو لوٹا دے، کیونکہ اصل میں مغصوب چیز کا لوٹانا واجب تھا۔ وہ دشوار ہونے کی وجہ سے بدل کا حکم دیا گیا۔ پس جب اصل کو لوٹانا ممکن ہو گیا تو اسے ہی لوٹانا واجب ہے، جس سے یہ واضح ہوا کہ غاصب اس کا مالک نہیں بنا۔

اب غاصب نے اصل چیز لوٹا دی تو مغصوب منہ پر لازم ہے کہ پہلے جو بدل اس نے بطور ضمان لیا تھا وہ غاصب کو واپس لوٹا دے، اگر اس میں متصل اضافہ ہو چکا ہو (مثلاً جانور کا موٹا ہونا) تو اسے بھی لوٹائے گا، اگر اضافہ منفصل اور جدا ہو، جیسے بچہ، مکان کا کرایہ وغیرہ تو بدل کے ساتھ اس اضافہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اس کی ملکیت میں پائے گئے ہیں۔ (لیکن اتصال کی صورت میں اضافہ کو اصل سے الگ کرنا ممکن نہیں، اس لئے مجبوراً مکمل لوٹایا جائے گا۔)

۴) **مغصوب شئی میں غاصب کے تصرفات:** اگر غاصب مغصوب میں کوئی تصرف کرے، مثلاً فروخت کرنا، ہبہ، اجارہ، اعارہ یا ودیعت وغیرہ تو اس کا یہ تصرف باطل ہو گا، اور اس پر اس تصرف کا کوئی شرعی اثر مرتب نہ ہو گا، اور وہ شئی جس کے قبضہ میں چلی گئی ہے، اس پر غصب کا حکم نافذ ہو گا، لہٰذا وہ مغصوب شئی کا ضامن ہو گا، کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی ملکیت پر اس کی اجازت کے بغیر قبضہ جمایا ہے، گرچہ وہ شخص اس شئی کے مغصوبہ ہونے سے لاعلم ہو، کیونکہ لاعلمی کی وجہ سے گناہ نہ ہو گا، لیکن ضمان ساقط نہ ہو گا، جیسا کہ کسی دوسرے کا مال لاعلمی میں یا بلا قصد تلف کر دے تو ضامن ہو گا، گرچہ گنہگار نہ ہو گا۔

لہٰذا اگر مغصوب تلف ہو جائے تو مغصوب منہ غاصب اور جس کی طرف وہ چیز منتقل ہوئی تھی، دونوں میں سے کسی سے بھی ضمان کا مطالبہ کر سکتا ہے، اگر غاصب کے علاوہ سے مطالبہ کر کے ضمان وصول کرے، تو وہ یہ مقدار غاصب سے لوٹا لے گا، جبکہ اسے غصب کا علم نہ ہو، اور اس کا قبضہ امانت کا قبضہ ہو، جیسے مُودع اور مُستاجر، اور اگر اس کا قبضہ اصل میں ضمان والا ہو جیسے مستعیر، خریدار اور مقروض وغیرہ تو غاصب سے واپس نہ لیگا۔ کیونکہ غاصب کے ساتھ ان کا معاملہ ہی ضمان کی بنیاد پر ہے، لہٰذا اس کی جانب سے دھوکہ دہی نہیں پائی

گئی، اگر اسے غصب کا علم ہو، تو غاصب سے واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ جب اسے خود غصب کا علم ہے تو غاصب کی طرف سے دھوکہ کا سلوک نہیں پایا گیا۔

۵) **مغصوب شئی میں تغیر:** اگر وہ چیز بذات خود متغیر ہو جائے، مثلاً انڈا غصب کیا تھا پھر وہ چوزہ بن چکا، یا کھیتی غصب کے بعد اناج بن چکا، تو مغصوب منہ اسے واپس لے گا کیونکہ یہ اسی کا مال ہے، اگر تغیر کی وجہ سے قیمت گھٹ گئی ہو تو وہ غاصب سے اس نقص کی قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کمی غاصب کے قبضہ میں پائی گئی، اگر قیمت میں اضافہ ہوا ہے تو غاصب کو کچھ نہ ملے گا، کیونکہ یہ اضافہ اصل کی نشو ونما کی وجہ سے اور اس کے تابع ہے، لہٰذا اصل کے مالک کی ملکیت ہو گی۔

اگر غاصب کی کسی حرکت سے مغصوب شئی میں تغیر اور تبدیلی پیدا ہو، تو اس کی تفصیل اس طرح ہے:

اگر کسی دوسری چیز کو اس میں ملائے بغیر صرف غاصب کے عمل کی وجہ سے تغیر ہو، جیسے کپڑے کو دھونا، یا اون کو کاتنا، یا لکڑے سے دروازہ بنانا، تو اسے مالک کو لوٹا دے، کہ یہ اسی کی ملکیت ہے، اور غاصب کو اس کے عمل کا کوئی بدلہ اور اجرت نہ ملے گی، گرچہ اس چیز کی قیمت بڑھ جائے، کیونکہ اس نے بلا اجازت یہ عمل انجام دیا ہے، اس لئے یہ مفت شمار ہو گا، اور عامل کسی اجرت کا مستحق نہ ہو گا۔

اور اگر کسی دوسری چیز کو بھی ملا کر تغیر پیدا ہو، جیسے کپڑا غصب کر کے رنگنا، یا مکان کو رنگ و روغن لگانا یا پلاسٹر کرنا وغیرہ تو:

اس تغیر کی وجہ سے مغصوب کی قیمت میں اضافہ نہ ہو، تو مغصوب منہ اسے واپس لے گا اور غاصب کو کچھ بدلہ نہ ملے گا، کیونکہ اس ملائی ہوئی چیز کی قیمت اسی کے عمل سے ختم ہو چکی۔

اور اگر اس تغیر کی وجہ سے قیمت میں کمی ہو تو غاصب پر اس کمی کا ضمان لازم ہے، کیونکہ اس کی حرکت سے یہ کمی ہوئی ہے۔

تغیر کے بعد قیمت بڑھ جائے، اور اب اس کی قیمت مغصوب کی قیمت اور ملائی ہوئی چیز کی قیمت کے مساوی ہو چکی ہے، تو دونوں اس کی قیمت میں اپنے اپنے حصہ کے تناسب سے شریک ہوں گے۔ لہٰذا اگر مغصوب کی قیمت ۱۰۰ روپئے ہو اور ملائی ہوئی چیز ۵۰ روپئے تو اس کی قیمت کا دو تہائی مالک کا اور ایک تہائی غاصب کا ہے، اگر ہر ایک کی قیمت ۱۰۰، ۱۰۰ روپئے ہے تو اس کی قیمت دونوں میں نصف نصف ہو گی اور اسی طرح...

اور اگر اس کی قیمت دونوں کی مجموعی قیمت کے برابر نہ ہو، مثلاً اب قیمت ۱۵۰ روپئے ہو چکی ہے، اور مغصوب کی قیمت ۱۰۰ اور ملائی ہوئی چیز کی قیمت ۱۰۰ ہے۔ تو مغصوب منہ کو اس کی ملکیت کی قیمت ملے گی (یعنی ۱۰۰) اور غاصب کو ۵۰، یعنی اس کے عمل اور چیز کی وجہ سے جتنا اضافہ ہوا وہ مقدار۔

اگر قیمت دونوں کی مجموعی قیمت سے بھی بڑھ جائے، مثلاً سابقہ مثال میں قیمت ۳۰۰ ہو جائے تو ہر ایک کو اس کی چیز کی قیمت کے تناسب سے اس میں سے ملے گا۔ اگر دونوں کی ملکیت ۱۰۰، ۱۰۰ تھی تو نصف نصف ملے گا۔ اگر ایک کی قیمت دوسرے سے دو گنا تھی تو اسے دو تہائی اور دوسرے کو ایک تہائی ملے گا۔

اگر غاصب کے عمل سے مغصوب کی ذات اور اس کے نام ہی میں تغیر ہو، جیسے گیہوں غصب کر کے اسے پیسنا، یا بکری غصب کر کے اسے ذبح کرنا تو مالک کی ملکیت اس میں ختم نہ ہو گی، مالک اسے واپس لے سکتا ہے، اگر اس عمل سے قیمت میں کمی ہو تو اس کمی کے بدل کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اگر مغصوب منہ اس صورت میں اس کے بدل کا مطالبہ کرے تو اسے اس کا حق نہ ہو گا، کیونکہ اس کا مال خود موجود ہے، لہٰذا بدل

کے مطالبہ کا اختیار نہ ہوگا۔

۶)مغصوب میں نقص اور کمی:

حسّی نقص: اگر نقص ایسا ہو، جس کا ضمان بطور بدل مقرر ہو، جیسے عین (چیز) کے کسی جز کا نقص، تو غاصب کو اس کا ضمان ادا کرنا لازم ہے، خواہ اس کی وجہ سے اس چیز کی قیمت کم نہ ہو، مثلاً کوئی مثلی اشیاء غصب کرے اور اس میں سے کچھ تلف ہو، اور بقیہ کی قیمت مجموع قیمت کے مساوی ہو، یا بکری غصب کرے اور اس کی آنکھ چلی جائے، اور اس کی وجہ سے اس کی قیمت کم نہ ہو، تو ان صورتوں میں غاصب پر تلف شدہ کا مثل یا نقص کی قیمت لازم ہے۔

اگر حسی نقص کا بدل اور ضمان مقرر نہ ہو، تو قیمت کم ہو جائیگی تو اسکا ضمان ہو گا ورنہ نہیں، مثلاً بکری موٹی تھی پھر دبلی ہو گئی، اب اس کی وجہ سے قیمت میں کمی ہو، تو اس نقص کا ضامن ہو گا، اور قیمت پر اثر نہ پڑے تو غاصب پر کچھ لازم نہیں۔

معنوی نقص: یعنی قیمت میں کمی ہو، اور مغصوب شئ میں کوئی کمی نہ ہو، اور یہ بازار میں اس چیز کی قیمت گرنے کی وجہ سے ہو گا، اس صورت میں غاصب اسی حالت میں مغصوب شئ لوٹا دے تو اس نقص کا ضامن نہ ہو گا، کیونکہ شئ اپنی حالت پر باقی ہے، فرق لوگوں کی مانگ کا ہے، البتہ مغصوب یا اس کا ایک جز تلف ہو جائے، تو مغصوب کی یا تلف شدہ جزء کی اعلیٰ قیمت کا ضامن ہو گا، جیسا کہ گذر چکا۔

۷)مغصوب کے زوائد: غاصب کے قبضہ میں مغصوب شئ میں اضافہ اور زیادتی ہو، تو یہ اضافہ مغصوب منہ کا ہو گا، کیونکہ اسی کی ملکیت کی آمدنی ہے، اور اصل کی طرح یہ بھی غصب کے حکم میں ہو گا اور غاصب اس کا ضامن ہو گا، کیونکہ اصل کے تابع ہے، اس لئے حکم میں بھی تابع ہو گا۔

اضافہ متصل ہو جیسے موٹاپا یا منفصل (جدا) جیسے درخت کے پھل، جانور کے بچے وغیرہ، دونوں صورت میں یہی حکم ہو گا۔

پس اگر منفصل اضافہ غاصب کے پاس تلف ہو جائے تو اصل کی طرح اس کا بھی ضامن ہو گا، اسی طرح غاصب کے پاس جانور موٹا ہونے کے بعد پھر دبلا ہو جائے تو قیمت کے تفاوت کا ضامن ہو گا۔

۸)مغصوب کے منافع: اگر مغصوبہ چیز کی کوئی منفعت ہو، جیسے مکان کی رہائش، جانور کی سواری، کار کی سواری وغیرہ، تو یہ بھی غاصب کے ضمان میں داخل ہے، خواہ وہ خود انتفاع کرے یا کسی اور کے سپرد کرے یا انتفاع ہی نہ کرے۔ لہٰذا غاصب پر غصب سے واپسی یا تلف تک کی جو اعلیٰ اجرتِ مثل ہو گی، وہ لازم ہے، جبکہ اتنی مدت گزر چکی ہو، جس کے مقابلہ میں عموماً اجرت اور کرایہ ہوتا ہے۔ کیونکہ منافع بھی مال ہیں۔ اور اس نے اصل کو غصب کر کے مالک کو اس سے محروم کر دیا، لہٰذا منافع کا بھی غاصب شمار ہو گا، اور اس کا بدل یعنی اجرت مثل لوٹانا واجب ہو گا۔ اور اعلیٰ اجرتِ مثل لازم ہے کیونکہ یہ ظالم اور غاصب ہے اور اس اعلیٰ اجرت کو اس نے مالک سے فوت کر دیا، تو یہ اس کا بھی غاصب ہے۔

یہ اجرت منافع کا بدل ہے، لہٰذا اگر چیز تلف ہو جائے تو اس کا بھی ضمان لازم ہے۔

۹)مغصوبہ زمین میں تعمیر اور باغبانی یا کاشتکاری: اگر زمین غصب کر کے اس پر عمارت بنائے، یا درخت لگائے تو عمارت کو ڈھانے اور درختوں کو اکھاڑنے کا حکم دیا جائیگا، اور حسبِ سابق زمین کو درست کرنا ضروری ہو گا، اگر اس سبب سے زمین کی قیمت کم ہو جائے تو اس کمی کا بدل بھی دینا لازم ہے، نیز اتنی مدت گزر چکی کہ اس کے مقابلہ میں کرایہ وصول کیا جاتا ہو، تو اس مدت کا معقول کرایہ بھی غاصب پر لازم ہے، کیونکہ ان سارے امور میں اس کی تعدی کو دخل ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ”ظالم جڑ

کا کوئی حق نہیں"(ابوداود، ترمذی)

اگر مالک عمارت یا درخت کی قیمت دے کر اسے خریدنا چاہے، تو غاصب پر یہ لازم نہیں، کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہے، لہٰذا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے لیا نہیں جاسکتا، اگر دونوں اس پر متفق ہوں تو صحیح ہے۔

اگر عمارت اور درخت بھی زمین کے مالک سے غصب شدہ ہو، اور مالک انہیں اپنی زمین میں باقی رکھنا چاہتا ہو، تو غاصب کو عمارت ڈھانے یا درخت اکھاڑنے کا اختیار نہ ہوگا، اور (عمارت کے بنانے اور درختوں کے لگانے میں) اس کی محنت کا کوئی معاوضہ نہ ملے گا، کیونکہ مالک کی اجازت نہ تھی۔ اگر اس عمل کی وجہ سے مجموعی قیمت میں کمی نہ آئے تو غاصب پر کچھ لازم نہیں، اگر کمی آئے تو اس کا بدل لازم ہے۔

اگر غاصب زمین میں اناج بوئے تو مالک اسے بیج نکال کر زمین درست کر کے دینے پر مجبور کر سکتا ہے، نیز نقص کا بدل اور اس مدت کی اجرتِ مثل بھی غاصب پر لازم ہو گی۔

اگر مالک بیج کی قیمت دے کر اسے زمین میں باقی رکھنا چاہے، تو غاصب اسے نکال نہیں سکتا، کیونکہ عموماً غاصب کو اس سے کچھ نفع نہ ہو گا۔

۱۰) مغصوب کو دوسرے کے ساتھ خلط کرنا (ملانا): اگر مغصوب شئی کسی دوسری چیز میں مل جائے، یا ملائی جائے، اور اسے جدا کیا جاسکتا ہو تو غاصب پر جدا کرنا لازم ہے، خواہ اس میں مشقت درپیش ہو، اور جدا کرنا ممکن نہ ہو تو اب اس کا لوٹانا بالکل دشوار ہو چکا، لہٰذا تلف شدہ چیز کے مشابہ ہو گا (اور غاصب اس کا مالک بن جائے گا، لیکن جب تک بدل نہ ادا کرے اس میں تصرف نہیں کر سکتا) (فتح المعین) تو مالک کو بطور بدل اس کا مثل یا اس کی قیمت لوٹانا لازم ہے۔ جس کی تفصیل گزر چکی۔

اگر مغصوب کی جنس کے ساتھ ہی خلط کرے، اور خلط شدہ چیز مغصوب ہی کے مثل یا اس سے بہتر ہو تو غاصب اسی مخلوط سے بدل ادا کر سکتا ہے، اگر مغصوب سے کمتر درجہ کی چیز مخلوط ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر اس میں سے بدل ادا نہیں کر سکتا (مثلاً گیہوں غصب کر کے اسی طرح کے، یا اس سے بہتر گیہوں میں شامل کر دے تو اسی میں سے بدل دے سکتا ہے، لیکن اس سے کمتر گیہوں میں شامل کرے تو مالک کی مرضی ضروری ہے)

۱۱) مغصوب کو لوٹانا، خواہ غاصب کا ضرر ہو: اگر مغصوب کے لوٹانے میں غاصب کو کافی ضرر اور نقصان ہو، تب بھی فوراً لوٹانا اس پر لازم ہے، اور اس ضرر کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ غصب کی وجہ سے وہ ظالم اور متعدی ہے، لہٰذا لکڑی غصب کر کے مکان یا کشتی میں استعمال کرے، تو وہاں سے نکال کر واپس کرنا لازم ہے، خواہ مکان منہدم ہو جائے یا کشتی ڈوب جائے، نیز غاصب پر نقص کا تاوان اور اجرتِ مثل لازم ہے، اور مکان یا کشتی کسی دوسرے کی ہو اور اسے غصب کا علم نہ تھا، تو اسے بھی نقص کا تاوان دینا لازم ہے۔

اگر اس مغصوب کے لوٹانے سے معصوم الدم شخص (یعنی جسے مارنا شرعاً جائز نہ ہو) یا محترم حیوان (یعنی شرعاً جسے مارنے کا حکم نہ ہو، اور اس کا مالک بننا یا پالنا جائز ہو) کی موت ہوتی ہو، یا کسی مسلمان یا ذمی کا مال برباد ہوتا ہو، تو اسے لوٹانا لازم نہیں، بلکہ مثل یا قیمت کی شکل میں ضمان ادا کرے گا۔

۱۲) غاصب اور مغصوب منہ کا اختلاف:

(الف) مغصوب کے تلف ہونے نہ ہونے کے متعلق اختلاف: غاصب مغصوب شئی کے تلف ہونے کا دعویٰ کرے اور مغصوب منہ (مالک) اس کا انکار کرے، تو غاصب سے قسم لے کر اس کی تصدیق کی جائے گی، اور مالک کو اس کا بدل ادا کرے گا۔

(ب) مغصوب کی قیمت: مغصوب کے تلف پر دونوں متفق ہوں، لیکن اس کی قیمت میں اختلاف ہو، مثلاً مالک کہے: قیمت ۱۰۰۰ روپۓ تھی، اور غاصب کہے: ۸۰۰ روپۓ کی چیز تھی تو غاصب کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کریں گے، کیونکہ مالک زیادتی کا دعویٰ کر رہا ہے اور غاصب اس کا انکار کر رہا ہے اور اصل اس کا زیادتی سے بری ہونا ہے۔ لہٰذا قسم کے ساتھ اس کی بات مانی جائے گی، اگر زیادتی کے بارے میں مالک بیّنہ (گواہ) پیش کرے تو غاصب پر وہ لازم ہے۔

(ج) مغصوب کی صفت یا مقدار: مثلاً مالک کہے کہ مغصوبہ مکان پلاسٹر شدہ تھا، اور غاصب اس کا انکار کرے، یا مالک دعویٰ کرے کہ ۲۰ ر کلو گیہوں غصب کیا اور غاصب صرف ۱۰ ر کلو غصب کا اقرار کرے وغیرہ تو ان صورتوں میں غاصب کی تصدیق مع قسم کی جائے گی۔

اگر مغصوب میں کسی نئے عیب کے متعلق اختلاف ہو، یعنی صفتِ نقص کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً مالک کا دعویٰ ہو کہ مغصوب میں کوئی عیب نہ تھا، اور غاصب دعویٰ کرے کہ مغصوب عیب دار تھا:

تو اس صورت میں اگر مغصوب چیز تلف ہو چکی ہو، تو مالک کی مع قسم تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل اور غالب عیب کا نہ ہونا ہے، اور جس کا دعویٰ اصل کے مطابق ہو اس کا اعتبار ہو گا۔

اور اگر مغصوب موجود ہے، اور غاصب اپنے دعویٰ کے مطابق عیب دار حالت میں لوٹائے، تو غاصب کی مع قسم تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اصل اس سے زائد کے ضمان سے بری ہونا ہے۔

(د) مغصوبہ شئی کا لوٹانا: اگر غاصب واپسی کا دعویٰ کرے، اور مالک انکار کرے، تو مالک کی بات کو مع قسم تسلیم کیا جائے گا، کیونکہ مغصوب غاصب کے قبضہ میں تھا اور اصل نہ لوٹانا ہے، لہٰذا جو اصل کے مطابق دعویٰ کرے یعنی مغصوب منہ، اس کی بات مانی جائے گی، لہٰذا غاصب وہ چیز، ورنہ اس کا بدل مغصوب منہ کو لوٹائے۔

متفرق مسائل

۱) تین اشخاص میں مشترک مال میں سے ایک تہائی پر یا اس کی آمدنی کے ایک تہائی پر کوئی جبراً اس نیت سے تسلط جمائے کہ یہ اس میں سے ایک کا حصہ ہے، تو بقیہ دو تہائی میں تینوں مشترک ہوں گے (تینوں کا حق ہو گا) اور تسلط جمانے کے والے کے قصد اور تقسیم کر کے ایک تہائی جدا کرنے سے کوئی اثر نہ ہو گا کیونکہ اس کی یہ تقسیم غیر معتبر ہے۔ جیسا کہ کوئی ظالم زید کا مال یہ سمجھ کر غصب کرے کہ یہ جمیل کا مال ہے، تو زید جمیل سے رجوع نہیں کر سکتا، کیونکہ اصول یہ ہے کہ مظلوم ظالم کے علاوہ سے رجوع نہیں کر سکتا (اپنا حق نہیں لے سکتا)، اس کے برعکس اگر دو شخص کسی غلام (وغیرہ) میں شریک ہوں اور ایک اپنا حصہ غاصب کو فروخت کر کے قیمت وصول کر لے، تو دوسرا شریک اس قیمت میں شریک نہ ہو گا، کیونکہ اس کا حصہ ابھی باقی ہے، فروخت نہیں ہوا (بغیۃ المسترشدین ص ۱۵۶)

۲) بادشاہ عوام پر ایک مخصوص رقم مصالح پر صرف کرنے کے لئے مقرر کرے، اور وہ اپنی خوشی سے اسے ادا کریں نہ کہ خوف یا حیاء کی وجہ سے، تو اس کا لینا جائز ہے، ورنہ باطل طریقے پر لوگوں کا مال کھانا شمار ہو گا، اور اسے اس میں کسی بھی طرح کا تصرف حلال نہیں، مصالح اور کارِ خیر میں صرف کرنے کے ارادہ سے وہ حلال نہ ہو گا۔ (بغیۃ۔ ۱۵۸)

۳) کسی سے درخت خرید کر اس کا پھل استعمال کرتا رہا، پھر معلوم ہوا کہ درخت وقف تھا، تو استعمال شدہ پھلوں کا ضامن ہو گا۔

........فروخت کرنے والے کو صرف قیمت لوٹانا لازم ہے، نیز وہ گنہگار ہوگا۔(بغیۃ۔۱۵۷)

۴)امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جو لوگوں کے سامنے کسی سے مال طلب کرے، اور وہ محض حیاء کی وجہ سے دے (نہ کہ برضا اور غبت) تو یہ اس کا مالک نہ بنے گا، اور اسے اس میں تصرف کرنا حلال نہیں، بلکہ ناحق دوسروں کا مال کھانے میں شامل ہے (اعانۃ الطالبین ۱۳۷/۳)

۵)مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کو، یا بازار وغیرہ میں بیٹھے شخص کو اٹھانا، یا جس مسافر خانہ میں کسی کو رہنے کا حق ہو، اسے اس سے روکنا غصب میں داخل ہے(اعانۃ ۱۳۷/۳)

۶)غصب کی قسمیں:

(۱)کسی کے متمول مال پر ظلماً قبضہ جمائے تو گناہ اور ضمان دونوں ہوگا۔

(۲)کسی کے اختصاص یا غیر متمول مال پر ظلماً تسلط کی صورت میں گناہ ہوگا، نہ کہ ضمان۔

(۳)کسی کے متمول مال کو اپنا مال سمجھ کر اس پر قبضہ کرے تو ضمان لازم ہے، گناہ نہ ہوگا۔

(۴)کسی دوسرے کے اختصاص کو اپنا سمجھ کر قبضہ کرے تو نہ ضمان لازم ہے اور نہ گناہ ہوگا(اعانہ ۱۳۷/۳)

(۷)کسی کے بستر پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھنا غصب میں شمار ہے، اگرچہ اسے منتقل نہ کرے، اس کے اٹھنے کے بعد دوسرا بیٹھے تو اب وہ غاصب ہے، اور جس کے ہاتھ سے بھی وہ تلف ہو، وہ ضامن ہوگا، اگر دونوں کے منتقل ہونے کے بعد تلف ہو تو مالک کسی سے بھی ضمان لے سکتا ہے، پھر وہ دوسرے سے وصول نہیں کر سکتا(اعانۃ ۱۳۷/۳)

(۸)کسی کو اس کے مکان سے نکالنا، یا داخل ہونے نہ دینا، غصب میں داخل ہے، (خواہ یہ شخص خود داخل نہ ہو) اجازت کے بغیر کسی کی سواری پر سوار ہونا بھی غصب میں داخل ہے، خواہ مالک کے سامنے ہو(اعانۃ ۱۳۷/۳)

(۹)کوئی لوہار کی بھٹی میں داخل ہو، اور چنگاری اڑ کر اس کا لباس جلائے تو لوہار ضامن نہ ہوگا۔ اگر کسی کے چپل مسجد سے گم ہو جائیں اور دوسرے وہاں موجود ہوں تو اسے پہننا جائز نہیں، خواہ جو اس کی چپل لے گیا ہے، اس کے ہو، البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ اس کے چپل لے جانے والے کے چپل ہیں، تو اسے فروخت کر کے اپنے چپل کی قیمت کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے ورنہ یہ لقطہ ہے۔(الشروانی علی التحفۃ ۲۹۳/۷)

(۱۰)کوئی حربی کسی مسلمان یا ذمّی کا مال غصب کرنے کے بعد اسلام لائے، اور وہ مال موجود ہو تو لوٹانا لازم ہے، اور موجود نہ ہو تو ضمان لازم نہ ہوگا(تحفۃ المحتاج ۲۹۹/۷)

(۱۱)غاصب غصب شدہ شئی مالک کے سامنے اسی حالت میں رکھے اور وہ کھا جائے، تو غاصب بری ہو جائے گا، خواہ اسے معلوم نہ ہو کہ یہ میری ہی چیز ہے، البتہ اسے کسی چیز میں ملا کر اور پکا کر کھلائے (مثلاً آٹا غصب کر کے اس سے حلوہ بنا کر کھلائے) تو بری نہ ہوگا۔(تحفۃ ۳۰۸/۷)

(۱۲)ہر مکلف پر منکر (حرام اور خلافِ شرع امور) کا ازالہ اور اس سے روکنا واجب ہے، جبکہ وہ اس پر قادر ہو، گرچہ عورت یا فاسق ہی کیوں نہ ہو، اور ایک ممیز کو بھی اس پر بالغ کی طرح ثواب ملے گا۔ بت اور آلاتِ موسیقی اور حرام برتنوں کو توڑنے پر کچھ واجب نہ ہوگا، البتہ صرف اتنا توڑے کہ حرام استعمال کی شکل بالکل ختم ہو جائے، بلاوجہ اس سے زیادہ توڑے تو اس زیادتی کا ضامن ہوگا۔

(تحفۃ ۷/۳۳۲)

(۱۳) کئی لوگوں کے مثلاً روپئے غصب کرکے خلط ملط کرے کہ ہر ایک کے جدا سمجھ میں نہ آئے، پھر اسے تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے حق کے بقدر واپس کردے، تو یہ ان کے لئے جائز ہے، اگر کسی ایک ہی کو اس کا حصہ دے، تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اور بقیہ لوگوں کے مقدار کے تناسب سے وہ رقم آپس میں بانٹ لیں۔ اگر اصحابِ حقوق کا علم نہ ہو، اور نہ آئندہ علم کا امکان ہو، تو یہ مال بیت المال کے سپرد ہوگا۔ (اور بیت المال کے مصارف پر صرف ہوگا) اور اگر آئندہ علم کا امکان ہو تو حفاظت کی خاطر امام (حاکم) کے سپرد کرے (تحفۃ ۷/۳۶۲)

(۱۴) کوئی مرگی کی وجہ سے کسی کے مال پر گر جائے اور مال تلف ہو، تو وہ ضامن ہوگا، جیسا کہ بچہ جھولے سے مال پر گرنے کی صورت میں ہوگا (نہایۃ المحتاج ۵/۱۵۲)

(۱۵) کسی کی بکری یا کبوتر کو ذبح کرنے کی وجہ سے ان کا بچہ مر جائے تو دونوں کا ضامن ہوگا (نہایۃ ۵/۱۵۳)

(۱۶) کسی پرندے کا پنجرہ کھول کر اسے اکسائے اور وہ اڑ جائے، یا بغیر اکسائے فوراً اڑ جائے تو اس کا ضامن ہوگا، اگر کچھ دیر کے بعد اڑے تو ضامن نہ ہوگا۔ (نہایۃ ۵/۱۵۴)

شُفعہ

شُفعہ شُفْعٌ سے ہے، جس کا مطلب لغت میں ضم کرنا، جوڑنا اور جمع کرنا ہے۔ فقہی اصطلاح میں شفعہ کا مطلب ہے: قہراً (جبراً) مالک بننے کا حق، جو قدیم شریک کو جدید شریک پر حاصل ہوتا ہے، اس شئ میں جس کا وہ عوض سے مالک ہوا ہے، اسی عوض کے بالمقابل، تاکہ اس (قدیم شریک) کے ضرر کو دور کیا جاسکے۔

مثلاً کسی کے گھر میں دو اشخاص شریک ہوں، پھر ایک شریک اپنا حصہ دوسرے شریک کے بجائے کسی اور کو فروخت کرے، تو اس شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خریدار (نئے شریک) سے اسی قیمت پر اس کی رضامندی کے بغیر وہ حصّہ لے لے۔

اس حق کے ذریعہ چونکہ قدیم شریک اپنے حصہ کے ساتھ جدید شریک کے حصہ کو بھی ملالیتا اور جمع کرلیتا ہے، اس لئے اسے شفعہ کہا گیا ہے

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر وہ شئ جس کی تقسیم نہ ہوئی ہو، اس میں حقِ شفعہ کا فیصلہ دیا ہے، جب (تقسیم اور) حد بندی ہو جائے اور راستے جدا مُتمیز ہو جائیں تو پھر حق شفعہ نہیں“ (متفق علیہ)

حِکمتِ مشروعیت: شریعتِ اسلامیہ ہمیشہ لوگوں کے مصالح کو پیش نظر رکھتی ہے، لہٰذا جب ایک شریک کسی مصلحت سے اپنا حصہ بیچتا ہے تو شریعت اس کے آڑے نہیں اتی، البتہ دوسرے شریک کے مصلحت کو بھی مد نظر رکھتی ہے، کیونکہ کسی اور کو بیچنے کی صورت میں ممکن ہے اس کی بد اخلاقی وغیرہ سے یہ پریشان ہو جائے، یا وہ تقسیم کا مطالبہ کرے، جس کی وجہ سے تقسیم کے مصارف اور جد احمام و بیتُ الخلاء جیسے اسبابِ ضرورت و سہولت کی تعمیر کا بوجھ پڑے، جو اس کے ضرر کا باعث ہے، نیز یہ اسباب آپسی نزاع اور نااتفاقی کا باعث ہوں گے، لہٰذا شریعت نے اپنا حصہ فروخت کرنے والے شریک کو یہ حکم دیا کہ وہ پہلے یہ بات قدیم شرکاء کے سامنے رکھے۔ اگر وہ خریدنا چاہیں تو وہ اس کے اوّلین مستحق ہیں اور ان کا ارادہ نہ ہو تو پھر کسی کو بھی فروخت کرسکتا ہے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے ”کسی کے مکان (یا زمین) یا کھجور کے درخت (و باغ) میں کوئی شریک ہو تو یہ اپنے شریک سے

اجازت کے بغیر (اپنا حصہ) فروخت نہیں کرسکتا، پس اگر وہ شریک راضی ہے، تو لے لے ورنہ چھوڑ دے۔"(مسلم)

شُفعہ کے ارکان

(۱) شَفِیع (۲) مَشْفُوع عَلَیہ (۳) مَشْفُوع فِیہ

۱) **شفیع:** (جسے حقِ شفعہ حاصل ہوتا ہے): حق شفعہ شریک کو حاصل ہوگا، جب تک تقسیم نہ ہو جائے، شریک کا مطلب جو کسی اصل یا اس کے ملحقات میں کسی دوسرے کا شریک ہو، مثلاً کسی گھر اور اس کے مرافق (ضروریات، ناگزیر لوازم مثلاً حمام، بیت الخلاء وغیرہ) اور اس کے راستہ میں شریک ہو، یا کسی زمین میں اور اس کے گھاٹ اور سیرابی کے حق میں اور باڑہ میں شریک ہو۔

جب گھر یا زمین کی تقسیم ہو اور ہر شریک کا حصہ بالکل جدا ہو جائے، پھر کوئی اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کرے (ان قدیم شرکاء کے علاوہ)، تو یہ قدیم شرکاء وہ حصہ حق شفعہ کی بنیاد پر نہیں لے سکتے، خواہ مرافق مثلاً گذرگاہ اور سیرابی کا حق وغیرہ مشترک ہو، کیونکہ حدیث میں گذر چکا کہ حد بندی کے بعد حقِ شفعہ نہ ملے گا، ایسے اشخاص جن کے حصے جدا جدا ہوں، لیکن مرافق میں مشترک ہوں، ان کو شریک مخالط کہا جاتا ہے۔

جب شریک مخالط کو حق شفعہ نہ ملے گا، تو محض پڑوسی وغیرہ کو تو بدرجہ اولیٰ نہیں ملے گا۔

ایک سے زائد شفیع: اپنا حصہ فروخت کرنے والے کے ایک سے زائد شرکاء ہوں، تو ان میں سے ہر ایک کو حق شفعہ حاصل ہوگا، اور ہر ایک کو اپنے حصہ کے تناسب سے استحقاق حاصل ہوگا۔ مثلاً: تین شرکاء ہوں، ایک کا پاؤ حصہ، دوسرے کا پاؤ حصہ اور تیسرے کا نصف حصہ، اب پہلا اپنا حصہ فروحت کرے اور دوسرے دونوں حق شفعہ کی بنیاد پر لینا چاہیں تو دوسرے کو (پاؤ حصے والے کو) ایک تہائی اور تیسرے کو (نصف والے کو) دو تہائی ملے گا۔ کیونکہ استحقاق کا سبب ملکیت ہے، اور اس میں تفاوت ہے۔ شفیع اپنے شریک کا حصہ پورا خریدے یا پورا چھوڑ دے، بعض حصہ خریدے اور بعض ترک کر دے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ایک سے زائد شفیع ہوں، لیکن دیگر حضرات نہ خریدیں، تو اسے مکمل خریدنا یا مکمل چھوڑ دینا ضروری ہے۔

شُفَعَاء میں سے بعض کی غیر موجودگی: شفعاء میں سے کوئی فی الحال موجود نہ ہو، تو بقیہ حضرات اپنے حق کا مطالبہ کر کے وہ حصہ مکمل خرید سکتے ہیں، پھر موجود شفعاء اپنے حصوں کے اعتبار سے تقسیم کرلیں گے، صرف حاضرین اپنا حصہ لیں اور غائب کا چھوڑ دیں، یہ جائز نہیں، مکمل لینے کے بعد جب وہ غائب آجائے گا تو ان شرکاء سے اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور اپنی ملکیت کے تناسب سے اس میں سے حصہ حاصل کرلے گا۔

اگر موجود شفعاء فی الحال فروخت شدہ حصہ نہ لے کر غائب کا انتظار کریں، تو یہ بھی جائز ہے اور اس کے آنے کے بعد سب مل کر مطالبہ کرسکتے ہیں۔

۲) **مشفوع علیه:** اس سے وہ شخص مراد ہے، جس کی ملکیت میں شریکِ قدیم کا حصہ (یعنی محل شفعہ) منتقل ہوا ہے۔ اس کی طرف ملکیت کا یہ انتقال عوض سے ہونا شرط ہے، کبھی یہ عوض مال ہوگا، جیسے خریدنا اور کبھی غیر مال ہوگا، مثلاً شریک نے وہ حصہ مہر مقرر کیا، یا بیوی نے بدلِ خلع مقرر کیا، اگر مشفوع علیہ نے وہ حصہ خریدا ہے، اور قیمت مثلی ہے تو شفیع اسی قیمت سے لیگا۔ اور متقوم ہے مثلاً کپڑا تو بروز فروخت اس (کپڑے) کی جو قیمت ہو، اس قیمت کے بدلہ لے گا۔ اگر مہر مقرر کیا ہے تو بوقتِ نکاح کا مہرِ مثل، اور بدلِ خلع مقرر کیا ہے تو خلع کے وقت کا مہرِ مثل ادا کر کے وہ حصہ لے لے گا۔ خواہ یہ مقدار اس حصہ کی (عام) قیمت سے کم ہو یا زائد۔

شریکِ جدید کی ملکیت میں وہ حصہ بلاعوض منتقل ہوا ہے، تو قدیم شریک کو حقِ شفعہ کی بنیاد پر لینے کا حق نہیں، مثلاً بلاعوض ہبہ، صدقہ، وصیت، وراثت وغیرہ کے ذریعہ اس کی طرف منتقل ہو۔

۳) **مشفوع فیہ:** یعنی جو چیز حقِ شفعہ کی بنیاد پر شفیع لینا چاہتا ہے۔

مشفوع فیہ کا غیر منقول ہونا شرط ہے (یعنی ایسی چیز ہو جو منتقل نہ ہوتی ہو) جیسے مکان، زمین، باغ وغیرہ۔ منقول شئی مثلاً جانور، سازوسامان وغیرہ میں یہ حق نہ ملے گا۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا "شفعہ ہر مشترک شئی میں ہے: (یعنی) زمین میں یا مکان میں یا باغ میں..................." (مسلم شریف)

نیز حقِ شفعہ مستقل بُرے ساتھی کے ضرر سے بچنے کے لئے دیا گیا ہے، اور منقول میں مستقل اور دائم ضرر نہ ہوگا۔ کوئی عمارت یا درخت زمین سمیت فروخت ہو، تو تبعاً اس میں بھی حقِ شفعہ حاصل ہوگا۔

کسی چیز میں حقِ شفعہ اس وقت حاصل ہوگا، جبکہ وہ قابل تقسیم ہو، اور تقسیم شدہ حصہ سے مقصود نفع حاصل ہو سکے، تقسیم کے بعد منفعت باطل ہوتی ہو، تو وہ چیز نا قابل تقسیم سمجھی جائیگی، اور اس میں حق شفعہ نہ ملے گا۔ مثلاً چھوٹا سا حمام، چھوٹی چکی وغیرہ کیونکہ روایت میں گذر چکا کہ غیر منقسم چیز میں حق شفعہ ہوگا۔ تقسیم کے بعد نہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ جو قابلِ تقسیم ہو، اسی میں حقِ شفعہ ہے، کیونکہ پھر نئے شریک کی وجہ سے تقسیم کرنے کا ضرر اور اپنے حصہ میں مرافق کی تعمیر کا خرچ وغیرہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اور جو شئی قابلِ تقسیم نہ ہو، اس میں اس طرح ضرر کا سوال نہیں۔

بعض دیگر شرائط: ۱) مشفوع فیہ میں شریکِ اوّل کی ملکیت اور حق ختم ہو جائے۔ اگر یہ اپنا حصہ کسی دوسرے کو فروخت کرے اور اپنے لئے یا دونوں کے لئے خیار کی شرط لگائے، تو مدتِ خیار تک شفعہ ثابت نہ ہوگا، جب مدتِ خیار مکمل ہو اور بیع فسخ نہ کرے تو اب بیع مکمل ہو چکی، لہٰذا شفعہ ثابت ہوگا، اگر صرف خریدار کے لئے شرطِ خیار ہو تو عقدِ بیع کے فوراً بعد شفیع کو وہ حصہ لینے کا حق ہے۔

اگر عقدِ تملیک (یعنی جس عقد کے ذریعے شریک اول نے کسی دوسرے کو اپنے حصے کا مالک بنایا ہے) کا فساد و بطلان ظاہر ہو، تو حقِ شفعہ نہ ملے گا، کیونکہ بائع (قدیم شریک) کی ملکیت ابھی زائل نہیں ہوئی۔

۲) جدید شریک کے تملیک کے عقد کے وقت شفیع اپنی شرکت کا مالک ہو، اور شفعہ کے فیصلہ تک اس کی ملکیت برقرار رہے۔ اگر شفیع اپنا حصہ، بیع، ہبہ وغیرہ کے ذریعہ اپنی ملکیت سے خارج کر دے، قبل اس کے کہ اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ ہو، تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہو گا۔ خواہ وہ اس سے واقف ہو یا نہ ہو، اور حقِ شفعہ کا مطالبہ کر چکا یا نہ کیا، کیونکہ سببِ شفعہ یعنی شرکت ختم ہو چکی۔

اس شفیع سے وہ حصہ جس کی ملکیت میں گیا، وہ شفیع کا حق استعمال کرتے ہوئے دوسرا حصہ لینا چاہے، تو اسے اجازت نہ ہو گی، کیونکہ اس حصہ کے فروخت کے وقت یہ شریک اور مالک نہ تھا۔

البتہ شفعہ کے فیصلہ سے قبل شفیع انتقال کر جائے، تو وارثوں کو یہ حق ملے گا، کیونکہ شفعہ ان حقوق میں سے ہے، جن میں وراثت چلتی ہے۔ موت سے قبل شفیع نے شفعہ کا مطالبہ کیا ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں وارث کو حق ملے گا۔

۳) شفیع کی جانب سے کوئی ایسی بات نہ پائی جائے جو شفعہ سے اعراض اور درگذر پر دلالت کرے، مثلاً وہ یہ اعلان کر دے کہ شریکِ جدید کی ملکیت سے وہ راضی ہے، یا اس کے کسی قول یا عمل یا سکوت و خاموشی سے یوں معلوم ہو کہ اسے شفعہ کی رغبت نہیں، مثلاً

اس کے سامنے خرید وفروخت ہو، پھر وہ مجلس سے اٹھ کر چلا جائے اور مطالبہ نہ کرے، یا فروخت کی اطلاع ملنے کے باوجود کافی عرصہ تک بلا کسی عذر کے وہ شفعہ کا مطالبہ نہ کرے، ان صورتوں میں اب آئندہ اسے مطالبہ کا حق نہ ہو گا۔

البتہ درج ذیل صورتوں میں بظاہر اعراض کے باوجود اسے شفعہ کے مطالبہ کا حق ہو گا:

(الف) صحیح عوضِ تملیک کا علم نہ ہو، مثلاً اسے بتایا گیا کہ ایک لاکھ میں فروخت کیا، چنانچہ اس نے مطالبہ نہ کیا پھر یہ راز کھلا کہ مثلاً نوے ہزار میں فروخت ہوا ہے۔ کیونکہ پہلے اس کا اعراض رضامندی سے نہ تھا۔ عوض کی زیادتی کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا یہ اعراض شریکِ جدید کی رضامندی کی دلیل نہیں۔ (اگر بعد میں معلوم ہوا کہ قیمت زیادہ تھی تو حق نہ ملے گا)

(ب) اسے بتایا گیا کہ خریدار فلاں شخص ہے، پس اس نے مطالبہ نہ کیا، پھر پتا چلا کہ خریدار کوئی دوسرا شخص ہے، تو اب وہ شفعہ کا مطالبہ کر سکتا ہے، کیونکہ کبھی انسان ایک کی شرکت کو پسند کرتا ہے اور دوسرے کی شرکت کو ناپسند کرتا ہے۔

(ج) شفیع کو یہ کہا گیا کہ عوض معجّل (نقد) ہے پھر یہ حقیقت کھلی کہ عوض مؤجل (اُدھار) ہے، تو اب وہ شفعہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ گرچہ پہلے اعراض کر چکا ہو، کیونکہ کبھی انسان ادھار خریدنے پر قادر ہوتا ہے، لیکن نقد پر قادر نہیں ہوتا۔

(د) شریک نے دوسرے کو کتنا حصہ دیا ہے، اس کی صحیح مقدار معلوم نہ ہو، مثلاً پہلے بتایا کہ صرف نصف حصہ دیا ہے، پھر پتہ چلا کہ مکمل حصہ دیا ہے، یا اس کے برعکس، تو شفیع نے پہلے اعراض برتا ہو تو اب حقیقت کھلنے کے بعد مطالبہ کر سکتا ہے۔

(۴) شفیع حقِ شفعہ کے مطالبہ میں ممکنہ مبادرت (جلدی) کرے، کیونکہ یہ فوری حق ہے۔ لہٰذا ضعیف حق ہے، حدیث میں وارد ہے: "شفعہ اونٹ کی رسی کھولنے کی طرح ہے" (ابن ماجہ) یعنی: جلد مطالبہ نہ کرے تو فوت ہو جائے گا۔ جیسا کہ رسی کھلتے ہی اونٹ بدک کر بھاگ جاتا ہے، اسی لئے شفیع کو جیسے ہی پتہ چلے کہ شریک کا حصہ دوسرے کی طرف منتقل ہوا ہے، تو عادت وامکان کے مطابق فوراً مطالبہ واجب ہے، اگر رات میں پتہ چلا تو دن نکلنے تک تاخیر کر سکتا ہے۔ اگر بیمار ہے یا بستی میں نہیں ہے تو کسی کو وکیل بنا دے، ورنہ کسی کو اس پر گواہ رکھے کہ مجھے شفعہ چاہئے۔ (گواہ دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور پھر شفیع کی قسم)

شفعہ کے ثبوت کے لئے کسی حاکم کا فیصلہ، یا خریدار کی حاضری اور اس کی رضامندی اور قیمت حاضر کرنا شرط نہیں، بلکہ ایسے الفاظ سے مطالبہ کرنا، جو حقِ شفعہ کی بنیاد پر اس حصہ کو اپنی ملکیت میں لینے پر دلالت کرے، شرط ہے مثلاً میں شفعہ کی رو سے اس چیز کا مالک بنا، یا وہ چیز میں نے لی۔

قیمت کا خریدار کے حوالہ کرنا، یا شفیع کے ذمہ بطورِ قرض رہنے پر اس کا راضی ہونا شرط ہے، اگر یہ نہ ہو اور قاضی (حاکم) شفعہ کا فیصلہ دے، تو اس سے بھی مالک بن جائے گا۔

شُفعہ کے احکام

۱) **حقِ شُفعہ کا ساقط ہونا:** بعض اسباب سقوط گذر چکے، مزید ایک سبب معاوضہ لے کر صلح کرنا ہے، مثلاً شفیع خریدار سے کچھ مال لے کر صلح کر لے تاکہ اس کا حصّہ اسی کو چھوڑ دے، تو یہ صلح باطل ہے شفیع کو کوئی معاوضہ نہ ملے گا، اور اس کا حقِ شفعہ بھی ساقط ہو گا۔

۲) **خریدار کا مشفوع فیہ میں تصرّف کرنا:** کسی مشترک مکان یا زمین وغیرہ کا ایک حصہ خریدنے والے کو چاہئے کہ

اس میں کوئی تصرف نہ کرے، جب تک کہ شفیع کا نظریہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا حق اس خریدار پر مقدم ہے، اور شفیع جب اپنا حق ترک کر دے، تبھی اِس خریدار کی ملکیت اس میں پختہ ہو گی، البتہ شفیع کے مطالبہ یا موقف کی وضاحت سے قبل یہ جدید خریدار اُس میں کچھ تصرف کرلے، تو یہ صحیح اور نافذ ہو گا، لیکن اِس سے شفیع کا حق باطل نہ ہو گا، بلکہ ہر وہ تصرف جس میں ابتداءً پائے جانے کی صورت میں شُفعہ نہیں ہوتا، اُسے ختم کر سکتا ہے، جیسے ہبہ وقف اور اجارہ، اور پھر وہ چیز شفعہ کے سبب لے لے گا، کیونکہ اس کا حق ان تصرفات پر مقدم ہے، لہٰذا ان سے باطل نہ ہو گا۔

لیکن خریدار کا جدید تصرف بھی ایسا ہو، جس سے شُفعہ حاصل ہوتا ہے، جیسے فروخت کرنا، تو شفیع کو اختیار ہے، چاہے تو اس جدید تصرف کی بنیاد پر حقِ شفعہ کی وجہ سے لے لے، یا اسے ختم کر کے پہلے ثابت حق کی وجہ سے لے۔ اس اختیار کا ایک فائدہ اسے یہ ہو گا کہ کسی ایک میں عوض کم، یا کوئی اور سہولت ہو گی، پس جو بہتر ہو، اسے وہ اختیار کر لے گا۔

اگر خریدار اپنے حصے میں کوئی ایسا تصرف کرے، جو اس میں اضافہ یا نقص و کمی کا باعث ہو، مثلاً زمین میں کاشت کرنا، پودے لگانا یا مکان تعمیر کرنا، تو شفیع اسے ان چیزوں کو ہٹا کر زمین درست کرنے کا مکلف بنا سکتا ہے، یا ان چیزوں کی ہٹا کر جو قیمت ہو، وہ ادا کر کے وہ بھی لے لے۔

اگر زمین میں کوئی عمارت یا درخت ہو، پھر عمارت ڈھا دے یا درخت کاٹ ڈالے، تو شفیع وہ حصہ لے سکتا ہے، البتہ بروز عقد مکان یا درخت کی جو قیمت ہو گی، اسے نفی کرے گا، اسی طرح زمین کا ایک حصہ غرقابی یا دھنسنے کی وجہ سے تلف ہو جائے، تو اسی تناسب سے قیمت کا ایک حصہ ساقط ہو جائے گا۔

البتہ عمارت یا درخت کسی کی دخل اندازی کے بغیر خود بخود تلف ہو جائے، تو شفیع یا تو مکمل قیمت سے زمین لے لے یا چھوڑ دے، قیمت میں سے کچھ ساقط نہ ہو گا۔

٣) **قیمت کی کمی بیشی:** بیع لازم اور پختہ ہونے کے بعد اگر بائع مشتری کو قیمت کچھ معاف کر دے، یا اضافہ کر دے تو اس کمی بیشی کا شفیع سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ عقد اس سے پہلے مکمل ہو چکا، لیکن یہ کمی یا بیشی لزوم سے قبل ہو، مثلاً مجلس عقد میں اور جدائی سے قبل، یا خیارِ شرط کی مدت کے دوران، تو شفیع کے ساتھ بھی یہ کمی بیشی لاحق ہو گی، لہٰذا جتنی قیمت گھٹائی گئی ہے، شفیع سے بھی ساقط ہو گی یا جتنی بڑھائی گئی ہے، شفیع پر بھی لازم ہو گی۔

٤) **ادھار فروخت شدہ شئی لینا:** شریک نے اپنا حصہ اُدھار فروخت کیا ہو، تو شفیع کو اختیار ہے کہ یا تو فی الحال وہ چیز لے اور فوراً قیمت ادا کرے، یا ادھاری کی مدت تک انتظار کرے، جب مدت مکمل ہو تو قیمت ادا کر کے وہ چیز لے لے، اس تاخیر میں وہ معذور ہے، لہٰذا اس سے اس کا حق باطل نہ ہو گا۔

اگر خریدار اس پر راضی ہو کہ شفیع اپنا شفعہ ابھی لے لے اور قیمت تکمیلِ مدت پر ادا کرے، اور شفیع انکار کرے اور شفعہ کو بھی موئخر کرے تو اس کا حقِ شفعہ باطل ہو گا۔

٥) **خریدار اور شفیع کا اختلاف:** اگر شفیع اور خریدار میں قیمت میں اختلاف ہو، مثلاً شفیع کہے: آپ نے ہزار میں خریدا ہے اور خریدار کہے: میں نے ١٥٠٠ میں خریدا ہے، اور دونوں کے پاس گواہ نہ ہوں، تو خریدار کی بات مع قسم تسلیم کی جائے گی۔

اگر دونوں میں نفسِ بیع میں ہی اختلاف ہو، شفیع بیع کا دعویٰ کرے اور خریدار انکار کرے تو خریدار کی بات مع قسم معتبر ہو گی، البتہ

شریکِ قدیم خود بیع کا اعتراف کرے تو اسے تسلیم کریں گے۔

قِرَاض (مُضَارَبَت)

تعریف: مال کا مالک کسی دوسرے کو مال دے، تاکہ وہ شخص اس میں محنت و تجارت کرے، بشرطیکہ نفع دونوں میں مشترک ہو، قراض کہلاتا ہے۔

حدیث: (۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب بطورِ مضاربت (قراض) مال سپرد کرتے تو یہ شرط لگاتے: مال لے کر سمندری سفر نہ کرے، کسی وادی میں پڑاؤ نہ ڈالے، اور کوئی تر جگر والا جاندار (یعنی زندہ حیوان) نہ خریدے، ورنہ وہ ضامن ہوگا، ان کی شرط کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی۔ (بیہقی فی کتاب القراض)

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین باتوں میں برکت ہے: ادھار فروخت کرنا، مقارضہ (قراض) اور گیہوں کو جو کے ساتھ ملانا (گھر کے استعمال کے لئے) نہ کہ فروخت کے لئے'' (ابن ماجہ، باب الشرکۃ)

مذکورہ دونوں روایتوں کی سند میں اگرچہ ضعف ہے، لیکن مجموعی طور پر قوت حاصل ہو کر مقبول اور قابلِ استدلال ہو جائے گی، بالخصوص جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل اور اجماع سے اس کی تائید بھی ہو جائے۔ اس تعامل کی بعض امثلہ درج ذیل ہیں۔

(۱) ایک طویل روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیت المال کا مال حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور عُبید اللہ بن عمرؓ کے سپرد کیا کہ اس میں تجارت کرتے جائیں اور مدینہ پہنچ کر اصل رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ (خلیفۂ وقت) کے سپرد کریں، اور نفع خود لیں،... بعد میں حضرت عمرؓ نے اس کو قراض قرار دیتے ہوئے نصف نفع بیت المال میں داخل کیا، اور نصف ان کو دیا۔ (مؤطا امام مالک، بیہقی)

۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علاء بن عبد الرحمن کے دادا کو بطور قراض تجارت کیلئے مال دیا اور یہ شرط لگائی کہ نفع دونوں میں تقسیم ہوگا (مؤطا امام مالک، سنن بیہقی)

(۳) حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جب کسی کو بطورِ قراض مال دیتے تو یہ شرط لگاتے: اس سے کوئی جانور نہ خریدے، سمندری سفر میں لے کر نہ جائے، کسی آبی وادی میں نہ ٹھہرے، خلاف ورزی میں مال کا ضامن ہوگا (سنن بیہقی)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہ آثار قراض کے تعامل پر دلالت کر رہے ہیں، جو دیگر حضرات کے روبرو اور ان کی واقفیت کے ساتھ ہو رہے ہیں، لیکن کسی نے بھی اس پر انکار نہ فرمایا، گویا اس پر اجماع ہو گیا، تمام زمانوں میں امت کا اس کی مشروعیت پر اجماع رہا ہے۔

حکمت: بعض لوگ تجارت میں کافی تجربہ کار اور ماہر ہوتے ہیں، لیکن مطلوبہ رقم اور اسباب مہیا نہیں ہوتے، دریں اثنا بعض دیگر لوگوں کے پاس مال و اسباب تو موجود ہوتے ہیں، لیکن تجارت کے متعلق تجربہ اور صحیح واقفیت نہیں ہوتی، (یا وہ کسی وجہ سے بذاتِ خود اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے) لہٰذا شریعت نے طرفین کی مصلحت اور رعایت کے پیش نظر قراض کو مشروع فرمایا، تاکہ دونوں بھی مناسب طریقے سے معاشی فوائد کو حاصل کر سکیں۔

حکم: عقدِ قراض ایک جائز عقد ہے، نہ کہ لازم، یعنی عاقدین (صاحب مال اور عامل) میں سے ہر ایک جب چاہے اسے فسخ (ختم) کر سکتا ہے، خواہ عامل تصرف شروع کر چکا ہو یا نہیں۔

عمل کی ابتداء سے پہلے ہی فسخ ہو تو اب عامل کو مال میں کسی طرح کے تصرف کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہو گا۔ عمل شروع کرنے کے بعد فسخ ہو تو اب عامل کوئی نئی شئی خریدنے سے رک جائیگا، اور اس پر خرید شدہ اسباب کا مناسب دام پر فروخت کرنا اور اس شرکت سے متعلق قرضوں کو وصول کرنا واجب ہے۔ پھر حساب کر کے اصل رقم مالک کے سپرد کرے، اور نفع دونوں میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جائے۔

عقدِ قراض کے ارکان

(۱)صیغہ (۲)عاقدین (۳)رأس المال

۱)**صیغہ:** یعنی اس عقد سے رضامندی پر دلالت کرنے والے ایجاب و قبول کے کلمات۔

ایجاب: مثلاً، میں نے تمہارے ساتھ مضاربت کا معاملہ کیا، یا قراض کا معاملہ کیا، یا ان روپیوں سے تجارت کرو، جو نفع ہو ہم نصف نصف تقسیم کرلیں گے، یا ایک تہائی نفع میرا اور دو تہائی تمہارا وغیرہ۔

قبول: میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں وغیرہ

صیغہ مُنجَّز (فوری) ہو، کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں، مثلاً ماہِ رمضان آجائے تو ہمارا قراض کا معاملہ رہیگا، وغیرہ

اسی طرح قبول ایجاب سے عرفاً متصل ہو، اگر طویل سکوت یا عقد سے غیر متعلق کلام کے ذریعہ ایجاب و قبول میں فاصلہ ہو تو عقد صحیح نہ ہو گا۔

۲)**عاقدین:** یعنی صاحب مال اور عامل (تجارت اور محنت کرنے والا)

صاحب مال میں موکِّل (وکیل بنانے والا) اور عامل میں وکیل کے شرائط ضروری ہیں، کیونکہ صاحبِ مال موکّل کی طرح اور عامل وکیل کی طرح ہے۔ کیونکہ عامل مالک کی اجازت سے اس کے مال میں تصرّف کرتا ہے۔ اگر کسی ایک پر مالی تصرفات کی نااہلی کی وجہ سے تصرفات کی پابندی عائد ہو چکی ہو، تو عقدِ قراض صحیح نہ ہو گا، اگر عامل نابینا ہو تو حرج نہیں، کیونکہ نابینا کسی دوسرے کو لین دین میں وکیل بنا سکتا ہے۔

۳)**رأس المال** (تجارت میں لگنے والی پونجی اور رقم): اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱- نقود ہو، یعنی درہم و دینار یا دورِ حاضر کی کرنسی، سامانِ تجارت رأس المال نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں بہت غرر ہے، کہ رأس المال اور نفع دونوں مجہول ہوں گے، کیونکہ اسبابِ تجارت کی قیمت قبضہ کے دن اور فروخت یا واپسی کے دن کے دوران بدل جائے گی اور اصل بات یہ ہے کہ قراض میں ویسے بھی غرر ہے، کیونکہ نہ عمل بالکل متعین اور منضبط" اور نہ نفع یقینی، پھر بھی لوگوں کی حاجت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا، لہٰذا جو ہر حال میں رائج اور جس سے تجارت میں سہولت ہو یعنی نقود، اسی پر اقتصار کیا جائے۔

۲- رأس المال کی مقدار معلوم ہو، مال کی مقدار مجہول اور نامعلوم ہو تو عقدِ قراض صحیح نہیں، کیونکہ نفع بھی مجہول ہو گا۔

۳- معین ہو، ذمہ میں ہو تو صحیح نہیں، اِلّا یہ کہ مجلس عقد میں ہی اُسے سامنے کر کے متعین کر دے، اسی طرح عامل کے اوپر مالک کا قرض ہو، تو اس پر بھی مضاربت صحیح نہیں، البتہ مجلس میں وہ قرض ادا کر دے، اور اسے معین کر دیا جائے تو جائز ہے۔

۴- رأس المال عامل کے سپرد کر دیا جائے، اسے براہ راست اس میں تصرف کا اختیار حاصل ہو، سو مالک یا کسی دوسرے کے قبضہ

میں مال رکھنے کی شرط صحیح نہیں، اور نہ ہر تصرف کے لئے مالک کی طرف رجوع کی شرط صحیح ہے، کیونکہ ممکن ہے بوقتِ تصرف اور حاجت مالک جگہ پر نہ ہو اور یہ عامل کے لئے تنگی اور نقصان کا باعث ہو گا۔

عقدِ قراض کے شرائط

۱) **عقدِ قراض مطلق ہو**، یعنی عامل کو تصرف میں آزادی حاصل ہو، لہٰذا کسی معین چیز کے خریدنے کی قید، یا کسی متعین شخص سے کوئی مخصوص مال خریدنے کی قید مثلاً زید کے گیہوں، یا کسی چھوٹی بستی کا مال، مثلاً اس بستی کے گیہوں (اور بستی چھوٹی ہو اور وہاں پیداوار کافی کم ہو) یا کسی مخصوص شخص سے ہی معاملہ ہو، مثلاً جمیل سے ہی خریدے، جمیل ہی کو فروخت کرے یا ایسی چیز کی تجارت کی قید جس کا وجود نادر اور بہت ہی کم ہو، تو ان صورتوں میں عقدِ قراض صحیح نہ ہو گا۔

کسی مدت کی تعیین شرط نہیں، اگر ایسی مدت متعین ہو جس میں مقصد حاصل نہ ہو، یعنی عامل تجارت کر کے نفع نہ حاصل کر سکے، تو یہ عقدِ فاسد ہو گا۔

ایسی مدت متعین ہو کہ اس میں خرید ممکن ہو، اور اس کے بعد خریدنے سے روک دے، فروخت سے نہ روکے، تو یہ صحیح ہے۔

۲) **نفع میں دونوں شریک ہوں**، اور نفع ان کے ساتھ ہی مخصوص ہو:

نفع مالک اور عامل میں مشترک ہونا شرط ہے، تاکہ مالک کو مال کا اور عامل کو اپنے عمل کا ثمرہ حاصل ہو، پس اگر تمام نفع کسی ایک کے لئے طے کریں تو یہ عقد فاسد ہو گا۔

اگر عامل کے لئے تمام نفع کی شرط ہو، تو عقد فاسد ہے، اور تمام نفع مالک کا ہو گا۔ اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی، کیونکہ اس نے نفع کی امید پر محنت کی ہے۔

تمام نفع مالک کے لئے طے ہو، تب بھی عقد فاسد ہے، اور عامل کو کچھ نہ ملے گا، چونکہ عامل نے نفع کی امید اور طمع کے بغیر محنت کی ہے، لہٰذا اس کی محنت تبرعاً (مفت میں) سمجھی جائے گی۔

دونوں کا نفع میں حصہ جزئیت اور نسبت کے اعتبار سے متعین ہو، مثلاً پاؤ حصہ، نصف حصہ، یا دس فی صد یا پچاس فیصد وغیرہ۔

اگر نفع میں ہر ایک کا حصہ معلوم نہ ہو تو عقد صحیح نہیں، کیونکہ اس میں اصل مقصد نفع ہی ہے، لہٰذا وہی معقود علیہ یعنی محلِ عقد ہے اور محل عقد کی جہالت فساد عقد کا موجب ہے۔

کسی ایک کے لئے نفع کی مقدار عدد سے متعین کر دی جائے تو عقد صحیح نہیں، مثلاً کسی ایک کو ہزار روپیہ یا کم و بیش، ممکن ہے کہ نفع اس سے زائد نہ ہو، پھر جس کے لئے یہ طے ہوا ہے اسی کو ملے گا، اور دونوں کا اشتراک پایا نہ جائے گا، تو یہ قراض نہ ہوا، سو عقد فاسد ہو گا، اور ایسی صورت میں تمام نفع مالک کا ہو گا، اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی۔

اسی طرح عامل کے لئے جزئیت کی اعتبار سے بھی نفع طے ہو، اور ساتھ میں ایک متعین مقدار بھی، مثلاً ۵٪ اور ہزار روپیہ ماہانہ تو عقد فاسد ہو گا۔

نفع ان دونوں کے ساتھ ہی مخصوص ہو، یعنی عامل اور مالک کے ساتھ، کسی دوسرے کے لئے نفع کے ایک حصہ کی شرط صحیح نہیں، البتہ وہ عامل کے ساتھ محنت میں شریک ہونے کی شرط ہو تو صحیح ہے، اور یہ مالک اور دو عامل یا زائد عامل کے درمیان قراض ہو گا۔

۳) **تصرف اور محنت میں عامل مستقل ہو:** لہٰذا عامل کے ساتھ محنت اور تصرف میں مالک کی شرکت وشمولیت کی شرط ہو تو قراض صحیح نہیں، شرط کے بغیر عامل مالک کا تعاون حاصل کرے تو یہ جائز ہے۔

عامل کا قبضہ: مالِ قراض میں عامل کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے، اسی طرح خرید شدہ اشیاء میں بھی۔ قبضۂ امانت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس یہ مال اس کی بے توجہی ولاپرواہی اور زیادتی کے بغیر تلف ہو تو وہ اس کا ضامن نہ ہو گا۔ (قبضہ ضمان میں بغیر کوتاہی کے بھی مال تلف ہو تو وہ آدمی ذمہ دار اور ضامن قرار پائے گا)

نقصان: جب یہ معلوم ہو چکا کہ عامل کا قبضہ بطور امانت ہے، تو قراض کے اختتام پر تمام نقصان صاحبِ مال پر ہو گا، عامل پر کچھ نہ ہو گا۔

وہ امور جو مضارب انجام نہیں دے سکتا۔

۱- رأس المال اور اس سے حاصل شدہ نفع کی مقدار سے زائد رقم کی اشیاء نہ خریدے۔

۲- صاحب مال کی اجازت کے بغیر مال لے کر سفر میں نہ جائے، اگر اجازت ہو تو اجازت کے مطابق جا سکتا ہے، اجازت مطلق ہو تو عادتاً تاجر حضرات جن محفوظ علاقوں تک جاتے ہیں، وہاں تک اجازت ہو گی۔

۳- مالک کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت نہ کرے۔

۴- عامل کسی اور کے ساتھ اس مال میں قراض کا معاملہ نہ کرے، تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ محنت اور نفع میں شریک ہو، خواہ مالک کی اجازت سے ہو، اگر کسی نے اس طرح کیا تو دوسرا عقد باطل ہے، اور پہلا صحیح، اب دوسرے عامل نے اس کے سپرد کی گئی رقم میں تصرف کیا تو اسے مالک کی طرف سے اجرتِ مثل ملے گی، اور اس کا نفع مکمل مالک کا ہو گا، اوّل عامل کو اس میں سے کچھ نہ ملے گا، کیونکہ اس کی طرف سے محنت وغیرہ نہیں پائی گئی۔

۵- اپنی بستی میں قیام کے دوران قراض کے مال سے اپنی ذات پر خرچ کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، اور اظہر قول یہ ہے کہ سفر میں بھی اس کی گنجائش نہیں، ایک قول یہ ہے کہ سفر کی وجہ سے عام خرچ سے جو مزید رقم صرف ہو گی، وہ لے سکتا ہے۔

اور حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سفر کی صورت میں تمام اخراجات مالِ قراض سے وصول کر سکتا ہے، کیونکہ سفر کی وجہ سے وہ اسی مقصد کے لئے مقید ہو چکا ہے، لہٰذا اسکے بالمقابل اخراجات کا مستحق ہو گا۔

اصحاب "الفقہ المنہجی" فرماتے ہیں "بوقتِ حاجت اس مسئلہ پر عمل کرنے میں ہماری رائے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ عقد میں اس کی شرط نہ ہو، شرط کی صورت میں عقد فاسد ہو گا"

عامل کی ذمہ داری: عادتاً عامل اور تاجر جن امور کو بذاتِ خود انجام دیتے ہیں، عامل پر لازم ہے کہ وہ بھی بذاتِ خود ان کو انجام دے، گرچہ وہ ان کا عادی نہ ہو، اگر کسی کو ان امور کی انجام دہی کے لئے نوکر رکھا تو تنخواہ عامل کو اپنی جیب سے ادا کرنی ہو گی، نہ کہ مالِ قراض سے، اگر مالِ قراض سے ادائیگی کی شرط لگائے تو عقد صحیح نہ ہو گا۔

عرف اور عادت کی رو سے جو امور خود انجام دینا لازم نہیں، ان کے لئے مالِ قراض سے تنخواہ دے کر نوکر وغیرہ رکھ سکتا ہے۔ لیکن کسی نے خود ہی ان امور کو انجام دیا تو اس کے عوض اجرت نہیں لے سکتا، بلکہ یہ اس کی جانب سے تبرع (مفت خدمت) ہو گی۔

عامل اپنے حصہ کے نفع کامالک کب بنے گا: عامل مال قبضہ میں لے کر خرید وفروخت اور تجارت شروع کرے اور اس تصرف سے اس میں نفع ظاہر ہو، توجب تک سارامال نقدی میں تبدیل نہیں ہوتا(مثلاً آج کل روپے پیسے کی شکل میں نہ آجائے)عامل اپنے حصہ کا مالک نہ بنے گا، تمام مال فروخت ہو کر جب نقدی میں بدل جائے تو رأس المال کو جدا کر کے بقیہ رقم (نفع) دونوں آپس میں تقسیم کرلیں، اب عامل اپنے نفع کامالک بن گیا، کیوں کہ اس سے قبل نقصان کا احتمال ہے، ایسی صورت میں نفع سے اس کی تلافی کی جائے گی۔

اس کے باوجود تقسیم سے قبل عامل کا حق مؤکد ہے، اسی لئے مالک قراض کا مال تلف کرڈالے یا تقسیم سے قبل واپس لے لے تو عامل کو ظاہر شدہ نفع کاحصہ دینالازم ہے، اسی طرح تقسیم سے قبل عامل مر جائے تو وہ حصہ وارثوں کو ملے گا۔

رأس المال کا نقصان: عامل کی کوتاہی کے بغیر تصرف سے قبل ہی جو نقصان ہو، وہ رأس المال سے ہوگا، اور مالک اسے برداشت کرے گا،(عامل پر کچھ نہ آئیگا۔)

تصرف کے بعد دام گرنے کی وجہ سے، یاعیب پیدا ہونے کی وجہ سے مثلاً جانور کی بیماری، پھلوں کانقصان وغیرہ، کانقصان ہو تو نفع میں سے اس کی تلافی ہوگی (نفع ختم ہو تو رأس المال سے) کوئی ناگہانی آفت مثلاً سیلاب، آگ لگناوغیرہ یاغصب یاچوری اس نقصان کاسبب ہو تواس کی تلافی بھی نفع سے ہوگی۔

عقد قراض کی انتہاء (اختتام)

درج ذیل صورتوں میں یہ عقد اختتام پذیر ہوگا:

۱) **فسخ:** دونوں میں سے کوئی بھی کسی وقت بھی اس عقد کو فسخ کرے، تو یہ فسخ جائز ہوگا، عامل کے تصرف سے قبل ہو یابعد، فریقِ ثانی موجود ہو یاغائب، راضی ہو یانہ ہو۔

دونوں یاکسی ایک کے فسخ کرتے ہی عقد قراض ختم ہوگیا، خواہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، مالک نے مثلاً کہا: میں نے قراض کو فسخ کیا، یاباطل کردیایاختم کردیا، یااب سے تم تصرف نہ کرو... تو فسخ حاصل ہوگا۔

فسخ کے بعد عامل کو قراض کے مال سے کچھ خریدنا جائز نہیں، فسخ کے علم سے پہلے کچھ خریدا ہو تو یہ نافذ نہ ہوگا، فسخ کے وقت موجودہ اسباب کو فروخت کرسکتاہے، جبکہ ظاہری نفع کی توقع ہو، مالک کا مطالبہ ہو تو فروخت کرکے رأس المال کو نقدی میں تبدیل کرنا تاکہ نفع ظاہر ہو لازم ہے، جیساکہ قراض سے متعلق قرضوں کی وصولی اس پر لازم ہے۔

۲) **عاقدین میں سے کسی ایک کی موت:** چونکہ قراض کے شرائط میں سے عاقدین میں وکالت کی اہمیت ہے، اور موت سے وکالت باطل ہوتی ہے۔(اس لئے قراض کی انتہا ہوگئی) البتہ مالک کے انتقال کی صورت میں وارثوں کی اجازت کے بغیر عامل موجودہ اسباب فروخت کرے گا تاکہ وہ نقدی میں تبدیل ہو جائے اور نفع ظاہر ہو۔ اس کے برعکس عامل کا انتقال ہو تو اس کے ورثاء مالک کی اجازت کے بغیر اسے نقدی سے نہیں بدل سکتے کیونکہ ان کے تصرف سے مالک راضی نہ تھا، بلکہ مورث کے تصرف سے راضی تھا۔

۳) **عاقدین میں سے کسی کا جنون یا بے ہوشی:** خواہ جلد ہی جنون یابے ہوشی کا ازالہ ہو جائے، مالک پاگل یابے ہوش ہو تو عامل موجودہ اسباب کو نقدی میں تبدیل کرے، اور عامل پاگل یابے ہوش ہو تو اس کا ولی مالک کی اجازت سے یہ خدمت انجام

دے۔

۴) **رأس المال کی بربادی:** کیونکہ رأس المال ہی محلِّ عقد ہے، جب یہی تلف ہو جائے تو عقد کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں، خواہ یہ تلف و بربادی سیلاب وغیرہ کسی ناگہانی آفت سے ہو، یا مالک یا عامل کے تلف کرنے کی وجہ سے۔ لیکن مالک تلف کرے تو عامل کا حصہ مقرر ہو جائے گا۔ اگر عامل نے تلف کیا ہو، اور اس سے اس کا بدل وصول نہ کیا جائے تو عقد ختم ہو جائے گا اور بدل لیا جائے تو عقد جاری رہے گا، ان دو کے علاوہ کسی تیسرے نے تلف کیا، تب بھی یہی حکم ہے، یعنی بدل وصول کیا جائے تو عقد جاری رہے گا ورنہ نہیں، اس صورت میں مالک بدل کا مطالبہ کرے گا جبکہ نفع ظاہر نہ ہو، اور نفع ظاہر ہو تو مالک و عامل دونوں مطالبہ کریں گے، کیونکہ بدل میں دونوں مشترک ہیں۔

مالک اور عامل کا اختلاف

(۱) اگر نفع میں دونوں کا اختلاف ہو، عامل کہے کہ نفع نہیں ہوا، یا اتنا ہی نفع ہوا ہے، تو عامل کی بات مع قسم تصدیق کی جائے گی۔ کیونکہ اصل یہی ہے۔ اگر عامل کسی معیّن نفع کا اقرار کرے، پھر حساب کی غلطی کا دعویٰ کرے (اور کہے کہ اس سے کم نفع ہوا ہے) تو اس کی بات قبول نہ ہوگی، کیونکہ یہ دوسرے کے حق کا اقرار کرنے کے بعد رجوع ہے، جو مقبول نہیں ہوتا۔

۲) اگر کسی چیز میں اختلاف ہو: پس مالک کہے: یہ تم نے قراض کیلئے خریدا ہے، اور عامل کہے: میں نے اپنی ذات کے لئے خریدا ہے، یا اس کے برعکس، تو مع قسم عامل کی تصدیق کی جائے، جبکہ خریدی ذمہ میں ہو، اور اگر قراض کے مال سے خریدے تو اس کی بات تسلیم نہ ہوگی، چاہے وہ اپنی نیت سے خریدے، پس یہ خرید شدہ شئ قراض میں شمار ہوگی۔

۳) رأس المال کی مقدار یا جنس میں اختلاف ہو، تب بھی عامل کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

۴) اگر رأس المال کے تلف کے دعویٰ میں اختلاف ہو: پس مالک کہے: تمہاری تعدی یا کوتاہی سے تلف ہوا، اور عامل کہے: نہیں: بلکہ بلا تعدی اور کوتاہی کے تلف ہوا، تو عامل کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

۵) رأس المال کے لوٹانے میں اختلاف ہو: اور عامل تو لوٹانے کا دعویٰ کرے اور مالک نہ لوٹانے کا، تو عامل کی مع قسم تصدیق ہوگی، کیونکہ وہ مؤتمن ہے، اور ہر امین جو سامنے والے کو لوٹانے کا دعویٰ کرے، اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔

۶) مال کے تلف ہونے کے بعد مالک دعویٰ کرے کہ قرض تھا، اور عامل دعویٰ کرے کہ قراض تھا، تو مالک کی بات مع اس کے قسم کے مقبول ہوگی۔ اسی طرح مالک توکیل کا اور عامل قراض کا دعویٰ کرے تو مالک کی بات مع قسم کے معتبر ہوگی، کیونکہ اس کے قصد کو وہی زیادہ جانتا ہے، اور عامل کو اجرت نہ ملے گی، کیونکہ وہ اجرت کے عدم استحقاق کا اقرار کر رہا ہے۔

۷) نفع کے متعینہ نسبت میں اختلاف ہو: مثلاً پاؤ حصہ یا تہائی حصہ وغیرہ؟ تو دونوں اپنے دعویٰ کے اثبات میں اور دوسرے فریق کے دعویٰ کے نفی پر قسم لیں گے، دونوں کی قسم کے بعد نفع تمام مالک کا ہوگا، اور عامل کو اس کے عمل کی اجرتِ مثل ملے گی۔

مُسَاقَاۃ

یہ لفظ سَقۡیٌ (پلانا) سے ماخوذ ہے۔

شرعی تعریف: درخت کے مالک کا کسی دوسرے کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کہ وہ اس کی اصلاح و دیکھ ریکھ اور متعلقہ ضروری اعمال انجام دے اور حاصل ہونے والے پھلوں میں سے ایک متعین حصہ اس کے عوض اسے دیا جائے گا۔

عموماً اس عمل میں پانی ڈالنے اور سیرابی کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے اسے مساقات کہا گیا۔

مشروعیت: مساقات مشروع اور جائز ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے خیبر کو اس شرط پر (یہودیوں کے) سپرد کیا کہ پھل اور کھیتی کی پیداوار کا نصف ان کو دیا جائے گا۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ کے بعد شیخین رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا اور کسی بھی صحابی نے اس پر نکیر نہ فرمائی، جیسا کہ صحیحین سے واضح ہے۔ تو گویا صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہو گیا۔

حکمت: لوگوں کی سہولت اور بغیر کسی ضرر انگیزی کے مشترک مصالح کی تحقیق کے لئے اسے مشروع قرار دیا گیا، کیونکہ بعض اوقات کھیتی اور باغ کا مالک اس کی دیکھ ریکھ اور اس سے انتفاع نہیں کر پاتا اور دوسرا شخص جس کے پاس کھیتی وغیرہ تو نہیں ہے لیکن جسمانی محنت، اور کاشتکاری اور باغبانی کی مہارت وصلاحیت سے متصف ہے۔ اب اسے بطور اجرت ومزدوری کے رکھے تو ممکن ہے مطلوبہ اعمال میں کوتاہی کرے اور نتیجتاً مالک کو نقصان اٹھانا پڑے۔ لیکن جب پیداوار میں خود اس کا حصہ رکھا جائے گا تو خود بھی تندہی اور توجہ سے ذمہ داری انجام دے گا۔ اور ہونے والے نفع میں مالک کی طرح یہ بھی شریک ہو جائے گا۔ لہٰذا دوطرفہ مصلحت، بلکہ پورے معاشرہ کی مصلحت کے پیش نظر اسے روا رکھا گیا۔

مساقاة کے ارکان

(۱) مالک، (۲) عامل، (۳) صیغہ، (۴) مَورِد، (۵) عمل، (۶) پیداوار (پھل)

(۱) **مالک:** مالک خود یہ معاملہ طے کرے تو اس میں کامل اہلیت (عقل وبلوغ وغیرہ) شرط ہے۔ اگر بچہ، پاگل، یا مجور سفیہ مالک ہو اور مصلحت مساقات کی متقاضی ہو تو اس مالک پر جسے ولایت حاصل ہو وہ اسے انجام دے۔ (مثلاً باپ، دادا)

اگر مالک غیر معین ہو جیسے وقف یا بیت المال کا مال تو یہ ذمہ داری وقف کے ناظر، حاکم، یا اس کے نائب کی ہے۔

(۲) **عامل:** یہ بھی مالک کی طرح کامل اہلیت سے متصف ہو، بچہ یا پاگل عامل نہیں بن سکتا۔

(۳) **صیغہ:** مساقات میں ایجاب وقبول لازم ہے۔ ایجاب کا صریح لفظ مثلاً ''میں نے اس کھجور کے باغ میں تمہارے ساتھ نصف پھل پر مساقات کا معاملہ کیا'' کنایہ لفظ مثلاً ''میں نے یہ درخت دیکھ ریکھ کیلئے نصف پھل کے عوض تمہارے حوالے کیا یا تم اس درخت پر نصف پھل کے عوض محنت کرو وغیرہ۔

پھر مالک کے الفاظ سے رضامندی پر دلالت کرنے والے الفاظ سے عامل قبول کرلے تو مساقات صحیح ہو گی۔

اجارہ کے لفظ سے مساقات منعقد نہ ہو گی۔ اور اجرت مجہول ہونے کی وجہ سے اجارہ بھی شمار نہ ہو گا۔

مَورِد: یعنی صیغہ جس پر وارد ہو رہا ہے، اور جس کی دیکھ ریکھ اور اصلاح کے متعلق یہ عقد ہو رہا ہے، اور وہ ہے انگور اور کھجور کا درخت۔ کیونکہ حدیث میں کھجور کے درخت کی صراحت ہے، اور انگور بھی اسی کی طرح ہے، کیونکہ باتفاقِ فقہاء ان دونوں میں زکات

واجب ہے، اور دونوں خشک وتر پائے جاتے ہیں اور ذخیرہ کرکے رکھ سکتے ہیں، نیز بطورِ قوت (خوراک۔ گذارہ کے لائق کھانا) استعمال کرسکتے ہیں۔ اس لئے انگور کو بھی کھجور پر قیاس کیا گیا۔

امام شافعیؒ کا قولِ قدیم، جسے بعض اصحابِ ترجیح نے اختیار کیا ہے، اور جو دیگر اکثر فقہاءِ کرام کا مسلک ہے، وہ یہ کہ تمام پھل آور درختوں میں مساقات صحیح ہے، اور بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، نیز بلادِ عرب بالخصوص حجازِ مقدس اور خیبر میں اکثر و بیشتر چونکہ کھجور کے ہی درخت پائے جاتے تھے، اس لئے شاید بعض احادیث میں اس کی صراحت ہوئی۔

لہٰذا "الفقہ المنہجی" کے مصنفین کا خیال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں، جبکہ مختلف النوع پھل آور درختوں کی کثرت ہے، اور ضرورت و حالات تمام درختوں میں مساقات کے صحت کی متقاضی ہے، حکمت تشریع کے زیادہ موافق اور بہتر اور راجح یہی ہے کہ تمام درختوں میں اسے جائز اور صحیح قرار دیا جائے، (امام نوویؒ نے "تصحیح التنبیہ" میں تمام پھل آور درختوں میں مساقات کے قول کو اختیار کیا ہے)۔ "(نہایۃالمحتاج ۲۴۶/۵)"

(۵) **عمل:** پھلوں کی بہتری اور اضافہ کے لئے مطلوبہ ہر عمل انجام دینا لازم ہے، جو کہ ہر سال دوہرایا جاتا ہو۔

پس سیرابی اور اس سے متعلقہ امور، مثلاً پانی جاری کرنا، بند کرنا، پانی کے نالوں کو صاف کرنا، درخت کے جڑ میں پانی کے گڑھے کی اصلاح وغیرہ انجام دے، مضر پودے اور گھاس پھوس کا ازالہ کرے، چور اور کیڑے مکوڑوں سے حفاظت کے لئے ضروری امور پر عمل کرے، نیز پھلوں کو توڑے، اور خشک کئے جاتے ہوں تو خشک کرے۔

ان میں سے بعض امور کی انجام دہی سے عاجز ہو، مثلاً درختوں کی کثرت وغیرہ کی وجہ سے، تو دوسروں کا تعاون حاصل کرے، اور یہ خرچ اسی کے ذمہ ہوگا۔

ہر وہ عمل جس سے درخت کی حفاظت مقصود ہو، اور وہ ہر سال انجام نہ دیا جاتا ہو، عامل پر لازم نہیں ہے، لہٰذا احاطہ (کمپاؤنڈ) بنانا، جدید نہر یا کنواں کھودنا، دروازہ لگانا وغیرہ عامل پر لازم نہیں، بلکہ یہ مصارف مالک پر ہیں۔

اگر مالک نے عامل پر غیر لازم کسی عمل کو لازم قرار دیا، یا عامل نے اپنے اوپر واجب کوئی عمل مالک کے انجام دینے کی شرط لگائی تو مساقات صحیح نہ ہوگی۔

مساقات کی صحت کے لئے شرط ھے کہ:

مَورِد (معقود علیہ، باغ) عامل کے سپرد کردیا جائے کہ وہ براہِ راست اس میں جب چاہے اپنی ذمہ داری انجام دے سکے، اگر مالک کے قبضہ میں یا دونوں کے قبضہ میں رہنے کی شرط ہو، تو مساقاۃ صحیح نہیں، البتہ مالک اس سے متعلق اعمال کی انجام دہی کے لئے نوکر کو رکھنے کی شرط لگائے تو یہ صحیح ہے۔

عمل کی مدت فی الجملہ معلوم ہونا شرط ہے، یعنی ایسی مدت کا ذکر ہو جس میں عموماً وہ درخت پھل لائے، اور درخت میں پھل لانے کی صلاحیت باقی رہے۔

مدت کی تعیین کے بغیر، یا ایسی مدت جس میں وہ درخت عموماً پھل نہ لاتے ہوں، یا اتنی مدت کہ جب تک اس میں پھل کی صلاحیت باقی نہ رہے گی، طے پائے تو مساقاۃ صحیح نہ ہوگی۔ پھلوں کی پختگی کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں، کیونکہ مدت مجہول ہے، پختگی مقدم، یا مؤخر بھی ہوسکتی ہے۔

(۶) **پھل**: یعنی جن درختوں کی عقد مساقاۃ ہوتی ہے، ان کے پھل، اس میں شرط ہے کہ:
۱- مالک اور عامل کے ساتھ خاص ہو، کسی تیسرے کے لئے ایک حصہ کی شرط لگائے تو عقد فاسد ہو گا۔
۲- پھل میں دونوں شریک ہوں، کسی ایک ہی کے لئے سارے پھل کی شرط ہو تو عقد فاسد ہے۔
۳- مالک اور عامل، دونوں کا حصہ جزئیت (نسبت) کے اعتبار سے معلوم و متعین ہو، مثلاً نصف، ایک تہائی، پاؤ حصہ وغیرہ۔ اگر یہ طے پایا کہ پھل ہم دونوں میں، تو نصف نصف پر محمول کریں گے۔ کسی ایک کے لئے متعین مقدار کی شرط ہو، مثلاً ہزار کلو یا ہزار من، تو صحیح نہ ہو گا۔ کسی ایک کے لئے مخصوص رقم متعین کریں، تب بھی یہی حکم ہے۔

پھل کے ظہور سے عامل کا حق اس میں ثابت ہو گا، لہٰذا مدت کی تکمیل سے پہلے پھل نمودار ہوں، خواہ پوری طرح ظاہر نہ ہوں، تو اس میں عامل کا حق ثابت ہو گا۔

پھل بالکل نمودار ہونے سے پہلے، یا اس کے بعد لیکن بُدُوِّ صَلَاح سے قبل مساقات صحیح ہے، کیونکہ اکثر عمل ابھی باقی ہے۔ (بدوِ صلاح کے بعد مساقات قطعاً ممنوع ہے۔ النہایۃ ۲۵۲/۵)

عقد مساقات کا وصف: یہ عقد طرفین کی جانب سے لازم عقد ہے، پس تمام ارکان و شرائط کے ساتھ جب پایا جائے تو ہر ایک پر اس کی تنفیذ لازم ہے، دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ اور رجوع کا حق نہیں، خواہ عمل کے بعد ہو یا قبل، کسی آفت وغیرہ سے تمام پھل تلف بھی ہو جائیں تو عمل کو مکمل کرنا لازم ہے۔

تکمیلِ عمل سے قبل عامل فسخ کر دے، تو مالک کا نقصان ہے، اور مالک فسخ کر دے تو عامل کا نقصان ہے، کیونکہ پھل کا مقررہ حصہ نہ ملے گا، جو اکثر اجرت مثل سے زائد ہو گا۔

فاسد مساقاۃ کا حکم: مساقات کے بیان کردہ احکام صحیح مساقاۃ پر مرتب ہونگے جس میں تمام ارکان و شرائط کی رعایت ہو، اگر کوئی رکن یا شرط نہ پائی گئی تو مساقاۃ فاسد ہو گی، جس کا تذکرہ اپنی جگہ آتا رہا، یعنی جہاں پر بھی یہ کہا گیا کہ مساقاۃ صحیح نہیں: مثلاً کسی پر اس عمل کی شرط جو اس کے ذمہ نہیں ہے، یا حصہ غیر معلوم ہو، یا نسبت کے اعتبار سے متعین نہ ہو، یا ایسے درختوں میں مساقاۃ ہو جو پھل آور نہ ہو... وغیرہ

جب مساقاۃ فاسد ہو، تو تمام پھل مالک کے ہوں گے، کیونکہ یہ اس کی ملکیت کی پیداوار ہے، اور عامل نے جو اعمال انجام دیئے ہیں، اسے ان کی اجرتِ مثل ملے گی۔

عامل کا قبضہ: عامل کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، لہٰذا اپنی کوتاہی یا زیادتی کے بغیر درخت، پھل یا کسی اور چیز کے تلف کا دعویٰ کرے تو مع قسم تسلیم کیا جائے گا، اسی طرح مالک اس کی خیانت کا دعویٰ کرے اور وہ انکار کرے، تو اسکا انکار مع قسم تسلیم کیا جائے گا۔

مساقاۃ کی انتہاء (اختتام و تکمیل): مقررہ مدت کے اختتام کے ساتھ مساقاۃ کی انتہاء ہو جائے گی، جبکہ پھل پختہ ہو چکے ہوں، اور چنے گئے ہوں (توڑے اور جمع کئے جا چکے ہوں) اگر مدت کے اختتام پر پھل نمودار ہو چکے ہوں تو اس سے عامل کا حق متعلق ہو چکا، لہٰذا ابھی مساقاۃ کا سلسلہ اس کی پختگی اور توڑنے تک جاری رہے گا، اور اس وقت تک عامل پر عمل جاری رکھنا لازم ہے۔

عاقدین میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے مساقاۃ ختم نہ ہو گی، بلکہ مالک کے انتقال کی صورت میں عامل اپنا عمل جاری رکھے گا اور تکمیل پر اپنا حصہ لے لے گا۔

اگر عامل کا انتقال ہو، تو اس کا وارث خود عمل کی تکمیل کر سکتا ہے، اور مالک پر لازم ہے کہ اسے اس کا موقع دے جبکہ وہ معتبر ہو، اور مطلوبہ عمل سے واقف بھی ہو، ورنہ مالک حاکم کی اجازت سے کسی کو اعمال کی انجام دہی کیلئے مزدور رکھے، جس کی مزدوری عامل کے ترکہ سے ادا ہو گی، وارث پر عمل کے لئے جبر (زبردستی) نہیں کر سکتے، بلکہ وہ عامل کے ترکہ یا اپنے ذاتی مال سے بھی (مزدور رکھ کر) عمل کی تکمیل کر سکتا ہے۔

عامل ترکہ چھوڑ کر مرا ہے، تو وارث پر اتمام عمل لازم ہے۔ (بذاتِ خود یا مزدور کے ذریعے)، اسے اس پر مجبور کیا جائیگا، کیونکہ یہ عامل کے ذمہ واجبِ حق ہے، لہٰذا دیگر حقوق کی طرح اس کے ترکہ سے ادا ہو گا، اگر عامل نے ترکہ نہ چھوڑا تو وارث پر بذاتِ خود یا اپنے مال سے عمل کی تکمیل لازم نہیں ہے، مالک اسے فسخ کر سکتا ہے۔ اور ابھی پھل نمودار نہ ہوئے ہوں، تو ورثاء عامل کے ابھی تک کے عمل کے اجرتِ مثل کے مستحق ہوں گے اور پھل نمودار ہو چکے ہوں تو فی الحال ان پھلوں میں عامل کے حصے کی قیمت کے مستحق ہوں گے۔

عامل کی خیانت کی وجہ سے مساقاۃ ختم نہ ہو گی، جبکہ اقرار یا گواہوں کے ذریعہ اس کی خیانت ثابت ہو، بلکہ کسی (نگہبان، سپر وائزر) کو اس پر نگاہ رکھنے کیلئے متعین کیا جائے گا۔ عامل کو عمل سے نہ روکیں گے، اس نگہبان کی اجرت (تنخواہ) عامل پر ہو گی، کیونکہ اسی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آئی۔ (بلا ثبوتِ خیانت صرف شک و شبہ کی وجہ سے مالک کسی کو نگہبان مقرر کرے، تو اجرت مالک پر لازم ہو گی)۔ (فتح الوہاب۔ نہایۃ المحتاج)

نگہبان رکھنے کے باوجود عامل خیانت سے باز نہ آئے تو اس کا قبضہ بالکل ختم کر دیں گے، اور اس کے مال سے کسی کو عمل کی تکمیل کے لئے مزدور رکھیں گے۔

تکمیلِ عمل سے قبل عامل کہیں بھاگ جائے، یا قید ہو جائے یا بیمار ہو جائے تو مساقاۃ فسخ نہ ہو گی، بلکہ حاکم اس کی طرف سے کسی مزدور کو تکمیلِ عمل کے لئے مقرر کرے گا، الّا یہ کہ مالک یا کوئی اور اپنی جانب سے تبرعاً (مفت میں) اسے انجام دے۔ (یعنی عمل کرے یا خود ہی اجرت و مزدوری دے) پس پھل کے متعینہ حصہ کا عامل مستحق ہو گا۔

حاکم کی طرف رجوع ممکن نہ ہو، یا وہ اس پر توجہ نہ دے، تو مالک خود کسی کو عمل کے لئے نوکر رکھے، اور مزدوری کی رقم پر، نیز عامل سے یہ رقم واپس لینے کی نیت سے صرف کر رہا ہے، اس پر گواہ رکھے، گواہ رکھنے کی صورت میں آئندہ یہ رقم عامل سے واپس لے سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

حاکم اور مالک کو کوئی مزدور نہ ملے تو، مالک مساقاۃ کو فسخ کر سکتا ہے۔ اگر پھل ظاہر نہ ہوئے ہوں تو عامل کو باعتبارِ عمل اجرتِ مثل ملے گی، اور ظاہر ہوئے ہوں تو فی الحال اس کے حصہ کی قیمت کا مستحق ہو گا۔

عامل اور مالک کا اختلاف: مقررہ عوض کے متعلق دونوں کا اختلاف ہو، مالک کہے: میں نے تمہارے لئے ایک تہائی ۱/۳ مقرر کیا تھا۔ اور عامل کہے: تم نے میرے لئے نصف کی شرط لگائی تھی، تو دونوں کو اپنے دعویٰ کے اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کی نفی کے متعلق قسم دلائی جائے گی، جب دونوں قسم لیں تو عقدِ مساقاۃ فسخ ہو گا اور تمام پھل مالک کے ہوں گے، اور عامل کو اجرتِ مثل ملے گی۔

مزارعہ اور مخابرہ (بٹائی پر معاملہ کرنا)

مزارعہ دراصل زَرْع (کھیت، بونا، جوتنا) سے ماخوذ ہے، فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ”مالک زمین کسی دوسرے کے

ساتھ یہ معاملہ کرے کہ وہ کھیتی لگائے اور دیکھ ریکھ وغیرہ انجام دے، اور حاصل پیداوار میں دونوں شریک رہیں گے، اور بیج مالک کی طرف سے ہوں گے۔"

مخابرہ لغت میں خَبَار سے ماخوذ ہے، یعنی نرم زمین، اور اصطلاح میں یہ بھی مزارعہ کی طرح ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں بیج عامل کی طرف سے ہوں گے۔

حکم: مزارعہ اور مخابرہ دونوں باطل ہیں، جبکہ عقد سے براہِ راست یہی مطلوب ہوں، یعنی اس زمین میں درخت نہ ہوں، یا درخت تو ہوں لیکن معاملہ مساقاہ کے بغیر کھیت کی بٹائی پر طے پایا ہو۔ صحیحین میں حضرت رافع بن خدیجؓ سے مرفوعاً اس کی ممانعت مروی ہے۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا" (متفق علیہ)

اگر درختوں کے درمیان زمین ہو، تو ان درختوں میں مساقاۃ کے تابع درمیانی زمین میں مزارعہ صحیح ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے خیبر کی زمین ان کے حوالہ اس شرط پر کی کہ پھل اور کھیت کی پیداوار نصف نصف تقسیم ہوگی۔ اس طرح مزارعہ کی صحت کے شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) اتحادِ عامل، مساقاہ اور مزارعہ کا معاملہ ایک ہی شخص سے طے ہو۔

(۲) صرف درختوں کی آب پاشی وغیرہ زمین کے بغیر مشکل ہو، اگر ممکن ہو تو مزارعہ صحیح نہیں۔

(۳) مزارعہ اصل مقصودِ عقد نہ ہو، یعنی مساقاۃ اور مزارعہ کا معاملہ ایک ہی وقت میں طے ہو، اگر مساقاۃ پر معاملہ طے ہو، پھر مزارعہ پر تو صحیح نہیں، کیونکہ دونوں مستقل ہونے کی وجہ سے تبعیت نہ رہی۔

اسی لئے مزارعہ کا مساقاۃ پر مقدم نہ ہونا شرط ہے، اگر یوں کہے: میں نے تم سے اس زمین میں مزارعہ کا معاملہ کیا، اور ان درختوں میں مساقاۃ کا تو صحیح نہیں، کیونکہ تابع مقدم نہیں ہوا کرتا۔ زمین کی قلت و کثرت سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ بصورت حاجت دونوں صورتوں میں جائز ہوگا۔

مساقاۃ اور مزارعہ میں طے شدہ حصہ مساوی ہونا ضروری نہیں، مختلف بھی ہو سکتا ہے، مثلاً مساقاۃ میں نصف پر معاملہ ہو، اور مزارعہ میں تہائی پر، کیونکہ مزارعہ تابع ہونے کے باوجود مستقل عقد کے حکم میں ہے۔

مخابرہ: مخابرہ مطلقاً باطل ہے، گرچہ مساقاۃ کے تابع ہو، کیونکہ یہ شریعت میں وارد نہیں، نیز مزارعت مساقاۃ کے مثل ہے۔ کہ دونوں میں عامل پر صرف عمل ہے، بخلاف مخابرہ کے، کہ اس میں عمل کے ساتھ بیج بھی عامل کے ذمہ ہے۔

فاسد مزارعہ اور مخابرہ کا حکم: اگر فاسد طریقہ پر مزارعہ یا مخابرہ کا معاملہ طے پائے، پھر عامل نے محنت کی اور کھیتی صحیح سلامت ہو، تو مزارعہ میں پیداوار صاحبِ زمین کی ہے، اور عامل کو اس کے عمل کی اجرت نیز اسباب ہل وغیرہ اگر اس کے ہوں تو ان کی اجرت ملے گی، اور مخابرہ کی صورت میں پیداوار عامل کی ہوگی، کیونکہ بیج اس کے تھے، اور پیداوار بیج کے تابع ہوتی ہے، اور اس پر زمین کے مالک کو اجرت مثل (زمین کا معقول و مناسب کرایہ) لازم ہے، اگر بیج دونوں کے ہوں تو، پیداوار میں دونوں اسی تناسب سے شریک ہوں گے اور ہر ایک دوسرے سے اس کے حصہ میں صرف شدہ منافع کی اجرت لے گا، لہٰذا اگر بیج نصف نصف ہوں تو: مالک عامل سے زمین کی نصف اجرتِ مثل (کرایہ) وصول کرے گا، اور عامل مالک سے اس کے عمل کا نصف اجرتِ مثل وصول کرے گا۔

مزارعہ و مخاربہ کو مالک و عامل کے درمیان حلال اور صحیح قرار دینے کی صورت:

(۱) مالک عامل کو اجرت پر رکھے، اور اجرت بوئے جانے والے بیج کا ایک متعین حصہ (مثلاً نصف، پاؤ وغیرہ) شائع طریقے پر قرار

دے، (یعنی اجرت کے بیج الگ اور جدا نہ ہوں) تاکہ وہ مالک کی نصف زمین میں کاشت کر کے دے، اور اسی وقت اجرت میں متعین بیج کی نسبت سے زمین کا حصہ شائع طریقہ پر اسے کاشت کے لئے بطور عاریت دے دے، اس طرح عامل محنت کرے تو پیداوار دونوں میں بیج کے تناسب سے تقسیم ہوگی۔

(۲) یا شائع طریقہ پر نصف بیج اور زمین کی نصف منفعت کو اجرت ٹھہرائے۔ تاکہ عامل بقیہ نصف میں بقیہ نصف بیج کی کاشت کرے۔ اس صورت میں بھی پیداوار میں دونوں شریک ہوں گے، ایک دوسرے پر اجرت یا کرایہ نہ ہوگا۔

(۳) اگر بیج عامل کے ہوں، تو وہ مالک سے زمین کا ایک شائع حصہ (مثلاً نصف) بیج کے شائع حصے (نصف) اور دوسرے نصف میں اپنے عمل کے عوض اجرت پر لے لے، یا نصف زمین نصف بیج کے عوض لے اور بقیہ نصف میں، تبرعاً (مفت میں اپنی جانب سے) عمل انجام دے۔

اس صورت میں بھی ہر ایک بیج اور زمین کی منفعت میں اپنے حصے کی نسبت سے پیداوار کا مالک ہوگا، اور ایک دوسرے پر کرایہ وغیرہ نہ ہوگا۔

امام ابن المنذر، امام ابن خزیمہ، امام خطابی، امام نووی، امام سبکی اور کئی دیگر علمائے کرام نے مطلقاً دونوں (مخابرہ ومزارعہ) کو جائز قرار دیا ہے۔ (ترشیح المستفیدین ص ۲۶۵)

اِجَارَہ (کرایہ، اجرت ومزدوری)

شریعت میں اجارہ مقصود و معلوم منفعت، جس میں اباحت کی قابلیت ہو، کی معلوم عوض کے ذریعے تملیک کو کہتے ہیں۔

اجارہ کی مشروعیت پر قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں اجماع ہے۔

آیات: "فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ" (الطلاق: ۶)

ترجمہ: "پھر اگر (عدت کے بعد) وہ (مطلقہ) عورتیں تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلاویں تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو"
اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دودھ پلانے کی اجرت کا حکم دیا، تو معلوم ہوا کہ یہ اس عورت کا حق ہے، وہ بغیر عقد کے اس کی مستحق نہ ہوگی، کیونکہ بغیر عقد کے پلانے کی صورت میں مفت میں پلانے والی شمار ہوگی، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ عقدِ اجارہ مشروع ہے۔

۲) "قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ" (القصص ۲۶) ترجمہ: "ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے۔ کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط، امانت دار ہو۔"

احادیث: ۱) آپ ﷺ نے (سفر ہجرت کے وقت) ایک ماہر واقف کار کو بطور رہبر اجرت پر ساتھ لیا (بخاری شریف)

۲) آپ ﷺ نے زمین (کھیتی) کو کرایہ پر دینے کی اجازت دی (مسلم شریف)

۳) آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: بروز قیامت تین اشخاص کا میں مد مقابل (خصم) رہوں گا: ایک وہ جو میرے نام سے معاہدہ کرے پھر غداری کرے، دوسرا وہ جو آزاد کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھاجائے، اور تیسرا وہ جو کسی کو نوکر رکھ کر اس سے مکمل خدمت لے اور اس کی اجرت ومزدوری نہ دے" (بخاری شریف)

اجارہ کے ارکان وشرائط

اجارہ کے چار ارکان ہیں(۱)عاقدین(۲)صیغہ(۳)منفعت(۴)اجرت(کرایہ)

۱)**عاقدین**:یعنی مُؤجِر اور مُستَأجِر(موجر یعنی کرایہ پر دینے والا اور مستاجر یعنی کرایہ پر لینے والا)۔دونوں میں عقد کی صلاحیت ہو، یعنی عاقل وبالغ ہوں، پس پاگل وبچہ کا عقد اجارہ صحیح نہیں، کہ دونوں کو اپنے آپ اوراپنے مال پر ولایت حاصل نہیں ہے، اسی طرح اس پر مالی تصرفات کی پابندی نہ ہو۔

۲)**صیغہ**:یعنی ایجاب وقبول، ایجاب سے مراد موجر سے صادر ہونے والا ہر وہ لفظ جوبظاہر بِالعِوضَ منفعت کی تملیک پر دلالت کرے، خواہ صریح ہو یا کنایہ۔

صریح الفاظ:میں نے یہ تمہیں بطوراجارہ دیا، کرایہ پر دیا، اس کے منافع کافلاں مال کے عوض تم کوایک سال کے لئے مالک بنادیا۔

کنایہ الفاظ:میرے گھر میں اتنے روپے کے عوض ایک ماہ قیام کرو، یااس کی منفعت فلاں کے عوض تمہارے لئے کر دی۔

قبول:مستاجر سے صادر ہونیوالا وہ لفظ جوبظاہر منفعت کامالک بننے کی رضامندی پر دلالت کرے۔مثلاً میں نے قبول کیا، کرایہ پر لے لیا، وغیرہ۔

جن امور میں مُعَاطَاۃ(بلالفظ بطور کرایہ استعمال اور لین دین)کاعرف ہو، وہ بھی صیغہ کے قائم مقام ہے، مثلاً بلاعقد کے بس وغیرہ میں سفر کرنا اور متعینہ کرایہ دینا، کہ یہ صحیح ہے، کیونکہ ایسے مقامات میں معاطاۃ سے بھی رضامندی پر دلالت ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایجاب و قبول کے حکم میں ہو گا۔

صیغہ کے شرائط:

(أ)-ایجاب وقبول میں موافقت ومطابقت، لہٰذا کسی نے کہا: میں نے اپناگھر سو۱۰۰ر روپے میں ایک ماہ کے لئے تمہیں کرایہ پر دیا اور مستاجر کہے: میں نے ۹۰ر روپیہ میں قبول کیا، تو یہ عقد صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایجاب وقبول میں مخالفت ہے۔

(ب)-طویل سکوت یاکلامِ اجنبی(اجارہ سے غیر متعلق گفتگو)کے ذریعے ایجاب وقبول کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

(ج)-کسی شرط پر معلق نہ ہو۔مثلاً جب زید آجائے تومیں نے یہ کرایہ پر دے دیا۔

۳)**منفعت**:اس کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(أ):منفعت متقوم ہو، یعنی شرعاً یاعرفاً معتبر ومقصود ہو، تاکہ اس کے عوض مال صرف کرنا صحیح ہو، مثلاً رہنے کے لئے مکان کرایہ پر لینا، یاکوئی جانور یاگاڑی سواری کے لئے لینا، کیونکہ شرعاً متقوم نہ ہو تو اس کے عوض مال کاصرف کرنا بے وقوفی اور مال کی بربادی ہے، جس سے شریعت نے روکا ہے، لہٰذا لہو ولعب کے آلات(آلاتِ موسیقی)کرایہ پر لینا، ذی روح(جاندار)کی تصویر بنانے کے لئے کرایہ پر رکھنا، وغیرہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ حرام ہیں۔

کتےّ کوشکار یاپاسبانی کیلئے اجرت پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ اس کے عین(خود کتےّ)کی شرعاً کوئی قیمت نہیں، اس لئے اس کے منفعت کی بھی قیمت نہیں۔

بغیر کلفت وپریشانی کے ایک لفظ کی ادائیگی کے لئے کسی کو اجرت پر رکھنا صحیح نہیں، گرچہ اس سے سامان بکے، یا کوئی اور نفع حاصل ہو۔ اسی طرح دراہم ودنانیر مزین کے لئے دینا صحیح نہیں۔

(ب) اس کا سپرد کرنا موجر کے بس میں ہو، تاکہ مستاجر اس سے نفع اٹھا سکے، اگر موجر شرعاً یا حِسًّا منفعت کے سپردگی سے عاجز ہو تو اجارہ صحیح نہیں۔ لہٰذا کسی مغصوب شئ کو غاصب کے علاوہ کسی اور کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں جبکہ عقد کے بعد اس سے واپس لینے پر قادر نہ ہو، گمشدہ گاڑی کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں، ایسی زمین کاشت کاری کے لئے کرایہ پر دینا صحیح نہیں جس کے لئے مناسب پانی کا کوئی انتظام نہ ہو، کیونکہ ان اشیاء میں حِسًّا منفعت کی سپردگی سے عاجز ہے۔

شرعاً عاجز کی مثال: حائضہ یا نفاس والی مسلمان عورت کو مسجد کی اندرونی خدمت کے لئے نوکر رکھنا، کیونکہ اس کا لازمی تقاضا مسجد میں آمدورفت و ٹھہرنا ہوگا، جو اسے جائز نہیں، لہٰذا شرعاً وہ عورت اس منفعت کی سپردگی (خدمت) سے عاجز ہے۔ اگر غیر حائضہ عورت کو اس خدمت کے لئے رکھا، پھر اسے حیض یا نفاس شروع ہوا، تو یہ عقد اجارہ فسخ ہو جائے گا، اگر اس نے حیض کی حالت میں مسجد میں رک کر خدمت انجام دی تو گنہگار ہوگی، اور اجرت کی مستحق نہ ہوگی۔ قرآن کی تعلیم بھی خدمتِ مسجد کی طرح ہے۔

کسی شادی شدہ عورت کو دودھ پلانے یا کسی اور خدمت کے لئے اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر اجرت پر رکھنا صحیح نہیں، کیونکہ اس کے سارے اوقات شوہر کا حق ہے، لہٰذا اس کی اجازت کے بغیر اس کے حق کے علاوہ میں صرفِ وقت جائز نہیں۔

اسی طرح کسی بھی عورت کو ایسے کام پر رکھنا جائز نہیں، جس میں شوہر یا کسی محرم کے بغیر سفر کی ضرورت پیش آتی ہو، یا کسی اجنبی (غیر محرم اور پرائے) مرد کے ساتھ خلوت (تنہائی) کا موقع آتا ہو، کیونکہ صریح اور صحیح احادیث کی رو سے یہ حرام ہے، تو عورت شرعاً اس طرح کے منفعت کی سپردگی پر قادر نہیں ہے۔

(ج) منفعت مستاجر کو حاصل ہو، نہ کہ موجر کو: لہٰذا ان قربتوں (نیکیوں اور عبادتوں) میں اجارہ صحیح نہیں جو نیت کی محتاج ہوں، اور جن میں نیابت کا کوئی دخل نہ ہو، جیسے روزہ، نماز کیونکہ ان کی منفعت (یعنی ثواب) موجر کو ملے گی، نہ کہ مستاجر کو، نیز ان سے اصل مقصد ایک مکلف کے اطاعت وامتثال کی آزمائش وامتحان اور نفس کی اصلاح ہے، اور اس میں دوسرا اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ قربت وعبادت جس میں نیابت (دوسرے کو نائب بنانا اور اس کے ذریعہ کروانا) کی گنجائش ہو، اس میں اجارہ صحیح ہے، گرچہ نیت کی ضرورت ہو۔ پس عاجز اور مردہ کی طرف سے حج بدل کے لئے، میت کی جانب سے روزہ رکھنے کے لئے، قربانی کا جانور ذبح کرنے اور زکات کی تقسیم کے لئے اجارہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت میں ان عبادات میں نیابت ثابت ہے۔

وہ عبادات جو نیت کی محتاج نہ ہوں جیسے فروض کفایہ: تو اگر یہ اصل میں شائع ہو، یعنی ہر مسلمان اس کا مخاطب ہو، لیکن بعض کے انجام دینے سے بقیہ سے ساقط ہو جائے، جیسے جہاد، تو اس کے لئے اجارہ صحیح نہیں، کیونکہ جو مسلمان جہاد کے لئے اپنے آپ کو اجرت پر دے، وہ میدانِ جنگ میں حاضر ہوگا تو جہاد اس پر فرضِ عین ہو جائے گا، تو یہ جہاد خود اس کی جانب سے ادا ہوگا ، نہ کہ مستاجر کی جانب سے، لہٰذا منفعت مستاجر کے بجائے موجر کو حاصل ہوگی، تو یہ اجارہ صحیح نہیں۔

لیکن وہ فرض کفایہ اصل میں شائع نہ ہو، تو اجارہ صحیح ہے، جیسے کسی میت کی تجہیز (غسل، تکفین اور دفن)، کیونکہ یہ دراصل اس میت کے ترکہ سے متعلق ہے، ترکہ نہ ہو تو جن پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ورنہ پھر مسلمان مالداروں کے ذمہ واجب ہے کہ اسے انجام دے۔

بعض یا مکمل قرآن کی تعلیم کے لئے اجارہ صحیح ہے، کیونکہ تعلیم میں اصل یہ ہے کہ خود متعلم یا پھر اس کا نفقہ جس کے ذمہ لازم ہے

اس کے مال سے متعلق ہے، اور آپ ﷺ کا فرمان ہے "بے شک کتاب اللہ پر اجرت لینے کا زیادہ حق ہے" (بخاری)
دیگر علمی مسائل اور قضاو غیرہ فرض کفایہ کا بھی یہی حکم ہے۔ غیر واجب شعار جیسے اذان کے لئے اجارہ صحیح ہے۔

(د)- چوتھی شرط یہ ہے کہ منفعت میں قصداً عین کا استیفاء نہ ہو، (یعنی صرف منفعت کے بجائے براہ راست کسی چیز کا حاصل کرنا نہ ہو) لہٰذا باغ کو پھلوں کے لئے استعمال کے لئے، یا بکری دنبہ وغیرہ کو اون حاصل کرنے یا دودھ یا نسل حاصل کرنے کے لئے کرایہ سے نہیں دے سکتے۔ کیونکہ عقد اجارہ میں اصل منافع کی تملیک ہے، نہ کہ عین کی، لہٰذا عقد اجارہ کے ذریعہ کسی عین (چیز) کی ملکیت حاصل نہ ہوگی (مذکورہ مثالوں میں پھل، اون، دودھ وغیرہ عین ہیں) نیز یہ درحقیقت استہلاک (ختم کرنا) ہے، نہ کہ انتفاع، اور اجارہ میں اصل انتفاع ہے۔ نہ کہ استہلاک (تالاب مچھلی کے لئے اور موم بتی جلانے کے لئے کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہے۔)(جمل)

البتہ عقدِ اجارہ میں تبعاً استیفاء عین پایا جائے تو جائز ہے، مثلاً کسی عورت کو دودھ پلانے کیلئے اجرت پر رکھنا، کیونکہ اس میں ضمناً اور تبعاً دودھ کا استعمال پایا جارہا ہے، جو عین ہے۔

اسی طرح کوئی مکان رہنے کے لئے کرایہ سے لے، اور اس کے احاطہ میں پھل آور درخت ہوں تو ان پھلوں کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ تبعاً ہے۔ (اصل مقصود گھر میں رہنا ہے)

(ھ)-منفعت کی پانچویں شرط یہ ہے کہ: منفعت عاقدین (موجر اور مستاجر) میں سے دونوں کو عین (وہ چیز)، اس کی صفت اور مقدار کے اعتبار سے معلوم ہو۔

منفعت کے عین کا علم: بغیر تعیین کے کسی ایک گھر کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ عینِ منفعت مجہول ہے، یا کہا کہ میں نے ایک گھر تمہیں کرایہ سے دیا، بغیر اس کے اوصاف کے ذکر کے یا اس کی طرف اشارہ کے تو یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اجارہ میں اصل منفعت ہے، لیکن وہ کوئی مادی چیز نہیں کہ اس کی طرف اشارہ وغیرہ کیا جاسکے، لہٰذا اس کی جگہ محلِ منفعت (کرایہ پر دی جانے والی چیز) کا ذکر ضروری ہوا۔

منفعت کی نوعیت وصفت کا علم: جب مُستَأجَرُ (کرایہ پر دی جانیوالی شئ) سے انتفاع کے مختلف طریقے ہوں، اور اس کے اثر کے تفاوت کی وجہ سے عادتاً ایک انتفاع کے بجائے دوسرے کی اجازت نہ رہتی ہو تو منفعت کی نوعیت وصفت کو متعین کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا زمین کو کاشت کے لئے کرایہ سے دینا صحیح نہیں جبکہ کس چیز کی کاشت ہوگی اسے متعین نہ کرے، کیونکہ مختلف اشیاء کی کاشت کا اثر زمین اور کھیتی پر الگ الگ پڑے گا، اگر یہ صراحت کردی جائے کہ جو چیز چاہے کاشت کرسکتا ہے تو عقد صحیح ہوجائے گا۔

اگر منفعت مقصودہ میں بظاہر اتنا زیادہ اختلاف نہ ہو، جو آئندہ نزاع و جھگڑے کا سبب بنے، تو نوعیت کی وضاحت کے بغیر بھی اجارہ صحیح ہوگا، مثلاً رہنے کے لئے مکان کرایہ سے دینا، تو اس میں اس کے ساتھ مزید کون افراد رہیں گے، یا گھر میں کیا کیا اسباب رکھے گا وغیرہ کی وضاحت ضروری نہیں، اگر مکان غالب اور معتاد کے خلاف استعمال کرے تو (بغیر وضاحت کے) اس کی اجازت نہ ہوگی، مثلاً کسی صنعت یا تجارت کے لئے استعمال کرنا۔ اگر مکان ایسی جگہ ہو کہ رہائش اور دیگر امور کے لئے استعمال ہوسکتا ہو، تب منفعت کی نوعیت یعنی رہائش، تجارت یا صنعت کی وضاحت، نیز تجارت وصنعت کی نوعیت کی صراحت ضروری ہے۔ اسی طرح کسی کام اور عمل کے لئے کسی کو نوکر رکھے تو اس کے عمل اور کام کی جسے وہ انجام دے گا۔ وضاحت ضروری ہے۔

منفعت کے مقدار کا علم: بعض کی تعیین وقت کے ذریعے، بعض کی عمل کے ذریعے اور بعض دونوں طریقے سے صحیح

ہو گی۔

(اَ) وقت اور مدت کے اعتبار سے تعیین اس منفعت کی ہو گی جس کا اس کے بغیر ضبط ممکن نہ ہو، اور جس میں کمی بیشی اور قلت و کثرت پائی جاتی ہو، مثلاً رہائش کے لئے مکان، کیونکہ رہائش کی مدت کم اور زیادہ ہو سکتی ہے، یا دودھ پلانے کے لئے دائی رکھنا، کیونکہ دودھ کی مقدار قلیل وکثیر ہو سکتی ہے، اس طرح کے منافع کا تعین وقت سے ہی ہو سکتا ہے۔

جب منفعت کو مدت کے ذریعے مقید کیا جائے تو مدت کا علم واجب ہے، اور اتنی مدت تک وہ چیز عموماً باقی رہتی ہو، تاکہ متعینہ نفع اٹھایا جاسکے۔ اس چیز کے بقا کی مدت کا اندازہ عرف اور واقف حضرات کے تجربہ کی روشنی میں کیا جائے گا۔ لہٰذا زمین مثلاً سو یا زائد سال کے لئے کرایہ سے دے سکتے ہیں، جانور تقریباً دس سال کے لئے وغیرہ۔

مدت میں استثناء: کسی کو مدت کے اعتبار سے اجرت پر (نوکر) رکھا گیا ہو (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) تو اس مدت کے اندر واجب عبادات کی ادائیگی کا وقت (مثلاً فرض نماز کا وقت) اور عادتاً کھانے پینے کے اوقات مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی طرح مدت طویل ہو تو شرعاً ثابت عید کے ایّام، اور عرفاً ثابت تعطیل کے ایام بھی مستثنیٰ ہوں گے، پس اجیر (نوکر۔ مزدور) ان اوقات اور ایام کی تنخواہ کا بھی مستحق ہو گا، گرچہ عقد میں اس کی صراحت نہ کی گئی ہو، لہٰذا یومیہ، ماہانہ یا سالانہ متعینہ اجرت و تنخواہ میں کمی نہیں کر سکتا۔

(ب) عمل کے ذریعے تعیین: یہ اس وقت ہے جبکہ منفعت اپنی ذات سے معلوم ہو، اور وقت اس کے لئے کبھی کم اور کبھی زیادہ درکار ہو، جس کی وجہ سے وقت سے تعیین مشکل ہو مثلاً پوشاک سینا، کھانا پکانا وغیرہ ان امور کو عمل کے ذریعے متعین کریں گے، نہ کہ مدت کے ذریعے۔

(ج) جس میں منفعت کو وقت یا عمل (دونوں) کے ذریعے مقید کیا جاسکتا ہو،: مثلاً کسی درزی کو سینے کے لئے رکھنا، یا کار وغیرہ گاڑی سواری کے لئے کرایہ سے لینا، لہٰذا درزی کو ایک دن کی مزدوری کے اعتبار سے بھی طے کر سکتے ہیں اور فلاں فلاں کپڑے سینے کے اعتبار سے بھی، اور گاڑی فلاں مقام سے فلاں جگہ تک سفر کیلئے بھی کرایہ سے لے سکتے ہیں، یا ایک دن یا دو دن کے لئے بھی لے سکتے ہیں۔

لیکن ایک ہی منفعت کو بہ یک وقت مدت اور عمل دونوں کے ذریعے مقید نہیں کر سکتے، مثلاً یہ کپڑا ایک دن میں سی کر دو، یا یہ دیوار دو دن میں تیار کر کے دو، یا مجھے تین روز میں دمشق سے مکہ پہنچاؤ، کیونکہ کبھی وہ عمل مقررہ مدت سے کم میں انجام پائے گا اور کبھی اسے زائد مدت درکار ہو گی، جو غرر (دھوکہ وخطرہ) کا باعث ہے، لہٰذا یہ عقد صحیح نہ ہو گا۔

۴- **چوتھا رکن اجرت (مزدوری، تنخواہ) ھے:** بیع میں جو قیمت کے شرائط ہیں، وہی اجرت کے شرائط ہیں، کیونکہ اجرت درحقیقت منفعت کی قیمت ہے، لہٰذا اجرت میں شرط ہے کہ:

(اَ) **وہ پاک ھو!** اگر اجرت میں کتاّ، سور، مردار کی غیر مدبوغ کھال یا شراب مقرر کرے تو یہ عقد صحیح نہ ہو گا، کیونکہ یہ اشیاء نجس العین ہیں، آپ ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) نیز صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب اور مردار اور سور اور بتوں کے فروخت کو حرام قرار دیا ہے“ اسی طرح وہ متنجس اشیاء جسے اب پاک کرنا ممکن نہ ہو، اجرت مقرر نہیں کر سکتے، مثلاً وہ سرکہ، دودھ، تیل، وغیرہ جس میں نجاست شامل ہو، کیونکہ آپ ﷺ نے مائع (سیّال) گھی کو نجس ہونے کی صورت میں بہا دینے کا حکم دیا۔ (ابن حبان) بہانے کے حکم سے معلوم ہوا کہ اسے پاک نہیں کیا جاسکتا، تب پھر اس کی بیع، اور اسے اجرت متعین کرنا صحیح نہ ہو گا۔

(ب) اجرت نفع بخش ہو: جو چیز نفع بخش نہ ہو، اسے اجرت قرار نہیں دیا جاسکتا؛ یاتو اس کی خِسَّت اور حقارت کی وجہ سے جیسے کیڑے مکوڑے اور گیہوں کے دو دانے، یا اس کی ایذا رسانی کی وجہ سے جیسے درندے، یا شرعاً استعمال حرام ہونے کی وجہ سے، جیسے آلات لہو، بت، جانداروں کی تصویر، کیونکہ یہ اور ان کے مثل اشیاء میں کوئی (معتبر) نفع نہیں اور یہ مال میں شمار نہیں، لہٰذا اس کے مقابلہ میں مال لینا صحیح نہیں، اور منفعت بھی در حقیت مالِ متقوم ہے، لہٰذا ان اشیاء کو اجرت نہیں قرار دے سکتے۔

(ج) اس کی سپردگی ممکن ہو: لہٰذا ہوا میں اڑتے پرندے، پانی میں تیرتی مچھلی وغیرہ اجرت نہیں ہو سکتی۔

(د) عاقد کو اجرت ادا کرنے کی ولایت (شرعی اختیار) ہو: ملکیت یا وکالت کی وجہ سے اسے اس کا اختیار ہو، ورنہ اجارہ صحیح نہیں۔

(ھ) عاقدین کو معلوم ہو: لہٰذا گھر کو اس کی تعمیر و اصلاح کے عوض، گاڑی درکار پٹرول، ڈیزل وغیرہ کے عوض، یا جانور کو اس کے چارہ کے عوض کرایہ پر دینا صحیح نہیں، کیونکہ اجرت مجہول (نامعلوم) ہے۔

مزدور کے عمل سے حاصل ہونے والی چیز ہی کا ایک حصہ اجرت متعین کرنا صحیح نہیں، مثلاً بکری کے ذبح و کھال اتارنے کی اجرت اس کھال کو یا گوشت کے ایک حصہ کو قرار دینا، یا گیہوں پیسنے کی اجرت اسی آٹے کا ایک حصہ (مثلاً پاؤ یا پانچواں حصہ) مقرر کرنا، کیونکہ اس میں جہالت ہے، نیز مزدور کا خود اپنے عمل سے انتفاع پایا جارہا ہے، تو گویا ایک طرح خود اپنا کام کر رہا ہے، لہٰذا اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔ دار قطنی کی ایک روایت اس آخری مثال کی ممانعت کے متعلق وارد ہے۔

گیہوں کا ایک حصہ اجرت مقرر کرے تاکہ بقیہ پیس کر دے تو یہ صحیح ہے، کیونکہ ممانعت کے دونوں اسباب (جہالت اور اپنا کام کرنا) مفقود ہیں۔

درج ذیل صورتیں بھی بدرجہ اولیٰ اس ممانعت میں داخل ہیں۔

کھیتی اور اناج کی کٹائی کی اجرت اسی سے حاصل اناج کا ایک حصہ مقرر کرنا۔

مختلف انجمنوں اور اداروں کے سفیروں اور چندہ اکٹھا کرنیوالوں کو اسی چندہ کا ایک حصہ اجرت و تنخواہ مقرر کرنا مثلاً ۲ فی صد یا ۵ فی صد وغیرہ۔

گھر وغیرہ کے دلالوں کو فروخت کی جانے والی شئ (جس میں وہ دلالی کر رہے ہیں) کی قیمت کا ایک حصہ دلالی اور اجرت مقرر کرنا۔ مثلاً ایک فی صد یا ۳ فیصد وغیرہ۔

اجارہ کے یہ تینوں طریقے غلط ہیں، کیونکہ اجرت مجہول ہے، لہٰذا لوگ یہ جان لیں کہ اس طرح کی کمائی ناپاک اور غیر مشروع ہے، لینے اور دینے والے دونوں کی گرفت ہوگی، پس شریعت الٰہی کی مخالفت کرنے والے متنبہ ہو جائیں اور اس سے پرہیز کریں، بالخصوص مختلف انجمنوں کے سفیر کہ ان کی جمع کردہ رقوم اکثر فقراء و مساکین کا حق ہوتی ہیں، جسے غلط اور ظالمانہ طریقے سے استعمال کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا نیک اور اچھا کام کر رہے ہیں، ایسے لوگ اللہ کی ناراضگی اور عقاب سے ڈریں!

اجارہ کے اقسام

(۱) اجارہ عَین (۲) اِجارہ ذِمّہ

(۱) **اجارہ عین:** یعنی جس کا تعلق کسی معین چیز کی منفعت سے ہو۔ مثلاً: میں نے تمہیں یہ گھر کرایہ پر دیا۔ یا فلاں گاڑی (جو معین ہو اور دونوں اس سے واقف ہوں) کرایہ سے دی۔ یا کسی معین شخص کو کسی بھی کام کے لئے مزدور رکھے، یا تاکہ وہ کپڑا سی کر دے۔

(۲) **اجارہ ذمہ:** اس اجارہ کا تعلق ذمہ سے متعلق منفعت سے ہوتا ہے، مثلاً: فلاں قسم کی سواری سے معین مقام تک پہنچانے کی ذمہ داری، یا موصوف گاڑی متعین مدت کے لئے کرایہ سے دینے کا ذمہ لے۔ (اس میں گاڑی معین نہیں۔ گاڑی کے اوصاف بیان کردے۔ ان اوصاف کی کسی بھی گاڑی سے متعینہ مقام تک پہنچانا یا اسے متعین مدت کے لئے دینا کافی ہے)۔ یا مستاجر موجر کے ذمہ کوئی عمل لازم قرار دے (کنٹریکٹ دینا) مثلاً گھر کی تعمیر، سلائی وغیرہ اور وہ قبول کرلے۔ (اب چاہے وہ خود کرے یا کسی اور سے کروا کر دے

اجارہ عین کے شرائط: (۱) کرایہ سے دی جانے والی چیز متعین ہو، پس دونوں میں سے کوئی ایک گاڑی کرایہ سے دینا صحیح نہیں (بلکہ کوئی ایک متعین کرلے)

(۲) چیز حاضر ہو اور عقد کے وقت دونوں کے سامنے ہو۔ اگر کوئی کہے: میں نے تمہیں گھر، یا کار، یا کپڑا کرایہ سے دیا اور یہ چیزیں سامنے نہ ہوں، تو یہ اجارہ صحیح نہیں ہے، البتہ چیز پہلے دونوں دیکھ چکے ہوں، اور اتنی مدت میں بظاہر اس میں کوئی تبدیلی نہ آتی ہو، تو اجارہ صحیح ہے۔

۳) منفعت کی تحصیل عقد سے موئخر نہ ہو، مثلاً گھر آئندہ سال کے لئے (ابھی سے) کرایہ سے دینا، یا خود کو مزدوری کے لئے پیش کرنا کہ کام ایک تاریخ سے شروع کروں گا، یا کار کل کرایہ سے دینا، یا گھر ایک ماہ یا سال کے لئے کرایہ سے دینا اور مدت کی ابتداء آئندہ ایک تاریخ سے ہوگی وغیرہ۔ البتہ فی الحال جس نے کرایہ سے لیا ہے، مستقبل میں بھی اسی کے ساتھ معاملہ طے کرے، اور وہ مدت اس مدت کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہو، تو یہ عقد صحیح ہے۔

اجارہ ذمہ کے شرائط: (۱) اجرت نقد ہو اور مجلس عقد ہی میں سپرد ہو، کیونکہ یہ اجارہ منافع کا سَلَم ہے، لہٰذا رأس المال (یعنی اجرت) مجلسِ عقد ہی میں ادا کرنا شرط ہے، ادھار کی شرط سپرد نہ کرنے کی طرح ہے۔

اگر دونوں اجرت کو ادھار رکھنے پر متفق ہوں تو یہ اجارہ صحیح نہ ہوگا، خواہ اجرت مجلس ہی میں ادا کردے، اسی طرح ادھار پر اتفاق تو نہ ہو، لیکن اجرت بالفعل مجلس میں ادا نہ کرے تو یہ عقد صحیح نہ ہوگا۔

۲) اس عَین (چیز) کی جنس، نوع، اور صفت کی وضاحت اور تذکرہ جس سے انتفاع کرنا ہے، مثلاً کسی دفتر حمل و نقل (ٹراویل ایجنسی) سے کسی متعین شہر تک پہنچانے کے متعلق معاملہ طے پائے تو وسیلۂ نقل کہ ہوائی ہے یا بحری یا بری؟ کار ہے یا بس؟ قدیم ہے یا جدید؟ وغیرہ ایسے امور کی وضاحت ضروری ہے جن سے اغراض میں تفاوت ہوتا ہے۔

اجارہ کا حکم

عقد اجارہ جب تمام ارکان وشروط کے ساتھ پایا جائے تو صحیح ہو جائے گا اور اس پر درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

اس چیز کی منفعت میں کرایہ دار (مستاجر) کی ملکیت ثابت ہوگی، نفع میں اس کا تصرف اور انتفاع جائز ہوگا۔ اجرت پر موجر کی ملکیت ثابت ہوگی، اس ملکیت کی ترتیب یہ ہوگی کہ جتنا وقت گذر جائے گا، اور وہ چیز مستاجر کے قبضہ میں صحیح سلامت ہو، اس نفع یا وقت کے مقابلہ کی اجرت پر اس کی ملکیت پختہ اور مستقر ہوگی، جب مستاجر مکمل (طے شدہ) نفع اٹھائے، یا اجارہ کی مدت مکمل گذر جائے تو پوری

اجرت پر ملکیت مستقر ہوچکی، چاہے مستاجر نے اس مدت میں نفع نہ اٹھایا ہو، جبکہ وہ چیز اس کے قبضہ میں صحیح سلامت تھی، کیونکہ اسی کے ماتحتی میں اسکے منافع تلف ہو چکے، لہٰذا اس کا عوض اس پر لازم ہو چکا، جیساکہ مبیع خریدار کے قبضہ میں تلف ہو جائے تو قیمت اس پر لازم ہے۔

اگر عَیْن مُسْتَاجَرَہ (کرایہ اور اجرت پر لی ہوئی چیز) طے شدہ منفعت کا ایک جُز حاصل کرنے کے بعد یا اس کے امکان کے بعد تلف ہو جائے، اور یہ جز (حصّہ) عادتاً نفع بخش ہو، تو اس کے بالمقابل اجرت پر مالک (موجر) کی ملکیت مستقر ہو گی، جیسے کسی مخصوص مقام کے سفر کے لئے کار کرایہ سے لی، لیکن منزل تک پہنچنے سے قبل وہ بگڑ جائے اور مزید سفر کے قابل نہ ہو، تو طے شدہ مسافت کا کرایہ لازم ہے، جبکہ بغیر کسی مشقت کے وہاں سے آگے کا سفر جاری رکھ سکتا ہو، یا اس جگہ مستأجر کا کوئی کام ہو۔ اور اگر یہ جز عادتاً نفع بخش نہ ہو، مثلاً کار بگڑنے کی جگہ مقصود نہ ہو، یا وہاں سے آگے سفر کا تسلسل مشکل ہو، تو موجر کو کوئی اجرت نہ ملے گی، اور یہ سپردگی سے قبل یا انتفاع سے قبل یا امکانِ انتفاع سے قبل ہی اس چیز کے برباد ہونے کے مثل ہو گا۔ اجرت نقد ہو یا ادھار اس میں ملکیت ثابت ہو گی، اور یہ مسئلہ بیان ہو چکا کہ اجارہ ذمہ میں اجرت ادھار جائز نہیں اور اگر اجارہ عین ہو اور اجرت متعین شئ ہو، مثلاً ان دراہم کے عوض یا اس گھڑی کے عوض میر اگھر تمہیں ایک سال کے لئے کرایہ سے دے دیا، تو اس معین اجرت کی تعجیل واجب ہے، تاخیر وادھار جائز نہیں، کیونکہ معین اشیاء میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی، اور اجرت ذمہ میں ہو، مثلاً اپنا گھر ہزار روپۓ میں ایک سال کرایہ سے دے دیا، تو اجرت میں تعجیل اور تاخیر دونوں جائز ہیں، جیساکہ بعض کی تعجیل (فوری ادائیگی) اور بعض کی تاخیر، یا ہر ماہ قسط وار ادائیگی، جیسے بھی دونوں کے اتفاق سے طے پائے، جائز ہے۔ عقد میں تعجیل یا تاخیر کی صراحت نہ ہو تو تعجیل مراد ہو گی۔

منفعت کی تحصیل کا حق: مستاجر براہ راست خود انتفاع کرے، یا کسی اور کے ذریعے، دونوں جائز ہیں۔ اگر مکان کرایہ سے لیا تو خود اس میں سکونت اختیار کرے، یا کسی اور کے ساتھ یا کسی اور کو عاریۃً یا کرایہ سے رہنے دے۔ اگر موجر یہ شرط لگائے کہ مستاجر خود ہی انتفاع کر سکتا، تو یہ اجارہ صحیح نہیں، یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی چیز اس شرط پر فروخت کرے کہ خریدار کسی اور کو فروخت نہ کرے، تو یہ بیع بھی صحیح نہیں ہے۔

مستاجر کسی اور کے ذریعے انتفاع کرے تو درج ذیل شرائط کالحاظ ضروری ہے۔

۱- جس کے سپرد انتفاع کے لئے کرے وہ امین (امانت دار شخص) ہو۔

۲- تحصیلِ منفعت میں وہ شخص اس کرایہ کے چیز کے حق میں مستاجر کے مساوی یا اس سے کم ضرر و نقصان پہنچانے والا ہو۔ پس کسی نے مکان رہائش کے لئے کرایہ سے لیا تو کسی دوسرے کو صنعت یا تجارت کے لئے نہیں دے سکتا، کوئی گاڑی سواری کی عرض سے کرایہ پر لے تو کسی دوسرے کو بوجھ وغیرہ منتقل کرنے کے لئے نہیں دے سکتا، جبکہ اس کا نقصان سواری کی بہ نسبت زیادہ ہو، اگر کپڑا پہننے کے لئے کرایہ سے لے تو اپنے سے موٹے شخص کو وہ نہیں دے سکتا...

اجارۂ فاسدہ اور اجرت مِثْل: اجارہ کے شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو اجارہ فاسد ہو گا، اور مستاجر پر واجب ہے کہ وہ چیز واپس لوٹادے، لوٹانے سے قبل منافع حاصل کر چکا، یا اتنا وقت گذر چکا کہ منافع حاصل کر سکتا تھا، تو اس پر مکمل اجرت مثل واجب ہو گی، خواہ یہ اجرت، اجرتِ مُسمّٰی (متعینہ اجرت) کے مساوی ہو یا اس سے کم یا بیش۔ اسی طرح بعض منفعت کی تحصیل کے بعد فسادِ عقد کی وجہ سے اسے فسخ کر دیا جائے تو اسی قدر اجرت مثل واجب ہو گی، (مثلاً ایک سال کے لئے اجرت پر لینے کے بعد چھ ماہ میں فسخ کیا تو نصف اجرت مثل واجب ہے)۔

کسی کام اور عمل کے لئے مزدور رکھا (یعنی فاسد طریقے سے) اور مزدور نے متعلقہ عمل مکمل یا بعض انجام دیا تو بقدر عمل اجرتِ مثل کا مستحق ہو گا۔

اُجرتِ مِثل: واقف اور تجربہ کار حضرات اس چیز یا اس عمل کی جو مناسب اور عام اجرت قرار دیں، اسے اجرتِ مثل کہتے ہیں۔

اجرتِ مسمّٰی: عاقدین آپس میں جو بھی اجرت طے کرلیں، اسے اجرت مسمی کہیں گے، یہ اجرت مثل سے کم و بیش بھی ہو سکتا ہے۔

(دورِ حاضر میں معمول ڈپازٹ و پگڑی کے مسائل وقف کے بعد بعض متفرق جدید مسائل ص ۲۲۸ میں ملاحظہ فرمائیں)

عَیْنِ مُسْتَاجَرَہ کا ضمان (اجرت اور کرایہ پر لی ہوئی چیز کا ضمان): عین مستاجرہ پر مستاجر اور کرایہ دار کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، لہٰذا اس کے تلف ہونے یا عیب دار ہونے سے کرایہ دار پر اس کا ضمان (تاوان) نہیں آئیگا، خواہ یہ نقصان انتفاع کے دوران پیش آئے یا اس سے قبل یا بعد، عدمِ ضمان کا حکم اس وقت تک ہے جبکہ اس چیز کے استعمال میں یہ تعدّی نہ کرے (حد سے تجاوز نہ کرے) یا حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہ لے۔

رہائش کے لئے مکان کرایہ سے لیا، پھر عادتاً مکان میں چولھا یا چراغ وغیرہ جو جلایا جاتا ہے، اس سے اس کی غفلت و لاپرواہی اور کوتاہی کے بغیر مکان میں آگ لگ جائے تو کرایہ دار ان نقصانات کا ذمہ دار نہیں، البتہ عادت کے برخلاف استعمال سے یہ نقصان ہو، مثلاً لوہاری کام وغیرہ کے لئے بھٹی جلایا اور اس سے آگ لگ گئی تو یہ ضامن ہو گا، کیونکہ رہائشی مکان میں یہ کام تعدّی ہے۔

اسی طرح اس کی لاپرواہی کی وجہ سے آگ لگ جائے، مثلاً سوتے وقت اسٹو یا انگیٹھی کو جلتا ہی چھوڑ دے اور اس سے آگ لگ جائے تو وہ ضامن ہو گا، کیونکہ یہ غالب عادت کے بھی برعکس ہے اور شرعاً بھی ممنوع ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے "سوتے وقت گھر میں آگ باقی نہ رکھو (بجھادو)" ایک مرتبہ آپ ﷺ کو پتہ چلا کہ رات میں مدینہ منورہ میں ایک گھر جل گیا، تو ارشاد فرمایا "بلاشبہ یہ آگ تو تمہاری دشمن ہے، لہٰذا سوتے وقت اسے بجھادیا کرو" (بخاری مسلم) اسی طرح چھوٹے بچوں وغیرہ کے ہاتھ میں جلانے والی چیزوں کو رہنے دے (اور آگ لگے) تو ضامن ہو گا۔

کسی بھی غلط اور نامناسب استعمال کی وجہ سے نقصان ہو، تو ضمان لازم ہے، مثلاً کرایہ کی گاڑی بھیڑ کے مقامات یا مشکل اور پرخطر راستوں میں زیادہ تیز چلائے، اور اس سے کچھ حادثہ و نقصان ہو تو ضمان لازم ہو گا۔

حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے نقصان ہو، تب بھی ضمان لازم ہے، مثلاً وہ چیز ایسی جگہ رکھ دے کہ عادتاً وہاں نہیں رکھی جاتی، مثلاً گاڑی کو سڑک کے بیچ میں رکھنا، یا کسی غیر مامون علاقے میں بلا پاسبانی کے چھوڑ دینا وغیرہ۔ اس صورت میں کچھ نقصان و حادثہ پیش آئے تو کرایہ دار ضامن ہو گا، لیکن اس چیز کو مناسب اور محفوظ مقام میں رکھنے کے باوجود کوئی نقصان پہنچے تو اس کا ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح اجارہ کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی وہ چیز استعمال کرے، یا استعمال تو نہ کرے لیکن مالک کے سپرد کرنے میں اپنی رکاوٹ کو ختم نہ کرے (پھر مثلاً وہ تلف ہو جائے) تو ضامن ہو گا، اگر استعمال نہ کرے اور واپسی کے امکان و قدرت سے قبل ہی کچھ نقصان پیش آئے تو ضامن نہ ہو گا۔

اَجِیر کا ضمان (اجیر یعنی مزدور، نوکر، یا جس کے ذمہ اجرت پر کوئی کام سونپا جائے): اس کی

دو قسمیں ہیں۔

(أ) اَجیرِ خاص: اس سے وہ اجیر اور مزدور مراد ہے جس سے مستاجر کسی خاص مدت کے لئے کسی کام کے انجام دینے کا معاملہ کرے، اور اس پوری مدت کے نفع کا مستاجر مستحق ہوگا، اور اجیر اس کی اجرت کا مستحق ہوجائیگا، چاہے مستاجر اس سے کام نہ لے۔ یا مستاجر اسکے ساتھ کسی خاص اور معین کام اور عمل کے سلسلہ میں معاملہ طے کرلے، کہ اس کی تکمیل کے بغیر کسی اور کا کام نہ لے، جیسے فیکٹری اور مل کے کاگیر، دوکان کا مزدور، کسی پیشہ ور کے یہاں کاریگر مثلاً درزی وغیرہ، اسی طرح گھروں میں رنگ وروغن کرنے والا، تعمیری کام کرنے والا اور بڑھئی وغیرہ وہ اشخاص جو مستاجر کی موجودگی یا اس کی ماتحتی وتابعداری میں کام کرتے ہیں، اگر اس طرح کے مزدوروں اور کاریگروں کے ہاتھوں کچھ نقصان ہوجائے تو وہ اس کے ضامن نہیں، لیکن ان کی بے احتیاطی وتساہل، زیادتی کی وجہ سے یا عمداً نقصان کریں تو ضامن ہوں گے۔

(ب) أجیر مشترک: اس سے وہ اجیر مراد ہے، جس کے ساتھ مستاجر کسی خاص عمل اور کام کے لئے معاملہ طے کرلے، جس کے مکمل کرنے پر وہ اجرت کا مستحق ہوگا، اور ایک ہی وقت کئی افراد کے ساتھ اس عمل کے لئے یا کسی اور عمل کے لئے وہ معاملہ کرسکتا ہے، اور عموماً مستاجر کی تابعداری یا حاضری میں کام انجام نہیں دے گا، بلکہ اپنے گھر یا دوکان یا کارخانہ میں اپنے طور پر وہ کام مکمل کرے گا، جیسے درزی، رنگ ریز، گیرج فٹر وغیرہ۔ یہ اجیر بھی تعدی اور زیادتی کے بغیر ہونے والے نقصان کے ذمہ دار نہیں، اور وہ چیز ان کے پاس بطور امانت ہوگی، کیونکہ ان کا قبضہ مستاجر کی مصلحت کی خاطر ہے۔

حنفیہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجیر مشترک اس کے ہاتھوں پیش آنے والے نقصان اور تلف کا ضامن ہوگا، الا یہ کہ سبب ایسا عام ہو کہ اس سے احتراز ناممکن ہو، جیسے آگ لگ جانا، عام غرقابی یا سیلاب وغیرہ، اور ایسا سبب نہ ہو، مثلاً چوری وغیرہ تو وہ ضامن ہوگا۔ ان کی اصل دلیل وحجت یہ ہے کہ انہیں اس صورت میں ضامن نہ قرار دیں تو لوگوں کے مال کے متعلق تساہل اور لاپرواہی سے کام لیں گے، اور اتنی ذمہ داری لیں گے جو ان کے بس سے باہر اور حفاظت مشکل ہو، لہذا مصلحت اسی میں ہے کہ انہیں ضامن قرار دیں، تاکہ لوگوں کے مال کی حفاظت میں کسی طرح کی کوتاہی نہ برتیں۔ آج کل کے حالات کے اعتبار سے ''الفقہ المنہجی'' کے مؤلفین کا خیال یہ ہے کہ اسی قول پر عمل کرنا زیادہ راجح اور بہتر ہے

اجارہ کی انتہا اور اختتام

۱) عقد اجارہ طرفین کی جانب سے عقدِ لازم ہے، یعنی ایک مرتبہ صحیح منعقد ہوجائے تو مستاجر یا موجر جب چاہے بلا عذر فسخ نہیں کرسکتے، اگر فسخ کردے تو اجارہ ختم ہوجائے گا۔ فسخ کے اعذار درج ذیل ہیں۔

(أ) اجارہ عین میں اس شئی کا ھلاک اور تلف ھوجانا، پس معین گھر یا گاڑی کرایہ سے لے، پھر کسی انتفاع سے قبل ہی گھر منہدم ہوجائے یا گاڑی ناکارہ ہوجائے تو اجارہ فسخ ہوجائے گا۔ اگر شئی تلف نہ ہو لیکن ایسی عیب دار ہوجائے کہ اس سے مقصود انتفاع متعذر ومشکل ہو، تب بھی فسخ ہوگا۔ کسی قدر انتفاع کے بعد تلف یا عیب پیدا ہو، تو آئندہ کے لئے اجارہ فسخ ہوگا، اور طے شدہ اجرت میں سے بقدر انتفاع حصہ ادا کردے (مثلاً ایک سال کے لئے مکان کرایہ سے لیا اور ۶/ ماہ بعد منہدم ہوگیا تو نصف کرایہ ادا کرے)

اگر اجارہ ذمہ ہو، مثلاً کسی سے فلاں مقام تک موصوف گاڑی کے ذریعہ پہنچانے پر معاملہ طے پائے، اس کے مطابق وہ گاڑی لے

آئے لیکن پہلے ہی یا دورانِ سفر وہ گاڑی بگڑ کر نا قابلِ سفر ہو جائے، تو اس سے اجارہ فسخ نہ ہو گا، بلکہ موجر دوسری گاڑی کے ذریعے اسے پہنچادے، کیونکہ عقد کسی معین گاڑی کے متعلق نہیں تھا، بلکہ موصوف گاڑی کے متعلق تھا۔

عین مستاجرہ (کرایہ کی چیز) ہی کی طرح گذشتہ سارے مسائل میں اجیر (مزدور، کاریگر) کا حکم ہے لہٰذا کسی معین شخص کو کسی کام کے لئے مزدور رکھے، پھر وہ مر جائے یا ایسا بیمار ہو جائے کہ مقررہ کام انجام نہیں دے سکتا، تو اجارہ فسخ ہو گا۔ اور اجارہ ذمہ اس سے فسخ نہ ہو گا، بلکہ دوسرے کے ذریعہ وہ کام کروا کے دے سکتا ہے۔

(ب) عین مؤجَرہ (کرایہ کی چیز) کامدت میں سپرد نہ کرنا: اجارۂ عین میں منفعت مدت کے ساتھ مقید ہو، اور مدت گذر جانے تک مُوجِر عین موٗجرہ (کرایہ پر دی جانے والی شئی) سپرد نہ کرے تو اجارہ فسخ ہو گیا۔

اجارۂ ذمہ میں وقت متعین ہو، اور موجر اس وقت میں وہ چیز جس سے انتفاع ہو سکے پیش نہ کرے، تو اجارہ فسخ ہو جائے گا۔ اگر تحصیل منفعت کے لئے کوئی وقت متعین نہ کرے، اور اس چیز کے پیش کرنے سے قبل اتنی مدت گذر جائے جس میں انتفاع ہو سکتا تھا، تو نہ فسخ ہو گا اور نہ فسخ کرے گا۔ اگر موجر مدتِ اجارہ کا بعض حصہ گذرنے کے بعد وہ شئی پیش کرے تو گذشتہ مدت میں اجارہ فسخ ہو چکا، اور بقیہ مدت کے لئے مستاجر کو اختیار ہے (کہ چاہے تو باقی رکھے ورنہ فسخ کرے)۔

اگر منفعت عمل کے ساتھ مقید ہو (نہ کہ مدت کے ساتھ) اور اس شئی کی سپردگی میں اتنی تاخیر ہو کہ اس میں وہ عمل انجام پا سکتا تھا، تو اجارہ فسخ نہ ہو گا۔

جن اسباب سے اجارہ فسخ نہ ہوگا۔

(أ) کرایہ کی چیز موجر کی ملکیت سے نکل جائے تو اجارہ فسخ نہ ہو گا، مثلاً مکان کرایہ سے دیا پھر اسے کسی کو ہبہ کیا یا فروخت کر دیا، کیونکہ عقد اجارہ کا تعلق منفعت سے ہے (نہ کہ عین اور چیز سے) لہٰذا اس چیز کی ملکیت بیع یا ہبہ کی وجہ سے خریدار یا موہوب لہٗ کی طرف منتقل ہو گی، نہ کہ منفعت، کیونکہ بائع یا واہب (فروخت کرنے والا یا ہبہ کرنے والا) خود بوقت عقد منفعت کا مالک نہیں تھا، اور وہ چیز اجارہ کی مدت کے اختتام تک مستاجر کے قبضہ میں رہے گی۔ البتہ خریدار کو اجارہ کا علم نہ تھا، یا اجارہ کی مدت کا علم نہ تھا تو اسے خیار حاصل ہو گا۔ (وہ بیع فسخ کر سکتا ہے)

(ب) موجر یا مستاجر میں سے کسی ایک یا دونوں کے انتقال سے اجارہ فسخ نہ ہو گا، بلکہ اختتامِ مدت تک باقی رہے گا، اور تحصیل منفعت میں مستاجر کے وارث اس کے قائم مقام ہوں گے۔

(ج) معقود علیہ (یعنی جس پر عقد ہوا ہے) کے علاوہ میں کسی خلل یا عذر کے طاری ہونے سے اجارہ فسخ نہ ہو گا، مثلاً اپنی کار کرایہ سے دیا اور خود ہی اس کا ڈرائیور بھی ہے، اب مالک بیمار ہو جائے اور کرایہ دار کے ساتھ نہ نکل سکے تو اجارہ فسخ نہ ہو گا، کیونکہ کسی اور ڈرائیور کو روانہ کر کے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح کسی نے گاڑی کرایہ سے لی اور مستاجر (کرایہ دار) بیماری کی وجہ سے سفر میں نہ جا سکے، یا مکان رہائش کیلئے کرایہ پر لے، پھر سفر کی ضرورت پیش آئے تو اجارہ فسخ نہ ہو گا، کیونکہ معقود علیہ (مکان یا گاڑی) میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا، اور کرایہ دار کسی اور کے ذریعے یہ منفعت حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) مقررہ منفعت کی تحصیل: عقد اجارہ میں جس عمل کی قید لگائی گئی ہو، اس کے اتمام پر یا جس مدت کی قید ہو، اس کے

گذرنے کے ساتھ عقد اجارہ اپنے اختتام وانتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کرایہ دار اس چیز کو استعمال کرے تو اس مزید استعمال کی اجرت مثل واجب ہو گی، اور یہ اس چیز کا ضامن ہو گا، کیونکہ بغیر عقد کے اس کا استعمال تعدی ہے۔

کھیتی کسی خاص کاشت کے لئے کرایہ سے لے، اور مدت کے اختتام تک اس کے کاٹنے کا وقت نہ ہو، تو اسے اکھاڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ کرایہ دار کا نقصان ہے، بلکہ مزید مدت کی اجرت مثل واجب ہو گی، البتہ زمین کا ضامن نہ ہو گا، کیونکہ یہ تعدی میں داخل نہیں ہے۔

عقد اجارہ کے خیارات

۱)**خیار مجلس اور خیارِ شرط:** عقد اجارہ میں خیار مجلس اور خیار شرط حاصل نہ ہو گا، کیونکہ یہ ایک طرح کا عقد غَرَر ہے، جسے لوگوں کی عام ضرورت کے پیشِ نظر جائز قرار دیا گیا، اور خیار بھی ایک قسم کا غرر ہے، لہٰذا یہ حاصل نہ ہو گا، کیونکہ کثیر غرر کی صورت میں عقد صحیح نہیں ہوتا۔

۲)**خیارِ عیب:** اجارۂ عین میں خیار عیب حاصل ہو گا، لہٰذا کرایہ کی چیز میں ایسا عیب پیدا ہو، جس سے منفعت پر واضح اثر پڑتا ہو، اور بے عیب اور پیدا شدہ عیب کے درمیان کرایہ کا تفاوت ہوتا ہو، جیسے کاشت کے لئے کھیت کرایہ سے لے پھر اس کا پانی ختم ہو جائے، یا سفر کے لئے ایر کنڈیشن سواری کرایہ سے لے، پھر اس کا ایر کنڈیشن سسٹم بگڑ جائے اور مالک اس عیب کو فوراً درست نہ کرے، تو کرایہ دار کو اجارہ کے باقی رکھنے کا یا فسخ کرنے کا اختیار ہے، اگر کچھ وقت گذرنے سے قبل ہی فسخ کرے تو اس پر کچھ لازم نہیں، اور اتنا وقت گذر چکا ہو کہ اس کے عوض عموماً کرایہ ہوتا ہے، تو مقررہ کرایہ میں سے اس تناسب سے ادا کرے۔

اجارہ ذمہ میں خیار عیب حاصل نہیں ہوتا، موجر متعینہ اوصاف کے مطابق چیز پیش کرے، پھر وہ عیب دار ہو جائے تو موجر پر لازم ہے کہ اس کا بدل پیش کرے، کیونکہ اس کے ذمہ عیب سے صحیح سالم پیش کرنا طے پایا تھا، اب اس میں عیب ہے تو دوسرا پیش کرے، لیکن عقد اجارہ فسخ نہ ہو گا۔

واپسی یا تلف کے دعویٰ میں موجر اور مستاجر کا اختلاف

(ا) تلف کا دعویٰ: اگر کرایہ کی چیز کرایہ دار کے ہاتھوں تلف ہو جائے یا عیب دار ہو جائے، اور یہ دعویٰ کرے کہ اس سے تعدّی نہیں ہوئی، بلکہ ناگہانی آفت اور اس کے ارادے کے بغیر قہری سبب سے یہ پیش آیا، یا عادتاً جس استعمال کی اجازت ہوتی ہے اس استعمال سے یہ نقصان پیش آیا، اور موجر کا دعویٰ ہو کہ کرایہ دار کی تعدی اور تساہل ولاپرواہی کی وجہ سے یہ پیش آیا ہے، تو مستاجر (کرایہ دار) کی بات کو اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کیا جائیگا، کیونکہ موجر تعدی کا دعویٰ کر رہا ہے اور مستاجر اس کا انکار کر رہا ہے، اور اصل عدم تعدی اور ضمان سے بری الذمہ ہونا ہے، لہٰذا اصل کے مدعی کی بات مع قسم کے تسلیم کرلیں گے۔

(ب) واپسی کا دعویٰ: اگر کرایہ دار چیز مالک کو واپس کرنے کا دعویٰ کرے، اور موجر (مالک) اس کا انکار کرے، تو موجر کی بات اس کے قسم کے ساتھ تسلیم کرلیں گے، کیونکہ کرایہ دار اپنے نفع کے لئے چیز پر قبضہ کر چکا تھا، اور اصل نہ لوٹانا ہے، اور مستاجر لوٹانے کا دعویٰ کر رہا ہے، پس موجر کا قول مع قسم قبول کریں گے، کیونکہ وہ واپسی کا انکار کر رہا ہے اور وہی اصل ہے۔

متفرقات

قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کے لئے، یا قبر کے علاوہ کہیں اور لیکن اس کے ساتھ میت کے لئے یا مستاجر کے لئے تلاوت کے بعد تلاوت کے مثل ثواب یا مغفرت وغیرہ کی دعا کے لئے (چاہے کوئی جگہ یا وقت معین کرے یا نہ کرے) یا مستاجر کے روبرو تلاوت کے لئے یا مستاجر کا خیال دل میں رکھے ہوئے تلاوت کے لئے کسی کو اجرت پر متعین کرنا جائز ہے، کسی اور ذکر اور اس کے بعد دعاء کے لئے بھی اجارہ جائز ہے۔(نہایۃ المحتاج مع الحواشی ۲۹۳/۵ ۔بغیۃ المسترشدین ص ۱۲۶ ۔حاشیۃ الجمل ۵۴۱/۳ ۔فتح المعین مع الترشیح ۲۵۳)

جُعَالہ

جُعالہ عربی زبان میں اجرت اور مزدوری کو کہتے ہیں، اور شرعاً: کسی معین عمل کو جو معلوم ہو یا مجہول کسی معین یا مجہول شخص کے ذریعہ انجام دینے کی صورت میں معلوم عوض کو اپنے اوپر واجب اور لازم قرار دینے کو کہتے ہیں۔ جُعالہ کے ارکان کی تفصیل سے اس تعریف کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

جُعالہ مشروع اور جائز ھے، اور اس کی ایک دلیل صحیحین کی وہ حدیث ہے، جس میں وارد ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے ایک سفر میں ایک قبیلے کے سردار کے بچھو کے زہر کو بکریوں کی ایک تعداد کی شرط پر اتارا، اور اتارنے کے بعد شرط کے مطابق ان بکریوں پر قبضہ کیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تفصیل پیش کی تو آپ ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی۔

آیت: قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ (یوسف ۷۲) **ترجمہ:** "انہوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا، اور جو شخص اس کو حاضر کرے، اس کو ایک بارِ شتر (اونٹ کا بوجھ) غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا۔ اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔" یہ سابقہ شریعت کا حکم ہے، اور درج بالا حدیث سے ہماری شریعت کا بھی یہی حکم باقی معلوم ہوا

حکمت: حاجت کی وجہ سے اسے مشروع کیا گیا، کیونکہ کبھی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے اور اس کی تحقیق و تلاش اور جستجو کر کے مفت میں لوٹانے والا کوئی مل نہیں پاتا، اور خود بھی اس عمل سے عاجز ہو گا، جہالت کی وجہ سے اجارہ بھی صحیح نہ ہو گا، لہٰذا اس کی تحصیل کے لئے متعین عوض کے التزام و اعلان کا سہارا لے گا، لہٰذا اسی حاجت کے رفع کرنے اور مصلحت کے حصول کے لئے اسے مشروع کیا گیا۔

ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) عمل (۴) عوض (جُعْل)

۱) **عاقدین:** یعنی جاعل اور عامل = جاعل سے مراد وہ شخص ہے جو عوض کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے، اس کا مکلف یعنی عاقل و بالغ اور رشید ہونا شرط ہے۔

اور عامل یعنی عمل اور کام کر کے عوض کا مستحق بننے والا، عامل کا معین ہونا شرط نہیں، مثلاً یوں کہے: جو بھی میری گاڑی یا گھڑی وغیرہ واپس لا کر دے اسے اتنی رقم دوں گا۔

۲) **صیغہ:** یعنی وہ الفاظ جو عوض کے بالمقابل مطلوبہ عمل کی اجازت پر دلالت کرے، مثلاً جاعل کہے: میری سائیکل جو بھی لا کر

دے اسے ۱۰۰/روپیہ دوں گا، یا معالج (ڈاکٹر) سے کہے: اگر میرے مریض کا علاج کر کے وہ شفایاب ہو جائے تو تمہیں ہزار ۱۰۰۰ روپئے، یا معلم سے کہے: میرے بچہ کو قرأت وکتابت سکھادو تو تمہیں اتنی اتنی رقم دوں گا وغیرہ...

عامل کی جانب سے قبول کرنا شرط نہیں، خواہ عامل معین ہو، کیونکہ جُعالہ عامل کے ابہام اور جہالت (نامعلوم وغیر متعین ہونے) کے باوجود جائز ہے، پس اس کا عمل کرنا کافی ہے۔

۳) **عمل**: یعنی عوض کے استحقاق کے لئے جاعل اور صاحب مال جو بھی شرط لگائے، مثلاً گمشدہ چیز کا لوٹانا، بچہ کی تعلیم، مریض کا علاج وغیرہ۔

عمل معلوم ہونا شرط نہیں، مجہول ہو تب بھی جُعالہ صحیح ہے، یعنی خاص فعل یا مدت کے ساتھ مقید نہ ہو تب بھی صحیح ہے، کبھی تو اس گمشدہ چیز کے لوٹانے یا بچہ کی تعلیم میں زیادہ وقت اور محنت درکار ہوگی اور کبھی کم، حاجت کی وجہ سے اس جہالت کے باوجود اس کی چھوٹ دی گئی۔

۴) عوض: یعنی وہ معاوضہ جو جاعل عامل کے لئے اپنے ذمہ مقرر کرتا ہے، عوض معلوم ہونا شرط ہے، کیونکہ یہ ایک عقدِ معاوضہ ہے۔ لہٰذا مجہول عوض کے بالمقابل جائز نہیں، اگر مجہول عوض کی شرط ہو تو عقد فاسد ہو گا، اور عامل نے عمل انجام دیا تو اجرت مثل کا مستحق ہو گا، کیونکہ ہر وہ عقد جس کے صحیح ہونے پر معین ومقرر عوض واجب ہوتا ہے۔ اس کے فاسد ہونے پر اجرت مثل واجب ہوتی ہے۔

احکام

۱- **جعالہ ایک جائز عقد ہے** یعنی لازم نہیں ہے، بلکہ جاعل جب چاہے فسخ کر سکتا ہے، جیسا کہ عامل جب چاہے اپنے عمل سے رجوع کر سکتا ہے، فریقِ ثانی متفق اور راضی ہو یا نہ ہو، اسے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

اگر عامل نے فسخ کیا تو اسے کچھ نہ ملے گا، خواہ کچھ عمل انجام دے چکا ہو، کیونکہ وہ عمل مکمل ہونے کے بعد ہی عوض کا مستحق ہوتا ہے، اور اس نے مکمل کیا نہیں، لہٰذا اس کا حق ساقط ہو گیا۔

اور اگر جاعل (صاحب مال) نے فسخ کیا ہے: اور عمل کی ابتداء سے قبل ہی فسخ کیا ہے، تو اس پر کچھ لازم نہیں، اور اگر عمل شروع کرنے کے بعد فسخ کیا ہے تو عمل کی اجرت مثل لازم ہو گی۔

۲- **صاحبِ مال اور جاعل کی اجازت کے بغیر** جُعل (عوض) کا مستحق نہ ہو گا، مثلاً جاعل یہ اعلان کرے جو میری فلاں گمشدہ شئے لادے اسے سو ۱۰۰ روپئے دونگا، کوئی شخص جاعل کے اعلان کے بغیر ہی کام کرے تو کسی جُعل کا مستحق نہ ہو گا، جیسا کہ کسی کو کوئی گمشدہ شئے مل جائے اور وہ مالک کو لوٹا دے تو کسی معاوضہ کا مستحق نہیں ہو گا، یا کسی کے بچہ کو جاعل کی اجازت کے بغیر پڑھادے تو یہی حکم ہے۔

اگر عمل کی اجازت تو دے، لیکن کسی جعل کی شرط نہ لگائے، تو راجح یہ ہے کہ وہ کسی عوض کا مستحق نہ ہو گا، کسی معین شخص کو عمل کی اجازت دے، اور دوسرا شخص اسے انجام دے تو اسے کچھ نہ ملے گا۔

۳) **عامل عمل سے فارغ ہونے کے بعد** ہی جُعل کا مستحق ہو گا: اگر جُعل مریض کی شفا پر ہے تو اس کے شفایاب ہونے کے بعد، قرأت وکتابت کی مہارت پر ہے تو مہارت حاصل ہونے کے بعد، گمشدہ کے لوٹانے پر ہے تو اسے لوٹانے کے بعد ہی جُعل کا مستحق ہو گا (صرف علاج کیا ابھی شفا نہیں ہوئی تو کسی جُعل کا مستحق نہیں... وغیرہ...)

عمل میں ایک سے زائد افراد شریک ہوں تو جُعل میں سب برابر شریک رہیں گے، خواہ ان کے عمل میں تفاوت ہو، کیونکہ اس کا ضبط اور اسکے مطابق تقسیم متعذر و مشکل ہے۔

۴)**عمل سے فراغت سے قبل جُعل میں کمی بیشی جائز ھے**: کسی سے کہا: فلاں کام کرو تمہیں دس روپے دوں گا، پھر کہا: وہ کام کرو تو بیس روپے دونگا یا پانچ روپے دوں گا، تو عمل سے فراغت کے بعد آخری بات یعنی بیس یا پانچ لازم ہیں، جبکہ عمل شروع کرنے سے قبل ہی جُعل کی مقدار تبدیل کرچکا ہو، اور عامل معین ہونے کی صورت میں اسے اطلاع بھی مل چکی ہو، اور غیر معین ہونے کی صورت میں اس کا اعلان کرچکا ہو۔

عمل شروع کرنے کے بعد یہ تبدیلی ہو، تو عامل اجرت مثل کا مستحق ہو گا، کیونکہ دوسرا اعلان پہلے کو فسخ کردے گا، اور دورانِ عمل فسخ کا تقاضا یہ ہے کہ اجرت مثل کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی طرح تبدیلی تو عمل کے ابتداء سے قبل ہو، لیکن عامل معین اس سے ناواقف ہو، یا جاعل نے اس کا اعلان نہ کیا ہو، تو عامل اجرتِ مثل کا مستحق ہو گا۔

۵)**عامل اور جاعل کا اختلاف**: اگر دونوں کا جُعل کی شرط میں اختلاف ہو، عامل کہے کہ تم نے اس عمل پر جُعل کی شرط لگائی تھی، اور صاحبِ مال اس کا انکار کرے، تو صاحبِ مال کی بات مع قسم کے تسلیم کی جائے گی۔ اسی طرح دونوں کا عمل کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً جاعل کہے کہ میں نے گمشدہ گاڑی کے لوٹانے پر جُعل کا اعلان کیا تھا، اور عامل کہے کہ تم نے گمشدہ گھڑی پر یہ اعلان کیا تھا، یا عمل انجام دینے والے کے متعلق اختلاف ہو! مثلاً زید دعویٰ کرے کہ میں نے انجام دیا، اور جاعل کہے بلکہ انور نے انجام دیا، تو ان دونوں صورتوں میں جاعل (صاحبِ مال) کی مع قسم تصدیق کی جائے گی۔

اگر جُعل کی مقدار یا صفت یا جنس کے متعلق اختلاف ہو، مثلاً عامل کہے: آپ نے ہزار (۱۰۰۰) روپے کا وعدہ کیا تھا، اور صاحبِ مال کہے بلکہ میں نے تو پانچ سو روپے کا وعدہ کیا تھا، یا عامل کہے کہ آپ نے دس دینار کا وعدہ کیا تھا، اور صاحب مال کہے میں نے تو دس درہم کا وعدہ کیا تھا، تو دونوں بھی اپنے دعویٰ کے اثبات اور فریقِ ثانی کے دعوی کی نفی پر قسم لیں، پھر دونوں کی بات ساقط اور کالعدم ہو جائیگی، اور عامل اجرتِ مثل کا مستحق ہو گا۔ یہی حکم عمل میں دونوں کے اختلاف کا ہے۔ مثلاً عامل کہے: تم نے تنہا اس عمل پر یہ عوض مقرر کیا تھا، اور جاعل کہے: بلکہ میں نے تو اس کے ساتھ فلاں عمل سمیت یہ عوض مقرر کیا تھا۔

جُعالہ اور اجارہ کا فرق

۱- جُعالہ مجہول عمل پر بھی جائز ہے، جبکہ اجارہ صرف معلوم عمل پر جائز ہے۔
۲- جُعالہ غیر معین عامل کے ساتھ بھی صحیح ہے، اور اجارہ مجہول (غیر معین) کے ساتھ صحیح نہیں۔
۳- اجارہ میں عمل کرنے والے اجیر کا قبول کرنا لازم ہے، جبکہ جعالہ میں عامل کا قبول کرنا لازم نہیں۔
۴- جعالہ میں عمل سے فارغ ہونے کے بعد ہی جُعل (عوض) کا مستحق ہو گا، اگر تعجیل (فراغت سے قبل ہی عوض) کی شرط لگائے تو عقد فاسد ہو گا، اور اجارہ میں اجرت کے تعجیل کی شرط جائز ہے۔
۵- جعالہ عقدِ جائز ہے (لازم نہیں)، جبکہ اجارہ عقدِ لازم ہے، طرفین میں سے کوئی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر اسے فسخ نہیں کرسکتا۔

متفرقات

جائز جھاڑ پھونک (افسوں، تعویذ) پر جعالہ جائز ہے۔ اگر حج وعمرہ اور زیارت پر عقد جعالہ ہو، اور عامل بعض ادا کرے تو اجرتِ مسمی سے مثل کے تناسب سے تقسیم کر کے دیا جائے گا۔ عامل کو جاعل کی جانب سے عوض کے اعلان کا علم نہ ہو تو وہ جُعل کا مستحق نہ ہو گا۔ مثلاً کسی نے کہا: زید نے گمشدہ چیز لوٹائی تو اسے اتنی رقم دوں گا، پھر وہ لوٹائے لیکن اسے اس اعلان کا علم نہ تھا، یا یہ کہا: جو بھی گمشدہ چیز لوٹادے، اسے اتنی رقم ملے گی، پھر وہ شخص لوٹائے جسے اس جعل کا علم نہیں تھا، تو کسی عوض کا مستحق نہ ہو گا۔

عامل میں فی الجملہ اس عمل کی قدرت اور اہلیت ہونی چاہئے، لہٰذا غلام، بچہ، پاگل (جن میں کچھ تمیز وشعور ہو) یا جس پر مالی تصرف کی پابندی ہو، وہ بھی عمل کرے تو صحیح ہے۔

عمل میں کچھ کلفت ومشقت ہونا شرط ہے، لہٰذا جس میں کلفت نہ ہو، وہ جُعل کا مستحق نہ ہو گا۔

کوئی ظلماً مقید ہو، اور اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کر کے اس کی رہائی کے لئے کوشش اور گفتگو کرنے والے کے لئے جعل مقرر کرے تو یہ جائز ہے۔ (حاشیۃالجمل ۳/۶۳۴)

اذکار ودعوات پر جُعل لینا جائز ہے۔ (ترشیح ص ۲۵۶)

اِحْیَاءُ الْمَوَاتِ

(افتادہ وبنجر زمین کی آباد کاری)

احادیث: (۱) ”جو زمین کسی کی نہیں، جو بھی اسے آباد کرے، تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے“ (بخاری شریف)

(۲) ”جو کسی مردہ (غیر آباد) زمین کو زندہ کرے (آباد کرے اور کام میں لائے)، تو اسے اس میں ثواب ملے گا، اور جو بھی روزی کی تلاش کرنے والا (انسان، جانور یا پرندہ) اس (کی پیداوار) میں سے کھائے، وہ اس کے حق میں صدقہ ہے“ (رواہ النسائی وغیرہ وصححہ ابن حبان)

امام زرکشی نے فرمایا: زمین یا تو کسی کی ملکیت میں ہو گی، یا کسی عام یا خاص حقوق کے لئے محبوس ہو گی، یا اس کے علاوہ ہو گی، اور یہی موات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے، پھر شارع کو اسکا مالک بنایا، پھر شارع نے اسے اپنی مسلمان امت کے سپرد کیا۔ مذکورہ دوسری حدیث کی وجہ سے احیاء موات سنت ہے۔

مَوَات (اُفتادہ وبنجر اور غیر آباد زمین): جس زمین کی اسلام میں کسی مسلمان یا ذمی کی طرف سے آباد کاری یقینی نہ ہو، اور جو کسی آباد جگہ کے حقوق میں داخل نہ ہو (حریم نہ ہو، ارد گرد کی ضرورت کی جگہ نہ ہو) اور نہ مسلمانوں کے حقوق میں داخل ہو، اس زمین کو مَوَات کہا جاتا ہے۔ اگر موات مسلم وطن میں ہو، تو کسی مسلمان کے احیاء (اسے آباد کرنے) کی صورت میں وہ اس کا مالک بن جائے گا گرچہ غیر مکلف ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ ممیز ہو، امام (حاکم) کی اجازت ہو، یا نہ ہو (احیاء کرنے والا مالک بن جائے گا)۔

ایک کافر کو اسلامی علاقہ میں احیاء کا حق حاصل نہیں، خواہ امام اسے اجازت دے، کیونکہ یہ غلبہ اور تسلط کے مثل ہے، جو اسے ہمارے علاقے میں ممنوع ہے۔

ایک ذمی اور مستأمن کو ہمارے علاقہ میں ایندھن، گھاس پھوس جمع کرنے اور شکار کی اجازت ہے۔

اگر کفار نے مسلمانوں سے اپنے علاقے کے دفاع میں صلح کرلی ہو، تو وہاں مسلمان احیاء کرکے مالک نہیں بن سکتا، البتہ ایک کافر اس طرح مالک بنے گا، اگر وہ دفاع نہ کریں، یا مصالحت نہ ہو (بلکہ دارالحرب ہو تو دفاع کے باوجود) احیاء کی وجہ سے مسلمان مالک ہو گا۔

جس زمین کا ایک مرتبہ احیاء ہو چکا ہو، خواہ فی الحال ویران و بنجر پڑی ہو، وہ اس کے مالک کی ہے، مالک مسلمان ہو یا کافر، اگر مالک کا علم نہ ہو، اور اسلامی دور میں آباد کاری ہوئی ہو، تو اس کا حکم ضائع مال کا ہے، یعنی وہ بیت المال اور امام کے حوالہ ہے، اگر مالک کا پتہ لگنے کا امکان ہو، تو امام اس کی حفاظت کرے، یا فروخت کرکے قیمت محفوظ کرلے یا بیت المال کی طرف سے بطور قرض دے، اگر مالک کے ظہور کی کوئی امید نہ ہو، تو وہ بیتُ المال کی ملکیت ہے، امام کو بطور جاگیر کسی کی ملکیت میں دینے کا یا عارضی طور پر انتفاع کے لئے کسی کے سپرد کرنے کا اختیار ہے، دوسری صورت میں وہ شخص صرف مقررہ مدت تک ہی انتفاع کرسکتا ہے۔

اگر زمین جاہلیت میں (یعنی اسلامی دور سے قبل) آباد کردہ تھی، تو احیاء کی وجہ سے ملکیت حاصل ہو گی۔

حَریم: کسی آباد جگہ کے ارد گرد کی وہ جگہ، جو اس آباد جگہ سے مکمل انتفاع کے لئے ضروری ہو، اس کا حریم کہلاتا ہے۔ کسی جگہ کا حریم بھی تبعاً اس جگہ کے مالک کی ملکیت ہے، اس لئے کوئی دوسرا شخص اس کا احیاء کرکے مالک نہیں بن سکتا، (چونکہ اس جگہ کسی دوسرے کو تصرف حرام ہے، اس لئے اسے حریم کہا جاتا ہے)

بستی کا حریم: کسی جگہ نئی بستی آباد کریں، تو وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر گفتگو وغیرہ کے لئے بیٹھتے ہوں، گھوڑ دوڑ کا میدان، کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ، قرب وجوار کی مستقل چراگاہ اور بچوں کے کھیل کود کا میدان، اس بستی کا حریم کہلائے گا۔

گھر کا حریم: کسی موات میں مکان تعمیر کرے، تو گذرگاہ اور راستہ، دیوار کے اطراف کا میدان، کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ وغیرہ اس کا حریم شمار ہو گا۔ درمیانی گلی اور تنگ راستے کسی خاص مکان کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ سڑک کی طرح مشترک ہو گا۔

کوئی مکان چاروں طرف سے مکانات سے گھرا ہوا ہو، (مثلاً سبھی نے بیک وقت موات میں اسطرح مکان تعمیر کیا)، تو اس مکان کا خصوصی حریم نہ ہو گا، گرچہ تمام کا مشترک حریم ہو گا۔

تصرف کا حق: ہر مالک اپنی ملکیت میں عادت (وعرف) کے مطابق تصرف کرسکتا ہے، خواہ اس سے پڑوسی کو ضرر ہو، یا اسکا مال تلف ہو، مثلاً کسی نے اپنی جگہ پانی کا کنواں کھودا، جس سے پڑوسی کی دیوار کو نقصان پہنچا، یا بیت الخلاء بنایا جس سے پڑوسی کے کنویں کے پانی میں تغیر پیدا ہوا، یا اپنی ملکیت میں چراغ جلایا جس کے دھویں سے پڑوسی کی دیوار آلودہ ہوئی وغیرہ۔

اگر عادت سے تجاوز کرجائے، تو اس کی وجہ سے جو نقصان ہو گا، اس کا ضامن ہو گا۔ مثلاً اپنی ملکیت میں پانی روکے رکھا، جس کی وجہ سے تری پڑوسی کے دیوار تک پہنچی۔ اگر کوئی پانی کا گڑھا کھودے یا درخت لگائے تو جائز ہے، آئندہ پانی کی تری یا درخت کی جڑیں دوسروں کی ملکیت میں داخل ہوں، تو اس ضرر کا ازالہ ضروری ہو گا۔

کوئی شخص اپنی جگہ اصطبل چکی یا لوہار کی دوکان بناسکتا ہے، جبکہ متعلقہ مقصد کے مطابق دیواروں کو مضبوط وپختہ بنائے، کیونکہ اس سے دوسرے کی ملکیت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ خواہ بدبو وغیرہ کی وجہ سے مالک کو تکلیف پہنچے۔

کسی شخص نے اپنی جگہ موری کھودی، جس سے پڑوسی کے کنویں کا پانی بگڑ گیا، یا کنواں کھودا، جس سے اس کے کنویں کا پانی گھٹ گیا، تو یہ ضامن نہ ہو گا، جبکہ عادت کے برعکس کنواں زیادہ کشادہ نہ ہو، یا دیوار سے بالکل قریب نہ بنائے۔ اسی طرح اگر زمین نرم ہو کہ مَن

کے بغیر منہدم ہوتی ہو، اور وہ مَن نہ باندھے تو ضامن ہو گا اور خلاف عادت تصرف سے روکا جائے گا۔

احیاء کی صورتیں

موات کے کسی زمین کو قبضہ میں لے کر آباد کرنا ہو تو جس مقصد کے لئے قبضہ کر رہا ہے، اس اعتبار سے احیاء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مکان: مکان کی غرض سے کسی موات کا احیاء کرنا ہو، تو اس جگہ (علاقہ کی) عادت کے مطابق کچی یا پکی اینٹ کی، یا مٹی، یا تختے یا بانس وغیرہ کی دیوار بنانا، دروازہ لگانا، کچھ حصے میں چھت ڈالنا، تاکہ قابل سکونت ہو جائے ضروری ہے۔

باڑہ: جانوروں یا پھل و اناج کے لئے باڑہ بنانا ہو، تو دیوار اور دروازہ کافی ہے، چھت ضروری نہیں۔

کھیتی: احیاء کا مقصد کھیتی باڑی ہو، تو مٹی، بانس، پتھر یا کانٹوں کے ذریعے اطراف میں باڑ (باندھ) لگادے، تاکہ احیاء شدہ حصہ دوسرے حصوں سے جدا ہو جائے، نیز وہاں کے نشیب و فراز کو ختم کر کے زمین درست کر دے، اور صرف بارش کا پانی ناکافی ہو تو پانی کا معقول انتظام کرے۔ باقاعدہ کاشتکاری کرنا ضروری نہیں، یہ احیاء میں داخل نہیں۔

باغ: باغ کے لئے احیاء کر رہا ہے، تو مٹی وغیرہ سے مناسب کمپاؤنڈ (احاطہ) یا باندھ بنائے، اور پانی کا نظم کرے، (جبکہ بارش ناکافی ہو) اور کم از کم اتنے درخت لگائے، جس پر باغ کا اطلاق ہو۔

تَحجُّر (زمین روک کر رکھنا): کسی نے اپنی حیثیت کے مطابق اتنے حصے کا احیاء شروع کیا، جو اس کی کفایت سے زائد نہ ہو، یا اس جگہ پتھر لگا کر یا لکڑیاں گاڑ کر (احیاء کی) نشانی لگادی، یا امام نے بطور جاگیر (اِقْطاع) اسے عنایت کیا، یا کافروں کے علاقے میں اس حصے پر مسلط ہو کر قبضہ جمالیا، تو وہ اس حصے کا متحجر (تحجر کرنے والا) ہے، یعنی دوسروں کو اس سے روکنے والا ہے، اور وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ ابو داود کی حدیث میں ہے: "جو کسی ایسی چیز کی طرف سبقت لے جائے، جس کی طرف ابھی تک کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی، تو وہ اس کی ہے" (یعنی اسے اس کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے، یہ مراد نہیں کہ وہ مالک بن گیا) لیکن کسی دوسرے نے ایسی جگہ کا باقاعدہ احیاء کیا، تو وہ مالک بن جائے گا، گرچہ اس طرح کرنا ظلم ہے، (کیونکہ متحجر مالک نہیں بنا تھا، لیکن اس کا حق مقدم تھا)، متحجر احیاء سے قبل اسے فروخت نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی اتنی جگہ روک رکھے، جس کا احیاء اس کے بس میں نہیں، یا اپنی کفایت سے زائد جگہ گھیر رکھے، تو یہ حرام ہے، جبکہ اس سے دوسرے کو ضرر ہو، اور دوسرا شخص اس صورت میں زائد جگہ کا احیاء کر سکتا ہے۔

کفایت سے مراد احیاء سے جو غرض و مقصد ہے، اس کی کفایت ہے۔ اگر رہائشی مکان کے لئے احیاء کر رہا ہے، تو اس کے اور اہل و عیال کی رہائش کے لئے کافی جگہ مراد ہے۔ اگر اپنی آمدنی کے لئے کئی مکانات تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اس کے گذر بسر کے لئے درکار آمدنی کے بقدر مکانات مراد ہیں۔

عرفاً طویل مدت تک کوئی کسی زمین کو روک کر رکھے، اور بلا عذر احیاء نہ کرے، تو امام (حاکم) پر واجب ہے کہ اسے حکم دے کہ یا تو احیاء کر دو ورنہ وہ جگہ چھوڑ دو، کیونکہ اس کی یہ حرکت مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے وہ احیاء کے لئے کچھ مدت مانگے، تو امام اپنی صواب دید سے مناسب اور مختصر مدت تک مہلت دے، جس میں وہ احیاء کی تیاری کر سکے، مقررہ مدت کے گذرنے تک اس نے احیاء کا سلسلہ شروع نہ کیا، تو اس کا حق باطل ہو جائے گا۔ اگر وہ کوئی عذر پیش نہ کرے، تو مہلت دینے کی ضرورت نہیں،

حِمی (چراہ گاہ کو محفوظ کرنا)

جزیہ، فئی، زکات اور مالک سے بھٹکے ہوئے جانوروں کو اور کمزوری کی وجہ سے جو جانوروں کو دور نہیں لے جاسکتے، ان کے جانوروں کو چرانے کے لئے امام (خلیفہ۔ حاکم) موات کی چراگاہ کو محفوظ کرکے لوگوں کو وہاں چرانے سے روک سکتا ہے، جبکہ ان کو ضرر رساں نہ ہو، (اسی کو حِمیٰ کہتے ہیں)، کیونکہ آپ ﷺ نے نقیع (مدینہ منورہ سے تقریباً ۲۰ میل دور ایک جگہ کا نام) کو مسلمانوں کے گھوڑوں کی خاطر حمیٰ بنایا تھا۔'' (امام احمد و ابن حبان فی صحیحہ)

عوام اور رعایا کو، یا امام کو اپنی ذات کے لئے اس کی اجازت نہیں، کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

چشمے اور کنویں وغیرہ کے جاری و غیر منقطع پانی کو امام جزیہ وغیرہ کے جانوروں کے پینے کے لئے محفوظ نہیں کرسکتا۔ آپ ﷺ کے حمیٰ کے علاوہ، دیگر حمی کو، امام وقت اگر مصلحت سمجھے تو منسوخ کرسکتا ہے۔ (من الجمل علی فتح الوھاب ۳/ ۵۶۱-۵۶۸)

وَقْف

وقف عربی زبان میں حَبس اور روکنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

جس مال کے عین (اصل چیز) کے بقاء کے ساتھ اس سے انتفاع (نفع اٹھانا) ممکن ہو، اس میں براہ راست اپنے تصرف کو ختم کرکے، اسے کسی موجود مباح مصرف کے لئے روک دینا، شرعاً وقف کہلاتا ہے۔ شرعی تعریف کے قیود کی وضاحت آئندہ سطروں میں آجائیگی۔

مشروعیت کی دلیل: قرآن وحدیث کی روشنی میں وقف ایک قربت اور محبوب عمل ہے۔

آیت: ''لَنۡ تَنَالُوۡا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ '' (آل عمران: ۹۲)

ترجمہ: ہر گز نہ حاصل کرسکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ، اور جو چیز خرچ کروگے، سو اللہ کو معلوم ہے۔''

حضرت ابو طلحہؓ نے جب یہ آیت کریمہ سنی، تو وقف کی رغبت لئے ہوئے آپ ﷺ سے مشورہ کرنے آئے۔ (جس کی تفصیل صحیحین میں موجود ہے)

۲) '' وَمَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّکۡفَرُوۡہُ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ '' (آل عمران: ۱۱۵)

ترجمہ: ''اور جو کچھ کریں گے وہ لوگ نیک کام، اس کی ہر گز ناقدری نہ ہوگی، اور اللہ کو خبر ہے پرہیز گاروں کی''

احادیث: ۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب انسان انتقال کرجاتا ہے، تو اس کے اعمال کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، سوائے تین اسباب کے: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے (اوروں کو) نفع ہو، یا صالح اولاد جو اس کے حق میں دعا کرے'' (مسلم)

صدقہ جاریہ کو علماء نے وقف پر محمول کیا ہے۔ صالح (نیک) سے مراد جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پابند ہو۔

۲) حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے کہ میری نگاہ میں اس سے بہتر مال مجھے قطعاً نہیں ملا، آپ کا اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: ''چاہو تو اسکے اصل کو روکے رکھو، اور اس کا صدقہ کرو'' (یعنی اسے وقف کردو)...

(متفق علیہ)

مشہور یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وقف اسلام میں پہلا وقف ہے۔

وقف صحابہ کرام میں مشہور و معروف تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: جس صحابی کو بھی کچھ حیثیت حاصل رہی، اس نے وقف سے دریغ نہیں کیا، امام شافعیؒ کا ارشاد ہے: اسّی (۸۰) انصاریوں نے اپنا مال وقف کیا تھا۔

حکمت: وقف کے ذریعہ ایک انسان اپنی زندگی میں اور وفات کے بعد مستقل اپنے لئے ثواب اور نیکیوں کا سلسلہ جاری کرتا ہے، اور اس کے قبر میں مدفون ہونے کے بعد بھی اس کا ثواب اسے ملتا رہے گا، نیز اس کے ذریعہ امت کے مختلف مصالح کا تحقق ہوتا ہے، کیونکہ اوقاف کا صحیح استعمال ہو، تو مساجد اور مدارس کی تعمیر وترقی، علمی نشوونما اور دیگر اسلامی شعائر اور مصالح کے بقا کا سبب بنتا ہے، اور فقراء و مساکین اور یتیموں اور مسافروں کی ضروریات کا تکفل ہوتا ہے۔

وقف کے ارکان

(۱) وَاقِف (۲) مُوْقُوْف (۳) مُوْقُوْف عَلَیہ (۴) صیغہ

۱) **وَاقِف (وقف کرنے والا)**: شرعاً کسی کا وقف صحیح ہونے کے لئے درج ذیل شرائط لازم ہیں۔

(الف) اس کی عبارت (اور الفاظ) شرعاً صحیح اور معتبر ہو، یعنی وہ آزاد اور عاقل اور بالغ ہو۔ لہٰذا ایک غلام یا بچہ یا پاگل کا وقف صحیح نہیں۔ بچہ ممیز ہو، یا یہ لوگ ولی کی اجازت سے وقف کریں، یا خود ولی ان کا مال وقف کرے، تب بھی یہ وقف باطل ہوگا۔

(ب) تبرع کی اهلیت هو (یعنی بلا عوض مال صرف کرنے کا اختیار ہو)، لہٰذا جو سفاہت یا مفلسی کی وجہ سے مجور ہو، اس کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ انہیں اپنے مال میں تصرف کی اجازت نہیں۔

(ج) اختیار، لہٰذا مکرہ کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ اختیار بھی مکلف ہونے کے لئے ایک شرط ہے۔ (یعنی آدمی اپنے اختیار اور مرضی سے وقف کرے، کسی نے جبراً دھمکی دے کر وقف کروایا تو یہ صحیح نہیں)

مرض الموت میں وقف: ترکہ میں وارثوں کے حق کی رعایت کے پیش نظر مرض الموت میں ایک مریض اپنے ایک تہائی سے زائد مال کو وقف نہیں کر سکتا، اس کی اپنی مصلحت کی خاطر ایک تہائی یا اس سے کم مال کو وقف کر سکتا ہے، تاکہ موت کے بعد بھی اسے اجر وثواب ملتا رہے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، تو آپ ﷺ سے اپنے سارے مال کی وصیت کی اجازت چاہی، لیکن آپ ﷺ نے وارثوں کی مصلحت کے پیش نظر اس کی اجازت نہ دی، آخر میں اپ ﷺ نے ایک تہائی کے وصیت کی اجازت دی (متفق علیہ)

کافر کا وقف: کافر کا وقف صحیح ہے، خواہ مسجد کے لئے ہو، اور وہ اسے نیکی نہ سمجھے، کافر کو راہِ خیر میں صرف کرنے کا بدلہ اسی دنیا میں ملے گا، آخرت میں اس کا کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک مومن کو اس کی نیکی کا بدلہ دنیا و آخرت دونوں جگہ حاصل ہوگا، البتہ ایک کافر کو اس کی نیکی کا بدلہ دنیا میں کھلا دیا جائے گا، پھر جب آخرت میں پہنچے گا، تو اس کے پاس ثواب کے قابل کوئی نیکی نہ ہوگی۔

۲) **موقوف** (جو چیز وقف کی جائے) اس کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(الف) **موقوف معین شئی ھو،** صرف کسی چیز کے منافع کا وقف، خود اس چیز کے بغیر صحیح نہیں، خواہ یہ منافع مُؤقّت (ایک محدود وقت کے لئے) ہوں، مثلاً اپنے مکان کی رہائش کو ایک سال کے لئے وقف کرنا، یا مُؤبّد (ہمیشہ کے لئے) ہو، مثلاً رہائش کو ہمیشہ کے لئے وقف کرنا۔

اگر موقوفہ شئ معین نہ ہو، تب بھی وقف صحیح نہیں ہے، اگر کسی نے بلا تعیین دو مکان میں سے ایک مکان، اور دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی وقف کر دی، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ موقوف معین نہیں ہے۔

(ب) **موقوف پر واقف کو ایسی ملکیت حاصل ھو،** جسے منتقل کیا جا سکتا ہو، اور اس سے کچھ نفع یا فائدہ حاصل ہو، لہٰذا کسی کا ایسی شئ وقف کرنا، جس کا وہ مالک نہیں، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وقف میں اپنے قبضہ سے ملکیت کو منتقل کرنا ہے، جب خود ہی مالک نہیں، تو کسی دوسری طرف منتقل کیسے کر سکتا ہے؟ اسی طرح ایک آزاد شخص اپنے آپ کو وقف نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ خود اپنا مالک نہیں، بلکہ اس کی ملکیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

کسی حاملہ جانور کے صرف حمل کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ حمل جب تک اپنی ماں کے پیٹ میں ہے، اس کی ملکیت منتقل نہیں ہو سکتی، البتہ ماں کو وقف کیا جائے تو تبعاً حمل کا وقف بھی درست ہو گا۔

اسی طرح موقوف کا مفید و نافع ہونا واجب ہے، اگر ایسی زمین وقف کرے جو تعمیر یا کاشتکاری وغیرہ کسی بھی کام کی نہ ہو، یا بالکل تار تار کپڑے، جس میں کوئی نفع نہ ہو، وقف کرے، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔

(ج) **موقوف سے ھمیشہ انتفاع ھو،** لہٰذا کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ کا وقف صحیح نہیں ہے، جن کا فائدہ ان کو ختم کر کے ہی حاصل ہوتا ہے۔

دائم اور ہمیشہ انتفاع سے مراد ابدی دوام نہیں، بلکہ نسبی دوام ہے، یعنی موقوف اتنی مدت تک باقی رہ سکے، کہ اس منفعت کے عوض اجرت حاصل ہو سکتی ہو، لہٰذا گاڑی یا جانور کا وقف صحیح ہے۔ گرچہ یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں۔

موقوف سے فی الحال (بوقت وقف) انتفاع شرط نہیں، آئندہ انتفاع ممکن ہو، تو یہ بھی کافی ہے، پس اگر کمسن جانور کو وقف کرے تو صحیح ہے، کیونکہ آئندہ اس سے انتفاع ممکن ہے۔

(د) **موقوف کی منفعت مباح اور جائز ھو،** اس میں کوئی حرمت نہ ہو، لہٰذا آلات لہو (گانے بجانے کے آلات) کا وقف صحیح نہیں، کیونکہ وقف ایک قربت اور نیکی ہے، اور معصیت اس کے بالکل منافی اور برعکس ہے۔

زمین، باغ، مکان، تجارت گاہ، کنواں اور پانی کا چشمہ وغیرہ وقف کرنا جائز ہے، جبکہ یہ اشیاء فی الحال یا آئندہ قابلِ انتفاع ہوں۔

مَنقُولہ اشیاء کا وقف

منقولہ شئ یعنی جو چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہے، جیسے موٹر کار، جانور، ہتھیار، بستر، برتن، کتابیں وغیرہ۔
منقولہ اشیاء کا بھی وقف صحیح ہے۔

حدیث: (۱) آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ”جو اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) گھوڑا روک کے رکھے (وقف کرے)، اللہ

پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدہ پر بھروسہ کرتے ہوئے، تو اس کا کھانا، پینا، لید اور پیشاب بروز قیامت اس کے میزان (نیکیوں کے پلڑے) میں ہوگا۔" (بخاری، نسائی)

(۲) آپ ﷺ نے فرمایا... "رہا خالد کا معاملہ، تو تم اس پر ظلم کر رہے ہو، اس نے تو اپنی زرہیں اور ہتھیار اور آلاتِ حرب اللہ کے راستہ میں وقف کر دیئے ہیں۔" (متفق علیہ)

مُشَاعُ کا وقف

مُشاع یعنی ایسی مشترک چیز، جس کی ابھی تقسیم نہ ہوئی ہو۔

مُشاع کا وقف بھی صحیح ہے، خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، چاہے ایک شخص اپنا حصہ شائع طور پر وقف کرے، (یعنی تقسیم کر کے اپنا حصہ جدا کرنے کے بغیر)، یا ایک جماعت اپنے حصے شائع طور پر وقف کریں، شرعاً سب جائز ہے۔

حدیث: ۱) حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: "خیبر میں میرے جو سو (۱۰۰) حصے ہیں، اس سے بہتر اور پسندیدہ مال مجھے بالکل نہیں ملا میں اسے صدقہ کر دینا چاہتا ہوں، تو اپ ﷺ نے فرمایا: "اس کے اصل کو باقی رکھ کے پھلوں کو خیرات کر دو، (وقف کر دو) (نسائی)

۲) آپ ﷺ نے مسجد (نبوی) کی تعمیر کا حکم دیا، تو فرمایا: "اے بنو نجار، تمہارے اس باغ کی قیمت طے کر لو" انہوں نے عرض کیا: واللہ (قسم بخدا)، ہم تو اس کی قیمت اللہ تعالیٰ ہی سے لیں گے (بخاری شریف)

خطیب شِربینی، 'مغنی المحتاج' میں فرماتے ہیں: مساجد میں چٹائیاں اور قندیلیں وقف کرنے پر ہر دور میں امت کا اتفاق رہا ہے۔

۳) **مَوْقُوْف عَلَیْه:** یعنی جس پر وقف کیا جائے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱) مُعیّن، ایک ہو یا اس سے زائد (۲) غیر معین، جیسے کسی جہت پر وقف کرنا، مثلاً فقراء پر

مُعیّن موقوف علیه کے شرائط: وقف کے وقت اسے مالک بنایا جا سکتا ہو، یعنی وہ حقیقتاً موجود ہو، لہٰذا کسی لاولد کا اپنے بیٹے پر وقف صحیح نہیں، اسی طرح فلاں شخص کے فقیر (غریب) اولاد پر وقف کرے، اور بوقتِ وقف ان میں کوئی بھی فقیر نہ ہو، تو یہ وقف صحیح نہیں ہے۔ جنین، میت، جانور اور مکان وغیرہ وہ اشیاء جن کا بوقت وقف مالک بننے کا کوئی تصور ہی نہ ہو، ان پر وقف صحیح نہیں ہے۔

لہٰذا، قرآن مجید اور شرعی علوم کی کتابیں کسی غیر مسلم پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اسے ان کا مالک بنانا صحیح نہیں ہے۔

واقف کا براہِ راست اپنی ذات پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، (البتہ وہ مثلاً کنواں مسلمانوں پر وقف کر دے، تو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے خود وہ بھی اس سے انتفاع کر سکتا ہے) جب معین پر وقف ہو، تو اس کا قبول کرنا شرط ہے، اور یہ قبول ایجاب سے متصل ہونا واجب ہے۔ اگر وہ قبول نہ کرے، یا رد کر دے، تو یہ وقف باطل ہوگا، لیکن اگر غیر معین پر وقف ہو، مثلاً فقراء پر، یا مسجد پر وقف ہو، تو اس کی صحت کے لئے قبول شرط نہیں ہے۔

کافر پر وقف: اگر کافر معین ذمّی ہو، تو اس پر وقف صحیح ہے۔ جبکہ اس سے کوئی گناہ مقصود نہ ہو، کیونکہ ذمی کو صدقہ دینا جائز ہے، تو اسی طرح وقف بھی جائز ہوگا۔

اگر ذمّی پر وقف کے وقت کوئی معصیت پیش نظر ہو، مثلاً کسی گرجا کے خادم پر اس کی خدمت کے پیش نظر وقف کرنا، تو یہ وقف

صحیح نہیں ہے۔

مُعَاہَد اور مُستَامَن جب تک مسلمانوں کے علاقہ میں ہوں، وہ بھی ذمی کی طرح ہیں۔ ایک حربی کافر یا مرتد پر وقف صحیح نہیں۔

غیر معین موقوف علیہ کے شرائط:

موقوف علیہ غیر معین ہو، مثلاً فقراء، مساجد، مدارس وغیرہ، تو اس کی صحت کی خاص شرط یہ ہے کہ کسی معصیت اور گناہ پر وقف نہ ہو، ورنہ یہ گناہ پر تعاون ہو گا، اور وقف تو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو آپس میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

لہٰذا کفار کی عبادت گاہوں کے لئے اور اس کی خدمت اور چٹائی اور قندیل وغیرہ کے لئے یا اس کی تعمیر یا ترمیم کے لئے وقف صحیح نہیں ہے۔

فتنہ پرور افراد یا ڈاکوؤں پر ہتھیاروں کا وقف صحیح نہیں ہے۔

فقراء، علماء، قراء، مجاہدین، کعبہ، مساجد، مدارس، سرحد، شفاخانے (دواخانے، ہاسپٹل) اور میت کی تکفین وغیرہ کے لئے وقف جائز، بلکہ مستحب ہے، جس کی شریعت نے تعلیم دی ہے، اور اس پر ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

اغنیاء (مالداروں) پر وقف: شرعاً اغنیاء پر وقف صحیح ہے، کیونکہ ان پر نفلی صدقہ جائز ہے، اور ان پر وقف میں کوئی معصیت کا پہلو بھی نہیں۔

غِنٰی اور فقر (مالداری اور غریبی) کی حد:

اگر کوئی شخص اپنا مکان وقف کرے، اور کہے: اس کی آمدنی فقراء کے لئے ہے، یا اغنیا کے لئے ہے، تو اس صورت میں فقیر اور غنی سے کون مراد ہوں گے۔

فقیر: فقیر یعنی وہ شخص جسے فقر کی وجہ سے زکاۃ دی جاسکتی ہو، لہٰذا جو زکات کے بارے میں فقیر شمار ہو گا، وہی وقف میں بھی فقیر شمار ہو گا۔

البتہ جو شخص اپنی ضروریات کے بقدر کما سکتا ہے، لیکن اس کے پاس مال نہیں ہے، وہ وقف میں فقیر شمار ہو گا (بخلاف زکات کے) (حاشیۃ الجمل ۵۷۸/۳)

کسی فقیرہ عورت کا شوہر اس کا نان نفقہ سنبھال رہا ہو، یا اولاد کی کفایت والد کی طرف سے ہو رہی ہو، تو ان پر اس وقف سے صرف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کو زکات دینا جائز نہیں ہے۔

غنی: (مالدار) جس پر زکات حرام ہو، وہ غنی شمار ہو گا۔

راہِ خیر میں یا فی سبیل اللہ وقف: اگر واقف یہ کہے: میں نے یہ زمین راہِ خیر میں یا نیکی کے راستہ میں، یا ثواب کے لئے وقف کیا، تو اس کی آمدنی کے مستحق واقف کے رشتہ دار ہوں گے۔ اگر وہ نہ ہوں، تو عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دیگر مستحقینِ زکوٰۃ اس آمدنی کے مستحق ہوں گے۔

اگر فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں) وقف کرے، تو اس آمدنی کے مستحق وہ غازی (مجاہدین) ہیں، جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں۔

اگر فی سبیل اللہ، راہِ خیر اور راہِ ثواب، تینوں کو جمع کرے، تو اس وقف کا ایک تہائی غازیوں کا، ایک تہائی واقف کے رشتہ داروں کا

اور ایک تہائی عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دیگر مستحقین زکات کا حق ہو گا۔

مسجد کے نقش ونگار اور تزئین اور قبر کی تعمیر کے لئے وقف

فقہاء کرام نے فرمایا: مسجد کی تزئین اور نقش ونگار کے لئے، اور قبر پر تعمیر کے لئے وقف صحیح نہیں ہے، کیونکہ مُردے تو سڑ گل کر مٹی میں ملنے والے ہیں، لہٰذا اس پر تعمیر کرنا اور بلا فائدہ اس میں مال ضائع کرنا جائز نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں عموماً مسلمان، علماء کے اس فیصلہ کے خلاف عمل کرتے ہیں، اور اکثر ان کے علماء اسے صحیح قرار دیتے ہیں، یا سکوت اختیار کرتے ہیں۔

امیروں اور غریبوں سے، وقف کی آمدنی سے، نیز لوگوں کے عطیات کی شکل میں کتنی رقمیں سمیٹی جاتی ہیں، تاکہ مسجد کو مزیّن کیا جائے، اس میں نقش ونگار کیا جائے، یا گنبد تعمیر کیا جائے، یا بڑے اور منقش محراب بنائیں جائیں، حالانکہ یہ ناپسندیدہ فضول خرچی اور اضاعتِ مال ہے، جس کے ذریعے لوگوں کو فتنہ میں ڈال کر، نماز میں ان کی توجہات کو ہٹایا جاتا ہے، کیا ان لوگوں نے اللہ کا یہ فرمان نہیں پڑھا: "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ" (المؤمنون: ۱-۲) جس میں خشوع کے ساتھ نماز پڑھنے والے مومنوں کے لئے فلاح اور کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ جب نمازی کے چاروں طرف ایسے نقش ونگار ہوں، جو اس کے دل ودماغ کو اپنی جانب مائل کرے، تو خشوع کہاں سے حاصل ہو گا؟

اسی طرح قبروں کی تعمیر، اس کی پختگی اور اس پر بتے وغیرہ کی تعمیر میں مال صرف کرنا بھی بالکل فضول خرچی اور اسراف میں داخل ہے، ان تعمیرات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل ہیں، نہ کہ قبریں، گویا کہ اصحابِ قبور ان تعمیرات سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔

۴) **صیغہ:** یعنی وہ الفاظ جو مقصود پر دلالت کرے، یا ان الفاظ کے قائم مقام ہو، جیسے گونگے کا مناسب اشارہ یا تحریر۔ وقف کی صحت کے لئے صیغہ ضروری ہے۔

صیغہ کے اقسام:

(الف) صریح: جس میں صرف مقصود مفہوم کا ہی احتمال ہو، مثلاً میں نے اپنا گھر فقراء پر وقف کر دیا، صریح لفظ کی ادائیگی سے ہی وقف صحیح اور منعقد ہو گا، اس کے ساتھ نیت کا ہونا لازم نہیں۔

(ب) کِنایہ: جس میں مقصود مفہوم کے علاوہ دیگر مفہوم کا احتمال بھی ہو، مثلاً میرا مال فقراء پر صدقہ ہے، یا ان کی خاطر حرام کر دیا، یا ہمیشہ کے لئے ان پر صرف کر دیا، وغیرہ۔ گفتگو پر قادر شخص کی تحریر بھی کنایہ کے حکم میں ہے۔

کنایہ صیغہ کی ادائیگی کے ساتھ وقف کی نیت بھی ہو، تو وقف صحیح ہو گا۔

وقف کے صیغہ کے شرائط: (۱) ایسے الفاظ ہوں جو مقصود پر دلالت کریں یا پھر اسی طرح گونگے کا اشارہ

(۲) صیغہ میں توقیت نہ ہو (متعین مدت کے لئے نہ ہو)، مثلاً یوں کہا: میں نے میری زمین ایک سال کے لئے طلبہ پر وقف کی، تو یہ وقف باطل ہے، کیونکہ صیغہ میں توقیت ہے، حالانکہ وقت کا تقاضہ دوام ہے۔

لیکن مسجد، قبرستان اور رباط وغیرہ وہ امور جو غلام کی آزادی کے مشابہ ہوں، اس شرط سے مستثنیٰ ہیں، یہ امور توقیت کے باوجود صحیح ہیں، البتہ شرط لغو قرار پائے گی، اور ہمیشہ کے لئے وقف ہو جائے گا۔ پس اگر کسی نے کہا: میں نے یہ زمین ایک سال کے لئے بطورِ مسجد

وقف کردی، یا بطور قبرستان، یا رباط، تو وقف صحیح ہو گا، ایک سال کی قید فضول سمجھی جائے گی، اور ہمیشہ کے لئے وقف ہو جائے گا۔

۳) وقف کے مصرف کا تذکرہ: اگر کوئی کہے کہ میں نے فلاں چیز وقف کردی، لیکن مصرف بیان نہ کرے، تو وقف منعقد نہ ہو گا، کیونکہ وقف کی جہت معلوم نہیں۔

۴) مُعلق نہ ہو، کیونکہ وقف ایسا عقد ہے، جو فی الحال ملکیت کا تقاضہ کرتا ہے، لہٰذا اسے کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

پس اگر کوئی کہے: جب زید آجائے تو میرا گھر فقراء پر وقف ہے، یا میری بیوی راضی ہو تو میری کار ان پر وقف ہے، تو یہ وقف باطل ہے۔ البتہ اس شرط میں بھی حسب سابق مسجد جیسے امور کا وقف مستثنیٰ ہے، لہٰذا اگر کوئی کہے کہ جب ماہِ رمضان آجائے تو میں نے اپنا مکان بطور مسجد وقف کردیا، تو یہ وقف صحیح ہے۔

(اسی طرح موت پر بھی معلق کرنا صحیح ہے، جس کی تفصیل وقف کے بعض مسائل نمبر ۱۷ میں آرہی ہے)

۵) اِلزام (لازم قرار دینا)، لہٰذا وقف میں خیار شرط یا خیارِ مجلس کی گنجائش نہیں، اگر کہے: میں نے اپنا جانور فقراء پر وقف کیا، اور مجھے تین دن اختیار رہے گا، یا مجھے اختیار ہے کہ جب چاہوں فروخت کردوں، تو یہ وقف باطل ہے۔

وقف سے خود واقف کا انتفاع

چونکہ وقف میں موقوف چیز اپنی ملکیت سے خارج کی جاتی ہے، اس لئے خود واقف کو اس سے انتفاع ممنوع ہے، البتہ اگر کوئی شخص اپنی ملکیت بطورِ مسجد، یا قبرستان یا کنواں وقف کردے، تو اسے بھی ایک عام مسلمان کی حیثیت سے اس موقوف سے انتفاع جائز ہے لہٰذا واقف کو اس مسجد میں نماز پڑھنا، کنویں سے پانی لینا اور اس قبرستان میں دفن ہونا جائز ہے۔

حدیث: آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "کون ہے، جو رُومہ کنواں خرید لے، اور اپنا ڈول بھی مسلمانوں کے ڈول کی طرح رکھے، اور اس کے مقابلہ میں جنت میں خیر حاصل کرلے" (ترمذی بسند حسن، نسائی، والبخاری تعلیقاً)

بئرِ رُومہ (رومہ کنواں) مدینہ منورہ میں شیریں پانی کا کنواں تھا، جو ایک یہودی کی ملکیت تھا، اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ اس کا پانی ایک درہم میں ایک مشک فروخت کیا کرتا، لہٰذا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی اس ترغیب پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خالص اپنے مال سے اسے خرید کر مسلمانوں پر وقف کردیا کہ وہ خود بھی دیگر مسلمانوں کی طرح اس کا پانی استعمال کریں گے۔

وقف کا لزوم اور اس پر مرتب احکام

وقف ایک لازم عقد ہے، یعنی صحیح طریقہ پر اس کے انعقاد کی صورت میں اس کے آثار مرتب ہوں گے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱) صحیح طور پر وقف کرے، تو اب واقف کو خیار مجلس یا خیار شرط حاصل نہیں۔

۲) موقوف کی ملکیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منتقل ہوگی، پس اب واقف کو فروخت، ہبہ وغیرہ کسی تصرف کا حق نہ ہو گا۔

۳) جس جہت پر وقف کیا ہے، انتفاع کا حق اس طرف منتقل ہو گا، خواہ جہت عام ہو یا خاص۔

موقوف کی ملکیت: واقف زمین، کار، ہتھیار وغیرہ کوئی چیز وقف کردے تو اس موقوف کی اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوئی، اب نہ واقف کو ملکیت حاصل ہے اور نہ موقوف علیہ کو۔

موقوف کے فوائد ومنافع: اگر موقوف علیہ معین ہو، تو موقوف کے منافع موقوف علیہ کی ملکیت ہے، اسے بذاتِ خود یا کسی دوسرے کے ذریعہ (مثلاً کسی کو عاریۃً یا کرایہ پر دے کر) اس کی تحصیل جائز ہے۔

اسی طرح وقف کے بعد اس سے جو فوائد حاصل ہوں، مثلاً موقوفہ درختوں کے پھل، جانوروں کا اون، دودھ اور اولاد وغیرہ کا بھی وہ مالک ہوگا۔

اگر موقوف علیہ غیر معین ہو، مثلاً فقراء یا علماء وغیرہ، تو وہ منافع کے مالک نہ ہونگے، بلکہ انہیں صرف انتفاع کا حق حاصل ہوگا۔

موقوف میں تصرف: براہ راست موقوف چیز میں خرید وفروخت، ہبہ وغیرہ تصرفات جائز نہیں، نہ واقف کی جانب سے اور نہ موقوف علیہ کی جانب سے، خواہ موقوف علیہ معین ہو، یا غیر معین، بلکہ وہ ہمیشہ اللہ کی ملکیت پر باقی رہے گا، اور اس کے منافع موقوف علیہ پر صرف ہوں گے، اور ممکنہ حد تک واقف کی صراحت پر عمل کریں گے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے وقف کے متعلق صراحت فرمائی تھی۔: "نہ فروخت کیا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ اس میں وراثت چلے گی" (صحیحین)

موقوف کے مصارف: اگر موقوف پر کچھ صرف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہو، مثلاً جانوروں کا چارہ، عمارت کی مرمت اور آلات کی اصلاح، تو یہ مصارف واقف کی شرط کے مطابق اس کے مال یا وقف کے مال سے ادا کئے جائیں گے، اگر اس نے کوئی شرط نہ لگائی ہو، اور وقف سے آمدنی حاصل ہوتی ہو، تو اس سے ادا کریں گے، اگر کوئی آمدنی نہ ہو، یا منافع معطل ہوں، تو یہ مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے ادا ہوں گے۔

موقوف کی ہلاکت وبربادی: اگر موقوف شئ ہلاک وتلف ہو جائے، تو درج ذیل احکام متعلق ہوں گے۔

۱) اگر موقوف غیر ماکول جانور ہو، (یعنی جس کا گوشت حرام ہے)، اور وہ مر جائے، تو اس کی کھال موقوف علیہ کے ساتھ مختص ہو گی، اسے دباغت دی جائے تو دوبارہ اس پر وقف شمار ہوگا، لہٰذا اس سے انتفاع کر سکتا ہے، لیکن فروخت کرنا جائز نہیں، تاکہ حتی الامکان واقف کے مقصد کی تعمیل ہو۔

۲) اگر موقوف مَاکُول جانور ہو، (یعنی جس کا گوشت حلال ہے)، اور موقوف علیہ کو کسی سبب سے یہ یقین ہو کہ یہ مر جائیگا، تو اسے ذبح کرنا مجبوراً جائز ہے، پھر اس کا گوشت فروخت کر کے اس قیمت سے اسی جنس کا دوسرا جانور خرید کر اس کی جگہ وقف قرار دے۔

۳) اگر کوئی موقوف شئ تلف کر دے، اور اس پر قیمت کا ضمان عائد ہوتا ہو، مثلاً کسی نے تعدی اور ظلم کے طور پر تلف کر دیا، تو موقوف علیہ اس تلف شدہ شئ کی قیمت (ضمان) کا مالک نہ ہوگا، بلکہ اس قیمت سے اسی کے مثل دوسری چیز خریدی جائے، جو اس کی جگہ وقف شمار ہوگا، تاکہ واقف کے مقصد کے مطابق ثواب کا سلسلہ جاری رہے، اگر اس کے مثل چیز اس قیمت میں دستیاب نہ ہو، تو اس کا بعض خرید لے، اگر وہ بھی ممکن نہ ہو، لیکن آئندہ توقع ہو، تو محفوظ رکھے، ورنہ وہ موقوف علیہ کا ہے، اگر وہ موجود نہ ہو، تو واقف کے سب سے قریبی رشتہ دار کا حق ہے، اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو، تو فقراء ومساکین کا حق ہے (جمل ۳/ ۵۹۰)

اگر موقوف خود بخود تلف ہو جائے، یا بغیر ضمان کے تلف ہو، تو اس کے تلف کے ساتھ ہی وقف کی انتہا ہو گئی۔

۴) ضمان کے سبب کے بغیر موقوفہ شئ کی منفعت ختم ہو جائے، مثلاً درخت وقف کیا تھا، اب وہ خشک ہو گیا یا سیلاب یا ہوا کی وجہ سے اکھڑ گیا اور دوبارہ لگایا نہیں جاسکتا، تو اس صورت میں وقف منقطع نہ ہوگا، بلکہ ایک لکڑے کی حیثیت سے بطور وقف اس سے کرایہ وغیرہ کے ذریعہ انتفاع کیا جائے گا، تاکہ اسی چیز کو بطور وقف باقی رکھا جائے، اسے فروخت کرنا یا ہبہ کرنا، جائز نہیں ہے، اگر جلانے وغیرہ

کے ذریعہ (جس سے وہ ختم ہو جائے) ہی انتفاع ممکن ہو، تو موقوف علیہ اسی طرح انتفاع کرے، لیکن فروخت کرنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے

۵) اگر موقوف شئ مسجد کی چٹائی وغیرہ ہو، جو بالکل بوسیدہ ہو چکی ہو، یا لکڑا ہو، جو بوسیدہ ہو چکا ہو، اور جلانے کے علاوہ کسی اور کام کا نہ ہو، تو اسے فروخت کرنا جائز ہے، تاکہ وہ ضائع نہ ہو، اور بلا فائدہ کے جگہ اس سے گھری نہ رہے، اس کی کچھ نہ کچھ قیمت حاصل کرنا، جو وقف کے کام آئے، اس کی بربادی سے بہتر ہے، اس صورت میں یہ قیمت مصالح مسجد پر صرف کی جائے اگر تلف شدہ کے مثل خریدنا ممکن ہو، تو اسے ہی مقدم رکھے۔

اگر جلانے کے علاوہ کسی اور مقصد میں کام آسکتا ہے، تو اسے فروخت کرنا جائز نہیں، تاکہ واقف کی غرض کے مطابق وہی چیز مستعمل ہو، مسجد کے لئے ہبہ شدہ یا بغیر وقف کے خریدی ہوئی چٹائی ہو، تو بوقتِ حاجت فروخت کرسکتے ہیں (فتح الوہاب ۱/۲۵۹)

۶) اگر کوئی مسجد منہدم ہو جائے، اور اس کا اعادہ دشوار ہو، تو اسے فروخت کرنا جائز نہیں، ممکن ہے کسی نہ کسی وقت وہ پھر تعمیر ہو، اگر اس مسجد کی کوئی آمدنی ہو، جو اس کے مصالح پر صرف ہوتی ہو، اور آئندہ پھر اس کی تعمیر کی توقع ہو، تو اس آمدنی کو محفوظ رکھا جائے، اگر پھر تعمیر کی توقع نہ ہو، تو یہ آمدنی اس کے قریب ترین دوسری مسجد پر صرف کرنا جائز ہے۔

۷) کسی مسجد کے متعلق خطرہ ہو، تو حاکم اسے توڑ کر ان پتھروں سے دوسری مسجد بنا سکتا ہے۔ لیکن ان پتھروں وغیرہ کو دیگر کسی تعمیر میں استعمال نہ کرے، تاکہ واقف کے مقصد کی رعایت ہو اس مسجد سے قریب تر دوسری مسجد بنانا بہتر ہے۔

موقوف علیہ کی موت

۱) اگر موقوف علیہ کی موت ہو، اور واقف نے پہلے ہی اس موقوف علیہ کی موت کی صورت میں دوسرے مصرف کی تعیین کی ہو، تو وقف اس کی طرف منتقل ہو گا، مثلاً واقف نے کہا: میں نے یہ مکان یا کار میرے بیٹے پر وقف کیا، پھر فقراء پر، (تو اس صورت میں بیٹے کی موت کے بعد یہ وقف فقراء کی طرف منتقل ہو گا)

اگر دوسرے مصرف کی تعیین نہ کرے، تو یہ وقف وقف ہی رہے گا، اور اول موقوف علیہ کے انتقال کے وقت جو رحم کے اعتبار سے واقف کا قریبی رشتہ دار ہو گا، اس پر صرف ہو گا (جبکہ وہ فقیر ہو) لہٰذا، نواسہ، چچازاد بھائی پر مقدم ہو گا (کیونکہ وراثت کی ترتیب کا اعتبار نہ ہو گا) (مغنی ۲/۳۸۴)

۲) اگر دو افراد پر وقف کرے، پھر فقراء پر، مثلاً کہے: میں نے اپنی زمین زید اور عمر پر وقف کی، بعد میں فقراء پر، پھر زید کا انتقال ہو، تو اس کے حصہ کا وقف بھی عمر کو ملے گا، (عمر کے بھی انتقال کے بعد فقراء کو ملے گا)

۳) اگر دو (۲) شخصوں پر جدا کر کے وقف کرے، مثلاً: میں نے دونوں میں سے ہر ایک پر اس گھر کا نصف حصہ وقف کیا، پھر فقراء پر، تو یہ دو وقف ہیں، لہٰذا ایک کے انتقال کی صورت میں وہ حصہ دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو گا، بلکہ فقراء کی طرف منتقل ہو گا۔

ابتداء اور دوام کے اعتبار سے وقف کا حکم

۱) اگر وقف کسی موجود پر ہو، لیکن وہ منقطع الآخر ہو، (یعنی آئندہ اس موقوف علیہ کا سلسلہ ختم ہوتا ہو)، مثلاً: میں نے یہ کتب خانہ میری اولاد پر وقف کیا، یا زید پر، پھر اس کی نسل پر وقف کیا، اور اس کے آگے کچھ نہ کہے، تو یہ وقف صحیح ہے، کیونکہ وقف کا مقصد قربت (نیکی) اور دوام (ہمیشگی) ہے، پس جب اس نے ابتدائی مصرف کی وضاحت کر دی، تو آئندہ راہِ خیر میں اس کا دوام آسان ہے، لہٰذا مذکورہ

موقوف علیہ کا سلسلہ ختم ہو جائے، تو وہ شئ وقف ہی رہے گی، اور اس وقت واقف کا سب سے قریبی جو رشتہ دار موجود ہو، اس پر صرف کیا جائیگا، کیونکہ رشتہ داروں پر صدقہ افضل نیکیوں میں سے ہے، اس لئے کہ یہ بیک وقت صدقہ اور صلہ رحمی دونوں ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے "مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور ذو رحم (رشتہ دار) پر دو چیزیں ہیں: صدقہ اور صلہ رحمی" (ترمذی بسند حسن، نسائی، ابن ماجہ)

اس صورت میں یہ وقف قرابتِ رحم کے فقراء کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کہ قرابت وراثت کے، پس نواسہ چچازاد بھائی پر مقدم ہوگا (حالانکہ وراثت میں اس کے برعکس ہوگا) اگر قرابت میں کوئی فقیر نہ ہو، تو مصالح مسلمین پر یا فقراء و مساکین پر صرف ہوگا۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۰)

۲) اگر وقف منقطع الاول ہو، (یعنی پہلے جس پر وقف کر رہا ہے، وہ وقف کے وقت موجود نہ ہو) مثلاً واقف کہے: یہ مکان آئندہ مجھے پیدا ہونے والے بچوں پر وقف ہے، پھر فقراء پر، تو یہ وقف باطل ہے۔

۳) اگر وقف منقطع الوسط ہو، (یعنی درمیان میں موقوف علیہ نہ ہو)، مثلاً واقف کہے یہ دوکان خالد کے اولاد پر وقف ہے، پھر ایک شخص پر (جس کی کوئی صراحت نہیں) پھر فقراء پر تو یہ وقف صحیح ہے، کیونکہ فی الحال اور آخر میں مصرف موجود ہے، اور خالد کی اولاد کے بعد یہ فقراء پر صرف ہوگا۔

موقوف کا ناظم (والی، منتظم، ناظر)

اگر واقف خود کسی کو ناظم مقرر کردے، تو وہی اس کا مستحق ہے، واقف خود اپنے لئے انتظام و نگرانی کی شرط لگائے، تو یہ اس کا حق ہے، اگر کسی دوسرے کیلئے شرط لگائے، ایک ہو یا زائد، تو اس کی پابندی کی جائے گی، خواہ اپنی زندگی میں ہی یہ ذمہ داری سونپے، یا وصیت کر جائے، اگر واقف کہے، پہلے فلاں ناظم ہوگا، اس کی موت کے بعد فلاں، تو یہ جائز ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بذاتِ خود اپنے وقف کے ناظر تھے، پھر اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد تاحیات کیا، پھر ان کے خاندان کے صاحبِ بصیرت افراد کے سپرد کیا (ابوداود)

اگر واقف ناظر کے متعلق کوئی شرط نہ لگائے، تو اس صورت میں انتظام اور نگرانی کا حق قاضی (حاکم) کو حاصل ہوگا، کیونکہ اسے عام ولایت حاصل ہے پس وقف کی نگرانی کے لئے بھی وہی بہتر ہے۔

وقف کے ناظر کے شرائط

۱) عادل اور دیندار ہو

۲) کفایت، یعنی متعلقہ ذمہ داری کو بہتر طریقہ پر انجام دینے کی قابلیت و صلاحیت موجود ہو۔

اگر کسی ناظم میں ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو جائے تو حاکم اسے ہٹا کر خود ناظم بنے، یا کسی دوسرے مناسب شخص کو ناظم بنائے، اگر کسی ناظم کا خلل دور ہو، اور دوبارہ نظامت کے شرائط اس میں پائے جائیں، اور واقف نے اسے ناظم بنانے کی صراحت اور شرط رکھی ہو، تو دوبارہ اسے ناظم بنایا جائیگا۔

وقف کے ناظم کو چونکہ دوسروں کی مصلحت کی تدبیر کرنا ہے، لہٰذا یہ یتیم کے والی کے مثل ہوا، اس لئے اسے مصلحت کے تقاضوں

اور احتیاط کو پیشِ نظر رکھ کر تصرف کرنا ضروری ہے۔

ناظر کی ذمہ داری

۱) وقف کی تعمیر، کرایہ پر دینا، آمدنی وصول کرنا، مستحقین پر اسے تقسیم کرنا، اصل چیز اور آمدنی کو بہ احتیاط محفوظ رکھنا۔ یہ اس وقت ہے جبکہ تمام ذمہ داری اس کے سپرد ہو، یا مطلق ناظم بنایا جائے، اگر صرف بعض امور میں ناظم ہو، تو صرف ان امور کو انجام دے۔

۲) واقف نے دو کو ناظم بنانے کی شرط لگائی ہو، تو ایک تنہا تصرف نہیں کر سکتا، البتہ ایک کے تصرف کی صراحت کر دے تو تنہا تصرف جائز ہے۔

ناظم کا معاوضہ (اجرت)

اگر واقف آمدنی میں سے ناظر کے حق میں کسی حصہ کی شرط لگائے، تو یہ جائز ہے، اور ناظر وہ مقررہ حصہ لے سکتا ہے، اگر ناظر کے لئے کسی اجرت کا تذکرہ نہ کرے، تو اسے اجرت نہیں ملے گی۔

اگر ناظر معاملہ کو حاکم کے روبرو پیش کر کے اجرت متعین کرنے کا مطالبہ کرے، تو حاکم اس کی محنت اور عمل کے مناسب اجرت مقرر کر سکتا ہے، جبکہ کوئی مناسب ناظر بلا معاوضہ ذمہ داری نہ سنبھالے، ناظر خود وقف کے مال سے کچھ لے نہیں سکتا، اگر لے تو ضامن ہوگا، اگر حاکم نہ ہو تو کسی دین دار عالم کو ذمہ دار بنالے جو اس کی اجرت مقرر کرے (الشروانی علی التحفہ ۸/۱۶۴)

ناظر اور موقوف علیہ کا اختلاف

اگر ناظر آمدنی و فوائد کو مستحقین پر صرف کرنے کا دعویٰ کرے، اور وہ انکار کریں، پس اگر وہ معین ہوں، تو ان کی بات تسلیم کی جائیگی، اور وہ ناظر سے حساب کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور اگر مستحقین (موقوف علیہ) غیر معین ہوں، تو حاکم کو حساب کے مطالبہ کا اختیار ہے، اور صرف شدہ مقدار کے متعلق بصورتِ احتمال ناظر کی تصدیق کرے گا، اور اگر اسے متہم سمجھے تو اسے قسم دلائے گا۔

ناظر کو معزول کرنا

اگر ناظر نااہل ہو جائے تو معزول ہوگا، اسی طرح واقف اسے معزول کر دے، تو وہ معزول ہو جائے گا، اس صورت میں واقف کسی دوسرے کو ناظر مقرر کر سکتا ہے، کیونکہ ناظر کی حیثیت وکیل کی ہے، اور موکل وکیل کو کسی بھی وقت ہٹا سکتا ہے، لیکن واقف نے بوقتِ وقف کسی کے ناظر ہونے کی شرط لگائی ہو، تو اسے ہٹانا جائز نہیں، گرچہ اس میں مصلحت ہو، کیونکہ عقدِ وقف کے وقت کے شرائط کی خلاف ورزی جائز نہیں، جیسا کہ اپنے غریب اولاد پر وقف کرے، تو بعد میں اسے مالداروں کے حق میں نہیں کر سکتا۔

وقف کے بعض مسائل

۱) اگر واقف کہے: میں نے یہ مکان میری اولاد اور اولاد کے اولاد پر وقف کیا، تو یہ تمام لوگ وقف کے مستحق ہوں گے، اور وقف کے منافع ان کے درمیان مساوی و برابر) تقسیم کئے جائیں گے، اس میں مذکر و مؤنث یا اولاد اور اولاد کے اولاد میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

۲) اگر واقف نے کہا: میں نے یہ مکان میری اولاد پر وقف کیا، تو اولاد کی اولاد اس وقف میں داخل نہیں ہونگی، لیکن اگر واقف کی اولاد نہ ہو، اور اولاد کی اولاد ہو تو پھر وہ اس لفظ میں داخل ہوں گے اور وقف کے مستحق ہوں گے، کیونکہ قرینہ موجود ہے، نیز تاکہ ایک مکلف کا کلام لغو نہ قرار پائے۔

۳) اگر کہے: یہ باغ میری ذرّیت، یا نسل پر وقف ہے، تو اس میں بیٹیوں کی اولاد، اور قریب اور بعید اولاد کی اولاد، مذکر و مؤنث سب داخل ہوں گے کیونکہ لفظ ان کو شامل ہے۔

۴) اگر کہے میرا مال فقراء قرابت (رشتہ دار) پر وقف کیا، تو واقف کے نسب سے جڑنے والے تمام افراد جو فقراء ہوں، اس میں داخل ہیں، خواہ قریب ہوں یا بعید، مذکر ہوں یا مؤنث، وارث ہوں یا غیر وارث، مَحْرَم ہو یا غیر مَحْرَم

۵) کئی عطف شدہ الفاظ سے قبل یا بعد کوئی صفت ہو، تو تمام میں اس کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً واقف نے کہا: میں نے یہ زمین میرے محتاج اولاد، پوتے اور بھائیوں پر وقف کی، تو ان تمام میں حاجت کی صفت -ضروری ہے، یا کہا: میں نے یہ مکان میری اولاد، پوتے اور بھائی جو فقیر ہوں، ان پر وقف کیا، تو ان تمام میں فقر کی صفت شرط ہے۔

۶) رشتہ دار، اولاد، پوتے وغیرہ پر وقف کو ''وقف ذُرّی''، یا ''وقفِ اہلی'' کا کہا جاتا ہے اور مصالح اور جہت، مثلاً مساجد، مدارس او رعلماء و فقراء وغیرہ پر وقف کو 'وقف خَیْری' کہا جاتا ہے۔

۷) اگر کوئی کہے: میں نے زمین کا یہ حصہ مسجد بنادیا، تو اتنا کہنے سے وہ مسجد ہو جائیگا، گرچہ وقف کی صراحت نہ کرے، اگر کہے: میں نے یہ نماز کیلئے وقف کیا، تو یہ صریح وقف ہے، لیکن بطور مسجد وقف ہونے میں کنایہ ہے، لہٰذا نیت کی ضرورت ہے، اگر ایک مکان تعمیر کرکے اس میں نماز کی اجازت دے تو وہ مسجد نہ ہوگی، خواہ اس میں نماز ہو اور اسے مسجد کرنے کی نیت ہو، البتہ موات (عام زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو) میں صرف نیت کافی ہے (لفظ کی ضرورت نہیں) (مغنی المحتاج ۲/۳۸۳)

۸) قبرستان میں درخت اگے، تو اس کے پھل قبرستان کی طرح لوگوں کے لئے مباح ہیں، لیکن اسے قبرستان کی مصلحت پر صرف کرنا بہتر ہے۔ مسجد میں مسجد کی خاطر جو درخت لگائے جائیں، اس کے پھل بلا عوض جائز نہیں، بلکہ اس کا عوض مسجد کی مصلحتوں میں صرف کیا جائے، اگر عام استعمال کیلئے درخت لگائے، یا نیت معلوم نہ ہو اور عادت عام استعمال کی جاری ہو، تو پھلوں کو بلا عوض استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھے تو امام (حاکم۔ ذمّہ دار) مسجد سے درخت کاٹ سکتا ہے، بلکہ کسی قطعۂ زمین کو مسجد بنایا جائے، اور اس میں درخت ہوں، تو امام انہیں کاٹ سکتا ہے، خواہ واقف نے انہیں وقف میں داخل کیا ہو۔

وقف، موقوف علیہ کے پاس بطور امانت ہے، پس اگر کسی دوسرے مقصد میں استعمال کرے، تو ضامن ہوگا (مغنی ۲/۳۹۶)

۹) موقوفہ کتاب پر ایک طالب علم کا قبضہ امانت کا قبضہ ہے، جن صورتوں میں ودیعت کا ضامن ہوگا، یہاں بھی ضامن ہوگا، اگر بلا تقصیر تلف ہونے کا دعویٰ کرے، تو ودیعت کی تفصیل کے مطابق اس کی قسم کے ساتھ اس دعویٰ کی تصدیق کی جائیگی۔ کسی مصلحت کی وجہ سے ناظر اس کتاب کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے مثلاً اس سے زیادہ ضرورت مند کو دینا وغیرہ (بغیہ ص ۱۷۵)

۱۰) وقف کو کرایہ پر دینے میں مدت وغیرہ کے اعتبار سے مصلحت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ وقف ختم ہو کر سامنے والا اس کا مالک بن بیٹھے گا۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۷۳)

۱۱) اگر مسجد یا مسافر خانہ وغیرہ ویران ہو جائے، تو اس پر وقف کی آمدنی کو اسی کے مثل پر صرف کرے۔ مسجد کی آمدنی کسی دوسری مسجد پر، مسافر خانہ کی مسافر خانہ پر... اس سے قریب تر پر صرف کرنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۰)

۱۲) مسجد یا مصالحِ مسجد پر وقف میں سے مؤذن، امام اور روشنی کا نظم وغیرہ پر صرف کیا جائیگا، لیکن تعمیرِ مسجد پر وقف میں سے ان امور پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (فتاویٰ ابن زیاد ص ۱۸۴)

۱۳)ناظر کو واجب ہے کہ جو بہتر اور واقف کے اغراض سے اقرب شکل ہو، اس پر عمل کرے، گرچہ اس کی صراحت نہ ہو، جب کہ اس کے شرائط کے خلاف نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی مدرسہ میں مدرس (استاد) مقرر کرنا ہو، اور اس کی اہلیت رکھنے والے کئی علماء ہوں، جن کے رتبہ سے یہ واقف ہے، تو ان میں جو افضل اور زیادہ صاحبِ علم ہو، اس کا تقرر لازم ہے، لیکن افضل کے متعلق تحقیق کرنا ضروری نہیں۔

کسی استاد کو اس سے افضل عالم موجود ہونے کی وجہ سے معزول کرنا جائز نہیں (فتاوی ابن زیاد ص ۱۸۸)

۱۴)مالک اپنا غصب شدہ مال وقف کر سکتا ہے، گرچہ غاصب کے قبضہ سے اسے چھڑانے پر قادر نہ ہو (فتح المعین)

۱۵)عمارت کے صرف اوپری حصے کو وقف کرے، نچلے حصہ کو نہ کرے، خواہ بطورِ مسجد وقف کرے، یہ صحیح ہے۔ (اعانہ)

۱۶)مسجد کی طرح عمارت بنا کر اس میں نماز کے قیام کی اجازت دے، تو یہ اس کی ملکیت سے نہ نکلے گا (وقف شمار نہ ہوگا)، جیسا کہ کسی جگہ کو قبرستان کے مثل بنا کر اس میں دفن کی اجازت دینے سے وہ ملکیت سے نہ نکلے گا۔ (اعانہ ۱۶۱/۳)

۱۷) وقف کو موت پر معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً کوئی کہے: میں نے اپنا مکان میری موت کے بعد فقراء پر وقف کیا، یا جب میں مر جاؤں تو میرا مکان فلاں مصرف پر وقف ہے، یا وقف کر چکا، تو یہ وقف صحیح ہے۔ اور ان مسائل میں اس کا حکم وصیت کی طرح ہے: ایک تہائی میں اس کا اعتبار ہوگا موت سے قبل رجوع کر سکتا ہے، اور وارث کے حق میں نہیں کیا جا سکتا۔

انتقال کے بعد وقف کا حکم ہوگا، یعنی ہمیشہ وقف رہے گا، اسے فروخت کرنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں، نیز اس میں وراثت نہ چلے گی۔ (اعانۃ ۱۶۲/۳)

۱۸)اگر فقراء، علماء یا مجاہدین پر وقف کرے، پھر واقف خود فقیر یا عالم یا مجاہد ہو جائے یا وقف کے وقت ہی اس صفت پر تھا، تو اسے بھی وقف سے انتفاع جائز ہے۔ (اعانۃ ۱۶۴/۳)

۱۹)اگر وقف کے مستحقین کا علم نہ ہو، تو اسے واقف کے قریبی رشتہ داروں پر صرف کریں گے، جو کہ فقراء ہوں (اعانہ)

۲۰)واقف کی شرط مجمل ہو، واضح نہ ہو، تو اس کے زمانے کے عام عرف پر عمل کیا جائے گا، اگر ایسا عرف نہ ہو، تو واقف حضرات کے مقاصد سے قریب تر امر پر محمول کیا جائے گا۔ (فتح المعین)

۲۱) موقوفہ قبرستان کے آثار بالکل مٹ جائیں، تو اسے کاشتکاری کیلئے کرایہ پر دے کر آمدنی اس کی مصلحت پر صرف کرنا جائز نہیں، مملوکہ قبرستان اصل مالک کا ہی رہے گا، وہ جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے جبکہ مالک معلوم ہو، مالک کا پتہ نہ ہو، یا قبرستان مملوکہ تھا یا موقوفہ اس کا علم نہ ہو، تو وہ مال ضائع کے حکم میں ہے، لہٰذا امام اس میں مصلحت کے مطابق تصرف کرے۔ (اعانہ ۱۸۳/۳)

۲۲) کسی ذمہ داری مثلاً امامت یا تدریس کی انجام دہی پر وقف ہو، اور متعلقہ ذمہ دار کسی عذر (مثلاً مرض) کی وجہ سے ناغہ کرے اور دوسرے کو اس غیر حاضری کی مدت میں نائب رکھے، تو مکمل مدت کے وقف کا مستحق ہوگا، اگر کسی کو نائب نہ رکھے، یا بلا عذر ناغہ کرے (گرچہ نائب رکھے) تو غیر حاضری کی مدت کا مستحق نہ ہوگا۔ (اعانہ ۱۷۵/۳)

مسجد کے بعض احکام

کسی نے اپنا سامان مسجد میں رکھا تو اس پر اس کا کرایہ لازم ہے، جو مسجد کے مصالح پر صرف ہوگا۔ جو پہلے پہنچ کر مسجد کی کسی جگہ میں قرآن، حدیث یا کوئی شرعی علم سکھانے یا سیکھنے کے لئے بیٹھے پھر اٹھ کر جائے، تا کہ پھر لوٹے، اور اس کی جدائی اتنی طویل نہ ہو، کہ اس

جگہ سے اس کی اُنسیت و تعلق ختم ہو جائے، تو اسکا حق باقی ہے۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں دوسرے کے لئے وہاں بیٹھنا جائز ہے، تاکہ فی الحال اس جگہ کی منفعت معطل نہ ہو۔

حدیث: ''جو اپنی مجلس سے اٹھے، پھر لوٹ کر آئے، تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے۔'' (مسلم)

جو نماز کیلئے مسجد میں کسی جگہ بیٹھے، یا ذکر یا تلاوت کے لئے، پھر کسی عذر (مثلاً قضائے حاجت) سے اٹھ کر جائے، تو اس نماز میں اس کا حق باقی ہے، خواہ بچہ ہو اور پہلی صف میں ہو، اور اپنی چادر (یا رومال) وغیرہ وہاں رکھ کر نہ گیا ہو، لہٰذا کسی دوسرے کو جو اس مسئلہ سے واقف ہو، وہاں بیٹھنا حرام ہے۔ اگر اس کی اجازت ہو، یا یہ گمان ہو کہ وہ راضی ہے (اسے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں) تو حرج نہیں، اسی طرح صرف اس کی غیر موجودگی میں بیٹھے اور اس کے آنے پر اٹھ جائے تو اس میں حرج نہیں، اگر اس کے آنے سے قبل جماعت کھڑی ہو جائے تو صف کی تکمیل کے لئے اس جگہ کو پُر کریں گے، اور وہ اس جگہ کوئی چادر وغیرہ رکھ کر گیا ہو، تو اپنے پیر سے اسے سرکائے، لیکن زمین سے اٹھائے نہیں، تاکہ اس کے ضمان میں داخل نہ ہو۔ اگر کوئی مدت کی تعیین کے بغیر اعتکاف کے لئے بیٹھے، تو اس کے مسجد سے نکلنے سے اس کا حق ختم ہو گا، خواہ حاجت کے لئے نکلے، اگر مدت متعین ہو، تو دورانِ مدت حاجت کے لئے نکلنے سے حق ختم نہ ہو گا۔

امام قفّال رحمۃ اللہ علیہ نے بچوں کو مسجد میں تعلیم دینے سے منع فرمایا ہے۔ بچے اگر پوری طرح باشعور ہوں اور استاد مسجد کے نامناسب حرکات سے ان کو روکے تو حرج نہیں۔ جو خرید و فروخت یا کسی حرفت کے لئے مسجد میں بیٹھے، تو اسے منع کرنا مستحب ہے، کیونکہ یہ مسجد کے احترام کے خلاف اور مکروہ ہے، مسجد کی چٹائی وغیرہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسجد کو لکڑی وغیرہ ہبہ کرے، اور ناظر قبول کرے تو یہ ہبہ صحیح ہے، اگر وہ قبول نہ کرے تو صحیح نہیں۔ اگر ناظر مسجد کے لئے لکڑے خریدے، یا کوئی ہبہ کرے اور ناظر قبول کرے تو اسے مصلحت کی وجہ سے فروخت کرنا جائز ہے، مثلاً چوری کا خدشہ ہو، لیکن موقوف ہو تو مسجد کے لئے محفوظ رکھنا واجب ہے۔

مسجد میں حرفت و معاملہ میں اس کی تحقیر و تذلیل ہو رہی ہو تو یہ حرام ہے، اور اس سے روکنا واجب ہے، اسی طرح اس کی وجہ سے اگر لوگوں کو تنگی ہو رہی ہو، تو یہ حرام ہے۔ جو شخص علماء یا قراء کے حلقہ کے درمیان سے گذرے، اسے ان حضرات کے احترام میں روکنا مستحب ہے۔

کوئی شخص رمضان یا جمعہ وغیرہ میں قرآن شریف لے کر مسجد میں تلاوت کے لئے بیٹھے، پھر وضو ٹوٹنے کی وجہ سے وضو کرنے کے لئے جائے تو اس وقت اس کا حق ختم نہ ہو گا، خواہ اس نے اپنی کوئی چیز وہاں نہ رکھی ہو، البتہ اس وقت تلاوت مکمل کر کے اٹھ جائے، تو پھر آئندہ آنے کے بعد اس کا حق باقی نہ رہے گا۔

دن میں مسجد میں روشنی کرنا حرام ہے، کیونکہ اس میں اسراف (فضول خرچی) اور عیسائیوں کی مشابہت ہے۔ رات میں اگر کسی (نمازی وغیرہ) کو ضرورت پیش آنے کی توقع ہو تو روشنی رکھنا جائز ہے، ورنہ اسراف کی وجہ سے حرام ہے۔

کسی کے لئے اس کے آنے سے قبل جائے نماز بچھا کر رکھنے کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا دوسرا شخص زمین سے اٹھائے بغیر اپنے پیروں سے سرکا سکتا ہے۔ (بعضوں نے اس طرح بچھانے کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ دیگر لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہے، نیز خود بھی صرف بچھا کر چلا جائے تو اس کا اعتبار نہ ہو گا) (حاشیۃ الجمل ۳/۵۷۰۔ اعانہ ۳/۱۷۶)

ایک مسلمان کو کسی کنیسہ (گرجا چرچ وغیرہ) میں ان لوگوں کی اجازت کے بغیر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ (جمل ۳/۵۷۲)

ہبہ (ھدیہ)

شرعاًہبہ ایسے عقد کو کہیں گے جس کی رو سے اپنی زندگی میں کسی کو بلا عوض تطوعاً(اپنی مرضی واختیار سے بلا وجوب شرعی کے) کسی چیز کامالک بنایا جائے۔

(ہبہ کرنے والے کو واہب، جس کو ہِبہ کیا جائے اسے ''مَوْھُوْب لَہٗ'' اور جو شئے ہبہ کی جائے اسے ''موھوب'' کہا جاتا ہے)

ہبہ میں موھوب لہٗ موھوب چیز کا مالک بن جائے گا، اور بدلہ میں اسے کچھ لوٹانا واجب نہیں ہے، بخلاف بیع کے کہ وہ تملیک (مالک بنانا) بالعوض ہے۔ ہبہ میں تملیک زندگی میں ہوگی، بخلاف وصیت کے کہ اس کا تعلق بعد الموت سے ہے۔ زکات میں بھی تملیک بلا عوض ہے، لیکن وہ واجب ہے، بخلاف ہبہ کے کہ اس میں تملیک بلا عوض اپنی مرضی اور خوشی سے ہے۔

مذکورہ تعریف کے اعتبار سے اس میں ہدیہ اور صدقہ بھی داخل ہوگئے، کیونکہ ان میں بھی زندگی میں بلا عوض تطوعاً تملیک پائی جاتی ہے، گرچہ ان تینوں میں بعض مفہوم واحکام کے اعتبار سے کچھ اختلاف بھی ہے۔

پس: ہبہ اپنے مذکورہ تعریف کے اعتبار سے عام ہے، امیر کی طرف سے غریب کو ہو یا اسکے برعکس، آخرت کے اجر وثواب کے قصد سے ہو یا نہ ہو، شئ موھوب، موھوب لہٗ کی طرف منتقل کی گئی ہو یا نہ ہو۔

جبکہ صدقہ سے بظاہر غالباً تقرب الی اللہ کی نیت سے، آخرت کے ثواب کی خاطر کسی محتاج اور ضرورت مند کی تملیک مراد ہے۔

اور کسی کے اکرام کے طور پر اس کی خدمت میں کوئی شئ (منتقل کرکے) پیش کی جائے تو اسے ''ہدیہ'' کہا جائے گا۔

صدقہ اور ہدیہ کے درمیان یہ فرق آپ ﷺ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ، جبکہ آپ ﷺ نے ہانڈی میں پکنے والا گوشت طلب فرمایا اور یہ کہا گیا کہ یہ گوشت حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ میں ملا ہوا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا''وہ ان کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔''(متفق علیہ) اسی لئے آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور نوش کرتے، جبکہ صدقہ استعمال نہ کرتے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں کوئی کھانا لایا جاتا تو دریافت فرماتے، اگر کہا جاتا کہ ہدیہ ہے تو تناول فرماتے اور کہا جاتا کہ صدقہ ہے تو تناول نہ فرماتے۔

کسی حاکم وغیرہ کو خوف کی وجہ سے ہدیہ پیش کرے تو دراصل یہ رشوت ہے (لہٰذا اسے لینا حرام ہوگا)۔ کسی کو اس شرط سے ہدیہ دے کہ وہ اس کی کوئی ضرورت پوری کرے، لیکن اس نے پوری نہ کی تو وہ ہدیہ لوٹانا لازم ہے، اگر ختم ہو چکی ہو تو اس کا بدل لوٹانا لازم ہے۔ کسی نے مثلاً کسی کو اس مقصد سے ہدیہ دیا کہ وہ اس کے قیدی کو قید سے چھڑائے، اور اس نے کوشش بھی کی لیکن نجات نہ دلا سکا تو ہدیہ واپس کرنا لازم ہے، کیونکہ مقصد حل نہیں ہوا، البتہ صرف شفارش کرنے کے لئے دیا تھا اور اس نے سفارش کردی تو اب لوٹانا واجب نہیں، سفارش قبول ہو یا رد ہو۔(حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۴-۵۹۵)

ہبہ میں ایجاب وقبول ضروری ہے، جبکہ ہدیہ وصدقہ میں یہ شرط نہیں، آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بکثرت صدقہ کیا کرتے، لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ لینے اور دینے والوں کے درمیان ایجاب وقبول بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح صحیحین میں روایت ہے کہ صحابہ کرام جس روز آپ ﷺ کا قیام حضرت عائشہؓ کے گھر ہوتا، ہدایا خدمتِ اقدس میں روانہ کرنے کا اہتمام فرماتے، لیکن یہ منقول نہیں کہ آپس میں ایجاب وقبول بھی ہوا کرتا تھا۔

مشروعیت: ہبہ اپنے سابقہ عام مفہوم کے اعتبار سے (یعنی بشمول صدقہ وہدیہ) قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں مستحب و مطلوب ہے۔

آیات: "وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحۡلَةً فَإِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَيۡءٍ مِنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا" (النساء ۴) **ترجمہ:** "اور تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو (اور یہی حکم کل کا ہے) تو تم اسکو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر "یعنی بیویوں کو ان کا فرض حق (مہر) دینے کے بعد اپنی خوشی سے اگر وہ تم کو ہبہ کرے تو یہ تمہارے لئے حلال ہے، اس کے لینے اور استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲) "لَيۡسَ الۡبِرَّ أَنۡ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلَكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ آمَنَ بِاللَّهِ وَالۡيَوۡمِ الۡآخِرِ وَالۡمَلَائِكَةِ وَالۡكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الۡمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الۡقُرۡبَى وَالۡيَتَامَى وَالۡمَسَاكِينَ وَابۡنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ" (البقرہ۔۱۷۷) ترجمہ: "کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہیکہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو)"...

آیت محتاج وغیر محتاج دونوں کو عطا کرنے پر مشتمل ہے، محتاج کو عطا کرنا صدقہ اور غیر محتاج کو عطا کرنا ہبہ ہے۔

احادیث: ۱) حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کے انصاری پڑوسی آپ کی خدمت میں اپنے مویشیوں کا دودھ بطور عطیہ (ہدیہ) پیش کرتے، تو آپ ہمیں پلایا کرتے" (متفق علیہ)

۲) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے "اے مسلم خواتین! کوئی پڑوسن اپنے پڑوسن کے حق میں قطعاً حقارت کا نظریہ نہ رکھے، گرچہ ایک بکری کا کُھر (یا معمولی گوشت لگی ہوئی ہڈی) ہی کیوں نہ ہو" (متفق علیہ) (یعنی اپنی حیثیت کے مطابق معمولی سے معمولی چیز کے بھی دینے یا لینے کو حقیر نہ سمجھے، بلکہ پیش کرے اور دوسرا لے، تاکہ یہ سنت زندہ رہے اور محبت والفت کا سبب بنے)

۳) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کا فرمان ہے: "اگر مجھے (گائے بکری وغیرہ کے) دست یا پائے کی دعوت کی جائے تو میں قبول کرلوں، اور اگر دست یا پایا ہدیہ میں پیش ہو، تو قبول کرلوں" (بخاری)

اجماع: تمام زمانوں میں فقہا کرام کا ہبہ کے تمام انواع کے استحباب پر اجماع رہا ہے، کیونکہ یہ تعاون کے قبیل سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: " وَتَعَاوَنُوا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوَى" (المائدہ: ۲) اور نیکی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو۔"

رشتہ داروں کو ھبہ: ہبہ جب مطلق مستحب ہے، تو رشتہ داروں کے حق میں اس کا استحباب و تاکید اور فضیلت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ صلۂ رحمی بھی ہے اور قرآن وحدیث نے اس کی ترغیب دی ہے۔

آیت: "وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالۡأَرۡحَامَ" (النساء: ۱) ترجمہ: "اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو، اور قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو۔" (یعنی صلہ رحمی کیا کرو، قطع رحمی نہ کرو)

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا" جسے اپنے رزق کی کشادگی وبرکت اور درازیٔ عمر محبوب ہو وہ صلہ رحمی کیا کرے"۔(متفق علیہ)

ھبہ پر مکافات (بدلہ دینا): کوئی ہبہ دے، اور گنجائش ہو تو خود بھی اسے ہبہ دے، کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ہدیہ قبول کیا کرتے اور اس پر بدلہ عنایت فرماتے۔

حکمت: اسلام ایک مثالی اور کامل معاشرہ کی تشکیل کو بڑی اہمیت دیتا ہے، جو آپسی محبت ومؤدت اور الفت واتفاق کی بنیادوں پر قائم ہو، اسی لئے ہر اس عمل اور محرک کو مشروع قرار دیتا ہے جو افراد کے درمیان محبت والفت کو پیدا کرنے اور قوی کرنے میں معین و مددگار ہو۔ ہبہ بھی اس مقصد کے حصول کا ایک اہم سبب اور کڑی ہے، کیونکہ اس میں اکرام واحترام اور محبت کا جذبہ پایا جارہا ہے، اور انسان فطرتاً اپنے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور اکرام کرنے والے کے ساتھ محبت والفت کا برتاؤ کرتا ہے۔

احادیث سے صراحتاً اس مقصد کی تائید ہوتی ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے "آپس میں ہدیے کالین دین رکھو، آپس میں محبت پیدا ہوگی" (اخرجہ مالک مرسلاً) ایک حدیث میں ارشاد ہے "ہدیے کالین دین رکھو، کیونکہ ہدیہ سینہ کے کینہ وکپٹ کو دور کرتا ہے۔"(ترمذی)

اسی مقصود کے تحقق کی خاطر آپ ﷺ نے ہبہ کو قبول کرنے کی تاکید فرمائی اور لوٹانے سے منع فرمایا، کیونکہ اس میں واہب کی دل شکنی اور تذلیل ہے۔ صحیحین کی ایک روایت عنقریب گذرچکی، مسند احمد کی ایک روایت میں اپ ﷺ نے ہبہ کو قبول کرنے کی تاکید فرمائی اور لوٹانے سے منع فرمایا، کیونکہ اس میں واہب کی دل شکنی اور تذلیل ہے۔ صحیحین کی ایک روایت عنقریب گذرچکی، مسند احمد کی ایک روایت میں اپ ﷺ کا ارشاد ہے "بغیر سوال اور حرص ولالچ کے کسی کو اپنے (مسلمان) بھائی کی جانب سے کوئی بھلائی پہنچے (وہ کچھ مال وغیرہ ہبہ کرے) تو اسے قبول کرلے اور رد نہ کرے، کیونکہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے پہنچایا ہے"(مسند احمد ۴/۲۲۱)

کسی معقول شرعی سبب کی وجہ سے ہبہ قبول نہ کرے تو اس کی وضاحت کردے، تاکہ واہب کی دل شکنی اور بدگمانی نہ ہو۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت صَعب بن جُثامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک جنگلی گدھا بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے لوٹا دیا، پھر ان کے چہرہ پر افسردگی کے آثار دیکھ کر انہیں تسلی دی کہ "ہم چونکہ احرام میں ہیں، اس لئے تمہارا ہدیہ واپس کردیا (کیونکہ احرام میں شکار وغیرہ منع ہے)"(متفق علیہ)

ھبہ کے ارکان وشرائط

ہبہ کے تین ارکان ہیں۔(۱)عاقدین (۲)صیغہ (۳)موہوب

۱)**عاقدین: یعنی واھب اور مَوْھُوب لَهُ:** واہب کے لئے شرط ہے کہ وہ موہوب کا مالک ہو، تبرع کی اہلیت رکھتا ہو، اپنے مال میں تصرف کا اسے مکمل اختیار ہو۔ جس شئے کا مالک نہ ہو، اس کا ہبہ صحیح نہیں، اسی طرح بچہ یا پاگل کا ہبہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کو تبرع (مفت کوئی چیز دینا) کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ محض ضرر ونقصان ہے، اسی لئے ان کا ولی بھی ان کے مال میں سے کچھ ہبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کے مقابلہ میں کوئی دنیوی نفع نہیں ہے، صرف نقصان ہے، جس کا ولی کو اختیار نہیں، اس کے ولایت کا تعلق صرف ماتحتوں کے نفع کی حد تک ہے۔ قلاش ومفلس یا سفیہ ہونے کی وجہ سے قاضی نے جس پر مالی تصرفات کی پابندی عائد کردی ہو، وہ بھی ہبہ نہیں کرسکتا۔

موہوب لہ میں موہوب کے مالک بننے کی اہلیت شرط ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو جو پیدا ہو چکا ہو ہبہ کیا جاسکتا ہے، بچہ اور پاگل کی جانب سے اس کا ولی قبول کرلے گا۔ حمل کے حق میں ہبہ صحیح نہیں ہے۔ کسی ممیز (باشعور) بچہ کو صدقہ دینا جائز ہے، لیکن جب ولی قبضہ کرلے اس وقت وہ اس کا مالک بنے گا۔ لیکن اس کی عادت کے بگڑنے کے خوف سے ولی بچہ کو صدقہ دینے سے ناراض ہو، تو اسے دینا حرام ہے۔ مجور (بچہ یا پاگل) کو کوئی شئی ہبہ کی جائے تو ولی کو قبول کرنا واجب ہے۔ باپ یا دادا ہبہ کریں تو خود ہی اس کی جانب سے قبضہ بھی کریں گے۔(حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۶)

۲) **صیغہ:** یعنی ایجاب و قبول (واہب کے الفاظ ایجاب اور موہوب لہٗ کے الفاظ قبول کہلائیں گے)۔

ایجاب کے کلمات: میں نے تمہیں ہبہ کیا، میں نے تمہیں عطا کردیا، دے دیا، بلاقیمت تمہیں مالک بنادیا، یہ کھانا تم لے جاکر کھالو، وغیرہ۔ ان میں بعض الفاظ ہبہ کے سلسلے میں صریح اور بعض صریح کی طرح ہی ہیں، لہٰذا نیت کے بغیر بھی ان الفاظ سے ہبہ صحیح ہو جائے گا، اگر ان کا کہنے والا یہ دعوی کرے کہ میری نیت ہبہ کی نہیں تھی تو اسے قبول نہ کریں گے۔ (بلکہ ہبہ قرار دیں گے)

بعض دیگر الفاظ ہبہ کے سلسلہ میں صریح یا صریح کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کپڑا میں نے تمہیں پہننے دیا، یہ جانور سواری کے لئے دے دی، وغیرہ۔ یہ الفاظ کنایہ ہیں، اگر ہبہ کی نیت سے کہے، تو ہبہ منعقد ہوگا، اور اگر کہے کہ میری مراد ہبہ نہیں تھی تو اسے تسلیم کرتے ہوئے عاریت قرار دیں گے، کیونکہ الفاظ میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

قبول کے کلمات: میں نے قبول کیا، میں راضی ہوں، راضی ہوا، یا میں نے ہبہ لے لیا۔

صیغہ کے شرائط: (۱) عرف کے اعتبار سے ایجاب و قبول کے درمیان فصل (تاخیر) نہ ہو۔

۲) کسی شرط کے ساتھ مقید نہ ہو، مثلاً یوں کہا: اگر زید آگیا تو میں نے یہ کپڑا تمہیں ہبہ کیا، تو یہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ہبہ تملیک ہے۔ (یعنی مالک بنانا) اور تملیک کو ایسے شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے جس کے وجود عدم دونوں کا احتمال ہو۔

۳) کسی وقت یا مدت کے ساتھ مقید نہ کرے۔ مثلاً میں نے یہ کتاب ایک ماہ یا سال کے لئے تمہیں ہبہ کردی، کیونکہ ہبہ کا تقاضا فی الحال تملیک مطلق ہے، اور یہ شرط اس کے منافی ہے۔

موہوب کا بعض حصہ قبول کرے، یا دو کو ہبہ کرے اور صرف ایک قبول کرے تو یہ صحیح ہے (حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۷) کسی نے اپنی بیوی یا بچی کے لئے زیورات بنا کر اسے آراستہ ومزین کیا (لیکن اسے ہبہ کرنے کے کوئی الفاظ نہیں کہے) تو یہ تملیک نہیں ہے۔ (بلکہ وہ زیورات اُسی شخص ہی کی ملکیت میں ہیں)۔ کوئی بیوی اپنی باری سوکن کو ہبہ کرے تو اس میں قبول شرط نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت کچھ اسباب اس کے ساتھ روانہ کردے (جہیز دے) لیکن ہبہ و تملیک کی صراحت نہ ہو، تو وہ عاریت ہے، اگر کہے کہ یہ بیٹی کا جہیز ہے، تو پھر بیٹی کی ملکیت ہے، اگر کسی نے خادم یا بیوی کی بیٹی کو مثلاً ان کی ضرورت یا ثواب کے قصد سے کچھ دیا تو یہ صدقہ ہے، اور ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں، ورنہ ہبہ ہے اور ایجاب و قبول ضروری ہے۔ قصد کا علم دینے والے کی طرف سے یا قرائن سے ہوگا۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۵)

قرض خواہ اگر مقروض کو قرض ہبہ کردے تو یہ دراصل ابراء ہے۔ (یعنی قرض کو معاف کردینا) اس لئے قبول کی ضرورت نہیں ہے (فتح الوہاب)

عمری اور رقبیٰ

۱) **عُمریٰ**: یہ عمر سے ماخوذ ہے، یعنی واہب موہوب لہ سے کہے، یہ گھر (یا کوئی اور چیز) میں نے تجھے عمر بھر کے لئے دیا، یا تمہاری حیات تک تمہارا ہے پھر تم مر جاؤ تو میرے ورثاء کا ہے۔

یہ بھی ہبہ کا صیغہ ہے، لیکن موہوب لہ کے عمر کے ساتھ مقید ہے، اس کے باوجود یہ ہبہ صحیح ہے، لیکن شرط باطل اور لغو ہے، احادیث کی روشنی میں وقت کے ساتھ مقید ہونے کے باوجود اسے صحیح قرار دیا گیا۔

احادیث:(۱) آپ ﷺ نے فرمایا "عُمریٰ جائز ہے" (متفق علیه)

(۲) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے عُمریٰ کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ وہ موہوب لہ کا ہے" (متفق علیه)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے اموال اپنے پاس رکھو اور اسے برباد نہ کرو، کیونکہ جو بطور عمریٰ (کوئی شئ) کسی کو دے دے تو وہ زندگی میں اور موت کے بعد اس کی اور اس کے ورثاء کی ہے" (مسلم)

امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں "اس سے مراد یہ اطلاع دینی ہے کہ عمری صحیح اور نافذ ہبہ ہے، موہوب لہ اس کا کامل مالک بن جائے گا، آئندہ کبھی واہب کی طرف نہ لوٹے گا، جب یہ مسئلہ معلوم ہو چکا تو اب جو چاہے سوچ سمجھ کر اس پر عمل کرے، جو نہ چاہے ترک کرے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ عمری عاریت کی طرح ہے اور اسے واپس لے سکتے ہیں۔"

اگر واہب ہبہ کو اپنی یا کسی اجنبی کی عمر کے ساتھ مقید کرے مثلاً میری حیات تک تجھے ہبہ کیا یا زید کی زندگی تک تجھے ہبہ کیا تو یہ صحیح نہ ہو گا (فتح المعین)

۲) **رُقبیٰ**: یعنی واہب موہوب لہ سے کہے "دَارِیْ لَکَ رُقْبیٰ" (میرا گھر بطور رُقبیٰ تمہارا ہے) یا "اَرْقَبْتُکَ هٰذِهِ الدَّار" (یہ گھر میں نے تمہیں رقبیٰ دے دیا) وغیرہ، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو میں واپس لے لوں گا، اور میں تجھ سے قبل مر گیا تو مستقل تمہارا ہو جائیگا۔ یہ رُقُوب اور تَرَقُّب سے ماخوذ ہے یعنی انتظار کرنا، کیونکہ واہب و موہوب لہ دونوں بھی ایک دوسرے کے موت کے منتظر ہیں۔ اس شرط کے باوجود حدیث کی وجہ سے یہ صیغہ بھی معتبر ہے، اور ان الفاظ سے کسی چیز کا ہبہ کرنا صحیح ہے، اور شرط لغو ہو گی۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے "عمری جن کے لئے کیا گیا انہیں جائز ہے اور رقبیٰ جن کے لئے کیا گیا انہیں جائز ہے" (یعنی نافذ اور جاری و صحیح ہیں) (ترمذی، ابوداود، ابن ماجه)

صاحب مغنی المحتاج، فرماتے ہیں۔ "امام سبکیؒ نے فرمایا کہ عمری و رقبی کی صحت قیاس سے بعید ہے، لیکن حدیث ہر اصل اور قیاس پر مقدم ہے۔"

۳) **موهوب**: ہبہ کا تیسرا رکن محل عقد یعنی موہوب (ہبہ کی جانے والی چیز) ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ "جس چیز کی بیع و فروخت جائز ہے، اس کا ہبہ بھی جائز ہے" جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

أ- بوقتِ هبه موجود هو، لہٰذا فی الحال مفقود و غیر موجود شئ کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ ہبہ کا تقاضا فی الحال تملیک ہے، اور معدوم میں یہ بات محال ہے، تو یہ ہبہ باطل ہو گا۔

مثال: اس سال درخت جو پھل دے گا اسے ہبہ کرنا، اس سال بکریوں کو جو اولاد ہوگی اسے ہبہ کرنا، حکماً مفقود بھی حقیقۃً مفقود کی طرح ہے، مثلاً اس بکری کے پیٹ کا بچہ (حمل) ہبہ کر دیا، یا اس کے تھن کا دودھ ہبہ کر دیا، تو یہ ہبہ صحیح نہیں ہے۔

ب- مال متقوم ہو (شرعاً وہ مال اور قابلِ قیمت ہو)، پس مردار، خون، سور، شراب، مُحرِم کا یا حَرَم کا شکار وغیرہ کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ شرعاً مالِ متقوم نہیں ہیں۔

ج- واہب اس کا مال ہو، لہٰذا جو چیز واہب کی ملکیت میں نہ ہو اس کا ہبہ صحیح نہیں۔ مثلاً بغیر اجازت دوسرے کا مال ہبہ کرنا، مباحات کا ہبہ (مباحات سے مراد وہ اشیاء جو کوئی بھی اپنے قبضہ میں لے کر اس کا مالک بن سکتا ہے، جیسے خشکی وتری کے عام جانور (جو کسی کی ملکیت میں نہ ہوں) عام زمین کی گھاس، لکڑی وغیرہ، ایسی اشیاء اپنے قبضہ میں لینے سے قبل ان کا ہبہ صحیح نہیں، کیونکہ قبضہ سے قبل اس کا مالک نہیں بنا)

دوسرے کے ساتھ متصل شئی کا ہبہ: موہوب شئی دوسرے کے ساتھ متصل اور ملی ہوئی ہو، اور بغیر کسی نقصان اور ضرر کے اسے اس سے جدا کر سکتے ہوں اور اس میں دھوکہ اور خطرہ کی کوئی شکل نہ ہو، تو یہ ہبہ صحیح ہے، کیونکہ اس کی بیع صحیح ہے۔

مثلاً زمین میں سے ایک گز ہبہ کر دیا، یا کپڑے میں سے ایک گز ہبہ کر دیا کہ اسے کاٹ کر دینے سے قیمت پر اثر نہ پڑے۔ (تو یہ صحیح ہے)

اگر دوسرے کے ساتھ متصل چیز کو بغیر نقصان کے جدا کرنا نا ممکن ہے، مثلاً نصف تلوار ہبہ کرنا، یا جدا کرنے میں دشواری یا غرر کا پہلو ہو، مثلاً دنبے کے پشت پر موجود اون کا ہبہ، کیونکہ اس صورت میں موہوب کو غیر موہوب سے الگ کرنا دشوار ہے، اس لئے کہ اون کو بالکل جڑ سے کترنا چاہئے، جو ناممکن ہے نیز جدید بال نکل کر ان کے ساتھ مخلوط ہو سکتے ہیں، جن کی تفریق ممکن نہیں، اس میں غرر بھی ہے، اس لئے اس کا ہبہ صحیح نہیں جیسا کہ بیع درست نہیں۔

اگر درخت پر موجود پھل ہبہ کرے، اور پھل ایسے ہوں کہ نئے نکلتے رہتے ہیں اور موجودہ اور نئے پھلوں میں تمیز دشوار ہو تو یہ ہبہ صحیح نہیں، ورنہ صحیح ہے۔

گیہوں کے چند دانے وغیرہ محقرات کی بیع صحیح نہیں، لیکن ان کا ہبہ صحیح ہو جاتا ہے۔ (فتح المعین)

غیر کے ساتھ مشغول کا ہبہ: مثلاً گھر ہبہ کرے اور گھر میں خود واہب کے اسباب موجود ہوں، یا جانور ہبہ کرے جس پر واہب کا سامان لدا ہو، یا درخت ہبہ کرے جس پر پھل ہوں، تو اس طرح کا ہبہ صحیح اور جائز ہے، کیونکہ موہوب اور غیر موہوب میں بغیر کسی ضرر وغرر اور دشواری کے تمیز ممکن ہے، اور اس کی بیع جائز ہے۔

مُشاع کا ہبہ (مشترک اور غیر منقسم کا ہبہ): یعنی کسی چیز میں کسی انسان کا ایک غیر معین حصّہ ہو، اور وہ اسے (بغیر تقسیم و تعیین کے) کسی کو ہبہ کر دے، یا کسی چیز کو دو یا زائد افراد کو ہبہ کر دے تو یہ ہبہ صحیح ہے، کیونکہ مُشاع کی فروخت صحیح ہے، اور موہوب لہٗ مکمل اس چیز پر قبضہ کرے گا تو اسے (ہبہ میں مطلوب) قبضہ قرار دیا جائیگا، پھر اپنے حصے کے برابر حق وصول کرے گا اور باقی حصہ اس کے پاس بطور امانت ہو گا۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے ایک سفر میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنگلی گدھے کا شکار کیا، (تو وہ اس کے مالک بن گئے) پھر تمام صحابہ کرام نے مل کر کھایا (تو گویا شائع حصے ان کو ہبہ کر دیئے) اور آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو کوئی نکیر نہ فرمائی۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک جنگلی گدھا آپ ﷺ وصحابہ کرام کو ہبہ کیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسے صحابہ کرام کے درمیان تقسیم کر دیا(مؤطاامام مالک، نسائی)اس سے صراحتاً ایک چیز کا کئی لوگوں کو ہبہ کرنا ثابت ہوتا ہے۔

قبضہ سے ہبہ لازم ہوگا: عقد ہبہ محض ایجاب وقبول سے مکمل ولازم نہ ہوگا، بلکہ واہب کی طرف سے ابھی غیر لازم ہے، پس واہب ہبہ سے رجوع کرنے اور اس میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ اور جب تک موہوب لہ کا اس پر قبضہ نہ ہو، اسے کامل وپختہ ملکیت حاصل نہ ہوگی۔

آئندہ مذکورہ شرائط کے مطابق جب قبضہ حاصل ہوگا، تو عقد ہبہ مکمل اور لازم ہو جائے گا اور موہوبہ شئی میں موہوب لہ کو کامل اور پختہ ملکیت حاصل ہوگی۔

امام حاکم نے مستدرک میں ایک روایت نقل فرمائی ہے(اور اسے صحیح بھی قرار دیا) کہ آپ ﷺ نے جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو ارشاد فرمایا: "میں نے نجاشی کی خدمت میں چند اوقیے مشک اور ایک جوڑا ہدیہ روانہ کیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، اور میرے خیال میں مذکورہ ہدیہ واپس آجائے گا، پس جب میرے پاس واپس ہو تو وہ تمہارا ہے یا تم سب (ازواج مطہرات) کا ہے۔" پس آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہی ہوا، نجاشی کا انتقال ہوا، پھر جب ہدیہ واپس پہنچا تو آپ ﷺ نے اپنی ہر زوجہ مطہرہ (بیوی) کو اس میں سے ایک اوقیہ (۴۰ درہم) مشک عنایت فرمایا، اور بقیہ حضرت ام سلمہ کو دیا، اور جوڑا بھی انہیں عطا فرمایا۔

اگر ہبہ بغیر قبضہ کے لازم ہوتا (ہدیہ بھی ہبہ کی طرح ہے) تو آپ ﷺ نے وہ ہدیہ واپس قبول نہ کیا ہوتا، بلکہ نجاشی کے وارثوں کو لوٹایا ہوتا، تو آپ ﷺ کے قبول کرنے سے ثابت ہوا کہ سامنے والے کے قبضہ سے قبل اس کی ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ۲۰/ وسق اناج (ایک وسق تقریباً ۱۴۰ کلوگرام ہوتا ہے) اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عطا فرمایا، پھر ان کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا کہ تم نے اس پر قبضہ کر لیا ہوتا تو وہ تمہارا تھا، (چونکہ قبضہ نہیں ہوا تھا) اس لئے اب وہ مال (تمام) وارثوں کا ہے،... قرآن کی روشنی میں اسے آپس میں تقسیم کرلو۔ (مؤطا امام مالک) اس سے بھی صراحتاً ملکیت کے لئے قبضہ ضروری معلوم ہوا۔

قبضہ کے شرائط: (أ) واہب کی اجازت: قبضہ کی صحت کے لئے واہب کی اجازت شرط ہے، اگر موہوب لہ اس کی اجازت سے قبل قبضہ کرلے تو یہ قبضہ معتبر نہیں، اس سے ہبہ مکمل اور لازم نہ ہوگا، بلکہ واہب کی ملکیت ہی میں رہے گا۔

اجازت صراحتاً ہونا ضروری ہے، یا واہب اپنے ہاتھوں ہی اسے موہوب لہ کے سپرد کر دے، خواہ عقدِ ہبہ کی مجلس میں یا بعد میں، اور چاہے موہوب، موہوب لہٗ کے قبضہ میں ہو یا نہ ہو، صریح اجازت یا قبضہ میں دیئے بغیر موہوب لہ اس پر قبضہ کرے تو یہ قبضہ صحیح نہیں، گرچہ واہب اسے دیکھے اور خاموش رہے (تب بھی یہ قبضہ ناکافی ہے)

(ب) موہوب غیر موہوب کے ساتھ مشغول نہ ہو: کیونکہ غیر موہوب سے فارغ اور خالی ہونا سپردگی اور قبضہ کے لئے شرط ہے، اور قبضہ کا مقصد مقبوض میں تصرف کا اختیار ہونا ہے، اور اس صورت میں یہ حاصل نہیں۔ لہٰذا موہوب خالی ہونے کے بعد سپرد کر دے تو قبضہ صحیح ہے۔ اسی طرح موہوب خِلقۃً غیر کے ساتھ متصل ہو، مثلاً زمین میں کھیتی ہو، یا درخت پر پھل ہوں، تو انہیں جدا کرنے کے بعد سپرد کر دے تو قبضہ صحیح ہوگا۔

(ج) قبضہ کی اہلیت (صلاحیت): یعنی قبضہ کرنے والا عاقل وبالغ ہو، پس بچہ یا پاگل کا قبضہ کرنا صحیح نہیں، کیونکہ یہ

ولایت ہے اور انہیں نفس یا مال پر ولایت حاصل نہیں، اس لئے ان کا قبضہ بھی معتبر نہیں۔ (بلکہ ان کی طرف سے ان کا ولی قبضہ کرے)

بطورِ نیابت قبضہ: یعنی جن کا خود قبضہ صحیح نہیں جیسے بچہ و پاگل، ان کی طرف سے قبضہ کرنا، اس قبضہ کی صحت کے لئے قبضہ کرنے والے کو ان پر ولایت کا حق ہونا شرط ہے، یا وہ اس کے عیال (رعایت و تربیت) میں داخل ہوں۔

شوہر اپنے نابالغ بیوی کی جانب سے قبضہ کر سکتا ہے، جبکہ بیوی کو اس کے سپرد کیا گیا ہو، (بدائی ہو چکی ہو)، کیونکہ وہ اس کے عیال میں داخل ہو چکی، سپردگی سے قبل اسے قبضہ کا حق نہ ہوگا۔ اولیاء (شرعی سرپرستوں) میں سے کوئی اپنے ماتحت (زیر سرپرست) کو کچھ ہبہ کرے تو یہ صحیح ہے، اور صرف عقد سے موہوب لہ اس کا مالک بنے گا، کیونکہ موہوب ولی کے قبضہ میں ہے، یہ ہبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہوگا، صرف کیا ہبہ کیا ہے معلوم ہونا چاہئے، اگر اس پر گواہ رکھے تو بہتر ہے تاکہ آئندہ اس کے انکار یا اس کے موت کے بعد وارثوں کے انکار کی گنجائش نہ ہو۔

ولی کے علاوہ بچہ وغیرہ جس کی پرورش و نگہداشت میں ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے۔

ہبہ کا حکم اور اسے واپس لینا: مذکورہ تمام ارکان و شرائط کے ساتھ جب ہبہ اور موہوبہ شئ پر قبضہ پایا جائے تو موہوب لہٗ اس چیز کا مالک بن جائے گا، اب واہب اسے واپس نہیں لے سکتا۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ہبہ کر کے واپس لینے والا قے کر کے چاٹنے والے کی طرح ہے۔" (متفق علیہ) ایک اور حدیث میں اسے قے کر کے چاٹنے والے کتے کی طرح قرار دیا ہے۔ (متفق علیہ)

البتہ اصل اپنی فرع کے پاس سے ہبہ کے حکم کے ثبوت کے بعد بھی واپس لے سکتا ہے۔

حدیث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کسی شخص کو حلال نہیں کہ کسی چیز کا عطیہ یا ہبہ دینے کے بعد واپس لے، البتہ والد اپنی اولاد سے واپس لے سکتا ہے" (ترمذی و قال حدیث حسن صحیح۔ ابو داود) والد پر دیگر اصول (دادا، نانا، ماں، نانی وغیرہ اوپر تک) اور اولاد پر دیگر فروع (پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ نیچے تک) کو قیاس کیا گیا۔ فوراً واپس لینا ضروری نہیں، جب چاہے لے سکتا ہے گرچہ اولاد غریب، کمسن، دین میں مخالف ہو، البتہ بلا عذر واپس لینا مکروہ ہے۔ اگر اولاد نافرمان ہو، یا اسے گناہ میں صرف کرے اور سمجھانے کے باوجود نہ سنے تو واپس لینا مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ گناہ کی صورت میں واپسی مستحب ہے۔ نذر، زکات، کفارہ یا قربانی کا گوشت فرع کو دینے کے بعد واپس لینا جائز نہیں ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۳/۵۹۹)

اگر موہوب فرع کی ملکیت سے نکل جائے، مثلاً اسے فروخت کر دے، وقف کر دے یا کسی دوسرے کو ہبہ کر دے اور وہ قبضہ بھی کر لے تو اب اصل واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

فرع موہوب کو صرف کرایہ پر دے، یا رہن رکھے، یا کسی کو ہبہ کرے لیکن ابھی قبضہ نہیں ہوا تو اصل کو واپسی کا حق باقی ہے۔

موہوب میں متصل یا منفصل (غیر متصل اور جدا) اضافہ کے باوجود اصل کو واپس لینے کا اختیار ہے، واہب متصل اضافہ کے ساتھ موہوب کو واپس لے سکتا ہے، مثلاً جانور کا موٹاپا، کھیت میں ہل چلانا منفصل اضافہ مثلاً جانور کا بچہ یا درخت کا پھل بوقت ہبہ موجود تھا تو اس اضافہ سمیت واپس لے سکتا ہے، لیکن یہ اضافہ ہبہ کے بعد وجود میں آیا ہو تو اس اضافہ کو نہیں لے سکتا، بلکہ وہ موہوب لہ ہی کا حق ہے۔

اسی طرح غیر حاملہ جانور یا بغیر پھل کے درخت ہبہ کرے، پھر رجوع سے قبل جانور حاملہ ہو یا درخت پھل لائے، تو حمل اور پھل

کو نہیں لوٹا سکتا، گرچہ ابھی وضع حمل نہ ہوا ہو اور پھل توڑے نہ گئے ہوں، صرف اصل (یعنی جانور اور درخت) واپس لے سکتا ہے، اضافہ موہوب لہ کی ملکیت میں رہے گا۔

موہوب سے فرع کی ملکیت ختم ہونے کے بعد دوبارہ کسی اور سبب سے وہ اس کی ملکیت میں آئے مثلاً خرید لیا، یا ہبہ یا وراثت میں ملا، تو اب اصل (والد وغیرہ) کو واپس لینے کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ ملکیت کا سبب بدل چکا، تو گویا چیز ہی بدل گئی۔

رجوع اور واپسی کے الفاظ 'میں نے ہبہ سے رجوع کر لیا، اسے ختم کر دیا، اسے باطل قرار دیا، یا موہوب کو واپس میری ملکیت میں لے لیا۔ اگر نیت کے ساتھ کنایہ لفظ استعمال کرے تو یہ بھی کافی ہے۔ مثلاً میں نے موہوب لے لیا۔ اس پر قبضہ کر لیا۔ (فتح المعین)

مطلق هبه اور هبه بِثَوَاب (یعنی بالعوض هبه۔ بدله والا هبه)

کوئی شخص کسی کو کچھ ہبہ کرے، اور اس میں بدلہ اور عوض کی کوئی شرط نہ ہو، تو وہ کسی بدلہ کا مستحق نہیں، اور موہوب لہ کو اسے اس ہبہ کا عوض دینا لازم نہیں ہے، خواہ واہب موہوب لہ سے (کسی بھی اعتبار سے) برتر ہو، یا مساوی ہو یا کمتر ہو۔

اگر ہبہ بثواب ہو، مثلاً یوں کہے میں نے یہ چیز اس شرط پر تجھے ہبہ کر دی کہ تم فلاں چیز مجھے ہبہ کر دو، یا میں نے یہ کتاب تمہیں ہبہ کر دی بشر طیکہ تم یہ کپڑا مجھے عوض میں دے دو وغیرہ تو اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اگر مشروط عوض اور بدل معلوم ہے تو یہ عقد صحیح ہے، اور مفہوم کو دیکھتے ہوئے در حقیقت بیع ہے، کیونکہ یہ معلوم مال کے ذریعہ عقدِ معاوضہ ہے، تو گویا مطلب ہوا میں نے فلاں چیز فلاں کے عوض تمہیں فروخت کر دی، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا، اسی لئے ہبہ بثواب میں بیع کے احکام ثابت ہوں گے۔ مثلاً خیار مجلس، خیار شرط، رد بالعیب وغیرہ کا ثبوت۔

اگر مشروط عوض مجہول (غیر معلوم) ہو، مثلاً میں نے یہ کتاب تمہیں ہبہ کی بشر طیکہ تم (کوئی سا) ایک کپڑا مجھے ہبہ کرو (کپڑے کی کوئی تفصیل و تعیین نہ ہو) یا بشر طیکہ تم اس کا کچھ بھی بدلہ دو، تو ان صورتوں میں یہ عقد باطل ہو گا، کیونکہ عوض کی جہالت کی وجہ سے بیع نہیں قرار دیا جا سکتا، اور عوض کے شرط کی وجہ سے ہبہ بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اولاد کے هبه اور عطایا میں مساوات: ہبہ اور عطایا سے واجب نفقہ اور مصارف کے علاوہ مراد ہے، والد اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو اس میں ان کے درمیان مساوات مستحب ہے، اولاد مذکر ہوں یا مؤنث، کمسن ہوں یا بڑے، ان کے درمیان ہبہ میں کمی بیشی اور فرق برتنا مکروہ ہے۔ (اور بعض علماء نے اسے حرام قرار دیا ہے)، کیونکہ یہ ان میں آپسی حسد و بغض کا سبب بنے گا، اور خاندانی یکجہتی اور اتفاق میں دراڑ پیدا کرے گا۔ پوتے نواسے وغیرہ نیچے تک اس حکم میں اولاد ہی کی طرح ہیں، خواہ اولاد موجود ہوں (جمل)

ایک مرتبہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے والد نے صرف حضرت نعمان کو کچھ عطیہ (ہبہ) عنایت فرمایا، دیگر اولاد کو نہ دیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ سے ڈرو اور اپنے اولاد میں عدل و انصاف برتو" تو انہوں نے وہ عطیہ واپس لے لیا۔ (متفق علیہ)

حدیث کے ظاہری الفاظ کی روشنی میں اس مساوات سے مراد لڑکے اور لڑکی کو یکساں دینا ہے۔ (نہ کہ وراثت کی طرح لڑکے کو لڑکی سے دوگنا) ہدیہ، صدقہ، وقف وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔ (حاشیۃ الجمل ۵۹۸/۳)

مساوات کا حکم اس وقت ہے، جبکہ اولاد کی ضروریات بھی یکساں ہوں، یا دیگر اولاد کسی کو زائد دینے سے متفق نہ ہوں، اگر کوئی

زیادہ ضرورت مند ہو، یا دیگر اولاد زائد دینے سے راضی ہوں، تو اس میں کوئی کراہت اور حرج نہیں ہے۔ اسی پر صحابہ کرام کے عمل کو محمول کریں گے، کیونکہ صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو، حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عاصم کو اور حضرت ابن عمرؓ نے اپنے بعض بیٹوں کو عطیہ میں ترجیح دی۔(الاقناع ۸۹/۲)

کراہت کی صورت میں بھی والد اگر کسی کو زیادہ کسی کو کم دے، یا کسی کو ہبہ کرے دوسرے کو نہ کرے تو ہبہ صحیح ہوگا اور موہوب لہ اس کا مالک بن جائے گا، گرچہ والد کا یہ عمل نامناسب اور غیر مطلوب ہے۔

علم، تقویٰ وورع، والدین کی اطاعت وفرمانبرداری اور گناہ میں صرف کرنے نہ کرنے کے اعتبار سے تخصیص وکمی بیشی مکروہ نہیں ہے۔(حاشیۃ الجمل ۵۹۹/۳)

والدین کو ہبہ اور عطایا میں مساوات

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی سے پیش آنا اولاد پر واجب ولازم ہے۔ قرآن وحدیث نے اس کا بارہا حکم دیا ہے۔(مثلاً سورۃ النساء آیت ۳۶، سورۃ الاسراء آیت ۲۳)

حسن سلوک میں ان کے مصارف برداشت کرنا، اور مخصوص موقعوں پر ان کی خدمت میں تحفے اور ہدیہ پیش کرنا بھی داخل ہے، بالخصوص عید الفطر وعید الاضحیٰ کی مناسبت سے۔

اولاد کی طرح والدین کے عطیوں میں بھی مساوات مسنون ہے، البتہ کبھی والدہ کی تخصیص یا اسے مزید دینے میں حرج نہیں، کیونکہ ایک صحابی نے اپنے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ سوال کیا تو آپ ﷺ نے تین مرتبہ والدہ کا ذکر کیا پھر چوتھی مرتبہ پوچھنے پر والد کا ذکر کیا۔(متفق علیہ)

بھائی بھنوں کے ھبہ میں مساوات: ایک مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے۔(دیکھئے النساء، آیت ۳۶، البقرۃ آیت ۱۷۷)

والدین اور اولاد کے بعد انسان کے سب سے قریبی رشتہ دار بھائی بہن ہیں، لہٰذا ان کی خدمات میں بھی ہبہ اور ہدیہ پیش کرے بالخصوص خاص موقعوں پر، اور جب یوں کرے تو ان میں مساوات مستحب ہے (لیکن اولاد کے بمقابلہ کمتر درجہ میں) جبکہ سب کی ضروریات یکساں ہوں، (کوئی محتاج ہو تو اس کی تخصیص میں حرج نہیں) اگر کسی کی تخصیص کرنا ہو تو سب سے بڑے کو ترجیح دے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے "بڑا بھائی باپ کے درجہ میں ہے" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) صلہ رحمی شرعاً مطلوب ومامور ہے، یعنی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ چاہے دور کے ہوں ایسا (بہتر) سلوک کرنا کہ قطع رحمی شمار نہ ہو۔ مثلاً مالی تعاون، ان کے مختلف مسائل حل کرنا، ملاقات، خط وکتابت، غائبانہ سلام وغیرہ روانہ کرنا وغیرہ (ترشیح المستفیدین ص ۲۶۳ الاقناع ۸۹/۲)

بعض متفرق مسائل

امام عبادیؒ نے فرمایا کہ اگر کسی نے دوسرے سے کہا کہ تم میرے مال سے جو بھی لو یا کسی کو دو یا کھاؤ تمہارے لئے حلال اور جائز ہے تو وہ صرف کھا سکتا ہے، کیونکہ یہ اباحت ہے (تملیک نہیں) اور اباحت مجہول کی بھی صحیح ہے بخلاف لینے یا کسی اور کو دینے کے۔ اگر کسی نے کہا کہ میں نے سارا مال یا نصف مال تم کو ہبہ کیا، تو مال کی مقدار دونوں کو معلوم ہو تو یہ ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں۔ 'انوار' میں ہے کہ کسی نے

دوسرے سے کہا کہ میرے گھر میں جو کچھ ہے یا باغ میں جو انگور ہیں وہ میں نے تمہارے لئے مباح (جائز و حلال) قرار دیا، تو وہ صرف کھا سکتا ہے، اسے فروخت کرنا، لے جانا اور کسی دوسرے کو کھلانا جائز نہ ہو گا۔ نیز اس اباحت (جواز) کا تعلق اس کے کہنے کے وقت گھر یا باغ میں موجود چیز سے ہو گا (بعد میں پائے جانے والے پھل وغیرہ جائز نہ ہوں گے (فتح المعین)

ہبہ کا ظرف (برتن) لوٹانے کی عادت اور ماحول نہ ہو، مثلاً عطر کی شیشی، کھجور کا بکس، کتابوں کا بکس (کارٹون) وغیرہ تو وہ ظرف بھی ہبہ شمار ہو گا (صراحتاً ظرف کو مستثنیٰ کر دے تو الگ بات ہے)، اور ظرف عادتاً لوٹایا جاتا ہو تو وہ ہبہ نہ ہو گا، مثلاً طشت میں کھانا پیش کرنا۔ گلاس و کپ میں کسی مشروب کا ہدیہ پیش کرنا وغیرہ۔ ظرف جب ہبہ نہ ہو تو اس کا استعمال حرام ہے، البتہ اس میں کھانے کا معمول ہو، تو اس ہبہ اور ہدیہ کے کھانے کی حد تک اسے استعمال کر سکتے ہیں، اور اسے عاریت سمجھا جائے گا۔ (حاشیۃ الجمل ۲۰۱/۳) اگر کسی نے خط میں سلام روانہ کیا تو وہ خط ہدیہ ہے، اِلاَّ یہ کہ اسی کی پشت پر جواب مانگے، اگر خط میں ایسی بات ہو جس کا دوسرے کے سامنے اظہار و اطلاع کاتب (خط لکھنے والے) کو پسند نہ ہو، تو کسی اور کو بتانا جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی نے کسی کو ایسی بات کی اطلاع دی جس کا کسی اور کے سامنے ذکر کرنا اسے پسند نہیں تو اس بات کا افشاء جائز نہیں، گرچہ اس کی موت کے بعد ہو، البتہ اظہار کی کراہت کا تعلق صرف زندگی سے ہو تو حرج نہیں، مثلاً اس کے اظہار سے اسے کچھ خطرہ ہو تو اب موت کے بعد کسی خطرہ کا سوال نہیں۔

کسی نے کسی غریب کو کسی خاص مقصد سے رقم دی (مثلاً کپڑا دھونے، بال کٹوانے وغیرہ کے لئے) اور قرینہ سے اس کا پتہ چلے، (یا اس نے مقصد کی صراحت کر دی) تو اسی میں وہ رقم استعمال کرنا لازم ہے۔ کسی نے جھوٹی شکایت کی کہ تم نے میری اجرت اور تنخواہ نہیں دی تو اس نے اسے رقم دے دی، یا کسی صفت کے گمان سے کچھ ہبہ کیا (مثلاً عالم یا سید سمجھ کر) حالانکہ درحقیقت اس میں وہ صفت نہ تھی، تو اسے قبول کرنا جائز نہیں، اور وہ اس کا مالک نہ بنے گا۔ دینے والے کے خیال و گمان کے متعلق قرینہ کافی ہے (یعنی صرف قرائن سے یہ محسوس ہو کہ اس نے مجھے عالم سمجھ کر یہ رقم ہبہ کی ہے، حالانکہ میں عالم نہیں ہوں، تو یہ رقم لینا حلال نہیں) کسی لڑکی کو پیغام دینے کے بعد اسے، یا اسکے ولی یا وکیل کو کچھ عطا کرے، تاکہ اس لڑکی سے نکاح کرے اور پیغام رد ہو گیا تو وہ چیز واپس لے سکتا ہے۔

اگر قرائن سے یہ اندازہ ہو کہ سامنے والا محض حیا و شرم کی وجہ سے عطا کر رہا ہے (دل سے برضا و رغبت نہیں دے رہا ہے) تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ بالاجماع اس عطیہ کا لینا حرام ہے، اور لینے کے باوجود یہ مالک نہ بنے گا۔ (حاشیۃ الجمل علی فتح الوہاب ۲۰۱/۳)

کسی خیر کے وعدہ کا نبھانا اکثر ائمہ کرام کے نزدیک مستحب ہے، اور خلاف ورزی شدید مکروہ ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کسی سبب سے وعدہ ہو مثلاً تم شادی کر لو میں اتنی رقم دے دوں گا تو نبھانا واجب ہے، اور مطلق ہو تو واجب نہیں۔ فقہاء شافعیہ میں امام تقی الدین السبکیؒ نے ایفاءِ وعدہ کو واجب قرار دیا ہے۔ (ترشیح المستفیدین ص ۲۶۴)

علامہ شوبریؒ نے ابن حجرؒ سے نقل فرمایا ہے کہ نہ نبھانے کی نیت کے ساتھ وعدہ کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ (شبراملسی علی النہایۃ ۴۲۲/۵)

لُقَطہ

تعریف: لُقَطہ وہ مال یا اختصاصِ محترم ہے، جو کسی غیر مملوک جگہ ملے، اور غیر محفوظ ہو اور پانے والا اس کے مستحق سے ناواقف ہو۔
اِختصاص: یعنی وہ شئی جس میں شرعاً ملکیت تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن کسی کے قبضہ و تصرف میں اور اس کے ساتھ مختص ہو سکتی

ہے، مثلاً کتا، گوبر وغیرہ۔

محترم: یہ مال اور اختصاص کی صفت ہے، یعنی مال محترم ہو، یعنی شرعاً معتبر ہو، پس آلات لہو ولعب، شراب اور سور وغیرہ محترم مال نہیں، اسی طرح حربی کا مال بھی محترم نہیں ہے۔ اِختصاصِ محترم یعنی شکاری کتا، حفاظت کا کتا وغیرہ۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ محترم نہیں۔

غیر مملوک جگہ یعنی ایسی جگہ جو کسی کی ملکیت نہ ہو، غیر محفوظ ہو یعنی اس پر حفاظت کی کوئی علامت نہ ہو، اور یہ کہ اس جگہ حفاظت کی خاطر اسے رکھا گیا ہے، یا جگہ غیر محفوظ ہو، یعنی احاطہ بندی وغیرہ نہ ہو، اور اسے اشیاء کی حفاظت کے اعتبار سے بنایا اور متعین کیا گیا نہ ہو۔

مشروعیت: لُقَطہ ملے تو اٹھالینا مشروع ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ سے اس کے متعلق سوال ہوا، تو ارشاد فرمایا: ''اس کے بندھن اور ظرف کو پہچان لو (اور ذہن میں محفوظ رکھو)، پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو، اگر (مالک کو) نہ پہچان سکو تو (خود اس کا مالک بن کر) اسے خرچ کرے (استعمال کرے)، اور یہ (یعنی اس کی قیمت گویا) تمہارے پاس ودیعت ہوگی، پھر زندگی میں کسی بھی وقت اس کا مالک آکر مطالبہ کرے تو اسے دے دو'' (متفق علیہ)

حِکمت: یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی کسی چیز کے گم ہو جانے سے انسان کو غم اور افسوس ہوگا، پھر براہِ راست اس تک پہنچ نہ پائے گا، کہاں کھو گیا یا بھول گیا کچھ پتہ نہیں، کبھی خیانت دار آدمی کے ہاتھ لگ جائے تو مالک اس سے بالکل ہی محروم ہو جائے گا، کبھی بے کار ایسے ہی پڑے پڑے وہ چیز بیکار ہو جائے گی، لہٰذا اس کے اٹھالینے میں لوگوں کو سہولت اور مصلحت کی تحصیل ہے، اٹھانے والا اصل مالک کو اس تک پہنچنے کا راستہ ہموار کرتا اور لوگوں کے مال پر ناحق قبضہ جمانے والوں کے لئے رکاوٹ بنتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نیکی اور تقویٰ کے امور پر معاون بنتا ہے، نہ کہ گناہ اور ظلم پر (المائدۃ: ۲) نیز اس حدیث پر عمل پیرا ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد کرتے ہیں، جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔'' (مسلم شریف)

اس طرح جب گمشدہ شئی مالک کو مل جائے گی، تو وہ خوش ہوگا، اور اس کی رنجیدگی ختم ہو جائے گی، اور اٹھا کر پہچانے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب کا مستحق ہوگا، آپ ﷺ فرماتے ہیں ''جو کسی مسلمان کی کسی دنیوی کھٹن اور مصیبت کو دور کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے مصائب میں سے اس کی ایک مصیبت دور کریں گے'' (مسلم شریف)

اس طرح لوگ امن واطمینان کی زندگی بسر کریں گے، انہیں اپنے مال کی حفاظت کا یقین ہوگا، اگر گم بھی ہو جائے تو شریف نفوس اور امانت دار ہاتھ اسے اٹھا کر مستحق تک پہنچا دیں گے۔ اور آپسی محبت ومودّت اور بھائی چارگی کی فضا عام ہوگی۔

حکم: سابقہ تعریف کے مطابق کسی مسلمان کو لُقَطہ نظر آئے تو اسے اٹھالینا مستحب ہے، جبکہ اپنی امانت داری پر اسے اطمینان ہو، اور نہ اٹھانے کی صورت میں اس چیز کے ضائع ہو جانے اور مالک تک نہ پہنچنے کا اندیشہ ہو، تاکہ اپنے بھائی کا مال محفوظ رہے۔

اگر ضائع اور برباد ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اٹھالینا مباح ہے، اٹھالے خواہ چھوڑ دے، اس جگہ اس کے علاوہ کوئی اور امانت دار شخص نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بربادی یقینی ہو تو پھر اٹھالینا واجب ہے، کیونکہ مسلمان کے مال کی حفاظت واجب ہے۔

کسی کو مستقبل میں اپنی امانت داری پر اطمینان نہ ہو، یہ خدشہ ہو کہ کہیں نفس اسے ہضم کر جانے پر نہ اکسائے، تو لقطہ اٹھانا مکروہ ہے۔ اگر یقین ہو کہ میرا نفس خیانت کرے گا، اور اٹھانے کی صورت میں حفاظت کے ساتھ مالک تک پہنچانے کی کوشش کے بجائے تو خود ہی قبضہ کرلے گا، تو اس صورت میں اٹھانا حرام ہے، اسی کے متعلق آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے ''گمشدہ چیز کو گمراہ ہی اٹھائے گا، جبکہ اس کا اعلان نہ کرے'' (مسند احمد)

حیوان کا لُقطہ: (اَلف) اگر حیوان چھوٹے درندوں سے اپنی حفاظت کر سکتا ہو، اپنی قوت کی وجہ سے، جیسے گھوڑا اور اونٹ، یا تیز رفتاری کی وجہ سے، جیسے ہرن اور خرگوش، تو صحرا میں ان کو پائے تو اپنے قبضہ میں لینا جائز نہیں، آپ ﷺ سے گمشدہ اونٹ کے متعلق سوال ہوا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ اور اسے اپنے حال پر چھوڑنے کا حکم دیا۔" (بخاری شریف)

اونٹ پر دیگر ان حیوانات کو قیاس کیا جائے گا جو اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہوں۔ البتہ امن وامان کے دور میں حفاظت کی خاطر اور مالک تک پہنچانے کی نیت سے ان حیوانات کو قبضہ میں لینے کی گنجائش ہے۔

اگر کسی بستی یا شہر میں یہ حیوانات ملیں تو مطلقاً قبضہ میں لینا جائز ہے۔

(ب) اگر حیوان اپنے دفاع اور حفاظت پر قادر نہ ہو: خواہ کمزور ہونے کی وجہ سے جیسے بکری وغیرہ، یا اپنی ظاہری مجبوری کی وجہ سے مثلاً بیمار اونٹ یا لنگڑا گھوڑا وغیرہ تو انہیں صحرا وغیرہ میں بھی لینا جائز ہے۔ آپ ﷺ سے گمشدہ بکری کے متعلق سوال ہوا تو اسے قبضہ میں لینے کی اجازت دی (بخاری شریف) دیگر کمزور جانوروں کو بھی بکری پر قیاس کیا جائے گا۔

غیر حیوان کا لُقطہ: حیوان کے علاوہ کوئی لقطہ ملے تو کمزور حیوان کی طرح مطلقاً اٹھا لینا جائز ہے (سابقہ تفصیل کے مطابق)

حدیث: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ایک مرتبہ مجھے سو دینار کا ایک بٹوہ ملا، تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ارشاد فرمایا: "ایک سال تک اس کا اعلان کرو" ایک سال اعلان کے باوجود اسے جاننے والا (مالک) نہ ملا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو فرمایا "ایک سال اعلان کرو" باوجود اس کے کوئی نہ ملا تو پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا" اس کا ظرف، اور بندھن یاد رکھو، اگر مالک آجائے تو فبہا، ورنہ تم استعمال کرو" پس میں نے استعمال کیا۔ (متفق علیہ)

حرم کا لُقطہ: حرمِ مکہ میں کوئی لقطہ ملے تو، صرف حفاظت اور مالک تک پہچانے کی نیت سے اسے اٹھا سکتا ہے، کبھی بھی وہ اسکا مالک نہیں بن سکتا، فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے حرم پاک کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا" یہاں کا لقطہ صرف اعلان کرنے والے کے لئے حلال ہے" (یعنی جو ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے) (متفق علیہ) اعلان کے لئے خود وہاں رکے، اگر مکہ سے کوچ کرنا ہو تو حاکم یا اس کے نائب کے سپرد کرے، تاکہ وہ اعلان کر کے بحفاظت مالک تک پہنچا سکے۔ (دور حاضر میں سعودی حکومت کی جانب سے ایسی اشیاء کے جمع کرنے کا مستقل دفتر ہے۔ وہاں جمع کر دے، مالک خود تلاش کرنے پہنچ جائیگا، اور حاصل کر لے گا)

لقطہ اٹھانے پر گواہ رکھنا: یہ واجب نہیں ہے، کیونکہ لقطہ کی اکثر احادیث میں اسکا حکم نہیں ہے، البتہ مستحب ہے، گرچہ اٹھانے والا عادل ہو، تاکہ اس کا نفس مستقبل میں خیانت نہ کرے، یا اس کی موت کے بعد اس کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے وارث اپنی ملکیت میں نہ لے لے۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جو کوئی لقطہ اٹھائے تو اس پر ایک یا دو (۲) عادل شخص کو گواہ بنالے۔" (ابوداود)

ایک یا دو میں اختیار استحباب پر دلالت کر رہا ہے، اگر واجب ہوتا تو ایک ناکافی ہوتا، گواہوں کو لقطہ کے بعض صفات سے آگاہ کرے، نہ کہ تمام صفات اور تفصیلات سے، زیادہ وضاحت کرنا مکروہ ہے، گواہ رکھنے کی صورت میں غیر امانت دار کو پتہ چلنے اور ظلماً چھین لینے کا اندیشہ ہو تو گواہ رکھنا ممنوع ہے۔

لُقطہ کا اعلان: (ا) اگر لقطہ بالکل حقیر اور معمولی چیز ہو کہ عادتاً اس کے گم ہونے پر کوئی فکر اور کوئی جستجو نہیں کرتا، مثلاً ایک

لقمہ، ایک کھجور وغیرہ (علاقہ اور وقت کے عرف کے مطابق) تو اٹھانے والا بغیر کسی اعلان کے ہی اس کا مالک بن جائیگا۔(فوراً وہ خود استعمال کرسکتا ہے)

حدیث: آپ ﷺ راہ میں ایک کھجور کے پاس سے گذرے تو فرمایا" اگر یہ صدقہ کا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں نے کھالیا ہوتا۔"(متفق علیہ)

لیکن اگر مالک ظاہر ہو اور کہے کہ میں نے اس چیز کی طرف سے اعراض نہیں برتا تو اسے لوٹانا اور تلف ہو تو بدل لوٹانا واجب ہے۔ (الشروانی علی التحفۃ ۸/۲۴۵)

۲) اگر لقطہ کی کچھ قیمت اور اہمیت ہو، یعنی گم ہو جانے پر ایسی چیز کی تلاش اور جستجو ہوتی ہو، تو اٹھانے والے پر گذشتہ روایات کی رو سے اس کا اعلان واجب ہے، صرف حفاظت کی نیت سے اٹھائے، یا حفاظت کے بعد خود مالک بننے کی نیت سے، دونوں صورتوں میں اعلان واجب ہے۔

اعلان کی کیفیت: (۱) لقطہ کے تمام اوصاف کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے، تاکہ کوئی آکر دعویٰ کرے تو اس کی گمشدہ چیز کی تفصیلات کی روشنی میں صحیح فیصلہ کرسکے، کہ یہ لقطہ اسی کا ہے یا نہیں۔

لہٰذا لقطہ کسی برتن یا ظرف وغیرہ میں ہے تو اُسے یاد رکھے، اگر رسی وغیرہ سے بندھا ہوا ہو تو اس کی تفصیل یاد رکھے، چیز متعدد ہو تو گن کر تعداد معلوم کرلے، اسی طرح اس کی جنس ونوعیت اور دیگر صفات کو ذہن نشین کرلے۔

۲) جب خود لقطہ کے نمایاں اوصاف کو ذہن نشین کر چکا تو اب اس کے بعض صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا اعلان کرے، جس سے اصل مالک متنبہ ہو، صفات کو بالتفصیل نہ بتائے، ورنہ کوئی بدنیت غیر مستحق آکر ظلماً اپنی بتلا کر لے لے گا۔

۳) اگر لقطہ زیادہ قیمتی ہو، اور گم کرنے والا زیادہ مدت تک اس کی تلاش اور فکر وغم میں رہے گا، تو حدیث کی رو سے، ایک سال تک اس کا اعلان کرے (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے تین سال اعلان کا حکم دیا، یہ ورع اور فضیلت کے طور پر تھا، ورنہ بالاجماع ایک سال اعلان کافی ہے، کسی نے بھی تین سال اعلان کی شرط نہیں لگائی۔شرح مسلم للنووی علیہ الرحمۃ)

ابتداءً ایک ہفتہ تک صبح وشام دو وقت اعلان کرے، پھر دوسرے ہفتہ میں دن میں ایک بار، پھر پانچ ہفتہ تک ہر ہفتہ میں ایک یا دو(۲) بار، پھر ہر ماہ ایک بار اعلان کرے، چونکہ ابتداءً تلاش شدید ہوگی، اس لئے اعلان بار بار رکھا گیا، اور یہ تفصیل علماء نے اپنے اجتہاد سے مستحب سمجھی ہے، ورنہ اصل مطلوب یہ ہے کہ صاحبِ حق کو اطلاع اور تنبیہ ہوسکے، اور وہ اپنے حق تک رسائی حاصل کرسکے۔

اگر چیز زیادہ قیمتی نہ ہو، تو اتنی مدت تک اعلان کرے جب تک عموماً مالک ایسی چیز کی تلاش میں رہے گا، جب اتنی مدت گذر جائے کہ گمان غالب یہ ہو کہ اب مالک اس کی تلاش ترک کر چکا ہوگا، تو مزید اعلان کی ضرورت نہیں۔ عرف اور قرائن سے غلبۂ ظن کے اعتبار سے لقطہ کے مناسب مدت کا اندازہ لگایا جائے گا، پس سو ۱۰۰ دینار اونٹ اور بکری وغیرہ ایسی قیمتی اشیاء ہیں کہ ایک سال ان کا اعلان ضروری ہے۔

۴) عام مقامات، بازار اور مسجد کے دروازے پر اعلان کرے، جہاں پر لوگ جمع رہتے ہیں۔ جہاں لقطہ ملا ہو، وہاں زیادہ اعلان کرے، کیونکہ اس جگہ مستحق کے تلاش کرنے کا زیادہ امکان ہے۔

مسجد میں اعلان مکروہ ہے۔(بعض علماء نے اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے) کیونکہ اس میں آواز کا بلند کرنا، اور نمازی اور ذاکرین

کے حق میں تشویش اور خلل پایا جارہا ہے۔ حدیث میں اس پر ڈانٹ اور تنبیہ موجود ہے۔ فرمایا "جو مسجد میں کسی کو گمشدہ چیز کا اعلان کرتے سنے تو کہے، اللہ تعالیٰ تمہاری چیز تم کو نہ لوٹائے، کیونکہ مساجد اسلئے تعمیر نہیں ہوئیں" (مسلم شریف) اس ممانعت سے مسجد حرام مستثنیٰ ہے، وہاں اعلان جائز ہے۔

'الفقہ المنہجی' کے مؤلفین کی رائے میں اذان کے لاؤڈ اسپیکر (اور مائک) سے اس طرح کا اعلان حالات اور ماحول کے پیش نظر اس ممانعت میں داخل نہیں، کیونکہ یہ آواز مسجد میں نہ گونجے گی، نیز باہر دور تک پہنچ جائے گی، جہاں تک عام انسانی آواز کی رسائی دشوار ہے، گرچہ اس سے احتیاط اور گریز بہتر ہے۔ البتہ اعلان کسی گمشدہ بچہ کی وجہ سے ہو تو کبھی یہ اعلان وجوب تک بھی پہنچ جائے گا۔

اعلان کے اخراجات: لقطہ اٹھانے والا خود اعلان کرے، یا کسی اور کے ذریعہ کرائے اگر خرچ آئے تو یہ مالک کے ذمہ ہے، کیونکہ اس کی ملکیت کی مصلحت کے لئے ہے۔ اب یہ مصارف قاضی بیت المال سے ادا کرے، یا مالک کے نام سے کسی سے قرض لے، یا خود اٹھانے والے کو خرچ کی اجازت دے تاکہ بعد میں مالک سے وصول کرے، یا لقطہ ہی کا ایک حصہ اس مقصد سے فروخت کرے، اگر لقطہ اٹھانے والا قاضی (حاکم) کی اجازت کے بغیر اپنے مال سے صرف کرے تو یہ اسکی جانب سے تبرع ہے، بعد میں مالک کا پتہ چلے تو اس پر اس کی ادائیگی لازم نہیں۔

لقطہ کے انواع اور تصرف کی کیفیت

۱) **اگر لقطہ حیوان ہو:** تو اسے باقی رکھ کر حاکم کی اجازت سے اس پر خرچ کرتا رہے، تاکہ مالک ظاہر ہونے پر یہ رقم اس سے وصول کرلے، اگر حاکم نہ ہو تو اس پر گواہ رکھے، اگر حاکم کی اجازت یا گواہ کے بغیر صرف کرتا رہے تو تبرع (مہربانی) شمار ہوگی، آئندہ مالک سے وصول نہیں کرسکتا۔

یا پھر۔ حاکم کی اجازت سے فروخت کرکے اس کی قیمت محفوظ رکھے، اگر ایسی جگہ ملے جہاں فروخت کی گنجائش نہ ہو، تو فی الحال اس کا مالک بن کر اسے کھا سکتا ہے، بعد میں مالک ظاہر ہو تو جس دن اس نے اپنی ملکیت میں لی، اس دن کی قیمت ادا کرے۔

۲) **اگر لقطہ حیوان نہ ہو،** لیکن فوراً بگڑنے یا سڑنے والی چیز ہو، تو اسے کھا جائے اور قیمت کا ضامن بنے یا حاکم کی اجازت سے فروخت کرکے قیمت محفوظ رکھے۔

۳) **اگر کسی طریقہ اور عمل سے لقطہ محفوظ رہے:** مثلاً تر کھجور کو خشک کرنا، دودھ کو پنیر بنانا، تو درج ذیل امور میں سے جو مالک کے حق میں بہتر ہو اس پر عمل واجب ہے۔

حاکم کی اجازت سے تمام فروخت کرکے قیمت محفوظ رکھے، یا اپنے طور پر حفاظت کا جو طریقہ ہے (یعنی خشک کرنا یا پنیر بنانا وغیرہ) اس پر عمل کرے (اور اس عمل کی اجرت نہ ملے گی)، مفت یہ خدمت انجام نہ دینا چاہے تو حاکم کی اجازت سے اتنا حصہ فروخت کردے کہ اس رقم سے بقیہ کی حفاظت کا طریقہ انجام پاسکے۔

۴) **اگر لُقَطَہ بغیر کسی عمل کے اپنی حالت پر محفوظ رہ سکتا ہو:** تو اس پر اعلان کی لازمی مدت تک اس کی حفاظت واجب ہے۔ (جیسے سونا، چاندی، روپیہ، پیسہ، کتاب، گھڑی وغیرہ)

تنبیہ: یہ بات مد نظر رہے کہ جن صورتوں میں لقطہ فروخت کرکے قیمت محفوظ رکھی جاتی ہے، لازمی مدت تک اس لقطہ کا اعلان

ضروری ہے، اعلان لقطہ کے متعلق ہی ہو گا، نہ کہ قیمت کے متعلق۔

لُقطہ کا مالک بن جانا

لازمی مدت تک اعلان کرنے کے باوجود مالک نہ ملے، اور وہ چیز ابھی باقی ہو یا بصورتِ فروخت اس کی قیمت، تو جسے لقطہ ملا ہے، وہ اس چیز کا مالک بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں گذر چکا، بعد میں بھی اصل مالک کا پتہ چل گیا تو مالک بننے کے دن کی قیمت اسے ادا کرے گا۔ (اگر لُقَطہ مثلی ہو تو اس کا مثل ادا کرے گا، فتح الوہاب)

صریح لفظ مثلاً ''میں اس کا مالک بن گیا'' یا ''میں نے یہ چیز اپنی ملکیت میں لے لی'' یا کنایہ لفظ مع نیت جیسے ''میں نے لے لیا'' وغیرہ کے ذریعہ اس لقطہ کا مالک بن جائے گا، ایک قول یہ ہے کہ اعلان کی مدت گذر جانے کے بعد ملکیت کے قصد سے ہی بلا لفظ مالک بن جائے گا۔

لقطہ اٹھانے والے کا قبضہ اور لقطہ کی حفاظت: اٹھانے والے کو لقطہ کی اس کے مناسب محفوظ مقام میں حفاظت ضروری ہے، یہی بصورتِ فروخت اس کی قیمت کا حکم ہے، اب اس کی کوتاہی یا زیادتی کے بغیر کچھ نقصان وغیرہ ہو تو یہ ضامن نہ ہو گا، جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے ''تمہارے پاس بطورِ ودیعت کے رہے'' پس اعلان کی مدت کے دوران یہ اس کا ضامن نہیں، اسی طرح مدت کے بعد مالک بننے کا ارادہ نہ ہو تب بھی ضامن نہیں، لیکن لقطہ یا اس کی قیمت کو اپنی ملکیت میں لے تو ضامن بن جائیگا، لہٰذا آئندہ کسی بھی وقت مالک ظاہر ہو تو اسے اس کا بدل (مثل یا قیمت) ادا کرے گا۔

لُقطہ مُدّعِی کے سپرد کرنا: کسی نے آکر لقطہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا تو اس سے تمام اوصاف دریافت کرے، اگر اس نے بالکل صحیح تمام اوصاف بتادیئے اور اٹھانے والے کو غالب گمان ہو کہ یہ سچا ہے تو لقطہ اس کے سپرد کرنا جائز ہے، بلکہ سنت ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پس اگر اس کا مالک آئے، اور لقطہ کے ظرف، بندھن اور تعداد (یعنی ساری تفصیلات) کو پہچانے تو وہ اس کے حوالے کردو'' (مسلم شریف)

مذکورہ صورت میں سپردگی کی اجازت اس وقت ہے، جبکہ ایک ہی شخص دعویٰ کرے، اگر صحیح وصف بیان کرنے والے زائد ہوں، تو بغیر حُجّت (گواہ) کے کسی کو بھی نہیں دیا جائے گا۔

اوصاف کی بنیاد پر کسی کو دینے کے بعد دوسرا کوئی حُجّت (گواہ وغیرہ) کے ذریعہ اپنی ملکیت ثابت کرے تو پہلے کے پاس سے لے کر اس کے سپرد کر دیں گے، اگر اسکے پاس تلف ہو چکی ہو تو، اصل مالک لُقَطہ اٹھانے والے اور پہلے مُدّعی میں سے کسی کو بھی ضامن بنا سکتا ہے، اگر لقہ اٹھانے والے کو ضامن بنائے تو وہ پہلے مدعی سے ضمان کی مقدار وصول کرے گا، جبکہ اس کی ملکیت کا اقرار نہ کیا ہو، اگر اس پہلے مدعی کی ملکیت کا اقرار کر چکا ہو تو اس سے وصول نہیں کر سکتا (فتح الوہاب)

بالکل صحیح اور باریکی کے ساتھ بھی مُدّعی اوصاف بیان کرے، تو اس کے سپرد کرنا واجب نہیں ہے۔ خواہ اسے اس کی ملکیت کا غلبہ ظن حاصل ہو، اگر وہ قاضی کے پاس گواہ پیش کرے، اور قاضی واپسی کا فیصلہ صادر کرے تب سپرد کرنا لازم ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے، ''...بیّنہ (گواہ) مدعی پر ہے...'' (بخاری و مسلم)، لہٰذا جب تک بینہ سے ثبوت پیش نہ کرے، محض دعویٰ کی وجہ سے دینا لازم نہ ہو گا۔

تنبیہ: جن مسائل میں قاضی کی اجازت یا اسے اطلاع وغیرہ کا تذکرہ ہوا، وہ اس وقت ہے جب کہ اس کا امکان بھی ہو، اور خود اس کی طرف سے ظلماً وہ چیز لینے اور مالک کی بربادی کا خطرہ نہ ہو، ورنہ قاضی کی طرف رجوع نہ کرے۔

متفرقات

۱) کھیتی کی گری پڑی بالیاں جس کے اٹھانے کا مالک کی طرف سے اہتمام نہیں ہوتا، ریتی کرتے وقت لوہے کے گرے ہوئے ذرّات اور روٹی وغیرہ کا رشید شخص کے ہاتھ سے گرا ہوا ٹکڑا، وغیرہ، جن کی طرف سے بے توجہی اور اعراض برتا جاتا ہے، اٹھالینا جائز ہے، جو اٹھالے مالک بن جائیگا اور وہ اس میں تصرف کر سکتا ہے، اگر درخت کسی کمپاؤنڈ اور احاطہ میں ہو، تو اس کے اندر گرے ہوئے پھل اٹھانا حرام ہے، احاطہ نہ ہو لیکن عادتاً اس کے اٹھانے کی اجازت اور اس میں مسامحت نہ ہو تب بھی حرام ہے، احاطہ کے باہر گرے ہوئے پھل عرف وعادت کے اعتبار سے مباح ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام ہیں۔ (ترشیح مع فتح المعین ص ۲۹۵، تحفہ ۲۴۶/۸)

۲) کسی کی مملوکہ زمین میں جو چیز ملے وہ اس زمین کے مالک کی ہے، جبکہ وہ اس کا دعویٰ کرے، ورنہ اس سے قبل مالک کی اسی طرح آخر تک پہنچے گا، آخری مالک اور زمین کو آباد کرنے والا بھی دعویٰ نہ کرے، تب وہ لقطہ شمار ہوگا، (تحفۃ المحتاج ۲۱۲/۸)

۳) مسلمان دارالحرب میں بغیر امان کے داخل ہو، اور وہاں کوئی مسلمان نہ ہو، تو جو چیز ملے وہ غنیمت ہے، اور امان سے داخل ہو، تو وہ لقطہ ہے (ءً)

۴) ہوا میں اڑ کر کوئی چیز کسی کے گھر یا گود میں آگرے، یا کسی بھاگتے ہوئے شخص نے گھر میں یا گود میں پھینک دیا، یا مورث کچھ ودیعت چھوڑ کر مر جائے اور مالک کا علم نہ ہو، تو یہ سب 'ضائع مال' ہے، نہ کہ لقطہ۔ اس طرح کا مال امام کی ذمہ داری میں جائیگا، وہ اس کی حفاظت کرے یا مناسب سمجھے تو فروخت کر کے قیمت محفوظ رکھے، یا بیت المال کے لئے قرض لے، جبکہ مالک کے ظہور کی توقع ہو، ورنہ بیت المال کے مصارف پر صرف کرے، اگر کہیں حاکم نہ ہو یا ظالم ہو، تو جس کے بھی قبضہ میں اس طرح کا ضائع مال موجود ہے، وہ خود یہ امور انجام دے۔ (تحفۃ المحتاج)

۵) کسی کے چپل بدل جائے، تو یہ دوسرے چپل لقطہ ہے، لہٰذا گذشتہ تفصیلات کے مطابق اعلان کے بعد یا مالک کے اعراض کے تحقق کے بعد ہی استعمال کر سکتا ہے، اس سے پہلے استعمال جائز نہیں، لیکن یہ معلوم ہو کہ سامنے والے نے عمداً اس کے چپل لئے ہیں، تو ظفر کے شرائط کے ساتھ اس کا فروخت جائز ہے۔ (تحفۃ المحتاج ۲۱۳/۸)

۶) چیل کوّے وغیرہ کے گھونسلے میں کوئی چیز ملے، اور یہ گھونسلہ کسی کی ملکیت کے اندر ہو تو بظاہر یہ ضائع مال کے حکم میں ہے، اور کسی کی ملکیت میں نہ ہو، مثلاً موات کی زمین، یا مسجد وغیرہ تو بظاہر یہ لُقطہ ہے۔ (حاشیۃ الشروانی علی التحفہ۔ ۲۳۴/۸)

۷) کسی کا جانور چلنے سے عاجز ہو جائے اور مالک مجبوراً کسی جنگل یا صحرا میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے، پھر دوسرا شخص وہاں پہنچ کر اس کی دیکھ بھال کرے اور وہ قوی ہو جائے تو اب بھی اصل مالک کی ملکیت میں ہی رہے گا، اور اس شخص نے جو کچھ خرچ کیا وہ مالک سے واپس نہیں لے سکتا، کوئی شخص دوسرے کے ڈوبنے یا جلنے والے مال کو بچا کر نکال لے، یا کسی کا مال سمندر میں غرق ہو گیا، اور مالک اسے نکالنے اور سمندر کے باہر اسے پھینکنے تک وہیں قیام کرنے سے عاجز ہو، اور بعد میں سمندر اسے باہر پھینک دے، تو اصل مالک کی ملکیت میں ہی باقی رہے گا۔ (حاشیۃ الجمل۔ ۲۱۲/۳)

لَقِیط (لاوارث بچہ، گراپڑا بچہ)

تعریف: سڑک وغیرہ پر پھینکا ہوا بچہ، جس کا کوئی مدعی (دعویدار) نہ ہو، اسے لقیط (اور مَلْقُوط یا مَنْبُوذ) کہا جاتا ہے۔
کسی لقیط کے اٹھانے اور پرورش کے متعلق قرآن وحدیث کے عام دلائل بکثرت موجود ہیں۔

آیات: (۱) ”وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ“ (الحج:۷۷)

ترجمہ: ”اور (تم ایسے) نیک کام (بھی) کیا کرو امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔“

(۲) ”وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی“ (المائدہ:۲) **ترجمہ:** ”اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو۔“

(۳) ”وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً“ (المائدہ۔۳۲) **ترجمہ:** ”اور جو شخص کسی شخص کو بچا لیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا۔“

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”جو کسی مومن کی دنیوی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی کو دور کرے، اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی دور فرمائیں گے۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے“ (مسلم)

(۲) آپ ﷺ نے اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے“ (یعنی اسے آپ ﷺ سے کافی قرب نصیب ہوگا) (بخاری شریف)

(۳) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کریں گے“ (ترمذی)

لقیط کو اٹھانے کا حکم: کہیں کوئی لقیط مل جائے، اور اس کا کوئی ذمہ دار اور سرپرست معلوم نہ ہو، تو اسے اٹھانا، اور اس کی تربیت و کفالت کرنا فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی، اور وہ وہیں پڑا رہا، تو اس علاقہ کے وہ تمام افراد، جو اس واقعہ سے واقف تھے، گنہگار ہوں گے، اور کسی ایک نے بھی اسے اٹھا کر اس کی تربیت و پرورش وغیرہ کا نظم کیا، تو تمام سے گناہ ساقط ہو گا۔
جو شخص کسی لقیط کو اٹھا لے، اسے **لَاقِطْ** یا **مُلْتَقِطْ** کہتے ہیں۔

اٹھانے پر گواہ رکھنا: جو پرورش و کفالت کی خاطر کسی لقیط کو اٹھا لے، اسے اپنے اس عمل (یعنی اٹھانے پر) دو معتبر حضرات کو گواہ رکھنا واجب ہے، تاکہ لقیط کی آزادی و نسب کی حفاظت ہو، نیز اس کے ساتھ مال ہو، تو اس پر بھی گواہی واجب ہے، تاکہ تہمت کی گنجائش نہ رہے، اور لقیط کے مال کے حفاظت کی ضمانت حاصل ہو۔

لاقط کے شرائط: جہاں بھی لقیط کسی کو ملے، بلا کسی قید اور شرط کے اس کا اٹھانا فرض کفایہ ہے، اور کسی کے بھی اٹھانے سے دیگر حضرات سے یہ فریضہ ساقط ہو گا، البتہ لاقط کے پاس ہی اس بچہ کو رکھنے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں۔

(۱) **اسلام:** لہٰذا کسی کافر کے پاس اسے نہیں رکھا جائے گا، اگر لقیط پر کفر کا حکم ہو، مثلاً کسی بھی طریقے سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے والدین کافر ہیں، تو اس صورت میں اسے کافر کے قبضہ میں رکھنے میں حرج نہیں۔

(۲) **عدالت:** لاقط عادل (دیندار و معتبر) شخص ہو، اگر وہ فاسق و فاجر ہو، تو اس سے لے کر کسی دیندار و امانتدار شخص کے سپرد

کریں گے۔

(۳) **رُشد:** اگر لاقط رشید نہ ہو، تو لقیط کو اس کے قبضہ میں نہیں رکھ سکتے۔

مذکورہ تفصیل کے مطابق لقیط کو لاقط کے قبضہ میں رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرنا قاضی یا حاکم کی ذمہ داری ہے، کیونکہ جس کا کوئی ولی (ذمہ دار) نہ ہو، حاکم اس کا ولی ہوتا ہے۔

لاقط لقیط کو جنگل سے دیہات کی طرف، یا جنگل و دیہات سے شہر کی طرف منتقل کر سکتا ہے، کیونکہ یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے، اس کے برعکس منتقل کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ لقیط کے لئے پریشانی اور دینی و دنیوی علوم کی تحصیل سے محرومی کا سبب بنے گا، اسے کسی جگہ سے اسی طرح کے دوسری جگہ منتقل کر سکتا ہے۔ مذکورہ انتقال کی اجازت اس وقت ہے، جبکہ راستہ اور مقصود و منزل پر امن ہو، وہاں سے اخبار موصول ہوتے رہیں اور لاقط کی امانت داری آزمودہ ہو (فتح الوہاب)

لقیط کے مصارف: اگر لقیط کے ساتھ مال موجود ہو، تو یہ مال اس کی ملکیت شمار ہوگی، اور اسی مال کو اس پر صرف کیا جائے گا، حاکم لاقط کو اجازت دے کہ وہ اس مال میں سے لقیط کی ضروریات پر خرچ کرتا رہے، اگر لاقط حاکم یا قاضی کی اجازت کے بغیر بذاتِ خود وہ مال لقیط پر خرچ کردے، تو ضامن ہوگا، اور خرچ کردہ مقدار بچہ کو لوٹانا لازم ہوگا، جیسے کسی یتیم کی ودیعت (امانت) اس کے ولی (سرپرست) کے پاس ہو، اور ولی حاکم کی اجازت کے بغیر اس پر صرف کرے، تو صرف شدہ مال کا ضامن ہوگا۔ اگر حاکم کی سہولت نہ ہو تو گواہ ٹھہرا کر صرف کرے۔

اس مال کا صرف کرنا حاکم کی اجازت پر اس لئے موقوف رکھا گیا ہے، کہ مالی ولایت اجنبی تو درکنار، باپ دادا کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار کو بھی حاصل نہیں ہوتی، اور جن کا بھی ولی نہیں، حاکم ان کا مطلق ولی ہے، لہٰذا ان کے مختلف مالی تصرفات میں اس کی طرف رجوع کریں گے، اب یا تو وہ براہ راست خرچ کرے، یا لاقط کو اجازت دے۔

اگر لقیط کے ساتھ مال نہ ہو، تو مسلمانوں کے بیت المال میں مصالح عامہ کے مد سے اس کے مصارف کا انتظام کیا جائے گا، یہ مسئلہ بالاجماع ثابت ہے، نیز مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا، تو سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ بیت المال ذمہ دار ہے۔

بیت المال سے ادا ہونے والی یہ رقم اس لقیط کا حق ہے، اس پر قرض نہیں ہے، لہٰذا آئندہ اس کے بالغ اور مالدار ہونے کے بعد یہ مصارف اس سے واپس نہیں لئے جائیں گے۔

اگر بیت المال میں گنجائش نہ ہو، تو حاکم اس لقیط کے نام سے قرض لے، یہ بھی ممکن نہ ہو، (یا حاکم و بیت المال کا نظم ہی نہ ہو)، تو مالدار مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کے مصارف برداشت کریں، اور یہ اس لقیط پر ان کا قرض شمار ہوگا۔ (جمل ۶۱۶/۳)

لقیط کا نسب: سابقہ تفاصیل سے یہ واضح ہو چکا کہ شریعتِ اسلامیہ نے لقیط کی تربیت و پرورش کو بڑی اہمیت دی ہے، اور اس میں کوتاہی کی وجہ سے وہ ضائع ہو جائے تو متعلقہ تمام افراد مجرم اور گنہگار ہوں گے، نیز حکومت نے اس مسئلہ پر توجہ نہ دی، اور والدین کی غیر موجودگی کی حتی الامکان تلافی کی کوشش نہ کی تو وہ بھی گناہ میں شریک ہوگی۔

اس اہتمام و ترغیب کے باوجود، شریعت اس کی قطعاً روادار نہیں کہ کوئی بھی شخص اس لقیط کا نسب اپنے ساتھ جوڑے، اور اسے اپنا بیٹا قرار دے، لاقط ہو یا کوئی دوسرا، مرد ہو یا عورت۔

اسلامی بھائی چارگی اور انسانیت کے ناطے اس کی تربیت و کفالت واجب ہے، لیکن تَبَنّی (اپنا بیٹا بنالینا) حرام و باطل ہے، کیونکہ نسب کی بنیاد ولادت یا نکاح پر ہے، اور ان دونوں میں ایسا کوئی رشتہ نہیں۔

تَبَنِّی کی حرمت: آیت: "وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ" ترجمہ: "اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (سچ مچ کے) بیٹے نہیں بنادیا، یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔" (الاحزاب: ۴)

لقیط کا مذہب: اگر دارالاسلام میں لقیط ملے، گرچہ وہاں ذمی آباد ہوں، یا ایسے علاقے میں ملے جسے مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد کافروں کے قبضہ میں ہی رکھا ہو، اور وہاں کوئی مسلم موجود ہو، جس کو یہ لقیط پیدا ہونا ممکن ہو، تو اس لقیط کو مسلمان شمار کریں گے، یہی اسلام کے غلبہ کا تقاضا ہے، نیز حدیث میں ہے: "اسلام برتر و غالب رہے گا۔ اس کے برعکس نہ ہو گا۔" (احمد، دارقطنی)

اگر لقیط دارالحرب (کفار کے وطن) میں ملے، اور وہاں کوئی مسلم موجود نہ ہو، تو یہ لقیط کافر شمار ہو گا، اگر وہاں کئی مذاہب ہوں، تو اسلام سے قریب تر مذہب میں شمار ہو گا۔ اگر وہاں کوئی مسلم موجود ہو، جیسے تاجر، قیدی وغیرہ تو اسے مسلمان شمار کرینگے، اگر وہ مسلمان اس بچہ کی نفی کرے، تو نسب کی نفی میں اس کی بات معتبر ہو گی، نہ کہ اسلام کی نفی میں (مغنی: ۲/۴۲۳)

علاقہ کی وجہ سے اسلام کا حکم لگانے کے بعد کوئی ذمی، معاہد یا مستامن اس لقیط کے اپنے ساتھ نسب کے متعلق بیّنہ (گواہ) پیش کرے، تو (نسب اور) کفر میں لقیط اس کے تابع ہو گا، اگر صرف بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے، تو نسب ثابت ہو گا، لیکن کفر میں تابع نہ ہو گا۔ (بلکہ مسلمان ہی شمار ہو گا)۔ (مغنی المحتاج ۲/۴۲۲)

بچہ کا مذہب: لقیط کے علاوہ کسی بچہ کے اسلام کا فیصلہ درج ذیل دو (۲) اسباب کی بنا پر ہو گا۔

۱) ولادت: کسی بچہ کا نطفہ قرار پاتے وقت (یعنی اس کی ماں کے حاملہ ہوتے وقت) اس کے والدین میں سے کوئی ایک بھی مسلم ہو، تو بالاجماع وہ بچہ (یا بچی) مسلم ہے، بعد میں والدین کے ترکِ اسلام سے یہ فیصلہ تبدیل نہ ہو گا، یہ بچہ آئندہ بالغ ہونے کے بعد کفر اختیار کرے، تو یہ مرتد شمار ہو گا۔ والدین کی طرف سے اس بچہ کے نسب میں اوپر تک خاندان کے اندر کوئی بھی مسلم ہو، تو یہ بچہ اس کے تابع مسلم شمار ہو گا، خواہ اس سے قریبی رشتہ دار زندہ ہو۔

اگر حمل کے وقت والدین کافر ہوں، پھر اس بچہ کے بالغ ہونے سے قبل کسی بھی وقت ان میں سے ایک اسلام لائے، تو فوراً بچہ بھی مسلمان شمار ہو گا، خواہ زچگی سے قبل ہو یا بعد، حد تمیز سے پہلے ہو یا بعد میں۔

آیت: "وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا۔ ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ) میں ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔"

(۲) **قید کرنا:** اگر کوئی مسلمان کسی بچہ یا پاگل کو قید کرلے، تو اس کے تابع وہ بچہ بھی ظاہراً و باطناً مسلمان شمار ہو گا، جبکہ اسی فوج نے اس کے والدین میں سے کسی ایک کو قید نہ کیا ہو، اگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک بھی قید ہوا ہو، تو بچہ اسی کے تابع اس کے مذہب پر شمار ہو گا۔

کوئی ذمی بچہ کو قید کر کے دارالاسلام لے آئے تو اسے مسلمان قرار نہیں دیں گے، بلکہ قید کرنے والے ذمی کے مذہب پر شمار ہو گا۔ (مغنی ۲/۴۲۳)

بچہ کا اسلام قبول کرنا: کوئی ممیز (باشعور نابالغ) بچہ بذاتِ خود اسلام قبول کرلے، تو (دنیوی اعتبار سے) یہ صحیح اور معتبر

نہ ہوگا، جیسا کہ ایک غیر ممیز بچہ یا پاگل کا اسلام لانا بالاتفاق غیر معتبر ہے، کیونکہ یہ سب غیر مکلف ہیں۔ جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے، امام احمد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہ وہ اس وقت بالغ تھے، بالفرض بالغ نہ بھی ہوں تو امام بیہقیؒ "معرفۃ السنن والآثار" میں فرماتے ہیں کہ ہجرت کے بعد احکام کا دارومدار بلوغ پر رکھا گیا، امام سبکیؒ فرماتے ہیں: یہ بات صحیح ہے، کیونکہ پندرہ سال کی عمر کے ساتھ احکام کا تعلق غزوۂ خندق کے سال جوڑا گیا۔ (جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق موجود ہے کہ اس سے قبل انہیں غزوہ میں شرکت کی اجازت نہ ملی، غزوہ خندق میں پندرہ (۱۵) سال کے ہو چکے تھے، اس لئے اجازت ملی)

اگر بلوغ سے قبل کوئی بچہ اسلام کا کلمہ پڑھتا ہو، تو مستحب ہے کہ نرمی سے اس کے والدین کو سمجھا بجھا کر اسے ان سے جدا کرے، تاکہ وہ اسے اسلام سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں، لیکن وہ انکار کریں، تو جدا نہ کرے، امام سبکیؒ وغیرہ بعض علماء نے جدا کرنا واجب قرار دیا ہے۔

باطنی اور اخروی اعتبار سے اس کا اسلام معتبر ہوگا، اور وہ اس کی وجہ سے جنت میں جائے گا، لہٰذا ہم اسے روزہ نماز وغیرہ عبادتوں سے منع نہیں کریں گے۔

بالغ ہونے کے بعد وہ کفر پر چلے، تو ڈرا دھمکا کر اسلام کا مطالبہ کریں گے، اگر پھر بھی نہ مانے، تو اسے والدین کے سپرد کریں گے۔

ایک مکلف شخص گفتگو پر قادر ہو، تو زبان سے اسلام قبول کرے، اگر گونگا ہو تو صرف اشارہ سے اس کا اسلام صحیح ہوگا۔

کفار کے بچے: زبان سے اسلام قبول کئے بغیر کافر کی اولاد مرے، تو اس کے متعلق کافی اختلاف ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، کیونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، (اور چونکہ بالغ ہو کر اس فطرت کے بگڑنے کا وقت آنے سے قبل ہی مر گیا، جبکہ غیر مکلف ہی تھا، تو جنت میں جائیگا)، لہٰذا اس دنیا میں تو ان کا حکم کافروں کی طرح ہے، پس نہ ان کی نماز جنازہ ہوگی، اور نہ مسلمانوں کے مقبرہ میں دفنایا جائے گا، اور آخرت میں مسلمانوں کا حکم ہوگا۔ (مغنی۔ ۴۲۴/۲) (اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں فتح الباری شرح البخاری ۲۴۶/۳)

لقیط کا استلحاق: (یعنی کسی کا اس کے نسب کو خود سے جوڑنا): اگر کوئی آزاد شخص کسی لقیط کا نسب خود سے الحاق کرے، تو یہ اس کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ (اس کا نسب اس سے جڑ جائے گا)، جبکہ اقرار کے باب میں مذکورہ شرائط موجود ہوں، اب اس کی تربیت وغیرہ کا یہی مستحق ہوگا۔ اگر کسی عورت نے اس طرح استلحاق کیا تو بغیر گواہوں کے تسلیم نہ کریں گے۔

اگر دو آدمی استلحاق کریں تو جس کے پاس بینہ ہو، اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اگر بینہ نہ ہو تو لقیط اور دونوں مدعی کو قائف (قیافہ شناس) کے روبرو پیش کریں گے، اب وہ جس سے نسب جوڑے، اس سے جڑے گا، اگر قائف نہ ہو، یا وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے، یا دونوں سے نفی کرے، یا دونوں سے الحاق کرے تو ان صورتوں میں اس بچہ کے بالغ ہونے کے بعد اسے حکم دیا جائیگا کہ ان دونوں میں سے جس کی طرف اس کا طبعی میلان ہو، اس سے اپنے نسب کا الحاق کرے، محض اس کی خواہش کا (بغیر طبعی میلان کے) اعتبار نہ ہوگا، بیہقی میں بسندِ صحیح مروی ہے، کہ "دو آدمیوں نے ایک کے بارے میں دعویٰ کیا، اور ان میں سے کون اس کا باپ ہے، پتہ نہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ دونوں میں سے جس کی چاہو اتباع کرو۔" بلوغ سے پہلے اس کے اختیار کا اعتبار نہ ہوگا۔

اگر کسی کی طرف بھی اس کا میلان نہ ہو، تو معاملہ موقوف ہی رہے گا، اگر اس نے کسی تیسرے کی طرف نسبت کی اور وہ تصدیق کرے، تو اس سے نسب ملحق ہوگا۔ اگر یہ ایک کی طرف انتساب کرے، اور قائف دوسرے کی طرف، تو قائف کا فیصلہ مقدم ہوگا۔

اگر دونوں متعارض بینہ پیش کریں، تو یہ ساقط ہوگا، اور قائف کے فیصلہ کا اعتبار ہوگا۔ (مغنی۔ ۴۲۷/۲)

اسلام: لوگوں میں اصل اسلام ہے، لہٰذا کسی بچہ یا پاگل پر کفر کا حکم عائد نہ ہوگا، ہاں اگر اس کے اصول (ماں باپ وغیرہ) کا کافر ہونا معلوم ہو، یا ایسے دارالکفر میں ملے جہاں ایسا کوئی مسلمان نہ ہو، جس کا یہ بچہ ہو سکتا ہو، (تو اس پر کفر کا حکم ہوگا)۔

اگر بچہ کے والدین کا مذہب جدا ہو، تو اس میں جو اسلام سے زیادہ قریب ہوگا، وہی اس بچہ کا مذہب قرار پائے گا۔ (قلائدالحزائد ۱/۲۶۵)

وصیت

آیت: (۱) كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۨالۡوَصِيَّةُ۔ (البقرة: ۱۸۰) ترجمہ: "تم پر فرض کیا جاتا ہے، کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو، تو وصیت کر جائے۔"

(۲) میراث کی تقسیم کی تفصیل کے بعد ارشاد فرمایا: "مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ" (النساء: ۱۱) ترجمہ: (وارثوں کے یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جائے یا دَین (اگر ہو تو اس کے بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے)

(۳) "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا شَهَادَةُ بَيۡنِكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ حِيۡنَ الۡوَصِيَّةِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ..." (المائدہ: ۱۰۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو! تمہارے آپس میں دو شخص وصی ہونا مناسب ہے، جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے (یعنی) جب وصیت کرنے کا وقت ہو (اور) وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں"

احادیث: (۱) "کسی مسلمان کے لئے یہ زیبا اور مناسب نہیں کہ اس کے پاس وصیت کے قابل کوئی چیز ہو، اور وہ دو رات بھی اس حالت میں بسر کرے، کہ وصیت اس کے پاس تحریر شدہ نہ ہو۔" (متفق علیہ)

۲) "محروم وہ ہے، جو وصیت سے محروم ہے" (ابن ماجہ)

صحابہ کرام کے مقدس دور سے آج تک تمام فقہاء کرام وصیت کے جواز پر متفق ہیں، کسی سے بھی اس اجماعی مسئلہ سے اختلاف مروی نہیں۔

تعریف: عربی زبان میں وصیت کا لفظ ایصال یعنی ملانے اور جوڑنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ شرعاً، موت کے بعد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی حق کے تبرع کو وصیت کہا جاتا ہے۔ (تبرع یعنی بلاعوض تصرف، جیسے صدقہ، ہدیہ وغیرہ)

چونکہ ایک آدمی وصیت کے ذریعے اپنے عاقبت کی بھلائی کو دنیاوی بھلائی کے ساتھ جوڑتا ہے اس لئے اسے وصیت کہا جاتا ہے۔

عام تصرفات مثلاً ہبہ وغیرہ میں اپنی زندگی میں ہی تملیک ہوتی ہے، جبکہ وصیت میں یہ تملیک موت کے بعد کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

وصیت کرنے والے کو مُوصِیۡ، جس کے حق میں وصیت ہو اسے مُوۡصیٰ لَہٗ، اور جس چیز کی وصیت کی جائے اسے مُوۡصیٰ بِہٖ کہا جاتا ہے۔

زندگی میں صدقہ: اپنی زندگی میں ہی صدقہ ادا کرنا وصیت کے مقابلہ میں افضل اور مزید ثواب و اجر کا باعث ہے، کیونکہ اس سے جلد ثواب کا حصول ہوتا ہے، نیز یہ ایک انسان کے ایمانی قوت اور نیک اعمال سے اس کے تعلق اور محبت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے۔ (قلائد ۲/۱۲)

ارشاد باری ہے: "**فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ**" (المائدة: ۴۸) ترجمہ: "...تو مفید باتوں کی طرف دوڑو۔" نیز فرمایا" **وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَا كُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ**" (المنافقون: ۱۰) ترجمہ: "اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے، اس میں سے اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو۔"

اور آپ ﷺ سے ایک شخص نے افضل صدقہ کے متعلق پوچھا، تو ارشاد فرمایا: "ایسے وقت تمہارا صدقہ کرنا جبکہ تم تندرست اور مال کے حریص ہو، تمہیں فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو، اور مالداری کی امید ہو، اور اتنی تاخیر نہ کرو کہ روح حلق میں پہنچ جائے (یعنی بظاہر موت بالکل قریب معلوم ہو) اور اس وقت کہنے لگو: فلاں کو اتنا، اور فلاں کو اتنا، حالانکہ وہ تو فلاں کا (یعنی وارثوں کا حق) ہو چکا" (متفق علیہ)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے موت کے وقت غلام آزاد کرنے والے کو شکم سیر ہونے کے بعد ہدیہ دینے والے کے مثل قرار دیا ہے۔ (ترمذی)

حکمت: شریعت کے عام اصول کی رو سے وصیت جائز نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ یہ ایسے وقت کی طرف منسوب ہے، جس میں وصیت کرنیوالے کا اپنے مال میں درحقیقت کوئی حق باقی نہیں رہتا، کیونکہ موت سے ملکیت ختم ہو جاتی ہے، لیکن موصی اسکے رشتہ دار اور اسلامی معاشرہ کے مصلحت کے پیش نظر شریعتِ اسلامیہ نے وصیت کو جائز قرار دیا ہے۔

وصیت کے ذریعے موصی ثواب حاصل کرتا ہے، اور اس کی موت کے بعد بھی اس کا ذکر خیر باقی رہتا ہے اور وصیت چونکہ عموماً ایسے رشتہ داروں کے حق میں ہوتی ہے، جو شریعت کے نظامِ وراثت کی رو سے وراثت سے محروم رہتے ہیں، اور محتاج ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا فائدہ ہوتا ہے۔

نیز وصیت اکثر مساجد، مدارس، اسپتال وغیرہ عمومی نفع کے وسائل کے متعلق ہوتی ہے، اور کبھی فقراء یتیم بچے اور اہل خیر حضرات کے حق میں ہوتی ہے، جس سے اجتماعی امور کے مصلحت کی تحصیل اور بڑی خیر و برکت وابستہ ہے۔

وصیت کا حکم: ابتدائِ اسلام میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰ کی رو سے سارے مال کی والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت واجب تھی۔ بعد میں میراث کی آیات نازل ہوئیں تو یہ وجوب منسوخ ہو گیا، اور مختلف خیر کے راستوں میں ایک تہائی یا اس سے کم کی وصیت کا استحباب باقی رہا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "بلاشبہ اللہ عزوجل نے ہر صاحبِ حق کو اسکا حق دے دیا (یعنی وارثوں کے حصے متعین کر دیئے)، تو اب کسی وارث کے حق میں وصیت کی گنجائش نہیں" (ترمذی، نسائی)

مختلف صورتوں میں وصیت کا حکم

عام حالات میں وصیت مستحب ہے۔ بعض حالات میں اس کا حکم بدل جاتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱) **وجوب:** اگر کسی انسان کے ذمہ اللہ کا یا کسی آدمی کا کوئی شرعی حق ہو، مثلاً زکات، حج، ودیعت یا دَین وغیرہ، اور وصیت نہ کرنے کی صورت میں اس کے ضائع ہونے اور عدمِ ادائیگی کا خطرہ ہو، تو وصیت کر جانا واجب ہے، جبکہ ایسے حضرات کو اس کا علم نہ ہو، جن کے ذریعے یہ حق ثابت ہو سکے۔

۲) **حرمت:** کسی ایسے چیز کی یا ایسے مصرف کے لئے وصیت کرنا، جو شرعاً حرام ہے، جائز نہیں مثلاً شراب کی وصیت یا مندر

کے لئے وصیت، ایسی وصیت باطل ہے، اور نافذ نہ ہو گی۔

وارثوں کو نقصان پہنچانے اور شریعت سے ان کے لئے مقررہ حصے سے روکنے کے ارادہ سے وصیت کرنا بھی حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے وصیت کے ذریعے ضرر پہنچانے سے منع فرمایا ہے۔(دیکھئے سورۃ النساء ۱۲)

آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک شخص اور ایک عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آتا ہے، تو وصیت میں (دوسروں کو) ضرر پہنچاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے،(ابوداود، ترمذی)

۳) **اباحت:** اپنے کسی دوست یا کسی مالدار کیلئے وصیت کرنا، جس میں کوئی علمی فضیلت یا بزرگی نہ ہو، اگر اس وصیت سے حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا ارادہ ہو، تو یہ مندوب (مستحب) شمار ہو گا۔

۴) **کراہت:** موصی کا مال کم ہو، اور اس کے ورثاء غریب اور محتاج ہوں، تو وصیت مکروہ ہے، اسی طرح نافرمانوں اور بدکاروں کے لئے بھی وصیت مکروہ ہے، جبکہ موصی کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ لوگ اس مال کو گناہ اور معصیت کے کام پر صرف کریں گے۔

وصیت کے ارکان

(۱) **مُوْصِی** (وصیت کرنے والا (۲) مُوْصٰی لَہٗ (جس کے حق میں وصیت ہو) (۳) مُوْصٰی بِہٖ (جس چیز کی وصیت کی جائے) (۴) صیغہ۔

۱) مُوْصِی کے شرائط:

(الف) عقل: لہٰذا کسی پاگل یا بے ہوش کی وصیت درست نہیں، اسی طرح جسے بغیر گناہ کے نشہ آئے، اس کی وصیت بھی معتبر نہیں۔

(ب) بلوغ: کسی بچہ کی وصیت، خواہ وہ ممیز ہو، معتبر نہیں۔(بعض شافعی فقہاء کے نزدیک ممیز بچہ کی وصیت صحیح ہے، کیونکہ اس سے فی الحال ملکیت کا خاتمہ نہیں ہوتا، نیز موت کے بعد اسے ثواب کا فائدہ حاصل ہو گا۔ مغنی المحتاج ۳/۳۹)

(ج) اختیار: وصیت موصی کے اختیار اور مرضی سے ہو، اگر کسی کے جبر و اکراہ سے ہو تو صحیح نہیں۔

(د) آزادی: کسی بھی قسم کے غلام کی وصیت صحیح نہیں ہے۔

کسی کافر یا سفاہت کی وجہ سے مجور شخص کی وصیت صحیح ہے۔

(۲) مُوْصیٰ لَہٗ کے شرائط: اس کی دو قسمیں ہیں (۱) معین (۲) غیر معین

(۱) معین موصیٰ لہ کے شرائط:

(الف) موصِی کے انتقال کے وقت اس کا مالک بننا متصور ہو، پس کسی میت یا جانور کے لئے وصیت درست نہیں، اگر یہ صراحت کرے کہ جانور کے چارہ پر صرف کرنے کے لئے وصیت کر رہا ہے، تو درست ہے، اور اس صورت میں اس جانور کے مالک کے حق میں وصیت سمجھی جائے گی، کیونکہ چارہ اسی پر لازم ہے، اور موصِی کے غرض کی رعایت کرتے ہوئے اس رقم کو اس کے چارہ پر ہی صرف کرنا لازم ہے۔

اگر ایسے حمل کے لئے وصیت کرے، جو بوقتِ وصیت موجود ہو، تو صحیح ہے۔ لہٰذا وصیت سے چھ ماہ کے اندر پیدا ہو تو وصیت نافذ

ہو گی، کیونکہ یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے اگر اس کے بعد پیدا ہو، اور عورت کسی کی بیوی ہو، تو نافذ نہ ہو گی۔ عورت کسی کے نکاح میں نہ ہو، اور وصیت سے چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو، تو یہ وصیت کا مستحق نہ ہو گا، لیکن چار سال کے اندر پیدا ہو، تو مستحق ہو گا۔(مغنی ۴۱/۳)

(ب) عدم معصیت: لہٰذا کسی کافر کے لئے مسلمان غلام یا قرآن مجید کی وصیت صحیح نہیں۔ نیز کسی حربی کے لئے ہتھیار کی وصیت درست نہیں، کیونکہ ان صورتوں میں معصیت پائی جارہی ہے۔

(ج) معین ہو: اگر کہے: ان دو میں سے ایک کے لئے وصیت، تو یہ درست نہیں، کیونکہ موصیٰ لہ مجہول ہے۔

(د) وصیت کے وقت موجود ہو، لہٰذا آئندہ قرار پکڑنے والے حمل کے لئے، یا تعمیر ہونے والی مسجد کے لئے وصیت صحیح نہیں۔

کسی مسجد، مدرسہ، مسافر خانہ یا اسپتال کی تعمیر، یا ترمیم یا مصالح کے لئے وصیت کرنا معین کے حق میں وصیت کی طرح ہے۔

اگر وصیت کے الفاظ مطلق ہوں (یعنی اس میں کوئی قید نہ ہو)، صرف یوں کہا کہ "میں نے اس مسجد کے لئے وصیت کی" تعمیر یا مصالح وغیرہ کا تذکرہ نہ کیا، تو یہ وصیت صحیح ہے، اور مسجد کے مصالح پر صرف کیا جائے گا، جیساکہ عرف کا تقاضا ہے۔

قاتل کے حق میں وصیت صحیح ہے، نیز وارث کے حق میں بھی صحیح ہے، جبکہ دیگر ورثاء اجازت دیں، جیساکہ تفصیل آئے گی۔ قاتل کے لئے وصیت کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے وصیت کرے، پھر وہی اسے قتل کر دے، اگر یوں وصیت کرے کہ جو دوسرے کو ظلماً قتل کرے، اس کے لئے تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ معصیت ہے۔(جمل)

(۲) غیر معین مُوصیٰ لہ کے شرائط: اگر وصیت کسی معین کے لئے نہ ہو، بلکہ کسی عام جہت کے لئے ہو، مثلاً فقراء، علماء، مساجد، مدارس وغیرہ، تو یہ ضروری ہے کہ کسی گناہ کی جہت کے لئے وصیت نہ ہو، لہٰذا غیر مسلموں کے عبادت خانہ کے لئے وصیت صحیح نہیں۔ جن عام جہتوں کے لئے وصیت صحیح ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

الف- فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں)، اگر کوئی کہے: میں نے تہائی مال کی فی سبیل اللہ وصیت کی، تو صحیح ہے، اور زکات کے مصارف میں جن غازیوں اور مجاہدین کا تذکرہ ہوا، ان پر صرف کیا جائے گا، کیونکہ یہی شریعت کا عرف ہے۔

ب- علماء، اگر علماء کے لئے وقف کرے تو صحیح ہے، کیونکہ ان پر صرف کرنا قربت ہے، لیکن یہ وصیت علماء اسلام یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقیدہ وغیرہ اسلامی علوم کے حاملین علماء پر صرف کریں گے، کیونکہ عرفاً یہ لفظ انہیں کے لئے مشہور ہے، لہٰذا ادیبوں، انجینئروں اور ڈاکٹروں وغیرہ پر جو دنیوی فنون کے ماہر ہیں، صرف نہیں کیا جائے گا،

اگر کسی دور میں عرف بدل جائے، اور لفظ 'علماء' کا اطلاق عام طور پر کسی بھی علم و فن کے ماہر کے لئے مستعمل ہو، تو اس صورت میں تمام علماء پر صرف کیا جاسکتا ہے۔

ج- فقراء، فقراء کو وصیت میں مساکین بھی شامل ہونگے، اسی طرح مساکین کے لئے وصیت کرے تو اس میں فقراء بھی شمار ہوں گے۔ ان میں سے کسی تین کو دینا کافی ہے، کیونکہ یہ (عربی زبان میں) اقل جمع ہے۔

د- اہل بیت، اگر آپ ﷺ کے اہلِ بیت کے لئے وصیت کرے تو بنو ہاشم اور بنو المطلب کے افراد کو دیا جائے گا، ان میں سے کسی تین کو دینا بھی کافی ہے۔

ھ- اقارب (رشتہ دار)، اس میں والدین کی جانب سے موصی کے تمام رشتہ دار داخل ہوں گے، جو کہ وارث نہ بن رہے ہوں۔

و-حج وعمرہ: اگر اپنے مال کی ایک مقدار حج وعمرہ کے لئے وصیت کر جائے، تو یہ صحیح ہے، اور یہ رقم حج وعمرہ کرنے والوں کے سپرد کی جائے گی۔

اگر اپنی جانب سے حج کرانے کی وصیت کرے، تو صحیح ہے، وصیت کے مطابق اس کی بستی یا میقات سے حج کرائیں گے، اگر وصیت میں کچھ صراحت نہ کرے، تو میقات سے حج کرائیں گے، کیونکہ یہ کم سے کم درجہ ہے، اور عام عمل اسی پر تھا، لیکن اب عمل اور عرف بدل چکا ہے، لہٰذا موصی کی بستی سے حج کرایا جائے۔

۳)موصیٰ بہٖ کے شرائط:

الف-موصیٰ بہ شرعاً قابلِ انتفاع ہو، جس سے انتفاع حرام ہو، اس کی وصیت صحیح نہیں، مثلاً آلاتِ موسیقی، جوا وغیرہ۔

ب-موصیٰ بہ دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے قابل ہو، لہٰذا قصاص یا حقِ شفعہ کی وصیت درست نہیں، کیونکہ ان کا مستحق دوسرے کی طرف یہ حق منتقل نہیں کر سکتا۔

مذکورہ دونوں شرائط کی روشنی میں درج ذیل امور میں وصیت درست ہے۔

(۱) مجہول مال کی وصیت صحیح ہے، مثلاً جانور کے پیٹ کا حمل، تھن کا دودھ، پشت پر موجود اون وغیرہ۔

۲) بوقتِ وصیت جو چیز معدوم (غیر موجود) ہو، اس کی وصیت صحیح ہے، مثلاً آئندہ پیدا ہونے والے پھل یا حمل کی وصیت۔

۳) مبہم کی وصیت صحیح ہے، مثلاً: میرا ایک کپڑا وصیت کرتا ہوں، بعد میں وارث معین کرے گا۔

۴) منافع کی وصیت مؤقت (عارضی ووقتی) اور مؤبد (مستقل اور ہمیشہ کے لئے) صحیح ہے۔ لہٰذا ایک چیز کی وصیت کسی کے لئے اور اس کی منفعت دوسرے کے حق میں وصیت کر سکتا ہے مثلاً اپنے مکان کو زید کیلئے اور اس کی رہائش خالد کے لئے وصیت کرے۔

۵) ایسی نجاست جس سے انتفاع حلال ہو، اس کی وصیت صحیح ہے، مثلاً مُعَلَّم کتا (شکار کے لئے سدھایا ہوا کتا)، گوبر، سرکہ کی نیت سے بنائی ہوئی شراب وغیرہ، کیونکہ یہ اشیاء وراثت میں منتقل ہوتی ہیں۔

۴)صیغہ کے شرائط:

(الف) وصیت صریح یا کنایہ لفظ کے ذریعے ہو۔

صریح الفاظ: میں نے اس کے لئے ہزار روپئے کی وصیت کی، اسے میری موت کے بعد ہزار دے دو، یہ ہزار میرے مرنے کے بعد اس کے ہیں۔

صریح لفظ کے محض ادا کرنے سے وصیت منعقد اور صحیح ہوگی، کسی کا یہ کہنا معتبر نہ ہوگا کہ اس نے وصیت کی نیت سے نہیں کہا تھا۔

کسی گونگے کے واضح اور سمجھ میں آنے والے اشارہ کا بھی یہی حکم ہے۔

کنایہ میں لفظ کے ساتھ نیت بھی ضروری ہے، کیونکہ لفظ میں غیر وصیت کی بھی گنجائش ہے، لہٰذا نیت سے مفہوم کی تعیین ہوگی۔

کنایہ: میری یہ کتاب زید کی ہے۔

گفتگو پر قادر شخص کی تحریر کنایہ ہے، نیت ہو تو اس سے وصیت منعقد ہوگی، جیسا کہ بیع کا حکم ہے۔

(ب)-اگر موصیٰ لَہٗ معین ہو، تو اس کا قبول کرنا شرط ہے اگر جہت عامہ کے لئے ہو، جیسے فقراء علماء وغیرہ، تو قبول شرط نہیں، کیونکہ دشوار ہے، اس صورت میں موصی کے مرنے سے وصیت لازم ہوگی۔

(ج) مُوصیٰ لَہ' کا قبول کرنا موصی کی موت کے بعد ہو، پس موصی کی زندگی میں اس کا قبول یا رد کرنا معتبر نہ ہو گا، کیونکہ ابھی اسکا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر موصی کی زندگی میں قبول کرے اور موت کے بعد رد کرے، یا اس کے بر عکس کرے، تو یہ صحیح ہے ،اور موت کے بعد کا فیصلہ معتبر ہو گا۔

اگر مُوصیٰ لَہ مُوصِی سے قبل مر جائے تو وصیت باطل ہو گی، اگر موصی کے بعد لیکن قبول کرنے سے قبل مر جائے تو وصیت صحیح ہے، اب اس کے ورثاء کو قبول یا رد کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

وصیت کے حدود

۱)موصی کے لئے بہتر اور مستحب یہ ہے کہ اپنے تہائی مال سے زائد کی وصیت نہ کرے، کیونکہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس سے زائد کی وصیت کرنا چاہی، تو آپ ﷺ نے اجازت نہ دی، صرف ایک تہائی کی اجازت دی(متفق علیہ)

ایک تہائی سے زائد کی وصیت مکروہ ہے، اگر کسی نے زائد وصیت کی اور وارثوں نے اس اضافہ کی اجازت نہ دی، تو یہ باطل ہے، کیونکہ یہ ان کا حق ہے، اور اگر انہوں نے اجازت دی، تو یہ اضافہ نافذ اور صحیح ہو گا۔

اگر موصِی کا کوئی وارث نہ ہو، اور وہ ایک تہائی سے زائد وصیت کرے، تو یہ اضافہ لغو ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کا حق ہے، لہٰذا اجازت کا سوال نہیں۔

وارثوں کی رعایت کرتے ہوئے ایک تہائی سے بھی کچھ کم وصیت کرنا مستحب ہے، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک تہائی کی اجازت مرحمت فرمائی اور فرمایا:"تہائی بہت ہے" نیز اسی روایت میں وارثوں کو مالداری کی حالت میں چھوڑ جانا محتاج اور بھیک مانگتے ہوئے چھوڑ جانے سے بہتر بتلایا۔

۲)موصِی کی موت کے وقت مال کا اعتبار ہو گا، نہ کہ وصیت کے وقت، کیونکہ وصیت موت کے بعد تملیک ہے۔ پس اگر کسی نے دو ہزار کی وصیت کی، اور اس وقت اس کے پاس کل ۶ ہزار ہو، لیکن بوقت موت یہ مقدار گھٹ کر تین ہزار کو پہنچ چکی، تو تین ہزار کا تہائی یعنی ایک ہزار کی وصیت صحیح، اور مزید ایک ہزار کی وصیت وارثوں کی اجازت پر موقوف ہو گی، اگر اجازت دیں تو نافذ، ورنہ باطل قرار پائے گی۔

۳)میت کے ذمہ جو قرض ہو، اس کی ادائیگی کے بعد بقیہ کے ایک تہائی کا اعتبار ہو گا۔ دین (قرض) بالاجماع وصیت پر مقدم ہے۔ اگر تمام ترکہ قرض میں چلا جائے، تو اس کی وصیت بالکل نافذ نہ ہو گی۔

اگر موصیٰ کی وصیت اور مرض الموت کے تبرعات (صدقہ، ہبہ وغیرہ) کی مجموعی مقدار ایک تہائی سے زائد ہو، اور ورثاء اضافہ کی اجازت نہ دیں، تو ان امور میں حسب ذیل ترتیب ملحوظ ہو گی۔

۱)اگر ان تبرعات میں بعض معلق اور بعض مُنجَّز (فوری اور نقد) ہو، تو منجز کو مقدم رکھا جائے گا۔ مثلاً کسی نے اپنا ایک لاکھ کا مکان وقف کیا، اور ایک لاکھ کی وصیت کی اور بوقتِ موت اس کا کل ترکہ تین لاکھ ہو، تو وقف مقدم ہو گا، اور وصیت لغو قرار پائے گی، البتہ وارث اجازت دیں تو نافذ ہو گی، کیونکہ مرض الموت کے تبرع کا بھی ترکہ کی ایک تہائی میں شمار ہو گا۔

۲)اگر اس کے سارے تبرعات مابعد الموت سے متعلق ہوں، اور مقدار تہائی سے زائد ہو، اور وارث اجازت نہ دیں، تو ایک تہائی کو تمام پر ان کی مقدار کے تناسب سے تقسیم کریں گے۔ مثلاً: زید کے لئے ۱۰۰، خالد کے لئے ۵۰، اور عقیل کے لئے ۵۰ کی وصیت کرے

اور ترکہ کا تہائی ۱۰۰ ہو، تو زید کو ۵۰، خالد کو ۲۵ اور عقیل کو ۲۵ دیا جائے گا۔

۳) مرض الموت میں منجز تبرعات مثلاً وقف، صدقہ وغیرہ کی مجموعی مقدار ایک تہائی سے بڑھ جائے، تو الاوّل فالاوّل مقدم ہو گا، یہاں تک کہ تہائی مکمل ہو جائے (اس کے بعد کے تبرعات کا نفاذ وارث کی اجازت پر موقوف ہو گا)

۴) مرض الموت کے کئی منجز تبرعات بیک وقت ہوں، اور تہائی سے زائد ہوں، تو قیمت کے اعتبار سے تقسیط ہو گی، (جس کی مثال اوپر ۲۹ میں گذر چکی)

وارث کے حق میں وصیت

۱) وصیت میں اصل یہ ہے کہ وارث کے علاوہ کے لئے ہو، کیونکہ اس کا مقصد نیکی اور تقرب کی تحصیل اور زندگی کی کوتاہی کا تدارک ہے، اور وارث ترکہ سے اپنا حصہ حاصل کر ہی رہا ہے۔ لیکن اسکی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی اپنے کسی وارث کے لئے وصیت کرے تو اس کے احکام درج ذیل ہیں۔

وصیت تو جائز ہو گی، لیکن اسکا نفاذ دیگر وارثوں کی اجازت پر موقوف ہو گا۔

حدیث: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ”وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، ہاں البتہ دیگر ورثاء چاہیں تو“ (دارقطنی)

۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”وارث کے لئے وصیت نہیں، اِلاّ یہ کہ (دیگر) ورثاء اجازت دیں“ (بیہقی باسناد قال الذہبی صالح-مغنی ۳/۴۳)

۲) موصی کسی وارث کے حق میں وصیت کرے، تو اس کی زندگی میں دیگر وارثوں کا قبول کرنا یا رد کرنا معتبر نہیں، کیونکہ فی الحال اس کے مال میں ان کا کوئی حق نہیں، لہٰذا اس کی زندگی میں کسی نے اس وصیت کو قبول کیا ہو تو وہ موت کے بعد انکار کر سکتا ہے، اور اس کے برعکس زندگی میں انکار کیا ہو، تو موت کے بعد قبول کر سکتا ہے۔

۳) موصیٰ لہ موصی کی موت کے وقت وارث ہو تو ان مسائل کی رعایت ضروری ہے، وصیت کے وقت کا اعتبار نہیں، لہٰذا کسی نے اپنے بھائی کے لئے وصیت کی، اور اس وقت اس کی کوئی اولاد نہیں تھی، (اور بھائی بظاہر وارث بن رہا ہے)، پھر موت سے قبل بیٹا پیدا ہوا، تو یہ وصیت صحیح اور نافذ ہو گی، کیونکہ درحقیقت یہ وصیت غیر وارث کے لئے ہے۔ (کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں بھائی وارث نہ ہو گا)

۴) موصی کی موت کے بعد بعض وارث وصیت قبول کریں، اور بعض نہ کریں، تو ہر ایک کا مستقل حکم ہو گا، جس نے انکار کیا، اس کے حصے میں نافذ نہ ہو گی، اور جس نے قبول کیا، اس کے حصے میں نافذ ہو گی، اور اس ترکہ میں ان کے حق کے مقدار کو پیش نظر رکھیں گے۔ (مثلاً تین بیٹوں میں ایک کے لئے تین سو ۳۰۰ کی وصیت کرے، ایک قبول کرے اور ایک انکار، تو قبول کرنے والے کے سو (۱۰۰) میں نافذ اور دوسرے کے سو (۱۰۰) میں نافذ نہ ہو گی)

۵) وصیت ہی کی طرح مرض الموت میں کسی وارث کے لئے وقف یا ہبہ کرنے اور مُوَرِث کا اس وارث کے ذمہ قرض کو معاف کرنے کا حکم ہے، یعنی وارثوں کی اجازت کے بغیر یہ نافذ نہ ہوں گے۔

۶) اگر کوئی ایک تہائی تک وارثوں پر ان کے حصوں کے تناسب سے وقف کرے، تو ان کی اجازت کے بغیر نافذ ہو گا۔ انہیں اس وقف کو باطل کرنے کا حق نہیں (مثلاً ایک مکان تہائی مال کے برابر ہے۔ اور وارثوں میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، اور اس نے مکان کا

ایک تہائی بیٹی کے لئے اور دو تہائی بیٹے کے لئے وقف کیا تو یہ صحیح ہے) ہر وارث کے حق میں اس کے حصے کے بقدر وصیت لغو ہے، کیونکہ وہ بغیر وصیت کے ہی اس کا مستحق ہے، لیکن اس وصیت سے گنہگار نہ ہو گا، کیونکہ شرعی حکم کے موافق ہے اگر وارثوں کے لئے ان کے حصے کے برابر اشیاء متعین کر کے وصیت کرے (مثلاً دو بیٹے وارث ہوں اور ترکہ میں ایک مکان اور ایک کھیت ہو جو مساوی قیمت کے ہوں، اور ایک کے لئے مکان کی اور دوسرے کے لئے کھیت کی وصیت کرے) تو ان کی اجازت سے یہ وصیت صحیح ہو گی، (ورنہ نہیں) کیونکہ اشیاء کے اغراض مختلف ہوتے ہیں۔ (فتح المعین مع الاعانۃ ۳/۲۰۴)

وصیت سے رجوع (وصیت منسوخ اور ختم کرنا)

وصیت بیع اور نکاح کی طرح لازم عقد نہیں ہے، بلکہ ایک جائز عقد ہے، لہٰذا موصی کا اپنی تمام وصیت یا بعض وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے، اسی طرح وصیت میں آئندہ مزید شرائط یا قیود کا داخل کرنا بھی صحیح ہے، کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے، وصیت کے مال میں اس کی ملکیت اور تصرف کی آزادی باقی ہے، پس وہ کسی بھی مناسب تصرف کا مختار ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ”آدمی اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے“ (بیہقی)

رجوع کی کیفیت: مناسب الفاظ کے ذریعہ رجوع کرے، مثلاً: میں نے وصیت کو ختم کر دیا، اسے باطل قرار دیا، اس سے رجوع کیا، اسے فسخ کر دیا، کالعدم قرار دیا، یا یہ چیز میرے وارثوں کے لئے ہے۔

مُوصیٰ بہ میں ایسا تصرف کرنا، جو وصیت کے ابطال اور اس سے اعراض پر دلالت کرتا ہو، رجوع سمجھا جائے گا، مثلاً:۔ موصیٰ بہ کو فروخت کر دینا، اسے مہر میں دینا، کسی کو ہبہ کر کے اس کے سپرد کرنا، قرض کے عوض اسے رہن رکھنا، وصیت میں ان تصرفات کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے وصیت سے رجوع کیا۔

رجوع کی بعض صورتیں: (۱) کسی نے معین گیہوں کی وصیت کی، پھر اسے دوسرے گیہوں میں ملا دیا، تو یہ وصیت سے رجوع سمجھا جائے گا، کیونکہ اب موصی بہ کا سپرد کرنا مُتعذّر ہے۔

(۲) گیہوں کے ایک ڈھیر میں سے ایک کلو دینے کی وصیت کی، پھر اس میں اس سے بہتر گیہوں ملا دیئے، تو یہ رجوع شمار ہو گا، لیکن اسی کے مثل یا اس سے گھٹیا گیہوں ملا دیئے، تو یہ رجوع نہ ہو گا۔

(۳) گیہوں کے متعلق وصیت کے بعد اسے پیس دیا یا بو دیا، آٹے کی وصیت کے بعد اسے گوندھ دیا، کپاس کی وصیت کے بعد اسے کاتا، کپڑے کی وصیت کے بعد اسے سی دیا یا کسی کھلی جگہ کی وصیت کرنے کے بعد اس میں مکان تعمیر کیا یا باغ لگایا، تو ان تمام صورتوں میں وصیت سے رجوع سمجھا جائیگا۔

عدم رجوع کی صورتیں: موصی بہ کو کرایہ پر دینا، عاریتاً دینا، خود استعمال کرنا، وصیت کی سواری پر سوار ہونا، یا وصیت کا کپڑا پہننا رجوع نہیں ہے۔ اگر کسی نے موصی سے وصیت کے متعلق پوچھا اور اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو یہ بھی رجوع نہیں ہے۔

کسی نے اپنے تہائی مال کی وصیت کی (یعنی موصیٰ بہ معین نہیں ہے)، پھر اس کا مال برباد ہو جائے یا تمام مال میں فروخت وغیرہ کے ذریعے تصرف کرے، تو رجوع شمار نہ ہو گا، بلکہ موت کے وقت جو مال ہو گا، اس کا ایک تہائی معتبر ہو گا۔ (مغنی ۳/۷۲)

مرضِ مخُوف (خوفناک بیماری): یعنی ایسی بیماری جس کی وجہ سے موت نادر نہ ہو، خواہ غالب بھی نہ ہو (مغنی

۵۰/۳)

مرض مخوف اوراس سے ملحق صورتوں میں تہائی سے زائد تبرع پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ اگر کوئی زائد میں تبرع کرے، پھر اس بیماری میں مر جائے، گرچہ کسی اور سبب سے ہو، تو تہائی سے زائد تبرع نافذ نہ ہوگا، اگر اس بیماری سے شفایاب ہو جائے تو زائد تبرع بھی نافذ ہوگا۔

اگر مرض غیر مخوف ہو، پھر وہ مر جائے، اور موت اتفاق پر محمول نہ ہو، یا کسی دوسرے سبب سے نہ ہو (مثلاً ڈوب جانا، حادثہ وغیرہ)، تب بھی تہائی سے زائد کا نفاذ نہ ہوگا، مثلاً ایک دوروز اسہال کے بعد مر جانا۔

اگر کسی دوسرے سبب سے موت ہو جائے، یا اتفاق پر محمول ہو، مثلاً خارش، دانت درد یا آنکھ درد کی حالت میں انتقال ہو، تو تہائی سے زائد تبرعات بھی نافذ ہوں گے۔

اگر بیماری کا مخوف وپر خطر ہونا مشکوک ہو، تو دوایسے ڈاکٹروں (طبیبوں) کے کہنے سے ہی ثابت ہوگا، جن کی گواہی مقبول ہو۔

مرض مخوف کی مثالیں: قولنج، ذات الجنب (نمونیہ)، دائم نکسیر، مسلسل اسہال (جلاب، پیٹ جلنا)، دق، ابتداء فالج، (یعنی ایک ہفتہ تک، بعد میں غیر مخوف شمار ہوگا)" مختلف قسم کے بخار، (البتہ چوتھیا بخار یعنی جو ایک روز آئے پھر دوروز نہ آئے، یہ غیر مخوف ہے، اسی طرح ایک دوروز کا معمولی بخار بھی غیر مخوف ہے)

مخوف سے ملحق صورتیں: کسی ایسے آدمی کے قید میں ہونا جو عموماً قیدی کو قتل کرتا ہو، دوہمسروں میں قتال، کسی کو قتل کے لئے لانا، کشتی میں سوار شخص کے حق میں سمندر یا بڑی نہر میں طوفانی ہواؤں کا چلنا، زچگی کے وقت دردِ زہ، مشیمہ کا پیٹ میں رہ جانا (مشیمہ یعنی بچہ کی جھلی جس میں بچہ پیدائش کے وقت لپٹا ہوا ہوتا ہے)، اگر مشیمہ نکل آئے اور ولادت کی وجہ سے زخم وغیرہ نہ ہو، تو خطرہ ٹل چکا۔ (چونکہ مذکورہ صورتوں میں غالباً موت آتی ہے، اس لئے تبرعات کے مسئلہ میں یہ بھی مرضِ مخوف کے مثل ہوں گی) (حاشیۃالجمل ۵۳/۴)

طاعون اور وبا کے زمانہ میں تمام لوگوں کے تصرفات میں ایک تہائی کا اعتبار ہوگا۔ (فتح المعین)

بعض لفظی احکام: (۱) اونٹ یا بکری کی وصیت میں بچہ شمار نہ ہوگا، البتہ جسامت کے اعتبار سے چھوٹا بڑا، عیب دار وبے عیب شمار ہوگا۔ بیل کی وصیت میں گائے یا گائے کی وصیت میں بیل شمار نہ ہوگا۔

۲) اگر اپنی بکریوں میں سے ایک بکری کی وصیت کرے، اور موت کے وقت اسکے پاس بکریاں نہ ہوں تو یہ وصیت لغو ہوگی۔

۳) اپنے مال میں سے ایک بکری کی وصیت کرے، اور بوقتِ موت اس کی ملکیت میں بکری نہ ہو، تو بکری خرید کر دی جائے گی۔

۴) کسی کے حمل کے لئے وصیت کرے، تو زندہ پیدا ہونے کی صورت میں مستحق ہوگا، اگر دو بچے پیدا ہوں تو دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، مذکر و مؤنث کو یکساں ملے گا، ایک زندہ اور ایک مردہ پیدا ہو، تو مکمل وصیت زندہ کو ملے گی، اگر کہے: حمل مؤنث ہو تو اسے اتنی رقم یا کہے: مذکر ہو تو اتنی رقم، پھر دونوں بھی پیدا ہو، تو وصیت لغو قرار پائے گی۔

۵) اگر اپنے پڑوسیوں کے لئے وصیت کرے، تو اسکے گھر کے چاروں طرف سے چالیس چالیس گھروں تک اس وصیت کو صرف کیا جائے گا، جیسا کہ ابوداود اور بیہقی وغیرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے، موصی بہ کو گھر کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا، نہ کہ افراد کے اعتبار سے، البتہ ہر گھر کا حصہ اس کے مکینوں کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ اگر موصی کے دو گھر ہوں تو جہاں زیادہ رہتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا، دونوں جگہ رہائش مساوی ہو، تو دونوں کے پڑوسیوں کا حق ہوگا۔

۶) زید اور عارف کے اولاد کے لئے وصیت کرے، تو ان کی تعداد کے مطابق تقسیم ہوگا، نہ کہ دونوں کی اولاد پر نصف نصف۔

۷) کسی معین بستی کے فقراء یا علماء کے لئے وصیت کرے، اور موت کے وقت اس بستی میں فقراء یا علماء کا وجود نہ ہو، تو وصیت باطل ہوگی، اگر کسی بستی کی تخصیص نہ کرے، تو جہاں بھی مستحق موجود ہوں، ان کو دیا جائے گا، خواہ دور ہی ہوں۔" (حاشیۃ الجمل ۴/ ۶۰)

حج: میت کے ذمہ فرض حج ہو تو اس کا تعلق اس کے تمام ترکہ سے ہوگا، وصیت کرے یا نہ کرے اگر مال میقات سے حج کے لئے ناکافی ہو، تو جہاں سے بھی ممکن ہو، واجب ہے، مال میں گنجائش ہو تو میقات سے ہی احرام واجب ہے، اگر میت نے حج کی ادائیگی کو تہائی کے ساتھ مقید کیا ہو، تو اس کا اعتبار ہوگا، اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسری وصیتوں کے ساتھ مزاحمت ہوگی، (یعنی حج کے مصارف میں ایک تہائی صرف ہو، تو دیگر وصیتیں نافذ نہ ہوں گی)، لیکن تہائی سے حج ادا نہ ہو، تو مزید درکار رقم کل مال سے لی جائے گی۔

حج ہی کی طرح اصلِ شرع سے واجب تمام اعمال کا حکم ہے، مثلاً عمرہ، زکات اور صحت کی حالت کی نذر لیکن بیماری کی نذر کا ایک تہائی سے اعتبار ہوگا۔

وارث یا دوسرا کوئی شخص وارث کی اجازت کے بغیر، میت کا فرض حج اپنی جانب سے ادا کر سکتے ہیں، جیسا کہ اس کا قرض ادا کر سکتے ہیں، اگر میت اپنی زندگی میں حج پر قادر نہ تھا، تب بھی اس کی جانب سے حج ادا کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ واجب ہی شمار ہوگا۔

نفلی حج وارث یا اجنبی میت کی وصیت کے بغیر انجام نہیں دے سکتے۔

میت کے ذمہ مالی کفاروں کو اس کے ترکہ سے ادا کرنا واجب ہے وارث یا غیر وارث کو اپنے مال میں سے ادا کرنا جائز ہے۔ (خواہ میت کا مال ہو یا نہ ہو)۔ (جمل ۴/۶۶)

ایصاء

لغت میں ایصاء بھی وصیت کے معنی میں ہے، لیکن فقہی اعتبار سے دونوں کی تعریف میں فرق ہے۔

تعریف: موت سے قبل کسی کو اپنے اولاد کی رعایت و دیکھ ریکھ، وصیت کا نفاذ، قرض کی ادائیگی، ودیعت (امانت) کی واپسی وغیرہ کا ذمہ دار بنانا، ایصاء، کہلاتا ہے۔

وصی: جو شخص کسی کی موت کے بعد مذکورہ ذمہ داری کو میت کی وصیت کے مطابق اس کی نیابت میں انجام دے، اسے 'وصی' کہا جائے گا۔

حکم: ایصاء دراصل مستحب ہے، بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے۔

امام اذرعی فرماتے ہیں: "والد پر اپنی اولاد کے سلسلہ میں وصیت بظاہر واجب ہے، جبکہ ولایت کی اہلیت رکھنے والا دادا موجود نہ ہو، اور معتبر اور مناسب وصی موجود ہو، اور اس کا غالب گمان یہ ہو کہ وصیت نہ کرنے کی صورت میں کوئی خیانت دار اور ظالم اس کے مال پر قبضہ جمالے گا، کیونکہ بچے کے مال کی حفاظت اس پر واجب ہے۔"

امام باجوریؒ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں: "ایصاء مذکور سنت ہے، البتہ جس حق کی ادائیگی سے فی الحال عاجز ہو اور اس کے گواہ نہ ہوں، تو اس صورت میں واجب ہے ورنہ وہ حق ضائع ہو جائے گا۔"

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگر موصی پر کچھ حق ہو، جو ایصاء کے ترک سے فوت ہو جائے گا، یا کمسن اولاد کے ضائع ہونے یا ان

کو ضرر و نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ایصاء واجب ہے، ورنہ عام حالات میں مستحب ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو وصی بنایا اور اسے تحریر کیا (بیہقی، باسناد حسن)

حکمت: کبھی انسان بظاہر قریب المرگ ہو جاتا ہے، اور لوگوں سے مختلف مادی و مالی تعلقات کی وجہ سے ودیعت، عاریت، قرض وغیرہ کی ذمہ داری سر رہ جائے گی۔ نیز کمسن اولاد، جو مالی تصرفات کی صلاحیت سے عاری ہوں، چھوڑ جارہا ہوگا، جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ کسی مناسب شخص کو ان امور کا ذمہ دار ٹھہرا کر جائے، اسی مصلحت کی تحصیل کے لئے اسلام نے ایصاء کو مشروع فرمایا، اور اس کی ترغیب دی۔

وصی کے شرائط

(۱) مکلف ہو، (۲) آزاد ہو۔ (۳) مسلمانوں کا معاملہ ہو، تو وصی بھی مسلم ہو، کسی کافر کو مسلمانوں کے معاملات کا وصی بنانا صحیح نہیں، کیونکہ وہ متہم ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں پر ولایت نہیں دی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً“ (النساء: ۱۴۱) **ترجمہ:** ”اور ہر گز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرماویں گے“ نیز فرمایا: ”يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالاً“ (آل عمران: ۱۱۸) **ترجمہ:** ”اے ایمان والوں اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت میں برتاؤ میں) صاحبِ خصوصیت مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔“

البتہ ایک ذمی کسی ذمی کو وصی بنا سکتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی وصی بنا سکتا ہے۔

۴) عادل ہو، کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو، اور نہ صغیرہ گناہوں پر اصرار ہو، صرف ظاہری عدالت کافی ہے، یعنی اس کی ظاہری حالت اس طرح ہو، (باطنی اور اندرونی حالت کی تحقیق ضروری نہیں) لہٰذا کسی فاسق (بدکار) کو وصی نہیں بنا سکتے۔

۵) جن امور کی ذمہ داری سونپی جارہی ہے، اس کی اس میں صلاحیت بھی ہو، اور وہ اس کی ادائیگی پر قادر ہو، لہٰذا کسی سفیہ، مریض، بالکل بوڑھا، دماغی خلل میں مبتلا یا غفلت کے شکار آدمی کو وصی بنانا درست نہیں، کیونکہ اس میں کوئی مصلحت نہیں۔

۶) جس معاملہ میں وصی بنا رہا ہے۔ اس کا تذکرہ ضروری ہے، اگر صرف اتنا کہا کہ تجھے وصی بنایا، یا میرے قائم مقام بنایا، تو یہ کافی نہیں (قلائد)

مذکورہ شرائط کی روشنی میں معلوم ہوا کہ:

۱) کسی نابینا کو وصی بنانا درست ہے، کیونکہ جس معاملہ کو وہ بذاتِ خود انجام نہ دے سکے، کسی کو وکیل بنا کر انجام دے سکتا ہے۔

۲) عورت کو وصی بنا سکتے ہیں، کیونکہ اس میں تصرف کی صلاحیت ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوقتِ وفات اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو وصی بنایا، (ابوداود)

اگر ماں میں وصی کے شرائط ہوں، تو اسے وصی بنانا بہتر ہے، کیونکہ وہ زیادہ شفیق رہے گی، بلکہ امام اصطخری کے نزدیک تو باپ دادا کے بعد اسے ولایت حاصل ہے، دورِ حاضر میں تو بعض مرتبہ انہیں کے قول پر عمل کرنا پڑے گا۔ (جمل۔ ۷۱/۴)

مذکورہ شرائط کا موصی کے موت کے وقت پایا جانا ضروری ہے، کیونکہ یہی قبول پر تسلط کا وقت ہے، ایصاء کے وقت یا اس کے موت

کے درمیان کوئی شرط مفقود ہو، لیکن موت کے وقت موجود ہو تو ایصاء صحیح ہے۔(جمل ۴/۷۱)

وصی اور ایصا کے احکام

۱)ایک وصی دوسرے کسی کو وصی نہیں بنا سکتا، کیونکہ موصی نے اسے اختیار کیا ہے، اور کسی دوسرے کے تصرف پر رضامند نہیں ہے ، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ موصی نے اس کی اجازت نہ دی ہو، یا اس سے منع کیا ہو، اگر خود موصی کی اجازت ہو تو دوسرے کو وصی بنانا جائز ہے۔

۲)ایصاء میں توقیت و تعلیق صحیح ہے (یعنی وقت کی قید یا کسی شرط پر معلق کرنا) مثلاً کسی نے کہا: میں نے فلاں کو میرا بیٹا بالغ ہونے تک وصی بنایا، یا بھائی کے آنے تک، تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کہا: اگر میں مر گیا تو تجھے وصی بنایا، تو یہ جائز ہے۔

۳)اگر دو آدمی کو وصی بنائے، اور دونوں مل کر تصرف کرنے کی شرط لگائے، یا اس شرط کا ذکر نہ کرے، تو ایک وصی تنہا تصرف نہیں کر سکتا، لیکن ہر ایک کو تنہا تصرف کی اجازت دے دے، تو تنہا تصرف کرنا جائز ہے۔

اگر دو کو وصی بنائے، اور ایک ہی قبول کرے، تو تنہا وہ تصرف کرے گا، اسی طرح دو وصی میں سے ایک مر جائے یا فاسق ہو جائے، تو دوسرا تنہا تصرف کر سکتا ہے۔(قلائد ۲/۲۳)

۴)عقد ایصاء طرفین کے لئے صرف ایک جائز عقد ہے، لہٰذا وصی جب چاہے خود کو اس منصب سے معزول کر سکتا ہے، کیونکہ وہ موصی کا وکیل ہے، لیکن اس صورت میں متعلقہ یتیموں کے مال پر کسی ظالم کے قبضہ یا اس کے تلف وغیرہ کا اندیشہ ہو، تو ان کی رعایت کرتے ہوئے اس کی سبکدوشی نافذ نہ ہوگی، اور اسے اس طرح کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵)بچوں کے معاملات میں ایصاء کرنے والا وہ شخص ہو، جسے بچے پر ولایت حاصل ہو، جیسے باپ، دادا۔

دادا میں ولایت کی صفت موجود ہو، تو باپ کا کسی دوسرے کو وصی بنانا درست نہیں ہے، کیونکہ دادا کو شرعاً ولایت حاصل ہے، لہٰذا یہ اسے منتقل نہیں کر سکتا، جیساکہ نکاح کی ولایت کا حکم ہے، اگر دادا غائب ہو، اور اس کی آمد تک کے لئے کسی کو وصی بنائے، تو بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے، اگر دادا کی زندگی میں وصی بنائے، پھر دادا باپ سے پہلے مر جائے تو یہ ایصاء نافذ ہوگا(قلائد)

۶)بچہ بالغ ہونے کے بعد خرچ کے متعلق وصی سے اختلاف کرے، اور دعویٰ کرے کہ اس نے اسراف (فضول خرچی) سے کام لیا ہے، تو وصی کی بات مع قسم معتبر ہوگی۔

اگر بلوغ کے بعد مال کی سپردگی میں اختلاف ہو، وصی سپردگی کا دعویٰ کرے، اور بچہ انکار کرے، تو بچہ کی بات (جو بالغ ہو چکا ہے) مع قسم تسلیم کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ "(النساء: ٦) ترجمہ: "پھر جب (بلوغ اور رشد کے بعد) ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے مال ان کو دے دینے) پر گواہ بھی کر لیا کرو۔ (شاید کسی وقت کچھ اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آویں)۔ نیز مال کی سپردگی پہ گواہ رکھنا وصی کے لئے کوئی مشکل بات نہیں۔(بخلاف پہلی صورت کے)

متفرق مسائل

ایک تہائی وارث کے لئے اور ایک تہائی اجنبی کے لئے وصیت کرے، اور دیگر وارث تہائی سے زائد کو رد کریں، تو صرف وارث کا تہائی رد ہو گا، اور اگر تمام ترکہ دونوں میں نصف نصف وصیت کرے، تو اجنبی کے حق میں تہائی صحیح ہو گا، اور بقیہ وارث کی اجازت پر

موقوف ہوگا(قلائد۔ ۲/۲۳)

۲)کسی نے تہائی مال کی اللہ کے لئے وصیت کی، تو صحیح ہے، اوراس مال کو مختلف نیک کاموں میں صرف کیا جائے گا، اگر صرف اتنا کہا :"میں نے تہائی مال کی وصیت کی" تو یہ بھی صحیح ہے، (وقف کے برعکس)، اور مساکین پر صرف کیا جائے گا: اگر یوں کہا!" فلاں شخص اپنے ہاتھ سے جہاں مصلحت سمجھے صرف کرے۔" تو مذکورہ شخص مناسب مصارف میں صرف کرے، مثلاً مساکین کو کھلانا، جائیداد خرید کر آمدنی کو نیک کام میں صرف کرنا، مسلمانوں کی تلاوت کے لئے قرآن کا انتظام کرنا، فقراء واہل خیر اور مسجد میں لگانا، جس کا نفع دائم ہو، وہ صورت افضل ہے۔(قلائد۔ ۲/۲۹)

۳)کسی چیز کے متعلق یہ وصیت کرے کہ اسے زید کے ہاتھ فروخت کیا جائے، تو یہ لازم ہے، اگر وہ نہ خریدے تو وصیت باطل ہوگی، البتہ بیچ کر قیمت صدقہ وغیرہ کرنے کہے، تو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرکے اس کے وصیت کو نافذ کیا جائے گا، مخصوص رقم دے کر فلاں کے ذریعے حج کرانے کی وصیت کرے، اور وہ فلاں انکار کرے، تو کسی دوسرے کے ذریعے حج کرائے، حج کی وصیت کرے ، اوراس کے لئے ایک تہائی سے زائد رقم کی وارث اجازت نہ دیں، تو یہ رقم وارث کی طرف لوٹے گی(قلائد)

۴)اگر موصی کہے: میں نے فلاں کی اولاد کے لئے وصیت کی، تو وصیت کے وقت اس کی جو اولاد موجود ہو، ان پر صرف ہوگا، بعد میں پیدا ہونے والے مستحق نہ ہوں گے ، گرچہ حمل کی حالت میں ہو۔ (یعنی بوقت وصیت جو بچہ پیٹ میں ہو، وہ بھی مستحق نہ ہوگا) (قلائد ۲/۴۳)

۵)کسی کو سو(۱۰۰)روپئے کی وصیت کرے، پھر کسی دوسرے وقت سو(۱۰۰)روپئے کی وصیت کرے، تو صرف سو(۱۰۰)روپے کا مستحق ہوگا، اگر دوسری مرتبہ زائد رقم کی وصیت ہو، تو صرف اسی کا مستحق ہوگا، اگر دونوں ہوں تو دونوں صحیح ہیں،(یعنی پہلے کہا کہ یہ معین سو(۱۰۰)روپئے پھر دوسری مرتبہ دوسرے سو(۱۰۰)روپئے معین کرے، تو دونوں مستقل وصیت شمار ہوں گے)، اگر ایک مطلق اور ایک معین ہو، تو مطلق کو بھی معین پر محمول کریں گے ،(یعنی صرف معین کا مستحق ہوگا)، پہلے سو کی پھر پچاس کی وصیت کرے، تو اسے صرف پچاس کا حق ہوگا، اور بقیہ پچاس سے گویا اس نے رجوع کیا، جیسا کہ امام نوویؒ نے فتویٰ دیا ہے(قلائد)

۶) قرض کی وصیت صحیح ہے، پس اگر اپنے مقروض سے کہے: میں مرجاؤں تو میرا قرض فلاں کو دینا یا فقراء کو صدقہ کرنا، تو یہ صحیح ہے۔(قلائدالخرائد ۲/۵۱)

۷)جس کی زبان بند ہوجائے، تو اس کے عقود اور وصیت کے لئے تحریر یا بامفہوم اشارہ معتبر ہوگا(قلائد)

۸)وصیت کو معلق کرنا جائز ہے، اوراس میں جو شرط لگائے، وہ معتبر ہوگا، لہٰذا کسی نے اپنے پوتوں کے حق میں وصیت کی، بشرطیکہ وہ اپنے والد کو نہ ستائیں، اگر ستائیں، تو پھر ان کے حق میں وصیت نہیں، پھر انہوں نے قبول کیا، تو صحیح ہے، بعد میں اگر والد کو ستائیں، تو واپس لیا جائے گا، خواہ وہ فروخت کرچکے ہوں، تو گویا ان کا فروخت کرنا صحیح سمجھا گیا، لیکن ستانے کی وجہ سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوا(قلائد ۲/۶۱)

۹)اگر خالد کو وصی بنائے پھر بعد میں کہے کہ جس معاملہ میں خالد کو وصی بنایا تھا، اس میں زید کو وصی بنایا، تو خالد معزول ہوجائے گا۔(قلائد ۲/۶۳)

۱۰)کسی معین چیز میں سے قرض کی ادائیگی کے لئے کسی کو وصی بنائے، تو وارث اس چیز کو روک نہیں سکتے، اور وصی بذاتِ خود تنہا اس میں سے ادا کرسکتا ہے، اگر موصی معین نہ کرے، تو وارث اس کا ترکہ روک کر اپنی جانب سے بھی قرض ادا کرسکتے ہیں، لہٰذا وصی ان

سے مطالبہ کرے گا کہ یا تو قرض ادا کرو، یا ترکہ میں سے اتنا میرے سپرد کر دو کہ فروخت کر کے قرض ادا کر سکوں، اس صورت میں وصی وارث سے رجوع کئے بغیر خود ہی ترکہ فروخت کرے، تو یہ بیع باطل ہے (قلائد)

۱۱) وصی کسی ظالم کے پنجہ سے مال آزاد کرنے کے لئے اس میں سے کچھ اسے دے سکتا ہے، حتی الامکان کم سے کم پر اسے راضی کرنے کی کوشش کرے، اسی طرح اس چیز میں عیب پیدا کرنے سے اس کی سلامتی کی امید ہو، تو یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہوتا ہے، ودیع اور مُقارض (قِراض میں عامل) کا بھی یہی حکم ہو گا (قلائد)

۱۲) کسی نے کسی بچے کے لئے کسی چیز کی وصیت کی، اور کہا: اس کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے سپرد نہ کرو تو اس شرط پر عمل کیا جائے گا، اور اسکے ولی کے سپرد نہ کریں گے، اگر وہ بلوغ سے قبل مر جائے، تو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ (قلائد ۶۶/۲)

۱۳) کسی کافر نے تعمیر مسجد کے لئے وصیت کی، تو یہ صحیح ہے (تحفۃالمحتاج ۴۳۴/۸)

۱۴) اپنی زندگی یا موت کے بعد کسی شرط پر وصیت کو معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً: میں نے فلاں چیز کی فلاں کو وصیت کی، اگر وہ میری بیٹی سے نکاح کرے، یا سفر سے لوٹ آئے، یا میں اس بیماری میں مر جاؤں تو، یا اگر زید چاہے تو۔ (لہٰذا ان صورتوں میں شرط پائی گئی، تو وصیت نافذ ہو گی، ورنہ نہیں) (تحفۃالمحتاج)

۱۵) کسی نے اپنی بستی کے کسی بزرگ کے قبر کے قریب دفن کرنے کی وصیت کی، تو وہیں دفنانا واجب ہے۔ (بغیہ۔ص ۱۸۵)

۱۶) مسلکِ شافعی میں صرف تحریر عقود، اخبار (خبر دینا) اور انشاء (فی الحال انجام دینا) میں شرعی حجت نہیں، ائمہ کرام نے تحریر کو کنایہ قرار دیا ہے، پس وصیت وغیرہ نیت کے ساتھ تحریر کرے، تو منعقد ہو گی، گرچہ وہ کہنے پر قادر ہو، نیز اس کی جانب سے، یا وارثوں کی طرف سے نیت کا اعتراف ضروری ہے، لہٰذا کسی نذر، طلاق یا وصیت کے متعلق میت کی صرف تحریر پر کوئی حکم مرتب نہ ہو گا، گرچہ وارثوں کو میت کی تحریر ہونے کا یقین ہو، بلکہ اس نے خود پہلے یہ اقرار کیا ہو کہ یہ میری تحریر ہے، اور اس میں میری وصیت ہے۔ (لیکن نیت کا اعتراف نہ ہو، تو یہ معتبر نہ ہو گا)، اور وارثوں کو اس پر عمل پیرا ہونا قطعاً لازم نہیں، کیونکہ وہ معدوم کے حکم میں ہے، جو کہ شرعی حجت و دلیل نہیں، اگر اس صورت میں موجود وارثین نے میت کی تحریر کی بنیاد پر ترکہ میں عادت کے مطابق تصرف کیا، تو غائب کامل وارث آنے کے بعد اجازت دے تو فبہا، (ٹھیک ہے) ورنہ تجہیز و تکفین کے واجب مصارف کے علاوہ دیگر رقم کا تصرف کرنے والا ذمہ دار ہو گا۔ (بغیہ ص ۱۸۶)

۱۷) اگر اشراف کے لئے، یا لوگوں میں سب سے اشرف کے حق میں وصیت کرے تو حضرات حسنین (حضرات حسن اور حسین علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی اولاد پر محمول ہو گا، ان کی اولاد میں اشرف کیلئے وصیت کرے، تو علم و تقویٰ وغیرہ معنوی وصف میں تفوق کا اعتبار ہو گا۔ (بغیہ۔ص ۱۸۸)

۱۸) رشتہ دار وغیرہ کے حق میں وصیت کرے تو صرف وصیت کے وقت موجود افراد اس میں داخل ہوں گے، جبکہ وہ موصی کی موت تک زندہ ہوں، اگر موصی سے قبل انتقال کر جائے، یا اس میں شک ہو (کہ پہلے ہوا یا بعد میں) تو اس کے حصہ میں وصیت باطل ہو گی، اور وہ موصی کے وارثوں کو ملے گا، نہ کہ دیگر رشتہ داروں کو، وصیت کے وقت موجود حمل بھی مستحق نہ ہو گا، خواہ وہ موصی کی زندگی میں ہی پیدا ہو۔ (بغیہ ۱۸۹)

۱۹) کتابوں کی وصیت میں قرآن (مصاحف) بھی داخل ہے، لیکن قرآن کی وصیت میں کتابیں داخل نہ ہوں گی۔ (بغیہ ص ۱۹۳)

۲۰) اگر وصی خود کو معزول کرے (سبکدوش ہو)، یا کہیں سفر کا ارادہ ہو، تو مال امانت دار قاضی کے سپرد کرنا لازم ہے، اگر امین قاضی موجود نہ ہو، جیساکہ عموماً دورِ حاضر کا حال ہے، تو اس پر لازم ہے کہ بستی کے نیک حضرات کو جمع کرکے ان کے سپرد کر دے، اوران پر کسی ایک کو ذمہ دار منتخب کرنا لازم ہے، جیساکہ ان پر وصی کے خیانت یا فسق کی صورت میں (جبکہ قاضی نہ ہو) اس وصی کو معزول کرکے کسی دوسرے کو ذمہ دار بنانا لازم ہے۔ خود وصی موصی کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو وصی نہیں بنا سکتا، صاحبِ تحفہ اور نہایہ فرماتے ہیں کہ دورِ حاضر میں خیانت کی کثرت کی وجہ سے وصی اور ہر امین کے لئے ہر سال گواہ پیش کرنا اور محاسبہ لازم ہے۔ (بغیہ ص ۱۹۹)

۲۱) فقراء کے حق میں وصیت کرے، تو وصی اس میں سے میت کے وارث کو کچھ نہیں دے سکتا، خواہ وہ فقیر ہو، جیساکہ ''الام'' میں صراحت ہے۔ (فتح المعین)

۲۲) میت جو مال چھوڑ جائے مثلاً کسی پر قرض تھا، اور وارث نے اسے وصول نہیں کیا، تو اس کا ثواب میت کو ملے گا، گرچہ وارث کو مطالبہ جائز ہے، کیونکہ اس میں اس کا حق ہے، لیکن بغیر قبضہ کے وہ مالک نہ بنے گا۔ (ترشیح المستفیدین ص ۲۷۵)

وَدِیعت (اَمانت)

تعریف: کسی مملوک یا مخصوص محترم کی مخصوص انداز پر حفاظت کے لئے وکیل بنانے کو ودیعت کہتے ہیں۔ ودیعت میں رکھی جانے والی چیز کو بھی ودیعت کہا جاتا ہے۔

مملوک: یعنی جن کا مالک بننا شرعاً صحیح ہے، جیسے پاک اور مباح مستعمل اشیاء،

مخصوص محترم: جس کا مالک بننا شرعاً صحیح نہیں، لیکن اس پر اپنا قبضہ اور اسے اپنے ساتھ مخصوص کرنا صحیح ہے، جیسے شکاری کتا، اور محترم کا مطلب یہ ہے کہ جس کے تلف اور ختم کرنے کا شرعی حکم نہ ہو، ارکان پر گفتگو کے دوران مزید وضاحت آجائے گی۔

مشروعیت: ودیعت کی مشروعیت پر قرآن، حدیث اور اجماع سے دلائل موجود ہیں،

آیت (۱) ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا'' (النساء: ۵۸)

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو''

(۲) ''فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ'' (البقرہ: ۲۸۳)

ترجمہ: ''پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا تو چاہئے کہ پورا ادا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا، اپنی امانت کو''

'امانت' ایک عام لفظ ہے، جس میں انسان کی حفاظت میں سونپی گئی ہر چیز اور قرض داخل ہے، کسی چیز کو حفاظت کے لئے دینا ہی ودیعت ہے، امانت کی واپسی اور حفاظت کا حکم اس کی مشروعیت کو متضمن ہے۔

حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا ''جو تمہارے پاس امانت رکھے، اس کی امانت اسے لوٹا دو، اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت مت کرو'' (ابوداود، ترمذی شریف)

مروی ہے کہ آپ ﷺ کے پاس اہل مکہ کی امانتیں تھیں، پس جب ہجرت کا ارادہ ہوا تو اسے حضرت اُمّ ایمن بَرکۃ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ان کے مالکوں کو لوٹا دیں۔

اجماع: آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے دور سے آج تک ہمیشہ اس کی مشروعیت اور جواز پر علماء کرام متفق ہیں۔

حکمت: تمام شرعی احکام کی طرح یہ حکم بھی لوگوں کی مصلحت اور سہولت کی خاطر مشروع کیا گیا ہے۔ کبھی کسی کے پاس مال ہو گا، لیکن حفاظت کیلئے محفوظ جگہ نہ ہو گی، یا اس پر ظالمانہ قبضہ جمانے والوں کو روکنے سے عاجز ہو گا، کبھی اپنی کسی مصلحت اور ضرورت سے سفر پر جارہا ہو گا، اور بغیر نگرانی کے مال چھوڑ جانے میں خطرہ ہو گا، کبھی آدمی بازار میں ضرورت کی اشیاء مختلف دوکانوں سے خرید تا رہتا ہے، سارا سامان ساتھ سمیٹ کر دوکانوں کا چکر مشکل ہو گا، ایسی صورت میں کسی کے پاس حفاظت سے رکھے گا تاکہ اطمینان سے دیگر مشغولیات سے فارغ ہو، اسی طرح کبھی ایسی اشیاء حاصل کرے گا جس کی فی الحال ضرورت نہیں، مستقبل میں ضرورت ہے، لیکن اپنے پاس اس وقت تک رکھنے کے لئے محفوظ جگہ نہیں، لہٰذا ان تمام صورتوں میں کسی معتبر شخص اور محفوظ مقام پر بطور ودیعت رکھنے کی ضرورت پیش آئے گی، اور دینِ اسلام میں سہولت ہے، نہ کہ تنگی، لہٰذا اسے مشروع قرار دیا گیا، تاکہ نیکی اور تقویٰ پر آپسی تعاون پایا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ودیعت کا حکم

۱) **استحباب:** عام حالات میں یہ مستحب ہے، جبکہ ودیع (جس کے پاس ودیعت رکھی جائے) اس چیز کی حفاظت پر قادر ہو، اپنے نفس کی امانتداری پر اطمینان ہو، اس کی طرح حفاظت کرنے والا امانت دار شخص دوسرا موجود ہو، کیونکہ اس میں اپنے ایک مسلمان بھائی کا تعاون ہے اور آپ ﷺ کا فرمان ہے "جب تک ایک شخص اپنے (کسی مسلمان) بھائی کے تعاون میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے" (رواہ مسلم)

۲) **وجوب:** جو شخص امین ہو، اپنے نفس کی امانتداری سے مطمئن ہو، اس کے پاس کوئی ودیعت رکھنے کی درخواست کرے، جس کی حفاظت اس کے بس میں ہو، اور دوسرا کوئی مناسب شخص ودیعت کو قبول کرنے والا موجود نہ ہو (اور اس کے سبب اپنے جان یا مال یا اولاد کا بظاہر کوئی ضرر نہ ہو۔ حاشیۃ الجمل) تو ایسی صورت میں ودیعت کا قبول کرنا واجب ہے، کیونکہ نہ قبول کرنے میں مال کی اضاعت و بربادی، اور قبول کرنے میں اس کی حفاظت ہے، اور آپ ﷺ نے مال برباد کرنے سے منع فرمایا ہے (صحیحین) اور ایک مسلمان کے مال کی حرمت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا "مومن کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے" (مسند احمد)

لہٰذا جس طرح اپنے مسلمان بھائی کے جان کی طرف سے دفاع اور اس کی حفاظت لازم ہے، اسی طرح اس کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا بھی لازم ہے۔

وجوب کا مطلب یہ نہیں کہ مفت میں یہ ذمہ داری ادا کرنا واجب ہے، بلکہ وہ چاہے تو حفاظت اور جگہ کی اجرت لے سکتا ہے۔ (نہایۃ، ۱۱۱/۶)

۳) **کراھت:** کوئی شخص امین ہو، لیکن آئندہ کے لئے اسے اپنے اوپر اطمینان نہ ہو، تو ودیعت کا قبول کرنا مکروہ ہے، تاکہ کہیں خیانت کا مرتکب نہ ہو اور مالک کا نقصان نہ ہو

۴) **تحریم** (حرمت): جو شخص ودیعت کی حفاظت سے عاجز اور قاصر ہو، اسے ودیعت قبول کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ اضاعت مال کا سبب بنے گا، جو ممنوع ہے۔ اسی طرح کسی کو خیانت کے صدور کا غلبہ ظن ہو تو ودیعت کا قبول کرنا حرام ہے۔ (نہایۃ المحتاج ۱۱۱/۶)

۵) **اباحت (جواز):** یعنی ودیعت کا قبول کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ جبکہ مستقبل میں اسے اپنے امانتداری کا اطمینان نہ

ہو، یا حفاظت سے قاصر ہو، لیکن مالک خود اس کی حالت سے واقف ہو، اور پھر بھی اس کے پاس ودیعت رکھنے پر راضی ہو۔

وَدیعت کے ارکان

(۱) عاقدین (۲) صیغہ (۳) مُودَعْ شئی۔ ان میں سے ہر ایک کے کچھ شرائط ہیں۔

۱) **عاقدین**: یعنی مُودِعْ (چیز کا مالک، ودیعت رکھنے والا) اور وَدِیع (جس کے پاس ودیعت رکھی جائے)، ودیعت چونکہ حفاظت کے لئے وکیل بنانا ہے، اس لئے مُودِع میں موکل کے صفات اور وَدِیع میں وکیل کے صفات شرط ہیں۔

وکالت کے بیان میں یہ مسئلہ پیش ہو گا کہ وکیل اور موکل کا عاقل اور بالغ ہونا شرط ہے، اور جس امر میں وکالت ہو، موکل اور وکیل کا بذاتِ خود وہ تصرف انجام دینا صحیح ہو۔

پس کوئی بچہ یا پاگل مودع یا ودیع نہیں بن سکتا، اسی طرح جس سفیہ پر مالی تصرف کی روک ہو، وہ ودیع نہیں بن سکتا، کیونکہ ودیعت ایک مالی تصرف ہے، جس کی اس پر پابندی ہے۔

اسی طرح کسی غیر مسلم کے پاس قرآن مجید ودیعت رکھنا صحیح نہیں، کیونکہ اسے مصحف کے اٹھانے اور چھونے کا موقع نہیں دیا جاسکتا۔

اگر کسی نے ان میں سے کسی کے پاس ودیعت رکھی، پھر وہ تلف ہو، تو وہ ضامن نہیں، خواہ ودیع نے حفاظت میں کوتاہی برتی ہو، کیونکہ اس کے پاس ودیعت رکھنا خود مودع کی کوتاہی ہے۔

۲) **صیغہ**: یعنی ایجاب وقبول، مثلاً مالک اور مودع کہے: میں نے کپڑا تمہارے پاس ودیعت رکھا، اور ودیع کہے: میں نے قبول کیا۔

ودیع کا کلام مودع کے کلام پر مقدم ہو سکتا ہے، مثلاً وہ کہے: آپ کا یہ کپڑا میرے پاس ودیعت رکھئے، تو وہ کہے: میں نے ودیعت رکھا۔

دونوں کی جانب سے الفاظ ضروری نہیں، ایک کی طرف سے الفاظ اور دوسرے کی طرف سے فعل ہو تب بھی کافی ہے، سو اگر مودع نے کہا: میں نے میری یہ کتاب تمہارے پاس ودیعت رکھی (ودیعت رکھ رہا ہوں) اور ودیع اسے اپنے قبضہ میں لے لے، تو کافی ہے اسی طرح اگر ودیع نے کہا: آپ کا یہ سامان میرے پاس ودیعت رکھ دیجئے، اور مالک نے بلا کسی لفظ کے وہ سامان اس کے سپرد کر دیا، تو ودیعت صحیح ہے۔

صریح لفظ ہونا ضروری نہیں، ودیعت کی نیت اور قرینہ کے ساتھ کنایہ لفظ بھی کافی ہے، مثلاً یوں کہے: میری یہ چیز اپنے پاس رکھئے، یا بطورِ امانت یہ لیجئے، یا تمہیں میں نے اس کی حفاظت کے لئے نائب بنادیا اور ودیع اپنے قبضہ میں لے لے، تو یہ کافی ہے۔

۳) **مُودَع شئی**: یعنی جو چیز ودیعت اور امانت رکھی جائے، اس پر اکثر 'ودیعت' کا اطلاق ہوتا ہے، یہ شرعاً محترم ہونا شرط ہے، گرچہ مال نہ ہو (یعنی شرعاً اسے مالی حیثیت حاصل نہ ہو)، جیسے گیہوں کے چند دانے یا نجس ہو، جیسے شکاری کتا یا گوبر وغیرہ۔

اگر شرعاً غیر محترم ہو، جیسے سوّر اور آلاتِ لہو ولعب، تو ان کو ودیعت رکھنا یا قبول کرنا جائز نہیں، اور اس پر ودیعت کے احکام کا نفاذ نہ ہو گا۔

ودیعت پر مُرتب احکام

صحیح طریقہ پر عقدِ ودیعت پایا جائے تو اس پر درج ذیل احکام کا ترتب ہو گا۔

۱) **حفاظت کا وجوب**: ودیعت دراصل مالک حفاظت کی خاطر دیتا ہے، اور ودیع اسی اعتبار سے قبول کرتا ہے، لہٰذا اس پر اس

کی حفاظت لازم ہے، حدیث میں ہے کہ مسلمانوں پر طے شدہ شرائط کی پابندی لازم ہے۔(ترمذی)

عادتاً ودیعت کی حفاظت کے مناسب جو جگہ سمجھی جاتی ہے، ایسی جگہ میں اس کی حفاظت لازم ہے۔(کسی چیز کے مناسب محفوظ مقام کو 'حرزِ مثل' کہا جاتا ہے اسی طرح ودیع پر لازم ہے کہ خود ہی اس کی حفاظت کرے، بیوی، اولاد یا نوکر وغیرہ کے ذریعہ حفاظت کافی نہیں، اگر مالک خود دوسروں کے ذریعہ حفاظت کی اجازت دے تو جائز ہے۔

اگر کوئی عذر درپیش ہو، مثلاً اسے سفر پر جانا ہے یا آگ لگ گئی، اور مالک کے سپرد کرنے کی گنجائش نہ ہو، اور نہ اس کے وکیل کے یا قاضی کے حوالہ کرنا ممکن ہو، تو ایسی صورت میں کسی اور کے سپرد حفاظت کی غرض سے دینا جائز ہے۔

۲)**عقدِ ودیعت** ایک جائز عقد ہے، یعنی طرفین سے میں سے کوئی بھی فریقِ ثانی کی اجازت و رضامندی کے بغیر اسے فسخ کر سکتا ہے۔ مودع جب چاہے اپنی ودیعت واپس لے سکتا، اور ودیع جب بھی چاہے واپس لوٹا سکتا ہے۔

مالک جب ودیعت کا مطالبہ کرے تو اسی وقت بقدرِ امکان اس کے سپرد کر دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانتیں امانت والوں کو پہنچانے کا حکم دیا ہے۔(سورہ نساء۔۵۸)

لوٹانے اور سپرد کرنے سے اس کی خدمت میں لے جانا مراد نہیں، بلکہ تخلیہ مراد ہے، یعنی مالک کو اسے لیجانے میں کوئی رکاوٹ اور حائل باقی نہ رکھے۔

۳)**ودیع کے قبضہ کی صفت:** ودیع کا قبضہ از قبیل امانت ہے، یعنی حفاظت میں کوتاہی یا کسی زیادتی کے بغیر وہ چیز تلف ہو جائے، تو ودیع اسکا ضامن نہیں۔

نیز اسے ضامن قرار دیا جائے تو لوگ ودیعت قبول کرنے سے کترائیں گے، جو عوام کی مشقت کا باعث ہو گا، مزید یہ کہ حفاظت کی خدمت انجام دے کر وہ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آرہا ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ" (التوبہ:۹۱)، (نیکوکاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں)، نیز ودیع کا ودیعت پر قبضہ مالک کے قبضہ کے قائم مقام ہے، لہٰذا مالک کے قبضہ میں تلف ہونے کی طرح ہے۔ لہٰذا مطلقاً ضمانت یا مطلقاً عدمِ ضمانت کی شرط پر ودیعت رکھے تو صحیح نہیں۔

ودیعت کے ضمان کی صورتیں: درج ذیل صورتوں میں ودیع پر ودیعت کا ضمان عائد ہو گا۔

۱)**مودِع کی اجازت** اور عذر کے بغیر کسی دوسرے کے پاس ودیعت رکھے، اس صورت میں دوسرے کے پاس وہ چیز تلف ہو جائے تو مالک دونوں میں سے کسی سے بھی ضمان (تاوان، بدلہ) وصول کر سکتا ہے۔

اگر دوسرے کو ضامن بنا دیا اور صورتِ حال سے ناواقف تھا، تو اول سے یہ ضمان واپس لے گا، کیونکہ اس دوسرے ودیع کا کوئی قصور نہیں، کہ وہ ضامن بن جائے، اور اسے صورت حال کی تفصیل معلوم ہو، تو اول سے ضمان واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ ودیع نہیں، بلکہ غاصب ہے۔

۲)**ترکِ حفاظت:** ودیعت کی حفاظت چونکہ ودیع کی ذمہ داری ہے، لہٰذا حفاظت کی کوتاہی کے سبب ودیعت تلف ہو جائے تو وہ ضامن ہو۔ اس کوتاہی اور ترکِ حفاظت کی صورتیں درج ذیل ہیں:

الف–ودیعت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے، اور دوسری جگہ پہلے کے بمقابل کم محفوظ ہو، کیونکہ وہ اسے بربادی کے لئے پیش کرتا پایا جا رہا ہے۔ دوسری جگہ بھی پہلے کی طرح محفوظ یا اس سے بھی بہتر ہو، تو ضمان نہ آئے گا۔ البتہ مودع منتقل کرنے سے منع

کردے یا راستہ پر خطر ہو تو منتقل کرنے سے تلف ہونے کی صورت میں ضامن ہوگا۔

ب-ودیعت کو درپیش خطرات کا دفاع نہ کرنا، کیونکہ حتی الامکان اسبابِ تلف کو دفع کرنا بھی حفاظت میں داخل اور ودیع پر واجب ہے۔ مثلاً کسی حیوان کو ودیعت رکھا اور اس نے اتنی مدت تک چارہ پانی نہ دیا جس میں عموماً وہ مر جاتا ہے، پھر اس سے مر گیا تو ضامن ہوگا، خواہ مالک نے کھلانے کا حکم دیا ہو، یا نہ دیا ہو، کیونکہ اس نے جب ودیعت قبول کر لیا تو یہ بطورِ حق اللہ اس پر واجب ہے۔

اسی طرح ودیعت کو دھوپ یا ہوا میں رکھنا ضروری ہو تو اسے بھی انجام دے، (ورنہ تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا) اگر مالک خود اسبابِ تلف کے دفاع سے منع کرے تو پھر تلف سے ضامن نہ ہوگا، لیکن ودیعت حیوان ہو تو روح کی حرمت کی وجہ سے دفع نہ کرنا گناہ ہے، گرچہ مالک کے حکم کی وجہ سے ضامن نہ ہوگا۔

۳) **ودیعت کا استعمال اور اس سے انتفاع:** کسی بھی طرح کے استعمال کے بعد وہ تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا، گرچہ استعمال کے ترک کے بعد تلف ہو، کیونکہ بلا اجازت غیر کی چیز کا استعمال تعدی ہے، اور اس تعدی سے اسکا اصل حکم یعنی امانت ختم ہو گیا، اب تجدیدِ عقد کے بغیر دوبارہ امانت کا حکم نہ لوٹے گا، لہٰذا تجدید سے قبل تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا۔

۴) **ودیعت کو سفر میں لے جانا:** ودیع کو ودیعت کی بستی سے کہیں کا سفر درپیش ہو، تو ودیعت ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں، کیونکہ محفوظ مقام پر اس کی حفاظت واجب ہے، اور سفر میں یہ بات نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں مالک کو لوٹا دے، وہ نہ ہو تو اس کے وکیل کے سپرد کرے، ورنہ پھر کسی امانتدار شخص کے پاس حفاظت کے لئے رکھ دے۔

مذکورہ افراد میں سے کسی کے سپرد کرنا ممکن ہو، پھر بھی وہ ساتھ لے جائے تو ضامن ہوگا، لیکن ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو مجبوری ہے پس غیر معتبر لوگوں کے حوالہ کرنے سے ساتھ لے جانا بہتر ہے۔

مسافر ہی کی طرح اس ودیع کا حکم ہے، جو ایسا بیمار ہو کہ موت کا اندیشہ ہو، یا جس کے اسبابِ موت پائے گئے، اسے سپرد کرنے کے لئے مناسب شخص نہ ملے تو اس کی وصیت کرے، ورنہ موت کے بعد تلف ہو جائے تو ضامن ہوگا، کیونکہ ورنہ وارث اس کی چیز سمجھ کر ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے گا۔ اور اس طرح مالک کا نقصان ہوگا۔

اگر اچانک موت یا قتل کی وجہ سے وصیت نہ کر پایا تو ضامن نہ ہوگا، (نہایۃ ۱۱۹/۶)

۵) **بلا عذر ودیعت کا انکار:** مودع کے مطالبہ پر ودیع ودیعت ہی کا انکار کر دے، پھر وہ تلف ہو جائے تو اس کا ضامن ہوگا، گرچہ بعد میں اپنے انکار سے رجوع کر کے اعتراف کر چکا ہو، کیونکہ انکار کی وجہ سے وہ اس چیز کا غاصب ہوگا، اور غاصب کا قبضہ باعث ضمان ہوتا ہے، اور انکار کے بعد اب تجدید عقد کے بغیر ودیعت کا حکم نافذ نہ ہوگا۔

کسی عذر سے انکار کرے تو عقد ودیعت کا حکم ختم نہ ہوگا، بلکہ بطورِ امانت اس کے قبضہ میں ہوگی، پس بصورت تلف ضامن نہ ہوگا، مثلاً کوئی غاصب یا ظالم مالک کو مطالبہ پر مجبور کرے، اور ودیع کو معلوم ہو کہ اگر اس نے اعتراف کیا تو مالک واپس لے گا، پھر مالک سے وہ چیز ناحق چھین لی جائے گی، لہٰذا مالک کو اس نقصان سے بچانے کے لئے وقتی طور پر ودیع اس کا انکار کر دے، پھر وہ تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ تعدی وزیادتی نہیں پائی گئی۔

۶) **واپسی کے مطالبہ کے باوجود واپسی سے باز آنا:** مسئلہ گذر چکا کہ مودع جب چاہے ودیعت کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس صورت میں فوراً واپس کرنا لازم ہے۔ یعنی تخلیہ (واپسی کی رکاوٹوں کا دور کرنا) اگر بلا عذر واپسی سے باز آئے یا اس میں

تاخیر کرے، تو وہ ضامن ہو گا، کسی عذر سے موئخر کرے، مثلاً مطالبہ ایسے وقت ہو کہ اسی وقت واپسی ممکن نہ ہو، یا مودع کے پاس سے کسی ظالم کے غصب کر لینے کا اندیشہ ہو... وغیرہ، تو ضامن نہ ہو گا۔

۷) **ودیعت کو دوسرے کے ساتھ خلط کرنا:** ودیع کی ذمہ داری ہے کہ ودیعت کو اپنے کسی ایسے مال میں نہ ملائے جس کی وجہ سے پھر وہ متمیز نہ ہو سکے (الگ تھلگ سمجھ میں نہ آئے)، (مثلاً گیہوں کو گیہوں میں، یا روپے کو روپے کے ساتھ ملانا) اگر اس نے ملالیا، یا بلا ارادہ اس طرح مل گیا، تو وہ ضامن ہو گا، لیکن آپس میں خلط ملط کے باوجود متمیز ہو مثلاً دینار کو درہم کے ساتھ، روپے کو ریال کے ساتھ، (یا گھڑی کو اپنی گھڑی کے ساتھ) ملا دیا، تو ضامن نہ ہو گا، کیونکہ بسہولت پہچان کر جدا کر سکتے ہیں۔ اگر جدا کرنا کافی دشوار ہو، جیسے گیہوں کو جو میں ملا دیا، تو یہ بھی عدم تمیز کے حکم میں ہے۔ (یعنی ضامن ہو گا)

۸) **مودع کے شرط کی مخالفت:** مثلاً مودع کسی خاص جگہ یا کسی خاص انداز سے حفاظت کا حکم دے، لیکن ودیع اس کی مخالفت کرے، اور اس سبب سے وہ تلف ہو جائے تو ضامن ہو گا۔

حفاظت کے معتاد طریقے سے بھی محتاط پہلو اختیار کرے، اور وہ تلف ہو جائے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ضامن نہ ہو گا، مثلاً ودیعت صندوق میں رکھ کر ایک کے بجائے دو تالہ لگا دیا۔

دو اشخاص کے پاس ودیعت: اگر کسی نے دو اشخاص کے سپرد ودیعت کی: اور وہ قابل تقسیم ہو، مثلاً نقدی اور روپے پیسے وغیرہ، تو دونوں تقسیم کر کے نصف، نصف اپنی حفاظت میں رکھ سکتے ہیں، اگر ان میں سے ایک اپنا نصف بھی دوسرے کے سپرد کر دے کہ وہی مکمل ودیعت رکھے، تو یہ نصف کا ضامن ہو گا۔

اگر ودیعت قابلِ تقسیم نہ ہو تو ہر ایک دوسرے کے سپرد کر سکتا ہے، اور اس پر کوئی ضمان نہ ہو گا۔

دو اشخاص کا ایک کے پاس ودیعت رکھنا: دو اشخاص کوئی چیز کسی کے پاس ودیعت رکھیں، پھر ان میں سے ایک آکر واپسی کا مطالبہ کرے، یا اس میں سے اپنے حصے کی واپسی کا مطالبہ کرے، تو ودیع اس کے سپرد نہیں کرے گا، کیونکہ ودیعت دونوں نے مل کر رکھی ہے، اس لئے واپسی میں بھی دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔ اگر صرف اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہا ہے تو مسئلہ قاضی (حاکم) کے پاس لے جائے، تاکہ وہ تقسیم کر کے اس کا حصہ اُسے دے دے۔

ودیعت کی انتہا: مودع کے ودیعت کو واپس لینے یا ودیع کے لوٹانے سے اس کی انتہا ہو گی اگرچہ ودیعت کے قبولیت کے وجوب کی صورت میں مالک کے ارادے کے بغیر لوٹانا حرام، اور استحباب کی صورت میں مکروہ ہے، دونوں میں سے کسی ایک کے انتقال سے بھی ودیعت کی انتہا ہو گی، نیز کسی ایک کے جنون یا بے ہوشی کی وجہ سے، اور مودع پر سفاہت کی وجہ سے حجر اور پابندی سے، اور ودیع پر فلس کی وجہ سے حجر سے اس کی انتہا ہو گی۔ فروخت یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ مالک کی ملکیت منتقل ہو جائے تو اس سے بھی ودیعت کی انتہاء ہو گی۔

ودیعت کے انتہاء واختتام کے ساتھ ہی اس کا حکم بھی ختم ہو جائے گا، واپس لینے یا دینے کے علاوہ انتہاء کی صورتوں میں گمشدہ چیز کی طرح اس کے قبضہ میں بطورِ شرعی امانت کے ہو جائے گی، لہٰذا بصورتِ امکان فوراً مالک کے یا اس کے ولی کے سپرد کرنا واجب ہے، گرچہ وہ مطالبہ نہ کرے، سپردگی کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس ودیعت کی یا اس کے جگہ کی اطلاع دے، (اور وہ آکر لے جائے)۔ مذکورہ افراد نہ ہوں تو امانت دار قاضی (حاکم) کے سپرد کرے، اگر اس میں کوتاہی سے کام لے تو ودیعت کی انتہاء کے بعد تلف ہو جائے تو ودیع ضامن ہو گا۔

مُتفرقات

۱) کسی کے پاس ودیعت ہو، اور اس کا مالک نہ ملے، تو لقطہ کی طرح اس کا اعلان کرتا رہے، یا امانت دار قاضی یا حاکم ہو، تو اس کے سپرد حفاظت کے لئے کردے۔ تحقیق کے باوجود مالک کی ملاقات سے ناامید ہو جائے اور اب بظاہر اس کے ملنے کا امکان نہ ہو، تو یہ بیت المال کے اموال میں شمار ہوگا، لہٰذا جس کے پاس بھی ہے وہ مسلمانوں کے اہم مصالح پر اسے صرف کرے، خود مصلحت سے واقف نہ ہو، تو واقف سے پوچھے (یا اس کے سپرد کردے کہ وہ صرف کرے) تعمیرِ مسجد کے علاوہ پر صرف افضل ہے، لیکن مسجد کے لئے بھی صرف کرسکتا ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے اس شخص کے ترکہ کے متعلق صراحت فرمائی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو کہ اس سے مسجد تعمیر کی جائے یا حاکم ظالم نہ ہو تو اس کے سپرد کردے۔ (نہایۃ المحتاج ۶/ ۱۳۲، فتح المعین ص ۲۹۴)

۲) اگر کسی نے کسی چیز پر لکھا: "یہ فلاں شخص کی ودیعت ہے" یا اپنی ڈائری میں لکھا: "میرے پاس فلاں کی فلاں امانت ہے" تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، جب تک کہ وہ شخص اس کا اقرار نہ کرے، یا اس بات پر گواہ پیش ہوں، یا وارث اس کا اقرار کرے۔ (حاشیۃ الجمل ۴/ ۷۸)

۳) کوئی امین مثلاً ودیع یا چرواہا اپنے ماتحت کسی ماکول اللحم جانور کو دیکھے کہ خطرہ میں ہے (ذبح نہ کرنے کی صورت میں مر کر رائیگاں جائیگا) اس لئے ذبح کرے تو جائز ہے (نہایۃ ۶/ ۱۲۱)

۴) فائدہ: جھوٹ حرام ہے، لیکن کبھی واجب ہوتا ہے، جیسے کوئی ظالم کسی ودیعت کے متعلق دریافت کرے۔ تاکہ ظلماً چھین لے، تو ودیعت کا انکار واجب ہے، گرچہ جھوٹ ہو، اور اس پر توریہ کے ساتھ قسم بھی جائز ہے، اگر انکار نہ کرے اور اپنی کوشش اور امکان کے حد تک اس کی اطلاع سے باز نہ آئے، تو ضامن ہوگا، اسی طرح کوئی معصوم الدم (جس کا قتل شرعاً حرام ہے) کسی ظالم سے روپوش ہو، جو اس کے قتل کے درپے ہے، تب بھی یہی حکم ہے (یعنی اس کا پتہ نہ بتانا اور اپنی لاعلمی کا اظہار ضروری ہے)

جنگ کا مقصد یا مسلمانوں میں اپسی صلح یا بیوی کو راضی کرنا بغیر جھوٹ کے ممکن نہ ہو تو یہ مباح ہے۔

"احیاء" میں فرمایا کہ اگر کسی سے بادشاہ کسی گناہ مثلاً زنا یا شراب کے متعلق باز پرس کرے، جو اس سے تنہائی میں صادر ہوئی ہے، تو وہ جھوٹ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ برائی نہیں کی، اور وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے راز کا انکار کرسکتا ہے۔ (ترشیح المستفیدین ۲۹۴)

بعض متفرق جدید مسائل

(دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۱۹۸۹ء کے اہم فیصلے)

اعضاء کی پیوند کاری: (۱) کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو، اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو، تو اس ضرورت کا پورا کرنے کے لے:

(الف) غیر حیوانی اجزاء کا استعمال (جائز ہے)۔

(ب) ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور بطریقۂ شرعی ذبح کئے گئے ہوں (جائز ہے)

(ج) جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو، اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے، جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریقِ شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔ اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو، تو خنزیر (سوّر) کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

۲) اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

۳) اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

۴) اگر کوئی مریض ایسی حالت کو پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ دوسرا عضو اس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائیگی اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوند کاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے۔ اور عضو انسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کیلئے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوند کاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کیلئے مباح ہو گا۔

۵) اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر حال اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے، اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

۶) اگر کسی شخص نے یہ ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا ہے اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں۔ (مجلہ فقہ اسلامی۔ ص ۵۶۳)

پگڑی کا مسئلہ: (۱) مالک مکان زر ضمانت و ڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے، بہتر ہے کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کر دے تو وہ اس بات کا ضامن ہو گا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کر دے۔

۲) اگر کوئی مکان یا دکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروّجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی نقد رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالک مکان نے بحیثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کر لیا ہے اور یہ رقم اسکے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہو گی۔ آئندہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہو گا کہ وہ مکان خالی کرنے کا عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہو جائیں مالک مکان سے وصول کرے اور اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہو سکتا ہے۔

۳) مالک مکان نے پگڑی لئے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت اصل معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالک مکان کو حق ہو گا کہ جب چاہے مکان خالی کرالے۔ البتہ مالک مکان کو چاہیئے کہ خالی کرانے کی نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے جو مقامی حالات کے پیش نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو اور کرایہ دار کو بھی

چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کر دے۔

۴)جو مکان یا دکان بغیر پگڑی لئے کرایہ پر دی گئی ہو، مالک مکان کو واپس کرتے وقت کرایہ دار کے لئے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵)سیمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدہ کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلق امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کرلیں تاکہ آئندہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو، اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں سیمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت مدت کا تعین کرلیا جائے، اور اگر مالک مکان عوض لے کر ہمیشہ کے لئے اپنے خالی کرانے کے حق سے دستبردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحتاً آپس میں طے کرلیں۔ (مجلہ فقہ اسلامی ص ۵۶۷)

کرنسی نوٹ کا مسئلہ: (۱) کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زرِ اصطلاحی و قانونی کی ہے۔

۲)عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے۔ اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے۔ لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے، نہ ادھار۔

۳)دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔ ۴) کرنسی نوٹوں پر زکوۃ لازم ہے۔

۵)نوٹوں میں زکات کا نصاب، چاندی کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔ (علامہ یوسف قرضاوی اور بعض دیگر علماء کے نزدیک نوٹوں میں نصاب، سونے کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔ دیکھئے فقہ الزکاۃ للقرضاوی ج/۱، ص ۲۶۴)

۶)اس اجلاس کا احساس ہے کہ مہر کی تعیین سونے اور چاندی کے ذریعہ عمل میں آئے تاکہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے اور سکّوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہونچے۔ (مجلہ فقہ اسلامی ۵۶۸)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (آمین) وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

تحفۃ الباری

فی الفقہ الشافعی

جلد سوم

کتاب النکاح (نکاح کا بیان)

آیت: وَاَنۡكِحُوۡا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ ....''(النور: ۳۲)

ترجمہ: ''اور تم میں جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد، خواہ عورت، اور خواہ ابھی نکاح ہی نہ ہوا ہو، یا وفات وطلاق سے اب تجرد ہو گیا ہو) تم ان کا نکاح کر دیا کرو''۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''۔۔۔اَ تَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنۡ رَغِبَ عَنۡ سُنَّتِیۡ فَلَيۡسَ مِنِّیۡ (صحیحین۔کتاب النکاح) (۔۔۔میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، پس تو جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی، تو وہ مجھ سے نہیں۔)

اسلام اور نکاح: اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقیٔ مدارج کے لئے عائق ومانع تسلیم کیا گیا تھا۔ اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل قرار دیا، اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تعلقِ ازدواج میں ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر وبرکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا ''وَأَنۡكِحُوا الأَيَامَى مِنۡكُمۡ وَالصَّالِحِينَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَإِمَائِكُمۡ إِنۡ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهِ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ '' (النور ۳۲)

(اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحین کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ تعالی ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا، اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم رکھنے والا ہے)

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا، اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو، تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے (دیکھئے سورہ نساء آیت ۴)

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، (اور اسلام عین دینِ فطرت ہے)، چنانچہ زن وشوہر (میاں بیوی) کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا: ''وَمِنۡ آيٰتِهِ أَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجاً لِتَسۡكُنُوۡا اِلَيۡهَا وَجَعَل بَيۡنَكُمۡ مَوَدَّةً وَرَحۡمَةً ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوۡمٍ يَتَفَكَّرُوۡنَ ''(الروم ۲۱)

(اور اس (خدا) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ، اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر ومحبت پیدا کر دیا، بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں)

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے، جو زن وشوہر کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا: (تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں.... اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔بقرہ-۱۰۲)

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کے معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے،

"هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ" (بقرہ ۱۸۷) (عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو)

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا، بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت ومرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا: (اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو، جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رَحِموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ سورہ نساء: ۱)

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد وعورت پیدا ہوئے، اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا اور ان رَحِموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا واسطہ اور ذریعہ ہیں۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا، اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر ومحبت اور الفت ومودّت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد وعورت میں صلاح وعفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے، "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ" (المائدہ: ۵)

"پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے"۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے (نکاح کے فائدہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک حدیث میں) ارشاد فرمایا: "اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی۔۔۔۔" (متفق علیہ)

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں: "فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ" (النساء: ۳۴) (تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال ودولت اور عزت وآبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔)

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تقوی کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔" (ابن ماجہ۔ نکاح)

مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت وعفت ہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے"۔ (ترمذی، دارمی، ابن ماجہ) انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بنادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا، وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

ایک صحابی بڑے عابد وزاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا

کر فرمایا: "وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقاًّ" (بخاری کتاب النکاح)۔ "اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، حضرت عمرؓ کا فرمان ہے: "۔۔۔ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے ان کے بارے میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے" (بخاری شریف۔ تفسیر سورۃ تحریم)

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (بقرہ ۲۲۸) (اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر، اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔) اور یہ منزلت اس لئے ہے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، اسی اعزازی منصب کے لئے شوہر کے انتخاب کی مصلحتیں بھی قرآن پاک نے بتادی ہیں، فرمایا: "اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ" (نساء: ۳۴) (مرد عورتوں کے نگراں ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور اس لئے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا۔) یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ، اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرتاً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دینِ مہر، نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

بعض مرد عورتوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کے مقابلہ میں سختی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ پن و کجی کو نکالنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ: "عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے، جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے" (صحیحین)۔ آپ ﷺ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا: "اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، بلکہ غور کروگے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی"۔ (صحیح مسلم۔ کتاب النکاح) یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔ "وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا" (نساء: ۱۹) (اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔)

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعے عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے، اس پر بھی مرد نہ دے تو

بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہاء یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جسکی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

ایک مشہور حدیث ہے، جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا: "تم میں ہر ایک اپنی رعایا (ماتحت) کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی۔۔۔" مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اسی کی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" (بخاری) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

شریعت نے آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی اجازت خاص حالات میں دی ہے، اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ مار ایسی ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے۔ (تفسیر طبری ۴۱/۵۔ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایک حدیث میں فرمایا: "یہ (یعنی بیویوں سے بدسلوکی کرنے اور مارنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں"۔ (ابوداود، ابن ماجہ، دارمی)

ایک موقع پر فرمایا: "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر ہو"۔ (صحیحین) (ملخص از سیرت النبی للندوی۔ ۲۷۰/۶)

مشروعیت نکاح کی حکمتیں

۱۔ انسان کی فطرت میں جنسی میلان وجذبات موجود ہیں، لہٰذا اسلام نے جو عین دینِ فطرت ہے، اس کی صحیح تکمیل کے لئے نکاح کو مشروع قرار دیا۔ اسے پامال کر کے رہبانیت و تبتل کو اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ لیکن اسلام نے ان جذبات کی تکمیل وتسکین کے لئے انسان کو حیوانات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ اپنے آپ کو اور سارے معاشرہ اور اخلاق کو برباد کر کے شیطانی گمراہی کے لئے راہ ہموار کرے، بلکہ فطرت کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے معتدل اور شریفانہ اصول وضوابط کا اسے پابند بنایا۔

۲۔ اسلام نے کثرتِ نسل کی ترغیب دی ہے، جس سے ایک بارُعب ومضبوط اسلامی معاشرہ وجود میں آسکے، اور ظاہر ہے کہ شفیق والدین کی پرورش ونگہداشت میں ہی یہ ممکن ہے، جس کی اولین بنیاد نکاح ہے۔

اپنی من مانی شہوت رانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کا نہ کوئی باپ ہوگا، نہ کوئی تادیب وتربیت کا نظم، اور انجام کار ایک بدترین معاشرہ کے وجود کا سبب بنے گا۔

۳۔ شرعی نکاح کے ذریعے انسان صحیح سکونِ نفس اور اطمینان کی زندگی حاصل کرے گا۔ قرآن نے نہایت بلیغ انداز میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پوشاک (لباس) قرار دیا، جس طرح ظاہری لباس جسمانی مصائب کو چھپاتا اور تکلیف دہ امور سے بچاتا ہے، میاں بیوی ایک دوسرے کے شرف وعزت کی حفاظت اور راحت وانسیت کا باعث ہوتے ہیں۔

۴۔ شرعی نکاح سے رکاوٹ کی صورت میں انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے بدکاری کا راستہ اختیار کرے گا، جس کے خطرناک اور گھناؤنے نتائج سے ہر کوئی واقف ہے، لہٰذا اخلاقی تباہی اور معاشرہ کی بربادی سے حفاظت کے لئے مشروع نکاح لازم ہے، اسی

لئے ایک حدیث میں فرمایا: "دین دار وبا اخلاق شخص کا رشتہ آئے تو نکاح کر دو، ورنہ روئے زمین میں فتنہ وفساد ہو گا" (ترمذی۔نکاح)

۵۔ نسل انسانی کی صحیح بقا: عادت اللہ یہی جاری ہے کہ انسان والدین کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، لہٰذا اس نسل کے تسلسل کا صحیح ضامن مشروع نکاح ہے،

٦۔ نکاح کے ذریعہ آپسی رشتہ داریاں اور قرابت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، اور آپس میں روابط ومحبت اور تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔(ملخص از الفقہ المنہجی۔۱۱/۴)

نکاح: نکاح کا لفظ عربی زبان میں ضَم (جمع کرنے) اور وطی (صحبت) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں نکاح ایسے عقد کو کہیں گے جو لفظِ انکاح (نکاح کر دینا) یا تزویج (زوجیت میں دینا) یا اس کے ترجمہ کے ذریعہ منعقد ہو، اور اس کی وجہ سے وطی (صحبت) جائز ہو جائے۔

عربی میں نکاح کے لئے (۱۰۴۰) الفاظ ہیں۔ شرعاً نکاح در حقیقت عقد کے لئے مستعمل ہے، البتہ مجازاً صحبت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مشروعیت، نکاح کی حلت ومشروعیت قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔(مغنی ۲۳/۳)

آیات: ا۔"۔۔۔فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔۔۔"(النساء:۳)

ترجمہ:"تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں دو دو تین تین چار چار"

۲۔"وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ"(النور:۳۲)

ترجمہ:"اور تم میں جو بے نکاح ہوں، اور تمہارے نیک غلام وباندیوں کا نکاح کر دو"۔

احادیث: ا۔ آپ ﷺ نے نوجوانوں کو خطاب فرمایا:"اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو (اسبابِ نکاح پر قدرت کی وجہ سے) جماع (صحبت) پر قادر ہو، وہ نکاح کر لے، کیونکہ اس سے نگاہیں پست اور شرمگاہ محفوظ رہیں گی، اور جو قادر نہ ہو، تو اسے چاہئے کہ روزے رکھے، کیونکہ یہ اس کے حق میں وِجَاء (خصی ہونے کی طرح) ہے،(یعنی روزے کے ذریعے اسے نفس پر قابو حاصل ہو گا، اور بے راہروی کا خطرہ ٹل جائے گا، اس طرح اس کی پاکیزگی برقرار رہے گی)(صحاح ستہ)

۲-"حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے نکاح سے بچنا چاہا، تو آپ ﷺ نے انھیں اس سے منع فرمایا۔"(متفق علیہ)

۳-ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"۔۔۔میں عورتوں سے نکاح (بھی) کرتا ہوں، تو جو میرے طریقے سے اعراض برتے، وہ مجھ میں سے نہیں"(مقفق علیہ)

۴-ایک حدیث میں آپ ﷺ نے نیک عورت کو دنیا کی بہترین دولت قرار دیا۔(مسلم)

۵-آپ ﷺ کا ارشاد ہے:"تمہاری دنیا میں سے عورت اور خوشبو مجھے محبوب ہیں، اور میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے"۔(نسائی، طبرانی باسناد حسن۔نیل الاوطار ۱۱۴/٦)

٦-ارشاد نبوی ہے:"چار باتیں رسولوں کی سنت میں داخل ہیں: حیاء، خوشبو، مسواک، اور نکاح"(ترمذی شریف)

مرد کے لئے نکاح کا حکم

کسی شخص کی حالت کے پیشِ نظر نکاح کے حکم کی درج ذیل نوعیتیں ہوں گی۔

۱-**مستحب:** کوئی شخص نکاح کا محتاج ہو، یعنی اس کا جی نکاح وصحبت کا مشتاق وآرزومند ہو، اور اسے اس کی رغبت ہو، نیز وہ نکاح کے اسباب ومصارف پر قادر ہو، یعنی مہر اور بیوی کی دیگر ذمہ داریاں نبھا سکتا ہو، اور نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا وبدکاری میں گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو اسے نکاح کرنا مستحب ہے، کیونکہ اس سے نسل کی بقا اور نسب کی حفاظت، نیز مختلف مصالح کی ادائیگی پر تعاون حاصل ہوگا۔ (اوپر کی پہلی حدیث اس شق کی دلیل ہے)

اسی صورت میں عبادت کے لئے یکسو ہونے اور وقت فارغ کرنے کے مقابلہ میں نکاح کرلینا افضل ہے، صحیحین وغیرہ کی روایات میں آپ ﷺ نے جو بعض صحابہ کو بے نکاح رہ کر عبادات کی مشغولیت کے ارادہ سے منع فرمایا، اور نکاح کی ترغیب دی، اسے اسی صورت پر محمول کریں گے، لہٰذا جو بطورِ اعراض اسے ترک کرے، اس کی آپ ﷺ نے اپنے سے نفی فرمائی ہے۔

۲-**نکاح نہ کرنا مستحب** (یعنی نکاح کرنا خلافِ اولیٰ): کوئی نکاح کا تو محتاج ہو، لیکن متعلقہ اسباب ومصارف پر قادر نہ ہو، تو اس کے حق میں بہتر یہ ہے کہ نکاح نہ کرے، بلکہ عبادات وروزوں کے ذریعے اپنی عفت وپاکدامنی کی حفاظت کرے، کیونکہ عبادات میں مشغولی اسے نکاح کے خیالات سے باز رکھے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے دولت سے نوازے (اگر روزے سے قابو حاصل نہ ہو تو پھر نکاح کرلے۔) (نہایہ) ارشادِ باری ہے: "**وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَايَجِدُوْنَ نِكَاحاً حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ** "(النور ۳۳)

ترجمہ: "اور ایسے لوگوں کو کہ جن کو نکاح کا مقدور نہیں، ان کو چاہئے کہ (اپنے نفس کو) ضبط کریں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے (پھر نکاح کرلیں)"۔

نیز صحیحین وغیرہ کی حدیث میں بھی (جیسا کہ گذر چکا) آپ ﷺ نے قادر ومستطیع نوجوانوں کو نکاح کا حکم دیا، اور جو قادر نہ ہو، اسے روزہ کا حکم دیا۔ لہٰذا یہ شخص بکثرت روزے رکھ کر اپنے جذبات کو قابو میں کرلے۔

تنبیہ: کافور وغیرہ کسی دوائی سے شہوت کو کمزور کرنا مکروہ، اور بالکل نابود وختم کرنا حرام ہے۔ (مغنی ۱۲۶/۳)

۳-**مکروہ:** اگر کوئی نکاح کا محتاج نہ ہو، یعنی فطرتاً وطبعاً ہی اُسے اس کی رغبت نہ ہو، یا کسی بیماری وعارضہ کی وجہ سے رغبت نہ ہو، نیز اسبابِ نکاح بھی مُیّسر نہ ہوں، تو اس کے لئے نکاح مکروہ ہے، کیونکہ بلاضرورت مہر ونفقہ وغیرہ ذمہ داریاں اپنے سر لادرہا ہے، حالانکہ ان کی ادائیگی پر قادر بھی نہیں ہے۔

۴-**نکاح نہ کرنا افضل:** کسی کے پاس اسبابِ نکاح تو ہیں، لیکن اسے نکاح کی احتیاج نہیں، کیونکہ اس کے نفس میں نکاح وصحبت کی طرف کوئی میلان ورغبت نہیں، نیز عبادات یا طلبِ علم میں مشغول ہے، تو ایسے شخص کے لئے نکاح نہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ وقت عبادت وتعلّم میں صرف کرنا افضل ہے، ممکن ہے کہ نکاح کے بعد مصروفیت بڑھ جائے، اور اتنا وقت نہ دے سکے۔

۵-**نکاح کرنا افضل:** اوپر چوتھے نمبر پر درج شخص اگر اپنے فارغ اوقات کو علم وعبادات کی نذر نہیں کرتا، تو اس کے حق میں نکاح کرلینا افضل ہے، تاکہ نکاح کے فوائد ومصالح بھی حاصل ہوں، اور بے کاری اور فارغ البالی کہیں اسے غلط راستے پر نہ ڈال دے،

۶-نکاح کرنا حرام (البته نکاح کرلے تونکاح صحیح هوگا): اگر کوئی شخص نکاح کا محتاج نہ ہو، اور اسے معلوم ہو کہ نکاح کے بعد وہ بیوی کے حقوق ادا نہیں کرے گا، تو اسے نکاح کرنا حرام ہے۔ (گرچہ نکاح صحیح ہو گا) (الشروانی علی التحفہ ۱۲/۹)

عورت کے لئے نکاح کا حکم

ہر عورت جو نکاح کی رغبت رکھتی ہو، یا نان نفقہ کی محتاج ہو، یا جسے بے نکاح رہنے کی صورت میں بدکار اور اوباش لوگوں کی دست درازی کا اندیشہ ہو، اسے نکاح کر لینا مستحب ہے۔ صاحبِ تنبیہ فرماتے ہیں: ”جس عورت کو نکاح کرنا جائز ہے بصورت احتیاج اسے مندوب ہے، ورنہ مکروہ ہے“۔

بعضوں نے فرمایا کہ اگر بد معاشوں کی دست درازی اور عزت وآبرو پر حملہ سے بچنے کا نکاح کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو اسے نکاح کرنا واجب ہے۔

کوئی عورت نکاح کی محتاج نہ ہو، اور اسے اندازہ ہو کہ بصورت نکاح وہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نہیں کرے گی، تو اسے نکاح کرنا حرام ہے۔ (کیونکہ بلاوجہ خود کو گناہ میں مبتلا کرنا ہے) حقوق سے نکاح سے متعلقہ حقوق مراد ہیں، مثلاً شوہر کے حکم کے مطابق خوشبو اور دیگر بناؤ سنگھار کا استعمال، شوہر کے لئے کھانا وغیرہ تیار کرنا مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ اس پر واجب نہیں ہے۔

تنبیه: عورت کا ایسا کوئی طریقہ استعمال کرنا جس سے استقرار حمل میں تاخیر ہو، مکروہ ہے اور حمل کی صلاحیت بالکل ختم ہو جائے تو حرام ہے۔ (تحفہ مع الشروانی ۱۲/۹، نہایہ ۱۸۳/۶، مغنی ۱۲۵/۳، شرح التنبیہ ۵۹۰/۲، الفقہ المنہجی ۱۷/۴، ترشیح المستفیدین ص۲۹۶)

نکاح کے مقدمات

ایک نئے جوڑے کی نئی زندگی کی سعادت، ازدواجی زندگی کی پائداری اور اولاد کی نجابت وشرافت کا دارومدار میاں بیوی کے ایک دوسرے کے صحیح انتخاب پر ہے۔ عارضی جذبات، وقتی مصلحت اور جلد بازی کا فیصلہ مطلوبہ سعادت وفوائد کا ضامن نہ ہو گا، اسی لئے مستقبل کے اس اہم فیصلہ سے پہلے چند مقدمات کو مشروع کیا گیا ہے، جس کی روشنی میں طرفین ایک دوسرے کے متعلق اطمینان حاصل کر کے آئندہ کا سفر بڑی خوش بختی کے ساتھ طے کر سکتے ہیں:

اوّل: میاں بیوی میں مطلوبہ صفات

دوّم: نکاح سے قبل ایک دوسرے کو دیکھ لینا

سوّم: خِطبہ (پیغام، منگنی)

اوّل: زَوْجَیْن (میاں بیوی) میں مطلوبه صفات: اسلام نے ایک جوڑے کے انتخاب میں درجِ ذیل صفات کو مد نظر رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

۱-دین داری: دونوں دیندار اور بااخلاق ہوں، اسی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے: ”جب تم کو ایسے شخص کا پیغام آئے، جس کا دین اور اخلاق اطمینان بخش ہو، تو اس سے نکاح کر دو، ورنہ روئے زمین میں فتنہ اور طویل فساد پھیل پڑے گا“ (ترمذی)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "کسی عورت سے چار اسباب کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال، حسب، حُسن اور دین کی وجہ سے 'پس تم دیندار کا انتخاب کرکے کامیابی حاصل کرو.... (صحیحین) اخلاق و دینداری کو معیار بنانے کی صورت میں آپسی محبت و مودت کی برقراری نصیب ہوگی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان حسب اور حُسن وجمال سے بالکل صرفِ نظر کرے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اصل نظر دینداری پر ہو، اگر اس کے ساتھ دیگر پسندیدہ صفات ہوں تو نورٌ علی نور، ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے: "عورتوں سے ان کے حسن کی بنیاد پر نکاح نہ کرو، بعید نہیں کہ یہ حسن ان کو ہلاک کردے، اور نہ ان کے مال کی خاطر نکاح کرو، شاید یہ مال انہیں سرکش بنادے، بلکہ ان کی دینداری کی بنیاد پر ان سے نکاح کرو، ایک سیاہ دین دار باندی زیادہ افضل ہے"۔(فتح الباری ۱۳۵/۹)

۲-**نسب:** یعنی دونوں پاکیزہ اور شریف نسب والے ہوں، جیساکہ اوپر صحیحین کی روایت سے معلوم ہوا، کیونکہ ازدواجی زندگی کی پائداری اور بہتری کے لئے یہ مفید ہے۔ اس لئے کہ ایک صحیح النسب شخص کا برتاؤ نیک رہے گا، محبت کی صورت میں اکرام سے پیش آئے گا، ورنہ کم از کم ظلم نہ ڈھائے گا۔

صاحب نہایہ فرماتے ہیں: "یعنی لڑکی معروف الاصل ہو، علماء وصلحاء کی طرف انتساب ہو، زنا کی لڑکی اور فاسق کی بیٹی سے نکاح مکروہ ہے"۔(۱۸۴/۶)

۳-**زوجین میں قریبی رشتہ داری نہ ہو:** کیونکہ نکاح کا ایک مقصد مختلف خاندانوں کا آپس میں اتصال وتعلق ہے، تاکہ تعاونِ باہمی کی فضا قائم ہو، اور قریبی رشتہ داریوں میں یہ بغیر نکاح کے ہی حاصل ہے، نیز شہوت کی کمزوری کی وجہ سے اولاد کمزور پیدا ہوگی۔

دورِ صحابہ کے بعض نکاح سے اس مسئلہ پر زد نہیں پڑتی، کیونکہ جواز میں کوئی کلام نہیں۔

۴-**کَفَاءَت** (برابری، مساوات): یعنی درج ذیل امور میں شوہر بیوی کے مساوی اور اس کے معیار کا ہو:

(الف) صلاح ودینداری، لہٰذا ایک فاسق شخص نیک وپاکدامن عورت کا کُفُو (ہمسر، مثل) نہیں ہوسکتا۔ اللہ سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے: "اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِناً كَمَنْ كَانَ فَاسِقاً لَا يَسْتَوُوْنَ" (السجدۃ ۱۸)

ترجمہ: "توجو شخص مومن ہو، کیا وہ اس شخص جیسا ہوجائے گا جو فاسق (بے حکم) ہو (نہیں) وہ آپس میں برابر نہیں ہوسکتے"۔

(ب) پیشہ، لہٰذا ایک گھٹیا اور حقیر پیشہ والا شخص، مثلاً بھنگی، جھاڑو دینے والا، چرواہا وغیرہ کسی عالم، قاضی اور تاجر کی بیٹی کا کفو نہیں ہے۔

(ج) جن عیوب سے نکاح کے فسخ کا حق حاصل ہوتا ہے (جسکی تفصیل آئندہ آئے گی) اگر شوہر میں ان میں سے کوئی عیب موجود ہو، مثلاً پاگل پن، برص (سفید داغ) تو وہ کفو نہ ہوگا۔

نکاح میں کفاءت دراصل بیوی اور اس کے اولیاء (ذمہ داروں) کا حق ہے، جو نکاح کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے، البتہ بیوی اور اس کے اولیاء کو عار دور کرنے کے لئے اس کی گنجائش دی گئی ہے، نیز عموماً اس کو پیشِ نظر رکھنا زوجین کی خانگی زندگی کی سہولت کا ضامن ہوگا، کیونکہ دونوں کی زندگی کا، ڈھنگ، اور گذر بسر کا طریقہ یکساں ہونے کی وجہ سے اپنی عادت کو بدلنے کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ عورت اور اولیاء اس حق کو نظر انداز کرسکتے ہیں، لہٰذا ولی لڑکی کی رضامندی سے غیر کفو میں نکاح کردے، تو نکاح صحیح ہوگا، ان پر کسی طرح کا اعتراض وارد نہ ہوگا۔

اپنے نطفہ کے لئے بہتر انتخاب اور کفو میں نکاح کے متعلق روایت بقول امام ابن الصلاح مختلف سندوں سے مروی ہے۔ جس میں کچھ کلام ہے، گرچہ حاکم نے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔(مغنی ۱۲۷/۳ نہایہ)

۵- **بکارت** (دوشیزگی، کنوارا پن): زوجین کا کنوارا ہونا مستحب ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: "کنواری سے نکاح کیوں نہ کیا، کہ ایک دوسرے سے دل لگی و تفریح کرتے۔"(متفق علیہ)

نیز ایک اور حدیث میں فرمایا:"کنواریوں سے نکاح کرو، کیونکہ وہ شیرین کلام، کثیر الاولاد اور راضی بقلیل ہوتی ہیں"(ابن ماجہ فی النکاح)

'احیاء العلوم' میں فرمایا:"سنت ہے کہ اپنی بیٹی کا نکاح بھی کنوارے سے ہی کرے، جسکا اب تک نکاح نہ ہوا ہو، کیونکہ فطرتاً اول مانوس ہستی سے زیادہ انسیت و محبت ہوگی"۔(نہایہ) اسی طرح دیگر صفات میں بھی شوہر میں ان کی موجودگی کو ترجیح دی جائے گی۔ (بجیرمی علی الاقناع ۳۰۵/۳، تحفہ)

حیض وغیرہ کی وجہ سے کسی عورت کا پردہ بکارت زائل ہو، تب بھی وہ کنواری ہی شمار ہوگی۔ جو شخص جنسی کمزوری کی وجہ سے ایک کنواری سے صحبت کرنے اور اسے مطمئن کرنے پر قادر نہ ہو، یا گھر کے دیگر افراد کی نگہداشت و تربیت کے پیش نظر کسی تجربہ کار عورت کا محتاج ہو، تو یہ شخص کسی ثَیِّبہ (جس کی پہلے شادی ہوچکی ہو) سے نکاح کرلے۔(الاقناع مع البجیرمی ۳۰۵/۳)

بقیہ مطلوبہ صفات: وَلُود (یعنی جس سے اولاد پیدا ہو، بانجھ نہ ہو)،: آپ ﷺ کا فرمان ہے:"اولاد کی صلاحیت اور محبت کرنے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ بروز قیامت دیگر امتوں کے مقابلہ میں اس امت کی کثرت پر فخر کروں گا،(ابوداود، حاکم وصححہ واحمد وابن حبان) کنواری لڑکی کے رشتہ داروں کے حالات سے اُس کے ولود ہونے کا اندازہ ہوگا۔

خوبصورتی: جیساکہ صحیحین کی حدیث میں گذرا، نیز حاکم کی روایت میں ہے۔"بہترین عورت وہ ہے کہ اسے دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ، اور اسے کچھ حکم دو تو وہ مان لے، اور اپنے نفس ومال کے متعلق خلاف ورزی نہ کرے۔"

امام ماوردیؒ نے فرمایا: علماء نے بہت زیادہ حسین عورت کو مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ (بعض مرتبہ) یہ حسن جمال اسے خود پسندی اور تکبر وغرور میں مبتلا کردے گی، اسی لئے امام احمدؒ نے اپنے بعض شاگردوں کو اس سے بچنے کی وصیت کی۔

عقل: عورت عقلمند و سمجھدار ہو۔

کسی ایسے شخص کی مطلقہ نہ ہو، جو دوبارہ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہو، یا یہ اس سے نکاح کی خواہش رکھتی ہو۔

قلتِ مہر: اس کا مہر کم ہو، ایسی عورت کو آپ ﷺ نے زیادہ بابرکت قرار دیا ہے۔(حاکم)

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ بیوی کی پہلی نحوست اس کا مہر زیادہ ہونا ہے۔ نیز بالغہ ہو، اور کسی دوسرے سے اس کی اولاد نہ ہو۔ اسی طرح اس عورت کے حلال ہونے میں کسی دوسرے امام کا اختلاف نہ ہو (مثلاً اس کے ماں یا بیٹی سے زنا، کیونکہ اس صورت میں بعض دیگر ائمہ کرام کے نزدیک اس سے نکاح صحیح نہیں، گرچہ عند الشافعیہ صحیح ہے) یا رضاعت وغیرہ کی وجہ سے شک نہ ہو۔

مذکورہ صفات میں تعارض کی صورت میں تقدیم کی ترتیب یہ ھے: دینداری تمام صفات پر مقدم، پھر عقل اور خوش خلقی، پھر نسب، پھر کنوارا پن، پھر اولاد کی صلاحیت، پھر حسن وجمال، پھر اپنی مصلحت کے اعتبار سے غور وفکر کرکے فیصلہ کرے۔ کسی ظاہری حاجت کے بغیر ایک سے زائد عورت سے نکاح نہ کرنا سنت ہے۔

اگر ماہ شوال وغیر شوال میں نکاح یکساں ممکن ہو تو ماہ شوال میں کرنا سنت ہے، اور بدائی (دخول) بھی ماہ شوال میں سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے شوال میں ہی نکاح کیا۔ اور دخول بھی شوال میں ہوا۔ (ترمذی وصححہ) اگر نکاح کا سبب کسی اور ماہ میں پایا جائے تو اسی وقت نکاح کرلے (شوال تک موخر کرنے کی ضرورت نہیں) ماہ صفر کے متعلق بھی ترغیب مروی ہے، بقول امام زہری حضرت علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما کا نکاح ماہ صفر میں ہوا، نیز نکاح مسجد میں بروز جمعہ لوگوں کے مجمع کے روبرو اور دن کے ابتدائی حصے میں سنت ہے، کیونکہ دن کے ابتدائی حصے میں اپ ﷺ نے اپنی امت کے حق میں برکت کی دعا فرمائی ہے۔ (ترمذی وصححہ) (مغنی الحتاج ۳/۱۲۷، نہایۃ المحتاج ۶/۱۸۵ و تحفۃ المحتاج ۹/۶۵)

مسجد میں نکاح کا حکم: طبرانی میں وارد ہے۔ زیادہ لوگوں کی شرکت خصوصاً علماء وصالحین کی شرکت کی نیت سے جمعہ کے بعد نکاح رکھنا اولی ہے (تحفہ المحتاج ۹/۶۵)

دوّم: نکاح سے قبل طرفین کا ایک دوسرے کو دیکھ لینا: کسی سے نکاح کا ارادہ ہو، اور بظاہر وہاں اپنے پیغام کی قبولیت کا امکان ہو، تو اسلام نے اس لڑکی کو دیکھنا مستحب قرار دیا ہے، گرچہ اس لڑکی کی اجازت نہ ہو، یا اسے اس کا علم نہ ہو، شریعت نے جو اجازت دی ہے وہ کافی ہے، نیز اطلاع کی صورت میں وہ بناؤ سنگھار کرے گی، (جس سے صحیح اندازہ نہ ہو پائے گا) اور اس کی غرض فوت ہوگی۔ ایک نگاہ میں اس کی شکل وصورت کا صحیح اندازہ نہ ہو پائے، تو دوسری اور تیسری مرتبہ بھی دیکھ سکتا ہے، تاکہ نکاح کے بعد پچھتاوا نہ ہو۔

حضرت مغیرہؓ نے ایک عورت کو پیغام دیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسے دیکھ لو، کیونکہ اس سے آپسی مؤدت ومحبت کی پائداری کے زیادہ امکانات ہیں"۔ (نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، ابن حبان) اسی طرح مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے دار قطنی، حاکم، ابوعوانہ اور ابن حبان نے مع التصحیح حضرت انسؓ سے، ابن ماجہ وابن حبان نے محمد بن مَسْلمہؓ سے اور ابوداود بزار اور حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم کی روایات کو پیش کیا ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "کوئی کسی عورت کو پیغام دے (یا ارادہ ہو) تو اسے دیکھ لینے میں کوئی گناہ نہیں، جبکہ پیغام کی خاطر دیکھ رہا ہو۔" (احمد۔ طبرانی۔ بزار) مسند احمد میں ہے: "گرچہ اس عورت کو علم نہ ہو" (تلخیص الحبیر ۳/۱۴۷) اسی طرح نکاح کا ارادہ ہو تو عورت کے لئے بھی مرد کو دیکھ لینے کا حق ہے، تاکہ اپنی پسند اور معیار کے مطابق فیصلہ کرے، اور آئندہ ندامت نہ ہو۔ (دونوں کو ایک دوسرے کو چھونا جائز نہیں ہے، جمل)

نظر کے حدود: مذکورہ صورت میں لڑکی کے صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیوں کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ اللہ کا فرمان ہے، "وَلَا يُبْدِينَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا" (النور ۳۱)

ترجمہ: (اور (عورتیں) اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں، مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے۔) اس آیت میں مذکورہ ظاہری زینت سے یہی مراد ہے۔ ہتھیلی کے پیٹ اور پشت دونوں کو دیکھ سکتا ہے۔ چہرہ سے حسن وجمال کا اور ہتھیلی سے موٹاپے اور نرمی وغیرہ کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر براہِ راست دیکھنا دشوار ہو، تو کسی عورت یا اس کے محرم مرد کو روانہ کرے، تاکہ وہ دیکھ کر اس کے سامنے تفصیلات بیان کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت اُم سُلَیم کو اس مقصد سے ایک عورت کے پاس روانہ کیا، اور فرمایا: "اس کے دونوں ایڑی کے اوپر کے پٹھے دیکھ لو، اور اس کے بدن کی خوشبو سونگھو" (رواہ الحاکم وصححہ)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ عورت نسبتاً زیادہ

تفصیلات سے آگاہ کر سکتی ہے، اس اعتبار سے اس میں مزید معلومات ملتی ہیں۔

ایک مرتبہ دیکھنے سے اندازہ مل جائے تو مزید دیکھنا حرام ہے، ورنہ بار بار دیکھ سکتا ہے، گرچہ تین سے بڑھ جائے۔ سنت یہ ہے کہ پیغام سے پہلے ہی دیکھ لے، تاکہ ناپسندیدگی کی صورت میں اعراض یا انکار کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ پہنچے۔ ایک روایت میں دل میں پیغام کی بات آنے کی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے۔ (ابوداود)۔ اگر پہلے نہ دیکھے، تو پیغام کے بعد بھی دیکھ سکتا ہے، بعضوں نے اسے مندوب قرار دیا ہے، اور بعضوں نے صرف مباح (نہایہ ۱۸۶/۶) اس صورت میں لڑکی ناپسند ہو، تو چپ رہے، صراحتاً انکار نہ کرے۔

ایک عورت نکاح کے ارادہ کی صورت میں مرد کے ناف اور گھٹنے کے درمیان کے علاوہ دیگر بدن کو دیکھ سکتی ہے۔ (خلاصہ یہ کہ دونوں کو نماز میں جن اعضاء کا کھلا رکھنا جائز ہے، انہیں دیکھ سکتے ہیں)۔ اگر خود نہیں دیکھ سکتی تو کسی کو بھیج کر اس کے اوصاف معلوم کرلے۔ (حاشیتہ الجمل ۱۲۰/۴) (الفقہ المنجی ۴۱/۴)

نظر کے اقسام (من الاقناع مع البجیرمی)

کسی کو دیکھنے کی درج ذیل صورتیں ہوں گی۔

۱) کسی عاقل بالغ مرد کا عام حالات میں (بلا کسی معقول و شرعی حاجت کے) کسی بڑی اجنبی (غیر مَحرم۔ پرائی) عورت کے بدن کو قصداً دیکھنا حرام ہے، گرچہ وہ قابلِ اشتہانہ ہو، اور فتنہ کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اگر اتفاقاً نگاہ پڑ جائے تو گناہ نہ ہوگا (البتہ فوراً نگاہ پھیر لے)۔ خصی، مجبوب (مقطوع الذکر۔ جس کا آلہ تناسل کٹا ہو، لیکن خصیتین باقی ہو)، بوڑھا کھوسٹ، (پیر فرتوت۔ کہن سال) اور مُخَنّث (عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والا) کا بھی یہی حکم ہے۔ (یعنی ان لوگوں کو بھی اجنبی عورت کی طرف دیکھنا حرام ہے)

مَمسُوح (جس کی شرمگاہ خصتین سمیت غائب ہو اور بالکل شہوت نہ ہو) کسی اجنبی عورت کو دیکھ سکتا ہے، جیسا کہ ایک محرم دیکھ سکتا ہے، یعنی ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتا ہے، جبکہ وہ عادل و مسلمان ہو اور عورت بھی عادلہ ہو، اور اس میں عورتوں کی طرف بالکل میلان موجود نہ ہو۔

ایک قول میں ممسوح کے لئے بھی اجنبی عورت کو دیکھنا حرام ہے، یہی امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ کا مسلک ہے، اور امام سبکیؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ کسی پاگل کی نگاہ کو حرام نہیں کہا جائے گا۔ لیکن ایک عاقلہ بالغہ عورت کو اسے دیکھنا حرام ہے،

نابالغ کی چار قسمیں ہوں گی: ۱- مُراھِق (قریب البلوغ) اس کا حکم بالغ کی طرح ہے۔ یعنی ولی پر ضروری ہے کہ اسے دیکھنے سے روکے، نیز عورت کو اس کے سامنے آنا حرام ہے۔

۲- وہ نابالغ جو اپنے مشاہدہ کو بلاشہوت بیان کر سکتا ہو، یہ محرم کی طرح ہے،

۳- وہ نابالغ جو اپنا مشاہدہ شہوت کے ساتھ بیان کرے، یہ بالغ کی طرح ہے۔

۴- وہ نابالغ جو بیان کرنے پر ہی قادر نہ، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ایک بالغ کے لئے اجنبی عورت کے بدن کا کوئی بھی حصہ دیکھنا حرام ہے، یہاں تک کہ ناخن اور بال وغیرہ بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی دیکھنا حرام ہے۔ اس کی آواز سننا حرام ہے، گرچہ تلاوت کی آواز ہو، جبکہ فتنہ کا خوف ہو، یا آواز سے لطف اندوز ہو، ورنہ حرام نہیں، اس میں اَمرد کا بھی یہی حکم ہے۔ (عورت کے لئے سنت ہے کہ اجنبی سے بات کرتے وقت آواز کچھ موٹی اور بھاری نکالے یا منہ پر

ہاتھ رکھے۔قلائد)

آیت:"قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ "۔(النور:۲۰)

ترجمہ: آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے"۔

احادیث: ۱-حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اتفاق نگاہ کے متعلق سوال کیا، تو فرمایا:"نگاہ پھیر لو"(احمد، مسلم،ابوداود، ترمذی)

۲-آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:"اے علی! ایک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ نہ ڈالو۔۔۔"(احمد،ابوداود، ترمذی)

۳-حجۃ الوداع میں ایک عورت آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھنے آئی، تو حضرت فضل اس کی طرف دیکھنے لگے، تو آپ ﷺ نے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ دوسری طرف پھیر دیا۔۔(بخاری)(نیل الاوطار ۱۲۸/۲)

۲) **کسی کا اپنی بیوی کو دیکھنا:** زندگی میں اپنی بیوی کے مکمل بدن کو دیکھنا جائز ہے، کیونکہ یہ اس کے لطف اندوزی کا سامان ہے، شرم گاہ کی طرف بلاحاجت دیکھنا مکروہ ہے، اس کے باطن (اندرون) کو دیکھنا شدید مکروہ ہے۔ پچھلی شرمگاہ(دُبُر) کو دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا جائز ہے، البتہ اس جگہ صحبت حرام ہے، کوئی عورت کسی دوسرے کی وطی بُشبہ (غلطی وشبہ سے صحبت) کی وجہ سے عدت گذار رہی ہو تو شوہر کے لئے اس کے ناف وگھٹنے کے درمیان دیکھنا حرام ہے، دیگر اعضاء کو دیکھنا جائز ہے۔

بیوی بھی شوہر کے مکمل بدن کو دیکھ سکتی ہے، البتہ وہ منع کرے تو شرم گاہ کی طرف نہیں دیکھ سکتی۔(یعنی اس کے ناف وگھٹنے کے درمیان)

بیوی کے انتقال کے بعد اب شوہر ایک محرم کی طرح صرف ناف وگھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن بغیر شہوت کے دیکھ سکتا ہے۔

۳) **مَحْرَم کو دیکھنا**(محرم یعنی جس سے نکاح حرام ہو، جیسے ماں بیٹی بہن وغیرہ): کسی محرم کے ناف وگھٹنے کے درمیانی اعضاء کے علاوہ بدن کے دیگر حصوں کو بغیر شہوت کے دیکھنا جائز ہے۔ناف وگھٹنے کے درمیان دیکھنا بالاجماع حرام ہے۔ شہوت کے ساتھ محرم کو یا کسی دوسرے کو جس سے لطف اندوزی جائز نہیں، دیکھنا حرام ہے۔

امام قفال وغیرہ نے فرمایا کہ محرم کے جو اعضاء عموماً کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں، صرف انھیں دیکھ سکتے ہیں، دیگر اعضاء کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں(لہٰذا یہ جائز نہیں)(المجموع ۱۴۰/۱۶)

آیت:"وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ"(النور ۳۱)

ترجمہ:(عورتیں)اپنی زینت (کے مواقع) کو(کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں، مگر اپنے شوہروں پر یا(اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر، یا اپنے شوہر کے باپ پر، یا اپنے بیٹوں پر، یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر، یا اپنے (حقیقی وعلاتی واخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد، ماموں زاد وغیرہ پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی (یعنی اپنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر، کیونکہ کافر عورت کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے ۔رواہ فی الدرعن عمر بن الخطاب وابن عباس ومجاھد رضی اللہ عنہ یا اپنے ملک یمین (یعنی غلام باندی) پر، یا ان مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں

اوران کو (عورتوں کی طرف) ذراتوجہ نہ ہو، یاایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے۔۔۔"

۴) **مسنون نظر**: یعنی نکاح کاارادہ ہو تو دیکھنا، جس کی تفصیل گذر چکی۔

۵) **علاج کے لئے دیکھنا**: بغرضِ علاج جن اعضاء کو دیکھنے کی ضرورت ہو، دیکھ سکتے ہیں، لہٰذا ایک مرد وعورت ایک دوسرے کا علاج کرسکتے ہیں، لیکن کسی محرم یاشوہر یا معتبر عورت کی موجودگی میں ہو۔ نیز مناسب علاج کرنے والی خاتون ڈاکٹر نہ ہو، تب مرد کے پاس جاسکتی ہے، اسی طرح مناسب مرد طبیب نہ ہو، تب ایک مرد کسی خاتون کے پاس جاسکتا ہے۔ (یعنی ہم جنس ڈاکٹر کی موجودگی میں غیر جنس کے پاس نہیں جاسکتے)

ایک مسلم مُعالج (ڈاکٹر) کی موجودگی میں کسی غیر مسلم سے رجوع ہونا جائز نہیں، اگر ایک غیر مسلم عورت اور ایک مسلم مرد معالج ہو، توکسی عورت کے علاج کے لئے غیر مسلم عورت مقدم ہوگی۔ حتی الامکان عادل معالج سے رجوع ہو، عادل کے ہوتے ہوئے غیر عادل کے پاس نہ جائے۔

امام ماوردی نے فتنہ سے اطمینان کی بھی شرط لگائی ہے۔ معالج کے سامنے صرف بقدر ضرورت حصہ کھولے۔

ایک عورت کے طبیب کی ترتیب: مسلمان عورت سب پر مقدم ہوگی، پھر غیر مراہِق مسلم بچہ، پھر غیر مراہق کافر بچہ، پھر کافرہ عورت، پھر محرم مسلم مرد، پھر کافر محرم، پھر اجنبی مسلمان، پھر (سب سے آخر میں) غیر مسلم مرد، بعضوں نے کافرہ عورت کو محرم کے بعد رکھا ہے۔

ختنہ کرنے والے کا سامنے والے کی شرمگاہ کو اور دائی کا حاملہ عورت کی شرمگاہ کو دیکھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

اجنبی ڈاکٹر کے سامنے عورت کو چہرہ یا ہتھیلی کھولنے کے لئے صرف حاجت کافی ہے، (یعنی عام بیماری میں بھی گنجائش ہوگی) اگلی پچھلی شرمگاہ کے علاوہ بدن کے دیگر حصے پر دیکھنے کی نوبت آتی ہو، تو شدتِ حاجت شرط ہے، یعنی ایسی بیماری وتکلیف ہو کہ اس کی وجہ سے تیمم کی رخصت مل جائے، مثلاً سخت لاغری وبیماری، اور شرمگاہ کی طرف نگاہ کے لئے ایسی سخت تکلیف شرط ہے، کہ اس کی وجہ سے ان اعضاء کو کھولنا مروت کے خلاف نہ سمجھا جائے۔

حدیث: "حضرت اُم سلمہ نے آپ ﷺ سے پچھنے لگوانے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے ابو طَیبہ کو حکم دیا کہ انھیں پچھنے لگائیں" (مسلم شریف)

۶) **گواہی کے لئے دیکھنا**: گواہ بننے، یا گواہی دینے، یا خرید وفروخت وغیرہ معاملات کے لئے دیکھنا جائز ہے۔ حتٰی کہ زنا اور ولادت کی گواہی کے لئے شرمگاہ کی طرف اور رضاعت کی گواہی کے لئے پستان کی طرف بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس طرح دیکھ کر گواہ بنے، اور گواہی دیتے وقت نقاب میں عورت کو پہچان نہ سکے، تو اسے چہرہ کھولنا ضروری ہے، اور نقاب کے باوجود پہچان رہا ہو تو اس کی ضرورت نہیں، بلکہ اس صورت میں دیکھنا حرام ہے۔

معاملات میں صرف چہرہ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔

۷) **غلام باندی خریدنا**: ایک مرد کسی باندی کو یا ایک عورت کسی غلام کو خریدنا چاہے، تو ناف وگھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتے ہیں، چھونے کی اجازت نہیں۔

۸) **تعلیم**: فرض یا مستحب تعلیم کے لئے عورت اور اَمَرد کی طرف دیکھنا جائز ہے۔

عورت کو بغرض تعلیم دیکھنا اس وقت جائز ہے، جبکہ کسی مناسب عورت یا محرم کے ذریعہ یہ ممکن نہ ہو، اور پسِ پردہ دشوار ہو، نیز خلوتِ محرمہ نہ پائی جائے۔(یعنی کسی جگہ صرف ایک عورت اور اجنبی مرد نہ ہو۔)(نہایۃ ۶/۱۹۹)

۹)**عورت کا اپنے محرم مردوں کو دیکھنا:** ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو دیکھ سکتی ہے۔

۱۰)**عورت کا کسی اجنبی مرد کو دیکھنا:** امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اسے اجنبی مرد کے کسی بھی حصّہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

آیت: ”وَقُلۡ لِلۡمُؤۡمِنَاتِ یَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ“(النور ۳۱)

ترجمہ: ”اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔۔۔۔“

حدیث: ایک مرتبہ حضرت ابن اُم مکتومؓ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو ان سے پردہ کا حکم دیا، اس پر حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ وہ تو نابینا ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم دونوں بھی نابینا ہو، تم انھیں نہیں دیکھ رہی ہو؟“(ابوداود، نسائی، ترمذی، ابن حبان)

امام بلقینی وغیرہ کا قول ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو تو اسے مرد کے چہرہ اور ہتھیلی کو دیکھنا جائز ہے۔(مغنی ۳/۱۳۲)

۱۱)**مرد کا مرد کو دیکھنا:** ناف اور گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو بغیر شہوت کے دیکھ سکتا ہے۔ فتنہ کا ڈر نہ ہو تو حائل کے ساتھ ایک مرد دوسرے مرد کے ران کو رگڑ سکتا ہے۔

۱۲)**اَمۡرَد کو دیکھنا:**(اَمۡرَد یعنی وہ نو عمر لڑکا جسے ابھی داڑھی نہ آئی ہو، اور غالباً داڑھی اگنے کی عمر تک نہ پہنچا ہو، اور اگر لڑکی ہوتا تو شہوت ابھری ہوتی) بڑی عمر کے باوجود داڑھی نہ ہو تو وہ امرد نہیں کہلائے گا۔

شہوت کے ساتھ خوبصورت امرد کی طرف نگاہ بالاجماع حرام ہے، بلکہ شہوت کے ساتھ تو باریش شخص اور محرم عورتوں کی طرف بھی نگاہ قطعاً حرام ہے، اگر دیکھنے سے لطف اندوز ہو(لذت حاصل ہو) تو اسے شہوت کی نگاہ شمار کرینگے۔ شہوت تو نہ ہو، لیکن فتنہ کا اندیشہ ہو، تب بھی امرد کی طرف نگاہ حرام ہے۔

امام نوویؒ کے نزدیک شہوت اور فتنہ کے خوف کے بغیر بھی امرد کو دیکھنا حرام ہے، جبکہ وہ محرم نہ ہو، اکثر حضرات کے نزدیک اس صورت میں دیکھنا حرام نہیں۔ امرد کے ساتھ خلوت یا اس کے بدن کے کسی حصّہ کو چھونا حرام ہے۔(اعانۃ ۳/۲۶۳)

۱۳) باندی کو دیکھنا: اس کا حکم بھی محققین کے نزدیک آزاد عورت کی طرح ہے۔

۱۴)**ایک عورت کا دوسری عورت کو دیکھنا:** ناف و گھٹنے کے درمیان کے علاوہ بدن کو بلاشہوت دیکھ سکتی ہے۔

۱۵)**خُنثٰی مشکل:** اسے عورتوں کے حق میں مرد، اور مردوں کے حق میں عورت شمار کرینگے۔ کسی اجنبی مرد یا عورت کو تنہائی میں اس کے ساتھ رہنا جائز نہیں۔

۱۶)**کافرہ عورت کا مسلمان عورت کو دیکھنا:** سورۂ نور کی آیت ۳۱ جو (۳) نمبر پر گذر چکی، اس میں ”اَوۡ نِسَائِهِنَّ“(اپنی عورتوں پر) لفظ گذر چکا، لہٰذا کسی مسلمان عورت کو غیر مسلم عورت کے سامنے بے پردہ ہونا جائز نہیں، ورنہ 'اپنی عورتیں' کہنے کی ضرورت نہ تھی، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ غیر عورتوں کو مسلم عورتوں کے ساتھ حمام میں داخل

ہونے سے روکتے تھے۔ عام طور پر کام کاج کے وقت جو اعضاء کھلے رہتے ہیں، اسے دیکھنے میں حرج نہیں۔ نیز یہ حکم اس کافرہ کا ہے جو اس مسلم عورت کی محرم یا باندی نہ ہو۔(البجیرمی مع الاقناع۔ ۳/۳۲۵)

۱۷) **نابالغ بچی**: جو بچی ابھی اتنی کم سن ہو کہ ایک طبع سلیم (سلیم الفطرت) شخص کو اسے دیکھ کر شہوت (جنسی خواہش ورغبت) نہ ابھرے، اسے دیکھنا جائز ہے۔ بدصورتی کی وجہ سے رغبت نہ ہو، تو اس کے بغیر اسکا اندازہ لگایا جائے گا۔ یعنی اتنی عمر ہو جائے کہ اگر بدشکل نہ ہوتی تو رغبت ابھری ہوتی تو دیکھنا حرام ہوگا، ورنہ نہیں۔

ایسی بچی کی اگلی و پچھلی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز نہیں (خواہ وہ محرم ہو یا غیر محرم) البتہ والدہ یا دیگر اس کی پرورش کرنے والے دودھ پلانے اور تربیت کے دوران شرمگاہ کی طرف دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ نجاست دھونے، غسل کرانے وغیرہ میں اس کی ضرورت پڑے گی۔

چھوٹے بچے کی شرمگاہ کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض علماء نے بچے کی شرمگاہ میں اجازت دی ہے۔(نہایۃ۔ ۶/۱۸۹۔ تحفہ ۹/۲۶)

۱۸) **اپنی شرم گاہ**: کسی انسان کو عبث اپنی شرمگاہ دیکھنا مکروہ ہے (نہایۃ ۶/۲۰۱)(تحفۃ ۹/۵۱)

مَسّ (چھونا)

جہاں دیکھنا ممنوع ہے، چھونا بھی حرام ہے، کیونکہ چھونا شہوت بھڑکانے میں دیکھنے سے بڑھ کر ہے، اسی لئے چھونے سے انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور صرف دیکھنے سے انزال ہو جائے تو نہیں ٹوٹتا۔

لہٰذا کسی امرد کو چھونا، اور بلا حائل کسی آدمی کی ران رگڑنا حرام ہے۔ حائل کے ساتھ کسی آدمی کی ران رگڑنا جائز ہے، جبکہ بلا شہوت ہو اور فتنہ کا خوف نہ ہو۔ امرد کی ران حائل کے ساتھ بھی چھونا حرام ہے۔

کبھی چھونا جائز اور دیکھنا حرام ہوتا ہے، مثلاً طبیب جبکہ صرف چھو کر مرض کا پتہ لگا سکتا ہو۔

نکاح کے قصد، گواہی اور تعلیم کے لئے دیکھنے کی اجازت کے باوجود چھونا حرام ہے۔ "اسی طرح عورت کو اپنے غلام کو دیکھنا جائز لیکن چھونا منع ہے"، اور غلام کے حق میں اپنی آقا کا بھی یہی حکم ہے، ممسوح کو بھی چھونا حرام ہے۔

مَحرم کے پیٹ، پشت اور پیر وغیرہ کو بلا حائل بغیر حاجت و شفقت کے چھونا یا اس کا بوسہ لینا حرام ہے۔ حاجت یا شفقت کی صورت میں جائز ہے، جبکہ شہوت یا فتنہ کا خوف نہ ہو۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا بوسہ لیا تھا۔(بخاری شریف)

صاحبِ مغنی نے حاجت و شفقت کے بغیر بھی جواز کو ترجیح دی ہے۔ والدہ وغیرہ محرم کا پیر دبانا حاجت کی صورت میں جائز ہے۔

صحبت کے وقت کسی اور کا تصور: اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے وقت کسی دوسری عورت کے محاسن کا تصور کرے، یہاں تک کہ یوں سمجھے کہ اس سے صحبت کر رہا ہوں، تو کئی متاخرین محققین مثلاً ابن الفرکاح، جمال الاسلام ابن البزری، کمال رواد اور امام سیوطی وغیرہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

بال وناخن: جن اشیاء کا بدن پر ہوتے ہوئے دیکھنا حرام ہے، جدائی کے بعد بھی حرام ہے، اسی لئے علماء نے موئے زیرِ ناف اور عورت کے ناخن وبال کو دفن کرنا واجب قرار دیا ہے۔

ساتھ لیٹنا: دو مرد یا دو عورت کا برہنہ ایک ہی کپڑے میں لیٹنا حرام ہے، جبکہ بستر ایک ہو، گرچہ ایک دوسرے سے مس نہ ہوں، یا ماں باپ کے ساتھ ہوں، جبکہ بچے دس سال کا ہو چکا ہو، کیونکہ مسلم شریف کی حدیث میں دو مردوں کو یا دو عورتوں کو اس طرح

ایک ہی کپڑے (چادر) میں سونے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث: "سات سال کی عمر میں اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، دس سال کے ہو جائیں تو نماز (میں کوتاہی) پر مارو، اور ان کا بستر جدا کردو" (ابوداود، حاکم۔ تلخیص)

دار قطنی اور حاکم کی ایک روایت میں سات سال میں بستر کی جدائی کا حکم دیا ہے۔

بچہ جب دس سال (یا بعضوں کے نزدیک سات سال) کا ہو جائے، تو والدین و بھائی بہنوں سے جدا سلانا واجب ہے، جبکہ بدن میں کپڑا نہ ہو، ورنہ گنجائش ہوگی۔ (مغنی المحتاج۔ ۱۳۵/۳، نہایۃ المحتاج ۲۰۱/۶، تحفۃ المحتاج ۵۱/۹، اعانۃ الطالبین ۲۶۳/۳)

مصافحہ وغیرہ

احادیث: ۱) حضرت انسؓ سے قتادہؓ نے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام میں مصافحہ کا معمول تھا؟ انہوں نے فرمایا: "جی ہاں" (بخاری)

۲) آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا، ملاقات پر اپنے بھائی کے لئے جھک جائیں؟

فرمایا: "نہیں"۔ پوچھا: تو کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرلیں؟ فرمایا: "ہاں"۔ (ترمذی وحسنہ)

۳) ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جو بھی دو مسلمان بوقت ملاقات مصافحہ کرلیں، بچھڑنے سے پہلے ضرور ان کی مغفرت ہوگی" (احمد، ابوداود، ترمذی) ابوداود کی ایک روایت میں ہے: "اور دونوں اللہ کی حمد اور استغفار کریں"۔ (فتح الباری۔ ۵۵/۱۱)

دو مردوں اور دو عورتوں کو بوقت ملاقات مصافحہ مسنون ہے۔ اگر ایک مرد و عورت آپس میں محرم یا میاں بیوی ہوں یا ایک حدِ شہوت سے کمسن ہو، تو مصافحہ جائز ہے۔ حسین امرد سے مصافحہ حرام ہے۔ جسے جذام یا برص جیسی بیماری ہو، اس سے مصافحہ مکروہ ہے۔

معانقہ (گلے ملنا۔ بغلگیر ہونا) اور سر میں بوسہ لینا مکروہ ہے، البتہ کوئی سفر سے آیا ہو، یا عرفاً کافی مدت کے بعد ملاقات ہو تو حدیث کی روشنی میں یہ سنت ہے، جبکہ جنس متحد ہو (یعنی مرد کو مرد سے اور عورت کو عورت سے گلے ملنا اس صورت میں سنت ہوگا) لیکن امرد مستثنٰی ہے، جیسا کہ گذر چکا۔

کسی زندہ آدمی کے ہاتھ کو بوسہ دینا سنت ہے، جبکہ کسی دینی فضلیت و بزرگی کی وجہ سے ہو، کسی دنیوی امر مثلاً مالداری، وزارت وغیرہ کی وجہ سے مکروہ ہے، کسی مجبوری کی وجہ سے حرج نہیں۔

اہل فضل کے لئے اکراماً کھڑے ہونا مستحب ہے، ریا اور تفخیم کے طور پر منع ہے۔ (بجیرمی مع الاقناع ۳۲۶/۳۔ اعانۃ مع الفتح ۲۶۳/۳)

تنبیہ: (بعض علاقوں میں عید، شادی اور جنازہ کے موقع پر معانقہ کا معمول واہتمام ہے، لیکن حدیث وفقہ کی کسی کتاب میں ان اوقات میں معانقہ کی مشروعیت احقر کی نظر سے نہیں گذری۔ شرعی ثبوت کے بغیر کسی چیز کا اہتمام کرنا اور رسم بنالینا کہ وہ کوئی مطلوب اور شرعی عمل محسوس ہونے لگے، قطعاً مناسب نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب)

خِطْبَہْ (منگنی۔ پیغام)

خِطبہ یعنی کسی لڑکی سے نکاح کا التماس اور نکاح کے لئے پیغام دینا۔

خِطبه کے احکام: ۱)اگر لڑکی نہ کسی کے نکاح میں ہو، اور نہ عدت گذار رہی ہو، تو اسے تصریحاً وتعریضاً پیغام دینا حلال ہے، جبکہ کوئی دوسرا مانع نہ پایا جائے (جس کا ذکر آئندہ آئے گا)

۲)اگر لڑکی پہلے شوہر کی وفات یا طلاقِ بائن کی عدت میں ہو تو تعریضاً پیغام حلال ہے، نہ کہ تصریحاً۔

آیت: ”وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ “(البقرہ۔۲۳۵)

ترجمہ: ”اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہو گا جو ان مذکورہ عورتوں کو پیغام دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو“۔ عورت جسکی عدت میں ہو، اسے دوبارہ اس سے نکاح حلال ہو، تو وہ عدت میں تصریحاً بھی پیغام دے سکتا ہے(مغنی ۱۳۶/۳)

۳)مذکورہ دونوں قسم کی عورتوں کے علاوہ کو تصریحاً یا تعریضاً دونوں طرح پیغام دینا حرام ہے، جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، اسے پیغام دینا حرام ہے۔ اسی طرح محرمات نکاح میں بیان ہونے والی ہر عورت کو پیغام دینا حرام ہے، خواہ حرمت ابدی ہو یا عارضی۔

کوئی عورت طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو، تو اسے بھی تصریحاً یا تعریضاً پیغام دینا حرام ہے، کیونکہ وہ بیوی کے حکم میں ہے، کیونکہ اس کے شوہر کو اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لینے کا حق حاصل ہے، ارشاد باری ہے!”وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا“۔(البقرۃ:۲۲۸)

ترجمہ: ”اور ان عورتوں کے شوہر ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں“۔

تصریح: تصریحاً پیغام یعنی ہر وہ لفظ جو قطعاً وصراحتاً نکاح کی رغبت پر دلالت کرے: مثلاً میرا تجھ سے نکاح کا ارادہ ہے، تیری عدت ختم ہو تو میں تجھ سے نکاح کرلوں گا۔

تعریض: یعنی ایسا لفظ جس میں نکاح کی رغبت اور عدم رغبت دونوں کا احتمال ہو: مثلاً تو خوبصورت ہے، تیرے کئی لوگ خواہاں ہیں، تجھ جیسی عورت کسے ملے گی وغیرہ

پیغام کا جواب: مذکورہ صورتوں میں عورت یا ولی کی جانب سے پیغام کے جواب کا حکم بھی پیغام کی طرح ہے۔(یعنی تصریحاً پیغام جائز ہو تو جواب بھی جائز، صرف تعریضاً جائز ہو تو جواب بھی صرف تعریضاً ہی جائز ہو گا۔ اگر پیغام حرام ہو، تو ہاں میں جواب بھی حرام ہو گا)(مغنی۔فتح الوھاب۔الفقہ المنہجی ۵۰/۴)

پیغام پر پیغام

حدیث: ۱)”کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ دے، یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے یا ترک کردے“(بخاری، نسائی)

۲)”کوئی شخص کسی دوسرے کے پیغام پر پیغام نہ چڑھائے، یہاں تک کہ وہ پہلا شخص پیغام ترک کردے یا اسے اجازت دے۔(بخاری۔نسائی۔نیل الاوطار)

کسی لڑکی کو ایک شخص کا پیغام جا چکا ہو، تو دوسرے کو اس پر پیغام چڑھانا حرام ہے، جبکہ درج ذیل شرائط موجود ہوں۔

۱) پہلے شخص کا پیغام جائز ہو، خواہ مکروہ ہو۔ ۲) پہلے پیغام کا صراحتاً اثبات میں جواب مل چکا ہو۔ ۳) اجازت وغیرہ کے ذریعے طرفین میں سے کسی کی جانب سے اس رشتہ سے اعراض نہ پایا گیا ہو۔ ۴) دوسرے شخص کو ان تمام شرائط کا، نیز اس صورت میں دوسرا پیغام دینے کی حرمت کا علم ہو۔

لہٰذا مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو دوسرا پیغام حرام نہ ہو گا۔ مثلاً: ابھی اس لڑکی کو کسی کا پیغام نہیں گیا، پہلے پیغام کا جواب نہیں ملا، جواب تعریضاً ملا ہو، جواب تو تصریحاً مل چکا ہے لیکن دوسرے شخص کو اس پیغام کا، یا جواب کا، یا جواب کے صریح ہونے کا، یا اس صورت میں دوسرے پیغام کی حرمت کا علم نہ ہو، پیغام دینے والے نے کسی خوف یا شرم کے بغیر دوسرے شخص کو پیغام کی اجازت دی، پہلے شخص یا لڑکی کی جانب سے اعراض پایا گیا، پہلا پیغام حرام ہو، مثلاً: کسی کی عدت میں اس نے پیغام دیا تھا، تو ان تمام صورتوں میں دوسرے کو پیغام دینا جائز ہے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو حضرت معاویہؓ اور ابو جہمؓ اور اسامہؓ نے پیغام دیا، تو آپ ﷺ نے حضرات اسامہؓ کے متعلق مشورہ دیا۔ (مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ نیل الاوطار ۱۲۳/۶)

اگر لڑکی مُجْبَرَہ ہے تو ولی مُجْبِرہ کی، غیر مجبرہ ہے تو لڑکی کی اور غیر کفو کا پیغام ہو تو دونوں کی قبولیت کا اعتبار ہو گا۔ (کسی اور کے پیغام قبول کرنے کا کوئی اعتبار نہیں)۔ جس صورت میں پیغام پر پیغام حرام ہے، اگر کوئی اس صورت میں پیغام دے اور نکاح ہو جائے تو یہ نکاح صحیح ہو گا، صرف پیغام دینا گناہ شمار ہو گا۔

مشورہ

حدیث: ”کسی سے اس کا بھائی خیر خواہی چاہے (مشورہ طلب کرے) تو اس کے ساتھ خیر خواہی سے پیش آؤ۔“ (بیہقی بسند حسن)

مسلم کی ایک حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق شمار کئے جس میں ایک یہی خیر خواہی کا سلوک ہے۔ (تلخیص الحبیر ۱۵۱/۳)

کوئی شخص کسی دوسرے سے نکاح، خرید و فروخت، یا تعلیم وغیرہ کسی مقصد کے لئے تعلق جوڑنا چاہتا ہو، تو اس شخص کو اس کے عیوب سے آگاہ کرنا لازم ہے، جبکہ آگاہ کرنے والے کے جان ومال اور عزت وآبرو وغیرہ کو اس سے خطرہ لاحق نہ ہو، اور یہ اطلاع محض خیر خواہی کی نیت سے ہو اور سچائی کے ساتھ ہو۔ مذکورہ شخص اس سے مشورہ طلب نہ کرلے، تب بھی اسے اطلاع دینا واجب ہے۔

اگر عیوب کو بیان کرنے کے بجائے صرف اسے منع کرنے سے وہ رک جائے تو بیان کرنا جائز نہیں، یا بعض عیب کا ذکر کافی ہو تو بقیہ کا ذکر حرام ہے، اسی طرح صرف متعلقہ عیب کا ذکر کرے، یعنی کسی کا نکاح کا ارادہ ہے، تو صرف اس سے متعلق عیب بیان کرے، معاملات کے عیب کے ذکر کی اجازت نہ ہو گی۔ اگر اسے اندازہ ہو کہ عیوب کے ذکر سے بھی وہ باز نہ آئے گا، تو کسی عیب کا ذکر نہ کرے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو جب حضرت ابو جہمؓ اور معاویہؓ کا پیغام آیا، اور آپ ﷺ سے مشورہ کیا تو فرمایا کہ، ابو جہم تو ڈنڈا ہاتھ سے نہیں رکھتے (یعنی بہت مارتے ہیں، یا سفر کرتے ہیں)، اور معاویہ تو فقیر ہیں، ان کے پاس کچھ مال نہیں (مسلم)

اپنی ذات کے متعلق مشورہ: کسی سلسلہ میں خود اپنی ذات کے متعلق کوئی مشورہ کرے، اور اپنی ذات میں عیوب

ہوں، تو میں اس قابل نہیں ہوں کہنا واجب ہے۔ اس جواب سے وہ راضی نہ ہو، تو یہ اس معاملہ کو ترک کردے، یا شرعی وعرفی جو مذموم امور اس میں ہیں، وہ بیان کردے۔

غیبت

کسی کی ذات، یا اس کے اولاد، بیوی یا مال وغیرہ سے متعلق کوئی بات جو اسے عرفاً یا شرعاً ناپسند ہو، اسکا تذکرہ غیبت کہلاتا ہے۔ (جو حرام ہے) گرچہ صرف اشارہ سے ہو، یا دل میں اس کا استحضار ہو، لیکن درج ذیل صورتوں میں غیبت جائز ہے۔

۱) خیر خواہی اور مشورہ کے طور پر ذکر کرنا، جس کی تفصیل ابھی گذر چکی (گواہوں اور حدیث کے راویوں پر کلام بھی اس میں داخل ہے)

۲) جو انصاف دلانے کی قدرت رکھتا ہو، اس سے ظلم کی شکایت کرنا۔

۳) کسی منکر اور حرام سے روکنے میں جو تعاون کر سکتا ہو، اس کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا۔

۴) استفتاء، یعنی اپنے اور مخالف کی تفصیل مفتی کے سامنے پیش کرنا تاکہ شرعی مسئلہ بتادے، گرچہ مخالف کی تعیین ضروری نہ ہو، کیونکہ کبھی تعیین میں کچھ فائدہ ہو سکتا ہے،

۵) جو کسی فسق یا بدعت کو علی الاعلان کرے، اور کسی کے کہنے کی اسے کوئی پروانہ ہو، تو اس کا احترام ساقط ہو چکا، لہٰذا اسکے اس علانیہ گناہ کا ذکر کر سکتے ہیں، دیگر گناہوں کے ذکر کی اجازت نہیں۔

۶) کوئی کسی ایسے وصف کے ساتھ مشہور ہو، جو اسے ناپسند ہو، تو محض تعارف کے طور پر اس کا مشہور نام لینا جائز ہے، گرچہ دوسرے نام کے ساتھ تعارف ممکن ہو، تنقیص کے طور پر مکروہ نام کی گنجائش نہ ہو گی (حاشیۃالجمل ۱۳۱/۴، مغنی ۱۳۷/۳، تحفہ ۲۰/۹، اعانۃ ۲۶۹/۳، نہایۃ ۲۰۶/۶، الفقہ المنہجی ۵۰/۴)

کسی نیک اور متقی شخص کو اپنی بچی سے نکاح کی پیشکش

کسی عورت کے ولی کو، جو اس کا نکاح کرانا چاہتا ہو، سنت ہے کہ کسی صالح اور متقی شخص سے اس سے نکاح کی درخواست کرے، جیسا کہ حضرت شعیب علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی امانت وعفت کو دیکھتے ہوئے ان کے سامنے اپنی بیٹی سے نکاح کی پیشکش رکھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قَالَ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ" (القصص ۲۷)

ترجمہ: "(وہ بزرگ موسی علیہ السلام سے) کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دولڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو"۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے نکاح کے متعلق پہلے حضرت عثمانؓ سے، پھر حضرت ابو بکرؓ سے گفتگو فرمائی، پھر آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔ (بخاری)

خُطبَۃ

منگنی سے پہلے پیغام دینے والے یا اس کے نائب کو خُطبہ پڑھنا سنت ہے جس میں پہلے حمد و صلوٰۃ (اللہ کی ثنا اور درود) اور تقوی کی وصیت ہو، پھر اپنا مقصد پیش کرے، مثلاً: میں تمہاری دختر کو نکاح کا پیغام دینے آیا ہوں۔

لڑکی کے ولی کیلئے بھی اسی طرح خطبہ سنت ہے، جس میں وہ مناسب جواب دے، مثلاً: مجھے بھی اس سے اتفاق ہے، یا اعراض نہیں ہے۔

حدیث: ''ہر اہم کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہ ہو، بے برکت ہے''۔ (ابن ماجہ)

عقد نکاح سے قبل بھی خطبہ سنت ہے، جو زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ سلفِ صالحینؒ سے وارد ہے۔

ائمہ کرام نے حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً و مرفوعاً مروی خطبہ کو پڑھنا بابرکت قرار دیا ہے، فرمایا جب کوئی نکاح یا کسی دوسرے حاجت کا ارادہ کرے تو یہ (خطبہ) پڑھے: '' اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ (نَحْمَدُہٗ) وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ پھر تین آیات تلاوت کرے، بقول سفیان ثوریؒ آیات یہ ہیں: اِتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ . اِتَّقُوْا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا . اِتَّقُوْا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قولاً سَدِیْداً الاٰیۃ'' (رواہ الترمذی وصححہ، وابوداود، نسائی، حاکم، بیہقی، وصححہ ابو عوانہ، وابن حبان۔ فتح الباری ۹/۲۰۲، نیل الاوطار ۶/۱۴۸)

ترجمہ: ''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اسی سے مدد مانگتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، اپنے نفس کے شرور اور برے اعمال سے اللہ کی پناہ، جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جسے وہ گمراہ کردے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا''۔۔۔ اسی خطبہ کو ''خطبہ حاجت'' کہتے ہیں۔

مذکورہ آیات مکمل اس طرح ہیں:

۱) ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْن'' (آل عمران ۱۰۲)

۲) ''یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالاً کَثِیْراً وَّ نِسَاءً واتَّقُوْا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً'' (النساء۔۱)

۳) ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا''۔ (الاحزاب ۷۰۔۷۱)

امام قفال فرماتے ہیں: خطبہ کے بعد یہ پڑھے: ''اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْاُمُوْرَ کُلَّھَا بِیَدِ اللّٰہِ یَقْضِیْ فِیْھَا مَا یَشَاءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ لَا مُؤَخِّرَ لِمَا قَدَّمَ وَلَا مُقَدِّمَ لِمَا اَخَّرَ وَ لَا یَجْتَمِعُ اثْنَانِ فَلَا یُفْتَرِقَانِ اِلاَّ بِقَضَاءٍ وَّقَدْرٍ وَّکِتَابٍ قَدْ سَبَقَ وَاِنَّ مِمَّا قَضَی اللّٰہُ وَقَدَّرَ اَنْ خَطَبَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ فُلَانَہ بِنْتَ فُلَانٍ عَلٰی صَدَاقٍ کذا اَقُوْلُ قَوْلِ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہِ لِیْ وَلَکُمْ اَجْمَعِیْنَ ''۔ فلاں بن فلاں کی جگہ شوہر کا اور فلانہ بنت فلاں کی جگہ بیوی کا نام اور کذا کی جگہ مہر کی مقدار بیان کرے۔

عقد نکاح کے الفاظ (ایجاب و قبول) سے پہلے خطبہ پڑھے۔ ولی، شوہر یا اجنبی کسی بھی شخص کے پڑھنے سے خطبہ کی سنت حاصل ہوگی۔

عقد سے پہلے (یعنی باقاعدہ ایجاب کے کلمات سے پہلے) ولی کو یہ کہنا مستحب ہے: "زَوَّجۡتُكَ عَلٰی مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ مِنۡ اِمۡسَاكٍۭ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ" (اللہ کے حکم کے مطابق معروف و بھلے طریقے سے اپنے نکاح میں رکھنے، یا بہتر طریقے سے آزاد کرنے کی شرط کے ساتھ میں تمہارے نکاح میں دے رہا ہوں) کیونکہ حضرت عمرؓ اس طرح کہا کرتے تھے (ابن ابی شیبہ) پھر ایجاب کے کلمات کہے۔(جمل ۱۳۲/۴۔مغنی ۱۳۸/۳، شرح التنبیہ ۵۹۹/۲، الفقہ المنہجی ۵۲/۴)

منگیتر کے ساتھ تنہائی

اسلامی تعلیمات اور روح سے دور بعض مسلم معاشروں میں محض منگنی کی بنیاد پر دونوں کا ایک دوسرے سے بے تکلف ملاقات، خلوت اور سیر و تفریح کا رواج عام ہے۔ اور دعوی یہ ہوتا ہے کہ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے اخلاق وعادات اور مزاج سے روشناس ہوں گے، حالانکہ دونوں اپنے آپ کو ریاکاری اور اداکاری کے طور پر حقیقت کے خلاف بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور حقیقت بعد میں بے نقاب ہوتی ہے۔

بہر حال نکاح سے قبل اس طرح کا اختلاط وخلوت قطعاً حرام ہے، شریعت میں اس کی کوئی اجازت نہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز تنہائی میں بغیر محرم کے نہ پایا جائے" (متفق علیہ) اور ایک منگیتر بھی نکاح ہونے تک بالکل پرایا اور اجنبی ہے۔

عقلمند لڑکی وہی ہے، جو ایک مرتبہ پیغام کیلئے دیکھنے کے بعد، دوبارہ نکاح ہونے تک اپنے منگیتر کے سامنے بھی نہ آئے۔ دوراندیشی کا بھی یہی تقاضا ہے، ممکن ہے ساتھ گھومنے پھرنے کے بعد اس کا ارادہ بدل جائے، تب پھر اس سے ان تعلقات کو جانتے ہوئے دوسرا کوئی شریف شخص اسے پیغام دینے کی ہمت نہ کرے گا۔(الفقہ المنہجی ۵۳/۴)

منگنی کے بعد تحفہ

منگنی طے، ہونے کے بعد منگیتر خود، یا اس کا وکیل یا ولی لڑکی یا اس کے ولی کو (آئندہ نکاح کے ارادہ کی وجہ سے) کوئی چیز عطا کرے، خواہ کھانے پینے کی اشیاء ہوں، یا نقدی (روپیہ پیسہ)، کپڑے یا زیورات، پھر جانبین سے یا کسی ایک جانب سے (اس رشتہ سے) اعراض پایا جائے، یا دونوں یا ایک انتقال کر جائے، تو دینے والا یا (اس کی موت کے صورت میں اس کا) وارث عطا کردہ تمام اشیاء واپس لے سکتا ہے، جبکہ عقدِ نکاح سے قبل ہو یا عقد کے بعد دخول سے قبل طلاق ہو جائے، یا شوہر مر جائے، دخول کے بعد واپسی کا مطلقاً حق نہیں۔

اگر عطا کردہ چیز تلف ہو چکی ہو، تو اسکا بدل لوٹانا لازم ہے (جمل ۱۲۹/۴)

عقد نکاح کے ارکان

نکاح کے پانچ ارکان ہیں: صیغہ، بیوی، شوہر، ولی، دو گواہ

۱) **صیغہ**: یعنی ولی کی جانب سے ایجاب کے کلمات، مثلاً: زَوَّجۡتُكَ اِبۡنَتِيۡ (میں نے اپنی بیٹی تمہارے زوجیت میں دی) یا اَنۡكَحۡتُكَ اِبۡنَتِيۡ (میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی۔ اور شوہر کی جانب سے قبول کرنا، مثلاً: تَزَوَّجۡتُ اِبۡنَتَكَ (میں نے تمہاری بیٹی کو اپنی زوجیت میں لیا) یا اَنۡكَحۡتُ اِبۡنَتَكَ (میں نے تمہاری بیٹی سے نکاح کر لیا)

حکمت: چونکہ عقد نکاح میں جانبین کی رضامندی ضروری ہے، اور رضامندی تو ایک مخفی امر ہے، جس کی اطلاع نہیں ہو سکتی، لہٰذا شریعت نے ایجاب وقبول کے صیغہ کو جانبین کی اندرونی رضامندی کی ظاہری دلیل قرار دیا۔(بیع کے صیغے کے شرائط یہاں بھی ضروری ہیں۔)

شرائط: ۱) تزویج یا انکاح یا ان دونوں سے مشتق لفظ ہو، مثلاً زَوَّجۡتُكَ، اَنۡكَحۡتُكَ، قَبِلۡتُ تَزۡوِيۡجَهَا، یا قَبِلۡتُ نِكَاحَهَا (میں نے اس کا نکاح قبول کر لیا)

دراصل تزویج اور نکاح یہی دو لفظ لغت اور شریعت میں عقد نکاح پر دلالت کے لئے وضع کئے گئے ہیں، نیز قرآن وحدیث کے نصوص میں بھی یہی دو لفظ مستعمل ہیں،(دیکھئے سورہ نساء۔آیت۔۳، سورہ احزاب۔آیت ۳۷) مسلم کی ایک روایت میں ہے "۔۔۔ عورتوں کی شرم گاہوں کو تم نے کلمۃ اللہ کے ذریعے حلال کیا ہے"۔ اور کلمۃ اللہ تزویج اور انکاح ہے، کیونکہ قرآن میں یہی دو لفظ وارد ہیں، لہٰذا تعبداً واحتیاطاً اسی پر اکتفاواجب ہے۔(مغنی ۱۴۰/۳)

۲) **ایجاب وقبول میں لفظ زواج یا نکاح کی صراحت:** اگر ولی کہے: زَوَّجۡتُكَ ابۡنَتِيۡ، پھر شوہر کہے: قَبِلۡتُ (آگے نکاحھا نہ کہے) تو نکاح منعقد نہ ہو گا۔

اگر شوہر کہے: زَوِّجۡنِيۡ ابۡنَتَكَ (تمہاری بیٹی میری زوجیت میں دے دو) اور ولی کہے: قَبِلۡتُ (میں نے قبول کیا)، تو نکاح منعقد نہ ہو گا، کیونکہ جانبین نے زواج یا نکاح کی صراحت نہیں کی (صرف ایک جانب صراحت پائی گئی)

غیر عربی میں صیغے: عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی نکاح صحیح ہو گا، گرچہ شوہر اور ولی عربی جانتے ہوں، کیونکہ اصل اعتبار مفہوم کا ہے، لہٰذا ان دو کا ترجمہ بھی کافی ہے۔

جس زبان میں بھی صیغے ادا ہوں، جانبین اور گواہوں کا اس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے، نیز ایسا لفظ ہو کہ اہلِ زبان اسے نکاح کیلئے صریح لفظ شمار کرتے ہوں، ایجاب وقبول الگ الگ زبان میں ہوں، تب بھی جائز ہے، جبکہ دونوں ایکدوسرے کے کلمات کا مفہوم سمجھتے ہوں، اگر جانبین یا شاہدین (گواہ) مفہوم سے واقف نہ ہوں، لیکن کوئی معتبر شخص واقف ہو اور ان کو مفہوم سے آگاہ کرے، پھر زیادہ فاصلہ کے بغیر جلد ہی صیغے ادا ہوں، تو نکاح صحیح ہو گا، فاصلہ زیادہ ہو جائے، یا صیغے کی ادائیگی کے بعد مفہوم سمجھائے، تو صحیح نہ ہو گا (جمل مع فتح الوھاب ۱۳۴/۴، اعانۃ ۲۷۶/۳، الفقہ المنہجی ۵۶/۴)

کنایہ الفاظ: کسی بھی زبان کے کنایہ الفاظ سے نکاح منعقد نہ ہو گا، کنایہ سے وہ الفاظ مراد ہیں، جن میں نکاح وغیر نکاح دونوں کا احتمال ہو، م۔ثلاً! میری بیٹی تمہارے لئے حلال کر دی، یا اسے تم کو ھبہ کر دیا، کیونکہ کنایہ میں نیت کی ضرورت ہے، اور محلِ نیت دل ہے، اور نکاح میں گواہوں کا ہونا شرط ہے، اور گواہوں کو دل کی نیت کی اطلاع نہیں کہ اس کے متعلق گواہی دے سکیں۔

تحریر: تحریر وکتابت کے ذریعے عقد نکاح منعقد نہ ہو گا، خواہ طرفین حاضر ہوں یا غائب، لہٰذا اگر ولی کسی غائب یا حاضر کو لکھے: میں نے میری بیٹی تمہارے نکاح میں دی پھر تحریر شوہر کے پاس پہنچی اور اس نے پڑھ کر کہا: میں نے تمہاری بیٹی کا نکاح قبول کر لیا، تو عقد صحیح نہ ہو گا، کیونکہ تحریر کنایہ ہے، اور نکاح کنایہ سے منعقد نہیں ہوتا۔

گونگے کا اشارہ: اگر گونگے کا اشارہ مفہمہ ہو، یعنی ایسا اشارہ ہو، جسے صرف ذہین وفطین لوگ ہی نہ سمجھے (بلکہ عام انسان بھی سمجھ سکے) تو اس سے نکاح منعقد ہو گا، کیونکہ ایسا اشارہ صریح لفظ کے قائم مقام ہے۔

اگر اشارہ واضح نہ ہو، بلکہ خفی ہو، جسے صرف ذہین لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں، تو اس سے نکاح منعقد نہ ہو گا، کیونکہ یہ کنایہ شمار ہو گا۔

لیکن اگر کوئی اشارہ مُفہِمہ نہ کر سکے، اور کسی کو وکیل بنانا بھی دشوار ہو، تو ایسا اشارہ جسے صرف ذہین سمجھیں، یا تحریر کے ذریعے بھی اس کا نکاح صحیح ہو گا۔(جمل۔الفقہ المنہجی ۴/۵۶)

۳) **ایجاب وقبول میں اتصال:** صیغہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایجاب وقبول متصل ہو، اگر لڑکی کا ولی کہے: میں نے بیٹی تیرے نکاح میں دی، پھر شوہر (لڑکا) کافی دیر تک چپ رہا، پھر کہا: میں نے اس کا نکاح قبول کر لیا، تو نکاح صحیح نہ ہو گا، کیونکہ ایجاب وقبول میں طویل فاصلہ ہو چکا۔ اگر معمولی فاصلہ ہو، مثلاً سانس لینے یا چھینک کی وجہ سے، تو اس میں حرج نہیں، نکاح صحیح ہو گا۔

۴) **صیغہ کی تکمیل تک جانبین کی اہلیت کا باقی رہنا:** لہٰذا ولی کے ایجاب کے بعد شوہر کے قبول سے پہلے ولی پاگل یا بے ہوش یا (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے، پھر شوہر قبول کرے، تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔

اسی طرح شوہر ولی سے کہے: تمہاری بیٹی میرے نکاح میں دے دو، پھر ولی کے الفاظ سے قبل شوہر بے ہوش ہو جائے یا مرتد (نعوذ باللہ) ہو جائے تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔

۵) **صیغہ مُنَجَّزْ (فوری ونقد) ہو:** پس عقد نکاح کو مستقبل کی طرف منسوب کرنا، یا کسی شرط پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

اگر ولی کہے: جب رمضان آجائے تو میں نے اپنی بیٹی کا تم سے نکاح کر دیا، پھر شوہر قبول کرے، تو عقد صحیح نہ ہو گا۔

یا ولی کہے: اگر میری بیٹی امتحان میں کامیاب ہو چکی ہو تو میں نے تم سے اسکا نکاح کر دیا، اور شوہر قبول کر لے، تو نکاح صحیح نہ ہوا، کیونکہ عقد نکاح کا منجز (یعنی فی الحال ہی مکمل) ہونا واجب ہے۔

۶) **صیغہ مُطۡلَقۡ ہو** (یعنی عارضی اور کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو): اگر کسی نے متعینہ مدت کی قید کے ساتھ نکاح کیا تو صحیح نہ ہو گا، مثلاً ولی کہے: میں نے تم سے بیٹی کا نکاح ایک ماہ یا ایک سال یا فلاں کے آنے تک کے لئے کیا، اور شوہر نے قبول بھی کر لیا، تو یہ نکاح صحیح نہ ہو گا، کیونکہ یہ نکاح مُتعہ ہے، جو حرام ہے، صحیحین وغیرہ میں موجود ہے کہ نکاح متعہ پہلے جائز تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔ (تلخیص ۳/۱۵۴) کیونکہ اس سے مجرد لطف اندوزی مقصود ہے اولاد اور دیگر اغراضِ نکاح مقصود نہیں۔ اگر تبرکاً یا اس نیت سے کہ تمام امور اللہ کی مشیت سے ہیں، صیغہ کے ساتھ انشاء اللہ کہے، تو نکاح صحیح ہو گا، اور تعلیق کے قصد سے یا مطلقاً (بلا کسی قصد کے) کہے تو صحیح نہ ہو گا۔(فتح الوھاب مع الجمل ۴/۱۳۳)

نکاح شغار

حدیث: ”آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ نے شِغار سے منع فرمایا، اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی (دوسرے کو) اس شرط پر بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے، دونوں کے درمیان کوئی مہر نہ ہو“۔(صحاح ستہ۔المجموع ۱۶/۲۶۴)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ”اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کا، یا کسی ایسی لڑکی جس کا یہ ولی ہے، خواہ کوئی بھی ہو، کسی سے اس شرط پر نکاح کر دے، کہ وہ اپنی بیٹی یا کسی بھی زیر ولایت لڑکی کا نکاح اس سے کر دے، بشرطیکہ ہر ایک کا مہر دوسری کی شرم گاہ ہو گی، اور کسی ایک کیلئے بھی (صحیح) مہر مقرر نہ ہو، تو یہ وہی شِغار ہے، جس سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ نے منع فرمایا ہے، پس یہ نکاح حلال نہیں، بلکہ مفسوخ (فسخ) ہے۔“ ”اگر ہر ایک اس نکاح میں متعلقہ لڑکی سے صحبت کرے، تو ہر ایک لڑکی کو مہر مثل ملے گا، اور عدت گذارنی ہو گی، تمام احکام میں یہ نکاح فاسد کی طرح ہے“۔(اَلْاُم۔۵/۱۱۳)

اگر شرم گاہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور مہر بھی متعین کریں، مثلاً دونوں یوں کہیں: ہر ایک کی شرم گاہ اور ہزار روپئے دوسری کا مہر، تب بھی یہ نکاح صحیح نہ ہو گا۔

اگر شرم گاہ کو مہر متعین نہ کریں، صرف یوں کہے: میری بیٹی اس شرط پر تمہارے نکاح میں دی کہ تم اپنی بیٹی میرے نکاح میں دو، (اور دوسرا قبول کرے) تو نکاح صحیح ہو گا، اور دونوں کو مہر مثل واجب ہو گا۔

اگر شرم گاہ کے علاوہ کچھ اور مہر متعین کریں: مثلاً کہے: میری بیٹی تمہارے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ تمہاری بیٹی میرے نکاح میں، اور دونوں کا مہر ہزار ہزار روپیہ ہو گا (اور دوسرا قبول کرلے) تو دونوں نکاح صحیح ہیں، لیکن مقررہ مہر کا اعتبار نہ ہو گا، بلکہ دونوں کیلئے مہر مثل واجب ہو گا۔

اگر صرف ایک کے فرج (شرمگاہ) کو مہر ٹھہرائے تو صرف اسی کا نکاح باطل ہو گا، لہٰذا اگر اس طرح کہے: میری بہن کا تم سے نکاح کر دیا بشرطیکہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دو اور تمہاری بیٹی کا فرج میری بیٹی کا مہر ہو گا، تو پہلا نکاح (یعنی کہنے والی کی بیٹی کا) مہر مثل پر صحیح اور دوسرا باطل ہے۔ اس کے برعکس اپنی بیٹی کا فرج مخاطب کی بیٹی کا مہر قرار دے، تو پہلا باطل اور دوسرا صحیح ہو گا۔ اور مہر مثل واجب ہو گا۔ (المجموع ۲۴۸/۱۶، المغنی ۱۴۳/۳، نہایۃ ۲۱۵/۶، تحفہ ۸۲/۹، جمل ۱۳۶/۴)

۲- نکاح کا دوسرا رکن 'بیوی' ھے: جس کے شرائط حسبِ ذیل ہیں:

الف: اس میں نکاح کے مواقع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو (بعض کا ذکر پیغام میں گذر چکا، اور بعض مواقع کا تذکرہ آئندہ ہو گا) (لہٰذا کسی کی منکوحہ یا معتدہ سے نکاح صحیح نہ ہو گا (جمل)

ب: بیوی معین ہو، اگر ولی یوں کہے: میں نے اپنی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی تمہارے نکاح میں دی، تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔

ج: بیوی حج یا عمرہ کے احرام میں نہ ہو، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''محرم نہ نکاح کرلے، اور نہ نکاح کرائے'' (مسلم شریف) یعنی لڑکا یا لڑکی احرام میں نکاح نہ کریں، اور کسی محرم کے ساتھ کوئی کسی محرمہ یا غیر محرمہ کا نکاح نہ کرائے۔

حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ نے احرام کے نکاح کو ختم کر دیا تھا (مالک، بیہقی۔ الحاوی مع التعلیق ۳۳۶/۹)

کوئی عورت زنا سے حاملہ ہو، تو اس سے زانی یا دوسرا کوئی کراہت کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے، (بغیہ ۲۰۱)

۳- شوھر: اس کے شرائط درج ذیل ہیں:

الف: شوہر ایسا ہو کہ متعلقہ لڑکی کے ساتھ اسے نکاح حلال ہو، یعنی اس پر حرام مردوں میں سے نہ ہو۔

ب: معین ہو، لہٰذا ولی دو آدمیوں کو مخاطب کر کے کہے کہ: میں نے تم میں سے ایک کے نکاح میں بیٹی دے دی، تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔

ج: شوہر احرام میں نہ ہو، جیسا کہ مسلم کی روایت میں گذرا، شوہر محرم ہو تو وکیل کے ذریعے بھی نکاح صحیح نہ ہو گا (فتح الوھاب)

د: اختیار، شوہر اپنے اختیار سے نکاح کرلے، لہٰذا جبراً کسی لڑکی کے ساتھ اس کا نکاح کریں، تو صحیح نہ ہو گا، اگر کسی نے باری کے سلسلے میں کسی بیوی کا حق مار کر اسے طلاق دی، پھر اس حق کی تلافی کیلئے جبراً نکاح کرایا گیا، تو نکاح صحیح ہو گا، کیونکہ یہ جبر واکراہ برحق ہے۔ (جمل ۱۳۸/۴)

۴- ولی: جس کا قول وفیصلہ کسی دوسرے پر نافذ ہو، خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو، اسے ولی (سرپرست) کہا جائے گا۔

حکمت: جو خود نا اہل ہوں، ان کی مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے ولایت کو مشروع کیا گیا ہے، تاکہ ان کے حقوق کی صحیح حفاظت ہو سکے۔

لڑکی چاہے بالغہ ہو یا نابالغہ (کمسن)، ثیبہ (شادی شدہ) ہو، یا باکرہ (کنواری) ہر حال میں اس کے نکاح کے لئے ولی ضروری ہے۔ لہٰذا کوئی عورت بذاتِ خود نہ اپنا نکاح کر سکتی ہے، اور نہ کسی دوسرے کا نکاح کرا سکتی ہے، خواہ (ولی کی) اجازت سے ہو، یا بغیر اجازت، نیز اس سے ایجاب صادر ہو، یا قبول۔

احادیث: ۱) حضرت معقلؓ کی بہن کو شوہر نے طلاق دی، پھر عدت کے بعد دوبارہ پیغام دیا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا، حالانکہ وہ عورت خود بھی ان کے نکاح میں جانا چاہتی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ) (پھر ان کو نکاح سے نہ روکو) (بخاری) (مذکورہ آیت کیلئے دیکھئے سورہ بقرہ ۲۳۲)

امام شافعیؒ کتاب الام میں مذکورہ آیت وروایت کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی واضح ترین آیت ہے کہ عورت کے متعلق اس کے ساتھ ولی کو بھی حق حاصل ہے۔ اور روکنے سے اسی کو منع کریں گے جسے اس کا حق حاصل ہو، اور اس کی اجازت کے بغیر نکاح مکمل نہ ہو۔ (الام۔ ۲۱/۶)

۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے: "بغیر ولی کے نکاح (درست) نہیں" (احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم واطال فی تخریج طرقہ۔۔۔ثم سرد تمام ثلاثین صحابیا)

۳) "جو عورت بھی اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کرلے، تو اس کا نکاح باطل ہے"۔۔۔ (الشافعی، احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، ابوعوانہ، ابن حبان، حاکم)

۴) آپ ﷺ نے فرمایا: "نہ تو عورت کسی عورت کا نکاح کرے، اور نہ خود اپنا" (دارقطنی باسناد علی شرط الشیخین کما فی ارشاد الساری، وابن ماجہ والبیہقی) (تلخیص الحبیر ۱۵۷/۳)

حکمت: حیا عورت کا زیور ہے، اور خود اپنا نکاح انجام دینا اس کے منافی اور محاسنِ عادات کے خلاف ہے، لہٰذا اس کے حق میں ولی کو مشروط قرار دیا گیا۔

بغیر ولی کے نکاح: اگر کوئی عورت بغیر ولی کے خود ہی نکاح کرلے، تو یہ نکاح باطل ہے، اب اگر اس نکاح میں دخول (صحبت) ہو جائے، تو دونوں میں جدائی واجب ہے، کیونکہ عقد باطل ہے، اور عورت مہر مثل کی مستحق ہو گی۔ بغیر ولی کے نکاح کی صحت میں علماء کے اختلاف کی وجہ سے ایسے نکاح میں صحبت کرنے والے پر حد زنا کا نفاذ نہ ہو گا، کیونکہ یہ اختلاف شبہ کا باعث بن گیا، اور حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہوتی ہیں، البتہ تعزیری سزا کا مستحق ہو گا یعنی حاکم کوئی مناسب سزا تجویز کرے جو حد سے کم ہو۔

نکاح میں اولیاء (جمع والی) کی ترتیب: باپ سب پر مقدم ہو گا، پھر دادا (پھر پردادا اوپر تک)، پھر حقیقی بھائی (یعنی لڑکی اور اس بھائی کے ماں باپ ایک ہوں)، پھر باپ شریک بھائی (دونوں کا باپ ایک اور ماں جدا ہوں) پھر حقیقی بھائی کا بیٹا (حقیقی بھتیجہ)، پھر باپ شریک بھائی کا بیٹا، پھر حقیقی چچا، (باپ کا حقیقی بھائی)، پھر علاتی چچا (باپ کا باپ شریک بھائی)، پھر حقیقی چچا کا بیٹا، پھر علاتی چچا کا بیٹا، اسی طرح میراث کی ترتیب پر دیگر عصبات ولی بنیں گے۔

اگر کوئی عصبہ ماں شریک بھائی بھی ہو، اور عصبہ ہونے میں دونوں برابر ہوں، تو ماں شریک بھائی مقدم ہو گا (مثلاً کسی لڑکی کے

دو چچازاد بھائی میں ایک اس کا ماں شریک بھائی بھی ہو، تو وہ مقدم ہو گا)

اگر عصبات میں سے کوئی نہ ہو، اور یہ لڑکی پہلے باندی رہ چکی ہو تو اس کو آزاد کرنے والا آقا ولی بنے گا، پھر اس کے عصبہ وراثت کی ترتیب سے ولی ہوں گے۔

مذکورہ اولیاء میں سے کوئی نہ ہو، تو سلطان (بادشاہ) ولی ہو گا۔ یہاں اور آئندہ مسائل میں سلطان میں قاضی (جج حاکم) اور (حکومت کی جانب سے) نکاح کا ذمہ دار بھی داخل ہے۔ لہٰذا یہ حضرات ان لڑکیوں کا نکاح کرا سکتے ہیں، جو ان کے محلِ ولایت اور دائرہ حکمرانی میں ہوں، گرچہ وہاں سے گذر رہی ہو (مستقل اس علاقہ میں سکونت نہ ہو)، یا محل ولایت سے باہر ہوتے ہوئے اسے اجازت دی ہو، پھر علاقہ میں لوٹنے کے بعد اس کا نکاح کر دے۔ (جمل ۱۵۰/۴، تحفہ ۱۲۷/۹)

حدیث: "۔۔۔۔ بس سلطان اس کا ولی ہے، جسکا کوئی ولی نہیں" (ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)

تنبیہ: (آج کل نکاح پڑھانے کیلئے عموماً جو قاضی مقرر ہوتے ہیں وہ مذکورہ سلطان و قاضی کے حکم میں داخل نہیں ہیں۔ اور شرعاً نکاح کیلئے وہ کوئی شرط نہیں ہیں۔ عموماً چونکہ لوگ صیغے وغیرہ کی صحیح ادائیگی سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے انھیں مقرر کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب)

بیٹا: کسی عورت کا بیٹا، بیٹا ہونے کے ناطے اس کا ولی نہیں بن سکتا۔ اگر ولایت کا کوئی سبب اس میں ہو، تو ولی بنے گا، بیٹا ہونا ولایت سے مانع نہ ہو گا، مثلاً چچازاد بھائی سے نکاح ہو، تو پیدا ہونے والا بیٹا آئندہ چچازاد بھائی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ولی بنے گا۔ اسی طرح بیٹا قاضی یا سلطان ہو، تو اس اعتبار سے اپنی والدہ کا ولی بنے گا۔ (فتح الوھاب) اگر کہیں حاکم ہی نہ ہو تو جانبین کسی عادل شخص کو حَکَم (فیصل) بنائیں، جو ان کا نکاح کر دے، خواہ وہ مجتہد نہ ہو، اگر حاکم موجود ہو تو کسی مجتہد کو ہی حکم بنا سکتے ہیں، لیکن حاکم نکاح کیلئے عرفاً بڑی رقم وصول کرتا ہو، تو کسی عادل کو حکم بنانا کافی ہے، گرچہ وہ مجتہد نہ ہو، مسئلہ سفر میں در پیش ہو، یا اقامت میں۔ اگر کوئی بھی نہ ملے اور لڑکی کو زنا کا اندیشہ ہو، تو لڑکی خود اپنا نکاح کر لے، بشرطیکہ اسکے اور ولی کے درمیان مسافتِ قصر ہو، پھر آبادی میں پہنچ جائیں، تو تجدید عقد کر لیں، جبکہ سابقہ نکاح کو صحیح قرار دینے والے امام کی تقلید نہ کی ہو۔

حکم (فیصل) بنانے کی صورت میں جانبین کی طرف سے لفظ ضروری ہے، مثلاً لڑکا اور لڑکی دونوں اسے کہیں، میں نے میرے نکاح کے لئے تم کو حکم بنایا یا تمہیں نکاح کی اجازت دی، یا میر افلاں سے نکاح کر دو، یا میں نے تمہیں وکیل بنایا وغیرہ۔ اگر کنواری لڑکی سے حکم یہ کہے کہ مجھے حکم بناؤ اور وہ چپ رہے، تو یہ بھی کافی ہے، امام اذرعی کے نزدیک ولی غائب ہو، تب بھی حکم بنا سکتے ہیں۔ (بجیرمی علی الاقناع ۳۴۲/۳۔ بغیۃ المسترشدین ۲۰۷)

ولی کے شرائط:

(الف) اسلام: کافر کسی مسلمان عورت کا نکاح نہیں کرا سکتا، کیونکہ اسے کسی مسلمان پر ولایت نہیں، ارشاد باری ہے: "**وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا**" (النساء ۱۴۱) ترجمہ: "اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ ہرگز نہ دے گا۔"

نیز ولایت کی بنیاد میراث میں عصبیت پر ہے، اور ایک مسلمان و کافر کے درمیان میراث نہیں چلتی۔

ایک کافر کسی کافرہ کا نکاح پڑھا سکتا ہے، خواہ دونوں کا عقیدہ الگ الگ ہو، پس یہودی نصرانی کا، اور نصرانی یہودیہ عورت کا نکاح کرا سکتا ہے، کیونکہ کفر کے تمام اقسام ایک ہی ملت ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "**وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ**"۔

(الانفال۷۳)

ترجمہ: "اور جو لوگ کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں"۔

(ب) عدم فسق: ولی کا فاسق نہ ہونا شرط ہے۔

حدیث: "بغیر مُرشِد ولی کے نکاح (صحیح) نہیں" (رواہ الشافعی فی مسندہ بسند صحیح) امام شافعیؒ نے فرمایا: حدیث میں مرشد سے عادل ہونا مراد ہے۔

نیز فسق ایسی کمی ہے، جو گواہی کے منافی ہے، لہٰذا ولایت کے بھی منافی ہوگی اکثر متأخرین (اصحاب نے فاسق کی ولایت کو اختیار کیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ: "فاسق کی ولایت ختم کرنے کی صورت میں اگر فاسق حاکم کی طرف منتقل ہو، تو یہ ولی بنے گا، ورنہ نہیں، یعنی فاسق کی ولایت ختم کرنے کی صورت میں اگر اس کے دور کا غیر فاسق ولی (ولی ابعد) یا غیر فاسق حاکم ولی بنتا ہو، تو ولایت ختم کریں گے، ورنہ اس کی ولایت برقرار رہے گی، کیونکہ فسق کافی عام ہو چکا ہے"، روضہ میں اس قول کو مستحسن قرار دیا، اور فرمایا کہ اسی پر عمل ہونا چاہئے، اور ابن الصلاح، سبکی اور اذرعی رحمہم اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، دیگر کئی حضرات نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ لیکن منہج، مغنی المحتاج اور نہایۃ المحتاج میں پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

اقرب ولی فاسق ہو تو ولایت ابعد (اس کے بعد والے ولی) کی طرف منتقل ہوگی۔ امام اعظم (خلیفہ، بادشاہ) فسق کی وجہ سے معزول نہ ہوگا، لہٰذا اپنی اور دیگر لڑکیوں کا نکاح ولایتِ عامہ کے تحت کرے گا، اسکے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو یہ خصوصیت دی گئی۔ اگر کوئی فاسق صحیح توبہ کرلے تو فوراً نکاح کرا سکتا ہے، گرچہ مظالم کو لوٹانا اور نمازوں کی قضا وغیرہ شروع نہ کی ہو، جبکہ توبہ کے شرائط پائے جائیں، اسلئے کہ اصل شرط فاسق نہ ہونا ہے، نہ کہ عادل ہونا، اور ان کے درمیان واسطہ ہے، اسی لئے مستور جو ظاہر العدالۃ ہو، نکاح کرا سکتا ہے۔ (نہایۃ ۲۳۹/۶۔ مغنی ۱۵۵/۳، تحفہ ۱۳۹/۹، جمل ۱۵۵/۴، قلائد ۱۰۶/۲، بغیہ ۲۰۳)

(ج) بلوغ: پس بچہ کسی کا ولی نہیں بن سکتا، اسے جب اپنی ذات پر ولایت نہیں، تو کسی دوسرے پر تو بدرجہ اولیٰ نہ ہوگی۔

(د) عقل: لہٰذا کسی پاگل کو ولایت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ اسے تو اپنے آپ پر بھی ولایت نہیں ہے۔

(ھ) غور و فکر اور توجہ پر خلل انداز آفات سے سلامتی: انتہائی بڑھاپے یا عقل سٹھیا جانے کی وجہ سے جو صحیح سوچ اور غور و فکر پر قادر نہ ہو، اسے ولایت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ یہ حضرات مناسب رشتے کے اختیار سے عاجز ہیں۔

اگر کوئی بے ہوش ہو تو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے، کیونکہ یہ نیند کی طرح جلد ختم ہونے والا عذر ہے، اگر تین دن تک بھی افاقہ نہ ہو، تو ولایت اس کے بعد والے کی طرف منتقل ہوگی (بجیرمی)

نابینا شخص ولی بن سکتا ہے، کیونکہ وہ سن کر مصلحت اور بہتری کو سمجھ سکتا ہے۔ (شرح التنبیہ للسیوطی ۵۹۵/۲)

(و) سفاہت کی وجہ سے محجور نہ ہو: یعنی مالی فضول خرچی کی وجہ سے اس پر پابندی عائد نہ ہو، کیونکہ ایسا شخص خود اپنا ولی نہیں، تو دوسرے پر کیسے ولی بنے گا۔

اگر سفاہت اور اسراف و فضول خرچی کی وجہ سے اس پر پابندی نہ ہو تو وہ ولی بنے گا مفلسی کی وجہ سے پابندی ولایت سے مانع نہیں، کیونکہ یہ پابندی قرض خواہوں کی وجہ سے، نہ کہ اس میں کسی نقص کی وجہ سے (جمل مع فتح الوھاب ۱۵۶/۴)

(ز) حلال ہو (احرام میں نہ ہو): جو حج یا عمرہ کے احرام میں ہو، وہ نکاح نہیں کرا سکتا، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں

گذر چکا۔

شوہر یا ولی احرام میں ہوں، تو ان کا وکیل نکاح نہیں کر سکتا، گرچہ وہ احرام میں نہ ہو، کیونکہ وہ تو محض ایک سفیر اور واسطہ ہے، اور حقیقتاً عقد موکل انجام دے رہا ہے، وکیل موکل کے احرام کی وجہ سے معزول نہ ہوگا، بلکہ اس کا احرام مکمل کھلنے کے بعد نکاح کرائے گا اگر کسی نے احرام سے قبل وکیل بنایا، تب بھی احرام کے بعد (بحالتِ احرام) وہ نکاح نہیں کرا سکتا۔ اگر احرام میں کسی کو وکیل بنائے، اور وہ احرام کھلنے کے بعد نکاح کرائے تو جائز ہے۔

اگر سلطان یا قاضی احرام باندھیں، تو ان کے نائبین نکاح کرا سکتے ہیں، کیونکہ ان کا تصرف ولایت کی وجہ سے ہے، نہ کہ وکالت کی بنیاد پر (فتح الوھاب مع الجمل ۱۵۸/۴)

تنبیہ: کسی قریبی ولی میں مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو ولایت اس کے بعد والے کی طرف منتقل ہو گی۔ (مثلاً باپ پاگل ہے تو دادا ولی بنے گا) جس میں تمام شرائط موجود ہوں، سوائے مُحرِم کے، بلکہ ولی احرام میں ہو تو یہ حق سلطان کی طرف منتقل ہو گا۔

ولایت کے اقسام: نکاح کے ولایت کی دو قسمیں ہیں: ۱) ولایتِ اِجبَارْ (۲) ولایتِ اختیار

۱) **ولایت اجبار:** (یعنی لڑکی کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کا نکاح کر دینے کا حق)، یہ ولایت صرف باپ اور دادا (اوپر تک) کو حاصل ہے، دیگر اولیاء کو حاصل نہیں۔

ولایتِ اجبار صرف باکرہ (کنواری) بیٹی پر حاصل ہے، خواہ وہ کمسن ہو یا بالغہ، عاقلہ ہو یا پاگل، پس باپ دادا کو اس کی اجازت و مرضی کے بغیر اسکے نکاح کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ اس کی مصلحت سے زیادہ واقف ہو گا، اور اس کے حق میں حد درجہ شفقت کی وجہ سے اس کی مصلحت کا پہلو اختیار کرے گا۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ثَیِّبہ (پہلے شادی شدہ) اپنے نفس کا ولی کے مقابلہ میں زیادہ حق رکھتی ہے۔۔۔" (مسلم وغیرہ) اس کا مفہوم یہ بتلا رہا ہے کہ کنواری کا ولی اس کے مقابلے میں زیادہ اختیار رکھتا ہے، البتہ اس اجبار کی صحت کے چند شرائط ہیں: (الف) لڑکی کے اور ولی کے درمیان ظاہری دشمنی نہ ہو (یعنی ایسی دشمنی جس کی اھل محلہ کو خبر ہو) (ب) شوہر لڑکی کا کفو ہو (ج) شوہر معجل مہر کی ادائیگی پر قادر ہو۔ (د) لڑکی اور شوہر میں عداوت و دشمنی نہ ہو۔ ان میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو لڑکی کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح نہ ہو گا۔

اجبار کے جواز کیلئے شرط ہے کہ نکاح مہر مثل پر ہو جو معجل (فوری) اور بستی میں رائج نقدی میں ہو، اگر وہاں کی عادت ادھار یا غیر رائج نقدی کی ہو تو حرج نہیں، اس شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں نکاح صحیح ہو گا، لیکن اس طرح کرنا جائز نہیں، اور مہر مثل واجب ہو گا۔ (جمل ۱۴۸/۴)

کنواری لڑکی کی اجازت کی ترغیب: باپ دادا کو گرچہ اجبار کا حق حاصل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی مرضی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرح جبراً نکاح کرنا افضل ہے، بلکہ افضل اور مستحب یہ ہے کہ اس کی خوشی اور مرضی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نکاح کے سلسلہ میں اس سے اجازت لی جائے، لڑکی کو رشتہ ناپسند ہو تو وہاں نکاح کرانا مکروہ ہے، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"۔۔۔ کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کی اجازت چپ رہنا ہے"۔ (مسلم۔ ترمذی) اجازت کا یہ حکم بطور سنت کے ہے، جبکہ وہ مکلفہ ہو، کیونکہ کمسن لڑکی کی اجازت کا سوال نہیں، بعض علماء نے ممیزہ لڑکی سے اجازت کو مستحب قرار دیا

ہے، اسی طرح لڑکی کی والدہ سے بھی مشورہ کرنا اور اجازت لینا سنت ہے۔

بہتر ہے کہ لڑکی کے پاس کسی ایسے معتبر عورت کو روانہ کرے، جس سے وہ ہچکچائے نہیں، تاکہ اس کے دل کی بات معلوم کرلے، والدہ کے ذمہ سونپنا زیادہ بہتر ہے۔

باپ یا دیگر اولیاء کی جانب سے اجازت چاہنے کی صورت میں کنواری لڑکی کا چپ رہنا بھی اجازت ہے (یعنی زبان سے اثبات میں جواب ضروری نہیں) جبکہ کوئی ظاہری قرینہ انکار کا نہ ہو، مثلاً چلا کر رونا، چہرہ پیٹنا وغیرہ، صرف سکوت کے ساتھ رونا، اجازت سمجھا جائے گا۔

چپ رہنا صرف نکاح کی حد تک اجازت سمجھیں گے، گرچہ غیر کفو میں ہو، مہر مثل سے کم یا نقدِ بلد کے علاوہ مہر کے سلسلہ میں صرف سکوت کافی نہیں سکوت کی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔ بعض علماء نے غیر کفو میں نکاح کے لئے سکوت کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ زبانی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اجازت میں شوہر کی تعیین ضروری نہیں ہے (تحفہ ۱۱۶/۹، مغنی ۱۵۰/۳، نہایۃ ۲۳۱/۶، قلائد ۱۰۰/۲)

۲) ولایتِ اختیار: (اس ولایت میں ولی لڑکی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرا سکتا): باپ دادا کے علاوہ گذشتہ ترتیب کے مطابق دیگر تمام اولیاء کو ولایتِ اختیار حاصل ہے۔ (یہ اولیاء کسی کا بھی نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتے) نیز ثیبہ (شادی شدہ) عورت کا نکاح باپ دادا بھی دیگر اولیاء کی طرح اس کی صریح اجازت کے بغیر نہیں کرسکتے۔

حدیث: ۱-"بیوہ کا نکاح اس کا اَمر (حکم) لے کر ہی کیا جاسکتا ہے" (بخاری، مسلم)

۲-"۔۔۔ ثیبہ کو اپنے نفس کا ولی کے مقابلہ میں زیادہ حق حاصل ہے۔۔۔" (مسلم، ترمذی)

حکمت: چونکہ ثیبہ نکاح کے مقاصد سے واقف ہو چکی، اور اسے تجربہ حاصل ہو چکا، اس لئے اس کی اجازت ضروری ہوئی، نیز شوہر سے ازدواجی تعلقات کی وجہ سے کنواری جیسی حیاء باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس کی جانب سے صراحت کو لازم قرار دیا گیا۔ (صرف سکوت کافی نہیں)

ثیّبہ: (ثیبہ در حقیقت شادی شدہ عورت کو کہا جاتا ہے، لیکن مسئلہ کے اعتبار سے اس کے مفہوم میں کچھ توسیع ہیں)

جس عورت کی دوشیزگی (کنوارپن) حلال، یا حرام صحبت سے یا شبہ کی صحبت سے ختم ہو جائے، وہ ثیبہ کہلائے گی، خواہ عورت بوقتِ صحبت نیند وغیرہ کی کیفیت میں ہو۔ بغیر صحبت کے اس کا ازالہ ہو، تب بھی باکرہ (کنواری) ہی کہلائیگی، مثلاً تیز ٹھوکر یا گرنا، حیض کی تیزی، یا انگلی وغیرہ کے ذریعہ اسے ختم کرے تو وہ ثیبہ نہ ہوگی۔ نیز پچھلی شرم گاہ میں صحبت سے بھی ثیبہ شمار نہ ہوگی۔ جو عورت اس پردہ کے بغیر پیدا ہو، وہ باکرہ ہی شمار ہوگی۔ جس کی بکارت کا ازالہ انسان کے علاوہ کسی جانور کی صحبت سے ہو، وہ ثیبہ شمار ہوگی۔ صحبت کے باوجود کسی عورت کا پردہ بکارت (فرج کے اندر ہونے کی وجہ سے) باقی ہو، تو بعض فقہاء اسے ثیبہ اور بعض باکرہ ہی شمار کرتے ہیں۔ کوئی مکلفہ عورت باکرہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو بغیر قسم کے مان لیں گے، گرچہ وہ فاسقہ ہو، لہٰذا اس کی اجازت میں سکوت کافی ہوگا، اور باپ دادا کو بغیر اجازت کے اس کے نکاح کا اختیار ہوگا۔

شادی سے قبل کوئی عورت اپنے ثیبہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو قسم کے ساتھ اس کا دعویٰ تسلیم کیا جائے گا، گرچہ اس سے قبل اس کی شادی نہ ہوئی ہو، اور صحبت کے متعلق اس سے پوچھنے اور تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ولی کسی عورت کا نکاح زبان سے اس کی اجازت کے بغیر کردے، پھر وہ عورت ثیبہ ہونے کا دعویٰ کرے، تو اس صورت میں ولی کی بات مع قسم معتبر ہوگی، کیونکہ عورت کی تصدیق کی صورت میں نکاح کا ابطال لازم آتا ہے (نہایۃ ۲۳۰/۶، مغنی ۱۵۰/۳، تحفۃ ۱۱۸/۹، جمل ۱۵۰/۴، بجیرمی علی الاقناع ۳۵۲/۳)

کمسن ثیبہ: جو ثیبہ ابھی نابالغہ ہو، اس کا نکاح باپ دادا یا کوئی اور ولی بلوغ تک نہیں کر سکتے، کیونکہ اجازت کے بغیر اس کا نکاح جائز نہیں، اور بغیر بلوغ کے اجازت معتبر نہیں۔

ولی کا لڑکی کو نکاح سے روکنا: ایک عاقلہ بالغہ لڑکی کفو میں نکاح کا مطالبہ کرے، تو ولی پر اس کا نکاح کرا دینا لازم ہے، لڑکی کنواری ہو یا ثیبہ، نکاح مہر مثل پر ہو، یا کم پر، اگر ولی نہ کرے، گرچہ باپ ہو، تو سلطان اس کا نکاح کرائے گا، کیونکہ یہ ولی کی ذمہ داری تھی، جب وہ نہیں نبھاتا، تو حاکم نبھائے گا۔ حاکم کے نکاح کرانے کے لئے ولی کا روکنا ثابت ہونا ضروری ہے، یعنی حاکم اسے حکم دینے کے باوجود وہ انکار کرے، یا چپ رہے، اور جانبین یا ان کے وکیل حاضر ہوں، اور اس کی روپوشی کی صورت میں گواہوں کے ذریعے انکار ثابت ہو۔ اگر ولی تین مرتبہ لڑکی کو نکاح سے روکے، گرچہ ایک ہی نکاح میں ہو، اور اس کی طاعات اس کے گناہوں پر غالب نہ ہوں، تو اس کی وجہ سے ولی فاسق ہو گا، اور بعد والا ولی نکاح کرائے گا، غیر کفو میں نکاح کا مطالبہ کرے تو ولی روک سکتا ہے۔ نابالغہ کے مطالبہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر لڑکی ایک رشتہ پسند کرے، اور باپ دوسرا، (اور دونوں کفو میں ہوں)، تو باپ لڑکی کی پسند کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی پسند میں نکاح کرا سکتا ہے، جبکہ لڑکی کنواری ہو، کیونکہ باپ تفصیل اور مصلحت سے زیادہ واقف ہو گا۔ (شرح التنبیہ للسیوطی ۵۹۲/۲، ترشیح المستفیدین ۳۱۳)

ولی کی غیر موجودگی: قریبی ولی مسافت قصر یا اس سے دور ہو، تو ولایت بعد والے کی طرف منتقل نہ ہو گی، بلکہ بستی کا حاکم اس کا نکاح پڑھائے گا، کیونکہ غائب ولی ہے، اور یہ اس کا حق ہے، لہٰذا فی الحال اس حق کی تحصیل دشوار ہو، تو حاکم اس کا نائب ہو گا۔ اگر ولی مسافتِ قصر کے اندر ہی ہو، تو سلطان اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرائے، کیونکہ مسافتِ قریب ہونے کی وجہ سے اس سے مراجعت سہل ہے، لہٰذا یا تو وہ خود حاضر ہو جائے یا کسی دوسرے کو وکیل بنادے لیکن کسی خوف یا فتنہ کی وجہ سے ولی تک پہنچنا متعذر دشوار ہو، یا بستی میں قید میں ہو، اور وہاں پہنچنا متعذر ہو، تو قاضی نکاح کرا سکتا ہے۔ اسی طرح جو مفقود الخبر ہو، کہاں ہے اور زندہ ہے یا نہیں کچھ پتہ نہ ہو، تو قاضی نکاح کرائے۔ لیکن مفقود کے موت کا فیصلہ ہو جائے تو بعد والے ولی کو حق ملے گا۔ (مغنی ۱۵۷/۳، تحفہ ۱۴۴/۹)

ایک سے زائد اولیاء: کسی عورت کے ایک ہی درجہ کے کئی ولی ہوں، مثلاً کئی بھائی، یا چچا وغیرہ تو ان میں جو نکاح کے مسائل سے زیادہ واقف ہو، اس کا نکاح کرانا مستحب ہے، کیونکہ اسے شرائط کا زیادہ علم ہے۔ اس کے بعد جو زیادہ متقی و نیک ہو وہ پڑھائے، پھر جو عمر میں آگے ہو، وہ مقدم ہو گا، کیونکہ اس کو تجربہ زیادہ ہو گا بہتر ہے کہ ان میں سے ہر کوئی دیگر ولیوں کی رضامندی سے نکاح کرالے تاکہ تمام کی رائے متفق ہو، اگر اولیاء میں اختلاف ہو، اور ہر کوئی نکاح کرانا چاہے، تو اس نزاع کے حل کے لئے قرعہ اندازی کرنا واجب ہے، جس کے نام قرعہ نکلے، وہ نکاح کرائے۔

اگر فضلیت میں کم درجہ کا ولی، یا جس کے نام قرعہ نہیں نکلا، وہ نکاح کرائے، اور لڑکی ہر ولی کو اجازت دے چکی تھی، تو یہ نکاح صحیح ہو گا۔ اگر لڑکی کسی ایک ولی کو اجازت دے، تو دوسرے کسی کا نکاح کرانا صحیح نہ ہو گا۔

اگر بالغہ لڑکی باپ دادا سے، یا دوسرا کوئی ولی ہو تو اس سے کسی کفو کے رشتہ میں نکاح کرانے کی درخواست کرے، تو اسے تسلیم کرنا واجب ہے، تاکہ اس کی آبرو محفوظ رہے، اگر انکار کرے تو گنہگار ہو گا، (مغنی المحتاج ۱۶۰/۳)

وکالت: باپ دادا اپنی کنواری بچی کے نکاح کے لئے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو وکیل بنا سکتے ہیں لیکن اجازت لینا سنت ہے اس

وکالت میں ولی کو شوہر کی تعیین کرنا لازم نہیں، پس اگر بغیر تعیین کے وکیل بنائے، تو وکیل پر اس لڑکی کی مصلحت کی خاطر احتیاط پر عمل واجب ہے، لہٰذا وہ غیر کفو میں نکاح نہیں کرا سکتا، اسی طرح کفو سے بہتر رشتہ ہو، تو کفو میں نہیں کرا سکتا، ورنہ نکاح صحیح نہ ہو گا۔ دیگر اولیاء کی توکیل اور باپ دادا کی جانب سے ثیبہ لڑکی کے نکاح کی توکیل کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱) نکاح اور توکیل دونوں کی اجازت دے، تو دونوں جائز ہیں۔ (خود نکاح کرانا بھی یا کسی کو وکیل بنانا)۔ ۲) وکیل بنانے کی اجازت دی، تو وکیل بھی بنا سکتا ہے۔ اور خود بھی نکاح کرا سکتا ہے۔ ۳) وکیل بنانے کی اجازت دی، لیکن ولی کو خود نکاح کرانے سے روکا، تو دونوں کی اجازت نہ ہو گی۔ ۴) ولی کو نکاح کی اجازت دے، لیکن وکالت سے منع کرے، تو کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں۔ ۵) ولی کو نکاح کی اجازت دی، آگے وکالت کا کچھ تذکرہ نہ کیا، تو ولی وکیل بنا سکتا ہے۔

اگر اس نے اجازت کے وقت شوہر کی تعیین کی ہے، تو وکالت میں بھی یہ تعیین ضروری ہے، ورنہ نکاح صحیح نہ ہو گا، خواہ اتفاقی طور پر وکیل اسی معین شخص سے نکاح کرائے۔ کسی کو وکیل بنانے کے بعد ولی لڑکی سے اجازت لے تو یہ وکالت صحیح نہیں ہے۔

وکیل کا صیغہ: ولی کا وکیل شوہر سے کہے: میں نے فلاں کی بیٹی تمہارے نکاح میں دی۔ اگر شوہر کی جانب سے وکیل نکاح قبول کر رہا ہو، تو ولی اس سے یوں کہے: میں نے اپنی بیٹی فلاں کے نکاح میں دی (فلاں کی جگہ موکل یعنی شوہر کا نام لے) اور شوہر کا وکیل اس طرح قبول کرلے: میں نے اِس کا نکاح اُس کے لئے قبول کیا (یعنی موٴکل کے حق میں)۔ اگر "اس کے لئے"۔ فقرہ ترک کردے تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا صیغوں سے نکاح اس وقت درست ہو گا، جبکہ پہلی صورت میں گواہوں اور شوہر کو وکالت کا علم ہو، اور دوسری صورت میں ولی اور گواہوں کو وکالت کا علم ہو، ورنہ دونوں میں وکیل کو صیغوں میں وکالت کی صراحت کرنا ضروری ہے۔ مثلاً: آگے یوں کہے اس کی جانب سے بطور وکالت، یا فلاں موکل کی طرف سے۔ اگر دونوں طرف وکیل ہوں، تو ولی کا وکیل کہے: میں نے فلاں کی بیٹی فلاں کے نکاح میں دی، اور شوہر کا وکیل کہے: میں نے اس کا نکاح فلاں کے حق میں قبول کیا۔ (تحفة المحتاج ۹/۱۵۳۔ مغنی المحتاج ۳/۱۵۸)

حاکم کے نکاح کرانے کی صورتیں

(۱) (عصبات میں سے) کوئی ولی موجود نہ ہو۔ (۲) ولی مفقود ہو، اور اس کی موت وزندگی اور جگہ کا کچھ پتہ نہ ہو، جبکہ اس کی موت کا فیصلہ نہ دیا گیا ہو۔ (۳) ولی خود لڑکی سے نکاح کرنا چاہے، مثلاً اس کی چچازاد بہن کا یہ ولی ہے، اور دوسرا کوئی اسی درجہ میں (یعنی چچازاد بھائی) اس کا ولی نہیں، تو اس صورت میں حاکم نکاح کرائے گا۔ (۴) ولی مسافتِ قصر کے اندر نہ ہو، (مسافتِ قصر کے فاصلہ پر ہو) (۵) ولی مسافت قصر کے اندر ہی ہو، لیکن اس تک پہنچنا بالکل دشوار ہو۔ (۶) ولی مقید ہو، اور وہاں تک رسائی دشوار ہو (اگر رسائی ممکن ہو، تو وہ کسی کو وکیل بنائے) (۷) ولی روپوش اور مخفی ہو اور نکاح نہ کرائے۔ (۸) ولی حج یا عمرہ کے احرام میں ہو۔ (۹) ولی اپنی طاقت وغلبہ کی بنیاد پر نکاح کرانے سے انکار کردے۔ (۱۰) بالغہ پاگل لڑکی کا باپ دادا نہ ہو، تو حاکم اس کا نکاح کرائے گا۔ (جبکہ شرائط موجود ہوں) (بجیرمی علی الاقناع ۳/۳۴۴)

ولی کی غیر موجودگی وغیرہ صورتوں میں حاکم کیلئے اس کے بعد والے ولی کے سپرد کرنا، یا اس سے اجازت لینا (لڑکی کی اجازت کے بعد) سنت ہے (قلائد ۲/۱۰۶)

سلطان کا عدمِ وجود

اگر سلطان ہی نہ ہو تو اہل حل وعقد ذمہ داروں پر لازم ہے کہ ایک قاضی مقرر کریں، مجبوری کی وجہ سے اس صورت میں اس کے احکام وفیصلے نافذ ہوں گے، امام الحرمین نے اسے امام اشعری وغیرہ سے نقل فرمایا ہے، امام خطابیؒ نے اس کے لئے غزوہ موتہ میں حضرت خالدؓ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، کیونکہ یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کی جانب سے متعینہ تینوں سپہ سالار حضرات زیدؓ، جعفرؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ شہید ہوئے، تو حضرت خالدؓ حالات کی سنگینی اور خطرے کو دیکھتے ہوئے خود ہی امیر بن گئے، جس پر آپ ﷺ راضی ہوئے، اور یہ حق کے موافق قرار پایا، لہٰذا مجبوری کی شکلوں میں دینی امور کے قیام کے لئے یہ ایک اصل بن گئی۔ (تحفۃ المحتاج ۱۴۶/۹)

کوئی حاکم نہ ہو، تو لڑکی کسی عادل کو اپنے نکاح کی ذمہ داری سونپ سکتی ہے۔ (اسے ولی بنا سکتی ہے) (قلائد ۹۸/۲)

۵) نکاح کا پانچواں رکن دو گواہ ہیں:

حدیث: ۱- ”ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح (صحیح) نہیں، اور جو اس کے بغیر ہو گا، وہ باطل ہے“ (ابن حبان فی صحیحہ)

۲- ”زانیہ عورتیں ہی اپنا نکاح خود بغیر گواہوں کے کرتی ہیں۔“ (ترمذی)

تمہید: چونکہ نکاح کے نتیجہ میں میاں بیوی کی معاشرتی زندگی، مہر ونفقہ کا وجوب، اولاد کے نسب کا ثبوت، میراث کا استحقاق، اور شوہر کی اطاعت وغیرہ احکام مرتب ہوتے ہیں، جو کافی اہمیت کے حامل ہیں، اور بعض صورتوں میں جانبین کی طرف سے اس کے انکار کی گنجائش تھی، اس لئے احتیاط کے پیشِ نظر شریعت نے اس موقع پر کم از کم دو گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا، اور ان میں چند شرائط کو لازمی قرار دیا، تاکہ ان کی گواہی قابلِ اطمینان ہو۔

گواہوں کے شرائط (۱) **اسلام:** غیر مسلموں کی گواہی سے نکاح صحیح نہ ہو گا۔ (۲) **مذکر** (مرد) ہونا: عورتوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہ ہو گا۔ امام زہری کا فرمان ہے: ”آپ ﷺ سے طریقہ یہی چلا آرہا ہے کہ حدود نکاح اور طلاق میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں“۔ (۳) **عقل وبلوغ:** پاگل اور نابالغ بچوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہ ہو گا۔ (۴) **عادل ہونا:** دونوں گواہ عادل ہوں، گرچہ ظاہری حیثیت سے، یعنی انکی اندرونی حالت کا علم نہ ہو (مستور الحال ہوں)، اور بظاہر فاسق نہ ہوں، مستور الحال کو بوقت عقد توبہ کرانا مستحب ہے اگر ایک عادل ایسے مستور الحال پر عقد سے قبل جرح کرے (اسے فاسق قرار دے) تو اس کی گواہی کافی نہیں۔ فاسق گواہوں کے ذریعے نکاح منعقد نہ ہو گا۔ ۵) **سننا:** بہرے یا سوئے ہوئے حضرات کے ذریعے نکاح کا انعقاد نہ ہو گا۔ ۶) **دیکھنا:** نابینا کی گواہی بھی ناکافی ہے، اس سے نکاح نہ ہو گا، کیونکہ اقوال دیکھنے اور سننے سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

عدالت: عدالت ایسے مَلَکہ (نفس کے اندر راسخ صفت) کو کہیں گے جو گناہوں کے ارتکاب سے روکے، گرچہ ذلیل وخسیس صغائر (مثلاً ایک لقمہ کی چوری، وزن میں ایک کھجور کم دینا یا زائد لینا) اور مباح رذیل امور ہوں، رذیل یعنی جس کا ترک مستحسن اور پسندیدہ ہو، جیسے کسی عالم کا ننگے سر باہر چلنا وغیرہ (بجیرمی ۳۳۰/۳)

عادل: جو کسی کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے، جیسے قتل، زنا، قذف، جھوٹی گواہی اور صغیرہ گناہ پر اصرار نہ کرے (ایک ہی صغیرہ پر اصرار ہو یا مختلف انواع پر) یا اصرار کی صورت میں اس کی طاعات ونیکیاں گناہوں پر غالب ہوں، تو ایسا شخص عادل کہلائے گا۔ لہٰذا کسی

ایک کبیرہ کے ارتکاب سے، یا صغائر پر اصرار سے، جبکہ طاعات غالب نہ ہوں، اس کی عدالت ختم ہو گی۔(فتح الوھاب ۲۲/۲)

دیگر شرائط: گواہ ناطق (گفتگو پر قادر) رشید اور ضبط کرنے والے (یعنی ایجاب و قبول کو یاد رکھنے والے) ہوں، گرچہ بعد میں جلد ہی بھول جائیں، نیز جانبین کے ایجاب و قبول کے کلمات کا مفہوم سمجھتے ہوں۔ اگر کوئی معتبر شخص گواہوں کو عقد سے پہلے صیغوں کا مفہوم سمجھائے، پھر جلد ہی ایجاب و قبول ہو، تو کافی ہے۔

(دو محرم گواہ سے نکاح منعقد ہو گا، لیکن ان کا حاضر نہ ہونا بہتر ہے) بالکل تاریکی ہو اور جانبین نظر نہ آرہے ہوں، تو صرف آواز پر اعتماد کرتے ہوئے گواہ بنا صحیح نہیں۔ میاں بیوی کے دو بیٹوں، یا ایک کے دو بیٹوں، یا ایک کا ایک بیٹا اور دوسرے کا ایک بیٹا گواہ ہوں، یا دونوں کے یا کسی ایک کے دشمن گواہ ہوں، تب بھی نکاح منعقد ہو گا۔

گواہ کا ولایت کے لئے متعین نہ ہونا شرط ہے۔ جیسے باپ یا تنہا بھائی ولی ہو، اور وہ کسی دوسرے کو وکیل بنا کر خود ایک گواہ بن جائے، تو نکاح صحیح نہ ہو گا، خواہ اس میں گواہی کے شرائط موجود ہوں، کیونکہ اصل نکاح کرانے والا ولی تو یہ ہے، اور وکیل تو محض ایک سفیر اور واسطہ ہے، لہٰذا ولی خود گواہ نہیں بن سکتا، اسی طرح شوہر کسی کو اپنا وکیل بنا کر خود گواہ کی حیثیت سے حاضر ہو، تو اس کی گواہی معتبر نہیں۔ کسی عورت کے تین بھائی ولی ہوں اور وہ اس میں سے صرف ایک کو اپنے نکاح کی اجازت دے، اور دوسرے دونوں بھائی گواہ بنیں تو صحیح ہے، اگر تینوں کو اجازت ہو، یا دو کو اجازت ہو اور وہ تیسرے کو وکیل بنا کر خود گواہ بنیں تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔

عقد کے بعد (کبھی بھی) ولی یا گواہ کا عقد کے وقت فاسق ہونا ظاہر ہو جائے (یعنی یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عقد کے وقت فاسق تھے) یا کوئی اور مانع نکاح موجود تھا، مثلاً "جنون یا بے ہوشی" تو یہ نکاح باطل ہے، جیسا کہ گواہ کافر ظاہر ہوں تو حکم ہے، کیونکہ عقود میں اصل اعتبار نفس الامر اور حقیقت کا ہوتا ہے (نہ کہ مکلف کے گمان کا)

فاسق وغیرہ ہونا حاکم کے علم سے ظاہر ہو گا، جبکہ اسے اپنے علم پر فیصلہ کی گنجائش ہو، لہٰذا جانبین اپنا مسئلہ اسکے سامنے پیش نہ بھی کریں، تو اس پر لازم ہے کہ ان میں جدائی کرائے، نیز دو مرد گواہ کی گواہی سے بھی ثابت ہو گا۔ اسی طرح جانبین (میاں بیوی) نکاح کے بطلان کے کسی سبب کا اقرار کریں، مثلاً گواہ کا فسق، تو ان کے حقوق کی حد تک نکاح باطل قرار پائے گا، حق اللہ کے سلسلہ میں یہ اقرار معتبر نہ ہو گا، لہٰذا شوہر کے تین طلاق کے بعد دونوں بطلان کا اقرار کریں تو تہمت کی وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا، اس لئے محلل کے بغیر اس شوہر سے پھر نکاح جائز نہ ہگا۔

گواہ نکاح کو باطل کرنے والے کسی سبب کا اقرار کریں، مثلاً کہیں کہ ہم اس وقت فاسق تھے، تو اس سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہ ہو گا۔

اگر صرف شوہر باطل ہونے کا اقرار کرے، بیوی نہ کرے، تو نکاح فسخ کر دیا جائے گا، دخول ہو چکا ہو تو مکمل مہر ورنہ نصف مہر واجب ہو گا۔ اگر صرف بیوی ولی یا گواہ کے فسق کا اقرار کر لے، شوہر نہ کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی بات تسلیم کریں گے (اور نکاح باقی رہے گا)

لڑکی کے رضامندی پر گواھی: لڑکی نکاح سے اپنی رضامندی کا اظہار کرے، تو اس وقت، دو گواہ کا ہونا سنت ہے (جمل ۱۴۴/۴، تحفہ ۹۵/۹، بجیرمی ۳۳۵/۳، اعانہ ۳۰۰/۳، مغنی ۱۴۷/۳، نہایۃ ۲۲۳/۶، الفقہ المنہجی ۵۵/۴۔۷۱)

باپ یا دادا کا اعفاف (یعنی ان کو پاکدامن رکھنے کیلئے انکا نکاح کردینا)

اولاد پر، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنے باپ یا دادا و نانا کو پاکدامن رکھنا واجب ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، یعنی ان کو بیوی کا مہر دے دے یا کہے کہ تم نکاح کرو، میں تمہیں مہر کی رقم دیتا ہوں۔ اس وجوب کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱) اولاد مہر دینے پر قادر ہو (مالی اعتبار سے اس کی گنجائش ہو)

۲) باپ یا دادا (جسکی شادی کا مسئلہ ہے) خود مہر دینے سے عاجز ہوں۔

۳) باپ دادا نکاح کے محتاج ہوں، یعنی ان کا نفس اس طرف مائل و مشتاق ہو،

اس صورت میں یہ اعفاف بھی نفقہ و لباس کی طرح اس کی اہم ضرورتوں میں شمار ہوگا، نیز ورنہ زنا کی ہلاکت میں پڑنے کا خطرہ بھی ہے، لہٰذا اس پر عدم توجہ مصاحبت بالمعروف کے خلاف ہے، جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ "وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً (لقمان:۱۵)

ترجمہ: "اور دنیا میں انکے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا"۔

کفار کے نکاح

کافروں کا آپس میں نکاح صحیح ہے، حضرت غیلانؓ وغیرہ کی حدیث اس پر دلیل ہے، جن کے اسلام کے وقت، ان کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے چار کو رکھ کر بقیہ کو جدا کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے ان سے ان کے نکاح کے شرائط کی کوئی تحقیق نہیں کی۔ اگر کسی مسئلہ میں وہ ہمارے پاس معاملہ لے آئیں، تو ان کے نکاح کو باطل قرار نہیں دیں گے، اگر وہ اسلام لائیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔ (الفقہ المنہجی ۴/۷۲)

نکاح کے بعد کافر کا اسلام

کوئی کافر اسلام لائے اور اس کے نکاح میں ایسی اہل کتاب عورت ہو، جو ایک مسلمان کے لئے جائز ہو، تو یہ نکاح برقرار رہے گا۔ مذکورہ اہلِ کتاب کے علاوہ کوئی عورت نکاح میں ہو، مثلاً مجوسیہ، بت پرست وغیرہ، اور ابھی دخول (صحبت) نہ ہوا ہو، اور شوہر اسلام لائے اور بیوی نہ لائے تو فوراً دونوں میں جدائی ہوگی، اسی طرح صحبت سے قبل بیوی (اہل کتاب ہو یا کوئی اور) اسلام لائے اور شوہر نہ لائے تو فوراً دونوں میں جدائی ہوگی۔ اگر دخول کے بعد دونوں میں سے ایک اسلام قبول کرے، اور دوسرا عورت کی عدت کے اندر اسلام قبول نہ کرے، تو اسلام کے وقت سے دونوں میں جدائی ہو چکی۔ اگر عدت کے بعد اسلام قبول کرے تو (نکاح کے تمام شرائط کے ساتھ) از سرِ نو نکاح کر سکتے ہیں۔ ورنہ دونوں کا کوئی رشتہ نہیں، ترمذی میں حدیث ہے کہ "(حضرت ابو العاص جب اسلام لائے تو) آپ ﷺ نے نئے مہر اور نکاح کے ذریعے دوبارہ اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دی"۔ ان تمام صورتوں میں یہ مفارقت، اور جدائی بطور فسخ ہے، نہ کہ طلاق، لہٰذا اس سے طلاق کی تعداد کم نہ ہوگی۔ اگر عدت کے اندر دوسرا بھی اسلام لے آئے تو دونوں کا نکاح باقی رہے گا۔

دخول سے قبل یا بعد دونوں ساتھ اسلام قبول کریں تو نکاح باقی رہے گا، کیونکہ اس سلسلہ میں صحیح روایت موجود ہے، اور معیت (ساتھ ہونے) کا اعتبار آخری لفظ سے ہوگا، یعنی دونوں کا کلمۂ شہادت کا آخری لفظ ساتھ ادا ہو، ابتدا آگے پیچھے ہو تو حرج نہیں۔

ایک عورت آپ ﷺ کے دورِ مسعود میں اسلام قبول کر کے شادی کر لیتی ہے، پھر اس کا (پہلا) شوہر آکر آپ ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ میں اسلام لا چکا تھا، اور بیوی کو اس بات کا علم تھا، تو آپ ﷺ نے اسے (دوسرے) شوہر سے واپس لے کر پہلے شوہر کو لوٹا دیا (ابوداود)

حضرت امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ: حضرات صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزامؓ کی بیویاں پہلے اسلام لاتی ہیں، پھر یہ حضرات تقریباً ایک ماہ بعد اسلام لاتے ہیں، اور ان کا نکاح بر قرار رہتا ہے۔

جن صورتوں میں اسلام کے بعد نکاح بر قرار رہتا ہے، ان صورتوں میں اگر حالتِ کفر میں نکاح کے وقت اسلام کے اعتبار سے کوئی مُفسد پایا جائے، جو اسلام لاتے وقت باقی نہیں، اور اس طرح کا نکاح اُن کے مذہب میں فاسد نہ ہو، تو اسلام کی وجہ سے تخفیفاً اس میں کوئی حرج نہ سمجھا جائے گا، اگر وہ مفسد قبولِ اسلام کے وقت بھی موجود ہو، یا موجود تو نہ ہو، لیکن ان کے مذہب میں بھی وہ مفسد ہو، تو یہ نکاح باقی نہیں رکھیں گے۔ اسلام میں مُفسد ہونے سے تمام علماء کے نزدیک بالاتفاق مفسد ہونا مراد ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف اسلام میں، یا صرف ان کے مذہب میں مفسد ہو، تو حرج نہیں، اگر دونوں کے نزدیک مفسد ہو، تو ایسا نکاح باقی نہ رہے گا۔

لہٰذا ان کا جو نکاح بغیر ولی یا گواہ کے ہو، یا عدت میں ہو اور اسلام کے وقت عدت ختم ہو چکی ہو، یا عارضی نکاح ہو لیکن وہ اسے ابدی و مستقل سمجھتے ہوں، تو ان صورتوں میں نکاح باقی رہے گا۔ اسلام کے وقت عدت باقی ہو، یا عارضی کو عارضی ہی سمجھتے ہوں، اور ابھی مقررہ مدت باقی ہو، تو یہ نکاح بر قرار نہیں رکھیں گے۔ جانبین میں سے ایک اسلام لا کر حج کا احرام باندھے، پھر عدت میں دوسرا اسلام لے آئے اور یہ ابھی احرام میں ہو، تو نکاح باقی رہے گا، کیونکہ احرام سے دوامِ نکاح پر اثر نہ پڑے گا۔

اگر کوئی کافر مَحرَم سے (مثلاً ماں، بیٹی، بہن، باپ کی بیوی، بہو وغیرہ) سے نکاح کرے تو یہ نکاح اسلام کے بعد باقی نہ رہے گا۔ کیونکہ مُفسد (یعنی مَحرَم ہونا) اسلام کے وقت بھی موجود ہے۔

اگر کوئی حربی یا ذمی کسی حربیہ عورت کو غصب کرے، اور اسے وہ نکاح مانتے ہوں، تو یہ رشتہ باقی رہے گا۔ لیکن ذمیہ عورت کو غ۔صب کرے، تو اسلام کے بعد اسے بر قرار نہیں رکھیں گے، خواہ وہ اسے نکاح مانتے ہوں۔

کسی آزاد شخص کے اسلام لاتے وقت اس کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں ہوں، اور وہ سب بھی ساتھ اسلام قبول کریں، یا بصورتِ دخول عدت کے اندر اسلام قبول کر لیں، یا بیویوں کے اسلام کے بعد عدت میں شوہر اسلام لائے، تو اس پر لازم ہے کہ ان میں سے کسی بھی چار کو اختیار کر لے، خواہ ان سے ایک ساتھ نکاح ہوا ہو، یا آگے پیچھے، خواہ جن سے پہلے نکاح ہوا ہے انھیں اختیار کرے یا بعد والیوں کو، بقیہ کا نکاح اسلام کے وقت سے فسخ ہو جائے گا، حضرت غیلانؓ کے اسلام کے وقت ان کی زوجیت میں دس بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار کو نکاح میں روک لو، اور بقیہ کو جدا کر دو (الشافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ وصححہ ابن حبان والحاکم۔ تلخیص وفتح الوھاب)

اختیار کے الفاظ: میں نے تیرا نکاح اختیار کیا، باقی رکھا، تجھے اختیار کیا، روک لیا۔

اگر کسی بیوی کو طلاق دے، تو یہ بھی اختیار ہے۔ لہٰذا چار کو طلاق دے، تو طلاق سے ان کا نکاح ٹوٹ گیا، اور بقیہ کا فسخ ہو گیا۔ طلاق کی نیت کے بغیر فراق (مفارقت۔ جدائی) کا لفظ، یا صحبت، ظہار یا ایلاء اختیار نہیں ہیں۔

کسی کے اسلام کے وقت اس کے نکاح میں ماں اور بیٹی ہوں، اور یہ دونوں اہلِ کتاب ہوں، یا یہ بھی اسلام قبول کر لیں، اور شوہر دونوں سے یا صرف ماں سے صحبت کر چکا ہے، تو دونوں ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئیں، اور اگر کسی سے صحبت نہ کی ہو، یا صرف بیٹی سے

صحبت کی ہو، تو ماں ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی، اور بیٹی کا نکاح باقی رہے گا۔(مغنی المحتاج ۱۹۶/۳، حاشیۃ الجمل ۲۰۹/۴)

چار سے زائد کی صورت میں اسلام کے بعد چونکہ چار کا نکاح باقی ہے، لہٰذا شوہر کو چار سے کم اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ کفار کا نکاح صحیح ہے، اس لئے اسلام کے بعد چار کا نکاح باقی رہے گا، تعیین کرنا اس کی ذمہ داری ہے (تحفہ مع الحواشی ۲۸۸/۹)

مُحَرَّمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے)

آیت: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ ۔۔۔ الی ۔۔۔۔ واُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ (النساء: ۲۳۔۲۴)

ترجمہ: ''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں، اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے، اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہارے بیویوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں، ان بیویوں سے کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو، اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو، تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمہاری نسل سے ہوں (اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے یعنی لے پالک جس کو متبنّٰی کہتے ہیں، اس کی بیوی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو، لیکن جو پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے)، بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے رحمت والے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں (وہ بھی حرام ہیں) مگر جو کہ (شرعاً) تمہاری مملوک (باندی) ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے ان حکام کو تم پر فرض کر دیا ہے، اور اُن عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں'' (یعنی انکے ساتھ شرعی شرائط کے مطابق نکاح کرنا جائز ہے)''۔

اسلام نے بطور احترام واکرام، طبع سلیم کی رعایت، اور معاشرہ کی صحیح تنظیم وترتیب کے پیشِ نظر بعض عورتوں سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔

حرمت کے اقسام: (۱) ابدی حرمت۔ (۲) وقتی وعارضی حرمت (حرمت مُوقّتہ) ابدی حرم (حرمت مُؤبّدہ): اس سے وہ عورتیں مراد ہیں، جن سے کبھی بھی کسی بھی صورت میں نکاح جائز نہیں۔ اس حرمت کے تین اسباب ہیں: قرابت (نسبی رشتہ داری)، سسرالی رشتہ داری (مُصَاهَرَتْ)، رضاعی رشتہ داری (دودھ کا رشتہ)

قرابت کی وجہ سے حرام عورتیں: (۱) ماں، نانی، دادی (اسی طرح اوپر تک) ان رشتوں کو اصول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (۲) بیٹی، پوتی، نواسی، (اسی طرح نیچے تک) ان کو فروع سے تعبیر کیا جاتا ہے (کسی کے زنا سے پیدا ہونے والی بچی اس پر حرام نہیں کیونکہ اس نطفہ کی کوئی حرمت نہیں، لیکن دیگر ائمہ کے اختلاف کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا جائے گا۔ کسی عورت کے زنا کا بچہ اس عورت پر حرام ہے، کیونکہ دونوں میں نسب اور میراث جاری ہو گا) (فتح الوھاب) (۳) بہن، خواہ سگی ہو، یا باپ شریک، یا ماں شریک، ان کو والدین کے فروع کیا جائے گا۔ (۴) بھتیجی، یعنی حقیقی یا باپ شریک یا ماں شریک بھائی کی بیٹی، (اسی طرح ان کی پوتی نواسی نیچے تک۔ فتح الوھاب)

(۵) بھانجی، یعنی حقیقی یا باپ شریک یا ماں شریک بہن کی بیٹی، (اسی طرح انکی پوتی نواسی نیچے تک۔ فتح الوھاب)

(۶) پھوپھی، یعنی باپ کی بہن یا دادا، نانا کی بہن (یعنی اصول میں کسی بھی مذکر کی حقیقی، باپ شریک یا ماں شریک بہن۔ جمل)

(۷) خالہ، یعنی ماں کی بہن، اسی طرح دادی نانی کی بہن (یعنی اوپر تک کسی بھی مونث اصل کی حقیقی، باپ شریک یا ماں شریک

بہن، جمل)

ان میں سے کسی سے بھی عقد کرے تو باطل ہے، اگر حلال سمجھے تو وہ کافر ہے۔

اسی طرح ایک عورت پر اس کا باپ، دادا، نانا وغیرہ تمام اصول، بیٹا، پوتا، نواسہ وغیرہ تمام فروع، حقیقی، باپ شریک اور ماں شریک بھائی، بھائی بہنوں کی اولادِ ذکور چچا، ماں باپ کے چچا اوپر تک، ماموں، اور ماں باپ کے ماموں اوپر تک حرام ہیں۔

ضابطہ: نسبی ورضاعی حرمت کا ایک مختصر ضابطہ یہ ہے کہ ایک شخص پر اس کے اصول، فروع، اول اصل کے تمام فروع اور دیگر تمام اصول کی (صرف) ایک فرع (نہ کہ نیچے تک تمام فروع) حرام ہیں۔ پس اصول میں اوپر تک مائیں، فروع میں نیچے تک بیٹیاں، اول اصل کے فروع میں بہنیں اور بھانجیاں و بھتیجیاں، اور دیگر اصول کے فرع میں پھوپھیاں اور خالائیں داخل ہوئیں (الاقناع۔مغنی ۳/۱۷۴)

رضاعی حرمت: مذکورہ بالا تمام رشتے رضاعت (دودھ پینے) کی وجہ سے بھی حرام ہوں گے۔ جن میں سے دو (یعنی رضاعی ماں اور بہن) کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے، اور بقیہ کو حدیث پاک نے انکے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

حدیث: (۱) رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (متفق علیہ ۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ) (۲) حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت ہے: ”بلاشبہ رضاعت ان رشتوں کو حرام قرار دیتا ہے، جنکو ولادت حرام کرتا ہے“ (متفق علیہ)

رضاعی رشتوں کی تفصیل: (۱) **رضاعی ماں**، جو تم کو اپنا دودھ پلائے، وہ تمہاری رضاعی ماں ہے، اسی طرح اس رضاعی ماں کی نسبی یا رضاعی ماں اوپر تک، رضاعی باپ (یعنی رضاعی ماں کا شوہر جس کے تعلق سے وہ دودھ ہے) کی نسبی یا رضاعی ماں اوپر تک (یعنی بالواسطہ یا بلاواسطہ) اور اوپر تک نسبی والدین کی رضاعی ماں بھی تمہاری رضاعی ماں کہلائے گی۔

کچھ مثالیں: رضاعی ماں کی والدہ، رضاعی ماں کی رضاعی ماں، اپنے نانا کی رضاعی ماں، اپنے دادا کی رضاعی ماں وغیرہ حرام ہیں۔

۲- **رضاعی بیٹی:** جو تمہارا (یعنی تمہاری بیوی کا) دودھ پیے، یا تمہارے کسی نسبی یا رضاعی فرع کا دودھ پیے، اور ان سب کی بیٹیاں نیچے تک تمہاری رضاعی بیٹی کہلائیگی

مثالیں: جو تمہاری پوتی کا دودھ پیے وہ، اور اس کی بیٹی پوتی نواسی اور جو ان سے دودھ پیے، یہ سب تمہاری رضاعی بیٹیاں ہیں۔

۳- **رضاعی بہن:** جو لڑکی تمہارے نسبی یا رضاعی والدین میں سے کسی کا دودھ پیے تو وہ تمہاری رضاعی بہن ہے۔ (والدہ کا دودھ کسی دوسرے شوہر سے ہو اور پیے، یا والد کی کسی دوسری بیوی کا دودھ پیے، تب بھی یہی حکم ہے)، اسی طرح رضاعی ماں یا باپ کی نسبی بیٹی بھی تمہاری رضاعی بہن ہے۔

۴- **رضاعی بھانجی وبھتیجی**، رضاعی ماں یا باپ کے اولاد کی بیٹی نیچے تک، خواہ نسبی ہو یا رضاعی، اور جسے تمہاری نسبی یا رضاعی بہن نے دودھ پلایا، یا جو تمہارے نسبی یا رضاعی بھائی (کے بیوی) کا دودھ پیے، یا ان بھائی بہنوں کی نسبی یا رضاعی بیٹیوں نے جسے دودھ پلایا، گرچہ نیچے کے درجے میں ہوں، اور جسے تمہارے نسبی ماں نے دودھ پلایا، اس کی رضاعی ونسبی بیٹیاں نیچے تک، یا تمہارے باپ (کی دوسری بیوی) سے جو دودھ پیے، اس کی رضاعی ونسبی بیٹیاں نیچے تک رضاعی بھتیجیاں یا بھانجیاں ہوں گی۔

۵- **رضاعی پھوپھی:** رضاعی باپ کی یا اسکے باپ کی (رضاعی دادا کی) یا رضاعی ماں کے باپ (رضاعی نانا) کی (اسی طرح اوپر

تک) ان لوگوں کی نسبی یا رضاعی بہن رضاعی پھوپھی کہلائیگی۔

۲-**رضاعی خالہ**: رضاعی ماں کی اور بالواسطہ یا بلاواسطہ رضاعی نانی یا رضاعی دادی کی نسبی یا رضاعی بہن رضاعی خالہ کہلائیگی۔ (حاشیۃالجمل ۱۷۸/۴، الاقناع مع حاشیۃالبجیرمی ۳۵۵/۳)

(۴ نمبر پر رضاعی بھانجی و بھتیجی کو ایک ساتھ شمار کرنے کی وجہ سے ان کی تعداد ۶ ہوئی ورنہ حقیقتاً یہ سات ہیں) اسی طرح ایک عورت پر اس کا رضاعی باپ، رضاعی بیٹا، رضاعی بھائی، رضاعی بھانجہ و بھتیجہ اور رضاعی چچا و ماموں حرام ہیں۔

تنبیہ: (۱) جو بچہ کسی عورت کا دودھ پیئے، تو اس عورت کی گذشتہ بچیاں اور مستقبل میں پیدا ہونے والی بچیاں بھی اس کی رضاعی بہنیں ہوں گی (الاقناع)

(۲) تمہارے بھائی یا بہن کی رضاعی ماں اور بہن تم پر حرام نہیں، اسی طرح پوتے و نواسی کی رضاعی ماں، اولاد کی رضاعی نانی اور اولاد کی رضاعی بہن تم پر حرام نہیں، حالانکہ نسب میں یہ رشتے حرام ہیں، کیونکہ نسب میں حرمت کا جو سبب پایا جارہا ہے، رضاعت میں وہ موجود ہی نہیں، اسی طرح نسبی چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی رضاعی مائیں حرام نہیں ہے، کسی عورت کا بیٹا دوسری عورت کا دودھ پیئے تو اس کا بیٹا اس کا رضاعی بھائی ہے، لیکن پہلی عورت اپنے بیٹے کے اس رضاعی بھائی سے نکاح کر سکتی ہے۔ زید کا ایک باپ شریک بھائی جمیل ہو، اور جمیل کی ماں شریک بہن صفیہ ہو، تو زید صفیہ سے نکاح کر سکتا ہے، نیز اسکے برعکس زید کا ماں شریک بھائی جمیل ہو، اور جمیل کی باپ شریک بہن صفیہ ہو، تب بھی زید صفیہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ (جمل ۱۸۰/۴، بجیرمی ۳۵۷/۳)

مُصَاھَرَت (سسرالی رشتہ) کی وجہ سے مُحَرَّمَات: سسرالی رشتہ سے چار عورتیں حرام ہیں۔ (۱) باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) اسی طرح دادا، نانا کی بیویاں اوپر تک، یعنی اصول کی بیویاں۔ ارشاد باری ہے: "**وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ**" (النساء ۲۲) (اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہے) (۲) بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں (نیچے تک یعنی) تمام فروع کی بیویاں۔ فرمانِ باری ہے: "**وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ**" (النساء ۲۳)

(اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو تمہاری نسل سے ہوں) اللہ کے ارشاد "جو تمہاری نسل سے ہوں"، کی قید سے متبنّٰی (لے پالک) کی بیوی نکل گئی، جاہلیت میں متبنّٰی کی بیوی بھی حرام سمجھتے تھے، اسلام نے اسے باطل کیا اور اس کی بیوی سے نکاح کو حلال قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ**" (الاحزاب: ۴)

(اور تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (سچ مچ کا) بیٹا (بھی) نہیں بنادیا)

نیز ارشاد فرمایا، "**لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا**"۔ (احزاب ۳۷) (تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے (نکاح کے) بارہ میں کچھ تنگی نہ رہے، جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں)

(۳) بیوی کی ماں، نانی، دادی اوپر تک تمام اصول، ارشاد ربانی ہے، "**وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ**" (النساء ۲۳) (اور تمہارے بیویوں کی مائیں (تم پر حرام ہیں) مذکورہ تینوں رشتے محض عقدِ نکاح سے حرام ہو جاتے ہیں جبکہ عقد صحیح ہو، خواہ اسکے بعد دخول و صحبت پائی جائے یا نہ پائی جائے اور ان محرمات میں سے کسی سے عقد کرے تو وہ عقد باطل ہو گا۔ اگر عقد فاسد کے بعد دخول پایا جائے تو دخول کی وجہ سے یہ رشتے حرام ہوں گے (مغنی ۱۷۷/۳)

(۴) بیوی کی بیٹی، جسے رَبِیْبَہ کہتے ہیں، یہ اپنی ماں کے شوہر پر حرام ہے، لیکن محض عقد کی وجہ سے نہیں، بلکہ جب شوہر ماں کے ساتھ دخول کرے، تب جاکر رَبِیْبَہ حرام ہوگی۔ ابتدا میں آیت میں اس کا تذکرہ گذر چکا، جس میں اس حرمت کو صحبت کے ساتھ مقید کیا گیا، پھر یہ صراحت کردی کہ اگر دخول نہ ہو تو کوئی حرج نہیں (دیکھئے سورہ نساء آیت ۲۳)

البتہ رَبِیْبَہ کی حرمت کے لئے اس کا اپنی ماں کے شوہر (سوتیلے باپ) کے زیر پرورش ہونا کوئی شرط نہیں، بلکہ یہ ہر حال میں اس پر حرام ہے، خواہ اس کے زیر پرورش ہو، یا اس سے دور اور الگ تھلگ زندگی گذار رہی ہو۔ آیت میں زیر پرورش کی قید غالبی حالت کے پیش نظر ہے، کیونکہ عموماً ربیبہ اپنے سوتیلے باپ کی زیر پرورش ونگہداشت رہتی ہے۔ (عقد فاسد ہو، تب بھی دخول سے ربیبہ، حرام ہوگی، مغنی)

اسی طرح ایک عورت پر اپنی ماں کا شوہر، بیٹی کا شوہر، شوہر کا بیٹا اور شوہر کا باپ حرام ہے۔ مصاھرت کے یہ چاروں رشتے، رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوں گے، لہٰذا: (۱) بیوی کی رضاعی ماں (اوپر تک) (۲) بیوی کی رضاعی بیٹی جبکہ اس کے ساتھ دخول ہوا ہو، (نیچے تک) یعنی بیوی نے کسی دوسرے شوہر کے تعلق سے جس کو دودھ پلایا ہو۔ (اگر اس کا دودھ ہے تو خود اس کی بھی رضاعی بیٹی ہوئی) (۳) رضاعی باپ کی بیوی، یعنی تمہاری رضاعی ماں کی سوکن۔ (۴) رضاعی بیٹے کی بیوی (اسی طرح رضاعی پوتے ونواسے نیچے تک کی بیویاں) حرام ہوں گی،

تنبیہ: ماں کے شوہر کی بیٹی (سوتیلے باپ کی بیٹی جو اس کی ماں سے نہ ہو) ماں کے شوہر کی ماں، باپ کے بیوی کی ماں (سوتیلی ماں کی ماں) باپ کے بیوی کی بیٹی، بیٹے کے بیوی کی ماں (بہو کی ماں) بہو کی بیٹی (جو اپنے بیٹے سے نہ ہو) بیٹی کے شوہر کی بیٹی (داماد کی بیٹی جو اپنی بیٹی کے علاوہ دوسری بیوی سے ہو) داماد کی ماں، ربیب (یعنی سوتیلے بیٹے) کی بیوی، اور ماں کے شوہر کی بیوی (یعنی سوتیلے باپ کی دوسری بیوی) حرام نہیں ہیں، ان سے نکاح جائز ہے۔ (اعانۃ ۲۹۲/۳، قلائد ۱۱۸/۲)

شبہ کی وطی (صحبت): کسی کو اپنی بیوی سمجھ کر وطی کرے، یا نکاح فاسد میں وطی کرے تو اسے وطی بِشُبہ کہا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شبہ کی وطی کرے (خواہ عورت کی جانب سے شبہ نہ پایا جائے) تو اس عورت کی ماں (اوپر تک) اور بیٹی (نیچے تک) اس شخص پر حرام ہوگی، نیز یہ عورت اس شخص کے باپ اور بیٹے پر حرام ہوں گی، کیونکہ اس وطی سے نسب اور عدت کا ثبوت ہوتا ہے، لہٰذا تحریم بھی پائی جائے گی، لیکن اس کی وجہ سے مَحْرَمِیَت ثابت نہ ہوگی لہٰذا اِس پر اُس عورت کی ماں بیٹی کو دیکھنا حرام ہے، اور ان کو چھونے سے وضو ٹوٹ جائے گا، اسی طرح اجنبیہ کے دیگر احکام ثابت ہوں گے (اگر کسی کو اس عورت سے زنا پر مجبور کیا گیا یا پاگل پن کی حالت میں زنا کیا، تو مذکورہ مسائل کا یہی حکم ہوگا۔ بغیہ ۲۰۱)

بطور زنا وطی کرے، یا صحبت کے علاوہ دیگر امور مثلاً بوس وکنار وغیرہ انجام دے، تو اس سے یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔ (فتح الوھاب مع الجمل ۱۸۱/۴)

عورت زنا سے راضی نہ ہو، یا وطی بالشبہ کرے تو مہر لازم ہے، عورت بھی زنا سے راضی ہو، تو مہر نہ ملے گا، کیونکہ بدکار عورت (زانیہ) کے لئے مہر نہیں۔ (بغیہ ۲۰۱)

اشتباہ: کسی پر حرام عورت غیر محصور (یعنی جنکو بادی النظر میں باقاعدہ شمار کرنا دشوار ہو، جیسے ۷۰۰ یا ہزار) عورتوں میں خلط ملط ہو جائے تو ان عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرنا جائز ہے، ورنہ اسکے لئے نکاح مشکل ہو جائے گا، کیونکہ یہ کہیں دوسری جگہ چلا جائے، تو

اس عورت کے وہاں پہنچنے کا بھی امکان ہے۔ اگر محصور عورتوں میں (مثلاً ۱۰، ۲۰ وغیرہ) اختلاط ہو، تو ان میں سے کسی سے بھی نکاح نہیں کرسکتا، (تحریم کے پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے) بعضوں نے کہا کہ پانچ سو اور زائد تعداد غیر محصور، اور دو سو یا اس سے کم محصور ہے، درمیانی تعداد کے لئے اپنے دل سے فتویٰ طلب کرے، فرمایا کہ دل تحریم کی طرف زیادہ مائل ہے۔

اگر کسی کی بیوی کسی وجہ سے دیگر عورتوں میں خلط ملط ہو جائے (اور پہچان نہ پائے)، تو اجتہاد کرکے بھی ان میں سے کسی عورت سے صحبت نہیں کرسکتا، کیونکہ اس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں، اور صحبت تو عقد سے حلال ہوتی ہے، نہ کہ اجتہاد سے۔ (جمل ۴/ ۱۸۲)

نکاح ٹوٹ جانا: نکاح کے بعد ابدی حرمت کا کوئی سبب پایا جائے، تو نکاح ٹوٹ جائے گا مثلاً شوہر بیوی کی ماں یا بیٹی سے وطی بالشبہ کرے، یا کوئی اپنے بیٹے یا باپ کی بیوی سے شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، تو (پہلی صورت میں وطی کرنے والے شوہر کا، اور دوسری صورت میں باپ یا بیٹے کا) نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اگر صحبت کرنے والا اور جس عورت سے کیا ہے، دونوں آپس میں پہلے سے مَحْرَم ہوں، تب بھی یہی حکم ہے، مثلاً کسی کے بیٹے کی بیوی اس کی بھتیجی ہو، تب بھی اس بہو سے وطی بالشبہ کی وجہ سے بیٹے کا نکاح فسخ ہو جائے گا"۔

اگر کوئی بیٹے کی بیوی سے وطی بالشبہ کرے تو اس عورت کو مکمل مہر مثل، اور بیٹے کے دخول کے بعد واقعہ پیش آیا ہے تو بیٹے کو بھی مکمل مہر، اور دخول سے قبل ہے، تو نصف مہر دینا وطی کرنے والے پر واجب ہے (فتح الوھاب مع الجمل ۴/۱۸۳، تحفہ ۹/۲۳۰) (الفقہ المنہجی ۴/۲۵۔۳۰)

حرمتِ مُؤَقَّتَہ (وقتی وعارضی حرمت)

اس سے ایسی حرمت مراد ہے، جو کسی سبب سے ہو، لہٰذا جب یہ سبب زائل ہو جائے، تو حرمت بھی ختم ہو گی، اور اس عورت سے نکاح حلال ہو گا، سبب حرمت کے زوال سے قبل کسی سے نکاح کرے، تو یہ نکاح باطل ہو گا۔

(۱) دو بہنوں کو جمع کرنا: نسبی یا رضاعی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، اگر دونوں سے ایک ساتھ عقد کرے، تو دونوں عقد باطل ہیں اور آگے پیچھے (الگ الگ) عقد کرے، تو پہلا صحیح اور دوسرا باطل ہے۔

ایک سے نکاح کے بعد وہ انتقال کر جائے یا اسے طلاقِ بائنہ ہو جائے (خواہ عدت میں ہو)، یا طلاقِ رجعی کے بعد عدت ختم ہو جائے، تو ان صورتوں میں اس کی بہن سے نکاح کرنا حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَاَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ" (النساء: ۲۳)

ترجمہ: "اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو"۔

(۲) کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ، یا بھانجی یا بھتیجی یا پوتی یا نواسی کو جمع کرنا: فقہائے کرام نے ایک قاعدہ پیش کیا ہے، جو دو عورتوں کو جمع کرنے کی حرمت کو ضبط کرے۔

قاعدہ: "ان دو عورتوں کو (ایک ساتھ نکاح میں) جمع کرنا حرام ہے، جن میں ایسا نسبی یا رضاعی رشتہ ہو، کہ ان میں سے ایک مذکر (مرد) فرض کریں، تو ان دونوں کا آپس میں نکاح حرام ہو"۔

لہٰذا ایک عورت اور اس کی بہن، یا اس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ نسبی یا رضاعی خالہ، یا پھوپھی، یا بھانجی اور بھتیجی وغیرہ کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، اگر دونوں نکاح ایک ہی عقد میں ہوں، تو دونوں باطل ہیں، آگے پیچھے ہوں اور پہلا نکاح (شرائط کے اعتبار سے) صحیح ہو، تو دوسرا باطل اور پہلا (شرائط میں کوتاہی کی وجہ سے) فاسد، تو دوسرا صحیح ہو گا، خواہ پہلے سے اس کا علم تھا یا نہ تھا، ایک کی موت یا

طلاق کے بعد دوسری سے نکاح کرنا جائز ہے، جیسا کہ بہن کے سلسلہ میں تفصیل گذر چکی۔

نسب اور رضاعت کی قید سے مصاہرت کا رشتہ نکل گیا، لہٰذا کسی عورت اور اس کے (سابقہ) شوہر کی ماں یا بیٹی کو جمع کرنا جائز ہے، گرچہ ایک کو مرد فرض کرنے کی صورت میں آپس میں ان کا نکاح حرام ہے۔(جمل ۴/۱۸۳، مغنی ۳/۱۸۰، بجیرمی ۳/۳۶۰)

کسی شخص کی بیٹی اور اس کی ربیبہ (سوتیلی بیٹی) کو (جو آپس میں ماں شریک بہن نہ ہوں)، جمع کرنا جائز ہے۔(قلائد ۲/۱۱۸) کسی عورت اور اس کے شوہر کی ربیبہ (جو دوسری بیوی سے ہو)، یا کسی شخص کی ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن کو جمع کرنا جائز ہے (مغنی ۳/۱۸۰)

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا: ”کسی عورت اور اس کی پھوپھی، اور کسی عورت اور اس کی خالہ کو جمع نہیں کیا جائے گا“ (متفق علیہ عن ابی ہریرۃ ونحوہ البخاری عن جابر)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے، نہ بھتیجی پر پھوپھی سے، نہ کسی عورت کی خالہ پر، اور نہ بھانجی پر خالہ سے، نہ چھوٹی پر بڑی سے، اور نہ بڑی پر چھوٹی سے (نکاح کیا جائے)“۔(ابوداود، ترمذی وصححہ، نسائی بعضہ، ودارمی)

نیز حضرت ابن عباس سے مسند احمد، ابوداود، ترمذی، ابن حبان، اور حضرت ابوسعید سے بسند ضعیف ابن ماجہ، حضرت علی سے بزار، حضرت ابن عمرؓ سے ابن حبان میں اور حضرات سعدؓ بن ابی وقاص، زینبؓ زوجۂ ابن مسعودؓ، ابوامامہؓ، عائشہؓ، ابوموسیٰؓ اور سمرہؓ بن جندب سے اس سلسلہ میں روایات مروی ہیں۔(تلخیص الحبیر ۳/۱۶۷، خلاصتہ البدر ۲/۱۹۳، فتح الباری ۹/۱۶۰)

حکمت: مذکورہ رشتوں کا تقاضا ہے کہ آپس میں صلہ رحمی ہو، اور عموماً سوکن بننے کی صورت میں طبعاً کچھ نہ کچھ نوک جھونک اور خلش پیش آتی رہے گی، جو آپس میں کینہ کپٹ کا سبب بن سکتی ہے، اور اس طرح صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی پائی جائے گی، اس لئے اسلام نے ان رشتوں کی عورتوں کو سوکن بنانے سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے خود اس حدیث میں اس علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ”تم لوگ اس طرح کروگے تو قطع رحمی کروگے“ (ابن حبان، ابن عبدالبر فی التمہید)، مراسیل ابوداود کی ایک روایت میں بھی قطع رحمی کے اندیشہ کو ممانعت کی علت قرار دیا ہے۔(تلخیص ۳/۱۶۷)

(۳) **چار سے زائد بیویاں:** کسی آزاد شخص کے لئے ایک وقت میں اپنے نکاح میں صرف چار بیویاں رکھنا جائز ہے، چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں ہے، ارشاد باری ہے: ”فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ“ (النساء: ۳)

ترجمہ: ”تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو، دو دو عورتوں سے، اور تین تین عورتوں سے، اور چار چار عورتوں سے۔۔۔“

حضرت غَیلَانؓ کے اسلام کے وقت ان کے نکاح میں دس بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ”ان میں سے چار کو اختیار کرلو، اور بقیہ کو جدا کردو“ (الشافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، بیہقی، وصححہ الالبانی) اسی طرح حضرت نوفلؓ کے نکاح میں پانچ بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے انھیں ایک کو جدا کرنے کا حکم دیا۔(الشافعی) اور حضرت قیس بن حارثؓ کے نکاح میں بوقت اسلام آٹھ بیویاں تھیں، تو آپ ﷺ نے ان میں سے چار کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔(ابوداود ابن ماجہ، بیہقی، ابن ابی شیبہ وحسنہ الالبانی) (تلخیص ۳/۱۶۹۰ ارواء الغلیل ۶/۲۹۱)

اگر ایک آزاد شخص ایک ہی عقد میں چار سے زائد نکاح کرے، تو تمام نکاح باطل ہونگے، اگر آگے پیچھے کرے تو ابتدا کے چار صحیح

اور اس کے بعد کے باطل ہیں۔ چار بیویوں تک ایک ہی عقد میں کرے، تب بھی صحیح ہے۔

چار میں سے کسی کے انتقال، یا طلاقِ بائنہ کے بعد (گرچہ عدت باقی ہو)، یا طلاق رجعی کی عدت ختم ہونے کے بعد دوسری سے نکاح کر سکتا ہے۔ (جمل ۱۸۵/۴)

(۴) **غیر مسلم عورت:** کسی مسلمان کو خالص کتابیہ عورت (یعنی جس کے والدین دونوں کتابی ہوں) کے علاوہ کسی بھی غیر مسلم عورت سے نکاح حلال نہیں ہے، خواہ مجوسی (آتش پرست) ہو یا بُت پرست یا کسی اور مذہب پر، جب یہ اسلام لے آئے تو اس سے نکاح جائز ہو جائے گا۔

آیت: "وَلَاتَنْكِحُوْاالْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ" (البقرۃ: ۲۲۱)

ترجمہ: "اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں"۔

تنبیہ: ایک مسلمان عورت کو کسی بھی مذہب کے غیر مسلم سے نکاح جائز نہیں، کیونکہ شوہر کو بیوی پر ولایت وحاکمیت حاصل ہوتی ہے، اور ایک کافر کو مسلمان پر کوئی ولایت نہیں، نیز اس کی ماتحتی میں اسکے دین واسلام کے حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں، ارشاد باری ہے "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" (النساء: ۱۴۱) **ترجمہ:** اور ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے"۔ نیز ارشاد ہے۔ "وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْاَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِه" (البقرہ: ۲۲۱) **ترجمہ:** "اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو، جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں، اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے، کافر مرد سے، گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو، یہ لوگ دوزخ کی تحریک دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں۔"

ایک کافرہ عورت جب اسلام لے آئے، تو اس سے نکاح حلال ہے، اسلام سے قبل نکاح ہو، تو یہ باطل ہے، اور فوراً دونوں میں جدائی کرنا واجب ہے، اگر صحبت کرے تو یہ زنا ہے۔

کتابیہ عورت: ایک مسلمان مرد کو کسی یہودیہ یا نصرانیہ (عیسائی) عورت سے نکاح جائز ہے کیونکہ ممکن ہے اس طرح اسلام اور اس کے محاسن پر اطلاع پا کر وہ اور اس کے رشتہ دار اسلام قبول کرلیں۔ لیکن یہ مکروہ ہے، کیونکہ (بیوی ہونے کی حیثیت سے) اس کی طرف میلان کی وجہ سے اِس کا اسلام خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ حربیہ ہو تو کراہت اور شدید ہوگی، امام زرکشی کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کتابیہ کے اسلام کی اُمید ہو تو اس سے نکاح کرنا مندوب ہے، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی خاتون سے نکاح فرمایا، پھر وہ اسلام لے آئیں۔

آیت: "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَامُتَّخِذِيْٓ اَخْدَان" (المائدہ: ۵) **ترجمہ:** "اور جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں (یعنی یہود ونصاریٰ) ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے، اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے، اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں) اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے (آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں، (تم کو حلال ہیں) جب کہ تم ان کو انکا معاوضہ دے دو (یعنی مہر) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (یعنی نکاح کرو جس کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں) نہ تو علانیہ بدکاری کرو، اور نہ خفیہ آشنائی کرو"۔

شرائط: کتابیہ سے صرف یہودیہ یا نصرانیہ مراد ہے، زبور یا دیگر انبیائے کرام کے صحیفوں کے ماننے کا جو دعویٰ کریں، وہ اس میں

داخل نہیں ہیں۔ اگر کتابیہ عورت اسرائیلیہ ہو، (یہ حضرت اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی طرف نسبت ہے) تو یہ شرط ہے کہ اس کے اول اصل کا (خواہ باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے) اس دین میں اس کے منسوخ ہونے کے بعد داخل ہونا معلوم نہ ہو، (یعنی یا تو نسخ سے پہلے داخل ہوا ہو، یا پتہ نہ ہو کہ کب داخل ہوا، اگرچہ تحریف کے بعد داخل ہوا ہو)، اگر معلوم ہو کہ نسخ کے بعد داخل ہوا تھا، تو اس کتابیہ سے نکاح حلال نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد کوئی یہودیت میں داخل ہو یا آپ ﷺ کی بعثت کے بعد کوئی یہودیت یا عیسائیت میں داخل ہو، تو یہ معتبر نہیں، (اور اس نسل کی کتابیہ سے نکاح جائز نہیں)

غیر اسرائیلی کتابیہ عورت کے اول اصل کا اس دین میں اس کے منسوخ ہونے سے قبل داخل ہونا معلوم ہونا شرط ہے، خواہ اس دین کے تحریف کے بعد ہو، جبکہ مُحرّفات سے مجتنب ہو، اگر نسخ کے بعد داخل ہو، یا شک ہو، یا تحریفی امور سے نہ بچے تو ان صورتوں میں ایسی کتابیہ سے نکاح جائز نہیں ہے۔

خالص کتابیہ بیوی نفقہ، لباس، باری اور طلاق وغیرہ امور میں ایک مسلمان بیوی کی طرح ہے"۔ (البتہ دونوں میں میراث نہ چلے گی) لہٰذا وہ اسے حیض وجنابت کے غسل، اور میل کچیل ونجاست کے ازالہ وصفائی پر، اور خبیث اشیاء مثلاً سور، شراب وغیرہ کے تناول سے رکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ کیونکہ بیوی سے انتفاع یا کمال انتفاع اس پر موقوف ہے۔ غسل میں بیوی کی نیت مجبوری کی وجہ سے ضروری نہیں۔

اس کا مسلمان شوہر اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اسے عبادت کرنے سے روک نہیں سکتا۔ والدین میں ایک کتابی اور دوسرا غیر کتابی ہو، تو اس لڑکی سے نکاح حلال نہیں، لیکن لڑکی بالغہ ہونے کے بعد ان میں سے کتابی کے دین کی اتباع کرے، تو اس میں شمار ہوگی اور اکثر علماء کے نزدیک اُس سے نکاح حلال ہے، امام اسنوی وغیرہ اس کے باوجود حرمت کے قائل ہیں۔

ایک دین سے دوسرے دین کی طرف انتقال: جو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے، تو اب اسے اسلام ہی قبول کرنا ضروری ہے، ورنہ اگر اسے امان ہے تو اسے اپنے مقام امن پر بھیج دیا جائے گا، پھر وہ حربی شمار ہوگا، ہم اس پر قابو پالیں تو اسے قتل کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی یہودیہ عورت نصرانیہ ہو جائے، یا اس کے برعکس، تو یہ عورت کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں، اگر کسی کے نکاح میں تھی، تو اس کا حکم مرتدہ کی طرح ہے۔

مرتدہ: جو عورت اسلام چھوڑ دے، وہ نہ کسی مسلمان کے لئے حلال ہے، اور نہ کسی کافر کے لئے۔

ارتداد: شوہر بیوی دونوں، یا کوئی اسلام چھوڑ دے، اور ابھی دخول نہ ہوا، تو فوراً نکاح ختم ہو جائے گا، اور دخول کے بعد یہ واقعہ پیش آئے، تو انتظار کریں گے، اگر عدت کے اندر دوبارہ اسلام لے آئے تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ رِدّت کے وقت سے دونوں میں جدائی ہو چکی، عدت کے توقف کی مدت میں صحبت کرنا حرام ہے، لیکن شبہ کی وجہ سے حد جاری نہ ہوگی، صرف تعزیری سزا ملے گی، نیز اس صحبت کی وجہ سے عدت واجب ہے، جیسا کہ طلاق رجعی کی عدت میں صحبت کرنے سے واجب ہے، کیونکہ یہ دونوں شبہ کی وطی ہے، (جمل ۱۹۹/۴، مغنی ۱۹۰/۳، تحفہ ۲۷۰/۹)

(۵) **شادی شدہ عورت:** جو عورت کسی کی بیوی ہو، اس سے کسی کو نکاح جائز نہیں، اگر شوہر کا انتقال ہو جائے، یا وہ طلاق دے دے، پھر عدت گذر جائے تو اس سے نکاح حلال ہے۔ محرمات کو شمار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "۔۔وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ" (النساء ۴)

ترجمہ: ”اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں“ (وہ بھی حرام ہیں)

(۶) **مُعْتَدَّہ عورت:** جو عورت شوہر کی موت یا طلاق کی عدت میں ہو، اس سے نکاح کرنا جائز نہیں، عدت ختم ہونے کے بعد نکاح جائز ہے۔ قران کریم میں ہے: ”**وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَه**“ (البقرہ ۲۳۵)

ترجمہ: ”اور تم تعلق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدتِ مقررہ اپنے ختم کو پہنچ جائے“۔

(خود صاحبِ عدت یعنی جس شخص کی عدت میں ہے، اس کے لئے بعض صورتوں میں معتدہ سے نکاح جائز ہے)

(۷) **مُطَلَّقه ثَلاَثه** (جس عورت کی تینوں طلاق ہو چکی ہو): کسی عورت کو شوہر تین طلاق دے چکے، تو اسے آئندہ اُس عورت سے نکاح کے جواز کے شرائط حسبِ ذیل ہیں۔

۱- اس کی عدت ختم ہو۔ ۲- دوسری جگہ صحیح نکاح ہو، گو غلام یا پاگل سے ہو اگر نکاح فاسد میں صحبت ہو یا شبہ کی وطی ہو تو یہ کافی نہیں۔ ۳- دوسرے شوہر کا حَشَفَہ (سپاری) یا اس کے بقدر (جبکہ یہ کٹا ہو) عضو تناسل بیوی کی اگلی شرم گاہ میں غائب ہو، خواہ عضو تناسل پر حائل مثلاً کپڑا وغیرہ لپیٹا ہو، یا دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں نیند میں ہوں، پچھلی شرم گاہ وغیرہ میں غائب ہونا کافی نہیں۔ اگر عورت کنواری ہے تو صحبت سے اس کے پردہ بکارت کا ازالہ ضروری ہے۔

آلہ تناسل میں انتشار (استادگی) بھی ضروری ہے، گو انتشار ضعیف ہو، اور انگلی کی مدد سے داخل کرنا پڑے، اگر شل ہونے یا عِنّین ہونے کی وجہ سے بالکل انتشار نہ ہو تو یہ کافی نہیں۔ (۴) دوسرا شوہر کم از کم اتنی عمر کا ہو کہ اس کا صحبت کرنا ممکن ہو، یعنی طبعاً اس میں شہوت ہو، اور عادتاً صحبت سے لطف اندوز ہو سکے، اس سے بھی کم سن ہو، تو اس کا صحبت کرنا کافی نہیں، لیکن مطلقہ اگر چھوٹی بچی ہو کہ عام طور پر اس سے صحبت نہ ہو سکے، لیکن کسی کم سن نے صحبت کرلی، تو یہ کافی ہے، بعض علماء کے نزدیک دوسرے شوہر کا مراہق یعنی قریب البلوغ ہونا شرط ہے، اس سے کم سن کافی نہیں، دوسرا شوہر نابالغ ہو، تو اس کا عاقل اور آزاد ہونا شرط ہے، بالغ ہو تو یہ دونوں شرط نہیں،

(۵) دوسرے شوہر کی صحبت کے بعد اس کی وفات یا طلاق وغیرہ کے ذریعے اس سے جدائی ہو۔

(۶) جدائی کے بعد عدت گذر جائے۔

ان تمام شرائط کے پائے جانے کے بعد اب پہلا شوہر دوبارہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ (اور اس نکاح میں اسے از سرِ نو مکمل تین طلاق کا اختیار حاصل ہو گا)

اگر دوسرے شوہر کے صحبت کے وقت دونوں میں سے کوئی احرام میں ہو، یا روزہ دار ہو، یا شوہر خصی ہو، یا بیوی سے ظہار کر چکا ہو، یا بیوی حائضہ ہو، تب بھی تحلیل (پہلے شوہر کے لئے حلال ہونے) کیلئے یہ صحبت کافی ہے۔ کیونکہ صحیح نکاح میں شوہر کی جانب سے صحبت پائی جا رہی ہے (گرچہ بعض صورتیں حرام ہیں)

آیت: ”**فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَه**“ (البقرہ: ۲۳۰)

ترجمہ: ”پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار، تو اب اُس کو وہ عورت اُسکے بعد حلال نہیں، جب تک اس کے سوا کسی خاوند سے نکاح نہ کرے“۔

حدیث: حضرت رِفاعہؓ نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دی تو انھوں نے بعد میں عبدالرحمن بن زَبیرؓ سے نکاح کیا، پھر آپ ﷺ سے ان کی جنسی کمزوری کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم رفاعہ کے پاس واپس لوٹنا چاہتی ہو؟ نہیں جب تک کہ تم

اس کا عُسَیْلَہ اور وہ تمہارا عُسَیْلَہ نہ چکھے" (صحاح ستہ، دارمی 'ابن ابی شیبہ، بیہقی، احمد عن عائشہ)

عُسَیْلَہ عَسَل (شہد) کی تصغیر ہے، یعنی تھوڑا سا شہد، تو حدیث میں لذتِ جماع کے لئے یہ تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔ یہ حدیث حضرات عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبدالرحمن بن زبیرؓ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً مروی ہے: "عُسَیْلَہ یعنی جماع (صحبت)" (احمد نسائی ابویعلی فی مسندہ وھو صحیح المعنی) (ارواء الغلیل ۲۹۲/۶، ۱۶۳/۷۔ تلخیص ۱۷۰/۳، خلاصۃ البدر ۱۹۴/۲)

لہٰذا صرف صحبت کافی ہے، انزال ہونا شرط نہیں ہے۔ اور شریعت نے یہ حکم تیسری طلاق سے روکنے اور نفرت دلانے کیلئے دیا ہے، (آئندہ اسے اپنانے کا ارادہ ہو، تو ان سارے مراحل سے گذرنا لازم ہو گا، لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر تیسری طلاق دے)

حدیث: "اللہ نے مُحَلِّلْ اور مُحَلَّلْ لَہٗ پر لعنت فرمائی ہے" (ترمذی، نسائی وصححہ ابن القطان وابن دقیق العید علی شرط البخاری) نیز دیگر کئی صحابۂ کرامؓ سے بھی اِس طرح مختلف کتب حدیث میں روایت موجود ہے (تلخیص ۱۷۰/۳) (مُحَلِّلْ یعنی دوسرا شوہر اور مُحَلَّلْ لَہٗ پہلا شوہر)

اگر دوسرا شوہر اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ صحبت کرنے کے بعد طلاق دے گا، یا بیوی اس سے بائنہ (جدا) ہو جائے گی، یا دونوں میں نکاح باقی نہ رہے گا، اور یہ شرط عقد میں لگائی جائے، تو یہ نکاح ہی باطل ہے، کیونکہ یہ ایسی شرط ہے جو نکاح کے دوام سے مانع ہے، لہٰذا مؤقت (وقتی) نکاح کی طرح ہوا، اگر عقد سے پہلے جانبین آپس میں ایسی کسی شرط پر متفق ہوں، پھر اس قصد کے ساتھ نکاح ہو، لیکن عقد میں شرط نہ لگائی جائے تو مکروہ ہے، تاکہ جن علماء نے اسے بھی باطل قرار دیا ہے، ان کے مسلک کی رعایت ہو، نیز اصول یہ ہے کہ جس شرط کی صراحت باطل کرتی ہے، اس کا جی میں ارادہ کرنا مکروہ ہے۔ اسی طرح بلا شرط نکاح کرے، لیکن دل میں نیت یہ ہو کہ صحبت کرنے کے بعد طلاق دوں گا، تو یہ مکروہ ہے۔ (مغنی ۱۸۳/۳، تحفہ ۲۴۰/۹، نہایہ ۲۸۲/۶، جمل ۱۸۷/۴، الفقہ المنہجی ۳۰/۴۔۳۴)

تعدد ازواج (ایک سے زائد بیویاں)

حکم: اصل میں تعدد ازواج مباح ہے، ارشاد باری ہے: "فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتَامٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ" (النساء: ۳)

ترجمہ: "اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو، جو اور عورتیں تم کو خوش آویں، دو دو، تین تین، چار چار"

یعنی اگر یتیم لڑکیوں سے نکاح کی صورت میں ان کے ساتھ بے انصافی کا ڈر ہو تو تم کو اس کی اجازت ہے کہ ان کے سوا دیگر عورتوں سے نکاح کرو، (یہ اجازت صرف چار تک ہے، جیسا کہ گذر چکا، بالا جماع ایک وقت میں اس سے زائد جائز نہیں)

زائد نکاح کرنے والے کے احوال کے اعتبار سے کبھی تعدد مستحب، کبھی مکروہ اور بعض اوقات حرام ہو گا۔ (۱) اگر کسی کو دوسری بیوی کی ضرورت ہو: مثلاً ایک سے عفت کا مقصد حل نہ ہو، یا پہلی بیوی بیمار رہتی ہو، یا بانجھ ہو، اور اسے اولاد کی خواہش ہو، اور اس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ بیویوں میں عدل وانصاف برتے گا، تو یہ تعدد مستحب ہے، کیونکہ اس میں مشروع مصلحت موجود ہے، کئی صحابۂ کرامؓ نے ایک سے زائد نکاح کئے ہیں۔

(۲) بغیر حاجت کے محض تنعم اور تعیش کے طور پر زائد بیویاں رکھے، اور اُن میں انصاف کر پائے گا یا نہیں، اس میں شک ہو، تو یہ تعدد مکروہ ہے۔

(۳) اپنی غریبی، ضعف و کمزوری یا کسی طرف میلان کی وجہ سے کسی پر ظلم کے متعلق اپنے نفس پر اطمینان نہ ہو، اور غالب گمان یہ ہو کہ ایک سے زائد بیویوں میں عدل وانصاف نہیں کر پائے گا، تو اسے تعدد حرام ہے، بے انصافی کے اندیشہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک پر اکتفا کا حکم دیا ہے (دیکھئے سورۂ نساء آیت ۳)

آخری دونوں صورتوں میں کوئی مزید نکاح کرے، تو یہ عقد صحیح ہو گا، اور تمام آثار مثلاً مہر کا وجوب، نفقہ کا وجوب وغیرہ مرتب ہوں گے، گرچہ دوسری صورت میں مکروہ اور تیسری صورت میں حرام ہے۔ اور حرمت سے گناہ ہو گا۔ لیکن عقد باطل نہ ہو گا۔

مطلوبہ عدل: بیویوں کا نفقہ، رہائش، ان کے ساتھ شب باشی، حسن معاشرت اور دیگر ازدواجی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اسلام نے عدل و مساوات کو واجب قرار دیا ہے۔ جہاں تک قلبی محبت کا تعلق ہے، تو اس میں مساوات واجب نہیں ہے، جبکہ عملاً کسی ظلم کا باعث نہ بنے، کیونکہ محبت کے باب میں انسان کو اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں، شاید قرآن کریم کی اس آیت سے یہی مراد ہے:

آیت: "وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ" (النساء: ۱۲۹)

ترجمہ: اور تم ہرگز عورتوں کو برابر نہ رکھ سکو گے، اگرچہ اس کی حرص کرو"۔

دیگر مذکورہ بالا امور میں عدل وانصاف لوگوں کے بس اور اختیار میں ہے۔ آپ ﷺ مطلوبہ مساوات وانصاف کے بعد فرمایا کرتے: "یا اللہ یہ میرے بس کی تقسیم تھی، بس جس کا تو مالک ہے، اور میرے بس میں نہیں، اس پر مجھے ملامت نہ کر"۔ (ابوداود، ترمذی وغیرہ) اس سے دلی محبت اور میلان مراد ہے۔

حکمت: اسلام نے تعدد کی اجازت دی ہے، اسے کوئی فرض نہیں قرار دیا، تعدد کی اس اجازت کے مختلف فوائد ہیں، جن کا ادراک ایک دور رس نگاہ ہی کر سکتی ہے، مثلاً: (۱) ایک بیوی اپنی عفت و تکمیل جذبات کے لئے ناکافی ہو، تو یہ ناجائز راستے کی طرف قدم بڑھانے کا سبب بنے گا، تو اس کے اور معاشرہ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ کسی دوسری عورت سے نکاح کر کے دونوں شریف زندگی گذاریں، اور زنا کی گمراہی و تاریکی سے محفوظ رہیں۔

(۲) تعدد کی وجہ سے ایک بے نکاح عورت کو صحیح سہارا نصیب ہوتا ہے، اور اس بات سے اس کی حفاظت ہوتی ہے کہ بدکار لوگ اس کا پیچھا کر کے اسے اپنے ہوس کا نشانہ بنائیں، اور ہر ہر حق سے محروم اور ذلیل قرار پائے، نیز اس کی اولاد بھی نسب کے حقوق اور پدری شفقت کی محرومی کا شکار نہ ہوئیں گے۔

بہر حال تعدد سے اسلام کا مقصد دونوں کو زنا و بدکاری کے دلدل سے بچا کر ایک شریفانہ زندگی سے ہمکنار کرنا، اور ایک صالح معاشرہ کا وجود ہے۔

ایک شخص میں بیویوں کی رغبت ہو، اور اس کی بیوی فطرتاً یا کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے اس کے برعکس ہو، تو اس شخص کے لئے کیا بہتر ہے؟ کیا زنا کر کے اپنی دین و دنیا و صحت کو تباہ کر دے، یا اپنے جذبات کو دبا کر گھلتا اور گھٹتا رہے، یا پھر دوسرا نکاح کر لے، ظاہر ہے کہ تیسری ہی شکل بہتر ہے۔

جنگ کے شعلے ہمیشہ بھڑکتے رہتے ہیں، گویا کہ یہ ضروریات زندگی میں داخل ہے، جس کے نتیجے میں مردوں کی قلت، اور ان کے

مقابلہ میں عورتوں کی کثرت ایک بدیہی امر ہے، تو کیا ہر شخص صرف ایک بیوی کا پابند بن کر دیگر عورتوں کو اسی طرح ازدواجی مسرتوں اور اولاد کی شفقت سے محروم رکھا جائے اور اپنی پیری میں بالکل بے سہارا ہو جائے، نیز اکثر وبیشتر وہ بے راہ روی اختیار کر کے بالکل ہی برباد ہو جائے گی، ایسے ماحول میں تعدد کو مروت وغیرت کا ایک انسانی فریضہ قرار دینا مبالغہ نہ ہو گا۔

شوہر کو بیوی سے محبت ہو، لیکن اس کی تقدیر میں اولاد کی خوشی نہ ہو، تو کیا اسے اس خوشی سے محروم رہنے پر مجبور کریں، یا اس محبوب بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیں، یا اسے زوجیت میں رکھ کر دوسرے نکاح کی اجازت دیں اور دونوں میں عدل وانصاف کو ضروری قرار دیں، ظاہر ہے کہ تیسری ہی شکل معتدل اور بہتر ہے۔

جو معاشرے تعدد ازواج کو جرم سمجھتے ہیں، وہ بے انتہا ضرر وخطرات اور بربادی کا شکار ہوتے ہیں، جو ان کے گمان کے مطابق تعدد ازواج کے ضرر سے بہت زیادہ ہیں، ان میں ازدواجی خیانت، علانیہ بدکاری اور خفیہ آشنائی عام ہوتی جارہی ہے، جس کی وجہ سے ان کے سنجیدہ افراد خود تعدد ازواج کی اجازت کیلئے چیخ رہے ہیں۔

تنبیہ: اسلام نے تعدد کی اجازت کسی پر ظلم وستم ڈھانے اور پریشان کرنے کے لئے نہیں دی، بلکہ افراد ومعاشرہ کی ضرورت اور اصلاح کے پیش نظر مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، اب اگر بعض جاہل اور بددین افراد اس کا غلط استعمال کریں، تو اس سے اسلام کے اس حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ (الفقہ المنہجی ۴/۳۵۔۴۰)

مہر (صَدَاق)

تعریف: عقد نکاح (یا وطی) کی وجہ سے شوہر پر جو مال بیوی کو دینا واجب ہے، اسے مہر کہا جاتا ہے۔

حکم: عقد نکاح مکمل ہوتے ہی شوہر پر مہر واجب ہو گا، خواہ عقد میں مہر مقرر کیا جائے یا نہ کیا جائے، بلکہ جانبین مہر کی نفی پر متفق بھی ہوں، تو یہ اتفاق باطل اور مہر لازم ہے۔

وجوب کی دلیل: مہر کا وجوب قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔

آیت: (۱) "وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً" (النساء: ۴)

ترجمہ: "اور تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوشدلی سے دے دیا کرو"۔

(۲) "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً" (النساء: ۲۴)

ترجمہ: "پھر (نکاح کے بعد) جس طریق سے تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو، سو ان کو (اس کے عوض) ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں"۔

(۳) "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً" (البقرہ: ۲۳۶)

ترجمہ: "تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہے"۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کرانے کے متعلق درخواست کی تو آپ ﷺ نے مہر ادا کرنے کا حکم دیا، کچھ نہ ملا تو اسے کم از کم ایک لوہے کی انگوٹھی تلاش کر کے لانے کا حکم دیا، وہ بھی نہ ملا تو آخر میں آپ ﷺ اس کو یاد چند سورتوں

کی تعلیم کی شرط کے عوض اس عورت کا نکاح اس سے کر دیا۔

ہر دور میں بغیر کسی انکار کے تمام علماء کا مہر کے وجوب پر اتفاق ہے۔

عقد میں مہر کا ذکر: عقد میں مہر کی مقدار کا ذکر سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے کسی نکاح کو مہر کی تعیین کے بغیر انجام نہیں دیا، نیز اس صورت میں آئندہ دونوں میں اختلاف وتنازع کا موقع نہ آئے گا۔ عقد میں مہر کا ذکر نہ کرنا مکروہ ہے۔ (اوپر کی تیسری آیت۔ البقرہ: ۲۳۶ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر کے ذکر کے بغیر بھی نکاح صحیح ہے)

مہر کی ملکیت: مہر خالص بیوی کا حق ہے، کسی ولی کا اس میں کوئی حق نہیں، گرچہ ان کو قبضہ کا حق ہے، لیکن یہ قبضہ اسی کی ملکیت کے طور پر ہے۔

مہر کی مقدار: مہر کی اقل واکثر (کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ) مقدار کی کوئی حد نہیں، (جو چیز کسی چیز کی قیمت بن سکتی ہے، وہ مہر بن سکتی ہے، منہج الطلاب) قلیل یا کثیر، کوئی معین چیز، یا ذمہ میں بطور قرض، (مثلاً ہزار روپیہ) یا منفعت (گھر کی رہائش یا تعلیم) مہر مقرر کی جاسکتی ہے۔

آیت: ''أُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ ''(النساء ۲۴)

ترجمہ: اور (سابقہ آیت میں بیان کئے گئے) ان (مُحرَّم) عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کئی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو ان کے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو (یعنی مہر ہونا نکاح میں ضرور ہے) اس آیت میں مال کو مطلق بیان کیا، کسی خاص مقدار کی قید نہیں لگائی، صحیحین کی ایک حدیث میں اپ ﷺ نے لوہے کی انگوٹھی مہر مقرر کرنے فرمایا، پھر چند سورتوں کی تعلیم کو مہر مقرر کیا، ترمذی کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے ایک جوڑ چپل (کے مہر) پر نکاح کیا، تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تو اپنے نفس ومال کے مقابلہ میں چپل کے جوڑ پر راضی ہے؟'' اس نے اثبات میں جواب دیا، تو آپ ﷺ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا۔ اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے۔ ''وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰاهُنَّ قِنْطَاراً فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئاً۔ ''(النساء: ۲۰)

ترجمہ: ''اور اگر تم بجائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دوسری بیوی کرنا چاہو، اور تم اس ایک کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو، تو تم اس میں سے کچھ بھی مت لو''۔

لیکن مستحب یہ ہے کہ مہر کی مقدار دس درہم سے کم نہ ہو، تاکہ حنفیہ کے اختلاف سے بچ سکیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ واجب ہے۔ اسی طرح ۵۰۰ درہم سے زائد نہ ہونا مستحب ہے، کیونکہ آپ ﷺ کے (اکثر) ازواجِ مطہرات اور پاکیزہ دختروں کا مہر یہی وارد ہے۔

حدیث: حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو، کیونکہ یہ بات دنیا میں بزرگی اور آخرت میں تقوی کا باعث ہوتی، تو اس کے آپ ﷺ زیادہ مستحق تھے، آپ ﷺ کے ازواجِ مطہرات اور بیٹیوں کا مہر ۱۲ اُوقیہ سے زائد نہ تھا'' (احمد، اصحاب السنن وصححہ الترمذی)

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے ازواجِ مطہرات کا مہر ۱۲ اُوقیہ اور نصف اُوقیہ (۱۲،۵ اُوقیہ) مروی ہے (تلخیص ۳/ ۱۹۱) ایک اوقیہ ۴۰ درہم کا ہوتا ہے، لہٰذا ساڑے بارہ اوقیہ ۵۰۰ درہم کے برابر ہوا۔ یہ چاندی کی زکات کے نصاب کے ڈھائی گنا ہوا۔ (آپ ﷺ کی اتباع میں مہر چاندی میں ہونا سنت ہے۔ نیز مہر میں سے کچھ مقدار بیوی کے سپرد کرنے سے پہلے دخول نہ کرنا سنت ہے، تاکہ جن علماء نے

اسے واجب قرار دیا ہے ان کے اختلاف سے بچ جائیں۔جمل ۴/۲۳۶)

نقد یا ادھار مہر (معجل یا مؤجل): مہر معجل اور فوری ہونا شرط نہیں، پورا مہر دخول سے قبل معجل، یا پورا مؤجل، یا بعض معجل اور بعض مؤجل ہو، تو صحیح ہے۔ لیکن مؤجل (ادھار) ہو تو مدت متعین ہونا شرط ہے۔

اگر مہر نقد ہو، تو اس پر قبضہ کرنے تک بیوی اپنے آپ کو شوہر سے روک سکتی ہے۔ لیکن ادھار ہو، تو اسے خود کو روکنے کا حق حاصل نہ ہو گا، کیونکہ وہ خود تاخیر پر راضی ہوئی ہے، اس لئے خود کو روکنے کا حق ساقط ہو گا۔

مہر کا استقرار (پختہ ہونا): (۱) شوہر بیوی سے صحبت کرے تو اس پر کل مہر بالکل لازم ہو گیا۔ خواہ یہ صحبت حلال حالت میں ہو، جیسے بیوی حیض سے پاک ہو، یا حرام حالت میں، مثلاً ح۔ض کی حالت میں، اس آیت سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔ ترجمہ: ”پھر (نکاح کے بعد) جس طریق سے تم ان عورتوں سے متنفع ہوئے ہو، سو ان کو (اس کے عوض) ان کے مہر دو، جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں“ (النساء ۲۴) استمتاع اور انتفاع سے یہاں دخول اور صحبت سے لطف اندوز ہونا مراد ہے۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے: ”جو شخص بھی کسی عورت سے نکاح کرے۔۔۔ پھر اسے مَس کرے۔ (یعنی اس سے جماع کرے) تو اسے کامل مہر ملے گا۔ (مؤطا مالک۔النکاح)

(۲) دخول سے قبل یا بعد میاں بیوی میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، تو مکمل مہر لازم ہو گا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہو چکا ہے۔

نصف مہر کا استقرار: صحیح عقدِ نکاح ہو، اور عقد میں صحیح طریقے سے مہر متعین ہو، پھر صحبت سے قبل ہی شوہر بیوی کو طلاق دے، تو نصفِ مہر لازم ہو گا۔

آیت: ” وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ “ (البقرہ:۲۳۷)

ترجمہ: ”اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو مَس کرو (یعنی صحبت کرو) اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو، اس کا نصف (واجب) ہے۔ (اگر شوہر انگلی وغیرہ سے پردہ بکارت کا ازالہ کرے، پھر دخول سے قبل طلاق دے دے، تو صرف نصف مہر واجب ہو گا۔ لیکن یہ حرکت حرام ہے، اور اسے تعزیری سزا ملے گی (فتاوی ابن زیاد ۲۱۵) اگر شوہر طلاق بیوی کے سپرد کرے اور وہ خود کو طلاق دے دے، یا بیوی کے عمل پر معلق کرے اور بیوی وہ عمل کرے، یا شوہر کے اسلام یا ارتداد کی وجہ سے یا لعان کی وجہ سے جدائی ہوئی ہو، یا شوہر کی ماں دو سال سے کم عمر بیوی کو دودھ پلائے، یا بیوی کی ماں اس طرح شوہر کو دودھ پلائے تو ان تمام صورتوں میں بھی نصف مہر ساقط ہو گا (جب کہ صحبت سے قبول ہو) (فتح الوھاب)

کل مہر کا سقوط: اگر صحبت سے پہلے ہی میاں بیوی میں جدائی ہو جائے، اور یہ جدائی بیوی کے سبب سے ہو، تو کل مہر ساقط ہو گا۔ مثلاً بیوی کے اسلام کی وجہ سے، یا ارتداد کی وجہ سے نکاح فسخ ہو جائے، یا شوہر کے عیب کی وجہ سے بیوی نکاح فسخ کرنے، یا بیوی میں عیب کی وجہ سے شوہر نکاح فسخ کرے، تو ان تمام حالات میں کل مہر ساقط ہو گا۔ (فسخ کن عیوب کی وجہ سے ہو سکتا ہے، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی)

مہرِ مثل: بیوی کے مثل عورتوں کا عموماً جو مہر مقرر ہوتا ہے، اسے اس کا مہر مثل کہیں گے۔ اس کی تعیین کے لئے لڑکی کے والد کی طرف سے نسبی رشتہ دار لڑکیوں کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ پس جس لڑکی کے مہر مثل کی تعیین کرتا ہو، عصبات میں سے سب سے قریبی

عورت کا اس سلسلہ میں اعتبار کیا جائے گا۔ سب سے قریبی سگی بہن ہے، پھر باپ شریک بہن، پھر بھتیجیاں (نیچے تک)، پھر پھوپھیاں (پہلے سگی پھر باپ شریک)۔ نیز آئندہ آنے والی صفات میں بھی متعلقہ لڑکی کے مساوی ہونے کی رعایت کی جائے گی۔

اگر عصبات عورتیں نہ ہوں، یا ان کا نکاح نہ ہوا ہو، تو ارحام میں سے (یعنی والدہ کی جانب سے) قریبی رشتہ دار کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً والدہ، نانی، خالہ، بھانجیاں، کیونکہ اجنبی اور پرائی عورتوں سے یہ بہتر ہیں۔ اگر یہ بھی مفقود ہوں، تو درج ذیل صفات میں اس لڑکی کے مثل بستی کی دیگر لڑکیوں کا اعتبار کیا جائے گا۔

مہر مثل کی تعیین میں معتبر صفات: عمر، عقل، جمال، مالداری، عفت و پاکدامنی، دین، تقویٰ، علم، کنوارا پن، شادی شدہ ہونا، نیز ہر وہ صفت جس سے صحیح غرض کا اختلاف ہو، کیونکہ ان صفات کے اختلاف سے مہر بھی مختلف ہوتا ہے۔

حدیث: حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے نکاح کیا، اور کچھ مہر مقرر نہ کیا، پھر صحبت سے پہلے انتقال کر گیا، تو ابن مسعودؓ نے فرمایا: اسے اس جیسی عورتوں کی مہر کے مثل مہر ملے گا، نہ کم نہ زائد۔۔۔ تو حضرت معقل نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ ﷺ نے بھی ایسا ہی فیصلہ دیا تھا۔۔ (ابو داود، ترمذی بسند حسن صحیح وغیرہما)

مہر مثل کے مُوجبات: درج ذیل صورتوں میں مہر مثل واجب ہوگا۔

(۱) **نکاح فاسد ہو،** یعنی شرائطِ صحت میں سے کوئی شرط مفقود ہو، مثلاً بغیر گواہوں یا ولی کے نکاح ہوا پھر اس فاسد عقد میں دخول (جماع) بھی پایا گیا، تو مہر مثل واجب ہوگا، کیونکہ عقد اور معین مہر فاسد ہیں، نیز دونوں میں تفریق بھی واجب ہے۔ دخول کے وقت کے اعتبار سے مہر مثل مقرر ہوگا، نہ کہ عقد کے وقت، کیونکہ فاسد عقد کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۲) **اگر مہر کی تعیین میں جانبین کا اختلاف ہو،** بیوی کہے: آپ نے عقد میں مہر متعین کیا تھا، اور شوہر انکار کرے، تو بیوی اپنے دعویٰ پر قسم لے گی، اور شوہر اپنے دعویٰ پر قسم لے گا۔ پھر مہر کو فسخ کریں گے اور مہر مثل واجب ہوگا۔

(۳) **مہر کا ذکر فاسد ہو:** اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہوں گی۔

(۱) **مقررہ مہر شرعاً مال نہ ہو:** مثلاً شراب، سور، آلات لہو وغیرہ جو شریعت کے عرف میں مال شمار نہیں ہوتے۔

(۲) **مقررہ مہر اس کی ملکیت نہ ہو،** مثلاً کسی کی گھڑی غصب کر کے مہر مقرر کرے۔

(۳) دو یا زائد عورتوں سے ایک ہی مہر پر نکاح کرے، تو یہ نکاح صحیح ہے، لیکن مہر فاسد ہے، بس ہر ایک کے لیے مہر مثل واجب ہوگا۔

(۴) ولی نابالغ بچہ کا نکاح مہر مثل سے زائد پر کرے اور مہر بچے ہی کے مال سے متعین ہو، یا ولی کمسن بچی کا نکاح، یا بالغہ کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر مہر مثل سے کم پر کرے، تو مہر فاسد ہوگا اور مہر مثل واجب ہوگا، کیونکہ ولی اس بات کا مکلف ہے کہ دونوں کی مصلحت پیش نظر رکھے، جو کہ یہاں رکھی نہ گئی۔

(۵) **مفوّضہ:** یعنی وہ رشیدہ لڑکی (کنواری ہو یا شادی شدہ) جو اپنے ولی سے کہے کہ میرا نکاح بغیر مہر کے کر دو، پھر ولی اس کا نکاح کرائے اور مہر کی نفی کرے، یا مہر کے متعلق سکوت اختیار کرے، تو اسے مہر مثل دینا واجب ہے، لیکن صرف عقد سے نہیں، بلکہ دخول سے (یا کسی ایک کی موت سے) اور عقد کے وقت کا مہر مثل معتبر ہوگا، نہ کہ دخول کے وقت کا (اگر ولی مہر مثل پر ہی نکاح کرے تو وہی واجب ہے)

عورت شوہر سے یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ دخول سے پہلے مہر متعین کرے، اور مہر مثل متعین کرنے سے پہلے اپنے نفس کو اس سے روک سکتی ہے (شوہر مہر متعین کرنے سے انکار کرے، یا مقدار میں دونوں کا اختلاف ہو، تو قاضی مہر مثل مقرر کرے۔ فتح الوھاب)

(۶) اگر عقد میں مہر کے ایک حصّہ کی بیوی کے علاوہ کسی کے حق میں شرط لگائی گئی، مثلاً اس کا باپ، یا بھائی، تو نکاح صحیح ہے، لیکن مہر فاسد ہے، اور اسے مہر مثل دینا واجب ہے۔

(۷) نکاح فاسد کی وطی اور وطی بالشبہ سے مہر واجب ہو گا۔ اسی طرح زنا بالجبر سے بھی واجب ہو گا، حربیہ سے وطی کی وجہ سے مہر واجب نہیں۔ نیز جو عورت رضامندی سے زنا کرے گرچہ کسی انکار کے بغیر صرف سکوتِ اختیار کرلے تو مہر واجب نہیں ہے (قلائد)

سری وعلانیہ مہر: آپس میں جانبین سراً کچھ مہر مقرر کریں، پھر علانیہ اس سے زائد ذکر کریں، تو عقد میں جس مقدار کا ذکر ہو، وہ معتبر ہو گا، لہٰذا سراً باقاعدہ عقد نکاح ہو، جس میں ایک ہزار مہر معین ہو، پھر علانیہ دو ہزار پر دوبارہ عقد ہو (تاکہ مہر کی قلت سے شرمندگی نہ ہو) تو ایک ہزار لازم ہے، دونوں کے عقد کے گواہ متحد ہوں یا مختلف (کیونکہ اصل عقد پہلا ہے)۔ اگر سراً ایک ہزار مہر پر اتفاق کریں، (لیکن عقد نہ ہو) پھر علانیہ عقد میں دو ہزار طے ہو، تو دو ہزار لازم ہیں۔ (فتح الوھاب مع الجمل ۴/ ۲۴۶)

مہر میں معین چیز دینا: کوئی متعین شئ (مثلا ایک معین بکری یا کار) مہر مقرر کرے، تو بیوی کے قبضہ سے قبل یہ شوہر کے ضمان میں داخل ہے، یعنی بطور ضمان عقد، (لہٰذا تلف کی صورت میں مہر مثل واجب ہو گا) گرچہ بیوی مطالبہ کرے اور وہ نہ دے، جیسا کہ مبیع فروخت کنندہ کے قبضہ میں بطور ضمان عقد ہوتا ہے، لہٰذا قبضہ سے قبل بیوی اس میں کوئی تصرّف (مثلاً فروخت کرنا، ہبہ کرنا، کرایہ پر دینا وغیرہ) نہیں کرسکتی، اگر اس کے ہاتھوں خود بخود تلف ہو جائے، یا وہ خود تلف کردے، تو مہر مثل واجب ہو گا، اور اگر رشیدہ بیوی خود تلف کردے، تو گویا اپنے حق پر قبضہ کرلیا (اب مزید کوئی مہر نہ ملے گا)۔ اگر کسی تیسرے آدمی (اجنبی) نے تلف کیا، یا بیوی کے دخل کے بغیر عیب دار ہوا، تو بیوی کو اختیار ہے کہ یا تو مہر فسخ کرکے شوہر سے مہر مثل لے، اور شوہر اجنبی سے وصول کرے گا، اگر فسخ نہ کرے تو اجنبی سے تاوان لے، (مکمل تلف کیا ہے، تو مکمل بدل لے، عیب دار کیا ہے تو اس کا تاوان لے۔ اجنبی کے علاوہ عیب کی شکل میں اسے عیب کے بدلہ میں کچھ نہ ملے گا)

اگر مہر میں دو چیزیں متعین ہوں، پھر قبضہ سے پہلے ایک تلف ہو جائے، تو اس چیز کا مہر ہونا فسخ ہو گا، نہ کہ باقی میں، اب بیوی مکمل فسخ کرے تو مہر مثل ملے گا، ورنہ باقی چیز اور تلف شدہ کی نسبت سے مہر مثل ملے گا۔ (اگر بیوی یا اجنبی کے ذریعے تلف ہو تو وہی سابقہ تفصیل ہو گی)

شوہر بیوی کے سپرد کرنے سے قبل متعینہ مہر کے منافع سے استفادہ کرلے، مثلاً سوار ہونا، تب بھی ان منافع کا ضامن نہ ہو گا (یعنی اس استعمال کے عوض بیوی کو کرایہ دینے کی ضرورت نہیں) گرچہ بیوی سپردگی کا مطالبہ کرچکی ہو، البتہ زوائد (مثلاً دودھ، اون وغیرہ) شوہر کے ہاتھ میں امانت ہیں، یہاں تک کہ بیوی کے مطالبہ پر سپرد نہ کرے، اور کچھ عذر بھی نہ ہو، تو پھر ان کا ضامن ہو گا (جمل ۴/ ۲۳۹)

بیوی کی سپردگی: اگر لڑکی یا ولی (شوہر کے مطالبہ پر) لڑکی کی سپردگی کے لئے کچھ مدت ومہلت طلب کریں، تاکہ وہ نظافت وطہارت حاصل کرسکے، مثلاً میل کچیل کا ازالہ، موئے زیر ناف وبغل کی صفائی تو تین دن تک کی مہلت دینا واجب ہے، اس سے زائد کی ضرورت نہیں۔ (یعنی قاضی ایک یا دو یا تین دن جو بھی مناسب سمجھے فیصلہ کرے، اس سے زائد مدت کا فیصلہ نہ دے) حیض ونفاس کے ختم ہونے کے لئے مہلت کی ضرورت نہیں، گرچہ مدت کم ہو، بلکہ اسی حال میں سپرد کرے، کیونکہ فی الجملہ انتفاع ممکن ہے، امام غزالیؒ نے فرمایا: اگر اس کی عادت معلوم ہو کہ حیض میں بھی صحبت کرے گا، تو بیوی اس کے ساتھ لیٹنے سے باز آسکتی ہے، جو لڑکی کمسن ہو، اور ابھی صحبت کو برداشت نہیں کرسکتی، یا مریضہ یا دبلی ہو کہ صحبت سے نقصان ہو گا، تو ان کو عوارض کے ختم ہونے تک سپرد کرنا مکروہ ہے، اگر شوہر وعدہ کرے کہ میں فی الحال صحبت نہیں کروں گا، اور معتبر شخص ہو، تب بھی سپرد نہ کرے، پتہ نہیں شہوت کے ہیجان میں

کیا کر بیٹھے۔ امام بغوی اور ابن المقری کا خیال ہے کہ شوہر معتبر ہو تو مریضہ کو سپرد کرے نہ کہ کمسن لڑکی کو۔

جو عورت جنون، مرض، دبلا پن، کمسنی وغیرہ کی وجہ سے وطی (صحبت) کو برداشت نہ کر سکے، اس سے وطی کرنا حرام ہے۔ بلکہ برداشت کی طاقت تک مہلت دینا واجب ہے۔ اگر کمسن لڑکی جو ابھی صحبت کے قابل نہ ہو شوہر کے سپرد کی جائے، تو اسے قبول کرنا ضروری نہیں۔ اگر قبول کرے تو مہر نفقہ کی طرح سپرد کرنا ضروری نہیں، اگر مریضہ یا دبلی بیوی کو سپرد کرے تو شوہر انکار نہیں کر سکتا جیسا کہ بیوی کی بیماری میں اسے اپنے گھر سے نہیں نکال سکتا، (بلکہ) اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔ (مغنی المحتاج ۳/۲۲۴، جمل ۴/۲۴۱، نہایۃ ۶/۳۴۱)

سپردگی کی جگہ: جس بستی میں عقد نکاح ہو اور شوہر موجود ہو، اس بستی میں شوہر جس مکان میں کہے، بیوی کو سپرد کرنا ضروری ہے۔ گرچہ بوقتِ عقد بیوی کسی اور جگہ ہو، اگر وکیل کے ذریعے عقد ہو اور شوہر کسی دوسری جگہ ہو تو شوہر کی بستی کا اعتبار ہوگا (لہٰذا بیوی مدراس میں ہو اور شوہر بمبئی میں اس سے نکاح کرے، تو اسے بمبئی لے جا کر شوہر کے سپرد کیا جائے گا، سفر کا خرچ اور ان ایّام کا نفقہ بیوی پر ہی ہوگا، اگر شوہر دہلی میں سپردگی کا مطالبہ کرے، تو بمبئی سے دہلی تک مصارف اور نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا) (جمل ۴/۲۴۰، مغنی ۳/۲۲۴، تحفہ ۹/۳۷۳، نہایہ ۶/۳۴۰)

بیوی کے گھر رہنا: کسی عورت کو اسی کے گھر شوہر کے سپرد کریں، اور شوہر بیوی کی اجازت سے اسکے گھر میں داخل ہو، تو قیام کی مدت کا کرایہ اس پر لازم نہیں، اگر بیوی سفیہ ہو (رشیدہ نہ ہو) یا بالغہ ہو اور چپ رہے، اور اس کے گھر والوں کی اجازت سے داخل ہو، اور وہ چپ ہو، تو قیام کی مدت کا کرایہ شوہر پر لازم ہے، اگر گھر بیوی کے گھر والوں کا ہو، اور وہ داخل ہونے کی اجازت دیں، اور کرایہ کا کچھ ذکر نہ کریں، تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کرایہ واجب ہوگا۔

بیوی کے برتنوں کا استعمال: اگر شوہر بیوی کے برتن استعمال کرے، اور وہ عادت کے مطابق چپ ہو، تو اس پر کرایہ لازم ہوگا۔ (جمل مع فتح الوھاب ۴/۲۴۰۔ الفقہ المنہجی ۴/۷۵)

عقد نکاح میں شرائط کی قسمیں

(۱) شرط نکاح کے تقاضے کے مطابق ہو، مثلاً بیوی کے نفقہ یا باری کی شرط لگانا تو یہ شرط فضول ہے (کیونکہ اس کے بغیر بھی یہ حق حاصل ہے)، اور عقد و مہر کی تعیین صحیح ہے۔

(۲) شرط نکاح کے مقتضیٰ کے مخالف ہو، لیکن نکاح کے اصل مقصد یعنی صحبت میں خلل انداز نہ ہو، مثلاً یہ شرط کہ شوہر سوکن نہیں لائے گا، یا بیوی کا نفقہ نہ دے گا، تو نکاح صحیح ہوگا، اور شرط فاسد ہے، خواہ شوہر کے حق میں ہو، یا بیوی کے حق میں، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ ”ہر وہ شرط جو قرآن مجید میں نہیں، وہ باطل ہے۔“ (بخاری) (بیوی کو باری نہ دینا، یا سوکن کے ساتھ رہنا، یا اسے سفر میں نہ لے جائے وغیرہ شرط کا بھی یہی حکم ہے۔ قلائد ۲/۱۳۶) شرط کے فساد کی وجہ سے مہر بھی فاسد ہوگا۔ (اور مہر مثل واجب ہوگا)

(۳) شرط نکاح کے اصل مقصود یعنی جماع میں خلل انداز ہو، مثلاً بیوی کی طرف سے یہ شرط کہ اس سے جماع نہیں کرے گا یا صرف دن میں جماع کرے گا، یا صرف ایک مرتبہ جماع کرے گا یا نکاح کے بعد طلاق دے دے گا، تو یہ نکاح ہی باطل ہے۔ اگر شوہر کی طرف سے جماع نہ کرنے کی شرط ہو تو حرج نہیں، (مغنی ۳/۱۸۳،) (اصل نکاح میں خیار شرط سے بھی نکاح باطل ہوگا۔ قلائد)

کسی دوسرے کا مہر دینا: اگر بچے کی طرف سے باپ دادا مہر ادا کریں، پھر دخول سے قبل مفارقت ہو جائے، تو مہر بچے کی طرف لوٹے گی، لیکن اگر باپ دادا کے علاوہ کوئی ادا کرے، یا باپ دادا بالغ بیٹے کی طرف سے ادا کریں، تو ادا کرنے والے کی طرف لوٹے گی (قلائد ۱۴۳/۲)

مُتْعَہ: متعہ دراصل متاع سے مشتق ہے، یعنی وہ چیز جس سے انتفاع واستفادہ ہو سکے۔ اس باب میں متعہ کا مطلب وہ مال ہے، جو شوہر پر بیوی کے حق میں واجب ہوتا ہے، جبکہ طلاق وغیرہ کے ذریعے وہ جدا کی گئی ہو۔

متعہ کب واجب ھے: (۱) دخول اور صحبت کے بعد طلاق ہو (۲) صحبت سے قبل طلاق ہو، اور عقد نکاح میں مہر مقرر نہ ہو (۳) بیوی کی شوہر سے جدائی کا فیصلہ ہو، اور یہ جدائی صرف شوہر کے سبب ہو، مثلاً اس کا ارتداد، (اسلام چھوڑ دینا)، لعان کرنا، اور یہ جدائی دخول کے بعد ہو، یا قبل دخول ہو بشر طیکہ عقد میں مہر مقرر نہ ہو۔

کسی عورت کا مہر عقد میں مقرر ہو جائے، پھر دخول سے قبل طلاق ہو، تو اسے متعہ نہیں ملے گا، کیونکہ اسے نصف مہر مل چکا، اور شوہر کو اس کی طرف سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اگر بیوی کے سبب جدائی ہو، مثلاً اس کا ارتداد یا اسلام، عیب کی وجہ سے جانبین میں سے کسی کا نکاح فسخ کرنا، یا دونوں کے سبب سے ہو، مثلاً دونوں کا ارتداد یا دونوں کی یا کسی ایک کی موت ہو جائے، تو ان صورتوں میں متعہ واجب نہیں، خواہ صحبت ہو چکی ہو یا نہیں۔ (فتح الوھاب)

وجوب مُتْعہ کے دلائل

آیات: (۱) "لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْتَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعاً بِالْمَعْرُوْفِ حَقاً عَلَى الْمُحْسِنِيْنِ" (البقرہ: ۲۳۶)

ترجمہ: "تم پر (مہر کا) کچھ مؤاخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے، اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے اور ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ (یعنی متعہ دو)۔ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے۔ ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا، جو قاعدہ کے موافق خوش معاملہ لوگوں پر واجب ہے۔ (یعنی سب مسلمانوں پر کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے)"

(۲) "وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقاً علَى الْمُتَّقِيْنِ" (البقرۃ: ۲۴۱)

ترجمہ: "اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں"۔ (یعنی مسلمانوں پر)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: "ہر مطلقہ کے لئے (واجب ہے) سوائے اس کے جس کا مہر مقرر ہو، اور دخول نہ ہوا ہو، اسے نصف مہر کافی ہے" (مؤطا، بیہقی) یہی امام قاسم بن محمد اور امام زہری سے بھی مروی ہے (معرفۃ السنن مع التعلیق ۴۰۱/۵)

متعہ کی مقدار: میاں بیوی قلیل یا کثیر جس مقدار پر بھی متفق ہو جائیں، وہ متعہ صحیح ہوگا۔ اگر مقدار میں دونوں کا اختلاف ہو، تو قاضی شوہر کی مالداری و تنگدستی اور بیوی کے نسب وصفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب مقدار متعین کرے گا۔ جیسا کہ ابھی آیت میں گذرا۔

مستحب یہ ہے کہ متعہ کی مقدار ۳۰ درہم یا اس کی قیمت سے کم نہ ہو، اور عورت کے مہر مثل کے نصف تک نہ پہنچے۔ (۳۰ درہم کی مقدار حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے۔ بیہقی، خلاصۃ البدر)

حکمت: ازدواجی رشتہ کے خاتمہ کے وقت بیوی کی دل دہی وتطیب خاطر، اس سے لاحق وحشت کی کمی، اور غم والم اور کراہت کی شدت کو کم کرنا، متعہ کے مشروعیت کی حکمت ہے۔

طلاقِ رجعی میں متعہ: طلاق رجعی کی عدت میں شوہر کی موت ہو جائے، تو متعہ نہ ملے گا، کیونکہ (اس صورت میں بیوی وارث بنے گی اور) میراث اور متعہ جمع نہیں ہو سکتے۔

عدت میں ہی رجوع کر لے، تو ابن حجرؒ کے نزدیک متعہ واجب نہ ہو گا، لہٰذا عدت ختم ہونے پر متعہ واجب ہو گا، اسی طرح عدت میں دوسری تیسری طلاق دینے سے مزید متعہ واجب نہ ہو گا، لیکن رملیؒ کے نزدیک محض طلاق رجعی سے بھی متعہ واجب ہو گا، نیز عدت میں بار بار طلاق دے، تو اتنے متعہ بھی واجب ہیں، امام نوویؒ نے فرمایا کہ متعہ کے مسئلہ سے عورتیں عموماً ناواقف ہوتی ہیں، لہٰذا اس مسئلہ کی وضاحت واشاعت ہونی چاہئیے، تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے۔ (الفقہ النہجی ۴/۸۵، تحفہ ۹/۴۳۳، نہایہ ۶/۳۶۴، فتح الوھاب مع الجمل ۴/۲۶۵، بغیہ ۲۱۴)

مہر میں مبالغہ

کئی افراد مہر کو عورت کی قیمت تصور کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مہر کی زیادتی عورت کیلئے قدر ومنزلت اور بڑائی ورفعت کا سبب ہے، اسی لئے بڑی سے بڑی مہر مقرر کی جاتی ہے۔ ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ مہر کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو شوہر کے نکاح کی رغبت کی سچائی کی ایک نشانی ہے، اور عورت کی تکریم اور ایک نئی خانگی زندگی کی ابتداء کے لئے اس کے حق میں ایک عطیہ اور تحفہ ہے۔

مہر کے سلسلہ میں فضول مبالغہ کی وجہ سے کئی مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس میں سرفہرست آپ ﷺ کے طریقے کی مخالفت ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نوجوان بالخصوص غریب افراد نکاح کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، پھر نتیجے میں شیطان کی پیروی میں مختلف فواحشات کا شکار ہوتے ہیں، نیکی کی فضا اور عزت وآبرو داؤ پر لگ جاتی ہے۔ نسب میں اختلاط اور مختلف امراض کی کثرت ہوتی ہے۔ اگر مناسب بیوی ہوتی تو ان کی عفت واخلاق کی حفاظت ہوئی ہوتی۔

اسی طرح عورت کے والد وغیرہ کی جانب سے کثیر مہر کے مطالبہ کی وجہ سے کئی لڑکیاں ایسے ہی ترس ترس کی زندگی گذار دیتی ہیں، کیونکہ اتنی بڑی مہر پر کوئی نوجوان آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر پاتا، اور اگر اس عورت نے اپنی حیا کو بھی خیر باد کر دیا تو تباہی کی کوئی انتہا نہیں۔

آپ ﷺ نے کم خرچ والے نکاح کو زیادہ بابرکت قرار دیا ہے (احمد، ابوداود وحاکم وصححہ) لہٰذا مہر تجارت اور آپسی مفاخرہ کا سامان بن جائے تو اس میں کوئی خیر وبرکت نہیں۔

حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے ایک کھجور کی گٹھلی برابر سونے کے مہر پر نکاح کیا، اور آپ ﷺ نے اس نکاح میں خیر وبرکت کی دعا فرمائی (متفق علیہ) اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی روایت گذر چکی۔

خلاصہ یہ کہ مہر میں غلو شرعاً ناپسندیدہ ومکروہ ہے، اور سہولت وآسانی مندوب اور جانبین اور پورے معاشرہ کے حق میں خیر وبرکت کا باعث ہے۔ (الفقہ المنہجی ۴/۸۶)

عقد نکاح کی سنتیں

(۱) عقد سے قبل خُطبہ جس کی تفصیل گذر چکی۔

(۲) **میاں بیوی کے حق میں دعا:** نکاح کے وقت میاں بیوی کو دعا دینا سنت ہے، آپ ﷺ نکاح کے تعلق سے اس طرح دعا دیتے: بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَ بَارَكَ عَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي الْخَيْرِ (ترمذی وصححہ، ابوداود، ابن ماجہ) (اللہ آپ کو برکت دے، اور آپ پر برکت نازل کرے، اور دونوں کو خیر میں ملائے) اسی طرح صحیحین میں عبد الرحمن بن عوفؓ کے حق میں بھی آپ ﷺ سے برکت کی دعا منقول ہے۔

الرِفَاءِ وَالْبَنِيْنَ (آپسی ملاپ اور بیٹے کی دعا) کے ذریعہ دعا دینا مکروہ ہے۔ (نہایۃ)

(۳) **عقد نکاح کا اعلان اور دف بجا کر خوشی کا اظہار:** عقد نکاح کا اعلان اور لوگوں کے مجمع میں اسے انجام دینا مستحب ہے، سراً نکاح کرنا مکروہ ہے۔

اسی طرح خوشی کا اظہار، دف بجانا اور ایسے گیت جو اچھے مفہوم پر مشتمل ہوں، مستحب ہے، ابن ماجہ کی روایت میں نکاح کے اعلان اور دف بجانے کا حکم موجود ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نکاح کا اعلان کیا کرو، اور اسے مساجد میں انجام دو، اور اس موقع پر دف بجاؤ" اعلان کا حکم مسند احمد میں بھی ہے، جس کی ابن حبان وحاکم نے تصحیح فرمائی ہے۔

شریف اور مناسب لہو بھی مشروع ہے، ایک انصاری کے دولہن کی بدائی کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا: "عائشہ تمہارے ساتھ لہو نہیں تھا؟ کیونکہ انصار کو لہو پسند ہے"۔ نسائی کی حدیث میں ہے۔ "شادی کے موقع سے ہم لوگوں کو لہو کی رخصت دی گئی" (صححہ الحاکم)

فسق وفجور، اور فحاشی پر مشتمل گانے، جو جذبات کو بھڑکانے اور لوگوں کو برباد کرنے کا باعث ہوتے ہیں، بلاشبہ شادی بیاہ اور دیگر تمام مواقع میں حرام ہیں۔ قوی احادیث میں دف کی اجازت عورتوں کے لئے ہے، لہٰذا مردوں کو اس کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ مردوں کو عورتوں کی مشابہت ممنوع ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۲۶)

(۴) **دخول کے وقت کی دعا:** نکاح کے بعد جب پہلی مرتبہ بیوی سے ملاقات ہو، تو شوہر اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هَا وَشَرِّ مَاجَبَلْتَهَا عَلَيْه" (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ۔ نیل الاوطار ۶/۲۱۳) (یااللہ! میں اس کے خیر اور جو خیر تو نے اس کی فطرت میں رکھ دی ہے، اسکا سوال کرتا ہوں، اوراس کے شر اور جو شر اس کی فطرت میں رکھ دی ہے، اس سے پناہ چاہتا ہوں) ایک روایت میں برکت کی دعا کا حکم ہے، لہٰذا یوں دعا کرے۔ "بَارَكَ اللّٰهُ لِكُلِّ مِنَّا فِي صَاحِبِهٖ" (اللہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے ساتھی میں برکت عطا فرمائے) (تحفہ ۹/۲۶) (الفقہ المنہجی ۴/۹۴)

جماع (صحبت) کے آداب

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اگر تم میں سے کوئی جماع کے (ارادہ کے) وقت یہ کہے: "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا

الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَارَزَقْتَنَا "پھر اس میں بچہ مقدر ہو، تو شیطان اسے کبھی ضرر نہ پہنچائے گا"۔(احمد، بخاری، مسلم)

ضرر سے جسمانی و دینی دونوں ضرر مراد ہوسکتے ہیں۔ داودیؒ فرماتے ہیں کہ دین سے گمراہ کر کے کفر کی طرف نہیں لے جائے گا۔ یا یہ منشاہے کہ شیطان باپ کے ساتھ جماع میں شریک نہ ہو گا، کیونکہ امام مجاہدؒ سے مروی ہے کہ جو جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے، شیطان اس کی شرم گاہ سے لپٹ کر ساتھ جماع کرتا ہے۔(فتح الباری ۹/۲۲۹)

سنت یہ ہے کہ جب جماع کا ارادہ ہو تو دونوں اپنے اوپر ایک کپڑا اوڑھ لیں، اور جماع سے قبل دونوں پاکی و صفائی حاصل کر لیں، اور خوشبو استعمال کریں، نیز بوس و کنار وغیرہ ایسے امور جن سے نشاط پیدا ہو، انجام دیں، بخاری وغیرہ کی روایات میں اپ ﷺ نے سفر سے واپسی پر بیوی کے صفائی تک رات گھر پہنچنے سے منع فرمایا، حضرت ابن عباسؓ۔ آیت "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ "(اور (مردوں پر) عورتوں کے بھی حقوق ہیں، جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:" مجھے بیوی کی خاطر مزین ہونا محبوب ہے، جیسا کہ اس کا میرے لئے مزین ہونا پسندیدہ ہے"۔

ابن ماجہ کی ایک ضعیف روایت میں جماع کے وقت گدھے کی طرح برہنہ ہونے کی ممانعت، مروی ہے۔ جماع کے ارادہ کے وقت دونوں (اور بعضوں کے نزدیک صرف شوہر) اوپر کی دعا بِسْمِ اللّٰهُ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الخ پڑھیں، گرچہ بظاہر اولاد کی کوئی توقع نہ ہو، انزال کے وقت مذکورہ دعا کو سچائی کے ساتھ دل میں مستحضر رکھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اولاد کی صلاح وغیرہ میں اس کا واضح اثر ہے، قبلہ کی طرف رخ کر کے صحبت کرنا مکروہ نہیں ہے، خواہ صحرا (کھلی جگہ) میں ہو، (لیکن امام غزالی نے احیاء العلوم۔ آداب الجماع میں فرمایا ہے کہ جماع کے وقت قبلہ کی تکریم کے طور پر قبلہ کے رخ سے مُڑ جائے اور استقبال نہ کرے)

جماع کے وقت گفتگو مکروہ ہے، جماع کے تعلق سے کچھ کہنے کی ضرورت ہو، تو حرج نہیں، مثلاً بیوی سے کسی خاص صفت کو اختیار کرنے کے لئے کہنا، جماع کی کوئی کیفیت مکروہ نہیں، خواہ بیوی پہلو پر لیٹی ہو، یا چت لیٹی ہو، یا کھڑی ہو، آگے کی طرف سے کرے یا پیچھے کی جانب سے وغیرہ، لیکن پچھلی شرم گاہ (دُبر) میں صحبت کرنا سخت حرام ہے، عادل طبیب (ڈاکٹر) صحبت کا جو طریقہ نقصان دہ بتلائے، اس سے پرہیز کرے، صحبت کی تفاصیل کا کسی کے سامنے تذکرہ کرنا حرام ہے، بلکہ صحیح روایت سے اس کا کبیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ایسا شخص بروز قیامت اللہ کے نزدیک بدترین درجہ میں ہو گا، بغیر فائدہ کے صرف جماع کا ذکر مکروہ ہے، کیونکہ یہ خلافِ مروت ہے۔ اگر کسی حاجت یا فائدے کے لئے کرے، تو مکروہ نہیں، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ جماع کے وقت کسی دوسری عورت کے تصور کا حکم گذر چکا کہ کئی محققین نے جائز قرار دیا ہے، احیاء العلوم وغیرہ میں چاند کی پہلی، درمیانی اور آخری تاریخ میں صحبت کرنا مکروہ قرار دیا ہے، صاحبِ قوت نے بعض صحابہ سے اس کی کراہت کو نقل کیا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ ان راتوں میں شیطان حاضر ہوتا ہے اور جماع کرتا ہے، لیکن علامہ ابن حجرؒ اور رملیؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی ممانعت ثابت نہیں، اگر بالفرض شیطان کا جماع کرنا ثابت بھی ہو تو حدیث میں وارد ذکر پڑھنا اس سے حفاظت کیلئے کافی ہے۔

اگر شوہر کا انزال پہلے ہو جائے تو بیوی کے انزال تک رکنا بہتر ہے، جو بیوی کے کہنے یا قرائن سے معلوم ہو گا۔ سحر کے وقت صحبت کرنا حدیث کی اتباع میں مندوب ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ اس وقت نہ شکم بالکل پُر ہو گا، اور نہ بالکل خالی، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں جماع عموماً نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس طرح تکلف کے ساتھ صحبت کی افراط بھی نقصان دہ ہے۔ بعض اطباء نے انفع جماع کا یہ ضابطہ پیش

کیا ہے کہ تفکر وغیرہ وسائل کے بغیر نفس میں جماع کا داعیہ ہو، تو جماع کرلے البتہ ایک صحیح حدیث میں کسی عورت پر نظر پڑے اور وہ پسند آئے تو اپنی بیوی کے پاس جاکر صحبت کرنے کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا یہ صورت مستثنیٰ ہوگی۔

بعض حضرات نے اگر کوئی عذر نہ ہو (اور صحت و تندرستی اجازت دے) تو چار راتوں میں ایک رات جماع کرنا مسنون قرار دیا ہے۔ اگر بیوی کے جذبات کی وجہ سے اس کی عفت و پاکدامنی کیلئے مزید کی ضرورت ہو تو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ بطور انسیت بیوی سے ملاعبہ و دل لگی مسنون ہے۔ جمعہ کی نماز کو جانے سے قبل، یا جمعہ کی رات صحبت مندوب ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد جماع کرنا سنت ہے، اگر دن میں واپسی ہو اور تنہائی کا موقع ہو تو دن میں کرے، ورنہ رات میں۔

طبی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے عفت اور نسل وغیرہ نیک مقصد سے دوائیوں کے ذریعہ قوتِ باہ کے اضافہ کی کوشش مندوب ہے، کیونکہ یہ محبوب امر کا وسیلہ ہے، لہٰذا یہ بھی محبوب ہوگا۔ کئی افراد اس میں غلطی کرتے اور اسے ترک کرتے ہیں، جس کی وجہ سے صحبت کے نتیجہ میں کافی مضر نتائج سامنے آتے ہیں۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے وطی مکروہ ہے، جبکہ بچہ کو نقصان کا اندیشہ ہو بلکہ ضرر یقینی ہو، یا ایسا غلبہ ظن ہو جو یقین کے قریب ہو، تو جماع حرام ہے۔ اگر کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو جماع مکروہ نہیں ہے۔

شوہر کو بیوی کے بدن سے ہر طرح کا انتفاع و استمتاع (لطف اندوزی) جائز ہے، صرف دُبر (پچھلی شرمگاہ) میں صحبت حرام ہے، (اسی طرح حیض و نفاس کی حالت میں ناف سے گھٹنے کے درمیان استمتاع ممنوع ہے) خواہ اس کی شرم گاہ کے اوپر کا وہ حصہ جو ختنہ میں کاٹا جاتا ہے، اسے چوسنا ہی کیوں نہ ہو، بیوی کے ہاتھ سے استمناء (یعنی اپنی منی نکالنا) جائز ہے، اپنے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے حرام ہے، خواہ زنا کا اندیشہ ہو، بیوی کے پردہ بکارت کو اپنی انگلی وغیرہ سے زائل کرنا جائز نہیں، اگر کچھ عذر نہ ہو تو میاں بیوی کو ایک ہی بستر پر سونا سنت ہے۔ بالخصوص جبکہ بیوی اسے پسند کرے۔ شوہر کو جائز انتفاع سے روکنا بیوی کے لئے حرام ہے۔ (جبکہ کوئی معقول عذر مثلاً بیماری وغیرہ نہ ہو) جو عورت کسی کے نکاح میں نہ ہو، اس کے اوصاف بلاحاجت شوہر یا کسی دوسرے کے سامنے ذکر کرنا مکروہ ہے، اگر حاجت ہو، مثلاً نکاح کے ارادہ سے اسے دیکھنے روانہ کیا ہو، تو اس میں کوئی کراہت نہیں، جیسا کہ منگنی کے بحث میں گذر چکا۔ کسی کی منکوحہ کے اوصاف بیان کرنا، جبکہ فتنہ کا غالب گمان ہو، حرام ہے۔ (گھر میں) ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے جماع کرنا مکروہ ہے۔

حیض کی حالت میں گھٹنے اور ناف کے درمیان کے علاوہ بدن سے انتفاع اور بیوی کے ہاتھ سے استمناء جائز ہے۔ نیز اس کے ساتھ لیٹنے اور کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں (جیسا کہ صحاح ستہ وغیرہ کی حدیث سے ثابت ہے)

صحیحین وغیرہ کی احادیث کی رو سے جنابت کی حالت میں غسل کے بغیر سونا کھانا پینا اور دوبارہ جماع کرنا جائز ہے، البتہ ان امور کے لئے شرم گاہ کو دھونا اور وضو کرلینا مستحب ہے بالخصوص دوسری مرتبہ دوسری بیوی سے جماع کرنا ہو تو شرم گاہ کو دھونے کی زیادہ تاکید ہے، وضو کے بغیر جنابت کی حالت میں مذکورہ امور کو انجام دینا مکروہ ہے۔

صحاح ستہ کی روایت کی رو سے جب لیٹنے کے لئے بستر پر آئے تو پہلے تہبند کے کنارہ (وغیرہ) سے بستر کو جھاڑ دے، پتہ نہیں اس کے پیچھے اُس پر کون سی نقصان دہ چیز ہو۔

عَزْل (یعنی انزال کے وقت بیوی سے جدا ہو جانا تاکہ منی رحم میں نہ پہنچے): صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ہم آپ ﷺ کے عہد میں عزل کیا کرتے تھے، مسلم کی ایک روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ

نے منع نہ فرمایا۔

عزل کرنا جائز ہے، خواہ بیوی کی اجازت ہو یا نہ ہو، لیکن ادب یہ ہے کہ عزل نہ کرے۔ بعض علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، عزل میں مندرجہ ذیل چار نیتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) بیوی کے حسن و جمال اور صحت کو باقی رکھنا، تاکہ انتفاع دائم رہے، اور اس کی زندگی کو زچگی وغیرہ سے خطرہ نہ لاحق ہو، یہ نیت ممنوع نہیں ہے۔

(۲) کثرتِ اولاد کی وجہ سے کمانے کی زیادہ فکر سے احتراز، یہ بھی منع نہیں، کیونکہ خرچ کی کمی دین کے لئے معاون ہے، لیکن بہتر وافضل اللہ پر توکل و بھروسہ کرنا ہے۔

(۳) لڑکیوں کی پیدائش کے خوف سے، تاکہ ان کی شادی کا عار لاحق نہ ہو، یہ جاہلیت کا عقیدہ اور فاسد نیت ہے۔

(۴) عورت نظافت میں غلو کرتے ہوئے اس طرح کرنا چاہے تاکہ زچگی، نفاس اور دودھ پلانے کے مراحل سے بچ سکے، یہ بھی فاسد نیت ہے۔

فائدہ: شوہر بیوی کو ان امور پر مجبور کر سکتا ہے: غسلِ جنابت، نجاست و میل کچیل کو دھونا، موئے زیرِ ناف و بغل کی صفائی، ناخن تراشنا، مضر چیز جیسے زہر کے کھانے سے رکنا، بیمار کرنے والی یا تکلیف دہ چیز کے کھانے سے رکنا، جیسے لہسن، بدبودار کپڑے اتارنا، مسجد یا جماعت کی حاضری سے ممانعت۔

صرف اتنا وقت ہو کہ جماع سے فارغ ہو کر غسل کر کے نماز ادا ہو سکتی ہے، اور شوہر کو معلوم ہو کہ بیوی جماع کے بعد غسل نہیں کرے گی (اور اس طرح اس کی نماز قضا ہو گی)، تب بھی شوہر اس سے جماع کر سکتا ہے۔ بیوی کے اوصاف بیان کرنا مناسب نہیں، بلکہ باعث حیا ہوں، تو حرام بھی ہو سکتا ہے۔ (شرح مسلم للنووی۔ ۱/۱۴۴، ۴۶۴، فتح الباری ۳۰۸/۹، جمل ۱۳۳/۴، تحفہ ۶۷/۹، نہایۃ ۲۰۹/۶، اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء العلوم ۳۸۲/۵، قلائد ۱۲۹/۲، ترشیح ۳۲۰، اعانۃ ۳۴۱/۳)

تنبیہ: شوہر کی پراگندگی اور میلا کچیلا ہونے کی وجہ سے بیوی شوہر کو اپنے اوپر قابو دینے سے باز آئے تو یہ ناشیزہ (شوہر کی نافرمان) نہیں شمار ہو گی۔ جن چیزوں کے ازالہ پر بیوی کو مجبور کیا جا سکتا ہے، شوہر کو بھی مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جن امور سے کسی انسان کو ایسی تکلیف پہنچے، جو عادتاً برداشت نہیں کی جاتی، شوہر پر اس کا ازالہ واجب ہے۔ (حاشیہ الجمل ۱۹۷/۴)

وَلِیْمَہ (دعوت)

ولیمہ وَلْم سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے اجتماع، اور شرعاً اس کا اطلاق شادی وغیرہ کسی بھی نئی خوشی کے موقع پر کھانے کی دعوت پر ہوتا ہے۔ البتہ مطلقاً شادی کی دعوت کے لئے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسری دعوتوں میں قید لگائی جائے گی مثلاً ولیمہ ختان۔

ولیمہ کے اقسام: (۱) اِمْلاک: عقد نکاح کی دعوت (۲) ولیمہ: نکاح کے بعد دخول کی دعوت (۳) خُرْس: ولادت کی خوشی میں دعوت (۴) عقیقہ: نوزائیدہ بچہ کی وجہ سے دعوت (۵) اِعْذار: ختنہ کی دعوت، یہ لڑکے کے ختنہ میں مستحب ہے، لڑکی کے ختنہ میں عورتوں کو دعوت دینے میں حرج نہیں۔ (۶) حِذاق: تکمیل حفظِ قرآن یا کسی اور کتاب کی تکمیل کی خوشی میں دعوت (۷) وَکِیرَہ: نئے مکان (میں داخلے، گھر بھرنی) کی دعوت۔ (۸) نَقِیعَۃ: طویل سفر سے واپسی پر دعوت خواہ یہ دعوت مسافر کرے یا دوسرا اس کی آمد پر۔

(۹)وَضِیمَہ: مصیبت کی وجہ سے دعوت (جو پڑوسیوں کی طرف سے ہوگی)(۱۰)مَأدُبَہ: بلاکسی سبب کے دعوت۔

وَلِیْمَہ عُرُس (شادی کا ولیمہ)

نکاح کی مناسبت سے رشید شوہر کو اور غیر رشید شوہر کے باپ دادا کو اپنے مال سے ولیمہ کی دعوت کرنا سنت ہے۔ایک قول میں اسے واجب شمار کیا ہے۔

احادیث:(۱)"آپ ﷺ نے حضرت زینبؓ سے زائد کسی اور زوجہ مطہرہ کے موقع پر ولیمہ نہیں کیا"(متفق علیه، ابوداود، ابن ماجه، بیهقی، احمد)

(۲) حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے نکاح کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:"ولیمہ کرو، گرچہ ایک بکری ہو"(متفق علیه)(ارواء الغلیل ۷/۳، تلخیص ۳/۱۶۴) باپ دادا وغیرہ کو بچے کے مال سے ختنہ، ختم قرآن اور شادی کی دعوت کرنا جائز نہیں ہے۔

کسی بھی کھانے پینے کی چیز سے ولیمہ ادا ہو جائے گا، لہٰذا عقد نکاح کے بعد شربت وغیرہ پلانے سے بھی اس کی سنت حاصل ہوگی۔جو قادر ہو، یعنی ایک شب وروز کے مصارف سے زائد اتنا مال ہو کہ ایک بکری دے سکتا ہے، تو اس کے حق میں اقل کمال ایک بکری کا ولیمہ ہے، جیساکہ صحیحین کی حدیث میں گذرا، دیگر حضرات جتنا ہو سکے کریں، آپ ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کا ولیمہ دو مُدجَو پر کیا، اور حضرت صفیہ کا ولیمہ ستو اور کھجور پر انجام دیا(احمد، اصحاب السنن، ابن حبان) صحیحین میں انکے ولیمہ میں گھی، کھجور اور پنیر کا ذکر ہے۔

شادی کے ولیمہ کی دعوت قبول کرنا (اور پہنچنا) فرض عین ہے، دیگر دعوتوں کو قبول کرنا سنت ہے۔صحیحین کی حدیث ہے:"تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت ہو، تو دعوت میں پہنچ جائے" نیز صحیحین میں ہے۔"جو دعوت میں نہ آئے، اس نے اللہ ورسول کی نافرمانی کی"۔علماء نے کہا کہ اس سے شادی کا ولیمہ مراد ہے۔ابوداود کی روایت میں ہے:"کسی کو اس کا بھائی دعوت دے تو قبول کرے، شادی کی دعوت ہو یا کوئی دوسری دعوت"۔اس روایت میں دیگر دعوت کی حاضری کا حکم استحبابی طور پر ہے، بعض علماء نے تمام دعوتوں کو قبول کرنا واجب کہا ہے۔

شوہر کی اجازت سے کوئی دوسرا شخص، مثلاً بیوی یا خسر ولیمہ کرے تو اس سے سنت حاصل ہوگی، اور قبول کرنا واجب ہوگا، اجازت نہ دے تو حاصل نہ ہوگی۔

دعوت قبول کرنے کے وجوب یا استحباب کے شرائط

(۱) دونوں مسلمان ہوں، اگر دعوت دینے والا، یا مدعو غیر مسلم ہو تو وجوب یا استحباب باقی نہ رہے گا، کیونکہ اس کے ساتھ مودت موجود نہیں، البتہ ذمی کسی مسلمان کو دعوت دے، اور اس کے اسلام کو توقع ہو، یا رشتہ ہو، یا پڑوسی ہو، تو قبول کرنا سنت ہے (لیکن مسلمان کی دعوت کے مقابلہ میں کمتر درجہ میں) ورنہ مکروہ ہے۔

(۲) دعوت عام ہو، یعنی مالداروں وغیرہ کی تخصیص نہ ہو، بلکہ گنجائش کی صورت میں تمام اہلِ خاندان، یا تمام پڑوسی، یا اسکے تمام اہلِ حرفت کو دعوت دے، گرچہ وہ تمام اغنیاء ہوں، بہر حال اصل شرط یہ ہے کہ تخصیص کا قصد ظاہر نہ ہو،

حدیث: بدترین کھانا، ولیمہ کا کھانا ہے، جس میں اغنیاء کو دعوت دی جائے، اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے"(متفق علیه)

(۳) داعی خود، یا اپنے نائب یا خط کے ذریعے بالخصوص اسے دعوت دے، اگر عام اعلان کر دے کہ جو چاہے حاضر ہو جائے، تو قبول کرنا ضروری نہیں، اگر کسی معین شخص سے کہے کہ آپ چاہیں تو حاضر ہو جائیں، تو حاضری ضروری نہیں، البتہ بظاہر اس کے ادب واحترام

کے طور پر اس کی حاضری کی رغبت وخواہش کے ساتھ درخواست ہو، تو لازم ہے۔

(۴) شادی کے ولیمہ میں پہلے دن دعوت دے، تین یا زائد ایّام تک دعوت کرے تو صرف پہلے دن دعوت قبول کرنا واجب ہے۔ لیکن جگہ کی تنگی اور لوگوں کی کثرت وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے ایک سے زائد دن دعوت کرے، تو یہ ایک ہی دن میں الگ الگ جماعت کی یکے بعد دیگرے دعوت کی طرح ہو گا، لہٰذا جسے پہلے دن دعوت نہ ملے، دوسرے یا تیسرے دن قبول کرنا لازم ہے۔

بلا عذر ایک سے زائد دن دعوت کی صورت میں دوسرے دن کی دعوت قبول کرنا سنت ہے، شادی کا ولیمہ ہو، یا کوئی اور دعوت، لیکن عام دعوتوں کے پہلے دن کی سنت کے مقابلہ میں کم درجہ میں۔ حدیث: "پہلے دن کا کھانا حق ہے، دوسرے دن سنت، اور تیسرے دن شہرت کی خاطر ہے" (ترمذی) اس حدیث میں ضعف ہے، البتہ امام احمد، دارمی، بزار، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی اور طبرانی وغیرہ میں مختلف طرق سے مروی ہے، لہٰذا مجموعی طور پر قوت حاصل ہو گی (دیکھئے تلخیص ۱۹۵/۳)

(۵) کسی خوف یا اس کے مقام ومرتبہ سے کچھ غرض وابستہ ہونے کی وجہ سے دعوت نہ دے، اگر اس طرح کے کسی غرض سے دعوت دے، تو قبول کرنا لازم نہیں، بلکہ دعوت مطلوب تقرب ومحبت کے لئے، یا اس کے علم وفضل، بزرگی یا تقوی کی وجہ سے ہو، یا کسی خاص قصد کے بغیر ہو۔

احیاء العلوم میں فرمایا کہ دعوت قبول کرنے میں سنت کی پیروی کی نیت کرے، تاکہ ثواب ملے، نیز اپنے مسلمان بھائی کی ملاقات واکرام کی نیت رکھے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت وملاقات کرنے والوں میں شامل ہو (جن کی فضلیت وارد ہے) یا یہ نیت ہو کہ کسی کو اس کے متعلق تکبر یا ایک مسلم کی تحقیر کا گمان نہ ہو۔

(۶) کوئی معقول عذر نہ ہو، ورنہ واجب (یا سنت) نہ ہو گا، بعض اعذار درج ذیل ہیں۔ (الف) کسی دوسرے کی جانب سے پہلے ہی ایسی دعوت نہ ہو، جس کا قبول کرنا لازم ہو، اگر لازم نہ ہو تو وہ کالعدم (نہ ہونے کی طرح) ہے، لزوم کی صورت میں پہلی دعوت قبول کرے، دونوں دعوت ساتھ آجائیں، تو قریبی رشتہ دار کی مقدم ہو گی، پھر جس کا گھر قریب ہو (اس میں بھی دونوں برابر ہوں تو) پھر قرعہ اندازی سے فیصلہ ہو گا، اس ترتیب کی رعایت بظاہر واجب ہے، بعضوں نے اس کے استحباب کا بھی امکان ظاہر کیا ہے۔

(۷) دعوت میں کوئی ایسا شخص نہ ہو، جس سے اسے دشمنی وغیرہ کی وجہ سے ایذاء پہنچے، یا جو فحش گوئی اور جھوٹ کے ذریعہ لوگوں کو ہنساتا اور سامان تفریح فراہم کرتا ہو۔

(۸) دعوت کی جگہ کوئی مُنکَر اور حرام کام نہ ہو، خواہ صغیرہ ہو، اگر مدعو اور فاعل دونوں حرمت کے قائل ہوں، تو حاضری حرام ہے، اِلّا یہ کہ ازالہ کے لئے جائے" اگر فاعل حرمت کا قائل ہو، تو جا کر اسے روکے، نہ مانے تو نکل جائے، صرف مدعو حرمت کا قائل ہو، تو جانا جائز ہے، واجب نہیں، کسی کام کے کرنے والے کے مسلک میں وہ حرام ہے، تو اسے روکا جائے گا، صرف روکنے والے کے مسلک میں حرام ہو، نہ کہ کرنے والے کے مسلک میں، تو روکا نہیں جائے گا۔ مثلاً: پرائی عورت کا مرد کو جھانکنا، یا اس کے برعکس شراب نوشی فرش حرام ہو یعنی مغصوبہ ہو، یا مردوں کیلئے ریشم کا ہو یا چیتے کی کھال کا ہو، آلاتِ لہو اور موسیقی جو اسے سنائی دے، گرچہ دعوت کی جگہ سے ہٹ کر ہو، جبکہ داعی کے گھر ہو، نہ کہ پڑوس میں، کسی جاندار (حیوان۔ ذی روح) کی تصویر مرفوع (بلند ہو)، یعنی چھت، دیوار، پہننے کے کپڑے یا پردے یا کھڑے رکھے ہوئے تکئے پر ہو، جبکہ تصویر ایسے اعضاء پر مشتمل ہو، جس کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہ ہو، نہ کہ اس کے علاوہ، گرچہ اس کی نظیر نہ ہو، جیسے پردار گھوڑا، نیز جبکہ تصویر محلِ دعوت میں ہو، نہ کہ دروازہ یا گذرگاہیں، اگر تصویر کسی فرش یا بچھونے پر

ہو، جسے روندا جاتا ہو، یا ایسے تکیہ پر ہو، جس پر ٹیک لگایا جائے یا مرفوع ہو، لیکن سر کٹا ہوا ہو، یا درخت، سورج چاند (وغیرہ غیر جاندار) کی تصویر ہو، تو دعوت کے قبول کا حکم باقی رہے گا، کیونکہ روندے اور پھینکے ہوئے تصویروں کی ذلت ہو رہی ہے، اور دیگر ذی روح حیوان کے مشابہ نہیں، بخلاف بلند مرفوع تصویروں کے، کیونکہ یہ بتوں کے مشابہ ہے۔

اگر حرام امر، دعوت میں حاضری کی جگہ ہو، تو قبول کرنا واجب نہیں، اور حاضر ہونا حرام ہے۔ گذر گاہ میں ہو، تو واجب ہے، کسی ایسی جگہ صرف داخل ہونا حرام نہیں (جبکہ وہ ٹھہرے اور، رکے نہیں)

اگر مدعو (کی بزرگی، علم یا رعب وغیرہ کی وجہ سے اس) کی حاضری سے منکر اور حرام امور کا ازالہ ہوتا ہو، تو پہنچنا واجب ہے، تاکہ منکر ختم ہو جائے، اگر دعوت شادی کے ولیمہ کی نہیں ہے، تو دعوت کے اعتبار سے حاضری سنت ہے لیکن منکر کے ازالہ کے اعتبار سے واجب ہے۔

اگر دعوت میں حاضری کے بعد منکر کا علم ہو، تو انھیں روکے، روکنے سے مجبور ہو، تو نکل جائے، کسی خوف وغیرہ کی وجہ سے نکلنے سے مجبور ہو، تو ناگواری کے ساتھ رک جائے، لیکن حتٰی الامکان منکر انجام دینے والوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو، وہ ہرگز ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب کا دور چل رہا ہو''۔ (ترمذی وقال حسن غریب وصححہ الحاکم علی شرط مسلم)

(۹) مدعو (جسے دعوت ملی ہے وہ) قاضی (حاکم، جج) نہ ہو،

(۱۰) کوئی ایسا عذر نہ ہو، جس سے جماعت کے ترک کی رخصت ملتی ہے۔

(۱۱) داعی کے مال میں قوی شبہ ہو، یعنی یہ معلوم ہو کہ اس کے مال میں حرام بھی ہے، لیکن کونسا مال حرام ہے پتہ نہیں، گرچہ اس کا اکثر مال حرام نہ ہو، اس صورت میں دعوت قبول کرنا مکروہ ہے، جو چیز کھلائی جائے اس کا حرام ہونا معلوم ہو تو قبول کرنا حرام ہے۔

(۱۲) داعی سے عذر خواہی کرے، اور وہ بشاشت سے قبول کر لے، تو حاضری واجب نہیں، غصہ اور ناراضگی کے ساتھ قبول کرے تو حاضری واجب ہے۔

(۱۳) دعوت اجنبی عورت کی طرف سے نہ ہو، اگر وہاں اس کا یا اس عورت کا کوئی محرم ہو، اور شادی شدہ عورت کے شوہر کی اجازت ہو، اور اسے ولیمہ کرنا سنت ہو تو قبول کرنا واجب ہے۔ ورنہ واجب نہیں۔ گرچہ خلوتِ محرمہ نہ ہو، کیونکہ فتنہ و تہمت کا اندیشہ ہے۔

(۱۴) دعوت عقد نکاح کے بعد ہو، اگر عقد سے بھی پہلے ہو تو اسے ولیمہ نکاح نہ کہیں گے، لہٰذا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

(۱۵) مدعو پر کوئی حق متعین نہ ہو، جیسے گواہی دینا، نماز جنازہ وغیرہ

(۱۶) داعی ظالم یا فاسق، یا توزیادہ شر انگیز نہ ہو، یا فخر و مباہات کے طور پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر دعوت نہ کر رہا ہو۔

(۱۷) کسی باطل کام پر تعاون کے مقصد سے دعوت نہ دے۔

(۱۸) کسی بدعت کا داعی وہاں نہ ہو، جس پر یہ رد نہ کر سکے۔

(۱۹) ہر وہ شخص جس سے قطع تعلق جائز ہو، اس کی دعوت قبول کرنا واجب نہیں۔

مسافتِ وجوب: کتنی دور تک ولیمہ کی دعوت میں پہنچنا واجب ہے، اس سلسلہ میں ہر علاقہ کے عام عرف کو پیش نظر رکھا جانا بہتر ہے۔ اگر کسی جگہ مسافتِ عُدویٰ تک دعوت میں شرکت کا معمول ہو، اور عدم شرکت قطع تعلق سمجھا جاتا ہو، تو قادر شخص پر اس مسافت تک

حاضری واجب ہو گی، (مسافتِ عدوی یعنی اتنا فاصلہ کہ سویرے نکل کر شام تک واپس پہنچ سکے)، اتنی دور جانے کا عرف نہ ہو، تو واجب نہیں، بعضوں نے وجوبِ جمعہ کی طرح یہ معیار مقرر کیا کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچے، ان حضرات کو شرکت واجب ہے، جہاں نہ پہنچے ان پر واجب نہیں، لیکن پہلے قول کے اعتبار سے اگر بستی کے باہر سے دعوت میں شرکت کا عام ماحول نہ ہو، تو اذان سننے کے باوجود شرکت واجب نہیں۔

روزہ اور دعوت

احادیث: (۱) ''کسی کو دعوت دی جائے، تو قبول کرلے، اب اگر روزہ سے ہو، تو دعا دے، ورنہ کھالے'' (مسلم، ابوداود، نسائی فی الکبری، الطحاوی فی المشکل، بیہقی، احمد، ترمذی)

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں: ''میں نے آپ ﷺ کے لئے کھانا تیار کیا، پھر آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ تشریف لائے، جب کھانا رکھا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ میرا روزہ ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بھائی نے تم کو دعوت دی، اور تمہارے لئے تکلف کیا'' پھر فرمایا: ''روزہ توڑ دو، اور اس کی جگہ چاہو تو ایک دن روزہ رکھو، (بیہقی، طبرانی، وحسنہ الحافظ والالبانی)

(۳) حضرت ابن عمرؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں: ''اس دعوت کو قبول کرلو، جبکہ دعوت دی جائے'' ''حضرت ابن عمرؓ شادی کی اور دیگر دعوتوں میں حاضر ہوتے تھے، وہ روزہ کی حالت میں بھی حاضر ہوتے تھے''۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، طحاوی، بیہقی، احمد) (ارواء الغلیل ۵/۷)

روزہ کی وجہ سے دعوت کی قبولیت ساقط نہ ہو گی، گرچہ، فرض روزہ ہو، روزہ دار کو دعوت کی صورت میں یہ کہنا کہ میرا روزہ ہے، مکروہ نہیں ہے، شاید کہ داعی اسے معذور سمجھ کر چھوڑ دے، روزہ اگر نفلی ہو، گرچہ موکد ہو، اور داعی کو گراں اور شاق ہو (اور وہ یہ چاہے کہ ہمارا کھانا کھائے) تو روزہ توڑنا افضل ہے، خواہ شام کے قریب ہو، اس سے نیت یہ ہو کہ داعی خوش ہو جائے، اور اسے جتنا روزہ ہوا، اسکا ثواب ملے گا، اس کی قضا کرلینا مستحب ہے۔ اگر اسے شاق نہ ہو، تو روزہ مکمل کرنا افضل ہے۔ کسی بھی فرض روزہ کو دعوت کی وجہ سے توڑنا جائز نہیں ہے۔

جس کا روزہ نہ ہو، اسے دعوت میں شرکت کے بعد کھانا سنت ہے، ایک قول وجوب کا ہے، امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اسے صحیح قرار دیا ہے، لیکن معتمد پہلا قول ہے، دونوں قول پر اس کی اقل مقدار ایک لقمہ ہے۔

ایک سے زائد نکاح: ایک سے زائد بیویوں کی طرف سے ایک ہی ولیمہ کرے، تو امام اذرعی ورملی کے نزدیک یہ کافی ہے، لیکن خطیب اور ابن حجر ہر ایک کے لئے مستقل ولیمہ کے قائل ہیں۔

امام بخاری نے ازواجِ مطہرات کے ولیمہ کے اختلاف کے پیشِ نظر بیویوں کے ولیمہ میں کمی بیشی کے جواز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ولیمہ کا وقت: ولیمہ کا وقت عقد نکاح کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ (لہٰذا نکاح کے فوراً بعد کھانا کھلانے یا شربت وغیرہ کی تقسیم سے بھی اس کی اصل سنت حاصل ہو گی) اور اس کا کوئی آخری وقت نہیں، دخول کے بعد ولیمہ انجام دینا افضل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کا ولیمہ دخول کے بعد ہی انجام دیا ہے، جیسا کہ حضرت زینب کے ولیمہ میں بخاری میں صراحت ہے۔ پس عقد کے بعد سے کسی بھی وقت دعوت دے، تو قبول کرنا واجب ہے، گرچہ افضل وقت نہ ہو، طلاق، موت یا زیادہ مدت گذرنے کی وجہ سے یہ

فوت نہ ہو گا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ مدت زفاف میں ہونی چاہئے، یعنی کنواری کیلئے سات دن تک اور دوسروں کے لئے تین دن تک اس کے بعد قضا شمار ہو گی۔

اگر کسی کو عقد سے پہلے ہی دعوت دی جائے، لیکن دعوت کا نظم اور کھانا عقد کے بعد ہو، تو بظاہر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ عقد سے قبل دعوت کھلانے سے ولیمہ حاصل نہ ہو گا، اور اس دعوت کا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

عورتوں اور بچوں کی شرکت: بخاری کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے چند عورتوں اور بچوں کو شادی سے آتے دیکھا، تو (خوشی میں) جلد کھڑے ہوئے اور فرمایا: "اللھم! تم لوگ میرے محبوب ترین لوگوں میں ہو"۔ اس حدیث سے امام بخاری نے عورتوں اور بچوں کی شرکت کے جواز کے لئے استدلال کیا ہے، اسی طرح بخاری شریف میں حضرت رُبَیِّعؓ بنت مُعَوِّذ کے بدائی کے بعد بچیوں کا جمع ہونا حضرت عائشہؓ کی بدائی کے وقت انصاری خواتین کا اجتماع اور حضرت عائشہؓ کا ایک نکاح میں شریک ہونا وارد ہے۔ (البتہ پردہ وغیرہ کے شرعی اصول کا لحاظ ضروری ہے)

تصویر کا حکم

احادیث: (۱) "فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا اور تصویر ہو" (مؤطا، متفق علیہ)

(۲) "بروزِ قیامت بارگاہِ الٰہی میں مصوروں (تصویر گروں) کو یقیناً شدید ترین عذاب ہو گا"۔ (متفق علیہ)

(۳) "بلاشبہ جو یہ تصویریں بناتے ہیں، بروز قیامت ان کو عذاب ہو گا"۔ ان سے کہا جائے گا: تم نے جو پیدا کیا اس میں روح پھونکو" (اسے زندہ کرو) (متفق علیہ)

(۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: آپ ﷺ ایک مرتبہ سفر سے تشریف لائے، اور میں نے ایک باتصویر پردہ لٹکا رکھا تھا، پس جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو اسے ہٹانے کا حکم دیا اور فرمایا: "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، انھیں بروزِ قیامت سخت ترین عذاب ہو گا" (متفق علیہ)

(۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مصوروں سمیت کئی گنہگاروں پر لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری)

امام نوویؒ نے فرمایا: علماء فرماتے ہیں کہ کسی حیوان کی تصویر بنانا سخت حرام ہے، یہ کبائر میں داخل ہے، کیونکہ اس پر مذکورہ بالا شدید ترین وعید وارد ہے، چاہے تحقیر و تذلیل کے طور پر استعمال کے لئے بنائے، یا کسی اور مقصد سے، بنانا ہر حال میں حرام ہے، خواہ کپڑے میں بنائے یا بچھونے، درہم و دینار (نوٹ وغیرہ پر) یا برتن و دیوار پر۔

غیر جاندار کی تصویر بنانا حرام نہیں، مسلم وغیرہ میں ابن عباسؓ سے اس کی اجازت منقول ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ مصوروں کو اتنی سخت وعید اس لئے ہے کہ تصویریں اللہ کے علاوہ پوجی جاتی تھیں، نیز اس کو دیکھنا فتنہ کا باعث ہے، اور بعض نفوس اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر تصویر سایے دار نہ ہو (یعنی کاغذ کپڑے وغیرہ پر ہو) اور اسے روندا جاتا ہو، (چلنے پھرنے کی جگہ ہو) یا استعمال کے ذریعے اس کی تحقیر و تذلیل ہوتی ہو، تو اس چیز کا استعمال جائز ہے، (گرچہ اس تصویر کا بنانا بھی حرام ہے) اگر دیوار پر آویزاں یا پوشاک اور عمامہ وغیرہ پر ہو جس میں تحقیر کا پہلو نہ ہو، تو استعمال بھی حرام ہے۔ امام رافعیؒ نے جمہور سے نقل فرمایا کہ تصویر کا سر کاٹ دیا جائے، تو ممانعت ختم ہو جائے گی، لیکن امام متولی اس سے متفق نہیں، نہایۃ، فتح الوہاب و تحفہ وغیرہ میں بچیوں کے لئے گڑیا کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سے کھیلا کرتی تھیں

اس میں حکمت یہ ہے کہ اولاد کی تربیت کی مشق حاصل ہو جائے، بعض علماء نے ممانعت کی روایات کے پیش نظر اس اجازت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ سکّوں پر مکمل تصویر ہو تب بھی اسے استعمال کرنے اور ساتھ رکھنے میں حرج نہیں، اسلاف اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔

تنبیہ - ویڈیو سے متعلق: دورِ حاضر میں تصویر ہی کی ایک ترقی یافتہ اور بسہولت دستیاب لعنت ومصیبت ویڈیو ہے جس کا نشہ باوجود کئی مفاسد کے لوگوں کے دماغ پر چھا چکا ہے، اور اس زہریلے سانپ کو حسین ہار سمجھ کر گلے میں لٹکا لیا ہے، حالانکہ ان متحرک تصاویر کے مفاسد واضح ہیں اس کے ذریعہ شادی کی عام مجلسوں کی تصویر کشی تو ایک عام سی بات بن ہی چکی ہے، مزید آگے بڑھ کر عورتوں کے کھانے پینے وغیرہ کی اداؤں کو بھی محفوظ کیا جارہا ہے۔ بلکہ شیطان نے تو ایسا مخمور کر دیا ہے کہ حجلۂ عروسی اور فراشِ عروسی کے مناظر تک اس کیمرہ اور کیمرہ مین کو رسائی حاصل ہو رہی ہے، کیا یہی نکاح کے سنت کی ادائیگی کا طریقہ ہے، کہ حیاء کو بالکل بالائے طاق رکھ کر فحاشی اور بے پردگی کا یوں مظاہرہ کیا جائے" یہ مقدس مذہبِ اسلام کی عفت مآب بیٹیاں ہیں، یا نعوذ باللہ کسی قحبہ خانہ کی عصمت فروش اور بے حیا عورتیں، ذرا تو ہوش کے ناخن لیجئے، مردوں اور عورتوں کی غیرت اور حیا کہاں مرگئی؟ اللہ تعالیٰ امت کو تمام فتنوں سے بچ کر سنت کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کھانے پینے کے آداب

آیت: (۱) "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" (البقرہ:۱۷۲)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں، انہیں کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے ہو"۔

آیت: (۲) "يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا" (المؤمنون:۵۱)

ترجمہ: "اے پیغمبرو! اور تم نفیس چیزیں کھاؤ (کہ خدا کی نعمت ہے) اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو۔

وصول الی اللہ کے لئے علم وعمل ضروری، اور اس پر مداومت اور ہمیشگی بغیر جسمانی صحت وتندرستی کے ناممکن، اور صحت کی تحصیل (عادتاً) اناج وغذا کے بغیر مشکل ہے، اسی لئے امام احمدؒ نے فرمایا کہ کھانا دین میں داخل ہے، لہٰذا جو علم وعمل پر استعانت ومدد اور تقویٰ کے لئے قوت حاصل کرنے کی نیت سے کھائے پئے، اسے چاہئے کہ اپنے نفس کو بالکل آزاد نہ چھوڑے کہ جانوروں کی طرح چرتا رہے، شرعی آداب ومسائل کی رعایت کرتے ہوئے اس عمل کو انجام دے گا، تو اس سے بھی نورانیت اور ثواب کا مستحق ہو گا، گرچہ اس میں نفس کا نفع ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آپ ﷺ نے بیوی کی طرف بڑھائے جانے والے لقمہ میں بھی ثواب کی خوشخبری سنائی ہے۔

کھانے کے متعلق سرفہرست یہ تاکیدی حکم پیش نظر رہے کہ کھانا اپنے طور پر بھی حلال ہو، نیز اس کی تحصیل کے اسباب بھی حلال وجائز ہوں، کمائی کا ذریعہ حرام یا مکروہ نہ ہو۔

کھانے سے قبل دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئے، صرف دایاں ہاتھ یا انگلیاں دھونے پر اکتفا نہ کرے، حدیث میں ہے: "کھانے سے قبل اور بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) برکت کا باعث ہے"۔ (ابوداود، ترمذی، احمد، حاکم) نیز مختلف اشغال کی وجہ سے ہاتھوں پر کچھ نہ کچھ میل کچیل وغیرہ ہو گا، لہٰذا دھونا نظافت کے مناسب ہے۔ کھانا شروع کرتے وقت مالک (یعنی دعوت دینے والا) پہلے اور آخر میں سب

کے بعد ہاتھ دھوئے۔

کھانا ٹیبل وغیرہ کسی اونچی جگہ رکھنے کے بجائے زمین پر بچھے دستر خوان پر رکھ کر کھائے، آپ ﷺ کا معمول زمین پر رکھنے کا تھا۔ (احمد فی کتاب الزھد مرسلاً، والبزار عن ابی ہریرۃ) یہ کیفیت تواضع سے قریب تر ہے، بخاری شریف میں ہے کہ آپ ﷺ خوان پر نہیں کھاتے تھے (یعنی ٹیبل جیسی کسی بلند چیز پر رکھ کر نہ کھاتے، کہ یہ عجمیوں اور عیش پسندوں کا طریقہ ہے) خِوان پر کھانا بدعت ہے، گرچہ جائز ہے۔

کھانے کے لئے ابتداء سے آخر تک ایک ہی ہیئت اور نشست پر بیٹھے، آپ ﷺ کبھی دوزانو بیٹھتے (ابوداود)، یا دائیں قدم کو کھڑا کرے اور بائیں پر بیٹھے (ابوالحسن بن المقری فی الشمائل) لیٹ کر یا ٹیک لگا کر ایک طرف جھک کر کھانا پینا مکروہ ہے۔

کھانے سے تلذذ و تنعم کے بجائے اللہ کی عبادت کے لئے قوت حاصل کرنے کی نیت کرے، اسی لئے کم کھانے کی عادت ڈالے، کیونکہ شکم سیری عبادت سے روک دے گی، آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ کوئی آدمی پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرتا، ابن آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں، جو اس کی پشت کو سیدھی رکھے (یعنی عبادت کیلئے قوت کا باعث ہو) اگر اس سے زیادہ کھانا ہے، تو ایک تہائی حصہ کھانے کے لئے، ایک تہائی پینے کے لئے، اور ایک تہائی (اطمینان سے) سانس کے لئے۔ (ترمذی وقال حسن، نسائی، ابن ماجہ وغیرہم) لہٰذا بغیر بھوک کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے، اور شکم سیری سے قبل ہی ہاتھ روک دے، جو اس کی پابندی کرے گا، وہ طبیب (ڈاکٹر) سے بے نیاز ہو گا۔

جو کچھ موجود ہو، اسی پر قناعت کرے اور راضی رہے، مزید کی کوشش اور تنعم کی ضرورت نہیں، روٹی مل چکی تو اس کے اکرام کا تقاضا یہ ہے کہ سالن کا منتظر نہ رہے، جو چیز بھی صحت و قوت کی حفاظت و دوام کے کام آئے، بڑی خیر ہے، اسے حقیر نہ سمجھے۔

اگر کھانا حاضر ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو کھانے کو مقدم کرے (صحیحین) جبکہ وقت میں گنجائش ہو، اگر نفس کو کھانے کی طرف میلان نہ ہو، اور تاخیر میں کوئی ضرر نہ ہو، تو نماز کو مقدم کرے۔

کھانے پر زیادہ ہاتھوں (یعنی زیادہ افراد کی شرکت) کی کوشش کرے، یہ کھانا اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے (ابویعلی، ابن حبان، بیہقی وسندہ حسن) خواہ گھر کے افراد ہوں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "سب مل کر کھایا کرو، اس میں برکت حاصل ہو گی"۔ (ابوداود، ابن ماجہ باسناد حسن)

آپ ﷺ نے فرمایا: "جب کھانا کھاؤ تو بسم اللہ کہو، اگر ابتداء میں بھول جائے تو اس طرح کہے: بسم الله فِيْ اَوَّلِهٖ وَآخِرِهٖ" (ابوداود، ترمذی)، بسم اللہ کے استحباب پر تمام علماء متفق ہیں، (گرچہ حائضہ یا جنبی ہو) بلکہ بعضوں نے اسے واجب قرار دیا ہے، (حائضہ یا جنبی وغیرہ بھی کھاتے وقت بسم اللہ پڑھے)، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: "بسم اللہ کہو، اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ" (بخاری) ہر لقمہ کے ساتھ بسم اللہ کہنا اچھا ہے، اقل درجہ بسم اللہ کہنا، اور اکمل بسم اللہ الرحمن الرحیم کہنا ہے، یہ سنت کفایہ ہے، اس کے باوجود ہر ایک کیلئے سنت ہے، اگر ابتداء میں ترک ہو، تو درمیان میں، اور درمیان میں ترک ہو، تو آخر میں پڑھ لے، کیونکہ اس کی وجہ سے شیطان نے ساتھ شامل ہو کر جو کچھ کھایا پیا ہے، سب قئے کر دے گا۔

دائیں ہاتھ سے کھانا پینا اور اپنے سامنے سے کھانا سنت ہے، چونکہ احادیث میں اس کا حکم ہے، اس لئے امام شافعیؒ نے بعض جگہ اور امام بُویطیؒ نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ میوے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ بڑھا سکتے ہیں (یعنی جبکہ پلیٹ میں مختلف انواع کے میوے

ہوں)

لقمہ چھوٹا لے، اور اچھی طرح چبا کر نگلنے کے بعد دوسرے لقمہ کی طرف ہاتھ بڑھائے، کسی کھانے کو عیب نہ لگائے، "آپ ﷺ کسی کھانے کی چیز کو عیب نہ لگاتے، پسند آتی تو کھالیتے، ورنہ چھوڑ دیتے" (متفق علیہ) مجھے اس کھانے کی رغبت نہیں، یا اسے کھانے کی عادت نہیں، اس طرح کہنا مکروہ نہیں ہے۔ اپنا منہ کھانے کے قریب لے جانا مکروہ ہے۔ پیالہ کی اونچائی اور کھانے کے درمیان سے نہ کھائے، بلکہ روٹی کو گولائی کی طرف سے (کنارے سے) کھائے، اگر روٹی کم ہو تو توڑ لے، روٹی و گوشت چھری سے نہ کاٹے (یعنی کھاتے وقت)، آپ ﷺ نے دانت سے بوٹی کو جدا کر کے کھانے کا حکم دیا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ) بخاری میں آپ ﷺ کا خود یہ عمل مروی ہے، نیز بخاری میں گوشت کو چھری سے کاٹنا بھی وارد ہے، (لہٰذا بڑے ٹکڑے کو چھری سے کاٹ کر چھوٹا کرنے میں حرج نہیں۔ واللہ اعلم)

کھاتے وقت ایسا قول و فعل جس سے دوسروں کو گھن آئے مکروہ ہے، برتن و پیالہ میں ہاتھ نہ جھاڑے، منہ سے کچھ نکالے تو چہرہ کھانے سے پھیر کر بائیں ہاتھ سے نکالے۔ روٹی وغیرہ منہ سے توڑنے کے بعد شوربے وغیرہ میں نہ ڈبوئے۔ روٹی پر پیالہ وغیرہ نہ رکھے، جس سالن سے کھانا ہو، اسے رکھنے میں حرج نہیں، روٹی سے اپنا ہاتھ نہ پوچھئے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ لقمہ گر جائے تو اسے اٹھا کر لگی ہوئی گندگی دور کر لے (اور کھالے) اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑ دے، برتن چاٹ کر صاف کر لے، حدیث کی رو سے تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے (مسلم)

مالک اور ذمہ دار حضرات دوسروں کو ابھی کھانے کی حاجت باقی ہو، تو کھانا چھوڑ کر نہ اٹھیں، کھانے کے گرے ہوئے دانے اور ذرات اٹھا کر کھالے۔ کھانا اطمینان سے کھائے اِلّا یہ کہ کوئی مشغولی ہو۔

حدیث میں ہے: "کھانے کے بعد تولیہ سے ہاتھ پونچھ کر صاف نہ کرے، جب تک کہ اسے چاٹ نہ لے، یا چٹوا نہ لے، (یعنی شاگرد یا بچوں وغیرہ کو چٹوادے، جنھیں اس میں کوئی کراہت محسوس نہ ہو) اسے کیا پتہ کہ اس کے کھانے کے کس حصّہ میں برکت ہے"۔ (مسلم، احمد، نسائی)

آپ ﷺ نے کھانے پینے کی اشیاء و برتن میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے (احمد، ابوداود، ترمذی)

کھاتے وقت تھوڑی بہت اچھی باتیں کرنا، دیگر ساتھیوں کی طرف نگاہ نہ اٹھانا، اور آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کی ترغیب دینا مسنون ہے۔ کھجور طاق عدد میں کھانا مستحب ہے، ایک ہی پلیٹ میں کھجور اور گٹھلیاں جمع نہ کرے، (بلکہ بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر پھینک دے) دیگر گٹھلی دار اشیاء کا بھی یہی حکم ہے، کھانے کے دوران پانی زیادہ نہ پئے، اطباء اسے ہاضمہ کے لئے مضر بتلاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ کھانے والا پہلے میوے کھائے، پھر گوشت، پھر شیرینی، (یعنی تینوں کھانا ہے، تو اس ترتیب سے کھائے)

کھانے کے بعد خلال کرے اور جو ذرات دانتوں سے نکلیں انھیں پھینک دے، نگلے نہیں، زبان کے ذریعہ دانتوں سے جو ذرات نکلیں، انھیں نگل لے۔ (طبرانی) خلال کے بعد کلی کر لے، گوشت کھانے سے قبل روٹی کے دو تین لقمے کھالے، کھانے کو سونگھے نہیں، گرم کھانا جو تکلیف دے، نہ کھائے، یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے، گرم کھانے میں پھونک نہ مارے، کھاتے وقت بلا مجبوری کے تھوکنا اور بلغم صاف کرنا مکروہ ہے، دیگر لوگوں کے ساتھ کھجور وغیرہ دو دو کھانا ان کی رضامندی کے بغیر مکروہ ہے، اگر کھجور سب کی مشترک ملکیت ہو، تو دیگر مالکوں کی اجازت کے بغیر اس طرح کھانا حرام ہے۔

مسلم شریف میں حضرات انس، ابو سعید، اور ابو ھریرہؓ سے مرفوعاً کھڑے ہو کر پینے سے ممانعت وارد ہے، صحیحین وغیرہ میں

کھڑے ہو کر پینا بھی وارد ہے، لہٰذا بیٹھ کر پینا سنت شمار ہوگا، اور کھڑے ہونا کسی عذر کی وجہ سے یا بیان جواز کے لئے ہوگا، عام حالات میں کھڑے ہو کر پینا خلافِ اولی ہے، بلا عذر کھڑے ہو کر پی لے تو اسے قئے کر دینا مندوب ہے، مسلم وغیرہ میں اس کا حکم موجود ہے۔ پینے سے قبل گلاس میں نگاہ ڈالے، تاکہ کوئی نقصان دہ چیز نہ ہو، گلاس میں نہ ڈکار لے اور نہ سانس لے، بلکہ اسے منہ سے جدا کر کے یہ امور انجام دے۔ کسی مشروب وغیرہ کی مجلس میں تقسیم اور دور کی صورت میں دائیں طرف سے تقسیم کریں گے، جیسا کہ مؤطا اور صحاحِ ستہ کی روایات سے ثابت ہے۔

پانی تین سانس میں پینا سنت ہے۔ (احمد، صحاح ستہ) یعنی ایک مرتبہ کچھ پی کر برتن منہ سے جدا کر کے سانس لے، پھر دوبارہ سہ بارہ اسی طرح کرے، ہر مرتبہ الحمدللہ کہہ کر شکر ادا کرے، کھانے پینے سے فراغت پر ماثورہ دعاؤں کا اہتمام کرے۔

(۱) آپ ﷺ جب کھاتے اور پیتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَ سَقٰی وَ سَوَّ غَهٗ وَ جَعَلَ لَهٗ مَخْرَجاً" (ابوداود باسناد صحیح) (شکر اس خدا کا جس نے کھلایا، پلایا اور اسے خوشگوار بنایا اور اس کے نکلنے کا راستہ مہیا کیا)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو کھانے کے بعد یہ دعا پڑھے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَطْعَمَنِیْ هٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّی وَلَا قُوَّةٍ"۔ اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے" (ابوداود، ابن ماجہ، ترمذی وحسنہ) (شکر اس خدا کا جس نے میری قدرت اور قوت کے بغیر مجھے یہ کھانا کھلایا اور رزق عنایت فرمایا)۔

(۳) آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ" (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، سنن وشمائل، ترمذی) (حمد وتعریف اس اللہ کی جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا)

(۴) آپ ﷺ کھانے کے بعد یہ دعا پڑھتے: "اَللّٰهُمَّ اَطْعَمْتَ وَسَقَیْتَ وَاَغْنَیْتَ وَاَقْنَیْتَ وَهَدَیْتَ وَاَحْیَیْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰی مَا اَعْطَیْتَ" (نسائی، ابن السنی بسند صحیح) یا اللہ، تونے کھلایا، پلایا، بے نیاز کیا، غنی وراضی کیا، ہدایت بخشی، اور زندہ کیا، بس تمام عطایا پر تیرا ہی شکر ہے)

(۵) دستر خوان اٹھ جانے پر آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِیْراً طَیِّباً مُبَارَكاً فِیْهِ غَیْرَ مَكْفِیٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ ولا مُسْتَغْنًی عَنْهُ رَبَّنَا" (بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان) (اس دعا میں اللہ بکثرت، پاکیزہ اور مبارک حمد کی گئی ہے، جو کسی کا محتاج نہیں، اور اس سے کوئی مستغنی نہیں)

(۶) آپ ﷺ نے فرمایا: "کوئی کھانا کھائے تو یہ کہے: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْهِ وَاَطْعِمْنَا خَیْراً مِنْهُ" (یا اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرما اور اس سے بہتر کھلا اور دودھ پئے تو یہ کہے: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ" (یا اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرما اور مزید عنایت فرما) (ابوداود، ابن السنی، ترمذی وحسنہ)

مہمان: مہمان کو خوش آمدید کہے، اور اس کا اکرام کرے، اور اس کی آمد پر اللہ کا شکر ادا کرے، مہمان کے لئے میزبان کو دعا دینا سنت ہے، اگرچہ وہ نہ کھائے، مثلاً: "اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ، وَاَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ وَصَلَّتْ عَلَیْكُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَ ذَكَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْمَنْ عِنْدَهٗ" (تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں، تمہارے یہاں روزہ دار افطار کریں، تم پر ملائکہ کی دعا ہو، اور اللہ تمہارے ذکر اپنے پاس والوں میں کرے۔ مہمان اور بیوی بچے وغیرہ کھانے سے ہاتھ روک دیں، تو مالک ان کو کھانے کے لئے اصرار کرے، اگر وہ بقدر کفایت کھا چکے ہوں تو ضرورت نہیں، تین سے زائد مرتبہ اصرار کی ضرورت نہیں۔

مہمان کے آداب میں یہ داخل ہے کہ صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، عورتوں کے کمروں اور پردے کے بالمقابل نہ بیٹھے، اور جس جگہ سے کھانا لایا جارہا ہو، وہاں زیادہ نگاہ نہ ڈالے، اور میزبان کے آداب میں یہ داخل ہے کہ مہمان کی روانگی کے وقت دروازہ تک مشایعت کرے (اس کو چھوڑنے جائے) اور ٹھہرنے والے مہمان کو قبلہ کا رخ اور دیگر ضروریات کی جگہ بتلادے۔

مہمان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے، مالک کی طرف سے زبانی اجازت کے بغیر اس میں سے تناول کر سکتا ہے، عرفی قرینہ کافی ہے جن صحیح احادیث میں اجازت کا ذکر ہے، وہ استحباب پر محمول ہے، البتہ کسی دوسرے کی آمد کا انتظار ہو، تو لفظی اجازت یا اس کی آمد کے بغیر کھانا شروع نہ کرے۔

دعوت میں کوئی غیر مدعو ساتھ آئے تو اسے روکنے یا اجازت دینے کی یا اس سے تنگ دل ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ داعی کو اس کی اطلاع دے، اگر وہ اجازت دے تو شریک ہو، ورنہ لوٹ جائے، کوئی حرج نہ ہو تو بہتر ہے کہ داعی اجازت دے دے، کسی کے کھانے کے دوران کوئی داخل ہو، اور خوش دلی اور چاہت سے وہ شرکت کی دعوت دے، تو شریک ہو جائے، حیا کی وجہ سے کہے تو شریک نہ ہو۔

بعض مخصوص اور بڑے حضرات کے سامنے کوئی خصوصی اور نفیس چیز رکھی ہو، تو دیگر حضرات کو اس میں سے کھانا جائز نہیں ہے، آپس میں کینہ کپٹ کا اندیشہ ہو تو حاضرین میں اس طرح تفاوت برتنا مکروہ ہے، سامنے رکھی ہوئی چیز تمام کھانے یا کچھ باقی رکھنے کے بارے میں عرف کا لحاظ کیا جائے گا، مالک کی رضامندی کے علم کے بغیر شکم سیری سے زائد کھانا حرام ہے، رضامندی کا علم ہو، یا اپنے حلال مال سے کھائے، تو مکروہ ہے، جبکہ نقصان دہ نہ ہو ورنہ حرام ہے، اگر مہمان بہت زیادہ کھاتا ہو، اور مالک کو اس کا علم نہ ہو، تو اسے عرف کی مقدار سے زائد کھانا جائز نہیں ہے، کھانا کم ہو، اور دیگر ساتھیوں کو محروم کر کے خود زیادہ کھا جانے کے لئے بڑے لقمے جلد جلد کھائے، تو یہ جائز نہیں ہے۔

طفیلی بننا یعنی بغیر دعوت اور بلاوے کے کسی کی دعوت میں شریک ہونا حرام ہے، اگر آپسی تعلقات وانسیت اور بے تکلفی کی وجہ سے مالک کی رضامندی کا علم ہو، تو حرج نہیں۔ میزبان مہمان کے سامنے جو کھانا پینا پیش کرے، مہمان اس میں کوئی اور تصرف نہ کرے، مثلاً فروخت کرنا، سائل کو دینا، بلی وغیرہ کو کھلانا، مہمان آپس میں ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں، جبکہ ان کے انواع میں تفاوت نہ برتا گیا ہو۔

مہمان جب لقمہ منہ میں رکھ لے گا، تو اس کا مالک بن جائے گا۔ مہمان پیش کردہ کھانا، برتن اور بیٹھنے کی چٹائی وغیرہ کا ضامن نہ ہوگا۔ کھانے کے قبل یا بعد بغیر اجازت کے برتن اٹھائے تو ضامن ہوگا، اور واپس اپنی جگہ رکھنے سے بری ہوگا۔ کسی عالم، بزرگ وغیرہ کو دعوت ہو، تو اپنے ساتھ صرف ان لوگوں کو لے جا سکتا ہے، جن سے مالک کی رضامندی کا علم ہو، بغیر رضامندی کے کسی کو لے جانا حرام ہے۔

کوئی شخص دوسرے شخص کا مال، خواہ نقدی ہو یا کھانا پینا یا کچھ اور، لے سکتا ہے، جبکہ اس کی رضامندی کا علم یا گمان ہو، گرچہ قوی قرینہ کی وجہ سے ہو، کبھی ایک کے حق میں رضامندی ہوگی، اور دوسرے کے حق میں نہ ہوگی، یا کسی وقت، یا نوع، یا جگہ میں ہوگی نہ کہ دوسرے میں، تو ہر ایک کا اس کے مطابق حکم ہوگا۔ (یعنی رضامندی کی صورت میں جواز ورنہ حرمت) لی ہوئی چیز میں کھانے یا دیگر تصرف میں مالک کی طرف سے جواز کے گمان کے مطابق اجازت ہوگی۔ (یعنی جس تصرف سے مالک کی رضامندی کا گمان ہو وہ جائز اور دیگر تصرف ناجائز ہوگا) (مذکورہ مسائل میں اکثر جگہ مہمان سے کسی دوسرے کا کھانا کھانے والا مراد ہے، باقاعدہ مہمان ہو یا نہ ہو)

میزبان کے لئے دعا: (۱) ایک صحابی کے گھر کھانے پینے کے بعد ان کی درخواست پر آپ ﷺ نے انھیں یہ دعا دی: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ" (مسلم، ترمذی، نسائی) (یا اللہ ان کے رزق میں برکت عطا فرما، اور ان

کی مغفرت اور ان پر رحم فرما)

(۲) حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں ایک مرتبہ آپ ﷺ نے روٹی تناول فرمائی اور یہ دعا دی: "اَفْطَرَ عِنْدَکُمُ الصَّائِمُوْنَ وَاَکَلَ طَعَامَکُمُ الْاَبْرَارُ ، وَصَلَّتْ عَلَیْکُمُ الْمَلَائِکَةُ" (ابوداود وغیرہ بالاسناد الصحیح) (تمہارے گھر روزہ دار افطار کریں، اور تمہارا کھانا نیک لوگ کھائیں، اور فرشتے تم کو دعائیں دیں) ابن السنی کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ جب کسی قوم کے پاس روزہ افطار کرتے، تو یہ دعا پڑھتے۔ (۳) "اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِیْ وَاسْقِ مَنْ سَقَانِیْ" (مسلم) (یا اللہ جس نے مجھے کھلایا اسے کھلا اور جس نے پلایا اُسے پلا)

مختلف احادیث کی روشنی میں حسن سلوک اور احسان کرنے والے کو بدلہ دینا اور مکافات مسنون ہے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اس کے حق میں دعا کرے، تاکہ اس کا شکر ادا ہو جائے، ایک حدیث میں کسی کے احسان کے بدلے میں "جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْراً" (اللہ تمہیں جزائے خیر دے) کہنے کو بہترین بدلہ قرار دیا ہے۔ (ترمذی، نسائی فی الیوم واللیلۃ۔ صحیح)

مہمان کے لئے سنت ہے کہ میزبان کو دعا دے، گو وہ نہ کھائے۔

نِثَار (شادی وغیرہ کے موقع پر کسی چیز کا بکھیرنا)

امام شافعیؒ نے فرمایا: "نکاح کے موقع پر اخروٹ، بادام اور شکر (وغیرہ) نہ بکھیرنا مجھے زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ یہ چھینا جھپٹی اور لوٹ کے ذریعے اٹھایا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر نہیں کہ یہ حرام ہو، البتہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی بعض بعض پر غالب آتے ہیں، اور ایسے لوگ لیتے ہیں کہ مالک کے نزدیک دوسرے کا لینا اس سے محبوب تر ہوتا ہے"۔

نکاح کے وقت کھجور، سکے یا دیگر اشیاء کے نچھاور کرنے اور بکھیر کر پھینک دینے کے متعلق کوئی معتبر حدیث موجود نہیں ہے، اس سلسلہ میں وارد حدیث کافی ضعیف ہے۔ حضرات ابو مسعود انصاری، عطار، عکرمہ اور ابراہیم اسے مکروہ سمجھتے تھے۔

درہم ودینار (سکے)، بادام، اخروٹ اور کھجور وغیرہ نکاح وختنہ کے موقع پر بکھیرنا جائز ہے۔ عرف کی روشنی میں دیگر دعوتوں کا بھی بظاہر یہی حکم ہوگا، زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ مکروہ نہیں، لیکن خلافِ اولی ہے، بعض حضرات نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

ایسی اشیاء کو زمین سے اٹھالینا خلاف اولیٰ ہے، الاُم میں امام شافعیؒ کے الفاظ کراہت پر دلالت کرتے ہیں، انابہ، تتمہ، نہایہ کے کلام کا تقاضا بھی یہی ہے، نیز امام زرکشی نے بھی کراہت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ لوٹنے کے مشابہ ہے، جس سے مسلم واحمد وغیرہ کی احادیث میں ممانعت فرمائی گئی ہے، نیز اٹھانے والا دوسرے پر غلبہ پا کر ہی اٹھاتا ہے، یا تو مزید قوت کی وجہ سے یا قلتِ حیاء کے سبب، اور مالک نے صرف اس کا قصد نہیں کیا، پس اٹھانے والے کا مالک کے قصد کے اعتبار سے کتنا حصّہ ہے، پتہ نہیں، مزید یہ کہ اس طرح اٹھانے میں ذلت وحقارت اور کم عقلی وبے وقوفی پائی جا رہی ہے۔

اگر یہ معلوم ہو کہ مالک بعض کو بعض پر ترجیح نہیں دیتا (کوئی بھی اٹھالے، اس کی نظر میں سب یکساں ہیں) اور اٹھالینا اس کی مروت کے خلاف نہ ہو، تو اٹھانا خلافِ اولی نہ ہوگا۔ (زمین پر گرنے سے قبل) ہوا ہی سے اپنی چادر وغیرہ کے ذریعہ نثار کا لینا مکروہ ہے، اگر اس طرح لے لیا، یا زمین سے اٹھالیا یا اس مقصد سے دامن پھیلا لیا اور اس میں آکر گر گیا، تو ان صورتوں میں یہ شخص اس چیز کا مالک نہ بنے گا، کیونکہ گرتے وقت اس کی جانب سے نہ ملکیت کا قصد پایا گیا، اور نہ کوئی فعل، لیکن یہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا (اور اسے اختصاص حاصل

ہو گا) لہٰذا کسی دوسرے کو اس کی رضامندی کے بغیر اٹھالینا حرام ہے، اور اٹھالے تو وہ مالک نہ بنے گا۔ اگر اٹھانے کے قصد سے پہلے وہ چیز کسی عذر سے یا بلا عذر سے گر جائے یا وہ کھڑا ہو جائے اور وہ چیز گر جائے یا وہ خود جھاڑ دے، تو اس کا اختصاص ختم ہو جائے گا، اب جو بھی اٹھالے مالک بن جائے گا۔ اگر بیچ اور کمینہ لوگوں کا ایک دوسرے کو ڈھکیل کر ضرر پہنچانے کا اندیشہ و گمان ہو، تو نثار حرام ہے (ولیمہ سے نثار تک اجمالی حوالہ، فتح الباری ۳۸۰/۱۰-۳۹۲، ارواء الغلیل ۳/۷، خلاصۃ البدر ۲۰۷/۲، معرفۃ السنن والانثار ۴۰۱/۵-۴۲۰، شرح مسلم ۱۴۴/۱-۴۶۴، تلخیص ۱۹۴/۳، فتح الباری ۳۰۸/۹، ۲۲۱-۲۴۹، الحاوی الماوردی ۵۵۵/۹-۵۶۷، جمل ۲۷۰/۴-۲۷۹، المجموع ۳۹۲/۱۶-۴۰۶، تحفۃالمحتاج مع الحواشی ۴۴۷/۹-۴۷۵، نہایہ المحتاج مع الحواشی ۳۶۹/۶-۳۷۸، اعانہ ۳۵۷/۳-۳۷۰، ترشیح المستفیدین ۳۲۳-۳۲۶، مغنی المحتاج ۳۴۴/۳-۲۵۰، بجیرمی ۳۸۳/۳-۳۹۳، اتحاف شرح الاحیاء ۲۱۰/۵-۲۲۷، قلائد ۱۴۷/۲-۱۵۳، بغیۃ المسترشدین ۲۱۴، فتاوی ابن زیاد ۲۱۶، الاذکار مع الفتوحات الربانیہ ۱۷۸/۵-۲۶۵، ۳۴۲/۴، الفقہ المنہجی ۹۶/۴)

خِیَار (نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار)

فسخ کے فوائد: (۱) اس سے طلاق کی تعداد کم نہ ہو گی۔ (۲) دخول سے قبل ہی فسخ ہو جائے تو مہر لازم نہ ہو گی، طلاق دے تو نصف مہر لازم ہے۔ (۳) دخول کے بعد عیب کا علم ہو، اور نکاح فسخ کرے، تو مقررہ مہر ساقط ہو گی، اور مہر مثل لازم ہو گی، اگر طلاق دے تو مقررہ مہر لازم ہے۔

فسخ کے بعد دوبارہ اسے بیوی بنانا ہو، تو جدید عقد ضروری ہے، خواہ عدت میں ہو، نیز مُحَلِّل کی ضرورت نہیں، نیز اسے (عدت کا) نفقہ نہ ملے گا، گو وہ حاملہ ہو، بخلاف طلاق کے،

فسخ کے اسباب: (۱) نکاح کا عیب (۲) شرط کی عدم موجودگی (۳) شوہر غریبی کی وجہ سے نفقہ پر قادر نہ ہو (۴) بیوی آزاد ہو جائے اور شوہر غلام ہو (۵) بیوی شوہر کو آزاد سمجھے اور وہ غلام نکلے۔

جن عیوب سے فسخ کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(۱) **جنون:** خاوند و بیوی میں سے کوئی ایک پاگل ہو، خواہ قابلِ علاج ہو یا لا علاج، گو عقد اور دخول کے بعد پاگل ہو جائے یا جنون کا دورہ پڑتا ہو، تو دوسرے کو فسخ کا حق ہے۔ اگر بہت ہلکا دورہ پڑتا ہو، مثلاً سال میں ایک دن، تو خیار حاصل نہ ہو گا۔ اگر بے ہوشی سے افاقہ کی امید نہ ہو تو خیار حاصل ہو گا ورنہ نہیں۔ مرگی کو بھی بعض علماء نے جنون کی نوع قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے بھی خیار ثابت ہو گا۔

(۲) **جذام (کوڑھ کا مرض):** کسی ایک کو جذام کی بیماری ہو، جو پختہ ہو، یعنی عضو سیاہ پڑ جائے اور کٹنا شروع ہو تو دوسرے کو خیار حاصل ہو گا (بعضوں نے صرف سیاہ پڑنا کافی سمجھا ہے، جبکہ واقف حضرات اسے پختہ بتلائیں) ابتدائی حالت میں خیار حاصل نہ ہو گا۔

(۳) **بَرَص (سفید داغ):** کسی ایک کو سفید داغ کی بیماری ہو، تو دوسرے کو خیار حاصل ہو گا، جبکہ مُستَحکَم (مضبوط اور پختہ) ہو، یعنی ہڈی تک اثر پہنچ جائے، کہ خوب رگڑنے کے باوجود وہ جگہ سرخ نہ ہو۔

مذکورہ تینوں عیب جانبین میں مشترکہ ہیں، دونوں میں سے جس میں بھی پایا جائے، دوسرے کو خیار ثابت ہو گا۔ اگر دونوں میں یہ

بیماری ہو، تب بھی خیار حاصل ہو گا، کیونکہ اپنی ایک بیماری سے گھن اور کراہت محسوس نہ بھی ہو، تو سامنے والے کی وجہ سے انسان کراہت محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ تینوں عیب میں سے کوئی عیب بوقتِ عقد شوہر میں موجود ہو تو بیوی کے ولی کو بھی اس کی وجہ سے خیار حاصل ہو گا، گو بیوی راضی ہو، بخلاف اس کے عقد کے بعد پیدا ہو، تو ولی کو حق نہ ہو گا۔

(۴) **رَتَق**: بیوی کو رتق ہو، یعنی صحبت کی جگہ گوشت (بڑھنے کی وجہ) سے بند ہو جائے، اور صحبت ممکن نہ ہو، تو شوہر کو خیار حاصل ہو گا، بیوی بالغہ ہو تو اسے اس جگہ کے چیرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، اگر بیوی اپنی مرضی سے چیرے (آپریشن وغیرہ کے ذریعے) اور صحبت ممکن ہو، تو خیار حاصل نہ ہو گا، اگر بیوی کمسن ہو، اور راستہ بنانے میں خطرہ کے بغیر مصلحت ہو، تو ولی کو اس کی اجازت ہو گی۔

(۵) **قَرَن**: یعنی صحبت کی جگہ ہڈی (بڑھنے) کی وجہ سے بند ہو جائے تو شوہر کو خیار ہے

(۶) **جَبّ**: اگر شوہر مجبُوب ہو، یعنی اس کا پورا ذکر (عضو تناسل) کٹا ہوا ہو، یا حَشَفہ (عضو تناسل کی سپاری) کی مقدار سے بھی کم حصّہ باقی ہو، تو بیوی کو خیار حاصل ہو گا۔ گو بیوی خود کاٹ دے، یا صحبت کرنے کے بعد مجبوب ہو۔ اگر حشفہ کے بقدر باقی ہے، لیکن صحبت نہیں کر سکتا تو اسکا حکم عِنّین کی طرح ہے (جو آئندہ آرہا ہے)

(۷) **عِنّین**: اگر شوہر عنین ہو، یعنی عضو مخصوص میں انتشار (استادگی) نہ ہونے کی وجہ سے بیوی سے صحبت سے عاجز ہو، اور شوہر پاگل یا نابالغ نہ ہو، تو بیوی کو فسخ کا حق حاصل ہو گا، جب کہ اس نکاح میں ابھی تک صحبت نہ کر چکا ہو، اس سے پہلے نکاح میں صحبت کر چکا ہو، تو اس کا اعتبار نہیں۔ اگر کسی دوسری عورت سے صحبت پر قادر ہو، لیکن اس بیوی کی صحبت سے عاجز ہو، تب بھی اسے خیار حاصل ہو گا۔

مذکورہ بالا عیوب کی وجہ سے خیار کے متعلق مختلف آثار وارد ہیں، ابتدائی تین (یعنی جنون، برص اور جذام) میں حضرت عمرؓ سے صحیح سند سے ثابت ہے، آخری دو کے متعلق صحابہ کرام کا اجماع ہے، نیز خرید و فروخت میں اس سے کم کی وجہ سے خیار حاصل ہوتا ہے، حالانکہ وہاں معمولی مالیت کا فرق پڑے گا، اور یہاں تو اصل مقصد صحبت و انتفاع ہے، لہٰذا قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی وجہ سے خیار حاصل ہو، نیز جذام و برص کی بیماری (تقدیر سے اسباب کے درجہ میں) ایک دوسرے کو اور اولاد کی عموماً متعدی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا عیوب کے علاوہ کسی دوسرے عیب سے خیار حاصل نہ ہو گا، مثلاً خنثیٰ واضح ہونا، استحاضہ، رسنے والے زخم، خارش، بوقتِ صحبت پاخانہ ہونا، شوہر سے قبل انزال، برص کی بیماری کے علاوہ جسم پر سفید داغ، گندہ دہنی، بوقت صحبت پیشاب نکلنا، گندہ بغلی، نابینائی، لنجاپن، بیوقوفی وغیرہ۔

اگر عیب ختم ہونے کے یا موت کے بعد عیب کا علم ہو تو خیار حاصل نہ ہو گا۔

فسخ کی صورت میں مہر: شوہر یا بیوی کے عیب کی وجہ سے صحبت سے قبل ہی نکاح فسخ ہو، تو کوئی مہر واجب نہیں، خواہ عیب عقد سے پہلے ہی موجود تھا، یا بعد میں پیدا ہوا، اس صورت میں مُتعہ بھی واجب نہ ہو گا۔

اگر صحبت کے بعد عیب پیدا ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ ہو، تو مقررہ مہر واجب ہو گا۔ بقیہ صورتوں میں مہر مثل واجب ہو گا، یعنی صحبت کے بعد یا صحبت کے وقت فسخ کرے اور عیب عقد کے وقت ہی موجود ہو، یا عقد اور صحبت کے درمیان پیدا ہو، اور شوہر کو علم نہ ہو یا صحبت کے وقت پیدا ہو (خلاصہ یہ کہ فسخ صحبت سے پہلے اور عیب صحبت کے بعد نہ ہو، یہ کل چھ صورتیں ہوئیں)

اگر صحبت کے بعد رِدّت کی وجہ سے نکاح فسخ ہو، تو مقررہ مہر واجب ہو گا۔

عیب کی وجہ سے فسخ کی صورت میں ولی، وکیل یا لڑکی سے شوہر مہر کی رقم واپس نہیں لے سکتا۔ ان تمام عیوب کے سبب فسخ کی صورت میں ولی، وکیل یا لڑکی سے شوہر مہر کی رقم واپس نہیں لے سکتا۔ ان تمام عیوب کے سبب فسخ کے لئے قاضی سے رجوع ہونا شرط ہے، قاضی نہ ہو تو اپنے شرائط کے ساتھ مُحَکَّم کافی ہے، شوہر کی غریبی کی وجہ سے فسخ کی صورت میں قاضی اور محکم نہ ہو تو عورت خود فسخ کر سکتی ہے، اس مسئلہ پر قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی قاضی اور محکم نہ ہونے کی صورت میں یہی حکم ہونا چاہئے۔

شوہر کا عنین (جماع سے عاجز) ہونا قاضی کے پاس اس کے اقرار سے، یا دو گواہوں کے سامنے اقرار اور ان کی گواہی سے، یا شوہر کے انکار کے بعد قسم نہ لینے پر وہ قسم بیوی پر لوٹ جائے اور بیوی قسم لے تو ثابت ہو جائے گا۔ عنین ہونا ثابت ہو، تو قاضی بیوی کے مطالبہ پر اس کیلئے ایک سال کی مہلت دے گا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کہا، (رواہ الشافعی) اور آئندہ علماء نے اسی کی اتباع کی، کیونکہ یہ عاجزی کسی عارض کی وجہ سے ہو سکتا ہے، لہٰذا مختلف موسم گذرنے پر دور بھی ہو سکتا ہے، اگر بیوی مسئلہ سے لاعلمی یا دہشت کی وجہ سے چپ رہے، تو اسے متنبہ کرنے میں حرج نہیں، سال مکمل ہوتے ہی فوراً بیوی پھر مسئلہ قاضی کے پاس لے جائے، اب شوہر اس دوران صحبت کرنے کا دعویٰ کرے اور بیوی ثیبہ ہو اور انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلائی جائے کہ وہ صحبت کر چکا اور اس کی تصدیق کی جائے گی، اگر بیوی باکرہ ہو، اور چار عورتیں اسکے بکارت کی گواہی دے، تو بیوی کو قسم دلائی جائے کہ اس نے صحبت نہیں کی، اور اس کی بات تسلیم کی جائے۔ اسی طرح شوہر قسم سے انکار کرے تو بیوی کو قسم دے، شوہر کے اقرار یا بیوی کے قسم کے بعد قاضی کہے کہ عنین ہونا ثابت ہوا، تو اب بیوی نکاح فسخ کر دے۔ اگر سال بھر بیوی شوہر سے جدا رہی، یا بیمار رہی، تو یہ مدت شمار نہ ہوگی لہٰذا دوبارہ ایک سال کا موقع دے۔ لیکن یہی عذر شوہر میں پایا جائے تو مدت شمار ہوگی۔

خیار شرط

میاں بیوی میں سے کسی ایک میں کسی وصف کی شرط لگائی جائے، جو صحتِ نکاح کے منافی نہ ہو، خواہ کمال ہو جیسے خوبصورتی، کنوارا پن، آزادی یا نقص جیسے ان کی ضد، یا دونوں نہ ہو جیسے سفیدی، گندمی رنگ پھر وہ شرط موجود نہ ہو، تو نکاح صحیح ہو گا، لیکن دونوں کو خیار حاصل ہو گا، لہٰذا قاضی کے بغیر بھی فسخ کر سکتے ہیں، جبکہ جو شرط لگائی گئی، اس سے کم درجہ میں ہو، مثلاً آزادی کی شرط ہو اور غلام یا باندی نکلے، اگر شرط کے مطابق یا اس سے برتر ہو تو خیار نہ ہو گا۔

اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے میں کسی وصف کی موجودگی کا گمان کریں (شرط نہ لگائیں) لیکن وہ وصف موجود نہ ہو، تو خیار نہ ہو گا۔ مثلاً شوہر لڑکی کو مسلمان سمجھے اور وہ کتابیہ تھی، یا بیوی کفو سمجھ کر نکاح کی اجازت دے، پھر شوہر کا فاسق، یا غلام، یا کمتر نسب یا حرفت والا ہونا معلوم ہو، کیونکہ تحقیق کرنا یا شرط لگانا چاہئے تھا، خلاف ورزی اس کی غلطی ہے (عیب کا مسئلہ گذر چکا کہ بعد میں علم ہوتے ہی خیار حاصل ہو گا)

شرط میں تخلف کی وجہ سے فسخ کی صورت میں وجوب مہر اور مہر کی واپسی کی وہی تفصیل ہے، جو خیار عیب میں گذر چکی۔

عقد نکاح میں شرط لگائی جائے اور تخلف ہو، تبھی فسخ کی گنجائش ملے گی، اگر عقد سے پہلے شرط لگائی جائے، اور عقد میں ایسی کسی شرط کا ذکر نہ ہو، تو فسخ کی گنجائش نہ ہو گی۔

خیار عیب اور خیار شرط فوری ہے، لہٰذا عیب یا شرط کی مخالفت کا علم ہوتے ہی، قاضی کے روبرو مسئلہ پیش کرنا، اور قاضی کے پاس

ثابت ہونے کے بعد فوراً فسخ کرنا ضروری ہے۔ (عنین میں سال گذرنے کے بعد فسخ کیا جائے گا) ورنہ خیار ساقط ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی بچہ یا پاگل ہو تو انکے کمال تک خیار مؤخر ہو گا۔

جسے خیار حاصل ہے، وہ اس خیار کے استحقاق سے ناواقفیت کا، یا فوری ہونے سے ناواقفیت کا دعویٰ کرے، تو اسے قسم دلا کر تسلیم کریں گے، خواہ طویل مدت گذر چکی ہو، جبکہ یہ ممکن ہو، مثلاً اس مسئلہ سے واقف حضرات سے زیادہ میل جول نہ ہو۔

مسخ: جانبین میں سے کوئی مسخ ہو جائے، تو نکاح فسخ ہو گا، اگر شوہر پتھر بن جائے، تو مکمل مہر واجب ہو چکا، اگر بیوی حیوان کی صورت میں مسخ ہو، تو مہر ساقط ہو گا، یا شوہر حیوان ہو جائے تو پورا مہر بیوی کا ہے، گو دخول سے قبل ہو۔ (جمل ۲۲۴/۴، قلائد ۱۲۷/۲، مغنی ۲۰۹/۳، نہایہ ۳۱۸/۶، بجیرمی ۳۶۷/۳، تحفہ ۳۲۵/۹، الفقہ المنہجی ۱۱۱/۴۔۱۱۵)

مُعَاشَرَت، قَسْم اورنُشُوز (خانگی زندگی، عدل اور نافرمانی)

قسم: بیویوں کے درمیان عدل وانصاف اور باری کی صحیح تقسیم وحفاظت۔

نُشُوز: میاں بیوی کا ایکدوسرے کی نافرمانی اور ادائے حق میں کوتاہی۔

بیویوں کے ساتھ قیام وشب باشی: کسی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اور کسی کے ساتھ رات گذارے، تو دوسرے بیویوں کے ساتھ بھی رات گذارنا واجب ہے۔ گو انکو کچھ عذر لاحق ہو، مثلاً بیماری، حی۔ض، نفاس، رَتْق، قَرْن، احرام، جنون (جبکہ اس سے کوئی خطرہ نہ ہو) جس سے ظہار یا ایلاء کیا ہو، اور دیگر شرعی یا طبعی عذر، کیونکہ اصل مقصد انسیت ہے نہ کہ صحبت۔

اگر کوئی بیویوں کو لے کر سفر میں جائے، اور ایک بیوی مرض کی وجہ سے نہ جاسکے، تو اس کی باری ساقط ہو گی۔ گو نفقہ کی مستحق ہو گی۔

مرض میں جذام بھی داخل ہے، وہ بھی باری کی مستحق ہو گی، یہ بات جذامی سے دور رہنے کے حکم کے منافی نہیں، کیونکہ یہ حق خود اس نے اپنے اوپر لاد لیا ہے، حالانکہ طلاق وغیرہ کے ذریعہ خلاصی حاصل کر سکتا ہے، نیز اس کے ساتھ ایک گھر میں رہنا کافی ہے، خواہ ایک گوشہ میں الگ تھلگ رات بسر کرے۔

رات بسر کرنے میں مساوات اور برابری واجب ہے، صحبت یا دیگر انتفاع میں مساوات واجب نہیں، البتہ سنت ہے۔

آیت: "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ" (النساء ۱۲۹)

ترجمہ: "اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتی کہ رغبت قلب میں بھی) گو (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے، تو تم (پر واجب ہے کہ) تم بالکل تو ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ، جس سے اُس کو ایسا کر دو جیسے کوئی اُدھر (یعنی بیچ) میں لٹکی ہو،

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کی سنت اور عام مسلمانوں کا عمل اس پر دلالت کرتا ہے کہ شوہر پر بیوی کے شب وروز کی باری لازم ہے، اور اس میں عدل ضروری ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں (جس برابری کی نفی کی ہے اس سے) قلبی محبت کی کمی بیشی مراد ہے، جو اللہ نے معاف رکھی ہے۔

امام شافعیؒ نے عورتوں کے حقوق سے متعلق آیات کو پیش کرنے کے بعد فرمایا: آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے لئے حَضَر میں

باری کی ترتیب کے ذریعہ مسلمانوں پر اسے مشروع فرمایا، نیز آپ ﷺ باری میں عدل وانصاف کے بعد یہ دعا کرتے: "یا اللہ! یہ میرے بس کی تقسیم ہے، اور جو بس میں نہیں اس سے آپ واقف ہیں"۔ یعنی آپ ﷺ کا دل نیز آپ ﷺ کو مرض الوصال میں سہارے سے روزانہ ایک ایک زوجہ مطہرہ کے حجرہ میں لے جایا جاتا، حتی کہ انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا۔۔ آپ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ آپ کو لوگوں میں سب سے محبوب کون ہے؟ تو فرمایا: "عائشہ (متفق علیه) (معرفة السنن والآثار ۴۲۳/۵، والام ۱۵۸/۵)

آپ ﷺ نے فرمایا: "جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف مائل ہو تو بروز قیامت مفلوج اٹھے گا، (ایک بازو گھسٹ کر چلے گا)" (احمد، سنن اربعه، ابن حبان، حاکم، بیہقی، صحیح علی شرط الشیخین۔ ارواء ۸۰/۷، تلخیص ۲۰۱/۳)

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: آپ ﷺ باری میں عدل برتنے کے بعد کہتے: "یا اللہ یہ میرے بس کی تقسیم ہے، پس جو میرے بس میں نہیں، اس پر ملامت نہ فرما" (سنن اربعه)

امام شافعیؒ کا فرمان ہے: "اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (البقرہ: ۲۲۸) (اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر) اور زوجین میں معروف ودستور کا جامع یہ ہے کہ مکروہ وتکلیف کو روکے، اور بغیر اظہار کراہت کے (خوشدلی کے ساتھ) صاحبِ حق کا حق پورے طریقے سے ادا کرے (اور قاضی کے پاس پہنچنے کیلیء مجبور نہ کرے) پس دونوں میں سے جو بھی تاخیر کر کے ٹال مٹول کرے، تو غنی (قدرت والے) کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ (الحاوی ۵۶۸/۹)

نشوز کی صورت میں قسم: اگر بیوی نشوز اختیار کرے (گو اس سے گنہگار نہ ہو، مثلاً پاگل ہو) یعنی شوہر کی اطاعت سے نکل جائے، مثلاً اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا، یا دروازہ بند کر دے اور اسے آنے نہ دے، یا اسے استمتاع کا موقع نہ دے، تو اس صورت میں وہ قسم اور نفقہ کی مستحق نہ ہوگی، آئندہ پھر شوہر کی فرمانبرداری کرے، تو سابقہ باری کی قضا نہیں کی جائے گی، جو عورت وطی بالشُبہ کی عدت میں ہو، یا اتنی کمسن ہو کہ صحبت کو برداشت نہ کر سکے، ان کا بھی یہی حکم ہے۔

شوھر: قسم کی ترتیب ہر عاقل شوہر پر واجب ہے (کوئی نشہ میں ہو تو اسکا بھی یہی حکم ہے) گو سفیہ ہو یا نابالغ، جبکہ صحبت پر قادر ہو، نابالغ کی ناانصافی پر اس کا ولی گنہگار ہوگا، بالغ ہونے کے بعد اسے باری کی قضا ضروری نہیں ہے۔ اگر نابالغ ابھی صحبت پر قادر نہ ہو، اور کسی بیوی کے پاس رہے، پھر دوسری بیوی بھی مطالبہ کرے، تو ولی پر لازم ہے کہ اس مطالبہ کو پورا کرے۔

شوھر کا اعراض: اگر شوہر ابتداء سے یا تمام کی باری مکمل ہونے کے بعد کسی بھی بیوی کے پاس نہ رہے تو یہ جائز ہے، کیونکہ شب باشی اس کا حق ہے، تو وہ اس حق کو ترک کر سکتا ہے، لیکن یہ مکروہ ہے۔ بلکہ سنت یہ ہے کہ ان کو ایسے ہی نہ چھوڑ دے، بلکہ ان کے ساتھ رات گذارے اور ان کے ساتھ صحبت وغیرہ کے ذریعہ ان کی پاکدامنی کی حفاظت کرے، تاکہ ان کو ضرر نہ ہو اور غلط راہ پر نہ چلیں، اور آپس میں دشمنی واختلاف کا سبب نہ بنے، نیز بغیر عذر کے الگ نہ سوئے، بلکہ دونوں ایک ہی بستر پر آرام کریں۔

باری کی ترتیب کے دوران کسی بیوی کی باری باقی رکھ کر اعراض کرنا جائز نہیں، حتی کہ اسے طلاق دے، تو تجدید نکاح واجب ہے، تاکہ اس کی باری کا حق ادا کر سکے۔

(امام صمیری نے کہا کہ امام مالکؒ کا فرمان ہے: طویل مدت تک بیوی سے صحبت نہ کرے، تو صحبت کا حکم دیا جائے گا، انکار کرے تو بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے)

کسی کی ایک ہی بیوی ہو، تب بھی اعراض وغیرہ میں یہی تفصیل ہے۔ ایک بیوی ہو تو ساتھ رہنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ چار دن میں ایک دن رہے، جیسا کہ چار بیویوں کی صورت میں ہوا ہوتا۔

باری کی جگہ: شوہر تنہا کسی مکان میں رہتا ہو، اور بیویوں کو باری باری شب گذاری کیلئے اپنے مکان میں بلائے تو یہ جائز ہے، اور بیوی کو جانا ضروری ہے، جبکہ مکان اس کے مناسب حال ہو" اگر جانے سے انکار کرے، تو نشوز شمار ہوگا، البتہ ایسی شرف والی خاتون ہو کہ اس کا اپنا گھر سے باہر نکلنے کا معمول نہ ہو، تو ماوردی واذرعیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ شوہر اسکے گھر جائے۔ اگر بیوی بیماری وغیرہ کی وجہ سے معذور ہو، اور سواری پر آسکتی ہو، تو سواری کا نظم شوہر کے ذمہ ہے۔

شوہر کے لئے بیویوں کو اپنے گھر بلانے کے بجائے، انکے گھر خود پہنچنا افضل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا، نیز وہ باہر نکلنے سے بچ جائیں گی۔

بیویوں کی رضامندی یا قرعہ اندازی کے بغیر بعضوں کو اپنے مکان پر بلانا، اور بعضوں کی باری میں انکے پاس حاضر ہونا جائز نہیں، کیونکہ اس تخصیص سے دوسروں کو وحشت و نفرت پیدا ہوگی اگر کسی غرض سے اس طرح کرے تو جائز ہے، مثلاً جس کے گھر گیا اس کا مکان قریب ہے، اور دوسری کا دور، یا پہلی نوجوان ہے اور اس کے نکلنے میں خطرہ ہے، اور دوسری بوڑھی ہے کہ کوئی خطرہ نہیں۔

شوہر بیویوں کی رضامندی کے بغیر کسی ایک بیوی کے گھر دوسروں کو نہیں بلا سکتا، خواہ بیوی کا مکان ہو یا شوہر کا، یا دوسری کو بلاتے وقت خود صاحبۂ خانہ موجود نہ ہو، کیونکہ اس میں ان پر مشقت، اور اسے ان پر فضلیت بخشنا اور بغیر رضامندی کے ایک مکان میں بیویوں کا جمع کرنا پایا جارہاہے۔

بیویوں کی رھائش: ایک سے زائد بیویوں کو ان کی رضامندی کے بغیر ایک ہی مکان میں رکھنا جائز نہیں، کیونکہ یہ آپس میں بکثرت جھگڑے واختلاف کا سبب بنے گا، اور خانگی سکون برباد ہوگا۔ اگر بیویاں راضی ہوں، تو ایک ساتھ رکھنا جائز ہے، لیکن کسی ایک سے صحبت کرنا، جبکہ دوسری کو بلا تجسس اس کا علم ہو، مکروہ ہے کیونکہ یہ خلافِ مروت ہے، اور بیوی انکار کر سکتی ہے، اگر دوسری کو ایذا پہنچانا مقصود ہو، یا قابلِ ستر حصہ پر ناجائز نگاہ پڑتی ہو، تو صحبت کرنا حرام ہے۔

اگر ایک ہی مکان میں الگ الگ کمرے ہوں، یا نچلا حصہ اور اوپری منزل الگ الگ ہو، اور ہر ایک کے مَرَافِق (یعنی منافع واسباب آسائش) جیسے باورچی خانہ، بیت الخلاء، حمام اور موری وغیرہ جدا ہوں، نیز مکان انکے شایانِ شان ہو، تو اس میں بیویوں کو جدا جدا رکھنا جائز ہے۔ سفر میں عارضی طور پر ایک ہی خیمہ یا جہاز میں ایک ہی جگہ رکھنا جائز ہے۔

باری کا وقت: جو دن میں کام کاج میں مشغول ہو، اس کے حق میں باری کا اصل وقت رات ہے، کیونکہ رات سکون وآرام کا وقت ہے، اور اس کے قبل یا بعد دن اس کے تابع ہے، (بعد والے دن کو تابع قرار دینا بہتر ہے) کیونکہ دن ذریعۂ معاش کا وقت ہے۔

(آیت): "هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ اللَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِراً" (یونس ۶۷)

ترجمہ: "وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور دن بھی اسی طور پر بنایا کہ دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے"۔

(۲) "وَجَعَلْنَا اللَّیْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" (النباء ۱۰، ۱۱)

ترجمہ: "اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا"۔

جو رات کام کاج کرتا ہو، جیسے پہرہ دار، تو اس کے حق میں باری کا اصل وقت دن ہے، کیونکہ یہی اسکے آرام کا وقت ہے، اور رات

تابع ہے۔ اور ایک مسافر کے لئے کہیں رکنے اور پڑاؤڈالنے کا وقت اصل ہے، کیونکہ یہی اس کے خلوت کا وقت ہے، قلیل وقت ہو یا زیادہ ، گرچہ بیویوں کے اوقات میں تفاوت حاصل ہو، دورانِ سفر کہیں اتنا مقیم ہو کہ با قاعدہ باری ممکن ہے، تو قسم واجب ہے۔

باری کے دن یا رات کے ابتداء وانتہا میں ہر شخص اپنے کاروبار وغیرہ کی مصروفیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ باجماعت نماز یا دعوت کی شرکت میں مساوات لازم ہے، بعض کی باری میں شریک ہو اور بعض میں نہ ہو تو یہ حرام ہے۔

ایک بیوی کی باری کے اصل وقت میں کسی شدید ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے دوسری کے پاس جاسکتا ہے، اس کے بغیر نہیں جاسکتا، مثلاً: وہ شدید بیمار ہو۔ اگر وہ بیمار ہے یا اس کی زچگی ہو، اور کوئی خبر گیر موجود نہ ہو، تو پوری رات وہاں گذار سکتا ہے، پھر اس کی قضا کرے، تابع وقت میں محض حاجت کی وجہ سے بھی دوسری کے یہاں جاسکتا ہے، مثلاً کچھ اسباب وہاں رکھنا، یا وہاں سے اٹھانا، یا نفقہ اس کے سپرد کرنا وغیرہ اس صورت میں زیادہ دیر رکنا جائز ہے، لیکن بہتر نہیں ہے، جب دوسری کے پاس جائے گا، تو اس سے صحبت کے علاوہ تمتع (انتفاع) جائز ہے، صحبت کرنا حرام ہے۔

حدیث: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''آپ ﷺ ہم ازواجِ مطہرات کے پاس قیام کے سلسلہ میں بعض کو بعض پر فوقیت نہ دیتے، اور بہت کم ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ دن میں ہم سب کے پاس سے ہو کر نہ گذرتے ہوں، پس ہر زوجہ مطہرہ سے قرب حاصل کرتے، البتہ صحبت نہ کرتے، حتی کہ جس کی باری ہے، اس کے پاس پہنچ کر وہیں رات بسر کرتے''۔ (ابوداود، احمد، بیہقی، صححہ الحاکم، تلخیص)

ایک کی باری میں دوسری کے یہاں جاکر صحبت یا انتفاع کرے، تو اس کی قضا لازم نہیں، خواہ گناہ ہو، اور جاکر زیادہ نہ رکے تو اس مدت کی بھی قضا نہیں، خواہ جواز کے بغیر گیا ہو، اگر ضرورت یا حاجت کے لئے درکار وقت رکے، تو اس کی بھی قضا لازم نہیں، اس سے زائد وقت رکے تو اصل میں تمام وقت کی، اور تابع میں خود جو زائد وقت رکے، اس کی قضا لازم ہے، اگر دن میں بلا سبب داخل ہو تو گنہگار ہوگا، اور اس مدت کی قضا لازم ہے، جبکہ زیادہ دیر رکے۔

اصل کے علاوہ وقت میں (یعنی جس کے حق میں رات اصل ہو اور دن تابع تو دن میں یا اس کے برعکس) باری والی کے یہاں قیام میں مساوات لازم نہیں، کیونکہ یہ تابع وقت ہے، اور اس کے آمدورفت اور مختلف مصروفیات کا وقت ہے، جو کم و بیش ہوتا رہے گا، اس لئے ہر ایک کے یہاں یکساں مدت کی رعایت کافی مشکل ہے، اصل وقت میں ہر ایک کے پاس رکنے کی مدت مساوی ہونا لازم ہے۔

ایک باری کی مدت: جو دن میں مصروف رہتا ہے ہو، اس کیلئے ایک بیوی کے حق میں کم از کم باری کی مدت ایک رات ہے، اور یہی افضل ہے، کیونکہ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنا دن حضرت عائشہؓ کو ہبہ کیا، تو آپ ﷺ ان کے پاس دو دن رہا کرتے تھے، جو رات میں مصروف رہتا، تو اس کے حق میں باری کی اقل مدت ایک دن ہے، لہٰذا بیویوں کی رضامندی کے بغیر رات کا بعض حصّہ یا مثلاً نصف رات اور نصف دن مقرر کرنا جائز نہیں''۔

بیویوں کی رضامندی کے بغیر ایک ایک کے لئے مسلسل دو دو رات یا تین تین رات باری مقرر کر سکتا ہے، اس سے زائد بلا اجازت جائز نہیں، خواہ بیویاں مختلف مقامات میں ہوں، اگر بیویاں راضی ہیں تو زائد مدت کی باری بھی جائز ہے، خواہ ایک ایک ماہ یا ایک ایک سال ہو۔

باری کی ابتداء: باری شروع کرنے کے لئے قرعہ اندازی واجب ہے خواہ عقد سب سے ایک ہی ساتھ ہوا ہو، یا آگے پیچھے، اگر بیویاں قرعہ اندازی کے بغیر ابتداء کی اجازت دیں، تو قرعہ اندازی واجب نہیں، قرعہ اندازی سے یکے بعد دیگرے باری کی تکمیل کے

بعد آئندہ اسی ترتیب کی رعایت کافی ہے دوبارہ قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں، اگر قرعہ کے بغیر کسی بیوی کی باری شروع کرے، تو یہ ظلم ہے، اب بقیہ کے لئے قرعہ اندازی کرے، اس کی تکمیل کے بعد آئندہ ابتداء کیلئے از سرِ نو قرعہ کے ذریعہ ترتیب قائم کرے۔ باری کی مقدار میں ہر بیوی کے درمیان مساوات واجب ہے، حتیٰ کہ مسلم عورت اور کتابیہ کے درمیان بھی۔

دولھن کی باری: (حقِ زِفاف) حدیث: حضرت انسؓ نے فرمایا: ''سنت طریقہ یہ ہے کہ جب ایک شخص کسی باکرہ سے نکاح کرے اور ثیبہ نکاح میں ہو، تو اس (باکرہ) کے پاس سات دن رہے، پھر قسم پر عمل کرے، اور ثیبہ سے نکاح کرے، تو اس کے پاس تین دن رہے، پھر باری کی تقسیم کرے، (حضرت انسؓ کے شاگرد) ابو قلابہ کہتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو کہدوں کہ حضرت انسؓ نے اسے آپ ﷺ تک مرفوع کیا'' (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، بیہقی) بعض روایات میں صراحت ہے کہ: ''آپ ﷺ نے فرمایا۔۔۔'' (بیہقی، دارمی، ابن ماجہ، دارقطنی) (ارواء ۷/۸۸)

ایک کنواری لڑکی سے نئی شادی ہو، اور پہلے سے نکاح میں ایک یا زائد بیویاں ہوں، اور ان کی باری جاری ہو، تو اس کے پاس مسلسل سات دن رہنا، اور کسی ثیبہ سے نکاح ہو، تو اس کے پاس مسلسل تین دن رہنا واجب ہے، ان ایّام کی قدیم بیویوں کے حق میں قضا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ یہ دولہن کا حق زِفاف ہے تاکہ ایک دوسرے سے شرم وحیا اور انقباض ختم ہو جائے۔ اگر مسلسل نہ رہے، بلکہ متفرق ایّام رہے، تو اس کا اعتبار نہیں، از سرِ نو مسلسل اس مدت کو مکمل کرے، اور متفرق ایّام کی دیگر بیویوں کے حق میں قضا کرے۔ اگر پہلے سے نکاح میں دوسری بیوی نہ ہو، تو یہ حقِ زِفاف ادا کرنا مستحب ہے۔

ثیبہ کو اس بات کا اختیار دینا سنت ہے، کہ وہ چاہے تو تین دن اس کے پاس رہے، اور ان ایّام کی دیگر بیویوں کیلئے قضا نہ ہو گی، اور چاہے تو سات دن رہے، اور اس صورت میں ان ایّام کی قضا ہو گی، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا تھا۔ ''اگر تم چاہو تو تمہارے پاس سات دن رہوں، اور دیگر بیویوں کے پاس بھی سات دن رہوں گا، اور تم چاہو تو تین دن تمہارے پاس رہوں، پھر دور جاری ہو گا'' (یعنی پرانی ترتیب کے مطابق بغیر قضا کے باری کا سلسلہ جاری رہے گا) (مالک، مسلم)

ثیبہ بیوی سات دن اختیار کرے، تو دوسروں کیلئے مکمل سات دن کی قضا کرے، اگر سات دن سے کم اختیار کرے، مثلاً پانچ دن، یا اس کے اختیار کے بغیر شوہر اپنی مرضی سے سات دن رہے، تو اس صورت میں صرف تین سے زائد ایّام کی قضا کرے۔

قضا کی ترتیب اس طرح ہو گی کہ قرعہ اندازی سے باری شروع کرے، نئی بیوی کی باری کا وقت، قرعہ اندازی سے دوسری بیوی کو دے، دوسرے چکر میں پھر قرعہ اندازی سے اِس کی باری تیسری بیوی، پھر تیسرے چکر میں چوتھی بیوی کو دے، اس طرح ۱۲ بارہ ایّام میں ہر ایک کی ایک باری کی قضا ہو گی، لہٰذا چار بیویاں ہوں اور سات دن کی قضا ہو، تو ۸۴ دن میں اس کی تکمیل ہو گی۔

طلاق کے بعد عدت میں ہی رجعت کر لے، تو اسے حق زفاف نہ ملے گا، اگر کسی عورت سے طلاق کے بعد دوبارہ نکاح ہوا، تو اسے دوبارہ حق زفاف ملے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''(حق زفاف کی وجہ سے) فرض نماز (کی جماعت) میں حاضری، جنازہ میں شرکت، دیگر جو نیک کام کیا کرتا تھا اور دعوت میں جانا ترک کرنا مجھے پسند نہیں ہے''۔ (الام المزنی)

حق زفاف کی وجہ سے اس مدت میں جماعت اور دیگر نیک اعمال مثلاً مریض کی عیادت، جنازہ میں شرکت وغیرہ سے باز نہ آئے، بجز رات کے، واجب کو مقدم رکھتے ہوئے رات کو ان امور کیلئے جانے سے رکنا واجب ہے، لیکن امام اذرعیؒ وغیرہ نے اسے شاذ قرار دیا، اور

فرمایا کہ امام شافعیؒ کے نصوص اور قاضی وبغوی وغیرہ کے کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ان امور کی ادائیگی کے لئے نکلنے کے استحباب میں رات بھی دن ہی کی طرح ہے، امام جوینیؒ نے تبصرہ اور امام غزالیؒ نے خلاصہ میں بھی اس کی صراحت فرمائی ہے، بجیرمی نے بھی اسے معتمد قرار دیا ہے۔ البتہ یہ عادت جاری ہے کہ مدتِ زفاف میں عام باری کی مدت کے مقابلہ میں زیادہ قیام رہتا ہے، تو اس کی رعایت کرے، تاکہ جلد انسیت ورغبت بڑھ جائے۔ باری کے عام ایّام میں ان امور کے لئے جانے نہ جانے میں مساوات لازم ہے، یا تو ہر کسی کی باری میں جائے، ورنہ کسی کی باری میں نہ جائے، بعض کی تخصیص کرے، تو گنہگار ہوگا۔

سفر میں باری: جس عورت کے ساتھ سفر میں شوہر نہ ہو، اور وہ شوہر کی اجازت کے بغیر سفر میں جائے، گو شوہر کے کسی کام سے جائے، یا شوہر کی اجازت سے جائے، لیکن شوہر کے کام سے نہ جائے، مثلاً حج، عمرہ، یا تجارت کا سفر، تو یہ باری کی مستحق نہ ہوگی۔ اگر شوہر کے ساتھ سفر کرے، گو اجازت نہ ملے۔ (اور شوہر منع بھی نہ کرے)، یا شوہر کے بغیر، اس کی اجازت سے شوہر کے کام سے سفر کرے (گو ساتھ اپنا یا کسی اور کا بھی کچھ کام ہو) تو باری کی مستحق ہوگی، لہٰذا اس کی قضا کرے، شوہر کے منع کرنے کے باوجود وہ شوہر کے ساتھ سفر کرے، تو باری کی مستحق نہ ہوگی، البتہ سفر میں اس سے انتفاع کرے تو باری کی مستحق ہوگی۔

اگر کوئی دوسری جگہ منتقل (شفٹ) ہو، تو صرف بعض بیویوں کو ساتھ نہیں لے جاسکتا، (گو قرعہ اندازی سے ہو) اور نہ سب کو چھوڑ جائے، (یعنی جبکہ وہ راضی نہ ہوں) بلکہ سب کو منتقل کرے، یا سب کو طلاق دے دے، یا بعض کو لے جائے اور بقیہ کو طلاق دے دے، اگر بعض کے ساتھ سفر کرے، تو پیچھے رہنے والیوں کے حق میں قضا لازم ہے۔

منتقلی کے بغیر عام مُباح سفر میں جاتے وقت، صرف بعض کو ساتھ لے جانا بھی جائز ہے، خواہ سفر طویل ہو، یا قصیر، لیکن قرعہ اندازی کے ذریعہ انتخاب لازم ہے، کیونکہ صحیحین وغیرہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: ”آپ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواجِ مطہرات میں قرعہ اندازی کرتے، اور جس کے نام قرعہ نکلتا، اسے ساتھ لے جاتے“۔ دیگر بیویاں راضی ہوں تو قرعہ اندازی ضروری نہیں، سفر میں نکلنے سے قبل وہ اپنی اجازت سے رجوع کرسکتی ہیں۔

واپسی کے بعد سفر کے آمد ورفت کے ایّام کی دیگر بیویوں کے حق میں قضا نہ کرے، کیونکہ یہ آپ ﷺ سے مروی نہیں، تو یہ قضا کا سقوط بھی سفر کی رخصتوں میں سے ایک ہے نیز اسے ایک طرف شوہر کا ساتھ نصیب ہوا ہے تو دوسری طرف دیگر بیویوں کے برعکس سفر کی مشقتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ قصر کے اعتبار سے اقامت کی مدت میں اگر اس کے ساتھ رہا، تو اس مدت کی قضا دیگر بیویوں کے حق میں لازم ہے، کسی ناجائز سفر میں مطلقاً کسی کو ساتھ لے جانا جائز نہیں، اگر لے گیا تو پیچھے رہنے والیوں کے حق میں قضا لازم ہے۔

شوہر کی اجازت سے بیوی بستی میں ہی اپنی کسی ضرورت سے جائے مثلاً دایہ جنائی ہو اور کسی کی زچگی پر پہنچے، تو اس کی باری ونفقہ ساقط نہ ہوگا۔ شوہر بیوی کو سفر میں ساتھ لے جائے اور راستہ اور منزل پُر امن ہو، تو اسے جانا ضروری ہے، اگر بلا عذر انکار کرے تو یہ نشوز ہے، اگر بیماری، یا راستے میں شدید گرمی یا سردی جو قابلِ برداشت نہ ہو، یا کچھ اور مناسب عذر ہو تو انکار کرنا نشوز نہیں ہے، اپنے رشتہ داروں سے دوری عذر میں داخل نہیں۔

اپنی باری کا ھبہ: کوئی بیوی اپنی باری کا ہبہ کرے تو شوہر کو اسے قبول کرنا لازم نہیں، کیونکہ تمتع اس کا حق ہے، اگر شوہر اس ہبہ سے متفق ہو، اور کسی معین بیوی کے حق میں ہبہ کرے تو اس کے پاس دو [۲] باری گذارے گا، ایک اس کا اپنا اور ایک واہبہ کا، جس کے حق میں ہبہ کرے، اس کا راضی ہونا ضروری نہیں، واہبہ کی باری کے وقت دوسری کے پاس رہے، اس کی باری سے متصل ہو یا جدا،

صحیحین میں ہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو بخش دی، لہٰذا آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس دو باری گذارتے، اگر تمام بیویوں کے حق میں ہبہ کرے، یا اپنی باری ساقط کر دے، تو اب (اسے کالعدم سمجھ کر) بقیہ میں مساوات کے ساتھ باری رکھے، اس کی باری کو کسی ایک کے ساتھ خاص نہ کرے، اگر شوہر کو ہبہ کرے، تو شوہر اس باری کو کسی کے حق میں بھی استعمال کر سکتا ہے، واہبہ جب چاہے، اپنے ہبہ سے رجوع کر سکتی ہے، لہٰذا اب آئندہ اس کی باری اسے ہی ملے گی، سابقہ ایّام کی قضا نہیں کی جائے گی، نیز شوہر کو رجوع کی اطلاع ملنے سے قبل جو باری گذر چکی، اس کی بھی قضا لازم نہیں۔ واہبہ اپنی باری کے مقابلہ میں کچھ معاوضہ نہیں لے سکتی، اگر معاوضہ لیا ہو تو اسے لوٹانا لازم ہے، اور اپنی باری کے قضا کی مستحق ہو گی۔

نشوز: آیت: "وَاللّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا" (النساء: ۳۴) ترجمہ: "اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بد دماغی کا احتمال (قوی) ہو تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو) ان کو لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور ان کو (اعتدال کے سات) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو"۔

نشوز یعنی شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کرنا، (نہ کہ ناز کے طور پر) یہ بڑا گناہ ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اگر بیوی (شوہر کے بلانے کے باوجود) شوہر کے بستر سے الگ رات بسر کرے (یعنی صحبت سے بلا عذر انکار کرے اور شوہر اس سے غصہ میں رات گذار دے) تو اس کے اس فعل سے باز آنے تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں" (صحیحین) ابن خزیمہ اور ابن حبان کی ایک حدیث میں ہے کہ: "جس عورت سے شوہر ناراض ہو، اس کی رضامندی تک اس کی نماز قبول نہ ہو گی، اور نہ کوئی نیکی آسمان کی طرف بلند ہو گی" (فتح الباری ۹/۲۹۴) ایک حدیث میں ہے: "شوہر کا بیوی پر یہ حق ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے" (ابن ابی شیبہ)

بغیر اجازت گھر سے نکلنا اور صحبت یا دیگر انتفاع سے شوہر کو روکنا نشوز ہے، قاضی کے پاس اپنے حق کے مطالبہ کیلئے جائے یا مسئلہ معلوم کرنے کے لئے جانا پڑے یا شوہر کی غریبی کی وجہ سے اپنے گذارے اور نفقہ کیلئے جائے، تو یہ نشوز نہیں ہے۔ اگر شوہر کو سب و شتم (گالی گلوچ) کرے اور زبانی ایذا پہنچائے تو یہ گناہ ہے۔ اور شوہر اس پر تادیب کر سکتا ہے، لیکن نشوز میں شمار نہ ہو گا۔ بیوی کا کوئی رشتہ دار انتقال ہو، تو شوہر کو اسے جانے کی اجازت دینا مستحب ہے۔

اگر بیوی کے نشوز کی علامت ظاہر ہو، اور قرائن سے اس کی بد دماغی کا احتمال قوی ہو، مثلاً نرم گفتار تھی، لیکن اب تلخ و تیز جواب دے، یا بڑی خندہ رو اور ہنس مکھ تھی، اور اب اعراض و ترش روئی محسوس کرے تو مستحب ہے کہ اسے وعظ و نصیحت کرے اور سمجھائے، اعراض و قطع تعلق نہ کرے اور نہ مارے، شاید کہ کچھ عذر بتلائے، یا اپنی اس حرکت سے باز آجائے، اسے اس طرح سمجھائے کہ میرے واجب حق کے متعلق اللہ سے ڈرو، دنیا و آخرت کی سزا سے بچو، تمہارا نفقہ و باری ساقط ہو گی، بہتر ہے کہ اسے اوپر کی حدیث سنائے، نیز اسے یہ حدیث سنائے کہ: "جو عورت بھی اس حال میں انتقال کر جائے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو، وہ جنت میں داخل ہو گی" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

اگر بیوی کے نشوز کا علم ہو (یعنی نشوز کا تحقق ہو) تو اسے سمجھائے اور بستر سے الگ کر دے اور مارنے سے کچھ فائدہ ہو، تو مار سکتا ہے، بالخصوص بار بار نشوز پایا جائے تو، لیکن بہتر یہ ہے کہ معاف کر دے، نہ مارے، جیسا کہ بعض احادیث میں ممانعت وارد ہے، لیکن بچے کے سرپرست کو بطور تادیب مارنا بہتر ہے، کیونکہ اس میں بچہ کی مصلحت ہے اور یہاں شوہر اپنی مصلحت سے مارتا ہے، ایسی مار کہ خون

نکلے یا کسی عضو کو بے کار کر دے، یا حلیہ بگاڑ دے، یا زیادہ تکلیف دہ ہو، جائز نہیں، چہرہ پر اور نازک مقامات پر مارنا مطلقا منع ہے، جو لاغر و کمزور ہو اور مار برداشت نہ کرے، اسے مارنا جائز نہیں، نیز ایک آزاد عورت کی مار چالیس تک نہ پہنچے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ مارنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، تو مارنا حرام ہے۔ بعض علماء نے کوڑے اور لکڑی سے مارنا ناجائز قرار دیا ہے، بلکہ ہاتھ سے یا کپڑا الپیٹ کر اس سے مارے۔

ترک کلام: آپ ﷺ نے ایک حدیث میں مسلمانوں کو آپسی بغض وکینہ اور حسد سے منع فرمایا اور بھائی بھائی بن کر رہنے کا حکم دیا اور فرمایا: ”ایک مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین (دن) سے زائد قطع تعلق رکھے“ (صحیحین) صحیحین کی ایک روایت میں آگے یہ الفاظ ہیں: ”دونوں ملاقات پر ایک دوسرے سے اعراض کرتے ہیں، ان میں جو پہلے سلام کرے، وہ بہتر ہے“۔ ایک حدیث میں مزید یہ ہے: ”۔۔۔جو تین دن سے زیادہ قطع تعلق (وگفتگو) کرے، پھر مر جائے، تو جہنم میں داخل ہوگا“ (ابوداود علی شرط البخاری ومسلم)

نشوز وغیرہ کی وجہ سے بیوی کے ساتھ یا کسی دوسرے کے ساتھ تین دن تک گفتگو چھوڑ دینا جائز ہے البتہ والدین اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ السلام کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سلوک جائز نہیں۔ نشوز کی وجہ سے بیوی سے یا کسی سبب سے دوسروں سے تین دن سے زائد بات چیت بند کرنا جائز نہیں ہے، اگر صرف بیوی یا دوسرے کو گناہ سے روکنا اور اس کی دینی اصلاح مقصود ہو، نہ کہ اپنا نفسانی حظ اور نہ دونوں، تو اس کی گنجائش ہوگی، کیونکہ کسی دینی عذر سے تین روز سے زائد ترک کلام جائز بلکہ مندوب ہے، مثلاً اس کا فاسق یا بدعتی ہونا، گو ترکِ کلام سے وہ اپنی روش نہ بدلے، البتہ ترکِ کلام کی وجہ سے اسکا فسق اور بڑھتا ہو، تو ایسا نہ کرے، اسی طرح اپنے یا اس کے دینی اصلاح کے لئے بھی ترکِ کلام مندوب ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے والے تین صحابہ کرام حضرات کعبؓ بن مالک، مرارہؓ بن ربیع اور ہلال بن اُمیہؓ سے دیگر صحابہ کرامؓ کو قطع تعلق کو حکم دیا، (بخاری وغیرہ) اسلاف کے ترکِ کلام کو بھی انھیں شرعی اعذار پر محمول کیا جائے گا۔

شوھر کا نشوز

اگر ظلم وزیادتی شوہر کی جانب سے ہو، مثلاً: باری اور نفقہ وغیرہ کا حق ادا نہ کرے، یا قول وفعل میں سختی وتلخی سے پیش آئے، تو بیوی اپنا حق یاد دلا کر اسے سمجھائے، مثلاً: یہ آیت سنائے:

آیت: ”وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا“ (النساء:۱۹)

ترجمہ: ”اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو، اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں، تو ممکن ہے کہ تم ایک شئے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں کوئی بڑی منفعت رکھ دے“۔

نیز آپ ﷺ کا یہ فرمان سنائے: ”تم میں سب سے بہتر وہ ہے، جو اپنی بیوی اور گھر والوں کے حق میں بہتر ہے، اور میں گھر والوں کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں“ (ترمذی) نیز یہ فرمان سنائے۔ ”بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق میری وصیت قبول کرو“۔ (متفق علیہ) اور اسے ظلم کے مذموم نتائج سے چوکنا کرے، اگر معاملہ درست ہو گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر مسئلہ قاضی کے روبرو پیش کرے، کیونکہ مستحقین کو انکا حق دلوانا ہی اس کی اہم ذمہ داری ہے، نیز بیوی براہِ راست اپنا حق وصول نہیں کر سکتی۔ قاضی پر واجب ہے کہ وہ شوہر پر حقوق کی ادائیگی اور ظلم سے بچنا لازم قرار دے۔ اگر وہ بدخلقی سے پیش آئے، بلا سبب بیوی کو مارے یا گالی گلوج کرے، تو قاضی

اسے اس سے روک دے، دوبارہ یہی روش اختیار کرے، اور بیوی سزا کا مطالبہ کرے، تو قاضی شوہر پر مناسب تعزیری سزا نافذ کرلے۔

اختلاف کی شدت اور حکم: آیت: ”وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا“ (النساء: ۳۵)

ترجمہ: ”اور اگر اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں کشاکش (ضد، مخالفت و دشمنی) کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک منصف (جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو) مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے بھیجو اگر دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادینگے“۔

اگر میاں بیوی کا اختلاف بڑھ جائے، اور مسئلہ قاضی تک لے جائیں، اور حل نہ نکلے، (خواہ اس میں دونوں کے نشوز کو دخل ہو یا کسی ایک کے) تو قاضی (حاکم) پر واجب ہے، کہ دونوں کے تصفیہ کیلئے دو مسلمان، عادل اور اصلاح کے انداز سے واقف حکم (فیصل، پنچ) کو واسطہ بنائے، مستحب ہے کہ ایک حکم شوہر کے کنبہ سے، اور دوسرا بیوی کے خاندان سے ہو، یہ دونوں حکم میاں بیوی کے وکیل ہیں، لہٰذا دونوں کی اپنے اپنے وکیل سے رضامندی شرط ہے، اب دونوں حتی المقدور زوجین میں صلح پیدا کرنے کی کوشش کریں، اگر کامیاب ہوگئے تو بڑی اچھی بات ہے، ورنہ شوہر اپنے حکم کو بیوی کی طلاق، اور بدلِ خلع قبول کرنے میں وکیل بنائے، اور بیوی اپنے حکم کو بدل خلع کی ادائیگی اور اس کے عوض طلاق قبول کرنے میں وکیل بنائے۔ اور پھر دونوں حکم بہتر سمجھیں تو زوجین میں جدائی کردے۔

اگر دونوں حکم کا اختلاف ہو، اور کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں، تو قاضی دوسرے دو حکم روانہ کرے، یہاں تک کہ دونوں کسی فیصلہ پر متفق ہوجائیں۔ اگر میاں بیوی حکم کے روانہ کرنے پر راضی نہ ہوں، یا کسی بات پر متفق نہ ہوں، تو جو ان میں ظالم ہو، قاضی اس کی تادیب کرے، (اسے مناسب سزا دے) اور مظلوم کو اس کا پورا حق دلوائے، اور دونوں حکم کی گواہی پر عمل کرلے۔ (جمل ۲۷۹/۴۔۲۹۱، المجموع ۴۲۵/۱۶۔۴۵۵، الحاوی ۵۶۸/۹۔۶۰۸، مغنی ۲۵۱/۳۔۲۶۱، نہایہ ۳۷۹/۶۔۳۹۲، تحفہ ۴۶۷/۹۔۵۱۰، قلائد ۱۵۴/۲۔۱۵۹، شرح التنبیہ ۶۳۲/۲۔۶۳۹، تحفہ الحبیب علی شرح الخطیب ۳۹۴/۳۔۴۰۹، اعانہ ۳۷۰/۳۔۳۷۸، الفقہ المنہجی ۱۰۱/۴۔۱۱۰)

خُلع

خُلع: عربی لفظ میں لفظ خلع (لباس، چپل وغیرہ) نکالنے اور اتارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً: شوہر کی طرف راجع مقصود عوض کے مقابلہ میں طلاق کے کسی لفظ یا خلع کے لفظ سے زوجین کے مابین جدائی کو خلع کہا جائے گا۔ (مغنی وفتح الوہاب والسراج الوہاج)

سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷، میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پوشاک قرار دیا گیا ہے، لہٰذا گویا مذکورہ طریقے سے جدائی کے ذریعہ دونوں اپنا یہ ازدواجی پوشاک اتار دیتے ہیں۔

اس کی مشروعیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے:

آیت: ”فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ“ (البقرہ: ۲۲۹)

ترجمہ: ”اور تم لوگوں کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ کرسکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ

ہو گا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے"۔

حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی نے بعض وجوہات کی بنا پر آپ ﷺ سے اپنے نکاح کو ختم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو، آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تم اس کا باغ اسے واپس کر دو گی ؟" اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے حضرت ثابت سے فرمایا: "باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو" (بخاری، ابوداود)

خلع کا حکم: خلع مکروہ ہے، کیونکہ اس میں نکاح کا خاتمہ ہے، اور نکاح شرعاً مطلوب ہے، نسائی کی ایک حدیث میں خلع لینے والی خواتین کو منافق قرار دیا ہے۔ البتہ دو صورتوں میں مکروہ نہیں:

(۱) دونوں کو یا ایک کو یہ اندیشہ ہو کہ اللہ کے ان ضوابط و حدود کو، جو نکاح میں فرض ہیں، قائم نہ رکھ سکیں گے۔

(۲) شوہر بیوی کے تین طلاق کو کسی ایسے عمل پر معلق کرے، جس کا انجام دینا ناگزیر ہو، مثلاً: کھانا، پینا، قضائے حاجت وغیرہ (مثلاً شوہر کہے: اگر میں نے کچھ کھالیا تو میری بیوی کو تین طلاق) تو ایسی صورت میں بیوی کو خلع دے کر وہ عمل انجام دے، پھر دوبارہ نکاح کرلے۔ اب اس عمل سے طلاق واقع نہ ہو گی، اور اس طرح تین طلاق کی قسم ختم ہو جائے گی۔

خلع کے ارکان

(۱) شوہر (۲) عوض کا ملتزم (عوض اپنے ذمہ لینے اور لازم کرلینے والا) (۳) بضع (اس سے عورت مراد ہے) (۴) عوض (۵) صیغہ

(۱) **شوھر:** شوہر کا طلاق دینا صحیح ہو، لہٰذا سفاہت کی وجہ سے مجور، اور جو نشہ میں ہو اس کا خلع دینا صحیح ہے، بچہ، مجنون اور مکرہ کا خلع صحیح نہ ہو گا۔

(۲) **عوض کا ملتزم:** جو عوض اپنے ذمہ لے، خواہ ابتداءً اپنی جانب سے خلع کی درخواست کرے، یا شوہر کے خلع کے مطالبہ کو قبول کرے، خواہ بیوی ہو یا کوئی دوسرا، اس کا مالی تصرفات میں مطلق ہونا شرط ہے۔ یعنی مالی تصرفات میں آزاد ہو، اس پر پابندی نہ ہو اور وہ مکلف ہو۔ بیوی پس سفاہت کی وجہ سے حجر ہو اور وہ خلع لے تو طلاقِ رجعی واقع ہو گی جبکہ دخول کے بعد ہو اور مال کا ذکر لغو قرار پائے گا اور دخول سے پہلے ہو تو بائنہ طلاق واقع ہو گی۔

بیوی مرض الموت میں خلع لے تو صحیح ہے، اور عوض کی مقدار مہر مثل سے زائد ہو، تو وہ زائد مقدار تہائی میں شمار ہو گی، مہر مثل کی مقدار یا اس سے کم کا شمار کل مال سے ہو گا۔

(۳) **بُضع:** بضع میں یہ شرط ہے کہ شوہر اس کا مالک ہو، لہٰذا (بیوی کی طرح) رجعیہ سے خلع صحیح ہے، (رجعیہ یعنی جو رجعی طلاق کی عدت میں ہو) کیونکہ وہ کئی احکام میں بیوی کی طرح ہے۔ مطلقہ بائنہ سے خلع صحیح نہیں، (خواہ رجعی عدت ختم ہونے سے بائنہ ہو) کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

(۴) **عوض:** عوض ایسا ہونا شرط ہے، جو بطور مہر ادا کیا جاسکے (جس میں ثمن کے شرائط موجود ہوں)، اگر عوض فاسد لیکن مقصود ہو، جیسے مجہول، شراب، مردار اور بیوی سے خلع کی گفتگو ہو، تو مہر مثل پر بائنہ ہو گی، کیونکہ عوض فاسد ہو تو مہر مثل کی طرف لوٹیں گے، جیسا کہ مہر کے فساد میں ہوتا ہے، اگر عوض فاسد وغیرہ مقصود ہو، جیسے خون، کیڑے مکوڑے (حشرات الارض) تو رجعی طلاق ہو گی (اور کچھ عوض لازم نہ ہو گا)، عوض معلوم و مجہول ہو تو مہر مثل واجب ہو گا، اگر شوہر بیوی سے کہے کہ اگر میرا قرض معاف کر دو، تو تجھے

طلاق، اور اس نے معاف کیا، لیکن قرض مجہول ہو، تو طلاق واقع نہ ہو گی۔ کیونکہ مجہول کا معاف کرنا صحیح نہیں۔ اگر اجنبی سے فاسد ومقصود عوض پر خلع کی گفتگو ہو، تو طلاقِ رجعی واقع ہو گی۔

توکیل: میاں بیوی خلع میں کسی کو وکیل بنا سکتے ہیں۔ اور شوہر وکیل کو مال کی معین مقدار پر خلع کی اجازت دے۔ اور وہ اس سے کم پر یا کسی دوسری چیز پر خلع دے، تو طلاق نہ ہو گی، اگر معین مقدار پر خلع دے، یا اس سے زائد پر (گو زائد کوئی دوسری چیز ہو) تو صحیح ہے۔ عوض متعین نہ کرے اور وکیل مہر مثل سے کافی کم پر خلع دے، تو مہر مثل پر بائنہ ہو گی، اگر مہر مثل پر یا زائد پر خلع دے تو صحیح ہے۔

اگر بیوی عوض کی مقدار متعین کرے، اور وکیل اس پر اضافہ کرے، اور خلع کو بیوی کی طرف منسوب کرے، یعنی یہ کہے کہ اس کے مال میں سے بطورِ وکالت، تو مہر مثل پر بائنہ ہو گی، اگر وکیل خلع اپنی طرف منسوب کرے، یعنی کہے کہ میرے مال سے تو وکیل پر مقررہ رقم واجب ہو گی، کیونکہ یہ اجنبی کا خلع ہے، (اس لئے کہ بیوی کے بجائے اپنی طرف منسوب کیا ہے)، اگر وکیل نہ بیوی کی طرف منسوب کرے اور نہ اپنی طرف، تب بھی جو مقدار وکیل مقرر کرے، وہ اس پر لازم ہے۔ بعد میں جتنی مقدار بیوی نے مقرر کی تھی، اتنی اس سے لے لے گا، اور اضافہ وکیل کی جیب سے جائے گا، اگر بیوی کی مقررہ رقم پر یا اس سے کم پر خلع لے تو اسی پر نافذ ہو گی۔ بیوی مقدار مقرر نہ کرے، تو وکیل مہر مثل پر اضافہ نہ کرے، اگر اضافہ کرے گا تو مقررہ مقدار پر اضافہ کی مانند ہو گا۔

میاں بیوی کسی کافر یا عورت کو بھی خلع میں وکیل بنا سکتے ہیں۔ دونوں ایک ہی شخص کو وکیل بنائے، تو وہ صرف کسی ایک کی طرف سے ہی وکالت انجام دے سکتا ہے۔

(۵) **صیغہ:** صیغہ میں بیع کے صیغہ کے شرائط ضروری ہیں (یعنی معلق نہ ہونا، مؤقت نہ ہونا، ایجاب وقبول کے درمیان غیر متعلق گفتگو کا نہ آنا، طویل خاموشی وفاصلہ کا نہ ہونا اور معنوی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے مطابق وموافق ہونا) لیکن خلع میں معمولی فرق ہے، جو آئندہ تفصیل سے معلوم ہو گی۔

خلع میں ایجاب وقبول کے درمیان معمولی گفتگو کے ذریعہ فصل ہو تو حرج نہیں۔ خلع کے صریح وکنایہ الفاظ طلاق کے صریح وکنایہ الفاظ ہیں۔ فسخ اور فروخت کا لفظ کنایہ ہے مثلاً: میں نے ہزار روپئے میں تمہارا نکاح فسخ کیا، یا تمہارا نفس ہزار روپئے میں تمہیں فروخت کر دیا، پھر بیوی قبول کرے اور دونوں کی نیت طلاق کی ہو، تو خلع صحیح ہو گا۔ دونوں کی یا ایک کی نیت نہ ہو تو صحیح نہیں۔

مفاداۃ (فدیہ لے کر چھوڑ دینا) سے مشتق لفظ صریح ہے، کیونکہ قرآن میں اس مفہوم کے لئے وارد ہے۔ (دیکھئے سورہ بقرہ، آیت ۲۲۹)، نیز خلع سے مشتق لفظ بھی صریح ہے، کیونکہ عرف واستعمال میں طلاق کے لئے شائع اور اس کا مفہوم (افتداء) قرآن میں وارد ہے۔ لیکن ان دونوں لفظ کے صریح شمار ہونے کے لئے اِن تینوں میں سے کوئی ایک شرط لازم ہے نہ مال کا تذکرہ ہو، یا مال کی نیت ہو، یا بیوی کے قبول کے التماس کی نیت ہو اور تمام صورتوں میں بیوی قبول کرے تو بائنہ ہو گی، اگر قبول نہ کرے تو آخری صورت میں طلاق نہ ہو گی، بقیہ میں کنایہ ہو گا، بصورت نیت طلاق ہو گی۔ اگر ان دو میں سے کوئی لفظ عوض کے تذکرہ کے بغیر قبول کرنے کی درخواست کی نیت کے ساتھ ادا کرے، مثلاً: کہے میں نے تجھے خلع دیا، فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اور بیوی کے قبول کے التماس کی نیت ہو، (یعنی مستقلاً اپنی جانب سے طلاق کا ارادہ نہ ہو، بلکہ مقصود یہ ہو کہ اگر تم کو قبول ہو تو میں دے رہا ہوں) پھر بیوی قبول کرلے تو عرف کے پیشِ نظر مہر مثل واجب ہو گا، قبول نہ کرے تو طلاق نہ ہو گی۔ اگر یہی گفتگو اجنبی (یعنی بیوی کے علاوہ کسی دوسرے) کے ساتھ ہو تو بلا عوض طلاق ہو گی۔

اگر شوہر کہے: میں نے تجھے بلا عوض خلع دیا، تو طلاق رجعی ہو گی۔

اگر شوہر کہے: تجھے ہزار روپئے کے عوض طلاق، تو یہ معاوضہ کا صیغہ ہے جس میں تعلیق کا بھی شائبہ ہے۔ کیونکہ طلاق بیوی کے قبول کرنے پر موقوف ہے، پس معاوضہ کی طرف نظر کرتے ہوئے بیوی کے قبول سے قبل شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ (پھر بیوی کے قبول کرنے سے طلاق نہ ہوگی)

اگر ایجاب و قبول میں اختلاف ہو، تو لغو ہے نہ طلاق واقع ہوگی، نہ مال واجب ہوگا۔ مثلاً شوہر کہے: میں نے تجھے ہزار میں طلاق دی، اور بیوی دو ہزار میں قبول کرے یا اس کے برعکس، یا شوہر کہے: میں نے ہزار میں تین طلاق دی اور بیوی ہزار کے تہائی میں ایک طلاق قبول کرے، اگر اس آخری صورت میں بیوی ہزار میں ایک طلاق قبول کرے، تو ہزار میں تینوں طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ طلاق تو شوہر تنہا دے سکتا ہے، قبول کا اعتبار مال کے سبب ہے، اور اس میں مال کی مقدار میں وہ شوہر کے موافق ہے۔

اگر مثبت پہلو میں تعلیق کا صیغہ استعمال کرے، تو یہ تعلیق کہلائے گا، لہٰذا رجوع کا حق نہ ہوگا (تعلیق یعنی کسی چیز کو کسی پر موقوف رکھنا، مثلاً تو گھر سے نکلی تو تجھے طلاق، اس میں طلاق کو گھر سے نکلنے پر موقوف رکھا ہے، لہٰذا اسے تعلیقِ طلاق کہیں گے)

مثلاً: تو جب (یا جب بھی، یا جس وقت بھی) مجھے ہزار روپئے دے گی، تو تجھے طلاق ہے۔ چونکہ یہ تعلیق ہے، اس لئے بیوی کے دینے سے قبل شوہر کو رجوع کا حق نہیں (یعنی جب بھی بیوی مذکورہ رقم دے طلاق ہو جائے گی، گو شوہر نہ چاہے یا انکار کرے) ان الفاظ میں لفظاً قبول کرنا یا فوراً مذکورہ رقم ادا کرنا ضروری نہیں۔

اگر شوہر کہے: اگر تو ہزار روپئے دے، تو تجھے طلاق، تو فوراً ہونا شرط ہے، جیسا کہ عوض کے ساتھ لفظ کا تقاضا ہے، پس اتنا وقت گذر جائے کہ اس میں دے سکتی تھی اور نہ دے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

اگر بیوی مطالبہ کرے اور کہے: مجھے ہزار کے عوض طلاق دو، یا اگر مجھے طلاق دو تو تمہارے لئے میرے اوپر ہزار لازم یا جب تم طلاق دو تو تمہارے لئے میرے اوپر ہزار لازم، تو شوہر کا فوراً قبول کرنا ضروری ہے، اور بیوی اس کے قبول سے قبل رجوع کر سکتی ہے۔ اگر شوہر تاخیر سے یا بعد میں طلاق دے، تو ابتداءً طلاق شمار ہوگی۔ اور رجعی ہوگی (کوئی عوض نہ ملے گا) اگر بیوی تاخیر کی صراحت کردے تو فوراً قبول شرط نہیں۔ مثلاً کہے ایک ماہ بعد بھی دو تو تمہیں ایک ہزار۔

شوہر کو تین طلاق کا اختیار ہو، اور بیوی اس سے ہزار کے مقابلہ میں تین طلاق کا مطالبہ کرے۔ اور وہ ایک طلاق دے، تو ہزار کا ایک تہائی لازم ہوگا۔

اگر خلع یا عوض کے مقابلہ میں طلاق دے، تو شوہر کو رجعت کا حق نہیں (بیوی بائنہ ہو چکی) اگر خلع میں رجعت کی شرط لگائے تو خلع فاسد ہوگا، مثلاً شوہر کہے: تجھے ایک دینار میں طلاق دی، بشرطیکہ مجھے رجعت کا حق ہوگا اور بیوی قبول کرے تو یہ رجعی طلاق ہوگی اور کوئی مال نہ ملے گا۔ اگر ایک دینار پر اس شرط پر خلع دے کہ جب چاہے دینار لوٹا کر رجعت کرے گا، تو رجعت کا حق نہ ہوگا، بلکہ مہر مثل پر بائنہ ہوگی۔

اگر شوہر طلاق کو مال عطا کرنے پر معلق کرے اور بیوی اسی نیت سے مال اس کے سامنے رکھ دے اور وہ اسے قبضہ میں لینے پر قادر ہو (گو نہ لے)، تو بیوی بائنہ ہوگی اور شوہر اس مال کا مالک ہوگا۔

اگر بیوی ہزار میں تین طلاق مانگے، اور شوہر صرف ایک یا دو طلاق کا مالک ہو، اور ملکیت کی ساری طلاق دے دے، تو ہزار کا مستحق ہوگا، اگر ہزار میں ایک طلاق کا مطالبہ کرے اور شوہر ہزار میں مطلقاً (ہزار کی صراحت کے بغیر) ایک یا زائد طلاق دے، تو ہزار کا مستحق ہوگا، اگر سو میں طلاق دے، تو سو کا مستحق ہوگا، اگر بیوی آئندہ کل ہزار میں طلاق طلب کرے اور شوہر کل یا پہلے ہی طلاق دے، تو بیوی مہر

مثل پر بائنہ ہو گی۔

اجنبی کا خلع: اگر بیوی کے بجائے اس کا ولی یا دوسرا کوئی شخص اپنی جانب سے اس کو خلع دلوائے تو یہ سابقہ الفاظ واحکام میں بیوی کے خلع کی طرح ہے، گو بیوی اس خلع کو ناپسند کرے۔ (یعنی کوئی دوسرا شخص شوہر سے کہے کہ تم ہزار میں بیوی کو خلع دو، اور وہ قبول کرے تو خلع ہو جائے گا، اور وہ شخص ہزار دے گا، گو بیوی خلع لینا نہ چاہتی ہو) لیکن یہ مسئلہ گذر چکا کہ اجنبی فاسد عوض پر خلع لے تو طلاق رجعی ہو گی (اور بیوی لے تو مہر مثل واجب ہو گا)

اگر شوہر کسی شخص سے کہے کہ میں نے بیوی کو اس شرط پر طلاق دی کہ تمہارے ذمہ ہزار روپئے، اور وہ قبول کرے، یا وہ شخص شوہر سے کہے: اپنی بیوی کو طلاق دو اس شرط پر کہ میرے ذمہ ہزار، اور شوہر قبول کرے، تو مقررہ عوض (ہزار) پر بیوی بائنہ ہو گی۔

بیوی کسی کو اپنی خلع کے لئے وکیل بنائے، تو وہ بیوی کی طرف سے وکالت کی صراحت یا نیت سے، نیز اپنی جانب سے بھی صراحتاً یا نیت سے خلع لے سکتا ہے، اگر کوئی صراحت یا نیت نہ ہو، تو بیوی کی جانب سے شمار ہو گا، اور اس پر عوض لازم ہو گا۔ اگر کوئی اجنبی کسی عورت کو وکیل بنائے کہ وہ عورت شوہر سے خلع لے لے، تو اسے بھی اختیار ہے کہ اجنبی کی طرف سے لے، یا خود اپنی طرف سے، یعنی کسی ایک کی صراحت ہو یا نیت، دونوں نہ ہو تو بیوی کی جانب سے شمار ہو گا۔ دونوں مسئلہ میں اگر وکالت کی صراحت ہے تو شوہر موکل سے (یعنی پہلی صورت میں بیوی اور دوسری صورت میں اجنبی سے) مطالبہ کرے گا، ورنہ جو شوہر سے گفتگو کر کے معاملہ طے کرے (یعنی پہلی صورت میں اجنبی اور دوسری صورت میں بیوی) اس سے مطالبہ کرے گا، پھر اس نے موکل کی نیت کی ہو، یا بلا کسی نیت کے ہو، تو موکل سے رقم وصول کرے گا۔ اگر اجنبی جھوٹی وکالت کی صراحت کر کے بیوی کے مال سے خلع لے تو طلاق نہ ہو گی۔

اختلاف: بیوی خلع کا دعوی کرے اور شوہر انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اگر بیوی دو مرد گواہ پیش کرے تو اس پر عمل ہو گا، لیکن شوہر کو مال (بدلِ خلع) نہ ملے گا، کیونکہ وہ انکار کر رہا ہے، البتہ اگر وہ اپنی بات سے رجوع کر کے خلع کا اقرار کرے، تو مال کا مستحق ہو گا۔

اگر شوہر خلع کا دعویٰ کرے، اور بیوی انکار کرے اور کہے کہ تم نے طلاق نہیں دی، یا مفت میں دی ہے، تو شوہر کے دعوی کی وجہ سے وہ بائنہ ہو گی، اور کوئی عوض نہ ملے گا۔ اور بیوی مال کی نفی پر قسم لے گی، بیوی کو عدت کا نفقہ ولباس ملے گا۔ اگر شوہر گواہ (یعنی دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں) پیش کرے، یا ایک مرد گواہ پیش کرے اور خود قسم لے، یا بعد میں بیوی خود خلع کا اعتراف کرے تو مال لازم ہو گا۔

اگر دونوں میں طلاق کی تعداد میں اختلاف ہو، مثلاً بیوی کہے: میں نے ہزار میں تین طلاق طلب کی تھی، اور تم نے قبول کیا، اور شوہر کہے: ایک طلب کی تھی، اور میں نے وہی دی، یا عوض کی صفت یا مقدار میں اختلاف ہو، تو جس کے پاس گواہ ہوں، اس کے حق میں فیصلہ ہو گا، اگر دونوں کے پاس گواہ نہ ہوں، یا دونوں کے پاس ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے متعارض ہوں، تو میاں بیوی دونوں قسم لیں گے۔ (جس کی تفصیل وہی ہے جو بائع ومشتری کے اختلاف میں قسم کی ہے) اور عوض کو فسخ کر دیا جائے گا، اور بائنہ ہونے کی وجہ سے مہر مثل واجب ہو گا۔ طلاق کی تعداد کے اختلاف میں شوہر کو ایک اور قسم دلا کر اس کی بات مانی جائے گی۔

خلاصہ: (۱) اگر صیغہ وعوض صحیح ہے، تو مقررہ عوض پر طلاق بائنہ ہو گی، صرف عوض فاسد ہو گا، تو مہر مثل پر بائنہ ہو گی، اگر صیغہ فاسد ہو تو رجعی طلاق ہو گی، جبکہ شوہر اسی وقت طلاق دے چکا ہو، اگر ایسے امر پر معلق ہو، جو پایا نہیں گیا، تو طلاق ہی نہ ہو گی۔

(شرح التنبیہ ۲/ ۲۴۰، مغنی ۲/ ۲۶۲، جمل ۴/ ۳۱۹)

(۲) بیوی کو خلع دینے کے بعد اب شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں، اور عدت میں رجعت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ طلاق بائن ہے، ایک نئے نکاح کی طرح بیوی کے اختیار و مرضی اور نئے مہر کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ (۳) خلع دینے کے بعد عدت میں کسی طرح کی طلاق، یا ایلاء یا ظہار واقع نہ ہوں گے، کیونکہ وہ شوہر سے بالکل جدا ہو چکی، طلاق رجعی کی عدت میں یہ امور واقع ہوں گے (۴) حیض میں یا جس پاکی میں صحبت کی ہو بیوی کو خلع دے سکتا ہے، (حالانکہ طلاق دینا ممنوع ہے)۔ لیکن اجنبی کو اس حال میں خلع دینا ممنوع ہے۔ (الفقہ المنہجی ۱۲۸/۴)

طلاق

آیت: (۱) "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ" (البقرہ ۲۲۹)

ترجمہ: "وہ طلاق (جس میں رجوع کرنا درست ہے) دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ (رجعت کر کے عورت کا) رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ"۔

(۲) "يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" (الطلاق ۱)

ترجمہ: "اے پیغمبر (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دینے لگو، تو ان کو ان کی عدت پر طلاق دو"۔

تعریف: لغت میں بندش و گرہ وغیرہ کے کھلنے یا کھولنے اور آزاد کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

شرعاً: نکاح کے بندش کو طلاق جیسے الفاظ سے ختم کر دینا طلاق کہلاتا ہے۔

مشروعیت: طلاق کی مشروعیت پر کتاب و سنت اور اجماع سے دلیل موجود ہے۔

حکمت ومصلحت: علامہ قسطلانی فرماتے ہیں: "نکاح کی مشروعیت میں بندوں کی دینی و دنیوی مصلحتیں ہیں، اور طلاق میں اس کی تکمیل ہے۔ کیونکہ بعض اوقات نکاح اسے راس نہ آئے گا، لہٰذا دونوں کے اخلاق و عادات کا اختلاف اور آپسی بغض و نفرت کی وجہ سے حدودِ الٰہی کی صحیح پابندی نہ ہو پائے گی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے خلاصی کی شکل مشروع فرمائی۔ نیز طلاق کی تعداد تین رکھنے میں بڑی لطیف حکمت ہے، بلاشبہ نفس بڑا جھوٹا ہے، بعض مرتبہ یوں ظاہر کرے گا کہ تجھے اس بیوی کی کوئی ضرورت نہیں، یا اسے چھوڑنے میں بہتری ہے، اور اس نظریہ کو اس کے دل و دماغ میں مزین کر کے بٹھا دے گا، بس جب دونوں میں جدائی ہو جائے گی، تو نادم ہو گا، سینہ تنگ ہو گا، اور صبر مشکل ہو گا، لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تین طلاق کو مشروع فرمایا، تاکہ پہلی مرتبہ نفس کو آزمالے، اور فیصلہ صحیح ہے، تو عدت ختم ہونے تک اس پر قائم رہے، ورنہ عدت میں رجعت کے ذریعہ تلافی کر لے، پھر دوبارہ نفس سابقہ حالت کی طرف لوٹے، اور وہی بات اس پر غالب آئے، حتی کہ دوسری طلاق دے، تو پھر جانچ لے کہ کیا کیفیت پیش آتی ہے، پھر تیسری طلاق دے گا تو خوب تجربہ کر کے اپنے نفس کی حالت کو سمجھ کر دے گا، اب ساری طلاقیں دے چکا تو کسی دوسرے کو نکاح میں جانے کے بعد (آئندہ وہاں سے جدائی ہو تب) ہی اس کے لئے حلال ہو گی، تاکہ اسے ایسا بدلہ ملے جس میں اس کے لئے غصہ (وغیرت) ہو، یعنی دوسرا شوہر، جیسا کہ ایک مرد کی فطرت ہے، بہر حال (دیگر تمام احکام کی طرح) اس میں بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور لطف و کرم ہے" (ارشاد السّاری شرح بخاری ۱۲۵/۸)

نکاح کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی قائم دائم رہے، اسی مقصد سے شریعت نے کافی احکام وآداب مشروع

فرمائے ہیں، لیکن بعض اوقات دونوں یا کوئی ایک ان احکام وآداب کی صحیح رعایت وپابندی نہیں کرتے، جو رفتہ رفتہ آپسی نفرت اور شدید اختلاف تک پہنچا دیتا ہے، اور بظاہر اصلاح اور ازدواجی رشتہ کے بقا کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، لہٰذا ایسے سنگین حالات کے لئے ایک احتیاطی قانون کی تشریع لازمی تھی، جس کے سہارے اس رشتہ سے دونوں کو آزاد کر دیا جائے، تاکہ ایک دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔ اللہ کا فرمان ہے۔ "وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا" (النساء ۱۳۰)

(اور اگر دونوں میاں بیوی جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاج کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑے حکمت والے ہیں)

پس اگر ایک شوہر بالکل آخری اور مجبوری کے درجہ میں اسے استعمال کرے، تو یہ ایک لازمی علاج ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں، خواہ بعض اوقات کافی تلخ محسوس ہو۔ اگر کوئی بلاوجہ خواہشات کی پیروی میں حماقت وبیوقوفی سے اس کا غلط استعمال کرے، تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے، اور اس کے حق میں اللہ کے نزدیک ابغض الحلال شمار ہوگا۔

انواعِ طلاق

مختلف اعتبار سے طلاق کی تین تقسیم ہوگی: (۱) طلاق کے لئے مستعمل الفاظ کی طلاق پر دلالت کے سلسلہ میں وضاحت وعدم وضاحت کے اعتبار سے صریح اور کنایہ دو تقسیم ہوگی۔ (۲) بیوی کی حالت کے اعتبار سے بدعی، سنی، یا نہ بدعی نہ سنی، تین تقسیم ہوگی (۳) مال کے عوض میں ہونے، نہ ہونے کے اعتبار سے خلع، اور عام طلاق، دو تقسیم ہوگی۔ (خلع کا تذکرہ گذر چکا)

پہلی قسم: صریح اور کنایہ

(۱) **صریح طلاق**: طلاق کے لئے مستعمل لفظ قطعاً طلاق پر دلالت کرے، اور دوسرے کسی مفہوم کا اس میں احتمال نہ ہو، تو اسے صریح کہا جائے گا، طلاق کے صریح الفاظ تین ہیں طلاق، سَراح اور فِراق اور ان سے مشتق الفاظ، مثلاً: اَنْتِ طَالِقٌ (تو مطلقہ ہے) فَارَقْتُكِ (میں نے تجھے جدا کر دیا) یہ الفاظ صریح اس لئے ہیں کہ شریعت میں بکثرت وارد، اور قرآن میں بارہا طلاق کے لئے مستعمل ہیں ۔ مثلاً دیکھئے سورہ طلاق آیت ۲۔۱، سورہ احزاب، آیت ۲۸، دیگر زبانوں میں لفظ طلاق کا ترجمہ بھی صریح کہلائے گا۔

(۲) **طلاقِ کنایہ**: اس سے ہر وہ لفظ مراد ہے جس میں طلاق اور غیر طلاق، دونوں مفہوم کا احتمال ہو، (اور قریبی درجہ میں طلاق پر دلالت کر سکے) مثلاً: تو خالی ہے (یعنی مجھ سے خالی ہے) تو بَرِیّہ ہے (مجھ سے خالی اور جدا ہے) تو بتّہ ہے (مجھ سے کٹی ہوئی ہے) اپنے گھر چلی جاؤ، جہاں جی چاہے جاؤ، مجھ سے دور ہو جاؤ، میرے لئے اجنبی بن جاؤ، تیری رسّی تیرے کندھے پر (یعنی میں نے تجھ اونٹ کی طرح آزاد چھوڑ دیا) تو مجھ پر حرام ہے۔ وغیرہ

طلاق میں کنایہ لفظ کے استعمال کی دلیل بخاری کی حدیث ہے، جس میں ایک عورت سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: "اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ" (اپنے گھر چلی جاؤ)

حکم: صریح لفظ کے استعمال سے طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ طلاق کی نیت ہو یا نہ ہو، کیونکہ لفظ کی صراحت اور مفہوم پر اس کی قطعی دلالت نے تلفظ کے وقت اسے نیت سے بے نیاز کر دیا۔

کنایہ لفظ سے شوہر اگر طلاق کا قصد کرے، تبھی طلاق ہوگی، گرچہ لوگوں میں وہ لفظ طلاق کے لئے مشہور ہو، لیکن طلاق کی نیت نہ

ہو، کچھ اور ارادہ ہو، یا کسی ارادہ کے بغیر یہ لفظ کہے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ حضرت کعب بن مالک جب غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں بیوی سے اعتزال (کنارہ کشی) کا حکم دیا، تو انھوں نے بیوی سے کہا: ''اپنے گھر والوں میں جاکر رہو'' (بخاری) اس سے طلاق نہ ہوئی، بلکہ جب ان کی توبہ نازل ہوئی تو بیوی بغیر جدید عقد کے ان کے پاس آگئی، کیونکہ انھوں نے یہ لفظ طلاق کی نیت سے نہیں کہے تھے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ فی الحال وہ ان سے الگ تھلگ رہے۔

دوسری قسم: سُنّی، بدعی، نہ سنی نہ بدعی

(۱) **سُنّی طلاق:** عورت حیض ونفاس سے پاک ہو، اور اس پاکی میں شوہر نے اس سے صحبت نہ کی ہو، تو ایسی پاکی میں طلاق دینا سنی طلاق کہلائے گا۔

(۲) **بدعی طلاق:** اگر بیوی حیض، یا نفاس میں ہو، یا ایسی پاکی میں ہو، جس میں شوہر نے اس سے صحبت کی ہو، تو اس حالت کی طلاق بدعی طلاق ہوگی۔

(۳) نہ سُنّی نہ بدعی: بیوی ابھی کمسن ہو کہ حی-ض کا سلسلہ شروع ہی نہ ہوا ہو، یا آئیسہ ہو یعنی اتنی عمر دراز ہو کہ حیض سے ناامید ہو چکی، یا حاملہ ہو، یا نکاح کے بعد ابھی تک، بیوی سے صحبت نہ ہوئی ہو، یا بیوی خلع کا مطالبہ کرے، تو ان حالتوں میں دی جانے والی طلاق بدعی وسنی دونوں بھی نہیں کہلائے گی۔

تینوں انواع کا حکم: (۱) **سُنّی طلاق:** یہ جائز ہے، اور طلاق دینے کا شرعی طریقہ ہے، جبکہ شوہر کو طلاق ہی دینا ہو، خواہ ایک طلاق دے، یا تینوں ایک ساتھ۔ لیکن سنت یہ ہے کہ ایک پاکی میں صرف ایک یا دو طلاق پر اکتفا کرے، تاکہ ندامت کی صورت میں رجوع کر سکے۔

ابتداء میں سورہ طلاق کی پہلی آیت گذری، جس میں بیویوں کو عدت پر طلاق دینے کا حکم دیا، یعنی ایسے وقت کہ وہ عدت شروع کر سکیں، اور وہ طُہر (پاکی) ہے، کیونکہ حیض کی مدت عدت میں شمار نہ ہوگی۔

(۲) **بدعی طلاق:** یہ طلاق حرام ہے، لیکن واقع ہوگی، البتہ شریعت کے مقررہ اصول کے خلاف ہے، اس لئے گناہ ہوگا۔ اگر کوئی ایسی طلاق دے، تو اسے رجعت کر لینا سنت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حی-ض میں طلاق دے دی تو آپ ﷺ نے رجعت کا حکم دیا (یعنی دوبارہ اسے نکاح میں واپس لینا) پھر ایک پاکی کے بعد حیض اور اس کے بعد پاکی آئے تو اس میں جی چاہے تو صحبت سے قبل طلاق کی اجازت دی، اور فرمایا کہ یہی وہ عدت ہے جس میں اللہ نے عورتوں کے طلاق کا حکم دیا ہے''۔ (متفق علیہ)

حیض میں طلاق سے عورت کی عدت کی مدت بڑھ جائے گی، کیونکہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اور کسی کو ضرر پہنچانا شرعاً منع ہے، اور صحبت شدہ پاکی میں حمل کے استقرار کا احتمال ہے، اور ممکن ہے کہ حاملہ ہونے کی صورت میں طلاق کا ارادہ نہ ہو۔

(۳) **نہ سنی نہ بدعی:** یہ طلاق جائز ہے اور واقع ہوگی، کیونکہ اس میں بیوی کا کوئی نقصان نہیں، اس لئے کہ کمسن اور بڑھیا (جو حیض سے مایوس ہو چکی ہو) کی عدت مہینوں کے اعتبار سے ہے، حاملہ کی عدت ہر حال میں وضع حمل ہے، اور بیوی کا رقم دے کر خلع لینا اس پر دلیل ہے کہ شوہر سے چھٹکارا چاہتی ہے، گو عدت بڑھ جائے، اس میں کوئی حرج نہیں،

طلاق کے ارکان: (۱) مُطلّق (طلاق دینے والا) (۲) صیغہ (۳) محل (جسے طلاق دی جائے) (۴) ولایت (سلطنت وقبضہ) (۵) قصد

مُطَلِّق (طلاق دینے والا): مطلق کا مکلف ہونا شرط ہے، گو طلاق کو معلق کرے، پس غیر مکلف کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث کی رو سے تین افراد مرفوع القلم ہیں: ”بچہ بالغ ہونے تک، پاگل افاقہ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک“ (صحیح ابوداود وغیرہ) اور جب یہ مرفوع القلم ہیں، توان کا تصرف باطل وغیر معتبر ہوگا، البتہ جو نشہ میں ہو، اس کی طلاق واقع ہوگی، جبکہ اس طرح نشہ اور زوالِ عقل میں اس کا قصور ہو، اگر کسی کو شراب پینے پر مجبور کیا جائے، یا اسے علم نہ ہو کہ اس مشروب میں نشہ ہے، یا بطورِ علاج کوئی نشہ آور چیز استعمال کرے، توان صورتوں میں نشہ آنے پر طلاق دے تو نافذ نہ ہوگی۔

مطلق اپنے اختیار سے طلاق دے، اگر اکراہ (جبر) کی وجہ سے دے، تو طلاق واقع نہ ہوگی، گو وہ تَوْرِیَہ نہ کرے (یعنی بظاہر طلاق کے الفاظ ادا کرنا اور دل میں کسی اور مفہوم کا ارادہ کرنا، جس کے الفاظ میں گنجائش ہو، یہ ضروری نہیں) کیونکہ حدیث میں ہے ”اکراہ میں طلاق نہیں“ (واقع ہوگی) (ابوداود والحاکم علی شرط مسلم) توریہ کی ایک شکل یہ ہوگی کہ بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کی نیت کرے، یا بندھن کھولنا مراد لے، یا ماضی میں طلاق کے بارے میں جھوٹی خبر کے ارادہ سے کہے۔

اکراہ کے شرائط: (اس کی تفصیل باب الاکراہ میں گذر چکی) اکراہ اور جبر کرنے والا جس بات کی دھمکی دے فوراً اور ظلماً اس کے کر گذرنے پر اپنی حکومت یا طاقت وغلبہ کی بنیاد پر قادر ہو، اور مُکرَہ (مجبور) بھاگ کر، یا کسی کی مدد سے اس کے دفاع سے عاجز ہو، نیز اس کا گمان یہ ہو کہ متعلقہ وماموره کام اگر انجام نہ دوں گا تو یہ دھمکی پر باقاعدہ عمل کرے گا (دھمکی صرف برائے دھمکی نہیں ہے)

اکراہ کسی تکلیف دہ وخطرناک چیز سے ڈرانا و دھمکی دینا ہو، مثلاً سخت مار، قید، مال برباد کرنا، کسی منصب سے معزولی جبکہ یہ اس منصب کا مستحق واہل ہو، وغیرہ امور، اور لوگوں کے درجات واحوال کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا۔ ایک شریف شخص کے لئے معمولی مار بھی اکراہ ہوگی، ایک مالدار کے حق میں معمولی رقم کی دھمکی اکراہ نہ ہوگی۔ اگر مستقبل کے متعلق دھمکی ہو، مثلاً: میں تمہیں کل سزا دوں گا، یا ظلماً نہ ہو، مثلاً: جس پر قصاص عائد ہو، اس سے یہ کہنا کہ بیوی کو طلاق دو، ورنہ تم سے قصاص لوں گا، تو یہ اکراہ نہیں ہے (اور طلاق دے تو نافذ ہوگی)

اگر مُکرَہ کی جانب سے اختیار ومرضی پایا جائے تو طلاق نافذ ہوگی۔ مثلاً: تین طلاق پر جبر ہو، اور یہ ایک یا دو دے، صریح پر اکراہ ہو اور یہ کنایہ دے، یا معلق طلاق کے لئے اکراہ ہو، اور یہ فوراً دے دے، یا طَلَّقْتُ کہنے پر اکراہ ہو اور یہ سَرّحْتُ کہے، یا مبہم طلاق پر اکراہ ہو، اور یہ معین بیوی کو طلاق دے، توان صورتوں میں طلاق نافذ ہوگی۔

اگر اکراہ کے مطابق طلاق دے، لیکن خود طلاق کی نیت سے دے تو طلاق ہوگی

اگر کوئی کہے: میری بیوی کو طلاق دو ورنہ قتل کروں گا، (گویا جبراً طلاق کے لئے وکیل بنا رہا ہے) اور مُکرَہ طلاق دے، تو طلاق واقع ہوگی۔ (کیونکہ خود اکراہ کرنے والے کی بیوی کا مسئلہ ہے)

صیغہ: (صیغہ کی کچھ تفصیل گذر چکی) صیغہ ایسا ہو جو صراحتاً یا کنایۃً آپس میں جدائی پر دلالت کرے۔ صریح لفظ سے بغیر نیت کے بھی طلاق ہوگی، طلاق، فراق، اور سَراح اور ان کے ترجمے سے مشتق الفاظ صریح ہیں۔ (مفاداۃ اور خلع سے مشتق الفاظ کی صراحت کا تذکرہ خلع میں گذر چکا)

مثلاً: میں نے تجھے طلاق دی، تو طالق، (طلاق شدہ) ہے، تو مُطَلَّقہ ہے، اے طالق وغیرہ۔

کنایہ لفظ (یعنی جس میں طلاق وغیر طلاق، دونوں مفہوم کا احتمال ہو) کی ادائیگی کے وقت جملہ کے ابتداء سے انتہا تک کسی بھی حصہ میں طلاق کی نیت ہو، تو طلاق ہوگی، ورنہ نہیں (کنایہ کی کچھ مثالیں گذر چکیں) تم طلاق ہو، تم مطلَقہ ہو (بغیر تشدید کے) تم بائنہ ہو، عدت

گذارو، مجھے چھوڑدو، نکل جاؤ، مجھ سے دور ہو جاؤ، اپنا توشہ لے لو، سفر کرو، مجھ سے پرائی وا جنبی بن جاؤ، مجھ سے پردہ کرو، میں تم سے بری ہوں، مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، تم جانو تمہارا کام جانے، تم اپنے نفس کی ذمہ دار ہو، تم نکاح کرلو، تمہیں (دوسرے شوہروں کے لئے) حلال کردیا، تمہیں تمہارے گھر والوں کو یا لوگوں کو، یا شوہروں کو یا پرائے لوگوں کو ہبہ کیا، تمہیں آزاد کردیا، میرا تم پر کوئی اختیار نہیں وغیرہ الفاظ طلاق کی نیت سے ادا کرے، تو طلاق ہو گی

صرف دل میں طلاق کے قصد اور نیت سے طلاق نہ ہو گی، اسی طرح صرف زبان کو حرکت دینا کافی نہیں، بلکہ اتنی آواز سے طلاق دینا شرط ہے کہ اگر اس کی سماعت صحیح ہو، اور کوئی شور وعارض نہ ہو، تو خود سن سکے (جیساکہ نماز کے قولی ارکان میں شرط ہے)

اگر شوہر کہے: تیسری طلاق عیب ہے، یا نقص ہے، تو کھڑی ہو جا، بیٹھ جا، دروازہ کھلا ہے وغیرہ تو اس سے طلاق نہ ہو گی، گو نیت ہو، کیونکہ یہ الفاظ ایسے نہیں کہ بلا تاسف طلاق کے مفہوم کو محتمل ہو، اگر یہ الفاظ کسی علاقہ میں طلاق کے لئے مشہور ہوں، تب بھی اس سے طلاق نہ ہو گی۔ کنایہ سے طلاق کے لئے یہ ضروری ہے کہ قریبی درجہ میں اس میں طلاق کا احتمال ہو۔

کنایہ لفظ سے قبل بیوی کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو، یا غصہ کی حالت میں یہ لفظ کہے، یا ان میں سے کوئی لفظ کسی علاقہ میں طلاق کے لئے کافی مشہور ہو، تو اس وجہ سے کنایہ صریح نہ کہلائے گا (پس ان صورتوں میں بھی کنایہ سے بغیر نیت کے طلاق نہ ہو گی)

طلاق کا لفظ ظہار کے لئے یا ظہار کا لفظ طلاق کے لئے کنایہ نہیں، گو دونوں تحریم کی افادیت میں مشترک ہیں، کیونکہ دونوں کا اپنی اپنی جگہ نفاذ ممکن ہے، لہٰذا دوسرے مفہوم میں نہیں لیا جائے گا، کیونکہ اصول یہ ہے کہ جو اپنے باب میں صریح ہو، اور وہ اپنی جگہ اس کا نفاذ ممکن ہو، تو دوسرے مفہوم میں بطور کنایہ اسے نہیں لیا جائے گا۔

تحریم: اگر بیوی سے کہے: تو مجھ پر حرام، یا میں نے تجھے حرام قرار دیا، اور اس جملہ سے طلاق کی نیت ہو، تو طلاق اور ظہار کی نیت ہو تو ظہار، اور دونوں کی نیت ہو تو، اسے اختیار ہو گا کہ دونوں میں سے کوئی ایک قرار دے، اور اگر طلاق وظہار کی نیت نہ ہو، مثلاً اس کے بدن، صحبت، فرج یا سر کے تحریم کی نیت ہو، یا کوئی نیت نہ ہو، تو اس جملہ سے بیوی اس پر حرام نہ ہو گی، لیکن اس پر قسم کا کفارہ لازم ہے، جیساکہ حضرت ماریہؓ کے واقعہ سے مستفاد ہوتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے انھیں اپنے اوپر حرام قرار دیا تو سورہ تحریم کی ابتدائی آیات میں کفارہ یمین کو فرض قرار دیا گیا (نسائی)

بیوی یا باندی کے علاوہ کسی چیز کو حرام قرار دے، مثلاً یہ کپڑا مجھ پر حرام، یہ کھانا مجھ پر حرام، تو یہ لغو ہے، اس میں کوئی کفارہ لازم نہیں۔

اشارہ: جو گفتگو پر قادر ہو، اس کا اشارہ طلاق کے متعلق لغو وغیر معتبر ہے۔ مثلاً بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر ہاتھ سے اشارہ کرے کہ تو چلی جا، تو اس سے طلاق نہ ہو گی، کیونکہ زبان استعمال نہ کرتے ہوئے صرف اشارہ کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اس کا طلاق کا ارادہ نہیں، اگر ارادہ ہو بھی تو اشارہ افہام کے لئے نادر طور پر استعمال ہوتا ہے، اور درحقیقت یہ افہام کے لئے موضوع بھی نہیں، بخلاف تحریر کے، کہ وہ الفاظ کی طرح افہام کے لئے موضوع حروف ہیں۔

فائدہ: گفتگو پر قادر شخص کا اشارہ صرف امان، فتویٰ اور اجازت میں گفتگو کی طرح معتبر ہے، دیگر مسائل میں طلاق کی طرح معتبر ہے۔

گونگے کا اشارہ: گونگے کا اشارہ طلاق، خرید وفروخت، نکاح، اقرار، دعویٰ وغیرہ میں معتبر ہے، گو وہ تحریر پر قادر ہو، خواہ

گونگا پن اصلی ہو یا عارضی، گونگا شخص نماز میں اشارہ کرے، تو اس سے اس کی نماز باطل نہ ہو گی (اسے کلام نہ سمجھیں گے) گونگا گواہ بنے تو معتبر ہے، لیکن اشارہ میں گواہی ادا کرے تو معتبر نہیں، کوئی شخص گفتگو نہ کرنے کی قسم کھائے، پھر گونگا ہونے کے بعد اشارہ میں کلام کرے، تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اگر گونگے کا شارہ ایسا واضح ہو کہ ہر کوئی اس کا مطلب سمجھتا ہے، تو یہ صریح ہے، اور صرف ذہین وفطین ہی سمجھ سکتے ہوں، تو کنایہ ہے، لہٰذا نیت کی ضرورت ہو گی، اور اس کے اشارہ یا تحریر سے نیت کا اندازہ ہو گا۔

تحریر: تحریر کنایہ ہے، جبکہ ایسی جگہ لکھے جس پر تحریر ثبت ہو، جیسے کاغذ، کپڑا وغیرہ، خواہ لکھنے والا بات کر سکتا ہو، یا گونگا ہو، نیز صریح لفظ لکھے یا کنایہ، (دونوں صورتوں میں تحریر کنایہ شمار ہو گی) لہٰذا طلاق کی نیت سے لکھے تو طلاق ہو گی، ورنہ نہیں، صریح طلاق کی تحریر لکھتے وقت یا بعد میں زبان سے ادا کرے تو طلاق ہو گی، اگر وہ دعویٰ کرے کہ محض تحریر پڑھنے کا ارادہ تھا، نہ کہ طلاق کا، تو اس کی بات مان لی جائے گی، کنایہ تحریر کو زبان سے پڑھنے سے بغیر نیت کے طلاق نہ ہو گی۔ گونگا شخص تحریر میں آگے یہ بھی لکھے کہ میں نے طلاق کا قصد کیا ہے، یا (طلاق کی نیت کے بارہ میں) اشارہ کرے۔ اگر ہوا یا پانی پر لکھے تو یہ کنایہ نہیں ہے (اس سے طلاق نہ ہو گی)

اگر شوہر یہ لکھے کہ تجھے خط ملے، تو تجھے طلاق، تو خط ملنے پر طلاق ہو گی، اگر لکھے کہ تو جب خط پڑھے تو تجھے طلاق، پھر بیوی خط پڑھے، یا صرف مطالعہ کر کے سمجھ لے (زبان سے الفاظ ادا نہ کرے) تو طلاق ہو گی۔ اگر بیوی پڑھنا نہ جانتی ہو، اور شوہر اس بات سے واقف بھی ہو، تو کسی دوسرے کے اس کو خط پڑھ کر سنانے سے طلاق ہو گی۔ اگر بیوی خود پڑھ سکتی ہے، یا اس کا ان پڑھ ہونا شوہر کو معلوم نہ ہو، تو اس طرح دوسرے کے سنانے سے طلاق نہ ہو گی۔

شوہر کسی دوسرے سے طلاق کی تحریر لکھوائے اور اسے نیت کا بھی حکم دے، تو یہ کافی ہے اور طلاق ہو گی، اگر دوسرا لکھے اور شوہر نیت کرے یا اس کے برعکس تو طلاق نہ ہو گی۔

محل: یہ شرط ہے کہ طلاق کا محل بیوی ہو، گو رجعی عدت میں ہے، پس طلاق کو بیوی کی طرف یا اس کے کسی متصل جز کی طرف منسوب کرے، تو طلاق واقع ہو گی، متصل جز یعنی مثلاً: چوتھائی حصہ، ہاتھ، بال، ناخن، خون، دانت وغیرہ، پس پہلے مذکورہ جز پر طلاق واقع ہو گی، پھر بطور سرایت بقیہ پر بھی واقع ہو گی۔ فضلہ (یعنی جو چیز طبعی طور پر بدن کے منافذ سے نکلے) کی طرف، مثلاً: تھوک، منی، دودھ یا پسینہ وغیرہ کی طرف طلاق کی نسبت کرے تو طلاق نہ ہو گی۔

(اگر کوئی بیوی سے کہے: تیرے دانت کو طلاق، یا بال کو طلاق، تو طلاق ہو گی، اگر کہے: تیرے پسینہ کو طلاق تو طلاق نہ ہو گی)

ولایت: (طلاق کے الفاظ ادا کرتے وقت) طلاق کے محل پر عقد کے ذریعہ مُطلِّق کی ملکیت ہو، پس کسی اجنبی عورت پر یا بائنہ پر طلاق واقع نہ ہو گی گو معلق کرے، اگر اجنبیہ سے، یا طلاقِ بائنہ کے بعد کہے: تجھے طلاق ہے، یا میں نے تجھ سے نکاح کیا تو تجھے طلاق، یا تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، یا جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اسے طلاق، تو ان صورتوں میں آئندہ اس عورت سے نکاح کے بعد اور گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی طلاق واقع نہ ہو گی۔ کیونکہ کہنے والے کو فی الحال محل پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ معلق طلاق دے تو تعلیق کے وقت سے طلاق تک (معلق علیہ کے وجود تک) ملکیت کا پایا جانا شرط ہے، (درمیان میں بھی ملکیت ختم نہ ہو)

حدیث: (۱) ”جس (محل) کے تم مالک ہو، وہیں طلاق واقع ہو گی“ (صحیح اخرجہ ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ، طحاوی فی المشکل، ابن الجارود، دارقطنی، حاکم، بیہقی، احمد)

(۲) ''جس نے نکاح نہیں کیا اس کی طلاق نہیں (واقع ہوگی ۔۔۔۔)'' (حاکم وقال صحیح علی شرط الشیخین ووفقه الذہبی والالبانی، طیالسی، بیہقی)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''کوئی شخص کہے کہ میں نے فلانی عورت سے نکاح کیا تو اسے طلاق، تو نکاح سے قبل اس طرح کہنے سے طلاق نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ) (یعنی اے ایمان والو! جب تم مؤمنات سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دو)، یہ نہیں فرمایا کہ جب تم انھیں طلاق دو پھر ان سے نکاح کرو''۔ امام بخاری و بیہقی وغیرہ نے بعض صحابہ اور کئی تابعین ائمہ کرام سے اس مسئلہ کو نقل فرمایا ہے کہ نکاح سے قبل طلاق کا کوئی اعتبار نہیں۔ (فتح الباری ۹/۳۸۱، معرفۃ السنن ۵/۴۴۶، تلخیص ۳/۲۱۰، ارواء الغلیل ۶/۱۷۳، ۷/۱۵۲)

جو عورت طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو، اس پر طلاق واقع ہوگی، کیونکہ رجعت کے حق کی وجہ سے ابھی اس پر ولایت باقی ہے۔

اگر طلاق کو کسی صفت پر معلق کرے، پھر بیوی شوہر سے بائنہ (جدا) ہو جائے، پھر دوبارہ نکاح کے بعد وہ صفت پائی جائے، تو طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ جس نکاح میں معلق کیا تھا وہ ختم ہو چکا۔ (مثلاً کوئی کہے تو نے زید سے بات کی تو تجھے طلاق، پھر اپنی بیوی کو طلاق دے، آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کرے، اور وہ زید سے بات کرے تو اس سے طلاق نہ ہوگی)

طلاق کی تعداد: ایک آزاد شخص تین طلاق (تک) دے سکتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے تیسری طلاق کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: '' اَوْتَسْرِيحٌ بِاِحْسَان '' (بقرہ: ۲۲۹)۔ اگر کسی نے ایک یا دو طلاق کے بعد رجعت کی یا از سرِ نو نکاح کیا، گو درمیان میں وہ عورت دوسرے شوہر سے نکاح کر چکی ہو، تو اب صرف بقیہ طلاق کا مالک ہوگا (یعنی ایک دیا تو دو کا، اور دو دے چکا تو ایک کا)۔ اگر کوئی مکمل تین طلاق دے چکا، پھر تمام شرائط پائے جانے کے بعد آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کرے، تو اب از سرِ نو تین طلاق کا اختیار ہوگا۔

مرض الموت میں طلاق: صحت کی طرح مرض الموت میں بھی طلاق واقع ہوگی۔ اگر بیوی رجعی عدت میں ہو، اور زوجین میں سے کوئی مر جائے تو دوسرا اس کا وارث ہوگا، کیونکہ ابھی زوجیت کے آثار باقی ہیں، اسی لئے اسے طلاق واقع ہوتی ہے، نیز اس سے ایلاء، ظہار اور لعان کرنا صحیح ہے، اور اس کا نفقہ واجب ہے۔

اگر بیوی بائنہ ہو چکی ہو، تو عدت میں دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے، کیونکہ زوجیت کا تعلق کٹ چکا۔

قصد: طلاق کا لفظ اُسی مفہوم و مطلب کے قصد سے زبان سے ادا کرنا شرط ہے۔ لہٰذا کوئی دوسرے کی طلاق نقل کرے کہ، فلاں نے کہا میری بیوی پر طلاق، یا نیند میں زبان سے طلاق کا جملہ نکلے، تو طلاق نہ ہوگی۔ اسی طرح جو طلاق کے الفاظ کے مفہوم سے ناواقف ہو، گو طلاق کی نیت سے ادا کرے، یا بلا قصد زبان ان الفاظ کی طرف سبقت کر جائے (سبقت لسانی ہو) تو طلاق نہ ہوگی، لیکن شوہر ایسی بات کا دعویٰ کرے، جو طلاق کے نفاذ سے مانع ہو، تو ظاہراً بغیر قرینہ کے اس کی تصدیق نہ کی جائے گی، کیونکہ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہے۔ (مثلاً کوئی کہے: تجھے طلاق ہے، پھر دعوی کرے کہ سبقت لسانی ہوئی، تو بغیر قرینہ کے قبول نہ کریں گے) البتہ در حقیقت وہ سچا ہو، تو اسے نفع پہنچائے گا، (اور طلاق نہ ہوگی) اور بیوی اسے سچا سمجھ رہی ہے تو اس کی بات مان سکتی ہے۔

قرینہ: مثلاً کسی کی بیوی کا نام طالق ہو، وہ اسے، یا طالق (اے طالق) کہے اور طلاق کا قصد نہ ہو، تو طلاق نہ ہوگی، بلکہ پکارنے پر محمول کریں گے، اگر طلاق کا قصد ہو تو طلاق ہوگی۔

کسی کی بیوی کا نام طارق، طالب، یا طالع ہو، اور وہ اسے ''یا طالق'' کہے اور کہے کہ میں اسے پکار رہا تھا، لیکن زبان پلٹ گئی (اور آخری

حرف قاف نکلا)، تو طلاق نہ ہوگی، اگر وہ یہ عذر پیش نہ کرے، تو طلاق ہوگی۔

تفریحاً طلاق: اگر کوئی بطورِ تفریح ومذاق یابکواس بیوی کو طلاق دے، (یعنی اپنے قصد واختیار سے طلاق کے صریح الفاظ ادا کرے، لیکن طلاق کے وقوع کی نیت نہ ہو) یابیوی استہزاءیاناز کے طور پر طلاق کا مطالبہ کرے اور شوہر بطورِ استہزاءیا تفریح کہہ دے: میں نے تمہیں طلاق دی، تو طلاق واقع ہوگی۔

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''تین مسائل ایسے ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے، اور ٹھٹھاوبکواس بھی سنجیدگی ہے: طلاق، اور نکاح اور رجعت''(ابوداود، ابن ماجه، طحاوی، دارقطنی، حاکم، شرح السنه، وحسنه الترمذی والالبانی۔الارواء ۲۲۴/۶)(یعنی سنجیدگی کے طور پر انجام دے یابطور تفریح نفاذ ہوگا)

بیوی تاریکی میں، یاپردہ کے پیچھے ہو، یااس کے ولی یاوکیل نے نکاح کرایاتھا اور یہ بیوی کو جانتا نہ تھا، لہٰذا اسے اجنبی عورت سمجھ کر طلاق دے دے، تو طلاق واقع ہوگی۔

بیوی کوطلاق کی تفویض (طلاق کااختیار بیوی کوسونپنا)

منجّز (فوری وفی الحال) طلاق بیوی کے سپرد کرنا دراصل اسے طلاق کامالک بنانا ہے۔خواہ صریح لفظ ہو یاکنایہ، مثلاً یوں کہنا: تواپنے آپ کو طلاق دے، یااپنے نفس کو جدا کر، پس اس طلاق کے واقع ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ بیوی فوراًخود کو طلاق دے، گو کنایہ لفظ سے ہو، اگر بیوی یہ کہے: میں خود کو کیسے طلاق دوں، پھر دے دے، یامعمولی غیر متعلق گفتگو ہو، پھر طلاق دے دے، تو طلاق واقع ہوگی، زیادہ تاخیر ہو، تو واقع نہ ہوگی۔بیوی کے طلاق دینے سے قبل شوہر کارجوع کرنا صحیح ہے، (پھر طلاق نہ ہوگی)

اگر شوہر کہے: تم جب بھی چاہو اپنے آپ کو طلاق دو، تو اس صورت میں کئی علماء کے نزدیک فوراًدیناضروری نہیں، کبھی بھی دے تو طلاق ہوگی، لیکن بعض علماء یہاں بھی فوراًدیناضروری سمجھتے ہیں، مگر شوہر بیوی کو اپنی طلاق کاوکیل بنائے تو فوراًدیناشرط نہیں۔

اگر شوہر کہے: تم ہزار میں خود کو طلاق دو، تو بیوی نے دے دی، تو ہزار میں بائنہ ہوگی۔

اگر شوہر کہے: تم خود کو طلاق دو اور کسی خاص عدد کی نیت کی (دو طلاق یا تین طلاق) اور بیوی نے اسی عدد یااس سے کم وبیش کی نیت سے طلاق دی، تو جس عدد پر دونوں متفق ہوں، اس کا اعتبار ہوگا، (یعنی جس نے کم کی نیت کی وہ واقع ہوگی)، اگر دونوں نے یاکسی ایک نے کسی عدد کی نیت نہیں کی، تو ایک طلاق ہوگی۔

اگر شوہر تین طلاق کا اختیار دے اور بیوی ایک دے یااس کے برعکس، تو ایک واقع ہوگی۔پہلی صورت میں فوراًبیوی دوسری اور تیسری طلاق بھی دے سکتی ہے۔اگر شوہر کہے: تین طلاق دو، اور بیوی کہے: میں نے خود کو طلاق دی، لیکن کسی عدد کاذکر یانیت نہ ہو تو تین ہوگی۔

طلاق کی تعداد

اگر شوہر صریح یاکنایہ لفظ سے طلاق دے، اور تعداد کی نیت ہو، تو جتنی نیت ہے، اتنی طلاق واقع ہوگی، اگر تجھے طلاق دیا، کہے اور نیت تین طلاق کی ہو، تو تین واقع ہوگی۔

اگر شوہر تجھے طلاق دیا تین طلاق، کہنے کاارادہ کرے، اور طلاق دیا کہنے سے قبل بیوی مر جائے، تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ لفظ مکمل ہونے سے قبل بیوی محلِ طلاق نہ رہی، اگر طلاق کے الفاظ مکمل ہونے کے بعد مرے (گو تین طلاق کہنے سے قبل) تو تین طلاق واقع ہوگی۔

جس بیوی سے صحبت ہو چکی ہو، اسے یوں کہے: تو مطلقہ ہے، مطلقہ ہے، مطلقہ ہے، یا تو مطلقہ ہے، تو مطلقہ ہے، تو مطلقہ ہے، اور ان کلمات کے درمیان سانس سے زیادہ فاصلہ ہو، یا (فاصلہ تو نہ ہو) لیکن تاکید کی نیت سے نہ کہے (بلکہ مستقل جدا جدا طلاق کی نیت سے یا بلا کسی نیت کے کہے)، یا تیسرے طلاق کے ذریعہ پہلے کی تاکید کی نیت کرے، تو تین طلاق واقع ہو گی۔ اگر پہلی صورت میں تاکید کا دعویٰ کرے تو ظاہراً قبول نہیں کریں گے (لیکن دعویٰ میں سچا ہو تو باطناً ایک ہی ہو گی) اگر اوّل کو دوسرے و تیسرے سے موکد کرے، تو ایک ہو گی، صرف دوسرے سے موکّد کرے، یا دوسرے کو تیسرے سے موکّد کرے تو دو طلاق ہو گی۔ طلاق کے الفاظ الگ الگ استعمال کرے، یا کنایہ الفاظ بہ نیت طلاق اس طرح ادا کرے، تب بھی یہی تفصیل ہو گی۔ اگر بیوی سے صحبت نہ ہوئی ہو، تو مذکورہ تمام صورتوں میں ایک ہی طلاق ہو گی، کیونکہ پہلی طلاق سے ہی وہ بائنہ ہو جائے گی۔

اگر معلق طلاق کو اس طرح دوہرائے مثلاً: تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، اور ہر جملہ سے مستقل طلاق کی نیت ہو، تو تعداد پر محمول ہو گا، ورنہ ایک ہی طلاق ہو گی۔

اگر نصف یا پاؤ طلاق دے تو ایک طلاق ہو گی۔

ان الفاظ سے ایک ہی طلاق ہو گی: تجھے طلاق ہے دنیا بھر کر، پہاڑ کے مثل، اعظم طلاق، اکبر طلاق، سب سے لمبی، سب سے چوڑی طلاق، اشد طلاق وغیرہ۔

استثناء

دیگر مسائل کی طرح طلاق میں بھی استثناء معتبر و صحیح ہے، جبکہ شرائط موجود ہوں، جن کا تذکرہ 'اقرار' کے باب میں گذر چکا، یعنی مستثنیٰ منہ (جس جملہ سے استثناء کرنا ہے) مکمل ہونے سے قبل استثناء کی نیت ہو، سانس لینے کے وقت سے زیادہ فاصلہ و تاخیر نہ ہو، اور مستثنیٰ منہ کا استغراق نہ ہو (یعنی نتیجہ صفر نہ ہو)

اگر شوہر کہے: تجھے تین طلاق مگر دو (سوائے دو) تو ایک طلاق ہو گی۔

اگر کہے: تجھے تین طلاق مگر دو اور ایک، تو ایک ہو گی۔

اگر کہے: تجھے دو اور ایک طلاق مگر ایک، تو تین ہو گی۔

اگر معلق یا منجز طلاق کے پہلے یا بعد میں فوراً انشاء اللہ (اگر اللہ چاہے) یا اِنْ لَمْ یَشَأَ اللّٰہُ (اگر اللہ نہ چاہے) کہے، اور طلاق کو اللہ کی مشیئت یا عدم مشیئت پر معلق کرنے کے قصد سے کہے تو طلاق منعقد ہی نہ ہو گی۔ مثلاً: تجھے طلاق ہے انشاء اللہ، اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو انشاء اللہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اگر اللہ نہ چاہے۔ تعلیق کے قصد سے نہ کہے تو طلاق ہو گی، یعنی عادت کی وجہ سے سبقت لسانی ہوئی اور یہ کلمہ نکلا یا تبرکاً کہا، یا یہ کہ ہر بات اللہ کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے، یا پتہ نہ ہو کہ تعلیق کا ارادہ تھا یا نہیں، یا بلا کسی قصد کے کہے۔ نذر، قسم، بیع، فسخ، اور نماز وغیرہ دیگر مسائل میں بھی انشاء اللہ ساتھ ملائے تو یہی تفصیل جاری ہو گی۔

اگر کہے، اے طالق انشاء اللہ تو طلاق ہو گی۔

شک

منجز یا معلق طلاق کے وقوع میں شک ہو، تو واقع نہ ہو گی، اگر تعداد میں شک ہو، مثلاً ایک دیا یا زائد، تو اقل پر عمل ہو گا (یعنی اس

مثال میں ایک ہو گی) لیکن تقوی واحتیاط کا پہلو تو واضح ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو تمہیں شک (یا بیقراری) میں ڈالے اسے چھوڑ کر ایسا پہلو اختیار کرو، جو شک (وبیقراری) میں نہ ڈالے، (ترمذی وصححہ) پس اگر رجعی طلاق میں شک ہے تو رجعت کرلے، یا تین سے کم بائن میں شک ہے، تو تجدید نکاح کرلے۔ یا تین میں شک ہے، تو خود رُک جائے اور طلاق دے دے، تاکہ یقینا دوسرے کے لئے حلال ہو جائے، تعداد میں شک ہو، تو زائد پر محمول کرے، دو یا تین میں شک ہو تو مغلظہ سے دوبارہ نکاح کے شرائط پائے جانے تک اس سے نکاح نہ کرے۔

طلاق وقت پر معلق کرنا

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ مسلمان اپنے شرائط کے پابند ہیں (الحاکم ونحوہ البخاری معلقاً فی الشروط والنکاح)

اگر کھے: تجھے فلاں ماہ میں یا اس کی ابتداء میں یا شروع میں طلاق، تو اس ماہ کے شروع ہوتے ہی، یعنی اس سے پہلے ماہ کے آخری دن سورج غروب ہو کر رات شروع ہوتے ہی طلاق واقع ہو گی۔ اگر اس طرح کہے: فلاں ماہ کے دن میں، یا پہلے دن، تو پہلی تاریخ کے صبح صادق کے ساتھ طلاق ہو گی۔ اگر کہے: فلاں ماہ کے آخر میں، تو ماہ کے آخری جز میں (یعنی آخری تاریخ کو غروب سے پہلے پہلے) ہو گی۔ تجھے گذشتہ کل طلاق کہے، تو ابھی ہو گی۔

تعلیق کے الفاظ: جو اگر، جب، جب بھی، جب جب بھی، جب کبھی، جس، وغیرہ۔

مثالیں: میری بیویوں میں سے جو بھی گھر میں داخل ہوئی اسے طلاق، تو جس وقت (جب) بھی داخل ہوئی، تجھے طلاق، اگر زید چاہے تو تجھے طلاق، تو جب کبھی گھر سے نکلے، تجھے طلاق۔

تعلیق کے الفاظ مثبت پہلو میں عوض اور بیوی کی مشیئت کے بغیر استعمال ہوں، تو معلق علیہ کا فوراً پایا جانا ضروری نہیں، جب بھی معلق علیہ پایا جائے طلاق ہو گی۔ اگر عوض کے ساتھ ہو تو بعض الفاظ میں فوراً ہونا ضروری ہے (جس کی کچھ تفصیل خلع میں گذر چکی)

کُلّما (جب جب بھی، جب کبھی) کے علاوہ دیگر الفاظ تکرار کا تقاضہ نہیں کرتے، یعنی ایک مرتبہ معلق علیہ پایا گیا، تو اب تعلیق کا اثر ختم ہو گیا، دوبارہ پایا جائے، تو دوسری طلاق نہ ہو گی۔ لیکن کُلّما کے مفہوم کا خود تقاضا یہ ہے کہ بار بار پایا جائے تو بار بار طلاق ہو گی۔

اگر کوئی کھے: اگر تجھے طلاق دوں تو تو مطلقہ ہے، پھر ایک طلاق دے، تو صحبت شدہ بیوی کو دو طلاق ہو گی (اگر ابھی صحبت نہ ہوئی ہو، یا طلاق بالعوض ہو، یا وکیل طلاق دے تو ایک ہی ہو گی)

اگر کہے: جب جب بھی تجھ پر میری طلاق واقع ہو، تو مطلقہ ہے، پھر ایک طلاق دے، تو صحبت شدہ بیوی کو تین طلاق ہو گی (صحبت نہ ہوئی ہو تو ایک ہو گی)

اِنْ (اگر) کے علاوہ دیگر الفاظ منفی پہلو میں استعمال ہوں، تو فوراً معلق علیہ پایا جانا ضروری ہے، کوئی کہے: اگر تو گھر میں داخل نہ ہوئی، تو تجھے طلاق، تو داخلہ سے ناامیدی کے بغیر طلاق نہ ہو گی، پس عورت کی موت سے قبل طلاق کے وقوع کا حکم لگایا جائے گا۔

دیگر الفاظ میں فوراً ضروری ہے، پس کوئی کہے: جب تم گھر میں داخل نہ ہو، تو تمہیں طلاق ہے، پھر اتنا وقت گذر جائے کہ داخل ہو سکتی تھی، لیکن نہ ہوئی تو طلاق ہو گی۔

کسی کو مشیئت پر معلق: اگر بیوی سے خطاب کے جملہ میں بیوی کی مشیئت پر طلاق معلق کرے، مثلاً: اگر تو چاہے تو تجھے

طلاق، یا تجھے طلاق اگر تو چاہے، تو بیوی کو فوراً جواب دینا ضروری ہے، یعنی کسی غیر متعلق گفتگو یا طویل سکوت کے بغیر جواب دے، تو طلاق نافذ ہو گی، ورنہ نہیں، البتہ، جب بھی تو چاہے، جیسے الفاظ استعمال کرے تو فوراً جواب ضروری نہیں،

اگر بیوی کی مشیئت پر غائبانہ صیغہ سے معلق کرے، (گو وہ موجود ہو) مثلاً اگر میری بیوی چاہے تو اسے طلاق، یا بیوی کے علاوہ کسی دوسرے کی مشیئت پر معلق کرے، مثلاً: اگر تو چاہے تو میری بیوی کو طلاق، تو فوراً جواب ضروری نہیں۔

جس کی مشیئت پر طلاق معلق ہو، (بیوی ہو یا کوئی دوسرا) وہ اگر کہہ دے کہ "میں نے چاہا، تو ظاہراً و باطناً طلاق ہو جائے گی، جبکہ وہ بچہ یا پاگل نہ ہو، گو نشہ میں ہو یا دل میں نہ چاہے، کیونکہ تعلیق میں باطن مقصود نہیں ہوتا، کہ وہ تو مخفی ہے، بلکہ اس پر دلالت کرنے والا لفظ مقصود ہوتا ہے۔ اگر بچہ یا پاگل کی مشیئت پر معلق کرے، تو اس کے چاہنے سے طلاق نہ ہو گی، کیونکہ تصرفات میں ان کے قول کا اعتبار نہیں۔ مندرجہ بالا جملوں میں سامنے والے کی مشیئت سے قبل معلق کرنے والے کو رجوع کا حق نہیں ہے، کیونکہ بظاہر یہ تعلیق ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طلاق اپنے کسی فعل پر معلق کرے، یا کسی ایسے شخص کے فعل پر جو اس کے تعلیق کی فکرو پرواہ کرے، یعنی دوستی وغیرہ کسی تعلق کی وجہ سے اسے یہ پسند نہ ہو کہ اُس کے فعل کی وجہ سے اس کی بیوی کو طلاق ہو، اور تعلیق کرنے والے کا ارادہ یہ ہو کہ اسے اِس تعلیق سے باخبر کرے، گو ابھی اسے خبر نہ ہوئی ہو، پھر پہلی صورت میں خود مطلق نے یا دوسری صورت میں اس متعلقہ شخص نے بھول کر، یا جبر واکراہ کی وجہ سے، یا لاعلمی میں (کہ اس فعل پر طلاق معلق ہے) وہ فعل انجام دیا، تو طلاق نہ ہو گی۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے، "بلاشبہ اللہ نے میری امت سے خطا، بھول چوک، اور وہ کام جو جبراً کروایا جائے معاف رکھا ہے" (ابن ماجہ وصححہ ابن حبان والحاکم)، یعنی ان امور پر مؤاخذہ و گرفت نہ ہو گی، جبکہ کسی مسئلہ میں کسی دوسری دلیل سے اس کے برعکس ثابت نہ ہو۔

اگر ایسے شخص کے فعل پر معلق کرے، جس کو اس تعلیق کی کچھ پرواہ نہ ہو، یا پرواہ تو ہو، لیکن اس کا ارادہ اسے باخبر کرنے کا نہ ہو، تو کسی بھی صورت میں اس شخص کے معلق علیہ فعل کو انجام دینے سے طلاق ہو گی، کیونکہ اس صورت میں مقصود نری تعلیق ہے، اور پہلی صورت میں مذکورہ فعل سے روکنا بھی مقصود تھا۔

جو چیز ہو چکی ہو، لاعلمی کی وجہ سے، یا بھول کر اس کی نفی پر قسم کھائے، مثلاً یوں کہے: اگر زید گھر میں ہو تو میری بیوی کو طلاق، تو طلاق نہ ہو گی، لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ نفس الامر اور حقیقت میں ایسا ہی ہے، تو اکثر علماء کے نزدیک طلاق ہو گی۔

اشارہ

بیوی سے کہے تجھے طلاق ہے، اور دو یا تین انگلی سے اشارہ کرے، تو بغیر نیت کے زائد طلاق نہ ہو گی، اگر انگلی کے اشارہ سے طلاق کے تعداد کی نیت ہے تو اس کے مطابق طلاق ہو گی۔

اگر تو اس طرح ہے، کہے اور انگلی سے اشارہ کرے تو طلاق نہ ہو گی، اگر، تجھے اس طرح طلاق ہے، کہتے ہوئے انگلی سے تعداد کی طرف ایسا اشارہ ہو جو قصداً ہو اور سمجھ میں آئے تو تعداد بغیر نیت کے معتبر ہو گی، پس دو انگلی سے اشارہ کرے تو دو، اور تین سے کرے تو تین طلاق ہو گی۔ ایسے ہی دورانِ گفتگو عادت کے اعتبار سے انگلی کو حرکت دے تو اس کا اعتبار نہیں۔ اگر تین انگلی سے اشارہ کرے، پھر دعویٰ کرے کہ میری مراد بند دو انگلیاں تھیں، تو قسم دلا کر تصدیق کریں گے، اور دو ہی ہو گی۔

متفرقات

(۱) **اگر شوھر بیوی کے ولی** سے کہہ دے کہ اس کا نکاح کر دو، تو گویا وہ طلاق اور اختتامِ عدت کا اقرار کر رہا ہے۔

(۲) **اگر شوھر اپنی بیوی** کے متعلق کہے کہ یہ فلاں کی بیوی ہے، تو یہ بھی طلاق کا اقرار ہے۔

(۳) **اگر شوھر کھے:** اگر میں بیوی سے ایک سال تک غائب رہا، تو میں اس کا شوہر نہیں، تو یہ ظاہر میں یک سالہ غیر حاضری کے بعد طلاق کا اقرار ہے، لہٰذا بیوی کو اس کے ایک سال غائب رہنے کے بعد عدت گذار کر دوسرے سے نکاح کرنا جائز ہے۔

(۴) **اگر طلاق کی درخواست والتماس کے طور پر شوھر سے کھے:** کیا تم نے بیوی کو طلاق دے دی۔ پھر وہ کہے: جی ہاں، تو طلاق ہو گی، اور یہ صریح ہے، اگر شوہر پہلے طلاق دے چکا ہے یا نہیں، اس کی تحقیق کے طور پر پوچھے، اور شوہر اثبات میں جواب دے، تو یہ طلاق کا اقرار ہے، اگر اس اقرار میں جھوٹا ہے تو بظاہر اس سے طلاق ہو گی، لیکن باطناً طلاق نہ ہو گی۔ اگر شوہر یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ماضی کے طلاق کا اقرار کیا تھا جس سے رجوع کر لیا تھا، تو قسم کے ساتھ اس کا دعویٰ تسلیم کریں گے۔

(۵) **کسی کی بیوی کا نام زینب ھو، اور وہ کھے:** زینب کو طلاق، اور دعویٰ کرے کہ میں نے دوسری زینب (اجنبی عورت) مراد لی تھی تو ظاہراً اس کی بات قبول نہ ہو گی، البتہ حقیقتاً اس نے پرائی عورت کے نیت سے ہی کہا تھا، تو نکاح باقی ہے (اور بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہنے پر اسے گناہ نہ ہو گا)

(۶) **عام آدمی کی زبان سے طلاق** کے حروف صحیح ادا نہ ہو پائے، مثلاً تلاق، یا طلاک کہے، یا اس کی لغت ہی اس طرح ہو، تو اس سے طلاق ہو گی، اور اس کے حق میں یہ صریح کہلائے گی۔ ورنہ کنایہ ہو گی۔

(۷) **اگر کوئی اپنی بیوی سے مخاطب ھو:** اے زینب تجھے طلاق ہے، اور اس کا نام جمیلہ ہو، تو اشارہ کی وجہ سے طلاق ہو گی۔ اگر کوئی کہے: میری بیوی عائشہ بنت محمد مطلقہ ہے، حالانکہ اس کی بیوی خدیجہ بنت محمد ہے، تو طلاق ہو گی، کیونکہ نام کی غلطی میں حرج نہیں (جبکہ صراحتاً میری بیوی کہہ چکا ہے)

(۸) **توکیل:** کسی کو طلاق دینے کے لئے وکیل بنایا تو جب وکیل طلاق دے گا، مثلاً کہے گا: میں نے فلانی کو طلاق دی، تب طلاق واقع ہو گی، گو مؤکل کے جانب سے طلاق کی نیت نہ کرے۔

اگر کسی نے دوسرے سے کہا: میں نے میری بیوی کی طلاق تمہیں دی، یا تمہارے ہاتھ میں دی، یا اس کی طلاق لے جاؤ، یا اسے طلاق دو، تو یہ توکیل ہے، لہٰذا جب بھی وکیل طلاق دے گا، تب طلاق ہو گی، شوہر کے اس طرح کہنے سے، یا اس عورت کو شوہر کے اس توکیل کی اطلاع سے طلاق نہ ہو گی۔

اگر شوہر وکیل سے کہے کہ فلاں دن ہی طلاق دینا، تو اس دن یا اس کے بعد دے، تو واقع ہو گی، اگر اس سے پہلے ہی دے تو واقع نہ ہو گی، اگر اسی ایک دن دینا مقصد ہو، تو بعد میں بھی دینا جائز نہیں، اسی دن دے۔ طلاق دینے میں توکیل صحیح ہے۔ معلق کرنے میں توکیل صحیح نہیں۔

(۹) **طلاق کا ثبوت:** اگر شوہر طلاق کا انکار کرے یا اقرار کرنے کے بعد انکار کرے، تو طلاق یا طلاق کے اقرار کے ثبوت کے لئے دو آزاد اور عادل گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ عورتوں کی، یا ایک مرد اور عورتوں کی، گو چار عورتیں ہوں، یا غلاموں کی گو وہ نیک

ہوں، یا فاسقوں کی گواہی سے ثابت نہ ہو گا۔ گواہی کو حاکم کے روبرو ادا کرنے اور قبول کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں گواہ طلاق کے الفاظ ادا کرتے وقت اسے دیکھیں اور اس کی آواز سنیں،

صرف طلاق دینے والے کی آواز سن کر اسے دیکھے بغیر گواہ بننا صحیح نہیں، کیونکہ آواز میں اشتباہ ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی شرط ہے کہ گواہ یہ بھی بیان کریں کہ صریح لفظ سے طلاق دی یا کنایہ سے۔

(۱۰) **طلاق کا ارادہ ہو تو افضل** یہ ہے کہ ایک سے زائد طلاق نہ دے، کیونکہ ممکن ہے اس پر نادم ہو، تو ایسی صورت میں رجعت کر سکتا ہے، اگر تین طلاق دینا ہو، تو افضل یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے، تاکہ جو علماء بہ یک وقت تین طلاق دینا حرام سمجھتے ہیں، ان کے اختلاف سے بچ نکلے، ایک ہی طہر میں تینوں طلاق دینا مکروہ ہے۔

(۱۱) **طلاق کو کسی صفت پر معلق کرے**، تو اس صفت کے وجود سے طلاق ہو گی، لیکن چار صورتوں میں نہ ہو گی: تعلیق اور صفت یا کوئی ایک نکاح کی حالت میں نہ ہو، مثلاً اجنبیہ عورت سے کہے: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، پھر اس سے نکاح سے قبل یا نکاح کے بعد وہ داخل ہو، تو طلاق نہ ہو گی۔ یا بیوی سے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق، پھر وہ بائنہ ہوئی، پھر داخل ہوئی تو طلاق نہ ہو گی، یا صفت دوسرے نکاح میں ہو، مثلاً بیوی سے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے، پھر اسے جدا کیا، پھر آئندہ دوبارہ اس سے نکاح کیا، پھر وہ داخل ہوئی، تو طلاق نہ ہو گی۔ اجنبیہ کی طلاق معلق کرنے کی صورت میں آئندہ نکاح کے بعد (حنفی مسلک کا کوئی) حاکم طلاق کا فیصلہ دے، تو یہ فیصلہ معتبر نہ ہو گا۔

(۱۲) **کسی اجنبی عورت سے کہا:** تو مجھ پر حرام ہے میں تجھ سے نکاح نہ کروں گا، تو اس سے کچھ لازم نہیں، اور اس سے نکاح کرنا جائز ہے، اور کسی کفّارہ کی ضرورت نہیں۔

(۱۳) **طلاق کا حکم: (۱) واجب:** ایلاء کی صورت میں جبکہ صحبت کا ارادہ نہ ہو، اور شقاق کے وقت جب کہ دونوں حکم طلاق دینا مناسب سمجھیں۔ (۲) **مستحب:** جو بیوی کے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہو، یا اس کی طرف بالکل ہی میلان نہ ہو، یا بلا تعنّت اور بلا وجہ مشقت میں ڈالے بغیر کسی صحیح غرض سے والدین میں سے کسی کا حکم ہو، یا ایسی بد اخلاق ہو کہ اس کے ساتھ گذر بسر و صبر مشکل ہو، یا عفیفہ نہ ہو۔ (۳) **حرام:** بدعی طلاق۔ (۴) **مکروہ:** سابقہ کوئی شکل نہ ہو، تو طلاق مکروہ ہے، کیونکہ اسے حدیث میں ابغض حلال قرار دیا گیا ہے۔ (۵) **مباح:** بیوی کی طرف کامل میلان نہ ہو، گو کسی درجہ میں ہو۔

کسی صحیح غرض کے بعد بطورِ تعنّت (دشواری و مشقت میں ڈالنے کے لئے) والدین یا کوئی ایک طلاق کا حکم دے، تو طلاق دینا مستحب نہیں ہے۔

(۱۴) **تین طلاق:** ایک ہی وقت تین طلاق دے، مثلاً: تجھے تین طلاق ہے، تو طلاق واقع ہو گی نیز یہ حرام نہیں ہے، گو مکروہ ہے

حدیث: ۱- حضرت رکانۃ نے طلاق بتّہ دی (ایسی طلاق کہ رشتہ کٹ جائے)، پھر انھوں نے رجعت کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے ان کو قسم دلا کر پوچھا کہ: کیا تم نے ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے کہ: قسم بخدا میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا، تو آپ ﷺ نے بیوی ان کو لوٹا دی" (شافعی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، وصححہ ابوداود وبن حبان والحاکم۔۔۔ تلخیص ۲۱۳/۳)

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر رکانۃ لفظ "البتّۃ" سے تین کا ارادہ کرتے، تو تین نافذ ہوتی، اور رجعت کی اجازت نہ ملتی، ورنہ استفسار اور قسم دلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

۲- صحیحین وغیرہ میں لعان کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضرت عُوَیمرؓ نے لعان سے فراغت کے بعد اپنی بیوی کو تین طلاق دی۔

گرچہ لعان سے خود دونوں میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہو جاتی ہے، اور طلاق کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ عویمرؓ نے اس مسئلہ سے واقفیت سے پہلے ہی تین طلاق دی، تو آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہ فرمائی، اگر حرام ہوتا تو عویمرؓ اور دیگر صحابہ کرام کی معلومات کے لئے آپ ﷺ نے فوراً انکار فرمایا ہوتا۔

(۱۵) کسی شرط یا صفت پر طلاق معلق کرنے کی صورت میں اس شرط یا صفت کی موجودگی میں خود بخود طلاق ہو گی، دوبارہ طلاق کے الفاظ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(خلع وطلاق کے حوالے) (المجموع ۱۷/۲-۲۶۱، اعانتہ ۴، ۳/۲-۲۸، بجیرمی ۳/۴۱۰-۴۴۱، تحفہ ۹-۱۰/۳-۲۶۲، شرح التنبیہ ۲/۶۴۰-۶۷۵، جمل ۴/۲۹۱-۳۸۵، ترشیح ۳۳۰-۳۴۱، مغنی ۳/۲۶۲-۳۳۴، بغیہ ۲۱۶-۲۳۴، نہایہ ۶-۷/۳-۵۶، الفقہ المنہجی ۴/۱۱۹-۱۳۹)

رِجْعَت

رجعت ایک مرتبہ رجوع (واپسی، لوٹنا) کو کہا جاتا ہے، شرعاً جو مطلقہ بائنہ نہ ہو، اسے آئندہ مذکورہ شرائط کے ساتھ عدت میں دوبارہ نکاح میں لوٹانے کو رَجعت کہا جاتا ہے۔

آیت: (۱) "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِإِحْسَان" (البقرہ ۲۲۹)

ترجمہ: "وہ طلاق (جس میں رجوع کرنا درست ہے) دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ (رجعت کرکے عورت کا) رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ"

(۲) "وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحاً" (البقرہ ۲۲۸)

ترجمہ: "اور ان عورتوں کے شوہر (جبکہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو) ان کے (بلا تجدیدِ نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں"۔

(۳) "وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَاتُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ" (البقرہ: ۲۳۱)

ترجمہ: "اور جب تم نے عورتوں کو (رجعی) طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جاویں، (اور عدت ختم نہ ہوئی ہو) تو تم (پر واجب ہے کہ یا تو) ان کو قاعدے کے موافق (رجعت کرکے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کروگے اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا سو وہ (آخرت میں) اپنا ہی نقصان کرے گا (کیونکہ ظلم کی سزا بھگتے گا)"۔

صحیحین وغیرہ کی روایات میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو ح-ض میں طلاق دی، تو آپ ﷺ نے ان کو رجعت کا حکم دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حفصہؓ کو طلاق دی، پھر ان سے رجعت کرلی۔ (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، حاکم۔ تلخیص ۳/۲۱۸)

امام شافعیؒ رجعت سے متعلق آیات کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں: جو رجعت کرنا چاہے اسے اس کا حق ہے، کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اسے اس کا اختیار دیا ہے۔ فرمایا: سو جو آزاد شوہر بھی صحبت کے بعد اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دے، اسے کتاب و سنت کی روشنی میں مطلقہ بیوی کو واپس لوٹا لینے کا استحقاق حاصل ہے، کیونکہ رُکانہ نے ایک طلاق کی نیت سے طلاقِ بتّہ دی، تو آپ ﷺ نے بیوی کو ان کے سپرد کیا، اور یہ ہمارے نزدیک عدت کے اندر کا واقعہ ہے۔ تمام بیویوں کا یہی حکم ہے، جو آزاد شوہر کی زوجیت میں ہو، خواہ بیوی مسلمان ہو، یا ذمیہ یا باندی، کافر آزاد کا حکم بھی طلاق ورجعت میں مسلمان آزاد کی طرح ہے، خواہ ذمی ہو یا غیر ذمی۔ پس جب عدت گذر جائے تو جدید نکاح کے بغیر بیوی پر شوہر کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ اللہ عزوجل نے جب عدت میں شوہر کو رجعت کا اختیار دیا، تو واضح کر دیا کہ عدت کے بعد رجعت کا کوئی حق نہیں، نیز اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (البقرہ: ۲۳۴)

ترجمہ: "پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کر لیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہو گا۔ ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے قاعدہ کے موافق کچھ کاروائی (نکاح کی) کریں" (الامّ ۵/۳۵۲)

رجعت کے ارکان

(مُرْتَجِعْ (رجعت کرنے والا) (۲) صیغہ (۳) محل

(۱) **مُرْتَجِع (رجعت کرنے والا)**: مرتجع میں خود نکاح کرنے کی اہلیت موجود ہو، گو دوسرے کی اجازت پر موقوف ہو، لہٰذا مدہوش، غلام، سفیہ اور مُحْرِم (جو احرام میں ہو) کا رجعت کرنا صحیح ہے۔ مرتد، بچہ، پاگل اور مُکْرَہ کا رجعت کرنا درست نہیں۔

محرم بھی فی الجملہ نکاح کا اہل ہے، احرام (عارضی طور پر) صرف مانع ہے، (اس لئے اس کا رجعت کرنا صحیح ہوا)

مجنون کی بیوی کو طلاق ہوئی ہو، تو اس کا ولی رجعت کر سکتا ہے، جب کہ وہ اس کا نکاح کرا سکتا ہو، یعنی جب کہ وہ نکاح کا محتاج ہو، اگر طلاق میں شک کی وجہ سے احتیاطاً رجعت کر لے، پھر معلوم ہوا کہ طلاق ہوئی تھی، تو یہ رجعت کافی ہے۔

(۲) **صیغہ**: صیغہ میں شرط یہ ہے کہ ایسا لفظ ہو جو مقصد پر دلالت کرے،

صریح الفاظ: تجھے اپنی طرف لوٹا لیا، تجھ سے رجوع کر لیا، تجھ سے مراجعت کر لی، تجھے (اپنے نکاح میں) روک لیا۔ کیونکہ یہ الفاظ رجعت کے لئے مشہور اور کتاب و سنت میں وارد ہیں۔ ان کے مصادر سے مشتق دیگر الفاظ کا بھی یہی حکم ہو گا۔ عربی زبان جاننے کے باوجود بھی کوئی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کہے تو وہ صریح ہے۔ لوٹانے کے لفظ میں "میری طرف" (اپنی طرف) کہنا ضروری ہے، دیگر الفاظ میں 'میری طرف' یا 'میرے نکاح میں' بڑھا دینا سنت ہے۔

کنایہ الفاظ: میں نے تجھ سے نکاح کیا تجھے اپنی زوجیت میں لیا، وغیرہ (اگر رجعت کی نیت سے یہ جملہ کہا، تو رجعت صحیح ہو گی، ورنہ نہیں)

رجعت منجز ہو (فوراً ہو، معلق نہ ہو)، نیز موقّت نہ ہو، پس اگر کسی نے کہا: اگر تو چاہے تو تجھ سے رجعت کر لیا، اور بیوی کہے: میں نے چاہا، یا کہا: ایک ماہ کے لئے تجھ سے رجعت کر لیا، تو رجعت حاصل نہ ہو گی۔

گواہ: رجعت کے صیغہ کی ادائیگی کے وقت دو گواہ کا ہونا سنت ہے، کیونکہ آیت میں اس کا حکم ہے:

آیت: '' فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْاذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ '' (الطلاق-۲)

ترجمہ: ''پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جاویں تو ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو''۔

آیت کو وجوب پر محمول نہیں کیا، کیونکہ طلاق کے وقت گواہ کے عدم وجوب پر اجماع ہے، پس امساک (رجعت) کا بھی یہی حکم ہوگا، اور صرف استحباب پر محمول کریں گے، جیسا کہ لین دین کے وقت گواہ کے قرآنی حکم کو استحباب پر محمول کیا گیا، نیز رجعت نیا نکاح نہیں ہے، بلکہ سابقہ نکاح کو ہی بر قرار رکھنا ہے، نکاح میں چونکہ فراش کا اثبات ہے، اس لئے گواہ رکھنا واجب ہے، جو یہاں پہلے سے ثابت ہے۔ اگر رجعت کے وقت گواہ نہ رکھے، تو اس کے اقرار کے وقت رکھنا مستحب ہے، تاکہ آئندہ بیوی کے انکار کی گنجائش نہ رہے، کیونکہ عدت میں شوہر کا رجعت کا اقرار کرنا معتبر ہے۔

کسی فعل مثلاً صحبت یا اس کے مقدمات (بوس وکنار وغیرہ) سے رجعت حاصل نہ ہوگی، گو رجعت کی نیت سے ان امور کو انجام دے، کیونکہ یہ رجعت پر دلالت نہیں کرتا، اور جیسا کہ اس سے نکاح نہ ہوگا، نیز صحبت سے تو عدت واجب ہوتی ہے، پھر یہ عدت کو ختم کیسے کرے گا، البتہ تحریر اور گونگے کے مُفْہِم اشارہ سے رجعت حاصل ہوگی، اور دونوں کنایہ شمار ہوں گے، لیکن اشارہ ہر کوئی سمجھ سکے تو صریح شمار ہوگا۔

(۳)**محل:** محلِ رجعت میں شرط یہ ہے کہ ایسی بیوی ہو، جس سے صحبت ہو چکی ہو، (گو دُبُر یعنی پچھلی شرم گاہ میں ہو)، معین ہو، حلت کو قبول کرے، بلا عوض اسے طلاق دی گئی ہو اور تمام طلاقیں نہ دے چکا ہو، لہٰذا عدت ختم ہونے کے بعد رجعت نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اجنبیہ ہو چکی، اور نہ صحبت سے قبل، کیونکہ اس پر عدت ہی نہ آئے گی، اور نہ مبہم بیوی سے، مثلاً دو بیویوں میں سے ایک کو بلا تعیین طلاق دے، پھر اسے معین کرنے سے قبل رجعت کرے، تو یہ رجعت صحیح نہیں، اگر دونوں سے رجعت کرے۔ یا مطلقہ کو معین کرنے کے بعد اس سے رجعت کرلے تو صحیح ہے۔

زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے، تو اس حال میں رجعت صحیح نہیں۔ گو مرتد عدت کے اختتام سے قبل اسلام کی طرف لوٹ جائے، نیز فسخ کی صورت میں بھی رجعت نہیں کر سکتا، اگر طلاق بالعوض ہو، تو بائنہ ہونے کی وجہ سے رجعت کا حق نہ ہوگا، اسی طرح شوہر تمام طلاق دے دے، (یعنی ایک آزاد شخص تیسری طلاق بھی دے دے) تو اب رجعت نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ بالکل بائنہ ہو چکی، نیز پھر نکاح میں رکھنے سے اب یہ نکاح بلا طلاق کے ہو جائے گا۔

اگر مطلقہ کی عدت پاکی یا وضع حمل ہو، اور وہ عدت کے اختتام کا دعویٰ کرے، اور شوہر انکار کرے، تو عورت کو قسم دلائی جائے گی (اور اس کی بات تسلیم کی جائے گی) جب کہ اتنی مدت میں یہ ممکن بھی ہو، گو اس کی عام عادت کے خلاف ہو۔

اگر شوہر رجعیہ سے صحبت کرے، تو اس وطی بالشبہ کی وجہ سے از سرِ نو عدت ضروری ہے، جسمیں طلاق کی بقیہ عدت بھی داخل ہوگی، م۔ ثلاً طلاق کے عدت کی دو پاکی گذرنے کے بعد صحبت کرے، اب دوبارہ تین پاکی عدت گذارے، جس میں پہلی پاکی طلاق اور شبہ دونوں کی مشترکہ عدت ہے، تو شوہر اس پہلی پاکی میں رجعت کر سکتا ہے، بقیہ دو پاکی میں نہیں، لیکن اگر اس صحبت سے بیوی حاملہ ہو جائے تو اب دونوں کی عدت وضع حمل (زچگی) ہے، لہٰذا وضع حمل سے قبل رجعت کر سکتا ہے۔

بیوی یا اس کے ولی کی رضامندی یا علم کے بغیر بھی رجعت صحیح ہے۔

رجعیہ کے احکام: عورت کو طلاقِ رجعی دینے کے بعد عدت میں اس سے تمتع وانتفاع حرام ہے، اور حرام سمجھنے والا شخص ایسی کوئی حرکت کرے تو تعزیری سزا کا مستحق ہوگا علماء کے اختلاف کی وجہ سے صحبت کرنے سے حد نافذ نہ ہوگی۔ صحبت کرنے کی وجہ سے شوہر پر مہر مثل واجب ہوگی، گو وہ بعد میں رجعت کرلے، کیونکہ رجعیہ صحبت کی حرمت میں بائنہ کے مثل ہے، لہٰذا مہر میں بھی اس کے مثل ہوگی۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ رجعیہ عورت قرآن کی پانچ آیتوں میں بیوی ہے، یعنی اُن آیات میں مذکورہ مسائل میں بیوی کی طرح رجعیہ بھی شامل ہے: ایلاء، میراث، لعان، ظہار اور طلاق (گو بالعوض ہو) لیکن ظہار اور ایلاء کا حکم رجعت کے بعد ہی ثابت ہوگا۔

مذکورہ پانچ آیات یہ ہیں:

(۱)"لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ "(البقرہ:۲۲۶)(۲)"وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ "(النساء:۱۲)

(۳)"وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ أَزْوَاجَهُمْ "(النور:۶)(۴)"وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَائِهِمْ "(المجادلۃ:۳)

(۵)"وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ"(البقرہ:۲۳۲)

زوجین میں جدائی کے انواع

(۱) ایسی جدائی جس سے بیوی حرام ہو، اور رجعت سے یہ حرمت ختم ہو، یعنی طلاق رجعی

(۲) وہ جدائی جس کی حرمت جدید نکاح سے ختم ہو، یعنی صحبت سے پہلے ایک یا دو طلاق، یا صحبت کے بعد بلا عوض ایک یا دو طلاق دے اور عدت ختم ہونے تک رجعت نہ کرے، یا ایک یا دو طلاق بالعوض دے، یا کسی عیب یا شوہر کی تنگ دستی کی وجہ سے نکاح فسخ کیا جائے تو ان صورتوں میں دوسرے شوہر سے نکاح کے بغیر بھی یہ شوہر جدید نکاح کرے تو حرمت ختم ہوگی۔

(۳) ایسی جدائی جس کی حرمت اسی وقت ختم ہوگی کہ بیوی کا دوسرے کسی شوہر سے نکاح وصحبت ہو، پھر وہاں سے جدائی کے بعد اب پہلا شوہر جدید نکاح کرے، یہ اپنی بیوی کو تین طلاق دینے کی صورت میں مسئلہ ہے، خواہ بیوی سے صحبت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

(۴) ایسی جدائی کہ حرمت آئندہ کبھی بھی ختم نہ ہو، جبکہ شوہر لعان کرے۔

پہلی صورت میں بیوی رجعیہ کہلائے گی، اور بقیہ صورتوں میں بائنہ کہلائے گی۔ (بائنہ یعنی جو جدا ہو چکی) دوسری صورت کو بَيْنُوْنَةِ صُغْرٰى (چھوٹی جدائی) اور تیسری صورت کو بَيْنُوْنَةِ كُبْرٰى (بڑی جدائی) کہا جاتا ہے۔ (المجموع ۲۶۲/۱۷-۲۸۸، فتح الوھاب مع الجمل ۳۸۵/۴-۳۹۴، تحفہ مع الحواشی ۲۶۳/۱۰-۲۷۸، الفقہ المنہجی ۱۳۹/۴، شرح التنبیہ ۲/۱۷۶، نہایہ ۵۷/۷-۶۴)

ایلاء

آیت: "لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَآءُوْ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "(البقرہ:۲۲۶-۲۲۷)

ترجمہ: "جولوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ سے زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں (کے پاس جانے) سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے، پھر اگر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کرلیں تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، رحمت

فرمائیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔"

عربی میں ایلاء حلف (قسم) کو کہتے ہیں، یہ جاہلیت میں بائنہ طلاق شمار ہوتی تھی، تو شریعت نے اس کا حکم بدل کر آیت کے مطابق چار ماہ تک انتظار اور رجوع یا طلاق کی طرف منتقل کیا۔ شرعاً شوہر کا مطلقاً (یعنی بلا قید مدت) یا چار ماہ سے زائد مدت تک اپنی بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانا ایلاء کہلاتا ہے، اور ایذاء و تکلیف کی وجہ سے یہ حرام ہے۔

ایلاء کے ارکان

(۱) زوجین (۲) محلوف بہ (۳) محلوف علیہ (۴) مدت (۵) صیغہ

(۱) **زوجین**: زوجین میں یہ شرط ہے کہ شرعاً و حساً صحبت ممکن ہو، اور شوہر میں طلاق کی صحت کے شرائط موجود ہوں، گو وہ غلام یا مریض یا خصی یا کافر یا نشہ میں ہو، یا بیوی باندی یا بیمار یا کمسن ہو، لیکن ایلاء کی مدت میں صحبت کے قابل ہو، اور اس قابلیت کے بعد ایلاء کے بقدر مدت باقی ہو۔

بچہ، پاگل، مکرہ اور ایسے شخص کا ایلاء صحیح نہیں جس کا ذَکَر (عضو تناسل) شل (خشک و لنجا) ہو چکا ہو، یا اتنا کٹا ہو کہ حَشَفہ (سپاری) کے بقدر بھی باقی نہ ہو، کیونکہ ان صورتوں میں بیوی کی ایذاء کا قصد موجود نہیں ہے، کیونکہ ویسے بھی صحبت ممکن نہیں ہے۔

شوہر کے علاوہ ایلاء صحیح نہیں، کسی پرائی عورت سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھالے، پھر اس سے نکاح کر لے، تب بھی ایلاء نہ ہو گا، بلکہ صرف عام قسم شمار ہو گا، رتقاء اور قرناء بیوی سے ایلاء صحیح نہیں، رجعیہ سے ایلاء صحیح ہے، کیونکہ صحبت ممکن ہے، گرچہ رجعت پر موقوف ہو۔

(۲) **مَحْلُوفٌ بِہ** (جس کی قسم لی جائے): محلوف بہ کی شرط یہ ہے کہ اللہ کا نام یا اس کی صفت ہو، جیسے اللہ کی قسم، یا رحمن کی قسم، میں تجھ سے صحبت نہ کروں گا۔

یا محلوف بہ ایسی چیز کا التزام ہو جو نذر کی وجہ سے لازم ہوتی ہو، یا طلاق یا آزادی کو معلق کرنا ہو، اور چار ماہ کے بعد ہی قسم سے آزاد ہو جاتا ہے (نہ کہ چار ماہ میں یا کم میں) مثلاً: اگر میں نے تجھ سے صحبت کی تو اللہ کے لئے مجھ پر نماز لازم، یا روزہ، یا حج، یا (غلام کی) آزادی، یا میں نے تجھ سے صحبت کی تو تیری سوکن کو طلاق، یا میرا غلام آزاد، کیونکہ ان صورتوں میں شوہر مذکورہ امور کے لازم ہونے یا طلاق و آزادی کی وجہ سے بیوی سے صحبت کرنے سے رکے گا جیسا کہ اللہ کی قسم لینے میں رکے گا۔

اگر چار ماہ تک قسم ختم ہو جائے تو ایلاء نہ ہو گا۔ (کسی چیز کو لازم کرنے، یا طلاق آزادی کو معلق کرنے کو بھی عموماً فقہی اصطلاح میں حلف اور قسم کہا جاتا ہے)۔ (مثلاً: مُحرّم میں کوئی بیوی سے کہے: اگر میں نے تجھ سے صحبت کی تو مجھ پر ماہِ ربیع الاول کے روزے لازم، تو یہ ایلاء نہیں، کیونکہ ربیع الاول کے گذرنے کے بعد صحبت سے روزہ وغیرہ لازم نہ ہو گا، اور یہ چار ماہ میں ہی گذر رہا ہے۔ اگر اس کے بجائے جمادی الاول یا بعد کے روزے لازم قرار دے تو ایلاء ہو گا، کیونکہ چار ماہ کے بعد بھی قسم باقی رہے گی)

(۳) **محلوف علیہ** (جس بات پر قسم لی جائے): یہ شرط ہے کہ محلوف علیہ شرعی صحبت کا ترک کرنا ہو۔

لہٰذا محلوف علیہ یہ امور ہوں تو ایلاء نہ ہو گا: صحبت کے علاوہ دیگر لطف اندوزی (بوس و کنار وغیرہ) کا ترک، پچھلی شرم گاہ میں صحبت کا ترک، حیض یا احرام میں صحبت کا ترک،

اگر کوئی کہے: واللہ میں تو تم سے پچھلی شرم گاہ کے علاوہ کہیں اور صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء ہو گا۔

(۴)**مدت:** ایک قسم میں چار ماہ سے زائد مدت ہونا شرط ہے۔

اگر کوئی مطلقاً (کسی مدت کی قید کے بغیر) کہے: واللہ (قسم بخدا) میں تجھ سے صحبت نہ کروں گا، یا ہمیشہ کی قید لگائے کہ کبھی بھی نہ کروں گا، یا چار ماہ سے زائد کی قید لگائے، مثلاً: قسم بخدا میں تجھ سے پانچ ماہ صحبت نہ کروں گا، یا ایسی قید لگائے کہ اس مدت میں اس کا حصول بعید ہو، مثلاً: قسم خدا کی حضرت عیسیٰ نبیناوعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزول تک تجھ سے صحبت نہ کروں گا، یا میری موت تک، یا تیری موت تک، یا فلاں کی موت تک تو ان تمام صورتوں میں ایلاء ہو گا۔

اگر کوئی کہے: قسم بخدا میں تجھ سے پانچ ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو پھر قسم بخدا تجھ سے ایک سال صحبت نہ کروں گا، تو یہ دو ایلاء ہوئے، لہٰذا بیوی پانچویں ماہ پہلے ایلاء کے مُوْجِب یعنی رجوع یا طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اگر رجوع کر لیا، تو اس کے موجب سے بری ہو گیا۔ پانچویں ماہ کے ختم ہوتے ہی دوسرے ایلاء کی مدت شروع ہو گی، اب اس کے چار ماہ گذرنے کے بعد اس ایلاء کے موجب کا تقاضا کر سکتی ہے۔ اگر پہلے ایلاء میں پانچ ماہ گذر گئے تو اب مطالبہ نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ ایلاء ختم ہو چکا، اسی طرح دوسرے ایلاء کا ایک سال گذر جائے تو اب مطالبہ کا حق ختم ہو گیا۔

اگر کوئی صرف چار ماہ یا اس سے کم مدت کے لئے ترکِ صحبت کی قسم کھائے، تو یہ ایلاء نہ ہو گا، بلکہ صرف قسم شمار ہو گی (اور مقررہ مدت کے اندر صحبت کرے تو قسم کا کفارہ ادا کرنا لازم ہو گا) اسی طرح ایک سے زائد قسم میں چار ماہ سے زائد مدت کی قید ہو، تو ایلاء نہ ہو گا، گو اسے ایذاءرسانی کا گناہ ہو گا، لیکن ایلاء کا خصوصی گناہ نہ ہو گا، مثلاً اس طرح کہا، واللہ میں تجھ سے چار ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو واللہ مزید چار ماہ تجھ سے صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء نہیں ہے، کیونکہ پہلے چار ماہ کے گذرنے پر وہ قسم ختم ہو گئی، اس لئے مطالبہ کا سوال نہیں، اور دوسرے قسم کی چار ماہ کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اگر دوسری مرتبہ قسم کا لفظ نہ دوہرائے، مثلاً اس طرح کہے: واللہ میں تجھ سے چار ماہ صحبت نہ کروں گا، پھر یہ مدت گذر جائے تو پھر مزید چار ماہ تجھ سے صحبت نہ کروں گا، تو یہ ایلاء ہے، کیونکہ ایک ہی قسم میں چار ماہ سے زائد مدت کی قید آ گئی۔

ایلاء میں چار ماہ کی مدت تک رخصت اس لئے دی گئی کہ اس کے بعد شوہر کے تعلق سے ایک عورت کی قوتِ برداشت جواب دے گی، یا کم ہو جائے گی۔

(۵)**صیغہ:** صیغہ ایسا ہو جو ایلاء پر دلالت کرے۔

صریح الفاظ، حشفہ کو فرج میں غائب کرنا، وطی کرنا، جماع کرنا وغیرہ مثلاً اس طرح کہنا: قسم بخدا میں اپنا حشفہ تیرے فرج (شرم گاہ) میں غائب نہ کروں گا، یا تجھ سے وطی (صحبت) نہ کروں گا، یا تجھ سے جماع نہ کروں گا۔

کنایہ الفاظ: مُلَامَسَہ، مُبَاضَعَہ، مُبَاشَرَت، آنا، ڈھانکنا وغیرہ، مثلاً: میں تجھ سے مباشرت نہ کروں گا، یا تیرے پاس نہ آؤں گا، یا تجھے نہ ڈھانکوں گا (مباشرت کا لفظ عربی میں عام ہے) کنایہ لفظ صحبت کی نیت سے ادا کرے تو ایلاء ہو گا ورنہ نہیں۔

اگر کوئی اپنی بیوی سے کہے: اگر تجھ سے صحبت کروں تو تیری سوکن کو طلاق، تو مخاطبہ بیوی سے ایلاء شمار ہو گا، اگر اس سے صحبت کر لے تو سوکن کو طلاق ہو گی، اور ایلاء ختم ہو جائے گا۔

اگر مثلاً کوئی کہے: واللہ میں تجھ سے سال میں صرف ایک مرتبہ صحبت کروں گا، پھر ایک مرتبہ صحبت کے بعد چار ماہ سے زائد مدت باقی ہو، تو ایلاء ہے ورنہ نہیں۔

ایلاء کے احکام

(جو شوہر ایلاء کرے اسے مُوْلِی کہا جائے گا)

مُوْلِی کو ایلاء کے وقت سے مسلسل (پے در پے) چار ماہ کی مدت مہلت دینا واجب ہے، اس مہلت کے لئے قاضی و حاکم کوئی ضروری نہیں، کیونکہ قرآن پاک نے خود صراحتاً اس کا فیصلہ دیا ہے۔ رجعیہ سے ایلاء کرے تو رجعت سے مدت شمار ہوگی۔

اگر شوہر کے اندر صحبت سے مانع کوئی امر موجود ہو، جو نکاح کے لئے مخل نہ ہو، تو اس کے باوجود ایلاء کی مدت شمار ہوگی، خواہ ابتداء سے موجود ہو، یا درمیان میں طاری ہو، نیز خواہ مانع شرعی ہو، جیسے فرض روزہ، فرض اعتکاف، احرام یا حسی ہو، جیسے مرض، قید یا پاگل پن وغیرہ۔

اگر عورت میں صحبت سے مانع حسی سبب موجود ہو، مثلاً نشوز، اتنی کمسن یا ایسا مرض کہ صحبت ممکن نہ ہو، یا شرعی سبب موجود ہو مثلاً فرض روزہ، فرض اعتکاف، احرام (فرض ہو یا نفل) تو ان اسباب کے خاتمہ کے بعد مدت شروع ہوگی، اگر دورانِ مدت ان میں سے کوئی مانع پایا جائے تو سابقہ مدت کا اعتبار نہ ہوگا، اب مانع ختم ہونے کے بعد چار ماہ سے زائد مدت باقی ہو، تو از سرِ نو مہلت کی مدت (چار ماہ) شمار ہوگی، کیونکہ مدت میں تسلسل ضروری ہے۔ چار ماہ کی مدت مکمل ہونے کے بعد ان میں سے کوئی مانع طاری ہو، تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا، عورت مطالبہ کرسکتی ہے، نفل روزہ، حیض و نفاس وغیرہ سے ایلاء کی مدت پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ (اس کے باوجود مدت شمار ہوگی)

چار ماہ کی مدت گذر جائے اور شوہر صحبت نہ کرے، اور بیوی میں کوئی مانع موجود نہ ہو، تو وہ قاضی کے توسط سے شوہر سے فِیْئَۃ (رجوع کرنے یعنی صحبت) کا یا طلاق کا مطالبہ کرے، (بعض علماء کے نزدیک پہلے فیئۃ کا مطالبہ کرے، اس سے انکار کرے تو پھر طلاق کا مطالبہ کرے) اگر شوہر دونوں سے انکار کرے، تو قاضی عورت کے مطالبہ پر شوہر کی طرف سے بطور نیابت ایک طلاق دے، قاضی اس طرح طلاق دے: میں نے اس عورت پر اس کے شوہر کی طرف سے ایک طلاق واقع کی، میں نے فلاں پر اس کی بیوی کے بارہ میں ایک طلاق کا فیصلہ دیا، میں نے اسے اس کے شوہر کی طرف سے طلاق دی، قاضی شوہر کی طرف منسوب نہ کرے تو طلاق نہ ہوگی۔

اگر بیوی مطالبہ کا حق ترک کردے، تو آئندہ بھی مطالبہ کرسکتی۔

فِیْئَۃ: حشفہ یا بقدر حشفہ (جبکہ حشفہ نہ ہو) بیوی کی اگلی شرم گاہ میں انتشار کے ساتھ غائب کرے (داخل کرے) تو اس سے فِیْئَۃ حاصل ہوگی، گو صحبت حرام ہو، حشفہ سے کم مقدار کا غائب کرنا کافی نہیں، اگر ایلاء میں اگلی شرم گاہ کی صراحت اور نیت نہ ہو، بلکہ مطلق ہو، تو پچھلی شرم گاہ میں صحبت سے بھی قسم ختم ہوجائے گی۔ اگرچہ یہ عمل حرام ہے۔ مدت کے بعد عورت میں حیض، مرض یا کمسنی وغیرہ کوئی مانع موجود ہو تو فی الحال مطالبہ نہیں کرسکتی، کیونکہ فی الحال صحبتِ مطلوبہ ممکن نہیں، مانع کے زائل ہونے کے بعد مطالبہ کرسکتی ہے۔

اگر شوہر میں کوئی طبعی مانع مثلاً مرض موجود ہو، تو زبان سے فِیْئَۃ کا مطالبہ کرے، یعنی شوہر یہ کہے کہ جب بھی صحبت پر قادر ہو جاؤں گا، فِیْئَۃ پر عمل کروں گا، اگر نہ مانے تو طلاق کا مطالبہ کرے۔ اگر شرعی مانع ہو، مثلاً احرام، فرض روزہ، تو طلاق کا مطالبہ کرے، کیونکہ اس وقت صحبت کی حرمت کی وجہ سے صرف یہی ممکن ہے۔

اگر شوہر حیض یا نفاس میں جماع کرے، یا دونوں میں سے کسی ایک کے احرام یا فرض روزہ کی حالت میں صحبت کرے، تو ایلاء ختم ہوا، (فیئۃ حاصل ہوا) گو گناہ ہوگا، اور بیوی کو ان صورتوں میں صحبت کا موقع دینا گناہ ہے۔

شوہر فیئۃ کے لئے کچھ مہلت مانگے، تو ایک دن تک مہلت دی جائے گی، اس سے زائد نہیں، زبان سے فیئۃ کرنا ہو، تو مہلت نہ دی جائے۔

شوہر نے اللہ کی قسم کھائی ہو، تو ایلاء کی مدت میں صحبت کرنے سے قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ اگر نذر میں لازم ہونے والی چیز کا التزام کیا ہو، تو وہ لازم ہوگی مثلاً صحبت کی صورت میں روزہ کا التزام کیا تو روزہ واجب ہوگا یا قسم کا کفارہ، اور طلاق یا آزادی کو معلق کا ہو تو وہ واقع ہوں گے۔

وقف: قسم کے بعد چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاق واقع نہ ہوگی، بلکہ مولی کے ساتھ وقف کا معاملہ کیا جائے گا، یعنی حسبِ تفصیل بالا اس سے فیئۃ یا طلاق کا مطالبہ کیا جائے گا، کیونکہ اللہ نے اسے چار ماہ کی مہلت دی ہے۔ تو اس مدت میں مطالبہ کا حق نہ ہوگا، جیساکہ کوئی چار ماہ کی مہلت پر کوئی چیز خریدے، تو اس مدت کے گذرنے کے بعد ہی فروخت کرنے والا قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے، نہ کہ چار ماہ کے اندر، نیز آیت میں فیئۃ کو مدتِ مہلت کے بعد فاء تعقیب کے ساتھ ذکر کیا ہے (جو فیئۃ کا مدت مذکورہ کے بعد ہونے پر دلالت کرتا ہے) نیز طلاق کو شوہر کے عزم کے ساتھ متعلق قرار دیا ہے، نہ کہ مدت کے گذرنے کے ساتھ، مزید اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فیئۃ اور طلاق میں اختیار دیا ہے، اور یہ ایک ہی حالت میں ہوتا ہے، آگے پیچھے ہو تو ترتیب ہوگا، نہ کہ تخییر، نیز عزیمتِ طلاق کے ساتھ اللہ کے سمیع ہونے کو (یعنی اللہ سننے والے ہیں) بیان کرنا اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ طلاق الفاظِ مسموعہ سے ہوگی (نہ کہ محض مدت گذرنے سے)

جمہور صحابہؓ وامت کا مسلک یہی ہے کہ محض چار ماہ گذرنے سے طلاق نہ ہوگی، بلکہ اس کے بعد فیئۃ یا طلاق کا مطالبہ ہوگا، امام بخاری نے اپنی صحیح میں نیز موطا میں امام مالک نے اسے ابن عمرؓ سے موصولاً پیش کیا ہے۔ نیز حضرات علیؓ ابو الدرداءؓ عائشہؓ، عثمانؓ سے بسند صحیح وقف کا قول مروی ہے۔ امام بخاری نے تاریخ میں اور امام بیہقی نے بسند صحیح ثابت بن عبید سے ۱۲ صحابہ کرام کا فتوی یہی پیش کیا ہے، حضرت ابو صالح فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ صحابہ کرام سے ایلاء کا مسئلہ پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''چار ماہ گذرنے تک اس پر کچھ بھی نہیں، پھر وقف پر عمل ہوگا، پس اگر وہ رجوع کرے تو ٹھیک ورنہ طلاق دے دے'' (دارقطنی۔ بیہقی واسنادہ صحیح علی شرط مسلم)

حضرت سلیمانؒ بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے دس سے کچھ زائد صحابہ کرام سے ملاقات کی، جو تمام مولی کے وقف کے قائل تھے'' (الشافعی والدار قطنی، ابن ابی شیبہ بسند صحیح علی شرط الشیخین) (بخاری مع فتح الباری ۴۲۶/۹، ارواء الغلیل ۱۶۹/۷، معرفۃ السنن ۵۱۷/۵، الام ۳۸۲/۵، الحاوی ۳۳۶/۱۰، المجموع ۲۸۸/۱۷، جمل مع الفتح ۳۹۴/۴، الفقہ المنہجی ۱۴۴/۴، اعانۃ ۳۴/۴، تحفہ ۲۸۶/۱۰، نہایۃ ۶۸/۷، مغنی ۳۴۳/۳)

ظِهَار

آیات: وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (المجادلۃ: ۳-۴)

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات میں عود کرتے ہیں، تو ان کے ذمہ ایک غلام یا

لونڈی کا آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں باہم اختلاط کریں، اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔ پھر جس کو (غلام لونڈی) میّسر نہ ہو تو اس کے ذمہ پیاپے (یعنی مسلسل لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ دونوں باہم اختلاط کریں، پھر جس سے یہ بھی نہ ہو سکیں تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ حکم اس لئے ہے، تاکہ اللہ اور رسول پر ایمان لے آؤ، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور کافروں کے لئے سخت دردناک عذاب ہو گا"۔

فائدہ: سورہ مجادلہ کی ہر آیت میں ایک یا دو تین مرتبہ اللہ کا نام موجود ہے، یہ بات کسی دوسری سورت میں نہیں ہے، سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ نصف قرآن اور اجزاء کے اعتبار سے دسواں حصہ ہے۔

ظہار دراصل ظہر (پشت) سے ماخوذ ہے، کیونکہ اس کی اصلی صورت یہ ہوتی تھی کہ اپنی بیوی سے کہا جاتا: "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ" (تو مجھ پر میرے والدہ کی پشت کی طرح ہے) امام ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرمایا کہ، جاہلیت میں کوئی اپنی بیوی سے مذکورہ جملہ کہتا تو وہ اس پر حرام ہو جاتی، پھر اسلام میں سب سے پہلے حضرت اوسؓ نے اپنی بیوی سے ظہار کیا، اور یہ معاملہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوا، تو سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور اس کا شرعی حل بتایا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ مجادلۃ ملخصاً)

حقیقت شرعی: ظہار کی شرعی حقیقت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو حرمت میں اپنے کسی محرم کے ساتھ تشبیہ دے۔ ظہار حرام اور کبیرہ گناہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے قولِ منکر وزور (نامعقول اور جھوٹ بات) قرار دیا ہے۔

ظہار کے ارکان

(۱) مُظاہِر (ظہار کرنے والا) (۲) مُظاہَرٌ مِنْھا (جس عورت سے ظہار کیا جائے) (۳) مُشَبَّہ بِہٖ (جس سے تشبیہ دی جائے) (۴) صیغہ

(۱) **مُظَاهِر:** ظہار کرنے والا ایسا شوہر ہو، جس کا طلاق دینا صحیح ہو (یعنی مظاہر میں مُطلّق کے شرائط ضروری ہیں) گو وہ غلام، کافر، خصی، مجبوب، یا نشہ میں ہو، شوہر کے سوا کسی کا ظہار صحیح نہیں، گو ظہار کرنے والا بعد میں اس عورت سے نکاح کر لے۔

اسی طرح بچہ، پاگل، اور مُکرَہ کا ظہار بھی صحیح نہیں۔

(۲) **مُظَاهَر مِنْها:** مُظاہَر مِنھا کا بیوی ہونا شرط ہے، گو وہ باندی، کمسن، پاگل، بیمار، رتقاء، قرناء، کافرہ یا رجعیہ ہو۔ اجنبیہ عورت سے ظہار درست نہیں، گو خلع شدہ ہو۔ اگر کسی پرائی عورت سے کہے: جب میں تم سے نکاح کر لوں، تو تم مجھ پر میری والدہ کی طرح ہو، تو ظہار صحیح نہ ہو گا گو بعد میں اس سے نکاح کر لے۔

ظہار کا تعلق صرف شوہر سے ہے، لہٰذا اگر بیوی شوہر سے کہے کہ تم مجھ پر میرے باپ کی پشت کی طرح ہو، یا میں تم پر تمہاری والدہ کی پشت کی طرح ہوں، تو بیوی پر کچھ لازم نہیں (اور اس سے ظہار نہ ہو گا)

(۳) **مُشَبَّه بِهٖ:** مشبہ بہ میں یہ شرط ہے کہ نسب، رضاعت، یا مصاہرت کی وجہ سے محرم ہو ایسی عورت سے یا اس کے جز سے تشبیہ دی جائے، جو اس کے لئے کبھی بھی حلال نہ تھی۔ مثلاً مظاہر کی نسبی بیٹی، بہن، اس کے ماں یا باپ کو دودھ پلانے والی عورت، باپ کی وہ بیوی جس سے اس کی پیدائش سے قبل باپ نے نکاح کیا ہو۔

کسی مرد یا خنثیٰ سے تشبیہ ظہار نہیں، نیز آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ سے تشبیہ بھی ظہار نہیں، کیونکہ ان سے نکاح کی حرمت محرم ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ کے شرف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح جو عورت کبھی اس کے لئے حلال رہ چکی ہو، اس سے تشبیہ بھی ظہار شمار نہ ہو گا، جیسے بہو، خود مظاہر کو دودھ پلانے والی، والد کی بیوی جس سے مظاہر کی ولادت کے بعد نکاح کیا ہو، وہ رضاعی بہن جو اس کے دودھ پینے سے قبل پیدا ہو چکی ہو وغیرہ۔

(۴) **صیغہ**: صیغہ ایسا لفظ ہونا شرط ہے، جو ظہار پر دلالت کرے، صریح الفاظ سے بلا نیت بھی اور کنایہ سے بصورت نیت ظہار صحیح ہو گا۔

صریح: تم، یا تمہارا سر یا ہاتھ یا بال یا ناخن، میرے ماں کی پشت یا جسم یا ہاتھ کی طرح ہے۔ یا مجھ پر میرے ماں کی پشت۔۔۔ کی طرح ہے، (مجھ پر کہنا ضروری نہیں)

کنایہ: تو میری والدہ کی طرح ہے، یا اس کے آنکھ کی طرح، یا کسی ایسے عضو کی طرح جو بطورِ کرامت (تعظیم و تکریم اور محبت) ذکر کیا جاتا ہو، جیسے سر روح وغیرہ، کیونکہ اس میں ظہار و غیر ظہار دونوں کا احتمال ہے۔

ظہار مؤقت: ظہار میں توقیت (مدت کی قید) صحیح ہے، مثلاً تو ایک ماہ یا ایک دن کے لئے میرے اوپر میری والدہ کی پشت کی طرح ہے، کیونکہ ایک صحابی سلمہ بن صخرؓ نے صرف رمضان گذرنے تک اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا، لیکن درمیان میں ہی اس سے صحبت کر بیٹھے تو آپ ﷺ نے انھیں کفارہ کا حکم دیا (احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم بیہقی۔ تلخیص ۲۲۱/۳، وصححہ الالبانی فی الارواء ۱۷۶/۷)

اگر کوئی اس طرح کہے: تم پانچ ماہ تک میری ماں کی پشت کی طرح ہو، تو یہ ظہار مؤقت بھی ہے اور ایلاء بھی، کیونکہ اس ظہار کی وجہ سے وہ چار ماہ سے زائد اس سے صحبت کرنے سے رکے گا۔

تعلیق: ظہار کو معلق کرنا (کسی امر پر موقوف رکھنا) صحیح ہے، کیونکہ اس سے طلاق کی طرح تحریم اور قسم کی طرح کفارہ متعلق ہے، اور یہ دونوں بھی تعلیق کو قبول کرتے ہیں، لہٰذا اگر بیوی سے کہا کہ تم گھر میں داخل ہوئی تو تم مجھ پر میری والدہ کی پیٹھ کی طرح ہو، پھر بیوی داخل ہوئی تو ظہار ہوا، یا یہ کہا کہ تیری سوکن سے ظہار کیا تو تو میری ماں کے پشت کی طرح، پھر سوکن سے ظہار کیا تو دونوں سے ظہار ہوا۔

ظہار کے احکام

اگر مظاہر عود کرے تو اس پر کفارہ لازم ہے، گو بعد میں طلاق وغیرہ کے ذریعہ اسے جدا کر دے۔

عود: ظہار کے بعد بیوی کو اتنی دیر اپنے نکاح میں باقی رکھنا، جس میں اسے (طلاق وغیرہ سے) جدا کر سکتا تھا، اور نہ کیا، تو یہ عود کہلائے گا۔ کیونکہ قول میں عود کا مطلب ہے، اس قول کی مخالفت، اور ظہار کا مقصود عورت کو تحریم سے موصوف کرنا ہے اور اسے اپنے نکاح میں باقی رکھنا اس تحریم کے خلاف ہے۔ اگر ظہار سے متصل شوہر پاگل ہو، یا بے ہوش ہو، یا موت کی وجہ سے یا کسی سببِ فسخ کی وجہ سے یا طلاق بائن یا رجعی کی وجہ (جبکہ رجعت نہ کرے) دونوں میں جدائی ہو جائے، تو عود نہ پایا گیا۔

رجعیہ سے عود یہ ہے کہ اس سے رجعت کر لے، خواہ ظہار سے قبل طلاق دی ہو، یا ظہار سے متصل بعد میں۔

اگر ظہار مؤقت ہو تو متعینہ مدت کی اندر حشفہ ورنہ بقدر حشفہ بیوی کی شرم گاہ میں غائب ہونے سے عود حاصل ہو گا، صرف مدت

گذرنے تک نکاح میں باقی رکھنے سے عود نہ ہو گا، اس طرح مدت کے اندر صحبت کرتے ہی فوراً جدا ہونا ضروری ہے، گو پہلی مرتبہ صحبت حلال ہے، کیونکہ ابھی تک عود نہیں ہوا تھا۔

تمتع: کفارہ کی ادائیگی سے قبل یا مؤقت ظہار میں مدتِ ظہار گذرنے سے قبل بیوی سے وہ تمام تمتع (انتفاع ولطف واندوزی) حرام ہے، جو حیض میں حرام ہے، (یعنی صرف ناف وگھٹنے کے درمیان تمتع حرام ہے)، کیونکہ آیت میں دو کفاروں کو 'تماس' (دونوں کے اختلاط) سے قبل واجب قرار دیا، تیسرے کو بھی اسی پر محمول کریں گے، ایک شخص نے ظہار کے بعد صحبت کی تو آپ ﷺ نے کفارہ کی ادائیگی تک کنارہ کشی کا حکم دیا۔ (اصحاب السنن وصححہ الترمذی۔ تلخیص ۳/۲۲۱)

ظہار مؤقت میں ایک مرتبہ صحبت کے ذریعہ عود کے بعد کفارہ کی ادائیگی اور مدت کے گذرنے سے پہلے تمتع حرام ہے، کسی ایک کے بعد حلال ہے، پس اگر کفارہ ادا کردے، اور ابھی مدت باقی ہو، تب بھی تمتع حلال ہے، اسی طرح مدت گذر جائے اور ابھی کفارہ نہ دیا ہو، تو تمتع حلال ہے، اور کفارہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ اگر عود ہی نہ کرے، یعنی مکمل مدت گذرنے تک بالکل صحبت نہ کرے، تو اب مدت کے بعد صحبت حرام نہیں، اور نہ کفارہ واجب ہو گا۔

عود کی وجہ سے کفارہ واجب ہونے کے بعد میاں بیوی یا کوئی ایک مرجائے، یا اسے بائنہ کردے، یا طلاق رجعی دے یا نکاح فسخ ہو جائے تو اس سے کفارہ ساقط نہ ہو گا۔ بیوی کو جدا کرنے کے بعد دوبارہ اس سے نکاح کرے تو کفارہ کی ادائیگی تک صحبت حرام ہے۔

معتمد قول یہ ہے کہ ظہار اور دیگر امور کا کفارہ علی التراخی ہے (یعنی فوراً ادا کرنا لازم نہیں، تاخیر کی گنجائش ہے) گو کفارہ کا سبب گناہ کا باعث ہو۔ لیکن ظہار میں صحبت کرنے کے بعد بظاہر فوراً کفارہ کی ادائیگی واجب ہے۔

(فتح الوہاب مع الجمل ۴/۴۰۴-۴۱۳، تحفہ مع الحواشی ۱۰/۳۱۸-۳۳۷، اعانہ ۴/۳۶، نہایہ مع الحواشی ۷/۸۱-۹۰، مغنی ۳/۳۵۲-۳۵۸، الفقہ المنہجی ۴/۱۴۶، المجموع ۱۷/۳۴۱-۳۶۶)

کَفَّارَہ

کفارہ دراصل کفر سے مشتق ہے، یعنی محو کرنا (مٹا دینا) یا چھپانا یا مؤاخذہ نہ کرنا، چونکہ کفارہ گناہ کو مٹاتا اور چھپاتا ہے، اور مؤاخذہ سے بچاتا ہے، اس لئے اسے کفارہ کہا گیا۔

نیت: کفارہ کی نیت واجب ہے، یعنی کفارہ کے طور پر غلام کی آزادی، روزہ، کھانا کھلانا یا لباس عطا کرنا کی نیت ہو، تاکہ نذر وغیرہ سے تمیز حاصل ہو، محض اپنے اوپر واجب روزہ وغیرہ کی نیت کافی نہیں، آزادی یا اطعام (اناج دینا) کے ساتھ متصلاً نیت واجب نہیں، بلکہ مقدم بھی کر سکتا ہے، مال کی تعین کے وقت نیت کرلے کہ یہ غلام کفارہ کی طرف سے آزاد کردوں گا، یا یہ اناج کفارہ میں دوں گا، تو پھر آزادی یا اطعام کے وقت اس نیت کا پیش نظر ہونا ضروری نہیں، روزہ کی نیت رات میں ہونا شرط ہے۔

ظہار کا کفارہ ہے یا کسی اور چیز کا اس کی تعیین ضروری نہیں، اگر کسی کے ذمہ ظہار اور قتل کے دو کفارے ہوں، اور (بلا تعیین مح۔ض) کفارہ کی نیت سے غلام آزاد کرے، یا روزہ رکھے، تو کسی ایک کی طرف سے ادا ہو گا، لیکن کوئی تعیین کرے اور اس میں غلطی ہو جائے، تو یہ کفارہ کافی نہ ہو گا، مثلاً کفارۂ قتل کی نیت کرے، حالانکہ اس کے ذمہ ظہار کا کفارہ تھا، تو یہ ظہار کی طرف سے ادا نہ ہو گا۔ کفارہ میں فرضیت کی نیت کرنا واجب نہیں ہے۔

قسم میں کفارہ ابتداء میں مُخیَّر ہے۔(یعنی مختلف کفاروں میں اختیار ہے) اور آخر میں مرتب ہے۔ جس کا تذکرہ قسم میں ہو گا۔ ظہار، قتل، اور رمضان میں جماع کی وجہ سے واجب کفارہ مرتب ہے، (یعنی پہلی صورت پر قادر ہو تو اسی کو انجام دینا ہے، عاجز ہو تو دوسری شکل اختیار کرے، وہ بھی ممکن نہ ہو، تب جا کر تیسری خصلت پر عمل کر سکتا ہے)

ظہار اور رمضان میں جماع کے کفارہ کے تین خصال (خصلتیں و قسمیں) ہیں یعنی آزادی، پھر روزہ، پھر اطعام، اور قتل کے کفارہ میں پہلے کی دو خصلتیں ہیں۔

(۱) مومن غلام یا باندی کی آزادی: ظہار وغیرہ کے کفارہ میں سرِ فہرست آزادی ہے، قتل کے کفارہ میں قرآن میں "رقبہ مؤمنہ" (مومن بردہ) کی قید آئی ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے اور مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہوئے ظہار وغیرہ کی آزادی میں بھی یہ قید شرط ہے، جیساکہ ایک آیت میں مردوں کی گواہی کے حکم کو دوسری آیت کی روشنی میں عادل کے ساتھ مقید کیا گیا۔

غلام باندی کو بلاعوض کفارہ کی جانب سے آزاد کرنا ضروری ہے، نیز ان میں ایسا کوئی عیب نہ ہو، جو کام کاج میں واضح خلل کا باعث ہو۔

(۲) روزے: اگر کفارہ کی ادائیگی کے وقت حساً یا شرعاً آزادی سے عاجز ہو، (جیساکہ آج کل عموماً ان کا وجود ہی نہیں کہ اس پر عمل کر سکیں)، تو مسلسل (پیاپے اور لگاتار) قمری دو ماہ کے روزے واجب ہیں۔ صرف کفارہ کی جانب سے روزے کی نیت کافی ہے، تسلسل کی نیت ضروری نہیں، اگر روزے کسی ماہ کے درمیان سے شروع کرے اور وہ مہینہ ۲۹ کا ہو، تب بھی تیسرے ماہ اتنے روزے رکھنا ضروری ہیں کہ مجموعہ ۳۰ ہو جائے (دوسرا ماہ ۲۹ کا ہو تو وہ کافی ہے)

اگر مرض، سفر، یا نیت بھول جانے کی وجہ سے ایک روزہ چھوٹ جائے، گو آخری ہو، تو تسلسل ختم ہو جائے گا، حاملہ یا مرضعہ خوف کی وجہ سے روزہ ترک کرے، یا دوسرے کسی ایسے عذر کی وجہ سے روزہ ترک ہو، جس کے ساتھ روزہ رکھنا صحیح ہو، تب بھی تسلسل ختم ہو گا۔

اگر بلاعذر فاسد کیا ہے، تو تمام روزے باطل قرار پائیں گے، عذر کی وجہ سے ہو تو نفل شمار ہوں گے۔

تسلسل ختم ہونے کی صورت میں از سر تو مکمل دو ماہ کے روزے واجب ہیں، بلاعذر تسلسل کو قطع کرنا حرام ہے، کیونکہ دو ماہ ایک دن کی طرح ہے، نیز اس دوران رات میں مظاہر کو مظاہر منھا سے صحبت کرنا حرام ہے، البتہ رات صحبت کرنے سے تسلسل ختم نہ ہو گا۔

حیض، نفاس، جنون اور مکمل دن بے ہوشی کی وجہ سے (روزہ ترک ہو) تو تسلسل ختم نہ ہو گا۔

(۳) اطعام (مساکین کو اناج دینا): اگر بوڑھاپے، یا ایسی بیماری کی وجہ سے جس کے متعلق عادت کی وجہ سے یا عادل طبیب کے کہنے کی وجہ سے یہ گمان ہو کہ (کم از کم) دو ماہ تک اس مرض کا سلسلہ جاری رہے گا، روزہ رکھنے سے یا تسلسل کے ساتھ رکھنے سے عاجز ہو، یا کافی مشقت لاحق ہوتی ہو، گو یہ مشقت شہوت کی قوت کی وجہ سے ہو، یا روزہ کی وجہ سے مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو، تو ظہار کے اور رمضان میں جماع کے کفارہ میں اطعام پر عمل کرے، یعنی زکات کے مستحق ساٹھ (۶۰) فقراء و مساکین کو صدقہ فطر کے جنس سے ایک ایک مد اناج کا مالک بنائے، اگر تیس مساکین کو دو دو مد دے تو یہ کافی نہیں، مزید ۳۰ مساکین کو ایک ایک مد دینا ضروری ہے، کیونکہ مساکین کی تعداد ۶۰ ہونا اور ہر ایک کو ایک مُد یا ایک مُد سے کم نہ ہونا ضروری ہے۔

کافر کو یا سادات کو دینا، جس کا نفقہ خود کفارہ ادا کرنے والے پر واجب ہو، اسے دینا کافی نہیں۔ اگر کھانا پکا کر فقراء و مساکین کو دو وقت کھلا دے تو یہ کافی نہیں، کیونکہ یہ دعوت ہے، جس میں صرف، اباحت ہوتی ہے، تملیک نہیں ہوتی۔

کفارہ کے تمام خصال سے عاجز ہو، تو کفارہ ساقط نہ ہو گا، بلکہ اس کے ذمہ باقی رہے گا، جب بھی کسی خصلت پر قادر ہو، اسے ادا

کرے، کیونکہ اعرابی کے اپنے آپ کو تینوں خصلتوں سے عاجز بتلانے کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے سپرد اناج کرکے کفارہ کی ادائیگی کا حکم دیا، اس سے پتہ چلا کہ کفارہ اس پر باقی تھا، غلام کا کچھ حصہ آزاد کرنا یا چند روزے رکھنا، کافی نہیں، لیکن چند مد اناج دے سکتا ہو، تو اتنے دے دے، بقیہ جب بھی گنجائش نکلے ادا کرے، بعض مد کی ادائیگی کے بعد آزادی یا روزہ پر قدرت حاصل ہو، تو وہ لازم نہیں کیونکہ اطعام شروع کر چکا ہے۔(المجموع ۱۷/۳۴۴-۳۸۴، فتح الوہاب مع الجمل ۴/۴۱۳-۴۲۳، الفقہ المنہجی ۴/۱۴۷، تحفہ مع الحواشی ۱۰/۳۳۸-۳۶۲، مغنی ۳/۳۵۹-۳۶۷، نہایہ مع الحواشی ۷/۹۰-۱۰۲)

لِعَانْ وَقَذْفَ

قَذْف: قذف عربی زبان میں پھینکنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، شرعاً کسی شخص کو عار دلانے کے طور پر زنا کی تہمت لگانا قذف کہلاتا ہے۔

لِعَان: لعان دراصل لَاعَنَ کا مصدر ہے، جس کا مطلب ہے دور کرنا، دھتکارنا، رسوا کرنا، اور گالی دینا

اپنے فراش (بستر) کو آلودہ کرنے والی (یعنی بیوی) اور عار لاحق کرنے والی کو قذف کرنے پر یا بچے کے نسب کی اپنی ذات سے نفی کرنے پر، جو مجبور ہو، اس کے حق میں بطور حجت و دلیل جو کلمات (جملے) معلوم و مخصوص ہیں، اسے لعان کہا جاتا ہے۔ اسے لعان کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس میں لعنت کا لفظ پایا جاتا ہے، نیز میاں بیوی لعان کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا اور دور ہو جاتے ہیں۔

لعان کے کلمات دراصل قسم ہیں، گو شہادت (گواہی) کے الفاظ میں ہیں، اسی لئے جو اس میں جھوٹا ہو اس پر چار کفارے لازم ہیں۔

حکمت: عام حالات میں کسی کو قذف کرنے کی صورت میں حد قذف عائد ہوگی، (جبکہ گواہوں کو پیش نہ کرے) لیکن کوئی شخص اپنی بیوی کو قذف کرے تو لعان کے مخصوص احکام عائد ہوتے ہیں۔ اس فرق و امتیاز کا سبب یہ ہے کہ کسی دوسرے کو قذف کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ سچا ہو یا جھوٹا، بلکہ اسلامی وآداب کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالے، اور تنہائی میں اسے نصیحت کرکے اصلاح کی کوشش کرے۔

لیکن کسی کی بیوی بدکاری کا ارتکاب کرکے اس کی عزت پر دھبہ لگائے تو یہ ایک ایسا عذر شرعی ہے کہ شریعت نے لعان کی شکل میں نجات کا راستہ بتلایا۔ اگر طلاق دے کر اسے جدا کر دے، تو بیوی کی اس حرکت کے مقابلہ میں کسی بدلہ کے بغیر محض شوہر کو مہر وغیرہ کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، لہٰذا زوجین کے تعلق سے قذف کی صورت میں لعان کے امتیازی حکم کے ذریعے دونوں کے حق میں ایک منصفانہ فیصلہ دیا گیا، اور دونوں کو ایک دوسرے کے بے جا ظلم کا شکار ہونے سے بچایا گیا۔

آیت: ''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنِ''(النور ۶-۹)

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور ان کے پاس بجز اپنے اور کوئی گواہ نہ ہوں (جن کا عدد میں چار ہونا چاہیئے) تو ان کی شہادت (جو کہ حبس یا حد قذف کو دفع کرے) یہی ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اس عورت سے سزا (یعنی حبس یا حد زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے کہ بے شک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ سچا ہو''

صحیحین وغیرہ میں حضرت ہلال بن اُمیّہ اور حضرت عُوَیمِر عَجلانی اور ان کی بیویوں کے لعان کی تفصیلات موجود ہیں۔

قذف کے صریح الفاظ: تونے زنا کیا، اے زانی، اے زانیہ، تیرے عضو تناسل نے یا تیرے فرج (شرم گاہ) نے یا تیرے بدن نے زنا کیا، تونے اپنے حشفہ کو حرام فرج میں داخل کیا، یا دبر (پچھلی شرم گاہ) میں داخل کیا۔

کسی دوسرے کے اولاد کو یہ کہے کہ تو اس کی اولاد نہیں ہے، تو یہ اس کے ماں پر صریح تہمت ہوگی۔

قذف کے کنایہ الفاظ: تیرے ہاتھ یا پیر نے زنا کیا، اے فاجر (فاجرہ)، اے فاسق (فاسقہ) تجھے تنہائی پسند ہے، (کسی عورت سے جس کا مباح طریقہ سے ثیبہ ہونا معلوم نہ ہو یہ کہنا کہ) میں نے تجھے باکرہ (کنواری، دوشیزہ) نہیں پایا، کسی عربی کو نَبَطی کہہ کر پکارنا (جو عراق کی ایک قوم ہے) یا اسکے برعکس، اپنے بیٹے سے یہ کہنا کہ تو میرا بیٹا نہیں، (والد کی یہ بات بطور تادیب و تنبیہ بھی ہوسکتی ہے، اس لئے یہ کنایہ ہے، اگر پوچھنے پر کہے کہ زنا کی اولاد ہے تو قذف ہے، یا یہ کہے کہ شکل وصورت یا اخلاق میں میرے مشابہ نہیں، تو قسم کے ساتھ اس دعوی کو تسلیم کریں گے)

تعریض: اے حلال زادہ، میں زانی نہیں ہوں، یہ الفاظ کوئی قذف کی نیت سے کہے، تب بھی قذف شمار نہ ہوں گے، کیونکہ نیت کا اعتبار اس وقت ہوگا، جب کہ الفاظ میں اس مفہوم کی کچھ گنجائش بھی ہو، اور ان الفاظ میں ایسا کوئی احتمال موجود نہیں، اس سے اگر ایسا مفہوم ذہن میں آئے تو قرائن احوال کی وجہ سے ہے (نہ کہ الفاظ کے احتمال کی وجہ سے)

قذف کے قصد سے مستعمل لفظ میں دوسرے مفہوم کا احتمال نہ ہو، تو یہ صریح کہلائے گا، ورنہ اگر اپنی وضع کے اعتبار سے قذف کا مفہوم نکل آئے تو کنایہ ہے (یعنی جس میں وضع کے اعتبار سے قذف اور غیر قذف دونوں کا احتمال ہو تو کنایہ کہلائے گا) ورنہ تعریض کہلائے گا (یعنی جو بالکل قذف کے لئے موضوع نہ ہو، بلکہ صرف قرائن سے مقصود سمجھ میں آئے، تو تعریض ہے۔ امام ابن السبکی فرماتے ہیں کہ تعریض وہ لفظ ہے جو اپنے معنی میں مستعمل ہو تاکہ دوسرے معنی کی طرف اشارہ کرے)

قذف کی سزا: جو کسی مُحۡصَنۡ کو قذف کرے، اس پر حد نافذ ہوگی، فرمانِ باری ہے: "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ الخ (النور: ۴)

ترجمہ: "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی دُرّے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول مت کرو، اور یہ لوگ فاسق ہیں"۔

اور کسی غیر محصن کو قذف کرے تو اس کو تعزیری سزا ملے گی، کیونکہ اس نے ایسی معصیت کا ارتکاب کیا ہے، جس میں حد یا کفارہ نہیں ہے۔ بیوی کو قذف کرے یا کسی دوسرے کو، یہی تفصیل رہے گی (حد و تعزیر کی تفصیل متعلقہ ابواب میں موجود ہے)

مُحۡصَن: جس شخص کو قذف کرنے سے حد نافذ ہوتی ہے، اس سے مکلف، آزاد اور زنا، اور بیوی کے دُبر میں صحبت سے پاکدامن مسلمان مراد (حدِ قذف کے مسئلہ میں اسی کو محصن کہا جاتا ہے) اپنی بیوی سے حیض یا نفاس میں صحبت کرے، تب بھی محصن شمار ہوگا (گو یہ فعل حرام ہے)

اگر کوئی شخص مذکورہ بالا شرائط کے مطابق محصن نہ ہو، تو اسے قذف کرنے والے پر حدِ قذف نافذ نہ ہوگی، گو وہ شخص توبہ کرکے ایک صالح زندگی گذار رہا ہو۔

شوہر کا بیوی کو قذف کرنا: ان دو صورتوں میں شوہر بیوی کو قذف کرسکتا ہے:

(۱) بیوی کے زنا کا یقین ہو، مثلاً اپنی آنکھ سے اس حرکت کو دیکھا،

(۲) زنا کا پختہ گمان حاصل ہو، مثلاً اس کا زید کے ساتھ زنا مشہور ہو اور ساتھ کوئی قرینہ بھی ہو، جیسے دونوں کو تنہائی میں دیکھا، یا زید کو اس کے پاس سے نکلتے دیکھا، صرف شہرت یا صرف قرینہ کافی نہیں۔

مذکورہ صورتوں میں اگر بچہ کی نفی کا مسئلہ نہ ہو، تو اس مسئلہ پر پردہ ڈالنا اور اس کے ساتھ رہنا گوارہ نہ ہو، تو اسے طلاق دینا بہتر ہے، (بہ نسبت اس کے کہ قذف کرکے لعان کرے)

بچہ کا انکار: اگر بیوی کو بچہ پیدا ہو، اور شوہر کو یقین ہو، یا پختہ گمان ہو، کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے، (اور انکار نہ کرے تو بظاہر اس کا شمار ہو سکتا ہو)، تو اس بچہ کا انکار کرنا کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے، لازم ہے، کیونکہ ورنہ بچہ کا نسب اس سے جڑے گا، اور غیر کے بچہ کو اپنی طرف منسوب کرنا حرام ہے، جیسا کہ اپنے بچہ کا انکار حرام ہے۔

بچہ اپنا نہ ہونے کے یقین یا پختہ گمان کی صورتیں: ابھی تک بیوی سے صحبت ہی نہیں کی، یا صحبت کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ تولد ہو، یا صحبت سے چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو۔

بچہ کے انکار کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بیوی کو قذف کرے (جب کہ زنا کا یقین یا پختہ گمان ہو) پھر لعان کرے، بچہ کے انکار کے لئے یہ دونوں بھی لازم ہیں، اگر زنا کا یقین یا پختہ گمان نہ ہو، تو قذف نہ کرے، کیونکہ بچہ شبہ کی وطی وغیرہ سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن بچہ کی نفی لازم ہے، لہٰذا (لعان کے مشہور الفاظ کے بجائے) اس طرح کہے: میرے بستر پر دوسرے کی اس کے ساتھ صحبت کی تہمت میں میں سچا ہوں، اور یہ بچہ اسی صحبت سے ہے۔ (یہاں بستر سے ظاہری مفہوم کے بجائے باقاعدہ اپنی زوجیت میں ہونا مراد ہے)

اگر بچہ اپنا نہ ہونے کا یقین یا پختہ گمان نہ ہو، تو اس کی نفی نیز قذف ولعان حرام ہے مثلاً زنا سے چھ ماہ کے اندر بچہ پیدا ہو، اور دل میں کچھ تردد وغیرہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اگر کوئی صحبت کرے اور عزل کرے (باہر انزال کرے) تب بھی بچہ کی نفی کرنا جائز نہیں۔

لعان

شوہر کے لعان کی کیفیت: چار مرتبہ اس طرح کہے: "اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنِّیْ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ فِیْمَا رَمَیْتُ بِهٖ هٰذِهٖ مِنَ الزِّنَا" (میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اسے (اپنی بیوی کو) جو زنا کی تہمت لگائی ہے، اس میں میں بلاشبہ سچا ہوں)

پھر پانچویں مرتبہ کہے: "اِنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیَّ اِنْ کُنْتُ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ فِیْهِ" (بے شک مجھ پر اللہ کی لعنت ہو، اگر میں اس میں (یعنی بیوی کو زنا کی تہمت لگانے میں) جھوٹا ہوں)

مذکورہ الفاظ اس وقت کہے گا، جب کہ بیوی روبرو حاضر ہو۔ اگر حاضر نہ ہو تو اس کا نام ونسب بیان کرے کہ وضاحت ویقین ہو جائے۔ لعان میں معاملہ کی تاکید کے پیش نظر چار مرتبہ شہادت کو دوہرایا گیا، نیز شوہر کی جانب سے یہ کلمات چار گواہوں کے قائم مقام ہے، یہ درحقیقت قسمیں ہیں، اور پانچواں جملہ پہلے جملوں کے مفاد کی تاکید کے لئے ہے۔

اگر بچہ کا انکار بھی کرنا ہو، تو پانچوں جملوں میں اس کا بھی ذکر کرے، یعنی یہ کہے کہ اس کا بچہ (یا یہ بچہ) زنا سے ہے (بہتر ہے کہ آگے یہ بھی کہہ دے، میرا نہیں ہے) صرف یہ کہنا کہ میرا نہیں ہے، کافی نہیں، پانچویں مرتبہ یہ بڑھا دے:۔۔۔ اگر میں۔۔۔ اس دعوی میں جھوٹا ہوں کہ بچہ زنا سے ہے، میرا نہیں ہے۔۔۔

اگر لعان کے کسی جملہ میں بچہ کی نفی نہ کرے تو اس کے لئے شوہر کو از سرِ نو لعان کرنا ضروری ہے۔ بیوی کو دوبارہ لعان کرنے کی

ضرورت نہیں۔

بیوی کا لعان: شوہر لعان سے فارغ ہو جائے، تو بیوی اس طرح لعان کرے:

چار مرتبہ یہ جملے کہے: "اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ فِيْمَا رَمَانِيْ بِهٖ مِنَ الزِّنَا"

(میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتی ہوں کہ بے شک اس نے مجھ پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے، اس میں یہ جھوٹا ہے)

پانچوں مرتبہ یہ جملہ کہے: "اِنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيَّ اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ فِيْهِ" (بے شک اللہ کا غضب ہو مجھ پر، اگر اس تہمت میں یہ سچا ہو)

عورت کو اپنے لعان میں بچہ کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ شوہر نے بیوی کو قذف کیا ہو، اور بیوی نے گواہوں کے ذریعہ قذف کو ثابت نہ کیا ہو، اگر صرف بچہ کا انکار مقصد ہو، مثلاً وطی بالشبہ سے بھی ہو سکتا ہو، یا گواہوں کے ذریعہ بیوی نے شوہر کا قذف ثابت کیا ہو، تو پہلی صورت میں اس طرح کہے۔۔۔ میرے فراش پر اس کے ساتھ دوسرے کے صحبت کی تہمت ۔۔اور یہ کہ یہ بچہ اسی صحبت سے ہے۔۔ اور دوسری صورت میں اس طرح کہے:۔۔۔ اُس نے مجھ پر جو زنا کی تہمت کو ثابت کیا ہے۔۔۔

پہلی صورت (یعنی وطی بالشبہ کی نسبت) میں عورت لعان نہ کرے، کیونکہ اس میں اس پر حد عائد نہیں ہوتی کہ اس کے دفع کرنے کے لئے لعان کرنا پڑے۔

شرائط: (۱) بیوی کا لعان شوہر کے لعان کے بعد ہونا شرط ہے، کیونکہ بیوی کا لعان اس پر عائد ہونے والی سزا کو دور کرنے کے لئے ہے، اور یہ سزا شوہر کے لعان سے واجب ہو گی، لہٰذا اس سے قبل لعان کی کوئی ضرورت نہیں ہے (۲) لعنت اور غضب کا لفظ پہلے کے چار جملوں کے بعد ہی ہونا شرط ہے (۳) مذکورہ جملوں میں شہادت، لعنت، اور غضب کے الفاظ کی جگہ کسی دوسرے الفاظ کا استعمال کرے تو لعان صحیح نہ ہو گا، تاکہ قرآنی الفاظ کی اتباع ورعایت ہو۔ (۴) لعان کے پانچوں جملے مسلسل ادا ہوں، درمیان میں زیادہ فاصلہ نہ ہو، زوجین کا لعان مسلسل ہونا ضروری نہیں، دونوں میں کافی فصل ہو جائے، تب بھی کافی ہے۔

(۵) قاضی (حاکم) لعان کے کلمات کی تلقین کرے (یعنی کہلوائے) شوہر اور بیوی سے کہے کہ اس طرح کہو۔۔۔، (قاضی اجمالاً صرف کلمات لعان کی ادائیگی کا حکم دے تو بظاہر یہ بھی کافی ہے، قاضی کا باقاعدہ مکمل جملے ادا کرنا ضروری نہیں)، قاضی کی تلقین کے بغیر ہی لعان کے جملے ادا کرنا معتبر نہیں زنا کے سلسلہ میں لعان کے لئے محکم بھی کافی ہے، غیر مکلف بچہ کے انکار کے لئے محکم کافی نہیں، اگر مکلف ہو اور تحکیم سے راضی ہو تو کافی ہے۔ قذف ولعان غیر عربی زبان میں بھی صحیح ہے، گو وہ عربی سے واقف ہو، اسی طرح گونگے کے بامفہوم اشارہ یا تحریر کے ذریعہ بھی قذف ولعان صحیح ہے۔ لہٰذا اشارہ یا تحریر کو لعان میں پانچ مرتبہ ادا کرے، اگر بامفہوم اشارہ اور تحریر پر قادر نہ ہو، تو اس کا قذف ولعان صحیح نہیں، جیسا کہ دیگر تصرفات صحیح نہیں، کیونکہ اس کا منشاء معلوم ہونا دشوار ہے۔

سنتیں: (۱) وقت اور جگہ کے اعتبار سے تغلیظ (موکد کرنا) سنت ہے، پس عصر کے بعد لعان کروائے، کیونکہ صحیحین کی حدیث کی رو سے اس وقت جھوٹی قسم کی سزا زیادہ سخت ہے، ممکن ہو تو بروزِ جمعہ عصر بعد کرانا بہتر ہے۔ لعان کے لئے بستی کی اشرف وزیادہ بابرکت جگہ کا انتخاب کرے، پس مکہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان، بیت المقدس میں صخرہ کے پاس، اور دیگر بستیوں میں جامع مسجد کے منبر پر لعان کروائے۔

یہود ونصاریٰ اور آتش پرستوں کو ان کی عبادت گاہوں میں لعان کروائے، لیکن بت پرستوں کے لعان کے لئے ان کے بت کدہ

میں نہ جائے، بلکہ فیصلہ کی جگہ میں ہی لعان کروائے۔

(۲) بوقتِ لعان بستی کے معتبر و نیک افراد موجود ہوں، کم از کم چار افراد ہوں، جو گواہی کے قابل اور لعان کی زبان سے واقف ہوں۔

(۳) ایک شخص پیچھے سے آکر شوہر کے منہ پر اور ایک عورت بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا، قاضی یا اس کا نائب ان دونوں کو وعظ و نصیحت کرے، اور قرآن کی آیت پڑھ کر سمجھائے کہ دنیوی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور معمولی ہے۔

(۴) پانچویں جملہ سے قبل پر زور انداز میں سمجھائے، شوہر سے کہے کہ اللہ سے ڈرو، کیونکہ پانچواں جملہ اللہ کی لعنت کو واجب کردے گا، بیوی سے بھی اسی طرح کہے کہ غضب کو واجب کردے گا، شاید کہ وہ باز آجائیں، ایک شخص کو شوہر کے منہ پر اور ایک عورت کو بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا حکم دے، جیسا کہ ابوداود میں یہ حکم موجود ہے۔ بقول امام الحرمین وغزالی ہاتھ رکھنے والا پیچھے سے آئے۔ اگر باز نہ آئیں تو پانچواں جملہ بھی تلقین کرے۔

(۵) میاں بیوی ایک دوسرے کے روبرو ہوں، اور ایک دوسرے کا کلام سن سکتے ہوں۔

(۶) شوہر کھڑا ہو کر لعان کے کلمات ادا کرے، اور بیوی بیٹھی رہے، پھر وہ کھڑی ہو کر ادا کرے اور شوہر بیٹھا رہے۔

بغیر عذر کے مذکورہ کسی سنت کی خلاف ورزی مکروہ ہے۔

مُلَاعِن (لعان کرنے والا): مُلَاعِن ایسا شوہر ہو، جس کا طلاق دینا درست ہو، گو ذمی ہو یا نشہ میں ہو، شوہر بیوی کے زنا پر گواہوں کو پیش کر سکتا ہو، تب بھی (پیش نہ کرتے ہوئے) لعان کرنا بالاجماع جائز ہے، جب کہ بچہ کی نفی کرنا ہو، گو بیوی کا حد قذف معاف کرے اور طلاق وغیرہ کے ذریعہ اس سے جدا ہو چکی ہو، اسی طرح بیوی سزا کا مطالبہ کرے، تو اسے دفع کرنے کے لئے لعان کر سکتا ہے، گو وہ جدا ہو چکی ہو اور بچہ نہ ہو۔

اگر کسی چھوٹی بچی کو تہمت لگائے، جس سے صحبت ممکن نہ ہو، یا بڑی عورت کا زنا گواہوں یا اس کے اقرار سے ثابت ہونے کے بعد اسے تہمت لگائے، تو شوہر کو تادیباً تعزیری سزا ملے گی، اور اس سزا کے دفع کرنے کے لئے لعان کی اجازت نہیں۔

اگر بیوی کا زنا گواہوں سے یا اقرار سے ثابت ہو، یا بیوی سزا معاف کردے، یا سزا کا مطالبہ ہی نہ کرے، یا قذف کے بعد بیوی پاگل ہو جائے، اور ان تمام صورتوں میں بچہ نہ ہو، تو لعان نہیں کیا جائے گا۔

شوھر کے لعان پر مرتب احکام: شوہر لعان کے تمام الفاظ سے فارغ ہو جائے تو درج ذیل احکام مرتب ہوں گے (گو بیوی لعان نہ کرے)

(۱) ظاہراً باطناً نکاح فسخ ہو گا (۲) دونوں ہمیشہ ہمیش کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہوں گے، گو بعد میں شوہر خود کو جھٹلائے (کہ میں اس تہمت و لعان میں جھوٹا تھا) بیہقی کی روایت میں ہے کہ ”دو لعان کرنے والے کبھی بھی آپس میں جمع نہ ہوں گے“ (بعضوں نے کہا کہ جنت میں بھی یہ دونوں جمع نہ ہوں گے)

اگر شوہر خود کو جھٹلائے، تو اس پر سزا عائد ہو گی، نیز بچہ کا نسب ثابت ہو گا، اور پرورش کی ذمہ داری عائد ہو گی، اور بیوی کی سزا ساقط ہو گی۔

(۳) لعان میں جس بچہ کی نفی کی ہو، اس کا نسب اس سے کٹ جائے گا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے دونوں (میاں بیوی) کو جدا کر دیا، اور بچہ کو عورت کے ساتھ جوڑ دیا“

(۴) بیوی کی جانب سے جو سزا (قذف کی وجہ سے) شوہر پر عائد ہو رہی تھی، وہ ساقط ہو گی، اگر لعان میں زانی کا بھی نام لے تو اس کے قذف کی سزا بھی ساقط ہو گی۔

(۵) اگر بیوی لعان نہ کرے تو اس شوہر کے حق میں وہ مُحصَن شمار نہ ہو گی۔

(۶) شوہر کے لعان کرنے سے بیوی زنا کے سزا کی مستحق ہو گی، اور اس سزا کو دفع کرنے کے لئے بیوی لعان کر سکتی ہے، اگر گواہوں سے زنا ثابت ہو، تو لعان سے سزا ساقط نہ ہو گی، اگر بظاہر بچہ کسی درجہ میں شوہر کا ہو سکتا ہو، تب اس کی نفی کرے گا، اگر اس کا امکان ہی نہ ہو (مثلاً نکاح سے چھ ماہ کے اندر رہی بچہ پیدا ہو، یا مجلس نکاح میں ہی طلاق دی تھی، یا شوہر ممسوح ہو، یا نکاح کے وقت سے شوہر مشرق میں اور بیوی مغرب میں ہو) تو بچہ کی نفی کے لئے لعان نہ کرے، کیونکہ جب شوہر کا ہو ہی نہیں سکتا، تو لعان کے بغیر بھی اس کا نسب اس سے نہ جڑے گا۔

بچہ کا انکار: بچہ کا انکار کرنا ہو، تو فوراً حاکم کو اس کی اطلاع دینا ضروری ہے، (گو باقاعدہ لعان کے ذریعہ انکار کے مطابق فیصلہ بعد میں ہو) اگر فوراً حاکم تک پہنچنے میں کچھ عذر در پیش ہو مثلاً (بچہ کی پیدائش کی) خبر رات کو ملی، اس لئے صبح تک مؤخر کیا، یا نماز کا وقت ہو چکا تھا، اس لئے پہلے نماز ادا کی، یا بھوکا تھا لہٰذا پہلے کھانا کھالیا، تو (اس تاخیر میں) وہ معذور سمجھا جائے گا۔

اگر وہ قید میں ہو یا مریض ہو، یا مال ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو کسی کو قاضی کے پاس روانہ کرے، تاکہ وہ اپنا نائب اس کے پاس روانہ کر دے، تاکہ یہ اس نائب کے سامنے لعان کر لے، یا قاضی کو اطلاع دے کہ میں بچہ کے انکار پر قائم ہوں، اگر اس طرح نہ کرے تو اس کا حق باطل ہو گا، اگر کسی کو روانہ کرنا بھی دشوار ہو، تو اپنے انکار پر گواہ قائم کرے، جبکہ یہ ممکن ہو، امکان کے باوجود کسی کو گواہ نہ رکھا، تو حق باطل ہو گا، اگر گواہوں کا قائم کرنا بھی دشوار ہو، تو حق باطل نہ ہو گا۔

حمل کا انکار: شوہر حمل کی حالت میں ہی حمل کا انکار کر سکتا ہے۔ (یعنی یہ کہ بیوی کے پیٹ کا بچہ میرا نہیں ہے) جیسا کہ صحیحین میں حضرت ہلال بن امیہ کا حمل کی طرف سے لعان کرنا موجود ہے۔

بیوی کے پیٹ میں حمل ہی ہے، اس بات کے یقین کے لئے زچگی تک لعان مؤخر کر سکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے پیٹ میں حمل کے علاوہ کچھ اور بیماری ہو۔ اگر اس لئے لعان مؤخر کرے کہ بچہ مردہ پیدا ہو، تو لعان کی نوبت ہی نہ آئے، تو اس کا حق باطل ہو گا۔

اگر انکار کو مؤخر کرے، اور کہے کہ مجھے زچگی کا علم نہیں تھا، اور اس کی لاعلمی ممکن ہو، تو قسم دلا کر تصدیق کی جائے گی، اگر لاعلمی کا امکان نہ ہو تو تسلیم نہ کریں گے۔ اگر نفی کے مسئلہ سے یا فوراً نفی کرنے سے لاعلمی کا دعوی کرے، اور وہ شخص تازہ ہی اسلام میں داخل ہوا ہو، یا علماء سے دور پرورش پایا ہو، یا عام آدمی ہو، تو قسم کے ساتھ اس کا دعوی تسلیم کیا جائے گا۔

جڑواں بچے: اگر دو بچوں کی پیدائش کے درمیان چھ ماہ سے کم مدت ہو، تو یہ جڑواں شمار ہوں گے، لہٰذا صرف ایک کا انکار کرنا قبول نہ ہو گا، بلکہ پہلے بچے کے وقت اس کا انکار کرے، پھر دوسرا پیدا ہو اور سکوت اختیار کرے، تو دونوں کا نسب اس سے جڑے گا، اگر دوسرے کا بھی فوراً انکار کرے، تو دونوں مُنتفی ہوں گے۔ دونوں کے انکار کے بعد ایک کا بھی اقرار کرے تو دونوں کا نسب اس سے جڑے گا۔

اگر دو بچوں کی پیدائش میں چھ ماہ یا زائد مدت کا فاصلہ ہو جائے، تو یہ دونوں جدا جدا حمل ہیں، لہٰذا صرف کسی ایک کی نفی کرنا صحیح ہے۔

(فتح الوہاب مع الجمل ۴/۴۲۳-۴۴۰، مغنی ۳/۳۶۷-۳۸۳، تحفہ مع الحواشی ۱۰/۳۶۳-۴۱۱، نہایہ مع

الحواشی۷/۱۰۳-۱۲۵، الام ۵/۴۱۰-۴۲۴، المجموع۱۷/۳۸۵-۴۵۸، الفقه المنہجی ۴/۱۵۰، معرفۃ السنن ۵/۵۴۱-۵۶۷)

عِدَّت

تعریف: عدت عَدَد (شمار۔ گنتی) سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ غالباً چند پاکی یا ماہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اصطلاحاً عدت اس معین مدت کا نام ہے، جو ایک عورت اللہ تعالیٰ کے لئے تعبّداً یا شوہر پر رنج وغم کے طور پر یا برأت رحم (یعنی پیٹ میں حمل نہ ہونے) کے اطمینان کے لئے گذارتی اور انتظار کرتی اور اپنے آپ کو (نکاح سے) روکتی ہے۔ (جس حکم کا مقصد بظاہر انسانی عقل میں نہ آئے، اسے تعبدی حکم کہیں گے، خواہ عبادت ہو یا کچھ اور)

دلیل: قرآن کریم کی کئی آیات اور بکثرت احادیث سے عدت کی مشروعیت ثابت ہے، اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ آئندہ عدت کے مختلف احکام اور تفاصیل کے دوران متعلقہ آیات وروایات کا تذکرہ ہوگا۔

عدت کے اقسام: (۱) حمل، یہ سب سے قوی عدت ہے، اور اس میں استبراء (برأت رحم) کا پہلو تعبد کے بمقابلہ قوی ہے۔

(۲) پاکی (طُہر۔ اقراء)، یہ درمیانی درجہ کی عدت ہے، اس میں استبراء وتعبد دونوں مساوی درجہ میں ہیں۔

(۳) ماہ، یہ ضعیف عدت ہے، اگر صحبت کے بعد ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ممکن ہو، تو تعبد واستبراء دونوں ہیں، اور صحبت سے قبل وفات کی وجہ سے ہو تو محض تعبدی عدت ہے۔

حکمت: (۱) اگر شوہر کی وفات کی وجہ سے عدت لازم ہو، تو یہ جدا ہونے والے شوہر کے حق کی وفا ہے، نیز جاہلیت کے مختلف ظلم وستم اور زیادتی کے احکام کو ختم کرکے اس کی جگہ ایک مناسب اور معقول حکم کی مشروعیت ہے۔

(۲) زندگی میں طلاق وغیرہ کی وجہ سے جدائی ہو، اور عدت لازم ہو، تو اس میں یہ حکمتیں ہیں: نسب کی حفاظت، برأتِ رحم کا اطمینان، تعبدی پہلو، نکاح کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور اس کے مناسب شرعی اہمیت کو واضح کرنا۔

زندگی میں جدائی کی عدت

اگر شوہر کی زندگی میں زوجیت کا رشتہ طلاق یا فسخ کی وجہ سے ختم ہو جائے تو بیوی پر عدت واجب ہے، جب کہ شوہر کی محترم منی (عورت کی شرم گاہ میں) داخل ہو، یا اُس سے صحبت کرے، گو دُبُر میں صحبت کرے۔ اسی طرح برأت رحم کا یقین ہو، تب بھی عدت لازم ہے، مثلاً شوہر یا بیوی کمسن ہو، کیونکہ دلائل عام ہیں، نیز انزال نگاہ سے پوشیدہ ہے، جس پر حمل کا دارومدار ہے، لہٰذا اس سے قطع نظر اس کے سبب یعنی صحبت یا منی کے داخل کرنے کو کافی سمجھا گیا، جیسا کہ سفر کی رخصتوں میں مشقت سے قطع نظر صرف سفر کو بنیاد بنایا گیا۔

اگر صحبت اور منی کا دخول نہ پایا گیا، تو عدت واجب نہیں، گو خَلوت ہو چکی ہو، (یعنی دونوں تنہائی میں مل چکے ہوں)

آیت: ”یٰاَیُّهَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَـكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا“ (الاحزاب: ۴۹)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم جب مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم ان کو ہاتھ لگانے کے قبل (کسی اتفاق سے) طلاق دے دو، تو تمہاری ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں، جس کو تم شمار کرنے لگو“۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے وطی بالشبہ کرے، تو اس سے بھی عدت واجب ہو گی۔

وطی بالشُبہ: شُبہ کی وطی سے وہ وطی مراد ہے، جس میں وطی کرنے والے پر حد نہ آئے (مثلاً نکاح فاسد میں وطی، یا اپنی بیوی سمجھ کر پرائی عورت سے وطی وغیرہ) گو عورت پر حد آئے، مثلاً کسی قریب البلوغ شخص کا کسی بالغہ سے یا کسی پاگل کا کسی عاقلہ سے صحبت کرنا۔ البتہ اکراہ کی وجہ سے کوئی زنا کرے تو اس سے نہ عدت واجب ہو گی، اور نہ نسب ثابت ہو گا، گو زانی پر حد نافذ نہ ہو گی۔

محترم منی کا مطلب یہ ہے کہ منی کے نکلتے وقت اس کے گمان میں یا حقیقت میں وہ لذاتہ حرام نہ ہو۔ پس زنا یا بیوی کے علاوہ کسی کے استمناء کی وجہ سے نکلنے والی منی محترم نہیں، اور اس کے دخول سے عدت واجب نہ ہو گی۔

حائضہ کی عدت: مذکورہ بالا صورت میں اگر عورت آزاد ہو، اور اسے حیض آتا ہو، (گو کسی دوا کے استعمال سے حیض شروع ہو) تو اس کی عدت تین قُرُوْءَ ہے، اور یہاں قرء سے دو حیض کے درمیان، یا حیض و نفاس کے درمیان یا دو نفاس کے درمیان کی پاکی مراد ہے۔

آیت: (۱) "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ" (البقرۃ: ۲۲۸)

ترجمہ: "اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین طُہر (ختم ہونے) تک (نکاح سے) روکے رکھیں"۔

(۲) "إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" (الطلاق: ۱) یعنی بیویوں کو طلاق دینا ہو تو عدت کے وقت میں دی جائے، اور وہ پاکی کا وقت ہے، کیونکہ حیض میں طلاق حرام ہے، صحیحین وغیرہ کی احادیث میں آپ ﷺ نے پاکی میں طلاق کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہی وہ عدت ہے، جس میں اللہ نے طلاق کا حکم دیا ہے۔ نیز طلاق کے ساتھ ہی عدت کی ابتداء بھی ہو گی، جب کہ طہر کو عدت شمار کیا جائے۔

لفظ قُرء عربی میں حیض و طہر دونوں میں بطورِ اشتراک مستعمل ہے، مؤطا امام مالک اور بیہقی میں حضرت عائشہؓ سے، اور امام مالک و شافعی نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر سے یہ نقل فرمایا ہے کہ طلاق کے بعد عورت کا تیسرا حیض شروع ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے سے بری ہو جائیں گے (یعنی تین طہر گذرتے ہی عدت ختم ہو گی) (تلخیص الحبیر ۲۳۳/۳)

اگر پاکی میں طلاق دے، اور طلاق کے بعد پاکی کا کچھ وقت باقی ہو (گو ایک لمحہ ہی ہو) تو تیسرا حیض شروع ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی، کیونکہ بقیہ طُہر (پاکی) بھی ایک 'قرئ' شمار ہو گا، اور اس طرح تین طہر حاصل ہو چکے، جس پاکی میں طلاق دی ہے، اس میں صحبت کر چکا ہو، تب بھی وہ پاکی ایک قرء شمار ہو گی، دو پاکی اور ایک کے کچھ حصہ پر تین پاکی کے اطلاق میں حرج نہیں، جیسا کہ حج کے اشہر معلومات سے شوال، ذوالقعدہ، اور بعض ذوالحجہ مراد ہیں۔ (حالانکہ اشہر جمع ہے، جس کا اطلاق عربی میں کم از کم تین پر ہوتا ہے)

اگر پاکی کے بالکل آخری لمحہ میں طلاق دے (کہ طلاق کے بعد پاکی کا وقت بالکل نہ ملے)، یا حیض کے دوران یا آخر میں طلاق دے، تو مکمل تین پاکی گذرنے کے بعد حیض شروع ہوتے ہی عدت ختم ہو گی۔ حیض کا ابتدائی لمحہ عدت میں داخل نہیں ہے، بلکہ اس سے عدت کے اختتام کا علم ہو گا۔

جس عورت کو ابھی تک حیض یا نفاس نہ آیا ہو، تو پاکی کی یہ مدت قرء شمار نہ ہو گی۔ غیر آزاد عورت کی عدت دو قُرءُ ہے۔

غیر حائضہ کی عدت: جس آزاد عورت کو ابھی تک حیض کا سلسلہ شروع نہ ہوا ہو، یا (بوڑھی ہونے کی وجہ سے حیض کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو اور) حیض سے ناامید ہو چکی ہو، (جسے آیسہ کہا جاتا ہے) تو اس کی عدت قمری تین ماہ ہیں۔ اگر ماہ کے ابتداء میں طلاق ہو،

توچاند کے اعتبار سے مکمل تین ماہ گذارے، خواہ مہینہ ۲۹ کا ہو یا ۳۰ کا، اور اگر درمیان میں طلاق ہو، تو چوتھے ماہ میں اتنے ایام گذارے کہ پہلے ماہ کے ایام سمیت ۳۰ دن مکمل ہوں، خواہ چاند انیتس کا ہو، یا تیس کا۔

آیت: "وَّاللائی یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّاللائی لَمْ یَحِضْنَ" (الطلاق: ۴)

ترجمہ: "اور تمہاری (مطلقہ) بیویوں میں سے جو عورتیں (زیادہ عمر کی وجہ سے) حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم کو (ان کی عدت کی تعیین میں) شبہ ہو، تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک کمر عمری کی وجہ سے) حیض نہیں آیا (ان کی عدت بھی تین مہینے ہیں)"

اس صورت میں ایک غیر آزاد عورت ڈیڑھ ماہ عدت گذارے گی۔ اگر کسی عورت کا حیض رُک جائے تو حیض شروع ہونے تک یا آیسہ کی عمر تک پہنچنے تک انتظار کرے، گو طویل مدت گذر جائے، کیونکہ یہ مذکورہ دونوں صورتوں میں داخل نہیں، کہ فی الحال تین ماہ عدت گذارے۔

جسے ابھی تک حیض نہ آیا ہو وہ آیسہ مہینے کے اعتبار سے عدت گذاریں، اور عدت ختم ہونے سے قبل حیض شروع ہو جائے، تو از سرِ نو پاکی کے ذریعہ عدت گذارے، سابقہ ایام شمار نہ ہوں گے، جسے ابھی تک حیض نہ آیا ہو، وہ مہینوں کے اعتبار سے عدت مکمل کرلے، پھر حیض شروع ہو، تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا (اس کی عدت ختم ہو چکی، از سرِ نو گذارنے کی ضرورت نہیں)

آیسہ مہینوں میں عدت گذارے، پھر دوسرے نکاح سے قبل حیض شروع ہو جائے، تو از سرِ نو قرء (پاکی) کے ذریعہ عدت گذارے، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آیسہ نہیں ہے، لیکن دوسرا نکاح ہو چکا ہو، تو اب اس پر کوئی عدت واجب نہیں۔

یاس یعنی حیض سے نااُمیدی کے سلسلہ میں جس حد تک ہمیں علم ہو سکتا ہو، ان تمام عورتوں کی عمر کا اعتبار کیا جائے گا، نہ کہ صرف اس عورت کے رشتہ دار عورتوں کا، اور نہ دنیا کے تمام عورتوں کا، غالباً یاس کی انتہائی عمر ۶۲ سال ہے۔

فائدہ: ابن النحوی کی 'عُجَالہ' میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے حیض کو روکنے کے لئے دوا استعمال کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا، اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر یاس کی عمر سے قبل کسی کا حیض رک جائے، تو اسے جاری کرنے کے لئے دوا کا استعمال جائز ہے۔ اگر کوئی یتیم لڑکی نکاح کی ضرورت مند ہو، تو دوا کے ذریعہ جلد حیض جاری کرنا (تاکہ بالغ ہونے کی وجہ سے نکاح ہو سکے) جائز ہونا قوی معلوم ہوتا ہے (قلائد ۲/۲۷۵)

حاملہ کی عدت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: " وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ "(طلاق: ۴)

ترجمہ: "اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے"۔

حاملہ عورت کی عدت وضع حمل (زچگی) ہے، یعنی بچہ مکمل ماں کے پیٹ سے باہر نکل جائے، بعض حصہ نکلنے سے عدت ختم نہ ہو گی، اگر (حمل کا علم نہ ہونے کی وجہ سے) پاکی یا مہینوں میں عدت گذرانے کے بعد بھی حمل ظاہر ہو، تو زچگی کے بعد ہی عدت ختم ہو گی۔

اگر حمل میں ایک سے زائد بچے ہوں، تو آخری بچے کے مکمل جدا ہونے کے بعد عدت ختم ہو گی، (پہلے بچے اور دیگر بچوں کی پیدائش کے درمیان چھے ماہ سے کم کا فاصلہ ہو، تو وہ ایک ہی حمل کے شمار ہوں گے، اس سے زائد فاصلہ ہو تو عدت پر موقوف نہ ہو گی)

اگر بچہ مردہ پیدا ہو، یا مُضغہ کی حالت میں اسقاط ہو اور پیٹ میں باقی رہتا تو بظاہر شکل وصورت کا ظہور ہوا ہوتا، یعنی ہاتھ، انگلی یا

ناخن وغیرہ ظاہر ہوں، یا دایہ یہ خبر دے کہ مزید رکتا تو صورت ظاہر ہوتی، تو ان صورتوں میں بھی عدت ختم ہو گی۔ اگر یہ شک ہو کہ یہ انسانی گوشت ہے، یا علقہ نکلے تو اس سے عدت ختم نہ ہو گی۔

اگر بچہ پیٹ میں مر جائے، تو اس کے نکلنے کے بعد ہی عدت ختم ہو گی، گو زیادہ مدت گذر جائے،

اگر بچہ کسی غیر انسانی شکل میں پیدا ہو، تو اس سے بھی عدت ختم ہو گی۔

وضع حمل سے عدت اسی صورت میں ختم ہو گی، جب کہ وہ حمل صاحبِ عدت (یعنی شوہر یا شبہ سے صحبت کرنے والے) کی طرف منسوب ہو، گو احتمال کے درجہ میں، جیسے لعان کے ذریعہ جس بچہ کی نفی کی گئی، لہٰذا کسی حاملہ سے لعان کرکے اس کے حمل کی نفی کرے، تو وضع حمل سے اس عورت کی عدت ختم ہو گی۔ حمل کی نسبت صاحبِ عدت کی طرف ممکن نہ ہو، تو اس سے عدت ختم نہ ہو گی، مثلاً شوہر موت کے وقت ۹ سال سے کم عمر ہو، یا ممسوح ہو اور اس کی بیوی حاملہ ہو، تو وضعِ حمل سے عدت ختم نہ ہو گی۔ خصی یا مجبوب ہو، تو عدت ختم ہو گی اور بچہ اس کی طرف منسوب ہو گا۔

مسئلہ: کسی کی صحبتِ شبہ کی وجہ سے عورت عدت میں ہو، تو وہ شخص اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ جو عورت زنا سے حاملہ ہو، اس سے نکاح صحیح ہے، اور (وضع حمل تک) صحبت کرنا مکروہ ہے، اگر اس کے دخول کے امکان کے بعد چھے ماہ سے زائد عرصہ میں بچہ پیدا ہو تو اس (شوہر) کا شمار ہو گا، اگر نفی کرنا ہو، تو لعان لازم ہے۔ (قلائد: ۲/۲۷۵)

اگر عدت کے دوران عورت کو پیٹ میں گرانی یا حرکت کی وجہ سے حمل کا شک ہو، تو اس کے شک کے ازالہ تک دوسرا نکاح نہ کرے، اگر نکاح کرے تو باطل ہو گا، جب کہ بعد میں حمل ظاہر ہو، اگر حمل نہ ہو، تو ابن حجرؒ نے فرمایا کہ نکاح صحیح ہے، کیونکہ عقود میں اصل یہ ہے کہ نفس الامر اور حقیقت کا اعتبار ہو گا، بعض دیگر علماء نے دونوں صورتوں میں نکاح کو باطل قرار دیا ہے۔

اگر (مہینوں یا پاکی کی) عدت ختم ہونے کے بعد حمل کا شک ہو، تو اس کے ازالہ تک صبر کرنا سنت ہے۔ اگر شک کے ازالہ سے قبل نکاح کر لے، یا نکاح کے بعد یہ شک ہوا ہو تو نکاح باطل نہ ہو گا، البتہ نکاح کے بعد چھے ماہ کے اندر اسے بچہ پیدا ہو، تو معلوم ہوا کہ نکاح باطل تھا، اور بچہ پہلے شوہر کا ہو گا، جب کہ اس کی طرف نسبت ممکن ہو، اگر چھے ماہ یا زائد مدت میں بچہ پیدا ہو تو دوسرے شوہر کا شمار ہو گا (اور نکاح بھی صحیح شمار ہو گا)

اگر موت یا طلاق وغیرہ کی وجہ سے بیوی کی جدائی ہو، پھر اس جدائی سے قبل حاملہ ہونے کے امکان کے وقت سے چار سال یا اس سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو، تو یہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہو گا۔ جب کہ اس عورت نے کسی دوسرے سے نکاح نہ کیا ہو، یا نکاح تو کیا ہو، لیکن بچہ کے اس کی طرف نسبت کا امکان نہ ہو۔ اگر چار سال کے بعد بچہ پیدا ہو، تو اس کی طرف مسنوب نہ ہو گا۔ اگر عورت (مہینے یا پاکی کی) عدت گذار کر دوسرا نکاح کرے، پھر حمل کے امکان سے چھ ماہ یا زائد مدت کے بعد بچہ پیدا ہو، تو اس دوسرے شوہر کا شمار ہو گا، اگر عدت میں نکاح فاسد کرے، اور دوسرے شوہر کو اس کا علم نہ ہو، اور اتنی مدت میں بچہ پیدا ہو کہ اسی دوسرے شوہر کا ہو سکتا ہے، پہلے کا نہیں ہو سکتا، تو دوسرے کی طرف منسوب ہو گا، اگر پہلے کا ہو سکتا ہے، نہ کہ دوسرے کا، تو پہلے کی طرف منسوب ہو گا۔ اگر اتنی مدت میں پیدا ہو کہ دونوں کا ہو سکتا ہے، تو قائف (قیافہ شناس) کے روبرو پیش کریں گے، اگر وہ کسی ایک کے ساتھ جوڑے، تو اسی کی طرف منسوب ہو گا، اگر وہ دونوں سے جوڑے، یا دونوں سے نفی کرے، یا اسے بھی اشتباہ ہو، یا اس جگہ مسافتِ قصر کے اندر کوئی قائف ہی نہ ہو، تو اس بچہ کے بالغ ہونے اور خود کسی ایک کی طرف نسبت کرنے کا انتظار کریں گے، اگر وہ کسی کی بھی طرف نسبت نہ کرے تو اس پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔

اگر دوسرا شوہر یہ سمجھ کر نکاح کرے کہ عدت ختم ہو چکی، یا اس کا گمان یہ ہو کہ عدت میں نکاح حرام نہیں، اور وہ ابھی اسلام لایا ہو یا علماء سے دور پلا بڑھا ہو، اور صحبت کرے، تب یہ ساری تفصیل ہو گی، ورنہ دانستہ اس طرح کرے تو یہ زنا شمار ہو گا۔

اگر بچہ اتنی مدت میں پیدا ہو کہ دونوں کا نہیں ہو سکتا، یعنی دوسرے کی صحبت سے چھ ماہ کے اندر اور پہلے کی جدائی کے چار سال کے بعد پیدا ہو، تو کسی کی طرف بھی منسوب نہ ہو گا۔

ایک عورت کی دو عدتوں میں تداخل

ایک شخص کی عدت: اگر کسی عورت پر ایک ہی شخص کی ایک ہی جنس کی دو عدتیں لازم ہوں، تو دونوں میں تداخل ہو گا۔ مثلاً: کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے، پھر مہینوں یا پاکی والی رجعی عدت میں اس سے صحبت کرے، یا بائنہ عدت میں اسے مطلقہ کے بجائے اپنی بیوی سمجھتے ہوئے، یا قربِ اسلام یا بُعدِ علماء کی وجہ سے صحبت کی حرمت سے لاعلمی کی وجہ سے صحبت کرے، تو طلاق کی اور اس شبہ کی صحبت کی عدت میں تداخل ہو گا، لہٰذا اس صحبت سے فارغ ہونے کے بعد وہ از سرِ نو صحبتِ شبہ کی عدت شروع کرے گی، اور اسی میں طلاق کی بقیہ عدت بھی شمار ہو گی۔ طلاق رجعی کی صورت میں طلاق کی بقیہ عدت میں رجعت کر سکتا ہے، نہ کہ بعد میں۔

مثال: طلاق کی عدت کے دو ماہ گذرنے کے بعد صحبتِ شبہ کرے، تو اب مزید تین ماہ عدت گذارے، جس میں پہلا مہینہ بہ یک وقت طلاق کی عدت کا تیسرا مہینہ اور شبہ کی عدت کا پہلا مہینہ شمار ہو گا۔ اب اگر طلاقِ رجعی تھی تو طلاق کی عدت کے تیسرے ماہ کی تکمیل تک رجعت کر سکتا ہے، بقیہ دو ماہ جو خالص شبہ کی عدت ہے، اس میں رجعت نہیں کر سکتا (بائنہ عدت میں دانستہ صحبت کرے تو یہ زنا ہے)

اگر دونوں عدت دو جنس کی ہوں، مثلاً حمل اور پاکی، تب بھی تداخل ہو گا، لہٰذا کسی غیر حاملہ عورت کو طلاق دے، پھر پاکی کی عدت میں صحبتِ شبہ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے، یا حاملہ کو طلاق دے اور دورانِ عدت صحبتِ شبہ کرے، تو پاکی کی عدت بھی وضعِ حمل میں داخل ہو جائے گی، اور وضعِ حمل سے دونوں عدت ختم ہوں گی، اور طلاقِ رجعی ہو، تو وضعِ حمل سے قبل رجعت کر سکتا ہے، خواہ حمل طلاق سے قبل ہو، یا صحبتِ شبہ کی وجہ سے ہو، اگر کسی عورت کو دورانِ حمل حیض آتا ہو، تب بھی اس کا اعتبار نہ ہو گا۔ بلکہ وضعِ حمل ہی سے دونوں عدت ختم ہوں گی۔

دو اشخاص کی عدت: کسی عورت پر دو اشخاص کی دو عدت لازم ہوں، تو تداخل نہ ہو گا، کیونکہ عدت کے مستحق جدا ہیں، بلکہ ہر ایک کے لئے مستقل مکمل عدت گذارے گی، جیسا کہ امام مالکؒ و شافعیؒ نے حضرت عمرؓ سے، اور امام شافعیؒ، دار قطنیؒ و بیہقیؒ نے حضرت علیؓ سے نقل فرمایا ہے۔ (تلخیص ۳/۲۳۶) مثلاً: شوہر کی عدت کے دوران یا شبہ کی عدت کے دوران دوسرا شخص صحبتِ شبہ کرے، یا کوئی شبہ کی عدت کے دوران اپنی بیوی کو طلاق دے، تو تداخل نہ ہو گا۔ اس صورت میں حمل والی عدت مقدم ہو گی، خواہ اس کا سبب مقدم ہو، یا مؤخر، کیونکہ اس عدت میں تاخیر کی گنجائش نہیں، اگر طلاق دینے والے کا حمل ہو، پھر صحبت شبہ ہو، تو وضعِ حمل سے طلاق کی عدت ختم ہو گی، اب نفاس کے بعد پاکی کے ذریعہ شبہ کی عدت گذارے۔

اگر حمل نہ ہو، تو طلاق کی عدت شبہ کی عدت پر مقدم ہو گی، گو صحبتِ شبہ طلاق پر مقدم ہو، کیونکہ عقد جائز کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یہ قوی ہے۔

اگر رجعی طلاق ہو تو شوہر مذکورہ صورتوں میں اپنی عدت میں یا اس سے قبل اس سے رجعت کر سکتا ہے، گو وہ نفاس میں ہو، البتہ صحبتِ شبہ کے تعلق سے جتنی مدت وہ عورت اس کا فراش شمار ہو گی، اس میں رجعت درست نہیں، اسی طرح دوسرے کی عدت میں

تجدیدِ نکاح صحیح نہیں ہے۔ رجعت کے بعد اب اگر وہ حاملہ نہ ہو، تو طلاق کی عدت ختم ہو گی اب شبہ کی عدت گذارے، اگر طلاق مقدم ہو تو مکمل عدتِ شبہ گذارے، اور مؤخر ہو، تو بقیہ عدت کی تکمیل کرے، رجعت کے بعد عدتِ شبہ کی تکمیل تک بیوی سے استمتاع (صحبت وغیرہ) جائز نہیں، اگر شوہر سے حاملہ تھی، تب بھی وہ عدت ختم ہو چکی، اب وضعِ حمل اور نفاس کے بعد شبہ کی عدت گذارے، اس صورت میں نفاس کے ختم ہونے تک تمتع جائز ہے۔ کیونکہ وہ ایسی بیوی ہے، جو کسی دوسرے کی عدت میں نہیں ہے، اگر صحبتِ شبہ کی وجہ سے حاملہ عورت سے رجعت کرے، تو وضع حمل تک تمتع جائز نہیں۔

معتدہ کے ساتھ معاشرت (گذر بسر اور مل جل کر رہنا)

اگر رجعی عدت میں شوہر اس مطلقہ کے ساتھ معاشرت رکھے، یعنی دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں، تنہائی یا ساتھ سونا وغیرہ پایا جائے، اور صحبت وغیرہ کرنا چاہے تو ممکن ہو، اور اس عورت کی عدت مہینوں یا پاکی والی ہو، تو اس کی عدت ختم نہ ہو گی، خواہ صحبت کرے یا نہ کرے، گو کتنا ہی عرصہ اس حال میں گذر جائے، جب یہ معاشرت ختم ہو جائے، یعنی شوہر یہ نیت کر لے کہ اب اس کے پاس نہیں لوٹنا ہے، تو سابقہ عدت پر بنا کرتے ہوئے بقیہ کی تکمیل کرے، اگر طلاق کے وقت سے ہی معاشرت جاری ہو تو مکمل عدت گذارے۔ لیکن طلاق کے وقت سے تین ماہ یا پاکی گذرنے کے بعد شوہر کو احتیاطاً رجعت کا حق نہ ملے گا، گو عدت بھی احتیاطاً ختم نہ ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ طلاق کے وقت سے عدت کی مقدار میں تمام احکام میں وہ بالکل رجعیہ کی طرح ہے۔ معاشرت کی وجہ سے مزید مدت میں ۶/ (چھے) احکام میں رجعیہ کی طرح ہے۔ اس پر طلاق واقع ہو گی، اس کا سُکنیٰ (رہائش) واجب ہے، اس سے صحبت کی وجہ سے حد نہ لگے گی، اس کی بہن وغیرہ سے یا اس کے علاوہ چار سے نکاح جائز نہیں، اس سے نکاح جائز نہیں، اور ۹/ (نو) احکام میں وہ بائنہ کی طرح ہے: اس سے رجعت صحیح نہیں، (اگر اس دوران دونوں میں سے کوئی مر جائے تو) آپس میں میراث نہ چلے گی، اس سے ایلاء، ظہار اور لعان صحیح نہ ہو گا، اسے نفقہ اور کِسْوَہ (لباس) نہ ملے گا، اس سے خلع صحیح نہ ہو گا، یعنی خلع دینے کی صورت میں طلاق رجعی واقع ہو گی اور عوض لازم نہ ہو گا۔

بائنہ مطلقہ کے ساتھ اس طرح معاشرت رکھی، تب بھی عدت ختم ہو گی، لیکن اس سے صحبتِ شبہ کرے تو بعد میں جب تک معاشرت ہو، اور شبہ باقی ہو، وہ نکاح نہیں کر سکتی، لیکن اسے طلاق دے تو واقع نہ ہو گی، نیز اس کے بہن وغیرہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ اگر بائنہ سے بغیر شبہ کے صحبت کرے تو یہ زنا ہے۔ جس سے مسئلہ پر کوئی فرق نہ پڑے گا، اور اس کے باوجود عدت ختم ہو گی۔

شوہر کے علاوہ کوئی شخص رجعی یا بائنہ عدت میں اس کے ساتھ معاشرت رکھے، تو شوہر کے بائنہ کے ساتھ معاشرت رکھنے کی طرح ہے، پس اگر زنا کے طور پر صحبت کرے تو کوئی فرق نہیں (عدت ختم ہو گی) اور شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، تو عدت ختم نہ ہو گی۔

اگر عورت حمل کی عدت میں ہو تو وضع حمل سے مطلقاً اس کی عدت ختم ہو گی۔

عدت میں نکاح: عدت میں صاحبِ عدت کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح کو جائز سمجھتے ہوئے اس سے نکاح کرے اور صحبت کر لے تو صحبت کے وقت سے اس کی عدت رک جائے گی، دونوں میں تفریق کے بعد، یا وہ شخص خود دوبارہ اس کے پاس نہ آنے کی نیت کر لے، تو اس کے بعد سابقہ عدت کی بقیہ مدت مکمل کرے، پھر اس شبہ کی صحبت کی مکمل عدت گذارے، اگر وہ حاملہ تھی یا صحبتِ شبہ سے حاملہ ہوئی، تو حمل والی عدت تفریق کے بغیر بھی وضعِ حمل سے ختم ہو گی۔ اگر صرف نکاح کرے، صحبت نہ ہو، تو اس سے عدت

منقطع نہ ہوگی، گو معاشرت پائی جائے۔

عدت میں رجعت: کوئی شخص اپنی رجعیہ مطلقہ سے رجوع کرے اور وہ غیر حاملہ ہو اور پھر اسے طلاق دے، یا حاملہ ہو اور وضعِ حمل کے بعد طلاق دے، تو از سرِ نو مکمل عدت گذارے، گو رجعت کے بعد صحبت نہ کرے، اگر وضعِ حمل سے قبل ہی طلاق دے، تو وضعِ حمل سے عدت ختم ہوگی، گو رجعت کے بعد صحبت بھی کرلی ہو، اگر رجعی عدت میں رجعت کے بغیر دوسری طلاق دے، تو پہلے طلاق کی عدت دونوں کی طرف سے کافی ہے، گویا کہ دونوں طلاق ساتھ واقع ہوئے ہیں، گرچہ دوسری طلاق عوض کے مقابلہ میں ہو۔

عوض کے مقابل طلاق کی وجہ سے بیوی بائنہ ہوجائے، تو شوہر عدت میں دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، اگر نکاح کے بعد صحبت کرنے کے بعد پھر طلاق دے، تو اسے از سرِ نو مکمل عدت گذارنی لازم ہے، اگر صحبت سے قبل ہی طلاق دے، تو سابقہ عدت پر بناء کرے (یعنی نکاح ثانی سے قبل کی عدت کو شمار کرکے بقیہ کی تکمیل کرے)، اس دوسری طلاق کی وجہ سے کوئی عدت لازم نہیں، کیونکہ یہ جدید نکاح تھا، جس میں صحبت سے قبل ہی طلاق دی گئی۔

وفات کی عدت

شوہر کا انتقال ہوجائے تو بیوی پر عدت گذارنا لازم ہے۔ اگر بیوی آزاد اور غیر حاملہ ہو، تو اس کی عدت چار ماہ دس روز ہیں، خواہ صحبت نہ ہوئی ہو۔ اگر بیوی رجعی عدت میں ہو، اور شوہر کا انتقال ہو، تو رجعی عدت ختم ہوجائے گی، اور از سرِ نو وفات کی مکمل عدت گذارے گی۔ اگر بیوی حاملہ ہو، لیکن حمل شوہر کا نہ ہو، مثلاً بچہ یا ممسوح انتقال کرجائے اور اس کی بیوی حاملہ ہو، تو اس کی عدت بھی چار ماہ اور دس دن ہیں۔

مہینوں کا اعتبار چاند سے ہوگا، اگر مہینہ کے بالکل ابتداء میں انتقال ہو تو چاند کے اعتبار سے چار ماہ (گو ۲۹ کے مہینے ہوں) پھر مزید دس دن گذارے، اگر انتقال کے بعد اس ماہ کے صرف دس روز باقی ہیں، تو اس کے بعد قمری چار ماہ گذارے (گو ناقص ہوں)، اگر دس روز سے کم ہوں، تو چار ماہ کے بعد مزید اتنے دن گذارے کہ مجموعہ دس روز ہوجائے، اگر دس روز سے زائد باقی ہوں تو آئندہ تین ماہ چاند کے اعتبار سے گذارنے کے بعد چوتھے ماہ میں اتنے دن گذارے کہ ابتدائی ایّام سمیت مجموعہ ۴۰ (چالیس) دن ہوجائے، جس ماہ چاند کا علم نہ ہو اسے کامل شمار کرے۔

غیر آزاد عورت کی عدت مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ۲ ماہ اور ۵ دن ہوگی۔

آیت: ”وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا“ (البقرہ: ۲۳۴)

ترجمہ: ”اور جو لوگ تم میں وفات پاجاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) چار مہینے اور دس دن روکے رکھیں“۔

حاملہ متوفی عنہا: اگر بیوی شوہر سے حاملہ ہو، اور شوہر کی وفات ہو، تو عدت وضعِ حمل ہے، (اور وضع حمل میں وہی تفصیل ہوگی، جو طلاق کی عدت میں گذر چکی) خواہ شوہر کو صرف خصیتین ہوں، اور ذکر (آلہ تناسل) کٹا ہو، یا اس کے برعکس ہو، نیز بیوی آزاد ہو یا غیر آزاد، اس کی عدت وضع حمل ہے۔

آیت: ”وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ“ (الطلاق: ۴)

ترجمہ: ’’اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے‘‘۔

حدیث: ’’حضرت سُبَیْعَہ الاَسْلَمِیَہؓ شوہر کے انتقال کے وقت حاملہ تھیں، پھر چند ہی ایّام میں (یعنی چار ماہ دس روز سے قبل ہی) ان کی زچگی ہوئی، تو آپ ﷺ نے انھیں نکاح کی اجازت دی‘‘۔(مالک صحیحین، احمد، نسائی۔ تلخیص ۲۳۲/۳)

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ابھی شوہر کا جنازہ تخت پر دھرا ہو، تدفین نہ ہوئی ہو، اور بیوی کی زچگی ہو جائے، تو اس کی عدت ختم ہو گی (مالک، شافعی عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ۔ تلخیص ۲۳۶/۳)

مفقود الخبر

اگر کوئی شخص سفر وغیرہ میں جاکر بالکل مفقود الخبر اور لاپتہ ہو جائے، تو اس کی بیوی اس کے موت یا طلاق کے ثبوت اور پھر عدت کے بغیر دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اگر قاضی کے پاس گواہ اس کے موت کی گواہی دیں تو اس سے اس کی موت ثابت ہو گی۔ اس کی پیدائش سے اتنی مدت گذرنے کے بعد کہ بظاہر اس سے زائد اس کے جینے کا گمان نہ ہو، قاضی اس کی موت کا فیصلہ دے، تو اس سے بھی اس کی موت ثابت ہو گی، اور اب عدت گذار کر بیوی نکاح کر سکتی ہے، امام شافعی و بیہقی وغیرہ نے حضرت علیؓ سے نقل فرمایا ہے کہ مفقود کی بیوی آزمائش سے دوچار ہے، اس کے موت کی یقینی خبر یا طلاق تک اسے صبر کرنا چاہئے۔ بقول ابن جریج ابن مسعودؓ نے بھی ان سے اتفاق کیا (تلخیص ۲۳۷/۳)

اگر اس کی موت یا طلاق کے ثبوت سے قبل کوئی قاضی اس عورت کے نکاح کا فیصلہ دے، تو قیاس جلی کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ نافذ نہ ہو گا۔ اگر عورت ثبوت سے قبل نکاح کرلے، پھر پتہ چلا کہ نکاح سے قبل اس شوہر کا انتقال ہو کر عدت کی مدت گذر چکی تھی، تو یہ نکاح صحیح ہو گا۔ اگر پتہ چلا کہ پہلا شوہر (مفقود) ابھی زندہ ہے، تو یہ اسی کی بیوی ہے، گو اُس نے دوسرے شوہر سے نکاح کیا ہو اور حاکم نے اس کا فیصلہ دیا ہو، لیکن دوسرے شوہر کی صحبت چونکہ شبہ پر مبنی ہے، اس لئے شبہ کی عدت گذارنے سے قبل پہلا شوہر اس سے تمتع نہیں کر سکتا۔ اس نکاح ثانی اور صحبت کی وجہ سے کسی پر حد نہ آئے گی، اور نہ دونوں شوہروں میں سے کسی پر ان کا نفقہ لازم ہے، البتہ ان میں جدائی کے بعد عورت پہلے شوہر کے گھر لوٹ جائے اور اسے اس کا علم ہو جائے، تو اب سے نفقہ واجب ہے۔

امام شافعی کے قول قدیم میں (جو بعض دیگر ائمہ کرام کا بھی مسلک ہے) مفقود الخبر کی بیوی، اپنا مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کرنے کے بعد وہ چار سال انتظار کا فیصلہ دے، قاضی کے فیصلہ کے بعد چار سال گذرنے کے بعد عورت وفات کی عدت گذار کر بعد میں نکاح کر سکتی ہے۔ جیسا کہ مؤطا میں امام مالک نے، اور امام شافعی، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، دار قطنی اور بیہقی نے حضرت عمرؓ سے، ابن ابی شیبہ و ابوعُبَیْد نے حضرت عمرؓ و عثمانؓ سے اور ابوعبیدؒ نے حضرت ابن عباسؓ و ابن عمرؓ سے نقل فرمایا ہے۔(تلخیص ۲۳۷/۳) لیکن جدید قول (جو پہلے گذر چکا) کے اعتبار سے کوئی قاضی اس قولِ قدیم کے مطابق فیصلہ دے تو اصح وجہ یہ ہے کہ اسے ختم کیا جائے گا (نافذ نہ ہو گا)، دوسری وجہ میں فیصلہ نافذ ہو گا۔

(دورِ حاضر کے مسائل اور وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے محققین نے دلائل کی روشنی میں ایسی عورت کے لئے گنجائش کی راہ متعین کی ہے۔ اگر کسی کو ایسا مسئلہ درپیش ہو تو وہ متعلقہ ذمہ داروں اور علماء سے رجوع ہوں، مناسب فیصلہ حاصل ہو گا)

مسئلہ: کسی عورت کو کوئی ایک عادل شخص یا عورت خبر دے کہ اس کا شوہر مر چکا، تو وہ (عدت کے بعد) نکاح کر سکتی ہے۔ کسی کا وطن سے دور انتقال ہو، اور بعضوں کو اس کا علم ہو، تو اس کی اطلاع دینا واجب ہے، جب کہ اس سے کوئی فوری حق متعلق ہو، جیسے بیوی کا

سوگ کرنا، یا کسی ضرر کا اندیشہ ہو، جیسے اس کے نائب کا اس کے مال میں تصرف کرنا۔(قلائد ۲/۲۷۸)

اِحْدَاد (سوگ کرنا)

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والی کسی عورت کے لئے یہ حلال نہیں کہ کسی میت پر تین روز سے زائد سوگ کرے، بجز شوہر کے، (اس پر) چار ماہ دس روز (سوگ کرے گی)" (مالک، بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی، طحاوی، بیہقی۔ارواء الغلیل ۷/۱۹۳)

شوہر کی وفات کی عدت میں بیوی پر احداد (سوگ کرنا) بالاجماع واجب ہے۔ کمسن بچی اور پاگل عورت کے ولی پر لازم ہے کہ ان کو ان امور سے روکے جو احداد کی وجہ سے منع ہیں۔ اگر زندگی میں طلاق یا فسخ وغیرہ سے بائنہ ہو جائے تو احداد سنت ہے، واجب نہیں، اگر رجعی عدت میں شوہر کے رجعت کی توقع نہ ہو، تو بائنہ کی طرح اسے بھی احداد مستحب ہے۔ اور اگر رجعت کی امید ہو تو بہتر ہے کہ زیب وزینت اختیار کرے، جب کہ طلاق پر خوشی کی بدگمانی نہ ہو۔

احداد لغت میں روکنے کو کہتے ہیں، اصطلاحاً اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

ایسا رنگا ہوا کپڑا جو زینت کے طور پر استعمال ہوتا ہو نہ پہنے، خواہ بننے سے قبل رنگا ہو یا موٹا ہو، کیونکہ صحیحین میں حضرت امّ عطیہ سے مروی ہے کہ: "۔۔۔ ہمیں سرمہ لگانے، خوشبو استعمال کرنے اور رنگین لباس استعمال کرنے سے روکا جاتا تھا"۔ جس رنگ میں زینت نہ ہو، بلکہ مصیبت کے طور پر یا جلد میلا نہ ہونے کے لئے مستعمل ہو، جیسے سیاہ یا سرمگیں رنگ، تو اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ اگر رنگ زینت وغیر زینت کے بین بین ہو، جیسے سبز یا آسمانی رنگ، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ صاف ستھرا اور روشن ہو تو حرام ہے، اگر خوب گہرا یا مٹیالا رنگا ہوا ہو تو حرج نہیں کتان، سوت، ریشم اور اون وغیرہ کے وہ کپڑے جو رنگے ہوئے نہ ہوں اور نقش وغیرہ کے ذریعہ ان میں زینت نہ پیدا ہو، جائز ہیں، گو بہترین ہوں، یا خلقتاً کسی بھی رنگ کے ہوں (یعنی جو دھاگے و کپڑے ابتداء سے رنگے بغیر ہی رنگین ہوں، وہ ممنوع نہیں)

احداد میں ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات دن میں پہننا حرام ہے۔ نسائی وابوداود وغیرہ کی ایک حسن حدیث میں وفات کی عدت میں زیورات، مہندی اور سرمہ سے ممانعت موجود ہے۔ زیورات کا کپڑوں کے اندر پہننا بھی حرام ہے۔ سیسہ یا تانبہ وغیرہ پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھایا جائے، یا عورت ایسی ہو کہ پانی کے بغیر بھی ان دھاتوں کی اشیاء بطورِ زیور استعمال کرتی ہو، تو یہ زیورات بھی منع ہیں، ورنہ منع نہیں۔ رات میں حفاظت وغیرہ حاجت کی وجہ سے پہننا جائز ہے، اور بلا حاجت مکروہ ہے، دن میں بھی اس کی حفاظت کے لئے مجبوراً پہننا پڑے، دوسرا کوئی راستہ نہ ہو، تو گنجائش ملے گی۔ اگر رات میں ولیمہ وغیرہ کی مناسبت سے عورتوں کا مجمع ہو، تو رات میں بھی پہننا حرام ہے۔

وفات کی عدت میں عورت اپنے بدن، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء اور سرمہ میں خوشبو استعمال نہ کرے، مسلم کی ایک حدیث کی رو سے حیض سے پاکی کے وقت تھوڑا سا قُسط یا اَظفار استعمال کرنا جائز ہے۔ (یہ دونوں دھونی کے خوشبو کا نام ہے) اسی طرح سر کے بالوں میں اور داڑھی ہو تو اس میں تیل لگانا منع ہے، بدن کے دیگر حصوں میں تیل لگانا حرام نہیں، ضابطہ یہ ہے کہ احرام میں خوشبو و تیل جن صورتوں میں حرام ہے، یہاں بھی حرام ہے، لیکن فدیہ لازم نہ ہوگا، جو وہاں حلال ہے، یہاں بھی حلال ہے، احداد میں زینت کے لئے مستعمل سرمہ حرام ہے، اگر آشوب چشم وغیرہ حاجت ہو، تو رات میں لگائے اور دن میں پونچھ کر صاف کر دے، مجبوری کی صورت میں

دن میں بھی استعمال جائز ہے، ایک صحابیہ نے احداد میں ایلوا آنکھوں میں لگایا تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ: رات کو لگالیا کرو، اور دن میں پونچھ ڈالو" (ابوداود، نسائی)

چہرہ پر سفید قلعی (اسفیذاج۔ پاؤڈر) ولالی وغیرہ لگانا اور بدن کے جو اعضاء کام کاج کے وقت کھلے رہتے ہیں ان میں مہندی، ورس یا زعفران وغیرہ لگاکر رنگنا منع ہے۔

احداد کا تعلق عورت کے بدن سے ہے، لہٰذا اپنے گھر، دیگر اسباب اور بستر وغیرہ کو مزین کرنا حلال ہے۔ اسی طرح غسل، سر دھونا، ناخن تراشنا، میل کچیل دور کرنا، کنگھی کرنا، اور موئے زیر ناف کا دور کرنا بھی جائز ہے۔

احداد کا ترک: اگر کوئی عورت عدت میں سوگ نہ کرے، گو اسے شوہر کی وفات کا علم ہی عدت کی مدت کے بعد ہو، تو عدت کا عرصہ گذرنے سے عدت ختم ہو جائے گی، گرچہ دانستہ احداد نہ کرنے سے گناہ ہو گا۔

شوھر کے علاوہ کسی پر سوگ کرنا: ایک عورت شوہر کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار وغیرہ کی موت پر، جس کی موت سے اسے صدمہ و غم لاحق ہو، تین دن یا اس سے کم سوگ کر سکتی ہے، تین دن سے زائد سوگ کی نیت سے زینت وغیرہ کا ترک حرام ہے۔ سوگ کے قصد کے بغیر ایسے ہی ترک کرے تو حرام نہیں۔ مرد کے لئے کسی کی وفات پر سوگ حرام ہے، اسے ہر اس عمل سے جو (اس مصیبت پر) رنج اور تنگدل ہونے پر دلالت کرے، اجتناب واجب ہے۔

تنبیہ: دورِ حاضر میں بعض عورتیں شوہر کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کی موت پر اپنے غم کے اظہار کے طور پر سیاہ کپڑا وغیرہ پہنتی، اور عام مواقع اور خوشی کی محفلوں میں شرکت سے کافی عرصہ تک گریز کرتی ہیں، اور بعض مرتبہ تو غم وصدمہ کا نام ونشان تک نہیں رہتا، محض رسماً اور تصنعاً یہ پابندی کرتی ہیں، یہ رسم آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے گذشتہ فرمان کے صریح مخالف اور حرام ہے، بلکہ حضرت زینب بنت جحش اسی فرمان کی وجہ سے اپنے بھائی کے انتقال کے وقت خوشبو منگوا کر استعمال کرتی ہیں، پھر اسی روایت کا حوالہ پیش کرتی ہیں (صحیحین)

اسی طرح غیروں کی تقلید میں مردوں کا رنج و غم کے اظہار کے لئے مخصوص شعار (سیاہ پٹی وغیرہ) کا اپنانا حرام وممنوع ہے۔

عدت میں سُکنیٰ (رھائش کا نظم۔ رھنے کی جگه)

مطلقہ عورتوں کے متعلق ارشاد باری ہے: "لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ" (الطلاق ۱)

ترجمہ: "ان (مطلقہ) عورتوں کو (عدت میں) ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں" کچھ آگے مزید ارشاد ہے:

"اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ" (الطلاق: ۲)

ترجمہ: "تم ان (مطلقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے (سکنی کے بارہ میں) تکلیف مت پہنچاؤ۔" (مثلاً کوئی ایسی بات کرنے لگو جس سے وہ پریشان ہو کر نکل جائیں)

حضرت فُرَیعَہ کے شوہر قتل ہوئے، تو انھوں نے اپنے اہل کی طرف لوٹنے کی اجازت چاہی، تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے عدت کے اختتام تک گھر میں رکنے کا حکم دیا۔ (مالک، شافعی، احمد، سنن اربعہ، ابن حبان، طبرانی وصححه الترمذی، والذهلی والحاکم۔ تلخیص، وخلاصة البدر ۲/۲۴۵)

جدائی نہ ہونے کی صورت میں جس عورت کا نفقہ شوہر پر واجب ہو، طلاق، فسخ یا وفات کی وجہ سے ایسی عورت کا سُکنی عدت میں شوہر پر واجب ہے۔ ناشزہ کا سکنی واجب نہیں، خواہ طلاق سے قبل نشوز اختیار کرے یا دورانِ عدت، اگر وہ دوبارہ اطاعت اختیار کرے تو سکنی کا حق بھی لوٹے گا۔

اگر میت کا کچھ ترکہ نہ ہو، اور وارث تبرعاً سکنی نہ دے، تو حاکم کو بیت المال سے اس کی سکنی کا نظم سنت ہے، ورنہ پھر جہاں چاہے رہے۔

جدائی کے وقت بیوی جس مکان میں ہو، اسی میں اسے رکھنا واجب ہے، جب کہ اس کے مناسب حال ہو، اور شوہر کے استحقاق میں ہو۔ بغیر عذر کے دورانِ عدت عورت کو اس گھر سے نکالنا یا اس کا نکلنا جائز نہیں، خواہ شوہر بھی نکلنے سے متفق ہو، جب کے بلا حاجت ہو، اور حاکم کو روکنا لازم ہے، کیونکہ عدت میں اللہ کا بھی حق ہے۔ جس کا نفقہ شوہر پر لازم نہ ہو، وہ عورت دن میں کھانا، کپاس و کتان وغیرہ خریدنے جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت جابرؓ کی خالہ سلمیٰ کو عدت میں کھجور توڑنے کے لئے باغ میں جانے کی اجازت دی تھی۔ (مسلم) اور سوت کاتنے یا گفتگو وانسیت کے لئے رات کا کچھ حصہ اپنے پڑوسن کے پاس گذار سکتی ہے، جب کہ شب باشی کے لئے اپنے گھر لوٹے، جیساکہ شہداءِ احد کی بیویوں کو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی تھی (شافعی، بیہقی) رجعیہ اور حاملہ بائنہ نفقہ کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتی، کیونکہ نفقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ دیگر امور کے لئے بصورتِ حاجت نکل سکتی ہے۔

اگر اس مکان میں رکنے میں جان یا مال کا خطرہ ہو (جلنے، منہدم ہونے، غرق ہونے یا بدکار پڑوسیوں کی وجہ سے) یا پڑوسیوں یا شوہر کے رشتہ داروں سے اسے بڑی تکلیف پہنچتی ہو، یا اس سے ان لوگوں کو شدید تکلیف پہنچتی ہو، تو وہاں سے منتقل ہونا جائز ہے۔ ابوداود میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس کو پُر خطر جگہ میں ہونے کی وجہ سے منتقل ہونے کی اجازت دی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کا ایک سبب شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ ان کی سخت گوئی کو بتلایا ہے۔ معمولی تکلیف کی وجہ سے اجازت نہ ملے گی۔ بیوی اپنے والدین کے گھر ہو، اور طلاق ہو، اور آپس میں ایذا رسانی کا مسئلہ آئے، تب بھی منتقل نہ کی جائے، کیونکہ یہ سلسلہ زیادہ طول نہ پکڑے گا۔

اگر شوہر کی اجازت سے کسی دوسری بستی یا مکان کی طرف منتقل ہو، پھر عدت واجب ہو جائے، گو ابھی وہاں پہنچی نہ ہو، تو وہیں عدت گذارے، خواہ پہلی جگہ سے اسباب منتقل کر چکی ہو یا نہ کر چکی ہو، اگر شوہر کی اجازت کے بغیر منتقل ہوئی ہے، تو پہلی جگہ ہی عدت گذارے، اگر شوہر بعد میں اجازت دے، تو منتقل شدہ جگہ عدت گذارے۔ منتقل ہونے کی اجازت کے بعد یہاں سے نکلنے سے قبل ہی عدت واجب ہو جائے تو یہیں گذارے۔

اگر بیوی شوہر کی اجازت سے سفر میں جائے، پھر راستہ میں عدت واجب ہو جائے، تو واپس لوٹنا بہتر ہے، لازم نہیں، اگر سفر کسی ضرورت سے تھا تو ضرورت کی تکمیل کے بعد، یا مدت مقرر تھی، تو مدت کے بعد، ورنہ ایک مسافر کے اقامت کی مدت (یعنی دخول و خروج کے علاوہ چار دن) کے بعد لوٹنا واجب ہے، بلا عذر تاخیر کرے تو گنہگار ہوگی۔ اسی طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کے بعد لوٹنا واجب ہے۔

اگر مکان شوہر کی ملکیت یا استحقاق میں ہو، اور بیوی کے شایانِ شان ہو، تو اسی میں عدت گذارنا لازم ہے۔ اگر مکان کرایہ کا ہو، اور مقررہ مدت ختم ہو جائے، اور مناسب کرایہ پر مزید دینے پر مالک راضی نہ ہو، یا عاریت کا ہو، اور مالک واپس لے، اور مناسب کرایہ پر بھی دینے پر راضی نہ ہو، یا مالک سفیہ یا پاگل ہونے کی وجہ سے تبرع کی اہلیت سے نکل جائے، تو وہاں سے منتقل کر کے ممکنہ حد تک اس سے قریب ترین مناسب جگہ اس کے سکنی کا نظم کرے۔ اگر مکان خود بیوی کی ملکیت ہو، تو اسے اختیار ہے کہ عاریت یا کرایہ کے طور پر اس میں عدت گذارے، یا وہاں سے منتقل ہو جائے، کیونکہ اسے اپنا مکان شوہر کو عاریت سے یا کرایہ پر دینا لازم نہیں ہے۔

اگر مکان بیوی کے مرتبہ سے گھٹیا (فروتر) ہو، تو اسے اختیار ہے کہ اسی میں عدت گذارے، یا اس کے مناسب مکان میں منتقل کرنے کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح بیوی کے مرتبہ سے اعلیٰ درجہ کا مکان ہو، تو شوہر کو اختیار ہے کہ اسی میں رکھے، یا اس کے مناسب مکان میں منتقل کرے۔ مذکورہ تمام صورتوں میں قریب ترین ممکنہ مکان میں منتقل کرنا واجب ہے۔

شوہر کو مطلقہ کے سکنی میں رہنا: بیوی جس جگہ عدت گذارے، شوہر کو وہاں اس کے ساتھ رہنا، یا وہاں داخل ہونا اور جانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں خلوت (تنہائی) واقع ہوگی، جو عام اجنبیہ کی طرح مطلقہ کے ساتھ بھی حرام ہے، گو شوہر نابینا ہو، یا طلاق رجعی ہو اور بیوی اس کی آمد ورفت سے راضی ہو۔

اگر مکان کافی کشادہ ہو کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں اور ایک کو دوسرے کی اطلاع نہ ہوتی ہو، اور وہاں بیوی کا کوئی بالغ، یا ایسا ممیز محرم جس کی موجودگی میں شرم وحیا کی وجہ سے خلوت کا امکان نہ ہو (مرد ہو یا عورت) یا اسی طرح شوہر کی مؤنث محرم، یا بیوی، یا کوئی پرائی عورت موجود ہو (جب کہ یہ سب ثقہ اور معتمد ہوں)، تو کراہت کے ساتھ شوہر کو اس گھر میں رہنا یا داخل ہونا جائز ہے۔

اگر مکان کشادہ ہو اور اس میں جدا جدا کمرے ہوں، بالائی اور تحتانی حصہ جدا جدا ہو، اور ہر ایک کے امور آسائش (باورچی خانہ، آرام گاہ، گذرگاہ، غسل خانہ وغیرہ) بھی جدا ہوں اور درمیانی دروازہ بند کرکے میخ سے بالکل مضبوط کر دیا جائے، یا بالکل ختم کر دیا جائے، تو دونوں کا جدا حصہ میں رہنا جائز ہے، لیکن مکروہ ہے، اگر امور آسائش مشترک ہوں، تو اوپر کی طرح محرم وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔ (لیکن دورِ حاضر میں احوط یہی ہے کہ محرم وغیرہ کے ساتھ بھی اس گھر میں نہ رہے، جیسا کہ امام اذرعی نے فرمایا ہے، کیونکہ وہ کبھی کسی ضرورت سے باہر نکل جائے گا، کبھی بے توجہی ہوگی، بالخصوص جبکہ زوجین یا کوئی ایک دیندار نہ ہو۔ فتاوی ابن زیاد: ۲۴۲)

خَلۡوَت (تنہائی): کسی ایک یا زائد مرد کا ایک پرائی عورت کے ساتھ کسی جگہ خلوت (تنہا پایا جانا) حرام ہے۔ ایک شخص کو دو یا زائد ثقہ (معتبر اور قابل بھروسہ) عورتوں کے ساتھ خلوت جائز ہے۔ غیر ثقہ عورتوں کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے۔ کسی مرد کو ایسے مردوں کے ساتھ خلوت جائز نہیں۔ جن کو دیکھنا حرام ہو، ایک امرد کو دوسرے امرد کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے۔

(فتح الوھاب مع الجمل ۴/۴۴۱-۴۶۷، نہایہ مع الحواشی ۷/۱۲۶-۱۶۳، تحفہ مع الحواشی ۱۰/۲۱۲-۲۸۷، مغنی المحتاج ۳/۳۸۴-۴۰۷، الفقہ المنہجی ۴/۱۵۷-۱۶۶، المجموع ۱۸/۱۲۴-۱۹۴، فتح المعین مع الاعانہ ۳/۳۷-۵۳)

رِضَاعَت (دودھ پلانا۔ شیرخواری)

تعریف: رِضَاع اور رِضاعت کا لفظ عربی زبان میں پستان سے چوس کر دودھ پینے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

اور شرعاً: کسی عورت کے دودھ یا دودھ سے حاصل شئی کے کسی بچہ کے معدہ یا دماغ میں پہنچنے کو رضاعت کہا جاتا ہے۔

مشروعیت: کسی بچہ کا اپنی والدہ کے علاوہ کسی دوسری عورت سے دودھ پینا شرعاً جائز ہے، اسلام سے قبل یہ دستور معروف تھا، پھر جب اسلام کی روشنی نمودار ہوئی، تو اسے برقرار رکھا، حرام نہ قرار دیا، کیونکہ بعض مصلحتوں اور مجبوریوں کا یہی تقاضہ ہے، مثلاً کبھی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے، یا کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے خود دودھ پلانے سے عاجز ہوتی ہے۔

جواز کی دلیل: آیت:۱-"وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰی" (الطلاق:٦)

ترجمہ: ”اور اگر تم (بچہ کی رضاعت کے سلسلہ میں) باہم کش مکش کروگے، تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی“۔

۲-”وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ“(البقرہ: ۲۳۳)

ترجمہ: ”اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو، تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔“

والدہ کا دودھ پلانا: رضاعت اور دودھ پلانا والدہ کا حق ہے، جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے، اس پر واجب نہیں ہے ،(البتہ دوسری عورت سیر نہ ہو، تو والدہ پر واجب ہوگا)، اوپر کی آیات، نیز درج ذیل آیات کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے۔

آیت: ۱-”وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ“(البقرہ: ۲۳۳)

ترجمہ: ”اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں، یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے“۔

۲-”فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ“(الطلاق: ۶)

ترجمہ: ”پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلادیں، تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو“۔

جب یہ مسئلہ واضح ہو چکا کہ رضاعت والدہ پر واجب نہیں ہے، تو اس پر درج ذیل احکام مرتب ہوں گے۔

۱- شوہر بچہ کو دودھ پلانے کے لئے اپنی بیوی کو مجبور نہیں کر سکتا، اگر وہ جبر کرے اور بیوی نہ مانے تو گنہگار اور ناشرہ شمار نہ ہوگی، لیکن وہاں دوسری کوئی مناسب عورت جو اسے دودھ پلا سکے موجود نہ ہو، تو بچہ کی زندگی کی بقا کے پیش نظر والدہ پر رضاعت واجب ہوگی۔

۲- اگر بیوی مطالبہ کرے، تو اسے دودھ پلانے کی مناسب اجرت دینا شوہر پر واجب ہے، اگر وہ اجرت طلب نہ کرے، جیسا کہ عام ماحول ہے، تو اجرت واجب نہ ہوگی، جب کہ وہ تبرعاً اور اجرت کی بے رغبتی کے اظہار کے ساتھ اسے انجام دے:

رضاعی حرمت: رضاعت کی وجہ سے حرمت اور محرم رشتوں کی تفصیل اور دلائل ’محرمات‘ کے باب میں گذر چکے۔ اس باب میں رضاعت کے حصول اور دیگر مسائل کا تذکرہ ہوگا۔

سببِ حرمت: دودھ چونکہ مرضعہ کا ایک جزء ہے، جو رضیع کے اجزاء میں شامل ہو گیا، تو یہ نسب میں اس کی منی کے مشابہ ہوا۔

اثرات: رضاعی محرمیت کی وجہ سے ابتداً و دواماً نکاح حرام ہوگا، نیز خلوت اور دیکھنا جائز ہوگا، اور چھونے کی وجہ سے وضو ختم نہ ہوگا۔ دیگر نسبی احکام، مثلاً: میراث، نفقہ، قصاص کا سقوط اور گواہی کا رد ہونا وغیرہ ثابت نہ ہوں گے۔

رضاعت کا ارکان

(۱) مُرضِع (انّا۔ دایہ) (۲) رَضِیع (۳) دودھ

(۱) مُرْضِع (دایہ یعنی دودھ پلانے والی خاتون): مرضع کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱- انسانی عورت ہو، ۲- زندہ ہو، یعنی اس میں حیات مستقرہ ہو۔ ۳- حیض کی عمر کو پہنچ چکی ہو، یعنی اس کی عمر تقریباً ۹ سال اسلامی ہو، گو ابھی باکرہ (کنواری) ہو۔

کسی مرد یا خنثیٰ (کو دودھ پیدا ہو تو ان) کا دودھ پینے کی وجہ سے رضاعی حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ درحقیقت بچہ کی غذائیت کے لئے پیدا شدہ نہیں، لہٰذا دیگر مائع کی طرح حکم ہوگا، نیز دودھ ولادت کا اثر ہے، اور ان میں ولادت کا کوئی سوال نہیں، البتہ ان سے دودھ پینے والی بچیوں سے انھیں اور ان کے اصول و فروغ اور حواشی کے لئے نکاح مکروہ ہے۔

کسی جانور (گائے بھینس وغیرہ) کے دودھ سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہو گی، ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی جانور کا دودھ پئیں تو یہ آپس میں رضاعی بھائی بہن شمار نہ ہوں گے، اسی طرح کسی جِنّیہ (جنات میں کی عورت) کے دودھ سے بھی حرمت ثابت نہ ہو گی، کیونکہ رضاعت سے نسب ثابت ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن وانس میں نسب کو منقطع کیا ہے۔ جن علماء کے نزدیک جِنّیہ سے نکاح جائز ہے، ان کے اعتبار سے اس کے دودھ سے حرمت بھی ثابت ہو گی۔

جو عورت کسی جنایت (یعنی کسی کے مارنے وغیرہ) کی وجہ سے حرکت مذبوح تک پہنچ چکی ہو، اس کے دودھ سے حرمت ثابت نہ ہو گی، البتہ نکاح کرنا مکروہ ہو گا۔ اگر بعد میں شفا ہو جائے تو حرمت ثابت ہو گی۔ کسی مرض کی وجہ سے حرکتِ مذبوح تک پہنچنے کے باوجود حرمت ثابت ہو گی۔ مردہ عورت کے دودھ سے حرمت ثابت نہ ہو گی، لیکن (نکاح کرنا) شدید مکروہ ہے، کیونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ جو عورت ابھی سنِ حیض کو نہ پہنچی ہو، (کمسن ہو) اس کا دودھ پینے سے حرمت ثابت نہ ہو گی۔

(۲) **رَضِیع (دودھ پینے والا بچہ)**: رضیع کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱- رضیع زندہ ہو، اس میں حیات مستقرہ ہو، مردہ بچہ کے یا حیات مذبوحہ کو پہنچنے کے بعد اس کے جوف میں دودھ پہنچنے سے رضاعی حرمت ثابت نہ ہو گی۔

۲- رضیع کی عمر بالیقین (قمری واسلامی) دو سال سے کم ہو، اگر دو سال ہو، یا شک ہو، تو رضاعی حرمت ثابت نہ ہو گی، پانچویں مرتبہ دودھ شروع کرتے وقت عمر دو سال سے کم ہو، پھر دوران میں ہی دو سال ہو جائے، تو حرمت ثابت ہو گی، آیت میں گذر چکا کہ شیر خوارگی کی تکمیل کرنا ہو تو کامل دو سال دودھ پلائے (البقرہ: ۲۳۳)

حدیث: ۱- آپ ﷺ نے فرمایا: "رضاعت تو بھوک میں (معتبر) ہے، (یعنی جو بھوک سے بے نیاز کر سکے) (متفق علیہ، نسائی، احمد، درامی)

تشریح: یعنی ایسی رضاعت جس سے حرمت ثابت ہو، اور خلوت حلال ہو، وہ ہے کہ رضیع بچہ ہو، کیونکہ اس صورت میں دودھ اس کی بھوک مٹاتا ہے، کیونکہ اس کا معدہ کمزور ہوتا ہے، اور صرف دودھ کافی ہو جاتا ہے، اس سے اس کا گوشت بنتا ہے، تو وہ مرضعہ کے ایک جز کی طرح ہو جاتا ہے، لہٰذا حرمت میں اولاد کی طرح ہو جاتا ہے۔ (فتح الباری ۱۴۸/۹)

۲- "رضاعت (معتبر) نہیں، مگر جو دو سال کے اندر ہو" (دار قطنی۔ بیہقی)

۳- "رضاعت وہی (معتبر) ہے، جو انتڑیوں (یعنی معدہ) میں پہنچ جائے اور دو سال سے پہلے ہو"۔ (ترمذی وصحہ وفال لالبانی صحیح علی شرطھما، واخرج خوہ ابن حبان وابن ماجہ)

امام بیہقی نے حضرات عمرؓ وابن مسعودؓ سے بھی دو سال کی تحدید روایت کی ہے۔ (تلخیص الجیر ۴/۴، ارواء الغلیل ۲۲۱/۷)

چاند کے اعتبار سے دو سال مراد ہیں، اگر کسی ماہ کے دوران پیدا ہو، تو اس ماہ اور پچیسویں ماہ کے مجموعی ایّام تیس شمار ہوں گے۔ سال کی ابتداء بچہ مکمل ماں سے جدا ہونے کے بعد ہو گی۔

(۳) **دودھ**: دودھ یا دودھ سے بنی ہوئی چیز مثلاً پنیر کا جوف میں یعنی معدہ یا دماغ میں پہنچنا شرط ہے۔ زخم کے ذریعہ جوف تک پہنچے تو اس سے حرمت ثابت ہو گی، مسامات سے پہنچے تو ثابت نہ ہو گی۔ جوف تک پہنچنے سے پہلے بالیقین قئ کرے تو حرمت ثابت نہ ہو گی۔ اگر

دودھ کسی دوسرے مائع یا جامد میں مختلط (گھلی ملی) ہو، اور دودھ غالب ہو، یعنی اس کا رنگ، بو یا مزہ ظاہر ہو، تو اس کے پینے سے حرمت ثابت ہو گی، اگر دودھ مغلوب ہو، یعنی تینوں وصف میں سے کوئی بھی حساً اور تقدیراً موجود نہ ہو، اور دودھ کا کچھ حصہ جوف میں پہنچنا یقینی ہو، مثلاً بقیہ مقدار دودھ سے کم ہو، یا اس کا خلیط کے تمام اجزاء میں منتشر ہونا یقینی ہو، تو حرمت ثابت ہو گی۔ دو عورتوں کا دودھ ملا کر پلایا جائے تو دونوں سے رضاعی رشتہ ثابت ہو گا۔ ایک کا دودھ غالب اور دوسری کا مغلوب ہو، تو اوپر کی تفصیل کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ دودھ سے آٹا گوندھ کر اس کی روٹی بچہ کو کھلائی جائے تو حرمت ثابت ہو گی۔ اگر دودھ حلق میں ٹپکایا جائے اور معدہ میں پہنچ جائے، یا ناک کے راستہ دماغ میں پہنچے، تو حرمت ثابت ہو گی۔ زندگی میں عورت کا دودھ نکال کر اس کے مرنے کے بعد بچہ کو پلایا جائے تو حرمت ثابت ہو گی۔ اگلی یا پچھلی شرم گاہ میں یا کان میں دودھ ٹپکانے سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہو گی۔ بعض علماء کے نزدیک اس طرح ٹپکانے سے معدہ یا دماغ میں پہنچے تو حرمت ثابت ہو گی۔

حرمت کی شرط: رضاعی حرمت کے ثبوت کے لئے یہ شرط ہے کہ دودھ بالیقین پانچ مرتبہ عورت سے جدا ہوا ہو، اور پانچ مرتبہ بچہ کے جوف میں پہنچا ہو، اس سے کم کا اعتبار نہیں، اگر پانچ مرتبہ میں شک ہو، تو بھی حرمت ثابت نہ ہو گی، مثلاً مخلوط میں سے اتنی مقدار استعمال کرے کے خالص دودھ پانچ مرتبہ ہونا محقق نہ ہو۔

حدیث: حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: ”پہلے قرآن میں یہ نازل ہوا تھا، دس معلوم مرتبہ رضاعت حرام کرتی ہے، پھر یہ (حکم) پانچ معلومات کے ذریعہ منسوخ ہوا، اور آپ ﷺ کا وصال ہوا، تو اس کی قرآن میں تلاوت ہوتی تھی“ (مالک، شافعی، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی، دارمی، بیہقی۔ ارواء ۲۱۸/۷)

اس کی تلاوت ہوتی تھی، یعنی اس حکم پر عمل جاری تھا، یا اس کی تلاوت بالکل آخر میں منسوخ ہونے کی وجہ سے جسے نسخ کا علم نہیں تھا، وہ تلاوت کیا کرتا تھا۔

رضاعت عرفاً پانچ متفریق مرتبہ ہونا شرط ہے، پس اگر رضیع پستان سے اعراض کرتے ہوئے دودھ پینا چھوڑ دے، یا دایہ پلانا چھوڑ دے، پھر دوبارہ پینا شروع کرے، تو یہ دوسری مرتبہ شمار ہو گا، گو جوف میں صرف ایک ہی قطرہ پہنچے۔ اگر لہو اور کھیل کے طور پر، یا سانس لینے کے لئے، یا ہلکی نیند کی وجہ سے، یا منہ میں جمع شدہ دودھ کو نگلنے کے لئے دودھ پینا چھوڑ دے، پھر فوراً دوبارہ پینا شروع کرے، یا ایک پستان سے دوسرے کی طرف منتقل ہو، یا دایہ منتقل کرے، یا دایہ کسی معمولی و سرسری کام کے لئے چلی جائے، پھر لوٹ کر پلائے، تو ان صورتوں میں ایک ہی مرتبہ شمار ہو گا۔ زیادہ دیر کھیلتا یا سوتا رہا اور پستان اس کے منہ میں ہی ہو، تو ایک ہی شمار ہو گا ورنہ دو شمار ہوں گے۔

اگر پانچ مرتبہ دودھ نکال کر ایک ہی مرتبہ تمام دودھ بچہ کو پلا دیا جائے، یا ایک مرتبہ نکال کر پانچ مرتبہ پلایا جائے، تو ایک شمار ہو گا۔ اگر پانچ عورتوں کا دودھ جمع کر کے بہ یک وقت پلا دیا جائے، تو ہر ایک عورت سے ایک مرتبہ پینا شمار ہو گا۔

رضاعی والدین اور دیگر رشتہ دار: مُرضعہ (دایہ) رضیع کی رضاعی ماں، اور جس شوہر (یا صحبت شبہ کرنے والے) کے تعلق سے یہ دودھ ہے، وہ اس کا رضاعی باپ شمار ہو گا، رضاعی والدین کی طرف سے یہ حرمت ان کے اصول، فروع اور حواشی کی طرف بھی منتقل ہو گی، خواہ نسبی اعتبار سے ہو یا رضاعی اعتبار سے اور رضیع (شیر خوار بچہ) کی طرف سے صرف اس کے فروع کی طرف منتقل ہو گی، اصول اور حواشی کی طرف منتقل نہ ہو گی، (اصول یعنی والدین اوپر تک، فروع یعنی اولاد در اولاد نیچے تک اور حواشی یعنی بھائی بہن اور ان کی اولاد نیچے تک)

لہٰذا مرضعہ کے والدین اس بچہ کا نانانانی، مرضعہ کی اولاد اس کے بھائی بہن، اور مرضعہ کے بھائی بہن اس کے ماموں اور خالہ شمار ہوں گے۔ رضاعی والد کے والدین دادادادی، اس کی اولاد بھائی بہن، اور رضاعی والد کے بھائی بہن رضیع کے چچا اور پھوپھی شمار ہوں گے، اور رضیع کی اولاد رضاعی والدین کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں شمار ہوں گے۔ رضیع کے بھائی بہن یا نسبی والدین کا اس کے رضاعی والدین سے محرمیت کا کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

کوئی بچہ کسی کے چار بیویوں سے ایک ایک مرتبہ دودھ پیئے، پھر ایک کے طلاق یا موت کی وجہ سے پانچویں بیوی سے ایک مرتبہ پیئے، تو یہ بچہ اس شخص کا بیٹا بن جائے گا، کیونکہ تمام کا دودھ اسی سے ہے، اور وہ ساری بیویاں رضاعی باپ کی صحبت شدہ بیوی ہونے کی وجہ سے حرام ہوں گی، ان کا رضاعی ماں ہونا ثابت نہ ہوگا، کیونکہ ایک عورت سے پانچ مرتبہ دودھ نہیں پیا ہے۔ کسی شخص کے پانچ بیٹیوں یا بہنوں سے ایک ایک مرتبہ دودھ پینے سے اس کے اور رضیع کے درمیان کوئی حرمت نہ ہوگی، یعنی وہ اس بچہ کا رضاعی نانا یا ماموں نہ ہوگا، کیونکہ یہ رشتہ ماں کے توسط سے ثابت ہوتے ہیں، اور ایک ایک مرتبہ پینے کی وجہ سے رضاعی ماں ہونا ثابت نہ ہوگا۔

جس بچہ کی پیدائش سے دودھ شروع ہو، وہ بچہ شرعاً جس شخص کا ہوگا، دودھ اسی کی طرف منسوب ہوگا، (یعنی وہ رضاعی باپ ہوگا) خواہ وہ شوہر پر ہو یا آقا یا شبہ کی وجہ سے صحبت کرے، اگر زنا کی وجہ سے دودھ آئے تو زانی کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ اور وہ رضاعی باپ نہ ہوگا، کیونکہ اسی کے دودھ کا کوئی احترام نہیں، اسی لئے اُس دودھ سے پرورش پانے والی لڑکی سے زانی نکاح کر سکتا ہے، لیکن مکروہ ہے۔

شوہر کے صحبت سے قبل، یا صحبت کے بعد لیکن حمل سے قبل بیوی کو دودھ آئے، تو اس دودھ کو پلانے کی وجہ سے بیوی تو رضاعی ماں بن جائے گی، لیکن شوہر کے حق میں حرمت ثابت نہ ہوگی۔

دودھ جس شخص کی طرف منسوب ہو، اس کی طرف دودھ کی یہ نسبت اس وقت ختم نہ ہوگی، جب تک کہ اس عورت کو دوسرے شخص سے بچہ پیدا نہ ہو، گو طویل مدت گذر جائے، یا درمیان میں دودھ ختم ہو جائے اور بعد میں پھر شروع ہو جائے، دوسرے سے نکاح اور حمل کے باوجود زچگی سے قبل تک دودھ کی نسبت اوّل کی طرف ہوگی، خواہ دوسرے کے حمل کے دودھ کے ظہور کا وقت ہو چکا ہو، گو پہلے کے مقابلہ میں دودھ بڑھ جائے یا نہ بڑھے۔

نکاح پر رضاعت کا طاری ہونا

کسی کے نکاح میں کمسن بچی (دو سال سے کم عمر) ہو، اور کوئی ایسی عورت اس بچی کو دودھ پلائے جس کی بیٹی اس شخص پر حرام ہو، تو یہ نکاح فسخ ہو جائے گا۔ مثلاً شوہر کی بہن یا ماں اس بچی کو دودھ پلائے، کیونکہ وہ بچی اس کی بھانجی یا بہن بن چکی۔ اس بچی کے حق میں شوہر پر نصف مہر لازم ہوگا، کیونکہ صحبت سے قبل جدائی ہوگئی۔ اور مُرضعہ کو شوہر نے رضاعت کی اجازت نہ دی تھی، تو شوہر اس سے نصف مہر مثل وصول کرے گا۔ اگر نیند میں بچی جاکر خود دودھ پی لے، یا وہ بیدار ہو، لیکن چپ ہو (یعنی خود نہ پلائے) تو نہ بچی کو شوہر سے مہر ملے گا اور نہ شوہر مرضعہ سے کچھ وصول کرے گا۔

کسی کے نکاح میں ایک بڑی عورت اور ایک کمسن بچی ہو، اور بڑی کی ماں کمسن کو دودھ پلائے، تو دونوں کا نکاح فسخ ہوا۔ کیونکہ دونوں رضاعی بہن ہو چکیں اور ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، اور کسی ایک کو دوسری پر ترجیح بھی نہیں، بعد میں ان میں سے کسی ایک سے نکاح کر سکتا ہے، کیونکہ صرف دونوں کو جمع کرنا حرام ہے۔ اگر بڑی بیوی کی بیٹی چھوٹی بیوی کو دودھ پلائے تو بڑی ہمیشہ کے لئے

حرام ہو چکی، کیونکہ وہ بیوی کی نانی بن چکی، اور چھوٹی ربیبہ ہے، پس اگر بڑی سے صحبت کر چکا ہے، تو یہ بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہو چکی، ورنہ حرام نہ ہو گی۔ چھوٹی کو اور بڑی کو جب کہ صحبت نہ ہوئی ہو، نصف مہر دے گا۔ اور مرضعہ سے دونوں کے مہر مثل کو نصف وصول کر لے گا۔ اگر بڑی سے صحبت ہو چکی ہو، تو مکمل مہر ادا کرے گا، اور مرضعہ سے اس کا مکمل مہر مثل وصول کرے گا۔ اگر بڑی بیوی چھوٹی کو دودھ پلائے تو بڑی ہمیشہ کے لئے حرام ہو چکی، کیونکہ وہ بیوی کی ماں ہے (یعنی چھوٹی کی رضاعی ماں ہے)، اور دودھ اسی شوہر کی طرف منسوب ہو، تو چھوٹی بھی رضاعی بیٹی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے حرام ہو چکی ہے، ورنہ پھر ربیبہ شمار ہو گی، لہٰذا بڑی سے صحبت کر چکا ہو، تو ہمیشہ کے لئے حرام ہے، ورنہ حرام نہیں، لیکن یہ نکاح فسخ ہو گا، کیونکہ ماں بیٹی ایک ساتھ نکاح میں جمع ہیں۔

کسی کی دو چھوٹی بیویوں کو کوئی پرائی عورت دودھ پلائے تو دونوں کا نکاح فسخ ہو گا، کیونکہ دونوں بہنیں بن چکیں، بعد میں کسی ایک سے نکاح کر سکتا ہے، مرضعہ ساس ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حرام رہے گی۔ کوئی اپنی کمسن بیوی کو طلاق دے، بعد میں کوئی عورت اسے دودھ پلائے تو مرضعہ اس شخص کی ساس شمار ہو گی، لہٰذا ہمیشہ کے لئے حرام ہو گی۔ کسی کی مطلقہ کسی کمسن (دو سال سے کم) لڑکے سے شادی کرے، اور سابقہ شوہر کی طرف منسوب دودھ اس لڑکے (حالیہ شوہر) کو پلائے، تو دونوں پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو چکی، کیونکہ وہ طلاق دینے والے کے رضاعی بیٹے کی بیوی، اور کمسن کی ماں اور باپ کی بیوی بن چکی، یعنی بڑے شوہر پر ایک اعتبار سے اور کمسن پر دو اعتبار سے حرام ہے۔

(مذکورہ مسائل میں دودھ پلانے سے رضاعی حرمت کے تمام شرائط کے ساتھ پلانا مراد ہے)

رضاعت کا اقرار

اگر کوئی مرد یا عورت دونوں میں رضاعی حرمت کا اقرار کریں، مثلاً زید یہ کہے کہ مریم میری رضاعی بیٹی ہے، یا بہن ہے، یا اس کے برعکس، اور یہ ممکن بھی ہو، یعنی حس اسے نہ جھٹلائے، تو دونوں کا آپس میں نکاح حرام ہے، اگر ممکن نہ ہو تو حرام نہیں، مثلاً کہے کہ فلانی میری بیٹی ہے، حالانکہ وہ اس سے عمر دراز ہے۔ اگر زوجین رضاعی حرمت کا اقرار کریں، تو دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔ اور بیوی کو مکمل مہر ملے گا، جب کہ صحبت ہو چکی ہو، اور اس میں بیوی معذور ہو، مثلاً اسے اس حقیقت کا علم نہ تھا یا جبراً صحبت کی ہو، صرف شوہر اقرار کرے اور بیوی انکار کرے تو نکاح فسخ ہو گا، اور صحبت کی صورت میں کل مہر، ورنہ نصف مہر لازم ہو گا۔ صرف بیوی اقرار کرے اور شوہر انکار کرے، تو شوہر کو قسم دلا کر اس کی تصدیق کی جائے گی، جب کہ بیوی کی رضامندی سے یہ نکاح ہوا ہو، اور اجازت میں اس نے شوہر کی تعیین کی ہو، یا شوہر کو اپنے آپ پر قدرت دی ہو، اگر باپ دادا نے بلا اجازت نکاح کیا ہو، یا دوسروں نے اس کی اجازت سے کیا، لیکن کسی شوہر کی تعیین نہیں کی، اور خود پر اسے قدرت نہ دی، تو بیوی کو قسم دلا کر تصدیق کی جائے گی، مذکورہ صورتوں میں صحبت ہو چکی ہو اور بیوی معذور ہو، تو اسے مہر مثل ملے گا، ورنہ اسے کچھ نہ ملے گا، اگر وہ متعین مہر پہلے ہی لے چکی ہو، تو شوہر واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ بیوی رضاعت کا اقرار کرے تو شوہر کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے ایک طلاق دے دے، تاکہ وہ جھوٹی ہو تو دوسرے کے لئے حلال ہو جائے۔

جو رضاعت کا انکار کرے، وہ اپنے علم کی نفی پر قسم لے، اور جو دعوی کرے وہ حتمی قسم لے، خواہ مرد ہو یا عورت۔

رضاعت کا ثبوت: دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں، یا چار عورتوں کی گواہی سے رضاعت ثابت ہو گی۔ اگر کسی برتن سے پینے کے متعلق اختلاف ہو تو صرف عورتوں کی گواہی کافی نہیں ہے۔ اگر کوئی رضاعت کا اقرار کرے، تو اس اقرار کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی گواہی ضروری ہے۔

اگر خود مرضعہ گواہی دے تو مقبول ہوگی، جبکہ وہ رضاعت کی اجرت کا مطالبہ نہ کر رہی ہو، گو وہ اپنے فعل کا تذکرہ کرے کہ میں نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ اگر اپنی اجرت طلب کر رہی ہو تو تہمت کی وجہ سے اس کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔

رضاعت کی گواھی کے شرائط: ۱-رضاعت کے وقت کا ذکر کرنا، تاکہ رضیع کے دو سال کے بعد، یا مُرضعہ کے ۹ سال سے پہلے یا دونوں کی موت کے بعد ہو، تو اسے رد کر دیا جائے۔

۲-اس بات کا ذکر کرنا کہ کتنی مرتبہ دودھ پیا ہے، تاکہ پانچ سے کم ہو تو غیر معتبر قرار دیا جائے۔

۳-یہ وضاحت کہ متفرق پانچ مرتبہ پیا ہے۔

۴-اس بات کی صراحت کہ دودھ اس کے جوف میں پہنچ گیا تھا، نکالے ہوئے دودھ، اور ٹپکانے و نگلنے کو دیکھ کر اس کا اندازہ ہوگا، یا دیگر قرائن سے پتہ چلے گا، مثلاً پستان چوسنا اور بچہ کے حلق کی حرکت، جبکہ عورت کے پستان میں دودھ کی موجودگی کا علم ہو، اگر اس کا علم نہ ہو، تو گواہی دینا جائز نہیں۔ شہادت کی ادائیگی میں قرائن کا تذکرہ کافی نہیں، بلکہ قرائن پر اعتماد کرتے ہوئے بالجزم (حتمی) گواہی دے۔

اگر مسلک کے موافق فقیہ شخص رضاعت کی گواہی دے، تو ان شرائط کا تذکرہ ضروری نہیں، (کیونکہ وہ اپنے علم کی روشنی میں تمام شرائط موجود ہوں، تبھی گواہی دے گا)، اگر دوسرے مسلک کا یا غیر فقیہ ہو، تو ان شرائط کا ذکر ضروری ہے۔ اس کا صرف اتنا کہنا کافی نہیں کہ ان دونوں میں رضاعی حرمت کا رشتہ ہے۔ رضاعت کے اقرار یا اقرار کی گواہی کے لئے ان شرائط کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

(تحفہ مع الحواشی ۱۰/۵۱۱-۵۴۳، نہایہ مع الحواشی ۷/۱۷۲، ۱۸۶، مغنی ۳/۴۱۴-۴۲۵، فتح الوہاب مع الجمل ۴/۴۷۴-۴۸۷، الاقناع مع تحفۃ الحبیب ۴/۵۹-۶۵، المجموع ۱۸/۲۰۷-۲۳۵، الفقہ المنہجی ۴/۲۰۳-۲۱۲، شرح التنبیہ للسیرطی ۲/۷۳۷)

نَفَقَات (ضروریاتِ زندگی۔ نان نفقہ)

تعریف: نَفَقَات دراصل نَفَقَہ کی جمع ہے، جو اِنفَاق سے ماخوذ ہے، یعنی اخراج (نکالنا و خرچ کرنا) اور ختم ہونا، یہ لفظ صرف خیر میں خرچ کرنے کے لئے مستعمل ہے۔

شرعی اصطلاح میں انسان کی ضروریاتِ زندگی، یعنی کھانا، پینا، اور لباس وغیرہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

نفقات کے انواع: (۱) اپنی ذات کا نفقہ (۲) شوہر پر بیوی کا نفقہ (۳) اصول پر فروع کا نفقہ (۴) فروع پر اصول کا نفقہ (۵) دیگر نفقات

(۱) **اپنی ذات کا نفقہ:** جب ایک انسان قادر ہو، اس کے پاس مال ہو، تو سب سے پہلے اس کے ذمہ خود اپنا نفقہ واجب ہے۔ اس میں ایک انسان کی تمام ضروریات داخل ہیں، یعنی مکان، لباس، اور کھانا پینا وغیرہ۔ صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنی ذات سے شروع کرنے اور اس کی ضروریات پر صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) **شوہر پر بیوی کا نفقہ:** بعض شرائط کے ساتھ جن کا تذکرہ آئندہ ہوگا، شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ بالاجماع واجب ہے۔

آیات: ۱) ”اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ“

(النساء:۳۴)

ترجمہ:''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں نان ونفقہ میں) خرچ کئے ہیں''۔

۲)''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''(البقرہ:۲۳۳)

ترجمہ:''اور (شرعاًنسب کے اعتبار سے) جس کا بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق''۔

احادیث:۱) حجۃ الوداع سے متعلق حضرت جابرؓ کی طویل روایت میں آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:''۔۔۔۔۔اور ان (عورتوں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق تم (مردوں) پر لازم ہے۔''(مسلم)

یہی مفہوم سنن کی روایات میں حضرت عمروبن عاص سے بھی مروی ہے۔

۲) حضرت معاویہ قُشیری نے آپ ﷺ سے بیوی کے حق کے متعلق پوچھا، تو ارشاد فرمایا: جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ، اور جب تم پہنو تو اسے پہناؤ''(نسائی، ابن ماجہ، ابوداود، ابن حبان وحاکم وصحاہ وصححہ الدارقطنی)

۳) آپ ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ایک شخص نے کہا: میرے پاس ایک دینار ہے، فرمایا: اسے اپنی ذات پر صرف کرو، کہا ایک اور دینار ہے، ارشاد فرمایا: اسے اپنی بیوی پر صرف کرو، کہا کہ میرے پاس ایک دینار اور ہے، کہا: اپنی اولاد پر خرچ کرو، کہا کہ مزید ایک دینا ہے، تو فرمایا: اسے اپنے خادم پر صرف کرو، کہا: ایک دینار اور ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے متعلق تم زیادہ جانتے ہو (یعنی اپنی صوابدید سے مناسب موقع محل میں اسے صرف کرو۔)(احمد، نسائی) ابوداود کی روایت میں اولاد کو بیوی پر مقدم رکھا ہے

حکمت: نفقات کے سلسلہ میں ازدواجی زندگی کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) شوہر اپنی بیوی اور اولاد کی ضروریات کا ذمہ دار ہو، (۲) اس کے برعکس بیوی ان ذمہ داریوں کو انجام دے۔ (۳) زوجین باہمی تعاون واشتراک سے مادی وسائل اور مصارف کا بار اٹھائیں

ہم اگر شریعت اِسلامیہ کی مقرر کردہ پہلی صورت کو چھوڑ کر بقیہ دو کو اختیار کریں تو نتیجہ میں مہر کا حکم بھی بدل جانا چاہئے، کہ بیوی شوہر کو دے، یا دونوں مشترک طور پر اسے برداشت کریں، نیز مختلف خارجی میدانوں میں معیشت کی بھاگ دوڑ میں عورت کی عزت، اس کا شرف واحترام، اور زیورِ حیا، سب کچھ برباد ہوجائے گا، اور وہ ہوا پرستوں کے ہاتھ کھلونا بن جائے گی نیز گھر ایک ایسے ذمہ دار سے خالی ہوجائے گا جو امورِ خانہ داری کو اور گھریلو نظم ونسق کو صحیح ترتیب سے انجام دے، اور کمسن اولاد کو ماتا کے آغوش میں زیورِ تعلیم وتربیت سے آراستہ کرسکے، لہٰذا گھر آرام گاہ اور محلِ انسیت ہونے کے بجائے، ویران اور وحشت ناک جگہ بن جائیگی، جہاں قلق واضطراب کا راج ہوگا، واقعات اور مشاہدات ان سنگین نتائج کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔

نیز مذکورہ صورتوں میں طلاق کا اختیار بھی عورتوں کو مل جانا چاہئے، حالانکہ شریعت کا حکیمانہ قانون یہ ہے کہ یہ حق عام حالات میں شوہر کو حاصل ہے۔

لہٰذا زوجین ایک دوسرے کی خوش بختی کا عنصر قرار پائیں، اور خانگی ماحول ایک خالص شریفانہ واسلامی ہو، جہاں صحیح تربیت ونگرانی اور انسیت حاصل ہو، نیز عورت کا اپنا صحیح مقام اور عزت وشرف باقی رہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی اور خانگی ضروریات کا کفیل وذمہ دار قرار پائے۔

بیوی کے حقوق: اناج، سالن، گوشت، لباس، سامانِ نشست (بیٹھنے کا نظم)، اوڑھنا، بچھونا، کھانے پینے اور پکانے کے برتن

وغیرہ، نظافت کے اسباب ووسائل اور خادم۔

نفقہ کا وقت: ہر روز صبح صادق ہوتے ہی، اس کے بعد آنے والی رات سمیت بیوی کا نفقہ واجب ہو گا۔ اگر اس رات میں بھی وہ نشوز اختیار کرے، تو اس دن کا نفقہ ساقط ہو جائے گا۔ اگر دن یا رات کسی دوران تمکین وسپردگی پائی گئی تو اسی قسط کے اعتبار سے واجب ہو گا۔ لیکن نشوز کے بعد پھر اطاعت کرے، تب بھی اس دن کا نفقہ بالکل واجب نہ ہو گا۔ اگر دے چکا ہے، تو واپس لے سکتا ہے۔

اگر بیوی وجوب کے بعد مطالبہ کرے تو (فوراً) دینا واجب ہے، بلا عذر نہ دے، تو گنہگار ہو گا۔

مقدار: بیوی کے نفقہ کی مقدار متعین ہے، جو شوہر کی مالی حالت کے پیشِ نظر مقرر کی جائے گی، نہ کہ بیوی کے مالی معیار کے مطابق، جس کی دلیل یہ آیتِ مبارکہ ہے:

"لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ" (الطلاق: ۷)

ترجمہ: "وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہئے، اور جس کی آمدنی کم ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے"

شرعاً مالی نقطۂ نظر سے شوہر کے تین درجات قائم ہوں گے:

(۱) مُعْسِر (تنگدست، غریب) (۲) مُتَوَسِّط (درمیانی درجہ کا) (۳) مُوْسِر (دولت مند، آسودہ حال)

جس دن کا نفقہ دینا ہے، اس دن فجر کے وقت کسی کے پاس موجود مال اس کے غالب عمر کے مصارف (یعنی اس کے اور دیگر زیر کفالت افراد کے خرچ) سے زائد نہ ہو، یا صرف ڈیڑھ مُد سے کم بچتا ہو، تو (اس دن) وہ مُعْسِر شمار ہو گا، اگر ڈیڑھ مد بچتا ہو، لیکن دو مد تک نہ پہنچے، تو متوسط، اور دو مد یا زائد بچے تو موسر اور مالدار شمار ہو گا۔ غالب عمر گذر چکی ہو، تو ایک سال کا اعتبار ہو گا۔ لباس کے متعلق موسم کے ابتداء کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کافی مقدار کمانے پر قادر ہو، (لیکن مال جمع نہ ہو)، تب بھی وہ نفقہ کے مسئلہ میں معسر شمار ہو گا، گو زکات کے مسئلہ میں مسکین شمار نہ ہو گا۔ جو شخص کما کر موسر کی مقدار ادا کر سکتا ہو، اس پر یہ لازم نہیں ہے۔

(۱) **مُعْسِر:** ایک معسر پر اپنی بیوی کے لئے (ایک دن کا نفقہ) ایک مُد اناج لازم ہے، گو بیوی ذمیہ (یعنی اہلِ کتاب)، یا بیمار یا اونچے درجہ کی ہو۔ بیوی جس جگہ رہتی ہے، وہاں غالباً جو اناج استعمال ہو، اس کا اعتبار ہو گا۔ اگر مختلف اناج مستعمل ہوں، اور کچھ غالب نہ ہو، تو شوہر کے مناسبِ حال اناج کا اعتبار ہو گا۔

(۲) **متوسط:** جو فجر کے وقت متوسط مالیت کا حامل ہو، اس پر اس دن ڈیڑھ مُد نفقہ واجب ہے۔

(۳) **مُوْسِر:** ایک غنی اور مالدار شخص پر اپنی بیوی کے حق میں دو مُد اناج بطورِ نفقہ واجب ہے۔

علماء نے اصل تفاوت کے لئے مذکورہ بالا آیت (سورہ طلاق: ۷) سے استدلال کیا ہے۔ اور نفقہ کو کفارہ پر قیاس کر لیا، کیونکہ دونوں بھی شریعت کی جانب سے واجب ہونے والا مال ہے، اور ذمہ میں مستقر ہوتا ہے، کفارہ میں ایک مسکین کے لئے زیادہ سے زیادہ دو مد واجب ہوتا ہے، جو حج کے اَذٰی کا کفارہ ہے، اور اقل مقدار ایک مسکین کے لئے ایک مد ہے، جو قسم کے کفارہ وغیرہ میں واجب ہے۔ لہٰذا موسر پر اکثر، معسر پر اقل، اور متوسط پر دونوں کا اوسط واجب کیا گیا۔ دیگر رشتہ داروں کے نفقہ کی طرح بیوی کے نفقہ میں کفایت (جو کافی اور دوسرے سے مستغنی کرنے والی ہو) کا اعتبار نہ کیا گیا، کیونکہ بیوی اپنی بیماری اور استغناء ومالداری اور شکم سیری کے باوجود نفقہ کی مستحق ہے۔ نیز قرآن وحدیث نے معروف اور قاعدہ کے موافق خرچ کا حکم دیا ہے، اور یہ تفاوت وتفصیل اسی معروف کی وضاحت ہے،

مزید یہ کہ بغیر تعیین کے محض کفایت کے سپرد کردیا جائے، تو کافی اختلاف وتنازع کھڑا ہو جائے گا۔

بیوی کا امورِ خانہ داری کو انجام دینا: عموماً بیوی جو گھریلو کام کاج انجام دیتی ہے، مثلاً: پکانا، جھاڑو دینا وغیرہ، جو کہ اس پر واجب نہیں، تو بیوی کو یہ مسئلہ بتادینا ضروری ہے، کیونکہ اسے مسئلہ معلوم نہ ہو، تو وہ یہ سمجھے گی کہ یہ امور مجھ پر واجب ہیں، اور انجام نہ دوں تو مجھے نان نفقہ وغیرہ کا استحقاق نہ ہو گا۔ تو ایک طرح سے وہ مُکرَہ شمار ہو گی، اس کے باوجود وہ ان خدمات کو انجام دے تو اس کا احتمال ہے کہ اس کے حق میں اس کے عوض اجرت واجب نہ ہو، کیونکہ مسئلہ کی تحقیق نہ کرنا اس کی غلطی ہے۔

تنبیہ: اصل مسئلہ تو یہی ہے، جو بیان ہوا، لیکن صحیحین وغیرہ کی احادیث سے جو بات سامنے آتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ رسالت وصحابہ میں صحابیات خوش اخلاقی اور معاشرت بالمعروف کے طور پر گھر کے اندرونی نظام کو اپنی خوشی ومرضی سے سنبھالا کرتی تھیں، اس لئے ایک مسلمان خاتون کو انہیں کے اسوہ کو اپنانا چاہئے، تاہم یہ اس پر واجب نہیں، لہٰذا اس پر ان امور کے لئے جبر جائز نہ ہو گا، اور اسے بنیاد بنا کر ایک شوہر کے لئے اس کے خلاف کوئی اقدام روا نہ ہو گا۔ شوہر کے دیگر رشتہ داروں (ساس سسرے دیور نند وغیرہ) کی خدمت ازروئے فقہ اس پر واجب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

پیسنا وغیرہ: اگر اناج واجب ہو رہا ہو، تو شوہر پر بے عیب اناج ہی دینا واجب ہے، کیونکہ اس کا نفع اکمل ہے، پس آٹا یا روٹی یا گھُن لگا ہوا اناج دینا کافی نہیں، اگر بیوی کچھ اور طلب کرے تو شوہر کو دینا، یا شوہر کچھ اور دے تو بیوی کو قبول کرنا لازم نہیں ہے۔ اناج کے پیسنے، گوندنے اور روٹی بنانے (کے مصارف) کا ذمہ دار شوہر ہے۔ گو بیوی ازخود ان امور کو انجام دینے کی عادی ہو، اگر بیوی اناج فروخت کردے یا اسی شکل میں استعمال کرلے، تب بھی ان مصارف کی مستحق ہو گی۔

اعتیاض: بیوی اپنے سابقہ یا حالیہ نفقہ کے عوض شوہر سے درہم ودینار یا کپڑا وغیرہ کوئی دوسری چیز لے سکتی ہے، جب کہ اس میں سود کی شکل نہ ہو، جیسا کہ جو کی جگہ گیہوں دینا۔ اگر سود لازم آئے تو جائز نہیں، مثلاً گیہوں کا آٹا یا روٹی (لیکن امام بغوی واذرعی وغیرہ نے سہولت اور تسامح کے طور پر اسے بھی کافی قرار دیا ہے)۔ مستقبل کے نفقہ کے عوض دوسری کوئی چیز لینا جائز نہیں ہے۔

شوہر کے ساتھ کھانا پینا: عام عادت کے مطابق بیوی اپنی خوشی سے شوہر کے ساتھ کھائے پئے، اور وہ رشیدہ ہو یا غیر رشیدہ ہو، لیکن ولی نے اس کی اجازت دی ہو، تو یہ کافی ہے، اور اس سے اس کا نفقہ ساقط ہو گا، کیونکہ قدیم زمانہ سے عموماً لوگوں کا یہی معمول چلا آرہا ہے۔ اگر بیوی رشیدہ نہ ہو، مثلاً پاگل یا کمسن ہو، اور ولی کی اجازت نہ ہو، تو ساتھ کھانے پینے سے اس کا نفقہ ساقط نہ ہو گا۔ اگر بیوی اپنی کفایت سے کم استعمال کرے تو بقیہ مقدار کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

اگر صرف شوہر کے اکرام کے طور پر کہیں ضیافت میں کھالے تو اس سے بھی نفقہ ساقط ہو گا، صرف بیوی کے تعلق اور اکرام کی وجہ سے ضیافت ہو تو نفقہ ساقط نہ ہو گا، اگر دونوں کا اکرام شامل ہو، تو نصف نفقہ ساقط اور نصف واجب ہو گا۔

سالن وغیرہ: موقع محل، ماحول، موسم، معاشرہ اور شوہر کی مالی حیثیت کے اعتبار سے قاعدہ وعادت اور عرف کے مطابق سالن، گوشت وغیرہ اشیاء بھی واجب ہوں گی، گو بیوی انھیں استعمال نہ کرے۔ اگر بعض اوقات میوہ اور پھل وغیرہ مستعمل ہوں، تو وہ بھی ضروری ہیں۔ ان امور میں میاں بیوی میں اختلاف ونزاع ہو، تو قاضی شوہر کی مالی حیثیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اجتہاد اور صوابدید سے مناسب مقدار متعین کرے۔

عید وغیرہ کے موقع پر جن مخصوص چیزوں کے استعمال کی عادت ہو، بظاہر وہ بھی واجب ہیں۔

لباس

(سورہ بقرہ کی آیت: ۲۳۳ میں بیوی کے لئے لباس اور کپڑے کی ذمہ داری کا ذکر گذر چکا)

بیوی کے لئے مناسب لباس و پوشاک بھی شوہر پر واجب ہے۔ علاقہ کی گرمی و سردی اور بیوی کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس میں تفاوت واختلاف ہو گا۔ اگر کسی جگہ سونے کے لئے الگ لباس کا عرف ہو، تو وہ بھی واجب ہے۔

قمیص (جو اوپری بدن چھپائے)، شلوار (وغیرہ جو نچلے حصہ میں مستعمل ہو)، دوپٹہ (جس سے سر چھپا سکے) اور پیروں میں پہننے کے لئے چپل وغیرہ لباس میں داخل ہیں۔ موسم سرما میں سوئٹر وغیرہ کا اضافہ کیا جائے گا۔ اگر سردی کی شدت کی وجہ سے آگ تاپنے کا معمول ہو، تو ایندھن یا کوئلہ وغیرہ بھی فراہم کرے۔

کپڑے کی جنس ونوعیت کے متعلق شوہر کے طبقہ کی عادت کا لحاظ کیا جائے گا۔ کپڑے کی دیگر ضروریات مثلاً ازار بند، بٹن وغیرہ بھی شوہر کے ذمہ ہے۔ نیز سلائی کے مصارف بھی شوہر پر لازم ہیں، گو بیوی خود اپنے کپڑے سی ڈالے۔

عام اوقات میں بیوی کے بیٹھنے کیلئے مناسب انتظام (چٹائی وغیرہ)، نیز آرام کے لئے بستر، لحاف، چادر، تکیہ وغیرہ کا نظم بھی شوہر پر واجب ہے۔ ان امور کی تفصیلات میں علاقہ، موسم، اور شوہر کے طبقہ کا عام رواج و معمول اور اس کی مالی حیثیت کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

عام لباس اور پوشاک سال میں دو مرتبہ دینا واجب ہے، یعنی ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔ سوئٹر، بیٹھنے کا نظم اور بستر وغیرہ میں عادت کے مطابق اصلاح اور تجدید کی جائے گی۔

کھانے پینے اور پکانے کے اسباب: بیوی کے لئے کھانے پینے اور پکانے کے برتن وغیرہ مثلاً پیالہ، کوزہ، گھڑا، ہانڈی اور چمچہ کی فراہمی شوہر کے ذمہ ہے۔ شوہر کے طبقہ میں عادت کے مطابق مٹی، پتھر، لکڑی یا تانبے وغیرہ کے بنے ہوئے ظروف فراہم کرے۔ اسی طرح مذکورہ امور میں بیوی کے مراتب، مثلاً دیہاتی یا شہری ہونے، وغیرہ کے اعتبار سے بھی تفاوت ہو گا۔

روشنی کا نظم اور کپڑے دھونے کے لئے بالٹی وغیرہ اور بصورت عادت وضو کے لئے لوٹا وغیرہ بھی فراہم کرے۔ معتمد قول یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام اشیاء بطورِ تملیک ہے (یعنی بیوی ان کی مالکہ ہو گی) شوہر کا بیوی کے حق کی نیت سے دے دینا اور بیوی کا لینا اور قبضہ کر لینا کافی ہے۔ (باقاعدہ ایجاب و قبول ضروری نہیں)

تنبیہ: مذکورہ تمام اشیاء جب بیوی کو عطا کرے، تو بیوی شوہر کو ان کے استعمال سے روک سکتی ہے، خواہ کھانے پینے وغیرہ میں استعمال کرے۔ اگر شوہر خلاف ورزی کرتے ہوئے خود استعمال کرے تو اس پر کرایہ اور نقصان کی تلافی لازم ہے۔ (اگر بیوی اپنے برتنوں میں پکا کر خود شوہر کے یا اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش کرے تو اجرت نہ ملے گی) نیز بیوی ان اشیاء کا مطالبہ کر سکتی ہے، گو حاکم کے ذریعہ یا دونوں میں جدائی کے بعد ہو، اگر بیوی اپنے مال سے یہ ضروریات پوری کرے، تو اس سے یہ ساقط نہ ہو گا۔

اگر یہ اشیاء ٹوٹ پھوٹ جائیں، تو جس مدت میں اس کے بدلنے کی عادت ہو، اس وقت بدلنا کافی ہے۔ فی الحال دوسری اشیاء کی فراہمی واجب نہیں ہے۔

صفائی ونظافت کے اسباب: بیوی کے لئے نظافت کے اسباب مثلاً: کنگھی، تیل، اور (بدن، کپڑے اور برتن کی صفائی کے لئے) صابن وغیرہ کا انتظام کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ زچگی اور صحبت کی وجہ سے واجب غسل کے لئے درکار پانی بھی شوہر کے ذمہ ہے۔

حیض واحتلام کے غسل کا شوہر ذمہ دار نہیں ہے۔

شوہر بیوی کو بدبودار اشیاء کے کھانے یا بدبودار لباس کے پہننے سے منع کر سکتا ہے، اور وہ خلاف ورزی کرے تو ناشزہ شمار ہوگی۔

اسبابِ زینت: سرمہ اور مہندی وغیرہ زینت کی اشیاء شوہر پر واجب نہیں، اور شوہر کو بیوی کا مزیّن ہونا مطلوب ہو، تو وہ ان اشیاء کو فراہم کرے، اور اس صورت میں ان کا استعمال بیوی پر واجب ہے۔

علاج ودوا: بیوی کا علاج اور طبیب (ڈاکٹر) کی اجرت (فیس) وغیرہ شوہر پر واجب نہیں، کیونکہ یہ بدن کی حفاظت کی خاطر ہے۔ زچگی کے بعد پیٹ وغیرہ میں پیش آنے والی تکلیف کے ازالہ کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ یہ بھی دوا میں داخل ہے۔ نیز بیوی کے پاس عورتوں کے جمع ہونے کے وقت ان کی ضیافت وغیرہ کا نظم شوہر کی ذمہ داری میں داخل نہیں ہے، اگر بیوی چاہے تو اپنے جیب سے ان امور کو انجام دے۔ بیماری کے ایّام میں نفقہ وغیرہ مذکورہ بالا تمام امور کی بیوی مستحق ہوگی، ان کو وہ اپنے معالجہ پر صرف کر سکتی ہے۔

تنبیہ: دورِ حاضر کے محقق علامہ دُکتور وَھبۃ الزُحَیلی کا خیال یہ ہے کہ علاج معالجہ ماضی میں بنیادی حاجت میں داخل نہ تھا، پس ایک انسان غالباً علاج کا محتاج نہ رہتا، کیونکہ وہ صحت وحفاظت کے اصول کو اپنا کر زندگی گذارتا تھا، لہٰذا فقہاء کرام کا اجتہاد ان کے دور کے عرف پر مبنی ہے، لیکن دورِ حاضر میں علاج کی ضرورت بھی غذا کی طرح ہو چکی ہے، بلکہ (بعض اوقات) اس سے بھی اہم، کیونکہ مریض اپنے علاج کو اکثر دیگر تمام امور پر ترجیح دیتا ہے،۔۔۔ لہٰذا موصوف کی رائے میں دیگر نفقاتِ ضروریہ کی طرح دواوعلاج کے مصارف بھی شوہر پر واجب ہیں، جیسا کہ ایک والد پر اولاد کے دوا کا خرچ بھی بالا جماع لازم ہے۔ کیا یہ حسنِ اخلاق اور اچھے برتاؤ میں داخل ہوگا کہ بحالتِ صحت تو شوہر بیوی سے انتفاع کرے، اور بحالتِ مرض علاج کے لئے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دے؟ (من الفقہ الاسلامی ۷/۷۹۴) واللہ اعلم بالصواب

مَسْکَن (مکان۔گھر)

عدت کے باب میں سورہ طلاق کی آیت ۱ اور ۶ کی تشریح گذر چکی، جس میں مطلقہ کے لئے دورانِ عدت رہائش کے نظم کا حکم ہے، لہٰذا ایک بیوی کے لئے بدرجہ اولیٰ یہ حکم ہوگا۔ نیز قرآن نے بیوی کے ساتھ معاشرت بالمعروف کا حکم دیا ہے، لہٰذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ بیوی کے لئے مکان کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہو۔

بیوی کیلئے اس کے مناسبِ حال رہنے کا انتظام (مکان یا کمرہ وغیرہ) شوہر پر واجب ہے، جہاں شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہ ہو، مکان شوہر کی ملکیت ہونا کوئی ضروری نہیں، اگر عاریت، یا کرایہ، یا وقف کا ہو، تب بھی کافی ہے۔ نان نفقہ اور لباس میں چونکہ تملیک ہے، اس لئے شوہر کی حالت کا اعتبار کیا گیا، اور رہائش میں صرف انتفاع ہے، اس لئے بیوی کے مناسبِ حال اس کا اعتبار کیا گیا، نیز نفقہ ولباس اگر بیوی کے مناسب نہ ہو، تو وہ اسے تبدیل کر سکتی ہے، لہٰذا کسی ضرر کا سوال نہیں، بخلاف مسکن کے، کیونکہ اسی میں رہنا اس پر لازم ہے، پس اس کے مناسب حال تجویز کیا گیا۔

اگر شوہر بیوی کے ساتھ اس کی اجازت سے اسی کے گھر رہے، یا وہ شوہر کے ساتھ منتقل ہونے سے انکار کرے اور اس وجہ سے شوہر اس کے گھر رہے، یا مثلاً بیوی کے باپ کے گھر میں اس کی اجازت سے رہے، یا باپ منتقل کرنے سے روکے (تو اس مدت کا سکنیٰ ساقط ہوگا) اور شوہر پر کرایہ لازم نہ ہوگا، کیونکہ اجازت میں عوض کا تذکرہ نہ ہو تو اسے عاریت واباحت پر محمول کیا جائے گا۔ بیوی یا اس کا باپ

سکوت اختیار کرے (یعنی زبان سے اجازت نہ دیں اور شوہر بیوی کے ساتھ وہاں رہے) تو کرایہ لازم ہو گا۔

خادم

جو آزاد عورت ایسے طبقہ کی ہو، کہ اس کے والد کے گھر عادتاً کام کاج کے لئے نوکر رہتے ہیں، تو ایسی عورت کے خدمت کا انتظام شوہر پر لازم ہے، گو شوہر غریب ہو، کیونکہ یہ معاشرت بالمعروف میں داخل ہے، شوہر کے گھر آنے کے بعد اس معیار پر پہنچی ہو، تو یہ لازم نہیں ہے۔

گھر کے اندرونی کام کے لئے شوہر ایسے خادم کا انتظام کرے، جسے اس عورت کو دیکھنا جائز ہو، مثلاً: کوئی عورت، ممیز بچہ جو مراہق (قریب البلوغ) نہ ہو، ممسوح یا عورت کا کوئی محرم رشتہ دار۔

تنبیہ: نوکروں کے متعلق کئی علاقوں میں کافی کوتاہی اور شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ بالکل اجنبی اور غیر محرم ہونے کے باوجود گھر کے اندر اور مستورات میں بڑی آزادی سے اس کی آمد و رفت رہتی ہے، اور اس سے پردہ وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات تو یہ غیر مسلم ہوتے ہیں، جن کی عورتوں تک سے مسلم عورتوں کو کسی درجہ میں پردہ ضروری ہے، جس کی تفصیل نظر کے احکام میں گذر چکی، لیکن الامان والحفیظ غیر مسلم اور نیم برہنہ نوکروں کو محرم سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا ہے، اور ایک محرم مرد کے سامنے جس پردہ کا اہتمام اور حیا کا احساس ہوتا ہے، ان غیر مسلم مردوں کے ساتھ اتنی بھی رعایت نہیں کی جاتی، بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

اگر شوہر خود بیوی کے کام کاج کو انجام دینا چاہے، تاکہ نوکر کے خرچ سے بچ سکے، تو بیوی کو قبول کرنا ضروری نہیں، خواہ کپڑے دھونے، پانی فراہم کرنے یا پکانے کا کام ہو، کیونکہ اس سے اسے حیا و شرم محسوس ہو گی، اور لوگ عار دلائیں گے۔ اگر بیوی اپنا کام کاج خود انجام دے کر خادم کی اجرت لینا چاہے، تو شوہر کو ماننا ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ متفق ہو تو گنجائش ہے۔ خادم کا انتظام ہو تو شوہر بیوی کو کام کاج سے روک سکتا ہے۔ جس بیوی کے لئے بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ایک یا زائد خادمہ کی ضرورت ہو، اس کا انتظام کرنا واجب ہے، خواہ عام حالات میں بیوی اس معیار و طبقہ کی نہ ہو کہ خادمہ فراہم کرنا واجب ہو۔

خادم اور مسکن میں واجب امتاع (انتفاع، نفع اٹھانا) ہے، اور دیگر اشیاء یعنی کھانا پینا، سالن، لباس، اسبابِ نظافت وظروف وغیرہ میں تملیک واجب ہے، بغیر صیغہ کے شوہر متعلقہ حق کی نیت سے ادا کرے تو یہ بھی کافی ہے، بیوی اسے لے کر جی چاہا تصرف کر سکتی ہے، یعنی اپنے دیگر اموال کی طرح فروخت وغیرہ کرنا بھی جائز ہے۔ اگر یہ حقوق فوت ہوں تو بیوی قیمت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اگر بیوی ان اشیاء کے استعمال میں تنگی سے کام لے، جو اس کے لئے مضر ہو، یا جس کی وجہ سے شوہر کو اس سے نفرت پیدا ہو، تو شوہر اسے اس تنگی و بخیلی سے روک سکتا ہے۔

مسئلہ: (۱) بیوی کے لئے زیور وغیرہ خرید کر اسے پہنائے تو اس سے بیوی مالکہ نہ بنے گی، اگر ان اشیاء کے ہدیہ یا عاریت ہونے میں دونوں میں اختلاف ہو، تو شوہر کی تصدیق کی جائے گی (اور اس کے وفات کی صورت میں اس کے وارث کی تصدیق کی جائے گی)

(۲) باپ اپنی بیٹی کو جہیز دے، تو بغیر ایجاب و قبول کے بیٹی اس کی مالکہ نہ بنے گی، اور باپ کہے کہ میں نے اسے مالکہ نہیں بنایا، تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔

لباس وغیرہ کی مدت: ہر چھ ماہ کے ابتداء میں بیوی کو لباس دیا جائے گا (گویا سال میں دو لباس، سردی و گرمی کی

مناسبت سے) امام دَمیری فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ ترتیب و مقدار اکثر علاقوں کے اعتبار سے ہے، جہاں اس مدت تک لباس محفوظ رہتا ہے۔ اگر کسی علاقہ میں گرمی کی شدت یا کپڑا گھٹیا ہونے کی وجہ سے اتنی مدت تک نہ رہتا ہو، تو ان کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی علاقہ میں ایسے کپڑوں کی عادت ہو، جو مثلاً ایک سال تک محفوظ رہے، تو بظاہر ان کی عادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر ہر چھ ماہ میں نئے جوڑے کا عرف ہو، اور اس مدت میں لباس بوسیدہ نہ ہو، تب بھی عادت کے مطابق نیا جوڑا دینا واجب ہے۔

اگر چھ ماہ کے اندر کپڑا تلف ہو، خواہ بیوی کی غلطی کے بغیر، تو اس کی جگہ دوسرا دینا لازم نہیں، اگر مدت کے دوران بیوی کی وفات ہو، تو جوڑا واپس نہیں لے سکتا، اور اگر کافی عرصہ تک بیوی کو لباس نہ دیا، تو یہ شوہر پر قرض رہے گا۔

بستر اور کنگھی وغیرہ عام طور پر جس مدت میں تبدیل کی جاتی ہیں، اس وقت تبدیل کی جائیں۔

تنبیہ: اگر زوجین یا دونوں کے وارث، یا ایک کے وارث اور دوسرے میں گھر کے اسباب میں اختلاف ہو، (شوہر کا ہے یا بیوی کا) تو وہ چیز صرف کسی ایک کے مناسب ہو، تو اس کا ہوگا، ورنہ بیّنہ نہ ہو، اور قبضہ میں ہونے کے اعتبار سے اختصاص نہ ہو، تو دونوں ایک دوسرے کو قسم دلا سکتے ہیں، اگر دونوں قسم لیں، تو دونوں میں (برابر) تقسیم ہوگا، اگر ایک قسم سے انکار کرے، تو دوسرا قسم لے، پھر اسی کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

نفقہ وغیرہ کے وجوب کا وقت

صرف عقد نکاح سے نفقہ واجب نہ ہوگا، بلکہ تمکین (قدرت دینا، بیوی کو شوہر کے حوالہ کرنا) سے واجب ہوگا، گو شوہر کمسن ہو اور صحبت پر قادر نہ ہو، اگر اتنی کمسن ہو کہ صحبت نہیں کر سکتی تو اسکا نفقہ واجب نہیں ہے۔ پاگل اور قریب البلوغ بیوی کی سپردگی کے بارہ میں ان کے ولی کا اعتبار ہوگا۔ اگر قریب البلوغ بیوی خود ہی اپنے آپ کو سپرد کرے اور شوہر اسے اپنے گھر منتقل کرے، تو اس کے مصارف واجب ہوں گے۔ اگر بیوی نقد مہر کے لئے اپنے آپ کو روکے اور کہے کہ جب بھی مہر دوگے، میں خود کو سپرد کروں گی، تو یہ بھی تمکین (کی طرح) ہے، لہٰذا نفقہ واجب ہوگا۔

اگر تمکین کے سلسلہ میں اختلاف ہو، تو شوہر کو عدمِ تمکین کے متعلق قسم دلا کر اس کی تصدیق کریں گے۔ اگر مکلف بیوی خود کو، یا غیر مکلف کا ولی اسے شوہر پر پیش کرے، مثلاً اسے کہلا بھیجے کہ میں اپنا نفس تمہارے حوالہ کرتی ہوں، تو جب شوہر کو یہ خبر ملے، اس وقت سے نفقہ لازم ہے۔

مسئلہ: جس پر نفقہ واجب ہے، وہ بیوی وغیرہ کا نفقہ نہ دے، تو اس کی مال میں سے اپنا حق لینا جائز ہے۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو آپ ﷺ نے معروف کے مطابق لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

نفقہ وغیرہ کا سقوط

اگر بیوی نشوز اختیار کرے، یعنی شوہر کی اطاعت سے نکل جائے، گو دن کے کچھ حصہ میں ہو، اور اس سے گنہگار نہ ہو، مثلاً پاگل یا نابالغہ ہے، تو نان نفقہ، لباس اور سکنی وغیرہ گذشتہ تمام حقوق ساقط ہو جائیں گے۔ اگر دن یا رات کے کسی ایک لحظہ میں بھی نشوز ہو، تو اس دن رات کا نفقہ، اور اس موسم کا لباس مکمل ساقط ہوگا، جب کہ شوہر بیوی سے انتفاع نہ کرے، اگر ایک لمحہ بھی انتفاع کرے، تو نفقہ و لباس مکمل واجب ہوگا، نشوز کے بعد پھر اطاعت کرے تو دن کے باقی حصہ کا نفقہ یا موسم کے بقیہ ایّام کا لباس نہ ملے گا، جب کہ استمتاع نہ کرے۔

نشوز کی مثالیں: (۱) شوہر کو تمتع (انتفاع، لطف اندوزی) سے روکنا، گو صرف چھونا ہی کیوں نہ ہو، اگر بطورِ ناز روکے، یا کسی

عذر سے روکے، مثلاً ایسی بیماری کہ صحبت کو برداشت نہ کر سکے۔ یا حیض و نفاس کی وجہ سے صحبت سے روکے، تو یہ نشوز نہیں ہے، اور اس سے نفقہ وغیرہ ساقط نہ ہو گا۔

(۲) شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا۔

اگر کسی عذر سے نکلے، مثلاً گھر کے منہدم ہونے کے خوف سے، یا کسی پیش آمدہ مسئلہ کا جواب معلوم کرنا ہو، اور شوہر خود یہ کام انجام نہ دے، تو نفقہ ساقط نہ ہو گا۔

فی الحال ضرورت کے بغیر محض تحصیل علم کے لئے علمی مجالس میں حاضری یا وعظ کی مجلس میں حاضری عذر میں شمار نہیں۔ اگر شوہر بستی میں موجود نہ ہو، تو بیوی اپنے رشتہ داروں کی ملاقات اور عیادت کے لئے جاسکتی ہے، جب کہ اس کی طرف سے ممانعت نہ ہو، اور اس کی ناراضگی کا علم نہ ہو، اس کی موجودگی میں بھی عرفاً اس طرح جانے میں اسے اعتراض نہ ہو، تو حرج نہیں، نیز صبح گھر سے نکل کر شوہر شام میں آنے کا عادی ہو، تب بھی وہ عیادت وغیرہ کے لئے جاسکتی ہے، جبکہ شوہر کے لوٹنے سے قبل لوٹ جائے، اور اس کی رضامندی کا علم ہو۔

تنبیہ: شوہر اپنے حق کیلئے (مثلاً نشوز، پڑوسیوں کے ساتھ زبان درازی، روشن دان سے تانک جھانک وغیرہ) بیوی کی سرزنش کر سکتا ہے، نہ کہ اللہ کے حق کی وجہ سے، نماز کے وقت بیوی کو نماز کا حکم دینا واجب ہے، لیکن علامہ رملی وغیرہ کے نزدیک نماز کے ترک پر بیوی کو مارنا جائز نہیں، تاہم ابن حجر وغیرہ نے اجازت دی ہے۔ (جمل ۱۶۵/۵، نہایہ ۲۲/۸، مغنی ۱۹۳/۴، ترشیح ۳۸۷)

سفر: اگر بیوی شوہر کے ساتھ سفر میں ہو، یا اس کے ساتھ نہ ہو، لیکن اس کی اجازت سے اس کی ضرورت سے سفر کرے تو نان نفقہ ساقط نہ ہو گا، لیکن شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ سفر کرے تو گنہگار ہو گی، شوہر کے روکنے کے باوجود بیوی اس کے ساتھ سفر کرے، تو نفقہ ساقط ہو گا۔

اگر بیوی شوہر کے بغیر سفر میں جائے، گو اس کی اجازت سے جائے، لیکن شوہر کی ضرورت سے نہ ہو، بلکہ اپنی یا کسی دوسرے کی ضرورت سے ہو، تو نفقہ ساقط ہو گا۔

احرام: حج یا عمرہ کا یا مطلقاً صرف احرام باندھنے سے نفقہ ساقط نہ ہو گا، گو شوہر کی اجازت کے بغیر باندھے، جب تک کہ گھر سے نہ نکلے۔ اگر اجازت کے بغیر احرام باندھے تو شوہر اسے کھلوا سکتا ہے (حلال کر سکتا ہے) حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لئے گھر سے نکل جائے اور شوہر ساتھ نہ ہو، تو نفقہ ساقط ہو گا۔

نفل وقضا: شوہر نفل عبادت (روزہ ہو یا کچھ اور) سے بیوی کو روک سکتا ہے، اسی طرح بیوی نفل شروع کرے تو اسے توڑ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ واجب نہیں، اور شوہر کا حق ہے، بعض علماء کے نزدیک تمتع کا ارادہ ہو یا نہ ہو، روک سکتا ہو، لیکن امام ماوردی کا خیال ہے کہ اگر شوہر کا تمتع کا ارادہ ہو، تب منع کرے۔

فرض روزہ وغیرہ کی قضا مُوَسَّع ہو، یعنی فوراً قضا کرنا لازم نہ ہو، تو فی الحال قضا کرنے سے منع کر سکتا ہے۔ اگر منع کرنے کے باوجود بیوی اسے انجام دے تو ناشزہ ہو گی۔

راتب سنتیں جیسے سنتِ ظہر، عرفہ وعاشوراء کا روزہ یا عیدین، ضحیٰ، کسوف، خسوف، استقاء، کی نماز، نمازوں کے بعد مطلوبہ اذکار، اداعبادتیں، اور جن کی قضا میں تاخیر کی گنجائش نہ ہو، ایسے امور سے روکنا جائز نہیں ہے۔ پنجوقتہ فرائض اور ان کی سنتوں کو اوّل وقت پڑھنے سے بھی نہ روکے۔

فائدہ: شوہر بیوی کو گھر سے نکلنے سے روک سکتا ہے، گو والدین کی ملاقات یا ان کے جنازہ میں شرکت کے لئے ہو، اسی طرح کسی کو اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت سے بھی روک سکتا ہے، خواہ اس کے والدین یا کسی دوسرے شوہر کی اولاد ہو، لیکن بلا عذر والدین کو آنے سے روکنا مکروہ ہے۔ اگر والدین فاسق یا بد اخلاق ہوں اور اسے شوہر کی نافرمانی پر ابھاریں تو روکنا ممنوع نہیں ہے، اگر بیوی اس معیار کی ہو کہ اسے خادمہ کی ضرورت ہو، تو ایک خادمہ کو نہیں روک سکتا، ایک سے زائد کو روک سکتا ہے۔ اگر مکان بیوی کی ملکیت ہو، تو شک و تہمت کے بغیر مذکورہ کسی امر سے روک نہیں سکتا۔

عِدَّت میں نفقہ وغیرہ کا حکم

(عدت میں سکنی و رہائش کی تفصیل عدت کے باب میں گذر چکی)

(۱) رجعیہ: اگر بیوی طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو، تو اسبابِ نظافت کے علاوہ دیگر تمام مصارف (یعنی کھانا، پینا، لباس، رہائش وغیرہ) اختتامِ عدت تک لازم ہیں، خواہ بیوی حاملہ ہو یا غیر حاملہ، کیونکہ ابھی تک وہ شوہر کے قابو میں ہے۔

(۲) بائنہ: اگر بیوی بائنہ ہو، اور حاملہ ہو، تو اسے عدت میں نفقہ اور لباس وغیرہ دینا واجب ہے۔

آیت: ''وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: ٦)

ترجمہ: ''اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو''

اگر حاملہ صحبتِ شُبہ کی عدت میں ہو، یا عقد کے ساتھ پائے جانے والے کسی سبب سے فسخِ نکاح کی عدت میں ہو، تو نفقہ نہ ملے گا۔ رضاعت وغیرہ کسی عارض کی وجہ سے فسخ ہو، تو نفقہ ملے گا۔

اگر بائنہ حاملہ نہ ہو، تو اسے بھی نفقہ نہ ملے گا۔

حدیث: ''حضرت فاطمہ بنتِ قیسؓ کو جب ان کے شوہر نے آخری طلاق دے دی (اور وہ بائنہ ہو گئیں) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں نفقہ نہیں ملے گا، البتہ اگر حاملہ ہو (تو ملے گا) (مالک، مسلم، ابوداود، نسائی، طحاوی، بیہقی، احمد، حاکم بطولہا مع الفاظ مختلفہ۔ ارواء الغلیل ٦/٢٠٨)

(۳) **وفات کی عدت:** وفات کی عدت میں نفقہ نہ ملے گا، گو بیوی حاملہ ہو، حدیث میں ہے کہ جس حاملہ کا شوہر انتقال ہو، اسے نفقہ نہ ملے گا۔ (رواہ الدار قطنی باسناد صحیح) اگر رجعی عدت میں شوہر کی وفات ہو تب بھی یہی حکم ہو گا، کیونکہ اب اس کی عدت وفات کی عدت ہو گی۔

جو بیوی شوہر کے انتقال سے قبل ہی بائنہ اور حاملہ ہو، تو اسکا نفقہ ساقط نہ ہو گا۔

عدت کے تمام اخراجات کی تفصیل وہی ہے، جو ایک بیوی کے اخراجات کی ہے۔ حاملہ کے لئے جو نفقہ واجب ہوتا ہے حمل کے ظہور سے قبل یا شوہر کے اقرارِ حمل سے قبل ادا کرنا لازم نہیں، اگر حاملہ سمجھ کر نفقہ دیتا رہا، پھر پتہ چلا کہ حمل نہیں ہے، تو اس سے واپس لے سکتا ہے۔

تنگ دستی کی وجہ سے فسخِ نکاح

آیت: ''وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔۔'' (البقرہ: ۲۳۱)

ترجمہ: ”اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کروگے۔“

نفقہ کے متعلق ایک حدیث کے ضمن میں حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے:

”بیوی کہے گی: یا تو آپ مجھ کھلائیں یا پھر مجھے طلاق دے دیں“ (بخاری، احمد، دارقطنی)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اپنی بیوی کا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو، تو دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے“ (دارقطنی، بیہقی) امام سعید بن المسیب سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے بھی تفریق کا فتوی دیا اور فرمایا کہ یہ سنت ہے (الشافعی) (سنت کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ سے ثابت ہے)۔ جو حضرات اپنی بیویوں سے دور تھے، ان کے متعلق حضرت عمرؓ نے (مختلف علاقوں میں متعین) لشکر کے امراء کو یہ خط روانہ فرمایا کہ، یا تو وہ لوگ بیویوں کو نفقہ دیں، ورنہ پھر انھیں طلاق دے دیں، اور جتنی مدت انہیں روک رکھا ہے، اس کا نفقہ روانہ کر دیں“ (الشافعی، عبدالرزاق، ابن المنذر، بیہقی وصححہ ابن الملقن والالبانی) (ارواء الغلیل ۷/۲۲۸، تلخیص الحبیر ۴/۸، فتح الباری ۹/۵۰۰، خلاصۃ البدر المنیر ۲/۲۵۴)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں بیوی کے ضرر کو دور کرنے کے لئے شوہر کی تنگدستی، (اعسار) کی صورت میں اسے فسخِ نکاح کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر وہ شوہر کے اعسار پر راضی ہو، گو ہمیشہ کے لئے، یا تنگدستی کا علم ہوتے ہوئے اس سے نکاح کرے تب بھی آئندہ نفقہ کی وجہ سے وہ نکاح فسخ کر سکتی ہے۔

بیوی مکلفہ (یعنی عاقلہ وبالغہ) ہو، تو وہ اپنا نکاح فسخ کر سکتی ہے، جب کہ شوہر کے پاس اتنا حلال مال نہ ہو، یا حلال کمائی کا ذریعہ نہ ہو، جس سے بیوی کے اقل نفقہ، لباس یا مسکن کا بار اٹھا سکے، کیونکہ ان کے بغیر نفس کا بقا ممکن نہیں۔

اقل نفقہ یعنی ایک مد اناج، اور اقل لباس یعنی قمیص، دوپٹہ اور سرما کا جبہ (سوئٹر وغیرہ)۔ اگر چپل، بستر، تکیہ، سالن اور خادم کے مصارف سے عاجز ہو، تو فسخ کا حق نہ ہوگا۔ نیز سابقہ ایّام کے مصارف کی وجہ سے بھی حقِ فسخ نہ ہوگا، البتہ یہ تمام مصارف شوہر پر قرض ہوں گے، خواہ وہ معتبر ہو۔

اگر صبح نصف مد اور شام نصف مد دے سکے تو فسخ کا حق نہ ہوگا، اگر ایک دن ایک مد، اور دوسرے دن نصف مد دے، یا ہر دن نصف مد سے زائد دے، تو فسخ کا حق ہوگا۔

امام شافعی کا فرمان ہے کہ شوہر کے اعسار کی وجہ سے فسخ کا فیصلہ حضرات عمرؓ، علیؓ اور ابوہریرہؓ سے منقول ہے، ان حضرات کے اس فیصلہ کے انتشار کے باوجود کسی صحابی سے اس کے مخالف مروی نہیں، تو گویا کہ اجماعِ سکوتی حاصل ہو چکا۔

اگر شوہر واجب اور نقد مہر کے دینے پر قادر نہ ہو تو، اس کی وجہ سے بھی بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ جبکہ بیوی کی رضامندی سے اب تک صحبت نہ ہوئی ہو۔ مہر پر عدم قدرت کی وجہ سے فسخ کرنا ہو، تو فوراً قاضی کے روبرو پیش کرنا ضروری ہے، اگر بلا عذر موئخر کرے تو یہ حق ختم ہو جائے گا۔ اگر کچھ عذر ہو، مثلاً مسئلہ معلوم نہ تھا، یا فوراً فسخ کرنے کی شرط کا علم نہ تھا، اسلئے موئخر ہوا تو حق ساقط نہ ہوگا۔ اگر بیوی کی رضامندی سے صحبت ہو جائے، تو اب فسخ کا حق نہیں، لیکن رضامندی کے بغیر جبراً صحبت کرے، تو حق باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر بیوی کمسن یا پاگل ہو، اور ولی بغیر مصلحت کے اسے شوہر کے سپرد کرے، پھر بالغ ہونے یا افاقہ کے بعد اپنے آپ کو شوہر سے روکے، تو اب یہ مہر سے عاجز ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ کر سکتی ہے، گو اس سے قبل صحبت ہو چکی ہو۔

اگر بیوی مہر کا بعض حصہ لے چکی ہو، تو بعض علماء کے نزدیک اسے فسخ کا حق نہ ہوگا، لیکن بارزیؒ جوجریؒ، اذرعیؒ اور خطیبؒ وغیرہ کے

نزدیک فسخ کا حق باقی رہے گا۔ مفوضہ کا مہر جب تک مقررہ نہ ہو، وہ مہر سے عاجز ہونے کی وجہ سے فسخ نہیں کر سکتی۔ اگر شوہر کے مہر پر قادر نہ ہونے کا علم ہوتے ہوئے بیوی اس سے نکاح کرے، یا اس پر راضی ہو جائے تو آئندہ اس کی وجہ سے فسخ کا حق نہ ہوگا۔

اگر شوہر کا مال مسافتِ قصر کی دوری پر ہو، تو اسے نفقہ سے عاجز سمجھا جائے گا۔ اور اس مال کے آنے تک بیوی پر صبر لازم نہیں، بلکہ وہ فسخ کر سکتی ہے۔ اگر شوہر مہلت کی مدت (یعنی تین دن) میں مال لے آنے کا وعدہ کرے، تو اسے رخصت دی جائے گی۔ پھر اس مدت میں نہ لائے تو مزید تین دن کی مہلت دے کر، اس دوران مال نہ آئے تو نکاح فسخ کر یگی۔ اسی طرح کسی پر شوہر کا قرض ہو، یا شوہر کے پاس جائداد وزمین یا دیگر اسباب ہوں، یا اس کا مال غصب شدہ ہو، اور ان تمام صورتوں میں تین دن میں نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ ولی کو فسخِ نکاح کا اختیار نہیں، بیوی کا مال ہو تو اس میں سے اس پر صرف کرے، ورنہ نکاح سے قبل جس پر نفقہ تھا، اب بھی اس پر اس کا نفقہ ہوگا۔

اگر شوہر کو کوئی کام نہ ملے (اور یہ نادر نہ ہو) یا بیماری وغیرہ کا عارضہ پیش آئے، جس کی وجہ سے کام کر کے کما نہیں سکتا، اور تین دن سے قبل اس عارضہ کے ازالہ کی امید نہ ہو، یا حرام مال پیش کرے، تو یہ بھی مُعْسِر وعاجز شمار ہوگا۔

اگر شوہر اقل نفقہ وغیرہ یا اس سے زائد پر قادر ہو، لیکن ادا نہ کرے، خواہ موجود ہو، یا کہیں گیا ہوا ہو، اس کی کچھ خبر ہو یا بالکل کوئی خبر نہ ہو، نکاح کے فسخ کا حق نہ ہوگا کیونکہ اعسار منتفی ہے، جس کی بنیاد پر فسخ کا حق ملتا ہے، اور بیوی حاکم کے ذریعہ اپنا حق وصول کر سکتی ہے۔ اگر شوہر کی کچھ خبر نہ ہو، اور اس کا کچھ مال بستی میں یا مسافتِ قصر کے اندر موجود نہ ہو تو بیوی کو فسخ کا حق ہوگا۔ (بعض علماء نے فرمایا ہے کہ فسخ کا حق نہ ہوگا)

جو شوہر غائب ہو، اور اس کے تنگدستی یا مالداری کا کچھ علم نہ ہو، تو فسخ کا حق نہ ہوگا۔

تنبیہ: کئی متاخرین محققین نے اس کو ترجیح دی ہے کہ شوہر غائب ہو، اور اس سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو فسخ جائز ہے۔ اور ابن الصّلاح نے اسی کو قوی قرار دیا ہے، وہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ "شوہر کا مال حاضر نہ ہو، اور وہ جہاں پر ہے، حاکم کے خط کے ذریعہ وہاں سے بھی نفقہ کی تحصیل دشوار ہو تو حاکم کے ذریعہ فسخ کر سکتی ہے، خواہ اس کی تنگدستی یا مالداری کا علم ہو یا نہ ہو، اور (اس صورت میں) فسخ کا فتویٰ ہی صحیح ہے"۔

صاحب قلائد علامہ باقشیر حضرمی فرماتے ہیں: ابن الصباغ نے فرمایا: فتویٰ اس پر ہے کہ مال نہ ہونے کی وجہ سے نفقہ دشوار ہو، یا حاکم وغیرہ کے ذریعہ نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، خواہ شوہر مالدار ہو یا تنگدست، اس کی مالداری کا علم ہو یا نہ ہو، تو فسخ کا حق ثابت ہوگا۔ اور یہی امام غزالی کے نزدیک زیادہ صحیح ہے، اور یمن کے کئی علماء نے اسی کے موافق فتویٰ دیا ہے، اور احمد بن عُجیل سے یہی منقول ہے، صاحبِ عُباب نے اسے مختار قرار دیا ہے۔ (قلائد ۲/۲۹۴)

سید علوی السقاف فرماتے ہیں: "کئی حضرات نے اسے اختیار کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق ابن عُجیل، ابن کبن، ابن الصباغ اور رویانی نے فتویٰ دیا ہے کہ تین دن میں شوہر سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، تو بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے، شوہر موجود ہو یا غائب، اور ابن الصلاح نے اسی کو قوی قرار دیا ہے۔ اور ابن زیاد، طنبداوی، مزجد، صاحب مہذب اور صاحب کافی وغیرہ حضرات نے اسے ترجیح دی ہے، جب کہ شوہر غائب ہو، اور اس سے نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، ابن قاسم فرماتے ہیں کہ صرف شوہر کا مال غائب ہونے کی صورت میں فسخ جائز ہے، تو اس صورت میں بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے۔ شوہر کی طویل غیر حاضری اور صحبت کی خواہش کے ضرر کی وجہ سے فسخ نکاح بالاتفاق جائز نہیں

ہے، گو اسے زنا کا خطرہ ہو" (ترشیح المستفیدین: ۳۵۸) سید علوی فرماتے ہیں کہ بیوی کے ضرر کی وجہ سے مجبوراً درج بالا مسئلہ کے مطابق فتوی دینا اور اس پر عمل کرنا جائز ہے (بغیۃ المسترشدین: ۲۴۳)

فسخ کے شرائط: مہر یا نفقہ وغیرہ سے اعسار کی وجہ سے فسخ کے لئے قاضی یا مُحکّم کے پاس اعسار کا ثبوت شرط ہے۔ اس سے قبل فسخ نہ ہوگا۔ شوہر کے اقرار یا گواہوں کے ذریعہ ثبوت حاصل ہوگا۔ فی الحال تنگدستی کے متعلق گواہی ضروری ہے، اگر گواہ یہ کہیں کہ شوہر غائب ہوتے وقت تنگدست تھا تو یہ کافی نہیں، البتہ اُس وقت کی تنگدستی کے پیش نظر اسی حالت کو برقرار سمجھتے ہوئے فی الحال تنگدستی کی گواہی دے سکتے ہیں، لیکن وہ اپنے دلیل کی صراحت کریں تو گواہی باطل ہوگی۔

قاضی کے پاس معاملہ پیش کرنے سے قبل فسخ نافذ نہ ہوگا۔ بستی میں قاضی کی موجودگی میں کسی مجتہد کو محکم بنائے، یا قاضی کی غیر موجودگی کی صورت میں کسی مقلد کو بھی محکم بنائے، تو یہ کافی ہے۔ (شرائط کے بعد جب فسخ ہوگا اس وقت سے سے عدت شمار ہوگی۔)

اگر کسی جگہ قاضی یا محکّم نہ ہوں، یا قاضی کے سامنے پیش کرنے سے عاجز ہو، مثلاً بغیر مال کے قاضی فسخ نہ کرے، یا گواہ نہ ہوں، تو مجبوراً بیوی خود ہی اپنا نکاح فسخ کرسکتی ہے، جیسا کہ امام الحرمین وغزالی وغیرہ نے فرمایا، جب کہ اسے شوہر کے اعسار کا علم ہو اور یہ کہ وہ نفقہ کی مستحق ہے، اور یہ فسخ ظاہراً وباطناً نافذ ہوگا، ابن زیاد کے فتاوی میں ہے کہ اگر عورت تنگدستی کے بینہ (گواہ) سے عاجز ہو تو خود ہی فسخ کرسکتی ہے، شیخ عطیہ مکی اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں کہ "اگر قاضی متعذر ہو، یا گواہوں کے مفقود یا غائب ہونے کی وجہ سے اس کے روبرو ثابت کرنا دشوار ہو، تو بیوی خود فسخ پر گواہ رکھ کر نکاح فسخ کرسکتی ہے۔" کوئی بیوی کو شوہر کے اعسار کی خبر دے، اور یہ دل میں اسے سچ سمجھے تو اس بنیاد پر بھی فسخ کرسکتی ہے۔

شوہر جس (مناسب) مکان میں رکھ کر جائے، بیوی کا وہیں رہنا، اور کسی نشوز کا ارتکاب نہ کرنا، اور ان دونوں باتوں پر اور اس پر کہ اس کا کوئی حاضر مال موجود نہیں اور نہ نفقہ چھوڑ گیا ہے، بیوی کو قسم دلانا، اور نفقہ سے عاجز ہونا یا اس کی تحصیل کا دشوار ہونا ثابت کرنا شرط ہے۔

مذکورہ تمام شرائط اور ثبوت کے بعد قاضی یا محکم پر واجب ہے کہ شوہر کو تین روز کی مہلت دے، گو وہ مہلت نہ مانگے اور اس دوران نفقہ کے حصول کی کوئی امید نہ ہو۔ (مہر سے عاجز ہو تو مہلت نہ دے، فوراً فسخ کردے، اسی طرح غائب کے نکاح کے فسخ میں بھی مہلت کی ضرورت نہیں، بلکہ ثبوت کے بعد فوراً فسخ ہوگا) مہلت کے تین دن گذر جائیں (اور شوہر نفقہ وغیرہ نہ دے سکے) تو چوتھے دن قاضی یا محکم خود نکاح فسخ کردے، یا اس کی اجازت سے بیوی فسخ کردے، یعنی اس طرح کہے: "میں نے نکاح فسخ کردیا"۔

اگر شوہر چوتھے دن کا نفقہ سپرد کرے، تو گذشتہ ایّام کے نفقہ کی وجہ سے فسخ نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ شوہر پر قرض ہوچکا، چوتھے دن کا نفقہ دینے کے بعد پانچویں دن دینے پر قادر نہ ہو، تو سابقہ مدت پر بناء کرتے ہوئے آج فسخ کرسکتی ہے، شوہر کو از سرِ نو تین دن کی مہلت نہ ملے گی، اگر درمیان میں تین روز تک نفقہ دیتا رہا، پھر عاجز ہوا، تو از سرِ نو مہلت دی جائے گی۔

کوئی شخص اپنی جانب سے مفت میں نفقہ دینے کی ذمہ داری لے، تو بیوی کو قبول کرنا لازم نہیں، بلکہ وہ فسخ کرسکتی ہے، کیونکہ اس میں کسی کا احسان لینا ہے۔ اگر وہ شخص شوہر کو دے اور شوہر بیوی کو دے تو لینا لازم ہے، اگر باپ یا دادا نفقہ دیں، اور شوہر ان کی ماتحتی میں ہو (کمسن وغیرہ ہو)، تو قبول کرنا لازم ہے۔

بیوی کا کمانا: شوہر تنگدست ہو اور بیوی اس پر راضی ہو (فسخ نہ کرے) تو ان ایّام میں، یا فسخ کے مطالبہ کے بعد قاضی تین دن کی مہلت دے، تو اس مدت میں اپنے گذر بسر کے انتظام اور کمانے کے لئے بیوی گھر سے باہر جاسکتی ہے، شوہر اسے روک نہیں سکتا، گو

بیوی کے پاس اپنا ذاتی مال ہو، یا گھر بیٹھے ہی کمانے پر قادر ہو، کیونکہ شوہر کو اِسے گھر میں روکنے کا حق اس پر خرچ کرنے کے مقابلہ میں حاصل ہوتا ہے، جب خود خرچ نہیں کر سکتا، تو روک بھی نہیں سکتا، رات میں بیوی کو گھر لوٹنا لازم ہے، کیونکہ یہ آرام کا وقت ہے، نہ کہ کام کاج کا، (اگر نفقہ کی تحصیل رات میں ہی ممکن ہو، تو بظاہر رات میں جانے کی اجازت ہوگی) دن میں نفقہ کی تحصیل کے وقت وہ شوہر کو تمتع سے روک سکتی ہے، رات میں نہیں روک سکتی، اگر رات میں روکے تو اس کا نفقہ ساقط ہوگا۔

فسخ نکاح کے شرائط کا خلاصہ: شوہر موجود ہو یا غائب، مندرجہ ذیل ۹ شرائط ہوں تو بیوی نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ شوہر اقل نفقہ، لباس اور مسکن کی فراہمی سے عاجز ہو، (نہ کہ سالن سے)، مثلاً کچھ کمائی ہی نہ ہو، یا کمائی مذکورہ ضروریات کے لئے ناکافی ہو، یا کوئی کام نہ ملے، یا ایسی بیماری ہو کہ تین روز تک کما نہیں سکتا، یا کام اس کے شایانِ شان نہ ہو، اس لئے وہ انکار کرے، یا حرام کمائی ہو، یا شوہر موجود ہو اور مال دو مرحلہ (مسافتِ قصر) کی دوری پر ہو، یا زمین واسباب کی شکل میں ہو (کہ فوراً بک کر رقم نہ مل سکے) یا موئخر قرض ہو، یا مقروض تنگدست ہو، یا مال غصب ہو چکا ہو، اور ان تمام صورتوں میں تین دن میں نفقہ کی تحصیل دشوار ہو، اور یہ بات حاکم کے پاس ثابت ہو، یعنی دو گواہوں کے ذریعہ، یا حاکم کے علم کی وجہ سے، یا یمینِ مردودہ کی وجہ سے جب کہ وہ لوٹائی جائے، اور بینہ کے ساتھ بیوی قسم لے کہ وہ نفقہ کی مستحق ہے اور شوہر نے کوئی مال نہیں چھوڑا، اور بیوی گھر میں رہے، اور نشوز نہ اختیار کرے، اور معاملہ حاکم کے سامنے رکھے، اور وہ تین دن کی مہلت دے، شاید کہ وہ نفقہ لے آئے یا غائب کا کچھ مال وغیرہ ظاہر ہو، اور گذشتہ تمام امور کے پائے جانے کے بعد صحیح لفظ کے ساتھ فسخ صادر ہو، مثلاً: میں نے فلاں کا نکاح فسخ کیا، عورت کے مطالبہ پر حاکم فسخ کر دے، یا حاکم کی اجازت سے عورت فسخ کر دے، اور عورت مکلف ہو، غیر مکلف کے ولی کو فسخ کا حق نہیں۔ (من بغیۃ المسترشدین: ۲۴۲)

(۳) اصول پر فروع کا نفقہ

(اصول یعنی باپ دادا اوپر تک اور فروع یعنی اولاد اور ان کی اولاد نیچے تک)

والد پر گو اوپر کے درجہ کا ہو، اپنی اولاد کا نفقہ واجب ہے، گو نیچے کے درجہ کا ہو (یعنی پوتا وغیرہ ہو)۔ پس والد نہ ہو، تو دادا (اوپر تک) نفقہ کا ذمہ دار ہے، اولاد مذکر ہو یا موئنث۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ'' (الطلاق: ٦)

ترجمہ: ''پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے (بچہ کی اجرت پر) دودھ پلائیں تو تم ان کو اجرت دو''۔ جب بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے والد پر مرضعہ کی اجرت واجب ہوئی، تو معلوم ہوا کہ بچہ کے نان نفقہ کا والد ذمہ دار ہے۔ نیز فرمانِ باری ہے۔ ''**وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُھُنَّ وَكِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ**'' (البقرہ: ۲۳۳)، ترجمہ: اور جس کا (شرعاً نسب کے اعتبار سے) بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق''۔ آیت کے لفظ ''لَهٗ'' میں لامِ اختصاص کے ذریعہ بچہ کی والد کی طرف نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نفقہ و دیگر مصارف کا وہ ذمہ دار قرار پائے۔ اسی طرح بچہ کی مُرضِعہ (والدہ) کے نفقہ ولباس کا وجوب بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بچہ کے یہ مصارف بدرجہ اولیٰ واجب ہیں۔

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ھندہ نے اپنے شوہر ابوسفیان کی شکایت کی کہ وہ میرا اور اولاد کا مکمل خرچ نہیں دیتے، تو آپ ﷺ نے انھیں ان کے مال سے اتنا لینے کی اجازت دی، جو معروف و قاعدہ کے مطابق ھندہ اور اولاد کو کافی ہو جائے۔ (متفق علیہ)

پوتے وغیرہ بھی اولاد کے حکم میں ہیں۔

اصول پر فروع کے نفقه کے وجوب کے شرائط: (۱) اصل کے پاس اپنے اور بیوی کے یک روزہ مصارف سے زائد رقم موجود ہو، اگر اس سے زائد مال نہ ہو تو وہ اپنے فرع پر خرچ کرنے کا مکلف نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی ذات سے ابتدا کرنے کا حکم دیا ہے (مسلم)

(۲) فرع خود فقیر (غریب) ہو، نیز فقیر ہونے کے ساتھ کمسن، یا اپاہج یا مریض یا پاگل بھی ہو۔ اگر اولاد بالغ و تندرست اور کمانے پر قادر ہو، تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں، گو وہ (سُستی وغیرہ کی وجہ سے) نہ کمائے۔

اگر فرع کسی فرض عین علم کی تحصیل میں مشغول ہونے کی وجہ سے کما نہ پائے، تو اس کا نفقہ والد پر واجب ہے۔ اگر عام معاشرہ کی ضروریات کا کفایہ علم ہو جیسے ڈاکٹری، انجینیئرنگ وغیرہ، تو اس کی تحصیل میں مشغولی کے باوجود وہ کمانے پر قادر شمار ہو گا، لہٰذا اصل (والد وغیرہ) کو اختیار ہے کہ اسے اس مشغولی کی اجازت دے اور اس کے مصارف برداشت کرے، یا اس کے مصارف سے دست بردار ہو جائے، اور وہ خود محنت کر کے گذر بسر کرے۔

مقدار: اس نفقہ کی کوئی مقدار متعین نہیں، اپنی حیثیت اور عرف کے مطابق بقدر کفایت (جو کافی ہو اور دوسرے سے بے نیاز کرے) دینا ضروری ہے۔ سورہ طلاق کی آیت ۷ میں فرمایا: "وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہئے۔ اور جس کی آمدنی کم ہو، اس کو چاہئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جتنا اس کو دیا ہے۔"

وقت گذر جائے اور اصول فروع کے مصارف ادا نہ کریں، تو یہ ان کے ذمہ بطورِ قرض باقی نہ رہے گا، کیونکہ یہ بطورِ مُوَاسَاۃ واحسان کے ہے، کسی معین حق کی تملیک نہیں ہے، (جیسا کہ بیوی کے نفقہ میں ہوتا ہے) جس پر نفقہ واجب ہے، وہ کسی دوسرے کو خرچ کرنے کی اجازت دے اور وہ خرچ کرے، تو اجازت دینے والے پر قرض ہو گا، اگر وہ خرچ نہ کرے تو قرض نہ ہو گا۔

اگر مسئلہ قاضی کے روبرو پیش ہو، اور فرع کا احتیاج اور اصل کی مالداری (یعنی جس مالداری پر فرع کا نفقہ واجب ہو) ثابت ہو جائے، پھر اصل کی غیر موجودگی یا مصارف نہ دینے کی وجہ سے قاضی خود اس کی اجازت سے دوسرا شخص فرع کو قرض لے کر دے، تو یہ مقدار اصل پر قرض ہو گا۔

مقدار کے عنوان کے تحت درج تینوں مسائل میں فرع کے ذمہ اصل کے نفقہ کی تفصیلات کا بھی یہی حکم ہو گا۔

دودھ پلانا: والدہ پر واجب ہے کہ پیدائش کے بعد بچہ کو پیوسی کا دودھ پلائے (یعنی پیدائش کے بعد ابتدائی دودھ، جس کی مدت معمولی ہے جو عرف سے متعین ہو گی) اس کے بعد بچہ کو دودھ پلانے کے لئے صرف والدہ ہی موجود ہو، یا صرف کوئی دوسری ایک عورت موجود ہو، تو جو بھی موجود ہے، اس پر دودھ پلانا واجب ہے، اور وہ اس کی اجرت لے سکتی ہے۔ گو باپ کے نکاح میں ہو، اگر بچہ کا مال (میراث میں یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ ملا ہوا)، تو اسی میں سے اجرت دی جائے، ورنہ باپ پر واجب ہے (جیسا کہ نفقہ کا حکم ہے)

اگر دوسری عورت بھی دودھ پلانے کے لئے میّسر ہو، تو والدہ پر جبر کرنا جائز نہیں، گو وہ بچہ کے باپ کے نکاح میں ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰی" (الطلاق ۶)

ترجمہ: "اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی"۔

اگر بچہ کی والدہ خود دودھ پلانا چاہے، تو والد اسے اس سے نہیں روک سکتا، گو مناسب اجرت طلب کرے، یا والد کے نکاح میں ہو، کیونکہ وہ بچہ کے حق میں زیادہ شفیق ہوگی اور اس کا دودھ (عموماً) زیادہ بہتر وموافق ہوگا، اگر والدہ کسی دوسرے کے نکاح میں ہو تو والد اسے رضاعت سے روک سکتا ہے۔

اگر والدہ اجرتِ مثل سے زائد طلب کرے، یا کوئی دوسری عورت مفت یا اجرتِ مثل سے کم پر دودھ پلانے پر راضی ہو، اور والدہ اس بات کے لئے راضی نہ ہو، تو والد والدہ کو رضاعت سے منع کرکے دوسری عورت کے سپرد کرسکتا ہے، جب کہ اس کا دودھ اسے راس آئے، ورنہ والدہ مقدم ہوگی،

آیت: ''وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوْا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ''(البقرہ: ۲۳۳)

ترجمہ: اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو، تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں''

اگر والدہ اجرت کے مطالبہ کے بغیر دودھ پلاتی رہے، تو اسے اجرت نہ ملے گی، اگر وہ مطالبہ کرے اور والد چپ رہے، اور وہ دودھ پلاتی رہی، تو مطالبہ کے بعد کی رضاعت کے لئے اجرتِ مثل کی مستحق ہوگی۔

اصول کی ترتیب: فروع کے نفقہ کے سلسلہ میں والد سب پر مقدم ہے، پھر دادا، پھر اس کے والد اوپر تک، پھر والدہ، پھر نانا اور دادی ونانی لوگ، یہ ایک سے زائد ہوں تو جو قریب تر ہو، اگر ایک ہی درجہ میں ایک سے زائد ہوں اور ان میں ایک وارث ہو تو وارث، مثلاً دادا اور نانا ہو، تو دادا نفقہ کا ذمہ دار ہے (کیونکہ وہ وارث بنتا ہے)۔

بچہ کا مسئلہ: والدہ بچہ کا مال اس پر صرف کرسکتی ہے، گو قاضی اجازت نہ دے، والد آجائے تو اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے، اگر بچہ کا مال کہیں اور ہو، یا فی الحال اس میں سے صرف کرنا مشکل ہو، اور والدہ اس کے مال میں سے واپس لینے کی نیت سے اپنا مال صرف کرتی رہی، تو واپس لے سکتی ہے، جب کہ اس خرچ اور واپس لینے کے ارادہ پر گواہ رکھے، اگر گواہ نہ رکھے تو واپس نہ لے، اگر گواہ موجود نہ ہوں، تو باطنی طور پر اس میں سے واپس لے سکتی ہے۔

اگر بچہ والد کے زیرِ خرچ ہو، اور وہ کہیں گیا ہوا ہو، یا خرچ نہ دے، تو والدہ گواہ رکھ کر والد سے مصارف واپس لینے کی نیت سے خرچ کرسکتی ہے۔ پس اس کا بدل والد پر لازم ہوگا، اگر والد کا مال موجود ہو، تو اس میں سے صرف کرسکتی ہے، گو قاضی سے اجازت نہ لے۔

فروع پر اصول کا نفقہ

اصول یعنی باپ، دادا، نانا، نانی وغیرہ کا نفقہ فروع پر واجب ہے۔

آیت: (۱)''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً ''(لقمان ۱۵)

ترجمہ: ''اور دنیا میں ان کے (یعنی والدین کے) ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا۔''

(۲)''وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً ''(الاسراء ۲۳)

ترجمہ: ''اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو، اور تم ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو''۔

مطلوبہ معروف اور احسان (خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور حسن سلوک کرنا) بوقتِ ضرورت واحتیاج ان کے مصارف برداشت کئے بغیر ممکن نہیں۔

احادیث:(۱)"بلاشبہ پاکیزہ ترین مال جو آدمی کھائے، وہ اس کی اپنی کمائی سے کھانا ہے، کسی کی اولاد بھی اس کی کمائی میں داخل ہے" (ابوداود، ترمذی)

(۲)"دینے والے کا ہاتھ اونچا ہے، اور جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہے، اس سے ابتداء کرو، تمہارے ماں اور باپ، اور بہن اور بھائی، پھر جو تم سے قریب ہو، جو تم سے قریب ہو"(نسائی)

نیز جب بصورتِ احتیاج فروع کا نفقہ اصول پر واجب ہے، تو قیاس کا تقاضہ یہی ہے کہ اصول کے احتیاج کی صورت میں بعضیت کی وجہ سے اس کا نفقہ فروع پر واجب ہو۔

شرائط:(۱) فرع کے پاس اپنے اور بیوی کے یک روزہ مصارف سے زائد مال ہو، اگر اس سے زائد نہ ہو، تو وہ والدین وغیرہ کے مصارف کا مکلف نہیں، کیونکہ ایک فقیر پر دوسرے فقیر کا نفقہ واجب نہیں، اگر کچھ مقدار دے سکتا ہو، تو اتنا ہی دے دے، صرف ایک کا خرچ ہو، تو ماں کو باپ پر مقدم رکھے۔

(۲) اصل فقیر (غریب) ہو، یعنی اپنی ضروریات کے بقدر کماتا نہ ہو، خواہ کما سکتا ہو یا نہ کما سکتا ہو، بخلاف اس کے فرع کما سکتا ہو اور نہ کمائے تو اس کا نفقہ اصل پر واجب نہ تھا، یہ فرق دراصل اس وجہ سے ہے کہ اصل کا فرع کو کمانے پر مجبور کرنے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اس کے برعکس ایک فرع کا اپنے اصل کو کمانے پر مجبور کرنا قبیح اور بری بات ہے، بالخصوص جب کہ وہ عمر دراز بھی ہو۔

(۳) ماں کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا، جب کہ باپ اس پر خرچ کرنے سے عاجز ہو، یا باپ انتقال کر چکا ہو اور ماں کا کوئی شوہر نہ ہو، اگر والدہ کے لئے کوئی مناسب رشتہ ہو، اور وہ قبول نہ کرے، تب بھی اولاد پر اس کا نفقہ واجب ہے۔

اگر باپ ماں کے مصارف پر قادر ہو، یا ماں کا کسی دوسرے شوہر سے نکاح ہو چکا ہو، تو اولاد نفقہ کی ذمہ دار نہیں، اگر دوسرا شوہر غریبی کی وجہ سے خرچ برداشت نہ کر سکے، تب بھی ماں کا نفقہ واجب نہیں، جب تک کہ وہ اعسار (تنگدست) کی بنیاد پر یہ نکاح فسخ نہ کر دے۔

دین: اصول و فروع پر ایک دوسرے کے نفقہ کے شرائط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں کا دین ایک ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا ایک مسلمان بیٹا اپنے غیر مسلم والدین کا، اور ایک مسلمان باپ اپنی غیر مسلم اولاد کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ البتہ مرتد مستثنیٰ ہے، اس کا نفقہ واجب نہیں، خواہ اصل ہو یا فرع۔ سورہ لقمان کی مذکورہ بالا آیت کے سیاق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ والدین غیر مسلم ہوں، تب بھی ان کے ساتھ دنیا میں حسنِ سلوک سے پیش آنا ہے۔ نیز صحیحین وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت اسماءؓ کو ان کی مشرک والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا۔

اصول وفروع کے مصارف کی ترتیب

اگر والدین فقیر ہوں، اور ایک ہی درجہ میں ان کے کئی فروع ہوں، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، وارث ہوں یا غیر وارث (مثلاً ایک سے زائد بیٹے یا بیٹیاں) تو تمام برابر برابر ان کے مصارف برداشت کریں گے، گو بعض زیادہ مالدار ہوں، یا ایک کے پاس مال موجود ہو، اور دوسرا کماتا ہو، اگر ایک غائب ہو، تو اس کا حصہ اس کے مال میں سے لیا جائے، مال نہ ہو تو اس کے نام سے قرض لے، یہ ممکن نہ ہو تو حاکم م۔ثلاً حاضر کو خرچ کرنے کا حکم دے، پھر غائب کے پاس سے وہ رقم اسے واپس کر دی جائے۔

اگر ایک فرع قریبی اور دوسرا بعید ہو، تو قریبی فرع پر نفقہ واجب ہوگا، گو یہ مؤنث اور غیر وارث ہو، اور بعید مذکر اور وارث ہو،

اگر ایک ہی درجہ میں بعض وارث اور بعض غیر وارث ہوں، تو وراث پر نفقہ واجب ہو گا، اگر دونوں کی وراثت کے تناسب میں فرق ہو، جیسے بیٹا اور بیٹی (کیونکہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے گا) تو بعض علماء کے نزدیک اس صورت میں بھی دونوں برابر ذمہ دار ہوں گے (گویا اس مثال میں نصف، نصف نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے)، اور بعض کے نزدیک وراثت کے اعتبار سے ذمہ دار ہوں گے (پس اس مثال میں بیٹے پر نفقہ کا دو تہائی اور بیٹی پر ایک تہائی لازم ہو گا)

اگر کسی کے اصول وفروع میں کئی افراد محتاج ہوں، اور یہ تمام کا بار نہیں اٹھا سکتا، تو درج ذیل ترتیب کو ملحوظ رکھے۔

سب سے پہلے اپنی ذات، پھر بیوی کا نفقہ، پھر کمسن بچہ اور پاگل بالغ اولاد، پھر ماں، پھر باپ (امام بُلقینی فرماتے ہیں کہ اگر اپاہج یا پاگل ہو تو کمسن اولاد کے درجہ میں شمار ہو گا)، پھر مکلف اولاد، پھر دادا و نانا پھر اس کا باپ آگے تک، اگر آگے والا اپاہج ہو، تو وہ مقدم ہو گا، اگر ایک درجہ میں دو ہوں تو دونوں برابر مستحق ہوں گے، اور وارث غیر وارث پر مقدم ہو گا، مثلاً نواسہ اور پوتی ہو تو پوتی مقدم ہو گی، یا نانا اور دادا ہو تو دادا مقدم ہو گا، اسی طرح مثلاً دودھ پینے والا یا مریض دوسروں پر مقدم ہو گا، دو جہت والے اصل یا فرع کو اسی درجہ کے ایک جہت والے پر مقدم رکھیں گے، درجہ الگ ہو، تو قریب تر مقدم ہو گا، ایک درجہ میں کئی مستحقین ہوں اور موجود نفقہ سب کے گذر بسر کے لئے کسی حد تک کام دے، تو سب پر تقسیم ہو گا، ورنہ قرعہ اندازی سے فیصلہ ہو گا۔

کسی محتاج کے اصل وفرع دونوں ہوں، تو فرع نفقہ کا ذمہ دار ہے، گو نیچے کے درجہ کا ہو، کیونکہ اصل کے عظمت واحترام کے اعتبار سے فرع اس بات کا زیادہ ذمہ دار ہے کہ اس کا خیال رکھے۔

جائداد کی فروخت: اصول وفروع کا نفقہ قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے، لہٰذا قرض کی ادائیگی کے لئے جو چیزیں (جائداد وغیرہ) فروخت کی جاتی ہیں، اُن کے واجب نفقہ کی ادائیگی کے لئے بھی فروخت کی جائیں گی۔

کمانا: جو مناسب طریقہ سے کمانے پر قادر ہو، اس پر اپنے اصول یا فروع کے مصارف کے لئے کمانا لازم ہے، کیونکہ حدیث کی رو سے ان کو ضائع کرنا باعث گناہ ہے، نیز کمانے کی قدرت مال پر قدرت کی طرح ہے، اسی لئے اسے زکات لینا حرام ہے، نفقہ کیلئے یہ لوگوں سے مانگنے، یا ہبہ اور وصیت قبول کرنے کا مکلف نہیں ہے، لیکن اس طرح مال حاصل کرلے، تو اب حیثیت ہونے کی وجہ سے اس پر نفقہ واجب ہو گا۔

براہِ راست نفقہ لینا: جس رشتہ دار پر کسی کا نفقہ لازم ہے، وہ دینے سے انکار کرے یا غائب ہو (کہیں گیا ہو)، اور یہاں اس کا مال ہو، تو یہ اپنے نفقہ کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے، جو جنس واجب ہے، وہ موجود ہے، تو اس میں سے لے، ورنہ پھر دوسرے قسم کے مال سے یہ حق وصول کرے، مال نہ ہو تو قاضی اس رشتہ دار کی طرف سے قرض لے کر دے۔ بعض علماء کے نزدیک قاضی اس کی طرف سے قرض لینے کی اجازت دے، اور یہ لے لے تب بھی اس کو آئندہ وہ قرض ادا کرنا لازم ہے، اگر قاضی کی اجازت نہ ہو، تو اس کے نام سے قرض نہیں لے سکتے، اگر قاضی نہ ہو، اور یہ خود اس غائب کے نام سے قرض لے اور اس پر گواہ رکھے تو یہ قرض اس غائب سے وصول کیا جائے گا، اگر گواہ نہ رکھے تو اس سے وصول نہیں کر سکتا، البتہ گواہ میّسر ہی نہ ہوں، تو وصول کر سکتا ہے۔ فرع اگر کمسن یا پاگل ہو تو باپ دادا، ولایت کی وجہ سے براہِ راست ان کے مال سے اپنا نفقہ لے سکتے ہیں۔ نیز اپنے نفقہ کے لئے فرع کو اجرت پر کام پر بھی لگا سکتے ہیں، جب کہ کام اس کے بس میں ہو، ماں کمسن یا پاگل فرع کے مال سے اپنا نفقہ حاکم کے بغیر نہیں لے سکتی، اسی طرح اصل پاگل ہو تو فرع حاکم کے بغیر اس کے مال سے اپنا نفقہ نہیں لے سکتا۔

نفقہ ومصارف کی تفصیل: اصول یا فروع پر جو نفقہ و کفایت واجب ہے، اس میں مناسب لباس، رہائش کا نظم، کھانا، پینا، سالن، علاج، دوائی، اور مرض وغیرہ کی وجہ سے بصورتِ احتیاج خادم کا نظم داخل ہے۔ کھانا پینا کسی حد تک شکم سیری کے بقدر واجب ہے، جس کی وجہ سے اس کی صحت اور آمد ورفت اور مختلف تصرفات کی قوت باقی رہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز تلف ہو جائے تو اس کا بدل دینا لازم ہے۔

حَضانت (پرورش)

تعریف: حَضَانت لغت میں ضم (ملالینے اور سمیٹنے) اور گود میں لینے کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل حِضن سے ماخوذ ہے، یعنی گود۔

جو خود اپنے امور انجام دینے پر قادر نہ ہو، (مثلاً بچہ یا پاگل) اس کی تربیت و پرورش، اس کے معاملات کی اصلاح ودرستگی اور ضرر ونقصانات سے اس کی حفاظت کو شریعت میں حضانت کہا جاتا ہے۔ مثلاً اسے نہلانا، اس کے کپڑے دھونا، تیل لگانا اور کنگھی کرنا، سرمہ لگانا، بچہ کو جھولے میں ڈالنا اور جھُلا کر سُلانا وغیرہ۔ حد تمیز کے بعد بلوغ تک پرورش کے لئے کفالت بھی کہتے ہیں۔ حضانت ایک قسم کی ولایت واختیار ہے، لیکن فی الجملہ عورتیں اس میں مردوں پر مقدم ہیں۔ کیونکہ وہ زیادہ شفیق ومہربان، تربیت سے واقف اور اس سلسلہ میں پیش آمد پریشانیوں پر صبر گذار ہوتی ہیں (جس کی حضانت کی جائے اسے مَحْضُون اور حضانت کرنے والے کو حَاضِن کہیں گے)

حکمت: بعض اوقات میاں بیوی میں جدائی ہوتی ہے، یا بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، اس صورت میں معاملہ اس اختلاف وجھگڑے کے سپرد کر دیا جائے، یا جو بھی غالب آجائے، اس کی مرضی چلے، تو نونہالوں پر بڑا ظلم اور ان کی حق تلفی ومصلحت تلفی ہوگی، جو ان کی بدبختی وبربادی کا سبب بنے گی، لہٰذا ضروری ہوا کہ ایک ضابطہ مقرر کیا جائے، جو ان کی پرورش ونگہداشت کے ذمہ داروں کی تفصیل اور ترتیب وتقدیم کو واضح کر دے، اور اولیاء وسرپرستوں کے کسی اختلاف کی وجہ سے ان کی مصلحت پامال نہ ہو۔

حَضانت کے مصارف: مَحْضون کا نفقہ جس پر واجب ہو، حضانت کے مصارف بھی اسی پر ہیں، لہٰذا جس کو یہ حق ملے، وہ اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے، حتی کہ ماں بھی مطالبہ کر سکتی ہے، اگر ماں دودھ پلائے اور رضاعت وحضانت دونوں کی اجرت مانگے، تو منظور کرنا ہوگا۔ محضون کا مال ہو، تو یہ مصارف اس میں واجب ہوں گے ورنہ پھر باپ پر، اگر بچہ خدمت کا محتاج ہو تو عرف کے مطابق مناسب نظم کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، ماں کے ذمہ یہ لازم نہیں ہے۔

مستحقین: جب تک والدین کے زوجیت کا رشتہ باقی ہو، بچہ ان کے ساتھ ہی رہے گا، والد کفالت کا ذمہ دار ہوگا، اور والدہ پرورش وتربیت کرتی رہے گی، جب کہ بچہ اس کے مذہب پر ہو۔ رضاعی یا سسرالی مَحْرَمیت کی وجہ سے حضانت کا حق نہ ملے گا۔

طلاق، فسخ یا لعان کے ذریعہ شوہر بیوی میں جدائی ہو، اور شوہر کو اس بیوی سے غیر ممیز بچہ ہو، خواہ مذکر ہو یا مؤنث تو اس کے حضانت کا حق والدہ کو ہوگا، کیونکہ اس کی شفقت سب سے بڑھ کر ہوگی۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے بیوی کو طلاق دینے کے بعد بچہ اپنی پرورش میں لینا چاہا، تو آپ ﷺ نے بچہ کی ماں سے فرمایا: "تم اس کی زیادہ مستحق ہو، جب تک نکاح نہ کرو" (احمد، ابوداود، بیہقی، حاکم) اس کے بعد نانی، پھر نانی کی ماں اوپر تک، قریبی نانی بعد والی پر مقدم ہوگی، پھر باپ مقدم ہوگا، پھر باپ کی ماں، پھر اس کی ماں، اس طرح ماؤں کا سلسلہ اوپر تک، پھر دادا، پھر اس کی مائیں اوپر تک، پھر دادا کے ابا، پھر اس کی مائیں۔۔۔ قریبی بعید پر مقدم ہوگی، (نانیوں اور دادیوں میں جو وارث نہیں بنتی، اسے حضانت کا حق نہیں، یعنی جس کے اور محضون کے درمیان ایسے مذکر کا واسطہ ہو، کہ اس

مذکر اور محضون کے درمیان کوئی مؤنث ہو، جیسے نانا کی ماں، دادی کی دادی) پھر سگی بہن (حقیقی بہن)، پھر باپ شریک بہن، پھر ماں شریک بہن، پھر اسی ترتیب سے بھائی، پھر اسی ترتیب سے خالہ، پھر اسی ترتیب سے بھانجی، (بھانجہ کو حضانت کا حق نہیں)، پھر اسی ترتیب سے بھتیجی، پھر حقیقی بھائی کا بیٹا، پھر باپ شریک بھائی کا بیٹا، پھر حقیقی پھوپھی، پھر باپ شریک پھوپھی (یعنی باپ کی باپ شریک بہن)، پھر ماں شریک پھوپھی، (ابن رِفعہ اور رُویانی وغیرہ نے پھوپھی کو بھائی بہن کی اولاد پر مقدم رکھا ہے)، پھر حقیقی چچا، پھر باپ شریک چچا، (ماں شریک چچا کو حق حاصل نہیں)، پھر خالہ کی بیٹیاں، پھر پھوپھی کی بیٹیاں، ان کے ماؤں کی طرح، (یعنی حقیقی کی بیٹی باپ شریک کی بیٹی پر اور وہ ماں شریک کی بیٹی پر مقدم ہوگی)، پھر حقیقی چچا کی بیٹی، پھر باپ شریک چچا کی بیٹی۔۔۔۔

بعض ضابطے: (۱) (مذکورہ مؤنث حاضنات کے علاوہ) ان عورتوں کو حضانت کا حق ملے گا، جو غیر محرم رشتہ دار ہوں، اور ان کے اور محضون کے درمیان غیر وارث مذکر کا واسطہ نہ ہو، یعنی یا تو مؤنث کا واسطہ ہو، جیسے خالہ اور پھوپھی کی بیٹی، یا وارث مذکر کا واسطہ، جیسے حقیقی یا باپ شریک چچا کی بیٹی، تاہم محضون شہوت کی عمر کو پہنچا ہوا مذکر ہو، تو اس پر ان عورتوں کو حضانت کا حق نہ ہوگا۔ اگر غیر وارث مذکر کا واسطہ ہو، تو حق نہ ملے گا، جیسے ماموں کی بیٹی، یا ماں شریک چچا کی بیٹی۔

(۲) ان مردوں کو حضانت کا حق حاصل ہوگا، جو رشتہ دار اور وارث ہوں، خواہ محرم ہوں، جیسے بھائی، بھتیجہ، چچا، یا غیر محرم جیسے چچازاد بھائی، ان کی ترتیب میں (کسی حد تک) نکاح کے ولایت کی ترتیب ملحوظ ہوگی، (البتہ ماں شریک بھائی، چچا پر مقدم ہوگا، حالانکہ اسے نکاح میں ولایت حاصل نہیں) تاہم خَلْوت مُحَرمہ سے گریز کرتے ہوئے شہوت کی عمر کو پہنچی ہوئی بچی کو غیر محرم کے سپرد نہیں کیا جائے گا، بلکہ کسی معتبر خاتون کے سپرد کریں گے، گو اس کے مال سے اجرت دے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے، اور یہ غیر محرم حاضن اس کا تعاون کرتا ہے۔

جو مرد وارث اور محرم نہ ہو، جیسے ماموں کا یا پھوپھی کا بیٹا، یا وارث نہ ہو، گو محرم ہو، جیسے ماموں، ماں شریک چچا، یا نانا، تو ان کو حضانت کا حق نہ ملے گا۔

(۳) ایک ہی درجہ کے مذکر و مؤنث، میں مؤنث مقدم ہوگی، لہٰذا بہن بھائی پر اور بھتیجی بھتیجہ پر مقدم ہوگی۔

(۴) ایک درجہ کی وہ عورت جسکے اور محضون کے درمیان عورت کا واسطہ ہو، اس درجہ کی اس عورت پر مقدم ہوگی جس کا واسطہ مرد ہو، پس بھانجی بھتیجی پر مقدم ہوگی۔

(۵) ایک ہی درجہ میں ایک سے زائد مرد یا عورتیں ہوں، مثلاً کئی بھائی یا کئی بہنیں، تو قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوگا، (اس صورت میں خنثیٰ بھی مرد کی طرح ہوگا)

مسئلہ: (۱) اگر محضون کی بیٹی ہو تو والدین کی غیر موجودگی میں دیگر لوگوں (نانی دادی وغیرہ) کے مقابلہ میں وہ مقدم ہوگی۔

(۲) اگر محضون مذکر ہو، اور اس کی بیوی ہو، یا محضون مؤنث ہو، اور اس کا شوہر ہو، تو تمام لوگوں پر (حتی کہ والدہ پر بھی) بیوی یا شوہر حضانت میں مقدم ہوگا، جب کہ صحبت کرنا ممکن ہو (اتنی کمسنی نہ ہو کہ شوہر صحبت نہ کر سکے، یا بیوی برداشت نہ کر سکے)

(۳) اگر میاں بیوی دونوں محضون ہوں، تو شوہر کے حاضن کو بیوی کی حضانت کا بھی حق ملے گا۔

مُمَیّز کا حکم: حضانت کی مندرجہ بالا ترتیب و تفصیل غیر ممیز محضون کے متعلق تھی، جو بذاتِ خود تنہا کھانے پینے اور استنجاء جیسے امور پر قادر نہ ہو، اسے غیر ممیز کہا جائے گا، اور جو اتنی سمجھ کو پہنچ جائے کہ بذاتِ خود تنہا ان امور کو انجام دے سکے، اسے ممیز کہا جائے گا۔ سات سالہ عمر کی کوئی قید نہیں، سات سال کے بعد بھی ممیز نہ ہو، تو جس کی حضانت میں تھا اسی کے پاس رہے گا۔

محضون ممیز ہو، (اور والدین میں جدائی ہو) تو مستحب ہے کہ اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے، جب کہ دونوں میں حضانت کے شرائط موجود ہوں (جو آئندہ بیان ہوں گے)، گو ایک دوسرے کے مقابلہ میں دینداری، مال یا محبت میں فائق ہو، پھر وہ جسے بھی اختیار کرے، اس کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ آپ ﷺ نے ایک بچہ کو والدین کے درمیان اختیار دیا۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی وحسنہ) نیز ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ کا عمل اور امام شافعی اور بیہقی نے حضرت عمر کا عمل یہی نقل فرمایا ہے۔ اور الاُمّ میں حضرت عمارہ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے انھیں والدہ اور چچا کے درمیان اختیار دیا، اور اس وقت ان کی عمر ۷ یا ۸ سال تھی، اور ان کے ایک چھوٹے بھائی کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اس عمر میں ہوتا تو اسے بھی اختیار دیتا (تلخیص ۱۲/۴)

اگر حضانت کے شرائط ایک میں ہی ہوں، تو وہی متعین ہے، لہٰذا اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اختیار دینے سے قبل ایک اپنا حق ساقط کر چکا ہو، تب بھی اختیار دیا جائے گا۔ محضون جسے اختیار کرے وہ حضانت سے انکار کرے، تو دوسرا کفالت کرے، انکار کرنے والا رجوع کرے، تو دوبارہ محضون کو اختیار دیا جائے گا۔ اگر دونوں انکار کریں، اور بعد میں دو مستحق مثلاً دادا اور دادی ہوں تو ان دونوں میں اختیار دیا جائے، ورنہ پھر جس پر نفقہ واجب ہے، اسے اس کی کفالت و پرورش پر مجبور کیا جائے گا۔

(باپ نہ ہو تو) باپ کی طرح دیگر مذکر حاضنوں میں جو مقدم ہو اس کے اور ماں کے درمیان بھی اختیار دیا جائے گا، البتہ محضون مؤنث ہو، تو ماں مقدم ہو گی، لیکن اس مذکر رشتہ دار کی کوئی بیٹی ہو، جو محضون کی کفالت کر سکے، تو بعضوں کے نزدیک اختیار دیا جائے گا۔

ابن رفعہ نے فرمایا کہ ممیز اختیار وانتخاب کے اسباب سے واقف ہو، ورنہ اس واقفیت تک اختیار کو مؤخر کیا جائے گا، جس کا اندازہ کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔

اختیار میں تبدیلی: کسی ایک کو اختیار کرنے کے بعد وہ دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، گو بار بار اس طرح کرے، کیونکہ معاملہ اس کے گمان کے برعکس بھی سامنے آسکتا ہے، یا جسے پہلے اختیار کیا تھا، اس کی حالت بدل بھی سکتی ہے، تاہم اس کے بار بار منتقل ہونے سے یہ گمان غالب ہو کہ اسکا سبب تمیز کی کمی ہے، تو ممیز ہونے سے قبل جس کے پاس تھا، اسی کے پاس رکھا جائے گا۔

ملاقات: اگر مؤنث محضون باپ (یا کسی مذکر) کو اختیار کرے، تو وہ اسے والدہ کی ملاقات کے لئے جانے سے روک سکتا ہے، تاکہ پردہ سے مانوس ہو اور بے پردگی کی عادت نہ پڑے۔ اور والدہ کا ادھر آنا زیادہ بہتر ہے، لیکن مذکر کو والدہ کی ملاقات سے نہیں روک سکتا، تاکہ اسے نافرمانی کی عادت نہ پڑے، نیز اس کے جانے میں کوئی بے پردگی کا سوال نہیں، مؤنث کو والدہ کی عیادت اور بصورتِ احتیاج تیمارداری وخدمت سے روکنا صحیح نہیں ہے، البتہ شک وتہمت کی صورت میں جانے کی اجازت نہ دے۔

ماں کو عرف وعادت کے مطابق مذکر ومؤنث کی ملاقات سے روکنا صحیح نہیں، مثلاً چند دنوں میں ایک دن، نہ کہ روز روز، البتہ اس کا گھر قریب ہی ہو، تو روز آنے میں (عرف کی وجہ سے) حرج نہیں، ماں کو بچوں کی ملاقات کے لئے اپنے گھر میں داخل ہونے سے روکنا حرام ہے، جب وہ داخل ہو، تو زیادہ وقت نہ رکے،

محضون کی تیمارداری: اگر مذکر یا مؤنث محضون بیمار ہو (اور باپ کے گھر ہو) تو وہاں ان کی تیمارداری کے سلسلہ میں ماں مقدم ہو گی، جبکہ باپ راضی ہو، ورنہ ماں اپنے گھر ان کی تیمارداری کرے، اور باپ ان کی عیادت کیا کرے، بہرحال دونوں صورتوں میں خلوت محرمہ سے پرہیز کرے، محضون کے انتقال کی صورت میں باپ اس کی ماں کو جنازہ میں حاضری سے نہیں روک سکتا۔ اگر قبر کے سلسلہ میں والدین میں اختلاف ہو، تو باپ کی بات مقدم ہو گی، جبکہ جنازہ کا نقلِ محرم نہ پایا جائے۔

مسئلہ: اگر مذکر ماں کو اختیار کرے، تو رات اس کے پاس گذارے، اور دِن میں والد کے پاس چلا جائے تاکہ وہ اس کے مناسب دینی و دنیوی تعلیم سے اسے آراستہ کرے، کہ اس میں اس کی مصلحت ہے۔ مؤنث ماں کو اختیار کرے، تو دن رات وہیں رہے، اور والد عادت کے مطابق اس کی ملاقات کو جایا کرے، وہ بیٹی کو اپنے گھر لانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اگر ممیز دونوں کو اختیار کرے، تو قرعہ اندازی کر کے جس کا نام نکلے، اس کے حوالہ کرے، اور کسی کو اختیار نہ کرے تو ماں کے پاس رکھے۔

حاضن کا سفر: اگر دونوں میں سے ایک عارضی سفر میں جائے، مثلاً حج، تجارت یا تفریح وغیرہ، تو جو مقیم ہے، دوسرے کے لوٹنے تک وہ بچہ کی پرورش کا زیادہ مستحق ہے، بچہ ممیز ہو یا غیر ممیز نیز سفر طویل ہو یا مختصر، اگر دونوں سفر میں جارہے ہوں، تو ماں مقدم ہو گی۔

اگر ان میں سے ایک مستقل منتقل ہونے کے لئے سفر میں جائے، تو عصبہ ماں کے مقابلہ میں مقدم ہو گا، (باپ ہو یا کوئی اور) گو غیر محرم ہو، تاکہ نسب کی حفاظت ہو۔ اگر عصبہ خود سفر کر کے منتقل ہو رہا ہو، تو اس وقت مقدم ہو گا جب کہ بستی میں دوسرا کوئی عصبہ نہ ہو، لہٰذا اگر باپ جائے اور دادا ہو، یا دادا جائے اور بھائی ہو، تو ماں مقدم ہو گی، اسی طرح راستہ اور منزل پُر امن ہو، تو سفر میں جانے والا عصبہ مقدم ہو گا، ورنہ ماں مقدم ہو گی۔

نفقہ: غیر ممیز والدہ کے پاس ہو، تو اس کا نفقہ اس کے سپرد کر دے، اسی طرح مؤنث ممیز والدہ کو اختیار کرے تو نفقہ اس کے سپرد کر دے، مذکر ممیز کو والد کھانے کے لئے اپنے پاس بلائے، تو والد کے پاس جا کر کھائے، جب کہ باعث مشقت نہ ہو، (مثلاً دونوں کے گھر میں طویل فاصلہ ہو)

حضانت کے شرائط: کسی کو حضات کا استحقاق تبھی ہو گا، جب کہ اس میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

۱- عقل، پس کسی پاگل کو حضانت کا استحقاق نہیں، گو صرف دورہ پڑتا رہتا ہو، اگر بہت کم ہو، مثلاً سال میں ایک دن، تو حضانت، ساقط نہ ہو گی۔

۲- بلوغ، نابالغ کو یہ حق نہ ملے گا۔

۳- آزادی، کسی بھی قسم کے غلام، باندی کو حضانت کا حق نہ ملے گا۔

۴- دین، پس کسی کافر کو کسی مسلم پر حضانت کا استحقاق نہیں، کیونکہ اسے اس پر ولایت حاصل نہیں، نیز ممکن ہے کہ وہ اسے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا کرے، پس گذشتہ ترتیب کے مطابق اس کے مسلم رشتہ دار اس کی پرورش کریں گے، اگر ان میں کوئی نہ ہو، تو یہ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس کے مصارف اسی کے مال سے متعلق ہوں گے، ورنہ جس پر اس کا نفقہ لازم ہے، ورنہ محتاج مسلمانوں کی طرح بیت المال ذمہ دار ہے، بیت المال کا نظم نہ ہو، تو صاحبِ حیثیت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ ذمی بچہ اگر اسلام کا اقرار کرے تو اسے اس کی ذمی رشتہ داروں سے لے لینا مندوب ہے۔

ایک کافر کو ایک کافر پر حضانت کا حق ہے، ایک مسلمان کو بدرجہ اولیٰ کافر پر حضانت کا حق ہے، کیونکہ اس میں اس محضون کی مصلحت و بہتری ہے۔

۵- فاسق نہ ہو، کیونکہ فاسق کو ولایت حاصل نہیں، اور اس سے اطمینان نہیں، نیز اس میں محضون کو کوئی بھلائی نہیں، کیونکہ یہ بھی اس کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ صرف ظاہری عدالت کافی ہے تاہم اہلیت میں اختلاف ہو، تو قاضی کے پاس عدالت کا ثبوت ضروری ہے۔

۶- امانت، یعنی بچہ کی پرورش و حفاظت کے سلسلہ میں اس سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

۷-اقامت، سفر واقامت کی تفصیلات گذر چکیں۔

۸-حاضنہ عورت کسی ایسے شخص کے نکاح میں نہ ہو، جس کو اس محضون پر حضانت کا حق نہ ہو، (جیسا کہ ابتداء میں حدیث گذر چکی) لہٰذا ایسے کسی شخص سے مح-ض نکاح کر لینے سے حق حضانت ختم ہو گا، گو دخول نہ ہو، یا شوہر محضون کو اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو، اگر شوہر اور باپ دونوں راضی ہوں تو حق ختم نہ ہو گا، اور دونوں میں ہر ایک جب چاہے رجوع کر سکتا ہے۔ اگر اس شخص کو بھی حضانت کا حق ہو، تو اس سے نکاح کی وجہ سے عورت کا حق باطل نہ ہو گا، جب کہ وہ راضی ہو، جیسے محضون کا چچا یا چچازاد بھائی، خواہ اس کا باپ موجود ہو، کیونکہ اسے بھی حضانت کا حق ہے، تو اس کی شفقت کی وجہ سے دونوں اس کی کفالت میں ایکدوسرے کا تعاون کریں گے۔

۹-اگر محضون دودھ پیتا بچہ ہو، اور حاضنہ کو دودھ ہو، تو اس کا دودھ پلانا شرط ہے، اگر وہ دودھ پلانے سے انکار کرے تو اسے حضانت کا حق نہ ملے گا، اگر اسے دودھ نہ ہو، تو حق ملے گا۔

۱۰-سِل یا فالج وغیرہ کسی دائمی مرض کا شکار نہ ہو، جس کی تکلیف محضون کی نگہداشت سے غافل کرے۔ اگر ایسی تکلیف ہو کہ بذاتِ خود اس کی پرورش و نگہداشت نہ ہو سکے، تو بذاتِ خود انجام دینے والے کو حق نہ ملے گا، لیکن جو اپنی نگرانی میں دوسرے شخص سے پرورش کروائے، اسے حق ملے گا۔

۱۱-حاضن ابرص یا اجذم نہ ہو، جیسا کہ قواعد علائی میں ہے، (یعنی سفید داغ یا کوڑھ کے مرض میں مبتلا نہ ہو)

۱۲-نابینا نہ ہو، جبکہ خود براہِ راست پرورش کرے، اگر دوسرے کے ذریعہ کرواسکے، تو حق ملے گا۔

۱۳-مُغَفَّل (بے خبر وسادہ لوح) شخص نہ ہو۔

مذکورہ شرائط میں سے کوئی ایک بھی شرط نہ ہو، تو حضانت کا حق ساقط ہو گا، البتہ محضون کا باپ اس کی ماں کو مثلاً اس شرط پر خلع دے کہ ایک سال تک اس کی پرورش کرے، پھر دورانِ سال ماں نکاح کر لے، تب بھی یہ حق ساقط نہ ہو گا، کیونکہ اجارہ عقد لازم ہے،

حضانت کی کوئی شرط موجود نہ ہو، پھر بعد میں پائی جائے، تو حضانت کا حق ملے گا، مثلاً غیر مسلم کا اسلام لانا، فاسق کا تائب ہونا، پاگل پن ختم ہونا، یا منکوحہ کو طلاق ہونا، خواہ بائنہ ہو یا رجعی، مطلقہ کو عدت کے اختتام سے قبل ہی حضانت کا حق ملے گا، لیکن صاحبِ عدت کے جس مکان میں مطلقہ عدت گذارے، وہاں داخل کرنے سے وہ منع کر سکتا ہے، البتہ وہ اجازت دے تو یہ حضانت کی مستحق ہو گی۔

حضانت سے انکار: حضانت کا حق جسے حاصل ہے، وہ انکار کرے یا غائب ہو، تو یہ حق اس کے بعد والے کو ملے گا، پس ماں غائب ہو یا انکار کرے، تو یہ حق نانی کو ملے گا، معلوم ہوا کہ جو انکار کرے، اسپر جبر نہیں، تاہم نفقہ بھی اسی پر واجب ہو، تو جبر کیا جائے گا، مثلاً محضون کا باپ اور مال نہ ہو، تو ماں پر حضانت کے لئے جبر ہو گا۔

سرزنش: باپ، دادا، ماں اور وہ شخص جس کی کفالت میں بچہ ہو وہ تعلیم وتربیت اور تادیب کے لئے بچہ، پاگل اور سفیہ کو سزا دے سکتے ہیں۔ ایک استاد شاگرد کو اس کے ولی کی اجازت سے سرزنش کر سکتا ہے، گرچہ شاگرد بالغ ہو، کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی سے انکار کی وجہ سے شاگرد کو مارنا وغیرہ حرام ہے (جمل ۱۶۵/۵)

بالغ کا حکم: سابقہ مسائل کا تعلق بلوغ تک تھا، اگر کوئی مذکر محضون بالغ ہو جائے اور وہ رشید ہو، تو دوسروں کی کفالت سے بے نیاز ہو چکا، لہٰذا اپنے معاملات کا وہ خود ذمہ دار ہو گا، اب والدین میں سے کسی کے ساتھ رہنے کا پابند نہ ہو گا، لیکن افضل یہ ہے کہ ان سے جدا نہ رہے، تاکہ حسنِ سلوک اور خدمت کی سعادت سے بہرہ ور ہو، اگر امرد ہو اور تنہا رہنے میں خطرہ ہو تو والدین سے جدا رہنا

ممنوع ہے، اگر عاقل وبالغ تو ہو، لیکن رشید نہ ہو، تو اسے مالی اختیار حاصل نہ ہو گا، بلکہ مالی ولایت باپ کے ہی حق میں بر قرار رہے گی، البتہ خطرہ نہ ہو تو رہائش میں اسے اختیار ہے۔

مؤنث بالغہ اور رشیدہ ہو، تو بہتر ہے کہ نکاح تک والدین یا کسی ایک کے پاس رہے، کیونکہ یہ تہمت سے بعید ہے، گو وہ جہاں چاہے رہ سکتی ہے، خواہ باکرہ (کنواری) ہو، جبکہ کوئی تہمت و خطرہ نہ ہو، شک و تہمت کی صورت میں والدہ کو اپنے ساتھ رکھنا واجب ہے، اس طرح عصبات میں سے جو ولی ہو، وہ اپنے ساتھ رکھے، جب کہ اس کا محرم ہو، ورنہ کسی مناسب و محفوظ مقام پر اسے رکھ کر اس کی نگہداشت کرے۔ اس سلسلہ میں اس پر جبر کیا جائے گا، ولی تہمت کا دعوی کرے، تو اس کی قسم لے کر تصدیق کی جائے گی، بینہ کا مکلف نہ ہو گا، اگر رشیدہ نہ ہو، تو وہی تفصیل ہو گی، جو گزر چکی۔

دودھ چھڑانا: رضاعت کی مکمل مدت دو سال ہے، لہٰذا والدین میں سے کوئی ایک بلا ضرر نہ دو سال سے قبل رضاعت کو ختم کر سکتے ہیں، اور نہ دو سال کے بعد یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں، دونوں رضامندی سے دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں، یا دو سال کے بعد بھی پلانا چاہیں، تو جائز ہے، جبکہ بچہ اور ماں کو یا کسی ایک کو ضرر نہ ہو، بغیر حاجت کے دو سال کے بعد دودھ نہ پلانا مسنون ہے۔ دونوں میں اختلاف ہو، تو جو دو سال کی مدت مکمل کرنا چاہے، اس کی بات منظور کی جائے گی، لیکن اس سے قبل دودھ چھڑانا بچہ کے حق میں بہتر ہو، تو چھڑانے کا مطالبہ منظور ہو گا، جیسے ماں کے حمل یا بیماری کی صورت میں، جبکہ دوسری مرضعہ میسر نہ ہو، دو سال کے بعد ہر ایک کو دوسرے کی رضامندی کے بغیر دودھ چھڑانے کا حق ہے، جبکہ اس سے کوئی ضرر نہ ہو، کیونکہ دو سال رضاعت کی مکمل مدت ہے۔

(۵) دیگر نفقات

گذشتہ نفقات کے علاوہ انسان اپنی ملکیت کے اعتبار سے درج ذیل نفقات کا بھی ذمہ دار ہے۔

۱- حیوانات (ذی روح): ان کی تین قسمیں ہیں: (۱) ماکول جانور (وہ جانور جن کا گوشت حلال ہے)
(۲) محترم و غیر ماکول جانور (۳) غیر محترم جانور

(۱) ماکول جانور: گائے بیل وغیرہ ماکول جانوروں کے متعلق مالک کو اختیار ہے کہ ان کو صحیح طریقہ سے کھلاتا پلاتا رہے، جس سے ان کی زندگی محفوظ رہے، ابتدائی درجہ میں شکم سیری اور سیرابی تک کھلانا پلانا واجب ہے۔ یا کھانے کے لئے ان کو ذبح کرے، یا انھیں فروخت یا ھبہ کر دے اگر وہ ان میں سے کسی پر عمل نہ کرے، تو اسے مناسب مقدار میں کھلانے پلانے پر جبر کریں گے، نہ مانے تو بیچنے یا کرایہ سے دینے کا حکم دیں گے، نہ مانے تو (حاکم) جبراً بیچ دے گا یا کرایہ پر دے گا، یہ بھی ممکن نہ ہو، تو بیت المال ورنہ مسلمان ذمہ دار ہیں، چراگاہ میں آزاد چھوڑ دینے سے کھا پی لے تو یہ کافی ہے، اس سے واجب مقدار حاصل نہ ہو، تو بقیہ مقدار خود کھلائے پلائے، اگر چارہ بغیر غصب کے حاصل نہ ہو، تو غصب کر کے کھلائے، جبکہ دوسرا کوئی راستہ نہ ہو، اور غصب کے وقت کا بدل لازم ہے۔

(۲) محترم و غیر ماکول جانور: (محترم یعنی وہ جاندار جن کو بلا سبب مارنے کی اجازت نہیں): مثلاً بلی، شہد کی مکھی، ریشم کا کیڑا، گدھا، خچر وغیرہ۔ ان جانوروں کو بھی مناسب انداز میں کھلانا پلانا لازم ہے، ورنہ فروخت کر دے، اگر فروخت نہ کرے یا کوئی خریدے نہیں، تو کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس سے فائدہ اٹھائے اور اسے کھلاتا پلاتا رہے، تاکہ وہ ہلاک نہ ہو، ان جانوروں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ کھانے کے مقصد کے بغیر جانوروں کو ذبح کی ممانعت وارد ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ”ایک عورت ایک بلی (پر ظلم) کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی۔ اس نے اسے باندھ رکھا، پھر نہ تو اسے کھلایا، اور نہ ہی آزاد چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی“۔

اگر ایسا جانور ہو، جو ملکیت میں داخل نہیں ہوتا، جیسے شکاری کتا، تو اسے یا تو کھلائے، یا کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس سے انتفاع کرے (فروخت نہیں کر سکتا) یا آزاد چھوڑ دے،

دونوں قسم کے جانوروں کے عام احکام: جانوروں سے مستقل اتنا کام لینا کہ اس پر دوام ان کے بس میں نہ ہو، حرام ہے، حاجت سے زائد ان کو مارنا حلال نہیں، گھوڑا، گدھا اور خچر وغیرہ کو ایسی چیز پہنانا جو شدید گرمی وسردی سے ان کی حفاظت کرے، لازم ہے، جبکہ اس سے ان کو کافی تکلیف ہو، اصل مقصد کے علاوہ دیگر امور میں بھی جانوروں کو استعمال کر سکتے ہیں، جبکہ اسے ضرر نہ ہو، مثلاً بیل کو سواری یا بوجھ ڈھونے میں اور اونٹ وگدھے کو کھیتی باڑی کے لئے۔

جانور بالکل اپاہج یا بوڑھا ہو جائے اور اس سے کسی طرح انتفاع ممکن نہ ہو، تو بھی اسے کھلانا پلانا ضروری ہے۔ جانور کا دودھ اتنا دوہنا (نکالنا) جو اسے یا اس کی اولاد کو مضر ہو، حرام ہے، اولاد کی نشو ونما کے لئے مناسب مقدار سے زائد دودھ دوھ سکتا ہے، اگر ماں کا دودھ اسے ناکافی ہو، تو مالک پر تکمیل ضروری ہے۔ اگر ماں کے دودھ کے بدلہ دوسرا اسے خوشگوار اور موافق ہو، تو دوسرا انتظام کر کے ماں کا دودھ نکال سکتا ہے، کیونکہ اصل مقصد اسے ایسی چیز پلانا ہے کہ زندہ رہے، اگر بچہ انکار کرے اور قبول نہ کرے، تو ماں کے دودھ کا وہ زیادہ مستحق ہے، چارہ کی قلت وغیرہ کی وجہ سے جس دودھ کا نکالنا جانور کو مضر ہو، وہ حرام ہے۔ دودھ نہ نکالنا جانور کو مضر ہو، تو نہ نکالنا حرام ہے۔ ورنہ اضاعتِ مال کی وجہ سے حرام ہے۔ مستحب ہے کہ کچھ دودھ تھن میں چھوڑ دے، مکمل نہ نکالے، اور ناخن تراش لے، تاکہ اسے تکلیف نہ ہو، اگر ناخن زیادہ لمبے ہوں اور جانور کو تکلیف دے، تو اس کو دوہنا حرام ہے، اُون کو بالکل جڑ سے کترنا یا مونڈنا حرام ہے، کیونکہ اس سے حیوان کو تکلیف ہوگی۔

شہد کی مکھیوں کو پالنے والے پر لازم ہے کہ اس کے لئے بنائے ہوئے گھروندہ میں اس کی حاجت کے بقدر شہد چھوڑ دے، جبکہ دوسری چیز اسے کافی نہ ہو، ورنہ یہ لازم نہیں۔

جانوروں کو ایک دوسرے کے خلاف برانگیختہ کرنا اور آپس میں لڑانا حرام ہے۔ جفتی کے اوقات میں مذکر ومؤنث جانوروں کو ایک ساتھ رکھنا ان کے حق میں داخل ہے۔ گدھے کی گھوڑی کے ساتھ جفتی کرانا مکروہ، اور گائے کے ساتھ جفتی کرانا حرام ہے، شکار کے ذریعہ کسی جانور کا مالک بنے، اور اسے یہ معلوم ہو، کہ اس کے بچے ہیں جنھیں اس کی غیر موجودگی سے تکلیف ہوگی، تو اسے چھوڑ دینا تاکہ بچوں کے پاس چلی جائے جائز ہے۔

تنبیہ: مسلم وابوداود میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے، ”اپنے نفوس پر بددعا نہ کرو، اور اپنی اولاد پر بددعا نہ کرو، اور اپنے خدام کو بددعا نہ دو، اور اپنے اموال پر بددعا نہ کرو، کہیں اللہ تعالیٰ کی اس گھڑی کی موافقت نہ ہو جائے، جس میں جو چیز مانگی جائے، عطا ہوتی ہے“ اس حدیث کی روشنی میں تادیب وغیرہ کسی حاجت کے وقت مذکورہ لوگوں کو موت وغیرہ کی بددعا دینا مکروہ ہے، ورنہ بلاحاجت بظاہر اولاد یا خدام کے حق میں بددعا دینا جائز نہیں ہے۔

(۳) غیر محترم جانور: صحیحین وغیرہ میں آپ ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے: ”پانچ (حیوانات) فاسق ہیں، انھیں حل وحرم میں (یعنی حرم میں اور خارج حرم، ہر کسی جگہ) قتل کیا جائے گا: سانپ، کوا، چوہا، کاٹ کھانے والا کتا اور چیل“۔

مذکورہ اور دیگر موذی حیوانات کو کھلانا پلانا وغیرہ ضروری نہیں، کیونکہ ایذاء رسانی کی وجہ سے ان کے قتل میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان جانداروں کو بھی بھوکا پیاسا محبوس رکھ کر تکلیف پہنچانا ممنوع ہے، کیونکہ حدیث میں کسی کو قتل کرنا ہو، تو بہتر طریقہ پر قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

۲-غیر حیوان (غیر ذی روح): غیر ذی روح اشیاء مثلاً مکان وغیرہ کے رشید مالک پر اس کی تعمیر واصلاح واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ مال کے بڑھانے میں داخل ہے، جو واجب نہیں، البتہ بلاعذر ان اشیاء کو ایسے ہی چھوڑ دینا کہ ویران اور اجاڑ ہو جائے، مکروہ ہے، کھیتی باڑی اور درختوں کو سیراب نہ کرنا مکروہ ہے، جبکہ اس کی آمدنی سے سیرابی کے مصارف کی تلافی ہو جائے، ورنہ قطعاً کوئی کراہت نہیں، اگر درختوں کو سیراب نہ کرنے کا مقصد یہ ہو کہ خشک ہونے کے بعد کاٹ کر وہاں عمارت وغیرہ بنانا ہے، یا بطورِ ایندھن استعمال کرنا ہے، تب بھی کوئی کراہت نہیں۔ زمین (بے کار پڑی ہو تو اس) میں درخت نہ لگانا، یا کاشتکاری وغیرہ نہ کرنا مکروہ نہیں ہے۔ خود اپنے عمل سے مال ضائع کرنا حرام ہے، م-ثلاً بلاوجہ مال سمندر میں پھینک دینا، اور کسی عمل کے نہ کرنے سے مال ضائع ہو تو عمل کی مشقت کے پیشِ نظر یہ مکروہ ہے۔ اگر عمل میں کوئی مشقت نہ ہو، مثلاً: اپنے پاس پڑا ہوا دینار اٹھالینا، یا جیب سے گرنے والی رقم کو روک لینا وغیرہ، اور ان اعمال کے نہ کرنے سے مال ضائع ہو، تو یہ حرام ہے۔

جو رشید نہ ہو (مجور ہو)، اس کے ولی پر اس کے گھر وزمین وغیرہ کی تعمیر واصلاح، اور کاشت اور پھلوں کی حفاظت لازم ہے۔ اسی طرح وقف کے وکیل اور ناظر پر موقوفہ اشیاء کی تعمیر واصلاح اور حفاظت ضروری ہے، تاکہ مستحقین کا حق فوت نہ ہو۔

تعمیر: اپنی حاجت کے لئے عمارت بنانا مکروہ نہیں، گو طویل ہو، جن روایات میں سات ہاتھ سے زائد کی ممانعت ہے، اور اس میں شدید وعید وارد ہے، اسے لوگوں کے اوپر فخر تکبر کے طور پر بنانے پر محمول کریں گے، اپنی حاجت سے زائد تعمیر مکروہ ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ "انسان جو بھی خرچ کرتا ہے، اس میں اسے ثواب ملے گا، بجز اس کے جو اس مٹی میں ڈالے (یعنی تعمیر میں صرف کرے)" البتہ اس سے کوئی نیک مقصد کی نیت ہو، تو یہ مستثنیٰ ہے، مثلاً اس کی آمدنی مختلف نیک کاموں میں یا اہل وعیال کے مصارف میں صرف ہو۔ (تلخیص الحبیر ۴/۱۰-۱۳، فتح الوہاب مع الجمل ۴/۴۸۷-۵۲۹، تحفہ مع الحواشی ۱۰/۵۴۴-۶۷۵، مغنی المحتاج ۳/۴۲۵-۴۶۴، الفقہ المنہجی ۴/۱۶۹-۲۱۲، الاقناع مع البجیرمی ۴/۶۵-۹۹، نہایۃ المحتاج مع الحواشی ۷/۱۸۷-۲۴۵، ترشیح المستفیدین ۳۴۹-۳۶۳، فتح المعین مع الاعانہ ۴/۵۹-۱۰۹، قلائد ۲/۲۸۴-۳۰۸، بغیہ ص ۲۳۹-۲۴۵)

نسب (قرابت۔ رشتہ داری)

نسب کئی مختلف اہم احکام کی بنیاد ہے۔ مثلاً: وراثت، نکاح کی حلت وحرمت، ولایت، وصیت وغیرہ۔ لہٰذا ان دلائل کا تذکرہ ضروری ہے، جن سے نسب کا ثبوت ہوتا ہے۔

نسب کا ثبوت: شرعاً درج ذیل کسی ایک طریقہ سے نسب ثابت ہو گا۔

(۱) گواہی: ایسے دو مرد گواہوں کی گواہی سے نسب ثابت ہو گا، جن میں گواہ بننے اور گواہی دینے کے شرائط موجود ہوں، (جن کا تذکرہ نکاح میں گذر چکا) صرف عورتوں کی، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے نسب ثابت نہ ہو گا۔

(۲) **اقرار**: (اقرار کرنا۔ اقرار کرنے والے کو مُقِر کہیں گے) مثلاً کسی کا یہ اقرار کرنا کہ میں زید کا والد ہوں، یا جمیل کا بیٹا ہوں،

اقرار اس وقت معتبر و مقبول ہو گا جبکہ درج ذیل شرائط موجود ہوں (کسی کے نسب کے اقرار کرنے والے کو مستلحِق اور جس کے نسب کا اقرار کیا جائے اسے مستلحَق کہا جائے گا)

۱-حِس اس اقرار کی تکذیب نہ کرے (اسے غلط اور جھوٹ نہ بتائے) یعنی دونوں عمر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے باپ بیٹے ہو سکتے ہوں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو، مثلاً دونوں کی عمر ایک ہی ہو، تو یہ اقرار صحیح نہ ہو گا، اور اس سے نسب ثابت نہ ہو گا۔

۲-شریعت اس اقرار کی تکذیب نہ کرے، شریعت کی تکذیب کا مطلب یہ ہے کہ مستلحَق پہلے سے کسی دوسرے سے معروف النسب نہ ہو، کیونکہ ایک شخص سے ثابت نسب اقرار کی وجہ سے دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو گا۔ خواہ مستلحق اس اقرار کو تسلیم کرے یا انکار کرے۔

۳-اگر مستلحق تصدیق کا اہل (یعنی مکلف) ہو تو وہ مقِر (مستلحِق) کی تصدیق کرے، کیونکہ اس کے نسب میں اس کا بھی حق ہے، اور دوسروں کے مقابلہ میں وہ اس سے زیادہ واقف ہو گا۔

۴-مقر اس اقرار کے ذریعہ اپنا کوئی نفع حاصل نہ کرے، یا کسی نقصان کو دفع نہ کرے، اگر ان میں سے کوئی بات لازم آ رہی ہو، تو یہ اقرار کے بجائے اِدّعاء (دعویٰ) ہے، جو گواہی وغیرہ کے بغیر مقبول نہیں۔

مثال: کافی مال چھوڑ کر مرنے والے کسی جوان کے متعلق یہ کہا "کہ یہ میرا بیٹا ہے، تو یہ اقرار نہ ہو گا، کیونکہ اقرار کی تو یہ شان ہے کہ مقر پر کچھ تاوان یا ذمہ داری لازم آئے، اور نہ گواہی ہو گی، کیونکہ گواہی تبھی معتبر ہے، کہ گواہ کے نفع یا دفعِ ضرر کو مستلزم نہ ہو، کیونکہ ظَنّین کی شہادت کو آپ ﷺ نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔ (ترمذی) (ظنین یعنی متہم، اور اپنے لئے نفع اٹھانے یا نقصان دور کرنے والا متہم ہوتا ہے)۔

اس کا یہ کلام دعویٰ ہے، جو بغیر شرعی بینہ کے مقبول نہ ہو گا۔ مثلاً دو عادل گواہ اس کے سچائی کی گواہی دیں۔

(۳) **استفاضہ:** (پھیلنا و مشہور ہونا): یعنی عرصہ سے کوئی شخص اپنی نسبت کسی شخص یا قبیلہ (خاندان) کی طرف کرے اور اس بستی کے لوگ بھی اسے اسی طرف منسوب کریں، اور کوئی اس میں اختلاف نہ کرے، تو یہ استفاضہ (شہرت) صحیح گواہی کی طرح معاملہ کی صحت و صداقت پر ایک شرعی دلیل قرار پائے گی، بشرطیکہ جن لوگوں میں یہ مستفیض اور مشہور و معروف ہے، وہ اتنی کثرت میں ہوں کہ جھوٹ پر ان کا اتفاق عقلاً محال ہو۔

چونکہ نسب کا معاملہ طویل عرصہ سے ثابت و مستمر رہتا ہے، اسلئے مدتوں کے بعد اس کی ابتداء پر باقاعدہ گواہوں کا پیش کرنا کافی دشوار ہو گا، لہٰذا احاجت کے پیش نظر استفاضہ سے اس کا ثبوت کافی سمجھا گیا، نیز آپ ﷺ کے روبرو صحابہ کرامؓ اپنے قبائل اور اجداد کی طرف خود کو منسوب کیا کرتے، تو آپ ﷺ ان سے گواہوں کا مطالبہ نہ کرتے، بلکہ بغیر کسی مخالفت کے استفاضہ کو کافی سمجھتے، اور اسی اعتبار سے احکام مرتب ہوتے۔

رضاعت کا ثبوت: چونکہ رضاعت بھی تحریم میں نسب کی طرح ہے، لہٰذا اس کے ثبوت کے بھی وہی طریقے ہیں، جو نسب کے ہیں، یعنی گواہی، اقرار، اور استفاضہ، لیکن رضاعت کے گواہوں کا مذکر ہونا شرط نہیں، رضاعت میں مقبول گواہی درج ذیل ہیں:

(۱) دو عادل مرد (۲) ایک عادل مرد اور دو عادل عورتیں (۳) چار عادل عورتیں

نسب سے متعلق احکام: کافی احکام کا ترتب دو اشخاص کے درمیان نسب کے ثبوت کی بنیاد پر ہوتا ہے:

مثلاً: نکاح کی حلت و حرمت کے احکام، نفقہ اور اس سے متعلقہ دیگر ذمہ داریوں کے احکام، ولایت اور اس کے درجات، میراث اور حصوں کی تقسیم، وصیت اور اس کی صحت و بطلان کے احکام۔

یہ نسب کے ثبوت پر مرتب اہم احکام کا ایک مختصر سا خاکہ ہے، ان بعض احکام میں رضاعت بھی نسب کی طرح ہے۔ ان احکام کی تفصیلات کا اصل میدان متعلقہ ابواب ہیں۔ (الفقہ المنہجی ۴/۲۱۵-۲۱۸)

جِنَایَت

اس باب میں کسی کو قتل کرنے یا کسی اور طریقہ سے تکلیف پہنچانے اور زخمی وغیرہ کرنے سے متعلق مسائل واحکام کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض مصنفین اسے "جِرَاح" (زخم) کے عنوان سے بھی پیش کرتے ہیں۔

قتل: کسی شرعی جواز کے بغیر کسی مسلمان کا قتل بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے، جیسا کہ امام رافعیؒ و نوویؒ نے فرمایا، امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ نے صراحت فرمائی ہے۔ بکثرت آیات واحادیث میں اس سے ڈرایا اور روکا گیا ہے۔

آیت: "**وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ**" ترجمہ: "اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے۔" (سورۃ النساء: ۹۳)

دیکھئے۔ بلاحق قتل کرنے والے کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم، غضب، دوری اور عظیم عذاب قرار دی گئی ہے۔ اللہ ہم سب کو بچائے رکھے (آمین)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کسی مسلمان کا قتل ان تین اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر حلال نہیں: ایمان کے بعد کفر، مُحْصَن (شادی شدہ) ہونے کے باوجود زنا، اور بغیر حق کے ظلماً کسی نفس کو قتل کرنا۔" (صحیح مسلم)

ایک حدیث میں ایک مؤمن کے قتل کو اللہ کے نزدیک تمام دنیا کے فنا وزوال سے بھی بڑھ کر بتلایا۔ (ترمذی، نسائی، واسناد ھما صحیح)

قتل کی قسمیں: قتل کی تین قسمیں ہیں، (۱) **عَمْد** (۲) **خَطَأ** (۳) **شِبْهُ عَمْد** (عمد خطا)

۱- **قتل عمد:** (اسے عمد محض بھی کہتے ہیں): کسی معین شخص کو ایسی چیز سے قصداً قتل کرنا جو یقیناً یا غالباً قتل کرتی ہو۔ اگر قتل کا قصد نہ ہو، مثلاً کوئی پھسل کر دوسرے شخص پر گر جائے اور وہ مرے تو یہ قتل عمد میں داخل نہیں، اور قصاص واجب نہ ہوگا۔ اسی طرح کسی معین شخص کا قصد نہ ہو، مثلاً کسی گروہ پر تیر چلائے، اور کسی مخصوص آدمی کا قصد نہ ہو، تو اس میں بھی راجح قول یہ ہے کہ قصاص واجب نہ ہوگا۔ غالباً قتل کرنے والی چیز کوئی ہتھیار و آلہ ہو یا کچھ اور، نیز دھار دار ہو یا نہ ہو، دھار دار آلہ کی مثال چھری، تلوار وغیرہ اور غیر دھار دار جیسے آہنی گرز وغیرہ اسی طرح جلانا، ڈبونا، سولی دینا، دیوار وغیرہ بدن پر گرا دینا، جانور کے ذریعہ روند ڈالنا، زندہ دفن کرنا اور خصیتین کو سختی سے دبا کر مار ڈالنا بھی عمد میں داخل ہے۔

اور ان صورتوں میں قصاص واجب ہے۔ کسی کو قید میں بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالے، یا کپڑے اتار دے اور وہ سردی سے مر جائے، تو قصاص واجب ہے۔ اگر کسی کے خلاف ایسی گواہی دیں جس سے اس پر قتل کی سزا عائد ہو، مثلاً: قتل عمد، ردت یا مُحْصَن کا زنا، اور قاضی گواہی کے مطابق اس شخص کو قتل کرے، پھر گواہ اپنی گواہی سے رجوع کریں اور کہیں کہ ہم نے دانستہ ایسی گواہی دی تھی، اور ہمیں علم

تھا کہ ہماری گواہی سے وہ قتل ہو گا، تو ان جھوٹے گواہوں پر قصاص لازم ہے۔

کوئی شخص کسی بچہ یا پاگل کو زہر آلود کھانا کھلائے اور وہ مر جائے تو اس پر قصاص لازم ہے۔ اگر کوئی کسی پر جادو کرے اور وہ مر جائے، تو ہم جادوگر سے تحقیق کریں گے، اگر وہ کہے کہ میں نے اسے میرے جادو سے قتل کیا، اور میرا جادو غالباً قتل کرتا ہے، تو اس پر قصاص لازم ہے۔

قتل عمد اور قصاص کے لزوم کے لئے قاتل کا قتل کا قصد کرنا شرط نہیں، قتل کرنے والے فعل کا قصد کافی ہے۔

(۲) **شِبۡہ عَمۡد**: اگر کسی معین شخص کو قصداً ایسی چیز سے قتل کرے، جو غالباً قتل نہیں کرتا، تو یہ شبہ عمد ہے۔ اسے عمد خطا یا خطا عمد بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کوڑے یا چھڑی سے مارنا، جب کہ یہ دونوں خفیف ہوں، اور مسلسل نہ مارے، اور کسی نازک جگہ نہ مارے (یعنی ایسی پر خطر جگہ جہاں نسبتاً معمولی مار لگنے سے بھی آدمی مر جائے)، نیز جسے مارا جائے وہ بچہ یا کمزور نہ ہو اور سردی و گرمی میں نہ مارے، اور سخت درد نہ ہو، جو موت تک برقرار ہے، ورنہ پھر یہ قتل عمد شمار ہو گا۔

(۳) **قتل خطا**: جس کا قتل ہو، اس کا قصد نہ تھا، مثلاً پھسل کر کسی پر گرا اور وہ مر گیا، یا کسی کو مارا اور دوسرے کو جا لگا، تو یہ قتل خطا ہے۔

اگر پُرخطر و نازک مقام مثلاً آنکھ یا خصیتین میں سوئی چبھونے سے مر جائے تو یہ قتل عمد ہے۔ اسی طرح کسی دوسری جگہ سوئی چبھونے سے ورم آئے اور درد ہو، جو موت تک باقی رہے تو یہ بھی عمد شمار ہو گا۔ اگر کوئی اثر ظاہر نہ ہو، مثلاً شدید درد نہ ہو، اور اسی وقت مر جائے، تو یہ شبہ عمد ہے۔

اگر کسی ایسی جگہ سوئی چبھوئے جہاں درد نہ ہو، مثلاً ایڑی کی کھال میں، اور وہ مر جائے تو کچھ لازم نہیں، فوراً انتقال ہو یا بعد میں۔

کسی عاقل بالغ کو زہر آلود کھانا کھلائے اور کھانے والے کو اس کا علم نہ ہو، تو کھلانے والے پر دِیت لازم ہے، نہ کہ قصاص، اور اسے زہر کا علم ہو، تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ اگر زخمی شخص اپنے مُہلک زخم کا علاج نہ کرے اور مر جائے تو زخمی کرنے والے پر قصاص واجب ہے، کیونکہ جس پر جنایت کی جائے، اس پر اس کا علاج واجب نہیں ہے اگر مہلک زخم نہ ہو، اور پٹی نہ لگانے کی وجہ سے مر جائے ضمان لازم نہیں ہے۔

کوئی شخص کسی کو پکڑ کر رکھے اور دوسرا قتل کرے، یا ایک شخص کنواں کھودے اور دوسرا کسی کو اس میں ڈھکیل کر مار دے، یا ایک شخص کسی کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینکے اور دوسرا راستہ میں ہی (زمین پر گرنے سے قبل) اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے، تو صرف قاتل، ڈھکیلنے والا، اور دو ٹکڑے کرنے والے پر قصاص لازم ہو گا، نہ کہ پکڑنے، کھودنے اور پھینکنے والے پر،

کوئی شخص کسی پر جبر و اکراہ کرے کہ تم فلاں شخص کو قتل کرو، اور وہ قتل کرے، تو مُکرِہ اور مُکرَہ دونوں پر قصاص لازم ہے۔ اگر کوئی بالغ شخص کسی قریب البلوغ پر اکراہ کرے تو صرف اس بالغ پر قصاص لازم ہے، کسی کو جبراً کسی درخت پر چڑھائے اور وہ گر کر مر جائے تو یہ شبہ عمد ہے۔ اگر کسی پر اپنے آپ کو قتل کرنے کے لئے (خودکشی کے لئے) اکراہ کرے، اور وہ کر گذرے، تو قصاص لازم نہیں ہے۔

اگر کسی نے کہا کہ تم مجھے قتل کرو، اور اس نے قتل کر دیا، تو نہ قصاص لازم ہے، اور نہ دیت۔

قتل میں زائد افراد کی شرکت: اگر کسی شخص کے قتل میں کئی افراد شریک ہوں، تو اس کی سزا میں تمام کو قتل کیا جائے گا، جب کہ ہر ایک کا تنہا فعل قتل کرنے والا ہو، کیونکہ اس سلسلہ میں آیت عام ہے، اور حضرت عمرؓ نے یمن کے سات یا پانچ افراد کو ایک کے قتل کی پاداش میں قتل کیا، اور فرمایا کہ وہاں کے تمام افراد اس میں شریک ہوتے تو تمام کو قتل کر دیتا۔ اسی طرح حضرات علی،

مغیرہ اور ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے، اور کسی نے اس کا انکار نہ کیا، تو گویا اجماع ہو چکا۔

اگر کسی کو ہر کوئی کوڑے یا عصا سے ہلکی مار مارے، جس سے وہ مر جائے، تو راجح یہ ہے کہ اگر ان تمام نے آپس میں اتفاق و پلان سے اس طرح کیا ہے، تو ان پر قصاص لازم ہے، ورنہ نہیں۔

قصاص کے شرائط: قصاص مماثلت اور برابری کو کہتے ہیں، چونکہ ظالم سے اس کے ظلم و جنایت کے مثل بدلہ لیا جاتا ہے، اس لئے اسے قصاص کہا جاتا ہے۔ قصاص کے وجوب کے لئے کئی امور میں قاتل و مقتول میں برابری ضروری ہے۔ قصاص کے شرائط درج ذیل ہیں۔

(۱) قاتل بالغ عاقل ہو (۲) مقتول کا والد نہ ہو۔ (۳) مقتول قاتل کے مقابلہ میں کفر یا غلامی کی وجہ سے ناقص نہ ہو۔ لہٰذا ایک مسلمان کو کافر کی وجہ سے، ایک آزاد کو غلام کی وجہ سے اور کسی والد کو اس کے بیٹے کے قتل کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح بچہ یا پاگل کسی کو قتل کرے تو اس پر قصاص نہ آئے گا۔ اگر قاتل اپنے نابالغ ہونے کا دعوی کرے تو تصدیق کی جائے گی۔

مسلمان کسی کافر کو قتل کرے، خواہ وہ کافر حربی ہو، یا ذمی یا مُعَاهَدْ تو اس کے قصاص میں اس مسلمان کو قتل نہ کیا جائے گا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "مسلمان کو کافر کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا" (بخاری)

آزاد شخص کو غلام کے قتل کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔

فائدہ: (۱) کوئی آزاد مسلمان کسی شخص کو قتل کرے جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کافر ہے یا مسلم، یا آزاد ہے یا غلام تو شبہ کی وجہ سے قصاص نہ ہو گا۔

(۲) مسلمان کسی مرتد یا محصن زانی کو قتل کرے تو قاتل پر قصاص نہ ہو گا۔

زخم میں قصاص: مندرجہ بالا شرائط کے مطابق جن دو شخصوں کے درمیان جان میں قصاص جاری ہوتا ہے، ان میں اعضاء کے کاٹنے اور زخم میں بھی قصاص جاری ہو گا، جب کہ مزید دو شرائط موجود ہوں:

۱-اسم خاص میں اشتراک ہو، مثلاً دایاں دائیں کے عوض اور بایاں بائیں کے عوض، لہٰذا دائیں کے عوض بایاں عضو اور اوپری ہونٹ کے عوض نچلا ہونٹ اور اس کے برعکس کاٹا نہیں جائے گا۔ جنایت کے بعد پیدا ہونے والا عضو بھی کاٹا نہیں جائے گا، پس کسی کا دانت اکھاڑ دے اور اس کو اس طرح کے دانت نہ ہوں، تو قصاص نہ ہو گا، گرچہ بعد میں دانت آجائے۔ بدن میں اشتراک شرط نہیں، پس مرد کا عضو عورت کی وجہ سے اور اس کے برعکس کاٹا جائے گا۔ ذمی کا عضو مسلم کے بدلہ میں کٹے گا، نہ کہ اس کے برعکس۔

۲-جنایت کرنے والے کا عضو صحیح اور سامنے والے کا شل (لنجا) نہ ہو، لہٰذا کسی کے شل ہاتھ یا پیر کو کاٹنے کی وجہ سے اس کا صحیح ہاتھ یا پیر کاٹا نہ جائے گا۔ شل عضو کے بدلہ شل عضو کاٹا جائے گا، جبکہ دونوں میں یہ صفت مساوی درجہ میں ہو، یا جنایت کرنے والے کے عضو زائد ہو، صحیح عضو کے عوض شل عضو کٹے گا، تاہم تجربہ کار حضرات کا یہ فیصلہ ہو کہ کاٹنے کی صورت میں کسی بھی طرح خون رک نہ پائے گا، تو کاٹا نہیں جائے گا۔

ہر وہ عضو جو جوڑ سے کاٹا جائے، اس میں قصاص ہو گا، مثلاً کہنی، پورا، گٹا، گھٹنا وغیرہ زخموں میں صرف مُوْضِحہ میں قصاص ہو گا، یعنی وہ زخم جو ہڈی تک پہنچ جائے، کیونکہ بقیہ زخموں میں مساوات اور صحیح ضبط دشوار ہے۔ موضحہ کے قصاص میں اس کے لمبائی و چوڑائی کے اعتبار سے بدلہ لیا جائے گا، نہ کہ نسبت کے اعتبار سے مثلاً کسی نے نصف سر میں زخم کیا تو، اس کے نصف سر میں زخم نہیں کیا جائے گا، بلکہ

زخم کی لمبائی وچوڑائی مطابق زخم لگایا جائے، خواہ نصف سے کم یا بیش ہو جائے۔

دِیَت

تعریف: کسی آزاد کو قتل کرنے یا کسی عضو کو کاٹنے یا زخمی کرنے کی وجہ سے جو مال واجب ہوتا ہے، اسے دِیَت کہا جاتا ہے۔ اس کی مشروعیت قرآن وحدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔

دیت کی قسمیں: (۱) دیتِ مُغَلَّظَہ: یہ قتل عمد میں واجب ہوتا ہے، خواہ قصاص واجب ہونے کے بعد اسے معاف کر کے دیت پر راضی ہو جائے، یا قصاص واجب نہ ہو، جیسے والد کا بیٹے کو قتل کرنا اس دیت میں ۱۰۰/ اونٹ واجب ہیں، جن میں ۳۰/ حِقّہ (تین سالہ)، ۳۰/ جَذَعہ (چار سالہ) ۴۰/ خَلِفہ (یعنی حاملہ) ہوں۔ دیت کی یہ تفصیل ترمذی میں وارد ہے۔ مذکورہ دیت ایک آزاد، محقون الدم (یعنی جس کا قتل ممنوع ہو) مسلمان مرد کی ہے، اگر کوئی محقون الدم نہ ہو، مثلاً: بستی سے فرض نماز ترک کرنے والا یا محصن زانی، تو ان کو قتل کرنے والے مسلم پر نہ دیت ہے اور نہ کفارہ (گرچہ انفرادی طور پر حکومت کے بغیر کسی کو اس طرح قتل کی اجازت نہیں ہے)

(۲) **دیت مخففہ:** قتل خطا کی صورت میں تین حیثیت سے دیت میں تخفیف ہوگی۔

(۱) یہ دیت مُخَمَّسَہ ہوگی، یعنی ۱۰۰/ اونٹ پانچ قسموں پر مشتمل ہوں گے۔ ۲۰ حِقہ، ۲۰ جذعۃ، ۲۰ بنت لبون (دوسالہ اونٹنی)، ۲۰ بنت مخاض (ایک سالہ اونٹنی) اور ۲۰ ابن لبون (دوسالہ اونٹ) (۲) یہ دیت عاقلہ پر واجب ہوگی۔ (۳) اسے تین سال میں قسط وار ادا کرنا ہے۔

اگر قتل شبہ عمد ہو، تو دیت دو اعتبار سے مخفف ہوگی، یعنی عاقلہ پر اور تین سال میں ادائیگی لازم ہے۔ اگر کسی جگہ اونٹ موجود ہی نہ ہو، تو اس کی قیمت ادا کی جائیگی۔

اگر قتل خطا میں درج ذیل تین اسباب میں سے کوئی سبب پایا جائے، تو دیت میں ایک اعتبار سے تغلیظ (سختی) ہوگی، یعنی قتل عمد کی طرح تین قسموں کے اونٹ لازم ہوں گے۔ (۱) حرم مکہ میں قتل کرے۔ (۲) حرام مہینوں میں قتل کرے، حرام مہینے چار ہیں: ذوالقعدۃ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ (۳) کسی ذورحم محرم کو قتل کرے، مثلاً: بہن، ماں، چچا، خالہ وغیرہ۔

عورت: عورت کے جان یا زخم کی دیت مرد کے مقابلہ میں نصف ہوگی، جیسا کہ بیہقی کی حدیث میں ہے۔

اھلِ کتاب: یہودی ونصرانی کی دیت ایک مسلم کی دیت کا ایک تہائی ہوگا، جو مرفوعاً مروی ہے، نیز بقول امام شافعی حضرات عمرؓ وعثمانؓ نے یہی فیصلہ دیا تھا۔

مجوسی: جس مجوسی (آتش پرست) کو امان ہو، اس کی دیت ایک مسلمان کی دیت کا پندرھواں حصّہ 15\1 ہوگا، جیسا کہ حضرات عمرؓ، عثمانؓ وابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

بت پرست، سورج پرست وغیرہ افراد کی بھی یہی دیت ہوگی، جبکہ انھیں امان ہو، جسے امان نہ ہو، اس کا خون مھدر ورائیگاں ہے۔

مذکورہ تمام افراد کے عورتوں کی دیت ان کے مردوں کے نصف ہوگی۔

جس شخص کو ابھی تک اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو، اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

دار الحرب میں اسلام قبول کرے اور وہاں سے ہجرت نہ کرے، تو اس کی طرف سے قصاص لیا جائے گا۔

زخم وغیرہ کی دیت: درج ذیل صورتوں میں اس شخص کی مکمل دیت (جان کی دیت) لازم ہوگی۔

(۱) دونوں ہاتھ گٹوں سے ہتھیلی وانگلیوں سمیت کاٹ کر جدا کر دینا، (۲) دونوں پیروں کو ٹخنوں سے کاٹ دینا، (۳) ناک کاٹ کر جدا کرنا، (۴) دونوں کان کاٹ کر جدا کرنا، خواہ بہرہ ہو، (۵) دونوں آنکھوں کو جدا کرنا، (۶) چاروں پپوٹوں کو جدا کرنا، (۷) گفتگو پر قادر شخص کی زبان جدا کرنا، (۸) دونوں ہونٹ جدا کرنا، (۹) زبان پر جنایت کی وجہ سے گفتگو کی صلاحیت ختم ہو جائے، (۱۰) دونوں آنکھوں کی بینائی چلی جائے، (۱۱) سننے کی قوت ختم ہو جائے، (۱۲) سونگھنے کی قوت ختم ہو جائے، (۱۳) عقل چلی جائے، (۱۴) عضو تناسل (ذکر) کو کاٹنا، صرف حشفہ (سپاری) کے کاٹنے کا بھی یہی حکم ہے، (۱۵) دونوں خصیوں کو جدا کرنا (یعنی دونوں بیضے، کیونکہ عربی میں خصیہ اس کی کھال کو کہتے ہیں)

دیگر اعضاء وزخموں کا حکم: ایک ہاتھ، ایک پیر، ایک کان، ایک آنکھ، ایک ہونٹ، ایک آنکھ کی بینائی، ایک کان کی بینائی، ایک کان کی قوتِ سماعت، اور ایک خصیہ کے تلف کرنے میں اس شخص کی جان کی دیت کا نصف واجب ہو گا۔ ایک پپوٹے میں دیت کا چوتھائی حصّہ واجب ہو گا۔

مُوضِحَہ: (یعنی جو زخم ہڈی تک پہنچ جائے): سر یا چہرہ کے موضحہ میں اس زخمی شخص کی دیت کا بیسواں حصّہ واجب ہو گا، گو زخم چھوٹا ہو، بس ایک آزاد مسلمان کو موضحہ میں پانچ اونٹ واجب ہوں گے، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے، موضحہ کے چھوٹا بڑا ہونے سے اس مقدار میں کوئی تفاوت نہ ہو گا۔

دانت: اصلی اور مکمل ایک دانت (جب کہ دودھ دانت نہ ہو) کے اکھاڑنے میں بیسواں حصّہ واجب ہو گا، لہٰذا ایک آزاد مسلمان مرد کے ایک دانت میں پانچ اونٹ لازم ہوں گے۔

انگلی: ہاتھ و پیر کے ہر ایک اصل انگلی میں اس شخص کے دیت کا دسواں حصّہ واجب ہو گا، پس ایک مذکر آزاد مسلمان کی ایک انگلی کے جدا کرنے میں ۱۰/ اونٹ واجب ہوں گے۔ انگوٹھے کے ایک پورے میں انگلی کا نصف اور دیگر انگلیوں کے ایک پورے میں انگلی کا ایک تہائی واجب ہو گا۔

حُکُومَۃ: ہر وہ عضو جس میں کوئی منفعت نہ ہو، اس کی وجہ سے حکومۃ لازم ہے۔ اسی طرح ہڈی توڑنے اور ان تمام جنایات میں بھی، جن میں کوئی دیت متعین نہ ہو۔ مثلاً: گردن اور چہرہ کو ٹیڑھا کر دینا، یا سیاہ کر دینا یا چھوٹا کر دینا۔

جس شخص پر جنایت ہو، جنایت کے بعد زخم وغیرہ مندمل ہونے کے بعد اسے غلام فرض کرتے ہوئے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے، ما قبل کی اور اس قیمت میں جو تفاوت ہو، اسی نسبت سے دیت کی مقدار کو حکومۃ کہا جاتا ہے۔ مثلاً: جنایت سے قبل قیمت سو ہو اور جنایت و مندمل ہونے کے بعد ۹۰/ تو ۱۰/ کا تفاوت ہوا لہٰذا دیت کا دسواں حصہ واجب ہو گا، اور اسی کو حکومت کہیں گے۔

غلام: کوئی شخص کسی غلام باندی کو قتل کرے تو اس پر ان کی قیمت لازم ہے، جتنی بھی ہو۔

جَنین: مملوک جنین کی دیت اس کی ماں کے قیمت کا دسواں حصّہ ہے۔ اور ایک آزاد مسلمان جنین جنایت کی وجہ سے مردہ پیدا ہو، تو اس کی دیت غُرَّۃ یعنی ایک غلام یا باندی ہے، جو باپ کی دیت کے بیسویں حصّہ تک پہنچنا شرط ہے۔

فوائد: (۱) بچے کو تیراکی سکھلانے کے لئے کسی ماہر کے سپرد کرے اور بچہ غرق ہو جائے تو شبہ عمد کی دیت واجب ہے۔

(۲) معلّم شاگرد کو تادیباً سزا دے اور وہ مر جائے تو شبہ عمد کی دیت واجب ہے۔

(۳) ختنہ کرنے والے کے ہاتھ سے حشفہ کو نقصان پہنچے تو ضمان واجب ہے، جو عاقلہ کے ذمہ ہو گا۔

(۴) گھر کا کوڑا کرکٹ اور تربوزہ کے چھلکے وغیرہ موات کی زمین (بنجر زمین) میں پھینک دے، اور اسی سے کسی کی جان یا مال تلف ہو، تو کوئی ضمان عائد نہ ہو گا، اگر راستہ میں پھینکے اور کچھ نقصان ہو، تو ضمان واجب ہے، لیکن کوئی قصداً اس پر چلے، تو ضمان نہ ہو گا۔

(۵) راستہ میں عام مصلحت کی خاطر پانی چھڑکے، مثلاً راہ گیروں سے گرد و غبار کو دور کرنے کے لئے اور اس کی وجہ سے کوئی انسان یا جانور پھسل جائے، تو کوئی ضمان نہیں، اور اگر اپنی مصلحت کے لئے چھڑکے یا عادت سے تجاوز کر جائے، یا کیچڑ کر دے، تو تلف کا ضامن ہو گا۔

قَسامَہ: یعنی قتل کے مقدمہ میں قسمیں کھانا، اس کی شکل یہ ہے کہ کوئی مقتول کسی جگہ ملے اور قاتل کا کوئی علم نہ ہو، اور نہ گواہ ہوں اور مقتول کا ولی کسی معین شخص یا جماعت کے متعلق قتل کا دعوی کرے اور ایسا کوئی قرینہ بھی موجود ہو، جو اس کے دعوی کی صداقت پر دلالت کرے، (ایسے قرینہ کو لَوْث کہتے ہیں) تو ولی اپنے دعوی پر پچاس قسمیں کھائے گا، پھر جب قسم کھالے تو عمد میں جس کے خلاف قسمیں کھائی ہیں، اس پر، اور خطا و شبہ عمد میں اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہو گی، اگر مقتول کے ایک سے زائد ورثاء ہوں تو ان کی میراث کے تناسب سے یہ پچاس قسمیں ان پر منقسم ہوں گی۔

لَوْث کی مثالیں: مقتول کسی قبیلہ، قلعہ، چھوٹی بستی یا بڑی بستی کے جدا حصہ میں پایا جائے اور اس کے اور وہاں بسنے والوں کے درمیان ظاہری دشمنی ہو، چند افراد کسی گھر، مسجد، باغ، راستہ یا صحراء سے ہٹ جائیں اور وہاں مقتول موجود ہو، کوئی ایک عادل گواہی دے کہ زید نے فلاں کو قتل کیا، چند غلام، عورتیں، بچے، فاسق لوگ یا ذمی لوگ قتل کی گواہی دیں، عام وخاص میں یہ مشہور ہو کہ فلاں نے زید کو قتل کیا۔

قسامہ کے متعلق حضرت سہل سے صحیحین میں روایت موجود ہے۔

اگر لَوْث نہ ہو، تو یہ پچاس قسمیں مدعی علیہ (جس پر قاتل ہونے کا دعوی ہے) پر آئیں گی۔ (کفایۃ الاخیار ۲/۲۹۱-۳۳۱، الاقناع مع البجیرمی ۴/۹۹-۱۳۷، المنہاج مع السراج الوہاج ۴۷۷-۵۱۱)

قتل کا کفارہ

کسی بھی محترم جان کو قتل کرنے والے پر کفارہ واجب ہے، خواہ قاتل مسلم ہو یا کافر آزاد ہو یا غلام، بچہ ہو یا پاگل، براہِ راست قتل کرے یا سبب بنے، عمداً ہو یا خطاً یا بطور شبہ عمد۔ اللہ کے حق کی وجہ سے جسے قتل کرنا حرام ہے، اس کے قتل کی وجہ سے کفارہ واجب ہے، خواہ مقتول مسلم ہو یا کافر، ذمی ہو یا معاہد، آزاد ہو یا غلام، اپنا غلام ہو یا کسی دوسرے کا، عاقل ہو یا پاگل، چھوٹا ہو یا جنین، مقتول کے متعلق ضابطہ یہ ہے کہ وہ ایمان یا امان کی وجہ سے معصوم آدمی ہو (معصوم یعنی جسے مارنا جائز نہ ہو) پس کسی حربی، مرتد، ڈاکو اور محصن زانی کے قتل کی وجہ سے کفارہ واجب نہ ہو گا۔ حربی خواتین یا بچوں کے قتل سے بھی واجب نہ ہو گا، گرچہ ان کا قتل حرام ہے، کیونکہ یہ ان کی حرمت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی مصلحت کی وجہ سے ہے۔

کسی کے قتل میں کئی افراد شریک ہوں، تو ان میں ہر ایک پر مستقل کفارہ لازم ہے۔

کفارہ: قتل کے کفارہ میں ایک مؤمن غلام آزاد کرنا لازم ہے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو مسلسل دو ماہ کے روزے لازم ہیں، جیسا کہ نص قرآن سے، ثابت ہے۔ اگر روزے پر قادر نہ ہو، تو قتل کے کفارہ میں مساکین کو اناج دینا کافی نہیں ہے (دیکھئے سورہ نساء آیت: ۹۲)

تنبیہ: کسی کے چشم بد (نظر لگنے) کی وجہ سے کوئی مر جائے، تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہے، جس کی نظر لگتی ہے، اسے اس طرح برکت کی دعا کرنا مستحب ہے: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَلَا تَضُرَّهُ. مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، کیونکہ اس صورت میں اس کی نظر سے

نقصان نہ ہوگا۔(کفایہ الاخیار ۲/۳۳۲-۳۳۴، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۳۸-۱۴۰)

بُغاۃ (باغیوں کا مسئلہ)

بغاۃ دراصل باغی کی جمع ہے، اور بُغی کا مطلب ہے ظلم اور حد سے تجاوز کرنا۔ جو مسلمان حکومت اسلامیہ کے حاکم کی مخالفت کریں اور اس کے خلاف خروج کریں اور اس کی اطاعت نہ کریں، یا ان پر واجب حق کی ادائیگی سے انکار کریں (گو خروج نہ کریں) تو یہ درج ذیل شرائط کے ساتھ باغی کہلائیں گے۔

۱-ان کی کثرت یا قوت وغیرہ کی وجہ سے ان کو ایک شوکت وغلبہ حاصل ہو، کہ اطاعت پر لانے کے لئے کچھ مشقت اٹھانے کی نوبت آئے۔

۲-ان کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو، جس کی وجہ سے حاکم کی مخالفت کو روا سمجھ رہے ہیں۔

۳-ان کا کوئی رہنما و قائد ہو، جس کی وہ اطاعت کرتے ہوں۔

اگر مخالفین چند افراد ہوں، جن کو راہِ راست پر لانا بالکل آسان ہو، تو یہ باغی نہیں کہلائیں گے۔ اگر بلا تاویل کے مخالفت کریں، یا تاویل قطعاً باطل ہو، تب بھی یہ باغی نہیں کہلائیں گے۔ تاویل محتمل ہونا شرط ہے، یعنی کسی درجہ میں اس کی گنجائش بھی ہو۔

باغیوں کے احکام: (۱) پہلے حاکم ان کے پاس کسی امانتدار و ذہین خیر خواہ کو روانہ کرے، تاکہ ان کے اعتراض وشبہات کو سن کر اس کا ازالہ کرے، اس کے باوجود وہ اپنے موقف پر مصر ہوں تو ان کو نصیحت کرے اور سمجھائے۔

(۲) نصیحت کے باوجود نہ مانیں تو ان کے ساتھ اعلانِ جنگ کرے۔

(۳) ان کا جو شخص میدان چھوڑ کر بھاگے اسے قتل نہ کیا جائے، جو زخمی ہو جائے اس قتل نہ کرے، ان کے قیدیوں کو نہ تو قتل کرے اور نہ تو جنگ کے اختتام اور ان کے تتر بتر ہونے تک آزاد کرے۔ اگر وہ بذاتِ خود بغاوت کا راستہ ترک کر کے حاکم کی اطاعت اختیار کرے، تو آزاد کر دیا جائے۔

(۴) ان کے ہتھیار وغیرہ جنگ کے خاتمہ اور ان کی طرف سے خطرات وشرارت کے ٹلنے اور اطمینان کے بعد ان کو لوٹا دیئے جائیں، بغیر شدید مجبوری کے ان کے ہتھیاروں کو استعمال نہ کیا جائے۔

(۵) بغیر شدید مجبوری کے عام مہلک ہتھیاروں کا استعمال نہ کیا جائے، اور نہ ان کے خلاف کافروں سے تعاون لیا جائے۔

(۶) باغیوں کا کوئی مال غنیمت کا مال شمار نہ ہوگا، بلکہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ان کو لوٹا دینا واجب ہے۔ (المنہاج مع السراج: ۵۱۲، الفقہ المنہجی ۸/۹۸، الاقناع مع البجیرمی، ۴/۱۹۱، کفایۃ الاخیار ۳/۲۷۳)

رِدّت (اسلام کو چھوڑ دینا)

تعریف: عربی زبان میں کسی چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کرنے کو رِدّۃ کہا جاتا ہے، اور شریعت میں کسی مکلف اور مختار مسلمان کا مذہبِ اسلام چھور دینا رِدّۃ (مرتد ہونا۔ ارتداد) کہلاتا ہے (اعاذنا اللہ منہ)

ارتداد کفر کی بدترین قسم ہے، اور اس کا حکم شدید ترین ہے، اگر اسی پر موت ہوئی، تو سارے اعمال اکارت جائیں گے (حبط ہوں گے)، لہٰذا دوبارہ اسلام قبول کرلے تو ردّت سے قبل ادا کردہ عبادات کا اعادہ واجب نہیں ہے، البتہ اعمال کا ثواب بالاتفاق محض ردّت کی وجہ سے حبط اور برباد ہو جائے گا۔

آیت: ''وَمَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَیَمُتۡ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ''(البقرہ:۲۱۷)

ترجمہ: ''اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مر جائے، تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں، یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے''۔

ردّت کے اسباب: مندرجہ ذیل کسی سبب کے پائے جانے سے آدمی مرتد (غیر مسلم) ہو جائے گا۔ فی الحال یا آئندہ کافر ہونے کا عزم وارادہ کرنا، اس طرح کا ارادہ کرتے ہی کافر ہو جائے گا، صرف کسی کفریہ عمل کے کرنے کے ارادے سے کافر نہ ہوگا۔ کسی کفریہ قول یا عمل کو انجام دینا، خواہ بطور استہزا، وٹھٹھا کے ہو، یا عناداً ہو (یعنی باطن میں برحق سمجھتے ہوئے مخالفت کرنا)، یا اعتقاداً ہو، مثلاً، صانع (یعنی تمام جہاں کے خالق) کے وجود کا انکار کرنا، اللہ کے قادر یا عالم ہونے کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کو حادث ماننا، دنیا کے قدیم ماننا (یعنی یہ کہ ہمیشہ سے موجود ہے، کسی نے پیدا نہیں کیا)، کسی نبی کا انکار کرنا، کسی نبی کو جھٹلانا، اگر سبقتِ لسانی یا خوف کی وجہ سے کوئی کفریہ کلمہ زبان سے نکلے تو کافر نہ ہوگا، نیز کسی کے کفریہ کلمہ کو نقل کرنے سے کافر نہ ہوگا، تاہم گواہی وغیرہ کی ضرورت کے بغیر ایسا کلمہ نقل نہ کرے، اگر کوئی صراحتاً کفریہ کلمہ ادا کرے اور توریہ کرے (یعنی دل میں کوئی اور مفہوم مراد لے، جو کفر نہ ہو)، تب بھی اس عمل کو ہلکا سمجھنے کی وجہ سے وہ ظاہراً وباطناً کافر ہوگا۔

دیگر اسباب: کسی مسلمان کے کافر ہونے کی تمنّا، (تاہم اس کے ظالم ہونے کی وجہ سے اس پر سختی کے طور پر یہ تمنا کفر نہ ہوگا) حضرت ابو بکرؓ کے صحابی ہونے کا انکار، حضرت عائشہؓ کی اللہ نے جو برأت فرمائی اس میں انھیں ملوث سمجھنا، (دیگر کسی صحابی کے صحبت کا انکار کرنا، شیخین یعنی صدیقؓ وفاروقؓ کو برا بھلا کہنا یا حسنین کو برا کہنا کفر نہیں ہے) کسی نبی کی تحقیر، اسے برا بھلا کہنا، فرشتوں کو گالی دینا، نبوت کے جھوٹے دعویدار کی تصدیق کرنا، تمام امت کو گمراہ قرار دینا، صحابہ کرام کو کافر قرار دینا، جو معذور جاہل نہ ہو، اس کا دوبارہ جی اٹھنے کا، مکہ کا، کعبہ، مسجد حرام، جنت وجہنم، حساب وکتاب، ثواب یا عذاب کا انکار کرنا، کسی سنت کی تحقیر کرنا، مثلاً: کسی سے کہا جائے کہ آپ ﷺ کھانے کے بعد اپنی تینوں انگلیاں چاٹ لیتے تھے، تو وہ کہے: یہ کوئی ادب نہیں ہے۔

جس بات کا دینِ اسلام سے ہونا بالکل اجماعی وواضح اور ہر خاص وعام کو معلوم ہو، اس کا انکار کرنا مثلاً: پنج وقتہ فرض نماز، یا کوئی ایک نماز، یا ان میں سے ایک رکعت یا سجدہ کا انکار، چھٹی نماز کو فرض قرار دینا، زکات، روزہ، حج کے وجوب کا انکار، شراب، سود اور زنا کی حرمت کا انکار، قرآن کو اللہ کا کلام نہ ماننا، قرآن کے اعجاز کا انکار کرنا، قران شریف، کتب حدیث یا علوم دینیہ کے اوراق کو تحقیراً نجاست یا گندگی میں ڈالنا، بت کو سجدہ کرنا، سورج یا کسی بھی مخلوق کو سجدہ کرنا، خواہ کسی نبی کو سجدہ کرے، یا اس کا دل اعضاء کے مطابق نہ ہو، کیونکہ اس کی ظاہری حالت اس کے مخالف ہے (اگر اللہ کی طرح تعظیم کے قصد سے کسی مخلوق کو رکوع کرے تو کفر ہے، ورنہ کفر نہیں، گرچہ حرام ہے، صرف سر کو جھکانا یا معمولی سا جھکنا جو کہ اقل رکوع تک نہ پہنچے، مکروہ ہے)

یہ کہنا کہ نبی یا فرشتہ بھی فلاں بات کی گواہی دے تو میں قبول نہ کروں گا، یا اگر انبیاء کی باتیں سچی ہیں تو ہم نجات پا گئے، یا بطور تحقیر یہ کہا کہ مجھے پتہ نہیں ایمان کیا ہے، یا جو لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھے، اسے یہ کہنا یہ تمہاری بھوک مٹانے والا نہیں ہے، کسی مسلمان کو کفر کا

مشورہ دینا، یا جو کافر اسلام لانا چاہے اسے کفر پر باقی رہنے کا مشورہ دینا، یا کوئی اسلام بتانے کی درخواست کرے تو یہ نہ مانے، کسی مسلمان کو بغیر کسی تاویل کے کافر قرار دینا، کسی نے اسے یہودی وغیرہ کہہ کر آواز دی اور اس نے جواب دیا، کسی سے پوچھا گیا کہ کیا تو مسلمان نہیں؟ تو جواب دیا: نہیں، شراب نوشی یا زنا کے وقت تحقیراً بسم اللہ پڑھنا، تحقیراً یہ کہنا کہ مجھے قیامت کا کوئی ڈر نہیں۔ موذن کی اذان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، یہ کہنا کہ ایک پیالہ سالن علم سے بہتر ہے، جو اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا پیرو ہو اسے کافر نہ سمجھنا یا اس کے کفر میں شک کرنا، جس سنت کی مشروعیت پر اجماع ہو، اسکے انکار سے کافر ہو گا، جیسے رواتب اور عیدین کی نماز، (کیونکہ تواتر کا انکار پایا جا رہا ہے، اور یہ حکم ان اجماعی مسائل میں ہے جس کا دین میں داخل ہونا ہر کس و ناکس کو معلوم ہے)

تنبیہ: (۱) جو بات اجماعی ہو، تاہم اسے صرف خواص ہی جانتے ہوں تو اس کے انکار سے کافر نہ ہو گا، گو اس کے متعلق نص وارد ہو، مثلاً: ایک بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو میراث میں چھٹا حصّہ ملنا، نکاح متعہ کی حرمت، البتہ ایسے شخص کو صحیح مسئلہ سے آگاہ کیا جائے گا، تاکہ اس کا اعتقاد رکھے۔

(۲) کوئی کافر شخص کسی مسلمان سے درخواست کرے کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کرو، اور یہ اس سے کہے کہ تم تھوڑی دیر رکو، تو یہ کافر ہو جائے گا، جب کہ بلا عذر تاخیر کرے، اگر عذر ہو مثلاً کسی فرض یا نفل نماز میں ہو، اور اس کے اسلام کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو فوراً کلمہ پڑھانا واجب نہیں ہے، اگر فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو فوراً کلمہ پڑھانا واجب ہے، اور اس میں اس سے خطاب کی ضرورت ہو، مثلاً: آپ یوں پڑھیے، تو نماز باطل ہو گی، ورنہ ذکر کی نیت سے صرف شہادتین کو ادا کرے تو نماز باطل نہ ہو گی۔ (اس مسئلہ میں لاعلمی کی وجہ سے کافی کوتاہی برتی جاتی ہے، غسل وغیرہ کو مقدم کیا جاتا ہے، حالانکہ کوئی اسلام قبول کرنا چاہے تو بلا تاخیر فوراً اسے کلمہ پڑھا دینا چاہئے، اگر قانونی خطرات ہوں تو تحریری ضوابط کو آگے مکمل کیا جائے)

(۳) ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں کہ برحق بات یہ ہے کہ اجماعی مسائل کے ساتھ تواتر موجود ہو تو اس کا منکر تواتر کی مخالفت کی وجہ سے کافر ہو گا، نہ کہ اجماع کی مخالفت کی وجہ سے، اور تواتر موجود نہ ہو، تو کافر نہ ہو گا۔

(۴) اگر کوئی تازہ نو مسلم ہو، یا اہلِ علم سے دور پلا بڑھا ہو، اس لئے لاعلمی کی وجہ سے کسی حلال کو حرام یا اس کے برعکس قرار دے، تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہ ہو گا۔

نشہ: کوئی نشہ کی حالت میں ردّت اختیار کرے، تو وہ مرتد ہو گا۔

بچہ و پاگل: بچہ یا پاگل کے ردّت کا کوئی اعتبار نہیں۔

اکراہ: کوئی شخص اکراہ اور جبر کی وجہ سے کفریہ قول یا فعل کا ارتکاب کرے، حالانکہ دل میں ایسی کوئی بات نہ ہو، تو وہ کافر نہ ہو گا۔

آیت: ”مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ“ (النحل: ۱۰۶)

ترجمہ: جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے، مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدہ میں فتور نہ کرے اور اس قول یا فعل کو برا سمجھتا ہو تو وہ مستثنیٰ ہے، کہ اسکو ظاہری کفر کا ارتکاب جائز ہے اور اس کے لئے وہ وعید آئندہ نہیں ہے)

اگر کوئی شخص مرتد ہوتے ہی پاگل ہو جائے تو احتیاطاً اسے مہلت دینا واجب ہے، ممکن ہے کہ پھر عقل لوٹ آئے اور اسلام قبول

کرلے، اگر جنون میں ہی کوئی اسے قتل کردے، تو اس کا خون رائگاں ہے، کیونکہ وہ مرتد ہے، البتہ اس کے قاتل کو تعزیری سزا ملے گی، کیونکہ اس نے توبہ کے مطالبہ کو فوت کردیا۔

اگر ردّت کے بعد توبہ کے مطالبہ کے باوجود وہ نہ مانے، پھر بعد میں پاگل ہوجائے، تو اسے قتل کردیا جائے گا۔

توبہ کی ترغیب: مرتد مرد یا عورت کو توبہ کی ترغیب دینا واجب ہے، کیونکہ وہ اسلام کی وجہ سے محترم تھا، ممکن ہے اسے کچھ شبہ پیش آیا ہو، پس اس شبہ کا ازالہ کیا جائے گا، یہ ترغیب فی الحال ہی دی جائے، کیونکہ اس پر مرتب قتل کی سزا حد ہے، لہٰذا دیگر حدود کی طرح اسے بھی مؤخر نہ کیا جائے، تاہم وہ نشہ میں ہو، تو پوری طرح ہوش میں آنے تک مؤخر کرنا سنت ہے۔

توبہ کی ترغیب اور سمجھانے کے باوجود وہ رِدّت پر اصرار کرے، تو اسے قتل کیا جائے گا، بخاری شریف کی حدیث ہے: ”جو اپنا دین بدل دے، تو اسے قتل کردو، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک عورت پر اسلام پیش کرنے کا حکم دیا، اگر قبول کرے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کیا جائے (دارقطنی)

چونکہ مرتد کا قتل کفر کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کا غسل یا تکفین واجب نہیں، جائز ہے، اس پر نماز پڑھنا حرام ہے، نیز مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین بھی ناجائز ہے، کفار کے قبرستان میں دفن کرسکتے ہیں، لیکن ایک حربی کی طرح اس کی بھی تدفین واجب نہیں ہے۔

اگر وہ اسلام قبول کرے، تو اس کا اسلام صحیح ہوگا، اور اسے چھوڑ دیا جائے گا خواہ وہ زِندیق ہو، یا بار بار اس طرح کرچکا ہو، جو پہلی مرتبہ ردّت کے بعد تائب ہو کر اسلام لائے، اسے تعزیری سزا نہ دی جائے، جو بار بار اس طرح کرے، اسے تعزیری سزا دی جائے گی۔

آیت: ”قُلْ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ“ (الانفال: ۳۸)

ترجمہ: آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آجائیں گے تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہوچکے ہیں، سب معاف کردیئے جائیں گے“۔

نیز صحیحین وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے کہ آدمی کلمہ شہادت کا اقرار کرلے تو اس کا جان ومال محفوظ ہوچکا، البتہ کسی حق کی وجہ سے۔

جو بظاہر مسلمان ہو، اور بباطن کافر ہو اسے زندیق کہا جائے گا، جیسے دورِ اول میں منافق کہا جاتا تھا، یا زندیق سے وہ شخص مراد ہے، جو کسی بھی مذہب کا قائل اور پیرو نہ ہو۔

مرتد کی فرع (اولاد): اگر مرتد کے بچہ کا حمل ردّت سے پہلے قرار پائے تو وہ مسلم ہے، اگر رِدّت کی مدت میں قرار پائے بعد میں اور اس کے اصول (ماں باپ اوپر تک) میں سے کوئی مسلمان ہو، تو تبعاً یہ بچہ بھی مسلمان شمار ہوگا، اگر اصول بھی مرتد ہوں، تو یہ مرتد شمار ہوگا، نہ کہ مسلم اور نہ اصلی کافر (یعنی جو ابتداء سے کافر ہو، اسلام سے پھر کر کافر نہ ہوا ہو)، لہٰذا بالغ ہونے کے بعد اسے تائب ہو کر اسلام کی ترغیب دیں گے، اب نہ مانے تو قتل کیا جائے گا۔

مرتد کی ملکیت: مرتد کی ملکیت موقوف رہے گی، اگر اسی حال پر مرے، تو پتہ چلا کہ ردّت کے وقت ہی اس کی ملکیت زائل ہوچکی تھی، اور وہ فَیْئ شمار ہوگی، اگر اسلام قبول کرے، تو ملکیت زائل نہ ہوگی۔

جو قرض ردّت سے قبل اس پر لازم ہوچکا ہو، نیز ردّت میں کسی چیز کو تلف کرے، تو اس کا بدل اس کے مال سے ادا کیا جائے گا، اسی طرح اس کے زیر کفالت افراد کے مصارف بھی اسی سے ادا ہوں گے، اس کے جن تصرفات میں توقف وتعلیق کی گنجائش نہیں، جیسے فروخت کرنا، ہبہ اور رہن، یہ باطل ہوں گے، اور جن میں تعلیق کی گنجائش ہو، جیسے وصیت، وہ موقوف رہیں گے، اگر اسلام قبول کرلے

تو نافذ ہوں گے ورنہ نہیں۔ مرتد کا مال (فی الحال) کسی عادل شخص کے پاس رکھیں گے۔

وہ امور جن سے کافر نہ ہوگا: مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے ایک مسلمان کافر نہ ہوگا۔

دارالحرب میں داخل ہونا اور ان کے ساتھ شراب پینا اور سور کا گوشت کھانا، یہ کہنا کہ تم کو دیکھنا موت کے فرشتہ کو دیکھنے کی طرح ہے، دف وغیرہ کی آواز پر قرآن کی تلاوت، سفر میں جاتے ہوئے کوّے (وغیرہ) کی آواز سن کر لوٹنا، دانستہ بلا وضو یا نجاست کے ساتھ یا قبلہ کی طرف رخ کے بغیر نماز پڑھنا، جب کہ اسے حلال نہ سمجھے، جو چیز تحریم سے قبل کبھی حلال رہ چکی ہو اس کے متعلق یہ تمنا کرنا کہ کاش وہ حلال ہوتی، اپنے کمر میں زُنّار (جنیوٴ) باندھنا، یا مجوسی ٹوپی سر پر رکھنا، عیسائیت کو آتش پرستی سے بہتر کہنا، یوں کہنا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت دی تو میں اس میں داخل نہ ہوں گا۔ (تاہم تحقیراً یا بے نیازی کے ساتھ کہے تو کافر ہوگا)

طالب علم کا تختی پر قرآنی آیت کو تھوک سے مٹانا، (بعضوں نے اسے حرام قرار دیا ہے، بعضوں نے غیر حرام، اور بعضوں نے یہ تفصیل فرمائی کہ براہِ راست اس پر تھوک کو مسح کرے تو حرام ہے اور کسی دوسری چیز پر تھوک کر پھر اس سے مٹائے تو جائز ہے۔ اسی طرح قرآن لکھی ہوئی کوئی چیز تبرکاً یا نجاست سے بچانے کے لئے چبا کر کھا جانا جائز ہے۔)

اسلام قبول کرنا: اسلام قبول کرنے کے لئے شہادتین کا اقرار ضروری ہے، یعنی: "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" کہنا، بعضوں نے صرف "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کافی قرار دیا ہے۔ امام شربینیؒ فرماتے ہیں کہ اسے اقل پر محمول کریں گے۔ (یعنی وہ اقل جملہ جس سے اسلام صحیح ہو جائے) شہادتین میں ترتیب ضروری ہے، یعنی پہلے توحید پھر رسالت کی گواہی، اگر اس کے برعکس کرے تو صحیح نہیں، بعضوں نے دونوں میں موالات و تسلسل کو لازم قرار دا ہے، تاہم حلیمی فرماتے ہیں کہ یہ شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ پر ایمان کے کافی مدت بعد رسول پر ایمان لائے تو صحیح ہے۔

جو کسی فرض یا حرام کے انکار کی وجہ سے کافر ہو جائے، اسے کلمہ کے اقرار کے ساتھ اپنے اس عقیدہ سے رجوع کرنا بھی لازم ہے، ورنہ اس کا اسلام صحیح نہ ہوگا۔

عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اسلام لانا بھی صحیح ہے، گرچہ وہ عربی جانتا ہو، اسی طرح گونگے کا اشارہ کافی ہے،

اگر کسی غیر عربی شخص کو کلمہ عربی میں پڑھایا جائے اور وہ اس کے مفہوم سے آگاہ نہ ہو، تو یہ کافی نہیں ہے۔ اگر محمد رسول اللہ کی جگہ، "احمد رسول اللہ" یا "ابوالقاسم رسول اللہ" پڑھے تو کافی ہے، اگر کہے: "میں محمد النبی پر ایمان لے آیا" تو یہ کافی ہے 'اگر "محمد الرسول" پر ایمان لے آیا، کہے تو کافی نہیں۔ اِلا اللہ میں اِلَّا کی جگہ اس کے ہم معنی دیگر الفاظ مثلاً: غَیْرُ، سِوٰی، مَاعَدَا یا مَاخَلا استعمال کرے تو یہ کافی ہے، مثلاً: اِلٰہَ غَیْرُ اللّٰہِ۔

اگر کوئی کافر کہے: میں تم میں سے ہوں، یا تمہارے مثل ہوں، یا مسلم ہوں، یا میرے ولی محمد ہیں، یا مجھے ان سے محبت ہے، یا میں اسلام لے آیا، یا میں ایمان لے آیا، یا میں تمہاری طرح اسلام لایا، یا ایمان لایا، یا میں تمہاری طرح مسلم ہوں یا مومن ہوں، یا میں محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی امت میں داخل ہوں، یا تمہارا دین برحق ہے، یا جو کوئی اسلام کے مخالف ہو میں اس سے بری اور بیزار ہوں، تو یہ اسلام کا اعتراف نہ ہوگا۔

اگر کوئی 'لَا رَحْمٰنَ اِلاَّ اللّٰہ . یا لَا بَارِیَ اِلاَّ اللّٰہ کہے (یعنی اللہ کے سوا کوئی رحمن نہیں، یا خالق نہیں) تو اسلام کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔

اگر کھے: میں اس ذات پر ایمان لایا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، یا ''لَا الہ الا الملک''، یا ''لَا الہ الا الرزاق''، کہے تو اس سے مسلمان نہ ہو گا۔

اگر کوئی کھے: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ'' (میں اللہ پر ایمان لے آیا) اور اس سے قبل کسی مذہب پر نہ تھا، تو اللہ پر ایمان لانے والا ہوا، اب آپ ﷺ کے رسالت کی گواہی دے، اور اگر مشرک تھا، تو اس سے مومن نہ ہو گا، بلکہ یہ بھی کہے: میں جو شرک کرتا تھا اس کا انکار کرتا ہوں۔

تنبیہ: عوام کی زبان سے لاعلمی کی وجہ سے بعض مرتبہ ایسے الفاظ ادا ہوتے ہیں، جو کفر کا سبب ہوتے ہیں، لہٰذا اہلِ علم پر لازم ہے کہ اُن کو اس سے متنبہ کریں، شاید کہ معلوم ہونے کے بعد وہ اس سے اجتناب برتیں، تاکہ ان کے اعمال اکارت نہ جائیں، اور ہمیشہ کے شدید ترین عذاب میں مبتلا نہ ہوں، اس سے واقفیت کافی اہم ہے، کیونکہ جو شر سے واقف نہ ہو، تو لاعلمی میں اس میں گرفتار ہو جائے گا۔ ہر شر کا سبب جہل اور ہر خیر کا سبب علم ہے۔

تکفیر: (کسی پر کفر کا حکم لگانا): مفتی پر لازم ہے کہ کسی کی تکفیر کے متعلق کافی احتیاط سے کام لے، مکمل تحقیق کے بعد جب پختہ یقین حاصل ہو، تب جا کر کسی کی تکفیر کرے، کیونکہ یہ بڑا پُر خطر اور اہم مسئلہ ہے، نیز عموماً کہنے والے کا قصد وہ نہیں ہوتا، بالخصوص عوام کا، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ حقیقتاً کسی کفریہ لفظ و عمل کے بغیر کسی کو کافر قرار دے اور اس طرح خود ہی کفر کا ارتکاب کر بیٹھے، ہمارے ائمہ کرام ہمیشہ اس سلسلہ میں احتیاط برتتے رہے ہیں۔

کسی قوم کا لباس: کفّار کی طرح ہیئت اور لباس کے استعمال کے متعلق علماء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ان جیسا لباس ان کے مذہب کی طرف میلان اور شعائر کفر میں ان کے ساتھ تشبیہ کے قصد سے ہو، یا اس لباس میں ان کے ساتھ ان کی عبادت گاہوں کی طرف جاتا ہو، تو اس سے کافر ہو جائے گا، اگر ایسا قصد نہ ہو، بلکہ ان کے شعائر عید میں ان کو مشابہت کا قصد ہو، یا ان کے ساتھ کسی جائز معاملہ تک رسائی کا قصد ہو، تو گنہگار ہو گا، اور اگر بلا قصد ایسا اتفاق ہو جائے، تو یہ مکروہ ہے۔ (اعانہ ۱۳۲/۴-۱۴۲، الفقہ المنہجی ۱۰۴/۸-۱۰۸، تحفہ مع الحواشی ۳۵۷/۱۱-۳۹۴، فتح الوہاب مع الجمل ۱۲۱/۵-۱۲۷، الاقناع مع البجیرمی ۹۹/۴-۲۰۷، بغیہ ۲۴۸، ترشیح ۳۷۴-۳۷۸، مغنی ۱۳۳/۴-۱۴۳)

حُدُوْد

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت انسان کو اپنی کثیر مخلوقات پر ایک خاص تکریم و تفضیل سے نوازا، جس کا ایک اہم مظہر یہ ہے کہ اس کے سر پر اس کائناتِ ارضی کی خلافت کا تاج رکھا۔ اس اہم ترین ذمہ داری کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے، جب کہ بنی نوع انسان کے مصالح کی ضمانت اور ان کے مفاسد کا دفاع وازالہ حاصل ہو، اور اس کے لئے بالکل لازم ہے کہ دین، نفس (جان)، عقل، نسل اور مال کی صحیح حفاظت و نگہداشت ہو، کیونکہ یہ پانچوں وہ بنیادی امور ہیں، جو اس روئے زمین پر اس نسل انسانی کی بقا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر واجب ذمہ داریوں کی ادائیگی و قیام کے لئے بالکل ضروری ہیں۔

دینِ اسلام ان پانچوں بنیادی امور کی مکمل محافظت اور اس پر حملہ آور مفاسد کے دفاع کا ضامن ہے اسی لئے کہا گیا کہ: اسلام مصالح کی تحصیل اور مفاسد کے ازالہ کے لئے آیا ہے، اور اس کے لئے مختلف احکام کو مشروع فرمایا، انہیں احکام میں حدود و تعزیرات بھی ہیں، جو

ان امور خمسہ (پانچ بنیادی امور) کے خلاف ظلم وتعدی کا قدم اٹھانے والے نفوس کی تنبیہ کا باعث ہیں۔

سزاؤں کی قسمیں: اسلامی عقوبات وسزا کی دو قسمیں ہیں: حدود اور تعزیرات۔

حد: جو سزا شریعت کی جانب سے متعین ومقرر ہو، اسے حد کہیں گے، پس حد کے نام سے اس میں کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے۔ حدود چھ ہیں: حد زنا، حد قذف، چوری کی حد، شراب کی حد، ڈاکہ کی حد اور ردّت کی حد۔

تعزیر: جس سزا کی مقدار متعین نہ ہو، بلکہ حاکمِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہو اسے تعزیر کہیں گے۔

زنا کی حد

زنا کبیرہ گناہ ہے، اور اس کی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے۔

زنا کا ضابطہ جس میں حد واجب ہو: عضو مخصوص (ذکر) میں سے حشفہ (سپاری) کے بقدر کسی حرام فرج میں داخل کرنا جو طبعاً قابلِ شہوت ہو، اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ مذکر یا مؤنث کے دبر (پچھلی شرم گاہ) میں داخل کرے، تب بھی حد واجب ہے۔ بوس وکنار وغیرہ کی وجہ سے حد نہ آئے گی، صرف تعزیری سزا ملے گی۔

اپنی بیوی سے حیض، روزہ یا احرام میں صحبت کرنے سے حد نہ آئے گی۔ (گرچہ یہ صحبت حرام ہے)

صحبت شبہ: صحبتِ شبہ کی وجہ سے حد زنا کا نفاذ نہ ہو گا۔ مثلاً: اپنی شادی شدہ یا مجوسی یا محرم باندی سے صحبت، بیوی گمان کر کے پرائی عورت سے صحبت، مُکرَہ کی صحبت، ہر وہ صورت جس کو کسی عالم نے مباح قرار دیا ہو، جیسے بغیر گواہوں کے نکاح، یا بغیر ولی کے نکاح اور اسی طرح ہر وہ مخالف مسئلہ جس کی دلیل مضبوط ہو، کسی جانور یا مردہ عورت سے صحبت کی وجہ سے حد عائد نہ ہو گی کسی محرم سے نکاح کرے تب بھی اس سے صحبت کی وجہ سے حد نافذ ہو گی۔

حد کے شرائط: زانی مکلف ہو، البتہ جو نشہ میں ہو، اسے حد لگے گی (گو وہ مکلف نہیں ہے) زنا کی حرمت کا علم ہو، اگر نو مسلم ہونے، یا مسلمانوں سے دور بسنے کی وجہ سے زنا کی حرمت سے لاعلم ہو، تو اسے حد نہیں لگے گی، بینہ یا اقرار کے ذریعہ زنا کا ثبوت۔

مُحْصَن کی حد: اگر زانی مُحْصَن ہو، تو اس کی حد سنگسار کرنا ہے، حتیٰ کہ مر جائے جیسا کہ صحیحین وغیرہ سے ثابت ہے۔

مُحْصَن: جو آزاد مکلف (گو ذمی ہو) نکاح صحیح میں اپنی بیوی کی اگلی شرم گاہ میں صحبت کر چکا ہو، وہ (اس باب میں) مُحْصَن کہلائے گا، اسی طرح ان شرائط کے ساتھ جس بیوی سے صحبت ہو چکی ہو، وہ مُحْصَنہ کہلائیگی۔ نکاح فاسد میں صحبت کرے، یا بچہ، پاگل یا غلام صحبت کرے، تو وہ محصن شمار نہ ہو گا۔ میاں بیوی میں سے ایک کامل اور ایک ناقص ہو، تو کامل محصن ہو گا۔ مثلاً کامل شخص نابالغہ سے نکاح کر کے صحبت کرے تو شوہر محصن اور بیوی غیر محصن ہو گی۔ اس کے برعکس ہو، تو بیوی محصن اور شوہر غیر محصن ہو گا۔

غیر محصن کی حد: غیر محصن کی حد سو کوڑے اور ایک سالہ جلاوطنی ہے۔ کوڑوں کا ذکر قرآن مجید میں ہے (دیکھئے سورہ نور آیت: ۲) اور جلاوطنی کا ذکر صحیحین وغیرہ کی بکثرت روایات میں موجود ہے۔ اور آئندہ خلفائِ راشدین کا عمل بھی اس پر ثابت ہے۔ مسافت قصر یا اس سے زائد مسافت کے لئے جلاوطن کیا جائے۔

کسی بھی قسم کے غلام باندی کی سزا پچاس کوڑے اور نصف سالہ جلاوطنی ہے۔

زنا کا ثبوت: زنا کا ثبوت چار گواہوں کے ذریعہ یا خود زانی کے اقرار سے ہو گا۔ اگر اقرار کے بعد رجوع کرے تو حد ساقط ہو گی۔

اگر چار گواہ کسی عورت کے زنا کی گواہی دیں، اور چار عورت یہ گواہی دیں کہ وہ باکرہ ہے، تو شبہ کی وجہ سے اس پر حد نہ آئے گی۔ اگر ایک گواہ زنا کا مقام گھر کا ایک گوشہ بتائے، اور دیگر گواہ دوسرا گوشہ، تو اس پر حد نہ آئے گی، بلکہ قاذف اور گواہوں پر حدِ قذف نافذ ہوگی۔

حدود کے نفاذ کا اصل حق حاکم وقت کو ہے، تاہم آقا اپنے غلام پر حد نافذ کر سکتا ہے۔

متفرقات: حد جاری کرتے وقت امام (حاکم) اور گواہوں اور مسلمانوں کی ایک جماعت کا وہاں موجود ہونا مستحب ہے۔

اگر اقرار سے ثبوت ہو، تو پہلے امام پھر دیگر لوگ رجم کریں، اور گواہوں سے ثبوت ہو، تو پہلے گواہ پھر امام پھر دیگر لوگ رجم کریں، اگر عورت کا زنا گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو، تو سنگساری کی سزا میں اس کے لئے گڑھا کھودنا مستحب ہے، اقرار کی صورت میں مستحب نہیں ہے۔ بیماری یا شدید گرمی و سردی کی وجہ سے سنگساری کی سزا کو مؤخر نہ کیا جائے، تاہم کوڑوں کی سزا کو مؤخر کیا جائے۔ رجم سے قبل اسے توبہ کروائے، اگر نماز کا وقت ہو چکا ہو، تو اس کا حکم دے، اگر وہ سنت پڑھنا چاہے، تو دو رکعت کی مہلت دے، پانی مانگے تو پلائے، کھانا مانگے تو کھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

لواطت: یعنی کسی مرد یا عورت کی پچھلی شرم گاہ میں بدکاری کرنا، فاعل کے حق میں بھی صحیح قول کے مطابق زنا کے حکم میں ہے، لہٰذا لوطی محصن ہو تو سنگساری، ورنہ سو کوڑے اور یک سالہ جلاوطنی اس کی سزا ہوگی۔ بیوی کے علاوہ جس کے ساتھ یہ فعل کیا جائے (یعنی مفعول بہ) اسے سو کوڑے اور یک سالہ جلاوطنی کی سزا ملے گی، خواہ محصن ہو یا غیر محصن، نیز عورت ہو یا مرد۔

بیوی کے ساتھ لواطت کا عمل کافی احادیث کی روشنی میں کبیرہ گناہ ہے، تاہم اس کی وجہ سے حد نافذ نہ ہوگی، بلکہ حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا، جبکہ بار بار اس کا صدور ہو۔

جانوروں کے ساتھ بدکاری: راجح قول کے اعتبار سے کسی جانور کے ساتھ بدکاری کی صورت میں تعزیری سزا کا نفاذ ہوگا، حد عائد نہ ہوگی، کیونکہ یہ عمل سلیم الفطرت ذوق کے مطابق قابل میلان و شہوت نہیں ہے، نیز ابن عباسؓ نے اس میں حد کی نفی فرمائی ہے۔ (ترمذی نسائی) (الفقہ المنہجی ۸/۵۵-۶۴، المنہاج مع السراج ۵۲۱-۵۲۴، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۴۱-۱۴۹، کفایۃ الاخیار ۲/۳۳۵-۳۴۶)

حد قذف (زنا کی تہمت کی سزا)

شریعت اسلامیہ لوگوں کے عزت وآبرو کی حفاظت کی بڑی اہمیت دیتی ہے، بس جو اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کی عزت پر کیچڑ اچھالے اور اس کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنا چاہے، اس پر حد کو مشروع فرمایا۔

تعریف: عربی میں قذف پھینکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اصطلاحِ شریعت میں کسی کی طرف بطور عار دلانے اور شتم کے زنا کی نسبت قذف کہلاتی ہے۔

حکم: کسی مسلمان پر زنا کی تہمت حرام ہے، خواہ سچا ہو یا جھوٹا، صحیحین وغیرہ کی حدیث میں اسے سات مہلک کبائر میں شمار کیا ہے۔

حد: تمام شرائط موجود ہوں تو قذف کی وجہ سے اسّی (۸۰) کوڑے بطور حد مارے جائیں گے۔ (دیکھئے سورۃ نور: ۵-۴) غلام باندی کو چالیس (۴۰) کوڑے مارے جائیں گے۔

شرائط: قذف کرنے والے پر حد قذف کے نفاذ کے لئے قاذف (قذف کرنے والے) میں پانچ اور مقذوف (جس پر تہمت

لگائی جائے) میں پانچ، اس طرح کل دس شرائط ضروری ہیں۔

قاذف کے شرائط: ۱- بلوغ، پس نابالغ پر حد نافذ نہ ہوگی، کیونکہ وہ غیر مکلف ہے، تاہم وہ ممیز ہو، تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

۲- عقل، پس کسی پاگل قاذف پر حد نافذ نہ ہوگی۔ ناجائز طریقہ سے نشہ کرنے والے پر حد کا نفاذ ہوگا۔

۳- قاذف مقذوف کا اصل نہ ہو، پس کوئی اپنے بیٹے پوتے وغیرہ کو تہمت لگائے تو اس پر حد نہ آئے گی، لیکن حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

۴- اپنے اختیار سے قذف کرے، پس جبر واکراہ کی وجہ سے کرے، تو حد واجب نہ ہوگی۔

۵- قذف کی حرمت کا علم ہو، اگر کوئی نو مسلم ہونے کی وجہ سے یا علماء کرام سے دور دراز بسنے کی وجہ سے اس کی حرمت سے ناواقف ہو، اس پر حد نافذ نہ ہوگی، جو شخص حرمت سے واقف ہو، لیکن حد کے وجوب سے ناواقف ہو، تو حد نافذ ہوگی۔

مقذوف کے شرائط: (۱) مسلمان ہو، (۲) بالغ ہو، (۳) عاقل ہو، (۴) عفیف وپاکدامن ہو، یعنی اس سے قبل اس پر زنا ثابت نہ ہو، (۵) مقذوف اسے قذف کرنے کی اجازت نہ دے، اجازت کی وجہ سے گرچہ قذف جائز نہ ہوگا، لیکن شبہ کی وجہ سے حد ساقط ہوگی۔

تعزیر: مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط ناپید ہو، تو حد ساقط ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ قاذف بالکل سزا سے بری ہو جائے گا، بلکہ حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

قذف کے بعض الفاظ: تونے زنا کیا، اے زانی، تونے لواطت کی، اے لوطی، زید کے بیٹے سے کہنا کہ تو زید کا بیٹا نہیں ہے۔

سقوط حد: درج ذیل تین امور میں سے کسی ایک کی صورت میں حدِ قذف ساقط ہوگی۔

۱) مقذوف کے زنا پر گواہ قائم کرے یا خود مقذوف زنا کا اقرار کرے۔ قاذف مزید تین گواہ پیش کرے، یعنی قاذف سمیت چار گواہ ہوں، اور صراحتاً اس کے زنا کی گواہی دیں، تو حد قذف ساقط ہوگی اور مقذوف پر زنا کی حد نافذ ہوگی۔ اگر گواہوں کی کل تعداد چار سے کم ہو، تو یہ کافی نہیں، بلکہ ان تمام پر حد قذف نافذ ہوگی۔

۲) چونکہ یہ بندہ کا حق ہے، اس لئے اگر مقذوف معاف کر دے، تو ساقط ہوگی۔

۳) اگر شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگائے، پھر لعان کرے، تو حد قذف ساقط ہوگی۔ (الفقہ المنہجی ۸/۶۵-۷۰)

سَرِقَہ (چوری) کی حد

شریعت نے لوگوں کے مال کی حفاظت کے پیش نظر اس پر دست درازی کرنے والوں پر حد مقرر فرمائی ہے۔

سَرِقہ: عربی میں سرقہ (چوری) خفیہ طور پر مال لینے کو کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً: دوسرے کا مال ظلماً حرزِ مثل میں سے مقررہ شرائط کے ساتھ خفیہ طور پر لینے کو سرقہ (چوری) کہا جاتا ہے۔ (کسی چیز کے مناسب حفاظت کی جگہ کو اس کا حرزِ مثل کہا جائے گا)

پس غصب کرنا، اچک لینا، لوٹ لینا اور خیانت کرنا سرقہ نہ کہلائے گا۔

حد: آئندہ ذکر ہونے والے شرائط کے ساتھ حاکم کے سامنے چوری ثابت ہو جائے، تو اس چور پر حد کا نفاذ واجب ہے، یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو جوڑ سے کاٹا جائے گا، (دیکھئے مائدہ:۳۸) طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے ایک چور لایا گیا تو ہتھیلی کے جوڑ (گٹے) سے اسے کاٹا گیا۔ دوسری مرتبہ چوری کرے تو بایاں پیر، تیسری مرتبہ بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ دایاں پیر کاٹا جائے، اس کے بعد بھی چوری کرے تو حاکم مناسب تعزیری سزا نافذ کرے۔

شرائط: چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

۱- چور مکلف یعنی عاقل و بالغ ہو، پس بچہ و پاگل پر حد عائد نہ ہو گی۔

۲- جبر و اکراہ کی وجہ سے چوری نہ کرے۔

۳- چوری شدہ مال بقدرِ نصاب ہو، یعنی پاؤ دینار کے مساوی یا اس سے زائد (صحیحین وغیرہ)

۴- مال حرزِ مثل سے چوری کیا گیا ہو، حرزِ مثل یعنی وہ مال عادتاً جس جگہ محفوظ رکھا جاتا ہو، اس کا فیصلہ عرف کی روشنی میں ہو گا۔ مثلاً روپیہ کے لئے تجوری، کپڑوں کے لئے پیٹی (صندوق) وغیرہ، برتن اور بوسیدہ کپڑوں کے لئے گھر کا صحن، جانوروں کے لئے اصطبل عام اصطبل کپڑوں کے لئے حرز مثل نہ ہو گا۔

۵- اس مال میں چور کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ نہ ہو، مثلاً مشترک مال کی چوری جس میں اس کی بھی شرکت ہو، اصول یا فروع کے مال کی چوری، بیت المال کے مال میں اس کا حق ہو تو ہاتھ نہ کٹے گا، ورنہ کٹے گا۔

۶- چوری شدہ مال پاک ہو، اگر شراب، سور، کتا یا مردار کی بلا دباغت کھال کی چوری کرے تو ہاتھ نہ کٹے گا۔ نیز وہ مال شرعاً استعمال کرنا جائز بھی ہو، پس طنبور، آلاتِ موسیقی، بت اور صلیب کی چوری میں ہاتھ نہ کٹے گا۔

مندرجہ بالا شرائط میں سے کچھ مفقود ہو، تو حد تو نافذ نہ ہو گی، لیکن حاکم مناسب تعزیری سزا دے گا۔

چوری کا ثبوت: درج ذیل کسی ایک طریقہ سے چوری کا ثبوت ہو گا۔

(۱) خود چور کا اقرار کرنا، اگر وہ اقرار سے رجوع کرے تو ہاتھ نہ کٹے گا، البتہ مال لازم ہو گا۔ چوری کا اقرار اس وقت مقبول ہو گا جب کہ مالک حاضر ہو اور مطالبہ کرے۔

(۲) بیّنہ، یعنی دو عادل مردوں کی گواہی، اگر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں، تو مال ثابت ہو گا، لیکن ہاتھ نہ کٹے گا۔

(۳) مدعی کی یمینِ مردودہ، یعنی مدعی کسی پر چوری کا دعوی کرے، پھر مدعی علیہ انکار پر قسم نہ لے، جس کی وجہ سے یہ قسم مدعی کی طرف لوٹے اور وہ قسم لے تو مال کے ثبوت کی حد تک یہ قسم مقبول ہو گی، لیکن معتمد قول کے اعتبار سے اس کی وجہ سے اس کا ہاتھ نہ کٹے گا۔

مال کا ضمان: چوری ثابت ہو جائے اور مال موجود ہو، تو اسے لوٹانا ضروری ہے، اگر موجود نہ ہو، تو اس کا بدل دینا لازم ہے۔

تنبیہ: چور کا ہاتھ کاٹنا حق اللہ ہے، لہٰذا چوری کے ثبوت اور قاضی کے سامنے معاملہ پیش ہونے کے بعد اس حد کا نفاذ واجب ہے، اس کے اسقاط کی کوشش جائز نہیں ہے، لیکن قاضی تک پہنچنے سے قبل اسے معاف کرنا یا کرانے کی کوشش کرنا جائز ہے، جیسا کہ نسائی کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (الفقہ المنہجی ۸/۷۴-۸۱، منہاج مع السراج ۵۲۵-۵۳۱، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۶۳-۱۷۸، کفایہ ۲/۳۵۵-۳۶۴)

قاطع طریق (ڈاکو)

قطعِ طریق (ڈاکہ): مال لوٹنے، یا قتل کرنے یا ڈرانے کے لئے اپنی قوت وشوکت پر اعتماد کرتے ہوئے علانیہ میدان کی طرف نکل جانا قطع طریق کہلاتا ہے، جبکہ آبادی سے دوری یا لوگوں کی کمزوری کی وجہ سے امداد کی گنجائش نہ ہو۔ چونکہ ان لوگوں کے ڈر سے لوگ اس راستہ سے گذرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے اسے قطع طریق (راستے سے روکنے والا) کہا گیا۔

قاطع طریق (ڈاکو): جو مکلف، احکام کا پابند شخص مال لوٹنے، یا قتل کرنے اور ڈرانے دھمکانے کے لئے بطور مخالفت وغلبہ اپنی قوت وشوکت پر اعتماد کرتے ہوئے میدان میں نکل آئے اور سامنے والوں کو کوئی مدد نہ حاصل ہو سکے، تو اس شخص کو قاطعِ طریق کہا جائے گا، خواہ ذمی، مرتد، مدہوش، غلام یا عورت ہو، نیز ایک شخص ہو، یا زائد۔

اگر بستی والے مدد کے لئے پہنچ سکتے ہوں، تو یہ قطع طریق نہ کہلائے گا۔ احکام کا پابند کہنے سے حربی کافر نکل گیا۔ وہ ہر حال میں مہدر الدم ہے، ان حرکات کے بعد بھی اسلام قبول کرے تو سابقہ گناہوں پر گرفت نہ ہوگی۔

قاطع طریق کے اقسام: ان کی شرارتوں کے اعتبار سے درج ذیل چار اقسام ہیں۔

۱- جو گذرنے والوں کو قتل کریں اور ان کا مال لوٹ لیں، ان کو قتل کر کے کسی اونچی جگہ تین روز تک سولی پر لٹکا دینا واجب ہے۔ اگر مسلمان ہیں تو غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے بعد سولی پر لٹکائیں گے، کیونکہ اس عمل کی وجہ سے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔

۲- جو صرف قتل کریں (مال نہ لوٹیں)، ان کو بغیر سولی کے صرف قتل کیا جائے، یہ قتل حق اللہ کے قبیل سے ہے، لہٰذا مقتول کے ورثاء کے معاف کرنے سے ساقط نہ ہوگا۔

۳- جو صرف مال لوٹیں (قتل نہ کریں) ان کی سزا یہ ہے کہ دایاں ہاتھ ہتھیلی کے جوڑ سے اور بایاں پیر قدم کے جوڑ سے کاٹا جائے، دوبارہ ایسی حرکت کریں تو بایاں ہاتھ اور دایاں پیر کاٹا جائے۔ اس سزا کے لئے یہ شرط ہے کہ مال کی مقدار کم از کم پاؤ دینار کے برابر ہو، اس سے کم ہو تو قاضی تعزیری سزا دے۔

۴- جو صرف راہ گیروں کو ڈرائے دھمکائے، نہ قتل کرے اور نہ مال لوٹے، اسے جلاوطنی، قید یا کوئی اور مناسب تعزیری سزا دی جائے۔ اگر امام مصلحت سمجھے تو اسے معاف بھی کر سکتا ہے۔

توبہ: حکومت کی گرفت میں آنے سے قبل قاطع طریق اپنی حرکت سے تائب ہو جائے، تو قطع طریق اور ڈاکہ کے تعلق سے جو سزائیں ہیں، وہ ساقط ہو جائیں گی، یعنی قتل وسولی اور ہاتھ پیر کاٹنے کا وجوب، اب اس کا معاملہ ایک عام قاتل یا غاصب کی طرح ہوگا۔ پس ایک قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا، اگر مقتول کے ورثاء معاف کر دیں یا دیت وغیرہ پر راضی ہوں تو قتل ساقط ہو جائے گا۔ غاصب سے لوٹا ہوا مال وصول کر کے مستحقین کے حوالہ کیا جائے گا۔ اگر ڈاکہ کی اس مدت میں اس نے چوری، زنا یا شراب نوشی وغیرہ کا ارتکاب کیا ہو، تو توبہ کی وجہ سے ان جرموں کی سزا معاف نہ ہوگی۔ (دیکھئے سورہ مائدہ آیت: ۳۳-۳۴) (الفقہ المنہجی ۸/۸۲-۸۵، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۷۸-۱۸۳، منہاج مع السراج ۵۳۱، کفایۃ الاخیار ۲/۳۶۴-۳۶۶)

حرام مشروبات اور منشیات

کھانے پینے کی اشیاء میں اصل اباحت وحلت ہے، تاہم جن اشیاء کی حرمت پر کوئی دلیل موجود ہو، وہ حرام ہوں گی۔

حرام مشروبات: (۱) جو مضر ومہلک ہو، جیسے زہر وغیرہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔(دیکھئے البقرہ: ۱۹۳، اور النساء: ۲۹)

(۲) جو نجس ہو، جیسے خون پیشاب، حرام جانوروں کا دودھ، وہ سیال جس میں نجاست گرنے کی وجہ سے وہ متنجس ہو جائے۔

(۳) جو نشہ آور ہو، یعنی مستی لانے والی مدہوش کرنے والی ہو، خواہ انگور سے بنی شراب ہو یا کسی اور چیز سے (دیکھئے سورہ مائدہ: ۹۰، ۹۱)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر نشہ آور مشروب حرام ہے'' (صحیحین)

مُسْکِر (نشہ آور) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس جنس میں نشہ اور مستی لانے کی صفت موجود ہو پس اس کی قلیل مقدار اور ایک قطرہ بھی حرام ہوگا، گو اس سے نشہ نہ آئے، کیونکہ سنن وغیرہ کی احادیث میں صراحت ہے کہ: ''جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو، اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے''

تمام نشہ آور مشروب شافعی مسلک میں نجس ہیں۔

حکمت: انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے انتہا نعمتوں میں سے ایک عظیم ترین نعمت عقل ہے۔ جس کی وجہ سے اسے دیگر حیوانات پر خاص تفوق وبرتری اور شرافت حاصل ہے، اور اسی کی روشنی میں اس کی انفرادی واجتماعی زندگی صحیح اصول اور ضابطہ کے مطابق گذر سکتی ہے۔

اور یہ نشہ آور اشیاء اس عظیم نعمت سے محروم کر کے حیوانیت سے بھی ذلیل تر گہرے گڑھے میں دھکیل دیتی ہیں، نتیجہ میں شہوات وفواحش، سب وشتم، دشمنی وبغض اور لڑائی جھگڑے جیسے مسموم اثرات جنم لیتے ہیں، اور آپسی اخوت ومحبت کا رشتہ تار تار ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اللہ کے ذکر وعبادت سے روک کر اس کی رحمت اور فضل واحسان سے دور لے جا کر پھینک دیتی ہیں اور شیاطین کے صف میں کھڑی کر دیتی ہیں۔ اسی لئے حاکم کی روایت میں آپ ﷺ نے اسے ہر شر کی کنجی قرار دیا، اور نسائی کی ایک حدیث میں حضرت عثمانؓ نے اسے ام الخبائث (سارے شر وفساد کی جڑ) قرار دیا۔ لہٰذا شراب نوشی کبیرہ گناہ اور دنیا وآخرت کی بربادی کا سبب ہے۔

حد: شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہیں، تاہم حاکم مناسب سمجھے تو اسے بڑھا کر اسّی (۸۰) تک لے جا سکتا ہے، اور یہ زائد مقدار تعزیری سزا ہوگی۔ آپ ﷺ وصدیق اکبر سے چالیس، حضرت عمرؓ سے اسّی (۸۰) اور حضرت عثمانؓ سے چالیس کوڑے مروی ہیں۔ (مسلم) پس فقہائے کرام نے چالیس کو اصل حد اور مزید کو تعزیر قرار دیا ہے۔ شرابی کو نشہ کی حالت میں سزا نہ دی جائے، کہ اس سے صحیح عبرت وتنبیہ حاصل نہ ہوگی، بلکہ نشہ ختم ہونے کے بعد سزا دی جائے۔

حد کے شرائط: حد کے نفاذ کے لئے درج ذیل کسی ایک طریقہ سے شراب نوشی کا ثبوت ہونا چاہئے۔

(۱) دو عادل مرد کی گواہی، صرف ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یا حاکم کے علم کی بنیاد پر حد نافذ نہ ہوگی۔

(۲) **اقرار:** شرابی خود اقرار کرے کہ میں نے شراب پی ہے۔

درج ذیل صورتوں میں حد کا نفاذ نہ ہوگا۔

جبراً کوئی پلائے، اسے پتہ ہی نہ ہو کہ یہ شراب ہے، شراب کی قئی کرنا، منہ سے شراب کی بو محسوس ہونا، کیونکہ غلطی یا اکراہ کا بھی

احتمال موجود ہے۔

نفاذ کا مستحق: اس حد کو نافذ کرنے کا اصل حق دیگر حدود کی طرح حاکمِ وقت کو ہے۔ عوام الناس کو حد جاری کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تنبیہ: شراب یا کسی دوسرے گناہ کی حد کے مستحق شخص پر یہ لازم نہیں ہے کہ اپنے آپ کو سزا کے لئے علالت میں قاضی کے سامنے پیش کرے، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پکی اور سچی توبہ کر کے اسے معاف کرالے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مُخَدِّرات

تعریف: جس چیز کی وجہ سے عقل وفکر پر سُستی وکسل مندی اور فتور طاری ہو (اور اسے سن کر دے) اسے مخدر کہا جائے گا۔ جیسے بھنگ، افیون، اور حشیش وغیرہ منشیات۔

حکم: ان مخدرات کا کسی بھی طرح استعمال حرام ہے، کیونکہ یہ عقل وجسم کے لئے نقصان دہ اور مختلف امراض کا باعث ہیں۔ ابوداود کی حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے۔

سزا: مخدرات کی دنیوی سزا تعزیر ہے۔ جس کی نوعیت وشدت کی تعیین اسلامی عادلانہ عدالت کی صوابدید پر موقوف ہے، مثلاً قید وبند، مار وغیرہ، بشرطیکہ ادنی ترین حد تک نہ پہنچ جائے۔

تنبیہ: (۱) کسی شراب کو بطور علاج ودوا پینا جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث کی رو سے اللہ نے اس میں شفا نہیں رکھی ہے۔ (ابن ماجہ، مسند احمد، والبخاری تعلیقا) لیکن کسی دوسری دوا میں شراب شامل ہو اور اس کی کوئی صفت وخاصیت باقی نہ ہو، بلکہ اس میں ناپید ہو چکی ہو، اور معتبر ڈاکٹر کے بقول دوسری کوئی دوا اس کے قائم مقام موجود نہ ہو، تو ضرورت وحاجت کی وجہ سے اسے استعمال کرنا جائز ہے۔

(۲) **جراحی (آپریشن):** اگر ڈاکٹر مریض کے آپریشن کے لئے سُن کرنے پر مجبور ہو، اور اس کے لئے کسی مخدر کا استعمال ناگزیر ہو، تو اس کی گنجائش نکل آئے گی، خواہ اسے شرم گاہ کے راستہ داخل کرے یا پیئے یا نگل لے۔ (الفقہ المنہجی ۳/ ۷۴-۸۶)

صِیَال (حملہ کرنا، زبردستی کرنا، کود پڑنا)

آیت: ”فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ“ (البقرۃ: ۱۹۴)

ترجمہ: ”سو جو تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے“۔

احادیث: (۱) ”جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے، تو وہ شہید ہے“ (متفق علیہ)

ایک حدیث میں ہے: ”جس کا مال بلا حق کوئی چاہے، تو وہ قتال کرے اور قتل ہو جائے، تو وہ شہید ہے“ (ابوداود، نسائی، ترمذی وصححہ)

(۲) ”جو اپنے دین کی (طرف سے دفاع کی) وجہ سے قتل کیا گیا، وہ شہید ہے، جو اپنی جان بچانے میں قتل ہو جائے، وہ شہید ہے، جو اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے، وہ شہید ہے، جو اپنے گھر والوں (کی حفاظت اور ان کی طرف سے دفاع) کی وجہ سے مارا جائے تو وہ

شہید ہے"۔(ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وصححہٗ وابن حبان، والحاکم)

بیہقی کی ایک روایت میں ہے "(اس طرح دفاع کرنے میں حملہ آور کا اور ظالم کا جو نقصان ہو) تم پر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں ہے" ابوداود وغیرہ کی روایت میں ہے: "نہ قصاص ہے اور نہ دیت" (نیل الاوطار ۳۶۶/۵)

صائل: جو ظلماً کسی کی جان، عضو، مال یا عزت وآبرو پر حملہ آور ہو اور اسے تکلیف پہنچانا چاہے، اسے صائل کہیں گے۔

دفاع: کوئی مسلم یا غیر مسلم، آزاد یا غلام، اور مکلف یا غیر مکلف شخص کسی معصوم جان، عضو، منفعت، بُضع (شرم گاہ)، اس کے مقدمات مثلاً: بوس وکنار اور معانقہ وغیرہ، مال، گو تھوڑا ہو، یا اختصاص جیسے مردار کی کھال پر (ظلماً اور ناجائز طریقے سے) حملہ آور ہو، (یعنی اس کے حملہ آور ہونے کا غالب گمان ہو)، تو اس کا دفاع کیا جائے، خواہ مذکورہ اشیاء دفاع کرنے والے کی ہوں یا کسی دوسرے کی، بخاری میں ہے: "اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم" اور صائل وحملہ آور ظالم ہے، لہٰذا اسے ظلم سے روکا جائے گا، یہی اُس کی نصرت ومدد ہے۔ محض کسی کی ایذاءرسانی کے وہم وشک کی بنیاد پر دفاع جائز نہیں ہے (معصوم یعنی شرعاً جو محفوظ ہے، اور اسے تلف کرنا جائز نہیں ہے)

تنبیہ: اکراہ کی وجہ سے مجبوراً کوئی دوسرے کا مال تلف کرے، تو مالک کو دفاع جائز نہیں ہے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنے مال سے اس کی جان بچائے، جیساکہ مضطر کو اپنا کھانا کھلاتا ہے، مالک اور مُکرِہ مُکرَہ (اکراہ کرنے والے) کا دفاع کرسکتے ہیں۔

بُضع (شرم گاہ)، آبرو، عصمت: کوئی اپنی بیوی کے علاوہ کسی سے صحبت وابروریزی یا اس کے مقدمات مثلاً بوس وکنار وغیرہ کا ارادہ کرے، تو اسے روکنا اور دفاع کرنا واجب ہے، چاہے وہ عورت اس کی بیوی ہو یا کوئی اور، کیونکہ یہ امور مباح کرنے سے مباح نہ ہوں گے، اور زنا اکراہ کی وجہ سے مباح نہ ہوگا، پس کسی عورت پر حرام ہے کہ جو زنا کیلئے اس پر کود پڑے، اس کی موافقت وتابعداری کرے، خواہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہو۔

جان: محقون الدم (جس کو قتل کرنا ممنوع ہے) مسلمان کے علاوہ کوئی (مثلاً: کافر، جانور، غیر محقون الدم مسلمان جیسے محصن زانی، تارک نماز) کسی کے جان پر حملہ آور ہو، (اور اسے قتل کرنا چاہے) تو اس کا دفاع واجب ہے، اگر یہ امکان ہو کہ کافر کے تابع ہونے سے وہ قید کرلے گا (قتل نہ کرے گا) تو یہ جائز ہے، دفاع واجب نہیں ہے، جب کہ دفاع وانکار کی صورت میں کافر اسے قتل کردے۔

اگر کوئی محقون الدم مسلم ایسا قصد کرے، تو اس کا دفاع واجب نہیں ہے، بلکہ دفاع سے رک کر قتل ہوجانا جائز ہے، بلکہ روضہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسنون ہے، کیونکہ ابوداود کی حدیث میں ایسی صورت میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں (قابیل وہابیل) میں سے بہتر کی طرح ہونے کا حکم موجود ہے۔ جن کا قصہ قرآن مجید میں موجود ہے (دیکھئے سورہ مائدہ، آیت: ۳۰-۲۷)، نیز حضرت عثمانؓ کو جب بلوائیوں نے محاصرہ کرکے گھر میں مقید کردیا، تو اپنے غلاموں کو دفاع سے منع فرمایا، جن کی تعداد (۴۰۰) تھی، اور فرمایا کہ جو ہتھیار پھینک دے وہ آزاد ہے، یہ واقعہ صحابہ کرامؓ میں مشہور ہوا، لیکن کسی نے نکیر نہیں فرمائی، تاہم محقون الدم مسلم کسی مسلمان کے عضو پر زیادتی کرنا چاہے، تو دفاع واجب ہے، کیونکہ اس صورت میں شہادت حاصل نہ ہوگی، (جس کی وجہ سے مرجانے کی اجازت تھی) اسی طرح اپنے قتل سے اہل وعیال اور بچوں کے حق میں مفاسد کا غالب گمان ہو، تو اپنے جان کی طرف سے دفاع بصورتِ امکان واجب ہے۔

دوسرے کی شرم گاہ یا جان کی طرف سے دفاع اس وقت واجب ہے، جب کہ اسے اپنی جان کا خطرہ نہ ہو۔ اپنی جان کا خطرہ ہو تو بیٹے پر باپ کی طرف سے دفاع واجب نہیں ہے۔

دوسرے محترم شخص کی جان کی طرف سے دفاع کا حکم بھی اپنی طرف سے دفاع کی طرح ہے، جن صورتوں میں اپنا دفاع واجب

ہے، اس کا بھی واجب ہے، اور جہاں اپنا دفاع واجب نہیں، دوسرے کا بھی واجب نہیں، بعض علماء کے خیال میں دوسرے کا دفاع قطعاً واجب ہے (جب کہ اپنی جان کا خطرہ نہ ہو)، کیونکہ ایک حدیث میں ہے: ''کسی کے سامنے کسی مسلمان کی تذلیل ہو، اور یہ اس کی نصرت نہ کرے، حالانکہ یہ اس کی نصرت پر قادر ہے، تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت بر سر عالم اس کو ذلیل کریں گے''۔ (مسند احمد)

بادشاہ اور حکام پر عوام کے جان کی حفاظت اور اس کی طرف سے دفاع قطعاً واجب ہے۔

مال: مال پر کوئی حملہ کرے، (اور لوٹنا یا برباد کرنا چاہے) تو اس کا دفاع واجب نہیں ہے (جب کہ غیر ذی روح ہو، یعنی گائے بکری وغیرہ نہ ہو)، کیونکہ مال دوسرے کے لئے مباح کرنا جائز ہے۔ تاہم حاکم اور اس کے ماتحتوں کو رعایا کے مال کی جانب سے دفاع واجب ہے، اسی طرح اپنے مال سے دوسرے کا حق متعلق ہو، مثلاً رہن، اجارہ، تو دفاع واجب ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس محجور علیہ (بچہ، پاگل وغیرہ)، وقف یا ودیعت کا مال ہو، تو اس کی طرف سے دفاع واجب ہے۔

صائل کسی جاندار کو تلف کرنا چاہے تو دفاع واجب ہے، جب کہ اپنی جان، یا آبرو ریزی کا خطرہ نہ ہو، بلکہ کوئی شخص خود اپنے جانور کو ناجائز طریقہ سے تلف کرنا چاہے، تو اسے روکنا واجب ہے۔

صائل کا ضمان: شرعی طریقہ سے دفاع کرنے میں صائل مارا جائے، تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ قاتل پر قصاص، دیت، کفارہ، قیمت یا گناہ نہ ہوگا، کیونکہ شریعت کی جانب سے اسے دفاع کا حکم ہے اور اس طرح کا کوئی ضمان اس کے منافی ہے۔

فائدہ: اگر جان، عصمت اور مال پر حملہ ہو، اور بیک وقت تمام کی طرف سے دفاع ممکن نہ ہو، تو جان کا دفاع بقیہ پر مقدم ہوگا، اور عصمت کی حفاظت مال پر مقدم ہوگی، اور زائد مال کم پر مال پر مقدم ہوگا، اگر بیک وقت دو صائل دو جان یا دو شرمگاہ یا دو مال پر حملہ آور ہوں، اور دونوں کا ایک ساتھ دفاع نہ ہو سکے، تو جس کا چاہے دفاع کرے۔

مسئلہ: کسی پر مثلاً گھڑا گرے اور وہ اسے توڑ دے، تو اس کا ضمان واجب ہے، گو اسے اپنے اوپر گرنے سے روکنا واجب ہو، یا بغیر توڑے اس سے بچنا ممکن نہ ہو، کیونکہ گھڑے کا اپنا کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تاہم ایسی جگہ یا ایسی حالت پر رکھا ہوا ہو کہ رکھنے والے کی غلطی ہو اور وہ نقصان کا ذمہ دار ہو، (مثلاً: ڈھلان جگہ پر، یا گرنے کی حالت پر) تو اس صورت میں اپنے اوپر گرنے کی وجہ سے توڑنے سے ضامن نہ ہوگا، بلکہ گھڑا گرنے سے کچھ نقصان ہو، تو رکھنے والا ضامن ہوگا۔

دفاع کی ترتیب: اگر ممکن ہو تو اَلْاَخَفُ فَالْاخف طریقہ سے صائل کا دفاع کرے، یعنی پہلے خفیف طریقہ سے دفاع کی کوشش کرے، وہ کارگر نہ ہو، تو اس سے شدید، ورنہ اس سے بھی شدید تر طریقہ سے دفاع کرے۔

مثلاً: پہلے بھاگ کر دفاع کرے (یا کسی قلعہ یا لوگوں کی پناہ لے) ورنہ اسے ڈانٹ دے پھر دوسروں سے مدد طلب کرے، پھر ہاتھ سے مارے، پھر کوڑے سے، پھر ڈنڈے سے، پھر اس کا کوئی عضو کاٹ دے، (اس سے بھی مسئلہ نہ ہو تو) پھر آخر میں اسے قتل کردے، کیونکہ یہ دفاعی کاروائی مجبوری وضرورت کی وجہ سے جائز قرار پائی، لہٰذا خفیف اور ہلکے دفاع سے مقصد حل ہو جائے، تو شدید وسخت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اگر دونوں باہم گتھم گتھا ہو جائے، اور معاملہ اتنا سنگین ہو جائے کہ قابو میں نہ رہے تو ترتیب کی رعایت ساقط ہو جائے گی۔ اگر صائل حربی یا مرتد ہو، تو ترتیب کی رعایت کے بغیر ہی قتل کر سکتا ہے، کیونکہ اس کی کوئی حرمت نہیں۔ اسی طرح خفیف طریقہ اپنانا ممکن نہ ہو، مثلاً حملہ کے وقت اس کے پاس صرف تلوار ہو، کوڑا یا ڈنڈا نہ ہو، تو اسی سے دفاع کرے۔

اگر مال کی خاطر حملہ ہو، تو مال چھوڑ کر بھاگنا ضروری نہیں ہے، اگر مال سمیت بھاگ کر بچاؤ مشکل نہ ہو، تو اس پر عمل کرے۔

ترتیب کا فائدہ: مذکورہ ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ خفیف اور کم درجہ کا دفاع کافی ہونے کے باوجود شدید درجہ کو اختیار کرے، تو یہ ضامن ہوگا۔

منہ سے کاٹنا: کوئی شخص کسی کا ہاتھ مثلاً: اپنے دانت سے کاٹے، تو دونوں جبڑے جدا کرکے منہ کھول کر چھڑائے، اس طرح نہ ہو سکے تو جبڑے پر مار کر چھڑائے، پھر ہاتھ کھینچ لے، پھر اس کی آنکھ پھوڑے، پھر جبڑا کاٹے، پھر اس کا خصیہ (فوطہ) دبائے، پھر اس کا پیٹ پھاڑ دے۔

اگر ہاتھ کھینچنے کی وجہ سے کاٹنے والے کے دانت گر جائیں، تو اسکے جان کی طرح سے رائیگاں ہے، گو کاٹنے والا معصوم ہو، کیونکہ کاٹنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، تاہم بغیر کاٹے اپنا بچاؤ اور خلاصی ناممکن ہو، تو بقول ابن ابی عصرون اس ایک صورت میں کاٹنا جائز ہوگا۔

حدیث: ”ایک شخص نے دوسرے کا ہاتھ کاٹا، تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ میں سے کھینچ لیا، تو اس کے دانت گر گئے، یہ جھگڑا آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمھیں (دانتوں کی) دیت نہیں ملے گی“ (صحیحین)

کسی مکان میں جھانکنا: کوئی شخص گھر میں عریاں ہو، یا گھر میں اس کی بیوی یا کوئی محرم عورت موجود ہو، گو کپڑے پہنی ہو، اور کوئی بالغ یا قریب البلوغ شخص سوراخ، چھت، منارہ یا روشن دان وغیرہ سے اندر مکان میں عمداً جھانکے، اور یہ کسی ہلکی چیز جیسے کنکر پھینک کر جھانکنے والے کو مارے، اور اس سے وہ اندھا ہو جائے یا آنکھ کے قریب لگے، اور اس زخم سے وہ مر جائے، تو یہ نقصان رائگاں جائے گا، پھینکنے والے پر کوئی ضمان نہیں آئے گا، جب کہ جھانکنے والے کی بیوی، یا کپڑے پہنی ہوئی محرم یا کچھ اسباب اس گھر میں نہ ہو، مارنے سے قبل اسے ڈرانا مفید ہو، تو پہلے ڈرانا واجب ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے: ”اگر کوئی تمہارے مکان میں جھانکے، اور تم نے اسے اجازت نہ دی ہو، پھر اسے کنکر پھینک کر مارو، اور اس کی آنکھ پھوٹ جائے، تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا“۔

ایک حدیث میں ہے: ”نہ قود ہے اور نہ دیت“ (صححہ ابن حبان، والبیہقی)

اگر بیوی وغیرہ لباس میں ہو، یا کسی آڑ میں ہو تب بھی کنکر مارنا جائز ہے۔

اگر اتفاقاً یا خطاً نظر پڑے، یا مرد لباس میں ہو (ناف سے گھٹنے تک)، یا مذکورہ لوگوں کے علاوہ کسی پر جھانکے، یا مسجد، غصب شُدہ مکان، یا سڑک وغیرہ پر جھانک کر دیکھے، یا کھلے دروازے یا کشادہ روشن دان یا کشادہ جالی والی کھڑکی سے جھانکے، یا کنکر وغیرہ جیسی ہلکی چیز موجود ہوتے ہوئے ثقیل چیز مثلاً پتھر یا تیر پھینکے، یا اس مکان میں جھانکنے والے کی کوئی محرم عورت لباس میں موجود ہو، یا اس کی بیوی یا کچھ اسباب موجود ہو، یا آنکھ سے دور کسی حصہ پر کنکر لگے، تو ان تمام صورتوں میں اس کا نقصان رائگاں نہ ہوگا، بلکہ مارنے والا ضامن ہوگا، کیونکہ پھینکنے و مارنے والے کی غلطی ہے اگر جھانکنے والے کی محرم عورت کے بدن پر لباس نہ ہو، تو اسے کنکر وغیرہ مار سکتے ہیں۔ اگر عورت کسی ناجائز چیز کی طرف جھانکے تو اسے مارنے کی بھی یہی تفصیل ہوگی۔

کسی کی گفتگو پر کان لگانے والے کے کان پر، نابینا کی آنکھ پر اور تاریکی میں جھانکنے والے کی آنکھ پر کنکر وغیرہ مارنا جائز نہیں ہے۔

امام اذرعی کے بقول گھر میں مرد لباس میں ہو، تب بھی کنکر مار سکتا ہے، جیسا کہ حدیث کے عموم کا تقاضا ہے، جھانکنے والا ہٹ چکا ہو، تو اس پر کنکر مارنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ کوئی صائل حملہ سے رک جائے تو اب اسے مارنا جائز نہیں ہے، کنکر وغیرہ ہو تو پتھر وغیرہ سے

مار سکتا ہے۔ اگر آنکھ پر یا اس کے قریب مارنا ممکن نہ ہو، یا اس سے وہ نہ ہٹے تو راجح یہ ہے کہ دوسرے کسی عضو کو مار سکتا ہے، اگر کنکر وغیرہ مارنے سے وہ نہ ہٹے، تو دوسروں کو مدد کے لئے پکارے، اگر وہاں کوئی نہ ہو، تو مستحب ہے کہ اللہ کا واسطہ دے کر ہٹنے کے لئے کہے، اب بھی نہ ہٹے تو اسے ہتھیار وغیرہ سے مارنا جائز ہو گا، صحراء میں خیمہ کا حکم بستی میں مکان کے حکم کی طرح ہے۔

تنبیہ: اگر اصول (یعنی والدین اوپر تک) میں سے کوئی جھانکے، تو اسے مارنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ امام ماوردی ورویانی نے فرمایا، اگر مارے اور آنکھ پھوٹے تو ضامن ہو گا۔

تعزیر: سرپرست اپنے ماتحت کو، حاکم مجرم کو، شوہر بیوی کو یا استاد اپنے شاگرد کو بطور تعزیر و تادیب سزا دے، اور اس سے وہ مر جائے، تو ان کے عاقلہ پر اس کا ضمان لازم ہو گا۔ کیونکہ اصل مقصد تادیب ہے، نہ کہ مارنا، اسی لئے یہ سزا انجام کی سلامتی کے ساتھ مشروط ہے، پس جب وہ مر گیا، تو معلوم ہوا کہ یہ سزا میں حد سے تجاوز کر گیا، اگر ایسی مار سے مرے جو غالباً قتل کا سبب بنتی ہو، تو اس پر قصاص عائد ہو گا (البتہ باپ دادا اوپر تک قصاص سے مستثنیٰ ہیں)

جراحی (آپریشن): ایک عاقل بالغ شخص اپنے بدن میں کھال اور گوشت کے درمیان جو پھوڑا (رسولی)، اسے کاٹ سکتا ہے، تاکہ بد نمائی کا ازالہ ہو، جبکہ اس کا کاٹنا باقی رکھنے کے مقابلہ میں زیادہ پر خطر نہ ہو، یعنی کاٹنے میں کوئی خطرہ نہ ہو، یا نہ کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو، یا خطرہ صرف نہ کاٹنے میں ہو، یا دونوں خطرے برابر ہوں۔ اگر کاٹنا زیادہ پر خطر ہو، یا صرف اس میں خطرہ ہو، یا خطرہ کا صحیح اندازہ نہ ہو تو کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

کوئی عضو سڑے، گلے، یا کسی اور بیماری کے لئے آپریشن کی نوبت آئے، تو اس میں بھی اسی تفصیل کو مد نظر رکھا جائے گا۔

باپ دادا کمسن بچہ اور پاگل کے پھوڑے کو کاٹ سکتے ہیں، گو کاٹنے میں خطرہ ہو، جب کہ نہ کاٹنا زیادہ پر خطر ہو، دیگر لوگوں کو اس کی اجازت نہ ہو گی، کیونکہ انھیں غور وفکر کرنے کے لئے اتنی فرصت اور ان میں اتنی شفقت نہ ہو گی۔ اگر دونوں خطرے برابر ہوں، یا کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو، یا خطرہ صرف کاٹنے میں ہو، تو کاٹنے کی اجازت نہ ہو گی۔

مجنون یا بچہ کے باپ دادا اور دیگر ولی مثلاً: بادشاہ، اس کے نائب، وصی وغیرہ کو ایسے علاج کی اجازت ہے، جس میں کوئی خطرہ نہ ہو، گرچہ ترکِ علاج میں بھی خطرہ نہ ہو، مثلاً ایسا پھوڑا کاٹنا جس میں کوئی خطرہ نہ ہو، پچھنے یا سینگی لگوانا وغیرہ، مذکورہ جائز علاج کی وجہ سے اگر وہ بچہ یا مجنون مر جائے، تو ان پر کوئی ضمان نہ آئے گا، اگر ولی ممنوعہ علاج کرے اور وہ مر جائے تو اس کے مال میں اس کی مغلظہ دیت واجب ہو گی، کسی پر قصاص واجب نہ ہو گا۔

کان ناک میں سوراخ کرنا: امام غزالی وغیرہ نے صراحت فرمائی ہے کہ بچے اور بچیوں کے کان میں (زیورات کے لئے) سوراخ کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ بلا حاجت تکلیف پہنچانا ہے، لیکن طبرانی کی ایک روایت میں، جس کی سند کے راوی ثقہ و معتبر ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے ساتویں دن بچہ کے کان میں سوراخ کرنا سنت شمار کیا ہے، جو بچہ کے لئے جواز پر صریح دلیل ہے، تو بچی کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا، لہٰذا علامہ رملی وغیرہ بعض علماء نے جواز کو ترجیح دی ہے، ناک میں حلقہ (وغیرہ) ڈالنے کے لئے سوراخ کرنے کو علامہ ابن حجر مکیؒ نے حرام قرار دیا ہے، بعض لوگ اسے زینت سمجھتے ہوں، تو ان کا کوئی اعتبار نہیں، اس کے باوجود اگر کسی نے اس طرح سوراخ کر لیا ہو، تو اس میں زینت کے لئے نتھ ڈالنا اور اسے دیکھنا حرام نہیں ہے۔

طبیب (ڈاکٹر) کا ضمان: کسی عاقل بالغ شخص کی صریح اجازت سے طبیب اس کا علاج (یا آپریشن) کرے، جو تلف کا

باعث بنے، تو طبیب ضامن نہ ہو گا، جبکہ اس فن سے واقف وماہر ہو، یعنی اہلِ فن کے نزدیک اس سلسلہ میں اسکی خطا بالکل شاذ ونادر ہو ۔ص ۲۸۷

(۲) کسی کا کپڑا مثلاً ہوا میں اُڑ کر کسی شخص کے گود میں گر جائے، اور یہ اسے پھینک دے، تو ضامن ہو گا، کیونکہ اس پر واجب تھا کہ کپڑا مالک یا نائب ورنہ حاکم کے سپرد کرے۔

(۳) کسی کا جانور اپنی کھیتی میں داخل ہو، اور خود مالک نے اسے نہ چھوڑا ہو، تو واجب ہے کہ جانور کو مالک کے سپرد کرے، مالک نہ ملے تو حاکم کے سپرد کرے، اگر اپنی جگہ سے بھگادے، تو یہ ضامن ہو گا۔

(۴) کسی کا جانور دوسری کی ملکیت میں داخل ہو کر اسے لات مارے اور وہ مر جائے، تو کھیتی باڑی تلف کرنے کی طرح ہے، یعنی جن صورتوں میں کھیتی باڑی کے تلف میں ضمان ہو گا، یہاں بھی ہو گا، ورنہ یہاں بھی نہ ہو گا۔

(۵) اگر اپنا جانور کسی کی کھیتی میں اس کی اجازت کے بغیر داخل کر دے، اور وہ حاجت سے زائد اسے باہر نکال دے اور جانور ضائع ہو، تو معتمد یہ ہے کہ اس پر ضمان لازم نہ ہو گا۔

ایذا رساں حیوان: جو حیوان مثلاً: بلّی، گدھا، کُتّا وغیرہ کسی کی چیز اچکنے وجھپٹنے یا مارنے اور زخمی کرنے وغیرہ کا عادی ہو، (یعنی دو تین مرتبہ ایسی حرکت کر چکا ہو، بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ بھی ایسا تجربہ ہو چکا ہو)، تو دن یا رات میں وہ جو بھی نقصان پہنچائے۔ (مثلاً: بلّی پرندے کو پکڑ لے، کھانا کھا جائے،) مالک یعنی جو اسے پال رہا ہے، وہ اس نقصان کا ضامن ہو گا، جب کہ اسے باندھنے میں کوتاہی برتے، کیونکہ ایسے جانوروں کو باندھ کر دوسروں کو اس کے شر سے محفوظ رکھنا اس کی ذمّہ داری تھی، اگر حیوان ایذاء رسانی کا عادی نہ ہو، اور اسے عموماً باندھنے کا معمول نہ ہو، جیسے بلّی وغیرہ، تو مطلق ضامن نہ ہو گا، ورنہ دن میں ضامن ہو گا، نہ کہ رات میں۔

بلّی کسی کے مکان پر آکر رہنے لگے، لیکن وہ اس پر توجہ نہ دے، تو وہ ذمّہ دار نہ ہو گا، لیکن اگر وہ پناہ دینے کے قصد سے اسے رکھے، غائب ہو تو اس کی فکر وتلاش کرے، تو یہ ضامن ہو گا۔

معتمد قول یہ ہے کہ اس طرح کے موذی جانوروں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، تاہم جس وقت وہ ایذاء پہنچا رہے ہوں، اس وقت صائل کی طرح اخف فالاخف طریقہ سے اسے دفع کریں گے، قاضی حسین نے ایسے موذی جانوروں کو فواسق خمس کی طرح مطلق مارنا جائز قرار دیا ہے۔ امام ابن عبد السلامؒ نے بلی بار بار حد سے زیادہ ستائے تو اسے مارنے کا فتویٰ دیا، امام اذرعی نے اسی قول کو ایسی بلی کے متعلق اختیار کیا ہے، جو مہمل ہو، اسکا کوئی مالک نہ ہو۔

فوائد: (۱) امام قفالؒ نے فرمایا کہ پرندے کو اس کی خوش نوائی وچہچہاہٹ سننے وغیرہ کے لئے پنجرہ میں مقید کرنا جائز ہے، جبکہ اس کی مناسب دیکھ بھال کرے۔

(۲) کسی کے گھر میں کاٹنے والا کتا، یا سرکش جانور موجود ہو، اور کوئی شخص اس کی اجازت سے گھر میں آئے، اور یہ اسے اس بات سے آگاہ نہ کرے، اور کتا اسے کاٹے، یا جانور لات مارے، تو صاحبِ خانہ ضامن ہو گا، اگر وہ شخص بلا اجازت داخل ہو، یا صاحبِ خانہ اسے جانور کی عادت سے باخبر کر چکا تھا، تو ضامن نہ ہو گا۔

(۳) امام اسنویؒ نے امام ابن عبد السلامؒ سے نقل فرمایا ہے کہ جو (ناجائز) ٹیکس وصول کرنے والے اور دیگر ظالم حاکموں کو زہر وغیرہ کھلا کر مار سکتا ہو، تو یہ جائز ہے، تاکہ لوگ اس کے ظلم سے نجات پائیں، کیونکہ جب صائل کو دفع کر سکتے ہیں، گو ایک درہم کی خاطر

ہو، اور قتل کی نوبت آئے، تو ایسے سرکش ظالموں کو تو بدرجہ اولی قتل کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم (بغیہ: ۲۵۰)

(۴) کسی مسلمان کو ڈرانا حرام ہے، گو بطور مزاح و مذاق ہو، کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

موٹر کار کا حادثہ: موٹر گاڑیوں کے ذریعہ کسی کا مال، کھیتی باڑی وغیرہ تلف ہو، یا کوئی مر جائے یا زخمی ہو جائے، تو ڈرائیور پر مال اور کھیتی باڑ کا ضمان واجب ہو گا، خواہ گاڑی اس کی ہو، یا کسی دوسرے کی۔ اور دیت ڈرائیور کے عاقلہ پر واجب ہو گی۔

اگر گاڑی چلاتے ہوئے ڈرائیور کی موت واقع ہو، اور نتیجہ میں حادثہ کی وجہ سے کسی کا جانی یا مالی نقصان ہو، تو ڈرائیور یا اس کے ورثاء وغیرہ اس کے ذمّہ دار نہ ہوں گے۔

تنبیہ: جو دکھ درد میں ہو، اسے موت کی تعجیل (جلدی کرنا) حرام ہے، گو شدید اور برداشت سے باہر تکلیف ہو، کیونکہ شفا کا امکان و امید موجود ہے۔

فائدہ: خطیب شربینیؒ نے فرمایا کہ جو شخص جلتی ہوئی آگ میں ہو، اور اس سے صرف غرقاب کرنے والے پانی کی طرف ہی ہٹ سکتا ہے، (یعنی زندگی بچانے کی کوئی شکل ہی نہیں) اور آگ کے شعلوں پر صبر کے مقابلہ میں پانی میں غرق ہونا اس کے نزدیک ہلکا اور آسان ہو، تو وہ پانی کی طرف ہٹ سکتا ہے۔

(تحفہ مع الحواشی ۱۱/۵۴۳-۵۹۶، فتح الوہاب مع الجمل ۵/۱۶۵-۱۷۱، مغنی ۴/۱۹۴-۲۰۸، نہایہ مع الحواشی ۸/۲۳-۴۴، قلائد ۲/۳۴۶-۳۵۲، الاقناع مع البجیرمی ۴/۱۸۴-۱۹۱، الفقہ المنہجی ۸/۸۹-۹۷، بغیہ: ۲۵، ترشیح: ۳۹۰)

جہاد اور بعض دیگر فروضِ کفایہ

فرضِ کفایہ: یعنی ایسا فرض جس میں اصل مقصد اس عمل کی ادائیگی ہو، سو اتنے افراد اسے انجام دیں کہ مقصد حاصل ہو جائے، تو یہ کافی ہے، اور دیگر حضرات سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا، تاہم ثواب صرف انجام دینے والوں کو حاصل ہو گا۔

جہاد: کافروں سے جہاد فرض کفایہ ہے، اور عام حالات میں سال میں کم از کم ایک مرتبہ جہاد کرنا فرض ہے۔ جہاد وسیلہ ہے، اصل مقصد ہدایت ہے، کفار کا قتل مقصد نہیں ہے، حتیٰ کہ جہاد کے بغیر دلائل پیش کر کے ہدایت پر لانا ممکن ہو، تو وہ جہاد سے بہتر ہو گا۔

غسل میت، تکفین و تدفین، نماز جنازہ اور لقیط کو اٹھالینا، یہ سب بھی فرضِ کفایہ ہیں، جن کا متعلقہ ابواب میں تذکرہ ہو چکا۔

علمی دلائل قائم کرنا: اللہ تبارک و تعالیٰ کے وجود، اللہ کے لئے واجب صفات، اللہ تعالیٰ کے حق میں محال صفات، نبوت کا اثبات، رسولوں کی صداقت، حساب کتاب، معاد اور میزان وغیرہ شریعت میں وارد امور پر علمی دلائل اور قطعی براہین قائم و پیش کرنا فرضِ کفایہ ہے۔

دینی مشکلات کو حل کرنا اور شبہات کو دفع کرنا بھی فرضِ کفایہ ہے۔ کسی مکلف کے دل میں شک و شبہ داخل ہو، تو اس کا ازالہ اس پر متعین ہے، یعنی عقلی دلائل کی واقفیت حاصل کرے اور حسد، ریا، کبر وغیرہ قلبی بیماری کا علاج اور اس کے حدود اسباب کا علم حاصل کرے۔

قرآن و حدیث کے مطابق صحیح اور پختہ عقیدہ رکھنا ہر کسی پر فرض عین ہے۔ علم کلام فرضِ عین نہیں ہے، اور صحابہؓ کرام کبھی اس میں مشغول نہیں ہوئے، امام الحرمین فرماتے ہیں کہ دورِ اول کی طرح پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول ہوتا، تو ہم نے علم کلام میں مشغولی کو

واجب نہ قرار دیا ہوتا، بلکہ شاید اس سے روکا ہوتا، لیکن اب جب کہ بدعات سر اٹھارہے ہیں، تو اس کی لہروں اور موجوں کو آزاد چھوڑ دینے کی گنجائش نہیں، بلکہ ایسی تیاری اور اسباب کی فراہمی ضروری ہے، جس کے ذریعہ دینِ حق کی طرف دعوت، اس کی صحیح ترجمانی اور مخالفین کے پیدا کردہ شبہات کا ازالہ ہوسکے، سو عقلی دلائل کی تحصیل، اس میں مشغولی اور شبہات کی تردید فرض کفایہ شمار ہوگی۔ امام شافعیؒ نے علم کلام کو جو حرام قرار دیا ہے، وہ اس میں زیادہ غلو اور حد سے آگے بڑھنے پر محمول ہے۔

فائدہ: فلسفہ، شعبدہ بازی، تنجیم (علم نجوم، احوالِ عالم معلوم کرنے کے لئے ستاروں کو دیکھنا) رَمل (ایک علم ہے جس میں ریت پر لکیریں کھینچ کر آئندہ کے احوال کو معلوم کرتے ہیں) اور سِحر (جادو) کا سیکھنا حرام ہے۔

اسلامی علوم: تفسیر وحدیث کی تحصیل اور فقہی علوم میں اتنی مہارت کہ قاضی (اسلامی جج) اور مفتی کے قابل ہو، فرض کفایہ ہے ہر ایک کو اپنی حد تک ضروری مسائل کا علم حاصل کرنا فرضِ عین ہے۔ امام شافعیؒ نے تحصیلِ علم کو نفل نماز اور جہاد سے افضل قرار دیا ہے۔

تنبیہ: بدنی علاج کیلئے علم طب (ڈاکٹری)، میراث و وصیت کی تقسیم اور معاملات میں ضرورت کے بقدر علم حساب، اصول فقہ، نحو، لغت، صَرف، حدیث کے راویوں کے نام، جرح وتعدیل، اور علماء کے اختلاف واتفاق سے واقفیت بھی فرض کفایہ ہے۔ علم منطق میں مشغولی کو کئی علماء نے حرام قرار دیا ہے۔

فائدہ: علمی فرضِ کفایہ کا مخاطب وہ شخص ہوگا، جو آزاد، مرد اور مکلف ہو، اور کند ذہن نہ ہو، نیز دیگر مشاغل سے کٹ کر یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف رہ سکتا ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا): معروف اور واجبات کا حکم کرنا اور حرام امور سے روکنا بالاجماع فرض ہے، جب کہ اپنے جان، مال، عضو یا عزت وآبرو پر کوئی خطرہ نہ ہو، اے کسی دوسرے پر اس منکر سے برتر مَفْسَدہ وبگاڑ کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح اس بات کا امکان نہ ہو کہ برائی کا مرتکب ہٹ دھرمی اور ضد میں آکر مزید اس طرح کی برائی کریگا۔ امر بالمعروف کے لئے اس کا عادل ہونا شرط نہیں ہے۔ کسی کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے والا خود ان امور کا پابند ہو، یہ ضروری نہیں، کیونکہ اس پر خود اپنے نفس کو اور دوسروں کو سمجھانا ضروری ہے، اب اگر ایک میں (یعنی خود کو سمجھانے اور روکنے میں) کوتاہی ہو، تو اس سے دوسری ذمہ داری ساقط نہ ہوگی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف حکومت کے ذمہ داروں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر مکلف مرد، عورت، آزاد اور غلام پر جبکہ وہ قادر ہو، یہ واجب ہے۔ نابالغ پر واجب نہیں، تاہم وہ انجام دے تو ثواب ملے گا۔ یہ فریضہ بصورت امکان ہاتھ اور طاقت سے انجام دینا چاہئے، اگر اس سے عاجز ولاچار ہو، تو زبان سے، اس سے بھی عاجز ہو، تو آخری درجہ میں کم از کم اپنے دل میں اس پر کُڑھے اور انکار کرے۔ جس کی طرف سے شرارت کا اندیشہ ہو، تو نرمی سے کام لے، اگر فتنہ کا ڈر نہ ہو، تو دوسروں کا تعاون لے، ورنہ حاکم تک معاملہ پہنچائے۔ یہ کوئی شرط نہیں کہ سامنے والا اس کی بات مان لے، بلکہ ایک مکلف پر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے، گرچہ عبادت کے اعتبار سے یہ جانتا ہو کہ کچھ فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ آیت کی رو سے سمجھانا اور نصیحت کرنا مؤمنین کو نفع پہنچاتا ہے (دیکھئے سورہ ذاریات: ۵۵)

دقیق اور باریک امور میں امر ونہی صرف علماء کا کام ہے، نہ کہ عوام کا۔ ایک عالم صرف اسی بات سے روکے جس کے انکار پر تمام علماء متفق ہوں، اختلافی امور میں نہ روکے، تاہم کرنے والا خود اس عمل کو حرام سمجھتا ہو، تو روکے۔ جس عمل کی حرمت اختلافی ہو، اس کے مرتکب کو بطور خیر خواہی نرمی کے ساتھ اختلاف سے بچنے کی ترغیب دے تو اچھی بات ہے، جب کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے

اختلاف کا شکار نہ ہو، یا کوئی ثابت سنت ترک نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اختلاف سے بچ نکلنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (یعنی مثلاً: ایک عمل اپنے مسلک میں جائز ہو، لیکن کسی دوسرے مسلک میں حرام ہو، تو احتیاطاً اس سے بچنا بہتر ہے)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دینے والے کے لئے تحقیق و تجسس کرنا اور محض گمان کی وجہ سے کسی کے گھر میں گھس جانا منع ہے، بلکہ کوئی غلط بات سامنے آئے تو اسے روکے اور بدل دے۔ البتہ کوئی معتبر شخص مخفی انجام دی جانے والے کسی ایسے منکر کی خبر دے، جس میں حرمت کی پامالی ہو، اور آئندہ اسکا تدارک نہ ہو سکے، جیسے زنا، قتل، تو گھر میں گھس جانا اور تجسس کرنا واجب ہے۔

تنبیہ: امام (حاکم) پر واجب ہے کہ محتسب مقرر کرے، جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔ محتسب پر لازم ہے کہ جو ظاہری شعائر میں سے کسی چیز میں کوتاہی کرے، اسے روکے، گو سنت ہو، جیسے نمازِ عید، اذان۔

کعبہ کا احیاء: ہر سال بعض مکلفین کا حج اور عمرہ کے ذریعہ کعبہ کو آباد رکھنا فرضِ کفایہ ہے، اتنی مقدار ہو کہ جس سے اس شعار کا اظہار ہو۔

دفعِ ضرر: صاحبِ حیثیت لوگوں پر مسلمانوں کے ضرر کا دور کرنا فرضِ کفایہ ہے، جبکہ زکات اور بیت المال اور وقف وغیرہ کے ذریعہ یہ ضرورت پوری نہ ہو۔ مثلاً: برہنہ کے لئے لباس کا انتظام، بھوکوں کو کھلانا، علاج کے مصارف، معذور کے لئے خادم وغیرہ۔ لباس بدن کی ضرورت اور گرمی سردی کی مناسبت سے ہو، مذکورہ مواسات و غمگساری اور امداد اس پر واجب ہے، جس کے پاس اپنی یک سالہ ضروریات سے زائد مال ہو۔ (مضطر کی امداد کے لئے یہ قید نہیں ہے، جیسا کہ گذر چکا)۔ اگر کسی کے پاس اتنا مال تو نہ ہو، لیکن مثلاً: ماہانہ تنخواہ اتنی ملتی ہے، کہ ضروریات سے زائد ہو، تو اس پر یہ ذمہ داری عائد ہو گی۔

تنبیہ: مذکورہ کسی ضرر کے ازالہ کے لئے کسی قادر شخص سے مطالبہ ہو، تو وہ انکار نہیں کر سکتا، گو وہاں دوسرا شخص موجود ہو، تاکہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے اور ٹالنے کی نوبت نہ آئے لیکن کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا جائے، اور اس جگہ دوسرا مفتی موجود ہو، تو اسے جواب دینا ضروری نہیں ہے، کیونکہ نفس فطرتاً علم اور اس کی افادیت کو محبوب رکھتا ہے، لہٰذا اس میں ایک دوسرے پر ٹالتے رہنا کافی بعید ہے، بخلاف مال کے۔

گواہی: شرعی قاضی اور ججوں کو لوگوں کے حقوق دلوانے میں تعاون کرنا، گواہ بننا اور گواہی دینا فرضِ کفایہ ہے۔

صنعت وحرفت: تجارت، درزی کا پیشہ، خرید و فروخت، کاشت کاری وغیرہ امور فرض کفایہ ہیں۔ کیونکہ دنیا کا قیام انھیں اسباب پر موقوف ہے، اور دین کا قیام دنیا کے معاملہ پر موقوف ہے۔

سلام کا جواب: کوئی عاقل مسلمان (گو ممیز بچہ ہو) مکلف مسلمانوں کی جماعت کو (یعنی ایک سے زائد افراد کو) سلام کرے، (اور سلام کرنا اور جواب دینا مطلوب و مشروع ہو)، تو اس صورت میں جواب دینا فرضِ کفایہ ہے، مجمع میں سے کسی ایک شخص کا جواب دینا کافی ہے۔ اگر کسی ایک شخص کو سلام کرے، تو اس پر جواب دینا فرضِ عین ہے۔ کسی مسلمان کو جو کہ فاسق و بدعتی نہ ہو سلام کرنا مسنون ہے، ابو داود کی حدیث میں سلام کی ابتداء کرنے والے کو اللہ (کی رحمت) سے زیادہ قریب بتلایا ہے۔

آیت: ''وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا'' (النساء: ۸۶)

ترجمہ: ''اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو''۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذرنے والے مجمع میں سے ایک شخص کا سلام کرنا، اور بیٹھے ہوئے حضرات میں سے ایک کا جواب دینا کافی

ہے (ابوداود) ایک شخص جواب دے، تو ثواب صرف اسے ملے گا، اور دوسروں سے گناہ وحرج ساقط ہوگا۔ صرف ممیز بچہ کے جواب دینے سے فرض ساقط نہ ہوگا۔

سلام کرنے کے الفاظ (ابتداء کے الفاظ): اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ، سَلَامُ اللّٰہِ عَلَیْكَ ، سَلَامِیْ عَلَیْکُمْ ، سَلَامٌ عَلَیْکُمْ ، عَلَیْکُمُ السَّلَامُ ، عَلَیْکُمْ سَلَامٌ (آخری دونوں الفاظ مکروہ ہیں تاہم جواب دینا فرض ہے)

اگر تنہا شخص کو سلام کرے یا جواب دے تو علیکم کی جگہ صرف عَلَیکَ (تجھ پر) کہنا کافی ہے، لیکن ساتھ موجود فرشتوں کی وجہ سے جمع کا صیغہ یعنی علیکم (تم پر) کہنا مستحب ہے، مجمع کے سلام یا جواب میں صرف علیک کہنا کافی نہیں، بلکہ علیکم کہنا ضروری ہے۔

جواب کے الفاظ: وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ ، عَلَیْکُمُ السَّلَامُ ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ، وَعَلَیْکُمْ سَلَام ، عَلَیْکُمْ سَلَام سَلَامٌ عَلَیْکُمْ

جواب میں وعلیکم السلام کہنا (یعنی ابتداء میں واو کے ساتھ) افضل ہے، ابتداءً وعلیکم السلام کہنا صحیح نہیں، اور اس سلام کا جواب فرض نہیں ہے۔ سلام یا جواب میں صرف السلام یا صرف علیکم کہنا کافی نہیں ہے، خواہ دوسرے لفظ کی دل میں نیت ہو۔ اگر کوئی السلام علیٰ سیدنا یا مولانا یا السلام عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْھُدیٰ یا السلامُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ کہے، تو جواب دینا فرض نہیں ہے، کیونکہ یہ سلام کا شرعی صیغہ نہیں ہے

اگر ملاقات پر دونوں بہ یک وقت علیکم السلام کہیں، تو جو اُن میں سے جواب کی نیت سے یہ نہ کہے، اسے دوسرے کا جواب دینا فرض ہے۔

کوئی شخص آتے وقت سلام کرے، یا جدا ہوتے وقت، دونوں صورتوں میں جواب فرض ہے، جیسا کہ سلام کرنا سنت ہے۔

سلام اور جواب کے الفاظ میں وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ وَمَغْفِرَتُہٗ کا اضافہ مسنون ہے، اگر سلام کرنے والا یہ اضافہ کرے، تب بھی جواب میں یہ اضافہ واجب نہیں ہے۔

بھرہ: کسی بہرہ کو سلام کرے تو الفاظ کے ساتھ اشارہ بھی کرے، تا کہ وہ سمجھے اور جواب دے۔ بہرہ کسی کو سلام کرے تو جواب میں الفاظ اور اشارہ دونوں واجب ہیں، اگر اس کے منہ پر دیکھنے کی وجہ سے مثلاً: اسے اس کے جواب کا اندازہ ہو جائے، تو اشارہ واجب نہیں ہے۔

گونگا: گونگے کا اشارہ میں سلام کرنا اور جواب دینا معتبر ہوگا۔

اتصال: سلام اور جواب میں عقد (خرید وفروخت وغیرہ) کے ایجاب وقبول کی طرح اتصال شرط ہے، (یعنی زیادہ فاصلہ نہ ہو) اگر فاصلہ ہوا تو (جواب فوت ہو گیا اب) اس کی قضا نہیں۔

کسی کو مختلف گروہ (بہ یک وقت) سلام کریں، اور یہ سب کے جواب کی نیت سے ایک مرتبہ وعلیکم السلام کہے تو کافی ہے۔ اگر یکے بعد دیگرے سلام کریں، اور زیادہ افراد ہوں، تو ایک جواب سب کے لئے کافی نہ ہوگا۔ کیونکہ مشروط اتصال موجود نہیں ہے۔

فائدہ: پاگل اور نشہ میں مست شخص کو جواب دینا واجب نہیں ہے، اسی طرح فاسق اور بدعتی کے سلام کا جواب بھی واجب نہیں تا کہ اس سے ان کو یا دوسروں کو زجر وتنبیہ حاصل ہو۔

تنبیہ: اگر کوئی ذمی کسی مسلم کو سلام کرے تو، اسے وَعَلَیکَ، یا عَلَیکَ کہنا واجب ہے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی حدیث میں اس کا حکم موجود ہے، لیکن امام بلقینیؒ، اذرعیؒ، اور زرکشیؒ نے اسے مسنون قرار دیا ہے۔

اشارہ: صرف ہاتھ وغیرہ کے اشارہ سے سلام کرنا خلافِ اولیٰ ہے اور اس کا جواب فرض نہیں ہے، کیونکہ اس طرح سلام سے ترمذی ونسائی کی حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ لفظ اور اشارہ کو جمع کرنا افضل ہے۔ جو نماز میں یا دور ہونے یا گونگا ہونے کی وجہ سے لفظاً جواب نہیں دے سکتا، اسے اشارہ میں جواب دینا مشروع ہے۔

فائدہ: اگر دو آدمی ایک دوسرے کو بہ یک وقت سلام کریں، تو دونوں پر جواب لازم ہے، اگر آگے پیچھے کریں، تو دوسرے کا سلام بطورِ جواب کافی ہے، البتہ وہ اس سے ابتدا کا، یا ابتدا وجواب دونوں کا قصد کرے، تو جس نے پہلے سلام کیا، اس پر جواب لازم ہے۔

سلام کے آداب: آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”چھوٹا بڑے کو، سوار شخص چلنے والے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو اور قلیل کثیر کو (چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو) سلام کرے“۔ (صحیحین) حدیث کی ترتیب کے مطابق سلام کرنا مستحب ہے۔ اگر کوئی اس کے برعکس کرے، تو یہ مکروہ نہیں ہے، گو خلافِ سنت ہے، مذکورہ ترتیب اس وقت ہے، جبکہ راستہ میں ملاقات ہو، لیکن اگر کسی بیٹھے ہوئے شخص کے پاس کوئی آئے تو آنے والا سلام کرے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، قلیل ہو یا کثیر، جو کھڑا ہوا ہو یا لیٹا ہوا ہو، وہ بھی بیٹھے ہوئے کی طرح ہے۔ اگر قلیل پیدل اور کثیر سواروں میں ملاقات ہو، تو دونوں میں تعارض ہے۔ (اور ابتداء میں دونوں برابر ہوں گے، اور جو پہل کرے اسے فضیلت حاصل ہوگی)

غائبانہ سلام: اگر کسی کے ذریعہ سلام کہلوائے یا خط میں سلام لکھ کر روانہ کرے تو اس کا جواب بھی لازم ہے۔ جو قاصد دوسرے کا سلام لائے جواب میں اسے بھی شامل کرنا مستحب ہے، پس اس طرح جواب دے: وَعَلَيْكَ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ۔ کوئی شخص کسی کے سلام کو دوسرے تک پہنچانے کی ذمہ داری لے، تو پہنچانا اس پر لازم ہے، کیونکہ یہ ایک امانت ہے۔

نمازی کا سلام: نمازی سلام پھیرتے وقت پاس موجود حضرات پر سلام کی نیت کرے، تب بھی اس کا جواب لازم نہیں ہے۔

عورت اور سلام: کسی عورت کا عورت کو، یا اپنے محرم رشتہ دار کو، یا آقا کو، یا شوہر کو سلام کرنا مسنون ہے۔ اسی طرح غیر محرم کو بھی جب کہ عورت بوڑھی ہو اور قابلِ شہوت نہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں مرد کے سلام کا جواب اس پر لازم ہے۔ اگر کوئی قابلِ شہوت عورت تنہا ہو، تو اسے کسی اجنبی مرد (غیر محرم) کو سلام کرنا، یا اس کے سلام کا جواب دینا حرام ہے، اور اس مرد پر اس عورت کو سلام کرنا، یا اس کے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ اگر عورت ایک سے زائد ہوں، یا مرد ایک سے زائد ہوں، تو سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

فائدہ: درج ذیل لوگوں کو سلام کرنا مسنون نہیں ہے۔

قضاء حاجت کرنے والا جو کھانا کھا رہا ہو، سونے والا، صحبت کرنے والا، جو حمام میں نظافت حاصل کر رہا ہو، نمازی، سجدہ کرنے والا، تلبیہ پڑھنے والا، مؤذن، جو اقامت کہہ رہا ہو، اونگھنے والا، خطیب، جو خطبہ سن رہا ہو، جو دعا میں کھویا ہوا ہو، حاکم کے روبرو موجود فریقین۔

مذکورہ افراد کو کوئی سلام کرے تو ان پر جواب واجب نہیں ہے، بجز اس شخص کے جو خطبہ سن رہا ہو، کیونکہ اس پر جواب لازم ہے، تلبیہ پڑھنے والے کو لفظاً سلام کا جواب دینا مستحب ہے، مؤذن اور نمازی کو مستحب ہے کہ اشارہ سے جواب دیں، ورنہ فارغ ہونے کے بعد لفظاً جواب دیں، جب کہ زیادہ دیر نہ گذری ہو۔ کھانے والا شخص لقمہ نگلنے کے بعد دوسرا لقمہ منہ میں رکھنے سے پہلے اسے سلام کرنا مسنون ہے۔ اور اس صورت میں جواب واجب ہے، لقمہ چباتے یا نگلتے وقت سلام مسنون نہیں ہے۔ قضاء حاجت اور جماع کی حالت میں جواب مکروہ ہے۔

قرآن کی تلاوت کرنے والا، مدرس اور طلبہ کو سلام کرنا مسنون اور ان کو جواب دینا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص تلاوت میں بالکل

محو اور تدبر میں مستغرق ہو، تو امام اذرعی کا خیال ہے کہ یہ بھی دعا میں محو شخص کی طرح ہے۔ (یعنی اسے سلام کرنا مستحب نہیں ہے۔)

فوائد: (۱) کسی گروہ میں بعض کی تخصیص کر کے سلام کرنا یا جواب دینا مکروہ ہے۔

(۲) عجمی (غیر عربی) زبان میں سلام کرنا جائز ہے، جبکہ مخاطب سمجھے، گو عربی میں سلام پر قادر ہو، اور اس سلام کا جواب فرض ہے، کیونکہ یہ بھی سلام ہی کہلائے گا۔

(۳) کسی ذمی (غیر مسلم) کو سلام کرنا حرام ہے، اگر سلام کے بعد پتہ چلا کہ وہ ذمی ہے، تو اس سے یہ کہنا مستحب ہے: میں نے اپنا سلام واپس لیا، یا میرا سلام لوٹا دو۔

(۴) اگر مسلمانوں کے درمیان کوئی غیر مسلم بھی ہو، تو سلام کرتے وقت دل میں اس کا استثناء کرے۔

(۵) کسی گھر میں داخل ہو، تو گھر والوں کو سلام کہنا سنت ہے۔

(۶) انسانوں سے خالی کسی جگہ داخل ہو، تو یہ کہنا مستحب ہے: اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ

(۷) بلا عذر سلام کے علاوہ کسی دوسرے الفاظ سے ابتداء نہ کرے: مثلاً صبح بخیر، اور ان الفاظ کا جواب واجب نہیں ہے، اگر جواب میں دعا دے تو بہتر ہے، البتہ اس کے سلام نہ کرنے کی وجہ سے تادیباً جواب نہ دینا بہتر ہے۔

(۸) "اَطَالَ اللّٰهُ بَقَاءَكَ" (اللہ تمہیں طویل زندگی دے) کے ذریعہ کسی بزرگ، صاحبِ علم یا عادل حکمراں کے لئے دعا دینا بہتر ہے، ورنہ مکروہ ہے۔

(۹) کسی سے ملاقات پر پشت جھکانا مکروہ ہے، کسی کی دینی فضیلت مثلاً: زہد و تقوی، وغیرہ کی وجہ سے اس کا ہاتھ چومنا (بوسہ لینا) مستحب ہے، مال و دولت اور جاہ وغیرہ کی وجہ سے مکروہ ہے، کمسن بچہ کے گال کا بوسہ لینا، گو دوسرے کا بچہ ہو، مستحب ہے، نیز اپنے اصول و فروع کا شفقت و رحمت سے بوسہ لینا مستحب ہے۔ تبرکاً کسی نیک میت کے چہرہ کا بوسہ لینے میں حرج نہیں۔

(۱۰) آنے والے میں کوئی ظاہری فضیلت ہو، مثلاً: علم، دین داری، شرف، باپ دادا وغیرہ ہونا تو اکرام و احترام کے طور پر اس کے لئے کھڑے ہونا مستحب ہے، نہ کہ ریا و بڑائی کے طور پر۔ آنے والے کو یہ تمنا کرنا کہ لوگ مجھے دیکھ کر کھڑے رہیں، یعنی وہ بیٹھ جائے اور دیگر لوگ کھڑے ہی رہیں جیسا کہ جابروں کی عادت ہوتی ہے، حرام ہے۔

(۱۱) ملاقات کے وقت بشاشت کے ساتھ مصافحہ اور مغفرت وغیرہ کی دعا مستحب ہے۔

(۱۲) کسی کے گھر جانا ہو اور دروازہ بند ہو، تو سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے، پھر اجازت چاہے، اگر جواب نہ ملے تو تین مرتبہ اس عمل کو دوہرائے، اگر اجازت مل جائے تو ٹھیک، ورنہ لوٹ جائے، اگر اندر سے پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو اپنا نام وغیرہ لیکر صراحت کرے، کہ وہ پہچان سکے، میں فلاں شیخ یا فلاں قاضی ہوں کہنا، یا اپنی کنیت بیان کرنے میں حرج نہیں، جبکہ اس کے بغیر پہچانا نہ جائے۔ صرف میں ہوں، یا خادم ہے وغیرہ کہنا مکروہ ہے۔

(۱۳) نیک حضرات، پڑوسی جو کہ بدکار نہ ہوں، بھائی بند اور رشتہ داروں کی ملاقات اور ان کا اکرام کرنا مستحب ہے، بایں طور پر کہ نہ اسے پریشانی ہو اور نہ انھیں۔ ان سے اپنی ملاقات کا مطالبہ بھی مستحب ہے۔ مریض کی عیادت مستحب ہے۔

(۱۴) چھینک آئے تو ہاتھ یا کپڑا وغیرہ منہ پر رکھنا، اور حتی الامکان آواز پست کرنا مستحب ہے، چھینک کے بعد الحمد اللہ کہے، اگر نماز میں ہے، تو آہستہ کہے، اگر پیشاب یا صحبت وغیرہ کر رہا ہو، تو دل میں کہے، چھینکنے والا الحمد للہ کہے، تو تین مرتبہ تک اسے جواب دے،

یعنی یَرْحَمُکَ اللّٰہ (اللہ تجھ پر رحم فرمائے) کہے، اور چھینکنے والا جواب میں کہے: یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ (اللہ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے احوال درست کرے) یا کہے: یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ (اللہ ہمیں اور تمہیں بخش دے) دونوں کو جمع کرنا بہتر ہے، کوئی مسلسل تین سے زائد مرتبہ چھینکے، تو بعد میں جواب سنت نہیں، بلکہ کہے کہ آپ کو زکام ہے، اور اسے عافیت کی دعا دے۔ جو شخص چھینکنے والے سے پہلے ہی الحمد للہ کہے، وہ دانت، پیٹ اور کان درد سے محفوظ رہے گا۔

(۱۵) جمائی ناپسندیدہ ہے، حتی الامکان اسے روکنے کی کوشش کرے، نہ رکے تو ہاتھ وغیرہ سے منہ چھپائے۔ آہ کرتے ہوئے منہ کھول کے اطمینان سے جمائی لینے کی مذمت وارد ہوئی ہے، اور اس ہیئت سے شیطان خوش ہو کر ہنستا ہے۔

(۱۶) کسی سے للہ محبت ہو، تو اسے اس کی اطلاع دینا مستحب ہے، جو اپنے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اسے دعا دے۔ جلیل القدر عالم یا بزرگ جیسی شخصیت کو اس طرح کہنے میں حرج نہیں: فِدَاکَ اَبِیْ وَاُمِّیْ (میرے والدین آپ پر قربان)

مذکورہ بالا مسائل کے دلائل میں صحیح احادیث بکثرت موجود ہیں۔

جہاد

تعریف: کسی بھی مقصد کی تحصیل کے لئے کوشش وسعی اور جدوجہد کرنا لغت میں جہاد کہلاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اسلامی نظام کے قیام، اسلام کی سربلندی اور تمام دنیا میں شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی وقیادت کے لئے جدوجہد کرنا جہاد کہلاتا ہے۔

جہاد کے انواع: (۱) تعلیمی جہاد، یعنی اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت کرنا، اور اس کے خلاف پیدا کئے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ اور اس کی تردید۔

(۲) اسلامی معاشرہ میں امن وامان کے قیام کی خاطر مالی قربانی۔

(۳) دفاعی قتال: مسلمانوں کے دین پر حملہ آور دشمنوں سے قتال کرنا۔

(۴) ہجومی قتال: دیگر اقوام کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لئے ان کے علاقوں میں پہنچنے کی صورت میں جو حُکّام اور عوام اس میں آڑے آئیں، ان سے قتال کرنا۔

(۵) نَفیر عام (دشمن کے مقابلہ کے لئے عوام کا اٹھ کھڑا ہونا): جس وقت دشمنانِ اسلام ظلماً مسلمانوں کے علاقہ پر ٹوٹ پڑیں، اور ان کو اپنے وطن وعقیدہ سے بے دخل کرنا چاہیں، تو تمام مسلمانوں کو اجتماعی طور پر مقابلہ ضروری ہے۔

ترغیب وفضیلت: جہاد کی فضیلت واہمیت اور شہیدوں کے مرتبہ کے متعلق بکثرت آیات واحادیث وارد ہیں۔

فرمانِ باری ہے: ”اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ“ (التوبۃ: ۱۱۱)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی، وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔۔۔“ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو، پھر جب دشمن سے ملاقات ہو تو صبر کرو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے“ (صحیحین) ایک روایت میں اللہ کے راستے میں صبح یا شام ایک مرتبہ نکلنا دنیا ومافیہا سے بہتر بتلایا۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے نیک وبد ہر امیر کی ماتحتی میں جہاد کو واجب قرار دیا ہے۔(ابوداود)اور ایک جگہ ارشاد ہے:"اپنے جان ومال اور زبان سے مشرکین سے جہاد کرو"(ابوداود،نسائی)

جہاد کی تدریجی تاریخ

آپ ﷺ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلام پیش کرتے رہے، اس دور میں تمام مظالم کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور کوئی جوابی کاروائی انجام نہ دی، ہجرت کے بعد پہلے دفاعی قتال کی اجازت ملی(دیکھئے سورہ بقرہ: آیت: ۱۹۰، اورسورہ حج: آیت: ۳۹-۴۰)

پھر اللہ تعالیٰ نے بصورت ضرورت ابتداءً بھی مشرکین سے قتال کی اجازت مرحمت فرمائی، سوائے حرام مہینوں کے (یعنی محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے علاوہ)(دیکھئے سورۃ توبہ: ۵) یہ صلح حُدَیبیہ کے بعد کا واقعہ ہے۔اس بعد بغیر کسی وقت اور جگہ کی قید وبند کے جہاد کو مشروع قرار دیا۔(دیکھئے سورہ بقرہ: ۱۹۱)

جہاد کی حکمت: مسلمانوں کے ایمان کا امتحان، انسانیت کو لوگوں کی بندگی اور ظلم وستم اور گمراہی کی تاریکی سے نجات دلانا اور ایمان کی روشنی اور عدل وانصاف کی فضا کو عام کرنا، لوگوں میں اس شعور کو بیدار کرنا کہ روئے زمین اور سلطنت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ہے، لہٰذا یہاں اسی کے احکام کا نفاذ ہونا چاہئے، انسانی احکام وقوانین کے نفاذ اور احکام الہیٰ سے روگردانی کی وجہ سے طاری مسموم وشیطانی وظالمانہ ماحول کا خاتمہ کرکے ایک عادلانہ وسکون بخش ماحول کو پیدا کرنا۔۔۔وغیرہ۔۔۔

شرائط: جس صورت میں جہاد فرضِ کفایہ ہو، درج ذیل شرائط جس میں ہوں گے، اس پر جہاد واجب ہوگا،

(۱)اسلام (۲)تکلیف، سوکسی بچہ یا پاگل پر جہاد واجب نہیں، جنگ احد کی موقع پر حضرات ابن عمر کی عمر ۱۴ برس ہی تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے انھیں شرکت کی اجازت نہ دی۔(صحیحین)(۳)مرد ہونا، عورت کی کمزوری کی وجہ سے ان پر واجب نہیں، نیز فرض کفایہ کی ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے مرد کافی ہیں، حضرت عائشہؓ نے جہاد کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے حج مبرور کو عورتوں کے حق میں بہترین جہاد قرار دیا۔(بخاری شریف) نیز ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، ایسا جہاد جس میں قتال نہیں ہے، حج وعمرہ"(ابن خزیمہ)

(۴)**استطاعت:** جسمانی اعتبار سے جہاد میں جانے پر قادر ہو، اسی طرح اگر حکومت مجاہدین کے مالی مصارف پر قادر نہ ہو، تو مالی استطاعت بھی حاصل ہو، پس جو نابینا، اپاہج ولنگڑا ہو یا مصارف پر قادر نہ ہو، اس پر جہاد واجب نہیں ہے۔(دیکھئے سورہ توبہ، آیت: ۹۱-۹۲)

(۵)**والدین کی رضامندی:** اگر والدین جہاد میں جانے سے راضی نہ ہوں، تو ان کی مخالفت جائز نہیں ہے، کیونکہ ہماری گفتگو فرضِ کفایہ جہاد کے متعلق ہے اور والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔

کفار سے متعلق شرائط: مسلمانوں پر کفار سے جہاد وقتال اس وقت واجب ہے، جب کہ درج ذیل شرائط موجود ہوں:

(۱)کفار مُستأمن، معاہد یا ذمی نہ ہوں۔(دیکھئے سورہ توبہ، آیۃ: ۶ اور سورہ انفال، آیت: ۵۸) آپ ﷺ کا فرمان ہے:"جو کسی ذمی کو قتل کرے، وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا، حالانکہ اس کی خوشبو ستّر(۷۰) سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے"(ابوداود)

(۲) قتال سے قبل ان کو اسلام کی دعوت دی جائے، اس کی حقیقت کو ان پر واضح کیا جائے، اگر انھیں کچھ شبہات در پیش ہوں، تو ان کا معقول جواب دے کر مطمئن کیا جائے، اب ان پر حجت تام ہونے کے باوجود اپنی ضد وہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں اور کفر پر اڑے رہیں تو ان سے قتال کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مختلف سلاطین وحکمرانوں کے نام اسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے دعوتِ اسلام کے خطوط روانہ فرمائے۔

جہاد کے مراحل وآداب

(۱) کفار سے قتال اصل مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی کو ترک کر کے اسلام کو گلے لگالیں، لہٰذا پہلے مناسب انداز سے ان کو اسلام سے روشناس کرا کے اسلام کی ترغیب و دعوت دیں، اگر وہ قبول کرلیں تو اب ان کی زمین اور جان ومال وغیرہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، تمام حقوق واحکام میں وہ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح ہیں۔

(۲) اسلام کی دعوت کے باوجود وہ مخالفت اور انکار ودشمنی پر ڈٹے رہیں، تو مسلمانوں کو چاہئے کہ بصورت قدرت مسلم حکمران کی اجازت سے قتال کے لئے آگے بڑھیں، اور دشمن جزیہ (ایک متعینہ عوض) دے کر اسلامی حکومت کے تابع رہنے پر راضی ہوں تو اسے قبول کرلیں۔

(۳) اسلام اور جزیہ دونوں کا انکار کر بیٹھیں تو آخری درجہ میں ان سے قتال کیا جائے۔ (دیکھئے سورہ توبہ: ۲۹)

جزیہ: اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ (عیسائی) اور مجوس (آتش پرست) اور صحفِ ابراہیم علیہ السلام اور زبور داود علیہ السلام کو ماننے کے جو دعویدار ہیں، ان سے جزیہ قبول کیا جائے گا۔

دیگر کفار مثلاً: ملاحدہ، بت پرست وغیرہ سے جزیہ قبول نہ کریں گے، ان سے صرف اسلام قبول کیا جائے گا، ورنہ پھر قتل کیا جائے گا۔

جہاد پر مرتب آثار

قیدی: جہاد میں کفار مسلمانوں کی قید میں آجائیں تو بچے اور عورتیں محض قید ہوتے ہی غلام باندی بن جائیں گے۔ بالغ مردوں کے متعلق امام (بادشاہ) کو حق ہوگا کہ مندرجہ ذیل چار امور میں سے جو مسلمانوں کے حق میں بہتر شکل ہو، اسے اختیار کرے۔

قتل کرنا، مفت آزاد کرنا، فدیہ لے کر آزاد کرنا یا غلام بنالینا۔ (دیکھئے سورہ محمد، آیت: ۴، اور الانفال، آیت: ۶۷) نیز صحیحین وغیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیدیوں کو غلام باندی بنانا مروی ہے۔

جو قید ہونے سے قبل اسلام قبول کرلے، گو شکست کے بعد ہو، تو وہ قتل، اور غلامی سے محفوظ ہوگیا، نیز اس کا مال اور نابالغ اولاد بھی محفوظ ہوگئے۔ نابالغ بچوں کو درج ذیل تین اسباب میں سے کسی ایک سبب کی وجہ سے مسلمان شمار کیا جائے گا: والدین میں سے کوئی ایک اسلام قبول کرلے، والدین کے بغیر تنہا اسے کوئی مسلمان قید کرلے، دار الاسلام میں بطور لقیط مل جائے۔

غنیمت

جو مال اہلِ حرب سے قہراً حاصل ہو، اسے غنیمت کہا جاتا ہے، منقولہ ہو یا غیر منقولہ، نیز دورانِ جہاد حاصل ہو یا ان کے فرار ہونے

کے وقت (جو چیز منتقل نہ کی جاسکے اسے غیر منقولہ اور جو منتقل کی جاسکے اسے منقولہ کہا جائے گا۔ زمین، مکان اور باغ وغیرہ غیر منقولہ اور سونا، چاندی، برتن، کپڑے اور جانور وغیرہ منقولہ اشیاء ہیں)

غنیمت کا حکم: غنیمت کے پانچ حصّے کرنا واجب ہے، جن میں سے چار حصّے مقاتلین اور لڑنے والوں میں تقسیم کئے جائیں گے، آپ ﷺ کے دور میں پیدل مجاہد کو ایک حصّہ اور شہسوار کو تین حصّے ملتے تھے، جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ کی کیفیت اور جنگی آلات کی تبدیلی کی وجہ سے عموماً اس تقسیم کے نفاذ کا سوال نہیں آئے گا، لہٰذا ایک پیدل اور شہسوار کے درمیان تفاوت کا اندازہ لگا کر ادنیٰ طریقہ پر لڑنے والے کو اعلیٰ کے مقابلہ میں ایک تہائی ۱۳ حصہ دیا جائے۔ بہر حال اس میں سے حکومت کو اپنے لئے کوئی حصّہ روک لینا جائز نہیں ہے، غنیمت کی مذکورہ تقسیم کا استحقاق اسی مجاہد کو ہوگا، جس میں یہ شرائط موجود ہوں: اسلام، بلوغ، عقل، آزادی، مذکر ہونا، اگر ان میں سے ایک بھی شرط مفقود ہو، تو امام ان کو اپنی صوابدید سے تقسیم سے قبل ہی کچھ حصّہ دے دے، (جسے رَضۡخ کہا جاتا ہے)، اور اس کی مقدار ایک پیدل غازی کے حصّے سے کم ہو۔

خُمُس (پانچواں حصّه): غنیمت کے پانچویں حصّہ کے مزید پانچ حصّے کر کے آپ ﷺ، ذَوِی القُرۡبیٰ (آپ ﷺ کے رشتہ دار) یتیم، مساکین اور مسافروں پر تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ سورہ انفال، آیت: ۴۱ میں بیان فرمایا۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کا حصّہ مسلمانوں کے مصالح پر صرف کیا جائے گا۔ ذوی القربی سے بنو ہاشم اور بنو المطلب مراد ہیں، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے واضح ہے، یتیم سے وہ نابالغ مراد ہے، جس کا والد نہ ہو، بالغ ہونے کے بعد یتیم نہ کہلائے گا (ابو داود) اور مسافر سے وہ مسافر مراد ہے جس کے پاس خرچ نہ ہو اور وہ اپنے مال سے دور دراز علاقہ میں ہو۔

سَلَب: کسی حربی کو قتل کیا جائے تو اس کے ساتھ جو مال اور ہتھیار وغیرہ موجود ہو، اسے سَلَب کہا جائے گا، جو مجاہد خطرات میں کود کر حربی کو قتل کرے، اس کا سلب اس مجاہد کا حق ہے، اسے عام غنیمت کی تقسیم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔

فَیۡئٌ

کافروں اور دشمنوں سے جو مال بغیر قتال اور لڑائی کے ملے، اسے فیئ کہا جاتا ہے۔

حکم: فئی میں سے خمس (پانچواں حصہ) جدا کر کے انھیں حضرات پر تقسیم کریں گے، جن پر غنیمت کا خمس تقسیم کیا جاتا ہے، بقیہ چار حصّے امت مسلمہ کے مختلف مصالح پر صرف کیا جائے گا۔

جِزۡیَہ

اہلِ کتاب اور جو ان کے حکم میں ہیں، یہ لوگ اسلامی حکومت کی تابعداری اختیار کریں، تو اس حفاظت کے صلہ میں جو رقم بیت المال کو ادا کریں گے اسے جزیہ کہا جاتا ہے۔

شرائط: کسی سے جزیہ لینے کے شرائط حسبِ ذیل ہیں:

(۱) جزیہ دینے والا یہودی، نصرانی (عیسائی) یا مجوسی (آتش پرست) ہو، اسی طرح جن کا یہ دعوی ہو کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں یا حضرت داود علیہ السلام کے زبور پر عمل کرتے ہیں، ان سے بھی جزیہ لے سکتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے ذمہ دار اور ان کے درمیان باقاعدہ ایجاب و قبول کے ساتھ عقد جزیہ طے پائے۔

(۳) جزیہ کی مقدار، اور فقراء و مالداروں کے اعتبار سے اس کا تناسب واضح کیا جائے۔

(۴) کسی مخصوص مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔

جزیہ دینے والے کے شرائط: عقل، بلوغ، آزادی، مرد ہونا اور اہلِ کتاب ہو یا ان کے حکم میں ہو۔ لہٰذا عورتوں، غلاموں، بچوں اور پاگلوں پر جزیہ عائد نہ ہوگا۔

مقدار: جزیہ کی کم سے کم مقدار ایک دینار سالانہ ہے، اگر متوسط طبقہ کا شخص ہو تو بہتر ہے کہ اس پر دو دینار اور مالدار شخص پر چار دینار سالانہ طے کرلے۔ اگر یہ لوگ ایک دینار سے زائد پر راضی نہ ہوں، تو ایک دینار پر طے کرسکتا ہے، کیونکہ یہی واجب مقدار ہے۔ جزیہ کی مقدار کے علاوہ مزید گذرنے والوں کی ضیافت و مہمان نوازی کی شرط بھی ان پر عائد کرسکتے ہیں (موطا، ابوداود اور بیہقی وغیرہ میں یہ تفصیلات مروی ہیں)

عقد جزیہ پر مرتب آثار

عقد جزیہ کی وجہ سے ذمی لوگوں پر درج ذیل چار امور کی پابندی لازم ہے۔

(۱) جزیہ کی طے شدہ رقم کی ادائیگی۔

(۲) اسلامی احکام کا ان پر نفاذ، جس کے وہ خود قائل ہوں، گرچہ ضمناً ہو، مثلاً زنا کی حرمت، اسی لئے آپ ﷺ نے زنا کرنے والے ایک یہودی مرد و عورت کو سنگسار کروایا (صحیحین)۔ اسی طرح سودی لین دین، فواحش کے ارتکاب اور دیگر فسق و فجور کے اسباب سے ان کو روکا جائے گا، کیونکہ وہ ان امور کی حرمت کے قائل ہیں۔ تاہم شراب نوشی کو وہ اپنی شریعت میں حرام نہیں سمجھتے، لہٰذا اس میں ان پر ہمارے احکام کا نفاذ نہ ہوگا، لیکن اگر وہ ہمارے قاضی کے پاس مسئلہ لے آئیں، تو قاضی شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

(۳) دینِ اسلام کے خلاف بات نہ کریں، اگر قرآن مجید، یا آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کریں، یا دین اسلام کو بدنام کریں، تو تعزیری سزا دی جائے گی، اگر ان امور کی وجہ سے معاہدہ کے فسخ کی شرط لگائی ہو، تو معاہدہ فسخ ہوجائے گا۔ اگر اندرونی طور پر اسلام کے خلاف ان کے کسی قولی یا فعلی ریشہ دوانی پر مطلع ہوں، تو اس عقد ذمہ کو ختم کردیں گے، تاہم ان کے عقیدہ کے اعتبار سے ان کی جو گفتگو ہوگی، اس کی وجہ سے عقد ذمہ ختم نہ ہوگا، گو اس کا بطلان یقینی ہو۔

(۴) کوئی ایسا کام نہ کریں، جو مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہو، مثلاً: کفار کے جاسوس کو پناہ دینا، اہل حرب کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ایذا رسانی کی کوشش وغیرہ۔

اگر وہ طے شدہ جزیہ کی رقم نہ دیں، گو ایک دینار سے زائد مقدار ہو، یا اللہ و رسول کے متعلق بدگوئی بدکلامی کریں، یا مسلمانوں کے خلاف حربیوں کا ساتھ دیں، تو عقد جزیہ ختم ہوگا۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

اہلِ کتاب کو ذمی بنائیں، توان کے متعلق مسلمانوں کو درج ذیل چار امور کی پابندی لازم ہے۔

(۱) ان کے ساتھ جنگ سے باز آجانا، کیونکہ مسلم کی حدیث میں اس کا حکم موجود ہے۔

(۲) ان کے جان ومال کی حفاظت، کوئی بھی مسلم یا غیر مسلم ان پر یا ان کے مال پر ظلماً حملہ آور ہو، تو اس کا دفاع کرنا واجب ہے، جیساکہ حضرت عمرؓ نے آخری وقت وصیت فرمائی تھی۔(بخاری شریف)

(۳) ان کے عبادت خانوں اور دینی شعائر اور شراب وخنزیر سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، جب تک کہ وہ ان امور کا اظہار نہ کریں، یا اس پر فخر نہ کریں۔

(۴) مسلمانوں کے حق میں اس عقد ذمہ کا لزوم، یعنی ایک مرتبہ جب کسی کو ذمی بنالیا تو امام یا کوئی دوسرا شخص اس عقد کو ختم نہیں کرسکتا، جب تک گذشتہ اسبابِ فسخ میں کوئی سبب نہ پایا جائے۔

(الفقہ المنہجی ۱۱۵/۸-۱۴۳، فتح الوہاب مع الجمل ۱۷۹/۵-۲۲۸، الاقناع مع البجیرمی ۲۱۰/۴-۲۴۶، مغنی المحتاج ۲۰۸/۴-۲۳۶، تحفہ مع الحواشی ۳/۱۲-۱۰۱)

مصالحت اور امان دینا

مصالحت: اہل حرب سے مقررہ مدت تک جنگ بندی کی صلح کو ھُدنہ (مصالحت) کہا جاتا ہے۔ اجماع سے قبل قرآن مجید کی آیات (سورہ توبہ: ۱، وسورہ انفال: ۶۱) اور صلح حدیبیہ کا واقعہ اس کی مشروعیت کے واضح دلائل ہیں۔

اِستِئمَان (امان وپناہ دینا): کوئی حربی کسی بھی مسلمان سے امان طلب کرے، تو اسے استئمان کہیں گے۔ کسی بھی مسلمان نے کسی دشمن کو امان دی، خواہ دینے والا حاکم ہو یا رعایا کا کوئی فرد، مذکر ہو یا مؤنث، تو یہ امان معتبر ہوگا، اور اس کی وجہ سے اس کی جان محفوظ ہو جائے گی، اب کسی بھی مسلمان کو اسے کسی طرح کی تکلیف پہنچانا حرام ہے (دیکھئے سورہ توبہ، آیت: ۶)

فرق: مصالحت ایک اجتماعی صلح ہے، جو فریقین کے ذمہ داروں کے ذریعہ طے پاتی ہے، جبکہ امان انفرادی واجتماعی دونوں طریقہ سے ہوسکتی ہے، اور حاکم ورعایا ہر کوئی اسے انجام دے سکتا ہے۔ نیز مصالحت کی وجہ سے جنگ کا سلسلہ رک جاتا ہے، جبکہ بعضوں کے امان کے باوجود دیگر حربیوں سے جنگ جاری رہ سکتی ہے۔

مصالحت کا حکم: (۱) اگر دشمن مصالحت کا مطالبہ کریں، تو امامِ وقت کو احتیاط سے اور چوکنا رہتے ہوئے اسے قبول کرنا لازم ہے۔ اس کی مدت چار ماہ سے زائد رکھنا جائز نہیں ہے (سورہ توبہ: ۲)

(۲) اگر بغیر کسی مصلحت کے مسلمان صلح کی طرف پیش قدمی کریں تو یہ صلح منعقد ہی نہ ہوگی۔ اگر مسلمانوں میں کمزوری کی وجہ سے یہ پیشقدمی ہو، تو زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت کے لئے صلح کی اجازت ہے۔ جیساکہ صلح حدیبیہ میں ہوا تھا۔ (صحیحین وغیرہ) اگر مسلمانوں کی کمزوری کی بجائے کوئی دوسری مصلحت ہو، مثلاً دشمنوں کے اسلام قبول کرنے کی توقع، یا جزیہ دینے پر رضامندی، تو اس صورت میں چار ماہ سے زائد مدت کے لئے صلح کی اجازت نہ ہوگی۔ (دیکھئے سورہ توبہ، آیت: ۲)

استئمان کا حکم: اگر امن طلب کرنے والے کے حق میں یا مسلمانوں کے حق میں اس میں مصلحت ہو، تو امن دینا واجب

ہے۔(دیکھئے سورہ توبہ:۶) کسی بھی مسلمان کا امان دینا معتبر ہے۔(ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد) فتح مکہ کے وقت حضرت اُم ہانی نے ایک شخص کو پناہ دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معتبر قرار دیا۔(صحیحین) کوئی ذمی کسی غیر مسلم دشمن کو پناہ دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

تنبیہ: ایک مسلمان کسی حربی کو اس کے مطالبہ کے بغیر پناہ نہیں دے سکتا۔ ذمہ دار کو پناہ کا علم ہونا اور اسے معتبر قرار دینا ضروری ہے۔ اگر اسے علم نہ ہو، یا علم تو ہو لیکن کسی معقول سبب اور خطرہ کی وجہ سے (مثلاً وہ شخص دشمن کا جاسوس ہو) وہ اس پناہ کو لغو اور کالعدم قرار دے، تو اس پناہ کا اعتبار نہ ہو گا۔ اگر تحقیق کے باوجود اس شخص میں امان کے خلاف کوئی سبب نہ ہو، تو حاکم اور ذمہ دار کو اسے لغو قرار دینے کی اجازت نہیں، بلکہ اس کے لئے امان کا اعلان کرنا واجب ہے، تاکہ تمام مسلمانوں پر یہ لاگو ہو جائے۔ جسے امان دی جائے، کسی بھی مسلمان کو اسے کسی بھی طرح کی تکلیف دینا جائز نہیں ہے۔ جب امان کی مدت ختم ہو، یا پہلے ہی وہ خود امان سے نکل جانا چاہے، تو حاکم پر لازم ہے کہ اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دے، یعنی جہاں اس کی جان ومال پر کوئی تعدی نہ کرے (دیکھئے سورہ توبہ:۶) جب تک اس شخص کی طرف سے کوئی معقول سبب نہ پایا جائے، امن دینے والے شخص کو امن سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔

مصالحت کے آثار: جن لوگوں سے مصالحت ہو، کسی بھی طرح ان کی ایذاء رسانی سے رکنا واجب ہے۔ دوسرے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی حفاظت وتعاون واجب نہیں ہے۔ اگر کفار مصالحت کو ختم کر دیں، مثلاً اس کی صراحت کر دیں، یا جنگ شروع کر دیں، یا ہمارے دشمنوں کو ہمارے راز سے آگاہ کریں، یا ان کے ہاتھوں مسلمان کا قتل ہو، تو مصالحت ختم ہو جائے گی۔ اگر ان کی طرف سے کوئی خلاف ورزی نہ ہو، تو مقررہ مدت کے اختتام کے ساتھ یہ مصالحت بھی اختتام پذیر ہو گی۔ اگر امامِ وقت کو ان کی جانب سے خیانت کے آثار ظاہر ہوں، اور خطرہ محسوس ہو، لیکن باقاعدہ کوئی خیانت ثابت نہ ہو، تو ان کے سامنے علانیہ وضاحت کر کے اس عقدِ مصالت کے توڑنے کا اعلان کر دے، تمام شرائط وارکان کے ساتھ عقد مصالحت پائی جائے تو یہ ایک لازم عقد ہو گا، لہٰذا بغیر سبب کے مدت کی تکمیل تک اسے توڑنا جائز نہ ہو گا۔(دیکھئے سورہ توبہ:۷، سورہ انفال ۵۶-۵۷)

عقد مصالحت میں طے شدہ تمام شرائط کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہے، سوائے ان شرائط کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے، ایسے شرائط کی پابندی جائز نہیں ہے، بلکہ اس عقد میں ان شرائط کا داخلہ ہی ناجائز ہے۔(الفقہ المنہجی ۱۴۴/۸-۱۵۱)

ذبح اور شکار

آیت: ”حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ“ (المائدۃ:۳)

ترجمہ: ”تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر (سور) کا گوشت، اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو، اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، اور جو کسی ضرب (مار) سے مر گیا ہو، اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو، اور جو کسی کے سینگ مارنے (اور ٹکر) سے مرا ہو، اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو، لیکن (ان مذکورہ جانوروں میں سے جسے اس حال میں پالو کہ اس میں زندگی کے آثار موجود ہوں اور پھر) اسے تم (شرعی طریقے سے) ذبح کر ڈالو، تو حرام نہیں، اور جو آستانوں (پرستش گاہوں) پر ذبح کیا گیا ہو (وہ بھی حرام ہے)“

تَذْكِيہ: جس جانور کو حلق یا چنبر گردن (سینے کے اوپر ہار پڑنے کی جگہ) میں ذبح کر سکتے ہو، اسے ان مقامات میں ذبح کرنا، ورنہ

شکار کی طرح بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کر کے مارنا تذکیہ کہلاتا ہے۔ مچھلی و ٹڈی کے علاوہ کوئی ماکول جانور بغیر تذکیہ کے حلال نہیں۔

ذبح: گردن میں کاٹ دینا، جس سے موت واقع ہو، خواہ شرعی شرائط موجود ہوں، یا نہ ہوں، ذبح کہلاتا ہے (ذبح کرنے والے کو ذابح اور جس جانور کو ذبح کیا جائے اس ذبیح و مذبوح کہیں گے)

حکمت: حیوان کے حلال ہونے کے لئے اس کے تذکیہ کی شرط دراصل ایک تعبدی حکم ہے، گو اس میں بعض حکمتیں بھی ہیں: مثلاً تمام ملتوں میں مردار، نجس اور حرام ہیں، لہٰذا نجس و غیر نجس حیوانات میں تفریق ضروری ہے، لہٰذا شریعت نے تذکیہ کو اس کا بنیادی پہلو و فرق قرار دیا ہے، نیز شریعتِ اسلامیہ میں خون کے نقصانات کی وجہ سے وہ نجس اور اس سے پرہیز واجب ہے۔ اور شرعی تذکیہ حیوان کو اس خون سے پاک کرتا ہے۔

ذبح کے ارکان

(۱) ذبح کرنا: جس حیوان کو باقاعدہ ذبح کر سکتے ہوں، (خواہ پالتو ہو یا وحشی)، اس کے حلقوم (سانس کی نالی) اور مَرِیْ (غذا کی نالی) کو مکمل کاٹنا ضروری ہے، اگر ان کا کچھ حصہ بھی کٹنے سے رہ جائے، یا کچھ حصہ کٹنے کے بعد جانور حرکت مذبوح کی حالت کو پہنچ جائے، پھر کچھ تاخیر سے بقیہ حصہ کاٹے، تو تو جانور حلال نہ ہو گا، اگر کچھ حصہ کٹنے کے بعد چھری اٹھائے اور فوراً دوبارہ پھیرے، یا چھری گر جائے اور فوراً اٹھا کر ذبح مکمل کرے، یا دھار کم ہونے کی وجہ سے وہ چھری رکھ کر فوراً دوسری چھری سے ذبح مکمل کرے، تو جانور حلال ہے۔

حلقوم و مری اور وَدَجَیْن (گردن کی دونوں رگیں) سے زائد کاٹنا مکروہ ہے۔ اگر گدی کی جانب سے یا گردن کے کنارے سے، یا کان میں چھری داخل کر کے ذبح کرے تو گنہگار ہو گا، کیونکہ جانور کو زائد تکلیف پہنچا رہا ہے، اب اس طرح ذبح کرتے وقت حلقوم اور مری کاٹنا شروع کرتے وقت جانور میں حیات مستقرہ ہو، تو وہ حلال ہو گا، گو اس کے اوپر کی چمڑی نہ کٹے، بعد میں حیات مستقرہ باقی نہ رہے تو حرج نہیں، اگر حلقوم و مری تک پہنچنے سے قبل ہی حیات مستقرہ ختم ہو، یا ان کو کاٹے ہی نہیں (اور جانور مر جائے) تو حلال نہ ہو گا۔

جسے باقاعدہ ذبح کرنا ممکن نہ ہو (مثلاً شکار، یا جو پالتو جانور بدک کر وحشی بن جائے اور ہاتھ نہ آئے یا کنویں میں گر جائے اور باقاعدہ ذبح نہ ہو سکے) اسے کسی بھی عضو کو زخمی کر کے قتل کر دینا کافی ہے، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔ (جسے باقاعدہ ذبح کر سکتے ہیں اسے مَقْدُوْر عَلَیْہ اور جسے باقاعدہ ذبح نہیں کر سکتے اسے غیر مقدور علیہ کہتے ہیں)

ذبح میں (فی الجملہ) قصد کا پایا جانا شرط ہے، لہٰذا چھری ہاتھ سے جانور کے گلے پر گر جائے اور گلا کٹ جائے، یا جانور چھری سے گردن رگڑ کر کاٹ لے، یا کوئی شکاری جانور بذاتِ خود جا کر شکار کرے، یا تیر شکار کے علاوہ کسی نشانہ پر یا اس کی قوت کو آزمانے کے لئے چلائے اور اس سے کوئی شکار مر جائے، تو ان صورتوں میں جانور حرام ہے۔ اگر کسی شکار پر پتھر یا غیر ماکول جانور سمجھ کر تیر چلائے، یا ہرن وغیرہ کے غول میں تیر چلائے اور کسی ایک کو لگ جائے، یا ایک کے ارادہ سے چلائے اور دوسرے کو لگے، تو ان صورتوں میں جانور حلال ہے، کیونکہ صحیح قصد پایا گیا، اس کے مذکورہ گمان کا کوئی اعتبار نہیں۔

سنتیں: (۱) اونٹ کو کھڑا کر کے بایاں گھٹنا باندھ کر گردن کے نچلے حصہ میں نحر کرے، کیونکہ اس کی لمبی گردن کے اعتبار سے اس صورت سے روح نکلنے میں سہولت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافّ'' (حج: ۳۶) (پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یعنی تین پیروں پر کھڑا کر کے'' امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس

طرح اس کے بدک کر بھاگنے کا خطرہ ہو تو بٹھا کر نحر کرے، نہ کہ لٹا کر، شتر مرغ وغیرہ لمبی گردن والے دیگر حیوانات کو بھی نحر کرے۔

(۲) گائے بیل، بکری، نیل گائے اور گھوڑے جیسے حیوانات کو بائیں کروٹ لٹا کر حلق میں یعنی گردن کے اوپری حصہ میں ذبح کرے، اور اس کے دائیں پیر کے علاوہ بقیہ تینوں پیر باندھے، اگر اونٹ کو ذبح یا گائے وغیرہ کو نحر کرے، تو خلافِ اولیٰ ہے، مکروہ نہیں"۔

(۳) وَدَجَیْن یعنی گردن کے دونوں طرف محیط دونوں رگوں کو بھی کاٹے۔ (۴) چھری تیز کرلے (مسلم) (۵) جانور کا رخ یعنی ذبح کی جگہ کو قبلہ رو کرے اور خود بھی قبلہ رو ہو، (۶) ذبح یا شکار کے وقت صرف ایک اللہ کا نام لے (یعنی بسم اللہ پڑھے) اکمل بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا ہے، عمداً بسم اللہ کا ترک مکروہ ہے، لیکن ذبح حلال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے (دیکھئے سورہ مائدہ، آیت: ۵) حالانکہ وہ بسم اللہ نہیں پڑھتے۔ نیز ذابح کے بسم اللہ پڑھنے کے بارہ میں شک کی صورت میں آپ ﷺ نے اللہ کا نام لے کر کھانے کی اجازت دی (بخاری ابوداود، نسائی، ابن ماجہ) اگر یہ شرط ہو تا تو شک کی صورت میں حلال نہ ہوا ہوتا۔

آیت: "فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ" (الانعام: ۱۱۸)

ترجمہ: "جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے، اس میں سے کھاؤ، اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو"۔

جس آیت میں اللہ کا نام نہ لیا ہو تو کھانے کی ممانعت وارد ہے اور اُسے فسق قرار دیا ہے، تو آیت کے سیاق کی روشنی میں اس سے بتوں کے لئے ذبح شدہ جانور مراد ہیں، کیونکہ ایک دوسری آیت کی روشنی میں یہی فسق ہے، نیز اس پر اجماع ہے کہ بغیر بسم اللہ کے مسلمان ذبح کرے، تو اس کا کھانا فسق نہیں ہے۔

صحیحین میں رافع بن خَدِیجؓ کی مرفوع حدیث میں بوقتِ ذبح اور عدی بن حاتم کی مرفوع حدیث میں بوقت شکار بسم اللہ پڑھنے کا ذکر موجود ہے۔ (اگر شکار کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو) تیر لگنے کے وقت یا شکاری جانور کا شکار پر حملہ آور ہونے اور کاٹنے کے وقت بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔ امام رویانیؒ نے مچھلی اور ٹڈی کے شکار کے وقت بھی اسے مستحب قرار دیا ہے۔

ذبح کے وقت بسم اللہ واسم محمد یا باسمِ محمد یا بسم اللہ و محمدِ رسول اللہ کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں تشریک کا ابہام ہے، البتہ ذبیح حلال ہوگا۔ اگر تشریک کا ارادہ ہو، تو کفر ہوگا، اور ذبیحہ حرام ہوگا اور اگر اس ارادہ سے کہے کہ محمد ﷺ کے اسم گرامی سے تبرک حاصل کر رہا ہوں، تو مکروہ ہے، اور ذبیحہ حلال ہے۔

کسی اہل کتاب کا مسیح کے لئے ذبیحہ، اور مسلمان کا مثلاً محمد یا کعبہ کے لئے ذبیحہ حلال نہیں، اگر کعبہ کے لئے بیت اللہ ہونے کی نسبت سے، یا رسول کے لئے اللہ کا رسول کے لئے ہونے کی نسبت سے بطورِ تعظیم ذبح کرے تو جائز ہے۔ (اگر کعبہ کا استحقاق سمجھتے ہوئے ذبح کرے تو حرام، اور بطورِ عبادت و تعظیم ادا کرے تو کفر ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ بوقت ذبح مطلقاً (یعنی بغیر کسی ارادہ کے) صرف محمد نام لینا، یا عطف کے ساتھ لینا حرام ہے، اور تبرکاً حرام نہیں، اور ان دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال ہوگا، اگر مطلقاً آپ کے لئے ذبح کا قصد ہو، تو یہ عمل اور ذبیحہ دونوں حرام ہیں، اور تعظیم وعبادت کے قصد سے ہو تو کفر ہے، اور ذبیحہ حرام ہے۔

بادشاہ سے ملاقات کے وقت اس سے تقرب کے لئے، یا جن سے تقرب کے لئے ذبح کرے تو ذبیحہ حلال نہیں، اگر بطور تعظیم وعبادت ذبح کرے، تو کفر ہے۔ اگر بادشاہ کی آمد وغیرہ پر خوشی کے اظہار کے طور پر، یا کسی ناراض کو یا جن کو راضی کرنے کے لئے اللہ سے تقریب کے قصد سے ذبح کرے، تاکہ وہ ان کے شر سے محفوظ رکھے، تو یہ حرام نہیں، کیونکہ اس میں غیر اللہ کا قصد نہیں پایا جا رہا ہے۔

(۷) آپ ﷺ پر درود و سلام پڑھے، کیونکہ اس وقت اللہ کا ذکر مشروع ہے۔ لہٰذا نبی کا ذکر بھی مشروع ہو گا، جیسا کہ اذان و نماز میں۔

(۸) ذبح سے قبل جانور کے سامنے (پینے کے لئے) پانی پیش کرے، پھر نرمی سے لٹائے، اور چھری کو قوت اور تیزی سے پھرائے، ذبح کے بعد مرنے تک جانور کو ایسا ہی چھوڑ دے، جانور کے سامنے چھری تیز نہ کرے، ایک کو دوسرے کے سامنے ذبح نہ کرے۔

(۲) **ذابح**: ذبح کا دوسرا رکن ذابح یعنی ذبح کرنے والا ہے، ذابح، نحر کرنے والے اور شکار وغیرہ کرنے والے کے شرائط حسبِ ذیل ہیں:

۱- اس کے مذہب کی عورتوں سے ہمارا نکاح حلال ہو، یعنی مسلمان ہو، یا ایسا اہل کتاب جس کی تفصیل نکاح کے شرائط میں گذر چکی، مذکر یا مؤنث، آزاد ہو یا غلام باندی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ"۔ (مائدہ:۵) (اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے) مجوسی اور دیگر غیر مسلموں کا ذبیحہ حلال نہیں۔

شکار کرنے والا اور جس جانور کو باقاعدہ ذبح نہیں کر سکتے، اس پر حملہ کرنے والا بینا ہو، اگر نابینا شکار کرے تو حلال نہ ہو گا، نابینا غیر ممیز و پاگل، اور مدہوش (جو نشہ میں ہو اس) کا ذبح کرنا مکروہ ہے، کیونکہ ان میں فی الجملہ قصد وارادہ موجود ہے۔ جو نیند میں ہو، اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔

جس جانور کے ذبح وغیرہ میں دو آدمی شریک ہوں، جن میں ایک کا ذبیحہ حلال اور دوسرے کا حرام ہے تو یہ ذبیحہ حرام ہے۔ مثلاً ایک مسلم اور ایک مجوسی مل کر بکری کے گردن پر چھری چلائیں یا دونوں تیر یا شکاری جانور کے ذریعہ کوئی جانور شکار کریں، جس کا ذبیحہ حلال ہے اس کا تیر اگر پہلے لگ جائے اور شکار کو قتل کرے، یا حرکتِ مذبوح تک پہنچائے، تو حرام نہ ہو گا (جیسا کہ مسلمان بکری ذبح کرے، پھر مجوسی اسے چیرے) اگر اس کے برعکس ہو یا دونوں ساتھ زخمی کریں، یا کچھ پتہ نہ چلے، یا مرتب زخمی کریں، لیکن کسی ایک کا زخم اسے نہ مارے، پھر وہ شکار مر جائے، تو حرام ہو گا۔

(۳) **ذبیح**: ذبح کا تیسرا رکن ذبیح ہے۔ ذبیح کا ماکول حیوان ہونا شرط ہے (یعنی جس کا گوشت کھانا حلال ہو) جس میں ابتداءً ذبح کے وقت حیاتِ مستقرہ موجود ہو، ورنہ وہ حلال نہ ہو گا، کیونکہ وہ مردار ہے، البتہ بیمار جانور کو آخری رمق میں ذبح کرے، تب بھی حلال ہے، جبکہ کوئی ایسا فعل یعنی زخم وغیرہ نہ پایا جائے جس کی طرف ہلاکت کو منسوب کریں۔

حیات مستقرہ: یعنی روح حیوان کے بدن میں ہو، اور اختیاری حرکت پائی جائے، اس کی علامت خون کا بہنا اور شدید حرکت کرنا (تڑپنا) ہے، شدید حرکت ہو اور خون نہ بہے، تو یہ بھی کافی ہے۔

حیات مستقرہ کا یقین یا غالب گمان شرط ہے۔ اگر اس کے وجود میں شک ہو تو حرام ہے۔ حیاتِ مذبوح (حرکت مذبوح) یعنی جانور کی وہ کیفیت جس میں دیکھنے سننے کی قوت اور اختیاری حرکت باقی نہ رہے۔

کسی بکری پر چھت گر پڑے، یا درندہ اسے زخمی کر دے، اور اسے ذبح کر دیا جائے، تو حلال ہے، جب کہ اس میں حیات مستقرہ موجود ہو، گو کچھ دیر کے بعد اس کی موت یقینی ہو، اگر حیاتِ مستقرہ نہ ہو، تو حلال نہ ہو گا۔

غیر ماکول جانور کو ذبح کرنا حرام ہے، مثلاً اپاہج گدھا، گو راحت کی نیت سے ہو اگر اضطرار (بالکل مجبوری) کی صورت میں کسی غیر ماکول کو کھانے کی نوبت آئے، تو اسے ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔

غیر مقدور علیہ پر تیر وغیرہ چلا کر اسے زخمی کر دے، پھر اسے ذبح نہ کرنے میں اس کی کوئی کوتاہی نہ ہو، اور وہ مر جائے، تو بالاجماع

حلال ہے۔ مثلاً حیوان دو حصوں میں کٹ جائے، فوراً مارنے والے کا کاری زخم لگ جائے اور اس کا ایک عضو جدا ہو جائے، زخم معمولی ہو، جس کی وجہ سے حیوان بے بس ہو کر رکا نہیں، لہٰذا دوبارہ زخمی کیا اور فوراً مر گیا، یا حیوان کو زندہ پاکر اسے ذبح کرے، یا بلا تقصیر کوتاہی ذبح نہ ہو پائے، مثلاً اسے قبلہ رو کر رہا تھا، یا چھری نکال ہی رہا تھا اور جانور ذبح کے امکان سے پہلے ہی مر جائے، تو ان تمام صورتوں میں وہ جانور حلال ہے۔ جیسا کہ ایک بدکے اور بپھرے ہوئے اونٹ کو تیر سے شکار کرنے کے متعلق صحیحین میں موجود ہے۔

اگر حیوان میں تیر وغیرہ لگنے کے بعد حیات مستقرہ نہ ہو، تو گلے میں چھری پھیر کر ذبح کرنا مستحب ہے۔ اگر نہ پھیرے اور وہ مر جائے، تب بھی حلال ہے، کیونکہ اس حالت میں (مزید) تذکیہ ضروری نہیں۔ حیوان کے زخمی ہونے کے بعد شکاری کا دوڑنا شرط نہیں ہے، اگر اس کے محلِ ذبح کی تلاش میں رہا، یا جانور الٹا گرا اور اسے سیدھا کرنا پڑا، اور وہ (ذبح سے قبل) مر گیا، تو حلال ہے۔

اگر جانور کو زخمی کرکے اس کا ایک عضو جدا کر دے، لیکن زخم فوراً قتل کرنے والا نہ ہو، پھر دوسرے حملہ اور زخم سے اسے مار ڈالے، یا ذبح کا موقع ملا اور ذبح کر دے، یا ذبح کا موقع ہی نہ ملا اور وہ مر گیا تو جانور حلال ہو گا، لیکن جدا شدہ عضو حرام ہو گا، کیونکہ وہ ایک زندہ کا جدا شدہ عضو ہے۔

اگر اپنی کوتاہی سے زخمی جانور کو ذبح نہ کرے (اور وہ مر جائے) تو حلال نہ ہو گا۔ مثلاً: پاس چھری ہی نہ ہو، یا کوئی چھری چھین لے، یا چھری غلاف میں پھنس جائے کہ نکلے ہی نہیں، یا معمولی زخم کے ذریعہ اسے بے بس کر دے پھر دوبارہ زخمی کرکے اسے مار دے، تو ان صورتوں میں حلال نہ ہو گا، اگر چھری کا غلاف عادت کے مطابق اور مناسب ہو، تو تنگ نہ ہو، لیکن اتفاقاً پھنس جائے، تو امام بلقینی نے حلت کو ترجیح دی ہے۔

جس حیوان کو ذبح کرنا متعذر و دشوار ہو، مثلاً کسی کنویں میں گر جائے، اور حلقوم ومری، کا کاٹنا ممکن نہ ہو، تو اسے نیزہ یا تلوار وغیرہ کسی بھی ہتھیار سے مُہلِک زخم پہنچا کر مار دے، تو وہ حلال ہو گا، کیونکہ یہ بِدکے ہوئے اونٹ کے مانند ہے، (جس کو اس طرح مارنے سے اس کی حلت صحیحین کی روایت سے ثابت ہے) کسی شکاری جانور کے ذریعہ اسے قتل کرنے سے وہ حلال نہ ہو گا۔ اگر ایسے جانور کو با قاعدہ ذبح کرنا ممکن ہو، تو وہی ضروری ہے، کسی بھی طرح قتل کر دینے سے وہ حلال نہ ہو گا۔

اگر ایک اونٹ پر دوسرا اونٹ گرے، اور اوپر کے اونٹ میں نیزہ گھونپا، جو نیچے کے اونٹ کو بھی لگے اور اس سے وہ مر جائے، تو دونوں حلال ہیں، گو اسے دوسرے اونٹ کا علم نہ ہو، اگر اوپر کے اونٹ کے بوجھ سے مر جائے، یا شک ہو کہ نیزہ سے مرا یا بوجھ سے، تو حلال نہ ہو گا۔

(۴)**ذبح کا آلہ:** آلہ ایسا دھار دار ہو، جو زخمی کرے، جیسے دھار دار لوہا، بانس، پتھر، سیسہ وغیرہ۔ سوائے ہڈی، ناخن، اور دانت کے، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”جو (چیز بھی) خون بہائے اور اس (جانور) پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے کھالو، بجز دانت اور ناخن کے“ (صحیحین) دانت اور ناخن کے ساتھ دیگر ہڈیوں کو بھی ملحق کیا گیا۔ (شکاری جانور اپنے دانت یا ناخن سے جس شکار کو قتل کرے، وہ حلال ہو گا)

اگر کسی چیز کے بار، و دباؤ اور بوجھ سے جانور مر جائے، تو حلال نہ ہو گا گو خون بہے اور سر جدا ہو مثلاً: کوڑے، یا لاٹھی سے مارے، یا جال میں گلا گھٹ کر مر جائے، یا کند چھری بہت قوت سے چلائے اور اس دباؤ سے وہ مر جائے، (گو محض قوت کی وجہ سے گلا کٹ جائے) تو حرام ہو گا۔ اگر شکاری جانور حملہ آور ہو اور اس کے بوجھ سے شکار مر جائے تو حلال ہے، شکاری جانور کو دیکھ کر گھبراہٹ میں، یا تیز دوڑنے

کی وجہ سے مر جائے تو قطعاً حلال نہیں۔

اگر شکار کو ہوا میں یا درخت پر تیر لگے اور موئثر زخمی ہو، پھر زمین پر گر کر مرے، یا تیز ہوا کی مدد سے تیر شکار کو لگے اور قتل کرے، تو یہ شکار حلال ہے، اگر زخمی نہ ہو، مثلاً صرف بازو ٹوٹ جائے، یا زخمی ہو، لیکن زخم موئثر نہ ہو، تو حلال نہ ہو گا۔

تیر لگنے کے بعد شکار کسی اونچی زمین یا پہاڑی پر گر کر وہاں سے نیچے لڑھکے اور مرے، یا ایسی شاخ سے ٹکڑا کر نیچے گرے اور مرے کہ اس کی طرف موت کی نسبت ممکن ہو، یا پانی میں گرے اور مرے تو حرام ہے، خواہ زخمی ہو یا نہ ہو۔

پانی کے پرندہ پر پانی میں تیر چلائے (گو خشکی سے چلائے) اور تیر لگنے سے وہ مرے تو حلال ہے، پانی اس کے حق میں دیگر کے لئے زمین کی طرح ہے، اگر پرندہ پانی کے ہوا (فضا) میں ہو، اور تیر انداز پانی میں ہو (گو کشتی وغیرہ میں ہو) تو حلال ہے، اور تیر انداز خشکی میں ہو تو حرام ہے، اور اگر پرندہ پانی سے باہر ہو، اور تیر لگنے کے بعد پانی میں گرے (اور مرے) تو حرام ہے۔ تیر پانی سے چلائے یا باہر سے۔

پانی کی مذکورہ صورتوں میں اس وقت حلال ہو گا، جبکہ تیر شکار کو پانی میں نہ لے ڈوبے، یا وہ خود اپنے بوجھ کی وجہ سے نہ ڈوبے، اگر اس طرح ڈوب کر مرے تو یہ غریق ہے، جو قطعاً حلال نہیں، جو آگ میں گر جائے وہ بھی حرام ہے۔ تیر لگ کر گرنے والی مذکورہ بالا تمام صورتوں میں تیر لگنے کی وجہ سے شکار حرکتِ مذبوح تک پہنچ جائے، تو حلال ہو گا (بعد میں کہیں بھی کسی بھی طرح سے گرنے سے کوئی فرق نہیں)۔

شکار

آیت: (۱) ''وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا'' (مائدۃ: ۲)

ترجمہ: ''اور جس وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کیا کرو'' (یعنی اب شکار کی ممانعت ختم ہو چکی)

(۲) ''قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ' (المائدہ: ۴)

ترجمہ: ''آپ فرما دیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو اور تم ان کو چھوڑو بھی، اور ان کو اس طریقہ سے تعلیم دو، جو تم کو اللہ نے تعلیم دیا ہے، تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں، اس کو کھاؤ، اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں،

صحیحین وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم اور ابو ثعلبہ سے مرفوعاً شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کا جواز اور اس کے آداب واحکام موجود ہیں۔

شکار یا تو ہتھیار سے ہو گا، جس کے احکام گذر چکے، یا شکاری حیوان کے ذریعہ یہاں اسی کے احکام کا ذکر ہے۔

غیر مقدور علیہ حیوان کے شکار کے لئے بطورِ آلہ شکاری درندہ یا پرندہ کو استعمال کرنا جائز ہے، جیسے کتا، تیندوا، چیتا، شکرہ، باز، شاہین وغیرہ، جبکہ وہ سدھایا اور شکار کی تعلیم دیا ہوا ہو، گو کسی غیر مسلم نے تعلیم دی ہو۔ (جس حیوان کو شکار کے لئے سدھایا گیا ہو، اسے مُعَلَّم کہیں گے)

تعلیم کے شرائط

۱- شکار کے لئے جاتے وقت، جب ذمہ دار ابتداء میں یا بعد میں اسے ڈانٹے اور روکے تو وہ رک جائے۔

۲-جب شکار پر بھیجے اور برانگیختہ کرے، تو شکار کے لئے جائے اور برانگیختہ ہو۔
۳-شکار کو روک رکھے، اسے جانے نہ دے، تاکہ اسے بھیجنے والا شکار پکڑ لے۔
۴-قتل سے قبل یا بعد میں خود شکار کا گوشت پوست آنت وغیرہ نہ کھائے، اگر خون پئے تو حرج نہیں۔
۵-مذکورہ بالا امور پر بار بار عمل ہو، یہاں تک کہ اس فن کے ماہرین کے اعتبار سے اس کے مُعَلّم ہونے کا گمان حاصل ہو جائے۔
معتمد قول یہ ہے کہ شکاری پرندہ کی تعلیم میں صرف دوسری اور چوتھی شرط کافی ہے مُعَلّم ہونے کے بعد شکاری جانور کسی شکار کا گوشت وغیرہ کھائے یا کوئی اور شرط مفقود ہو جائے تو وہ شکار حرام ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر وہ اس میں سے کھالے تو تم مت کھاؤ" (صحیحین) اس سے قبل اس نے جو شکار کئے ہیں، وہ حرام نہ ہوں گے۔ اب از سر نو اس کی تعلیم شرط ہے۔
شکار کرنے میں مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو، پھر حیاتِ مستقرہ کی حالت میں شکار ہاتھ آئے اور اسے ذبح کرے تو وہ حلال ہے۔ اگر شکار کے بعد اتنا وقت گذر جائے کہ عرفاً شکاری درندہ کا جوش وغصہ ٹھنڈا ہو چکا یا وہ چلا گیا پھر آکر اس میں سے کھالیا، یا مالک نے خود اسے کھلایا تو یہ شکار حرام نہیں، اگر کوئی مُعَلّم درندہ اپنے طور پر کسی جانور کو شکار کر کے کھائے، تو اس سے اس کی تعلیم پر اثر نہ پڑے گا۔ کوئی شخص اجازت کے بغیر دوسرے کے شکاری درندہ کو شکار پر چھوڑے، تو وہ شکار حلال ہے۔ شکار کے بعد شکاری جانور مالک (بھیجنے والے) کو شکار سے روکے، تو یہ بھی کھانے کی طرح ہے۔
کتے کا منہ یا کوئی دوسرا عضو تر حالت میں شکار کے جس حصہ میں لگے، وہ نجس بنجاست مغلظہ ہو چکا۔ اسے سات مرتبہ پانی اور اس میں ایک مرتبہ مٹی ملا کر دھونا کافی ہے اتنا حصہ کاٹ کر پھینکنے کی ضرورت نہیں۔
اگر روانہ کردہ کتا شکار کو زخمی کرنے سے قبل دونوں نگاہوں سے غائب ہو جائیں، پھر شکار مردہ ملے، یا کتے یا تیر نے ایسا زخمی کیا کہ موت کو اس کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، پھر وہ غائب ہو جائے اور بعد میں مردہ حالت میں ملے، تو حرام ہے۔
درندہ شکار پر حملہ آور ہو، اور اس کے بوجھ سے، یا ٹکراؤ سے، یا کاٹنے کی وجہ سے یا قوت سے پکڑنے کی وجہ سے بغیر زخم کے وہ مر جائے، یا حرکت مذبوح تک پہنچ جائے تو حلال ہے۔
اگر معلم درندہ بذاتِ خود شکار کر کے اسے مارے، یا اس کے شکار پر جانے کے بعد مالک وغیرہ اسے برانگیختہ کرے، جس سے اس کی رفتار بڑھ جائے، تو یہ شکار حلال نہ ہوگا، کوئی مسلمان معلم شکاری کو شکار پر روانہ کرے، پھر کسی غیر مسلم کے برانگیختہ کرنے کی وجہ سے رفتار بڑھ جائے، تو یہ حلال ہے، اس کے برعکس غیر مسلم روانہ کرے، اور مسلمان کے برانگیختہ کرنے سے رفتار بڑھ جائے تو یہ شکار حرام ہے۔

شکار کی ملکیت

بقول امام رافعیؒ اصل ضابطہ یہ ہے کہ کسی طریقہ سے شکار کی قوت ختم کر کے اس پر غالب ہو جائے (اور اسے بس میں کر لے) تو اسکا مالک بن جائے گا، (گو غیر ممیز ہو)
اگر شکار حرم کا نہ ہو، اور اس پر کسی کی ملکیت کا کوئی اثر نہ ہو، مثلاً رنگ، پر کترنا، بالی اور شکاری مُحرِم یا مرتد نہ ہو تو حساً یا حکماً اس کی (دفاعی اور بچاؤ کی) قوت باطل کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے سے اس شکار کا مالک ہو جائے گا، جس کی تفصیل وامثلہ حسب ذیل ہیں۔
اگر کوئی شکار کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر قابو میں کر لے، تو اس کا مالک ہو گا، گو ملکیت کا قصد نہ ہو، حتی کہ صرف اسے دیکھنے کے لئے

پکڑ لے، تب بھی مالک ہو گا، کیونکہ یہ ایک مباح چیز ہے (یعنی کسی کی ملکیت میں نہیں ہے، جو بھی چاہے لے سکتا ہے) لہٰذا دیگر مباحات کی طرح اس پر قبضہ کر لینے سے مالک ہو گا، لیکن دوسرے کی اجازت سے بطورِ نیابت اس کے لئے پکڑ لے، تو وہ دوسرا شخص مالک ہو گا۔ اگر شکار پر کسی دوسرے کی ملکیت کا اثر ہو، تو وہ گمشدہ حیوان یا لقطہ شمار ہو گا۔ حرم کے اور محرم کے شکار کا مالک نہ بنے گا۔ مرتد کی ملکیت موقوف رہے گی، اگر اسلام لائے تو اس کی ملکیت ہے، ورنہ مباح ہی رہے گا، غیر ممیز کسی کے حکم سے شکار کرے تو حکم دینے والا مالک ہو گا، اور ممیز کسی کے حکم سے حکم دینے والے کے قصد سے شکار کرے تو حکم دینے والا مالک ہو گا، ورنہ شکار کرنے والا مالک ہو گا۔

شکاری کو کاری زخم پہنچائے کہ اس سے فوراً مر جائے، یا اسے اپاہج کر دے، یا بازو توڑ دے، یا کتر دے (جس کی وجہ سے دوڑ کر بچاؤ کرنے والا دوڑنے سے، اڑ کر بچاؤ کرنے والا اڑنے سے، اور دونوں طریقے سے بچاؤ کرنے والا دونوں سے عاجز ہو جائے) تو اس کا مالک ہو گا، گو ابھی اس پر قبضہ نہ کیا ہو، شکار کی یہ حالت ہو جائے کہ اب تیز نہیں دوڑ سکتا، اور بہ آسانی پیچھا کر کے اسے پکڑنا ممکن ہو، تو اس سے بھی مالک بنے گا۔ اگر شکار کو دوڑائے اور وہ تھک کر رک جائے، یا زخمی کر دے اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے رک جائے تو اسے پکڑ لینے تک مالک نہ بنے گا، اگر زخمی کرنے کے بعد پانی تک پہنچنے پر قادر نہ ہو اور پیاس سے رک جائے تو مالک بن جائے گا۔

شکاری شکار کے لئے جال لگائے، تو شکار کے اس میں پھنسنے سے یہ مالک بن جائے گا، جب کہ شکار جال میں سے رہائی نہ حاصل کر سکے۔ گو اس پر قبضہ نہ کر لے، خواہ خود وہاں موجود ہو یا نہ ہو، اور شکار کو اس طرف کسی نے دوڑایا ہو یا نہ دوڑایا ہو، نیز جال مباح ہو یا غصب کا۔ پھنسنے کے بعد شکار جال کتر کر مثلاً رہائی حاصل کر لے، تو وہ مباح ہے جو بھی شکار کرے، مالک ہو گا، اگر دوسرا کوئی جال کترے اور شکار بھاگ جائے تو ملکیت باقی رہے گی، دوسرا مالک نہ بنے گا۔

اگر جال شکار کے لئے نہ لگائے، یا کسی خاص نوع کے شکار کے لئے لگائے اور دوسرا جانور پھنس جائے، یا بلا قصد ہاتھ سے گر جائے اور اس میں شکار پھنس جائے، تو اس سے مالک نہ ہو گا۔ اگر شکار جال سمیت چلا جائے، اور اپنے بچاؤ پر قادر ہو، تو جو بھی اسے پکڑ لے، مالک ہو گا، اور اگر جال کا وزن اس کے بچاؤ کی قوت ختم کر دے کہ بہ آسانی پکڑنا ممکن ہو، تو جال والے کی ملکیت باقی رہے گی۔

اگر شکار کو کسی تنگ جگہ مجبور و بے بس کر دے، کہ وہاں سے بھاگنے اور چھٹکارا حاصل کرنے پر قادر نہ ہو اور بہ آسانی اسے پکڑ سکے، مثلاً گھر میں داخل کر دے، یا مچھلی کو چھوٹے حوض میں یا جانور کو گھڑے میں داخل کرے، تو مالک بنے گا، اگر بھاگ کر رہائی حاصل کر سکتا ہو یا کافی تھکن و مشقت کے بغیر پکڑنا ممکن نہ ہو، تو مالک نہ ہو گا، کوئی دوسرا پکڑ لے تو وہ مالک ہو گا، پرندہ کے آشیانہ (گھونسلہ) بنانے کے قصد سے کچھ تعمیر کرے اور اس طرح شکار کی عادت و ماحول ہو، تو اس میں آشیانہ بنانے سے اس پرندہ اور اسکے انڈے و چوزے کا مالک بنے گا۔ اس کے بغیر محض کسی کی زمین میں گھونسلا بنانے سے وہ مالک نہ ہو گا، البتہ اس کا زیادہ مستحق ہو گا۔

مچھلی کسی کے حوض میں داخل ہو اور وہ نکلنے کا راستہ بند کر دے، اور حوض چھوٹا ہو کہ بہ آسانی ہاتھ سے مچھلی کو پکڑ سکتا ہے، تو اس مچھلی کا مالک ہو گا، اگر حوض اتنا بڑا ہو کہ بغیر مشقت و محنت کے یا جالا ڈالے مچھلی کا حصول ممکن نہ ہو، تو اس سے وہ مچھلی کا مالک نہ ہو گا، البتہ دوسرں کے مقابلہ میں اس کا حق مقدم ہو گا، پس اسکی اجازت کے بغیر کسی کو اس کا شکار کرنا حرام ہے، گرچہ وہ مالک بن جائے گا۔ شکار گھر میں داخل ہونے کے بعد، گھر پر جس کا قبضہ واختیار ہے، وہ دروازہ بند کر دے، تا کہ شکار نکل نہ سکے، تو اس کا مالک ہو گا، کوئی اجنبی شخص بند کر دے تو مالک نہ ہو گا۔ کوئی اپنی زمین میں اس مقصد سے کیچڑ کرے کہ شکار اس میں لت پت ہو کر پھنس جائے، تو اس میں شکار پھنسنے سے وہ مالک ہو گا، اگر اس مقصد سے کیچڑ نہ کرے، تو وہ مالک نہ ہو گا، البتہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق قرار پائے گا، لہٰذا دوسرا کوئی

پکڑ لے تو مالک بن جائے گا، لیکن گنہگار ہو گا۔

مچھلی کے پیٹ میں موتی: اگر مچھلی کے پیٹ میں بغیر سوراخ کا موتی ملے، تو وہ شکاری کی ملکیت ہے، اگر مچھلی فروخت کر دے تو خریدار مالک بنے گا (بعضوں کے نزدیک موتی شکاری کی ہی ملکیت رہے گی) اگر موتی سوراخ دار ہو، تو فروخت کنندہ کا ہو گا، جب کہ وہ اس کا دعوی کرے، اگر فروخت نہ کرے، یا فروخت تو کرے لیکن دعوی نہ کرے تو لقطہ شمار ہو گا۔

شکار کو چھوڑ دینا: احرام کی وجہ سے اپنی ملکیت کے شکاروں پر سے ملکیت ختم ہو جاتی ہے، اور ان کو آزاد کر دینا لازم ہے، مذکورہ بالا کسی طریقہ سے شکار کا مالک بننے کے بعد وہ نکل بھاگے، تو ملکیت زائل نہ ہو گی، جو بھی اسے پکڑ لے، اس پر لازم ہے کہ مالک کے سپرد کر دے، خواہ بستی میں گھوم رہا ہو، یا جنگل بیابان میں وحشی جانوروں میں شامل ہو جائے، مالک بننے کے بعد از خود شکار کو آزاد کرنے سے اس کی ملکیت زائل نہ ہو گی، اور اس طرح آزاد کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں جاہل رسم کی مشابہت ہے، (وہ سائبہ کے نام سے اپنے باطل معبودوں کے نام جانور چھوڑ دیتے تھے) نیز وہ مباح حیوانوں کے ساتھ خلط ملط ہو گا، اور اس کا شکار ہو گا، البتہ ماں یا اولاد میں سے کسی ایک کا شکار کرے، اور اسے روک رکھنے میں اولاد کی جان کا خطرہ ہو، تو اس کی روح کی حفاظت کے لئے شکار کو آزاد کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ حدیث میں اولاد کی خاطر ایک ہرنی کو چھوڑنے کا ذکر موجود ہے، نیز ایک سرخ رنگ کے پرندہ کے بچوں کے شکار کے بعد وہ قریب آکر پھڑ پھڑانے لگی تو آپ ﷺ نے انھیں چھوڑنے کا حکم دیا تھا (امام زرکشی وغیرہ نے دونوں حدیث کو معتبر قرار دیا ہے، دوسری روایت بسند صحیح ابوداود میں موجود ہے) اگر شکار شدہ اولاد کا گوشت حلال ہو، تو اسے ذبح کرنا بھی جائز ہے (آزاد کرنا ہی لازم نہیں)

اگر مطلق التصرف (جسے مالی تصرفات کا اختیار ہو) شکار کو آزاد کرتے وقت کہے، میں نے اسے مباح قرار دیا، تو جو بھی پکڑ لے اسے بلا ضمان اسے کھانا اور دوسرے کو کھلانا حلال ہے، فروخت وغیرہ کرنا صحیح و نافذ نہ ہو گا (اس طرح آزاد کرنا حلال ہے) کسی کے پاس پرندہ وغیرہ ہو، اور اسے ذبح کرنے یا کھلانے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اسے آزاد کرنا لازم ہے۔ جو پرندہ وغیرہ آزاد کرنے کے بعد پھر لوٹنے کا عادی ہو، اسے آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: روٹی کے ٹکڑے اور اناج کی بالیاں وغیرہ جو مالک پھینک دیتا ہے، جو بھی اسے اٹھالے مالک ہو گا، اور فروخت وغیرہ کرے تو صحیح ہو گا، کوئی مردار کی کھال سے اعراض کرے، تو جو بھی اسے دباغت دے، اس کا مالک ہو جائے گا۔

پانچ فواسق (یعنی چیل، سانپ وغیرہ جن کا تذکرہ گذر چکا) میں سے کسی کو پالنے کے لئے روک رکھنا حرام ہے، کسی جاندار کی آواز یا رنگ سے انتفاع کے لئے اسے قید میں رکھنا حلال ہے۔

پرندوں کا اختلاط: کسی کے کبوتر مثلاً دوسرے کے گنبد وغیرہ پر جائیں (اور اس کے کبوتروں میں شامل ہو جائیں) تو مالک کو اس کی اطلاع دینا اور لے جانے دینا لازم ہے، اگر نہ لوٹائے تو ضامن ہو گا، اگر دونوں کے درمیان انڈے یا چوزے وجود میں آئیں تو وہ مؤنث کے تابع ہوں گے، لہذا مؤنث کے مالک کے ہوں گے۔ آنے والے کبوتر کے بارہ میں شک ہو کہ کسی کی ملکیت ہیں یا مباح، تو اسے تصرف جائز ہے، کیونکہ اصل اباحت ہے۔

اگر ایک کے کبوتر دوسرے کے کبوتروں میں شامل ہونے کے بعد دونوں کے جدا سمجھ میں نہ آئیں، تو کسی تیسرے کو معین کبوتر فروخت وغیرہ کرنا صحیح نہیں، انہیں میں سے ایک دوسرے کو مالک بنائے تو صحیح ہے، اگر دونوں کو اپنے کبوتر کی تعداد معلوم ہو اور ہر ایک کی قیمت برابر ہو، اور دونوں بھی کسی تیسرے شخص کو فروخت کریں، تو یہ صحیح ہے، اور تعداد کے مطابق قیمت تقسیم ہو گی، مثلاً ایک کے

سو اور دوسرے کے دو سو ہوں، اور قیمت تین ہزار ہو، تو اول کو ایک ہزار اور دوسرے کو دو ہزار ملیں گے، اسی طرح دونوں نسبت کے اعتبار سے معین کر کے بعض کبوتر فروخت کریں، تب بھی صحیح ہے، اگر تعداد کا علم نہ ہو، یا قیمت مساوی نہ ہو، تو بیع صحیح نہ ہو گی۔ تاہم ہر ایک اس طرح کہے کہ اس میں جتنے بھی میرے کبوتر ہوں، فلاں قیمت پر تم کو فروخت کر دیا، تو صحیح ہے۔ اگر کسی دوسرے کی ملکیت کا ایک کبوتر اپنے کبوتروں میں شامل ہو جائے، تو اجتہاد کر کے ایک کے علاوہ بقیہ کبوتروں کو کھا سکتے ہیں، اگر کسی کا پھل اپنے پھلوں میں، یا کسی کے محصور یا غیر محصور کبوتر بستی کے مباح (یعنی جو کسی کی ملکیت میں نہیں) وغیرہ محصور کبوتروں میں گھل مل جائیں، یا کسی کا پانی نہر میں گر جائے، تو کسی پر اُن کا شکار یا نہر کا پانی کا استعمال حرام نہیں۔ گو مالک کی ملکیت زائل نہ ہو گی، اگر مباح محصور ہوں تو حرام ہے۔

حلال وحرام کا اختلاط: کسی کے درہم و دینار یا کسی اور مال میں دوسرا حرام مال شامل ہو (اور دونوں میں فرق معلوم نہ ہو) تو حرام کی مقدار جدا کر کے اسے جس مصرف میں صرف کرنا واجب ہے، اس میں صرف کر دے، تو بقیہ میں (اپنا ذاتی مال سمجھ کر) تصرف کرنا جائز ہے۔ تاہم تقوی کا پہلو واضح ہے، جدا کردہ حرام مال اصل مالک سے واقف ہو تو اسے لوٹا دے، ورنہ بیت المال کے سپرد کرے یا بذاتِ خود بیت المال کے مصالح میں صرف کرے، جب کہ اس سے واقف ہو۔

شکار میں دو کی شرکت: دو اشخاص بہ یک وقت ایک شکار کو زخمی کر کے اس کی قوت ختم کر دیں، تو دونوں اس کے مالک ہیں، اگر ایک نے قوت ختم کر دی، تو وہی مالک ہے، اگر دونوں یکے بعد دیگرے زخمی کریں، اور صرف ایک قوت ختم کرے، تو وہ مالک ہو گا۔

خاتمہ: (۱) اگر تیر اور کتا روانہ کرے، اور کتا اسے لنجا کر دے، پھر تیر ذبح کر دے تو حلال ہے، اور تیر سے لنجا کرے، پھر کتا قتل کرے تو حرام ہے، کسی فاسق یا اہل کتاب نے یہ خبر دی کہ میں نے مثلاً یہ بکری ذبح کی ہے، تو اسے کھانا حلال ہے، اگر کسی بستی میں مسلمان اور مجوسی وغیرہ (جن کا ذبیحہ حلال نہیں) موجود ہوں، اور یہ معلوم نہ ہو کہ ذابح مسلم ہے یا دوسرا، تو اس کا کھانا حلال نہیں، اگر بستی میں صرف مسلمان ہوں، یا مسلمان غالب ہوں، جیسا کہ اسلامی بستیاں، تو حلال ہے۔

(۲) غیر دھار دار کسی ایسے ہتھیار سے شکار کرنا کہ عموماً شکار اس سے مر نہ جائے (بلکہ با قاعدہ ذبح کر کے حلال ہو گا) تو اس سے شکار جائز ہے، اگر عموماً شکار مر جاتا ہو، تو ایسے ہتھیار سے شکار حرام ہے، (کیونکہ وہ مردار شمار ہو گا، حلال نہ ہو گا) ایسے ہتھیار اپنی قوت سے (نہ کہ دھار سے) شکار کو ذبح کرے، یا اس کی گردن الگ کر دے، تو یہ حرام ہے۔

(۳) ذبح شدہ جانور کا شل عضو بھی دیگر اجزاء کی طرح حلال ہو گا۔

(۴) کسی زندہ حیوان کا کوئی جزو کاٹ کر الگ کیا جائے تو طہارت و نجاست میں اس حیوان کے مردہ کی طرح ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: "جو حصہ زندہ سے کاٹا جائے وہ مردہ ہے" (حاکم و صححہ) لہٰذا انسان، مچھلی، اور ٹڈی کے اجزاء پاک ہوں گے، اور بقیہ کے نجس، لیکن حلال جانوروں کے بال و پر، اون اور ریشم پاک ہیں، جبکہ ان کی زندگی میں یا شرعی تذکیہ کے بعد جدا ہوں، البتہ زندگی میں جدا شدہ عضو پر جو بال ہوں وہ نجس ہیں، انسان کے علاوہ تمام مردار جانداروں کے بال نجس ہیں، اور پاک نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ دباغت کو قبول نہیں کرتے۔

(تلخیص ۱۳۳/۴، فتح الوہاب مع الجمل ۲۳۳/۵-۲۵۰، نہایہ مع الحواشی ۱۱۱/۸-۱۳۰، مغنی المحتاج ۲۶۵/۴-۲۸۲، الاقناع مع البجیرمی ۲۴۶/۴-۲۵۶، بغیہ: ۲۵۶، المجموع ۴۲/۹-۱۴۵، ترشیح ۲۰۵، ۲۰۸، تحفہ مع الحواشی ۱۸۸/۱۲-۲۴۴، قلائد ۳۷۰/۲-۳۸۲، الفقہ المنہجی ۳۳/۳-۵۲)

اُضحیہ (قربانی)

۱۰/ذوالحجہ سے ایّام تشریق کے آخر تک اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے جو مویشی ذبح کیا جاتا ہے، اسے اضحیۃ (قربانی) کہتے ہیں۔ اس کے لئے اُضْحِيَة ، اِضْحِيَة ، اُضْحِيَّة ، اِضْحِيَّة ، ضَحِيَّة ، ضِحِيَّة ، اَضْحَاة اور اِضْحَاة آٹھ لغات مستعمل ہیں۔ یہ دراصل ضَحْوَۃٌ سے ماخوذ ہے، یعنی دن کا ابتدائی حصہ، کیونکہ اس کا ابتدائی وقت وہی ہے۔ یہ عیدین اور زکات وصدقہ فطر کی طرح ۲ سنہ ھ میں مشروع ہوا، قرآن وحدیث اور اجماع سے اس کی مشروعیت ثابت ہے۔

آیت: "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (الکوثر: ۲)

ترجمہ: "سو آپ اپنے پروردگار کے واسطے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے"۔ اس آیت میں اصح قول کے اعتبار سے نحر سے قربانی کے جانوروں کو نحر کرنا مراد ہے۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ نے فرمایا "یوم النحر (۱۰/ذوالحجہ) میں ابن آدم نے (قربانی کے جانور کا) خون بہانے سے محبوب تر کوئی عمل نہیں کیا، اور بلاشبہ وہ بروزِ قیامت اپنے سینگ، کھُر اور بالوں سمیت آئے گا اور یقیناً اس کا خون روئے زمین پر گرنے سے قبل بارگاہ الٰہی میں پہنچ جائے گا (اور قبولیت سے سرفراز ہوگا) پس اسے خوش دلی سے انجام دو" (ابن ماجہ، والترمذی وحسنہ)

(۲) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے قربانی کو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت قرار دیا، اور فرمایا کہ اس کے ہر بال اور اون میں ایک ایک نیکی ملے گی۔ (احمد۔ ابن ماجہ)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: "جو حیثیت وگنجائش کے باوجود قربانی نہ کرے، وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے" (احمد وابن ماجہ، ورجح الائمۃ وقفہ) (نیل الاوطار ۱۲۳/۵)

(۴) آپ ﷺ نے دو سفید (یا سفید وسیاہ) سینگ دار مینڈھوں کی قربانی کی، اپنے دست مبارک سے انھیں ذبح کیا اور اللہ کا نام لیا، اور تکبیر پڑھی، اور اپنا مبارک قدم ان کے گردن کے کنارے پر رکھا۔" (مسلم)

حکمت: اُضحیہ ایک عظیم عبادت ہے، جو اللہ کی بندگی کے طور پر انجام دینا ہے۔ اس کی ایک عظیم ترین حکمت حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی عظیم ترین قربانی کے مقصد کو تازہ کرنا اور اس کا احیاء ہے۔ نیز اس میں فقراء ومحتاجوں کی غمگساری وتعاون اور عید کے موقع سے ان کے اہلِ وعیال کو خوشی کی فراہمی ہے، اور نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کی بھائی چارگی کا تعلق قوی تر ہوتا ہے، اور اجتماعیت اور آپسی محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

حکم: جس رشید مسلمان کے پاس ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۳ ذوالحجہ تک اپنے مصارف وضروریات سے زائد اتنا مال ہو، کہ قربانی کرسکتا ہو، تو اس پر قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے، خواہ حج میں ہو، مقیم ہو، مسافر ہو، شہری ہو یا دیہاتی، اگر ایک شخص پر متعدد افراد کا نفقہ واجب ہو (مثلاً بیوی بچے وغیرہ)، تو ان پر قربانی سنت کفایہ ہے، یعنی ان میں سے کوئی ایک انجام دے، تو بقیہ سے اس کا مطالبہ ساقط ہوگا، گرچہ ثواب صرف قربانی کرنے والے کو ملے گا۔ البتہ امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا کہ اگر وہ دوسروں کو ثواب میں شریک کرے تو یہ جائز ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری فرماتے ہیں: "آپ ﷺ کے دور مسعود میں ایک شخص اپنے اور اہل خانہ کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دیا کرتا تھا" (مؤطا مالک، ابن ماجہ، والترمذی، وصححہ)

کسی تنہا شخص کے حق میں قربانی سنت عین ہے، حضرات ابو بکرؓ وعمرؓ قربانی نہ کرتے، تاکہ عوام اسے واجب نہ سمجھیں (بیہقی باسناد حسن) نیز ترمذی کی ایک روایت میں اسے سنت قرار دیا ہے، اور دار قطنی وغیرہ کی روایت میں ہے: ”قربانی مجھ پر فرض ہے، اور تم لوگوں پر واجب نہیں“ آپ ﷺ کے حق میں قربانی واجب تھی۔

چونکہ قربانی کے وجوب میں اختلاف ہے، اس لئے جس کے حق میں یہ سنت ہو، اسے ترک کرنا مکروہ ہے، اوراسی لئے نفلی صدقہ کے مقابلہ میں یہ افضل ہے۔

نذر یا التزام (اپنے اوپر واجب کرلینے) سے قربانی واجب ہوگی: مثلاً: میں نے یہ بکری قربانی کے لئے متعین کردی، یہ قربانی کا جانور ہے، اللہ کے لئے مجھ پر قربانی کرنالازم ہے۔ وغیرہ، اگر کسی نے کہا کہ میں اس بکری کا مالک بنا تو مجھ پر اللہ کے لئے اس کی قربانی لازم، تواس پر اس کی قربانی لازم نہ ہوگی، خواہ وہ اس کا مالک بنے، لیکن اگر یہ کہے: میں کسی بکری کا مالک بنا (یعنی بکری معین نہ کرے) تو اللہ کے واسطے اس کی قربانی مجھ پر لازم ہے، اور وہ بکری کا مالک بنے تو اس کی قربانی لازم ہے، لیکن محض خریدنے یا نیت کرنے سے وہ بکری قربانی کی شمار نہ ہوگی جب تک کہ خریدنے کے بعد لفظاً التزام نہ پایا جائے۔

تنبیہ: عوام اکثر وقت سے کافی قبل قربانی کا جانور خرید کر یہ کہتے ہیں کہ یہ قربانی کا جانور ہے (یا میں اس کی قربانی کروں گا وغیرہ) حالانکہ وہ اس جملہ پر مرتب احکام سے ناواقف ہوتے ہیں، کیونکہ یہ التزام کا جملہ ہے، لہٰذا وہ واجب قربانی ہوگی، اور اسے کھانے کی اجازت نہ ہوگی، اگر وہ یہ کہے کہ میری مراد یہ تھی کہ سنت قربانی ہے، تواس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

لیکن علامہ حضرمی فرماتے ہیں کہ لوگوں کا عام عرف اس سے سنت قربانی کا ارادہ ہوتا ہے، اسے لازم قربانی قرار دینے میں شدید حرج ہے، ائمہ کرام نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ عقیقہ میں اس طرح کہے: بسم اللہ یہ فلاں کا عقیقہ ہے، پھر سنت عقیقہ کی طرح اس میں سے کھانا وغیرہ جائز قرار دیتے ہیں، اور دونوں کا حکم بلاشبہ ایک ہی ہے، شیخ الاسلام امام بلقینی اور ابو بکر مراغی وغیرہ نے فتوی دیا کہ ”یہ میری قربانی ہے“، کہنے سے نذر کی قربانی (اور لازم) نہ ہوگی یہ 'فلاں کا عقیقہ' کی مانند ہے (قلائد ۲/۳۸۴) (اکثر فقہاء نے چونکہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے، لہٰذا احتیاط کا پہلو اختیار کرنے میں بہتری ہے)

بعض مسائل: (۱) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”جب تم ذوالحجۃ کا چاند دیکھو اور کسی کا قربانی کا ارادہ ہو، تو قربانی کرنے تک اپنے بال وناخن نہ تراشے“ (مسلم وسنن اربعہ)

جو قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اسے ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے کے بعد قربانی کرنے تک اپنے بدن کے کسی بھی حصہ کے بال وناخن اور چمڑی وغیرہ جب کہ کوئی ضرورحاجت نہ ہو، زائل کرنا مکروہ ہے حتی کہ جمعہ کے دن بھی، اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ مغفرت اور آگ سے خلاصی ان تمام اجزاء کو شامل ہو۔

ایک سے زائد قربانی کا ارادہ ہو، تو پہلی قربانی سے کراہت ختم ہوگی۔ (جو احرام میں ہو، اسے یہ امور حرام ہیں) ختنہ کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا، درد کی وجہ سے دانت نکالنا، یا تکلیف کی وجہ سے کسی عضو کو کاٹنا (آپریشن) وغیرہ مکروہ نہیں ہے۔

(۲) جو مرد بذاتِ خود صحیح طریقہ سے ذبح کرنے پر قادر ہو اسے خود ذبح کرنا سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے خود اپنی قربانی ذبح فرمائی (صحیحین) نیز یہ ایک قربت ہے، لہٰذا خود انجام دینا بہتر ہے۔ کسی دوسرے کو نائب بنانا بھی جائز ہے، کیونکہ ایک مرتبہ بعض جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو نائب بنایا“۔ نائب کا قربانی کے مسائل سے واقف اور مسلم ہونا بہتر ہے۔ اہل

کتاب، نابینا، یا بچہ کو نائب بنانا مکروہ ہے، حائضہ و نفساء کو نائب بنانا خلافِ اولیٰ ہے، موئنث اور خنثیٰ کے لئے دوسرے کو وکیل بنانا افضل ہے

(۳) جو دوسرے کو ذبح کے لئے وکیل بنائے، اسے ذبح کے وقت وہاں حاضر رہنا سنت ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو اس کا حکم دیا تھا (حاکم وصححہ)

قربانی کے جانور: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" (الحج: ۳۴)

ترجمہ: اور ہم نے ہر امت کے لئے اس غرض سے قربانی کرنا مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے"۔

صرف اونٹ، بیل، بھینس اور بھیڑ، بکری پر ہی قربانی ہو سکتی ہے، خواہ مذکر ہوں، یا موئنث، یا خنثیٰ، یا خصی، کیونکہ آپ ﷺ اور کسی صحابی سے ان کے علاوہ کی قربانی منقول نہیں ہے۔ اسمیں افضل اونٹ، پھر بیل، پھر بھیڑ، پھر بکری ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قربانی میں خون بہانا کافی ہے، گو مرغی یا بط کا ہو، ہمارے شیخ غریب شخص کو اس کی تقلید کا حکم دیتے تھے، اور عقیقہ کو قربانی پر قیاس کر کے کہتے کہ جس کے گھر بچہ پیدا ہو وہ ابن عباس کے مسلک پر مرغ ذبح کرے۔ باجوری، (بغیہ: ۲۵۷)

قربانی کے دو جدا جنسوں کی جفتی و میل سے پیدا شدہ جانور قربانی وہدی میں کافی ہے۔ والدین میں قربانی کی معتبر عمروں میں سے زائد عمر والے کا اعتبار ہو گا، لہٰذا بھیڑ اور بکری سے پیدا شدہ جانور کا دو سالہ ہونا ضروری ہے، نیل گائے، ہرن وغیرہ دیگر جانوروں کی قربانی صحیح نہیں،

شرائط: (۱) بھیڑ اور دنبہ کی عمر ایک سال ہو چکی ہو، یا اس سے قبل اس کے دانت گر چکے ہوں، اور گائے، بیل اور بکری دو سال کی ہو چکی ہو اور اونٹ پانچ سال کا ہو چکا ہو، مسلم کی حدیث میں آپ ﷺ نے مُسِنّہ کے ذبح کا حکم دیا ہے، اور اس کا مطلب وہ اونٹ ہے، جس کو پانچ سال مکمل ہو کر چھٹا شروع ہو چکا ہو، اور وہ گائے و بکری ہے جس کو دو سال مکمل ہو کر تیسرا سال شروع ہو چکا ہو۔ اس سے زائد عمر کی قربانی جائز ہے۔ ایک حدیث میں بھیڑ کے جَذَع کی قربانی کی تعریف فرمائی (ترمذی۔ احمد) ایک حدیث میں فرمایا کہ اس کی قربانی جائز ہے (احمد وابن ماجہ) جَذَع یعنی جسے ایک سال ہو چکا ہو، یا اس سے قبل دانت گر جائے۔

جانور کے عمر کے متعلق فروخت کنندہ کی خبر معتبر ہو گی، جبکہ اس کے پاس پیدا ہوئی ہو، ورنہ واقف و تجربہ کار حضرات کے گمان کی طرف رجوع کر لیں گے۔

تنبیہ: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر تہائی سے کم کان کٹا ہو، تو قربانی صحیح ہے، صحیح کان والے جانور دشوار ہونے کی وجہ سے قاضی حسین اس پر فتویٰ دیتے تھے، امام اذرعی شرح منہاج میں فرماتے ہیں کہ ایک دقیقہ یاد رہے کہ، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ۱۳/ ذوالحجہ کو قربانی جائز نہیں، لہٰذا کان کے مسئلہ میں جو ان کی تقلید کرنا چاہے، اس میں بھی تقلید کے دیگر شرائط کی طرح ان کے مسلک کا لحاظ رکھے (بغیہ: ۲۵۸)

(۲) قربانی کے جانور میں کوئی ایسا عیب نہ ہو، جس سے ماکول (یعنی کھائے جانے والے کسی) حصہ میں نقص و کمی پیدا ہو،

ناکافی جانور: درج ذیل جانوروں کی قربانی صحیح نہیں ہے۔

پیدائشی بلا کان، کان، تھن، دم، یا زبان کا کچھ حصہ کٹ کر جدا ہوا ہو، گو قلیل ہو، اور دور سے نظر نہ آئے، چکتی کٹی ہوئی (تاہم اس کے موٹاپے کے لئے اسے معمولی سا کاٹے تو حرج نہیں) جو چراگاہ سے بھاگے اور بہت کم چرے، جس کی وجہ سے دبلی ہو جائے، شدید لاغری کی وجہ سے جس کے ہڈی میں گودا نہ رہے، خارش زدہ، گو کم مقدار میں ہو، پھوڑے پھنسی والا، جو واضح طور پر بیمار ہو، کانا، (ایک آنکھ سے اندھا) یا لنگڑا ہو، جب کہ لنگڑے پن کی وجہ سے چراگاہ میں دیگر مویشیوں سے پیچھے رہے، گرچہ قربانی کے لئے لٹاتے وقت اس کے اضطراب و ہلچل سے لنگڑا ہو جائے، نابینا، حاملہ، (اگر حمل سے ابھی گوشت میں بالکل نقص نہ ہوا ہو، تو بعضوں کے نزدیک قربانی صحیح ہے) تمام دانت گرے ہوئے، ران وغیرہ سے بڑا حصہ کٹا ہوا، سینگ ٹوٹا ہوا جب کہ گوشت متاثر ہو، کوئی عضو شل ہو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''چار جانوروں کی قربانی جائز نہیں، بالکل کانا، جو واضح طور پر بیمار ہو، جو کافی لنگڑا ہو، جس (کی ہڈی) میں مغز نہ ہو'' (مالک، احمد، سنن اربعہ، ابن حبان، حاکم، بیہقی، وصححہ الترمذی) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے (قربانی کے جانوروں کے) آنکھ اور کان کو بغور دیکھنے کا حکم دیا (احمد، سننِ اربعہ) ایک روایت میں لاغر (دبلے) جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔ (ابوداود، حاکم)

جائز جانور: درج ذیل جانوروں کی قربانی جائز ہے۔

بے سینگ، شکستہ سینگ (سینگ ٹوٹا ہوا) جب کہ اس سے ماکول میں کوئی نقص نہ پیدا ہو، کان میں سوراخ ہو یا پھٹا ہوا ہو، (یعنی کان کا کوئی حصہ الگ نہ ہوا ہو)، بعض دانت گرا ہوا جبکہ اس سے چرنے پر اور گوشت پر اثر نہ پڑے، جو پیدائشی بلا چکتی، یا تھن، یا دم کے ہو، جس کے کان چھوٹے ہوں، بینائی کی کمزوری جو چرنے میں مانع نہ ہو، رات میں نظر نہ آئے، داغ دیا ہوا، عنقریب جسکی زچگی ہوئی ہو (علامہ زرکشی اور خطیب نے اسے اور دودھ پلانے والی کو ناکافی قرار دیا ہے) کسی بڑے عضو مثلاً ران سے تھوڑا سا کٹا ہو (اگر کٹی ہوئی مقدار کے قلیل و کثیر میں شک ہو، تو قلیل شمار کرے) معمولی بیمار، معمولی لنگڑا پن جس کی وجہ سے چراگاہ میں دیگر جانوروں سے پیچھے نہ رہے، ذکر (عضو تناسل) کٹا ہوا، خصی، کیونکہ آپ ﷺ نے دو خصی مینڈھوں کی قربانی دی تھی (احمد، ابوداود، ابن ماجہ، بیہقی)

سینگ دار جانور کی قربانی افضل ہے، کیونکہ مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں آپ ﷺ کا یہ معمول ہے، نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین قربانی سینگ دار مینڈھا ہے'' (ابوداود، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی) بلکہ بے سینگ کی قربانی مکروہ ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث کی وجہ سے کان میں شگاف وغیرہ ہو (لیکن ٹکڑا جدا نہ ہوا ہو) تو اس کی قربانی مکروہ تنزیہہ ہے۔

جانور کو خصی کرنا: تین شرائط کے ساتھ خصی کرنا جائز ہے: (۱) جانور کا گوشت حلال ہو (۲) جانور کمسن ہو (۳) معتدل زمانہ میں کرے۔ اگر ایک بھی شرط مفقود ہو، تو خصی کرنا حرام ہے۔

فائدہ: اگر کسی دوسرے سے کہا کہ میری جانب سے قربانی کرو، اور اس نے کی، تو صحیح ہے، اور قیمت اس پر فرض ہے۔

(۳) قربانی کی تیسری شرط یہ ہے کہ اسے۔ذبح کرتے وقت یا اس سے قبل اسے قربانی کے لئے متعین کرتے وقت قربانی کی نیت کرے، خواہ سنت قربانی ہو یا فرض۔ اگر ذمہ میں نذر کی قربانی ہو اور قربانی کے جانور کو اس کی طرف متعین کر دے، تو یہ بھی کافی ہے، جس جانور کو نذر کے ذریعہ قربانی کے لئے معین کر چکا ہو، اس میں نیت شرط نہیں (مثلاً یوں کہنا: میں نے اس بکری کی قربانی کی نذر مانی) اگر ذبح کیلئے کسی کو وکیل بنائے، تو اس کے سپرد کرتے وقت مالک کی نیت کافی ہے، لیکن اگر ذبح کے لئے اہل کتاب وکیل ہو تو ذبح کے وقت مالک کی نیت شرط ہے۔ وکیل کی نیت ضروری نہیں، بلکہ اسے یہ پتہ نہ ہو کہ قربانی کا جانور ہے، تب بھی حرج نہیں، اگر ذبح کے وکیل

یا کسی دوسرے کو نیت کی ذمہ داری دے تو جائز ہے، جبکہ وہ ممیز و مسلم ہو، کسی کافر یا غیر ممیز کو نیت کا ذمہ دار نہیں بنا سکتا۔

جانور میں شرکت: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: ''ہم نے حُدیبیہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک اونٹ سات کی جانب سے، اور گائے کو سات کی جانب سے نحر (ذبح) کیا'' (مسلم سنن اربعہ)

ایک اونٹ یا گائے کی قربانی میں مستقل سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، اسی طرح حج کے موقع پر (تمتع، احرام کی مخالفت وغیرہ کی وجہ سے) مشروع قربانیوں کا بھی یہی حکم ہے، خواہ اسباب ایک ہوں، یا مختلف، قربانی واجب ہو، یا سنت، اگر بعض قربانی کی نیت سے شریک ہوں، اور بعض محض کھانے کے لئے گوشت کی نیت سے، تب بھی صحیح ہے، قربانی کے ہر شریک کو اپنے حصہ سے کچھ گوشت کچا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر سات سے زائد مثلاً آٹھ آدمی ایک یا زائد اونٹ میں شریک ہوں، تو کسی کی قربانی صحیح نہ ہوگی، گو مسئلہ معلوم نہ ہو، یا ساتھ ایک بکری بھی ملالیں، جیسا کہ ایک بکری کو دو کی طرف سے قربانی صحیح نہیں، بکری یا اونٹ وغیرہ کے ثواب میں دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔

ایک بکری (بھیڑ، دنبہ) کی قربانی صرف ایک کی جانب سے ہوگی، اگر دو آدمی دو بکری کی قربانی یا ہدی وغیرہ میں شریک ہوں، تو جائز نہیں۔ ایک واجب بکری کے بدلہ اونٹ یا گائے کی قربانی دے، تو بقیہ چھ حصے نفل شمار ہوں گے، لہٰذا انھیں نفل کے مصرف میں صرف کر سکتا ہے۔ ایک شخص کئی جانوروں کی قربانی کر سکتا ہے۔

ترتیب: سب سے افضل سات مینڈھوں کی قربانی ہے، پھر سات بکریوں کی، پھر ایک اونٹ کی، پھر ایک گائے کی، پھر ایک مینڈھے کی، پھر ایک بکری کی، پھر اونٹ کا ایک حصہ، پھر گائے کا ایک حصہ،

رنگ: سب سے افضل سفید رنگ کا جانور ہے، پھر زرد، پھر خاکستری، پر سرخ، پھر سفید وسیاہ (یا سفید کے ساتھ کوئی دوسرا رنگ)، پھر سیاہ۔

مذکر مونث سے افضل ہے گو رنگ میں اس سے پیچھے ہو، جبکہ زیادہ جفتی نہ کی ہو، ورنہ نہ جنی ہوئی مونث افضل ہے۔ جو جانور مذکر، سفید اور موٹا ہو وہ مطلقاً افضل ہے، پھر جس میں دو صفت ہوں، تعارض کی صورت میں موٹا مقدم ہوگا، پھر مذکر۔ مذکر جانور مونث و خنثیٰ سے افضل ہے، جس مونث کو بچے ہو چکے ہوں، اس کے مقابلہ میں جسے ابھی تک بچہ نہ ہوا ہو، وہ افضل ہے، اور جس مذکر نے جفتی نہ کی ہو، وہ افضل ہے، بہ نسبت اس کے جو جفتی کر چکا ہو۔ کثرتِ تعداد سے موٹاپا کی زیادتی افضل ہے، پس ایک موٹا دو دبلے سے افضل ہے۔ چربی کی زیادتی سے گوشت کی زیادتی افضل ہے۔

وقت: یوم النحر (۱۰ / ذوالحجہ) کو سورج نکلنے کے بعد خفیف دو رکعت اور دو خطبوں کے بقدر وقت گذرنے کے بعد قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے، اور ۱۳ / ذوالحجہ کو سورج غروب ہونے تک باقی رہتا ہے۔ آپ ﷺ نے عید الاضحی کے خطبہ میں فرمایا: ''آج سب سے پہلے ہم نماز پڑھتے ہیں، پھر لوٹ کر قربانی کریں گے، جس نے اس طرح کیا، اس نے ہمارے طریقہ کو اپنایا، اور جو اس سے قبل ذبح کرے، تو بس وہ (صرف کھانے کے لئے) گوشت ہے، جو گھر والوں کے لئے مقدم کیا، اس کا قربانی کی عبادت سے کوئی واسطہ نہیں'' (صحیحین) ایک حدیث میں ہے: ''تمام ایّام منیٰ میں قربانی (کرنا جائز) ہے''۔ (بیہقی، وصححہ ابن حبان) (ایّام منیٰ یعنی ۱۰ سے ۱۳ / ذوالحجہ) ابن حبان کی ایک روایت میں ہے: ''ایّام تشریق کے ہر دن قربانی کر سکتے ہیں'' یوم النحر کو سورج بقدر نیزہ بلند ہونے کے بعد (کراہت کا وقت ختم ہونے کے بعد) مذکورہ مدت گذرنے تک موئخر کرنا افضل ہے۔ تاکہ دیگر علماء کے اختلاف سے بچ نکلیں۔ بغیر حاجت کے رات میں ذبح کرنا مکروہ ہے، مثلاً: دن میں فرصت نہ ملے، یا فقراء رات میں بہ آسانی میسر ہوں، تو کراہت نہ ہوگی۔ اگر ۱۳ / تاریخ

کو غروب مکمل ہونے سے قبل جانور کا حلقوم اور مری کاٹ دے (ذبح کرے) تو قربانی صحیح ہے۔ مذکورہ مدت سے قبل یا بعد ذبح کرے تو وہ قربانی شمار نہ ہوگی۔ یوم النحر میں قربانی کرنا مستحب ہے، گو ایک سے زائد جانور ہوں، تاکہ خیر کی طرف مسارعت وسبقت ہو۔

قربانی کی نذر: کوئی شخص اپنی ملکیت کے قربانی کی جنس کے کسی معین جانور کے قربانی کی نذر مانے، تو اس پر اس کی ملکیت ختم ہو جائے گی۔ مثلاً: مجھ پر اللہ کے لئے اس کی قربانی لازم ہے، مجھ پر اس کی قربانی واجب ہے، یہ قربانی کا جانور ہے، میں نے اسے قربانی کے لئے مقرر کر دیا وغیرہ۔ ان الفاظ کے ساتھ نیت نہ ہو یا کچھ اور نیت ہو، تب بھی لفظ کی صراحت کی وجہ سے نذر منعقد ہو گی۔ (لہٰذا ان الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتے) محض نیت کرے (اور لفظ ادا نہ کرے) تو اس کا کوئی اعتبار نہیں گو وہ قربانی کے لئے ناکافی ہو، مثلاً عیب دار، کمسن وغیرہ، ناکافی جانور قربانی کی طرف سے کافی نہ ہو گا، (تاہم اس پر ثواب ملے گا) (لیکن قربانی کی مشابہت کی وجہ سے) نذر کے بعد پہلے آنے والی قربانی کی مدت میں اسے ذبح کرنا لازم ہے، اگر وقت نکل جائے تو بعد میں بطور قضاء ذبح کرنا لازم ہے، جو جانور قربانی کی جنس سے نہ ہو، مثلاً ہرن، خرگوش وغیرہ، اس کی قربانی کی نذر صحیح نہیں۔

اگر اس کی کوتاہی کے بغیر قربانی کے وقت سے قبل یا قربانی کی مدت میں جانور تلف ہو جائے، یا چوری ہو، یا کھو جائے، تو اس پر بدل لازم نہیں، اگر اس کی کوتاہی سے تلف ہو، تو یوم النحر اور یوم تلف کی قیمتوں میں سے زائد قیمت اس پر لازم ہے، تاکہ اس سے تلف شدہ سے عمدہ جانور، یا اس کے مثل دو یا زائد جانور خرید سکے، اگر کچھ رقم باقی ہو تو دوسرے جانور میں شرکت کرے، بقیہ رقم کی قلت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو، تو اس سے گوشت خریدے، یا رقم ہی صدقہ کر دے، اگر مکمل قیمت سے اس کی مثل جانور نہ مل سکے، تو اس سے کمتر درجہ کا خریدے۔ کسی دوسرے شخص نے تلف کیا تو اس پر قیمت ادا کرنا لازم ہے، تاکہ یہ اس سے اس کا مثل خریدے۔ اگر معین نذر کے جانور میں اس کی کوتاہی کے بغیر قربانی کی مدت سے قبل قربانی کے منافی عیب پیدا ہو، تو وقت میں اسے ہی ذبح کرنا کافی ہے، عیب کی وجہ سے اس پر کچھ لازم نہیں، اگر وقت سے پہلے ذبح کرے تو گوشت صدقہ کر دے۔ اور خود اس میں سے کچھ نہ کھائے، نیز اس کی قیمت بھی صدقہ کرے، اس سے دوسرا جانور خریدنا لازم نہیں، ذبح کی قدرت کے بعد عیب پیدا ہو، تو یہ کافی نہیں ہے، (لیکن) اسے ذبح کرنا واجب ہے، اور اس کا گوشت صدقہ کر دے، خود بالکل نہ کھائے، نیز اس کی جگہ بے عیب جانور ذبح کرنا واجب ہے، اگر نذر ماننے والا خود اسے عیب دار کرے، تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، اب اس کے بدلہ دوسرا صحیح جانور ذبح کرے۔

ذمہ میں نذر: کوئی اپنے ذمہ میں قربانی کی نذر مانے (یعنی ابتداء میں جانور متعین نہ ہو) مثلاً: مجھ پر اللہ کے لئے قربانی لازم، پھر اسے معین کرے، مثلاً کہے: میں نے اس بکری کو اپنے نذر کی طرف سے معین کیا، تو اسے بھی قربانی کی مدت میں ذبح کرنا لازم ہے، وقت نکل جائے، تو بطورِ قضاء ذبح کرے۔ اسے بے عیب جانور کی تعیین لازم ہے، اور محض تعیین سے اس کی ملکیت ختم ہو گی، معین کرنے کے بعد اس کی کوتاہی سے یا بلا کوتاہی کے تلف ہو جائے، تو اصل نذر اس کے ذمہ باقی رہے گی، اسی طرح اس میں کوئی عیب پیدا ہو، گو بوقتِ ذبح ہو، تو اس کی تعیین باطل ہو گئی، اب اسے فروخت کرنا اور دیگر تصرفات جائز ہیں۔ اصل نذر اس کے ذمہ باقی ہے، لہٰذا دوسرا صحیح جانور ذبح کرنا لازم ہے۔

جانور گم ہونا: اگر نفل قربانی کا جانور کھو جائے تو اس پر کچھ لازم نہیں، لیکن جب وہ مل جائے، تو اسے ذبح کرنا اور صدقہ کرنا مستحب ہے۔ ایّام تشریق کے بعد ذبح کرے تو وہ گوشت ہے، جسے صدقہ کر رہا ہے۔ (قربانی شمار نہ ہو گی)

سنت قربانی کا مصرف: اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''**فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ**'' (الحج: ۲۸)

ترجمہ:"سوان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو" نیز فرمایا: "فَاِذَا وَجَبَتۡ جُنُوۡبُهَا فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَالۡمُعۡتَرَّ" (الحج:۳۶) ترجمہ: پس جب وہ (جانور کروٹ کے بل گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھانے دو"۔

ابتداء میں آپ ﷺ نے لوگوں کی غریبی وضرورت کے پیشِ نظر قربانی کرنے والوں کو صرف تین دن تک گوشت رکھنے اور کھانے کی اجازت دی تھی، بقیہ تمام صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا، بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا: "کھاؤ، ذخیرہ کر رکھو، اور صدقہ کرو۔" (متفق علیہ) ایک حدیث میں فرمایا: کھاؤ اور کھلاؤ اور روک کر ذخیرہ کر رکھو" (مسلم) ایک روایت میں فرمایا: "۔۔۔۔ جتنا چاہو کھاؤ اور کھلاؤ، اور جمع کر رکھو۔" (احمد، مسلم، ترمذی وصححہ) ایک حدیث میں صدقہ کرکے ثواب حاصل کرنے کا حکم دیا۔ (احمد، ابوداود)

آیات واحادیث کی روشنی میں اپنی سنت قربانی کے گوشت میں سے کچھ کھانا سنت ہے، جگر میں سے کھانا افضل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ سے مروی ہے (بیہقی) قربانی وہدی کا گوشت آئندہ کے لئے بچار کھنا مکروہ نہیں ہے، اگر رکھنا ہو تو مستحب یہ ہے کہ اپنے تہائی میں سے رکھے، نہ کہ دوسرے دو تہائی سے، ابتداء میں اپنی قربانی کا گوشت تین روز سے زائد بچار کھنا حرام تھا، پھر اجازت ملی، اپنے گھر پر گھر والوں کے روبرو قربانی کرنا مستحب ہے، تاکہ وہ خوش ہوں اور گوشت سے مستفید ہوں۔

اغنیاء کو نفلی قربانی میں سے بطورِ ہدیہ دینا جائز ہے۔ وہ اغنیاء اسے کھانے، مسلمان کو صدقہ کرنے، اور کسی مسلمان غنی یا فقیر کی مہمان نوازی میں استعمال کر سکتے ہیں، فروخت نہیں کر سکتے۔

آیت کے حکم کے پیش نظر نفل قربانی کا کچھ کچا گوشت صدقہ کرنا واجب ہے، گو صرف ایک فقیر یا مسکین کو دے۔ پکا کر یا خشک کر کے دینا کافی نہیں، کسی مالدار کو ہدیہ میں دینا صدقہ کی طرف سے کافی نہ ہوگا۔ افضل یہ ہے کہ صرف چند لقمے بطور تبرک کھائے، اور بقیہ تمام صدقہ کر دے، ادنیٰ کمال یہ ہے کہ ایک تہائی سے زائد خود استعمال نہ کرے، اگر کھانا، ہدیہ اور صدقہ تینوں انجام دینا ہو، تو سنت یہ ہے کہ ایک تہائی سے زائد نہ کھائے۔ اور ایک تہائی سے کم صدقہ نہ کرے، صرف کھانا اور صدقہ کرنا ہو، تب بھی ایک تہائی سے زائد نہ کھائے۔ (دونوں صورت میں جتنا زیادہ صدقہ کرے، وہ بہتر ہے) بعض حصہ کھائے اور بعض صدقہ کرے، تو قربانی کا ثواب مکمل ملے گا، اور صدقہ کی مقدار پر صدقہ کا ثواب (بھی) ملے گا۔ جتنی مقدار کا صدقہ واجب ہے، اسے قربانی کی بستی سے منتقل کرنا ممنوع ہے۔ اگر واجب مقدار کا صدقہ نہ کیا تو اس کی قیمت سے گوشت خرید کر صدقہ کرنا لازم ہے۔

سنت قربانی کی کھال یا کسی دوسرے حصہ کو فروخت کرنا، کرایہ پر دینا، یا قصاب کو بطور اجرت دینا حرام ہے، صحیحین میں قصاب کو جانور میں سے کچھ دینے کی ممانعت ثابت ہے، مسند احمد کہ ایک حدیث میں گوشت وکھال کے فروخت کی ممانعت اور کھال سے انتفاع کی اجازت ثابت ہے، اجرت اپنی جیب سے ادا کرکے بطور صدقہ اسے گوشت وغیرہ دے تو کوئی حرج نہیں، حدیث میں ہے کہ "جو اپنی قربانی کی کھال فروخت کرے اس کی قربانی نہیں" قربانی کی کھال سے ہر طرح کا انتفاع صحیح ہے، مثلاً: جوتا، چپل، موزہ، ڈول، اور پوستین وغیرہ بنانا۔

واجب قربانی کا مصرف: نذر وغیرہ کی وجہ سے واجب قربانی کو مکمل صدقہ کرنا واجب ہے، حتیٰ کہ کھال وغیرہ بھی۔ خود کھانا، کسی مالدار کو ہدیہ دینا، یا فروخت کرنا وغیرہ حرام ہے۔ اگر اس میں سے کچھ کھالیا تو اس کا بدل فقراء کو دینا لازم ہے، واجب قربانی کو بستی سے منتقل کرنا ممنوع ہے، زکات کی طرح مکمل وہیں صدقہ کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے جگہ قربانی یا عقیقہ کروائے (یعنی کسی کو

مثلاً جانور خرید کر قربانی کرنے کے لئے وکیل بنائے، گو کسی دوسری بستی میں) تو یہ جائز ہے۔

تنبیه: کسی بھی قربانی کا گوشت کسی غیر مسلم کو دینا یا کھلانا وغیرہ منع ہے۔ اسی طرح کوئی غریب خود کو صدقہ میں ملا ہوا، یا امیر ہدیہ میں ملا ہوا گوشت، کافر کو بیچ یا کھلا نہیں سکتا اور نہ ہدیہ میں دے سکتا ہے۔

اولاد: واجب قربانی کے بچہ کا حکم بھی ماں کی طرح ہے یعنی اسے بھی ذبح کر کے مکمل صدقہ کرے، خواہ نذر کے وقت ہی حاملہ ہو، یا بعد میں حاملہ ہو (علامہ رملی وخطیب وغیرہ کے نزدیک ماں باقی ہو، تو واجب کا بچہ مکمل بھی کھا سکتے ہیں، ماں تلف ہو، تو بچہ کی تقسیم واجب ہے۔ غیر واجب کا بچہ کھانا جائز ہے، (یعنی حمل کی حالت میں قربانی کی نیت کرے، پھر ذبح سے قبل ہی زچگی ہو)

دودھ: واجب اور غیر واجب قربانی کے جانور کا دودھ جو بچہ کی ضرورت سے زائد ہو، کراہت کے ساتھ پینا، یا کسی دوسرے کے بچہ کو پلانا جائز ہے، جب کہ اس کی وجہ سے گوشت پر اثر نہ پڑے۔ سنت یہ ہے کہ فاضل وزائد دودھ اور جھول وقلادہ وغیرہ صدقہ کر دے، اسے فروخت وغیرہ کرنا حرام ہے۔

اون: اگر اون وغیرہ کو ذبح تک باقی رکھنے سے جانور کو تکلیف ہو، تو اسے کتر کر اس سے انتفاع کر سکتا ہے، فروخت وغیرہ کرنا حرام ہے، اگر جانور کو تکلیف نہ ہو، تو واجب قربانی کا اون نہ کترے، کیونکہ ذبح کے بعد مساکین کو اس سے نفع ہوگا۔

سواری: اپنی واجب قربانی پر بصورت حاجت سواری کر سکتا ہے، یعنی جب کہ چلنا دشوار ہو، اور دوسری کوئی سواری میّسر نہ ہو، یا اس کے پاس اجرت نہ ہو، اسی طرح دوسرے محتاج کو سواری کے لئے بلا اجرت دے سکتا ہے۔ اجرت پر دینا جائز نہیں، سواری کی وجہ سے کچھ نقص پیدا ہو، تو سوار ہونے والا ضامن ہوگا، اسی طرح وقت ہونے اور ذبح پر قدرت کے بعد تلف ہو، تو ضامن ہوگا، اس سے قبل ضامن نہ ہوگا۔

دوسرے کی جانب سے قربانی: کوئی شخص دوسرے کی جانب سے اس کی اجازت کے بغیر قربانی نہیں کر سکتا، خواہ وہ شخص زندہ ہو یا مردہ، اگر کوئی کرے اور جانور معین تھا تو کرنے والے کی طرف سے واقع ہوگی، ورنہ نہیں، اگر زندہ شخص کی اجازت ہو، یا میت وصیت کر چکا تھا، تو ان کی طرف سے قربانی صحیح ہے۔ حضرت علیؓ آپ ﷺ کی طرف سے دو مینڈھوں کی قربانی کرتے اور فرماتے کہ آپ ﷺ نے مجھے ہمیشہ آپ ﷺ کی جانب سے قربانی کا حکم دیا ہے" (ابو داود، ترمذی، بیہقی) زندہ کی اجازت سے قربانی کرے، تو بظاہر تقسیم میں بھی یہ نائب شمار ہوگا، تقسیم اس کی اجازت پر موقوف نہ ہوگی، میت کی وصیت سے قربانی کرے تو مکمل صدقہ کر دینا واجب ہے، اپنے اور اپنے زیرِ کفالت افراد پر صدقہ نہیں کر سکتا، اور نہ کسی مالدار کو دے سکتا ہے۔

اجازت کی شرط سے درج ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

(۱) جو جانور نذر کی وجہ سے معین ہو، اسے کوئی دوسرا شخص اجازت کے بغیر قربانی کی مدت میں ذبح کرے، تو قربانی صحیح ہوگی، مالک گوشت تقسیم کر دے، کیونکہ اس میں بوقتِ ذبح نیت شرط نہیں، تاہم ذبح کرنے والے پر زندہ اور مذبوحہ جانور کے قیمت میں جو تفاوت ہو، وہ ادا کرنا لازم ہے، جس سے بکری، یا ایک حصہ اور یہ ممکن نہ ہو، تو گوشت خرید کر صدقہ کرے۔

(۲) باپ ورنہ دادا اپنی کمسن یا پاگل اولاد کی طرف سے اپنے مال میں سے قربانی کر سکتے ہیں، دیگر اولیاء کو اس کی اجازت نہیں، نیز اُن کے مال میں سے کسی کہ قربانی کی اجازت نہیں۔

(۳) امام (خلیفہ وحاکم) بیت المال سے مسلمانوں کی جانب سے عید گاہ میں اونٹ یا بیل ورنہ بکری کی قربانی کر لے۔ جب کہ بیت المال میں گنجائش ہو، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ثواب ملے گا، لیکن صاحبِ حیثیت لوگوں سے قربانی کا مطالبہ ساقط نہ ہوگا۔

(۴) واقف اپنے وقف سے قربانی کی شرط لگائے، تو وقف کی آمدنی سے قربانی کر کے اسکے متعینہ افراد پر صرف کریں گے، اس کی وجہ سے ان سے قربانی ساقط نہ ہوگی، وہ افراد اس قربانی سے کھا سکتے ہیں، گو مالدار ہوں، یہ دراصل واقف کی قربانی نہیں ہے، بلکہ محض صدقہ شمار ہوگا۔

(۵) کسی دوسرے کو اپنی قربانی کے ثواب میں شریک کرنا (نہ کہ اس کی طرف سے قربانی کرنا)

(۶) گھر کے ایک شخص کا دیگر اہل خانہ کو بھی اپنی قربانی میں (ثواب کے اعتبار سے) شامل کرنا۔

فائدہ: ایک بکری قربانی وعقیقہ کی نیت سے ذبح کرے، تو علامہ رملی نے اسے کافی قرار دیا ہے، لیکن علامہ ابن حجر نے ناکافی قرار دیا ہے۔

بعض سنتیں: (۱) قربانی کے جانور کو موٹا تازہ کرنا، حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں: ''ہم اور دیگر مسلمان حضرات قربانی کو فربہ کرتے تھے'' (بخاری) (۲) نماز عید (وخطبہ) کے بعد ذبح کرے۔ (۳) ذابح مسلم ہو (۴) دن میں ذبح کرے (۵) ذبح کے لئے نرم جگہ منتخب کرے۔ (۶) ذابح اور ذبیح کا رخ قبلہ کی طرف ہو، یہ تمام ذبح میں سنت ہے، لیکن قربانی میں اس کی زیادہ تاکید ہے (۷) صحیحین میں حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث کی وجہ سے قربانی کے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہنا سنت ہے۔ امام ماوردی فرماتے ہیں، بسم اللہ سے پہلے اور بعد میں تین مرتبہ تکبیر (اللہ اکبر) کہے۔

(۸) بوقت قربانی، بسم اللہ کے بعد تکبیر، پھر درود کے بعد یہ کہے: ''اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَاِلَیْکَ فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ'' (یا اللہ، یہ تیری ہی نعمت ہے اور تیرے ہی حضور پیش ہے، پس تو میری طرف سے قبول فرما) آپ ﷺ نے ایک دنبہ ذبح فرمایا اور (قبل ذبح) کہا: بسم اللہ، اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ'' (یا اللہ، محمد، آل محمد اور امتِ محمد کی طرف سے قبول فرما) پھر اس کی قربانی کی''۔ (مسلم) نیز حضرات ابن عباسؓ وابن عمرؓ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔

(۹) مسلمانوں کے حاکم کو بیت المال سے تمام مسلمانوں کی جانب سے قربانی کرنا سنت ہے، جیسا کہ مسلم کی حدیث سے آپ ﷺ کا امت کی جانب سے قربانی کرنا ثابت ہے۔ نیز اسے عید گاہ میں جہاں لوگ نمازِ عید کے لئے جمع ہوں، اپنے ہاتھوں سے ذبح کرے، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے ثابت ہے۔

(تلخیص الحبیر ۴/۱۳۷-۱۴۶، خلاصة البدر ۲/۳۷۷-۳۸۹، نیل الاوطار ۵/۱۲۳-۱۴۹، المجموع ۸/۳۸۲-۴۲۶، الفقه المنهجی ۱/۲۳۱-۲۳۶، فتح الوهاب مع الجمل ۵/۲۵۰-۲۶۲، نهایه مع الحواشی ۸/۱۳۰-۱۴۴، قلائد ۲/۳۸۳-۳۹۱، تحفه مع الحواشی ۱۲/ ۲۴۵-۲۹۰، بشری الکریم ۲/۱۲۵-۱۲۹، ترشیح علی الفتح ۲۰۲-۲۰۵، فتح المعین مع الاعانة ۲/۳۳۰-۳۳۵، بغیه: ۲۵۷، الاقناع مع البجیرمی ۴/۲۷۷-۲۸۶، مغنی المحتاج ۴/۲۸۲-۲۹۳)

عقیقہ

تعریف: عقیقہ عَقّ سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے، قطع کرنا، کاٹنا، جدا کرنا، پھاڑنا۔ دراصل اس کا اطلاق نوزائیدہ بچے کے پیدائشی بال پر ہوتا ہے، کیونکہ اسے مونڈ کر جدا کیا جاتا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے تعلق سے ذبح کئے جانے والے جانور کو شرعاً عقیقہ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے گلے کو کاٹا اور پھاڑ جاتا ہے، نیز (افضل طریقہ کے اعتبار سے) بچہ کے بال مونڈنے اور جدا کرنے کے وقت اسے انجام

دیا جاتا ہے، ابوداود کی ایک حدیث کی وجہ سے عقیقہ کو نَسِیکَہ یا ذبیحہ کہنا مستحب ہے، لیکن معتمد قول کے اعتبار سے عقیقہ کہنے میں کوئی کراہت نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ (کتابوں میں عام طور پر مستعمل و مشہور لفظ عقیقہ ہے)

حکمت: عقیقہ کی مشروعیت میں مختلف اسرار و مصالح اور گوناگوں فوائد ہیں۔ مثلاً:

۱- اولاد اللہ کی بڑی نعمت ہے، لہٰذا اس پر خوشی اور شکر کا اظہار

۲- بچہ نسب کی نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳- سخاوت و بخشش اور فیاضی کی خصلت کو پروان دینا، اور اس کے برعکس بخل و حرص کی صفت کو مات دینا۔

۴- اہل و عیال و رشتہ دار، اور فقراء و احباب کو عقیقہ کی دعوت میں جمع کر کے ان کا دل خوش کرنا، اور آپسی محبت و الفت اور اجتماعیت کی جڑوں کو مضبوط کرنا۔

حکم: عقیقہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، آپ ﷺ کے قول و عمل اور صحابہ کرام کے تعامل سے یہ ثابت ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "بچہ کے ساتھ عقیقہ (مشروع) ہے، پس اس کی جانب سے خون بہاؤ اور اس کی تکلیف کو دور کرو" (یعنی بال اور میل کچیل و گندگی دور کرو) (بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ایک دوسری حدیث میں فرمایا: "بچہ اپنے عقیقہ کے عوض مرتھن ہے، اس کی جانب سے ساتویں دن (عقیقہ) ذبح کیا جائے، سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے" (احمد، سنن اربعۃ و صححہ الترمذی) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرتھن ہے، یعنی بروزِ قیامت والدین کے حق میں شفاعت نہ کرے گا، بعضوں نے کہا کہ اس کی صحیح نشوونما نہ ہوگی۔

عقیقہ کا مخاطب: جس کے ذمہ اپنے فرع کا نفقہ لازم ہے، اسے اس فرع کی طرف سے عقیقہ کرنا سنت ہے (یعنی اگر بچہ کے پاس مال نہ ہوتا، تو جس پر نفقہ واجب ہوتا ہے، وہ اس کے عقیقہ کا ذمہ دار ہے، گو بچہ کے پاس میراث وغیرہ کے ذریعہ مال ہونے کی وجہ سے نفقہ اس پر واجب نہ ہو) بچہ کے مال سے عقیقہ کرنا ممنوع ہے، اگر کرے تو ضامن ہوگا۔

نفقہ کا ذمہ دار ایسا مالدار ہو، جو صدقہ فطر کے وجوب کے لئے ضروری ہے، تو وہ عقیقہ کا مخاطب ہے، اگر غریب ہو، لیکن اکثر مدتِ نفاس (یعنی ۶۰ روز) سے قبل مذکورہ مالداری حاصل ہو جائے، تو اس سے عقیقہ مطلوب ہے، ۶۰ روز کے بعد مالداری حاصل ہو، تو اب وہ عقیقہ کا مامور نہیں گو بچہ کے بلوغ سے قبل مالداری حاصل ہو، اس صورت میں عقیقہ کرے، تو وہ عقیقہ شمار نہ ہوگا، بلکہ محض گوشت ہے۔ (امام بجیرمی فرماتے ہیں کہ اب اسے تاکیدی حکم نہیں) بچہ کی پیدائش سے ۶۰ روز کے اندر حیثیت حاصل ہو، تو عقیقہ اسی درمیان کرنا ضروری نہیں، بچہ کے بلوغ تک کبھی بھی کر سکتا ہے، بلوغ کے بعد اصل (باپ وغیرہ) کی طرف سے عقیقہ ساقط ہو چکا، اب اسے خود اپنا عقیقہ کرنا سنت ہے۔

وقت: بچہ کی مکمل پیدائش سے بلوغ تک عقیقہ کا وقت ہے، علامہ ابن حجرؒ کے نزدیک پیدائش سے قبل بھی اصل سنت ادا ہوگی جبکہ وجود باحیات محقق ہو، لیکن صاحب مغنی و اسنیٰ وغیرہ کے نزدیک اس سے عقیقہ ادا نہ ہوگا، یہ محض گوشت ہوگا۔

احکام: درج ذیل امور میں عقیقہ کے احکام بھی قربانی کی طرح ہیں:

جانور کی جنس (اونٹ، گائے، بیل اور بکری وغیرہ) جانور کی عمر، عیوب سے سلامتی، نیت، افضل کی ترتیب، کھانا، صدقہ کرنا، ہدیہ دینا، ذخیرہ کر رکھنا، فروخت کی ممانعت، ایک بکرے سے اس سنت کا حصول، گو لڑکے کی طرف سے ہو، عقیقہ کی نذر ماننے یا عقیقہ کے لئے جانور کو

متعین کرے، تو قربانی کی طرح متعین ہو گا، اور تمام صدقہ کر دیناواجب ہے، خود کھانا یا امیروں کو کھلانا جائز نہیں، البتہ قربانی وعقیقہ کے نذر میں یہ فرق ہے کہ قربانی کا تمام گوشت کچا تقسیم کرنالازم ہے، اور عقیقہ کا کچھ پکاکر اور کچھ کچا تقسیم کر سکتے ہیں، تمام پکا کر صدقہ کرنا صحیح نہیں ہے۔(بعضوں کے نزدیک مکمل کچاصدقہ کرناواجب ہے، اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک مکمل پکا کر صدقہ کر سکتے ہیں)

سنتیں: (۱) لڑکے اور خنثٰی کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا مسنون ہے۔ آپ ﷺ نے لڑکی کی طرف سے ایک بکرا اور لڑکے کی طرف سے دو بکرے کے عقیقہ کا حکم دیا۔(احمد، ابن ماجه، وصححه الترمذی) ایک حدیث میں فرمایا کہ مذکر ہوں یا مؤنث (یعنی بکرا ہو یا بکری) کوئی حرج نہیں (احمد، ترمذی وصححه)

لڑکے کی طرف سے صرف ایک بکرا بھی عقیقہ کرے، تو اصل سنت حاصل ہو گی، کیونکہ آپ ﷺ نے حسنینؓ کی طرف سے ایک ایک مینڈھا عقیقہ فرمایا تھا (ابوداود، نسائی وصححه، عبدالحق وابن دقیق العید) اونٹ یا بیل کا ساتواں حصہ بھی ایک بکری کے حکم میں ہے۔ فضیلت کے اعتبار سے وہی ترتیب ہو گی، جو قربانی میں گذری، یعنی سات بکرے پھر اونٹ اس طرح آخر تک۔ اگر ایک اونٹ یا بیل سات بچوں کی طرف سے ذبح کرے تو جائز ہے۔ اس طرح مختلف لوگ مل کر کریں، تب بھی جائز ہے، خواہ بعض کا حصہ عقیقہ کا، بعض کا قربانی کا، اور بعض کا صرف گوشت کا ارادہ ہو۔

(۲) اسے پکانا سنت ہے، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے اسے سنت قرار دیا ہے، پکا کر سالن سمیت فقراء کی خدمت میں بطورِ صدقہ روانہ کرنا ان کو دعوت دے کر کھلانے سے افضل ہے۔

(۳) اس کا ایک پچھلا پیر ران کی ابتدا تک دایہ کو کچا دینا سنت ہے، دایاں دینا بہتر ہے۔ کئی بکرے ذبح ہوں، تب بھی ایک پیر دینے سے سنت ادا ہو گی، ایک سے زائد دایہ ہوں تو تمام کو مل کر ایک پیر دینا کافی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو حکم دیا کہ عقیقہ کا پیر دایہ کو دیں۔(بیہقی، ابوداود، فی مراسیله والحاکم)

(۴) عقیقہ کا گوشت میٹھا پکانا سنت ہے۔

(۵) عقیقہ کے جانور کی ہڈیاں نہ توڑے، بلکہ ہر ہڈی جوڑ سے جدا کرے، توڑنا خلاف اولیٰ ہے۔

(۶) بچہ کی پیدائش کے ساتویں روز عقیقہ کرنا سنت ہے، جیسا کہ مسند احمد و سنن کی روایت میں گذر چکا۔ اگر غروب سے قبل پیدا ہو، تو وہ دن شمار ہو گا، اگر رات میں پیدا ہو، تو بعد والا دن پہلا دن شمار ہو گا، ساتویں دن نہ کرے تو چودھویں دن ورنہ اکیسویں روز کرے، آئندہ بھی کرے تو سات کا اعتبار کرنا بہتر ہے۔(یعنی یومِ پیدائش سے ایک روز قبل کرے، مثلاً: پیر کو پیدا ہوا، تو آئندہ جب بھی کرنا ہو، اتوار کو کرے)

ذبح کی قدرت کے بعد بچہ کا انتقال ہو، گو سات روز سے قبل ہو، تو اس کا عقیقہ کرنا مسنون ہے۔ بعضوں نے کہا کہ روح پھونکنے کے امکان کے بعد حمل ساقط ہو، تو اس کا عقیقہ بھی مسنون ہے۔

(۷) ذبح کے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کے بعد یہ کہنا مسنون ہے: ”اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَ اِلَيْكَ عَقِيْقَةُ فُلَان“ (بیہقی باسنادٍ حسنٍ) (یا اللہ یہ تیری نعمت ہے، اور فلاں کے عقیقہ کے طور پر تیری خدمت میں پیش ہے) (فلاں کی جگہ بچہ کا نام لے)

(۸) دن کے ابتداء میں طلوع شمس کے وقت ذبح کرنا افضل ہے۔

فوائد: (۱) قربانی کے برعکس عقیقہ کا گوشت مال دار کو دیا جائے، تو وہ جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ (۲) ایک ہی بکری سے عقیقہ

و قربانی دونوں کی نیت کرے تو علامہ رملیؒ کے نزدیک دونوں حاصل ہوں گے، لیکن علامہ ابن حجر مکیؒ نے فرمایا کہ ایک بھی حاصل نہ ہو گا کیونکہ دونوں مقصود سنت ہیں، نیز قربانی سے عام ضیافت اور عقیقہ سے خاص ضیافت مقصود ہے، مزید برآں دونوں میں بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

دردِ زہ کی دعا: دردِ زہ کے وقت عورت کے پاس یہ پڑھنا مسنون ہے: آیۃ الکرسی، سورہ اعراف کی آیت: ''اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ وَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثاً وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَوَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ)، معوذتین نیز یہ دعا کرب بکثرت پڑھے: '' لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه الْعَظِيْمُ الْحَلِيْم ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ، نیز یونس علیہ السلام کی دعا والی یہ آیت پڑھے: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ''(الانبیاء:۸۷)

بچہ کے کان میں ''قل ھو اللہ احد'' پڑھنا مسنون ہے، اس کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں زنانہ کرے گا۔

وضع حمل (زچگی) کے لئے: نئے برتن میں لکھے: اُخْرُجْ اَيُّهَا الْوَلَدُ مِنْ بَطْنٍ ضَيِّقَةٍ اِلٰى سَعَةِ هٰذِهِ الدُّنْيَا اُخْرُجْ بِقُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى الَّذِيْ جَعَلَكَ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ، لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرآنَ عَلٰى جَبَلٍ'' سورت کے آخر تک (یعنی سورۂ حشر کی اکیسویں آیت سے ۲۴ تک) ''وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرآنِ مَاهُوَشِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'' اور پانی سے دھو کر حاملہ کو پلائے اور کچھ اس کے چہرہ پر چھڑکے (بجیرمی علی الاقناع ۲۸۸/۴، اعانہ مع الفتح ۳۳۹/۴)

نوزائیدہ کے بعض آداب ومسائل

نام رکھنا: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: ''مجھے بیٹا پیدا ہوا تو میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں لے گیا، تو آپ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا، اور کھجور سے اس کی تحنیک فرمائی اور اس کے لئے برکت کی دعا فرمائی'' (بخاری ومسلم) مسلم میں برکت کی دعا کا ذکر نہیں ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج کی شب مجھے بیٹا پیدا ہوا، تو میں نے اسے حضرت ابراہیم ﷺ کا نام رکھا'' (مسلم) حضرتِ انسؓ فرماتے ہیں: ''حضرت ابو طلحہؓ کو بیٹا پیدا ہوا، تو میں اسے آپ ﷺ کی خدمت میں لے گیا، تو آپ ﷺ نے اس کی تحنیک فرمائی اور اس کا نام عبد اللہ رکھا'' (صحیحین)

مذکورہ روایات سے پیدائش کے روز نام رکھنا ثابت ہوا، سننِ اربعہ وغیرہ کی صحیح روایات میں ساتویں روز نام رکھنے کا حکم موجود ہے، لہٰذا علماء فرماتے ہیں کہ بچہ کا نام پیدائش سے ساتویں روز رکھنا مستحب ہے، اس سے قبل اور بعد بھی رکھ سکتے ہیں، امام بخاریؒ نے یوں تطبیق دی ہے کہ اگر عقیقہ کرنا ہو تو (عقیقہ سے قبل) ساتویں دن نام رکھے، ورنہ اول روز ہی نام رکھے۔

نام کی تفصیل: اپنے بیٹے کا نام عبد اللہ یا عبد الرحمن رکھنا مستحب ہے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں اسے اللہ کے نزدیک محبوب ترین نام بتلایا ہے، نیز ایک شخص کو آپ ﷺ نے بیٹے کا نام عبد الرحمن رکھنے کا حکم دیا۔ (متفق علیہ) کسی نبی یا فرشتہ کا نام رکھنا یا یٰسین وطٰہٰ نام رکھنا مکروہ نہیں ہے۔ ایک حدیث میں انبیاء کرام کا نام رکھنے کا حکم فرمایا'۔۔۔ اور حارث وہمام کو سب سے سچے نام اور حرب اور مُرّہ کو سب سے قبیح نام شمار فرمایا۔ (ابوداود، نسائی) ایک حدیث میں ہے: ''بروزِ قیامت تم کو تمہارے اور والدوں کے نام سے بلایا

جائے گا، پس اپنے نام بہتر رکھو" (ابوداود باسناد جید) نافع، یسار، نجیح، رِباح، افلح، اور برکت نام رکھنا مکروہ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے (مسلم) دیگر بھی جس نام کی نفی میں بدشگونی ذہن میں آئے، وہ مکروہ ہے۔

قبیح نام رکھنا مکروہ ہے، اگر رکھا گیا تو اسے بدل کر بہتر نام رکھا جائے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیٹی کا نام عاصیہ تھا، تو آپ ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھا (مسلم) اسی طرح حضرت زینب بنت جحش کا نام بَرَّہ تھا، تو آپ ﷺ نے ان کا نام زینب رکھا۔ (صحیحین) حضرت جویریہ کا نام بھی برہ تھا، آپ ﷺ نے بدل کر جُوَیریہ رکھا۔ (مسلم) ابواُسَید کے ایک بیٹے کا نام بدل کر منذر رکھا" (صحیحین) اپنے اولاد شاگرد وغیرہ کو تنبیہ و تادیب کے طور پر قبیح نام سے آواز دینا جائز ہے، جیساکہ ایک مرتبہ صدیق اکبر نے اپنے بیٹے عبد الرحمن کو یا غُنْثَر (بیوقوف) کہہ کر آواز دی اور انھیں بُرا بھلا کہا۔ (صحیحین)

بچہ کی موت: اگر نام رکھنے سے قبل بچہ انتقال کر جائے، تب بھی اس کا نام رکھنا مستحب ہے، امام بغوی وغیرہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کی وجہ سے اس ساقط بچہ کا بھی نام رکھنا مستحب ہے، جس میں روح پھونکی گئی ہو، اگر لڑکا ہے یا لڑکی پتہ نہ ہو، تو مشترک نام رکھے، مثلاً طلحہ، ھند، خارجہ،

حرام نام: آپ ﷺ نے ملك الْاَمْلَاك، کو عند اللہ ذلیل ترین نام قرار دیا ہے۔ (صحیحین) مَلِكُ الْمُلُوك ، مَلِكُ اَلْاَمْلَاك (بادشاہوں کا بادشاہ، شہنشاہ) اَقْضَی القُضاۃ، عبد الکعبہ (کعبہ کا بندہ)، عبد النار (آگ کا بندہ)، عبد الحسین (حسین کا بندہ)، وغیرہ نام حرام ہیں، کیونکہ شرک کا وہم ہوتا ہے، اسی لئے جار اللہ (اللہ کا پڑوسی) اور رفیق اللہ (اللہ کا رفیق) جیسے نام بھی ممنوع ہیں۔ بعضوں نے قاضی القضاۃ اور حاکم الحکام کو بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ بجیرمی نے قاضی القضاۃ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

لقب: (اصل نام کے علاوہ کوئی دوسرا نام جو اپنے وضع اول کے اعتبار سے مدح یا ذم کی طرف مشعر ہو): اچھے لقب میں حرج نہیں، البتہ عوام کی طرح بے جا توسع نہیں ہونا چاہئے، کہ ہر کس و ناکس کے لئے علاء الدین (دین کی سربلندی) ضیاء الدین (دین کی روشنی) جیسے لقب مستعمل ہوں، یہ مکروہ ہے۔

کنیت: اَب یا اُمّ کے ساتھ جو نام مشروع ہو، اسے کنیت کہتے ہیں، مثلاً ابو عبد اللہ (عبد اللہ کا باپ) ام عبد اللہ (عبد اللہ کی ماں)، اہل فضل مذکر و مونث کے لئے کنیت مندوب ہے، گو ان کو اولاد نہ ہو، خواہ اپنے بچہ کے نام سے کنیت رکھے یا کسی دوسرے نام سے، لڑکے کے نام سے ہو یا لڑکی کے نام سے۔ آدمی کے نام کے علاوہ بھی کنیت جائز ہے۔ مثلاً ابوہریرہ (بلی کے ابا) ابو المکارم، ابو الفضائل، ابو المحاسن وغیرہ۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حضرت عبد اللہ (حضرت عائشہؓ کے بھانجے عبد اللہ بن زبیر) کے نام سے کنیت کی اجازت دی، لہٰذا ان کی کنیت ام عبد اللہ تھی۔ (ابوداود) کسی کافر، فاسق یا مبتدع کے لئے کنیت کا استعمال جائز نہیں، تاہم فتنہ کے خوف کی وجہ سے، یا تعریف (یعنی کوئی کنیت سے ہی مشہور ہو، تو اس سے واقف کرانے) کے لئے گنجائش ملے گی۔ ابو القاسم دراصل آپ ﷺ کی کنیت ہے، اور صحیح احادیث میں کسی دوسرے کے لئے اس کی ممانعت وارد ہے، لہٰذا کسی کو بھی یہ کنیت رکھنا حرام ہے۔ ابو عیسیٰ کنیت رکھنے میں حرج نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت مغیرہؓ کی کنیت ابو عیسیٰ رکھی تھی۔ (ابوداود باسناد جید)

کمسن کے لئے بھی کنیت رکھ سکتے ہیں، جیساکہ آپ ﷺ نے حضرت انسؓ کے ایک کمسن بھائی کو 'اَبُو عُمَیر' کہہ کر پکارا (صحیحین) جس کی کئی اولاد ہو، اسے اپنے بڑے بچہ کے نام پر کنیت رکھنا مندوب ہے، گو وہ لڑکی ہو، ادب یہ ہے کہ خود اپنے لئے کتاب و خط وغیرہ میں کنیت استعمال نہ کرے، اگر کنیت نام سے زیادہ مشہور ہو، یا لوگ اس کے بغیر پہچانتے نہ ہوں، تو حرج نہیں، جیساکہ صحیحین میں حضرت ام

ہانیؓ اور حضرت ابوذرؓ کا آپ ﷺ کے سامنے اپنے لئے کنیت کا ذکر کرنا موجود ہے۔

جو کنیت کسی کو ناپسند ہو، اس کے لئے وہ کنیت استعمال کرنا حرام ہے، گو اس میں موجود ہو، البتہ اسکے بغیر وہ پہچانا ہی نہ جائے، تو گنجائش ہوگی۔

مستحب ہے کہ کوئی اپنے استاد یا والد کو نام سے نہ پکارے، گو خط میں ہو، بلکہ مثلاً یوں کہے: اے میرے والدِ محترم، ہمارے استاد، ہمارے شیخ وغیرہ۔۔۔ آپ ﷺ نے ایک شخص کو ان کے والد کے متعلق فرمایا: "اس سے آگے نہ چلو، کوئی ایسا کام نہ کرو کہ تمہارے والد کو کوئی برا بھلا کہے، اس سے پہلے نہ بیٹھو، اور اسے نام سے نہ پکارو۔" (ابن السنی)

نام کا حق: نام اور کنیت رکھنے کا حق اسے حاصل ہے، جسے بچہ پر ولایت ہو، یعنی باپ ورنہ دادا۔

فائدہ: (۱) کسی کو پکارنا ہو، اور اس کا نام معلوم نہ ہو، تو ایسے الفاظ سے آواز دے، کہ اسے ناگوار نہ ہو، مثلاً اے بھائی، اے فقیہ، اے فلاں کپڑے والے وغیرہ، آپ ﷺ کو کسی شخص کا نام معلوم نہ ہوتا تو فرماتے: "یا ابن عبد اللہ" (اے اللہ کے بندے کے بیٹے) (ابن السنی)

(۲) کسی کے نام کی ترخیم (نام کو مختصر کرنا) جائز ہے، جب کہ اسے ناگوار نہ ہو، آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ ابوہریرۃ کو یا اَبَاہِر اور حضرت عائشہؓ کو یا عَائِش کہہ کر آواز دی۔

سر مونڈنا: پیدائش کے ساتویں دن بچہ کے بال مونڈنا مسنون ہے، جیسا کہ احمد و سنن اربعہ کی حدیث سے گذر چکا، عقیقہ ذبح کرنے کے بعد مونڈے، لڑکے اور لڑکی دونوں کے بال مونڈے جائیں گے، اگر سر پر بال نہ ہوں، تو استرا پھرانا مستحب ہے، عقیقہ کے خون سے سر کو آلودہ کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ جاہلیت کا عمل ہے، حرام نہیں ہے، کیونکہ بعض ضعیف روایات میں اس کا ذکر ہے۔ اور بعض مجتہدین کا یہ قول ہے، قزع مکروہ ہے، یعنی سر کے ایک یا کئی حصہ کے بال مونڈنا، اور بعض باقی رکھنا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ مونڈنے کے بعد سر پر خلوق اور زعفران لگانا مستحب ہے۔

مونڈنے کے بعد بالوں کے وزن کے برابر سونا ورنہ چاندی صدقہ کرنا سنت ہے، آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ کے بعد حضرت فاطمہؓ کو ان کے بال مونڈ کر اس کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا (مالک، ترمذی، حاکم، بیہقی)

حضرت ابن عباسؓ نے ساتویں روز کے سات سنتوں میں بالوں کے وزن برابر سونا یا چاندی صدقہ کرنا شمار کیا۔ عام حالات میں نظافت وصفائی کی نیت سے سر مونڈنا جائز ہے۔ اور جو تیل کنگھی کی فکر رکھے، اسے بال رکھنے میں کوئی حرج نہیں، سر مونڈنا صرف حج وعمرہ میں، کافر کے اسلام لاتے وقت، اور نومولود کے حق میں سنت ہے، ابن قیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صرف چار مرتبہ (یعنی حج وعمرہ کے موقع پر) سر مونڈا ہے۔ عورتوں کے لئے بغیر مجبوری کے سر مونڈنا مکروہ ہے۔

اذان: آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کی ولادت کے بعد ان کے کان میں اذان دی (احمد، ابوداود، ترمذی، حاکم، طبرانی، بیہقی) حاکم کی روایت میں حُسین ہے۔ اور ابونعیم نے دونوں کا نام ذکر کیا ہے۔

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا مستحب ہے، اس تفصیل کو ابن المنذر نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے نقل کیا ہے، نیز مروی ہے کہ اس کی وجہ سے بچہ کو اُم الصِّبْیان کی تکلیف نہ ہوگی (ابن السنی) (اُم الصبیان ایک بیماری ہے، جس سے بچے بیہوش ہو جاتے ہیں) اگر عورت کہے، تب بھی کافی ہے، کیونکہ یہ محض تبرکاً ذکر ہے، تاکہ اس کے کان سب سے

پہلے توحید اور اللہ کی کبریائی سے آشنا ہو، نیز اس وقت شیطان اسے پریشان کرنے اور بھڑکانے کے چکر میں رہتا ہے، لہٰذا اذان واقامت مشروع کی گئی، کیونکہ وہ یہ سن کر بھاگ جاتا ہے، دائیں کان میں یہ بھی پڑھے: "وَإِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" (اگر لڑکا ہو، تب بھی آیت کو تبرکا اسی طرح پڑھے) آپ ﷺ سے نومولود کے کان میں سورہ اخلاص کا پڑھنا بھی مروی ہے، لہٰذا یہ بھی مسنون ہو گا (ابن السنی)

تحنیک: (یعنی کچھ چبا کر نرم کر کے بچہ کے تالوں میں لگا دینا تاکہ پیٹ میں چلا جائے) صحیحین کے حوالہ سے ابو موسی اشعریؓ اور ابو طلحہؓ کے بیٹوں کی تحنیک کا ذکر گذر چکا۔ بچہ کی پیدائش پر کھجور کے ذریعہ اس کی **تحنیک** سنت ہے، کھجور نہ ہو تو کوئی دوسری میٹھی چیز جو آگ پر پکی ہوئی نہ ہو، بہتر ہے کہ کسی نیک اور بزرگ شخص کے ذریعہ تحنیک کروائے، مرد نہ ہو تو کسی نیک عورت کے ذریعہ کروائے، تاکہ اس کے لعاب کی برکت حاصل ہو۔

مبارکبادی: اولاد (یا بھائی وغیرہ) کی پیدائش پر مناسب الفاظ سے مبارکباد دینا (تَهْنِئَةٌ) مستحب ہے، حضرت حسینؓ سے منقول یہ الفاظ بہتر ہیں: "بَارَكَ اللهُ لَكَ فِي الْمَوْهُوْبِ لَكَ وَشَكَرْتَ الْوَاهِبَ وَبَلَغَ أَشُدَّهُ وَرُزِقْتَ بِرَّهُ" (اللہ تمھیں اس عطیہ میں برکت عطا فرمائے، اور اس پر اس کے شکر کی توفیق عطا کرے، اور یہ اپنی جوانی تک پہنچے اور تمہیں اس کی اطاعت وحسن سلوک نصیب ہو)

مبارکباد دینے والے کو جواب دینا مستحب ہے، مثلاً: "بَارَكَ اللهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَ يا جَزَاكَ اللهُ خَيْراً" یا "رَزَقَكَ اللهُ مِثْلَهُ" (اللہ تمھیں بھی ایسی دولت عنایت فرمائے)، یا "أَحْسَنَ اللهُ ثَوَابَكَ وَجَزَائَكَ"، (اللہ تمھیں بہترین بدلہ وجزا عطا فرمائے) وغیرہ۔ پیدائش کا علم ہونے یا سفر سے آنے کے بعد تین دن تک مبارکبادی کی مہلت ہے۔

خاتمہ

بعض مسنون امور: یہ امور ہر کسی کے لئے مستحب ہیں: وقتاً فوقتاً سر، داڑھی اور بدن میں تیل لگانا، (یعنی پہلا خشک ہونے پر دوبارہ لگائے)، ہر آنکھ میں سوتے وقت طاق مرتبہ سرمہ لگانا، تین تین مرتبہ سرمہ لگانا افضل ہے، اگلی وپچھلی شرم گاہ کے اطراف کے بال مونڈنا، ناخن تراشنا، بغل کے بال نوچنا (اکھیڑنا)، اگر شرم گاہ کے بال نوچے یا بغل کے مونڈے، تب بھی اصل سنت حاصل ہو گی، (تہذیب میں ہے کہ مردوں کو شرم گاہ کے بال مونڈنا اور عورتوں کو نوچنا سنت ہے) مونچ کترنا یہاں تک کہ ہونٹ کا کنارہ خوب کھل جائے، اسے جڑ سے صاف نہ کرے، (ان امور کو حاجت سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، اور چالیس روز سے مؤخر کرنا شدید مکروہ ہے)، انگلیوں کے جوڑ اور جوڑ کے پشت کو دھونا (وضو کے علاوہ بھی)، کان کے سلوٹوں اور سوراخ کو دھو کر میل کچیل پونچھ کر صاف کرنا، ناک کا اندرونی حصہ دھونا، مذکورہ تمام امور میں دائیں کو مقدم کرے، سر کے بال میں مانگ نکالنا، اور تیل یا پانی وغیرہ ڈال کر کنگھی کرنا، داڑھی میں کنگھی کرنا، رات کے ابتداء (شام) میں بچوں کو روکے رکھنا کیونکہ یہ شیاطین کے پھیلنے کا وقت ہے، رات کی ایک گھڑی گذرنے کے بعد انھیں چھوڑدیں۔ (مسلم)

رات (سوتے وقت) چراغ گل کرنا (تاکہ چوہے وغیرہ کی شرارت سے آگ نہ لگ جائے لہٰذا جس روشنی میں یہ خطرہ نہ ہو، اس میں حرج نہیں) دروازہ بند کرنا، برتن کو ڈھانکنا، گو ایک لکڑی ہی اوپر رکھ دے، یا اسے الٹ دے، اور مشک کا منہ باندھ دے، اور ان امور کو بسم اللہ کہہ کر انجام دے، سوتے وقت آگ بجھادے۔

داڑھی: صحیحین وغیرہ کی احادیث میں داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے، امام رافعیؒ ونوویؒ نے داڑھی مونڈنا مکروہ قرار دیا ہے، لیکن اس پر ابن الرفعہ نے حاشیۃ الکافیہ میں اعتراض کیا اور فرمایا کہ امام شافعیؒ نے اُلام میں تحریم کی صراحت فرمائی ہے۔ امام زرکشی فرماتے ہیں کہ اسی طرح حلیمی نے شعب الایمان اور ان کے استاد قفال شاشی نے محاسن الشریعۃ میں (بھی تحریم کو لکھا ہے)، امام اذرعی کا قول ہے: ''درست بات یہ ہے کہ بغیر علت کے مکمل مونڈنا حرام ہے'' البتہ امام غزالی، شیخ الاسلام، (تحفہ میں) ابن حجر، رملی اور خطیبؒ وغیرہ کے نزدیک کراہت کا قول معتمد ہے۔

داڑھی میں گرہ لگانا (جبکہ پانی پہنچنے سے مانع نہ ہو)، اسے تتر بتر پراگندہ چھوڑ دینا، اس کے لٹوں کو تصنعاً یا زینت کے لئے تہہ بہ تہہ ترتیب دینا۔ اسے نوچنا وا کھیڑنا، داڑھی بچہ کے کنارے اور داڑھی کے دونوں طرف کے بال مونڈنا، نوچنا، یا کترنا اور داڑھی وغیرہ کو گندھک وغیرہ کے ذریعہ جلد سفید کرنے کی کوشش کرنا اور اس کی سفیدی یا سیاہی کو خود بینی وفخر کے طور پر دیکھنا مکروہ ہے۔ حلقوم کے اوپر کے بال صاف کرنے میں حرج نہیں، سفید بالوں کو اکھیڑنا مکروہ ہے۔ احیاء میں فرمایا کہ داڑھی طویل ہو تو اس کے کترنے میں اسلاف کا اختلاف ہے، بعضوں کے نزدیک ایک مشت پکڑ کر زائد کتر سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے کیا تھا، بعض تابعین نے اسے مستحسن اور بعض نے مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ حدیث میں مطلقاً داڑھی بڑھانے کا حکم ہے۔ بقول امام نوویؒ وغیرہ صحیح بات یہ ہے کہ داڑھی کترنا مطلقاً مکروہ ہے، بلکہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دے جیسی بھی ہو (جتنی بھی بڑھے)

عورت کو داڑھی، مونچھ اور داڑھی بچہ (اگر نکل آئے تو اسے) صاف کرنا سنت ہے۔

خضاب (مہندی وغیرہ سے رنگنا): مرد اور خنثیٰ کو بلا عذر مہندی وغیرہ سے ہاتھ پیر رنگنا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں عورتوں سے مشابہت ہے، جس پر صحیح احادیث میں لعنت کی وعید وارد ہے۔ اگر کچھ عذر ہو تو کوئی حرمت وکراہت نہ ہوگی، عورتوں میں یہ تفصیل ہے کہ احرام کے لئے مستحب ہے، خواہ شادی شدہ ہو یا کنواری، نوجوان ہو یا بوڑھی، جب خضاب لگائے تو دونوں ہاتھ پر مکمل لگائے، سوگ کی مدت میں مہندی وغیرہ لگانا حرام ہے۔ عام حالات میں اگر عورت کسی کی بیوی ہو تو اسے مہندی لگانا مسنون ہے، ورنہ مکروہ ہے۔ (بعضوں نے عورتوں کے لئے مطلقاً مسنون قرار دیا ہے) نقش، کالا رنگنا، تطریف (پوروں کو رنگنا) اور رخسار کو سرخ رنگنا عورت کو مسنون نہیں ہے، بلکہ غیر شادی شدہ کو اور جسے شوہر نے اجازت نہ دی ہو، اسے یہ حرام ہے۔

مرد اور عورت کو سر کے سفید بال اور مرد کو داڑھی کے سفید بال، سرخ یا زرد رنگنا سنت ہے، سیاہ خضاب کا استعمال حرام ہے، کیونکہ ایسی ایک قوم کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ جنت کی خوشبو (تک) نہ پائیں گے۔ (ابوداود، نسائی، ابن حبان، حاکم) نیز ایک روایت میں سیاہ سے اجتناب کا حکم ہے۔ کافروں سے جہاد کرنے والے کے لئے سیاہ خضاب کی رخصت ہے۔ امام رملی کی رائے میں عورت شوہر کی اجازت سے سیاہ خضاب استعمال کر سکتی ہے۔

ختنہ: مردوں اور عورتوں کے حق میں ختنہ واجب ہے، صحیحین وغیرہ کی احادیث میں اسے فطرت میں شمار کیا ہے (ایک قول میں عورتوں کے لئے واجب نہیں، اور عام عمل اسی پر ہے)

مرد کی ختنہ میں حشفہ (سپاری) کے اوپر کی کھال اتاری جائے، جس سے حشفہ مکمل کھل جائے، اور عورت کے فرج کے اوپر کے حصہ میں پیشاب کے سوراخ کے اوپر مرغ کی کلغی کے مانند گوشت کے ٹکڑے کو کاٹا جائے، اور کاٹنے کے بعد اس کی اصل گٹھلی کے مانند باقی رہتی ہے، ختنہ بلوغ کے بعد واجب ہے، پیدائش سے ساتویں روز ختنہ کرنا مستحب ہے (اگر مؤخر کرے تو چالیسویں روز ورنہ ساتویں سال، ساتویں دن

سے قبل ختنہ مکروہ ہے)(جمل ۵/۱۷۴) اگر بچہ کمزور ہو اور برداشت نہ کرپائے تو مناسب وقت تک مؤخر کرے۔ ختنہ کے مصارف خود مختون (جس کا ختنہ کیا جائے) کے مال سے ادا ہوں گے، بغیر ختنہ کے بالغ ہو جائے، تو حاکم اسے ختنہ کا حکم دے، انکار کرے، تو جبر کرے، حاکم کے ختنہ کرانے سے وہ مر جائے تو اس پر کوئی ضمان نہیں، تاہم شدید گرمی یا سردی میں کرائے تو ضامن ہوگا۔ لڑکے کے ختنہ میں اظہار اور لڑکی کے ختنہ میں اس کے برعکس (اخفاء واسرائی) سنت ہے، اگر کوئی ختنہ شدہ ہی پیدا ہو تو اس پر ختنہ واجب نہیں۔

اگر بچہ طاقتور ہو اور ختنہ کو برداشت کر سکتا ہو، اور ولی ختنہ کرائے جس سے وہ مر جائے تو ولی ضامن نہ ہوگا، ولی کے علاوہ کوئی کرائے تو ضامن ہوگا، اسی طرح بچہ میں برداشت کی قوت نہ ہو، تو ختنہ کرانے والا قود یا دیت کا ضامن ہوگا۔

متفرق مسائل: گودنا، کسی سے گودنے کے لئے کہنا، ابرو کے بال اکھیڑنا، دانتوں کو تیز اور باریک کرنا، دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنا، بالوں کو گھنگھریالے (پیچدار) بنانا حرام ہے، عورتوں کو اپنے بالوں میں انسانی بال یا نجس بال جوڑنا یا ان سے باندھنا حرام ہے۔ خواہ شوہر والی ہو یا بے شوہر، شوہر کی اجازت ہو یا نہ ہو، اسی طرح دیگر پاک بالوں کو جوڑنا بھی بغیر شوہر والی پر اور شوہر والی پر شوہر کی اجازت کے بغیر حرام ہے۔ شوہر کی اجازت سے دیگر پاک بالوں کو جوڑنا حرام نہیں ہے۔ نیز ریشم یا اون کے ریشوں اور دھاگوں سے جوڑنا بھی حرام نہیں۔

امام غزالی وغیرہ نے کمسن بچی کے کان میں زیورات کے لئے سوراخ کرنا حرام قرار دیا ہے، لیکن علامہ رملی وغیرہ نے جواز کو ترجیح دی ہے، اور یہی معتمد ہے۔

(خلاصۃ البدر ۲/۳۹۰-۳۹۲، تلخیص الحبیر ۴/۱۴۶-۱۴۹، نیل الاوطار ۵/۱۴۹-۱۵۶، المجموع ۸/۴۲۶-۴۴۸، الاقناع مع البجیرمی ۴/۲۸۶-۲۹۲، الفقہ المنہجی ۳/۵۵-۶۳، قلائد ۲/۳۹۱-۳۹۶، فتح المعین مع الاعانۃ ۲/۳۳۵-۳۴۰، بشری الکریم ۲/۱۲۹-۱۳۱، تحفہ مع الحواشی ۱۲/۲۹۱-۳۰۵، مغنی ۴/۲۹۳-۲۹۷، بغیہ: ۲۵۸، ترشیح ۲۰۵-۲۰۸، فتح الوہاب مع الجمل ۵/۲۶۲-۲۷۷، ۵/۱۷۴، نہایہ مع الحواشی ۸/۱۴۵-۱۵۰)

اَطْعِمَۃ (کھانے کی اشیاء)

آیات: (۱) ”یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ“ (البقرہ:۱۶۸)

ترجمہ: ”اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں، ان میں سے حلال پاک چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے“۔

(۲) ”وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ“ (الاعراف ۲۳۶)

ترجمہ: ”اور (آپ ﷺ) پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں، اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں“۔

(۳) ”قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ“ (الانعام:۱۴۵)

ترجمہ: ”آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں، ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے

کے لئے، جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے، یا جو شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص بے تاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالبِ لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو، تو واقعی آپ کا رب غفور رحیم ہے (بخشنے والا، مہربان ہے)۔"

حلال و حرام غذا سے واقفیت کافی اہم اور فرض عین ہے، حرام غذا کے استعمال پر سخت وعید وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں حرام سے پیدا شدہ گوشت کے لئے مناسب جگہ جہنم کو قرار دیا۔ (ترمذی)

کیڑے اور گھن: کھانے کی اشیاء مثلاً گوشت، سرکہ، میوے وغیرہ میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں، ان اشیاء سمیت انھیں کھانا حلال ہے، خواہ زندے ہوں یا مردہ، قلیل ہو یا کثیر، کیونکہ ان کو جدا کرنا (اکثر) دشوار ہوتا ہے، اگر کیڑوں کی کثرت کی وجہ سے گندا محسوس ہو تو کھانا جائز نہ ہوگا۔ صرف کیڑوں کو جدا کر کے تنہا یا کسی چیز کے ساتھ کھانا حرام ہے۔ نیز اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائے، یا خود دہٹ جائے، پھر اس میں لوٹ جائے، حالانکہ اس سے حفاظت ممکن تھی، تو اسے کھانا حرام ہے، گھن لگا ہوا کھجور اور لوبیا گھن سمیت کھانا امام رملیؒ وغیرہ نے جائز قرار دیا ہے۔

اگر شہد (وغیرہ) میں مکھی یا چیونٹی ہو، تو اسے کھانا جائز نہیں، اگر ایک مکھی، چیونٹی، یا شہد کی مکھی کسی چیز میں گر کر اس کے اجزاء اس میں گل جائیں، تو اسے کھانا حرام نہیں، کیونکہ ان کی حرمت گندگی کی وجہ سے تھی، اور یہ گندہ شمار نہ ہوگا۔

ٹڈی: ٹڈی حلال ہے، خواہ کوئی مسلم اس کا شکار کرے یا غیر مسلم، یا اپنی طبعی موت مر جائے، حضرت ابن ابی اوفی فرماتے ہیں: "ہم نے آپ ﷺ کے ساتھ سات غزوات کئے، جس میں آپ ﷺ کے ساتھ ٹڈی کھایا کرتے تھے" (صحیحین) ایک حدیث میں اس کے مردہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے (الشافعی، بیہقی) امام رملیؒ نے فرمایا کہ محرم ٹڈی کا شکار کرے تو اس کے لئے حرام ہے، لیکن دوسرا شخص کھا سکتا ہے، گو وہ بھی محرم ہو، کسی دوسرے جانور کا شکار کرے تو ہر کسی کے لئے وہ حرام ہے۔

بحری حیوان (سمندری حیوان): قرآن میں فرمایا: "أُحِلَّ لَكُم صَيۡدُ الۡبَحۡرِ وَطَعَامُهُ" (مائدہ: ۹۶) ترجمہ: "تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا حلال ہے" صید سے مراد زندہ جانور، اور طعام سے مراد وہ مردہ (مچھلی وغیرہ) ہے، جسے سمندر یا دریا باہر پھینک دے یا پانی کے اوپر آجائے۔ ایک حدیث میں سمندر کے مردار کو حلال قرار دیا گیا (ترمذی) نیز ایک سفر میں صحابہ کرام نے سمندر کی مری ہوئی مچھلی (عنبر) کھائی، اور ان کے مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے بھی اس میں سے نوش فرمایا (صحیحین)، ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سمندر نے مردہ مچھلی پھینک دی۔ (بیہقی باسناد صحیح)

سَمک یعنی مچھلی حلال ہے (اور سمک کا اطلاق تمام بحری جانداروں پر ہوتا ہے جبکہ وہ صرف اسی میں زندہ رہیں یا باہر ان کی زندگی حیاتِ مذبوح ہو) گو مشہور مچھلیوں کے مشابہ نہ ہو، مثلاً کتے، سور، گھوڑے (وغیرہ کے مشابہ جاندار سمندر میں پائے جائیں تو وہ بھی حلال ہیں) یہ حیوانات، زندہ و مردہ، دونوں حلال ہیں، نیز ان کا شکار مسلمان کرے یا کوئی غیر مسلم۔ جو مچھلی طبعی موت مر کر پانی کے اوپر آجائے وہ بھی حلال ہے اگر پھول جائے، اور نقصان دہ ہو، تو کھانا حرام ہے۔

قرش نامی مچھلی (جسے کلب البحر بھی کہتے ہیں، یعنی سمندر کا کتا) جو پانی کے اندر جانوروں کو اپنے دانت سے تلوار کی طرح کاٹ دیتی ہے، حلال ہے، مچھلی اور ٹڈی کو زندہ نگل لینا جائز ہے۔ مچھلی کو زندہ تلنا، پکانا یا بھوننا مکروہ ہے، کسی مچھلی کے پیٹ میں دوسری مچھلی ہو، اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر فضلہ کی طرف متغیر نہ ہوئی ہو تو وہ حلال ہے، مچھلی کو ذبح کرنا خلافِ اولیٰ ہے، تاہم مچھلی بڑی ہو اور تادیر زندہ رہتی ہو، تو

اسے دم کی طرف سے کاٹ کر راحت پہنچانا مستحب ہے، اگر وہ خشکی کے کسی ذبح کئے جانے والے جانور کے مشابہ ہو، تو اسے گردن میں کاٹ کر قتل کرے۔ کسی زندہ مچھلی یا ٹڈی کا ایک حصہ کاٹ لینا مکروہ ہے، امام اذرعی وغیرہ نے تکلیف کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا ہے، لیکن جدا شدہ حصہ حلال ہے، کیونکہ زندہ سے جدا شدہ حصہ مردار کے حکم میں ہے (اور مچھلی کا مردار بھی حلال ہے) (واللہ اعلم بالصواب)

ٹڈی اور چھوٹی مچھلیوں کے پیٹ کی آلائش صاف کئے بغیر انھیں کھانا کراہت کے ساتھ جائز ہے، انھیں تیل میں تلنے سے وہ تیل نجس نہ ہوگا۔ بدبودار (سڑی ہوئی) مچھلی و گوشت مکروہ ہے، جبکہ اس کے کھانے میں کوئی خاص نقصان نہ ہو، ورنہ حرام ہے۔

جو جاندار خشکی اور سمندر دونوں جگہ زندہ رہتے ہیں، وہ حرام ہیں، مثلاً مینڈک، کیکڑا، سانپ، کچھوا، اور گھڑیال (مگرمچھ) بالفرض بعض سانپ و بچھو صرف سمندر میں ہی زندہ رہتے ہوں، تب بھی وہ زہر کی وجہ سے حرام ہیں۔ ایک حدیث میں مینڈک کے قتل سے منع فرمایا گیا ہے (احمد، ابوداود، نسائی، حاکم وصححہ)

جنین (بچہ جو ابھی پیٹ میں ہو): یہ خشکی کے کسی حلال جانور (مثلاً گائے، بکری وغیرہ) کے تذکیہ (ذبح وغیرہ کرنے) کی وجہ سے اس کے پیٹ کا بچہ مر جائے، یا اس کی زندگی حیاتِ مذبوحہ ہو، پھر وہ مر جائے، یا شک ہو کہ ماں کے ذبح سے مرا یا کسی دوسرے سبب سے، تو ان صورتوں میں وہ جنین حلال ہے، (اسے کھا سکتے ہیں)، اگر ماں کے ذبح سے قبل ہی بالیقین وہ مر چکا ہو، یا مردہ حالت میں وہ سر باہر نکالے، یا زندہ حالت میں نکالے پھر مر جائے، پھر ماں کو ذبح کیا جائے، یا ماں کے ذبح کے بعد کافی عرصہ تک وہ اندر پھڑپھڑاتا سے رہا، یا شدید حرکت کرنے کے بعد پھر ٹھنڈا ہو گیا، تو ان صورتوں میں وہ حلال نہ ہوگا، (خلاصہ یہ کہ جنین کی موت ماں کے تذکیہ کی طرف منسوب ہو، گو احتمال کے درجہ میں تو حلال ہے، ورنہ نہیں) اگر جنین میں شکل تیار ہو چکی ہو، اور ابھی روح نہ پھونکی گئی ہو، تب بھی وہ حلال ہے۔ علقہ اور وہ مضغہ جس میں ابھی جانور کی شکل نہ بنی ہو، حلال نہیں، گو پاک ہیں۔

صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے ذبح کے بعد جانور کے پیٹ سے نکلنے والے جنین کے کھانے یا پھینکنے کے متعلق سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "چاہو تو اسے کھالو، کیونکہ اس کا تذکیہ اس کی ماں کا تذکیہ ہے" (یعنی ماں کے تذکیہ کے ضمن میں اس کا بھی تذکیہ حاصل ہو چکا، لہٰذا اسے کھانا حلال ہے) (ترمذی، ابوداود، دارقطنی، حاکم، احمد، طبرانی، بیہقی وغیرہ، وصححہ ابن حبان وابن دقیق العید) ابن کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام اسی کے قائل تھے (ابن حزم) امام بیہقی نے اسے کئی صحابہ کرام سے موقوفاً نقل فرمایا ہے، امام ابن المنذر فرماتے ہیں کہ کسی بھی صحابی سے اس کے برعکس مروی نہیں ہے۔

بری حیوان (خشکی کے جانور): درج ذیل بری حیوان حلال ہیں:

اونٹ، گائے بیل، بھیڑ بکری و دنبہ، کیونکہ قرآن نے بہیمۃ الانعام کو حلال قرار دیا ہے (دیکھئے سورۂ مائدۃ، آیت: ۱) (اس سے یہی چوپایے مراد ہیں) گھوڑا، کیونکہ بروز خیبر آپ ﷺ نے اس کے کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی (صحیحین) نیل گائے، جنگلی گدھا، کیونکہ آپ ﷺ نے اسے کھانے کی اجازت دی اور خود بھی نوش فرمایا (صحیحین) ہرن، اس کی حلت پر اجماع ہے، بجو، حدیث میں اسے حلال قرار دیا ہے، (الشافعی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، وصححہ البخاری والترمذی وابن حبان وابن خزیمہ والبیہقی)، گوہ (جسے کوکن میں عموماً گوڑ پھل کہتے ہیں) یہ آپ ﷺ کے دسترخوان پر کھایا گیا (صحیحین)، خرگوش، کیونکہ اس کا گوشت آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو آپ نے قبول فرمایا (صحیحین)، بخاری میں مزید آپ ﷺ کا نوش فرمانا بھی مذکورہ ہے، لومڑی، کیونکہ اس کے کچلی کے دانت مضبوط نہیں ہوتے، نیز یہ طیّبات میں سے ہے، فنک (لومڑی کی جنس سے ایک جانور ہے

جو لومڑی سے چھوٹا ہوتا ہے، اور جس کی کھال کی پوستین بہت اچھی ہوتی ہے) سیہی، نیولا، پہاڑی بکرا، کیونکہ یہ سب طیبات میں داخل ہیں۔

حلال پرندے: شتر مرغ، سارس، بط، مرغابی، مرغی، حَمَام (کبوتر، نیز اس میں جانوروں کی طرح منہ لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے والے اور کوکو اور گٹکری کرنے والے تمام پرندے داخل ہیں، مثلاً جنگلی کبوتر، تیتر، فاختہ، سرخاب، چکور، قُمری وغیرہ) چڑیا کے شکل کے پرندوں کی تمام انواع (مثلاً: بلبل، چھوٹے چڑے (ممولا)، وغیرہ) پانی کے تمام پرندے، (بجز لَقْلَق کے، یہ سارس کی قسم کا ایک پرندہ ہے، جس کی گردن اور ٹانگیں لابنی ہوتی ہیں، اور سانپوں کو کھاتا ہے، یہ خباثت وگندگی کی وجہ سے حرام ہے) اور چونچ سے دانہ چگنے والے پرندے، کیونکہ یہ سب طیبات (پاکیزہ چیزوں) میں داخل ہیں، جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے۔

حرام حیوان: پالتو گدھا، کیونکہ صحیحین کی حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے، خچر، کیونکہ ابوداود اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ بروزِ خیبر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس سے اور گدھے سے منع فرمایا، نیز خچر گھوڑی اور پالتو گدھے کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، جب تک گھوڑی کو خچر کا حمل ہو اسے ذبح کرنا حرام ہے، کیونکہ وہ بھی مر جائے گا، اگر کوئی خچر جنگلی گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے پیدا ہو، تو وہ حرام نہیں ہے۔ ہر کچلی والا درندہ جو اپنی کچلی سے تقویت حاصل کرتا اور دیگر جانداروں پر حملہ آور ہوتا ہے، کیونکہ صحیحین کی روایت میں اس سے منع کیا گیا ہے، مثلاً: شیر، بندر، لنگور، ریچھ، ہاتھی، چیتا، تیندوا، بھیڑیا، کتا، سور، گیدڑ، پالتو اور جنگلی بلی۔

ہر چنگل والا پرندہ، کیونکہ مسلم وغیرہ کی حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے، مثلاً باز، شاہین، گدھ، عقاب اور تمام شکاری پرندے۔ چمگاڈر، طوطا، مور، مکھی، زمین کے کیڑ مکوڑے (حشرات الارض) مثلاً گبریلا، گرگٹ، ہر وہ حیوان جس کے قتل کا حکم ہے، کیونکہ کسی حیوان کے قتل کا حکم اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً بچھو، سانپ، چیل، چوہا، اور حملہ آور وشکاری درندے۔ صحیحین میں ہے کہ کوا، چیل، چوہا، بچھو اور کاٹ کھانے والا کتا حل اور حرم میں قتل کیا جائے، مسلم کی حدیث میں سیاہ سفید کوے اور سانپ کا ذکر ہے، اور ابوداود و ترمذی کی ایک حدیث میں حملہ آور درندے کا بھی ذکر ہے۔

ہر وہ حیوان جس کا قتل ممنوع ہے، کیونکہ یہ ممانعت کھانے کی حرمت پر دلالت کررہی ہے۔ مثلاً: شہد کی مکھی، چیونٹے، لٹورا، ہدہد وغیرہ۔ ایک حدیث میں شہد کی مکھی، چیونٹی، ہدہد اور لٹورا کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے (احمد، ابوداود، ابن ماجہ، ابن حبان) امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں چیونٹی سے نمل سلیمانی (سلیمانی چیونٹی) یعنی بڑے (چیونٹے) مراد ہیں، چھوٹی چیونٹیوں کو تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے قتل کرنا حلال ہے، بلکہ بغیر جلائے ان کی چچڑی اور دیگر کیڑوں مکوڑوں کی تکلیف دور نہ ہو، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ اگر بڑے چیونٹے گھروں میں آکر تکلیف دے تو انھیں مارنا جائز ہے۔

مخلوط نسل: جو حیوان حلال اور حرام جانور کے ملاپ اور جفتی سے پیدا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ (کیونکہ حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی) مثلاً کتے اور بکری یا گھوڑے اور پالتو گدھے کی جفتی سے جو بچہ پیدا ہو، وہ حرام ہوگا۔ اگر کسی بکری کو کتے کے مشابہ بچہ پیدا ہو، لیکن اس کے ساتھ کتے کی جفتی کا علم نہ ہو، تو یہ بچہ حلال ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ اسے نہ کھائے۔

فائدہ: (۱) کسی گھوڑی سے خچر یا کسی بکری سے کتا پیدا ہو، تو اس گھوڑی یا بکری کا دودھ پینا جائز ہے۔ (۲) صحیح حدیث کی رو سے جگر اور تلی بالاتفاق حلال ہیں۔

مکروہ اعضاء: پتا، عضو تناسل، غدّۃ (رسولی۔ گوشت کا سخت ٹکڑا جو مرض کی وجہ سے کھال اور گوشت کے درمیان پیدا ہوتا

ہے) مثانہ (پیشاب جمع ہونے کی جھلی)

دیگر حیوان کا حکم: جن حیوانات کے حلال و حرام ہونے کے متعلق کوئی دلیل اور صراحت نہ ہو، ان کے فیصلہ کے لئے عرب حضرات کی طرف رجوع کریں گے۔ جس حیوان کو آسودہ حال اور سلیم الفطرت عرب حضرات خوشحالی میں پاکیزہ سمجھتے ہوں، وہ حلال اور جسے گندہ وناپاک شمار کرتے ہوں، وہ حرام ہو گا، کیونکہ عرب دیگر اقوام پر مقدم ہیں۔ کیونکہ شریعت کے اولین مخاطب وہی ہیں، نیز دینِ اسلام عربی ہے، محتاج اور تنگ دست افراد کا، اجڈ جنگلی لوگ جو ہر جینے مرنے والی چیز کو بلا جھجک کھاجاتے ہیں ان کا، اور مجبوری کی حالت میں کھانے کا اعتبار نہ ہو گا۔

اگر عرب حضرات میں اختلاف ہو، تو اکثر کی رائے کو ترجیح دیں گے، اگر کسی جانب اکثریت نہ ہو، تو قریش کے نظریہ کو مقدم رکھا جائے گا، کیونکہ وہ عرب کے سردار ہیں اور اصل دارومدار انھیں پر ہے، نیز وہ مکارم اخلاق وشرف سے متصف ہیں، اگر قریش میں اختلاف ہو، اور کوئی وجہ ترجیح نہ ہو، یا وہ کوئی فیصلہ نہ دیں، یعنی خود انھیں بھی شک ہو، یا علاقہ میں عرب نہ ہوں، یا اس جانور کا ان کے پاس کوئی نام ہی نہ ہو، تو ان صورتوں میں اس جانور کی شکل وصورت یا عادت یا اس کے گوشت کے ذائقہ میں زیادہ مشابہ جانور کا اعتبار کریں گے، پہلے عادت، پھر ذائقہ، ورنہ شکل وصورت کا اعتبار ہو گا۔ (یعنی اس کی عادت وغیرہ کسی حلال جانور کے مشابہ ہے تو حلال، اور حرام جانور کے مشابہ ہے تو حرام قرار دیں گے) اگر دونوں طرف یکساں مشابہت ہو، یا کسی کے مشابہ نہ ہو، تو وہ حلال ہے، جیساکہ سورہ انعام کی آیت: ۱۴۵، کا تقاضہ ہے (جو باب کے ابتداء میں تیسرے نمبر پر گذر چکی) سابقہ کسی شریعت کا اعتبار نہ ہو گا۔

جس حیوان کے متعلق آپ ﷺ کے وقت سے اب تک کسی بھی دور کے عرب کا فیصلہ موجود ہو، تو اس کی پیروی کریں گے، اگر ماضی کا فیصلہ موجود نہ ہو، تو فی الحال موجود عرب کا اعتبار ہو گا۔ دوعادل عرب کا خبر دینا کافی ہے۔

حیوان کا نام: کسی حیوان کا حکم معلوم نہ ہو، تو اس کا نام عرب حضرات سے دریافت کریں، پھر اس نام کے حیوان کا شریعت میں جو حکم ہو، اس پر عمل کریں۔

متنجس: جو پاک چیز (سیال ہو یا جامد اور ٹھوس) نجاست کے ملاوٹ کی وجہ سے نجس ہو جائے، اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ غلہ کو گاہتے (پاؤں سے ملتے اور روندتے) وقت بیل کا پیشاب پاخانہ اسے لگے تو یہ معاف ہے، اس کے کھانے کے بعد منہ کا دھونا مستحب ہے۔

جلّالَة: یعنی نجاست کھانے والا جانور، نجاست کے کھانے کی وجہ سے جس جانور کے گوشت کے ذائقہ، رنگ یا بو میں تغیر پیدا ہو، اس کا گوشت، دودھ اور انڈا وغیرہ کھانا اور بغیر حائل اور آڑ کے اس پر سواری کرنا مکروہ ہے، ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ میں مردہ بچہ ملے یا زندہ ملے لیکن اس میں بھی تغیر ہو، تو وہ بھی مکروہ ہے، اگر زندہ ملے اور تغیر نہ ہو، اور اسے ذبح کرے تو وہ مکروہ نہیں ہے۔

دیگر اشیاء کے کھانے وغیرہ سے یہ تغیر ختم ہو جائے تو کراہت ختم ہو گی، دھونے یا پکانے وغیرہ سے تغیر ختم ہو، تو کراہت ختم نہ ہو گی آپ ﷺ نے جلّالۃ کے کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ چالیس روز اسے چارہ کھلایا جائے۔ (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح) ابوداود کی حدیث میں سواری کی ممانعت بھی موجود ہے۔ چالیس روز کی قید غالب کے اعتبار سے ہے۔ (اصل دارومدار تغیر ختم ہو کر گوشت بہتر ہونے پر ہے۔)

فائدہ: حلال جانوروں کو نجس العین چیز کھلانا مکروہ ہے، جو پاک چیز نجاست ملنے کی وجہ سے نجس ہو گئی ہو (جیسے نجس آٹا، پانی وغیرہ) اسے کھلانا مکروہ نہیں ہے، کسی جانور کی طویل مدت تک حرام مال سے پرورش ہو، تو اس سے اس کا گوشت حرام نہ ہو گا۔

ذبح شدہ جانور کے گوشت میں بو آنے لگے تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔

جس درخت یا کاشت میں گوبر، نجس کھاد، یا نجس پانی استعمال ہو اس کے پھل اور اناج میں کوئی کراہت نہیں، تاہم جس چیز پر نجاست لگ جائے، اسے دھونے سے وہ پاک ہو گا اگر پھل میں نجاست کی بو وغیرہ محسوس ہو تو وہ مکروہ ہے۔

نجاست کی کمائی: نجاست کے اختلاط سے جو کمائی حاصل ہو، کسی آزاد شخص کو اس کا استعمال مکروہ ہے، مثلاً: پچھنے لگانا، گوبر وغیرہ کی صفائی، دباغت (چمڑہ کی پکائی کا پیشہ)، قصاب (قصائی) کی کمائی وغیرہ۔ اس کمائی کو اپنے جانوروں کو کھلانا مسنون ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے پچھنے لگانے کی اجرت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اسے غلام اور سیر ابی کے اونٹ کو کھلانے کا حکم دیا (ترمذی وحسنہ وابن حبان وصحہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پچھنے لگوائے اور اسے اس کی اجرت دی، اگر (اجرت دینا) حرام ہوتا تو آپ ﷺ نے نہ دیا ہوتا۔ (صحیحین) کیونکہ جس کا لینا حرام ہو گا دینا بھی حرام ہو گا، بجز مجبوری کے مثلاً خوف کی وجہ سے کسی ظالم یا شاعر یا قاضی کو دینا، کیونکہ اس صورت میں صرف لینا حرام ہے۔

اپنے اور زیر کفالت افراد کے مصارف کے لئے حتی الامکان خالص پاکیزہ معاش کی کوشش کرنا مستحب ہے۔ اگر اس سے عاجز ہو، تو کم از کم اپنی حد تک کوشش کرے۔ جس کا اکثر مال حرام ہو، اس کے ساتھ لین دین اور اس کے مال میں سے کھانا حرام نہیں ہے۔ افضل ذریعۂ معاش کاشت کاری ہے۔ گو نوکروں کے ذریعہ انجام دے، پھر اپنے ہاتھ کی کاریگری سے کمائی، پھر تجارت۔

نائی (حجام)، کپڑا بننا، چوکیداری (پاسبانی وحفاظت)، رنگریزی، زرگری ستاری اور کنگھی کرنے کے پیشہ میں کوئی کراہت نہیں، کیونکہ اس میں نجاست سے کوئی تعلق نہیں۔

حیوان کا قتل: بعض حیوانات کے قتل کے حکم اور ممانعت کا تذکرہ گذر چکا۔

ہر وہ حیوان جس میں کوئی نفع نہ ہو، اور وہ تکلیف دہ اور موذی ہو، اسے قتل کرنا مندوب ہے۔ مثلاً: مچھر، جوں، چچڑی، چھپکلی، مسلم کی حدیث میں ہے کہ پہلی مار میں چھپکلی کو قتل کرنے پر ۱۰۰ نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دوسری میں اس سے کم، اور تیسری میں اس سے بھی کم۔

جس حیوان میں نفع ونقصان دونوں ہو، اسے مارنا نہ مندوب ہے اور نہ مکروہ۔ جیسے تیندوا، باز، شکرہ۔

حلال جانوروں کو صرف کھانے کے لئے ذبح کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی جانور کسی پر حملہ کر بیٹھے تو اپنے بچاؤ اور دفاع کے لئے قتل کی گنجائش ملے گی۔ ان دو اسباب کے بغیر اسے قتل کرنا حرام ہے۔

جس حیوان میں کوئی نفع اور نقصان نہ ہو، اسے قتل کرنا مکروہ ہے، جیسے گبریلا، کیڑے، مکھی وغیرہ (مکھیوں سے تکلیف ہو تو بظاہر قتل کرنا مکروہ نہ ہو گا)

کتے کو قتل کرنے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، خواہ سیاہ ہو یا کسی اور رنگ کا، لہٰذا پاگل اور کاٹ کھانے والے کتے کے علاوہ کسی کتے کو مارنا جائز نہیں، گو اس میں کوئی نفع نہ ہو، اسی کو المجموع وغیرہ میں صحیح قرار دیا ہے۔ (بعض علماء نے جس کتے میں کوئی نفع نہ ہو اسے مارنا مکروہ قرار دیا ہے)

جس جانور میں نفع ہو، اور کوئی نقصان نہ ہو، اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ (الاشباہ للسیوطی: ۴۴۸)

جمادات: (جماد یعنی غیر ذی روح اشیاء جیسے پتھر، مٹی وغیرہ): درج ذیل اشیاء کے علاوہ تمام پاک جمادات حلال ہیں۔

(۱) نشہ آور اشیاء جیسے افیون یا زعفران کی کثیر مقدار

(۲) اپنی اصل کے اعتبار سے اکثر سلیم الفطرت اشخاص کے نزدیک گندی اشیاء، جیسے: منی، رینٹ، تھوک، پسینہ وغیرہ، منہ سے جدا ہونے سے قبل تھوک حرام نہیں ہے۔

(۳) جو بدن یا عقل کے لئے واضح و نمایاں نقصان دہ ہو، جیسے: کانچ، نقصان دہ مٹی، گارا اور پتھر، زہر وغیرہ۔

اگر زہر کی قلیل مقدار کسی کو نقصان دہ نہ ہو، یا حاجت کی وجہ سے دوسری چیز کے ساتھ استعمال کرے، تو سلامتی کے غلبہ کی صورت میں جائز ہے۔

اگر مٹی کا گارا کسی کو نقصان نہ کرے، تو اس کے حق میں جائز ہے، حمل میں عورتیں جو مٹی استعمال کرتی ہیں، ان کے لئے وہ جائز ہے۔ مجبوری کی وجہ سے نشہ آور نباتات کا علاج کے لئے استعمال جائز ہے، جبکہ اس کا کچھ بدل نہ ہو، گو اس سے نشہ آجائے۔

تمباکونوشی: نقصان دہ اشیاء کی حرمت کے اصول کے پیشِ نظر کئی علماء نے تمباکو کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے۔

کھال: مردار کی چمڑی حرام ہے، گو دباغت شدہ ہو، اور حلال جانور کی ہو، مذبوح جانور کی کھال بھی کھاسکتے ہیں، خواہ دباغت سے پہلے ہو یا بعد میں۔

انڈا: حرام پرندوں کے انڈوں کو (جبکہ اس میں کوئی ضرر نہ ہو) مجموع میں حلال قرار دیا ہے۔ (البتہ امام بُلقینی کا میلان حرمت کی طرف ہے)

نجس چیز: تمام غیر معاف نجس اشیاء کا کھانا حرام ہے۔ (تاہم کسی چیز میں پیدا شدہ کیڑوں سمیت اس چیز کو کھانا حلال ہے، جیسا کہ گذر چکا) اگر کسی کا منہ نجس ہو جائے تو اسے پاک کرنے سے قبل کوئی چیز کھانا پینا جائز نہیں ہے۔

فوائد: (۱) گھی میں گر کر مرے ہوئے چوہے کے متعلق آپ ﷺ سے پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے اس چوہے اور اس کے اطراف کے گھی کو پھینک کر بقیہ کو کھانے کا حکم دیا (بخاری) ابوداود کی حدیث میں مزید یہ ہے کہ اگر وہ مائع (سیال) ہو، تو اس کے قریب نہ جاؤ۔ لہٰذا اگر کسی جامد (ٹھوس) اور جمی ہوئی چیز میں نجاست گر جائے تو نجاست اور اس کے اطراف کا حصہ الگ کر کے بقیہ کو کھاسکتے ہیں۔ اگر کسی سیال چیز (مثلاً تیل۔ دودھ وغیرہ) میں گرے تو مکمل نجس ہو گا، اسے کھانا پینا اور فروخت کرنا حرام ہے۔ دوسرا کوئی استعمال ہو تو جائز ہے۔ مثلاً تیل کو چراغ میں جلانا وغیرہ۔

(۲) کسی گوشت کے سالن میں کوئی پرندہ گر کر مر جائے (یا کوئی اور نجاست گرے) تو پورا سالن نجس ہو چکا، شوربا پھینک کر گوشت کو دھو کر استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) قلتین یا زائد پانی میں پیشاب وغیرہ شامل ہو، اور کوئی تغیر نہ آئے، تو تمام پانی کا استعمال جائز ہے۔

(۴) چھوٹی چڑیا وغیرہ کو زندہ نگل جانا حرام ہے، کیونکہ یہ بغیر تذکیہ (ذبح وغیرہ) کے حلال نہیں، تاہم مچھلی اور ٹڈی کو زندہ نگل جانا جائز ہے۔

(۵) گوشت وغیرہ کو ابتداء سے آخر تک بالکل ڈھانک کر بھونا جائے کہ نہ اس کے ابخرات باہر نکلیں اور نہ ہوا اندر داخل ہو، تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔

(۶) کسی سبزی و نباتات کے زہریلے ہونے میں شک ہو، یا کسی دودھ کے متعلق حلال یا حرام جانور کا ہونے میں شک ہو، تو اس کا کھانا پینا حرام ہے، کسی جامد چیز میں، جو پہلے سیال تھی، کوئی نجس چیز نظر آئے، لیکن یہ علم نہ ہو کہ پہلے گری یا جامد ہونے کے بعد، تو اس چیز

کا استعمال حلال ہے۔

مجبوروبے تاب کا حکم

آیت: (۱) "وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ" (الانعام: ۱۱۹)

ترجمہ: "اور تحقیق اللہ نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتلادی ہے، جن کو تم پر حرام کیا ہے، مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جائے تو حلال ہے"

(۲) "فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" (مائدہ: ۳)

ترجمہ: "پس جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو، تو یقینا اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں"۔

(۳) "إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" (البقرہ: ۱۷۳)

ترجمہ: "اللہ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو، اور خون کو، اور خنزیر (سور) کے گوشت کو، اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر بھی جو شخص بے تاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالبِ لذت ہو، اور نہ تجاوز (زیادتی) کرنے والا ہو، تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں"۔

مضطر: (بے تاب وبے بس): اگر نہ کھانے پینے کی وجہ سے موت، یا پُر خطر بیماری، یا بیماری میں اضافہ، یا بیماری کی مدت میں اضافہ، یا کسی ظاہری عضو میں کافی بدنمائی کا خطرہ ہو، تو اسے مضطر کہا جائے گا۔ (خلاصہ یہ کہ بیماری کی ہر وہ صورت جس میں تیمم جائز ہو، وہ مضطر کہلائے گا)

جو مضطر وبے تاب ہو، اور کوئی حلال چیز میسر نہ ہو، تو کسی حرام چیز کو کھا پی کر اپنی زندگی کو بچانا اس پر واجب ہے۔ مثلاً آدمی یا کسی جانور کا مردار، خون، سُوّر، پیشاب وغیرہ، تاہم کوئی نشہ آور چیز نہ کھائے۔ حرام چیز کو شکم سیر ہو کر کھانا جائز نہیں، گو عنقریب حلال کی توقع نہ ہو، کیونکہ سَدِّرَمَق سے فی الحال بے تابی کا ازالہ ہو چکا۔ البتہ سَدِّرَمَق پر اکتفا کرنے سے خطرہ کا اندیشہ ہو، تو شکم سیری واجب ہے، یعنی اتنا کھانا کہ بھوک کی شدت ختم ہو جائے، یہ مطلب نہیں کہ بالکل پیٹ بھر کر کھا جائے اور کھانے کے لئے جگہ باقی نہ رہے، اس حد تک کھانا قطعاً حرام ہے، اگر کچھ حلال کھانا میسر ہو، گو ایک لقمہ ہو، تو پہلے اسے کھالینا واجب ہے۔

جو مضطر بالکل جاں بلب ہو چکا ہو، یعنی کھانے کے باوجود موت یقینی ہو، تو اسے کوئی حرام چیز کھانا جائز نہیں، کیونکہ اس سے اسے کوئی نفع نہ ہو گا۔

جو سفر میں اس طرح مجبور وبے تاب ہو، اور اس سفر کی وجہ سے وہ گنہگار ہو، تو جب تک وہ اپنے گناہ سے توبہ نہ کرے، اسے کسی حرام کے کھانے کی رخصت نہ ہو گی۔

اگر آدمی کا مردار اور کسی دوسرے جانور کا مردار دونوں میسر ہوں، تو دوسرے مردار کو مقدم کیا جائے گا، کسی محترم آدمی کے مردار کو پکانا یا بھونا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کے احترام کے خلاف ہے، البتہ اسکے بغیر کھانا ممکن نہ ہو، تو گنجائش ہو گی، دیگر مردار میں اسے

اختیار ہے کہ پکا کر کھائے یا کسی اور طرح۔

جانور یا کسی آدمی کا قتل: مضطر اپنی بقا اور کھانے کے لئے کسی جانور کو یا ایسے شخص کو قتل کر سکتا ہے، جو معصوم نہ ہو، (یعنی شرعاً جس کو قتل کیا جا سکتا ہو) گو صرف مضطر کے حق میں معصوم نہ ہو، مثلاً جس پر اسے قصاص کا حق حاصل ہو، مرتد حربی، خواہ عورت یا بچہ ہو، مُحصَن زانی، تارکِ نماز، گو حاکم کی اجازت نہ ہو، کیونکہ ان لوگوں کو قتل کرنے کا حق حاصل ہے، ان کو قتل کرنے کے لئے حاکم کی اجازت عام حالات میں اس کے ادب کے طور پر ضروری ہے، مجبوری کی صورت میں اس ادب کی رعایت ضروری نہیں ہے۔ کسی معصوم شخص کا قتل جائز نہیں ہے، خواہ ذِمّی یا مستامن ہو۔

دوسرے کا کھانا: مضطر کو کسی دوسرے کا کھانا میسر ہو، اور مالک وہاں موجود نہ ہو، تو وہی چیز کھانا واجب ہے، کیونکہ وہ پاک چیز پر قادر ہے، اور اس چیز کی قیمت مالک کو ادا کرنا لازم ہے، فی الحال قیمت کی ادائیگی پر قادر نہ ہو، تب بھی وہی چیز کھائے، قیمت اس کے ذمہ قرض رہے گا۔ (اگر مثلی چیز ہے، تو مثل ادا کرنا لازم ہے)

اگر کسی مضطر کے پاس کھانا موجود ہو، تو دوسرے مضطر کو دینا لازم نہیں ہے، لیکن اگر کسی معصوم مسلمان مضطر کو اپنے مقابلہ میں ترجیح دے، تو یہ جائز، بلکہ مستحب ہے، گرچہ وہ خود اسکا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ قرآن نے انصاریوں کے اس صفت کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ اپنی فاقہ مستی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرتے ہیں۔ (دیکھئے سورہ حشر، آیت: ۹) نیز یہ ہمیشہ صالحین کی فطرت وعادت رہی ہے۔ کسی غیر مسلم یا جانور کو اپنے اوپر مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر مالک موجود ہو، اور مضطر نہ ہو، تو اسے کسی معصوم مضطر کو کھانا دینا لازم ہے، تاہم مفت دینا لازم نہیں ہے۔ بلکہ ثمنِ مثل (مناسب قیمت) وصول کر سکتا ہے، اگر مضطر کے پاس قیمت نہ ہو، تو اسکے ذمہ قرض رہے گا، کیونکہ ایک کے ضرر کو دفع کرنے کیلئے دوسرے کو ضرر میں مبتلا نہ کیا جائے گا۔ اگر قیمت کا کوئی تذکرہ نہ کرے، تو قیمت لازم نہیں، کیونکہ کھانے پینے کی اشیاء میں عموماً تسامح برتا جاتا ہے، لہٰذا اسے اسی پر محمول کریں گے، بالخصوص مضطر کے حق میں۔

اگر مالک مضطر نہ ہونے کے باوجود مضطر کو قیمت کے عوض بھی کھانا نہ دے، تو مضطر جبراً اور زبردستی اس کا کھانا لے سکتا ہے، گو اسے قتل کرنے کی نوبت آجائے، اور اس قتل کی وجہ سے ضامن نہ ہوگا، کوئی غیر مسلم مضطر کھانا حاصل کرنے کے لئے کسی مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا۔

دوسرے کا کھانا اور مردار: اگر کسی مضطر کے سامنے مردار اور دوسرے کا کھانا ہو، جو وہ دینے پر راضی نہ ہو، تو اس پر مردار کھانا لازم ہے، کیونکہ اس کی حلت صراحتاً قرآن میں موجود ہے، اور جبراً دوسرے کا کھانا لینے کا جواز اجتہاد سے ثابت ہے، اگر مالک کھانا مفت دے، یا مناسب قیمت (یا کچھ زائد قیمت) پر دے اور مضطر کے پاس قیمت موجود ہو، یا موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ ادھار رکھنے پر راضی ہو، تو ان صورتوں میں مردار حلال نہ ہوگا، اگر بہت زیادہ قیمت کا مطالبہ کرے، تو دینا لازم نہیں، مستحب ہے۔

مردار اور دوسری چیز: اگر کوئی مضطر احرام میں ہو یا حرم میں ہو، اور اسے مردار اور زندہ شکار میسر ہو، تو اسے مردار کھانا لازم ہے، کیونکہ شکار ممنوع ہے، اور اسے ذبح کرنے سے وہ بھی مردار ہی قرار پائے گا، اور اس کا کھانا حرام اور اس میں جزا واجب ہوگی۔ اگر اس کے سامنے مردار اور کسی مُحرِم کے ذبح کردہ شکار کا گوشت موجود ہو، تو دونوں میں سے جو چاہے کھالے، اگر صرف زندہ شکار میسر ہو، تو اسے ذبح کر کے کھالے اور اسکا فدیہ ادا کرے۔

اپنا عضو کاٹنا: اگر مردار وغیرہ میسر نہ ہو، تو مضطر کھانے کے لئے خود اپنے بدن کا کوئی حصہ، مثلاً: ران کا ایک ٹکڑا، کاٹ سکتا

ہے، جب کہ اس میں کوئی خطرہ نہ ہو، یا نہ کھانے کے مقابلہ میں کم خطرہ ہو، اگر مردار وغیرہ کچھ میسر ہو، یا خطرہ صرف کاٹنے میں ہو ،(بھوکا رہنے میں فی الحال خطرہ نہ ہو)، یا دونوں میں برابر خطرہ ہو، یا کاٹنے میں زیادہ خطرہ ہو، تو ان صورتوں میں کاٹنا حرام ہے۔ کسی دوسرے معصوم شخص کا گوشت اپنے لئے کاٹنا یا اپنا گوشت دوسرے کے لئے کاٹنا حلال نہیں ہے۔ غیر معصوم کا گوشت کاٹ کر کھا سکتا ہے،(جیسا کہ اسے قتل کرنے کا جواز گذر چکا)

فائدہ: اگر کھانے کا مالک کسی بے تاب عورت کو بغیر زنا کے کھانا نہ دے، تو اس عورت کو زنا کی اجازت نہ ہو گی۔

نجس پانی اور پیشاب: اگر صرف نجس پانی اور پیشاب میسر ہو، تو نجس پانی کو استعمال کرے۔ اگر حلال وحرام جانور کا پیشاب موجود ہو، تو حلال جانور کا پیشاب مقدم کرے، کیونکہ یہ کئی علماء کے نزدیک پاک ہے، صرف پیشاب میسر ہو، تو وہ پی سکتا ہے۔

شراب: پیاس یا علاج کی خاطر شراب پینا حرام ہے، کیونکہ شراب کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ دوا نہیں ہے، بلکہ وہ تو بیماری ہے۔(مسلم، احمد، ابوداود، ابن ماجہ) ابن حبان کی روایت میں ہے کہ ''وہ تو بیماری ہے، نہ کہ شفا'' ایک حدیث میں ہے کہ شراب سے علاج کے متعلق سوال ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ نے جو چیز تم پر حرام قرار دی ہے، اس میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی ہے'' (ابن حبان۔ بیہقی) اگر کسی دوا میں شراب شامل ہو، اور اس کے صفات ختم ہو چکے ہوں، اور بظاہر دوسری کوئی دوا اس کا بدل نہ ہو، تو مجبوری کی وجہ سے اس دوا کا استعمال جائز ہے۔ نیز شراب سے پیاس بجھنے کے بجائے، اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر لقمہ گلے میں پھنس جائے (اچھولگ جائے) اور شراب کے علاوہ کوئی چیز اسے گلے سے اتارنے کے لئے موجود نہ ہو تو شراب کا گھونٹ لے کر اسے اتارنا واجب ہے، کیونکہ اس سے موت سے سلامتی (کسی حد تک بظاہر) یقینی ہے۔

حرام سے علاج: شراب کے علاوہ دیگر نجاستوں سے علاج جائز ہے، جبکہ کوئی پاک چیز اس کی جگہ علاج کے لئے موجود نہ ہو، اگر پاک چیز میسر ہو، تو نجاست سے علاج حرام ہے، اور اوپر ممانعت کی جو حدیث گذری، اسے اسی صورت پر محمول کریں گے۔ نجاست سے علاج اس وقت جائز ہے جبکہ مریض خود اس سے واقف ہو کہ دوسری کوئی پاک چیز اسکا بدل موجود نہیں ہے، یا کوئی معتبر مسلمان ڈاکٹر اسے یہ بات بتادے۔ اگر نجاست کے استعمال سے جلد شفا حاصل ہو، ورنہ شفا کے حصول میں تاخیر ہو تو بظاہر نجاست کے استعمال کی گنجائش مل جائے گی۔

صحیحین وغیرہ کی روایات میں ہے کہ بعض لوگوں کو علاج کے لئے آپ ﷺ نے اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی۔ اس حدیث کو علماء نے مجبوری کی شکل پر محمول کیا ہے۔

فوائد: (۱) اگر کسی مریض کو ایسا کھانا میسر ہو، جو اس کے لئے نقصان دہ ہو، تو وہ اسے چھوڑ کر مردار کھا سکتا ہے۔

(۲) ہر طرف حرام مال ہی کا دور دورہ ہو، تو بقدر حاجت استعمال کر سکتا ہے، نہ کہ اس سے زائد، جبکہ اصل مالکوں کے معرفت کی توقع ہو، ورنہ وہ بیت المال کا مال شمار ہو گا۔ لہٰذا اپنے استحقاق کے بقدر اس میں سے لے سکتا ہے۔

(۳) امام شافعی نے فرمایا کہ سانپوں کے گوشت سے تیار شدہ تریاق بغیر شدید مجبوری کے کھانا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس حالت پر پہنچ جائے کہ مردار کھانا جائز ہو جائے۔

(۴) بغیر مجبوری کے بھی مردار وغیرہ حرام چیز کا توشہ سفر میں ساتھ رکھنا جائز ہے۔ (تاکہ بصورتِ مجبوری استعمال کر سکے)

(۵) مضطر کو ایک حلال جانور اور ایک حرام جانور کا مردار میسر ہو، مثلاً بکری اور گدھا تو اسے اختیار ہے، اگر گدھا اور کتا میسر ہو، تو

کتے کو چھوڑ کر گدھے کو مقدم کرے۔

(٦) دوسرے کے کھانے کو عیب لگانا مکروہ ہے۔

(٧) حلال کھانا شکم سیری سے زائد کھانا مکروہ ہے، جب کہ خود کا ہو، دوسرے کا ہو تو اس کی رضامندی کی صورت میں مکرہ، ورنہ حرام ہے۔

(٨) نفس کی جائز شہتوں اور لذتوں کے بارے میں اعتدال سے کام لینا بہتر ہے۔

(٩) مردار وغیرہ کھانے کے بعد مضطر کو حلال غذا ملے تو قئ کرنا لازم ہے، جب کہ ضرر کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح کسی کے جبر وزبردستی کی وجہ سے کوئی شراب پئے یا حرام چیز کھائے تو بصورتِ امکان بعد میں قئ کردے۔

دوسرے کا باغ: کوئی شخص کسی دوسرے کے باغ یا کھیتی کے پاس سے گذرے تو مالک کی اجازت کے بغیر اس کا پھل یا اناج لینا یا کھانا جائز نہیں ہے۔ اگر مضطر ہے تو کھا سکتا ہے، لیکن قیمت ادا کرے گا، اگر احاطہ (کمپاونڈ) کے اندر پھل گرے ہوئے ہوں تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر باہر گرے ہوئے پھل ہوں، اور علاقہ میں ایسے پھلوں کے اباحت کی عادت ہو (یعنی عام ماحول یہ ہو کہ ایسے پھلوں کے اٹھانے و کھانے میں مالک کو کوئی اعتراض نہ ہو) تو وہ جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''کسی شخص کو اپنے (مسلمان) بھائی کے مال میں سے وہی حلال ہے، جو وہ اپنی خوش دلی سے دے'' (بیہقی فی کتاب الغصب باسناد صحیح) جن روایات سے جواز معلوم ہوتا ہے، علماء نے اسے عرف وماحول پر یا مضطر پر محمول کیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کتاب وسنت کی روشنی میں کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

اگر کسی رشتہ دار یا دوست کے متعلق گمان غالب ہو کہ اس کے باغ، کھیت یا مکان سے کسی چیز کا کھانا اسے ناگوار نہ ہوگا، اور وہ اس سے راضی ہوگا، تو کھانے میں حرج نہیں، اشخاص، وقت، احوال اور مال کے اعتبار سے اس مقدار میں اختلاف ہوگا۔ اگر اس کی رضامندی میں شک ہو، تو کھانا جائز نہیں، کتاب وسنت اور امت کے قدیم وجدید افراد کے تعامل سے یہی تفصیل سامنے آتی ہے۔

ضیافت (مہمان نوازی): کوئی مسلم جو مضطر نہ ہو، کسی مسلمان کا مہمان بنے، تو اس کی مہمان نوازی مستحب ہے، واجب نہیں ہے، صحیحین وسنن کی احادیث میں اس کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، احادیث کی رو سے ایک دن اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کے لئے خصوصی اہتمام کرے، بقیہ، دوروز اپنی روزانہ کی عادت کے مطابق کھلائے پلائے، تین دن کے بعد جو ہو، وہ صدقہ ہے، جو میزبان کی مرضی پر موقوف ہے، مہمان کے لئے مناسب نہیں کہ میزبان کے مطالبہ والتماس کے بغیر تین روز سے زائد اس کے پاس ٹھہرے۔

داغ دینا: صحیحین وغیرہ کے احادیث کی رو سے علاج کی خاطر داغ دینے کی گنجائش ہے، لیکن حتی الامکان اس طریقۂ علاج کو نہ اپنانا بہتر اور مستحب ہے۔

پرہیز: حضرت علیؓ میں ایک مرتبہ بیماری کی نقاہت باقی تھی، پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے، اور کھجور کھانے لگے تو آپ ﷺ نے انھیں منع فرمایا۔ (ابو داود، ترمذی) لہذا بیماری کے اعتبار سے مناسب پرہیز مشروع ہے۔

جھاڑ پھونک: (منتر۔ تعویذ): ''آپ ﷺ نے ہر زہریلے جانور (کا زہر اتارنے) کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت دی'' (بخاری، مسلم)

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے ''آپ ﷺ نے مجھے نظر بد کے منتر کی اجازت دی۔'' (بخاری۔مسلم) ایک حدیث میں آپ ﷺ

نے فرمایا کہ "جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں، جب کہ اس میں شرک (کا کوئی کلمہ) نہ ہو" (مسلم) ایک یہودی عورت حضرت عائشہؓ کو جھاڑ پھونک کر رہی تھی، تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "اسے کتاب اللہ کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرو" (بیہقی باسنادہ الصحیح)

امام شافعیؒ نے فرمایا: "کوئی شخص کتاب اللہ سے یا اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے ذکر سے جو اسے معلوم ہو، جھاڑ پھونک کر سکتا ہے، نیز اہل کتاب (یہودی وعیسائی) بھی مسلمانوں کو جھاڑ پھونک کر سکتے ہیں، جبکہ اللہ کی کتاب یا اللہ کے ذکر سے کریں، جو معروف ہو، اور اس کے متعلق کافی دلائل موجود ہیں۔" امام بیہقی فرماتے ہیں کہ جھاڑ پھونک اور دوائی وعلاج کے متعلق آپ ﷺ سے بکثرت روایات مروی ہیں۔

تعویذ لٹکانا: مختلف روایات کی روشنی میں ایسے تعویذ کا استعمال جس کا مطلب معلوم نہ ہو، یا آدمی جاہلیت کی طرح براہ راست تعویذ کو شفا اور مقصد بر آری میں موثر سمجھے، ممنوع ہے۔ اگر اللہ کی کتاب یا کسی معلوم ذکر الٰہی کو تبرکاً استعمال کرے، اور شفا کو صرف اللہ کی طرف سے سمجھے، تو ایسے تعویذ میں حرج نہیں۔

چشمِ بد (نظر لگنا): صحیحین وغیرہ کی احادیث میں چشم بد کو آپ ﷺ نے برحق قرار دیا ہے، اور اس کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

نظر کے اثر کا ازالہ: مسلم کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم سے غسل کا مطالبہ کیا جائے، تو تم غسل کرو" یعنی بظاہر جس شخص کی نظر لگی ہے، مریض اس سے مطالبہ کرے تو وہ انکار نہ کرے، بلکہ اعضاء وضو، گھٹنے، تہہ بند کی اندرونی سطح دھو کر وہ پانی مریض کو دے، اور پیچھے کی طرف سے اس پانی کو مریض کے سر پر انڈیل دیا جائے۔

فائدہ: امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ مراتب پانچ ہیں: ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول۔

۱- **ضرورت:** یعنی اس حد تک پہنچ جانا کہ کچھ نہ کھائے تو مر جائے گا، یا قریب المرگ ہوگا، اس حالت میں حرام چیز کھانا جائز ہے۔

۲- **حاجت:** مثلاً ایسا بھوکا شخص کہ کچھ کھانے نہ ملے تو مرے گا تو نہیں، تاہم کافی تکلیف ومشقت پیش آئے گی، اس صورت میں حرام کی اجازت نہ ہوگی، البتہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ملے گی۔

۳- **منفعت:** مثلاً وہ شخص جسے بکری کا گوشت، اور مرغن غذا کی خواہش ہو۔

۴- **زینت:** مثلاً مٹھائی، ریشم اور کتان سے بنے ہوئے کپڑے کی خواہش۔

۵- **فضول:** حرام اور مشکوک اشیاء کے استعمال تک پہنچ جانا۔

(تلخیص ۲/۲۹۴-۲۹۷، ۴/۱۴۹، ۴۷-۱۶۰، المجموع ۹/۲-۱۷، مغنی ۴/۲۹۷-۳۱۰، فتح الوہاب مع الجمل ۵/۲۶۸-۲۷۹، الاقناع مع البجیرمی ۴/۲۵۶-۲۷۷، نہایہ مع الحواشی ۸/۱۵۰-۱۶۴، ترشیح ۲۰۹-۲۱۱، بغیہ ۲۵۸-۲۶۰، الفقہ المنہجی ۳/۶۷-۸۶، تحفہ مع الحواشی ۱۲/۳۰۶-۳۴۱، قلائد ۲/۳۹۸-۴۰۴، اعانہ ۲/۳۴۹-۳۵۶)

مقابلہ (مسابقہ)

اس باب میں تیر اندازی اور شہسواری وغیرہ میں مقابلہ کے مسائل درج ہیں۔

مشروعیت: مسابقہ (مقابلہ) مسلمان مردوں کو جہاد کے قصد سے بالاجماع مشروع اور سنت ہے۔ (فتح الوہاب ۲/۱۹۴) فخر اَو تکبر اور ظلم وتعدی کی نیت سے مسابقہ حرام ہے۔ ان دونوں ارادوں کے بغیر یہ مباح ہے۔ کیونکہ اس میں جسم کی ورزش اور طبیعت کے لئے تقویت کا سامان ہے۔

آیت: ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ'' (سورہ انفال: ۶۰)

ترجمہ: ''اور ان کافروں (سے مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہوسکے، ہتھیار سے، اور پلے ہوئے گھوڑوں سے، سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم (بالتعیین) نہیں جانتے، (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے۔''

حدیث: ۱) آپ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کروایا (بخاری۔ مسلم)

۲) مذکورہ آیت میں لفظ 'قوۃ' کی تفسیر آپ ﷺ نے تیر اندازسے فرمائی۔'' (مسلم شریف)

۳) قبیلہ اسلم کے ایک گروہ پر آپ ﷺ کا گذر ہوا، جو تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے نبی اسماعیل (اسماعیل علیہ السلام کی نسل) تیر اندازی کرو۔ کیونکہ تمہارے والد بھی تیر انداز تھے۔'' (بخاری شریف)

۴) آپ ﷺ نے فرمایا: ''عوض کے ساتھ (انعام و شرط کے ساتھ) مقابلہ صرف اونٹ، گھوڑا اور تیر اندازی (جیسے امور) میں مشروع ہے۔'' (الشافعی۔ ترمذی۔ وصححہٗ ابن حبان)

۵) جو تیر اندازی سیکھنے کے بعد اسے چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے نافرمانی کی۔'' (مسلم)

بالعوض مقابلہ صرف ایسے امور میں جائز ہے، جو اسبابِ جنگ میں داخل اور معاون ہوں، مثلاً گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ، ہاتھی، تیر اندازی، نیزہ بازی اور پتھر بازی کے مقابلے امام صمیری فرماتے ہیں کہ عورتوں کو بالعوض مسابقہ جائز نہیں، کیونکہ وہ جنگ کے اہل نہیں۔ (فتح الوہاب ۲/۱۹۴)

امام نوویؒ نے روضہ میں فرمایا کہ تیر اندازی سیکھ کر چھوڑ دینا شدید مکروہ ہے۔ (مغنی المحتاج ۴/۳۱۱)

جانوروں کے مقابلہ کے اقسام

۱) دو یا زائد افراد میں مقابلہ ہو، اور آگے بڑھنے والے (جیتنے والے) کے لئے انعام مقرر ہو، جو حاکم یا کسی تیسرے شخص کی جانب سے ہو، جو اس مقابلہ میں شریک نہ ہو، یہ قسم جائز ہے۔

۲) دو افراد کے مقابلہ میں ایک یہ کہے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تمہیں انعام دوں گا، لیکن میں جیت جاؤں تو تم کچھ نہ دینا، یہ قسم جائز ہے

۳) دو افراد کا مقابلہ ہو، اور اس میں جو بھی ہارے وہ جیتنے والے کو انعام دے، (یعنی دو طرفہ شرط ہو) یہ قسم حرام اور جوئے میں شامل ہے۔

۴) تیسری قسم کی طرح، لیکن ایک تیسرا ساتھی بھی شامل کرلیں، جس کا جانور بھی ان دونوں کے جانوروں کے مثل ہو (یعنی بقیہ دو کی طرح اس کے بھی ہار جیت کا امکان ہو)، اور شرط یہ طے پائے کہ تیسرا ساتھی جیت گیا، تو ان دونوں سے مقررہ انعام لے گا، لیکن یہ ہار جائے تو اس پر کچھ لازم نہ ہوگا، اس تیسرے ساتھی کو محلِّل کہیں گے۔ (کیونکہ اس کی شرکت کی وجہ سے یہ قسم حلال ہوگئی) اگر محلل اور

ان میں سے ایک ساتھ میں پہنچیں اور دوسرا ہار جائے، تو ہارنے والے کی رقم ان دونوں میں تقسیم ہو گی۔ یہ قسم جائز ہے۔

حدیث: "جو دو گھوڑے کے درمیان ایک گھوڑا (اخل (شامل) کرے، اگر اس کا آگے نکلنے کا (جیتنے کا) خطرہ نہ ہو، تو اس میں کوئی بھلائی نہیں، اور آگے نکلنے کا امکان ہو، تو حرج نہیں (رواہ فی شرح السنۃ) ابوداود شریف کی روایت میں پہلی صورت کو قمار (جوا) فرمایا اور دوسری صورت میں قمار کی نفی فرمائی (م شکوٰۃ شریف ص ۳۳۷)

مذکورہ مقابلہ کے شرائط

۱) مقابلہ میں شامل تمام افراد مسافت کی ابتداء اور انتہاء سے واقف ہوں، نیز ہر ایک کے لئے ایک ہی مسافت متعین ہو۔

۲) گھوڑے، اونٹ وغیرہ پہلے سے متعین ہوں، ایک مرتبہ متعین ہونے کے بعد ان کی تبدیلی جائز نہیں، اگر کوئی تبدیلی کرے تو یہ مسابقہ فاسد ہو گا۔

۳) ہر شریک کا جانور ایسا ہو کہ اس کے جیتنے اور ہارنے کا احتمال ہو، اگر کوئی جانور اتنا کمزور ہو کہ اسکا ہارنا یقینی ہو، یا کوئی جانور اتنا چست اور سبک (چالاک اور تیز رفتار) ہو کہ اس کا جیتنا یقینی ہو، تو یہ مسابقہ جائز نہیں۔

۴) تمام شرکاء اوّل، دوّم وغیرہ کے لئے متعین و مشروط انعام کی مقدار سے واقف ہوں، اگر ان میں کوئی ناواقف ہو، تو مسابقہ صحیح نہیں۔

۵) انعام کی رقم مسابقہ میں غیر شریک (اجنبی) کی طرف سے ہو، مثلاً حکومت کی جانب سے، کسی اور مالدار شخص کی جانب سے۔ شرکاء میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ دوسروں کے ہارنے کی صورت میں ان پر کچھ لازم نہ ہو۔ اگر ان پر بھی مال لازم ہو تو ایک محلل کا شامل ہونا ضروری ہے، جس کی تفصیل پانچویں قسم میں گذر چکی۔

۶) مسابقہ اور مقابلہ ہر ان جانوروں میں جائز ہے، جو جنگ میں کارآمد اور کرّ وفرّ (پینترا بدلنے کے لئے پیچھے ہٹنا اور پھر دوبارہ حملہ آور ہونا) کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جیسے گھوڑا، خچر، اونٹ وغیرہ، جو جنگ میں کارآمد نہ ہوں، جیسے بیل، پرندے وغیرہ ان میں مسابقہ جائز نہیں، جیسا کہ حدیث میں اونٹ اور گھوڑے وغیرہ میں مقابلہ کا ذکر گزر چکا۔ اُس دور میں چونکہ وہی آلاتِ جنگ تھے اسلئے ان کا تذکرہ کیا گیا، لہٰذا ہر دور اور علاقہ کے اعتبار سے جو بھی آلاتِ جنگ میں داخل اور دشمن کو شکست دینے میں معاون ہو، اس کا یہی حکم ہو گا۔ (اور اس میں مقابلہ کی اجازت ہو گی)

کتوں، مرغوں اور مینڈھوں کو لڑانا، بالعوض ہو یا بلا عوض، بالاتفاق ممنوع ہے۔ کیونکہ یہ بے وقوفی ہے اور قوم لوط کا عمل ہے، جن کو گناہوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔ (مغنی المحتاج ۴/۳۱۲)

۷) تمام شرکاء کے جانور ایک جنس کے ہوں، خواہ انواع جدا ہوں، (مثلاً تمام گھوڑے یا اونٹ ہوں۔ اگر ایک کا گھوڑا ترکی اور دوسرے کا عربی ہے تو حرج نہیں) البتہ ایک کا خچر اور دوسرے کا گدھا ہو، تو جائز ہے، کیونکہ ان دونوں میں خاص تفاوت نہیں۔ (فتح الوہاب ۲/۱۹۴)

۸) ہر شخص اپنے جانور پر سوار ہو، اگر بلا سواری کے صرف جانوروں کو دوڑانے کی شرط ہو تو صحیح نہیں۔

۹) سوار متعین ہوں، اگر ہر ایک یہ شرط لگائے کہ اپنی سواری پر جسے چاہے سوار کرے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج۔ ۴/۳۱۳)

تین یا زائد شرکاء کی صورت میں دوّم کو اوّل کے مساوی انعام رکھنا جائز ہے، زائد رکھے تو عقد فاسد ہو گا آخری نمبر آنے والے کو اس

کے ماقبل کے مساوی نہیں رکھتے، اس سے کم رکھنے میں حرج نہیں۔ دوّم کو اوّل سے کم انعام رکھنا مستحب ہے۔ اگر مثلاً دس افراد مسابقہ میں شریک ہوں، اور آخر میں آنے والے کے علاوہ دیگر ۹ شرکاء کو مساوی انعام رکھا جائے تو یہ جائز ہے۔(مغنی المحتاج ۳۱۴/۴)

۱۰) کسی مفسد شرط سے اجتناب: مثلاً "اگر تم جیت گئے تو یہ دینار تم کو انعام، بشرطیکہ اپنے ساتھیوں کو کھلاؤ، تو عقد فاسد ہو گا، کیونکہ یہ تملیک ایسی شرط کے ساتھ ہے جو کمالِ تصرف سے مانع ہے۔(مغنی المحتاج ۳۱۴/۴)

(مُنَاضَلَه) نشانه بازی [مختلف هتهیاروں میں مقابله]

جہاد اور دشمنوں سے مقابلہ کی نیت سے نشانہ بازی کا مقابلہ سنت ہے۔ اور اگر مفاخرہ اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کے ارادہ سے ہو، تو حرام ہو جائے گا، کیونکہ اصول ہے: "ہر امر کا فیصلہ اور حکم اس کے مقاصد پر موقوف ہے۔"

جانوروں کا مقابلہ کی طرح اس کی بھی چار قسمیں ہیں، اور تیسری قسم باطل ہے اور ناجائز ہے۔ یعنی مثلاً دو شرکاء میں سے جو بھی جیتے ، دوسرا اسے انعام دے، یہ جوئے میں داخل ہے، جو حرام اور ناپاک کمائی ہے۔

شرائط: (۱) تیر جیسے ہتھیاروں میں مقابلہ ہو، تو اصل مطلوب کی وضاحت شرط ہے، یعنی صرف نشانہ پر تیر لگنا کافی ہے، یا اسے پھاڑ دے، آر پار نکل جائے، اگر کوئی صراحت نہ ہو، تو صرف چھونے پر محمول کرتے ہوئے اس مقابلہ کو صحیح قرار دیں گے۔

۲) تمام شرکاء کے ہتھیار ایک ہی جنس کے ہوں، مثلاً تیر، بندوق وغیرہ، اگر دونوں کے بندوق مختلف جنس کے ہوں تو یہ مقابلہ صحیح نہیں، خواہ دونوں اس سے راضی ہوں۔

۳) ہتھیار چلانے والے، نشانہ، چلانے کی جگہ اور (تیر یا فائر وغیرہ کی) تعداد کی تعیین ضروری ہے۔

۴) مال (انعام) کی مقدار ہر شریک کو معلوم ہو۔

ناجائز مناضله

ایک عام قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ عوض اور مال کے ساتھ مناضلہ (ہتھیار وغیرہ کا مقابلہ) ہر اس چیز میں جائز ہے، جو جنگ میں نافع ہو، لہٰذا جو آلات وغیرہ جنگ میں کارآمد نہ ہوں، ان میں بالعوض مقابلہ جائز نہیں ہے۔

گیند (بال) کے تمام اقسام و انواع میں بالعوض مقابلہ جائز نہیں۔ اور تیرنے میں، شطرنج کی بازی میں، ایک قدم پر کھڑے ہونے کے کرتب میں، اور چھوٹی کشتیوں کے دوڑ میں (جو کہ جنگ میں کام نہ آئے) مقابلہ جائز نہیں ہے۔

کیونکہ یہ امور جنگ میں بالکل فائدہ مند نہیں، لہٰذا یہ خواہ جائز ہوں، یا مطلوب جیسے تیراکی، ان میں انعامی مقابلہ جائز نہیں ہے۔

عقد مسابقہ اور عقد مناضلہ ایک لازم عقد ہے، یعنی سابقہ شرائط کے ساتھ مشروع طریقے پر یہ پایا جائے، تو جس نے مال کا ذمہ لیا ہے، وہ اسے فسخ یا عمل ترک نہیں کر سکتا۔ لازم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک دیگر کی موافقت اور رضامندی کے بغیر اسے فسخ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ بیع و اجارہ وغیرہ

اگر مسابقہ و مناضلہ میں مال مشروط نہ ہو، تو یہ عقد صرف جائز ہے (لازم نہیں ہے) لہٰذا کوئی بھی تنہا فسخ کر سکتا ہے۔

کھیل کود اور اسباب تفریح [لہو]

ہر وہ امر جو بے قراری، تفکرات اور مختلف پریشان کن باتوں کی طرف سے انسان کی توجہ ہٹائے اسے لہو (کھیل کود) کہا جائے گا، مثلاً کھیل، خوش طبعی، گپ شپ اور موسیقی و گانے وغیرہ۔

لہو کے اقسام

۱) جو لہو انسانی زندگی پر کوئی اچھا یا برا اثر نہ چھوڑے، وہ مکروہ ہے، مثلاً ہنسی مذاق اور خوش طبعی کی مجلسیں آباد رکھنا، کہ بلا کسی فائدہ کے اپنا وقت اس میں برباد کرے۔

۲) جو لہو ایک انسان اور معاشرہ پر اپنے برے اور نقصان دہ اثرات چھوڑے وہ حرام ہے، اور اس کا اپنانا جائز نہیں ہے۔

مثلاً: پہلی قسم کا لہو جبکہ اس میں آزادی سے اتنا وقت برباد کرے کہ اس کے واجبات، یعنی فرض عبادات، یا معاش کی فکر اور تگ و دو فوت ہو جائے، یا برے نہج پر ہو جیسے جھوٹ، اور لوگوں کے ساتھ اخلاقی سلوک میں لاپرواہی۔

نیز آلاتِ موسیقی کے ساتھ گانے کی مجلس، یا عورتوں اور امردوں کے ساتھ گانے کی مجلس بھی اس میں داخل ہے۔

۳) وہ لہو اور کھیل، جو ایک انسان اور معاشرہ میں فائدہ اور نفع کا باعث ہو، مباح ہے، بلکہ کبھی اس سے برآمد نتیجہ اور فائدہ کی اہمیت کے اعتبار سے مستحب بھی قرار پائے گا۔

مثلاً شہسواری، تیر اندازی، اور دیگر وہ امور جو جنگ میں کارآمد ہوں۔

ان احکام کی مزید مثالیں

۱) عوام میں شائع پر سکون کھیل، جیسے شطرنج، نرد، تاش وغیرہ۔ ان کھیلوں کا حکم درج ذیل قاعدہ کی روشنی میں لگایا جائے گا۔

(الف) ان میں سے جو کھیل فکر و تدبر، اور نتیجہ اور اس میں مصروفیت کے اعتبار سے اباحت یا کراہت کا حکم لگے گا۔

انہیں کھیلوں میں شطرنج کا شمار ہوتا ہے، اس میں ذہنی ورزش اور عقل و فکر کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ ذہن و عقل کے لئے فی الجملہ نفع بخش ہے، اب کوئی اس فائدے سے زائد اس میں مشغول رہے تو یہ مکروہ ہے، اگر یہ زیادتی اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کی وجہ سے بعض واجبات ترک ہونے لگیں تو حرام قرار دیا جائے گا (یہ واضح رہے کہ اس میں انعامی مقابلہ قطعاً اور بالاتفاق حرام اور جوئے میں داخل ہے۔ اور بعض ائمہ کرام کے نزدیک یہ مطلقاً حرام ہے)

(ب) جن کھیلوں کی بنیاد اتفاق پر ہو، اور فکر و عقل کی کارکردگی کا اس میں کوئی دخل نہ ہو جیسے نرد اور تاش وغیرہ۔ وہ حرام ہیں، کیونکہ ایسے کھیل ایک انسان کو تمام احوال و امور میں اتفاقات کا عادی بنا دیتا ہے اور اس کی عقل اس کائنات کے نظام میں اتفاقات ہی کو عاملِ اول اور اصل محرک تصور کرتی ہے، لہٰذا یہ ایسا لہو ہے، جو نفس پر برا اور مضر اثر چھوڑتا ہے۔

۲) **حیوانات کے تماشے:** مثلاً آپس میں مرغ کو لڑانا، مویشیوں میں سینگ بازی اور مقابلہ، بیلوں کی کشتی وغیرہ۔ یہ تماشے حرام ہیں کیونکہ جانوروں کی یا انسانوں کی زندگی پر مضر اثرات کا باعث ہیں۔

۳) **کشتی۔** اس کی مختلف انواع ہیں۔

(الف) جو کشتی جسم کو نقصان دہ نہ ہو، نیز وہ ایک انسان کو قوت، فنونِ جنگ اور اپنے دفاع کا ماہر بنائے، وہ مباح ہے، بلکہ بعض

او قات مستحب شمار ہو گا، مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت رکانہ سے کشتی لڑی اور انہیں پچھاڑ دیا۔

(ب) جو کشتی جسمانی اعتبار سے نقصان دہ، ہو مثلاً زخمی کر دے، ہڈی توڑ دے یا کسی عضو کی صورت بگاڑ دے، وہ حرام ہے۔ جیسے باکسنگ، آزاد کشتی وغیرہ۔

قسم (یمین)

تعریف: یمین (قسم) لغت میں 'قوت' کو کہتے ہیں، جیسے قرآن کی آیت میں فرمایا: "لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡیَمِیۡنِ" (الحاقة: ۴۵) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں یمین قوت کے معنی میں ہے۔ قوت کی مناسبت سے دائیں ہاتھ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کسی معظم کی قسم اور حلف کو بھی یمین کہا جاتا ہے، کیونکہ عرب حضرات عہد و پیمان کے وقت آپس میں دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے۔ (جو اس کی مضبوطی و قوت پر دلالت ہوتا)

اصطلاح میں کسی ایسے کلام کو جس کا مضمون و مفہوم ثابت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا صفت کے ذکر کے ساتھ مخصوص پیرایہ وانداز میں قوی و مضبوط کرنے اور توثیق کو یمین کہا جاتا ہے۔

لہٰذا توثیق کی قید سے یمین لغو نکل گیا، یعنی وہ قسم جو دوران گفتگو توثیق و تحقیق کے قصد کے بغیر غیر ارادی اور عادت کے طور پر زبان پر آجاتا ہے۔ مثلاً: نہیں قسم بخدا، بالکل قسم بخدا، یہ شرعاً منعقدہ قسم شمار نہ ہو گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِیۤ اَیۡمَانِکُمۡ" (مائدہ: ۸۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر (یعنی جو پختہ نہ ہو اس پر) مؤاخذہ نہیں فرماتا"۔

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: "بات بات میں (یعنی دورانِ گفتگو) نہیں قسم بخدا، بالکل قسم بخدا، کے کہنے کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی" (بخاری) آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اس سے کسی شخص کا اپنے گھر میں (بات چیت کے دوران) كَلَّا وَاللّٰهِ ، اور بَلٰی وَاللّٰهِ (ہرگز نہیں قسم بخدا، یقیناً قسم بخدا) کہنا مراد ہے" (ابوداود، وصححه ابن حبان)

نیز جس کلام کا مضمون و مفہوم لامحالہ ثابت ہو، وہ بھی شرعاً قسم شمار نہ ہو گا، مثلاً کوئی کہے: قسم بخدا میں ضرور مروں گا، کیونکہ یہ بات فی نفسہٖ ثابت اور یقینی ہے، نیز اس میں حِنث یعنی قسم کے توڑنے و خلاف ورزی کا کوئی سوال نہیں۔

ماضی ومستقبل: قسم ماضی کے متعلق بھی ہو سکتی ہے، جیسے: واللہ میں نے فلاں کلام کیا، یا نہیں کیا، جیسا کہ مستقبل کے متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً: قسم بخدا میں ضرور فلاں کلام کروں گا، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم بخدا میں یقیناً قریش سے غزوہ کروں گا" (ابوداود)

قسم کا حکم: عام حالات میں اور بلاحاجت قسم کے الفاظ ادا کرنا مکروہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَیۡمَانِکُمۡ" (البقرہ: ۲۲۴) (اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ) یعنی کثرت سے اللہ کی قسم نہ کھاؤ، کیونکہ بعض اوقات اس کو نبھانا مشکل ہو گا۔

امام شافعی نے فرمایا: "میں نے اللہ کی قسم نہیں کھائی، نہ سچی نہ جھوٹی" البتہ بعض دیگر عوارض واسباب اور نتائج کے اعتبار سے قسم کے احکام کی تفصیل درج ذیل ہو گی۔

۱- **حرام:** جبکہ کسی حرام کے ارتکاب، یا واجب کے ترک پر قسم کھائے، یا جھوٹی قسم لے جس کے کچھ حقیقت نہ ہو۔

۲-**واجب**:جب کہ کسی مظلوم کے ساتھ انصاف یا حق کی وضاحت قسم کے بغیر ممکن نہ ہو۔
۳-**مباح**:جب کہ کسی نیکی کے انجام دینے، گناہ سے باز رہنے، حق کی رہنمائی یا باطل سے چوکنا کرنے کے لئے ہو۔
۴-**مستحب**:جب کہ قسم کسی وعظ ونصیحت کی سامعین پر اثر اندازی کا وسیلہ اور انکی تصدیق کا سبب ہو۔

تنبیہ:ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کا دل ودماغ اللہ تعالیٰ کے تعظیم اور اس کی خشیت وہیبت سے لبریز ہو، لہٰذا قرآنی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ بنانا، اور عام بول چال میں بلاضرورت سامنے والے پر اثر ڈالنے کے لئے بات بات پر قسم کھانے اور اسے تکیہ کلام بنالینے سے گریز واحتیاط برتنا چاہئے، کیونکہ یہ انداز تعظیم وخشیت کے منافی ہے، نیز اس عادت کا ایک بدترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ آدمی جھوٹی قسم پر بھی جری ہو جائے گا، جو گناہ کبیرہ ہے، صحیحین میں ہے کہ "قسم کی وجہ سے سامانِ تجارت تو خوب نکل جائے گا، (یعنی بظاہر تو تجارت کو فروغ حاصل ہو گا) لیکن برکت بالکل ختم ہو جائے گی" نیز بخاری کی ایک حدیث میں جھوٹ قسم کو کبائر کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

قسم منعقد ہونے کے شرائط:قسم شرعاً منعقد ہونے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں (یعنی ان میں سے کوئی شرط نہ ہو، تو وہ شرعاً قسم نہ کہلائے گی، اور اس کی خلاف ورزی سے کفارہ لازم نہ ہو گا)

۱-قسم کھانے والا عاقل بالغ ہو، کیونکہ ابوداود وغیرہ کی حدیث کی رو سے نابالغ اور پاگل مرفوع القلم ہیں (یعنی ان پر مواخذہ نہیں، اور وہ غیر مکلف ہیں)

۲-یمین لغو (یعنی غیر پختہ قسم) نہ ہو، جیسا کہ گذر چکا۔

۳-قسم درج ذیل کسی لفظ کے ساتھ ہو:

(الف) اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات: مثلاً: میں اللہ کے ذات کی قسم کھاتا ہوں، یا میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ناموں میں سے کوئی نام: مثلاً: میں رَبُّ العالمین (تمام جہاں کے پروردگار) یا مالک یوم الدین، (روزِ قیامت کے مالک) یا رحمٰن کی قسم کھاتا ہوں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کے صفات میں سے کوئی صفت: مثلاً، اللہ کے عزت کی، یا علم، یا ارادہ کی، یا قدرت کی قسم۔

مذکورہ تفصیل کے متعلق صحیح احادیث مروی ہیں:

۱-ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے والد کی قسم کھائی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "آگاہ ہو جاؤ! بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے آباواجداد کی قسم سے منع فرماتے ہیں، جسے قسم کھانا ہو، وہ اللہ کی قسم کھائے، ورنہ چپ رہے" (متفق علیہ)

۲-آپ ﷺ یوں قسم کھایا کرتے: "نہیں، قسم ہے مقلب القلوب کی" (دلوں کو الٹنے پلٹنے والے ذات کی قسم) (بخاری)

۳-بخاری وغیرہ میں آپ ﷺ سے بکثرت یہ قسم وارد ہے: "قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے" اور "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے"۔

اگر کوئی شخص کسی دوسرے الفاظ سے قسم کھائے، تو منعقد نہ ہو گی، کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت گذر چکی، نیز اس میں کمالِ تعظیم مفقود ہے، اور ایک مومن کو کسی غیر اللہ کی ذاتی تعظیم ممنوع ہے۔ دوسرے نام سے قسم کھانا مکروہ ہے، گو معظم ہو، جیسے نبی یا کعبہ کی قسم، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ گناہ ہو، کئی علماء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کو کفر قرار دیا ہے

(ترمذی، حاکم علیٰ شرط الشیخین) تاہم اسے ایسی صورت پر محمول کیا گیا ہے، جب کہ اس میں اللہ کی طرح تعظیم کا عقیدہ رکھے۔

صریح و کنایہ قسم: قسم کی دو قسمیں ہیں: (۱) صریح (۲) کنایہ

(۱) **صریح قسم:** اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کسی نام سے کھائے، تو اسے صریح قسم کہیں گے مثلاً: اللہ کی قسم، رب العالمین کی قسم۔

صریح قسم محض الفاظ کی ادائیگی سے منعقد ہوگی، اور اگر قسم کھانے والا یہ کہے کہ میرا قسم کا ارادہ نہ تھا، تو اس کی بات تسلیم نہیں کریں گے، کیونکہ ان الفاظ میں قسم کے علاوہ کا احتمال ہی نہیں، البتہ بلا ارادہ سبقتِ لسانی سے یہ الفاظ ادا ہوں، تو وہ لغو یمین شمار ہوگا۔

(۲) **کنایہ قسم:** درج ذیل الفاظ سے قسم کنایہ شمار ہوگی:

(الف) جن الفاظ سے اطلاق کی صورت میں (یعنی عام حالات میں جب کہ دوسری کوئی نیت نہ ہو) اللہ سبحانہ وتعالیٰ مراد ہوں، جیسے خالق، رازق، رب، ان الفاظ سے قسم منعقد ہوگی، البتہ اگر ان سے اللہ کی ذات کے علاوہ مراد لے، تو قسم منعقد نہ ہوگی، کیونکہ یہ الفاظ قید کے ساتھ اللہ کے علاوہ کے لئے بھی مستعمل ہے۔ (دیکھئے سورہ عنکبوت، آیت: ۱۷، سورہ نساء، آیت: ۸ اور سورہ یوسف، آیت: ۵۰)

(ب) جو الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسروں کے لئے مساوی درجہ میں مستعمل ہوں، مثلاً موجود، عالِم، حَیٌّ (زندہ) ان الفاظ سے اللہ کے ذات کی نیت ہو، تو قسم منعقد ہوگی، ورنہ نہیں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت، مثلاً: اللہ کی قدرت، اللہ کا علم، اللہ کا کلام، ان الفاظ سے قسم منعقد ہوگی، لیکن علم سے معلوم، قدرت سے مقدور، اور کلام سے حروف اور آواز مراد ہو، تو قسم منعقد نہ ہوگی۔

بِرّ اور حِنْث (قسم پوری کرنا اور توڑنا)

بِرّ: یعنی جس بات کی قسم کھائی ہے، اسے پورا کرنا اور نبھانا، یا کسی بات کی خبر دی ہو، تو اس میں سچا ہونا۔

حِنْث: یعنی جس بات کی قسم کھائی ہے، اسے پورا نہ کرنا اور قسم کی خلاف ورزی کرنا اور ایسے توڑنا، یا قسم میں کسی بات کی خبر دی ہو، تو اس میں جھوٹا ہونا۔ قسم توڑنے والے کو حانث کہیں گے۔ (لہٰذا اگر کسی نے قسم کھائی کہ کل روزہ رکھوں گا، اور رکھا تو بِرّ پر عمل ہوا اور نہ رکھا تو حنث پر عمل ہوا، اسی طرح کوئی قسم کھائے کہ یہ گھڑی میری ہے، اور حقیقتاً اسی کی ہو، تو یہ بِرّ ہے، اور وہ جھوٹا ہو، گھڑی اس کی نہ ہو، تو یہ حنث کی شکل ہے)

قسم پوری کرے یا قسم میں سچا ہو، تو آدمی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا، اس پر مزید کچھ لازم نہیں، لیکن حنث پر عمل کرے، یعنی قسم توڑ دے، یا جھوٹی قسم کھائے تو اس پر کفارہ لازم ہے۔

قسم کا کفارہ: حِنْث کی مذکورہ دونوں صورتوں میں کفارہ واجب ہے، اور قسم کے اس کفارہ میں ابتداء درج ذیل تین باتوں میں اختیار ہے، یعنی اپنی مرضی سے تینوں میں سے کسی بھی ایک پر عمل کرے:

۱- ایک مسلمان غلام یا باندی آزاد کرے۔

۲- دس مسکینوں کو اناج دے، یعنی (صدقہ فطر کی طرح) علاقہ کے غالب اناج میں سے ہر مسکین کو ایک مد یعنی تقریباً (۶۰۰)

گرام اناج ادا کرے، اور ان کو اس کا مالک بنادے، ان کو بلا کر دو پہر یا رات کھانا کھلا دینا کافی نہیں ہے۔

۳- دس مساکین کو ایسا لباس دے، جس کو عرف میں لباس کہا جاتا ہو، مثلاً قمیض، پاجامہ، تہہ بند، عمامہ، تولیہ وغیرہ۔ چڈی، ٹوپی یا موزہ وغیرہ کافی نہیں، بڑے شخص کو چھوٹا لباس، یا استعمال شدہ لباس جو بوسیدہ اور پھٹا ہوا نہ ہو، دینا کافی ہے۔ پانچ مسکین کو اناج اور پانچ کو لباس ادا کرنا کافی نہیں ہے۔ کسی میت کے ذمہ کفارہ باقی ہو، تو سب سے کم قیمت کفارہ اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص مذکورہ تینوں کفاروں میں سے کوئی بھی ادا نہ کر سکے، یعنی غریب و تنگدست ہو، تو اس پر تین دن کے روزے واجب ہیں، ان روزوں کو مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے، جدا جدا بھی رکھ سکتا ہے۔

آیت: ''لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ''(المائدة: ۸۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو (غیر پختہ) قسم پر تم سے مؤاخذہ نہیں فرماتے، لیکن مؤاخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو مستحکم (مضبوط و پختہ) کر دو، سو اس کا کفارہ (یہ ہے) دس محتاجوں کو کھانا دینا اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا، اور جس کو مقدور نہ ہو، تو تین دن کے روزے ہیں، یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب کہ تم قسم کھالو''

خاتمہ

(۱) اگر کوئی شخص کہے: میں نے اللہ کی قسم کھائی کہ میں فلاں کام کروں گا، تو یہ قسم ہے، جب کہ قسم کی نیت ہو، یا مطلق ہو (یعنی کوئی نیت نہ ہو)، اگر اس سے ماضی کے قسم کی خبر مقصود ہو، (یعنی میں نے پہلے کسی وقت قسم کھائی تھی)، تو قسم شمار نہ ہو گا۔

(۲) اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے: ''میں تجھ پر اللہ کی قسم ڈالتا ہوں کہ تو فلاں کام کر'' تو یہ قسم ہے جب کہ اپنی قسم کا ارادہ ہو، کیونکہ یہ شرعاً اسی میں مشہور ہے، اور سامنے والے کے لئے سنت ہے کہ قسم کھانے والے کی قسم پوری کرے (یعنی اس نے جس بات کی قسم ڈالی ہے، وہ انجام دے)، جب کہ اس میں کسی حرام یا مکروہ کا ارتکاب نہ پایا جائے، کیونکہ بخاری کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔

اگر مذکورہ لفظ سے سامنے والے کو قسم کا ارادہ ہو، یا محض اس سے سفارش کرنا مقصود ہو، نہ کہ قسم، تو یہ قسم شمار نہ ہو گی۔

(۳) اگر کوئی کسی واجب کے چھوڑنے کی قسم کھائے، مثلاً: نماز یا روزہ چھوڑنے کی، یا کسی حرام کے ارتکاب کی قسم کھائے، مثلاً: چوری کرنے یا قتل کرنے کی، تو دونوں صورتوں میں اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور دونوں قسموں کو توڑنا لازم ہے، کیونکہ اس پر قائم رہنا گناہ ہے، نیز اس قسم کو توڑنے کا کفارہ بھی ادا کرے گا۔

صحیحین کی حدیث میں ہے: ''جو قسم کھائے، پھر اس کے علاوہ کو اس سے بہتر پائے تو اس بہتری پر عمل کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے''۔

اگر کسی سنت کے ترک یا مکروہ کے ارتکاب کی قسم کھائے، مثلاً: چاشت کی نماز نہ پڑھوں گا، یا نماز میں التفات کروں گا، تو حنث

سنت ہے، اور کفارہ ادا کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ قسم اور اس پر بر قرار رہنا مکروہ ہے۔

کسی مباح عمل کے کرنے یا چھوڑنے کی قسم کھائے، تو سنت یہ ہے کہ اسے نہ توڑے، کیونکہ اس میں اللہ کی تعظیم ہے۔

کسی مستحب عمل کے کرنے یا مکروہ کے ترک کی قسم کھائے، تو حنث مکروہ ہے اور حنث کی صورت میں کفارہ واجب ہے۔

(۴) اگر کسی کام کے نہ کرنے کی قسم کھائے مثلاً: خریدنا، فروخت کرنا وغیرہ، پھر کسی دوسرے کو اس کام کے لئے وکیل بنائے، تو وکیل کے انجام دینے کی وجہ سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اس نے اپنے فعل کے بارے میں قسم کھائی ہے، لہٰذا دوسرے کے اس فعل کو انجام دینے سے یہ حانث نہ ہوگا، کیونکہ کوئی فعل براہ راست انجام دینے والے کی طرف منسوب ہوگا، تاہم قسم کھاتے وقت وکیل کے ذریعہ بھی انجام نہ دینے کی نیت ہو، تو وکیل کے انجام دینے سے بھی حانث ہوگا۔

(۵) اگر فلانی عورت سے نکاح نہ کرنے کی قسم کھالے، پھر اپنے لئے اس کا نکاح قبول کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنائے، تو وکیل کے قبول کرنے سے یہ بھی حانث ہوگا۔

(۶) کوئی شخص دو کام کے چھوڑنے کی قسم کھائے، پھر اس میں سے کوئی ایک انجام دے، تو حانث نہ ہوگا، مثلاً: قسم بخدا میں یہ دونوں کپڑے نہیں پہنوں گا، یا ان دو اشخاص سے گفتگو نہ کروں گا، پھر ان میں سے ایک کپڑا پہنے، یا ایک آدمی سے گفتگو کرے تو حانث نہ ہوگا۔

اگر یوں کہے: قسم بخدا میں نہ یہ کپڑا پہنوں گا، اور نہ یہ پہنوں گا، یا کہے: نہ اس سے گفتگو کروں گا، نہ اس سے، تو کسی ایک کپڑے کے پہننے یا ایک شخص سے بات کرنے سے حانث ہوگا۔

(۷) اگر کوئی کہے: قسم بخدا میں یہ دونوں روٹی کھاؤں گا، یا کہے: میں ان دونوں سے بات کروں گا، تو صرف ایک روٹی کھانے سے، یا ایک سے بات کرنے سے قسم پوری نہ ہوگی، بلکہ پہلی صورت میں دونوں روٹی کھانا، اور دوسری صورت میں دونوں سے بات کرنا ضروری ہے۔

(۸) قسم کے ابتدائی تین کفارہ (آزادی، اناج دینا، لباس دینا) کو حنث سے پہلے بھی ادا کرنا جائز ہے، نہ کہ قسم سے پہلے، روزہ حنث سے پہلے رکھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے، لہٰذا بلاحاجت وقتِ وجوب پر مقدم کرنا صحیح نہیں ہے۔ کفارہ کو حنث پر مقدم کرنے کے بعد حانث نہ ہو، تو کفارہ واپس لے سکتا ہے۔

(۹) اگر کوئی مثلاً کہے: میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی، یا اسلام سے بری، تو یہ سخت حرام ہے، یہ قسم شمار نہ ہوگی، اور اس میں کفارہ واجب نہ ہوگا، اور اس سے تعلیق مراد ہو (یعنی حقیقتاً فلاں کام کرنے کی صورت میں یہودی بن جانے کا عزم ہو)، تو فی الحال کافی ہو جائے گا، اور اس کام سے اپنے آپ کو دور رکھنا مقصد ہو (کہ وہ کام تو مجھے بالکل مبغوض ہے، جیسا کہ یہودی بن جانا)، تو کافر نہ ہوگا، اسے چاہے کہ استغفار اور لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھے۔

(۱۰) جو اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرے (کچھ مانگے) تو اسے لوٹانا مکروہ ہے۔ جبکہ اس کا سوال پورا کرنے میں کوئی کراہت نہ ہو، نیز اس طرح سوال کرنا بھی مکروہ ہے۔

(الفقہ المنہجی ۳/۹-۲۰، مغنی ۴/۳۲۰-۳۲۸، قلائد ۲/۴۲۷-۴۳۸، تحفہ ۱۲/۳۶۴-۳۹۲، فتح الوہاب مع الجمل ۵/۲۸۶-۲۹۸)

نَذر (مَنَّت)

تعریف: عربی زبان میں لفظ نَذر شرط کے ساتھ وعدہ کو، (مثلاً: اگر آپ آئیں، تو ہم آپ کا اکرام کریں گے) یا غیر لازم کو اپنے اوپر لازم کر لینے کو، یا خیر یا شر کو وعدہ کو (یعنی معلق ہو یا غیر معلق اور فوری) کہا جاتا ہے۔

کسی ایسی قربت (نیکی، عبادت) کو جو واجب و متعین نہ ہو، اپنے اوپر لازم کر لینے کو شرعاً نذر کہا جاتا ہے۔

آیت: (۱) "يُوفُونَ بِالنَّذْرِ" (الدھر: ۷)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے صفات میں بیان فرماتے ہیں) "وہ لوگ نذر (منت) پوری کرتے ہیں"۔

(۲) "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ" (حج: ۲۹)

ترجمہ: (لوگوں کو چاہیئے کہ) اور اپنی نذریں پوری کریں"۔

احادیث: (۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت کی نذر مانے، تو اللہ کی اطاعت کرے (اس نذر کو پورا کرے) اور جو اللہ کے نافرمانی (گناہ) کی نذر مانے، وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے (اس نذر کو پورا نہ کرے)" (بخاری شریف)

(۲) آئندہ آنے والے بعض لوگوں کی مذموم صفات کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: "۔۔۔ اور وہ لوگ نذر مانیں گے، لیکن اسے پورا نہ کریں گے۔۔۔" (متفق علیہ)

ارکان

نذر کے تین ارکان ھیں: (۱) ناذر (نذر ماننے والا) (۲) صیغہ (۳) مَنذُور (جس چیز کو نذر مانے)

ناذر: جو شخص نذر مانے، اس کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱- اسلام، پس کسی کافر کی نذر صحیح نہ ہو گی، کیونکہ وہ نیکی کرنے کا اہل نہیں ہے۔ کافر کی نذر لجاج صحیح ہو گی۔

۲- مکلف ہو، یعنی عاقل و بالغ ہو، لہٰذا کسی بچہ یا پاگل کی نذر صحیح نہ ہو گی، اور ان لوگوں کے کسی نیکی کو اپنے اوپر لازم کر لینے سے وہ واجب نہ ہو گی، کیونکہ حدیث کی رو سے یہ غیر مکلف اور مرفوع القلم ہیں۔ (ابو داود)

۳- اختیار، پس کسی کے جبر و زبردستی سے کوئی نذر مانے، تو یہ صحیح نہ ہو گی، کیونکہ حدیث کی رو سے اکراہ معاف اور مرفوع ہے (ابن ماجہ وصححہ ابن حبان والحاکم)

۴- جس چیز کی نذر مانے، اس میں شرعاً ناذر کا تصرف نافذ ہو، (اسے تصرف کا اختیار حاصل ہو)، لہٰذا مجور سفیہ یا مفلس متعین مال کی نذر مانے، تو صحیح نہیں، اگر ذمہ میں ہو، تو صحیح ہے، اور سفیہ رشید ہونے کے بعد اسے ادا کرے، اور ادائیگی سے قبل مر جائے تو اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے، مجور بدنی عبادت کی نذر مانے تو صحیح ہے (کیونکہ اس میں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے)

صیغہ: صیغہ میں ایسے الفاظ ہوں، جو اپنے اوپر لازم کر لینے پر دلالت کرے، مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر فلاں نیکی لازم ہے، یا مجھ پر نماز یا روزہ یا حج لازم ہے، یا میں نے فلاں نیکی اپنے اوپر لازم کر لی، یا اپنے اوپر واجب کر لی وغیرہ۔

زبان سے صیغہ کی ادائیگی کے بغیر صرف دل میں نیت کرنے سے نذر صحیح نہ ہو گی، اور اس پر عمل ضروری نہیں ہے، لیکن نیت کے

مطابق نیکی کا ادا کرنا بہتر ہے۔ نیت کی وجہ سے دیگر نیکیوں کی ادائیگی کا بھی تاکیدی حکم ہو گا (گرچہ واجب نہ ہو گی)

منذور: جس چیز کی نذر مانے، وہ ایسی نیکی ہونا شرط ہے، جو (نذر کے بغیر بھی) ناذر پر ادا کرنا لازم نہ ہو، خواہ نفل ہو، یا ایسا فرض کفایہ جس کی ادائیگی اسی پر متعین نہ ہو، مثلاً: غلام آزاد کرنا، عیادت (بیمار پرسی)، سلام، جنازہ کے ساتھ جانا، نمازِ جنازہ، تجہیز و تکفین، ایّام بیض یا پیر کے روزے، چاشت کی نماز، تحیۃ المسجد، طواف، کسی نماز میں کسی معین سورت کی تلاوت، نماز میں طویل تلاوت (جبکہ اس نماز میں مختصر تلاوت مستحب نہ ہو)، باجماعت نماز کی ادائیگی (نماز کے کسی حصہ میں بھی اقتدا سے یہ نذر پوری ہو گی)

منذور کے مذکورہ شرائط کی روشنی میں درج ذیل صورتوں میں نذر صحیح نہ ہو گی۔

۱- **کسی فرض عین کی نذر:** مثلاً ظہر کی نماز، کیونکہ یہ تو شرعاً بغیر نذر کے بھی فرض ہے۔

۲- **گناہ کی نذر:** مثلاً: شراب پینا، بے وضو نماز پڑھنا، فرض نماز چھوڑنا، غصب کی زمین میں نماز پڑھنا، مکروہ وقت یا نجس کپڑوں میں نماز پڑھنا، عید یا ایّامِ تشریق میں روزہ رکھنا وغیرہ کی نذر، کیونکہ حدیث میں گناہ کی نذر کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔(مسلم) امام زرکشی فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر میں قسم کی نیت ہو تو حنث کی صورت میں کفارہ لازم ہو گا۔

۳- **کسی مکروہ کی نذر:** مثلاً: ضرر کی صورت میں ہمیشہ روزہ کی نذر، یا صرف جمعہ کے نفل روزہ کی نذر

۴- **کسی مباح کے کرنے یا نہ کرنے کی نذر:** مثلاً: بیٹھنا، نہ بیٹھنا، کھڑے رہنا، فلاں چیز کھانا، سونا وغیرہ، حدیث میں ہے کہ نذر وہی معتبر ہے جس سے اللہ کی رضاجوئی مقصود ہو (ابوداود، احمد، بیہقی) حضرت ابو اسرائیل نے نذر مانی کہ وہ نہ بیٹھیں گے، نہ سایہ میں رہیں گے اور نہ گفتگو کریں گے، اور روزہ رکھیں گے، تو آپ ﷺ نے گفتگو کرنے، سایہ میں رہنے اور بیٹھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ مکمل کریں۔(بخاری، ابوداود، ابن ماجہ، ابن حبان)

مذکورہ بالا غیر صحیح نذروں کی خلاف ورزی سے کفارہ لازم نہ ہو گا، جس حدیث میں معصیت کی نذر میں کفارہ کا حکم دیا ہے، اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اگر مباح نذر تبرر کو اللہ کی طرف منسوب کرے (مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر فلاں چیز کھانا لازم) یا کسی مباح کی نذر لجاج مانے، تو یہ منعقد ہو گا، کیونکہ یہ قسم کے حکم میں ہے، اور حنث کی صورت میں قسم کا کفارہ واجب ہو گا۔ اور مباح نذر تبرر کو اللہ کی طرف منسوب نہ کرے، تو یہ منعقد نہ ہو گا۔

منذور میں یہ بھی شرط ہے کہ اس کا انجام دینا ممکن ہو، لہٰذا جو روزہ پر قادر نہ ہو، اس کا روزہ کی نذر ماننا، یا جو مکہ سے دور ہو اور اس سال حج کے لئے نہیں پہنچ سکتا، اس کا اس سال حج کی نذر ماننا صحیح نہیں ہے۔

نذر کا کسی شرعی رخصت کو باطل نہ کرنا ضروری ہے، لہٰذا جن صورتوں میں سفر میں رمضان کا روزہ نہ رکھنا اور قصر افضل ہو، روزہ رکھنے اور پوری نماز پڑھنے کی نذر منعقد نہ ہو گی۔

فائدہ: نذر تلاوتِ قرآن دیگر اذکار کی طرح نیت کی محتاج نہیں، تاہم خارجِ نماز تلاوت کی نذر ہو، تو نذر کی یا فرض تلاوت کی نیت ضروری ہے، گو تلاوت کے وقت کو متعین کیا ہو۔

نذر کی قسمیں: (۱) نذر لَجَاج (۲) نذر تبرُّر

(۱) **نذر لَجَاج:** (لجاج یعنی دشمنی و جھگڑے میں مداومت کرنا) اسے نذر غضب، یمین لَجَاج، یمین غضب، نذر الغَلَق اور یمین

الغَلَق بھی کہتے ہیں۔

غصہ میں کسی قربت کو واجب کرتے ہوئے اپنے نفس کو، یا کسی دوسرے کو کسی چیز سے روکنا، یا کسی چیز پر ابھارنا، یا کسی خبر کی تحقیق کرنا نذر لجاج کہلاتا ہے۔

مثلاً: (۱) اگر میں نے زید سے بات کی تو مجھ پر ہر نماز لازم ہے (گویا اپنے آپ کو اس سے گفتگو سے روکنا چاہتا ہے) (۲) اگر میں نے جمیل سے بات نہ کی تو مجھ پر روزہ لازم ہے (گویا خود کو بات کرنے پر ابھار رہا ہے) (۳) اگر کلیم گھر پر نہیں ہے، تو مجھ پر صدقہ کرنا لازم ہے (اس میں اپنے خبر کو حق بتلانا چاہتا ہے) (۴) اگر میں نے فلاں کام کیا تو اللہ کے لئے مجھ پر تجھے طلاق دینا لازم ہے، (۵) اگر میں نے فلاں کام کیا تو مجھ پر اللہ کے لئے روٹی کھانا لازم ہے۔

نذر لجاج میں جب صفت پائی جائے، تو اسے اختیار ہے کہ یا تو جس قربت کو لازم کیا ہے، اسے ادا کرے، (مثلاً پہلی مثال میں زید سے بات کی، تو نماز ادا کرے) یا قسم کا کفارہ ادا کرے، کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے: ”نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے“ اور قسم کا کفارہ نذر تبرر میں بالاتفاق ناکافی ہے، لہٰذا اسے نذر لجاج پر ہی محمول کیا جائے گا۔

اگر کسی نے کہا: میں نے زید سے بات کی تو مجھ پر قسم کا کفارہ، یا کہا: مجھ پر نذر کا کفارہ، تو اس پر (زید سے بات کرنے کی صورت میں) قسم کا کفارہ واجب ہے، اگر صرف مجھ پر قسم کہا، (قسم کا کفارہ نہ کہا) تو یہ لغو و مہمل ہے، (کفارہ واجب نہ ہوگا)، اور صرف مجھ پر نذر کہا، تو اسے اختیار ہے کہ یا تو کوئی سی نیکی (مثلاً: تسبیح، دو رکعت نماز یا ایک روزہ) ادا کرے، یا قسم کا کفارہ ادا کرے۔

(۲) **نذر تَبَرُّر:** تبرر دراصل بِرّ سے ہے، یعنی نیکی، چونکہ ناذر اس نذر کے ذریعہ نیکی کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لئے اسے نذر تبرر کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں:

(الف) نذر مُجَازَاۃ (بدلہ کی نذر): کسی نعمت کے حصول یا کسی مصیبت کے ازالہ پر کسی قربت کو معلق کرے، تو اسے نذر مُجازاۃ کہیں گے۔ مثلاً: اگر اللہ نے میرے مریض کو شفا دی تو مجھ پر ایک روزہ لازم ہے، اس نذر میں جس غرض پر نذر معلق کی گئی، وہ پائی گئی، تو لازم کردہ نیکی کو انجام دینا (یعنی نذر پوری کرنا) لازم ہے۔ (مذکورہ مثال میں مریض شفایاب ہو جائے تو ایک روزہ رکھنا لازم ہوگا)

معتمد قول یہ ہے کہ مالی نذر کو معلق علیہ کے وجود سے قبل ادا کرنا بھی جائز ہے، گو امام رافعیؒ و نوویؒ نے تعجیل زکات کے باب میں اسے ناجائز قرار دیا ہے۔

فائدہ: قسم کا مالی کفارہ حنث پر، ظہار کا مالی کفارہ عَوْد پر، قتل کا کفارہ، موت پر مقدم کرنا جائز ہے۔ رمضان، حج، یا عمرہ میں جماع کا کفار جماع پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز (احرام میں) حلق، لباس، اور خوشبو کا فدیہ سبب سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں ہے، اگر یہ تینوں مرض وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے جائز ہوں، تو فدیہ کو مقدم کرنا جائز ہے (مغنی ۴/۳۲۷)

(۲) **نذر مُطلَق:** بغیر تعلیق کے ابتداءً کے لئے کسی بھی نیکی کو اپنے اوپر لازم کر لینا نذر مطلق کہلاتا ہے۔ مثلاً: اللہ کے لئے مجھ پر جمعرات کا روزہ لازم، یا دو رکعت لازم، یا کوئی مریض صحت یابی کے بعد کہے: چونکہ اللہ نے مجھے صحت بخشی، لہٰذا اللہ کے لئے مجھ پر ایک روزہ لازم۔

نذر مطلق میں نذر مانتے ہی، جس نیکی کی نذر مانی ہے وہ واجب ہوگی، لیکن فوراً ادائیگی واجب نہیں ہے، تاہم کسی معین شخص کے حق میں نذر ہو، (مثلاً زید کو ۱۰۰ روپے کی نذر) اور وہ مطالبہ کرے، تو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

نذر تبرر کی دونوں قسموں میں جس کے حق میں نذر مانی ہو، اس کا قبول کرنا شرط نہیں ہے، صرف یہ شرط ہے کہ وہ رد نہ کرے۔ (پس کوئی زید کو ۱۰۰ روپئے دینے کی نذر مانے اور وہ رد کردے، تو نذر صحیح نہ ہوگی، ورنہ صحیح ہوگی)

اگر کوئی کہے: اگر میرا مریض صحتیاب ہوا، تو مجھ پر نذر لازم ہے، یا ابتداءً کہے: مجھ پر اللہ کے لئے نذر ہے، تو اس پر کوئی بھی نیکی لازم ہے۔

نذر لجاج ومجازاۃ کا فرق: خلاصہ یہ کہ کسی ناپسندیدہ چیز پر معلق ہو، تو نذر لجاج اور کسی پسندیدہ اور مقصود ومطلوب چیز پر معلق ہو، تو نذر مجازاۃ ہوگا۔ بعض صورتوں میں ناذر کے منشا کے اعتبار سے فیصلہ ہوگا، مثلاً: عورت شوہر سے کہے کہ اگر تم نے مجھ سے ہمبستری کی تو مجھ پر روزہ لازم، تو اگر شوہر کو صحبت سے روکنے کے لئے کہے تو نذر لجاج ہے، اور اس استمتاع پر اللہ کے شکر کی نیت سے کہے تو نذر مجازاۃ اور نذر پوری کرنا لازم ہے، یا کسی نے کہا: اگر زید نظر آگیا تو مجھ پر نماز لازم، تو اس سے نفرت کے اظہار کے طور پر کہے، تو یہ نذر لجاج ہے اور اس سے محبت کی وجہ سے کہے، تو نذر تبرر ہے۔

روزے کی نذر: چند ایّام کے روزوں کی نذر ہو، تو انھیں جلد رکھنا سنت ہے، جب کہ کوئی عذر نہ ہو، تاکہ جلد بری الذمہ ہو جائے۔ اگر جدا جدا یا مسلسل رکھنے کی قید لگائے، تو وہ واجب ہے، ورنہ جدا رکھے یا مسلسل، اسے اختیار ہے، سو کوئی دس دن جدا جدا روزہ رکھنے کی نذر مانے، اور مسلسل دس دن رکھے، تو نذر کے پانچ روزے ادا ہوئے (یعنی پہلا، تیسرا، پانچواں، ساتواں اور نواں) دانستہ اس طرح کرے تو بقیہ پانچ روزے باطل اور نادانستہ کرے تو نفل مطلق شمار ہوں گے۔ اگر مسلسل دس روزوں کی نذر ہو، اور جدا جدا ادا کرے، تو ایک بھی نذر کا شمار نہ ہوگا، اگر دانستہ اس طرح کرے تو یہ روزے باطل ورنہ نفل ہوں گے۔

کسی معین سال (یا ماہ یا ہفتہ) کے روزوں کی نذر مانے، (مثلاً ۱۴۳۰ھ کے روزے، یا کل سے ایک سال کے روزے، یا ایک محرم سے ایک سال کے روزے)، تو اس نذر میں دونوں عید، ایّام تشریق، ماہِ رمضان، اور حیض ونفاس کے ایّام داخل نہیں ہیں، لہٰذا ان ایّام کی ناذر کی طرف سے قضا لازم نہیں ہے۔ بعض علماء نے حیض ونفاس کے ایّام کی قضا کو واجب قرار دیا ہے۔ پاگل پن یا بے ہوشی کے ایّام کی قضا بھی ضروری نہیں ہے۔ سفر کی وجہ سے جو روزے ترک ہوں، ان کی قضا لازم ہے، بلقینیؒ، ابن حجرؒ وخطیبؒ نے مرض کی وجہ سے ترک شدہ روزوں کی قضا کو واجب قرار دیا ہے، اور ابن المقریؒ اور رملیؒ نے غیر واجب قرار دیا ہے۔ مذکورہ اعذار کے بغیر جو روزے قضا ہوں، ان کی قضا لازم ہے، لیکن تسلسل ضروری نہیں ہے، تاہم نذر میں تتابع وتسلسل کی شرط لگائے (مثلاً: مجھ پر فلاں سال کے مسلسل روزے لازم) تو قضا کو مسلسل رکھنا لازم ہے۔ محض تتابع کی نیت سے تتابع لازم نہ ہوگا۔

اگر مطلقاً ایک سال کے روزے کی نذر ہو، (کسی سال کو معین نہ کرے) تو تسلسل کے ساتھ رکھنا واجب ہے، جبکہ نذر میں اس کی شرط لگائے، یا صرف نیت کرلے، (گو لفظاً شرط نہ لگائے)، ورنہ تسلسل واجب نہیں ہے، اس صورت میں جیسے بھی چاہے ۳۶۰ روزے رکھے، یا چاند کے اعتبار سے ۱۲ ماہ کے روزے رکھے، اگر کوئی ماہ مکمل نہ ملے، تو ۳۰ کی تعداد پوری کرے، اور عید، تشریق اور رمضان کے ایّام کی قضا کرے۔ معین سال کی نذر میں جو روزے داخل نہیں تھے، (یعنی رمضان، عید، ایّام تشریق اور حیض ونفاس) ان کی وجہ سے تسلسل منقطع نہ ہوگا، کیونکہ وہ ایّام شرعاً مستثنیٰ ہیں۔ تاہم حیض ونفاس کے علاوہ دیگر ایّام کی سال کے آخر میں متصلاً قضا لازم ہے۔ بعض علماء نے حیض ونفاس کے ایّام کی قضا بھی لازم قرار دی ہے۔ اگر سفر یا مرض کی وجہ سے یا بلا عذر روزے ترک ہوں، تو از سر نو تسلسل کے ساتھ روزے رکھنا واجب ہے۔

ناذر مطلقاً سال کہے (قمری یا شمسی نہ کہے) تو قمری سال مراد ہو گا، کیونکہ وہی شرعی سال ہے۔ (اگر شمسی سال کی صراحت کرے تو شمسی سال مراد ہو گا)

اگر ہمیشہ (مثلاً) پیر کے دن روزہ کی نذر ہو، تو عید، ایّام تشریق، ماہِ رمضان اور حیض و نفاس کے ایّام میں آنے والے پیر کی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر کفارہ کی وجہ سے مثلاً دو ماہ کے مسلسل روزے لازم ہوں، یا کسی نذر کی وجہ سے ایک ہفتہ، یا ماہ وغیرہ کے مسلسل روزے لازم ہوں، اور ان کے اسباب پیر کے نذر پر مقدم ہوں، تو ان ایّام کے پیر کی قضا لازم نہیں ہے۔ اور اگر پیر کی نذر مقدم ہو، تو ان ایّام کے پیر کی قضا لازم ہے۔

ہفتہ کے کسی معین دن روزہ کی نذر مانے، تو اسی دن رکھنا لازم ہے۔ اس سے پہلے نہیں رکھ سکتا، اگر بعد میں رکھے تو قضا شمار ہو گی، اگر متعینہ دن بھول جائے، تو جمعہ کے دن رکھے، اگر اسی دن کی نذر تھی، تو ادا ہو گی، ورنہ قضا (کیونکہ ہفتہ کا اول دن سنیچر ہے، لہٰذا آخری دن جمعہ ہو گا)

اگر زید کی سفر سے واپسی کے دن روزہ کی نذر مانے تو منعقد ہو گی۔ اب رات میں پتہ چلے کہ زید کل آنے والا ہے، تو رات نیت کر کے روزہ رکھ لے، اگر زید رات میں، یا عید، رمضان یا ایّام تشریق میں آیا تو یہ روزہ ساقط ہو گیا، ان ایّام کے علاوہ کسی دن آیا اور اس کا نفل یا رمضان کے علاوہ کوئی فرض روزہ ہو، یا بغیر روزہ کے ہو، تو آئندہ اس کی قضا لازم ہے۔

کسی نفل کے تکمیل کی نذر: روزہ نماز وغیرہ کسی نفلی عبادت کو شروع کرنے سے پہلے یا شروع کرنے کے بعد اسے مکمل کرنے کی نذر مانے تو اسے مکمل کرنا لازم ہے۔ دن کے بعض حصہ کے روزہ کی، ایک رکعت سے کم نماز کی اور صرف سجدہ یا رکوع کی نذر مانے تو منعقد نہ ہو گی۔

حج وعمرہ یا حرم پاک جانے کی نذر: اگر حرم پاک، یا بیت الحرام، یا بیت اللہ الحرام، یا صفا یا مسجد خیف (منیٰ کی مسجد) جانے کی نذر مانے تو نُسُک (یعنی حج یا عمرہ) کے ساتھ جانا لازم ہے، کیونکہ تبھی قربت مکمل ہو گی، لہٰذا ناذر کے کلام کو اسی پر محمول کریں گے۔ اگر ان مقامات کی طرف پیدل جانے کی نذر مانے تو نسک کے ساتھ اپنے گھر سے پیدل جانا لازم ہے۔ اگر پیدل حج یا عمرہ کی نذر ہو، تو جہاں سے احرام باندھے، وہاں سے پیدل جانا لازم ہے۔ (خواہ میقات سے باندھے، یا پہلے یا بعد میں) تاہم گھر سے پیدل چلنے کی صراحت کرے تو گھر سے ہی پیدل چلنا ضروری ہے۔ عمرہ کا آخری رکن ادا ہونے تک، اور حج کے دونوں تحلل حاصل ہونے تک پیدل چلنا ضروری ہے، اس کے بعد رمی باقی ہو، تو پیدل چلنا ضروری نہیں ہے، حج وعمرہ کے دوران تجارت وغیرہ کے لئے سوار ہونے میں حرج نہیں ہے۔ اگر مذکورہ دونوں صورتوں میں عذر کی وجہ سے یا بلا عذر سوار ہو کر جائے، تب بھی کافی ہے، البتہ دم یعنی ایک بکری کی قربانی لازم ہو گی۔

کوئی سوار ہو کر حج یا عمرہ کی نذر مانے پھر پیدل ادا کرے تو اسے دم لازم ہے، اگر ننگے پیر حج کی نذر مانے تو حج لازم ہے، نہ کہ ننگے پیر کرنا، البتہ جن مقامات میں ننگے پیر چلنا مسنون ہے، وہاں ننگے پیر چلنا لازم ہے۔

حج یا عمرہ کی نذر کے بعد بذاتِ خود انجام دینے سے عاجز ہو جائے، تو دوسرے کو نائب بنا کر بطورِ بدل ادا کروانا لازم ہے، اور اس حج بدل کی بھی وہی تفصیل ہو گی جو اسلامی فریضہ حج کے بدل کی ہے۔ نذر کے حج کو امکان کے بعد فوراً ادا کرنا سنت ہے۔ اگر آئندہ حج سے عاجز ہونے کا خطرہ ہو، تو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔ اگر امکان کے بعد بغیر حج کے مر جائے تو اس کے مال سے حج کروایا جائے۔ اگر امکان سے قبل ہی مر جائے تو کچھ لازم نہیں ہے۔ افراد، تمتع، یا قران کسی بھی طریقہ سے حج ادا کرنے سے نذر پوری ہو گی، اور نذر کے تعلق سے کوئی دم واجب نہ ہو گا۔

اگر اس سال یا کسی اور معین سال میں حج یا عمرہ کرنے کی نذر مانے، اور ادا کرنا ممکن بھی ہو، یعنی اتنی مسافت پر ہو کہ اس سال وہاں سے پہنچ کر حج ادا کر سکے، تو اسی متعینہ سال میں ادا کرنا لازم ہے۔ اس سے پہلے یا بعد میں ادا کرنا جائز نہیں ہے،، مؤخر کرے تو قضا لازم ہے۔ اگر اس پر اسلامی فریضہ حج باقی ہو، اور نذر سے اس فرض حج کے علاوہ کی نیت ہو، تب نذر منعقد ہو گی، اسلامی فرض حج کو نذر پر مقدم کرے، اگر پہلے نذر کا حج کرے، تو اسلامی فرض حج ادا ہو گا۔ اگر نذر سے اسلامی فرض حج کی نیت ہو یا مطلق ہو (یعنی نہ اسلامی فرض حج کی نیت ہو، نہ مستقل الگ حج کی) تو نذر منعقد نہ ہو گی۔ اگر اس سال حج کی نذر ہو، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے پہنچنا اور ادا کرنا ممکن نہ ہو، تو نذر منعقد نہ ہو گی۔ اگر وقت میں گنجائش ہو، لیکن احرام سے قبل مرض وغیرہ عذر لاحق ہو، تو اس کی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر بلا عذر فوت ہو جائے، یا احرام کے بعد مرض، راستہ میں یا وقت میں غلطی، راستہ یا وقت یا نسک کو بھولنے کی وجہ سے فوت ہو جائے، تو قضا واجب ہے۔ احرام سے قبل ان اعذار کی وجہ سے فوت ہو تو قضا لازم نہیں ہے۔ احرام سے قبل یا بعد میں دشمن یا بادشاہ کے روکنے کی وجہ سے فوت ہو جائے، تو قضا لازم نہیں ہے۔ اسی طرح اس پر کسی کا قرض ہو، اور قرض خواہ اسے روک دے اور یہ فی الحال قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو، تب بھی قضا لازم نہیں ہے۔ اگر حج یا عمرہ کی نذر میں کسی سال کی تعیین نہ کرے، تو کسی بھی سال ادا کر سکتا ہے۔

نماز وغیرہ کی نذر: اگر کسی ایسے وقت نماز پڑھنے، یا روزہ رکھنے کی نذر مانے، جس میں نماز یا روزہ ممنوع نہ ہو، اور فوت ہو جائے (یعنی اس متعین وقت میں ادا نہ کرے) گو مرض وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے ہو، تو اس کی قضا لازم ہے۔

کسی جگہ کی تعیین: کسی مخصوص بستی والوں کو صدقہ کرنے کی نذر مانے، تو اسی بستی کے مسلمان فقراء و مساکین کو دینا لازم ہے، وہاں سے منتقل نہیں کر سکتا۔ اگر حرم پاک میں ذبح کی نذر ہو، تو وہاں ذبح کر کے وہیں کے مساکین پر صرف کرنا لازم ہے۔ کسی دوسری جگہ (صرف) ذبح کی نذر ہو تو کچھ لازم نہیں، کسی دوسری بستی میں ذبح و تقسیم دونوں کی نذر ہو، یا تقسیم کی نیت ہو، یا قربانی کی نذر ہو، تو اسی بستی میں ذبح کر کے وہیں تقسیم کرنا لازم ہے۔

کسی مخصوص جگہ روزہ رکھنے کی نذر مانے، تو وہ جگہ متعین نہ ہو گی، خواہ حرم پاک کو متعین کرے یا کسی دوسری جگہ کو، کہیں بھی ان روزوں کو رکھ سکتا ہے۔

کسی مخصوص جگہ نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کا حکم اعتکاف کی طرح ہے۔ یعنی اسی جگہ نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ تاہم مسجد حرام، مسجد مدینہ یا مسجد اقصیٰ کی تعیین کرے، تو یہ متعین ہوں گے، اور انھیں مساجد میں ادا کرنا لازم ہے، کیونکہ ان کی خصوصی فضیلت وارد ہے، مسجد مدینہ یا اقصیٰ کی تعیین کی ہو، تو مسجد حرام میں بھی اسے ادا کر سکتا ہے۔ اور مسجد اقصیٰ کی تعیین کی ہو، تو مسجد نبوی میں بھی اسے ادا کر سکتا ہے، مسجد حرام کی نماز بقیہ دونوں میں یا مسجد نبویؐ کی مسجد اقصیٰ میں نہیں ادا کر سکتا۔ (یہ حکم ان مساجد میں نماز کی فضیلت کی ترتیب کے پیش نظر ہے۔)

اسی طرح کسی فرض نماز یا ایسی نفل کے لئے جو مسجد میں ادا کرنا مسنون ہے، کسی مسجد کو متعین کرے، تو اس نماز کو مسجد میں ادا کرنا لازم ہے، گو کسی دوسری مسجد میں ادا کرے۔

فوائد: (۱) مطلق روزہ کی نذر ہو یعنی ایاّم کی تعیین نہ ہو، تو ایک روزہ مراد ہو گا۔ (۲) صدقہ کی نذر مانے (مقدار کی تعیین نہ ہو) تو کسی بھی مال کی تھوڑی مقدار بھی کافی ہے۔ (۳) اپنے تمام مال کے صدقہ کی نذر مانے، تو ستر عورت کے علاوہ بقیہ مال کا صدقہ لازم ہے۔ گو اس پر قرض ہو، (جبکہ قرض کی وجہ سے حجر و پابندی عائد نہ ہو) (۴) اگر نماز کی نذر مانے (اور رکعتوں کی تعداد ذکر نہ کرے) تو دو رکعت کافی ہیں، انھیں ایک ہی سلام میں ادا کرنا واجب ہے۔ صرف ایک رکعت، سجدۂ تلاوت، سجدۂ شکر یا نمازِ جنازہ کافی نہیں۔ اور دو نماز کی نذر

ہو، تو ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ قدرت ہو تو نذر کی نماز کو کھڑے ہو کر پڑھنا واجب ہے، خواہ نفل مطلق ہو، یا رواتب وچاشت وغیرہ۔ اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانے تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے، لیکن کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔ اسی طرح ایک رکعت ادا کرنے کی نذر مانے تو ایک رکعت ادا کرنا کافی ہے۔

اگر چار رکعت کی نذر ہو، تو ایک سلام سے بھی ادا کر سکتا ہے، اور دو سلام سے بھی، لیکن دو سلام سے ادا کرنے کی صراحت ہو، تو یہی لازم ہے

(۵) آپ ﷺ کے قبر اطہر کے زیارت کی نذر مانے، تو یہ لازم ہو گی۔ دیگر قبروں کے متعلق راجح یہ ہے کہ مردوں کے لئے لازم ہو گی، بالخصوص جب کہ کسی صالح شخص کی قبر ہو۔

(۶) کسی معین شخص کے لئے روپۓ پیسے وغیرہ کی نذر مانے، تو وہ شخص ناذر سے اس رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے، اگر ناذر کے ادا کرنے پر وہ نہ لے، تو ناذر بری ہو چکا، اس شخص کو لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن زکات کے مستحقین اگر زکات لینے سے انکار کریں، تو جبر کیا جائے گا، کیونکہ وہ اس کے مالک بن چکے، نیز زکات اسلام کا ایک رکن ہے، جسے معطل نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ شخص ناذر نے اپنے ذمہ جو نذر مانی ہے، اسے اس سے بری کر دے، تو وہ بری ہو جائے گا، کسی معین چیز کی نذر مانے، مثلاً یہ بکری، یہ کپڑا، یہ رقم وغیرہ، تو محض نذر مانتے ہی ناذر کی ملکیت اس چیز پر ختم ہو جائے گی، خواہ کسی غیر معین کے لئے نذر مانے یا معین کے لئے اور وہ رد کر دے۔ اگر نذر ذمہ میں ہو اور معین کے لئے ہو، تو اس کے رد کرنے سے ناذر بری ہو جائے گا، اگر ذمہ میں نذر ماننے کے بعد اسے متعین کر دے، مثلاً مجھ پر زید کو ۲۰ دینار صدقہ کرنا لازم، یا میرا بیٹا صحت یاب ہوا، تو مجھ پر زید کے لئے ۲۰ دینار لازم، پھر ۲۰ دینار کو متعین کر دے، تو زید اس کا مالک ہو چکا، گو قبضہ اور قبول نہ کرے، بلکہ رد کرے تب بھی مالک ہو گا، تو زید اس میں تصرف کر سکتا ہے، اور نذر کے وقت سے ۲۰ دینار کی زکات کا سال شروع ہو گا، اسی طرح ۲۰ دینار معین نہ کرے، تب بھی زید نذر کے وقت سے اس کا مالک ہو گا، جبکہ اسے رد نہ کرے، لہٰذا ناذر پر یہ زید کا قرض ہو گا، اور زکات وغیرہ مسائل میں قرض کے احکام اس پر ثابت ہوں گے، اگر قبضہ سے قبل زید اسے رد کر دے تو ناذر بری ہو گا، اور نذر باطل ہو گی، خلاصہ یہ کہ کسی معین شخص کو کسی معین چیز کی نذر مانے تو اس کے رد کرنے سے رد نہ ہو گی، اور غیر معین کی نذر ہو تو رد کرنے سے رد ہو گی، اگر معین چیز ناذر کے پاس تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہ ہو گا، البتہ اس کی کوتاہی کو دخل ہو، تو ضامن ہو گا، مثلاً وہ معین شخص مانگے اور یہ نہ دے، پھر تلف ہو جائے، تو ضامن ہو گا۔

(۷) کسی مسجد کو معطر اور خوشبودار کرنے کی نذر صحیح ہے، گھر یا مزاروں کو معطر کرنے کی نذر صحیح نہیں ہے۔

(۸) اگر کہے: میرا بیٹا صحت یاب ہوا تو مجھ پر اللہ کے لئے ۱۰۰ روپۓ صدقہ کرنا لازم، پھر دوسرے دن بھی یہی جملہ کہے، تو ۲۰۰ روپۓ کا صدقہ لازم ہے، تاہم تکرار کی نیت سے کہے تو صرف ۱۰۰ روپیہ لازم ہو گا۔

(۹) اگر غیر مسلم کو صدقہ کی نذر مانے تو مسلمان کو دینا، اور بدعتی یا رافضی کو صدقہ کی نذر مانے تو اہل سنت کو دینا اور مالداروں کو صدقہ کی نذر مانے تو غریبوں کو دینا جائز ہے۔

(۱۰) کافر نذر مانے تو اسلام لانے کے بعد اسے پورا کرنا لازم نہیں ہے، البتہ مستحب ہے (جب کہ شرعاً وہ نیکی ہو)، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو قبلِ اسلام مسجد حرام میں اعتکاف کی نذر کو پورا کرنے کا حکم دیا تھا۔ (بخاری شریف)

(۱۱) مسجد یا کسی اور جگہ روشنی کے لئے تیل وغیرہ کی نذر مانے، یا اس مقصد کے لئے کچھ وقف کرے، تو یہ نذر اور وقف صحیح ہے، جبکہ

اس مسجد یا جگہ میں نمازی یا سونے والے وغیرہ اس روشنی سے انتفاع کریں، ورنہ یہ نذر اور وقف صحیح نہ ہوگا، کیونکہ مال کی بربادی ہے۔

(۱۲) کسی ولی وغیرہ کے مقبرہ پر روشنی کرنے کے لئے نذر ماننے اور اس سے اس جگہ بسنے والوں کے لئے یا وہاں آمد ورفت رکھنے والوں کے لئے روشنی کا انتظام مقصود ہو، تو نذر صحیح ہے۔ اگر قبر پر روشنی کرنا مقصود ہو، گو سابقہ مقصد کے ساتھ، تو صحیح نہیں ہے۔ اگر اس جگہ یا قبر کی تعظیم، یا وہاں مدفون بزرگ کا قرب حاصل کرنا مقصد ہو، جیسا کہ غالباً عوام کا حال ہے، تو یہ نذر باطل ہے، کیونکہ عوام کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان مقامات کی اپنی بعض خصوصیات ہیں، اور اس کے لئے نذر کرنے سے آفات وبلیلات ٹلتے ہیں، مذکورہ مسائل میں وقف کا حکم بھی نذر کی طرح ہے۔ اس نذر و وقف سے کچھ (باقی ہو اور) ملے تو مالک کو، اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو لوٹایا جائے گا، اگر مالک یا وارث معلوم نہ ہوں تو مسلمانوں کے مصالح پر صرف کریں گے۔ (مغنی ۳۷۱/۴، الشروانی علی التحفۃ ۵۴۶/۱۲، بجیرمی ۳۱۵/۴)

(۱۳) کوئی تیل یا موم بتی (وغیرہ) مسجد کو دے اور نذر کی صراحت کرے، تو نذر کی جہت میں صرف کرنا واجب ہے، اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، گو کافی مقدار میں ہو، اگر وہ تبرع (عطیہ) کی صراحت کرے، تو اس کی اجازت کے مطابق ہی اس میں تصرف کیا جاسکتا ہے، اور وہ اسی (دینے والے) کی ملکیت میں باقی رہے گا، اگر کافی مدت گذر جائے، اور بظاہر دینے والا مر چکا ہوگا، تو اس کی اجازت باطل ہو چکی، اور وہ چیز اس کے وارث کو لوٹانا واجب ہے، اگر وارث کا پتہ نہ ہو، تو مسلمانوں کے مصالح پر صرف کرے، اگر دینے والے کے قصد کا علم نہ ہو تو اس پر نذر کے گذشتہ احکام جاری ہوں گے، یا مسلمانوں کے مصالح پر صرف کریں گے (مغنی ۳۷۱/۴)

(۱۴) کوئی شخص اپنے مقروض کے لئے اس کے ذمہ موجود قرض کی نذر مانے تو صحیح ہے، گو ناذر کو مقدار کا علم نہ ہو، اور مقروض فوراً قرض سے بری ہو جائے گا، گو وہ قبول نہ کرے، یا رد کر دے۔

(۱۵) اگر افضل ترین وقت یا اللہ کے نزدیک محبوب ترین وقت میں نماز پڑھنے کی نذر مانے، تو شبِ قدر مراد ہوگی، لہٰذا رمضان کے آخری عشرہ کے تمام راتوں میں نماز پڑھے، تاکہ بالیقین نذر پوری ہو۔

(۱۶) اگر صرف یہ کہے: میں نے اس چیز کی اللہ کے لئے نذر مانی یا اس چیز کی اللہ کے لئے وصیت کی، تو وقف کی طرح صحیح ہے، اور فقراء پر صرف کیا جائے۔

(۱۷) مجہول، معدوم (غیر موجود) اور غائب کی نذر اور جنین کے حق میں نذر صحیح ہے۔ میت کے لئے نذر صحیح نہیں ہے۔

(۱۸) نذر میں جن امور کا التزام کیا ہے، اسی کے مطابق لازم ہوگی، جب کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہو، اگر مطلق ہو، تو شرعی عرف پر محمول کریں گے۔

(۱۹) موت یا مرض الموت پر معلق نذر، یا مرض الموت میں مانی ہوئی نذر ایک تہائی سے معتبر ہوگی۔ اگر کسی صفت پر نذر معلق کرے، اور وہ ناذر کی موت کے بعد پائی جائے، تو یہ نذر باطل ہے، کیونکہ موت کی وجہ سے وارث مالک بن چکا۔ اور اگر وہ صفت مرض الموت میں ناذر کے اختیار کے بغیر پائی گئی، تو ایک تہائی سے معتبر نہ ہوگی (بلکہ کل مال سے معتبر ہوگی) کیونکہ وہ غیر متہم ہے، اور اگر اس کے اختیار سے پائی گئی، مثلاً اس کا گھر میں داخل ہونا، تو ایک تہائی سے معتبر ہوگی۔

(۲۰) کسی مقام پر تعمیرِ مسجد کی نذر مانے تو صحیح ہے، کسی دوسری جگہ بنانا کافی نہ ہوگا۔

تنبیہ: قرآنی آیات، احادیث، اجماع اور قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر قربت اور نیکی ہے۔ قیاس اس طرح کہ نذر قربت کا وسیلہ ہے، اور وسائل کو مقاصد کا حکم ہوتا ہے، نیز اس پر فرض کا ثواب ملے گا، جو نفل سے ستر گنا زائد ہے، لیکن صحیحین کی حدیث میں

ہے کہ آپ ﷺ نے نذر سے منع فرمایا اور کہا: "بلاشبہ یہ (نذر) کسی چیز کو روکتا نہیں ہے، اس سے تو بس بخیل سے مال نکلوایا جاتا ہے"۔ لہٰذا بظاہر نذر تبرر نیکی ہے اور نذر لجاج مکروہ ہے، یا ممانعت اس وقت ہے، جبکہ نذر پوری نہ کرنے کا خطرہ ہو، یا یہ نظریہ ہو کہ نذر میں براہِ راست (کسی مصیبت کے ٹالنے وغیرہ کی) تاثیر ہے، جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے، یا جب کہ نیکی کو کسی چیز پر معلق کیا جائے۔ (کیونکہ نیکیاں تو ویسے ہی جتنی بھی ہوسکے انجام دینا سعادت مندی ہے)

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ معلق نذر (نذر مجازاۃ) تقدیر کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی، وہ صرف بخیل کے جیب سے نیک راستہ میں مال نکالنے کا سبب ہے، کیونکہ وہ اپنے بخل کی وجہ سے بغیر نذر وجوب کے اللہ کے راستے میں صدقہ وخیرات وغیرہ نہیں کرپائے گا۔

(تلخیص ۱۷۵/۴، الفقہ المنہجی ۲۱/۳-۳۰، مغنی المحتاج ۳۵۴/۴-۳۷۱، قلائد ۴۰۷/۲-۴۲۶، تحفہ مع الحواشی ۴۸۳/۱۲-۵۴۸، فتح الوہاب مع الجمل ۳۲۱/۵-۳۳۴، فتح المعین مع الاعانہ ۳۵۶/۲-۳۷۰، الاقناع مع البجیرمی ۳۱۰/۴-۳۱۶، نہایہ مع الحواشی ۲۱۸/۸-۲۳۵، ترشیح ۲۱۱-۲۱۴)

قضاء (فیصلہ)

لفظ قضاء عربی میں حکم، فیصلہ، فراغت وانتہا، ادائیگی اور تقدیر وغیرہ کئی معانی کیلئے مستعمل ہے۔

شرعاً دو یا زائد افراد کے درمیان خصومت و جھگڑے کا اللہ عزوجل کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا قضاء کہلاتا ہے۔

مشروعیت: قضاء کی مشروعیت پر قرآن وحدیث اور اجماع وعقل کے دلائل موجود ہیں۔ (دیکھئے مائدہ آیت: ۴۹، نساء آیت: ۵۸، ۱۰۵)

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ: "حاکم اجتہاد و کوشش کرکے فیصلہ کرے، اور فیصلہ صحیح ہو، تو اسے دوہرا اجر ملے گا، اور اجتہاد کرکے فیصلہ کرے، اور غلطی کر جائے تو ایک اجر ملے گا" (متفق علیہ)

آپ ﷺ کے دورِ مسعود سے آج تک اس کی مشروعیت پر تمام کا اتفاق ہے، کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے، کیونکہ انسانی طبیعتیں اور مزاج مختلف ہیں، لہٰذا آپسی اختلاف، ظلم وستم اور دوسرے کی حق تلفی واقع ہوتی رہتی ہے، اور حاکم تنہا بذاتِ خود تمام رعایا کے فیصلے کرے، یہ ناممکن ہے، لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ مختلف علاقوں میں قاضی (منصف۔ جج) متعین کئے جائیں" جو لوگوں کے ان مسائل کو حل کریں۔

منصب قضاء کی اھمیت: یہ ایک عظیم منصب ہے۔ اور انبیاء کرام اور خلفاء وعلماء کا وظیفہ رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ نے ہر حق فیصلہ کا حکم فرمایا (سورۃ صٓ: ۲۶)

خطرہ: اس اہمیت کے ساتھ فی نفسہٖ یہ منصب بڑا پُر خطر بھی ہے، اس کی ذمہ داریوں کو نبھانا بڑی احتیاط اور باریکی کو چاہتا ہے، اس کا صحیح حق ادا کرکے نجات پانے والے کم، اور خلاف ورزی کرکے ہلاک ہونے والے زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "قاضی تین (قسم کے) ہیں: ایک جنت میں اور دو جہنم میں، جنت میں وہ قاضی ہوگا، جو حق کو پہچان کر اس کے مطابق فیصلہ دے اور جو حق کو جان کر بھی ناانصافی کرے، وہ جہنم میں ہے، اور جو جہل کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کرے، وہ بھی جہنم میں ہے"۔ (ابوداود) ایک حدیث میں فرمایا: "جسے لوگوں کا قاضی بنایا گیا، وہ بلا چھری کے ذبح ہوگیا" (ابوداود، ترمذی) (بلا چھری کے ذبح ہونے سے اس منصب کے حرص ومطالبہ سے ڈرانا اور اس

کے خطرات سے متنبہ کرنا مراد ہے) اسی لئے کئی صحابہ وعلماء اس منصب سے ڈرتے اور اپنے آپ کو باز رکھتے رہے کہ کہیں اس میں کوتاہی نہ ہو۔

حکم: ہر علاقہ میں ایک ایسا قاضی ہونا، جو فریقین میں منصفانہ فیصلہ کر کے ظلم وستم کو دور کرے، فرض کفایۃ ہے۔ اس منصب کے قابل تمام حضرات اس سے باز آئیں، تو تمام گنہگار ہوں گے، اور امام پر واجب ہوگا کہ کسی مناسب وقابل شخص پر اس ذمہ داری کے نبھانے کے لئے جبر (زبردستی) کرے۔

اسی لئے فقہائے شوافع فرماتے ہیں کہ ہر مسافتِ عَدۡویٰ پر ایک قاضی اور مسافت قصر میں ایک مفتی کا تقرر امام پر واجب ہے۔ مسافت عدوی سے مراد اتنی دوری کے ایک شخص صبح گھر سے نکلے تو وہاں جاکر رات تک واپس لوٹ سکے۔

اگر کسی علاقہ میں اس منصب کے قابل صرف ایک ہی شخص ہو، تو قاضی بننا اس پر فرض عین ہوگا۔ اگر اسے یہ منصب عطا نہ ہو، تو خود اس کا مطالبہ کرنا لازم ہے۔ اگر اپنے مثل یا اپنے سے بہتر شخص علاقہ میں موجود ہو، تو اس منصب کا مطالبہ مکروہ ہے، احادیث میں اس سے منع کیا اور ڈرایا ہے۔ تاہم درج ذیل صورتوں میں کراہت نہ ہوگی، بلکہ مستحب قرار پائے گا۔

۱- کوئی عالم گمنامی میں ہو، اور قضا کے ذریعہ اپنے علمی فیضان کو عام کرنا چاہتا ہو۔

۲- غریب ومحتاج ہو، اور قاضی بننے کی صورت میں بیت المال سے نظم ہو جائے گا، لہٰذا اس عظیم نیکی کے ذریعہ گذر بسر کا بھی سامان ہو جائے گا۔

۳- دوسروں کے ظلم یا کمزوری کی وجہ سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو رہے ہوں۔

اگر دشمنوں سے انتقام، رشوت خوری، فخر وتکبر اور برتری وغیرہ مذموم مقاصد ہوں، تو اس کا مطالبہ حرام ہوگا۔

قاضی کے شرائط: (۱) اسلام، پس شرعاً کسی کافر کو قاضی نہیں بنایا جاسکتا۔

(۲) مکلف: یعنی عاقل وبالغ ہو، کسی پاگل یا بچہ کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے، قاضی کے لئے عام عقل کافی نہیں بلکہ مزید ذہانت وفطانت اور قوتِ فکر ضروری ہے، تاکہ مشکل مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکے۔

(۳) آزادی، پس ایک غلام قاضی نہیں بن سکتا۔

(۴) مذکر ہونا، لہٰذا کوئی عورت قاضی نہیں بن سکتی، حدیث میں ہے کہ "جو قوم کسی عورت کو اپنے معاملات کا ذمہ دار بنائے، وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی" (بخاری)، نیز اس میں ان کو اپنی اصل ذمہ داری سے باز رکھنا پایا جارہا ہے، یعنی خانگی امور کی اصلاح ونگہداشت اور اولاد کی تربیت۔

(۵) قاضی عادل ہو، کوئی فاسق قاضی نہ بنایا جائے، کیونکہ اس کی باتوں اور فیصلوں کا کوئی اعتبار واطمینان نہیں، کسی میں درج ذیل صفات ہوں تو وہ عادل کہلائے گا۔

کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتا ہو، (کبیرہ گناہ یعنی جس کے ارتکاب پر قرآن یا حدیث میں سخت وعید وارد ہو، اور اس کا ارتکاب دین سے لاپروائی پر دلالت کرے، جیسے قتل، شراب نوشی، زنا، سود خواری وغیرہ)

صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے (مثلاً غیر محرم کو دیکھنا) صحیح العقیدہ ہو اور اس کے ہم طبقہ لوگوں کے مروت کا پابند ہو، یعنی زمان ومکان کے اعتبار سے دیندار لوگوں کے اخلاق وآداب کی رعایت کرے۔ نیز اطمینان بخش شخص ہو، اور اس منصب کے ذریعہ غیر شرعی طریقہ پر کسی نفع کی تحصیل سے متہم نہ ہو۔

(۶) قوتِ سماعت صحیح ہو، گو زور سے کہنا پڑتا ہے، پس کسی بہرہ کو قاضی بنانا درست نہیں ہے۔
(۷) بینا ہو، ایک نابینا قاضی نہیں بن سکتا۔
(۸) گویا ہو، پس کسی گونگے کو قاضی بنانا درست نہیں، خواہ اس کے اشارے سمجھ میں آئیں۔
(۹) قضاء سے متعلقہ ذمہ داریوں کو انجام دینے اور حق کے نفاذ کی قوت وصلاحیت ہو۔
(۱۰) مجتہد ہو، یعنی احکام سے متعلق قرآنی آیات واحادیث اور ان سے متعلقہ علوم سے واقف ہو، نیز عربی زبان اور نحو وصرف وغیرہ اور صحابہ کرام اور مابعد کے علماء کے اجماع واختلاف اور قیاس کے انواع سے واقف ہو۔ جس کسی امام کے مسلک کا مقلد ہو، تو اس پر صرف اپنے امام کے قواعد کی معرفت کافی ہے، اور ان قواعد کی ایسی ہی رعایت کرے، جیسے ایک مجتہد مطلق شرعی قوانین کی رعایت کرتا ہے۔

اگر کسی میں قاضی کے تمام شرائط موجود ہوں، اور اسے جانتے ہوئے حاکم کسی دوسرے کو مقرر کرے جو قابل نہ ہو، تو دونوں گنہگار ہوں گے اور اس کے فیصلے نافذ نہ ہوں گے۔ اگر کسی بھی شخص میں مندرجہ بالا تمام شرائط جمع نہ ہوں، اور کوئی صاحبِ شوکت حاکم کسی مسلمان کو قاضی مقرر کرے، تو مجبوری کی وجہ سے اس کے فیصلے نافذ ہوں گے، تاکہ مصالح معطل نہ ہوں۔

قاضی کے حق میں مستحب صفات: قریشی ہو، نسب کے بمقابلہ علم وتقوی کو ترجیح دی جائے، باوقار ہو، حلیم وبردبار اور ذہین وفطین اور بیدار مغز ہو، اعضاو حواس صحیح ہوں، علاقہ کی زبان سے واقف ہو، قناعت پسند ہو۔

قاضی کی ذمہ داریاں: لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرنا، فریقین کی رضامندی سے صلح کرانا، قید وبند اور تعزیری سزا کا نفاذ، حدود کا قیام، جس عورت کا ولی نہ ہو اس کا نکاح کرانا، نابالغ، پاگل اور سفہاء کے مال پر ولایت ونگرانی، قرض کے لئے ترکہ کی فروخت، غائب شخص کے مال کی حفاظت وقف کی نگرانی اور مستحقین پر اس کی آمدنی کا صرف، وصیتوں پر نگاہ رکھنا، مفتی اور محتسب حضرات کا تقرر، زکات کی وصولیابی، ترکوں کی تقسیم، مساجد میں ائمہ کا تقرر وغیرہ۔

قاضی کا محلِ قیام: قاضی بن کر کسی بستی میں پہنچے تو سنت ہے کہ دن میں پہنچے، اور جامع مسجد جا کر دوگانہ ادا کرے، اور شہر کے درمیان میں کوئی مناسب جگہ ہو، تو وہیں اپنا قیام رکھے، تاکہ تمام لوگوں کے لئے مراجعت میں سہولت ہو، ورنہ جہاں اسے سہولت ہو، قیام کرے، تاہم قاضی کے قیام وفیصلے کے لئے جگہ متعین ہو (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تو وہیں ٹھہرے۔ بہر حال اپنے عمل کی جگہ پہنچ کر اپنی آمد کے متعلق اعلان کروادے کہ جسے کوئی حاجت ہو، حاضر ہو جائے، اور پھر آنے والے حضرات کے معاملات کو حل کرنا شروع کرے، اس طرح اس کی خدمات شروع ہو جائے گی، اور اپنے وظیفہ کا مستحق قرار پائے گا۔

ذمہ داری کی ترتیب: سب سے پہلے قاضی جیل میں مقید لوگوں کے معاملات پر نظر کرے، اور جو جس سزا کا مستحق ہے، اس پر اس کا نفاذ کرے، اور اسے آزاد کر دے، جو بلا جواز ظلماً مقید ہو، اسے آزاد کر دے۔

پھر بچوں، پاگل اور سفہاء کے اوصیاء اور ذمہ داروں کی تحقیق کرے، جو صحیح طریقہ سے اس ذمہ داری کو نبھا رہا ہو، اسے برقرار رکھے، کوئی فاسق وغیرہ ہو تو اس سے مال لے کر کسی عادل کے سپرد کرنا واجب ہے، کوئی عادل ہو لیکن کمزور ہو تو دوسرے معاون کے ذریعے اس کی مدد کرے۔

پھر (سابقہ) قاضی کی طرف سے بچوں پر اور وصیتوں کی تقسیم پر مقرر اُمَناء کی تحقیق کرے، اور فاسق کو معزول کرے، نیز کمزور کے لئے ایک معاون فراہم کرے۔ اس کے بعد عام وخاص اوقات اور اس کے ناظرین کی تحقیق وفکر کرے۔ اور بعد میں اپنے دیگر امور کو الْاَھَم

فَالْاَھَم کی ترتیب سے انجام دے۔ (یعنی جو معاملہ سب سے اہم ہو اسے پہلے انجام دے، پھر اس کے بعد جو اہم ہو... اسی ترتیب سے)

ایک قاضی بہر حال لوگوں کی مصلحتوں اور حقوق کا ضامن اور ذمہ دار ہے، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ پوری جانفشانی کے ساتھ جلد از جلد تمام امور میں عدل وانصاف کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے اور ظلم وستم، بے توجہی اور تساھل سے گریز کرے۔

تحکیم (کسی کوحَکَم اور فیصل بنانا): اگر دو یا زائد افراد اپنے کسی معاملہ میں (خصومت ہو یا کچھ اور) کسی ایک یا زائد اشخاص کو حَکَم بنائیں، تو یہ جائز ہے، جب کہ حَکَم میں قاضی کی اہلیت موجود ہو، اور اللہ کی عقوبت (حد یا تعزیر) میں نہ ہو، اللہ کے حق کی وجہ سے عائد ہونے والے حد یا تعزیر میں حَکَم بنانے کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس کا کوئی معین مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، اسی لئے اللہ کے مالی حق میں بھی حکم بنانا جائز نہیں ہے۔ جس فیصل میں قاضی کے شرائط ہوں، حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہونے کے باوجود اسے حکم وفیصل بنا سکتے ہیں، خواہ قصاص یا نکاح وغیرہ میں بنائے (نکاح میں یعنی جس لڑکی کا خاص ولی نہ ہو اس کے عقد نکاح میں)

اگر قاضی موجود ہو، گو مجبوری کے درجہ کا ہو، تو کسی غیر اہل (یعنی جس میں قاضی کی اہلیت نہ ہو اس) کو حَکَم بنانا جائز نہیں، تاہم اس تک پہنچنا دشوار ہو، یا وہ مال کی معقول مقدار وصول کرتا ہو، تو اس کی موجودگی کے باوجود غیر اہل کو حَکَم بنانا جائز ہے۔

اگر مطلقاً قاضی مفقود ہو، تو موجودہ عادل افراد میں سے افضل وبہتر کو حَکَم بنانا جائز ہے۔

حَکَم کا فیصلہ اسی وقت نافذ ہوگا، جب کہ فریقین فیصلہ سے قبل اس سے راضی ہوں، البتہ فریقین میں ایک قاضی ہو، تو یہ ضروری نہیں ہے، دونوں کا الفاظ میں رضامندی کا اظہار ضروری ہے، نکاح کے مسئلہ میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے، اور تحکیم کی اجازت کے سلسلہ میں باکرہ کا سکوت بھی کافی ہے۔ فیصلہ کے بعد فریقین کی رضامندی شرط نہیں ہے۔

اگر دو اشخاص کو حَکَم مقرر کریں تو دونوں فیصلہ پر متفق ہوں، تبھی فیصلہ نافذ ہوگا، عاقلہ پر دیت کے فیصلہ میں صرف قاتل کی رضامندی کافی نہیں، بلکہ عاقلہ کی رضامندی بھی ضروری ہے۔

اگر فیصلہ سے قبل ایک فریق رجوع کرے، گو مدعی کے گواہ پیش کرنے کے بعد ہو، تو حکم کو فیصلہ کا اختیار نہ ہوگا۔ حکم کا کام صرف فیصلہ کرنا ہے، کسی کو قید وغیرہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر قصاص، حد قذف وغیرہ سزاؤں کا فیصلہ کرے، تو خود اس کا نفاذ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ حاکموں کی عظمت وشوکت کے منافی ہے۔ بقول امام زرکشیؒ رمضان کے چاند کے ثبوت کے لئے تحکیم جائز ہے، اور جو اس کے فیصلہ سے راضی ہو، اس پر نافذ ہوگا، پس اس پر روزہ واجب ہوگا۔ (الاقناع مع البجیرمی ۳۲۲/۴، تحفہ مع الحواشی ۳۲/۱۳، فتح الوہاب مع الجمل ۳۳۹/۵، مغنی ۳۷۸/۴)

مُزَکِّی (یعنی جو گواہوں کے عادل یا غیر عادل ہونے کے خبر دے): قاضی کے لئے مستحب ہے کہ مُزَکِّی حضرات کو اختیار کرے، تاکہ جن گواہوں کے حالات سے وہ واقف نہیں ہے، مزکی حضرات کے ذریعہ ان کی تحقیق کر سکے۔ مزکی مسلمان، عاقل، بالغ، عادل اور جرح وتعدیل کے اسباب سے واقف ہو، نیز متعلقہ گواہ کی مصاحبت پڑوس پن یا اس کے ساتھ معاملہ کی وجہ سے اس کے حالات سے واقف ہو۔

کاتب: قاضی کو اپنے منصب کی مصروفیت کی وجہ سے لکھنے کے فرائض انجام دینے کے لئے کاتب کی ضرورت پیش آئے گی، لہٰذا کاتب کا تقرر مستحب ہے، جس کا مسلمان، عادل مرد اور آزاد ہونا شرط ہے، نیز مَحَاضِر وسِجِلَّات کی تحریر سے واقف ہو (عدالت میں فریقین کی گفتگو کی تفصیلات جس میں قلمبند کی جائے، اسے محاضر (دستاویز) اور جس میں فیصلہ قلمبند کیا جائے اسے سِجِّل (رجسٹر) کہا جائیگا۔

کاتب کا فقیہ، کامل العقل، خوشخط، فریقین کی زبان سے واقف، فصیح اور حساب کتاب سے واقف ہونا مستحب ہے۔

مترجم: قاضی کے لئے مترجم کا تقرر مستحب ہے، جو فریقین کے کلام کے ترجمہ سے قاضی کو آگاہ کرے۔ مترجم کا مسلمان، آزاد اور عادل ہونا شرط ہے۔

دِرّہ وجیل: قاضی کیلئے لوگوں کی تادیب کے لئے حضرت عمرؓ کی اتباع میں درہ رکھنا مستحب ہے۔ نیز حقوق کے ادائیگی اور سزا کے لئے جیل خانہ کا نظم کرے۔

مجلس: قاضی کی مجلس (یعنی عدالت) کشادہ، عام وظاہر ہو، اور آرام دہ ہو کہ آنے والے ضرورت مندوں کو مشقت نہ ہو۔

مسجد: فیصلے کے لئے قاضی کو مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ مجلس غالباً فریقین کے شور غل سے خالی نہ رہے گی، نیز حائضہ، بچے، پاگل اور کافروں کی حاضری کے مواقع بھی آئیں گے۔ بہتر ہے کہ قاضی کسی اونچی جگہ بیٹھے تاکہ تمام حاضرین پر نگاہ رہے، اور قبلہ رو بیٹھے، کیونکہ یہ اشرف ترین جہت ہے، نیز بیٹھنے کے بعد اللہ سے توفیق اور صحیح فیصلوں کے لئے دعا کرے۔

دربان (حَاجِب): فیصلہ کی مجلس میں ضرورت مندوں کو آنے سے روکنے کے لئے دربان رکھنا مکروہ ہے، بلکہ اپنا دروازہ ہر آنے والے کے لئے کھلا رکھے، تاہم لوگوں کی بھیڑ ہو تو ان کے نظم وترتیب کے لئے کسی کو متعین کرنے میں حرج نہیں، ابوداود وترمذی کی احادیث سے ثابت ہے کہ جو ذمہ دار ضرورت مندوں کے ضرورت کے وقت اپنا دروازہ بند رکھے، بروزِ قیامت اس کے حوائج کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔

مشورہ: قاضی کے لئے مستحب ہے کہ پیچیدہ مسائل میں فقہاء کرام اور اصحاب بصیرت سے مشورہ کرے۔

فریقین میں مساوات: قاضی کے لئے درج ذیل امور میں فریقین میں مساوات واجب ہے۔

(۱) قاضی کے پاس داخلہ میں، پس ایک فریق کے لئے قاضی کھڑا ہو، اور دوسرے کے لئے کھڑا نہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عدل کے منافی، اور دوسرے کے دل شکنی کا باعث ہے، لہٰذا یا تو دونوں کے لئے کھڑا ہو، ورنہ دونوں کیلئے کھڑا نہ ہو۔

(۲) دونوں کی گفتگو سننا، دونوں کے ساتھ خندہ پیشانی، دونوں کے سلام کا جواب۔

(۳) اپنے سامنے دونوں کی نشست، یعنی یا تو دونوں کو اپنے سامنے بٹھائے، یا ایک کو دائیں اور دوسرے کو بائیں۔

فیصلہ کے بعض آداب: مُدَّعِی کے اپنے دعوی سے فارغ ہونے سے قبل قاضی کو مُدَّعیٰ عَلَیۡہِ سے پوچھنا جائز نہیں ہے، مدعی کے مطالبہ کے بعد ہی قاضی مدعی علیہ کو قسم دلوائے، کسی فریق کو اس کی حجت ودلیل تلقین نہ کرے، یا ایسی بات نہ کرے کہ اس سے وہ دعوی یا جواب کی کیفیت کو تاڑ جائے، یا انکار واقرار کی کیفیت کو سمجھے، کیونکہ اس میں اس کی طرف میلان اور دوسرے فریق کے حق میں ضرر رسانی کا اظہار ہے، اور یہ حرام ہے۔

قاضی گواہوں کے ساتھ بلاوجہ تشدد کے ساتھ پیش نہ آئے اور نہ اپنی کسی بات وغیرہ سے ان کو تکلیف پہنچائے، کیونکہ ایسی صورت میں لوگ گواہ بننے اور گواہی دینے سے دور بھاگیں گے۔ گواہی اسی کی قبول کرے، جس کی عدالت سے خود واقف ہو، یا دو عادل افراد (مزکی) اسے گواہی کے قابل قرار دیں، دشمن کے خلاف دشمن کی، اور والد کے حق میں اولاد کی یا اس کے برعکس گواہی قبول نہ کرے۔

فیصلہ سے اجتناب کے مواقع: دس مواقع میں قاضی فیصلہ کرنے سے رکے، غصّہ، بھوک، پیاس، شہوت کی شدت، غم، بے انتہا خوشی، بیماری، بول وبراز کی حاجت کو روک کر، اونگھ، اور گرمی اور سردی کی شدت، ان کے علاوہ دیگر ان صورتوں کا بھی یہی حکم ہوگا، جن میں نفس پریشان ہو، اور بد خلقی اور خللِ فکر حاصل ہو۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں فیصلہ سے منع فرمایا ہے (صحیحین) اور یہ ممانعت کراہت پر محمول ہے، لہٰذا اس حال میں کوئی قاضی فیصلہ کرے تو نافذ ہوگا۔

قاضی کی خرید وفروخت: بہتر ہے کہ قاضی بذاتِ خود خرید وفروخت نہ کرے، تاکہ اپنی عظیم ذمہ داری میں کوتاہی نہ ہو، نیز سامنے والا قاضی ہونے کے ناطے اس کی رعایت کرے گا، اور کل عدالت میں اس کا کوئی مسئلہ پیش ہوگا، تو قاضی کے اس کی طرف میلان کا خطرہ ہے۔

قاضی کا اپنے یا شریک کے یا اصل وفرع کے حق میں فیصلہ: (۱) قاضی خود اپنے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتا، اور یہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔

(۲) مشترک مال میں اپنے شریک کے حق میں بھی قاضی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

(۳) اسی طرح قاضی کو اپنے اصل وفرع (باپ دادا اور بیٹے پوتے وغیرہ) کے حق میں فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے، اور نہ یہ فیصلہ نافذ ہوگا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں تہمت اور طرفداری کا احتمال موجود ہے۔ تاہم ان لوگوں کے خلاف قاضی کا فیصلہ جائز اور نافذ ہوگا، کیونکہ تہمت کا کوئی سوال نہیں۔

(۴) قاضی کو اپنے دشمن کے خلاف فیصلہ جائز نہیں، البتہ اس کے حق میں فیصلہ جائز ہے۔ جن صورتوں میں قاضی کو فیصلہ کرنا منع ہے، حاکم یا کوئی دوسرا قاضی فیصلہ کرے گا۔

قاضی کے لئے ھدیه: (۱) قاضی کی عدالت میں جس کا قضیہ پیش ہو، اس کی طرف سے کسی بھی صورت میں ہدیہ قبول کرنا قاضی کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ کم ہو یا زائد، قاضی بننے سے پہلے اس کی ہدیہ کی عادت تھی یا نہ تھی، قاضی کے زیر تصرف علاقہ کا ہو یا خارج کا، کیونکہ اس صورت میں فیصلہ میں ان کی طرفداری ومیلان کا قوی امکان ہے۔

(۲) قاضی بننے سے قبل جس شخص کے ساتھ ہدیہ کے لین دین کا معاملہ نہ رہا ہو، اب قاضی بننے کے بعد وہ ہدیہ پیش کرے تو لینا جائز نہیں ہے، گو اس کا کوئی جھگڑا اور مسئلہ عدالت میں نہ ہو۔

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو عامل بنا کر روانہ کیا اور کچھ مال وہ ہدیہ کے نام سے لئے آئے، تو اس پر آپ ﷺ نے بڑی سخت تنبیہ ووعید ارشاد فرمائی۔ مسند احمد کی حدیث میں آپ ﷺ نے عامل کے ہدیہ کو خیانت سے تعبیر فرمایا ہے۔

(۳) قاضی بننے سے قبل جو شخص اسے ہدیہ پیش کرتا رہا ہو، اب قاضی بننے کے بعد بھی اسی عادت کے مطابق پیش کرے، کمیت وکیفیت میں اضافہ نہ ہو، اور اس کا کوئی مسئلہ وتنازعہ اس کی عدالت میں نہ ہو، تو یہ ہدیہ قبول کر سکتا ہے۔ لیکن اسے سنت ہے کہ اس ہدیہ کا بدلہ دے، یا مالک کو لوٹا دے یا بیت المال کے سپرد کر دے۔

تنبیه: اگر کسی غلط ارادہ وقصد سے ہدیہ ہو، مثلاً اپنے حق میں ناجائز فیصلہ کروانا وغیرہ، تو یہ ہدیہ کے نام پر رشوت ہے، جو کبیرہ گناہ ہے، اور اسے دینے والا، لینے والا اور اس سلسلہ میں کوشاں اور واسطہ تینوں گنہگار ہوں گے، احادیث میں ان تینوں کو ملعون قرار دیا ہے۔

ھدیه کی ملکیت: مذکورہ ناجائز صورتوں میں قاضی ہدیہ قبول کرے، تو مالک نہ ہوگا، بلکہ اسے دینے والے کو واپس کر دے، اگر یہ دشوار ہو تو بیت المال کے سپرد کر دے۔

ولیمه میں شرکت: فریقین کا تنازعہ عدالت میں جاری ہو، تو ان میں سے کسی کی دعوت میں شرکت قاضی کے لئے جائز نہیں ہے۔ قضا سے قبل جہاں دعوت کی عادت جاری تھی، اگر ان کا کوئی تنازعہ نہ ہو تو ان کی دعوت میں شریک ہو سکتا ہے۔ اگر ولیمہ وغیرہ کی عام دعوت ہو، اور اس کا کوئی تنازعہ نہ ہو، تو اس کی دعوت قبول کرنا مستحب ہے۔ بشرطیکہ اپنی ذمہ داری میں خلل نہ پڑے، کیونکہ اس صورت میں تہمت کا گذر نہیں، نیز میزبانوں کا دل خوش ہوگا۔

مسئلہ: قاضی کے لئے مریض کی عیادت اور جنازہ میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ نیکی ہے، اور اس میں کوئی تہمت بھی نہیں ہے۔

قاضی کا فیصلہ سے رجوع: اگر قاضی کا فیصلہ قرآن، حدیث، اجماع یا قیاس جلی کے مخالف ہو، تو (اس فیصلہ کی غلطی کا علم ہوتے ہی) اسے توڑ دیا جائے گا، اور صحیح فیصلہ کے مطابق عمل ہو گا، صحابہ وغیرہ سے اس کی کافی مثالیں وارد ہیں۔

اگر فیصلہ قیاسِ خفی کے مخالف ہو، تو سابقہ فیصلہ اپنے حال پر باقی رہے گا، آئندہ کا فیصلہ جدید اجتہاد کے مطابق ہو گا، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔

قاضی کے فیصلہ کی حقیقت: جو فیصلہ کسی کاذب اصل (جھوٹی بنیاد) پر مرتب ہو، (یعنی باطن اور حقیقت ظاہر کے خلاف ہو) وہ صرف ظاہر اًنافذ ہو گا، نہ کہ باطناً، پس نہ تو کسی حرام کو حلال کرے گا اور نہ اس کے برعکس، لہٰذا گواہ بظاہر عادل ہوں، اس لئے ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ دے، لیکن درحقیقت ان کی گواہی جھوٹی تھی، تو باطناً اور حقیقتاً اس سے حلت وجواز حاصل نہ ہو گا، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔ خواہ مال کا مسئلہ ہو یا نکاح کا یا کچھ اور۔

اگر فیصلہ اصلِ صادق (سچی بنیاد) پر مرتب ہو، تو وہ باطناً بھی نافذ ہو گا، گو جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے، اس کے مسلک کے مطابق نہ ہو، تاکہ اتفاق قائم رہے اور کامل انتفاع ہو، لہٰذا کوئی حنفی قاضی (اپنے مسلک کے مطابق) کسی شافعی شخص کے حق میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے شفعہ کا فیصلہ دے، یا ذورحم ہونے کی وجہ سے وارث قرار دے، تو اس شافعی کو اسے لینا حلال ہے۔ اسی لئے قاضی کے مسلک کو دیکھتے ہوئے شافعی شخص اس سلسلہ میں دعوی دائر کرے تو دعوی سے اور فیصلہ کے بعد اس چیز کے لینے سے قاضی اسے منع نہیں کر سکتا۔

(جو فیصلہ صرف ظاہر اًنافذ ہو اسے قضاءً نافذ اور جو باطناً بھی نافذ ہو اسے دیانتاً نافذ کہا جاتا ہے)

اس اصول پر مرتب بعض مسائل: (۱) کوئی شخص کسی عورت کے متعلق اپنی بیوی ہونے کا جھوٹا دعوی کرے، اور اس پر گواہ پیش کرے اور قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے، تو اس فیصلہ کی وجہ سے اس عورت سے استمتاع وتعلق اسے حلال نہ ہو گا، اور اس عورت پر واجب ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

(۲) کوئی شخص کسی پر اپنے مالی حق کا جھوٹا دعوی کرے، اور قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے دے، تو وہ مال اس کے لئے حلال نہ ہو گا، اور دیانتاً اس کا مالک نہ بنے گا، بلکہ اسے مالک کو لوٹانا واجب ہے۔

(۳) شریک اپنا حقِ شفعہ معاف کر چکا تھا، بعد میں اس کا انکار کر کے گواہ پیش کرے، تو حقیقتاً وہ حقِ شفعہ کا مستحق نہ ہو گا، گو بظاہر مستحق قرار پائے۔

قاضی کا معزول ہونا: درج ذیل صورتوں میں قاضی خود بخود اس منصب سے معزول ہو جائیگا۔

(۱) اس کا مرتد ہو جانا۔ (۲) اہلیت کا زائل ہونا، مثلاً: پاگل، بے ہوش، نابینا، گونگا یا بہرہ ہو جانا، (۳) فسق، اگر قاضی فاسق ہو جائے تو معزول ہو جائے گا، اور اس کا فیصلہ نافذ نہ ہو گا۔

اگر یہ عوارض ختم ہو جائیں، تب بھی خود بخود دوبارہ قاضی نہ بنے گا، حاکم دوبارہ اسے اس منصب پر مقرر کرے تب قاضی قرار پائے گا۔

معزول کرنا: (۱) اگر قاضی میں ایسا خلل ظاہر ہو، جس سے خود بخود وہ معزول نہیں ہوتا، تو امام اسے معزول کر سکتا ہے۔ (۲) اس سے افضل قاضی دستیاب ہونے کی وجہ سے بھی اسے معزول کر سکتا ہے۔ (۳) اگر اس کے مثل یا کمتر درجہ کا قاضی دوسرا موجود ہو، اور اسے معزول کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، مثلاً فتنہ کو فرو کرنا، تو اسے معزول کرنا جائز ہے۔ (۴) اگر ان میں سے کوئی سبب

نہ ہو، تو قاضی کو معزول کرنا حرام ہے، تاہم حاکم کی اطاعت کے پیش نظر وہ معزول قرار پائے گا، جب کہ اس کی جگہ دوسرا مناسب قاضی میسر ہو، ورنہ یہ سبکدوشی نافذ نہ ہو گی، کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں کی مصلحت پر شدید زد پڑے گی۔

قاضی کو جب اپنی معزولی کی خبر پہنچے، تب وہ معزول ہو گا۔ قاضی خود سبکدوش و مستعفی ہونا چاہے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ اس کی حیثیت ایک وکیل کی طرح ہے، تاہم اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس منصب کے لائق موجود ہی نہ ہو، تو اسے مستعفی ہونا جائز نہیں ہے۔ حاکم کے مرنے کی وجہ سے قاضی معزول نہ ہو گا۔

مسئلہ: اگر قاضی کو کسی کاغذ پر اپنا فیصلہ تحریر شدہ ملے، یا دو گواہ گواہی دیں کہ قاضی نے فلاں فیصلہ دیا تھا، تو جب تک اسے خود یاد نہ آئے اس تحریر یا گواہی پر عمل نہیں کر سکتا۔ (فتح الوہاب مع الجمل ۵/۳۴۴-۳۵۲، الفقہ المنہجی ۸/۱۷۱-۱۹۹، کفایۃ الاخیار ۲/۴۸۴-۵۰۳، الاقناع مع البجیرمی ۴/۳۱۶-۳۳۶)

قِسۡمَۃ (تقسیم)

قسمۃ یعنی شرکاء کی مصلحت کے لئے مخصوص شرائط اور معین کیفیت کے ساتھ بعض حصوں کو بعض سے جدا کرنا، یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مشروع ہے۔ (دیکھئے سورہ نساء: ۸) صحیحین کی حدیث میں آپ ﷺ نے تقسیم ہونے تک حق شفعہ کا فیصلہ دیا ہے، حد بندی ہو جائے اور راستے جدا واضح ہو جائیں تو شفعہ نہ ملے گا، نیز صحیحین میں آپ ﷺ سے مجاہدین میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذکر موجود ہے۔

قاسم: شرکاء خود اپنا مال تقسیم کر سکتے ہیں، یا حاکم خود تقسیم کرے یا کسی کو اس خدمت کے لئے متعین کرے۔ حاکم کی طرف سے مقرر قاسم میں گواہی کے شرائط ضروری ہیں، نیز وہ تقسیم سے متعلق امور سے بھی واقف ہو۔ تقسیم میں قیمت کا اندازہ بھی لگانا ہو، تو دو قاسم ضروری ہیں، ورنہ ایک کافی ہے، اگر قیمت طے کرنے کے لئے حاکم اسے حاکم بنا دے، تو وہ تنہا بھی کافی ہے۔ قاسم کا معاوضہ بیت المال میں مصالح کے حصے سے دیا جائے۔ اگر یہ دشوار ہو تو شرکاء خود ادا کریں۔ اگر ہر ایک نے اپنا معاوضہ متعین کیا ہو تو فبہا، ورنہ کل رقم طے ہوتی ہو، تو ہر ایک حصے کے تناسب سے معاوضہ ادا کریں۔

تقسیم کا حکم: اگر تقسیم میں عظیم ضرر ہو، تو حاکم تقسیم سے منع کر دے، اگر نفع میں نقص ہو، یا اصل مقصود نفع باطل ہو، تو انھیں تقسیم سے نہ روکے، اور نہ خود ان کے مطالبہ پر عمل کرے۔

انواع: جس کی تقسیم میں زیادہ نقصان نہ ہو، اس کی تقسیم کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قِسۡمَۃ بِالۡاَجۡزَاء (اجزاء کے اعتبار سے تقسیم): مثلاً: مثلی اشیاء جیسے اناج، دراہم، تیل، یکساں تعمیر شدہ عمارت، یکساں صفات والی زمین وغیرہ۔ اس تقسیم میں انکار کرنے والے شریک پر تقسیم کیلئے جبر کیا جائے گا۔ تمام شرکاء کامل ہوں اور اتفاق سے ایک ایک حصّہ لیں تو فبہا، ورنہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ہر ایک کے حصہ کی تعیین ہو گی، اگر کوئی شریک مجور علیہ (مثلاً: بچہ یا پاگل) ہو، تب بھی قرعہ اندازی سے تعیین ہو گی۔

تمام شرکاء کامل ہوں اور کمی بیشی پر راضی ہوں، تو جائز ہے۔

(۲) **قِسۡمَۃُ بِالتَّعۡدِیۡل:** یعنی قیمت کے اعتبار سے حصوں کی تعیین کرنا، مثلاً زمین کے مختلف حصوں کی قیمت (زرخیزی کے فرق، پانی سے قرب وبعد، درختوں کے اختلاف، بستی سے قرب وبعد وغیرہ کی وجہ سے) مختلف ہو، جیسے ایک زمین دو میں نصف نصف

مشترک ہو، اور اس کے ایک تہائی کی قیمت دوسرے دو تہائی کے برابر ہو، تو پہلا تہائی ایک حصہ اور دوسرے دو تہائی ایک حصہ شمار ہوں گے، اور قرعہ اندازی سے فیصلہ ہو گا (اگر دونوں رضامندی سے ایک ایک حصہ لیں تو قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں ہے)

درج ذیل صورتوں میں قسمۃ تعدیل کے لئے انکار کرنے والے پر جبر کیا جائے گا۔

(۱) زمین کی مذکورہ مثال، تاہم قیمتی اور گھٹیا دونوں زمینوں کو مستقل تقسیم کیا جاسکتا ہو، تو تعدیل پر جبر نہ ہو گا۔ (بلکہ پہلے نوع کے مطابق قسمۃ اجزاء پر عمل ہو گا)

(۲) ایک ہی صنف کی منقولہ اشیاء ہوں، جن کی قیمت مختلف نہ ہو، اور تقسیم کی وجہ سے شرکت ختم ہو جائے۔ مثلاً یکساں قیمت کی تین گائیں تین شرکاء میں۔ اگر صنف جدا ہو، جیسے شامی و مصری دنبہ، یا انواع جدا ہوں جیسے ریشم، اون اور سوت کا کپڑا یا تقسیم کے باوجود شرکت ختم نہ ہو، جیسے دو غلام کہ ایک کے دو تہائی کی قیمت دوسرے غلام اور بقیہ ایک تہائی کے برابر ہو، تو ان صورتوں میں تقسیم پر جبر نہ ہو گا۔

(۳) ایک دوسرے سے متصل چھوٹی چھوٹی دکانیں، جن میں سے ہر ایک کی مستقل تقسیم کی گنجائش نہ ہو اور تقسیم کی وجہ سے شرکت ختم ہو جائے، تو جبر ہو گا، ان میں سے کوئی صفت نہ ہو، تو جبر نہ ہو گا۔

(۳) **قِسمَۃ بِالرَّد:** یعنی ایسی تقسیم جس میں خارج سے مال لوٹانے کی ضرورت پیش آئے۔ مثلاً ایک طرف ایسا کنواں، درخت یا کمرہ ہو، جس کی تقسیم ممکن نہ ہو، اور دوسری طرف اس کے بالمقابل کوئی چیز نہ ہو، بجز اس کے کہ خارج سے کچھ ملایا جائے، لہٰذا قرعہ اندازی میں وہ چیز جس کے حصہ میں آئے اس کے قیمت کی قسط وہ سامنے والے کو ادا کرے گا۔ مثلاً دو میں نصف نصف تقسیم کرنا ہو، اور کنویں کی قیمت ۵۰ ہزار ہو، تو کنواں جس کے حصہ میں آئے، وہ دوسرے شریک کو ۲۵ ہزار روپے لوٹائے، اس تقسیم کے لئے شریک پر جبر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس میں غیر مشترک مال کی تملیک پائی جارہی ہے۔

رضامندی: جس تقسیم کا تعلق رضامندی سے ہو، اس میں قرعہ اندازی کے بعد اس سے رضامندی شرط ہے۔ مثلاً یوں کہنا: ہم اس تقسیم سے راضی ہیں۔ اگر قرعہ اندازی کے بغیر ہی ایک ایک حصہ لینے پر راضی ہو جائیں، تو پھر دوسری مرتبہ رضامندی کی ضرورت نہیں۔ جس تقسیم میں جبر ہوتا ہے، اس میں قرعہ اندازی سے قبل یا بعد رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

فائدہ: قسمۃ بالاجزاء حق کا افراز (جدا کرنا) ہے، اور آخری دونوں نوع بیع ہے۔ (یعنی پہلی نوع میں دونوں کے حصوں کو جدا کیا جاتا ہے۔ لیکن بقیہ دونوں انواع میں آپس میں ایک دوسرے کے حصہ میں خرید و فروخت کی صورت پائی جارہی ہے)

(الفقہ المنہجی ۸/۲۲۹-۲۳۳، فتح الوہاب مع الجمل ۵/۳۷۰-۳۷۶)

شہادت (گواہی)

شہادت: لغت میں قطعی خبر کو شہادت کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً: خاص لفظ کے ساتھ کسی چیز کے متعلق خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں

دلیل: شہادت (گواہی) قرآن وحدیث اور اجماع سے مشروع ہے (دیکھئے سورہ بقرہ: ۲۸۲، ۲۸۳) احادیث سابقہ باب میں گذر چکیں۔ نیز اس کی مشروعیت پر اجماع ہے، کسی عالم کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

حکمت: گواہی کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق کا اثبات وحفاظت ہو، اگر یہ مشروع نہ ہوتا تو کافی حقوق کو ثابت کرنا دشوار ہوتا اور اس طرح وہ حقوق ضائع ہو گئے ہوتے، جو اسلامی روح کے منافی ہے۔

گواھوں کی تعداد: جن حقوق کے متعلق گواہی ہو، اس کی دو قسمیں ہیں: حق اللہ اور حق العباد۔

(الف) حق االلّٰہ تعالی[1]: اس قسم میں عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہے، بلکہ مردوں کی گواہی ہی ضروری ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱- جس میں چار گواہوں سے کم مقبول نہیں، گواہی کا یہ نصاب زنا کا ہے۔ (دیکھئے سورہ نور: ۴، سورہ نساء: ۱۵، اور سورہ نور ۱۳) نیز مسلم وغیرہ کی احادیث سے بھی یہ نصاب ثابت ہوتا ہے۔

۲- دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی، یعنی زنا کے علاوہ دیگر حقوق اللہ میں، مثلاً: رِدَّت، قطع طریق (ڈاکہ زنی)، قتل، چوری اور شراب نوشی۔ سورہ بقرہ کی آیت: ۲۸۲، اور طلاق کی آیت: ۲، میں دو گواہوں کا حکم موجود ہے۔ مسلم کی حدیث میں دو گواہوں کی شرط موجود ہے۔ نیز امام زہری کا فرمان ہے۔ مسئلہ یہی جاری ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔

۳- روزہ کی حد تک رمضان کے چاند کے بارے میں صرف ایک مرد کی گواہی بھی کافی ہے۔ (جس کی تفصیل روزہ کے مسائل میں گذر چکی ہے)

(ب) حَقُ الْعِبَادْ (بندوں کے حقوق): اس کی بھی تین قسمیں ہیں:

(۱) جس میں مال مقصود نہ ہو، اور مردوں کو اس پر اطلاع ہوتی ہو، تو ایسے معاملہ میں دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی، جیسے طلاق، رجعت، اسلام وردت، جرح وتعدیل، وقف، وصیت وغیرہ۔

(۲) جس معاملہ میں مال مقصد ہو (خواہ کوئی چیز ہو، یا قرض یا منفعت) اس میں دو مرد، ایک مرد اور دو عورتیں، یا ایک مرد اور مدعی کی قسم مقبول ہوگی، جیسے خرید وفروخت، اقالہ، حوالہ، ضمان، اجارہ، رہن شفعہ وغیرہ۔ ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کا ذکر مسلم کی حدیث میں موجود ہے۔

(۳) ہر وہ انسانی حق جس کی غالباً مردوں کو اطلاع نہیں ہوتی، اس میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں یا چار عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی جیسے ولادت، رضاعت، بکارت (دوشیزگی) حیض، اور عورتوں کے عیوب وغیرہ۔ امام زہری نے اسے سنت (شرعی) طریقہ قرار دیا کہ جن امور پر عورتوں کے علاوہ کو اطلاع وآگہی نہیں ہوتی، اس میں عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ جیسے ولادت اور ان کے عیوب (ابن ابی شیبہ۔ الاقناع ۲/۲۹۷)

گواھی کے شرائط: قاضی کے سامنے گواہی دیتے وقت گواہ میں درج ذیل شرائط ہوں، تب گواہی مقبول ہوگی۔

۱- **اسلام:** کسی کافر کی گواہی کسی مسلمان یا کافر کے خلاف قبول نہ ہوگی۔

۲- **بلوغ:** کسی بچہ کی گواہی قبول نہ ہوگی، گو ممیز و باشعور ہو۔

۳- **عقل:** پاگل کی گواہی بالاجماع مقبول نہیں ہے۔

۴- **آزادی:** کسی غلام کی گواہی مقبول نہ ہوگی۔

۵- **عدالت:** گواہ عادل نہ ہو، بلکہ فاسق ہو، تو اس کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۶- **گواھی** میں متہم نہ ہو، لہٰذا کسی دشمن کے خلاف یا باپ دادا یا اولاد کے حق میں گواہی قبول نہ ہوگی۔

۷- **گویا ھو:** کسی گونگے کی گواہی قبول نہ ہوگی، گو اس کا اشارہ سمجھ میں آجائے۔

۸- **گواہ** بیدار مغز ہو، پس کسی مغفل وسادہ لوح کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۹-**سفاہت** کی وجہ سے مجور نہ ہو۔

تنبیہ: نکاح کے علاوہ دیگر امور میں گواہ بننے کے لئے صرف تمیز شرط ہے، لہٰذا کوئی فاسق، غلام، یا نابالغ گواہ بنے، پھر کامل ہونے کے بعد گواہی دے تو مقبول ہوگی۔

عدالت کے شرائط: ایک گواہ کے عادل ہونے کے لئے درج ذیل شرائط لازم ہیں:

۱-کبیرہ گناہوں سے اجتناب برتے۔

۲-صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ ہو، تاہم مجموعی طور پر کسی کے صغائر کے مقابلہ میں اس کی نیکیاں غالب ہوں، تو وہ عادل شمار ہوگا۔

۳-سلیم العقیدہ ہو، لہٰذا جو صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں، ان کی گواہی قبول نہ ہوگی۔

۴-غصہ کے وقت قابو میں رہتا ہو، یعنی اپنے تصرفات میں حد سے تجاوز نہ کرے، اور باطل وجھوٹ میں نہ پڑ جائے۔

۵-اس جیسے افراد کے مروت کا لحاظ رکھے، یعنی اس کے طبقہ کے افراد کے اخلاق سے متصف ہو، جو وقت اور جگہ کے اعتبار سے عرف پر محمول ہوگا، اور اپنی شان کے خلاف کام نہ کرے، پس ایک شریف وعالم شخص بازار میں کھائے پیئے یا سر کھلا رکھے، تو یہ اس کے حق میں مروت کے خلاف ہے۔(لیکن ایک قلی کے لئے خلاف مروت نہ ہوگا)

نابینا کی گواہی: صرف درج ذیل امور میں نابینا کی گواہی معتبر ہوگی۔

(۱) فریقین اور گواہوں کے کلام کا قاضی کے سامنے ترجمہ کر کے سمجھانا، کیونکہ اس میں دیکھنے وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) نسب، موت اور ملکیت وغیرہ وہ امور جو استفاضہ وشہرت سے ثابت ہوتے ہیں، جب کہ جس کے حق میں گواہی دے وہ نام ونسب کے اعتبار سے معروف ہو۔

(۳) نابینا ہونے سے قبل جس مسئلہ میں گواہ بنا تھا، نابینا ہونے کے بعد اس گواہی کو پیش کر سکتا ہے، جبکہ فریقین کا نام ونسب معروف ہو، دونوں یا کسی ایک کا نام ونسب مجہول ہو تو یہ گواہی معتبر نہیں۔

(۴) کوئی شخص اس کے پاس طلاق، آزادی یا کسی معروف شخص کے لئے مال وغیرہ کا اقرار کرے، اور یہ نابینا فوراً اس اقرار کرنے والے کو پکڑ لے اور قاضی کے سامنے اس اقرار کی گواہی دے تو یہ معتبر ہوگی۔(ارشاد الساری شرح البخاری ۳۸۶/۴)

گواہی سے رجوع: سچی گواہی سے گواہوں کا رجوع کرنا حرام ہے، کیونکہ اس میں حقوق کی بربادی ہے، اور یہ رجوع شہادت کے چھپانے کی طرح ہوگا، جس سے قرآن نے روکا ہے اور اسے گناہ قرار دیا ہے۔(دیکھئے سورہ بقرہ: ۲۸۳)

اگر جھوٹی گواہی ہو، تو اس سے رجوع کرنا واجب ہے، کیونکہ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ حاکم کے فیصلہ سے قبل گواہ گواہی سے رجوع کریں، تو ان کی گواہی پر کسی بھی صورت میں فیصلہ کرنا ممنوع ہے۔ اگر زنا کی گواہی سے رجوع کریں، تو گواہوں پر حد قذف لگے گی۔ اگر مالی مسئلہ میں فیصلہ کے بعد اور مالی حق کے وصولیابی سے قبل رجوع کریں، تو یہ فیصلہ نافذ ہوگا، اور جس پر مال ثابت ہوا ہے، اس سے وصول کیا جائے گا، اگر کسی سزا کے فیصلہ کے بعد (چاہے سزا اللہ کا حق ہو یا بندہ کا) اور نفاذ سے قبل رجوع کریں، تو سزا ساقط ہوگی، کیونکہ عقوبتیں شبہ کی وجہ سے ساقط ہوتی ہیں۔

فیصلہ اور اس پر عمل کے بعد گواہ رجوع کریں تو اس سے فیصلہ پر کچھ زد نہ پڑے گی، اب اگر حق سزا کے تعلق سے تھا، اور گواہ یہ کہیں کہ ہم نے عمداً وقصداً جھوٹی گواہی دی تھی تو ان پر دیت مغلظہ یا قصاص واجب ہوگا۔ اگر طلاق بائن یا لعان کی گواہی کی وجہ سے قاضی نے میاں بیوی میں تفریق کر دی، پھر گواہ رجوع کریں، تو یہ جدائی ختم نہ ہوگی۔ اور ان رجوع کرنے والے گواہوں پر شوہر کو

مہر مثل دینا لازم ہے۔ اسی طرح مال کے متعلق گواہی کے مطابق فیصلہ اور مال کی ادائیگی کے بعد رجوع کریں، تو ان گواہوں پر لازم ہے کہ جس کے خلاف مال کا فیصلہ ہوا، اسے مال کی وہ مقدار ادا کریں۔ (فتح الوہاب مع الجمل ۳۷۷/۵، الفقہ المنہجی ۲۱۱/۸-۲۲۱)

دَعْوٰی اور بَیِّنَہ

دَعْوٰی: عربی میں دعوی رغبت اور طلب کرنے کو کہتے ہیں، اور شرعاً: حاکم کے سامنے دوسرے کے اوپر اپنے حق کے وجوب کی خبر دینے کو دعوی کہتے ہیں۔

بَیِّنَہ: بینہ یعنی واضح حجت و دلیل اور شرعاً: گواہوں کو بینہ کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے حق ظاہر و واضح ہوتا ہے۔

مشروعیت: اس کی مشروعیت کے لئے دیکھئے: سورۃ النور آیت: ۴۸، اور آل عمران، آیت: ۲۳۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے ۔۔۔ "قسم مُدّعیٰ علیہ پر ہوگی" (متفق علیہ) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مُدّعی سے فرمایا: "تمہارے دو گواہوں یا اس (مُدّعیٰ علیہ) کی قسم" (پر فیصلہ ہوگا) (مسلم) ایک حدیث میں ارشاد ہے: "بینہ مدعی کے ذمہ ہے۔ اور قسم مُدّعیٰ علیہ پر" (ترمذی)

مُدَّعِیْ اور مُدَّعیٰ علیہ: جس کی بات ظاہر کے مخالف ہو، وہ مُدّعی اور جس کی بات ظاہر کے موافق ہو، وہ مُدّعیٰ علیہ کہلائے گا (دعوی کرنے والا مُدّعی اور جس کے خلاف دعوی ہو وہ مدعی علیہ ہوگا۔ مثلاً: جمیل یہ دعوی کرے کہ زید پر میرے ہزار روپئے ہیں، تو جمیل مدعی اور زید مدعی علیہ کہلائے گا)

مدعی کی جانب چونکہ کمزور ہے، کیونکہ اس کا دعوی اصل کے یعنی برأت کے مخالف ہے، اس لئے قوی حجت یعنی بینہ کا مکلف قرار پایا اور مدعی علیہ کی جانب قوی ہے، کیونکہ اس کی بات اصل کے موافق ہے، لہٰذا اس کے لئے کمزور حجت یعنی قسم کو کافی سمجھا گیا۔

دعوی کی صحت کے شرائط: قاضی کے سامنے کسی بھی دعوی کی صحت کے (خواہ خون کا ہو یا غصب، چوری وغیرہ کا) چھ شرائط ہیں:

(۱) دعوی معلوم ہو، یعنی مدعی اپنے دعوی کو مفصل پیش کرے، مثلاً یوں کہے: فلاں نے میرے رشتہ دار کو عمداً قتل کیا۔ اگر صرف یہ کہے کہ اس نے میرے رشتہ دار کو قتل کیا، تو دعوی قبول نہ ہوگا، تاہم قاضی کو سنت ہے کہ اس سے دعوی کی تفصیل کا مطالبہ کرے۔

(۲) دعوی لازم کرنے والا ہو، پس صرف ہبہ کا دعوی ہو، قبضہ کرانے کا دعوی نہ ہو، تو سنا نہ جائے گا، کیونکہ ہبہ بغیر قبضہ کے لازم نہیں ہوتا۔ اگر مدعی کہے: فلاں نے مجھے ہبہ کیا اور اس کی اجازت سے میں نے اس پر قبضہ کر لیا، تو اب دعوی مقبول ہوگا۔

(۳) دعوی میں مدعی علیہ کی تعیین ہو، ایک ہو یا زائد، اگر دعوی کرے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک نے قتل کیا، تو ابہام کی وجہ سے یہ دعوی مقبول نہ ہوگا، اور مدعی ان لوگوں کو قسم دلانے کا مطالبہ کرے تو قاضی ان کو قسم نہیں دلائے گا، کیونکہ دعوی ہی صحیح نہیں ہے۔

(۴) مدعی مکلف یعنی عاقل بالغ ہو، پس کسی بچہ یا پاگل کا دعوی مقبول نہ ہوگا۔

(۵) مدعی یا مدعی علیہ ایسا حربی نہ ہو، جس کو امان نہ ہو، کیونکہ وہ قصاص وغیرہ کا مستحق نہیں، اس کے سارے حقوق مہدر (رائیگاں) ہیں۔

(۶) اس کا ایک دعوی دوسرے دعوی کے منافی نہ ہو، پس ایک شخص پر تنہا قاتل ہونے کا دعوی کرے، پھر دعوی کرے کہ دوسرا بھی اس کا شریک تھا یا دوسرے نے تنہا قتل کیا، تو دوسرا دعوی معتبر نہ ہوگا، تاہم دوسرا مدعی علیہ مدعی کی تصدیق کرے، تو اس کے اقرار کی وجہ سے گرفت کرتے ہوئے یہ دعوی سنا جائے گا۔

مقدمہ کی سماعت: جب دعوی میں مذکورہ تمام شرائط موجود ہوں، تو دعوی صحیح ہوگا، اور قاضی اس کی سماعت کرے گا، پھر مدعی سے اپنے دعوی کی صحت پر بینہ کا مطالبہ کرے گا، اگر بینہ پیش کرے، تو اس کے دعوی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

اگر مدعی کے پاس اپنے دعوی کے متعلق بینہ نہ ہو، تو قاضی مدعی علیہ سے مطالبہ کرے گا کہ مدعی کے دعوی کی نفی پر قسم کھائے، اور وہ قسم کھالے تو قاضی اس کی برأت کا فیصلہ کرے گا۔ اگر مدعی علیہ قسم لینے سے انکار کرے، تو یہی قسم مُدعی کی طرف لوٹے گی، اور قاضی اس سے اپنے دعوی پر قسم کا مطالبہ کرے گا، اور وہ قسم کھالے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے قسم کو حق کے طالب کی طرف لوٹا دیا۔ (حاکم) (مدعی کی طرف لوٹنے والی اس قسم کو یمین رَدیا یمین مَرْدُوْدَہْ کہا جاتا ہے)

یمین رد مدعی علیہ کے اقرار کی طرح ہے، پس مدعی کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد قاضی کے فیصلہ کے بغیر ہی حق مدعی کے لئے واجب ہوگا اور بعد میں اس حق کو ساقط یا بری کرنے والے حجت کو سُنا نہ جائے گا۔ قاضی قسم کو مدعی کی طرف لوٹائے اور وہ بلا عذر قسم سے انکار کرے تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔

دو کا دعوی: اگر کسی چیز کے متعلق دو آدمی دعوی کریں کہ یہ چیز میری ہے، اور کسی کے پاس گواہ نہ ہوں، تو وہ چیز جس کے قبضہ میں ہے، اس کی قسم کے ساتھ اس کے حق میں فیصلہ ہوگا، اگر دونوں کے قبضہ میں ہو، تو دونوں بھی اس بات پر قسم لیں کہ یہ چیز دوسرے کی ملکیت نہیں ہے، پھر اسے دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ ایک جانور کے متعلق اس صورت میں آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا تھا۔ (ابوداود، حاکم) (الفقہ المنہجی ۸/۲۰۳-۲۱۰)

قائف (قیافہ شناس)

لغت میں قائف اتباع و پیروی کرنے والے کو کہتے ہیں، اور شریعت میں اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم کی روشنی میں اشتباہ کی صورت میں جو نسب کا فیصلہ کرتا ہے، اسے قائف کہتے ہیں۔

شرائط: قائف میں گواہی کے تمام شرائط موجود ہوں، نیز نسب کی معرفت کا تجربہ بھی ہو، لہٰذا مختلف عورتوں اور ایک بچہ کو تین مرتبہ اس کے سامنے پیش کریں، جن میں اس کی ماں نہ ہو، چوتھی مرتبہ ماں کو بھی پیش کرے، اگر تمام مرتبہ وہ صحیح فیصلہ دے، تو آئندہ اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔ (اگر ہر مرتبہ الگ الگ عورت کا بچہ پیش کرتے رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے) اگر مردوں کے ساتھ باپ کو اسی ترتیب سے پیش کریں تو یہ بھی کافی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی لقیط وغیرہ مجہول النسب کے متعلق دو شخص دعوی کریں، یا دو اشخاص کسی عورت سے وطی بالشبہ کریں، اور پھر پیدا ہونے والے بچہ کا دونوں دعوی کریں، اور دونوں سے ہونے کا امکان ہو، یا کوئی شخص کسی کی بیوی سے وطی بالشبہ (صحبتِ شبہ) کرے اور اتنی مدت میں بچہ پیدا ہو کہ دونوں کا ہو سکتا ہے، تو اس صورت میں قائف کے سامنے پیش کریں گے، اور وہ جس شخص کے ساتھ بھی اس کا نسب جوڑ دے، جڑ جائے گا۔

اگر ایک کی صحبت کے بعد حیض آئے، پھر دوسرا صحبت کرے، تو بچہ دوسرے کا شمار ہوگا، تاہم پہلا شوہر ہو، جس کا نکاح صحیح ہو، تو اس کا تعلق ختم نہ ہوگا (یعنی قائف کے روبرو پیش کریں گے) لیکن نکاح فاسد ہو، تو اس کا تعلق ختم ہوگا (اور بچہ دوسرے کا ہوگا)۔ (فتح الوہاب مع حاشیۃ الجمل ۵/۴۳۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم الفرائض (میراث کا بیان)

مذہبِ اسلام دینِ فطرت ہونے کے ساتھ ایک جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے۔ اس میں صرف انسانی زندگی سے متعلق پیش آنے والے ہمہ جہت ورنگارنگ مسائل کے عادلانہ ومنصفانہ قوانین پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ عارضی زندگی کے خاتمہ کے بعد کے لئے بھی احکام وضوابط دیئے گئے ہیں جس کی واضح مثال مسائل فرائض کے وسیع اور جامع نظام میں ملتی ہے۔ یہ خوش عقیدگی پر مبنی بے بنیاد خیال نہیں بلکہ دلائل وشواہد سے ثابت شدہ ایک واضح حقیقت ہے۔ اور قوانین میراث کے متوازن ومبنی بر عدل ہونے کا مزید کشفِ حجاب اس وقت ہوگا جبکہ دیگر مذاہب وملتوں کے پیش کردہ قوانین کے ساتھ اس کا تقابل وموازنہ کیا جائے۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں استحقاقِ ارث کا اصلی وبنیادی سبب قوت اور رجولیت تھا۔ اسی طرح یہودی نظریہ میں بھی مردانگی کو اساسی حیثیت حاصل تھی۔ نیز ہندو مذہب کے ساتھ مبنی برعدل وانصاف سمجھے جانے والے قوانین ''رومن لاء'' میں بھی مرد ہی کو میراث کا حقیقی مستحق قرار دے کر قدرتی صنفِ نازک (عورتوں) سے یکسر صرف نظر کرلی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف مذہبِ اسلام نے اپنے قوانینِ میراث میں مرد وعورت کے طبعی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک کو اپنے تقاضوں کے مطابق مستحق میراث قرار دیا۔

مسائلِ فرائض کی اہمیت کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ میراث میں ایک ہی مقام پر تقریباً اکثر احکام نہایت اہتمام اور تعیین حصص کے ساتھ بیان فرمائے۔ اور آگے مزید اہتمام شان ''فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ'' سے واضح فرمایا، چہ جائیکہ اس کے علاوہ بہت سی روایات میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے اس کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ لیکن آج دین سے بیزاری اور احکامِ شرعیہ سے تغافل ولاپرواہی کی بناء پر اس اہم علم سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں مورث کے انتقال کے بعد فوراً تقسیمِ میراث کو معاشرہ میں بہت ہی زیادہ معیوب اور قابلِ ملامت سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کے لئے کچھ اقدام کرے تو اس علم کی اہمیت اور عدم تقسیم کے نتائج کی سنگینی سے ناواقف ہونے کی بناء پر وہ بے چارہ ہدف ملامت اور معتوب ومطعون قرار پاتا ہے۔ حالانکہ فوراً میراث تقسیم نہ کرنے سے کسی وارث کی حق تلفی یا اس پر ظلم یا اس کی رضامندی کے بغیر ناحق اس کے حق کو استعمال کرنے کے علاوہ اور بھی بہت پیچیدہ اور پریشان کن مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ حضرات عمرو، ابن مسعودؓ کا فرمان ہے کہ فرائض کا علم حاصل کرو کیونکہ یہ تمہارے دین میں داخل ہے۔ (دارمی)

لہٰذا حکم خداوندی پر عمل پیرا ہونے اور سنت نبوی کی کامل اتباع کا تقاضہ یہ ہے کہ معاشرہ کو اس علم کی ضرورت واہمیت سے متنبہ وچوکنّا کرکے اس کے تعلق سے بے اعتنائی ولاپرواہی کے رجحانات کو دور کرنے کی کامیاب جدوجہد میں مصروف رہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس اہم فریضہ کو اپنے بندوں میں سو فیصد زندہ کرے اور اس کی خلاف ورزی کے گناہ ونقصانات سے مکمل حفاظت فرمائے۔ آمین

حدیث: آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''فرائض اور قرآن کا علم حاصل کرو، اور لوگوں کو سکھلاؤ، کیونکہ مجھے (اس دنیا سے عنقریب) اٹھالیا جائے گا۔ (ترمذی شریف ج/۲، ص ۲۹)

لغوی تعریف: فرائض یہ فریضۃ کی جمع ہے۔ اور لفظ فرض لغوی اعتبار سے چند معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ایک معنی ہے ''تقدیر'' (متعین کرنا) اور وارث کے متعینہ حصہ کو شرعاً فرض کہتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف: تقسیمِ میراث کے مسائل اور حساب کے ان اصولوں کے جاننے کا نام ہے جن سے وارث کے متعینہ حصہ میت کے ترکہ سے معلوم کیا جاسکے۔

موضوع: میّت کا ترکہ

اب چونکہ اس علم میں دراصل میت کے ترکہ سے بحث کی جاتی ہے۔اس لئے یہاں پر ترکہ کی تعریف اور اس کے متعلقات کو مختصراً معلوم کریں۔

ترکہ کی تعریف: ہر وہ چیز جو موت کے وقت میت کی ملکیت میں ہو وہ ترکہ کہلاتی ہے۔مثلاًمال وغیرہ، غیر منقولہ جائیداد جیسے زمین، مکان، باغ وغیرہ اور منقولہ جائیداد جیسے سونا، چاندی، سامانِ تجارت وغیرہ سب مال میں داخل ہیں۔اسی طرح موجودہ زمانہ کے اعتبار سے روپیوں کی مندرجہ ذیل صورتیں بھی ترکہ میں شامل ہیں۔

(الف) بینک میں رکھی ہوئی اصل رقم چاہے F.D. (فکسڈ ڈپازٹ) یا اس کے علاوہ کسی بھی اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی ہو۔اس کی اصل رقم ترکہ میں شامل ہوگی البتہ رقم پر ملنے والا سود ترکہ میں شامل نہیں ہوگا۔بلکہ وہ بلانیت ثواب مستحقین زکوٰۃ پر خرچ کر دے۔

(ب) سروس گریجویٹی، بونس، اسی طرح P.F. (پراویڈنٹ فنڈ) کے طور پر ملنے والی پوری رقم ترکہ میں شامل ہوگی۔

تنبیہ: DeathCompensation (موت کی تلافی کے طور پر) ملنے والی رقم ترکہ میں شامل نہیں ہوگی۔میت کے ورثہ میں سے جس کے بھی نام کمپنی وہ رقم جاری کرے تو وہی شخص اس رقم کا مالک ہوگا۔

ترکہ میت سے متعلق ہونے والے حقوق:

ورثہ میں ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے اس سے مندرجہ ذیل پانچ حقوق متعلق ہوتے ہیں، سب سے پہلے ان کی ادائیگی ضروری ہے۔

۱) وہ حق جو عین ترکہ سے متعلق ہو، جیسے موت سے پہلے اس کے موجودہ مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہو، اسی طرح ”رہن“ کے طور پر رکھی ہوئی چیز وغیرہ۔

۲) اسراف اور کفایت کے بغیر تجہیز و تکفین کا خرچ۔البتہ بیوی کی تجہیز و تکفین کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہوگا، اگر بیوی موت سے پہلے شوہر کی نافرمانی (ناشزہ) ہوئی ہو تو پھر اس کا خرچ شوہر پر لازم نہیں ہوگا۔

۳) پھر میت کے ذمہ میں ثابت ہونے والے حقوق۔جیسے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ، کفارہ، حج بدل وغیرہ۔اسی طرح میت کے ذمہ میں کسی کا قرض ہو تو اس کو بھی ادا کیا جائے گا۔البتہ بندہ کے حق (قرض) پر اللہ کے حق (کفارہ، حج بدل وغیرہ) کو مقدم کیا جائے گا۔

۴) وارث کے علاوہ کسی شخص کے لئے وصیت کی ہو تو ثُلث مال (ایک تہائی) میں اس کی وصیت نافذ ہوگی۔اگر وصیت کی ہوئی چیز چیز ایک تہائی مال سے زائد ہو تو زائد میں نفاذ ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

۵) ان مذکورہ حقوق کی ادائیگی کے بعد اگر مال بچتا ہو تو بقیہ مال کو میت کے ورثہ کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

ارکانِ ارث: ارکانِ ارث تین ہیں۔

۱) **مورث:** وہ شخص جس کا انتقال ہو گیا ہو۔

۲) **وارث:** جو مورث کے انتقال کے وقت زندہ ہو یا اس کا زندوں میں شمار ہو، جیسے حمل

۳) **میراث:**

اسبابِ ارث: اسبابِ ارث تین ہیں۔

۱) **نسب** (قرابت و رشتہ داری) ۲) **نکاح** ۳) **ولاء** (آزاد کرنا)

شرائطِ ارث: شرائطِ ارث تین ہیں۔

۱) مورث کی موت کے بعد وارث کی زندگی کا یقین ہو۔

۲) مورث کی موت کا یقین ہو۔

۳) وارث اور مورث کے درمیان سببِ ارث کا علم ہو۔

موانعِ ارث: مانع کی جمع موانع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وارث مورث کی میراث سے کلی طور پر محروم ہوتا ہے۔

متفقہ موانع کل تین ہیں۔

۱) **غلامی:** یہ ایسا مانع ہے کہ غلام نہ تو خود وارث بن سکتا ہے اور نہ وہ کسی کو اپنا وارث بنا سکتا ہے۔ اسلئے کہ غلام کا اپنی ملکیت میں کچھ نہیں۔ جو کچھ اس کے پاس آئے اس پر آقا ہی کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔

۲) **قتل:** قاتل بھی اپنے مقتول کی وراثت سے محروم رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارث ہے "قاتل کے لئے (میراث میں سے) کچھ بھی حصہ نہیں ہے۔" (سنن دارمی ج/۲، ص ۳۸۵، مصنف عبدالرحمن ج/۹، ص ۴۰۴)

۳) **اختلافِ دین:** ایک مسلم کافر کا وارث نہیں بنتا اسی طرح کافر بھی کسی مسلم کا وارث نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: "مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔" (بخاری شریف، مسلم شریف جلد ۲، ص ۳۳)

نوٹ: میراث پانے کے لئے جیسے اسباب، ارکان اور شرائطِ ارث کا پایا جانا ضروری ہے اسی طرح موانع میں سے کسی مانع کا نہ پایا جانا بھی ضروری ہے، اگر تمام ارکان وغیرہ کے پائے جانے کے ساتھ کسی وارث میں کوئی مانع بھی پایا جاتا ہو تو پھر ایسا شخص مورث کے میراث کا مستحق نہیں ہو گا۔

ورثہ کی تعداد: مردوں میں سے کل پندرہ مرد وارث ہوتے ہیں۔

۱) بیٹا، ۲) پوتا پر پوتا تا آخر، ۳) باپ، ۴) دادا، پر دادا، تا آخر، ۵) حقیقی بھائی، ۶) علاتی بھائی، ۷) اخیافی بھائی، ۸) حقیقی بھائی کا بیٹا، پوتا تا آخر، ۹) علاتی بھائی کا بیٹا پوتا تا آخر، ۱۰) حقیقی چچا، ۱۱) علاتی چچا، ۱۲) حقیقی چچازاد بھائی، ۱۳) علاتی چچازاد بھائی، ۱۴) شوہر، ۱۵) آزاد کرنے والا،

عورتوں میں سے کل دس عورتیں وارث ہوتی ہیں: ۱) بیٹی، ۲) پوتی، پر پوتی تا آخر، ۳) ماں، ۴) نانی، ۵) دادی، ۶) حقیقی بہن، ۷) علاتی بہن، ۸) اخیافی بہن، ۹) بیوی، ۱۰) آزاد کرنے والی۔

حقیقی، عَلَّاتِی، اَخْیَافِیْ بھائی بہن کا مطلب:

جن بھائی اور بہنوں کے ماں باپ دونوں ایک ہی ہو ان کو "حقیقی بھائی بہن" کہتے ہیں۔ اور جن کے باپ ایک ہی اور ماں الگ الگ ہوں، گویا وہ آپس میں "باپ شریک" ہوں تو انہیں علاتی، اور جن کی ماں ایک ہی اور باپ جدا جدا ہوں گویا "ماں شریک" کو "اخیافی بھائی بہن" کہتے ہیں۔)

ان ورثہ میں سے تمام کے تمام بیک وقت وارث نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض ورثہ بعض کی موجودگی میں میراث نہیں پاتے۔ البتہ ان میں سے بعض ورثہ ایسے ہیں جو کبھی بھی مجوب نہیں ہوتے۔ چاہے کوئی بھی وارث موجود ہے۔ بہر صورت میراث کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اور یہ کل چھ ہیں۔

۱) شوہر ۲) بیوی ۳) باپ ۴) ماں ۵) بیٹا ۶) بیٹی

ورثہ کی قسمیں: مذکورہ ورثہ میں تمام کی حیثیت ایک ہی نہیں ہے، بلکہ بعض ورثہ ذوی الفروض کی حیثیت سے میراث پاتے ہیں تو بعض کا شمار عصبات میں ہوتا ہے۔ البتہ بعض افراد کبھی فرضیت کے طور پر تو کبھی عصبیت کے طور پر مستحق میراث ہوتے ہیں۔ اور بعض بیک وقت فرضیت و عصبیت دونوں اعتبار سے وارث ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام ورثہ کو کل تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

۱) محض فرضیت کے طور پر میراث پانے والے جیسے، شوہر، بیوی

۲) محض عصبیت کے طور پر میراث پانے والے جیسے بیٹا، بھائی وغیرہ

۳) کبھی فرضیت تو کبھی بحیثیت عصبیت میراث پانے والے جیسے بیٹی، پوتی، بہن وغیرہ یا فرضیت و عصبیت دونوں اعتبار سے میراث پانے والے جیسے باپ، دادا

فرضیت وتعصیب کا مطلب: شرعاً وارث کے مقررہ حصہ کو فرض اور غیر متعینہ حصہ کو تعصیب کہتے ہیں۔

ذوی الفروض کی تعریف: جن ورثہ کا حصہ شرعاً متعین ہے ان کو 'ذوی الفروض' کہتے ہیں۔ اور چونکہ ذوی الفروض کی تعداد عصبات کے مقابلہ میں زیادہ ہے اسی مناسبت سے ''تقسیم میراث'' کے علم کو بھی ''علم الفرائض'' کا نام دیا جاتا ہے۔

ذوی الفروض کی تعریف کے بعد اب یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں کل مقررہ حصے (فروض مقدرہ) چھ (۶) ہیں۔

۱) نصف (آدھا) = - ۱/۲ = ۵۰/۱۰۰ ۴) ثُلُثان (دو تہائی) - ۲/۳ = ۶۶،۶۶/۱۰۰

۲) رُبُع (چوتھائی) - = ۱/۴ = ۲۵/۱۰۰ ۵) ثُلُث (ایک تہائی) - ۱/۳ = ۳۳،۳۳/۱۰۰

۳) ثُمُن (آٹھواں حصہ) - - ۱/۸ = ۱۲،۵۰/۱۰۰ ۶) سُدُس (چھٹا حصہ) - ۱/۶ = ۱۶،۶۶/۱۰۰

ورثہ میں سے کل بارہ افراد ذوی الفروض ہیں۔ ان میں سے چار مرد اور آٹھ عورتیں ہیں۔

مذکر ذوی الفروض: ۱) باپ، ۲) دادا، ۳) اخیافی بھائی، ۴) شوہر

عورتوں میں ذوی الفروض یہ ہیں: ۱) بیٹی، ۲) پوتی، پرپوتی تا آخر، ۳) بیوی، ۴) حقیقی بہن، ۵) علاتی بہن، ۶) اخیافی بہن، ۷) ماں، ۸) جدۂ صحیحہ (نانی دادی)

ذوی الفروض کی حالتیں:

باپ: باپ کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس ۱/۶	جبکہ لڑکا یا پوتا، یا پرپوتا (صرف مذکر اولاد) موجود ہو۔
۲	سدس ۱/۶ اور عصبیہ باقی	جبکہ لڑکی، پوتی یا پرپوتی تا آخر (صرف موئنث اولاد) موجود ہو۔
۳	محض عصبہ	جبکہ میت کی مذکر و موئنث کوئی بھی اولاد نہ ہو۔

دادا: دادا کی چار حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس ۱/۶	جبکہ لڑکا یا پوتا، یا پر پوتا (صرف مذکر اولاد) ہو۔
۲	سدس ۱/۶ اور عصبیۃ باقی	جبکہ لڑکی، پوتی یا پر پوتی تا آخر (صرف مؤنث اولاد) ہو۔
۳	محض عصبہ	جبکہ کوئی بھی اولاد نہ ہو
۴	محجوب	جبکہ میّت کا باپ موجود ہو

شوھر: شوہر کی دو حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	ربع ۱/۴	جبکہ میت بیوی کی مذکر و مؤنث اولاد میں سے کوئی بھی موجود ہو
۲	نصف ۱/۲	جبکہ بیوی کی کوئی اولاد موجود نہ ہو۔

اخیافی بھائی بھن: (یعنی ماں شریک بھائی بہن)

اخیافی بھائی بہن دونوں کا حصہ برابر ہے، یعنی بھائی کو بہن کا دوگنا حصہ نہیں ملتا اس لئے دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا جارہا ہے، ان کی کل تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	ربع ۱/۶	جبکہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک ہو۔
۲	ثلث ۱/۳	جبکہ دو یا دو سے زیادہ ہوں۔
۳	محجوب	بیٹی یا پوتی میں سے کوئی موجود ہو۔

بیٹی: بیٹی کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف ۱/۲	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان ۲/۳	جبکہ دو (۲) یا دو سے زائد ہوں
۳	محض عصبہ	جبکہ میت کا بیٹا یعنی اس کا بھائی ہو اور بیٹے کو بیٹی کا دوگنا حصہ ملے گا۔

پوتی: پوتی کی چھ حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف ۱/۲	جبکہ ایک ہو

۲	ثلثان $\frac{2}{3}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہو
۳	سدس $\frac{1}{6}$	جبکہ میت کی ایک بیٹی موجود ہو، چاہے ایک ہی درجہ کی ایک یا ایک سے زائد پوتیاں ہوں۔
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ اس کے ساتھ اسی درجہ کا پوتا ہو اور پوتے کو پوتی کا دوگنا ملے گا۔
۵	محجوب	جبکہ میت کا بیٹا یا بیٹیاں ہوں۔
۶	عصبہ	جب دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتی محجوب ہو رہی ہو تو اس سے نچلے درجہ کا کوئی بھی پوتا اس کو اپنے ساتھ عصبہ بنائے گا گویا اعلیٰ درجہ کی محجوب ہونے والی پوتی کو اسفل درجہ کا پوتا عصبہ بنائیگا، پوتے سے نچلے درجہ میں محجوب ہونے والی پوتی کو عصبہ نہیں بنائے گا۔

بیوی: بیوی کی دو (۲) حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	ثمن $\frac{1}{8}$	جبکہ میت کی کسی بھی بیوی کی کوئی بھی اولاد موجود ہو۔
۲	ربع $\frac{1}{4}$	جبکہ کوئی اولاد نہ ہو

حقیقی بھن: حقیقی بہن کی چھ حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف $\frac{1}{2}$	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان $\frac{2}{3}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہوں
۳	عصبہ مع غیرہ	جبکہ میت کی بیٹی یا پوتی موجود ہو
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ میت کا حقیقی بھائی ہو اور بھائی کو بہن کا دوگنا حصہ ملے گا
۵	محجوب	جبکہ بیٹا، پوتا، یا باپ موجود ہو
۶	مقاسمہ	جبکہ میت کا دادا موجود ہو۔

علاتی بھن: علاتی بہن کی سات (۷) حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	نصف $\frac{1}{2}$	جبکہ ایک ہو
۲	ثلثان $\frac{2}{3}$	جبکہ دو یا دو سے زائد ہوں

۳	سدس $\frac{1}{6}$	جبکہ میت کی ایک حقیقی بہن موجود ہو۔
۴	عصبہ بغیرہ	جبکہ اس کے ساتھ علاتی بھائی ہو، تو بھائی کو بہن کا دو گنا ملے گا۔
۵	عصبہ مع غیرہ	جبکہ میت کی بیٹی یا پوتی موجود ہو، بشرطیکہ حقیقی بہن موجود نہ ہو۔
۶	محجوب	جبکہ دو حقیقی بہنیں موجود ہوں اسی طرح میت کا بیٹا، پوتا، باپ یا حقیقی بھائی ہو نیز ایک حقیقی بہن عصبہ ہو رہی ہو تب بھی یہ محجوب ہو گی۔
۷	مقاسمہ	جبکہ میت کا دادا موجود ہو۔

ماں: ماں کی تین حالتیں ہیں۔

نمبر	حالت	کیفیت
۱	سدس $\frac{1}{6}$	جبکہ میت کی اولاد یا کسی بھی قسم کے دو بھائی بہن موجود ہوں
۲	ثلث $\frac{1}{3}$	جبکہ اولاد یا دو بھائی بہن نہ ہوں۔
۳	ثلث مابقی	جبکہ میت کا شوہر اور باپ ہو یا میت کی بیوی اور باپ ہو۔

صرف ان دو حالتوں میں (۱-شوہر، ماں، باپ)، ۲-بیوی، ماں باپ)

ذوی الفروض (یعنی شوہر یا بیوی) کو اپنا حصہ دینے کے بعد بقیہ مال کا ثلث ($\frac{1}{3}$) ماں کو ملے گا۔

جدہ (نانی، دادی)

جدہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جدۂ صحیحہ (۲) جدۂ فاسدہ

جس عورت کا میت سے رشتہ جوڑنے میں کہیں بھی دو عورتوں کے درمیان مرد نہ آتا ہو، اسے "جدۂ صحیحہ کہتے ہیں۔ جیسے، نانی، دادی، نانی کی ماں وغیرہ اور اگر درمیان میں مرد کا واسطہ آتا ہو تو اسے جدۂ فاسدہ کہتے ہیں جیسے: نانا کی ماں، وغیرہ۔ یہاں جدہ سے مراد یہی جدۂ صحیحہ ہے۔

جدۂ فاسدہ کا شمار ذوی الفروض میں نہیں ہوتا۔

جدۂ صحیحہ کی دو (۲) حالتیں ہیں۔

۱) سدس ($\frac{1}{6}$) جبکہ ایک یا ایک سے زائد ہوں۔

(نانی، دادی دونوں کا حصہ برابر ہے)

۲) محجوب۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔

الف:- ماں کی موجودگی میں تمام نانیاں اور دادیاں محجوب ہوتی ہیں۔

ب:- باپ کی موجودگی میں صرف تمام دادیاں محجوب ہوتی ہیں۔

ج:- قریب کی نانی دور کی نانی کو محجوب نہیں کرتی، بلکہ دونوں کو برابر حصہ ملتا ہے۔ جیسے دادی پر نانی کو محجوب نہیں کرے گی۔

نوٹ: ذوی الفروض کی حالتوں میں ورثہ کے متعینہ حصے جس کیفیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر حصوں کا ذکر خود

قرآن مجید کی آیتِ میراث "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ "ترجمہ: اللہ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے۔(سورۂ نساء پ۴، آیت۱۱)

اور آیت کلالہ "يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ "ترجمہ: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں آپ کہئے اللہ تم کو حکم دیتا ہے کلالہ کے بارے میں (کلالہ جس کے نہ ماں باپ ہوں اور نہ اولاد ہو)"(سورہ نساء، پ۶، آیت۱۷۷)

وغیرہ میں موجود ہے۔ اس لئے دلیل کے بغیر صرف حصوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ صرف "جدہ" کا حصہ حدیث اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ قبیصہ بن ذؤیبؓ سے مروی ہے: کہ ایک "جدہ" حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس آکر اپنی میراث کا مطالبہ کرنے لگی تو آپ نے فرمایا: کہ تیرا کتاب اللہ میں کوئی مقررہ حصہ نہیں اور سنتِ رسول میں بھی تیرے حصہ کا مجھے علم نہیں۔ لہٰذا فی الحال لوٹ جاؤ یہاں تک کہ دیگر صحابہؓ کرام سے اس کی تحقیق کروں۔ چنانچہ جب صحابہؓ کرام سے دریافت فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے "سدس" کا فیصلہ فرمایا۔ اوران کے اس قول کی تائید حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بھی فرمائی۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے "جدہ" کے لئے "سدس" کو نافذ فرمایا۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بھی پیش آیا۔ تو آپ نے بھی اس کے حق میں "سدس" ہی کا فیصلہ فرمایا۔ (ابوداؤدج/۲،ص۴۰۱، ترمذی ج/۲،ص۳۰ وقال ہذا حدیث حسن صحیح)

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حقیقی وعلاتی بہن کی حالتوں میں "مقاسمہ" کی حالت بھی بیان کی گئی اس کا حاصل یہ کہ دادا کی موجودگی میں بھائی بہن مجحوب نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ بھی میراث کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس میں قدرے تفصیل ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کو حذف کیا جارہا ہے۔

عصبات:

عصبہ سے مراد وہ ورثہ ہیں جن کا شرعاً کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ ذوی الفروض کی موجودگی میں بچا ہوا مال اور ذوی الفروض کے نہ ہونے کی صورت میں پورے مال کے مستحق ہوتے ہیں۔

عصبہ کی مشروعیت: عصبہ کے طور پر میراث پانے کی مشروعیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ(سورہ نساء، پ۴، آیت۱۱)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد باری ہے۔ "وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ "ترجمہ: اور اگر (چند وارث) بھائی (بہن) ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (ملیگا) (نساء پ۴، آیت۱۷۷)

یہ دونوں آیتیں بیٹے اور بھائی کی عصبیت کے طور پر میراث پانے پر دلالت کررہی ہے۔ بایں طور کہ ہر ایک اپنی بہن کو عصبہ بنارہا ہے۔

اس طرح حدیث شریف میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "الحقوا الفرائض باہلہا، فما بقی فلاولی رجل ذکر" (بخاری ومسلم)

ترجمہ: مقررہ حصوں کو ذوی الفروض کے ساتھ لاحق کرو، اور جو کچھ بچے وہ سب سے قریبی مذکر مرد کے لئے ہے۔

اس حدیث سے بطور عصبیت میراث پانے کا ثبوت فراہم ہو رہا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوا کہ اگر متعدد عصبات جمع ہو جائیں تو میت سے جو زیادہ قریبی ہو گا اس کو ابعد پر مقدم کیا جائے گا۔

عصبہ کے اقسام:

عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱)عصبہ سببی: جیسے آزاد کرنے والا

۲)عصبہ نسبی: جیسے تمام مذکر ورثہ سوائے شوہر اور اخیافی بھائی کے عصبہ نسبی تین قسموں پر مشتمل ہیں۔

۱)عصبہ بالنفس (۲)عصبہ بالغیر (۳)عصبہ مع الغیر

عصبہ بالنفس: ہر وہ مرد جس کے اور میت کے درمیان کوئی عورت کا واسطہ نہ ہو، اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱)اصول یعنی باپ، دادا تا آخر (۲) فروع یعنی بیٹا، پوتا تا آخر، (۳) باپ کے فروع یعنی بھائی اور بھائی کی مذکر اولاد تا آخر، (۴) دادا کے فروع یعنی چچا اور چچا کی مذکر اولاد تا آخر

عصبہ بنفسہ صرف مرد ہی ہیں اور وہ ترتیب وار یہ ہیں۔ ان میں سے اقرب (پہلے) کی موجودگی میں ابعد (بعد والا) وارث نہیں ہوتا۔

(۱)بیٹا (۲)پوتا (۳)باپ (۴)دادا
(۵) حقیقی بھائی (۶)علاتی بھائی (۷) حقیقی بھائی کا بیٹا (۸)علاتی بھائی کا بیٹا
(۹) حقیقی چچا (۱۰)علاتی چچا (۱۱) حقیقی چچا کا بیٹا (۱۲)علاتی چچا کا بیٹا
(۱۳)دادا کا حقیقی بھائی (۱۴)دادا کا علاتی بھائی (۱۵)دادا کے حقیقی بھائی کا بیٹا (۱۶)دادا کے علاتی بھائی کا بیٹا

اسی طرح آگے یہ سلسلہ چلتا ہے۔

عصبہ بالغیر: اس سے مراد وہ حصہ پانے والی عورتیں ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں۔

یہ کل چار ہیں (۱) بیٹی (۲) پوتی (۳) حقیقی بہن (۴) علاتی بہن

عصبہ مع الغیر: وہ عورتیں جو بیٹی یا پوتی کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں۔

یہ کل دو ہیں (۱) حقیقی بہن (۲) علاتی بہن

حجب

حجب کے لغوی معنی: روکنا جیسے قرآن مجید میں ہے۔ ’’كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ‘‘(المطففین)

اصطلاحی تعریف: وارث کا وراثت سے کلی یا جزئی طور پر محروم ہو جانا۔

حجب کے احکامات اور اس کی تفصیلات کے جاننے کو ’’علم فرائض‘‘ میں بہت ہی زیادہ اہمیت ہے اور علم فرائض جاننے والے کو ان احکامات سے واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے کرام نے یہاں تک فرمایا ’’جو حجب کی تفصیلات سے ناواقف ہو، تو اسے فرائض میں فتویٰ دینا حرام ہے۔‘‘ اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا علم نہ ہونے کی وجہ سے مستحق وارث کو محروم کرنا یا محروم

وارث کو مستحق قرار دینالازم آئے گا۔اس لئے ہم بھی یہاں نہایت مختصر انداز میں اس کے بنیادی اجزاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حجب کی اقسام: حجب کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حجب بالاوصاف (۲) حجب الاشخاص

حجب بالاوصاف: موانع ارث میں سے کسی مانع کے پائے جانے کی وجہ سے وارث وراثت سے محروم ہو جائے، ایسے وارث کو محروم بھی کہتے ہیں۔

حجب بالاشخاص: کوئی وارث کسی دوسرے قریبی وارث کے موجود ہونے کی وجہ سے بالکل میراث نہ پائے یا میراث میں سے کم حصہ پائے، ایسے وارث کو محجوب بھی کہتے ہیں۔

اس آخر کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حجب حرمان (۲) حجب نقصان

حجب حرمان: کسی قریبی وارث کی وجہ سے کلی طور پر میراث سے محجوب ہو جائے جیسے پوتے کا محجوب ہونا بیٹے کی موجودگی میں۔

حجب نقصان: کوئی وارث بڑے حصے سے محجوب ہو کر چھوٹا حصہ پائے جیسے۔ اولاد کی موجودگی میں شوہر بڑا حصہ ($\frac{1}{2}$) سے محجوب ہو کر چھوٹا حصہ ربع ($\frac{1}{4}$) پاتا ہے۔

مخصوص احوال میں حجب نقصان تو تمام ورثہ پر طاری ہو سکتا ہے۔ تاہم ان میں کل چھ افراد ایسے ہیں کہ جن پر کبھی بھی حجب حرمان طاری نہیں ہوتا یعنی یہ افراد کسی قریبی وارث کی وجہ سے کلی طور پر محجوب نہیں ہوتے۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) باپ (۲) ماں (۳) بیٹا (۴) بیٹی (۵) شوہر (۶) بیوی

ان چھ کے علاوہ دیگر ورثہ پر حجب نقصان کی طرح حجب حرمان بھی طاری ہو سکتا ہے یعنی کسی قریبی وارث کی موجودگی میں بالکل بھی میراث سے محجوب ہو سکتے ہیں۔

مثلاً: حجب حرمان کے طور پر محجوب ہونے والے وہ ورثہ ہیں جن کو "ذوی الفروض" کے حالات میں "محجوب" کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

محروم ومحجوب میں فرق:

مانع ارث کے پائے جانے کی وجہ سے محروم ہونے والا شخص کسی دوسرے وارث کے نہ حجب حرمان کا سبب بنتا ہے اور نہ ہی حجب نقصان کا۔ گویا محروم کالمعدوم ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ جیسے بیٹا قاتل یا کافر ہو تو وہ نہ پوتے کو محجوب کرے گا اور نہ ہی کسی دوسرے وارث کو۔

اس کے برخلاف کسی فرد کی وجہ سے محجوب ہونے والا وارث کسی دوسرے وارث کے حجب نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ جیسے: دو بھائی باپ کی موجودگی میں محجوب ہوتے ہیں لیکن یہی ماں کے بڑے حصہ ($\frac{1}{3}$) کو چھوٹا حصہ ($\frac{1}{6}$) کر دیتے ہیں۔

مخارج

اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کرنے جارہے ہیں کہ کسی میت کے متعدد ورثاء ہوں تو اس کا ترکہ ان میں حصوں کے تناسب سے کیسے تقسیم کیا جائے گا، یہاں تقسیمِ میراث کے لئے مسئلہ بناتے وقت ”مخرج“ متعین کرنے کی ضرورت پیش آئیگی۔ اسی لئے ”فرائض“ کی تعریف میں ”حساب“ کے اصولوں کے جاننے کا بھی ذکر کیا گیا۔ ”اصول حساب“ سے ناواقفیت کے ساتھ ورثہ کے مقررہ حصوں کو ترکہ سے معلوم کرنا ممکن نہیں۔

مخرج کی تعریف: اس سب سے چھوٹے عدد کو کہتے ہیں جس سے وارثوں کے تمام مقررہ حصے ان میں بلاکسر تقسیم ہو سکیں۔

قرآن میں مقررہ حصے کل چھ ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم میں تین حصے		اسی طرح	دوسری قسم میں بھی تین حصے ہیں	
نصف	۱/۲		ثلثان	۲/۳
ربع	۱/۴		ثلث	۱/۳
ثمن	۱/۸		سدس	۱/۶

کل سات اعداد مخرج بن سکتے ہیں۔

۲/ ۳/ ۴/ ۶/ ۸/ ۱۲/ ۲۴

اگر مسئلہ میں ذوی الفروض میں سے کوئی ایک ہی وارث ہو تو اسی وارث کے حصہ سے مخرج متعین کریں گے۔ جیسے: صرف نصف والا وارث ہو تو مخرج ”۲“ صرف ثلث والا ہو تو ”۳“ اسی طرح ثلثان والے میں بھی ”۳“ اگر صرف ربع ہو ”۴“ صرف سدس ہو تو ”۶“ اور صرف ثمن ہو تو مخرج ”۸“ آئیگا۔

اگر متعدد ورثہ جمع ہو جائیں، ان میں صرف پہلی ہی قسم کے حصہ والے ہوں تو ان میں سب سے چھوٹے حصہ کا جو عدد ہو وہ ”مخرج ہو گا جیسے:

پہلی مثال میں ”نصف“ اور ”ثمن“ جمع ہے، تو ان میں چھوٹے حصہ کا عدد ”۸“ کو مخرج بنائے۔

دوسری مثال میں ”نصف“ اور ”ربع“ جمع ہے تو ان میں چھوٹے حصہ کا عدد ”۴“ کو مخرج بنائے۔

☆ اسی طرح مختلف ورثہ میں صرف دوسری قسم کے حصہ والے ہوں تو ان میں بھی جو سب سے چھوٹے حصہ کا عدد ہو گا اس کو ”مخرج“ بنائیں گے۔ جیسے:

الم ۶

حقیقی بہنیں ۲	دادی	اخیافی بھائی ۳
۲/۳	۱/۶	۱/۳

اس مثال میں دوسری قسم کے تینوں حصے جمع ہوئے تو ان میں چھوٹے حصہ کے عدد "۶" کو مخرج بنائے۔

☆ اگر پہلی اور دوسری دونوں قسم کے حصہ والے ورثہ جمع ہو جائیں تو مخرج بنانے کی ترتیب یہ ہے اگر پہلی قسم کا صرف "نصف" دوسری قسم کے تمام حصوں یا بعض حصوں کے ساتھ آئے تو مخرج "۶" ہوگا جیسے:

الم ۶

شوہر	اخیافی بھائی ۳	دادی	حقیقی بہنیں ۳
۱/۲	۱/۳	۱/۶	۲/۳

اس مثال میں پہلی قسم کا "نصف" دوسری قسم کے تمام حصوں کے ساتھ جمع ہے۔ اس لئے مخرج "۶" آیا ہے۔

☆ اگر پہلی قسم کا صرف "ربع" دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہو تو مخرج "۱۲" ہوگا جیسے

الم ۱۲

بیوی	اخیافی بہنیں ۳	ماں
۱/۴	۱/۳	۱/۶

اس مثال میں "ربع" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہے، اس لئے مخرج "۱۲" آیا ہے۔

☆ اسی طرح پہلی قسم کا صرف "ثمن" دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہو تو مخرج "۲۴" ہوگا۔ جیسے:

الم ۲۴

بیوی	بیٹیاں ۳	ماں
۱/۸	۲/۳	۱/۶

اس مثال میں "ثمن" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہے اس لئے مخرج "۲۴" آیا ہے۔

☆ اگر پہلی قسم کے بھی متعدد حصے والے دوسری قسم کے تمام یا بعض حصوں کے ساتھ جمع ہوں تو پہلی قسم کے چھوٹے حصے کے عدد کا لحاظ ہوگا۔ جیسے:

الم ۱۲

بیوی	حقیقی بہن	علاتی بہن	دادی
۱/۴	۱/۲	۱/۶	۱/۶

اس مثال میں پہلی قسم کے "ربع" اور "نصف" دوسری قسم کے بعض کے ساتھ جمع ہو رہے ہیں۔ اس لئے پہلی قسم کے چھوٹے حصہ (ربع) کے عدد کا لحاظ کرتے ہوئے مخرج "۱۲" متعین کئے ہیں۔

اب تک متعدد مخارج متعین کرنے کا جو طریقہ بیان ہوا وہ اس وقت جبکہ مسئلہ میں ذوی الفروض میں سے ورثہ موجود ہوں۔ اگر ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو۔ صرف عصبات ہوں تو مخرج عصبات کے عدد روٴس سے متعین کریں گے۔ جیسے

الم ۵

بیٹے ۵

اس مثال میں صرف عصبہ ہے۔ اس لئے ان کے عدد روس ۵ ہونے کی بناء پر مخرج "۵" آیا ہے۔

ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مذکر و مونث دونوں جمع ہو جائیں مثلاً بیٹا، بیٹی یا بھائی، بہن تو ایسی صورت میں مونث کے مقابلہ میں مذکر کو دو گنا شمار کریں گے۔ جیسے

الم ۱۳

بیٹے ۵ بیٹیاں ۳

ع

اس مسئلہ میں پانچ بیٹوں کو دو گنا (دس) اور بیٹیوں کو تین ہی شمار کر کے مخرج '۱۳' آیا۔

البتہ اخیافی بہنوں میں مذکر کو دو گنا شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ ان میں مذکر و مونث دونوں کو برابر حصہ ملے گا۔

مسئلہ بنانے کا طریقہ: میت کے ورثہ کا ترکہ میں سے حصہ معلوم کرنا ہو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ایک لمبی لکیر کھینچے اور اس کے نیچے اس کے تمام ورثہ کو الگ الگ لکھے۔ پھر جس وارث کو بیان کردہ حالتوں کے مطابق جو حصہ ملتا ہے وہ حصہ اس کے نیچے لکھے۔ اگر کوئی وارث عصبہ بنتا ہو تو اس کے نیچے "ع" کا نشان لگائے۔ اسی طرح کوئی شخص مجوب ہوتا ہو تو اس کے نیچے "م" کا نشان لگائے۔ اس کے بعد ذوی الفروض کے حصوں میں غور کر کے ما قبل کے بیان کردہ قاعدوں کے مطابق کوئی ایک مخرج متعین کرے۔

مخرج میں سے ہر وارث کا حصہ معلوم کرنے کا طریقہ: ہر وارث کا حصہ معلوم کرنا ہے تو اس کے دو طریقہ ہیں (۱) وارث کے حصہ کے "نسب نما" سے کل مخرج کو تقسیم کرے اور حاصل قسمت کو اس کے "شمار کنندہ" میں ضرب دیں، جو حاصلِ ضرب ہو وہی اس وارث کا حصہ ہو گا۔

(۲) حصہ کے "نسب نما" میں جو عدد ہے اس کے پہاڑے کو مخرج کا عدد آنے تک شمار کرتے رہے، جتنی مرتبہ میں مخرج کا عدد آئے وہی "عدد" اس وارث کا حصہ ہو گا۔ مثلاً کسی وارث کو ثلث ملا ہو اور اس مسئلہ کا مخرج "۱۲" ہو تو ۳ کا پہاڑہ شمار کرتے ہوئے چوتھی مرتبہ (چوتھے عدد) میں "۱۲" پر پہنچیں گے لہٰذا اس وارث کے لئے "۱۲" میں سے "۴" لکھا جائے گا۔ اسی طرح دیگر ورثہ کا حصہ معلوم کریں۔

مخرج میں سے ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جتنے حصے باقی ہوں وہ تمام عصبہ کو ملیں گے۔ اگر ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جب جتنے حصے باقی ہوں وہ تمام عصبہ کو ملیں گے۔ اگر ذوی الفروض کو دینے کے بعد مخرج میں سے کچھ نہ بچتا ہو تو عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا

نوٹ: مخرج میں سے حاصل شدہ حصوں کو "سھم" اور ایک ہی وارث میں متعدد افراد ہوں تو انہیں "عدد روس" کہتے ہیں۔

مثلاً (۱) الم ۱۲

شوہر	بیٹی	پوتی	حقیقی بھائی	علاتی بھائی
۱/۴	۱/۲	۱/۶	ع	م
۳	۶	۲	۱	

مثال (۲) الم ۱۲

علاتی بھائی	حقیقی بہن ا	اخیافی بہن	اخیافی بھائی	ماں	نانی	دادی
ع	۱/۲	۱/۳	۱/۳	۱/۶	م	
-	۳	۲		۱		

عول

عول کے لغوی معنی: بلند ہونا، زیادہ ہونا

اصطلاحی تعریف: ذوی الفروض کے مجموعی سہام "مخرج" سے بڑھ جائیں جس کی بناء پر تمام ورثہ کے "سہام" میں ان کے حصوں کے تناسب سے کمی واقع ہو۔

اگر کسی مسئلہ میں "عول" ہورہا ہو تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اولاً تمام ورثہ کو "مخرج" میں سے اپنا متعینہ حصہ دے دیں پھر مجموعی سہام کی تعداد کے بقدر "مخرج" کو زیادہ کریں۔

مثلاً:

المـــ

شوہر	حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۳	علاتی بہن	دادی
۱/۲	۱/۲	۱/۳	۱/۶	۱/۶
۳	۳	۲	۱	۱

اس مثال میں مخرج "۶" تھا، لیکن ذوی الفروض ہی کے مجموعی سہام اس سے زیادہ ہوئے اس لئے ورثہ کے حصوں کی تعداد کے بقدر "عو" کا نشان بنا کر مخرج کو زیادہ کیا، اب کل جائیداد کے "۶" حصے کرنے کے بجائے "۱۰" حصے کریں گے، جس کی وجہ سے لازماً ہر وارث کا حصہ اس کے تناسب سے کم ہو گا۔

مشروعیتِ عول: "عول" کا مسئلہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا تو آپ نے اس بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تو حضرت زید بن ثابتؓ نے "عول" کی رائے پیش کی پھر اس پر حضرت عمرؓ کی رائے بھی متفق ہوئی اور صحابہ کرام نے بھی اس سے موافقت کی۔ گویا اجماع صحابہ سے اس کی مشروعیت ثابت ہے اسی لئے امام شافعی کے ساتھ جمہور علمائے امت نے اسی کو اختیار کیا۔

مخارج کا عول: کل مخارج سات ہیں ان میں سے ۲/ ۳/ ۴/ ۸/ کا کبھی عول نہیں آتا۔ ان کے علاوہ ۶/ ۱۲/ ۲۴ میں کبھی عول ہو سکتا ہے۔

۶ کے عول کل چار (۴) آتے ہیں = ۷/ ۸/ ۹/ ۱۰

۱۲ کے عول کل تین (۳) آتے ہیں = ۱۳/ ۱۵/ ۱۷

۲۴ کا عول صرف ایک ہی آتا ہے = اور وہ "۲۷" ہے۔

مثلاً (۱)

المـــ ۶ عو ۹

شوہر	حقیقی بہنیں ۳	اخیافی بہنیں ۴	علاتی بہن
۱/۲	۲/۳	۱/۳	م
۳	۴	۲	

(۲) الم ۱۲ عو ۱۷

بیوی	اخیافی بھائی ۳	حقیقی بہنیں ۵	ماں
۱/۴	۱/۳	۲/۳	۱/۶
۳	۴	۸	۲

(۳) الم ۲۴ عو ۲۷

بیوی	بیٹیاں ۴	ماں	باپ
۱/۸	۲/۳	۱/۶	۱/۶ ع
۳	۱۶	۴	۴

پہلی مثال میں "٦" کا عول "۹" دوسری مثال میں "۱۲" کا عول "۱۷" اور تیسری مثال میں "۲۴" کا عول "۲۷" آیا ہے۔

نوٹ: عول میں جو اعداد بیان کئے گئے ہیں ان ہی میں سے کسی ایک عدد سے عول آسکتا ہے، اس کے علاوہ کسی اور عدد سے عول نہیں آسکتا۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ جس مسئلہ میں "عول" ہو رہا ہو اس میں "عصبہ" موجود ہو تو اسے میراث سے کچھ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ ترکہ خود ذوی الفروض ہی کے لئے ناکافی ہوا جس کے نتیجہ میں مخرج زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

رد

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ورثہ کے حصے متعین فرمائے اور ساتھ ہی ورثہ کے درمیان فرضیت و تعصیب کے طور پر تقسیمِ میراث کی کیفیت واضح فرمائی۔ مزید برآں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی اس کی تصریح کرتا ہے۔ "اَلحِقُوْا الْفَرَائِضَ بِاَہْلِہَا فَمَا بَقِیَ فَلَا وَلٰی رَجُلٌ ذکر (بخاری شریف ۲/۹۹۷، مسلم شریف، ج/۲، ص ۳۴)

لہٰذا ورثہ میں ذوی الفروض کے ساتھ عصبہ موجود ہو تو حکم بالکل واضح ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد مابقی کا عصبہ مستحق قرار پائے گا، اور یہی صورت کثیر الوقوع ہے۔

لیکن کبھی ورثہ میں عصبہ نہ ہونے کی وجہ سے ذوی الفروض کو اپنے سہام دینے کے بعد کچھ سہام بچ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بقیہ سہام متقدمین کے قول کے مطابق بیت المال میں جمع کئے جائیں گے۔ تاہم ہمارے زمانہ میں بیت المال کا مستقل نظم درست نہ ہونے کی بناء پر بقیہ ترکہ ان ہی ذوی الفروض پر ان کے حصوں کے تناسب سے دوبارہ تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ متأخرین کے قول سے مستفاد ہوتا ہے۔ (تحفۃ المحتاج ج٦، ص ۳۹۰)

رد کی تعریف: مخرج کا زیادہ ہونا اور ورثہ کے سہام کا کم ہو جانا مخرج سے باقی ماندہ سہام ذوی الفروض پر دوبارہ تقسیم کرنے کو "رد" کہتے ہیں۔

"عول" کی ضد "رد" ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ کسی مسئلہ میں عصبہ موجود ہو تو رد کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ کیونکہ باقی ماندہ سہام عصبہ بطور عصبیت لے گا۔

رد میں ذوی الفروض کی قسمیں: زوجین کے علاوہ دیگر ذوی الفروض پر "رد" ہو سکتا ہے، لہٰذا اس میں ورثہ کی دو

قسمیں ہیں۔(۱)زوجین(مَنْ لَا یَرُدَّ عَلَیۡہِمۡ یعنی جن پر رد نہیں کیا جاتا)(۲)غیر زوجین(مَنْ یَرُدَّ عَلَیۡہِمۡ یعنی جن پر رد کیا جاتا ہے)

رد کے قواعد: اگر کسی مسئلہ میں رد ہو تو اس کو بنانے کے چار قواعد ہیں۔

۱)زوجین میں سے کوئی نہ ہو اور بقیہ ذوی الفروض میں سے ایک قسم کا وارث موجود ہو تو مسئلہ ان کے عدد رؤس سے بنے گا جیسے

المـــــ۳ رد سے پہلے	المـــــ۸ رد کے بعد
بیٹیاں ۸	بیٹیاں ۸
۲/۳	۸
۲	

اس مثال میں بیٹیوں کو "ثلثان" دینے کے بعد ایک ثلث لینے کے لئے کوئی وارث نہیں تھا، اس لئے ایک ہی قسم کا وارث ہونے کی بناء پر مخرج ان کے عدد رؤس سے متعین کیا گیا۔

۲)زوجین میں سے کوئی نہ ہو اور بقیہ ذوی الفروض دو یا دو سے زیادہ قسم کے ہوں تو ان کے مجموعی سہام کو مخرج کے طور پر متعین کریں گے۔ جیسے

المـــــ۶	رد سے پہلے	المـــــ۶	رد الی ۵
حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۲	حقیقی بہن	اخیافی بھائی ۲
۱/۲	۱/۳	۱/۲	۱/۳
۳	۲	۳	۲

اس مثال میں "۶" مخرج سے کل پانچ سہام تقسیم ہوئے۔ ایک حصہ کو لینے والا کوئی نہیں اس لئے ورثہ کے مجموعی سہام "۵" کو اصل مسئلہ کے آگے "ردالی" لکھ کر مخرج بنایا گیا۔ گویا رد کے بعد مخرج "۶" کے بجائے "۵" ہی سمجھا جائے گا۔

۳)زوجین میں سے کوئی اور بقیہ ذوی الفروض ایک ہی قسم کے ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱)سب سے پہلے زوجین کے حصہ سے مخرج متعین کریں گے۔ اس میں سے شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ سہام بقیہ ذوی الفروض کے عدد رؤس پر برابر تقسیم ہوں تو تصحیح کی ضرورت نہیں۔ جیسے:

المـــــ۱۲	رد سے پہلے		المـــــ۴	رد کے بعد
شوہر	بیٹیاں ۳		شوہر	بیٹیاں ۳
۱/۴	۲/۳	(۳)	۱/۴	
۳	۸		۱	۳

اس مثال میں شوہر کے حصہ (۱/۴) سے "۴" مخرج متعین کر کے شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ سہام "۳" بقیہ ذوی الفروض میں سے تین بیٹیوں کے عدد رؤس پر برابر تقسیم ہو رہے ہیں اس لئے مزید کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲)اگر باقی ماندہ سہام بقیہ ذوی الفروض کے عدد رؤس پر برابر تقسیم نہ ہوتے ہوں تو عدد رؤس کو زوجین میں کے مسئلہ میں ضرب دے کر اس میں سے شوہر یا بیوی کا حصہ دیں گے۔ اور باقی ماندہ تمام حصے اس دوسرے وارث کو دیں گے۔ جیسے

بیوی	اخیافی بھائی ۴		بیوی	اخیافی بھائی ۴
الم ـــــ ۱۲	رد سے پہلے		الم ـــــ ۴×۴=۱۶	رد کے بعد
۱/۴	۱/۳	(۳)	۱/۴	۳
۳	۴		۴	۱۲

اس مثال میں بیوی کو اپنا حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ "۳" سہام دوسرے وارث کے رؤس پر برابر تقسیم نہیں ہو رہے تھے۔ اس لئے کل عدد رؤس سے اصل مسئلہ میں ضرب دے کر کل تصحیح "۱۶" ہوئی۔ اس میں بیوی کا "ربع" چار حصے دیئے اور باقی ماندہ "۱۲" حصے دوسرے وارث کو دیئے گئے۔

۴) زوجین میں سے کوئی ہو اور بقیہ ذوی الفروض دو یا دو سے زیادہ قسم کے ہوں زوجین و غیر زوجین دونوں کا الگ الگ مسئلہ بنائیں گے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ زوجین کے لئے شوہر یا بیوی کے حصہ کو مخرج بنا کر اس میں سے اس کا حصہ دیں گے۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کا مسئلہ "دوسرے قاعدے" یعنی اس کے سہام سے بنائیں گے۔ اب یہ دیکھیں کہ شوہر یا بیوی کا حصہ دینے کے بعد جو باقی ماندہ ہے وہ بقیہ ذوی الفروض کے مخرج پر برابر تقسیم ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر باقی ماندہ برابر تقسیم ہوتا ہو تو تصحیح کا عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ زوجین کے ہی مخرج کو دونوں مسئلوں کا "مشترکہ مخرج" تصور ہوگا۔ اس سے شوہر یا بیوی اور بقیہ ذوی الفروض کا حصہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر یا بیوی کو جو اپنے مخرج سے جو حصہ ملا ہے اسے بقیہ ذوی الفروض کے مخرج میں ضرب دیں۔ حاصل ضرب اس کا حصہ ہوگا۔ "مشترکہ مخرج" میں سے۔

اور دوسرے مسئلہ کے ورثہ کو جو حصہ ملا ہے، ہر ایک کے حصہ کو شوہر یا بیوی کے مخرج سے "باقی ماندہ عدد" میں ضرب دیں۔ حاصل ضرب ہر وارث کا مشترکہ مخرج میں سے حصہ شمار کیا جاوے گا۔ جیسے

بیوی	اخیافی بھائی ۳	ماں
الم ـــــ ۱۲	رد سے پہلے	
۱/۴	۱/۳	۱/۶
۳	۴	۲

	بیوی	اخیافی بھائی ۳	ماں
	الم ـــــ ۴	۶ رد الی ۳	رد کے بعد
(۳)	۱/۴	۱/۳	۱/۶
	۱	۲	۱

اس مثال میں پہلے زوجین کے مسئلہ میں بیوی کے حصہ سے مخرج متعین کیا گیا۔ اس میں سے بیوی کو ایک حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ "۳" ہیں۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کے مسئلہ میں مخرج "۶" سے "۳" پر رد ہوا یعنی ان کے سہام سے مخرج بنایا گیا۔ اور یہ دوسرے مسئلہ کا مخرج "۳" زوجین کے مسئلہ سے باقی ماندہ "۳" پر برابر تقسیم ہو رہا ہے اس لئے تصحیح کی ضرورت نہیں۔ بلکہ "۴" عدد ہیں دونوں کا

مشترکہ مخرج سمجھا جائے گا۔

الم ـــــ ۲۴ رد سے پہلے

بیوی	بیٹی	پوتی	دادی ـــــ نانی
۱/۸	۱/۲	۱/۶	۱/۶
۳	۱۲	۴	۴

الم ـــــ ۸×۵=۴۰ ۶ رد الی ۵ رد کے بعد

(۷)

بیوی	بیٹی	پوتی	دادی نانی
۱/۸	۱/۲	۱/۶	۱/۶
۱	۳	۱	۱
۵	۲۱	۷	۷

اس مثال میں سب سے پہلے زوجین کے مسئلہ میں بیوی کے حصہ سے مخرج بنایا، اس سے بیوی کا حصہ دینے کے بعد "۷" باقی ماندہ ہے۔ پھر بقیہ ذوی الفروض کا مسئلہ ان کے سہام سے بنایا گیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ "باقی ماندہ" بقیہ ذوی الفروض کے مخرج پر برابر تقسیم نہیں ہوتا۔ اس لئے دوسرے مسئلے کے "۵" مخرج کو زوجین کے مخرج "۸" میں ضرب دینے سے مشترکہ مخرج "۴۰" حاصل ہوا۔ بیوی کے حصہ کو "۵" میں ضرب دیا گیا پھر بیٹی، پوتی کے حصہ کو باقی ماندہ "۷" میں ضرب دینے سے ہر ایک کا مشترکہ مخرج سے حصہ معلوم ہوا۔

بحمد للہ وبعون اللہ التوفیق یہاں تحفۃ الباری فی الفقہ الشافعی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ کتاب کی طباعت، کتابت میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ کوئی غلطی نہ رہے۔ باوجود اس کے بتقاضائے بشریت اگر کوئی غلطی، سہو رہ گیا ہو تو گزارش ہے کہ ہمیں مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح کی جائے گی۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ وَالْمُعَافَاةَ الدَّائِمَةَ فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِیُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِیُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْكَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ (آمین) وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔